فریادی

شمیم نوید

1

پیش لفظ

کافی عرصے پہلے ہم نے سائنس کی ایک تھیوری پڑھی تھی۔ اُس تھیوری کے مطابق ہر انسان اپنے دماغ کے مختصر حصے ہی کو استعمال کر پاتا ہے۔ دماغ کے کم ہی خلیے بیداری کی حالت میں، یعنی فعال ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ جس شخصیت کے دماغ کے جتنے زیادہ خلیے بیداری کی حالت میں ہوتے ہیں، وہ اُتنا ہی زیادہ ذہین ہوتا ہے۔ اگر کسی فرد کے ایک چوتھائی دماغ کے خلیے بھی بیدار ہو جائیں تو اُس میں حیرت انگیز پراسرار قوتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ ہم نے یہ بھی پڑھا کہ کسی ایسے فرد میں دوسرے کسی فرد کے دماغ کو پڑھنے، اُس کے ماضی کا سراغ لگانے، اُسے کوئی حکم دینے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہم عرصۂ دراز سے مختلف موضوعات پر کہانیاں اور قسط وار ناول لکھتے آ رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ اگر کسی کردار میں مندرجہ بالا صفات پیدا ہو جائیں تو وہ کیا قیامت ڈھائے گا؟ یہ سوال خاصے دن ہمارے ذہن میں گردش کرتا رہا، مگر تشنہ جواب ہی رہا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ 1985ء میں ہماری زیرِادارت ایک ڈائجسٹ کی اشاعت کا پروگرام بنا۔ اُس ڈائجسٹ کے لئے ہمیں سلسلہ وار ناول بھی لکھنا تھا۔ سو یوں ہم نے ''فریادی'' لکھنے کی ابتدا کی۔ عذرا خان کے نام سے ہم نے ایک ایسا کردار تخلیق کیا جو مذکورہ حیرت انگیز و پراسرار صلاحیتوں کا حامل تھا۔ ہم نے ''فریادی'' کو ایک سرگزشت کی صورت میں عذرا خان ہی کی زبانی بیان کیا۔

''فریادی'' اپنے دور کا مقبول ترین قسط وار ناول ثابت ہوا۔ یہ حیرت انگیز ناول پہلی مرتبہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ برسوں پہلے جو قارئین اسے ڈائجسٹ میں قسط وار پڑھ چکے ہیں، وہ بھی اسے دوبارہ ایک ساتھ پڑھنا پسند کریں گے۔

ایسا انوکھا ناول ہم نے اور کوئی نہیں لکھا۔ اس ناول کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ ناول آپ کو پسند آئے گا۔ اگر ہماری یہ تحریر بھی آپ کے معیار پر پوری اُترے تو ہمیں اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

آپ کی دُعاؤں کا طالب...... شمیم نوید

فریادی کے نام سے صفحۂ قرطاس کی زینت بننے والی داستان، ایک ہشت پہلو داستان ہے۔ یہ ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے حسین ترین دوشیزہ عذرا خان کی سرگزشت ہے، جسے عذرا خان نے نہایت دلچسپ انداز اور کامل سچائی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

ٹیلی پیتھی کی صلاحیت کا مالک ذہن رکھنے والی اس قتالہ عالم نے ملکی تاریخ کے پس منظر میں ان حقائق کو منظر عام پر لانے کا معرکہ سر کیا ہے جس سے ہماری تاریخ کے صفحات بے خبر اور عام آدمی کے ذہن کی رسائی سے باہر تھے۔ عذرا خان جس کا ذہن ہزاروں سالوں پر محیط تھا، قدرت نے اُس کے ذہن کو ایسی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا جس سے وہ ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں سفر کر سکتی تھی۔ انہی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے اپنے وطن عزیز کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والی امن شکن طاقتوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

ملکی غداروں کے علاوہ اس نے عالمی اور منظم دہشت گردوں کے خلاف بھی طبل جنگ بجا دیا، جو دنیا کی سپر پاورز کے پروردہ اور گماشتے تھے۔ اس داستانِ دل ستان و دل نواز کا ایک حصہ قارئین کے لئے یقیناً ایک سرپرائز کی حیثیت رکھتا ہے جس میں عذرا خان نے اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ماضی کا ایک سفر طے کر کے مغلیہ سلطنت کے رومان پرور ماحول اور زوال کے خفیہ اسباب سے روشناس کرایا ہے۔ اورنگزیب عالمگیر سے بہادر شاہ ظفر تک کی روداد، محلاتی سازشیں، حسن و عشق کی دلفریب رنگینیوں کا احوال، دلگداز بغاوتوں کی وجوہات اور اعتبار اور نااعتبار کی کیفیتوں کا معلومات بخش خزانہ فراہم کر کے تاریخ کا پرانا قرض اُتار دیا گیا ہے۔

آیئے قارئین! ہم بھی ان اسرار کو جاننے کے لئے اس داستان کی پراسرار وادی میں عذرا خان کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔

ادارہ

میں اس بات کا قائل تھی کہ اب ہم دونوں میں سے کوئی ایک زندہ رہ سکتا ہے۔ میری فلائنگ کک سے زمین بوس ہو کر اس زردروڈ ونگی نے ریوالور نکال لیا تھا۔ میں نے بھی قریبی ریک پر رکھا ہوا چاقو اٹھانے میں دیر نہیں کی تھی۔ اس کا لہولہان چہرہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر اس کے زخمی ہونٹ عجیب سے انداز میں پھیل گئے۔ وہ شاید میری "حماقت" پر مسکرایا تھا کہ ریوالور کے مقابلے میں، میں نے چاقو اٹھایا تھا۔

"میں اب تجھے زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا!" معاً وہ ریوالور لہرا کر غرایا۔

"کیوں، کیا مجھے زندہ پکڑنے کی حسرت دم توڑ گئی؟" میرے لہجے میں استہزا تھا۔

"تیرے ہاتھوں میرے دو بہترین لڑاکے مارے جا چکے ہیں۔ میں تجھ سے ان کا انتقام ضرور لوں گا۔" اس نے دانت پیسے۔

"مگر تمہی نے تو کہا تھا کہ میں دنیا کی اچھی نسل کی عورت ہوں! مجھے زندہ گرفتار کر کے تم کروڑوں ڈالر کے مالک بن سکتے ہو۔ کیا تم اس کے باوجود مجھے قتل کر دینا چاہتے ہو؟" میں نے اس پر طنز کیا۔

"میں مجبور ہو گیا ہوں!" اس نے کسی قدر تیز انداز میں سر ہلایا۔ "تم مجھے باتوں میں لگا کر سوچنے کی مہلت چاہتی ہے، مگر میں تجھے اس کا موقع نہیں دوں گا۔" یہ کہتے ہی اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے ساتھ اس کے ریوالور کی نال میری طرف اٹھ گئی۔ اب وہ کسی بھی لمحے مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔

ممکن ہے میں اسے اتنا احساس دلانے سے قاصر رہتی کہ اس قدر رقم نظر انداز کر دے تو وہ مجھے قتل کرنے پر آمادہ نہ ہوتا، کوشش کے باوجود وہ مجھے معمولی سی ضرب لگانے میں بھی ناکام رہا تھا۔ میری نگاہ اس کے ریوالور پر جمی ہوئی تھی۔ میں اپنے چاقو کو نوک کی جانب سے پکڑے ہوئے تھی۔ اس سے معرکہ آرائی کے دوران میں مجھے اتنی مہلت نہیں مل سکی تھی کہ تکیے کے نیچے سے اپنا ریوالور نکال سکتی۔ چاقو بھی بس سوئے اتفاق میرے ہاتھ چڑھ گیا تھا۔

"کیوں، کیا پھر دولت کا لالچ سوار ہو گیا؟" چند لمحے بعد میں نے کمرے میں پھیلی ہوئی بوجھل خاموشی کو توڑا۔

"میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر ابھی تو تم مجھے قتل کرنے والے تھے؟"

"ہاں قتل بھی کر سکتا ہوں۔ یہ میرے اختیار میں ہے۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی اور مجھ سے سودا نہ کیا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔

"پھر یہ سودا تو نہ ہوا، زبردستی ہوئی۔"

''میرے نزدیک یہ سودا ہی ہے، تمہیں بہرحال یہ اختیار ہوگا کہ میری پیشکش قبول کرلو یا رد کردو، پیشکش قبول کرنے کی صورت میں میں تمہاری زندگی کی ضمانت لیتا ہوں، لیکن ردّ کرنے پر تمہیں خود اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں گا، بولو تمہیں زندگی چاہیے یا موت؟''

اس نے دھمکی آمیز انداز میں ریوالور والے ہاتھ کو جنبش دی۔

''یہ سوال کرنے سے پہلے مجھے کم از کم اپنی پیشکش کے بارے میں تو بتا دو تاکہ میں کوئی فیصلہ کرسکوں۔'' میں نے اس کے لہولہان چہرے پر نظر دوڑائی۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم آمادہ ہو!''

''ابھی مطلب اخذ نہ کرو، میں نے صرف پیشکش سننے پر رضامندی ظاہر کی ہے، تم خود ہی اسے قبول یا ردّ کرنے کا اختیار مجھے دے چکے ہو۔''

''ہوں!'' اس نے ہنکارا ابھرا۔ ''ٹھیک ہے! تمہیں ایک کروڑ ڈالر قبول ہیں؟ اس نے سوال کیا۔

''کس بات کے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اپنے اغواء کے!'' اس نے جواب دیا۔ ''اغواء کے بعد تمہاری زندگی اور رہائی کی ضمانت میں لیتا ہوں۔''

''اغواء کر کے تم مجھے کہاں لے جاؤ گے؟ ظاہر ہے کہ تم نے کسی سے میرا سودا کیا ہوگا، وہ کون ہے جو مجھے اتنے مہنگے داموں خریدنا چاہتا ہے اور کس لیے؟''

''وہ کون ہے، یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا اور یہ خود مجھے بھی معلوم نہیں کہ وہ کس وجہ سے تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہے اور تمہارا کیا کرے گا! ہاں میرے لیے یہ مشکل نہیں ہوگا کہ اس سے رقم وصول کرنے کے بعد تمہیں اس کے چنگل سے آزاد کرا دوں۔'' اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''گویا اس طرح مکمل طور پر میں تمہارے رحم و کرم پر رہوں گی۔''

''ہاں ایک کروڑ ڈالر کے لیے تمہیں مجھ پر بھروسا تو کرنا ہی پڑے گا۔'' یہ کہہ شاید وہ کچھ سوچنے لگا، ذرا توقف سے اس کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ ''تمہیں یقین دلانے کی میرے پاس ایک اور صورت بھی ہے۔''

''وہ بھی بتا دو۔'' میں مسکرائی۔ ''تاکہ مجھے یقین آجائے کہ تم میرے ساتھ دھوکہ نہیں کرو گے۔''

''میں تمہارے اغواء سے پہلے پچیس ہزار ڈالر تمہارے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرانے پر راضی ہوں۔'' اس نے اپنی تجویز پیش کی۔''

''اور میں تمہارے پچیس ہزار ڈالر ہضم کر گئی تو؟'' میں اس بچکانہ تجویز پر ہنس پڑی۔

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ غالباً اسے یہ توقع نہیں ہوگی کہ میں اپنی موت کو سامنے دیکھ کر بھی ہنسنے کی جرأت کرسکوں گی۔

''مجھے اعتراف ہے کہ تم بہت مضبوط اعصاب کی عورت ہو، لیکن یہ نہ بھولنا کہ میرے ساتھ دھوکہ کرنیوالے زندہ نہیں رہتے! اگر یقین نہیں تو مجھے دھوکہ دے کر دیکھ لو!''

''میں نے اب تک بہت سے احمق دیکھے ہیں مگر تمہارا کوئی جواب نہیں۔'' یہ کہہ کر میں ہنس پڑی۔ ''تم اتنے بڑے احمق ہو کہ مجھی سے میری زندگی کا سودا کر رہے ہو! ایک کروڑ ڈالر تو کیا کوئی خود کو ایک کھرب میں

بھی بیچنا پسند نہیں کرے گا آخر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری احمقانہ باتوں میں آجاؤں گی!'' میرا لہجہ پھر استہزائیہ ہوگیا۔

''سمجھ گیا میں!'' اس نے اتنی سختی سے ہونٹ بھینچے کہ دونوں جبڑوں کے ابھار نمایاں ہوگئے۔

''یہی سمجھے ہو گے تم کہ میں زندہ رہنا نہیں چاہتی، ہے نا؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں! یہی سمجھا ہوں میں! اور میں تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔''

''لیکن مجھے قتل کر کے تو کچھ بھی نہیں ملے گا تمہیں!''

''جانتا ہوں میں! لیکن اس طرح میرے دشمن بھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''تمہارے دشمن! سمجھی نہیں میں، تمہارے دشمنوں سے میرا کیا تعلق؟'' میں نے استفسار کیا۔

''وہ بھی تمہیں اغوا کرنا چاہتے ہیں اور ان کا مقصد بھی حصول زر ہے، لیکن جب تمہی قتل کر دی جاؤ گی تو پھر وہ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف تم اور تمہارے گرگے ہی میرے پیچھے نہیں پڑے ہوئے بلکہ کچھ اور لوگ بھی میری تلاش میں ہیں!'' یہ کہہ کر میں نے طویل سانس لیا۔

''ہاں میرے آدمیوں کی مسلسل ناکامی کے بعد ہی ایسا ہوا۔ وہ جو ہر قیمت پر تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہے، اس نے اسی دوران میں میرے مخالف گروہ سے بھی معاملہ کرلیا، اب ہم دونوں میں سے جو پہلے کامیاب ہوگیا، اسی کو معاوضہ مل سکے گا، عموماً میں ایسے ایسے چھوٹے موٹے چکروں میں خود ہاتھ نہیں ڈالتا، اس کے لیے میرے آدمی کافی ہوتے ہیں، لیکن یہ معاملہ مجبوراً مجھے اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔'' اس کے ساتھ ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔ ''سنو! میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں، میں تین تک گنتی گنوں گا، تمہیں اس سے پہلے اقرار کر لینا ہے کہ سودا منظور ہے ورنہ......'' اس نے ریوالور والے ہاتھ کو جنبش دی۔ ''میں گنتی شروع کر رہا ہوں۔ ایک......دو......''

مجھے یقین تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، اس پر عمل کر گزرے گا۔ ایسے لوگ عموماً اپنی زبان سے نہیں پھرتے، یہی سبب تھا کہ گنتی پوری ہونے سے پہلے میرے اعصاب تن گئے، میں نے پوری قوت کے ساتھ اپنا چاقو اس کی طرف پھینکا اور پھر فوراً ہی جھک گئی، دوسرے ہی لمحے سنسناتی ہوئی گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی، فائر ہونے سے دھماکہ نہیں ہوا تھا اور میں اس کی وجہ جانتی تھی۔ ریوالور کی نال پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا، اس نے اندازہ لگانے میں بس ایک ہی لمحے کی غلطی کی تھی اور یہی ایک لمحہ اس کے لیے قاتل ثابت ہوا تھا، میرا وار بڑا اچھا تلا تھا جس کے نتیجے میں وہ اب فرش پر پڑا تڑپ رہا تھا، میرا پھینکا ہوا چاقو اس کے سینے کی بائیں جانب دستے تک پیوست تھا، ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف جا پڑا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ، چاقو کے دستے پر تھے، آج میری ''فردِ جرم'' میں ایک اور قتل کا اضافہ ہوچکا تھا۔

میری خواب گاہ تک پہنچنے کے لئے اس زرد رُو چینی کو یقیناً بڑی مشکلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ مجھے اس بات کا علم تھا، اس کا میری خواب گاہ تک پہنچ جانا ہی یہ ثبوت فراہم کرتا تھا کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا، میری کوٹھی کی اطراف رات کو دس بجے کے بعد ہی خاردار تاروں میں برقی رو دوڑا دی جاتی تھی، اس کے علاوہ کمپاؤنڈ میں خوفناک بلڈ ہاؤنڈ چھوڑ دیئے جاتے تھے، یہ سارا بندوبست میں نے حال ہی میں کیا تھا، اس سے پہلے بھی

مجھے دومرتبہ تقریباً ایسی ہی صورت حال سے گزرنا پڑا تھا، مجھے ان کی لاشیں بھی ٹھکانے لگانا پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک مقامی تھا اور دوسرا چینی۔ وہ دونوں بس غلط فہمی میں مارے گئے تھے، یہ انکی حماقت ہی تھی کہ انہوں نے مجھے خوفزدہ کرنے کی خاطر یہ تاثر دیا تھا جیسے میرے قتل کے درپے ہیں، آج سے پہلے یہ معاملہ میرے لیے کسی معمے سے کم نہیں تھا کہ آخران دونوں کا مقصد کیا تھا!اگر مجھ پر یہ کھل گیا ہوتا کہ ان کا اصل مقصد مجھے قتل کرنا نہیں بلکہ ڈرادھمکا کر اغوا کرنا ہے تو شاید میں کوئی ایسی راہ نکال ہی لیتی کہ وہ میرے ہاتھوں مارے نہ جاتے، معلوم نہیں یہ مرد، عورت کو سمجھتے کیا ہیں! غالباً انہیں یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ موت کو سامنے دیکھ کر ہر عورت پسپائی اختیار کرلیتی ہے۔

یہ معما کسی حد تک حل ہونے کے باوجود اب تک میرے لیے الجھن کا سبب بنا ہوا تھا کہ آخر مجھے کون اغواء کرانا چاہتا ہے اور کیوں؟ پہلے دو افراد کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے سے قبل مجھے ان کی تلاشی لینے پر صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا تھا کہ وہ پیشہ ور مجرم ہیں، بعد میں اپنے طور پر میں نے اس کی تصدیق بھی کرلی تھی، لاشیں ٹھکانے لگانے سے قبل میں نے دونوں کی تصویریں کھینچ لی تھیں، وہ دونوں ہی مختلف کیسز میں پولیس کو مطلوب تھے لیکن یہ تیسرا شخص ان سے مختلف معلوم ہوتا تھا، نہ اس کا حلیہ اور لباس ایسا تھا، نہ ہی وہ چہرے مہرے سے جرائم پیشہ لگتا تھا، وہ یقیناً ان لوگوں میں سے تھا جن کے چہرے باطن کی چغلی نہیں کھاتے، وہ کون تھا؟ یہ جاننے کے لیے میں اس کی لاش کی طرف بڑھی، اس کا جسم اب ساکت ہوچکا تھا۔

پہلے میں نے اپنا چاقو اس کے سینے سے کھینچ کر نکالا اور اچھل کر پیچھے ہٹ گئی، میں نہیں چاہتی تھی کہ خون کی چھینٹیں میرے کپڑوں پر آئیں کیونکہ اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، اپنا چاقو اس کے کپڑوں سے صاف کرکے میں نے ایک طرف رکھ دیا اور پھر اس کی تلاشی لینے لگی۔

تلاشی سے مجھے اس کے نام کے علاوہ بس ایک ہی کام کی چیز ملی، یہ ایک ٹیلی فون نمبر تھا۔ اس ٹیلی فون نمبر کے ابتدائی دو ہندسے پڑھ کر مجھے معلوم ہوگیا کہ نمبر کس علاقے کا ہے۔ ہندسے اس طرح لکھے ہوئے تھے، جیسے مقتول چن ای نے جلدی میں وہ نمبر لکھا ہو، میں نے وہ نمبر ذہن نشین کرلیا، پھر لاش کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کرنے لگی۔ رات کا وقت اس کام کے لیے مناسب تھا، میں نے اسی لیے دیر نہیں کی۔ ابھی ساڑھے گیارہ ہی بجے تھے، کراچی ایسے شہر میں یہ وقت زیادہ نہیں۔

کچھ ہی دیر بعد میری شیورلیٹ، ڈیفنس کے علاقے سے نکل کر تیزی کے ساتھ ساحل سمندر کی طرف جارہی تھی، اس کی ڈکی میں اُسی چینی کی لاش تھی، لاش ایک بوری میں تھی جس کا منہ میں نے باندھ دیا تھا، لاش کے علاوہ بوری میں کچھ بھاری پتھر بھی تھے تاکہ بوری پانی کی تہہ میں بیٹھ جائے۔

یہ کام میرے لیے مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں، پھر یہ کہ پہلے بھی میں اس صورتحال سے گزر چکی تھی، بہر حال کسی نہ کسی طرح میں نے وہ ناخوشگوار فرض ادا کرہی دیا اور تقریباً رات کے ایک بجے تک اپنی کوٹھی میں واپس آگئی، لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں نے سب سے پہلے اپنی خواب گاہ پر توجہ دی، میں نے وہاں سے قالین اٹھا دیا جس میں مقتول کا خون جذب ہوگیا تھا، قالین اٹھانے کے بعد مجھے فرش پر بھی معمولی سا دھبا نظر آیا، میں نے فرش بھی دھوکر صاف کردیا، میں وہاں کوئی ایسا نشان چھوڑنا نہیں چاہتی تھی جس سے ذرا بھی یہ شبہ ہوسکے کہ

اس جگہ کسی کا خون بہا ہے، فرش دھونے کے بعد میں نے اسٹور سے دوسرا قالین لاکر وہاں بچھا دیا، یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ مقتول کی چلائی ہوئی گولی سے میری خواب گاہ کی کوئی دیوار متاثر نہیں ہوئی تھی کھلی ہوئی کھڑکی سے گولی باہر نکل گئی تھی، اسی کھڑکی کا ایک شیشہ کاٹ کر مقتول نے اس کی چٹخنی کھولی تھی اور پھر اس کے ذریعے میری خواب گاہ میں کودا تھا، کھڑکی کا شیشہ صبح سے پہلے لگوایا جانا، ممکن نہیں تھا، اس لیے میں نے فی الحال اسے نظرانداز کردیا، خواب گاہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد مجھے اپنے کتوں کا خیال آیا جنہیں میں نے کمپاؤنڈ میں بے حس وحرکت پڑے ہوئے دیکھا تھا، میری ہدایت پر میرے ملازمین رات کے وقت انہیں خوراک ضرور دیتے تھے، اس سے میرا مقصد محض یہ تھا کہ وہ رات کو بھوکے نہ رہیں اور یہ کہ جب ان کا پیٹ خوب بھرا ہوگا تو وہ گوشت کے کسی ٹکڑے کی طرف نہیں دوڑیں گے، مگر میری یہ احتیاط بے سود ہی ثابت ہوئی تھی، میں یہ بھول گئی تھی کہ جانور کی فطرت نہیں بدلتی، ان کے قریب ہی مجھے کمپاؤنڈ میں گوشت کے ٹکڑے پڑے نظر آگئے تھے جن پر یقیناً کوئی زوداثر نشیلی دوا چھڑکی گئی تھی، کمپاؤنڈ وال پر خاردار تار بھی مجھے ایک جگہ سے کٹا ہوا ملا، یقیناً مقتول چن ای یہیں سے تار کاٹ کر اندر داخل ہوا تھا۔

کمپاؤنڈ کا جائزہ لے کر میں سرونٹ کوارٹرز کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے ملازمین کو صرف اتنا ہی بتایا کہ کسی نے تار کاٹ کر برقی رو منقطع کرنے کے بعد کمپاؤنڈ میں گوشت کے ٹکڑے پھینکے اور جب کتے بے ہوش ہوگئے تو وہ کوٹھی میں گھس آیا، پھر جب وہ میری خواب گاہ کی کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر اندر داخل ہورہا تھا تو آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی اور اس نے راہ فرار اختیار کرلی۔

بے ہوش کتوں کو میرے ملازمین، کمپاؤنڈ سے اٹھا کرلے گئے اور پھر میری ہدایت پر رات ہی کو خاردار تاروں کو جوڑ کر ان میں برقی رو دوڑا دی گئی، اسی وقت میں نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ صبح، کھڑکی کا شیشہ بھی لگ جانا چاہیے، اس کے بعد میں اپنی خواب گاہ میں آگئی، ذہنی الجھن کے سبب اس رات مجھے کافی دیر میں نیند آسکی۔

صبح اٹھتے ہی میں نے ضروریات اور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد پہلے یہی معلوم کرنا ضروری سمجھا کہ وہ فون نمبر کس کا تھا جو مجھے مقتول چن ای کی جیب سے ملا تھا، میں نے ون سیون ڈائل کیا، خاصی دیر بعد دوسری جانب سے ریسیور اٹھایا گیا، مجھے اس پر تھوڑی سی جھنجلاہٹ بھی ہوئی مگر میں سرکاری محکموں کی ''فرض شناسی'' سے واقف تھی، اسی لیے اپنے غصے کو پی گئی اور آپریٹر کو وہ نمبر بتا کر پوچھا۔ ''یہ نمبر کس کا ہے؟''

چند لمحے بعد ہی دوسری جانب سے جواب ملا۔ ''خاتون! یہ نمبر غلط ہے۔ اس نمبر پر کوئی فون نہیں۔''

''آپ ایک بار پھر......''

''میں کہہ چکا ہوں جناب کہ یہ غلط نمبر ہے۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے سلسلہ منقطع کردیا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ بہت سے لوگ اپنے نمبر صیغہ راز میں رکھنے کے لیے ٹیلی فون کے محکمے سے درخواست کرتے ہیں، ایسے نمبر ڈائریکٹری میں بھی درج نہیں کیے جاتے، خود میں نے بھی ایک ایسا فون نمبر لے رکھا تھا، وہ نمبر واقعی غلط تھا یا صحیح، یہ جاننے کے لیے میں نے ایک ترکیب آزمائی، میں نے وہ نمبر ڈائل کیا تو دوسری جانب گھنٹی بجنے لگی، اس کا مطلب یہی تھا کہ نمبر غلط نہیں تھا، کچھ ہی دیر بعد ریسیور اٹھا لیا گیا اور اس پر ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

میرے لیے بس اتنا ہی کافی تھا، میں نے سلسلہ منقطع کر دیا، دوسری جانب سے جس نے ریسیور اٹھایا ہوگا، وہ غالباً یہی سمجھا ہوگا کہ غلط نمبر مل گیا ہوگا اور نمبر ملانیوالے کو کسی مرد کے بولنے کی توقع نہیں ہوگی، اسی لیے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں ایک اور نمبر ڈائل کر رہی تھی، یہ میری اپنی فرم کا نمبر تھا، نمبر ملتے ہی دوسری جانب سے میری ٹیلی فون آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ ''اسلام علیکم! عذرا انٹر پرائزز۔''

''میں عذرا بول رہی ہوں شبانہ!'' میں نے کہا

''لیس سر!'' اس کے لہجے سے ادب کا اظہار ہونے لگا۔

''دیکھو، مسز روزی سے کہہ دینا کہ آج میں شاید دفتر نہ آسکوں۔'' روزی میری جنرل منیجر کا نام تھا۔

''جی بہتر ہے سر!'' شبانہ کی مؤدب آواز سنائی دی۔

'اور سنو! ذرا نرگس سے بات کراؤ۔''

''ایک منٹ سر!'' شبانہ جلدی سے بولی، میں نے بھی ایک اور ٹیلی فون کی گھنٹی بجتے ہوئے سن لی تھی، شبانہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں فرض شناس افراد کو پسند کرتی ہوں، میں نے سنا کہ وہ دوسرے فون پر کسی کو ہولڈ کرنے کے لیے کہہ رہی تھی، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''سر! میں مس نرگس سے آپ کی بات کرا رہی ہوں۔''

''ہاں جلدی ملاؤ۔''

''ابھی لیجیے سر!'' شبانہ کے لہجے میں سعادت مندی تھی، چند ہی لمحے بعد مجھے اس کی آواز پھر سنائی دی، مگر اس بار وہ مجھ سے نہیں نرگس سے مخاطب تھی۔ ''ہیلو مس نرگس! سر آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں...... جی ہاں لائن پر ہیں، میں بات کراتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''مس نرگس سے بات کیجیے سر!''

''ہیلو نرگس!'' میں نے رابطہ ملتے ہی کہا۔

''آداب سر!'' نرگس کی نرم وشیریں آواز جواب میں سنائی دی۔

''آداب!...... ایک فون نمبر لکھو۔''

''ایک سیکنڈ سر!'' وہ بولی، پھر ذرا توقف سے کہا۔ ''جی بتایئے سر!''

میں نے فون نمبر لکھایا، پھر کہا۔ ''تمہیں جلد از جلد یہ معلومات حاصل کرنا ہیں کہ یہ فون کس کا ہے؟ اسی کے ساتھ مجھے پتا بھی چاہیے۔ نمبر سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلفٹن کے علاقے کا ہے، مگر مجھے پورا نام پتا چاہیے، غالباً تم ون سیون پر ٹرائی کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرو گی۔'' میرا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ ''یہ ان نمبروں میں سے ہے جن کے متعلق ٹیلی فون کے محکمے سے درخواست کی جاتی ہے کہ انہیں صیغہ راز میں رکھا جائے سمجھ گئیں تم!''

''جی سر!'' اس نے جواب دیا۔'' میں اس کے لیے ٹیلی فون ایکسچینج ہی کا رخ کروں گی، آپ مطمئن رہیں۔''

''میں کوٹھی پر ہی ہوں، تم مجھے یہیں اطلاع دینا اور اگر کوئی خاص بات ہو تو خود چلی آنا، مگر فون پر اطلاع دے کر کہ تم آرہی ہو۔'' میں نے ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے سر! میں ابھی اسی وقت دفتر سے روانہ ہو جاتی ہوں۔'' نرگس کا لہجہ پر جوش تھا اور مجھے اس

کا سبب معلوم تھا، بہت دن بعد میں نے کوئی کام اس کے سپرد کیا تھا۔

''خدا حافظ!'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور اٹھ کر خواب گاہ سے ملحق اپنے اسٹوڈیو میں آ گئی۔

جب کسی معاملے میں میرا ذہن الجھا ہوتا تھا تو میں کینوس پر رنگوں سے کھیلنے لگتی تھی، اس طرح مجھے بڑا سکون محسوس ہوتا تھا، وہاں بھی فون کا ایکسٹینشن تھا، اس لیے مجھے اطمینان تھا، اگر نرگس مجھے فون کرتی تو مجھے خواب گاہ میں نہ جانا پڑتا۔

اپنے بارے میں زیادہ تفصیلات سے میں اس لیے گریز کر رہی ہوں کہ میری آپ بیتی پڑھنے والوں کو خود ہی رفتہ رفتہ میرے بارے میں بہت سی باتوں کا علم ہوتا جائے گا، ہاں فی الوقت اتنا بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میرا نام عذرا خان ہے اور لوگ مجھے کروڑ پتی سمجھتے ہیں۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا میرا اچھا خاصا کاروبار ہے، یہ کاروبار کرنیوالے اداروں میں شاید میری فرم ہے جس میں صرف عورتیں اور ذہین و پڑھی لکھی لڑکیاں ہی ملازم ہیں، مردوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح میرے ذاتی ملازمین میں خواتین کی اکثریت ہے، دراصل میں عورت کو کسی بھی معاملے میں مرد سے کم تر تصور نہیں کرتی۔ میرے نزدیک عورت ہر وہ کام بہ حسن وخوبی انجام دے سکتی ہے، جس پر مرد صرف اپنے استحقاق کا دعویٰ کرتے ہیں، اعلیٰ حلقوں میں میری شخصیت جانی پہچانی ہونے کے باوجود کچھ پراسراری ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ لوگوں کو میرے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں کہ میں کون ہوں؟ اور یہ کہ میرا ماضی کیا ہے؟ میں کراچی شہر میں کہاں سے وارد ہوئی اور میرے عزیز واقارب کہاں ہیں؟ میں نے کبھی کسی کو خود سے اتنے قریب آنے کا موقع نہیں دیا کہ وہ میرے بارے میں مجھ سے کچھ پوچھنے کی ہمت کر سکتا۔ ہاں ایک شخص ضرور ایسا ہے جو میرے متعلق ہمیشہ متجسس رہا ہے، وہ بھی اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور میری طرح مہم جو فطرت کا مالک ہے، مگر اسے بھی میں نے زیادہ ہوا نہیں لگنے دی، اس کا نام ملک دلاور ہے اور وہ پنجاب کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے وہ ہمیشہ میری ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔

اپنی فرم میں ''آپریشنل'' کے نام سے میں نے ایک شعبہ قائم کر رکھا ہے۔ اس شعبے کی سربراہ نرگس ہے۔ نرگس کے شعبے میں اس کی ماتحت پانچ لڑکیاں اور ہیں جو بھی انتہائی ذہین اور پڑھی لکھی ہیں، اپنے اثر ورسوخ استعمال کر کے میں نے انہیں ریوالور رکھنے کے لائسنس بھی فراہم کر دیئے ہیں، وہ سب بھی مہم جو فطرت کی مالک ہیں، میں اکثر ان سے کام لیتی رہتی ہوں۔ کام کی نوعیت کیا ہوتی ہے، اس کا اندازہ جلد ہی آپ کو ہو جائے گا۔ میں قبل از وقت کچھ بتانا نہیں چاہتی۔

میں برش اور رنگوں سے کھیلتی رہی اور چونکہ اس وقت جب کینوس پر ایک چہرے کے خدوخال نمایاں نظر آنے لگے، واضح طور پر یہ مقتول چن ای کا چہرہ تھا، دراصل اس وقت میں اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی، کسی نفسیات داں نے یہ غلط نہیں لکھا کہ آدمی کے شعور یا لاشعور میں جو کچھ ہوتا ہے، اسی کا عکس رنگوں اور لفظوں میں جھلکتا ہے، مجھے اپنے نگارخانے میں ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا، اب تک نرگس کا فون آ جانا چاہیے تھا، میرے ذہن میں ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے لپک کر فون اٹھالیا، مجھے توقع تھی کہ دوسری جانب نرگس ہی ہوگی۔

''ہیلو!'' میں نے کہا، پھر دوسری جانب نرگس ہی کو فرض کر کے بولی۔ ''ہاں کیا رہا؟''

''کس سلسلے میں؟'' دوسری جانب سے نرگس کی بجائے ایک مردانہ آواز سنائی دی تو میں چونک اٹھی، وہ ملک دلاور کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا، میں اس کی آواز پہچانتی تھی۔

''دراصل اس وقت مجھے کسی اور کے فون کا انتظار تھا۔'' میں نے سنبھل کر کہا۔

''کبھی ہمارے فون کا انتظار بھی کر لیا کریں خاتون!'' وہ حسب معمول چہکا۔

مجھے اس وقت اس کا چہکنا کچھ کھلا، اس لیے سنجیدگی سے بولی۔ ''کہو کیا بات ہے؟ کس لیے فون کیا تھا؟''

''کیا کہاں تھا، ابھی تو کر رہا ہوں!'' اس کا لہجہ شوخ ہی تھا، وہ مجھ سے خاصا بے تکلف تھا۔ ''ویسے آج آپ اپنے دفتر نہیں گئیں!''

''ہاں کچھ کام تھا۔'' میں نے اسے ٹالا۔

''ذاتی نوعیت کا کام یا پھر......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا، اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟'' میں حسب معمول چڑ گئی۔ ''تم کس لیے میری ٹوہ میں رہتے ہو؟''

''اس لیے کہ آپ کبھی کسی مشکل میں پھنس جائیں تو میں کسی روایتی ہیرو کی طرح بر وقت آپ کی مدد کر کے اپنے لیے دل نازک میں جگہ بنا سکوں۔''

''منہ دھو رکھو! تمہیں ایسا موقع کبھی نہیں ملے گا! اور سنو یہ تم قاف نہیں بول سکتے کیا؟ اگر نہیں بول سکتے تو کم از کم میری سماعت پر اتنا ہی رحم کیا کرو کہ وہ الفاظ نہ بولا کرو جن میں قاف ہو!''

''آپ سے صحبت کا موقع مل گیا تو ایک نہ ایک دن شین قاف درست ہو ہی جائے گا، مگر آپ تو موقع ہی نہیں دیتیں حضور!''

''موکا نہیں موقع!'' میں نے تصحیح کی۔

''چلیں یہی سہی!'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''تو پھر کب امید رکھوں؟''

''انشاء اللہ اسی حسرت میں اس دنیا سے کوچ کر جاؤ گے۔'' میں نے ہنس کر کہا، پھر بولی۔ ''اچھا اب زیادہ کمبل ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے کسی کے فون کا انتظار ہے۔''

اسی وقت میں نے اپنی ملازمہ کو نگار خانے میں داخل ہوتے دیکھا۔

''اچھا دلاور، خدا حافظ!'' میں جلدی سے بولی۔

''ذرا ٹھہریں!'' وہ بھی جلدی سے بولا۔ ''ایک بات پوچھنا تھی آپ سے؟''

''تو پھر پوچھو جلدی!'' میں نے ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ مجھے کسی سے فون پر بات کرتے دیکھ کر میز کی جانب بڑھی اور ایک پرچے پر بال پین سے کچھ لکھنے لگی۔ غالباً وہ مجھے کوئی ضروری پیغام دینا چاہتی تھی۔

''کل آپ رات کے وقت ساحل سمندر پر دیکھی گئی تھیں۔''

دلاور کا لہجہ معنی خیز تھا، میں یہ سن کر چونک اٹھی، اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ اس نے کل رات میرا تعاقب کیا ہو۔

''کہاں کی اڑا رہے ہو!'' میں انجان بن گئی۔

''میرا آدمی غلط نہیں کر سکتا!'' وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔

''تو تم نے میرے پیچھے اپنے آدمی بھی لگا رکھے ہیں!'' مجھے غصہ آ گیا، یہ اطلاع واقعی میرے لیے نئی تھی، میں نے اسی دوران میں ملازمہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا، اس کے ہاتھ میں پرچہ تھا، جس پر اس نے کچھ لکھا تھا۔

''مزید عرض ہے کہ رات کو کسی نے آپ کی کوٹھی میں داخل ہونے کی کوشش بھی کی تھی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر......''

''ہولڈ کرو، ایک منٹ!'' میں نے ملازمہ کو اپنے قریب آ کر اپنی طرف پرچہ بڑھاتے ہوئے دیکھا۔

''ٹھیک ہے، میں ہولڈ کیے ہوئے ہوں۔'' دلاور کی آواز آئی۔

''میں نے ملازمہ سے پرچہ لے کر پڑھا، اس پر لکھا تھا۔ ''ذاتی فون پر مس نرگس آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر میں نے ملازمہ کو مخاطب کیا۔ ''اس سے کہو کہ ہولڈ کرے، میں ابھی بات کرتی ہوں۔'' یہ ذاتی فون وہی تھا جس کا نمبر ڈائریکٹری میں نہیں تھا، آپریشن سیل کے علاوہ کم ہی لوگوں کو میرا یہ فون نمبر معلوم تھا، نرگس نے اس فون نمبر کو انگیج پا کر ہی اس فون پر مجھ سے رابطہ قائم کیا ہوگا۔

ملازمہ چلی گئی۔

''ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم؟'' میں نے دوبارہ دلاور کو مخاطب کیا۔

''خادم یہ عرض کر رہا تھا کہ پھر کوٹھی میں چوری چھپے داخل ہونے والے اس شخص کو باہر نکلتے نہیں دیکھا گیا۔'' دلاور کے لہجے میں اب بھی معنی خیزی تھی۔

''پھر کیا کروں میں؟'' میرے لہجے میں تلخی تھی۔

''اب کیا کریں گی! جو کچھ کرنا ہوگا، رات ہی کو کر لیا ہوگا، ورنہ آپ رات کے وقت کار لے کر نہ نکلتیں۔''

''دیکھو دلاور، تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''برے ہوں آپ کے دشمن! آپ تو بہت اچھی ہیں، بس ذرا مزاج کی تیز ہیں، ہاتھ پیلے ہونے کے بعد عموماً لڑکیوں کی ساری تیزی نکل جاتی ہے، آپ بھی پرائی ہو گئیں تو......''

''بکو مت!'' میں نے اسے درمیان ہی میں ڈانٹ دیا۔ ''کان کھول کر سن لو کہ اب اگر میں نے تمہارے کسی آدمی کو ارد گرد منڈلاتے دیکھا تو تمہیں اس کے ہاتھ پیر سلامت نہیں ملیں گے۔ اسے دھمکی نہ سمجھنا۔ میں ہرگز یہ برداشت نہیں کروں گی!''

''مجھے تو اجازت ہے، ارد گرد منڈلانے کی؟'' اس نے کچھ ایسے لہجے میں یہ جملہ ادا کیا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔

''ہاں اگر تم پرندے ہو تو ضرور منڈلاؤ۔'' میں ہنس کر بولی۔

''آپ کی خاطر تو سب کچھ بنایا جا سکتا ہے، کبھی حکم تو کریں حضور۔''

''اور اگر میں تمہیں مرغا بنا دوں تو؟'' مجھے بھی شرارت سوجھنے لگی۔

''تو پھر آپ خود سمجھ لیجیے کہ آپ کو کیا بننا پڑے گا؟''

''شٹ اپ!'' میں جھینپ گئی اور اسی کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے خیال آ گیا تھا کہ نرگس دوسرے فون پر مجھ سے بات کرنے کی منتظر ہے۔

میں اچھی طرح جانتی تھی کہ ملک دلاور میرے بہی خواہوں میں ہے، اگر اسے میرے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات معلوم ہو بھی گئی تو وہ اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھائے گا، لیکن اب میں بے حد محتاط رہنے کا فیصلہ کر چکی تھی، عموماً میں چوکنا ہی رہتی ہوں، رات کو نہ جانے کیسے میں اپنا تعاقب کیے جانے کو محسوس نہ کر سکی، شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ دلاور کا آدمی محتاط رہا ہو اور اس نے مجھے شبہ نہ ہونے دیا ہو، اس کے علاوہ یہ سبب بھی ہو سکتا تھا کہ اس وقت میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا، میری ڈکی میں ایک شخص کی لاش تھی جسے میں ٹھکانے لگانے جا رہی تھی، بہر حال جو بھی تھا، آئندہ کے لیے چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔ میں یہی سوچتی ہوئی اپنے نگار خانے سے نکل کر خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ وہ فون میری خواب گاہ ہی میں تھا۔

ملازمہ نے ریسیور اٹھا کر قریبی میوزیکل اسٹینڈ پر رکھ دیا تھا، جس سے جلترنگ کی سی موسیقی کمرے میں گونج رہی تھی، یہ گویا وقفہ انتظار تھا، جب تک دوسری جانب یہ موسیقی سنائی دیتی رہتی، یہی سمجھا جاتا کہ ابھی کسی نے فون اسٹینڈ نہیں کیا اور مزید انتظار کرنا ہے۔ مصوری، موسیقی اور شاعری میری روح کی غذا ہے۔ میں ہر معاملے میں اس کا خیال رکھتی ہوں، گزشتہ دنوں جب میں پیرس گئی تھی تو مجھے یہ ٹیلی فون میوزیکل اسٹینڈ پسند آ گیا تھا جو ریسیور کا دباؤ پڑتے ہی موسیقی بکھیرنے لگتا تھا، میں قدم اٹھاتی ہوئی وہاں تک پہنچی اور اسٹینڈ سے ریسیور اٹھا لیا، موسیقی رک گئی۔

''ہاں نرگس، کیا بات ہے؟'' میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہی سوال کیا، میں دانستہ اس وقت سندھی میں بات کر رہی تھی۔

نرگس میرا اشارہ سمجھ گئی، اس نے بھی سندھی ہی میں جواب دیا۔ ''میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہوں سر! وہ شخصیت اب راز نہیں رہی مگر......''

اس کے ہچکچانے کی وجہ سمجھنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔

میں سمجھ گئی کہ وہ اس شخصیت کا ذکر فون پر کرنا نہیں چاہتی۔ نرگس بہت محتاط لڑکی تھی اور میں اس کی یہ احتیاط پسندی اچھی سمجھتی تھی، میں نے اسی لیے کہا۔ ''تم ایسا کرو نرگس کہ سیدھی کوٹھی آ جاؤ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔''

''تھینک یو سر! یہ کہتے ہوئے اس نے طویل سانس لیا۔ غالباً وہ یہی چاہتی تھی۔ ''میں نصف گھنٹے کے اندر اندر پہنچ رہی ہوں۔''

''آ جاؤ'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

نرگس کے فون نے میرے اضطراب میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگی وہ آدھا گھنٹہ گزرنے سے پہلے ہی پہنچ گئی، ملازمہ نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر مجھے اس کے آنے کی اطلاع دی تو میں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو نرگس مجھے آتے دیکھ کر اٹھنے لگی۔

''بیٹھو بیٹھو، یہ دفتر نہیں میرا گھر ہے۔'' میں نے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نرگس اچھی طرح جانتی تھی کہ

میں آفس ڈکورم اور ایڈمنسٹریشن کے معاملے میں کتنی سخت ہوں! ہمیشہ وہ اس کا خیال رکھتی تھی، یہ مجھے ہی معلوم تھا کہ بظاہر وہ نرم و نازک اور حسین لڑکی اندر سے کتنی خطرناک ہے! میرا اشارہ پا کر وہ بیٹھ گئی۔ میں اس کے مقابل والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ پھر میں نے اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں اور وہ ان کا مفہوم سمجھ گئی۔

پھر نرگس نے جو نام لیا، اسے سن کر میں چونک اٹھی۔ وہ ایک مشہور سیاسی شخصیت تھی۔ اگر ملک گیر بنیاد پر نہیں تو کم از کم صوبائی سطح پر اسے اچھی طرح جانا پہچانا جاتا تھا، جس سیاسی جماعت سے اس شخصیت کا تعلق تھا، وہی ان دنوں برسر اقتدار تھی، یہ وہ دور تھا جب برسر اقتدار جماعت ایک نئی طرز کی جمہوریت کے نتائج بھگت رہی تھی، ایک گھاگ سیاست دان نے تو یہ لاف زنی تک کی تھی کہ نعوذ باللہ یہ دور خلفائے راشدین کے عہد کی یاد دلاتا ہے، مگر حقیقی صورتحال اس سے مختلف تھی، قطعی مختلف! برسر اقتدار جماعت، پولیس اور اپنے پالتو غنڈوں کے بل پر اپنی حکومت کو سنبھالا دیئے ہوئے تھی۔

یہاں میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میرا مقصد اپنی حیرت انگیز آپ بیتی بیان کرنا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، میں نہ کسی سیاسی جماعت کو بدنام کرنا چاہتی ہوں، نہ میرا منشا کسی سیاسی شخصیت پر کیچڑ اچھالنا ہے۔ میں نے اس لیے کسی سیاسی جماعت کا نام نہیں لکھا، اس سیاسی شخصیت کا نام آپ کچھ بھی فرض کر سکتے ہیں میں اپنی سرگزشت میں اس کا تذکرہ عبدالحمید خان کے نام سے کروں گی، اس احتیاط کے باوجود اگر میرے مبہم اشاروں سے کسی مخصوص عہد حکومت اور شخصیت کا نام ذہنوں میں ابھرتا ہے تو میں اس سلسلے میں خود کو قصوروار تصور نہیں کرتی۔

مجھے اعتراف ہے کہ جب نرگس نے اس سیاسی شخصیت کا نام لیا تو کچھ دیر کو میں چکرا کے رہ گئی، چن ای ایسے شخص سے اس شخصیت کا تعلق میرے لیے حیرت انگیز تھا، لمحہ بھر کو میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ ممکن ہے، اس شخصیت کا فون نمبر چن ای نے کسی اور سلسلے میں لکھا ہو اور میرے اغواء سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ کسی بھی شخصیت کا فون نمبر کسی کے پاس بھی ہو سکتا ہے، یہ فون نمبر ایسا نہیں تھا، یہ فون نمبر صیغہ راز میں رکھا گیا تھا اور اس وقت تک کسی دوسرے کے علم میں نہیں آ سکتا تھا جب تک کہ خود ہی وہ شخصیت کسی کو یہ نمبر نہ بتاتی جس نے اسے صیغہ راز میں رکھا تھا، اس سے واضح طور پر نتیجہ برآمد ہوتا تھا کہ خود عبدالحمید خان نے وہ نمبر چن ای کو بتایا تھا، میں سوچتی رہی۔

''میرے لیے مزید کوئی حکم؟'' معاً نرگس نے مجھے مخاطب کیا تو میں چونک اٹھی۔

''فی الحال عبدالحمید خان کی نقل و حرکت پر نظر رکھو اور ہر روز صبح مجھے رپورٹ دیتی رہو، اب تم جا سکتی ہو۔''

میری اجازت ملتے ہی نرگس اٹھ کھڑی ہوئی۔

نرگس کو رخصت کر کے میں اپنی خواب گاہ میں آ گئی اور ایک بار پھر وہی فون نمبر ملایا، جلد ہی دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔

''مجھے عبدالحمید خان صاحب سے بات کرنا ہے۔'' میں نے دوسری جانب سے ''ہیلو'' سن کر کہا۔

''بول رہا ہوں، فرمایئے!'' مردانہ بھاری آواز جواباً سنائی دی۔

''مجھے چن ای سے آپ کا یہ فون نمبر ملا تھا مجھے اس کا ایک پیغام آپ تک پہنچانا ہے، یہ پیغام فوری اور اہم

نوعیت کا ہے۔" میں نے پانسا پھینکا، میرا مقصد محض اتنا جاننا تھا کہ عبدالحمید خان، چن ای سے اپنا تعلق ظاہر کرتا ہے یا نہیں!

"آپ کا نام؟"

میں اس سوال پر ذرا چکرائی، میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسے کوئی فرضی نام بتا دیتی اور میں نے یہی کیا۔ "مہ جبیں نام ہے میرا۔"

"مگر اس نے تو کبھی......" چند لمحے دوسری جانب خاموشی چھائی رہی، پھر کہا گیا۔ "کیا نام بتایا تھا آپ نے چن ای؟"

"جی...... جی ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"مگر میں تو اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔" اس کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پلٹا کھا گیا ہے اور جھوٹ بول رہا ہے، وہ مزید کہہ رہا تھا۔ "آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"میں صرف اتنا اور عرض کرنا چاہتی ہوں کہ وہ پیغام عذرا خان سے متعلق ہے۔" میں نے ایک اور چال چلی۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ وہ پیغام فون پر دے دیں؟"

"لیکن آپ تو فرما رہے تھے کہ چن ای کو نہیں جانتے پھر......"

"آپ شاید جانتی ہوں گی میں ایک سیاسی شخصیت ہوں۔ متعدد لوگ مجھ سے ملتے رہتے ہیں، ممکن ہے یہ نام میرے ذہن سے نکل گیا ہو۔" وہ میری بات کاٹ کر جواز پیش کرنے لگا۔

"چن ای نے مجھے ہدایت دی تھی کہ فون پر پیغام نہ دوں۔"

"پھر تو مجبوری ہے اس لیے کہ آج ہی ایک فلائٹ سے مجھے اسلام آباد جانا ہے۔"

"وہاں سے کب واپسی ہوگی آپ کی؟" میں نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا، فی الحال ویسے آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیں میں خود رابطہ قائم کرلوں گا۔" اس کے لہجے سے عیاری کا اظہار ہو رہا تھا۔

ظاہر ہے میں اسے اپنا فون نمبر کیسے بتا دیتی! فون نمبر ملنے کے بعد اس کے لیے میری حقیقت جان لینا کوئی مشکل نہ ہوتا، میں اسی لیے یہ مسئلہ ٹال گئی اور کہا۔ "میرے پاس فون نہیں ہے۔ اس وقت بھی میں ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ سے......"

میں ابھی اپنا فقرہ پورا نہیں کر پائی تھی کہ دوسری جانب سے بڑا زہریلا قہقہہ سنائی دیا۔ اس سے میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔

"تم مجھے بچہ سمجھتی ہو احمق عورت!" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا

"پھر اس نے میرا فون نمبر بتاتے ہوئے مزید کہا۔ "یہی فون نمبر ہے نا تمہارا؟ کہو تو تمہارا نام اور پتا بھی بتا دوں! سنو! مجھ سے الجھ کر گھاٹے میں رہوگی۔ اگر تم باز نہ آئیں تو پچھتاؤ گی!" اسی کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

میرے لیے یہ سمجھنا کوئی زیادہ مشکل نہیں تھا کہ جس دوران وہ مجھ سے فون پر گفتگو کر رہا تھا، اس کے

اشارے پر اسی کے کسی آدمی نے ایکسچینج سے میرا فون نمبر اور نام پتا معلوم کر لیا ہوگا، یہ نام پتا اور فون نمبر اس شخص نے کسی کاغذ پر لکھ کر عبدالحمید خان کو دے دیا ہوگا، اس کے سوا کچھ اور ممکن ہی نہیں تھا، اس فون کے بعد گویا براہ راست میری اور اس کی ٹھن گئی تھی، میرے نزدیک یہ کچھ اچھا نہیں ہوا تھا کیونکہ میں ابھی سامنے آنا نہیں چاہتی تھی لیکن اسے فون کر کے کم از کم مجھے یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ وہ چن ای کو اچھی طرح جانتا ہے اور یہ کہ چن ای اسی کا آلہ کار تھا۔

اگر میرے اخذ کردہ نتائج غلط ہوتے تو وہ میرا نام دریافت نہ کرتا اور نام پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیتا کہ چن ای کو نہیں جانتا، پھر میرا نام سن کر وہ یہ پیغام میرے متعلق ہے، مجھ سے اجنبیت کا اظہار کرتا۔ ان تمام باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ نہ صرف وہ چن ای سے واقف تھا بلکہ چن ای اسی کے ایماء پر میرے پیچھے لگا تھا۔

اس نتیجے تک پہنچنے کے باوجود میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ اگر میرے اغوا میں واقعی عبدالحمید خان کا ہاتھ تھا تو آخر اسے مجھ سے کیا دلچسپی تھی؟ بالفرض وہ عیاش بھی تھا تو اس کے لیے کوئی کمی تو نہیں تھی! پھر میں ہی کیوں؟ اس کے علاوہ یہ کہ وہ لاکھ پیسے والا تھا، مگر اس کی حیثیت لاکھوں کروڑوں ڈالر کی نہیں تھی، تو کیا پھر چن ای نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟ پچیس ہزار ڈالر تو وہ پیشگی دینے پر تیار تھا، پھر یہ کیا معاملہ ہے، کیا معما ہے؟ یہ سوچتے ہوئے معاً میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ عبدالحمید خان اصل آدمی نہیں ہے بلکہ وہ ایک غیر ملکی ہے، وہی اصل خریدار ہے۔ اس کا تعلق ایک غیر ملکی سفارت خانے سے ہے۔ جلد ہی عبدالحمید خان سے ملاقات کرنے والا ہے، جیسے کوئی میرے ذہن میں سرگوشیاں کر رہا تھا، حسب معمول اس دوران میں میرا سارا وجود جیسے ایک برقی رو کی زد میں تھا، میرے سارے جسم میں ایک مانوس اور لذت انگیز سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ یہ کیفیت ختم ہو گئی اور میری حالت اعتدال پر آ گئی۔ یہ کیفیت خود میرے لیے بھی انتہائی حیرت کا باعث تھی جو اختیاری نہیں غیر اختیاری تھی، کسی بھی لمحے اور کہیں بھی مجھ پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی، اس ذہنی کیفیت کے دوران میں عموماً ماضی یا مستقبل سے متعلق مجھے بہت سی باتیں خود بہ خود معلوم ہو جاتی تھیں، ان باتوں کا تعلق میری ذات سے بھی ہوتا تھا اور میرے علاوہ دوسروں کی ذات سے بھی! مجھ پر بس اچانک ہی یہ کیفیت طاری ہوتی اور کسی بھی شخصیت کا ماضی یا مستقبل عیاں ہو جاتا، ایسا متعدد بار ہو چکا تھا، مگر اس کی وجہ میں آج تک نہیں سمجھ سکی تھی۔ اسی ذہنی کیفیت یا بہ الفاظ دیگر حیرت انگیز ذہنی کیفیت کے سبب عرصہ دراز سے میں اعلیٰ طبقے میں مقبول تھی، اسی ضمن میں ایک واقعے سے تو مجھے خاصی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ میں ایک غیر ملکی سفارت خانے کی تقریب میں مدعو تھی، وہاں امریکی سفیر بھی تھا کیونکہ وہ ملک امریکی بلاک ہی میں شمار ہوتا تھا، بس اچانک ہی امریکی سفیر پر نظر پڑتے ہی میں اسی ذہنی کیفیت سے دوچار ہو گئی تھی، یہ تقریباً امریکی صدر کینیڈی کے قتل سے تقریباً ایک ماہ پہلے منعقد ہوئی تھی مجھ پر منکشف ہوا تھا کہ امریکی صدر کینیڈی کو جلد ہی قتل کر دیا جائے گا، یہ سنسنی خیز انکشاف ایسا نہیں تھا کہ میں براہ راست لفظ بہ لفظ اسے امریکی سفیر تک منتقل کر دیتی۔ میں نے اسی لیے محتاط الفاظ استعمال کیے تھے۔

"صدر امریکہ کی سکیورٹی کے انتظامات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔" میں نے امریکی سفیر سے کہا تھا۔ اس وقت امریکی سفیر کے گرد اور بہت سے افراد موجود تھے۔

''وہاٹ ڈیو مین؟'' امریکی سفیر نے حیرت زدہ ہو کر مجھ سے میری بات کی وضاحت چاہی تھی۔

''محترم صدر کی زندگی کو خطرہ درپیش ہے، اگر قبل از وقت اس کا تدارک نہ کیا گیا تو بھیانک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔''

''آپ کو شاید امریکی سکیورٹی کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ امریکی صدر کی حفاظت کے لیے ایسے انتظامات کیے جاتے ہیں جن کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

اس کے بعد امریکی سفیر نے اس وقت تک میری جان نہیں چھوڑی تھی جب تک میں نے اسے یہ نہیں بتا دیا کہ مجھے یہ خدشہ کیوں ہوا!

میری بات سن کر وہ ہنس پڑا تھا اور پھر کہا تھا۔ ''یہ آپ کا وہم ہے اور کچھ نہیں۔''

پھر جب واقعی صدر کینیڈی کو قتل کر دیا گیا تو نہ صرف وہ امریکی سفیر بلکہ اس دعوت میں موجود دیگر افراد بھی میری حیرت انگیز ذہنی کیفیت کے قائل ہو گئے تھے، اس دعوت میں کچھ اعلیٰ مقام اہم شخصیات بھی شریک تھیں، بعد میں انہوں نے بھی مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا اور اپنے مستقبل کے متعلق جاننا چاہا، مگر جیسا کہ میں عرض کر چکی ہوں، یہ ذہنی کیفیت میرے اختیار میں نہیں، یہی میں نے ان سے کہہ دیا تھا، ان میں سے کچھ کو میری بات پر یقین آ گیا تھا اور کچھ یہ سمجھے تھے کہ میں بتانا نہیں چاہتی۔ بہرحال اس واقعے کے بعد اعلیٰ طبقوں میں میری بات کو توجہ سے سنا جانے لگا تھا۔ کبھی آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہو، غلط نکلا ہو۔ یہی سبب تھا کہ اس وقت بھی مجھے پورا یقین تھا، میرے اغواء میں کسی غیر ملکی کا ہاتھ ہے۔ میرے نزدیک یہ بات غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ عبدالحمید خان بھی گویا درمیانی کڑی تھا۔

یہ منکشف ہونے کے بعد میں نے ایک بار پھر نرگس سے رابطہ قائم کرنا چاہا، مگر ناکام رہی، نرگس نے یقیناً میرے حکم پر عبدالحمید خان کی نگرانی شروع کر دی تھی، میں نے آپریشن سیل کی ایک اور رکن سے رابطہ قائم کر کے اسے صورتحال سے آگاہ کیا کہ نرگس کہاں ہو سکتی ہے! میں نے اسے صرف اتنا حکم دیا تھا، وہ نرگس تک میرا پیغام فوراً پہنچا دے کہ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔

آدھا گھنٹا بھی نہ گزرا تھا کہ پرائیویٹ فون پر نرگس نے مجھ سے رابطہ قائم کر لیا۔

''سنو نرگس! ممکن ہے جس پر تم نظر رکھے ہوئے ہو، وہ آج کسی فلائٹ سے اسلام آباد روانہ ہو جائے۔'' میں دانستہ اس وقت نرگس سے فرانسیسی زبان میں بات کر رہی تھی۔ ''تمہیں بھی اس کے ساتھ اسلام آباد جانا ہے۔ معلوم کرو کہ وہ کس فلائٹ سے جا رہا ہے اور ممکن ہو تو اسی فلائٹ سے تم بھی اپنی ریزرویشن کرا لو۔ یہ ممکن نہ ہو تو تم کسی دوسری فلائٹ سے اسلام آباد پہنچ جاؤ۔ تم چاہو تو اپنی سہولت کے لیے کسی اور رکن کو بھی ساتھ لے جا سکتی ہو، کیونکہ تمہیں سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا رہنا ہے۔ سمجھ رہی ہو نا!''

''جی سر! اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔'' نرگس نے یقین دہانی کرائی۔ اس نے بھی فرانسیسی ہی میں جواب دیا تھا۔

''اس بات کا امکان بھی ہے کہ بہت جلد کسی غیر ملکی سے ملے، اس غیر ملکی کا تعلق کسی سفارت خانے سے ہو گا۔'' میں نے اسے مزید بتایا۔

''سر! یہ تو کوئی لمبا چکر معلوم ہوتا ہے۔'' نرگس نے تبصرہ کیا۔

''ہاں۔ تمہیں بہرحال محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے اس کے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے ہدایت دی، پھر مزید کہا۔ 'وہ جس غیر ملکی سے ملنے والا ہے، اس کے بارے میں بھی تمہیں معلومات حاصل کرنا ہیں۔''

''بہتر ہے سر!'' نرگس کی آواز آئی۔

''اسلام آباد روانگی سے قبل مجھے مطلع کرنا نہ بھولنا!' آخری ہدایت دے کر میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔''

اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا، اس لیے میں نے ملازمہ کو بلا کر کھانا لگانے کو کہا۔ پھر جب ملازمہ نے مجھے آ کر بتایا کہ کھانا لگایا جا چکا ہے تو میں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔

کھانے کے بعد دوپہر کو کچھ دیر آرام کرنا میرے معمولات میں داخل ہے۔ اس روز بھی میں اپنی خواب گاہ میں آ کر بستر پر دراز ہو گئی پھر جانے کب میری آنکھ لگ گئی، اس کے بعد مجھے ملازمہ ہی نے جگایا، اس نے مجھے بتایا کہ ملک دلاور کا فون ہے۔ اسے ملازمہ نے یہ بتا دیا تھا، میں سو رہی ہوں مگر اس نے اصرار کیا تھا کہ مجھے جگا دیا جائے۔ عموماً وہ ایسی صورت میں یہ نہیں کرتا تھا بلکہ کچھ دیر بعد فون کر لیا کرتا تھا، اس وقت کوئی خاص بات ہی تھی جو اس نے مجھے سوتے میں اٹھوایا تھا۔ یہ سوچتی ہوئی میں اٹھ کر بیٹھ گئی، میرے اشارے پر ملازمہ ٹیلی فون سیٹ اٹھا لائی۔

میں نے ریسیور ہاتھ میں لیتے ہی کہا۔ ''ہاں کہو، کیا تکلیف ہے تمہیں؟''

''تکلیف مجھے نہیں، آپ کو ہونے والی ہے۔'' وہ حسب دستور چہکا۔ ''اگر اس تکلیف سے بچنا چاہتی ہیں تو فوراً خادم سے مل لیں۔ فون پر وہ بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں اپنی کوٹھی ہی پر آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''واقعی کوئی ایسی بات ہے جو فون پر نہیں کی جا سکتی یا تم اس بہانے مجھ سے ملاقات چاہتے ہو؟'' میرے لہجے میں شک تھا۔

''چلیں بہانہ سمجھ کر ہی مل لیں!''

''پھر تو میں نہیں آ رہی، اگر یہ بات ہے!''

''نہیں آئیں گی تو پچھتائیں گی، میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم خبر ہے۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں کل صبح مل لوں تم سے؟'' میں دراصل نرگس کی طرف سے کسی اطلاع کی منتظر تھی اور اس کے لیے میرا کوٹھی سے نکلنا مناسب نہیں تھا۔

''کل صبح تک ممکن ہے چڑیاں کھیت چگ چکی ہوں، اس لیے بہتر ہے کہ اسی وقت مل لیں۔''

''تم کیوں نہیں آ جاتے یہاں!''

''مجھے اسی سلسلے میں ایک فون کا انتظار ہے، اس لیے میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کے بعد ممکن ہے فوری طور پر کوئی قدم اٹھانے کے لیے مجھے گھر سے نکلنا پڑے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں آ رہی ہوں۔'' میں نے طویل بحث سے اجتناب کی خاطر کہا، پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''اگر میرے پہنچنے تک میرا کوئی فون آئے تو کہہ دینا کہ تھوڑی دیر بعد پھر فون کر لیا جائے۔ اتفاق سے مجھے

بھی ایک فون کال کا انتظار ہے۔ میں اپنی ملازمہ کو ہدایت دے کر یہاں سے چلوں گی کہ میرا کوئی فون آئے تو اسے تمہارا فون نمبر دے دیا جائے۔''

''میں منتظر ہوں۔ آپ کا فون آیا تو میں ہدایت دہرا دوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی دلاور نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ملک دلاور کا قیام سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں تھا۔ مجھے وہاں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگتی، مگر نرگس اس دوران میں بھی مجھ سے رابطہ قائم کر سکتی تھی۔ میں جلدی جلدی تیار ہوئی اور پھر ملازمہ کو بلا کر اسے ملک دلاور کا نمبر دیا، اس کے بعد میں برآمدے میں آ گئی میرے ڈرائیور کو شاید پہلے ہی کسی ملازمہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ میں کہیں جانے والی ہوں۔ وہ اسی لیے برآمدے کے نیچے میرا منتظر کھڑا تھا، میرے ملازمین میں صرف ڈرائیور، دفتر کا چوکیدار، کوٹھی کا مالی وغیرہ کا تعلق صنف مخالف سے تھا ورنہ سارے ہی ملازمین میری صنف سے تعلق رکھتے تھے۔ میں عموماً صرف دفتر آتے جاتے یا لانگ ڈرائیونگ میں ڈرائیور کو ساتھ لیتی تھی ورنہ نہیں۔ اس کی اصل ڈیوٹی میری گاڑیوں کی دیکھ بھال تھی، میرے پاس تین گاڑیاں تھیں اور میرے حکم پر وہ تینوں کی ٹنکیاں فل رکھتا تھا، میں نے اپنے ڈرائیور کو مستعد ہوتے دیکھ کر اس سے کہا۔ ''تمہیں ساتھ نہیں جانا، اس وقت بس گیرج سے اوپل نکال لاؤ۔'' یہ کہہ کر میں وہیں برآمدے میں کھڑی ہو گئی اور ڈرائیور، گیرج سے گاڑی نکالنے چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اپنی اوپل ڈرائیو کرتی ہوئی کوٹھی کے گیٹ سے نکل رہی تھی، اس وقت میرا ذہن ملک دلاور کی کہی ہوئی باتوں میں الجھا ہوا تھا، آخر اس کے پاس میرے لیے کیا اہم خبر ہو سکتی ہے؟ میں اسی سوال پر غور کر رہی تھی کہ معاً میری نگاہ عقبی آئینے پر پڑی اور میں چونک اٹھی مجھے یاد آیا کہ کوٹھی سے نکلتے ہوئے بھی میری نگاہ سلیٹی رنگ کی اس فیاٹ پر پڑی تھی، کیا اس کار میں کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے؟ میں نے سوچا اور اپنے اس خیال کی تردید یا تائید کے لئے اوپل کی رفتار ایک دم کم کر دی۔ فیاٹ نے بھی فوری طور پر ایسا ہی کیا۔ درمیانی فاصلہ بہ دستور برقرار رہا، یہ فاصلہ اتنا تھا کہ میں فیاٹ میں بیٹھے ہوئے افراد کے چہرے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے سیدھا جانیکی بجائے دائیں جانب کار موڑ دی اور میری نگاہیں عقبی آئینے پر جم گئیں، فیاٹ بھی اسی طرف مڑی، اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میرے ہی تعاقب میں ہے، میں نے ملک دلاور کے گھر جانے سے پہلے ان لوگوں کی خاطر مدارت کا فیصلہ کر لیا، میں اسی کے نتیجے میں آگے بڑھتی ہوئی ایک ایسے حصے کی طرف چل دی جو ابھی زیر تعمیر تھا، فیاٹ اب بھی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ آگے جا کر پکی سڑک نہیں تھی، میں نے گاڑی کچے میں اتار لی، میرے تعاقب میں آنے والے یقیناً اسے میری حماقت ہی پر محمول کر رہے ہوں گے، میں خود انہیں حملے کا موقع فراہم کر رہی تھی۔

گاڑی کو کچے میں اتار کر میں نے رفتار خاصی کم کر دی تھی، مگر فیاٹ کی رفتار وہی تھی، کچھ ہی دیر میں وہ میرے قریب آ گئی اور پھر آگے بڑھ کر گاڑی کو اس طرح ترچھا کھڑا کر دیا کہ مجھے اپنی اوپل روکنا پڑی، میں نے انجن بند کر کے ان پر نگاہ ڈالی، تعداد میں وہ چار تھے، پھر جب تک میں اپنی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلی، وہ چاروں میرے قریب پہنچ چکے تھے، چہروں ہی سے وہ چھٹے ہوئے غنڈے دکھائی دے رہے تھے۔

''کیا خیال ہے، پہلے تعارف نہ ہو جائے!'' میں نے پرسکون لہجے میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

ان کے چہروں پر حیرت کے آثار ابھرے۔ وہ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میں انہیں دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگوں گی۔

''مجھے عذرا خان کہتے ہیں۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا۔'' اور آپ حضرات کی تعریف؟''

وہ سب اب لحہ حیرت سے نکل چکے تھے اور غالباً ان ہیں مجھ پر اپنی برتری کا خیال بھی آ گیا تھا۔ وہ چار تھے میں اکیلی وہ بھی کمزور صنف یعنی عورت!

''زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں!'' ان میں سے ایک اپنا بگڑا ہوا چہرہ مزید بگاڑ کر بولا۔ ''خاموشی سے ہماری کار میں بیٹھ جاؤ۔''

''تو اس میں غصہ کرنے کی کیا بات ہے میرے شیر خان!'' میرا لہجہ تمسخرانہ تھا۔ یہ تو سوچو کہ میں ایک عورت ہوں اور صورت شکل کی بھی بری نہیں، ایسی عورتوں سے تو محبت اور نرمی کے ساتھ بات کرتے ہیں۔''

''ہم تمہاری باتوں میں نہیں آئیں گے۔ ہمیں پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ تم کتنی چلتا پرزہ ہو! چلو!'' ان میں سے ایک اور شخص مجھ سے مخاطب ہوا اور پھر یہ اس کی بدقسمتی ہی تھی کہ اس نے آگے بڑھ کر میرے بازو پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

میں نے تیزی کے ساتھ اس کی طرف پلٹ کر رخسار نامبارک پر ایک عدد طمانچہ عرض کر دیا۔ ضرب خاصی زوردار تھی اس لیے وہ میرا بازو چھوڑ کر اپنا رخسار سہلانے لگا جس پر میری انگلیوں کے نشانات ثبت ہو گئے تھے، اپنے ایک ساتھی کو یوں تلملاتے دیکھ کر بقیہ کی کھال بھی کھجانے لگی، پھر دوسرا آگے بڑھا تو میں نے گھٹنے سے اس کی تواضع کی اور وہ ''اوغ'' کی کریہہ آواز نکالتا ہوا پیٹ تھام کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اب دو رہ گئے جن کی مدارت باقی تھی، مگر اس سے پہلے ہی طمانچہ کھانے والا اپنا رخسار سہلا کر فارغ ہو چکا تھا، اس نے دور ہی سے مجھ پر چھلانگ لگائی، میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھی، فوراً ہی میں درمیان سے ہٹ گئی اور وہ اپنے ہی ایک ساتھی کو لیے ہوئے زمین چاٹنے لگا۔ اسی دوران میں چوتھا شخص وحشیوں کے انداز میں چیختا ہوا مجھ پر جھپٹا، میں نے اس پر کیرات کا وار کیا، سر تو اس نے میرے وار سے بچا لیا مگر کھڑی ہتھیلی کے وار سے اپنا شانہ کیسے بچاتا، میرا ہاتھ اس کی گردن کے قریب ہنسلی کی ہڈی پر پڑا اور وہ چیخ کر زمین بوس ہو گیا۔ اس کی ہنسلی کی ہڈی یقیناً ٹوٹ گئی ہو گی، وہ ایسا گرا کہ اسے پھر اٹھنا نصیب نہ ہوا، بقیہ تین پھر سنبھل کر بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئے، وہ شاید اندازہ لگا چکے تھے کہ میں کسی ایک کے بس میں آنے والی نہیں ہوں۔ انہوں نے اسی لیے ایک ساتھ ہلا بولا تھا میں نے ان سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر مخصوص انداز میں آگے کی طرف جھٹکا دیا اور وہ فضا میں قلابازی کھاتا ہوا اپنے ہی ایک ساتھی پر گرا جو میری طرف جھپٹ رہا تھا، میں نے فضا میں اچھل کر اپنے نقوش پا اس کے سینے پر ثبت کر دیئے، پھر تلے اوپر اوندھے پڑے ہوئے دونوں افراد میں سے اوپر والے کی پشت پر سوار ہو کر ایڑی کے بل گھوم گئی، نوک دار ہیل کی جوتی نے یقیناً اس کے چودہ سے زیادہ طبق روشن کر دیئے ہوں گے کیونکہ وہ کس ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح ڈکرانے لگا تھا، اس کے نیچے جو دبا ہوا تھا، وہ تیزی سے نکل کر فیاٹ کی طرف بھاگا، وہ اتنا دہشت زدہ نظر آ رہا تھا جیسے موت اس کے تعاقب میں ہو۔ مجھے اس کی حالت پر ہنسی آ گئی، میں اگر چاہتی تو وہ فیاٹ میں بیٹھ کر فرار نہ ہو پاتا، مگر میں نے اسے معاف کر دیا، میں بزدل دشمن پر کبھی نہیں جھپٹا کرتی۔

میری خاطر مدارات کے نتیجے میں تین افراد ہوش وحواس سے بیگانہ وہاں پڑے تھے اور چوتھا گویا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا، میرے لیے اتنا ہی کافی تھا، ان سے کسی قسم کی پوچھ گچھ کے لیے نہ میرے پاس وقت تھا اور نہ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کرائے کے غنڈے تھے اور ان کی خدمات حاصل کرنے والا بہرحال اتنا احمق نہیں رہا ہوگا کہ براہ راست ان سے معاملہ کیا ہو، پوچھ گچھ کے باوجود وہ صحیح، یعنی اصل آدمی کی نشاندہی نہ کر پاتے۔ یوں بھی مجھے علم تھا کہ میرے اغواء میں کسے دلچسپی ہے!

اس ہنگامہ آرائی کے دوران میں میرے جسم پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی، ہاں اچھل کود میں ایک جگہ سے میری ساڑھی پھٹ گئی تھی اور اس پر مٹی بھی لگی ہوئی تھی کیونکہ فلائنگ کک کے بعد ایک دفعہ مجھے بھی دانستہ کولھے کے بل زمین پر گرنا پڑا تھا، میں اس حال میں ملک دلاور سے ملنے نہیں جا سکتی تھی اس لیے مجبوراً لباس تبدیل کرنے کی غرض سے مجھے کوٹھی کی جانب لوٹنا پڑا۔

میں اس حالت میں نوکروں سے بھی بچنا چاہتی تھی، اسی لیے گاڑی کو سیدھی گیرج کی طرف لے گئی۔ گیرج میں ایک دروازہ تھا جس کو کھول کر ایک پٹی ہوئی راہداری سے گزرنے کے بعد میں سیدھی اپنی خواب گاہ پہنچ سکتی تھی، یہ دروازہ اور راہداری میں نے اسی غرض سے بنوائی تھی کہ کوئی ایسی صورتحال ہو تو سیدھی اپنی خواب گاہ تک پہنچ سکوں، اس وقت بھی میں نے وہی راستہ اختیار کیا۔

خواب میں پہنچتے ہی میں نے وارڈ روب کا رخ کیا کیونکہ اب خاصا وقت گزر چکا تھا، میں جلد از جلد ملک دلاور کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی، مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی اہم بات ضرور تھی ورنہ وہ مجھے فوراً آنے کے لیے نہ کہتا۔ میں نے دانستہ بلیو جینز اور چمڑے کی جیکٹ کا انتخاب کیا، کسی سے نبرد آزمائی کی صورت میں یہ لباس مناسب رہتا تھا۔ احتیاطاً اپنے پرس میں، میں نے چھوٹا خوبصورت مگر خطرناک کھلونا بھی ڈال لیا تھا، جسے عرف عام میں ریوالور کہا جاتا ہے۔ اب میں پوری طرح محتاط اور چوکنا رہنا چاہتی تھی کیونکہ مجھ پر پے در پے حملے ہو رہے تھے۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد جیسے ہی میں بیرونی برآمدے کی طرف بڑھی، ایک ملازمہ گھبرائی ہوئی سی آتی دکھائی دی مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھی۔

''کیا بات ہے؟ تم اس طرح بدحواس کیوں نظر آ رہی ہو؟''

میں نے رُک کر اس سے پوچھا۔

''پو...... پولیس والے میم صاحب! وہ...... وہ اندر آ رہے ہیں حالانکہ میں...... میں نے کہہ دیا تھا کہ آپ ......آپ اندر نہیں ہیں۔'' اس نے بہ مشکل اپنی بات پوری کی۔

''پولیس والے!...... مگر کیوں؟'' میں بھی چونک اٹھی وہ سوال بس بے اختیار ہی میری زبان پر آ گیا تھا ورنہ ظاہر ہے ملازمہ میرے سوال کا کیا جواب دیتی!

ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی تھی کیا کرنا چاہیے کہ معاً تین پولیس والوں پر نظر پڑی جو سیدھے راہداری میں چلے آ رہے تھے، ان میں سے ایک اپنی وردی سے سب انسپکٹر اور دو کانسٹیبل معلوم ہو رہے تھے، انہیں یوں درانہ اپنی کوٹھی میں گھستے دیکھ کر میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

میرے لباس سے غالباً انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں ہی کوٹھی کی مالکہ ہو سکتی ہوں، سب انسپکٹر نے اسی لیے کانسٹیبلوں کو مخاطب کیا۔ ''دیکھا! میں کہہ رہا تھا نا کہ ملازمہ جھوٹ بول رہی ہے!''

''کیا بات ہے؟'' میں آگے بڑھتے ہوئے بولی، میرے لہجے میں تلخی تھی۔

اس دوران میں وہ تینوں میرے قریب آ چکے تھے۔

''آپ ہی عذرا خان ہیں؟'' سب انسپکٹر مجھے گھورتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''وہ تو میں ہوں، لیکن تم نے کوٹھی میں گھسنے کی کوشش کیوں کی؟ کیا تمہارے پاس سرچ وارنٹ ہے؟'' میں نے سختی سے کہا۔

''یہ تو ہم تمہیں تھانے چل کر بتائیں گے!'' سب انسپکٹر پولیس والوں کے مخصوص لہجے میں بولا۔ پھر وہ ایک کانسٹیبل سے مخاطب ہوا۔ اس کا لہجہ حکمیہ تھا۔ ''یہی ہے وہ! ہتھ کڑی پہنا دو اسے!''

''کیا بکواس کر رہے ہو!'' میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ ''مجھے تم کس جرم میں گرفتار کر رہے ہو؟ وارنٹ ہے تمہارے پاس؟''

میری بات کو سنی ان سنی کرتا ہوا سب انسپکٹر کانسٹیبل پر برس پڑا۔ ''منہ کیا دیکھ رہے ہو، اب تک! ڈال دو ہتھکڑی!''

وہ کانسٹیبل جلدی سے ہتھکڑی سنبھالے میری طرف بڑھا۔ میں پولیس والوں کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف تھی اور یوں بغیر کچھ جانے بوجھے گرفتار ہو جانا مناسب نہیں تھا، بعد میں چاہے میں انہیں ناک چنے چبوا دیتی لیکن اس وقت وہ میرے انجر پنجر ڈھیلے کر دیتے پھر مار پیچھے پکار والی ہوتی، میں نے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا۔ کانسٹیبل نے جیسے ہی میری طرف ہتھکڑی بڑھائی میں نے ہتھکڑی پکڑ کر اسے زور کا جھٹکا دیا اور وہ سجدہ ریز ہوتا چلا گیا، اسی لمحے میری ٹھوکر اس کی پیشانی پر پڑی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ قریب کھڑے ہوئے دوسرے کانسٹیبل کو میں نے سب انسپکٹر کی طرف دھکا دیا۔ وہ غالباً ذہنی طور پر اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے سنبھلتے سنبھلتے بھی سب انسپکٹر کو لیتا ہوا ایک طرف جا پڑا۔

سب انسپکٹر کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُمڈ پڑا، مگر میں اس کی پرواہ کیے بغیر اچھل کر پیچھے کی طرف بھاگی۔ ملازمہ راہداری میں ہنگامہ آرائی دیکھ کر کبھی کی وہاں سے رفوچکر ہو چکی تھی۔ میں باہر کی طرف بھاگنے کی بجائے دانستہ اندر کی جانب بھاگی تھی۔ میں نے راہداری عبور کر کے مڑنے سے پہلے پلٹ کر دیکھا تو سب انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہو رہا تھا۔

''پکڑو!...... اسے پکڑو!'' یہ کہتا ہوا سب انسپکٹر میرے پیچھے بھاگنے لگا تھا۔

میں نے راہداری سے مڑ کر خواب گاہ کا رخ کیا اور اس میں داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا، پھر میں وہاں رکی نہیں۔ اب میرا رخ اس دروازے کی طرف تھا، جس میں داخل ہو کر میں خفیہ راہداری سے گزرتی ہوئی گیرج تک پہنچ سکتی تھی، پولیس والوں کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ میں یوں انہیں جل دے کر نکل جاؤں گی، وہ مجھے کوٹھی کے اندر ہی تلاش کرتے رہ جاتے اور میں کار لے کر وہاں سے فرار ہو جاتی، پھر یہی ہوا بھی! کچھ ہی دیر بعد میں اپنی اوپل میں بیٹھی اڑی چلی جا رہی تھی، اب میں جلد سے جلد ملک

دلاور کے گھر پہنچنا چاہتی تھی، اس کے بعد ہی یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی کہ میری گرفتاری کس سلسلے میں کی جا رہی ہے! مجھے یہ تو یقین تھا کہ گرفتاری کے وارنٹ کے بغیر پولیس والے اتنی ہمت نہیں کر سکتے، تب انسپکٹر کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ قدم اس نے اپنے کسی بڑے افسر کے ایماء پر اٹھایا ہے، ورنہ وہ اتنا شیر نہ ہوتا۔ اس بڑے افسر کی دوڑ کس نے ہلائی تھی، اس سلسلے میں فی الحال میں قیاس ہی کر سکتی تھی، میرے خیال میں وہ ڈور ہلانے والا عبدالحمید خاں کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا، اس نے بیک وقت مجھ پر دوہرا حملہ کیا تھا، ایک طرف غنڈوں کو میرے پیچھے لگا دیا تھا، دوسری جانب مجھے قانونی ہتھکنڈوں سے زیر کرنے کی کوشش کی تھی، اس کا مقصد بھی رہا ہوگا کہ اگر میں اس کے بچھائے ہوئے ایک جال سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں تو دوسرے جال میں پھنس جاؤں۔

یہی سب کچھ سوچتی ہوئی میں سندھی مسلم سوسائٹی تک پہنچ گئی، ملک دلاور میرا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

''کہاں رہ گئی تھیں آپ! بہت دیر کر دی آپ نے!'' وہ میرے پاس ہی صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا، یہ اس کی نشست گاہ تھی میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ ''دو مرتبہ تو اس دوران میں آپ کی کوٹھی فون کر چکا ہوں میں! طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہو رہے تھے کہ کہیں آپ پولیس والوں کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں، پولیس والوں کے ہتھے بھی چڑھ سکتی ہوں؟''

میں نے سوال کیا۔

''یہی اطلاع دینے تو آپ کو بلایا تھا حضور والا!''

وہ طویل سانس لے کر بولا۔

''کیا مطلب!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''مطلب یہ کہ مجھے معلوم ہوا تھا، حضور والا کے وارنٹ کٹنے والے ہیں، میں آپ کو پہلے ہی سے چوکنا کر دینا چاہتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ یہ کارروائی کس سلسلے میں ہو رہی ہے!'' ملک دلاور نے بتایا۔

''پھر کچھ معلوم ہوا؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''ہاں یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، اسی دوران میں دو مرتبہ کسی خاتون کا فون آ چکا ہے، آپ کے لیے۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ یہاں نہیں پہنچیں، ہاں بس پہنچنے والی ہیں، وہ محترمہ پھر فون کریں گی۔'' ملک دلاور بولا۔

میں سمجھ گئی کہ فون کرنے والی نرگس ہی ہو سکتی ہے، بہر حال اب تو میں یہاں آ ہی گئی تھی، اس کا فون اٹینڈ کر سکتی تھی۔

''ہاں تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا!'' میں نے دلاور کو ٹوکا۔ ''معلوم ہوا کہ مجھے کس سلسلے میں گرفتار کیا جانے والا ہے؟''

''ایک چینی شخص چن ای کی بیوی نے اپنے شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ہے۔'' ملک دلاور نے بتایا۔

''چن ای!'' میں حیرت زدہ ہو کر بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''جی ہاں اس کا نام یہی تھا، کیا آپ اسے جانتی ہیں؟'' دلاور نے میرے اظہار حیرت پر دریافت کیا۔

''تم آگے بتاؤ!'' میں اس کے سوال کو ٹال گئی۔

''آگے بھی عرض کر دوں گا لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' دلاور میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا، پھر خود ہی بولا۔ ''چن ای کی بیوی نے رپورٹ کی نقل اعلیٰ حکام کو بھی ارسال کی ہے۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس کا شوہر آپ سے ملنے گیا تھا، آپ نے اسے کسی کام سے رات کے وقت بلایا تھا، اس کے بعد وہ نہیں لوٹا، اپنی رپورٹ میں اس نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ اس کے شوہر کو آپ نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اس نے رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اُس کے شوہر کو آپ کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ اس کا اظہار کئی بار وہ اپنی بیوی سے بھی کر چکا تھا۔ جب وہ آپ سے ملنے جا رہا تھا تو اپنی بیوی سے کہا تھا، اگر میں صبح تک واپس نہ آؤں تو تم پولیس کو مطلع کر دینا، اس درخواست پر فوری کارروائی ہونے والی تھی، لیکن مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آپ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے یا نہیں! ہاں یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ اس سلسلے میں ایک سیاسی شخصیت خصوصی دلچسپی لے رہی ہے اور اسی کے ایماء پر فوری کارروائی کا امکان ہے۔'' دلاور یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''اس سیاسی شخصیت کا نام عبدالحمید خان ہے، ہے نا؟'' میں نے اس کے خاموش ہوتے ہی تصدیق چاہی۔

''جی...... جی ہاں۔ دلاور۔ چونک اٹھا، پھر بولا۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بھی غافل نہیں ہیں۔''

''ظاہر ہے، میں کس طرح غافل رہ سکتی ہوں! مجھے تو وہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے جو ابھی تمہارے علم میں نہیں آ سکی۔''

''یعنی؟'' اس نے وضاحت چاہی۔

''یعنی کہ میری گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے وہ واقعہ بیان کر دیا جو یہاں آنے سے پہلے پیش آیا تھا۔

''تو گویا آپ کی حیثیت اس وقت ایک مفرور مجرمہ کی ہے؟'' وہ مسکرایا۔

اسی وقت ایک جانب رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''شاید انہی خاتون کا فون ہے جو کئی بار آپ کے بارے میں پوچھ چکی ہیں، دیکھتا ہوں۔'' دلاور اٹھتے ہوئے بولا۔

معاً مجھے پہلی بار یہ خیال آیا کہ نرگس کی آواز دلاور کے لیے اجنبی نہیں ہو سکتی۔ نرگس اور دلاور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے۔ دلاور ہی کی سفارش پر میں نے نرگس کو ملازم رکھا تھا، لیکن یہ بات دلاور کے علم میں نہیں تھی کہ میں نرگس سے کیا کام لے رہی ہوں، نرگس سے بھی میں نے اس سلسلے میں رازداری برتنے کے لیے کہا تھا دلاور کو بس اتنا معلوم تھا کہ نرگس میری فرم کے کسی شعبے میں ملازم ہے، نرگس، دلاور کے قریبی عزیزوں میں سے تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دلاور نے نرگس کا نام نہیں لیا؟ کیا کسی سبب نرگس، فون پر آواز بدل کر بولی تھی؟

اس نے دلاور پر اپنی شخصیت کا اظہار کیوں نہیں کیا تھا؟ اس رازداری کی آخر کیا ضرورت تھی؟ یہ تمام سوالات یکے بعد دیگر چند ہی لمحوں میں میرے ذہن میں ابھرے اور میں کچھ فکر مندسی ہوگئی۔ اسی دوران میں دلاور، ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا چکا تھا۔

''ہیلو...... جی...... جی ہاں وہ یہاں پہنچ چکی ہیں۔''

دلاور کہہ رہا تھا۔ ''جی...... ٹھیک ہے میں بات کراتا ہوں آپ کی۔''

میرے لیے اتنا سننا ہی کافی تھا، میں صوفے سے اٹھ کر تیزی کے ساتھ دلاور کی طرف بڑھی، اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ فون میرے لیے تھا، میں دلاور کے قریب پہنچی تو اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو!'' میں نے ریسیور ہاتھ میں لیتے ہی کہا۔

''سر! بلقیس بول رہی ہوں۔'' دوسری جانب سے مجھے آپریشن سیل کی ایک اور رکن کی آواز سنائی دی۔ مجھے خلاف توقع نرگس کی بجائے بلقیس کی آواز سن کر حیرت ہوئی۔ اس کے ساتھ میری سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ دلاور نے فون کرنے والی کا نام بتانے کی بجائے لفظ خاتون کیوں کہا تھا! بہرحال میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کہو کیا بات ہے؟''

''بات کچھ ایسی ہے سر کہ فون پر مناسب نہیں۔'' بلقیس جواباً بولی۔ ''میں نے اسی لیے اپنی آمد کی اطلاع دینے آپ کی کوٹھی پر فون کیا تھا، وہاں سے معلوم ہوا کہ آپ اس فون نمبر پر ہیں۔ اس وقت سے اب تک میں کئی بار فون کر چکی ہوں، اگر آپ کہیں تو میں وہیں آ جاؤں؟''

اس وقت میرا ذہن اتنا اُلجھا ہوا تھا کہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ ''مگر تمہیں یہاں کا پتہ کیسے معلوم ہوا؟''

''سر! کسی کا فون نمبر معلوم ہو تو پتا معلوم کرنا کوئی مشکل کام تو نہیں، میں نے احتیاطاً............''

''معاف کرنا بلقیس!'' میں اس کی بات کاٹ کر بول اُٹھی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ''دراصل میرا ہن اس وقت کسی اور معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ ذرا توقف کرو، میں تمہیں ابھی بتاتی ہوں کہ کہاں ملنا مناسب ہے گا!'' یہ کہہ کر میں سوچ میں پڑ گئی کہ دراصل میں ملک دلاور سے یہ بات چھپانا چاہتی تھی کہ کن حالات سے گزر رہی ہوں یا یہ کہ میں نے ایک آپریشنل سیل بنا رکھا ہے اور بلقیس اس کی رکن ہے، میرے خیال میں یہ حاملہ یقیناً اہم نوعیت کا تھا ورنہ بلقیس فوری طور پر مجھ سے ملنا نہ چاہتی۔

میں ریسیور ہاتھ میں لیے محو فکر تھی کہ دلاور نے مجھے مخاطب کیا۔ ''ان حالات میں بہتر یہی ہے کہ آپ فی ال یہاں سے کہیں نہ جائیں اور اگر ان خاتون سے ملنا ضروری ہے تو انہیں یہیں بلوالیں۔'' دلاور میری ہی ف متوجہ تھا اور کم از کم وہ الفاظ تو سن ہی رہا تھا جو میں اس طرف سے کہہ رہی تھی۔

دلاور غلط نہیں کہہ رہا تھا اس وقت میرا اس کے گھر سے نکلنا مناسب نہیں تھا، اس کے باوجود میں بلقیس سے ں ملنا نہیں چاہتی تھی، پولیس کے چکر سے نمٹنا میرے لیے مشکل نہیں تھا، لیکن اس وقت تک کے لیے مجھے ئے پناہ کی ضرورت تھی، میرے نزدیک دلاور کی کوٹھی محفوظ نہیں تھی، اس سے میرے تعلقات ڈھکے چھپے نہیں ہے۔ پولیس میری تلاش میں وہاں تک پہنچ سکتی تھی، میں نے چند ہی لمحوں میں ان تمام باتوں پر غور کر لیا، پھر س سے مخاطب ہوئی ''تم اپنے فلیٹ پر پہنچو، میں وہیں آ رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے خدا حافظ!'' میں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''میرے خیال میں آپ کا فیصلہ غلط ہے۔'' دلاور بول اٹھا۔

''کیوں؟'' میں اس کی طرف بڑھی۔

''پولیس آپ کی تلاش میں ہے۔''

''اور وہ یہاں تک بھی پہنچ سکتی ہے!'' میں مسکرائی۔ ''کیا تمہارے ذہن میں اتنی سی بات نہیں آ سکی؟''

وہ چونک اٹھا، پھر بولا۔ ''ہاں اس کا امکان تو ہے، میرے آپ کے تعلقات سے اکثر افراد واقف ہیں۔''

''اسی لیے یہاں میرا زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں چلوں گی۔''

''بس ایک سوال!'' دلاور جلدی سے بولا۔

''کہو!''

''یہ جن ای وہی تو نہیں جس نے آپ کی کوٹھی میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی اور کامیاب ہو گیا تھا، پھر اسے آپ کی کوٹھی سے نکلتے نہیں دیکھا گیا؟''

''سوچتے رہو، کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ ہی جاؤ گے۔''

میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا، پھر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

''تو آپ کچھ بھی نہیں بتائیں گی!'' اس کے لہجے میں محبت آمیز شکایت تھی۔

''وقت آنے پر بتا دوں گی۔'' میں نے بغیر مڑے کہا۔ ''فی الحال تو میں خود تاریکی میں ہوں۔''

''میں یہی دعا کر سکتا ہوں کہ خدا آپ کو روشنی میں لائے۔''

میں نے عقب سے دلاور کی آواز سنی۔ ''ویسے خادم کی خدمات ہر وقت حاضر ہیں، جب ضرورت ہو رابطہ قائم کر لیجیے گا۔''

''شکریہ!'' یہ کہتی ہوئی میں نے اس کے ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔

اب میں جلد از جلد بلقیس کے فلیٹ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ کریم آباد میں رہتی تھی اور اس کے فلیٹ میں اتنی گنجائش تھی کہ میں وہاں ایک رات گزار سکوں۔ اس کی ایک ادھیڑ عمر ماں تھی اور ایک چھوٹا بھائی۔ وہاں بآسانی میرے سونے کی گنجائش نکل سکتی تھی، لیکن اپنی کار تک پہنچتے پہنچتے میں اس خیال کو بھی ذہن سے جھٹک چکی تھی۔ مجھے اپنے طارق روڈ والے فلیٹ کا خیال آ گیا تھا جسے میں نے ایسے ہی ہنگامی حالات کے لیے خریدا تھا، بلقیس کے فلیٹ میں فون بھی نہیں تھا مگر میرے فلیٹ میں یہ سہولت بھی تھی، ابھی میں اپنی کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھی تھی اور انجن اسٹارٹ کیا تھا کہ کافی فاصلے پر مجھے عقبی آئینے میں ایک پولیس جیپ نظر آئی اور میں چونک اٹھی، میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا اور میری کار تیزی کے ساتھ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی، دلاور کے یہاں سے فوری روانگی کا فیصلہ یقیناً میرے حق میں مفید ثابت ہوا تھا، اسی بروقت فیصلے نے مجھے پولیس کی دسترس سے بچا لیا تھا۔ یہ بھی بہت بہتر ہوا تھا کہ میں نے اپنی کار کو دلار کی کوٹھی کے باہر سڑک پر کھڑا کیا تھا اور اسے اندر نہیں لے گئی تھی ورنہ پولیس جیپ میری نظر میں نہ آتی۔

جس طرح میری نظر پولیس جیپ پر پڑ گئی تھی، اسی طرح یہ امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ پولیس والوں

نے بھی میری کار کو دیکھ لیا ہو۔ میری نگاہ اسی لیے عقبی آئینے پر تھی۔ پھر میرا قیاس غلط ثابت نہیں ہوا، یقیناً مجھے دیکھ لیا گیا تھا۔ پولیس جیپ دلاور کی کوٹھی کے سامنے رکنے کی بجائے سیدھی میرے تعاقب میں چلی آ رہی تھی۔ میں نے ایکسیلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ کچھ فاصلے پر گلیوں کا چوراہا نظر آ رہا تھا، وہ پورا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا، وہاں سے پولیس جیپ کو جل دے کر میرے لیے نکل جانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں ایک گلی سے دوسری میں اور تیسری سے تیسری میں مڑتی رہی، علاقہ کیونکہ اقامتی تھا، اس لیے بس اِکا دُکا مسافر ہی آ جا رہے تھے۔ مجھے تیز رفتاری برقرار رکھنے میں دقت پیش نہیں آ رہی تھی، نتیجہ بالآخر میری توقع کے مطابق ہی نکلا، میں پولیس والوں کو غچہ دینے میں کامیاب ہو گئی، اب میرا رخ سبیل والی مسجد کی طرف تھا، گلیوں گلیوں میں کافی دور نکل آئی تھی، اب پولیس جیپ میرے تعاقب میں نہیں تھی۔

میری تیز رفتاری اب بھی برقرار تھی، جہانگیر روڈ پر میں نے کار کی رفتار نسبتاً کم کر دی، میں نے دور ہی سے اس کے موڑ پر ایک ٹریفک پولیس انسپکٹر اور چند ٹریفک کانسٹیبلوں کو کھڑے دیکھا تھا، وہ لوگ یقیناً وہاں ''پیدا'' کی تلاش میں کھڑے تھے۔ مجھے علم تھا کہ ٹریفک قوانین پر عملدرآمد کی آڑ میں دراصل کیا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، کچھ کاریں اور دوسری گاڑیاں بھی وہاں ایک طرف کھڑی نظر آ رہی تھیں، جن سے غالباً ''سودے بازی'' جاری تھی۔ میں فی الحال اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتی تھی اس لیے احتیاط کے پیش نظر کار کی رفتار کم کر دی تھی، مجھے نہیں روکا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا اور پھر کچھ آگے جا کر رفتار دوبارہ بڑھا دی، جلدی میں لیاقت آباد سے گزرتی ہوئی کریم آباد پہنچ گئی۔

بلقیس مجھ سے چند منٹ پہلے ہی اپنے فلیٹ پر پہنچی تھی، اس کی ماں اور چھوٹا بھائی، دونوں ہی اندرونی کمرے میں تھے، مجھے اس نے بیرونی کمرے میں بٹھایا تھا، میں نے بلقیس کا چہرہ دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ کر لیا کہ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی ہے۔ اپنے خیال کی تصدیق کے لیے میں نے بغیر وقت ضائع کیے اس سے استفسار کیا۔

''سر! گمان غالب ہے کہ نرگس کو اغواء کیا جا چکا ہے۔''

بلقیس نے گویا دھماکہ خیز خبر سنائی۔

''اغواء!......'' میں حیرت سے بولی۔ ''تفصیلات سے آگاہ کرو۔''

''انہوں نے مجھ سے فون پر رابطہ قائم کیا تھا۔'' بلقیس بتانے لگی۔ ''میرے سپرد انہوں نے یہ کام کیا تھا کہ میں ایئرپورٹ سے یہ معلوم کروں، اس روز کسی فلائٹ سے عبدالحمید خان اسلام آباد جا رہا ہے یا نہیں میں نے جلد ہی معلومات حاصل کر لیں کہ عبدالحمید خان نے بکنگ نہیں کرائی، مجھے یہ اطلاع بذات خود نرگس کو پہنچانا تھی، جب میں کلفٹن پہنچی تو وہ مقررہ جگہ پر موجود نہیں تھیں۔ انہوں نے مجھے بتا دیا کہ وہ عبدالحمید خان کی کوٹھی کے ارد گرد ہی مجھے کہیں مل جائیں گی۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آئیں۔ سڑک کے کنارے مجھے ایک جگہ چھوٹی سی ڈائری پڑی ملی۔ میں نے وہ ڈائری اٹھا کر دیکھی۔ ڈائری نرگس ہی کی تھی، میں چوکنا ہو گئی، پھر مجھے کچھ ہی فاصلے پر ایک زنانہ سینڈل پڑا ہوا دکھائی دیا، میں نے اسے بھی اٹھا لیا میرے اندازے کے مطابق وہ سینڈل بھی انہیں کا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے بلقیس نے نرگس کی ڈائری پرس سے نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دی۔

میں نے ڈائری اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بلقیس سے کہا۔ ''تمہارا اندازہ صد فیصد درست ہے، معلوم ہوتا ہے یقیناً نرگس کو اغواء کیا جا چکا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میری نگاہ ڈائری کے صفحات کا جائزہ لے رہی تھی، ڈائری میں کوئی پیغام میرے لیے نہیں تھا کیا ہوا ہو گا؟ یہ سمجھنا زیادہ دشوار نہ تھا، جب نرگس کو اغوا کر کے لے جایا جا رہا ہو گا تو اس نے موقع پا کر اپنی ڈائری وہاں پھینک دی ہو گی اور شاید دانستہ اپنا ایک سینڈل بھی اتار یا ہو گا تا کہ مجھے حالات کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو۔ نرگس واقعی ذہین تھی، وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہی تھی، اس نے یہ باور کرا دیا تھا کہ اسے اغوا کیا جا چکا ہے۔ ظاہری بات تھی کہ اس کے اغوا میں عبدالحمید خان کا ہاتھ ہی رہا ہو گا۔ اسے یقیناً نرگس پر شبہ ہو گیا ہو گا، عبدالحمید خان اس طرح غالباً مجھے زچ کرنا چاہتا تھا۔ نرگس کو اغواء کر کے کہاں لے جایا گیا ہو گا؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

بلقیس کی اطلاع کے مطابق عبدالحمید خان اسلام آباد نہیں جا رہا تھا، اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے فون پر مجھ سے جھوٹ بولا تھا، میں کچھ دیر خاموش بیٹھ کر حالات پر غور کرتی رہی۔ عبدالحمید خان پر نظر رکھنا ضروری تھی لیکن اب وہ چوکنا ہو چکا تھا، اس لیے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میں نے بلقیس کو عبدالحمید کی نگرانی کا حکم دیا اور اس سلسلے میں آپریشن سیل کی دیگر کارکنوں سے مدد لینے کی اجازت بھی دے دی۔ مجھے اس سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ نرگس کے اغوا کے بعد اسے بہت چوکنا رہنا ہے۔ میری ایک کارکن ساجدہ کے گھر پر فون تھا میں نے بلقیس کو ہدایت دی کہ ساجدہ کو رپورٹ دیتی رہے۔ میں اس سے رپورٹ لیتی رہوں گی۔

اب میں پوری طرح اور تمام وسائل کے ساتھ حرکت میں آ چکی تھی۔ نرگس کا اغوا میرے نزدیک ایک معمولی بات نہیں تھی۔ اس حرکت پر میرا خون کھول اٹھا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد میں، بلقیس کے فلیٹ سے اتر کر اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھی اب میں اپنے طارق روڈ والے فلیٹ کا رُخ کرنا چاہتی تھی، اس وقت میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ شاید اسی سبب میں چند لمحے کے لیے اپنے اردگرد سے غافل ہو گئی تھی اور یہی چند لمحے میرے لیے خطرناک ثابت ہوئے، ہوش مجھے اس وقت آیا جب میں نے اپنی پسلیوں پر ریوالور کی نال کو چبھتے محسوس کیا نہ معلوم کدھر سے وہ دونوں تیزی کے ساتھ نکل کر میرے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے تھے میں اس وقت بس اپنی کار کا دروازہ کھولنے والی تھی، میرے دونوں پہلوؤں سے دو ریوالوروں کی نالیں لگی ہوئی تھیں۔

''ذرا بھی حرکت کی تو ہم تمہیں یہیں ٹھنڈا کر دیں گے!'' ان میں سے ایک نے غرا کر مجھے دھمکی دی، پھر حکم دیا۔ ''خاموشی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ!'' اس کے ساتھ ریوالور کی چبھن میں اضافہ ہو گیا۔

میں سمجھ چکی تھی کہ میری ذرا سی حرکت انہیں مشتعل کر سکتی ہے، میں نے اسی لیے فی الحال تعمیل حکم میں عافیت جانی۔ میں اپنی ہی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی، ریوالور کی نال اب بھی میری پسلیوں سے لگی ہوئی تھی، ان میں سے ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی، کار اسٹارٹ ہونے کے بعد ہی میں کچھ کر گزرنے کے بارے میں سوچ سکتی تھی، میرا پرس اب تک میرے ہی پاس تھا اور اس میں ریوالور موجود تھا۔ ان احمقوں نے نہ تو میرے پرس کی تلاشی لی تھی اور نہ ہی اسے مجھ سے چھینا تھا۔

کار آندھی اور طوفان کی طرح وہاں سے روانہ ہوئی اور اسی کے ساتھ جیسے میری آنکھوں میں ستارے ناچ

گئے۔ ہاتھ بہت جچا تلا پڑا تھا، میرے قریب بیٹھے ہوئے شخص نے بس اچانک ہی خلاف توقع میری کنپٹی پر زبردست وار کیا تھا، اس کے بعد میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا تھا، یقیناً وہ شخص تجربے کار معلوم ہوتا تھا۔

ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کمرے کے فرش پر پڑا ہوا دیکھا، میرا سر کسی کے زانو پر تھا۔ وہ چہرہ جس پر مجھے فکرمندی کے آثار نظر آ رہے تھے، میرے لیے اجنبی نہیں تھا وہ نرگس تھی جس کی گود میں میرا سر رکھا ہوا تھا، میں ایک دم اُٹھ کر بیٹھنے لگی۔

''لیٹی رہیں سر! لیٹی رہیں۔'' نرگس بول اُٹھی۔

''نہیں!'' میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس کمرے پر طائرانہ نظر ڈالی، وہاں فرنیچر نام کی کوئی شے نہیں تھی، فرش پر بھی کچھ بچھا ہوا نہیں تھا۔ دیواروں کی حالت اور فرش کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ کوئی پرانی عمارت ہے، کمرے کی چھت خاصی اونچی تھی اور بلندی ہی پر ایک روشن دان یقیناً ہوا کے گزر کی خاطر، مگر اس کے باوجود وہاں مجھے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا، کمرے میں پچیس واٹ کا بلب روشن تھا جس کی پیلی سی مردہ روشنی ناکافی سی تھی، دروازہ ایک ہی تھا، مگر کھڑکی ایک بھی نہیں تھی۔

ہر چند کہ میں خود بھی دشمنوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی لیکن نرگس کو اپنے قریب دیکھ کر مجھے اطمینان سا تھا۔

''تمہارے ساتھ کیا گزری، جلدی سے بیان کر جاؤ۔''

میں نے نرگس کو مخاطب کیا۔

''میں بلقیس کو فون کر کے دوبارہ عبدالحمید خان کی کوٹھی کی طرف لوٹ رہی تھی کہ اچانک ایک کار میرے قریب آ کر رکی۔'' نرگس گزرا ہوا واقعہ بیان کرنے لگی ''کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر جو شخص بیٹھا ہوا تھا، اس نے میری طرف ایک پرچہ بڑھاتے ہوئے ایک کوٹھی کے بارے میں پوچھا۔ پرچے پر ایک نام، کوٹھی کا نمبر اور علاقہ درج تھا۔ ابھی میں نے پرچہ لے کر اس پر ایک نظر ہی ڈالی تھی کہ اچانک پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص تیزی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اس نے میرے پہلو سے ریوالور کی نال لگا دی، پھر مجھ سے کار میں بیٹھنے کے لیے کہا گیا، میں نے کار میں بیٹھتے بیٹھتے نہایت تیزی سے اپنا پرس کھول لیا، جس میں ریوالور موجود تھا، اس شخص نے کھلے ہوئے پرس پر جھپٹا مارا۔ میں محتاط تھی، پرس کو میں نے دانستہ الٹ دیا، میرے پرس کے بیچ والے خانے میں ریوالور اور چھوٹی ڈائری تھی، یہ دونوں چیزیں نیچے گر گئیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا دوسرا آدمی بھی نیچے اتر آیا اور اس نے جھک کر ریوالور اٹھا لیا، پھر مجھے دھکا دے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں دانستہ لڑکھڑائی اور اپنا ایک سینڈل بھی وہیں اتار دیا، پھر مجھے انہوں نے ریوالور کیزد پر کار میں بٹھا ہی لیا، کار میں بیٹھتے ہی میرے منہ پر رومال رکھ کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا، غالباً وہ لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مجھے اس جگہ کا علم ہو سکے جہاں لے جایا جا رہا ہے، آنکھ کھلی تو میں نے خود کو یہاں اس کمرے میں پایا۔'' یہ کہہ کر نرگس خاموش ہو گئی۔

''جب وہ مجھے یہاں لائے ہوں گے، اس وقت تو دروازہ کھلا ہوگا!'' میں بولی۔

نرگس سمجھ گئی شاید میں کیا معلوم کرنا چاہتی ہوں! اس نے کہا۔ ''جی ہاں۔ آپ کو یہاں لے کر آنے والے بھی وہی دونوں تھے جنہوں نے مجھے اغواء کیا تھا۔ ان میں سے ایک آپ کو اُٹھائے ہوئے تھا اور دوسرا میری

طرف ریوالور تانے رہا تھا۔''

''ممکن ہے ان دونوں کے علاوہ بھی کوئی اس عمارت میں ہو۔'' میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا، پھر بولی۔

''جب سے تم یہاں آئی ہو کسی نے تم سے کچھ پوچھ گچھ کی؟''

''جی نہیں سر!'' نرگس نے جواب دیا، پھر وہ مؤدب اور دبی دبی آواز میں مجھ پر گزرے ہوئے واقعے سے متعلق دریافت کرنے لگی۔

ابھی میں کچھ کہنے والی تھی کہ معاً میری سماعت سے قدموں کی چاپ ٹکرائی وہ آواز دروازے ہی کی طرف سے آئی تھی، یقیناً کوئی اسی طرف آ رہا تھا، میری نگاہ بے اختیار اس طرف اٹھ گئی، کچھ کر گزرنے کے لمحے آ چکے تھے، یہ بات میرے لیے خوش آئندہ ہی تھی کہ دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا، میرا ذہن اس وقت بہت تیزی سے کام کر رہا تھا، میں فوراً ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اسی کے ساتھ نرگس کو اٹھنے کا اشارہ کیا، پھر دروازہ کھلنے سے پہلے اس کی ایک جانب میں اور میرے اشارے پر دوسری طرف نرگس کھڑی ہو گئی۔ اب دروازہ کھولا جاتا تو ہم دونوں دروازے کے دونوں پٹوں کی آڑ میں چھپ جاتے اور آنے والوں کو کمرا پہلی نظر میں خالی ہی دکھائی دیتا۔

نرگس کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ میں کیا چاہتی ہوں اور نہ ہی اس کا وقت تھا۔ چند لمحوں کے بعد قدموں کی چاپ دروازے کے باہر آ کر رک گئی، مجھے یہ آوازیں سن کر اندازہ ہو گیا تھا کہ آنیوالے دو ہو سکتے ہیں، دروازہ کھولا جانے لگا، میرا دل اس وقت بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ابھی دوران میں مجھے ایک آواز سنائی دی اور میرا دل جیسے بیٹھ گیا، وہ یقیناً چالاک لوگ تھے ان دونوں میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا تھا کہ میں اندر جاؤں گا اور تم دروازے کے باہر ہی چوکنا کھڑے رہو گے، وہ عورت بہت چالاک ہے، ہمیں اس سے ہوشیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

پھر دروازہ کھل گیا اور ایک شخص ریوالور ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا، اسی لمحے میں دروازے کی آڑ سے نکل کر کسی عقاب کی طرح اس پر جھپٹی، یقیناً وہ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا، میں نے اسی لیے پہلی ہی کوشش میں اس سے ریوالور چھین لیا اور اسی کے ساتھ اسے دور اچھال دیا، وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا، نرگس اب تک دروازے کی آڑ میں تھی۔

''ریوالور پھینک دو ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دوں گا!'' دروازے کے باہر کھڑا ہوا شخص چیخا، اس کے ریوالور کی نال میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھی۔''

میں نے بلا تاخیر اس پر فائر جھونک مارا اور اسی کے ساتھ ایک طرف لڑھکتی چلی گئی تا کہ وہ مجھ پر گولی چلائے تو میں نشانہ نہ بن سکوں میں نے نشانہ لیے بغیر گولی چلائی تھی اس لیے بے سود رہی، گولی چلانے سے میرا مقصد محض اسے خوفزدہ کرنا تھا جواباً اس نے بھی فائر کیا اور کمرے میں ایک بھیانک چیخ گونج اٹھی، اس کی گولی کا نشانہ بننے والا خود اسی کا ساتھی تھا جو فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ دوبارہ سینہ تھامے ڈھیر ہو گیا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دروازے کے سامنے سے ہٹ چکی تھی۔ پھر میں ایک اور جست لگا کر دوبارہ دروازے کی آڑ میں پہنچ گئی، اب پہلے کی نسبت میری پوزیشن مستحکم تھی۔ میں اب خالی ہاتھ نہیں تھی۔

مجھے یقیناً یہ توقع نہیں تھی کہ باہر کھڑا ہوا شخص دروازہ بند کردے گا، میں اسی لیے دروازہ بند ہوتے ہی چونک اُٹھی میرے اور نرگس کے علاوہ اب اس کمرے میں ایک لاش بھی تھی، دروازہ بند کیے جانے کے بعد قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی، اب ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس عمارت کا طرزِ تعمیر بتا رہا تھا کہ وہ کوئی قدیم آبادی ہے مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ آبادی کون سی ہوسکتی ہے!

وہ دونوں جنہوں نے مجھے اغواء کیا تھا، انہی میں سے ایک اس وقت مردہ پڑا تھا، مجھے حیرت تھی کہ وہ دونوں ہی اپنے حلیے سے کرائے کے غنڈے معلوم نہیں ہوتے تھے، پھر وہ کون تھے؟ اس سوال نے مجھے کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور کردیا، پہلے یہ میرا صرف اندازہ ہی تھا کہ انہی دونوں نے نرگس کو بھی اغوا کیا ہوگا۔" مگر اب نرگس سے اس کی تصدیق ہوچکی تھی، وہ دونوں یقیناً بہت چالاک اور پھرتیلے تھے غنڈوں میں عموماً اتنی سوجھ بوجھ اور ہوشیاری نہیں ہوتی، مجھے اور نرگس کو اغواء کرتے وقت انہوں نے ذرا بھی یہ موقع نہیں دیا تھا کہ ہم سنبھل سکیں، یہی سب کچھ سوچتی ہوئی، میں بے دھیانی میں لاش کے قریب پہنچ گئی، معاً مجھے خیال آیا کہ مقتول کی تلاشی لینا چاہئے۔ اس طرح اس کی شخصیت سے پردہ اٹھ سکتا تھا، دوسرے ہی لمحے میں اس کے قریب بیٹھ چکی تھی، فرش پر خون پھیلا ہوا تھا، اس لیے میں نے احتیاط سے کام لیا، تلاشی لیتے ہوئے میں نے پورا خیال رکھا تھا کہ میرے کپڑوں سے خون نہ لگے۔ تلاشی کے دوران میں مجھے اس کا شناختی کارڈ بھی ملا جس پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھی، میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ مقتول کا تعلق انٹیلی جنس سے ہوگا، اب اس معاملے نے میرے نزدیک ایک اور ہی نیا رخ اختیار کرلیا تھا، اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میں اور نرگس اس وقت انٹیلی جنس والوں کی قید میں تھے۔

نرگس کی نظر بھی اس شناختی کارڈ پر پڑ چکی تھی اور اس کے چہرے پر بھی مجھے حیرت کے آثار نظر آرہے تھے۔ ابھی میں اس سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ خود بول اٹھی۔ "سر! اس معاملے کی نوعیت قانونی نہیں غیر قانونی معلوم ہوتی ہے۔"

میں خود بھی تقریباً اسی نتیجے پر پہنچی تھی، نرگس کے اس خیال نے مجھے مزید سوچنے پر مجبور کردیا، فوری طور پر میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اگر یہ معاملہ قانونی نوعیت کا ہوتا تو ہمیں یوں اغواء نہ کیا جاتا۔" نرگس دوبارہ بولی۔ "پھر یہ کہ اس عمارت کی بجائے ہمیں کہیں اور رکھا جاتا، میری مراد انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر سے ہے، کیا میرا خیال غلط ہے سر؟"

"ٹھیک کہتی ہو تم!" میں نے اس کی تائید میں کہا، پھر مزید بولی۔ "اس معاملے کا تعلق عبدالحمید خان سے ہے اور ہمارے اغواء میں اس کا ہاتھ ہے، یقیناً اس نے ذاتی سطح پر ان دونوں کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔"

"جی ہاں سر، یہی معلوم ہوتا ہے، لیکن موجودہ صورتحال میں اب وہ کیا قدم اٹھائے گا۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" نرگس کے لہجے سے قدرے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"فی الحال تو کچھ کہنا مشکل ہے۔" میں نے جواب دیا، لیکن اب اس کے لیے ہم پر قابو پانا آسان نہیں رہا۔ اسے یقیناً یہاں پیش آنے والے واقعے سے مطلع کیا جا چکا ہوگا۔ ایسی صورت میں جبکہ میں غیر مسلح نہیں رہی دروازہ کھولنے کی حماقت نہیں کی جائے گی۔"

ابھی میری بات پوری ہوئی تھی کہ مجھے کمرے میں عجیب سی ناگوار بو محسوس ہوتی میں نے تیز تیز سانس لے کر اس کی تصدیق کی تو مجھے سانس کی نالی میں جلن سی محسوس ہونے لگی۔

"یہ...... یہ بو کیسی ہے سر؟" نرگس بھی بول اٹھی۔

اسی وقت میری نگاہ چھت کی طرف اٹھ گئی، وہاں دھواں سا چکراتا دکھائی دے رہا تھا اور اس کا مخرج روشن دان تھا وہ دھواں روشن دان کے ذریعے کمرے میں داخل ہو رہا تھا، لحہ بہ لحہ اس ناگوار بو میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، یہ بو اسی دُھوئیں کی معلوم ہوتی تھی، چند ہی لمحے بعد سانس لینا دوبھر ہوگیا، اب میں شدید گھٹن محسوس کررہی تھی، یقیناً یہی حال نرگس کا تھا، اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا غالباً وہ بھی میری طرح سانس روکنے کی کوشش کررہی تھی لیکن شاید یہ اس کا حل نہیں تھا ہم بھلا کب تک سانس روک سکتے تھے!

کمرے میں اب اس قدر دھواں بھر گیا تھا کہ مجھے نرگس کا وجود بھی دھواں دھواں لگ رہا تھا، میرا دم سانس روکنے سے گھٹنے لگا تو بالآخر میں نے یہ عمل ترک کردیا، اس کے نتیجے میں مجھے شدید تکلیف سے دوچار ہونا پڑا، مجھ پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا، یہی حال نرگس کا ہوا پھر میں نے نرگس کو گرتے دیکھا تو اس کی طرف لپکی، مگر خود میرا حال برا تھا وہ فرش پر پڑی بری طرح تڑپ رہی تھی، کچھ ہی دیر میں وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی، میرا سر بھی اب چکرانے لگا تھا نتیجتاً میں فرش پر بیٹھ گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک طرف لڑھک گئی۔ ریوالور جو اب تک میرے ہاتھ میں تھا، وہ بھی چھوٹ گیا اور میرے ذہن میں تاریکی پھیل گئی۔

معلوم نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں، یہ وہی کمرا تھا جہاں میں بے ہوش ہوئی تھی، میں نے اردگرد نظر دوڑائی اور پھر ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی، کمرے میں اب میں بالکل تنہا تھی نہ وہاں اب نرگس تھی نہ وہ لاش۔ کمرے کے فرش سے خون بھی صاف کردیا گیا تھا، مریل بلب اب بھی روشن تھا، اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ابھی رات باقی ہے میں نے سوچا کہ شاید نرگس کو اسی عمارت کے کسی اور کمرے میں منتقل کردیا گیا ہوگا، میں اب غیر مسلح تھی اور وہ ریوالور بھی وہاں نہیں تھا، جو بے ہوش ہوتے وقت میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

کچھ ہی دیر اور گزری ہوگی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور دو مسلح افراد اندر داخل ہوگئے ان دونوں ہی کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آرہے تھے، یقیناً گزشتہ تجربے کی روشنی میں انہوں نے ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ وہ دبے پاؤں دروازے تک پہنچے تھے تاکہ قدموں کی چاپ سن کر میں چوکنا نہ ہوجاؤں وہ دونوں غیر ملکی تھے اور میرے لیے قطعی اجنبی، ان کے ریوالوروں کی نالیں میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

"عذرا خان!" ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہم تمہیں زندہ رکھنا چاہتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو بے ہوشی کے دوران ہی میں تمہیں ٹھکانے لگا دیا جاتا۔" یہ الفاظ اس نے انگریزی زبان میں ادا کیے تھے، لیکن میرے لیے یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ انگریزی اس کی مادری زبان نہیں تھی۔ اپنے لہجے سے وہ مجھے جرمن معلوم ہوا تھا۔

"تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے بے جھجک سوال کیا، میں نے بھی انگریزی ہی کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔

"ہم تم سے کچھ نہیں چاہتے، صرف تمہیں چاہتے ہیں۔"
اس شخص نے عجیب سی بات کی۔

"مجھے چاہتے ہیں!" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ہنسی آ گئی۔ اس وجہ سے کہ ہماری زبان میں ان الفاظ سے کچھ اور ہی معنی لیے جاتے ہیں جو یقیناً اس کا مطلب نہیں رہا ہوگا۔

"ہاں تمہیں!" جواباً وہ غیر ملکی سنجیدگی سے بولا۔ "ہم نے تمہارے حصول کی خاطر بھاری رقم خرچ کی ہے، ہم تمہیں فی الحال ایک محفوظ مقام پر لے جائیں گے اس کے لیے ہم تمہیں ایک انجکشن بھی دیں گے جس کے بعد تم بغیر سہارے کے نہیں چل سکو گی۔ انجکشن دیے جانے کے بعد ایک خاص اور محدود وقت تک تمہیں کچھ بھی ہوش نہ رہے گا کہ تم کہاں ہو اور کون ہو؟"

اس کی بات سے میں سمجھ گئی کہ اب عبدالحمید خان درمیان سے ہٹ گیا ہے اور اس نے مجھے ان غیر ملکیوں کے سپرد کر دیا ہے جو کسی سبب مجھے کہیں لے جانا چاہتے تھے۔ ان غیر ملکیوں نے میرے حصول کی خاطر اتنا لمبا چکر کیوں چلایا تھا اور اتنی رقم کیوں خرچ کی تھی؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، یہ سوچتے ہوئے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتی رہی، وہ دونوں چہرے مہرے سے سفاک اور بے رحم معلوم ہوتے تھے، اس کے باوجود بھی میں نے ان کے ارادوں کو مزید جاننے کی خاطر کہا۔ "اگر میں انجکشن لگوانے سے انکار کر دوں تو؟"

"تو ہمیں زبردستی کرنا پڑے گی۔" غیر ملکی نے بہت اطمینان سے جواب دیا، پھر اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا جس کے کاندھے سے ایک بیگ لٹکا ہوا تھا۔ "تم اپنا کام کرو۔"

دوسرے غیر ملکی نے ریوالور اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور کاندھے سے بیگ اتار کر اس میں سے کچھ سامان نکالنے لگا، پھر کچھ ہی دیر بعد وہ ایک سرنج میں سیال مادہ بھر کے میری طرف بڑھا، پہلا غیر ملکی مجھے ابھی تک ریوالور کی زد میں لیے ہوئے تھا۔

میرے نزدیک یہی لمحات کچھ کر گزرنے کے تھے، مگر وہ دونوں ہی بہت چوکنا تھے، انہوں نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا، دوسرا غیر ملکی میرے اور ریوالور والے کے درمیان لمحہ بھر کو بھی نہیں آیا تھا اور مجھے اس موقع کی تلاش تھی۔ دوسرا غیر ملکی میری دائیں جانب سے میرے قریب پہنچ گیا میں توقع کر رہی تھی کہ شاید وہ انجکشن لگانے کے لیے میری آستین اٹھائے انتہائی تیزی اور مہارت سے انجکشن کی سوئی میرے بازو میں داخل کر دی، دوسرے ہاتھ سے اس نے فوراً ہی میرے بازو کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا تاکہ میں اپنا بازو ہٹا نہ سکوں، اگر مجھے آستین اُلٹے جانے کی توقع نہ ہوتی تو شاید وہ اتنی آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتا۔

میرے بازو میں وہ سیال اتارتے ہی اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ سوئی بھی نکال لی۔ اس کے بعد وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

اچانک میری سماعت سے ایک گھٹی گھٹی سی نسوانی چیخ ٹکرائی پھر ایک مردانہ قہقہہ سنائی دیا، کہیں یہ چیخ نرگس کی تو نہیں تھی؟ اس خیال نے مجھے بے چین کر دیا دونوں غیر ملکیوں کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نظر آنے لگے تھے۔ انہیں یقیناً یہ بات پسند نہیں آئی تھی، اس گھٹی گھٹی سی چیخ اور مردانہ قہقہے نے مجھے بہت کچھ باور کرا دیا

تھا، اگر واقعی یہ چیخ نرگس ہی کی تھی تو یقیناً اس کے ساتھ کوئی ظالمانہ کھیل کھیلا جا رہا تھا، ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ معاً دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں اور ان کے ساتھ ہی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"بچاؤ!...... بچاؤ!"

یہ آواز نرگس کی ہرگز نہیں تھی لیکن اس کے باوجود میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، وہ لڑکی یقیناً مظلوم تھی، آواز قریب آتی جا رہی تھی اور اس آواز کے پیچھے بھاری قدموں کی دھمک تھی، کوئی غالباً اس مظلوم لڑکی کا تعاقب کرتا ہوا آ رہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ ریوالور والا غیر ملکی سنبھل سکتا، وہ لڑکی اُس غیر ملکی سے ٹکراتی ہوئی اندر آئی تھی۔ جس کے نتیجے میں غیر ملکی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا تھا، لڑکی کی عمر اٹھارہ بیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی، وہ کسی غنچہ نوشگفتہ کی طرح خوفزدہ ہونے کے باوجود انتہائی حسین نظر آ رہی تھی۔ اس کے دراز گیسو کھلے ہوئے تھے اور لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا، لڑکی کے پیچھے پیچھے ایک لحیم شحیم شخص کمرے میں داخل ہوا اور اس پر نظر پڑتے ہی میں تقریباً اچھل پڑی، وہ عبدالحمید خان تھا اس نے کمرے میں آتے ہی لڑکی کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا اور گھسیٹ کر لے جانے لگا، ریوالور والا غیر ملکی جو گر گیا تھا اب اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران میں دوسرے غیر ملکی نے ریوالور نکال لیا تھا لیکن ان دونوں کے اور میرے درمیان اب وہ مظلوم لڑکی اور عبدالحمید خان آ چکا تھا۔ لڑکی نے گھسٹتے ہوئے بڑی التجا آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر میں جیسے سب کچھ بھول گئی۔

میرے ذہن سے ہر خطرے کا احساس محو ہو گیا تھا۔ میں نے عبدالحمید خان پر چھلانگ لگا دی، وہ اپنے بھاری تن و توش سمیت فرش پر آ رہا۔ لڑکی اس کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی، گرنے کے بعد وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری ٹھوکر اس کے ماتھے پر پڑی اور وہ چیختا ہوا دوبارہ ڈھیر ہو گیا، ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی اور خون رسنے لگا تھا، پھر تو میں جیسے بجلی کی طرح کوندنے لگی دونوں غیر ملکی "ہینڈز اپ!...... ہینڈز اپ!" چیخے جا رہے تھے مگر مجھے ان کی پروا نہیں تھی، اس دوران میں وہ حسین لڑکی کسی ایسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح ایک طرف کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی جس کے پیچھے درندے لگ گئے ہوں۔

"بھاگ جاؤ!...... بھاگ جاؤ یہاں سے!" میں عبدالحمید خان کو زدوکوب کرتے ہوئے اس لڑکی کی طرف دیکھ کر چیخی۔

عین اسی وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ پیروں کی جان نکل رہی ہو، میں بہ مشکل اچھل کر دروازے کی طرف بڑھی، لڑکی ابھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکی تھی۔ معاً ایک غیر ملکی میرے راستے میں حائل ہو گیا۔

"پیچھے...... پیچھے ہٹو!" اس نے میری طرف ریوالور سیدھا کر لیا۔

میرے ذہن پر دھند سی چھانے لگی تھی یقیناً انجکشن اپنا اثر دکھانے لگا تھا، میں ساکت ہو گئی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکوں گی، اسی وقت میری نگاہ عبدالحمید خان کی طرف اُٹھی، وہ اپنا لہولہان چہرہ لیے اُٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور مجھے بڑی قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

"اسے آپ...... آپ لوگ کل...... کل رات یہاں سے لے جائیے گا۔" معاً عبدالحمید خاں نے میری

طرف ہاتھ اٹھا کر کہا اور پھر اپنے ہونٹوں سے بہتا ہوا خون پونچھنے لگا۔

''یہ نہیں ہوسکتا!'' ایک غیر ملکی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''مگر کیوں؟'' عبدالحمید کے لہجے سے قدرے جھنجلاہٹ کا اظہار ہونے لگا۔

''اس لیے کہ، ہم تمہیں رقم ادا کر چکے ہیں اور تم معاہدے کے مطابق اسے لے جانے سے ہمیں روک نہیں سکتے۔'' اسے جواب ملا۔

''میں...... میں اس سے اپنے زخموں کا حساب چکانا چاہتا تھا مگر خیر...... میرے پاس دوسرا راستہ بھی ہے، یہ نہ سہی تو اس کی ساتھی...... لیکن......'' اس کے لہجے سے تذبذب جھلک رہا تھا، میں سمجھ رہی تھی کہ اس کا اشارہ نرگس کی طرف ہے، وہ میرا انتقام اس سے لے سکتا تھا، مگر اس میں شاید کوئی قباحت تھی، وہ کیا قباحت ہو سکتی تھی، مجھے یہ سوچنے کا موقع نہیں مل سکا۔

اب وہ عجیب سی دھند پوری طرح میرے ذہن کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی، اسی کے ساتھ جیسے میرے جسم کی طاقت سلب ہوتی جا رہی تھی، میرے لیے اب کھڑا رہنا مشکل تھا، پھر اس سے پہلے کہ میں گر جاتی، فرش پر بیٹھ گئی، میری کیفیت عجیب سی تھی، میں اس کیفیت کو بے ہوشی کا نام نہیں دے سکتی تھی، مجھ پر ایک خواب سا عالم طاری تھا، رفتہ رفتہ میرے ذہن سے یہ بھی محو ہو گیا کہ میں کون ہوں اور کہاں لے جائی جا رہی ہوں!

وہ دونوں غیر ملکی مجھے سہارا دیئے اس عمارت سے باہر لے آئے تھے، انہوں نے اب اپنے ریوالور بھی جیبوں میں رکھ لیے تھے، شاید اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی، پھر ایک غیر ملکی میرے قریب بیٹھ گیا اور اس نے وین کا پچھلا دروازہ اندر سے بند کر لیا، کچھ ہی دیر بعد وین حرکت میں آ گئی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے اس وین میں کتنی دیر سفر کیا! مجھے جب سہارا دے کر اتارا گیا تو وین ایک بڑی سی عمارت کے کمپاؤنڈ میں کھڑی تھی، سامنے ہی برآمدے کی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں، وہ دونوں سہارا دیئے مجھے برآمدے تک لے گئے اور پھر ایک دروازے میں داخل ہو گئے۔ وہ دروازہ ایک راہداری کا تھا، راہداری عبور کر کے وہ دائیں جانب مڑ گئے۔ راستے میں ایک مقامی شخص اور ساتھ ہو لیا، وہ بڑا سا کمرا، عمارت کی عقبی سمت میں تھا، جہاں مجھے لے جایا گیا۔ اس کمرے میں جگہ جگہ عجیب سی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے اس ٹیبل پر لٹا دیا گیا اور پھر میرے جسم کو ٹیبل ہی سے منسلک چمڑے کی مختلف پٹیوں سے کس دیا گیا۔ میرا سر بھی چمڑے کی ایک بیلٹ کی گرفت میں تھا۔ اب اگر دوبارہ میرے جسم میں طاقت آ بھی جاتی تو میں اپنے جسم کو حرکت دینے سے قاصر رہتی۔

میں کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی رہی، مقامی شخص کے سوا اب اس کمرے میں کوئی نہیں تھا، دونوں غیر ملکی جا چکے تھے، کچھ ہی دیر بعد میں نے اس مقامی شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا، اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی اس نے میرے بازو میں انجکشن دیا اور پھر وہ بھی کمرے سے چلا گیا۔ اب میں وہاں بالکل تنہا تھی۔

وقت گزرتا رہا اور اسی کے ساتھ میرے ذہن سے دھند چھٹتی رہی، میں واضح طور پر محسوس کر رہی تھی کہ میری جسمانی قوت بحال ہوتی جا رہی ہے، میں نے اسی دوران میں ایک غیر ملکی کو اپنے قریب دیکھا، پھر ایک اور غیر ملکی نظر آیا جو اس کے پیچھے کھڑا تھا، انہی دونوں کے ہمراہ وہ مقامی شخص بھی تھا۔ یہ دونوں غیر ملکی میرے لیے نئے

تھے۔ یہ وہ نہیں تھے جو مجھے بند وین میں وہاں تک لے کر آئے تھے، ان میں سے ایک نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا، پھر مقامی شخص کو کوئی اشارہ کیا، میں دیکھ چکی تھی کہ ٹیبل کے سہارے عجیب ساخت کی دو مشینیں موجود تھیں، مقامی شخص میری نظروں سے اوجھل ہو کر میرے سرہانے کی جانب آ گیا، پھر میں نے ایک غیر ملکی کو ٹیبل کے قریب ایک اور مشین لاتے دیکھا جس پر مختلف ڈائل نظر آ رہے تھے۔

معاً میں نے محسوس کیا کہ میرے سر پر کوئی ہیڈ فون ایسی چیز لگا دی گئی ہے، میں اپنی دونوں کنپٹیوں پر ہلکا سا دباؤ محسوس کر رہی تھی۔ اب تک ان میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا، میری دائیں جانب جو مشین تھی، اس میں سے ایک پلگ نکال کر قریب کھڑے ہوئے غیر ملکی نے مقامی شخص کی طرف بڑھایا، وہ پلگ ایک تار سے منسلک تھا اور تار مشین کے کسی حصے میں جا کر غائب ہو گیا تھا، وہ پلگ غالباً میرے سر پر لگے ہوئے کسی سوئچ میں لگا دیا گیا۔

دھند اب پوری طرح میرے ذہن سے چھٹ چکی تھی، میں نے محسوس کیا کہ میری جسمانی طاقت بحال ہو چکی تھی یہ غالباً اس انجکشن کا نتیجہ تھا جو مقامی شخص نے میرے بازو میں کچھ دیر پہلے لگایا تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' میں بول اٹھی۔

میرے سوال پر ان غیر ملکیوں کے چہروں پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا جیسے وہ میری زبان سمجھے ہی نہ ہوں حالانکہ میں نے انگریزی میں یہ سوال کیا تھا۔

''کیوں لائے ہو تم لوگ مجھے یہاں؟ بولتے کیوں نہیں!'' میں دوبارہ چیخی۔

اس سوال کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہرے ہوں یا واقعی میری زبان ان کی سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔ وہ بدستور اپنے کام میں لگے رہے، وہ دونوں میری دائیں جانب موجود مشین کی طرف متوجہ تھے، اس مشین کا ایک بٹن دباتے ہی ایک جھٹکا سا لگا، میرے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ میں نے اپنے سر کے اندرونی حصے میں تیز قسم کی سنسناہٹ محسوس کی، پھر میرے دماغ میں بھی برقی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ میری نگاہ مشین کے ڈائلوں پر پڑی تو مختلف سوئیوں کو حرکت میں آتے دیکھا، مشین کے اوپر لگا ہوا ایک سرخ بلب بھی اب روشن ہو چکا تھا۔

دونوں غیر ملکیوں میں سے ایک اب میرے سرہانے پہنچ چکا تھا، وہ غالباً ان دونوں مشینوں کو ہینڈل کر رہا تھا جو میرے سرہانے تھیں۔ مجھے اپنا حلق خشک محسوس ہو رہا تھا، میں نے بولنے کی کوشش کی مگر آواز نہ نکل سکی۔ میرے ہونٹ بس ہل کر رہ گئے تھے۔

''شیپرڈ!'' معاً میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے غیر ملکی کی آواز سنی۔ وہ میرے سرہانے کھڑے ہوئے اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔ ''ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ وہ لڑکی نہ ہو! اگر یہی ہو تو ہمیں اس کے بارے میں غلط اطلاعات ملی ہوں؟'' یہ الفاظ اس نے جرمن زبان میں ادا کیے تھے۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' دوسرے غیر ملکی کی بھاری آواز سنائی دی۔

میں دنیا کی بہت سی زبانوں کی طرح جرمن زبان بھی بولنے اور سمجھنے پر قادر تھی، پھر میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتی رہی۔ اس گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ ان کے نزدیک میرا دماغ غیر معمولی قوتوں کا مالک تھا اور وہ اسی کا یقین کرنے کے لیے مجھ پر مختلف تجربات کر رہے تھے۔ ان تجربات سے ان کا

مقصد کیا تھا، یہ بات ان کی گفتگو سے ظاہر نہیں ہوسکی، میں نے ان کے مابین ہونے والی گفتگو سے جو نتیجہ اخذ کیا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر انسان قدرتی طور پر حیرت انگیز دماغی قوتوں کا مالک ہوتا ہے، مگر اس کے دماغ کا بڑا حصہ خوابیدگی کے عالم میں ہوتا ہے اور وہ اسے استعمال نہیں کر پاتا، ہر انسان بہت کم اپنی دماغی صلاحیتیں اور قوتیں استعمال کر پاتا ہے، ان میں سے چند ہی دماغ ایسے ہوتے ہیں جن کی کچھ حیرت انگیز قوتیں کسی سبب متحرک ہو جاتی ہیں یا انہیں متحرک کیا جاسکتا ہے، میرا دماغ بھی ان کے نزدیک ایسی ہی قوتوں کا مالک تھا، اس سلسلے میں انہوں نے میری مختلف پیش گوئیوں کا ذکر بھی کیا تھا جو سبھی سچ ثابت ہوئی تھیں۔ انہی میں ایک پیشگوئی امریکی صدر کینڈی کے قتل سے متعلق تھی، ان دونوں میں سے ایک کا خیال تھا کہ شاید ان سے غلطی ہوئی ہے، میرا دماغ ان صلاحیتوں کا حامل نہیں، مگر دوسرا غیر ملکی بضد تھا کہ غلطی نہیں ہوئی، بہر حال بحث کے دوران میں بھی وہ اپنے تجربات سے غافل نہیں رہے تھے۔

مجھ پر ایک تجربے کے سلسلے میں ان دونوں کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ ایک کا کہنا یہ تھا کہ اس طرح میری زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور میرا جسم یہ تجربہ برداشت نہیں کر سکتا، اس کے خیال میں اس طرح میرے دماغ کی کوئی شریان پھٹ سکتی تھی ان میں سے ایک کا نام شیپرڈ اور دوسرے کا نام شیفرڈ تھا۔ دونوں ہی جرمن معلوم ہوتے تھے۔ مقامی شخص کا نام ابھی تک پردہ راز میں تھا کیونکہ اسے گفتگو میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور نہ ان دونوں نے اسے نام لے کر ابھی تک مخاطب کیا تھا۔

"سنو شیپرڈ، اگر یہ لڑکی واقعی وہ نہیں، یعنی غیر معمولی دماغی قوتوں کی مالک نہیں تو بھلا یہ ہمارے کس کام کی! اگر یہ آخری تجربہ کرتے ہوئے مر جاتی ہے تو کیا فرق پڑے گا! لیکن اس نے وہ تجربہ برداشت کر لیا تو ہم کسی حتمی نتیجے تک پہنچ سکیں گے، ہم اسی کے بعد تو اسے مصر بھیج سکیں گے" یہ بات شیفرڈ نے کہی تھی جو میرے قریب دائیں جانب کھڑا تھا۔

"بہر حال میں اس تجربے کے حق میں نہیں ہوں۔" شیپرڈ نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ "اس لڑکی کے حصول کی خاطر کروڑوں ڈالر خرچ کیے جا چکے ہیں۔ میرے خیال میں انہیں اس طرح ضائع کرنے پر ہم سے جواب طلبی بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر رچرڈ کسی اور طرح وہ سب کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں جس کے لیے ہم انتہائی قدم اُٹھانا چاہتے ہیں۔"

"مگر ڈاکٹر رچرڈ تو قاہرہ میں ہیں۔" شیفرڈ نے اعتراض کیا۔ "ہمیں تو یہ حکم ملا تھا کہ لڑکی کی طرف سے تجربات کے بعد مطمئن ہو کر ہی ہم اسے یہاں سے قاہرہ روانہ کریں۔ اگر اس لڑکی کا دماغ حیرت انگیز اور غیر معمولی قوتوں کا مالک نہیں تو پھر اسے قاہرہ بھیجنے سے کیا فائدہ!"

شیپرڈ غالباً سوچ میں پڑ گیا، کیونکہ کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ میرا دل اس وقت انتہائی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آخری تجربہ یقیناً خطرناک نوعیت کا تھا، اسی لیے شیپرڈ اس کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا، میں دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ مجھ پر وہ لوگ تجربہ نہ کریں، اس طرح میری زندگی یقینی طور پر خطرے میں پڑ سکتی تھی، مگر شاید وہ وقت دعا کی قبولیت کا نہیں تھا، بالآخر شیپرڈ راضی ہو ہی گیا، میرے دل کی دھڑکنوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

چند ہی لمحے بعد شیفرڈ نے اشارہ کیا، یہ اشارہ یقیناً شیپرڈ کے لیے تھا، غالباً میرے سرہانے رکھی ہوئی مشینوں میں سے کسی ایک کو حرکت میں لانا تھا۔

اچانک میرے جسم کو انتہائی شدید جھٹکا لگا، اتنا شدید اور تکلیف دہ جھٹکا کہ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی، اگر میرا جسم چمڑے کی بیلٹوں میں کسا ہوا نہ ہوتا تو شاید میں ٹیبل سے نیچے گر جاتی۔ اسی دوران میں مجھے شیفرڈ کی پرمسرت چیخ سنائی دی۔

"میں کہہ رہا تھا نا...... کہہ رہا تھا نا!" وہ بلند آواز میں اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔ "دیکھو...... یہ سوئی حرکت کر رہی ہے!" اس نے اپنے قریب موجود مشین کے ایک ڈائل کی طرف اشارہ کیا۔ "دیکھو...... تم دیکھ رہے ہو شیپرڈ؟"

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔" شیپرڈ کے لہجے سے بھی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہمارا یہ تجربہ کامیاب رہا اور...... اور یقیناً...... اب یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لڑکی غیر معمولی دماغی قوتوں کی مالک ہے۔ سوئی اب پچاس کے ہندسے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ حیرت انگیز...... انتہائی حیرت انگیز! اس کا مطلب جانتے ہو...... جانتے ہو شیپرڈ؟"

شیفرڈ بلند آواز میں کہنے لگا، پھر خود ہی مزید بولا۔ "اس کا ذہن...... دماغ اس وقت...... اس وقت اس لڑکی کے نصف دماغ کے سیل متحرک ہو چکے ہیں اور...... ڈاکٹر رچرڈ تو پاگل ہو جائیں گے یہ دیکھ کر!"

ڈاکٹر رچرڈ پاگل ہوتا یا نہ ہوتا لیکن اس وقت وہ دونوں ضرور مجھے پاگل دکھائی دے رہے تھے۔ اب اذیت کا احساس لحہ بہ لحہ کم ہوتا جا رہا تھا، اسی کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میرے دماغ کے مختلف تاریک گوشے روشن ہو چکے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ میرے ذہن پر عجیب سا نشہ چھاتا چلا گیا اور میری آنکھیں بند ہو گئیں، میں نے اس عالم میں خود کو ذہنی طور پر ایک عجیب ماحول اور فضا میں پایا۔ میرا ذہن جیسے گزری ہوئی انسانی تاریخ کا سفر کر رہا تھا۔ میں جیسے ذہنی طور پر صدیوں پہلے کے زمانے میں پہنچ گئی تھی، جب انسان غیر مہذب تھا۔ یہ سفر انتہائی تیزی کے ساتھ ماضی سے حال کی طرف جاری تھا۔ میرے صفحہ ذہن پر مختلف متحرک مناظر ڈوبتے ابھرتے رہے، بنتے اور بگڑتے رہے، لاکھوں سال پر محیط وہ سفر میں لمحوں میں کر رہی تھی۔ یہ سفر ماضی سے حال کی طرف جاری رہا اور پھر لحہ موجود پر آ کے رک گیا، اب میرے ذہن میں باری باری اس کمرے میں موجود تینوں افراد کے چہرے جیسے جل بجھ رہے تھے، مگر ان میں ٹھہراؤ نہ تھا، چند لمحے اسی کیفیت میں گزرے پھر شیفرڈ کا چہرہ ابھرا، مجھے یوں لگا جیسے اس کا ذہن میرے لیے ایک کھلی کتاب کے مانند ہے اور میں وہ کتاب پڑھ سکتی ہوں، میں نے ذرا سی دیر میں شیفرڈ کے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کر لیں، اس کے بعد شیپرڈ کی باری آئی اور میں نے اس کے ذہن کی کتاب بھی پڑھ لی، وہ دونوں جرمن نژاد ہی تھے، ان کا شمار اپنے ملک کے ذہین سائنس دانوں میں ہوتا تھا، مگر وہ اپنے ملک کے لیے نہیں بلکہ سپر پاور کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان کی آمد کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ میرے متعلق یقینی معلومات حاصل کریں اور تجربات کے بعد کامیاب ہو جائیں تو مجھے قاہرہ بھیج دیں۔ اس سلسلے میں ایک مقامی شخص شہریار ان کی معاونت کر رہا تھا۔ ان دونوں کے ذہن پڑھ کر ہی مجھے یہ معلوم ہوا کہ کمرے میں موجود تیسرے شخص کا نام شہریار ہے اور وہ بھی ان دونوں کی طرح اس سپر پاور کا آلہ کار

ہے۔

ان دونوں کے بعد شہر یار کا چہرہ میرے ذہن میں ابھرا اور میں اس کے ذہن کا مطالعہ کرنے لگی۔ یہ مطالعہ میرے لیے انتہائی ہیجان خیز تھا کیونکہ شہر یار، صدرِ مملکت کے قریبی مشیروں میں شمار ہوتا تھا اور ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔ اسی کی تجویز پر وہ دونوں جرمن سائنس دان خیر سگالی کے دورے پر پاکستان آئے تھے۔ صدر مملکت کے قریبی مشیروں میں سے دو کو شہر یار اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا کیونکہ ان دونوں کا جھکاؤ دنیا کے دوسرے بڑے بلاک کی طرف تھا۔ میرے لئے یہ انکشاف بھی حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھا کہ ان دونوں میں سے ایک اگلے ہفتے کراچی آنے والا تھا۔ کراچی کے دوران قیام ہی میں اسے ٹھکانے لگا دیا جاتا اور بظاہر اس کی موت ایک حادثہ معلوم ہوتی۔ ابھی میں اس سازش کی بقیہ تفصیلات نہیں جان سکی تھی کہ معاً میری سماعت سے ایک دھماکے کی آواز ٹکرائی جس سے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا، میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور لمحہ بھر کو ہر طرف تاریکی سی پھیل گئی۔ اسی وقت دوسرا دھماکہ ہوا اور وہ چیخ بھی سنائی دی۔

میں نے آنکھوں کھول دیں، کمرے میں اب میں تنہا تھی دونوں غیر ملکی اور شہر یار وہاں نہیں تھے۔

اب میرے دماغ میں سائیں سائیں سی ہو رہی تھی، میں نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ اب میرے سر پر وہ ہیڈ فون ایسی شے نہیں ہے اور مشینوں سے میرے ذہن کا رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔ ٹیبل کے قریب جو مشین موجود تھی، اس کا پلگ بھی مشین ہی کے ساتھ جھول رہا تھا، ان لوگوں نے جاتے جاتے یقیناً وہ پلگ بھی نکال دیا تھا، مشین پر لگے ہوئے ڈائلوں کی سوئیاں بھی اب حرکت نہیں کر رہی تھیں اور سرخ بلب بھی بجھ چکا تھا۔

اچانک ان مشینوں سے رابطہ منقطع ہونے کے سبب ہی شاید میرے ذہن کو جھٹکا لگا تھا، میں نے محسوس کیا کہ اب میرے ذہن پر تاریک غبار سا پھیلتا جا رہا تھا مکمل طور پر ہوش و حواس کھو دینے سے پہلے میں نے پے در پے دھماکوں کی آوازیں سنی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے دو گروہوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے، پھر مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

دوبارہ ہوش میں آنے پر میں نے خود کو آپریشن سیل کے ہیڈ کوارٹر میں پایا تھا۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ مجھے ان غیر ملکیوں کی گرفت سے نکال کر لے آنے والے کون افراد تھے میں اس وقت ہیڈ کوارٹر کے ایک ساؤنڈ پروف اور ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں تھی۔ مجھے علم تھا کہ ہنگامی حالات ہی میں آپریشن سیل کے ارکان ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ ایسی صورت میں جب معاملات ان کے قابو سے باہر ہو جائیں۔ ہیڈ کوارٹر سے زیادہ تر ان افراد کا تعلق تھا جو فوج سے ریٹائر ہو چکے تھے یا باقاعدہ فوجی تربیت حاصل کر چکے تھے۔ ان نوجوانوں کو فوجی تربیت دینے والے فوج کے ریٹائر اور تجربہ کار افسران ہی تھے۔

میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا تو صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے، وہ رات گویا انتہائی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی تھی۔ آپریشن سیل کے ہیڈ کوارٹر کو میرے اغوا کا علم کیسے ہوا، میں اس سے ابھی بے خبر تھی، بظاہر وہ عمارت میرے امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار ہی کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھی، لیکن اس کی اصل حقیقت سے صرف متعلقہ افراد ہی واقف تھے، اس عمارت میں مستقل طور پر کچھ تربیت یافتہ افراد قیام پذیر رہتے تھے اور ان کی ڈیوٹیز کے اوقات بدلتے رہتے تھے۔ ہنگامی حالات سے قطع نظر کسی کو بھی آٹھ گھنٹے سے زیادہ ڈیوٹی نہیں

دینا پڑتی تھی، ان میں سے ہر ایک جدید ہتھیاروں سے مسلح رہتا تھا اور ان کے پاس ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے ٹرانسیمٹرز بھی تھے۔ میں نے انتہائی جدید خطوط پر یہ سارا بندوبست کیا تھا اور اس کے پیچھے ایک اہم مقصد تھا، میں اپنے طور پر ایک عرصے سے ملک دشمن عناصر کے خلاف کام کر رہی تھی، میری سرگرمیوں سے متعلق کم ہی افراد کو علم تھا۔ ملک کی صرف چند ہی اہم شخصیات اس سے واقف تھیں اور ان میں سے ایک وزیر داخلہ بھی تھے۔ انہیں میری حب الوطنی پر یقین تھا، دو ایک بار وہ خود ذاتی طور پر بھی میرے آپریشن سیل کی خدمات حاصل کر چکے تھے اور میں نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا، وہ مجھ سے مطمئن اور خوش تھے۔

اس کمرے میں انٹرکام بھی تھا، میں بستر سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی، انٹرکام کے ذریعے میں اس وسیع و عریض عمارت کے ہر کمرے سے رابطہ قائم کر سکتی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر ریسیور اٹھا لیا اور پھر نمبر سات پر انگلی کا دباؤ ڈالا۔ یہ نمبر ڈیوٹی رُوم کا تھا، میں نے رابطہ ملتے ہی دریافت کیا کہ ڈیوٹی پر اس وقت کون ہے؟

دوسری جانب سے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا گیا۔ ”یس سر!! کمانڈر نواز آن دی لائن۔“ یقیناً اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔

”مجھے رپورٹ چاہیے۔“ میں نے کہا۔ اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ مجھے کس سلسلے میں رپورٹ چاہیے!

”سر! میں نے اسی لیے کیپٹن شاد اور مس بلقیس کو روک لیا تھا۔ میں انہیں آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔“ کمانڈر نواز نے بتایا۔

بلقیس کا نام سن کر میں چونک اٹھی کیونکہ اسے گزشتہ رات میری طرف سے کچھ اور ہی احکام ملے تھے، اس وقت ہیڈ کوارٹر میں اس کی موجودگی میرے لیے معنی خیز تھی۔

”ٹھیک ہے، بھیج دو ان دونوں کو میرے پاس!“ میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا اور انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔

واقعات یوں پے در پے پیش آ رہے تھے کہ مجھے کچھ سوچنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی، ان واقعات کی نوعیت کچھ اس طرح تھی کہ خود اپنا وجود میری نظر میں پراسرار ہوتا جا رہا تھا، یہ معاملہ میرے اغواء کی کوشش سے شروع ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں اپنی جان بچاتے ہوئے میرے ہاتھوں تین افراد قتل ہو چکے تھے، پہلے میں اس بات سے لاعلم تھی کہ کون مجھے اغواء کرانا چاہتا ہے اور کیوں؟ لیکن اب مجھے ان سوالوں کے جواب مل چکے تھے۔ میرے اغواء میں ایک مشہور سیاسی شخصیت کا ہاتھ تھا۔ یعنی عبدالحمید! لیکن یہ معاملہ صرف عبدالحمید خان تک محدود نہیں رہا تھا، اس کے بعد کچھ غیر ملکی سامنے آ گئے تھے، میرے عوض عبدالحمید خان کو اتنا بھاری معاوضہ ملا تھا کہ وہ اس سلسلے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب یہ بات سامنے آئی تھی کہ دراصل یہ معاملہ بین الاقوامی نوعیت کا تھا، دنیا کی ایک بڑی طاقت اس میں دلچسپی لے رہی تھی، یہ معاملہ اتنا طول پکڑ جائے گا، مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا مجھے یہاں سے اغواء کر کے قاہرہ بھیجا جانے والا تھا اور وہاں کوئی ڈاکٹر رچرڈ میرا منتظر تھا، اسی دوران میں شہر یار کی شخصیت سامنے آئی تھی جو یقیناً کسی سازش کے تانے بانے بننے میں مصروف تھا۔ یہ امر بھی میرے لیے تشویش کا باعث تھا کہ شہر یار، صدرِ مملکت کے قریبی لوگوں میں سے تھا اور یہ کہ وہ ایک بڑی طاقت کا آلہ کار تھا،

اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا ہنسی کھیل نہیں تھا۔ عبدالحمید خان کی سطح تک معاملات سے نمٹنا شاید میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہ ہوتا لیکن شہریار بہرحال لقمۂ تر نہیں تھا۔

میں ابھی انہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ دروازے کے قریب لگا ہوا بلب روشن ہو گیا۔

''آجاؤ!'' میں جھونک میں کہہ گئی اور یہ بھول گئی کہ وہ کمرہ ساؤنڈ پروف تھا۔

جب دوبارہ بلب جلا تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا، میری توقع کے مطابق آنے والی بلقیس ہی تھی اور اس کے پیچھے کیپٹن شاد تھا۔ کیپٹن شاد کو میں پسند کرتی تھی، وہ ذہین اور نوجوان ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی دلیر بھی تھا، اس میں ایک ہی خرابی تھی۔ حسن اس کی کمزوری تھا، لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ معاملہ صرف حسن پرستی ہی تک محدود ہے اور بدکرداری کی حدود میں داخل نہیں ہوا۔ وہ میری سخت گیر طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا، آپریشن سیل سے منسلک افراد کی معمولی سی غلطی کو بھی میں نظرانداز نہیں کرتی تھی۔ وہ اسی لیے میرے سامنے بہت محتاط اور مؤدب رہتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر وہ آپریشن سیل سے وابستہ خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ کام کرنا زیادہ پسند کرتا تھا، اس کے علاوہ میں نے خود اپنے لیے بھی اس کی نظروں میں پسندیدگی کی جھلکیاں دیکھی تھیں، لیکن وہ اپنی حد تک حتی الامکان اس بات کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ اگر وہ بلا کا ذہین اور دلیر نہ ہوتا تو شاید میں اسے کب کا آپریشن سیل سے الگ کر چکی ہوتی کیونکہ اس کی حسن پرستی دو ایک بار مجھے مشکلات میں مبتلا کر چکی تھی۔ بلقیس بھی کم خوبصورت نہیں تھی، اسی لیے اس وقت کیپٹن شاد کے چہرے پر بہار سی نظر آ رہی تھی۔ اس بات کو میں نے پہلی ہی نظر میں محسوس کر لیا تھا، وہ دونوں میرا اشارہ پا کر اب سامنے والے صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

''بلقیس! تمہیں تو میں نے عبدالحمید خان کی نگرانی پر مامور کیا تھا، پھر......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''سر! مجبوری تھی کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہ کر سکی۔'' اس نے جواب دیا اور پھر تفصیل کے ساتھ مجھے اس مجبوری کے اسباب بتانے لگی۔

ہوا یہ کہ جب میں اس سے رخصت ہو کر نیچے پہنچی تھی تو وہ اپنے فلیٹ کی ایک کھڑکی سے مجھے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی، اس نے مجھے اغواء ہوتے دیکھ لیا تھا، صورتحال ایسی تھی کہ تعاقب کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا، اگر وہ مداخلت کرتی تو میری زندگی کو خطرہ پیش آ سکتا تھا کیونکہ میں اغواء کرنے والے کے قابو میں تھی، بلقیس نے ایک ٹیکسی میں لی مارکیٹ کی ایک عمارت تک میری کار کا تعاقب کیا۔ اغواء کرنے والے مجھے بے ہوشی کی حالت میں عمارت کے اندر لے گئے تھے۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں پائی تھی کہ کیا کرے؟ اس نے ایک اور کار کو عمارت کے سامنے رُکتے دیکھا، کار کی نمبر پلیٹ سے بلقیس نے اندازہ لگایا کہ وہ کار کسی سفارت خانے کی ہے۔ اس کار سے بلقیس نے ایک سیاہ فام افریقی کو اترتے دیکھا جو عمارت میں داخل ہو گیا۔ بلقیس نے محسوس کیا کہ تن تنہا وہ اس معاملے سے نہیں نمٹ سکے گی۔ کیا خبر اس عمارت میں کتنے آدمی ہوں اور کیا صورت پیش آئے! وہ تنہا اس عمارت میں داخل ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی، نتیجتاً بہ مجبوری اس نے فوری طور پر آپریشن سیل کے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے لیے اسے کچھ دیر کو وہاں سے ہٹنا پڑا تھا اس نے کوڈ ورڈز

میں ٹیلی فون پر کمانڈر نواز کو صورتحال سے مطلع کر دیا تھا۔ کمانڈر نواز نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اس عمارت سے دور رہے تاکہ مجرموں کو اس پر کسی قسم کا شک نہ ہو جائے اور یوں وہ چوکنا نہ ہو جائیں، اس کے ساتھ ہی کمانڈر نواز نے اسے یقین دلایا تھا کہ بہت جلد کیپٹن شاد کچھ افراد کو لے کر اس تک پہنچ رہا ہے بلقیس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ آنے والے سبھی جدید ہتھیاروں سے مسلح ہوں گے اور ان کے لیے کسی بھی قسم کی صورتحال سے نمٹنا دشوار نہیں ہو گا، وہ اس عمارت سے کچھ فاصلے پر آنے والوں کا انتظار کرتی رہی۔

تقریباً نصف گھنٹے میں کیپٹن شاد اس تک پہنچ گیا، بلقیس نے اسے تازہ تر صورتحال سے آگاہ کیا، وہ عمارت ایک نیم تاریک سی گلی میں تھی، صرف اس عمارت کے باہر جلنے والی روشنی گلی کو قدرے روشن کیے ہوئے تھی، لیکن جب کیپٹن شاد وہاں پہنچا تو وہ گلی بالکل تاریک تھی، کسی سبب عمارت کے باہر جلتے ہوئے روشنی بجھا دی گئی تھی۔

کیپٹن شاد نے خطرے کی بو سونگھ لی، اس کے خیال میں بہت جلد کچھ نہ کچھ ہونے والا تھا، وہ بلقیس کو وہیں چھوڑ کر تاریک گلی میں رینگ گیا، اس کے بعد خود کیپٹن شاد مجھے بقیہ واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔ سر کچھ ہی دیر بعد میری آنکھیں جب اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں تو عمارت کے سامنے مجھے ایک کار کھڑی نظر آئی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود تھا، پھر میں نے دو افراد کو دروازے سے نکل کر کار کی طرف آتے دیکھا، وہ کسی نسوانی پیکر کو اٹھائے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ نسوانی پیکر بے ہوشی ہی ہو سکتا تھا ورنہ اسے یوں اٹھانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مس بلقیس مجھے پہلے ہی بتا چکی تھیں کہ آپ کو بے ہوشی کی حالت ہی میں وہاں لایا گیا تھا، میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اب وہ لوگ آپ کو کہیں اور لے جا رہے ہیں۔'' کیپٹن شاد تفصیل کے ساتھ پیش آنے والے واقعات بیان کرتا رہا۔

میں پورے انہماک سے اس کی رپورٹ سن رہی تھی، مجھے اس عمارت سے کار میں نہیں بلکہ ایک بند وین میں لے جایا گیا تھا، دوم یہ کہ میں خود اپنے پیروں سے چل کر غیر ملکیوں کے سہارے وین تک پہنچی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میں نہیں، کوئی اور ہی تھا جب قید کے دوران میں مجھے دوبارہ ہوش آیا تھا تو نرگس وہاں نہیں تھی، اس سے یہی ثابت ہوتا تھا، میرا یہ اندازہ غلط تھا کہ نرگس کو اسی عمارت کے کسی دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا ہو گا، بکمل بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے لے جائی جانے والی نرگس ہو سکتی تھی، یہ سوچ کر میں فکرمند ہو گئی۔ گویا نرگس اب بھی دشمن کی قید میں تھی۔

کیپٹن شاد کے بیان کے مطابق اس بے ہوش نسوانی پیکر کو کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا گیا، پھر اسے اٹھا کر لانے والوں میں سے ایک پیچھے بیٹھ گیا اور دوسرا ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اندھیرے کے سبب کیپٹن شاد یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ لوگ کسے لے جا رہے ہیں، ان کی کار اسٹارٹ ہونے سے پہلے ہی کیپٹن شاد، گلی سے نکل آیا، وہ سیاہ کار گلی سے نکلتے ہی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ ایک سمت روانہ ہو گئی، کار کے شیشے چڑھے ہوئے تھے جن کے آر پار دیکھا جانا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ شیشے دھندلے تھے۔

احتیاطاً کیپٹن شاد نے اپنے دو آدمیوں کو ایک گاڑی کے ساتھ وہیں چھوڑ دیا اور خود بلقیس کے ساتھ دیگر ساتھیوں کے ہمراہ سیاہ کار کے تعاقب میں روانہ ہو گیا بلقیس اس کار کی نمبر پلیٹ دیکھ کر چونک اٹھی، یہ وہی کار تھی جو اس نے عمارت کے سامنے رُکتے دیکھی تھی اور ایک سیاہ فام افریقی اس سے اتر کر عمارت میں گیا تھا، کار کا

تعلق کسی سفارتخانے سے تھا، اس نے یہ بات کیپٹن شاد کو بھی بتا دی۔ اس سیاہ کار کا تعاقب کرتے ہوئے کیپٹن شاد اور اس کے ساتھی ایک ایسی عمارت تک پہنچ گئے جس کے کمپاؤنڈ میں وہ کار داخل ہوئی تھی۔ وہ عمارت ایک غیر ملکی سفارتخانے کے پاس تھی اور اس سفارت خانے کا تعلق شمالی افریقہ کے ایک ملک سے تھا، کیپٹن شاد چکرا کر رہ گیا۔ یہ معاملہ ایک غیر ملکی سفارت خانے کا تھا، اس میں کسی قسم کی مداخلت سے غلط نتائج بھی برآمد ہو سکتے تھے۔

کمانڈر نواز کی طرف سے اسے یہ احکام ملے کہ وہ مداخلت نہ کرے اور دو آدمیوں کو عمارت کی نگرانی کرنے کے لیے وہاں چھوڑ دے، اس کے ساتھ یہ حکم بھی ملا کہ لی مارکیٹ والی عمارت پر چھاپا مار کر مزید معلومات حاصل کی جائیں کہ وہ عمارت کس کی ہے؟ اس غیر ملکی سفارت خانے سے عمارت کے مکین کا کیا تعلق ہے اور یہ کہ وہاں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟

کیپٹن شاد نے کمانڈر نواز کی ہدایت و احکام پر عمل کیا، اور اپنے دو آدمیوں کو وہاں چھوڑ کر لی مارکیٹ کی طرف روانہ ہو گیا، ابھی وہ اس عمارت تک پہنچنے ہی والا تھا کہ ٹرانسمیٹر پر اسے اشارہ موصول ہوا، اپنے جن دو آدمیوں کو وہاں چھوڑ گیا تھا، انہی میں سے ایک نے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کیا تھا۔ کیپٹن شاد کے ماتحت نے اسے بتایا کہ لی مارکیٹ والی عمارت سے ایک بند وین میں دو غیر ملکی مجھے ہاتھ آئی لینڈ کی ایک عمارت میں لے آئے ہیں، اس نے میری جھلک دیکھ لی تھی، اس وقت مجھے سہارا دیئے عمارت سے وہ دونوں غیر ملکی باہر آ رہے تھے، کیپٹن شاد نے اپنے ماتحت کو حکم دیا کہ اس کے پہنچنے سے پہلے وہ کوئی قدم نہ اٹھائے۔ کیپٹن شاد کے لیے یہ اطلاع الجھا دینے والی تھی کہ اس بند وین میں مجھے ہاتھ آئی لینڈ لے جایا گیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر سیاہ کار میں لے جائی جانے والی بے ہوش لڑکی کون تھی؟ بہرحال وہ لی مارکیٹ والی عمارت پر چھاپہ مارنے کی بجائے فوری طور پر ہاتھ آئی لینڈ روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنے ماتحتوں سے تازہ ترین صورتحال معلوم کی، پھر اس عمارت پر ہلہ بول دیا، اسے بہ آسانی عمارت میں داخل نہیں ہونے دیا گیا، مگر مزاحمت کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا، کیپٹن شاد کی اطلاعات کے مطابق مزاحمت کے دوران میں دو غیر ملکی فائرنگ کی زد میں آئے تھے، مگر ہلاک نہیں ہوئے تھے۔ اس کے ماتحتوں میں سے ایک کی ران میں گولی لگی تھی، لیکن ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا، عمارت کے مکین اور مزاحمت کرنے والے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کیپٹن شاد نے شہریار کو بھی ایک کار میں بیٹھ کر فرار ہوتے دیکھا تھا جس پر فلیگ لگا ہوا تھا، اس نے شہریار کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ یہ اس کے بس میں تھا، وہ شہریار کی حیثیت اور عہدے سے واقف تھا، شہریار کو روکنے یا اس پر فائرنگ کرنے سے صورتحال کوئی خطرناک رخ اختیار کر سکتی تھی، میرے نزدیک کیپٹن شاد نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا تھا۔ میں ابھی اس فتنے کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔

ابھی بلقیس اور کیپٹن شاد کے بیانات ختم ہوئے تھے کہ انٹر کام گنگنا اٹھا، میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ریسیور اٹھا لیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی ابھی ٹرانسمیٹر پر اطلاع ملی ہے کہ سر کہ وہی سیاہ کار اس عمارت سے نکل کر کسی طرف روانہ ہوئی ہے۔ قیاس ہے کہ اس میں وہی بے ہوش لڑکی ہے جسے رات کو لی مارکیٹ والی عمارت سے اٹھایا گیا تھا۔ کار کا تعاقب

کیا جا رہا ہے'' دوسری جانب سے کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔

مجھے اب تک یہ موقع نہیں مل سکا تھا کہ کمانڈر نواز کو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر سکتی۔ میں نے مختصراً اسے تمام روداد سنا دی۔ اس روداد میں نرگس کا اغواء کیا جانا بھی شامل تھا۔

''پھر تو سر! اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب آپ کو لی مارکیٹ والی اس عمارت میں بے ہوش کر دیا گیا تھا، ان دوران میں مس نرگس ہی کو وہاں سے سیاہ کار میں لے جایا گیا ہو۔'' کمانڈر نواز نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''تم نے یقیناً صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کمانڈر!'' میں تائید میں بولی۔ ''قوی امکان ہے کہ اس وقت سیاہ کار میں نرگس ہی کو کہیں لے جایا جا رہا ہو، تم تعاقب کرنے والوں سے برابر رابطہ قائم رکھو کہ وہ کدھر جا رہے ہیں!''

''میں ان سے رابطہ کیے ہوئے ہوں سر!'' کمانڈر نے جواب دیا، پھر جلدی سے بولا۔ ''ایک منٹ سر!...... شاید ٹرانسمیٹر پر پھر کوئی پیغام ہے۔''

''مجھے فوراً اس پیغام سے مطلع کرو۔'' میں نے بے چینی سے کہا۔ ''میں رابطہ منقطع نہیں کر رہی۔''

''بہتر ہے سر!'' کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی، پھر شاید وہ ٹرانسمیٹر پر کسی سے بات کرنے لگا۔ آواز اتنی مدھم آ رہی تھی کہ میں واضح طور پر کچھ سمجھ نہ سکی، ٹرانسمیٹر انٹر کام سے کچھ دور تھا۔

شمالی افریقہ کے کسی ملک سے نرگس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ سمجھنا میرے لیے فی الحال مشکل ہی تھا، میں نے اسے عبدالحمید خان کی نگرانی پر مامور کیا تھا، میرا اندازہ یہی تھا کہ عبدالحمید خان کو نگرانی کا علم ہو گیا تھا، لیکن اس سلسلے میں ایک غیر ملکی سفارت خانے کا چکر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''سر! ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ سیاہ کار نیشنل ہائی وے کا رُخ کر رہی ہے۔'' کمانڈر نواز کی آواز انٹر کام پر سنائی دی۔ ''میں نے تعاقب جاری رکھنے کا حکم دیا ہے۔''

میں چند لمحے خاموش رہی، پھر بولی۔ ''اس سیاہ کار کو روک کر اس کی تلاشی لینا ضروری ہے، تم فوری طور پر ایک پارٹی اپنے آدمیوں کی مدد کے لیے روانہ کر دو میرا اندازہ ہے کہ شاید وہ لوگ کراچی سے باہر جا رہے ہیں، تعاقب کرنے والوں کو مطلع کر دو کہ جب تک ان کی مدد کے لیے ان کے دوسرے ساتھی پہنچ نہ جائیں، وہ سیاہ کار والوں کو نہ چھیڑیں اور کسی بھی قیمت پر انہیں نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں، میں ابھی یہیں ہوں، تم اس سلسلے میں مجھے رپورٹ دیتے رہو گے۔''

''بہتر ہے سر!'' کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔

میں نے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا، پھر بلقیس اور کیپٹن شاد سے مخاطب ہوئی۔ ''تم دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے ہو، اب آرام کرو جا کر۔''

''شکریہ سر!'' وہ دونوں بیک وقت بولے اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

نرگس کے معاملے نے مجھے الجھا دیا تھا، لیکن اس کے باوجود میں آج ہی کم از کم پولیس سے تو نمٹ ہی لینا چاہتی تھی، جن ای کے سلسلے میں میری گرفتاری کا وارنٹ کٹ چکا تھا، پولیس میری تلاش میں تھی۔ میں اب کھلے عام نہیں گھوم سکتی تھی، ابھی صرف صبح کے پونے سات ہی بجے تھے۔ مجھے کم از کم آدھے پون گھنٹے مزید انتظار کرنا تھا۔ صبح ہی صبح میں کسی کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی، پولیس سے نجات حاصل کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا

مجھے صرف ایک فون کرنا تھا، اس کے بعد سارا معاملہ خود بخود حل ہو جاتا۔

ساری رات ہنگامہ آرائی میں گزری تھی، اس لیے میرے ذہن پر نیند کا غبار سا تھا، مگر ابھی میں سونا نہیں چاہتی تھی، نیند کے غلبے کو کم کرنے کی غرض سے میں کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں گھس گئی میں نہا کر نکلی ہی تھی کہ انٹر کام کی بیل بجنے لگی، میں نے آگے بڑھ کر اس کا ریسیور اٹھا لیا۔ توقع کے مطابق دوسری جانب کمانڈر نواز ہی تھا۔

''سر! پانچ مسلح ارکان پر مشتمل تیز رفتار پارٹی نیشنل ہائی وے کی طرف روانہ کر دی گئی ہے۔'' کمانڈر نواز مجھے تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کرنے لگا۔ ''آپ کا اندازہ درست ہی تھا سر! سیاہ کار اب شہر کی حدود سے نکل چکی ہے، وہ غالباً کسی اور شہر کا رخ کر رہے ہیں۔ تعاقب کرنے والوں کی طرف سے رپورٹ ملی ہے کہ سیاہ کار والوں کو اپنے تعاقب کا علم ہو چکا ہے سیاہ کار سے ان پر فائرنگ بھی کی گئی تا کہ وہ تعاقب سے باز آجائیں مگر وہ دونوں تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔ فائرنگ سے انہیں یا ان کی جیپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا کیونکہ درمیانی فاصلہ کم نہیں تھا احتیاطاً انہوں نے درمیانی فاصلہ بڑھا دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے طویل سانس لیا، پھر بولی۔ ''ظاہر ہے کہ سیاہ کار والے اناڑی نہیں ہوں گے، مجھے توقع تھی کہ وہ اپنے تعاقب سے بے خبر نہیں رہیں گے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہمارا مقصد بہر حال یہ جاننا نہیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں! ہم تو انہیں روک کر کار کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ مزید کوئی پروگریس ہو تو بتانا!'' یہ ہدایت دے کر میں نے سلسلہ منقطع کیا، پھر کچن سے رابطہ قائم کیا، اب مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی، کچن میں بھی انٹر کام تھا، میں نے ناشتے کے لیے کہا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

جب تک میں ہلکے سے میک اپ سے فارغ ہوئی خانساماں ناشتا لے آیا، میں نے ناشتا کیا اور جب خانساماں برتن واپس لے کر چلا گیا تو ٹیلی فون اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا، اب تقریباً پونے آٹھ بج رہے تھے۔ اب میں فون کر سکتی تھی، جلد ہی لائن مل گئی، میں نے رابطہ قائم ہونے پر بہت مختصر گفتگو کی اور بتایا کہ میں کیا چاہتی ہوں! میں اس وقت ملک کی ایک اہم شخصیت سے ہمکلام تھی۔

''ٹھیک ہے۔ یہ تو ابھی بندوبست ہو جائے گا مگر تم ہو کہاں اتنے دن سے؟'' دوسری طرف سے میری بات سننے کے بعد کہا گیا۔

''جلد ہی کچھ سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے، میں ایک سازش کی بو سونگھ رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کس قسم کی سازش؟'' پوچھا گیا۔

''اس سلسلے میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، پھر بولی۔ ''ممکن ہے مجھے ہز ایکسی لینسی پریذیڈنٹ سے ملنے کی ضرورت بھی پیش آئے اور محترم صدر سے میری ملاقات کا بندوبست ظاہر ہے کہ آپ ہی کو کرنا پڑے گا۔''

''تو معاملہ اتنا اہم ہے! تم نے مجھے تجسس میں مبتلا کر دیا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم یہاں آ کر مجھ سے مل لو؟ فی الحال میرا کراچی آنا تو مشکل ہے۔''

''کوشش کروں گی کہ جلد آپ سے مل سکوں، مگر قطعی طور پر ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ کم از کم اگلے ہفتے تک

میرا بھی کراچی میں رہنا ضروری ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''اچھا خدا حافظ!'' یہ کہتے ہی میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا کیونکہ مجھے علم تھا، اتنی جلدی وہ شخصیت میری جان نہیں چھوڑے گی۔ میں نے بات ہی ایسی کی تھی، ایسا میں دانستہ کیا تھا تا کہ وہ شخصیت ذہنی طور پر پہلے ہی سے غیر متوقع حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہے۔

میں نے یہ غلط نہیں کہا تھا کہ مجھے صدر مملکت سے ملاقات کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ صدر مملکت کو میں ان کے ارد گرد موجود افراد کی خفیہ سرگرمیوں سے آگاہ کرنا چاہتی تھی کیونکہ شہریار ایسے لوگ کسی بھی وقت ان کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے تھے، ایسا میں اسی وقت کر سکتی تھی جب میرے پاس واضح اور ناقابل تردید ثبوت ہوتے۔

کمانڈر نواز کی جانب سے مجھے نئی رپورٹ ملنے کے لیے کم از کم آدھے گھنٹے مزید منتظر رہنا پڑا۔ تازہ ترین رپورٹ میرے لئے انتہائی حیران کن اور غیر متوقع تھی۔ رپورٹ کے مطابق اس سیاہ کار کو نیشنل ہائی وے پر گھیر کر رکنے کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا۔ سیاہ کار میں ڈرائیور کے سوا چڑیا کا بچہ بھی نہیں ملا تھا۔ سیاہ کار کے ڈرائیور کو بے ہوش کر کے اور کار کو سڑک کے ایک کنارے کھڑا کرنے کے بعد کمانڈر نواز کے آدمی واپس ہیڈ کوارٹر پہنچ رہے تھے۔

میرے نزدیک یہ سب کچھ بے معنی نہیں تھا، یقیناً اس کا کوئی مقصد تھا، اس عمارت کی نگرانی کرنے والوں کو اپنے پیچھے لگا کر وہاں سے ہٹالے جانے کا مقصد صرف ایک ہی ہو سکتا تھا، اس دوران میں نرگس کو وہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا ہو گا، ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ کہیں نرگس کو دوبارہ تو لی مارکیٹ والی عمارت میں نہیں پہنچا دیا گیا؟ ایسا ممکن تو تھا لیکن یقینی نہیں، پھر بھی میں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا، اس کے علاوہ مجھے اس لڑکی کا خیال بھی آیا جسے میں نے رات کو اس عمارت میں دیکھا تھا۔ وہ مظلوم لڑکی اب تک یقیناً عبدالحمید خان کے ظلم سے نہیں بچ سکی ہو گی، ضروری نہیں تھا کہ وہ اب بھی اسی عمارت میں ہوتی، مطلب براری کے بعد اس کا وہاں رکھنا بے سود ہی تھا، نا معلوم وہ غریب کون تھی؟ لیکن یہ ظاہر تھا کہ اسے کہیں سے اغواء ہی کیا گیا ہو گا۔ عبدالحمید خان انتہائی گھناؤنے کردار کا مالک ثابت ہوا تھا، پہلے میری رائے اس کے بارے میں ایسی نہیں تھی، وہ ایسے لوگوں میں سے تھا جنکے چہرے ان کے باطن کی غمازی نہیں کرتے۔ اسی سے وہ فائدہ اٹھاتا تھا اور بگلا بھگت بنا رہتا تھا، کچھ سوچتے ہوئے میں نے انٹر کام کا ریسیور اٹھا لیا اور پھر سات نمبر کا بٹن دبا دیا۔

دوسری جانب سے کمانڈر نواز نے ریسیور اٹھا لیا تو میں نے کہا۔ ''لی مارکیٹ والی عمارت پر چھاپہ مارا جانا ضروری ہے، یہ کام فوراً ہونا چاہیے!''

''آپ غالباً یہ سوچ رہی ہیں سر کہ ممکن ہے مس نرگس کو دوبارہ وہاں پہنچا دیا گیا ہو!''

''تم ٹھیک سمجھے۔''

''میں ابھی اس کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔''

''اسی کے ساتھ اس عمارت کے بارے میں دیگر معلومات بھی ضروری ہیں اور سنو، اب میں جا رہی ہوں، میرے لیے ایک گاڑی کا بندوبست بھی کر دو! اور وہاں میری کار بھی لی مارکیٹ والی عمارت کے آس پاس ہونا

چاہیے، اس سلسلے میں بھی اپنے آدمیوں کو ہدایات دے دینا، کار مل جائے تو اسے میری کوٹھی پہنچا دیا جائے، میں تم سے کچھ دیر بعد خود فون پر رابطہ قائم کر کے رپورٹ لے لوں گی!"

"بہتر ہے سر!" کمانڈر نواز کی مؤدب آواز سنائی دی۔

"میں آپ کے لیے کار کا بندوبست کیے دیتا ہوں، بس چند منٹ لگیں گے۔"

پھر میں نے بغیر کچھ کہے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ نرگس کی گمشدگی نے مجھے ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد میں کمرے سے نکلی اور پھر کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میری کار ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے نکل رہی تھی، یہ سرخ اسپورٹس جس کی چابی اگنیشن میں لگی ہوئی ملی تھی، اس کا رجسٹریشن بھی میرے نام پر تھا۔

اب میں جلد از جلد پولیس ہیڈ آفس پہنچ جانا چاہتی تھی، میں بہر حال معمولی سماجی حیثیت کی مالک نہیں تھی، میری گرفتاری کا وارنٹ پولیس ہیڈ آفس کے علم میں لائے بغیر جاری نہیں کیا گیا ہوگا، اس کا مجھے پورا یقین تھا، روانگی سے قبل میں نے ایک اور فون کیا تھا، یہ فون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

پولیس ہیڈ آفس پہنچ کر میں بے دھڑک متعلقہ ڈی ایس پی کے کمرے میں داخل ہوتی چلی گئی، دروازے کے باہر کھڑا ہوا اردلی حیرت سے منہ پھاڑ کر ہی رہ گیا تھا، میرا انداز ہی ایسا تھا، اسے یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ مجھے اندر جانے سے روک دے۔

میں اندر پہنچی تو بڑی سی میز کے پیچھے ایک باوردی شخص کو بیٹھے دیکھا جو میرے قدموں کی چاپ سن کر چونک اٹھا تھا اور اسی کے ساتھ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

"ہیلو مسٹر ڈی ایس پی!" میں نے بے تکلفی سے مسکرا کر اسے مخاطب کیا اور پھر اس کی میز کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

"ہو آر یو؟" ڈی ایس پی ناگوار اور سخت لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم تھوڑی بہت اردو بھی بول ہی لیتے ہو گے!" میرا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"کیا مطلب ہے اس سے تمہارا؟" وہ مزید برہم ہو گیا۔ "کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تم اس وقت پولیس ہیڈ آفس میں ہو اور......"

"یہ کہ پولیس کے ایک ذمہ دار افسر سے مخاطب ہوں!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"اسٹینڈ اپ!" وہ پھر انگریزی میں دہاڑا۔ اسے میری یہ بے تکلفی پسند نہیں آئی تھی۔

"تم پھر اپنی فادر ٹنگ بولنے لگے!" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، میرا لہجہ بے حد پرسکون تھا۔

پھر تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کے اوپر زور سے ہاتھ مارا اور اسی کے ساتھ وہ "شٹ اپ" کہنا نہیں بھولا تھا۔

میں سمجھ رہی تھی کہ اب تک اسے میرے بارے میں آگاہ کیا جا چکا ہوگا یہ کہ جب اسے میرا نام معلوم ہوگا تو

ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا، یہی سوچ کر اس کے اردلی کے اندر داخل ہونے سے پہلے میں بول اٹھی۔

"ویسے میں اپنا تعارف کرانا بھول گئی، مجھے عذرا خان کہتے ہیں!"

"عذرا خان!" وہ چونک اٹھا پھر اس نے دانت پیس کر کہا۔ "اچھا تو تم وہی مفرور مجرمہ ہو جو پولیس کو جل دے کر نکل گئی تھیں، تم تو ہمیں ایک چینی کے قتل کے سلسلے میں مطلوب ہو!"

اب چونک اٹھنے کی باری میری تھی، اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ابھی اعلیٰ حکام کی طرف سے اسے میرے متعلق ہدایات نہیں ملی تھیں۔

اسی دوران میں اس کا اردلی، کمرے میں داخل ہوا۔

ڈی ایس پی نے اسے حکم دیا۔ "سب انسپکٹر قدیر بیگ کو فوراً بلاؤ!"

اردلی چلا گیا تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر مجھے گھورنے لگا، یوں جیسے نظروں ہی نظروں میں جلا کر خاک کر دے گا۔ مجھے اس کے اس انداز پر ہنسی آ گئی۔ وہ بالکل چغد معلوم ہو رہا تھا۔

"دانت بند کروا اپنے! ابھی جب ہتھکڑی لگے گی تو سارے کس بل نکل جائیں گے! شاید کبھی تمہارا واسطہ نہیں پڑا پولیس سے!" وہ غرایا۔

میں اُسے تپانے کے لیے اطمینان سے بیٹھی مسکراتی رہی، پھر ذرا توقف سے بولی۔ "ویسے ابھی تمہارے منہ سے دودھ کی بو آ رہی ہے۔"

"بکواس بند کرو اپنی! ورنہ......" اُس نے اس دھمکی آمیز انداز میں ٹیبل پر ایک طرف رکھا ہوا بیت اٹھا لیا۔

"شرم تو نہیں آئے گی تمہیں ایک عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے؟"

اس نے غصے میں بیت اٹھا کر میز پر مارا اور چیخا "چپ رہو!"

مجھے اس کی حالت پر رحم آ گیا اور پھر سب انسپکٹر کے آنے تک خاموش رہی، سب انسپکٹر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنے افسر کو سیلوٹ کیا، پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس طرح اچھل پڑا جیسے کوئی خلاف توقع منظر دیکھ لیا ہو۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا، یہ وہی سب انسپکٹر تھا جو گزشتہ روز مجھے گرفتار کرنے میری کوٹھی پہنچا تھا۔

"تم پہچانتے ہو اسے!" ڈی ایس پی نے میری طرف بیت اٹھا کر بے ادبی سے کہا۔ اب وہ بے ادبی پر اتر آیا۔

"یس سر!" سب انسپکٹر جلدی سے بولا۔ "یہ وہی مفرور مجرمہ عذرا خان ہے جو ایک چینی کے قتل......"

"تو پھر احمقوں کی طرح میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو!" ڈی ایس پی منہ بگاڑ کر کہنے لگا۔ "ڈال دو ہتھکڑی اس کے اور لے جا کر حوالات میں بند کر دو!"

"یس...... یس سر!" سب انسپکٹر گڑبڑا گیا کیونکہ اس کے پاس مجھے ہتھکڑیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ آتے ہوئے اسے یقیناً اسے یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ ڈی ایس پی کسی کو اسے ہتھکڑیاں لگانے کے لیے کہے گا، اس نے ہکلاتے ہوئے ہتھکڑیاں لانے کی اجازت طلب کی۔

"جلدی کرو!" ڈی ایس پی نے اسے ڈانٹا۔ "آج ہی مجھے اس کا اقبالی بیان چاہیے! اور شاید تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مجرموں کی زبان کس طرح کھلوائی جاتی ہے!"

آخری الفاظ سب انسپکٹر کی بجائے ڈی ایس پی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے، میں صرف مسکرا کر رہ گئی، مگر اندر سے مجھے وحشت سی ہونے لگی تھی، معاملہ کچھ اور ہی رخ اختیار کر گیا تھا، ڈی ایس پی مجھ سے انتقام لینے کے در پے نظر آرہا تھا، سب انسپکٹر کمرے سے ہتھکڑیاں لینے کے لیے جا چکا تھا۔

معاً اردلی اندر داخل ہوا اور ڈی ایس پی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں بولا۔ ''سر! بیگم افتخار رانا آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

ڈی ایس پی ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے تھے۔ اس کے برعکس مجھے اب قدرے اطمینان ہوا تھا۔ آپریشن سیل کے ہیڈ کوارٹر سے چلتے وقت میں نے بیگم افتخار رانا ہی کو فون کیا تھا۔ ڈی ایس پی خود اٹھ کر باہر تک گیا اور بیگم افتخار رانا کو اپنے ساتھ لیے کمرے میں آیا۔

''معاف کرنا عذرا ڈارلنگ، مجھے یہاں پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی۔'' بیگم افتخار رانا نے مجھے دیکھتے ہی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ آئی۔ چالیس سال کی عمر سے تجاوز کرنے کے باوجود ابھی اس کا حسن ماند نہیں پڑا تھا۔ وہ ان عورتوں میں تھی جو اپنے جسم سے غافل نہیں ہوتیں۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں مسکرا کر بولی۔ ''آپ آگئیں، یہی میرے لیے بہت ہے۔''

''کیا آپ انہیں جانتی ہیں بیگم صاحبہ؟'' ڈی ایس پی حیرت سے بولا، اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں! یہ میری چھوٹی بہن ہے۔'' بیگم افتخار رانا نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ مجھے وہ اپنی چھوٹی بہن ہی سمجھتی تھی۔

بیگم افتخار رانا کا شمار وی آئی پیز میں ہوتا تھا، شہر کے اعلیٰ حلقوں میں اس کی بڑی عزت تھی، وہ ایک سابق وزیر کی بیوہ تھی اور اپنے شوہر ہی کی طرح اسے بھی سیاست سے گہری دلچسپی تھی۔ اب وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

''ہاں اب بتاؤ عذرا، کیا واقعی مجھے تمہاری ضمانت لینا ہے؟'' بیگم افتخار رانا بولی۔

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی ڈی ایس پی بول اٹھا۔

''لیکن...... لیکن بیگم صاحبہ یہ ایک قتل کا معاملہ ہے اور پولیس کو شبہ ہے کہ قتل انہی کے ہاتھوں ہوا ہے۔''

بیگم افتخار رانا کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔ میں نے اسے فون پر یہ نہیں بتایا تھا کہ کس سلسلے میں میری ضمانت لینا ہے!

''کوئی اور معاملہ ہوتا بیگم صاحبہ تو یقیناً میں آپ کی ضمانت قبول کر لیتا، لیکن یہ معاملہ مختلف ہے اور...... پھر خود ڈی آئی جی صاحب کے احکام ہیں کہ مجرمہ کو جلد از جلد گرفتار کر کے اس سے اقبال جرم کرایا جائے۔''

بیگم افتخار رانا کو حیرت زدہ خاموش دیکھ کر ڈی ایس پی مزید بولا۔ خاموشی سے اس کی ہمت اور بڑھ گئی تھی۔

ابھی بیگم افتخار رانا حیرت زدہ ہی تھی کہ سب انسپکٹر ایک سپاہی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا، سپاہی کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں نظر آرہی تھیں، میرے سلسلے میں براہ راست ڈی آئی جی نے احکام دیئے تھے، یہ بات میرے لیے قطعی حیران کن نہیں تھی۔ عبدالحمید خان ایسے بارسوخ و بااثر شخص کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا میں سمجھ گئی کہ ڈی ایس پی اپنی نوکری کے تحفظ کی خاطر بھی لازماً مجھے گرفتار کر کے رہے گا۔

سب انسپکٹر شاید نئی صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور ڈی ایس پی کے حکم کا منتظر تھا۔

''معاف کیجئے گا بیگم صاحبہ! میں مجبور ہوں۔'' بالآخر ڈی ایس پی بول ہی اٹھا، پھر وہ فوراً ہی سب انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔ ''ہتھکڑیاں ڈال دو ان کے!''

''ٹھہرو!'' بیگم افتخار رانا کو جیسے ہوش آگیا۔ ''میں ڈی آئی جی صاحب سے بات کرتی ہوں، اس وقت عذرا کو......''

''ڈی آئی جی صاحب اس وقت اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔'' معاً سب انسپکٹر بول اٹھا۔ ''میں نے انہیں کچھ دیر پہلے جیپ میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔''

معلوم نہیں سب انسپکٹر جھوٹ بول رہا تھا، یا سچ لیکن ردعمل میں بیگم افتخار رانا کے چہرے سے مایوسی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ اپنی جگہ میں بھی فکرمند تھی، ایسی صورت میں یہی کہا جا سکتا تھا کہ فوری طور پر دارالحکومت کا کراچی سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا یا پھر آئی جی سندھ سے بات نہیں ہو سکی، مجھے اگر یہ خدشہ ہوتا تو مزید وقت گزاری کے بعد پولیس ہیڈ آفس کا رخ کرتی، لیکن اب موجودہ صورتحال میں کچھ نہیں ہو سکتا تھا، ڈی ایس پی پہلے ہی میری طرف سے بدظن ہو چکا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ سب انسپکٹر مجھے ہتھکڑیاں پہنانے میری طرف بڑھتا، معاً ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی اور ڈی ایس پی نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری جانب سے رابطہ قائم ہوتے ہی میں نے اس کے چہرے کی رنگت بدلتے محسوس کی۔ پھر وہ ''یس سر، یس سر'' کرنے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ یقیناً کوئی اعلیٰ افسر دوسری طرف سے بول رہا ہے۔

''جی سر...... جی سر!...... جی بہتر ہے...... جی...... جی؟...... جی وہ بیگم افتخار رانا ان کی ضمانت...... جی سر!''

اس کے الفاظ سن کر میں فوراً ہی سمجھ گئی کہ مجھے جس فون کا انتظار تھا، وہ اب آیا ہے، پھر چند ہی لمحے بعد اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔

''بیگم صاحبہ! آپ ان کی ضمانت لے سکتی ہیں۔'' ڈی ایس پی، بیگم افتخار رانا سے مخاطب ہوا۔

''جب تک اوپر سے تم لوگوں کی چاند پر ڈنڈا نہ پڑے، اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔'' میں بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''وہ جی...... ہم تو حکم کے بندے ہیں۔'' ڈی ایس پی بے غیرتی سے مسکرانے لگا۔ اب اس کا لہجہ قطعی بدل چکا تھا۔ معلوم نہیں کہ ان لوگوں میں ضمیر نام کی کوئی شے باقی بھی رہ جاتی ہے یا نہیں! میرا سخت فقرہ وہ بڑی ڈھٹائی سے پی گیا تھا، مگر سب انسپکٹر پر اس نے اپنا غصہ ضرور اتار دیا تھا، وہ سب انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے غرایا تھا۔ ''اب کیوں کھڑے ہو یہاں! دفع ہو جاؤ! سن نہیں رہے کیا کہ میں، بیگم صاحبہ کی ضمانت لینے پر راضی ہو گیا ہوں! کچھ سمجھے؟''

''یس...... یس سر!'' سب انسپکٹر گڑبڑا گیا اور پھر اس نے وہاں سے ٹل جانے ہی میں اپنی عافیت محسوس کی، اس کے ساتھ سپاہی بھی کھسک لیا تھا، جسے وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

اس کے بعد ضروری لکھا پڑھی میں بہت کم وقت لگا، میں بیگم افتخار رانا کے ساتھ پولیس ہیڈ آفس کی عمارت

سے باہر نکل آئی۔

''ملتی رہا کرونا!'' بیگم افتخار رانا نے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو کبھی کبھی عید کا چاند ہو جاتی ہو!''

''بس فرصت ملتے ہی آؤں گی کسی دن۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''آنے سے پہلے فون ضرور کر دینا تاکہ کوئی اور انگیج منٹ ہو تو میں اسے کینسل کر دوں ویسے تم سے کم ہی امید ہے مجھے۔'' بیگم افتخار رانا مسکرا کر بولی۔

''نہیں نہیں، ضرور آؤں گی اور آنے سے پہلے فون بھی کر لوں گی۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

''اچھا خدا حافظ عذرا!'' بیگم افتخار رانا اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

''خدا حافظ!'' میں نے بھی جواباً کہا اور اس طرف بڑھ گئی جہاں میری اپنی اسپورٹس کھڑی تھی۔

پولیس ہیڈ آفس سے میں نے اپنی کوٹھی کا رخ کیا، میں اب سب سے پہلے چند گھنٹے آرام کر لینا چاہتی تھی، اپنی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے بھی میں پوری طرح چوکنا تھی، میں اچھی طرح جانتی تھی کہ جن لوگوں نے میرے حصول کی خاطر لاکھوں ڈالر خرچ کیے ہیں، وہ مجھے آسانی سے نظر انداز نہیں کریں گے، ان کے اثر و رسوخ سے بھی مجھے پوری آگہی تھی، شہر یار ایسا شخص ان کا آلہ کار تھا جو صدر مملکت کے قریبی لوگوں میں شمار ہوتا تھا، بہر حال یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں تھا جسے میں سرسری لیتی، میرے لیے قدم قدم پر دشواریاں پیدا کی جا سکتی تھیں، میں ایک جال سے نکلتی تو میرے لیے دوسرا جال پھیلا دیا جاتا۔ میرے دشمنوں کے ذرائع بہت وسیع تھے اور ظاہر ہے کہ وہ یہ سب کچھ میرے ملک کے مفاد میں نہیں کر رہے تھے۔

شہر کی پر ہجوم شاہراہوں سے گزرنے کے بعد میں اور زیادہ محتاط ہو گئی، پھر میرا شک درست ہی نکلا، ایک نیلی کار میرے پیچھے لگ چکی تھی، میرے لیے چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ نیلی کار کو ڈرائیو کرنے والی ایک عورت تھی، میں نے کار کی رفتار کم کر کے عقبی آئینے میں بغور اس کا چہرہ دیکھا اور چونک اٹھی، وہ عورت میرے لیے اجنبی نہیں تھی، اس کا نام ریٹا تھا اور عموماً وہ شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں دیکھی جاتی تھی، اس کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ اعلیٰ طبقے کے ذوق حسن کی آسودگی کا سامان فراہم کرتی تھی، ایک خیال یہ بھی تھا کہ وہ اسمگلروں کے کسی بڑے گروہ سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اب تک پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکی تھی، اس کا سبب غالباً اعلیٰ طبقے میں اس کا اثر و رسوخ بھی تھا، وہ اینگلو انڈین ہونے کے باوجود اپنے چھریرے اور سفید چمڑی کی وجہ سے غیر ملکی ہی لگتی تھی، وہ خود بھی کم خوبصورت نہیں تھی۔ میں کئی بار اسے قریب سے دیکھ چکی تھی، اس کا جسم متناسب، نقوش تیکھے اور قد لمبا تھا۔

ریٹا میرا ہی تعاقب کر رہی ہے، اس یقین کے لیے میں اپنی اسپورٹس کو کچھ دیر بے مقصد ادھر ادھر دوڑاتی رہی، وہ بدستور میرے پیچھے لگی رہی، یہ کوئی راز میں رکھنے والی بات نہیں تھی کہ میں اپنی کوٹھی جا رہی ہوں، اس لیے تعاقب کے باوجود مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی، ہاں میرا ذہن ضرور قدرے الجھ گیا تھا، میں نے اب اپنی اسپورٹس کا رخ ڈیفنس کی طرف کر دیا تھا، ریٹا نے میری کوٹھی تک تعاقب جاری رکھا اور جب میں اپنی کار کوٹھی کے پھاٹک سے اندر لے گئی تو وہ سیدھی نکل گئی۔

میرے ملازمین میری طرف سے فکر مند تھے، مجھے کوٹھی میں واپس آتے دیکھ کر ان کے ویران چہروں پر رونق آ گئی، مگر کسی نے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں کی، میری ملازمہ خاص نے بتایا کہ صبح سے کئی مرتبہ ملک دلاور مجھے فون کر چکا ہے۔ اس نے میرے لیے پیغام چھوڑا تھا کہ جیسے ہی میں کوٹھی پہنچوں، فون پر اس سے رابطہ قائم کروں۔

سونے سے قبل کمانڈر نواز کو فون کر کے رپورٹ لینے کا فیصلہ میں پہلے ہی کر چکی تھی، میں لی مارکیٹ والی عمارت کے بارے میں جاننا چاہتی تھی کہ وہاں چھاپہ مارے جانے کا کیا نتیجہ برآمد ہوا! اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر میں نے ملک دلاور کو فون کرنے سے پہلے کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کیا۔

میں نے رابطہ ملتے ہی وقت ضائع کیے بغیر کہا ''رپورٹ پلیز!''

''یس سر!'' کمانڈر نواز ادب سے بولا، پھر بتانے لگا۔ ''سر! وہ عمارت خالی پڑی تھی، وہاں چھاپے کے بعد کچھ نہیں مل سکا، ہاں ایک کمرے سے کسی لڑکی کا پرس ضرور ملا ہے، پرس کی تلاشی لینے پر لڑکی کا نام اور پتا معلوم ہو گیا ہے۔''

''تم نے پتے پر تصدیق کی؟'' میرے ذہن میں اس لڑکی کا خیال آ گیا جس پر عبدالحمید خان تشدد کر رہا تھا، میرے خیال میں یہ وہی لڑکی ہو سکتی تھی۔

''جی ہاں سر!'' کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ ''وہ لڑکی وزارت دفاع کے ایک افسر کی بیٹی ہے۔ اس کا نام نرجس ہے، کل شام سے وہ غائب ہے۔ پی ای سی ایچ ایس کے تھانے میں رات گئے اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کرائی گئی ہے۔ اب تک لڑکی کا سراغ نہیں ملا، پولیس کا قیاس ہے کہ کالج سے واپسی کے وقت اسے اغواء کیا گیا ہے اس افسر کا ڈرائیور اسے کالج سے لینے گاڑی لے کر وہاں وقت مقررہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ کچھ دیر پہلے نرجس ایک اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے جا چکی ہے۔ پولیس سرگرمی سے تفتیش کر رہی ہے کیونکہ یہ معاملہ ایک اہم سرکاری افسر کی لڑکی کے اغواء کا ہے۔''

''پولیس نے ان لڑکیوں کے بیانات لیے جنھوں نے نرجس کو کسی اور کار میں بیٹھ کر کالج کے گیٹ سے جاتے دیکھا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔ لڑکیوں کا کہنا ہے کہ وہ کوئی نوجوان تھا، جسے دو ایک بار پہلے بھی نرجس کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ لڑکیوں کا بیان ہے کہ نرجس بخوشی نوجوان کی کار میں بیٹھ کر گئی تھی۔ اس کا حلیہ بھی لڑکیوں نے بتایا ہے، مگر کار نمبر ان کے ذہن میں نہیں۔''

وزارت دفاع کے اس افسر کا نام بتاؤ!'' میں نے کہا ''سمیع اللہ سر!'' کمانڈر نواز نے جواب دیا۔

''معلوم کرو کہ وہ کیا نظریات رکھتا ہے! یعنی اس کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف ہے یا دائیں بازو کی طرف؟ اور یہ کہ عبدالحمید خان سے اس کے تعلقات کیسے رہے ہیں اب تک؟''

''بہتر سر! اور کچھ؟''

''عبدالحمید خان اور جب تک شہر یار کراچی میں ہیں، ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھو!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کمانڈر نواز کو ہدایت دی، پھر مزید کہا۔ ''جرمنی سے سائنس دانوں کا جو وفد ان دنوں پاکستان کے دورے

پر آیا ہوا ہے، اس میں شیفرڈ اور شیپرڈ کی نگرانی بھی کراؤ۔ رپورٹ میں خود لیتی رہوں گی۔" اسی کے ساتھ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

نرجس کے اغواء میں بھی مجھے کوئی سیاسی مصلحت نظر آ رہی تھی، مجھے اس بات نے چونکا دیا تھا کہ وہ وزارت دفاع کے ایک اہم افسر کی بیٹی تھی۔ عیاشی کے لیے یہ قطعی ضروری نہیں تھا کہ عبدالحمید خان اسے ہی اغواء کرتا، یہی سوچتے ہوئے میں، ملک دلاور کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

سلسلہ ملتے ہی ملک دلاور کی مضطرب آواز سنائی دی۔ "آپ کہاں تھیں؟ معلوم ہوا ہے کہ آپ رات کو بھی اپنی کوٹھی پر نہیں تھیں!"

"تو اس میں تمہارے لیے فکر مند ہونے کی کیا بات ہے؟"

"آپ ایسی جوان جہان دوشیزاؤں کو یوں گھر سے باہر راتیں نہیں گزارنا چاہئیں۔ زمانہ بہت خراب ہے خاتون!" وہ شرارت پر اتر آیا۔ اضطراب اب اس کے لہجے سے غائب ہو چکا تھا۔

"کیا تم نے مجھے یہی نصیحت کرنے کے لیے بور کیا ہے؟" میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ "اگر تمہاری بکواس جاری رہی تو میں فون بند کر دوں گی!"

"ارے ارے سنیں تو سہی!" وہ جلدی سے بولا۔

"دراصل میں نے آپ کو نرگس کے بارے میں فون کیا تھا، صبح سے اس کے بھائی نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے، وہ بھی رات کو گھر نہیں پہنچی، عموماً جب اسے کسی رات گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے تو وہ پہلے سے مطلع کر دیتی ہے مگر اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا، معلوم نہیں وہ کونسی بری گھڑی تھی جب میں نے اسے آپ کی فرم میں ملازم رکھوایا تھا، اسی کے نتیجے میں اکثر اس کے گھر والے میری ٹانگ کھینچتے رہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یہ کیسی نوکری ہے جو راتوں کو بھی پیچھا نہیں چھوڑتی! اب آپ ہی بتائیں، کیا کہوں میں ان لوگوں سے؟ کیا جواب دوں انہیں؟ اگر اس کا بڑا بھائی فالج کا شکار نہ ہوتا تو شاید نرگس کو نوکری کی ضرورت پیش نہ آتی، بہرحال مجھے اس کے بارے میں بتائیں، کیا کہوں میں اس کے گھر والوں سے؟"

"ختم ہو گئی تمہاری تقریر!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ دراصل اس طرح میں کچھ دیر سوچنے کی مہلت چاہتی تھی کہ دلاور کو کیا جواب دوں؟ اسے مطمئن کرنا آسان نہیں، یہ میں اچھی طرح جانتی تھی، وہ بال کی کھال نکالنے کا عادی تھا۔

"جی ہاں میری تقریر ختم ہو گئی، اب آپ مائک پر تشریف لا کر اپنے واحد سامع کی سمع خراشی فرمایئے!" وہ حسب عادت پھر شوخی دکھانے لگا۔

اس دوران میں مجھے ایک بہانہ سوجھ چکا تھا، میں نے کہا۔ "نرگس کو میں نے ایک ضروری کام سے حیدر آباد بھیجا ہے اور وہ دو ایک دن میں لوٹ آئے گی۔"

"ممکن ہے آپ کی اس فلفی سے نرگس کے گھر والے مطمئن ہو جائیں خاتون، مگر ملک دلاور کو آپ چکر نہیں دے سکتیں۔"

"کیا مطلب!" میں بگڑ کر بولی۔ "تو کیا تمہارے خیال میں جھوٹ بول رہی ہوں میں؟"

"ایک سو ایک فیصد!" اس نے پر یقین لہجے میں کہا۔ "جب آپ مجھ سے جھوٹ بولتی ہیں کبھی تو میری بائیں پسلی پھڑکنے لگتی ہے اور اس وقت بھی وہ مستقلاً پھڑک رہی ہے، اس لیے کم از کم مجھے تو بتا ہی دیں کہ اصل بات کیا ہے؟ آپ کے سرِ عزیز کی قسم یہ بات صیغہ راز میں رہے گی۔"

میں سمجھ گئی کہ اسے مطمئن کرنا مشکل ہے چند لمحے میں نے سوچا کہ اگر اسے نرگس کے اغواء کے بارے میں بتا دوں تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اس طرح وہ بھی میرے ساتھ ہو جائے گا، میں اس کے وسائل اور ذہانت سے بھی فائدہ اٹھا سکوں گی۔ یہی سوچ کر میں نے اس سے پوچھا۔ "تم جلد سے جلد کتنی دیر میں میری کوٹھی تک پہنچ سکتے ہو؟"

"یا حیرت!" اس نے نعرہ لگایا، پھر بولا۔ "یہ آج آپ اتنی جلدی گھاٹ پر کیسے آ گئیں!"

"اب تم بکواس ہی کرتے رہو گے یا میرے سوال کا جواب دو گے!"

"اجی حضور! یہ خادم تو سر کے بل چلتا ہوا آئے گا۔"

"اگر تم واقعی سر کے بل چلتے ہوئے یہاں تک پہنچے تو تماشا بننے کے علاوہ اس وقت تک میں اپنی ملازمہ کو یہ ہدایت دے کر سو چکی ہوں گی کہ وہ تمہیں ٹرخا دے!" میں نے اس پر چوٹ کی۔

"آپ تو محاورہ بھی نہیں سمجھتیں خاتون! یہ تو عاشقوں کی زبان ہے جو ہمیشہ محبوب کے کوچے تک شربت دیدار پینے کے لیے اسی طرح آتے ہیں۔"

"تو پھر تم گلی میں کھڑے ہوئے شربت دیدار پینے کا انتظار کرتے رہنا اور میں اپنی خواب گاہ میں سوتی رہوں گی! میں سلسلہ منقطع کر رہی ہوں۔" میں نے دھمکی دی۔

"ارے نہیں! ابھی میں نے آپ کے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں!"

"تو پھر بک بھی چکو نا!" میں ناگواری سے بولی۔ "کمبل ہو جاتے ہو خواہ مخواہ!"

"دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

اس کا جواب سنتے ہی میں نے ریسیور رکھ دیا اور پھر لباس تبدیل کرنے لگی، اگر ملک دلاور سے ملنا ضروری نہ ہوتا تو میں لباس تبدیل کرتے ہی سو جاتی، میری آنکھیں جل رہی تھیں اور جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

ملک دلاور کا انتظار مجھے گراں گزر رہا تھا، لیکن اس نے دیر نہیں لگائی، دس منٹ پورے ہونے سے پہلے ہی ملازمہ نے مجھے اس کے آ جانے کی اطلاع دی، میں نے اسے خواب گاہ ہی میں بلوا لیا، اس وقت تکلف میرے بس میں نہیں تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اسے براہ راست اپنی خوابگاہ میں بلوا لیا تھا، وہ اسی لیے آتے ہی چہکنے لگا۔ "زہے نصیب کہ اس خادم کو آپ کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی، اب کچھ کچھ اُمید بندھتی ہے کہ خواب گاہ کے بعد آپ کے خوابوں میں بھی یہ خادم......"

میں نے اس کی چہکاری میں بریک لگانے کے لیے فوراً ہی ایک ایسی بات کہہ دی کہ وہ ہکا بکا رہ گیا، میں نے کہا۔ "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نرگس کو اغواء کیا جا چکا ہے!"

"نہیں!...... آپ مذاق کر رہی ہیں۔" وہ میرے سامنے ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر ایک دم فکرمندی کے آثار نظر آنے لگے تھے اور اس کی وجہ مجھے معلوم تھی۔ نرگس اس کے قریبی عزیزوں میں سے

تھی۔

''میں مذاق کر رہی ہوتی یا جھوٹ بولتی تو تمہاری بائیں پسلی پھڑکنے لگتی جو یقیناً اس وقت نہیں پھڑک رہی۔ غلط کہہ رہی ہوں؟'' میں نے اس کی بدحواسی دیکھ کر اسے چھیڑا۔ ایسے مواقع مجھے کم ہی ملتے تھے۔

''لیکن کب؟......اسے کب اغواء کیا گیا؟......اور کیوں'' وہ قدرے بدحواس سا نظر آنے لگا۔

میں نے مختصراً اسے حالات و واقعات سے آگاہ کر دیا، مگر اپنا ذکر گول کر گئی اور یہ بھی کہ وہ عبدالحمید خان کی نگرانی کر رہی تھی، ظاہر ہے کہ میں نے اس سے بہت سی باتیں چھپائی تھیں، اس لیے میرے بیان میں جگہ جگہ جھول تھے جو دلاور ایسے شخص کی نظر سے نہ بچ سکے۔

''سوال یہ ہے کہ وہ وہاں کس لیے گئی تھی؟ جہاں تک میری معلومات ہیں، اس علاقے میں تو کوئی عزیز رشتے دار بھی نہیں رہتا ہمارا!'' دلاور پرفکر لہجے میں کہنے لگا۔

''ممکن ہے اس کی کوئی سہیلی وہاں رہتی ہو۔'' میں نے بات بنائی۔

''پھر آپ کا یہ بیان بھی میرے حلق سے نہیں اتر رہا کہ اتفاقاً ایک لڑکی بلقیس کا ادھر سے گزر ہوا اور یہ کہ وہ لڑکی بھی آپ کی فرم میں ملازم ہے۔'' اس کا انداز خودکلامی کا سا تھا۔ ''پھر اس لڑکی بلقیس کو وہاں نرگس کی ڈائری ملی اور سینڈل بھی! اس کے بعد بلقیس نے آپ کو مطلع کیا۔ ڈائری کے ایک صفحے پر نرگس کا یہ لکھنا کہ اسے اغواء کر کے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی! نرگس کو کس طرح یہ معلوم ہو گیا کہ اسے اغواء کرنے والے کہاں لے جائیں گے؟'' یا تو آپ مجھ سے دانستہ کوئی بات چھپا رہی یا پھر......''

''اول تو میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہی۔'' میں نے دلاور کی بات کاٹی۔ ''بالفرض ایسا ہو بھی تو تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے؟ ضروری تو نہیں کہ نرگس کو اسی علاقے سے اغواء کیا گیا ہو جہاں ڈائری ملی ہے! پھر یہ کہ اغواء کرنے والوں کی گفتگو سے بھی تو یہ علم ہو سکتا ہے، اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے! اسے ڈائری میں ایک فقرہ لکھنے کا موقع مل گیا، اس سے بھی یہ ظاہر ہے کہ اپنے اغواء ہونے کے کافی دیر بعد اس نے وہ فقرہ لکھا ہو گا اور پھر موقع پا کر ڈائری، کار سے باہر پھینک دی ہو گی۔''

''لیکن ڈائری کے ساتھ سینڈل بھی ملا ہے، اسے آپ کس خانے میں فٹ کریں گی؟ کیا اس نے ڈائری کے ساتھ سینڈل بھی پھینکا ہو گا؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو اس نے ایسا کیوں کیا؟ اسے سینڈل پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟'' دلاور پھر بحث کرنے لگا۔

''سنو! تم سے سر مارنے کے لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، مجھے سخت نیند آ رہی ہے اور میں سونا چاہتی ہوں۔'' میں نے بیزار کن لہجے میں کہا۔ ''جو واقعہ تھا میں نے تمہیں بتا دیا۔ اب تمہارا جو جی چاہے کرو، میں اپنے طور پر بھی کوشش کر رہی ہوں، اگر تم اس سلسلے میں دلچسپی لینا نہیں چاہتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔''

''مگر مجھے معاملے کو سمجھنے تو دیں جبھی تو کوئی قدم اٹھا سکوں گا!'' اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔ ''یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ لی مارکیٹ کی اس عمارت سے اسے لے جانے والے غیرملکی تھے جن کا تعلق شمالی افریقہ کے ایک ملک سے ہے، آپ سمجھ نہیں رہی کہ یہ بات کتنی اہم ہے! وجہ شاید یہ ہے کہ آپ کو نرگس کے ماضی کا علم نہیں۔'' یہ کہتے ہی دلاور کو نہ جانے کا خیال آیا کہ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں چلتا ہوں۔ اس سے پہلے

مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ان دونوں کی زندگی کو بھی کوئی خطرہ پیش آ سکتا ہے! ان کی حفاظت بھی ضروری ہے۔''

''کون دونوں؟'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''نرگس کی والدہ اور اس کا بڑا بھائی۔'' دلاور نے جواب دیا، پھر بولا۔ ''اچھا خدا حافظ! اس وقت میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، میں آپ سے جلد ہی رابطہ قائم کروں گا۔ یہ کہنے کے بعد دلاور مزید نہیں رکا۔

وہ تو چلا گیا، مگر مجھے ایک نئی ہی الجھن میں مبتلا کر گیا، مجھے واقعی نرگس کے ماضی کا زیادہ علم نہیں تھا، دلاور سے گفتگو کے بعد نرگس کا معاملہ سیدھا سادا نہیں رہا تھا، اس میں کوئی نہ کوئی پیچ ضرور تھا، اسے صرف اسی لیے اغواء نہیں کرایا گیا تھا کہ وہ عبدالحمید خان کی نگرانی کر رہی تھی یا اس طرح عبدالحمید خان مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا چاہتا تھا، معاملہ کچھ اور ہی تھا، مجھے اسی سبب فوری طور پر نیند نہیں آ سکی، سونے سے پہلے میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور ملازمہ کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ کم از کم چار گھنٹے سے پہلے مجھے نہ جگایا جائے، ٹیلی فون کا ایکسٹینشن باہر بھی تھا، اگر اس دوران میں کوئی ضروری فون آتا تو میری کوئی ملازمہ بات کر سکتی تھی۔

جب میں سو کر اٹھی تو شام کے پانچ بج رہے تھے، میں سیدھی باتھ روم میں گھس گئی، نہا کر میری ساری تھکن دور ہو گئی، کپڑے تبدیل کرنے کے بعد میں نے خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا اور اپنی خاص ملازمہ کو بلا کر چائے لانے کو کہا، اس نے بتایا کہ اس دوران میں میرے لیے دو فون آئے تھے ایک فون میری فرم کی منیجر نے کیا تھا اور دوسرا فون دلاور کا تھا، دلاور نے پیغام دیا تھا کہ میں سو کر اٹھتے ہی فون پر اس سے رابطہ قائم کروں۔ یہ اطلاع دے کر ملازمہ میرے لیے چائے بنانے چلی گئی۔

فرم کی منیجر کا فون ظاہر ہے، دفتری معاملات سے متعلق ہو گا، اس سے میں کل صبح بھی رابطہ قائم کر سکتی تھی، اس نے کوئی پیغام نہیں چھوڑا تھا۔ ہاں دلاور سے فوری رابطہ قائم کرنا ضروری تھا۔ مجھے نرگس کے بارے میں بھی اس سے ضروری معلومات حاصل کرنا تھیں۔ ان معلومات کا تعلق نرگس کے ماضی سے تھا۔ اس الجھی ہوئی گتھی کا سرا یقیناً ماضی میں تھا۔

میں نے دلاور کا فون نمبر ملایا، دوسری جانب سے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا گیا۔ رابطہ ملتے ہی میں نے کہا۔

''کہو کیا بات ہے؟''

''جو افریقی باشندہ، نرگس کے اغواء میں ملوث تھا، کیا آپ اسے پہچان سکتی ہیں؟'' دلاور میرے سوال کے جواب میں بولا۔

''میں تو نہیں......لیکن اسے پہچانا جا سکتا ہے۔ کیوں کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''تو آپ جلد از جلد اس کی شناخت کا بندوبست کر کے میرے پاس آ جائیں ممکن ہے نرگس کا سراغ مل جائے۔''

''تم کچھ بتاؤ تو سہی کہ معاملہ کیا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''فون پر نہیں بتا سکتا۔'' دلاور کے لہجے میں اس وقت شرارت نہیں تھی، وہ سنجیدہ معلوم ہو رہا تھا۔

’’ٹھیک ہے، میں پہنچ رہی ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

موجودہ حالات میں میرے لیے خطرہ بڑھ گیا تھا، میرے لیے آزاد گھومنا آسان نہیں رہا تھا، یہی سوچ کر میں نے میک اپ کا سہارا لیا، میں نے ایک ادھیڑ عمر اینگلو انڈین عورت کا روپ دھار لیا تھا، رات کے وقت اپنی کوٹھی میں رہنا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا، مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا، میرے حفاظتی انتظامات بے سود ثابت ہو چکے تھے، میک اپ سے فارغ ہو کر میں نے اپنی خادمہ خاص کو طلب کیا، وہ مجھ پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھی اسے میری خواب گاہ میں کسی ’’اجنبی‘‘ عورت کی موجودگی کا یقیناً گمان نہیں رہا ہوگا۔

’’سنو فاطمہ!‘‘ میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ تقریباً اچھل پڑی۔

’’مسز ...... جی سر!‘‘ وہ ہکلانے لگی۔

’’میں جا رہی ہوں اور کہا نہیں جا سکتا کہ میری واپسی کب ہوگی!‘‘ میں نے بتایا۔ ’’ممکن ہے رات کو میں نہ لوٹ سکوں، تم لوگوں کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

’’بہتر...... بہتر ہے سر!‘‘

’’اگر تم لوگوں کو کوئی خطرہ محسوس ہو تو اسی فون پر رابطہ قائم کر کے مدد حاصل کر سکتی ہو جو ہنگامی حالات پیش آنے کی صورت میں تمہیں میں نے بتایا ہے، سمجھ گئیں؟‘‘

’’جی ...... جی ہاں سر!‘‘ اس نے جواب دیا، پھر پوچھا۔ ’’کیا کسی خطرے کی توقع ہے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ میں نے صاف گوئی سے کام لیا، میں اسے تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ ’’ممکن ہے رات کو کچھ لوگ کوٹھی میں گھسنے کی کوشش کریں، لیکن ان سے تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا، ویسے میں یہ بندوبست بھی کر دوں گی کہ کوئی شخص کوٹھی میں داخل ہی نہ ہو سکے۔‘‘ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، پھر بولی۔ ’’اب تم جا سکتی ہو۔‘‘

وہ چلی گئی تو میں نے آپریشن سیل کے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا...... دوسری جانب کمانڈر نواز کے ایک ماتحت عثمانی نے ریسیور اٹھایا، کمانڈر نواز رات بھر ڈیوٹی دینے کے بعد جا چکا تھا بلکہ دس بجے کے بعد تک وہ ہیڈ کوارٹر میں تھا، میری اس سے بات ہوئی تھی۔

’’سنو عثمانی! ممکن ہے آج رات کچھ لوگ میری کوٹھی میں داخل ہونے کی کوشش کریں، انہیں اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہونا چاہیے، اس کے علاوہ یہ کہ انہیں گھیرنے کی کوشش بھی کرنا ہے!‘‘ میں نے اسے حکم دیا۔ ’’تم سمجھ گئے؟‘‘

’’یس سر!‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’کسی کو بھی کوٹھی میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔‘‘

’’عقبی سمت کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے! خدا حافظ!‘‘ یہ کہہ کر میں نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اپنی خواب گاہ سے نکل کر کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف جا رہی تھی، ریٹا نے میری کوٹھی تک میرا تعاقب کیا تھا۔ خود وہ یا اس کا کوئی گرگا یقیناً کوٹھی کی نگرانی کر رہا ہوگا، میں اپنے دشمنوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھ کر ابھی اپنی کوٹھی ہی میں ہوں، وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی، میری کوٹھی کے عقبی سمت میں ایک پتلی سی گلی تھی جو عام گزرگاہ نہیں تھی۔ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑاتی ہوئی عقبی پھاٹک پر چڑھ گئی۔ اس وقت تک شام کے سائے

پوری طرح پھیل چکے تھے۔ تیزی کے ساتھ پھاٹک پر چڑھ کر گلی میں پہنچنے کے لیے میں نے زیادہ وقت نہیں لیا۔ گلی میں اس وقت کوئی نہیں تھا، میرے دشمنوں یا نگرانی کرنے والوں کو یقیناً یہ توقع نہیں ہوگی کہ میں یوں چوروں کی طرح چھپ کر پیچھے سے نکل جاؤں گی۔ غالباً اسی لیے انہوں نے کوٹھی کی عقبی سمت کو نظر انداز کر دیا تھا اور یہ میرے لیے سود مند ثابت ہوا تھا ورنہ مجھے کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑتا۔

مختلف گلیوں اور سڑکوں سے گزر کر میں کورنگی روڈ پر آ گئی۔ اب مجھے کسی ٹیکسی کی تلاش تھی، کوٹھی سے چلتے ہوئے میں نے اپنے پرس میں ایک چھوٹا سا ریوالور بھی رکھ لیا۔ یہ پرس اور ریوالور دونوں ہی نئے تھے کیونکہ گزشتہ شب میرا پرس دشمنوں کے قبضے میں پہنچ چکا تھا اور اسی پرس میں میرا ریوالور بھی تھا۔ ابھی تک مجھے اپنے اس ریوالور کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کا موقع نہیں مل سکا تھا، اس وقت جو ریوالور میرے پرس میں تھا، وہ بغیر لائسنس کا تھا، بہ امر مجبوری ہی میں نے اسے اپنے پرس میں رکھا تھا کسی بھی وقت مجھے اس کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

جلد ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔

’’کریم آباد چلو!‘‘ میں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ٹیکسی کا دروازہ بند کرتے ہی ڈرائیور سے کہا۔

’’اچھا جی!‘‘ ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا اور پھر عقبی آئینے میں میرا جائزہ لیتے ہوئے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

اس وقت یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ ادھیڑ عمری کے میک اپ کے باوجود میرے چہرے اور خصوصاً جسم میں صنف مخالف کے لیے کشش برقرار تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی ایک اچٹتی سی نظر ہی نے مجھے یہ احساس دلا دیا تھا، میک اپ سے چہرہ تو بڑی حد تک بدلا جا سکتا ہے لیکن تناسب جسم نہیں چھپایا جا سکتا۔

میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ کم از کم آپریشن سیل سے متعلق تمام اراکین کے پاس ٹیلی فون ضرور ہونا چاہیے تاکہ انہیں فون پر ضروری ہدایات دی جا سکیں، اگر بلقیس کے فلیٹ میں فون ہوتا تو مجھے اس کے یہاں جانے کی ضرورت پیش نہ آتی، میں ٹیلی فون پر اسے دلاور کے یہاں جانے کی ہدایت دے سکتی تھی، میرے اندازے کے مطابق اسے اپنے فلیٹ پر ہی ملنا چاہیے تھا کیونکہ رات بھر مصروف رہنے کے بعد دفتر جانے کا سوال تو تھا ہی نہیں، یوں بھی اب ساڑھے چھ بج رہے تھے، دفتر کا وقت بھی ختم ہو چکا تھا۔

توقع کے مطابق بلقیس مجھے اپنے فلیٹ ہی پر مل گئی۔ وہ بھی کچھ دیر پہلے سو کر اٹھی تھی، ٹیکسی کو میں نے دانستہ وہاں سے کافی دور چھوڑا تھا، محض احتیاطاً! میں نے کافی فاصلہ پیدل طے کیا تھا، بلقیس کو میں نے احتیاط ہی کے پیش نظر اپنے ساتھ لے جانا بہتر نہیں سمجھا، میں نے اسے جلد از جلد دلاور کے گھر پہنچنے کی ہدایت کی اور پھر فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ بلقیس اس افریقی باشندے کو پہچان سکتی تھی، میں نے اسی لیے اسے دلاور کے گھر پہنچنے کی ہدایت دی تھی۔

دوبارہ ٹیکسی میں آ کر بیٹھنے کے بعد میں نے ڈرائیور سے سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی چلنے کو کہا اور پھر اپنے خیالوں میں کھو گئی میرا ذہن اس افریقی باشندے میں الجھا ہوا تھا، جسے غالباً دلاور نے اپنے قابو میں کر لیا تھا، اس افریقی باشندے کو اسی کوٹھی پر ہونا چاہیے تھا۔

سوچتے سوچتے معاً مجھے خیال آیا کہ ٹیکسی کو چلتے ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔ سوچتے ہوئے ذہنی یکسوئی کی خاطر میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں، میں نے آنکھیں کھول کر ٹیکسی سے باہر نظر دوڑائی تو چونک اٹھی اور اسی کے ساتھ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ”یہ تم کدھر جا رہے ہو؟“

”چپ بیٹھی رہو!“ ٹیکسی ڈرائیور کے لہجے میں سختی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی کو ایک ویران سی سڑک پر لے آیا تھا جس پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا، پھر اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہہ سکتی، اس نے ٹیکسی کو سڑک سے کچے میں اتار لیا اور پھر تیزی سے ایک طرف بڑھنے لگا، کچھ ہی فاصلے پر درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ نظر آ رہا تھا، غالباً اس کی منزل وہی تھی، مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے کیا ارادے ہو سکتے ہیں! وہ اپنے جثے سے خاصا لحیم شحیم اور طاقت ور آدمی معلوم ہوتا تھا، غالباً اسے خیال ہوگا کہ مجھ ایسی نازک سی عورت پر قابو پانا اس کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا، مجھے شاید وہ اس شہر میں اجنبی ہی سمجھا ہوگا، اسے کیا خبر تھی کہ میں اپنے خیالوں میں کھوئے ہونے کے سبب آنکھیں بند کیے سفر کر رہی تھی۔

اس ناگہانی کے سبب مجھ پر جھنجلاہٹ سی طاری ہو گئی، اس احمق نے خواہ مخواہ میری راہ کھوٹی کی تھی، ورنہ اب تک میں دلاور کے گھر پہنچ چکی ہوتی، میرا جی چاہا کہ اسے گولی مار دوں اور پھر خود ٹیکسی ڈرائیو کرتی ہوئی دلاور کے گھر پہنچ جاؤں لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا وہ یقیناً اتنی بڑی سزا کا مستحق نہیں تھا، اب مجھے ٹیکسی رکنے کا انتظار تھا۔

ذرا ہی دیر کے بعد ٹیکسی پیڑوں کے جھنڈ میں داخل ہو کر رک گئی، میں چاہتی تو اپنے پرس سے ریوالور نکال سکتی تھی، مگر میں نے اسے ضروری نہیں سمجھا، ٹیکسی رکتے ہی وہ دروازہ کھولنے کی بجائے خلاف توقع انتہائی پھرتی سے اچھل کر پچھلی سیٹ پر آ گیا، اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو میں نے دیکھ لیا تھا، پھر اس سے پہلے میں سنبھل پاتی، اس نے چاقو کی نوک میرے سینے پر رکھ دی اور غرایا۔ ”اگر تم نے شور مچایا تو بھی یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا، اس لیے خاموش ہی رہو تو بہتر ہے!“

ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے خطرے کا شدید احساس ہو گیا، یقیناً میں نے یوں مطمئن بیٹھے رہ کر حماقت ہی کا ثبوت دیا تھا، میں اس پوزیشن میں نہیں رہی تھی کہ اسے اس کے ارادے سے باز رکھ سکتی، میری ذرا سی بھی مزاحمت اسے مشتعل کر سکتی تھی جو لوگ کوئی ایسا قدم اٹھاتے ہیں، ایسے لمحات میں بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں، مجھے اس کا پورا احساس تھا۔

پھر چند ہی لمحوں میں میں نے ایک فیصلہ کر لیا، میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑی دلفریب نظروں سے دیکھا اور اس کے چہرے کا کھنچاؤ کم ہو گیا۔

”تو اس میں چاقو سینے پر رکھنے کی کیا ضرورت ہے! تم تو ویسے بھی مرد ہو، ایک بھرپور مرد اور مجھ سے زیادہ طاقتور!“ میں نے مسکراتے ہوئے گویا اس کی حوصلہ افزائی کی۔

وہ میری توقع کے مطابق بانس پر چڑھ گیا اور پھر چاقو بند کر کے اگلی سیٹ پر پھینک دیا، اب اس کے ہونٹوں پر ایک فتح مندانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے وہ جیسے میری طرف جھکا، میرے دونوں ہاتھ پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی کے نیچے پڑے، ضرب اتنی شدید تھی کہ دوسری طرف الٹتے ہوئے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا، میرا جچا تلا ہاتھ اس کی بائیں کنپٹی پر پڑا، یقیناً اسے ستارے نظر آ گئے ہوں گے جگہ کی تنگی کے سبب میں جھگڑے کو طول دینا نہیں چاہتی تھی ورنہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی اس کے چہرے پر مزید نقش و نگار بنا دوں تا کہ آئندہ اسے کسی تنہا عورت کو دیکھ کر یہ جرأت نہ ہو، میرے دوسرے ہاتھ نے اسے عالم ہوش سے کہیں اور پہنچا دیا، اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا، دوسرا ہاتھ بھی اس کی کنپٹی پر ہی پڑا تھا، وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

بطور سزا میں نے اس کی جیب سے ڈھائی سو روپے کے قریب نوٹ نکال کر اپنے پرس میں ڈال لیے اور اس کے بے ہوش جسم کو پیڑوں کے جھنڈ میں پھینک دیا یہ بھی اس کے لیے سزا ہی تھی اسے ہوش میں آنے کے بعد کسی سواری کے لیے کافی دور پیدل چلنا پڑتا، وہ مجھے شہر کی حدود سے باہر نکال لایا تھا۔

اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسی ٹیکسی میں شہر تک واپس جاتی، میں نے سوچا کہ اس ٹیکسی کو شہری حدود میں داخل ہوتے ہی کہیں چھوڑ دوں گی اور پھر وہاں سے کسی دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کر سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی روانہ ہو جاؤں گی۔“

جب میں ٹیکسی ڈرائیو کرتی ہوئی پیڑوں کے اس جھنڈ سے نکلی تو خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا، مجھے یہ فکر بھی تھی کہ بلقیس اب تک میرے بتائے ہوئے پتے، یعنی دلاور کے گھر پہنچ چکی ہوگی، میں نے بلقیس کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا کہ اسے وہاں پہنچ کر کیا کرنا ہے! اس کا یہ سبب تھا کہ مجھے بلقیس سے پہلے وہاں پہنچنے کی توقع تھی، اس کے علاوہ میں نے دلاور کو بھی بلقیس کے متعلق کچھ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، دلاور اور بلقیس ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی تھے۔

میں انہی خیالوں میں غلطاں تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتی رہی، اب میں شہر کی حدود میں داخل ہونے والی تھی، میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے ٹیکسی سے اترتے دیکھے۔ میں نے اسی لیے نسبتاً ایک ویران سڑک کا انتخاب کیا اور وہاں سڑک کے کنارے ٹیکسی روک کر اس سے اتر آئی۔ اس خبیث ٹیکسی والے کو دل ہی دل میں کوس رہی تھی جس کی حماقت خود اسے بھی مہنگی پڑی تھی اور میں بھی ناحق الجھن اور پریشانی کا شکار ہو گئی تھی۔

احتیاط کے پیش نظر مجھے کافی دور پیدل چلنا پڑا وہاں مجھے کچھ فاصلے پر ایک بس اسٹینڈ نظر آ رہا تھا جہاں کئی بسیں کھڑی تھیں، ان میں سے صرف ایک کے اندر چند مسافر بیٹھے تھے بقیہ خالی تھی یہ اس بس روٹ کا شاید آخری اسٹاپ تھا، قریب پہنچ کر میں نے کسی ٹیکسی یا رکشا کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر مایوسی ہوئی، ناچار مجھے اسی بس کا سہارا لینا پڑا، وہ بس صدر جا رہی تھی، میں نے صدر کا ٹکٹ لے لیا تا کہ جہاں بھی چاہوں اس بس سے اتر سکوں۔

بس وہاں سے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد روانہ ہوئی، میری جھنجلاہٹ اور غصہ اپنے عروج پر تھا، سارا قصور میرا ہی تھا، مجھے اس طرح غافل ہو کر ٹیکسی میں نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔

خدا خدا کر کے نسبتاً گنجان آبادی کا علاقہ آیا اور مجھے اِکا دُکا ٹیکسیاں نظر آنے لگیں، میں ایک اسٹاپ پر اتر گئی، وہاں سے ٹیکسی میں روانہ ہونے کے لیے مجھے مزید دس منٹ لگے، اب رات کے سوا آٹھ بج رہے تھے،

فوری طور پر مجھے کوئی خالی ٹیکسی نہیں مل سکی تھی۔

ٹیکسی تیز رفتاری سے سفر کرتی رہی اور میں الجھے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچتی رہی، مگر اب پورا طرح چوکنا تھی، ایک بار چوٹ کھا کر مجھے عقل آ گئی تھی بالآخر ٹیکسی سوسائٹی کے علاقے میں داخل ہوئی، دلاور کی کوٹھی سے کچھ پہلے ہی میں نے احتیاطاً ٹیکسی رکوالی، میرے دشمن کو دلاور سے میرے تعلقات کا علم تھا اور میں اسے کسی قسم کے شک کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی، یہ بعید نہیں تھا کہ دلاور کی نگرانی کرائی جا رہی ہو۔ ٹیکسی کا میٹر دیکھتے ہوئے معاً مجھے اس رقم کا خیال آ گیا جو پہلے ٹیکسی ڈرائیور کی جیب سے نکالی تھی یہ ٹیکسی والا مجھے صورت سے مظلوم اور حالات کا ستایا ہوا لگ رہا تھا، میں نے وہ سارے نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

"یہ کرایہ بھی ہے اور تمہارا انعام بھی!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور کا منہ حیرت سے کھل گیا، شاید ٹیکسی چلاتے ہوئے پہلی بار اسے کسی ایسے "سخی" مسافر سے واسطہ پڑا ہوگا۔

"مگر..... مگر میم صاحب! یہ..... یہ تو....." ٹیکسی ڈرائیور غالباً اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے ہکلانے لگا۔

"رکھ لو، رکھ لو!" یہ کہتی ہوئی میں ٹیکسی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

"پھر اگلے ہی لمحے میں اس ٹیکسی ڈرائیور کو حیران پریشان چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی، کچھ ہی دیر بعد جب میں دلاور والی گلی میں مڑی ہی تھی تو میری سماعت سے کسی ایمبولینس کے سائرن کی آواز ٹکرائی، میں نے مڑ کر دیکھا اور ایک طرف ہو گئی۔ ایمبولینس تیزی کے ساتھ گلی میں داخل ہو گئی، دلاور کی کوٹھی اس گلی کے وسط میں تھی، میں تیز قدموں سے آگے بڑھتی رہی، کچھ فاصلے طے کرتے ہی میں چونک اٹھی۔ میرے چونک اٹھنے کا سبب وہ بھیڑ تھی جو مجھے دلاور کی کوٹھی کے باہر نظر آ رہی تھی اور چونک اٹھنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ایمبولینس بھیڑ کے قریب ہی جا کر رک گئی تھی، چند قدم اور آگے بڑھتے ہی مجھے ایک پولیس جیپ بھی کھڑی نظر آ گئی، خالی تھی پولیس کا ایک ٹرک بھی اس کے قریب کھڑا تھا مگر اس میں بھی کوئی پولیس والا نہیں تھا۔ ذرا اور آگے بڑھ کر مجھے کوٹھی کے پھاٹک پر باوردی پولیس والے کھڑے نظر آئے جو لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے میرے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر وہاں ہوا کیا ہے؟ بڑی تعداد میں وہاں پولیس کی موجودگی اور پھر ایمبولینس کا پہنچنا کیا معنی رکھتا ہے؟ میرے ذہن پر پے در پے سوالوں نے یورش کر دی تھی، لیکن میرے قدم تیزی سے آگے ہی بڑھتے رہے، وہاں یقیناً کوئی نہ کوئی بڑا ہنگامہ برپا ہوا تھا اور میں جلد از جلد اس کا سبب جان لینا چاہتی تھی، دلاور بہر حال میرا خیر خواہ تھا اور مجھے اس کی سلامتی عزیز تھی۔ اس کے علاوہ میں بلقیس کی طرف سے بھی فکر مند ہو گئی تھی۔

ooo

تیز تیز چلتی ہوئی میں دلاور کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئی، پھر میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئی جو وہاں ہجوم کیے ہوئے تھے، فی الحال اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کروں اور خود بھی انہی کی طرح ایک تماشائی بن جاؤں، اس وقت میں اتنی فکر مند اور مضطرب تھی کہ ایک معمولی سی بات میرے ذہن سے نکل گئی، اس بات کا احساس مجھے کچھ دیر بعد ہوا، اس وقت میرے چہرے پر ایک ادھیڑ عمر اینگلو انڈین عورت کا میک اپ اور لباس بھی ویسا ہی تھا، پھر یہ کہ میں بہر حال ایک عورت تھی اور عورتیں عموماً ایسے مقامات سے گریز کرتی ہیں جہاں بھیڑ ہو، کوئی ہنگامہ ہو، ہنگامے کا امکان ہو، انہی دونوں باتوں نے مجھے وہاں موجود افراد کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا اور وہ مجھے مشتبہ سی نظروں سے دیکھنے لگے تھے، عام حالات میں ممکن ہے یہ نکتہ میرے ذہن سے محو نہ ہوتا لیکن اس وقت عام حالات نہیں تھے، میں براہ راست اس معاملے میں ملوث تھی، اگر پہلے یہ بات میرے ذہن میں آ جاتی تو شاید میں حقیقت حال جاننے کے لیے کوئی اور راستہ تلاش کرتی، میرے ارد گرد جو افراد کھڑے تھے، وہ میری موجودگی محسوس کرتے ہی خاموش ہو گئے تھے، نتیجتاً مجھے اپنے مقصد میں فوری طور پر کامیابی نہ ہو سکی، میں بھیڑ سے نکل کر ایک طرف ہٹ آئی، اب میں نے شدید اضطراب کے باوجود اپنے حواس پر کسی قدر قابو پا لیا تھا، کچھ لوگ، دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں بھیڑ سے الگ بھی کھڑے ہوئے تھے، میں کچھ سوچتی ہوئی ایک طرف بڑھی، وہاں مجھے صرف دو افراد کھڑے نظر آ رہے تھے، ان دونوں تک پہنچتے ہوئے میں سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے!

"معاف کیجئے گا۔" میں نے ان میں سے ایک کو مخاطب کیا۔ "مجھے ایک کوٹھی کی تلاش ہے۔" پھر میں نے یونہی ایک نمبر بتا دیا۔

"بلاک نمبر کیا ہے؟" اس شخص نے سوال کیا۔

"بلاک نمبر......" میں سوچنے کی اداکاری کرنے لگی، پھر بولی۔

"دراصل بلاک نمبر میرے ذہن سے نکل گیا ہے، میں پہلے بھی ایک بار آ چکی ہوں، لکیشن یہی لگتی ہے اور ......"

"اس طرح بغیر بلاک نمبر کے آپ مطلوبہ جگہ نہیں پہنچ سکتیں۔"

"دراصل مجھے اس بھیڑ کی وجہ سے بھی کچھ کنفیوژن ہو رہا ہے ورنہ شاید......" میں اپنے مطلب پر آ گئی، پھر ایک دم چونک کر بولی۔ "ہاں، یہاں ہوا کیا؟" اتنی بھیڑ کیسے لگی ہوئی ہے؟"

"ہم تو خود ہی یہ جاننے کے لیے یہاں کھڑے ہوئے ہیں، ابھی تک تو کچھ معلوم نہیں ہوا، بس ایک زبردست دھماکے کی آواز سنائی دی تھی جیسے کوئی بم پھٹا ہو، پھر کچھ پتا نہیں چلا، دیکھ ہی رہی ہیں آپ کہ یہاں

پولیس بھی آ چکی ہے اور ایمبولینس بھی۔ دہشت گردی کا کوئی چکر لگتا ہے یا خدا معلوم کوئی اور معاملہ ہو......"

اس شخص نے یقیناً کچھ اور بھی کہا ہوگا، لیکن میں اس پر توجہ نہ دے سکی، میرے حواس پر ضرب لگانے کے لیے صرف یہی اطلاع کافی تھی کہ وہاں کوئی زبردست دھماکہ ہوا تھا، اس اطلاع کے ساتھ ہی میرا ذہن بھی جیسے ایک دھماکے سے اڑ گیا تھا، ملک دلاور اور بلقیس کے چہرے میری آنکھوں میں گھوم گئے۔

یقیناً ملک دلاور نرگس کی بازیابی کے سلسلہ میں نادانستہ طور پر کوئی ایسا قدم اٹھا بیٹھا تھا جس کا نتیجہ اتنا ہولناک نکلا تھا۔ آج شام پانچ بجے کے بعد فون پر میری اس سے جو گفتگو ہوئی تھی، اس گفتگو سے اپنے طور پر میں نے ایک نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ فون پر واضح الفاظ میں وہ کچھ نہیں بتا سکا تھا، اس نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ جو افریقی باشندہ نرگس کے اغواء میں ملوث تھا، کیا میں اسے پہچان سکتی ہوں؟ میں نے جواباً اسے بتایا تھا کہ اس کی شناخت ممکن ہے، اس کے بعد ملک دلاور نے شناخت کا بندوبست کر کے مجھ سے جلد از جلد پہنچنے کے لیے کہا تھا، میرے استفسار کے باوجود اس نے فون پر کچھ بتانے سے انکار کر دیا تھا، ہاں یہ ضرور کہا تھا کہ ممکن ہے، نرگس کا سراغ مل جائے، آپریشن سیل کی رکن بلقیس نے اس افریقی باشندے کو دیکھا تھا۔ میں نے اسی لیے بلقیس کو دلاور کی کوٹھی پر پہنچنے کا حکم دیا تھا اس لئے دلاور اور بلقیس کی نا آشنائی میرے لیے مسئلہ نہ تھی، مجھے زیادہ سے زیادہ چھ بجے تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا اور اب رات کے تقریباً پونے نو بجے تھے۔ اس دوران میں کیا ہوا؟ اس سلسلے میں مجھے بس ایک روح فرسا خبر چند لمحے پہلے ملی تھی۔

ان اجنبیوں کے قریب میرا زیادہ دیر کھڑا رہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا، میں نے ان پر یہ ظاہر کیا تھا کہ مجھے کسی کوٹھی کی تلاش تھی اور یوں ہی روا روی اور فطری تجسس سے مجبور ہو کر بھیڑ ہونے کا سبب پوچھ لیا تھا۔ میں نے اسی لیے ان کا شکریہ ادا کیا، پھر بولی۔ ''جہاں تک مجھے یاد ہے، گلی یہی تھی، خیر دیکھ لیتی ہوں۔''

پھر میں دوبارہ بھیڑ کی طرف بڑھ گئی، چلتے چلتے یہ جملہ کہنے کا مقصد محض یہ تھا کہ ابھی وہاں سے میرے جانے کا سوال ہی نہیں تھا، وہاں ایمبولینس کی موجودگی کا مطلب سمجھنا بھی میرے لیے مشکل نہیں تھا یا تو کوئی شدید زخمی تھا جسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی یا پھر...... اس سے آگے کچھ سوچتے ہوئے میرے دل کو دھکا سا لگا تھا، زندگی کے بعض حقائق ایسے ہوتے ہیں کہ انسان دانستہ انہیں تسلیم کرنے سے خوف کھاتا ہے اور خوش گمانی میں مبتلا رہنا چاہتا ہے۔ اس وقت اسی کیفیت سے میں بھی گزر رہی تھی اور اس کا سبب محض وہ تعلق تھا جو میرے اور دلاور کے درمیان تھا، ہر چند کہ اس تعلق میں معاملات دل شامل نہیں تھے مگر زندگی میں صرف معاملات دل ہی تو سب کچھ نہیں ہوتے زندگی تو بڑی ہمہ رنگ و ہمہ صفت ہے، ایک ہی تعلق، ایک ہی رشتہ تو زندگی کا حاصل نہیں۔

بھیڑ کی طرف بڑھتے ہوئے میری رفتار میں تیزی نہیں تھی، میری نگاہ ایمبولیس کی جلتی بجھتی روشنی پر مرکوز تھی، اس بار میرا ارادہ بھیڑ میں شامل ہونے کا نہیں تھا، ہاں یہ ضرور چاہتی تھی کہ کسی طرح ایسی جگہ تک پہنچ جاؤں جہاں سے مجھے ایمبولینس میں لے جائے جانے والے افراد یا کسی فرد کی شکل نظر آ جائے، ایمبولینس اب کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں کھڑی تھی۔

پھر میں بڑی مشکل سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکی، وہ بھی اس وجہ سے کہ فی الحال میری ساری توجہ

اس ایمبولینس پر مرکوز تھی اور وہاں موجود بقیہ افراد کو کچھ اور دیکھنے یا جاننے کا بھی تجسس تھا، اس وقت وہ میک اپ میرے لیے وبال جان بن گیا تھا ورنہ مجھے اتنی دشواری پیش نہ آتی۔ عذرا خان کی حیثیت سے ملک میں ملک دلاور کی دوست ہونے کے ناتے اور پھر اپنی شخصیت وسماجی رتبے سے فائدہ اٹھا کر اب تک بہت کچھ معلوم کر چکی ہوتی، میک اپ میں نے محض اپنے دشمنوں کی نظر میں آنے سے بچنے کے لیے کیا تھا اور اب پچھتا رہی تھی۔

میں ایک ایسی جگہ اور ایسے زاویے سے کھڑی تھی کہ کوٹھی کا برآمد اور ایمبولینس دونوں ہی میرے احاطہ نظر رہیں۔ حالات کے پیش نظر اب مجھے اس کی بھی کوئی زیادہ پروا نہیں رہی تھی کہ کوئی میرے بارے میں کیا سوچے گا، کوٹھی کا سامنے والا حصہ سلامت دیکھ کر میں یہ اندازہ بھی لگا چکی تھی کہ جو کچھ ہوا ہے، عقبی سمت میں ہو سکتا ہے۔

اچانک سائرن کی آواز پھر سنائی دی، میں نے دیکھا کہ ایک اور ایمبولینس گلی میں داخل ہو رہی تھی، وہ ایمبولینس قریب آ کر رکی تو سپاہیوں نے لوگوں کو پھر پیچھے ہٹا دیا تاکہ ایمبولینس، کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو سکے۔ میں کوٹھی کے پھاٹک سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی، اس لیے مجھے اپنی جگہ نہیں چھوڑنا پڑی، دراصل باؤنڈری وال زیادہ اونچی نہیں تھی، دوم یہ کہ مجھے وہاں دیوار کے قریب ایک ٹوٹا ہوا بلاک پڑا نظر آ گیا تھا، میں اسی ٹوٹے ہوئے نصب بلاک پر چڑھ کر کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں جھانک رہی تھی، کمپاؤنڈ بڑا تھا اس لیے دوسری ایمبولینس بھی اندر کھڑی ہو سکتی تھی۔

میں نے بس چند لمحے ماحول کی اس تبدیلی پر توجہ دی تھی اور پھر دوبارہ پہلی ایمبولینس پر میری نظر مرکوز ہو گئی تھی، اس وقت میری حیثیت محض ایک تماشائی کی سی تھی جو اپنے تجسس سے مجبور ہو کر کسی معاملے میں دلچسپی لینے لگتا ہے، کوئی اگر میری طرف متوجہ ہوتا بھی تو خیال کرتا کہ کچھ زیادہ ہی متجسس مزاج رکھتی ہوں۔

دوسری ایمبولینس کی آمد سے میری تشویش میں اضافہ ہو گیا تھا، عمارت میں جو بھی افراد رہے ہوں، ان میں سے کوئی اب تک باہر نہیں آیا تھا مجھے وہاں پہنچے کوئی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن فکر و پریشانی کے سبب یہ تھوڑا سا وقت بھی میرے لیے بہت تھا، ایک ایک لمحہ جیسے مجھ پر قیامت بن کر گزر رہا تھا، پھر وہ لمحہ آ ہی گیا جس کا مجھے بے چینی سے انتظار تھا، دو افراد ایک اسٹریچر اٹھائے تیز قدمی سے پہلی ایمبولینس کی طرف آئے انھی کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا، جس نے ایمبولینس کا پچھلا دروازہ کھولا تھا، جسے بھی اسٹریچر پر ڈال کر لایا گیا تھا، اس کا چہرہ چادر سے ڈھکا ہوا نہیں تھا، یہ دیکھ کر مجھے کچھ سکون سا محسوس ہوا، میرے سکون کی وجہ یہ تھی کہ لایا جانے والا مردہ نہیں تھا، ایسے حالات میں یہ ذرا سی بات بھی دل کو ڈھارس دینے کے لیے کافی تھی۔

جب اسٹریچر کو ایمبولینس میں رکھا جا رہا تھا تو اس وقت میری نگاہ بے ہوش شخص کے چہرے پر پڑی اور میں چونک اٹھی، وہ ملک دلاور ہی تھا جو یقیناً زندہ تو تھا مگر بے ہوش تھا، اسے یقیناً فوری طبی امداد کی ضرورت تھی، آناً فاناً میں وہ ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی روانہ ہو گئی، ظاہر ہے اس کی منزل جناح اسپتال ہی ہو سکتی تھی، کیونکہ وہ اسپتال وہاں سے قریب تھا، لیکن ابھی میں وہاں سے نہیں ہٹ سکتی تھی، دلاور کی طرف سے یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ وہ زندہ ہے، اب مجھے بلقیس کی فکر تھی، وہ بھی اس حادثے کا شکار ہو سکتی تھی۔

اس کے بعد مجھے بلقیس کی خاطر تقریباً آدھے گھنٹے تک وہاں رکنا پڑا، دوسری ایمبولینس میں دو لاشیں گئی تھیں، میرا اضطراب اسی لیے اپنے عروج پر پہنچ گیا، باقی اور تمام باتیں تو بعد میں بھی معلوم ہو سکتی تھیں، لیکن سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہاں سے جو لاشیں روانہ کی گئی ہیں کس کی ہیں؟

میں نے ٹیکسی کو اپنی کوٹھی کے گیٹ ہی پر روکا اور پھر کرایہ ادا کر کے اتر گئی، ٹیکسی چلی گئی اور میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھنا چاہی، اسی وقت مجھے اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی اور میں ایک دم مڑی، چہرے پر گھنی مونچھوں پر اضافے کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا، وہ کیپٹن شاد تھا اور یقیناً بہت محتاط تھا، مجھے آس پاس اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے خاتون؟'' اس نے آواز بدل کر مجھ سے سوال کیا، وہ یقیناً مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اس لیے بغیر وقت ضائع کیے اٹھی۔ ''احمق ہو تم! میرے اتنے قریب آ کر بھی مجھے نہیں پہچان سکے۔''

''آپ...... آپ......'' وہ سٹپٹا گیا۔

''اسی طرح محتاط اور چوکنا رہو، جاؤ!'' میں نے اس سے کہا اور پھر مڑ کر کال بیل کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔

کیپٹن شاد وہاں نہیں رکا، مجھے علم تھا کہ اس کے کچھ اور ساتھی بھی ارد گرد موجود ہوں گے، اپنی کوٹھی کی نگرانی کا حکم میں نے ہی دیا تھا، لیکن ہنگامی صورتحال کے سبب یہ بات میرے ذہن سے محو ہو گئی تھی، آپریشن سیل کے کچھ افراد میری کوٹھی کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے تھے، ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ کسی بھی اجنبی کو کوٹھی میں داخل نہ ہونے دیتے۔

چہرے پر میک اپ ہونے کی وجہ سے بس مجھے چند لمحوں کی تاخیر ہوئی، یہ بات صرف میری ملازمہ خاص فاطمہ کے علم میں تھی کہ میں اس میک اپ میں کوٹھی سے روانہ ہوئی تھی، دوسرے ملازمین اس سے لاعلم تھے اس لیے انہیں یہ باور کرانے میں چند لمحے تو صرف ہوتے ہی کہ میں کون ہوں! بہر حال یہ چند لمحات کی تاخیر بھی مجھے کھلی تھی اور پھر میں آندھی طوفان کی طرح اپنے کمرے میں جا پہنچی تھی۔

میک اپ ختم کرنے اور نیا لباس پہننے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی، عموماً میک اپ میں اپنے ملازمین کے سامنے آنے سے گریز کرتی تھی، لیکن اس وقت مجبوری ہی کچھ اور تھی اس کے باوجود میرے ملازمین اسی نوع کے اکا دکا واقعات ہوتے رہنے کی وجہ سے ان چیزوں کے عادی ہو گئے تھے، اپنی خواب گاہ میں داخل ہوتے وقت میں نے فاطمہ سے کہہ دیا کہ وہ ڈرائیور کو ہدایت دے دے، گاڑی تیار رکھے، روانگی سے قبل میں نے آپریشن سیل کے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرنا ضروری سمجھا۔

اس وقت کمانڈر نواز ڈیوٹی پر تھا، مختصراً میں نے اسے پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا اور پھر ضروری ہدایات دیں، کم سے کم الفاظ میں، میں نے اپنا مدعا بیان کیا تھا، پھر فون اس جگہ رکھ کر تقریباً دوڑتی ہوئی اپنی خواب گاہ سے نکلی تھی، اب میں جلد از جلد جناح اسپتال پہنچنا چاہتی تھی، لیکن اب میرے ذہن کا بوجھ قدرے کم ہو گیا تھا، کمانڈر نواز بہت سے معاملات کو سنبھال لیتا، وہ ذہین بھی تھا اور دلیر بھی، اس میں قوت فیصلہ بھی تھی

اور اپنے ماتحت عملے سے کام لینے کا سلیقہ بھی، اس وقت آپریشن سیل کے ہیڈ کوارٹر میں اسی کی موجودگی میرے لیے تقویت کا باعث ہوئی تھی۔

اپنی خواب گاہ سے پورچ تک پہنچنے میں مجھے چند لمحے لگے۔ میری ہدایت کے مطابق کار موجود تھی اور ڈرائیور بھی، اس نے مجھے آتے دیکھ کر جلدی سے کار کا دروازہ کھول دیا اور میں لپک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی، کار کی چابیاں اس نے میرے سیٹ سنبھالتے ہی مجھے تھما دی تھیں وہ میرا مزاج شناس تھا، اس نے شاید میرے انداز ہی سے سمجھ لیا تھا کہ میں خود ڈرائیو کر کے انتہائی سرعت کے ساتھ کہیں پہنچنا چاہتی ہوں، ویسے بھی جب اسے میرے ساتھ کہیں جانا ہوتا تھا تو میں پہلے سے کہہ دیتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میری کار، کمان سے چھوٹتے ہوئے کسی تیر کی طرح کوٹھی کے پھاٹک سے نکل رہی تھی، اپنی کوٹھی سے جناح اسپتال تک پہنچنے میں مجھے صرف چند منٹ لگے۔ دلاور کے بارے میں کچھ معلوم کرنے سے پہلے مجھے ان لاشوں کی فکر تھی جو وہاں سوسائٹی سے لائی گئی تھیں، میری شخصیت اسپتال کے کچھ ذمہ دار افراد کے لیے جانی پہچانی تھی، اس لیے مجھے دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا، ہاں وہاں پہنچتے ہی میں نے دو ایک فون ضرور کیے تھے۔

میرا دل اس وقت بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا، جب میں مردہ خانے کی طرف جا رہی تھی، اسپتال کے عملے کا ایک ذمہ دار شخص میرے ساتھ تھا، صرف بلقیس ہی پر منحصر نہیں مجھے اپنے تمام ہی ساتھی بہت عزیز تھے، مجھے اس دوران میں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہاں لائی جانے والی دو لاشوں میں سے ایک کا چہرہ اتنا مسخ ہو چکا ہے کہ شناخت ممکن نہیں، وہ لاش کسی مرد کی تھی، دوسری لاش ایک عورت کی بتائی گئی تھی اور مجھے وہی لاش دیکھنا تھی، میں نے یہ معلوم ہو جانے کے بعد کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا، میرا ذہن تو جیسے کہیں اور ہی تھا، مجھے تو بلقیس کی بوڑھی ماں اور زیر تعلیم چھوٹے بھائی کا خیال آ رہا تھا، اگر خدانخواستہ اسے واقعی حادثہ پیش آ چکا ہے تو ان دونوں پر کیا گزر جائے گی۔

پھر جب مردہ خانے کا دروازہ کھولا گیا تو صبر و ضبط کے باوجود خود پر قابو نہ رکھ سکی، سفید چادروں سے ڈھکی ہوئی دونوں لاشوں کی طرف میں تیزی سے بڑھی، اس کے بعد پہلی لاش کے چہرے سے چادر ہٹاتے ہی میرے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کو قرار آ گیا، بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی ہے کہ کسی لاش کا چہرہ دیکھ کر قرار آ جائے، لیکن میں شاید اپنی کیفیت کو اس سے بہتر کسی جملے میں بیان نہیں کر سکتی، وہ لاش عورت ہی کی تھی مگر بلقیس کی نہیں۔ دوسری لاش دیکھنے کا سوال ہی نہیں تھا، اس لیے میں الٹے قدموں باہر نکل آئی۔

بلقیس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے ایمرجنسی وارڈ کا رخ کیا، فی الحال بلقیس کے خیال کو میں نے ذہن سے نکال دیا تھا کہ وہ کہاں تھی! اب مجھے دلاور کی فکر تھی۔

دلاور کو بے ہوشی کی حالت میں اس کی کوٹھی سے لایا گیا تھا۔ وہ شدید زخمی حالت میں بھی ہو سکتا تھا اور یہ بے ہوشی عارضی بھی ہو سکتی تھی، دونوں ہی صورتوں میں اس کی خبر گیری میرے لیے ضروری تھی۔

میں ایمرجنسی وارڈ میں پہنچی تو معلوم ہوا کہ ابھی اسے ہوش نہیں آیا، میرے نزدیک یہ بات تشویش ناک صورت بھی اختیار کر سکتی تھی، طویل عرصے بے ہوشی کسی بھی قسم کے خطرے کا سبب بن سکتی ہے، یہ بات مجھے

معلوم تھی، میں نے اسی لیے ڈاکٹر سے مل لینا ضروری سمجھا۔

اس وقت ڈیوٹی پر دو ڈاکٹر تھے جن میں سے ایک مجھے مل گیا، میں نے اس سے اپنا تعارف کرایا اور اسی کے ساتھ اسپتال کی ایک ایسی شخصیت کا حوالہ دیا کہ وہ مصروف ہونے کے باوجود کچھ دیر کے لیے میری طرف متوجہ ہو گیا، میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھے ایمرجنسی وارڈ میں ایڈمٹ ایک مریض کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔

''آپ ادھر ...... یہاں......'' ڈاکٹر نے ایک طرف رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں تشریف رکھیں، میں ابھی آپ سے بات کرتا ہوں ......بس ذرا انہیں دیکھ لوں۔''

ڈاکٹر کے سامنے ایک باریش شخص بیٹھا ہوا تھا، اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہے، بار بار وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ظاہر ہے یہ ایمرجنسی وارڈ ہے اور لوگ یہاں فوری طبی امداد حاصل کرنے ہی آتے ہیں، آپ ہر ایک کو تو فوری توجہ نہیں دے سکتے۔''

''جی ...... جی'' یہ کہہ کر وہ سامنے بیٹھے ہوئے باریش شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ہاں بابا، کیا ہوا؟''

''ابھی کوئی ایک گھنٹے سے ایک دم پیٹ میں سخت درد......'' باریش شخص ڈاکٹر سے اپنی کیفیت بیان کرتا رہا۔

اس دوران میں وہ کبھی کبھی درد سے کراہنے بھی لگتا تھا۔

ڈاکٹر اس کے مرض کی تشخیص کرنے کے لیے اس سے مختلف سوالات کرتا رہا، پھر کمرے ہی میں موجود لمبی میز پر لٹا کر اس کا معائنہ کیا، کچھ دیر بعد میں وہ اس مریض کے لیے دوا تجویز کر کے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''جی اب فرمایئے!''

میں نے اس سے دلاور کے بارے میں سوال کیا۔ اسے میں نے بیڈ نمبر اور دلاور کی کیفیت سے بھی آگاہ کر دیا تھا تاکہ وہ سمجھ جائے، میں کس مریض کے متعلق پوچھ رہی ہوں۔

''جی ...... سمجھ گیا میں۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔ ''کوئی ایسی زیادہ فکر کی بات نہیں ہے۔''

''مگر اسے اب تک ہوش کیوں نہیں آیا؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''جہاں تک میرے علم میں ہے۔ ''بے ہوشی کو زیادہ طویل......''

''آپ سے یہ کس نے کہا کہ انہیں ہوش نہیں آیا؟''

''یہیں ابھی وارڈ میں ...... غالباً وہ وارڈ بوائے تھا۔''

''غلط کہا اس نے۔ معلوم نہیں ہوگا اسے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''انہیں یہاں آنے کے کچھ دیر بعد ہی ہوش آ گیا تھا، ہم نے خود انہیں انجکشن دے کر سلا دیا ہے، دراصل کچھ اندرونی چوٹیں بھی آئی ہیں انہیں! پھر بھی کوئی ایسی تشویشناک بات نہیں ہے۔''

''میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ خطرے کی حدود......''

''نہیں نہیں ...... مطمئن رہیں آپ۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''شکریہ ڈاکٹر صاحب! مجھے بس یہی معلوم کرنا تھا۔'' یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور گھڑی میں وقت دیکھا۔

ایمرجنسی وارڈ سے باہر آ کر میں نے ارد گرد نظریں دوڑائیں اور مطمئن ہو گئی، آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے متعلق دو افراد مجھے وہاں منڈلاتے نظر آ گئے تھے، انہی میں سے ایک کو میں نے وارڈ میں جاتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ کمانڈر نواز حرکت میں آ چکا تھا، وہ میری ہی ان ہدایات پر عمل کر رہا تھا جو کوٹھی سے چلتے ہوئے میں نے اسے دی تھیں، دراصل مجھے دلاور کی زندگی خطرے میں نظر آ رہی تھی، جو لوگ اس کی کوٹھی میں بم پھینک سکتے تھے، اسے ختم بھی کر سکتے تھے، میں نے اسی لیے فوری طور پر اس کی حفاظت کا بندوبست کر دیا تھا، جب تک پورا معاملہ سامنے نہ آ جاتا، نہایت چوکنا رہنے کی ضرورت تھی، کسی بھی لمحے کوئی غیر متوقع بات سامنے آ سکتی تھی۔

میں نے آج کی رات طارق روڈ والے فلیٹ میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن یہ فیصلہ مجھے بدلنا پڑا حالات اب کچھ ایسا ہی رخ اختیار کر گئے تھے کہ فوری طور پر میرا آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچنا ضروری ہو گیا تھا، وہاں پہنچ کر فوری طور پر کوئی قدم اٹھانے میں مجھے زیادہ قباحت نہ ہوتی، اس کے علاوہ یہ کہ میں تازہ ترصورتحال سے بھی باخبر رہتی جو وہاں سے دور رہتے ہوئے ذرا پریشانی کا سبب بنتا، ایسا اسی صورت میں ممکن تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہ ہوتا، حالات کے پیش نظر وقتی طور پر میں نے احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا تھا مگر اب پھر مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا تھا، اسپتال سے نکلنے کے بعد میں نے اسی لیے اطراف کا جائزہ لیا، بظاہر تو کوئی مجھے اپنی طرف متوجہ نظر نہیں آیا مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ تعاقب کرنیوالا اتنا ہی غیر محتاط ہوتا، یوں بھی وہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں ایک آتا ہے تو ایک جاتا ہے، کسی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ کون اور کیا ہے! اس کے باوجود اپنی کار اسٹارٹ کرتے ہوئے میرا ذہن بے حد اُلجھا ہوا تھا ایک مسئلہ نہیں تھا جو میرے لیے پریشانی کا سبب ہو، ایک طرف اب تک نرگس بے پتا تھی، دوسری جانب بلقیس کے بارے میں بھی اب تک مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ کہاں ہے! پھر مجھے دلاور کی طرف سے فکر تھی، وہ جانے کیا قدم اٹھا بیٹھا تھا! اور ان تمام مسئلوں سے قطع نظر مجھے اپنے ان دشمنوں کا بھی خیال تھا جو میری تاک میں لگے ہوئے تھے۔ ریٹا ایسی عورت کا میرے پیچھے لگنا بے وجہ تو نہیں ہو سکتا تھا، یقیناً اس کے پیچھے کسی نہ کسی کا ہاتھ تھا۔

اپنی کار اسٹارٹ کر کے میں اسپتال کے گیٹ سے نکل آئی اور پھر اسے بے مقصد سڑکوں پر دوڑانے لگی، میری اس ''بے مقصدی'' کے پیچھے جو مقصد تھا، وہ جلد ہی پورا ہو گیا، ایک موٹر سائیکل میرے پیچھے لگی ہوئی تھی، عموماً میں ایسی بے رحمانہ حرکتوں سے گریز کرتی ہوں، لیکن اس وقت ایسا کرنا ہی پڑا، میں نے ایک دم کار کی رفتار بڑھا دی، نتیجتاً میرا تعاقب کرنے والے کو بھی ایسا ہی کرنا پڑا، پھر میں نے رفتار ایک دم کم کر دی، میں نے ایسا بڑی سرعت سے کیا تھا جس کی توقع یقیناً اسے نہیں ہوگی، وہ رفتار کم کرتے کرتے بھی میری کار کے قریب آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ایک خطرناک قدم اٹھا لیا۔ کار کو روک کر اسے ایک ہی لمحے بعد ریورس گیئر میں ڈال دیا۔ میں نے اسے خطرناک قدم اس لیے کہا کہ وہ سڑک ویران نہیں تھی، گاڑیاں آ جا رہی تھیں، وہ میری کار کے بالکل قریب آ گیا تو میں نے اسے سائیڈ ماری اور پھر گیئر بدل کر تیزی سے بائیں جانب جانے

والی ایک سڑک پر مڑ گئی، سائیڈ مارتے ہوئے میں نے بہر حال یہ خیال رکھا تھا کہ اس شخص کو زیادہ چوٹ نہ آئے میرا ضمیر اس واقعے پر اس لیے بھی کوئی زیادہ بوجھ محسوس نہ کر سکا کہ بہر حال اس شخص کا تعلق جرم پیشہ افراد ہی سے ہو سکتا تھا، اس کے باوجود میں نے اپنی اس حرکت کو بے رحمانہ ہی لکھا ہے، میرے اس احساس کو میری طبیعت کا خاصہ بھی کہا جا سکتا ہے، بعض معاملات میں مجھے شدید غضب ناک بننا پڑتا ہے، اس کا انحصار مجھے پیش آنے والے واقعات پر بھی ہے، گزشتہ چند دنوں سے میری زندگی جن ہنگامہ آرائیوں سے گزر رہی تھی، ایسا کم کم ہی ہوتا تھا۔

ان دنوں مجھے جو پے در پے واقعات پیش آ رہے تھے میں انہی پر غور کرتی ہوئی آپریشن سیل کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچ گئی، عموماً وہاں میرا قیام اسی ساؤنڈ پروف کمرے میں ہوتا تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں۔

کمانڈر نواز کو میری غیر متوقع آمد پر حیرت ہوئی کیونکہ اس کے علم و اطلاع کے بغیر اس عمارت میں کسی کا داخلہ ممکن نہیں تھا، وہ عمارت ایک ایسے محفوظ قلعے کی سی حیثیت رکھتی تھی جو ناقابل تسخیر ہو، اس کا بڑا سبب وہاں قیام کرنے والے تھے، وہ بہر حال مختلف لوگ تھے، لیکن نہایت قابل اعتماد اور میرے جاں نثار۔ مجھے ان کی صلاحیتوں پر فخر تھا۔

ساؤنڈ پروف کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے کچھ دیر کے لیے ایزی چیئر پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن سے ہر خیال کو جھٹک دیا، عموماً جب میں ذہنی طور پر تھکن یا الجھن محسوس کرتی تھی تو ایسا کرنے سے مجھے سکون مل جاتا تھا، اس وقت بھی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی، کچھ دیر کے ذہنی سکون نے مجھے ایک نئی تازگی بخش دی تھی، میں ایزی چیئر سے اٹھ کر انٹرکام کی طرف بڑھی اور پھر کمانڈر نواز سے رپورٹ لینے کے لیے سات نمبر پر انگلی رکھ دی۔

دوسری طرف سے کمانڈر نواز نے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔ ”جی فرمائیے!“

”سوسائٹی میں ہونے والے دھماکے کی تفصیلات کا علم ہوا؟“ میں نے سوال کیا۔

”ابھی تفتیش جاری ہے، صرف چند باتیں سامنے آ سکی ہیں، لیکن توقع ہے کہ جلد ہی......“

”جو کچھ اب تک معلوم ہوا ہے وہ بتاؤ!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا، اسی وقت میں نے ریسیور پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنی فون پر کمانڈر نواز سے کوئی شخص بات کرنا چاہتا تھا، میں نے اسی لیے کہا۔ ”پہلے تم فون ریسیو کر لو، میں ہولڈ کیے رہتی ہوں۔“

میں کچھ دیر انتظار کرتی رہی، کمانڈر نواز اپنے کسی ماتحت کو کوڈ ورڈز میں ہدایات دے رہا تھا، میں اس کی آواز واضح طور پر سن رہی تھی وہ کوڈ سمجھنا بھی میرے لیے دشوار نہیں تھا، میں اسی لیے چونک اٹھی، لیکن بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا، کمانڈر نواز نے کسی شخص کو آپریشن سیل کے ہیڈ کوارٹر لانے کا حکم دیا تھا۔

پھر جب کمانڈر نواز نے مجھ سے دوبارہ رابطہ قائم کیا تو پہلا سوال میں نے اسی شخص کے بارے میں کیا۔

”وہ ایک افریقی باشندہ ہے۔“ کمانڈر نواز نے بتایا۔

”افریقی!“ میں چونک اٹھی۔

”جی ہاں۔“ کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ ”آپ کا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا، ابھی کچھ دیر قبل ملک دلاور پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا، لیکن اس کوشش کو ناکام بنا دیا گیا، ان پر قاتلانہ حملہ کرنے والا فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور ہمارے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا، میں نے اسی لیے اسے یہاں لانے کا حکم دیا ہے۔“

”ٹھیک کیا تم نے۔“ میں بولی، پھر اسے تفصیل سے واقعہ بیان کرنے کے لیے کہا۔

”وہ افریقی ملک دلاور کے بیڈ کے ارد گرد منڈلا رہا تھا اور ہمارے آدمی اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔“ کمانڈر نواز پیش آنے والے واقعے کی تفصیلات بتانے لگا۔ ”پھر جیسے ہی اس نے بیڈ کے قریب جا کر زہریلی سوئی ملک دلاور کے بازو میں اتارنا چاہی عقب سے میرے ایک ماتحت نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی، پھر اسے قابو میں کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا، آپ کے علم میں ہے کہ سرفراز ان کاموں میں کتنا ماہر ہے! اس نے کلائی تھامتے ہی دوسرے ہاتھ سے اس افریقی کی گردن کی ایک نس دبا دی تھی وہ آواز بھی نہیں نکال سکا تھا، پھر اسے اسی حالت میں وہ لوگ وارڈ سے نکال لائے تھے، اس پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری تھی، اسے دیکھ کر لوگ یہی سمجھے ہوں گے کہ وہ سخت بیمار ہے اور سہارے کے بغیر چل نہیں سکتا، زہریلی سوئی جو افریقی کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی، وہاں سے اٹھا لی گئی ہے، اس کا تجزیہ کر کے یقینی طور پر کہا جا سکے گا کہ آیا کہ وہ واقعی زہریلی ہے یا قیاس غلط ہے، ویسے یہ واقعہ جس طرح پیش آیا ہے، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر کمانڈر نواز خاموش ہو گیا۔



''دوسری کوشش بھی کی جاسکتی ہے، اس لیے مزید چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں وہاں متعین افراد سے اپنے اس خدشے کا اظہار کر چکا ہوں۔ میں نے انہیں تاکید کر دی ہے کہ ڈاکٹروں اور نرسوں کے سوا کسی بھی مشتبہ شخص کو بیڈ کے قریب نہ جانے دیں، یوں بھی اس واقعے کے بعد مزید احتیاط کریں گے۔'' کمانڈر نواز جواباً بولا۔

''انہیں چاہیے تو یہی !...... بہرحال یہ بہت اچھا ہوا کہ اس الجھی ہوئی گتھی کا ایک سرا ہمارے ہاتھ آ گیا، اس سے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں، اگر اس کی زبان کھلوائی جاسکے، تم تو جانتے ہی ہو کہ ایسے افراد بہت سخت جان ہوتے ہیں۔''

''درست فرمایا! آپ نے ! پھر بھی پوری کوشش کی جائے گی کہ وہ سب کچھ اگل دے۔''

اس کے بعد میں نے کمانڈر نواز سے پھر وہی گفتگو شروع کر دی جو ادھوری رہ گئی تھی۔ ''تم مجھے سوسائٹی میں ہونے والے دھماکے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے والے تھے!'' میں نے کہا۔

''جی ...... جی ہاں۔'' کمانڈر نواز نے جواب دیا، پھر مجھے تفصیلات بتانے لگا، اب تک جو چند باتیں سامنے آئی تھیں، وہ بھی میرے نزدیک اہم تھیں۔

کمانڈر نواز سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا، اس پر سوچنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے وقت تو درکار تھا، اگر وقت کچھ اور مسئلے میری فوری توجہ کے مستحق تھے، انہی میں سے ایک مسئلہ بلقیس کا تھا کہ وہ کہاں گئی؟ کمانڈر نوا کی رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا، میں نے اسے مختصراً بلقیس کے بارے میں بتایا اور اسی کے ساتھ اپنے ایک خدشے کا اظہار بھی کیا۔

دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی، پھر کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔ ''آپ نے جس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ وہ بھی کہیں دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو، اس کا امکان تو ہے لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں، وہ بہرحال آپ کی تربیت یافتہ ہے، وہ اتنی آسانی سے......''

''سنو!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''نرگس بھی میری تربیت یافتہ تھی اور اب تک اس کا سراغ نہیں مل سکا، درصل آپ لوگ کبھی کبھی اوور اسٹیمیٹ کر جاتے ہیں۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ بلقیس کے بارے میں مجھ فوری طور پر معلوم ہونا چاہیے!'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرے لہجے میں قدرے سختی آ گئی تھی۔

''جی بہتر ہے۔''

پھر میں نے بغیر مزید کچھ کہے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا، کمانڈر نواز سے میرا بس اتنا ہی کہنا تھا، میرے لہ کی ہلکی سی سختی اس کے لیے ہمیشہ تازیانہ ثابت ہوتی تھی۔ ہر چند کہ ابھی اور بہت سے مسائل زیرِ غور تھے لیکن ا

الوقت یکے بعد دیگرے ہی انسے نمٹنا میرے لیے ممکن تھا، مسائل کے ہجوم میں کوئی بھی مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوتا، جب تک ایک ایک مسئلے پر صبر و تحمل سے سوچ بچار کر کے راہ عمل متعین نہ کی جائے، یہ وقت بھی میرے لیے ایسا ہی تھا، ہر طرف میرے جال پھیلے ہوئے تھے۔ اندازے اور لائحہ عمل کی ذرا سی بھی غلطی میرے لیے بھیانک نتائج کا سبب بن سکتی تھی۔

بلقیس کا معاملہ کمانڈر نواز کے سپرد کرنے کے بعد میرے ذہن کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا تو میں اس واقعے پر غور کرنے لگی جس کا بالواسطہ تعلق نرگس سے تھا۔ اس معاملے میں جو غیر ملکی سفارت خانہ ملوث تھا، اس کے ایک ذمہ دار فرد نے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کیا تھا۔ اس سفارت خانے سے متعلق ایک افریقی باشندہ پراسرار طور پر غائب ہو چکا تھا۔ سفارت خانے کے اس ذمہ دار فرد نے خیال ظاہر کیا تھا کہ اسے اغواء کر لیا گیا ہے۔ اس افریقی باشندے کی بازیابی کے سلسلے میں فوری طور پر انتظامیہ حرکت میں آ گئی تھی، یہ معاملہ کیونکہ ایک غیر ملکی اغواء کا تھا اور اس کا تعلق ایک سفارت خانہ سے تھا، اس لیے متعلقہ حکام نے تاخیر سے کام نہیں لیا، اسی دوران میں انہیں سفارت خانے کی جانب سے ایک اور اہم خبر ملی۔ سفارتخانے نے اپنے ذرائع سے کسی طرح یہ معلوم کر لیا تھا کہ اغواء کیے جانے والے شخص کو سوسائٹی کی ایک کوٹھی میں لے جایا گیا ہے۔ یہ دلاور کی کوٹھی تھی، پھر جب تک پولیس کی بھاری جمعیت وہاں پہنچی دلاور کی کوٹھی کے ایک حصے کو دھماکے سے اڑایا جاچکا تھا۔ کمانڈر نواز کی اطلاعات کے مطابق کوٹھی کا ایک ایک گوشہ دیکھنے کے باوجود اغواء کیا جانے والا افریقی باشندہ پولیس کو وہاں نہیں مل سکا تھا، نہ وہ زخمیوں میں تھا، نہ ہلاک ہونے والوں میں، کمانڈر نواز کو اس کے بعد پیش آنے والے حالات کا علم اب تک نہیں ہوسکا تھا، اس کے آدمی بہرحال بقیہ تفصیلات فراہم کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے۔

پولیس کے نزدیک یہ کارروائی کسی دہشت پسند گروہ کی بھی ہوسکتی تھی، لیکن ابھی تک وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ ایسے سنگین واقعے کے بعد دلاور کی طرف سے پولیس کی غفلت اس کی کوتاہی پر ہی محمول کی جاسکتی تھی۔ پولیس کو اسے اپنی حفاظت و نگرانی میں رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ دلاور کا نام بہرحال غیر ملکی کے اغواء میں ملوث تھا، اور ایک سفارت خانے نے اس کی نشاندہی کی تھی۔ دوم یہ کہ دلاور کی زندگی اس لیے بھی اہم تھی، اس سے پوچھ گچھ کی جاسکے۔ اگر میں حالات کے پیش نظر اس کی حفاظت کا بندوبست نہ کر دیتی تو اسے راستے سے ہٹایا جاچکا ہوتا، پولیس کی کارکردگی مصلحت یا رویے سے قطع نظر یہ معاملہ نرگس اور دلاور کی وجہ سے میرے لیے اہم تھا۔

حقائق کیا رہے ہوں گے، اس کا علم دلاور سے گفتگو کیے بغیر آسان نہیں تھا، کافی دیر غور و فکر کے بعد میں کم ازکم ایک نتیجے تو پہنچ ہی گئی، ان دنوں میں جن حالات سے نبرد آزما تھی، بظاہر نرگس کے اغواء کا معاملہ اس سے الگ معلوم ہوتا تھا۔ یہ کوئی اور ہی چکر لگتا تھا، کوئی اور ہی سازش جو ابھی کھل کر سامنے نہیں آئی تھی۔ اس سلسلے میں چند اہم نکات بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ اب میں انہی پر ازسرِنو غور کر رہی تھی، پہلا اہم نرگس کا ماضی تھا جس کی طرف دلاور نے خفیف سا اشارہ کیا تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے نرگس کی ماں اور اپا بھائی کی زندگی کو بھی خطرے میں محسوس کیا تھا۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کرنا، ممکن تھا کہ کچھ لوگ نرگس اور اس کے افراد خاندان کی زندگی کے لیے خطرہ ثابت ہوسکتے تھے۔ نرگس کے اغواء میں کیونکہ ایک افریقی باشندہ

سامنے آیا تھا،اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دشمنوں کا تعلق شمالی افریقہ کے ایک ملک سے ہے، دوسرا نکتہ یہ تھا کہ دلاور نے بھی فون پر مجھ سے ایک افریقی کی شناخت ہی کے متعلق بات کی تھی۔ پھر یہ کہ اسے قتل کرنے کی کوشش بھی ایک افریقی ہی نے کی تھی، اس معاملے میں بھی عبدالحمید خان درمیانی کڑی نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود کچھ کڑیاں ابھی نہیں مل رہی تھیں، میرا اور نرگس کا معاملہ اس طرح ایک دوسرے میں گتھا ہوا تھا کہ اسے الگ الگ پس منظر میں دیکھنا بظاہر مشکل معلوم ہو رہا تھا۔

سوچتے سوچتے میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر ساؤنڈ پروف کمرے سے نکل کر ڈیوٹی روم کی طرف بڑھنے لگی۔

مجھے ڈیوٹی روم کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر کمانڈر نواز ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھو بیٹھو!'' میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک کرسی پر نیم دراز سی ہو گئی۔

''میں ابھی آپ ہی سے رابطہ قائم کرنے والا تھا، انٹرکام پر! بلقیس کا سراغ مل گیا ہے۔'' کمانڈر نواز بتانے لگا۔ ''وہ اپنے فلیٹ پر تھی۔ میں نے......''

''کیا؟'' میں چونک اٹھی اور میری دخل اندازی سے کمانڈر نواز کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ ''اگر وہ بخیریت تھی تو اس نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے اس کی اطلاع کیوں نہیں دی؟'' مجھے بلقیس کی حماقت پر غصہ آنے لگا۔

''اس طرح گھر جا کر بیٹھ جانے کا کیا مطلب ہوا؟''

''ابھی کچھ دیر ہی پہلے فون پر مجھے یہ اطلاع ملی تھی میں یہ بتانے والا تھا کہ اسے بھی میں نے فوراً یہاں پہنچنے کا حکم دیا ہے، میرے آدمی کے ذریعے اب تک بلقیس کو یہ پیغام مل چکا ہوگا اور وہ چل دی ہوگی۔''

''ٹھیک کیا تم نے۔'' میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''اس سے بھی پیش آنے والے واقعے کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے گا۔ وہ لڑکی اتنی غیر ذمہ دار تو نہیں، کوئی وجہ ہی ہوگی......'' یہ کہہ کر میں کچھ سوچنے لگی، دراصل مجھے اس افریقی باشندے کا خیال آ گیا تھا جسے ہیڈ کوارٹر لایا جا رہا تھا، یہ وہی تھا جس نے دلاور کو ختم کرنا چاہا تھا۔

کمانڈر نواز پینل کے سامنے گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا جس کا رخ اس نے اب میری جانب کر لیا تھا۔ اس کے سامنے والی میز پر انٹرکام، تین ٹیلی فون، ٹرانسمیٹر وغیرہ رکھے تھے۔ انہی کے ذریعے وہ اس عمارت میں موجود افراد کے علاوہ اپنے ان آدمیوں سے بھی رابطہ قائم رکھے ہوئے تھا۔ جنہیں اس نے مختلف کام سونپ رکھے تھے، ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوتے ہی اس نے اپنی کرسی گھمائی اور دوسری جانب سے موصول ہونے والا پیغام سننے لگا۔

یہ پیغام سیل کے ان افراد کی طرف سے تھا جنہیں شیپرڈ اور شیفرڈ کی نگرانی پر مقرر کیا گیا تھا۔ اطلاع کے مطابق وہ دونوں جرمن سائنس دان آج ہی رات ایک فلائٹ سے اسلام آباد جا رہے تھے، کمانڈر نواز نے یہ اطلاع پانے کے بعد اپنے آدمیوں سے کچھ دیر انتظار کے لیے کہا اور پھر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''وہ دونوں کراچی میں ہیں یا ملک کے کسی بھی حصے میں، ان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔'' میں نے کمانڈر نواز کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

کمانڈر نواز نے اثبات میں سر ہلایا، پھر اپنے آدمیوں کو ضروری احکام دینے لگا، ممکن ہے میں ڈیوٹی روم یں نہ ہوتی یا اس عمارت کے علاوہ کہیں اور ہوتی جہاں فوری طور پر مجھ سے رابطہ قائم کرنا ممکن نہ ہوتا تو خود لمانڈر نواز کوئی فیصلہ کرتا، میری وہاں موجودگی نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ بہر حال اچانک ان دونوں ی اسلام آباد روانگی میرے لیے معنی خیز تھی۔

ابھی اس نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کیا تھا کہ انٹرکام گنگنا اٹھا۔ ''یس!'' اس نے ریسیور اٹھاتے ہی کہا، پھر پھ دیر بعد بولا۔ ''ویری گڈ! اسے نمبر تھری میں لے جاؤ اور یہاں ڈیوٹی روم میں...... ٹھیک ہے، میں کوئی ندوبست کرتا ہوں۔''

اس نے ریسیور رکھ دیا، پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

روم نمبر تھری سن کر ہی ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی، جن افراد کی زبان کھلوانا مقصود ہوتا تھا، اسے مارت کے اسی کمرے میں لے جایا جاتا تھا۔

''غالباً تم یہاں ڈیوٹی روم میں کسی اور شخص کو تعینات کر کے روم نمبر تھری میں اس افریقی کی زبان کھلوانے ے لیے جانا چاہتے ہو جسے سیل کے آدمی یہاں لے آئے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''جی ہاں۔'' اس نے جواباً کہا۔

''میرے خیال میں فی الحال تمہاری یہاں موجودگی زیادہ ضروری ہے، یہ مسئلہ میں خود نمٹاتی ہوں۔'' میں لرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ کچھ تھکی ہوئی سی معلوم ہو رہی ہیں، آرام کریں، میں......''

''میری فکر نہ کرو اور چوکنا رہو، آج کی رات خاصی ہنگامہ خیز معلوم ہوتی ہے، ممکن ہے جاگتے ہوئے مجھے ی صبح ہو جائے۔ اوکے!'' یہ کہتی ہوئی میں ڈیوٹی روم سے نکل آئی۔

کسی کی زبان کھلوانے کے لیے عموماً جسمانی تشدد کو ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ پولیس والوں کی زبان میں اسے ھرڈ ڈگری کہا جاتا ہے، مجھے اس سے انکار نہیں کہ بعض حالات میں یہی واحد راستہ ہوتا ہے مگر اس سلسلے میں میرا نقطہ نظر ذرا مختلف ہے میں کوشش کرتی ہوں کہ اس کی نوبت نہ آئے، مجھے اسی لیے دوسرے ذرائع استعمال کرنا تے ہیں۔ سیل سے وابستہ میرے تمام آدمی اس سے واقف ہیں، ایسے حالات میں ان کی کوشش بھی یہی ہوتی ، یہ مشکل کام تو ضرور ہے مگر ناممکن نہیں کہ کسی پر جسمانی تشدد کیے بغیر سب کچھ اگلوا لیا جائے۔ عام طور پر اس انحصار اس شخص پر بھی ہوتا ہے جس کی زبان کھلوانا مقصود ہوتی ہے۔ روم نمبر تھری کی طرف بڑھتے ہوئے میں ں سوچ رہی تھی کہ اس افریقی باشندے کے ساتھ کیا طریقہ آزمایا جائے؟

عمارت میں بظاہر ہر طرف سکون اور سناٹا تھا لیکن مجھے علم تھا کہ جن لوگوں کو بیدار ہونا چاہیے، وہ پوری طرح ار ہوں گے۔ عمارت میں کسی کی نقل و حرکت ان کی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی، میں اطمینان سے قدم دم چلتی روم نمبر تھری کے دروازے تک پہنچ گئی اور مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی، اندر روشنی نظر آ ای تھی۔ چند ہی لمحے بعد آہستگی سے دروازہ کھول دیا گیا اور میں اندر داخل ہو گئی۔

کمرے میں سیل سے متعلق دو افراد موجود تھے، وہ بذات خود مجھے وہاں دیکھ کر چونک اٹھے جس کا اظہار ان

کے چہروں سے واضح طور پر ہوا۔ انہیں غالباً یہ توقع رہی ہوگی کہ کمانڈر نواز یا سیل کا کوئی اور ذمہ دار شخص وہاں آئے گا۔ میں نے ان سے کچھ کہے سنے بغیر سامنے نگاہ اٹھائی۔ آپریشن ٹیبل سے مشابہ ایک لمبی سی میز پر وہ افریقی باشندہ چمڑے کی بیلٹوں سے بندھا ہوا تھا، اس کا چہرہ میری ہی طرف تھا، میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں ہیں۔ چہرہ شناسی بھی ایک علم ہے، میں بغور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی، چند ہی لمحے بعد میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔

میں تیزی کے ساتھ سیل کے دونوں ارکان کی طرف پلٹی اور انہیں ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے چیخ اٹھی۔ "تم لوگ احمق ہو! تم اسے یہاں کیوں لے آئے؟" میں نے دانستہ انگریزی کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ "تم لوگ کچھ سمجھتے ہی نہیں! میں تو خود اس شخص کو راستے سے ہٹانا چاہتی ہوں، کھولو اسے اور چلے جاؤ یہاں سے!

پھر ان دونوں نے وہی کیا جو میں چاہتی تھی، وہ چلے گئے تو میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا پھر اس افریقی کی طرف پلٹی جو حیران پریشان سا میز کے قریب کھڑا تھا، کمرے میں ایک جانب چند کرسیاں دیوار سے لگی ہوئی رکھی تھیں۔ میں نے اس افریقی کو ان میں سے ایک کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر اس طرح اطمینان سے بیٹھ گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو، اسے یقیناً اسے گمان بھی نہ ہوگا کہ میں اس کی طرف سے پوری طرح چوکنا ہوں۔

"آؤ بیٹھ جاؤ نا!" میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ "میرے خیال میں تم انگریزی سمجھ لیتے ہوگے۔" میری آواز پرسکون تھی۔

"یا..... یس!" وہ پہلی بار بولا۔ اس کے چہرے سے شدید الجھن کا اظہار ہو رہا تھا، بہرحال وہ میرے کہنے پر آگے بڑھ آیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے کہا۔ "میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گی کہ تم کون ہو اور کیوں اس شخص کو قتل کر دینا چاہتے تھے جس کا نام دلاور ہے! میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ اور خاموشی کے ساتھ اسے موت کی نیند سلا دو، اب میرے آدمی تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ غلطی ہوگئی ورنہ اب تک ...... خیر چھوڑو! یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں آزاد کر دوں تو کیا تم میرا یہ کام کر سکتے ہو؟" یہ سوال کرتے ہوئے میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

چند لمحے وہ کچھ نہ بولا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید اس غیر متوقع صورتحال پر غور کر رہا ہے، میں نے مداخلت نہ کی اور اس کے بولنے کی منتظر رہی۔

"تم خود اپنے آدمیوں سے بھی تو یہ کام لے سکتی ہو۔" اس نے یہ کہہ کر میری طرف نگاہ اٹھائی۔

"یقیناً!" میں نے جواب میں کہا، مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ یہ بات ضرور کرے گا، ذرا توقف کے بعد میں پھر بولی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں کسی سبب خود سامنے آنا نہیں چاہتی، تمہیں شاید معلوم نہیں کہ بظاہر وہ شخص دوست ہے۔"

یہ سن کر وہ چونک اٹھا، پھر کہنے لگا۔ "تم عجیب عورت ہو، آج تک کسی ایسی عورت سے میرا سابقہ نہیں پڑا پھر..... پھر یہ بات بھی میرے لیے حیران کن ہے کہ تم مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھ رہیں!..... اور شاید تمہیں یہ بھی

نہیں معلوم کہ میں کتنا خطرناک آدمی ہوں!..... اور یہ کہ تم نے یہاں سے اپنے آدمیوں کو نکال کر کتنی بڑی غلطی کی ہے!" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ "تم نے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا اور نہ پوچھنا چاہتی ہو، مگر میں یہاں سے اس طرح نہیں جاؤں گا! تمہیں بتانا پڑے گا کہ تم کون ہو؟ اور....."

میں زور سے ہنس پڑی اور اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ پھر میں نے کہا۔ "میں کون ہوں؟ یہ تو مجھے وہ بھی نہیں معلوم! تم مجھے بہت بڑے احمق معلوم ہوتے ہو کہ یہ سوال کر رہے ہو!" میرا مقصد اسے طیش دلانا تھا اور مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔

"وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، میرے اور اس کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

"احمق میں نہیں تم ہو!" وہ غصے میں بولا۔ "اور تمہیں ابھی اپنی حماقت کا اندازہ ہو جائے گا!" یہ کہتے ہی وہ کسی ایسے باز کی طرح مجھ پر جھپٹا جو کسی معصوم پرندے کو اپنے خونیں پنجوں میں لے لینا چاہتا ہے۔

میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھی، بس یہ ہوا کہ میں انتہائی سرعت کے ساتھ کرسی کھسکا کر ایک طرف ہو گئی وہ اپنی ہی جھونک میں زمین پر آ رہا۔

"اٹھو! ایک بار پھر کوشش کرو!" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "پھر کوشش کرو!..... ہاں شاباش اٹھو! تم ایک مرد ہو اور میں ایک کمزور عورت! تم بہت آسانی سے مجھ پر قابو پا سکتے ہو!"

اس دوران میں وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور اب مجھے بڑی خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا، زمین پر گرنے کی وجہ سے اس کی پیشانی کی کھال ذرا سی چھل گئی تھی، ایک بار پھر اس نے نپے تلے انداز میں مجھ پر چھلانگ لگائی اور اس مرتبہ بھی میں نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا، اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا ورنہ اب تک وہ اسے آزما چکا ہوتا یا اگر کوئی ہتھیار رہا ہوگا تو میرے آدمیوں نے نکال لیا ہوگا۔

یہ تماشا زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکا، اس کے اعصاب جلد ہی جواب دینے لگے، پھر یہ کہ میرے پاس بھی وقت کم تھا، ابھی مجھے اور معاملات بھی نمٹانا تھے، اب تک وہ میرے جسم کو چھونے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"سنو!" معاً میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اب میری باری ہے!"

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا بری طرح ہانپ رہا تھا، اس نے بڑی مظلوم سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور ایک بار پھر میرا ارادہ بدل گیا۔

"تم بہت تھک چکے ہو، بیٹھ جاؤ!" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں!..... میں..... نہیں تھکا! میں ابھی اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکتا ہوں!" یہ ایک ہارے ہوئے شخص کی آواز تھی۔

"اچھا تو پھر کھڑے رہو۔" میں مسکرائی۔ "لیکن اب خود تم نے صورتحال بگاڑ دی ہے، پہلے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ تم سے کوئی سوال نہیں کروں گی مگر اب ایسا نہیں ہوگا! اب میں تم سے وہ کام بھی لینا نہیں چاہتی جس کے لیے کہا تھا، کیونکہ تم اپنا اعتماد کھو چکے ہو، میں اب اپنے طور پر اس معاملے سے نمٹوں گی۔" یہ کہہ کر میں چند ہی لمحے رکی، پھر اپنا لہجہ بدل لیا۔ "غالباً" تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے اب تک کہ خطرناک کون ہے! تم یا میں؟ یہ میرے اختیار میں ہے کہ تمہاری لاش کا سراغ بھی کسی کو نہ ملے! سمجھ رہے ہو میری بات کا مطلب؟"

"تم دھمکی دے رہی ہو مجھے؟"

"نہیں، یہ صرف دھمکی نہیں ہے! تم غلط سوچ رہے ہو۔ تمہاری زندگی یا موت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں اب اپنے چند سوالوں کا جواب چاہتی ہوں یقین کرو کہ اگر تم نے مجھے مایوس نہیں کیا تو اس عمارت سے زندہ سلامت نکل جاؤ گے ورنہ دوسری صورت میں......" میں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں...... میں تمہارے کسی...... کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا...... بالکل نہیں!" وہ میری بجائے جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھا، اس کے نتھنے پھول اور پچک رہے تھے۔

"ٹھیک ہے، تمہاری مرضی! میں نے تو تم سے صرف ایک شریفانہ معاہدہ کرنا چاہا تھا۔" میں نے سکون کے ساتھ کہا۔

"معاہدہ!...... کیسا معاہدہ؟" وہ چونک کر بولا۔

"یہ میرے اور تمہارے درمیان ایک شریفانہ معاہدہ ہی تو ہے کہ اگر تم نے میرے سوالوں کے جواب دے دیئے تو میں تمہیں یہاں سے نکل جانے دوں گی!"

"ایک شرط ہے" وہ کچھ دیر بعد کہنے لگا۔

"بولو!"

"میں جو کچھ خود بتانا چاہوں گا، بتا دوں گا، تم کسی سوال کا جواب پانے کے لیے اصرار نہیں کرو گی۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف متوقع نظروں سے دیکھنے لگا۔

میرے نزدیک یہ اس کی نصف شکست تھی، ابھی ا[illegible] میں مزاحمت کا جذبہ باقی تھا۔

"اس کا انحصار میرے سوال پر ہو گا، قبل از وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تم سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کر سکتی!" میں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ "میں اچھی طرح تمہارے مسئلے کو سمجھ رہی ہوں، تم ان لوگوں کے نام چھپانا چاہتے ہو گے جن کے لیے کام کر رہے ہو اور تم ایسا کیوں چاہتے ہو یہ بھی مجھے خبر ہے!"

"تمہیں...... تمہیں کیا معلوم کہ میں...... میں کیا چاہتا ہوں اور کیا نہیں چاہتا!"

"اگر تم مجھ سے واقف ہوتے تو ہرگز یہ نہ کہتے!"

میں نے ہنس کر کہا، پھر بولی۔ "بتاؤں تمہیں اس کی وجہ؟"

"ہاں بتاؤ!" وہ اس طرح بولا جیسے میری ذہانت کا امتحان لے رہا ہو۔

"تمہیں خطرہ ہے کہ اگر تمہاری زبان پر ان لوگوں یا اس شخص کا نام آ گیا تو تم زندہ نہیں بچو گے۔ ہے نا یہی بات! ممکن ہے تم زبان سے اس بات کا اقرار نہ کرو لیکن تمہارا دل اس وقت ضرور یہ گواہی دے رہا ہو گا کہ میں غلط نہیں کہہ رہی!" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"تم...... تم واقعی بہت خطرناک ہو، مجھ...... مجھ سے بھی زیادہ خطرناک اور...... ذہین!" اس نے بالواسطہ اعتراف کر لیا کہ میرا قیاس درست تھا۔ اس کی مزاحمت اب دم توڑتی جا رہی تھی۔

پھر کچھ ہی دیر میں مزید دو ایک نفسیاتی حربوں نے اسے مکمل شکست پر مجبور کر دیا، میں اس پر جسمانی تشدد کیے بغیر بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔

اس افریقی باشندے نے مجھے جو داستان سنائی اس سے کم از کم ایک بات کی ضرور وضاحت ہو گئی کہ اس معاملے میں شمالی افریقہ کے اس ملک کا سفارت خانہ براہ راست ملوث نہیں تھا، جس پر اب تک مجھے شک تھا، یہ معاملہ کچھ اور ہی رخ اختیار کر رہا تھا۔ ممکن ہے اس نے کوئی بات مجھ سے چھپا بھی لی ہو جو اس کے حق میں نقصان دہ ہوتی لیکن اس سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، یہ اندازہ تو مجھے پہلے ہی سے تھا کہ وہ شخص محض درمیانی کڑی ہے۔ اسے پورا قصہ معلوم نہیں ہو گا، اصل آدمی کوئی اور ہی تھا، میرے خیال میں یہ وہی شخص تھا جو نرگس کو لی مارکیٹ والی کوٹھی سے لے گیا تھا اور جسے بلقیس نے دیکھا تھا، ہر چند کہ وہ سفارت خانے میں کسی بڑے عہدے پر نہ تھا لیکن اس کی شخصیت میری نظر میں بڑی حد تک پراسرار ہو چکی تھی۔ اس شخص نے اس افریقی باشندے کو اپنا آلہ کار بنا کر دلاور کو ختم کرانا چاہا تھا، اس کے لیے اس نے ایک بڑی رقم خرچ کی تھی۔

جس افریقی باشندے کی اس نے اس سلسلے میں خدمات حاصل کی تھیں اور جو اس وقت قبضے میں تھا، افریقہ کی ایک دہشت گرد تنظیم کا رکن تھا، اس کے بقیہ ساتھیوں سے بھی اکثر بھاری معاوضے پر کام لیا جاتا رہا تھا، دلاور کی کوٹھی پر دستی بم پھینکنے والا بھی یہی دہشت گرد گروہ تھا، اسی گروہ کے افراد میں سے ایک دلاور کے ہتھے چڑھ گیا تھا، اپنے اسی ساتھی کو دلاور کی قید سے رہائی دلانے کے لیے اس گروہ نے دلاور کی کوٹھی پر حملہ کیا تھا، افراتفری اور ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے ساتھی کو نکال لے گئے تھے۔

یہ سارا معاملہ تو کھل کر سامنے آ گیا تھا لیکن ابھی چند باتیں میرے لیے الجھن کا سبب بنی ہوئی تھیں، ان میں سرفہرست یہ مسئلہ تھا کہ سفارت خانے کے ایک ذمہ دار افسر نے اعلیٰ حکام سے اپنے ایک آدمی کے اغواء کی کہانی کیوں بیان کی؟ افریقی باشندے کے بیان کے مطابق دلاور کی قید میں اس کا ایک ساتھی تھا جس کا کوئی تعلق سفارتخانے سے نہیں تھا۔

سفارتخانے سے متعلق پراسرار شخص کیا کھیل کھیل رہا تھا اور کیوں؟ اس سوال کا جواب مجھے دلاور ہی سے مل سکتا تھا، جب تک مجھے دلاور سے نرگس کے ماضی کا علم نہ ہو جاتا کسی نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

وہ افریقی باشندہ جب پوری کہانی بیان کر چکا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ مزید کچھ نہ بتا سکے گا تو میں اچانک بجلی کی طرح کوند گئی۔ میرا اچا تلا ہاتھ اس کی کنپٹی پر پڑا اور وہ لہرا کر زمین پر آ رہا۔ اب کم از کم ایک گھنٹے سے پہلے اس کا ہوش میں آنا ممکن نہیں تھا، میں نے اتنی تیزی سے اس پر حملہ کیا تھا کہ وہ سنبھل نہ سکا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ بظاہر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی مطمئن و پرسکون عورت ایک دم اسے ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے پر مجبور کر دے گی۔

روم نمبر تھری میں بھی انٹر کام موجود تھا، میں نے اس پر کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کیا، اس سے پہلے میں اس افریقی باشندے کی جیبوں سے برآمد ہونے والے کاغذات پر قبضہ کر چکی تھی۔

"کمانڈر نواز!" میں نے رابطہ ملتے ہی اسے مخاطب کیا۔ "یہاں روم نمبر تھری میں وہ افریقی باشندہ بے ہوش پڑا ہے، اسے یہاں سے اٹھوا کر شہر کے کسی دور دراز علاقے میں پھنکوا دو۔"

"بہتر ہے، مگر......"

"بلقیس پہنچ گئی؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

"جی ہاں۔ وہ میرے پاس ڈیوٹی روم میں ہے۔"

"اسے ساؤنڈ پروف کمرے میں میرے پاس بھیج دو، میں یہاں سے وہیں جارہی ہوں۔" میں نے حکم دیا، پھر کچھ سوچ کر کہا۔ "یقیناً تمہارے آدمیوں نے اس افریقی باشندے کو یہاں لاتے ہوئے کسی حماقت کا ثبوت نہیں دیا ہوگا!"

کمانڈر نواز میرا اشارہ سمجھ گیا اور بولا۔ "جی ہاں، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔"

میں اس کا جواب سن کر مطمئن ہوگئی، پھر "اوکے" کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

میں روم نمبر تھری سے نکل کر ساؤنڈ پروف کمرے میں پہنچ گئی اور دانستہ اس کا دروازہ کھلا رہنے دیا، وہاں پہنچتے ہی میں نے انٹرکام پر کچن سے رابطہ قائم کر کے کچھ توس اور کافی لانے کا حکم دیا، مجھے اب بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔

بلقیس کو ڈیوٹی روم سے میرے پاس پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ میں نے اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار دیکھ لیے تھے، یقیناً کمانڈر نواز نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس سے خفا ہوں وہ بہت ذہین، باحوصلہ اور پیاری لڑکی تھی، عموماً اس سے ایسی حماقتیں سرزد نہیں ہوتی تھیں، یہ سوچ کر اس نے فوری طور پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیوں نہیں کیا، اس کی کوئی نہ کوئی وجہ رہی ہوگی، میں نے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں اور پہلے سب جان لینا ضروری سمجھا۔

"بلقیس!" میں نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔ "کیا واقعی کوئی ایسی خاص وجہ تھی جو تم نے مجھے تاریکی میں رکھا؟ تمہیں شاید اندازہ نہ ہو کہ میں تمہارے لیے کتنی پریشان تھی!"

"یقیناً مجھے...... مجھے معلوم تھا کہ...... کہ...... مگر......"

بلقیس کی آواز بھاری تھی۔

"کہو، کیا بات ہے؟" میں نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔

"میں جب گھر...... گھر واپس پہنچی تو...... میری امی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ وہ...... وہ دراصل ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں، انہیں فوری طور پر کارڈیو ویسکلر لے جانا پڑا، میں اتنی...... امی کی طبیعت سے اتنی بے حواس ہوگئی تھی کہ...... کہ مجھ سے...... مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا، میں معذرت خواہ ہوں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

"بے وقوف ہو تم!" میں نے اسے محبت سے ڈانٹ دیا۔ "یہ کوئی معذرت کی بات ہے! اب کیا حال ہے تمہاری امی کا؟"

"قدرے بہتر ہیں، انہیں ایڈمٹ نہیں کیا گیا کیونکہ ان کا بلڈ پریشر نارمل کی طرف آنے لگا تھا، بہرحال جس ڈاکٹر کے زیر علاج ہیں اس نے دوائیں دے دی ہیں۔"

"گھر پر ان کی نگہداشت کے لیے اس وقت تمہارا چھوٹا بھائی ہوگا!"

"جی۔" وہ بولی۔

"کوئی تشویش طلب بات تو نہیں ہے نا! اگر ایسی کوئی بات ہے تو تم کچھ دن کے لیے چھٹی لے سکتی ہو۔"

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ورنہ میں...... میں عرض کر دیتی۔"

"بہرحال فکر نہ کرنا اور جو بھی مسئلہ ہو مجھے ضرور بتانا۔" یہ کہہ کر میں نے طویل سانس لیا، پھر بولی۔ "میں تمہاری طرف سے اس لیے فکرمند تھی کہ تمہیں ملک دلاور کی کوٹھی پر بھیجا تھا اور وہاں جو کچھ ہوا یقیناً تمہارے علم میں آچکا ہوگا۔"

"جب دھماکہ ہوا تو میں خود وہاں موجود تھی۔" بلقیس نے بتایا۔

"ہر چند کہ میں تمہیں یہاں زیادہ دیر روکنا نہیں چاہتی، لیکن مختصراً تمہاری رپورٹ ضرور سننا چاہوں گی، پھر کمانڈر نواز تمہیں کسی گاڑی میں تمہارے گھر پہنچوا دے گا۔"

"آپ کے حکم کے مطابق میں فوراً ہی روانہ ہوگئی تھی۔" بلقیس بتانے لگی۔ "چلتے وقت آپ نے کہا تھا کہ آپ وہاں موجود ہوں گی، لیکن وہاں پہنچی تو آپ نہیں ملیں، میں نے ملک دلاور کو اپنا نام بتایا تو وہ چونک اٹھے۔ میں نے حیرت کی وجہ پوچھی تو وہ ٹال گئے، اپنے بارے میں انہیں میں نے یہی بتایا تھا کہ آپ کی فرم میں ملازم ہوں، انہوں نے نرگس کے اغواء کے متعلق مجھ سے کرید کرید کر بہت سی باتیں معلوم کرنا چاہیں، ہر چند کہ میں نے محتاط انداز میں جوابات دیئے، لیکن شاید وہ مطمئن نہیں ہوئے، میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ میرے بارے میں شاید ان کی آپ سے کوئی بات ہوئی تھی، انہیں میں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ آپ کو مجھ سے پہلے وہاں پہنچنا تھا تو وہ کچھ فکرمند سے ہوگئے جب خاصی دیر گزر گئی اور آپ نہ آئیں تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم اس افریقی باشندے کو پہچان سکتی ہو جو نرگس کے اغواء میں ملوث تھا؟ میں نے محتاط رویہ اختیار کیا اور بولی آپ کی آمد سے پہلے میں ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی، اس کے بعد وہ ٹھیک ہے کہہ کر ڈرائنگ روم سے چلے گئے، مجھ سے انہوں نے آپ کا انتظار کرنے کے لیے کہا تھا، ملک دلاور کو گئے دس پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ اچانک زبردست دھماکہ ہوا جیسے کسی نے کوٹھی پر دستی بم پھینکا ہو، اسی کے ساتھ لائٹ آف ہوگئی، خطرے کی بو سونگھتے ہی میں انتہائی تیزی کے ساتھ وہاں سے نکل آئی، پھر کوٹھی سے باہر آتے ہی میں اس ہجوم میں شامل ہوگئی جو دھماکے کی آواز سنتے ہی......"

"ٹھیک ہے سمجھ گئی میں!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پھر تم نے اپنے طور پر معلوم کیا ہوگا کہ وہاں کیا واقعہ گزرا ہے۔ اس کے بعد پولیس کی آمد کے ساتھ ہی تم نے وہاں سے نکل جانا ہی غنیمت سمجھا ہوگا۔"

"جی...... جی ہاں بالکل! بس اس وقت مجھ سے ایک غلطی ہوگئی اور اس کا سبب میرے منتشر حواس تھے، مجھے فوری طور پر اس واقعے کی اطلاع ہیڈ کوارٹر کو دے دینا چاہیے تھی، میں نے سوچا کہ پہلے گھر جا کر......"

"ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا، اسی وقت خانساماں کمرے میں داخل ہوا، میرے اشارے پر وہ ٹرے میز پر رکھ کر جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا اور بلقیس سے پوچھا۔ "تم نے کھانا کھالیا؟"

"جی ہاں، کھانا کھا کر ہی گھر سے چلی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"چائے یا کافی پیو گی؟"

"شکریہ۔ اگر مجھ سے مزید......"

"ہاں تم جاؤ! ضرورت ہوئی تو میں خود تم سے رابطہ قائم کرلوں گی۔ کل تمہیں دفتر آنے کی ضرورت نہیں،

اپنی امی کے پاس رہو۔"

"شکریہ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی اور پھر میں نے خانساماں کو بھی جانے کا اشارہ کر دیا۔

کافی پینے کے بعد میں نے گھڑی میں وقت دیکھا، شب نصف سے زیادہ گزر چکی تھی، دن بھر کی ہنگامہ خیز بھاگ دوڑ نے مجھے تھکا دیا تھا لیکن ابھی نیند میری آنکھوں سے دور تھی، اس عمارت کا یہ ساؤنڈ پروف کمرا کبھی کبھار میرے استعمال میں رہتا تھا، اس لیے میری ضرورت کی ہر چیز وہاں رہتی تھی، میں کیونکہ وہ رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کر چکی تھی، اس لیے الماری سے شب خوابی کا لباس نکال لیا، لباس تبدیل کر کے میں نے انٹرکام پر خانساماں سے برتن لے جانے کو کہا، پھر کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کیا۔

"بلقیس گئی؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"جی۔ میں نے اسے کار میں اس کے......"

"ٹھیک! کوئی تازہ رپورٹ؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

"جی نہیں۔"

"ملک دلاور کے بارے میں مجھے فوری رپورٹ چاہیے کہ اب اس کی کیا حالت ہے؟ دوم یہ کہ لی مارکیٹ والی عمارت کے بارے میں کچھ معلوم ہوا وہ کس کی ملکیت ہے؟"

"جی ہاں۔" کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ "عموماً وہ عمارت خالی ہی پڑی رہتی ہے، اس کا مالک عبدالحمید خاں کا ایک کاروباری دوست ریاست علی ہے۔"

"اور وہ نرجس والے معاملے کا کیا بنا؟ یہ وہی لڑکی ہے جو مجھے لی مارکیٹ والی عمارت میں ملی تھی، وزارت دفاع کے ایک افسر سمیع اللہ کی بیٹی جسے اغوا کر لیا گیا تھا! سمجھ گئے؟"

"جی ہاں، جی ہاں!" کمانڈر نواز فوراً بولا۔ "آپ نے یہ بھی دریافت کرایا تھا کہ سمیع اللہ کا جھکاؤ دائیں بازو کی طرف ہے یا بائیں بازو کی طرف اور یہ کہ عبدالحمید خاں سے اس کے تعلقات کیسے ہیں! مجھے یاد ہے سب کچھ۔ اس سلسلے میں ابھی تفتیش جاری ہے، ہاں ابھی تک یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ نرجس کو پولیس برآمد نہیں کر سکی۔"

"شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالحمید خان نے نرجس کو لی مارکیٹ والی عمارت سے کہیں اور منتقل کر دیا ہے، جو لوگ عبدالحمید خان کی نگرانی کر رہے ہیں، انہیں ہدایت کر دو کہ وہ عبدالحمید خان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھیں، نرجس کے اغوا کا سبب کوئی بھی رہا ہو، اس سے قطع نظر عبدالحمید خان ایک بدکردار شخص ہے نرجس کو جہاں کہیں بھی رکھا گیا ہوگا، عبدالحمید خاں اس سے ملنے کی کوشش ضرور کرے گا، تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

"جی۔" کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ "میں عبدالحمید خان کی نگرانی کرنے والوں کو مزید تاکید کر دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر کمانڈر نواز نے کچھ جھجکتے ہوئے مجھ سے اس افریقی باشندے کے متعلق پوچھا جسے بے ہوشی کی حالت میں میرے حکم پر شہر کے کسی دور دراز علاقے میں پھنکوانے کے لیے بھیجا جا چکا تھا۔

کمانڈر نواز کے جھجکنے کا سبب میں سمجھتی تھی، وہ میرا مزاج داں تھا، جو بات میں اسے خود نہیں بتاتی تھی اسے پوچھنے سے عموماً گریز کرتا تھا۔

میں نے اسے مختصراً وہ تمام باتیں بتا دیں جو افریقی باشندے سے معلوم ہوئی تھیں، پھر بولی۔ "جب تک ملک دلاور سے گفتگو نہ ہو جائے فی الحال میں اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتی۔"

"یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔" کمانڈر نواز میری تائید میں بولا۔ پھر کہنے لگا۔ "دہشت گردوں کے اس گروہ کے بارے میں آپ نے کوئی فیصلہ کیا؟"

"یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ اس گروہ سے متعلق تمام ارکان کیونکہ غیر ملکی ہیں اور ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں، اس لیے جلد ہی ان کا بندوبست کر دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر میں نے کمانڈر نواز کو ان کاغذات کے متعلق بتایا جو افریقی باشندے سے مجھے حاصل ہوئے تھے، پھر کہا۔ "اس سلسلے میں میرا بس ایک اشارہ کافی ہوگا، کچھ اور نہیں تو ان لوگوں کو یہ ملک تو چھوڑنا ہی پڑے گا! اور یہ ضروری ہے، کل کلاں کو ایسے افراد کوئی اور مسئلہ بھی کھڑا کر سکتے ہیں۔ صبح ان کا بندوبست ہو جائے گا، بے فکر رہو! تم فی الحال مجھے ملک دلاور کے بارے میں رپورٹ دو، جتنی جلد ممکن ہو، اگر اسے ہوش آ گیا ہے تو میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہوں گی۔"

"میں ابھی اپنے آدمیوں سے بات کر کے بتاتا ہوں، کوئی اور حکم؟"

"نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

پھر تقریباً دس پندرہ منٹ بعد ہی کمانڈر نواز مجھے انٹرکام پر بتا رہا تھا کہ ملک دلاور ابھی تک انجکشن کے زیر اثر سو رہا ہے، اب صبح ہی اس سے کچھ پوچھ گچھ یا گفتگو ممکن ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ ملک دلاور کی حفاظت کا مزید بندوبست کر دیا گیا ہے، اب اس کے قریب پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ سیل کے ایک رکن نے خود کو ملک دلاور کا عزیز ظاہر کر کے ملک دلاور کے قریب رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔

"ویری گڈ!" میں نے تعریف میں بخل سے کام نہ لیا۔ "تمہارے آدمی اچھے جا رہے ہیں، لیکن یہ خیال رہے کہ ملک دلاور کے ہوش میں آنے کے بعد تمہارے آدمی کو وہاں سے غائب ہو جانا چاہیے۔"

"جی۔ میں اس تک یہ ہدایت پہنچا چکا ہوں۔"

کیپٹن شاد نے کوئی رپورٹ نہیں دی اب تک؟ کسی نے میری کوٹھی میں داخل ہونے کی کوشش تو نہیں کی؟"

"اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور مجھے مطلع کرتا، ویسے آپ کا حکم ہو تو میں......"

"نہیں رہنے دو۔" میں بول اٹھی۔ "تمہارا خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے، میں سوچ رہی ہوں کہ مجھے اب سو جانا چاہیے۔ خلاف توقع ہر معاملہ صبح تک کے لیے ٹل گیا ہے، ویسے کوئی اہم مسئلہ ہو تو تم مجھے بلا جھجک جگا سکتے ہو، ہاں صبح آٹھ بجے تک مجھے ضرور جگا دینا۔!"

"آپ آرام کریں، اگر کوئی مسئلہ ہوا تو میں سنبھال لوں گا۔"

"تھینک یو!" یہ کہہ کر میں نے انٹرکام ریسیور کریڈل پر رکھا اور سونے کی تیاری کرنے لگی۔

میری ہدایت کے مطابق دوسرے دن صبح آٹھ بجے کمانڈر نواز نے مجھے جگا دیا، نیند گہری تھی مگر انٹرکام کی مدھم اور مسلسل بیل نے مجھے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا، میں نے قریبی میز پر رکھا ہوا انٹرکام قریب کیا، پھر دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔

"شکریہ کمانڈر!" میں نے ریسیور اٹھاتے ہی کہا، پھر بولی۔ "رپورٹ پلیز!"

"ملک دلاور کو ہوش آ چکا ہے۔" کمانڈر نواز نے بتایا۔

"کب ہوش آیا؟"

"صبح سات بجے کے قریب۔"

ڈاکٹروں کی رپورٹ کیا ہے، معلوم کیا؟"

"ڈاکٹر تو انہیں مزید اسپتال میں رکھنا چاہتے ہیں مگر وہ بضد ہیں کہ آرام ہی کرنا ہے تو گھر پر بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"پھر؟"

"وہ ممکن ہے انہیں دوپہر تک چھٹی مل جائے۔"

"ہوں!" میں سوچنے لگی، پھر ذرا توقف سے بولی۔ "یقیناً تم کیپٹن شاد سے بھی رپورٹ لے چکے ہو گے!"

"جی"۔ وہ بولا۔ "وہاں حالات معمول پر ہیں، کسی نے بھی رات کو کوٹھی میں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔"

مجھے یہ سن کر اطمینان ہوا، پھر میں نے کہا۔ "تمہارا ماتحت عثمانی تم سے کب آ کر چارج لے گا؟"

"وہ آ چکا ہے، مگر میں خود ہی رک گیا تھا تا کہ آپ کا حکم ہو تو میں یہاں مزید......"

"نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں، تم جا سکتے ہو، اسے چارج دے کر! خود میں بھی یہاں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔ خدا حافظ!" یہ کہتے ہی میں نے ریسیور رکھ دیا۔

پھر نہا کر لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے ناشتے میں دیر نہیں کی، میں اس دوران میں فیصلہ کر چکی تھی کہ کیا کرنا ہے! میں نے جو کچھ سوچا تھا، اس میں خطرہ تو تھا، لیکن خطرات سے تو میری پوری زندگی ہی عبارت تھی، یہی سبب تھا کہ میں نے میک اپ کا سہارا نہیں لیا کچھ ہی دیر بعد میں اپنی کار میں جناح اسپتال کی طرف اڑی جا رہی تھی، سب سے پہلے ملک دلاور سے میرا ملنا ضروری تھی۔

جب میں جناح اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچی تو اپنے آدمیوں کو مستعد اور چوکنا پایا، ملک دلاور کو ختم کرنے کی دوسری کوشش نہیں کی گئی تھی، اس کا مطلب یہی تھا کہ دشمن اب محتاط رویہ اختیار کر رہا ہے، پہلی کوشش کی ناکامی کے بعد اسے غالباً اندازہ ہو گیا تھا کہ دلاور کو راستے سے ہٹانا اتنا آسان نہیں اور یہ کہ اس طرح وہ خود بھی پھنس سکتا ہے۔

ملک دلاور کے بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہے، میں آہستہ قدمی سے بیڈ کے قریب پہنچ گئی اور پھر "ہیلو" کہا۔

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"ڈر گئے" میں نے مسکرا کر کہا۔

جواباً اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی، پھر بولا۔ "زہے نصیب کہ آپ تشریف لے ہی آئیں ورنہ......"

ورنہ تو تم یہ سمجھ رہے تھے کہ مجھ سے ملے بغیر ہی اس جہان فانی سے کوچ کر جاؤ گے!" میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس پر فقرہ چست کیا اور بیڈ کے قریب رکھی ہوئی بینچ پر بیٹھ گئی۔

وہ بھلا کب باز آنے والا تھا، فوراً ہی بولا۔ "اول تو یہ کہ بندہ ڈھیٹ ہے، یوں ٹلنے والا نہیں، پھر بھی اگر ایسا کوئی کیس ہو جاتا تو میں کاگا سائیں سے یہ ضرور کہہ جاتا ہے کہ دو نیناں مت کھائیو انہیں پیا ملن کی آس!"

"اچھا بکواس چھوڑو، یہ بتاؤ طبیعت کیسی ہے اب؟"

"پہلے تو ٹھیک تھی، مگر آپ کو دیکھ کر خراب ہونے لگی ہے۔" وہ حسب معمول اپنی شرارت پر اتر آیا۔

"سنو!" میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"سنائیے! اور اسی طرح ذرا مزید جھک جائیے! آپ یوں جھکتے ہوئے بہت بہت اچھی لگتی ہیں!"

میں جھلا کر بولی۔ "تمہیں شاید ابھی حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں!"

"آپ کی آمد کے بعد تو میں سنگینی کے بجائے حالات کی رنگینی میں کھو گیا تھا۔ خیر......فرمائیے!"

"تمہیں غالباً ابھی یہ خبر نہیں کہ گزشتہ رات تمہاری کوٹھی میں جو دھماکہ ہوا تھا، وہ دو افراد کی جان لے چکا ہے۔" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

میری توقع کے مطابق وہ سنجیدہ ہو گیا، پھر طویل سانس لے کر بولا۔ "ہاں یہ بات میرے علم میں بھی آ چکی ہے مجھے ہوش میں آئے تقریباً دو ڈھائی گھنٹے ہو چکے ہیں، وہ لاشیں ابھی میں نہیں دیکھ سکا اور اسی لیے فکر مند ہوں، صرف اتنا معلوم ہو چکا ہے کہ ان میں سے ایک لاش کسی عورت کی ہے، میری فکر مندی کا سبب وہ لڑکی ہے جسے آپ نے......"

"وہ خیریت سے ہے" میں نے اس کی بات کاٹ کر بتایا۔

"تو پھر وہ میری ملازمہ ہو گی، جہاں دستی بم پھینکا گیا، وہاں سرونٹ کوارٹرز تھے، دوسرا ہلاک ہونے والا بھی میرے نوکروں ہی میں سے ہو سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اک دم اس طرح چونک اٹھا جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو، پھر جب وہ بولا تو اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ "وہ...... وہ نکل گیا ہو گا، اس...... ڈرامے کا یہی مقصد ہو سکتا تھا۔"

"تمہارا اندازہ قطعی درست ہے۔" میں بول اٹھی۔ "تم نے جس افریقی باشندے پر ہاتھ ڈالا تھا، اسے اس کے ساتھی نکال لے گئے۔"

"آپ تو اچھی خاصی بوجھ بجھکو معلوم ہوتی ہیں، آپ کو تو ہر بات کا علم پہلے ہی سے ہو جاتا ہے، ویسے آپ کہاں رہ گئی تھیں؟"

"یہ وقت تفصیلی باتوں کا نہیں ہے اور نہ یہاں ان باتوں کا موقع ہے۔" میری آواز دھیمی تھی۔ "مجھے صرف سوالوں کے جواب چاہئیں فی الحال!"

"ارشاد!"

"مجھے مختصراً نرگس کے ماضی کے بارے میں بتا دو، ممکن ہے اس طرح مجھے آگے قدم اٹھانے میں آسانی ہو۔"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے مختصراً بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس وقت میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ نرگس کو اغواء کرانے والوں کا تعلق شمالی افریقہ کے ایک ملک موری تانیا سے ہے۔" دلاور نے رازدارانہ لہجے میں بتایا۔

میں یہ سن کر چونک اٹھی کیوں کہ بظاہر جو لوگ اب تک اس سلسلے میں سامنے آئے تھے، ان کا تعلق شمالی

افریقہ کے ایک اور ملک سے تھا، میں نے اسی لیے پھر تصدیق چاہی۔ ”تمہیں یقین ہے اپنی بات پر؟“

”قطعی!“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کے چہرے پر پائی جانے والی الجھن کا سبب بھی سمجھ رہا ہوں، بہر حال مختصراً یوں سمجھ لیں کہ اس طرح دانستہ ہمیں الجھانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن میں اس لیے ٹریپ میں نہیں آسکا کہ مجھے حقائق کا علم تھا۔“

”خیر تم سے تفصیلی گفتگو ضروری ہے، اس کے بغیر یہ معما میری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم یہاں سے جانا چاہتے ہو!“

”ہاں، کوشش کر رہا ہوں کچھ معمولی چوٹیں ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کمبل ہٹایا، بائیں ٹانگ پر مجھے پٹی بندھی نظر آئی اور دایاں بازو بھی گلے میں پڑی ہوئی پٹی میں پڑا دکھائی دیا۔ ”یہ زیادہ تشویش کی بات نہیں۔ فریکچر وغیرہ نہیں ہے، بس کچھ دن ذرا چلنے پھرنے سے گریز کرنا پڑے گا، آرام کی ضرورت ہے اور آرام......“

”گھر پر بھی ہوسکتا ہے۔“ میں نے اس کی بات پوری کردی اور اک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے یہ آپ کدھر چلیں اچانک؟“ وہ چونک کر بولا۔

”میں جلد ہی تم سے رابطہ قائم کرلوں گی، فی الحال مجھے ایک ضروری کام ہے۔“ میں نے کہا پھر جھک کر آہستہ سے بولی۔ ”تمہیں بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے! ویسے میں تمہاری حفاظت کا بندوبست کرچکی ہوں۔“

”یعنی؟“ اس نے سوال کیا۔ ”کیا میرے لیے کوئی خطرہ ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے اس سے نہیں چھپایا۔ ”رات کو جب تم بے ہوش تھے تو تمہیں ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔“

خلاف توقع وہ مسکرا دیا، پھر کہنے لگا۔ ”اب آپ کو میری طرف سے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے ہوش آچکا ہے، بہر حال آپ کی عنایت کا بہت بہت شکریہ!“ وہ یقیناً مضبوط اعصاب کا مالک تھا ورنہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ اطلاع پا کر مسکرانے کی بجائے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتیں۔ میں اسی لیے اسے پسند کرتی تھی کہ وہ غیر معمولی حالات میں بھی اپنے حواس قائم رکھتا تھا، اسے قاتلانہ حملے کی خبر دینے سے میرا مقصد محض یہ تھا کہ وہ غفلت میں نہ رہے۔

”اچھا تو پھر میں چلی۔ خدا حافظ!“ یہ کہہ کر میں مڑنے لگی۔

”سنیں!“ اس نے مجھے آواز دی۔

”ہاں کہو۔“ میں مڑتے مڑتے رک کر بولی۔ ”میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک بار پھر شرارت کا تاثر نظر آنے لگا تھا۔

”جانے کیوں اس وقت مجھے ایک فلمی گانا یاد آرہا ہے، آپ نے بھی سنا ہوگا، اس کے بول تھے، چلی رے چلی رے تو کہاں او دل رُبا! جی چاہ رہا ہے کہ میں بھی آپ کو جاتے دیکھ کر یہی گانا گانے......“

”جیسا ذہن ہوتا ہے اس میں ویسی ہی باتیں آتی ہیں!“ میں اس پر طنز کیا۔ ”اس موقع پر تمہیں کوئی خوبصورت سا شعر بھی یاد آسکتا تھا مگر تمہارا ذوق ظاہر ہے فلمی گانے سے آگے کس طرح بڑھ سکتا ہے!“

”آپ بالکل غلط کہہ رہی ہیں!“ وہ لڑاکا عورتوں کی طرح بولا۔ ”سناؤ شعر! موقع کے اشعار مجھ سے زیادہ

کسی کو یاد نہیں ہوں گے، مگر رونا تو یہی ہے کہ آپ موقع نہیں دیتیں ورنہ تو وہ شعر ہے نا وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دست ناتواں......“

”بس بس! بہت گھسا پٹا شعر ہے، کچھ اچھے شعر یاد کرو!“

”اگر میں نے اچھے اچھے شعر یاد کرلیے پھر تو آپ مجھے لفٹ دینے لگی گی نا؟“ اس نے کچھ ایسے مظلومانہ لہجے میں یہ جملہ ادا کیا کہ مجھے ہنسی آگئی۔

”ایڈیٹ!“ میں نے آہستہ سے کہا اور پھر وہاں نہیں رکی۔

عقب سے میں نے اس کی آواز سنی تھی، وہ مرزا غالب کا ایک مصرعہ گنگنانے لگا۔ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔

دلاور سے فقرے بازی کے سبب کچھ دیر کو میرا ذہن الجھے ہوئے حالات سے آزاد ہوگیا تھا، میں خود کو تازہ دم سا محسوس کر رہی تھی۔ اسپتال کی عمارت سے نکل کر میں تیز تیز قدم اٹھاتی اس جگہ پہنچ گئی جہاں اپنی گاڑی پارک کی تھی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں اپنے اطراف سے غافل نہیں تھی، مجھے آس پاس کوئی مشتبہ چہرہ نظر نہیں آیا تھا، یہ بات میرے لیے غیر متوقع ہی تھی کہ میرے دشمن میری طرف سے غافل ہو چکے ہیں گزشتہ شب تک یہ صورتحال نہیں تھی۔ اسپتال سے آپریشن سیل کے ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے میرا تعاقب کیا گیا تھا۔ اس وقت ایسا ہوتا تو مجھے پروا نہ ہوتی مگر کچھ ہی دیر بعد اندازہ ہوگیا کہ میرے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔ میری کار اب کورنگی روڈ پر تھی اور میں بے مقصد ہی ادھر نہیں آئی تھی، میں بہر حال یقین کر لینا چاہتی تھی کہ واقعی میرا اندازہ درست ہے یا نہیں! کوئی میرے تعاقب میں ہوتا تو یہی سمجھتا کہ شاید میرا رخ اپنی کوٹھی کی طرف ہے، مگر ایسا نہیں تھا، میں اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہی تھی، کہیں اور ہی جانے کا ارادہ تھا۔

مزید کچھ فاصلہ طے کر کے میں نے واپسی کا سفر شروع کردیا، دشمنوں کا مجھ پر نظر نہ رکھنا الجھا دینے والی بات تھی۔ ان کے لائحہ عمل میں یقیناً کوئی تبدیلی ہوئی تھی۔ یہ تبدیلی کس نوعیت کی تھی اور اس سے ان کا کیا مقصد تھا، فی الحال میرے لیے سمجھنا مشکل تھا، اسی مسئلے پر غور کرتے ہوئے میں نے یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی تھی کہ گزشتہ رات ہی دونوں جرمن سائنس دان شیفرڈ اور شیپرڈ ایک فلائٹ سے اسلام آباد روانہ ہو چکے تھے، کراچی سے اچانک ان کی اسلام آباد روانگی بھی بے وجہ نہیں ہوسکتی تھی، انہی باتوں پر غور کرتی ہوئی میں تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتی رہی، میری کار اب میکلوڈ روڈ سے گزر رہی تھی اور میری منزل قریب آرہی تھی، میں اس دہشت گرد گروہ کو بھولی نہیں تھی جس نے دلاور کی کوٹھی پر دستی بم پھینکا تھا۔ میں اس وقت اسی کا بندوبست کرنے نکلی تھی۔

آئی جی سے میری زیادہ واقفیت تو نہیں تھی لیکن اتنا یقین تھا کہ وہ مجھے جانتا ہے اور اس کے علم میں میری اور وزیر داخلہ کے تعلقات بھی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ یقیناً میری بات کو توجہ سے سنتا۔ میں نے اسی توقع پر پولیس ہیڈ آفس کا رخ کیا تھا۔

پھر یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ بندہ اپنے دفتر میں موجود تھا ورنہ عموماً بغیر وقت لئے ایسے معروف حضرات

سے ملنا محال ہوتا ہے میں نے اپنا کارڈ بھیجا تو اس نے کچھ ہی دیر بعد مجھے اندر بلا لیا، کمرے میں ایک صاحب اور موجود تھے۔

''تشریف رکھیے!'' آئی جی نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

فرمایئے کیسے زحمت کی؟'' آئی جی نے پوچھا۔

''ابھی عرض کرتی ہوں۔'' میں نے اپنا پرس کھول کر کاغذ قلم نکالا اور پھر کاغذ پر لکھنے لگی۔ ''معاف کیجیے گا، مجھے آپ سے خلوت میں کچھ عرض کرنا ہے، آپ کے کمرے میں اس وقت ایک اور صاحب موجود ہیں یہ بد اخلاقی ہوتی کہ میں زبانی اس بات کا اظہار ان صاحب کے سامنے کرتی۔ اگر آپ اس وقت مصروف ہیں تو میں کچھ دیر باہر بیٹھ کر انتظار کر لیتی ہوں، جب آپ اپنے مہمان سے ملاقات کر لیں اور تنہا ہوں تو مجھے بلا لیجیے گا۔ عذرا خان۔

پرچہ لکھ کر میں نے آئی جی کی طرف بڑھایا تو اس کے چہرے پر الجھن سی نظر آ رہی تھی، اس الجھن کا سبب غالباً یہی رہا ہو گا کہ میں زبانی کچھ کہنے کی بجائے پرچہ لکھ کر اس کی طرف بڑھا رہی تھی، پرچہ پڑھتے ہوئے میں نے آئی جی کا چہرہ متغیر ہوتے دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر الجھن کی بجائے حیرت و استعجاب نظر آ رہا تھا، پرچہ پڑھ کر اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا، پھر دائیں جانب والی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص سے مخاطب ہوا۔ ''رؤف صاحب! آپ ایسا کریں کل اسی وقت تشریف لے آئیں۔ اس وقت تک میں کسی فیصلے پر پہنچ چکا ہوں گا۔''

''جیسا آپ کا حکم!'' وہ شخص جواباً بولا۔ ''میں کل حاضر ہو جاؤں گا، بس آپ ذرا یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ اس شخص کو ناحق پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' آئی جی نے جلدی سے کہا۔

''اچھا خدا حافظ!'' وہ شخص اٹھ کھڑا ہوا اور آئی جی سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''خدا حافظ!'' آئی جی نے اس سے مصافحہ کیا اور پھر وہ شخص دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اسی وقت آئی جی کا اردلی اندر داخل ہوا اور ایک چٹ اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔

آئی جی نے چٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ان صاحب کو بٹھاؤ ابھی! اور سنو کچھ دیر کسی کو بھی کمرے میں نہ آنے دینا، تم خود بھی نہیں آؤ گے!''

''جی بہتر ہے صاحب!'' اردلی یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

اردلی کے جاتے ہی آئی جی میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''جی اب فرمایئے؟''

''ممکن ہے، آپ واقف ہوں کہ میں درآمدات و برآمدات کی ایک فرم عذرا انٹرپرائزز کو رن کر رہی ہوں۔'' میں نے گفتگو شروع کی۔

''جی ہاں میرے علم میں ہے۔'' آئی جی نے سر ہلایا۔

''میری فرم میں باوجوہ خواتین کی اکثریت ہے۔'' میں آئی جی سے وہ باتیں کر رہی تھی جو پہلے ہی سوچ چکی تھی۔ ''گزشتہ دنوں میری فرم کی ایک لڑکی نرگس کو اغواء کر لیا گیا۔ نرگس کے اغواء میں میری اطلاع کے مطابق

کچھ غیر ملکی ملوث تھے، یہ معاملہ کیونکہ نازک تھا اور اس سلسلے میں ایک سفارت خانہ بھی سامنے آ گیا تھا، اس لیے میں نے دانستہ نرگس کے اغواء کی رپورٹ نہیں کرائی، میرے خیال میں پولیس کی مداخلت سے معاملہ بگڑ سکتا تھا، نتیجتاً میں اپنے طور پر اس کی بازیابی کے لیے کوشش کرتی رہی۔''

''مس عذرا!'' آئی جی درمیان میں بول اٹھا۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو صاف صاف بات کریں، میں اسی صورت میں کسی نتیجے تک پہنچ سکوں گا اور آپ کی بات بھی سمجھ سکوں گا۔ آپ مجھ پر مکمل اعتماد کر سکتی ہیں۔ مثلاً کچھ غیر ملکی والی بات وضاحت طلب ہے، اس کے علاوہ آپ کس سفارت خانے کی بات کر رہی ہیں، اس سلسلے میں بھی وضاحت ضروری ہے۔''

''آپ کہتے ہیں تو میں عرض کر دیتی ہوں۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''دراصل ابھی کچھ باتیں خود میرے لیے بھی معمہ بنی ہوئی ہیں، میں اسی لیے تفصیل سے گریز کر کے اصل موضوع کی طرف آنا چاہتی تھی۔'' یہ کہہ کر میں نے شمالی افریقہ کے اس ملک کے سفارت خانے اور غیر ملکیوں کے سلسلے میں وضاحت کر دی۔ میں نے آئی جی کو چونکتے دیکھا اور مجھے اس کا سبب معلوم تھا، میں نے بغیر رکے مزید کہا۔ ''یہاں میں یہ وضاحت کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ وہ سفارت خانہ اس معاملے میں براہ راست ملوث نہیں ہے۔ قصہ یہ ہے کہ سفارتخانے سے متعلق ایک شخص ذاتی طور پر نرگس کے اغواء کا ذمہ دار معلوم ہوتا ہے، جس کا ابھی میں نے ذکر کیا، اس سفارت خانے کے ذکر پر آپ کے چونک اٹھنے کا سبب بھی مجھے معلوم ہے۔ میرے قیاس کے مطابق سفارتخانے کے اس شخص کی بازیابی کے لیے ایک ذمہ دار شخص نے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کیا تھا اور پھر یہ شک ظاہر کیا تھا کہ اس شخص کو اغواء کر کے سوسائٹی کی ایک کوٹھی میں لے جایا گیا ہے۔''

آئی جی دوبارہ چونک اٹھا۔ ''آپ کی معلومات کے ذرائع واقعی حیرت انگیز ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ بات آپ کے علم میں کس طرح آ گئی! بہرحال آپ اپنی گفتگو جاری رکھیے۔''

''مختصراً مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ سفارتخانے کے اس پراسرار شخص کی گمشدگی، نرگس کا اغواء اور سوسائٹی میں ہونے والا دھماکہ ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔'' میں نے دوبارہ بات شروع کی۔ ''یوں سمجھئے کہ کسی سبب سفارتخانے سے متعلق وہ پراسرار شخص نرگس کو اغواء کر لیتا ہے۔ میں اور میرا ایک دوست دلاور اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس معاملے میں میری دلچسپی کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ لڑکی جو اغواء کی گئی، اس کا تعلق میری فرم سے تھا۔ رہا ملک دلاور کا معاملہ تو نرگس اس کے قریبی عزیزوں میں سے ہے اور اسی کی سفارش پر میں نے نرگس کو اپنی فرم میں ملازمت دی تھی۔ ایسی صورت میں ملک دلاور کو بھی نرگس کی بازیابی سے دلچسپی تھی۔ نتیجتاً مجرم نے ملک دلاور پر بھی بالواسطہ وار کیا، اس کے لیے اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور خود اپنی گمشدگی کا سوانگ رچایا۔ مجھ پر بھی اس کی نظر تھی۔ اس کی راہ میں مزاحم ہونے والے دو ہی افراد تھے۔ ایک ملک دلاور، دوسری میں! میرے اندازے کے مطابق ملک دلاور یقیناً مجرم کی راہ پر لگ گیا تھا۔ اس کی شخصیت کو مشتبہ بنانے اور پھر اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی گئی۔'' پھر میں نے گزشتہ رات ملک دلاور پر قاتلانہ حملے کی روداد مختصراً بیان کر دی۔ اس کے بعد ملک دلاور پر قاتلانہ حملہ کرنے والے افریقی باشندے کے بارے میں بتایا، آئی جی پوری توجہ سے میری بات سنتا رہا، میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ افریقی باشندے کا تعلق افریقہ ہی کی ایک

دہشت پسند تنظیم سے ہے۔ اس کے قبضے سے جو کاغذات برآمد ہوئے تھے، وہ بھی میں نے آئی جی کے حوالے کر دیئے، پھر مزید کہا۔ ''آپ اس شخص اور اس کے ساتھیوں کو چاہیں تو گرفتار کر سکتے ہیں، ان کاغذات میں اس کے ساتھیوں میں سے چند کے پتے بھی موجود ہیں اور سوسائٹی میں دلاور کی کوٹھی پر دستی بم پھینکنے والا یہی گروہ تھا، اس گروہ کی گرفتاری کے بعد آپ کو میری بات کا ثبوت مل جائے گا۔ آپ سے اتنے طویل مذاکرات و ملاقات کا مقصد محض یہ تھا کہ یہ دہشت گرد گروہ فوری طور پر قانون کی گرفت میں آ جائے اور مزید کوئی کارروائی نہ کر سکے۔ بقیہ تمام باتوں کا آپ ضمنی تصور کر سکتے ہیں۔''

میری بات سن کر آئی جی کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا، اس کے چہرے سے تذبذب اور الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''معاف کیجئے گا، ذاتی طور پر آپ کو اس معاملے اس حد تک دلچسپی نہیں لینا چاہیے تھی۔ آپ کو نرگس کے اغواء کی رپورٹ ضرور درج کرانا چاہیے تھی، دیکھیں اس طرح اگر ہر شخص اپنے طور پر قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے گا تو ہمارے لیے بڑے مسئلے پیدا ہو جائیں گے، مجھے آپ کی نیک نیتی پر شبہ نہیں، لیکن ......'' وہ کچھ کہتے ہوئے جھجکنے لگا۔ شاید اسے میرے وسیع تعلقات کا خیال آ گیا تھا۔ ذرا توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ ''آپ تشریف رکھیں، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا، وہ ان کاغذات کو اپنے ساتھ لے جانا نہیں بھولا تھا جو میں نے ہی اسے دیئے تھے اور جن کا تعلق افریقی دہشت گرد گروہ سے تھا۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ آئی جی کیوں اٹھ کر گیا ہے! وہ میری فراہم کردہ اطلاعات کی روشنی میں فوری طور پر دہشت پسند گروہ کی گرفتاری کا بندوبست کرنے ہی جا سکتا تھا۔ پولیس کا ایک ذمے دار افسر ہونے کی حیثیت سے اسے اپنے طور پر معاملات کو سمجھنے اور ان سے نمٹنے کا پورا حق تھا، کچھ دیر قبل اس نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، میں نے اس بات کا بھی برا نہیں مانا تھا، اسے بہر حال وہی کہنا چاہیے تھا۔ کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ ایمان دار اور محب وطن ہے! اس کی آڑ میں تو بہت سے کھیل کھیلے جاتے ہیں اور پولیس کے محکمے سے متعلق افراد کو تو پہلا سبق ہی یہ ملتا ہے کہ کوئی بھی شخص شک و شبے سے بالاتر نہیں ہوتا۔ میں اپنے طور پر لاکھ محب وطن تھی اور قانون کی حدود سے تجاوز نہیں کرتی تھی، لیکن دوسرا بھی مجھے ایسا ہی سمجھے یہ کوئی ضروری نہیں۔ میں کم از کم اپنے باب میں دوسرے کو اتنا مارجن ضرور دیتی تھی کہ وہ میری نیت پر شبہ کر سکے۔ آئی جی اگر چاہتا تو وہاں میری موجودگی میں متعلقہ افسران کو اپنے کمرے میں بلا کر ضروری احکام دے سکتا تھا مگر کسی سبب وہ ابھی مجھ پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اسے لفظ بہ لفظ میری باتوں پر یقین آ گیا ہے، کمرے سے اٹھ کر جانے کی ایک وجہ اور بھی تھی، جس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب آئی جی کچھ دیر بعد واپس آ گیا، اس نے یقیناً میرے سلسلے میں کسی نہ کسی ذمے دار شخصیت سے فون پر بات کی تھی، اس کے قدرے بدلے بدلے ہوئے رویئے سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا۔

''مس عذرا!'' اس نے اپنی کرسی پر آ کر بیٹھتے ہی مجھے مخاطب کیا۔ ''میں طویل گفتگو سے اجتناب کرتے ہوئے آپ سے صرف اتنا کہوں گا کہ پولیس کے ساتھ تعاون کریں اور اس کیس کی حد تک کم از کم مجھے ضرور باخبر رکھیں۔ میں بہر حال ہرگز نہیں چاہوں گا کہ قانون شکن افراد اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہیں اور میرا محکمہ

خاموش تماشائی بنا رہے، اس کے بعد میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں، اور امید ہے کہ آپ مجھے تاریکی میں نہیں رکھیں گی۔'' وہ یہ کہہ کر مجھے متوقع نظروں سے دیکھنے لگا۔

''جی پوچھیں!'' میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''یقین کریں کہ اگر وہ باتیں میرے علم میں ہوئیں جو آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو نہیں چھپاؤں گی۔''

''آپ کی فرم میں ملازم جس لڑکی کے اغواء سے یہ معاملہ شروع ہوا ہے، اس کا پس منظر کیا ہے؟ میرا مطلب ہے اس کے اغواء کی وجہ سے ہے! اسے آخر کیوں اغواء کیا گیا ہوگا؟ آپ کے بیان کی روشنی میں اغواء کا یہ کوئی سیدھا سادا کیس معلوم نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک فرمایا آپ نے!'' میں نے تائید میں کہا۔ ''یقیناً یہ کوئی سیدھا سادا کیس نہیں ہے، میں صاف صاف عرض کر دوں کہ اب تک جو باتیں سامنے آئی ہیں، ان میں سے ایک ہی نتیجہ برآمد کر سکی ہوں، وہ یہ کہ اس معاملے کا تعلق اس لڑکی کے ماضی سے ہے، جس کا علم مجھے ابھی نہیں ہو سکا، ہاں مجھے توقع ضرور ہے کہ جلد ہی مجھے اس اغواء کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔''

''ہوں!'' آئی جی کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔ ''ایک بات اور کہنا تھی آپ سے کہ اگر میرے محکمے کا کوئی افسر اس سلسلے میں میرے حوالے سے تعاون چاہے تو آپ گریز نہ کریں۔''

''دیکھیں، پولیس کا اپنا طریقہ کار ہے۔ اس طریقہ کار سے اتفاق یا اختلاف کو زیر بحث نہ لاتے ہوئے میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی کاروباری اور نجی مصروفیات کے سبب قدم قدم پر میں آپ کے محکمے کا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیا کیونکہ اس طرح میرے لیے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے۔ ''ہاں یہ ممکن ہے کہ جس طرح آج میں نے ایک دہشت پسند گروہ کی نشاندہی کی ہے، آئندہ بھی ایسے افراد کی نشاندہی کرتی رہوں۔ اسی کے ساتھ میں آپ پر یہ زور نہیں دیتی کہ میری فراہم کردہ اطلاعات کو من وعن تسلیم کر لیا جائے۔ آپ کا محکمہ اپنے طور پر اگر میری فراہم کی ہوئی اطلاع کو درست جانے تو کوئی قدم اٹھا سکتا ہے۔''

''سمجھ گیا میں۔'' آئی جی نے کہا۔

''زیادہ واضح الفاظ میں اس بات کو یوں بھی عرض کیا جا سکتا ہے کہ میں پولیس کی مخبر بننا نہیں چاہتی اور نہ میں آپ کے سوا اس محکمے میں کسی شخص کو کوئی اطلاع فراہم کروں گی، وہ بھی اس صورت میں جب یہ بہت ضروری ہوا، میں اپنی اس صاف گوئی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

اس کے بعد آئی جی نے مجھے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی، پھر بولا۔ ''آپ نے جو باتیں بتائی ہیں، ان کی روشنی میں آپ کے دوست......''

''ملک دلاور۔'' میں بول اٹھی۔

''جی تو ملک دلاور سے ضروری پوچھ گچھ اب ناگزیر معلوم ہو رہی ہے، اس سلسلے میں آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟'' یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''ظاہر ہے، میں اعتراض کرنے والی کون!'' میں نے بظاہر مسکرا کر کہا، لیکن اُس کی بات سن کر مجھے الجھن

سی ہونے لگی تھی۔ ملک دلاور پولیس سے کس طرح نمٹتا، یہ اسی کا نہیں خود میرا بھی مسئلہ تھا۔ اس طرح پولیس کی مداخلت سے میرے نزدیک بہت سے مسئلے پیدا ہو جاتے، لیکن آئی جی سے مجھے وہی کہنا چاہیے تھا، جو میں نے کہا۔ دوسری صورت میں وہ بلاوجہ مجھ پر شک کرنے لگتا۔

آئی جی سے میری ملاقات کا سبب محض افریقی دہشت پسند گروہ کی گرفتاری تھا، میں اس سلسلے میں اسے حالات سے آگاہ کر چکی تھی۔ بقیہ کارروائی اس کے محکمے کا مسئلہ تھا کہ وہ کیا قدم اٹھاتا! میں نے اس باب میں دانستہ اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا، اس لیے میں نے اس سے اجازت چاہی۔

''معاف کیجیے گا، میں نے گفتگو میں الجھ کر آپ سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ کیا پینا پسند کریں گی، ٹھنڈا یا گرم؟''

''جی نہیں شکریہ! میں اب اجازت چاہوں گی، پھر کبھی سہی۔'' یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

پولیس ہیڈ آفس کی عمارت سے نکلتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی جسے میں نے نادانستگی میں نظر انداز کر دیا تھا۔

اچانک جو خیال میرے ذہن میں آیا، وہ یہ تھا کہ نرگس کے ماضی سے اس کی ماں بھی پردہ اٹھا سکتی تھی، میں نے اسے بھی نظر انداز ہی کر دیا تھا۔ پہلے یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا، اس کی وجہ یہ تھی یکے بعد دیگرے اس طرح واقعات پیش آ رہے تھے کہ میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

نرگس کا قیام ناظم آباد میں تھا، میں کئی مرتبہ ضرورتاً اس کے گھر جا چکی تھی، مجھے یقین تھا کہ نرگس کی ماں سے مل کر میری ایک الجھن کم از کم دور ہو سکتی تھی، پہلے میرا ارادہ یہ تھا کہ میں پولیس ہیڈ آفس سے سیدھی اپنی کوٹھی جاؤں گی، لیکن یہ ارادہ مجھے تبدیل کرنا پڑا، اب میں جلد از جلد پہلے نرگس کی ماں سے ملنا چاہتی تھی۔

ناظم آباد کی طرف جاتے ہوئے میں یہ سوچ کر لطف اندوز ہو رہی تھی کہ دلاور سے کچھ معلوم کیے بغیر جب نرگس کا ماضی میرے علم میں آ جائے گا تو دلاور کو خوب ''گھسیٹ'' سکوں گی۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ اس عورت کا کیا حال ہوگا۔ جس کی بیٹی واپس گھر نہیں پہنچی تھی! معلوم نہیں دلاور نے اسے کس طرح تسلی دی ہوگی، یہ بہانہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا کہ میں نے اسے ایک دفتری کام* سے حیدر آباد بھیجا ہے۔ آخر کب تک ایک ماں ان کھوکھلی تسلیوں سے بہل سکتی تھی، راستے بھر میں اسی معاملے پر غور کرتی رہی کہ ان حالات میں کس طرح نرگس کی ماں کو ہینڈل کروں گی، اور کیسے اسے راضی یا آمادہ کروں گی کہ وہ اپنے یا نرگس کے ماضی سے پردہ اٹھا دے! لیکن میرا سوچنا سمجھنا لاحاصل رہا، میں جب نرگس کے گھر پہنچی تو گھر کے دروازے پر پڑا ہوا بڑا سا تالا گویا میرا منہ چڑا رہا تھا، فوری طور پر اس سے میرے ذہن پر جھٹکا تو لگا لیکن پھر میں بات کی تہہ تک پہنچ گئی میرے خیال میں اس کے سوا کوئی اور بات ممکن نہیں تھی کہ دلاور نے نرگس کی ماں اور اس کے مفلوج بھائی کی حفاظت کے خیال سے ان دونوں کو یہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا ہو۔ میں نے جب دلاور کو نرگس کے اغواء سے مطلع کیا تھا تو اس نے نرگس کی ماں اور مفلوج بھائی کی زندگی کو بھی خطرہ پیش آنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ دلاور فوراً ہی میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تھا، اس نے غالباً کچھ ایسی ہی بات کہی تھی کہ مجھے ان دونوں کی حفاظت کا بندوبست بھی کرنا ہے۔

اگر واقعی دلاور ہی نے ان دونوں کو وہاں سے کہیں اور محفوظ جگہ منتقل کر دیا تھا تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی، دوسری صورت میں یہ معاملہ اور الجھ جاتا۔

میں نے ناظم آباد کا رخ تو اس لیے کیا تھا کہ میری ایک الجھن تو کم ہو جائے مگر الجھن کم یا ختم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی تھی، اب ملک دلاور سے میری تفصیلی گفتگو اور بھی ضروری ہو گئی تھی۔

ناظم آباد سے لوٹ کر پہلے میں نے اپنی کوٹھی ہی کا رخ کیا، آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے ہی مجھے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ دلاور ابھی اسپتال ہی میں ہے یا اسے گھر جانے کی اجازت مل گئی؟ اس کے لیے میرا کوٹھی پہنچنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی فرم کی منیجر سے بھی ضروری گفتگو کرنا تھی۔ موجودہ حالات میں کچھ دن کے لیے اپنے کاروباری معاملات پر توجہ دینا میرے لیے ممکن نہیں تھا، میں منیجر کو یہی بتانا چاہتی تھی کہ کچھ دن کے لیے وہ خود ہی کاروباری معاملات کو سنبھال لے اور بغیر کسی ناگزیر وجہ کے مجھ سے رابطہ قائم نہ کرے۔

اپنی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے ہر چند کہ میرا ذہن پرسکون نہیں تھا، اس کے باوجود میں غافل نہیں تھی۔ ریٹا کی کار میں نے اپنے تعاقب میں دیکھ لی تھی، تعاقب کا احساس مجھے لسبیلہ کے پل سے نیچے اترتے ہی ہو گیا تھا، لسبیلہ کے چوراہے سے میں سیدھی سبیل والی مسجد کی طرف ہو لی تھی، میرے اندازے کے مطابق ریٹا، ناظم آباد ہی سے میرے پیچھے لگی تھی، ریٹا کے تعاقب کرنے سے میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی تھی کہ میرے دشمن کسی سبب فی الحال مجھ پر نظر رکھنا ضروری نہیں سمجھ رہے تھے۔ ریٹا کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی تھی کہ وہ میرے دشمنوں ہی کی آلہ کار معلوم ہوتی تھی۔ گزشتہ روز بھی اس نے میرا تعاقب کیا تھا اور میں اسے جل دے کر نکل گئی تھی، لیکن اس وقت میرے نزدیک یہ ضروری نہیں تھا، اگر اس وقت میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر جا رہی ہوتی تو یقیناً کچھ اور سوچتی۔ میں ریٹا کو ہرگز اپنے پیچھے لگا کر وہاں لے جانا پسند نہ کرتی۔ میں نے اسی لیے تعاقب کی پروا نہ کی، میں اس طرح اطمینان سے ڈرائیونگ کرتی رہی جیسے اپنے تعاقب سے بے خبر ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کس حد تک ریٹا کو یہ تاثر دینے میں کامیاب رہی لیکن اتنا اندازہ میں نے ضرور کر لیا کہ ریٹا بہت محتاط نظر آ رہی تھی اس نے خاصا درمیانی فاصلہ رکھا تھا کہ مجھے تعاقب کا شبہ نہ ہو سکے۔

میرے پاس وقت کم تھا اس لیے میں تیز ڈرائیونگ کرتی ہوئی جلد ہی اپنی کوٹھی تک پہنچ گئی، گزشتہ دن کی طرح ریٹا نے کوٹھی کے گیٹ تک میرا تعاقب نہیں کیا تھا وہ کچھ پہلے ہی ایک سڑک پر مڑ گئی تھی، غالباً اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اپنی کوٹھی ہی کی طرف آئی ہوں۔

میری کار گیٹ پر رکتے دیکھ کر پھر ہارن کی آواز سنتے ہی چوکیدار لپکتا ہوا آیا تھا اور گیٹ کھول دیا تھا، میں ہاتھ کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیتی ہوئی کار کو اندر لے گئی۔

گزشتہ روز شام کو میں گھر سے رخصت ہوئی تھی اور میرا ارادہ رات کو واپسی کا نہیں تھا، رات کو مجھے مجبوراً ہی اپنے چہرے سے میک اپ ختم کرنے کے لیے ایک بار آنا پڑا تھا۔ اس کے بعد اب لوٹی تھی، اس دوران میں کوئی شخص بھی مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے لیے فون کر سکتا تھا، یہ سوچ کر میں نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اپنی ملازمہ خاص فاطمہ کو طلب کر لیا۔ فاطمہ مجھے فون کرنے والے کا نام پوچھ کر لکھ لیتی تھی اور کوئی میسج ہوتا تھا تو وہ بھی نوٹ کر لیتی تھی۔

اپنے گھر کے در و دیوار اپنے ہی ہوتے ہیں۔ اپنی کوٹھی میں پہنچ کر میں نے کچھ سکون محسوس کیا۔ اعصاب

میں اب وہ تناؤ نہیں رہا تھا، میں اسی لیے فاطمہ کے دیے ہوئے پرچے کو بہت اطمینان سے پڑھ رہی تھی، صبح سے دو مرتبہ میری فرم کی منیجر فون کر چکی تھی، ایک فون ایک اہم شخصیت کا تھا جو نصف گھنٹے قبل کیا گیا تھا، اسی کے ساتھ ایک پیغام بھی تھا کہ میں فوری طور پر اس شخصیت سے فون پر بات کروں، آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے کمانڈر نواز کے ماتحت عثمانی نے بھی کچھ دیر پہلے مجھ سے بات کرنا چاہی تھی، کچھ فون کاروباری نوعیت کے تھے جن کی مجھے زیادہ پروا نہیں تھی، میری فرم کی منیجر ان معاملات سے بخوبی نمٹ سکتی تھی۔

"تم جاؤ فاطمہ!" میں نے پرچے پر نظر ڈال کر فاطمہ سے کہا۔ "اور ہاں ذرا اچھی سی کافی بنوا کر بھجوا دو۔"

"میں خود بنا کر لاتی ہوں۔" فاطمہ کے لہجے میں بڑی محبت تھی۔

"ہاں سنو!" وہ جانے لگی تو میں نے کہا۔ "رات کو تم لوگ سکون سے سوئے نا؟"

"جی...... جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے ایزی چیئر پر بیٹھ کر دونوں ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر میں پہلے ہی ایک تپائی پر اپنے قریب رکھ چکی تھی۔

فاطمہ چلی گئی تو میں نے سب سے پہلے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا نمبر ڈائل کیا۔

"لیس!" دوسری جانب سے مجھے عثمانی کی آواز سنائی دی۔ لفظ "لیس" وہ ایک خصوصی لہجے میں ادا کرتا تھا، جیسے یوں لفظ کا "جھٹکا" کر رہا ہو۔ کئی بار میں اُسے ٹوک بھی چکی تھی مگر ظاہر ہے کہ کوئی بھی عادت ایک دم نہیں بدلتی بلکہ بعض حالات میں تو عادت بدلنا ہی ممکن نہیں ہوتا۔

اس وقت بھی مجھے اُس کا لہجہ کھلا مگر پی گئی اور صرف اتنا کہا۔ "عذرا خان...... رپورٹ پلیز!"

میری آواز سن کر اُس نے سلام کیا، پھر سلام کا بر پانے کے بعد بولا۔ "ملک دلاور ابھی کچھ دیر پہلے ہسپتال سے چھٹی لے کر اپنے گھر جا چکے ہیں۔ کمانڈر نواز کا حکم تھا کہ ایسی صورت میں آپ سے احکام لئے جائیں اور صورتِ حال سے فوری طور پر آپ کو مطلع کر دیا جائے۔ سرفراز اور سیل کے دوسرے جو افراد ملک دلاور کی حفاظت کے لئے مقرر کئے گئے تھے، اُنہیں ہٹا لیا جائے یا اب بھی ضروری ہے کہ......"

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔" میں نے عثمانی کی بات کاٹ کر کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں۔ اور کچھ؟"

"جی نہیں......" اُس نے جواب دیا۔

"دیٹس آل۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد میں اُس اہم شخصیت کا نمبر ملانے لگی جس نے فوری طور پر رابطے کے لئے کہا تھا۔ اس کی وجہ سمجھنا میرے لئے ممکن تھا۔ آئی جی نے اُسی اہم شخصیت سے میرے متعلق بات کی ہو گی۔ یہ فون اسی سلسلے میں ہو سکتا تھا۔ پھر جب فون پر اُس شخصیت سے میرا رابطہ قائم ہو گیا تو میرے خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ اہم شخصیت وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری کی تھی۔ اُنہیں میرے بارے میں تشویش لاحق ہو گئی تھی کہ میں کیا کرتی پھر رہی ہوں؟ اُنہوں نے میری طرف سے آئی جی کو تو مطمئن کر دیا تھا لیکن خود بے اطمینانی کا شکار ہو گئے تھے۔ بہر حال میں نے کسی طرح اُنہیں یہ اطمینان دلایا کہ فی الحال کوئی بڑا ہنگامہ متوقع نہیں۔ دراصل وہ افریقی دہشت پسند گروہ کے بارے میں سن کر فکر مند ہو گئے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اب مزید کوئی ایسا واقعہ نہ ہو جیسا

سوسائٹی کے علاقے میں ہوا۔

اُن سے گفتگو کر کے میں نے اپنی فرم کی منیجر سے بھی بات کر لینا ضروری سمجھا۔ اُسے میں نے وہی ہدایات دیں جو پہلے ہی سوچ چکی تھی۔ ضروری کاروباری گفتگو کے بعد میں نے اُسے یہ بھی کہہ دیا کہ فرم سے متعلق ہر مسئلہ فی الوقت اُسی کو حل کرنا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کی اہل تھی۔

میں نے فرم کی منیجر سے بات کر کے ریسیور رکھا ہی تھا کہ فاطمہ کافی بنا کر لے آئی۔ پھر میں نے کافی پینے کے دوران ہی میں ملک دلاور کو فون کیا۔

"کچھ دیر بعد میں تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں۔" فون پر اُس کی آواز سن کر میں نے کہا۔

"آپ یہ روز روز کا ٹنٹا ختم ہی کیوں نہیں کر دیتیں؟"

"کیسا ٹنٹا؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ہمیشہ کے لئے پاس پہنچ جائیں گی تو بار بار فون پر یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ......"

"ملک دلاور!" میرا لہجہ سخت ہو گیا۔

"جی حضور ارشاد!"

"ہر وقت بچپنا اچھا نہیں لگتا۔ کبھی کبھی آدمی کو سنجیدہ بھی ہونا چاہئے۔"

"مجھے سنجیدگی سے یقیناً اتفاق ہے مگر رنجیدگی سے نہیں اور آپ مجھے رنجیدہ کرنے سے باز نہیں آتیں۔ میں اسی لئے تو سنجیدہ نہیں ہوتا کہ......"

میں نے کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ اس سے مغز مارنا فضول تھا۔ وہ اپنے ٹائپ کا ایک ہی شخص تھا۔ مجھے اُس سے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکی تھی۔ فون پر اُس سے مزید گفتگو وقت کا زیاں ہوتی۔

کافی پیتے ہوئے میں نے ریٹا کے بارے میں سوچا جو میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ اُس سے پیچھا چھڑانے کے لئے گزشتہ روز والا نسخہ آزماؤں یا ملک دلاور کی کوٹھی تک بھی اُسے اپنا تعاقب کرنے دوں؟ مجھے یقین تھا کہ وہ میری کوٹھی ہی کے آس پاس کہیں موجود ہو گی۔

کافی کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے میں ایک فیصلے تک پہنچ چکی تھی۔ ریٹا کو یوں اپنے پیچھے پیچھے لگائے پھرنا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ اس طرح میری نقل و حرکت ریٹا کے ذریعے دشمنوں کی نظر میں آتی رہتی۔ آئندہ اس کا نتیجہ بہتر صورت میں نکلنے کا امکان نہیں تھا۔

ریٹا سے نمٹنا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ عورت میرا ایک جھٹکا برداشت نہیں کر پائے گی۔ میں اب اُسے یہ بھی باور کرانا چاہتی تھی کہ میری راہ میں آنا اُسے مہنگا بھی پڑ سکتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے ایک بار پھر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔

کمانڈر نواز کے ماتحت عثمانی کے "لیس" سے بچنے کی خاطر سلسلہ ملتے ہی میں فوراً بول اُٹھی۔ "تمہارے کسی آدمی کو ڈیفنس تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ کتنی دیر لگ سکتی ہے؟"

"پندرہ سے بیس منٹ تک۔" اُس نے جواب دیا۔

"سنو! میں اب سے تقریباً نصف گھنٹے بعد اپنی کوٹھی سے نکلوں گی۔" میں اُسے بتانے لگی۔ "میرے تعاقب میں نیلے رنگ کی کار ہو گی۔ ایک اینگلو انڈین عورت ریٹا اس کار کو ڈرائیو کرتی نظر آئے گی۔" یہ کہہ کر میں نے ریٹا کا پورا حلیہ عثمانی کو نوٹ کرا دیا۔ پھر بولی۔ "اُس عورت کو ہر قیمت پر میرے تعاقب سے روکنا ہے۔ یہ میں تم پر چھوڑتی ہوں کہ اس سلسلے میں کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔ میں اُس عورت کو تھوڑا سا سبق بھی دینا چاہتی ہوں کہ آئندہ میرا تعاقب کرتے ہوئے اُسے سوچنا پڑے۔"

فون پر عثمانی کو ہدایات دے کر میں کچھ دیر آرام کے لئے بستر پر دراز ہو گئی، پھر نصف گھنٹہ گزر جانے کے بعد ہی اُٹھی۔ میں نے دانستہ دس منٹ تاخیر سے کام لیا تھا، یہ سوچ کر کہ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے بھیجے جانے والے آدمی کو تھوڑی بہت دیر بھی ہو سکتی تھی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد میری کار، کوٹھی کے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ چلتے وقت فاطمہ نے دوپہر کے کھانے کے لئے پوچھا تھا مگر مجھے ابھی بھوک نہیں تھی اور نہ میں کھانے کے انتظار میں مزید رُکنا چاہتی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق کچھ فاصلہ طے کرتے ہی ریٹا کی نیلی کار میرا تعاقب کرنے لگی۔ میری نظر عقبی آئینے پر جمی ہوئی تھی۔ جلد ہی مجھے نیلی کار کے پیچھے ایک جیپ نظر آ گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جیپ ڈرائیو کرنے والا سیل ہی کا کوئی رُکن ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے جیپ کو پہچان لیا تھا۔

مجھے سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی جانا تھا، لیکن میں دانستہ گورا قبرستان کے سامنے سے گزرتی ہوئی بائیں جانب ایک سڑک پر مُڑ گئی۔ اس طرح میں سیل کے آدمی کو پورا موقع دینا چاہتی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ مین روڈ کی نسبت ذیلی سڑکوں پر اُس کے لئے کچھ کر گزرنے میں آسانی ہوتی۔ سیل کا رُکن اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنی جیپ کو میری اور ریٹا کی کار کے درمیان لے آیا۔ میں یہی چاہتی بھی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا میں اُسے دیکھنے کے لئے وہاں نہیں رُکی۔ عقبی آئینے میں، میں نے صرف یہ دیکھا تھا کہ ریٹا کی کار جیپ کے پچھلے حصے سے ٹکرا گئی ہے اور سیل کا رُکن اپنی جیپ سے اُتر کر تیزی کے ساتھ ریٹا کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ ذیلی سڑک اتنی تنگ تھی کہ ریٹا چاہتی بھی تو اُس وقت تک میرا تعاقب جاری نہ رکھ سکتی جب تک کہ جیپ درمیان سے نہ ہٹ جاتی۔

مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی میں پھر مین روڈ پر آ گئی۔ پھر مجھے دلاور کی کوٹھی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

اپنی کار دلاور کی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں پارک کرتے ہوئے میں چونک اُٹھی۔ وہیں مجھے ایک پولیس جیپ کھڑی نظر آئی تھی۔ مجھے آئی جی سے صبح ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔ وہاں پولیس جیپ کی موجودگی یہی ظاہر کر رہی تھی کہ اس وقت پولیس کا کوئی ذمہ دار افسر، دلاور سے پوچھ گچھ کرنے آیا تھا۔ نہ تو مجھے کسی پولیس افسر کی وہاں موجودگی سے کوئی تشویش تھی نہ دلاور کی طرف سے کوئی فکر۔ میں تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ پولیس افسر کی موجودگی میں دلاور سے میری گفتگو فوری طور پر ممکن نہیں تھی۔ پولیس افسر کے جانے کے بعد ہی دلاور سے بات ہو سکتی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے میں اپنی کار سے اُتر آئی اور اس کا دروازہ مقفل کر دیا۔

دلاور کی کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی کہ اُس کے ملازمین ہراساں ہیں۔ اس کا سبب یقیناً گزشتہ رات پیش آنے والا واقعہ تھا۔ دلاور کے ایک ملازم نے مجھے ڈرائنگ رُوم میں بٹھا دیا

اور دلاور کو میری آمد سے مطلع کرنے چلا گیا۔ پھر کچھ دیر بعد اُس نے آ کر بتایا۔ "صاحب کہہ رہے ہیں، آپ کچھ دیر انتظار کریں۔ پھر وہ آپ کو اپنے کمرے میں بلوا لیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں یہاں بیٹھی ہوں۔ جب تمہارے صاحب کہیں مجھے آ کر اطلاع دے دینا۔" میں نے ملازم سے کہا۔

"آپ کچھ پئیں گی؟ چائے یا......"

"کچھ نہیں۔" میں ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ "تم جاؤ۔"

ملازم ادب سے سر جھکا کر چلا گیا اور میں یہ سوچنے لگی کہ دلاور نے پولیس افسر کے ایماء ہی پر مجھے اپنے کمرے میں نہیں بلوایا ہو گا۔ پوچھ گچھ کے درمیان میں اُس پولیس افسر کو دلاور کے سوا وہاں کسی کی موجودگی پسند نہیں ہو گی۔ میرے لئے یہ بہتر ہی ہوا تھا۔ میں خود بھی اس معاملے میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دلاور ایسا ذہین شخص اس معاملے سے خود بھی نمٹنے کا اہل تھا۔

اس پولیس افسر کو وہاں آئے شاید کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد میں دلاور کی خواب گاہ میں تھی۔ وہ سامنے ہی مسہری پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز نظر آ رہا تھا۔ مسہری کے قریب ہی دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی دلاور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور پھر اُس نے ایک مشہور شعر کا مصرعہ پڑھا......

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں......

ملک دلاور سے مجھے بہت سی کام کی باتیں معلوم کرنا تھیں اس لئے میں نے پڑھے جانے والے مصرعے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں نے خود پر سنجیدگی طاری کر لی اور پھر مسہری کے قریب پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ ملک دلاور میرے چہرے سے موڈ کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُسے مزید موقع دیئے بغیر میں نے فوراً ہی ایک سوال کر دیا۔ "نرگس کی ماں اور اُس کے اپاہج بھائی کو تم نے ہی کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا ہے؟"

"اچھا تو آپ وہاں پہنچ ہی گئیں۔" وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "میں خود یہی سوچ رہا تھا کہ آپ اُن دونوں کو نظر انداز نہیں کریں گی۔ آپ کا خیال درست ہے۔" اُس کے لہجے میں اب شرارت نہیں تھی۔

تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اُن دونوں کی زندگی کو بھی خطرہ پیش آ سکتا ہے اور یہ کہ اس بات کا تعلق نرگس کے ماضی سے ہے؟" میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

"جی ہاں...... یاد ہے مجھے۔" اُس نے آہستگی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میں وہی جاننا چاہتی ہوں۔" میں اُسے غیر سنجیدہ ہونے کا موقع دیئے بغیر پے در پے ضروری باتیں معلوم کر لینا چاہتی تھی۔ میں نے اسی لئے رُکے بغیر مزید کہا۔ "اگر نرگس کا ماضی سامنے آ جائے تو ممکن ہے اُس کی بازیابی کے لئے کوئی مناسب قدم اُٹھایا جا سکے! اس کا اندازہ خود تمہیں بھی ہو گا کہ نرگس کی ماں اور اُس کے بھائی کو تم زیادہ دن......"

"سمجھتا ہوں میں!" وہ اور بھی سنجیدہ نظر آنے لگا۔ "اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان باتوں کا آپ کے علم

میں بھی آ جانا مناسب ہے۔ میں نے جو کچھ سوچا ہے اس کا انحصار فی الحال قیاس پر ہے کہ نرگس کے اغواء کا تعلق اُس کے ماضی ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس امکان کو بہرحال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہم سرے سے غلط خطوط ہی پر سوچ رہے ہوں۔ اس معاملے میں کیونکہ ابتداء ہی سے افریقی باشندے ملوث نظر آ رہے ہیں، اسی لئے میرا خیال اُدھر گیا تھا، یعنی نرگس کے ماضی کی طرف۔" ملک دلاور بہت محتاط اور سنجیدہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے خود کلامی میں مبتلا ہو۔ اس طرح شاید وہ اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے مختلف خیالات کو کوئی ایک رُخ دینا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسی لئے اُسے درمیان میں ٹوکا نہیں کہ وہ تمہید سے گریز کرے۔ پھر چند لمحے بعد وہ خاموش بھی رہا تو میں نہ بولی۔ وہ اب میری طرف دیکھنے کی بجائے سامنے نظر جمائے بول رہا تھا۔ "میرے علم میں جو واقعات ہیں اُن کے مطابق نرگس کے والد اپنے عہد جوانی میں شمالی افریقہ کے ایک ملک موری تانیا میں سیٹل ہو گئے تھے۔ اس وقت وہ شادی شدہ تھے اور دو بچوں کے باپ بھی بن چکے تھے۔ سنا گیا ہے کہ وہاں انہیں ہیرے کی کانوں کی تلاش تھی۔ اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب رہے یا نہیں، اس سے قطع نظر یہ سبھی کو معلوم ہے کہ اچانک وہ بہت دولت مند ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں انہوں نے موری تانیا کی سرحد سے قریب صحرائے اسپین کے آس پاس آباد افریقی قبائل سے رسم و راہ بڑھا لی تھی۔ پھر نہ جانے کس مصلحت یا ضرورت کے تحت انہوں نے ایک افریقی قبیلے کے سردار کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس شادی کے بعد ہی اُن کے حالات بدلے تھے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی عورت دوسری عورت کو آسانی سے قبول نہیں کرتی۔ نرگس کی ماں کو ہر سکھ میسر تھا مگر اس دُکھ نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ اب نرگس کے والد پلٹ کر اُن کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔ ہاں اُن کی ضروریات کا پورا خیال رکھتے تھے۔ افریقی لڑکی سے شادی کے ایک سال بعد نرگس کے والد مزید ایک بیٹے کے باپ بن گئے۔ یہ بیٹا اُسی افریقی لڑکی یا عورت سے تھا۔ اس لڑکے کی پیدائش کے تقریباً تین سال بعد اچانک ایک حادثے میں نرگس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثے کے بارے میں بس اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ عجیب نوعیت کا تھا۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ یہ حادثہ نہیں تھا۔ بہرحال اپنے شوہر کی موت کے بعد نرگس کی ماں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے وطن واپس آ جائیں۔ انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اُن کی سوکن کا قبیلہ انہیں وہاں سکون سے نہیں رہنے دے گا اور نہ انہیں مال و دولت کی ہوا لگنے دے گا۔ اپنے اور اپنے دونوں بچوں کے تحفظ کی خاطر وہ پاکستان لوٹ آئیں۔ انہیں اپنے مرحوم شوہر سے بہت محبت تھی اس لئے انہوں نے دوسری شادی بھی نہیں کی۔ اُن کا خاندان کیونکہ متمول خاندانوں میں شمار ہوتا تھا اس لئے معاشی طور پر انہیں اپنے بچوں کی پرورش میں زیادہ دُشواری نہیں ہوئی۔ بدقسمتی یہ کہ نرگس کے بھائی کی دونوں ٹانگیں بچپن سے ہی پولیو کا شکار ہو گئیں۔ نرگس جوان ہوئی تو اُس کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی ننھیال پر بوجھ بنی رہے۔ وہ اپنی ماں اور بڑے بھائی کو لے کر لاہور سے کراچی آ گئی۔ وہ پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی تھی۔ میرے علاوہ بھی یہاں اُس کے بہت سے عزیز تھے۔ وہ مجھ سے بھی ملی اور دیگر عزیزوں سے بھی۔ پھر میں نے اُسے آپ کی فرم میں ملازم کرا دیا اور...... اور......" ملک دلاور اس طرح خاموش ہو گیا جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے ہی اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی ہو۔ اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر خجل سے انداز میں مسکرانے لگا۔

میں کچھ دیر خاموشی سے ملک دلاور کی سنائی ہوئی داستان پر غور کرتی رہی۔ نرگس کے ماضی کی روشنی میں اُس کے اغواء پر ملک دلاور نے کیا سوچا ہوگا؟ یہ اب بڑی حد تک مجھ پر واضح ہو چکا تھا۔ میں نے اسی کے پیش نظر ذرا توقف کے بعد کہا۔ "نرگس کے اغواء میں تمہارا شک موری تانیا کے اُسی قبیلے پر ہے، کسی سبب وہی قبیلہ نرگس، اُس کی ماں اور بھائی کو ختم کرنا چاہتا ہے۔"

"جی ہاں، میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔" دلاور نے جواب دیا۔

"معاملے کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں چند باتیں طے کرنا ہوں گی، انہیں تم مفروضات بھی کہہ سکتے ہو۔"

"مثلاً؟" اُس نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"مثلاً یہ کہ ہم فرض کئے لیتے ہیں، کسی وجہ سے وہ افریقی قبیلہ نرگس، اُس کی ماں اور بھائی کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ ایسی صورت میں اُس نے شمالی افریقہ ہی کے ایک باشندے کو اپنا آلہ کار بنایا جو یہاں ایک سفارت خانے میں ملازم تھا۔ میرا اشارہ اُسی پُراسرار افریقی باشندے کی طرف ہے جو نرگس کے اغواء میں ملوث تھا اور جس کی شناخت کے لئے تم نے مجھے بلایا تھا۔ سمجھ رہے ہو؟"

"جی...... آپ کہتی جائیں۔" وہ بولا۔

"اگر ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم نے فرض کیا تو پھر نرگس کو اغواء کرانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"آپ کا یہ سوال یقیناً غور طلب ہے۔" ملک دلاور نے اعتراف کیا۔

"نرگس پر قاتلانہ حملہ نہیں کیا گیا بلکہ اُسے اغواء کرایا گیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُس کے دشمن اُسے فی الحال کسی سبب زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ نرگس کی ماں اور اُس کے بھائی کو نہیں چھیڑا گیا۔ آخر کیوں؟ اس سے تمہارے ذہن میں کیا بات آتی ہے؟"

"ایک تو یہ کہ دشمن پہلے نرگس کو قبضے میں کر لینا چاہتا تھا، پھر اُس کا دوسرا ہدف نرگس کی ماں اور بھائی ہوتے۔ دوسری بات یہ ممکن ہے کہ صرف نرگس ہی اُن کا ہدف ہے۔" ملک دلاور نے جواب دیا۔

"دراصل یہ قصہ اتنا سیدھا سادا نہیں لگتا جتنا بظاہر معلوم ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے پیچھے کوئی اور چکر بھی ہے جو ابھی سامنے نہیں آیا۔ اس پر سکون کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کہیں کوئی کڑی ایسی ضرور ہے جو گم ہے۔ بہرحال تم بھی غور کرو اور میں بھی سوچتی ہوں۔ اس وقت نرگس کے ماضی سے قطع نظر پہلا مسئلہ اُس کی بازیابی کا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" ملک دلاور خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔

"یہ بتاؤ کہ اس سلسلے میں تم نے کن خطوط پر آگے قدم بڑھایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کی فراہم کردہ اطلاع کی روشنی میں مجھے یہی صورت نظر آئی تھی کہ اُسی سفارت خانے پر نظر رکھوں۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف اتنا کہوں گا کہ میں نے اپنی دانست میں جس افریقی باشندے پر ہاتھ ڈالا تھا، وہ مجھے نرگس کے اغواء میں ملوث معلوم ہوا تھا۔ وہ دو تھے جن میں سے ایک بچ کر نکل گیا۔ ان میں سے ایک کا تعلق سفارت خانے ہی سے تھا، وہی جو میرے آدمیوں کو جُل دے کر بھاگ گیا۔ میری نظر میں وہ دونوں

ہی مشتبہ تھے۔ اُنہیں نرگس کے بارے میں گفتگو کرتے سنا گیا تھا۔ اپنے آدمیوں سے جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو میں نے فوری طور پر یہی مناسب خیال کیا کہ اُن پر ہاتھ ڈال دیا جائے۔'' ملک دلاور یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

''پھر تم اُسے اپنی کوٹھی میں لے آئے اور اُس کی شناخت کے لئے مجھے فون کیا! یہی نا؟'' میں نے تصدیق چاہی۔ دلاور سے تفصیلات جاننا میں نے بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''جی۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''میں اُسے یہیں لے آیا تھا تا کہ آپ کے توسط سے اُس کی شناخت ہو سکے۔''

''وہ اصل آدمی نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔

میرے اس انکشاف پر ملک دلاور چونک اُٹھا اور بولا۔ ''لیکن آپ نے اُسے دیکھا بھی نہیں تھا اور نہ بلقیس.....''

''اس کے باوجود میں یقین کے ساتھ یہ بات کہنے کی اہل ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے مختصراً اُسے اُن واقعات سے آگاہ کر دیا جو اُس کے علم میں نہیں تھے۔ یہ معلومات مجھے اُس افریقی باشندے سے حاصل ہوئی تھیں جس نے ملک دلاور پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور جسے میرے آدمی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے کر آئے تھے۔

''پھر تو بس لے دے کر ایک ہی شخص رہ جاتا ہے، وہی جو میرے آدمیوں سے بچ کر فرار ہو گیا۔ اُسی کا تعلق سفارت خانے سے تھا۔'' ملک دلاور بولا۔

''اور وہ شخص غائب ہے۔''

''سمجھا نہیں میں۔'' ملک دلاور نے حیرت سے کہا۔

''اُس شخص نے تمہیں پھانسنے کے لئے اپنے اغوا کئے جانے کا ڈھونگ رچایا اور نہ معلوم کس طرح اپنے سفارت خانے کے ایک ذمہ دار شخص کو بھی اس معاملے میں ملوث کر لیا۔ پھر اُس ذمہ دار شخص نے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کیا اور اپنے آدمی کے اغواء کا شبہ تم پر ظاہر کیا۔'' میں اُسے بتانے لگی۔ ''ایک طرف تو وہ سرگرم عمل تھا، دوسری جانب وہ دہشت پسند گروہ جس کے ایک رُکن کو تم نے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ دراصل اس طرح وہ دو طرف سے تمہیں گھیر رہا تھا۔ اِدھر دہشت پسند گروہ تمہاری کوٹھی کے ایک حصے میں دھما کہ کر کے اپنے آدمی کو نکال لے گیا، اُدھر پولیس سفارت خانے سے متعلق افریقی باشندے کی بازیابی کے سلسلے میں یہاں پہنچ گئی۔ دھماکے کا مقصد محض افراتفری پھیلانا اور تمہاری توجہ دوسری طرف مبذول کرنا تھا جس میں اُنہیں کامیابی ہوئی۔''

''چھوڑیں بھی! دماغ دُکھ گیا سوچ سوچ کر۔'' دلاور نے کہا۔ ''کوئی اور بات کرتے ہیں۔''

''کوئی اور بات'' کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس لئے فوراً ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے یہ آپ کو بیٹھے بیٹھے ایک دم کیا ہو گا؟ کھڑی کیوں ہو گئیں؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''کچھ دیر تو اور بیٹھیں۔''

''میں اب چلوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے معاً مجھے اُس پولیس افسر کا خیال آ گیا جو دلاور سے مل کر گیا تھا۔

''اچھا تم کہتے ہو تو بیٹھ جاتی ہوں۔ مگر ایک شرط پر کہ ہم صرف کام کی باتیں کریں گے۔'' میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور خوش مزاجی سے بولی۔ ''اچھی سی چائے بنوالو۔''

''مگر یہ وقت تو کھانے کا ہے، کھانا کھالیں۔ یہیں ٹرالی منگوا لیتا ہوں۔'' اُس نے تجویز پیش کی۔

''نہیں، صرف چائے۔''

''چلیں یہی سہی۔'' یہ کہہ کر دلاور نے اپنے ملازم کو آواز دی۔ ملازم آ گیا تو اُس نے چائے لانے کو کہا، پھر مجھ سے بولا۔ ''میرے خیال میں کام کی بات صرف ایک ہی رہ گئی ہے۔ آپ شاید یہ جاننا چاہیں گی کہ وہ پولیس افسر جو آپ کی آمد سے پہلے یہاں بیٹھا تھا، کیوں آیا تھا؟'' یہ کہہ کر اُس نے مجھے شرارتی نظروں سے دیکھا۔ ''ورنہ آپ اتنی آسانی سے اس خادم کی درخواست قبول کر لیں، ہرگز نہیں۔''

''تم بہت تیز ہو۔'' میں ہنس دی، پھر اعتراف کر لیا کہ واقعی میں پولیس افسر سے ہونے والی گفتگو کے متعلق جاننا چاہتی ہوں۔''

''کوئی خاص بات نہیں ہوئی میرے نقطہ نظر سے۔'' دلاور نے بتایا۔ ''ہاں میں نے ایک بات ضرور محسوس کی کہ نرگس سے میرے قریبی تعلق کا علم پولیس کو آپ ہی کے ذریعے سے ہو سکتا تھا۔''

''تم نے اُسے بتایا کیا؟''

''کچھ نہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''وہ سوال کرتا رہا اور میں اُسے گول مول جواب دیتا رہا۔ ویسے اُس نے کوشش بہت کی اپنی دانست میں کہ مجھے گھاٹ پر لے آئے مگر......''

''تم کہاں ہار ماننے والے!'' میں نے ہنس کر اُس کی بات پوری کر دی۔

''ہاں تو آپ نے یہ نہیں بتایا کہ پولیس کو آپ ہی نے اس بندۂ بے توقیر کے پیچھے لگایا ہے یا......''

''توکیر نہیں توقیر!'' میں نے اُسے گھمانا شروع کر دیا کیونکہ میں اس سلسلے میں اُسے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔

''آپ پھر میرے زبان و بیان پر حملہ کر رہی ہیں، جواباً میری طرف سے اگر......''

''بیان پر نہیں، صرف زبان پر۔'' میں بہ دستور فقرے بازی کرتی رہی۔ اس سے میرا مقصد محض وہ بات گول کر جانا تھا جو دلاور معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اسی فقرے بازی کے دوران میں چائے آ گئی اور پھر چائے پیتے ہی میں اُٹھ گئی۔

دلاور غالباً سمجھ چکا تھا کہ میں اُسے کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں اس لئے بس وہ ایک دو ٹھنڈی آہیں بھر کے رہ گیا۔

''ٹاٹا!'' میں رخصتی انداز میں ہاتھ ہلاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں مسکراتی ہوئی اُس کے کمرے سے نکل آئی۔ اُس کا تلملانا بجا تھا، لیکن میری بھی اپنی مجبوریاں تھیں۔ اگر دلاور، نرگس کا قریبی عزیز نہ ہوتا تو شاید میں اُس سے اس سلسلے میں اتنی باتیں بھی کرنا پسند نہ کرتی۔ میں اپنے معاملات کو اپنے طور پر نمٹانے کی عادی ہوں۔ ایسی باتوں سے میں ہمیشہ گریز کرتی رہی ہوں جن سے میرے اصل مقاصد پر روشنی پڑتی ہو۔ اس باب میں کوئی تخصیص نہیں تھی۔ دلاور ہی کیا، کوئی بھی شخص میرے اس قدر قریب نہیں آ سکا تھا کہ اُس پر میری شخصیت کے اسرار کھل سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ مجھے خود نمائی اور نمائش

کا شوق تھا اور نہ میں کسی کو اپنے معاملات میں مداخلت کی اجازت دیتی تھی۔ دلاور اپنے طور پر اس کوشش میں ضرور لگا رہتا تھا لیکن اُسے بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ میری شخصیت کے کئی گوشے اُس کی نظروں سے اب تک اوجھل تھے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر خود اپنے اندر پوشیدہ حیرت انگیز قوتیں میرے لئے معمہ بن جاتی تھیں۔ مثلاً گزرے ہوئے اور پیش آنے والے واقعات کا علم! میں اُس حیرت انگیز تجربے کو بھی نہیں بھول سکی تھی جو جرمن سائنس دانوں نے مجھ پر کیا تھا۔ مجھے اُس وقت یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں صدیوں کا سفر طے کرتی ہوئی زمانہ حال تک پہنچی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ کہ کسی اُلجھے ہوئے مسئلے پر غور کرتے وقت اچانک حقیقت کا انکشاف ہو جانا، یہ بھی میرے لئے ایک معمہ ہی تھا۔

دلاور کی کوٹھی سے لوٹ کر اپنی کوٹھی میں آنے کے بعد بھی میں ایک ایسے ہی پراسرار مرحلے سے گزری۔ اُس روز بھی میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ اس واقعے کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتی ہوں۔

ہوا یہ کہ کھانا وغیرہ کھا کر میں کچھ دیر آرام کی غرض سے بستر پر دراز ہوگئی۔ میرے ذہن میں اُس وقت وہی داستان گردش کر رہی تھی جو دلاور سے سنی تھی۔ اس داستان میں بہت سی ایسی باتیں تھیں جو میرے لئے اُلجھن کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ بس اچانک ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میرے جسم میں ایک مانوس سی لذت انگیز سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ میرا پورا وجود جیسے کسی برقی رو کی زد پر تھا۔ یہ کیفیت میرے لئے نئی نہیں تھی۔ پہلے بھی متعدد بار میں اس سے گزر چکی تھی۔

میری آنکھیں بند تھیں اور میرے صفحۂ ذہن پر کچھ ہیولے سے اُبھر رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا جیسے کسی گزرے ہوئے زمانے میں پہنچ گئی ہوں۔ وہاں کی فضا اور ماحول میرے لئے اجنبی ہونے کے باوجود اجنبی نہیں تھا۔

پھر چند ہی لمحوں بعد مجھے وہ ہیولے واضح طور پر نظر آنے لگے۔ ایک بوڑھا افریقی، کسی ادھیڑ عمر عورت سے ہمکلام تھا۔

''یہ ادھیڑ عمر عورت، نرگس کی سوتیلی ماں ہے اور یہ بوڑھا افریقی اس عورت کا باپ ہے۔'' کسی نے میرے ذہن میں سرگوشی کر دی تھی۔

پھر ذرا ذرا وقفے سے منظر بدلتے رہے اور اسی کے ساتھ مجھے سرگوشیاں سنائی دیتی رہیں۔ میں نرگس کے ماضی کا سفر کرتی رہی جو ماضی سے حال کی طرف جاری تھا۔ میں نے اپنے اندر چھپی ہوئی حیرت انگیز قوتوں کے سبب جو کچھ دیکھا اور سنا خود میرے لئے بھی ناقابل یقین سا تھا۔ مجھے ماضی میں گزرے ہوئے وہ واقعات بالکل اس طرح نظر آئے جیسے میرے سامنے کوئی فلم چل رہی ہو اور میں سب کچھ دیکھ رہی ہوں، سن رہی ہوں، محسوس کر رہی ہوں! میں نے اس دوران میں نرگس کے سوتیلے بھائی کو بھی دیکھا اور وہ سب کچھ دیکھا جو تعجب خیز تھا۔

نرگس کی سوتیلی ماں کا قبیلہ عجیب و غریب رسوم و روایات کا حامل تھا، عجیب و غریب بھی اور ہولناک بھی ا نرگس کی سوتیلی ماں کا باپ قبیلے کا سردار تھا اور مذہبی پیشوا بھی۔ میں نے اُسے نرگس کے بارے میں اے

نوجوان نواسے کو حکم دیتے سنا۔ ''اس برس عظیم دیوتا ہتار کے ہیکل میں تیری سوتیلی بہن نرگس کی قربانی پیش کی جائے گی۔ تو جانتا ہے کہ دیوتا ہتار ہی کے قبضے میں اس بستی کی جان ہے۔ سن کہ ابھی وقت ہے۔ رات کو دیوتا نے مجھے خواب میں یہ حکم دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو بستی پر دیوتا کا قہر ٹوٹ پڑے گا۔ اب سے چوتھے چاند کی چوتھی رات اس قربانی کے لئے مقرر کی گئی ہے۔''

اس کے بعد جلدی جلدی منظر بدلنے لگے۔ نرگس کی تلاش شروع ہوگئی۔ پھر کسی نے سوتیلے بھائی کو ایک سوڈانی کا پتہ دیا۔ وہ شخص پاکستان میں سوڈانی سفارت خانے کا ملازم تھا اور جلد ہی اپنی چھٹیاں گزارنے کے بعد پاکستان واپس جانے والا تھا۔ کسی نجی کام سے وہ شخص اُن دنوں موری تانیا آیا ہوا تھا۔ بھاری معاوضے پر اُس شخص نے نرگس کو تلاش کر کے کسی بھی طرح وقت مقررہ سے پہلے موری تانیا پہنچانے کا وعدہ کیا۔ اُسے نرگس کے بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کر دی گئی تھیں۔ معاوضے میں اُسے بہت سے ہیرے پیشگی دیئے گئے اور اتنے ہی ہیرے بعد میں دینے کا وعدہ کیا گیا۔ قبیلے کا سردار بھی اُس شخص سے ملا۔ سردار نے اپنی شیطانی قوتوں کے سہارے اُس سوڈانی کو بتایا کہ نرگس پاکستان کے شہر کراچی میں ہے اور اُس کا حلیہ یہ ہے۔ نرگس کی پہچان کے لئے کچھ خاص نشانیاں بھی سردار نے اُسے بتائیں۔ ان نشانیوں میں واضح نشانی پیشانی پر ایک زخم کا نشان تھا۔ سردار نے بتایا کہ نرگس جب بچی تھی تو اُس کی پیشانی پر بائیں جانب چوٹ لگ گئی تھی۔ نرگس کی ماں نے زخم میں، میرے ہی کہنے پر پسا ہوا سرمہ بھر دیا تھا۔ پھر وہ زخم ٹھیک ہو گیا لیکن چھوٹا سا سیاہ ہلالی نشان ہمیشہ کے لئے اُس کے ماتھے پر رہ گیا تھا۔

وہ سوڈانی، موری تانیا سے اپنے وطن پہنچا، پھر وہاں سے پاکستان آ گیا۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود اس کا تعلق ایک دہشت پسند گروہ سے بھی تھا۔ اس گروہ کے کچھ ارکان پاکستان میں بھی تھے۔ لالچی سوڈانی، اس گروہ کے ارکان سے ملا اور اُنہیں نرگس کی تلاش پر مقرر کر دیا۔ خود بھی وہ ہر امکانی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ کراچی میں جن بااثر پاکستانیوں سے اُس کے رابطے تھے، اُن میں عبدالحمید خاں بھی تھا۔ عبدالحمید خاں سے بھی اُس نے محتاط الفاظ اپنا مسئلہ بیان کیا اور اُن دوسرے بااثر افراد سے بھی جنہیں وہ جانتا تھا۔ عبدالحمید خاں ایسا شخص ان چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالتا تھا لیکن اُس نے سوڈانی سے تعلقات قائم رکھنے کی خاطر وعدہ کر لیا کہ میں اس حلیے کی لڑکی کو تلاش کراؤں گا۔

منظر پھر بدلا۔ عبدالحمید خاں، لی مارکیٹ کی عمارت میں نرگس کو دیکھ کر چونک اُٹھا۔ ''آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔'' اُس نے زیر لب کہا اور پھر فوراً ہی اُس سوڈانی سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ وہ سوڈانی اپنے سفارت خانے کی گاڑی میں وہاں پہنچا۔ اُس نے نرگس کو اُس کے حلئے اور پیشانی پر زخم کے نشان سے پہچان لیا، پھر بھی وہ مزید تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے جانے کیا سوچ کر خود نرگس کو وہاں سے لے جانا مناسب نہیں سمجھا اور واپس آ گیا۔ وہ یہ کام دہشت پسند گروہ کے ارکان سے لینا چاہتا تھا کہ اگر مزاحمت ہو تو وہ لوگ اُس سے نمٹ لیں۔ اُس نے اپنی کار دہشت پسندوں کے حوالے کر دی اور خود سفارت خانے کی عمارت میں نرگس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ عبدالحمید خاں کو وہ طے شدہ رقم پہلے ہی دے آیا تھا۔ منصوبے کے مطابق دہشت پسند گروہ کے ارکان بے ہوش نرگس کو سیاہ کار میں ڈال کر لے آئے اور اُسے سوڈانی کے حوالے کر دیا۔ وہ سوڈانی بہت عیار

تھا۔ اُسے معلوم ہوگیا کہ سفارت خانے کی عمارت کی نگرانی ہو رہی ہے۔ اُس نے نرگس کو وہاں سے اپنے ایک پاکستانی دوست کی کوٹھی میں منتقل کرنے کے لئے ایک عیارانہ منصوبہ بنایا۔ اُس نے سفارت خانے کی سیاہ کار میں دہشت پسند گروہ کے ایک رُکن کو کچھ ہدایات دے کر روانہ کیا۔ نگرانی کرنے والے اُس کی توقع کے مطابق سیاہ کار کے پیچھے لگ گئے جس میں صرف ایک دہشت پسند تھا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر وہ سوڈانی، نرگس کو سفارت خانے کی عمارت سے نکال لے گیا۔ اپنے پاکستانی دوست کی کوٹھی کے ایک الگ حصے میں اُس نے نرگس کو ایک کمرے کے اندر قید کر دیا۔ نرگس کے ماضی کا علم اُسے افریقی سردار سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ خود نرگس کی زبان سے اس کی تصدیق چاہتا تھا تاکہ کسی شبے کی گنجائش نہ رہے کہ اس نے غلط لڑکی پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔ اس کے لئے سوڈانی نے نرگس پر تشدد کیا مگر نرگس نے کچھ بھی نہ بتایا۔ پھر مجبوراً وہ نرگس کو وہاں چھوڑ کر چلا آیا۔

نرگس ابھی تک ڈیفنس کی اُسی کوٹھی میں تھی اور اُس نے تشدد کے باوجود زبان نہیں کھولی تھی۔ عیار اور لالچی سوڈانی نے تصدیق کی خاطر دوسرے ذرائع کا سہارا لیا۔ اب وہ نرگس کی ماں اور بھائی کی تلاش میں تھا، لیکن اُسے ناکامی ہوئی۔ وہ دونوں گھر سے غائب تھے۔ مجبوراً تصدیق کے لئے اُسے نرگس ہی کی زبان کھلوانے پر اکتفا کرنا پڑا۔ بغیر تصدیق کے وہ اتنا بڑا جواء کھیلنا نہیں چاہتا تھا۔ نرگس کو وہ کس طرح پاکستان سے موری تانیا لے جاتا، اس کے لئے بھی وہ انتظامات کر چکا تھا۔ اپنے اسی منصوبے کی تکمیل کے لئے وہ سفارت خانے سے بھی غائب ہوگیا تھا اور ڈیفنس ہی میں اپنے پاکستانی دوست کی کوٹھی میں چھپا ہوا تھا اور یہیں نرگس بھی قید تھی۔

ماضی کا سفر طے کرتے ہوئے اب میں زمانۂ حال میں پہنچ چکی تھی۔ وہ آخری منظر میرے لئے بڑا رُوح فرسا تھا۔ عیار سوڈانی، نرگس کے جسم کو اذیتیں دے رہا تھا اور نرگس کا چہرہ جیسے مجھ سے فریاد کر رہا تھا۔

آخری بار میرے وجود میں ہونے والی سرگوشی نے مجھ پر منکشف کر دیا کہ وہ کوٹھی، ڈیفنس کے کس حصے میں ہے، اُس کا نمبر کیا ہے اور وہاں کون رہتا ہے!

اسی سرگوشی کے بعد رفتہ رفتہ میری حالت اعتدال پر آ گئی۔ اُس وقت میرے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ میں ایک دم بستر سے اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے جذبات اور غصے کی شدت نے جیسے اپنے حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ اگر اس حالت میں وہ سوڈانی میرے سامنے آ جاتا تو شاید میں اُس کے ٹکڑے اُڑا دیتی جو ایک بے بس لڑکی کو رسیوں سے باندھ کر ظلم ڈھا رہا تھا، اُس کی چیخوں اور کراہوں پر قہقہے لگا رہا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو شاید اُڑ کر نرگس تک پہنچ جاتی۔ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں کہ میں کس طرح اس عالم میں اپنے کمرے سے نکلی اور کب اپنی کار ڈرائیو کرتی ہوئی آندھی طوفان کی طرح ڈیفنس کی اُس کوٹھی تک جا پہنچی جہاں نرگس قید تھی۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے میں نے بڑی حد تک اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا۔ اُس لمحے میری آنکھوں میں نرگس کا فریادی چہرہ گھوم رہا تھا اور میں نے اُس چہرے کی فریاد سن لی تھی۔ اپنی کار سے اُترتے ہوئے میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ ''آ رہی ہوں...... میں آ رہی ہوں نرگس!...... بس چند لمحے، صرف چند لمحے اور یہ ظلم برداشت کر لو......!''

○○○

وہ کوئی عالم بے نام ہی تھا، ایسا عالم کہ جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ عقل و ہوش کی باتیں ایسے عالم میں حماقت معلوم ہوتی ہیں۔ جب سینہ دُھواں دُھواں ہو، لہو رگوں میں جوش مار رہا ہو تو بھلا حواس ٹھکانے کب رہتے ہیں؟ ایسے میں اگر کانٹے بچھے ہوں، دہکتے ہوئے انگارے بھی راستے میں پڑے ہوں تو ان کی پرواہ نہیں ہوتی۔ آدمی بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ اُن انگاروں پر چلتا ہوا دوسری جانب پہنچ جاتا ہے۔ دیکھنے والے حیرت کرتے ہیں کہ یہ کیسے ہوگیا؟ یہ تو ناممکن تھا! مگر وہ آدمی ہی کیا جو ناممکن کو ممکن نہ بنا دے۔ خدائے عزوجل نے آدمی کو بڑی قوتوں اور نعمتوں سے نوازا ہے۔ بس ان کی آگہی شرط ہے اور میں اپنی حد تک کسی قدر آگاہ ہو چکی تھی کہ مجھ میں کیا کیا حیرت انگیز قوتیں پوشیدہ ہیں۔ ایسی صورت میں یہ تو ممکن تھا کہ میں وقتی طور پر کسی فطری جذبے کے تحت بے حواس ہو جاؤں لیکن اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ گھبرا جاؤں۔

اُس وقت جب میں نرگس کی فریاد پر ڈیفنس کی اُس کوٹھی تک پہنچی تو حواس میں ہونے کے باوجود پوری طرح اپنے حواس میں نہیں تھی۔ شاید یہی سبب تھا کہ نہ تو میں نے کال بیل کیطرف توجہ دی، نہ یہ دیکھا کہ کوٹھی کا پھاٹک بند ہے۔ میں بڑبڑاتی ہوئی تیزی سے پیچھے ہٹی اور پھر ایک ہی جست میں باؤنڈری وال عبور کر کے اندر پہنچ گئی۔

کوٹھی میں اس وقت قدرے سناٹا تھا اور یہ سناٹا میرے لئے خلافِ معمول نہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دوپہر کے بعد اس علاقے میں رہنے والے عموماً سو جاتے ہیں اور پھر شام سے پہلے نہیں اُٹھتے۔ شام کی چائے کے لئے ہی ملازمین اُنہیں خوابِ راحت سے بیدار کرتے ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ملازمین بھی اِدھر اُدھر پڑ رہتے ہیں۔ ہاں ''صاحب'' کے جاگتے ہی وہ اس طرح چاق و چوبند نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ فرض شناس ملازمین ملنا ممکن ہی نہیں۔

اس کوٹھی میں بھی یہی صورت تھی۔ سو مجھے وہ حصہ تلاش کرنے میں زیادہ دُشواری پیش نہ آئی جہاں ایک مظلوم لڑکی فریادی بنی ہوئی تھی، مظلوم لڑکی، نرگس!

مطلوبہ کمرے کے دروازے پر پہنچتے ہی میں نے پیچھے ہٹ کر دایاں پیر اُٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے میرے پیر کی بھرپور ٹھوکر دروازے پر پڑی اور دروازہ چرچرا کر رہ گیا۔

''کون ہے؟'' اندر سے کرخت آواز میں پوچھا گیا۔ یہ دونوں الفاظ انگریزی میں ادا کئے گئے تھے۔ یہ اسی سوڈانی کی آواز ہو سکتی تھی جس نے نرگس کو حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا۔

''میں تمہاری موت، عذرا خان ہوں!'' میں نے بھی سوڈانی کے سوال کا جواب انگریزی میں دیا اور اسی کے ساتھ دروازے پر دوسری ضرب لگائی۔

مجھے یقین تھا کہ وہ سوڈانی، نرگس پر تشدد تو کر سکتا ہے مگر اُسے ختم نہیں کر سکتا۔ میں اسی لئے مطمئن تھی۔ اپنی فکر اُس وقت مجھے نہیں تھی اسی لئے اپنا تعارف کرا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

''دروازہ کھول دو! ورنہ میں اسے توڑ بھی سکتی ہوں۔'' مجھے اس وقت خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔ میری آواز میں درندوں جیسی غراہٹ تھی۔

پھر میری چوتھی ضرب پر خلافِ توقع ایک دم دروازہ کھل گیا۔ میرے اعصاب تن گئے اور اسی لمحے مجھے دروازے کے قریب کوئی ڈھیر کی صورت میں پڑا دکھائی دیا۔ وہ یقیناً نرگس ہی تھی۔

''نرگس!'' یہ کہتے ہوئے میں تیزی سے آگے بڑھتے بڑھتے رُک گئی۔ میری نگاہ سامنے ہی کھلی ہوئی ایک کھڑکی کی طرف اُٹھ گئی۔

نرگس کو نظر انداز کرتی ہوئی میں کھڑکی کی طرف لپکی۔ یقیناً وہ عیار سوڈانی مجھے دھوکہ دے کر نکل گیا تھا۔ میں نے کھلی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو وہاں دُور تک کوئی نظر نہ آیا اور کمرے میں نیم بے ہوش نرگس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نہ معلوم اُس نے دروازہ بھی کیسے کھولا تھا!

میں کھڑکی کی طرف پلٹی ہی تھی کہ اچانک بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی اسی طرف آ رہا ہو۔ شاید کسی کو ''خوابِ راحت'' سے بیدار کر دیا گیا تھا۔ قدموں کی چاپ سے میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ آنے والا اکیلا نہیں ہے۔

مجھے ان آنے والوں سے زیادہ نرگس کی فکر تھی۔ میں تیزی کے ساتھ اُس کے قریب پہنچی اور اُسے اُٹھا کر مسہری پر ڈال دیا۔ کمرے میں ایک طرف مسہری موجود تھی۔ نرگس کو اپنے بازوؤں پر اُٹھاتے ہوئے میں محسوس کر چکی تھی کہ اب وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی ہے۔

اسی دوران میں قدموں کی چاپ بہت قریب آ چکی تھی۔ لیکن اب میں پوری طرح چوکنا تھی۔ کسی قسم کی بھی صورتِ حال سے نمٹنا میرے لئے زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ میرے پاس ریوالور بھی تھا اور میں اُس کا استعمال بھی جانتی تھی۔

نرگس کو مسہری پر لٹا کر میں اطمینان سے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ایک بھاری بھرکم اور بظاہر بارُعب سا شخص کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اُس کے پیچھے دو آدمی اور تھے جو حلیے سے ملازمین ہی لگتے تھے۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھا، عمر پچاس اور پچپن کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے چہرے پر غصے کے اثرات تھے۔ اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی نہایت سخت لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

''کون ہو تم؟ اور بغیر اجازت تم نے میری کوٹھی میں داخل ہونے کی ہمت کیسے کی؟''

وہ خالی ہاتھ تھا اور شاید احمق بھی۔ ورنہ میرے سامنے اتنی دیدہ دلیری کا ثبوت نہ دیتا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر وہ رُک گیا اور مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے وہ ساہوکار ہو اور میں چور۔ میں اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی، پھر بولی۔ ''چودھری صاحب! آپ شاید مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ یا اگر واقف ہوں گے تو انجان بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے عذرا خان کہتے ہیں۔''

''تو پھر......؟'' اُس کا لہجہ بدستور سخت رہا۔ ''تمہیں عذرا خان کہتے ہوں یا کچھ اور، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے تم سے تمہارا نام نہیں پوچھا، یہ پوچھا ہے کہ تم یہاں میری کوٹھی میں داخل کیسے ہوئیں؟ زیادہ ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے ایک ملازم کی طرف مُڑا اور اُس سے کہا۔ ''پولیس کو فون کرو۔'' پھر وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تمہیں شاید اندازہ نہیں لڑکی! کہ تم نادانستگی میں کہاں آ گئی ہو!......اور یہ...... یہ دوسری لڑکی کون ہے؟'' اُس نے چونک اُٹھنے کی اداکاری کرتے ہوئے سامنے مسہری پر پڑی ہوئی نرگس کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے تم کہاں سے اُٹھا کر لائی ہو؟''

اس عرصے میں اُس کا ایک ملازم پولیس کو فون کرنے جا چکا تھا۔ اس کی ''تقریرِ دل پذیر'' سننے کے باوجود میرے ہونٹوں پر اب تک مسکراہٹ تھی۔ میں اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے بزرگ کسی بچے کو شرارت کرتے دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ وہ یقیناً مجھے جانتا نہیں تھا۔ اس کا اندازہ اُس کی مسلسل حماقتوں سے بخوبی ہو رہا تھا۔

''تمہاری خاموشی اور یہ مسکرانا سب ابھی کچھ دیر میں ختم ہو جائے گا۔'' اُس نے مجھے خاموش دیکھ کر مزید بڑہانکی۔

''مسٹر اے آر چودھری!'' میں پہلی بار اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''تمہیں شاید تمہارے سوڈانی دوست نے کچھ بتایا نہیں میرے بارے میں! ورنہ تم اس وقت شیر خان بننے کی بجائے میرے سامنے بکری بنے ہوتے!'' میرے لہجے میں تمسخر تھا۔

''وھاٹ ڈو یو مین؟'' وہ ایک دم بھتے سے اُکھڑ گیا۔ اُس کا سوجا ہوا چہرہ غصے کی زیادتی سے مزید سوج گیا تھا۔ ''میں تمہیں لڑکی سمجھ کر اب تک معاف کر رہا تھا، لیکن تم......'' اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ ملازم پر برس پڑا۔ ''رسّی لاؤ کوئی! باندھ دو اس حرافہ کو۔ یہ چوری کرنے ڈاکہ ڈالنے گھسی تھی میری کوٹھی میں۔'' اُس کا سانس بے قابو ہونے لگا۔ اسی کے ساتھ اُس نے اپنے گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔

دوسرا ملازم بھی باہر لپک گیا۔

اُس نے مجھے حرافہ کہا تھا اور نہ جانے کس غلط فہمی میں تھا۔ اُس کی پی آر اچھی ہوئی تبھی اتنا اکڑ رہا تھا، چمار کی طرح! مگر اب میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی تھی۔ پھر یہ کہ مجھے نرگس کا خیال بھی تھا۔ نرگس کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں بجلی کی طرح کوند گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، میں نے اُس کا ریوالور چھین لیا اور پھر ایک ہی فلائنگ کک نے اُسے زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔

''صاحب بہادر کا بچہ!'' میں نے حقارت سے کہا۔ ''ابھی تجھے یہاں سے ہتھکڑیاں لگوا کر تھانے بھجواؤں گی۔ آنے دے پولیس کو۔ حرافہ کہہ رہا تھا مجھے کمینہ!''

وہ زمین پر پڑا کراہ رہا تھا اور چہرے پر تکلیف کے آثار تھے شاید اُس میں چیخنے چلانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میں اُسے زمین پر پڑا ہوا چھوڑ کر نرگس کی طرف پلٹی۔ میرے ہاتھ میں چودھری سے چھینا ہوا ریوالور اب بھی تھا۔ ریوالور ایک طرف مسہری کے سرہانے رکھ کر میں نے نرگس کو ہلایا جلایا۔

"نرگس!...... نرگس!" میں اُسے ہوش میں لانے کے لئے جھنجھوڑنے لگی۔ اُس کا چہرہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔

مسہری کے قریب سرہانے رکھی میز پر مجھے خالی گلاس نظر آیا، مگر پانی کا جگ دکھائی نہ دیا۔ اس کی تلاش میں میری نگاہ اِدھر اُدھر بھٹکنے لگی۔ اُسی وقت چودھری کا ملازم رتی لے کر آ گیا۔ میں نے اُسے ہونقوں کی طرح کمرے کا بدلا ہوا منظر دیکھتے ہوئے محسوس کیا۔

"اے سنو اِدھر!" میں نے اُسے مخاطب کیا۔ "پانی لے کر آؤ جلدی!"

اس عرصے میں چودھری، فرش سے اُٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ اُس کی صورت پر بھی پھٹکار برس رہی تھی۔ ملازم میری بات سننے کی بجائے اپنے "صاحب" کی طرف لپکا اور اُسے اُٹھنے میں مدد دینے لگا۔

"سنا نہیں تو نے!" میں نے ملازم کو پھر مخاطب کیا۔ اس بار میرا لہجہ سخت تھا۔ "پانی لے کر آؤ!" یہ کہتے ہوئے میں نے دوبارہ ریوالور اُٹھا لیا اور چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اپنے ملازم سے کہو، پانی لے کر آئے ورنہ...... یہ دیکھ رہے ہو میرے ہاتھ میں!" میں نے ریوالور کو جنبش دی۔ چودھری اب اُٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

"لا...... لا دو پانی!" اُس نے ملازم کو حکم دیا۔ ابھی اُس کی اکڑفوں ختم نہیں ہوئی تھی۔ شاید میری بات کو وہ محض دھمکی ہی سمجھا تھا کہ میں ہتھکڑیاں ڈلوا کر اُسے تھانے بھجوا دوں گی۔

ملازم اپنے مالک کا حکم سن کر دوڑ گیا۔ رتی وہ وہیں پھینک گیا تھا۔ اسی وقت پہلا ملازم، پولیس کو فون کر کے لوٹ آیا۔ وہ بھی کمرے میں داخل ہو کر "اُلو" نظر آنے لگا۔

"لڑکی! تمہیں پچھتانا پڑے گا۔" چودھری مجھے گھورتا ہوا بولا۔ "پولیس آنے ہی والی ہو گی۔"

"بکواس بند کرو اور خاموشی سے کھڑے رہو!" میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔ "تم جو ڈرامہ کھیل رہے ہو وہ زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ تمہیں ابھی اندازہ نہیں ہو رہا کہ تم کتنے لمبے چکر میں پھنس چکے ہو! وہ تمہارا دوست، وہ چالاک سوڈانی تمہیں پھنسوا کر بھاگ گیا احمق آدمی! اور تم ابھی تک احمقوں کی جنت میں ہو۔ تمہارے سارے تعلقات اور سارا اسٹیٹس دو منٹ کے اندر خاک میں مل جائے گا۔ ساری پھنے خانی دھری رہ جائے گی۔"

پہلی بار میں نے اُس کے چہرے پر قدرے فکرمندی کے آثار دیکھے۔ بھرے ہوئے غبارے کی ہوا آہستہ آہستہ نکل رہی تھی۔ پھر اُس نے مجھے دوبارہ دھمکانے کی کوشش نہیں کی اور میں، نرگس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اُس کی حالت مجھے ٹھیک معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ نہ معلوم اُس پر کیا کیا ستم توڑے گئے تھے؟ میں نے اُسے ہلایا جلایا تو اُس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اُسی وقت مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے دروازے کی طرف نگاہ اُٹھائی، ملازم پانی کا گلاس لئے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے اُسے قریب آنے کا اشارہ کیا تو وہ کانپتے قدموں سے میری طرف بڑھنے لگا۔

میں نے سوچا کہ کہیں خوف کی زیادتی کے سبب پانی کا گلاس اُس کے ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔

"ڈرو مت!" میں نے اُسے مخاطب کیا۔ "میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ گلاس میز پر رکھ کر پیچھے ہٹ

جاؤ!" میں نے مسہری کے سرہانے کی طرف اشارہ کیا۔

ملازم لرزتا کانپتا، میز پر گلاس رکھ کر اپنے "صاحب" کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میں نے اُٹھ کر ایک نظر چودھری پر ڈالی، پھر نرگس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی۔ مجھے اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی کہ وہاں کچھ دیر بعد پولیس آنے والی ہے۔ چوہدری نے یقیناً اس دوران میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اُس کی "تڑی" سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ سمجھ لینا بھی اُس کے لئے کوئی مشکل نہیں ہو رہا ہو گا کہ میں اُس کے قابو سے باہر کی "شے" ہوں۔ وہ اسی لئے اب مجھ پر پڑو ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم کچھ بتاؤ تو سہی کہ آخر یہ چکر کیا ہے؟" چودھری مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "تم کون ہو؟...... یہ لڑکی......"

"تمہارے سوڈانی دوست نے تمہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے نرگس کے منہ پر ایک بار پھر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے کہا۔

"اُس نے تو کہا تھا کہ...... کہ......"

"اچھا کہا ہو گا۔" میں نرگس کو ہوش میں آتے دیکھ کر جلدی سے بولی۔ "یہ سب کچھ تم پولیس کو بتانا۔"

"مگر...... مگر......" وہ ہکلانے لگا۔ اُسے شاید اب اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا کہ پولیس کو فون کرانا خود اس کے لئے مصیبت بن گیا ہے۔

"میں اُس کی "اگر مگر" کو سنی ان سنی کر کے نرگس کو آواز دینے لگی۔ اُس کے پپوٹے حرکت کر رہے تھے۔

"نرگس!...... ہوش میں آؤ نرگس!" میں اُسے جھنجھوڑنے لگی۔ چودھری سے چھینا ہوا ریوالور میں نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔

پھر اِدھر نرگس کو ہوش آیا اور اُدھر پولیس پہنچ گئی۔ میں نرگس سے کچھ پوچھ بھی نہ سکی۔

پولیس والے سیدھے دندناتے ہوئے اُسی کمرے میں آ گئے تھے۔ اُن کی رہنمائی کرنے والا بھی ایک ملازم ہی تھا۔ ایک سب انسپکٹر تھا اور اُس کے ساتھ تین سپاہی تھے۔ انہوں نے آتے ہی گویا اپنی دانست میں مجھے گھیر لیا تھا۔ چودھری کے ملازم نے فون پر شاید مجھے کچھ زیادہ ہی خطرناک "مجرمہ" ظاہر کر دیا ہو گا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ تم لوگ!" میں نے اُنہیں ڈانٹ پلائی، پھر سب انسپکٹر سے مخاطب ہوئی۔ "تم صورت سے مجھے اتنے گھامڑ نہیں لگتے ہو اس لئے جو کہہ رہی ہوں، کرو!"

وہ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھنے لگا، مگر اُس کے ریوالور کا رُخ میری ہی طرف رہا۔

"نظیر صاحب اس وقت ہیں تھانے میں؟" میں نے اُس ایس ایچ او کا نام لیا جو اُن دنوں اس علاقے میں متعین تھا۔

"ایں جی، صاحب؟...... جی...... جی ہاں جی......" سب انسپکٹر اپنے ایس ایچ او کا نام سن کر کچھ ڈھیلا پڑ گیا اور تینوں سپاہی بھی ذرا پیچھے ہٹ گئے۔

"یہاں سے فون کرو اُنہیں۔" وہ بولی۔ "میرا نام عذرا خان ہے۔ نام بتا دینا اُنہیں...... کہنا وہ خود یہاں آ جائیں۔"

"ایں جی، یہاں آ جائیں؟" اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں کیوں، یہاں آنے میں کیا بات ہے؟'' میں نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کچھ نہیں جی، میں......فون کرتا ہوں...... کیا نام بتاتا تھا جی آپ نے؟''

''عذرا خان۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں بھی یہیں ڈیفنس میں رہتی ہوں۔''

اُسی وقت چودھری بول اُٹھا۔ وہ مجھی سے مخاطب تھا۔ ''میرا خیال ہے محترمہ عذرا خان کہ آپ بات نہ بڑھائیں۔ میں ان لوگوں کو رخصت کئے دیتا ہوں۔''

''یہ غریب اتنی دُور سے دوڑے ہوئے آئے ہیں، یونہی خالی ہاتھ بھی نہیں جائیں گے۔ پھر یہ کہ......''

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔'' وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔

''مسٹر چودھری!'' میرا لہجہ بدل گیا۔ ''زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کریں۔ آپ نے ایک لڑکی کو حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا اور یقیناً یہ بات آپ کے علم میں تھی۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ دانستہ یا نادانستہ آپ ایک لمبے چکر میں پھنس چکے ہیں۔ اتنی آسانی سے آپ اس چکر سے نہیں نکل سکتے!'' چودھری کی مداخلت کے سبب سب انسپکٹر رُک گیا تھا۔ میرے اشارے پر اُس نے ایک ملازم کو ساتھ لیا اور اپنے ایس ایچ او کو فون کرنے چلا گیا۔

ایس ایچ او سے میری واجبی سی ملاقات تھی، لیکن وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ میرے تعلقات اُوپر تک ہیں۔ میں عموماً یہ بات ظاہر کرنا پسند نہیں کرتی جب تک کوئی مجبوری نہ ہو۔ اس سے قطع نظر کچھ اندازہ خود لوگ بھی لگا لیتے ہیں۔ مجھے علم نہیں تھا کہ اس سے چودھری کے بھی تعلقات ہوں گے۔ خود اُسی نے شیخی میں آ کر مجھے یہ بات بتا دی۔ وہ کہنے لگا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ نچلی سطح پر ہی معاملہ ختم ہو جائے۔ مگر آپ مان نہیں رہیں۔ آپ شاید یہ سمجھ رہی ہیں کہ نظیر صاحب سے میرے مراسم نہیں! ابھی وہ آئیں گے تو خود آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ دیکھ لیجئے گا آپ سے وہ بھی یہی کہیں گے کہ ہم دونوں بات نہ بڑھائیں اور آپس میں ہی معاملہ طے کر لیں۔''

چودھری کی بات کے جواب میں مجھے خاموشی ہی اختیار کرنا پڑی کہ بعض باتوں کا جواب خاموشی بھی تو ہوتا ہے۔ یہ معاملہ خواہ مخواہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ میں اب یہ چاہتی تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو نرگس کو وہاں سے لے کر نکل جاؤں۔ اُسے طبی امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے اس دوران میں اُسے سہارا دے کر بٹھا دیا تھا۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ میں نے اُس سے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دو نرگس! اب میں آ گئی ہوں، تمہیں کوئی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے اُس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھرتے دیکھی۔ وہ یقیناً بہادر لڑکی تھی۔

پھر اُس وقت تک کمرے میں خاموشی رہی جب تک سب انسپکٹر فون کر کے نہ آ گیا۔ اُس نے آتے ہی مجھے بتایا۔ ''آ رہے ہیں جی صاحب!''

میں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

چودھری نے اپنے ملازمین سے کہہ کر پولیس والوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں منگوا لیں اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سب انسپکٹر تو کرسی پر بیٹھ گیا مگر سپاہی کھڑے ہی رہے۔ یوں بھی وہاں اُن کا ایس ایچ او آنے والا تھا، وہ کیسے بیٹھ جاتے؟

نرگس کی جسمانی حالت دیکھ کر میں یہ سمجھ گئی تھی کہ اُس کے جسم پر اس طرح ضربیں لگائی گئی ہیں جو بظاہر نظر نہ آ سکیں۔ پولیس والے بھی عموماً ایسا ہی کرتے ہیں۔ بند چوٹ زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے اور نرگس اس وقت اسی تکلیف میں مبتلا تھی۔ میں نے سوچا کہ اُسے یہاں سے سیدھی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے جاؤں گی۔ یوں بھی اُس سوڈانی کا بچ کر نکل جانا اچھا نہیں ہوا تھا۔ وہ نچلا بیٹھنے والا نہیں تھا۔ جب تک وہ پکڑا نہ جاتا، نرگس کی حفاظت ضروری تھی۔ پھر یہ کہ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں نرگس کی نگہداشت بھی ممکن تھی۔ اُسے پوری طرح سنبھلنے میں دو تین دن تو لگ ہی جاتے۔ جہاں وہ اب تک اپنی والدہ اور بھائی سے دُور رہی تھی، دو تین دن مزید رہ سکتی تھی۔

ایس ایچ او کو وہاں پہنچنے میں مشکل سے پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ مگر یہ وقت بھی مجھے بہت کھلا۔ وہ دراز قد اور لحیم شحیم آدمی تھا۔ چودھری اُس سے بہت لپک کر ملا۔ ''آئیے جناب! آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا۔''

''جی حکم فرمائیں۔'' وہ مسکراتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''آپ نے کیسے یاد فرمایا؟''

''یہ لڑکی میری فرم میں ملازم ہے۔'' میں نے نرگس کی طرف اشارہ کیا۔

''جی۔'' وہ خوش اخلاقی سے سر ہلا کر بولا۔

''اسے ایک سوڈانی نے اغواء کر کے یہاں ان حضرت کی کوٹھی میں رکھا ہوا تھا۔'' میں چودھری کی طرف دیکھ کر بولی۔

''ذرا ایک منٹ!'' چودھری نے مداخلت کی۔

''آپ خاموش رہیں!'' مجھے غصہ آ گیا۔

''چودھری صاحب!'' ایس ایچ او بول اُٹھا۔ ''پہلے مجھے مس عذرا خان کی بات سن لینے دیں، پھر آپ کو بھی میں صفائی کا موقع دُوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''جی فرمائیے!''

''یہ حبس بے جا کا کیس ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ لڑکی ان صاحب کی کوٹھی میں ہے، اس کا علم انہیں بخوبی تھا۔ بہرحال تفصیل سے گریز کرتے ہوئے میں اس وقت صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ مسٹر اے آر چودھری کو حراست میں لے لیں، باقی معاملات بعد میں نمٹائے جاتے رہیں گے۔ فی الحال اس لڑکی کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے اور میں اسے یہاں سے لے جانا چاہتی ہوں۔''

میری بات سن کر ایس ایچ او کچھ ٹپٹا گیا اور بولا۔ ''لیکن لڑکی کا بیان......اور پھر...... آپ سمجھتی ہیں نا کہ میں یکطرفہ کارروائی بغیر کسی بیان اور ثبوت......''

''میں جانتی ہوں کہ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔'' میں پُر سکون لہجے میں بولی۔ ''لیکن بعض معاملات میں غیر ضروری تاخیر سے غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ آپ کے لئے غالباً یہ جاننا کافی ہو گا کہ یہ سارا معاملہ آئی جی صاحب کے علم میں ہے۔ ان سے آپ اس سلسلے میں رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ابھی فون پر ان سے بات کر کے آپ کی تسلی کرا دُوں!''

''جی...... جی نہیں، اس...... اس کی ضرورت نہیں۔'' ایس ایچ او گھبرا گیا۔ ''مجھے آپ کی بات پر یقین

ہے۔ صرف اتنی ہی درخواست تھی کہ مغویہ کا بیان......"

"شام تک آپ اس کا بیان لے سکتے ہیں۔ میں خود آپ کو فون کر کے بلوا لوں گی۔" یہ کہتے ہوئے میرا ذہن اُلجھنے لگا۔ نرگس کا بیان واقعی قانونی ضرورت تھا مگر فی الحال وہ کوئی بیان دینے کی حالت میں نہیں تھی۔ میں اُسے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے جانا چاہتی تھی اور وہاں ایس ایچ او کو بلوانا مناسب تھا۔ خیر بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا! میں نے سوچا، پھر مزید بولی۔ "تو پھر مجھے اجازت ہے؟ میں اس لڑکی کو یہاں سے لے جا سکتی ہیں؟"

"یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟ میں بھلا آپ کو اجازت دینے والا کون؟" ایس ایچ او نے اخلاق کا مظاہرہ کیا، پھر بولا۔ "آپ کے حکم پر میں چودھری صاحب کو حراست میں لے رہا ہوں۔ لیکن مجھے جتنی جلد ممکن ہو...... میرا مطلب یہ ہے کہ...... آپ تو خود سمجھتی ہیں۔ میرا ذہن اُلجھا رہے گا جب تک مجھے اصل حالات کا علم......" اُس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

"میں آپ کی مجبوریاں سمجھتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا، میں اتنا یقین آپ کو ضرور دلا سکتی ہوں۔ اس کیس کی تمام تفصیلات کا علم آپ کو شام تک ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے میری نظر چودھری کے چہرے پر پڑی۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

پھر میں وہاں مزید نہیں رُکی۔ اب چودھری سے بھگتنا ایس ایچ او کی ذمہ داری تھی۔ نرگس کو سہارا دیئے میں کوٹھی سے باہر نکل آئی۔ کار میں اُسے میں نے اپنے برابر اگلی نشست ہی پر بٹھایا اور پھر وہاں سے چل دی۔ اس وقت میرا ذہن پوری طرح چوکنا اور بیدار تھا۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ سوڈانی اردگرد ہی کہیں منڈلا رہا ہو۔

میں اب نرگس کو لے کر جلد از جلد آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ جانا چاہتی تھی اس لئے کار کی سپیڈ لمحہ بہ لمحہ بڑھاتی ہی چلی گئی۔ عموماً میں فاسٹ ڈرائیونگ سے گریز کرتی ہوں لیکن ضرورت ہو تو پھر یہ ذرا مشکل ہی ہے کہ کوئی میری گرد پا لے۔

میں، نرگس کو ساتھ لئے خلافِ توقع آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچی۔ وہاں کسی کے وہم و گمان میں یہ بات نہ تھی کہ یوں اچانک نرگس کی بازیابی ممکن ہے۔ پوری عمارت میں ایک دم کھلبلی سی مچ گئی۔ نرگس کو میں نے متعلق افراد کے سپرد کر دیا۔ سیل سے متعلق یہ وہ افراد تھے جن کی ذمہ داری یہی تھی۔ اُس عمارت میں ایک کمرا اسی کے لئے مخصوص تھا۔ ہنگامی حالت میں وہاں ہر قسم کی طبی امداد دینا ممکن تھا۔ مختلف معرکہ آرائیوں کے دوران میں سیل کے افراد زخمی ہو جاتے یا اُنہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہوتی تو یہی افراد کام آتے۔ ان میں سے ایک سرجن بھی تھا۔ وہاں چھوٹا موٹا آپریشن کیا جانا بھی ممکن تھا۔ ایک مرتبہ ایک ہنگامے کے دوران میں میری بائیں پنڈلی میں گولی لگ گئی تھی تو یہیں کے سرجن نے پنڈلی سے گولی نکالی تھی اور میرا علاج کیا تھا۔ میڈیکل کور کا یہ عملہ چھ افراد پر مشتمل تھا۔ نرگس کو اُن کے سپرد کر کے میں مطمئن ہو گئی۔

نرگس کی بازیابی نے میری ایک بڑی ذہنی اُلجھن ختم کر دی تھی۔ میں کچھ دیر اپنے اعصاب کو سکون دینے کی خاطر ساؤنڈ پروف کمرے میں آ گئی۔ گزشتہ رات بھی میں نے یہیں گزاری تھی۔ کشیدہ اعصاب کو قدرے

سکون ملا تو مجھے بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس وقت شام کے پونے چار بج رہے تھے۔ کچن سے میں نے ناشتہ منگوا لیا اور پھر کافی پینے کے دوران میں اپنی کوٹھی فون کیا۔

دوسری جانب فاطمہ تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "تم میری طرف سے فکر مند نہ ہونا اور کوئی فون آئے تو نوٹ کر لینا۔"

میں کیونکہ بڑی روا روی میں کوٹھی سے چلی تھی اس لئے فاطمہ کو مطلع کرنا ضروری تھا۔ وہ بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ دوسرا فون میں نے دلاور کو کیا۔ اُسے بھی یہ اطلاع دینا ضروری تھی کہ نرگس مل چکی ہے۔ مگر اس وقت میں تفریح کے موڈ میں تھی۔ اتنی آسانی سے اُسے بخشنے والی نہیں تھی۔ وہ بھی تو مجھے موقع بے موقع ستاتا رہتا تھا۔

"ہیلو ملک دلاور!" میں نے فون پر اُس کی آواز سن کر کہا۔

"جی حضور عرض کر رہا ہوں۔ فرمایئے اس خاکسار کو کیسے یاد فرما لیا؟"

"کچھ پوچھنا تھا تم سے۔" میں مسکرا کر بولی۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ آج دوپہر جب اُس سے ملاقات ہوئی تھی تو اُس نے کہا تھا، اب پوچھئے گا مجھ سے کچھ! میں نے دانستہ اسی لئے یہ جملہ کہا تھا۔

"معاف کیجئے گا، آپ نے شاید غلط نمبر ڈائل کر دیا ہے۔ یہ انکوائری آفس نہیں ہے۔"

"نہیں بھئی!" میں نے اُسے گھسا۔

"ہاں بھئی!" اُس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ دلاور کے لہجے میں اتنی برجستگی تھی کہ مجھے ہنسی آ گئی۔

"گھنٹیاں سی بج رہی ہیں میرے کانوں میں۔ ذرا کچھ دیر اور یونہی ہنستی رہیں۔" وہ بولا، لہجے میں شوخی تھی۔

"تو نہیں بتاؤ گے کچھ؟" میں اُس کے فقرے کو نظر انداز کر کے بولی۔

"ہرگز نہیں۔"

"یقین دلاؤ!"

"اس میں کیونکہ بڑا کاف آتا ہے اس لئے نہیں دلا سکتا، آپ برا مان جاتی ہیں بڑے کاف پر۔"

"سنجیدہ نہیں ہو سکتے؟"

"آپ کے لئے تو بہت دن سے سنجیدہ ہوں۔ مگر آپ ہمیشہ رنجیدہ کر دیتی ہیں۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہی، مجھے نرگس کا خیال آ گیا تھا۔"

"بس رہنے ہی دیں، میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ بغیر مطلب کے آپ کبھی......"

"گھاس نہیں ڈالتیں۔" میں نے اُس کی بات پوری نہ ہونے دی۔

"گھاس جانوروں کو ڈالی جاتی ہے خاتونِ محترم! اور غالباً...... خیر یہ بتائیں، نرگس کے بارے میں مزید کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟ ہاں، یہ عرض کر دوں کہ بغیر شربت دیدار پیئے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ آپ تشریف لے آئیں غریب خانے پر۔" وہ بولا۔

"اور میں نہ آؤں تو؟" میں نے "شربت دیدار" والی بات کو دانستہ نظر انداز کرتے ہوئے چڑانے کے انداز میں کہا۔

’’صبر کیجئے کہ اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔‘‘

’’ویسے ملک دلاور! تم سے مجھے ایک اور کام بھی تھا۔‘‘ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ’’نرگس کی والدہ کو یہ اطلاع پہنچا دینا کہ وہ دو روز بعد گھر پہنچ جائے گی۔‘‘

’’کیوں اُس بوڑھی عورت کو آپ مجھ سے ’لارے‘ دلوا رہی ہیں! وہ تو خود ہی بہت پریشان ہے۔‘‘ اُس کی آواز سے بھی قدرے سنجیدگی کا اظہار ہونے لگا۔ ’’نرگس کا معاملہ جلد از جلد نمٹایئے! میں زیادہ دن گھسے بازی سے کام نہیں لے سکتا۔‘‘

’’تو اس کا مطلب ہے کہ کم از کم اس معاملے میں تم اپنی شکست تسلیم کر رہے ہو!‘‘ میں نے اُسے پھر چھیڑا۔

’’کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں محترمہ کہ اُن سے ہار جانا بھی جیت میں شمار کیا جا سکتا ہے اور میرے لئے آپ بھی انہی ہستیوں میں سے ہیں۔ آپ سے تو جان بوجھ کر ہارنے کو جی چاہتا ہے۔‘‘ وہ بہت دیر تک جانے کیا کیا ہانکتا رہا۔

’’بھڑاس نکل گئی دل کی؟‘‘ وہ چپ ہوا تو میں بول اُٹھی۔ اب میں ذہنی طور پر خاصا فریش ہو چکی تھی اس لئے مزید وقت گزاری کی بجائے اُس سے کہا۔ ’’خوش ہو جاؤ اور واقعی اپنی شکست تسلیم کر لو کہ میں نے نرگس کو دشمن کے چنگل سے نکال لیا ہے۔‘‘

’’واقعی؟‘‘ اُس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ ’’مگر آپ تو ابھی کہہ رہی تھیں کہ دو روز بعد......‘‘

’’اس کی بھی ایک وجہ ہے جو میں ابھی تمہیں نہیں بتا سکتی۔‘‘ میں صاف گوئی سے بولی۔ نرگس کی حالت سے مطلع کر کے میں اُسے فکرمند کرنا نہیں چاہتی تھی۔

’’بہرحال نہ بتائیں وجہ مگر یہ ضرور بتا دیں کہ واقعی آپ صحیح کہہ رہی ہیں؟‘‘

’’میں جھوٹ نہیں بولتی، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو دلاور! اور اس معاملے میں تو میں کوئی غیر ذمہ دارانہ بات کر ہی نہیں سکتی۔ شاید تمہیں علم نہ ہو کہ نرگس مجھے تم سے زیادہ عزیز ہے۔‘‘ ابھی میں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ انٹرکام کی بیل ہوئی۔ میں نے دلاور سے کہا۔ ’’اچھا خدا حافظ!‘‘

’’ذرا سنئے تو۔‘‘ وہ بولا۔

’’پھر سہی۔‘‘ یہ کہتے ہی میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا۔ انٹرکام پر میرے لئے کوئی ضروری میسج ہی ہو سکتا تھا، میں نے یہ سوچ کر ہی دلاور سے مزید گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ یوں بھی مجھے جو اطلاع دینا تھی، اُسے وہ اطلاع دے چکی تھی۔ انٹرکام کا ریسیور اُٹھاتے ہی مجھے دوسری جانب سے کمانڈر نواز کے نائب عثمانی کی آواز سنائی دی۔

’’ابھی ابھی سرفراز سے یہ اطلاع ملی ہے کہ......‘‘

’’عثمانی!‘‘ میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ’’مجھے الہام نہیں ہوتا۔‘‘

’’میں...... میں سمجھا نہیں کہ......‘‘ میرے لہجے کی سختی نے اُسے گڑبڑا دیا۔

’’تم لوگوں میں آخر یہ کیا بری عادت ہے کہ کسی بھی معاملے میں مجھے ایک دم درمیان سے کہانیاں سنانا شروع کر دیتے ہو! مجھے کیا الہام ہوگا کہ کمانڈر نواز نے یا تم نے سرفراز کی ڈیوٹی کہاں اور کس سلسلے میں لگا رکھی ہے۔‘‘

’’سوری!‘‘ اُس نے معذرت کی، پھر بتانے لگا۔ ’’وزارتِ دفاع کے ایک افسر سمیع اللہ کے سلسلے میں تفتیش کا کام سرفراز کے سپرد کیا گیا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کی بیٹی نرجس کو اغواء کر لیا گیا تھا۔ آپ......‘‘

’’ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ سمجھ گئی میں۔‘‘ میں نے مزید تفصیل سے گریز کرنے کی خاطر کہا۔ ’’تو کوئی نئی بات سامنے آئی؟‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ عثمانی کہنے لگا۔ ’’اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ سمیع اللہ کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف ہے۔‘‘

’’ہوں!‘‘ میں نے ہنکارا بھرا۔

’’سرفراز کی اطلاع کے مطابق سمیع اللہ آج چند ایسے افراد سے بھی ملا ہے جنہیں مخالف کیمپ سے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اُن میں سے ایک شخص کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ عبدالحمید خاں کا گرگا ہے۔‘‘

’’ویری گڈ!‘‘ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ میرے اندازے درست ثابت ہو رہے تھے۔ ’’سرفراز سے کہو کہ وہ سمیع اللہ کی نقل و حرکت پر پوری نظر رکھے! سرفراز کو اگر مزید آدمیوں کی ضرورت ہو تو اُس کی مدد کے لئے بھیج دو۔ جس شخص پر شبہ ہے کہ وہ عبدالحمید خاں کا گرگا ہے، اُس پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو وہ عبدالحمید خاں سے بھی ملے گا۔ اور ہاں عبدالحمید خاں کی نگرانی جاری ہے نا؟‘‘

’’جی۔‘‘ عثمانی نے جواب دیا۔ ’’کیپٹن شاد اُس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔‘‘

’’اُس سے بھی رابطہ قائم کر کے تازہ رپورٹ لو اور مجھے بتاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔

’’بہتر ہے۔‘‘ عثمانی سعادت مندی سے بولا۔

’’او کے....‘‘ یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا، پھر انٹرکام ہی پر اُس کمرے سے رابطہ قائم کیا جہاں نرگس تھی۔

’’جی!‘‘ دوسری جانب سے ڈاکٹر رشید کی آواز آئی۔ وہی سیل کے میڈیکل کور کا انچارج تھا۔

’’نرگس اب کیسی ہے؟ اُس کے طبی معائنے سے کیا بات معلوم ہوئی ہے؟ میں یہ بات خاص طور پر جاننا چاہتی ہوں کہ کہیں اُس کے ساتھ کوئی ایسی حرکت تو نہیں کی گئی جو...... جو مستقبل پر اثر انداز ہو؟ میرا واضح مطلب یہ ہے کہ کہیں اُسے بے آبرو تو نہیں کیا گیا؟‘‘ میں نے قدرے جھجکتے ہوئے وہ بات پوچھ ہی لی جو میرے دل میں کھٹک رہی تھی۔

’’ابھی اس نقطہ نظر سے مس نرگس کا معائنہ نہیں کیا گیا۔‘‘ ڈاکٹر رشید نے بتایا، پھر بولا۔ ’’اگر آپ خیال نہ فرمائیں تو میں یہ مشورہ دُوں گا کہ اس سلسلے میں طبی معائنے کی بجائے خود آپ مس نرگس سے گفتگو کر لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ ہم نے اب تک اُس کے طبی معائنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اُن پر سخت تشدد کیا گیا ہے اور یہ کہ تشدد کرنے والا انتہائی چالاک شخص تھا۔ انہیں اس طرح ضربیں لگائی گئی ہیں کہ بظاہر نظر نہ آئیں۔ بہرحال کل صبح تک اُن کی حالت بہتر ہو جانے کا امکان ہے۔‘‘

’’آپ کسی لیڈی ڈاکٹر کا بندوبست کریں۔ فوری طور پر!‘‘ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ’’دراصل بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر گفتگو ممکن نہیں ہوتی۔ آپ کا مشورہ بجا لیکن میں نرگس سے اس سلسلے میں گفتگو کرنا نہیں چاہتی بلکہ اپنے طور پر اطمینان چاہتی ہوں۔ یہ خیال رہے کہ نرگس کو شبہ نہ ہو۔ اس کے لئے اُسے بے ہوشی کا انجکشن بھی دیا جا سکتا ہے۔ یوں بھی کل صبح تک میرے لئے انتظار مشکل ہے۔ آپ سمجھ

رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔" ڈاکٹر رشید نے جواب دیا۔

"تو پھر کب تک مجھے آپ کی طرف سے یہ رپورٹ مل سکتی ہے؟"

"ہوں!" وہ غالباً سوچنے لگا، پھر اُس کی آواز آئی۔ "تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر۔"

"ٹھیک ہے۔" میں بولی۔ "ممکن ہے میں یہیں رہوں اتنی دیر۔ بہر حال مجھے کہیں جانا بھی پڑا تو آپ سے رابطہ قائم کرلوں گی۔ خدا حافظ!" میں نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

ڈاکٹر رشید سے میں نے جو کچھ کہا تھا، وہ غلط نہیں تھا۔ ایسا ہونا بعید از امکان نہ تھا۔ کسی بے بس و مجبور لڑکی پر کوئی بھی ستم توڑا جا سکتا ہے۔ نرگس کتنی بھی چالاک، ذہین اور بہادر سہی، بہر حال اُس عیار سوڈانی کے قبضے سے نہیں نکل سکی تھی۔ عورت اور خصوصاً کسی کنواری عورت کی زبان کھلوانے کے لئے تشدد کے کیا کیا طریقے ہو سکتے ہیں، میرے لئے یہ بات کوئی راز نہیں تھی۔ الجزائر کی جمیلہ کو فرانسیسیوں کی قید میں کیا کیا ظلم نہ سہنا پڑے تھے! اور ایک وہی جمیلہ ہی کیا، جانے کتنی جمیلائیں اب تک وحشت و بربریت کا نشانہ بن چکی ہیں۔ آدمی جب آدمی نہیں رہتا، درندہ بن جاتا ہے تو اُس سے کچھ بعید نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں نرگس سے کسی قسم کا استفسار میرے لئے واقعی ممکن نہیں تھا۔ وہ میری عزت کرتی تھی، میرے اور اُس کے درمیان بہر حال خوردی اور بزرگی کی دیوار حائل تھی۔ یہ وضاحت بھی کر دُوں کہ میرے نزدیک بزرگی کا تعلق صرف عمر سے نہیں۔ میں کسی کی عمر کا اندازہ اُس کے ذہن سے لگاتی ہوں۔ یہ وضاحت میں نے اس لئے بھی ضروری خیال کی کہ مجھے میرے پڑھنے والے کوئی خرانٹ قسم کی ادھیڑ عمر یا بوڑھی عورت تصور نہ کریں۔ یوں اگر بظاہر دیکھا جاتا تو میری اور نرگس کی عمر میں زیادہ فرق معلوم نہ ہوتا لیکن وہی بات کہ میں اُس سے نہ تو اتنی بے تکلف تھی اور نہ ہونا چاہتی تھی۔ میں اسے ضروری سمجھتی ہوں۔ محبت، تعلق خاطر اور دلی لگاؤ کے اظہار میں بھی حدود لازمی ہیں۔ ان حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر رشید اپنے طور پر معاملے کو نمٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن میں معاملات کی تمام نزاکتوں کو مدنظر رکھتی تھی۔ کسی لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ بھی میں نے اسی لئے دیا تھا۔ مجھے ڈاکٹر رشید کو یہ بتانے کی ضرورت بہر حال نہیں تھی کہ اس معاملے میں وہ کس حد تک رازداری برتے۔ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کے اسرار سے وہ واقف تھا۔ وہاں کسی کو بھی بلایا جاتا تو اس طرح کہ اُسے حقیقت کا علم نہ ہو پاتا۔ اس حد تک میں اپنے آدمیوں پر بہر حال اعتماد کرتی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ میں کس بات کا راز رکھنا پسند کرتی ہوں اور کسے نہیں! جس لیڈی ڈاکٹر کو بھی وہاں بلوایا جاتا، اس شرط پر کہ اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہو گی اور جب وہ جائے گی تو بھی اُسے یہ علم نہ ہو سکے گا کہ کون سی جگہ تھی جہاں اُس نے کسی لڑکی کا طبی معائنہ کیا تھا؟ مجھے بہر حال ابھی تقریباً دو گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ مجھ سے وابستہ افراد میری ذمہ داری تھے۔ میری ہی خاطر تو وہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھر رہے تھے۔ سو اگر میں نرگس کی طرف سے فکر مند تھی تو یہ میرا فرض بھی تھا اور محبت کا تقاضا بھی۔

میں ایزی چیئر پر ریلیکس موڈ میں نیم دراز تھی کہ انٹرکام پر عثمانی سے مجھے کیپٹن شاد کی طرف سے موصول ہونے والی رپورٹ کے مطابق اس وقت عبدالحمید خاں اپنی کوٹھی ہی میں تھا۔

"رات کو خاص طور پر نظر رکھنا ہے۔" میں نے ہدایت دی۔

"میں اُس سے کہہ چکا ہوں۔ کمانڈر نواز نے مجھے بتایا تھا کہ وہ رات کے وقت نرجس سے ملنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ وہ بھی بس آنے ہی والے ہوں گے۔ وقت ہو گیا ہے۔" عثمانی نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ جب کمانڈر نواز آ جائے تو تم اُسے چارج دے سکتے ہو۔ دیٹس آل!" میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔

مجھے جس کھیل کی توقع تھی، شروع ہو چکا تھا۔ وزارتِ دفاع کے ایک ذمہ دار افسر سمیع اللہ کی بیٹی نرجس کو اغواء کرنے کا مقصد واضح ہوتا جا رہا تھا۔ سمیع اللہ کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا۔ اُسے توڑ کر اپنے ساتھ ملا لینے ہی کی خاطر عبدالحمید خاں نے یہ چال چلی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس طرح اُس کی عیاش فطرت کی آسودگی کا سامان بھی ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً سمیع اللہ پر دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں تھا۔ سمیع اللہ سے ملاقات کرنے والوں میں دائیں بازو کے لوگ بھی تھے۔ اندر ہی اندر کوئی نہ کوئی چکر چل رہا تھا۔ نظریات و عقائد سے قطع نظر آدمی فطری جذبوں سے انحراف نہیں کر سکتا۔ وہ باپ جس کی جوان اور کنواری بیٹی اغواء کی جا چکی ہو، اُس سے بڑی آسانی سے بارگیننگ کی جا سکتی ہے۔ سمیع اللہ اپنے نظریات میں حق پر تھا یا نہیں، یہ مسئلہ اُس کا تھا۔ ہاں مجھے عبدالحمید خاں اور شہریار کے بارے میں یہ ضرور معلوم ہو چکا تھا کہ دونوں ہی سازشی ذہن کے مالک ہیں۔ میرے نزدیک عبدالحمید خاں ظالم اور سمیع اللہ مظلوم تھا۔ اس کھیل میں دانستہ یا نادانستہ کیونکہ میں بھی ملوث ہو چکی تھی اس لئے میری ہمدردیاں سمیع اللہ کی کے ساتھ تھیں۔ عبدالحمید خاں سے تو یوں بھی اب براہِ راست میری ٹھن چکی تھی۔ وہ میرے ہاتھوں نرجس ہی کے معاملے میں پٹ بھی چکا تھا۔ اگر اس وقت میں انجکشن کے زیرِ اثر نہ آ جاتی تو شاید اُس مظلوم لڑکی نرجس کو بچا سکتی۔ وہ ابھی تک عبدالحمید خاں کی قید میں تھی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اُس عیار شخص نے نرجس کو لی مارکیٹ والی عمارت سے کہاں منتقل کیا ہے؟ مجھے اس سوال کا جواب مل جاتا تو میں فوری طور پر کوئی قدم اُٹھا سکتی، لیکن اُس وقت تک عبدالحمید خاں فائدہ اُٹھا جاتا۔ اس وقت یہی مسئلہ میرے زیرِ غور تھا کہ سمیع اللہ کو کس طرح اُس کے جال میں پھنسنے سے بچایا جائے؟ اس کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ میں خود سمیع اللہ سے مل لیتی جس کا موقع مجھے اب تک نہیں مل سکا تھا۔ اُس سے میری ملاقات ہو جاتی تو شاید کسی حد تک میں اُسے بلیک میل ہونے سے بچا سکتی۔ اس کے علاوہ جن حالات میں نرجس کو اغواء کیا گیا، ان پر بھی مجھے زیادہ سوچ بچار کا موقع نہیں ملا تھا۔ نرجس کے اغواء میں اُس کے بوائے فرینڈ کا ہاتھ بھی معلوم ہوتا تھا۔ پولیس اُسے تلاش کر سکی یا نہیں میرے علم میں یہ بھی نہیں تھا۔ سمیع اللہ بھی بہر حال معمولی حیثیت کا مالک نہیں تھا۔ پولیس اس سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کر سکتی تھی، لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ نرجس کو اغواء کرانے والوں کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔ اس معاملے میں دونوں ہی پارٹیاں اپنے اثر و رسوخ سے پورا کام لے رہی ہوں گی۔ پولیس کے معمولی افسران پر دباؤ ڈالنا دونوں ہی طرف سے ممکن تھا۔ اب جس کا پلہ زیادہ بھاری ہوتا وہ افسران اُسی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جاتے۔ خود میرے اغواء کے ضمن میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ عبدالحمید خاں اور شہریار کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ شہریار گویا بڑی مچھلی تھا اور عبدالحمید خاں چھوٹی مچھلی! تھے دونوں ایک ہی تالاب کے۔ ایسی صورت میں یہ سامنے کی بات تھی

کہ شہر یار ہی کے ایماء پر عبدالحمید خاں نے یہ چال چلی ہوگی۔ کڑیاں ملتی جارہی تھیں اور میرا ذہن تیزی سے اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔

سمیع اللہ کی پہنچ کہاں تک تھی، یہ بات بھی اُس سے مل کر ہی سمجھ میں آسکتی تھی۔ اس کے لئے اُس سے براہِ راست کسی سوال کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اُس کی باتوں سے بھی بہت کچھ اندازہ لگا لیتی۔ ان حالات میں سمیع اللہ سے میری ملاقات ضروری ہے، میں اسی فیصلے پر پہنچی۔ اُس نے میری ملاقات راز رہ سکے گی، یہ خوش فہمی مجھے نہیں تھی، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اگر اس سے میری ملاقات عبدالحمید خاں کے علم میں آ بھی جاتی تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ وہ مزید چوکنا ہو جاتا۔ وہ اپنے تمام تر ذرائع کو کام میں لا کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ پھر یہ کہ میں حق پر تھی اور وہ ناحق پر! بالآخر شکست کا منہ اُسے ہی دیکھنا پڑتا۔ خود مجھے بھی اُس سے اپنا حساب چکانا تھا۔ اُسے میں معاف تو نہیں کر سکتی تھی، ہاں ابھی ڈھیل ضرور دے رکھی تھی۔ جب بھی مجھے موقع ملتا، میں ڈوری کھینچ لیتی۔ یہ میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ لیکن فی الوقت نرجس کا معاملہ اہم تھا۔ اس کے ذریعے بھی میں اس عیار شخص کے گرد اپنے جال کو مضبوط کر سکتی تھی، اتنا مضبوط کہ وہ اس سے نکلنے کی کوشش تو کر سکتا مگر نکل نہ پاتا۔

تقریباً دو گھنٹے میں نے سوچ بچار اور آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرنے میں گزار دیئے۔ اس دوران میں ایک بار کمانڈر نواز سے بھی میری بات ہوئی اور ڈاکٹر رشید نے بھی مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ اب مجھے کچھ ہی دیر بعد اپنے اُس سوال کا جواب ملنے والا تھا جس کے لئے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں رُکی تھی۔ اسی عرصے میں، میں نے ڈیفنس تھانے کے ایس ایچ او نظیر سے بھی فون پر بات کر لی تھی۔ میں نے اُس سے جو وعدہ کیا تھا، یاد تھا۔ ایس ایچ او سے میں نے کہا تھا کہ نرگس کا بیان فوری طور پر ممکن نہیں اس لئے کہ وہ اس قابل نہیں ہے۔ یہ مسئلہ میں نے آئندہ روز کے لئے ٹال دیا تھا۔ ایس ایچ او کی اطلاع کے مطابق چودھری حوالات میں تھا۔ ایس ایچ او نے ذاتی طور پر مجھ سے درخواست کی تھی کہ جلد از جلد ضروری کارروائی مکمل کرا دوں تا کہ کسی مرحلے پر اُسے جواب طلبی سے نہ گزرنا پڑے۔ میں نے اُسے مطمئن کر دیا تھا۔ حالات کے پیشِ نظر میں دراصل سمیع اللہ سے آج ہی مل لینا چاہتی تھی۔ بقیہ معاملات فی الحال میرے نزدیک ضمنی تھے۔ دراصل کس وقت کیا قدم اُٹھانا چاہئے؟ کس مسئلے پر فوری توجہ کی ضرورت ہے؟ اسی پر آدمی کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہوتا ہے۔ میں حتیٰ الامکان یہی کوشش کرتی تھی کہ حالات کے دھارے پر بہنے کی بجائے انہیں اپنے قابو میں رکھوں۔ اس میں کبھی کبھار ہی مجھ سے اندازے کی غلطی ہوتی تھی، وہ بھی یوں کہ بہرحال اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں کے باوجود میں بھی انسان ہوں اور غلطی اُسی سے ہوتی ہے جو کوئی کام کرتا ہے، جس کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے! اس وقت بھی تمام ہنگامہ آرائی اور غور و فکر کے باوجود میں، نرگس کی طرف سے غافل نہیں ہوئی تھی۔ یہ مسئلہ میرے نزدیک غیر اہم نہیں تھا۔ ایک لڑکی کے مستقبل کا سوال تھا اور یہ لڑکی بھی وہ جس سے مجھے محبت تھی اور جو میری ذمہ داری تھی۔ مجھے اپنے سوال کا جواب مل جاتا تو میں اُس کی روشنی میں معاملے کو نمٹانے یا اُس کا کوئی حل تلاش کرنے کی جستجو کرتی۔ یہی سبب تھا کہ جب ڈاکٹر رشید نے انٹرکام پر مجھ سے رابطہ قائم کیا تو میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اس کا سبب وہ اندیشے تھے جو میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔

"نرگس کے ساتھ وہ واقعہ پیش نہیں آیا جس کا آپ کو اندیشہ تھا۔" ڈاکٹر رشید نے مہذب الفاظ میں مجھے میرے سوال کا جواب دے دیا۔

"تھینک یو سو مچ ڈاکٹر!" میں کوشش کے باوجود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔

انٹرکام کا ریسیور رکھتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ نرگس کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی تھی، یہ میرے لئے مقامِ شکر ہی تھا۔ میں کچھ دیر جذباتی کیفیت سے دوچار رہی، پھر رفتہ رفتہ میری حالت اعتدال پر آ گئی۔ اب میں ایک بار پھر اپنے ذہن کو یکسو کر کے قدم اُٹھانے پر غور کر رہی تھی۔ ایک ہی مسئلے پر بار بار غور و فکر سے عموماً کچھ نئے گوشے بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ اب مجھے وزارتِ دفاع کے ایک افسر سمیع اللہ سے ملنا تھا اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ یہ ملاقات فوری طور پر مناسب بھی ہے یا نہیں؟ میرے ذہن نے اس بار بھی یہی جواب دیا کہ ملاقات ضروری ہے، جتنی جلد ممکن ہو۔

روانگی سے قبل میں نے کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کرنا ضروری سمجھا۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ اس وقت سمیع اللہ اپنے گھر پر ہے یا کہیں اور؟ کمانڈر نواز کے نائب عثمانی کی اطلاع کے مطابق سیل کا ایک رُکن سرفراز اُس کی نگرانی کر رہا تھا۔ کمانڈر نواز اُس سے رابطہ قائم کر کے مجھے میرے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ اس کے بعد ہی میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے نکلنا چاہتی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے انٹرکام پر ڈیوٹی رُوم کا نمبر ملا دیا۔

"جی!" کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔

میں نے اُسے ضروری ہدایت دی، پھر بولی۔ "ذرا جلدی رپورٹ دو! میں روانگی کے لئے تیار بیٹھی ہوں۔"

"بہتر ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

میں انٹرکام کا ریسیور رکھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ کمانڈر نواز نے واقعی مستعدی اور تیزی کا ثبوت دیا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سمیع اللہ اپنے گھر ہی میں تھا۔ میں نے اُس کا پورا پتہ بھی نوٹ کر لیا تھا۔

پھر کچھ ہی دیر بعد میری کار آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے نکل کر سوسائٹی کی طرف جا رہی تھی۔ پتے کے مطابق مجھے نرسری سے پہلے، خیام سینما کے برابر سے جانے والی سڑک پر مُڑ جانا تھا۔ میں اس دوران میں اپنے تعاقب سے بھی غافل نہیں تھی۔ کہیں سے بھی کوئی میرے پیچھے لگ سکتا تھا۔ مگر تعاقب نہیں کیا گیا۔

میں جلد ہی اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ اس کی تصدیق وہاں سرفراز کی موجودگی سے بھی ہوگئی۔ میک اپ کے باوجود میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ سمیع اللہ کی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر وہ ایک مجذوب کے رُوپ میں "یا حق، یا حق" کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ سڑک کے کنارے اُس نے ایک کمبل بچھا رکھا تھا اور قریب ہی اُس کی گدڑی رکھی تھی جس میں یقیناً تمام ہی ضروری اشیاء ہوں گی۔ وہ چھوٹا سا ٹرانسمیٹر بھی جس کے ذریعے کمانڈر نواز نے اُس سے رابطہ قائم کیا ہوگا۔ میں اُس پر بس ایک نظر ڈالتی ہوئی کار کو آگے بڑھا لے گئی۔ سرفراز کی حالت دیکھ کر میں زیرِ لب مسکرائی ضرور تھی۔

مطلوبہ کوٹھی کا نمبر پڑھ کر میں نے ایک جانب کار کھڑی کی اور پھر آگے بڑھ کر کال بیل پر اُنگلی رکھ دی۔ اُس وقت میری آنکھوں میں اُس مظلوم لڑکی کا چہرہ گھوم رہا تھا جو اسی کوٹھی میں رہتی تھی اور اب عبدالحمید خاں کی قید میں تھی۔

جلد ہی ایک نوجوان باہر آیا اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ چہرے مہرے سے وہ مجھے نرجس کا بڑا بھائی ہی معلوم ہو رہا تھا۔

''مجھے نرجس سے ملنا ہے۔'' میں نے بے جھجک کہہ دیا۔

''نر...... نرجس؟'' میری توقع کے مطابق نوجوان چونک اُٹھا۔ اُس کے چہرے پر میں نے لمحہ بھر کو غم کی پرچھائیں بھی دیکھی تھی۔ ''آپ کہاں سے آئی ہیں؟ اور...... اور نرجس کو کیسے......''

''میرا نام عذرا خان ہے۔ نرجس اکثر مجھ سے ملتی رہتی ہے۔ اُس نے ایک بار اپنا گھر بھی مجھے دکھایا تھا۔ مجھ سے اندر چلنے کو بھی کہا تھا مگر میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں نے سوچا، آج ادھر سے گزر رہی ہوں تو ملتی چلوں۔ کئی دن سے وہ ملی بھی نہیں تھی۔ تم شاید اُس کے بڑے بھائی ہو۔'' میں روانی سے کہتی رہی۔

''جی...... جی ہاں۔'' اُس نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔

''اگر وہ ہے گھر پر تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں چلتی ہوں۔ آ جائے تو بتا دینا، میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اُس سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ کسی دن تمہارے گھر ضرور آؤں گی...... ہاں، تمہیں میرا نام یاد رہے گا نا!...... عذرا خان۔'' یہ کہہ کر میں مُڑنے لگی۔

''ٹھہریئے۔'' وہ ایک دم بول اُٹھا۔

''تو ہے وہ گھر پر؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔'' وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تو پھر تم مجھے کیوں روک رہے ہو؟ بس کہہ دینا اُس سے کہ......''

''بس ایک منٹ رُک جایئے! شاید وہ اپنے کمرے میں ہو، دیکھتا ہوں میں۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے میری کار کی نمبر پلیٹ کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے۔ دیکھ آؤ! میں انتظار کر لیتی ہوں۔'' میں پُرسکون آواز میں بولی۔ دل ہی دل میں مجھے اس نوجوان کی حماقت پر ہنسی آ رہی تھی۔ وہ میرے ٹریپ میں آ گیا تھا۔ میرا تو مقصد ہی یہی تھا کہ وہ اپنے باپ سے جا کر ''انٹ شنٹ'' ہانکے۔ اُسے باہر آتے دیکھ کر فوری طور پر میرے ذہن میں یہی ترکیب آئی تھی۔

اُسے واپسی میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ باہر آتے ہی بولا۔ ''آیئے، اندر آ جایئے!...... نرجس اپنے کمرے ہی میں تھی۔ میرا اندازہ غلط تھا کہ وہ کہیں گئی ہے۔''

''چلو یہ اچھا ہوا۔'' میں اُس نوجوان کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔

اُس نے مجھے اندر لے جا کر ایک خوبصورت ڈرائنگ رُوم میں بٹھا دیا۔ ''آپ یہاں بیٹھیں، میں اُسے بھیجتا ہوں۔''

''ہاں ذرا جلدی بھیجنا، میرے پاس وقت کم ہے۔'' میں بولی اور آرام سے گویا نرجس کا انتظار کرنے لگی۔

پھر عین میری توقع کے مطابق کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر مگر بارُعب سا شخص، اندرونی دروازے سے ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوا۔ درمیان سے اُس کے سر کے بال اُڑے ہوئے تھے، چہرے پر سختی تھی اور وہ موٹے شیشوں کی خوبصورت عینک لگائے ہوئے تھا۔

''کون ہو تم؟'' اُس نے سخت لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ''نرجس کو کیسے جانتی ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ آپ یہاں سامنے تشریف رکھیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔'' میں نے سکون کے ساتھ کہا۔ ''غالباً آپ نرجس کے والد ہیں، سمیع اللہ صاحب!''

''ہوں!...... تو تم میرا نام بھی جانتی ہو!'' سمیع اللہ نے مجھے گھورا۔

''جی!...... اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ جانتی ہوں۔'' میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

اسی وقت وہ نوجوان بھی ڈرائنگ رُوم میں آ گیا جو مجھے یہاں بٹھا کر اندر گیا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کو مخاطب کیا۔ ''ابو! پولیس سٹیشن فون کر دُوں؟''

''ٹھہرو!...... پہلے میں اس سے بات کر لوں۔'' سمیع اللہ دوبارہ مجھے گھورنے لگا۔ وہ غالباً میرے چہرے سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پولیس کے ذکر پر میرا کیا ردِعمل ہے۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا، پہلے مجھ سے بات کر ہی لیں۔ مگر......''

''مگر کیا؟'' اُس نے ہونٹ بھینچے۔

''مگر یہ کہ اس کے لئے خلوت ضروری ہے۔ اپنے صاحبزادے سے کہہ دیں کہ اب یہاں کچھ دیر تشریف نہ لائیں۔'' میں نے نوجوان کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ''بلکہ بہتر یہ ہے کہ آپ ڈرائنگ رُوم کا دروازہ ہی بند کر لیں تا کہ گفتگو میں کوئی مخل نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' سمیع اللہ چند لمحے بعد بولا اور پھر میرے اصرار پر سمیع اللہ نے ڈرائنگ رُوم کا اندرونی اور بیرونی دروازہ بھی بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ میرے مقابل والے صوفے پر آ بیٹھا۔

''ہاں لڑکی! اب بتاؤ کون ہو تم؟'' اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ یقیناً گوشہ نشین قسم کا آدمی تھا ورنہ میں اتنی غیر معروف بھی نہیں تھی، خصوصاً سرکاری حلقوں میں!

''یہ لڑکی جس کا نام واقعی عذرا خان ہے، آپ سے کچھ پوچھنے آئی ہے، آپ کے سوالات کا جواب دینے نہیں آئی۔'' میں مسکرا کر بولی۔

''کیا بکتی ہو!...... تم شاید یہ نہیں جانتیں کہ کس سے مخاطب ہو۔''

''وزارتِ دفاع کے ایک ذمہ دار افسر سے مخاطب ہوں، یہ مجھے معلوم ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ ان دنوں وزارتِ دفاع کا وہ افسر اپنی بیٹی کے اغوا......'' میری نظریں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اپنا پہلا جملہ ادھورا چھوڑ کر میں نے مزید کہا۔ ''کچھ اور عرض کروں؟''

''تم...... تم......''

''میرا نام عذرا خان ہے۔'' اس بار میرے لہجے میں نرمی آ گئی۔ ''میں آپ کو زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتی بلکہ آپ پہلے ہی نرجس کے اغواء سے سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہیں۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اپنے نظریات سے بے وفائی پر آمادہ ہو جائیں!'' میرے آخری الفاظ کا اُس پر خاطر خواہ ردِعمل ہوا۔ میں نے اُن کے تنے ہوئے چہرے پر غم کا سایہ محسوس کر لیا تھا، مگر جلد ہی اُس نے خود پر قابو پا لیا۔

''تم...... تم مجھے کوئی غیر ملکی ایجنٹ معلوم ہوتی ہو!''

"غلط اندازہ ہے آپ کا۔" میں فوراً بول اُٹھی۔

"اگر میرا اندازہ غلط ہے تو پھر تمہیں میرے بارے میں سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟"

"یہ تو خیر میں نہیں بتاؤں گی کہ میرے ذرائع کیا ہیں، ہاں یہ ضرور بتا سکتی ہوں کہ نرجس کے اغواء میں کن لوگوں کا ہاتھ ہے!" میں نے اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کس کا ہاتھ ہے بتاؤ؟" اُس نے بے صبری سے پوچھا۔ وہ بہرحال ایک باپ بھی تھا۔

"اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتی ہوں۔"

"مگر کیوں؟" اُس نے کہا۔

"تاکہ میں اندازہ لگا سکوں کہ نرجس کی بازیابی کے سلسلے میں آپ کس حد تک کوشش کر چکے ہیں اور پولیس کی کارکردگی کیا ہے۔"

"نرجس کو تم کیسے جانتی ہو؟" وہ شخص یقیناً مضبوط اعصاب کا مالک تھا ورنہ اب تک بار بار نرجس کا نام آنے کے باوجود اپنے حواس پر قابو نہ رکھ پاتا اور نہ مجھ سے یہ سوال کرتا۔

"آپ نے پھر مجھ سے سوال کر دیا!" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ میں اُسے کسی نہ کسی طرح جانتی ہوں گی، تبھی یہاں آئی ہوں۔ میرا مقصد محض یہ ہے کہ جلد از جلد وہ اپنے گھر پہنچ جائے۔ میں کون ہوں؟ یہ نرجس ہی آپ کو بتا سکے گی۔ ویسے میں نے اپنا نام غلط نہیں بتایا۔ آپ کے صاحبزادے نے میری کار کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہے۔ خاصا ذہین بچہ معلوم ہوتا ہے۔"

"پوچھو! تم کیا پوچھنا چاہتی ہو؟" آخر اُس نے ہتھیار ڈال ہی دیئے۔

"نرجس کے اُس بوائے فرینڈ کا سراغ ملا جو اُسے کالج سے اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا تھا؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

"اُس کا سراغ اب تک نہیں مل سکا۔" سمیع اللہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔

"جن لڑکیوں نے نرجس کو اُس نوجوان کے ساتھ جاتے دیکھا تھا، اُنہوں نے پولیس کو یہ بیان دیا تھا کہ نرجس بخوشی اُس کی کار میں بیٹھ کر گئی تھی۔ اُس نوجوان کا حلیہ بھی اُنہوں نے پولیس کو بتایا تھا جو یقیناً آپ کے علم میں بھی ہوگا۔ کیا اس حلیے کے کسی نوجوان کو آپ نے یا آپ کے گھر کے کسی اور فرد نے کبھی دیکھا تھا؟"

"نہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ نرجس سے اُس کی رسم و راہ بالا بالا ہی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے طویل سانس لی پھر بولی۔ "یہ امکان بھی ہے کہ جن لوگوں نے نرجس کو اغواء کرایا ہے، وہ نوجوان اُنہی کا آلۂ کار ہو۔ انہوں نے ہی اُسے نرجس کے پیچھے لگایا ہو اور مطلب براری کے بعد اُسے اس شہر سے کہیں اور بھیج دیا ہو۔ یہ صرف ایک امکان ہے۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ پولیس دیدہ و دانستہ اُس نوجوان کی تلاش سے گریز کر رہی ہو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے!" وہ فوراً بول اُٹھا۔

"غالباً آپ ایسا اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کہنا کیا چاہتی ہو تم؟"

"یہ کہ نرجس کو اغواء کرانیوالوں کا اثر بھی پولیس پر ہو سکتا ہے اور یہ کہ صرف آپ ہی کسی اہم سرکاری عہدے پر فائز نہیں۔"

"یعنی تمہارا مطلب یہ ہے کہ کوئی اور اہم سرکاری افسر اس معاملے میں مداخلت کر کے پولیس کی تفتیش رُکوا سکتا ہے!" وہ اب کچھ کچھ گھاٹ پر آتا جا رہا تھا۔

"یقیناً!.....سرکاری افسر بھی اور کوئی سیاسی شخصیت بھی۔" میں نے مزید آگے بات بڑھائی۔

"سیاسی شخصیت؟" اُس نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی!" میں بولی۔ "یہ معاملہ بظاہر جتنا سیدھا نظر آ رہا ہے، اتنا دراصل ہے نہیں۔"

"تم صاف صاف بات کیوں نہیں کرتیں؟"

"صاف صاف بات کروں!.....ٹھیک ہے میں راضی ہوں اس پر۔ لیکن پھر آپ کو بھی صاف صاف بات کرنا پڑے گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" اُس نے کہہ دیا۔

"تو سنیں! آپ کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی خاطر دائیں بازو والوں نے یہ چال چلی ہو؟ اور اس طرح وہ....." میں نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"یہ..... یہ ممکن نہیں!" وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔

"دیکھیں، آپ ہی نے صاف صاف بات کرنے کو کہا تھا، اور آپ ہی وعدہ خلافی کر رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیا آپ اس سے انکار کریں گے کہ ان دنوں مخالف کیمپ والوں سے بھی ملاقاتیں کر رہے ہیں؟"

میری بات سن کر وہ چونک اُٹھا اور مجھے اس طرح حیرت سے دیکھنے لگا جیسے میرے ماتھے پر اچانک سینگ نکل آیا ہو۔

"میں..... میں سمجھ نہیں پا رہا کہ..... کہ تم..... تم....." وہ اپنا ماتھا رگڑنے لگا۔

"کہ تم ہو کیا بلا؟" میں نے اُس کا جملہ پورا کر دیا۔ "غالباً آپ یہی کہنا چاہتے ہیں۔" پھر اچانک میں نے اپنا لہجہ بدل لیا اور بولی۔ "مسٹر سمیع اللہ! احمقانہ باتیں نہ کرو۔"

میری توقع کے مطابق وہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا، لیکن ظاہر ہے کہ میرا کیا بگاڑ سکتا تھا؟

"اس گستاخی کے لئے معافی چاہتی ہوں۔" میں نے پہلو بدل کر کہا۔ "دراصل آپ کچھ زیادہ ہی خوش فہمیوں کا شکار معلوم ہوتے ہیں اور اسی لئے مجھے آپ کو کٹ ٹو سائز کرنا پڑا۔ آپ وزارت دفاع کے ایک ذمہ دار افسر ضرور ہیں مگر وزیر دفاع نہیں! اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں! کیا سمجھے آپ؟" میں کسی نہ کسی طرح اُس کے مضبوط اعصاب کو جھٹکا دینا چاہتی تھی اور مجھے اپنی اس کوشش میں ناکامی نہیں ہوئی۔ اب

میں اُسے بہ آسانی راہِ راست پر لا سکتی تھی۔

''تم......تم نے میرے اعصاب توڑ کر رکھ دیئے ہیں۔'' اُس نے گویا اعترافِ شکست کر لیا اور میں یہی چاہتی بھی تھی۔

''سنیں! میں جانتی ہوں کہ آپ اس وقت کس عذاب سے گزر رہے ہیں۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک اس ذہنی اذیت کو برداشت نہ کر پاتا۔'' میں نے کہنا شروع کیا، وہی جو دراصل مجھے کہنا تھا۔ اب تک یہی سب کچھ کہنے کے لئے میں فضا ہموار کر رہی تھی۔ ''میں نے جو کچھ کہا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ اپنے طور پر یقیناً آپ نے بھی لگایا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ آپ بچے نہیں، ایک تجربہ کار شخص ہیں، ایک زمانہ دیکھا ہو گا آپ نے! ہر طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑا ہو گا۔ آپ کے لئے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں رہا ہو گا کہ دائیں بازو کے لوگ آج کل کیوں اِردگرد منڈلا رہے ہیں! لیکن اندازہ بہرحال اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کو شبہ تو ہو سکتا ہے، یقین نہیں۔ اسی لئے آپ اُن لوگوں کو اپنے قریب آنے کا موقع دے رہے ہیں۔ بتایئے غلط کہا میں نے؟'' یہ کہہ کر میں سمیع اللہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''تمہاری باتیں حیرت انگیز طور پر درست ہیں۔'' اُس کی آواز میں حیرت بھی تھی اور شکست کا عنصر بھی۔ اس کے علاوہ اعتراف بھی!

''میں آپ کے شبہے کو یقین میں بدلنا چاہتی ہوں۔'

''وہ کیسے؟'' اُس نے سوال کیا۔

''اُن لوگوں کے نام بتا کر جو نرجس کے اغواء میں ملوث ہیں۔ اُن کا تعلق آپ کے مخالف نظریات ہی سے ہے۔ وہ اس طرح آپ پر دباؤ ڈال کر اپنے مذموم مقاصد کا حصول چاہتے ہیں۔''

''مگر وہ ہیں کون لوگ؟......تم کچھ بتاؤ بھی!''

''وہ لوگ آپ سے زیادہ بارسوخ اور......'' میں ایک بات کہتے کہتے رُک گئی۔ مقصد یہ تھا کہ کہیں سمیع اللہ ہمت نہ ہار بیٹھے۔ ''اور یہ کہ آپ کو اس کے باوجود ڈرنے یا دبنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ظالم سے ڈر جانا بھی ظلم کی معاونت کرنا ہے۔'' میرا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ آپ اپنے تمام تر اثر و رسوخ کے باوجود نرجس کی بازیابی کے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے! لیکن اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ میں جو کہوں وہ کئے جائیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ آپ میری بات کیوں مانیں، مجھ پر اعتماد کیوں کریں؟ تو یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔ میری باتیں آپ کے دل کو لگیں تو ان پر عمل کریں ورنہ نہیں۔ اس سے میرے اُوپر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''تم کہو تو کیا چاہتی ہو مجھ سے؟'' وہ بولا۔

''صرف اتنا کہ چند دن صبر کر لیں۔ صبر صرف ان معنوں میں کہ اپنے مخالفین کے دباؤ میں نہ آئیں، اُن کی کوئی بات نہ مانیں، صاف الفاظ میں یہ کہ بلیک میل نہ ہوں۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''لیکن پھر......پھر تم......تم کیا کرو گی؟......نرجس کس طرح......'' وہ ٹوٹنے لگا۔

''اُن کے قبضے سے نرجس کو نکالنا میرا کام ہے۔'' میں پُریقین لہجے میں بولی۔

''لیکن تم یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہو؟''

''اس کی وجوہ بہت سی ہیں۔ فی الحال اتنا بتا سکتی ہوں کہ جو لوگ نرجس کے اغواء میں ملوث ہیں، وہ کرپٹ ہیں، ملک دشمن ہیں، مفاد پرست اور ابن الوقت ہیں، اپارچونسٹ! بے پیندے کے لوٹے، کمینے، ذلیل، بدکردار اور...... خیر......تو یوں سمجھیں کہ میں اُنہیں بے نقاب کرنا چاہتی ہوں، اُنہیں اُن کے جرائم کی سزا دلوانا چاہتی ہوں۔ اُنہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اختیار اور اقتدار سے فائدہ اُٹھا کر وہ اپنی من مانی نہیں کر سکتے! وہ کسی بھی سمیع اللہ کی بیٹی کو اغواء کر کے اپنی بات نہیں منوا سکتے!'' میں جذبات کی رو میں بہتی رہی۔

جب میں خاموش ہوئی تو سمیع اللہ نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''تو تمہارا تعلق انٹیلی جنس سے ہے؟''

''میرے بارے میں مختلف اندازے لگانے کی ضرورت نہیں۔ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ اسے بھول کر صرف یہ سوچیں کہ میری باتوں میں صداقت ہے یا نہیں؟ اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں تو میں نے جو عرض کیا ہے، اس پر عمل کریں ورنہ آپ کو اختیار ہے۔ دوسری صورت میں تمام تر ذمہ داری آپ پر ہو گی۔''

''تم مجھے بہت سلجھے ہوئے ذہن کی مالک معلوم ہوتی ہو، لیکن تمہارے طریقۂ کار سے میں اختلاف کروں گا۔ تم اب جو کچھ کہہ رہی ہو، ابتداء میں بھی کہہ سکتی تھیں۔''

''نہیں۔ اُس صورت میں آپ میری کسی بات پر یقین نہ کرتے اور اب بھی میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں کہ میری باتیں آپ نے دل سے تسلیم کر لی ہوں گی۔''

''تم کچھ اور مجھے بتاؤ یا نہ بتاؤ، میں اصرار نہیں کروں گا، صرف اتنا بتا دو کہ وہ لوگ کون ہیں؟ تم نے کسی سیاسی شخصیت کا ذکر بھی کیا تھا، ابھی کچھ دیر پہلے۔'' سمیع اللہ نے کہا۔

''ہاں، ٹھیک کہا آپ نے۔'' میں نے سر ہلایا، پھر بولی۔ ''ایک شرط پر میں آپ کو اُن لوگوں کے نام بتا سکتی ہوں کہ آپ میرے ذرائع کے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گے۔ مجھ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ مجھے کس طرح ان باتوں کا علم ہوا؟ دوم یہ کہ اس معاملے کو اپنے طور پر نمٹانے کے لئے قدم نہیں اُٹھائیں گے۔ یہ میں آپ کی بھلائی کے لئے ہی کہہ رہی ہوں۔ اس سے معاملات بگڑ جائیں گے۔ آپ کی غیرضروری مداخلت میرے لئے نقصان دہ ثابت ہو گی اور خود آپ کے لئے بھی۔ بولیں منظور ہے؟''

''تم اس طرح گویا میرے ہاتھ پیر باندھنا چاہتی ہو......مگر ٹھیک ہے! جب تمہارے بقول میں کچھ کر ہی نہیں سکتا تو پھر کیا فائدہ؟ تمہاری ہی شرطیں مانے لیتا ہوں۔'' اب وہ سیدھی سیدھی بات کر رہا تھا۔ جو کچھ شاید اُس کے دل میں تھا، زبان پر تھا۔ وہ کچھ بجھ سا گیا تھا۔ اُس نے اپنی اطراف جو خول چڑھا رکھا تھا میں نے توڑ دیا تھا۔ وہ اب وزارتِ دفاع کا ایک ذمہ دار افسر نہیں بلکہ ایک ایسا باپ تھا جس کی بیٹی اغواء کر لی گئی تھی اور اُس کی بازیابی کی ایک صورت پیدا ہو رہی تھی۔ میں یہی چاہتی بھی تھی کہ اُس کی ''اکڑفوں'' ختم کر دُوں۔ اس کے بعد وہ میری بات سن سکتا تھا اور اس پر عمل بھی ممکن تھا۔

ذرا توقف سے اُس کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے میں نے صرف اتنا کہا۔ ''عبدالحمید خاں نے نرجس کو اغواء کرایا ہے۔''

''عبدالحمید خاں؟'' وہ تقریباً اُچھل پڑا۔ ''وہ...... وہ کمینہ!......''

''جذبات میں نہ آئیں۔'' میں نے پُرسکون آواز میں اُسے سمجھایا، پھر کہا۔ ''ممکن ہے، پہلے بھی وہ مختلف ذرائع سے آپ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتا رہا ہو۔ آپ کا غصہ یہی ظاہر کر رہا ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ وہ ذلیل شخص بہت دن سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ مگر...... وہ...... وہ اس حد تک بڑھ جائے گا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ تمہیں یقین ہے کہ...... کہ اُسی نے......''

''جس طرح یہ حقیقت ہے کہ میں اس وقت آپ کے گھر میں بیٹھی ہوں اور اس وقت رات ہے اسی طرح اسی یقین کے ساتھ میں نے نرجس کو اغواء کرنے والے کا نام بتایا ہے۔''

''لیکن میں...... میں اُس سے نمٹ سکتا ہوں!'' وہ جوش میں آ گیا۔ ''میں اُسے بھنگی بنا دُوں گا۔''

''مگر اُسی وقت جب اُس پر یہ جرم ثابت ہو جائے گا۔''

''تو جب تمہیں علم ہے کہ نرجس کو اُسی نے اغواء کرایا ہے تو پھر کیا...... کیا دُشواری ہے؟ اُس پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا جا سکتا؟'' اُس نے مضطرب ہو کر سوال کیا۔

''اس لئے کہ نرجس کو اُس نے کہاں قید رکھا ہے، یہ مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے اُسے بتا دیا۔ ''جس وقت بھی یہ معلوم ہو گیا، وہ اپنے تمام اثر و رسوخ کے باوجود مجھ سے بچ نہیں سکے گا۔ پھر ایک بات اور یہ کہ غیر ضروری چھیڑ چھاڑ خود نرجس کی زندگی کے لئے بھی خطرہ بن سکتی ہے۔ اغواء کے اس کیس سے بچنے کے لئے وہ کمینہ نرجس کو بھی کوئی ایسا نقصان پہنچا سکتا ہے کہ ہمیں بعد میں پچھتانا پڑے۔'' میں اُسے سمجھانے لگی۔ ''اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ خود نرجس کو کوئی موقع مل جائے کہ وہ اُس کی قید سے نکل سکے۔ نرجس بہر حال تعلیم یافتہ اور ذہین ہے۔ لیکن یہ قیاس محض قیاس ہے۔ ایک فیصد ایسا ممکن ہے۔ بہر حال عبدالحمید خاں کی نقل و حرکت میری نظر میں ہے۔ نرجس کے اغواء کو آج تیسرا دن ہے۔ ان تین دنوں کے دوران میں اپنے تمام تر وسائل کے باوجود بھی عبدالحمید خاں پر ہاتھ نہیں ڈال سکی۔ اس سلسلے میں پولیس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ وہ اپنی سی کوشش ممکن ہے کر رہی ہو۔ ممکن ہے، تفتیش رُکوا دی گئی ہو، مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس کو نہ چھیڑیں۔ اُسے اپنے طور پر کام کرنے دیں۔ اُس کی بھی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ پولیس کے محکمے میں بھی تو آدمی ہی کام کرتے ہیں۔ اُنہیں ترغیب بھی دی جا سکتی ہے، اُن پر دباؤ بھی ڈالا جا سکتا ہے، اُنہیں لالچ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اب یہ آدمی پر منحصر ہے کہ کس میں کتنا ظرف ہے؟ کون کس قیمت پر بکتا ہے یا دباؤ میں آتا ہے؟ مختصراً یہ کہ فی الحال آپ مجھے صرف ایک دن کی مہلت اور دے دیں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ آج رات کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ اور اگر آج رات بھی کوئی بات نہیں بنی تو کل تک دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر میں چپ ہو گئی اور سمیع اللہ کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

میں پوری طرح اپنی بات کنوے کر چکی تھی اور سمیع اللہ کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس نے میری بات سمجھ لی ہے۔ اُس کا جوش اب ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

''میرا فون نمبر نوٹ کر لیں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنی کوٹھی کا نمبر بتایا، پھر احتیاطاً آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا خفیہ نمبر بھی لکھوا دیا۔ اس کے بعد کہا۔ ''میں اگر ان نمبروں پر نہ ملوں تو آپ میسج ضرور دے سکتے ہیں۔ یہ نمبر میں نے اس لئے لکھوائے ہیں کہ ممکن ہے کبھی آپ کو میری ضرورت پیش آ جائے۔

''تمہارا شکریہ عذرا خان!'' سمیع اللہ کے لہجے میں واقعی شکر گزاری تھی۔ ''تم میرے لئے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئی ہو۔ میں اب خود کو بہت مضبوط محسوس کر رہا ہوں کہ تنہا نہیں۔ تم بھی میرے ساتھ ہو۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ ابھی نیکی اور سچائی اس دنیا سے نہیں اُٹھی۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ آج تم سے مل کر صنف نازک کے بارے میں میرے خیالات بدل گئے ہیں۔ میں عورتوں کو اب تک احمق سمجھتا تھا، لیکن اب...... اب ایسا نہیں۔ شاید میں غلطی پر تھا۔ عورتیں ذہین بھی ہو سکتی ہیں، یہ اعتراف کرتے ہوئے زندگی میں پہلی بار مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ بہر حال......''

''اچھا اب میں اجازت چاہوں گی۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

''نہیں۔'' اُس کے لہجے میں بزرگانہ شفقت تھی۔ ''تم ایسے نہیں جاؤ گی۔ کھانے کا وقت ہے، کھانا کھا کر جانا۔''

''اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں مسکرا کر بولی۔ ''اگر ایسا ہی ہے تو آپ کافی بنوا لیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں آتا ہوں ابھی۔'' وہ اُٹھنے لگا۔

''سنیں!'' میں نے اُسے مخاطب کیا۔ ''آپ کے صاحب زادے انجم کو کرید ضرور ہو گی کہ ڈیڈی اتنی دیر کمرے میں بند رہ کر کیا باتیں کرتے رہے؟ اور پھر ان کا رویہ کیسے بدل گیا؟ اپنے طور پر اُسے سمجھا دیجئے گا۔''

''وہ...... وہ تم فکر نہ کرو!'' اُس نے کہا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں، تم کیا چاہتی ہو۔ تمہارے میرے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے، کسی کو اس کی ہوا نہیں لگے گی۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ رُوم کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا اور پردہ اُٹھا کر دروازہ کھول دیا۔

''زحمت ہو گی آپ کو، یہ بیرونی دروازہ بھی اب کھول دیں۔'' میں بول اُٹھی۔

''ہاں...... کھول دیتا ہوں۔'' وہ پلٹا۔

پھر کچھ ہی دیر میں ایک ملازمہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ رُوم میں آ گئی۔ کافی کے ساتھ سمیع اللہ نے اور بھی تکلفات کر ڈالے تھے۔ میں نے اُس کی خاطر کافی کے ساتھ بس ایک آدھ بسکٹ ہی لینے پر اکتفا کیا۔ اس دوران میں نرجس کا بھائی انجم وہاں نہیں آیا۔ سمیع اللہ نے شاید اُسے اپنے طور پر کچھ سمجھا دیا تھا۔

کافی پی کر میں نے اجازت چاہی۔ میرے منع کرنے کے باوجود سمیع اللہ مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔ میں نے اپنی کار سٹارٹ کرتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر یوٹرن لے کر سیدھی نکلتی چلی گئی۔ میں نے دانستہ سرفراز کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی جو اب بھی مجذوب کا رُوپ دھارے جھوم رہا تھا۔

سمیع اللہ سے گفتگو کر کے اب میرا ذہن کسی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔ عبدالحمید خاں جو چال چل رہا تھا، میں نے اُسے ناکام بنا دیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ سمیع اللہ کو اب عبدالحمید خاں شیشے میں نہیں اُتار پائے گا۔ اس کے ساتھ مجھے نرجس کی فکر بھی تھی۔ جلد از جلد اُس کی بازیابی ضروری تھی۔ یہ تو طے شدہ امر تھا کہ عبدالحمید خاں نے اُسے برباد کر دیا ہو گا لیکن میں یہ چاہتی تھی، اُس کی زندگی کم از کم خطرے میں نہ پڑے۔ عبدالحمید خاں جیسے شخص سے بعید نہیں تھا کہ وہ نرجس کو ختم کرا دیتا تا کہ اُس کے جرم پر پردہ پڑا رہے۔ نرجس کی زندگی

اُس کی سیاسی موت ثابت ہوتی۔ وہ انتہائی عیاری کا ثبوت دے رہا تھا ورنہ اب تک میرے پھیلائے ہو
جال میں پھنس چکا ہوتا۔

میرا رُخ اب اپنی کوٹھی کی طرف تھا اور میں دل ہی دل میں یہ دُعا کر رہی تھی کہ آج رات عبدالحمید خا
کے اندر کا شیطان ظاہر ہو جائے! وہ نرجس سے ملنے کی کوشش کرے اور یوں مجھے اُس جگہ کا علم ہو جائے جہا
اُس نے نرجس کو قید کر رکھا ہے۔ یہ معلوم ہو جاتا تو پھر میرے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ نرگس کی بازیابی کے
معاملے میں بھی میں بہت فکر مند اور پریشان تھی۔ اُس معاملے میں میری حیرت انگیز ذہنی قوتوں نے م
ساتھ دیا تھا اور میں کامیابی سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ لیکن وہ ذہنی کیفیت اختیاری نہیں تھی۔ میں خود اپنی حیر
انگیز ذہنی قوتوں کو بیدار نہیں کر سکتی تھی۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو اس وقت میں، نرجس کے بارے میں فکر مند
ہوتی، اپنی ذہنی قوتوں سے کام لے کر معلوم کر لیتی کہ وہ کہاں ہے؟ دراصل نرگس اور نرجس کے معاملات الگ
الگ نوعیت کے حامل تھے۔ وہ اور معاملہ تھا یہ اور! نرجس کی بازیابی سے میں اپنے دشمنوں کو بھی کارنر کرنا چا
تھی۔ عبدالحمید خاں کی نقل و حرکت میرے آدمیوں کی نظر میں تھی اور مجھے اُن پر بھروسہ تھا۔ کیپٹن شاد ذہین
تھا اور جری بھی! وہی عبدالحمید خاں کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ عبدالحمید خاں کے لئے یہ ذرا مشکل تھا کہ اُس
آنکھوں میں دُھول جھونک کر نکل جاتا۔ راستے میں، میں نے فیصلہ کیا کہ کوٹھی پہنچتے ہی سب سے پہلے اسی سل
میں آپریشن سیل سے رپوٹ لوں گی۔ آج کی رات میں اپنی کوٹھی ہی میں بسر کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اس سلسلے م
بھی حفاظتی بندوبست کرنا تھا۔

میں اپنی کوٹھی پہنچی تو میری ملازمۂ خاص فاطمہ نے وہ پرچہ لا کر میرے سامنے رکھ دیا جس پر اُن لوگو
کے میسج لکھے تھے جنھوں نے میرے غیاب میں مجھے فون کئے تھے۔ میں نے پرچے پر نظر دوڑائی۔ پہلا
ملک دلاور کا تھا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میرے نزدیک فی الحال اُس سے فون پر بات کرنا
ضروری نہیں تھا۔ وہ نرگس ہی کے سلسلے میں مجھے کریدنا چاہتا ہوگا۔ اُس سے بعد میں بھی بات ہو سکتی تھی۔ د
نام آئی جی کا تھا۔ اُس نے اپنے گھر کا فون نمبر بھی لکھوایا تھا کہ میں گیارہ بجے رات تک بھی اگر لوٹ آؤ
فون پر اُس سے بات کر سکتی ہوں، وہ گھر پر ہی ملے گا۔ میں نے سوچا کہ شاید گیارہ بجے کے بعد وہ اپنی خوا
گاہ میں چلا جاتا ہوگا۔ تیسرا نام کمانڈر نواز کا تھا۔ اُس نے کوئی میسج نہیں چھوڑا تھا۔ میرے لئے صرف یہ
کافی تھا کہ اُس نے مجھے فون کیا تھا، یقیناً وہ کوئی اطلاع دینا چاہتا ہوگا۔

میں نے سب سے پہلے اُسی سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ سلسلہ ملتے ہی میں نے کہا۔ ’’پہلے اپنی بات کر
بعد میں، میں بات کروں گی۔ کوئی نئی اطلاع؟‘‘

’’جی......‘‘ اُس نے جواب دیا۔ ’’آج شام دونوں جرمن سائنس دان شیفرڈ اور شیپرڈ، صدر مملکت
ملے ہیں۔ اسلام آباد سے یہ رپورٹ ابھی کچھ دیر پہلے موصول ہوئی ہے سیل کے اُن ارکان کی طرف س
اُن دونوں کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ابھی اس ملاقات کا اصل مقصد سامنے نہیں آیا۔ بظاہر یہ ملاقات خیر س
کے دورے کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔‘‘

’’اینی تھنگ مور اِن دِس کنکشن؟‘‘ میں بولی۔

’’جی نہیں۔‘‘

’’کیپٹن شاد کی طرف سے کوئی رپورٹ؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’عبدالحمید خاں اپنی کوٹھی ہی میں ہے۔ کچھ دیر پہلے وہ ایک ڈنر میں شرکت کر کے واپس آیا ہے۔‘‘

’’میں کوٹھی ہی میں ہوں، اس سلسلے میں کیپٹن شاد سے رپورٹ لیتے رہو! غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کوئی بھی اہم اطلاع فوری طور پر مجھے ملنی چاہئے۔ اسی کے ساتھ میری کوٹھی کی حفاظت کا بندوبست بھی ضروری ہے۔‘‘

’’بہتر ہے۔‘‘ کمانڈر نواز نے جواباً کہا۔

’’خدا حافظ!‘‘ میں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کیا اور پھر آئی جی کے گھر کا نمبر ملانے لگی۔ دوسری طرف سے فون وصول کرنے والی غالباً کوئی لڑکی تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ آئی جی صاحب سے بات کرنا چاہتی ہوں، میرا نام عذرا خان ہے۔

جلد ہی مجھے آئی جی کی آواز سنائی دی۔ ’’ہیلو! مِس عذرا خان؟‘‘

’’جی بول رہی ہوں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’فرمائیے حکم؟‘‘

’’حکم تو خیر نہیں، عرض کرنا تھا کچھ۔‘‘

’’جی فرمائیں!‘‘

’’اے آر چودھری کو آپ کے ایماء پر حراست میں لے لیا گیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی فرم کی جو لڑکی اغواء ہوئی تھی، برآمد ہو گئی ہے۔‘‘ آئی جی کہنے لگا۔ ’’میں نے آپ سے ذاتی طور پر بھی عرض کیا تھا کہ ضروری خانہ پُری......‘‘

’’معاف کیجئے گا، میں آپ کی بات کاٹ رہی ہوں۔ دراصل اُس لڑکی کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ کوئی بیان دے سکتی۔‘‘

’’جی؟‘‘ آئی جی کے لہجے میں حیرت تھی۔ ’’مگر مجھے یہ بات نہیں بتائی گئی۔‘‘

’’میں عرض کرتی ہوں۔‘‘ میں پُرسکون آواز میں بولی۔ ’’یوں سمجھیں، ایک لڑکی کو اغواء کیا جاتا ہے اور وہ کسی کی کوٹھی سے پولیس کی موجودگی میں برآمد کر لی جاتی ہے، چاہے پہلے اُس کی رپورٹ کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو تو ایسی صورت میں یہ پولیس کیس بنتا ہے۔ پولیس خود اپنے طور پر اس صورت حال میں کوئی بھی قدم اُٹھانے کی مجاز ہے۔ جہاں سے مغویہ برآمد ہوئی ہے اور جو شخص اُس لڑکی کو حبس بے جا میں رکھے ہوئے تھا، پولیس اسے حراست میں لے سکتی ہے۔ رہی ضروری خانہ پُری تو یہ اُسی وقت ممکن ہے جب اغواء کی جانے والی لڑکی اس حالت میں ہو کہ بیان دے سکے! آپ سمجھ رہے ہیں نا۔ میں نے ایس ایچ او کو بھی یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ کل تک اُس لڑکی کا بیان دلوا دیا جائے گا۔ مگر شاید چودھری سے ایس ایچ او کے بھی تعلقات ہیں اور عین ممکن ہے کہ چودھری نے ہی کسی طرح آپ تک اپروچ کی ہو۔ دراصل اُس لڑکی پر شدید تشدد کیا گیا ہے، پھر بھی مجھے اُمید ہے کہ کل تک وہ کم از کم اس قابل ضرور ہو جائے گی کہ بیان دے سکے۔‘‘

’’ویری سوری!‘‘ آئی جی بولا۔ ’’مجھے صحیح صورتِ حال نہیں بتائی گئی تھی ورنہ میں آپ کو ہرگز زحمت نہ دیتا۔

آپ نے جو کچھ کہا، بالکل درست ہے! سوری اگین!"

"نہیں نہیں، کوئی بات نہیں۔ ایسے معاملات میں ہوتا ہے ایسا۔ اور کوئی حکم؟" میں نے کہا۔

"نو تھینک یو!" پھر سلسلہ منقطع ہوگیا۔

اب صرف دلاور سے بات کرنا رہ گیا تھا، مگر میں نے پہلے کھانا کھالینا ضروری سمجھا۔ میری ملازمۂ خاص فاطمہ خوش ہوگئی۔ اُس نے کھانا لگوا دیا۔ اُن کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ آج کل مجھے گھر پر کھانا کھانے کی مہلت کم ہی مل رہی تھی۔

کھانا کھا کر کافی وغیرہ پینے میں رات کے ساڑھے دس بج گئے۔ میں ڈائننگ ہال سے اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔ ابھی تک کمانڈر نواز نے کوئی نئی رپورٹ نہیں دی تھی۔ مجھے بلا سبب ہی عبدالحمید خاں پر غصہ آنے لگا کہ وہ نرجس سے مل کیوں نہیں رہا؟ حالانکہ اس میں غصے والی کوئی بات نہیں تھی، لیکن عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی کوئی لائحۂ عمل مرتب کر لیتا ہے، کوئی توقع باندھ لیتا ہے اور وہ توقع کسی سبب پوری نہیں ہوتی تو خواہ مخواہ غصہ آنے لگتا ہے۔ میں بھی اُس وقت ایسی ہی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ میں نے سوچا، کیوں نہ اس دوران میں دلاور سے بھی بات کر لی جائے۔ ممکن ہے انتظار کا یہ عذاب اس طرح کچھ دیر کے لئے کم ہو جائے۔ یوں بھی دلاور بزلہ سنج تھا۔ اُس سے گفتگو کر کے میں کچھ فریش نس محسوس کرنے لگتی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے ابھی ٹیلی فون سیٹ اُٹھایا ہی تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے فوراً ریسیور اُٹھا لیا۔

دوسری طرف سے مجھے کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ابھی ابھی سرفراز نے اطلاع دی ہے کہ سمیع اللہ کی بیٹی نرجس اپنے گھر پہنچ گئی ہے۔"

"نرجس اپنے گھر پہنچ گئی ہے؟...... کیا کہہ رہے ہو تم؟" مجھے جیسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"جی ہاں، سرفراز تصدیق کر چکا ہے۔ وہ نرجس ہی ہے۔" کمانڈر نواز نے بتایا۔

"مگر...... مگر یہ...... یہ کیسے ممکن ہے؟" میں جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

○○○

"آپ نے مجھ سے کچھ فرمایا؟" دوسری جانب سے مجھے کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔

"نہیں۔" یہ کہتے ہی میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اب مجھے فوری طور پر سمیع اللہ کی کوٹھی پہنچنا تھا۔ میرے لئے یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ ایک دم حالات کیسے پلٹا کھا گئے؟ عبدالحمید جیسا گھاگ اتنی جلدی تو ہار ماننے والا نہیں تھا! پھر یہ کہ وہ اتنی بڑی غلطی کس طرح کر سکتا تھا؟ نرجس کا اُس کی قید سے نکل جانا خود اُسی کے لئے گلے کا پھندا تھا۔ اور ایسی ہی بہت سی باتیں، بہت سے خدشات میرے ذہن میں آنے لگے۔ میں کیونکہ کسی بھی قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار تھی اس وجہ سے جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔ میں نے یہ سوچ کر شب خوابی کا لباس بھی نہیں پہنا تھا کہ ممکن ہے مجھے کوٹھی سے فوری طور پر کہیں جانا پڑے۔

میں نے اپنی ملازمۂ خاص فاطمہ کو بلا کر بتایا کہ میں جا رہی ہوں اور معلوم نہیں کب واپسی ہو، تم کوشش کرنا کہ میری واپسی تک فون اٹینڈ کرتی رہو۔ اُسے یہ ہدایت دے کر میں اپنی خواب گاہ سے نکل گئی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد میری کار سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔ اپنی کوٹھی کے پھاٹک سے نکل کر باہر آتے ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کوٹھی کی حفاظت کا بندوبست ہو چکا ہے۔ کمانڈر نواز نے میرے ہی حکم پر ایسا کیا تھا۔

کراچی جیسے بڑے شہر میں رات کے ساڑھے دس گیارہ بجے کا وقت کچھ زیادہ نہیں۔ یہ شہر دیر تک جاگتا ہے، بلکہ اس کے بعض علاقے تو ساری رات جاگتے رہتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ اس وقت بھی سڑکوں پر ٹریفک تھا، ہاں اس میں قدرے کمی ضرور ہوگئی تھی۔

سمیع اللہ کی کوٹھی تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ آج ہی چند گھنٹے قبل تو میں وہاں آئی تھی۔ اُس وقت مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی دوبارہ آنا پڑے گا۔ سرفراز کو میں نے مستعد و چوکنا دیکھ لیا تھا۔ اُسکی نگاہ کوٹھی کے گیٹ ہی پر تھی۔ اطلاعی گھنٹی بجانے کے باوجود فوری طور پر کوئی باہر نہیں آیا۔ میں دوسری مرتبہ گھنٹی بجا کر انتظار کرنے لگی تو ذرا دیر بعد ایک بوڑھی عورت نے گیٹ کھول کر پوچھا۔

"کون ہے؟" لباس سے وہ گھر کی ملازمہ معلوم ہوتی تھی۔

"سمیع اللہ صاحب سے کہو کہ عذرا خان ملنا چاہتی ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اچھا جی۔" ملازمہ یہ کہہ کر واپس چلی گئی۔

کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سمیع اللہ خود گیٹ تک دوڑا چلا آیا۔ "آیئے...... آؤ تم...... تم اچھی آ گئیں۔" وہ کچھ گھبرایا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔

وہ مجھے ساتھ لئے ڈرائنگ رُوم میں آ گیا۔ اُسی وقت میں نے اُسے مخاطب کیا۔ ''ابھی آپ نے پولیس کو تو یہ اطلاع نہیں دی کہ نرجس گھر آ گئی ہے؟''

میرا سوال سن کر وہ چونک اُٹھا اور اس طرح میری شکل دیکھنے لگا جیسے میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔

''تم...... تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ...... کہ نرجس...... اُسے گھر آئے ابھی مشکل سے آدھا گھنٹہ ہوا ہے۔ حیرت...... حیرت ہے کہ......''

''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟'' میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''ابھی تو میری سمجھ ہی میں نہیں آ رہا کہ...... کہ کیا کروں!''

''بات کیا ہے، آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

''وہ...... وہ جب سے گھر آئی ہے بس روئے جا رہی ہے۔ اور پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بتا رہی۔ اُس کی ماں بھی سخت پریشان ہے اور...... اور میں بھی۔'' اُس نے بتایا۔

نرجس کے رونے کا سبب مجھ سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔ وہ آخر بتاتی بھی کیا؟ کیا اپنے والدین کو یہ بتا دیتی کہ ایک شیطان صفت شخص عبدالحمید خان نے اُس کی عزت و آبرو خاک میں ملا دی ہے؟ کیا ایک معصوم و نوجوان لڑکی میں اتنی جرأت ہو سکتی ہے، خواہ وہ پڑھی لکھی ہی کیوں نہ ہو؟ وہ یقیناً بڑے رُوح فرسا حالات سے گزری ہو گی اور نہ جانے کیسے اپنے گھر تک پہنچ سکی ہو گی! اس وقت اُس سے کسی قسم کا استفسار خصوصاً والدین کی جانب سے بے جا ہی تھا۔ چاہے والدین اپنی محبت سے مجبور ہو کر سب کچھ جاننا چاہتے ہوں۔ نرجس کو ان لمحات میں کسی ایسے غمگسار کی ضرورت تھی جس سے بے جھجک وہ اپنا دُکھ کہہ سکے، اپنے سینے کا بوجھ اُس کے سامنے ہلکا کر سکے۔ ہر چند کہ میں نے اُسے صرف ایک بار دیکھا تھا، وہ بھی عجیب حالات میں۔ مگر مجھے یقین تھا کہ میں اگر کوشش کروں تو وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپائے گی۔ یوں بھی اُس پر جو ستم ٹوٹا تھا، میں اُس سے بخوبی واقف تھی۔ یہی سوچ کر میں نے سمیع اللہ سے کہا۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ میں تنہائی میں نرجس سے مل سکوں؟''

''تم...... تم اُس سے اس وقت مل کر کیا کرو گی؟''

''وہی جو آپ نہیں کر پا رہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اُس کا ذہن یقیناً اُلجھا ہوا تھا اس لئے میری بات نہیں سمجھ سکا اور وضاحت چاہی۔

''کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اپنوں کے سامنے نہیں کی جاتیں، سمجھے آپ؟ شاید میں اُس سے بہت کچھ معلوم کر سکوں اور یہ ضروری بھی ہے۔ کیوں؟ یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ یقیناً آپ یہ بھولے نہیں ہوں گے کہ نرجس، عبدالحمید کی قید میں تھی۔ وہ وہاں سے نکلنے میں کیسے کامیاب ہوئی؟ اُس پر وہاں کیا گزری؟ یہی جاننے کے بعد تو کچھ سوچا جا سکتا ہے کہ ہمارا اگلا اقدام کیا ہونا چاہئے! سمجھ رہے ہیں آپ؟''

میری بات سن کر سمیع اللہ نے طویل سانس لیا، پھر تھکی تھکی سی آواز میں بولا۔ ''تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ میرا ذہن اتنا اُلجھ گیا تھا کہ آج ہی تم سے ہونے والی گفتگو یاد نہیں رہی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''نرجس اپنے کمرے میں ہے۔ میرا خیال ہے تم وہیں اُس سے مل لو۔ میں ابھی آتا ہوں اُس کی ماں سے کہہ

کر۔ پھر تمہیں اندر لے جاؤں گا۔''

سمیع اللہ کی بات ابھی پوری ہوئی تھی کہ اُس کا نوجوان بیٹا انجم تقریباً دوڑتا ہوا ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوا اور اپنے باپ سے بولا۔ ''ابو!...... بے بی......''

''کیا ہوا اُسے؟'' سمیع اللہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھا۔

''وہ...... وہ بے ہوش ہو گئی۔'' اُس نے بتایا۔

''ڈاکٹر زیدی کو فون کرو جلدی، گھر پر!'' یہ کہتا ہوا سمیع اللہ تیز تیز قدموں سے گھر کے اندر چلا گیا۔ انجم بھی اُس کے پیچھے پیچھے لپک گیا تھا۔

میں ڈرائنگ رُوم میں اکیلی رہ گئی۔ نرجس کی بے ہوشی میرے لئے زیادہ تشویش ناک نہیں تھی۔ شدید صدمے کے سبب ایسا ہونا ممکن تھا۔ روتے روتے بے ہوش ہو جانا کچھ بعید نہیں تھا، لیکن ان حالات میں میرے لئے مشکل پیدا ہو گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جو کچھ سوچا تھا وہ ممکن نہیں رہا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر میں ڈاکٹر آتا، کتنی دیر بعد نرجس ہوش میں آتی اور پھر کیا صورت رہتی؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ نادانستگی اور محبت میں نرجس کے گھر والوں سے یہ حماقت سرزد ہو گئی تھی۔ اُنہیں نرجس سے فی الحال پوچھ گچھ نہیں کرنی چاہئے تھی۔

نرجس کے ہوش میں آنے سے پہلے میرا وہاں سے جانا کچھ غیر اخلاقی سی بات تھی۔ پھر یہ کہ میں، سمیع اللہ کو بھی کچھ ہدایات دینا چاہتی تھی۔ ان حالات میں عبدالحمید خاں جیسا گھاگ کوئی بھی خطرناک چال چل سکتا تھا۔ اُسے یقیناً اندازہ ہو گا کہ نرجس کی زندگی اُس کی سیاسی موت ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے بچنے کے لئے وہ نرجس کی زندگی کا چراغ گل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ میں تو اپنے طور پر نرجس کی پوری حفاظت کا بندوبست کرتی ہی لیکن سمیع اللہ کا بھی محتاط اور چوکنا ہونا ضروری تھا۔ میں اسی وجہ سے اُس وقت تک وہاں ٹھہری رہی جب تک ڈاکٹر آ کر چلا نہ گیا۔ سمیع اللہ نے مجھے آ کر بتایا کہ ڈاکٹر نے نرجس کو سکون آور انجکشن دے کر سلا دیا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ نرجس کو کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے اور اس کے لئے فی الحال نیند بہت ضروری ہے۔

اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ میں نے دیوار گیر گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سمیع اللہ کو مخاطب کیا۔ ''اب کافی دیر ہو گئی ہے۔ میں چلوں گی، مگر جانے سے پہلے......''

''معاف کرنا عذرا! اپنی پریشانی میں تم سے میں نے اب تک چائے تک کو نہیں پوچھا۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''ابھی چائے کے لئے کہتا ہوں۔'' اُس کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

''نہیں، رہنے دیں۔ اس تکلف کی ضرورت نہیں۔'' میں بولی۔

''مجھے خود بھی خواہش ہو رہی ہے۔ جب اتنی دیر رُکی ہو تو کچھ دیر اور سہی۔ چائے پی کر چلی جانا۔'' یہ کہتے ہی اُس نے ملازمہ کو آواز دی۔ ملازمہ آ گئی تو اُس نے چائے لانے کو کہا، پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں اب کہو، کیا کہہ رہی تھیں تم؟''

ملازمہ چلی گئی تو میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ویسے تو میں خود بھی آپ کی کوٹھی کی حفاظت کا ایسا بندوبست کر دوں گی کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکے لیکن اس کے باوجود بھی آپ کا چوکنا رہنا بہت ضروری ہے۔ وہ شیطان صفت شخص کوئی بھی خطرناک حرکت کر سکتا ہے، میری مراد عبدالحمید خاں سے ہے۔''

”گولی ماردوں گا میں اُسے!“ سمیع اللہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔

”اگر خود اُس نے اِدھر آنے کی حماقت کی اُس صورت میں۔“ میرا لہجہ پُرسکون ہی رہا۔ ”اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ اتنا بڑا احمق ہرگز نہیں ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ سمیع اللہ غصے کی وجہ سے تیز تیز سانس لے رہا تھا۔

”یہ کہ جذبات میں نہ آئیں۔ دل کی بجائے ذہن سے کام لیں اور غصہ سے گریز کریں۔ غصے میں آدمی کو برے بھلے کی تمیز نہیں رہتی۔ مثلاً اس وقت آپ غصے میں نہ ہوتے تو میری بات فوراً سمجھ لیتے۔ بھلا عبدالحمید خاں کے پاس کرائے کے ٹٹوؤں کی کمی ہے کہ کوئی جو وہ خود یہاں آئے گا؟ یہ کام وہ کسی سے بھی لے سکتا ہے۔“

سمیع اللہ پر میری بات کا مثبت اثر ہوا۔ اُس کے چہرے سے غم و غصے کے تاثرات چھٹنے لگے۔ اور پھر غالباً جلد ہی اُس نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ بولا تو اُس کی آواز پُرسکون تھی۔ ”تم بہت ذہین اور ہوش مند لڑکی ہو۔ تمہارے قیاسات درست معلوم ہوتے ہیں۔ میں چوکنا رہوں گا۔ ہاں یہ بتاؤ کہ پولیس کو کب اطلاع دی جائے؟ اصولاً تو اسی وقت مجھے پولیس کو آگاہ کر دینا چاہئے کہ......“

”نہیں......“ میں بول اُٹھی۔ ”ہر معاملے میں اصول پرستی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ جب تک نرجس سے میری بات نہ ہو جائے پولیس کو اطلاع نہ دیں۔ اس سے گفتگو کے بعد ہی ہم یہ فیصلہ کریں گے کہ کیا قدم اُٹھایا جائے! میں چاہتی ہوں کہ نرجس کا بیان عبدالحمید خاں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہو۔“

”لیکن...... لیکن......“ سمیع اللہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ اُس کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”ہاں ہاں کہیں، کھل کر کہیں کیا بات ہے؟“ میں اُسے تذبذب کا شکار دیکھ کر بولی۔

”میرا مطلب یہ تھا کہ اخبارات اس معاملے کو اپنے رنگ میں پیش کریں گے، یعنی...... اس سے بدنامی...... نرجس کا مستقبل......“ سمیع اللہ صاف الفاظ میں جو بات کہہ نہیں پا رہا تھا اسے میں پوری طرح سمجھ چکی تھی۔

”نرجس کے اغواء کی خبر اخبارات میں آ ہی چکی ہے۔ ہے نا؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔“ اُس نے سر ہلایا۔

”ویسے تو ابھی نرجس سے بات کئے بغیر کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا، پھر بھی یہ بتا دوں کہ اخبارات میں وہی آئے گا جو ہم چاہیں گے۔ اس کا انحصار نرجس کے اُس بیان پر ہو گا جو وہ پولیس کو دے گی اور اُسے کیا بیان دینا ہے، اس کا فیصلہ کل صبح ہو گا جب میں اُس سے حقائق معلوم کر چکی ہوں گی۔ اس سے قطع نظر ایک بات اور عرض کروں جو شاید اس وقت آپ بھول رہے ہیں کہ کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا پریس میں آنا ملک کے مفاد میں نہیں ہوتا۔ اندر اندر دائیں اور بائیں بازو کے درمیان ہونے والی سرد جنگ سے متعلق یقیناً کچھ باتیں ایسی ہیں جن کا منظر عام پر آنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہو گا۔ مختصراً اس بات کو یوں سمجھیں کہ پریس میں صرف وہی باتیں آئیں گی جو عبدالحمید خاں کے سیاسی مستقبل کو تباہ کر سکیں، اُسے ایک کرپٹ آدمی نہ سہی تو سازشی اور جرائم پیشہ ضرور ثابت کر سکیں۔ میرا قیاس ہے کہ ایسا ممکن ہے۔ وہ شخص......“ اسی وقت میں نے ملازمہ کو ٹرالی دھکیلتے ہوئے ڈرائنگ رُوم میں آتے دیکھا اور چپ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ملازمہ چلی گئی اور میں چائے کی چسکیاں لینے لگی تو دوبارہ اپنی بات شروع کی۔ ”وہ شخص کتنا بھی عیار سہی، اب یہ ممکن نہیں کہ مزید بچ سکے۔“ میرا اشارہ عبدالحمید

خاں کی طرف تھا۔

چائے پینے کے بعد میں مزید نہیں بیٹھی۔ میں نے روانگی سے قبل صبح چھ بجے آنے کے لئے کہا تھا۔

”اتنی صبح ہی صبح اُٹھ جاؤ گی تم؟“ سمیع اللہ نے مجھے رُخصت کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ہاں کیوں نہیں؟“ میں نے مسکرا کر جواب دیا اور پھر گیٹ سے نکلتے ہوئے بولی۔ ”خدا حافظ، شب بخیر!“

”خدا حافظ!“ سمیع اللہ نے جواباً کہا اور پھر اُس وقت تک گیٹ کے باہر کھڑا رہا جب تک میں اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ نہ ہو گئی۔

اپنی کوٹھی پہنچتے ہی میں نے کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کیا۔

”جی فرمائیے!“ دوسری جانب سے کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔

”ممکن ہے عبدالحمید خاں، نرجس کو قتل کرانے کی کوشش کرے۔“ میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے اس سلسلے میں؟“

”اس امکان کو بہرحال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“ اُس نے محتاط الفاظ میں جواب دیا۔

”تو ظاہر ہے، ایسی صورت میں کیا قدم اُٹھانا چاہئے؟“ میں بولی، پھر واضح الفاظ میں اُس سے کہا۔ ”فوری طور پر اردگرد کے سارے علاقے میں چپے چپے پر تمہارے آدمی ہونے چاہئیں۔ میں چاہتی ہوں کہ سمیع اللہ کی کوٹھی تک آج رات کوئی چڑیا کا بچہ بھی نہ پہنچ سکے۔ ممکن ہے کل صبح تک یہ صورت حال بدل جائے۔“

”یقیناً ایسا ہی ہو گا۔“ کمانڈر نواز نے مجھے مضبوط لہجے میں یقین دلایا۔ ”میں ابھی احکام جاری کر دیتا ہوں۔“

”اگر مزید آدمیوں کی ضرورت ہو تو تم میری کوٹھی کی حفاظت کرنے والوں کو بھی یہاں سے ہٹا سکتے ہو۔“ میں نے اُسے مشورہ دیا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ وہ بولا۔

پھر میں نے مختصراً اُسے اپنی تازہ کارکردگی سے آگاہ کر کے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ میری غیر موجودگی میں کسی نے مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں بھی اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ملک دلاور سے فون پر میری گفتگو نہیں ہو سکی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اب تک وہ سو جاتا ہے۔ مجھے شرارت سوجھی کہ اُسے جگایا جائے۔ ویسے بھی مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر میں نے اُس کا نمبر ملایا تو دیر تک گھنٹی بجتی رہی، پھر کسی نے ریسیور اُٹھا ہی لیا۔

”جی جناب!“ دوسری جانب سے نیند میں ڈوبی ہوئی سی آواز آئی۔ یہ ملک دلاور کے بوڑھے ملازم کی آواز تھی۔

”میں عذرا بول رہی ہوں۔ کیا تمہارے صاحب سو گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ابھی کوئی پون گھنٹہ ہوا ہے۔ فون اُنہوں نے باہر رکھوا دیا تھا۔ جی لیں؟“

”اُنہیں جگا دو! مجھے ضروری بات کرنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”بہتر ہے جی۔“ ملازم نے کہا۔ ”آپ ذرا انتظار کیجئے!“

''ٹھیک ہے۔ میں ہولڈ کیے ہوئے ہوں۔'' میں بولی۔

پھر کوئی دو تین منٹ انتظار کے بعد مجھے ملک دلاور کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!......کون بول رہا ہے؟''

''تم ابھی تک شاید سو رہے ہو۔ جاگ جاؤ چندا کہ یہ شرفا کے سونے کا وقت نہیں ہے۔ کیا تمہارے ملازم نے نہیں بتایا کہ کون بات کرے گا؟''

''اچھا تو حضور ہیں!...... جی ارشاد، کیا حکم ہے رات کے ساڑھے بارہ بجے؟''

''مجھے تو کچھ بھی نہیں کہنا تھا تم سے۔'' میں نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ دراصل اُس وقت میری چشم تصور میں ملک دلاور کا جھنجلایا ہوا چہرہ گھوم رہا تھا۔ ''میں کوٹھی پہنچی تو معلوم ہوا تم نے فون کیا تھا۔ سوچا معلوم کرلوں، کیا بات ہے۔''

''مگر اس بات کو تو کئی سال ہو گئے۔ آپ کو بڑی جلدی اس خاکسار سے گفتگو کا خیال آ گیا۔'' اُس کے لہجے سے جھنجلاہٹ کا اظہار ہو رہا تھا اور میں لطف اندوز ہو رہی تھی۔

میں نے بھی دانستہ قدرے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا، مقصد صرف یہ تھا کہ اُس کی رگِ شرارت پھڑکنے لگے اور میں لطف لے سکوں۔ میں بولی۔ ''دیکھو دلاور! میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ جو بات تمہیں کرنا ہے جلدی کرو!''

میری توقع کے مطابق وہ فوراً ہی گھاٹ پر آ گیا، کہنے لگا۔ ''آپ کا وقت ہی نہیں خود آپ بھی قیمتی ہیں۔ معاف کیجیے غلطی سے بڑے کاف والا لفظ بول گیا۔''

''آخر تمہیں کہنا کیا تھا مجھ سے؟'' میرے لہجے میں بدستور مصنوعی جھنجلاہٹ تھی۔

''کہنا تو جانے کیا کیا ہے آپ سے۔ مگر بقول شاعر، کچھ بھی نہ کہا جاتا، والا مسئلہ ہے۔ اب اگر آپ نے مجھے اور میرے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر ہی دیا ہے تو پھر اتنی جلدی بھی نہ کریں نا!''

''اور اگر میں سلسلہ منقطع کر دوں تو؟''

''یہ آپ کے بس میں نہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''آپ کے اور میرے درمیان دراصل ایسا سلسلہ ہے جو ٹوٹ ہی نہیں سکتا کسی طرح۔''

''منقطع کہتے ہوئے حلق دُکھ رہا ہے تمہارا شاید۔''

''بس یہی سمجھ لیجیے!...... اچھا خیر چھوڑیں، یہ بتائیں کہ آپ ہر وقت اتنی پراسرار بننے کی کوشش کیوں کرتی رہتی ہیں؟'' وہ بولا۔

''یعنی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ اب تک مجھے آپ نے نرگس کا کوئی ہور چھور نہیں دیا۔ آخر وہ ہے کہاں؟''

''جہاں بھی ہے امن چین سے ہے۔ تم کیوں اُس کے غم میں گھل گھل کر اپنی صحت برباد کر رہے ہو؟''

''اُس کے غم میں کیوں، میں تو آپ کے غم میں اپنی صحت تباہ کر رہا ہوں۔ مگر آپ بڑی کٹھور ہیں! کچھ خیال ہی نہیں ہم سے دل جلوں کا...... کبھی تو نظرِ کرم ہو جائے! یقین مانیں دل سے دُعا ہی دُعا نکلے گی آپ کے لئے۔''

''اور اب کیا بددُعا نکلتی ہے؟'' میں ہنس کر بولی۔

''آپ ہنستی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے......''

''کوئی نئی تشبیہ دینا، گھنٹیاں سی نہ بجانے لگنا!'' میں نے اُس کی بات کاٹ کر فقرہ چست کیا۔

''گھنٹیاں تو گھنٹیاں ہم نے تو گھنٹے تک بجا دیئے مگر آپ کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی۔ آہ! کتنی ظالم ہیں آپ۔''

''کھسکومت ورنہ میں واقعی فون بند کر دوں گی۔''

''بس یہی آتا ہے آپ کو!...... جادوگرسیاں چھوڑ میری بہیاں اب گھر جانے دے۔''

ملک دلاور نے کچھ ایسے لہجے میں ''فلمی گیت'' کے بول دُہرائے کہ بے ساختہ میری ہنسی چھوٹ گئی اور میں نے واقعی رابطہ منقطع کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ مجھے ستانے پر آمادہ ہے اس لئے ٹیلیفون کا ریسیور میں نے کریڈل پر نہیں رکھا تاکہ وہ دوبارہ فون کرے تو بس تلملا کر رہ جائے۔

صبح ہونے میں ابھی چار پانچ گھنٹے باقی تھے۔ میں نے سوچا کچھ دیر سو لوں۔ صبح چھ بجے مجھے سمیع اللہ کے ہاں پہنچنا تھا اس لئے ٹائم پیس میں پانچ بجے صبح کا الارم لگا کر اُسے اپنی مسہری کے سرہانے رکھ لیا۔ لباس تبدیل کر کے بستر پر دراز ہونے سے پہلے میں نے ٹیلی فون کا ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا تھا۔ رات کے کسی بھی حصے میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے کوئی بھی ایمرجنسی کال آ سکتی تھی۔ صورت حال ابھی زیادہ بدلی نہیں تھی۔ کسی بھی وقت غیر متوقع طور پر کوئی بھی ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

پانچ بجے صبح جاگنے کے بعد مجھے ہلکا سا ناشتہ کرنے اور تیار ہونے میں مشکل سے آدھا گھنٹہ لگا۔ چلتے چلتے میں نے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے فون پر بات کی کہ اطمینان ہو سکے۔ رات کو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ کمانڈر نواز نے رپورٹ دی کہ سمیع اللہ کی کوٹھی کے آس پاس کسی بھی مشتبہ شخص کو نہیں دیکھا گیا اور نہ کسی نے کوٹھی میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ مجھے اس رپورٹ پر حیرت ہوئی، مگر کمانڈر نواز سے اس کا اظہار نہیں کیا اور فون بند کر کے اپنے کمرے سے نکل آئی۔

اپنی کار میں سوسائٹی کی طرف جاتے ہوئے میں یہی سوچ رہی تھی کہ عبدالحمید خاں کیوں خاموش ہے؟ یہ واقعہ ایسا تو نہیں کہ وہ غافل ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے اور وہ سبب مجھے نرجس سے گفتگو کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے غیر ارادی طور پر کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔

چھ بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے کہ میری کار سمیع اللہ کی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ کر رُک گئی۔ میں نے سیل کے کارکنوں کو مستعد و چوکنا محسوس کر لیا تھا۔ اُنہوں نے یقیناً مجھے پہچان لیا تھا ورنہ اتنی آسانی سے سمیع اللہ کی کوٹھی میں داخل نہ ہونے دیتے۔

سمیع اللہ بھی اُس وقت تک جاگ چکا تھا۔ اس سے بات کر کے معلوم ہوا کہ وہ رات کو بمشکل ایک ڈیڑھ گھنٹے سویا ہے اور اس دوران میں بھی اُس کا بیٹا انجم جاگتا رہا ہے۔ نرجس کو ابھی نہیں جگایا گیا تھا۔ میرے ایما پر تو سمیع اللہ مجھے لے کر اُس کے کمرے میں آ گیا۔

''اب آپ باہر جائیں اور مجھے اندر سے دروازہ بند کر لینے دیں۔ میں خود نرجس کو جگا لوں گی۔'' میں نے

سمیع اللہ سے کہا۔

سمیع اللہ کے چہرے پر لمحہ بھر کو اُلجھن کے آثار نظر آئے، پھر وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اُس کے باہر نکلتے ہی میں نے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ صنفِ نازک ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا۔ اگر اس وقت میری جگہ کوئی نوجوان یا کسی بھی عمر کا مرد ہوتا تو شاید سمیع اللہ اُسے اپنی بیٹی کے کمرے میں اس طرح چھوڑ کر نہ چلا جاتا۔

دروازہ بند کر کے میں مُڑی اور بائیں جانب مسہری پر محوِ خواب اُس لڑکی کو دیکھا جس کی حفاظت کی خاطر میرے سیل کے متعدد افراد نے آنکھوں میں رات کاٹ دی تھی۔ وہ کروٹ لئے اور اپنے ایک رخسار کے نیچے ہاتھ رکھے بہت سکون سے سو رہی تھی۔ چہرے پر فطری بھولپن تھا۔ بالوں کی ایک لٹ اُس کے گلابی رُخسار پر پڑ رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر مسہری پر بیٹھ گئی۔ اس وقت مجھے اس مظلوم لڑکی پر بہت محبت آ رہی تھی جو یقیناً عبدالحمید خاں ایسے شیطان کی شیطنیت کا شکار ہو چکی تھی۔ میں نے محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر آہستگی سے شانہ ہلایا۔

اُسے پوری طرح بیدار کرنے میں مجھے کئی منٹ لگ گئے کیونکہ رات کو سکون آور انجکشن دیا گیا تھا۔ مجھے اپنے گھر کے کمرے میں دیکھ کر کچھ وہ یوں پلکیں جھپکاتی رہی جیسے اپنی بصارت پر اُسے شبہ ہو۔ اس کے باوجود اُس کے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مجھے پہچان چکی ہے۔ میں مسکرا کر اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اب وہ مسہری پر اُٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

''آپ!.....آپ!.....'' بالآخر مہرِ سکوت ٹوٹی۔

''ہاں میں۔'' میں نرمی سے بولی۔ ''تم شاید مجھے پہچان گئی ہو۔''

''جی..... جی ہاں..... میں..... میں آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں! آپ..... آپ بھی تو اُسی..... اُسی کمینے کی قید میں تھیں اور..... اور آپ..... آپ نے ہی مجھے اُس کے ظلم سے بچانے کی کوشش بھی کی تھی مگر..... مگر پھر..... پھر خود آپ.....'' اُسے سب کچھ یاد آتا جا رہا تھا۔ ''مگر آپ..... آپ کس طرح..... اور یہاں میرے گھر..... میرے کمرے میں کس طرح.....''

''میں نہیں چاہتی کہ تمہارا ذہن سوالوں میں اُلجھ جائے۔'' میں سکون کے ساتھ اُس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''مختصراً میں تمہیں اپنے متعلق ضروری باتیں بتا دیتی ہوں تاکہ تمہارا ذہن پُر سکون ہو سکے۔ سنو! میرا معاملہ تمہارے معاملے سے مختلف تھا۔ وہ ایک اور ہی قصہ تھا کہ عبدالحمید خاں نے مجھے کس لئے اغواء کرایا تھا! اس سلسلے میں کچھ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ وقت اور حالات نے ہم دونوں کو یکجا کر دیا تھا۔ اگر مجھے مہلت مل جاتی یا تم اپنے حواس قائم رکھتیں اور میرے کہنے پر واقعی وہاں سے فرار ہو جاتیں تو شاید تم پر وہ نہ گزرتی جو گزری۔ بہرحال میں اُسی رات فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی اور مجھے یہ خیال بھی تھا کہ تم اس کی قید میں ہو۔ وہاں سے فرار ہونے کے بعد میں تمہاری طرف سے غافل نہیں رہی، مگر عبدالحمید خاں نے تمہیں اُس رات کے بعد وہاں نہیں رکھا، کہیں اور منتقل کر دیا۔ میں تمہاری تلاش میں رہی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ مجھے کیونکہ یہ علم تھا کہ تم کسی شخص کی قید میں ہو اس لئے میں تمہارے والد سے ملی۔ یہ کل ہی کی بات ہے۔ میں نے

تمہارے والد کو یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کہاں اور کس حال میں دیکھا تھا! اس سے ظاہر ہے اُنہیں تکلیف پہنچتی۔ ہاں اُن پر یہ ضرور ظاہر کر دیا کہ میں تمہاری ہمدرد ہوں اور چاہتی ہوں کہ تم اپنے گھر پہنچ جاؤ۔ دراصل میرا مقصد یہ تھا کہ تمہارے والد، عبدالحمید خاں کے دباؤ میں نہ آئیں۔ تمہیں علم ہی ہے کہ تمہارے والد ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز ہیں، عبدالحمید خاں اس سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا جو میں کسی صورت نہیں چاہتی تھی۔ مختصر یہ کہ تمہارے والد کو یقین آ گیا کہ میں تمہارے سلسلے میں مخلص ہوں۔ میری بات توجہ سے سنو! میرے بارے میں استفسار پر تم اپنے والد کو یہی بتاؤ گی کہ مجھے پہلے سے جانتی ہو۔ اس کی وجہ یہ کہ اُنہیں وہ رُوح فرسا واقعہ نہ بتانا پڑے جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

نرجس کا گلاب سا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

''بولو نا نرجس! چپ کیوں ہو؟'' میں نے اُسے ٹوکا۔

''اب..... اب کچھ..... کچھ چھپانے کا فائدہ بھی کیا ہے..... کیا فائدہ؟'' اُس کی آواز بھرا گئی۔

''نہیں نرجس!'' میں پُر زور آواز میں بولی۔ ''ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ یہ معاملہ اب بھی سنبھالا جا سکتا ہے۔ تمہاری زندگی، تمہارا مستقبل تباہ ہونے سے بچ سکتا ہے۔''

اُس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ اُبھری، پھر اُس نے کہا۔ ''بچایا اُسے جاتا ہے جو تباہ نہ کیا جا چکا ہو! آپ..... آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔''

''سمجھ جاؤ گی بے بی!'' میں نے طویل سانس لے کر محبت سے کہا، پھر بولی۔ ''تم اگر مجھ پر یہ بھروسہ کر سکو کہ میں تم سے واقعی مخلص ہوں تو اپنی ذمہ داری مجھے سونپ دو۔''

''میں جانتی ہوں..... آپ کو اچھی طرح جان چکی ہوں کہ آپ کے سینے میں ایک دردمند دل ہے ورنہ..... ورنہ آپ کو کیا پڑی تھی کہ میری خاطر اُس ذلیل شخص سے بھڑ جاتیں! مجھ سے زیادہ آپ کے خلوص کو اور کون سمجھ سکتا ہے؟ میں نے تو..... میں تو.....'' اُس کی آواز ایک بار پھر بھرانے لگی۔ پھر میں نے اُس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں موتی چمکتے دیکھے۔

''نرجس! میں تمہارا دُکھ سمجھتی ہوں۔ مجھے علم ہے بے بی کہ اس کم عمری میں تم کس تلخ تجربے سے گزر چکی ہو! بھول جاؤ سارا ملال، سارا غم! اور صرف اتنی بات ذہن میں رکھو کہ اپنی عزت و آبرو گنوانے کی تشہیر کئے بغیر اُس شخص سے انتقام لینا ہے جس نے تمہارے جسم ہی کو نہیں، تمہاری رُوح کو بھی زخم زخم کر دیا ہے۔ وہ تمہارا ہی نہیں، میرا بھی دشمن ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جس طرح اُس نے تمہیں برباد کیا ہے، خود بھی برباد ہو جائے! اُس کا کریہہ چہرہ میں بے نقاب کروں گی، مگر اس کے لئے تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' میں دانستہ پُر جوش لہجے میں بول رہی تھی تاکہ اُس پر میری بات کا اثر ہو۔

میری توقع رائیگاں نہیں گئی۔ نرجس بھی پُر جوش آواز میں بولی۔ ''میں..... میں آپ کے ساتھ ہوں! اور..... اور وہی..... وہی کروں گی جو آپ کہیں گی۔ میں..... میں اُس رذیل شخص سے اپنی بے بسی کا انتقام لینا چاہتی ہوں، چاہے اس کے لئے مجھے کچھ..... کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جوشِ جذبات میں میرے قریب آ گئی۔

میں نے اُس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا اور وہ سسکیاں لینے لگی۔ میں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر جب اُس کے دل کا غبار آنسوؤں میں بہہ گیا تو میں نے بڑی محبت سے اُس کے آنسو پونچھ دیئے اور بولی۔ ''میرا نام عذرا خان ہے۔ تم مجھے عذرا باجی کہہ سکتی ہو۔ اس ناتے تم مجھے بڑی بہن سمجھتے ہوئے پہلے مختصراً اُن حالات سے آگاہ کرو جو تمہاری تباہی کا سبب بنے ہیں، پھر یہ بھی بتا دو کہ تم پر قید کے دوران میں کیا گزری؟ اور یہ بھی کہ تم کس طرح اُس کی قید سے نکلنے میں کامیاب ہوئیں؟ یہ سب کچھ جاننے کے بعد ہی میں کوئی لائحۂ عمل مرتب کر سکوں گی کہ کیا راہ اختیار کرنا چاہئے؟ اور ہاں اپنے والدین کی جانب سے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کہ اُنہیں تم کیا بتاؤ گی۔ یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ وہ تم سے اب کچھ نہیں پوچھیں گے۔''

''عذرا باجی!'' نرجس کے لہجے میں بلا کی محبت تھی۔ ''آپ...... آپ کتنی اچھی ہیں!''

اُس لمحے واقعی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نرجس نہ ہو، یقیناً میری چھوٹی بہن ذکیہ ہو۔ ذکیہ اُن دنوں مصر میں تھی۔ وہ بالکل اسی لب و لہجے میں مجھے ''عذرا باجی'' کہتی تھی۔ چند لمحوں میں خاموش رہی، اور پھر جیسے لمحہ موجود میں واپس آ گئی۔ نرجس کو میں اپنے اعتماد میں لے چکی تھی اور اب میرے لئے عبدالحمید خاں کے گرد پھندا مضبوط کرنا بہت آسان تھا۔ نرجس نے میرے ذرا سے اشارے پر اوّل تا آخر سب کچھ بتا دیا۔ میرے ایما پر نرجس نے اُس نوجوان کا ذکر کیا جس نے عبدالحمید خاں کے کہنے پر نرجس سے رسم و راہ بڑھائی تھی۔ میرا اندازہ حالات کے پیش نظر واقعی درست ثابت ہوا تھا۔

اُس نوجوان کا نام ارشد تھا جس نے نرجس پر ڈورے ڈالے تھے۔ نرجس عموماً گھر سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اُس کے ساتھ تفریحی مقامات پر گھومتی پھرتی تھی۔ تقریباً تین ماہ میں اُس نوجوان نے نرس کو اس حد تک پرچا لیا تھا کہ وہ اس نوجوان سے شادی کرنے پر بھی آمادہ ہو گئی تھی۔ اغوا والے دن سے ایک روز پہلے اُس نوجوان نے نرجس کو یہ جھانسا دیا تھا کہ میں خفیہ طور پر اپنے چند دوستوں کی موجودگی میں تم سے نکاح پڑھوا لیتا ہوں تاکہ تمہارے والد پھر انکار نہ کر سکیں۔ بھولی بھالی نرجس اُس کی باتوں میں آ گئی۔ طے یہ ہوا کہ تمام انتظامات کر کے وہ نوجوان وقت مقررہ پر کالج پہنچ جائے گا اور پھر نرجس کو لے کر وہاں جائے گا جہاں پہلے ہی سے قاضی اور اُس کے دوست جمع ہوں گے۔ پھر یہی ہوا۔ وہ نوجوان وقت پر آ گیا اور نرجس راضی بہ رضا اُس کی کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ وہ نوجوان، نرجس کو ساتھ لئے لی مارکیٹ والی عمارت میں پہنچا جہاں عبدالحمید خاں پہلے سے موجود تھا۔ نوجوان نے نرجس سے اس کا تعارف کرایا کہ یہ میرے بزرگ ہیں۔ نرجس، عبدالحمید خاں کو پہچانتی تھی کیونکہ آئے دن اس کی تصویریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ وہ نوجوان راشد، نرجس سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ اب تک قاضی صاحب کو پہنچ جانا چاہئے تھا اور میرے دوستوں کو بھی! بہرحال تم یہاں اطمینان سے انکل کے پاس بیٹھو، میں ابھی ان لوگوں کو لے کر آتا ہوں۔ عبدالحمید خاں یوں بھی معروف آدمی تھا اور عمر میں بھی خاصا بڑا۔ اس کے علاوہ وہ سنجیدہ اور بردبار بھی دکھائی دیتا تھا۔ اس لئے نرجس مزید مطمئن ہو گئی۔ راشد پہلے بھی اُسے بتا چکا تھا کہ عبدالحمید خاں میرے انکل ہیں اور وہ اس رشتے کے حق میں ہیں۔ نرجس اسی لئے بہت اطمینان و سکون کے ساتھ وہاں بیٹھی رہی۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اُس کا ''عاشق صادق'' اب پلٹ کر نہیں آئے گا اور یہ کہ کچھ ہی دیر بعد عبدالحمید خاں اپنی جگہ سے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دے گا!

پھر جب نرجس پر حقیقت کھلی تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ اُس پر ایسا جنون طاری ہوا کہ کسی طرح عبدالحمید خاں کے قابو میں نہ آئی۔ مجبوراً اس وقت عبدالحمید خاں اُسے کمرے میں بند کر کے چلا گیا اور پھر رات کو لوٹا۔ نرجس کے منہ میں وہ کپڑا ٹھونس گیا تھا اور اُس کے ہاتھ پیر بھی باندھ گیا تھا۔ رات کو پھر وہی سب کچھ ہوا اور کسی طرح نرجس، عبدالحمید خاں کو دھکا دے کر کمرے سے چیختی ہوئی نکل بھاگی۔ عبدالحمید خاں اُٹھ کر پھر اُس کے پیچھے بھاگا۔ نرجس بھاگتی ہوئی بیرونی دروازے تک پہنچی تو اُسے مقفل پایا۔ پھر وہ عبدالحمید خاں کی دسترس سے بچنے کے لئے چیختی چلاتی اُس کمرے میں گھس آئی جہاں میں اور ہی حالات سے نبرد آزما تھی۔ پھر جب میں انجکشن کے زیرِ اثر آ گئی اور مجھے غیر ملکی اُس عمارت سے لے کر چلے گئے تو عبدالحمید خاں طیش میں آ گیا۔ اُس نے نرجس کو بڑی بے رحمی سے زدوکوب کیا۔ پھر اُس رات نرجس بہت چیخی چلائی، بہت روئی اور گڑگڑائی مگر ایک ''پتھر'' نہ پگھلا۔ عبدالحمید خاں جیسے بہرا ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھوں پٹنے کا انتقام اُس ظالم نے نرجس سے لیا تھا۔ ساری رات نرجس کے جسم و جاں پر وہ عذاب گزرا جو پہلے کبھی نہ گزرا تھا، یہاں تک کہ وہ ظلم سہتے سہتے بیہوش ہو گئی۔

نرجس کو ہوش آیا تو اُس نے خود کو ایک اجنبی جگہ دیکھا۔ یہ لی مارکیٹ والی [illegible]ارت نہیں بلکہ کوئی نو تعمیر مکان تھا جس کے ایک کمرے میں وہ بند تھی۔ دیواروں پر تازہ کیا ہوا پلاسٹر نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں ایک کھڑکی بھی تھی جسے کھولا تو جا سکتا تھا مگر اس کے راستے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ کھڑکی میں باہر کے رُخ لوہے کا مضبوط جال لگا ہوا تھا اُسے توڑنا کم از کم نرجس کے بس میں تو نہیں تھا۔ کھڑکی سے کچھ فاصلے پر گھنے پیڑ نظر آ رہے تھے۔ ہوا کی تیز سرسراہٹ کے سوا وہاں کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نرجس نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی زیرِ تعمیر علاقہ ہے جہاں شاید ابھی زیادہ آبادی نہیں ہوئی۔ جس کمرے میں نرجس بند تھی وہ عمارت کا کوئی عقبی کمرا لگتا تھا۔ کمرے میں دن کا اُجالا دیکھ کر وہ پہلے ہی سمجھ چکی تھی کہ رات گزر چکی ہے، مگر شاید اُس کے لئے ابھی ''رات'' نہیں گزری تھی۔ ابھی تو جانے کتنے ستم باقی تھے اور کتنے اندھیرے اُس کی رُوح میں اُترنے کو بے تاب تھے! وہ اپنی بے بسی پر دیر تک روتی رہی اور پھر اُسی وقت چونکی جب کمرے کا دروازہ کھول کر ایک ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا۔ وہ شخص صورت ہی سے جرائم پیشہ معلوم ہوتا تھا۔ نرجس اُسے دیکھ کر ڈر گئی۔ اُس شخص کے تیور اچھے نہیں تھے۔ وہ بڑی حریص نظروں سے نرجس کو دیکھتا رہا۔ نرجس کے لئے وہ کھانا لے کر آیا تھا۔ اُسے نے بڑی کرخت آواز میں نرجس سے کھانا کھانے کے لئے کہا اور پھر دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ ایسے میں بھلا کھانا کس کے حلق سے نیچے اُترتا؟ سو نرجس نے کھانے کی طرف دیکھا بھی نہیں اور کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ شخص لوٹ کر آ گیا۔ نرجس کو روتا دیکھ کر اُس شخص کو رحم کی بجائے غصہ آ گیا۔ اُس نے نرجس کو بالوں سے پکڑ کر چارپائی سے اُٹھا لیا اور پھر غرا کر بولا کہ میرا نام شیدا ہے۔ اگر تو نے زیادہ نخرا کیا تو کھال اُتار دوں گا۔ چل کھانا کھا! پھر اُس نے اپنے نیفے سے لمبے پھل کا چاقو نکال لیا اور کہنے لگا، اگر کھانا نہیں کھایا تو ٹکڑے کر دوں گا تیرے۔ لرزتی کانپتی نرجس نے اُس شخص شیدے کے خوف سے روتے ہوئے کھانا کھانا شروع کر دیا۔ جب وہ کھانا کھا کر پانی پی چکی تو شیدا اُس کے پاس بیٹھ گیا اور پھر بڑی محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ تو، تو بہت اچھی ہے۔ بس! رومت، میں تجھ سے کچھ نہیں کہوں گا۔ پھر رات ہونے تک شیدا کئی بار اُس کے پاس آیا۔ شام کو اُس نے چائے بھی لا کر پلائی تھی۔ رفتہ رفتہ شیدے کے چہرے کی سختی کم ہوتی جا

رہی تھی۔ وہ رات سوتے جاگتے جیسے تیسے گزر گئی اور دوسرا دن ہوا تو شیدا اُس پر مزید مہربان ہو گیا۔ شیدے کے بدلے ہوئے رویئے کو دیکھ کر نرجس کی ہمت بندھی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے اُس کے سامنے زبان کھولی۔ وہ شیدے سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ بظاہر اس سیدھے سے سوال پر شیدا ایک دم گرم ہو گیا، بولا کہ زیادہ چالاک بنے گی تو مار مار کر سور بنا دُوں گا۔ پھر وہ غصے میں کمرے سے چلا گیا۔ پھر نہ جانے اُسے کیا ہوا کہ خود ہی تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا اور نرجس سے اپنے رویئے کی معافی مانگنے لگا۔ پھر اُس نے نرمی سے نرجس کو سمجھایا کہ میں خاں صاحب کا نمک خوار ہوں اور نمک حرامی نہیں کر سکتا۔ اُنہی کی نظر کرم کی وجہ سے میں جیل کی بجائے باہر ہوں۔ مگر تو بھی اچھی لگتی ہے مجھے۔ ایسی باتیں نہ کیا کر کہ غصہ آ جائے مجھے۔ مجھ سے کچھ پوچھنے پاچھنے کی ضرورت نہیں کہ میں تجھے کچھ نہیں بتاؤں گا! بس جتنے دن خاں صاحب کا حکم ہو گا، میں تجھے اپنے پاس رکھوں گا۔ پھر وہ جو حکم کریں گے مجھے اس پر عمل کرنا پڑے گا۔ شیدے کو نرم دیکھ کر نرجس نے بڑے بھولپن سے سوال کیا کہ اگر عبدالحمید خاں نے یہ حکم دیا کہ تم مجھے قتل کر دو تو کیا ایسا کر سکو گے؟ یہ سوال سن کر شیدا چند لمحے خاموش رہا، پھر کہنے لگا کہ یہ تو نے بڑا مشکل سوال کر دیا۔ اس کا جواب سوچ کر دُوں گا، رات کو۔

اب نرجس یہ اندازہ لگا چکی تھی کہ شیدا بظاہر کتنا ہی سخت سہی اندر سے اُس کے باب میں نرم ہے۔ شیدا رات کو کھانا لے کر آیا تو نرجس نے باتیں کر کے اُس کے اندر کی نرمی کو اور بھی بیدار کر دیا۔ شیدا پگھل گیا۔ پھر اُس نے نرجس کو اپنی دُکھ بھری رودادِ زندگی سنائی اور اپنی ماں کو یاد کر کے رونے لگا۔ وہ بہت محروم اور دُکھی آدمی تھا۔ اُس کی بیوی بھی شادی کے ایک سال بعد ہی غربت و افلاس سے تنگ آ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

اپنے اندر کی نرمی کے باوجود شیدا پوری طرح چوکنا تھا۔ اُس نے نرجس سے بھی صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اگر تو نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا، لیکن گزشتہ رات خود شیدے ہی نے نرجس کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہوا یہ کہ وہ رات کو کھانا لے کر آیا تو بہت اُلجھا اُلجھا سا تھا۔ نرجس نے وجہ پوچھی تو وہ بات ٹال گیا۔ نرجس نے کھانا کھا لیا تو وہ برتن لے کر خاموش خاموش سا واپس چلا گیا۔ ابھی کوئی نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا ہو گا کہ وہ پھر نرجس کے پاس آ گیا۔ اُس کے چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے اور وہ بڑی عجیب سی نظروں سے نرجس کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے دس دس روپے کے دو نوٹ اپنی جیب سے نکال کر نرجس کو دیئے اور بولا، دیکھ! تو اس مکان سے نکل کر ایک گلی میں پہنچے گی۔ اُلٹے ہاتھ پر سیدھی چلنا، دو گلی چھوڑ کر پھر اُلٹے ہاتھ ہی والی گلی میں مُڑ جانا۔ وہاں سے سیدھی تو سڑک پر نکل جائے گی۔ ابھی زیادہ ٹیم نہیں ہوا، ساڑھے نو یا دس بج رہے ہوں گے، نئی کراچی کی بسیں چل رہی ہوں گی ابھی! کسی بھی آنے والی بس میں بیٹھ کر...... بلکہ فوراً بی میں بیٹھ جانا، پھر لالوکھیت اُتر کر جہاں جی چاہے چلی جانا، یہاں سے بس ہی میں بیٹھ کر جانا، سمجھی؟ شیدے کی بات پر نرجس کو یقین نہ آیا۔ وہ حیران سی شیدے کی صورت دیکھنے لگی تو شیدا پھر بولا، اب چل بھی جا! دیکھ کیا رہی ہے مجھے؟ اور سن، یہ لے! یہ کہتے ہوئے شیدے نے نرجس کے ہاتھ میں وہ بھاری ڈنڈا تھما دیا جو وہ عموماً اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ نرجس نے اُس سے ڈنڈا لے لیا تو وہ کہنے لگا، اسے پوری قوت سے میرے سر پر مار دے! چل جلدی کر! نرجس اور بھی حیران ہوئی اور بولی، مگر تم ایسا کیوں کر رہے ہو شیدے؟ میں...... میں تم پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتی۔ شیدے نے کہا، اچھا میں خود اپنا سر پھوڑ لوں گا، تو ٹل یہاں سے! اور سن! خاں صاحب

اپنے کچھ دوستوں کو تجھ سے عیش اُڑانے کے لئے آج رات یہاں پہنچ رہے ہیں اور میں...... مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا! تجھے میں اپنی آنکھوں کے سامنے خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے...... اس لئے......

نرجس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ اسی لمحے شیدا، وہ غنڈہ، عبدالحمید کا پروردہ، وہ برا آدمی نرجس کو فرشتہ معلوم ہوا۔ پھر وہ مزید وہاں نہیں رُکی۔ اُس نے شیدے کی ہدایت پر پورا عمل کیا اور پھر لالوکھیت سے ایک ٹیکسی کر کے سیدھی اپنے گھر پہنچ گئی۔

اپنی رودادِ الم سناتے ہوئے نرجس نے آخر میں کہا۔ ”نہ معلوم بے چارے شیدے پر کیا گزری ہو گی؟“

”ہاں......“ میں بے خیالی میں بولی۔ کیونکہ میرا ذہن کہیں اور ہی تھا۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ ایسی صورت میں عبدالحمید خاں کو گزشتہ رات ہی نرجس کے فرار ہونے کے بارے میں معلوم ہو جانا چاہئے۔ پھر وہ کیوں خاموش بیٹھا رہا؟ اس سوال کا ایک ہی ممکنہ جواب تھا کہ کسی سبب پروگرام بدل گیا ہو۔ گزشتہ شب کسی سبب عبدالحمید خاں کے عیاش دوست فیڈرل بی ایریا کے اُس مکان میں نہ پہنچ سکے ہوں۔

اب تمام صورتِ حال مجھ پر واضح ہو چکی تھی اور میں کوئی بھی عملی قدم اُٹھا سکتی تھی۔ میرا ذہن تیزی کے ساتھ وہ بیان ترتیب دے رہا تھا جو نرجس کو پولیس کے روبرو دینا تھا۔ اور جو عبدالحمید خاں کے گلے کا پھندا بن سکتا تھا۔

”سنو نرجس!“ کچھ دیر بعد میں نے اُسے مخاطب کیا۔

”جی باجی؟“

”تمہیں اپنے اغوا کے سلسلے میں پولیس کے سامنے جو بیان دینا ہے، اُسے اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھا لو! یہی کہانی تمہیں اپنے گھر والوں کو بھی سنانی ہے اگر وہ تم سے استفسار کریں۔ اس طرح تمہاری عزت پر بھی کوئی حرف نہیں آئے گا اور عبدالحمید خاں بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔ میرا تو خیال ہے، جو بیان میں نے سوچا ہے، اگر پریس میں بھی آ جائے تو کوئی حرج نہیں۔“ نرجس پوری توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد میں اُس سے پھر مخاطب ہوئی۔ ”سنو! راشد سے تمہاری واجبی سی علیک سلیک تھی، مگر اتنی ضرور کہ تم اُس پر فریب دہی کا شبہ نہیں کر سکتی تھیں۔ جس دن تمہیں اغوا کیا گیا، راشد اپنی کار لے کر تمہارے کالج کے گیٹ پر آ گیا۔ اُس نے تم سے کوئی ضروری بات کرنے کو کہا۔ کالج کے سامنے کار کھڑی کر کے کسی لڑکی سے بات کرنا ذرا معیوب سی بات تھی اسی لئے تم اُس کے کہنے پر کار میں بیٹھ گئیں۔ تمہیں یقین تھا کہ وہ کچھ دُور کار لے جا کر روک دے گا اور پھر تم سے ضروری بات کر کے دوبارہ تمہیں کالج کے گیٹ پر چھوڑ دے گا جہاں تم اپنے گھر سے آنے والی کار کا انتظار کر رہی تھیں، مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس پر تم نے استفسار کیا تو اُس نے تمہارے منہ پر رُومال رکھ دیا جس میں بے ہوشی کی دوا تھی۔ ہوش آنے پر تم نے خود کو ایک پرانی سی عمارت میں دیکھا جہاں عبدالحمید خاں پہلے سے موجود تھا۔ راشد کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ عبدالحمید خاں نے تم پر دست درازی کرنا چاہی، مگر تمہاری مزاحمت کے سبب اُس وقت چلا گیا۔ پھر وہ رات کو آیا اور دوبارہ وہی کوشش کی۔ نتیجتاً وہ تمہارے ہاتھوں زخمی ہو گیا۔ جواباً شدید غصے میں اُس نے تمہیں اتنا زدوکوب کیا کہ تم ہوش کھو بیٹھیں۔ پھر تمہیں فیڈرل بی ایریا کے ایک مکان میں ہوش آیا۔ وہاں اوّل تا آخر جو کچھ تم پر گزری، مکمل طور پر بیان کر سکتی ہوں، یہاں تک کہ شیدے نے تمہیں کیوں وہاں سے خود ہی فرار کا موقع دیا۔ اپنے پورے بیان میں تمہیں کہیں بھی یہ ظاہر نہیں کرنا

بلکہ اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ عبدالحمید خاں کوشش کے باوجود اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ سمجھ رہی ہو نا؟'' یہ کہہ کر میں نے اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''سب کچھ سمجھ گئی میں۔ لیکن...... لیکن شیدے......'' وہ جو کہنا چاہتی تھی کہہ نہ سکی۔

''تم غالباً یہ سوچ رہی ہو کہ عبدالحمید خاں اس قصور پر شیدے غریب کو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اس نے جان بوجھ کر تمہیں فرار کرایا۔ یہی بات ہے نا؟''

''جج...... جی ہاں باجی!''

''بہت بھولی ہو تم۔'' میں تلخ انداز میں مسکرائی۔ ''سنو! تم اپنے بیان میں یہ ذکر نہ کرو کہ شیدے نے تمہیں فرار کا موقع دیا تھا پھر بھی عبدالحمید خاں جیسا عیار شخص معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ وہ شیدے کو معاف نہیں کرے گا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے، شیدے کو بھی خطرے کا احساس ہو جائے اور وہ بھی راہِ فرار اختیار کر لے۔ بہر حال بقول تمہارے واقعی وہ بڑا آدمی، فرشتہ ہی کہلائے جانے کا مستحق ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ کا اگر یہ خیال ہے تو...... تو میں یہی بیان دے دُوں گی۔ شیدے کا اللہ مالک ہے۔''

''یہ ضروری ہے بے بی!'' میں بولی۔ ''ورنہ اس کا کیا جواز دو گی کہ تم وہاں سے فرار ہونے میں کیسے کامیاب ہو گئیں؟ غالباً اب کوئی ایسی بات نہیں رہی جو تمہیں سمجھانا ہو۔ تم ایک بار میرے سامنے وہ بیان دُہراؤ جو میں نے ابھی تمہیں سمجھایا ہے تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے۔ پھر مجھے تمہارے والد صاحب سے بھی بات کرنی ہے۔ ایسا کروں گی کہ میں خود ہی اُنہیں یہ سب کچھ بتا دُوں گی تاکہ تمہیں شرمندگی کا سامنا نہ ہو۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا باجی!'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔ یوں بھی وہ غنچۂ نو شگفتہ ہی تھی۔

پھر اُس نے بیان دُہرایا۔ ایک جگہ وہ گڑبڑائی کیونکہ حقیقت بیان کے برعکس تھی۔ میں نے اُسے ٹوکا اور پھر جب پورا بیان ازبر ہو گیا تو مجھے اطمینان ہوا۔

''اچھا نرجس! تمہارے ابو بہت دیر سے میرے منتظر ہوں گے۔ اب کچھ دیر اُن کے پاس بیٹھ کر چلوں گی۔''

''تو...... تو آپ اُن سے مل کر چلی ہی جائیں گی؟'' اُس کے لہجے میں محبت آمیز شکایت تھی۔

''ہاں ہاں، کیوں؟''

''نہیں!...... آپ میرے ساتھ ناشتہ کر کے جائیں گی ہاں!''

''تم تو کچھ دیر میں ایک دم بھلی چنگی ہو گئیں!'' میں ہنس کر بولی۔ ''اچھا اتنے میں تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں، تم منہ ہاتھ دھو لو اور ہاں ذہن سے ہر مسئلے کو بالکل جھٹک دو! تم بڑی پیاری سی گڑیا ہو اور یہ عمر تمہارے ہنسنے کی ہے، رونے دھونے کی نہیں۔ اچھا اب تم خود ہی اُٹھ کر چٹخنی کھول دو اور اپنے ابو سے کہہ دو کہ وہ ڈرائنگ رُوم میں آ جائیں، ہاں پہلے مجھے وہاں پہنچا دو۔'' یہ کہتے ہی میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

نرجس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور میں ڈرائنگ رُوم میں آ گئی۔ سمیع اللہ فوراً ہی آ گیا اور مضطرب لہجے میں کہنے لگا: ''تم نے بڑی دیر کر دی!...... کیا رہا؟...... ویسے نرجس کے چہرے سے اب کافی اطمینان لگ رہا ہے۔''

''ہاں، سینے کا بوجھ ہلکا ہو جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے سمیع اللہ کو بھی گویا وہی بیان سنا دیا جو

نرجس کو ازبر کرا کے آئی تھی۔

میری توقع کے عین مطابق اُس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''اُس نے تو خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود لی ہے۔ نرجس کا بیان نہ صرف اُس کی سیاسی موت کا سبب ثابت ہو گا بلکہ اُسے جیل کی ہوا کھانے پر بھی مجبور ہونا پڑے گا۔ ایسے معاملات میں حمایتی بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ کہیں اُن کی پوزیشن نہ خراب ہو جائے! پھر یہ بھی تو سوچیں کہ نرجس کا دامن صاف رہا۔'' میں نے اُسے سمجھایا۔

''خدا نے اُس شیدے کے دل میں نیکی ڈال دی۔ ورنہ میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔'' سمیع اللہ بولا۔

اسی وقت انجم ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوا اور کہا۔ ''ناشتہ لگ گیا ہے...... بے بی کہہ رہی ہے کہ آپ انہی کے ساتھ ناشتہ کریں گی۔'' وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں! یہ...... یہ تو اب ہمارے ہی گھر کے فرد کی طرح ہیں۔ سب ساتھ ناشتہ کریں گے۔'' سمیع اللہ نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''چلو عذرا!''

میں سمیع اللہ کے ساتھ اندر کمرے میں پہنچ گئی۔ پہلی بار نرجس کی والدہ سے تعارف ہوا۔ بڑی بی کے چہرے پر اب تک غم و فکر کی پرچھائیاں تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے شوہر سے گفتگو کے بعد اُس کے چہرے سے بھی رنج و غم کے سائے چھٹ جائیں گے۔ نرجس کسی کھِلے ہوئے گلاب کی طرح مہک رہی تھی۔ اُس نے لباس بھی تبدیل کر لیا تھا اور کوئی عمدہ سا سینٹ بھی لگایا تھا۔ ہلکے سے میک اپ نے جیسے اُس کی شخصیت ہی بدل دی تھی۔ نرجس کو یوں تر و تازہ دیکھ کر جانے کیوں فراق گورکھپوری کا ایک شعر میرے ذہن میں گونجنے لگا۔

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے شباب کی دوشیزگی نکھر آئی

میں سوچنے لگی، کچھ بھی ہو، مرد کا لمس عورت کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ کوئی خواب سا میری آنکھوں میں جاگ اُٹھا۔ کسی یاد کا سایہ سا تپاں تپاں رگِ جاں سے قریب محسوس ہوا اور میں جانے کہاں کھو گئی!

''باجی! یہ لیں نا سویٹ!'' نرجس کی آواز مجھے جیسے کہیں دُور سے آتی سنائی دی۔ اور پھر کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جیسے میں جاگ اُٹھی۔

''ہاں...... ہاں، ٹھیک ہے...... بس!'' نرجس نے اپنے ہاتھ سے میری پلیٹ میں ''شاہی ٹکڑا'' ڈال دیا اور میں منع کرنے لگی۔

ناشتے کے بعد خلوت میں سمیع اللہ سے میری مزید گفتگو ہوئی۔ وہ خود بھی سورس فُل آدمی تھا۔ پھر یہ کہ کیس اتنا مضبوط تھا کہ عبدالحمید خاں بچ نہیں سکتا تھا۔ اب پولیس کو نرجس کی بازیابی سے مطلع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ سمیع اللہ کو اب میری مدد کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود سارا معاملہ سنبھال لیتا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے طور پر بھی اس سلسلے میں پیش بندی کا فیصلہ کیا تاکہ کوئی امکان نہ رہے کہ عبدالحمید خاں غوطہ دے کر نکل جائے۔ میں نے سمیع اللہ سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اس سے چلتے چلتے میں نے صرف اتنا کہا۔ ''کچھ دن آپ نرجس کو کالج نہ بھیجیں، یہ میں کسی خوف کی وجہ سے نہیں، احتیاطاً کہہ رہی ہوں۔''

"میں سمجھتا ہوں۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تمہارا مشورہ بہتر اور قابلِ قبول ہے۔"

پھر جب میں ڈرائنگ رُوم سے نکل رہی تھی تو نرجس نظر آئی۔ وہ شاید میری ہی منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "پھر کب آئیں گی باجی؟"

"آؤں گی جلد ہی!" میں نے اُس کا رُخسار تھپتھپاتے ہوئے محبت سے کہا۔ "تم جاؤ آرام کرو اپنے کمرے میں۔"

"اچھا خدا حافظ!" اُس نے کہا۔

"خدا حافظ!" میں نے جواب دیا اور پھر اُس کی والدہ کو اشارے سے سلام کرتی ہوئی سمیع اللہ کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

رات کو کیونکہ میں پوری نیند نہیں سو سکی تھی اس لئے واپس اپنی کوٹھی پہنچتے ہی میں نے سونے کا فیصلہ کیا۔ مگر اس سے پہلے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر فون کرنا ضروری تھا۔ اس وقت تک صبح کے آٹھ بج چکے تھے۔ کمانڈر نواز ڈیوٹی آف کر کے جا چکا تھا اور اُس کی جگہ عثمانی نے لے لی تھی۔ مجھے فون پر وہی ملا۔

"عثمانی! ظاہر ہے کہ کمانڈر نواز چارج دینے سے پہلے تمہیں آگاہ کر گیا ہوگا۔" میں نے تصدیق طلب انداز میں کہا۔

"جی...... جی ہاں۔" اُس نے جواب دیا۔

"کچھ دیر بعد سمیع اللہ کی کوٹھی پر پولیس پہنچے گی۔ جب پولیس والے رخصت ہو جائیں تو وہاں سیل کے ارکان کی تعداد گھٹا کر صرف چار کر دی جائے۔ میرا خیال ہے کہ پھر سیل کے چار افراد بھی کوٹھی کی حفاظت و نگرانی کے لئے کافی ہوں گے۔" یہ کہہ کر میں نے مختصراً عثمانی کو نئی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

"جی ہاں، نرجس کے بیان کے بعد پھر کوئی مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ اس سے قطع نظر کہ یہ معاملہ اس نوعیت کا ہے کہ پولیس فوری طور پر عبدالحمید خاں کو حراست میں لے لے گی۔ عبدالحمید خاں کی گرفتاری کے بعد نرجس کے لئے زیادہ خطرہ نہیں رہے گا۔" عثمانی میری بات سن کر کہنے لگا۔ یوں گویا اُس نے میرے خیال سے اتفاق کیا تھا۔

"اور کوئی خاص بات؟" میں نے سلسلہ منقطع کرنے سے پہلے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ جواباً بولا۔

"ہاں یاد آیا کیپٹن شاد کی طرف سے کوئی نئی رپورٹ ملی؟" میں نے دریافت کیا۔ کیپٹن شاد، عبدالحمید کی نگرانی کر رہا تھا۔

"صبح جب میں نے کمانڈر نواز سے چارج لیا تھا تو کچھ ہی دیر پہلے کیپٹن شاد نے رپورٹ دی تھی کہ عبدالحمید خاں ابھی تک اپنی کوٹھی میں ہے اور رات کو بھی ڈنر سے واپسی کے بعد وہ کہیں نہیں گیا۔"

"ٹھیک ہے، عبدالحمید خاں پر اُس وقت تک کڑی نظر رکھی جائے جب تک پولیس اُسے آہنی زیور نہ پہنا دے۔" میری آواز میں چبھن تھی۔

"بہتر ہے۔" عثمانی کی آواز آئی۔

معاً مجھے نرگس کا خیال آیا جو آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر ہی میں تھی۔ میں نے پوچھ لیا۔ "نرگس کا اب کیا حال

ہے؟"

"اُس کی حالت پہلے کی نسبت بہت بہتر ہے۔ سیل کے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ کل تک انشاء اللہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔" عثمانی نے بتایا۔

"کیا وہ اس پوزیشن میں ہے کہ گاڑی میں اُسے تھانے لے جا کر بیان دلوایا جا سکے؟" میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں یہ معاملہ بھی نمٹا ہی دیا جائے، اسی لئے یہ سوال کیا تھا۔

"جی ہاں، بالکل۔" عثمانی نے جواب میں کہا۔ "یہاں سے اُسے کار میں لے جایا جا سکتا ہے۔"

"تو پھر اُس کا بیان دلوا ہی دو تھانے بھجوا کر۔" میں بولی، پھر مزید ہدایات دینے لگی۔ "اُسے کسی بند وین میں تھانے بھجوانا، وہ بھی بے حد حفاظت کے ساتھ! یہ نہ بھول جانا کہ وہ سوڈانی مفرور ہے جس نے نرگس کو اغواء کیا تھا۔ اگر تھانے آتے جاتے کوئی گڑبڑ ہو گئی تو میں اس سلسلے میں کوئی معذرت قبول نہیں کروں گی۔ نرگس کے ساتھ مسلح آدمی ہونے چاہئیں جو کسی بھی قسم کی صورتِ حال سے فوری طور پر نمٹ سکیں۔ واپسی میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ تھانے پہنچ کر نرگس کو بہر حال بیان دیتے ہوئے کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ ابھی اُسے سیل کے ہیڈ کوارٹر ہی میں رکھو جب تک میری طرف سے تم لوگوں کو دوسرے احکام نہ مل جائیں۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اُسے کیا بیان دینا ہے۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ آپ کی ہدایات پر پورا عمل کیا جائے گا۔" عثمانی پُرعزم لہجے میں بولا۔ "آپ کو کسی سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

پھر میں نے عثمانی کو "خدا حافظ" کہہ کر دوسرا اہم نمبر ملایا جو فوری طور پر نہیں مل سکا۔ لائن میں کچھ خرابی معلوم ہوتی تھی۔ کچھ دیر کوشش کے بعد بالآخر میں نمبر ملانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ یہ وزیرِ داخلہ کا نمبر تھا۔ اُن سے میں نے مختصراً عبدالحمید خاں کے کرتوت بیان کئے تو وہ حیران رہ گئے۔ وہ عبدالحمید خاں سے واقف تھے۔ پھر میں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ ممکن، ان کے محکمے کے اعلیٰ افسران پر کسی طرف سے دباؤ ڈالا جائے اور عبدالحمید خاں کو قرار واقعی سزا نہ مل سکے۔

"تم بے فکر رہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" اُنہوں نے مجھے یقین دلایا۔ "میں ابھی اس سلسلے میں آئی جی سے براہِ راست بات کر لیتا ہوں اور اُسے ہدایت کئے دیتا ہوں کہ اُسے سیاہ رو شخص کے ساتھ کسی بھی قیمت پر کوئی رعایت نہ کی جائے۔"

میں نے وزیرِ داخلہ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا کہ اُنہوں نے ذاتی طور پر اس معاملے میں اتنی دلچسپی لی اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب میں ہر طرف سے پوری طرح مطمئن تھی اس لئے بہت پُرسکون نیند آئی۔ پھر دوپہر دو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی اور میں سیدھی باتھ رُوم میں گھس گئی۔ نہا کر تازہ دم ہونے کے بعد میں نے سمیع اللہ کا فون نمبر ملایا۔

"ہیلو کون؟" دوسری طرف سے غالباً نرجس کا بھائی انجم بول رہا تھا۔ آواز سے میں نے یہی اندازہ کیا تھا۔

"میں عذرا خان بول رہی ہوں، تم شاید انجم ہو!"

"جی...... جی ہاں۔"

’’تمہارے ڈیڈی ہیں؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’جی!...... وہ ڈرائنگ رُوم میں کچھ مہمانوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ بلاؤں انہیں فون پر؟‘‘

’’ہاں۔ میں ہولڈ کیے ہوئے ہوں۔‘‘

کچھ ہی دیر بعد سمیع اللہ کی آواز سنائی دی۔ ’’ہاں بھئی عذرا بولو۔‘‘

’’کیا رہا؟‘‘ میں نے مختصر سوال کیا۔

’’وہی جو ہم چاہتے تھے۔ وہ خبیث حوالات میں ہے۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ اُس کی ضمانت نہ ہو سکے۔‘‘ سمیع اللہ کا لہجہ پُرجوش تھا۔

’’خیر اُس کی ضمانت تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گی۔ یہ بتائیں پریس سے بھی رجوع کیا آپ نے؟‘‘

’’ہاں۔ صبح میں نے تمہارے جاتے ہی پہلا کام یہی کیا تھا۔ ممکن ہے آج شام ہی کے کسی اخبار میں نرجس کا وہ بیان چھپ جائے جو اُس نے پولیس کو بھی دیا ہے۔ شاید تمہی نے بریف کیا تھا اُسے! بیان میں کہیں جھول نہیں تھا۔ کیوں، میرا اندازہ ٹھیک ہے نا؟‘‘

’’کسی حد تک۔‘‘ میرے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آ گئی۔

’’اچھا اب، کب آ رہی ہو؟‘‘

’’کسی بھی دن آ جاؤں گی۔ نرجس نے تو اب ویسے ہی مجھے اپنی باجی بنا لیا ہے۔‘‘ میرے منہ سے نادانستگی میں یہ بات نکل گئی۔

سمیع اللہ فوراً بول اُٹھا۔ ’’اور پہلے کیا تھیں تم اُس کی؟‘‘

’’محض ایک پُرخلوص دوست۔‘‘ میں نے سنبھل کر بے جھجک کہہ دیا۔

’’یہ خیال رکھنا کہ میں اب اِس نئے رشتے کے سبب تمہیں حکم دینے کا مجاز بھی ہوں۔‘‘ وہ خاصے خوشگوار موڈ میں لگتا تھا۔

’’انشاء اللہ کبھی نافرمان نہیں پائیں گے مجھے۔ آپ کے پاس میرے فون نمبر ہیں، کبھی اور کسی بھی مسئلے میں بلاتکلف یاد کر سکتے ہیں۔‘‘

پھر سمیع اللہ سے مزید چند مکالمات کا تبادلہ ہوا اور میں نے گفتگو ختم کر دی۔ دراصل مجھے عبدالحمید خاں کی گرفتاری کے بارے میں معلوم کرنا تھا اور وہ معلوم ہو چکا تھا۔ یہ معلومات میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے بھی حاصل کر سکتی تھی مگر میں نے سمیع اللہ ہی سے براہِ راست گفتگو کر لینا مناسب سمجھا۔ اس طرح کچھ اور باتیں بھی میرے علم میں آ گئیں، مثلاً پریس کا معاملہ! گویا اب عبدالحمید خاں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جا چکی تھی۔ کل صبح تک شائع ہونے والے اخبارات اُس کے سیاسی مستقبل کو تباہ کر دیں گے، یہ امر میرے لئے انتہائی سکون و تقویت کا سبب تھا۔ ایسا نہیں کہ اس سے میری ٹھن گئی تھی تو میں اُس کی تباہی پر خوش تھی بلکہ میرے نزدیک ایسا گھٹیا ذہن رکھنے والوں کو کوچۂ سیاست کا رُخ ہی نہیں کرنا چاہئے اور اگر وہ اس کوچے میں آ بھی جائیں تو جلد انہیں بے نقاب کر دینا چاہئے۔

اُس روز کے بعد چار پانچ دن سکون سے گزرے۔ حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس مہلت

سے فائدہ اُٹھا کر میں نے اپنی فرم کے کچھ ایسے معاملات بھی نمٹا دیئے جنہیں میں ہی ٹیکل کر سکتی تھی۔ اس دوران میں جرمن سائنس دان شیفرڈ اور شیپرڈ بس ایک دن کے لئے اسلام آباد سے کراچی آئے تھے اور پھر یہاں سے دوسرے ہی روز خیر سگالی کے دورے پر مصر روانہ ہو گئے تھے۔ پاکستان سے اُن کا مصر جانا میرے لئے معنی خیز ضرور تھا مگر تشویش ناک نہیں۔ وہ دونوں مجھے پاکستان سے مصر ہی تو بھیجنے والے تھے جہاں سے کوئی ڈاکٹر رچرڈ اُن کی ڈوریاں ہلا رہا تھا۔ خیر سگالی کے اس دورے کی آڑ میں یقیناً وہ دونوں اُسی سے بالمشافہ ملاقات کے متمنی ہوں گے۔ صدرِ مملکت سے اُن دونوں کی ملاقات کا اصل مقصد اب تک پردۂ راز ہی میں تھا۔ سیل کے ارکان اس سلسلے میں کچھ بھی معلوم نہ کر سکے تھے۔

اسی عرصے میں عبدالحمید خاں کا تیا پانچا ہو گیا تھا۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اُس پر اس بے عزتی و رسوائی کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ دل کا دورہ پڑ گیا۔ شاید اس کی وجہ شدید صدمہ رہا ہو۔ وہ زیرِ علاج تھا۔ اُس کی ضمانت دوسرے ہی دن ہو گئی تھی۔ اب وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح اُسے اپنے علاج کے لئے برطانیہ جانے کی اجازت مل جائے۔ مگر سمیع اللہ اُس کی جان کا لاگو ہو گیا تھا۔ عبدالحمید خاں کو اب تک ملک سے باہر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی کیونکہ اُس پر سنگین نوعیت کا مقدمہ چل رہا تھا۔

جرمن سائنس دانوں اور عبدالحمید خاں کی طرف سے باخبر رہنے کے ساتھ ساتھ میں اُس سوڈانی کو بھی نہیں بھولی تھی جس نے نرگس کو اغوا کیا تھا اور جو مجھے جُل دے کر نکل گیا تھا۔ نرگس اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی۔ میرے ہی ایماء پر اب وہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ سوڈانی کسی طرح سامنے آ جائے۔ نرگس ہر لمحہ سیل کے ارکان کی نظر میں رہتی تھی۔ میری طرف سے اُس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ کھلے عام گھومتی پھرتی تھی۔ میں نے اُسے ان تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا جو مجھے اپنی حیرت انگیز قوتوں کے سبب معلوم ہو گئے تھے۔ اسی کے ساتھ میں نے اُسے اندھیرے میں بھی نہیں رکھا تھا بلکہ صاف بتا دیا تھا کہ اس کے ذریعے عیار سوڈانی پر ہاتھ ڈالنا چاہتی ہوں۔ نرگس کو بھی علم تھا کہ اس کے اِردگرد ہر وقت مسلح افراد کا حلقہ رہتا ہے وہ اسی لئے بڑی آزادی کے ساتھ جہاں چاہتی تھی، آتی جاتی تھی۔ وہ ملک دلاور کی عیادت بھی کر آئی تھی جو اب تیزی سے روبہ صحت تھا۔ نرگس خود بھی اُس سوڈانی کی فکر میں تھی جس نے اُسے انتہائی جسمانی اذیتیں دی تھیں۔ سوڈانی تو فرار ہو گیا تھا اور سزا اُس کے دوست اے آر چودھری کو بھگتنا پڑ رہی تھی۔ اُس کے سارے کس بل نکل گئے تھے۔ پولیس اُسے خوب رگید رہی تھی۔

موجودہ حالات میں میرے لئے صرف ایک ہی بات تشویش ناک تھی کہ اچانک میرے دشمن میری طرف سے غافل کیسے ہو گئے؟ اس خاموشی کے پیچھے کہیں کوئی طوفان تو دبے پاؤں میری جانب نہیں بڑھ رہا تھا؟ اسی خیال کے پیشِ نظر شہریار کی نقل و حرکت سیل کے ارکان سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ میرے ہی حکم پر دن رات اُس کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی۔ غالباً عبدالحمید خاں کی گرفتاری کے بعد وہ پانچواں یا چھٹا دن تھا کہ مجھے سیل کے ارکان کی طرف سے شہریار کے متعلق ایک ایسی خبر ملی جس نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے وہ لمحات یاد آ گئے جب جرمن سائنسدان مجھ پر ایک خطرناک تجربہ کر رہے تھے اور میں شہریار کا ذہن پڑھ رہی تھی۔ شہریار کے بارے میں ملنے والی تازہ خبر اُسی سازش کا شاخسانہ معلوم ہوتی تھی جو اُس کے ذہن میں پرورش پا رہی تھی۔ میں نے اُس دن کا

اخبار ایک بار غور سے پڑھا اور مجھے وہ خبر نظر آ گئی جس کی متلاشی تھی۔ گزشتہ روز ہی صدر مملکت کے قریبی مشیروں میں سے ایک کراچی پہنچا تھا۔ یہ شخص شیخ مجید، شہریار کے مخالف کیمپ کا آدمی تھا۔ تجربے کے دوران میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا، سب یاد آ گیا۔ میں سوچنے لگی کہ کیا شیخ مجید ہی وہ شخص ہے جسے شہریار قتل کرانا چاہتا ہے؟

اُس تجربے سے گزرے مجھے ایک ہفتے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اسی کے دوران میں یہ بات میرے علم میں آئی تھی کہ صدر مملکت کے قریبی مشیروں میں سے دو کو شہریار اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ اُن دنوں مشیروں کا جھکاؤ دنیا کے دوسرے بڑے بلاک کی طرف تھا۔ اُنہی میں سے ایک کراچی آنے والا تھا۔ کراچی کے دوران قیام ہی اُسے ٹھکانے لگا دیا جاتا اور اُس کی موت حادثاتی معلوم ہوتی۔ اس سازش کی بقیہ تفصیلات کا علم مجھے نہیں ہو سکا تھا، وجہ یہ کہ شہریار سے میرا ذہنی رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ سیل کے جیالوں نے ہاتھ آئی لینڈ کی اُس کوٹھی پر دھاوا بول دیا تھا جہاں مجھے اغواء کر کے لے جایا گیا تھا۔ نتیجتاً جرمن سائنس دانوں اور خود شہریار کو وہاں سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی تھی۔

یہ جاننے کے بعد کہ شہریار کے ارادے خطرناک ہیں اور وہ ایک بڑی طاقت کا آلۂ کار بنا ہوا ہے، میں اُس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ عبدالحمید خاں تو میری ایک جھپٹ سہنے کا متحمل نہیں ہوا تھا مگر شہریار بہت تیز تھا اور اُس کے تعلقات کا حلقہ بھی خاصا وسیع تھا۔ پاکستان کی جانب سے وہ کئی وفود کی سربراہی بھی کر چکا تھا جو خیر سگالی کے دورے پر غیر ممالک بھیجے گئے تھے۔ اُسے صدر مملکت کے بھی قریبی افراد میں شمار کیا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں میرے لئے اُس سے براہِ راست پنجہ کرنا بہرحال آسان نہیں تھا۔ میں اس کے باوجود مایوس نہیں تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ میرا اطمینانِ قلب تھا۔ میرا ضمیر صاف تھا اور میں اپنے وطن کے خلاف ہونے والی کسی بھی سازش کے سامنے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

میرا طریقہ کار یہ تھا کہ میں اپنے پھیلائے ہوئے جال کی ڈوریاں آہستہ آہستہ کھینچتی جاتی تھی۔ شکار جب بالکل بے دست و پا ہو جاتا تھا تو میں ایک دم اُسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اُس پر جھپٹ پڑتی تھی۔ عبدالحمید خاں کے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ قدرت بھی اکثر میرا ساتھ دیتی تھی۔ بعض اوقات حالات خود بخود میرے حق میں اُستوار ہوتے چلے جاتے تھے۔

شہریار ابھی تک اسلام آباد نہیں گیا تھا اور کراچی میں ہی تھا۔ عموماً کراچی میں وہ اتنا لمبا اسٹے نہیں کرتا تھا۔ اس مرتبہ کراچی میں اُس کا اتنا طویل قیام بھی محلِ نظر تھا۔ شہریار یا اُس کے دیگر ہم خیال ساتھی کیا چاہتے تھے؟ اس کا اندازہ مجھے کچھ کچھ ضرور تھا۔ یہ معاملہ میرے ملک کی خارجہ پالیسی کے تعین کا تھا۔ دنیا کے دونوں بڑے بلاک اور اُن کے آلۂ کار اس کوشش میں تھے کہ میرے ملک کی خارجہ پالیسی اُن کے حق میں اُستوار ہو اور اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ صدر مملکت کے گرد ایسے افراد ہوں جو اُن کی رائے پر اثر انداز ہو سکیں۔ اس چکر میں لوگ یہ بھول گئے تھے کہ دنیا کے نقشے پر ایک تیسری بڑی طاقت بھی رفتہ رفتہ اُبھر رہی ہے۔ غیر محسوس طور پر اُس تیسری بڑی طاقت سے میرے ملک کے تعلقات بہتر ہوتے جا رہے تھے۔

ذاتی طور پر میرا خیال یہ تھا کہ میرے ملک کی خارجہ پالیسی کسی بھی بڑی طاقت کے زیر اثر نہیں ہونا چاہئے ایک آزاد ملک ہونے کی حیثیت سے میرے ملک کی خارجہ پالیسی بھی آزاد ہونی چاہئے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ

بھی بڑی طاقت کا پٹھو بن کر ہی رہا جائے۔ مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے! اندر اندر کیا کیا کھیل کھیلے جاتے ہیں اور ڈوریاں کہاں سے ہلائی جاتی ہیں، یہ قیاس کرنا کوئی ایسا مشکل نہیں۔ میرے ملک کے عوام اتنا سیاسی شعور بہرحال رکھتے ہیں کہ وہ ان باتوں کو سمجھ سکیں۔ خواہشوں اور خوابوں کے قتل میں کیا کیا نادیدہ عوامل کارفرما ہوتے ہیں، کون جانے! معاشی جدوجہد اور اپنے سروائول کی کوشش میں کسے یہ پڑی ہے کہ ان عوامل پر غور کرے! سوچنے والے ہیں ہی کتنے؟ سب تو ایضاً لگانے والے ہیں! اگر صاحب رائے ہونا بھی تو ایک عذاب ہے۔ سوچنا بھی تو اپنی رُوح پر چرکے لگانا ہے، سو کون اس جہنم سے گزرے؟ اس کے باوجود کچھ لوگ سود و زیاں سے قطع نظر سوچتے ہیں۔ ایسے دیوانے کم سہی مگر ہیں ضرور! میں بھی اپنا شمار انہی دیوانوں میں کرتی ہوں۔ میرے لئے زندگی گزارنا کچھ ایسا دشوار تو نہ تھا! مجھے کیا پڑی تھی کہ یہ عذاب مول لیتی! ہر ماہ ہزاروں روپے خرچ کرتی اور پھر کچھ سر پھروں کو معاشی جدوجہد سے آزاد کر کے ایک خاص مقصد کے حصول کی خاطر اپنا ہم سفر بنا لیتی! سیل سے جو افراد وابستہ تھے، انہیں میں نے ہی تو معاشی تفکرات سے آزاد کر رکھا تھا کہ وہ حصولِ خیر میں میرا ساتھ دیں اور شر کی سرکوبی میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ یہ سارا کھیل میں کس لئے اور کیوں کھیل رہی تھی؟ شاید میری سرگزشت پڑھنے والے یہ سوچیں کہ سب پیٹ بھرے کی اُبکائیاں ہیں۔ اگر یہی فرض کر لیا جائے تو پیٹ بھرے اس ملک میں اور بھی ہیں۔ کیا وہ بھی ایسے ہی عذابوں سے گزرتے ہیں؟ کیا وہ بھی اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں؟ جواب نفی میں آئے گا۔ تو ایسا نہیں ہے اور نہیں تھا! اس دعوے کا ثبوت بھی میری سرگزشت ہے۔ شہریار جیسے لوگ ہمیشہ مجھ سے نبرد آزما رہے ہیں اس لئے کہ میں سدا اُن کے آڑے آئی۔ ان دنوں بھی یہی صورت حال تھی میں اس فکر میں تھی کہ کس طرح شہریار کو اُس کے مذموم ارادوں سے باز رکھ سکوں گی؟

شہریار کے بارے میں ملنے والی تشویش ناک اطلاع یہ تھی کہ گزشتہ روز رات کے وقت وہ چند خطرناک قسم کے جرائم پیشہ افراد سے ملا ہے۔ اسی اطلاع نے مجھے چونک اُٹھنے پر مجبور کر دیا تھا اور میں بقیہ کڑیاں جوڑنے لگی تھی۔ یہ خبر ملتے ہی میں نے فوری طور پر شیخ مجید کی نگرانی کے احکام بھی جاری کر دیئے تھے اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ کراچی میں شیخ مجید کے دورے کی تفصیلات جلد از جلد معلوم کی جائیں۔ وہ تین خطرناک افراد جن سے شہریار ملا تھا، اُن کے نام بھی معلوم ہو چکے تھے اور اُن کے بارے میں بقیہ تفصیلات بھی۔

میں نے کافی سوچ بچار کے بعد لائن آف ایکشن مقرر کی اور پھر ایک نئی صورت حال سے نمٹنے کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔

اُس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے جب میں اپنی کوٹھی سے نکلی تھی۔ ملنے والی اطلاع کے مطابق شام چھ بجے سے رات دس بجے تک وہ شخص کراچی کے ایک بار میں مے و ساغر سے جی بہلاتا تھا جس کی مجھے اس وقت تلاش تھی۔ یہ بار، صدر کے علاقے میں ایک پکچر ہاؤس کے مقابل تھا۔ بار ہی کی حدود میں لان بھی تھا۔ عموماً گرمیوں کے موسم میں یہاں میز کرسیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ بار کا ہال الگ تھا۔ گرمیوں کے موسم میں لوگ اندر ہال میں بیٹھنے کی بجائے لان ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس بار میں زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ آتے تھے۔ بڑے ہوٹلوں کے باروں یا نائٹ کلبوں کی طرح یہاں لڑکیاں یا عورتیں نہیں آتی تھیں۔ مجھے یہ بات معلوم تھی، اس کے باوجود اِدھر کا رُخ کیا تھا۔ میرے جسم پر بھی اس وقت معمولی کپڑے تھے اور میں کار لے کر بھی

نہیں چلی تھی۔ چہرے پر میں نے ہلکا سا میک اپ کر لیا تھا تا کہ آسانی سے پہچانی نہ جا سکوں۔ اپنی کوٹھی سے نکلنے کے لئے بھی میں نے عقبی دروازہ استعمال کیا تھا اور صدر تک ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر آئی تھی۔ مجموعی طور پر اپنی وضع قطع اور حلیے سے میں اس وقت کوئی کال گرل معلوم ہو رہی تھی جو کسی ''شکار'' کی تلاش میں نکلی ہو اور اس کی بھی وجہ تھی۔

میں اس وقت جس شخص سے ملنے جا رہی تھی، وہ ایسی ہی آوارہ لڑکیوں کا رسیا تھا۔ مجھے اُس کے متعلق یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ اپنے اپنے ذوق اور پسند کی بات ہے۔ کچھ لوگ طبعاً ہی ایسی گھٹیا پسند رکھتے ہیں۔ آدمی اندر سے جیسا ہوتا ہے، اُس کی پسند و ناپسند بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ معاملہ چاہے لباس کے انتخاب کا ہو یا ذوقِ حسن کا!

وہ ایک دوغلا عیسائی تھا۔ سیل کے فائل میں اُس کی تصویر اور کوائف موجود تھے۔ سیل کے ریکارڈ رُوم میں ملکی، شہری اور غیر ملکی جرائم پیشہ افراد کا ریکارڈ رہتا ہے۔ اس دوغلے عیسائی کی تصویر میری نظر سے گزر چکی تھی۔ اس لئے اُسے پہچاننے میں مجھے قباحت نہ ہوئی۔

ٹیکسی کو بار کے سامنے رُکوا کر میں نے کرایہ ادا کیا اور پھر اُتر کر بار کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ میں نے دانستہ اس وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اس وقت وہاں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی اور یوں بھی بقول شاعر، کچھ رات گئے ساقی میخانہ سنبھلتا ہے۔

میں نے احاطے میں داخل ہوتے ہی محسوس کر لیا کہ ابھی لان آباد نہیں ہوا ہے۔ وہ دوغلا عیسائی ولیم اندر ہال ہی میں ہو سکتا تھا۔ میرے قدم آگے بڑھتے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد میں ہال میں داخل ہو چکی تھی۔ اپنے متناسب جسم اور وضع قطع کے سبب میں فوراً ہی وہاں موجود افراد کی توجہ کا مرکز بن گئی۔

میں نے ایک نظر پورے ہال کا جائزہ لیا اور پھر اپنا پرس ہلاتی ہوئی ایک خالی میز پر جا بیٹھی۔ کچھ لوگ بڑے بڑے سٹولوں پر بیٹھے کاؤنٹر ہی کے پاس شغل جام کر رہے تھے اور کچھ میزوں پر بیٹھے تھے۔ ابھی زیادہ تر میزیں خالی ہی تھیں۔

روزانہ پابندی کے ساتھ چار گھنٹے ایک شراب خانے میں گزارنے والا شخص یقیناً عادی شرابی ہی کہلایا جا سکتا ہے۔ ولیم بھی ایسے ہی عادی شرابیوں میں سے تھا۔ میں اُسے دیکھ چکی تھی۔ وہ کاؤنٹر پر گلاس رکھے آہستہ آہستہ شراب کی چسکیاں لے رہا تھا۔ جب میں ہال میں داخل ہوئی تھی تو اُس نے بھی مجھے بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا، پھر وہ بارمین سے کچھ کہنے لگا تھا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ اُس نے بارمین سے میرے ہی متعلق کچھ پوچھا ہوگا۔ جواباً کچھ کہہ کر بارمین سے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔

مجھے ابھی وہاں بیٹھے چند منٹ ہوئے تھے کہ ایک ویٹر میرے پاس آ گیا۔

''اسکاچ ڈبل پیگ!'' میں نے ویٹر کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

''ساتھ میں سوڈا، میڈم! یا پانی؟'' ویٹر نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔ میں نیٹ پیتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور سنو! کھانے میں شامی کباب۔''

ویٹر سر ہلا کر چلا گیا۔

میں نے دانستہ کونے کی ایک ایسی میز کا انتخاب کیا تھا جہاں سے پورے ہال پر نظر رکھ سکوں اور ''ہاتھ کی صفائی'' دکھانے میں بھی مجھے آسانی ہو۔ میں نے اسی لئے شراب کے ساتھ سوڈا یا پانی نہیں منگوایا تھا۔ میں شراب نوشی نہیں کرتی، ہاں شراب کی بو ضرور برداشت کر لیتی ہوں اور اس برداشت کے لئے میں نے خاصی جدوجہد کی تھی۔ ابتداء میں مجھے شراب کی بو سے متلی آنے لگتی تھی مگر رفتہ رفتہ میں نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ مجھے عموماً جو جو سوانگ بھرنا پڑتے تھے، میں جو جو کردار ادا کرتی رہتی تھی، اُن کے پیش نظر اپنی اس کمزوری پر بھی قابو پانا ضروری تھا۔ کیا خبر کب کیسے حالات ہوں اور مجھے کس ماحول میں بیٹھنا پڑے! اگر میں ذہنی طور پر پہلے ہی سے خود کو اس کے لئے تیار نہ کر چکی ہوتی تو اس وقت میرا شراب خانے میں بہت اطمینان و سکون سے بیٹھنا تقریباً ناممکن ہوتا۔

جلد ہی بیرے نے میرے آرڈر کی تکمیل کر دی۔ میں نے سانس روک کر شراب کا گلاس اُٹھایا اور اُسے ہونٹوں تک لے گئی۔ جو لوگ شراب میں سوڈا یا پانی ملا کر نہیں پیتے عموماً سپ کرتے ہیں۔ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ گویا سپ کیا۔ یہ مجھے ہی معلوم تھا کہ شراب میرے ہونٹوں کو نہیں چھو سکی، ہاں دیکھنے والے یہی سمجھے ہوں گے کہ میں نے تھوڑی سی شراب یقیناً پی لی ہے۔ گلاس رکھ کر میں نے فوراً ہی گرم گرم شامی کباب کا ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھ لیا تھا جیسے شراب کی تلخی ختم کرنے کے لئے فوراً ہی کباب کھا رہی ہوں۔

اب میں بظاہر ہر طرف سے غافل بیٹھی ہوئی گویا شراب نوشی میں مصروف تھی۔ اسی دوران میں مجھے ہاتھ کی صفائی دکھانے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ اپنا پرس کھول کر میں نے بڑا سا رومال نکال لیا تھا اور اس [illegible] پونچھتے ہوئے شراب کا گلاس اُٹھا لیا تھا اور رومال کی آڑ میں تقریباً اپنے گلاس کی آدھی شراب میں نے رومال میں اُلٹ دی تھی اور پھر اس طرح گلاس ہونٹوں تک لے جا کر میز پر رکھ دیا تھا جیسے ایک ہی گھونٹ میں خاصی پی لی ہو۔ اس کے بعد رُومال سے اپنے ہونٹ پونچھ کر میں کباب کھانے لگی تھی۔ ایسے مواقع پر ہاتھ کی صفائی دکھانا ذرا مشکل ہوتا ہے جب سبھی متوجہ ہوں، لیکن میں مطمئن تھی کہ وہاں موجود افراد میں سے کسی نے میری حرکت نوٹ نہیں کی ہوگی۔

پھر مجھے ولیم کا زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ ذرا دیر بعد ہی اپنا گلاس تھامے میری طرف آتا دکھائی دیا۔ میں ایسی بن گئی جیسے اُسے دیکھا ہی نہ ہو۔

''اگر کہو تو میں تمہیں کمپنی دُوں؟'' وہ میرے قریب آ کر آہستہ سے بولا۔

''ایز یو لائیک!'' میں اس طرح بے پرواہی سے بولی جیسے یہ کوئی خاص بات نہ ہو، پھر کہنے لگی۔ ''بائی دا وے تمہیں میرے پاس آ کر بیٹھنے کا خیال کیوں آ گیا؟''

''اس لئے کہ میری یہاں موجودگی میں کسی اور کی ہمت نہ ہوتی جو تمہارے قریب آ سکتا۔'' وہ معنی خیز انداز میں یہ کہتا ہوا میرے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیوں، کیا تم کوئی پھنے خاں ہو کہ سب تم سے ڈرتے ہوں!'' میں نے بلا جھجک براہِ راست اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ''پھنے خاں تو ہوں میں! یہاں روز آنے جانے

والے سبھی جانتے ہیں مجھے۔ لڑکیاں یہاں جب بھی آتی ہیں، میرے ہی ساتھ آتی ہیں۔''

''تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔'' میں بولی۔

''ولیم!......بس اسی کو میرا پورا تعارف سمجھ لو۔'' وہ شراب کا گلاس خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

''تمہیں شاید اپنے بارے میں خاصی غلط فہمی ہوتی ہے۔ خیر، مجھے کیا؟'' یہ کہہ کر میں نے بھی اپنا گلاس اُٹھا لیا۔

''غلط فہمی کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اب سے پہلے تم کہاں تھیں؟ تمہیں کبھی دیکھا نہیں۔''

''کیا ضروری ہے کہ میں تمہارے سوال کا جواب دُوں؟ خیر پھر بھی بتائے دیتی ہوں کہ میں اس شہر میں نووارد ہوں۔ پہلے میں لاہور میں تھی۔'' یہ کہتے ہوئے گلاس کو ہونٹوں تک لے جائے بغیر میں نے اُسے دوبارہ میز پر رکھ دیا۔

''اسی لئے تو کبھی دیدار نہیں ہوئے۔'' وہ طویل سانس لے کر معنی خیز انداز میں کہنے لگا۔ ''ہاں، تم نے اپنا نام نہیں بتایا اب تک۔''

''لیوسی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہاں اپنی ایک کزن کے ہاں ٹھہری ہوں۔''

''کہاں؟''

''ڈیفنس میں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خاصی اُونچی چیز ہو۔''

''اے مسٹر!'' میں نے اُسے ناگواری سے مخاطب کیا۔ ''فری ہونے کی کوشش نہ کرو! میں کوئی چیز نہیں، لڑکی ہوں۔''

''کہیں نشہ تو نہیں ہو گیا تمہیں؟'' وہ ہنس کر بولا۔ ''میں بھی اے مسٹر نہیں، ولیم ہوں۔''

''میری بلا سے!'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی تیوریوں پر بل ڈال دیئے اور پھر خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑانے لگی۔ ''ذرا لفٹ دے دو تو لوگ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔''

''غصے میں اور بھی اچھی لگتی ہو!'' وہ مزید بے تکلفی پر اُتر آیا۔ اور پھر تو اُس نے حد ہی کر دی۔ ''میرے ساتھ چلو گی؟''

''کیا مطلب؟'' میں حیرت سے بولی۔ ''میں کیوں جانے لگی تمہارے ساتھ؟'' میں نے دانستہ اس طرح کہا جیسے اُس کی بات کا مطلب نہ سمجھتی ہوں۔

''اب زیادہ بھولی نہ بنو۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ تم کیا شے ہو۔''

اچانک میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ میرے جال میں پھنس چکا تھا۔ میں نے فوراً ہی اپنا رویہ تبدیل کر لیا اور بولی۔ ''ابھی سے؟''

''اب آئیں نا تم راہ پر!'' وہ بھی اپنی ''فتح'' پر مسکرانے لگا، پھر بولا۔ ''کیوں، ابھی کیا بات ہے؟''

''ابھی تو سورج ڈوبے زیادہ دیر نہیں ہوئی، پیاس بھی نہیں بجھی۔'' میں نے عادی شرابیوں کے سے لہجے میں کہا۔

''مگر یہ تم نیٹ کیوں پی رہی ہو؟ تمہارے پھیپھڑے بہت جلد خراب ہو جائیں گے۔ سوڈا نہیں تو پانی ہی

لیا کرو۔''

''کوئی ایک چیز تو بغیر ملاوٹ کے رہنے دو۔'' میں ہنس کر بولی۔ پھر کہا۔ ''جب تک شراب کی اصل تلخی محسوس نہ ہو مجھے مزہ نہیں آتا۔''

''خیر اپنی اپنی عادت کی بات ہے۔'' وہ سر ہلا کر بولا، پھر کہنے لگا۔ ''میں آیا ابھی کاؤنٹر سے اپنا گلاس بھروا کر۔ تم شاید اسکاچ وہسکی پی رہی ہو۔''

''ہاں کیوں؟'' میں جان کر انجان بن گئی۔ ''ایک ڈبل منگایا تھا اور ابھی دو ڈبل تو اور چلیں گے۔''

''نہیں!'' وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ''بس ایک ڈبل اور منگا لو...... بلکہ میں خود ہی کہہ دیتا ہوں ویٹر سے۔ پھر گھر چل کر پئیں گے۔ جتنی چاہو پی لینا۔ میں بوتل لے لوں گا۔''

''اچھا جو تمہاری مرضی۔'' میں گویا راضی ہو گئی۔

''یہ تو ختم کرو!'' یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

اُس کے مُڑتے ہی میں نے پھر ہاتھ کی صفائی دکھا دی۔ اب میرا گلاس خالی تھا۔ میں سوچنے لگی کہ اب شاید شہریار سے ملنے والے بقیہ دو خطرناک افراد سے ملنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ولیم ہی سے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اُس سے کچھ معلوم کرنے کے لئے بہر حال یہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ مجھے یہ احساس پہلے ہی سے تھا اس لئے میں نے اتنا لمبا چکر چلایا تھا اور خود کو اُس پر سوسائٹی گرل ظاہر کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی ہی باتیں کرے گا جو اُس نے کچھ دیر پہلے کی تھیں اور پھر ساتھ لے جانے کو بھی کہے گا۔ اُس کا قیام سولجر بازار میں تھا اور وہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ میرے مقصد کے حصول کے لئے وہی جگہ مناسب تھی۔ میں جلد از جلد اُس سے مطلوبہ معلومات حاصل کر لینا چاہتی تھی مگر اس طرح کہ اپنے گھر لے جانے سے پہلے اُسے مجھ پر کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ میں نے اسی لئے شراب خانے میں مزید کچھ دیر بیٹھنے پر اصرار کیا تھا۔ ولیم سے رات کے وقت بھی اُس کے گھر پر ملا جا سکتا تھا، مگر ایسی صورت میں مجھے کوئی اور ہی سوانگ بھرنا پڑتا۔ پھر یہ کہ اتنا وقت بھی رائیگاں جاتا۔ میں نے اسی سبب اُسے شراب خانے ہی سے اُٹھا لے جانے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے مقصد میں کامیابی کے قریب تھی۔

ولیم اپنے حلیے اور لباس کے سبب عام قسم کے جرائم پیشہ افراد سے قطعی مختلف تھا۔ بظاہر وہ پڑھا لکھا اور کوئی مہذب شہری ہی معلوم ہوتا تھا۔ اُسے ایک نظر دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی خطرناک قسم کا مجرم ہو گا۔ اُس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہو گی۔ کلین شیو، بڑے بڑے بال اور بے شکن لباس، دراز قد، درمیانی آنکھیں، نہ زیادہ بڑی، نہ بہت چھوٹی، بالائی ہونٹ پر خوبصورتی سے تراشی ہوئی مونچھیں، ایک اُوپری دانت پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ اُس کے کوائف پڑھ کر مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ عموماً پس پردہ ہی رہتا ہے۔ اسی لئے پولیس اب تک اُس پر ہاتھ نہیں ڈال سکی تھی۔ وہ پس پردہ رہ کر ہی سارا کھیل کھیلتا تھا۔ بظاہر ذریعہ معاش کے لئے اُس نے ایک جنرل سٹور کھول رکھا تھا جہاں وہ کبھی کبھار ہی نظر آتا تھا۔ جنرل سٹور شہر کے اچھے علاقے میں تھا، یعنی نرسری پر۔ رشتے کا ایک بھتیجا دراصل وہ جنرل سٹور چلاتا تھا۔ اُس کے تمام کوائف آج صبح ہی میں نے آپریشن سیل سے معلوم کر لئے تھے۔ کئی بار وہ مختلف کیسز میں پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بچا

تھا مگر عدم ثبوت کے سبب اُسے جیل کی ہوا نہیں کھانا پڑی تھی۔ وہ بے حد محتاط اور چوکنا آدمی تھا، اپنے پاس جو ریوالور رکھتا تھا، اُس کا لائسنس بھی رکھتا تھا۔ بس اُس کی دو کمزوریاں تھیں جن میں سے ایک کا فائدہ اُٹھا کر میں اُس تک پہنچ گئی تھی۔

تقریباً پون گھنٹے کے بعد میں اُس کے ساتھ بار سے اُٹھی۔ میرا بل بھی اُس نے ادا کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس پر کیا اعتراض ہوتا؟

بار سے اُٹھ کر اُس کے ساتھ چلتے ہوئے میں دانستہ لڑکھڑا رہی تھی۔ اسکاچ کے ''دو ڈبل'' یعنی چار پیگ بہر حال اتنا نشہ تو کر ہی سکتے تھے۔

''نشہ ہو گیا جانِ من تمہیں؟'' وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے ہنس کر بولا۔ ''اور تم کہہ رہی تھیں کہ ابھی....''

''ہرگز نہیں!'' میں ایک دم تن کر چلنے لگی۔

وہ ہنس پڑا، پھر بولا۔ ''اچھا دیکھ لیں گے ابھی گھر چل کر۔ کہاں تک میرا اندازہ ہے مزید ایک ڈبل کے بعد غیس ہو جاؤ گی تم۔''

یہی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں باہر نکل آئے۔ اُس کے پاس نیلی فیٹ الیون ہنڈرڈ تھی۔ اُس نے باہر آ کر اپنے کوٹ کی جیب سے چابیاں نکالیں اور کار کا دروازہ کھولنے لگا۔

پھر کچھ ہی دیر بعد میں اُس کے برابر کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اُس نے کار سٹارٹ کر دی۔

''میں زیادہ دیر نہیں رُکوں گی۔'' راستے میں، میں نے اُس سے کہا۔

''یعنی؟'' اُس نے پوچھا۔

''بس گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک چھوڑ دینا مجھے! اور ہاں مجھے تم ہی میری کزن کی کوٹھی تک پہنچاؤ گے۔''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے تم چلو تو! ابھی تو پورے آٹھ بھی نہیں بجے۔''

وہ پرانے طرزِ تعمیر کا بڑا سا گھر تھا جہاں ولیم مجھے لے کر آیا۔ مجھے اس پر بھی حیرت نہیں ہوئی کہ وہاں کوئی ملازم نہیں تھا۔ ولیم ایسے محتاط لوگ عملاً ملازمین کا جھنجھٹ نہیں پالتے۔ اُس نے کار سے اُتر کر خود ہی گیٹ کھولا تھا اور پھر اندر پہنچ کر کار ایک جانب کھڑی کر دی تھی۔ سامنے برآمدے میں کم پاور کا ایک بلب جل رہا تھا۔ ولیم کار کا دروازہ مقفل کر کے اور مجھے ساتھ لئے برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ چابیوں کا گچھا اُس کے ہاتھ میں تھا۔

''آؤ!'' دروازے کا قفل کھول کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں اُس کے ساتھ اندر داخل ہو گئی تو اُس نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ باہر سے وہ مکان جتنا خستہ و خراب معلوم ہو رہا تھا، اندر سے ویسا نہیں تھا۔ میں ولیم کے ساتھ چلتی ہوئی اُس کی خواب گاہ کے دروازے تک پہنچ گئی۔ شراب کی بوتل، کار سے اُترتے ہی اُس نے مجھے تھما دی تھی جو ایک اخبار میں لپٹی ہوئی تھی۔

''آ جاؤ جانِ من!'' اُس نے خواب گاہ میں داخل ہو کر لائٹ کا سوئچ آن کیا۔ میں نے اُس کی خواب گاہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے نظر پڑتے ہی تقریباً اُچھل پڑی...... وہ منظر میرے لئے اتنا ہی غیر متوقع تھا۔ سامنے ہی ایک شخص ریوالور لئے کھڑا تھا اور اُس کی نال کا رُخ میری ہی طرف تھا......!

OOO

میں نے اپنے منتشر حواس پر چند ہی لمحوں میں قابو پا لیا۔ اس طرح کی صورت حال میرے لئے کوئی نئی نہیں تھی۔ متعدد مواقع پر میں اسی طرح موت کا سامنا کر چکی تھی۔ میری نگاہ اُس شخص کے چہرے پر جم گئی جو گویا مجسم موت بنا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے کے خطوط سے سفاکی کا اظہار ہو رہا تھا۔ بظاہر وہ ولیم کا ہم عمر ہی معلوم ہو رہا تھا۔

''لڑکی!'' معاً اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''تو ایک طرف ہو جا اور مجھے ولیم سے اپنا پرانا قرض چکا لینے دے! آج کی رات ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ بچے گا۔ جو بھی زندہ بچ گیا وہ تیرے ساتھ......'' اُس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اُس کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔

ابھی اُس کے ہونٹوں سے شیطانی مسکراہٹ معدوم نہیں ہوئی تھی کہ میرا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ میں نے شراب کی بوتل اُس کی طرف اُچھال دی۔ میرا نشانہ ہدف پر صحیح بیٹھا۔ بوتل اُس کے ریوالور سے ٹکرائی اور اُسی لمحے میں تیزی سے جھک نہ گئی ہوتی تو ریوالور سے نکلی ہوئی گولی یقیناً میرے جسم کے کسی نہ کسی حصے میں سوراخ ضرور کر دیتی۔

میری توقع کے مطابق ولیم ایسے شخص کے لئے اتنی مہلت بہت تھی۔ وہ کسی عقاب کی طرح اُس شخص پر جھپٹا۔ ولیم نے اُس کی کلائی پر ہاتھ ڈال کر ریوالور کا رُخ چھت کی طرف کر دیا تھا۔ دوسرا فائر ہوا مگر اس بار بھی فائر کی آواز نہ ہوئی۔ ریوالور پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔

میں وقت ضائع کئے بغیر پھرتی سے آگے بڑھی۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے فرش پر لڑھک رہے تھے۔ ریوالور ایک طرف پڑا تھا۔ میں نے جیسے ہی جھک کر ریوالور اُٹھایا، ولیم کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ اُچھل کر میرے قریب آ گرا۔ وہ شخص، فرش سے اُٹھ کر خواب گاہ کی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف بھاگا۔ شاید وہ اسی کے ذریعے خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل نہیں تھا کہ فرار کی کوشش ناکام بنا دیتی، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ایک ہی جست میں کھڑکی سے باہر نکل گیا۔

ولیم کراہتا ہوا اُٹھا اور اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے کھڑکی کی طرف بھاگا۔ غالباً کہنی کی شدید ضرب نے ولیم کو وقتی طور پر بے حال کر دیا تھا ورنہ شاید وہ اپنے شکار کو اتنی آسانی سے نہ بھاگنے دیتا۔

کمرے میں شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی اور ٹوٹی ہوئی بوتل کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں جس مقصد سے ولیم کے ساتھ یہاں آئی تھی اس کا تقاضہ یہی تھا کہ کوئی اور قصہ شروع نہ ہو۔ میں نے اسی لئے ولیم کے اُس حریف کو فرار ہونے کا موقع دے دیا تھا۔

"نکل گیا!" ولیم کھڑکی کی طرف سے پلٹا۔ اب غالباً پیٹ کی تکلیف کم ہوگئی تھی اس لئے وہ سیدھا کھڑا تھا۔ اُس کی نگاہیں میری جانب ہی تھیں اور چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ اس کی وجہ کچھ کچھ میں سمجھ رہی تھی۔ پھر اُس کے ایک جملے نے مزید وضاحت کردی۔ اُس نے کہا۔

"تم یقیناً خاصی کھائی کھیلی معلوم ہوتی ہو۔"

"تمہارے اندازے سے کہیں زیادہ۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا اور ریوالور کا رُخ اُس کی طرف کر دیا۔

"کیا...... کیا مطلب؟" ولیم کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

"مطلب یہ کہ میں تمہارے مقابلے سے نہیں بھاگوں گی اُس چوہے کی طرح!" میرا لہجہ بدل گیا۔

"کون ہو تم؟" اُس نے تیزی سے سوال کیا۔ لہجے میں کسی سانپ کی سی پھنکار تھی۔

"مختلف مواقع پر بہت سے لوگ مجھ سے یہ سوال کر چکے ہیں ولیم! مگر اُنہیں جواب نہیں مل سکا۔ ویسے تمہیں میں اس سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔ سنو! اگر تم مجھ سے کھُل گئے، میں نے جو بھی پوچھا، اُس کا جواب دے دیا تو میں ایک نیک اور شریف لڑکی ہوں اور...... انتہائی خطرناک بھی، اتنی خطرناک کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"یہ شاید تم اس لئے کہہ رہی ہو کہ اس وقت تمہارے ہاتھ میں ریوالور ہے اور میں......"

ابھی اُس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ میں نے بائیں جانب بچھی مسہری پر ریوالور پھینک دیا۔ میں اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں جو صرف زبانی جمع خرچ سے راہِ راست پر آ جاتے ہیں۔

لمحہ بھر کو اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار اُبھرے اور پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ پھیلائے مجھ پر جھپٹا۔ یہی داؤ اُس نے اپنے حریف پر کچھ دیر پہلے آزمایا تھا۔ مگر اُس کی حسرت دل کی دل میں رہ گئی۔ میں نے اپنی جگہ سے اُچھل کر اُس کی ٹھوڑی پر فلائنگ کک جما دی۔ وہ اُلٹ کر دُور جا گرا اور اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے جان کر اس طرح وار کیا تھا کہ وہ فرش پر بکھرے ہوئے شیشوں سے نہ بچ سکے اور وہیں گرے۔ یقیناً کئی نوکیلے شیشے بیک وقت اُس کی پشت میں اُتر گئے ہوں گے۔ اُس کے چیخ اُٹھنے کا سبب یہی ہو سکتا تھا۔ فلائنگ کک لگا کر میں پھر قلابازی کھاتی ہوئی اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی۔ عموماً فلائنگ کک کے بعد وہ شخص بھی فرش پر آ رہتا ہے جو یہ داؤ آزماتا ہے مگر میں نے اس داؤ میں تھوڑی سی اختراع کر لی تھی۔ اپنے جسم کو فضا ہی میں مخصوص زاویئے سے موڑ کر نیچے گرتے ہوئے اپنے دونوں پیروں پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ میں نے اس کی بہت مشق کی تھی۔ ممکن ہے میرا جسم ذرا بھاری ہوتا تو میں یہ اختراع نہ کر پاتی۔ اس وقت بھی میں نے اپنی مشق کے بل بوتے پر جسم کو سنبھال لیا تھا۔ ولیم ابھی تک فرش پر ہی پڑا تھا۔

اپنے حریف کو زیر کر لینے کے باوجود یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ وہ بہرحال ایک جرائم پیشہ شخص ہے۔ ایسے افراد بہت سخت جان ہوتے ہیں اور یہ کہ آخر تک بساط اُلٹ دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ولیم کے بارے میں میرا قیاس غلط ثابت نہ ہوا۔ اُس نے زخمی ہونے کے باوجود کروٹ لے کر تیزی کے ساتھ اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا تھا۔ میری تمام تر توجہ اُسی کی طرف تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ ریوالور کا رُخ میری طرف کر سکتا، میں جیسے اُڑتی ہوئی ایک ہی جست میں اُس کے قریب پہنچ گئی۔ دوسرے ہی لمحے میرے پیر کی بھرپور ٹھوکر اُس کے ہاتھ پر پڑی۔ وہ ایک بار پھر چیخ اُٹھا اور ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر سامنے والی دیوار سے جا

ٹکرایا۔ اسی دوران میں ولیم اپنے مضروب ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر کراہتا ہوا اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اب سیدھا ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھنے نہ دیا اور اپنے پیر کی ایڑی اُس کے ماتھے پر رکھ کر تیزی سے گھوم گئی۔ یہ داؤ بھی میرا آزمایا ہوا تھا۔ میں نے دانستہ اپنے جسم کا زیادہ بوجھ اور دباؤ اُس کی پیشانی پر نہیں ڈالا تھا ورنہ اُس کا کاسۂ سر دو ٹکڑے ہو جاتا۔ میں نے اُس کی پیشانی سے پیر ہٹایا تو لہو کا ایک دائرہ سا نظر آیا۔ اُس کی پیشانی کی کھال میری ہیل سے اُدھڑ گئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ ولیم ذبح کئے جانے والے کسی جانور کی طرح چیختے ہوئے ہاتھ پاؤں پٹخ رہا تھا۔ کچھ دیر کو یقیناً اُس کے حواس قابو میں نہیں رہے ہوں گے۔

جب شدید تکلیف و اذیت کے لمحے گزر گئے اور ولیم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے اُسے مخاطب کیا۔ "ولیم! ناحق تم نے مجھے تشدد پر مجبور کیا۔ اب تم اس قابل بھی نہیں لگ رہے کہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکو۔ چلو میں تمہیں بستر پر لٹا دوں۔" یہ کہہ کر میں جھکی اور اُسے سہارا دے کر اُٹھانے لگی۔ پھر سہارا دیئے ہوئے میں اُسے مسہری تک لے آئی۔ بستر پر لٹانے سے پہلے میں نے اُس کی پشت میں پیوست نوکیلے شیشے بھی احتیاط کے ساتھ نکال دیئے تھے۔

"شرا...... شراب!" اُس کے ہونٹ ہلے۔ "وہ...... وہ اُدھر!" اُس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ دوسری سمت رکھی ایک میز کی طرف اُٹھایا۔

"میں تمہیں شراب پلا دوں گی۔" میں نے میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس پر شراب کا اَدّھا رکھا تھا۔ وہ نصف کے قریب خالی تھی۔ پھر میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "شراب پلانے کی ایک شرط ہے کہ تم اب سخت جانی کا ثبوت دو گے اور جو میں پوچھوں گی شرافت سے بتا دو گے۔" میری نگاہ اُس کے لہولہان چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

"کسی...... کسی شرط کی ضرورت نہیں۔" وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ "تم...... تم نے مجھے زیر...... وِل...... ولیم کو زیر کرلیا...... بس یہی کافی ہے۔"

"سمجھی نہیں میں، کیا کافی ہے؟ یہ میری بات کا جواب تو نہیں۔" میں بولی۔

"تم...... تم جو...... جو پوچھو گی بتا دوں گا میں!...... کہ...... کہ تم نے زیر کرلیا ہے مجھے۔"

دھوکہ تو نہیں دے رہے مجھے؟"

"نن...... نہیں!...... شراب...... شراب پلا دو مجھے...... تاکہ میں...... میں بول سکوں، تمہاری باتوں کا جواب...... دے سکوں۔"

ولیم کے لہجے میں مجھے سچائی محسوس ہوئی۔ بغیر کچھ کہے میں اُٹھی اور میز سے شراب کا اَدّھا اُٹھا لائی۔ "لو پیو!" میں نے ڈھکنا کھول کر اَدّھے کا منہ اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

وہ کئی گھونٹ پی گیا اور پھر سر ہلا کر مجھے اشارہ کیا کہ بس۔ میں نے ڈھکنا بند کر کے اَدّھا وہیں فرش پر رکھ دیا اور اُس کے سرہانے بیٹھ گئی۔

"طبیعت کچھ سنبھلی؟" چند لمحے بعد میں نے سوال کیا۔

"ہوں؟" اُس نے بایاں ہاتھ اُٹھا کر اپنے ہونٹ صاف کئے، پھر بولا۔ "تھوڑی...... تھوڑی سی اور۔"

میں نے اُس کی یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ پھر بولی۔ ''تم یقیناً اب اس قابل ہو کہ میرے سوالوں کے جواب دے سکو۔'' اس کے بعد میں نے بغیر رُکے پوچھا۔ ''شہریار تم سے کیا کام لینا چاہتا ہے؟''

''شیخ مجید کو قتل کرانا چاہتا ہے۔ اس طرح کہ اُس کی موت......''

''حادثہ معلوم ہو۔'' میں نے اُس کی بات پوری کر دی، پھر بولی۔ ''تمہاری کیا پلاننگ تھی اس سلسلے میں؟''

''ابھی میں کوئی واضح منصوبہ نہیں بنا سکا تھا اور خود بھی دانستہ تھوڑی ڈھیل دے رہا تھا۔''

''اس کی وجہ؟''

''میری اطلاعات کے مطابق...... وہ میرے علاوہ بھی دو آدمیوں سے ملا تھا...... خان اور ابرار ٹیڈی سے!...... ابرار ابھی...... ابھی یہاں سے کچھ دیر پہلے فرار ہوا ہے، میرا پرانا دشمن ہے وہ!...... بہت دن سے لگتی ہے میری اُس سے۔''

''اور خان؟...... کیا وہ بھی تمہارے حریفوں میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں!...... لیکن اُسے میں دوست بھی نہیں سمجھتا۔''

''سودا کتنے میں ہوا تھا؟ کچھ پیشگی وصول کیا شہریار سے؟''

''ہاں، بس دس ہزار...... مگر وہ کیا چاہتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر مجھ ہی سے کام لینا تھا تو پھر خان اور ابرار سے ملنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''حیرت ہے ولیم! کہ تم اتنی سیدھی سی بات نہیں سمجھے۔'' میں نے کہا۔ ''شہریار بہت عیار ہے۔ وہ ہر قیمت پر شیخ مجید کو ٹھکانے لگا دینا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تم، خان اور ابرار ٹیڈی، الگ الگ شیخ مجید کے قتل کی منصوبہ بندی کرو۔ اگر شیخ مجید ایک کے وار سے بچ جائے تو دوسرے کے بچھائے ہوئے جال میں آ پھنسے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو تیسرا شخص بہر صورت ناکام نہ رہے۔'' میں نے اُسے تفصیل کے ساتھ وہ باتیں بتا دیں جو میرے ذہن میں آئی تھیں۔

''ہاں...... شاید...... شاید یہی بات ہوگی۔'' ولیم تکلیف سے کراہتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم...... مگر تم کیا چاہتی ہو؟...... تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟...... میرا خیال ہے کہ یا تو تم شیخ مجید سے تعلق رکھتی ہو یا...... یا پھر کسی خفیہ سرکاری محکمے سے تمہارا تعلق ہے۔''

''تمہارا کوئی بھی اندازہ درست نہیں میرے بارے میں۔ ہاں، میں کیا چاہتی ہوں؟ تمہارے اس سوال کا جواب مجھے ضرور دینا ہے۔ جہاں تک میں نے تمہارے بارے میں قیاس کیا ہے، تم برے آدمی ہونے کے باوجود زبان کے دھنی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے جو وعدہ کر لو گے، پورا کرو گے۔ اس کے باوجود میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میرے پاس دوسرے ذرائع بھی ہیں کہ تم سے اپنی بات منوا سکوں۔'' یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کو خاموش ہو گئی۔ میری نگاہ اُس کے چہرے پر اپنی بات کا ردِ عمل تلاش کر رہی تھی۔

وہ فوراً ہی بول اُٹھا۔ ''تم کچھ کہو تو سہی!''

''شہریار کو اسی دھوکے میں رکھو کہ اُس کے لئے کام کر رہے ہو۔ اُسے یقین دلانے کے لئے تم کوئی بھی چھوٹا موٹا ڈرامہ کر سکتے ہو۔ مگر اس سے شیخ مجید کی زندگی خطرے میں نہیں پڑنی چاہیئے۔''

''سمجھ گیا میں!...... ایسا...... ایسا ہی ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ میز پر رکھا ہوا فون مجھے اُٹھا دو تاکہ میں اپنے ڈاکٹر کو بلوا لوں۔'' اُس نے رُک رُک کر اپنی بات پوری کی۔

اُسے طبی امداد کی بہرحال ضرورت تھی اور میرا مقصد بھی پورا ہو چکا تھا اس لئے میں نے فون اُٹھا کر دے دیا اور بولی۔ ''اب میں چلتی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اپنی زبان پر قائم رہو گے۔''

''کم سے کم تم مجھے اپنا نام تو بتاتی جاتیں!'' اُس نے فون نمبر ملانے سے پہلے کہا۔ ''میرا مطلب اصل نام...... نام سے ہے۔''

جواباً میں ہنس پڑی، پھر بولی۔ ''جلد ہی نام بھی معلوم ہو جائے گا تمہیں۔ پھر ملوں گی تم سے۔ ممکن ہے ضرورت پڑ جائے۔'' یہ کہتے ہی میرے قدم دروازے کی طرف اُٹھنے لگے۔

''سنو!'' اُس نے مجھے آواز دی۔ ''ممکن ہے وہ...... وہ خبیث ابرار اِردگرد ہی کہیں تمہاری تاک میں چھپا ہو۔ اُسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ...... وہ ایسا ہی کینہ پرور اور کمینہ ہے...... ہوشیار اور چوکنا رہ کر یہاں سے نکلنا۔''

''تم میری فکر نہ کرو۔'' میں نے مُڑ کر جواباً کہا اور سوچنے لگی، کاش ولیم نے جو کچھ کہا ہے سچ ہو۔ اس طرح لگے ہاتھوں مجھے اُس پر بھی ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔

پہلے میں نے سوچا تھا کہ صرف ولیم سے مل کر کام چل جائے گا مگر اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔ شہریار کچھ زیادہ ہی چالاک ثابت ہو رہا تھا۔

ولیم کے گھر سے نکلتے ہوئے میں پوری طرح چوکنا تھی کہ کہیں بے خبری میں ابرار کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں۔ مگر یہ خدشہ بے سود ہی ثابت ہوا۔ میں اطمینان سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈیفنس پہنچ گئی۔ اپنی کوٹھی میں داخل ہونے کے لئے میں نے عقبی پھاٹک ہی استعمال کیا تھا۔ ابھی صرف رات کے ساڑھے آٹھ ہی بجے تھے اس لئے حفاظتی بندوبست نہیں کیا گیا تھا ورنہ میں یوں خاموشی کے ساتھ باؤنڈری وال عبور کر کے عمارت میں داخل نہ ہو پاتی۔ بلڈ ہاؤنڈ مجھے بھنبھوڑ ڈالتے۔

اپنی خواب گاہ میں آ کر پہلے میں نے اس میک اپ سے جان چھڑائی، پھر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد فون پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔ دوسری جانب کمانڈر نواز موجود تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ''شیخ مجید کے دورے کی تفصیلات معلوم ہوئیں؟''

''جی ہاں۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''وہ تین دن کراچی میں رہیں گے۔ کل شام پانچ بجے وہ نشتر پارک میں ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ مِل ایریئے کا دورہ کریں گے۔ پرسوں......''

''ذرا ٹھہرو!'' میں نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور بولی۔ ''آج رات کیا پروگرام ہے اُس کا؟''

''اب سے کچھ دیر بعد یعنی ساڑھے آٹھ بجے ایک مقامی ہوٹل میں ڈنر ہے اُن کا۔ وہ اس ڈنر میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہونے والے ہیں۔'' کمانڈر نواز نے بتایا۔

''ڈنر کس کی طرف سے ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''چیمبر آف کامرس کے ارکان کی جانب سے۔''

"ہوں۔" میں کچھ سوچنے لگی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ "ڈنر سے واپسی کے بعد؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنی بڑی بہن کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے ہیں، باتھ آئی لینڈ میں۔ ان کی واپسی وہیں ہوگی۔ رات سوا دس بجے انہیں پارٹی کے مقامی افراد سے ملنا ہے۔"

"یہ ملاقات کب تک جاری رہنے کا امکان ہے؟"

"فی الحال کچھ اندازہ نہیں۔ ممکن ہے ملاقات کا وقت بڑھ جائے۔ ویسے اُنہوں نے ملاقات کے لئے صرف نصف گھنٹہ دیا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رات گیارہ بجے تک تو وہ ملاقاتیوں سے نجات پا ہی لے گا۔" میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

"جی ہاں، اس کے بعد اُنہیں کسی سے نہیں ملنا۔"

"کوئی اور خاص بات؟" میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کرنے سے پہلے دریافت کیا۔

"آج میں نے جب عثمانی سے چارج لیا تو اُس کی طبیعت خراب تھی۔"

"کیا ہوا اُسے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر رشید نے دیکھا تھا اُسے۔ فوڈ پوائزننگ کا کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔" کمانڈر نواز نے بتایا۔ "ممکن ہے کل اُسے ریسٹ کرنا پڑے۔"

"تم نے اُس کا آلٹرنیٹ سوچا کوئی؟...... میرا خیال ہے کہ دو ایک دن کے لئے کیپٹن شاد کو تم اپنے ساتھ لگا لو۔ عثمانی کو ریسٹ کرنے دو۔"

"بہتر ہے۔ ویسے میں نے بھی یہی سوچا تھا، بس اجازت لینا تھی آپ سے۔"

"او کے!" میں نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا اور اپنی ملازمۂ خاص فاطمہ کی طرف متوجہ ہوگئی جو فون پر گفتگو کے دوران ہی میں آ کر ایک طرف مؤدب کھڑی ہوگئی تھی۔

فاطمہ نے مجھ سے کھانا لگانے کے لئے پوچھا اور پھر کمرے سے چلی گئی۔

میں ابھی ڈائننگ ہال میں تھی کہ ملک دلاور کے آنے کی اطلاع ملی۔ اُس کی آمد میرے لئے خلافِ توقع ہی تھی۔ عموماً وہ فون کر کے ہی آتا تھا۔ اب وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ بیساکھیوں کے بغیر چل سکے۔ ایک ملازمہ نے اُسے نشست گاہ میں بٹھا دیا۔ اپنے فطری تجسس سے مجبور ہو کر میں نے جلدی جلدی کھانا کھایا، پھر پانی پی کر اُٹھتے ہوئے فاطمہ سے بولی۔ "چائے ڈرائنگ رُوم میں ہی بھجوا دینا، اور ہاں ملک دلاور سے پوچھا چائے وغیرہ کے لئے؟"

"جی۔" فاطمہ نے جواب دیا۔ "وہ لیمن اسکوائش پی رہے ہیں۔"

میں کچھ دیر بعد ڈرائنگ رُوم میں پہنچی تو ملک دلاور، لیمن اسکوائش کے آخری گھونٹ پی کر گلاس قریبی تپائی پر رکھ رہا تھا۔

"اس وقت اچانک کیسے نازل ہوگئے؟" میں یہ کہتی ہوئی اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"وجہ نزولِ اجلالِ دلاور ابھی عرض کی جائے گی، ذرا چھری کے نیچے دم لیں۔" اُس نے حسب معمول چہک کر کہا۔

"کیوں، کیا آج کل بقراطوں کے ساتھ بیٹھنے لگے ہو جو اتنی گاڑھی اُردو بول رہے ہو؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"اُردو صرف اُردو ہوتی ہے، گاڑھی یا پتلی نہیں ہوتی۔ ویسے مجھے آج کل آپ کی حالت ضرور پتلی معلوم ہو رہی ہے۔"

"یہ ہوائی کس دشمن نے اُڑائی ہے؟"

"وہ دشمن نہیں تھا، دوست تھا اپنا۔"

"انٹ شنٹ نہ اُڑاؤ اور یہ بتاؤ کیوں آئے ہو؟" میں بولی۔

"کیا آپ نے اپنے دیدار پر ٹکٹ لگا دیا ہے؟" وہ بہکنے لگا۔

"وہ ٹھیک ہوتا، میں اندر سے منع کرا دیتی کہ نہیں ہوں۔"

"منع تو تب کراتیں کہ مجھے معلوم نہ ہوتا کہ آپ اپنی کوٹھی کی عقبی دیوار پھاند کر چوروں کی طرح اندر پہنچ چکی ہیں۔ میں ٹلتا ہی نہیں۔"

"اچھا تو پھر تم میری ٹوہ میں رہنے لگے!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"ٹوہ میں تو بہت دن سے ہوں، بس اتنا کہنے آیا تھا کہ ولیم جیسے لوگوں کی وفا پر یقین نہیں [illegible] کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں سمجھ گئی کہ اپنی عادت کے مطابق وہ پھر میری نقل و [illegible] میں مجھے پہچان لینا اُس کے لئے مشکل نہ رہا ہوگا۔ وہ اس وقت [illegible] تھا۔ مگر میں بیداد پر آمادہ ہوگئی۔

"دلاور!" میرے لہجے میں سختی تھی۔ "بے تکلفی یا دوستی کا مطلب یہ نہیں ہوتا [illegible] شک کا اظہار کیا جائے۔"

"او ہو!...... آپ تو پوری پٹڑ ون ہیں!" وہ میرے لہجے کا نوٹس لئے بغیر بولا۔ "شک کون کر رہا ہے آپ پر! وہ تو میں نصیحت کر رہا تھا کہ ایسے لچے لفنگے وفادار ثابت نہیں ہوتے۔ اگر کسی سے جیون بھر ساتھ نبھانے کی ایسی ہی تمنا ہے تو یہ خاکسار حاضر ہے۔"

"میں سچ مچ آدمی کو خاکسار بننے پر مجبور کر دیتی ہوں، تم شاید یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔" مجھے غصہ آنے لگا۔

"تو مجھے کب انکار ہے؟" وہ ڈھیٹ بنا رہا۔ "بس اب تاریخ بتا دیں، کب کے چھپواؤں دعوت نامے؟ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ تاریخ لڑکی والوں ہی سے پوچھ کر رکھی جاتی ہے۔ یہاں ذرا مسئلہ یہ ہے کہ لڑکی والے لاپتہ ہیں اس لئے مجبوراً براہِ راست لڑکی ہی سے یہ نازیبا سوال کرنا پڑ رہا ہے۔"

میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر بھی میں نے اپنے غصے پر قابو پا کر کہا۔ "دلاور! اگر اس وقت تم میرے گھر میں نہ ہوتے تو......تو......"

"آپ فوراً ہاں کر دیتیں۔" اُس نے جلدی سے بات پوری کر دی، اپنی دانست میں پھر بولا۔ "ہوتا ہے...... ہوتا ہے ایسا! مشرقی لڑکیوں کی یہی شرمیلی ادا تو مغربی ممالک میں آج کل مشہور ہو رہی ہے۔ سنا ہے کہ مغرب والے اس ادا پر بھی ریسرچ کریں گے۔ اُن کے سامنے بڑے اہم نوعیت کے سوالات ہیں، مثلاً یہ کہ مغربی لڑکیوں کی آنکھ کا پانی کیسے مر گیا؟ اُن میں وہ شرم و حیا کیسے ختم ہو گئی جو کبھی تھی؟ دراصل یہ جو مستشرکین ہیں نا...... لاحول ولا...... آ ہی گیا کمبخت بڑا کاف! اتنی دیر سے سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا، مگر شاید میں پہلے ہی بڑا کاف بول چکا ہوں! 'مشرکی لڑکیوں' میں بھی تو یہ ظالم موجود ہے! آخر اس سے کس طرح بچا جائے؟ آپ ہی بتائیں۔ اس لئے کہ آپ بھی ایک مشرکی......" یہ کہتے ہوئے دلاور نے اس طرح دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ بند کر لیا کہ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی اور غالباً وہ یہی چاہتا بھی تھا۔ اُس نے میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر بات بدل دی تھی۔ مجھے ہنستا ہوا دیکھ کر اُس نے اپنے منہ سے ہاتھ ہٹا لئے اور بولا۔ "کیا غضب ناک ہنستی ہیں آپ! معلوم ہوتا ہے جیسے ہر طرف پھول ہی پھول کھل اُٹھے ہوں۔"

"اور اپنی ہنسی پر غور کیا ہے تم نے کبھی!" مجھے بھی شرارت سوجھ گئی۔ "اس طرح ہنستے ہو جیسے کوئی ڈبہ سیڑھیوں سے لڑھک رہا ہو!" پھر میں نے اُس کی ہنسی کی نقل اُتاری۔

"کمال ہے!" وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ "آپ کی اس صلاحیت پر غور ہی نہیں کیا تھا کبھی۔ آپ تو پنجابی فلموں کی ہیروئن بن سکتی ہیں۔ بس تھوڑا سا ناچنا سیکھ لیں۔ جہاں تک ناچتے ہوئے لمبی سے لمبی اُچھال مارنے کا سوال ہے تو اس کا پہلے ہی تجربہ ہے آپ کو! بات کروں کسی پنجابی فلم پروڈیوسر سے؟"

"ویسے ایک بات بتاؤ دلاور!" میں بھی سنجیدگی سے بولی۔ "ٹلنے کا کیا لو گے؟"

"میں جانتا ہوں آپ کو اچھی طرح۔ وعدہ کر کے مکر جائیں گی۔ کچھ دیں گی ویں گی نہیں آپ!"

"مجھے واقعی کام تھا اس وقت! برا نہ ماننا۔" میں سنجیدہ رہی کہ کہیں وہ پھر مجھے پنجابی فلموں کی ہیروئن نہ بنانے لگے۔

"برا کیا ماننا ہے اب! صبر کر لیا ہے آپ کو! مگر وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ لگا رہ دل کنارے سے، کبھی تو لہر آئے گی والا معاملہ ہے۔" یہ کہتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

اُسی وقت فاطمہ میرے لئے چائے لے آئی۔ میں نے دانستہ ملک دلاور سے بھی تکلفاً مزید رُکنے کو نہیں کہا، مگر وہ بھی خوب ہی شخص تھا، ڈرائنگ رُوم کے دروازے تک پہنچ کر مُڑا اور بڑی مظلوم نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "ہاں بولو، کچھ اور کہنا ہے؟"

"روکیں گی نہیں؟" اُس نے اس طرح کہا کہ میں نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

"سوری! اس وقت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے مجھے فاطمہ کا خیال بھی تھا۔ میرے اشارے پر وہ چائے واپس لے جا رہی تھی۔ ملک دلاور اُسے راستہ دینے کے لئے ایک طرف ہو گیا تھا۔ فاطمہ کے جانے کے بعد اُس نے طویل سانس لے کر غالب کا ایک شعر پڑھا

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی

میں ایسی بن گئی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اور وہ شعر پڑھ کر ڈرائنگ رُوم سے نکل گیا۔

دلاور چلا گیا تو میں پھر اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔

شیخ مجید سے میری ملاقات نہیں تھی، لیکن اتنا یقین ضرور تھا کہ اُس نے کم از کم میرا نام تو سنا ہی ہو گا۔ یہی سوچ کر رات کو تقریباً دس بجے میں نے اُسے فون کیا۔ لائن مسلسل انگیج تھی، پھر بھی چار پانچ منٹ کی کوشش کے بعد نمبر مل ہی گیا۔

"ہیلو! مجھے شیخ صاحب سے بات کرنا ہے۔ وہ تشریف رکھتے ہیں اس وقت؟" میں نے دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز سن کر کہا۔

"کون بول رہی ہیں آپ؟" مجھ سے پوچھا گیا۔

"میں عذرا خان ہوں، عذرا انٹر پرائزز کی پروپرائیٹر۔ شیخ صاحب سے کچھ ضروری بات کرنا تھی مجھے۔" میں بولی۔

"وہ ابھی آئے ہیں ڈنر سے! ہیں تو سہی، لیکن......" دوسری طرف سے بولنے والا کچھ تذبذب کا شکار معلوم ہو رہا تھا۔

"دیکھیں آپ اُنہیں میرا نام بتا دیں، اگر وہ بات کرنا نہیں چاہیں گے تو میں اصرار نہیں کروں گی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اُن کے سیکرٹری سے پوچھتا ہوں، غالباً آپ نے وقت نہیں لیا۔"

"گستاخی معاف! ٹیلی فون کرنے کے لئے وقت لینے کا مطلب نہیں سمجھی میں۔" مجھے اُس شخص پر غصہ آنے لگا۔ "آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"مشتاق احمد۔ بہنوئی ہوں میں اُن کا!" وہ مرعوب کن لہجے میں بولا، یوں جیسے شیخ مجید کا بہنوئی نہ ہو، گورنر یا کسی ریاست کا سابق نواب ہو۔ پھر اُس نے کہا۔ "ہولڈ کیجئے!"

میرے لئے ایسی کوئی بھی صورتِ حال متوقع تھی۔ جو لوگ بڑے عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں ان کے لواحقین ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔ کچھ دیر بعد فون پر ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "ہیلو! شیخ مجید بول رہا ہوں میں۔ فرمائیے!"

"آداب!" میں بولی۔

اُس نے بھی جواباً با اخلاق ہونے کا مظاہرہ کیا، پھر بولا۔ "نام تو سنا ہوا ہے آپ کا، ملاقات نہیں ہوئی کبھی۔ کوئی کام ہے مجھ سے؟"

"میں ملنا چاہتی تھی آپ سے۔"

"اس بار تو مشکل ہے، پرسوں یہاں سے اسلام آباد پہنچنا ہے۔ وہاں صدر صاحب......"

"قطع کلامی کی معافی چاہتی ہوں، مجھے معلوم ہے آپ بے حد مصروف آدمی ہیں اور آپ کا یہ دورہ بھی مختصر ہے۔ اس وقت بھی آپ کی پارٹی کے کچھ افراد ملنے آنے والے ہیں، غالباً سوا دس بجے کا وقت دیا ہے آپ نے اُن کو، اس کے باوجود آپ سے میری ملاقات بہت ضروری ہے۔"

''آپ یقیناً بہت باخبر خاتون معلوم ہوتی ہیں۔'' اُس کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔ ''مگر سوری! آج ملاقات ممکن نہیں۔ ہاں کل کسی وقت...... مگر کل بھی...... آپ ایسا کیجئے، میں اپنے سیکرٹری سے آپ کی بات کرائے دیتا ہوں، اُسے میرے اپائنٹمنٹس کا علم ہے۔ کل کا کوئی وقت دے دے گا آپ کو، وہ بھی اس صورت میں کہ یہ ممکن ہو۔''

''سنیے!'' میں فوراً بول اُٹھی۔ ''کل تک کیا حالات پیش آئیں، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے کل مل ایریئے کا دورہ کرتے ہوئے یا پھر نشتر پارک میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے خدانخواستہ آپ کسی حادثے کا شکار ہو گئے تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔''

''کیا مطلب؟...... کہنا کیا چاہتی ہیں آپ؟'' شیخ مجید کا لہجہ سخت ہوگیا۔ ''شاید آپ بھول رہی ہیں کہ کس سے بات کررہی ہیں۔''

''جی مجھے علم ہے کہ آپ پریذیڈنٹ کے قریبی مشیروں میں سے ایک ہیں۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ انہی قریبی مشیروں میں سے ایک پہلے سے یہاں موجود ہے۔ میری مراد محترم شہریار سے ہے۔ غالباً آپ بھی اُنہیں اچھی طرح جانتے ہوں گے۔'' میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''سنا ہے آپ سے بڑی دوستی ہے اُن کی۔''

چند لمحے دوسری جانب خاموشی رہی۔ غالباً شیخ مجید بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اُسے خطرے کا احساس دلا دیا تھا۔ میں خاموش رہی کہ اب وہی کچھ بولے تو بات کروں۔ چند ہی لمحے بعد اُس کی آواز پھر سنائی دی۔ ''غالباً پیش گوئیوں کے سلسلے میں آپ کا نام سنا ہے میں نے۔ شاید آپ نے پریذیڈنٹ کینیڈی کے قتل کی پیش گوئی کی تھی۔ بہرحال میں ان خرافات پر یقین تو نہیں کرتا۔ لیکن ایسی ہی کوئی بات ہے تو آپ فون ہی پر اس وقت بھی بتا سکتی ہیں۔''

میری پیش گوئیوں کو وہ خرافات بھی کہہ رہا تھا اور اپنے بارے میں پیش گوئی سننے کا بھی منتظر تھا۔ اُس کے لہجے کا کھوکھلا پن بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے کمزور قسم کا آدمی ہے۔ میں نے اُس کی اسی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ غالباً مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں اُن پیشہ ور قسم کے پیش گویوں میں سے نہیں ہوں جو اپنا کاروبار چمکانے کے لئے آئے دن پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی پیش گوئی تو صحیح ثابت ہو ہی جائے گی۔ اس سے قطع نظر نہ میں کسی سپر پاور کی ایجنٹ ہوں کہ وہاں سے ڈوری ہلائے جانے پر کوئی ایسی پیش گوئی کر دوں جس کے لئے مجھے بریف کیا جاچکا ہو۔ بہرحال آپ کے پاس ملاقات کا وقت نہیں تو مجبوری ہے۔ آپ کے ساتھ جو بھی پیش آنے والا ہے، خود اُس کے ذمہ دار ہوں گے۔ میرا مقصد تو محض یہ تھا کہ آپ کا حریف گروپ کہیں......''

''ٹھہریں!'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''فون پر اس طرح کی گفتگو مناسب نہیں ہے۔ آپ مل ہی لیں مجھ سے۔ ذرا ہولڈ کریں، میں اپنے سیکرٹری سے......''

''سوا دس بجے کے بعد کوئی اپائنٹمنٹ نہیں۔'' میں پُر یقین لہجے میں بولی۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں گیارہ بجے آجاتی ہوں۔''

''ہاں ٹھیک ہے، اس وقت سوا دس بجنے والے ہیں، میں نے شاید آدھے گھنٹے کا وقت دیا ہے اُن لوگوں

کو۔''

''میں ٹھیک گیارہ بجے پہنچ جاؤں گی۔ خدا حافظ!'' یہ کہتے ہی میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں اُسے مزید کچھ کہنے کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔

اس گفتگو کے بعد تقریباً ساڑھے دس بجے میں اپنی کوٹھی سے کار میں بیٹھ کر نکلی۔

میں نے دانستہ باوردی ڈرائیور کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ شیخ مجید جیسے لوگ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے مرعوب ہوتے ہیں، یہ مجھے معلوم تھا۔ بظاہر غریب عوام کے ہر دُکھ میں شریک ہونے کا دعویٰ کرنے والے دراصل اندر سے کتنے بچے ہوتے ہیں، مجھے اس کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ دولت و اقتدار کو وقتی کہنے والے کس طرح ان پر جان چھڑکتے ہیں، میں نے اس کا بھی بہت مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ مجید سے میں کبھی نہیں ملی تھی اور نہ کبھی اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ ممکن ہے وہ ایسا نہ رہا ہو۔ لیکن فون پر گفتگو سے میں نے یہی تاثر قبول کیا تھا کہ وہ بھی نمود و نمائش پسند ہے۔

میں نے اپنے ڈرائیور کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بتائے ہوئے پتے پر گیارہ بجے پہنچنا ہے اس لئے وہ بہت اطمینان سے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اُس نے مجھے ٹھیک گیارہ بجے ہی باتھ آئی لینڈ کی اُس کوٹھی تک پہنچا دیا جس میں شیخ مجید ٹھہرا ہوا تھا۔

شیخ مجید میرا ہی منتظر تھا۔ اُسے پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اخبارات میں اُس کی تصویریں چھپتی ہی رہتی تھیں۔ ڈرائنگ رُوم میں وہ اس وقت تنہا نہیں تھا، دو افراد اور بھی موجود تھے۔ وہ دونوں اُس کے قریبی عزیز ہی لگتے تھے۔ ایک تو اُن میں سے شاید وہی تھا جس سے فون پر میری بات ہوئی تھی، یعنی شیخ مجید کا بہنوئی اور دوسرا بھی اُسی کا کوئی ''اَدھا پونا'' معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس طرح اکڑے ہوئے بیٹھے تھے جیسے میرا انٹرویو لینے والے ہوں۔ شیخ مجید بھی مجھ سے کچھ زیادہ پُرتپاک انداز میں نہیں ملا تھا۔ اس کے علاوہ مجھ سے اُس نے وہاں موجود افراد کا تعارف بھی نہیں کرایا تھا۔

میں جب اُن کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی تو اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''جی اب فرمائیے! آپ فون پر کیا کہہ رہی تھیں؟ یہ خیال رکھئے گا کہ مجھے آج جلدی سونا ہے، وقت کم ہے میرے پاس۔ جو بھی کہیں اختصار سے کام لیں۔''

مجھے اُس کا طرزِ گفتگو ناگوار تو محسوس ہوا مگر عموماً میں لوگوں کو اتنا مارجن دے دیتی ہوں کہ وہ وقتی نمود و نمائش کا مظاہرہ کرسکیں۔ خصوصاً سیاست سے وابستہ افراد تو کچھ زیادہ ہی پوز کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں ایسے لوگوں کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی، لیکن اس وقت مسئلہ مختلف تھا۔ پھر یہ کہ وہ مجھ سے پوری طرح متعارف نہیں تھا۔ میں نے اُس کی بات سن کر اپنے چہرے پر ناگواری کے تاثر کو نہ اُبھرنے دیا اور مسکرا کر بولی۔ ''شیخ صاحب! میرا خیال ہے کہ گفتگو کے لئے خلوت ضروری ہے۔''

''انہیں غیر نہ سمجھیں آپ۔ ان حضرات میں سے ایک وہ...... میرے بڑے بہنوئی ہیں۔ اور یہ جو اِدھر بیٹھے ہیں ہم زُلف ہیں میرے! آپ بلاجھجک بات کریں۔'' شیخ مجید نے کہا۔

''یقیناً آپ درست کہہ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں پھر یہی عرض کروں گی کہ یہ معاملہ ذرا مختلف

ہے۔ اگر آپ مجھ سے تنہائی میں بات کرلیں تو زیادہ بہتر ہے، آپ کے حق میں بھی اور شاید میرے حق میں بھی۔'' میں نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

''آپ کہتی ہیں تو......'' یہ کہہ کر شیخ مجید معذرت خواہانہ انداز میں اُن دونوں کی طرف دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''بھائی صاحب! اگر آپ برا نہ مانیں تو......''

''کوئی بات نہیں!'' ادھیڑ عمر شخص ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے منہ میں دبے ہوئے پائپ کا گہرا کش لے کر بڑبڑایا۔ ''کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ خود کو ہر موقع پر اہم ثابت کرسکیں۔'' یہ ادھیڑ عمر شخص ہی شیخ مجید کا بہنوئی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس کی آواز سے پہچان لیا تھا۔ وہی شیخ مجید کے ہم زُلف کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

میرا جی تو چاہتا تھا کہ اُسے جھاڑ دیتی مگر اپنا غصہ پی ہی گئی۔ وہ نہ جانے خود کو کیا سمجھ رہا تھا۔

بڑے بہنوئی کی ناراضگی کا ردِعمل شیخ مجید پر بھی ہوا۔ اُس کے لہجے میں رُوکھا پن آگیا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ ''اب آپ کو جو کہنا ہے جلدی سے کہہ دیں! جی؟''

''میرے علم واطلاع کے مطابق آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔'' میں نے بات شروع کی۔

''علم واطلاع کی وضاحت کریں گی آپ؟'' اُس نے مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''نہیں۔'' میں نے دوٹوک جواب دیا۔

''پھر آپ کو مجھ سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ میں آپ کی باتوں پر یقین کرلوں گا۔''

''مجھے آپ سے قطعی یہ توقع نہیں اور نہ میں اس سلسلے میں اصرار کروں گی۔''

''پھر...... پھر کیا چاہتی ہیں آپ؟''

''مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، کہہ چکی ہوں۔ مزید یہ کہہ سکتی ہوں کہ کل آپ کے جو **اپائنٹمنٹس** ہیں اُنہیں کینسل کردیں۔ کل شام آپ نشتر پارک میں جلسہ عام سے خطاب نہ کریں۔''

''خوب ہیں آپ بھی!'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''بے بنیاد، بے سبب باتیں ہیں آپ کی۔ مجھے تو کوئی تک نظر نہیں آتی ان باتوں میں۔''

''اگر آپ میری پیش گوئی بے تکی سمجھ رہے ہیں تو سمجھا کریں۔ آپ سے میری کوئی غرض وابستہ نہیں، جو چاہیں کریں۔ میرا جو فرض تھا، میں نے ادا کردیا۔'' میرا لہجہ بھی بدل گیا۔

میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر تفکر کے آثار نظر آنے لگے۔ میری بات کا اُس پر متوقع اثر ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔ ''آپ فون پر شہر یار کے بارے میں بھی غالباً کچھ کہہ رہی تھیں۔''

''جی!'' میں نے اُس کی بدلتی ہوئی ذہنی کیفیت کو محسوس کرلیا۔ ''دراصل مجھے اپنے ذہن کی غیر معمولی قوتوں کی وجہ سے کچھ ایسی باتیں معلوم ہوگئی ہیں جو میرے ملک کی خارجہ پالیسی کے رُخ کو متعین کرسکتی ہیں۔ میں جلد ہی اس سلسلے میں صدرِ محترم سے بھی ملنے کا ارادہ رکھتی ہوں کہ اُنہیں صورتِ حال سے آگاہ کرسکوں۔ محترم وزیر داخلہ سے میری بات ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی یہ ملاقات اُن کے توسط سے ہو جائے گی، مگر فی الحال میرا کراچی میں رہنا ضروری ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کن انکھیوں سے میں، شیخ مجید کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ اب

مجھے اُس کے چہرے پر سختی کی بجائے مرعوب ہونے کا تاثر نظر آ رہا تھا۔ صدرِ مملکت سے ملاقات کا ذکر اور وزیر داخلہ کا حوالہ سودمند ثابت ہوا تھا۔

''آپ کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ بہت کچھ جانتی ہیں، کیسے؟ یہ سوال یقیناً میرے لئے حیران کن ہے، اس کے باوجود کہ آپ اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کا ذکر بھی کر چکی ہیں، دراصل میں بڑا پریکٹیکل سا آدمی ہوں۔ ذاتی طور پر کبھی مجھے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ ممکن ہے آپ کا بیان درست ہو اور اس کا امکان بھی ہے کہ کوئی اور بات ہو۔ بہرحال میں آپ پر شک کا اظہار نہیں کر رہا، صرف کچھ باتوں کی وضاحت چاہتا ہوں۔'' شیخ مجید میری بات سن کر قدرے بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

اُسے گھاٹ پر آتے دیکھ کر میں نے کہا۔ ''فرمایئے! کس بات کی وضاحت چاہتے ہیں آپ؟ اگر میرے علم میں وہ بات ہوئی تو یقیناً جواب دینے سے گریز نہیں کروں گی۔''

''آپ نے ابھی ملک کی خارجہ پالیسی کا ذکر کیا تھا، اس کے رُخ سے کیا مراد تھی آپ کی؟'' اُس نے پہلا سوال کیا۔

''ہرچند کہ یہ گفتگو آپ سے نہیں محترم صدرِ مملکت سے ہونا ہے، اس کے باوجود کچھ سامنے کی باتیں آپ سے بھی کی جاسکتی ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے طویل سانس لیا۔

''آپ کچھ پینا پسند کریں گی؟'' وہ درمیان میں بول اُٹھا۔

''جی نہیں شکریہ!'' میں بولی، پھر مسکرا کر کہا۔ ''یوں بھی آپ کے پاس وقت کم ہے۔''

وہ آہستہ سے ہنس دیا، ہنسی میں خجالت کا تاثر بھی تھا۔ پھر اُس نے مجھے ٹوکا۔ ''ہاں تو کچھ کہہ رہی تھیں آپ؟''

''جی!'' میں نے کہا۔ ''دراصل وہ سامنے کی بات یہ ہے کہ دونوں سپر پاورز اِسی ملک میں نہیں، تمام ہی ترقی پذیر ممالک میں اپنا اثر ورسوخ برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ مجھ سے بہتر خود آپ یہ بات سمجھتے ہیں۔'' میں بہت نپے تلے الفاظ میں بات کر رہی تھی۔ ''دونوں بڑی طاقتوں کے سیاسی نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے، یہ بھی کوئی الگ چھپی بات نہیں ہے۔ یوں کہ افراد چاہے برسرِ اقتدار ہوں یا اقتدار سے اُن کا کوئی تعلق نہ ہو، کسی نہ کسی ذریعے سے ضرور اثر قبول کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس وقت بھی مختلف نظریات کے حامل افراد صدرِ مملکت کے اردگرد ہوں۔ یہ فطری بات ہے کہ ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسرے کو بھی اپنا ہم خیال بنالے یا بہ الفاظ دیگر اس کی فکر کا رُخ بھی اپنے نظریات کی طرف موڑ دے۔ واضح طور پر میں یہ عرض کروں گی کہ مجھے اپنی حیرت انگیز ذہنی قوتوں کی وجہ سے معلوم ہوا ہے کہ ان دنوں ایوانِ حکومت میں یہی کشاکش جاری ہے۔ نتیجتاً کسی بھی نظریئے کے حامل گروپ کو اس سلسلے میں بہرحال برتری حاصل ہو جائے گی۔ اس کا انحصار ان افراد کی صلاحیت، خلوصِ نیت اور صدرِ مملکت سے قربت پر ہے۔ بائیں بازو کا پلہ بھاری رہتا ہے یا دائیں بازو کا؟ ملک کی خارجہ پالیسی اسی ایک سوال کے گرد گھومتی ہے۔ جہاں تک مجھے آپ کے بارے میں علم ہے، آپ کا تعلق بایاں بازو سے ہے اور یہ بھی کہ آپ بھی صدرِ مملکت کے قریبی لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں، مگر آپ سے کچھ حریف بھی صدرِ مملکت کے بہت قریب ہیں، اُنہی میں سے ایک شہر یار ہے جسے میں بہ وجوہ راہِ راست پر تصور نہیں کرتی۔

آپ اور آپ کے علاوہ ایک اور اہم شخصیت راستے سے ہٹ جائے تو شہر یار کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔ آپ میری بات پر یقین کریں یا نہ کریں، اُس شخص نے آپ کو فی الحال راستے سے ہٹانے کا پورا بندوبست کر دیا ہے، اس طرح کہ آپ کی موت ایک حادثہ معلوم ہو۔ مجھے یہ سب کچھ اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے معلوم ہوا ہے۔ اس لئے اس بات میں مزید کوئی ثبوت پیش کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ عرض نہیں کر سکتی۔ غالباً آپ مجھ سے جو وضاحتیں چاہتے تھے، وہ میں نے آپ کے ایک ہی سوال کے جواب میں بیان کر دی ہیں۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گئی۔

شیخ مجید میرے چپ ہوتے ہی فوراً بول اُٹھا۔ "مجھے اس سے انکار نہیں کہ آپ کی اطلاعات قطعی درست ہیں، مگر شاید آپ مجھے انڈر اسٹیمیٹ کر رہی ہیں، مجھے بھی اور میرے اُن دوستوں کو بھی جو میرے ہم نوا و ہم خیال ہیں۔ یہ شہر یار جیسے سازشی ذہن رکھنے والے افراد ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپ دیکھیں گی کہ آخری فتح ہماری ہو گی۔ کیونکہ ہم واقعی اپنے ملک و قوم کے ساتھ مخلص ہیں۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اُس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ وہ بہرحال ایک سیاسی لیڈر تھا اور ایسی ہی جذباتی باتیں عوام کو بھی پسند آتی ہیں۔ مگر میں جذبات کے ساتھ عقل کو بھی رہنما بنانے کی قائل ہوں اس لئے مجھ پر اس جذباتی فقرے کا کوئی زیادہ اثر نہیں ہوا۔

"تو پھر آپ کو مشورہ قبول نہیں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ "یعنی یہ کہ کل آپ نشتر پارک میں ضرور تقریر کریں گے؟"

"مجبوری ہے خاتون!" وہ بے جھجک بولا۔ پھر وہ دوبارہ جذباتی ہو گیا۔ "اگر ایک شیخ مجید کو راستے سے ہٹا بھی دیا گیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سینکڑوں شیخ مجید پیدا ہو جائیں گے۔"

"لیکن اس سے آپ کے کاز کو وقتی طور پر ہی سہی نقصان تو پہنچے گا۔" میں نے اُسے سمجھانا چاہا۔

"ممکن ہے، چند روز قبل آپ سے ملاقات ہو جاتی جو ممکن نہ تھا، تو شاید میں آپ کی بات مان لیتا، لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کل کے تمام اخبارات میں جلسے کا اعلان شائع ہو رہا تھا۔ میں لوگوں کو مایوس نہیں کر سکتا۔" اُس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"اگر خدانخواستہ آپ علیل ہو جائیں تو؟...... ایسی صورت میں تو جلسہ ممکن نہیں ہو گا!" میں نے اُسے ایک اور راہ سجھانا چاہی۔

"میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" اُس نے سر ہلا کر کہا۔ "لیکن اپنے آپ کو اور اپنے عوام کو دھوکہ دینا میرے لئے قطعی ممکن نہیں۔"

پھر میں مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد اُٹھ گئی۔ شیخ مجید بلاشبہ میرے لئے مشکل ثابت ہوا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شاید میں اُسے اپنی بات ماننے پر مجبور کر دوں گی۔ اور یوں مجھے مزید بھاگ دوڑ سے نجات مل جائے گی۔ مگر اب ایسا نہیں رہا تھا۔ آج ہی رات مجھے خان اور ابرار ٹیڈی کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا تھا تا کہ وہ کل کوئی ایسا قدم نہ اُٹھا سکیں جو شیخ مجید کے لئے خطرناک ثابت ہو۔

شیخ مجید سے رخصت ہوتے وقت میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مجھ سے متاثر ہو چکا ہے۔ اُس نے میرا فون نمبر اور پتہ بھی نوٹ کر لیا تھا اور یہ اصرار بھی کیا تھا کہ میں اُس سے پھر ملوں۔ میں "ہوں ہاں" کر کے چلی

آئی تھی۔ اس وقت میرا ذہن دراصل کہیں اور ہی تھا۔

اپنی کوٹھی پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔ ہنگامی حالات کے پیش نظر اب صرف ایک ہی امکانی صورت رہ گئی تھی کہ خان اور ابرار ٹیڈی پر براہِ راست ہاتھ ڈال دیا جائے۔ عموماً سول انتظامیہ بھی ایسے مواقع پر یہی طریقہ کار اختیار کرتی ہے۔ حکام کو جب امن و امان بحال رکھنا ہوتا ہے تو ایسے عناصر کو پہلے ہی زیرِ دام لے آتے ہیں۔ اس نتیجے پر پہنچ کر میں نے فون پر کمانڈر نواز کو احکام دیئے کہ خان اور ابرار ٹیڈی کو دو تین دن کے لئے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا "مہمان" بنا لیا جائے۔ یہ کام بہرصورت آج رات ہونا تھا۔ اُن دونوں کے تمام کوائف آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے۔ کمانڈر نواز کو میں نے یہ حکم بھی دیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس سلسلے میں رپورٹ دو، آیا وہ دونوں گرفت میں آ گئے کہ نہیں؟

رات کو تقریباً تین بجے تک میں اپنی خواب گاہ سے متصل سٹوڈیو میں پینٹنگ سے جی بہلاتی رہی۔ مجھے کمانڈر نواز کے فون کا انتظار تھا اسی کے بعد میں سکون سے سو سکتی تھی۔ تین بجے فون کی گھنٹی بجی تو میں نے برش رکھ کر قریبی تپائی پر موجود فون کا ریسیور اُٹھا لیا۔ توقع کے مطابق مجھے فون کرنے والا کمانڈر نواز ہی تھا۔

"ہاں کہو!" میں نے اُس کی آواز پہچان کر کہا۔

"آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟" وہ بولا۔

"رپورٹ پلیز!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ایسے موقعوں پر مجھے غیر ضروری باتیں یا ذاتی قسم کے سوال قطعی پسند نہیں آتے اسی لئے میں کچھ جھنجھلا گئی تھی۔

"سوری!" اُس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ پھر اُس نے بتایا۔ "خان تو ہاتھ آ گیا مگر ابرار ٹیڈی نہیں ملا۔ ہمارے آدمیوں نے اُس کا ایک ایک ٹھکانہ دیکھ لیا۔"

"پھر؟"

کمانڈر نواز میرے سوال سے کچھ گڑبڑا گیا۔ شاید اُسے اس سوال کی توقع نہیں رہی ہو گی۔ وہ بولا۔ "پھر...... پھر کیا...... کیا جائے؟ آپ...... آپ حکم دیں!"

"تم لوگ کب تک میری اُنگلی پکڑ کر چلتے رہو گے؟ خود نہیں سوچ سکتے کہ کیا کرنا چاہئے؟" میرے لہجے میں سختی تھی۔

"اُسے...... اُس کی تلاش جاری ہے اب تک! وہ...... جب بھی ہاتھ آ گیا......"

"اور ہاتھ نہ آیا تو؟"

"تو...... تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہم...... ہم شیخ مجید کے گرد حفاظتی حصار قائم کر دیں۔"

"اب آئے نا تم راہ پر!" میرے لہجے میں نرمی آ گئی۔ "اپنی پوری فورس کے ساتھ تمہیں کل صبح سے شیخ مجید کے اِرد گرد رہنا ہے۔ اس کے لئے تم کیا طریقہ کار اختیار کرتے ہو، یہ میں تم پر چھوڑتی ہوں۔ دوسری جانب ابرار ٹیڈی کی تلاش جاری رہنی چاہئے۔ اِس وقت تین بجے رہے ہیں، تم کسی کو بھی چارج دے کر کچھ دیر سو لو تا کہ صبح تمہارا ذہن اتنا ڈل نہ رہے جتنا اس وقت ہے۔"

"ایک بات اور پوچھنا تھی آپ سے!" میرے خاموش ہوتے ہی اُس نے کہا۔

"بولو!"

"آپ نے ولیم کے لئے کوئی حکم نہیں دیا!"

"وہ اس معاملے سے الگ رہے گا۔ اور اگر اُس نے کوئی قدم اُٹھایا بھی تو وہ ہمارے ہی حق میں ہوگا۔ یوں بھی وہ زخمی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے مختصراً اُسے ولیم سے اپنی معرکہ آرائی کا حال بتا دیا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" میری بات سن کر اُس نے اطمینان کا اظہار کیا۔

"غالباً تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تمہارے آدمیوں کو شیخ مجید کے اردگرد رہنے کے باوجود پولیس فورس، انٹیلی جنس اور دوسرے اداروں کی نظر میں نہیں آنا۔" میں نے تاکیداً کہا۔

"جی، میں جانتا ہوں۔" وہ بولا اور اسی کے ساتھ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ پینٹنگ ادھوری ہی رہ گئی جس پر میں دو ڈھائی گھنٹے سے کام کر رہی تھی۔ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے لائٹ آف کی اور اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔ ابرار ٹیڈی کے لاپتہ ہونے کی وجہ سے میرا ذہن اُلجھ ضرور گیا تھا، مگر میں اتنی تھکی ہوئی تھی کہ جلد ہی نیند آ گئی۔

صبح کوئی آٹھ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی۔ ناشتہ کرتے ہوئے میں نے اس دن کا لائحہ عمل اپنے ذہن میں ترتیب دے لیا۔ تقریباً ساڑھے نو بجے میری کار، آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں داخل ہو رہی تھی۔

عثمانی کی جگہ مجھے کیپٹن شاد ڈیوٹی پر ملا۔ میں سیدھی کنٹرول روم ہی میں آ گئی تھی۔ خلاف توقع مجھے وہاں دیکھ کر کیپٹن شاد پہلے تو کچھ نروس سا نظر آیا، پھر اُس نے مجھے مسکراتے دیکھ کر خود پر قابو پا لیا۔

"بیٹھو...... بیٹھ جاؤ اپنی سیٹ پر!" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بیٹھنے کو کہا اور پھر ایک جانب دیوار کے سہارے رکھی ہوئی آرام کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

"مجھے کمانڈر نواز نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ...... آپ یہاں تشریف لائیں گی۔" کیپٹن شاد میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس لئے کہ خود میں نے اُسے یہ اطلاع نہیں دی تھی۔" میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے اطمینان سے بولی۔

"ویسے میری آمد سے تمہیں بور تو نہیں ہونا چاہئے۔"

"بور... جی... جی نہیں... قطعی نہیں۔ میں... میں تو بڑا خوش ہوا کہ..." اُس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں اُس کی بوکھلاہٹ پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اکثر چور نظروں سے مجھے دیکھتا ہے۔ اُس کے لئے میری آمد سے لذتِ دید کا سامان فراہم ہو گیا تھا، غالباً یہی کہتے کہتے وہ رُک گیا تھا۔ اُس دل پھینک قسم کے نوجوان میں یہی خامی تھی ورنہ وہ انتہائی ذہین اور باحوصلہ تھا۔ میں بھی اُسے دانستہ طرح دے جاتی تھی، یہ سوچ کر کہ آدمی بہرحال آدمی ہوتا ہے، پتھر نہیں اور آدمی کے سینے میں دل بھی دھڑکتا ہے۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا رُخ میں نے اس لئے کیا تھا کہ مجھے براہِ راست ایک ایک لمحے کی رپورٹ ملتی رہے اور ضروری احکام بھی دے سکوں۔ عورت ہونے کے ناتے میرے لئے بذاتِ خود یہ ممکن نہیں تھا کہ شیخ مجید کے اردگرد رہ سکتی۔ اس طرح میں فوراً نظر میں آ سکتی تھی۔ نشتر پارک کی بھیڑ بھاڑ میں بھی اسی سبب میرا نہ ہونا بہتر تھا۔ اس معاملے میں مجھے بہرحال کمانڈر نواز پر بھروسہ کرنا تھا۔ اس سے قطع نظر مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ

میں شیخ مجید کو خطرے سے آگاہ کر چکی ہوں۔ انتظامیہ بھی پوری طرح مستعد و چوکنا ہوگی۔

مجھے ابھی وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ کیپٹن شاد پینل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹرانسمیٹر پر دوسری جانب سے کنٹرول روم کو رپورٹ دینے والا کمانڈر نواز تھا۔ اُس نے اطلاع دی تھی کہ شیخ مجید باتھ آئی لینڈ سے مل ایریئے کا دورہ کرنے روانہ ہو چکا ہے۔

اس کے بعد دوپہر ساڑھے بارہ بجے تک وقفے وقفے سے رپورٹس موصول ہوتی رہیں۔ ان رپورٹس کے مطابق مل ایریئے کے دورے کے دوران میں شیخ مجید کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ حفاظتی انتظام ایسا تھا کہ کوئی بھی غیر متعلق شخص، شیخ مجید کے قریب نہیں پہنچ سکتا تھا۔ شیخ مجید کی اطراف پہلا حلقہ پارٹی کے اُن مسلح نوجوانوں کا تھا جن پر پورا اعتماد کیا جا سکتا تھا، دوسرا مرحلہ مقامی سی آئی ڈی اور مرکزی انٹیلی جنس والوں کا تھا۔ تیسرے حلقے میں سیل کے ارکان تھے جو مزدوروں میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد پولیس والے تھے۔ اسی دوران میں شیخ مجید واپس باتھ آئی لینڈ پہنچ چکا تھا۔ اب پروگرام کے مطابق اُسے شام ہی کو نشتر پارک کے جلسے میں تقریر کرنے وہاں سے نکلنا تھا۔ مجھے کیونکہ شام تک وہیں رہنا تھا اس لئے کنٹرول روم سے اُٹھ کر اُس ساؤنڈ پروف کمرے میں آ گئی جو عموماً میرے ہی استعمال میں رہتا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد میں نے وہیں کمرے میں کھانا منگوا کر کھایا، پھر میں انٹرکام پر کیپٹن شاد کو یہ حکم دے کر سو گئی کہ شام کو چار بجے وہ انٹرکام کا بٹن دبا کر مجھے جگا دے۔ اس کے علاوہ اگر اس عرصے میں کوئی خاص رپورٹ ملے تو بھی فوری طور پر مجھے اس سے مطلع کیا جائے۔

شام تک میں اطمینان سے سوتی رہی اور پھر چار بجے ہی میری ہدایت کے مطابق کیپٹن شاد نے مجھے جگایا۔ اس دوران میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

"ابرار ٹیڈی کا کوئی سراغ ملا؟" میں نے انٹرکام پر کیپٹن شاد سے پوچھا۔

"کمانڈر نواز نے اُس کی تلاش کا کام سرفراز کے سپرد کیا تھا۔" کیپٹن شاد بتانے لگا۔

"ہوں، تو پھر کیا رہا، یہ بتاؤ! تم خواہ مخواہ گفتگو کو طول دینے کے عادی ہو۔ اس عادت کو بدلو کیپٹن! کم از کم مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے تمہیں فضول باتوں سے گریز کرنا چاہئے!" میں نے دانستہ اُسے جھاڑ پلا دی۔ وہ عموماً مجھ سے زیادہ دیر تک بات کرنے کے مواقع کی تلاش میں رہتا تھا اور اس کے پیچھے وہی جذبہ کارفرما تھا جس کا میں ذکر کر چکی ہوں۔

"بجا فرمایا آپ نے!" کیپٹن شاد کی آواز سنائی دی۔ "آئندہ گریز کروں گا اس سے میں۔"

"اوکے! سرفراز کے بارے میں بتاؤ، وہ کامیاب ہوا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اُس نے اطلاع دی ہے کہ ابرار ٹیڈی آج اپنے لانڈھی والے ٹھکانے پر دیکھا گیا ہے۔ اس وقت سرفراز وہیں گیا ہے۔"

"اب اگر کمانڈر نواز تم سے رابطہ قائم کرے تو کہنا، ابرار ٹیڈی جلسے میں نظر آ جائے تو کسی بھی طرح اُسے فوری طور پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جائے، چاہے اس کے لئے کوئی بھی صورت اختیار کرنی پڑے۔ ویسے امکان کم ہی ہے کہ وہ خود بھی وہاں ہو۔"

''بہتر جناب! اور کوئی حکم؟''

''نو!'' یہ کہہ کر میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھا اور باتھ رُوم کی طرف بڑھ گئی۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد دوبارہ کنٹرول رُوم میں پہنچ چکی تھی۔ وہیں میں نے چائے بھی لانے کو کہہ دیا تھا۔ مجھے کنٹرول رُوم میں دیکھ کر کیپٹن شاد کے چہرے پر بہار سی آ گئی۔ شاید اُس نے میری خفگی کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ میں اُس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر ابرار ٹیڈی کے بارے میں سوچنے لگی۔

کچھ دیر گزری تھی کہ کمانڈر نواز کی جانب سے رپورٹس آنا شروع ہو گئیں۔ کیپٹن شاد نے اُسے ابرار ٹیڈی کے بارے میں میرا حکم سنا دیا تھا۔ اسی اثناء میں سرفراز کی رپورٹ بھی ملی۔ رپورٹ کے مطابق ابرار ٹیڈی، لانڈھی سے بھی غائب ہو گیا تھا۔ آخری بار اُسے اُن ٹرک والوں سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا جو بجری لاتے لے جاتے ہیں۔ یہ اطلاع میرے نزدیک اہم تھی۔

شیخ مجید، باتھ آئی لینڈ سے نشتر پارک کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ میں نے کیپٹن شاد سے کہا۔ ''کمانڈر نواز سے کہو کہ وہ راستے میں بجری کے ٹرکوں پر نظر رکھے۔''

''جی...... بہتر ہے۔'' یہ کہہ کر کیپٹن شاد ٹرانسمیٹر پر کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ پھر جب رابطہ قائم ہو گیا تو اُس نے میرا حکم دُہرا دیا۔

دراصل میرا ذہن کسی حادثے کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔ تقریباً دس بارہ منٹ بعد ہی میرے اس خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ راستے میں ایک تیز رفتار ٹرک، شیخ مجید کی کار سے ٹکراتے ٹکراتے خود حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ اُس تیز رفتار ٹرک میں بجری ہی بھری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کار تک پہنچتا، کمانڈر نواز نے اُس کے دونوں پچھلے ٹائر فائر کر کے برسٹ کر دیئے تھے۔ ٹرک ڈرائیور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یا تو یہ ٹرک ڈرائیور خود ابرار ٹیڈی تھا یا پھر اُس کا کوئی خاص آدمی۔ ٹرک ایک پول سے ٹکرا کر بیچ سڑک پر رُک گیا تھا۔ کمانڈر نواز نے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے فائر کئے تھے اس لئے کسی کو اندازہ نہ ہو سکا کہ ایک دم کیا ہوا! ٹرک تیز رفتاری سے آگے بڑھتے ہوئے کسی طرح اچانک رُک گیا۔ لوگوں نے صرف ٹائر برسٹ ہونے کی آواز سنی تھی۔

کمانڈر نواز نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی بتایا تھا کہ شیخ مجید اُس کار میں نہیں تھا بلکہ وہ ایک فوکسی ویگن میں اپنی کار کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اگر کار کو حادثہ پیش آ بھی جاتا تو شیخ مجید کی زندگی بچ جاتی۔ یہ احتیاطی تدابیر انٹیلی جنس والوں کے ایماء پر کی گئی تھیں۔ میری دانست میں گولی بالکل کان کے قریب سے گزر گئی تھی۔

اس واقعے کے سبب شیخ مجید کو جلسہ گاہ تک پہنچنے میں صرف پانچ منٹ کی تاخیر ہوئی تھی۔ کمانڈر نواز پوری مستعدی سے اب گویا جلسے کا آنکھوں دیکھا حال ''نشر'' کر رہا تھا۔ کیپٹن شاد نے اُسے بتا دیا تھا کہ میں کنٹرول رُوم میں موجود ہوں۔

کوئی پون گھنٹے بعد کمانڈر نواز نے ٹرانسمیٹر پر اطلاع دی کہ شیخ مجید اب تقریر کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی تقریر میں واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ اُسے قتل کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ راستے میں جو حادثہ پیش آیا تھا، شیخ مجید نے اُس کا ذکر بھی کیا تھا اور اسے بھی قاتلانہ حملہ کہا تھا۔ اس پر زبردست کلیپنگ ہوئی تھی۔ پھر اس کلیپنگ کے

دوران میں یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے تھے۔ شیخ مجید پر فائرنگ کی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی جلسے میں ہلڑ مچ گئی تھی۔

کچھ دیر کمانڈر نواز بھی یہ رپورٹ نہ دے سکا کہ آیا شیخ مجید بچ گیا کہ نہیں؟ اُسے اُس کی پارٹی کے ارکان ہاتھوں ہاتھ وہاں سے نکال لے گئے تھے۔ تقریباً دس منٹ کے بعد یہ خبر ملی کہ شیخ مجید کو معمولی سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہاں اُس کی پارٹی کا ایک نوجوان رُکن ضرور شدید زخمی ہو گیا ہے جو پہلے فائر کے ساتھ ہی تیزی سے شیخ مجید کے سامنے آ گیا تھا۔ اُس کے شانے پر گولی لگی تھی۔ ابھی تک فائرنگ کرنے والے کے بارے میں کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا، لیکن کمانڈر نواز کا خیال تھا کہ وہ شخص جو بھی رہا ہو، فرار ہو چکا ہے۔ وہ ایک پیڑ پر چڑھا ہوا تھا۔ فائرنگ اُسی سمت سے ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ فائر کسی ریوالور کا نہیں ہو سکتا تھا۔

اس واقعے سے میں یہی نتیجہ اخذ کر سکی کہ شہریار نے آخری لمحات میں اپنا منصوبہ تبدیل کر دیا ہو گا، اُس وقت جب شیخ مجید پہلے حملے سے بچ گیا تھا، یعنی ٹرک کے حادثے سے! کسی بھی سبب سہی شیخ مجید بہر حال بچ گیا تھا۔ اگر اُس کی پارٹی کے نوجوان اتنے وفادار اور جانثار نہ ہوتے تو شاید اس وقت وہ ہسپتال میں ہوتا۔ کبھی کبھی بے جا قسم کی دلیری سے اسی طرح کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک کسی مسلح شخص کے سامنے نہتا آ جانا، بہادری نہیں حماقت ہے۔ کچھ اسی قسم کی حرکت شیخ مجید سے بھی سرزد ہوئی تھی۔ وہ اگر گزشتہ شب میری بات مان لیتا تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ جو کچھ بھی ہوا، گزر چکا تھا اور اب میرے کشیدہ اعصاب قدرے پُرسکون تھے۔ اب مجھے صرف آئندہ روز کی فکر تھی۔ شیخ مجید کو ابھی مزید ایک دن کراچی میں رہنا تھا۔

اس وقت رات کے ساڑھے سات بجے تھے جب میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے نکلی۔ اب وہاں میرا رُکنا فضول ہی تھا۔ روانگی سے قبل میں نے کمانڈر نواز سے معلوم کر لیا تھا کہ اس وقت شیخ مجید کہاں ہے۔ کمانڈر نواز کی اطلاع کے مطابق شیخ مجید، باتھ آئی لینڈ پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد سول ہسپتال روانہ ہو گیا تھا۔ شیخ مجید اپنی پارٹی کے اُس کارکن کی عیادت کرنے سول ہسپتال گیا تھا جس کے شانے میں گولی لگی تھی اور جو شیخ مجید کو بچاتے ہوئے شدید زخمی ہو گیا تھا۔ سیاسی مصلحت سے قطع نظر میرے نزدیک یہ اخلاقی تقاضا بھی تھا۔ مگر موجودہ سنگین حالات میں شیخ مجید کو ذرا احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر وہ کارکن خدانخواستہ مر گیا تو شہر کی فضا خراب ہو جائے گی۔ دائیں بازو اور بائیں بازو کے کارکنوں کے درمیان ٹھن جائے گی۔ یہ اندازہ لگانا کس کے لئے مشکل ہو گا کہ شیخ مجید پر قاتلانہ حملہ کرانے میں کس گروپ کا ہاتھ ہے۔ بہر حال بعد میں جو کچھ بھی ہوتا، اسے روکنا مشکل تھا۔ لیکن فی الحال میرے سامنے ایک اور مسئلہ تھا۔

میرے خیال میں شیخ مجید ایک ضدی اور جذباتی شخص تھا اور ایسے افراد نتائج کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ قاتلانہ حملے کے باوجود یہ عین ممکن تھا کہ وہ آئندہ روز کے پروگرام منسوخ نہ کرتا۔ یہ صورتِ حال شہریار کے لئے سودمند ہی ثابت ہوتی۔ پہلے اُس نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ شیخ مجید کی موت حادثہ معلوم ہو، لیکن جب وہ اس میں ناکام ہو گیا تو براہِ راست قاتلانہ حملہ کرانے سے بھی اُس نے گریز نہیں کیا۔ بات جب یہاں تک پہنچ ہی گئی تھی تو اب وہ مزید کوئی قدم اُٹھانے سے بھی کیوں چوکتا؟ یہ موقع تو اُس کے لئے بہت غنیمت تھا۔

شیخ مجید کو اگر کوئی اُس کے ارادے سے باز رکھ سکتا تھا تو وہ صرف میں تھی۔ میری یہ ''پیش گوئی'' صحیح ثابت

میری بات سن کر اُس شخص کے چہرے پر خجالت کے آثار نظر آنے لگے۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے ہی سے یہ بہت پہنچی ہوئی ہیں۔'' ولیم یہ کہتے ہوئے مسکرایا۔

''پہنچی ہوئی بھی ہیں اور بہت خطرناک بھی۔'' اُس شخص نے ہنستے ہوئے اپنی خجالت دُور کرنا چاہی، پھر ولیم سے مخاطب ہوا۔ ''تم ان سے کیسے ٹکر گئے بابا ولیم؟''

''میں نہیں خود یہی مجھ سے ٹکر گئی تھیں کل!'' ولیم نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے لہجے کی نقل اُتارتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''بچ کے رہنا ان سے! انہوں نے بیچارے جارج کے سینے کی دو ہڈیاں توڑ دی تھیں اور وہ ہفتوں ہسپتال میں پڑا رہا تھا۔ تم نے کبھی انہیں لڑتے نہیں دیکھا، بجلی کیا کوندے گی ان کے سامنے جو یہ کوندتی ہیں۔''

ولیم بس مسکرا کے رہ گیا۔ وہ بھلا اُس شخص کو کیسے بتاتا کہ وہ خود کل ہی میرا ہدف بن چکا ہے۔

میں نے گفتگو کو اصل موضوع پر لانے کی خاطر ولیم کو مخاطب کیا۔ ''ولیم! میں اس وقت ایک ضروری کام سے تمہارے پاس آئی ہوں۔''

''حکم دیں! اب تو آپ سے ادب آداب کے ساتھ بات کرنا پڑے گی۔ اس جابر کے بچے نے مجھے آپ کی طرف سے بہت ڈرا دیا ہے۔ پھر یہ کہ میں تو یوں بھی آپ کے سامنے کل......'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور پھر بات بدل دی۔ ''کل آپ نے آج آنے کو تو نہیں کہا تھا۔''

''ہاں، کل یہ ارادہ نہیں تھا۔ بس اچانک ہی ایک خیال آ گیا اور سوچا کہ اس بہانے تمہاری عیادت بھی کر لوں گی۔''

''تو کہیں، کیا ضروری کام ہے مجھ سے؟'' اُس نے پوچھا۔

میں نے بغیر کچھ کہے معنی خیز انداز میں اُن دونوں کی طرف دیکھا جو ولیم کے ''شریک'' محفل تھے۔

''یہ دونوں یار ہیں میرے! ان سے میں کچھ نہیں چھپاتا۔ ویسے اگر آپ تنہائی میں بات کرنا پسند کریں تو میں......''

''اگر ایسا ہے تو پھر انہیں یہاں بیٹھا رہنے دو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے طویل سانس لیا، پھر بولی۔ ''مجھے ابرار ٹیڈی کی تلاش ہے۔ اُس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ کیا تم اُس کے کسی خفیہ ٹھکانے سے واقف ہو؟''

''کئی ٹھکانے ہیں اُس کے۔'' ولیم نے بتایا۔ ''ایک خفیہ ٹھکانہ لانڈھی میں......''

''وہاں نہیں ہے وہ۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی، پھر خود ہی ان تمام ٹھکانوں کے بارے میں بتانے لگی جہاں جہاں اُسے میرے آدمی تلاش کر چکے تھے اور وہ نہیں ملا تھا، یعنی ابرار ٹیڈی۔

''حیرت ہے۔ آپ نے کوئی ایسی جگہ نہیں چھوڑی جہاں وہ خبیث مل سکتا تھا، پھر بھی......'' اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ولیم کچھ سوچنے لگا۔

''میں اس لئے تمہارے پاس آئی تھی کہ وہ تمہارا حریف ہے اور ایک دوسرے کے حریف ایسی باتوں سے زیادہ آگاہ ہوتے ہیں۔'' میں بولی۔

''ٹھیک اندازہ تھا آپ کا۔ ذرا سوچنے دیں، ممکن ہے۔''

''ولیم!'' معاً ولیم کے دوست جابر نے اُسے مخاطب کیا۔ ''وہ شمشاد کے کوٹھے پر بھی تو ہو سکتا ہے۔ ایک خفیہ ٹھکانہ وہ بھی تو ہے اُس کا۔''

''بہت اچھا یاد دلایا تم نے۔'' ولیم چونک اُٹھا۔ ''یہی ممکن ہے کہ وہ شمشاد کے کوٹھے پر ہو۔''

''پتہ سمجھاؤ مجھے۔'' میں نے ولیم سے کہا۔

''آپ......آپ جائیں گی نیپیئر روڈ؟'' ولیم حیرت زدہ سا ہو کر بولا۔

ولیم نے کچھ اس طرح حیرت کا اظہار کیا تھا جیسے یہ کوئی بہت عجیب بات ہو۔ مجھے اُس کے لہجے پر ہنسی آ گئی اور بولی۔ ''کیوں، کیا ہوا؟ اگر میں تمہاری تلاش میں شراب خانے تک پہنچ سکتی ہوں تو نیپیئر روڈ جانا کون سی انوکھی بات ہے؟ ایسی جگہوں پر خیر تماشا تو بننا پڑتا ہے، لیکن مجبوری ہے۔ ہاں تم اُس طوائف کے کوٹھے کا پتہ سمجھاؤ۔ کدھر ہے اُس کا کوٹھا؟''

''آپ گئی بھی ہیں اُدھر کبھی؟'' ولیم پتہ بتانے سے پہلے کہنے لگا۔

''کئی بار گئی ہوں، مگر کسی کوٹھے پر نہیں، آج یہ بھی سہی۔'' یہ کہتے ہوئے مجھے پھر ہنسی آ گئی۔

''کمال ہیں آپ بھی!'' ولیم بولا۔ پھر مجھے پتہ سمجھانے لگا۔

اُس کے بعد میں وہاں زیادہ دیر نہیں رُکی۔ ولیم نے بھی مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ غالباً اُسے اس معاملے کی سنگین نوعیت کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ ابرار ٹیڈی کے سلسلے میں اُس نے اشارتاً پیشکش بھی کی تھی کہ میں چاہوں تو وہ اپنے کچھ آدمیوں کو بھی میرے ساتھ کر دے۔ میں نے شکریے کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اُس کی پیشکش مسترد کر دی تھی کہ تمہارے حریف کے لئے میں خود کافی ہوں۔ زبان سے تو اُس نے اظہار نہیں کیا مگر وہ اس سے خوش معلوم ہو رہا تھا کہ میں اُس کے حریف کے پیچھے لگ گئی ہوں۔ میرے لئے واقعی یہ ممکن بھی تھا، لیکن اس وقت نیپیئر روڈ کا رُخ کرنا میری دانست میں فضول ہوتا۔ ابھی رات کے صرف آٹھ بجے تھے۔ اگر ابرار ٹیڈی نے واقعی وہیں پناہ لے رکھی تھی تو رات گئے اِدھر کا رُخ کرتا ہو گا جب نصف سے زیادہ رات گزر جاتی ہو گی۔ ولیم ہی کیا میں اپنے متعلق کسی کو بھی زیادہ ہوا نہیں لگنے دیتی تھی۔ میں نے اسی لئے اُس کی باتوں کو ہنسی میں اُڑا دیا تھا اور یہ تاثر دیا تھا کہ خود ابرار ٹیڈی کی تلاش میں نیپیئر روڈ کا رُخ کروں گی۔ حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ کام آپریشن سیل کے ارکان بخوبی کر سکتے تھے۔ اور میں نے یہی سوچا بھی تھا۔

سولجر بازار سے میں سیدھی اپنی کوٹھی پہنچی اور آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔ کمانڈر نواز وہاں پہنچ چکا تھا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ گزشتہ شب سے صرف چند گھنٹے سونے کے علاوہ وہ مسلسل ڈیوٹی پر تھا۔

''تم کیسے یہاں؟'' میں نے اُس کی آواز سن کر کہا۔

''مجھے کیپٹن شاد سے چارج لینا تھا۔'' اُس نے بتایا۔

''کسی اور کی ڈیوٹی لگا دیتے آج رات۔''

''عثمانی کی طبیعت اب بہتر ہے۔ وہ رات دس بجے تک مجھ سے چارج لے لے گا۔ میں آٹھ بجے یہاں پہنچا تھا، سوچا کہ صرف دو گھنٹے کے لئے کیوں کسی کو پریشان کروں؟ پھر یہ کہ ممکن ہے میرے لئے کوئی نیا حکم

ہو۔'' وہ مؤدب لہجے میں بولا۔

''تمہاری وہاں موجودگی یقیناً اس بات کا ثبوت ہے کہ شیخ مجید سول ہسپتال سے بخیریت تمام باتھ آئی لینڈ پہنچ چکا ہے!'' میں نے کہا۔

''جی ہاں۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''اور اب وہ کوٹھی سے باہر نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ میرا مطلب یہ کہ اب رات تک اُن کا کوئی ایسا پروگرام نہیں جس میں شرکت کی غرض سے اُنہیں باہر نکلنا پڑے۔ ساڑھے آٹھ بجے اُن کی پارٹی کے اہم ارکان کی میٹنگ ہے جو پہلے ہی سے باتھ آئی لینڈ میں ہونا تھی، وہ بھی کوٹھی کے لان میں۔''

''تمہارے اندازے کے مطابق یہ میٹنگ کتنی دیر چلے گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''اسے زیادہ سے زیادہ دس بجے تک ختم ہو جانا چاہئے۔ اس وقت میٹنگ شروع ہو چکی ہے۔ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے رپورٹ ملی ہے۔''

''اُس نوجوان کی حالت کیسی ہے جسے جلسے میں گولی لگی تھی؟'' میں نے معلوم کیا۔

''ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق وہ خطرے کی حدود سے باہر ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''یہ بہت اچھا ہوا، ورنہ ایک اور مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔''

کمانڈر نواز میرا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ ذہین شخص تھا، کہنے لگا۔ ''جی ہاں! دوسری صورت میں اسے سیاسی ایشو بھی بنایا جا سکتا تھا۔''

''یہ بتاؤ! سرفراز کیا کر رہا ہے؟ ابرار ٹیڈی آخر کب تک بے نتھے بیل کی طرح پھرتا رہے گا؟''

''کیپٹن شاد نے مجھے چارج دیتے ہوئے بتایا تھا کہ سرفراز کو ابرار ٹیڈی کے ایک نئے ٹھکانے کا سراغ ملا ہے اور......''

''اور جب تک سرفراز وہاں پہنچے گا، ابرار ٹیڈی وہاں سے رفو چکر ہو جائے گا! یہی ہو رہا ہے نا اب تک؟'' میں نے کمانڈر نواز کی بات کاٹ کر تلخ لہجے میں کہا، پھر میری آواز میں مزید سختی آ گئی۔ ''آج رات ہر قیمت پر ابرار ٹیڈی کو آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں سرفراز اور اُس کے ساتھی کیا کرتے ہیں یا تم کیا پلاننگ کرتے ہو، اس سے مجھے سروکار نہیں۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اُسی کے آزاد پھرنے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ خان ہمارے قبضے میں ہے، ولیم کے بارے میں تمہیں میں پہلے ہی بتا چکی ہوں اور میرے علم و اطلاع کے مطابق کوئی اور ایسا چوتھا گروہ اس شہر میں اتنی دیدہ دلیری کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ سرفراز سے فوراً رابطہ قائم کرو اور میرے احکام اُسے پہنچاؤ، اس کے علاوہ میں ایک اور پتہ بتا رہی ہوں جہاں ابرار ٹیڈی پناہ لے سکتا ہے۔ نصف شب کے بعد اُسے وہاں بھی چیک کیا جائے۔'' یہ کہہ کر میں کمانڈر نواز کو شمشاد بائی کے کوٹھے کا پتہ سمجھانے لگی۔ پھر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

ریسیور رکھتے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔

''عذرا خان۔'' میں نے ریسیور اُٹھاتے ہی کہا۔

''مبارک ہو!'' دوسری جانب سے ملک دلاور چہکا۔

''کس بات کی مبارکباد دے رہے ہو؟'' میں اُس کے لہجے سے سمجھ گئی تھی کہ وہ شرارت کے موڈ میں ہے۔

''ولیم سے ملاقات ہوئی تھی میری۔ وہ بتا رہا تھا کہ بس اب چند ہی دن میں آپ پیا کے دیس چلی جائیں گی، یعنی وہ آپ کو پھڑ لے جائے گا!''

''کیا یہ ضروری ہے کہ تم ہمیشہ بے تکی باتیں کیا کرو؟''

''ارے آپ تو یہ کہہ رہی ہیں اور اس خادم نے رخصتی کے موقع پر محلے والوں کی نیندیں حرام کر دینے والے سارے ریکارڈ ابھی سے خریدنا شروع کر دیئے ہیں۔'' وہ میری بات کو نظر انداز کر کے فراٹے سے بولے جا رہا تھا۔ ''وہ مشہور گیت ہے نا، کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے! یاد آیا آپ کو؟...... وہی گیت جس کے انترے میں ہے کہ ہم تو بابل تورے انگنا کی چڑیاں...... ہائے ہائے نہ پوچھیں! جب سے میں یہ ریکارڈ بجا بجا کر سن رہا ہوں دل پر چھریاں سی چل رہی ہیں اور تصور میں آپ کا بھولا سا مکھڑا گھوم رہا ہے۔ لال جوڑا پہنے، ناک میں بڑی سی نتھ ڈالے آپ ٹھمک ٹھمک کر ڈولی کی طرف بڑھ رہی ہیں اور یہ خادم ایثار و قربانی کی زندہ تصویر بنا ہوا، سیڈسٹ قسم کے عاشقوں کی طرح آپ کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈولی میں بٹھا رہا ہے۔ پھر یہ کہ......''

''پیچھے سے تمہاری چاند پر ایک زوردار چپت پڑتی ہے اور تم اپنی کھوپڑی سہلا کر رہ جاتے ہو!'' میں نے دانت پیستے ہوئے اُس کا جملہ پورا کر دیا، پھر مزید کہا۔ ''تم میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے باز نہ آئے تو بڑا برا حشر ہو گا کسی دن۔''

''آپ اس کا موقع ہی کہاں دیتی ہیں، خواہ مخواہ میری ٹانگ پر الزام لگا رہی ہیں۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولا۔

''اچھا اب تم میرے پیچھے آ کے دیکھنا!'' میں نے اُسے گویا دھمکی دی۔

''میرے ابے نے تو مجھے ہمیشہ افسر کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے منع کیا ہے، بہرحال آپ دھمکا رہی ہیں تو آپ کی پچھاڑی سے بھی دُور رہنے کی کوشش کروں گا۔ ہاں بس ایک اطلاع دینا تھی آپ کو اس وقت جس اللہ کے نیک بندے، یعنی نابدان گندے کی تلاش ہے، وہ کھارادر میں ایک شخص محمود دیانی کے گھر چھپا ہوا ہے۔''

ملک دلاور کی اس اطلاع پر میں چونک اُٹھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ حالات پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہے اور ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی میرے لئے راہ ہموار کر رہا ہے۔

''تمہاری مراد ابرار ٹیڈی سے ہے؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''جی حضور والا!''

''پتہ بتاؤ جلدی اُس کا۔''

''پیسے لگیں گے اس کے۔ ایسی زبردست انفارمیشن فری میں ہرگز......''

''بکواس نہ کرو زیادہ!'' میں جھنجھلا سی گئی، مگر اپنے لہجے سے جھنجھلاہٹ کا اظہار نہیں ہونے دیا ورنہ وہ مجھے اور ستاتا۔

''اگر شربت دیدار پلانے کا وعدہ کریں تو میں ابھی پتہ نوٹ کرائے دیتا ہوں بلکہ کہیں تو اُس نابکار کو پکڑ کر آپ کے قدموں میں لا کے ڈال دیتا ہوں۔ بولیں پلائیں گی شربت دیدار کا؟''

ملک دلاور کی بات پوری ہوئی تھی کہ اُسی وقت دوسرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ وہ فون تھا جس کا نمبر

ڈائریکٹری میں نہیں تھا اور اس پر عموماً آپریشن سیل کے ارکان ہی مجھ سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ یہ کوئی ضروری کال ہی ہوسکتی تھی اس لئے میں نے ملک دلاور سے کہا۔ ''ذرا ہولڈ کرو! دوسرے فون پر کال ہے، تم سے ابھی بات کرتی ہوں۔''

''جو مزاجِ یار میں آئے!'' مجھے دلاور کی آواز سنائی دی۔

جواب میں اُس سے کچھ کہے بغیر میں ریسیور ایک طرف رکھ کر اُٹھی اور آگے بڑھ کر دوسرے ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھالیا۔

''کمانڈر نواز۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''ہاں بولو! ابھی تو تم سے بات ہوئی تھی۔ کوئی نئی اطلاع؟'' میں بولی۔

''جی...... سرفراز، ابرار ٹیڈی پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اب وہ اُسے لے کر ہیڈ کوارٹر آ رہا ہے۔'' کمانڈر نواز نے تیزی سے بتایا۔ اُس کا لہجہ پُرجوش اور داد طلب تھا۔

''ابرار ٹیڈی، سرفراز کو کھارادر میں ایک شخص محمود دیانی کے گھر ملا ہوگا! ہے نا؟'' میں نے کہا۔

''آپ...... آپ کو معلوم...... معلوم تھا کہ...... کہ......'' کمانڈر نواز حیرت کے سبب ہکلانے لگا۔ ''جی...... جی ہاں سرفراز نے اُسے وہیں سے گرفتار کیا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ہمت افزائی سے گریز نہیں کیا۔ ''اور کچھ؟''

''جی نہیں، بس یہی اطلاع دینا تھی۔''

''خدا حافظ!'' میں نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا اور دوبارہ اپنی کرسی پر آ بیٹھی۔ پھر میں نے دوسرے فون کا ریسیور اُٹھا کر دوبارہ ملک دلاور کو مخاطب کیا۔ ''ہاں تو ملک دلاور! یہ بتاؤ کہ تم اتنی ڈھیٹ ہڈی کے کیوں بنے ہوئے ہو؟''

''جی؟'' ملک دلاور کی حیرت زدہ آواز آئی۔ اُسے یقیناً یہ توقع رہی ہوگی کہ میں اُس سے ابرار ٹیڈی کے متعلق بات کروں گی۔ مگر اب مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' میں نے اُسے خاموش دیکھ کر ٹوکا۔

''غالباً کچھ دیر پہلے ہمارے درمیان کوئی اور بات ہو رہی تھی۔'' اُس نے اپنی دانست میں مجھے یاد دلایا۔

''خاک ڈالو اُس بات پر۔''

''آپ کہتی ہیں تو ڈالے دیتا ہوں خاک! لیکن یہ خیال رہے کہ ابھی شیخ مجید مزید ایک دن کراچی میں ہے اور ابرار ٹیڈی بہت کائیاں ہالک ہے۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہتا رہا۔ ''اگر وہ ہتھے نہ چڑھا تو کم از کم کل ضرور شیخ مجید کو ٹھنڈا کرادے گا۔''

''تو پھر؟ ...... میری صحت پر اس سے کیا اثر پڑے گا؟ تم آخر سارے شہر کے اندیشے میں کیوں دُبلے ہوئے رہتے ہو؟ اور تمہارا تعلق کیا ان چکروں سے؟ اپنے چھوٹے سے دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا کرو، ورنہ عموماً جن لوگوں کی کھوپڑی میں گودا ذرا کم ہوتا ہے، وہ بہت جلدی چڑ جاتے ہیں۔'' میں نے دانستہ ایسے الفاظ استعمال کئے کہ اُسے غصہ آجائے۔

''تو کھارادر کا پتہ نہیں چاہئے آپ کو؟ حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے فرما رہی تھیں، جلدی بتاؤ پتہ۔''

''گھس رہی تھی یار تمہیں اور تم اتنے بانگڑو ہو کہ فوراً گھسائی میں آجاتے ہو۔''

''اچھا بانگڑو ہوں نا میں؟...... ٹھیک ہے، میں بھی اب کبھی کوئی اطلاع نہیں دُوں گا آپ کو۔'' اُس کی آواز میں غصہ تھا۔

مجھے علم تھا کہ یہ غصہ وقتی ہے۔ کچھ دیر بعد ہی وہ پھر سب کچھ بھول بھال جائے گا۔ میں نے اسی لئے کہا تھا۔ ''اچھا نہ دینا اطلاع۔ جان چھوڑو! معلوم نہیں خود کو نہ جانے کتنا بڑا طرم خان سمجھنے لگے ہو تم۔ تم سے دو چار ہر وقت میری جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔''

کوئی اور موقع محل ہوتا تو شاید ملک دلاور مزید فقرے بازی کرتا۔ مگر اس وقت وہ ''بمک'' گیا تھا اس لئے خود ہی بغیر کچھ کہے سلسلہ منقطع کر دیا اور میں اُس کی ممکنہ حالت کا تصور کر کے زور سے ہنس دی۔ مجھے ایسے مواقع کم ہی ملتے تھے کہ اُسے غصہ دلا سکوں۔

پھر دس بجے سے پہلے پہلے میں نے کھانا وغیرہ کھایا اور باتھ آئی لینڈ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ میں شیخ مجید کو فون کر کے اُس سے ملنے کی خواہش ظاہر کروں گی تو وہ مجھے آنے سے نہیں روکے گا۔ ہوا بھی یہی۔ پارٹی کے کارکنوں کی میٹنگ وقت سے کچھ پہلے ہی ختم ہو گئی تھی، یعنی پونے دس بجے! شیخ مجید اس وقت اپنے کچھ قریبی عزیزوں میں گھرا ہوا تھا جو اُس کی مزاج پرسی کے لئے آئے ہوئے تھے۔ آج شام اُس پر بہرحال قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور ایسے میں قریبی عزیز ہی کیا دُور کے عزیز بھی اپنے اپنے نمبر بڑھانے پہنچ جاتے ہیں کہ کبھی کوئی کام اٹک جائے تو بندہ لحاظ مروت سے کام لے۔ شیخ مجید نے فون پر مجھ سے کہا تھا، آپ کی آمد تک کوشش کروں گا کہ مہمانوں کو نمٹا دُوں۔ پھر سکون کے ساتھ گفتگو ہو سکے گی۔

گزشتہ شب جب میں، شیخ مجید سے ملنے گئی تھی تو اپنے ڈرائیور کو بھی ساتھ لے گئی تھی، لیکن آج مجھے اُس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں اکیلی ہی کار لے کر نکل گئی۔ اپنی کوٹھی کے پھاٹک سے نکلتے ہی مجھے ملک دلاور کا خیال آیا اور میں نے اِرد گرد کا جائزہ لیا کہ کہیں آس پاس خود ملک دلاور یا اُس کا کوئی آدمی تو میری تاک میں نہیں لگا ہوا؟ جب سے دونوں جرمن سائنس دان شیفرڈ اور شیپرڈ پاکستان سے گئے تھے، میں ذرا بے فکری ہو گئی تھی۔ مجھے اپنے تعاقب کئے جانے کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ کوئی میرے تعاقب میں ہے یا نہیں! مگر ملک دلاور مستقلاً میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اُس کی جانب سے یوں تو مجھے کوئی تشویش نہیں تھی کہ وہ بہرحال میرے لئے مخلص تھا مگر نادانستگی میں اُس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو سکتی تھی جو میرا کھیل بگاڑ دیتی۔ میں اس وقت اسی لئے چوکنا تھی۔

مین روڈ پر آکر میرا خیال صحیح ثابت ہوا۔ ایک سپورٹس کار میرا تعاقب کرنے لگی تھی۔ میں نے متعاقب کو یہی تاثر دیا کہ تعاقب سے لاعلم ہوں اور پھر عقبی آئینے پر نگاہ جما دی۔ ملک دلاور کے کچھ آدمی میری نظر میں آچکے تھے مگر یہ سپورٹس کار والا نوجوان میرے لئے اجنبی تھا۔ عبدالحمید خاں پہلے ہی اپنے زخم چاٹ رہا تھا، اس کے علاوہ شہریار، شیخ مجید کو ختم کرانے کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ جو جرمن سائنسدان مجھے اغواء کرا کے قاہرہ بھیجنا چاہتے تھے، وہ بھی ملک سے جا چکے تھے۔ ایسی صورت میں مجھے کسی کی طرف سے تعاقب کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

یہ نوجوان، ملک دلاور کے ایما ہی پر میرے پیچھے لگ سکتا ہے، یہ سوچ کر میں اطمینان سے ڈرائیونگ کرتی ہوئی باتھ آئی لینڈ پہنچ گئی۔ اُس نوجوان نے وہاں تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ یقیناً اب وہ ملک دلاور کو یہ رپورٹ دیتا کہ میں شیخ مجید سے ملنے باتھ آئی لینڈ گئی تھی اور ظاہر ہے کہ اس سے میرے لئے کوئی فرق نہ پڑتا۔

شیخ مجید میرے پہنچنے تک اپنے مہمانوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ کوٹھی پر اور اردگرد سخت پہرا تھا۔ میری کار کو کوٹھی تک پہنچنے سے پہلے کئی بار چیک کیا گیا۔ صرف اُنہی افراد کو کوٹھی میں داخل ہونے کی اجازت دی جا رہی تھی جن کے لئے پہلے ہی شیخ مجید ہدایات دے چکا تھا۔

گزشتہ رات اور آج کے رویئے میں نمایاں فرق میں نے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی محسوس کر لیا تھا۔ مجھے خود شیخ مجید کا بہنوئی ڈرائنگ رُوم تک لے کر آیا تھا اور اسی کے ساتھ اپنے کل کے رویئے پر معذرت بھی کی تھی۔ شیخ مجید نے یقیناً اُسے میرے بارے میں تفصیل کے ساتھ اگر نہیں تو مختصراً کچھ نہ کچھ بتا دیا ہوگا۔ مجھے ڈرائنگ رُوم میں بٹھا کر وہ فوراً ہی اندر چلا گیا۔

شیخ مجید کو ڈرائنگ رُوم میں آنے کے بعد آج کسی سے معذرت نہیں کرنا پڑی تھی کیونکہ وہاں میں تنہا ہی تھی۔ علیک سلیک کے ساتھ ہی ایک ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا وہاں آ گیا۔ پھر میرے اور شیخ مجید کے سامنے اُس نے کولڈ ڈرنکس کے گلاس رکھے اور پلیٹوں میں خشک میوہ لگانے لگا۔

''یہ کاجو لیجئے! ہندوستان سے میرے ایک عزیز نے بھیجے ہیں۔'' شیخ مجید نے ایک پلیٹ میری طرف بڑھائی۔

''شکریہ!'' میں نے ہاتھ بڑھا کر دو ایک کاجو اُٹھا لئے۔

شیخ مجید کے اشارے پر ملازم ڈرائنگ رُوم سے چلا گیا تو وہ بولا۔ ''آپ کی حیرت انگیز قوتوں کے قائل ہو گئے جناب!...... کمال ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ وہ شخص قطعی نروس نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُسے اس وقت دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آج شام اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔

''وہ تو خیر چھوڑیئے! جو ہوا سو ہو گیا، میں اس وقت کچھ اور عرض کرنے آئی ہوں۔'' میں فوراً ہی اصل موضوع پر آ گئی۔

''فرمایئے اگر یہ...... یہ تو لیں نا...... کولڈ ڈرنک!''

میں نے گلاس اُٹھا کر لیمن اسکوائش کا ایک گھونٹ لیا، پھر بولی۔ ''میری اطلاع کے مطابق پرسوں صبح کی کسی فلائٹ سے آپ اسلام آباد روانہ ہو رہے ہیں اور ابھی مزید ایک دن کراچی میں آپ کا قیام رہے گا۔''

''آپ کی اطلاعات قطعی درست ہیں، یہی پروگرام ہے میرا۔'' اُس نے میری تائید میں کہا۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ آپ پرسوں صبح کی بجائے کل ہی کی کسی فلائٹ سے اسلام آباد چلے جائیں؟'' میں نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''کل؟...... مگر کیوں؟...... پھر یہ کہ کل تو مجھے یہاں کئی ضروری میٹنگز اٹینڈ کرنی ہیں...... اس لئے کہ......''

وہ کچھ سوچنے لگا۔ اُس کے چہرے سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

دراصل ابرار ٹیڈی کے قابو میں آ جانے کے باوجود بھی یہ ضروری نہیں تھا کہ خطرہ ٹل گیا ہو۔ اس امکان کو

بہرحال نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ہتھے چڑھنے سے پہلے وہ عیار شخص کل کے لئے تمام بندوبست کر چکا ہو۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ خود ابرار ٹیڈی، شیخ مجید کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کرتا۔ اس سے قطع نظر یہ کہ شہریار کوئی اور ایسی خطرناک چال چل جاتا جو شیخ مجید کی زندگی کے لئے خطرہ ثابت ہوتی۔ میں اسی لئے اس امکانی خطرے سے شیخ مجید کو بچانا چاہتی تھی۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد شیخ مجید نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا پھر میری زندگی کے لئے کوئی خطرہ ہے؟''

''اس بار صرف خطرہ ہی نہیں بلکہ یقینی بات سمجھ لیں۔ اس صاف گوئی پر میں معذرت خواہ ہوں کہ اگر آپ بدستور اپنے شیڈولڈ پروگرام پر عمل کرتے رہے تو آج کی سی صورت پیش نہیں آئے گی۔''

''یعنی قصہ پاک!'' یہ کہہ کر شیخ مجید آہستہ سے ہنس تو دیا مگر اُس کی ہنسی کھوکھلی تھی۔ یہ بات میں نے واضح طور پر محسوس کی۔ میں نے اُس کی ضدی فطرت کے مدِنظر ہی یہ بات کی تھی۔ جو شخص ایک مرتبہ کسی کی بات نہ مان کر نقصان اُٹھا چکا ہو یا موت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ چکا ہو، وہ چاہے کتنے ہی مضبوط اعصاب کا مالک ہو، سوچنے پر مجبور ہو ہی جاتا ہے۔ شیخ مجید بھی مجھے خاموش دیکھ کر مزید بولا۔ ''کوئی اور ایسی امکانی صورت ہے آپ کی نظر میں کہ میں بزدل نہ کہلاؤں؟ دراصل میں اگر کل صبح یا دوپہر کی کسی فلائٹ سے تمام پروگرام منسوخ کر کے یہاں سے چلا گیا تو آج پیش آنے والے واقعے کی روشنی میں مجھے بزدل سمجھا جائے گا۔ ورنہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ میں یقیناً آپ کا مشورہ قبول کر لیتا۔''

شیخ مجید غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ عوام پر اُس کی کراچی سے فوری روانگی کا یہی ردِعمل مرتب ہوتا۔

''ایک امکانی صورت یقیناً ہے، اگر آپ اس پر عمل کر سکیں۔ اس طرح کم از کم آپ پر بزدلی کا چارج نہیں لگے گا اور آپ کراچی میں مزید ایک دن اطمینان سے گزار سکیں گے۔'' میں نے کہا، پھر رُکے بغیر مزید بولی۔ ''آپ کو کل اس کوٹھی کی حدود ہی میں رہنا پڑے گا۔ آپ اپنی پارٹی میٹنگز یہاں بھی تو کر سکتے ہیں۔''

''ایسی صورت میں مجھے بس کل رات کا ڈنر کینسل کرنا پڑے گا، باقی کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ ڈنر مجھے پی آئی اے کی مزدور یونین کی جانب سے دیا جا رہا ہے۔''

''آپ معذرت کر لیں اُن سے، اگلے دورے پر سہی!'' میں نے اُسے نرم ہوتے دیکھ کر کہا۔

''ٹھیک ہے، میں اُن لوگوں سے بات کر لیتا ہوں فون پر!'' یہ کہہ کر اُس نے طویل سانس لیا، پھر بولا۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور مجھے یہ مشورہ دیتا تو شاید کبھی میں قبول نہ کرتا۔''

''شکریہ!'' میں بولی۔ ''اب میں اجازت چاہوں گی۔''

''چلی جایئے گا آپ ابھی تو آئی ہیں۔ اور ہاں، کبھی اسلام آباد تشریف لائیں نا!'' اُس نے خوش اخلاقی سے ہا۔

''ہاں امکان تو ہے کہ مجھے جلد ہی وہاں آنا پڑے گا، کوشش کروں گی کہ آپ سے ملاقات ہو جائے۔''

''ملاقات کیا جناب، آپ کو میرے ہی غریب خانے پر ٹھہرنا ہوگا۔''

''دیکھا جائے گا۔'' میں مسکرا کر بولی اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اخلاقاً شیخ مجید مجھے کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑنے آیا اور پھر میں اُسے ''خدا حافظ'' کہہ کر وہاں سے روانہ ہو

گئی۔

مجھے اس پر خوشی تھی کہ میں نے شہریار کی سازش کو ناکام بنا دیا ہے۔ کل جب شیخ مجید، کوٹھی سے نکلے گا ہی نہیں تو شہریار تلملا کر رہ جائے گا۔ میں اسی خیال میں گم نہایت اطمینان سے ڈرائیونگ کرتی ہوئی اپنی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔ اب میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً سوا گیارہ بجنے والے تھے۔ یہ علاقہ بھی ایسا تھا کہ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ شیخ مجید سے جب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی تو میرے ذہن میں تھا کہ شاید مجھے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا رُخ بھی کرنا پڑے۔ مجھے ابرار ٹیڈی کی زبان کھلوانا پڑتی کہ اُس نے آئندہ روز کے لئے کیا منصوبہ بندی کی تھی اور یہ کہ اُس کی غیر حاضری سے کوئی فرق پڑے گا یا نہیں؟ مگر اب اس کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ شیخ مجید نے میری بات مان لی تھی اور امکانی خطرہ ٹل گیا تھا۔ کل کا دن اور خیریت سے گزر جائے تو میں ابرار ٹیڈی کے کس بل نکال لوں گی۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے ولیم یاد آ گیا جو ابرار ٹیڈی کا حریف تھا اور پھر وہ منظر بھی میری آنکھوں میں گھوم گیا جب ابرار ٹیڈی، ولیم کے گھر سے فرار ہوا تھا۔

میں اسی سوچ میں تھی کہ اچانک مخالف سمت سے ایک کار تیزی کے ساتھ آتی دکھائی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ مجھے خطرے کا احساس ہوتا پے درپے کئی فائر ہوئے...... میری کار کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ میری کار پر جیسے گولیوں کی بارش ہونے لگی...... ایک دم جھٹکے ہوئے بریک لگانے کے سبب میرا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور پھر میری اطراف اندھیرے پھیل گئے...... بے ہوش ہونے سے پہلے میرا آخری احساس یہ تھا کہ فائرنگ ابھی رُکی نہیں ہے......!

○○○

میرے ذہن میں روشنی کے جھماکے سے ہوئے تو میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ چاروں طرف ہلکی ہلکی دُھند سی تیر رہی تھی اور میں بھی جیسے اسی دُھند کا ایک حصہ تھی۔ میرا وجود ایک بے وزنی کی سی کیفیت میں تھا۔ دُھند میں جلتی بجھتی رنگ برنگی روشنیاں میری بصارت کو متاثر کر رہی تھیں۔ میں کون ہوں، کہاں ہوں؟ مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ روشنیوں اور دُھند کے اس حصار میں جانے کب تک میرا وجود گردش کرتا رہا اور پھر ایک جھناکا سا ہوا...... اس کے ساتھ ایک حزنیہ سی دُھن میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس دُھن کی تھکی تھکی سی لے مجھے اپنی رُوح میں اُترتی محسوس ہو رہی تھی اور میرے ذہن پر ایک انجانا سا نشہ طاری ہوتا جا رہا تھا۔ اس نشے میں بڑا سرور، بڑا کیف تھا، یوں جیسے میں رنگوں اور روشنیوں میں تیرتی ہوئی سرشاری اور بے خودی کی سرحدوں کو چھو رہی ہوں۔ پھر جانے کب اسی عالم میں مجھے ایک نرم اور شیریں مردانہ آواز سنائی دی۔ ”عذرا خان! یو آر مائی سویٹ ہارٹ!“

”یس! آئی ایم یور سویٹ ہارٹ۔“ میرے لبوں میں جیسے خود بخود حرکت ہوئی اور مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

پھر میں نے اُس دُھند سے ایک چہرہ اُبھرتے دیکھا۔ اُس کے نقوش تیکھے اور انتہائی دل کش تھے۔ بڑی بڑی خمار آلود سی آنکھیں، سحر کار آنکھیں! تراشیدہ لب، کتابی چہرہ، ستواں ناک، چوڑی پیشانی اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ! وہ چہرہ یقیناً مردانہ وجاہت اور کشش میں بے مثال تھا۔ میں نے چند لمحے قبل جو الفاظ سنے تھے، پھر سنائی دیئے۔ وہ چہرہ اب میرے بہت قریب تھا۔ اس بار بھی الفاظ انگریزی ہی میں ادا کئے گئے تھے اور میں نے بھی ان کا جواب انگریزی ہی میں دیا تھا۔

اُس نے میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، پھر اُس کے ہونٹ حرکت کرنے لگے۔ ”عذرا خان! یو آر مائی ڈارلنگ، مائی وائف، مائی سویٹ ہارٹ!“

”یس آئی ایم یور وائف، یور سویٹ ہارٹ۔“ میں ایک عالم خود سپردگی میں کہے جا رہی تھی۔

”ناؤ یو آر عذرا جیکب، ناٹ عذرا خان!“ اُس کی شیریں آواز میری سماعت میں اُتری۔

”ہاں میں اب عذرا خان نہیں، عذرا جیکب ہوں۔“ میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا۔

سرشاری، بے خودی اور خود سپردگی کے باوجود میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال ضرور تھا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ میں وہ نہیں جو مجھے بنایا جا رہا ہے، بتایا جا رہا ہے۔ پھر بھی جانے کیوں مجھے خود پر اختیار نہیں تھا۔ نہ اپنی زبان پر نہ اپنے جذبات و احساسات پر!

”تم اب میری باہوں میں میٹھی نیند سونے والی ہو۔ تمہیں نیند آ رہی ہے نا؟“ اُس نے میری آنکھوں میں

جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں، تم سونے والی ہو۔''

''ہاں مجھے نیند آ رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میری پلکیں جھکنے لگیں، پھر ایک گہرا نشہ سا میرے وجود میں چھا گیا۔

وہ نرم اور شیریں آواز جیسے کہیں دُور سے مجھے سنائی دے رہی تھی۔ ''عذرا جیکب! تم سو رہی ہو۔ تم عذرا جیکب ہو...... عذرا جیکب!''

پھر جانے کب تک میں ہوش و حواس سے بیگانہ رہی۔ بازو میں ہلکی سی چبھن کے احساس نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ سامنے وہی چہرہ تھا، خواب خواب چہرہ! میرے بازو میں انجکشن دے کر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں ایک نرم و گداز بستر پر دراز تھی۔

''تمہیں ابھی مزید آرام کی ضرورت ہے ڈارلنگ!'' اُس نے مسکرا کر محبت سے کہا۔

میں اُسے کھوئی کھوئی سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ کمرے میں ہلکی سی خنکی تھی۔ ایئر کنڈیشنر چلنے کی دھیمی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔

عذرا خان! تمہاری قوتِ مدافعت کمزور کی جا رہی ہے...... میرے ذہن کے کسی گوشے سے آواز آئی۔

پھر میں کیا کروں؟ میں نے کہنا چاہا مگر میرے لب ہی ساکت رہے۔

اُس نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، جھک کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کی چال میں ایک تمکنت و وقار تھا۔ دراز قد اور متناسب جسم پر بہترین تراش کا سوٹ اُس پر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ میں اُسے دروازہ کھول کر باہر جاتے دیکھتی رہی۔ اور پھر ذرا ہی دیر بعد میرے ذہن پر دُھند سی چھانے لگی۔ یہ شاید اُسی انجکشن کا اثر تھا جو کچھ دیر پہلے میرے بازو میں لگایا گیا تھا۔

وہی آشنا حزینہ سی دُھن سنائی دی تو میری رگ رگ میں جیسے نشہ سا انگڑائیاں لینے لگا۔ اب میں پھر اُسی دُھند اور رنگ برنگی روشنیوں کے حصار میں تھی۔ میں اور وہ! مگر آج میرا ذہن بار بار بغاوت کر رہا تھا۔ یہ سب فریب ہے، دھوکہ ہے! میں عذرا جیکب نہیں، عذرا خان ہوں! اس اجنبی غیر ملکی سے میرا کوئی رشتہ نہیں، کوئی تعلق نہیں! لیکن اس بغاوت کے باوجود مجھے اپنے قول و فعل پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ میں وہی کہہ رہی تھی جو وہ مجھ سے کہلوا رہا تھا۔ موسیقی کی لے پر اُس کی بانہوں میں بانہیں ڈالے رقص کر رہی تھی۔

''ہم بہت جلد یہاں سے ہنی مون منانے روانہ ہو جائیں گے۔'' وہ جیسے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ''یہاں سے پہلے ہم قاہرہ چلیں گے اور......''

قاہرہ! میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں اُس کے کہے ہوئے بقیہ الفاظ نہ سن سکی۔ وہ دونوں جرمن سائنس دان بھی تو مجھے قاہرہ بھیجنا چاہتے تھے۔ میں سوچ رہی تھی قاہرہ ہی میں تو کوئی ڈاکٹر رچرڈ میرا منتظر تھا۔ یہ اُسی کھیل کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

''میں قاہرہ نہیں جاؤں گی۔'' سوچتے سوچتے یہ الفاظ جانے کیسے میری زبان پر آ گئے۔

''ہم یہاں سے پہلے قاہرہ ہی چلیں گے عذرا!'' اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''تم چلو گی نا میرے ساتھ؟...... تم یقیناً اپنی مرضی سے میرے ساتھ قاہرہ چلو گی!''

''قاہرہ...... میں...... قاہرہ......'' میرے ہونٹ ہلے۔

''ہاں تم قاہرہ چلو گی!''

''ہاں چلوں گی۔'' میری قوتِ مدافعت جواب دے گئی اور میں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ ''میں تمہارے ساتھ قاہرہ چلوں گی۔''

''اور پھر وہاں بھی جہاں جہاں میں تمہیں لے جاؤں گا۔ میرے ساتھ ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے!'' مجھے اُس کی آواز اپنے وجود میں سرگوشیاں کرتی محسوس ہوئی۔

''تمہارے ساتھ ساتھ...... ہاتھ میں ہاتھ ڈالے......'' مجھ پر خود سپردگی طاری ہونے لگی۔ میری نظریں اب بھی اُس کی نظروں سے ملی ہوئی تھیں۔ میں جیسے اُس کی بڑی بڑی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ میرے قدم رقص کرتے کرتے بہکنے لگے تو اُس نے سہارا دے کر مجھے خود سے قریب کر لیا۔ پھر میں نے اپنا سر اُس کے شانے پر رکھ کر آنکھیں موند لی تھیں اور گہرے نشے نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اُس وقت مجھے محسوس ہوا جیسے بند آنکھوں میں بڑی وسعت ہے۔ میں خوابوں کے جزیروں میں کسی آزاد پنچھی کی طرح اُڑتی پھر رہی تھی اور میری آنکھوں کو یہ خواب دکھانے والا رنگوں اور خوشبوؤں کی اوٹ سے مجھے اپنے قریب بلا رہا تھا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ زندگی اسی کا نام ہے، حاصلِ زندگی یہی لمحے ہیں عذرا! لہو کی تال پر رقص کرنے والے جذبوں کو محسوس کرو! انہی میں ساری کائنات کا حسن ہے، تازگی ہے، روشنی! ہمارے وجود ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی تکمیل ہیں! ہیں نا عذرا؟......

میرے سارے وجود نے جیسے اُس کے ایک ایک لفظ کی تصدیق کی اور پھر میں جیسے خوشبو اور رنگوں کی برسات میں نہانے لگی۔ اس میں اتنا سکون، اتنی بے خودی تھی کہ میری رُوح آسودگی کے ساحل تک پہنچ گئی۔ خبر اور بے خبری کے درمیان وہ سفر تمام ہوا اور پھر ہر طرف ایک گہرا سکوت چھا گیا......!

پھر جانے کب اُس نے مجھے ایک حسین خواب سے بیدار کیا۔ خواب میں بھی وہی تھا اور بیدار ہونے کے بعد بھی مجھے اُسی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ مجھے سہارا دے کر اُٹھا رہا تھا۔ میں مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تو اُس نے کچھ کاغذات اور ایک قلم کھول کر میری طرف بڑھا دیا۔

''یہاں دستخط کر دو عذرا!'' اُس نے کاغذ پر ایک جگہ اُنگلی رکھ کر قلم مجھے تھما دیا۔

''یہ کیا ہے جیکب؟'' میں بمشکل اُس سے پوچھ سکی۔ میں جیسے نیند میں بول رہی تھی۔

''ہمارے خوابوں کی تعبیر!'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔

میں نے اُن کاغذات پر ایک نظر ڈالی۔ وہ کورٹ میرج کے مکمل کاغذات تھے۔ اُن کاغذات کی رُو سے میں نے ایک مقامی عدالت میں جیکب سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ اُن کاغذات پر صرف میرے دستخط ہونا باقی تھے، بقیہ تمام کارروائی، کورٹ کی تصدیق وغیرہ پہلے ہی سے مکمل تھی۔

نہیں! میرے ذہن نے بغاوت کی۔ مجھے ان کاغذات پر دستخط نہیں کرنے چاہئیں! پھر یہی انکار میری زبان پر آ گیا۔

میرا انکار سن کر وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ ''کیا تم میری نہیں ہو عذرا؟'' یہ کہتے ہوئے اُس نے براہِ راست میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالنا چاہیں۔

میں نے اُس کی آنکھوں کے سحر سے بچنے کی شعوری کوشش کی مگر اُس نے مجھے کامیاب نہ ہونے دیا۔

''میں...... میں تمہاری ہوں...... تمہاری ہوں جیکب!'' چند ہی لمحے بعد میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔

''تو پھر اس کی تصدیق بھی کر دو عذرا!'' اُس نے مجھے ترغیب دی۔ ''دستخط کر دو!''

خود فراموشی کے اُن لمحوں میں اُس نے مجھ سے جہاں جہاں دستخط کرانے کو کہا، میں نے دستخط کر دیئے۔

پھر اُس نے میرے بازو میں انجکشن دیا اور کمرے میں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔

اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کتنے شب و روز یونہی گزر گئے! میں دھیرے دھیرے اندر ہی اندر بدلتی جا رہی تھی۔ اب وہ اجنبی ہی جیسے میری کل کائنات تھا۔ اُس کے بغیر میں خود کو ادھورا محسوس کرنے لگی۔ وہ میرے پاس نہ ہوتا تو ایک عجیب سی بے کلی رہتی۔ پھر وہ آ جاتا تو جیسے مجھے قرار آ جاتا۔ میں اُس سے شکوہ کرتی۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے جیکب؟''

میرے سوال پر وہ مجھے مسکرا کر خود سے قریب کر لیتا اور میں کسی معصوم سی بچی کی طرح سسکنے لگتی۔ میری حالت کسی ایسے سدھے ہوئے پرندے کی سی ہو گئی تھی جو اپنے مالک کا ہر اشارہ سمجھتا اور اس کے ہر حکم کی تعمیل اپنا فرض جانتا ہے۔ اس کے عوض مجھے اُس کی محبت ملتی تھی جو شاید اب میری ضرورت بن چکی تھی۔ وہ کہتا، بیٹھ جاؤ! میں بیٹھ جاتی۔ وہ حکم دیتا، اب سو جاؤ عذرا! تو میں آنکھیں موند لیتی اور پھر واقعی مجھے نیند آنے لگتی۔ کبھی یہ حکم دیتا کہ آج شام تمہیں کمرے سے نکل کر کوٹھی کے لان میں ٹہلانا ہے! میں ایسا ہی کرتی۔

اس کے علاوہ کوٹھی میں ملازمین بھی تھے، مگر نہ وہ مجھ سے کبھی ہم کلام ہوتے نہ میں اُن سے کوئی بات کرتی۔ جیکب نے مجھے اُن سے گفتگو کرنے کو منع کر دیا۔ وقت پر وہ ملازمین مجھے کھانا دے جاتے اور میں خاموشی سے کھانا کھا کر جیکب کے حکم کے مطابق سونا ہوتا تو سو جاتی، باہر لان میں ٹہلنا ہوتا تو ٹہلتی اور یوں سارا دن گزار دیتی۔ عموماً خود جیکب بھی میرے ساتھ ہوتا۔ اب بھی روز انجکشن لگ رہے تھے۔ جیکب نے مجھے ان انجکشنوں کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ طاقت کے انجکشن ہیں۔ اور میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔

اس دوران میں ایک روز عجیب سی مضحکہ خیز صورتِ حال پیش آئی۔ میں، جیکب کے ساتھ ڈائننگ رُوم میں تھی۔ ملازمہ نے ہمارے سامنے کھانا لگا دیا تھا کہ معاً جیکب نے مجھے مخاطب کیا۔ ''عذرا! ملازمہ کو بلا کر اُس کے منہ پر ایک تھپڑ مارو کہ اُسے اتنی تمیز نہیں کہ سوپ میں پڑی ہوئی مکھی ہی نکال دیتی!'' جیکب کی آواز دھیمی تھی۔

میں نے فوراً ملازمہ کو آواز دی۔ وہ لپکتی ہوئی قریب آئی تو میرا تھپڑ اُس کے رُخسار پر پڑا۔ وہ حیران سی مجھے دیکھتی رہ گئی اور اپنا رُخسار سہلانے لگی۔

''ارے عذرا! اس غریب نے کیا بگاڑا ہے! کیوں مار دیا اسے؟'' جیکب مجھ سے بولا۔

''سوپ میں مکھی پڑی ہے اور اس نے نہیں نکالی۔ اسی لئے تو تمہارے کہنے پر میں نے......''

''مگر سوپ میں تو مکھی نہیں ہے۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''نہیں ہے نا مکھی!''

میں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے سوپ کی طرف دیکھا۔ ''ہاں سوپ میں مکھی نہیں ہے۔'' میں نے جیکب

کی بات کی تصدیق میں کہا۔

''تم جاؤ!'' جیکب نے ملازمہ سے کہا اور وہ مجھے حیرت سے دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ پھر جیکب نے مجھے مخاطب کیا۔ ''تم نے ناحق اُسے مارا عذرا!''

''ہاں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' میں بول اُٹھی۔

یہ مضحکہ خیز واقعہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ پوری طرح ہوش و حواس میں ہونے کے باوجود میری اپنی کوئی رائے نہیں رہی تھی۔ گویا جیکب کی مرضی و خواہش ہی میری مرضی و خواہش بن گئی تھی۔ وہ دن کو رات کہتا تو میں بھی نہ صرف یہی کہنے لگتی بلکہ اس پر مجھے مکمل یقین بھی آ جاتا۔

اُس روز جیکب نے مجھ سے کہا کہ آج آخری انجکشن لگنا ہے۔ اب تمہیں اس کی ضرورت نہیں رہی۔ تم صحت مند ہو اب!''

''ہاں اب میں صحت مند ہوں۔'' میں کہنے لگی۔

''تمہیں اپنے جسم میں کسی طرح کی کمزوری بھی محسوس نہیں ہوتی۔ ہے نا؟''

''بالکل نہیں۔'' میں بولی۔ ''میں قطعی کمزور نہیں ہوں۔''

''مجھ سے لڑ سکتی ہو؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''اگر تم کہو گے تو ضرور لڑوں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

اُس وقت ہم دونوں لان میں تھے اور شام کا وقت تھا۔ جیکب پینترا بدل کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور مجھ سے بولا۔ ''آؤ! لڑو مجھ سے۔''

دوسرے ہی لمحے میں نے اُس پر چھلانگ لگا دی۔ اُس نے بچنا چاہا مگر ناکام رہا۔ میرا تربیت یافتہ جسم خود کارانہ انداز میں بجلی کی طرح کوندنے لگا۔ جیکب بھی مارشل آرٹ سے واقف معلوم ہوتا تھا مگر کچھ ہی ...ر میں ...ر ہو گیا اور میرے سامنے زیادہ نہ ٹک سکا۔

''لڑائی ختم!'' اُس نے زمین پر گرے گرے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے۔

میں اُس وقت جیکب کے سینے پر سوار تھی۔ لڑائی ختم ہونے کا اشارہ پاتے ہی میں اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ...بھی کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا اور اپنے نچلے ہونٹ سے بہتا ہوا خون پونچھنے لگا۔ اُس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور ...ائیں رُخسار پر بھی چوٹ نظر آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ بائیں کلائی اور ایک پیر پر بھی ضربیں تھیں۔ اس کے ...اجود اُس کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔ یوں جیسے اُس کی کوئی توقع پوری ہو گئی تھی۔

پھر وہ مجھے ساتھ لئے کوٹھی میں آ گیا۔ اُس کے ایما پر میں نے مضروب حصوں پر دوا لگائی اور پھر فرسٹ ایڈ ...لس ملازم سے واپس بھجوا دیا۔

''اب تو کبھی نہیں لڑو گی مجھ سے؟'' اُس نے بڑی محبت سے کہا۔

''نہیں، بالکل نہیں!'' مجھے اُس پر پیار آنے لگا۔ وہ میری مسہری پر دراز تھا اور میں اُس کے قریب بیٹھی ...ی تھی۔ پھر میں جھک کر اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

ضربیں زیادہ شدید نہیں تھیں اس لئے جیکب دوسرے دن شام تک لنگڑائے بغیر چلنے لگا۔ شام کی چائے

میرے ساتھ پیتے ہوئے اُس نے مجھ سے پوچھا۔ ''ڈارلنگ! کیا خیال ہے، قاہرہ چلیں ہنی مون منانے؟''

''جیسا تم کہو۔'' میں بولی۔

''کل میں سیٹیں ریزرو کروا لیتا ہوں، اِجپٹ ایئر سے۔''

''ٹھیک ہے، کرالو۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جیکب نے اس عرصے میں میرے لئے ڈھیر ڈھیر کپڑے بنوا لئے تھے۔ اُن میں اسکرٹ بھی تھے، پینٹ شرٹ بھی اور ساڑھیاں بھی! میں اُس کی پسند اور مرضی سے لباس پہنتی تھی۔ میرے پاس ضروریاتِ زندگی کی ہر شے موجود تھی۔ سفر کے لئے اسی وجہ سے کسی چیز کی ضرورت پیش نہ آئی۔ میرے لئے پاسپورٹ وغیرہ وہ پہلے ہی بنوا چکا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر ضروری کاغذات، یعنی میرا شناختی کارڈ وغیرہ بھی اُس کے پاس تھا۔ پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور دیگر کاغذات میں میرا نام مسز عذرا جیکب ہی لکھوایا گیا تھا۔ قانونی طور پر اب میں اُس کی بیوی تھی۔

مجھے اُس کوٹھی میں جیکب کے ساتھ اُس کی بیوی کی حیثیت سے رہتے ہوئے کتنے دن ہو گئے تھے، اس کا علم جیکب کو ہو تو ہو، میں بے خبر تھی۔ میرے احساسات تو یہ تھے جیسے مجھے جیکب کے ساتھ ایک عمر گزر گئی ہے۔ ملازمین بھی اب مجھے عذرا خان یا کچھ اور کہنے کی بجائے مسز جیکب ہی کہتے تھے۔ اس تغیر کو قبول کرنے کے باوجود کبھی کبھی میرا ذہن جانے کہاں بھٹکنے لگتا تھا! عموماً جیکب میرے چہرے سے اندازہ لگا لیتا تھا کہ میں کس کیفیت کا شکار ہوں۔ پھر وہ مجھے یا تو باتوں میں لگا کر میری توجہ کسی اور طرف مبذول کر دیتا تھا یا پھر کوئی ٹرینکولائزر دے دیتا تھا۔ اس طرح میرے ذہن کو سکون مل جاتا تھا۔ اگر ایسے لمحات میں جیکب میرے قریب نہ ہوتا تو مجھ پر ایک عجیب سا وحشت اور بیزاری طاری ہونے لگتی۔ میرا دل چاہتا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں، مگر اپنے ارادے پر عمل نہ کر پاتی اور پھر میرے سر میں شدید درد ہونے لگتا۔ جیکب آتا تو مجھے نیند کی گولی کھلا کر سلا دیتا۔ پھر جب میں بھرپور نیند لے کر اُٹھتی تو میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ہوتا۔ نہ میری آنکھوں میں ماضی کا کوئی چہرہ گھومتا اور نہ کوئی واقعہ یاد آتا۔

جب سے میں اُس کوٹھی میں آئی تھی، جیکب مجھے ایک دفعہ بھی باہر نہیں لے گیا تھا۔ خود میں نے بھی اُس سے کبھی یہ خواہش نہیں کی تھی۔ میں تو ان دنوں جیسے ساری دنیا سے کٹ کر بس جیکب کی ہو رہی تھی۔ وہی میرے لئے سب کچھ تھا۔ میرا ہر ارادہ اُسی کے حکم کا پابند تھا۔ میں گویا اُس کی بے دام کنیز بن چکی تھی، ایک ایسی کنیز جس کی اپنی کوئی رائے مرضی یا خواہش نہیں تھی۔ میری ہر خواہش، ہر ارادہ جیکب سے وابستہ تھا اور شاید جیکب کو اسی کا انتظار تھا۔ وہ غالباً اب میری طرف سے پوری طرح مطمئن ہو چکا تھا اسی لئے قاہرہ لے جا رہا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے احکام کا پابند بنانے میں کسی قسم کی جلد بازی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ میں اب پوری طرح ہوش و حواس میں ہونے کے باوجود اُس کے کسی حکم سے سرتابی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میرے ذہن میں جانے کیوں اور کیسے یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اگر میں نے جیکب کا حکم نہ مانا تو وہ مجھ سے بچھڑ جائے گا اور اگر وہ مجھ سے جدا ہو گیا تو پھر میں اس کے بغیر جی نہ سکوں گی۔

میں نے اب تک جیکب سے اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ قاہرہ روانگی سے ایک روز

خود اُسی نے جانے کیا سوچ کر مجھے مخاطب کیا۔ ''عذرا ڈارلنگ! جانتی ہو، میں کون ہوں؟''

''نہیں۔'' یہ جواب دے کر میں کچھ چکرا سی گئی اور پھر فوراً بولی۔ ''تم...... تم جیکب ہو، میرے جیکب!''

مجھے حواس باختہ سا دیکھ کر وہ ہنس دیا، پھر بولا۔ ''اگر کوئی تم سے یہ پوچھے کہ تمہارا شوہر کہاں کا رہنے والا ہے تو کیا جواب دو گی؟''

''کیا...... کیا جواب دُوں گی میں؟...... ہاں کیا جواب دُوں گی؟...... تمہی بتا دو نا!'' میں زچ ہو کر بولی۔

''میں امریکہ کے ایک شہر ٹیکساس کا رہنے والا ہوں۔'' اُس نے بتایا، پھر سوال کیا۔ ''تمہارا شوہر جیکب کہاں کا باشندہ ہے، جانتی ہو؟''

''امریکہ کے ایک شہر ٹیکساس کا۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''شاباش! اب دوسری باتیں توجہ سے سنو اور انہیں دماغ میں رکھو! میں ایک امریکی تاجر کا بیٹا ہوں۔ ولسن میرے باپ کا نام ہے جو بے اندازہ دولت کا مالک ہے۔ سیاحت کی غرض سے میں پاکستان آیا تھا اور یہاں تم سے ملاقات ہو گئی۔ ہم پہلی بار کہاں ملے تھے؟''

میں اپنے ذہن پر زور دے کر اُس کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرنے لگی۔ میرا ذہن اُلجھتا گیا۔

''تم بھول گئیں کہ یہاں ہماری ملاقات ایک بڑے ہوٹل میں ہوئی تھی۔'' وہ مجھے خاموش دیکھ کر بولا اور پھر اُس ہوٹل کا نام بتا کر کہا۔ ''یاد آ گیا نا تمہیں؟ وہیں ملے تھے نا ہم پہلی بار؟''

''ہاں'' میں نے اُس کا ایما پا کر اقرار کیا۔

''اور پھر ہم ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے تھے نا! تمہیں چند ہی ملاقاتوں میں مجھ سے عشق ہو گیا تھا نا! تم عشق کرتی ہو نا مجھ سے؟''

''ہاں مجھے تم سے عشق ہو گیا تھا اور میں...... میں تم سے عشق کرتی ہوں۔'' میں کسی طوطے کی طرح وہ سبق یاد کر رہی تھی جو وہ مجھے یاد کرا رہا تھا۔

''پھر ہم نے کورٹ میرج کر لی تھی۔'' اُس نے گویا مجھ سے تصدیق چاہی۔ ''یہاں کی ایک عدالت میں تم میرے ساتھ گئی تھیں اور......'' وہ مجھے سبق پڑھاتا رہا، پھر کہنے لگا۔ ''پاکستان سے ہم مصر کے شہر قاہرہ جائیں گے۔ اور وہاں کچھ دن گزار کر امریکہ روانہ ہو جائیں گے۔ پھر تمہیں امریکی شہریت بھی مل جائے گی۔ تمہارا بھی ارادہ ہے نا کہ امریکہ میں رہو!''

''میں تمہارے ساتھ امریکہ ہی میں رہنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اور یہاں جو تمہارا کاروبار ہے اس کا کیا ہو گا؟'' اُس نے اچانک ایسا سوال کر دیا جس کا تعلق میرے ماضی سے تھا۔

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور بیک وقت متعدد بھولے ہوئے چہرے میری آنکھوں میں گھومنے لگے۔ جیکب اس دوران میں میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

''میرے کاروبار کا یہاں کیا ہو گا؟...... کیا ہو گا؟'' میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔

''تم نے ابھی اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔'' معاً جیکب بول اُٹھا۔ اُس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی

جیسے میرا ذہنی خلفشار ختم ہو گیا۔ میرے اُلجھتے ہوئے ذہن کو ان الفاظ سے ایک سہارا مل گیا تھا۔ جیکب مزید بولا۔ ''فی الحال تمہارے ملازمین حسبِ دستور کاروبار کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔ تم نے اپنی فرم کی منیجر کو اتھارٹی لیٹر دے ہی رکھا ہے۔ اس دوران میں وہ تمام کاروباری معاملات سنبھال سکتی ہے۔ سنبھال سکتی ہے نا وہ؟''

''وہ اس کی اہل ہے، اُسے کوئی دُشواری نہیں ہو گی۔'' میں خوابیدہ لہجے میں بولی۔ حقیقت بھی یہی تھی جو جیکب نے کہا تھا۔ معلوم نہیں اُسے یہ بات کس نے بتائی تھی؟ میں نے اس سوال پر غور نہیں کیا۔ اور غور تو اُس وقت کرتی جب خود جیکب یہ چاہتا۔

''تم نے اپنی ہی پسند اور مرضی سے شادی کی ہے اور اپنی ہی خواہش کے مطابق امریکہ میں میرے ساتھ سکونت اختیار کرنا چاہتی ہو۔ یہی بات ہے نا عذرا ڈارلنگ!'' اُس نے مجھ سے نظریں ملا کر تصدیق طلب لہجے میں کہا۔ جب وہ مجھ سے کسی بات کی تائید چاہتا تھا تو اسی لہجے میں بات کرتا تھا۔

میں نے اُس کی مرضی کے مطابق وہی الفاظ دُہرا دیئے جو وہ سننا چاہتا تھا۔

''تم کتنی اچھی ہو عذرا ڈارلنگ!'' اُس نے میرا ہاتھ تھام کر محبت سے کہا۔

میں کھل اُٹھی۔ ایسے ہی الفاظ سننے کے لئے تو میری رُوح پیاسی رہتی تھی۔ وہ جب محبت سے مجھے اپنے قریب بلاتا تو میرے دل میں پناہ کا احساس جاگ اُٹھتا، بالکل اُن بچوں کی طرح جو بڑوں کی موجودگی میں بہت مطمئن اور خوش نظر آتے ہیں۔

دوسرے دن دوپہر ہونے سے کچھ پہلے میں نے کوٹھی میں ایک ایسے شخص کو دیکھا کہ میرے اعصاب جھنجھنا اُٹھے۔ وہ شخص جیکب سے مل کر واپس جا رہا تھا اور میں اُسے پہچان گئی تھی۔ اس وقت میں، جیکب کی تلاش میں اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔

''میں اپنے ڈرائیور کو کار لے کر بھیجے دیتا ہوں۔ وہ تم دونوں کو ایئرپورٹ چھوڑ کر واپس آ جائے گا۔'' اُس شخص نے چلتے چلتے جیکب سے مصافحہ کیا تھا اور پھر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا تھا۔

میں اُن دونوں سے خاصے فاصلے پر برآمدے میں تھی۔ اُس شخص نے یقیناً مجھے نہیں دیکھا تھا۔

اُس جانے پہچانے چہرے کو دیکھ کر میرا ذہن بے حد اُلجھ گیا تھا۔ اُس کی کار اب کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی اور جیکب واپس آ رہا تھا۔ اُس نے مجھے برآمدے میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔

میں اپنی جگہ اُلجھی اُلجھی سی کھڑی رہی اور جیکب میرے قریب آ گیا۔ ''کیا بات ہے ڈارلنگ! تم پریشان کیوں ہو؟'' جیکب نے محبت سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''وہ...... وہ کون تھا جو...... جو ابھی تم سے مل کر گیا ہے؟ تم اُسے...... اُسے کیسے جانتے ہو؟'' میں رُک رُک کر بولی۔

''وہ...... دوست تھا میرا۔ یہ کوٹھی اُسی کی ہے۔ وہ یہاں کا ایک بڑا آدمی ہے۔ جب وہ امریکہ جاتا ہے تو ہمارا مہمان ہوتا ہے۔ کیوں، تم نے شاید اس کی تصویریں اخبارات میں دیکھی ہوں گی۔ وہ پریذیڈنٹ آف پاکستان کے قریبی لوگوں میں سے ایک ہے۔'' جیکب نے مجھے بتایا۔

''وہ اچھا...... اچھا آدمی نہیں ہے جیکب! تم اب اُس سے نہ ملنا۔'' یہ الفاظ جانے کیسے اور کیوں میری زبان پر آ گئے۔

''میرے ساتھ وہ اب تک دوستی ہی کا سلوک کرتا رہا ہے۔ بہرحال چھوڑو، ہم تو یوں بھی آج یہاں سے جا رہے ہیں۔ اب اُس سے ملنے کا سوال ہی نہیں۔ تم اُس سے ملو گی تو تمہاری رائے اُس کے بارے میں بدل جائے گی۔ کبھی وہ امریکہ آیا تو تم سے ملواؤں گا۔ اچھا آدمی ہے وہ۔''

میں نے محسوس کیا کہ جیکب اُس شخص کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے بھی اُس شخص کو اچھا ہی سمجھنا چاہئے، مگر کوشش کے باوجود میں اُس وقت جیکب کی ہاں میں ہاں نہ ملا سکی اور خاموش رہی۔

وہ شخص شہریار تھا! وہی شہریار جو میرے مخالفین میں سے ایک تھا۔ وہاں اُس کی آمد، جیکب سے اُس کے تعلق اور اس سے برآمد ہونے والے نتائج پر مجھے غور و خوض کی مہلت نہیں ملی۔ جیکب نے مجھے اپنی گفتگو میں اُلجھا لیا تھا۔ اُسے شاید میرے اُلجھے ہوئے ذہن کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ یوں بھی میری ذہنی حالت و کیفیت اُن دنوں ایسی تھی کہ زیادہ دیر میں کسی ایسے مسئلے پر سوچ بچار نہیں کر سکتی تھی جس سے ذہن اُلجھنے لگے۔ جیکب بھی یہی کہتا رہتا تھا کہ جن باتوں کے سوچنے سے ذہن اُلجھنے لگے، انہیں ذہن سے جھٹک دیا کرو اور میں اسی پر عمل کرتی تھی۔ یوں میرا ذہن پُرسکون ہو جاتا تھا۔ اُس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ وقتی طور پر میرا ذہن پریشان ہوا مگر میں کچھ دیر بعد ہی پُرسکون ہو گئی۔ شہریار کے خیال کو میں نے اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

لنچ کے بعد جیکب کے حکم پر میں نے لباس تبدیل کر لیا۔ اُس نے مجھ سے اسکرٹ پہننے کو کہا تھا۔ اُسے یہی لباس زیادہ پسند بھی تھا۔ حالانکہ پہلے میں شلوار قمیص زیادہ پہنتی تھی اور اسکرٹ نہیں پہنتی تھی لیکن اب جیکب کی پسند کے ساتھ ساتھ میری پسند بھی بدل چکی تھی۔ اس عرصے میں ملازمین نے وہ سامان بھی باندھ دیا تھا جو ہمیں ایئرپورٹ ساتھ لے جانا تھا۔

شہریار کی بھیجی ہوئی کار میں جیکب اور میں تقریباً ڈھائی بجے کے قریب اُس کوٹھی سے ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ شاید ایک طویل عرصے کے بعد میں اُس کوٹھی سے باہر نکلی تھی۔ مجھے پہلی بار ہی یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ کوٹھی کلفٹن کے علاقے میں تھی۔ کار کے ساتھ ہی ڈرائیور بھی آیا تھا۔ میں، جیکب کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

اُن دنوں کراچی ہی نہیں، پورے ملک میں جلسوں اور جلوسوں کی لہر آئی ہوئی تھی۔ برسرِاقتدار حکمران جماعت بھی شہر شہر اپنے جلسے کر رہی تھی اور حزبِ اختلاف کی جماعتیں بھی۔ کراچی شہر جانے کیوں ہمیشہ حزبِ اختلاف میں رہنا پسند کرتا ہے۔ یہاں حزبِ اختلاف ہی کا زیادہ زور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فریئر ہال کے قریب لوگوں کا ہجوم دیکھ کر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ لوگ بینر اُٹھائے حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ سڑک کا بڑا حصہ اُن لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ شام کو شاید فریئر ہال میں حزبِ اختلاف کا کوئی جلسہ ہونے والا تھا۔

وہ کار جس میں ہم سفر کر رہے تھے کیونکہ شہریار کی تھی اور اُس پر فلیگ بھی لگا ہوا تھا اس لئے لوگوں نے اُسے گھیر کر رُکنے پر مجبور کر دیا۔ لوگ شاید یہ سمجھے تھے کہ کار میں حکمران جماعت کا کوئی وزیر ہو گا۔ ڈرائیور گھبرا

گیا۔ یہ صورت حال جیکب کے لئے بھی غیر متوقع ہی رہی ہوگی۔ مگر میں نے اُسے پُرسکون دیکھا۔ کار کے رُکتے ہی اُس نے فوری طور پر دُھندلے شیشے نیچے کر دیئے تھے۔

''ارے یہ تو کوئی غیر ملکی ہے۔'' ایک طرف سے آواز آئی۔

''سرکاری مہمان ہوگا، جانے دو اسے!'' دوسری آواز اُبھری۔

''اور یہ جو اس کے ساتھ لڑکی بیٹھی ہے، یہ تو پاکستانی ہے۔'' کوئی اور چیخا۔

''یہ سرکاری مہمان دار ہوگی یار!'' کسی نے جواب دیا اور لوگ اس معنی خیز تبصرے پر زور سے ہنسنے لگے۔

جیکب کی تدبیر کارگر رہی۔ لوگوں نے یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ کار میں کوئی سرکاری وزیر سفیر نہیں ہے، ہمیں آگے جانے دیا۔ میں اس دوران میں محض ایک خاموش تماشائی بنی رہی تھی۔ اُس ہنگامے سے نکلتے ہی جیکب نے ڈرائیور کو ہدایت کر دی تھی کہ جہاں بھی مجمع نظر آئے، ڈرائیور اُس طرف سے نہ چلے۔ مگر ایئرپورٹ پہنچنے تک پھر کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔

پورٹرز نے کار سے ہمارا سامان اُتارا اور پھر جیکب مجھے ساتھ لئے آگے بڑھا۔ میں اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھی۔

معاً ایک جانب سے ایک نوجوان تیزی کے ساتھ چلتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا اور میں اُس پر نظر پڑتے ہی چونک اُٹھی۔ وہ آپریشن سیل کا کیپٹن شاد تھا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔

''وہاں ڈو یو وانٹ مسٹر؟'' جیکب نے اُسے میرے قریب دیکھ کر رُکتے ہوئے سوال کیا۔

''میں ان خاتون سے خلوت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ مائنڈ نہ کریں!'' کیپٹن شاد نے سنبھل کر جواب دیا۔

اُسی وقت میری نظر سرفراز پر پڑی۔ وہ کیپٹن شاد سے چند قدم کے فاصلے پر بظاہر ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر اپنے چہرے کے قریب کئے کوئی ریڈیو پروگرام سن رہا تھا، مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ میں نے اُس کے ہونٹوں کو حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹرانسسٹر نہیں بلکہ جدید ساخت کا چھوٹا سا ٹرانسمیٹر تھا۔ سرفراز اُس پر غالباً آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کو میرا سراغ مل جانے کی رپورٹ دے رہا تھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ آپریشن سیل کے ارکان نے میری اچانک گمشدگی کے بعد مجھے تلاش کرنے کی خاطر زمین آسمان ایک کر دیا ہوگا۔ یقیناً اُنہوں نے پوری ناکہ بندی کر رکھی تھی ورنہ یوں اچانک وہ لوگ سامنے نہ آ جاتے۔ میں سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہی تھی مگر مجھ میں جیکب کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اُٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ کیپٹن شاد کے چہرے پر مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ اُلجھن بھی نظر آ رہی تھی۔

''ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ مسٹر!'' جیکب کے لہجے میں سختی آ گئی۔ ''تم ناحق ہمارا وقت برباد کر رہے ہو۔ ہے نا عذرا ڈارلنگ؟'' جیکب نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

عموماً ایسے مواقع پر میں فوراً جیکب کی تائید میں بول اُٹھتی تھی۔ مگر اس وقت کوشش کے باوجود کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میرا ذہن انتہائی اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ کیپٹن شاد کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میں اُس سے نظریں بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

مجھے اُلجھن میں گرفتار دیکھ کر جیکب نے پھر مخاطب کیا۔ ''مائی سویٹ ہارٹ! کیا تم اس نوجوان سے واقف ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''کون ہے یہ؟'' اُس نے سوال کیا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں، جیکب کے سوال کا جواب دیتی، کیپٹن شاد بول اُٹھا۔ ''میں ان کا قریبی عزیز ہوں۔ اور ایک عرصے سے ان کی تلاش میں ہوں۔ یہ اچانک نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ اپنے تعارف کے لئے میں یہ شناختی کارڈ دکھا سکتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے کیپٹن شاد نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر ایک شناختی کارڈ جیکب کی طرف بڑھا دیا۔

''مسٹر انصار احمد فرام انٹیلی جنس۔'' جیکب نے با آواز بلند شناختی کارڈ پر لکھا ہوا نام پڑھا جس پر کیپٹن شاد کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ ایسے بہت سے ''چٹکلے'' آپریشن سیل کے ارکان کی جیبوں میں پڑے رہتے تھے جو بوقت ضرورت کام آ سکیں۔

''اب یقیناً آپ مجھے ان خاتون سے تنہائی میں بات کرنے کی اجازت دے دیں گے۔'' کیپٹن شاد چبھتے ہوئے لہجے میں جیکب سے مخاطب ہوا۔

''تو......!'' جیکب فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''میری فلائٹ روانہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے اور ابھی مجھے امیگریشن اور کسٹم کاؤنٹر پر بھی جانا ہے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔''

''تو آپ جائیں۔'' کیپٹن شاد نے اطمینان سے کہا۔ ''میں آپ کو تو نہیں روک رہا۔''

''مگر میری مسز بھی میرے ساتھ جا رہی ہیں اسی فلائٹ سے۔'' جیکب میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں انہیں کس طرح یہاں چھوڑ کر آگے بڑھ سکتا ہوں؟''

''مسز......؟'' کیپٹن شاد کی حیرت قابل دید تھی۔ ''یہ...... یہ آپ کی مسز ہیں؟''

''یس!'' جیکب اُس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''مسز عذرا جیکب۔''

اسی دوران میں سرفراز بھی آہستگی سے چلتا ہوا جیکب کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اُسے کیپٹن شاد کو ایک خفیہ اشارہ کرتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ ہی سرفراز اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوا جیکب کے بالکل قریب ہو گیا۔

جیکب نے فوراً ہی سرفراز کی موجودگی کو محسوس کر لیا، مگر اس سے پہلے کہ مُڑ کر کچھ کہتا، سرفراز کی مدھم آواز سنائی دی۔ اُس کے لہجے میں سختی تھی۔ ''مسٹر جیکب! خاموشی سے ہمارے ساتھ ہال کے گیٹ کی طرف چلے چلو۔ ورنہ تمہارے پیٹ میں سوراخ بھی ہو سکتا ہے۔ میں کسی قسم کی رعایت نہیں کروں گا گولی چلانے میں۔ تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ ریوالور کی نال پر سائلنسر چڑھا ہوا ہے، گولی چلنے کی آواز نہیں ہو گی۔''

''تم لوگ پچھتاؤ گے۔'' جیکب کی آواز میں بے بسی تھی۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''عذرا

ڈارلنگ! کیا تم ان لوگوں کو یہ نہیں بتا سکتیں کہ مجھ سے شادی کر چکی ہو!'' اُس نے یہ الفاظ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیے تھے۔

''ہاں کیوں نہیں!'' میں ایک دم بول اُٹھی۔

''تو ان لوگوں سے کہو کہ یہ ہمیں جانے دیں۔''

''ہاں جانے دو نا تم لوگ ہمیں!'' میں سرفراز اور کیپٹن شاد سے مخاطب ہوئی۔

وہ دونوں حیرت سے میری شکل دیکھنے لگے۔ یقیناً وہ یہ نہیں سمجھ سکے ہوں گے کہ میں جیکب کے زیرِ اثر ہوں۔

''ان سے کہو عذرا ڈارلنگ! کہ یہ پیچھے ہٹ جائیں۔ پلیز!'' جیکب کے لہجے میں فریاد تھی۔

میں تڑپ اُٹھی اور پھر نسبتاً سخت اور بلند آواز میں بولی۔ ''تم لوگ ہٹ جاؤ پیچھے!''

سرفراز اور کیپٹن شاد کو بہرحال میرا حکم ماننا پڑا۔ اُن کے چہروں سے شدید اُلجھن اور حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر جیکب مجھے لے کر آگے بڑھنے والا تھا کہ ایک مرتبہ پھر کیپٹن شاد نے اُس کا راستہ روک لیا اور جلدی سے بولا۔ ''کیا میں آپ کے کاغذات چیک کر سکتا ہوں؟...... کیا آپ کے پاس اس بات کا ثبوت ہے کہ عذرا خان آپ سے شادی کر چکی ہیں؟''

''اوہ یس!'' جیکب چہک کر بولا اور پھر اپنے شانے سے لٹکے ہوئے ایئر بیگ کی زپ کھول کر کیپٹن شاد کو مطلوبہ کاغذات دکھانے لگا۔

سرفراز بھی اب کیپٹن شاد کے قریب آ کر گہری نظروں سے اُن کاغذات کو دیکھ رہا تھا۔ اُن دونوں ہی کے چہروں پر عجیب سی حیرت و وحشت نظر آ رہی تھی۔ پاسپورٹ اور بقیہ شناختی کارڈ جیکب کو واپس کرتے ہوئے اُنھوں نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے میرے کسی اشارے کے منتظر ہوں۔ میں اُن سے نظریں چرانے کی خاطر جیکب کی طرف دیکھنے لگی۔

''اب آپ لوگ مطمئن ہو گئے نا؟'' جیکب نے اُن دونوں کو مخاطب کیا، پھر مزید کہا۔ ''خود میری مسز سے بھی پوچھ لیں، اگر چاہیں تو۔'' یہ کہہ کر جیکب مجھ سے بولا۔ ''انہیں بتا دو مائی سویٹ ہارٹ! کہ تم میری بیوی ہو۔''

''میں جیکب کی بیوی ہوں۔'' میں نے اس طرح یہ الفاظ بمشکل ادا کیے جیسے کوئی بچہ اپنا سبق سناتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے بھی میری نظریں جیکب ہی سے ملی ہوئی تھیں۔

اُسی وقت میں نے سرفراز کو کیپٹن شاد سے سرگوشی کرتے دیکھا۔ غالباً اُسے کچھ شبہ ہو گیا تھا کہ میں، جیکب کے ٹرانس میں ہوں، مجھ پر تنویمی کیفیت طاری ہے۔ اس کا سبب شاید میرا لہجہ تھا۔

''پلیز مسٹر جیکب!'' معاً کیپٹن شاد نے انتہائی نرمی سے کہا۔ ''کیا ہم آپ کی موجودگی ہی میں آپ کی مسز سے کچھ پوچھ سکتے ہیں؟''

لمحہ بھر کو جیکب نے جیسے کچھ سوچا، پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، مگر پلیز ذرا جلدی!''

اجازت ملتے ہی کیپٹن شاد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''پلیز مسز عذرا جیکب! ذرا میری طرف دیکھیے۔''

میں نے بمشکل نگاہ اُٹھائی اور پھر میری نظریں کیپٹن شاد سے مل گئیں۔

''آپ مسز عذرا جیکب نہیں، عذرا خان ہیں، صرف عذرا خان!'' کیپٹن شاد کہنے لگا۔ ''آپ عذرا خان ہیں۔ یہ الفاظ دُہرایئے میرے ساتھ! کہیے کہ میں عذرا خان ہوں۔''

''میں عذرا خان ہوں۔'' میں نے کیپٹن شاد کے کہے ہوئے الفاظ دُہرائے۔

''نو!'' معاً جیکب زور سے بول اُٹھا۔ ''تم عذرا جیکب ہو، مائی وائف!'' پھر وہ کیپٹن شاد سے مخاطب ہوا۔ اُس کے لہجے میں سختی تھی۔ ''مسٹر! تم نے یہ کیا بکواس شروع کر دی؟ تم شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اس طرح میری بیوی کو ورغلا سکتے ہو۔'' پھر اُس نے مجھ سے کہا۔ ''چلو عذرا ڈارلنگ!''

میں، جیکب کا حکم پاتے ہی آگے بڑھنے لگی۔ کیپٹن شاد نے مجھے تو نہیں روکا، ہاں جیکب کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔

''لیومی!'' جیکب دھاڑا۔ اس کے ساتھ اُس نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا لی اور پھر بلند آواز میں بولا۔ ''تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ملک میں بے یار و مددگار ہوں، تو ایسا نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مجھے ساتھ لئے ایک قریبی کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ اِردگرد موجود لوگ تماشہ دیکھنے لگے۔

کیپٹن شاد اور سرفراز نے ابھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور اُس کے ساتھ ساتھ تھے۔ جیکب نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے فون کرنے کی درخواست کی۔ غیر ملکیوں سے یوں بھی ہمارے لوگ بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ اُس شخص نے جیکب کے سامنے ٹیلی فون سیٹ رکھ دیا۔

جیکب چند ہی لمحے بعد ایک نمبر ملا کر فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔ ''یس! مجھے مسٹر شہریار سے فوراً بات کرنا ہے۔ میں ایئر پورٹ سے بول رہا ہوں...... جی ہاں میرا نام جیکب ہے...... میں ہولڈ کرتا ہوں۔''

میں نے محسوس کیا کہ شہریار کا نام سنتے ہی کیپٹن شاد اور سرفراز دونوں ہی چونک اُٹھے ہیں۔ شاید اُنھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ معاملہ اب آگے بڑھ سکتا ہے۔ سکیورٹی کے عملے کی مداخلت کے بعد اُن دونوں ہی کی پوزیشن مشکوک ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ وہ سکیورٹی والوں کے سامنے خود کو انٹیلی جنس سے متعلق کیسے بتا سکتے تھے؟ اس معاملے میں شہریار جیسے شخص کی مداخلت اُن دونوں ہی کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتی تھی۔ شہریار کے لئے یہ کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنی حیثیت اور عہدے سے فائدہ اُٹھا کر جیکب کے لئے قانونی تحفظ فراہم کر دیتا۔ جیکب کے پاس بہرحال تمام ضروری کاغذات موجود تھے اور اُسے ایئر پورٹ پر مزید نہیں روکا جا سکتا تھا۔

جیکب کی چیخ پکار اور ہنگامہ آرائی کے سبب میرے اور جیکب کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ادھر جیکب کا فون پر شہریار سے رابطہ قائم ہوا، اُدھر کیپٹن شاد اور سرفراز ہجوم کی آڑ میں وہاں سے غائب ہو گئے۔ جیکب اُس وقت شہریار سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اُس کی توجہ اُن دونوں کی طرف نہیں تھی۔ فون پر جیکب نے شہریار سے شکایت کی تھی کہ انٹیلی جنس کے دو نوجوان خواہ مخواہ اُسے پریشان کر رہے ہیں۔ پھر وہ دوسری جانب سے کہے جانے والے الفاظ سننے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اُس نے ''تھینک یو'' کہہ کر فون بند کر دیا۔

شہریار کا نام ایئر پورٹ کے عملے ہی کے لئے نہیں، عام لوگوں کے لئے بھی جانا پہچانا تھا۔ وہ بہرحال ایک

سیاسی شخصیت تھا اور صدر مملکت کے مشیروں میں سے تھا۔ اسی لئے لوگ، جیکب سے متاثر نظر آنے لگے۔
''کم آن عذرا ڈارلنگ!'' جیکب نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ''دیکھتا ہوں، اب وہ دونوں کیسے مجھے
اور تمہیں پریشان کرتے ہیں!......مگر وہ......وہ گئے کہاں؟'' وہ اِردگرد نظریں دوڑاتے ہوئے کہنے لگا۔
''معلوم نہیں۔'' میں آہستہ سے بولی اور اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگی۔
جیکب غالباً کچھ سوچ سمجھ کر ہی فلائٹ کی روانگی سے خاصا پہلے ایئرپورٹ پہنچ گیا تھا۔ غالباً اُسے اندازہ رہا
ہوگا کہ ایئرپورٹ پر کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔
پھر امیگریشن، کسٹم اور دیگر ضروری کارروائیوں سے نمٹنے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ توقع کے مطابق
سکیورٹی کے عملے والے جیکب کے ساتھ ساتھ تھے۔ شہریار نے جیکب کے تحفظ کا بندوبست کر دیا تھا۔ عملے کے
افراد نے بس واجبی طور پر ہی میرے اور جیکب کے کاغذات چیک کئے تھے۔
ضروری کارروائیوں سے نمٹ کر جیکب مجھے ساتھ لئے اُس لابی میں آ گیا جہاں اُس فلائٹ سے روانہ
ہونے والے دوسرے مسافر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی مسافروں کو بس کے ذریعے طیارے تک لے جانے
میں تقریباً دس منٹ باقی تھے کہ مجھے لابی کے دروازے پر ایک آشنا چہرہ نظر آیا۔ یہ کمانڈر نواز تھا، آپریشن سیل کا
انچارج! اُس کے شانے سے ایک ایئر بیگ لٹک رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں چونکی تو اُس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں
اس اشارے کا مطلب سمجھ کر بھی گم صم سی بیٹھی رہی اور پھر اپنے ذہن کو مزید اُلجھن سے بچانے کی خاطر دوسری
طرف دیکھنے لگی۔ کمانڈر نواز کے اُس خفیہ اشارے کا مطلب یہ تھا کہ میں خطرے میں تو نہیں ہوں؟ یعنی مجھے
زبردستی تو کہیں نہیں لے جایا جا رہا؟ میں اس اشارے کا جواب بہت آسانی کے ساتھ اشارے ہی سے دے سکتی
تھی، اقرار یا انکار میں! مگر اُسی وقت جب میرا ذہن قابو میں ہوتا، واضح ہوتا۔ میں تو اس وقت ایک خواب کے
سے عالم میں تھی۔ میری قوتِ ارادی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ یا بالفاظ دیگر اُسے ختم کر دیا گیا تھا۔ ہاں مجھے ایک
بے چینی سی ضرور تھی اور یہ بے چینی اُس وقت سے شروع ہوئی تھی جب سے میری نظر کمانڈر نواز پر پڑی تھی۔
یہی وجہ تھی کہ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر میری نگاہ اُس طرف اُٹھی جہاں میں نے کمانڈر نواز کو دیکھا تھا۔ مجھے
اپنی طرف متوجہ پا کر اُس نے پھر وہی مخصوص اشارہ کیا۔ اس مرتبہ میری نگاہوں کے تعاقب میں جیکب نے بھی
اُسے اشارہ کرتے دیکھ لیا۔
''عذرا ڈارلنگ!'' جیکب نے مجھے فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ''کون ہے وہ؟....کیا تمہارا کوئی شناسا؟''
''ہاں......'' میں نے جواب دیا۔
''تم اُس طرف نہ دیکھو۔ نہیں دیکھو گی نا اب اُس کی طرف؟'' وہ بولا۔
''ہاں اب میں اُس کی طرف نہیں دیکھوں گی۔'' میں خوابیدار سے لہجے میں بولی اور اپنے سَر کو دونوں
ہاتھوں سے دبانے لگی۔ میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اُس وقت میرے ذہن میں دُور تک یہ بات نہیں تھی
کہ کمانڈر نواز اس سے کیا نتیجہ اخذ کرے گا! یوں گویا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبا کر میں نے کمانڈر نواز کے
خفیہ اشارے کا جواب خفیہ اشارے ہی سے دے دیا تھا۔ میرے اس اشارے کا مطلب یہ تھا کہ میں خطرے
میں نہیں ہوں اور دانستہ کسی سبب اپنی مرضی سے جا رہی ہوں، مجھے زبردستی کہیں نہیں لے جایا جا رہا۔

اس کے بعد میں نے کمانڈر نواز کو وہاں نہیں دیکھا۔ میرے نادانستہ اشارے نے اُسے یقیناً مطمئن کر دیا تھا۔ پھر لابی سے جہاز تک پہنچتے ہوئے اور فلائٹ کی روانگی تک کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

جہاز جب کراچی ایئرپورٹ سے قاہرہ کے لئے پرواز کر گیا تو جیکب کے چہرے پر مجھے اطمینان وسکون نظر آنے لگا۔ جب تک جہاز روانہ نہیں ہوا تھا، وہ کچھ مضطرب سا تھا۔ ہاں میرا ذہن ابھی تک اُلجھن کا شکار تھا اور اسی وجہ سے میرے سر میں درد تھا۔ جیکب کو یقیناً میری ذہنی حالت کا اندازہ تھا۔ اُس نے ایک خوبصورت ایئر ہوسٹس کو بلا کر لیمن اسکوائش لانے کے لئے کہا، پھر اپنے ہینڈ پرس کی زِپ کھولنے لگا۔

''تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے نا!'' اُس نے مجھے مخاطب کیا۔

''ہاں۔'' میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

''ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے پرس سے ایک چھوٹی سی شیشی کھول کر اُس میں سے چند قطرے میرے گلاس میں ڈال دیئے۔

میں نے اُس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور لیمن اسکوائش پینے لگی۔ اُسے پیتے ہوئے مجھے ہلکی سی تلخی محسوس ہوئی، مگر جیکب کے ایما پر پورا گلاس ختم کر کے ہی گلاس رکھا۔ جیکب کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اور میرا ہاتھ تھامے وہی باتیں کرتا رہا جنہیں سن کر میں سب کچھ بھول جاتی تھی۔ پھر میرے ذہن پر ہلکی ہلکی نشہ آور سی غنودگی چھانے لگی۔ اُس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا کہ سفر کیسے تمام ہوا! وہ راحت انگیز غنودگی اُس وقت ختم ہوئی جب جہاز لینڈ کرنے سے پہلے جیکب نے مجھے ایک اور مشروب پلایا۔ اب میں خود کو بالکل تر و تازہ محسوس کر رہی تھی۔ نہ میرے سر میں درد تھا اور نہ ہی ذہن میں کوئی دباؤ! میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر کے سیدھی بیٹھ گئی۔

چند منٹ کے بعد اعلان ہوا کہ جہاز قاہرہ ایئرپورٹ پر اُترنے والا ہے۔ اسی کے ساتھ سیفٹی بیلٹ باندھنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جگمگ جگمگ کرتے شہر قاہرہ کو دیکھا اور پھر بیلٹ باندھنے لگی۔ یہ شہر میرے لئے نیا نہیں تھا۔ میں پہلے بھی متعدد بار یہاں آ چکی تھی۔ چار کروڑ سے زیادہ آبادی کا یہ شہر تین حصوں پر مشتمل تھا۔ جیزا، قاہرہ اور پرانا قاہرہ! ان تینوں حصوں کی انتظامیہ الگ الگ تھی۔ مشرق کی طرف رُخ کرنے کی صورت میں دریائے نیل کی دائیں جانب جیزا تھا جسے مقامی لوگ گیزا بھی کہتے تھے۔ بائیں جانب جدید قاہرہ اور پرانا قاہرہ آباد تھا۔ میری چھوٹی بہن ذکیہ بھی یہیں تھی۔ اُس کی سکونت جیزا کے ایک خوبصورت علاقے دُقی میں تھی۔ دُقی ہی میں پاکستانی سفارت خانہ بھی تھا۔ دُقی میں چڑیا گھر سے چار چھ فرلانگ کے فاصلے پر ذکیہ کی وسیع وعریض کوٹھی تھی۔ میں اس سے پہلے جب بھی قاہرہ آئی تھی، یہیں ٹھہری تھی۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں دُور تک ذکیہ کا خیال نہیں تھا۔ میں جیسے حال میں زندہ تھی اور ماضی گویا میرے ذہن سے تقریباً محو ہو چکا تھا۔ ماضی کی بس کچھ پرچھائیاں سی میرے ذہن میں رقصاں تھیں۔ ایئرپورٹ پر اُترنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جو کچھ نظروں کے سامنے سے گزر رہا ہے پہلے بھی دیکھا ہے۔

جیکب کے ہمراہ ضروری کارروائیوں سے فارغ ہو کر میں، ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ گئی۔ عمارت کے باہر ایک بڑی سی خوبصورت کار ہماری منتظر تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک مصری بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اُس نے کار

سے اُتر کر ہم دونوں کے لئے پچھلا دروازہ کھول دیا اور پھر ڈگی میں سامان رکھوا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اُس نے بڑی گرم جوشی اور خوش اخلاقی کے ساتھ میرا اور جیکب کا استقبال کیا تھا۔

قاہرہ کا موسم عموماً معتدل اور خوشگوار ہی رہتا ہے۔ گرمی یہاں بہت کم پڑتی ہے۔ اُن دنوں بھی موسم خوشگوار تھا۔ حالانکہ کراچی میں خاصی گرمی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے راحت افزا جھونکوں کے ساتھ ہماری کار ایئرپورٹ سے شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔ ڈرائیور کو یقیناً علم ہوگا کہ اُسے کہاں جانا ہے، اسی لئے جیکب نے اُس سے کچھ نہیں کہا تھا۔

دنیا کے بڑے شہروں کی راتیں عموماً جاگتی رہتی ہیں، رات پر بھی دن کا گمان ہوتا ہے۔ قاہرہ دنیا کے قدیم اور عظیم شہروں میں سے ایک ہے۔ یہاں کی راتیں بھی جاگتی ہیں۔ اُس وقت بھی رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی، مگر قاہرہ جاگ رہا تھا۔ ہماری کار تیز رفتاری سے سفر طے کرتی ہوئی جدید قاہرہ کے مرکزی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ تحریر اسکوائر تھا جسے جدید قاہرہ کا دل کہا جا سکتا ہے۔ اسی علاقے سے متصل ہماری کار شارع قصر النیل پر پی آئی اے کے دفتر کے سامنے سے گزرتی ہوئی دائیں جانب ایک سڑک پر مُڑ گئی۔ خوب صورت سی اُس تین منزلہ عمارت کے نچلے حصے میں بڑی بڑی دُکانیں تھیں جو اس وقت بند تھیں۔ اُسی کے سامنے پہنچ کر ہماری کار رُک گئی اور ڈرائیور نے جلدی سے اُتر کر ہمارے لئے کار کا دروازہ کھول دیا۔ جیکب میرا ہاتھ تھامے کار سے اُتر آیا اور کار آگے بڑھ گئی۔ دُکانوں کے درمیان ایک چوڑا سا زینہ تھا جس کا آہنی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جیکب مجھے ساتھ لئے اُس طرف بڑھ گیا۔ میں اُس کے ہمراہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ زینے میں روشنی تھی۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر ہم دائیں جانب مُڑ گئے۔ سامنے ہی کچھ بلندی پر دروازہ نظر آرہا تھا۔ دروازے پر ایک مقامی شخص کھڑا ہوا تھا۔ اُس کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔ اُس نے ہمیں قریب آتے دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ اندر راہداری میں دبیز اور خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا جس پر چلتے ہوئے ہم دونوں آگے بڑھتے رہے۔

اندر قدم رکھتے ہی مجھے اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ اس گھر کی فضا بڑی عجیب اور پُراسرار سی تھی۔ وہاں ڈِم لائٹ تھی، ہلکی نیلی! اور فضا میں ایک بوجھل سی خاموشی جو اعصاب پر گراں گزر رہی تھی۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی گھر کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس عمارت میں جیکب اور میرے سوا کوئی نہ ہو۔ جیکب کی رہنمائی میں، میں ایک بڑی سی خواب گاہ میں آ گئی۔

"اُس طرف وارڈ روب ہے، لباس تبدیل کرلو۔" جیکب نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"مگر کپڑے...... میرا سوٹ کیس......"

"وہاں تمہارے ناپ کے کپڑے موجود ہیں۔" اُس نے کہا اور ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

خواب گاہ میں دو بڑے بیڈ کچھ فاصلے سے موجود تھے۔ میں لباس تبدیل کر آئی تو جیکب نے آرام کرسی سے اُٹھتے ہوئے ایک بیڈ کی طرف اشارہ کیا اور میں اُس طرف بڑھ گئی۔ نہ معلوم وہاں میرے ناپ کے کپڑے پہلے ہی سے کس طرح موجود تھے! چند لمحے کو مجھے یہ خیال آیا اور پھر میں بیڈ پر رکھی ہوئی چادر اوڑھ کر بستر پر دراز ہو گئی۔ کچھ دیر بعد جیکب بھی شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے دوسرے بیڈ پر دراز ہو گیا۔

"سو جاؤ اب!" جیکب نے گویا مجھے حکم دیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر نیند میری آنکھوں میں

کروٹیں لینے لگی......!

"نو!" ایک تیز اور بھاری آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ یہ آواز میرے لئے اجنبی تھی۔ بولنے والا انگریزی میں کسی سے کہہ رہا تھا۔ "اس کی اجازت تو جیکب کو بھی نہیں دی گئی تھی جس نے عذرا خان کو باحفاظت یہاں پہنچا کر یقیناً ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"مگر کیوں؟ اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟" جواباً دوسری آواز سنائی دی۔ لہجے سے بولنے والا مقامی ہی معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے بھی انگریزی ہی کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔

میں نے آہستگی سے پلکیں کھولیں اور اطراف کا جائزہ لیا۔ یہ وہ خواب گاہ نہیں تھی جہاں میں سوئی تھی۔ میں ایک بڑی اُونچی میز پر دراز تھی اور میرا جسم بیلٹوں سے کسا ہوا تھا۔ میرے سرہانے اور دائیں بائیں عجیب سی مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔ اُس بڑے کمرے میں دائیں جانب کچھ فاصلے پر ایک بڑی سی میز کے گرد مجھے چند آشنا اور نا آشنا چہرے نظر آئے۔ جیکب بھی وہیں موجود تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ کوئی اہم میٹنگ کر رہے ہوں۔ وہ کل چھ افراد تھے جن میں سے نصف میرے لئے شناسا تھے، ایک تو جیکب، دوم وہ دونوں جرمن سائنس دان جن سے کراچی میں میری ملاقات ہو چکی تھی، یعنی شیفر اور شیپرڈ! اُن دونوں کے مقابل دو مصری بیٹھے تھے جن میں سے ایک قدیم عربی لباس میں تھا۔ بڑی سی میز کے دائیں بائیں وہ پانچوں بیٹھے تھے اور درمیان میں میز کے سرے پر ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا، یوں جیسے اُس میٹنگ کی صدارت کر رہا ہو۔ اُس کی کرسی بھی نسبتاً بڑی تھی۔ اُس ادھیڑ عمر شخص کی آنکھوں پر بھاری فریم کی عینک لگی ہوئی تھی، چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور جسم بھاری تھا۔ اُس کے سر کا بڑا حصہ بالوں سے خالی تھا، جھالر کی صورت میں کھچڑی بال اطراف میں نظر آرہے تھے۔ اُس کی شخصیت بارُعب اور متاثر کن تھی۔ قدیم عربی لباس پہنے ہوئے، چھوٹی سی داڑھی اور شکرے جیسی گول گول آنکھوں والا وہ مصری اسی ادھیڑ عمر شخص سے مخاطب تھا۔

"پھر! اس بات کا کیا ثبوت ہے ڈاکٹر رچرڈ! کہ جیکب نے تمہارے حکم کی تعمیل کی ہوگی اور اس حسین لڑکی سے......"

"شیخ سالم!" ادھیڑ عمر شخص نے اُس کی بات کاٹ دی جسے ڈاکٹر رچرڈ کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ "پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ میں کس لئے انکار کر رہا ہوں۔"

"ہاں بتائیں!" شیخ سالم پہلو بدل کر بولا۔

"یہ تو آپ کو علم ہے کہ یہ لڑکی حیرت انگیز ذہنی قوتوں کی مالک ہے!" ادھیڑ عمر ڈاکٹر رچرڈ کا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

"ہاں معلوم ہے۔" شیخ سالم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کسی مرد سے وابستگی عورت کے وجود میں مخصوص قسم کی تبدیلیاں رُونما کر دیتی ہے اور اس کا اثر اُس کے ذہن پر بھی پڑتا ہے۔ اس لڑکی کے سلسلے میں بھی ایسا ممکن تھا۔ اسی سبب جیکب کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھے جس پر اُس نے پورا عمل کیا۔ میں اس کی تصدیق کر چکا ہوں۔ اس سے قطع نظر مجھے جیکب پر بھی پورا بھروسہ ہے۔ وہ بہرحال غیر ذمہ دار نہیں ہے۔" ڈاکٹر رچرڈ نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "میں لڑکی

کا طبّی معائنہ کر کے پوری طرح مطمئن ہوں۔ اب ہم اس پر جو تجربہ کریں گے، اُس میں اس طرح کی کوئی رُکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔ آپ نے اب تک ہمارے ساتھ ہر اعتبار سے مکمل تعاون کیا ہے جس کے لئے ہم آپ کے ممنون ہیں، مگر یہ معاملہ ایسا ہے کہ معذرت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہاں، تجربے کے بعد یہ ممکن ہے کہ ہم اس لڑکی کو ایک دو روز کے لئے آپ کے حوالے کر دیں۔'' ڈاکٹر رچرڈ کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بڑی حد تک شیخ سالم کے دباؤ میں ہے۔

شیخ سالم نے ڈاکٹر رچرڈ سے کیا مطالبہ کیا ہوگا، ان لوگوں کی گفتگو سن کر یہ سمجھنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ مجھے اسی لئے طوطے کی سی ناک والے اُس مصری سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔

''اچھا تو پھر ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔ تم اپنا تجربہ کرو!'' یہ کہہ کر شیخ سالم اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''تجربے کے بعد اپنا وعدہ یاد رکھنا اور یہ بھی کہ میری ناراضگی مول لے کر تم اس شہر سے نکل نہیں سکو گے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اُس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

''میں اچھی طرح یہ بات جانتا ہوں شیخ سالم! تجربے کے بعد یقیناً چند روز کے لئے اس لڑکی کو آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور پھر جب اس سے آپ کا جی بھر جائے گا، اس کے بعد ہی ہم یہاں سے امریکہ روانہ ہوں گے۔'' ڈاکٹر رچرڈ جواباً بولا۔

شیخ کے ساتھ ہی دوسرا مقامی مصری اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جیکب اُن دونوں کو چھوڑنے چلا گیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تک اسے ہوش آ جانا چاہئے۔'' شیفر نے ڈاکٹر رچرڈ سے کہا۔

''ہاں، وقت تو ہو گیا ہے۔ انجکشن کا اثر اب تک ختم ہو جانا چاہئے۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی، پھر اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ! دیکھتے ہیں۔''

میں نے اُن تینوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ انہوں نے کب اور کس لئے انجکشن دیا تھا اور یہ کہ میں سونے کی بجائے بے ہوش تھی۔

''ہیلو عذرا خان!'' معاً بھاری آواز والے نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ ڈاکٹر رچرڈ ہی ہو سکتا تھا۔ اُس کی آواز میں اب پہچان گئی تھی۔ یہ وہی تھا، مجھے جس کے متعلق کراچی میں معلوم ہوا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تمہارے پپوٹوں کی حرکت بتا رہی ہے کہ تمہیں ہوش آ چکا ہے۔ آنکھیں کھول دو! تجربے کے دوران میں تمہارا باہوش رہنا ضروری ہے۔''

اچانک میں نے آنکھیں کھول دیں اور اسی کے ساتھ ڈاکٹر رچرڈ کو مخاطب کیا۔ ''تم مجھ پر کیا تجربہ کرنا چاہتے ہو اور کیوں؟''

''ہمارے خیال میں تمہارے دماغ کی حیرت انگیز قوتوں کو ارادے کا پابند بھی کیا جا سکتا ہے۔'' اُس نے نرم لہجے میں میرے سوال کا جواب دیا، پھر خود ہی اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔ ''اب تک تمہارے ذہن کی قوتیں کسی بھی لمحے خود بخود بیدار ہوتی رہی ہیں جس میں تمہاری مرضی یا خواہش کو کوئی دخل نہیں۔ ہم ان بے پناہ قوتوں کو تمہارے ارادے کا پابند بنانا چاہتے تھے، پھر تم جب چاہو گی مستقبل میں جھانک سکو گی اور گزرے ہوئے زمانوں کے بارے میں بھی بالکل درست باتیں بتا سکو گی۔''

''مگر اس سے تم لوگوں کو کیا فائدہ ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ کام سود و زیاں سے بالاتر ہو کر بھی تو کئے جاتے ہیں نا!'' وہ کہتے ہوئے مسکرایا۔ اُس کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔

''میں نہیں مان سکتی۔'' میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

''تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا عذرا خان!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

میں نے یہ بات بھی بخوبی محسوس کر لی تھی کہ اب میرے ذہن پر تنویمی اثرات نہیں ہیں، میں اب ٹرانس سے نکل آئی ہوں۔ ہاں اُس عالم میں جو کچھ مجھ پر گزرا تھا، مجھے پوری طرح یاد تھا۔ مجھے یہ جان کر بھی یک گونہ سکون و اطمینان ہوا تھا کہ جیکب نے میری قوتِ ارادی ختم کرنے کے باوجود کوئی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھایا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ اس کی وجہ بھی شیخ سالم سے بیان کر چکا تھا۔ مجھے تنویمی اثر سے نکالنے اور دوبارہ نارمل حالت میں لانے کے لئے یقیناً انہوں نے کچھ نہ کچھ کیا تھا ورنہ اس وقت میں ڈاکٹر رچرڈ سے سوال جواب کی حالت میں نہ ہوتی۔ اب میں یہ بھی سمجھ چکی تھی کہ مجھے کراچی سے بغیر کسی رُکاوٹ کے قاہرہ لانے کی خاطر کورٹ میرج وغیرہ کا ڈرامہ کھیلا گیا تھا ورنہ اس ڈرامے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس طرح گویا میں اپنی مرضی سے قانونی طور پر جیکب کے ہمراہ کراچی سے قاہرہ آ گئی تھی۔ میرے حریفوں نے اچانک ایک طویل عرصے تک غائب رہ کر مجھ پر اس طرح جال پھینکا تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس وقت جب ڈاکٹر رچرڈ، شیفرڈ اور شیپرڈ کی مدد سے مجھ پر ایک خصوصی نوعیت کا تجربہ کرنے والا تھا اور اُسی کی تیاری میں مصروف تھا، میرا ذہن گزرے ہوئے واقعات کی کڑیاں جوڑنے میں منہمک تھا۔

ذرا ہی دیر میں ڈاکٹر رچرڈ کے ایما پر شیفرڈ اور شیپرڈ نے میرے سر کو بھی ایک بیلٹ سے کس دیا۔ اب میں اپنے سر کو بھی اِدھر اُدھر حرکت نہیں دے سکتی تھی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے سر پر انہوں نے کوئی خود سا چڑھا دیا ہے۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنی کنپٹیوں پر بھی دباؤ محسوس ہوا۔

''یس!'' معاً ڈاکٹر رچرڈ کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔ ''سٹارٹ......!''

اس آواز کے ساتھ ہی میں نے شیفر کو ایک مشین کا لیور کھینچتے دیکھا جو میری دائیں جانب رکھی تھی۔ پہلے ہلکی سی زنزناہٹ ہوئی اور پھر میرے جسم کو جھٹکا سا لگا۔

''نمبر ٹو!'' ڈاکٹر رچرڈ کی آواز پھر سنائی دی۔

میرے جسم کو دوسرا جھٹکا لگا اور ایک برقی رو سی سارے جسم میں دوڑ گئی۔ بائیں جانب رکھی ہوئی مشین کو شیپرڈ کنٹرول کرنے لگا تھا۔

''ناؤ آئی ایم سٹارٹنگ ٹارگیٹ!''

ڈاکٹر رچرڈ کے یہ الفاظ ابھی ختم نہیں ہوتے تھے کہ میرے دماغ میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھیں جیسے خود بخود بند ہو گئیں۔ غالباً اُس نے میرے سرہانے رکھی ہوئی مشین سٹارٹ کر دی تھی۔ ان تینوں ہی مشینوں سے نکلے ہوئے تار میرے سر پر چڑھے ہوئے خود سے منسلک تھے۔ کچھ دیر میرے دماغ میں چکاچوند سی ہوتی رہی اور پھر میں نے اپنے ذہن کی سکرین کو روشن ہوتے دیکھا۔ میں اب بند آنکھوں

سے ایسے منظر دیکھ رہی تھی جو پہلے کبھی میری نگاہ سے نہیں گزرے تھے۔ وہ منظر بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔

"عذرا خان! اس وقت تمہیں ذہن کے وہ خوابیدہ سیل متحرک ہیں جن کا تعلق ماضی سے ہے۔" مجھے ڈاکٹر رچرڈ کی آواز جیسے کہیں بہت دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ "میرے اندازے کے مطابق اس وقت تمہارا دماغ ماضی کے اُن تاریک زمانوں کا سفر کر رہا ہے جن کے بارے میں تاریخ بھی خاموش ہے، قبل از تاریخ، اب سے لاکھوں سال پہلے...... تم کیا دیکھ رہی ہو، کیا ہمیں بتا سکتی ہو؟"

"ہاں، میں دیکھ رہی ہوں...... انجانے زمانے اور انجانے لوگ کہ جن کے قد آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔" میرے ہونٹ جیسے خود بخود حرکت کر رہے تھے۔ "وہ پہاڑوں کو کاٹ کر رہتے ہیں اور اجنبی زبانیں بولتے ہیں، مگر میں...... میں شاید ان کی باتیں سمجھ سکتی ہوں۔"

"تو پھر بتاؤ کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟" ڈاکٹر رچرڈ کی آواز پھر آئی۔

"کوئی نورانی چہرے والا اُنہیں آنے والے عذاب کی خبر دے رہا ہے اور...... اور وہ منظر بدل گیا ہے۔ اب...... اب ہر طرف قبرستان کا سا سناٹا ہے۔ شاید عذاب آ کر گزر چکا ہے۔ مجھے یہاں بڑی دہشت محسوس ہو رہی ہے۔"

"شیفر! فاسٹ!" ڈاکٹر رچرڈ کی آواز اُبھری۔

"او کے ڈاکٹر!" شیفر جواباً بولا۔ اُن سبھی کی آواز سے مسرت کا اظہار ہو رہا تھا شاید اُن کا تجربہ کامیاب ہو رہا تھا۔

منظر اب اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ اُن پر میرے باطن کی آنکھ جم نہیں پا رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا وجود انتہائی تیز ہواؤں کے زور پر ہے اور جیسے میں ماضی سے حال کی طرف سفر کر رہی ہوں، صدیوں کا سفر......!

اچانک میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا، اس کے ساتھ میرا ذہن تاریک ہو گیا۔

"یہ کیا، کیا تم نے احمق آدمی!" ڈاکٹر رچرڈ کی برہم آواز سنائی دی۔ "ابھی تمہیں یہ بٹن نہیں دبانا چاہئے تھا۔"

"سوری، ویری سوری ڈاکٹر!" شیفر کی خجالت آمیز آواز اُبھری۔ "ایکس کیوزمی!"

"معلوم نہیں اس کے کیا اثرات ظاہر ہوں گے۔" ڈاکٹر رچرڈ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

پھر میں کچھ نہ سن سکی۔ کیونکہ میرا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کے بعد نہ جانے کب تک میرے دماغ پر تاریکی مسلط رہی۔ میں تو اس وقت چونکی جب ایک تیز قسم کی سنسناہٹ مجھے اپنے سارے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر ایک دم میرا ذہن روشن ہو گیا۔ اب میرے ذہن کی سکرین پر کچھ دیکھے بھالے سے منظر اُبھر رہے تھے۔

"عذرا خان!" ڈاکٹر رچرڈ کی آواز کافی دیر بعد کہیں دُور سے سنائی دے رہی تھی۔ "اب تم زمانہ حال میں ہو۔ بتاؤ تمہیں کیا نظر آ رہا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اگر چاہوں تو ڈاکٹر رچرڈ کے سوال کا جواب نہ دُوں۔ سو میں نے خاموشی اختیار کی۔ میں اب خود کو پہلے کی طرح بے اختیار محسوس نہیں کر رہی تھی۔ یہ تبدیلی مجھے بہتر لگ رہی تھی۔

"بولو عذرا خان!" ڈاکٹر رچرڈ کی آواز نے مجھے ترغیب دی۔ "کیا تمہیں کچھ نظر آ رہا ہے؟"

"نہیں! ہر طرف تاریکی ہے یہاں۔ میں نے دانستہ جھوٹ بول کر دیکھا تا کہ ڈاکٹر رچرڈ کا ردِ عمل جان سکوں۔

"ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر رچرڈ نے اپنے معاونین کو کچھ ہدایات دیں۔

ان ہدایات کے چند لمحے بعد مجھے اپنے جسم میں غیر معمولی قوت کا احساس ہوا جیسے میں چمڑے کے ان بیلٹوں سے اپنا جسم آزاد کرا سکتی ہوں۔ بطور آزمائش میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے چمڑے کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ میرا ہاتھ گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ پھر مجھے اپنا دوسرا ہاتھ اور دونوں پاؤں آزاد کرانے میں بس چند منٹ لگے۔

"ارے...... ارے!...... یہ...... یہ کیا ہوا؟" یکے بعد دیگرے اُن کی حیرت بھری چیخیں اُبھریں۔

"شیپرڈ! ڈاؤن دی لیور!" ڈاکٹر رچرڈ چیخا۔

ابھی اُس کے الفاظ ختم نہیں ہوئے تھے کہ میں نے اپنے سر سے خود اُتار پھینکا۔ شیپرڈ، ڈاکٹر رچرڈ کی ہدایت پر غالباً عمل نہیں کر سکا تھا ورنہ شاید میں اپنے سر سے خود اُتارنے میں کامیاب نہ ہو پاتی۔ خود اُتارتے ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے پیشانی پر کسی ہوئی بیلٹ بھی ہٹا دی اور میز سے اُچھل کر نیچے کھڑی ہو گئی تھی۔

"مشین بند کرو!...... بند کرو مشین ورنہ آگ لگ جائے گی۔" ڈاکٹر رچرڈ نے چیخ کر اپنے معاونین سے کہا اور میرے سرہانے رکھی ہوئی مشین کا سوئچ آف کر دیا۔

شیفر اور شیپرڈ نے بھی اپنی اپنی مشینیں بند کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔ کمرے میں ان تینوں کے علاوہ نہ جانے کب جیکب بھی آ کر دُور ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اگر چیخ کر اپنی طرف متوجہ نہ کر لیتا تو میں اُس کی طرف سے غافل ہی رہتی۔

"بھاگنے کی کوشش نہ کرنا عذرا خان!" جیکب نے چیخ کر کہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں مجھے ریوالور نظر آ رہا تھا۔ "اگر تم اپنی جگہ سے ہلیں تو گولی مار دُوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُس کے ریوالور کی نال کا رُخ میری ہی جانب تھا۔

"تم نرے احمق ہو جیکب!" میں بلند آواز میں بولی۔ "تم مجھ جیسی قیمتی لڑکی کو گولی نہیں مار سکتے۔ چلاؤ گولی! میں اپنی جگہ سے چل کر تمہاری ہی طرف آ رہی ہوں۔"

"رُک جاؤ!" وہ اپنے ریوالور کو حرکت دینے لگا۔

"ریوالور جیب میں رکھ لو بیوقوف آدمی! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ڈاکٹر رچرڈ نے جیکب کو مخاطب کیا۔

"مگر...... مگر ڈاکٹر...... یہ...... یہ فرار ہو جائے گی اور پھر......"

"بکومت!" ڈاکٹر رچرڈ چیخا۔ "یہ ایک تنہا لڑکی ہے اور ہم چار افراد ہیں۔ کیا ہم اسے قابو نہیں کر سکتے؟"

''میرا خیال ہے کہ نہیں۔'' جیکب نے یہ کہتے ہوئے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ ''ڈاکٹر! آپ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ اس وقت اس کے جسم میں غیر معمولی طاقت پیدا ہو گئی ہے ورنہ چمڑے کی بیلٹوں کو توڑ کر اُن کی گرفت سے آزاد نہ ہو پاتی۔ اس سے قطع نظر، یہ ہوش و حواس میں کتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے، آپ کو غالباً اس کا اندازہ بھی نہیں ہے۔''

اس وقت تک میں جیکب کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ مجھ سے اب چند قدم پر تھا۔ کمرے کے بند دروازے اور میرے درمیان اب صرف وہی حائل تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اُس پر حملہ آور ہوتی، وہ خود ہی میری طرف لپکا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ آخری لمحے میں سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ اپنے زور میں تیزی سے آگے نکل گیا۔ اسی لمحے میں نے پلٹ کر اُس کے کولہے پر لات ماری اور وہ اوندھے منہ فرش پر گرا۔ پلٹنے کے ساتھ ہی میری نگاہ ڈاکٹر رچرڈ پر پڑی جو نہ جانے کیوں اپنے چہرے پر گیس ماسک چڑھا رہا تھا! میں اس وقت غور نہ کر سکی کہ اس کا سبب کیا ہے ورنہ شاید مزید ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کمرے سے نکل جاتی۔ میری وہ لمحاتی حیرت ڈاکٹر رچرڈ کے لئے سود مند ثابت ہوئی۔ اُس نے شیپرڈ اور شیفر کو اشارہ کیا جو مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ وہ دونوں مجھ پر جھپٹے اور پھر ربڑ کی گیند کی طرح اُچھل کر دُور جا گرے۔ اُن دونوں کے لئے ایک ایک پنچ کافی ہوا تھا۔ اسی دوران میں فرش پر گرے ہوئے جیکب نے ایک دم اُچھل کر مجھ پر جست لگائی عین اُسی وقت میں نے تیز قسم کی بو محسوس کی جو میرے سانس کے راستے پھیپھڑوں میں بھر گئی۔ جیکب کسی مُردہ چھپکلی کی طرح بے سدھ ہو کر فرش پر آ رہا اور جیسے میرے جسم کی قوت بھی کسی انجانی طاقت نے سلب کر لی۔ میرے پیر کانپنے لگے اور میں فرش پر بیٹھ گئی۔ لمحوں کے اندر سارے کمرے میں کثیف اور بدبودار دُھواں بھر گیا تھا۔ اُس دُھوئیں کا مخرج ایک گیس سلنڈر تھا جو ڈاکٹر رچرڈ کے قریب رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ، گیس ماسک پہنے دُھوئیں ہی کا ایک حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ گیس یقیناً انتہائی زود اثر تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ کے سوا کمرے میں کسی کو ہوش نہ رہا تھا۔ مجھ میں کیونکہ قوتِ مدافعت کچھ زیادہ تھی اس لئے اب تک فرش پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ مگر آخر کب تک! چند لمحے مزید گزرنے تو مجھے بھی اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا اور پھر چکر بھی آنے لگے۔ کمرے کے در و دیوار تیزی سے گھومنے لگے تو میں ایک طرف لڑھک گئی۔ پھر مجھے یاد نہ رہا، کیا ہوا! میری اطراف دُھواں ہی دُھواں تھا اور میرا وجود جیسے اُس دُھوئیں میں گردش کرتا ہوا تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک نئی جگہ پایا۔ یہ کسی کی وسیع و عریض خواب گاہ معلوم ہوتی تھی، مگر وہ خواب گاہ نہیں جہاں پہلے میں ایک رات گزار چکی تھی۔ میرے ہاتھ پیر ریشمی ڈوریوں سے بندھے ہوئے تھے اور میں ایک بڑے ڈبل بیڈ پر پڑی تھی۔ خواب گاہ بہترین سامانِ آرائش سے مزین تھی۔ فرش پر بھی قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس سے تازہ ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ خواب گاہ میں روشنی تھی، مگر اتنی تیز نہیں کہ ناگوار ہو۔ میں نے اسی سے اندازہ لگایا کہ یہ رات کا وقت ہے۔ پھر ایک جانب مجھے دیوار پر لگا ہوا خوبصورت کلاک بھی نظر آ گیا۔ اس میں نو بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے۔ دروازہ مجھے بند نظر آیا۔ میرے سوا وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ میں سوچنے لگی کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ کیا یہ وہی عمارت ہے جہاں میں، جیکب کے ساتھ آئی تھی یا کوئی اور جگہ ہے؟ جانے کیوں اس خوبصورت خواب گاہ کو دیکھ کر مجھے بار بار شیخ سالم کا خیال آ رہا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ نے میرے سامنے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ تجربے کے بعد ایک دو دن کے لئے وہ مجھے اُس کے حوالے کر دے گا۔ تو کیا یہ وہی وعدہ وفا کیا جا رہا ہے؟ میرے ذہن میں خیال آیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں شیخ سالم کا چہرہ گھومنے لگا۔ چہرے ہی سے وہ عیاش معلوم ہوتا تھا۔ اگر واقعی یہ خواب گاہ اُسی کی تھی تو یہ امر میرے لئے تشویش ناک تھا۔ ہوش کھونے سے پہلے جس طرح میرے جسم میں غیر معمولی طاقت پیدا ہو گئی تھی، وہ یقیناً وقتی ہی تھی۔ کیونکہ اس وقت خاصی جدوجہد کے باوجود میں خود کو ریشمی ڈوریوں کی گرفت سے آزاد نہ کرا سکی تھی۔ میرے اندر پیدا ہو جانے والی غیر معمولی قوت تجربے ہی کے سبب وقتی طور پر رونما ہوئی تھی، مجھے اس کا اندازہ بخوبی ہو چکا تھا۔ اب وہ صورت حال نہیں تھی اور میں تقریباً کلیتہً بے بس تھی۔ ایسے میں اگر واقعی شیخ سالم آ جاتا تو میں کسی طور اپنا دفاع نہ کر پاتی۔

بالآخر تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد میرے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ خواب گاہ کا دروازہ کھول کر شیخ سالم اندر داخل ہوا۔ اندر آتے ہی اُس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ وہ اپنے مخصوص عربی لباس میں تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے اُس کی ریشمی عبا ہوا سے لہرا رہی تھی۔ میں نے اُس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کرتے دیکھی، اُس کی آنکھوں میں بھی ہوس کی مخصوص چمک تھی۔

میں نے چند ہی لمحوں میں انتہائی سرعت کے ساتھ ایک فیصلہ کیا اور پھر خالص عربی لب و لہجے میں شیخ سالم کو مخاطب کیا۔ ''خوش آمدید یا شیخ!'' اسی کے ساتھ میں اُسے دیکھ کر مسکرائی۔

میری بات سن کر وہ آگے بڑھتے بڑھتے چونک اُٹھا۔ پہلے اُس کے چہرے پر حیرت اور پھر مسرت نظر آئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر اپنی ریشمی عبا سنبھالتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا، پھر پُر مسرت لہجے میں بولا۔ ''کیا تم عربی بول اور سمجھ سکتی ہو؟'' اُس نے یہ الفاظ عربی ہی میں ادا کئے تھے۔

''ہاں شیخ! میں تمہاری زبان بول بھی سکتی ہوں اور سمجھنے کی بھی اہل ہوں۔'' یہ کہہ کر میرا لہجہ شکایتی ہو گیا۔ ''مجھے جانے کس نے اس طرح یہاں باندھ کر ڈال دیا کہ میں اپنے شیخ کا شایانِ شان استقبال کرنے کھڑی بھی نہ ہو سکی۔ میرے دل میں تو نہ جانے کب سے یہ آرزو تھی کہ میں کسی عرب شیخ کے دل کی دھڑکن بن سکوں۔ اے شیخ! کیا یہ ظلم نہیں کہ خلوت کے یہ حسین لحات یوں جبر کی نذر ہو جائیں! یوں تو میں اپنے جذبوں کا عملی اظہار بھی نہ کر سکوں گی۔''

''یہ مجبوری ہے اے صحرا کے چاند!'' اُس نے گستاخانہ حد تک بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے تمہارے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے، اُس کا تقاضہ یہی ہے کہ میں احتیاط سے کام لوں، مگر جانے کیوں تم...... تم مجھے اتنی خطرناک معلوم نہیں ہوتیں۔''

''ڈاکٹر رچرڈ نے میرے متعلق آپ کو قطعی غلط معلومات فراہم کی ہیں اے شیخ!'' موقع ملتے ہی میں بول اُٹھی۔ شیخ سالم کی گستاخانہ حرکتیں جاری تھیں جو بہرحال اپنے دل پر جبر کر کے مجھے برداشت کرنا پڑ رہی تھیں۔ وہ اُن عیاش طبع لوگوں میں سے لگتا تھا جو عورت کی بے بسی اور مجبوری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

میری بات کا ابھی اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ دروازے پر دستک سن کر اُس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک دیو ہیکل

حبشی نظر آیا۔

"کیا بات ہے؟" شیخ سالم دروازہ کھولتے ہی اُس پر برس پڑا۔ "جب کہہ دیا تھا میں نے کہ کوئی دستک نہ دے تو پھر......"

"اسے میں نے مجبور کیا تھا اے شیخ!" عقب سے مجھے ایک آشنا آواز سنائی دی۔ یہ آواز جیکب کی تھی۔

"مگر کیوں؟" شیخ سالم بدستور غصے میں بولا۔

"ڈاکٹر رچرڈ نے ایک رات کی مہلت اور مانگی ہے، اس کے بعد......"

"ہرگز نہیں!" شیخ سالم درمیان ہی میں چیخ اُٹھا۔ "اُس بوڑھے سے کہہ دو کہ اب میں مزید صبر نہیں کر سکتا۔"

اُن دونوں کے درمیان انگریزی میں بات ہو رہی تھی اور حبشی دیوہیکل ملازم ایک جانب چپ چاپ تصویرِ حیرت بنا کھڑا تھا۔ وہ یقیناً انگریزی زبان سمجھنے سے قاصر تھا۔ میری نگاہیں دروازے ہی پر لگی ہوئی تھیں مگر مجھے جیکب کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُسے نے شاید شیخ سالم کی خفگی کے سبب خواب گاہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔

"اے شیخ! جو آپ کی مرضی ہو کیجئے گا، بس میری گزارش سن لیں!" جیکب کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"ہاں کہہ دو، کیا کہنا ہے؟" شیخ سالم قدرے نرم پڑ گیا، پھر بولا۔ "لیکن یہ یاد رکھنا کہ اس لڑکی کے سلسلے میں، میں کچھ نہیں سنوں گا۔"

"ڈاکٹر رچرڈ اپنی مشینیں لے کر یہیں آ رہا ہے۔" جیکب نے بتایا۔ "تجربہ کیونکہ مکمل نہیں ہو سکا تھا اس لئے ضروری ہے کہ......"

"پھر وہی ایک رٹ!" شیخ سالم نے جیکب کی بات کاٹ دی۔

"آپ سنیں تو سہی! پھر جو چاہیں فیصلہ کیجئے گا۔" جیکب نے کہا اور پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔

"ڈاکٹر رچرڈ کا کہنا ہے کہ اگر یہ تجربہ مکمل نہ ہوا تو اب تک کے سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ صرف ایک شب کی بات ہے۔ لڑکی یہیں آپ کے تصرف میں رہے گی۔"

"پھر تم چاہتے کیا ہو فی الحال؟" شیخ سالم کے لہجے میں عیاری کی جھلک تھی۔

"صرف یہ کہ ڈاکٹر رچرڈ کی آمد تک مجھے لڑکی کے پاس رہنے دیا جائے۔" جیکب بولا۔ "وہ تجربہ یہاں اس خواب گاہ میں بھی ممکن ہے۔ ہاں اس کے لئے کچھ ابتدائی تیاریاں کرنا ہوں گی۔ ویسے اگر آپ چاہیں تو اپنے قصر کا کوئی اور حصہ بھی تجربے کے لئے......"

"ڈاکٹر رچرڈ کتنی دیر بعد یہاں پہنچ جائے گا؟" شیخ سالم نے جیکب کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"تقریباً اُسے ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔ ابھی فون پر میری اُس سے بات ہوئی ہے۔" جیکب نے جواب دیا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" شیخ سالم نے سر ہلا کر کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ تم ایسا کرو کہ میرے اس ملازم کے ساتھ قصر کے مغربی حصے میں چلے جاؤ۔ وہاں کئی کمرے خالی ہیں، ان میں سے کوئی ایک تجربے کے لئے منتخب کر لو۔ تجربے سے پہلے جو تیاریاں ضروری ہیں، اُن سے بھی فارغ ہو لو۔ یہاں میں اپنی خواب گاہ میں اس نوعیت کا

کوئی تجربہ کچھ مناسب نہیں سمجھتا۔" یہ کہتے ہی شیخ سالم نے عربی میں حبشی ملازم کو ہدایات دیں۔

"مگر...... مگر اے شیخ!......" جیکب کو یقیناً شیخ سالم کی بات پر بھروسہ نہیں تھا، اسی لئے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"اب اگر مگر کی کوئی گنجائش نہیں۔" شیخ سالم کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "کیا تمہیں میری زبان پر اعتبار نہیں؟"

"کیوں...... کیوں نہیں!......" جیکب کے لہجے سے بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تو پھر جاؤ اس کے ساتھ!" شیخ سالم نے حبشی ملازم کی طرف اشارہ کیا۔ شیخ سالم یقیناً جلد سے جلد جیکب کو وہاں سے ٹال دینا چاہتا تھا۔

"میں تمہاری نیت کے فتور کو سمجھ چکا ہوں شیخ!" معاً جیکب کی تیز آواز بلند ہوئی۔ "تم مجھے دھوکہ دینا چاہتے ہو اور اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر، مجھے یہاں سے بھیج کر......"

"گستاخی مجھے پسند نہیں اے امریکی! اپنی زبان بند رکھو۔" شیخ سالم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ "یہ نہ بھول کہ تو میری چھت کے نیچے ہے اور یہ قصر سالم ہے۔"

"شیخ! اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر باہر آ جاؤ ورنہ گولی مار دُوں گا۔" جیکب کے لہجے میں درندگی عود کر آئی۔

اُسی وقت نہ جانے اُس حبشی ملازم کو کیا ہوا کہ وہ تیزی سے پلٹا۔ اُسے غالباً شیخ سالم نے کوئی اشارہ کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فائر کی آواز ہوئی۔ میں سمجھ گئی کہ کیا ہوا ہو گا! حبشی ملازم نے اپنے آقا کے ایما پر اپنی جان کی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ شاید جیکب پر حملہ آور ہوا تھا جس کے نتیجے میں اب اپنا پیٹ پکڑے اوندھا گر رہا تھا۔ گولی اُس کے پیٹ میں لگی تھی۔ میں نے اُس کی سیاہ اُنگلیوں کو خون میں تر بہ تر دیکھ لیا تھا۔ اُس کے دونوں ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور چہرے پر انتہائی کرب کے آثار تھے۔

اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر شیخ سالم چیخ اُٹھا۔ وہ غالباً اپنے ملازمین ہی کو بلانے کے لئے چیخ رہا تھا۔

"خاموش ہو جاؤ شیخ! ورنہ تمہیں بھی قتل کر دُوں گا۔" جیکب نے خوف زدہ آواز میں دھمکی دی، مگر اُسے دیر ہو چکی تھی۔

شیخ کی چیخ و پکار رنگ لائی اور ذرا ہی دیر میں وہاں حبشی ملازمین کی گویا فوج جمع ہو گئی۔ جیکب اُن میں سے بس چند ہی کو نشانہ بنا سکا ہو گا۔ میں نے پے در پے مزید تین دھماکے سنے تھے، اس کے بعد شاید حبشیوں نے جیکب سے ریوالور چھین لیا تھا یا پھر جیکب کے ریوالور میں اتنی ہی گولیاں تھیں۔

"اسے اندر لے آؤ!" شیخ سالم نے حکم دیا۔ "اس سے اسی وقت اپنے مقتول ساتھیوں کا قصاص لو!" شیخ سالم کی آواز میں وحشت و درندگی تھی۔

پھر میری آنکھوں نے ایک ہولناک منظر دیکھا۔ وہ حبشی، جیکب کو اپنی گرفت میں لئے اندر آ گئے۔ پھر بقیہ تین حبشیوں نے شیخ سالم کے اشارے پر اپنی پیٹیوں سے بندھے ہوئے لمبے خنجر باہر کھینچ لئے۔ اُن تینوں نے یکے بعد دیگرے جیکب کے پیٹ، سینے اور گردن پر خنجر آزمائی کی۔ جیکب کی چیخیں بڑی دل دوز تھیں۔ حبشیوں نے اُسے ٹھکانے لگاتے ہوئے انتہائی بربریت کا ثبوت دیا تھا۔ اُس کی گردن ڈھلک چکی تھی مگر وہ اس کے جسم کے مختلف حصوں میں خنجر اُتار رہے تھے۔ جیکب کا خون خواب گاہ کے قالین میں جذب ہو رہا تھا۔

"لے جاؤ اسے یہاں سے۔" بالآخر شیخ سالم نے حکم دیا۔ "جتنی جلد ممکن ہو اس کی لاش ٹھکانے لگا دو! اور

سنو کہ یہ شخص قصرِ سالم میں داخل ہی نہیں ہوا تھا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے شیخ سالم کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔
پھر اُس نے ایک حبشی کو حکم دیا کہ مجھے اُٹھا کر اُس کے ساتھ چلے۔

پھر شیخ سالم مجھے اپنے قصر کے ایک اور کمرے میں لے آیا۔ وہ کمرہ بھی غالباً بطور خواب گاہ ہی استعمال ہوتا تھا۔ اُس کی زیبائش و آرائش سے بھی شیخ سالم کی امارت اور شوکت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہاں دو بیڈ تھے جن میں سے ایک پر حبشی ملازم نے مجھے ڈال دیا، پھر شیخ سالم کے اشارے پر باہر نکل گیا۔ شیخ سالم نے اُس سے اپنے کسی ملازم خاص کو بھیجنے کے لئے کہا تھا۔ شیخ سالم غالباً اُسے کچھ ہدایات دینا چاہتا تھا۔

ذرا دیر بعد ایک حبشی ملازم، خواب گاہ میں داخل ہوا اور پھر شیخ سالم دھیمی آواز میں اُسے کچھ ہدایات دینے لگا۔ اُس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ کوشش کے باوجود میں کچھ بھی نہ سن سکی۔ یوں بھی وہ دونوں مجھ سے خاصے فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ حبشی ملازم اثبات میں سر ہلاتا رہا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شیخ سالم آگے بڑھا اور حبشی کے باہر نکلتے ہی اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ پھر وہ میری طرف مُڑا۔ قاتل وہی نہیں ہوتا جو اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل کرے بلکہ جس کے ایما اور حکم پر قتل کیا جائے وہ اصل قاتل ہوتا ہے۔ جیکب کو شیخ سالم ہی کے حکم پر میری آنکھوں کے سامنے حبشیوں نے بڑی بے رحمی سے قتل کیا تھا۔ اس لئے میرے نزدیک جیکب کا اصل قاتل شیخ سالم ہی تھا، وہی شخص جو اس وقت اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے قدم قدم میری طرف بڑھ رہا تھا۔

ہر چند کہ جیکب کا تعلق بھی اُنہی لوگوں سے تھا جنہیں میں اپنا حریف کہتی تھی مگر اُس کے لئے پھر بھی میرے دل میں نرم گوشہ تھا۔ وہ کچھ بھی تھا جیسا بھی تھا اپنے نظریات اور مقاصد سے مخلص تھا۔ وہ جانے کتنے دن شب و روز میرے ساتھ رہا تھا، وہ بھی ایسی صورت میں کہ میں اُس کی بے دام کنیز تھی۔ وہ مجھے جو بھی حکم دیتا، میں اُس کی تعمیل میں کوتاہی نہ کرتی۔ اس اختیار کے باوجود اُس نے انتہائی صبر و تحمل کا ثبوت دیا تھا۔ وہ چاہتا تو با آسانی مجھے خراب کر سکتا تھا مگر اُس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اس کڑی آزمائش پر پورا اُترا۔ اُس کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید اس امتحان میں ناکام رہتا۔ اختیار کے باوجود قدموں میں لغزش نہ آنے دینا ہی آدمی کی سب سے بڑی آدمیت ہے، اُس کی بڑائی ہے کہ جیکب ان معنوں میں یقیناً بڑا تھا۔ مجھے اسی لئے اُس کے قتل پر انتہائی رنج تھا۔ ممکن ہے کہ اُسے میری نظروں کے سامنے انتہائی سفاکی سے قتل نہ کیا گیا ہوتا تو میرا دل یوں اُس کے لئے نہ روتا۔

"تم کن خیالوں میں گم ہو اے میرے چاند!" شیخ سالم نے میرے قریب بیٹھ کر میری ٹھوڑی اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ اُس وقت میں نے کس طرح اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی اور کیسے اُس ہوس کار کی نظروں کے تیر برداشت کیے۔

"تم شاید اُسے اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھ کر ڈر گئی ہو...... یہی بات ہے نا؟" اُس نے اپنی دانست میں بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "بات یہ ہے کہ شیخ سالم کی نافرمانی کرنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ خیر تم دل چھوٹا نہ کرو! شاید تمہارے دل پر اس لئے بھی اُس کے قتل کا اثر ہے کہ تم بہت دن اُسے اپنے قریب

دیکھتی رہی ہو۔ اچھا یہ ذکر چھوڑو اور بتاؤ کہ تم کیا کہہ رہی تھیں؟ کیا واقعی وہ بات سچ تھی کہ تمہاری خواہش تھی، تم بھی کسی شیخ کے دل کی دھڑکن بنو۔ مجھے اس کی وجہ بتاؤ گی؟"

"زندگی ایک بار ملتی ہے شیخ!" میں ہمت کر کے بولی۔ "اسے یوں بے مصرف گنوا دینا میرے نزدیک حماقت ہے۔ اس کے ساتھ انصاف کرنا چاہئے۔ زندگی کے ہر لمحے کی پوری قیمت وصول کرنی چاہئے۔"

"تمہاری باتیں بھی تمہاری ہی طرح خوبصورت ہیں۔" یہ کہتے ہوئے شیخ سالم ایک بار پھر گستاخانہ حرکتیں کرنے لگا۔ اور میں خون کے گھونٹ پیتی رہی۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ "تم نے ایسی رواں عربی بولنا کہاں سے سیکھا؟"

"میں نے بچپن ہی سے اپنے ذہن میں ایک تصور بسا لیا تھا اور پھر اس تصویر کی تکمیل کے لئے یہ زبان سیکھی کہ جب خواب کو تعبیر مل جائے تو برملا اپنے جذبات کا اظہار کر سکوں۔ تم...... تم شیخ سالم میرے اسی خواب کی تعبیر ہو۔" میں نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں اپنی تمام تر اداکارانہ صلاحیتیں صرف کر کے اُسے شیشے میں اُتار لینا چاہتی تھی۔ صرف میری زبان ہر گرفت سے آزاد تھی اور میں اس آزادی سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی۔ میں نے کانپتے ہونٹوں سے مزید کہا۔ "اے شیخ! کیا یہ ممکن نہیں کہ تم مجھے اپنی کنیز بنا لو، ہمیشہ کے لئے! یوں بھی تمہارے سوا اب تک کوئی مرد میرے دل میں اتنی جگہ نہیں بنا سکا۔" میں نے اُس کے شوقِ ہوس کو مزید ہوا دی۔

اُس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"کیا یوں پہلی بار میرے خوابوں کو تعبیر ملے گی کہ...... کہ میں تمہارے لئے اپنی بانہیں بھی بلند نہیں کر سکتی!" میں نے اپنے لہجے میں سپردگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

وہ لمحے ایسے ہی تھے کہ شیخ سالم ہوش و خرد کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا تھا۔ اُس پر ایک ایک لمحہ جیسے ایک ایک صدی بن کر گزر رہا تھا اور کچھ یہی کیفیت میری تھی، مگر میری اور اُس کی خواہشات مختلف تھیں۔ اُس نے انتہائی سرعت کا ثبوت دیتے ہوئے ریشمی ڈوریوں کی گرہیں کھول دیں۔ پھر وہ مجھ پر چھا جانا چاہتا تھا کہ میری دائیں ٹانگ حرکت میں آ گئی۔ میرے پیر کی بھرپور ضرب اُس کی ٹھوڑی کے نیچے پڑی اور وہ چیختا ہوا مسہری سے نیچے جا پڑا۔

گرتے ہی اُس نے اپنے لبادے سے لمبے پھل کا خنجر نکال لیا تھا۔

"حرافہ! تو نے شیخ سالم کو دھوکا دیا۔" وہ دانت پیستا ہوا اُٹھنے لگا۔ "میں تیرے ٹکڑے کر دوں گا اپنے ہاتھ سے۔"

میں زقند بھر کر اُس کے قریب پہنچ گئی۔ پھر میں نے اُسے اُٹھنے نہ دیا اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ خنجر اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گرا۔ مجھ سے پٹتے ہوئے وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ اُس درندے کو زدوکوب کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی رحم نہیں آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ میری ٹھوکروں سے لہولہان ہو رہا تھا۔ وہ قاتل تھا اور میرے نزدیک ایک قاتل سے ایسا سلوک روا تھا۔ جب بھی وہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا میں لات مار کر اُسے گرا دیتی اور پھر خود ہی اُسے دوبارہ کھڑا ہونے کا موقع دیتی۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل نہیں تھا کہ شیخ سالم کی گردن پر

کراٹے کا وار کر کے گردن کی ہڈی توڑ دیتی اور یوں وہ قیدِ حیات سے رہائی پا جاتا، مگر یہ صریحاً قتل ہوتا۔ ہر چند کہ مجھے اُس پر شدید غصہ تھا اور وہ کسی قسم کی رعایت کا مستحق بھی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود میں نے خود پر قابو پا لیا۔ میں نے اُس کی ایک ٹانگ اور دایاں ہاتھ توڑنے پر اکتفا کیا۔ اُس کے لئے یہ اتنی سزا کافی تھی۔ یہ وہی گناہ آمادہ ہاتھ تھا جس کی آوارگی نے مجھے خون کے گھونٹ پینے پر مجبور کیا تھا۔ کلائی کی ہڈی ٹوٹتے ہی وہ پوری قوت سے چیخ اُٹھا۔ ہڈی ٹوٹنے کی تکلیف یقیناً اُس کے لئے ناقابلِ برداشت رہی ہوگی۔ وہ فرش پر گرا ہوا بری طرح تڑپ رہا تھا۔

شیخ سالم کی چیخ و پکار نے ہی غالباً اُس کے وفادار حبشی ملازمین کو اُس طرف متوجہ کر دیا تھا۔ وہ لوگ اب چیخ چیخ کر خواب گاہ کا دروازہ پیٹ رہے تھے۔

''یا شیخ! کیا ہوا؟..... کیا ہوا یا شیخ؟'' ہر طرف سے مجھے یہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اس خواب گاہ میں بھی ایک کھڑکی تھی، مگر اُس کی طرف سے میں مطمئن تھی۔ اُس پر لوہے کی گرل چڑھی ہوئی تھی۔ وہاں سے کوئی بھی اندر نہیں آ سکتا تھا۔

''دروازہ..... توڑ کر..... اندر..... اندر آ جاؤ!'' نامعلوم کس طرح شیخ سالم نے تکلیف سے کراہتے ہوئے چیخ کر اپنے ملازم کو حکم دیا۔

اسی وقت میری ٹھوکر اُس کی کنپٹی پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے وہ تڑپ کر ساکت ہو گیا۔ مجھے اُس پر غصہ آ گیا تھا، لیکن غصے کے باوجود اتنا ہوش بہرحال تھا کہ شیخ سالم صرف ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جائے اور اُس کی زندگی خطرے میں نہ پڑے۔

مجھے علم نہیں تھا کہ اُس عمارت میں کتنے حبشی ملازمین ہیں۔ میری نظر سے صرف دس بارہ حبشی گزرے تھے۔ مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ ان کی تعداد اتنی ہی ہوتی۔ مجھے بہرحال اُن کے چنگل سے نکلنا تھا۔ اگر پکڑی جاتی تو شاید زندہ بچنا محال ہوتا۔ شیخ سالم میری عزت و آبرو سے تو کھیلتا ہی مگر اسی کے ساتھ انتقاماً مجھے زندہ بھی نہ چھوڑتا۔

شیخ سالم بے ہوش ہونے سے پہلے اپنے ملازمین کو حکم دے چکا تھا۔ اب وہ اُسی پر عمل کر رہے تھے۔ خواب گاہ کے دروازے پر بھرپور ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔ مضبوط دروازہ کسی بھی لمحے ٹوٹ کر اندر گر سکتا تھا۔ میرے پاس گنتی کے چند لمحات تھے، انہی میں مجھے کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ انہی لمحات میں میری نگاہ شیخ سالم کے خنجر پر پڑی جس کا خوبصورت دستہ ہاتھی دانت کا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر وہ خنجر اُٹھا لیا اور پھر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف لپکی۔ میں اس عرصے میں سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے!

دروازے کے قریب پہنچتے ہی میں نے پیتل کی مضبوط چٹخنی نیچے گرا دی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور میں سرعت سے اُس کے دائیں پٹ کی آڑ میں ہو گئی۔ بیک وقت کئی حبشی اپنے زور میں اندر آ کر گرے۔ یہ غالباً وہی تھے جو دروازے پر ضربیں لگا رہے تھے اور ایک دم دروازہ کھلنے کے سبب اپنے جسموں کا توازن کھو بیٹھے تھے۔ فرش پر گرے ہوئے حبشی اُٹھنے کی کوشش کرنے لگے اور اسی اثناء میں دوسرے حبشی چیختے ہوئے اندر آ گئے۔ اُن کی تعداد کسی بھی طرح پندرہ سولہ سے کم نہیں تھی۔ میں اس انتظار میں تھی کہ وہ سب اندر آ جائیں اور اُن میں سے کوئی باہر نہ رہ جائے تا کہ میرے فرار کے لئے راستہ صاف ملے۔ مگر عین اُس وقت

جب میں دروازے کی اوٹ سے نکلنے والی تھی، فرش پر سے اُٹھتے ہوئے ایک حبشی نے مجھے دیکھ لیا اور چیخ اُٹھا۔

اب ایک لمحے کی تاخیر بھی میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ کیونکہ مجھے دیکھ لیا گیا تھا۔ میں اس لئے ایک لحہ بھر ضائع کئے بغیر دروازے کی اوٹ سے نکل کر بھاگی۔ سیاہ فام حبشی چیختے ہوئے میرے پیچھے بھاگے، مگر اب میں آسانی سے اُن کے ہتھے چڑھنے والی نہیں تھی۔

وہ عمارت میرے لئے بھول بھلیاں ثابت ہو گی مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ نامعلوم وہاں حبشیوں کی کتنی تعداد تھی! ہر طرف سے وہ جیسے اُبلے پڑ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے خنجر تھے اور وہ چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ میں نے اُن کے شیخ کو قتل کر دیا ہے۔ اُنہوں نے شاید یہ تصدیق ضروری نہیں سمجھی تھی کہ اُن کا شیخ ابھی مرا نہیں ہے۔ اسے لہولہان اور بے ہوش دیکھ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اُن کا شیخ میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔

اُن وحشیوں کی یلغار سے بچنے کے لئے میں نے ایک زینے کا رُخ کیا اور بیک وقت کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اُوپر چڑھنے لگی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ شاید زینے کے اختتام پر کوئی دروازہ ضرور ہو گا جسے میں اُوپر پہنچتے ہی بند کر دُوں گی، مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہاں مجھے کوئی دروازہ نہیں ملا۔ زینہ عبور کر کے میں ایک کھلی چھت پر پہنچ گئی تھی اور یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے تھے کہ نیچے کی نسبت یہاں ان وحشیوں سے بچنا میرے لئے قطعی ناممکن تھا۔ اُن کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

مجھے چھت پر پہنچے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ بہت سے حبشی ہوا میں خنجر لہراتے اور غیظ و غضب میں چیختے ہوئے میری طرف لپکے۔ میں گھبرا کر ایک طرف بھاگی۔ سامنے ہی چھوٹی سی دیوار تھی۔ میں اُچھل کر اُس پر چڑھ گئی۔ اُس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میں اُس عمارت کی تیسری منزل پر ہوں۔ تیسری منزل سے چھلانگ لگانا موت کو دعوت دینے ہی کے مترادف تھا۔ ایسی صورت میں بھی میری موت یقینی تھی اور اُن حبشیوں کے قابو میں آنے کے بعد بھی میرا حشر مختلف نہ ہوتا۔ چھت پر اگر اندھیرا ہوتا تو شاید ایک فیصد میرے بچ جانے کا امکان بھی تھا مگر وہاں روشنی تھی۔ چاندنی رات میری دشمن بن گئی تھی۔

میں سوچ رہی تھی کہ لوگ تو تاریک راہوں میں مارے جاتے ہیں اور میں شاید روشنی میں شکار ہونے والی ہوں! حبشی اب اپنے اپنے خنجر لہراتے ہوئے مجھ سے بہت قریب آ چکے تھے۔

ooo

موت کو خود سے قریب دیکھ کر میں نے آخری لمحات میں ایک خطرناک قدم اُٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ جس دیوار پر میں کھڑی تھی، وہ زیادہ چوڑی نہیں تھی، مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ میں نے اپنے جسم کو مخصوص انداز میں ایک خاص زاویئے سے موڑا، پھر طویل جست بھری۔ اندازے کی ذرا سی بھی غلطی مجھے موت سے ہمکنار کرسکتی تھی، لیکن میرے پاس یہ خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں جیسے اُڑتی ہوئی حبشیوں کے اُوپر سے دوسری جانب جا گری۔

عین اُسی وقت فضا میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ نہ صرف میں بلکہ وہ حبشی بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ اچانک کسی سرچ لائٹ کی طاقتور روشنی نے اُن حبشیوں کو اپنے دائرے میں لے لیا۔ سرچ لائٹ اُس ہیلی کاپٹر سے قصر کی چھت پر ڈالی گئی تھی جس کی گڑگڑاہٹ چند لمحے قبل سنائی دی تھی۔ حبشی چند لمحے کو ساکت سے رہ گئے، پھر وہ ہیلی کاپٹر چھت پر اُترنے کے لئے نیچے آنے لگا۔

اُس ہیلی کاپٹر میں وہاں آنے والے کون ہیں، کون نہیں، اس تجسس سے قطع نظر اُن کی اچانک آمد اور مداخلت میرے لئے سودمند ہی ثابت ہوئی تھی۔

پھر جیسے ہی میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں اس موقع سے فائدہ اُٹھا سکتی ہوں، اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اُسی لمحے سرچ لائٹ کے دائرے نے حرکت کی اور میں اس کی زد میں آ گئی۔

''عذرا خان! بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ تمہارا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا!'' ایک بھاری آواز فضا میں گونجی۔ ''تم اسٹین گن کی زد پر ہو۔''

یہ بھاری آواز میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ کے باوجود کہے جانے والے الفاظ مجھے واضح طور پر سنائی دیئے تھے۔ ہیلی کاپٹر بس اب چھت پر اُترنے ہی والا تھا کہ اچانک جیسے حبشیوں کو ہوش آ گیا۔ وہ یقیناً لمحاتِ حیرت سے نکل آئے تھے۔ اُنہوں نے مجھ پر یلغار کردی، مگر اس سے پہلے کہ اُن میں سے کوئی بھی حبشی میرے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوتا، فضا اسٹین گن کے وحشیانہ ''قہقہوں'' سے گونج اُٹھی۔ حبشیوں اور میرے درمیان آگ اور خون کی دیوار حائل ہو چکی تھی۔ تین حبشی چھت پر گرے ہوئے تڑپ رہے تھے۔ اُن کے خون کے چھینٹے دُور دُور تک اُڑ رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر والوں نے محض دھمکی نہیں دی تھی۔ اُن کے پاس واقعی اسٹین گن تھی۔ واقعی وہ میرے جسم کو چھلنی کر سکتے تھے۔ میں نے اس کے باوجود لمحوں میں ایک فیصلہ کرلیا اور دوسرے ہی لمحے اُچھل کر ایک طرف بھاگی۔ اُسی وقت میری چاروں طرف گولیوں کی بوچھاڑ ہو گئی اور مجھے زینے کے قریب پہنچتے پہنچتے رُک جانا پڑا۔ مزید آگے قدم بڑھانے کا مطلب خودکشی ہی ہوتا۔ کیونکہ مجھ سے بمشکل ایک ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر تڑاتڑ گولیاں برس رہی تھیں۔ انہی گولیوں نے میری راہ مسدود کر

دی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ لوگ کسی قیمت پر مجھے ہلاک نہیں کریں گے، یہی سوچ کر میں نے وہ خطرناک قدم اُٹھایا تھا جو بالآخر بے سود ثابت ہوا۔

ابھی مجھے اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے ہوئے چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ عقب سے کسی نے میری پشت پر غالباً ریوالور کی نال رکھ دی۔

''اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا لو عذرا خان!'' مجھے حکم دیا گیا۔ حکم دینے والے کی آواز میں لئے آشنا تھی۔ وہ ڈاکٹر رچرڈ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے مجبوراً اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے کہ اب اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں تھی۔

ڈاکٹر رچرڈ کی آمد بہرحال اتفاقی نہیں تھی۔ مقتول جیکب اُس کے بارے میں شیخ سالم کو بتا چکا تھا۔ جیکب نے شیخ سالم سے کہا تھا کہ ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر رچرڈ وہاں آنے والا ہے۔ ڈاکٹر رچرڈ، شیخ سالم کے قصر ہی میں مجھ پر وہ تجربہ کرنے والا تھا جو ادھورا رہ گیا تھا۔ پہلے والی عمارت میں یہ تجربہ کیوں ممکن نہیں رہا تھا اور مجھے اس قصر میں کیوں لایا گیا تھا، میں اس سے بے خبر تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ڈاکٹر رچرڈ اُس ہیلی کاپٹر میں وہ عجیب مشینیں لے کر آیا تھا جو تجربے کے دوران میں کام آتیں۔ ڈاکٹر رچرڈ کی آمد کے بارے میں تو مجھے پہلے سے معلوم تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہاں آئے گا۔ اُس کی غیر موجودگی میں یہاں جو واقعات پیش آئے تھے یقیناً وہ اُن سے لاعلم ہی تھا۔ جیکب کے قتل سے شیخ سالم اور ڈاکٹر رچرڈ کے تعلقات کی نوعیت بدل چکی تھی۔ اب یہ قصر ڈاکٹر رچرڈ کے لئے پناہ گاہ کی بجائے زندان ہی ثابت ہوتا۔ شیخ سالم کے ہوش میں آتے ہی یقیناً صورتِ حال بدل جاتی۔ خود میں بھی اُس قصر میں محفوظ نہیں تھی۔ ہرچند کہ ڈاکٹر رچرڈ اور شیخ سالم دونوں ہی کو میرا حریف کہا جا سکتا تھا، مگر فی الحال شیخ سالم میرے لئے زیادہ خطرناک اور بڑا حریف ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے اس موقع پر ایشیا کے ایک عظیم لیڈر ماؤزے تنگ کا ایک قول یاد آیا۔ ماؤ نے کہا تھا کہ بڑے دشمن سے نبرد آزما ہونے اور اُسے شکست دینے کی خاطر چھوٹے دشمن سے عارضی صلح کرلو، پھر جب بڑے دشمن پر فتح پالو تو چھوٹے دشمن سے جنگ کرو!

میں ابھی ایک نتیجے پر پہنچی ہی تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ کی آواز سنائی دی۔ وہ شیفرڈ سے مخاطب تھا۔ ''شیفرڈ! تم ان حبشیوں کو کور کئے رہو۔ ان میں سے کوئی بھی حرکت کرے تو اسے گولی مار دو۔'' یہ کہہ کر اُس نے دوسرے جرمن سائنسدان شیپرڈ سے کہا۔ ''اور شیپرڈ! تم عذرا خان کو سنبھالو۔ میں اس صورت حال کو پہلے سمجھنا چاہتا ہوں کہ آخر ہوا کیا! شیخ سالم اور جیکب کہاں ہیں؟ اور عذرا خان آزاد کیسے ہوگئی؟ میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں۔''

اس دوران میں ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ کافی دیر پہلے ختم ہو چکی تھی۔ ہیلی کاپٹر کی طرف میری پشت تھی اس لئے وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی دونوں جرمن سائنسدان دکھائی دے رہے تھے جو ڈاکٹر رچرڈ کے ساتھ آئے تھے۔

ڈاکٹر رچرڈ کے حکم پر دونوں جرمن سائنسدانوں نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ پھر ڈاکٹر رچرڈ میرے عقب سے سامنے آ گیا۔ اُس کا رُخ زینے کی طرف تھا۔ چند قدم چلتے ہی وہ غالباً کچھ سوچ کر پلٹا اور بلند آواز سے حبشیوں کو مخاطب کیا۔ وہ صاف اور رواں عربی بول رہا تھا۔ ''میری واپسی تک تم لوگ اسی طرح بے حس و

حرکت کھڑے رہو گے۔ اگر تم نے کوئی حرکت کی تو اپنی موت کے ذمہ دار خود ہو گے! تم اپنے اُن ساتھیوں کا حشر دیکھ ہی چکے ہو جو حد سے آگے بڑھ گئے تھے۔'' ڈاکٹر رچرڈ کے لہجے میں دھمکی تھی۔ ''تمہارا بھی یہی حشر ہو سکتا ہے، اگر تم نے حکم نہ مانا۔''

اس کے بعد ڈاکٹر رچرڈ پلٹ کر زینے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں بول اُٹھی۔ ''ڈاکٹر رچرڈ! تمہارا نیچے جانا بے سود ثابت ہو گا۔''

''کیوں؟'' وہ ایک دم مُڑ کر بولا۔

''اس لئے کہ نیچے تمہارے سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں ہے۔'' میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

''کیا مطلب؟'' اُس کی آواز میں حیرت بھی تھی اور چہرے پر اُلجھن کے آثار تھے۔ ''کیا شیخ سالم اور جیکب نیچے نہیں ہیں؟''

''اُن میں سے صرف ایک نیچے ہے، مگر وہ تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ اور دوسرا، دوسری دنیا کے سفر پر جا چکا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ صاف صاف کہو!'' ڈاکٹر رچرڈ اُلجھے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

پھر میں نے اُسے مختصراً سب کچھ بتا دیا۔ جب میں اُسے جیکب کے قتل کئے جانے کے بارے میں بتا رہی تھی تو اُس کے چہرے پر شدید غم و غصے کے آثار تھے، مگر درمیان میں کچھ نہیں بولا۔ جب میں خاموش ہو گئی تو اُس نے تیزی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا، پھر بغیر کچھ کہے سنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا زینے کی طرف چلا گیا۔

میں سمجھ گئی کہ شیخ سالم کا آخری وقت آ چکا ہے۔ ڈاکٹر رچرڈ یقیناً اُسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد جب نیچے سے فائر کا دھماکہ سنائی دیا تو میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ ڈاکٹر رچرڈ نے بے ہوش شیخ سالم کو شاید بے ہوشی ہی کے دوران میں سفرِ آخرت پر روانہ کر دیا تھا۔

پھر ڈاکٹر رچرڈ کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اُس نے آتے ہی اپنے ساتھیوں کو روانگی کا حکم دیا۔

''مگر ہم اب جائیں گے کہاں؟ شارع قصر النیل والی عمارت تو غیر محفوظ ہو چکی ہے۔'' شیفرڈ کی آواز سنائی دی۔

''ہم وہاں نہیں چل رہے۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے جواب دیا۔

''پھر؟'' شیفرڈ نے دوبارہ سوال کیا۔

''ہیلی کاپٹر میں تو چلو، بتا دُوں گا کہ کہاں چلنا ہے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر رچرڈ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''عذرا خان! تمہیں بھی ہمارے ساتھ ہی چلنا ہے۔ یقین کرو کہ جیکب کے قتل سے مجھے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ شیخ سالم کو قتل کر کے میں نے انتقام تو لے لیا ہے، مگر میرے ذہن سے یہ بات محو نہیں ہوئی کہ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمہاری معمولی سی غیر ذمہ دارانہ حرکت مجھے مشتعل کر سکتی ہے۔ پھر میں کچھ نہیں سوچوں گا، یہ بھی نہیں کہ تم کتنی قیمتی عورت ہو اور یہ کہ تمہارے لئے اب تک کتنی دولت خرچ کی جا چکی ہے۔ جیکب بھی ہمارا

بہت قیمتی آدمی تھا جو مارا گیا۔ ایسی صورت میں مجھے تمہاری موت کا بھی کوئی زیادہ رنج نہیں ہو گا اور اس کی تمام تر ذمہ داری تم پر ہو گی۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر رچرڈ نے اپنے ریوالور کا رُخ میری طرف کر لیا، پھر حکم دیا۔ ''چلو......!''

فی الحال مجھے ڈاکٹر رچرڈ کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس طرح گویا ڈاکٹر رچرڈ مجھے اُن حبشیوں سے بچا کر لے جا رہا تھا۔ اس قصر سے نکلنے کے بعد میں ڈاکٹر رچرڈ کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کر سکتی تھی۔

پھر کچھ ہی دیر میں شیفرڈ، شیپرڈ، ڈاکٹر رچرڈ اور میں سبھی ہیلی کاپٹر میں آ گئے۔ ہیلی کاپٹر کا پائلٹ ایک اجنبی نوجوان تھا جسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ مصری ہی معلوم ہوتا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے کے بعد میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی کہ ڈاکٹر رچرڈ اُس میں مشینیں لے کر آیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کے پچھلے حصے میں وہ مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔

ہیلی کاپٹر کے پرواز کرتے ہی ڈاکٹر رچرڈ نے اس کے پائلٹ کو مخاطب کیا۔ ''اب المنیل چلنا ہے۔'' یہ الفاظ اُس نے عربی ہی میں ادا کئے تھے۔

''بہتر ہے جناب!'' پائلٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں کھڑکی کے قریب ایک سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے برابر والی نشست پر ڈاکٹر رچرڈ تھا، مگر اب اُس نے اپنا ریوالور جیب میں رکھ لیا تھا۔ عقبی نشستوں پر شیفرڈ اور شیپرڈ تھے۔ اُنہیں میں سے ایک کے ریوالور کی سر د نال میری گدی پر رکھی ہوئی تھی۔ میں اُس سے بے پرواہ ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر صلاح الدین ایوبی کے قلعے کے برج نظر آ رہے تھے۔ میں یہ تاریخی قلعہ دیکھ چکی تھی۔ اسی سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پرانا قاہرہ ہے اور اس وقت میں پرانے قاہرہ کی ایک قدیم آبادی میں ہوں جو قلعے ہی کی وجہ سے ''قلعہ'' کہلاتی ہے۔ ہیلی کاپٹر قلعے کے قریب سے گزرا تو میری نگاہ اُس عالیشان مسجد کے بلند میناروں پر پڑی جسے خاندانِ خدیویہ کے بانی محمد علی پاشا نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مسجد استنبول کی مسجد قرطبہ کے نمونے پر تعمیر کرائی گئی تھی۔ کچھ دیر کو جیسے میں ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی۔ قلعے کے عقب میں پہاڑی سلسلہ نظر آ رہا تھا جسے مقطم کا پہاڑی سلسلہ کہا جاتا ہے۔

ہیلی کاپٹر پرواز کرتا رہا اور پرانے قاہرہ کی قدیم آبادیاں گزرتی رہیں۔ اب ہیلی کاپٹر ایک ایسے علاقے پر پرواز کر رہا تھا جسے قدیم ترین علاقہ کہا جا سکتا ہے۔ اس وسیع علاقے کو مصر قدیمہ کہا جاتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جو کبھی فسطاط کہلاتی تھی۔ یہیں مسلمان فاتح مصر نے کبوتر کا گھونسلا دیکھ کر شہر بسانے کا حکم دیا تھا۔ اس کے بعد ہیلی کاپٹر کا رُخ اہرامِ مصر کی طرف ہو گیا۔ پرانا قاہرہ انہی اہرام کے پیچھے آباد ہے۔

معاً مجھے خیال آیا کہ نہ معلوم المنیل پہنچ کر کیا صورتِ حال پیش آئے! کیوں نہ میں سفر کے دوران ہی میں حالات کو اپنے حق میں اُستوار کر لوں!

کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے میں نے اِردگرد کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ ڈاکٹر رچرڈ میری طرف سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اُس کا ریوالور بھی اُس کے کوٹ کی جیب میں تھا اور وہ جیب میری ہی طرف تھی۔ دراصل

جیب سے قدرے نکلے ہوئے ریوالور کے دستے ہی نے مجھے کچھ کر گزرنے پر اُکسایا تھا۔ اگر میں ڈاکٹر رچرڈ کی جیب سے ریوالور نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں تو حالات میرے حق میں ہو سکتے ہیں، میرے ذہن میں بار بار یہی خیال گردش کر رہا تھا، میں ڈاکٹر رچرڈ کے اطمینان سے فائدہ اُٹھا سکتی تھی۔ میری گدی پر ایک ریوالور کی سرد نال اب بھی رکھی ہوئی تھی۔ لیکن جب میرے ہاتھ میں بھی ریوالور آ جاتا تو اس کی زیادہ اہمیت نہ رہ جاتی۔ میں اس دوران میں سوچ چکی تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ کا ریوالور اپنے قبضے میں کرنے کے بعد مجھے پہلا قدم کیا اُٹھانا ہے!

پھر چند ہی لمحے بعد بالکل غیر محسوس انداز میں میرا ہاتھ، ڈاکٹر رچرڈ کے کوٹ کی جیب کی طرف بڑھنے لگا۔ اُس وقت میں نے احتیاطاً اپنا سانس بھی روک لیا تھا۔ یہ میری بدقسمتی ہی تھی کہ جب میں نے ریوالور کے دستے کا سرد لمس محسوس کیا، اُسی وقت ڈاکٹر رچرڈ نے پہلو بدلا اور دوسرے ہی لمحے میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ اگر اس سے ایک لمحے بھی تاخیر ہو جاتی تو میں اُس کی جیب سے ریوالور نکال چکی ہوتی۔ میری کلائی پر اُس کی گرفت سخت تھی۔

''تم مجھے طیش دلانے سے باز نہیں آ رہیں عذرا خان!'' اُس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں سختی تھی۔

''سوری ڈاکٹر!'' میں معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

اُس نے میری کلائی چھوڑ دی اور ریوالور، کوٹ کی دوسری جیب میں رکھ لیا۔ میں سمجھی کہ شاید اس نے میری معذرت قبول کر لی ہے، مگر ایسا نہیں تھا۔ کوٹ کی دوسری جیب میں ریوالور رکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف پلٹا، پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتی، اُس کا نپا تلا ہاتھ میری کنپٹی پر پڑا اور اس کے ساتھ ہی میری اطراف اندھیرا اچھل گیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اپنے ہوش و حواس قائم نہ رکھ سکی۔

ہوش آنے پر میں نے خود کو ایک لمبی سی آہنی ٹیبل پر دراز پایا۔ میرا جسم چمڑے کے تسموں کی گرفت میں تھا۔ مجھے جرمن سائنس دان شیفرڈ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''یہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر! مگر تجربے کی کامیابی کے بعد اس کے ذہن میں کیا تبدیلیاں رُونما ہونے کے امکانات ہیں؟'' یہ سوال اُس نے غالباً ڈاکٹر رچرڈ ہی سے کیا تھا۔ موضوع گفتگو ظاہر ہے کہ میں ہی تھی۔

جواباً ڈاکٹر رچرڈ کی مانوس آواز اُبھری تو میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ شیفرڈ، ڈاکٹر رچرڈ ہی سے مخاطب تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ پُرجوش آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''شیفرڈ! دنیا کا یہ حیرت انگیز سائنسی تجربہ ہو گا۔ اس تجربے کی کامیابی کے بعد عذرا خان جب چاہے گی ماضی یا مستقبل میں جھانک سکے گی۔ یوں گویا وہ قطعی درست پیش گوئیاں کرنے کی اہل ہو گی۔ اُس کے دماغ میں یہ صلاحیت موجود ہے، لیکن یہ صلاحیت اختیاری نہیں۔ میں اسے اختیاری بنانا چاہتا ہوں۔ اس سے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوں گے۔ پیش آنے والے خطرات کا ہمیں پہلے ہی علم ہو جایا کرے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے ذہن میں ٹیلی پیتھی کی قوت بھی پیدا ہو جائے۔''

''ممکن ہے ڈاکٹر! کہ آپ کی توقعات پوری ہو جائیں۔ لیکن ایک بات اب تک میری سمجھ میں نہیں

سکی۔'' اس بار شیپرڈ بول اُٹھا۔

''وہ بھی کہہ دو!'' ڈاکٹر رچرڈ کی آواز سے خوش دلی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''اس سے امریکی حکومت کو کیا فائدہ ہو گا؟'' شیپرڈ نے سوال کیا۔ یہی سوال خود میرے ذہن میں بھی اُبھرا تھا۔

''اس تجربے کی کامیابی کے چند روز بعد ہی عذرا خان پر ایک اور تجربہ کیا جائے گا، اہم تجربہ! اس دوسرے تجربے کا مقصد عذرا خان کے ذہن کو امریکی مفادات کا تابع بنانا ہو گا، مگر فوری طور پر یہ تجربہ ممکن نہیں ہو گا۔ اس کے لئے ہمیں کم از کم دو ہفتے انتظار کرنا پڑے گا تا کہ عذرا خان کا ذہن تجربے کا متحمل ہو سکے۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے وضاحت کی۔

''اگر اس دوران میں عذرا خان فرار ہو گئی، یعنی پہلے تجربے کے بعد! یا پھر دوسرا تجربہ ناکام رہا تو؟'' شیفرڈ نے ایک اہم سوال کیا۔

''شیفرڈ! کسی بھی تجربے کا نتیجہ دو ہی صورتوں میں برآمد ہوتا ہے، ناکامی یا کامیابی! مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تجربہ کیا ہی نہ جائے۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے جواب دیا۔ ''جہاں تک تمہارے پہلے خدشے کا سوال ہے کہ پہلے تجربے کے بعد کہیں عذرا خان فرار نہ ہو جائے تو اس کا امکان بہر حال ہے، لیکن وہ فرار ہو بھی گئی تو جائے گی کہاں! اسی کرۂ ارض پر رہے گی نا! اُسے دوبارہ قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ ساری دنیا میں امریکی ایجنٹوں کا جال بچھا ہوا ہے، عذرا خان اُن کی نظر سے بچ کر نہیں رہ سکتی۔ تمہارے دوسرے خدشے کا جواب یہ ہے کہ دوسرے تجربے کی ناکامی کے امکانات پانچ فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔''

اُن لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے میرے ذہن میں پیدا ہونے والے بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے۔ اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ امریکی حکومت مجھ میں کیوں دلچسپی لے رہی تھی اور اُس نے میرے حصول کی خاطر اب تک اتنی بڑی رقم کیوں خرچ کی تھی! کم از کم پہلے تجربے کی حد تک میں ان لوگوں کے ساتھ پوری طرح تعاون کرنا چاہتی تھی۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ ناحق فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر تجربے کے بعد میرے ذہن میں متوقع قوتیں پیدا ہو جاتیں تو اُنہیں اپنے ملک اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر بروئے کار لایا جا سکتا تھا۔ میں اس تجربے کی کامیابی کے بعد ہی وہاں سے فرار ہونا چاہتی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوتا، دوبارہ میں امریکی ایجنٹوں کے ہتھے چڑھتی نہ چڑھتی، یہ باتیں پھر بھی سوچی جا سکتی تھیں۔

''کیا خیال ہے ڈاکٹر! عذرا خان کو اب تک ہوش آ جانا چاہئے یا نہیں؟'' معاً شیپرڈ کی آواز سنائی دی۔

''ہاں۔'' ڈاکٹر رچرڈ بولا۔ ''آؤ چلو دیکھتے ہیں۔ میں اب تجربے میں زیادہ تاخیر نہیں چاہتا۔ اور سنو! تم لوگ اس مرتبہ غفلت سے کام نہ لینا جیسا پہلی بار ہوا تھا۔''

''نہیں ڈاکٹر!'' شیفرڈ اور شیپرڈ بیک آواز بولے۔ ''ہم پوری طرح چوکنا رہ کر آپ کی ہدایات پر عمل کریں گے۔''

میں نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی کہ خود کو مزید بے ہوش ظاہر کرتی رہوں۔ اس کے باوجود میں یہ

چاہتی تھی کہ وہ لوگ یہی سمجھیں، مجھے ابھی ابھی ہوش آیا ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ گویا میں نے اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سنی۔ میں اسی لئے آہستہ سے کراہنے لگی اور پھر اسی کے ساتھ آنکھیں کھول کر یوں حیرت سے دیکھا جیسے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کہاں ہوں! اُس وقت تک وہ تینوں میرے قریب پہنچ چکے تھے۔

''اسے ابھی ہوش آیا ہے۔'' شیفرڈ کی آواز سن کر مجھے اپنی اداکاری کی کامیابی کا یقین ہو گیا۔

''ہاں یہی لگتا ہے۔'' شیپرڈ بھی تائید میں بولا۔

''میں کہاں ہوں؟'' میں نے اداکاری جاری رکھی، پھر مزید بولی۔ ''تم لوگوں نے مجھے کیوں باندھ رکھا ہے؟''

''ضروری نہیں عذرا خان کہ تمہارے سوالوں کے جواب دیئے جائیں۔'' ڈاکٹر رچرڈ ناگوار لہجے میں بولا، پھر شیفرڈ اور شیپرڈ کو مختلف ہدایات دینے لگا۔

ٹیبل کی اطراف اور سرہانے مشینیں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ شیفرڈ اور شیپرڈ انہیں سیٹ کرنے لگے۔ پھر کچھ ہی دیر بعد میرے سر پر ایک خود چڑھا دیا گیا۔ ڈاکٹر رچرڈ نے شیفرڈ کو ایک مشین کا بٹن دبانے کے لئے کہا۔ شیفرڈ نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی اور اسی کے ساتھ میرے سارے جسم میں برقی رو سی دوڑ گئی۔ پھر مجھے اپنے ذہن میں جھماکے سے محسوس ہوئے اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میرے ذہن میں تیز قسم کی سنسناہٹ ہوئی اور پھر ذہن کی سکرین پر ایسا منظر اُبھرا جیسے میں کسی تیز رفتار ٹرین میں بیٹھی ہوئی کھڑکیوں سے باہر کا منظر دیکھ رہی ہوں۔ ہر شے مجھے پیچھے کی طرف بھاگتی دکھائی دے رہی تھی۔ اسی دوران میں مجھے کہیں دُور سے ڈاکٹر رچرڈ کی آواز آتی سنائی دی۔ اُس نے اپنے ماتحتوں میں سے کسی کو کوئی ہدایت دی تھی۔ معاً میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر میں سے ایک منظر واضح ہو گیا، یوں جیسے میرے سامنے کوئی فلم چل رہی ہو، کوئی تاریخی فلم! میں نے تاریخ کی کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا، اُس کے مطابق یہ منظر کسی مغلیہ تاجدار کے دربار کا تھا۔ حاجب بہ آوازِ بلند بادشاہ کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد ایک بارُعب و باجبروت شخص بڑے وقار سے چلتا ہوا تختِ شاہی کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ تمام حاضرینِ دربار باادب سر جھکائے کھڑے تھے۔ جب وہ شخص تخت پر بیٹھ گیا تو درباری اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے۔ معاً تختِ شاہی پر بیٹھے ہوئے بارُعب شخص کی گونج دار آواز بلند ہوئی۔

''انارکلی کو ہمارے حضور میں حاضر کیا جائے!''

فوراً ہی تعمیل کی گئی اور ایک حسین ترین لڑکی پابہ زنجیر وہاں لائی گئی۔ حاجب کی آواز سے میں پہلے ہی سمجھ چکی تھی کہ تختِ شاہی پر بیٹھا ہوا شخص شہنشاہ اکبر ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے ماضی کا ایک منظر گویا زندہ ہو گیا تھا۔

''انارکلی!'' شہنشاہ اکبر نے اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کی محبوبہ کو مخاطب کیا۔ ''ہمیں یقین ہے کہ قید خانے کے اندھیروں نے تمہاری آرزوؤں میں وہ چمک باقی نہ رکھی ہو گی جو کبھی تھی۔'' اکبر کے لہجے میں گہری چبھن تھی۔

''قید خانے کے اندھیرے کنیز کی آرزوؤں سے بہت کم تھے۔'' انارکلی کی نرم و شیریں آواز سنائی دی۔

شہنشاہ اکبر کے چہرے پر غصے کے اثرات اُبھرے اور وہ پہلے سے زیادہ سخت آواز میں بولا۔ ''اندھیرے اور بڑھا دیئے جائیں گے۔''

''آرزوئیں اور بڑھ جائیں گی۔'' انارکلی نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''اور ہم بڑھتی ہوئی آرزوؤں کا سر کچل دیں گے!''

''ظلِ الٰہی کا الطاف۔''

''ہم اِک لفظ سننا نہیں چاہتے!'' شہنشاہ اکبر کے لہجے میں بلا کا جلال تھا۔ ''ایک باندی نے ملکہ عالم بننے کا خواب دیکھا اور محبت کا جھوٹا ڈھونگ رچا لیا۔''

''یہ غلط ہے!''

''مگر تمہیں یہی ثابت کرنا ہو گا۔'' شہنشاہ اکبر کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ''داروغۂ زندان! لے جاؤ اور اس گستاخ کو قید خانے کے اندھیروں میں غرق کر دو!''

اچانک ڈاکٹر رچرڈ کی آواز جیسے لمحے بھر کو مجھے ماضی سے زمانۂ حال میں کھینچ لائی۔ اُس نے شیپرڈ کو کوئی ہدایت دی تھی۔ چند لمحے بعد میرے صفحۂ ذہن پر ایک اور تاریخی منظر اُبھر آیا۔ یہ آخری مسلمان خلیفہ مستعصم باللہ کا دربار تھا، مگر خلیفہ فرش پر بندھا پڑا تھا اور ایک وحشی منگول ہلاکو خاں اُسے دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر وقفے وقفے سے بہت سے اہم تاریخی ادوار مجھے نظر آتے رہے۔ میں نے ماضی میں سفر کرتے ہوئے قلوپطرہ کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر یہ سفر انسان کی اُس حیرت پر ختم ہوا جب اُس نے پہلی بار آگ دریافت کی تھی اور وہ غاروں میں رہتا تھا۔ اُس دور کے انسانوں کے قد حیرت انگیز طور پر انتہائی طویل تھے اور جسم بھی اسی حساب سے چوڑے تھے۔ میں نے وہ قدیم ہیکل اور قربان گاہیں بھی دیکھیں جہاں انسانوں کو دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قربان کیا جاتا تھا۔ میرے لئے یہ سب کچھ نیا ہونے کے باوجود بھی نیا نہیں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں یہ سارے منظر پہلے بھی دیکھ چکی ہوں اور یہ احساس میرے لئے انتہائی حیرت انگیز تھا۔

ڈاکٹر رچرڈ نے اپنے معاونین کو پھر کوئی حکم دیا تو گویا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ اب میں گویا ماضی سے حال کی طرف سفر کر رہی تھی۔ یہ سفر زمانۂ حال تک آ کر ختم نہیں ہوا بلکہ جاری ہی رہا۔ میرا ذہن اب مستقبل کی طرف سفر کر رہا تھا۔ میرے سارے وجود میں ایک آشنا سی لذت انگیز سنسناہٹ دوڑ رہی تھی اور ذہن میں پے در پے روشنی کے جھماکے ہو رہے تھے۔ میرے ذہن میں جیسے کلیاں سی چٹخ رہی تھیں، بند دروازے سے کھل رہے تھے! مناظر اب پیچھے کی طرف بھاگنے کی بجائے مجھ سے آگے دوڑ رہے تھے اور میں اُن کے تعاقب میں تھی۔ یہ بالکل نیا اور انوکھا سا احساس تھا۔ اس کے بعد ماضی ہی کی طرح میں نے یکے بعد دیگرے کئی مناظر بالکل واضح اور آہستہ روی کے ساتھ دیکھے۔ ان مناظر کی تمام جزئیات، آوازیں اور صورتیں مجھے صاف طور پر سنائی اور دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ جن دنوں کا ذکر ہے، یعنی جب میں اس عجیب تجربے سے گزر رہی تھی، لبنان تباہ نہیں ہوا تھا۔ لبنان کا ایک شہر بیروت اُن دنوں مشرق کا پیرس بنا ہوا تھا۔ مستقبل کے اس سفر میں لبنان کو میں نے تباہ و برباد ہوتے دیکھا۔ اُن دنوں جن حکمرانوں کے بارے میں یہ تصور بھی محال تھا کہ کبھی وہ

تخت و تاج سے محروم بھی ہو سکتے ہیں، انہیں میں نے قابلِ رحم حالت میں اقتدار سے محروم ہوتے دیکھا۔ ان حکمرانوں میں شہنشاہِ ایران بھی شامل تھے۔ یہ مناظر میرے لئے ناقابلِ یقین سے تھے۔ پھر مستقبل کا یہ سفر تیسری عالمگیر جنگ کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ دنیا کی دو بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ اور ان کے درمیان ایٹمی جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس ایٹمی جنگ کے نتیجے میں ساری دنیا تباہی اور ہلاکت سے دوچار ہو گئی تھی۔ کرۂ ارض پر کہیں بھی کسی ذی روح کے لئے جائے پناہ نہیں تھی۔ ساری انسانیت اس ایٹمی جنگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ وہ ممالک جو براہِ راست تیسری عالمگیر جنگ میں شریک نہیں تھے، وہ بھی تابکاری کے اثرات سے نہیں بچ سکے تھے۔ وہاں بھی زندگی، موت کے پنجوں میں سسک رہی تھی۔ میں نے وہ تباہی، وہ ہلاکت اور بربادی دیکھی کہ چیخ اُٹھی۔

پھر مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی دیر ان ہلاکت خیز مناظر کے زیرِ اثر چیختی چلاتی رہی اور کتنی دیر مزید وہ تجربہ جاری رہا! میرے ذہن پر ایک غنودگی سی طاری ہونے لگی جیسے اس سفر نے مجھے تھکا دیا ہو۔ اسی دوران میں بار بار روشنی کے جھماکے ہو رہے تھے۔ معاً میں نے اپنے بازو میں چبھن محسوس کی اور پھر میرا ذہن پُرسکون ہوتا گیا۔ میرے ذہن کی روشن سکرین بجھ گئی۔ اس کے بعد شاید مجھے گہری نیند آ گئی۔

جانے کب تک میرے حواس پر گہری نیند مسلط رہی اور نہ جانے کتنی دیر کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ کچھ دیر میری سمجھ میں ہی نہ آ سکا کہ میں کہاں ہوں! پھر یکے بعد دیگرے مجھے تمام واقعات یاد آتے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ ڈاکٹر رچرڈ نے مجھ پر ایک تجربہ کیا تھا، اسی تجربے کے بعد مجھ پر گہری نیند مسلط ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں اب تک ڈاکٹر رچرڈ کی قید میں ہوں۔ ہاں میں اُسی کی قیدی تھی اور اُس نے مجھے واقعی ایک قیدی ہی کی حیثیت سے وہاں رکھا ہوا تھا۔

میں اُس وقت ایک بڑے سے کمرے میں، ایک آہنی پنجرے کے اندر تھی۔ پنجرے کی آہنی سلاخوں سے مجھے اطراف کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں تیز روشنی تھی، اتنی تیز روشنی کہ فرش پر سوئی بھی گرے تو نظر آ جائے۔ وہ پنجرا ایک دیوار کے سہارے رکھا ہوا تھا۔ پنجرے کے عقب میں سلاخوں کے باہر ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ پنجرے کی وجہ سے اُس دروازے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ وہ دروازہ کسی راہداری کا تھا جس کی دونوں جانب دو دروازے نظر آ رہے تھے اور بالکل سامنے سپاٹ دیوار تھی۔ میں نے اُس طرف سے نظر ہٹا کر سامنے کی سمت دیکھا۔ اُدھر کمرے کا دروازہ تھا جو اندر سے بند نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے قریب ایک مسلح شخص کھڑا تھا اُس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ مجھے اپنی حالت دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی خطرناک درندہ ہوں جسے اس آہنی پنجرے میں قید کر کے ڈاکٹر رچرڈ نے گویا میرے فرار کی راہ بند کر دی تھی۔ اب آخری تجربے سے پہلے وہ مجھے آزاد نہ کرتا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر رچرڈ کا پہلا تجربہ کامیاب ہوا یا نہیں؟ یعنی میرے ذہن کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو سکیں یا نہیں؟ اسی کے ساتھ مجھے وہ تمام باتیں یاد آنے لگیں جن کا ذکر خود ڈاکٹر رچرڈ نے کیا تھا۔ اُس نے یہ امکان بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید میرے ذہن میں ٹیلی پیتھی کی قوت بھی پیدا ہو جائے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والی ممکنہ قوتوں کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے اپنی تمام تر ذہنی یکسوئی کے ساتھ وہاں موجود مسلح شخص کے ذہن پر توجہ دی۔ میں اُس کا ذہن پڑھنا چاہتی تھی۔ چند ہی لمحے بعد مجھے اپنے ذہن میں ہلکی سی سنسناہٹ محسوس ہوئی اور یوں لگا جیسے میرے ذہن سے نادیدہ سی لہریں خارج ہو کر اس شخص کے ذہن میں داخل ہو رہی ہیں۔ میں نے اُس مسلح شخص کو چونک کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اُس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

تم کون ہو؟...... میں نے گویا لب خاموش سے سوال کیا۔ کیا نام ہے تمہارا؟

میرا نام جیرالڈ ہے اور میں برطانوی باشندہ ہوں۔ اُس شخص کے ذہن نے جواب دیا۔

اپنے سوال کا جواب سننے سے میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میرے ذہن میں ٹیلی پیتھی کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ میں نے اس کے ذہن سے دوسرا سوال کیا۔ ڈاکٹر رچرڈ اور اُس کے دونوں ساتھی کہاں ہیں؟

وہ دونوں اس عمارت کے اُوپری حصے میں ہیں۔ مجھے اپنے سوال کا فوری جواب مل گیا۔

اُسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیا میں اس شخص کو اپنا حکم ماننے پر مجبور کر سکتی ہوں؟ میں نے اُسے فوراً ہی حکم دیا۔ میرے پنجرے کے قریب آؤ!

میرا حکم سنتے ہی وہ شخص جس نے مجھے اپنا نام جیرالڈ بتایا تھا، کسی سحر زدہ کی طرح چلتا ہوا پنجرے کے قریب آ گیا۔ وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

کیا تم مجھے اس پنجرے سے باہر نکال سکتے ہو؟ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

ہاں، مگر ڈاکٹر رچرڈ نے مجھے سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔ اُس کے ذہن نے جواب دیا۔

میں دیکھ چکی تھی کہ پنجرے کے سلاخوں دار آہنی دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔ اُس شخص کے پاس یقیناً دروازے کی چابی ہوگی۔ میں نے سوچا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ اقرار نہ کرتا کہ مجھے پنجرے سے باہر نکال سکتا ہے۔

تم بھول جاؤ کہ ڈاکٹر رچرڈ نے تمہیں کیا حکم دیا تھا اور یہ دروازہ کھول دو! میرے ذہن نے اُس کے ذہن کو حکم دیا۔

وہ چند لمحے شاید تذبذب کا شکار رہا، پھر اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر آگے بڑھ آیا۔ عین اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ جیرالڈ چونک اُٹھا اور پھر آگے بڑھتے بڑھتے رُک گیا۔

رُکو مت جیرالڈ! پنجرے کا دروازہ کھول دو! میں نے اُسے رُکتے دیکھ کر پھر حکم دیا۔

نہیں جیرالڈ! تم ہرگز ایسا نہیں کرو گے! معاً میں نے جیرالڈ کے ذہن میں ایک تیز قسم کی سرگوشی سنی۔ بولو! ہاں نہیں کرو گے نا! پنجرہ نہیں کھولو گے نا!

”ہاں میں پنجرہ نہیں کھولوں گا۔“ جیرالڈ بڑبڑانے لگا۔

کمرے کا دروازہ کھول دو آ کر! تم یقیناً ڈاکٹر رچرڈ کے فرمانبردار ہو! جیرالڈ کے ذہن کو پھر حکم دیا گیا۔

جیرالڈ فوراً ہی اپنی جیب میں چابیوں کا گچھا واپس رکھتا ہوا کمرے کے دروازے کی طرف پلٹا۔

کامیابی کی منزل قریب آتے آتے ایک دم دُور ہوگئی۔ میں سمجھ گئی کہ ڈاکٹر رچرڈ بھی حیرت انگیز ذہنی قوتوں کا مالک ہے۔ وہ بھی ٹیلی پیتھ ہے۔ کمرے کے دروازے کے باہر یقیناً وہی تھا۔ اُسی نے جیرالڈ کے ذہن کو حکم دے کر میری بات ماننے سے روک دیا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی دروازہ کھلا تو میرا خیال صحیح ثابت ہوا۔ کمرے میں داخل ہونے والا ڈاکٹر رچرڈ ہی تھا اور اُس کے ہونٹوں پر بڑی فتح مندانہ مسکراہٹ تھی۔

''مبارک ہو عذرا خان کہ میرا پہلا تجربہ کامیاب رہا۔'' اُس نے پنجرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر رچرڈ! مجھے تم سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ میرے ساتھ ایسا غیر انسانی سلوک کرو گے۔'' میرے لہجے میں شکایت تھی۔

''صرف چند دن کی بات ہے عذرا خان!'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تم پر دوسرا تجربہ بھی کرلوں، اس کے بعد تمہیں یہ شکایت نہیں ہوگی۔ تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔'' اب وہ پنجرے کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ''اگر مجھے یہاں پہنچنے میں چند منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتیں۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی تیزی دکھاؤ گی اور ہوش میں آتے ہی جیرالڈ کے ذہن کو اپنا تابع بنالو گی۔ اب مجھے اس کی جگہ شیفرڈ کی ڈیوٹی یہاں لگانا پڑے گی۔''

''تو کیا شیفرڈ بھی تمہاری طرح ٹیلی پیتھ ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے جواب دیا، پھر بولا۔ ''مگر وہ مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہے۔ تم اُس کے ذہن کو اپنا تابع نہیں بنا سکتیں! اور تم ہی کیا کوئی بھی ٹیلی پیتھ اُس کا ذہن نہیں پڑھ سکتا اور نہ اُسے حکم ماننے پر مجبور کر سکتا ہے۔''

''لیکن میں اس پنجرے میں کیسے رہ سکتی ہوں؟ تم نے یہ نہیں سوچا ڈاکٹر!'' میں بولی۔

''رات کے وقت اور دیگر ضروریات کے لئے پنجرے کا پچھلا دروازہ کھول دیا جائے گا تا کہ تم پنجرے سے نکل کر عقبی کمرے میں پہنچ سکو۔ کمرے کے ساتھ ہی باتھ رُوم ہے، تم اُسے استعمال کر سکتی ہو۔ یہ پنجرا تو صرف اس لئے ہے کہ تمہاری نقل و حرکت نظر میں رہے، دوم یہ کہ کسی ضرورت سے اس کا دروازہ نہ کھولنا پڑے۔ پنجرے کی سلاخوں کے درمیان سے تمہیں کھانے پینے کی اشیاء فراہم کی جاسکتی ہیں۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے میرے سوال کا تفصیلی جواب دیا، پھر مُڑ کر جیرالڈ سے مخاطب ہوا۔ ''سنو! اُوپر جاؤ اور شیفرڈ کو یہاں بھیج دو۔''

اُس کا حکم ملتے ہی جیرالڈ وہاں سے چلا گیا۔

''ڈاکٹر! غالباً یہ اس عمارت کا تہ خانہ ہے۔'' میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

''ہاں تمہارا اندازہ درست ہے۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ پھر کہنے لگا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں کہ اس طرح تم اس عمارت کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتی ہو، لیکن اس سے تم کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکو گی عذرا خان! تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو! صرف چند ہی دن کی تو بات ہے۔''

''ڈاکٹر! کیا یہ ضروری ہے کہ تمہارا دوسرا تجربہ بھی کامیاب ثابت ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''کوئی ضروری نہیں۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

''پھر ایسی صورت میں تم کیا کرو گے؟''

''قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے ایک مرتبہ ناکامی کے بعد دوبارہ کوشش کی جائے یا پھر میری حکومت میری بجائے کسی اور کو یہ ذمہ داری سونپ دے۔''

''یہ تجربہ کس نوعیت کا ہوگا؟ کیا تم اس پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہو؟'' میں نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔ اس سے میرا مقصد یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ حقیقت سے بے خبر رہے۔ اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ مجھے اپنے اُوپر کئے جانے والے دوسرے تجربے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔

''عذرا خان! میں تمہارے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا، معذرت خواہ ہوں۔'' اُس کا لہجہ شائستہ اور نرم تھا۔ ''ہاں، تمہیں اتنا یقین ضرور دلا سکتا ہوں کہ اس تجربے سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

میں اُس کی بات سن کر دل ہی دل میں ہنسی۔ اُس کے خیال میں یہ کوئی نقصان نہیں تھا کہ میں امریکی مفادات کی غلام بن جاتی۔ نقصان اور فائدے کا مفہوم ہر شخص کے نزدیک مختلف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رچرڈ کے ذہن میں بھی ان کے معنی مختلف تھے۔ میں نے اسی لئے ڈاکٹر رچرڈ کے جواب میں کچھ نہ کہا۔

''مستقبل کے بارے میں تم اب اہم اور صحیح پیش گوئیاں کرنے کی اہل ہو عذرا خان!'' ڈاکٹر رچرڈ مجھے خاموش دیکھ کر پھر بولا۔ ''کیا تم اپنی اس غیر معمولی قوت کو آزمانا پسند کرو گی۔''

''ممکن ہے مجھ میں یہ قوت پیدا ہو چکی ہو، مگر میں اسے خواہ مخواہ بروئے کار نہیں لانا چاہتی ڈاکٹر!'' میں نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

''تمہاری مرضی۔''

ڈاکٹر رچرڈ کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور جرمن سائنس دان شیفرڈ اندر داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ ہی جیرالڈ بھی تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ نے اُن دونوں کو مُڑ کر دیکھا۔

''ڈاکٹر! مجھے جیرالڈ نے بتایا ہے کہ اُس کی بجائے اب میں یہاں رہوں گا۔'' شیفرڈ نے ڈاکٹر رچرڈ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ہاں شیفرڈ!'' ڈاکٹر رچرڈ نے تصدیق کر دی۔ ''جیرالڈ کا یہاں رہنا اب ہمارے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ تم اس سے چارج لے لو۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر رچرڈ نے شیفرڈ کو پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا۔

''ایسی صورت میں تو واقعی میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔'' شیفرڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد شیفرڈ نے جیرالڈ سے اسٹین گن اور پنجرے کی چابیوں کا گچھا لے لیا۔ پنجرے کے تالے کی چابی کے علاوہ شاید اُس گچھے میں کچھ اور ایسی چابیاں بھی تھیں جن کی شیفرڈ کو ضرورت پڑ سکتی تھی۔

''اب شیپرڈ اور جیرالڈ کی بجائے تمہیں اور مجھے بارہ بارہ گھنٹے ڈیوٹی دینا پڑے گی۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے شیفرڈ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ رات کے وقت میں بہتر طور پر ڈیوٹی دے سکتا ہوں۔ ویسے تم جو مناسب سمجھو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر! میں دن میں ٹھیک رہوں گا۔'' شیفرڈ بولا، پھر ہنس کر کہنے لگا۔ ''اس وقت ڈیوٹی دینے

میں ویسے بھی چار گھنٹے کا فائدہ ہے مجھے۔ چار گھنٹے جیرالڈ ڈیوٹی دے چکا ہے۔ مجھے صرف آٹھ گھنٹے گزارنا پڑیں گے۔“

پھر ڈاکٹر رچرڈ اور جیرالڈ وہاں سے چلے گئے۔ کمرے میں صرف شیفرڈ رہ گیا۔ اُس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور سٹین گن تھامے دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اُن لوگوں کا رویہ میرے ساتھ بظاہر کتنا ہی نرم اور شائستہ سہی مگر یہ حقیقت تھی کہ میری حیثیت ایک قیدی کی تھی۔ وہ لوگ ہر قیمت پر مجھے چند روز اپنی قید میں رکھنا چاہتے تھے، اُس وقت تک جب تک اُن کا دوسرا تجربہ بھی کامیاب ہو جائے۔ میرے پاس بھی آزادی کی جدوجہد کے لئے صرف یہی دن تھے، اس کے بعد سب کچھ لاحاصل ہوتا۔ وہ میرے ذہن کو امریکی مفادات کا غلام بنا دیتے۔

مجھے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھنا چاہئے۔ میں نے سوچا۔ ممکن ہے میں کچھ نہ کچھ کرتی رہوں تو کوئی راہ نکل ہی آئے۔ ڈاکٹر رچرڈ مجھے بتا چکا ہے کہ میں اس پنجرے سے نکل کر عقبی راہداری میں موجود باتھ رُوم وغیرہ تک بھی جا سکتی ہوں۔ باتھ رُوم کے علاوہ وہیں ایک کمرا بھی تھا جہاں گویا رات کے وقت میرے سونے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اندازے کے مطابق مجھے اُن لوگوں کی قید میں زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ پھر بھی اس عرصے میں بہ قید ہوش وحواس میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ یہ بات بھی میرے لئے عجیب ہی تھی کہ اس کے باوجود مجھے بھوک بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی غرض سے میں نے عقبی کمرے اور باتھ رُوم کا جائزہ لینا ضروری خیال کیا۔ مجھے اُمید تو نہیں تھی کہ وہاں سے فرار کی کوئی راہ نکل سکے گی، مگر جائزہ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

”شیفرڈ!“ کچھ سوچ کر میں نے اپنے نگران کو آواز دی۔

”کیا بات ہے عذرا خان؟“ شیفرڈ نے میری طرف متوجہ ہو کر نرم لہجے میں پوچھا۔

”میں باتھ رُوم جانا چاہتی ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”اچھا۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھہرو، میں آتا ہوں ابھی۔“ یہ کہہ کر اُس نے سٹین گن دروازے کے قریب رکھے ہوئے ایک سٹول پر لٹکائی اور جیب سے چابیوں کا گچھا نکالتا ہوا پنجرے کی طرف بڑھنے لگا۔

اُسے چابیوں کا گچھا نکالتے دیکھ کر مجھے ایک اور تالے کا خیال آیا۔ میں نے چھت کی طرف نگاہ اُٹھائی تو پنجرے کی عقبی سمت مجھے ایک اور تالا نظر آ گیا۔ وہ تالا یقیناً پنجرے کے عقبی دروازے میں لگا ہوا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے شیفرڈ، بندروں کی طرح پنجرے کی چھت پر چڑھ گیا اور پھر جھک کر تالا کھولنے لگا۔ پنجرے کی چھت اتنی اُونچی تھی کہ میرا ہاتھ شیفرڈ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اُس نے تالا کھول کر ایک طرف رکھ دیا اور پھر سلاخ دار عقبی دروازے کو اُوپر کھینچنے لگا، یوں جیسے سرکس کے جانوروں کے لئے دروازہ اُوپر اُٹھایا جاتا ہے۔ مجھے اپنی حالت پر ہنسی بھی آئی اور دُکھ بھی ہوا۔

دروازہ اُوپر اُٹھانے کے بعد شیفرڈ نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اب تم اندر جا سکتی ہو۔ جب تم دوبارہ یہاں واپس آ جاؤ گی تو دروازہ بند کر دُوں گا۔“

”تم اس دروازے کو کھلا ہی کیوں نہ رہنے دو۔“ میں اُوپر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس دروازے کے کھلا

رہنے سے فرق بھی کیا پڑے گا! اس طرح جب بھی میں چاہوں گی اندر آ جا سکوں گی اور تمہیں بار بار دروازہ اُٹھانے اور بند کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ یوں گویا میں اپنے قید خانے کی وسعت میں اضافہ کرنا چاہتی تھی۔

”ٹھیک کہتی ہو تم!“ اُس نے کہا۔ ”میں یہ دروازہ کھلا ہی رہنے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جھکا اور دروازے کا تالا پنجرے کی ایک سلاخ میں ڈال دیا۔ تالے میں چابی گھما کر اُس نے گچھا اپنی جیب میں رکھ لیا اور پھر پنجرے کی چھت سے اُتر آیا۔

پنجرے سے نکل کر میں اُسی چھوٹی سی راہداری میں پہنچ گئی۔ چند قدم آگے بڑھ کر میں نے دائیں جانب کا دروازہ کھولا۔ وہ بیڈرُوم تھا۔ اُس میں ایک مسہری کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ وہ ایک بڑے سے صندوق کی طرح تھا۔ میں نے چند ہی لمحوں میں دروازے پر کھڑے کھڑے اُس کا جائزہ لے لیا اور پھر اُسے بند کر کے مزید آگے بڑھ گئی۔ بائیں جانب والا دروازہ ظاہر ہے کہ باتھ رُوم ہی کا تھا۔ میں نے ایک نظر اُسے بھی دیکھا، پھر پلٹ کر شیفرڈ کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی نگاہ میری ہی حرکات وسکنات پر تھی۔ میں اسی لئے کچھ دیر کو باتھ رُوم میں گھس گئی تا کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں نے اُس سے جھوٹ بولا تھا۔ باتھ رُوم سے باہر آ کر میں نے کمرے کا رُخ کیا۔ کمرے میں داخل ہو کر ہوا کے لئے میں نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا اور آگے بڑھ کر مسہری پر دراز ہو گئی۔ میں اب تنہائی میں یکسوئی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔

سوچتے سوچتے معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں اب مستقبل میں بھی تو جھانک سکتی ہوں۔ کیوں نہ میں اپنے مستقبل کے بارے میں معلوم کروں کہ میرے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے! اب تک مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں اپنے ذہن کی خوابیدہ قوتوں کو کس طرح متحرک کر سکتی ہوں! پہلے تو خود بخود یہ خوابیدہ قوتیں متحرک ہو جاتی تھیں۔ میں ... نے غور کیا کہ ایسا عموماً کس وقت ہوتا تھا؟ مجھ پر یہ کیفیت کب اور کن حالات میں طاری ہوتی تھی؟ غور وخوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ جب میرا ذہن کسی سوال کا جواب پانے کی خاطر انتہائی پریشان اور مضطرب ہوتا تھا اور یہ اضطراب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا تھا تو میری حیرت انگیز قوتیں فعال ہو جاتی تھیں۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے ذہن میں سوال قائم کیا کہ آئندہ ایک ہفتے کے دوران میں مجھ پر کیا گزرنے والی ہے؟ میں یہ سوال بار بار اپنے ذہن میں دُہراتی رہی، مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ مجھے اس سے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا، کیا مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں علم نہیں ہو سکتا؟ لیکن ابھی تو میں نے ہوش میں آنے کے بعد کسی کے مستقبل میں نہیں جھانکا تھا۔ اپنی طرف سے مایوسی کے بعد میں نے بطور آزمائش شیفرڈ کا تصور کیا اور اُس کے حوالے سے اس سوال کا جواب پانے کی سعی کرنے لگی کہ آج اُسے کیا واقعات پیش آئیں گے؟ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میرے ذہن میں مانوس سی لذت انگیز سنسناہٹ شروع ہو گئی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب میرے صفحۂ ذہن پر شیفرڈ کا چہرہ تھا، پھر یہ چہرہ پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اب وہ مجھے بیرونی بڑے کمرے میں دروازے کے سامنے اسٹین گن لئے ٹہلتا دکھائی دے رہا تھا۔ معاً دروازے پر دستک سنائی دی۔ شیفرڈ نے با آواز بلند پوچھا، کون ہے؟ دستک دینے والے نے اپنا نام شیپرڈ بتایا اور کہا کہ میں، عذرا خان کے

لئے کھانا لے کر آیا ہوں۔ اس پر شیفرڈ نے پوچھا کہ جیرالڈ کھانا لے کر کیوں نہیں آیا؟ شیپرڈ نے جواب دیا کہ ڈاکٹر رچرڈ نے اُسے کسی کام سے بھیجا ہے۔ اس کے بعد شیفرڈ نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ میں واضح طور پر سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی شیپرڈ اس طرح کمرے کے اندر اوندھے منہ فرش پر آ کے گرا جیسے کسی نے اُسے پیچھے سے دھکا دیا ہو۔ اگر وہ گرتے گرتے اپنے دونوں ہاتھ آگے نہ کر لیتا تو اُس کا چہرہ بھرتا بن جاتا۔ اُسے گرتے دیکھ کر شیفرڈ اُس کی طرف لپکا۔ اُسی وقت چار پانچ نقاب پوش کمرے میں داخل ہوئے اور اُنہوں نے شیفرڈ کو چھاپ لیا۔ پھر ذرا ہی دیر میں ان نقاب پوشوں نے شیفرڈ اور شیپرڈ کو رسیوں سے باندھ کر فرش پر ڈال یا۔ اس کے بعد شیفرڈ کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر آہنی پنجرے کی طرف بڑھے۔ اچانک آہنی پنجرا تاریکی کے پردے میں چلا گیا اور وہ نقاب پوش بھی اُس تاریکی کا حصہ بن گئے۔ میں کافی دیر تک منتظر رہی کہ تاریکی کے اُس پردے سے وہ نقاب پوش باہر آئیں، مگر ایسا نہ ہوا۔ میرے صفحۂ ذہن کے ایک حصے پر تاریکی ہی مسلط رہی۔ پھر منظر بدل گیا۔ اب اُس کمرے میں ڈاکٹر رچرڈ حیران اور پریشان سا کھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے ساتھ جیرالڈ بھی تھا۔

ڈاکٹر رچرڈ نے جیرالڈ کو حکم دیا کہ شیفرڈ اور شیپرڈ کو وہ رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دے۔ جیرالڈ نے تعمیل حکم کی۔ پھر ڈاکٹر رچرڈ، شیفرڈ اور شیپرڈ کے درمیان گفتگو ہونے لگی۔ میرے لئے باعث حیرت یہ امر تھا کہ مجھے اُن کے ہونٹ تو ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے مگر گفتگو کا ایک لفظ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر وہ سب اُس کمرے سے نکل کر دائیں جانب موجود ایک زینے پر چڑھنے لگے۔ اُن کے درمیان اب بھی گفتگو جاری تھی۔ لیکن صورتِ حال بدستور تھی۔ میں اُن کی آوازیں سننے سے قاصر تھی۔ مجھے اس سے اُلجھن ہونے لگی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مستقبل میں جھانکنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

شیفرڈ کے حوالے سے میں نے مستقبل میں جو کچھ دیکھا تھا، اس نے میرے ذہن کو اُلجھا دیا۔ نہ معلوم وہاں کیا ہونے والا تھا؟ اور خدا جانے وہ نقاب پوش کون تھے جو تاریکی کا حصہ بن گئے تھے؟

اُس واقعے کو ذہن سے جھٹک کر میں نے از سر نو سوچنا شروع کیا کہ وہاں سے کس طرح فرار ہو سکتی ہوں؟ اگر ڈاکٹر رچرڈ عین وقت پر نہ آ گیا ہوتا تو میں شاید اُس پنجرے سے تو نکلنے میں کامیاب ہو ہی جاتی۔ پھر ممکن ہے مجھے وہاں سے فرار کا موقع بھی مل جاتا۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ جیرالڈ کو تو میں اب بھی اپنا آلۂ کار بنا سکتی ہوں۔ ممکن ہے، میں اُس سے ذہنی رابطہ قائم کر سکوں۔ میں نے دوسرے ہی لمحے آنکھیں بند کر کے جیرالڈ کا تصور کیا اور پھر اُس سے ذہنی رابطہ قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ حیرت انگیز طور پر مجھے اس میں کامیابی ہوئی۔ پھر بھی میں نے اُس کے ذہن سے تصدیق چاہی، کیا تم جیرالڈ ہو؟

"ہاں، میں جیرالڈ ہوں۔" اُس کے ذہن نے جواب دیا۔

ڈاکٹر رچرڈ اس وقت کہاں ہے؟ تمہیں علم ہے؟ میں نے سوال کیا۔

ہاں۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں آرام کر رہا ہے۔ کیونکہ اُسے آج رات جاگنا ہے۔ دن کے وقت وہ اسی لئے سو لینا چاہتا ہے۔ جیرالڈ کے ذہن نے بتایا۔

کیا تم نیچے تہ خانے میں آ سکتے ہو؟ میں نے پوچھا۔

نہیں! مجھے ڈاکٹر رچرڈ نے وہاں جانے سے منع کیا ہے۔ اُس کے ذہن نے انکار کر دیا۔

لیکن تم ایسا کرو گے! کرو گے نا؟"

ہاں کروں گا...... کروں گا، مگر مجھے وہاں کیا کرنا ہے؟

پھر اس سے پہلے کہ میں اُسے کوئی حکم دے سکتی، اُس کا ذہن ایک دم تاریک ہو گیا۔ اس سے میرے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اسی کے ساتھ جیرالڈ سے میرا ذہنی رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے دوبارہ رابطہ بحال کرنا چاہا مگر ممکن نہ ہوا۔ تاریکی کے سوا مجھے اُس کے ذہن میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی۔ میں نے ٹیلی پیتھی کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ ایسا اُسی صورت میں ہوتا تھا کہ یا تو جس شخص کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو، وہ مُردہ ہو یا پھر بے ہوش۔ چند لمحے پہلے تک جیرالڈ کا ذہن میرے سوالوں کا جواب دے رہا تھا اور اچانک ہی اُس پر تاریکی چھا گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُسے یقیناً اچانک ہی کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔

مجھے کچھ دیر اسی کیفیت میں گزری تھی کہ اچانک بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی اور میں چونک اُٹھی۔ آنے والا کون ہے اور کیوں آیا ہے؟ یہ جاننے کے لئے میں تیزی کے ساتھ اُٹھی اور پھر کمرے سے نکل کر پنجرے میں پہنچ گئی۔

"ڈاکٹر رچرڈ نے اُسے کسی کام سے بھیجا ہے۔" میں نے وہاں آتے ہی شیپرڈ کی آواز سنی جو یقیناً دروازے کے باہر تھا۔ اُس نے شیفرڈ ہی کے کسی سوال کا جواب دیا تھا۔

بظاہر یہ الفاظ ایسے نہیں تھے کہ میرے اعصاب تن جاتے، مگر چند لمحے بعد وہاں جو کچھ ہونے والا تھا، کچھ دیر پہلے ہی دیکھ اور سن چکی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب شیفرڈ دروازہ کھولے گا اور شیپرڈ اندر آ کر فرش پر اوندھے منہ گرے گا۔ پھر...... پھر وہی سب کچھ ہونے لگا جو میں سوچ رہی تھی اور دیکھ چکی تھی۔

مسلح نقاب پوشوں نے شیفرڈ اور شیپرڈ کو فرش پر باندھ کر ڈال دیا۔ پھر وہ چابیوں کا گچھا نکال کر پنجرے کی طرف بڑھے۔ یہی وہ منظر تھا جس کے ایک حصے کو میں نہ دیکھ سکی تھی۔

اُن مسلح نقاب پوشوں میں سے ایک نے پنجرے کا دروازہ کھول کر مجھے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ اُن کے ارادے جو بھی رہے ہوں لیکن وہ بہر حال مجھے اُس قید سے نکال کر لے جا رہے تھے۔ یہ سوچ کر میں نے ان سے بھڑنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں بھی وہ مسلح تھے اور اُن کے آتشیں ہتھیاروں کا رُخ میری ہی طرف تھا۔ میں نے فی الحال اُن سے تعاون کا فیصلہ کیا تھا۔

پھر جیسے ہی میں نے پنجرے سے باہر قدم رکھا، میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کسی نے میرے سر پر بھاری ضرب لگائی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل گیا اور میں لہرا کر گرنے لگی۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ ایک نقاب پوش نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے سنبھال لیا تھا۔ اس کے بعد میں اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکی۔

جب میں دوبارہ اپنے حواس میں آئی تو میرے چاروں طرف گھری تاریکی مسلط تھی۔ میں غالباً کسی بستر پر دراز تھی اور میرا جسم شاید رسیوں کی گرفت میں تھا۔ مجھے اس کا اندازہ یوں ہوا کہ میں اُٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب

نہیں ہوسکی اور نہ اپنی مرضی سے اپنے پیروں کو حرکت دے سکی۔

اب مجھے کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ میں، ڈاکٹر رچرڈ کی قید میں نہیں ہوں۔ مجھے ڈاکٹر رچرڈ کی قید سے نکال کر لانے والے وہ نقاب پوش کون ہیں اور اُن کا اس سے کیا مقصد ہے؟ مجھے ان سوالوں کے جواب دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ لیکن یہ میرے لئے کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کا احساس تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنی ذہنی قوتوں کے ذریعے وہاں کسی ذی رُوح کی تلاش شروع کر دی۔ مجھے اپنی تلاش میں ناکامی نہیں ہوئی۔ جلد ہی میرے ذہن سے خارج ہونے والی طاقتور لہروں نے ایک ذی رُوح کو تلاش کر لیا۔ میرے ذہن کی لہریں اُسی کے ذہن سے ٹکرائی تھیں۔

کون ہو تم؟ میں نے اُس کے ذہن سے سوال کیا۔

حسن بن شعبان۔ مجھے میرے سوال کا جواب ملا۔

تمہارے علاوہ اس عمارت میں اور کتنے افراد ہیں؟ میں نے دریافت کیا۔

میرے تین ساتھی اور ہیں۔ اُس نے بتایا۔

کیا تمہی لوگ اُس پاکستانی دوشیزہ کو اغوا کر کے یہاں لائے ہو؟ میں نے پوچھا۔

ہاں، مگر تم کون ہو؟ اُس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا۔ اسی کے ساتھ مجھے اُس شخص کے ذہن میں ایسے خیالات اُبھرتے محسوس ہوئے جیسے کسی کو دیکھ کر اُسے شدید حیرت ہوئی ہے۔ آپ؟...... اچانک کیسے؟ اُس نے کسی سے کہا، مگر ان الفاظ کی ادائیگی سے پہلے ہی مجھے علم ہو گیا کہ وہ کیا کہنے والا ہے! اس کی وجہ یہ کہ بولنے سے پہلے آدمی کے ذہن میں وہ الفاظ آتے ہیں جو وہ زبان سے ادا کرتا ہے۔ یقیناً اُس شخص کے سوال کا جواب دیا گیا تھا اور اسی کے ساتھ کچھ پوچھا بھی گیا تھا۔ جواب میں اُس شخص کے ذہن میں جو الفاظ اُبھرے، وہ یہ تھے کہ نہیں، ابھی اُسے کھانے کے لئے کچھ نہیں دیا گیا۔ وہ سوال بھی شاید مجھی سے متعلق تھا جس کا جواب اُس شخص حسن بن شعبان نے دیا تھا۔

میرے ذہن میں تجسس پیدا ہوا کہ آخر وہ آنے والا کون تھا جسے دیکھ کر حسن کو حیرت ہوئی ہے؟ میں نے اسی لئے حسن سے اپنا ذہنی رابطہ منقطع کر لیا اور پھر اُس نووارد کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے لگی۔ وہاں غالباً حسن اور نووارد ہی تھے اسی لئے میں نے جلد ہی نووارد کے ذہن سے رابطہ قائم کر لیا۔ پھر میں بھی حیران رہ گئی۔ وہ نووارد شیپرڈ تھا، جرمن سائنس دانوں میں سے ایک! آخر وہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟ میرے ذہن میں متعدد سوالات اُبھرنے لگے۔ ان سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لئے میں اُس کا ذہن پڑھنے لگی۔

شیپرڈ کا ذہن پڑھ کر مجھے جو باتیں معلوم ہوئیں، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ اُن کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ میری حیرت انگیز قوتوں کے متعلق دنیا کی دوسری بڑی طاقت کو آگاہ کر چکا تھا۔ اُس نے رُوسی حکومت سے میرا سودا کر دیا تھا۔ نصف رقم اُسے ادا کی جا چکی تھی اور بقیہ بڑی نصف رقم آج ہی رات ادا کی جانے والی تھی۔ آج ہی رات جب وہ مجھے روسی ایجنٹوں کے حوالے کرتا تو اُسے بقیہ نصف رقم مل جاتی۔ شیپرڈ نے مجھے کچھ مقامی جرائم پیشہ افراد کے ذریعے اس طرح اغوا کرایا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کو اُس پر غداری کا شبہ نہ ہو۔

اگر ڈاکٹر رچرڈ کو اُس پر شبہ ہو جاتا اور پھر یہ شبہ یقین میں بدل جاتا تو اُس کا بچنا محال تھا۔ امریکی ایجنٹ اُسے قتل کر دیتے۔ شیپرڈ نے اسی لئے خود الگ رہ کر وہ کھیل کھیلا تھا اور میرے اغواء کی تمام تر ذمہ داری رُوسی ایجنٹوں پر ڈال دی تھی۔ اس منصوبہ بندی میں شیپرڈ سے بس ایک ہی فاش غلطی ہو گئی تھی کہ اُس نے میری حیرت انگیز قوتوں کا اندازہ نہیں کیا تھا۔ اگر اُسے یہ اندازہ ہوتا تو شاید وہ اُس وقت تک مجھے بے ہوش رکھتا جب تک رُوسی ایجنٹوں کے حوالے نہ کر دیتا۔ شیپرڈ سے اگر یہ غلطی نہ ہوتی یا اس کا ذہن بھی شیفرڈ کی طرح ہوتا تو یقیناً میرے فرار کی راہ اتنی جلدی استوار نہ ہو سکتی۔

جو کچھ بھی ہوا میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا۔ اگر شیپرڈ کے دل میں لالچ پیدا نہ ہو جاتا تو میں، ڈاکٹر رچرڈ کی قید سے کبھی نہ نکل پاتی۔ ہاں اس سے یہ ضرور ہوا کہ میرے لئے آئندہ مزید خطرات بڑھ گئے تھے۔ اب رُوسی ایجنٹ بھی میرے پیچھے لگ جاتے، مگر یہ بعد کی باتیں تھیں۔ فی الحال تو میں اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی اور میں نے اس میں دیر نہیں کی۔

پھر میں نے شیپرڈ کے ذہن کو اپنے ذہن کی گرفت میں لے لیا۔ اُس کا ذہن اب میرے تابع تھا۔

شیپرڈ! اگر تم نے عذرا خان کو رُوسی ایجنٹوں کے حوالے کر دیا تو امریکی ایجنٹوں سے نہ بچ سکو گے۔ وہ تمہیں قتل کر دیں گے۔ میں نے اُس کے ذہن میں خوف پیدا کر دیا۔

پھر؟...... پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟ وہ سوچنے لگا۔ شیپرڈ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اُس سے جو کچھ کہہ رہی ہوں، جو کچھ اُس کے ذہن میں بٹھا رہی ہوں، وہ باتیں خود اُس کے ذہن میں آ رہی ہیں۔

تم عذرا خان کو رُوسی ایجنٹوں کے حوالے نہ کرو! میرے ذہن نے اُس کے ذہن کو مشورہ دیا۔

مگر میں...... میں تو اُن سے پیشگی رقم بھی وصول کر چکا ہوں۔ اس کے ذہن نے مزاحمت کی۔

رقم واپس کر دو! رقم تمہاری زندگی سے زیادہ نہیں ہے۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اُسے اپنا کوئی پروجیکٹ پورا کرنے کے لئے کثیر رقم کی ضرورت تھی۔

شیپرڈ! وہ سائنسی پروجیکٹ بھی تمہاری زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ بولو ہے؟ میں نے اُسے سوچ میں گم دیکھ کر پھر رقم واپس کرنے کی ترغیب دی۔

ہاں، میری زندگی سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں زندہ رہا تو وہ پروجیکٹ بھی کبھی نہ کبھی پورا ہو جائے گا۔ مگر...... مگر عذرا خان کا کیا کروں؟ اُسے تو اب ڈاکٹر رچرڈ کے حوالے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ میں نے اُس سے غداری کی ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ شیپرڈ کا ذہن بے چین ہونے لگا۔

عذرا خان کو تم اُس کے حال پر چھوڑ دو، اُسے یہاں سے بھی فرار کرا دو۔ میرے ذہن نے اُسے راہ سجھائی۔

مگر فرار کا جواز؟ میں رُوسی ایجنٹوں کو کس طرح مطمئن کروں گا؟ وہ بھی تو کم خطرناک نہیں ہیں۔ رقم کی واپسی کے باوجود اُن کا مطمئن ہونا بھی تو ضروری ہے کہ عذرا خان کے فرار میں میرا ہاتھ نہیں ہے۔ شیپرڈ اپنی دانست میں خود اپنے ذہن سے سوال جواب کر رہا تھا۔ اس دوران میں اُس نے حسن کو خاموش رہنے کے لئے کہہ دیا تھا۔

یہ کوئی مسئلہ نہیں! تم اُنہیں بتا دینا کہ تمہاری یہاں آمد سے قبل ہی عذرا خان فرار ہو گئی تھی۔ مزید یقین

دلانے کی خاطر تم اُنہیں یہ بھی بتا سکتے ہو کہ تجربے کی کامیابی کے بعد عذرا خان کا ذہن بے حد طاقتور ہو چکا ہے۔ وہ کسی بھی شخص سے ذہنی رابطہ قائم کر کے اُسے اپنی بات ماننے پر مجبور کر سکتی ہے۔ تمہاری غیر موجودگی میں عذرا خان نے اس عمارت میں موجود افراد کے ذہنوں کو قابو میں کر لیا اور پھر یہاں سے فرار ہو گئی۔ میں نے گویا وہ ساری کہانی اُس کے ذہن میں بٹھا دی جو اُسے رُوسی ایجنٹوں کو سنانا تھی۔

ہاں، یہ بالکل ٹھیک ہے اور...... اور یہ درست بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر رچرڈ نے بھی ایک بار اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ عذرا خان کے ذہن میں یہ صلاحیت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ شیپرڈ کا ذہن مطمئن ہو گیا اور فکر و پریشانی کے اثرات غائب ہونے لگے۔

میں سمجھ گئی شیپرڈ کو کسی سبب ڈاکٹر رچرڈ نے ابھی یہ نہیں بتایا کہ حقیقتاً میرے ذہن میں قوت پیدا ہو گئی ہے۔ اُسی وقت مجھے اُن مشکلات کا خیال آیا جو یہاں سے فرار ہونے کے بعد میرے لئے پریشانی کا سبب ہو سکتی تھیں۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ میری جیب بالکل خالی تھی۔ دوسرا اہم مسئلہ یہ تھا کہ میرا پاسپورٹ اور دوسرے شناختی کاغذات جیکب کے پاس تھے جو قتل ہو چکا تھا۔ وہ کاغذات یقیناً اب ڈاکٹر رچرڈ کے قبضے میں تھے۔ پاسپورٹ اور اُن کاغذات کے بغیر میرے لئے اس ملک سے نکلنا ناممکن تھا اور یہاں میری موجودگی بھی گویا غیر قانونی تھی۔ ایسی صورت میں یہ ملک میرے لئے کسی بڑے سے چوہے دان کی طرح تھا جہاں سے میرا باہر نکلنا محال تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا مسئلہ بہر حال یہ بھی تھا کہ میرے جسم پر موجود لباس جگہ جگہ سے مسل گیا تھا اور میلا بھی ہو گیا تھا۔ مجھے نئے لباس کی بھی ضرورت تھی لیکن نئے لباس اور رقم کے حصول سے قطع نظر اہم مسئلہ پاسپورٹ کا حصول ہی تھا۔ میں نے اُس پاسپورٹ پر مسز عذرا جیکب کی حیثیت سے سفر کیا تھا۔ میرا اصل پاسپورٹ اور دوسرے شناختی کاغذات پاکستان میں تھے۔ اگر میں پکڑی جاتی تو اس سوال کا کیا جواب دیتی کہ کس طرح اس ملک میں داخل ہوئی؟ مجھ پر بہ آسانی کوئی بھی الزام لگایا جا سکتا تھا۔ میں نے چند ہی لمحوں میں تمام صورتِ حال پر غور کر لیا، پھر شیپرڈ کے ذہن سے دوبارہ رابطہ قائم کیا۔

شیپرڈ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ عذرا خان کا پاسپورٹ اور دیگر شناختی کاغذات کہاں ہیں؟ میں نے شیپرڈ کے ذہن سے معلوم کیا۔

پاسپورٹ اور کاغذات، ڈاکٹر رچرڈ کے پاس ہیں جسے اُس نے اپنی تجوری میں رکھا ہے۔ مجھے اپنے سوال کا جواب ملا۔

کیا تم وہ پاسپورٹ اور کاغذات حاصل کر سکتے ہو؟ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ شیپرڈ کے ذہن نے واضح طور پر جواب دیا۔

تمہاری جیب میں اس وقت کتنی رقم ہو گی؟ ایک طرف سے مایوس ہو کر میں نے دوسرے مسئلے کا حل ڈھونڈنا چاہا۔

میری جیب میں اس وقت صرف ایک ہزار گنی کے نوٹ ہیں، اس کے علاوہ سو ڈیڑھ سو پیاسٹر ہوں گے۔ اُس نے بتایا۔

میں نے فوری طور پر حساب لگایا۔ ایک گنی تقریباً چودہ پاکستانی روپوں کے مساوی ہوتی ہے اور سو پیاسٹر

کی ایک گنی ہوتی ہے۔ اس طرح گویا شیپرڈ کے پاس اس وقت چودہ ہزار روپے تھے، پاکستانی! پیاسٹر کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اگر ڈیڑھ سو پیاسٹر بھی تھے تو وہ ڈیڑھ گنی کے برابر تھے، یعنی اکیس پاکستانی روپے! بہرحال یہ رقم فی الحال کم نہیں تھی۔ میں نے یہی سوچ کر شیپرڈ کے ذہن کو ترغیب دی۔

شیپرڈ! تم ایک ہزار گنی کے نوٹ عذرا خان کے حوالے کر دینا تاکہ وہ فوری طور پر یہاں سے نکل سکے۔ اگر وہ یہاں رہی تو اس راز کے کھلنے کا امکان ہے کہ تم ہی نے اسے ڈاکٹر رچرڈ کی قید سے فرار کرایا تھا یا بہ الفاظ دگر اغوا کرایا تھا۔

شیپرڈ کے ذہن کو بہر حال اِس آمادگی کا اظہار کرنا ہی پڑا۔ رقم دینے کے لئے میں نے جو جواز پیش کیا تھا، اُس کے ذہن میں بیٹھ گیا۔

اُس کے بعد میں نے شیپرڈ کو اُس کمرے میں آنے کا حکم دیا جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ میرے ہی ایما پر شیپرڈ نے اُن مقامی افراد کو بتا دیا تھا کہ مجھے قید میں رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اسی کے ساتھ ان مقامی جرائم پیشہ افراد سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھیں۔ وہ لوگ تو میرے اغواء کے سبب ہی سے ناواقف تھے اس لئے کیا کہتے؟ اُنہیں اس کام کا معاوضہ بھی مل چکا تھا۔ یہ جگہ اُنہی کی تھی۔ اُنہوں نے یہی سوچا ہو گا کہ اچھا ہے جلد جان چھوٹ رہی ہے۔ پیشہ ور مجرم عموماً معاوضہ ملنے کے بعد بقیہ معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ ہاں، اُنہیں حیرت ضرور ہوئی تھی جس کا اظہار اُنہوں نے شیپرڈ سے بھی کیا تھا [illegible] اس طرح اغوا کر کے یوں ہی رہا کر دینا بہرحال ان کے نزدیک عجیب بات تھی۔

پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میں نے کسی کے قدموں کی چاپ [illegible] آنے والا شیپرڈ ہی ہو سکتا تھا۔ چند لمحے بعد قدموں کی چاپ رُک گئی اور اس کے ساتھ [illegible] جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ وہ بہت چھوٹا سا کمرا تھا۔ وہاں ایک جانب چھوٹی سی میز اور [illegible] پڑی تھیں اور وہ سنگل بیڈ تھا جس پر مجھے باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ آنے والا شیپرڈ ہی تھا۔

''عذرا خان! میں چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد یہاں سے فرار ہو جاؤ!'' اُس نے مجھے ہوش میں دیکھ کر کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ ''میں تو چاہتا ہوں کہ تم اس ملک ہی سے فرار ہو جاؤ۔''

''مگر کیسے؟ میرے پاس تو پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔'' میں نے دانستہ کہا۔

''میں تمہیں ایک شخص کا پتہ دے رہا ہوں۔ وہ جیزا میں رہتا ہے۔ مجھے تمہاری اس مشکل کا پہلے ہی احساس تھا۔ جیزا کے علاقے زمالک میں وہ تمہیں ملے گا۔ تم چاہو تو میرا حوالہ بھی دے سکتی ہو، مناسب رقم میں کام ہو جائے گا۔ وہ تمہارے لئے پاسپورٹ کا بندوبست کر دے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب آ کر مجھے رسیوں کی گرفت سے آزاد کرنے لگا۔

''مگر تم...... تم شیپرڈ! مجھ پر یہ مہربانی کیوں کر رہے ہو؟''

''اس لئے عذرا خان کہ میں میں تمہارا بہی خواہ ہوں۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے بات بنائی۔ ''خود میں نے تمہیں اسی غرض سے اغوا کرایا تھا۔ اس طرح کہ واقعی اغوا معلوم ہو۔''

''میں تمہارا احسان یاد رکھوں گی شیپرڈ!'' میں پُر جوش لہجے میں بولی۔ ''مگر میرے پاس اخراجات سفر بالکل نہیں ہیں اور نہ ہی پاسپورٹ فراہم کرنے والے کو دینے کے لئے رقم ہے۔''

اس دوران میں شیپرڈ مجھے رسیوں کی گرفت سے آزاد کرا چکا تھا۔ اُس نے رسّی ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ''رقم کا بندوبست بھی میں کروں گا۔'' یہ کہہ کر اُس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو، ایک ہزار گنی کے نوٹ ہیں یہ۔ فی الحال میں تمہارے لئے اتنا ہی کر سکتا ہوں ...... اور یہ...... یہ اُس شخص کا پتہ لکھ دیا ہے میں نے، جس سے تمہیں جیزا میں ملنا ہے پاسپورٹ کے لئے۔''

میں نے نوٹ اور وہ پرچہ لے لیا جس پر پتہ لکھا تھا۔ پرچے پر لکھے ہوئے پتے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد میں نے اُسے اسکرٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ جیزا میں وہ علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ زمالک، جیزا کی قدیم آبادیوں میں سے تھا۔ یہ قدیم اُمرا کا علاقہ تھا اور یہاں متمول طبقے کے لوگ ہی رہتے تھے۔ اب اس علاقے میں دوسرے طبقوں کے افراد بھی آباد ہو گئے ہیں اس لئے اس کا شمار اپر کلاس سوسائٹیز میں نہیں ہوتا۔ اُس وقت اس علاقے میں بڑے بڑے ممالک کے سفارت خانے بھی تھے جن دنوں کا میں ذکر کر رہی ہوں۔

شیپرڈ سے گفتگو کے دوران میں کسی بھی طرح میں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ سب کچھ میری ہی مرضی اور ایما کے مطابق ہو رہا ہے۔ وہ اپنی دانست میں یقیناً یہی سمجھ رہا ہو گا کہ مجھ سے پیچھا چھڑا رہا ہے۔

جب میں اُس عمارت سے نکلی تو رات کے ساڑھے نو بجے تھے۔ گھڑی ابھی تک میری کلائی پر بندھی ہوئی تھی۔ قاہرہ جیسے شہروں میں رات کے ساڑھے نو بجے کا وقت کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔ وہاں تو اکثر علاقے رات بھر روشن رہتے ہیں۔

کچھ فاصلہ عبور کر کے جب میں ایک سڑک پر آ گئی تو معلوم ہوا کہ وہ جیزا کا علاقہ عجوزا تھا۔ یہ متوسط طبقے کی آبادی تھی اور یہاں سے جدید قاہرہ کا گویا دل تحریر اسکوائر تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ تحریر اسکوائر بھی قاہرہ کے اُن علاقوں میں سے ہے جہاں تقریباً رات بھر ہی چہل پہل رہتی ہے۔ یہ قاہرہ کی اپر کلاس سوسائٹی ہے، جدید ترین علاقہ! یہ دریائے نیل کی بائیں جانب آباد ہے۔ مشرق کی طرف رُخ کرنے کی صورت میں! یہیں اہم سرکاری دفاتر ہیں۔ یہ خاصا وسیع و عریض علاقہ ہے۔ سی آئی ڈی آفس، پولیس ہیڈ آفس اور پاسپورٹ آفس بھی یہیں ہیں۔ یہ تمام دفاتر ایک قدیم دس منزلہ عمارت میں واقع ہیں۔ یہاں میوزیم بھی ہے۔ جب میں پہلی بار قاہرہ آئی تھی تو یہ میوزیم دیکھا تھا۔ اس میوزیم میں فراعنۂ مصر کی ممیاں ہیں۔ یہیں فرعونِ موسیٰ کی تاریخی ممی بھی میں نے دیکھی تھی۔ یہ وہ فرعون تھا جس سے حضرت موسیٰ نبرد آزما ہوئے تھے۔

فراعنہ کے تابوتوں میں ہزاروں من سونا اب بھی موجود ہے۔ اسی وسیع و عریض علاقے کے ایک حصے میں اسمبلی ہال بھی ہے اور یہیں تمام وزارتوں کے دفاتر بھی ہیں۔ اسی علاقے میں قاہرہ کے نئے ریڈیو اسٹیشن کی اٹھائیس منزلہ عمارت بھی تعمیر کی گئی ہے جو ہلٹن ہوٹل کے قریب ہے۔ ریڈیو اسٹیشن کی نچلی دس منزلیں دائرے کی صورت میں ہیں اور بقیہ اٹھارہ منزلیں مربع کی شکل میں۔ ریڈیو کی اس عمارت میں ہر منزل پر سو کمرے ہیں۔ بلاشبہ دنیا کے چند بڑے ریڈیو اسٹیشنز میں اس کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

قاہرہ شہر کے بارے میں میری معلومات کیونکہ ناکافی نہیں تھیں اور میں یہاں گھوم پھر چکی تھی اس لئے

مجھے کوئی قباحت نہیں ہو رہی تھی۔ میں کسی خالی ٹیکسی کے انتظار میں سڑک کی ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے ایک خالی ٹیکسی گزرتی نظر آ گئی۔ میں نے اُسے ہاتھ دے کر روک لیا۔

''تحریر اسکوائر کا کیا کرایہ لو گے؟'' میں نے خالص عربی لہجے میں ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

ٹیکسی ڈرائیور عموماً بڑے شہروں میں اتنے قریب کی سواری نہیں بٹھاتے، مگر وہ ٹیکسی والا کچھ شریف معلوم ہوتا تھا۔ پچاس پیاسٹر پر راضی ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ فی کلومیٹر ٹیکسی کا کرایہ بارہ پیاسٹر ہے اور اس حساب سے تحریر اسکوائر کا کرایہ چوبیس پیاسٹر بنے گا۔ مگر میں یہ بھی جانتی تھی کہ کرایہ مقرر ہونے کے باوجود ٹیکسی والے میٹر سے نہیں چلتے اور ہر جگہ کے لئے کرایہ طے کرتے ہیں۔ بہر حال میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد مجھے پہلی بار اطمینان و سکون اور آزادی کا احساس ہوا۔ نہ معلوم کتنے عرصے بعد میں نے اُن لوگوں کی قید سے رہائی حاصل کی ہے! یہ احساس میرے لئے انتہائی سکون بخش تھا۔ مجھے پاکستان سے اغوا کر کے یہاں مصر کے شہر قاہرہ لایا گیا تھا اور میں اس طویل عرصے میں اُن لوگوں کی قیدی ہی بنی رہی تھی۔ اُنہوں نے مجھے فرار کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب بھی اگر میرے ذہن میں غیر معمولی قوتیں پیدا نہ ہو جاتیں تو مجھے فرار کا موقع نہ ملتا۔

تحریر اسکوائر کا رُخ میں نے بہ وجوہ کیا تھا۔ وہاں میرے کئی مسئلے بیک وقت حل ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد قیام کا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ بھی وہاں جا کر حل ہو سکتا تھا۔ میں نے فی الحال ہلٹن ہوٹل میں قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ اس فائیو اسٹار ہوٹل کے بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور ساری رات کھلے رہتے تھے۔ میں نے اسی لئے ہلٹن ہوٹل کے سامنے پہنچ کر ہی ٹیکسی رُکوائی اور کرایہ ادا کر کے اُتر گئی۔

پہلے میں نے چھوٹا سا ایک اٹیچی کیس خریدا، پھر ریڈی میڈ کپڑے لئے، اس کے بعد ایک سٹور سے میک اَپ کا ضروری سامان خرید لیا۔ ہرچند کہ ریڈی میڈ لباس مغربی ہی تھا، مگر فی الحال گزارا کیا جا سکتا تھا۔ کپڑے اٹیچی کیس میں رکھ کر میں ہوٹل کے اندر گھس گئی۔ میں نے وہاں صرف ایک شب کے لئے کمرا بُک کرایا تھا جس کے لئے مجھے پچاس گنی ادا کرنا پڑے تھے۔ وہاں میں نے اپنا صحیح نام بھی نہیں لکھوایا تھا اور نہ صحیح پتہ! وہاں مجھے بمشکل ایک گھنٹہ گزارنا تھا اور پھر خاموشی کے ساتھ اُس ہوٹل کو خیر باد کہہ دینا تھا۔ پچیس گنی کے دو نوٹ میں نے کاؤنٹر کلرک کے حوالے کئے اور ہوٹل کے رجسٹر پر دستخط کر کے اپنے کمرے کی چابی تھامے لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ہوٹل کے پورٹر نے میرا اٹیچی کیس اُٹھا رکھا تھا۔ میں پہلے ہی سب کچھ سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے عجوزہ سے تحریر اسکوائر آتے ہوئے!

میرے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ میں اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کے ہاں ٹھہرتی، مگر موجودہ حالات میں مجھے یہ مناسب معلوم نہیں ہوا۔ میں اپنی وجہ سے اُسے کسی مصیبت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یوں بھی اُس کا چہرہ، قد اور رنگ رُوپ مجھ سے بہت ملتا جلتا تھا۔ کبھی کبھار تو سرسری نظر سے دیکھنے والوں کو مجھ پر اُس کا اور اُس پر میرا گمان ہو جاتا تھا۔ اگر میں کسی کاروباری معاملے میں وہاں آئی ہوتی یا میرا مقصد محض تفریح کرنا ہوتا تو یقیناً ذکیہ ہی کے یہاں ٹھہرنا پسند کرتی۔

ہوٹل کے اُس کمرے میں پہنچتے ہی میں نے وقت ضائع نہیں کیا اور اپنے چہرے پر میک اَپ کرنے لگی۔

اس میں مجھے تقریباً پون گھنٹہ لگا۔ میں نے مطمئن انداز میں ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر آخری نظر ڈالی اور پھر اٹیچی کیس سے نیا لباس نکال کر پہننے لگی۔ لباس تبدیل کر کے میں نے اُتارے ہوئے کپڑے بھی وہیں پڑے ہوئے اُسی دن کے ایک اخبار الجمہوریہ میں لپیٹے اور اُنہیں اٹیچی کیس میں رکھ دیا۔

اس کے بعد میں زیادہ دیر وہاں نہیں رُکی۔ میں نے اٹیچی کیس اُٹھایا اور کمرے سے نکل کر عقبی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ہلٹن ہوٹل سے نکلنے میں مجھے کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ اب میں خود کو نئے میک اَپ میں قدرے محفوظ تصور کر رہی تھی۔ جینز، جیکٹ اور اس نئے میک اپ میں مجھے عذرا خان کی حیثیت سے پہچانا جانا ممکن نہیں رہا تھا۔

ہلٹن ہوٹل کے مقابل ہی قلوپطرہ ہوٹل کی بارہ منزلہ عمارت تھی۔ میں ایک لمبا چکر کاٹ کر اُس ہوٹل کے سامنے پہنچ گئی۔ قلوپطرہ ہوٹل کو اوسط درجے کے اچھے، مناسب اور کم خرچ ہوٹلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا کرایہ تیس گنی یومیہ تھا۔ یہاں میں نے تیسری منزل پر ایک کمرہ تین دن کے لئے کرائے پر حاصل کیا۔ یہاں بھی میں نے اصل نام پتہ نہیں لکھوایا تھا۔ اندازے کے مطابق قاہرہ سے روانگی میں مجھے تین دن سے زیادہ نہ لگتے۔

ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر بیرونی سمت میں نے ایک فوٹو گرافر کی دُکان دیکھ لی تھی۔ جعلی پاسپورٹ کے لئے یقیناً میری تصویر کی بھی ضرورت ہوتی، اس کا مجھے پہلے ہی خیال تھا۔ میں نے نیچے جا کر اُسی میک اَپ میں تصویر کھنچوائی۔ میرا ارادہ اُسی میک اپ میں سفر کرنے کا تھا۔ فوٹو گرافر کو میں نے ہدایت کر دی تھی کہ کل صبح دس بجے تک تصویریں مل جانا چاہئیں۔ اُس نے کچھ زیادہ ر لے کر یہ وعدہ کر لیا تھا۔ صبح دس بجے کے بعد میں، جیزا جا کر اُس شخص حسان سے مل لینا چاہتی تھی جس کا پتہ مجھے شیپرڈ نے بتایا تھا۔

کمرے میں آ کر میں نے رُوم سروس کو فون کیا اور اپنے لئے کھانا منگوایا۔ جانے کب سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ مگر اس کے باوجود مجھے زیادہ بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ غالباً اس کی وجہ وہی تجربہ تھا جو ڈاکٹر رچرڈ نے مجھ پر کیا تھا۔ شاید اس تجربے سے میری قوتِ برداشت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

میں نے کھانے کے انتظار میں قریبی میز پر رکھے ہوئے اُس دن کے اخبارات میں سے ڈیلی اجپشین میل اُٹھا لیا اور اُس کا مطالعہ کرنے لگی۔ اخبار کے پہلے ہی صفحے پر میرے ملک کے نوجوان وزیر خارجہ کی تصویر چھپی ہوئی تھی جو اُن دنوں مصر کے دورے پر تھے۔

وزیر خارجہ کی تصویر پر نظر پڑتے ہی مجھے وہ مناظر یاد آ گئے جو مستقبل میں جھانکتے ہوئے تجربے کے دوران میں میری نگاہ سے گزرے تھے۔ تصویر دیکھتے ہوئے میرے منہ سے آہ نکل گئی۔ اُس وقت کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ یہی شخص کبھی پاکستان کا سربراہ بن جائے گا اور پھر اسی شخص کو پھانسی دے دی جائے گی۔

''آہ اے خوش نصیب اور اے بدنصیب شخص!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

یقیناً وہ شخص دنیا کا خوش نصیب انسان بھی تھا اور بدنصیب انسان بھی! میں انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ!'' میں نے باآواز بلند عربی میں کہا۔

توقع کے مطابق بیرا کھانا لے آیا تھا۔ اُس نے کھانا میز پر لگایا اور پھر چلا گیا۔ میں اخبار ایک طرف رکھ کر ہاتھ دھونے کے لئے باتھ رُوم کی طرف بڑھ گئی۔

دیگر عرب ممالک کی طرح مصری کھانے بھی پھیکے ہوتے ہیں۔ روٹی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک شامی، دوسری بلدی۔ بلدی میں سے بھوسی نہیں نکالی جاتی۔ شیش کباب اور کوفتہ یہاں کی مرغوب غذاؤں میں سے ہیں۔ یہ دونوں ہی سیخوں پر نیم کچے بھونے جاتے ہیں۔ شیش کباب دراصل تکّے کو کہا جاتا ہے۔ کوفتہ، سیخ کے کبابوں کو کہتے ہیں۔ میں نے اس وقت شامی اور شیش کباب ہی منگوائے تھے۔ مجھے بھی یہ غذا پسند تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے بیرے کو بلوایا تا کہ وہ برتن لے جائے۔ اب میں آرام کرنا چاہتی تھی۔ ہرچند کہ تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی، لیکن میرے نزدیک آرام ضروری تھا۔

وہ رات اطمینان و سکون سے گزر گئی۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں دس بجے تک ہوٹل سے نکل گئی۔ فوٹو گرافر سے پاسپورٹ سائز کی تصویریں لے کر میں نے اپنے پرس میں رکھیں اور پھر جیزا روانہ ہو گئی۔ وہ علاقہ ایسا تھا کہ مجھے خالی ٹیکسی کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔

دریائے نیل، شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ مختلف مقامات پر تقریباً پندرہ سولہ پُل بنے ہوئے ہیں جو جیزا اور قاہرہ کو آپس میں ملاتے ہیں۔ اُنہی پلوں میں سے ایک کو عبور کر کے میری ٹیکسی جیزا کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ مجھے زمالک پہنچنا تھا اور شیپرڈ کا دیا ہوا پتہ میرے پاس موجود تھا۔

زمالک پہنچ کر مجھے اُس شخص حسان کا گھر تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا اُس کا گھر قدیم طرزِ تعمیر کا نمونہ تھا۔ میں نے حسان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ایک حبشی ملازم نے مجھے بڑی سی نشست گاہ میں لے جا کر بٹھا دیا۔ وہاں عجیب سا غیر فطری سناٹا تھا۔ میں ایک پرانی طرز کے صوفے پر بیٹھی ہوئی حسان کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ ممکن ہے میری جگہ کوئی اور تنہا لڑکی یا عورت ہوتی تو اس عمارت ہی میں داخل ہونے کی ہمت نہ کرتی یا آ ہی جاتی تو زیادہ دیر یہاں نہ بیٹھ پاتی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں میرے سوا کوئی اور موجود نہ ہو۔ معاً قدموں کی بھاری چاپ اُبھری تو میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد ایک پستہ قد مگر انتہائی فربہ شخص نشست گاہ میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر اس طرح محسوس ہوتا تھا کہ ایک بڑی سی گیند لڑھکتی ہوئی آ رہی ہے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں اندر گوشت میں دھنسی ہوئی تھیں، رُخسار بے حد پھولے ہوئے تھے، گردن نہ ہونے کے برابر تھی اور سر پر ایک بال بھی نہ تھا۔

میں اُسے دیکھ کر احتراماً و اخلاقاً کھڑی ہو گئی۔

''مجھے حسان کہتے ہیں۔'' اُس شخص نے قریب آتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ الفاظ اُس نے انگریزی میں ادا کئے تھے۔

''آپ ہی سے ملنا تھا مجھے۔'' میں نے اُس کی بات کے جواب میں کہا۔ میں نے بھی دانستہ انگریزی ہی کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ ''مجھے آپ کے پاس مسٹر شیپرڈ نے بھیجا ہے۔ آپ جانتے ہیں نا اُنہیں؟''

''شیپرڈ......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''جرمن...... وہ مسٹر شیپرڈ، جرمن باشندے ہیں؟''

''جی...... جی ہاں وہی۔'' میں جلدی سے بولی۔

''تو بولیں کیا کام ہے مجھ سے؟'' اُس نے سوال کیا۔

میں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

''مگر میں تو یہ کام چھوڑ چکا ہوں اب۔'' حسان بولا۔ ''میں تو آج کل ممیوں کا کاروبار کر رہا ہوں۔ مغربی ممالک میں آج کل مصری ممیوں کی بہت مانگ ہے۔ اسی عمارت کے ایک حصے میں ممی خانہ بنا لیا ہے میں نے۔''

حسان کی بات سن کر مجھے احساس ہوا کہ وہاں اس قدر وحشت اور سناٹا سا کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ اس عمارت میں بہرحال مُردوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ چند لمحے کو میرے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

''میں اپنے ایک شناسا کا پتہ دے سکتا ہوں آپ کو۔'' مجھے خاموش دیکھ کر حسان بول اُٹھا۔ ''وہ کبھی میرا بزنس پارٹنر تھا۔ وہ عیسائی ہے، جیمس نام ہے اُس کا۔''

''بہت ممنون ہوں گی میں آپ کی۔ مجھے اُن کا پتہ دے دیں۔'' میں نے فوراً کہا۔ دراصل میں جلد از جلد اس عمارت سے نکل جانا چاہتی تھی۔

حسان نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اُس کی پشت پر جیمس کا پتہ لکھ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میرا کارڈ دیکھ کر یقیناً وہ آپ سے رعایت برتے گا۔''

''شکریہ!'' یہ کہتے ہوئے میں نے اُس سے کارڈ لے کر اپنے پرس میں رکھ لیا، پھر کہا۔ ''اب میں اجازت چاہوں گی۔''

''کچھ پئیں گی نہیں؟'' وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

''جی نہیں شکریہ!'' یہ کہہ کر میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

حسان مجھے عمارت کے گیٹ تک چھوڑنے آیا۔ اُس عمارت سے نکل کر مجھے محسوس ہوا جیسے میرے اعصاب پر جو بوجھ تھا، ختم ہو چکا ہے۔

حسان سے کارڈ لے کر اپنے پرس میں رکھتے ہوئے اُس پر میں نے ایک نظر ڈال لی تھی۔ وہ رَم سیس اسکوائر کا پتہ تھا۔ میں ٹیکسی کر کے فوراً ہی رَم سیس اسکوائر کے لئے روانہ ہو گئی۔

جدید قاہرہ کا یہ علاقہ بھی اعلیٰ درجے کے علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ میں نے رَم سیس چوک پہنچ کر ٹیکسی چھوڑ دی۔ حسان نے اسی چوک کی ایک عمارت کا پتہ دیا تھا جہاں مجھے جیمس مل سکتا تھا۔ اس چوک میں چاروں جانب بلند عمارتیں ہیں اور نیچے دُکانیں۔ چوک کے بیچوں بیچ رَم سیس کا اسّی ٹن وزنی مجسمہ نصب ہے۔ یہ مجسمہ مصر ہی کے کسی دُور دراز علاقے سے یہاں لا کر نصب کیا گیا ہے۔ اس مجسمے کے قدموں سے فوارہ نکلتا ہے۔ اس کے بارے میں دو روایتیں مشہور ہیں۔ یا تو یہ مجسمہ فرعونِ موسیٰ ؑ کے باپ کا ہے یا پھر اُس کے بیٹے کا۔ میں اُس عظیم مجسمے پر نگاہ ڈالتی ہوئی ایک عمارت کی طرف بڑھ گئی۔ مطلوبہ عمارت کی تیسری منزل کے ایک فلیٹ میں وہ شخص جیمس رہتا تھا۔ میں لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچی اور وہ فلیٹ نمبر تلاش کر کے کال بیل پر اُنگلی رکھ دی۔

ذرا دیر بعد ہی دروازہ کھل گیا اور ایک نوجوان باہر نکلا۔ اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

''مسٹر جیمس سے۔'' میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا۔ کیونکہ اُس نوجوان نے بھی مجھے غیر ملکی سمجھ کر انگریزی میں سوال کیا تھا۔ مزید وضاحت کی خاطر میں بولی۔ ''مجھے مسٹر حسان نے بھیجا ہے۔''

وہ نوجوان اندر چلا گیا۔ پھر اُس کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اُس نے مجھے اندر آنے کو کہا اور پھر ایک ڈرائنگ رُوم میں لے کر آ گیا۔ ''مسٹر جیمس ابھی آتے ہیں، تشریف رکھیں!'' نوجوان نے مجھ سے کہا اور ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں صوفے پر بیٹھ گئی اور وہ نوجوان وہاں سے چلا گیا۔

جیمس جلد ہی آ گیا۔ مجھے زیادہ دیر اُس کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا، مگر خاصا باوقار۔ خلافِ توقع اُس نے حسان کا وزیٹنگ کارڈ دیکھ کر زیادہ گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا اور مجھ سے آمد کا مقصد دریافت کرنے لگا۔

میں نے اُسے بتایا کہ کیا چاہتی ہوں تو وہ خالص کاروباری لہجے میں کہنے لگا۔ ''پانچ سو گنی خرچ ہوں گے آپ کے۔ پاسپورٹ میں آپ کو فراہم کر دُوں گا۔''

''ٹھہریں، میں آتا ہوں ابھی۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور اندر چلا گیا۔

پھر جب وہ لوٹا تو اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا بریف کیس تھا۔ اُس نے درمیانی میز پر بریف کیس رکھ کر کھولا۔ میں نے دیکھا کہ بریف کیس میں مختلف ملکوں کے پاسپورٹ موجود تھے۔ جیمس اُنہیں کھول کھول کر دیکھتا رہا اور اُن میں سے تین چار پاسپورٹ ایک طرف نکال کر رکھ لئے۔ اُنہی میں سے ایک پاسپورٹ دیکھتے ہوئے وہ چونکا بھی تھا۔ وہ پاسپورٹ بھارت کا تھا۔

''اپنی تصویریں لائی ہیں آپ؟'' اُس نے پوچھا۔

''جی ہاں لائی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

جیمس نے وہی بھارتی پاسپورٹ اُٹھا لیا اور اُسے کھول کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''آپ کی صورت بہت حد تک اس ہندوستانی عورت سے ملتی جلتی ہے۔ یہ دیکھیں!''

میں نے اُس سے وہ پاسپورٹ لے لیا۔ جیمس واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اُس عورت کا چہرہ اُس میک اَپ سے بے حد ملتا جلتا تھا جو میں نے اپنے چہرے پر کیا تھا۔ نمایاں فرق صرف نظر کے چشمے کا تھا۔ میں نے اُس عورت کا نام پڑھا۔ اُس کا نام مسز کانتا جوشی تھا اور وہ بھارت کے ایک شہر دہلی کی رہنے والی تھی۔

''مسٹر جیمس! آپ غالباً اس تصویر کی جگہ نہایت صفائی کے ساتھ میری تصویر چسپاں کر دیں گے!'' میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

''جی ہاں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔'' میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''مجھ میں اور اس کی صورت میں خاصی مماثلت ہے اور بظاہر جو فرق نظر آتا ہے، اُسے آسانی سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ اس عورت کے بقیہ کوائف سے مجھے آگاہ کر دیں۔''

"یہ ہیں اس کے کاغذات۔" جیمس نے پاسپورٹوں کے قریب رکھے ہوئے چند کاغذات اُٹھا لئے۔

"آپ خود انہیں ملاحظہ فرمالیں۔"

میں وہ کاغذات لے کر دیکھنے لگی۔ اُن کاغذات کی رُو سے مسز کانتا جوشی کا تعلق ہندوستان کے محکمہ آثارِ قدیمہ سے تھا اور وہ اسی سلسلے میں مصر آئی تھی۔ اس کا پاسپورٹ انٹرنیشنل تھا اور اس میں پاکستان کا نام بھی درج تھا۔ یہ اتفاق تھا یا پھر میری خوش قسمتی کہ اُس کے پاس پاکستان کا ویزا بھی تھا۔ پاکستان میں وہ موئن جودڑو وغیرہ دیکھنا چاہتی ہوگی۔ بہرحال میں نے جیمس سے اُس کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات لے لئے اور اُسے پانچ سوگنی کے نوٹ تھما دیئے۔

میرے نزدیک اُس پاسپورٹ پر سے مسز کانتا جوشی کی تصویر اُکھاڑ کر نئی تصویر لگانا ضروری نہیں تھا۔ اگر میں پاسپورٹ پر لگی ہوئی تصویر کے مطابق اپنی شکل میں معمولی سی تبدیلی کر لیتی تو یہ مسئلہ حل ہوسکتا تھا۔ اس طرح وہ پاسپورٹ مشتبہ بھی نہ ہوتا۔

رَم سیس اسکوائر سے لوٹ کر میں تحریر اسکوائر آ گئی۔ وہیں سے میں نے پاسپورٹ پر لگی ہوئی تصویر کے مطابق چشمہ خریدا اور دو ساڑھیاں بھی۔ پھر میں اپنے ہوٹل میں آ گئی۔ اس وقت تک دوپہر ہو چکی تھی۔ اپنے کمرے ہی میں دوپہر کا کھانا کھا کر میں نے ایئر پورٹ فون کر کے پاکستان کے لئے روانہ ہونے والی پروازوں کے بارے میں معلوم کیا۔

کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کے بعد میں پھر ہوٹل سے نکل آئی۔ قصر النیل کا علاقہ تحریر اسکوائر سے ملا ہوا ہے۔ وہیں پی آئی اے کا دفتر ہے۔ میں پیدل ہی بارونق سڑکوں سے گزرتی ہوئی پی آئی اے کے دفتر پہنچ گئی۔ اُسی دن شام کی ایک فلائٹ سے میں نے کراچی کے لئے ایک سیٹ بُک کرا لی۔ اب میں جلد از جلد قاہرہ سے نکل جانا چاہتی تھی۔

شام کو ہوٹل سے روانہ ہوتے وقت میں نے اپنے چہرے میں وہ معمولی سی تبدیلیاں کر لی تھیں جو پاسپورٹ پر لگی ہوئی تصویر کے مطابق تھیں، ہاں چشمہ نہیں لگایا تھا۔ یہ تبدیلیاں واقعی اتنی معمولی تھیں کہ کسی نے محسوس نہ کیں۔

ایئر پورٹ جانے کے لئے میں نے لیموزین کا انتخاب کیا۔ یہ سرکاری ٹیکسیاں ہوتی ہیں جو ایئر پورٹ سے شہر اور شہر سے ایئر پورٹ کے لئے چلتی ہیں۔

قاہرہ ایئر پورٹ پر پہنچ کر میں پوری طرح مطمئن تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب کچھ ہی دیر بعد قاہرہ سے کراچی کے لئے روانہ ہو جاؤں گی۔ ڈاکٹر رچرڈ یہی سمجھتا رہے گا کہ میں ابھی قاہرہ ہی میں ہوں۔ اُس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آئے گی کہ میں اتنی جلدی اُس کے پھیلائے ہوئے جال سے نکل سکتی ہوں۔ انہی دل خوش کن خیالات میں کھوئی ہوئی میں امیگریشن کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک کسی نے عقب سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں چلتے چلتے چونک کر ایک دم رُک گئی اور مُڑ کر دیکھا۔

میرے شانے پر ہاتھ رکھنے والا ایک اجنبی شخص تھا۔ اُس کی عمر چالیس سال کے قریب ہوگی۔ اپنے لباس اور چہرے کے نقوش سے وہ ہندوستانی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ مدھم آواز میں بول

اُٹھا۔ "کانتا! تم نے ایئر پورٹ کا رُخ کر کے انتہائی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔"

میں اُسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی بے وقوف ہو گی!" وہ سرسراتی ہوئی سی آواز میں بولا، مگر لہجہ اب بھی دھیما تھا، جیسے وہ چاہتا ہو کہ کوئی اس کے اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکے۔ مجھے خاموش اور حیرت زدہ پا کر اُس نے مزید کہا۔ "یہاں مجھے دیکھ کر یقیناً تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی! مگر...... خیر چھوڑو! کیا تم یہ سمجھ رہی تھیں کہ یوں آسانی کے ساتھ یہاں سے فرار ہو جاؤ گی! تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ قاہرہ کی پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ میرے ایک اشارے پر تمہیں اسی وقت حراست میں لیا جا سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ میرے ساتھ فوراً واپس چلو!"

معلوم نہیں وہ شخص کون تھا اور مسز کانتا جوشی سے اس کا کیا تعلق تھا! لیکن میں اتنا ضرور سمجھ گئی تھی کہ وہ جو بھی تھا، کانتا کو اچھی طرح جانتا تھا۔

مجھے قطعی اُمید نہیں تھی کہ عین وقت پر اس طرح کا کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔

"سوچ کیا رہی ہو؟ چلو میرے ساتھ۔" وہ شخص پھر بول اُٹھا اور اسی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔

"ایئر پورٹ پولیس کے پاس بھی تمہاری تصویر موجود ہے۔ یقین کرو کانتا! تمہیں یہاں گرفتار کر لیا جائے گا۔ تم میری بات سمجھتی کیوں نہیں ہو!" یہ کہتے ہوئے اُس اجنبی کے لہجے میں جھنجھلاہٹ بھی شامل ہو گئی۔

میری سمجھ میں اس وقت کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے! اُس شخص نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اُس کا کہنا نہ مانا تو وہ مجھے گرفتار کرا دے گا۔ مجھے اُس کی دھمکی محض دھمکی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ نہ معلوم اُس عورت کانتا نے ایسا کیا جرم کیا تھا کہ قاہرہ کی پولیس اُس کی تلاش میں تھی۔ میں ناحق اپنے چہرے پر اُس کا میک اَپ کر کے مصیبت میں پھنس گئی تھی۔

ooo

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ جو کچھ ہوا ہے میرے حق میں بہتر ہی ہوا ہے۔ اگر وہ اجنبی میری راہ میں حائل نہ ہو جاتا تو شاید ایئر پورٹ پولیس مجھے کانتا جوشی سمجھ کر حراست میں لے لیتی۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے ایسا ممکن تھا۔ یہ بھی میرے امکان میں تھا کہ اُس شخص سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں اپنی ذہنی قوتیں بروئے کار لے آتی، مگر اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ میں اس کے باوجود متوقع گرفتاری سے نہ بچ سکتی۔ صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ میں خاموشی سے اُس اجنبی کے ساتھ چل دیتی، بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا۔ فی الحال تو مجھے ایک ایسی عورت کے میک اَپ سے جان چھڑانا تھی جو کسی سلسلے میں قاہرہ پولیس کو مطلوب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں بغیر کچھ کہے سنے اپنا سوٹ کیس اُٹھائے اُس اجنبی کے ساتھ ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر نکل آئی۔

باہر آتے ہی اُس اجنبی نے ایک خالی لیموزین کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اجنبی کے انداز واطوار سے بے چینی مترشح تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جلد از جلد مجھے ساتھ لے کر وہاں سے نکل جانا چاہتا ہو۔ جلد ہی لیموزین قریب آ کر رُک گئی۔ ڈرائیور نے اُتر کر سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے لیا، پھر اُسے ڈگی کھول کر رکھنے لگا۔ اس دوران میں وہ اجنبی، لیموزین کی پچھلی نشست کا دروازہ کھول چکا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اُس نے مجھے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گئی تو وہ بھی آ بیٹھا اور دروازہ بند کر لیا۔

”راستے میں کوئی بات نہ کرنا!“ اجنبی نے مدھم لہجے میں مجھ سے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خود میں بھی یہی چاہتی تھی تا کہ راستے میں اُس کا ذہن پڑھ کر حقیقت حال جان سکوں۔

ڈرائیور ڈگی بند کر کے اپنی سیٹ پر آ بیٹھا تو اجنبی نے اُسے مخاطب کیا۔ ”شارع شریف۔“

یہ سن کر ڈرائیور نے لیموزین اسٹارٹ کر دی۔ شارع شریف، تحریر اسکوائر سے بمشکل دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ یہ علاقہ بھی جدید قاہرہ کے بارونق علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ غالباً وہ اجنبی وہیں کسی اوسط درجے کے ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔

لیموزین نے ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ میں نے اُس شخص سے ذہنی رابطہ پیدا کر لیا اور اُس کا ذہن پڑھنے لگی...... اُس اجنبی کا نام دھرم وِیر تھا۔ ہندوستان سے جو چار رُکنی وفد آیا تھا، اُس میں دھرم وِیر اور کانتا جوشی دونوں شامل تھے۔ وفد کے بقیہ دو افراد میں سے ایک کانتا جوشی کا شوہر اشوک جوشی تھا اور دوسرا دھنپت رائے کانتا اور اشوک جوشی، دونوں میاں بیوی میں نہیں بنتی تھی۔ اشوک جوشی ہمیشہ کانتا پر حکم چلاتا رہتا تھا اور اُس پر شبہ بھی کرتا تھا کہ وہ اُس کی وفادار نہیں۔ کانتا خوبصورت تھی اور اشوک اُس کے مقابل واجبی شکل

وصورت کا تھا۔ دھرم وِیر اور دھنپت رائے دونوں کو کانتا پسند تھی۔ کانتا دانستہ اپنے شوہر کو جلانے کے لئے اُن دونوں کی طرف اپنا جھکاؤ ظاہر کرتی تھی۔ حالانکہ حقیقتاً وہ ابھی تک اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب نہیں ہوئی تھی۔ میاں بیوی کا یہ اختلاف ایک دن اس حد تک بڑھ جائے گا کہ کانتا اپنے شوہر کو قتل کر دے گی، دھرم وِیر کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ ایک روز وہ دونوں میاں بیوی دریائے نیل کی سیر کو گئے اور پھر ان میں سے کوئی نہیں لوٹا۔ پولیس کو دریا میں ایک کشتی ملی جس میں اشوک جوشی کی لاش تھی۔ کشتی کے پتوار سے اُس کے سر پر شدید ضربیں لگائی گئی تھیں۔ اشوک جوشی پتلا دُبلا کمزور سا آدمی تھا اس لئے یہ شدید ضربیں برداشت نہ کر سکا۔ اطلاعات کے مطابق اُنہوں نے وہ کشتی ایک بوٹنگ کلب سے کرائے پر حاصل کی تھی۔ جب اُنہوں نے کشتی کرائے پر لی تھی تو اُن کے ساتھ کوئی تیسرا شخص نہیں تھا۔ اشوک جوشی کی لاش ملنے کے بعد پولیس نے کانتا کو بہت تلاش کیا مگر وہ نہیں ملی۔ دھنپت رائے اور دھرم وِیر کے بیانات لئے گئے۔ اُن دونوں ہی نے اپنے بیانات میں میاں بیوی کے شدید اختلافات کا اظہار کیا۔ ان بیانات اور کانتا جوشی کی پراسرار گمشدگی کے سبب قاہرہ پولیس نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ کانتا جوشی اپنے شوہر کو قتل کر کے رُوپوش ہو گئی ہے۔ کشتی کے جس پتوار سے اشوک جوشی کے سر پر ضربیں لگائی گئی تھیں، اُس پر کسی کی اُنگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔ پولیس کا خیال تھا کہ کانتا ہی نے پتوار سے اپنی اُنگلیوں کے نشانات صاف کر دیئے ہوں گے۔

میری جگہ اگر کسی اور شخص کے علم میں یہ واقعات آتے تو شاید وہ مزید کچھ جاننے کی جستجو نہیں کرتا۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا جیسا کہ دھرم وِیر کے علم میں تھا تو پھر کانتا جوشی کا پاسپورٹ اور بقیہ کاغذات ایک ایسے شخص کے پاس کس طرح پہنچ گئے جو جعلی پاسپورٹ کا دھندا کرتا تھا؟ ظاہر ہے کہ خود کانتا جوشی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ پھر یہ کام کس نے کیا؟ دھرم وِیر کا ذہن میں پڑھ چکی تھی۔ اشوک جوشی کے قتل میں وہ ملوث نہیں تھا۔ اب صرف دھنپت رائے رہ جاتا تھا۔ پولیس نے اشوک جوشی کی لاش ملنے کے بعد دونوں میاں بیوی کے جس سامان کو سِیل کیا تھا، اُن میں کانتا جوشی کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ نہیں تھا۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کانتا نے پہلے سے اپنے شوہر کے قتل کا منصوبہ بنا رکھا تھا کہ اُسے قتل کر کے فرار ہو جائے۔

دھرم وِیر کا ذہن پڑھ کر ہی مجھے چند اور باتیں بھی معلوم ہوئی تھیں۔ ہندوستان سے آنے والا چار رُکنی وفد قلوپطرہ ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ ہوٹل کے ایک کمرے میں کانتا اور اشوک ٹھہرے تھے اور دوسرے ایک کمرے میں دھرم وِیر اور دھنپت رائے۔ دھنپت رائے اور دھرم وِیر ابھی تک اُسی ہوٹل میں مقیم تھے۔ پولیس نے اُن دونوں پر پابندی لگا دی تھی کہ فی الحال وہ قاہرہ سے کہیں نہیں جا سکتے۔ اس پر اُن دونوں نے احتجاج بھی کیا تھا، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ اس واقعے کو ابھی پندرہ بیس دن ہی ہوئے تھے۔ پولیس اب تک کانتا جوشی کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔ دھرم وِیر کے دل میں کانتا کے لئے کیونکہ نرم گوشہ تھا اس لئے وہ خود بھی اُس کی تلاش میں تھا۔ آج شام اُس نے مجھے قلوپطرہ ہوٹل سے نکلتے دیکھا تو میرے پیچھے لگ گیا۔ اُس نے ایک ٹیکسی میں ایئر پورٹ تک میرا تعاقب کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں، پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں اور کسی طرح وہ مجھے قاہرہ سے نکال لے جائے۔ کس طرح ایسا ممکن تھا؟ یہ ابھی اُس نے نہیں سوچا تھا۔ اس سلسلے میں وہ دھنپت رائے سے بھی مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کی دانست میں دھنپت رائے بھی کانتا کے ساتھ مخلص تھا۔

چارزکنی وفد کیونکہ قلوپطرہ ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور وہاں کی انتظامیہ کے علم میں تمام واقعات تھے اس لئے دھرم ویر مجھے اُس ہوٹل کی بجائے فی الحال شارع شریف کے ایک ہوٹل میں لے جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ مجھے قلوپطرہ ہوٹل لے جاتا تو وہاں کی انتظامیہ کے افراد مجھے پہچان لیتے اور میں گویا پکڑی جاتی۔

لیموزین تیز رفتاری سے فاصلے طے کرتی رہی۔ مجھے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ معلوم کر چکی تھی، میرا ذہن یہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ کانتا ہی نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے اور فرار ہو گئی ہے۔ اس کا سبب وہ کاغذات اور پاسپورٹ تھا جو اس وقت بھی میرے پرس میں موجود تھا۔

شارع شریف پہنچ کر دھرم ویر نے لیموزین کی رہنمائی کی اور پھر کچھ دیر بعد اُسے ایک نو منزلہ بلڈنگ کے سامنے روک لیا۔ اس بلڈنگ کے ساتویں اور آٹھویں فلور پر تیسرے درجے کا ایک ہوٹل تھا۔ اُس ہوٹل کا نام ''ہوٹل مونٹانا'' تھا۔ دھرم ویر نے لیموزین کا کرایہ ادا کیا جو چار گنی تھا۔ ایئرپورٹ سے شہر کے کسی بھی حصے میں آنے جانے کے لئے ان سرکاری ٹیکسیوں کا یہی کرایہ مقرر تھا۔ میرا سوٹ کیس اب دھرم ویر نے اُٹھا لیا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لئے اُس عمارت میں داخل ہوا۔ اندر پہنچ کر ہم دونوں ایک خودکار لفٹ میں سوار ہو گئے۔ لفٹ میں سوار ہوتے ہی دھرم ویر نے ساتویں منزل کا بٹن دبا دیا۔ ہم دونوں کے سوا اس وقت لفٹ میں کوئی اور نہیں تھا۔

''سنو کانتا! یہاں ہم دونوں اپنا اصل نام ظاہر نہیں کریں گے۔'' دھرم ویر نے گویا مجھے ہدایت دی۔ ''یوں سمجھو کہ میرا نام دینش کمار ہے اور تم میری مسز ہو، مسز ساوتری دینش! سمجھ گئیں نا! پولیس سے بچنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے اصل نام ظاہر نہ کریں۔''

اب تک میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا اس لئے خاموش ہی رہی۔ ہاں اثبات میں سر ضرور ہلا دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری آواز سن کر دھرم ویر کسی قسم کے شک و شبہے میں مبتلا ہو۔

''تمہیں چھوڑ کر میں، دھنپت کو بھی یہیں لے آؤں گا۔ پھر ہم دونوں تمہاری بپتا سنیں گے اور تم جس مشکل میں گرفتار ہو، اُس کا کوئی حل تلاش کریں گے۔ دھرم ویر مزید بولا۔

اسی دوران میں لفٹ ساتویں منزل پر رُک گئی اور دھرم ویر کے ساتھ میں بھی لفٹ سے باہر آ گئی۔ ہوٹل مونٹانا میں کمرا حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہ بنا۔ پانچ گنی یومیہ پر کمرا مل گیا تھا۔ دھرم ویر مجھے ساتویں منزل ہی کے ایک کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔

میرے لئے یہ کوئی مشکل نہیں تھا کہ اس عرصے میں موقع سے فائدہ اُٹھا کر وہاں سے فرار ہو جاتی، مگر اب میرے دل میں دھنپت رائے کو دیکھنے اور اُس معاملے کی تہ تک پہنچنے کا تجسس پیدا ہو چکا تھا۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ دھنپت رائے کا ذہن پڑھ کر مجھے کوئی ایسی بات معلوم ہو جاتی جس سے حقیقت تک پہنچنے میں مدد ملتی۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دھرم ویر اپنے ساتھی دھنپت رائے کو ساتھ لئے لوٹ آیا۔

کمرے کا دروازہ میں نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ دروازے پر دستک سن کر میں نے پوچھا تھا، کون ہے؟ اور جب جواب میں دھرم ویر کی آواز سنی تھی تو دروازہ کھول دیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ دونوں اندر آ گئے تھے

اور میں نے دوبارہ دروازہ بند کر دیا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کر لی تھی کہ دھنپت رائے مجھ پر نظر پڑتے ہی اُچھل پڑا تھا، یوں جیسے اُس نے کوئی ناقابلِ یقین منظر دیکھ لیا ہو۔ دروازہ بند کر کے میں اُس کی طرف پلٹی تو وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ دھرم ویر کچھ کہتا، اُس کا ساتھی دھنپت رائے کانپتے قدموں سے میری طرف بڑھا اور میرے پیروں پر گر پڑا۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا ''کانتا!...... مجھے معاف...... معاف کر دو! میرا مقصد یہ...... یہ نہیں تھا کہ...... کہ تمہیں قتل کر دوں۔ دراصل...... میں...... میں گھبرا گیا تھا......'' اُس کے آنسو میرے پیروں پر گر رہے تھے اور وہ جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا۔

دھرم ویر تصویرِ حیرت بنا ایک طرف کھڑا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر میں دھنپت رائے کا ذہن پڑھنے لگی اور پھر جلد ہی مجھ پر ساری حقیقت منکشف ہو گئی۔

''دھنپت رائے!'' میں پہلی بار بولی۔ ''تم غلط سمجھ رہے ہو، میں کانتا جوشی نہیں ہوں۔'' پھر میں نے اُسے اپنے قدموں سے اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ میں نے اُسے مزید کہا۔ ''تمہارے ضمیر کا بوجھ اُس وقت تک ہلکا نہیں ہوگا جب تک تم خود کو قانون کے حوالے نہیں کر دو گے۔''

''ہاں تم...... ٹھیک کہتی ہو۔ میں خود کو قانون کے حوالے کر دوں گا...... مگر...... مگر تم...... تم کون ہو؟''

''یہ...... یہ سب کیا چکر ہے؟...... میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔'' دھرم ویر بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''تمہارے دوست دھنپت رائے نے اشوک جوشی اور کانتا جوشی کو قتل کر دیا ہے۔'' میں نے دھرم ویر کو بتایا۔

''مگر...... مگر کیسے؟ وہ...... وہ دونوں تو اکیلے سیر کرنے گئے تھے۔'' دھرم ویر حیرت سے بولا۔

''اُن کے ساتھ دھنپت رائے بھی تھا۔'' میں نے گویا انکشاف کیا۔ میں دھرم ویر کو جو کچھ بتا رہی تھی، وہ سب کچھ مجھے دھنپت رائے کا ذہن پڑھ کر معلوم ہوا تھا۔ ''جب انہوں نے کشتی کرائے پر حاصل کر لی تو سب سے پہلے کانتا اور دھنپت رائے کے مابین طے شدہ منصوبے کے مطابق دھنپت رائے اُن دونوں سے آ ملا۔ اس نے اشوک جوشی پر یہی ظاہر کیا تھا کہ اتفاقاً اُدھر آ نکلا تھا۔ پھر کانتا کے ایما اور اصرار پر دھنپت رائے بھی اُن دونوں کے ساتھ کشتی پر سوار ہو گیا تھا۔ اس سے اشوک جوشی کا موڈ بگڑ گیا...... پھر...... مگر میرا خیال ہے کہ یہ بقیہ کہانی تم خود اپنے دوست کی زبانی سنو تو زیادہ بہتر ہے۔ اس طرح دھنپت رائے کے سینے کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔''

دھنپت رائے نے فوراً ہی میری تجویز قبول کر لی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ''کشتی میں میری موجودگی کے سبب اشوک جوشی کا بگڑا ہوا موڈ کچھ ہی دیر میں رنگ لے آیا۔ پہلے وہ کینہ توز نظروں سے مجھے اور کانتا کو دیکھتا رہا، پھر کانتا پر الزام لگانے لگا کہ میرے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔ پہلے کبھی اُس نے میرے سامنے ایسی بات نہیں کی تھی۔ یوں بھی یہ سراسر الزام تھا۔ مجھے اسی لئے سخت غصہ آ گیا اور کانتا بھی اپنے شوہر کو برا بھلا کہنے لگی۔ جواب میں اشوک جوشی نے مجھے اور کانتا دونوں ہی کو گالیاں دیں۔ کانتا بھی نہ چوکی۔ اشوک جوشی نے اُس پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے کانتا کو مزید پٹنے سے بچانے کے لئے اشوک جوشی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اشوک جوشی، کانتا کو چھوڑ کر مجھ سے بھڑ گیا۔ اُس نے مجھے مارنے کے لئے کشتی کا ایک پتوار اُٹھالیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھے پتوار مار کر زخمی کر دیتا، میں نے اُس سے پتوار چھین لیا۔ اس کے باوجود وہ مجھ پر جھپٹ پڑا۔ وہ بھی غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا اور میں بھی۔ میں نے اسی حالت میں پتوار اُس کے سر پر دے مارا۔ وہ چکرا کر گرا۔ میں غصے میں اندھا ہو رہا تھا۔ مجھ پر ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ میں نے پے در پے پتوار سے اُس کے سر پر کئی شدید ضربیں لگائیں، اور پھر جب اُس کا جسم ساکت ہو گیا تو میرا ہاتھ رُکا۔ میں سمجھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے مگر حقیقت اس سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ اشوک جوشی میرے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ جب کانتا کو اس کا احساس ہوا کہ اس کا شوہر مر چکا ہے تو وہ جیسے حواس کھو بیٹھی۔ اُس نے میرا گریبان تھام لیا اور زور زور سے چیخنے لگی کہ تم نے میرے شوہر کو قتل کیا ہے۔ میں سب کو بتا دوں گی کہ تم قاتل ہو۔ میں نے اُسے لاکھ سمجھایا کہ قتل نادانستگی میں ہوا ہے اور اس کا ذمہ دار خود اُس کا شوہر تھا، مگر وہ نہ مانی۔ مجھے اُس پر بھی غصہ آنے لگا کیونکہ سب کچھ اُسی کی وجہ سے ہوا تھا اور وہی مجھے موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی۔ اُنہی لمحات میں مجھے حالات کی سنگین نوعیت کا احساس ہوا۔ پھر میرے ذہن میں ایک خطرناک منصوبے نے جنم لیا۔ میں نے سوچا کہ اگر قتل کی عینی شاہد کانتا کو بھی راستے سے ہٹا دیا جائے تو قتل کے الزام سے بچا جا سکتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ قتل کا الزام بھی کانتا پر ڈالا جا سکتا ہے۔ دوسرے ہی لمحے میرے اندر کا شیطان جاگ اُٹھا۔ جس عورت کی خاطر میں قاتل بن گیا تھا، اُسے یوں ہی تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا! خلافِ توقع اچانک میں نے کانتا پر حملہ کر دیا۔ اُس نے بہت مزاحمت کی مگر ظاہر ہے کہ عورت تھی، خود کو مجھ سے نہ بچا سکی۔ میں جیسے بہرا اور اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ کچھ نظر آ رہا تھا۔ شاید اسی لئے مجھے کانتا کی چیخیں سنائی نہ دیں۔ پھر میں نے اسی عالمِ وحشت میں اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ جب اُس کا جسم ساکت ہو گیا تو میں نے کشتی کے پتوار سنبھال لئے اور کشتی کو ایک کنارے پر لے آیا۔ کنارے پر اُتر کر میں نے کئی بھاری پتھر اُس کے پیروں سے باندھ دیئے۔ رسّی کشتی میں موجود تھی۔ پھر میں نے کانتا کے جسم کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ اس دوران میں، میں سوچ چکا تھا کہ مجھے مزید کیا کرنا ہے۔ کانتا کے پرس سے میں نے اُس کے ہوٹل کے کمرے کی چابی نکال کر پرس وہیں پھینک دیا، پتوار اور کشتی کے مختلف حصوں سے اپنی اُنگلیوں کے نشان صاف کئے، پھر کشتی سے اُتر گیا۔ وہاں سے کافی دُور پیدل چلنے کے بعد میں آبادی تک پہنچا اور ایک ٹیکسی کے ذریعے اپنے ہوٹل آ گیا۔ ہوٹل پہنچتے ہی میں نے کانتا کا شناختی کارڈ اور اُس کا پاسپورٹ غائب کر دیا۔ پھر کمرا مقفل کر کے اُس کی چابی اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ اب میرا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ میں پہلے بھی کئی بار مصر آ چکا تھا۔ میں قاہرہ میں ایک ایسے شخص سے واقف تھا جو مجھے کانتا کے شناختی کارڈ اور اس کے پاسپورٹ کے عوض خاصی رقم دے سکتا تھا۔ وہ رمسیس اسکوائر میں رہتا ہے۔ میں نے ایک بار تم سے بھی اُس کا ذکر کیا تھا۔ توقع کے مطابق اُس شخص جیمس نے مجھے پاسپورٹ اور کاغذات کے دو سو گنی دیئے۔ میں اب پوری طرح مطمئن تھا کہ اشوک جوشی کے قتل کا الزام کانتا ہی پر آئے گا۔ اور پھر وہی ہوا، مگر...... مگر شاید مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ کانتا یقیناً مری نہیں تھی ورنہ اس وقت ہمارے سامنے موجود نہ ہوتی۔'' اپنی داستان سنا کر دھنپت رائے خاموش ہو گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی نظروں میں رحم طلبی تھی۔

میں سمجھ گئی تھی کہ میری بدلی ہوئی آواز کے باوجود وہ مجھے کانتا جوشی ہی سمجھ رہا ہے۔ اُس نے دُہرے قتل کا جو واقعہ بیان کیا تھا، لفظ بہ لفظ درست تھا۔ اُس کا ذہن پڑھ کر مجھے بھی یہی سب کچھ معلوم ہوا تھا۔ اُس کے اعترافِ جرم کا سبب کانتا جوشی کے میک اَپ میں اچانک میرا سامنے آ جانا تھا۔

''تم نے مجھے معاف کر دیا نا کانتا؟'' دھنپت رائے ایک بار پھر بول اُٹھا۔

''میں کہہ چکی ہوں کہ میں کانتا جوشی نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''مگر...... مگر تمہاری بدلی ہوئی آواز کے باوجود میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں کانتا!'' وہ پُر یقین لہجے میں بولا۔ ''اگر تم کانتا نہ ہوتیں تو تمہیں یہ علم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کشتی میں کانتا اور اشوک کے علاوہ میں بھی تھا۔'' اُس نے گویا دلیل دی تھی۔

''میں کون ہوں، کون نہیں، یہ بھول جاؤ دھنپت رائے! اور میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے اُس پر عمل کرو۔ تم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔'' میں نے اُس سے کہا۔

''تمہاری اگر یہی خواہش ہے تو میں یقیناً ایسا ہی کروں گا۔'' اُس کے لہجے میں پختگی تھی۔ ''مگر صرف ایک بار...... ایک بار تم اپنی زبان سے کہہ دو کہ مجھے معاف کر چکی ہو۔''

''میرے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کچھ نہیں ہو گا دھنپت رائے! معاف کرنے والا کوئی اور ہے، اُس سے معافی مانگو! ہاں تمہاری یہ غلط فہمی میں ضرور دُور کر سکتی ہوں کہ میں کانتا جوشی نہیں ہوں، مگر اس کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ تم کسی سے میرا ذکر نہیں کرو گے کہ میں نے کانتا جوشی کا کردار کیوں اپنایا!'' میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''کیا تم... تم واقعی کانتا جوشی نہیں ہو؟'' دھرم ویر نے یہ سوال کر کے خاصی دیر بعد اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

''ہاں تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کانتا جوشی تو بے چاری قتل کی جا چکی ہے، میں یہ ثابت کر سکتی ہوں کہ تمہیں واقعی دھوکہ ہوا ہے۔''

''اگر تم یہ ثابت کر دو گی تو یقین کرو ہم کسی سے تمہارا ذکر نہیں کریں گے۔'' دھرم ویر بولا۔

''اور نہ مجھ سے کوئی سوال کرو گے؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''ہاں ہم تم سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔'' اس بار دھنپت رائے نے کہا۔

''اچھا ٹھہرو، میں ابھی باتھ رُوم ہو کر آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنی اٹیچی سے کچھ سامان نکالا اور باتھ رُوم میں گھس گئی۔ اب میں کانتا جوشی کے میک اپ سے جان چھڑا لینا چاہتی تھی، مگر اپنی اصل شکل میں رہنا بھی میرے لئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے اپنے چہرے پر کوئی اور میک اپ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

پھر جب میں کچھ دیر بعد باتھ رُوم سے نکلی تو مجھے دیکھ کر وہ دونوں ہی حیران رہ گئے۔

''تم...... تم...... کون ہو؟'' وہ دونوں ہی ہکلانے لگے۔

''تم لوگوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کوئی سوال نہیں کرو گے۔'' میں نے اُنہیں یاد دلایا۔

''مگر...... مگر......'' دھنپت رائے کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے اُسے مخاطب کیا۔

''اگر...... اگر تم کانتا جوشی نہیں تو پھر...... پھر مجھے اعتراف جرم کی کیا ضرورت ہے! میں...... میں کیوں ......آخر کیوں......''

''دھنپت رائے!'' میری آواز میں سختی آ گئی۔ ''تمہیں یہ اعتراف جرم کرنا پڑے گا۔ اور تم دھرم ویر کے سامنے دُہرے قتل کا اعتراف کر بھی چکے ہو۔ اگر تم نے خود کو قانون کے حوالے نہ کیا تو تمہارا دوست، پولیس کو سب کچھ بتا دے گا۔''

''دھرم ویر ایسا نہیں کر سکتا! وہ...... وہ میرا دوست ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دھرم ویر کی طرف پلٹا اور تصدیق چاہی۔ ''کیوں دھرم ویر! میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں تم غلط کہہ رہے ہو دھنپت!'' دھرم ویر مضبوط لہجے میں بولا۔ ''تم قاتل ہو اور میرے سامنے قتل کا اعتراف کر چکے ہو۔''

مجھے اس معاملے سے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ مجرم کو اُس کے جرم کی سزا مل جائے، سو اس کے لئے میں نے ایک راستہ اختیار کر لیا۔ میں نے دھنپت رائے کے ذہن کو اپنے قابو میں کر کے اُسے یہ باور کرا دیا کہ اعتراف جرم ہی کے بعد اُس کے ضمیر کو سکون مل سکتا ہے۔

''ہاں میں دُہرے قتل کا اعتراف کر لوں گا ورنہ میرا ضمیر مجھے چین سے نہیں جینے دے گا۔'' وہ میرے ذہن کے زیر اثر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

پھر میں وہاں زیادہ دیر نہیں رُکی، مگر اس سے پہلے میں نے دھرم ویر اور دھنپت رائے کے ذہن سے اس ملاقات کا ہر نقش مٹا دیا تھا۔

اپنا سوٹ کیس اُٹھائے میں ہوٹل مونٹانا سے نکل آئی۔ تحریر اسکوائر وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا اس لئے میں ٹہلتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اب جو کچھ بھی ہونا تھا، آئندہ روز ہی ہو سکتا تھا۔ مزید ایک شب قاہرہ میں میرا قیام ضروری تھا۔ میں نے دس منزلہ ہوٹل ہلٹن میں ایک کمرا حاصل کر لیا۔ یہ بھی قاہرہ کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں سے ایک تھا۔

اُس وقت رات کے نو بجنے والے تھے۔ اپنے ہوٹل کے کمرے میں سوٹ کیس رکھ کر میں، پی آئی کے دفتر پہنچ گئی اور آئندہ روز کی ایک فلائٹ کے لئے بکنگ کرا لی۔ آج کی فلائٹ کا ٹکٹ میں نے واپس کر دیا تھا۔ کچھ کمیشن کاٹ کر مجھے اس کی رقم واپس مل گئی تھی۔

قصر النیل سے لوٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ اسی وقت کیوں نہ جیمس سے مل لیا جائے۔ اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ کانتا جوشی کے پاسپورٹ کی جگہ کوئی اور پاسپورٹ میرے پاس ہو۔ نتیجتاً میں ٹیکسی کر کے رَم سیس پہنچ گئی۔

جیمس سے سودے بازی میں مجھے صرف سوگنی کا نقصان ہوا۔ اب مجھے ایک عورت نسرین کا پاسپورٹ اور شناختی کاغذات مل گئے تھے اور وہ عورت پاکستانی ہی تھی۔ کانتا جوشی کے کاغذات اور پاسپورٹ میں نے جیمس کو دے دیا تھا۔ اس نئے پاسپورٹ پر تصویر کی تبدیلی کی بجائے میں نے پہلا نسخہ ہی آزمانے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں نے تصویر کے مطابق اپنے چہرے پر میک اپ کرنے کو مناسب خیال کیا تھا۔ یہ کام میں نے اُسی شب انجام دے لیا اور خاموشی کے ساتھ ہلٹن ہوٹل سے نکل آئی۔ اب میں گویا ایک پاکستانی عورت نسرین تھی۔ پاسپورٹ کے علاوہ میرے پاس شناختی کاغذات بھی تھے۔

جب میں ہوٹل ہلٹن سے نکلی تو صبح کے سوا چار بج رہے تھے۔ تحریر اسکوائر سے ٹیکسی کر کے میں کہیں اور جانے کی بجائے سیدھی ایئر پورٹ روانہ ہو گئی۔ ایئر پورٹ کے قریب ہی ہیلیو پولس کا علاقہ تھا اور وہیں ایک فائیو اسٹار ہوٹل ہیلیو پولس شیرٹن تھا۔ میرا ارادہ وہیں قیام کرنے کا تھا۔ بس دن بھر ہی تو وہاں گزارنا تھا۔ شام کو میں ایک فلائٹ سے پاکستان کے لئے روانہ ہو جاتی۔

ہیلیو پولس شیرٹن چار منزلہ تھا مگر خاصے بڑے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مجھے وہاں قیام میں ایک آسانی یہ تھی کہ وہاں سے ایئر پورٹ صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا۔

ہیلیو پولس شیرٹن میں اپنے نئے نام ہی سے میں نے کمرا حاصل کیا تھا۔ پاسپورٹ پر یہ پورا نام نسرین کمال لکھا ہوا تھا۔ شناختی کاغذات سے نسرین کمال کے بارے میں مجھے صرف چند باتیں معلوم ہو سکی تھیں۔ وہ شادی شدہ تھی اور کمال غالباً اُس کے شوہر کا نام تھا۔ پاکستان میں اُس کی سکونت کراچی میں تھی۔ عمر اتنی تھی کہ میرے جسم کے ساتھ آسانی سے کھپ سکتی تھی۔

ہوٹل کے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہونے کے بعد میں سوچنے لگی کہ اب کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہ ہو تو اچھا ہے۔ میری خواہش تھی کہ اب میں جلد از جلد کراچی پہنچ جاؤں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اب میرے پاس زیادہ رقم نہیں بچی تھی۔ انہی حالات پر غور کرتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔

جب میں بیدار ہوتی تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ میں انگڑائی لے کر بستر سے اُٹھ گئی اور غسل خانے کا رُخ کیا۔ غسل کر کے لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے ہوٹل کی روم سروس کو کھانے کے لئے فون کیا۔ کچھ ہی دیر میں دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ ویٹر کھانا لے آیا تھا۔ کھانے کے بعد میں عموماً چائے یا کافی ضرور پیتی تھی ورنہ مجھے کھانا ادھورا محسوس ہوتا تھا لیکن اس وقت میں نے کھانا کھا کر کوئی مشروب نہ منگوایا۔ میں دراصل ہوٹل کے ہال میں چائے یا کافی پینا چاہتی تھی۔ میری فلائٹ شام کے بعد تھی اسی لئے میں کچھ وقت ہوٹل کے ہال میں گزارنا چاہتی تھی۔

ویٹر جب کھانے کے برتن لے کر چلا گیا تو میں نے کمرا مقفل کیا اور نیچے ہال میں آ کر بیٹھ گئی۔ اُس وقت ہال میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ میں نے کافی کا آرڈر دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ میں اس رُخ سے بیٹھی تھی کہ ہال کا دروازہ میری نظر میں تھا۔ ابھی ویٹر کافی لے کر نہیں آیا تھا کہ میرا دل زور سے دھڑک اُٹھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں اچانک میری چھوٹی بہن ذکیہ میرے سامنے آ جائے گی۔ وہ ایک مقامی نوجوان کے ساتھ ہال کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں اُس نوجوان کو پہچانتی تھی۔ وہ ایک ذہین وکیل تھا۔ اُس کی حیثیت ذکیہ کے قانونی مشیر کی تھی۔ یقیناً ذکیہ اُس سے کوئی قانونی مشورہ کرنے اُسے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ میں ذکیہ کی طبیعت اور مزاج سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ روایتی دفتری ماحول کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اُس نے شاید وکیل سے گفتگو کے لئے اسی سبب اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

میری میز سے چوتھی میز خالی تھی۔ وہ دونوں اُسی میز پر آکر بیٹھ گئے۔ میں نے کئی سال بعد ذکیہ کو دیکھا تھا۔ میرے دل میں اُس کی محبت جوش مارنے لگی۔ مگر جلد ہی میں نے اس پر قابو پا لیا۔ اسی اثناء میں ویٹر کافی لے آیا اور میں اس کی چسکیاں لینے لگی۔ ذکیہ نے غالباً کھانے کا آرڈر دیا تھا کیونکہ میں نے اُس کے ہاتھ میں مینو دیکھا تھا

ویٹر اُن دونوں کا آرڈر لے کر گیا ہی تھا کہ ایک بار پھر میرے اعصاب جھنجنا اُٹھے۔ ہال کے دروازے سے میں نے ایک ایسے نوجوان کو اندر آتے دیکھا تھا جو میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جسے میں نے ہیلی کاپٹر چلاتے دیکھا تھا، وہی ہیلی کاپٹر جس میں ڈاکٹر رچرڈ مجھے شیخ سالم کے قصر سے اُٹھا لے گیا تھا۔ وہ نوجوان تنہا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ دو قوی ہیکل مقامی اور بھی تھے۔ اُن تینوں نے بھی ایک ایسی میز کا انتخاب کیا جو ذکیہ کی میز کے قریب تھی۔ میری چھٹی حس کسی خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ میں نے اُس مقامی نوجوان کو ذکیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کچھ اشارہ کرتے بھی محسوس کر لیا تھا۔

وہاں یقیناً کوئی نہ کوئی کھیل شروع ہونے والا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ ڈاکٹر رچرڈ کے گرگے ذکیہ کے پیچھے کیوں لگ گئے ہیں۔ اُن لوگوں کو غالباً ذکیہ پر میرا گمان ہوا تھا۔ مجھ سے حیرت انگیز مشابہت ذکیہ کے لئے خطرہ بن گئی تھی۔ اگر میں کافی پینے ہال میں نہ آگئی ہوتی تو مجھے کچھ خبر بھی نہ ہوتی اور ذکیہ پر جانے کیا گزرتی۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ ذکیہ کو کس طرح خطرے سے آگاہ کروں؟ یہی سوچتے ہوئے میری نگاہ ہال کے دروازے کی طرف اُٹھی۔ وہی ویٹر اندر آرہا تھا جو ذکیہ سے آرڈر لے کر گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ ابھی وہ آگے ہی بڑھ رہا تھا کہ مشتبہ نوجوان اپنی میز سے اُٹھ کر تیزی کے ساتھ اُس کی طرف بڑھا۔ ویٹر گڑبڑا گیا۔

مشتبہ نوجوان ''سوری'' کہتا ہوا ہال کے باتھ رُوم کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران میں وہ ہاتھ کی صفائی دکھا چکا تھا۔ میں نے اُسے کھانے پر کوئی سفوف ڈالتے دیکھ لیا تھا۔ غالباً یہ کوئی ایسا سفوف تھا جو کھانا کھانے والے کو بے ہوش کر سکے۔

کھیل شروع ہو چکا تھا اور اب میں خاموش تماشائی نہیں بن سکتی تھی۔ اس عرصے میں ویٹر، ذکیہ کی میز کے قریب پہنچ چکا تھا۔ معاً میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے چلتی ہوئی ذکیہ کی میز تک پہنچ گئی۔ اس دوران میں میرا ذہن تیزی سے کام کرتا رہا تھا۔

مجھے قریب دیکھ کر ذکیہ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''میں فوراً ہی بول اُٹھی۔ ''ہیلو مس عذرا خان! آپ کب قاہرہ آئیں؟'' میں دانستہ اپنی آواز بدل کر بولی تھی تاکہ ذکیہ میری آواز نہ پہچان لے۔

''تشریف رکھئے!'' ذکیہ مسکرا کر بولی۔

''شکریہ!'' یہ کہہ کر میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میں عذرا خان نہیں، ذکیہ خان ہوں۔'' ذکیہ نرم لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''عذرا خان میری بڑی بہن ہیں جو پاکستان میں رہتی ہیں۔ ہم دونوں کی شکلیں بہت ہی ملتی جلتی ہیں اس لئے اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہو

جاتی ہے۔''

''حیرت انگیز مشابہت ہے۔'' میں دانستہ بلند آواز میں بولی تاکہ قریبی میز پر بیٹھے ہوئے مشتبہ افراد بھی میری آواز سن لیں اور اُنہیں معلوم ہو جائے کہ وہ غلطی پر ہیں۔ ''آپ کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ عذرا خان نہیں ہیں۔''

''ہاں ایسا بار ہا ہو چکا ہے کہ لوگ باجی کے دھوکے میں میری طرف متوجہ ہو گئے ہوں۔'' ذکیہ نے کہا، پھر بولی۔ ''آپ کی تعریف؟ یقیناً آپ عذرا باجی کو اچھی طرح جانتی ہوں گی۔''

''مجھے نسرین کمال کہتے ہیں۔ آپ مجھے اپنی عذرا باجی کی شناسا کہہ سکتی ہیں۔ میں اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں اور آج شام کی فلائٹ سے پاکستان جا رہی ہوں۔ اگر مس عذرا کے لئے کوئی پیغام ہو تو دے دیں، میں اُنہیں پہنچا دُوں گی۔'' میں نے کن انکھیوں سے قریبی میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اب وہ مقامی مشتبہ نوجوان بھی باتھ رُوم سے واپس آچکا تھا۔ اُس کے ساتھی اُس سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اُس مقامی نوجوان کو یہی بتا رہے تھے کہ غلطی سے وہ عذرا خان کی بجائے اُس کی چھوٹی بہن ذکیہ کے پیچھے لگ گئے ہیں۔

''نہیں شکریہ!'' ذکیہ بولی۔ ''اگر عذرا باجی سے ملاقات ہو تو اتنا کہہ دیجئے گا کہ میں خیریت سے ہوں۔ ہاں، آپ کے لئے کیا منگواؤں؟''

''کچھ نہیں۔ میں کھانا کھا چکی ہوں۔ کافی پینے ہال میں آئی تھی کہ آپ پر نظر پڑ گئی اور میں آپ کو مس عذرا خان سمجھ بیٹھی۔ میں اپنی کافی اسی ٹیبل پر منگوا لیتی ہوں۔'' اس کے ساتھ میں نے ایک ویٹر کو اشارہ کر کے اپنی میز سے کافی لانے کو کہہ دیا۔

ذکیہ نے نوجوان وکیل سے میرا تعارف کرایا، پھر اپنے اور اس نوجوان کے لئے پلیٹوں میں کھانا نکالنے لگی۔

میں ہر قیمت پر ذکیہ اور اُس نوجوان کو وہ کھانا کھانے سے روک دینا چاہتی تھی اور میں سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے! اچانک میرے منہ سے کراہ سی نکلی اور پھر میں اپنا سینہ تھامے جھکتی چلی گئی۔ میرا سر میز سے ٹکرا گیا تھا۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا مسز نسرین؟'' میری توقع کے عین مطابق ذکیہ کھانا نکالتے نکالتے رُک کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''میری...... میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ پلیز!...... آپ...... آپ مجھے میرے کمرے...... کمرے تک پہنچا دیجئے!'' میں رُک رُک کر بمشکل کراہتے ہوئے بولی۔

ذکیہ اپنی کرسی سے اُٹھ گئی۔ اب وہ مجھے کرسی سے اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے دانستہ اپنے جسم کو الیا تاکہ ذکیہ کا ساتھی نوجوان بھی اُس کی مدد کو اُٹھ کھڑا ہو۔ پھر یہی ہوا۔ ذکیہ اور اُس کے ساتھی نوجوان نے مجھے کرسی سے اُٹھا کر کھڑا کر دیا اور سہارا دیئے مجھ سے قدم بڑھانے کو کہنے لگے۔

اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر میں نے ایک اور کام دکھا دیا۔ میں نے میز کے پائے میں ٹانگ پھنسا کر ے اُلٹ دیا تاکہ واپس آنے کے بعد ذکیہ وہ کھانا نہ کھا سکے۔ ہال میں افراتفری مچ گئی۔ کئی ویٹر اُس طرف

دوڑ پڑے۔

پھر ذکیہ اور اُس کا ساتھی نوجوان مجھے سہارا دیئے ہال سے نکال لائے اور لفٹ کی طرف بڑھنے لگے۔

''روم نمبر تین سو تین۔'' میں نے لفٹ میں قدم رکھتے ہوئے بتایا۔ پھر کہنے لگی۔ ''آپ لوگوں کو ناحق میری وجہ سے زحمت ہوئی۔''

''نہیں، کوئی بات نہیں۔'' ذکیہ خوش اخلاقی سے بولی۔ ''یوں بھی آپ عذرا باجی کی جاننے والی ہیں، اس ناتے میرا اتنا فرض تو ہے نا! اب کیسا محسوس کر رہی ہیں؟'' اُس نے لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے پوچھا۔

''پہلے سے بہتر ہوں۔'' میں نے طویل سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب...... اب میں بغیر سہارے کے بھی کھڑی ہو سکتی ہوں۔''

''آپ غالباً ہرٹ کی مریضہ لگتی ہیں۔'' ذکیہ بولی۔

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''انجائنا کی مریض ہوں۔ اتفاق سے اس وقت میرے پرس میں ٹیبلٹس نہیں تھیں ورنہ......''

''کمرے میں تو ہیں نا؟'' ذکیہ نے سوال کیا۔ ''نہ ہوں تو میں......''

''ہیں موجود، آپ کو زحمت نہیں ہو گی۔ بس مجھے میرے کمرے تک چھوڑ دیں۔'' میں اُس کی بات کاٹ کر بولی۔

لفٹ تیسری منزل پر پہنچ کر رُک گئی اور میں اُن دونوں کے ساتھ لفٹ سے باہر آ گئی۔ راہداری میں اُنہوں نے مجھے سہارا دینا چاہا، مگر میں نے اُنہیں روک دیا یہ کہہ کر نہ میں اب بغیر سہارے کے چل سکتی ہوں۔

میرے کمرے کا دروازہ آ گیا تو میں رُک گئی اور پھر اُن دونوں کو مخاطب کیا۔ ''آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ! مجھے خوشی ہو گی اگر آپ لوگ میرے کمرے میں کھانا کھائیں۔''

''دراصل کھانے کے دوران میں ہمیں کچھ گفتگو بھی کرنا تھی اس لئے معذرت چاہیں گے۔ بہر حال آپ کی دعوت کا شکریہ!'' ذکیہ نے میری پیشکش پر کہا۔

میں اس دوران میں اپنے کمرے کا قفل کھول چکی تھی۔ ''ویری سوری کہ میں آپ لوگوں کی گفتگو میں مخل ہوئی۔'' میں بولی۔

''کوئی بات نہیں۔'' ذکیہ نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ پھر ''خدا حافظ'' کہہ کر اپنے نوجوان ساتھی کو لئے لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دیر پہلے ذکیہ کے گرد جو خطرہ منڈلا رہا تھا، میں نے اُس کا سدباب کر دیا تھا۔ یہ جاننے کے بعد کہ ذکیہ ہے عذرا خان نہیں، یقیناً وہ لوگ اب ذکیہ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ میں نے اطمینان سے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اس ناگہانی میں بہر حال ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ میر حریف ذکیہ کے بارے میں بقیہ تفصیلات جاننے کے بعد یقیناً اُس کی جان چھوڑ دیں گے۔

اپنے کمرے میں مزید آدھے پون گھنٹے آرام کرنے کے بعد میں نے ہوٹل کے واجبات ادا کئے اور ساڑھے چار بجے کے قریب سوٹ کیس اُٹھائے ہوٹل کی عمارت سے نکل آئی۔ باہر نکلتے ہی مجھے ٹیکسی مل گئی۔

پھر ایئرپورٹ پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ گزشتہ روز بھی میں تقریباً اسی وقت ایئرپورٹ پہنچی تھی۔ اگر کل ایئرپورٹ پر مجھے دھرم ویر نہ مل جاتا اور قاہرہ پولیس کو مسز کانتا جوشی کی تلاش نہ ہوتی تو شاید میں اس وقت کراچی میں ہوتی۔ چوبیس گھنٹے کی یہ تاخیر بہر حال ان معنوں میں سود مند ثابت ہوئی تھی کہ میری چھوٹی بہن ذکیہ متوقع خطرے سے بچ گئی تھی۔ پاکستان پہنچ کر اب میں اُس کی طرف سے زیادہ فکرمند نہ ہوتی۔

ضروری خانہ پُری کے بعد بالآخر وہ وقت بھی آ ہی گیا جب میں جہاز پر سوار ہو گئی۔ فلائٹ صحیح وقت پر قاہرہ ایئرپورٹ سے روانہ ہو گئی اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں بہر حال بخیریت ڈاکٹر رچرڈ کے پھیلائے ہوئے جال سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں اب دُور تک کسی خطرے کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن کراچی ایئرپورٹ پر پہنچ کر میری یہ غلط فہمی دُور ہو گئی۔ مجھے ایئرپورٹ پولیس نے حراست میں لے لیا تھا اور میں اپنی گرفتاری پر حیران تھی۔ پولیس نے میرا پاسپورٹ اور شناختی کاغذات اپنے قبضے میں لے لئے تھے۔ پولیس والوں کے ساتھ ہی ایک کسٹمز آفیسر بھی تھا اور وہ مجھے اس طرح حیرت سے دیکھ رہا تھا جیسے میرے سر پر سینگ اُگ آئے ہوں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اُسی کے ایما اور اشارے پر پولیس نے مجھے گرفتار کیا تھا۔

''کیا آپ کو یقین ہے مسٹر کمال! کہ آپ کی وائف گھر ہی پر ہیں؟'' پولیس انسپکٹر نے اُس کسٹمز آفیسر سے سوال کیا۔

''جی ہاں، میں ابھی فون پر اُن سے گفتگو کر چکا ہوں۔'' اُس کسٹمز آفیسر نے جواب دیا جسے کمال کہہ کر پولیس آفیسر نے مخاطب کیا تھا۔ ''یہ عورت مجھے زبردست فراڈ معلوم ہوتی ہے۔''

میں یہ نام سن کر چونک اُٹھی۔ میں نے جو شخصیت اپنائی تھی، اس کے نام کے ساتھ بھی ''کمال'' لگا ہوا تھا، کہیں یہ شخص اس عورت نسرین کا شوہر تو نہیں؟ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ دوسرے ہی لمحے حقیقت حال جاننے کے لئے میں اُس شخص کا ذہن پڑھنے لگی۔ اس کے بعد ہی میں کوئی قدم اُٹھانا چاہتی تھی۔

میرا شبہ درست نکلا۔ اُس شخص کا ذہن پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ گزشتہ ماہ وہ اپنی بیوی نسرین کے ساتھ قاہرہ گیا تھا۔ وہیں قیام کے دوران میں اُن دونوں کے پاسپورٹ اور شناختی کاغذات چوری ہو گئے تھے۔ پاکستان ایمبیسی سے رابطہ قائم کر کے اُنہوں نے نئے پاسپورٹ حاصل کر لئے تھے۔ مجھے اچانک قاہرہ کی فلائٹ سے اُترتے دیکھ کر اُس شخص کا حیران رہ جانا یقینی امر تھا۔ اُس نے تصدیق کی خاطر فوراً اپنے گھر فون کر کے اپنی بیوی سے بات کی، پھر ایئرپورٹ پولیس کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا۔ فون پر اُس نے اپنی بیوی سے فوری طور پر ایئرپورٹ پہنچنے کے لئے بھی کہا تھا تاکہ پولیس کو اُس کے بیان پر یقین آ جائے۔ اپنی بیوی سے اُس نے پاسپورٹ بھی ساتھ لانے کو کہا تھا۔

یہ میری بدقسمتی ہی تھی کہ مجھے ایک ایسی عورت کا پاسپورٹ ملا تھا جس کا شوہر ایئرپورٹ پر اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے لئے موجود تھا۔ اب یہ ثبوت ملنے کے بعد ہی کہ میرے پاس چوری کا پاسپورٹ ہے اور میں وہ نہیں ہوں جو خود کو ظاہر کر رہی ہوں، پولیس مجھے لاک اپ میں بند کر سکتی تھی۔ فی الحال اُنہوں نے مجھے کسٹمز کے ایک کمرے ہی میں بٹھا رکھا تھا جہاں کمال بھی موجود تھا۔ پولیس والوں کو اُس کی بیوی کے آنے کا انتظار تھا اور خود مجھے بھی۔ اُس کی آمد کے بعد ہی میں وہ قدم اُٹھانا چاہتی تھی جو سوچ چکی تھی۔ اس طرح وقتی

طور پر اُس جوڑے کو تھوڑی سی پریشانی ضرور ہوتی۔ مگر یہ پریشانی ناگزیر تھی۔

''محترمہ! آپ کو شاید پہلے کبھی پولیس والوں سے سابقہ نہیں پڑا۔'' پولیس انسپکٹر مجھے دھونسانے لگا۔ ''بہتر یہ ہے کہ آپ سب کچھ سچ سچ بتا دیں کہ آپ کون ہیں اور یہ چوری کا پاسپورٹ آپ نے کہاں سے حاصل کیا؟''

''میں ہی نسرین کمال ہوں اور یہ میرے شوہر ہیں۔'' میں اطمینان سے کہنے لگی۔ ''وہ عورت یقیناً کوئی فراڈ ہے جو ان کی بیوی بنی ہوئی ہے۔ دراصل قاہرہ میں ان کے اور میرے درمیان کچھ اختلافات ہو گئے تھے جس کی وجہ سے یہ پہلے چلے آئے اور میں اب آ رہی ہوں۔''

''جھوٹ، سفید جھوٹ!'' کمال فوراً بول اُٹھا۔ ''یہ عورت سفید جھوٹ بول رہی ہے۔''

''کمال مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں اسی لئے مجھے آپ لوگوں کے حوالے کر رہے ہیں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ابھی جب میری بیوی یہاں آئے گی تو تمہارا سارا ڈھونگ ختم ہو جائے گا۔'' کمال جزبز ہو کر بولا۔

معاً میرے ذہن میں آیا کہ ناحق اُس کی بیوی کو اور اسے کیوں وقتی طور پر ہی سہی، پریشان کیا جائے! ورنہ میں نے سوچا تھا کہ جب اُس کی بیوی آ جائے گی تو میں اُس کی جگہ لے لوں گی، مگر اُس کے بغیر بھی میں کام چلا سکتی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی بہر حال بے قصور تھے، میں نے اسی لئے دوسری راہ اختیار کی۔

''میں باتھ رُوم جانا چاہتی ہوں۔'' میں نے پولیس انسپکٹر کو مخاطب کیا۔

''وہ اُدھر ہے باتھ رُوم، مگر وہ جینٹس کے لئے ہے۔'' کمال بول اُٹھا اور اسی کے ساتھ ایک طرف اشارہ کیا۔

''کوئی حرج نہیں۔'' پولیس انسپکٹر نے کہا۔ ''یہ وہاں بھی جا سکتی ہیں۔ کیوں محترمہ؟'' وہ میری طرف مُڑا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں؟'' میں کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''دراصل ان محترمہ کو میں اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر بولا۔ ''یہ مجھے کوئی بہت اُونچی فنکار معلوم ہوتی ہیں۔''

میں نے اپنے عقب سے پولیس انسپکٹر کی آواز سنی۔ وہ غالباً اپنے ساتھیوں سے مخاطب تھا۔ میں کمرے ہی میں موجود باتھ رُوم کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

باتھ رُوم میں داخل ہو کر میں نے دروازہ بند کر لیا اور پھر اپنے چہرے سے میک اپ ختم کرنے لگی۔ میک اپ ختم کر کے میں نے اطمینان سے منہ دھویا اور پھر بڑے سکون کے ساتھ باتھ رُوم کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ پولیس والوں اور کمال کی طرف متوجہ ہوئے بغیر میں سیدھی کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ اپنا سوٹ کیس میں نے وہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''اے لڑکی! رُک جاؤ۔'' معاً پولیس انسپکٹر نے مجھے للکارا۔

''جی فرمایئے!'' میں آگے بڑھتے بڑھتے رُک کر پلٹی اور پولیس انسپکٹر کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی جس کا چہرہ خود تصویرِ حیرت بنا ہوا تھا۔ میں دانستہ آواز بدل کر بولی تھی۔

''تم...... تم حراست...... حراست میں ہو!'' پولیس انسپکٹر نے اپنی آواز کو بارُعب بنانا چاہا، مگر آواز میں کھوکھلا پن تھا۔

''کس جرم میں جناب؟'' میں اُس کے قریب پہنچ کر بولی۔

''تم نے چوری کے ایک پاسپورٹ پر سفر کیا ہے۔'' اُس نے گویا فردِ جرم سنائی۔

''کہاں ہے وہ پاسپورٹ؟'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے، سمجھیں؟'' اُس نے مجھے رُعب میں لینا چاہا۔

''میرا خیال ہے انسپکٹر کہ تم مجھے جانے دو! اس لئے کہ جو الزام لگا رہے ہو، اُسے ثابت نہیں کر سکو گے۔'' میری آواز میں سختی آ گئی۔

انسپکٹر مجھے گھورنے لگا۔ میں نے اُس سے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں تھا۔ میک اپ ختم ہونے کی صورت میں وہ بھلا کس طرح اپنا عائد کردہ الزام صحیح ثابت کرتا اور اسی لئے شاید چکرا کر رہ گیا تھا۔ چند لمحے بعد وہ ہونٹ بھینچ کر پھر بول اُٹھا۔ ''میں تمہارے پرس کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔''

''اور اس سے چرس یا ہیروئن برآمد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں!'' میں مسکرا کر بولی۔ ''پوری بات کہو نا انسپکٹر!''

''لڑکی! تم اپنی حد سے بڑھ رہی ہو اور اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔'' اُس نے آنکھیں نکالیں۔

''سنو انسپکٹر! ابھی میں اپنی حد میں ہوں، حد سے بڑھی تو تم چلتے پھرتے نظر آؤ گے۔'' میں ابھی تک آواز بدل کر بول رہی تھی۔

''تم مجھے...... مجھے انسپکٹر شرافت خان کو دھمکی دے رہی ہو، ہیں؟'' وہ برہم ہو گیا

نسرین کا شوہر کمال اس دوران میں قطعی خاموش کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر اب تک شدید حیرت کے آثار تھے۔ شاید اُس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا حیران کن منظر نہیں دیکھا ہوگا کہ ایک لڑکی اُس کے سامنے باتھ رُوم گئی اور جب باہر آئی تو اُس کی شخصیت یکسر بدل چکی تھی۔

معاملے کو آگے بڑھتے دیکھ کر میں نے اپنی حیرت انگیز قوتوں کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ انسپکٹر مجھ سے چڑ کر انتقامی طور پر کوئی بھی کارروائی کر سکتا تھا۔ میں پولیس والوں کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُس کے ذہن کو اپنے ذہن کی گرفت میں لے لیا۔

''تم...... تم جا سکتی ہو۔'' معاً پولیس انسپکٹر خواب ناک سی آواز میں بول اُٹھا۔ ''تمہارے خلاف میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔'' وہ میرے ذہن کے زیرِ اثر یہ الفاظ ادا کر رہا تھا۔

میں نے اُس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ یہ معاملہ اُس کے حق میں نقصان دہ ہو سکتا ہے، مزید مداخلت اور مجھے روکے رکھنا کسی طور بہتر نہیں۔

''شکریہ انسپکٹر!'' میں نے کہا اور پھر اطمینان سے کمرے کے دروازے کی طرف چل دی۔

''مسٹر کمال! میں مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے اپنے عقب میں انسپکٹر کی آواز سنی۔

''کک...... کوئی بات نہیں انسپکٹر صاحب!...... کوئی بات نہیں۔'' کمال ہکلانے لگا۔

"تمہارے حق میں یہ بہتر ہو گا کمال! کہ تم اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرو۔" انسپکٹر نے کمال کو ہدایت کی۔ یہ بات بھی میں نے ہی اُس کے دماغ میں ڈالی تھی۔

"ایسا ہی ہو گا جناب! میں کسی سے بھی......" کمال کی آواز دھیمی پڑتی گئی کیونکہ اب میں اُس کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

پھر جب میں ایئرپورٹ سے ٹیکسی کر کے اپنی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی تو صبح ہو چکی تھی۔ اب میرے اعصاب پُرسکون تھے۔ میں بہرحال اپنے ملک اور اپنے شہر میں واپس آ گئی تھی، لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ کتنے عرصے کے بعد اپنے گھر لوٹ کر جا رہی ہوں۔ مجھے اپنے گھر کے در و دیوار یاد آ رہے تھے، اپنی ملازمۂ خاص فاطمہ یاد آ رہی تھی اور جانے کیا کیا یاد آ رہا تھا! میں سوچ رہی تھی کہ اتنے دن کے بعد جب میرے ملازمین مجھے دیکھیں گے تو کتنے خوش ہوں گے! اس کے علاوہ مجھے کمانڈر نواز اور آپریشن سیل کے دوسرے ارکان کا بھی خیال آ رہا تھا۔ اگر مجھے اُن سے بچھڑے زیادہ دن ہو گئے تھے تو پھر اُن کی تنخواہیں وغیرہ بھی چڑھ گئی ہوں گی۔ مجھے اُن تنخواہوں کی بھی ادائیگی کرنا تھی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اُنہیں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ نہ مل گئی ہو۔

انہی خیالوں میں ایئرپورٹ سے ڈیفنس سوسائٹی تک کا سفر طے کیا۔ وہاں پہنچ کر ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے رہنمائی چاہی اور میں اُسے اپنی کوٹھی کا راستہ بتانے لگی۔ پھر کچھ ہی دیر کے بعد ٹیکسی میری کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ کر رُک گئی۔ میرے پرس میں پاکستانی کرنسی نہیں تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنی کوٹھی پہنچ کر کرایہ دُوں گی۔ میں نے اس لئے ٹیکسی ڈرائیور سے گیٹ پر رُکنے کو کہا اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر گئی۔

اپنی کوٹھی کے گیٹ پر لگی ہوئی نیم پلیٹ پڑھ کر میرے ذہن کو پہلا جھٹکا لگا۔ پیتل کی بڑی سی نیم پلیٹ پر انگریزی حروف میں "ایاز ایم جہانگیر" لکھا ہوا تھا۔ میں نے خالی الذہنی کے سے عالم میں آگے بڑھ کر کال بیل پر اُنگلی رکھ دی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک پٹھان چوکیدار گیٹ کی دوسری جانب نظر آیا جو میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کس سے ملنا ہے؟ اُس کا سوال بظاہر بہت سیدھا سا تھا مگر اس سوال نے میرے دل پر بڑا اثر کیا۔ خود میرے ہی گھر کے دروازے پر مجھ سے پوچھا جا رہا تھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے؟ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے صورتِ حال کو سمجھنے کی خاطر چوکیدار سے پوچھا۔ "تم کب سے ملازم ہو یہاں؟"

میرا سوال سن کر اُس کے چہرے پر ناگواری کے سے تاثرات نظر آئے، پھر وہ کہنے لگا۔ "ابی صُبو صُبو تم کیوں اَمارا متھا کھراب کرتا ہے! صاب ابھی سو کر نہیں اُٹھا۔ تم بولتا کیوں نہیں کہ کس سے ملنا ہے؟"

"تم گیٹ کھولو!" میری سمجھ میں کچھ اور نہ آیا تو کہنے لگی۔

"نہیں، اَم گیٹ نہیں کھولے گا! تم ابی جاؤ!" اُس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

میں سمجھ گئی کہ اس شخص سے مغز مارنا بیکار ہے۔ یہ سوچ کر بولی۔ "ایاز صاحب سے کہو کہ میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ابی اَم بولا نا بی بی کہ صاب دس بجے سے پہلے سو کر نہیں اُٹھتا اور ابی نو بجنے والا ہے۔ پورا نو بی نہیں بجا دو منٹ باقی ہے۔"

اُسی وقت ٹیکسی والے نے ہارن دیا۔ میں سٹپٹا گئی۔ میں زندگی میں کبھی کسی ایسی صورت حال سے دوچار نہیں ہوئی تھی کہ میری جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو۔ اس وقت مسئلہ ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون ایاز ایم جہانگیر تھا جو میری غیر موجودگی میں کوٹھی پر قابض ہو گیا تھا؟ اُس سے تو میں بعد میں بھی نمٹ سکتی تھی، فی الحال مجھے ٹیکسی کے کرائے کی فکر تھی۔ میں کچھ سوچتی ہوئی واپس ٹیکسی میں آ بیٹھی، میرا بینک وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ نو بجے بینک کھل جاتا ہے۔ میں ایک لوز چیک لے کر اپنے اکاؤنٹ سے کچھ رقم نکلوا لوں گی، پھر بعد میں سوچوں گی کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں!

ٹیکسی والے کی تیوریوں پر یہ سن کر بل پڑ گئے کہ اب میں اُس سے کہیں اور چلنے کو کہہ رہی ہوں۔ بہرحال اُس نے ٹیکسی سٹارٹ کر دی۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے اپنے بینک کے سامنے ٹیکسی رُکوائی اور ڈرائیور کی تسلی کے لئے اُس سے کہا۔ "بس ابھی آ کر تمہیں کرایہ دیتی ہوں اور ٹپ بھی دُوں گی، فکر مت کرو!"

جواب میں ٹیکسی ڈرائیور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

میں تیزی سے چلتی ہوئی بینک یں داخل ہو گئی۔ بینک منیجر میرا شناسا سا تھا۔ میں سیدھی اُس کے کیبن میں پہنچ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ بینک منیجر مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا ہے۔

"میں نے تو سنا تھا کہ آپ امریکہ میں سیٹل ہو چکی ہیں، تشریف رکھیں! کب آئیں وہاں سے؟" اُس نے مجھے مخاطب کیا۔

"پلیز! باقی باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے مجھے ایک لوز چیک اِشو کرا دیجئے!" اُس کی بات سن کر میں اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ میں اُس کی بات سے سمجھ چکی تھی کہ میری غیر موجودگی میں کوئی نہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

"وہ تو خیر ٹھیک ہے مِس عذرا! مگر......" بینک منیجر کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"مگر کیا منیجر؟ بولیں نا!" میں اُسے خاموش ہوتے دیکھ کر بولی۔ مجھے بار بار ٹیکسی والے کا خیال آ رہا تھا جو باہر کرائے کا منتظر تھا۔

"مگر یہ کہ آپ کے اکاؤنٹ میں تو کچھ بھی نہیں۔"

"کیا؟" میں سناٹے میں رہ گئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ "آپ میرے پرسنل اکاؤنٹ کی بات کر رہے ہیں یا عذرا انٹرپرائزز والے اکاؤنٹ کی؟"

"دونوں اکاؤنٹس کی مِس عذرا...... آپ شاید بھول گئیں کہ......"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" میں بے چین ہو گئی۔

"میں صحیح عرض کر رہا ہوں۔" منیجر پُریقین لہجے میں بولا۔ "آپ حکم دیں تو میں لیجر منگواؤں؟"

"میں پھر آؤں گی ابھی میرے پاس لیجر دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے بیٹھیے نا! چائے پی کر جایئے گا! کئی مہینے بعد تو آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔" منیجر مجھے چائے پینے

کے لئے روکنے لگا۔

''شکریہ منیجر! میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اُس کے کیبن سے نکل آئی۔

اُس وقت جو میری حالت تھی، نا قابل بیان تھی۔ لاکھوں کروڑوں کی جائیداد اور دولت کی مالک ہونے کے باوجود میں اس وقت گویا کنگال تھی۔ میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ ٹیکسی کا کرایہ بھی ادا کرسکوں۔

بینک سے نکل کر میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔ اُسی وقت ٹیکسی ڈرائیور کی گویا زہر میں بجھی آواز مجھے سنائی دی۔ ''اب کدھر چلنا ہے بی بی جی؟''

جواباً اُس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے اُسے عذرا انٹر پرائزز کے دفتر کا پتہ بتایا۔

''اس کے بعد کہاں چلنا ہوگا، یہ بھی ابھی سے بتا دیں تو اچھا ہے!'' ٹیکسی ڈرائیور طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

''سنو! تمہیں اپنے کرائے سے مطلب ہے، وہ مل جائے گا۔ زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔'' مجھے غصہ آگیا۔

''تو دے دیں نا کرایہ! آپ نے مجھ سے ڈیفنس چلنے کے لئے کہا تھا ایئر پورٹ پر! میں نے آپ کو وہاں پہنچا دیا، پھر کیا بات ہے، کیوں مجھے اِدھر اُدھر لئے پھر رہی ہیں؟''

''میٹر تو چل رہا ہے نا تمہارا! فری میں تو سفر نہیں کررہی میں!'' میں ترکی بہ ترکی بولی۔

''معلوم نہیں صبح کس کا منہ دیکھا تھا کہ آپ آکر بیٹھ گئیں میری ٹیکسی میں۔'' وہ بڑبڑایا۔

اس بار میں اُس کی بات پی گئی اور خاموشی اختیار کرلی۔ پھر سفر خاموشی سے طے ہوا۔ اپنے دفتر کے سامنے ٹیکسی رُکواتے ہی جیسے میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ دفتر کے صدر دروازے کے اُوپر لگا ہوا بڑا سا بورڈ گویا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ بورڈ پر نمایاں اور بڑے الفاظ میں ''ایاز انٹر پرائزز'' لکھا ہوا تھا۔

''جی یہاں اُترنا ہے یا کہیں اور لے چلوں؟'' ٹیکسی والا مجھے ٹیکسی میں بیٹھے دیکھ کر مبتذل سے لہجے میں بولا۔ ''کہیں اور لے چلوں'' پر اُس نے کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں اُس کے مبتذل لہجے کے جواب میں سختی سے پیش آتی۔ مگر اُس وقت اتنا ہی کہہ سکی۔ ''دیکھو! تم اپنی حد میں رہو۔ مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھنا۔''

''چلیں نہیں سمجھتا۔ کرایہ دیں اور اُتریں نیچے! جان چھوڑیں میری۔'' اُس کا لہجہ بھی بدل گیا۔

''بس اب میں صرف ایک جگہ اور جاؤں گی، پھر تمہیں تمہارا کرایہ مل جائے گا۔'' میں اُس لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''اپنے الفاظ یاد رکھئے گا۔ اس کے بعد میں آپ کو لے کر کہیں اور نہیں جاؤں گا۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں کہنے لگا۔ ''بتائیں کہاں چلوں؟''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے سوسائٹی چلنے کے لئے کہا۔ مجھے ملک دلاور یاد آ گیا تھا۔ وہ اس موقع پر میرے کام آسکتا تھا، میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا رُخ بھی کرسکتی تھی۔ مگر دانستہ ایسا نہیں کیا کہ خدا معلوم وہاں کیا صورتِ حال پیش آئے۔ وہاں کوئی نہ ہوا تو کیا ہوگا؟ حالانکہ اس کا امکان بس پانچ فیصد ہی تھا

کہ وہاں کوئی نہ ہو۔ وہاں کا رُخ نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اپنے ملازمین سے پیسے مانگنا نہیں چاہتی تھی۔ گھر اور دفتر کی بات بہرحال مختلف تھی۔

ٹیکسی چلتی رہی اور میرا ذہن اُس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ فعال رہا۔ یقیناً یہ سارا کارنامہ میرے دشمنوں کا تھا جنہوں نے میرے ہی شہر میں مجھے اجنبی بنا دیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، فی الحال میں اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔ میری کوٹھی اور میری فرم پر کسی شخص ایاز کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ میرے بینک اکاؤنٹس کو بھی صاف کردیا گیا تھا۔ یہ بہرحال کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ شخص ایاز میرے لئے قطعی اجنبی تھا، مگر اُس کا نام کچھ کچھ سنا ہوا سا لگ رہا تھا۔ بینک منیجر کی یہ بات بھی ابھی تک میرے ذہن میں گونج رہی تھی کہ اُس نے سنا تھا، میں امریکہ میں سیٹل ہو چکی ہوں۔ جن لوگوں نے بھی اس بات کو شہرت دی تھی یقیناً وہ میرے حریف تھے۔ اس سے ان لوگوں کو میری کوٹھی اور کاروبار پر قابض ہونے میں آسانی رہی ہوگی۔ اُنہوں نے مشہور کیا ہوگا کہ میں اپنے تمام اثاثے فروخت کر کے امریکہ چلی گئی ہوں۔ میری غیر حاضری نے اُن کی بات کو مزید مستحکم کردیا ہوگا۔

اسی سوچ بچار میں سوسائٹی کا علاقہ آ گیا اور میں، ٹیکسی ڈرائیور کی رہنمائی کرنے لگی۔

ٹیکسی کو دلاور کی کوٹھی کے سامنے رُکوا کر جب میں اُتر رہی تھی تو ڈرائیور بولنے سے باز نہ آیا۔ ''ذرا جلدی لوٹ کر خبر لیجئے گا!''

''تم مطمئن رہو۔ میرے لوٹنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں ملازم کے ہاتھ کرایہ بھجوا دُوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ٹیکسی کے میٹر پر نظر ڈالی۔ میٹر کچھ زیادہ ہی تیز رفتاری کا ثبوت دے رہا تھا، مگر یہ موقع میٹر غلط ہونے پر احتجاج کرنے کا نہیں تھا۔

دلاور میری خوش قسمتی سے گھر ہی پر مل گیا۔ وہ مجھے یوں اچانک دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔

''یہ کوئی خواب ہے یا اس کی تعبیر؟'' بالآخر وہ بول اُٹھا۔ پھر ایک شعر پڑھا ۔

وہ آئیں ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے۔
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

''شاعری کرتے رہنا، پہلے ٹیکسی کا کرایہ اپنے ملازم سے بھجوا دو!'' یہ کہہ کر میں نے ٹیکسی کا کرایہ بتایا۔

''براہِ راست امریکہ سے آپ نے یہاں نزول فرمایا ہے یا کہیں اور......''

''تم پہلے ٹیکسی کا کرایہ بھجواؤ!'' میں اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''ابھی لیجئے سرکار!'' یہ کہہ کر اُس نے اپنی جیب سے پرس نکالتے ہوئے ملازم کو آواز دی۔

جب ملک دلاور نے ملازم کو ٹیکسی کا کرایہ دے کر باہر بھیج دیا تو مجھے اطمینان ہوا اور میں نے طویل سانس لی، یوں جیسے میرے ذہن سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔

''اب جلدی سے عمدہ سی کافی پلوا دو!'' میں نے بے تکلفی سے کہا۔

''ضرور پلواؤں گا اس لئے کہ آپ بھی مجھے شربت دیدار پلوا رہی ہیں۔ مگر یہ تو بتایئے! کیا خرکاروں نے آپ کو بالکل بھی یہ موقع نہیں دیا تھا کہ آپ وہاں سے نکل بھاگتیں؟'' وہ شوخی سے بولا۔

"ہارے رے تمہاری کطعی اور ہائے رے تمہارا موکع! یقین کرو کان ترس گئے تھے سننے کو!" یہ کہہ کر میں ہنس دی۔ ملک دلاور کی موجودگی میں خود کو قدرے ریلیکس محسوس کر رہی تھی ورنہ کراچی ایئر پورٹ پر اُترنے کے بعد سے اب تک میرے اعصاب کشیدہ ہی رہے تھے۔

اُسی وقت ملازم، ٹیکسی کا کرایہ دے کر آ گیا اور بقیہ روپے ملک دلاور کو دے دیئے۔ دلاور نے بغیر گنے روپے جیب میں رکھ لئے، پھر بولا۔ "بابا! عمدہ سی کافی!"

"ابھی لایا بنا کر صاحب!" ملازم نے سعادت مندی سے کہا اور چلا گیا۔

"ہاں تو اے عزت مآب وعفت مآب خاتون! یہ بتائیں کہ اچانک آپ کو کیا سوجھی کہ امریکہ شریف میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کر لیا؟" دلاور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "پھر یہ کہ مل کر بھی نہیں گئیں۔"

"یہ ہوائی کس دُشمن نے اُڑائی تھی؟" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں وہ کون تھا، ہم نے اُڑتی اُڑتی خبر سنی تھی۔"

میں سنجیدہ ہو گئی اور دلاور سے کہا۔ "میرے خلاف کوئی زبردست سازش کی گئی ہے۔ تمہیں اس سلسلے میں جو کچھ معلوم ہو، بتا دو!"

"مگر پہلے یہ تو معلوم ہو کہ کیا واقعی آپ امریکہ چلی گئی تھیں؟" اُس نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ بتاؤ کہ تم ایاز ایم جہانگیر کو جانتے ہو؟ کون شخص ہے یہ؟"

"یہ وہی شخص ہے جس کے ہاتھوں آپ اپنے تمام اثاثے فروخت کر کے اچانک غائب ہو گئی تھیں۔" دلاور نے بتایا۔ "یہ غالباً اب سے کوئی تین مہینے پہلے کی بات ہے۔"

"کیا تم اُس شخص کے بارے میں کچھ اور بھی جانتے ہو؟ کون ہے؟ کیا ہے؟" میں نے دلاور سے دریافت کیا۔

"صدرِ مملکت کے مشیر شہریار کا سالا ہے یہ شخص۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

دلاور کا جواب سن کر میں چونک اُٹھی۔ اب مجھے گویا اس اُلجھی ہوئی گتھی کا ایک سرا مل گیا تھا۔ ایک طویل عرصے تک میں، جیکب کے ٹرانس میں رہی تھی اور یہ ظاہر ہی ہو چکا تھا کہ شہریار اور جیکب کے درمیان کیا تعلقات تھے! یقیناً اسی دوران میں جیکب نے مجھ سے جائیداد وغیرہ کے کاغذات پر دستخط کرا لئے ہوں گے ایسی حالت میں مجھ سے چیکوں اور دیگر مطلوبہ ضروری کاغذات پر دستخط کرا لینا بھی کوئی مشکل نہیں رہا ہو گا میں اُس وقت پوری طرح اپنے حریفوں کے قابو میں تھی۔ اُنہوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر مجھے پوری طرح کنگال کر دیا تھا۔ ہرچند کہ سوئٹزرلینڈ کے ایک بینک میں میرا کافی سرمایہ جمع تھا مگر فوری طور پر پاکستان اُس کی منتقلی ممکن نہیں تھی۔ یہاں کے بینک میں میرے ذاتی اکاؤنٹ اور فرم کے نام سے تقریباً ڈیڑھ دو کرو روپیہ تھا جس پر اُنہوں نے ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار میں بھی ا کروڑ کے قریب رقم رولنگ میں تھی۔ کوٹھی کے علاوہ وہ بلڈنگ بھی میری تھی جس میں عذرا انٹر پرائزز کا آ تھا۔ وہ بلڈنگ کاروباری علاقے میں تھی۔ اُس کی قیمت بھی پچاس لاکھ سے کم نہیں تھی۔ ایک فلور پر میرا دفتر تھا اور بقیہ چار منزلیں کرائے پر تھیں۔ ہر ماہ اُس بلڈنگ کا کرایہ باون ہزار روپے آتا تھا۔ بلڈنگ کی تیسری منز

ایک غیر ملکی بینک کو میں نے کرائے پر دی ہوئی تھی جہاں اس کا ہیڈ آفس تھا۔ جس وسیع وعریض کوٹھی میں میری سکونت تھی، اُس زمانے میں بھی اُس کی قیمت دس بارہ لاکھ سے کم نہیں تھی۔ کوٹھی، دفتر اور بینک اکاؤنٹس پر قبضہ کر کے میرے حریفوں کو ایک بڑی دولت ہاتھ میں آئی تھی۔ جس عمارت میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر تھا، مجھے اب اُس کی طرف سے بھی فکر تھی۔ اُس بلڈنگ کے کاغذات ایک غیر ملکی بینک کے لاکر میں تھے اس لئے میں کسی قدر مطمئن تھی۔ پھر یہ بھی کہ میرے اور آپریشن سیل کے ارکان کے سوا کسی کو اس کے متعلق علم نہیں تھا۔

اس کے باوجود میں نے فوری طور پر صورتِ حال کا اندازہ لگانے کی خاطر وہاں فون کرنا ضروری خیال کیا۔

"ذرا فون تو اُٹھاؤ اِدھر!" میں نے دلاور سے کہا۔ میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"یہ آپ کا روئے زیبا اِک دم پھول کر کپا کیوں ہو گیا؟ کیا اچانک کسی ہرجائی بلما کی یاد آ گئی؟" دلاور نے مجھے چھیڑا۔

"تم فون تو دو نا!" میں جھنجھلا سی گئی۔ مجھے اس وقت ملک دلاور کی شوخی گراں گزر رہی تھی۔

دلاور بغیر کچھ کہے اپنی نشست سے اُٹھا اور تپائی پر ایک طرف رکھا ہوا فون اُٹھا لیا۔ اسی دوران میں اُس کا ملازم کافی بنا لایا۔

میں نے کافی کے کپ سے چسکی لیتے ہوئے اُسے سامنے میز پر رکھ دیا اور پھر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملانے لگی۔ جلد ہی دوسری جانب سے ریسیور اُٹھا لیا گیا۔

"یس!" دوسری جانب سے مخصوص لہجے میں کہا گیا اور میرا دل تیزی سے دھڑک اُٹھا۔ یقیناً یہ عثمانی کی آواز تھی۔ گویا آپریشن سیل کا نظام بدستور تھا۔ میرے حریف اُس تک نہیں پہنچ سکے تھے اور یہ امر میرے لئے نہایت اطمینان کا باعث تھا۔

"میں عذرا خان بول رہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں اپنے لہجے کی تھرتھراہٹ پر قابو نہ رکھ سکی۔

"آداب...... آداب!" اُس کی آواز میں بھی جوش تھا۔ "آپ...... آپ کہاں سے بول رہی ہیں؟"

"یہیں کراچی سے۔" میں نے جواب دیا۔ "تم سب لوگ ٹھیک تو ہو نا؟"

"جی...... جی ہاں بالکل!"

"میں کوشش کروں گی کہ آج ہی تم لوگوں سے ملاقات ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"آپ...... آپ کہاں تھیں اب تک؟...... کمانڈر نواز نے بتایا تھا کہ آپ کسی کام سے قاہرہ......"

"یہ سب باتیں ملاقات ہونے پر کروں گی، تم سب کو میری آمد سے مطلع کر دو۔" میں اُس کی بات کاٹ کر بولی، پھر کہا۔ "خدا حافظ!"

"خدا حافظ!" دوسری جانب سے عثمانی نے کہا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ملک دلاور کی موجودگی میں اُس سے زیادہ گفتگو کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آپریشن سیل اُس کے لئے بھی بہرحال ایک راز تھا۔

فون کر کے میں کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے حالات پر غور کرنے لگی۔ دلاور سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تین ماہ قبل میرے حریفوں نے میرے تمام اثاثے پر قبضہ کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ کم از کم چار مہینے میں

دنیا و مافیہا سے بے خبر رہی تھی۔ جیکب کو مجھے پوری طرح قابو میں لانے اور اپنے اشاروں پر نچانے میں ایک مہینہ تو لگا ہی ہوگا۔ گویا آپریشن سیل کے ارکان کو چار ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ ہر ماہ تقریباً پچپن ہزار روپے کی تنخواہیں آپریشن سیل کے ارکان میں تقسیم ہوتی تھیں۔ اس حساب سے صرف تنخواہوں کے لئے مجھے دو لاکھ بیس ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ دیگر اخراجات الگ تھے جن کا تخمینہ تقریباً دس پندرہ ہزار روپے مہینہ بنتا تھا۔

''اب کچھ بولیں گی بھی کہ یونہی گُم سُم بیٹھے رہیں گی؟'' دلاور کی آواز مجھے خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی۔ ''اس بندۂ بے دام کے لئے کوئی خدمت ہو تو بتائیں، فکر کی کیا بات ہے؟''

دلاور کے لہجے میں ایسی شوخی تھی کہ میں مسکرا دی۔ پھر وہ بات میری زبان پر آہی گئی جو میں سوچ رہی تھی۔

''لو، تو اس میں ایسے برے برے منہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی بینک ٹائم نہیں نکلا۔ میں خود چل کر چیک کیش کرا کے رقم آپ کے حوالے کئے دیتا ہوں۔ اور حکم فرمائیں؟''

اُس وقت دلاور مجھے بہت مخلص نظر آیا۔ اس شہر میں اور لوگ بھی ایسے تھے جن سے میں پانچ لاکھ روپے قرض مانگتی تو انکار نہ کرتے، مگر اُن سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔ اُن کے سامنے میری زبان نہ کھلتی۔ اس سے پہلے کبھی میں نے دلاور سے بھی قرض نہیں مانگا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ مجھے کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑا تھا۔

''ویسے مجھے پوچھنا تو نہیں چاہئے، مگر کچھ تو بتائیں کہ آپ نے اپنے سارے اثاثے کیوں بیچ دیئے؟ جوئے میں ہار گئیں سب کچھ کہ ریس میں؟'' دلاور بدستور شوخی پر آمادہ تھا۔

''دلاور! کیا تم میری مجبوری......''

''ارے آپ تو ایک دم سیریس خانم ہوگئیں!'' وہ ایک دم بول اُٹھا۔ ''میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا جو آپ سمجھ رہی ہیں۔''

''اچھا تو پھر اُٹھو!'' میں نے آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا، مگر اسی کے ساتھ کہنے لگا۔ ''میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے کچھ نہیں بتائیں گی، عادت ہے آپ کی! پھر بھی اتنا ضرور بتا دیں کہ اب تو ایک دم غائب ہونے کا ارادہ نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''اور اگر ایسا ارادہ ہو بھی تو تمہارے پانچ لاکھ ضرور ادا کر کے جاؤں گی۔''

''یقین دلائیں پہلے۔'' وہ مسکرایا۔

''قاف سے دلا سکتی ہوں، کاف سے نہیں۔'' میں نے اُس کی کھنچائی لگائی۔

''بس یہی آتا ہے، آپ کو آف کاف!'' وہ میرے ساتھ چلتا ہوا چڑ کر بولا۔ ''حلک سے نہیں بولا جاتا مجھ سے۔''

''اس لئے کہ تمہاری بدنصیبی سے حلق میں بھی قاف ہے۔'' میں نے اُس پر پھر چوٹ کی۔

''ہوگا، مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔'' وہ بدستور چڑا ہوا تھا۔ یہ تھی ہی اُس کی دُکھتی رگ!

پھر کچھ ہی دیر بعد میں اُس کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی اُس کے بینک جا رہی تھی۔ دراصل آپریشن سیل ہیڈکوارٹر پہنچ کر میں سب سے پہلے اُس کے ارکان کی تنخواہیں ادا کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اس بات کا پورا احساس

تھا کہ تنخواہ دار لوگوں پر وقت پر تنخواہ نہ ملنے کی صورت میں کیا گزرتی ہے!

آپریشن سیل کے ارکان میں سے زیادہ تر کا تعلق متوسط گھرانوں سے تھا۔ چار مہینے تنخواہ نہ ملنا یقیناً اُن کے لئے مسئلہ بن گیا ہوگا۔ نہ معلوم اُن غریبوں نے کس طرح یہ دن گزارے ہوں گے۔ اُن کی ذمہ داری بہرحال مجھ پر تھی۔ اس لئے میں نے ملک دلاور کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے گریز نہیں کیا تھا۔

''ایک بات تو بتائیں۔'' معاً ملک دلاور نے مجھے مخاطب کیا۔

''پوچھو!'' میں بولی۔

''رہ کہاں رہی ہیں آج کل؟ کوٹھی تو آپ نے بیچ دی۔'' اُس نے پوچھا۔

''فی الحال تو کہیں نہیں رہ رہی۔''

''کیا مطلب؟.... آخر کہیں تو کیام ہوگا نا! میرا مطلب یہ کہ آج نہیں تو کل آپ کو سسرال میں آ کر رہنا ہی ہے، پھر کیوں نہ ابھی سے پریکٹس شروع کر دیں! میں آپ کے لئے کوئی کمرا صاف کرائے دیتا ہوں۔''

''منہ دھو رکھو! ہوٹل میں رہ لوں گی، مگر تم سے اپنا دماغ نہیں چٹواؤں گی۔''

''آپ کی مرضی! میں تو آپ کے بھلے ہی کو کہہ رہا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی کار ایک بینک کے سامنے روک دی۔

پھر زیادہ دیر نہیں لگی۔ دلاور نے اپنے اکاؤنٹ سے پانچ لاکھ کی رقم نکلوا کر میرے حوالے کر دی۔ میں نے اُس میں سو روپے کا ایک نوٹ الگ نکال کر بقیہ رقم کاغذ کے بڑے سے تھیلے میں رکھ لی جو دلاور نے ایک بینک کلرک سے لیا تھا۔

''جہاں جانا ہے آپ کو یہ خاکسار چھوڑ دے گا۔'' دلاور نے بینک سے نکلتے ہوئے کہا۔

''نہیں شکریہ! میں ٹیکسی میں جاؤں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر کب ملیں گی؟'' اُس نے سوال کیا۔

''جب ضرورت محسوس ہوئی یا زیادہ بور ہوئی۔''

''یعنی اس کے بغیر نہیں؟''

میں نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سامنے سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو ہاتھ اُٹھا کر روک لیا اور پھر دلاور سے بولی۔ ''خدا حافظ!''

دلاور جواباً خدا حافظ کہہ کر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا اور میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور کو میں نے آپریشن سیل کا پتہ بتایا اور پھر دلاور کی کار کو دیکھنے لگی جو سٹارٹ ہو چکی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ دلاور میری ٹیکسی کا تعاقب کر کے یہ معلوم کرنے کی ضرور کوشش کرے گا کہ میں کہاں جا رہی ہوں! میں اسی لئے چوکنا تھی۔ میں ایسی صورت میں آپریشن سیل ہیڈکوارٹر جانے کی بجائے کسی اور طرف کا رُخ کر لیتی، مگر خلاف توقع ایسا نہیں ہوا۔ دلاور نے میری ٹیکسی کا تعاقب نہیں کیا۔ غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اُسے یہ نہیں بتانا چاہتی کہ کہاں جا رہی ہوں۔ ورنہ اُس کی یہ پیشکش مسترد نہ کرتی کہ وہ مجھے کار میں وہاں چھوڑ دے گا۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے کچھ پہلے ہی میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ ایسا میں نے محض احتیاطاً کیا تھا۔ جب ٹیکسی چلی گئی تو میں نے عمارت کی طرف قدم بڑھائے۔

طویل عرصے کے بعد آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں میری آمد سے جیسے اس کے ارکان کی عیدسی ہوگئی۔ وہ سبھی جانثار پروانوں کی طرح میری اطراف جمع ہو گئے۔ عثمانی سبھی کو میری کراچی میں آمد سے مطلع کر چکا تھا۔ اُس نے کمانڈر نواز اور دیگر ارکان کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ آج ہی کسی وقت میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر آؤں گی۔ یہی سبب تھا کہ تقریباً تمام ہی ارکان میری آمد سے پہلے وہاں موجود تھے۔ اس وقت میں تمام ارکان کے ساتھ اُس ہال میں تھی جو عموماً میٹنگز کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ کمانڈر نواز اور عثمانی میرے دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

میں نے مختصر الفاظ میں اُن سب کو اُن واقعات و حالات سے آگاہ کر دیا جن سے گزر کر کراچی پہنچی تھی۔ آپریشن سیل کے ارکان کے علم میں ان باتوں کا آنا میرے نزدیک ضروری تھا۔ پھر میں نے اُنہیں یہ بھی بتایا کہ میرے حریفوں نے میری غیر موجودگی میں کیا ''کارنامہ'' انجام دیا ہے اور یہ ان کے لئے کس طرح ممکن ہوا!

میرے خاموش ہونے کے بعد کمانڈر نواز بول اُٹھا۔ ''ہم لوگوں نے اپنے طور پر بھی کچھ معلومات اس سلسلے میں حاصل کی تھیں۔ شہریار کے برادر نسبتی کے پاس تمام ضروری کاغذات موجود ہیں جن کی رُو سے وہ آپ کے تمام اثاثوں کا قانونی طور پر مالک بن چکا ہے۔ ہم ان تمام باتوں کی تصدیق کر چکے ہیں۔ ہمیں بس آپ کی طرف سے فکر تھی۔ ہم نے قاہرہ میں آپ کی ہمشیرہ ذکیہ صاحبہ سے بھی اس دوران میں دو مرتبہ رابطہ قائم کیا تھا، ایک مرتبہ اُس وقت جب آپ یہیں تھیں اور ایک بار اُس وقت جب آپ اُس شخص جیکب کے ساتھ یہاں سے قاہرہ روانہ ہوگئی تھیں۔ دونوں ہی بار اُنہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ جیسے ہی کراچی پہنچیں، اُنہیں آپ کی خیریت سے مطلع کر دیا جائے۔ میں اسی لئے اُنہیں ٹیلیگرام دیتا ہوا یہاں آیا ہوں تاکہ وہ فکرمند نہ ہوں۔''

''ویری گڈ!'' میں نے کمانڈر نواز کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہ لیا۔ یقیناً وہ ایک ذمہ دار شخص تھا۔

''تھینک یو!'' اُس نے میرا شکریہ ادا کیا۔

''فی الحال میں یہیں رہوں گی، اپنے اسی کمرے میں جو پہلے بھی میرے استعمال میں رہتا تھا۔'' میں نے بتایا۔ پھر پوچھا۔ ''میری غیر موجودگی میں اور کوئی اہم واقعہ تو پیش نہیں آیا؟''

''جی نہیں۔'' کمانڈر نواز نے جواب دیا، پھر مسکرا کر بولا۔ ''سارے ہنگامے تو بس آپ کے دم سے جنم لیتے ہیں۔''

اس موقع پر مجھے شیخ مجید کا خیال آیا۔ یہ وہی تھا جسے شہریار اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اُسی کی کوٹھی سے لوٹتے ہوئے میں اپنے حریفوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ میرے استفسار پر کمانڈر نواز نے بتایا کہ شیخ مجید بخیریت کراچی سے اسلام آباد چلا گیا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد کمانڈر نواز نے ابرار ٹیڈی کو بھی رہا کر دیا تھا جسے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں میرے ہی حکم پر رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے گروہ بند جرائم پیشہ خان لو

بھی چھوڑ دیا تھا۔

''گزشتہ تین ماہ کے اخبارات کا فائل میرے کمرے میں پہنچا دینا!'' میں نے عثمانی کو مخاطب کیا۔ ''میں اُن کا مطالعہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''بہتر ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔

اخبارات کا فائل باقاعدہ مینٹین کیا جاتا تھا اسی لئے عثمانی نے فوراً حامی بھر لی تھی۔

''کمانڈر نواز! یہ تھیلا پکڑو اور اپنی نگرانی میں تنخواہیں تقسیم کرا دو۔'' میں نے اپنے سامنے میز پر رکھا ہوا تھیلا کمانڈر نواز کے حوالے کر دیا، پھر بولی۔ ''یہ پانچ لاکھ ہیں تنخواہیں اور دیگر اخراجات کے لئے رقم نکال کر بقیہ رقم میرے کمرے میں پہنچا دینا! میں آپ تمام لوگوں سے بے حد معذرت خواہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو پورے چار ماہ پریشانی رہی۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ لوگوں کو یقیناً مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اس کے لئے ایک بار پھر معذرت!'' یہ کہتے ہی میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اُن لوگوں کے احسان مندانہ چہرے نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور نہ اس سلسلے میں کچھ سننا ہی چاہتی تھی اس لئے مزید کہا۔ ''اس سلسلے میں کچھ کہئے گا مت ورنہ میں مزید شرمندگی سے دوچار ہو جاؤں گی۔''

وہ میرے اپنے لوگ تھے اور مجھ سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے کسی نے کچھ نہ کہا اور میں تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل کر اُس کمرے کی طرف بڑھ گئی جو میرے ہی لئے مخصوص تھا۔ ہنگامی حالات میں استعمال کے لئے لباس اور تمام ہی ضروری اشیاء وہاں موجود تھیں۔ کوٹھی کے ساتھ ہی میرے استعمال میں رہنے والی کئی کاریں بھی دشمنوں کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ پھر کاریں ہی کیا میری کوٹھی میں اور بھی قیمتی ساز و سامان تھا۔ مجھے ایک ایک چیز یاد آ رہی تھی۔ اپنی لائبریری جس میں نادر و نایاب اور قیمتی کتب تھیں، اپنا اسٹوڈیو جس میں میری پینٹنگز کے علاوہ دنیا کے کئی بڑے آرٹسٹوں کی قیمتی تصاویر تھیں۔ مجھے تمام ہی سامان کا بہت دُکھ تھا، مگر سب سے زیادہ دُکھ اپنے وفادار ملازمین کا تھا جس میں فاطمہ بھی تھی۔ اُس کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ نہ جانے کہاں ہوگی! ان سب لوگوں کے بغیر میں خود کو ادھورا ادھورا سا محسوس کر رہی تھی۔ میری فرم سے وابستہ ملازمین جن کا تعلق آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے تھا مثلاً نرگس، بلقیس، ساجد وغیرہ، وہ تو اب بھی میرے کانٹریکٹ میں تھیں۔ مگر بقیہ کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ ظاہری بات تھی کہ اُن سب کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا ہوگا۔ میری فرم کی ذہین و تعلیم یافتہ اور ذمہ دار منیجر عارفہ بھی ان میں شامل تھی۔ عارفہ کے گھر کا فون نمبر میرے پاس تھا۔ میں نے سوچا، کیوں نہ فون کر کے اُس کی خیریت معلوم کر لی جائے۔ اُسی سے اُن حالات کا علم بھی ہو سکتا تھا جو میری غیر موجودگی میں ان لوگوں کو پیش آئے تھے۔ یہی سوچ کر کمرے میں آتے ہی میں نے اُس کا فون نمبر ملایا۔

فون اُٹھانے والی عارفہ کی بڑی بہن تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ''کیا عارفہ گھر پر ہیں؟''

''جی ہاں!'' اُس کی بہن نے جواب دیا۔

''ذرا اُن سے بات کرا دیجئے! میں عذرا خان بول رہی ہوں۔''

''آداب!'' وہ میرا نام سن کر بولی۔ ''ابھی بلاتی ہوں اُسے! آپ تو خیریت سے ہیں؟ کب آئیں امریکہ

سے؟"

"آج آئی ہوں اور خیریت سے ہوں۔" میں نے جواباً کہا۔

"ہولڈ کیجئے، ابھی بلاتی ہوں عارفہ کو!"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں انتظار کرنے لگی۔

مجھے یقین تو نہیں تھا کہ اتنے عرصے عارفہ جیسی ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکی بے روزگار بیٹھی رہی ہوگی، لیکن مجھے یہ اُمید ضرور تھی، جب میں اُس سے کہوں گی وہ دوبارہ میری ملازمت میں آ جائے گی۔ ذرا ہی دیر بعد دوسری جانب سے مجھے عارفہ کی نرم وشیریں آواز سنائی دی۔ وہ مجھے سلام کر کے سب سے پہلے میری خیریت پوچھنے لگی۔ پھر شکایت کرنے لگی کہ اگر مجھے کاروبار ختم کر کے امریکہ جانا ہی تھا تو کم از کم جانے سے پہلے ایک بار مل تو لیتی۔

"عارفہ! جو کچھ ہوا اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔" سچ بات میری زبان پر آ ہی گئی۔ "بہر حال مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اور فرم کی دیگر لڑکیوں کو میری وجہ سے بیروزگاری کا منہ دیکھنا پڑا۔ مگر جلد ہی میں اس کا تدارک کر دُوں گی۔ یہ بتاؤ! اس عرصے میں تم نے کہیں ملازمت کر لی ہے یا ابھی تک......" میں نے دانستہ بے روزگاری کا لفظ ادا نہ کرنے کی وجہ سے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جی ہاں، ایک فرم میں ملازمت کر لی تھی میں نے، مگر پچھلے ہفتے ہی استعفیٰ دیا ہے وہاں سے۔" اُس نے بتایا۔

"وجہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"مجھے وہاں کا دفتری ماحول پسند نہیں آیا تھا۔ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ مردوں کے ساتھ کام کرنا کتنا مشکل ہے۔" اُس نے صاف گوئی سے کہا۔

"مختصراً مجھے وہ حالات بتاؤ جو میری غیر موجودگی میں تم لوگوں کو پیش آئے۔" میں نے اُس سے خواہش ظاہر کی۔

"ہوا یہ کہ ایک دن صبح دس بجے کے قریب ایک صاحب ایاز ایم جہانگیر مجھ سے ملے اور اُنہوں نے بتایا، عذرا خان کے تمام اثاثے ہم نے خرید لئے ہیں جن میں یہ فرم بھی شامل ہے۔ یہ سن کر میں نے اُن صاحب سے کاغذات طلب کئے۔ اُنہوں نے مجھے کاغذات دکھا دیئے جن پر آپ کے دستخط تھے اور عدالت کی جانب سے جاری کردہ یہ حکم نامہ بھی کہ فرم کا چارج اُنہیں دے دیا جائے۔ اُن صاحب کے ساتھ پولیس بھی تھی، مگر اُسے مداخلت کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ایاز صاحب کے آدمی بھی چارج لینے ساتھ آئے تھے جو میرے کمرے کے باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے فرم کے تمام ملازمین کے واجبات ادا کر دیئے جو تیرہ دن کی تنخواہ پر مشتمل تھے۔ تنخواہ ادا کرنے کے بعد اُنہوں نے ہم سے فرم کا چارج لے لیا اور سب کے نام پتے بھی لکھوا لئے کہ اگر اُنہیں ہماری ضرورت ہوئی تو خط لکھ کر بلا لیں گے۔ کسی اور کے بارے میں تو مجھے علم نہیں مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ مجھے اُنہوں نے خط لکھ کر نہیں بلوایا، ویسے وہ بلواتے بھی تو شاید میں جانا پسند نہ کرتی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ فرم کا نام بھی بدل گیا ہے، عذرا انٹرپرائزز کی بجائے ایاز انٹرپرائزز نے لے لی ہے۔" عارفہ

نے مجھے تفصیل کے ساتھ تمام حالات بتا دیئے۔

"سنو عارفہ!" وہ خاموش ہو گئی تو میں نے کہا۔ "انشاء اللہ بہت جلد دوبارہ میں کام شروع کر دُوں گی۔ تم سے صرف اتنا کہنا ہے کہ اُس وقت تک کہیں اور ملازمت نہ کرنا! تم آج ہی سے خود کو ملازم تصور کر سکتی ہو۔"

"شکریہ! مگر اس کی ضرورت نہیں۔ میں آپ پر بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی۔ میں اُسی وقت خود کو ملازم تصور کروں گی، جب آپ کے نئے دفتر میں بیٹھوں گی۔ ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ اس عرصے میں ملازمت نہیں کروں گی کہیں، چاہے مجھے دو ایک مہینے بے روزگار ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔" عارفہ نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

میں سمجھ گئی کہ وہ خود دار لڑکی بغیر کچھ کئے دھرے تنخواہ لینا قبول نہیں کرے گی۔ اس لئے اُس پر مزید دباؤ نہ ڈالا، پھر مزید کچھ دیر گفتگو کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی دوران میں عثمانی نے اخبارات کا فائل میرے کمرے میں بھجوا دیا تھا۔ عارفہ سے بات کر کے میں اخبارات کی ورق گردانی کرنے لگی۔ میں اپنے ملک کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنا چاہتی تھی۔ ابھی اخبارات کا مطالعہ جاری تھا کہ کمانڈر نواز میرے کمرے میں آ گیا۔ کمرے کا دروازہ میں نے اسی لئے بند نہیں کیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں وہ لفافہ نظر آ رہا تھا جو میں نے اُسے دیا تھا اور جس میں پانچ لاکھ روپے تھے۔

"بیٹھو!" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"شکریہ!" کمانڈر نواز یہ کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا، پھر میری طرف لفافہ بڑھایا۔

"تنخواہیں اور دیگر واجبات وغیرہ ادا کر دیئے گئے؟" میں نے اُس سے تھیلا لے کر ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اُس نے جواب دیا۔ "حساب کا پرچہ اور بقیہ رقم گن لیجئے!"

"ضرورت نہیں اس کی۔ مجھے تم لوگوں پر مکمل اعتماد ہے۔" میں نے کہا۔

کمانڈر نواز نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا، پھر بولا۔ "اب یہ فرمائیں کہ شہریار نے جس طرح آپ کے تمام اثاثوں پر قبضہ کر لیا ہے، اس کی واپسی کس طرح ہوگی؟"

"تمہاری کیا رائے ہے اس سلسلے میں؟"

"زبردستی کا جواب زبردستی!" اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ آپ کی مرضی ومنشا سے نہیں ہوا اس لئے واپسی بھی اُن لوگوں کی مرضی وخواہش سے نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم!" میں اُس کی تائید میں بولی۔ "اس کا طریقۂ کار وہی ہوگا جو اُنہوں نے استعمال کیا تھا۔" میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

کمانڈر نواز کو میری بات کی تہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ بولا۔ "تو گویا ایاز کو اغوا کرنا پڑے گا؟"

"ظاہر ہے۔" میں نے اُس کے خیال کی تصدیق کی۔ "میں اس معاملے میں زیادہ تاخیر نہیں چاہتی۔ کیا خیال ہے، آج ہی رات یہ قصہ کیوں نہ ختم کر دیا جائے۔"

"بالکل! میں آپ کے خیال سے متفق ہوں۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بس یہ ہے کہ اُس نے زیادہ رقم خرد برد نہ کی ہو! بہرحال جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ آج شب اُسے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر میں ہونا چاہئے۔'' میں بولی۔

''ایسا ہی ہوگا۔'' کمانڈر نواز پُریقین لہجے میں کہنے لگا۔

''میں تمہیں ابھی کچھ ڈرافٹس بنا کر دُوں گی، اُنہیں اسٹیمپ پیپرز پر ٹائپ کرانا ہوگا۔ یہ کام آج ہی ہو جائے تو بہتر ہے تاکہ رات کو ایاز سے ان کاغذات پر دستخط کرائے جاسکیں۔''

''بہتر ہے۔ میں ڈیوٹی روم میں ہوں۔ جب آپ ڈرافٹ کرلیں تو مجھے طلب کر لیجئے گا۔''

پھر میرا اشارہ پا کر نواز اُٹھ کر چلا گیا۔ میں کمرے میں موجود الماری کی طرف بڑھی۔ سب سے پہلے میں نے الماری کی تجوری میں رقم کا تھیلا رکھا، پھر کاغذ اور قلم نکال کر رائٹنگ ٹیبل پر آ بیٹھی جو اُسی کمرے میں ایک جانب دیوار سے لگی ہوئی تھی۔

مطلوبہ ڈرافٹس وغیرہ تیار کرنے میں مجھے ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ پھر انٹرکام پر میں نے ڈیوٹی رُوم سے رابطہ قائم کر کے کمانڈر نواز کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ مجھے علم تھا کہ کمانڈر نواز ایم اے ایل ایل بی تھا۔ کچھ عرصہ اُس نے وکالت بھی کی تھی۔ جب وہ آ گیا تھا میں نے اُسے وہ سارے ڈرافٹس نظرثانی کے لئے دے دیئے اور کہا۔ ''تم ان پر ایک نظر ڈال لو اور کہیں کوئی کمی ہو تو ان میں مزید عبارت کا اضافہ کرلو۔ میں چاہتی ہوں کہ قانونی طور پر ان میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔''

کمانڈر نواز اُن کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا، پھر اُس نے دو جگہ ترمیم کی اور مجھے وہ عبارت سنائی جس کا اضافہ کیا تھا۔

''ٹھیک ہے، قانونی معاملات کو تم مجھ سے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''دراصل اس طرح فرم کا بینک اکاؤنٹ بھی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔'' اُس نے وضاحت کی۔

''میں سمجھ رہی ہوں۔'' میں بولی، پھر کہا۔ ''اُسے اغواء کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی چیک بُک بھی تمہیں ساتھ لانی ہے۔ یقیناً اُس نے بہت سی رقم اپنے پرسنل اکاؤنٹ میں بھی رکھی ہوگی۔''

''میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی۔ بہرحال آپ نے مزید یاددہانی کرا دی۔'' وہ بولا۔

''اچھا اب تم جاؤ!''

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب دوپہر ہو رہی تھی اور مجھے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ انٹرکام پر میں نے کچن سے رابطہ قائم کیا اور کھانے کے لئے کہا۔ کھانا آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اس لئے کہ سبھی کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ فی الحال میرا قیام آپریشن سیل ہیڈکوارٹر ہی میں رہے گا۔ باورچی نے پہلے ہی میری پسندیدہ ڈشیں تیار کر لی تھیں جن میں کوفتے اور ماش کی دال سرفہرست تھی۔ میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور پھر جب ملازم کھانے کے برتن لے کر چلا گیا تو چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے میں اُن حالات پر غور کرنے لگی جن سے گزری تھی۔ ان حالات کے نتیجے میں آئندہ کیا واقعات پیش آسکتے تھے، میں ان پر غور کر رہی تھی۔ میرے فرار کے بعد یقیناً ڈاکٹر رچرڈ خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اسی پر غور کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ ڈاکٹر رچرڈ جیسا شخص اس نکتے کو بھی نظرانداز نہیں کرے گا کہ فرار ہو کر میں پاکستان بھی پہنچ سکتی ہوں۔ اگر واقعی اُس کے

ذہن میں یہ خیال آ گیا ہوگا تو اُس نے پاکستان میں اپنے گرگوں کو میرے فرار سے مطلع کر دیا ہوگا۔ پاکستان میں دنیا کی بڑی طاقت کا سب سے اہم اور مضبوط مہرہ صدرِ مملکت کا مشیر شہریار ہی تھا۔ میں سوچنے لگی، کیا شہریار کو میرے قاہرہ سے فرار ہونے کے بارے میں آگاہ کر دیا گیا ہوگا؟ اور ایسی صورت میں اُس کا ردِعمل کیا ہوسکتا ہے؟ اُس نے خود سامنے نہ رہ کر میرے تمام اثاثے اپنے برادرِ نسبتی ایاز کے نام کرا دیئے تھے۔ قریبی تاریخوں کے اخبارات کا مطالعہ کر کے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ان دنوں شہریار، اسلام آباد میں تھا۔ میں نے اسی لئے جلد از جلد اُس کے سالے ایاز پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر انہی حالات پر غور کرتی ہوئی بستر پر دراز ہوگئی۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی، مگر ایک عجیب سی بےکلی تھی جو مجھے سونے نہیں دے رہی تھی اور اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بہرحال اس بےکلی کے باوجود کروٹیں بدلتے بدلتے کچھ دیر کو میرے ذہن پر غنودگی طاری ہو ہی گئی۔

میں جب بیدار ہوئی تو شام کے چار بج رہے تھے۔ میں اُٹھ کر اٹیچ باتھ رُوم میں گھس گئی۔ غسل کرنے سے طبیعت کو کچھ فرحت محسوس ہوئی۔ پھر جب میں شام کی چائے پی رہی تھی تو کمانڈر نواز کے آنے کی اطلاع ملی۔ ڈیوٹی رُوم سے انٹرکام پر عثمانی نے مجھے اُس کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ میں نے اُسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ مطلوبہ عبارت اسٹیمپ پیپرز پر ٹائپ کرا کے لے آیا تھا۔

میں نے اُن پر ایک نظر ڈالی اور پھر اُن کاغذات کو ایک جانب رکھ دیا۔

''رات کو ایاز کے اغوا کا پروگرام بنا لیا تم نے؟'' میں نے اُس سے پوچھا۔

''جی ہاں، میں تمام تیاری کر چکا ہوں۔'' اُس نے جواب دیا۔

''وہ آپ ہی کی کوٹھی میں سکونت پذیر ہے اور کوٹھی ہماری دیکھی بھالی ہے۔ انشاء اللہ کوئی دقت نہیں ہوگی ہمیں۔''

''اُس کے معمولات کے بارے میں معلوم کیا تم نے کہ وہ کب کوٹھی پہنچتا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ممکن ہے وہ رات کو دیر سے کوٹھی لوٹتا ہو۔''

''معاف کیجئے گا، مجھے اس کا موقع ابھی نہیں مل سکا۔'' اُس نے صاف گوئی سے بتایا۔

''یہ ضروری ہے۔'' میں نے ہدایت کی۔

''بہتر ہے، میں بھی تمام معلومات حاصل کئے لیتا ہوں۔'' کمانڈر نواز نے یہ کہہ کر اجازت چاہی۔

''ٹھہرو ابھی!'' میرے ذہن میں نہ معلوم کیوں ایک کھٹک سی تھی۔ میں کھانا کھانے کے بعد سے ایک عجیب سی بےکلی محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی سامنے کی بات میری نظر سے اوجھل ہوگئی ہے۔

کمانڈر نے مجھے کچھ سوچتے ہوئے دیکھ کر مداخلت نہ کی اور خاموش بیٹھا رہا۔

''تم ایسا کیوں نہ کرو کہ ابھی سے ایاز کی نگرانی شروع کرا دو تاکہ وہ تمہاری نظر میں رہے۔'' میں نے محسوس کیا، کمانڈر نواز سے یہ بات کہتے ہوئے میری بےچینی قدرے کم ہوگئی تھی۔

''جی ہاں یہ بھی ممکن ہے۔'' وہ بولا۔ ''بلکہ یہ بہتر رہے گا، میں ابھی کیپٹن شاد کو اُس کی نگرانی پر متعین کر دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، اب تم جاسکتے ہو۔'' میں نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔

کانڈرواز میرے کمرے سے چلا گیا۔ میں اس دوران میں چائے پی چکی تھی۔ اختتام پر میں نے چائے کے برتن لے جانے کو کہا اور پھر اپنے خیالوں میں کھو گئی۔ اب میں اپنے اضطراب کا سبب کچھ کچھ سمجھ چکی تھی۔ معلوم کہیں نیاز کے اغواء کا معاملہ اور یہ معاملات مجھے آسانی سے حل ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ غالباً اسی احساس کے پیش نظر میں نے نیاز کی نگرانی کا حکم دیا تھا۔

کہیں نہ کہیں کوئی بات ایسی ضرور تھی جس سے میری چھٹی حس کو متحرک کر دیا تھا۔ عموماً اسی وقت مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوتی تھی جب میری منصوبہ بندی میں کوئی خامی ہوتی تھی۔ اپنی منصوبہ بندی میں مجھے بظاہر یہی خامی نظر آئی تھی کہ میں نے ابھی تک نیاز کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں کیا تھا۔ اس کی نگرانی کا حکم بالواسطہ اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

اسی عالم میں تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پھر ایک دم انٹرکام کھٹکا اٹھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب کانڈرواز تھا۔ "ہاں کہو، کیا بات ہے؟" میں اس کی آواز پہچان کر بولی۔

"مس ابھی ابھی مرا سکھر سے گل شاہ نے رپورٹ دی ہے کہ نیاز نہ دفتر میں ہے نہ کوٹھی پر۔" کانڈرواز نے بتایا۔

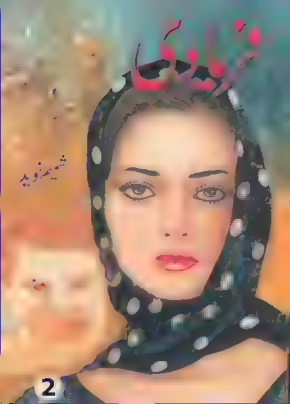
"جہاں جہاں اس کے ملنے کے امکانات ہیں، اسے تلاش کرو!" میں نے مضطرب ہو کر حکم دیا۔ "ممکن ہے دفتر یا کوٹھی میں اس نے کوئی پیغام چھوڑا ہو کہ وہ کہاں گیا ہے؟"

"بہتر ہے" یہ کہہ کر کانڈرواز نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر رات گئے تک آپریشن سیل کے اہلکار سارے شہر میں نیاز کو تلاش کرتے پھرے مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ دوپہر دو بجے کے قریب دفتر سے کوٹھی پہنچا تھا۔ پھر اپنے سوٹ کیس میں کچھ سامان اور کاغذات رکھ کر وہ بغیر کچھ کہے سنے کہ کہاں جا رہا ہے کوٹھی سے نکل گیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی بیوی کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ خود اس کی بیوی بھی اس سلسلے میں پریشان تھی۔ اس سے پہلے وہ کبھی اس طرح غائب نہیں ہوا تھا۔ کوٹھی سے سوٹ کیس لے کر نکلتے ہوئے وہ اکیلا ہی تھا۔ عموماً وہ خود کار ڈرائیو نہیں کرتا تھا مگر اس وقت اس نے ڈرائیور کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ اس کی کار اس کے دفتر کے سامنے کھڑی تھی۔ کار کی چابیاں وہ دو بجے چھوٹے بھائی کو دے گیا تھا جو اس کے دفتر ہی میں ملازم تھا۔ اس کے بعد نیاز کو کہیں نہیں دیکھا گیا۔ نیاز کے چھوٹے بھائی کو بھی اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

نیاز کی پراسرار گمشدگی نے گویا میرے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔ میں چکرا کر رہ گئی تھی۔ میرے تمام اندازوں کا قانونی طور پر وہی ایک تھا۔ جب تک وہ میرے ہاتھ نہ آتا میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بار بار میرے ذہن میں یہی سوال گونج رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے؟ مگر اس سوال کا مجھے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اب میں سمجھ چکی تھی کہ دوپہر سے میری بے کلی بے سبب نہیں تھی۔

عذرا خان کی پراسرار آپ بیتی ابھی جاری ہے۔ بقیہ واقعات کیلئے دوسرے حصہ کا مطالعہ کریں۔


2

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور میرا اضطراب اپنے نقطہ عروج پر تھا۔ میں کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔ آپریشن ٹیبل کے امکان میرے کسی بھی قسم کے خطرے تھے۔ میری کیفیت کسی ایسے مسافر کی سی تھی جسے صحرا میں دور کہیں نخلستان نظر آ گیا ہو اور قریب پہنچنے پر اس نخلستان نے سراب کا روپ دھار لیا ہو۔ مجھے اب حالات پر از سر نو غور و فکر کرنے کی ضرورت تھی۔ بظاہر تو یہی لگ رہا تھا کہ بس اچانک ہی وہ غائب ہو گیا ہے اور اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا لیکن یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی۔ یہ سب کچھ بے سبب نہیں ہوا تھا۔

کافی دیر غور و خوض کرنے کے بعد مجھے یہی امکان نظر آیا کہ کہیں نہ کہیں اصلی خطرہ ابھی باقی ہے اور ڈاکٹر ولی بنانے والا ڈاکٹر رچرڈ ابھی بھی ہو سکتا تھا۔ یہ نکتہ آج دوپہر ہی میرے ذہن میں آیا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ شہریار کو میرے فرار سے آگاہ کر سکتا تھا جو انتقام کے جذبے پر کہیں ظاہرہ سے فرار ہو کر ہی پاکستان تک پہنچ پایا تھا۔ نیاز کو اس سے بچانا ہی گیا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو کسی نہ کسی طرح اس کی تصدیق ضروری تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ میرے دشمن اس سے واقف رہیں کہ میں بحفاظت پاکستان پہنچ گئی ہوں۔ اس طرح ایک طرف تو میں ان کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہتی دوسری جانب ان سے نبرد آزما ہونے کیلئے لائحہ عمل مرتب کر سکتی۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ اب میں پہلے کی نسبت زیادہ قوی اور اپنے حریفوں کیلئے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہوں۔ ڈاکٹر رچرڈ نے میرے ذہن پر جو تجربہ کیا تھا اس کے نتیجے میں مجھے حیرت انگیز اور ناقابل یقین سی قوتیں حاصل ہو گئی تھیں مگر میں ان قوتوں کو جا اور بے جا ہر موقع پر استعمال کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ میں ان حیرت انگیز قوتوں کو اپنے دشمنوں کے خلاف یا پھر انتہائی مجبوری اور ضرورت کے وقت استعمال کرنا چاہتی تھی۔ دراصل یہ اپنی سوچ اور اپنے فکر کی بات ہے۔ کچھ لوگ اپنے اقتدار و طاقت کی نمائش پسند کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی انہیں با اقتدار اور با اختیار تصور کریں۔ کچھ ایسے افراد ہوتے ہیں جو قوت و اختیار رکھنے کے باوجود اس کی نمائش کرتے ہیں نہ اسے بے جا طور پر استعمال کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ تو میں بھی ما فوق الفطرت اقتدار اور اختیار بھی قدرت کا عطیہ ہیں۔ ان عطیات کا بے جا استعمال قدرت کو پسند ہے نہ انسانیت کا تقاضا ہے۔ انسان کو قدرت نے بے پناہ صلاحیتوں اور قوتوں سے نوازا ہے۔ کچھ مخصوص افراد تک محدود ہوتی ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسانی ذہن کی کچھ قوتیں خوابیدگی کی حالت میں ہوتی ہیں مگر انہیں کسی طرح متحرک کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ وضاحت کرنے کی مجھے یوں ضرورت پیش آئی کہ میری آپ

بیتی کو ماورائی اور افسانوی نہ سمجھا جائے۔ زندگی بڑی عجیب اور حیرت ساماں ہے۔ عام زندگی میں ہمارے سامنے بہت سے ایسے واقعات گزرتے ہیں جو ناقابل یقین سے معلوم ہوتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ ہم حقائق کو کس طرح جھٹلا سکتے ہیں۔

میری آپ بیتی پڑھتے ہوئے یہ سوال بھی ذہنوں میں ابھر سکتا ہے کہ جب میں اتنی حیرت انگیز قوتوں کی مالک بن چکی تھی تو میرے اختیار میں سب کچھ تھا۔ میں جو بھی چاہتی کرتی نہ میرے لیے پیسے کا حصول کوئی مسئلہ تھا اور نہ کسی سے کوئی جا و بے جا بات منوا لینا کوئی مشکل۔ میں نے اسی لیے اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ میرا انداز فکر کیا ہے۔ مثبت اور منفی' خیر اور شر ان کے درمیان ہمیشہ میں نے حتی الامکان واضح فرق قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں ان دنوں جن حالات سے دوچار تھی اور جن صبر آزما مراحل سے گزر رہی تھی' ان کے باوجود میرا مخصوص انداز فکر اپنی جگہ قائم تھا۔

ایاز کے بارے میں آپریشن سیل کے ارکان نے جو معلومات فراہم کی تھیں' ان پر کسی قسم کے شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی' مگر اب میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ سیل کے ارکان میری طرح بہرحال حیرت انگیز ذہنی قوتوں کے مالک نہیں تھے۔ اگر میں خود اس معاملے کی تفتیش کرتی تو ممکن تھا کوئی نیا گوشہ سامنے آ جاتا۔ اس رات میں یہی سوچتے ہوئے سو گئی کیوں کہ صبح سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر میرا ذہن قدرے پرسکون تھا کیوں کہ میں اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل مرتب کر چکی تھی۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے انٹرکام پر ڈیوٹی روم کا نمبر ملایا۔ کمانڈر نواز اپنے ماتحت عثمانی کو چارج دے کر جا چکا تھا۔

''ایاز کے متعلق کوئی نئی رپورٹ؟'' میں نے عثمانی سے دریافت کیا۔

''جی نہیں جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔''

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ کیا قدم اٹھانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ان حالات میں آپریشن سیل کو میں اپنے اقدامات سے باخبر رکھنا چاہتی تھی۔

''اس سلسلے میں مزید کوئی حکم؟'' عثمانی نے پوچھا۔

''اگر کہیں تو آپ کی نگرانی کا بندوبست کر دیا جائے۔''

''نہیں' میرے خیال میں فی الحال اس کی ضرورت نہیں کیوں کہ ابھی یہ بات سامنے نہیں آئی کہ ہمارے حریفوں کو پاکستان میں میری موجودگی کا علم ہو چکا ہے۔ دوم یہ کہ میں تمہیں ابھی بتا ہی چکی ہوں میک اپ کے بغیر باہر نہیں نکلوں گی۔'' میں نے اسے بتایا۔

''بہتر ہے۔'' عثمانی کی آواز سنائی دی۔

میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا اور پھر الماری سے میک اپ کا سامان نکال کر آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ میک اپ کرتے ہوئے میں نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ میرے چہرے میں کوئی ایسی خاص اور نمایاں علامت نہ ہو کہ خواہ مخواہ کوئی میری طرف متوجہ ہو۔ میں بس ایک عام سی لڑکی نظر آؤں۔ ایک ایسا چہرہ جسے کوئی یاد رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ میک اپ کرتے ہوئے مجھے ملک دلاور کا خیال بھی آیا تھا۔ وہ بہرحال میرا بہی خواہ تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میرے خلاف کوئی

زبردست سازش کی گئی ہے۔ میری بات سن کر اس وقت تو دلاور نے بظاہر کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا' لیکن میں جانتی تھی کہ وہ میری طرف سے فکرمند ہو گا۔ یہی سوچ کر میں نے اسے اپنی خیریت سے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔ میں نے ٹیلی فون اٹھا کر اپنے قریب کیا اور دلاور کا نمبر ملانے لگی۔

''ہیلو!'' دوسری جانب سے نمبر ملنے کے بعد آواز آئی۔ میں نے آواز سے پہچان لیا کہ وہ دلاور کا کوئی ملازم ہے۔

''اپنے صاحب سے کہو کہ میرا فون ہے۔ میں عذرا خان بول رہی ہوں'' میں بولی۔

''سلام بی بی جی! میں ابھی صاحب سے کہتا ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ملک دلاور کے سبھی ملازم مجھ سے واقف تھے۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور فون پر ملک دلاور کی آواز سنائی دی۔ ''زہے نصیب کہ آج صبح ہی صبح آپ کی آواز سنائی دی۔'' اب دن بھر جتنی آوازیں سنوں گا بس اسی طرح ٹھنڈی میٹھی سنائی دیں گی۔ یہ تو آپ نے سنا ہی ہو گا کہ صبح اٹھ کر کوئی اچھا چہرہ نظر آ جائے تو سارا دن اچھا گزرتا ہے۔ اسی کہاوت کو میں نے آواز سننے پر بھی اپلائی کر لیا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''کوئی اچھا خیال نہیں ہے۔''

''کیوں؟ یہ آپ کو برے برے خیال کب سے آنے لگے؟''

''دراصل مجھے یہ ڈر ہے کہ کسی دن صبح ہی صبح تم کسی بکرے کو ممیاتے ہوئے نہ سن لو پھر تم خود سوچو کہ دن بھر تمہارا کیا حال ہو گا؟''

''حد ہے آپ سے بھی! کہاں میرے نازک اور لطیف جذبات اور کہاں بکرا! سارا رومانی موڈ آپ نے چوپٹ کر دیا۔''

''تو تم سے کہا کس حکیم نے ہے کہ تم ہر وقت رومان کے گھوڑے پر چڑھ کر سرپٹ دوڑتے رہا کرو۔''

''لو اور سنو! اب بکرے کے بعد یہ ظالم گھوڑا درمیان میں آ کودا' ویسے آج کل انسانوں کی بجائے جانور آپ کے حواس پر زیادہ مسلط نظر آ رہے ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟'' وہ بدستور اپنی عادت کے مطابق چہکتا رہا' پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''خیریت سے تو ہیں نا؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہیں اسی لئے فون بھی کیا تھا' مگر تم ایک دم اڑنگ بڑنگ ہانکنے لگے۔''

''بس پوچھیے نہیں کہ اس وکت میرے دل مضطرب کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ تھامے ہوئے ہوں اپنے سینے کو ورنہ ابھی پہلو سے نکل کر رقص بسمل شروع کر دے۔ ہائے میرے یہ نصیب کہ آپ کو میرا خیال آئے اور اپنی خیریت دینے کیلئے مجھے فون کریں۔''

وہ اور نہ جانے کیا کیا کہتا کہ میں بول اٹھی۔ ''اچھا خدا حافظ!''

''ارے ارے سنیں تو سہی! ٹھہری کہاں ہیں؟ یہ تو بتا دیں کم سے کم۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''ایسی جگہ جہاں تم بھی نہیں پہنچ سکتے۔''

''چیلنج کر رہی ہیں؟''

''نہیں' یہ حقیقت ہے۔''

''آپ شاید دل والوں سے واقف نہیں اور آپ کو فرہاد کا کصہ بھی یاد نہیں رہا جس نے شیریں کی خاطر دودھ کی نہر کھود نکالی تھی اور مجنوں کا کصہ......''

''تم جوش جذبات میں یقیناً پیدل ہو گئے ہو اسی لئے کوئے پر اتر آئے ہو۔ اس کا علاج میرے نزدیک یہی ہے کہ......'' پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا' میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ دلاور کے پاس آپریشن سیل کا نمبر نہیں تھا اس لئے میں مطمئن تھی کہ وہ مجھے فون نہیں کر سکے گا ورنہ ایسے مواقع پر وہ دوبارہ فون ملا کر ''شروع'' ہو جاتا تھا۔ اسے فون کرنے کا جو میرا مقصد تھا' وہ حل ہو چکا تھا۔

پھر میں نے اپنے پرس میں ضروری اشیاء رکھیں' آئینے پر آخری نظر ڈالی اور کمرے سے نکل گئی۔ کچھ ہی دیر بعد میری سپورٹس آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی عمارت سے نکل رہی تھی۔ یہ کار عموماً بہ وقت ضرورت پہلے بھی میرے استعمال میں رہتی تھی۔ عمارت سے نکلتے ہی میں نے احتیاطاً اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر اطمینان سے کار ڈرائیو کرنے لگی تھی۔

اس وقت میرے احساسات عجیب سے تھے۔ میری کار کا رخ اپنے دفتر کی طرف تھا' مگر اب وہ دفتر میرا نہیں رہا تھا' اس پر میرے حریف قبضہ کر چکے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ قسمت بھی آدمی کے ساتھ کیا کیا کھیل کھیلتی ہے۔ جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا' سامنے آ جاتا ہے۔''

اپنے دفتر کی عمارت سے کچھ پہلے ہی میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر اپنی کار پارک کی اور پھر پیدل ہی اس طرف چلنے لگی۔ یہ بھی محض ایک احتیاطی قدم تھا ورنہ دفتر کی عمارت کے سامنے بھی کار پارکنگ کی گنجائش تھی۔ یہ کاروباری علاقہ تھا اور صبح کا وقت تھا اس لئے خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ میں بھیڑ سے بچتی بچاتی آگے بڑھتی رہی۔ میک اپ کرتے ہوئے میں نے دانستہ اپنے چہرے کو پرکشش نہیں بنایا تھا اسی لیے خال خال ہی کوئی نگاہ میری طرف اٹھ رہی تھی' وہ بھی یوں ہی سرسری انداز میں۔ مردوں کی نفسیات سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ کچھ اور نہ سہی تو وہ چلتے پھرتے نظر بازی سے بہرحال نہیں چوکتے اور اس میں عمر کی بھی کچھ زیادہ تخصیص نہیں۔ میں نے اکثر عمر رسیدہ افراد تک کو اس حرکت میں مبتلا پایا ہے۔ یہ مثل شاید ایسے ہی لوگوں کیلئے ہے کہ چور چوری سے باز آ جاتا ہے' ہیرا پھیری نہیں چھوڑتا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اپنے دفتر میں داخل ہو رہی تھی۔ وہی در و دیوار' وہی سامان آرائش اور وہی مانوس فضا' بس چہرے بدل گئے تھے۔ صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد بائیں جانب کچھ دور چل کر استقبالیہ کاؤنٹر تھا۔ میں اسی طرف بڑھتی چلی گئی۔ وہاں بھی ایک اجنبی چہرہ مجھے نظر آیا۔ استقبالیہ پر بیٹھنے والا شخص ٹیلی فون آپریٹر بھی تھا۔ ایسا ہی میرے زمانے میں بھی تھا۔ گزشتہ شب میں نے جو کچھ سوچا تھا اس کی روشنی میں استقبالیہ پر بیٹھا ہوا شخص میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ امکان بہرحال تھا کہ اس شخص کا ذہن پڑھ کر مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہو جاتی۔ میں قدم بہ قدم چلتی ہوئی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس نے فون پر بات کرتے ہوئے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ کاؤنٹر کے قریب ہی بائیں جانب پڑے ہوئے صوفے کی طرف۔ اس نے اشارہ

کیا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گئی۔ میرے سوا اس وقت وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ میری توجہ فون پر ہونے والی گفتگو کی طرف تھی۔

''جی...... جی ہاں!'' وہ کسی کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ ''معلوم نہیں جناب...... جی ہاں وہ نہیں ہیں...... جی...... اگر آپ کہیں تو پرویز صاحب سے بات کرا دوں۔ وہ ہیں دفتر میں...... جی؟...... بہتر ہے۔'' ٹیلی فون کا ریسیور رکھ کر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔

میں صوفے سے اٹھ کر پھر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''مجھے ایاز صاحب سے ملنا ہے' آپ انہیں مطلع کر دیں۔''

''وہ تو جی تشریف نہیں رکھتے۔'' اس نے بتایا۔

''کب تک آ جائیں گے؟'' میں دانستہ انجان بن گئی۔

''کچھ معلوم نہیں' آئیں گے بھی آج یا نہیں۔ آپ کو اگر ان سے کوئی بہت ضروری کام ہو تو پرویز صاحب سے مل لیں' وہ ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ پرویز صاحب کا بھی حکم ہے کہ اگر کسی کو بڑے صاحب سے ملنا بہت ضروری ہو تو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔'' اس شخص نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''ٹھیک ہے' آپ مجھے انہی سے ملوا دیں۔'' میں طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔

''اس وقت تو ان کے کمرے میں ایک صاحب بیٹھے ہیں' ان کے جاتے ہی آپ کو بھیج دوں گا۔ آپ کا نام؟''

''نسرین جمال۔'' میں نے یوں ہی ایک نام لے دیا۔

''تشریف رکھیں' میں انہیں مطلع کیے دیتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''شکریہ!'' یہ کہہ کر میں دوبارہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ یہی وہ لمحے تھے جب میں نے استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے شخص کا ذہن پڑھنا شروع کر دیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ گزشتہ روز ایاز کو اسلام آباد سے کوئی ٹرنک کال تو موصول نہیں ہوئی؟ جلد ہی مجھے اپنے اس سوال کا جواب مل گیا اور پھر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ میرے قیاسات درست ثابت ہو رہے تھے۔ گزشتہ روز تقریباً ساڑھے بارہ بجے کے قریب شہریار نے اسلام آباد سے ایاز کو ٹرنک کال کی تھی۔ فون پر شہریار سے خاصی دیر اس کی بات ہوئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی' اس سے استقبالیہ پر بیٹھا ہوا شخص ناواقف تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے ان دونوں کی گفتگو سننے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ یوں بھی وہ اس کا مجاز نہیں تھا۔ اس کا کام صرف فون ملا دینا تھا' گفتگو سننا نہیں۔ یہ اہم بات معلوم ہونے کے بعد میں نے اس شخص کے ذہن سے اپنے ذہن کا رابطہ منقطع کر دیا۔ مجھے اس سے مزید کچھ معلوم ہونے کی توقع نہیں تھی۔

اپنے ذہن کی غیر معمولی صلاحیت سے کام لے کر میں نے بہرحال ایک کام کی بات معلوم کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ آپریشن سیل کے کسی رکن کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس سلسلے میں خود میرا متحرک ہونا سودمند ثابت ہو رہا تھا۔ شہریار سے فون پر بات کرنے کے بعد ایاز کا غائب ہو جانا اسی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ' شہریار کو میرے فرار سے آگاہ کر چکا ہو گا۔ میرا ذہن کڑیاں جوڑنے میں مصروف تھا' مگر بظاہر میں وہاں لاتعلق سی بنی بیٹھی تھی۔ ایاز نے ساڑھے بارہ بجے اپنے بہنوئی شہریار سے فون پر بات کی

تھی اور پھر دو پہر دو بجے گھر پہنچا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ افراتفری میں نہیں اطمینان کے ساتھ فرار ہوا تھا۔ اب میرے سامنے صرف ایک سوال تھا کہ وہ گیا کہاں؟ آیا وہ اسی شہر میں کہیں روپوش ہو گیا ہے یا اس نے کسی اور شہر کا رخ کیا ہے؟ مجھے اس سوال کا جواب مل جاتا تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے اس سلسلے میں اپنے چھوٹے بھائی پرویز کو کچھ بتایا ہو اور پرویز دانستہ اپنے بھائی کی ہدایت پر لاعلمی کا اظہار کر رہا ہو۔ اس کے علاوہ یہ امکان بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ایاز نے اپنی بیوی کو اس سے آگاہ کر دیا ہو اور رازداری کی ہدایت کی ہو۔ میرے نزدیک یہی دو مہرے ایسے تھے جن کے ذہن پڑھ کر حقیقت کا سراغ لگانا ممکن تھا۔ بس یہ معلوم ہو جاتا کہ ایاز کہاں ہے؟ اس کے بعد میرے لیے حصول مقصد کی راہ استوار ہو جاتی۔ میں اسی لیے اس وقت پرویز سے ملنے کی منتظر بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ شاید پرویز سے ملنے کے بعد ایاز کی بیوی سے ملنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

پرویز سے ملنے کیلئے مجھے تقریباً پندرہ بیس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ اس کا کیبن وہی تھا جہاں کبھی میری فرم کی منیجر عارفہ بیٹھتی تھی۔ استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے شخص نے پہلے انٹرکام پر پرویز کو میرے بارے میں بتایا' پھر دوسری جانب سے غالباً اجازت ملنے پر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ کے منتظر ہیں پرویز صاحب مل لیجئے ان سے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک چپڑاسی کو بلایا اور اس سے کہا کہ انہیں پرویز صاحب کے پاس لے جاؤ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

چپڑاسی نے میری رہنمائی کی اور میں انجان بنی ہوئی اس کے ساتھ چلتی رہی۔ حالانکہ ریسپشن روم سے بھی وہ کیبن نظر آ رہا تھا اور میں نے کیبن سے اس شخص کو بھی باہر نکلتے دیکھ لیا تھا جو پرویز سے مل کر گیا تھا مگر ظاہر ہے مجھے لاعلمی ہی کا اظہار کرنا تھا۔ چپڑاسی مجھے ساتھ لیے وہاں پہنچا اور میرے لیے کیبن کا دروازہ کھول دیا۔ میں اندر چلی گئی۔

کیبن میں دائیں جانب عارفہ کی کرسی پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے بڑی سی میز تھی اور اس طرف دو آرام دہ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نوجوان نے ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں اور بولا۔ ''جی؟''

''میرا نام نسرین جمال ہے۔''

''جی' مجھے بتایا جا چکا ہے۔'' اس کا لہجہ قدرے بیزار کن تھا۔ ''آپ فرمائیے کس سلسلے میں زحمت کی ہے؟''

''زحمت تو خیر آپ کو ہو رہی ہے' میں تو اپنے کام سے آئی ہوں۔'' میں نے فضا کے تناؤ اور اجنبیت کو کم کرنے کیلئے مسکرا کر کہا' پھر بولی۔ ''دراصل مجھے ایاز صاحب سے ملنا تھا' معلوم ہوا کہ وہ تشریف نہیں رکھتے۔ میں نے سوچا کہ آپ ہی سے بات کر لی جائے۔ آپ بھی ظاہر ہے کہ اس دفتر کے ایک ذمے دار اور با اختیار آدمی ہیں۔ پھر یہ کہ مجھے بتایا گیا ہے' آپ ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ایسی صورت میں آپ سے بات کرنا بھی میرے لیے سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔''

''معاف کیجئے گا خاتون میں اس وقت ذرا مصروف تھا' آپ اپنی آمد کا مقصد بیان

کر دیں تو ممنون ہوں گا۔'' میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

''مجھے آپ کی مصروفیت کا اندازہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''زیادہ وقت نہیں لوں گی آپ کا چند ماہ قبل خود ایاز صاحب ہی نے بہ اصرار مجھ سے کہا تھا کہ میں ان سے ملوں ضرور مگر افسوس کہ مجھے انہی دنوں پنڈی جانا پڑا اور وہاں خاصے دن لگ گئے۔ میری خالہ جان اور خاندان کے بہت سے لوگ پنڈی ہی میں رہتے ہیں۔ میرا ارادہ تھا وہیں کوئی جاب کر لوں اور میں اس میں کامیاب بھی ہو گئی۔ گھر ہم لوگوں کا یہیں کراچی میں ہے' مگر ابو سرکاری ملازمت کے سبب پنڈی ہی میں تھے۔ ان کے ریٹائرمنٹ میں کچھ دن باقی تھے۔ وہ اسی لیے یہ چاہتے تھے کہ پنڈی کے بجائے کراچی ہی میں کوئی جاب کروں۔ بہرحال مختصراً یہ کہ میں ابو کے ریٹائرمنٹ کے بعد جاب چھوڑ کر یہاں آ گئی اور پھر مجھے ایاز صاحب کی پیشکش یاد آئی میں نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں تعلیم بھی حاصل کی ہے اور مجھے اس کا تجربہ بھی ہے۔ ایاز صاحب سے میری ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ ان دنوں میں جاب لیس تھی۔ یہ خودستائی نہیں حقیقت ہے کہ ایاز صاحب مجھ سے خاصے متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے اسی لیے مجھ سے اپنی فرم میں ملازمت کی پیشکش کی تھی۔'' آخر الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے اس نوجوان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میری توقع کے مطابق ہی تھے' واضح طور پر چہرے سے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا' مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔

''ہوں!'' اس نے طویل سانس لیا۔ ''تو آپ ملازمت کیلئے آئی ہیں۔ میرے خیال میں اس کیلئے اتنی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ معلوم نہیں بھائی جان آپ سے کیسے متاثر ہو گئے۔'' اس کے لہجے میں چبھن سی تھی۔'' پھر یہ کہ انہوں نے بہ اصرار آپ سے ملازمت کی پیشکش کی تھی' اس کا سبب کچھ سمجھا نہیں میں۔''

''میرا خیال ہے پرویز صاحب کہ ملازمت کی پیشکش کے سلسلے میں سب سے بڑا سبب آدمی کی لیاقت' صلاحیت' ذہانت اور تجربہ ہوتا ہے۔ میں کوئی دعویٰ نہیں کر رہی مگر یہ ضرور عرض کروں گی کہ امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس کا مجھے خاصا تجربہ ہے۔ اس بزنس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو میری نظروں سے پوشیدہ ہو۔ آپ اس سلسلے میں کوئی بھی سوال کریں' اگر میں جواب نہ دے پائی تو آپ کے قیمتی وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گی اور یہاں سے اٹھ کر چلی جاؤں گی۔'' میں نے دانستہ چیلنج کا سا انداز اختیار کیا تھا تاکہ مزید کچھ دیر وہاں رک سکوں۔ اس سے گفتگو کرنے کے دوران میری تمام تر توجہ اس کے ذہن پر مرکوز تھی۔ میں اس کا ذہن پڑھ رہی تھی۔

نتیجہ میری توقع کے مطابق ہی نکلا۔ وہ کچھ چڑ سا گیا اور بولا۔ ''ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ آپ کو کیا آتا ہے' کیا نہیں؟''

پھر اس نے مجھ سے امپورٹ ایکسپورٹ کے متعلق بہت سے سوالات کئے اور میں اطمینان سے ان کے جواب دیتی رہی۔ میرے لیے بھلا یہ کیا مشکل تھا۔ میں تو اس بزنس کے بارے میں اسے ایسی باتیں بتا سکتی تھی جن کے متعلق خود وہ بھی لاعلم ہوتا۔ اس کے باوجود اس نے مجھے وہی جواب دیا جو میں پہلے ہی سوچ چکی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان کشیدگی اور چیلنج کی سی فضا قائم ہو چکی تھی اس لیے وہ

مجھے ٹال گیا۔

''دیکھیں خاتون!'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''دراصل جب بھائی جان سے آپ کی بات ہوئی تھی اور انہوں نے ملازمت کی پیشکش کی تھی تو اس وقت واقعی ہمیں لوگوں کی ضرورت تھی۔ اب آپ اتنے دن بعد تشریف لائی ہیں تو آپ کے انتظار میں جگہ تو خالی نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ ہمارے یہاں تو آج کل ویسے ہی اوور سٹاف ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ آپ بھائی جان سے مل لیجئے گا کیوں کہ انہی سے آپ کی بات ہوئی تھی ممکن ہے ان کی نظر میں آپ کیلئے کوئی جگہ ہو۔''

میں سمجھ رہی تھی' اس نے یہ بات بھی محض اسی لیے کی تھی کہ ایاز اگر اس کی دانست میں استفسار کرے تو بچت کا پہلو رہے۔

''ایاز صاحب سے کب ملاقات ہو سکے گی؟'' میں نے دانستہ یہ سوال کیا۔

''کچھ کہا نہیں جاسکتا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''کیوں؟ آپ کو تو معلوم ہوگا ان کے اوقات کار اور دیگر مصروفیات کا علم......''

''پلیز!'' اس نے ناگوار لہجے میں میری بات کاٹ دی۔ ''آپ میرا خاصا وقت ضائع کر چکی ہیں' اب میں معذرت چاہتا ہوں۔ آپ فون کر کے معلوم کر لیجئے گا اور ازراہ کرم اسی وقت تشریف لایئے گا جب بھائی جان دفتر میں موجود ہوں۔''

''بہتر ہے۔'' یہ کہہ کر میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے میرا مقصد یہ تاثر دینا تھا کہ مجھے اس کی بات ناگوار معلوم ہوئی ہے۔ پھر میں نے چلتے چلتے مزید کہا۔

''انشاء اللہ آئندہ کم از کم آپ کو اس سلسلے میں ہرگز زحمت نہیں دوں گی''

''بڑا کرم کریں گی آپ مجھ پر۔'' اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔

میں مزید کچھ کہے بغیر کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

پرویز کا ذہن پڑھ کر مجھے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو گئی تھیں جو کسی اور ذریعے سے علم میں آنا' ممکن نہ ہوتیں۔ میرے اندازے بڑی حد تک درست ثابت ہوئے تھے۔ اس تمام کھیل کے پیچھے شہریار ہی کا ہاتھ تھا۔ ایاز کی حیثیت محض ایک مہرے کی تھی۔ شہریار خود سامنے آ جاتا' میرے تمام اثاثوں پر براہ راست وہ قابض ہوتا اور بعد میں بات بگڑ جاتی تو اس سے اس کی شہرت اور سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ ان تمام باتوں کا علم ایاز کے علاوہ پرویز کو بھی تھا' مگر ایک حد تک اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ شہریار کسی سپر پاور کا بھی آلہ کار بنا ہوا ہے۔ اس بات میں بھی حقیقت نہیں تھی کہ پرویز اپنے بڑے بھائی ایاز کے بارے میں قطعی بے خبر تھا۔ گزشتہ روز ایاز نے اسے بتا دیا تھا کہ کچھ عرصے کیلئے اس کا روپوش ہونا ضروری ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں پرویز کو کاروباری معاملات سے نمٹنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے' اسی غرض سے وہ سارا بندوبست کر کے گیا تھا۔ پرویز کو وہ پاور آف اٹارنی دے گیا تھا۔ میں خود بھی جب ملک سے باہر ہوتی تھی یا کسی معاملے میں الجھ جاتی تھی تو اپنی منیجر عارفہ کو تمام اختیارات دے دیتی تھی۔ احتیاط کے طور پر یا پھر کسی مصلحت کے پیش نظر ایاز نے پرویز کو اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ روپوشی

کے دن وہ کہاں گزارے گا۔ میرے نزدیک اہم اور اصل سوال یہی تھا' مگر پرویز کا ذہن پڑھنے کے باوجود مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ خود پرویز نے اس سلسلے میں جو اندازے لگائے تھے' ان کا علم مجھے ضرور ہو گیا تھا۔ میں دفتر کی عمارت سے نکلتے ہوئے اسی پر غور کر رہی تھی۔

میری کوٹھی میں منتقل ہونے سے پہلے ایاز کی سکونت نیو ٹاؤن میں تھی۔ وہ گھر خالی پڑا تھا کیونکہ ایاز اپنے والدین اور چھوٹے بھائی پرویز سے الگ رہتا تھا۔ پرویز کا ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ شاید ایاز وہاں رہے گا۔ دوسری بات اس کے ذہن میں یہ آئی کہ ایاز غالباً کراچی میں رہنے کی بجائے اپنے بہنوئی شہریار کے پاس اسلام آباد چلا جائے گا۔ اس کے علاوہ پرویز ہی کے ذہن میں ایک اور جگہ بھی آئی تھی۔ ایاز وہاں بھی جتنے عرصے چاہتا رہ سکتا تھا۔ ایاز کے ایک قریبی دوست عاصم کا گھر قلب شہر سے دور ملیر میں تھا۔ عاصم اور ایاز کی دوستی بچپن سے تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی پڑھے تھے۔ عاصم کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا' ایک بڑی بہن تھی جو اپنے گھر کی تھی۔ عاصم اس لیے تنہا ہی رہتا تھا۔ شادی اس نے کی نہیں تھی۔ ایاز کے اور اس کے درمیان ایک قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں ہی شروع سے آوارہ مزاج تھے۔ طبقاتی فرق کے باوجود ایاز کی اب بھی اس سے گاڑھی چھنتی تھی۔ کبھی کبھار وہ ملیر کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ پرویز کے اندازوں کے مطابق اگر ایاز کراچی میں تھا تو انہی دو جگہوں میں سے کہیں ہو سکتا تھا۔ یہی سوچتی ہوئی میں اپنی سپورٹس میں آ بیٹھی۔

ایاز کے بارے میں یہ اطلاع کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی پرویز کو بھی کچھ بتا کر نہیں گیا' غلط ثابت ہوئی تھی۔ دانستہ اس بات کو چھپایا گیا تھا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ ایاز اچانک پراسرار طور پر کسی سے بغیر کچھ کہے غائب ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں آپریشن سیل کے ارکان کا مس گائیڈ ہونا قرین قیاس تھا۔

میں نے سوچا تھا کہ اگر ایاز کے بھائی پرویز سے مل کر کچھ معلوم نہ ہو سکا تو پھر ایاز کی بیوی سے ملوں گی۔ پرویز سے ملاقات کے بعد اب یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ جس طرح پرویز نے اصل بات کسی پر ظاہر نہیں کی تھی' اسی طرح ایاز کی بیوی بھی اپنے شوہر کے ایما پر اس کے بارے میں اپنی لاعلمی اور پریشانی کا اظہار کر سکتی تھی۔ اب تک مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا اس سے واضح طور پر یہی ظاہر تھا کہ ایاز اچانک افراتفری میں فرار نہیں ہوا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو بھی کچھ نہ بتایا ہو۔ آدمی کیسا ہی کیوں نہ ہو' وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس کے گھر والے اور خصوصاً شریک حیات اس کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہو جائے' اسے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ اس کا شوہر کس سبب کچھ عرصے گھر سے غائب رہے گا۔ ہاں ہنگامی حالات یا افراتفری میں ایسا ممکن ہے' مگر اس معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ میں اپنی کار ڈرائیو کرتی رہی اور میرا ذہن اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کیلئے تیزی سے کام کرتا رہا۔

خاصی دیر کسی منزل کا تعین کیے بغیر میں غور و فکر میں مصروف رہی اور جیسے خود کارانہ طور پر میرے ہاتھ کبھی گیئر بدلتے رہے' کبھی اسٹیئرنگ ادھر سے ادھر گھماتے رہے۔ بالآخر مجھے آج ہی ایاز کی بیوی سے بھی مل لینا چاہئے۔ اس وقت میری کار کراچی کی ایک بارونق اور پرہجوم سڑک سے گزر رہی تھی۔ میں نے اس سڑک سے گزرنے کے بعد کار کا رخ ڈیفنس کی طرف کر دیا۔

اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی میں سوچ چکی تھی کہ مجھے ایاز کی بیوی کے روبرو کیا کردار ادا کرنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ڈیفنس کے علاقے میں داخل ہو کر اپنی کوٹھی سے کافی فاصلے پر کار کھڑی کی اور اسے لاک کر کے اطمینان سے آگے بڑھ گئی۔

اگر مجھے اس گلی میں کسی نے کار پارک کرتے دیکھا بھی ہو گا تو یہی سوچا ہو گا کہ میں یہیں کہیں قریب ہی کسی کوٹھی میں جانا چاہتی ہوں۔ وہ راستے میرے تمام آشنا تھے۔ مختلف گلیوں اور سڑکوں سے گزرتی ہوئی میں جلد ہی اپنی کوٹھی تک پہنچ گئی۔

کل کی طرح آج مجھے اپنی کوٹھی کے گیٹ پر کسی اور شخص کے نام کی تختی لگے دیکھ کر ذہنی جھٹکا نہیں لگا تھا۔ میرا ذہن اس کیلئے پہلے ہی سے تیار تھا کہ [illegible] در و دیوار مجھ سے چھین لیے گئے ہیں، مجھے بے گھر کر دیا گیا ہے۔ مگر بہت جلد میں ان حالات پر قابو پا لوں گی۔ اسی یقین اور اطمینان نے میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ نہیں ہونے دیا تھا۔ میں نے اسی لیے پرسکون انداز میں کال بیل پر انگلی رکھ دی جیسے واقعی کوئی اجنبی ہوں اور اس کوٹھی کی مالکہ سے ملنے آئی ہوں۔

کوٹھی کے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھلنے میں زیادہ دیر نہیں۔ میں نے چوکیدار کو بتایا کہ مسز ایاز سے ملنا ہے۔

اسی وقت دور سے ایک بوڑھا شخص آتا دکھائی دیا۔ جو اپنے حلیے سے ملازم ہی لگتا تھا۔ وہ غالباً کال بیل کی آواز سن کر ادھر آ رہا تھا۔

''کون ہے خان بابا؟'' بوڑھے ملازم نے دور ہی سے ہانک لگائی۔

''یہ بی بی صاحب مالکن کے پاس آیا ہے۔'' پٹھان چوکیدار نے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔ ''ابی تم اس بی بی صاحب کو اندر لے کے جاؤ اور مالکن کو بولو۔''

اس اثنا میں بوڑھا ملازم قریب آ چکا تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''آئیے! میں بیگم صاحبہ کو خبر کرتا ہوں۔''

میں اس کے ساتھ چل دی۔ مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھانے سے پہلے اس نے میرا نام پوچھ لیا تھا۔

''نام تو میرا نسرین جمال ہے لیکن تمہاری بیگم صاحبہ مجھے نام سے نہیں پہچانیں گی۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''ٹھیک ہے جی، میں ان سے کہہ دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا

بوڑھا ملازم چلا گیا تو میں اپنے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگی۔ دل ہی دل میں میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا حلیہ زیادہ نہیں بگاڑا گیا تھا۔ بس ذوق اور بدذوقی کی باتیں تھیں اور کچھ چیزیں شاید وہاں سے اٹھا کر اندر کسی کمرے میں رکھ دی گئی تھیں۔

ایاز کی بیوی کو آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ظاہر ہے کہ [illegible] کے چہرے پر اجنبیت ہی تھی۔ اس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان ہی ہو گی۔ اسے [illegible] قبول صورت ضرور کہا جا سکتا تھا۔ میں اسے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر [illegible] اٹھ کھڑی ہوئی، پھر سلام

کیا۔

''بیٹھیے۔'' وہ سلام کا جواب دے کر بولی۔

''شکریہ!'' میں نے کہا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ گھریلو قسم کی عورت معلوم ہوتی تھی۔

''نسرین دراصل میری ایک سہیلی کا نام بھی ہے، میں سمجھی کہ وہی آئی ہو گی۔'' وہ میرے برابر والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں نے آپ کے ملازم کو نسرین جمال بتایا تھا اور......''

''بھلکو ہے وہ سدا کا۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''مجھے اس نے صرف نسرین بتایا اور میں نے اسے ڈانٹا بھی تھا کہ وہاں ڈرائنگ روم میں لے جا کر اجنبیوں کی طرح کیوں بٹھا دیا۔ پھر کہیں اس نے بتایا کہ نام سے میں آپ کو نہیں پہچان سکوں گی۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ خاصی باتونی ہے اور خواہ مخواہ بات کو طول دینے کی بھی عادی ہے۔ میں نے اپنا اصل کام نے اسی وقت شروع کر دیا تھا۔ جب اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تھا۔ میں اپنے ذہن میں پیدا ہونے والی نئی حیرت انگیز صلاحیت کو بروئے کار لا چکی تھی۔ اس کا ذہن میرے لیے کسی کھلی کتاب کی طرح تھا۔ جسے میں بہ آسانی پڑھ سکتی تھی۔ گفتگو کرتے ہوئے ذہن میں دیر تو لگتی تھی مگر مقصد بہرحال حل ہو جاتا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ ایاز کی بیوی مجھ سے میری آمد کا مقصد دریافت کرتی، میں خود ہی بول اٹھی۔ ''آپ عاصم کو تو جانتی ہیں نا......؟ وہی جو ملیر میں رہتے ہیں۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں......؟ کیا ہوا انہیں؟'' وہ چونک کر بولی۔ ''وہ میرے شوہر کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔''

''عاصم کو کچھ نہیں ہوا، لیکن......'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر طویل سانس لیا۔ ''لیکن کسی اور کی زندگی عاصم کی وجہ سے تباہ ہو رہی ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں، آپ صاف صاف بات کریں۔'' اس نے پہلو بدل کر متجسس لہجے میں کہا۔

''دراصل ایک عورت ہی دوسری عورت کا دکھ محسوس کر سکتی ہے۔ اسی ناتے میں آپ کے پاس ایک التجا لے کر آئی ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ میرا دل نہیں توڑیں گی۔ یہ میری چھوٹی بہن نائلہ کی زندگی کا سوال ہے۔'' میری آواز بھرانے لگی۔ میں حتیٰ الامکان یہ کوشش بھی کر رہی تھی کہ چہرے سے اسے مظلوم نظر آؤں۔

''آخر ہوا کیا، بتائیں تو سہی! میں...... میں...... مجھ سے جو بھی ہو سکا...... مگر معلوم تو ہو کچھ۔'' وہ کچھ گھبرا سی گئی تھی۔ اسی کے ساتھ اس کے لہجے میں ہمدردی کا تاثر بھی تھا۔

''بتاتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پھر ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''ہم لوگ بھی وہیں ملیر میں رہتے ہیں، اسی گلی میں جہاں عاصم کا گھر ہے۔ بچپن سے ہمارے گھر اس کا آنا جانا ہے۔ جب سے عاصم کے والدین کا انتقال ہوا ہے، میری امی اس کا اور بھی خیال رکھنے لگی ہیں۔ معلوم نہیں کیسے اور کب نائلہ اور وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ گھر میں کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا کہ اندر ہی اندر وہ کیا گل کھلا رہا ہے۔ آپ برا نہ مانیے گا، ذاتی طور پر مجھے شروع ہی سے عاصم پسند نہیں تھا، مگر امی کی وجہ سے میں کچھ نہیں کہتی تھی۔

امی کا کہنا تھا کہ بے ماں باپ کا بچہ ہے' ہمیں اس کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش آنا چاہئے۔ پھر یہ کہ پڑوس کا بھی کچھ حق ہوتا ہے۔" میں اپنی کہانی ایاز کی بیوی کو سناتی رہی' اسی کے ساتھ اس کے ذہن کو بھی ٹٹولتی رہی۔ "نائلہ نے تو اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا' مگر مجھے کچھ شک ہو گیا۔ کبھی کبھار امی' میرے یا نائلہ کے ہاتھ اس کیلئے کھانا بھی بھجوا دیتی تھیں۔ گھر میں جب بھی کوئی اچھی چیز پکتی تو امی اسے ضرور یاد رکھتی تھیں۔ ہم دونوں بہنوں کے علاوہ گھر میں ابا کے سوا کوئی مرد نہیں اور وہ بھی اکثر بیمار رہتے ہیں۔ میں اسی لئے نوکری کرتی ہوں۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے ورنہ ظاہر ہے کہ امی ہمارے ہاتھ اس کیلئے کھانا نہ بھجوایا کرتیں۔ امی کو ہم دونوں بہنوں پر بھی بھروسہ تھا اور عاصم کو تو وہ جانے کیوں فرشتہ سمجھتی ہیں' شاید اسی وجہ سے کہ وہ امی سے ہمیشہ بڑی نرمی اور محبت سے بات کرتا ہے۔ امی سے اسے میں نے ایک دفعہ یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا کہ خالہ آپ کے کوئی بیٹا نہیں' مجھے اپنا بیٹا سمجھیں۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میرا اندازہ تھا کہ شاید امی' مجھے یا نائلہ کو عاصم کے پلے باندھنے کا ارادہ رکھتی تھیں' لیکن اس سلسلے میں انہوں نے کھل کر کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ایک دن ہوا یہ کہ میں نے نائلہ اور عاصم کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی۔ دراصل نائلہ کو عاصم کے گھر گئے خلاف توقع کچھ دیر ہو گئی تھی۔ رات کا وقت تھا کوئی ساڑھے سات آٹھ بجے ہوں گے۔ امی نے مجھ سے کہا' نسرین ذرا دیکھ کر تو آنا نائلہ' عاصم کو کھانا دینے گئی تھی' اب تک آئی نہیں۔ دو چار گھر چھوڑ کر عاصم کا گھر تھا۔ میں وہاں پہنچی تو اندر سے ان دونوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند نہ تھا اور میں اندر صحن میں پہنچ گئی تھی مگر وہ دونوں اپنی باتوں میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ انہیں گھر میں کسی کے داخل ہونے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ کمرے میں تھے اور میں صحن میں کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ عاصم میری بہن کو دھمکی دے رہا تھا کہ اگر اس نے کسی کو کچھ بتایا تو اچھا نہیں ہو گا۔ نائلہ اس سے التجائیں کر رہی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو' عاصم میری امی سے بات کر لے ورنہ وہ بدنام ہو جائے گی۔ نائلہ کے اس جملے کا مطلب سمجھنا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا۔ میں سمجھ گئی کہ بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ میں الٹے پاؤں خاموشی سے واپس آ گئی اور امی سے بہانہ کر دیا کہ نائلہ برتن لے کر ابھی آ رہی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد نائلہ لوٹ آئی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اسی رات میں نے نائلہ سے بات کی اور اس نے ڈرتے جھجکتے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ عاصم اسے بہت دن سے ٹالے جا رہا تھا۔ میں نے نائلہ کو سخت سست اور بہت برا بھلا کہا کہ اس نے ماں باپ کی عزت خاک میں ملا دی۔ وہ رونے لگی۔ مجھے بھی خیال آیا کہ صرف اسے برا بھلا کہنے سے بات نہیں بنے گی۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ تم عاصم سے دو ٹوک بات کرو۔ اس نے میرے مشورے پر عمل کیا اور پھر مجھے بتایا کہ عاصم اس سے کسی قیمت پر شادی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس نے صاف جواب دے دیا ہے۔ مجبوراً میں نے خود عاصم سے بات کی۔ اس نے سارا الزام نائلہ پر ڈال دیا اور صاف مکر گیا کہ نائلہ سے میرا کوئی معاملہ نہیں۔ وہ کسی اور کا گناہ خواہ مخواہ میرے سر منڈھنا چاہتی ہے۔ اس کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اسے لاکھ سمجھایا' غصے سے' محبت سے مگر وہ نہیں پگھلا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں؟ عاصم کا کوئی ایسا قریبی عزیز رشتے دار بھی نہیں تھا جس کی بات وہ مان لیتا۔ کافی

سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں بس آپ ہی کے شوہر ایاز صاحب کا خیال آیا۔ میں نے اکثر انہیں عاصم کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔ میں انہیں برسوں سے جانتی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اگر عاصم کسی کی بات سن سکتا ہے تو وہ بس آپ کے شوہر ہیں۔ پچھلے مہینے خود انہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ اب وہ نیو ٹاؤن سے ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں منتقل ہو گئے ہیں۔ میں نے جانے کیا سوچ کر ان سے پتا بھی پوچھ لیا تھا۔ شاید اس وقت میرے ذہن میں لاشعوری طور پر یہی خیال رہا ہو گا کہ کبھی ان سے کوئی کام پڑ جائے تو مل سکوں۔ ان دنوں عاصم پر میں یہ زور ڈال رہی تھی کہ وہ میری بہن کی زندگی تباہ نہ کرے اور اسے اپنا لے۔ اس میں تقریباً مہینہ بھر گزر گیا اور میں عاصم کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ امی یا ابو کے علم میں یہ بات آئے۔ اس سے پہلے ہی کوئی راہ نکل آئے ورنہ بہت برا ہو گا۔ نہ امی یہ دکھ برداشت کر پاتیں اور نہ میرے بیمار ابو اس صدمے کو برداشت کر سکتے۔ پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ دکھوں اور مجبوریوں میں مجھے بس ایک ہی راہ نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ آپ کے شوہر ایاز صاحب سے تو میں کھل کر یہ ساری باتیں نہیں کر سکوں گی' کیوں نہ آپ سے مل لوں۔ آپ ایاز صاحب کو ساری بات بتائیں گی تو وہ یقیناً عاصم کو راضی کر لیں گے۔ یہی سوچ کر اور یہی امید لے کر میں آپ کے پاس آئی ہوں۔" میں یہ طویل من گھڑت کہانی سنا کر خاموش ہو گئی۔ میں نے اس کہانی کو اس لیے طوالت دی تھی کہ اس دوران میں ایاز کی بیوی کے ذہن کو اچھی طرح پڑھ لوں۔ مجھے اس میں کامیابی ہو چکی تھی۔ جو کچھ معلوم کرنا تھا' میں معلوم کر چکی تھی۔ جو بھی میرے ذہن میں آیا تھا کہتی رہی تھی اور یہ پروا بھی نہیں کی تھی کہ میری سنائی ہوئی کہانی میں کہیں کوئی جھول نہ رہ جائے۔

ایاز کی بیوی کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ بس وقت اور حالات نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ وہ ایک سیدھی سادی عورت تھی اسی لیے میری کہانی کا اس پر بہت اثر ہوا۔

"آپ اس سلسلے میں قطعی پریشان نہ ہوں۔ عاصم بھائی ایسے ہوں گے میرے تو وہم گمان میں بھی نہیں تھا۔" اس کے لہجے میں تاسف تھا۔ اسی کے ساتھ وہ مجھے تسلی بھی دے رہی تھی۔ "میں ایاز سے بات کروں گی اور مجھے یقین ہے کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ عاصم بھائی کو تمہاری بہن سے شادی کرنا ہی پڑے گی۔ میں خود بھی عاصم بھائی پر زور ڈالوں گی۔ بھلا یہ کوئی بات ہوئی کہ وہ ایک شریف خاندان کی لڑکی کو اس طرح دھوکا دیں۔" یہ کہہ کر وہ کسی سوچ میں پڑ گئی اور میں جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ مزید بولی۔ "دراصل ایاز...... کل سے بغیر کچھ بتائے ہوئے کہیں چلے گئے ہیں۔ میں خود بھی اس سلسلے میں پریشان تھی۔ شاید کوئی...... انہیں کوئی ایسا ہی ضروری کام ہو گا کہ...... کہ مجھے بتا کر نہیں گئے ورنہ...... ورنہ پہلے وہ...... پھر ایک دم سنبھل گئی۔ "پھر بھی تم پروا نہ کرو وہ ظاہر ہے کہ آ ہی جائیں گے اور پھر......"

"ٹھیک ہے' کوئی بات نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جہاں میں نے اتنے دن انتظار کیا ہے' چند روز اور سہی۔"

دراصل جب کوئی سیدھا سادا آدمی کسی بات کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے یا جھوٹ بولتا ہے تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے جو ایاز کی بیوی کی تھی۔ ایک طرف تو اسے واقعی میری کہانی نے متاثر کیا تھا اور

وہ میری مدد کرنا چاہتی تھی' دوسری طرف یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے شوہر کی واپسی کب ہوگی۔ وہ اسی لیے کچھ تذبذب اور پریشانی کا شکار ہوگئی تھی۔

یہاں آنے کا جو میرا مقصد تھا حل ہو چکا تھا اس لیے ایاز کی بیوی سے اجازت چاہی۔

''ارے اس طرح آپ کیسے چلی جائیں گی۔ باتوں میں یہ تو میں بھول ہی گئی کہ آپ سے چائے تک کو نہیں پوچھا۔ میں ابھی آئی۔'' یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اس تکلف کی ضرورت نہیں' سنئے!'' میں کہتی رہ گئی مگر وہ نہ مانی۔

اس کے لہجے میں اتنا خلوص تھا' اتنی اپنائیت تھی کہ میں کوشش کے باوجود اپنی جان نہ چھڑا سکی۔ ملازم سے چائے وغیرہ لانے کو کہہ کر وہ پھر میرے پاس آ بیٹھی اور دوبارہ وہی موضوع چھیڑ دیا جس سے مجھے اب کوئی خاص دلچسپی نہیں رہ گئی تھی' مگر مجبوراً میں اس کا ساتھ دیئے جا رہی تھی۔ میں نے بدستور مظلومیت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اسی دوران میں ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا آ گیا۔ اس نے خاصا تکلف کر ڈالا تھا اور مجھ سے کہہ رہی تھی کہ یہ کیک پیس تو لیں۔ آپ تو صرف چائے کی پیالی لے کر بیٹھ گئیں۔ کبھی وہ میرے سامنے بسکٹ کی پلیٹ رکھتی' کبھی کوئی اور چیز کھانے پر اصرار کرتی۔

میں اس سے الجھ رہی تھی اور چاہتی تھی کہ اب جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤں۔ اس کے اصرار پر میں نے کچھ بسکٹ وغیرہ اپنی پلیٹ میں رکھ لیے تھے اور جلدی جلدی چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔ چائے پیتے ہوئے بھی اس کی زبان رکی نہیں۔ وہ انہی روایتی عورتوں میں سے تھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کسی حال میں چپ نہیں رہ سکتیں۔

ابھی میں نے چائے کا آخری گھونٹ ہی لیا تھا کہ کہیں قریب ہی سے ایک آشنا اور سنی ہوئی سی آواز آئی۔ ''بھابی...... کہاں ہیں آپ؟''

''میرا دیور آ گیا۔'' ایاز کی بیوی آہستگی سے بولی۔ پھر بلند آواز میں کہا۔ ''یہاں ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔''

میرے اعصاب ایک دم کشیدہ ہو گئے۔ آنے والا ایاز کا بھائی پرویز کے سوا اور بھلا کون ہو سکتا تھا۔ اس کی آواز بھی اب میں نے پہچان لی تھی۔ آج ہی تو میں اس سے ملی تھی۔ یہ صورتحال میرے لیے قطعی غیر متوقع اور تشویش کن تھی۔ میں اس طرح بیٹھی تھی کہ میری پشت داخلی دروازے کی طرف تھی۔

''آپ جائیے' میں چلتی ہوں۔'' میں نے ایاز کی بیوی کو مخاطب کیا۔

''چلی جایئے گا' ابھی تو آپ نے چائے بھی نہیں پی۔'' وہ انکسار سے بولی۔

اسی دوران میں بھاری قدموں کی چاپ قریب آتی گئی جن کی دھمک میرے حواس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر پرویز نے مجھے دیکھ لیا تو یقیناً بات بگڑ جائے گی کیوں کہ میں کسی اور حیثیت سے اس کے پاس گئی تھی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ قدموں کی چاپ غالباً ڈرائنگ روم کے دروازے پر آ کے رک گئی ہے۔

''بھابی! آپ بہت کہتی رہتی تھیں کہ میں یہاں کبھی دوپہر کا کھانا کیوں نہیں کھاتا۔ میں نے سوچا' چلو آج یہی سہی۔ بھابی خوش ہو جائیں۔'' مجھے اپنے عقب سے پرویز کی آواز آئی۔ ''ابھی ویسے

کھانے کا وقت نہیں ہوا' مگر دفتر میں بھی زیادہ کام نہیں تھا۔ بور ہو رہا تھا وہاں اس لیے چلا آیا۔ پھر سوچا کہ اپنی مرضی کی ڈش......'' اس نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے بعد شاید پہلی بار اسے وہاں میری موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ چند لمحے رک کر اس نے مزید کہا۔ ''آپ کی تو کوئی مہمان بیٹھی ہیں۔''

''ہاں بس یہ جا ہی رہی تھیں۔'' ایاز کی بیوی بولی۔ ''اور تم وہاں کیوں کھڑے ہو' اندر آ جاؤ نا۔''

''لیجئے آ گیا۔'' قدموں کی چاپ آگے بڑھی۔ ''دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں آپ لوگ کوئی پرسنل بات نہ کر رہی ہوں' پرائیویٹ قسم کی۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں! اور اگر تھی تو اب ختم ہو چکی ہے۔'' ایاز کی بیوی نے بھی ہنس کر جواب دیا۔ وہ دونوں بہر حال دیور بھابی تھے اور اسی فضا میں بات کر رہے تھے۔

''اگر ایسا ہے تو پھر......'' یہ کہتے ہوئے پرویز مزید آگے بڑھ آیا۔

اسی وقت پرویز کی نگاہ میری طرف اٹھی اور میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ وہ لمحہ بالآخر آ ہی گیا تھا جس سے میں بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آپ...... آپ یہاں؟'' وہ مجھے گھورتے ہوئے درشت سے لہجے میں بولا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟ کیا تم انہیں جانتے ہو پرویز؟'' ایاز کی بیوی نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں بھابی جانتا ہوں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ کی بھی ان سے پرانی ملاقات ہوگی۔''

''پرانی ملاقات تو خیر نہیں' آج ہی یہ مجھ سے ملی ہیں' مگر تم......''

''اچھا اب میں اجازت چاہوں گی۔'' میں نے ایاز کی بیوی کو مخاطب کیا اور اس کی بات پوری نہ ہونے دی۔ اس کے ساتھ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھ جایئے خاتون!'' پرویز کے لہجے میں سختی تھی۔ ''میں آپ کو اس آسانی کے ساتھ یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔'' وہ بھی صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''پرویز! آخر بات کیا ہے' مجھے تو بتاؤ نا۔'' ایاز کی بیوی نے مداخلت کی۔

''ابھی بتاتا ہوں بھابی!'' پرویز کی نگاہ یہ کہتے ہوئے میری ہی طرف تھی۔ ''آپ پہلے ان سے کہہ دیں کہ یہ بیٹھ جائیں۔ جب تک یہ آپ کے پاس آنے کا مقصد نہیں بتائیں گی' میں انہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔''

''آپ بیٹھ جایئے نا۔'' ایاز کی بیوی نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کے چہرے سے الجھن اور تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''جو بات بھی ہے' وہ سکون سے بیٹھ کر بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''اب میرے لیے دو ہی راستے تھے۔ ان میں سے ایک راستہ اختیار کرنے پر خواہ مخواہ ہنگامہ آرائی ہوتی' دوسرا راستہ نسبتاً محفوظ تھا۔ مجھے ایاز کی بیوی کا خیال بھی تھا۔ وہ سیدھی سادی ہمدرد عورت بے سبب میری وجہ سے پریشان ہو رہی تھی۔ مجھے ایک فیصلے تک پہنچنے میں چند لمحوں سے زیادہ دیر نہ لگی۔

''لیجئے میں بیٹھ جاتی ہوں۔'' میں نے نرم لہجے میں ایاز کی بیوی سے کہا اور دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

پرویز کو یقیناً مجھ سے یہ امید نہیں رہی ہو گی کہ میں یوں دوبارہ اطمینان وسکون سے بیٹھ جاؤں گی۔ اس کے چہرے پر غالباً اسی لیے حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے تو شاید یہی سمجھا تھا کہ میں ہر قیمت پر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں گی۔ بہر حال وہ حیرت زدہ سا پھر میرے مقابل والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

فضا کا تناؤ اور کشیدگی قدرے کم ہو گئی تو ایاز کی بیوی نے پرویز سے کہا۔ ''یہ میرے پاس اپنے ایک ذاتی قسم کے کام سے آئی ہیں۔ بات کچھ ایسی ہے جو میرے خیال میں تمہیں بتانا ضروری نہیں۔ مگر یہ ضرور پوچھوں گی کہ تم انہیں کیسے اور کب سے جانتے ہو؟''

''مجھ سے آج یہ دفتر میں ملی تھیں۔'' پرویز بتانے لگا۔

''انہوں نے مجھ سے بھائی جان کا حوالہ دے کر ملازمت کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔''

ایاز کی بیوی نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا' پھر کہا۔ ''مگر یہ تو کہیں ملازمت کر رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے یہی بتایا تھا۔''

''اسی لیے تو میں کہنا چاہتا ہوں بھابی کہ یہ کوئی دھوکے باز قسم کی خاتون ہیں۔'' پرویز نے کہا۔

''میں بس یہی عرض کروں گی پرویز کہ آپ کو میرے بارے میں کوئی شدید قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے۔'' میں نے براہ راست پرویز کو مخاطب کیا۔ ''میں نے تو پہلی بار آپ کو یہاں دیکھا ہے۔ وہ کوئی اور لڑکی ہو گی جو ملازمت کیلئے آپ سے ملی ہو گی۔'' میرا لہجہ انتہائی اور نرم تھا۔

''تو کیا میں جھوٹا ہوں! جھوٹ بول رہا ہوں! بے وقوف بنا رہی ہیں آپ مجھے۔'' اس نے غصے کا اظہار کیا۔

''نہ میں جھوٹ بول رہی ہوں اور نہ آپ کو جھوٹا کہہ رہی ہوں' نہ میرا مقصد آپ کو بے وقوف بنانا ہے۔'' میرے لہجے میں نرمی بدستور برقرار تھی۔

اس دوران میں ایاز کی بیوی نے مداخلت نہیں کی۔ وہ خاموشی اور حیرت سے ہم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔

''آپ اگر اپنے آپ کو بہت زیادہ چالاک سمجھ رہی ہیں اور یہ غلط فہمی ہے کہ مجھے بے وقوف بنا کر یہاں سے نکل جائیں گی تو ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ سمجھ گئیں آپ۔'' پرویز کے لہجے میں غصہ بھی تھا اور گہری چبھن بھی۔ ''یقین کریں کہ آپ اگر اسی طرح جھوٹ بولتی رہیں اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہیں تو میں آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

''مگر کس جرم میں پرویز صاحب......؟ میں تو خود ایک مظلوم لڑکی ہوں اور آپ کی بھابی اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں۔''

''جرم تو پولیس بتائے گی آپ کو!'' اس کی آواز میں دھمکی تھی۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ نے اپنا نام بھی بھابی کو غلط بتایا ہو گا۔'' یہ کہہ کر وہ ایاز کی بیوی سے بولا۔ ''کیوں بھابی انہوں نے اپنا کیا نام

بتایا آپ کو؟''

''نسرین جمال۔'' ایاز کی بیوی نے جواب دیا۔

یہ سن کر پرویز چونک اٹھا' پھر بولا۔ ''یہی نام انہوں نے مجھے بھی بتایا تھا مگر....'' چند لمحے اس نے شاید کچھ سوچا' پھر ایک دم بول اٹھا۔ ''یوں تو ایک اور ثبوت مل گیا کہ آپ ہی مجھ سے آج دفتر میں ملی تھیں۔ اب کیا کہتی ہیں؟ بولیں' کیا یہ بھی جھوٹ ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں اس سلسلے میں! ممکن ہے جو لڑکی آپ سے ملی ہو' اس نے بھی یہی نام بتایا ہو۔ نسرین نام کی نہ معلوم کتنی لڑکیاں اس شہر میں ہوں گی۔''

''دیکھیں خاتون' اب تک میں نے صرف بھابی کی وجہ سے بہت برداشت کیا ہے' لیکن اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔'' اس کے چہرے سے شدید غصے کا اظہار ہونے لگا۔ پھر اس نے ایاز کی بیوی سے کہا۔ ''بھابی! آپ اب اس معاملے میں کچھ نہ بولیں' میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔ پھر جو بھی حقیقت ہو گی خود سامنے آ جائے گی۔''

پھر اس سے پہلے کہ ایاز کی بیوی کچھ کہتی وہ ایک دم جھٹکے سے اٹھا۔ وہیں ایک جانب تپائی پر فون رکھا تھا اور پرویز اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔'' ایاز کی بیوی بڑبڑائی۔

''کوئی خاص بات نہیں' بس پرویز صاحب کو نہ جانے کیوں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ابھی خود انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔''

''خدا ہی معلوم کیا ہو گا' کیا نہیں۔'' اس کی آواز اب بھی دھیمی ہی تھی اور اس سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

مجبوراً مجھے وہ قدم اٹھانا ہی پڑا جس سے اب تک گریز کر رہی تھی۔ میری نگاہ پرویز کی طرف اٹھی۔ وہ ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا چکا تھا اور غالباً اب قریبی پولیس تھانے کا نمبر ملانے والا تھا۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ شاید اس لیے کہ مجھے اپنی نظر میں رکھ سکے۔ میں اسی لمحے پرویز کے ذہن کو اپنے طاقتور ذہن کی گرفت میں لے چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا۔

پرویز نے ٹیلی فون کا ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا اور پلٹ آیا۔ اب اس کا ہر عمل میرے ذہن کے تابع تھا۔ وہ دوبارہ میرے مقابل والے صوفے پر آ کے بیٹھ گیا۔ اب اس کے چہرے سے نہ غصے کا اظہار ہو رہا تھا' نہ کسی طرح کے تناؤ کا۔ ایاز کی بیوی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔'' میرے ذہن کے زیر اثر پرویز اپنی بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''دراصل بعض چہرے ایک دوسرے سے اتنے ملتے جلتے ہوتے ہیں کہ آدمی دھوکا کھا جاتا ہے۔ پھر بھی مجھے شک تھا' وہ اب دور ہو گیا۔ پولیس کو بلانے کی دھمکی دے کر میں ان کے سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔'' وہ کہے جا رہا تھا۔ ''بھابی! اگر یہ وہی ہوتیں جو مجھ سے دفتر میں ملی تھیں تو پھر صورتحال مختلف ہوتی۔ پھر یا تو یہ گھبرا کر جاتیں اور خوشامد پر اتر آتیں یا پھر یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتیں' مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ سکون و اطمینان سے بیٹھی رہیں۔ بہرحال میں ان سے معذرت خواہ

ہوں۔''

''تم بس ایک ہی ہو پرویز!'' ایاز کی بیوی خوش دلی سے بولی۔ پھر اس نے طویل سانس لیا جیسے اس کے ذہن سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ کچھ خیال نہ کیجیے گا' میرا دیور دل کا برا نہیں ہے۔''

''ہو جاتی ہے غلط فہمی' یہ کوئی ایسی بات نہیں۔'' میں بول اٹھی۔ ''پرویز صاحب سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔''

''شکریہ!'' پرویز مسکرا کر بولا' پھر کہنے لگا۔ ''آپ بھابی کی مہمان تھیں اس لیے مجھے مزید شرمندگی ہو رہی ہے۔''

''چلو...... اب تو بات ختم ہو گئی نا۔'' چھوڑو خاک ڈالو۔ ایاز کی بیوی نے کہا۔

''اچھا اب تو مجھے اجازت ہے' میں جاؤں؟'' میں نے پرویز کی طرف مسکرا کر بولی۔ ''یا پھر پولیس کو بلانے کا ارادہ ہے۔''

''ارے نہیں! کیوں شرمندہ کر رہی ہیں مجھے۔'' پرویز نے جواباً کہا۔ اس کا رویہ اب قطعی بدل گیا تھا۔ میں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ نام اور چہرے کی مشابہت کے باوجود میں کوئی اور ہی لڑکی ہوں۔

پھر میں وہاں مزید نہیں رکی اور ایاز کی بیوی سے اجازت لے کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔ چلتے وقت میں نے اس سے کہا تھا کہ آئندہ ہفتے پھر آؤں گی۔ ہر چند کہ اب میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا۔ میں نے اسے محض اپنی طرف سے مزید مطمئن کرنے کی خاطر یہ بات کہی تھی۔

اپنی کوٹھی سے باہر نکل کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر اس طرف چل دی جہاں اپنی سپورٹس کھڑی کی تھی۔ خلاف توقع اگر ایاز کا بھائی پرویز نہ آ گیا ہوتا تو میں کب کی اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد وہاں سے نکل چکی ہوتی۔ بہر حال اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا' بس ذرا سا وقت ضائع ہوا تھا مگر میں جس غرض سے نکلی تھی اس میں مجھے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔

ڈیفنس سے میں نے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا رخ کیا۔ ایاز کی بیوی کا ذہن پڑھ کر میں اس کے شوہر کے ماضی سے پوری طرح واقف ہو چکی تھی۔ وہ بھی اپنے بہنوئی شہریار ہی کی طرح مجرمانہ ذہنیت ہی کا مالک تھا۔ زندگی کے متعلق اس کا انداز فکر مثبت نہیں' منفی تھا۔ غالباً اسی لیے شہریار نے اسے اپنا آلہ کار بنایا تھا۔ ان دونوں کے درمیان گویا یہ ایک قدر مشترک تھی۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر مجھے سب سے اہم بات جو معلوم ہوئی تھی' یہ تھی کہ ایاز اپنی بیوی کو یہ بتا کر گیا تھا فی الحال کہاں جا رہا ہے۔ وہ کب لوٹ سکے گا اور کتنے عرصے اسے روپوش رہنا پڑے گا' اس سلسلے میں اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ فون پر رابطہ قائم کر کے ضروری ہوا تو بتا دے گا۔ ایاز نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ کسی بھی صورت میں پرویز تک کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ پھر ایاز کی بیوی نے اپنے شوہر کی ہدایت پر ہی عمل کیا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی تھی اور سب سے یہی کہا تھا کہ وہ خود پریشان ہے۔

صبح سے اب تک میری بھاگ دوڑ رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اب میں ایک راہ پر لگ چکی تھی اور

مجھے امید تھی کہ اب منزل زیادہ دور نہیں ہے۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ سپورٹس کو گیرج میں پارک کر کے میں اپنے کمرے میں آ گئی پھر میں نے انٹر کام پر ڈیوٹی روم سے رابطہ قائم کیا۔ دوسری جانب میری توقع کے مطابق عثمانی ہی تھا۔

''عثمانی! میری بات پوری توجہ سے سنو۔ میں تمہیں جو کچھ بتانے والی ہوں اس پر نہایت احتیاط کے ساتھ عمل کرنا ہے۔'' میں نے عثمانی سے کہا۔

''جی...... جی فرمائیے۔ آپ کی ہدایات پر پوری طرح عمل کیا جائے گا۔'' عثمانی پر یقین لہجے میں بولا۔

''ایاز کا سراغ مل گیا ہے وہ کہاں روپوش ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''سراغ...... اس کا سراغ مل گیا؟'' عثمانی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں!'' میں نے اطمینان سے کہا' پھر بولی۔ ''وہ اپنے ایک قریبی دوست عاصم کے گھر ہے' ملیر میں۔'' یہ کہہ کر میں نے عثمانی کو عاصم کا پورا پتا سمجھایا۔ ''یہ پتا تم لکھ بھی لو تو مناسب ہے' پھر میں نے اسے پتا نوٹ کرایا۔

''کیا اس پر فوراً ہاتھ ڈال دیا جائے؟'' عثمانی کے لہجے میں اضطراب بھی تھا اور جوش بھی۔

''پہلے میری پوری بات سن لو۔'' میں بول اٹھی۔ ''وہ کل اپنی کوٹھی سے سیدھا وہیں گیا تھا' لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس وقت بھی وہاں موجود ہو۔ وہ دراصل اپنی بیوی سے یہ کہہ کر گیا تھا کہ میں فی الحال وہیں جا رہا ہوں' اس کے بعد کچھ سوچوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں اس کا ملنا یقینی نہیں ہے۔ وہ اب تک وہاں ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ بہر حال ہمیں ایک راہ تو مل ہی گئی ہے' کم از کم اب ہم اس کے بارے میں قطعی تاریکی میں تو نہیں ہیں۔ سب سے پہلے یہ تصدیق ضروری ہے کہ ابھی وہ وہیں ہے یا نہیں۔ یہ معلومات حاصل کرتے ہوئے اس بات کا پورا خیال رکھنا ہے کہ ایاز کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ اگر اسے خطرے کا احساس ہو گیا تو وہ وہاں سے بھی فرار ہونے میں دیر نہیں کرے گا۔ اس کے بعد کیا قدم اٹھانا ہے' یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔''

''بہتر ہے۔'' عثمانی کی آواز سنائی دی۔

''میں تمہاری رپورٹ کی منتظر رہوں گی۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر انٹر کام پر کچن کا نمبر ملایا۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے لباس تبدیل کیا اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے بستر پر دراز ہو گئی۔

عثمانی کی رپورٹ کا مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

''ہاں عثمانی' کیا معلوم ہوا؟'' میں نے انٹر کام کا ریسیور اٹھاتے ہی سوال کیا۔ مجھے یقین تھا کہ دوسری جانب عثمانی ہی ہوگا۔

''یہ اطلاع صحیح ثابت ہوئی کہ ایاز کل دوپہر کے بعد اپنے دوست عاصم کے گھر ہی پہنچا تھا۔

گزشتہ رات بھی اس نے وہیں گزاری تھی۔" عثمانی بتانے لگا "آج صبح دس بجے تک ایاز وہیں تھا۔"

"یعنی؟" میرے لہجے میں اضطراب تھا۔ "کیا اب وہ وہاں نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔" عثمانی نے جواب دیا۔ "وہ اور اس کا دوست عاصم دونوں ہی صبح سے غائب ہیں اور گھر کے دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے۔ ان دونوں کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ حیدر آباد گئے ہیں۔ حیدر آباد میں وہ کہاں ٹھہریں گے یا ان کی واپسی کب ہوگی' یہ معلوم نہیں ہو سکا۔"

"ہوں!" عثمانی کی رپورٹ سن کر میں نے طویل سانس لیا' پھر کہا۔ "عاصم کے گھر کی نگرانی کا حکم دے دو۔ جیسے ہی ان دونوں کی واپسی کے بارے میں معلوم ہو مجھے مطلع کیا جائے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ دونوں دو چار دن میں کراچی واپس آ جائیں گے۔ اگر ایاز کا ارادہ واپسی کا نہ ہوتا اور وہ کراچی سے فرار ہونا چاہتا تو اپنے دوست کو ساتھ نہ لے جاتا۔ اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے عثمانی۔"

"میں آپ کے خیال سے متفق ہوں۔" عثمانی بولا۔ "لیکن...... حیدر آباد جانا سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اس لیے کہ تمہیں معلوم نہیں' وہ دونوں آوارہ مزاج اور اوباش ہیں۔ اوباشی اور وقت گزاری کی خاطر ہی انہوں نے حیدر آباد کا قصد کیا ہوگا۔ بہر حال جو بھی رہا ہو' ہمیں ان کی واپسی کا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔" یہ کہہ کر میں نے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا۔

پھر تین دن انتظار میں گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ میرا زیادہ تر وقت آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت ہی میں گزرا۔ میں مطالعے میں مصروف رہی کہ میرے نزدیک وقت گزاری کا اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ میں نے اب اپنا پہلا میک اپ بھی ختم کر کے نیا میک اپ کر لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میک اپ میں ایاز کے بھائی اور اس کی بیوی سے مل چکی تھی۔ میری طرف سے یہ مکمل خاموشی بے سبب نہیں تھی۔ اسی سے میرا مقصد اپنے دشمنوں کو مکمل طور پر تاریکی میں رکھنا تھا۔ میں اس وقت سے پہلے سامنے نہیں آنا چاہتی تھی جب تک اپنی حیثیت بحال نہ کر لیتی' مجھے کاروبار' کوٹھی اور دیگر اثاثے واپس نہ مل جاتے۔ اس کے بعد تو ظاہر ہی ہے کہ میرے حریفوں کو معلوم ہو ہی جاتا کہ میں' پاکستان پہنچ چکی ہوں۔ پھر مجھے اس کی زیادہ پرواہ نہ ہوتی۔ میں اپنے دشمنوں سے خوف زدہ نہیں' محتاط تھی۔

تیسرے دن' رات کو تقریباً آٹھ بجے مجھے وہ اطلاع مل ہی گئی جس کیلئے بے چین اور مضطرب تھی۔ میرا قیاس درست ہی ثابت ہوا۔ ایاز اپنے دوست عاصم کے ساتھ کراچی لوٹ آیا تھا۔ انٹر کام پر مجھے یہ اطلاع کمانڈر نواز نے دی تھی۔ وہ عموماً رات ہی کو ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔

"ان دونوں کی نگرانی کون کر رہا ہے؟" میں نے کمانڈر نواز سے دریافت کیا۔

"کیپٹن شاد اور سرفراز' دونوں اس وقت وہاں موجود ہیں۔" کمانڈر نواز نے بتایا۔

"ان سے کہہ دو کہ وہ ایاز کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ یہ رات بہر حال فیصلہ کن ثابت ہونا چاہئے۔ وقفے وقفے سے وہ تمہیں رپورٹ دیتے رہیں۔ بہت محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ ایک بار جل دے کر نکل گیا تو اس کا ہاتھ آنا مشکل ہو جائے گا۔" میں نے ہدایت دی۔

"میں ابھی انہیں آپ کے احکام سے مطلع کیے دیتا ہوں۔" کمانڈر نواز بولا۔ پھر پوچھنے لگا۔ "اس سلسلے میں میرے لیے کیا حکم ہے؟ اگر آپ کا حکم ہو تو میں خود وہاں جا کر چارج سنبھال لوں۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا تھا کہ اسے اسی وقت کیوں نہ اغوا کر لیا جائے؟"

"نہیں!" میں جواباً بولی۔ "میں حتیٰ الامکان ہنگامہ آرائی سے گریز کرنا چاہتی ہوں لیکن ضرورت محسوس ہوئی تو پھر یہ قدم بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس کیلئے رات کا وقت ہی مناسب رہے گا۔ کیوں کہ یہ معاملہ اہم نوعیت کا ہے۔ اس لیے رات کو تمہی چارج سنبھالو گے۔ اگر ضرورتاً پروگرام میں کوئی تبدیلی کرنا پڑی تو ظاہر ہے' میں تمہیں بتا دوں گی۔" یہ کہہ کر میں نے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا۔

پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد کمانڈر نواز نے مجھے ایک نئی اطلاع دی۔ یہ نئی اطلاع میرے لیے تشویش کن تھی۔

"سرفراز نے رپورٹ دی تھی کہ وہاں جوئے کی محفل جم گئی ہے۔ عاصم کے دوست وہاں آئے ہیں۔" کمانڈر نواز مجھے انٹر کام پر بتا رہا تھا۔ "ان لوگوں کا ارادہ رات بھر جوا کھیلنے کا ہے۔ عاصم کے وہ دونوں دوست علاقے کے چھٹے ہوئے غنڈے ہیں۔ انہوں نے مے نوشی کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ آپ کا حکم تھا کہ ہنگامہ آرائی سے گریز کیا جائے' مگر ایسی صورت میں ایاز کو وہاں سے اٹھانے کیلئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ کم از کم آج رات اسے خاموشی کے ساتھ اغوا کر کے یہاں لے آنا شاید ممکن نہیں رہا۔"

"ٹھہرو مجھے سوچنے دو! ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔ میں ابھی تم سے خود بات کرتی ہوں۔ کچھ بھی ہو آج رات میں اسے بہر حال آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں دیکھنا چاہتی ہوں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے انٹر کام کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہر چند کہ مجھے آپریشن سیل کے ارکان کی صلاحیتوں کا پورا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ ایاز کو اغوا کر کے لے آنا ان کیلئے کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ اس کے باوجود میں نے سوچا' بہتر ہے خود کوشش کر کے دیکھ لوں کہ بغیر کسی ہنگامے کے ایاز کو وہاں سے نکال لاؤں۔ مجھے ایک راہ سوجھ گئی تھی' لیکن اس کا تعلق میرے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں سے نہیں تھا۔ مناسب وقت آنے ہی پر میں ان قوتوں کو بروئے کار لانا چاہتی تھی۔ مزید نصف گھنٹہ سوچ بچار میں گزر گیا تھا۔ اس عرصے میں کوئی نئی خبر نہیں ملی تھی۔ خود اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ناکامی کے امکانات کو قطعی طور پر ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں مزید تاخیر یا آئندہ رات کا انتظار کرنا بھی میری قوت برداشت سے باہر تھا۔ جلد ہی میں روانگی کیلئے تیار ہو گئی۔ کمانڈر نواز سے انٹر کام پر رابطہ قائم کرنے کے بجائے میں سیدھی ڈیوٹی روم میں جا کر پہنچی۔ ظاہر ہے اسے میرے ارادے کا علم نہیں تھا اس لیے مجھے دیکھ کر چونک اٹھا۔ میرے لباس اور ہاتھ میں پرس دیکھ کر اس کیلئے یقیناً یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ میں کہیں جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ میرے چہرے پر میک اپ تھا' لیکن یہ میک اپ اس کیلئے نیا نہیں تھا۔ میں گزشتہ چند دنوں سے اسی میک اپ میں تھی۔

اجتراماً وہ مجھے دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا' پھر اپنے اندازے کی تصدیق کیلئے پوچھنے لگا۔

''کیا آپ نے خود وہاں جانے کا فیصلہ کیا ہے؟''

''تم ٹھیک سمجھے۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا اور پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''مجھے جیپ کی چابیاں دے دو۔''

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی سوالیہ نظروں کو محسوس کرلیا' پھر میرے ذہن میں جو کچھ تھا اسے مختصراً بتا دیا۔

''ضروری نہیں کہ میں نے جو کچھ سوچا ہے' سب کچھ اسی طرح ہو جائے' لیکن امکان بہرحال ہے۔'' میں نے مزید کہا۔ ''اس وقت تک انہیں دور ہی دور رہنا ہے جب تک میری طرف سے کوئی اشارہ نہ ملے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

''جی۔'' کمانڈر نواز بولا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ میری بات سن کر کسی سوچ میں پڑ گیا ہے۔

''کیا بات ہے' تم کس سوچ میں پڑ گئے؟'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''یہ نہ سمجھنا کہ تم لوگوں کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوں۔ بات وہی ہے جو میں ابھی تمہیں بتا چکی ہوں۔''

''جی...... جی ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر آپ اپنی جگہ مجھے بھیج دیتیں تو آپ کو یہ زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔''

''ٹھیک کہا تم نے' لیکن عین وقت پر بھی کبھی کبھی پروگرام میں ردوبدل کرنا پڑتی ہے۔ ممکن ہے میں جو کچھ سوچ کر جا رہی ہوں' وہاں پہنچ کر کوئی اور نئی بات ذہن میں آ جائے یا پھر حالات کے پیش نظر کوئی اور قدم اٹھانا پڑے۔ ایسی صورت میں فوری طور پر میں جو چاہوں گی کر سکوں گی۔'' میں نے اسے مطمئن کرنے کیلئے کہا۔

کمانڈر نواز نے میری بات سن کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر زبانی بھی میرے خیال سے متفق ہونے کا اظہار کیا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ حقیقتاً اس کے ذہن میں کیا بات آئی ہوگی۔ میرا تنہا جانا بہرحال خطرے سے خالی نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ میرا تعلق صنف نازک سے تھا اور وہ لوگ اوباش تھے۔ کوئی بھی ایسی صورتحال پیدا ہو سکتی تھی جو میرے لیے پسندیدہ نہ ہوتی۔ کمانڈر نواز اور میرے درمیان جو فرق مراتب تھا اسی کے سبب غالباً یہ بات اس کی زبان پر نہیں آ سکی تھی۔ کمانڈر نواز ہی کیا سیل کے تمام ہی ارکان مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی خواہش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ مجھے کسی خطرے سے دوچار نہ ہونے دیں اور میری جگہ خود اس خطرے کا سامنا کریں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ میرے ملازم تھے۔ اس کا اصل سبب میرے اور ان کے نظریات و خیالات کی ہم آہنگی تھی۔ خلوص تھا' محبت تھی' ایک دوسرے کے ساتھ بھی ان کا سلوک ایسا ہی تھا جیسے وہ سب ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔

میرے حکم پر اب کمانڈر نواز ٹرانسمیٹر پر کیپٹن شاد سے رابطہ قائم کر رہا تھا تا کہ اسے نئی صورتحال سے آگاہ کر دے۔ میں ڈیوٹی روم سے باہر نکل آئی اور پھر گیراج کی طرف چل دی۔ ایاز کا پروگرام میرے علم میں آ چکا تھا اس لیے مجھے زیادہ جلدی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ملیر پہنچنے کیلئے جیپ کو تیز

رفتاری سے نہیں چلایا۔ میں اطمینان سے جیپ ڈرائیو کرتی ہوئی تقریباً آدھ پون گھنٹے میں مطلوبہ پتے تک پہنچ گئی۔ جیپ کو میں نے عاصم کے گھر کے سامنے ہی جا کر کھڑا کیا تھا۔ میں اسی دوران میں کیپٹن شاد اور سرفراز کو بھی دیکھ چکی تھی۔

جیپ کے انجن کی آواز شاید اس گھر میں موجود افراد نے سنی ہو' مگر کوئی توجہ نہیں دی۔ اندر سے ہنسنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیپ کا انجن بند کر کے میں نیچے اتر آئی اور پھر آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ کیوں کہ وہاں مجھے کال بیل نظر نہیں آئی تھی۔ مکان پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ کئی بار زور زور سے کنڈی ہلانے کے بعد کہیں ان کے کانوں پر جوں رینگی۔ میں اطمینان سے کھڑی رہی۔

''اے جا کے دیکھ یہ اس وقت کون آ مرا۔'' اندر سے کسی کی آواز سنائی دی۔

صدر دروازے کے قریب ہی ایک کھڑکی تھی جس پر لوہے کی جالی چڑھی ہوئی تھی۔ اندر کی آوازیں مجھے اسی کھڑکی کے ذریعے واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کھڑکی غالباً اسی کمرے کی تھی جہاں ان لوگوں نے محفل جما رکھی تھی۔

''تو شو تو کر پہلے' ابھی دیکھے لیتا ہوں۔'' جواب میں ایک اور آواز ابھری۔

''لے یہ شو! دو گلے ہیں میرے پاس اور ایک چھکا۔'' بول اب تیرے پاس کیا ہے؟'' وہ اپنی ہی دھن میں لگے ہوئے تھے۔

''چل جیت گیا تو اٹھا لے مال...... اور ہاں معلوم نہیں کون ہو تے اور پیسے چھپا لو میں دیکھتا ہوں جا کر۔''

''عاصم تو بھی پاگل ہے پورا ایاز نام ہے میرا۔ ہے کسی کی مجال جو تجھ پر ہاتھ ڈال دے۔ چل جا دیکھ جا کے کون ہے۔''

''ہاں معلوم ہے تیرا بہنوئی بڑی توپ چیز ہے اور تو بھی کسی سے کم نہیں' پھر بھی یار میں احتیاطاً کہہ رہا تھا۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی اور پھر چند ہی لمحوں بعد مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی جو دروازے ہی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا اور مجھے ایک نوجوان کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی' سر کے بال بڑے بڑے اور مونچھیں گھنی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے تھے' پھر آنکھوں میں ایک شیطانی چمک سی آ گئی تھی۔ وہ میرے عقب میں کھڑی ہوئی جیپ کو بھی حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ ''چھپر مار کر'' مونچھوں والا نوجوان کچھ کہتا یا پوچھتا' میں بول اٹھی۔ ''ایاز صاحب ہیں؟''

''ایاز......'' اس کی نظریں میرے سراپا کا جائزہ لینے لگیں۔ ''جی...... ہاں ہیں آپ...... اندر...... اندر آ جائیں نا۔'' وہ رک رک کر بولا۔ اس کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا کہ بس غیر ارادی طور پر وہ بولے جا رہا ہے اور کچھ سمجھ نہیں پا رہا کہ کہنا کیا چاہیے۔ ویسے اس کی آنکھیں مجھ سے بہت کچھ کہہ رہی

تھیں۔

میں کسی قسم کی جھجک کا مظاہرہ کیے بغیر اندر داخل ہوئی اور اس نوجوان کے چہرے پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ وہ مزید حیرت زدہ نظر آنے لگا تھا۔ اسے یقیناً یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ میں فوراً ہی اس کی پیشکش قبول کرلوں گی۔ شاید اسی سبب وہ گھر کا دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔

بائیں جانب دو کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔ انہی میں سے ایک کا دروازہ کھول کر اس نے لائٹ جلائی اور میری طرف مڑا۔ ''آئیے یہاں اندر بیٹھ جائیے...... میں ابھی ایاز کو بھیجتا ہوں...... وہ معاف کیجیے گا' میں نے اب تک آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔''

''کوئی بات نہیں' آپ بس ایاز صاحب کو بھیج دیں۔ میں بیٹھتی ہوں یہاں۔'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھی اور اس کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ نوجوان مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر ایک طرف ہوگیا تھا۔

وہ کمرہ کیا اچھا خاصا کباڑ خانہ تھا۔ ایک طرف دو تین کرسیاں پڑی تھیں۔ میں ایک کرسی پر جا کے بیٹھ گئی۔ وہ نوجوان ابھی تک حیران سا کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔

''آپ جائیں نا۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''جی...... جی ہاں...... جا...... جاتا ہوں۔'' وہ میرے ٹوکنے پر کچھ گڑبڑا سا گیا اور پھر پلٹ کر چل دیا۔

وہ نوجوان ایاز کا دوست عاصم ہی لگتا تھا۔ وہ چلا گیا تو میں سوچنے لگی کہ میری جگہ اگر اس وقت کمانڈر نواز ہوتا تو شاید عاصم اسے دروازے ہی سے ٹال دیتا۔ رات کے وقت توقع کے خلاف ایک تنہا اور جوان لڑکی کو دیکھ کر عاصم یقیناً بوکھلا گیا تھا۔ اس بوکھلاہٹ کا سبب اس کی آوارہ مزاجی ہی ہوسکتی تھی۔

جس کمرے میں وہ لوگ بیٹھے تھے وہاں سے مجھے کچھ دیر تک کبھی مدھم اور کبھی نسبتاً تیز آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میں صرف چند جملے ہی واضح طور پر سن سکی۔

''جب میں نے تجھ سے منع کر دیا تھا کہ کسی اجنبی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں' میں یہاں ہوں تو پھر تو نے کیوں اسے......''

''بس یار نکل گیا نا منہ سے! لڑکی ہی تو ہے کوئی شیرنی تو نہیں کہ پھاڑ کھائے گی تجھے۔'' یہ اسی نوجوان کی آواز تھی جو مجھے کمرے میں بٹھا کر گیا تھا۔ پھر ان کے درمیان چند مبتذل قسم کے فقروں کا تبادلہ ہوا۔ آوازیں مدھم ہوگئی تھیں۔ ایاز کے علاوہ عاصم کے دوسرے دو دوستوں کی آوازیں بھی ان میں شامل تھیں جن کے بارے میں مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ اس علاقے کے غنڈے ہیں۔

''میاں اب تک تو یہی سنتے آئے تھے کہ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے' آج کنویں کو خود پیاسے کے پاس چل کر آتے دیکھ لیا۔'' یہ جملہ شاید انہی دونوں غنڈوں میں سے کسی نے کہا تھا اور پھر خود ہی زور سے ہنس پڑا تھا۔

''کیا بکواس شروع کر دی تم لوگوں نے۔ معلوم نہیں' کون ہے وہ کون نہیں۔'' یہ آواز ایاز ہی کی معلوم ہوئی تھی۔

''تو یار دیکھ لو نہ جا کر! خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ ڈال دیا تم نے تو۔''

''ظاہر ہے' دیکھنا ہی پڑے گا جا کر کہ کون مسمات ہیں...... اور عاصم! گھر کا دروازہ بند کر دیا تم نے......؟ اگر نہیں کیا تو بند کر دو' میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔''

ان لوگوں کی گھٹیا اور مبتذل باتیں سن کر مجھے غصہ تو بہت آیا کہ ابھی ان کی ساری طرم خانی نکال دوں مگر مصلحت وقت کو دیکھتے ہوئے کسی طرح برداشت کر ہی گئی۔ میں یہاں پہلے ہی یہ سوچ کر آئی تھی کہ ہنگامہ نہیں کرنا۔ اگر وہ حد سے گزرنے کی کوشش کرتے تو دوسری بات تھی۔ ابھی بہرحال وہ منزل نہیں آئی تھی۔ ایاز نے دوست سے گھر کا دروازہ بند کرنے کیلئے کہہ دیا ہے' یہ سنکر مجھے کچھ تشویش نہیں ہوئی تھی۔ اس سے میرے نزدیک کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

ایاز میرے لیے اجنبی ہی ثابت ہوا۔ اس سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے میری طرف بہت غور سے دیکھا۔ میری نگاہ بھی اسی کا جائزہ لے رہی تھی۔ چہرہ اس کے باطن کا آئینہ تھا۔ اجلے کپڑوں اور اجلی رنگت کے باوجود میلی روحیں' میلی ہی رہتی ہیں۔ میں اس کی بیوی سے بھی مل چکی تھی مگر میاں بیوی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے قدم قدم چلتا ہوا اور میرے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے قریب آ گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے مرعوب کرنا چاہتا ہو۔

''تفصیلی تعارف تو خیر آپ سے ہوتا رہے گا' پہلے یہ بتا دیں کہ یہاں کا پتا کس نے دیا آپ کو؟'' اس کے لہجے میں گہری چبھن تھی۔

''ایاز صاحب!'' میں نے پرسکون لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی مگر پہلے اپنے دوستوں سے کہہ دیں کہ یہاں کچھ دیر کوئی نہ آئے' اس کے بعد کمرے کا دروازہ بند کر دیں۔''

لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر الجھن سی نظر آئی' پھر بولا۔ ''ایسی کیا بات ہے آخر جس کیلئے اتنی راز داری کی ضرورت ہے؟'' لہجے کی چبھن اب بھی برقرار تھی۔

''بات ہے نا ایسی' اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔''

''اچھا!'' اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا' پھر مزید کچھ کہے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا۔ چند لمحے بعد اس نے اپنے دوست عاصم کو آواز دی۔

''ہاں کہو!'' دور سے عاصم کی آواز آئی۔ ''آیا!''

کچھ دیر مجھے کمرے کے باہر سرگوشیاں سنائی دیتی رہیں' پھر ایاز کمرے میں لوٹ آیا اور میرے ایما پر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

''جی محترمہ! اب کیا خیال ہے؟'' قریب پڑی ہوئی دوسری کرسی پر آکر بیٹھتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اب غالباً مزید راز داری کی ضرورت نہیں رہی۔''

''ہاں اب میں جو کہنا چاہتی ہوں' کہہ سکتی ہوں۔'' میں نے اس کے چڑانے والے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے میری پوری بات سن کر آپ مجھ سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں اس لیے پہلے مجھے کہہ لینے دیں۔'' پھر میں اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر بول اٹھی۔

''آپ یہاں خطرے میں ہیں' آپ کے بہنوئی شہریار صاحب نے مجھے یہ پیغام پہنچانے کیلئے یہاں بھیجا

ہے۔ آپ کو اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہے۔ میں اس لیے جیپ لے کر آئی ہوں تاکہ میں آپ کو اس محفوظ جگہ تک پہنچا دوں جس کے بارے میں مجھ سے کہا گیا ہے۔ فون ہی پر انہوں نے مجھے اطلاع بھی دی ہے کہ عذرا خان' مصر سے فرار ہو کر پاکستان پہنچ چکی ہے۔ اپنے تعارف کے طور پر میں صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھتی ہوں کہ میرا تعلق انٹیلی جنس سے ہے۔ آپ کے بہنوئی سے میرے ذاتی مراسم ہیں' ان مراسم کا تعلق میرے محکمے سے نہیں۔ وہ اکثر مجھ سے ایسے کام لیتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے بھی میں شرمندہ نہیں کہ ان سے مجھے اس کا بھرپور معاوضہ ملتا ہے۔"

ایاز میری بات سنکر کچھ دیر تو گم صم سا ہو گیا تھا' پھر اس کے چہرے سے فکر و پریشانی کا اظہار ہونے لگا۔ وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اسی اضطراب کے عالم میں اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا' سگریٹ کا پیکٹ نکال کر لائٹر سے سگریٹ سلگائی اور گہرا کش لیا۔

"کیا سوچنے لگے آپ؟" میں بولی تو وہ چونک اٹھا۔

"کچھ ..... کچھ نہیں۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ غالباً وہ اپنی گھبراہٹ کو مجھ سے چھپانا چاہتا تھا۔ "چلنا کہاں ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"کیوں' کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟" میں نے کہا۔

"نن...... نہیں یہ...... یہ بات نہیں! بس یوں...... یوں ہی میں نے پوچھ لیا تھا۔ میرا مقصد کچھ...... کچھ اور نہیں تھا۔" وہ کچھ زیادہ ہی گھبرا گیا تھا۔

"ظاہر ہے کہ میں آپ کو اسی جگہ لے جاؤں گی جہاں آپ کی حفاظت کا پورا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ بس اب آپ وقت ضائع نہ کریں۔ آپ کو وہاں پہنچا کر مجھے فون پر شہریار صاحب کو بھی رپورٹ دینی ہے۔"

"اچھا...... ٹھیک ہے میں ابھی...... بس دس پندرہ منٹ کے اندر...... بلکہ اس سے بھی پہلے تیار ہوا جاتا ہوں۔ آپ یہاں اطمینان سے بیٹھیں۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہو گیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ میرا تیر صحیح نشانے پر لگا ہے۔ بالآخر میں اسے کسی ہنگامہ آرائی کے بغیر اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہونے والی تھی۔ اس سلسلے میں اس کے بہنوئی شہریار کا حوالہ تیر بہ ہدف ثابت ہوا تھا۔ پھر اس خبر نے اسے اور بھی بوکھلا دیا تھا کہ عذرا خان یعنی میں پاکستان پہنچ چکی ہوں۔ اس کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی تھی۔ ذرا ہی دیر میں وہ بالکل بدلا ہوا سا نظر آنے لگا تھا۔ میری نگاہ اسی کی طرف تھی۔ اب وہ کمرے کے دروازے کی چٹخنی کھول رہا تھا۔

معاً مجھے ان کاغذات کا خیال آیا جن کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ ایاز انہیں اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ وہی کاغذات ہو سکتے تھے جن پر عالم بے خبری میں مجھ سے دستخط کرائے گئے تھے اور انہی کے سبب ایاز میرے تمام اثاثوں کا مالک بن گیا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے احتیاطاً اس مخاطب کیا۔ "سنیئے۔"

"جی!" وہ پلٹا۔

"جلدی میں وہ کاغذات وغیرہ یہاں نہ بھول جائیے گا جو اپنی کوٹھی سے لے کر چلے تھے۔" میں نے کہا۔

خلاف توقع وہ ایک دم چونک اٹھا۔ پھر میں نے چند ہی لمحوں کے اندر اندر اس کے چہرے کا رنگ بدلتے ہوئے دیکھا۔ میں کچھ سمجھ نہ سکی کہ اچانک اسے ہوا کیا۔

"ابھی آپ شاید فون کی بات کر رہی تھیں کہ......"

"ہاں ہاں' کیوں؟ یہ کہہ رہی تھی میں کہ فون پر مجھے آپ کے بہنوئی کو رپورٹ دینی ہے۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"آج فون پر آپ کی ان سے کس وقت بات ہوئی تھی؟"

"دوپہر کے شاید دو اڑھائی بجے۔" میں اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کچھ الجھنے لگی۔ "مگر یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟ ناحق وقت ضائع ہو رہا ہے۔ راستے میں بھی ہم یہ باتیں کر سکتے ہیں۔"

"اب کسی بات کی ضرورت نہیں رہی۔" اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ "سمجھیں آپ کچھ...... اور اگر نہیں سمجھیں اب بھی تو......"

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر تیزی سے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا۔

"یہ ایسی چیز ہے خاتون کہ بہت کچھ سمجھا دیتی ہے۔" اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا۔ "یہ ریوالور میں نے گولی مارنے کیلئے نہیں محض اس لیے نکالا ہے کہ پلیز آپ چیخنے چلانے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ ورنہ پھر مجبوراً مجھے گولی چلانا ہی پڑے گی۔" اس کے مخصوص عیارانہ لہجے کی چبھن واپس آ گئی تھی۔ "بس ذرا میرا دوست عاصم آپ کے منہ میں کپڑا ٹھونس دے' پھر یقین کریں' میں یہ ریوالور جیب میں رکھ لوں گا۔"

اس کے الفاظ میری سماعت میں زہر سا گھول رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک بساط کیسے الٹ گئی۔

☆......☆......☆

چند لمحے اسی کیفیت میں گزرے۔ ایاز نے میری خاموشی کا کوئی اور ہی مطلب اخذ کیا۔ و بولا۔ ''آپ شاید کچھ گھبرا گئیں خاتون! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔'' پھر وہ ہنسا۔ ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں...... ویسے آپ حیران ضرور ہوں گی کہ ایک دم آپ کے ڈرامے کا ڈراپ سین کیسے ہو گیا؟'' یہ کہتے ہوئے وہ قدم قدم چلتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ اس کے ریوالور کا رخ اب بھی میری طرف تھا۔ ''کبھی کبھی اندازوں کی غلطی ہو جاتی ہے' مگر اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں آپ کے ٹریپ میں آ گیا تھا۔ پس آپ کے ایک جملے نے بچا لیا مجھے۔ آپ اگر کاغذات ساتھ لے کر چلنے کو نہ کہتیں تو...... خیر چھوڑیں' اس ذکر کو! میرا خیال ہے کہ آپ ان خواتین میں سے نہیں ہیں جو موقع محل کو نہ سمجھ سکیں اور ناحق شور مچانے لگیں۔ آپ کے بارے میں میرا اندازہ درست ہے نا۔''

میں اس دوران میں خود پر قابو پا چکی تھی۔ اس کے ریوالور کی پروا کیے بغیر میں ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''بکواس بند کرو۔''

میرے کرسی سے اٹھتے ہی وہ تیزی کے ساتھ ایک دم پیچھے ہو گیا اور پھر درشت لہجے میں بولا۔

''لڑکی! زیادہ بہادری دکھانے کی ضرورت نہیں۔ تم شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ میں فائر نہیں کروں گا۔ تم بہادری نہیں حماقت کا ثبوت دے رہی ہو۔''

''بے وقوف ہو تم! اس کا اندازہ تمہیں ابھی ہو جائے گا۔'' یہ کہتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھلی۔

پھر میرا دایاں پیر ایک دائرے کی صورت میں گھوم کر اس کی کلائی پر پڑا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فضا میں بلند ہوا اور میں نے فوراً ہی اسے لپک لیا۔

''اب کیا خیال ہے بہادر خان!'' میں نے اسی کے لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے۔ ریوالور کا رخ اب اس کی جانب تھا۔

وہ اپنی کلائی پکڑے جھکا ہوا تھا۔ چند ہی لمحوں میں صورتحال بدل چکی تھی۔

''سیدھے کھڑے ہو!'' میں نے اسے سخت لہجے میں حکم دیا۔

''کک...... کون...... کون ہو تم؟'' وہ کراہتا ہوا میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

''عذرا خان!'' میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔ اس سے میرا مقصد محض یہ تھا کہ اس کی قو

مزاحمت قطعی طور پر ختم ہو جائے۔

''مگر میں...... میں نے اس کی تصویر دیکھی تھی۔ تم...... تم وہ......''

''کبھی کبھی آنکھوں دیکھا بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔ میرے چہرے پر اس وقت میک اپ ہے اس لیے کہ میں چاہتی تھی سیدھی انگلیوں سے گھی نکل جائے' مگر لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔'' میں اپنے آخری الفاظ پر زور دے کر بولی۔ ''اپنے دوست عاصم کو آواز دے کر اپنا اٹیچی کیس یہیں منگوا لو۔ تم اسے یہی بتاؤ گے کہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ جا رہے ہو اور یہ لو اپنا ریوالور بھی اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لو۔''

وہ اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ کوشش کے باوجود ریوالور نہ لپک سکا۔ ریوالور اس کے جسم سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔

پھر جب وہ ریوالور اٹھانے کیلئے جھک رہا تھا تو اسی وقت اس کا ذہن میرے طاقتور ذہن کی گرفت میں آ چکا تھا۔ کسی بھی قسم کی ہنگامہ آرائی سے بچنے کیلئے مجھے مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا تھا۔ وہ اب بغیر کسی مزاحمت کے میرا ہر حکم ماننے پر مجبور تھا۔

''ریوالور اٹھا کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لو۔'' میں نے اسے پہلا حکم دیا۔

اس نے فوراً ہی میرے حکم پر عمل کیا۔ پھر اس نے میرے ہی حکم پر اپنے دوست عاصم کو آواز دے کر بلایا۔ میں اب دوبارہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

''عاصم! میں جا رہا ہوں ان کے ساتھ۔'' اس نے اپنے دوست کو مخاطب کیا۔ ''تم میرے کپڑے وغیرہ اور اٹیچی لے آؤ۔''

''مگر تم...... تم تو کہہ رہے تھے کہ کچھ دن میرے ساتھ......''

''جو کہہ رہا ہوں کرو' مجھے بہت جلدی ہے۔''

میں نے عاصم کے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھے۔ اس نے کن انکھیوں سے میری طرف بھی دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے تم جانو! لیکن...... ذرا دیر کیلئے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کہہ دیا نا تم سے کہ وقت نہیں ہے یار! تم خواہ مخواہ دیر کر رہے ہو۔'' ایاز کے لہجے میں میرے ہی ایماء پر قدرے سختی آ گئی۔

پھر عاصم وہاں نہیں رکا۔ اسے ایاز کا سامان لانے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی تھی جو ایک اٹیچی اور ایک ایئر بیگ پر مشتمل تھا۔

''اچھا خدا حافظ!'' ایاز نے ایئر بیگ اپنے شانے سے لٹکاتے ہوئے کہا اور پھر اٹیچی اٹھا لی۔

عاصم کے چہرے پر اب بھی حیرت تھی۔ وہ کچھ چپ چپ سا تھا۔ اس نے زیر لب ''خدا حافظ'' کہا۔ میں بھی اس دوران میں کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر ایاز اور میں ساتھ کمرے سے نکلے۔ عاصم گھر کے دروازے تک ہمیں چھوڑنے آیا تھا۔

''بیگ اور اٹیچی پچھلی سیٹ پر رکھ دو۔'' میں نے جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ایاز نے ایسا ہی کیا اور پھر میرے حکم پر جب جیپ میں سوار ہو گیا۔ میں نے اس کے بیٹھتے ہی جیپ سٹارٹ کر دی۔ وہ میری برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی اس لیے سڑک تک مجھے ریورس گیر میں آنا پڑا۔

سڑک پر آتے ہی میں نے جیپ کو تیزی سے دوڑانا شروع کر دیا۔ ایاز کسی معمول کی طرح بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ ابھی تک وہ میرے ذہن کے زیر اثر تھا۔ آپریشن سیل ہیڈکوارٹر پہنچنے تک اس کے ذہن کو قابو میں رکھنا ضروری تھا۔ اس کا ذہن پڑھ کر مجھے یہ جاننے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی کہ میری زبان سے کاغذات کا ذکر سن کر وہ ایک دم بدل کیوں گیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ کاغذات اس نے حیدر آباد جانے سے پہلے بینک کے لاکر میں رکھوا دیئے تھے اور اپنے بہنوئی شہریار کو بھی فون پر اس سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے اسی لیے مجھ سے یہ سوال کیا تھا کہ شہریار سے فون پر کب میری بات ہوئی تھی؟ پھر جب اسے میری طرف سے یہ جواب ملا کہ آج دوپہر شہریار سے فون پر میری بات ہوئی ہے تو اس پر میرا جھوٹ کھل گیا۔ اگر واقعی شہریار سے میری بات ہوئی تھی تو پھر مجھے کاغذات کا ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس نتیجے تک پہنچتے ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اسے دھوکا دے کر اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔ ایاز نے آج صبح ہی حیدر آباد سے شہریار کو فون کیا تھا۔ اس نے شہریار کو یہی بتایا تھا کہ میں کراچی ہی میں اپنے دوست کے گھر ہوں۔ شہریار نے اس سے کہا تھا کہ اگر تم کراچی میں اپنے لیے کسی قسم کا خطرہ محسوس کرو تو سیدھے اسلام آباد آ جانا۔ ایاز نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ فی الحال کوئی خطرہ نہیں' اگر ایسا ہوا تو میں یقیناً آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔ ایاز کے فون کرنے کا مقصد شہریار کو اپنی خیریت سے مطلع کرنا تھا۔ شہریار نے تاکید کی تھی کہ ہر دوسرے تیسرے دن وہ فون پر اپنی خیریت دیتا رہے۔ اس کے تو گمان میں بھی نہ ہو گا کہ آج ہی ایاز میرے قابو میں آ جائے گا۔

جو کچھ بھی ہوا تھا بہرحال میں نے صورتحال بگڑنے نہیں دی تھی۔ اسی کے نتیجے میں ایاز اس وقت میرے ساتھ آپریشن سیل ہیڈکوارٹر جا رہا تھا۔

میں نے احتیاطاً اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے ایاز کے ذہن پر غنودگی طاری کر دی۔ اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

اس وقت نصف شب گزر چکی تھی جب میری جیپ آپریشن سیل ہیڈکوارٹر پہنچی۔

عمارت میں بظاہر ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ جاگنے والی آنکھیں جاگ رہی ہوں گی جیپ کو گیرج کے باہر پارک کر کے میں اتری اور اپنے ساؤنڈ پروف کمرے کی طرف بڑھنے کے بجائے ڈیوٹی روم کی طرف چل پڑی۔ ایاز کو میں نے اسی طرح خوابیدگی کی حالت میں جیپ کے اندر چھوڑ دیا تھا۔ اسے اس عمارت میں لے آنے کے بعد اب مجھے کوئی فکر نہ رہی تھی۔

میری توقع کے مطابق کمانڈر نواز کو علم ہو چکا تھا کہ میں آ چکی ہوں۔ اسی کے ساتھ اسے یہ خبر بھی مل چکی تھی کہ میں خالی ہاتھ نہیں لوٹی۔ اس عمارت میں دراصل ایسا خودکارانہ نظام ہر وقت فعال حالت میں رہتا تھا کہ بغیر علم و اطلاع کے کوئی اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے میں اسے ایک محفوظ قلعہ کہتی تھی۔ اس جدید نظام کے علاوہ کچھ مسلح افراد بھی ہر دم چوکنا اور مستعد رہتے تھے تاکہ کسی بھی قسم کی صورتحال سے

فوری طور پر نمٹ سکیں۔

مجھے ڈیوٹی روم میں قدم رکھتے دیکھ کر کمانڈر نواز پینل سے اٹھ کھڑا ہوا اور ستائشی لہجے میں بولا۔ ''آپ کا فیصلہ درست ہی تھا۔ اس کا ثبوت آپ کی کامیاب واپسی ہے۔ ممکن ہے ہم لوگوں سے ہی کوئی غلطی ہو جاتی۔ سرفراز اور کیپٹن شاد کی طرف سے مجھے رپورٹ مل چکی ہے۔''

''یہ لو۔'' میں نے جیپ کی چابیاں اس کی طرف بڑھا دیں۔ ''تم نے ان دونوں سے کہہ دیا کہ اب مزید نگرانی کی ضرورت نہیں ہے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے مجھ سے چابیاں لے کر کی بورڈ پر لٹکاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر بولا۔ ''ایاز کو آپ کے کمرے میں پہنچا دیا جائے یا......''

''اس کیلئے کسی اور کمرے کا بندوبست کر دو۔'' میں کمانڈر نواز کی بات کاٹ کر بولی۔ ''ممکن ہے اسے کئی دن یہاں رکھنا پڑے' یہ خیال رکھنا کہ وہ کمرا بھی ساؤنڈ پروف ہونا چاہئے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پینل کی طرف پلٹا اور انٹرکام پر اپنے ماتحتوں کو احکام دینے لگا۔

وہ احکام دے چکا تو میں بولی۔ ''میں اپنے کمرے میں چلتی ہوں تاکہ لباس وغیرہ تبدیل کر لوں۔ پھر میں ایاز سے ملوں گی۔''

یہ کہتے ہی میں مڑی اور ڈیوٹی روم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ کمانڈر نواز نے ایاز کو کس کمرے میں لے جانے کا حکم دیا تھا' یہ مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ وہ کمرہ عمارت کے عقبی حصے میں تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں کچھ ہی دیر میں فریش ہو گئی۔ میں نے کچن روم سے چائے بھی منگا لی تھی۔ اپنا میک اپ بھی میں نے ختم کر دیا تھا۔ میرے نزدیک اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ شہریار اور اس کے برادر نسبتی ایاز نے مجھے جس ذہنی اذیت میں مبتلا کیا تھا' وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھی۔ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے باب میں میرا رویہ یکسر بدل جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی رعایت میرے نزدیک گناہ کا درجہ رکھتی تھی۔ اگر یہ معاملہ براہ راست مجھ سے متعلق نہ ہوتا تو بھی میرے احساسات یہی ہوتے۔ دراصل ظلم' دھاندلی اور جرائم کے خلاف خاموشی اختیار کرنا' مجرموں کو قرار واقعی سزا نہ دینا بھی جرم ہے۔ اس سے مجرموں کے حوصلے اور بلند ہوتے ہیں۔ وہ اور بھی شیر ہو جاتے ہیں۔ ایاز کے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ بھی مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ میں اس لئے اسے ایسا سبق دینا چاہتی تھی کہ جسے وہ تازندگی فراموش نہ کر سکے۔ جہاں تک اس سے کاغذات پر دستخط کرانے کا تعلق تھا تو وہ اب کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جو کاغذات بینک کے لاکر میں تھے ان کا حصول بھی مشکل نہیں تھا کیوں کہ اب وہ میرے قابو میں تھا۔

چائے پینے کے بعد میں اٹھی اور الماری سے وہ کاغذات نکال لئے جن پر مجھے ایاز سے دستخط کرانا تھے۔ وہ کاغذات اپنے پرس میں رکھ کر میں اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔ پھر میں مختلف راہداریوں سے گزرتی ہوئی عمارت کے عقبی حصے میں پہنچ گئی۔

مطلوبہ کمرے کے دروازے تک پہنچتے ہی ایک جانب سے سیل کا ایک مسلح کارکن میرے

سامنے آ گیا۔ وہ دائیں جانب تاریکی میں کھڑا ہوا غالباً میری ہی آمد کا منتظر تھا۔ اس نے میرا اشارہ ملتے ہی اس کمرے کا دروازہ کھول دیا اور پھر ادب سے ایک طرف ہو گیا۔

میں نے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں روشنی تھی۔ سامنے ہی مسہری پر ایاز ابھی تک محوِ خواب تھا۔ مسہری کے قریب ہی میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ میں آہستگی سے آگے بڑھی اور میز کے قریب جا کر گلاس میں پانی انڈیلا' پھر گلاس کا سارا پانی ایاز کے چہرے پر پھینک دیا۔

توقع کے مطابق وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور حیران حیران نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''ایاز!'' معاً میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''تم نے مجھے بتایا تھا میری تصویر دیکھ چکے ہو۔ اب پہچانے مجھے۔''

''تم...... تم عذرا...... عذرا خان ہو۔ ہاں تمہی ہو وہ۔'' وہ ہکلاتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا' پھر کہنے لگا۔

''مگر...... مگر تم...... تم مجھے یہاں...... یہاں تک لے آئی ہو اور......''

''اور کیسے لے آئی ہو؟ یہ بھی کہو نا! رک کیوں گئے؟ حیرت ہو رہی ہے مجھے تم پر کہ ایک عورت کے سامنے تم یوں بزدلوں کی طرح ہکلا رہے ہو...... وہ بھی ایک تنہا عورت کے سامنے۔'' میں نے دانستہ گویا اس کی غیرت کو جگانا چاہا۔

میری بات کا اس پر خاطر خواہ ردعمل ہوا۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اسی وقت میں ہنس پڑی۔ مجھے یقین تھا کہ سیل کے ارکان نے اس کی جیب سے ریوالور نکال لیا ہوگا۔

''میں نے غلط نہیں کہا تھا کہ تم بے وقوف ہو۔ ریوالور تو تم وہیں اپنے دوست کے گھر چھوڑ آئے تھے۔'' میں بول اٹھی۔ ''پھر یہ کہ تمہیں آخر ریوالور کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم خاصے ہٹے کٹے ہو کہاں تم کہاں میں۔''

''تمہارا مطلب کیا ہے آخر ان باتوں سے؟'' وہ مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ریوالور واقعی اس کی جیب میں نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ خالی تھا۔

میں نے اس کی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے پرسکون آواز میں کہا۔ ''دراصل میں تمہیں تمہاری بے بسی کا احساس دلانا چاہتی ہوں۔ تم جو کسی چوہے کی طرح بل میں جا چھپے تھے دیکھ لو کہ میں تمہیں کس طرح وہاں سے باہر نکال لائی۔ ویسے ایک بات بتاؤ ایاز کہ میری کوٹھی اور سارا کاروبار کیا تمہارے اباجی کی جاگیر تھا جو تم نے اس پر قبضہ کر لیا' اپنے بہنوئی کے اشارے پر اس سے تو میں بعد میں بھگتوں گی مگر تم اس وقت میرے قابو میں ہو۔''

''میں...... میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھ سے...... مجھ سے انہوں نے ہی کہا تھا کہ......''

''کہ حرام کا مال ڈکار جاؤ۔'' میں نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ پھر بولی۔ ''اس میں حصہ تو تمہارا بھی تھا۔ عیش تو تم بھی اڑا رہے تھے۔ پھر اتنے بھولے کیوں بن رہے ہو۔''

''دیکھو عذرا خان اگر اس طرح مجھ پر ہاتھ ڈال کر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ دوبارہ سب کچھ حاصل کر

لو گی تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔'' اس کے لہجے میں اب بوکھلاہٹ نہیں تھی۔ وہ غالباً خود پر کسی قدر قابو پا چکا تھا۔ وہ مزید بولا۔ ''تمہارے ذہن سے شاید یہ بات محو ہو گئی ہے کہ میرے بہنوئی کی حیثیت کیا ہے۔ ان سے ٹکرانا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔''

''واقعی ایاز۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔'' میرا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''مجھے معلوم ہے تمہیں اپنے متعلق بہت غلط فہمی ہے۔'' وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ''لیکن ایسی غلط فہمیاں لے بھی ڈوبتی ہیں۔''

''تو پھر مجھے کوئی مشورہ دو نا کہ میں آخر کیا کروں؟ کس طرح تمہارے اور تمہارے بہنوئی کے کس بل نکالوں؟''

''نکال دو اس بات کو اپنے ذہن سے۔ یہی تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''اچھا خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ وہ کاغذات کہاں ہیں جن کی رو سے تم میرے تمام اثاثوں کے مالک بن بیٹھے ہو؟''

''کیا تمہارے خیال ہے کہ تمہیں بتا دوں گا تمہیں؟''

''کیوں' کیا تمہیں یہ بتانے میں کوئی اعتراض ہے کہ تم نے وہ کاغذات اپنے بینک کے لاکر میں رکھوا دیئے ہیں؟''

وہ چونک اٹھا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اچھا تو تم یہ بھی معلوم کر چکی ہو۔ پھر بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب تک میں خود بینک کے لاکر سے وہ کاغذات نہ نکلواؤں کسی کو ان کی ہوا نہیں لگ سکتی۔''

''تم واقعی بہت ذہین ہو ایاز میں ناحق تمہیں گدھے کی دم سمجھ رہی تھی۔'' میں اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پھر میں نے اسے مزید گھسنے کیلئے کہا۔ ''ایک اور صورت بھی تو ہے کہ ان کاغذات کی ضرورت ہی نہ پڑے۔'' یہ کہتے ہوئے میں آگے بڑھی اور میز کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''وہ کیسے؟'' وہ بول اٹھا۔ ''بغیر ان کاغذات کے تم کس طرح......''

''وہ کاغذات گزشتہ تاریخوں کے ہیں۔ مثلاً آج کی تاریخ میں تم نئے کاغذات پر دستخط کر دیتے ہو کہ میرے تمام اثاثے ایک معقول رقم کے عوض دوبارہ میرے حوالے کر چکے ہو۔ ایسی صورت میں ان کاغذات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ اس بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟''

میری بات کے ردعمل میں اس کے چہرے پر تاریکی سی چھا گئی۔ وہ یقیناً میری بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔

''ایک بات اور بتاؤں تمہیں'' میں اسے خاموش اور بے حواس سا دیکھ کر مزید بولی۔ ''بینک کے لاکر سے وہ کاغذات نکلوا لینا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے میرے لیے۔ زندگی تو سبھی کو عزیز ہوتی ہے نا۔ یہ عیش' یہ سارے آرام زندگی ہی تک تو ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ تمہیں بھی اپنی زندگی عزیز ہوگی اور تم اپنی

زندگی بچانے کیلئے خود مجھے وہ کاغذات لا کر دے دو گے۔"

"تو......تو تم مجھے دھمکی دے رہی ہو قتل کی۔"

"نہیں، غلط سمجھے تم! میرا مقصد محض تمہیں یہ سمجھانا ہے کہ تم درمیان سے ہٹ جاؤ، خواہ مخواہ مارے جاؤ گے۔ مجھے اور شہر یار کو آپس میں نمٹنے دو۔ تم چھوٹی چڑیا ہو اور چھوٹی چڑیا کی پرواز محدود ہوتی ہے۔ تم کہاں درمیان میں آ گئے۔"

"میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔" اس کے لہجے میں یک دم سختی آ گئی۔

"وہ لو۔" میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ "ممکن ہے کہ میرے آدمی جب تمہاری کھال اتار رہے ہوں تو تمہیں اپنے فیصلے پر افسوس ہو۔"

اچانک وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر کرخت لہجے میں بولا۔ "میری کھال اتار دیں گے تمہارے آدمی! مگر میں اس سے پہلے ہی......" اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ مجھ پر جھپٹ پڑا۔

میں بہت دیر سے اسی لمحے کی منتظر تھی۔ اس کا یوں بھڑ جانا میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ ہتک آمیز جملوں کی چبھن آخر کب تک اپنا اثر نہ دکھاتی۔ میں نے دانستہ اسے طیش دلا کر یہ صورتحال پیدا کی تھی تاکہ میرے دل کی بھڑاس کچھ تو نکل جائے۔ خود پہل کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

وہ جیسے ہی مجھ پر جھپٹا، میں نے تیزی سے اپنی کرسی پیچھے کی۔ اسی کے ساتھ کرسی سے اٹھتے اٹھتے میرا پنچ اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ وہ مسہری پر جا گرا۔

"اٹھو میرے شیر پھر کوشش کرو اچھے بچے ہمت نہیں ہارتے۔" میں نے اسے تاؤ دلایا۔

غصے نے شاید اس کی عقل خبط کر دی تھی۔ ورنہ دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش سے باز آ جاتا۔ اس لئے اسے شاید یقین تھا کہ مجھے چھاپ لے گا، مگر دوبارہ اس نے منہ کی کھائی۔ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے اس کے پیٹ پر کک لگائی تھی اور وہ کسی مردہ چھپکلی کی طرح فرش پر آ رہا تھا۔ پیٹ پر پڑنے والی ضرب نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فرش پر ایک کروٹ سے پڑا ہوا دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے وہ کراہ رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہلکی سی ٹھوکر ماری اور بولی۔ "ستانے کی نہیں ہو رہی۔ اٹھ جاؤ بس اب ورنہ میں ٹھوکریں مار مار کر جگہ جگہ سے تمہاری کھوپڑی چٹخا دوں گی۔"

اس نے لیٹے لیٹے ہی میری ٹانگ گھسیٹنے کی کوشش میں تیزی سے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے۔

میں پہلے ہی چوکنا تھی، اچھل کر دور ہٹ گئی اور اسے مخاطب کیا۔ "قدم بوسی کی ابھی اجازت نہیں ہے۔ ابھی اسی طرح زمین چاٹتے رہو۔"

قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے سر کے بال بکھر گئے تھے اور چہرے پر وحشت سی رقص کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پیٹ کی تکلیف شاید اب کچھ کم ہو گئی تھی۔

"آؤ، قریب آؤ نا۔" میں نے اسے چڑایا۔ "دور کھڑے کیوں کانپ رہے ہو، مرد ہو کر ایک عورت سے ڈر رہے ہو اس سے بہتر ہے کہ تم چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔"

پھر تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ بار ہا میرے ہاتھوں پٹتا رہا اور بار بار چیختا چلاتا ہوا میری طرف وحشیانہ انداز میں لپکتا رہا۔ میں نے اس دوران میں پورا خیال رکھا تھا کہ اس کا چہرہ میری ضربوں سے بچا رہے اور چوٹ ظاہر نہ ہو۔ دس پندرہ منٹ ہی میں وہ اس قابل نہ رہا کہ اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکتا۔ اب میرے دل کا غبار بھی کسی حد تک نکل چکا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر مسہری پر ڈال دیا۔ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بار بار اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔

اس کے ساتھ دھما چوکڑی میں کمرے کا حلیہ خاصا بگڑ گیا تھا۔ حتی الامکان طور پر میں نے اسے درست کیا اور پھر ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ کمرہ ساؤنڈ پروف تھا اس لئے ایاز کے چیخنے چلانے کی آوازیں یقیناً باہر نہیں گئی تھیں۔ میں اسی سبب مطمئن تھی۔ یوں بھی سیل کے کسی رکن کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ میری اجازت کے بغیر اندر آ جاتا یا مداخلت کرتا۔

پھر جب ایاز کی حالت قدرے اعتدال پر آ گئی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "کچھ کیڑے بھڑے دماغ کے؟"

"تم......تم نے مجھ پر ناحق ظلم کیا ہے۔ میں...... میں بے قصور ہوں۔" وہ رک رک کر بولا۔

"تو پھر کاغذات پر دستخط کرنے کیلئے تیار ہو نا تمہارے بے قصور ہونے کا ثبوت تو اسی طرح مل سکتا ہے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں! ہرگز نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تم میں دم خم باقی ہے۔ ابھی اور پٹنا چاہتے ہو۔"

"نہیں...... خدا کیلئے نہیں۔" وہ گھگیانے لگا۔ اسی کے ساتھ اس نے خوف زدہ سے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے جیسے اسے اندیشہ ہو کہ میں دوبارہ ہاتھ چھوڑ بیٹھوں گی۔ ادھر وہ مجھ سے رحم طلب تھا اور دوسری جانب کاغذات پر دستخط کرنے کیلئے راضی نہیں تھا۔ خود میں بھی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ وہ بخوشی اس پر آمادہ نہیں ہو گا۔ میں اسے خاصا سبق دے چکی تھی۔ یقیناً اپنی ساری زندگی میں وہ کسی عورت کے ہاتھوں اتنا نہیں پٹا ہو گا۔

"تمہیں کاغذات پر دستخط تو کرنا ہی پڑیں گے ایاز۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ "اٹھو" میں نے اسے حکم دیا۔"

وہ کسی کٹھ پتلی کی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے کاغذات نکال لیے۔ یہ وہی کاغذات تھے جو کمانڈر نواز میرے ایما پر ٹائپ کرا کے لایا تھا۔ پرس میں قلم بھی تھا۔ میں نے قلم کھول کر ایاز کے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر کاغذات بھی اس کے سامنے رکھ دیئے۔

"یہاں دستخط کرو۔ اور یہاں بھی۔" میں کاغذات پلٹتی رہی وہ دستخط کرتا رہا۔

ان کاغذات پر جہاں جہاں اس کے دستخط ضروری تھے میں نے لے لئے اور پھر ایک طویل سانس لیا۔ بالآخر میں اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ کاغذات سمیٹ کر میں نے دوبارہ اپنے پرس میں رکھ لئے۔ قانونی طور پر اب میں اپنے تمام اثاثوں کی مالک بن چکی تھی۔ اب مجھے کورٹ کی تصدیق

اور بقیہ ضروری کارروائیوں کیلئے صبح کا انتظار تھا۔

''تم بہت تھک گئے ہو ایاز! تمہیں اب سو جانا چاہئے ...... تمہیں نیند آ رہی ہے نا۔'' میں نے ایاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں ...... میں سونا چاہتا ہوں۔'' اس نے خوابیدہ سی آواز میں جواب دیا۔

''سو جاؤ!'' میں نے یہ کہہ کر اس کے ذہن کو سونے کی ترغیب دی۔

پھر اسے گہری نیند سو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ سو گیا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر میں باہر آئی تو مسلح محافظ تیزی سے میرے قریب آ گیا۔

''دروازہ مقفل کر دو۔'' میں اسے یہ حکم دے کر آگے بڑھ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے انٹرکام پر کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کیا۔

''جی!'' دوسری طرف سے کمانڈر نواز نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر کہا۔

''کام ہو گیا کمانڈر!'' میں نے گویا اسے خوشخبری سنائی۔ ''اس نے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔''

''مبارک ہو آپ کو۔'' اس نے اظہارِ مسرت کیا۔

''تمہیں بھی مبارک ہو۔'' میں نے جواباً کہا۔ پھر بولی۔ ''تمہیں کل میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ تم اگر مناسب سمجھو تو اپنے کسی ماتحت کو چارج دے کر کچھ دیر سو لو۔ دو بجنے والے ہیں اب میرا ارادہ صبح نو اور ساڑھے نو بجے کے درمیان یہاں سے نکل جانے کا ہے۔ ایاز بھی ہمارے ساتھ ہو گا۔''

''جی...... ایاز!'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کی موجودگی کورٹ میں بھی ضروری ہے اور پھر بعد میں بھی۔ کیا تمہارے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ ابھی قبضہ لینا بھی ضروری ہے۔ صرف کاغذات پر دستخط کرا لینا تو کافی نہیں۔''

''جی...... جی میں سمجھ رہا ہوں! ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... میں تو دراصل کسی گڑبڑ کے امکان پر غور کر رہا تھا۔''

''کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔ ایاز پوری طرح میرے قابو میں ہو گا اور وہی کرے گا جو میں چاہوں گی۔'' میں نے کمانڈر نواز کو مطمئن کرنے کیلئے کہا۔ ''اس سلسلے میں جو کچھ میرے ذہن میں ہے' صبح تمہیں اس سے آگاہ کر دوں گی۔ تم صبح آٹھ بجے مجھے جگا دینا۔''

''بہتر ہے۔'' وہ بولا۔

''خدا حافظ شب بخیر۔'' یہ کہہ کر میں نے انٹرکام کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اس شب کافی عرصے کے بعد مجھے سکون محسوس ہوا۔ میرے ذہن سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اب میری حیثیت دوبارہ بحال ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ میرے خلاف جو سازش کی گئی تھی میں نے اس کا سدباب کر دیا تھا۔ اب تک میری روپوشی کا سبب یہی تھا۔ میں اس وقت تک اپنے

دشمنوں کے سامنے نہیں آنا چاہتی تھی جب تک ایاز میرے قابو میں نہ آ جاتا۔ مجھے اب اس کی پروا بھی نہیں تھی کہ میرے دشمنوں کو پاکستان میں میری موجودگی کا علم ہو جائے گا۔ میں بزدل نہیں تھی کہ ان سے چھپتی پھرتی۔ خطرات سے کھیلنا تو یوں بھی میری سرشت میں داخل تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ میرے دشمن جب تک میری طرف سے بےخبر رہتے میرے حق میں بہتر تھا۔ انہیں اپنی جانب سے مطمئن اور بےخبر رکھنے کیلئے میں نے فی الحال ایاز ہی کو آلہ کار بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ احتیاط بھی محض وقتی تھی۔ اپنے اثاثوں کی واپسی کے بعد مجھے اس کی ضرورت بھی نہ رہتی۔

قانونی خانہ پری اور دیگر ضروری اقدامات کی تکمیل کیلئے اب عذرا خان کی حیثیت سے میرا سامنے آنا ناگزیر تھا۔ اس کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ انہی باتوں پر غور و فکر کرتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن آٹھ بجے کمانڈر نواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ اس کیلئے اس نے انٹرکام کو ذریعہ بنایا تھا۔ نیا دن طلوع ہو چکا تھا۔ نہا کر لباس تبدیل کرنے اور پھر ناشتے سے فارغ ہونے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ رات کو سوتے سوتے میں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور اب سب سے پہلے اسی پر عمل کرنا چاہتی تھی۔

میں نے انٹرکام پر کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کیا۔ وہ ڈیوٹی روم میں میرے حکم کا منتظر تھا۔

''ایاز کو جس کمرے میں رکھا گیا ہے' وہاں غالباً ٹیلی فون سیٹ بھی تھا جو احتیاطاً ہٹا لیا گیا'' میں نے کمانڈر نواز سے تصدیق طلب لہجے میں کہا۔

''جی ہاں۔'' اس نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔

''میں اس کمرے میں جا رہی ہوں مجھے وہاں عارضی طور پر ٹیلی فون چاہئے۔'' میں نے کہا۔

''آپ تشریف لے جائیں وہاں میں ابھی اس کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔''

''عثمانی نے تم سے چارج لے لیا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''جی ہاں وہ پہنچ چکا ہے۔ میں نے بیدار ہوتے ہی اسے فون کر دیا تھا۔'' کمانڈر نواز نے بتایا۔

''او کے!'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنا پرس اٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔

ایاز مجھے بیدار ہی ملا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف سا پھیل گیا تھا۔

''کیوں' کیا تمہیں میرے آدمیوں نے ناشتہ وغیرہ نہیں کرایا؟'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''کر چکا ہوں ناشتہ۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ پھر کہا۔ ''مجھے کب تک اسی طرح تمہاری قید میں رہنا پڑے گا؟''

''تم میرے قیدی نہیں ہو یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔'' میں مسکرائی اور آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''دیکھو میں نے تو دروازہ بھی بند نہیں کیا۔''

''دروازہ کھلا ہو یا بند رہے' مگر میں جانتا ہوں کہ ...... کہ تمہاری مرضی کے بغیر......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ سیل کے ایک رکن کو کمرے میں آتے دیکھ کر وہ چپ ہو گیا تھا۔

آنے والے کے ہاتھ میں ایک ٹیلی فون سیٹ تھا۔ میں نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ ایاز حیران حیران سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ ٹیلی فون لائن بحال کر کے چلا گیا۔

”میرا خیال ہے ایاز کہ تم اپنے بہنوئی شہریار کو اپنی خیریت سے مطلع کر دو۔“ میں بول اٹھی۔ ”میں نے تمہاری اسی سہولت کی خاطر یہاں ٹیلی فون سیٹ منگوایا ہے۔“

”کک......کیا؟“ وہ ہکلانے لگا۔ اسے یقیناً میری بات پر اعتبار نہیں آیا تھا۔

”ہاں ہاں اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟“ یہ کہہ کر میں نے میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ اس کی طرف کھسکا دیا۔ ”نمبر ملاؤ۔“

”اور......اور اگر میں فون پر ان سے یہ...... یہ کہہ دوں کہ تم......تم نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا ہے تو......تو پھر......“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ میں پرسکون آواز میں بولی۔ ”تم نمبر تو ملاؤ۔“

اس نے بے یقینی کے سے انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں اس کے ذہن سے رابطہ قائم کر چکی تھی۔

پھر لائن مل جانے کے بعد اس نے شہریار سے وہی سب کچھ کہا جو میں چاہتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں اپنے دوست عاصم کے گھر میں ہوں، آپ میری طرف سے مطمئن رہیں۔“

میری پوری توجہ اس کے ذہن پر مرکوز تھی۔

”اب میں پرسوں آپ کو فون کروں گا، خدا حافظ۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے میرے ایما پر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے اس کے ذہن کو اپنے ذہن کی گرفت سے آزاد نہیں کیا۔

”جلدی سے تیار ہو جاؤ، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“ میں نے اسے حکم دیا۔

میرا حکم پا کر وہ کسی سحر زدہ شخص کی طرح اٹھ کھڑا ہوا اور باتھ روم کی طرف چل دیا۔ وہ اب میرے ذہن کے تابع تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اپنے حلیے سے وہ وحشت زدہ اور بدحواس نظر نہ آئے۔ میری مرضی کے مطابق حلیہ درست کرنے میں اسے تقریباً آدھا گھنٹہ لگا۔ اس نے شیو بھی کر لیا تھا۔ اب وہ پہلے کی نسبت تازہ دم معلوم ہو رہا تھا۔ دراصل یہی ذرا ذرا سی باتیں بھی شکوک و شبہات پیدا ہونے اور امکانی خطرات سے بچانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ میں حتیٰ الامکان کسی بھی ایسے نکتے کو نظر انداز نہیں کرتی تھی۔

تقریباً سوا دس بجے کے قریب میری کار آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے نکلی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر کمانڈر نواز تھا۔ میں ایاز کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ کمانڈر نواز پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ چلا تھا تاکہ ہر امکانی خطرے سے نبرد آزما ہو سکے۔ اس وقت بھی ہماری کار کے آگے پیچھے سیل کے کئی ارکان کی گاڑیاں تھیں۔ ان میں سے کچھ موٹر سائیکلوں پر تھے اور کچھ کاروں میں۔ یہ سارے انتظامات درحقیقت ایاز کے لئے کیے گئے تھے۔ ایاز کو بہرحال اس وقت تک میرے قبضے میں رہنا تھا جب تک تمام معاملات نمٹ نہ جاتے۔ مجھے یہ خوبی علم تھا کہ دشمن کو غافل اور کمزور سمجھنے والے عموماً دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

روانگی سے قبل میں نے اپنے لیگل ایڈوائزر ایڈووکیٹ اے کے صمدانی کو بھی فون کر دیا تھا۔ توقع کے مطابق صمدانی کو بھی میرے فون پر حیرت ہوئی تھی۔ اسے بھی یہی علم تھا کہ میں امریکہ میں سیٹل ہو چکی ہوں۔ فون پر زیادہ تفصیلات میں نہ جا کر میں نے یہی کہا تھا کہ اب ارادہ بدل گیا ہے اور میں دوبارہ پاکستان آ گئی ہوں۔ باقی باتیں بالمشافہ ملاقات ہونے پر عرض کر دوں گی۔ میں آپ ہی کی طرف آ رہی ہوں۔ اس کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

ایڈووکیٹ صمدانی کا دفتر کورٹ کے قریب ہی ایک عمارت میں تھا۔ وہ مجھے اپنا منتظر ہی ملا تھا۔

”آیئے تشریف لایئے۔“ وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”تشریف رکھیں۔“ میں نے کہا اور پھر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میری دائیں جانب ایاز بیٹھا تھا اور بائیں جانب کمانڈر نواز۔ میں درمیان میں بیٹھی تھی۔ ”صمدانی صاحب!“ میں نے وقت ضائع کیے بغیر بیٹھتے ہی مطلب کی گفتگو شروع کر دی۔ ”یہ مسٹر ایاز ایم جہانگیر ہیں۔“ میں نے ایاز کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے انہی کے ہاتھوں اپنے تمام اثاثے فروخت کیے تھے اور اب انہی سے دوبارہ انہیں خرید چکی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پرس کھول کر وہ تمام کاغذات نکال لئے جن پر ایاز دستخط کر چکا تھا۔ وہ کاغذات میں نے صمدانی کی طرف بڑھا دیئے اور بولی۔ ”آپ انہیں ملاحظہ کر لیں۔“

”بہتر ہے۔“ صمدانی نے مجھ سے کاغذات لے لئے اور ان کا مطالعہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے کاغذات ایک طرف رکھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ”کاغذات میں کوئی سقم نہیں۔ تمام اہم اور ضروری نکتے ان میں آ گئے ہیں۔ یہ جان کر بہرحال بہت خوشی ہوئی کہ آپ دوبارہ یہیں آ گئی ہیں۔“

”محبت ہے آپ کی۔“ میں نے جواباً کہا۔

پھر میرے ایما پر ایڈووکیٹ صمدانی نے تمام معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسے میں نے بتا دیا تھا کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ جتنی جلد ممکن ہو آپ ضروری قانونی کارروائیاں مکمل کرا دیں۔ ایڈووکیٹ صمدانی کی طرف سے مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ اس نے جلد ہی سارا مسئلہ حل کرا دیا۔ کورٹ میں خود ایاز کی موجودگی کے سبب کوئی قباحت نہیں ہوئی تھی۔ میں اسی لئے اسے ساتھ لے کر آئی تھی۔

کورٹ کے احاطے سے نکلتے ہوئے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا اور اپنے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کمانڈر نواز کو مخاطب کیا۔ ”ابھی بینک بند ہونے میں خاصا وقت ہے۔“ میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

”جی۔“ اس نے بھی معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ یقیناً وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔

کار میں آ کر بیٹھنے کے بعد میں نے اپنا پرس کھولا اور ایاز کے بینک لاکر کی چابی اس کے حوالے کر دی۔ چلتے وقت میں نے ایاز کی اٹیچی سے بینک لاکر کی چابی نکال لی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اگر کورٹ سے جلد فراغت ہو گئی تو بینک اکاؤنٹس وغیرہ کا معاملہ بھی آج ہی نمٹا دوں گی۔ ایاز کا ذہن پڑھ کر مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کاغذات کے ساتھ ہی اس نے ایاز انٹرپرائزز اور اپنے پرسنل اکاؤنٹس کی چیک بکس بھی لاکر میں رکھ دی تھیں۔ بینک کے لاکر میں وہ کاغذات تھے جن پر میرے دستخط کرائے گئے تھے اور جن کی رو سے ایاز میرے تمام اثاثوں کا مالک بن گیا تھا۔ وہ کاغذات بھی اب میں اپنے قبضے میں کر لینا چاہتی تھی تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ رہے۔

کمانڈر نواز اب کار سٹارٹ کر چکا تھا۔ میرے ایما پر اب وہ بینک کی طرف ہی چل رہا تھا۔ میں نے راستے میں وہ تمام باتیں ایاز کے ذہن میں بٹھا دیں جن پر اسے عمل کرنا تھا۔

بینک پہنچ کر میں ایاز کو ساتھ لیے منیجر کے کیبن کی طرف بڑھ گئی۔ کمانڈر نواز کو میں نے کار ہی میں چھوڑ دیا تھا۔

بینک منیجر ایاز کو میرے ساتھ دیکھ کر چونک اٹھا پھر اس کے ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کن انکھیوں سے ایاز کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میری توقع کے مطابق وہ قطعی نارمل نظر آ رہا تھا۔ میں اور ایاز کرسیوں پر بیٹھ گئے تو بینک منیجر بولا۔ ''فرمایئے میرے لیے کیا خدمت ہے؟''

''پہلے آپ ایاز صاحب کا کام کر دیں' پھر مجھے جو عرض کرنا ہو گا میں بھی عرض کر دوں گی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنے لاکر سے کاغذات نکالنا ہیں۔'' ایاز نے کہا۔

''لاکر کی چابی یقیناً لائے ہوں گے آپ۔'' بینک منیجر بولا۔

''جی...... یہ رہی!'' ایاز نے اپنی جیب سے لاکر کی چابی نکال کر منیجر کو دکھائی۔

''ٹھیک ہے۔'' منیجر نے چابی کا نمبر دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے اکاؤنٹینٹ کو بلوا لیا۔

پھر ایاز اکاؤنٹینٹ کے ساتھ بینک کے سٹرانگ میں چلا گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے منیجر کو آگاہ کر دیا کہ قانونی طور پر میں دوبارہ اپنے تمام اثاثوں کی مالک بن چکی ہوں۔ اس پر اس نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے مبارکباد بھی دی۔

''میں اب یہ چاہتی ہوں کہ آپ ایاز انٹر پرائزز کا اکاؤنٹ کلوز کر دیں اور اس کے بیلنس میں جو رقم ہے' اسے دوبارہ عذرا انٹر پرائزز میں ڈال دیں۔'' یہ کہہ کر میں نے عدالت سے تصدیق شدہ کاغذات منیجر کو دکھائے' پھر بولی۔ ''اسی لئے میں ایاز صاحب کو بھی ساتھ لے کر آئی ہوں کہ اگر ان کے دستخطوں وغیرہ کی ضرورت پڑے تو......''

''جی...... جی ہاں...... وہ تو ظاہر ہے ضرورت پڑے گی۔'' وہ بول اٹھا۔

ابھی منیجر سے میری گفتگو جاری تھی کہ ایاز لاکر سے کاغذات اور چیک بکس نکال کر لے آیا۔ وہ کاغذات اس نے میرے حوالے کر دیئے۔ پھر منیجر کو مخاطب کیا۔ ''میرے پرسنل اکاؤنٹ میں کتنا اماؤنٹ ہے' ذرا یہ معلوم کرا دیں' زحمت تو ہو گی آپ کو۔'' وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس میں میری ہی مرضی کو دخل تھا۔

''زحمت کی کیا بات ہے جناب' ابھی لیجئے۔'' یہ کہہ کر منیجر نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آ گیا تو اس نے کسی کلرک کو بلوایا' اسی کے ساتھ چائے لانے کو بھی کہا۔ چپراسی اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد ایک نوجوان کلرک اندر داخل ہوا۔ منیجر نے اس سے کہا۔ ''ایاز صاحب کے پرسنل اکاؤنٹ کا بیلنس لکھ کر دے دیجئے۔''

''ابھی لایا سر۔'' نوجوان کلرک مستعدی سے بولا اور الٹے قدموں لوٹ گیا۔

اس دوران میں ایاز انٹر پرائزز کی چیک بک ایاز سے میں نے لے لی تھی۔ اس کے پاس اب صرف اپنے پرسنل اکاؤنٹ کی چیک بک رہ گئی تھی۔ جلد ہی نوجوان کلرک ایک سلپ پر ایاز کے اکاؤنٹ کا

...س لکھ کر لے آیا۔

''ایاز صاحب کو دے دیجئے۔'' منیجر نے کلرک کو اشارہ کیا۔

''لیجئے سر!'' کلرک نے وہ سلپ ایاز کو تھما دی اور چلا گیا۔

میں نے بیلنس دیکھا تو میری توقع سے خاصا کم تھا۔ ''اپنے اکاؤنٹ میں صرف سو روپے چھوڑ ... بقیہ رقم کا چیک میرے نام کاٹ دو'' میرے ذہن نے ایاز کو حکم دیا۔

اس نے چیک بک کھول کر میرے نام چیک لکھا اور پھر اسے میرے حوالے کرتے ہوئے ... ''اس رقم کی ادائیگی کے بعد میرا اور آپ کا حساب صاف ہو جاتا ہے۔'' یہ جملہ بھی اس نے میرے ... ایما پر ادا کیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں اب آپ کی طرف میری کوئی رقم واجب الادا نہیں رہتی تھینک یو۔'' یہ کہہ کر ... نے وہ چیک کیش کرانے کیلئے منیجر کی طرف بڑھا دیا اور بولی۔ ''اس اماؤنٹ میں سے فی الحال مجھے ... ف پانچ لاکھ روپے کی ضرورت ہے' بقیہ رقم میں اپنے پرسنل اکاؤنٹ میں جمع کرا رہی ہوں۔ ذرا مجھے ... سلپ بھی عنایت کر دیں تاکہ دونوں کام ایک ساتھ ہو جائیں۔''

منیجر نے مجھ سے چیک لے لیا۔ اسی وقت چپراسی چائے لے آیا پھر چائے پینے کے دوران ... وہ سارے مراحل طے ہو گئے جن کی خاطر میں نے بینک کا رخ کیا تھا۔ ایاز انٹر پرائزز کا بینک ... نٹ بند ہو گیا۔ اس میں جو رقم تھی وہ عذرا انٹر پرائزز کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی گئی۔ ایاز کا پرسنل ... نٹ بھی گویا میرے قبضے میں آ گیا۔

جب میں اور ایاز چائے کے آخری گھونٹ لے رہے تھے تو منیجر مسکرا کر بولا۔ ''پہلے تو مس ... ذرا امریکہ میں سیٹل ہو رہی تھیں لیکن اب یہ معلوم ہو رہا ہے جیسے ایاز صاحب امریکہ جا رہے ہیں۔''

منیجر کے اس تبصرے پر میں ہنس پڑی اور میرے ایما پر ایاز نے بھی قہقہہ لگایا۔

اٹھنے سے پہلے ایاز نے منیجر سے کہا۔ ''آپ سے ذاتی طور پر ایک درخواست ہے کہ فی الحال ... معاملے کو اپنے تک ہی محدود رکھیں۔ بس دو ایک دن کی بات ہے میں نہیں چاہتا کہ میرے چھوٹے ... ہائی پرویز کو بھی یہ بات معلوم ہو کہ......''

''میں سمجھ گیا' فکر نہ کریں آپ۔'' منیجر بول اٹھا۔

''تھینک یو ویری مچ!'' ایاز نے کھڑے ہو کر منیجر سے ہاتھ ملایا۔

منیجر بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اسے خدا حافظ کہہ کر ایاز کو ساتھ لیے بینک سے نکل ... میرے خیال میں آج کیلئے اتنا ہی کافی تھا۔ میں اس سلسلے میں جلد بازی کا مظاہرہ کر کے اپنے ... وں کو چوکنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ایاز کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اس کا دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے کمانڈر نواز سے کہا۔ ''اب ... ں چلو!''

''کام ہو گیا؟'' اس نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے صرف یہی کہنے پر اکتفا کیا۔

کار آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں نے بالا ہی بالا بنیادی کام نمٹا دیا اب صرف فرم اور کوٹھی پر قبضہ کرنا باقی تھا۔ اس کے علاوہ طارق روڈ والے فلیٹ کی چابیاں لینا تھ آئندہ روز کیلئے میں نے اپنے ذہن میں ابھی سے سارا پروگرام مرتب کر لیا تھا۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ کر میں نے ایاز کے ذہن کو اپنے طاقت ور ذہن کی گرفت سے کر دیا۔ وہ خاصی دیر میرے ٹرانس میں رہا تھا اس لئے اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی تھی۔ اس کے کم سے فون ہٹا دیا گیا تھا تاکہ بیدار ہونے کے بعد وہ فون پر کسی سے رابطہ قائم نہ کر سکے۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر چائے پینے کے بعد اپنی فرم کی عارفہ کا نمبر ملایا۔ رابطہ ملنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''عارفہ تمہیں کل دوپہر کے بعد دفتر پہنچنا ہے

''جی!'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''دفتر......؟ کون سے دفتر؟''

''عذرا انٹر پرائزز کے دفتر۔ کل دوپہر تک انشاء اللہ میں ان لوگوں سے دفتر خالی کرا چکی ہ گی۔'' میں نے بتایا۔ ''میں اپنے تمام اثاثے دوبارہ خرید چکی ہوں۔''

''ویری گڈ!'' اس کے لہجے سے خوشی کا اظہار ہونے لگا۔

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں تو پہلے یہ سمجھی تھی کہ آپ کوئی نیا دفتر لیں گی۔''

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مزید کہا۔ ''آفس ریکارڈ سے تمہیں ع انٹر پرائزز میں کام کرنے والوں کے پتے معلوم ہو جائیں گے۔ تمہیں ان سب سے رابطہ قائم کرنا ہ میری خواہش ہے کہ جو سٹاف پہلے کام کر رہا تھا اسے ترجیح دی جائے۔ باقی تم جیسا مناسب سمجھو کرنا۔''

''بہت بہتر ہے، میں کل دو بجے دوپہر دفتر پہنچ جاؤں گی۔'' عارفہ کا لہجہ یقینی تھا۔

''تمہاری مدد کیلئے نرگس، بلقیس، ساجدہ وغیرہ بھی ہوں گی۔ اچھا اب کل ملاقات ہو گی حافظ۔''

''خدا حافظ۔'' عارفہ نے کہا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ نرگس اور بقیہ چار لڑکیاں کیوں کہ درحقیقت آپریشن سیل ہیڈ کوا سے متعلق تھیں اس لئے میں نے فوراً ہی ان کے نام لے دیئے تھے۔ عارفہ یہی سمجھی ہو گی کہ ان سے میر بات ہو چکی ہے۔ اس سلسلے میں غالباً اسی لیے عارفہ نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچتے ہی کمانڈر نواز کو میں نے چھٹی دے دی تھی۔ اس وقت ڈیو انچارج اس کا ماتحت عثمانی تھا۔ میں نے انٹرکام پر اس سے رابطہ قائم کر کے مختصر آج کی روداد دہرا دی میں اس بات کا بطور خاص خیال رکھتی تھی کہ جو شخص بھی ڈیوٹی انچارج ہو وہ حالات سے پوری طرح با رہے تاکہ نادانستگی میں وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے۔ عموماً کمانڈر نواز اور عثمانی خود ہی ایک دوسرے کو تما حالات سے باخبر رکھتے تھے مگر آج کمانڈر نواز کو ڈیوٹی روم تک جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے اسے گیٹ ہی سے رخصت کر دیا تھا کہ تم جا کر آرام کرو۔ میں خود عثمانی کو بریف کر دوں گی۔ عثمانی ہی سے میں نے نرگس اور اس کی چاروں ماتحتوں کیلئے بھی کہہ دیا تھا کہ تم انہیں مطلع کر دو، کل دوپہر دو بجے انہیں عذرا انٹر پرائزز کے دفتر پہنچنا ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے عثمانی کو آئندہ روز کے پروگرام کے بارے میں

ں آگاہ کر دیا تھا۔

عثمانی سے انٹرکام پر بات کر کے میں ایک بار پھر ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے ملک ر کی کوٹھی کا نمبر ملایا تو معلوم ہوا وہ اپنے دفتر میں ہے۔ پھر میں نے اس کے دفتر کا نمبر ڈائل کیا۔ وہاں بطہ مل گیا۔

میری آواز سنتے ہی وہ چہک اٹھا۔ ''میں تو سوچ رہا تھا کہ تلاش گمشدہ میں آپ کا اشتہار دینا کا، مگر آپ نے کبھی تصویر ہی نہیں دی۔ بس اسی وجہ سے میں ایسا نہ کر سکا۔ کم سے کم اپنی ایک عدد تو دے دیں کہ کبھی آئندہ ایسی ضرورت پڑے تو کام آ جائے۔''

''شروع ہو گئے فوراً۔'' میں ہنس کر بولی، پھر کہا۔ ''کب اٹھ رہے ہو دفتر سے؟''

''جب آپ حکم دیں۔''

''آج شام کی چائے تمہارے ساتھ پیوں گی۔''

''وہ تو خیر عنایت ہے آپ کی مگر آپ تھیں کہاں اتنے دن سے؟'' وہ بولا۔

''کیوں، تمہارے آدمی آج کل میرا تعاقب نہیں کر رہے؟ ان سے رپورٹ نہیں ملی کچھ؟'' نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ ہی نے تو ایک دفعہ کہا تھا کہ بھلے مانس لوگ شریف بہو بیٹیوں کا پیچھا نہیں کرتے۔ نے بس اسی دن سے ان سب کو چھٹی دے دی۔''

''اچھا تو پھر مل رہے ہو شام کو؟''

''پانچ بجے تک آ جاؤں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، میں اس سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا تاکہ دیدہ و دل فرش راہ کر سکوں اور آپ ٹھک ان پر چلتی ہوئی......''

ملک دلاور کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیوں کہ میں نے لائن کاٹ دی تھی۔ آج شام اس سے قات کا مقصد یہ تھا کہ میں نے اس سے جو رقم ادھار لی تھی، واپس کر دوں۔ میں نے اسی لیے بینک سے ئی لاکھ روپے نکلوا لیے تھے۔

رات کو دیر سے سونے اور پھر صبح جلدی اٹھ جانے کی وجہ سے میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ نے اس وقت اسی لیے کچھ دیر کو سو لینے کا فیصلہ کیا اور بستر پر دراز ہو گئی۔

بستر پر لیٹے مجھے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی غنودگی سی ہونے لگی تھی کہ اچانک ے سارے جسم میں تیز قسم کی سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے برقی رو سی میرے وجود میں ل ہو۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ پھر ہر طرف گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ ی آنکھیں اب تک بند تھیں اور میں انہیں کوشش کے باوجود نہیں کھول سکی تھی۔

''فریادی...... فریادی۔'' ہر سمت سے مجھے یہی ایک آواز آتی سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یوں وس ہو رہا تھا کہ جیسے خود میرے وجود سے بھی یہی صدا بلند ہو رہی ہے۔

معاً میرے ذہن کا سکرین جیسے روشن ہو گیا اور اس پر ایک بوڑھا چہرہ ابھرا۔ جھریوں سے بھرا

وہ چہرہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔

''مجھے بچا لو...... بچا لو مجھے! ورنہ...... ورنہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔'' اس بوڑھے چہرے ہونٹ حرکت کرنے لگے۔ ''میں بیگناہ ہوں...... بیگناہ ہوں میں!'' ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذ میں تاریکی پھیل گئی۔ اسی کے ساتھ میرے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور میری آنکھیں کھل گئیں۔

کچھ دیر تک میرے حواس پر سناٹا سا طاری رہا' پھر میری حالت اعتدال پر آ گئی۔ اس پہلے کبھی کسی ایسی کیفیت سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ چند لمحے پہلے میں نے جو کچھ محسوس کیا اور دیکھا تھا کی ساری تفصیل مجھے یاد تھی۔ یہ میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ وہ کوئی خواب نہیں تھا بلکہ میں ایک برا تجربے سے گزری تھی۔ وہ بوڑھا کون تھا؟ اسے کون قتل کرنے والا تھا؟ اور اس معاملے سے میرا کیا تھا؟ میں کافی دیر انہی سوالوں پر غور کرتی رہی مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ میرے لیے ''فریادی'' کی وہ بھی عجیب تھی جسے میں نے خود اپنے وجود سے بھی بلند ہوتے محسوس کیا تھا۔ عالم ہوش میں یہ ساری با سوچ سکی کہ یہ سب کچھ میرے حیرت انگیز ذہن کی کارفرمائی ہے۔ پھر میں نے اس پراسرار واقعہ کو ا ذہن سے جھٹک دیا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔ جلد ہی میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی۔

پھر جب شام کو میں سو کر اٹھی تو سوا پانچ بج رہے تھے۔ ملک دلاور کو میں نے پانچ بجے پہنچ وقت دیا تھا اس لئے پہلے اسی کو فون کیا۔

''سوری! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ اب میں چھ بجے تک پہنچ سکوں گی۔'' میں نے ملک دلاو آواز سنتے ہی کہا۔ ''تم بور ہو گے اسی لیے تمہیں فون کرنا ضروری سمجھا۔'' پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ میں نے ریسیور رکھ دیا۔

پھر باتھ روم میں جا کر میں نے منہ دھویا' لباس تبدیل کیا اور باہر آ گئی۔ انٹرکام پر میں عثمانی کو بتا دیا کہ کہاں جا رہی ہوں اور کب تک میری واپسی متوقع ہے۔ سپورٹس کی چابیاں میرے ہی میں تھیں۔ کمرے سے نکل کر میں گیرج کی طرف چل دی۔ رقم کا تھیلا میرے ہاتھ میں تھا۔

آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی عمارت سے نکل کر کچھ دیر میں اپنی سپورٹس کو مختلف راستوں پر دوڑا رہی پھر جب مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تو میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ علاقے میں یوں بھی زیادہ ٹریفک نہیں ہوتا تھا اس لئے کوئی بھی مشتبہ شخص فوراً نظر میں آ سکتا تھا۔ اس علاوہ یہ کہ وہ علاقہ اقامتی نہیں تھا۔ وہاں بڑی بڑی فیکٹریز اور فرموں کے گودام تھے۔ اسی وجہ سے میں خوب سوچ سمجھ کر وہاں آپریشن سیل ہیڈکوارٹر قائم کیا تھا۔ وہاں اگر لوگوں کی سکونت ہوتی تو یقیناً میر لیے مسئلہ ہو جاتا۔

جب میں سوسائٹی کے علاقے میں داخل ہوئی تو چھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ میں گو وقت پر وہاں پہنچ گئی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد میری سپورٹس دلاور کی کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ چکی تھی۔ نے ہارن بجایا تو چوکیدار نے مجھے دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ اپنی سپورٹس کو کمپاؤنڈ میں ایک جانب پارک کر کے میں اپنا پرس اور رقم کا تھیلا سنبھالتی ہوئی عمارت کی طرف بڑھ گئی۔ ملک دلاور کے بوڑھے ملازم مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔ خلاف توقع دلاور نے آنے میں دیر لگائی تو مجھے بیزاری محس

ہونے لگی۔ پھر جب وہ مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو میں اس پر گرم ہو گئی۔ ''یہ کوئی طریقہ ہے دس منٹ سے زیادہ ہو گئے مجھے یہاں بور ہوتے......''

''دھیرج...... آپ تو میرے آتے ہی پھاڑ کھانے کو دوڑ پڑیں۔ محترم خاتون۔'' وہ میری بات کاٹ کر ہاتھ اٹھاتا ہوا بولا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کیا تمہیں اطلاع نہیں ملی تھی کہ میں آ چکی ہوں؟'' میں بدستور خفگی سے بولی۔

''جی مل گئی تھی۔ اطلاع۔'' وہ شرارت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ''آپ کو معلوم ہے' میں کیا کر رہا تھا اندر؟''

''کیا کر رہے تھے؟'' میرے منہ سے یونہی نکل گیا۔

''آرام سے اپنے کمرے میں لیٹا تھا۔'' اس نے دھیرے سے کہہ دیا۔

''کیا مطلب؟'' میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''بس ذرا آپ کو یہ احساس دلانے کیلئے کہ انتظار میں کتنا مزہ آتا ہے محترم خاتون! دراصل انتظار کے موضوع پر آپ کے اردو شعراء نے انتہائی جھک ماری ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ انتظار چاہے کسی پری چہرہ ہی کا کیوں نہ ہو' بہت بور ہوتا ہے۔''

میں سمجھ گئی کہ ملک دلاور دانستہ مجھے تپانا چاہتا ہے۔ میری خفگی سے وہ لطف لے رہا تھا۔ میں نے اسی لئے فوراً اپنا رویہ بدل لیا اور مسکرا کر بولی۔ ''خیر چھوڑو' کوئی بات نہیں۔''

''یہ...... یہ کیا ہوا آپ کو ایک دم گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ! ابھی چند لمحے پہلے تک تو معلوم ہو رہا تھا کہ آپ......''

''ہو رہا ہوگا معلوم' مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے رقم کا تھیلا اٹھایا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''رٹرن ود تھینکس۔''

''کیا ہے اس میں؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''کم از کم ٹائم بم نہیں ہے۔'' میں نے کہا' پھر بولی۔ ''یہ وہ رقم ہے جو میں نے تم سے ادھار لی تھی۔ چاہو تو گن لو پانچ لاکھ ہیں اب لو بھی نا۔''

اس نے رقم کا تھیلا لے لیا اور اسے وہیں میز پر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر کہنے لگا۔ ''حیرت ہے...... شدید حیرت ہے۔''

''کس بات پر حیرت ہے تمہیں؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''ہمیں اتنے دن ہو گئے آج تک کیمیا بنانے کا نسخہ ہاتھ نہیں لگا اور ایک آپ ہیں کہ چند دنوں میں کامیاب ہو گئیں۔''

''اچھا تو تم اتنی جلدی رقم کی واپسی پر گویا اپنی دانست میں طنز فرما رہے ہو۔'' میں نے جل کر کہا۔

''نہ گھر نہ در' نہ کوئی کاروبار' نہ کچھ اور چند ہی دن میں پانچ لاکھ کا بندوبست بھی ہو گیا پھر اگر میں یہ نہ سوچوں کہ آپ نے کہیں سے سونا بنانے کا نسخہ تھیا لیا ہے تو کیا سوچوں۔ آپ ہی فرما دیں محترم

خاتون!'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

''تم یہ بکواس بند کرو گے یا میں جاؤں؟'' میں نے گویا اسے دھمکی دی۔

''دراصل بات یہ ہے کہ آپ غصے میں مجھ بہت اچھی لگتی ہیں' اتنی اچھی جتنی مجھے اپنی خالہ اچھی لگتی تھیں۔ آج آپ کو دیکھ کر جانے کیوں وہ مجھے بار بار یاد آئے جا رہی ہیں۔''

تو پھر تم اپنی خالہ کو یاد کرو' میں چلتی ہوں۔'' میں نے اپنا پرس اٹھا لیا۔ وہ مجھے اپنی خالہ سے تشبیہ دے کر مزید سلگا رہا تھا۔

''اتنے دن میں تو آپ نے شربت دیدار پلایا ہے اور یوں تڑپتا چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ بڑی ظالم ہیں آپ! چلیں میں اپنی خالہ کی یاد کو ٹاٹا بائی بائی کر دیتا ہوں۔ میں تو فون پر یہ اطلاع پا کر گارڈن گارڈن ہو گیا کہ حضور تشریف لا رہی ہیں اور حضور ہیں کہ کسی شاعر کے شعر کے مطا......؟'' اس نے فوراً اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

''ہاں ہاں بولو نا آگے رک کیوں گئے۔'' میں نے اسے چڑایا۔ ''بہت سنبھل سنبھل کر بول رہے تھے اب تک کہ کہیں قاف نہ نکل جائے منہ سے۔''

''چھوڑیں اس ذکر کو۔ میں چائے منگواتا ہوں آپ کیلئے۔'' یہ کہتے ہی اس نے اپنے ملازم کو آواز دی۔

''آیا جناب!'' دور سے ملازم کی آواز آئی۔

''چائے لے آئیں اور کچھ پھل فروٹ بھی۔'' ملازم آ گیا تو دلاور نے اس سے کہا۔ ملازم چلا گیا تو دلاور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''میں آج کل دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی صحت خاصی گرتی جا رہی ہے۔ کچھ فروٹ شروٹ کھایا کریں۔''

''یہ فروٹ تو خیر میری سمجھ میں آ گئے' شروٹ کیا ہوتے ہیں؟'' مجھے کافی دیر بعد اسے گھسنے کا موقع ملا۔

''یہ جو شروٹ ہوتا ہے نا' یہ فروٹ سے بھی زیادہ...... طاقت ور...... چلو اب نکل ہی گیا ہے منہ سے تو نکلا کرے' میں کیا کروں۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا محترم خاتون؟''

''تم کہہ رہے تھے کہ شروف زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں ہنس پڑی۔

''بس آ گئیں نا آپ وہی اپنی زباں دانی پر۔ ایسے ہی کہوں گا طاقت ور۔'' وہ بھنا گیا۔

''میری بلا سے۔ لوگ تمہیں پینڈو کہیں گے۔''

''آپ بڑی ہمدرد ہیں میری۔'' وہ نک چڑھی عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا کر بولا۔ ''آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ اسی طرح بولتے ہیں۔''

''مگر وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں نا۔''

''اور میں کیا جاہل ہوں' آپ کے خیال میں۔ سمجھ نہیں آتی کہ......''

اسی وقت دلاور کا ملازم ٹی ٹرالی دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور دلاور مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ملازم کے جاتے ہی میں فوراً بول اٹھی۔ ''تم کہہ رہے تھے کہ سمجھ نہیں آتی۔ تو میں یہ

سمجھنا چاہتی ہوں کہ سمجھ کہیں چلی جاتی ہے جو نہیں آتی؟''

''محاورہ ہے یہ ہمارا جناب!...... اسی طرح بولتے ہیں ہم۔''

''یعنی سمجھ نہیں آتی اور سمجھ نہیں جاتی...... ویری گڈ۔''

''لو میں بھی خواہ مخواہ آپ کے چکر میں آ گیا۔ آپ کا تو یہ من پسند موضوع ہے۔ اب بھائیں۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ ''آپ مجھے جان بوجھ کر غصہ دلا رہی تھیں۔''

''دراصل بات یہ ہے دلاور کہ جب تم غصے میں ہوتے ہو تو مجھے اپنے خالو یاد آنے لگتے ہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح......''

''اچھا آپ کو خالو یاد آنے لگتے ہیں۔'' اس نے میری بات اچک لی۔ وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ میں اب جوابی کارروائی کر رہی ہوں۔ پھر وہ مزید بولا۔ ''میرا خیال ہے محترم خاتون کہ ہمیں اپنی اپنی خالاؤں اور خالوؤں کی یاد میں تڑپنے کے بجائے چائے پینی چاہئے۔'' یہ کہہ کر وہ میرے لیے چائے بنانے لگا اور پھلوں کی پلیٹ بھی اٹھا کر میرے سامنے رکھ دی۔

''بس چائے پینے کے دوران میں بھی ہماری نوک جھونک چلتی رہی۔

جب میں اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی تو اس نے کہا۔ ''اب تو اپنا کچھ اتا پتا بتا دیں' کہاں ہیں؟ کیا کر رہی ہیں؟ یقین کریں کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ تو دن بہ دن اور پراسرار ہوتی جا رہی ہیں۔ پہلے ہی آپ کی دید کو آنکھیں ترس جاتی تھیں' اب تو آپ نے بالکل ہی لائن کاٹ دی۔''

''بس دو دن کی بات ہے اور پھر وہی اتا پتا ہوگا جو پہلے تھا۔'' میں معنی خیز لہجے میں بولی۔

میری بات سن کر وہ چونک اٹھا۔ ''یعنی...... سمجھ نہیں آئی کہ......''

''آ جائے گی غم نہ کرو جب گئی ہے تو آ بھی جائے گی۔'' یہ کہہ کر میں ہنسنے لگی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک ہے نا بتائیں' میں آخر لگتا بھی کون ہوں آپ کا۔'' وہ مظلوم سی صورت بنا کر کہنے لگا۔

''اب کوئی فلمی مکالمہ نہ بولنا۔'' وہ مزید کچھ کہنے والا تھا کہ میں بول اٹھی' پھر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

ملک دلاور مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔

میں نے اپنی سپورٹس میں بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ ''اب سراغ رسانی میں نہ لگ جانا یہ میں تاکیداً کہہ رہی ہوں۔ جب حالات میرے حق میں سازگار ہو گئے تو میں خود تم سے رابطہ قائم کر لوں گی۔ ممکن ہے تمہاری مداخلت سے کھیل بگڑ جائے۔''

''ویسے ایک بات میں بھی آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ ایاز ان دنوں لاپتا ہے۔'' ملک دلاور نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا جیسے داد طلب ہو۔

''معلوم ہے مجھے۔'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''پھر بھی تمہاری اطلاع کا شکریہ۔ ہاں یہ بات میرے لئے ضرور اطلاع کی حیثیت رکھتی ہے کہ تم اپنی عادت کے مطابق بدستور میری ٹوہ میں لگے ہوئے ہو۔ خدا حافظ۔'' میں نے یہ کہتے ہی کار سٹارٹ کر دی۔ میں نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں

دیا تھا۔

ملک دلاور سے مل کر میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر انٹر کام پر میں نے عثمانی سے ایاز کی خیریت دریافت کی پھر لباس تبدیل کر کے اس دن کے اخبارات دیکھنے لگی مجھے آج صبح اخبارات دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ شہریار کی طرف سے باخبر رہنے کیلئے ان دنوں میں پابندی سے اخبارات کا مطالعہ کر رہی تھی۔ وہ بہرحال صدر مملکت کا مشیر تھا اور اسے ''بیان بازی'' کا بھی خاصا شوق تھا۔ اردو کے ایک روزنامے کی ورق گردانی کرتے ہوئے اچانک میری نگاہ ایک تصویر پر پڑی اور پھر جیسے میری نظریں وہیں جم کر رہ گئیں۔ وہ ایک بوڑھے شخص کی تصویر تھی۔ یہ اسی بوڑھے کا جھریوں بھرا چہرہ تھا جسے آج دوپہر ہی میں نے اپنے ذہن کی سکرین پر دیکھا تھا۔ مجھے وہ پراسرار تجربہ اپنی تمام جزئیات سمیت یاد آ گیا جس سے میں گزر چکی تھی۔ اس فریادی بوڑھے نے جیسے مجھی کو مخاطب کیا تھا۔ ''بچا لو مجھے... مجھے قتل کر دیا جائے گا۔'' اب میں اسی بوڑھے کی تصویر اخبار میں چھپی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ تصویر کے نیچے واضح الفاظ میں ''تلاش گمشدہ'' لکھا ہوا تھا۔ عام حالات میں ہرگز میں اس اشتہار کی طرف متوجہ نہ ہوتی مگر یہ معاملہ مختلف نوعیت کا تھا۔ اس کا تعلق مجھے پیش آنے والے ایک پراسرار تجربے سے تھا' میں اس لیے پوری توجہ اور انہماک سے اشتہار کی عبارت پڑھنے لگی۔

اس اشتہار کی عبارت کے مطابق بوڑھے کا نام ایس حامد علی تھا۔ وہ کسی معمولی سی بات پر گھر سے روٹھ کر چلا گیا تھا۔ اشتہار بوڑھے کے بیٹے کی طرف سے تھا۔ اس نے بوڑھے کے متعلق اطلاع دینے والے کیلئے تین ہزار روپے کے انعام کا اعلان بھی کیا تھا۔ اشتہار میں اس کا پورا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا۔ عبارت میں یہ بھی تھا کہ اگر خود میرے والد صاحب کی نظر سے یہ اشتہار گزرے تو وہ گھر آ جائیں' میں ان سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ آئندہ میں انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ اس عبارت سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بوڑھا تقریباً ایک ماہ سے لاپتا تھا۔

بظاہر اس اشتہار میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ایسے اشتہارات آئے دن چھپتے ہی رہتے تھے ہاں اس میں ایک بات ذرا سی مختلف تھی۔ عموماً اس طرح بچے گھر سے روٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ ماں باپ نے کسی بات پر زیادہ سختی کی اور بچہ اسے برداشت نہ کر پایا تو گھر سے بھاگ گیا۔ یہاں صورتحال مختلف تھی۔ ایک باپ اپنے بیٹے سے روٹھ کر چلا گیا' لیکن یہ بات بھی زیادہ اہم نہیں تھی۔ بعض بوڑھوں کا مزاج بھی بچوں ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر ضد کرنے لگتے ہیں اور روٹھ جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود میرا ذہن مطمئن نہ ہو سکا۔ اس بوڑھے کو آخر کون قتل کرنے والا تھا؟ اور قتل کا سبب کیا ہو سکتا تھا؟ مجھ پر ایک اضطراری سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اسی کیفیت میں غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اخبار میں دیا ہوا ٹیلی فون نمبر ملایا۔ دوسری جانب کافی دیر تک گھنٹی بجتی رہی اور کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ میں نے لائن ڈس کنیکٹ کر کے دوبارہ نمبر ملایا۔ اسی کے ساتھ ساتھ میرا ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں منہمک تھا۔

اس مرتبہ کچھ دیر بعد ریسیور اٹھا لیا گیا۔ ''ہیلو!'' دوسری جانب سے مجھے کسی بچے کی آواز سنائی دی۔ آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ بچے کی عمر آٹھ دس سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

''بیٹے! آپ کے ابو ہیں گھر پر؟'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

''جی نہیں آپ کون بول رہی ہیں؟'' بچے نے سوال کیا۔

''آپ کی امی تو ہوں گی نا؟'' میں بولی۔

''جی ہاں' بلاؤں انہیں؟'' بچے نے کہا۔ ''وہ کچن میں ہیں۔''

''اچھا انہی کو بلا دیں۔ شاباش۔''

''ابھی بلاتا ہوں۔'' اس نے بھولپن سے کہا اور پھر غالباً وہیں کھڑے ہو کر اپنی ماں کو آوازیں دینے لگا۔ میں اس کی آوازیں سن رہی تھی۔ ''امی...... امی! فون......''

مجھے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر دور سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔'' کیوں چیخ جا رہے ہو' یہاں کھڑے ہو کر کچن میں آ کر نہیں بتا سکتے تھے۔ لاؤ اِدھر ریسیور۔'' چند لمحے بعد وہی نسوانی آواز واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ ''جی...... کس سے بات کرنا ہے آپ کو؟''

''سہیل صاحب سے۔'' میں نے اشتہار میں پڑھا ہوا نام لیا۔

''وہ تو ہیں نہیں اس وقت۔ آپ کا نام؟''

''نام بتانا فضول ہی ہوگا اس لیے کہ وہ مجھے جانتے نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ ان سے کب فون پر بات ہو سکے گی؟''

''آ تو جانا چاہئے تھا انہیں اب تک! پھر بھی کام تو بتا دیں ان سے کیا کام ہے آپ کو؟''

''میں انہیں ایک اطلاع دینا چاہتی تھی۔''

''کس سلسلے میں؟''

''سہیل صاحب آپ کے شوہر ہیں نا۔''

''جی۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو کیا آپ کو علم نہیں کہ انہوں نے آج اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ ان کے والد......''

''اچھا...... وہ...... جی...... جی ہاں' جی ہاں۔'' وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ اس کی گھبراہٹ میرے لیے خلاف توقع ہی تھی۔'' تو آپ کو اس سلسلے میں کیا...... کیا بات کرنا تھی ان سے؟''

''مجھے ان کے والد کا سراغ مل گیا ہے۔'' میں نے دانستہ غلط بیانی سے کام لیا۔

''جی...... جی؟...... کیا...... کیا کہا آپ نے؟ میں...... میں سمجھی نہیں۔'' اس کے لہجے میں انتہائی حیرت تھی۔ اس موقع پر اظہار خوشی کی بجائے شدید حیرت کا اظہار بھی معنی خیز تھا۔

میں نے اپنی بات دہرانے کی بجائے صرف اتنا کہا۔ ''میں ایک گھنٹے کے بعد پھر فون کروں گی۔ امید ہے کہ سہیل صاحب اس وقت تک گھر آ چکے ہوں گے۔ خدا حافظ۔''

''سنئے آپ...... آپ نام تو بتا دیں۔''

میں نے کوئی جواب دیئے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ سہیل کی بیوی سے فون پر گفتگو کرتے ہوئے میں ایک نتیجے تک پہنچ چکی تھی۔ کسی توقف کے بغیر میں نے انٹر کام پر ڈیوٹی روم کا نمبر ملایا۔ اس وقت تک کمانڈر نواز چارج لے چکا تھا۔ مجھے انٹر کام پر اسی کی آوز سنائی دی۔ ''جی فرمایئے۔''

"میں تمہیں ایک پتا لکھوا رہی ہوں' یہاں ایک شخص ایم سہیل حامد رہتا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں مکمل معلومات چاہئیں۔ اس سلسلے میں تم آج کا کوئی اخبار بھی دیکھ سکتے ہو۔ تقریباً تمام ہی اردو کے اخبارات میں تلاش گمشدہ کے عنوان سے ایک اشتہار شائع ہوا ہے۔ یہ اشتہار ایک بوڑھے شخص ایس حامد علی کی گمشدگی کے بارے میں ہے۔ ایم سہیل حامد کی طرف سے اشتہار چھپا ہے۔ خیر پتا لکھو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے اخبار میں شائع ہونے والا پتا لکھوا دیا۔

"جی لکھ لیا پتا۔" کمانڈر نواز بولا۔ "کوئی اور حکم؟ کیا اسی وقت میں کسی کی ڈیوٹی لگا دوں؟"

"میرا خیال ہے کہ تم ایسا ہی کرو۔ یہ معاملہ فوری توجہ کا مستحق ہے۔" میں نے فی الحال کمانڈر نواز کو تفصیلات بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

"جی بہتر ہے۔" اس نے جواباً کہا اور میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔

کمانڈر نواز کو ہدایات دے کر میرا ذہن پرسکون ہو چکا تھا۔ اب مجھ پر اضطراری کیفیت طاری نہیں تھی۔ پھر میں اس رات جلدی سو گئی کیوں کہ آئندہ روز مجھے پوری طرح چاق و چوبند رہنا تھا۔ میں صبح تازہ دم اٹھنا چاہتی تھی۔ سونے سے پہلے میں نے انٹرکام پر کمانڈر نواز سے کہہ دیا تھا کہ جب تک کوئی بہت اہم مسئلہ نہ ہو' مجھے نہ جگایا جائے اور سونے دیا جائے۔

دوسرے دن صبح سات بجے ہی خود بخود میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کمانڈر نواز کو ایاز کے متعلق ضروری ہدایات دیں اور پھر بستر سے اٹھ گئی۔ میں چاہتی تھی کہ جب تک میں تیار ہوں ایاز بھی میرے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہو جائے۔ میرا ارادہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے تک ایاز کو لے کر نکل جاؤں۔

ناشتہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ اب تک میں نے قریب رہ کر ایاز کے ذہن کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کیا میں دورہ رہ کر بھی ایسا کر سکتی ہوں؟ اسی سوال کا جواب پانے کیلئے میں ایاز کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے لگی۔ پھر اس وقت میرا دل خوشی کے سبب تیزی سے دھڑکنے لگا جب میں پانی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ ایاز اس وقت یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ میری قید سے کس طرح فرار ہو سکتا ہے؟

تم اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے احمق آدمی! میرے طاقتور ذہن نے گویا اس کے ذہن میں سرگوشی کی۔

وہ چونک اٹھا اور پھر بڑبڑانے لگا۔ "کیوں...... آخر کیوں؟ میں اتنا نروس پہلے تو نہیں تھا۔" میں اس کی آواز بھی واضح طور پر سن رہی تھی۔ یوں جیسے میں خود وہاں موجود تھی۔

جس کا ضمیر مجرم ہوتا ہے' وہ اسی طرح نروس اور بزدل ہو جاتا ہے۔ تمہارا ضمیر بھی مجرم ہے۔ میں نے اپنے ذہن میں سوچا اور یہ الفاظ ایاز کے ذہن تک منتقل ہو گئے۔

ایاز یقیناً یہی سمجھ رہا ہوگا کہ خود بہ خود اس کے ذہن میں یہ خیالات آ رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔

پھر میں نے اس کے ذہن کی آزادی سلب کر لی اور اسے حکم دیا کہ تمہیں جلد از جلد عذرا خان

کے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہو جانا چاہئے۔ کیا تم بھول گئے کہ تمہیں آج عذرا خان کو اپنی فرم کا چارج دینا ہے۔

"ہاں مجھے یاد ہے...... یاد ہے مجھے۔" وہ خوابیدہ سی آواز میں بڑبڑانے لگا۔ "میں ابھی اٹھتا ہوں اور پھر......"

ایاز کو یہ حکم دے کر میں دوبارہ ناشتہ کرنے لگی۔ اس دن میں وقت مقررہ پر ایاز کو ساتھ لے کر آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی عمارت سے نکلی تو گویا حسب سابق سیل کے ارکان کا ایک حفاظتی دستہ میرے ساتھ تھا۔ آج میں خود ہی کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ میرے ساتھ ہی اگلی نشست پر ایاز بیٹھا تھا۔ کمانڈر نواز کو آج میں نے اپنے ساتھ رکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

میرے اندازے کے عین مطابق اس وقت ٹھیک نو بجے تھے جب میں نے اپنی فرم کی بلڈنگ کے سامنے کار روکی۔ بلڈنگ کے نچلے حصے میں کار پارکنگ کی جگہ تھی۔ میں نے ایک عرصے کے بعد اپنی کار اسی جگہ پارک کی جہاں کیا کرتی تھی۔ پھر میں ایاز کو ساتھ لیے زینے کی طرف بڑھ گئی۔ نو بجے دفاتر کھل جاتے تھے اس لئے لوگوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔

ایاز میرے ساتھ خلاف توقع دفتر میں داخل ہوا تو ہر طرف کھلبلی سی مچ گئی۔ ایاز اسی کمرے میں بیٹھتا تھا جہاں کبھی میں بیٹھتی تھی۔ میں ایاز کے ساتھ اسی کمرے میں آ گئی۔ ایاز کو میں نے فی الحال مصلحتاً اپنی ہی کرسی پر بٹھایا تھا اور خود اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ایاز کی حیثیت اب میرے ہاتھ میں ایک کھلونے کی سی تھی۔ اس کا ہر عمل میرے ذہن کا پابند تھا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایاز کا چھوٹا بھائی پرویز اندر آ گیا۔

"آپ...... آپ بھائی جان......" وہ شدید حیرت کے سبب اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"بیٹھو!" ایاز نے پرسکون آواز میں پرویز سے کہا اور ان سے ملو' یہ عذرا خان ہیں اس فرم کی مالک۔"

پرویز حیران پریشان سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

"پرویز! اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔" ایاز نے پھر اپنے بھائی کو مخاطب کیا۔

"کیسا ارادہ بھائی جان؟" پرویز نے چونک کر سوال کیا۔

"تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا...... مگر پہلے...... خیر میں خود ہی چپراسی کو بلا کر کہہ دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے میز کی ایک جانب ہاتھ بڑھایا اور چپراسی کو بلانے کیلئے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ چپراسی فوراً ہی اندر آ گیا۔ ایاز نے اس سے کہا۔ "دیکھو کسی کو بھی اندر نہ آنے دینا! ضروری میٹنگ ہو رہی ہے یہاں۔"

"یس سر!" چپراسی ادب سے اثبات میں سر ہلا کر باہر چلا گیا۔

"مس عذرا خان!" ایاز نے مجھے مخاطب کیا۔ "آپ وہ کاغذات ذرا پرویز کو بھی دکھا دیجئے تاکہ یہ بھی صورتحال کو سمجھ سکیں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی' مگر......"

''نہیں' اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔'' میں نے پرس کھول کر کاغذات نکالے اور انہیں پرویز کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''پرویز صاحب دراصل ایاز صاحب نے میرے تمام اثاثے دوبارہ میرے ہاتھوں فروخت کر دیئے ہیں۔ یہ کاغذات دراصل اسی کا ثبوت ہیں۔''

پرویز کا چہرہ ایک دم تاریک سا ہو گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے بے یقینی سی جھلک رہی تھی۔ پھر بھی اس نے کاغذات مجھ سے لے کر ان کی ورق گردانی شروع کر دی۔ لحہ لحہ پرویز کے چہرے پر حیرت کے تاثرات گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

''پرویز! اب یہ کاغذات مس عذرا خان کے حوالے کر دو۔'' ایاز نے اپنے بھائی سے کہا۔

پرویز ان کاغذات پر سرسری نظر ڈال چکا تھا۔

پرویز نے کاغذات میری طرف بڑھا دیئے پھر ایاز کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''مگر...... مگر بھائی جان......''

''اب اس معاملے میں کسی اگر مگر کی گنجائش نہیں رہی۔'' ایاز کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ''میں آج اور اسی وقت فرم کا چارج انہیں دے دینا چاہتا ہوں۔ کیا تم بھول گئے کہ خود ہم نے بھی تو اسی طرح کیا تھا۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ اس وقت ہمارے ساتھ پولیس بھی تھی۔ لیکن یہ معاملہ راضی بہ رضا کا ہے۔ میں خوش اسلوبی کے ساتھ تمام معاملات نمٹانا چاہتا ہوں۔ اب یہ ان کی مرضی پر منحصر ہو گا کہ یہ فرم کے ملازمین کو بدستور ان کے عہدوں پر برقرار رکھتی ہیں یا نہیں۔ میری غیر موجودگی میں کیوں کہ تمہی فرم کے معاملات دیکھ رہے تھے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم سب کچھ انہیں ہینڈ اوور کر دو۔ میں نے ان سے آج دوپہر دو بجے تک کا وقت لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وقت کم نہیں اس دوران میں تم معاملات نمٹا سکتے ہو۔''

''آپ...... آپ بھابی سے مل کر آ رہے ہیں نا......''

''نہیں۔'' ابھی میں گھر نہیں گیا۔ ایاز نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ سے میں ذرا...... تنہائی میں ......'' پرویز یہ کہہ کر میری طرف مڑا۔ ''معاف کیجئے مجھے بھائی جان سے خلوت میں کچھ بات......''

''میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ...... عذرا خان کو یہیں بیٹھنے دو۔'' ایاز بول اٹھا اور پھر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

پھر ایاز اور پرویز کمرے سے نکل گئے۔ ان دونوں کے درمیان خلوت میں جو گفتگو ہوئی اسے سن لینا میرے لیے اب کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ایاز کی سماعت گویا اب میری سماعت تھی۔ اس کے علاوہ وہ جو کچھ اپنی زبان سے کہتا وہ بھی میرے ہی الفاظ ہوتے۔ میری پوری توجہ ایاز کے ذہن پر تھی۔ میں نے ارتکاز توجہ کیلئے اپنی آنکھیں بھی بند کر لی تھیں۔

ذرا ہی دیر بعد میں نے ایاز کی آواز سنی۔ ''ہاں کہو کیا بات ہے؟''

''آپ نے یہ کیا کر دیا؟ شہریار بھائی نے کل ہی رات فون پر مجھ سے بات کی تھی۔ انہوں نے تو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔'' پرویز کی مضطرب آواز سنائی دی۔

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' ایاز بولا۔ ''سنو پرویز اگر میں یہ قدم نہ اٹھاتا تو بری طرح ں جاتا اور تم بھی لپیٹ میں آ جاتے۔ تمہیں کم از کم یہ تو معلوم ہے کہ ہم نے ناجائز طور پر عذرا خان تمام اثاثوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ شہریار بھائی کی بات دوسری ہے' وہ تو کسی نہ کسی طرح بچ نکلتے مگر ہم...... ں جاتے۔ تم عذرا خان کو نہیں جانتے۔ صدر مملکت تک اس کی بھی رسائی ہے۔ اس سے پہلے کہ آگے بڑھتی میں نے اس سے مل کر اسی سطح پر معاملہ نمٹا دیا۔''

''لیکن بھائی جان شہریار بھائی سے ہم کیا کہیں گے؟ کیا وہ آپ کے اس فیصلے کو قبول کر لیں ''؟

''وہ قبول کریں یا نہ کریں' لیکن میں اپنی اور تمہاری گردن پھنسانا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی اب نہیں ہو سکتا۔'' پھر ایاز اسے بتانے لگا کہ ایاز انٹر پرائزز کا بینک اکاؤنٹ بھی بند ہو چکا ہے اور اس نے کاغذات وغیرہ بھی میرے حوالے کر دیئے ہیں۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ نے یہ سب کچھ اپنی ذمے داری پر کیسے کر دیا۔ بہر حال اب جو بھی ہو گا بھگتنا ہی پڑے گا۔ آپ جائیں میں کوشش کرتا ہوں کہ دوپہر دو بجے تک......''

''کوشش نہیں' یہ ہر حال میں کرنا ہے۔'' ایاز نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''دوپہر دو بجے عذرا خان کے آدمی چارج لینے آ جائیں گے۔''

''ملازمین کی تنخواہوں وغیرہ کا کیا ہو گا؟ ہر چند کہ ہم نے احتیاطاً ابھی اپائنٹمنٹ لیٹر کسی کو نہیں مگر پھر بھی......''

''میں ابھی اس سلسلے میں عذرا خان سے بات کر کے تمہیں انٹر کام پر بتائے دیتا ہوں۔'' میں نے دانستہ ایاز سے یہ جملہ کہلوایا تھا۔

میرے ذہن میں بس اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ اس معاملے میں غریب ملازمین کا کیا قصور ہے؟ کیا خبر ان سے کتنے بیروزگار ہو کر جانے کتنے دن ملازمت کی تلاش میں دھکے کھاتے پھرتے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ چار ماہ کے عرصے میں میرا سابقہ سٹاف بیکار بیٹھا رہا ہو۔ یقیناً ان میں سے خاصی تعداد نے دوبارہ کہیں نہ کہیں ملازمت کر لی ہو گی۔ سبھی تو میری منیجر عارفہ ایسے نہیں ہوتے۔ مجھے یہ بات کچھ غیر انسانی سی لگی کہ اتنے سارے لوگوں کو بیک وقت ملازمت سے جواب دے دیا جائے۔ اگر میں بھی ایسا ہی کرتی تو پھر ایاز اور مجھ میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ بعد میں نااہل لوگوں کو نکال دیا جاتا۔

جب تک ایاز کمرے میں لوٹ کر آیا میں فیصلہ کر چکی تھی۔

''تمہاری جو ذاتی چیزیں اس کمرے میں ہوں وہ نکال لو۔'' میں نے ایاز کو مخاطب کیا۔ وہ اب دوبارہ میری کرسی پر آ کے بیٹھ چکا تھا۔ ''اور سنو اپنے بھائی سے انٹر کام پر یہ کہہ دو کہ فرم کا کوئی ملازم بیروزگار نہیں ہو گا' کسی کو ملازمت سے جواب نہیں دیا جائے گا۔ یہ ان کی مرضی پر منحصر ہو گا کہ فرم کا مالک بدل جانے کے بعد وہ بدستور کام کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ہاں تمہارا بھائی پرویز بحیثیت منیجر کام نہیں کر سکے گا۔''

پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے کم از کم اپنے کمرے کا چارج ایاز سے لے لیا۔ اس نے میرے ا پر اپنا ذاتی سامان میز پر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد ایاز نے انٹرکام پر پرویز سے میری بات ک دی تھی اور کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"اب تم یہاں بیٹھو۔" میں یہ کہتے ہوئے اٹھی اور اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گئی۔

ایاز اب اس کرسی پر جا بیٹھا تھا جہاں پہلے میں بیٹھی تھی۔ میں اپنی میز کی درازیں کھول کر ان جائزہ لے رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ٹیلی فون ادھر دو۔" میں نے ایاز سے کہا۔

ایاز نے خود ٹیلی فون ریسیور کرنے کی بجائے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ریسیور اٹھایا تو آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ "اسلام آباد سے کال ہے' بات کیجئے۔"

"ہیلو!" میں بول اٹھی۔

"ہیلو......! ایاز کو فون دو۔" ٹیلی فون پر مجھے ایک گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دی اور میں بولنے والے کو پہچان گئی۔

اب اس سے بات کرنا بیکار ہے شہریار! تم مجھ سے بات کر لو۔ میں عذرا خان بول رہی ہوں۔" میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "تمہیں یقیناً پرویز نے فون پر سب کچھ بتا دیا ہو گا تم بازی ہار چکے ہو۔"

"اس کا فیصلہ آج ہی ہو جائے گا عذرا خان کہ بازی کون ہارا ہے۔ تم یا میں؟ میں پہلی فلائٹ سے آج ہی کراچی پہنچ رہا ہوں۔" شہریار کی جیسے زہر میں بجھی ہوئی آواز سنائی دی اور اسی کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

☆......☆......☆

میں نے کچھ سوچتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ وہ آواز ایک ہارے ہوئے اور زخم خوردہ آدمی کی آواز تھی۔ اس کی دھمکی کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ ذہنی طور پر اس کیلئے میں پہلے ہی سے تیار تھی۔ میں وہ الفاظ بھولی نہیں تھی جو ڈاکٹر رچرڈ نے اپنے ایک معاون جرمن سائنس دان سے کہے تھے۔ جرمن سائنس دان نے کہا تھا کہ اگر دوسرے تجربے سے پہلے عذرا خان فرار ہو گئی تو کیا ہو گا؟ جواب میں ڈاکٹر رچرڈ نے کچھ اس طرح کے الفاظ کہے تھے کہ دنیا بھر میں ہمارے ایجنٹوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ عذرا خان دنیا کے کسی بھی کونے میں جا کر روپوش ہو جائے' ہمارے ایجنٹ اسے تلاش کر لیں گے۔

ان حالات میں شہریار میرے خلاف جو قدم اٹھا سکتا تھا' اس سے میں واقف تھی۔ سب سے پہلے وہ میرے بارے میں ڈاکٹر رچرڈ کو مطلع کرتا عذرا خان پاکستان پہنچ چکی ہے اور کراچی میں ہے۔ اس طرح پاکستان میں موجود امریکی ایجنٹ اور ان کے پروردہ میرے خلاف فوراً حرکت میں آ جاتے۔ خود شہریار بھی انہی میں سے ایک تھا۔ ایک بڑے سرکاری عہدے پر ہونے کی وجہ سے اس کے ذرائع اور وسائل بڑے تھے۔ اسی سبب اس کا دماغ بھی کچھ زیادہ ہی خراب تھا ورنہ وہ مجھے ٹیلی فون پر دھمکی نہ دیتا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ براہ راست اس طرح کھل کر سامنے آیا تھا۔ جھنجلاہٹ اور غصے ہی میں شاید اس سے یہ حماقت سرزد ہو گئی تھی ورنہ عموماً ایسے افراد خاموشی کے ساتھ اور پردے میں رہ کر سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے حریف کو چوکنا ہو جانے کا موقع نہیں دیتے اور غفلت میں وار کرتے ہیں۔

شہریار سے فون پر گفتگو کے بعد اپنے لائحہ عمل پر میں نے از سر نو غور کیا۔ جوابی کارروائی کے طور پر میرے ذہن میں کچھ نئی باتیں آئیں اور میں نے ان پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فرم پر تو اب میرا قبضہ ہونے ہی والا تھا' لیکن حالات کے پیش نظر بقیہ معاملات بھی آج ہی نمٹ جاتے تو بہتر تھا۔

کمرے میں کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ ایاز سامنے والی کرسی پر گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن پر اب تک میری گرفت برقرار تھی۔ اس وقت دس بجنے والے تھے اور دو بجنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ ایاز کے بھائی پرویز کو میں نے فرم کا چارج دینے کیلئے دو بجے دوپہر تک کا وقت دیا تھا۔ میری منیجر عارفہ نرگس اور اس کی چاروں ماتحت بھی دو بجے ہی یہاں پہنچتیں۔ میں نے سوچا' کیوں نہ اس وقت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ دو بجے سے پہلے ایاز کو ساتھ لے کر میں پھر یہاں لوٹ آؤں گی۔

"اٹھو!" معاً میں نے ایاز کو مخاطب کیا اور خود بھی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایاز اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

’’میں ریسیپشن پر تمہارا انتظار کر رہی ہوں‘ پرویز سے یہ کہہ کر آ جاؤ کہ میرے ساتھ جا رہے ہو اور دو بجے سے پہلے دفتر واپس آ جاؤ گے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے میں آگے بڑھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ ایاز میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں نے دانستہ انٹر کام پر پرویز سے یہ بات نہیں کہلوائی تھی کہ وہ خواہ مخواہ کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔

پھر ایاز تو اندر دفتر میں چلا گیا اور میں نے ریسیپشن کا رخ کیا۔ کمرے سے باہر آتے ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ سارے دفتر میں ایک افراتفری سی پھیلی ہوئی ہے۔ یقیناً اب تک نئے حالات کا علم دفتر کے تمام عملے کو ہو چکا تھا۔ ہر شخص مجھے سہمی سہمی سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا شخص بھی مجھے اسی طرف آتے دیکھ کر ایک دم کرسی چھوڑ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھ جانے کو کہا پھر بائیں جانب پڑے ہوئے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

ایاز کو واپسی میں دیر نہ لگی‘ مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ پرویز بھی تھا جس نے آتے ہی مجھ سے سوال کیا۔ ’’آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟‘‘ اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

’’میرا خیال ہے مسٹر پرویز کہ میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے میں صوفے سے کھڑی ہو گئی۔

میرے سخت لہجے سے وہ بوکھلا گیا اور بولا۔ ’’میرا...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ مس عذرا خان...... میں...... میں نے تو دراصل بھائی جان سے یہ سوال کیا تھا۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو میں نے سوچا آپ...... آپ سے پوچھ لیتا ہوں۔ اگر...... اگر آپ کو میری بات بری لگی ہے تو...... تو میں معذرت چاہتا ہوں۔‘‘

’’مائنڈ اٹ مسٹر پرویز کہ دوپہر دو بجے تک آپ کو بہرحال چارج دے دینا ہے۔‘‘ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ’’اپنا بورڈ بھی یہاں سے اتروا لیجئے گا۔ دو بجے میں یہ سننا نہیں چاہوں گی کہ آپ کو مزید وقت چاہیے۔ وی ول کم بیک بفور ٹو کم آن مسٹر ایاز۔‘‘ یہ کہتے ہوئے میں دفتر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی اور ایاز میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میری اور پرویز کی گفتگو کے دوران میں وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ پرویز کو پھر مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

گراؤنڈ فلور پر آ کر میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ مجھے سیل کے ارکان مستعد و چوکنا نظر آئے۔ پھر جب میں ایاز کو اپنی کار میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہوئی تو وہ لوگ بھی حرکت میں آ گئے۔

اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے میں ایاز کے ذہن میں وہ ساری باتیں منتقل کر چکی تھی جن پر اب اسے عمل کرنا تھا۔ اس بات کو بھی میں نے نظر انداز نہیں کیا تھا کہ ممکن ہے‘ پرویز نے ایاز کی بیوی کو بھی فون کر دیا ہو۔ مگر اس سے میرے نزدیک کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں ہر نکتے پر غور کر چکی تھی۔ ڈیفنس میں اپنی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ کر میں نے کار روکی اور ہارن دیا۔ چوکیدار نے میرے ساتھ اگلی سیٹ پر ایاز کو بیٹھے دیکھ کر فوراً گیٹ کھول دیا۔ میں کار کو اندر لے گئی اور پھر پورچ میں پہنچ کر کار سے اتر گئی۔ ایاز دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اتر آیا۔ ایک ملازم نے مجھے اور ایاز کو کار سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ہماری طرف لپکا۔

ملازم قریب آ گیا تو ایاز نے اس سے کہا۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ جی بہتر ہے صاحب!‘‘ ملازم جلدی سے بولا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ’’آئیے!‘‘

کار کا دروازہ مقفل کر کے میں اس ملازم کے ساتھ چل دی اور ایاز برآمدے سے گزر کر اندر کوٹھی میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی یہ سوچ رہی تھی کہ یہاں ایاز کا ساز و سامان ہی کتنا ہو گا۔ میری کوٹھی میں سبھی کچھ تو تھا۔ یہاں آنے سے پہلے ایاز نیو ٹاؤن میں رہتا تھا۔ وہاں اس کا ذاتی مکان تھا جو ان دنوں خالی پڑا تھا۔ اسے کرائے پر نہیں اٹھایا گیا تھا۔ ایاز کو اب اپنی بیوی‘ ملازمین اور اپنے سامان کے ساتھ وہیں منتقل ہونا تھا۔ ایاز کی بیوی کسی حد تک اپنے شوہر کے کرتوت سے واقف تھی اور اس سے دبتی تھی اس لئے یہ امکان نہیں تھا کہ وہ میری کوٹھی سے دوبارہ اپنے پہلے گھر میں جانے پر واویلا کرتی۔

پھر وہی سب کچھ ہوتا رہا جس کیلئے میں یہاں آئی تھی۔ ایاز کے بیوی بچے میری ہی کار میں بیٹھ کر ایک ملازم کے ساتھ وہاں سے چلے گئے۔ ملازم کو ڈرائیونگ آتی تھی۔ وہ کار واپس لے آیا۔ میرے اندازے کے مطابق سامان کم ہی تھا جو آرام سے دو ویگنوں میں آ گیا ایاز کے ملازمین بھی سامان کے ساتھ ہی ان ویگنوں میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ کہیں وہ لوگ میرا کچھ سامان بھی اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ ایاز نے خود اپنی نگرانی میں سارا سامان رکھوایا تھا اور اس کے ذہن پر میری گرفت تھی۔ ایسی صورت میں یہ امکان قطعی نہیں تھا۔ میری کوٹھی سے صرف ایاز ہی کا ساز و سامان گیا تھا۔ ایاز اب تک کوٹھی ہی میں تھا۔ وہ اب کوٹھی کی چابیاں‘ دیگر ضروری کاغذات وغیرہ میرے حوالے کر رہا تھا جو میری خوابگاہ کی تجوری میں تھے۔ طارق روڈ والے فلیٹ کی چابیاں اور کاغذات بھی مجھے مل چکے تھے۔ ایاز میرے ساتھ ساتھ تھا اور میں ہر چیز کو چیک کر کے مقفل کرتی جا رہی تھی۔

میں نے کوٹھی کا قبضہ لینے میں انتہائی سرعت کا ثبوت دیا تھا۔ پھر بھی وہاں سے چلتے چلتے ڈیڑھ بج گیا۔ اپنی کوٹھی کے گیٹ پر تالا ڈالتے ہوئے میں نے اس سمت بھی نگاہ ڈالی جہاں ایاز کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ جگہ خالی تھی۔ یہ بھی میرے ہی ایما پر ہوا تھا۔ میں نے محض تصدیق کی خاطر ادھر دیکھا تھا۔ میرے لیے وہ لمحات انتہائی طمانیت بخش تھے۔ ایاز کے ساتھ کار میں بیٹھے ہوئے میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ بالآخر یہ مرحلہ بھی میری مرضی کے مطابق طے ہو گیا تھا۔ کار سٹارٹ کرتے ہوئے میری نگاہ ایاز کی طرف اٹھی۔ وہ خاموش بیٹھا ہوا ایک ہی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں اس سے مخاطب ہوئی تو وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔

’’سنو ایاز!‘‘ میں نے کہا۔ ’’تمہارا بہنوئی شہریار تم پر بہت لعن طعن کرے گا کہ تمہیں ہرگز وہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا جو کیا۔ تمہیں اس کی ہر بات کے جواب میں یہی کہنا ہے کہ تمہارا ضمیر بیدار ہو گیا تھا اور تم نے اسی سبب اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے میری ہر بات مان لی۔ میں نے جو کچھ کہا‘ تمہیں یاد رہے گا نا؟‘‘

’’ہاں مجھے یاد رہے گا۔‘‘ وہ بھاری سی آواز میں بولا اور پھر میرے کہنے پر ان الفاظ کو دہرانے لگا جو میں نے اس کے ذہن نشین کیے تھے۔

میں مطمئن ہو گئی کہ میرے ذہن کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد بھی اسے یہ باتیں رہیں گی۔ دراصل اس طرح میں' شہریار کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا چاہتی تھی۔ جب وہ اپنے ہی پروردہ ایسے شخص کی زبان سے یہ باتیں سنتا تو یقیناً اسے تکلیف پہنچتی۔ بے ضمیر لوگوں کیلئے ضمیر وغیرہ کی با تکلیف دہ ہی تو ہوتی ہیں۔

دو بجنے میں بس چند ہی منٹ باقی تھے جب میں واپس اپنے دفتر پہنچی۔ یہ دیکھ کر مجھے خ ہوئی کہ ایاز انٹرپرائزز کا بورڈ وہاں سے ہٹایا جا چکا تھا۔ یہ دن میرے لیے واقعی بہت زیادہ خوشی کا دن ثابت ہو رہا تھا' مگر اسی کے ساتھ مجھے آنے والے خطرات کی آہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ا ساتھ ایاز کو لیے اوپر پہنچی تو میری منیجر عارفہ' نرگس اور اس کی چاروں ماتحت آ چکی تھیں۔ وہ سب ریسپشن روم میں بیٹھی تھیں۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

میں نے ان کے سلام کا جواب دے کر ان سے بیٹھنے کو کہا اور عارفہ کو اپنے ساتھ آنے کا اش کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

کمرے میں آ کر میں نے ایاز کے بھائی پرویز کو بلوا لیا۔ میں اب اپنی ہی کرسی پر بیٹھی تھ ایاز اور عارفہ میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ پرویز بھی آ کر انہی کے برابر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مسٹر پرویز!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''ان سے ملیں۔'' میں' عارفہ کی طرف دیکھتے ہو بولی۔ ''یہ عذرا انٹرپرائزز کی منیجر عارفہ ہیں...... اور عارفہ! یہ پرویز ہیں' تمہیں انہی سے چارج لینا ہے ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں پھر بول اٹھی۔ ''پرویز صاحب! آپ نے ان افراد لسٹ بنا لی جو ملازمت چھوڑنا چاہتے ہیں؟''

''اس کی ضرورت نہیں پڑی۔'' اس نے بجھے ہوئے سے لہجے میں جواب دیا۔ ''کوئی بھ ملازمت چھوڑنا نہیں چاہتا۔''

''آپ کے سلسلے میں مجھے افسوس ہے مسٹر پرویز۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر آپ ا صاحب کے بھائی نہ ہوتے تو......''

''ڈونٹ وری مس عذرا خان! آئی ایم اے کوالیفائڈ مین۔ سروس از ناٹ پرابلم فار می۔''

میری بات سے یقیناً اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی جس کا اظہار اس کے چہرے سے بھی ہو تھا۔ جواباً میں نے اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہا۔ پرویز کی بجائے میں عارفہ سے مخاطب ہوئی اور اسے سورتحال سے آگاہ کیا۔ پھر بولی۔ ''فی الحال تمہیں اسی سٹاف سے کام لینا ہے' بعد میں اگر تمہیں کو قباحت ہو تو سٹاف میں ردوبدل کر سکتی ہو۔ اب تم ان کے ساتھ جا کر دفتر کا چارج لے لو اور اپنے ساتھ نرگس وغیرہ کو بھی لے جاؤ تا کہ جلد سے جلد معاملہ نمٹ جائے۔ میں اس وقت تک یہیں ہوں' چارج لے کر مجھے رپورٹ دو۔''

''جی بہتر ہے۔'' عارفہ نے جواباً کہا اور پھر پرویز کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

شہریار سے فون پر گفتگو ہوئے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میرے حریف ابھی تک حرکت میں نہیں آ سکے تھے۔ میں

ں مہلت سے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ اب گویا بس پلکوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں۔ فرم کا چارج مل جانے کے د یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا جس میں بظاہر اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

پھر مزید ایک گھنٹہ گزر گیا اور تمام معاملہ بہ حسن و خوبی طے ہو گیا۔ عارفہ نے مجھے آ کر رپورٹ ے دی کہ وہ چارج لے چکی ہے۔ پرویز بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اس عرصے میں ایاز کا وہ سامان ہی پیک کرا کے اس کے حوالے کر دیا تھا جو میرے کمرے میں تھا۔ اخلاقاً میں اٹھ کھڑی ہوئی' پھر ایاز اور ں کے بھائی کو دفتر کے دروازے تک چھوڑنے گئی۔

''خدا حافظ!'' میں نے ایاز اور پرویز دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پرویز کے چہرے سے فکر و ملال کا اظہار ہو رہا تھا اور ایاز کا چہرہ سپاٹ تھا۔ جواباً ان دونوں نے بھی خدا حافظ کہا اور نیچے جانے والے زینے کی طرف بڑھ گئے۔ اسی لمحے میں نے ایاز کے ذہن کو اپنی لاقت و ذہن کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ میرے نزدیک اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں اس ے ذہن میں یہ بات بٹھا چکی تھی کہ اس نے اپنی خوشی سے میرے تمام اثاثے واپس کیے ہیں۔

اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد عارفہ کو میں نے کچھ ضروری باتیں سمجھائیں جن کا تعلق ے آئندہ لائحہ عمل سے تھا۔ اسی کے پیش نظر میں نے نرگس اور بلقیس کو بلوا لیا اور ان دونوں کو ساتھ لے کر دفتر سے نکل آئی۔ اب میں جلد از جلد آپریشن سیل ہیڈکوارٹر پہنچنا چاہتی تھی۔

آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی طرف جاتے ہوئے میں نے راستے میں ان دونوں کو وہ باتیں ذہن نشین کرا دیں جو ان کیلئے جاننا ضروری تھیں۔ وہ دونوں انتہائی ذہین اور نڈر تھیں۔ میں نے اسی لئے ان کا انتخاب کیا تھا۔ سیل کے ارکان کا حفاظتی دستہ بدستور میری کار کے آگے پیچھے تھا۔

صبح سے اب تک مجھے اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ ناشتے کے بعد ایک کپ چائے ہی پی لیتی' دوپہر کا کھانا بھی گول ہو گیا تھا۔ جب میں آپریشن سیل ہیڈکوارٹر پہنچی تو خاصی بھوک لگ رہی تھی۔ نرگس اور بلقیس کو میں اپنے کمرے ہی میں لے آئی تھی۔

''تم لوگ کچھ کھاؤ گی؟'' میں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے ان دنوں سے پوچھا۔

''جی نہیں' شکریہ! ہم کھانا کھا چکے ہیں۔'' ان دونوں نے باری باری جواب دیا۔

''اچھا پھر چائے تو چل ہی جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے کچن روم سے رابطہ قائم کیا اور کھانے کے ساتھ چائے لانے کو بھی کہا۔ پھر ڈیوٹی روم کا نمبر دبایا مختصراً میں نے آج پیش آنے والے واقعات سے عثمانی کو بھی آگاہ کیا' پھر اسے ضروری ہدایات دیں اور اپنے کمرے میں آنے کو کہا۔ عثمانی سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ ڈیوٹی روم خالی نہیں رہنا چاہئے۔ وہ اور کمانڈر نواز دونوں ہی ہر حال میں اس کا خیال رکھتے تھے۔

میری ہی طرح عثمانی کو بھی میک اپ میں کمال حاصل تھا۔ میں نے اسی لیے اسے بلایا تھا۔ کھانا آنے سے پہلے ہی وہ ایک بڑا سا بیگ اٹھائے میرے کمرے میں آ گیا۔ بیگ میں میک اپ کا ضروری سامان رکھا تھا۔ میرے اشارے پر پہلے وہ نرگس کا میک اپ کرنے لگا۔ نرگس اور بلقیس کے انتخاب کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کے جسم اور قد بڑی حد تک مجھ سے ملتے جلتے تھے۔ ابھی نرگس کا میک

اپ جاری تھا کہ کھانا آ گیا۔ میں کھانا کھانے لگی اور بلقیس نے اپنے لئے چائے بنالی۔ عثمانی' نرگس میک اپ میں اپنی مہارت دکھا رہا تھا۔

''کھیل شروع ہو چکا ہے عثمانی!'' میں نے کھانا کھاتے ہوئے عثمانی کو مخاطب کیا۔ ''دشمن تمام تر قوتوں کے ساتھ حملہ آور ہوگا اور ہمیں بھی پوری شدت سے اس کا جواب دینا ہے۔''

''جی ہاں مجھے اس کا اندازہ ہے۔'' عثمانی نے جواباً کہا۔ میری بات کا جواب دیتے ہوئے اس کی نگاہ نرگس کے چہرے سے نہیں ہٹی تھی۔

''میری پلاننگ کے مطابق آپریشن سیل کے ارکان کی بڑی تعداد کو حرکت میں آنا پڑے اس کا سبب تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔ مجھے یہ دونوں لڑکیاں بہت عزیز ہیں۔ انہیں کسی صورت کوئی نقص نہیں پہنچنا چاہئے۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ کراچی پہنچنے کے بعد شہریار ایک لمحے کو بھی کے ارکان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکے۔ اس کی نقل و حرکت میرے علم میں رہنا چاہیے!''

''آپ مطمئن رہیں' جو ہدایات دی گئی ہیں' ان پر پوری طرح عمل کیا جائے گا۔ میں ی آنے سے قبل ہی سرفراز کو ہاتھ آئی لینڈ بھیج چکا ہوں۔ اس کے ساتھ سیل کے دو ارکان اور بھی ہ شہریار جیسے ہی کراچی پہنچے گا' ہمیں اطلاع مل جائے گی۔'' عثمانی مجھے مطمئن کرنے کے لئے بتانے لگا۔

''کیپٹن شاد کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اس وقت میری جگہ ڈیوٹی روم میں ہے۔'' عثمانی نے بتایا۔ ''وہ بھی انہی لوگوں میں ش تھا جو آج صبح سے آپ کے ساتھ تھے۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' میں بولی۔ ''میں تو دراصل اس وقت کے بارے میں پوچھ رہی تھ میں سمجھی تھی کہ شاید تم نے اسے چھٹی دے دی ہو۔''

''آپ کی ہدایات ملتے ہی میں نے فوری طور پر ایمرجنسی ڈیکلیئر کر دی تھی اور ایمرجنس مطلب سیل کا ہر رکن اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ڈیوٹی آورز ختم ہو جانے کے باوجود وہ اس وقت تک چ نہیں کر سکتا جب تک ڈیوٹی انچارج سے اجازت نہ مل جائے۔''

عثمانی جو کچھ کہہ رہا تھا' میرے ہی وضع کردہ اصولوں میں سے ایک کی وضاحت تھی۔ آپریش سیل کے ارکان ایمرجنسی کی صورت میں مزید مستعد' چوکنا ہو جاتے تھے۔ ایسے مواقع خال خال ہی آ تھے اور ان مواقع پر سیل کے ارکان کا جوش و خروش قابل دید ہوتا تھا۔

اسی گفتگو کے دوران میں عثمانی' نرگس کے میک اپ سے فارغ ہو گیا اور اس نے داد طل نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے مایوس نہیں کیا اور بولی۔ ''ویری گڈ!'' پھر میں نرگس مخاطب ہوئی۔ ''اب تم الماری سے میرا کوئی جوڑا نکال کر پہن لو۔ ابھی وقت ہے' تم دفتر جا سکتی ہو۔''

نرگس کرسی سے اٹھ کر پہلے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی او چونک اٹھ ''ونڈرفل مسٹر عثمانی!'' وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ نرگس کا چہرہ ہو بہو میری تصویر لگ رہا تھا۔

''تھینک یو مس نرگس!'' عثمانی بولا۔

پھر نرگس کی جگہ میرے اشارے پر بلقیس بیٹھ گئی۔ نرگس میری ہدایت کے مطابق الماری۔

میرا ایک جوڑا نکال کر باتھ روم میں گھس گئی۔ عثمانی اب بلقیس کا میک اپ کرنے لگا۔ میں اس عرصے میں کھانا کھا چکی تھی اور اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔

نرگس لباس تبدیل کر کے باتھ روم سے نکل آئی تو میں نے اس سے بھی چائے پینے کو کہا۔ وہ میرے قریب آ بیٹھی۔ اس وقت اگر کوئی شخص کمرے میں داخل ہوتا تو یقیناً چکرا کے رہ جاتا۔ اس کیلئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ ہم دونوں میں سے عذرا خان کون ہے۔

چائے پیتے ہوئے میں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا اور ڈیوٹی روم سے رابطہ قائم کیا۔ دوسری طرف میری توقع کے مطابق کیپٹن شاد ہی تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''کیپٹن! تم کسی اور کو ڈیوٹی روم کا چارج دے کر میرے کمرے میں آ جاؤ۔''

''بہتر ہے۔'' کیپٹن شاد نے جواب دیا اور اسی کے ساتھ میں نے انٹرکام کا ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا۔

''عثمانی! میرا خیال ہے کہ نرگس کے ساتھ کیپٹن شاد کی ڈیوٹی لگا دی جائے۔ تمہارے خیال میں کیپٹن شاد کے سوا کتنے افراد ضروری ہیں؟''

''میرے خیال میں مزید چار افراد کافی ہوں گے کیوں کہ ڈیوٹی راؤنڈ دی کلاک ہوگی۔ ویسے جو آپ مناسب خیال فرمائیں۔''

''دو کا اضافہ مزید بہتر رہے گا۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ ایک وقت میں کم از کم سیل کے تین ارکان نرگس کی نگرانی کر سکیں۔ کیپٹن شاد ان چھ افراد کا انچارج ہوگا۔ وہ ان سے رپورٹ لے کر آپریشن سیل کو تازہ ترین حالات سے مطلع رکھے گا۔ دوسرے گروپ کیلئے میجر شہباز مناسب ہے۔ اس کے ساتھ بھی سیل کے اتنے ہی ارکان ہونا چاہئیں!'' میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی۔

''یہ قطعی مناسب ہے' میرے ذہن میں بھی دوسرے گروپ کیلئے میجر شہباز ہی کا نام تھا۔'' عثمانی میری تائید میں بولا۔ پھر کہنے لگا۔ ''اور آپ کے ساتھ۔ اس سلسلے میں ابھی تک آپ نے کچھ نہیں بتایا۔''

''میری پروا نہ کرو!'' میں مسکرا کر بولی۔ ''میں جب اس کی ضرورت محسوس کروں گی تو تیسرا گروپ بھی بن جائے گا۔ فی الحال اتنا کافی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ضرورتاً مجھے کسی اور شکل میں ظاہر ہونا پڑے۔ اس کا انحصار وقت' حالات اور ضرورت پر ہوگا۔''

میری بات ختم ہوتے ہوئے کیپٹن شاد کمرے میں داخل ہوا اور میری توقع کے عین مطابق پہلی بار چونک اٹھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس کیلئے بہر حال یہ کھیل نئے نہیں تھے۔ میں دانستہ چپ رہی اور نرگس کو بولنے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑی حد تک میری آواز کی نقل اتار لیتی تھی۔

''کیپٹن شاد! یہاں ادھر اس کرسی پر آ کر بیٹھ جاؤ!'' نرگس نے حتیٰ الامکان میرے لب و لہجے میں کیپٹن شاد سے کہا۔

''بہتر ہے مس نرگس!'' کیپٹن شاد مسکرا کر بولا اور پھر آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کیپٹن شاد' نرگس کے ٹریپ میں نہیں آیا تھا۔ اس سے مجھے یہی امید

تھی۔ اس کی تربیت میں میرا وقت ضائع نہیں گیا تھا۔

نرگس اس وقت تک چائے پی چکی تھی۔ کیپٹن شاد کو ضروری احکام دے کر میں نے اسے نرگس کے ساتھ روانہ کر دیا۔ پھر جب عثمانی بلقیس کے میک اپ کو آخری ٹچ دے رہا تھا تو میں بول اٹھی۔ ''عثمانی! تمہارے خیال میں نرگس کیلئے زیادہ خطرہ ہے یا بلقیس کیلئے؟''

''بلقیس کیوں کہ رات کو بھی آپ کی کوٹھی میں رہے گی اس لیے زیادہ خطرہ اسی کیلئے ہوگا۔ یوں بھی خطرات زیادہ تر رات کے اندھیرے ہی میں جنم لیتے ہیں۔'' عثمانی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

ایک حد تک تمہارا خیال درست ہے مگر تقریباً یہی صورتحال نرگس کے ساتھ بھی ہوگی۔ اس کی سکونت طارق روڈ والے فلیٹ میں ہوگی وہ جگہ بھی دشمنوں کی نظر میں آ چکی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں وہاں بھی رہ سکتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں کچھ سوچنے لگی۔ بلقیس کی نسبت نرگس بہرحال زیادہ تجربہ کار تھی۔ میں اسی پر غور کر رہی تھی کہ بلقیس کے مزید تحفظ کی کیا صورت ہو؟ کچھ دیر بعد میں ایک نتیجے پر پہنچ گئی اور عثمانی سے کہا۔ ''ملازمین کی صورت میں سیل کے کم از کم تین افراد کوٹھی کے اندر بھی رہیں گے۔ ایک چوکیدار، ایک مالی اور ایک کک! غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انہی پوری طرح مسلح ہونا چاہئے۔''

''جی ہاں، میں سمجھ گیا۔'' عثمانی یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بلقیس کا میک اپ کر چکا تھا اور اب باتھ روم میں ہاتھ دھونے جا رہا تھا۔

پھر کچھ ہی دیر بعد بلقیس بھی میجر شہباز اور سیل کے دیگر ارکان کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ اس کے چہرے پر بھی میرا ہی میک اپ تھا۔ یوں گویا ایک عذرا خان، نرگس کے روپ میں عذرا انٹر پرائزز کی طرف روانہ ہوگئی اور دوسری عذرا خاں یعنی بلقیس میری کوٹھی کی جانب چل دی۔ خود میں ابھی تک آپریشن ہیڈ کوارٹر ہی میں تھی۔ میرا ارادہ اس وقت یہاں سے نکلنے کا تھا جب مجھے یہ اطلاع مل جاتی کہ شہریار، کراچی پہنچ چکا ہے اور اس کیلئے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سوا چھ بجے کے قریب مجھے یہ اطلاع مل گئی۔ اسی کے ساتھ یہ خبر بھی ملی کہ کراچی پہنچتے ہی اس نے متعدد افراد سے فون پر بات کی ہے اور کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنی کوٹھی سے نیوٹاؤن کیلئے روانہ ہوا ہے۔ سرفراز نے یہ بندوبست بھی کر لیا تھا کہ شہریار کی فون کالز بھی چیک کی جاسکیں۔ روانگی سے قبل شہریار نے ایاز سے بھی فون پر گفتگو کی تھی۔ اسی سے سرفراز کو معلوم ہوا تھا کہ شہریار ایاز سے ملنے نیوٹاؤن جا رہا ہے۔ اس فون کال سے پہلے شہریار نے جن افراد سے رابطہ قائم کیا تھا اور جو گفتگو کی تھی، اس کی رپورٹ بھی سرفراز نے آپریشن سیل کو دے دی تھی۔ اسی رپورٹ کی روشنی میں میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا تھا کہ کیوں نہ خود شہریار کو کچھ دن کیلئے آپریشن سیل کا مہمان بنا لیا جائے۔ میں اسے اپنا آلہ کار بنا کر اپنے خلاف کیے جانے والے اقدامات کو کم از کم وقتی طور پر تو روک ہی سکتی تھی۔ اسی دوران میں شہریار کے ذہن کی سکریننگ بھی کی جاسکتی تھی۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ شہریار بہرحال کسی معمولی حیثیت کا آدمی نہیں تھا۔ وہ ایاز بہرحال نہیں تھا کہ اس کی گمشدگی چھپی رہ سکتی۔ صدر مملکت کا مشیر ہونے کی وجہ سے اس کا شمار اہم شخصیات میں ہوتا تھا۔ اس کا اغوا اور گمشدگی کوئی بھی نیا ہنگامہ کھڑا کر سکتی تھی۔ یہ معاملہ اتنا سہل نہیں تھا۔ اسی لیے میں تذبذب کا شکار تھی۔ ایسے مواقع پر جب میں کسی مسئلے میں تذبذب کا شکار ہوتی تھی تو کمانڈر نواز مجھے بہتر مشورہ دیتا تھا۔ وہ اچھی سوجھ بوجھ کا

مالک تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے پہلے یہ تصدیق ضروری سمجھی کہ وہ ڈیوٹی پر آ چکا ہے یا نہیں۔ میں نے انٹر کام کا ریسیور اٹھا کر سات نمبر کا بٹن دبا دیا۔ یہ ڈیوٹی روم کا نمبر تھا۔

''یس!'' کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔

''تم نے چارج لے لیا؟''

''جی!'' اس نے جواب دیا۔ ''فرمائیے کوئی حکم؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں محض یہ تصدیق چاہتی تھی کہ تم ڈیوٹی پر آ چکے ہو۔ میں خود تمہارے پاس ڈیوٹی روم میں آ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر میں اپنے کمرے سے نکل کر ڈیوٹی روم میں پہنچ گئی۔

''کوئی خاص بات؟'' کمانڈر نواز میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ اس نے اپنی گھومنے والی کرسی کا رخ میری طرف کر لیا تھا۔

''ہاں۔'' میں کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولی اور پھر اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو میرے ذہن میں تھا۔

کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کہنے لگا۔ ''معاف کیجئے گا، میں آپ کے خیال سے متفق نہیں ہوں۔''

''اور ظاہر ہے کہ اس کے دلائل بھی ہوں گے تمہارے پاس کہ یہ قدم کیوں نہیں اٹھانا چاہئے۔'' میں بولی۔

''جی ہاں!'' اس نے کہا اور پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا جو خود میرے ذہن میں آئے تھے۔ اس کے بعد وہ بولا۔ ''قاہرہ سے واپسی کے بعد آپ کے ذہن میں جو حیرت انگیز قوتیں پیدا ہوگئی ہیں، یقیناً انہیں بروئے کار لا کر شہریار کو آلہ کار بنایا جاسکتا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس کے ذہن کو بدل دیا جائے، وہ اپنے مفادات کی خاطر ایک بڑی طاقت کے ہاتھوں میں نہ کھیلے مگر یہ بہت بڑا رسک ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ اس سلسلے میں مزید غور وفکر کر لیں اور فوری طور پر کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ دو ایک روز بعد ہی حالات نیا رخ اختیار کریں۔ فی الحال شہریار سے نمٹنے کیلئے آپ نے جو پلاننگ کی ہے، میں اس سے پوری طرح متفق ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اور میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اگر تمہارا مشورہ ہے تو ٹھیک ہے۔ میں طویل سانس لے کر بولی۔ دیکھتے ہیں کہ شہریار میں کتنا کس بل ہے۔''

''آخری اقدام کے طور پر یقیناً آپ نے جو کچھ سوچا ہے اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔'' کمانڈر نواز مزید بولا۔

''اور اس کی ابھی نوبت نہیں آئی۔'' میں نے مسکرا کر گویا اس کی بات پوری کر دی۔ بہرحال شکریہ کمانڈر تم نے میری ایک ذہنی الجھن دور کر دی۔'' یہ کہتے ہوئے مجھے اپنی ایک اور الجھن کا خیال آیا۔ یہ واقعہ گزشتہ روز کا تھا جب میں ایک پراسرار تجربے سے گزری تھی۔ ایاز کے معاملے میں الجھ کر اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ یہ ایک بوڑھے شخص ایس حامد کی گمشدگی کا چکر تھا۔ وہ بوڑھا ایک ماہ سے

غائب تھا اور اس کے بیٹے ایم سہیل حامد نے اخبار میں گمشدگی کا اشتہار بھی دیا تھا۔ میں نے بوڑھے کے بیٹے سہیل کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس ضمن میں ابھی تک مجھے کمانڈر نواز نے کوئی رپورٹ نہیں دی تھی۔ اس معاملے میں میری دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ نیم خوابی کے سے عالم میں مجھے اس بوڑھے کا چہرہ نظر آیا تھا۔ اسی کیفیت میں اس بوڑھے نے مجھ سے مدد کی درخواست کی تھی اور کہا تھا کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ اس سے پہلے مجھے ''فریادی...... فریادی'' کی صدائیں سنائی دی تھیں۔ اس پراسرار تجربے کا تفصیلی ذکر میں اس سے پہلے بھی کر چکی ہوں۔ مجھے اس وقت گزشتہ روز کا وہی واقعہ یاد آ گیا تھا۔ اسی کے پیش نظر میں نے کمانڈر نواز سے اس سلسلے میں پوچھا۔ ''کمانڈر! تم نے ایم سہیل حامد والے معاملے کے متعلق مجھے اب تک کوئی رپورٹ نہیں دی' اس سلسلے میں کیا ہوا؟ اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں؟''

کمانڈر نواز نے جواباً بتایا ابھی تک سہیل کے متعلق صرف چند باتیں معلوم ہوئی ہیں' مکمل معلومات حاصل نہیں ہو سکیں' میں نے اسی لئے آپ کو رپورٹ نہیں دی تھی۔''

''یعنی اب تک کیا معلوم ہو سکا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

وہ پی آئی ڈی سی کے محکمے میں ملازم ہے' وہاں افسر ہے' فطرتاً لالچی اور نمائش پسند آدمی ہے۔ محکمے میں بھی اس کی ریپوٹیشن اچھی نہیں ہے۔ میرے نزدیک اب تک جو اہم بات معلوم ہو سکی ہے' وہ یہ ہے کہ سہیل اس بوڑھے کا سگا بیٹا نہیں ہے ہاں یہ خبر درست ہے کہ اس بوڑھے کو ایک ماہ سے کہیں نہیں دیکھا گیا۔ سہیل کے خاندانی پس منظر کی چھان بین ابھی جاری ہے۔''

میرا ذہن ابھی تک اس ایک نکتے پر اٹکا ہوا تھا کہ سہیل اس بوڑھے کا سگا بیٹا نہیں۔ بوڑھے کا نام اشتہار کی عبارت کے مطابق ایس حامد علی تھا اور اس کے بیٹے کا پورا نام ایم سہیل حامد تھا۔ اگر وہ بوڑھے کا سگا بیٹا نہیں تھا تو پھر اس نے اپنے نام کے ساتھ حامد کیوں لگا رکھا تھا؟ گزشتہ روز ہی سہیل کی بیوی سے فون پر بات کر کے میں اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ کہیں نہ کہیں' کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ جو کچھ ظاہر کیا جا رہا ہے' حقیقتاً ویسا نہیں ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر کمانڈر نواز بول اٹھا۔ ''امید ہے کہ سہیل کے خاندانی پس منظر کے بارے میں بھی کل تک تمام معلومات حاصل ہو جائیں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا' پھر بولی۔ ''ممکن ہے آج کی رات میں اپنی کوٹھی ہی میں بسر کروں' اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں بہرحال اس سے مطلع کر دوں گی۔'' یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

اطلاعات اور میرے اندازے کے مطابق اب تک میرے حریفوں کو حرکت میں آ جانا چاہیے تھا۔ ایسی صورت میں اپنی پلاننگ کے مطابق خود مجھے باہر نکلنا تھا۔ میں دانستہ ان کی نظروں میں آنا چاہتی تھی۔ اس طرح ان کی توجہ بیک وقت تین طرف مبذول ہو جاتی اور وہ چکرا کے رہ جاتے۔ انہیں گویا ایک ہی وقت اور ایک ہی شہر میں تین تین عذرا خان نظر آتیں۔ ایک وہ جو عذرا انٹرپرائزز کے دفتر سے اٹھ کر طارق روڈ والے فلیٹ میں گئی تھی' دوسری وہ جو کوٹھی میں موجود تھی اور تیسری عذرا خان وہ جو اب نظر آتی۔ ان تینوں میں سے حقیقتاً عذرا خان کون سی تھی اور کس پر انہیں ہاتھ ڈالنا تھا' یہ فیصلہ بہرحال ان کیلئے

آسان نہ ہوتا۔ مجھے اسی لیے بہرحال آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے نکلنا تھا۔ اس کا علم کمانڈر نواز کو بھی تھا۔ میں تو اس پر راضی نہیں تھی کہ نرگس اور بلقیس کی طرح میرے لیے بھی حفاظتی انتظامات کیے جائیں مگر کمانڈر نواز نے میری پلاننگ ہی کے مطابق دلیل دے کر مجھے قائل کر دیا۔ دراصل میں اس بار اپنے دشمنوں کے ساتھ کسی قسم کی نرمی برتنا نہیں چاہتی تھی۔ میرا مقصد اب انہیں یہ باور کرانا تھا کہ عذرا خان پر ہاتھ ڈالنا ہنسی کھیل نہیں۔ میں نے اس سلسلے میں واضح احکام دے دیئے تھے کہ جو مشتبہ شخص یا افراد نرگس یا بلقیس کے اردگرد منڈلاتے نظر آئیں' انہیں ایسی سزا دی جائے کہ آئندہ وہ ایسی ہمت نہ کر سکیں۔ میں اس طرح اپنے حریفوں کے حوصلوں کو پست اور انہیں ہراساں کرنا چاہتی تھی۔ کمانڈر نواز نے میرے باب میں حفاظتی انتظامات کی بابت یہی دلیل دی تھی۔

میں رات کو تقریباً ساڑھے سات بجے کے قریب اپنی سرخ سپورٹس کار میں بیٹھ کر آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی عمارت سے نکلی۔ شہر میں بے مقصد ادھر ادھر گھومنے کی بجائے میں نے سوچا کہ کیوں نہ لارنس روڈ کا رخ کیا جائے۔ اس طرح ایک پنتھ دو کاج والی بات ہو جائے گی۔ ایم سہیل حامد وہیں رہتا تھا اور اس کا پتا میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ سہیل سے ملاقات ہونے کے بعد یہ معمہ حل کرنا میرے لیے کچھ مشکل نہ ہوتا۔ یہ خیال سیل کی عمارت سے نکلنے کے بعد ہی میرے ذہن میں آیا تھا اسی لیے کمانڈر نواز اس سے بے خبر تھا۔

لارنس روڈ آ کر مطلوبہ پتے پر پہنچنے میں مجھے تھوڑی بہت دشواری تو ہوئی مگر ناکامی نہیں ہوئی۔ میں نے اپنی سپورٹس سڑک کے ایک کنارے پارک کر دی تھی۔ قدیم وضع پر بنی ہوئی ایک تین منزلہ عمارت کی دوسری منزل پر سہیل حامد کی سکونت تھی۔ عمارت کے گراؤنڈ فلور پر دکانیں تھیں جو اس وقت تک بند ہو چکی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں دوسری منزل پر پہنچ گئی۔ پھر دائیں جانب ایک لکڑی کی تختی پر مجھے ایم سہیل حامد لکھا ہوا نظر آ گیا۔ لکڑی کی وہ تختی دروازے کے قریب دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ تختی کے قریب دروازے کی ایک جانب مجھے کال بیل نظر آ گئی اور میں نے اسی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

اندر گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی اور پھر کچھ ہی دیر بعد دس بارہ سال کا ایک لڑکا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

''سہیل صاحب ہیں بیٹے گھر میں۔'' میں نے اس بچے سے پوچھا۔

میری بات کا جواب دینے کی بجائے بچے نے سوال کیا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

''نام بھی بتا دیں گے تمہیں' پہلے یہ بتاؤ کہ سہیل صاحب گھر میں ہیں۔''

''آپ نام بتا دیں' میں دیکھتا ہوں ابو کو۔''

میں سمجھ گئی کہ بچے کو خاصا سکھایا پڑھایا ہے۔ میں نے اسی لیے یوں ہی ایک نام لے دیا' پھر بولی۔ مگر تمہارے ابو' نام سے نہیں پہچانیں گے۔ ان سے کہنا کہ میں تمہارے دادا ابو کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔''

یہ سنتے ہی بچے کے چہرے پر رونق سی آ گئی اور وہ پرجوش سے لہجے میں بولا۔ ''اچھا میں ابھی بتاتا ہوں ابو کو۔'' پھر وہ دروازہ بھیڑ کر اندر چلا گیا۔

بچے کے آخری جملے سے میں اندازہ لگا چکی تھی کہ سہیل گھر میں موجود ہے۔ ذرا سی دیر بعد دروازے کے عقب سے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ یقیناً یہ بچے کے قدموں کی آواز نہیں تھی۔ پھر دروازہ کھلا اور مجھے کرتے پاجامے میں ملبوس ایک شخص نظر آیا۔ چہرے ہی سے وہ خاصا چلتا پرزہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے جس انداز میں میرے سراپا کا جائزہ لیا تھا' اس سے بھی میں بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔

''جی محترمہ......؟ مجھے سہیل حامد کہتے ہیں فرمایئے؟'' وہ دروازے سے باہر آ گیا۔

''دراصل کل میں نے اخبار میں آپ کا اشتہار پڑھا تھا' اسی سلسلے میں بات کرنے آئی تھی۔'' میں نے کہا۔

وہ چونک اٹھا' پھر بولا۔ کل شاید میری غیر موجودگی میں آپ ہی نے فون کیا تھا!'' یہ کہہ کر وہ میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

''جی ہاں۔'' میں نے جواباً کہا۔ بات یہ ہے سہیل صاحب کہ لوگ ایسے معاملات میں انعام کا اعلان تو کر دیتے ہیں مگر بعد میں اپنی بات سے پلٹ جاتے ہیں۔''

یہ تصدیق ہوتے ہی کہ وہی سہیل حامد ہے' میری توجہ اس کے ذہن پر مرکوز ہو گئی تھی اور میں اس کا ذہن پڑھ رہی تھی' اس سے گفتگو تو محض ایک بہانہ تھی۔ میری بات سن کر اس کے چہرے پر الجھن کے سے آثار نمودار ہونے لگے' پھر اس نے کہا۔ ''میں بات سمجھا نہیں۔''

میرا خیال ہے سہیل صاحب' یہاں دروازے پر کھڑے کھڑے بات کرنے سے بہتر ہے کہ ہم کہیں بیٹھ کر سکون سے بات کریں۔''

''جی......جی ہاں۔'' وہ بولا۔ ''ٹھہریئے میں...... میں ابھی......! وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر دوبارہ اندر چلا گیا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد واپس آ کر بولا۔ ''آیئے...... اندر آ جایئے۔''

میں اس کی رہنمائی میں اندر ایک کمرے میں آ گئی جو غالباً نشست گاہ کے طور پر ہی استعمال ہوتا تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھ سے کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی دوسری کرسی سنبھال لی جس کے قریب چھوٹی سی تپائی پر سگریٹ ماچس اور ایش ٹرے رکھی تھی۔ اس نے پہلے ایک سگریٹ سلگائی پھر گہرا کش لیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہونے والا تھا کہ وہی بچہ کمرے میں آ گیا جس نے دروازہ کھول کر مجھ سے بات کی تھی۔

''تم جاؤ بیٹے...... ہم بات کر رہے ہیں' شاباش۔'' اس نے بچے سے کہا۔ بچہ مجھ پر نظر ڈالتا ہوا کمرے سے نکل گیا تو وہ پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ''جی اب بتایئے' کیا کہہ رہی تھیں آپ؟'' اس کے لہجے میں اضطراب جھلک رہا تھا اور مجھے اس کی وجہ معلوم ہو چکی تھی۔

''میں انعامی رقم کے بارے میں کہہ رہی تھی۔'' میں بول اٹھی۔ ''آپ نے تین ہزار روپے کا اعلان کیا ہے۔ یہ کہ اگر کوئی آپ کے والد صاحب کے بارے میں درست اطلاع دے سکے تو آپ اسے تین ہزار روپے بہ طور انعام دیں گے۔''

''ہاں ہاں تو پھر؟'' وہ کچھ جھنجلانے لگا۔ ''کیا آپ کو یقین نہیں اس پر؟''

''دیکھئے سہیل صاحب' برا نہ مانئے گا' میں ذرا منہ پھٹ قسم کی لڑکی ہوں۔ مجھے واقعی اس پر

یقین نہیں آیا تھا۔''

''اگر آپ کو یقین نہیں تھا تو پھر یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا! میں آپ کو بتاؤں کہ خود میں بھی ذرا صاف گو واقع ہوا ہوں۔ آپ مجھے منہ پھٹ ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ مینٹل کیس بھی لگتی ہیں۔''

''جی......! کیا کہا آپ نے؟'' میں نے دانستہ اس طرح کہا جیسے مجھے اس کی بات ناگوار گزری ہے۔

''معاف کیجئے گا' میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ آپ کیوں مجھ سے ملنے آئی ہیں۔''

''میں بتا تو چکی ہوں آپ کو۔''

''کیا بتایا ہے آپ نے۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''آپ تو بس انعامی رقم کی بات کیے جا رہی ہیں۔''

''جی نہیں!'' میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''مجھے آپ کے گمشدہ والد صاحب کے بارے میں سو فیصد علم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟''

وہ ہنسنے لگا' پھر بولا۔ ''محترمہ! آپ خواہ مخواہ اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں۔''

''آپ عجیب آدمی ہیں سہیل صاحب!'' میں ناگواری سے بولی' پھر کہا۔ ''آپ شاید مجھے کوئی لالچی قسم کی لڑکی سمجھ رہے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ انعامی رقم کی بات تو میں نے یوں ہی کی تھی' مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ میں تو آپ کی مدد کرنے آئی تھی۔ اگر آپ کو میری مدد درکار نہیں تو نہ سہی۔''

''ویسے سچ پوچھیں تو حقیقت یہی ہے۔ مجھے یقین ہے محترمہ کہ آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ''ایک بات اور یاد رکھئے گا کہ میں ان بیوقوف لوگوں میں سے نہیں جن کی جیب آسانی سے خالی کرائی جا سکے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز میں چبھن تھی۔

مجھے کسی ایسے ہی موقع کی تلاش تھی۔ میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ آپ میری توہین کر رہے ہیں سہیل صاحب! اب میں یہاں ایک لمحے نہیں بیٹھ سکتی۔''

''تشریف لے جا سکتی ہیں۔'' وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

پھر میں وہاں نہیں رکی اور اس کے گھر سے نکل آئی۔ اس نے کچھ بڑبڑاتے ہوئے گھر کا دروازہ بڑی زور سے بند کیا تھا۔ میں صرف یہی سن سکی تھی۔ ''مینٹل کیس!''۔

میرا یہاں آنا رایگاں نہیں ہوا تھا۔ مجھے جو کچھ معلوم کرنا تھا' اس کا ذہن پڑھ کے معلوم کر چکی تھی۔ میں بروقت سہیل حامد تک پہنچ گئی تھی ورنہ خدا جانے اس فریادی بوڑھے پر کیا گزرتی! شاید یہ اُس کی زندگی کی آخری رات ہی ثابت ہوتی اور اسے واقعی قتل کر دیا جاتا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ معاملہ مجھے بہرحال آج ہی نمٹانا ہے۔

نیچے آ کر اپنی سپورٹس کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اردگرد کوئی مشتبہ

شخص نہیں تھا' ہاں سیل کے وہ ارکان مجھے ضرور مستعد و چوکنا نظر آ رہے تھے جو کچھ فاصلے پر ایک جیپ میں بیٹھے تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ سڑک کے کنارے جیپ روک کر کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ پھر جیسے ہی میری سپورٹس آگے بڑھی جیپ بھی حرکت میں آ گئی۔

لارنس روڈ کے بعد اب میری منزل رام سوامی تھی جہاں پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ رنچھوڑ لائن کے چوراہے سے آگے نکل کر میں نے بائیں جانب ایک پختہ گلی میں کار موڑ لی تھی۔ مجھے جہاں پہنچنا تھا' وہاں تک کار لے جانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسی لیے ڈبل روٹی اور سوئٹس بنانے والی ایک مشہور فیکٹری کے سامنے سے گزر کر کچھ فاصلے پر بائیں جانب کار کھڑی کر دی اور اس کا دروازہ مقفل کر کے پیدل ہی گلیوں کے ایک چوراہے کی طرف بڑھ گئی۔ چوراہے سے گزر کر میں سیدھی چلتی ہوئی دائیں طرف ایک پتلی سی گلی میں گھس گئی۔ پھر مطلوبہ مکان کے دروازے پر رک کر میں نے دستک دی۔

''کون ہے؟'' اندر سے ایک نحیف سی نسوانی آواز آئی۔ میں نے کچھ کہنے کی بجائے دوبارہ دروازے پر دستک دی۔

''عالم...... اے عالم! دیکھ وہی تیرا دوست ہوگا سہیل۔'' وہی نسوانی آواز پھر سنائی دی۔

''اچھا ماں...... دیکھتا ہوں ابھی!'' ایک اور آواز ابھری۔ یہ مردانہ آواز تھی۔

کچھ ہی دیر میں سانولے رنگ کا ایک پتلا دبلا سا نوجوان باہر آ گیا اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''تمہارا ہی نام عالم ہے نا؟'' میں اس سے مخاطب ہوئی۔

''جی...... جی! کیا بات ہے؟'' وہ بولا۔ اس کے لہجے سے حیرت اور قدرے خوف زدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''عالم! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے جو ظاہر ہے کہ یہاں نہیں ہو سکتی۔ تمہارے ہی فائدے کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''مگر آپ...... آپ کو...... آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟''

میں اس کے قریب ہو گئی اور پھر سرگوشی کی۔ ''سہیل نے بھیجا ہے مجھے وہ آج خود نہیں آ سکتا۔ معلوم نہیں کیسے پولیس لگ گئی ہے اس کے پیچھے۔''

''کیا؟'' اس نوجوان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''میرے ساتھ چلو میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔'' میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

وہ فوراً میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا اور پھر وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے زور سے بولا۔ ''اماں! میں ابھی آ رہا ہوں' کنڈی لگا لو۔''

عالم کو میں اپنے ساتھ لیے اس گلی سے نکل آئی اور پھر مجھے اپنی سپورٹس تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ عالم کبھی حیرت سے مجھے اور کبھی میری سپورٹس کو دیکھ رہا تھا۔ جب میں سپورٹس کا دروازہ کھول کر اس سے بیٹھنے کو کہا تو وہ ہکلانے لگا۔ ''میں...... بیٹھ...... بیٹھ جاؤں اس میں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں! بیٹھ جاؤ!'' میں بول اٹھی۔

وہ ڈرتا جھجکتا سپورٹس میں بیٹھ گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے کار سٹارٹ کر دی۔ عالم خاصا ں دکھائی دے رہا تھا۔ میں کچھ ہی دیر میں مین روڈ پر آ گئی اور گارڈن کی طرف چل دی۔

''عالم!'' معاً میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھا۔ ''مجھے تم اپنا ہمدرد سمجھ سکتے ہو۔ تم ایک یب نوجوان ہو اس لیے مجھے ترس آ گیا ورنہ اس وقت تم میری کار کی بجائے حوالات میں ہوتے۔''

''حوا...... حوالات!'' وہ گھبرا کر میری طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں حوالات میں۔'' میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''میرا تعلق سی آئی ڈی سے ہے۔ سمجھتے ہو نا سی آئی ڈی؟''

''ہاں...... ہاں خفیہ...... خفیہ پولیس۔'' وہ اور بھی گھبرا گیا۔

''گھبراؤ مت!'' میں نے اسے تسلی دی۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں' مجھے تم پر ترس آ گیا ہے' محض تمہاری غربت کی وجہ سے۔ اس لیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔''

''م...... مگر آپ...... آپ تو کہہ رہی تھیں کہ...... کہ آپ کو سہیل صاحب نے بھیجا ہے؟'' اس نے شاید ہمت کر کے یہ بات کہہ ہی دی۔

''اگر میں یہ نہ کہتی تو تم میرے ساتھ نہ آتے۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''خیر میں تمہیں یہ بتانے اپنے ساتھ لائی ہوں کہ ناحق تم نے اپنی گردن اس معاملے میں پھنسا لی ہے۔ صرف چند ہزار روپوں کی خاطر جانتے ہو تم کہ سہیل کو تو کبھی قید ہو گی ہی' تم بھی جیل چلے جاؤ گے۔ سہیل کے دفتر میں تم دفتری ہو نا؟''

''جی...... جی...... جی ہاں۔'' وہ مردہ سی آواز میں رک رک کر بولا۔ ''مگر آپ...... آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟''

''سی آئی ڈی والے سب معلوم کر لیتے ہیں۔'' میں آہستہ سے ہنس کر بولی۔ ''تم ان چکروں میں نہ پڑو کہ مجھے کون سی بات کیسے معلوم ہوئی۔'' پھر میں سنجیدہ ہو گئی۔ ''سنو عالم! یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ اگر تم لمبی قید سے بچنا چاہتے ہو تو میں جو کہوں اس پر عمل کرو' لیکن میرا ذکر درمیان میں نہیں آنا چاہیے ورنہ تمہارے لیے مشکل پیدا ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو پھر میں خود تمہیں گرفتار کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ سہیل اپنے باپ کو قتل کر دینا چاہتا ہے اور پھانسی کے پھندے کیلئے اس نے پہلے ہی سے تمہاری گردن ڈھونڈ لی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کا سانولا رنگ خوف کی وجہ سے سیاہی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ میں پھر بولی۔ ''بولو کیا کہتے ہو؟ مانو گے مشورہ؟''

اس نے پہلے اثبات میں سر ہلایا' پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنے لگا۔ ''یقین کریں کہ...... کہ مجھے یہ...... یہ معلوم نہیں تھا...... سہیل...... سہیل صاحب میرے ساتھ ایسا کرنے والے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ جائیداد اپنے نام لکھوانے کے بعد وہ...... وہ بڑے میاں کو میرے گھر سے لے جائیں گے۔ اگر...... اگر وہ...... وہ قتل کرنا چاہتے ہیں تو...... تو پھر...... پھر آپ ہی بتائیے کہ میں...... میں کیا کروں؟...... یقین مانیں آپ...... آپ جو کہیں گی میں وہی...... وہی کروں گا...... اور آپ...... آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔'' اس کی آواز بھرانے لگی۔

”تمہیں واپس گھر جاتے ہی سہیل کے والد کو لے کر پولیس تھانے جانا ہے......“

”پولیس تھانے!“ اس نے درمیان میں میری بات کاٹ دی۔

”ہاں تھانے جانا ہے تمہیں!“ میں دوبارہ بولی۔ ”تم میری پوری بات سن لو پہلے اب درمیان میں نہ بولنا۔ تھانے جا کر تمہیں بالکل صحیح صحیح بیان دینا ہے۔ تم اپنے بیان میں یہی کہو گے کہ سہیل کے والد کی حالت دیکھ کر تمہارا ضمیر تم پر ملامت کرنے لگا تھا۔ اور تمہیں یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ سہیل اپنے باپ کو قتل نہ کر دے۔ تم اسی لیے اس کے باپ کو لے کر تھانے آ گئے۔ ممکن ہے ایسی صورت میں پولیس تمہیں تھوڑی بہت سزا دے کر چھوڑ دے یا پھر عدالت سے تمہیں کم سزا ہو' مگر یہ سزا بہر حال پھانسی کے پھندے سے کم ہو گی۔“ میں اسے سمجھاتی رہی۔

پہلے تو وہ ڈرنے لگا کہ پولیس اسے بند کر دے گی مگر میرے مزید سمجھانے بجھانے کے بعد اس نے تھانے جانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

میری کار اس وقت تین ہٹی سے گزر کر جہانگیر روڈ کی طرف مڑ رہی تھی۔ اب مجھے پھر رام سوامی واپس جانا تھا۔ میں نے ٹریفک پر نظر رکھتے ہوئے ذرا آگے جا کر یوٹرن لیا اور پھر تین ہٹی سے دوبارہ لسبیلہ کی طرف چل دی۔ میں نے اس دوران میں عالم کا ذہن بھی پڑھ لیا تھا۔ وہ واقعی دل سے میری بات مان گیا تھا۔ اس کے باوجود میں اس وقت تک عالم کا پیچھا کرنا چاہتی تھی جب تک کہ وہ سہیل کے باپ ایس حامد علی کو لے کر تھانے نہ چلا جاتا۔ میں نے یہ بات اس سے چھپانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے علاوہ میں کم از کم ایک نظر اس فریادی کو بھی دیکھنا چاہتی تھی جس کے سبب مجھے ایک نیا اور پراسرار تجربہ ہوا تھا۔

رام سوامی پہنچ کر دوبارہ بھی میں نے وہیں کار کھڑی کی جہاں پہلے کھڑی کی تھی۔ عالم کار سے اتر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے بہت عجلت ہو۔ سہیل جب بھی یہاں آتا تھا' نصف شب کے قریب آتا تھا اس لیے میں اس کی طرف سے مطمئن تھی۔ ابھی تو نو بھی نہیں بجے تھے۔ میری نگاہ اسی گلی کی طرف لگی ہوئی تھی جہاں جا کر عالم میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کی واپسی کا مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ توقع کے مطابق وہ تنہا نہیں تھا۔ میں نے دور ہی سے اس کے ساتھ ایک بوڑھے شخص کو آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بوڑھے کو سہارا دیئے چل رہا تھا۔ اس بوڑھے نے مضبوطی سے عالم کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں کچھ اور قریب آ گئے تو میری نگاہیں' بوڑھے کے چہرے پر جم گئیں۔ سو فیصد یہ وہی چہرہ تھا' وہی جھریوں بھرا فریادی چہرہ جس نے مجھ سے فریاد کی تھی' جسے میں نے گزشتہ روز پہلی بار اپنے صفحہ ذہن پر منعکس دیکھا تھا۔ اب بھی وہ چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔

اس بوڑھے کو سنبھالے ہوئے عالم میری کار کے قریب سے گزر گیا تو میں نے کار سٹارٹ کی اور اسے موڑنے لگی۔ پھر میں نے اپنی کار تھانے کے گیٹ سے کچھ پہلے ہی روک لی تھی۔ عالم کو میں راستے ہی میں چھوڑ آئی تھی۔ میں براہ راست اس معاملے میں ملوث ہوئے بغیر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میں نے اس فریادی بوڑھے کی جان بچا لی تھی۔ جسے شاید آج رات قتل کر دیا جاتا۔ اسی کے ساتھ سہیل کو بھی بوڑھے کے بیان کی روشنی میں گرفتار کر لیا جاتا۔ اس پر حبس بیجا میں رکھنے اور قتل عمد کا کیس بنتا۔

سہیل کا ذہن پڑھ کر مجھے تمام حالات کا علم ہو گیا تھا۔ وہ اس بوڑھے کا سوتیلا بیٹا تھا۔ بوڑھے نے اپنی پہلی بیوی کی موت کے بعد ایک ایسی بیوہ عورت سے شادی کر لی تھی جو پہلے ہی ایک بچے کی ماں تھی۔ سہیل اس وقت صرف دو سال کا تھا۔ بوڑھے کی پہلی بیوی سے اس کے دو بچے تھے' ایک لڑکا' ایک لڑکی۔ لڑکی اب اپنے گھر کی ہو چکی تھی اور لڑکا الگ رہتا تھا۔ بوڑھے کی سکونت اپنے سوتیلے بیٹے سہیل کے ساتھ تھی۔ تین سال پہلے سہیل کی ماں بھی چل بسی تھی۔ بوڑھا خاصی بڑی جائیداد کا مالک تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے سگے بیٹے بیٹی کو بھی اپنی زندگی ہی میں جائیداد کا کچھ حصہ دے دے۔ سہیل کو بھی بوڑھے نے اپنی اولاد ہی کی طرح پالا تھا۔ اسی سبب خود سہیل بھی اپنے نام کے ساتھ بوڑھے ہی کا نام لکھتا تھا' لیکن جب اسے بوڑھے کے ارادے کا علم ہوا تو وہ برہم ہو گیا۔ وہ مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ اس نے پہلے بوڑھے کو خوشامد درآمد سے منانے کی کوشش کی۔ بوڑھا جب اپنی ساری جائیداد صرف اس کے نام کرنے پر راضی نہ ہوا تو وہ اپنی اصلیت پر آ گیا۔ وہ ایک روز کسی بہانے سے بوڑھے کو عالم کے گھر لے گیا اور وہاں اسے گھر کے اندرونی کمرے میں قید کر دیا۔ عالم کو وہ پہلے ہی سانٹ چکا تھا۔ عالم کی ماں اندھی تھی اور فالج کی وجہ سے بمشکل چلتی پھرتی تھی۔ اس کا ذہنی توازن بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ عالم کے گھر میں ماں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس لیے بات چھپی رہی۔ بوڑھے کے منہ میں کپڑا ٹھنسا رہتا تھا۔ اس لیے وہ چیخ چلا کر بھی کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تالا اسی وقت کھلتا تھا جب عالم اس بوڑھے کو کچھ کھانے پینے کیلئے دیتا تھا یا پھر جب سہیل وہاں آتا تھا۔ سہیل کے زدوکوب کرنے کے باوجود بوڑھا اب تک اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا بلکہ اس نے تو سہیل سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ قید سے رہا ہوتے ہی سیدھا تھانے جائے گا اور سہیل کے خلاف رپورٹ لکھوا دے گا۔ گزشتہ ڈیڑھ مہینے سے یہی چکر چل رہا تھا۔ بوڑھا سہیل کیلئے سانپ کے منہ میں چھچھوندر کے مانند ہو گیا تھا' نہ اگلنے کا نہ نگلنے کا۔ بوڑھے کو رہا کرنے کی صورت میں سہیل کو جیل کی ہوا کھانا پڑتی۔ اس نے اسی لیے اب یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر بوڑھا اب بھی اپنی ساری جائیداد اس کے نام کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ سہیل نے اپنی بیوی کو بس اتنا بتایا تھا کہ اس نے بوڑھے کو اپنے ایک دوست کے گھر رکھا ہوا ہے۔ سہیل کی بیوی یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے شوہر کا مقصد کیا ہے۔ قتل کے الزام سے بچنے ہی کے لیے سہیل نے اخبار میں وہ گمشدگی کا اشتہار دیا تھا تا کہ اس پر کسی کو شبہ نہ ہو۔

اب یہ بات واضح طور پر میرے سامنے آ چکی تھی کہ اس بوڑھے یا ان واقعات سے براہ راست میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں ان حالات کے پیش نظر اسی نتیجے پر پہنچ سکی کہ قدرت نے مجھے جو حیرت انگیز صلاحیتیں بخشی ہیں اس طرح وہ ان سے کام لینا چاہتی ہے۔ میرے ذریعے گویا قدرت نے اس بوڑھے کو قتل ہونے سے بچا لیا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو میرے لیے باعث توقیر بات تھی۔ عالم اور اس بوڑھے کی آمد تک میں اسی نکتے پر غور کرتی رہی پھر جب وہ دونوں تھانے کے گیٹ سے اندر چلے گئے تو میں نے کار کا انجن سٹارٹ کر دیا۔ گزشتہ روز سے میں جس ذہنی الجھن کا شکار تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔

آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی عمارت سے نکلنے کے بعد اب تک میں اپنے دشمنوں کی طرف سے غافل نہیں رہی تھی' لیکن اب تک ان کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ میرے خیال میں یہ ناممکن سی بات تھی کہ شہریار کراچی پہنچنے کے بعد خاموش بیٹھ جاتا اور حقیقتاً ایسا تھا بھی نہیں۔ میری اطلاعات

کے مطابق اس نے آتے ہی فون پر اپنے گرگوں کو احکام جاری کر دیئے تھے اور ان احکام کا تعلق مجھی سے تھا۔ پھر کیا سبب تھا کہ اب تک خاموشی تھی؟ میں اسی پر غور کرتی ہوئی کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہو سکتی تھی کہ اس کے گرگے تذبذب کا شکار ہو گئے ہوں اور میری چال کامیاب رہی ہو یعنی یہ کہ وہ کس پر ہاتھ ڈالیں؟ یا پھر وہ نرگس اور بلقیس' دونوں میں سے کسی ایک کے گرد اپنا جال پھیلا رہے تھے۔

میری سپورٹس میں کم طاقت کا ایک ٹرانسمیٹر موجود تھا۔ میں اس کے ذریعے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے رپورٹ لے سکتی تھی۔ مجھے وہاں سے چلے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اس دوران میں نرگس یا بلقیس کو کوئی واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے ٹرانسمیٹر پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر لیا۔

"ہیلو...... ہیلو...... عذرا خان آن دی لائن اوور۔" میں نے کہا۔

"یس کمانڈر نواز سپیکنگ اوور۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"رپورٹ پلیز! اوور۔"

"کچھ مشتبہ افراد کو طارق روڈ والے فلیٹ کے اطراف دیکھا گیا تھا۔ پلاننگ کے مطابق ان میں سے دو کو بری طرح زدوکوب کر کے وہاں سے کافی دور نیم بیہوشی کی حالت میں کچرے کے ایک ڈھیر پر پھینک دیا گیا۔ تیسرا شخص زخمی ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ابھی تقریباً پندرہ بیس منٹ قبل کیپٹن شاد نے مجھے یہ رپورٹ دی ہے۔ آپ کو تو کوئی واقعہ پیش نہیں آیا؟ اوور۔"

"نہیں اور سنو! تمہارا جو آدمی سہیل کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے میں مصروف تھا' اسے اب تم کہیں بھی کسی اور ڈیوٹی پر لگا سکتے۔ وہ معاملہ اب ختم ہو چکا ہے۔ ہاں...... میجر شہباز کی طرف سے کوئی رپورٹ ملی؟ اوور۔" میں نے پوچھا۔ میجر شہباز کے گروپ کی ڈیوٹی میری کوٹھی پر تھی۔

"جی ہاں اس نے بھی رپورٹ دی ہے مگر وہاں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اوور۔" کمانڈر نواز نے بتایا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی صرف نرگس ان کی نظر میں آ سکی ہے۔ کیپٹن شاد کو پوری طرح چوکنا رہنے کی تاکید کر دو۔ ممکن ہے رات کو کسی وقت وہ لوگ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کریں اور کوئی خاص بات؟ اوور۔"

"جی نہیں۔" کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ پھر پوچھنے لگا۔ "آپ کا کیا ارادہ ہے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر واپس آئیں گی یا اپنی کوٹھی میں رات گزاریں گی؟ اوور۔"

"ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ فی الحال تو کچھ دیر سڑکیں ناپنے کا ارادہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کسی طرح اپنے دشمنوں کی نظر میں آ جاؤں۔ بہرحال تمہیں مطلع کر دوں گی اوور اینڈ آل۔" یہ کہہ کر میں نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔

اس وقت میری کار بند روڈ پر پلازہ سینما کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ میں رام سوامی سے رنچھوڑ لائن ہو کر بند روڈ پر نکل آئی تھی۔ کچھ دیر میرا ارادہ یونہی بے مقصد گھومنے کا تھا۔ میں اسی لیے وکٹوریہ روڈ پر مڑ کر صدر کی طرف ہو لی۔ صدر میں کچھ دیر گھوم کر میں پھر بند روڈ پر آ گئی۔ پھر جب میری

کار پرانی نمائش سے کچھ آگے بڑھی تو ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔

میں نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آن کر کے پیغام وصول کیا۔ یہ پیغام اس جیپ سے دیا گیا تھا جو میرے پیچھے آ رہی تھی اور جس میں سیل کے ارکان سوار تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کچھ دیر سے ہم ایک فوکس ویگن کو آپ کی کار کے تعاقب میں محسوس کر رہے ہیں فوکس ویگن میں دو نوجوان سوار ہیں۔

میں چوکنا ہو گئی' گویا میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے عقبی آئینے میں اس فوکس ویگن کو دیکھا جو خاصی دور تھی۔ یہ تصدیق بہرحال ضروری تھی کہ واقعی وہ فوکسی میرے ہی تعاقب میں ہے یا سیل کے ارکان کو محض گمان ہوا ہے۔ پھر کچھ ہی دیر میں اپنی کار کی سپیڈ کم اور زیادہ کرنے کے بعد اور اسے بے مقصد ادھر ادھر مختلف راستوں پر دوڑانے سے یہ تصدیق بھی ہو گئی۔

سیل کے ارکان کی جیپ سے ٹرانسمیٹر پر میرا رابطہ برقرار تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں گرو مندر سے سوسائٹی کی طرف جاؤں گی۔ اس طرف کچھ ایسا علاقہ ہے جہاں رات کے وقت ٹریفک نسبتاً کم ہوتا ہے' وہاں فوکسی کو گھیر لیا جائے۔ یہ حکم دینے کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک نظر اپنے شکار کو دیکھ بھی لیا جائے۔ تاکہ پھر کبھی سامنا ہونے پر میں غافل نہ رہوں۔ اسی خیال سے قائداعظم کے مزار کو ذرا پیچھے چھوڑ کر میں نے ایک دم کار کو بریک لگا دیئے اور سڑک کے ایک کنارے ہو گئی۔ پہلے میری کار کی رفتار خاصی تیز تھی جسے میں نے دانستہ کم کر کے اچانک ہی بریک لگا دیئے تھے۔ فوکسی تیز رفتاری سے آ رہی تھی۔ اس میں سوار نوجوانوں کو یقیناً یہ توقع نہیں ہو گی کہ میں خوامخواہ سڑک کے کنارے ایک دم رک جاؤں گی۔ اسی سبب سپیڈ کم کرتے کرتے بھی وہ میرے اتنے قریب آ گئے کہ میں نے واضح طور پر دیکھ لیا اور تقریباً اچھل پڑی۔ وہ دونوں میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ میں انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں ٹرانسمیٹر پر سیل کے ارکان سے رابطہ قائم کر کے انہیں کوئی نیا حکم دیتی۔ معاً زبردست دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ فائر کا نہیں بلکہ فوکسی کے ٹائر برسٹ ہونے کا تھا کیوں کہ سیل کے ارکان نے سائلنسر لگے ہوئے ریوالوروں سے فائر کیے تھے۔ چند ہی لمحوں میں فوکسی پر یکے بعد دیگرے اتنے فائر ہوئے کہ اس کا حلیہ بگڑ گیا۔ یہ سارا تماشا مجھ سے صرف کچھ فاصلے پر ہو رہا تھا۔ میرے آدمیوں نے گویا اس فوکسی کا شکار کر لیا تھا۔ اپنے دشمنوں کے سلسلے میں بھی میرے واضح احکام تھے' اس حد تک نہیں جانا کہ کوئی قتل ہو جائے۔ کسی بھی حالت میں قانون شکنی مجھے پسند نہیں تھی۔ اس وقت بھی سیل کے ارکان نے یہ خیال رکھا تھا ورنہ ان دونوں نوجوانوں کی زندگی کے چراغ گل کر دینا ان کے لیے بہت آسان تھا۔

وہ سب کچھ بس دیکھتے دیکھتے چند ہی لمحوں میں ہو گیا تھا اور میں کچھ بھی نہ کر سکی تھی۔ سیل کے ارکان نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا تھا کیوں کہ اس وقت اس سڑک پر اور کوئی کار یا سواری نہیں تھی۔ اب انہوں نے ٹرانسمیٹر پر مجھے نکل چلنے کا سگنل دے دیا تھا۔

میں نے تیزی سے کار سٹارٹ کی اور اسے سوسائٹی کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑانے لگی۔ اس وقت مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور ذہن پر جھنجلاہٹ بھی سوار تھی۔ جو کچھ بھی ہوا تھا' نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اس میں سیل کے ارکان کی کوئی غلطی نہیں تھی' نہ ہی میرا کوئی قصور تھا۔ حماقت ایک ایسے شخص کی تھی جسے علم

ہی نہیں تھا کہ میں کن حالات سے گزر رہی ہوں۔

اس وقت رات کے تقریباً پونے دس بج رہے تھے جب میں نے ملک دلاور کی کوٹھی کے گیٹ پر اپنی کار روکی اور ہارن دیا۔ میرے پیچھے آنے والی جیپ پہلے ہی کافی فاصلے پر رک گئی تھی۔

ملک دلاور گھر ہی پر تھا۔ میری غیر متوقع آمد پر وہ کھل اٹھا' مگر شاید میری تیوریوں پر پڑے ہوئے بل دیکھ کر وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا تھا۔ پھر وہ بھی فوراً ہی آ گیا تھا۔

''تم اپنی حماقتوں سے باز نہیں آؤ گے۔'' ملک دلاور جیسے ہی میرے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھا میں بول اٹھی۔

''ذرا چھری کے نیچے دم تو لیں' آپ نے تو آتے ہی نیغن بان چلانا شروع کر دیئے۔'' اس نے اپنی روایتی شوخی برقرارر کھتے ہوئے کہا۔ ''آخر ہوا کیا؟ اگر کسی نے آپ کی طرف آنکھ اٹھائی ہو تو آنکھ نکلوا دوں' اگر کسی نے......''

''بکواس نہ کرو زیادہ۔'' میرا موڈ بگڑا ہوا تھا۔

''اچھا نہیں کرتا بکواس...... اب خوش! مگر پتا تو چلے سرکار کہ اتنا غصہ کس بات پر ہے؟''

''سب معلوم ہے تمہیں!'' میں ناگواری سے بولی۔ ''کتنی دفعہ منع کیا ہے تمہیں کہ اپنے احمق پنچھیوں کو میرے پیچھے نہ لگایا کرو' کسی دن پچھتانا پڑے گا تمہیں مگر تم ایک ڈھیٹ ہو کہ کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تم پر۔ آخر تمہیں تکلیف کیا ہے' میری ٹوہ میں رہنے کی۔''

''کس نے کہہ دیا آپ سے! خواہ مخواہ الزام لگا رہی ہیں مجھ پر۔'' وہ صاف مکر گیا۔

''ٹھیک ہے' خود بھگتنا اب......! تم آخر خود کو اتنا عقل مند کیوں سمجھتے ہو کہ مجھے کچھ خبر ہی نہیں ہو گی۔ اتنے تو احمق ہیں تمہارے آدمی کہ کار کے اندر لائٹ جلا کر تعاقب فرماتے ہیں کہ انہیں فوراً پہچان لیا جائے۔ آج بس بال بال بچ گئے ورنہ دونوں مارے جاتے۔ کیا خبر زخمی ہو گئے ہوں۔ ہاں فوکسی کا تو کباڑا ہو ہی گیا۔ میں نے اسے بھی پہچان لیا تھا۔ وہ واکس ویگن تمہاری ہی تھی ہلکی سلیٹی!''

''کیا...... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ کار کو پہچاننے کے باوجود آپ نے......''

''تو آخر قبول کر ہی گئے نا تم!'' میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ پھر کہا۔ ''جب تک میں اپنے آدمیوں کو روکتی' وہ تمہاری فوکسی کو اڑا چکے تھے۔''

''بہت خو...... ب!'' اس نے لفظ خوب کو کھینچتے ہوئے کہا۔ ''یہ اب آپ کے بھی آدمی ہونے لگے۔''

''کیوں' کیا ایک تمہی طرم خاں ہو!'' میں اسے گھور کر بولی۔

''ہم کہاں کچھ ہیں میری سرکار' سبھی کچھ آپ ہی ہیں۔ بہرحال فوکسی کا بل بھجوا دوں گا آپ کو یہ کوئی چنگی گل نہیں کہ اپنے پرائے سب پر آپ ہاتھ صاف کرنے لگیں۔'' وہ ٹھنڈا سانس بھر کر بولا اور چہرے پر مظلومیت طاری کر لی۔

''سنو ملک دلاور' آج کل حالات بہت سنگین ہیں۔'' میں سنجیدہ ہو گئی۔

''پہلے بھی کب حالات رنگین تھے' ہمیشہ ہی سے سنگین ہی چلے آ رہے ہیں۔ اپنے تو نصیب ہی

لکھنے والے نے......''

''تم کبھی سنجیدہ نہیں ہو سکتے۔'' میں اس کی بات کاٹ کر خفگی سے بولی۔

''ہو سکتا ہوں' کیوں نہیں ہو سکتا۔'' اچھے اچھوں کو اس عورت ذات نے سنجیدہ...... بلکہ رنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ گل دسو مینوں!''

''تم گل گل میں اڑنا چھوڑو' جب تو کچھ کہوں۔ آج تم پر نہ جانے یہ پنجابی بولنے کا دورہ کیوں ہو گیا ہے؟''

''اس لیے بادشاہو کہ اسی پنجاب دے پتر آں۔ اے ساڈی مادری زبان اے۔'' اس نے پنجابی فلموں کے کسی ہیرو کی طرح سینہ پھلا کر گویا مکالمہ بولا۔

میں اس کی حرکتوں کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس کا مقصد محض موڈ ٹھیک کرنا تھا۔ اس کی دل جوئی کی خاطر آخر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ ہی گئی۔

''یہ ہوئی نا بات!'' وہ چہک اٹھا۔ ''اب آپ لگیں نا مونا لیزا! سنا ہے کہ وہ بھی اسی طرح مسکراتی تھی۔''

''ادھر ادھر کی نہ ہانکو اور میری بات توجہ سے سنو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ وہ مجھ سے دور رہیں ورنہ انہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''چلیں وہ تو کہہ دوں گا میں' مگر یہ آج کل چکر کیا چلا رہی ہیں آپ۔ گھڑی میں دفتر میں ہیں آپ اور گھڑی میں اپنی کوٹھی کے اندر...... ارے ہاں میں آپ کو مبارک باد دینا تو بھول ہی گیا...... مبارک......''

اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی جو وہاں کچھ فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ دلاور کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ وہ فون ریسیور کرنے اٹھ گیا۔

''ہیلو...... ہاں...... ہاں ہاں...... کیا؟...... غلط کہہ رہے ہو تم! وہ تو اس وقت میرے پاس بیٹھی ہیں۔'' میرے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے اور میں پوری توجہ سے دلاور کی بات سن رہی تھی۔ یقیناً اس کا کوئی آدمی میرے ہی متعلق اسے رپورٹ دے رہا تھا۔ دلاور نے بھی غالباً محسوس کر لیا کہ میں اس کی بات سن رہی ہوں۔ اسی لیے اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

اپنے کسی آدمی سے فون پر بات کر کے وہ پھر میرے سامنے آ بیٹھا اور میں اسے گھورنے لگی۔

''میں نہیں مان سکتا...... بالکل نہیں۔'' وہ ایک دم ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''کیا نہیں مان سکتے؟ یہ کیا بے تکی اڑانے لگے تم؟''

''آپ کے پاس ضرور بالضرور کوئی جادو کی ٹوپی ہے جسے آپ اوڑھ لیتی ہیں تو آدمی کو ایک کے دو نظر آنے لگتے ہیں۔''

میں فون پر اس کی گفتگو کا کچھ حصہ سن ہی چکی تھی اس لیے بات کی تہ تک پہنچ گئی اور بولی۔ ''تو تمہارے کسی آدمی نے یہ خبر دی ہے کہ میں یہاں نہیں کہیں اور ہوں یہی بات ہے نا؟''

''چھوڑیں جی' ان شبروں وبروں کو۔ یہ بتائیں کچھ کھائیں گی پئیں گی؟'' وہ میری بات ٹال گیا۔

"نہیں، بس اب چلوں گی میں۔" میں نے کہا۔ "بہرحال میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے بع
میں یہ شکایت نہ کرنا کہ تمہیں اپنے آدمیوں کی ڈینٹنگ کرانی پڑی ہے۔"

"کھلے عام دھونسا رہی ہیں مجھے۔" وہ بولا۔

"کچھ بھی سمجھ لو، میں نے تو حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ بائی!" یہ کہہ کر میں کھڑی ہو گئی۔

پھر ملک دلاور بہت بک بک جھک جھک کرتا رہا مگر میں نے اسے کچھ نہیں بتایا اور اپنی کار میں بیٹھ کر اس کی کوٹھی سے نکل آئی۔ وہاں سے میں نے طارق روڈ کا رخ کیا۔ میرے ذہن میں نرگس کے تحفظ کی ایک اور صورت آ گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے دشمن اپنے چند گرگوں کی ٹھکائی کے بعد خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ اب وہ یقیناً دور رہ کر میرے فلیٹ کی نگرانی کر رہے ہوں گے اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں رہیں گے کہ نرگس پر ہاتھ ڈال سکیں۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں نے گویا اپنی حفاظت کا بندوبست کر رکھا ہے۔ فی الحال نرگس ہی ان کی نظر میں تھی۔ انہوں نے شاید میری کوٹھی کی طرف تو نہیں دی تھی۔ جہاں گویا ایک اور عذرا خان موجود تھی۔

جلد ہی میں طارق روڈ پہنچ گئی اور اس بلڈنگ کے نیچے اپنی کار روک دی جس میں میرا فلیٹ تھا کار سے اترنے میں میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہت اطمینان کے ساتھ میں، کار سے اتر اس کا دروازہ لاک کیا اور بے پروائی کے سے انداز میں کی رنگ گھماتی ہوئی بلڈنگ کی طرف بڑھ گئی۔

اس بلڈنگ کی پہلی ہی منزل پر میرا فلیٹ تھا۔ اوپر پہنچ کر میں نے کال بیل کے بٹن پر انگلی ر دی۔ دروازہ فوراً نہیں کھلا۔ میں سمجھ گئی کہ نرگس پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی دروازہ کھولے گی میں اسی لیے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ پھر ذرا دیر بعد ہی آہستگی سے دروازہ کھلا اور میں نے اند قدم رکھ دیا۔ اسی کے ساتھ کوئی سخت چیز میری کنپٹی پر آ لگی۔

"ہینڈز اپ!" مجھے جیسے اپنی ہی آواز سنائی دی۔

وہ نرگس ہی تھی جو میری آواز کی نقل میں بول رہی تھی۔ اس نے پیر کی ٹھوکر سے دروازہ بند دیا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ریوالور کی نال اب تک میر کنپٹی پر رکھی تھی۔

اس کی مستعدی پر مجھے خوشی ہوئی اور بیدار ذہنی پر بھی۔ دشمن کی کوئی آلہ کار بھی اس طر میرے میک اپ میں اس تک پہنچ سکتی تھی۔ نرگس نے اس اہم نکتے کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ میں نے اس داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ اس نے واقعی مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ آنے والی کوئی اور نہیں، میں ہوں تو وہ کہنے لگی۔ "سوری! دراص میں....."

"تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، غلطی میری ہی ہے کہ یہاں آنے سے پہلے تمہیں انفا نہیں کیا۔ ہاں یہ بتاؤ کہ تم نے اپنی والدہ کو تو مطلع کر دیا تھا نا کہ دو ایک دن کیلئے باہر جا رہی ہو؟" م نے پلٹ کر فلیٹ کا دروازہ مقفل کرتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں، بتا دیا تھا میں نے انہیں۔" اس نے جواب دیا۔ پھر میں اس کے ساتھ ہی نشست گاہ ہی میں بیٹھ گئی۔ وہیں ایک تپائی پر فون بھی رکھا تھا۔ میں نے اس سے فون اٹھا کر لانے کو کہا اور صوفے پر آرام سے نیم دراز ہو کر بیٹھ گئی۔

نرگس ٹیلی فون اٹھا لائی اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "چائے بناؤں آپ کیلئے یا کافی؟"

"فی الحال تو بھوک سی لگ رہی ہے کچھ۔" میں بے تکلفی سے بولی۔ "تم ایسا کرو دو انڈوں کا آملیٹ بنا لاؤ اور کچھ سلائس لے آؤ، چائے بعد میں پیوں گی۔"

نرگس اثبات میں سر ہلا کر اندر کچن میں چلی گئی۔ میں اپنی کوٹھی کا نمبر ملانے لگی۔ دوسری طرف سے انگیج ٹیون آنے پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے دوسرا نمبر ملایا اور دوسری جانب گھنٹی بجنے لگی پھر کچھ دیر بعد ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "کس سے بات کرنا ہے؟" یقیناً یہ شخص سیل کے انہی ارکان میں سے ایک تھا جن کی ڈیوٹی کوٹھی کے اندر لگائی گئی تھی۔

"عذرا خان بول رہی ہوں!" میں نے کہا۔ "دوسرے فون نمبر پر کون بات کر رہا ہے؟"

"بلقیس بات کر رہی ہے۔" اس نے میری آواز پہچان کر جواب دیا۔

"کس سے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی ملک دلاور صاحب ہیں جو بار بار فون کر رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔

میں یہ سن کر جھنجلا گئی اور بولی۔ "اسے بلاؤ اس فون پر بلقیس کو اس سے کہو کہ لائن ڈس کنیکٹ کر دے۔"

"بہتر ہے جناب۔"

کچھ ہی دیر بعد مجھے بلقیس کی آواز سنائی دی۔ "جی میں بلقیس بول رہی ہوں۔"

"کیا کہہ رہا تھا ملک دلاور؟" میں نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"وہ..... وہ جناب..... عجیب عجیب سی باتیں کر رہے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دوست ہیں آپ کے اس لیے....."

"کوئی دوستی ووستی کا خیال کرنے کی ضرورت نہیں تمہیں۔ اب وہ فون کرے تو لتاڑ دینا۔ بلکہ اس کی آواز تو پہچان ہی گئی ہو گی تم..... جیسے ہی آواز سنو لائن کاٹ دینا۔" مجھے سخت غصہ آ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ شیطان، بلقیس کو عذرا خان سمجھ کر جانے کیا کیا بکواس کر رہا ہو گا۔ بلقیس نے جن باتوں کو "عجیب عجیب سی" کہا تھا انہیں میں سمجھ گئی تھی۔ وہ رومانی قسم کے مکالمات کے سوا اور کیا ہو سکتے تھے۔

"بہتر ہے، میں اب ایسا ہی کروں گی۔" بلقیس نے گویا مجھے یقین دلایا۔

"کوئی غیر معمولی بات تو اب تک محسوس نہیں کی تم نے؟" میں نے جس لیے اسے فون کیا تھا، اس بات پر آ گئی۔

"جی نہیں، ابھی تک تو کوئی بات نہیں ہوئی۔" اس نے جواب دیا۔

''ممکن ہے کہ میں کچھ دیر بعد تمہارے پاس پہنچوں تمہیں بہر حال ہر طرح چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

بلقیس کو فون کر کے میں نے ملک دلاور کا نمبر ملایا۔ پھر جیسے ہی مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ میں برس پڑی۔

''ارے ارے' یہ کیا ہو گیا آپ کو! کہیں دھتورا تو نہیں کھا گئیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو بڑے پریم نال میرا حال دل سن رہی تھیں اور اب......''

''ملک دلاور!'' میں سختی سے بولی۔ ''تم جانتے ہو مجھے۔''

''آپ کو نہیں جانوں گا تو کسے جانوں گا میری سرکار!'' وہ چہکنے لگا۔

''میں تمہارا جینا حرام کر دوں گی!'' میں اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''ابھی تک کون سا حلال کیا ہے جو حرام کر دیں گی۔'' وہ باز نہیں آ رہا تھا۔

''تم اب مجھے فون نہیں کرو گے بس۔'' میں نے جیسے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

''ویسے بھی میں اب سونے ہی جا رہا تھا' میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا' خود آپ ہی نے......''

''میں آج کی بات نہیں کر رہی تھی' کل بھی تم پریشان نہیں کرو گے مجھے۔''

''اب کل کی گارنٹی تو میں ابھی سے نہیں دے سکتا۔ کیا خبر کل جب آپ کی یاد دبے پاؤں آ کر میرے دل کے تار چھیڑ دے اور میں بے کل ہو جاؤں تو......''

''ایڈیٹ!'' میں نے جھنجلا کر کہا اور کریڈل پر ہاتھ رکھ کر لائن کاٹ دی۔ اسے کچھ سمجھانا فضول ہی تھا کہ اسے میرے اس فلیٹ کا فون نمبر معلوم نہیں تھا ورنہ وہ یہاں بھی فون کر کر کے نرگس کا ناک میں دم کر دیتا۔

نرگس ابھی تک کچن میں تھی۔ یہاں آنے کے بعد یقیناً اس نے سب سے پہلے کچن کے سامان کا بندوبست کیا ہو گا۔ نرگس ایسی لڑکیوں کو ذرا ذرا سی باتیں سمجھانے یا بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں اسے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ ممکن ہے' کئی دن اسی فلیٹ میں گزارنا پڑیں۔ اس کیلئے اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ نرگس کا انتظار کرتے ہوئے میں نے کچھ دیر اپنے ذہن کو سکون پہنچانے کی خاطر ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی چند لمحے سکون سے گزرے ہوں گے کہ اچانک میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لہریں سی میرے دماغ میں دوڑ رہی ہوں۔ کچھ دیر میں اسی کیفیت سے دوچار رہی۔ اس کے بعد معاً مجھے اپنے دماغ میں ایک سرگوشی سی سنائی دی۔ کوئی جیسے مجھے میرا نام لے کر پکار رہا تھا' عذرا خان...... عذرا خان۔''

ہاں میں عذرا خان ہوں۔ میرے ذہن نے مجھے خود بخود اس سرگوشی کا جواب دیا۔

عذرا خان! تم نے جو پلاننگ کی ہے غلط ہے۔ بہت جلد تمہیں تمہارے دشمن گھیر لیں گے۔ وہی سرگوشی پھر ابھری۔

مگر تم کون ہو؟ میرے ذہن نے سوال کیا۔

غلط سوچ رہی ہو تم عذرا خان...... ڈاکٹر رچرڈ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو تمہارا ایک

بہی خواہ ہوں...... نہیں عذرا خان تمہارا یہ سوچنا بھی غلط ہے' میں کوئی پراسرار وجود نہیں ہوں' تمہاری ہی طرح ایک جیتا جاگتا انسان ہوں۔

وہ جو کوئی بھی تھا' میرے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو بھی سمجھ رہا تھا اور خود ہی ان کا جواب بھی دے رہا تھا۔

پھر آخر تم کون ہو؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔

اسی وقت مجھے نرگس کی آواز سنائی دی۔ ''لیجئے میں آپ کیلئے آملیٹ بنا لائی...... مگر آپ...... آپ تو شاید سو......''

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ نرگس سنٹرل ٹیبل پر کھانے کی ٹرے رکھ رہی تھی۔ ابھی تک میری ذہنی کیفیت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ نرگس کو خاموش رہنے کا اشارہ کر کے میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

عذرا خان تم پوچھ رہی تھیں کہ میں کون ہوں؟ تو مجھے بھی تم ایک فریادی سمجھ سکتی ہو۔

فریادی! میرے اعصاب پر چھناکا سا ہوا۔

ہاں فریادی...... مگر ابھی فریاد کرنے کا وقت نہیں آیا۔ ممکن ہے بہت جلد مجھے تمہی سے فریاد کرنا پڑے اور مجھے یقین ہے کہ تم میری فریاد ضرور سنو گی...... تمہارا ذہن پھر بہک رہا ہے۔ یقین کرو عذرا خان کہ میں کوئی پراسرار وجود نہیں ہوں اور نہ تم اس وقت کسی حیرت انگیز تجربے سے گزر رہی ہو۔ زیادہ سے زیادہ تم مجھے ایک ٹیلی پیتھ کہہ سکتی ہو' ایک ایسا شخص جو اپنے خیالات کو دوسرے کے ذہن تک منتقل کر سکتا ہے۔ خود تمہارے ذہن میں بھی تو یہ صلاحیت موجود ہے۔ ہاں اب تم ٹھیک خطوط پر سوچ رہی ہو۔ ٹیلی پیتھی ایک سائنسی علم ہے' اس کا پراسراریت سے کوئی تعلق نہیں' میں بھی ایک ٹیلی پیتھ ہوں۔ اور اس کیلئے میں نے ایک عمر ریاضت کی ہے' مگر اس کے باوجود میرے ذہن میں اتنی قوت پیدا نہیں ہو سکی کہ کسی سے بالجبر اپنی بات منوا سکوں...... ہاں ٹیلی پیتھی کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ میں بھی ہر ذہن کو نہیں پڑھ سکتا' نہ اس سے رابطہ قائم کر سکتا ہوں...... ہاں ہاں تمہارے ذہن میں اتنی قوت ہے کہ کسی دوسرے ٹیلی پیتھ کے خیال کو قریب نہ آنے دو' مگر ابھی تم نے اس کا تجربہ نہیں کیا۔ ٹھہرو...... میں کسی کے قدموں کی چاپ سن رہا ہوں' شاید کوئی ادھر ہی آ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ تم سے میرا ذہنی رابطہ منقطع ہو جائے' میں ایک بار تمہیں خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں۔ تمہارے گرد شدید خطرہ منڈلا رہا ہے۔ تمہیں اپنی پلاننگ پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

لیکن تمہیں اس خطرے کے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا؟ میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا۔

وقت آنے پر تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذہن کو پھر ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس پراسرار شخصیت سے میرے ذہن کا رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ اب میرا ذہن پہلے ہی کی طرح پھر ہلکا پھلکا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر نرگس کو دیکھا۔ وہ گم صم اور خاموش خاموش سی سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔

''معاف کرنا نرگس' میں ایک اہم نکتے پر غور کر رہی تھی۔'' میں نے مسکرا کر بات بنائی۔ ''دراصل خیالات کی یکسوئی کیلئے میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔''

"آپ کی آنکھیں ایک دم سرخ ہو رہی ہیں۔" نرگس نے کہا۔

پھر بولی۔ "آملیٹ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا' میں پھر گرم کر کے لے آتی ہوں۔" وہ صوفے سے اٹھنے لگی۔

"نہیں' رہنے دو چل جائے گا۔" میں نے سنٹرل ٹیبل کو قریب کھسکاتے ہوئے کہا۔ "تم جا کر چائے کا پانی رکھ دو۔ میں اس دوران میں کچھ کھا لیتی ہوں۔"

"وہ تو میں رکھ بھی آئی۔" اس نے بتایا۔ "آپ جب کہیں گی چائے بنا کے لا دوں گی۔"

"ویری گڈ!" میں نے پلیٹ سے سلائس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم بہت اچھی بچی ہو! تم بھی آ جاؤ نا کھا لو کچھ۔"

"میں کھا چکی ہوں کھانا' آپ کھائیے۔"

پھر کھانا کھا کر چائے پینے کے بعد میں وہاں رکی نہیں۔ مجھے کچھ اضطراب سا محسوس ہو رہا تھا۔ بار بار میرے ذہن میں اس پراسرار فریادی کے یہی الفاظ گونج رہے تھے کہ تمہارے گرد شدید خطرہ منڈلا رہا ہے۔ تمہیں اپنی پلاننگ پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

بظاہر مجھے اپنی پلاننگ میں کوئی جھول نظر نہیں آ رہا تھا۔ پیش آنے والے یا ممکنہ خطرے سے بچنے کیلئے میں نے اب بھی یہی سوچا تھا کہ جلد از جلد آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ جاؤں۔ بلقیس کے پاس' اپنی کوٹھی جانے کے خیال کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ اب تک میرے دشمنوں کی توجہ اس طرف نہیں تھی۔ میں وہاں جاتی تو ممکن تھا' وہ اس طرف بھی متوجہ ہو جاتے۔

طارق روڈ سے گزر کر میں شہید ملت روڈ پر نکل آئی اور پھر تیز رفتاری سے سفر طے کرنے لگی۔ سیل کے ارکان کی جیپ اب بھی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

اس وقت سڑکوں پر ٹریفک خاصا کم ہو گیا تھا کہ اب رات کے سوا گیارہ سے زیادہ ہو رہے تھے۔ میں اب اس علاقے میں داخل ہو چکی تھی جہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہاں سے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت بمشکل ڈیڑھ دو میل کی مسافت پر تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ بس اب کچھ ہی دیر میں اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گی۔ اچانک سامنے سے ایک تیز رفتار ٹرک آتا دکھائی دیا۔ جس نے فل لائٹس کھولی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنی کار ایک سائڈ پر کر لی اور بڑبڑائی۔ "بیوقوف کہیں کا۔"

وہ ٹرک گزرا تو اسی کے پیچھے کچھ فاصلے پر ایک اور ٹرک نظر آیا پھر اس سے پہلے کہ مجھے کسی خطرے کا احساس ہوتا۔ اس ٹرک کی رفتار ایک دم کم ہو گئی اور پھر وہ سڑک پر ترچھا کھڑا ہو گیا۔

خطرہ......! خطرہ! میرے ذہن نے جیسے گردان کی اور میرا پیر خود بخود جیسے بریک تک پہنچ گیا۔

بریک لگاتے لگاتے میری کار اس ٹرک کے قریب پہنچ گئی اور پھر عین اسی وقت پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ وہ شاید دھویں کے بم تھے جو اس ٹرک سے پھینکے گئے تھے۔ آناً فاناً ہر اطراف دھواں ہی دھواں پھیل گیا تھا اور میں بری طرح کھانسنے لگی تھی۔ اس "پراسرار فریادی" نے جو پیش گوئی کی تھی صحیح ثابت ہوئی تھی۔ میرے گرد واقعی شدید خطرہ منڈلا رہا تھا جس سے میں بے خبر تھی۔

☆......☆......☆

خطرے کے وقت اگر حواس بحال رہیں تو اس سے بچنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکالی جا سکتی ہے۔

میری زندگی تو یوں بھی خطرات سے کھیلتے ہوئے گزری تھی اس لیے ابتدائی ذہنی جھٹکا لگنے کے بعد میں فوراً سنبھل گئی۔ میں نے کھانستے ہوئے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور پھر کار کا بایاں دروازہ کھول کر انتہائی سرعت سے سڑک کے نشیب میں رینگ گئی۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں اور اندھیرا تھا۔ کہنیوں اور گھٹنوں کے بل تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے ابھی میں نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں تیز روشنی کا احساس ہوا۔ رکے بغیر میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک سرچ لائٹ کی تیز روشنی تھی جس کا روشن دائرہ میری کار کو چند لمحے اپنے احاطے میں لیے رہا پھر نشیب کی طرف ہو گیا۔ اسی وقت میں نے اندھیرے میں بیک وقت کئی شعلے سے لپکتے دیکھے اور پھر زبردست چھناکا ہوا۔ سرچ لائٹ کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ یہ کارنامہ یقیناً سیل کے ارکان کا تھا جنھوں نے سائلنسر لگے ریوالوروں سے سرچ لائٹ کو نشانہ بنا دیا تھا۔ ان کی جیپ میری کار کے پیچھے ہی پیچھے آ رہی تھی۔ پہلے اچانک دھوئیں اور اندھیرے کی وجہ سے وقتی طور پر غالباً وہ لوگ بھی چکرا گئے ہوں گے کہ ہوا کیا پھر جب سرچ لائٹ حرکت میں آئی ہو گی تو وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہوں گے۔ اگر بروقت وہ یہ قدم نہ اٹھاتے تو شاید میرے دشمن مجھے تلاش کر لیتے۔

سرچ لائٹ بجھتے ہی جواباً ٹرک کی طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ دشمنوں کی توجہ اب میری بجائے سیل کے ارکان کی طرف ہو گئی تھی۔ دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے سمت کا تعین کیا اور پھر جیسے میرے پیروں میں پر لگ گئے۔ تیزی کے ساتھ نشیب میں دوڑتے ہوئے میں نے ایک لمبا چکر کاٹا' پھر میرا رخ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی طرف ہو گیا۔ فائرنگ کی آوازیں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ میں بہر حال اپنے دشمنوں کے نرغے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس وقت مجھے کمانڈر نواز کی دور اندیشی کا اندازہ ہوا جس نے مجھے میرے ہی دلائل سے قائل کر کے میری حفاظت کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ اگر سیل کے ارکان کا حفاظتی دستہ میرے عقب میں نہ ہوتا تو شاید میں اپنے دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی ہوتی۔

جس وقت میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں داخل ہوئی تو میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ میری کہنیاں اور گھٹنے چھلے ہوئے تھے جن میں جلن محسوس ہو رہی تھی۔ سڑک کے نشیب میں زمین ناہموار تھی اور جگہ جگہ کنکریاں اور پتھر پڑے ہوئے تھے' مگر وہ ایسا وقت نہیں تھا کہ مجھے اس کا احساس

ہوتا۔

اس ہیئت کذائی کے باوجود اپنے کمرے میں جانے کی بجائے میں نے فوری طور پر ڈیوٹی روم کا رخ کیا۔ سیل کے جو ارکان دشمنوں سے نبرد آزما تھے انہیں کسی تاخیر کے بغیر مدد کی ضرورت تھی۔ میں اپنے سانسوں پر قابو پاتی ہوئی ڈیوٹی روم میں داخل ہوئی تو کمانڈر نواز ٹرانسمیٹر پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر بدستور بات کرتا رہا۔

''ہاں...... ہاں وہ پہنچ چکی ہیں یہاں۔ تم لوگ بھی فوراً یہاں پہنچو اوور اینڈ آل۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ کمانڈر نواز ٹرانسمیٹر پر سیل کے انہی ارکان میں سے کسی رکن کو ہدایات دے رہا تھا جنہیں میری حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ میرے فرار ہو جانے کا یقین کرنے کے بعد دشمنوں نے راہ فرار اختیار کر لی ہوگی۔ سیل کی عمارت میں داخل ہوتے ہی کمانڈر نواز کو یقیناً میری آمد کی اطلاع مل گئی تھی اور اسی لیے ڈیوٹی روم میں مجھے دیکھ کر وہ چونکا نہیں تھا۔

اپنے اندازوں کے باوجود محض تصدیق کی خاطر میں نے کمانڈر نواز کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سیل کے ان ارکان کے بارے میں پوچھ لیا جنہیں دشمنوں سے نبرد آزما چھوڑ آئی تھی۔ میں اس دوران میں ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی اور بڑی حد تک اپنے چڑھتے ہوئے سانسوں پر بھی قابو پا لیا تھا۔

''فائرنگ کے تبادلے میں سیل کا ایک رکن زخمی ہو گیا ہے۔'' کمانڈر نواز بتانے لگا۔ ''اس کے شانے پر گولی لگی ہے۔ ابھی میں انہی سے ٹرانسمیٹر پر بات کر رہا تھا۔ انہیں میں نے آپ کی کار لے کر یہاں پہنچنے کا حکم دیا ہے۔ مگر...... آپ...... آپ بھی شاید کچھ زخمی معلوم ہوتی ہیں۔ میں ابھی ڈاکٹر رشید کو بلاتا ہوں۔'' اس نے میری حالت کا جائزہ لیتے ہوئے فوراً ہی انٹر کام کا ریسیور اٹھا لیا۔

''کوئی خاص بات نہیں بس معمولی خراشیں ہیں' کہنیوں اور گھٹنوں پر تم بس فرسٹ ایڈ باکس میرے کمرے میں بھجوا دو۔ میں لباس تبدیل کر کے تم سے رپورٹ لوں گی۔'' یہ کہتے ہی میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کمانڈر نواز انٹر کام پر میڈیکل کور کے عملے کو ہدایات دینے لگا۔ میں ڈیوٹی روم سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ میں نے کھلا ہی رکھا تھا۔ باتھ روم سے میں لباس تبدیل کر کے باہر آئی تو فرسٹ ایڈ باکس سنٹر ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے میں نے اپنی کہنیوں اور گھٹنوں پر دوا لگائی۔ کہیں کہیں خراشیں گہری تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ دوا لگانے سے وقتی طور پر شدید جلن ہوئی مگر پھر ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی۔ مسہری پر نیم دراز ہونے سے پہلے میں نے انٹر کام قریب کر لیا اور پھر نیم دراز ہو کر ڈیوٹی روم کا نمبر دبا دیا۔

''جی فرمائیے! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' دوسری جانب سے کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کہا تھا نہ میں نے کہ معمولی خراشیں ہیں۔ تم رپورٹ

دو۔ سیل کے جس رکن کو گولی لگی ہے' پہلے مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔ اس کے شانے کی ہڈی کو تو نقصان نہیں پہنچا؟''

''اس سلسلے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ لوگ بس اب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔'' کمانڈر نواز بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ ان لوگوں نے تمہیں کیا رپورٹ دی تھی؟''

''انہوں نے رپورٹ دی تھی کہ سیل کی طرف آتے ہوئے راستے میں اچانک ایک ٹرک نے سڑک پر ترچھا کھڑا ہو کر آپ کی کار کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ آپ کی کار اور ان لوگوں کی جیپ کے درمیان خاصا فاصلہ تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ لوگ کوئی قدم اٹھا سکتے' ٹرک سے دھوئیں کے بم پھینکے گئے اور آپ کی کار ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ گہرے دھوئیں کے سبب ٹرک بھی انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔'' کمانڈر نواز مجھے پیش آنے والے واقعے کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

پھر انہیں سرچ لائٹ کی تیز روشنی نظر آئی اور انہوں نے سرچ لائٹ کو نشانہ بنا دیا۔'' میں درمیان میں بول اٹھی۔ ''اس کے بعد ان کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ یہ سب خود مجھے بھی معلوم ہے' تم اس کے بعد جو کچھ پیش آیا' وہ بتاؤ۔''

''کچھ دیر فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا' پھر ٹرک والوں نے دوبارہ دھوئیں کے بم پھینکے اور دھوئیں کی آڑ میں فرار ہو گئے۔ انہیں غالباً آپ کی طرف سے اتنی شدید مزاحمت کا اندازہ نہیں ہوگا۔'' کمانڈر نواز نے آخر میں قیاس آرائی کی۔

''نہیں' یہ بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دراصل انہیں میرے بچ کر نکل جانے کا یقین ہو گیا تھا۔ سرچ لائٹ کی تیز روشنی پہلے میری کار پر پڑی تھی' مگر میں اس سے پہلے ہی کار سے اتر کر سڑک کے نشیب میں رینگ چکی تھی۔'' یہ کہہ کر میں مختصراً کمانڈر نواز کو صورتحال سے آگاہ کرنے لگی۔

''دشمنوں کے فرار ہوتے ہی سیل کے ارکان نے مجھے اس واقعہ کی رپورٹ دی تھی۔ میں نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ آپ کو تلاش کریں اور اسی کے ساتھ مجھ سے رابطہ قائم رکھیں۔ وہ لوگ اسی لیے آپ سے پہلے یہاں نہیں پہنچے۔ پھر عمارت میں آپ کے داخل ہوتے ہی میں نے انہیں نئے احکام دیئے اور اسی وقت آپ ڈیوٹی روم میں آ گئیں۔'' یہ کہتے ہوئے کمانڈر نواز لمحہ بھر کو خاموش ہو گیا' پھر بولا۔ ''ابھی ابھی مجھے سگنل موصول ہوا ہے کہ ایک جیپ عمارت میں داخل ہو رہی ہے' آپ کی سپورٹس بھی اس کے پیچھے ہے۔ یقیناً وہ لوگ پہنچ چکے ہیں۔''

''کمانڈر! تم ذاتی طور پر ان لوگوں کی خبر گیری کرو۔ اس کے علاوہ زخمی ہونے والے رکن کے بارے میں میڈیکل کور کے انچارج ڈاکٹر رشید سے بات کر کے مجھے رپورٹ دو۔''

''بہتر ہے۔'' کمانڈر نواز بولا۔

میں نے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کر ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکا لیا۔ اب میں اپنی کوٹھی کے نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ طارق روڈ والے فلیٹ سے میں نے بلقیس کو فون کیا تھا۔ میں نے اس سے

کہا تھا' ممکن ہے کہ میں کچھ دیر بعد تمہارے پاس پہنچوں۔ حالات کے پیش نظر میں نے پروگرام بدل دیا تھا۔ اسے یہ اطلاع دینا ضروری تھا تاکہ وہ میرا انتظار نہ کرے۔ اس کے علاوہ مجھے اس کی خیریت بھی مطلوب تھی۔ میرے فرار کے بعد دشمنوں کا رخ ادھر بھی ہو سکتا تھا۔ وہ یہ سوچ سکتے تھے کہ کہیں فرار ہو کر میں اپنی کوٹھی تو نہیں پہنچ گئی۔

دوسری جانب سے جلد ہی ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو!'' یہ بلقیس ہی کی آواز تھی۔

''عذرا خان بول رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اب میرا پروگرام بدل گیا ہے' میں تمہاری طرف نہیں آ رہی' تم ٹھیک تو ہو؟ اب تک کوئی خاص واقعہ تو پیش نہیں آیا؟''

''اب تک خیریت ہے۔ ہم لوگ پوری طرح چوکنا ہیں' آپ ہماری طرف سے قطعی فکر نہ کریں۔ ٹرانسمیٹر پر میجر شہباز سے بھی ہمارا رابطہ قائم ہے۔ کسی بھی قسم کے خطرے کی صورت میں وہ ہمیں پہلے سے مطلع کر دے گا۔ آپ کا فون آنے سے پہلے میری اس سے بات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں سکون سے سو جاؤں۔ وہ پوری طرح مستعد ہے مگر میں نے اپنے طور پر فی الحال یہی فیصلہ کیا ہے کہ بیدار رہا جائے۔''

''تم میری طرف سے میجر شہباز کو یہ رپورٹ دے دو کہ کھیل شروع ہو چکا ہے۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اب ہمارے دشمنوں کا رخ اسی طرف ہو۔''

''بہتر ہے' میں ابھی اسے مطلع کر دیتی ہوں۔'' بلقیس پرسکون آواز میں بولی۔ مجھے اس کے لہجے سے کسی طرح کی گھبراہٹ یا فکر و پریشانی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

''تم لوگوں کیلئے میں مزید حفاظتی بندوبست کر رہی ہوں تاکہ ممکنہ خطرے کا سدباب ہو سکے۔''

''میرا خیال ہے کہ مزید حفاظتی بندوبست کی ضرورت نہیں۔ ویسے آپ زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ یوں بھی ہم لوگ پوری طرح مسلح ہیں اور اتنے سہل بھی نہیں کہ دشمن آسانی سے ہم پر ہاتھ ڈال سکیں۔'' بلقیس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔ وہ یقیناً ایک نڈر لڑکی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے' وقت اور حالات کے پیش نظر میں جو مناسب سمجھوں گی' اس پر عمل کروں گی۔ اور کوئی خاص بات؟'' میں نے سلسلہ منقطع کرنے سے پہلے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' بلقیس نے جواب دیا پھر وہ مجھ سے ''کھیل شروع ہو چکا ہے'' کی وضاحت کیلئے درخواست کرنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے نئے حالات سے آگاہ کر دیں۔'' وہ نرگس کے سلسلے میں بھی مجھے کچھ فکرمند محسوس ہوئی۔ غالباً وہ یہ سمجھی تھی کہ کھیل شروع ہونے کا تعلق نرگس سے ہے۔

میں نے اسی سبب مختصراً اسے حالات سے آگاہ کر دیا۔

''ایسی صورت میں تو آپ کا یہ قیاس درست ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادھر کا رخ کریں۔'' میری پوری بات سن کر بلقیس نے کہا۔

''ہاں اسی لیے میں تمہیں چوکنا رہنے کی تاکید کر رہی ہوں۔'' میں ابھی اتنا ہی کہہ سکی تھی کہ

انٹرکام کی بیل بج اٹھی۔ ''اچھا بلقیس خدا حافظ۔'' یہ کہتے ہی میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ کر انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا۔

''ڈاکٹر رشید نے بتایا ہے کہ زخمی ہونے والے رکن کے شانے کی ہڈی کو معمولی سا نقصان ضرور پہنچا ہے مگر زیادہ فکر و تشویش کی بات نہیں۔ گولی بس شانے کی ہڈی کو چھوتی ہوئی گزر گئی ہے۔ ڈاکٹر رشید کا ایک نائب اس وقت ڈریسنگ کر رہا ہے۔'' مجھے یہ رپورٹ دینے والا کمانڈر نواز تھا۔

''تھینک یو کمانڈر کہ تم نے یہ بتا کر میری فکر کم کر دی۔'' میں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ زخمی ہونے والے سیل کے رکن کی طرف سے میں واقعی فکرمند تھی۔

''مجھے آپ سے کچھ اور بھی عرض کرنا تھا۔'' کمانڈر نواز نے گویا اجازت چاہی۔

''ہاں کہو!''

''موجودہ حالات کے پیش نظر بلقیس اور نرگس دونوں ہی کیلئے خطرہ بڑھ گیا ہے۔ اگر آپ کا حکم ہو تو دونوں جگہ سیل کے مزید ارکان کا اضافہ کر دیا جائے۔''

''بلقیس کی حد تک میں تمہارے خیال سے متفق ہوں بلکہ میں خود اس سلسلے میں تم سے کہنے والی تھی' مگر نرگس کیلئے بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ تمہارا خیال قطعی درست ہے۔ دشمنوں کی نظر میں میرے دونوں ہی ٹھکانے ہیں۔ وہ میری تلاش میں وہاں بیک وقت یا یکے بعد دیگرے حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ میں نے ابھی فون پر بلقیس کو چوکنا رہنے کی تاکید کر دی ہے۔ اس عرصے میں نرگس سے تمہاری بات ہوئی؟ یا کیپٹن شاد نے تم سے رابطہ قائم کیا؟'' میں نے آخر میں دریافت کیا۔

''جی نہیں' نرگس سے کوئی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی کیپٹن شاد نے کوئی رپورٹ دی۔ ہاں اس نے آپ کے وہاں پہنچنے اور پھر روانگی کی اطلاع ضرور دی تھی۔'' کمانڈر نواز نے جواباً بتایا۔

''کیپٹن شاد اور نرگس کو بھی ہوشیار رہنے کی تاکید کر دو۔ اور تم نے مزید حفاظتی اقدامات کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے' اس پر بھی فوراً عمل کرو۔ آج کی رات خاصی ہنگامہ آرائی کی معلوم ہوتی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ خود بھی آج کی رات اپنی کوٹھی میں گزاروں' لیکن مجھے معلوم ہے' تم میری بات سے اتفاق نہیں کرو گے۔'' یہ کہتے ہوئے میں آہستہ سے ہنس دی۔

''جی ہاں' میں ہرگز اتفاق نہیں کروں گا اس لیے کہ اولاً تو آپ کو فی الحال آرام کی ضرورت ہے۔ دوم یہ کہ اس طرح آپ کا یہاں سے نکل کر خود کو خطرے میں ڈالنا' دشمنوں کا مقصد پورا کرنا ہوگا۔ آخری بات یہ کہ اگر ہر معاملے میں آپ ہی کو فیصلہ کن اقدامات اٹھانا پڑ جائیں تو پھر آپریشن سیل بیکار ہے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ قدرے جذباتی ہو گیا۔

''او کے کمانڈر! ڈونٹ وری' مجھے تم لوگوں پر مکمل اعتماد اور بھروسا ہے۔ میں آج کی رات یہیں گزاروں گی۔''

''تھینک یو ویری مچ۔''

''ڈو یور بزنس! خدا حافظ!'' میں نے یہ کہتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

کمانڈر نواز سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے ٹیوب لائٹ بجھا کر کمرے میں ہلکا نیلا بلب

روشن کر دیا اور بستر پر دراز ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ آئندہ روز حالات کیا نئی کروٹ لیں اور مجھے کیا نیا قدم اٹھانا پڑے' کچھ طے نہیں تھا۔ ایسی صورت میں اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر میں جتنی دیر آرام کر لیتی' غنیمت تھا۔ میں اس وقت گویا ایک محفوظ قلعے میں تھی اور یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔

سونے کیلئے کروٹیں بدلتے ہوئے مجھے اس پراسرار فریادی کا خیال آ گیا جس نے خود کو میرا بہی خواہ بتایا تھا۔ اسی نے مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کر کے بتایا تھا کہ میرے گرد شدید خطرہ منڈلا رہا ہے' مجھے اپنی پلاننگ پر نظر ثانی کرنا چاہیے' اس کا مجھے عملی ثبوت مل چکا تھا کہ اس کی پیش گوئی غلط نہیں تھی۔ وہ کون تھا' کون نہیں' اس سے قطع نظر میں اپنی پلاننگ پر غور کرنے لگی۔ اسی غور وخوض کے دوران میں ایک نیا نکتہ میرے ذہن میں آیا۔ میں نے سوچا کہ شہریار کی دھمکی سے میں خواہ مخواہ جذباتی ہو گئی تھی۔ اس سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کے بغیر بھی تو کام چل سکتا تھا۔ اگر میں نرگس اور بلقیس کو اپنے میک اپ میں سامنے نہ لاتی اور خود بھی دانستہ شہریار کے گرگوں کی نظر میں نہ آتی تو اس سے کیا فرق پڑتا۔ جس طرح میں اس وقت سکون واطمینان کے ساتھ آپریشن سیل کی عمارت میں ہوں' کسی ہنگامہ آرائی کے بغیر بھی یہاں اپنا وقت گزار سکتی تھی۔ پھر نہ میں نرگس کی طرف سے فکرمند ہوتی نہ بلقیس کیلئے مزید حفاظتی انتظامات کے متعلق سوچنا پڑتا۔ اپنے حریف کو شکست دینے یا بے بسی کا احساس دلانے کیلئے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اسے اتنا موقع ہی نہ دیا جائے کہ وہ کوئی مخالفانہ قدم اٹھا سکے۔

میں نے اس سلسلے میں خود اپنے اقدامات کا تجزیہ کیا تو یہ راز کھلا کہ اس طرح میری انا مجروح ہوتی۔ یوں گویا میں روپوش ہو کر خود کو بزدل تصور کرتی۔ اس طرح میرے حریف یہی تاثر لیتے کہ میں ان سے خوف زدہ ہو کر راہ فرار اختیار کر گئی ہوں۔

تو اصل مسئلہ میری انا کا تھا جس کی تسکین کیلئے میں نے سیل کے اتنے سارے افراد کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ میں سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچی تو مجھے ندامت سی محسوس ہوئی۔ اگر متبادل راہ موجود تھی تو محض اپنی انا کی تسکین کیلئے مجھے دوسروں کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ پراسرار فریادی کا مشورہ قطعی درست تھا کہ مجھے اپنی پلاننگ پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ اگر اپنے حریف کو یہ احساس دلانا ضروری تھا کہ وہ اپنے تمام تر وسائل کے باوجود مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تو یہ مقصد بھی حل ہو چکا تھا۔ میرے نزدیک اب مزید یہ کھیل جاری رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

یہ نتیجہ اخذ کر کے میری آنکھوں کی نیند اڑ گئی۔ میں نے سوچا کہ سیل کے جانے کتنے ارکان اس وقت بلاسبب جاگ رہے ہوں گے اور میں یہاں گویا ایک محفوظ پناہ گاہ میں سونے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرا یہ عمل سراسر خود غرضی ہے۔ میں یہ سوچ کر اتنی مضطرب ہوئی کہ بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

عالم اضطراب میں ٹہلتے ٹہلتے میری نگاہ وال کلاک کی چمکتی ہوئی سوئیوں پر پڑی رات کا ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ کمانڈر نواز سے گفتگو کیے مجھے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس عرصے میں یقیناً کمانڈر نواز کو کیپٹن شاد یا میجر شہباز کی طرف سے کوئی نہ کوئی رپورٹ ملی ہو گی۔ کمانڈر نواز نے سوچا ہو گا کہ اب تک میں سو چکی ہوں گی اسی لیے اس نے مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ یہ سوچتے ہوئے میں آگے بڑھ کر انٹرکام تک پہنچ گئی اور ڈیوٹی روم کا نمبر دبا دیا۔

خلاف توقع دوسری جانب سے انٹرکام کا ریسیور فوراً نہیں اٹھایا گیا۔ میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر دوبارہ رابطہ قائم کرنے کے لیے نمبر دبا دیا۔ اس بار ریسیور اٹھا لیا گیا۔

''جی؟'' کمانڈر نواز کے لہجے سے جلد بازی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کیا تم فون یا ٹرانسمیٹر پر کسی سے گفتگو کر رہے تھے؟'' میں نے قیاساً کہا۔

''جی ہاں۔'' کمانڈر نواز جواباً بولا۔ ''میجر شہباز اس وقت لائن پر ہے اور رپورٹ دے رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم اس سے بات کر کے مجھ سے رابطہ قائم کر لینا۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

میں دوبارہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ میرے اندازے کے مطابق میجر شہباز یقیناً کوئی اہم رپورٹ دے رہا تھا اسی لیے کمانڈر نواز نے فوراً انٹرکام کا ریسیور نہیں اٹھایا تھا۔ پھر تقریباً دو تین منٹ بعد انٹرکام کی بیل بجنے لگی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

''آپ کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ابھی کچھ دیر قبل کچھ مسلح افراد نے فائرنگ کرتے ہوئے آپ کی کوٹھی میں گھسنے کی کوشش کی تھی' مگر ان کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا گیا۔ فائرنگ سے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ مسلح حملہ آور فرار ہو چکے ہیں۔ ہمارے کسی آدمی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا' لیکن اندازے کے مطابق حملہ آوروں میں سے دو زخمی ہو گئے ہیں۔'' کمانڈر نواز رپورٹ دے رہا تھا۔ ''ممکن ہے علاقے کے رہنے والوں میں سے کسی نے پولیس کو بھی فون کر دیا ہو۔ میں نے میجر شہباز کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی پولیس کی پوچھ گچھ کی صورت میں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا جائے۔ تقریباً اسی طرح کی رپورٹ کیپٹن شاد کی طرف سے بھی موصول ہوئی ہے۔ وہاں بھی مسلح افراد نے بلڈنگ میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ بلڈنگ کا چوکیدار فائرنگ سے زخمی ہو گیا ہے۔ دونوں جگہ تقریباً بیک وقت حملہ کیا گیا ہے۔ بہرحال حملہ آور دونوں ہی جگہ ناکام رہے اور انہیں راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ طارق روڈ پر گشتی پولیس کی ایک گاڑی فائرنگ کے کچھ دیر بعد ہی موقع پر پہنچ گئی تھی۔ زخمی چوکیدار کو ہسپتال بھیج دیا گیا ہے اور پولیس بلڈنگ کے مکینوں کے بیانات لے رہی ہے۔ کیپٹن شاد اور اس کے ساتھی فی الحال وہاں سے ہٹ گئے ہیں تاکہ پولیس کی نظروں میں نہ آ سکیں۔ پولیس کی روانگی کے بعد وہ پھر وہاں پہنچ جائیں گے۔'' کمانڈر نواز تفصیلی رپورٹ دے کر خاموش ہو گیا۔

''پاگل ہو گیا ہے وہ...... دیوانہ ہو گیا ہے۔'' میں غصے میں شہریار کو برا بھلا کہنے لگی۔ ''وہ اس طرح اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے' مگر...... مگر بنیادی غلطی میری ہے۔''

''جی!'' کمانڈر نواز کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں اب...... اب یہ خونی کھیل بند ہو جانا چاہئے...... کوئی ضرورت نہیں اس کی۔'' میں جوش جذبات میں کہتی رہی۔

''معاف کیجئے گا' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔'' کمانڈر نواز کے لہجے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں خود ہی تمہارے پاس آ رہی ہوں۔'' میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

نیند نہ آنے اور میرے اضطراب کا سبب سامنے آ گیا تھا۔ مجھے جس بات کا خدشہ تھا وہ رونما ہو چکی تھی اور آئندہ بھی یہی سب کچھ رونما ہونے کے امکانات تھے۔ میں ان امکانات کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتی ہوئی میں اپنے کمرے سے نکل کر ڈیوٹی روم تک پہنچ گئی۔

ڈیوٹی روم میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ کمانڈر نواز بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے ریوالونگ چیئر گھما کر اپنا رخ میری طرف کر لیا اور پرسکون آواز میں بولا۔ ''آپ سوئی نہیں؟''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ان حالات میں مجھے نیند آ سکتی ہے۔ جب کہ مجھ سے متعلق افراد ہمہ وقت خطرے سے دوچار ہوں۔'' میں بغیر رکے کہے گئی۔ ''مجھے بتاؤ کمانڈر کہ اس خونی کھیل کا ہمارے پاس کیا جواز ہے؟ یہ سب کچھ کیوں اور کس لیے ہو رہا ہے؟ پارٹی بن کے نہیں بلکہ غیر جانب دار ہو کے سوچو۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دو صاحب حیثیت اور باوسائل افراد اپنی اپنی طاقت کا بیجا مظاہرہ کر رہے ہیں؟''

کمانڈر نواز ذہین اور باشعور شخص تھا۔ غالباً اسی لیے وہ میری بات کی تہ تک پہنچ گیا اور بولا۔

''کسی حد تک یہ بات درست کہی جا سکتی ہے' مگر مسئلہ وہی خیر و شر کا ہے۔ ابھی کیا' ہم ہمیشہ اسی سے شر پسند عناصر کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں اور یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ ہمارے حریف کے مقاصد نیک نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ہم اس کے آڑے آ رہے ہیں تو اپنے عمل میں حق بجانب ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاید آپ موجودہ لائحہ عمل سے مطمئن نہیں ہیں اور غالباً اس میں تبدیلی چاہتی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ٹھیک سمجھے تم کمانڈر۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ میری پلاننگ غلط اور وقتی جذبات کا نتیجہ تھی۔ موجودہ صورتحال میں ایک متبادل راستہ بھی تھا۔'' یہ کہہ کر میں نے کمانڈر نواز کو ان تمام خیالات سے آگاہ کر دیا جو میری ذہن میں کچھ دیر پہلے تک چکراتے رہے تھے۔

میری بات سن کر کمانڈر نواز کچھ دیر خاموش رہا' پھر بولا۔

''آپ کے جذبات و احساسات یقیناً قابل قدر ہیں جو کچھ آپ نے کہا یہ بھی ممکن تھا لیکن گستاخی معاف میرے خیال میں اس مسئلے کا حل روپوشی یا خاموشی نہیں۔ بالفرض آپ ایسا ہی کرتیں جیسا کہہ رہی ہیں تو کیا شہریار کوئی اور چال نہ چلتا؟ وہ آپ کی روپوشی کے بعد کیا خاموش بیٹھا رہتا؟ اس کا شیطانی ذہن یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیتا اور پھر مجبوراً آپ کو سامنے آنا پڑتا۔''

''کمانڈر! یہ سب محض تمہارے قیاسات ہیں جو ممکن ہیں درست ہوں' لیکن یہ قیاسات اس بات کا جواز بہر حال نہیں کہ موجودہ صورتحال کو برقرار رکھا جائے۔ میرے سامنے سے ہٹ جانے کے بعد شہریار کیا قدم اٹھائے گا یہ بعد کی بات ہے' فی الحال میں سمجھتی ہوں کہ یہ خونی کھیل بند ہونا بہتر ہے۔ تم چاہو تو اسی وقت اس سلسلے میں عملی اقدامات کر سکتے ہو۔''

''یعنی؟'' کمانڈر نواز نے وضاحت چاہی۔

''یعنی یہ کہ تم میجر شہباز اور کیپٹن شاد کو نئے احکام دے دو۔ نئے احکام یہ ہوں گے کہ وہ موقع ملتے ہی بلقیس اور نرگس کو ساتھ لے کر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں۔ طارق روڈ والے فلیٹ اور کوٹھی کو مقفل کر دیا جائے۔'' میں نئے احکام کی وضاحت کرنے لگی۔'' اس طرح فوری طور پر محاذ آرائی ختم ہو جائے گی۔ ہاں یہ خیال رہے کہ روانگی سے قبل نرگس اور بلقیس کو یہاں لانے کی بجائے اگر ان کے گھروں چھوڑ دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ اس طرح وہ کل سے اپنی سابقہ حیثیتوں میں عذرا انٹرپرائزز جانا شروع کر دیں گی۔ اس کے علاوہ سیل کے ارکان بھی اپنی اپنی ڈیوٹی آف کر کے اپنے گھروں کا رخ کر سکتے ہیں۔ یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ جب آپ محاذ آرائی ختم کرنے کا فیصلہ کر چکی ہیں تو ان لوگوں کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں رہتی۔'' کمانڈر نواز نے تجویز پیش کی۔

''تم جس طرح مناسب خیال کرو' میری طرف سے پوری اجازت ہے۔ میرا مقصد تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو' میں بس اسی کی تکمیل چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔

''میرا خیال ہے کہ اب آپ کو اطمینان سے نیند آ جائے گی۔'' کمانڈر نواز مسکرا کر بولا۔

''ہاں شاید!'' میں نے جواباً کہا اور پھر ڈیوٹی روم سے نکل آئی۔

پھر واقعی اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہونے کے کچھ دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔

دوسرے دن صبح میں تقریباً پونے دس بجے سو کر اٹھی۔ باتھ روم کا رخ کرنے سے پہلے میں نے انٹرکام پر ڈیوٹی روم سے رابطہ قائم کیا۔ کمانڈر نواز ڈیوٹی آف کر کے جا چکا تھا اور اس کی جگہ عثمانی نے سنبھال لی تھی۔

عثمانی ہی سے مجھے یہ رپورٹ ملی کہ گزشتہ رات کمانڈر نواز کو میں نے جو احکام دیئے تھے ان پر عمل کیا جا چکا ہے اور حالات میری مرضی کے مطابق نیا رخ اختیار کر چکے ہیں۔ میرے فلیٹ اور کوٹھی کی چابیاں آپریشن ہیڈ کوارٹر پہنچا دی گئی تھیں۔

یہ رپورٹ دے کر عثمانی سلسلہ منقطع کرنے والا تھا کہ میں بول اٹھی۔ ''تمہیں کمانڈر نواز نے میری نئی حکمت عملی سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ میں اب شہریار سے محاذ آرائی نہیں چاہتی' مگر اس کی نقل و حرکت پر بہر حال نظر رکھنا ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے' سرفراز اور اس کے ساتھیوں کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔''

''جی ہاں۔'' عثمانی میری بات کی تائید میں بولا۔

''سرفراز کو مزید مستعد رہنے کی ہدایت کر دو اور اس سے پابندی کے ساتھ رپورٹ لیتے رہو۔ اگر کوئی خاص بات معلوم ہو تو اس سے بلاتوقف مجھے آگاہ کیا جائے۔'' یہ کہہ کر میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا اور پھر اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

پھر اس دن کے بعد جیسے میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں محبوس ہو کے رہ گئی۔ فرم کے معاملات سے نمٹنے کیلئے پہلے کی طرح میں نے اپنی منیجر عارفہ کو اتھارٹی لیٹر بھجوا دیا تھا۔ تین دن بخیریت و عافیت گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ شہریار ابھی تک کراچی میں تھا اور میرے

آدمی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ سرفراز نے رپورٹ دی تھی کہ شہریار میری روپوشی سے سخت جھنجلایا ہوا ہے اور اس کے گرگے پاگلوں کی طرح سارے شہر میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔

اب سے پہلے کبھی مجھے کوئی ایسی صورتحال پیش نہیں آئی تھی کہ میں نے یوں روپوشی اختیار کر لی ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ چوتھے روز یکسانی سے مجھے کچھ بیزاری سی محسوس ہونے لگی۔ اس موقع پر مجھے ملک دلاور یاد آیا۔ میں نے اس عرصے میں اس سے بھی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا' کیوں نہ آج اسی سے ملا جائے۔ ہر چند کہ اس کی شوخیاں کبھی کبھی مجھے کھل جاتی تھیں' لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ دل کا برا نہیں تھا اور بہر حال میرا بہی خواہ تھا۔

جس وقت مجھے ملک دلاور کا خیال آیا دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا اپنے دفتر سے گھر آ کر ہی کھاتا ہے اور کھا کے کچھ دیر آرام کرنے کے بعد دفتر جاتا ہے۔ یہ اس کے آرام کا وقت تھا اور میں بھی کھانا کھا کر آرام ہی کر رہی تھی کہ اٹھ بیٹھی۔

کچھ سوچتے ہوئے میں نے ٹیلیفون سیٹ اپنی جانب کھسکا لیا اور ملک دلاور کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ ذرا دیر بعد دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ ریسیور اٹھانے والا ملک دلاور کا ایک ملازم تھا۔ اس نے بتایا کہ صاحب اپنی خوابگاہ میں آرام کر رہے ہیں۔

''ان سے کہو عذرا خان کا فون ہے' چاہیں تو بات کر لیں' میں ہولڈ کیے......''

''اچھا جی۔'' وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔ ''آپ ہولڈ کریں میں ابھی انہیں جا کر بتاتا ہوں۔''

ملک دلاور کو میرا فون ریسیور کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس کے ملازم نے یقیناً بتا دیا تھا کہ فون کس نے کیا ہے۔ اس لیے وہ فوراً ہی شوخی پر آمادہ ہو گیا۔ ''او ہو مسمات عذرا خان ہیں...... آداب! معلوم ہوتا ہے کہ شاید آپ نے اشتہار پڑھ لیا۔''

''کون سا اشتہار؟''

''ارے وہی تلاش گمشدہ کا اشتہار!'' ایک تصویر بھی تھی میرے پاس آپ کی' وہ بھی اشتہار کے ساتھ دے دی تھی۔ کیا آج کا اخبار نہیں دیکھا آپ نے؟ اشتہار کی سرخی یہ تھی کہ اے مسمات گھر لوٹ آئیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اگر آپ نے وہ اشتہار نہ پڑھا ہوتا تو مجھے فون کیوں کرتیں بھلا!'' وہ روانی سے بغیر رکے بولے گیا۔

''پرانی ہو گئی تمہاری یہ لطیفے بازی' کوئی خاص مزہ نہیں آیا۔''

''سارا مزہ تو سنتے ہیں کوئی محمد رضا ہیں' وہ لے گئے' اب تو بس خوف قضا رہ گیا ہے جو آپ کو ہے نہیں۔''

''ذرا سوچو تو ملک دلاور کہ کتنے دن بعد تمہارے منہ سے میں نے 'کوئے'' سنی ہے۔

''یہ بھی پرانی ہو گئی جناب بلکہ جنابہ! کوئے دوئے سے اب مجھے بھی مزا نہیں آتا۔ مزے کی کوئی اور سبیل کریں۔''

''سنو! میری ایک مہمان آج ہی لاہور سے آئی ہیں۔ میں نے غائبانہ ان سے تمہارا تعارف

کرایا تو وہ تم سے ملنے کیلئے بے چین ہو گئیں۔ میرے پاس وقت نہیں تھا کہ انہیں لے کر تمہارے پاس آتی۔ انہیں میں نے تمہارا پتا دے دیا ہے تم سے انہیں کوئی ذاتی کام بھی ہے۔ آج رات غالباً سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان وہ تم سے ملنے آئیں گی۔ تمہیں یقیناً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کھانے کا وقت ہوتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ تم مہمان نواز آدمی ہو۔ میں نے اسی لیے تمہیں فون کیا تھا۔''

''یہ جو آپ نے مجھے ابھی ایک عدد لاہوری مسمات کی سٹوری سنائی' اس میں کئی عدد جھول ہیں۔'' ملک دلاور حسب دستور شگفتہ لہجے میں بولا۔ ''ان خاتون سے میرا غائبانہ تعارف کرانا اور آج ہی ان کا لاہور سے آنا' مجھ سے ملنے کیلئے بے چین ہونا' پھر ذاتی کام بھی! گل جمی نہیں جی!''

''کیسے جمے گی گل' وہ صورت بتا دو۔'' میں نے کہا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ ملک دلاور ایسے ذہین شخص کو بے وقوف بنانا آسان نہیں۔ وہ یقیناً بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

''سچ سچ بتا دیں کیا چکر ہے تو گل جم جائے گی۔ گل جمنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔''

میں نے گفتگو کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور اس سے اصل بات کہہ دی۔ ''اگر تمہیں تنہا ان خاتون کی آمد پر اعتراض ہے تو ان کی جگہ میں آ جاؤں گی' ان سے منع کر دوں گی کہ تم ملنے پر راضی نہیں ہو' مگر آؤں گی میں بھی لاہور سے۔''

''اب آپ مجھے اتنا بھی گاؤدی نہ سمجھیں۔ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ لاہوری مسمات آپ ہی ہوں گی۔ ہاں کچھ اتا پتا بتا دیں تاکہ میں پہچان لوں۔ روئے زیبا تو آپ کا کسی وجہ سے میک اپ میں چھپا ہو گا۔''

''میرا خیال ہے اس سلسلے میں صرف نام کی پہچان کافی ہے۔ میں تمہارے ملازم کو اپنا نام سلطانہ بتاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے یہ نام مجھے بالکل یاد رہے گا کیونکہ اس نام کا ایک مشہور ڈاکو بھی گزرا ہے۔ آپ نے بھی یقیناً اس کا نام سنا ہو گا' سلطانہ ڈاکو۔''

''اچھا خدا حافظ!'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان پہنچ جاؤں گی۔''

پھر اس سے پہلے کہ ملک دلاور مزید کچھ کہتا' میں نے ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

بغیر میک اپ کے آپریشن سیل کی عمارت سے نکلنا خطرناک تھا۔ میں نے اسی لیے میک اپ کا فیصلہ کیا تھا۔ شام سوا چار بجے کے قریب میں سو کر اٹھی تو چائے پی کر اطمینان سے میک اپ کرنے بیٹھ گئی کیوں کہ میری روانگی میں ابھی خاصی دیر تھی اس لیے میں بہت آہستہ اور آرام سے میک اپ کر رہی تھی۔

معلوم نہیں ان دنوں وقت اتنا سست رفتار کیوں ہو گیا تھا۔ دن کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ بار بار میری نگاہ وال کلاک کی طرف اٹھ رہی تھی۔ ساڑھے چھ بج گئے تو میں اٹھ ہی گئی۔ جب میں ڈیوٹی روم میں پہنچی تو وہاں لائق نواز اور عثمانی دونوں ہی موجود تھے۔ عثمانی چارج دے کر جانے والا تھا۔ آپریشن سیل سے میک اپ کر کے نکلتے ہوئے عموماً میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ سیل کے زیادہ سے زیادہ محافظ اور ارکان مجھے اس میک اپ میں دیکھ لیں تاکہ واپسی کے وقت کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو۔

میں نے مختصراً کمانڈر نواز کو بتایا کہ کہاں اور کس غرض سے جا رہی ہوں' پھر ایک کار کی چابی لے کر ڈیوٹی روم سے نکل آئی۔ میں نے دانستہ اپنی سپورٹس کی چابی نہیں لی تھی کیوں کہ وہ دشمنوں کی نظر میں آ چکی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے نکل کر کھلی فضا میں آتے ہی مجھے سکون کا احساس ہوا۔ چار روز کے بعد میں اس عمارت سے باہر آئی تھی۔

اطمینان و سکون کے ساتھ ڈرائیونگ کرتی ہوئی میں وقت مقررہ پر سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی پہنچ گئی۔ اپنی کار ملک دلاور کی کوٹھی کے گیٹ پر روک کر میں نے ہارن دیا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولنے سے پہلے میرا نام پوچھا اور پھر گیٹ کھول دیا۔ ملک دلاور یقیناً اسے بتا چکا ہوگا کہ سلطانہ نامی اس کی ایک مہمان آنے والی ہے۔ کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں اپنی کار پارک کر کے میں اتر آئی۔ اس دوران میں چوکیدار ایک ملازم کے ذریعے ملک دلاور کو میری آمد کی خبر کرا چکا تھا۔ میں ملازم کے انتظار میں برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب اس طرح کھڑی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے پہلی بار اس کوٹھی میں آئی ہوں۔ جلد ہی ایک ملازم مجھے اپنی رہنمائی میں ڈرائنگ روم تک لے آیا جہاں ملک دلاور پہلے ہی میرا منتظر بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ایک دم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ملک دلاور کا ملازم جا چکا تھا۔

''بندہ محترمہ سلطانہ خاتون صاحب کو خوش آمدید کہتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مخصوص انداز میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور سر جھکا دیا۔

''جیتے رہو!'' میں نے اس کی حرکت پر اپنی ہنسی روکتے ہوئے بزرگانہ انداز میں کہا اور اس کے ساتھ بولی۔ ''ملک صاحب! میرا خیال ہے کہ آپ کم از کم اردو زبان تو سیکھ ہی لیں۔ جب کسی خاتون کے نام سے پہلے محترمہ کہتے یا لکھتے ہیں تو پھر صاحبہ کہنا یا لکھنا سراسر جہل ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ ہی کافی ہے۔ مثلاً ملک دلاور صاحب یا محترم ملک دلاور! آئی کچھ عقل شریف میں۔''

''تشریف تو رکھیں آپ! آتے ہی آپ نے تو اردو میڈیم کا سکول لگا لیا۔ کہیں آپ ہماری عزیز از جان دوست عذرا خان کی خالہ تو نہیں ہیں؟''

''تم پر پھر خالہ اور خالو کا دورہ پڑ گیا۔'' میں ہنستے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''دیکھیں جی! آپ کو زیادہ بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں ہے مسمات لاہوری۔ آپ کی میری یہ پہلی ملاقات ہے۔ مجھ سے بے تکلفی کا پرمٹ اس شہر میں صرف ایک عدد خاتون کے پاس ہے۔ ان دنوں مجھے شربت دیدار پلانے پر بھی راضی نہیں ہیں۔ ویسے آپ تو انہیں اچھی طرح جانتی ہیں اس لیے کہ انھی کی سفارش پر آج میں نے آپ کی دعوت کر ڈالی ہے ورنہ آج نہ جمعرات ہے نہ مجھے بھوکے کھلانے کی عادت ہے۔ یہ بتائیں کہ آج کل وہ کہاں مٹر بھناتی پھر رہی ہیں؟''

''تمہاری کب سے ملاقات نہیں ہوئی ان سے؟'' میں نے دانستہ اسی کے لہجے اور تلفظ کی نقل اتاری۔

ملک دلاور میرے لہجے اور تلفظ کو طرح دے گیا اور کہنے لگا۔ ''ہائے ہائے نہ پوچھیں سوال......''

''تم پھر غلط اردو بول رہے ہو' سوال پوچھتے نہیں کرتے ہیں۔'' میں نے موقع ملتے ہی پہلی چٹکی لی۔

''آپ اردو کی امی جان ہیں کیا؟'' وہ آخر چڑ ہی گیا۔ ''بولنے ہی نہیں دیتیں' یہ غلط ہے' وہ غلط ہے' غلط ہے تو ہوا کرے میری بلا سے...... ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟''

''ابھی تک تو تم نے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کی' معلوم نہیں کیا کہہ رہے تھے کیا نہیں؟'' میں نے دانستہ منہ بنایا۔

وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اچانک اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ بولا۔ ''اگر اجازت ہو تو آپ کے برابر آ کے بیٹھ جاؤں تاکہ حال دل کہہ سکوں۔''

''ہرگز نہیں!'' میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ''تمہیں برابری کی اجازت نہیں مل سکتی۔''

''ایک آپ ہی کٹھور کہ آپ کا دل نہیں پسیجتا کبھی اور ایک ہم ہیں کہ آپ کی ایک ایک ادا پر جان دے رہے ہیں۔ ابھی سے میں نے خوب نمک مرچ کھانے کی عادت ڈالنا شروع کر دی ہے۔ دیکھ لیں آپ میرے عشک کی انتہا۔''

''عشق اور نمک کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ تم یہ کیا بے تکی اڑانے لگے۔'' میں ہنس کر بولی۔

''یہی تو آپ کو نہیں معلوم۔'' وہ عجب سی صورت بنا کر بولا۔ ''کل کلاں کو جب آپ اس بندہ ناچیز کے پلے بندھ جائیں گی تو مجبوراً مجھے کھانا بھی آپ کے ساتھ ہی کھانا پڑا کرے گا۔ تو میں نے ابھی سے اس کی ریہرسل شروع کر دی ہے۔ پرانا باورچی بھی بدل دیا ہے۔ ابھی آپ جب میرے ساتھ کھانا کھائیں گی تو خود آپ کو میرے عشک کی صداقت کا یکین آ جائے گا۔''

''تم نے بیک وقت اتنی ساری کوئی' بولی ہیں کہ مجھے یقین نہ بھی ہو تو یقین کرنا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں ہنسنے لگی۔ دراصل تم جوش جذبات میں بہت جلدی پٹڑی سے اتر کر اپنی اصلیت پر آ جاتے ہو۔''

ملک دلاور سے ایسی ہی نوک جھونک میں تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا اور اس نے ملازم سے کھانا لگانے کیلئے کہہ دیا تھا۔

کھانا میز پر لگ گیا اور ہم دونوں ڈائننگ روم میں آ گئے تو ایک بار پھر ملک دلاور اپنے نئے باورچی کے قصیدے پڑھنے لگا۔ میں اس کے ساتھ کھانے کی میز پر آ بیٹھی۔

دلاور نے نئے باورچی کے پکائے ہوئے کھانوں کی اس قدر تعریف کی تو میں نے تنقیدی نظروں سے ڈونگوں کی طرف دیکھا۔ گھی اور مسالوں کا استعمال بڑے کھلے طریقے سے ہوا تھا۔ پسندوں سے خوشبو آ رہی تھی اور پالک گوشت بھی خوب بھون بھان کر تیار کیا گیا تھا۔ ڈھیر سارا گھی دونوں سالنوں پر تیر رہا تھا۔ مزے کے اعتبار سے وہ سالن بس غنیمت ہی کہے جا سکتے تھے' مگر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

کھانا کھا کر جب میں ہاتھ دھونے کیلئے اٹھنے لگی تو آخر دلاور سے نہ رہا گیا' اچھا نہیں لگا کھانا؟''

''دراصل تمہیں اچھے کھانوں کی نئی نئی چاٹ لگی ہے اس لئے کچھ ضرورت سے زیادہ ہانک

رہے ہو۔'' میں اس پر چوٹ کر کے واش بیسن کی طرف بڑھ گئی اور وہ منہ بناتا رہ گیا۔

دلاور کو میری غیر معمولی سرگرمیوں کا یقیناً کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہوگا لیکن ظاہر ہے اسے یہ علم نہیں تھا کہ میں ان دنوں کن حالات سے دوچار ہوں۔ میرا بہی خواہ اور دوست ہونے کی حیثیت سے اس سلسلے میں اس کی فکر وتشویش بجا تھی مگر ہمیشہ کی طرح اس وقت چائے پیتے ہوئے بھی اسے باتوں میں اڑا رہی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو اتنا پراسرار بننے کی آخر ضرورت کیا ہے۔'' میری مسلسل فقرے بازی اور غیر سنجیدہ رویئے سے تپ کر اس نے کہا۔

''خاصے سنبھل کر بول رہے ہو تم اس وقت ورنہ یہ کہتے کہ سمجھ نہیں آتی۔'' چائے پیتے ہوئے میں بدستور اسے فقروں میں اڑاتی رہی۔

ٹھیک ہے بنی رہیں پراسرار۔ ایک دن خود ہی سر پر ہاتھ رکھ کر روئیں گی کہ کاش میں نے کسی کا دل نہ توڑا ہوتا۔''

''ویسے تمہارا دل ہے بہت ڈھیٹ۔ بار بار ٹوٹنے کے باوجود پھر نئے سرے سے ٹوٹنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔'' میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ نو سے زیادہ ہو رہے تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی اس تفریح نے بڑی حد تک میرا موڈ خوش گوار کر دیا تھا اور اب میں واپس آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچنا چاہتی تھی۔

حسب دستور دلاور نے ''کمبل'' ہونے کی کوشش کی مگر میں اس سے جان چھڑا کر چلی ہی آئی۔

دلاور کی کوٹھی سے لوٹتے ہوئے مجھے اس بات کا احساس بھی تھا کہ میرے دشمن اس کی نگرانی بھی نہ کرا رہے ہوں۔ میں اسی لیے محتاط اور چوکنا تھی لیکن آپریشن سیل کی عمارت تک پہنچتے ہوئے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہاں وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک ایسی اطلاع ضرور ملی کہ میرا خون کھول اٹھا۔ شہریار اب انتہائی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔ اس نے اپنے گرگوں کو حکم دیا تھا کہ آج میری کوٹھی میں آگ لگا دی جائے۔ یہ اطلاع فراہم کرنے والا اسی سیل کا ایک ذہین رکن سرفراز تھا۔ سرفراز اور اس کے کئی ساتھی شہریار کے فون بھی ٹیپ کیے جا رہے تھے۔ کمانڈر نواز نے یہ اطلاع ملتے ہی نہ صرف میری کوٹھی کیلئے حفاظتی بندوبست کر دیا بلکہ طارق روڈ والے فلیٹ اور میری فرم کی بلڈنگ کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ شہریار سے بعید نہیں تھا کہ وہ اس جگہ سے مایوسی کے بعد دوسری جگہ طاقت آزمائی نہ کرتا۔ اس حرکت سے میرے حریف کا مقصد محض مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا معلوم ہوتا تھا یا پھر اس طرح وہ ایک بار پھر مجھے محاذ آرائی پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ میری روپوشی کے فیصلے کے وقت کمانڈر نواز نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا' وہ بہرحال سامنے آ گیا تھا۔

میں اس وقت ڈیوٹی روم میں بیٹھی ہوئی کمانڈر نواز سے اس نئی صورتحال پر گفتگو کر رہی تھی۔

''میں حکمت عملی میں تھوڑی سی تبدیلی چاہتا تھا۔'' کمانڈر نواز کہنے لگا۔

''کس قسم کی تبدیلی؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''دراصل اب تک ہم اپنے حریف کے حملوں سے ایک حد تک صرف مدافعت کرتے رہے

ہیں۔'' کمانڈر نواز کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے غالباً اسی وجہ سے اس کے حوصلے مزید بڑھ گئے ہیں۔ اگر اسے یہ خوف ہو کہ جوابی کارروائی کے طور پر خود اسے بھی نقصان پہنچ سکتا ہے تو شاید وہ ان اوچھی حرکتوں سے باز آ جائے۔

میں نے اس کے خیال سے اتفاق کیا اور بولی۔ ''اب تک میں نے ایسا کیا تو نہیں' لیکن شاید آئندہ یہی حکمت عملی اختیار کرنا پڑے۔ پھر بھی میں ایسا کرنے سے پہلے اسے ایک وارننگ ضرور دینا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے اسے عقل آ جائے ورنہ پھر مجبوراً یہی قدم اٹھانا پڑے گا۔ دراصل درگزر کرنے اور برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب یہ حد گزر جائے تو معاملہ بزدلی اور کم ہمتی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ تم اسکی کوٹھی کا نمبر ملاؤ' میں ابھی فون پر اس سے بات کرتی ہوں۔''

کمانڈر نواز نے اپنی ریوالونگ چیئر گھمائی اور اس کا رخ پینل کی طرف ہو گیا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی موٹی سی ڈائری میں شہریار کی کوٹھی کا نمبر دیکھا اور پھر قریب ہی رکھے ہوئے ٹیلی فون پر وہ نمبر ملانے لگا۔ میں اس دوران میں کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گئی۔ شہریار کی کوٹھی کا یہ وہ فون نمبر تھا جو صرف چند مخصوص افراد ہی کے پاس تھا اور یہ نمبر ٹیلی فون ڈائریکٹری میں بھی درج نہیں تھا۔ اس لیے توقع یہی تھی کہ خود شہریار ہی فون اٹینڈ کرے گا اور پھر یہی ہوا بھی۔ کمانڈر نواز نے سلسلہ ملتے ہی ٹیلی فون کا ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو...... ہیلو!'' دوسری جانب سے شہریار کی آواز آ رہی تھی جسے میں اچھی طرح پہچانتی تھی۔

''کون بول رہا ہے؟''

''عذرا خان!'' میں نے جواباً کہا۔ ''پھر بغیر رکے بولی۔ ''شہریار تم نے ابھی تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھا ہے۔ مجھے تم کیوں مجبور کر رہے ہو کہ میں تمہیں تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنے پر مجبور کر دوں۔ یہ نہ بھولو کہ جو آگ میرے دامن تک پہنچ سکتی ہے' تمہیں بھی جلا سکتی ہے۔ اگر میری کوٹھی میں آگ لگائی جا سکتی ہے تو تمہاری کوٹھی بھی شعلوں میں گھر سکتی ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ نہ میں بزدل ہوں' نہ طاقت و وسائل میں کسی بھی طرح تم سے کم۔ طاقت وقوت اور وسائل و اقتدار رکھتے ہوئے اس کا بیجا استعمال نہ کرنا انسانیت ہے' مگر یہ لفظ تم سے لوگوں پر یقیناً زیب نہیں دیتا۔ انسانیت سے تمہارا کیا واسطہ۔ اسے تم میری وارننگ تصور کر سکتے ہو ورنہ تمام تر نتائج کی ذمے داری تم پر ہوگی۔'' درمیان میں خود وہ بھی کچھ نہیں بولا۔ غالباً حیرت کے سبب کہ میں اتنی باخبر ہوں اور پھر اپنی بات مکمل کر کے خود میں نے بھی اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

شہریار سے فون پر گفتگو کر کے میں پھر کرسی پر آ بیٹھی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے کمانڈر' وہ باز آ جائے گا؟'' میں نے کمانڈر نواز کی رائے معلوم کی۔

''مشکل ہی ہے۔'' کمانڈر نواز سر ہلا کر بولا۔ ''وہ جو کہتے ہیں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے' ایسا ہی کچھ معاملہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہے۔ عموماً شہریار ایسے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ جو کچھ کرنے کا اہل ہوتا ہے' وہ کہتا نہیں۔ ہاں اس سے یہ ضرور ہوگا کہ وہ اپنی سیکورٹی کے افراد کی تعداد میں اضافہ کر دے گا۔''

''وہ جو کچھ بھی کرے یا نہ کرے مگر اب یہ طے ہے کمانڈر کہ اس وارننگ کے باوجود بھی آج رات محاذ آرائی کی نوبت آئی تو پھر تمہیں میری طرف سے پوری اجازت ہے تم جوابی کارروائی کے طور پر جو قدم بھی اٹھانا چاہو اٹھا سکتے ہو۔'' میں فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''ہاں اتنا خیال رکھنا کہ ہمارا مقصد اسے محض ہراساں اور خوف زدہ کرنا ہے۔'' کمانڈر نواز کو یہ تاکید کرتے ہوئے میں نے کرسی چھوڑ دی۔ میں جاگ رہی ہوں' تم مجھے تازہ ترین صورتحال سے باخبر رکھنا۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے چلی آئی۔

گزشتہ دنوں میں نے وقت گزاری کیلئے اپنے کمرے میں مصوری کا سامان بھی منگوا لیا تھا۔ کئی دن سے میں ایک لینڈ سکیپ پر کام کر رہی تھی۔ آج رات یوں بھی مجھے جاگنا ہی تھا۔ میں نے سوچا کہ آج یہ پینٹنگ پوری کر ہی دوں۔ اپنے کمرے میں آ کر لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے برش سنبھال لیا اور ایزل کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پینٹنگ کے سلسلے میں پیشنز کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے ایسے لوگ جو شوقیہ مصوری کرتے ہیں' عموماً پیشنز پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ جلد از جلد پینٹنگ مکمل ہو جائے اور یہی سب سے بڑی خرابی ہے۔ جلد بازی پینٹنگ کو بگاڑ دیتی ہے۔ ابتداء میں میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا' مگر میں نے رفتہ رفتہ اس پر قابو پا لیا تھا۔

میں نے ابھی کینوس پر دو چار سٹروک ہی لگائے ہوں گے کہ میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں ایک مانوس سی ذہنی کیفیت سے دوچار ہونے لگی۔ برش اور رنگوں کی پلیٹ سٹینڈ پر رکھ کر میں جلدی سے قریب ہی پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر میری آنکھیں جیسے خودبخود بند ہونے لگیں۔

عذرا خان! تم کہاں ہو؟ ایک آشنا آواز میرے ذہن میں گونجی۔

پراسرار فریادی! میں نے سوچا۔

''ہاں میں وہی ہوں اور تمہاری طرف سے فکرمند ہوں۔

''کیوں؟'' میرے ذہن میں سوال ابھرا۔

اس لیے کہ تمہارا حریف ایک بار پھر تمہارے خلاف حرکت میں آ گیا ہے۔ مجھے اپنے سوال کا جواب ملا۔

مجھے علم ہے' بہرحال تمہاری اطلاع کا شکریہ۔ میں نے اس سے ذہنی رابطہ بحال رکھا۔ کیا تم مجھے اپنے بارے میں اب بھی کچھ نہیں بتاؤ گے کہ تم کون ہو؟

میں اس کوشش میں ہوں کہ جلد ہی تم سے ملاقات ہو جائے مگر ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟

اس پراسرار فریادی کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے اپنے ذہن میں برقی لہریں سی دوڑتی محسوس کیں۔ اسی کے ساتھ میرے شعور کی سطح پر ایک لفظ بار بار ابھرنے لگا۔ خطرہ' خطرہ! مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پراسرار فریادی میرا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مجھے علم نہیں تھا کہ میں اس صورتحال سے کس طرح بچ سکتی ہوں۔ میرے ذہن میں یہی آیا کہ فوری طور پر اپنے ذہن سے ہر خیال کو جھٹک کر اس پینٹنگ کے متعلق سوچنے لگوں جس پر میں کام کر رہی تھی اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔

عذرا خان! عذرا خان!'' اس پراسرار فریادی کی آواز ایک بار پھر میرے ذہن میں ابھری تم شاید میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہو۔ یقین کرو کہ میں تمہارا بہی خواہ ہوں مجھے آپریشن سیل کے بارے میں بتا دو تا کہ میں وہاں آ کر تم سے مل سکوں۔

ہرگز نہیں! میں تمہیں یہاں کا پتا نہیں بتاؤں گی۔ میرے ذہن نے مدافعت کی۔ پھر مجھے اسی پراسرار فریادی سے اپنی وہ گفتگو یاد آئی جب پہلی بار اس نے مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کیا تھا۔ خود اسی نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے ذہن میں اتنی قوت ہے کہ کسی دوسرے ٹیلی پیتھ کے خیال کی رو کو قریب نہ آنے دو مگر ابھی تم نے اس کا تجربہ نہیں کیا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں جانے کیسے خودبخود ہی یہ بات آ گئی کہ اگر میں کچھ دیر کو اپنے ذہن سے ہر خیال جھٹک دوں' اپنے ذہن کو خالی چھوڑ دوں تو شاید وہ پراسرار فریادی میرا ذہن نہ پڑھ سکے اور اس سے میرا ذہنی رابطہ بھی منقطع ہو جائے۔ میں نے کسی تاخیر کے بغیر اسی پر عمل کیا۔ چند لمحے مجھے یوں لگا جیسے وہ پراسرار فریادی مجھے پکار رہا ہے' پھر اس کی آواز قطعی معدوم ہو گئی اور میرے ذہن کو دوبارہ ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اسی کے ساتھ میری آنکھیں کھل گئیں۔ میری ذہنی کیفیت بھی اعتدال پر آ گئی مگر میں بدستور اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس پراسرار فریادی کے محض ایک سوال نے مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا پتا معلوم کیا تھا جو میرے قریبی دوستوں کے علم میں بھی نہیں تھا۔ وہ پراسرار فریادی جس نے استفسار کے باوجود ابھی تک اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا' واقعی میرا بہی خواہ ہے' مجھے اب اس پر شک ہونے لگا تھا۔ اسے آپریشن سیل کا پتا پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے ذہن میں بار بار یہی سوال گردش کر رہا تھا۔ آخر وہ ہے کون؟

انہی سوالوں پر غور کرتے ہوئے اچانک کافی عرصے کے بعد ایک مانوس لذت انگیز سی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔ یہ وہی مانوس کیفیت تھی جس کے زیر اثر اب تک قطعی درست پیش گوئیاں کرتی رہی تھی۔ اس کیفیت میں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی میرے ذہن میں سرگوشیاں سی کر رہا ہے اور وہ آواز خود میری ہی ہوتی تھی۔ اس وقت بھی میں اپنے ذہن کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے عجیب تجربے سے گزر رہی تھی۔ یہ سرگوشیاں اسی پراسرار فریادی کے متعلق تھیں۔

عذرا خان! تم جسے پراسرار فریادی کہتی اور سمجھتی ہو وہ حقیقتاً تمہارا بہی خواہ نہیں ہے۔ تمہیں علم نہیں کہ دنیا کی دوسری بڑی طاقت کے ذہین ایجنٹ بھی تمہاری راہ پر لگ چکے ہیں۔ یہ پراسرار فریادی بھی انہی میں سے ایک ہے۔ اس نے اپنے بارے میں یہ غلط نہیں کہا تھا کہ اس کا تعلق ڈاکٹر رچرڈ سے نہیں۔ ڈاکٹر رچرڈ دائیں بازو کا نمائندہ ہے اور یہ پراسرار فریادی جس کا نام موشوروف ہے' بائیں بازو کا اہم شخص ہے۔ قاہرہ میں جرمن سائنس دان شیپرڈ نے موشوروف ہی کے کچھ ساتھیوں سے تمہاری سودے بازی کی تھی مگر اس سے پہلے کہ شیپرڈ تمہیں ان لوگوں کے حوالے کر دیتا تم نے اپنی حیرت انگیز قوتوں سے کام لے کر بساط الٹ دی اور بچ کر نکل آئیں۔ موشوروف اسی وقت سے تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اس کا طریقہ کار ڈاکٹر رچرڈ سے مختلف ہے۔ وہ ڈاکٹر رچرڈ اور اس کے ساتھیوں یعنی امریکی ایجنٹوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ انہی کے توسط سے موشوروف کو یہ معلوم ہوا کہ تم ان دنوں پاکستان میں ہو۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں

کے ہمراہ پاکستان آ گیا۔ کیوں کہ وہ خود ایک ٹیلی پیتھ ہے اس لیے اس نے تم سے ذہنی رابطہ قائم کر لیا اور خود کو تمہارا بہی خواہ ظاہر کیا۔ اس طرح وہ تمہیں اعتماد میں لے کر شکار کرنا چاہتا ہے۔ تمہاری حیرت انگیز ذہنی قوتوں کو اب دنیا کی دونوں ہی بڑی طاقتیں اپنے اپنے مفاد کا غلام بنانا چاہتی ہیں۔ موشوروف کو تم ڈاکٹر رچرڈ کا ہی ہم پلہ سمجھ سکتی ہو۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی سرگوشیاں بند ہو گئیں اور میرے سارے جسم میں آشنا سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

میرے حیرت انگیز ذہن نے ایک پریشان کن سوال کا جواب فراہم کر دیا تھا اور اب میں خود کو بے حد سبک اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ پراسرار فریادی کا عقدہ کھل چکا تھا۔ ایسی صورت میں اب میں مزید چوکنا اور محتاط رہ سکتی تھی۔

قاہرہ میں مجھے جو واقعہ پیش آیا تھا وہ تقریباً میرے ذہن سے محو ہی ہو چکا تھا۔ اگر جرمن سائنس دان شیپرڈ نے روسی ایجنٹوں سے سودے بازی نہ کی ہوتی تو شاید میں ڈاکٹر رچرڈ کی قید سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو پاتی اور وہ مقررہ وقت پر دوسرا تجربہ کر کے میرے ذہن کو امریکی مفادات کا غلام بنا دیتا۔ شیپرڈ نے دنیا کی دوسری بڑی طاقت کے ایجنٹوں کو میرے متعلق تمام معلومات فراہم کر دی تھیں۔ وہ اسی سبب سودے بازی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ وقتی طور پر یہ سودے بازی میرے حق میں بہتر ثابت ہوئی تھی مگر اب صورتحال بدل چکی تھی۔ مجھے بیک وقت دونوں بڑی طاقتوں کے ایجنٹوں سے بچنا تھا جو بہر طور میرے حصول کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ وہ دونوں ہی مجھے زیر دام لانا چاہتے تھے۔

مقررہ وقت پر دوسرا تجربہ نہ ہونے کی صورت میں کیا ردعمل رونما ہوتا' میں اس سے بھی فی الحال بے خبر تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مدت گزرنے میں اب صرف چند دن باقی رہ گئے تھے۔ مجھے ڈاکٹر رچرڈ کے الفاظ اب تک یاد تھے۔ میرے خلاف اتنی شدومد یقیناً اسی لیے تھی کہ دوسرے تجربے کا وقت گزرنے سے پہلے میں ان کے ہتھے چڑھ جاؤں۔ ملکی اور غیر ملکی امریکی ایجنٹ اور ان کے آلہ کار بھی اس وقت میری تلاش میں تھے۔ پاکستان میں ان لوگوں کا گویا سرغنہ شہریار تھا' مجھے اس کا علم پہلے ہی سے تھا۔ شہریار کے توسط سے میری اصل جنگ امریکی ایجنٹوں سے تھی۔ دوسرے بلاک کے ایجنٹ بھی میری فکر میں ہیں' اس کے بارے میں مجھے آج ہی معلوم ہوا تھا لیکن ان لوگوں نے مجھ سے براہ راست ٹکرانے کی بجائے دوسری راہ اختیار کی تھی۔ یہی سبب تھا کہ میرے نزدیک فی الحال وہ لوگ زیادہ خطرناک نہیں تھے۔

کافی دیر تک میں انہی حالات و واقعات پر غور کرتی رہی اور پھر اٹھ کر دوبارہ پینٹنگ کرنے لگی تاکہ میرا ذہن دوسری طرف لگ جائے۔

رات کو تقریباً اڑھائی بجے انٹرکام پر بیل گنگنا اٹھی اور میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ وہ کمانڈر نواز ہی ہو سکتا تھا اس لیے میں نے کہا۔ ''ہاں کہو کیا بات ہے؟''

دوسری جانب میری توقع کے مطابق کمانڈر نواز ہی تھا۔ میری آواز سن کر وہ بول اٹھا۔ ''آپ کی وارننگ کا شہریار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آپ کی کوٹھی میں آگ لگانے کی بجائے اسے مکمل طور پر تباہ

کرنے کیلئے دستی بم پھینکنے کی کوشش کی گئی تھی جسے ناکام بنا دیا گیا۔ خاصی محاذ آرائی رہی کیوں کہ سیل کے ارکان نے ان دونوں افراد کو پکڑ لیا تھا جن کے پاس دستی بم تھے۔ ان دونوں میں سے ایک غیر ملکی تھا۔ ان بموں کو ناکارہ بنا دیا گیا ہے۔ ان دونوں افراد کے ساتھ دشمن کے تقریباً دس مسلح افراد تھے جو چھپ کر دور سے ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ جب وہ دونوں پکڑے گئے تو مسلح افراد نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں سیل کے تین رکن زخمی ہو گئے ہیں جن میں سے ایک کی حالت تشویشناک ہے۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے۔ اس وقت ڈاکٹر رشید اس کا آپریشن کر رہے ہیں بقیہ دو ارکان کے بھی گولیاں لگی ہیں' مگر ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ سیل کے کچھ ارکان زخمیوں اور گرفتار ہونے والوں کو لے کر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ چکے ہیں' مگر ان کی بڑی تعداد ابھی تک کوٹھی کی حفاظت کر رہی ہے اور......''

''جہنم میں جھونکو کوٹھی کو!'' میں جذبات کی شدت سے تقریباً چیخ اٹھی۔ ''میں ایسی دس کوٹھیاں اپنے آدمیوں پر قربان کر سکتی ہوں۔ کوٹھی تباہ ہوتی ہے تو ہونے دو...... ان سب کو فوراً واپسی کا حکم دے دو! میری کوٹھی کی قیمت میرے کسی آدمی کی جان سے زیادہ نہیں ہے کمانڈر۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

کمانڈر نواز نے میرے الفاظ' لہجے اور آواز کے زیر و بم سے یقیناً میری دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ اسی لیے فوراً بول اٹھا۔ ''بہتر ہے' میں ابھی انہیں واپس بلائے لیتا ہوں اور کوئی حکم؟'' اس نے آخر میں سوال کیا۔

''نہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھا اور پھر کسی تاخیر کے بغیر اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔

اب میرے قدم تیزی کے ساتھ عمارت کے اس حصے کی طرف اٹھ رہے تھے جس کے دو کمرے میڈیکل کے کور کیلئے وقف تھے۔ انہی میں سے ایک کمرے کو بوقت ضرورت آپریشن تھیٹر کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ تمام ضروری ساز و سامان اور دوائیں وہاں موجود رہتی تھیں۔

میں پہلے کمرے میں پہنچی تو ڈاکٹر رشید کا ایک ماتحت اور اس کا معاون سیل کے ان دو ارکان کی نگہداشت اور مرہم پٹی کرتے نظر آئے جن کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ان میں سے ایک کی ران میں گولی لگی تھی جو نکال دی گئی تھی۔ دوسرے رکن کی بائیں کلائی پر پٹی باندھی جا رہی تھی۔ کلائی کو سہارا دینے کیلئے ڈاکٹر نے لکڑی کی ایک چھوٹی سی پٹی بھی رکھی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ کلائی کی ہڈی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ پھر میں نے ڈاکٹر سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو میرے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ گولی کلائی کی ہڈی توڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ ان دونوں زخمیوں کے چہروں پر تکلیف اور اذیت کے آثار تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھے اپنی مزاج پرسی کیلئے آتا دیکھ کر ان دونوں ہی نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس سے غالباً ان کا مقصد یہی رہا ہوگا کہ میں ان کی طرف سے زیادہ تشویش میں مبتلا نہ ہوں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ان کی طرف سے میرے دل پر کیا بیت رہی تھی۔

پھر جب تک برابر والے کمرے کا دروازہ نہ کھل گیا اور ڈاکٹر رشید سے مجھے یہ معلوم نہ ہو گیا کہ آپریشن کامیاب رہا ہے اور اب خطرے کی کوئی بات نہیں' میرے دل کو سکون نہ آیا۔ پیٹ سے گولی

نکال دی گئی تھی اور اب اسے خون دیا جا رہا تھا۔

قدرے مطمئن ہونے اور ڈاکٹر رشید کو زخمی ارکان کے متعلق ضروری ہدایات دے کر میں وہاں سے ڈیوٹی روم میں آ گئی۔ کمانڈر نواز ٹرانسمیٹر پر کسی سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔

''تم لوگوں کو بہرحال یہ خیال رکھنا ہے کہ تمہارے ہاتھوں کوئی ہلاک نہ ہو۔ عمارت کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔ اوور اینڈ آل۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

میں کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ میرے لیے یہ سمجھنا قطعی مشکل نہیں تھا کہ کمانڈر نواز نے کن لوگوں کا اور کس سلسلے میں احکام دیئے ہیں۔

اس وقت میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کمانڈر نواز سے پوچھا۔ ''شہریار کی کل کی مصروفیات کے بارے میں تمہارے پاس رپورٹ ہے۔''

''جی ہاں!'' اس نے جواب دیا۔

پھر کمانڈر نواز نے وضاحتاً شہریار کی مصروفیات کے بارے میں جو کچھ بتایا' اس میں سے میرے لیے کام کی صرف ایک ہی بات تھی۔ کل شام پانچ بجے وہ آرٹ کونسل میں کسی مصور کی تصاویر کی نمائش کا افتتاح کرنے والا تھا۔

''کمانڈر! کل کا دن بھی اس کیلئے خیریت سے نہیں گزرنا چاہئے۔'' کمانڈر نواز سے تمام تفصیلات معلوم کرنے کے بعد میں نے گویا حکم دیا۔ ''یہ خیال رہے کہ آج رات کے بعد حفاظتی انتظامات مزید سخت کر دیئے جائیں گے۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' وہ جواباً بولا۔

''ان دو آدمیوں کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے جنہیں سیل کے ارکان یہاں پکڑ کر لے آئے ہیں؟'' وہی جنہیں دستی بم پھینکنے سے پہلے پکڑ لیا گیا اور جن میں ایک غیر ملکی ہے۔''

''انہیں میں نے کچھ روز مہمان' بنائے رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' کمانڈر نواز نے لفظ مہمان پر زور دیتے ہوئے پھر انکشاف کیا۔ ''ان میں سے ایک کو پہچان لیا گیا ہے۔ وہ بدنام جرائم پیشہ اور گروہ بند ابرار ٹیڈی ہے۔ ابھی غیر ملکی کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔''

ابرار ٹیڈی پہلے بھی شہریار کیلئے کام کرتا رہا تھا۔ اپنے سیاسی حریف شیخ مجید پر قاتلانہ حملے کرانے کیلئے بھی شہریار نے اسی کے گروہ کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ان حالات میں کمانڈر نواز کا فیصلہ صحیح تھا۔ کم از کم اس طرح شہریار اپنے ایک اہم مہرے سے محروم ہو جاتا۔

''اب یہ جرائم پیشہ شخص جب یہاں سے جائے گا تو یقیناً اس قابل نہیں رہے گا کہ آئندہ اپنی قانون دشمن سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ایسے افراد معاشرے کا مردہ حصہ ہوتے ہیں۔ ان کی سرشت ہی یہ ہوتی ہے تم انہیں لاکھ راہ راست پر لانا چاہو یہ پھر کتے کی دم کے مانند ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی رعایت ظلم اور ناانصافی کہی جا سکتی ہے۔''

''میں آپ کیلئے چائے منگواؤں؟'' کمانڈر نواز میری بات کی تائید کے بعد بولا۔

''ہاں منگوا لو۔'' میں نے کہہ دیا۔

کمانڈر نواز نے کچن سے رابطہ قائم کیا اور چائے منگوا لی۔ میں نے چائے پینے کے دوران میں کمانڈر نواز کو آئندہ روز کے متعلق چند ہدایات دیں اور پھر وہاں سے اٹھ آئی۔

دوسرے دن میری آنکھ دیر سے کھلی کیوں کہ میں صبح چار بجے کے قریب سوئی تھی۔ ناشتے سے پہلے میں نے رات کے آپریشن کی رپورٹ لی۔ یہ رپورٹ شہریار کے باب میں جوابی کارروائی سے متعلق تھی۔ کمانڈر نواز کی ہدایت کے مطابق سیل کے ارکان نے شہریار یا اس کے آدمیوں اور محافظوں کو جانی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کارروائی بڑی منظم اور اچانک تھی اس لیے متوقع نتائج برآمد ہوئے تھے۔ اطلاعات کے مطابق شہریار ایک دم بوکھلا گیا تھا۔ اس کے خوف زدہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ تھا کہ اس نے آج دن بھر کے تقریباً تمام ہی پروگرام منسوخ کر دیئے تھے' صرف آرٹ کونسل میں تصویروں کی نمائش کے افتتاح کا پروگرام برقرار رکھا تھا۔ پولیس کی بھاری تعداد اس کی کوٹھی کے اردگرد متعین کر دی گئی تھی۔

صبح شائع ہونے والے اخبارات میں یہ خبر نہیں آ سکی تھی' لیکن جو اخبارات قدرے توقف سے شائع ہوتے تھے انہوں نے یہ خبر نمایاں طور پر شائع کی تھی۔ انہی اخبارات میں شہریار کا بیان بھی شائع ہوا تھا۔ اس نے اس واقعے کا ذمہ دار مخالف پارٹیوں کو ٹھہرایا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے بیان میں اس نے یہ بھی کہا تھا کہ کچھ ملک دشمن عناصر ایک منظم سازش کے تحت امن وامان کی صورتحال کو دانستہ بگاڑ رہے ہیں' حکومت ایسے افراد کے ساتھ سختی سے نمٹے گی۔

ظاہر ہے کہ اس عیار شخص کا بیان پڑھ کر ہنس ہی سکتی تھی۔ شہریار ایسے لوگوں کی فطرت و ذہنیت سے میں بخوبی واقف تھی۔ ایسے مواقع پر بھی یہ لوگ سیاسی بیان بازی اور سیاسی مفادات حاصل کرنے سے نہیں چوکتے۔ یہ لوگ ہر حال میں پبلسٹی کا کوئی موقع نہیں گنواتے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ اس نے آرٹ کونسل کا پروگرام منسوخ نہیں کیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو دوسرے دن کے اخبارات میں اس کی تصویریں کیسے شائع ہوتیں۔ اسے فن اور فنکار کا قدرداں کس طرح ثابت کیا جاتا۔

اخبارات پڑھنے کے بعد میرا جی چاہا کہ خود بھی شہریار سے گفتگو کر کے یہ اندازہ لگاؤں کہ میرا مقصد کس حد تک پورا ہو سکا ہے۔ اس کا فون نمبر ڈیوٹی روم سے معلوم کرنے کے بعد میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ یہ وہی مخصوص نمبر تھا جس پر میں پہلے بھی اس سے بات کر چکی تھی۔

پہلی بار انگیج ملا مگر میری دوسری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ دوسری بار کچھ توقف کے بعد میں نے نمبر ملایا تھا۔ سلسلہ ملنے اور شہریار کی آواز پہچاننے کے بعد میں بول اٹھی۔ ''گزشتہ رات تمہارے ساتھ جو کچھ پیش آیا اسے تم محض ابتداء سمجھ سکتے ہو۔ آج کے اخبارات میں تمہارا بیان پڑھ لیا ہے میں نے۔ تم نے اسے قاتلانہ حملہ قرار دیا ہے تو سنو کہ اگر اب بھی تمہارے دل میں حوصلہ باقی ہے تو پھر حقیقتاً بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ کل میں نے تمہیں وارننگ دی تھی' مگر تم باز نہیں آئے۔''

''تم مجھے قتل کی دھمکیاں دے رہی ہو عذرا خان!'' اس کی آواز اور لہجے سے سختی کے باوجود خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کون عذرا خان!'' میں دانستہ اور مصلحتاً بولی۔ مصلحتاً ہی میں اس وقت آواز بدل کر بول رہی

تھی۔ اس امکان کو میں نے نظر انداز نہیں کیا تھا کہ میری آواز ٹیپ کی جا رہی ہو۔

''تم...... تم عذرا خان بول رہی ہو اور نہ میں کسی عذرا خان کو جانتی ہوں۔ میں نے اس وقت تمہیں صرف یہ بتانے کیلئے فون کیا ہے کہ تم ڈاکٹر رچرڈ کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکے۔ اس نے تمہیں کیا حکم دیا تھا' اس سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ تمہیں شاید علم نہ ہو کہ ڈاکٹر رچرڈ ایسے لوگ کبھی کبھی خود اپنے مہروں کو ناکارہ ہونے کی صورت میں بساط سے ہٹا دیتے ہیں اور ان کی جگہ بساط پر نئے مہرے لے آتے ہیں۔ بہت جلد تمہارے سلسلے میں بھی یہی ہونے والا ہے۔ تم چاہو تو اپنے ذرائع سے میری فراہم کردہ اطلاعات کی تصدیق کر سکتے ہو۔ عنقریب تمہاری زندگی خطرے میں پڑنے والی ہے۔''

''تم جھوٹ...... جھوٹ بول رہی ہو۔'' شہریار کی آواز سنائی دی۔ جس سے واضح طور پر فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میرا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ میں اسے ذہنی خلفشار میں مبتلا کر چکی تھی۔

''جھوٹ اور سچ کا اندازہ تمہیں بہت جلد ہو جائے گا شہریار جہاں تک مجھ پر ہاتھ ڈالنے کا سوال ہے تو تم میری پرچھائیں بھی نہیں پا سکے۔ تمہیں خبر مل ہی گئی ہو گی کہ تمہارا اگرگا ابرار ٹیڈی بھی اب میرے قبضے میں آ چکا ہے۔ تم چاہو تو اپنے آقاؤں تک میرا یہ پیغام پہنچا سکتے ہو کہ بہت جلد اس ملک سے ان کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دی جائیں گی۔ پھر تم ایسے لوگوں کا حشر تو بہت برا ہو گا۔'' میں نے ان الفاظ کے ساتھ ہی لائن کاٹ دی۔

میرے نزدیک شہریار کو فون کرنے کا مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ گفتگو کے دوران میں اسے میں نے گھبرایا ہوا محسوس کیا تھا۔ چور کے پاؤں ہی کتنے والی مثل تھی۔ میں جانتی تھی کہ ایسے لوگ اندر سے بزدل اور خوف زدہ ہوتے ہیں' بس ذرا ان کے احساس خوف کو کسی طرح بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے اسی سبب ڈاکٹر رچرڈ کی طرف سے بھی اسے شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ ایسا معاملہ تھا جسے شہریار نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

ایک بار پسپا ہونے کے بعد میرے حریفوں نے دوبارہ میری کوٹھی' فلیٹ یا فرم کی عمارت کو نقصان پہنچانے کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ انہوں نے غالباً اندازہ لگا لیا تھا کہ دوسری کوشش بھی انہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔ ان کے دو اہم افراد کا میرے ہتھے چڑھ جانا بہرحال معمولی بات نہیں تھی۔ اس کی دوسری وجہ کمانڈر نواز کی جانب سے کی جانے والی جوابی کارروائی بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں' شہریار کی طرف سے کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھی۔ وہ شاطر کوئی بھی نئی چال چل سکتا تھا۔ اسی کے تدارک کی خاطر گزشتہ رات میرے ذہن میں ایک اور نیا خیال آیا تھا۔ میں نے اسی لیے کمانڈر نواز سے شہریار کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا تھا۔ آج شام پانچ بجے شہریار کو آرٹس کونسل میں ایک مصور کی تصویروں کی نمائش کا افتتاح کرنا تھا۔ میں بھی وہاں جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

دوپہر کو کھانا کھا کے میں نے کچھ دیر آرام کیا' پھر رات کے ہنگامے میں زخمی ہو جانے والے سیل کے ارکان کی عیادت کیلئے اپنے کمرے سے نکل آئی۔ اس سے پہلے انٹرکام پر میں ڈاکٹر رشید کو مطلع کر چکی تھی کہ ادھر آ رہی ہوں۔ وہ میرا ہی منتظر تھا۔ جس رکن کے پیٹ میں گولی لگی تھی اور رات کو جس کا

آپریشن ہوا تھا' اب وہ ہوش میں تھا۔ ڈاکٹر رشید نے مجھے بتایا کہ اب اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ بقیہ دو زخمیوں کا حال بھی ٹھیک تھا۔ تشویش کی کوئی بات نہیں تھی' میں ان لوگوں کی طرف سے مطمئن ہو کر پھر اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور میک اپ کرنے لگی کیوں کہ مجھے اب سیل کی محفوظ پناہ گاہ سے نکلنا تھا۔

شام سوا چار بجے کے قریب میں سیل کی عمارت سے باہر آ گئی۔ میرے چہرے پر ایک غیر ملکی ادھیڑ عمر عورت کا میک اپ تھا۔ میری کار کی جعلی نمبر پلیٹ سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ میں کسی غیر ملکی سفارتکار کے عملے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میک اپ میں ہونے کے سبب عثمانی کی تجویز کے باوجود میں نے اپنے ساتھ بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کی تھی۔ عثمانی کی تجویز یہ تھی کہ سیل کے کچھ ارکان کو میری حفاظت کی خاطر دوسری گاڑی میں ساتھ جانا چاہیے۔

پانچ بجے سے پہلے ہی میں آرٹس کونسل پہنچ گئی۔ وہاں مجھے پولیس کی خاصی تعداد نظر آئی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ سادہ لباس والے بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ ابھی تک شہریار نہیں آیا تھا۔ یوں بھی بڑے لوگوں کیلئے خصوصی حفاظتی انتظامات ہوتے ہیں۔ شہریار پر تو گویا قاتلانہ حملہ بھی ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ اسی وجہ سے تھا۔ وہاں موجود افراد میں صرف میں اس سے واقف تھی کہ شہریار کے ساتھ جو کچھ ہونا ہے یہاں نہیں راستے میں ہو گا۔ سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود مجھے یقین تھا کہ سیل کے ارکان اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہیں گے۔ باتھ آئی لینڈ سے آرٹس کونسل تک انہیں کہیں بھی موقع مل سکتا تھا۔ یہ بھی اسی جوابی کارروائی کا حصہ ہوتا جس پر گزشتہ رات عمل کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد بھی شہریار کو محض ہراساں اور خوف زدہ کرنا تھا۔ جس راستے سے شہریار کی کار گزرنا تھی اس پر پہلے ہی سے تین جگہ سیل کے ارکان موجود تھے۔ یہ پلاننگ کمانڈر نواز کی تھی اس لیے ناکامی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہ علم بھی مجھی کو تھا کہ شہریار مقررہ وقت پر آرٹس کونسل نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ امکان بھی میری نظر میں تھا کہ شہریار ضرورت سے کچھ زیادہ بھی خوف زدہ ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ آرٹس کونسل کا پروگرام منسوخ بھی کر سکتا تھا' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب وہ آ ہی گیا۔ کار سے اترتے ہی اسے پولیس اور سادہ لباس والوں نے گویا اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ میں نے دور سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر وحشت سی برس رہی تھی۔ پھر پولیس کے اس گھیرے میں بمشکل کچھ منتظمین کو داخل ہونے کی اجازت ملی جو بھاری بھاری پھولوں کے ہار لیے شہریار کی آمد کے منتظر تھے۔ انہی میں وہ مصور بھی تھا جس کی تصاویر کی نمائش کا افتتاح شہریار کے ہاتھوں ہونے والا تھا۔

عموماً غیر ملکیوں سے ہمارے لوگ کچھ زیادہ ہی متاثر ہو جاتے ہیں۔ مجھے اسی لیے اس بھیڑ بھاڑ میں بھی منتظمین نے خصوصی اہمیت دی۔ یہی سبب تھا کہ جب شہریار نے نمائش کا افتتاح کیا تو میں اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ یہی وہ لمحات تھے جب میں نے وہ اہم کام انجام دیا جس کی خاطر یہاں آئی تھی۔

افتتاح کے بعد شہریار نے مختصر سی تقریر کی جو مصوری کی بجائے اس پر راستے میں ہونے والے حملے کے متعلق تھی۔ اپنی تقریر کے آخر میں اس نمائش سے متعلق اس نے بالواسطہ غالباً ایک آدھ ہی جملہ کہا

تھا کہ حکومت اسی طرح فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں کی سرپرستی کرتی رہے گی وغیرہ۔ پھر وہ وہاں مزید رکے بغیر تصاویر کھنچوانے کے بعد واپسی کیلئے روانہ ہو گیا تھا۔

آرٹس کونسل سے شہریار کی روانگی کے بعد بھیڑ خاصی چھٹ گئی۔ ذاتی طور پر کیوں کہ خود مجھے بھی مصوری سے دلچسپی تھی اس لیے میں نے ایک نظر نمائش میں لگی ہوئی تصاویر دیکھیں۔ وہ ایک نیا مصور تھا۔ ابھی اسے خاصی محنت اور مشق کی ضرورت تھی۔ میرے خیال میں ابھی اس نے اپنی تصاویر کی نمائش کرنے میں جلد بازی کا ثبوت دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی طرف واپس جاتے ہوئے ملک دلاور کا خیال بھی آیا' مگر میں نے اس سے ملاقات کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ آپریشن سیل پہنچ کر مجھے کمانڈر نواز کو ایک خوشخبری سنانا تھی۔ ملک دلاور سے اس وقت نہ ملنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

اپنی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ کر پہلے میں نے میک اپ ختم کیا پھر لباس تبدیل کر کے ڈیوٹی روم سے رابطہ قائم کیا۔ اس وقت تک کمانڈر نواز نہیں پہنچا تھا۔ اس وقت مجھے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ کچن روم سے میں نے چائے منگوا لی اور اس کی چسکیاں لیتے ہوئے بدلنے والے متوقع حالات پر غور کرنے لگی۔ اسی دوران میں انٹرکام کی بل بجی۔ کمانڈر نواز نے انٹرکام پر مجھے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ عثمانی نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے اس سے کہا کہ ابھی خود اس کے پاس پہنچ رہی ہوں۔ پھر میں نے چائے کے آخری گھونٹ لیے اور اپنے کمرے سے نکل کر ڈیوٹی روم میں آ گئی۔

''کمانڈر! آج ہی رات کسی فلائٹ سے شہریار اسلام آباد واپس چلا جائے گا۔'' میں نے کمانڈر نواز کو گویا خوشخبری سنا دی۔

کمانڈر نواز میری بات سن کر چونک اٹھا' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''مگر حیرت ہے کہ سرفراز نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی رپورٹ نہیں دی۔''

''اس کی طرف سے بھی تمہیں جلد ہی یہ رپورٹ مل جائے گی۔'' میں نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''میں اسی غرض سے آرٹس کونسل گئی تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے وہاں شہریار کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا جس وقت وہ نمائش کا افتتاح کر رہا تھا۔ وہ پہلے ہی سے خوفزدہ تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی' یہاں یعنی اس شہر میں اس کی زندگی کو خطرہ درپیش ہے اور اس کیلئے یہی مناسب ہے کہ وہ فوری طور پر اسلام آباد چلا جائے' کسی بھی پہلی فلائٹ سے میرا خیال ہے کہ اس سے کم از کم پے در پے محاذ آرائی کی صورتحال میں تبدیلی آ جائے گی۔''

''ممکن ہے ایسا ہی ہو۔'' کمانڈر نواز محتاط انداز میں بولا۔

''کیوں' کیا تمہیں اس میں کوئی شک ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کسی قدر!'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''دراصل اس میں تو خیر کوئی شک نہیں کہ وہ ہمارے ملک میں ڈاکٹر رچرڈ کا سب سے اہم مہرہ ہے لیکن ہمیں بہرحال دیگر حقائق کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔'' پھر وہ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔ ''یہاں سے شہریار کی روانگی یقیناً ہمارے لیے سود

مند ہے۔ اس سے لازماً محاذ آرائی کی شدت کم ہو جائے گی' مگر حتمی طور پر یہ ممکن نہیں کہ یہ صورتحال ختم ہو جائے۔ ہمارے خلاف اقدامات کیلئے شہریار کا اس شہر میں رہنا غالباً ضروری نہیں۔ وہ اسلام آباد میں رہ کر بھی ڈوریاں ہلا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ صرف شہریار ہی ہمارے ملک میں دائیں بازو کا آلہ کار نہیں اور بھی جانے کتنے معلوم و نامعلوم افراد ایسے ہیں۔ ان افراد سے قطع نظر ان غیر ملکی ایجنٹوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو براہ راست ڈاکٹر رچرڈ کے احکام پر یہاں سرگرم عمل ہیں۔ مختصراً یہ کہ شہریار کی روانگی کے بعد بھی میرے خیال میں یہ صورتحال برقرار رہ سکتی ہے۔''

کمانڈر نواز نے جو کچھ کہا تھا اور جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ خود میری نظر میں بھی تھے۔ میں نے اسی لیے اس سے اتفاق کیا۔ اسی کے ساتھ مجھے وہ غیر ملکی بھی یاد آ گیا جسے میری کوٹھی پر دستی بم پھینکنے سے پہلے ابرار ٹیڈی کے ساتھ ہی پکڑ لیا گیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں کمانڈر نواز سے دریافت کیا۔ ''اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟''

''عثمانی نے میرے ایما پر آج کوشش کی تھی' مگر شاید تشدد کے بغیر وہ زبان نہیں کھولے گا۔'' کمانڈر نواز نے بتایا۔ ''اس نے آپ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔''

''تشدد کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں خود اس سے مل کر سب کچھ معلوم کر لوں گی اور شاید اس کیلئے تشدد کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے' اس شخص سے یقیناً کوئی نہ کوئی اہم بات معلوم ہو سکتی ہے۔''

پھر میرے ایمان پر کمانڈر نواز نے مجھے اس کمرے کی چابی دے دی جہاں غیر ملکی کو رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ڈیوٹی روم سے نکل کر میں عمارت کے عقبی حصے میں پہنچ گئی۔

اس کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے جیسے ہی اندر قدم رکھا' اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ خلاف توقع اس غیر ملکی نے مجھ پر چھلانگ لگا دی تھی اور میرے گرتے ہی اچھل کر کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے جست بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ غالباً پہلے ہی سے کسی ایسے موقع کا منتظر تھا' مگر اسے شاید خبر نہیں تھی کہ اس عمارت سے نکلنا ہنسی کھیل بہرحال نہیں تھا۔ میں اسی لیے اس کی غیر متوقع حرکت سے جھنجلانے کے باوجود فکرمند نہ ہوئی اور فرش سے اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگی۔

پھر چند ہی لمحے بعد وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ سیل کا ایک مسلح محافظ اس غیر ملکی کی پشت پر گن رکھے کمرے میں داخل ہوا۔ غیر ملکی اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا۔ مسلح محافظ نے میرے اشارے پر غیر ملکی کی پشت پر زوردار لات ماری اور پھر کمرے سے نکل گیا۔ وہ غیر ملکی اوندھے منہ فرش پر گرنے کے بعد اب دوبارہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اس کے چہرے مہرے سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ امریکی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اسے انگریزی زبان میں مخاطب کیا۔ ''مسٹر! تم یقیناً بہت پھرتیلے ہو اسی لیے انتہائی صفائی کے ساتھ مجھے گرا کر کمرے سے نکل گئے۔ کمرے کا دروازہ اب بھی میں بند نہیں کروں گی۔ تم اسے میری طرف سے پیشکش سمجھ سکتے ہو کہ اب اگر دوبارہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں اس عمارت سے نکل جانے دوں گی۔ کوشش کرو' ممکن ہے تم کامیاب ہو جاؤ۔'' بے خبری میں کسی کو بھی اس طرح زیر کیا جا سکتا ہے جس

طرح تم نے مجھے زیر کیا۔"

اس دوران میں وہ فرش سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا اپنی بھوری آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر دائیں جانب واضح ابھار نظر آ رہا تھا۔ منہ کے بل چند لمحے پہلے فرش پر گرنے کے سبب سنبھلتے سنبھلتے اس کا سر زمین سے ٹکرا گیا تھا۔

"نہیں۔!" بالآخر وہ بول اٹھا اور اسی کے ساتھ اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ "میں دوبارہ یہ کوشش نہیں کرنا چاہتا...... سوری' ویری سوری...... مجھے معلوم نہیں تھا کہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے والی شخصیت عذرا خان کی ہو گی۔"

میں چونک اٹھی اور بولی۔ "تو تم مجھے پہچانتے ہو۔"

"ہاں مجھے تمہاری تصویر دکھائی گئی تھی۔" اس نے اعتراف کیا۔ "مجھے ایک بار تمہیں دیکھنے کی شدید خواہش تھی۔ میں نے تمہارا بہت نام سنا تھا۔ میرے دل میں تمہاری بہت عزت ہے۔"

"شاید اسی لیے تم میری کوٹھی پر دستی بم پھینکنے گئے تھے۔" میں چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"وہ سولومن کا حکم تھا جسے ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔" اس نے ایک اجنبی شخص کا نام لیا۔

"یہ سولومن کون ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اسے تم ڈاکٹر رچرڈ کا نائب سمجھ سکتی ہو۔ وہ تمہاری ہی تلاش میں ڈاکٹر رچرڈ کے حکم پر تم روز قبل یہاں پہنچا ہے۔" اس نے بتایا۔

"تم اپنے متعلق کچھ بتانا پسند کرو گے؟"

"ہاں۔" اس نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ "میرا نام جیفرسن ہے۔ میرے ساتھی مجھے جیف کہتے ہیں۔ جیکب جو قاہرہ میں شیخ سالم کے محافظوں کے ہاتھوں مارا گیا میرا بہت عزیز دوست تھا میرا دوست جیکب بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کی موت کا مجھے بہت افسوس ہے۔ میں نے اسی سے کئی بار تمہارا ذکر سنا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ جیکب کے دل میں تمہارے لیے یقیناً کوئی نرم گوشہ موجود تھا۔"

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ شخص کسی تشدد اور استفسار کے بغیر سب کچھ بتاتا چلا جا رہا تھا۔ میں بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ چہرے کے تاثرات اس کے الفاظ کا ساتھ دے رہے تھے میں نے ذرا توقف سے اسے مخاطب کیا۔ "جیف ! کیا تمہیں اعتراف ہے کہ تم بھی امریکی ایجنٹ ہو؟"

"ہاں' کیوں نہیں۔" اس نے بلا جھجک کہہ دیا۔ "اگر میں یہ اعتراف نہ کرنا چاہتا تو ڈاکٹر رچرڈ سولومن اور جیکب کا ذکر کیوں کرتا۔ پھر یہ بھی کہ میرے اعتراف نہ کرنے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ بہر حال اسی نتیجے پر پہنچتیں۔"

"لیکن اس اعتراف کے پس پشت یقیناً کوئی جذبہ کارفرما ہے جس کا ذکر ابھی تم نے نہیں کیا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"یقیناً!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں اس کھیل سے اب تھک گیا ہوں عذرا خان اور تمہاری پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ صرف تمہی مجھے تحفظ فراہم کر سکتی ہو۔"

"کس قسم کا تحفظ چاہتے ہو تم مجھ سے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اپنی زندگی کا تحفظ!" اس نے جواباً کہا۔ "اگر میں' ڈاکٹر رچرڈ کے احکام ماننے سے انکار کر دوں تو مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ دراصل جیکب کی موت کے بعد ہی سے میرا دل کھٹا ہو گیا ہے۔ مجھے اس زندگی سے نفرت ہو گئی ہے جو میں گزارنے پر مجبور ہوں۔ میں نے اسی لئے تمہارے آدمیوں سے کہا تھا کہ تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اگر واقعی تمہارا بیان درست ہے تو پھر ابھی کچھ دیر پہلے تم نے جو حرکت کی اسے کس خانے میں فٹ کیا جائے گا؟" میں بول اٹھی۔ "اگر تم مجھی سے ملنے کی خواہش مند تھے تو تمہیں فرار ہونے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے تھی۔"

"مجھے معلوم تھا عذرا خان کہ میں اس کوشش میں ناکام رہوں گا۔ اس حرکت کا مقصد محض یہ تھا کہ جب تمہیں اپنے آدمیوں سے یہ رپورٹ ملے گی تو یقیناً میری طرف متوجہ ہو گی۔"

جیفرسن کی اس دلیل نے مجھے کچھ زیادہ مطمئن نہیں کیا۔ چند لمحے کچھ سوچ کر میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ "جیف ! کیا تم میرے لیے کام کر سکتے ہو؟"

"کیا کام؟" اس نے پوچھا۔

"فرض کرو' میں تمہیں رہا کر دیتی ہوں اور تم پھر اپنے لوگوں کے درمیان پہنچ جاتے ہو' ایسی صورت میں کیا تم مجھے میرے خلاف اٹھائے جانے والے اقدامات سے قبل از وقت آگاہ کر سکتے ہو؟"

"نہیں عذرا خان!" وہ صاف گوئی سے بولا۔ "میں ایسا نہیں کر سکوں گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ صورتحال بدستور وہی رہے گی۔ دراصل اب میں واپسی ہی نہیں چاہتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہ کر ان کے خلاف کام کروں۔"

"مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم میرے ہی وفادار رہو گے؟"

"اس کی ضمانت آنے والا وقت ہی فراہم کر سکتا ہے بشرطیکہ تم مجھ پر اعتماد کر لو۔"

"تمہاری پیشکش پر میں غور کروں گی' لیکن فی الحال تم سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے تم میرے لیے سود مند ثابت ہو سکو۔"

میری بات سن کر اس کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔ پھر ممکن ہے کہ میں ڈاکٹر رچرڈ سے اپنا ایک پرانا حساب بھی بے باق کر سکوں۔ میری بیوی سوزی یقیناً بے وفا نہیں تھی' ڈاکٹر رچرڈ نے اسے بے وفائی پر آمادہ کیا تھا اسی لیے وہ مجھے چھوڑ گئی۔ اب وہ قاہرہ میں ڈاکٹر رچرڈ کے ساتھ ہے۔ تم نے تو اس خبیث بوڑھے کو دیکھا ہو گا۔ وہ حیرت انگیز شیطانی قوتوں کا مالک ہے۔ سوزی کو اس نے انہی شیطانی قوتوں کے بل بوتے پر اپنا غلام بنا رکھا ہے اور...... اور میں آج...... آج بھی سوزی کو نہیں بھول سکا...... میں اسے اب بھی اسی شدت سے چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے جیفرسن کی آواز بھاری ہو گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی تیرتی دیکھی۔

"ٹھیک ہے جیف' میں سوچوں گی تمہارے بارے میں ! مجھے امید ہے کہ اب کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے اور میرے آدمیوں سے تعاون کرو گے۔ تمہارے علم میں جو کچھ ہے یقیناً تم انہیں بتانے سے

گریز نہیں کرو گے۔'' یہ کہہ کر میں اس کمرے سے نکل آئی اور اسے دوبارہ مقفل کر دیا۔
جیفرسن سے گفتگو کرتے ہوئے میری توجہ اس کے ذہن کی طرف مبذول رہی تھی۔ اس نے ا
کچھ کہا تھا' بڑی حد تک قطعی درست تھا۔ میں اس کا ذہن پڑھ چکی تھی۔ چند باتیں جو ابھی اس نے مع
مجھے نہیں بتائی تھیں' وہ بھی اس طرح میرے علم میں آ چکی تھیں۔ فی الحال تو اس کے خیالات یہی تھے جن'
اس نے اظہار کیا تھا۔ لیکن آئندہ ان خیالات میں کوئی بھی نئی تبدیلی پیدا ہو سکتی تھی۔ میں اسی سب
تذبذب میں تھی اور اس کے متعلق کسی فیصلے تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ جیفرسن سے گفتگو کرنے اور اس کا ذہ
پڑھنے کے بعد واقعی چند اہم باتیں میرے علم میں آ گئی تھیں۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں ان
سے فائدہ اٹھانے کے متعلق سوچ رہی تھی کہ کمانڈر نواز نے انٹرکام پر مجھے سرفراز کی طرف سے موصو
ہونے والی تازہ ترین رپورٹ سے آگاہ کیا۔ رپورٹ کے مطابق شہریار آج رات کی ایک فلائٹ سے اسلا
آباد روانہ ہو رہا تھا۔

''اس کے ساتھ ہی سرفراز نے بتایا ہے کہ شہریار ایک غیر ملکی سولومن سے بھی ملا ہے۔ سولومن
فون کر کے اس نے اپنی کوٹھی بلایا تھا۔ فون کرنے ہی کے سبب اس غیر ملکی کا نام سرفراز کے علم میں آیا تھا۔
اس غیر ملکی سے شہریار کی یہ ملاقات تقریباً پون گھنٹے رہی۔ وہ غیر ملکی ابھی کچھ دیر پہلے شہریار سے مل کر گ
ہے۔'' کمانڈر نواز نے مزید بتایا۔

''تو گویا شہریار اپنا چارج اسے دے کر جا رہا ہے۔'' میرا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ پھر مجھے فو
ہی یہ خیال آ گیا کہ کمانڈر نواز میری اس بات سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکے گا۔ میں اسی لیے اسے سولومن
کے بارے میں بتانے لگی تھی۔ ''سولومن' ڈاکٹر رچرڈ کا نائب ہے اور تین دن قبل ہی اس کی ہدایات
یہاں پہنچا ہے۔'' یہ کہہ کر مختصراً میں نے جیفرسن سے حاصل ہونے والی معلومات کا ذکر کیا۔

''آپ گویا اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب رہیں۔'' کمانڈر نواز بولا۔

''اس کی نوبت نہیں آئی۔ وہ خود ہی سب کچھ بتاتا چلا گیا۔ اس کا کیس ذرا مختلف ہے۔ م
اس سلسلے میں تم سے تفصیلی بات کروں گی۔ فی الحال صرف اتنا جان لو کہ وہ اپنے ساتھیوں سے برگشتہ ہو کر
ہمارا ساتھ دینے پر راضی ہو گیا ہے۔''

''اگر واقعی ایسا ہی ہے اور وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا تو ہم اسے استعمال......''

''یہ بھی ممکن نہیں۔'' میں نے کمانڈر نواز کی بات کاٹ دی۔ ''میں خود بھی اسی امکان کے پیش
نظر اس سے بات کر چکی ہوں۔ ایسا کیوں ممکن نہیں' اس کیلئے تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے' جب آپ مناسب سمجھیں۔'' کمانڈر نواز بولا۔

''ہاں سرفراز کو ہدایت کر دو کہ اگر اب سولومن نظر آئے تو اس پر نظر رکھی جائے۔ ویسے مشکل
ہی ہے کہ وہ دوبارہ نظر آ سکے۔ محض احتیاطاً تم اسے یہ ہدایت دے سکتے ہو۔''

''کیا جیفرسن کو یہ علم نہیں کہ سولومن کا قیام کہاں ہے؟'' کمانڈر نواز سے پوچھا۔

''حیرت ہے کمانڈر کہ تم یہ سوال کر رہے ہو۔ سولومن ایسے لوگ تو اپنے سائے سے بھی چو
اور محتاط رہتے ہیں۔ وہ بھلا جیفرسن کو یہ علم کیسے ہونے دیتا کہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ بہرحال جیفرسن سے م

ایسی باتیں ضرور معلوم ہوئی ہیں جن کی روشنی میں سولومن کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ میں فی الحال اسی سلسلے میں غور و فکر کر رہی ہوں' جب کسی نتیجے تک پہنچ جاؤں گی تو تمہیں مطلع کر دوں گی۔''

پھر میں اس رات دیر تک اسی مسئلے پر غور کرتی رہی کہ سولومن سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے؟

دوسرے دن صبح اٹھ کر میں نے ناشتہ کرتے ہوئے حسب معمول اخبار اٹھا لیا۔ عموماً میں ناشتے کے وقت ہی اخبار کا مطالعہ کرتی تھی۔ اخبار کے پہلے ہی صفحے پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے وہ دو کالمی خبر نظر آ گئی جس کے بعد میں گویا ناشتہ کرنا بھول گئی۔ وہ خبر میرے لیے اتنی ہی حیران کن اور چونکا دینے والی تھی۔

اس خبر کے مطابق گزشتہ رات میری فرم عذرا انٹرپرائزز پر پولیس نے چھاپہ مارا تھا اور وہاں سے غیر قانونی اسلحہ برآمد کیا تھا۔ میری فرم کی منیجر عارفہ کو حراست میں لے لیا گیا تھا اور پولیس اب میری تلاش میں تھی۔

میں یہ خبر پڑھ کر سناٹے میں رہ گئی۔ میرے حریف شہریار نے گویا جاتے جاتے بھی کام دکھا دیا تھا۔

میں ایک بار پھر وہ خبر غور سے پڑھنے لگی۔ عارفہ کی گرفتاری نے مجھے شدید ذہنی دھچکا پہنچایا تھا۔ اپنے حریفوں کی اس حرکت کا مقصد سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ اس طرح مجھے میری محفوظ پناہ گاہ سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔

☆......☆......☆

دوبارہ خبر پڑھ کر میں نے اخبار میز پر رکھ دیا۔ اسی وقت انٹر کام کی بیل بج اٹھی۔ دوسری جانب کمانڈر نواز کا نائب عثمانی تھا۔ اس نے بھی مجھے اسی خبر سے آگاہ کیا۔

''ہاں میں پڑھ چکی ہوں وہ خبر۔'' میں نے حتیٰ الامکان پرسکون آواز میں جواب دیا۔

''اس سلسلے میں کوئی اقدام.....؟ کوئی حکم؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی' مجھے سوچنے دو۔'' یہ کہہ کر میں نے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا۔

مجھے علم تھا کہ آپریشن سیل کے ارکان پوری طرح باخبر اور چوکنا رہتے ہیں۔ ان کی تربیت اسی انداز میں کی گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ذرا سی بھی غفلت جواب طلبی کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ الگ بات کہ ایسے مواقع شاذ ہی آتے تھے۔

عثمانی یقیناً واقف تھا کہ وہ خبر ایسی نہیں جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ میں اس سلسلے میں فوری طور پر کوئی قدم ضرور اٹھاؤں گی۔ اس نے اسی لیے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ہر چند کہ صورت حال ہنگامی نوعیت کی تھی مگر جلد بازی میں اٹھایا جانے والا کوئی قدم آئندہ میرے لئے مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے مسئلے کے ہر ممکنہ پہلو پر غور کر لینا ضروری سمجھا تھا۔

کیسی عجیب بات تھی کہ میں جو قانون شکن افراد اور شر پسندوں کے خلاف تھی' مجھے ہی قانون شکن اور شر پسند قرار دے دیا گیا تھا! اس خبر کی اشاعت سے میری کاروباری ساکھ کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ ہر طبقے میں کاروباری رقیب اور حاسد ہوتے ہیں لیکن جس طبقے سے میرا تعلق تھا' وہ کچھ زیادہ ہی اس مرض میں مبتلا تھا۔ میرے بھی کچھ کاروباری رقیب تھے۔ ان کیلئے یقیناً یہ خبر باعث مسرت رہی ہو گی۔ ایسی صورت میں یہ اور بھی ضروری تھا کہ میری پوزیشن جلد سے جلد صاف ہو جائے۔

مجھے یقین تھا کہ میرے گرد سازش کا یہ نیا جال بچھانے والی شخصیت نچلی سطح کی نہیں ہو سکتی' بات بہت اوپر سے چلی ہو گی۔ میرے نزدیک اسی لئے اس کا توڑ بھی اوپری سطح ہی پر ممکن تھا۔ عموماً میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ مجھے ان بااثر و بااقتدار شخصیات کا سہارا نہ لینا پڑے جنہیں میرے نیک مقاصد پر پختہ یقین تھا اور جو میری پشت پناہ بھی تھیں۔ اس کے باوجود کبھی کبھی ایسے ناگزیر مواقع آ جاتے کہ میرے پاس کوئی اور چارہ کار نہ ہوتا۔ موجودہ صورت حال کا تقاضا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

کچھ دیر غور خوض کے بعد ٹیلی فون پر میں ایک ایسی ہی اہم شخصیت سے رابطہ قائم کرنے میں

کامیاب ہو گئی۔ ان دنوں یہ اہم سیاسی شخصیت وزیر داخلہ کے عہدے پر فائز تھی اور ملک کے شمالی صوبے پر اس کا خاصا اثر تھا۔ یہ شخصیت قائداعظمؒ کے رفیقوں اور تحریک پاکستان کے حوالے سے بھی جانی پہچانی جاتی تھی۔ اس شخصیت کا قیام گزشتہ دو روز سے کراچی ہی میں تھا۔ اخبارات کے مطالعے سے یہ بات میرے علم میں تھی۔

یہ جاننے کے بعد کہ انہیں ٹیلی فون کرنے والی میں ہوں انہوں نے شفقت آمیز انداز میں مجھے ڈانٹا۔ ''کہاں ہو تم اتنے دن سے! اور کیا کرتی پھر رہی ہو؟ تمہاری فرم کے بارے میں ابھی میں نے ایک ناقابل یقین خبر پڑھی ہے۔ کیا چکر ہے یہ.....؟ اور ہاں.....'' انہوں نے مجھے بولنے کا موقع دیئے بغیر مزید کہا۔ ''یہ آج کل کیا ہو رہا ہے کراچی میں؟ اور تم اتنی غافل کیوں بیٹھی ہو؟ خارجہ امور میں صدر مملکت کے مشیر شہریار پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور اس سے چند ماہ پہلے بھی اسی شہر میں صدر کے ایک اور مشیر شیخ مجید پر بھی قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں کئی بار میں نے تم سے رابطہ قائم کرنا چاہا..... بلکہ ابھی اخبار میں یہ خبر پڑھ کر کہ پولیس نے تمہاری فرم پر چھاپہ مار کر غیر قانونی اسلحہ برآمد کیا ہے' میں تمہیں فون کرنے والا تھا۔'' پھر شاید انہیں خود ہی یہ احساس ہو گیا کہ وہ مجھے کچھ بولنے کا موقع نہیں دے رہے اسی لئے بولے۔ ''ہاں تم کہو اس وقت کس لئے فون کیا ہے مجھے؟''

''مجھے آپ سے صرف ایک درخواست کرنا ہے کہ میری فرم کی منیجر کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ اسی کے ساتھ خود میری بھی ضمانت قبل از گرفتاری قبول کر لی جائے۔'' میں نے مختصراً اپنا مدعا بیان کر دیا۔ میں فون پر اس وقت تفصیلی گفتگو سے دانستہ گریز کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے..... ہو جائے گا ایسا مگر..... اتنی چھوٹی سی بات کے لئے تم نے مجھے فون کیا.....! کچھ سمجھا نہیں میں.....! یہ کام تو کوئی.....'' انہوں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ان کے لہجے میں الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

دوسری طرف خاموشی رہی تو میں بول اٹھی۔ ''اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو میں کبھی آپ کو زحمت نہ دیتی۔ مجھے شک ہی نہیں یقین ہے کہ ڈوریاں اوپر سے ہلائی گئی ہیں۔ مقامی انتظامیہ اس سلسلے میں بے قصور ہے۔ آپ نے ابھی مجھ سے جو کچھ دریافت کیا تھا وہ بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔''

''لیکن کون لوگ ہیں وہ جو یہ سب کچھ کر رہے ہیں؟ تمہیں کچھ تو اندازہ ہو گا کہ تمہارے گرد یہ جال کس نے بنا ہے؟ جہاں تک میں اندازہ لگا سکتا ہوں آج کل تم انہی لوگوں سے نبرد آزما ہو اور انہوں نے ہی تمہیں پھانسنے کے لئے غیر قانونی اسلحہ والی چال چلی ہے' مگر وہ..... وہ لوگ کیا اتنے بااثر ہیں کہ انتظامیہ پر اثر انداز ہو سکیں؟ اور..... اور تم بھی اتنی مجبور ہو جاؤ کہ تمہیں ذرا سے معاملے میں مجھے فون کرنا پڑے!''

''جی ہاں' کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔'' میں نے واضح اور تفصیلی جواب نہ دیتے ہوئے محض اتنا کہا۔ ''بہر حال وہ لوگ میری نظر میں ہیں اور بہت جلد انہیں بے نقاب کر دیا جائے گا۔''

''اس سلسلے میں تم اگر مجھ سے کسی قسم کا تعاون چاہو تو بلا جھجک کہہ سکتی ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں کہ کسی سبب تم دانستہ اس وقت تفصیلات بتانے سے گریز کر رہی ہو!''

میں نے تعاون کی پیشکش پر ان کا شکریہ ادا کیا پھر بولی۔ ''حالات سازگار ہوتے ہی کوشش کروں گی کہ آپ سے مل لوں۔ اس ملاقات میں شاید میں تفصیلی طور پر صورت حال کی وضاحت کر سکوں۔ فی الحال صرف اتنا عرض کروں گی کہ یہ معاملہ قدرے سیاسی نوعیت کا ہے۔''

میرا خیال تھا کہ میری اس گفتگو کے بعد وزیر داخلہ مجھے مزید کچھ کہنے پر مجبور نہیں کریں گے مگر شاید غلطی مجھی سے ہوگئی تھی۔ مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ معاملہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ انہوں نے فوراً مجھ سے وضاحت طلب کر لی۔ ''سیاسی نوعیت سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

مجبوراً مجھے مختصراً انہیں ان حالات سے آگاہ کرنا پڑا جو میرے علم میں آ چکے تھے۔ اس کے باوجود میں نے احتیاطاً کسی کا نام نہیں لیا۔ میں بولی۔ ''یہ تو خود آپ کے علم میں ہے کہ دائیں اور بائیں بازو کے نظریات رکھنے والے ایک دوسرے سے نظریاتی اختلافات رکھنے کے سبب متصادم رہتے ہیں۔ موجود برسر اقتدار حکومت میں بھی دونوں نظریات کے حامل افراد شامل ہیں۔ ان دنوں میں صورت حال کچھ یوں ہے کہ اپنی سیاسی بالادستی کی خاطر دائیں بازو کے کچھ اہم افراد طاقت و اقتدار کے نشے میں بہک گئے ہیں۔ وہ اپنے حریفوں کو راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ شیخ مجید پر ہونے والے قاتلانہ حملے اسی سلسلے کی کڑی تھی۔''

''لیکن شہریار پر قاتلانہ حملے کو تم کس خانے میں فٹ کرو گی؟ اس کا تعلق تو بائیں بازو سے نہیں۔'' وہ درمیان میں بول اٹھے۔

''آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ شہریار پر قاتلانہ حملہ محض ایک ڈھونگ تھا بلکہ سرے سے اسے قاتلانہ حملہ ہی نہیں کہا جا سکتا۔'' میں نے کہا۔

''تم اتنے یقین سے یہ بات کس طرح کہہ سکتی ہو! ممکن ہے اس میں بائیں بازو کا ہاتھ ہو۔''

میں دل ہی دل میں ہنسی کیوں کہ مجھ سے زیادہ بہتر کون یہ بات جان سکتا تھا کہ اس سلسلے میں بائیں بازو نے کوئی کارروائی نہیں کی! شہریار کو مزید مجرمانہ سرگرمیوں سے روکنے اور خوف زدہ کر کے کراچی سے اسلام آباد جانے پر مجبور کرنے میں خود میرا ہاتھ تھا۔ میں نے وزیر داخلہ کو یہ بات تو نہیں بتائی مگر اتنا ضروری کہا۔ ''کیوں کہ ان معاملات میں براہ راست خود میں بھی دلچسپی لے رہی ہوں اسی لئے مجھے تمام حالات کا علم ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مجھے اس پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ دائیں بازو کی انتہا پسندی اور قانون کو ہاتھ میں لینے ہی کے سبب مجھے اس کے آڑے آنا پڑا ہے۔ اسی کے نتیجے میں وہ میرے خلاف مختلف اقدامات کر رہے ہیں۔ انہی میں تازہ ترین اقدام میری فرم سے غیر قانونی اسلحہ برآمد کرایا جانا ہے۔''

''میں تمہاری حوصلہ شکنی تو نہیں کروں گا مگر ذاتی طور پر تم سے خلوص و محبت کے سبب صرف یہ کہوں گا کہ اس خطرناک کھیل سے الگ رہو تو بہتر ہے۔ اس کے تانے بانے بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ آگے چل کر شاید کسی مرحلے پر تمہیں اپنی بے بسی کا احساس ہو۔ مجھے خود اپنے ذرائع سے بھی اس سلسلے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ تمہاری گفتگو سے اس کی مزید تصدیق ہو گئی۔ دائیں اور بائیں بازو کی سیاسی کشمکش اور تصادم کے نتیجے میں ہرگز میں یہ نہیں چاہوں گا کہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ تمہاری

حب الوطنی اور نیک مقاصد پر مجھے جس طرح پہلے یقین تھا آج بھی ہے لیکن یہ سیاسی معاملات ہیں جو ملک کی خارجہ پالیسی پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں اس لئے ان معاملات میں تمہاری مداخلت خود تمہارے لئے شاید تشویش کا سبب بن جائے۔'' انہوں نے مجھے ایک مشفق بزرگ کی حیثیت سے سمجھایا۔ ان کے جذبات و احساسات یقیناً میرے لئے قابل قدر تھے۔ ان کے لہجے سے خلوص اور اپنائیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

خلوص اور اظہار میں ہمدردی پر میں نے ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کیا اور اسی کے ساتھ کہا۔ ''آپ میری طرف سے قطعی فکر مند نہ ہوں۔ مجھے اپنے دائرہ کار اور حدود کا اندازہ ہے۔ لاقانونیت، شر پسندی اور اپنے ملک کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا تدارک کرنے میں کسی بھی صورت میرے قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ خواہ مجھے بڑے سے بڑا نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ آپ ہی ایسے بزرگوں کی محبت و شفقت کے سائے میں مجھے اب تک کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا اور انشاء اللہ آئندہ بھی مجھے کامیابی ہی نصیب ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے میرا لہجہ قدرے پر جوش ہو گیا۔ میرے ملک کے خلاف سازشیں کرنے والے چاہے کتنے ہی بااثر اور طاقت ور ہوں میں ان کے آڑے آتی رہوں گی، ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملاتی رہوں گی!''

''خدا تمہارا حوصلہ بلند رکھے!'' انہوں نے مجھے دعا دی پھر تاکیداً کہا۔ ''پھر کہہ رہا ہوں کہ کسی بھی مرحلے پر میری مدد کی ضرورت پیش آئے تو اس سے ہرگز گریز نہ کرنا! میں انتظامیہ کے اعلیٰ حکام کو بھی اس سلسلے میں آج ہی ہدایات جاری کر دوں گا کہ وہ تم سے ہر ممکن تعاون کریں۔''

''بہت بہت شکریہ!'' یہ میرے دل کی آواز تھی، رسمی الفاظ نہیں تھے۔ اسی کے ساتھ میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس حد تک میرا فیور کریں گے۔ یقیناً وہ میری قدر کرتے تھے اور انہیں میری نیک نیتی پر مکمل یقین تھا۔ ان کے متوقع اقدام سے میری راہ کی بہت سی رکاوٹیں ختم ہو گئی تھیں۔ اب آئندہ شہریار مقامی انتظامیہ کو با آسانی میرے خلاف استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ وزیر داخلہ سے اس گفتگو کے بعد میرے دل کو بہت تقویت ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے اپنی فرم کی منیجر عارفہ کی گرفتاری اور فرم پر چھاپہ پڑنے کی خبر پڑھ کر جو مجھے ذہنی دھچکا لگا تھا اس کا اثر تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اب میں اپنے آئندہ اقدامات پر غور کر رہی تھی۔ کچھ دیر میرا توقف اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس دوران میں وزیر داخلہ متعلقہ حکام کو ضروری ہدایات اور حکم دے سکیں تاکہ مجھے کئی غیر ضروری قباحت نہ ہو۔

ایسے معاملات میں جب پولیس کی نچلی سطح کے کارندے اپنے اوپر والوں کے احکام پر کسی کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو پھر ان سے گلوخلاصی تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔ ان کے پاس ہزار حیلے ہزار بہانے ہوتے ہیں۔ پوچھ گچھ اور ضروری تفتیش کی آڑ میں وہ ملزم کو عدالت کے روبرو پیش ہی نہیں کرتے کہ اس کی ضمانت ہو سکے۔ پولیس جب کیس بنا کر عدالت میں چالان ہی پیش نہیں کرے گی تو ضمانت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے! ملزموں سے ان کے جرائم کا اعتراف کرانے کیلئے پولیس کو جو قانونی سہولت حاصل ہے اسے جا اور بیجا دونوں ہی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ عارفہ کی ضمانت کے سلسلے میں بھی مجھے

یہی خدشہ درپیش تھا جس کا اب سد باب ہو گیا تھا۔ مقامی انتظامیہ پر شہریار یا اس کے گرگوں کا اثر وزیر داخلہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا۔

جب کچھ دیر گزر گئی تو میں نے اپنے ان اقدامات پر عمل شروع کر دیا جن پر غور و خوض کر چکی تھی۔

عارفہ کی ضمانت کے لئے میں نے سیل ہی کے ایک سینئر رکن ریٹائرڈ شبیر احمد کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے جب آپریشن سیل قائم کیا تھا تو کرنل شبیر بھی ان افراد میں شامل تھا جنہوں نے سیل سے وابستہ دوسرے ارکان کو تربیت دی تھی۔ سیل سے وہ اب بھی وابستہ تھا مگر اس کی عمر کو مدنظر رکھتے ہوئے میں ہنگامی حالات ہی میں اسے طلب کرتی تھی یا پھر ایسے مواقع پر جب مجھے سیل کے سینئر ارکان سے کوئی اہم مشورہ کرنا ہوتا تھا۔ کرنل شبیر کے انتخاب کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کا شمار صاحب حیثیت افراد میں ہوتا تھا۔ یوں بھی کبھی وہ میرے تنخواہ دار ملازمین میں شامل نہیں رہا۔ اس نے اعزازی طور پر بغیر کسی معاوضے کے سیل کو اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ اس کے نزدیک وہ کار خیر تھا۔ کرنل شبیر کے علاوہ اور بھی کئی سینئر ارکان ایسے تھے جو بلا معاوضہ سیل سے وابستہ تھے۔ میری نظر میں ایسے افراد کی بہت عزت تھی۔ بلا معاوضہ کام کرنے کے باوجود وہ کبھی میرے حکم سے روگردانی نہیں کرتے تھے۔ انہیں مجھ پر بھرپور اعتماد تھا کہ میں سیل کے ارکان کو اپنے ذاتی مفادات کے حصول میں بھی استعمال نہیں کروں گی۔ سیل سے دیرینہ وابستگی کے سبب ایسے افراد کمانڈر نواز سے وقتاً فوقتاً رابطہ قائم کر کے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ کمانڈر نواز خود بھی ان افراد کو پیش آنے والے حالات سے مطلع کرتا رہتا تھا۔

سب سے پہلے میں نے کرنل شبیر ہی سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ کافی عرصے کے بعد فون پر میری آواز سن کر اس نے مسرت کا اظہار کیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اس سے اپنا مدعا بیان کر دیا' پھر متعلقہ تھانے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''پولیس آپ کے ساتھ تعاون کرے گی۔ پہلے آپ تھانے چلے جائیں اور کہیں کہ آج ہی عارفہ کا چالان عدالت میں پیش کر دیا جائے۔ میں اپنے لیگ ایڈوائزر رائے کے صدانی کو بھی فون کر رہی ہوں۔ آپ تو واقف ہیں اس سے! کورٹ پہنچنے سے پہلے اس سے بھی مل لیں تاکہ وہ معاونت کر سکے۔ ضمانت کے لئے ضروری کاغذات وغیرہ ساتھ لے جانا نہ بھولیں۔'' آخری جملہ میں نے محض کرنل شبیر کی عمر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ پینسٹھ سال سے اوپر تھا اور بڑھاپے میں عموماً حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔

کرنل شبیر کو ضروری ہدایات دے کر میں نے اپنے لیگ ایڈوائزر رائے کے صدانی سے فون پر بات کی اور اسے کرنل شبیر کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی آج کے اخبار میں میری فرم پر چھاپہ مارے جانے کی خبر پڑھ چکا تھا۔ خبر کے مطابق کیوں کہ پولیس میری تلاش میں بھی تھی اس لئے ایڈووکیٹ صدانی نے وہی مشورہ دیا جس کا فیصلہ میں پہلے ہی کر چکی تھی۔

''میں نے بھی ضمانت قبل از گرفتاری ہی کے متعلق سوچا تھا لیکن فی الحال یہ اتنا ضروری نہیں۔ پہلے میری منیجر عارفہ کی ضمانت ہو جانے دیں۔ میں نے ضروری سمجھا تو آج ورنہ پھر کل اپنی ضمانت بھی کرا لوں گی۔ جہاں تک میرا خیال ہے ضمانت کیلئے کورٹ میں میری موجودگی ضروری ہو گی!'' میرا لہجہ

تصدیق طلب تھا۔

''جی ہاں۔'' ایڈووکیٹ صدانی نے میرے خیال کی تائید میں کہا۔

میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''خیر اس سلسلے میں جو بھی فیصلہ میں نے کیا آپ کو مطلع کر دوں گی۔ خدا حافظ!'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اپنی ضمانت کرانے کے سلسلے میں ابھی تک میں تذبذب کا شکار تھی کہ آیا فوری طور پر یہ قدم اٹھانا مناسب ہو گا بھی یا نہیں! اس تذبذب کا سبب یہ تھا کہ میں اپنے حریفوں کے اصل مقصد سے آگاہ تھی۔ وہ بھی تو خود بھی چاہتے تھے اور اسی کے لئے انہوں نے یہ سارا جال پھیلایا تھا کہ میں کسی طرح اپنی محفوظ پناہ گاہ سے باہر آ جاؤں۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ میں میک اپ کا سہارا بھی نہیں لے سکتی تھی۔ کورٹ میں مجھے بہ حیثیت عذرا خان ہی پیش ہونا تھا۔ میرے حریف اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔

ایڈووکیٹ صدانی سے فون پر بات کرنے کے بعد میرے ذہن میں ایک اور خدشے نے سر ابھارا۔ غیر قانونی اسلحہ برآمد کرنے کے بعد پولیس میری فرم کے دفتر کو سیل بھی کر سکتی تھی۔ پولیس بہرحال اس کی مجاز تھی۔ میرے حریف کی ایک ہی شاطرانہ چال نے بہت سی الجھنوں اور پریشانیوں کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اپنے خدشے کی تردید یا تصدیق کیلئے میں نے عثمانی کو احکام دے دیئے کہ وہ اس سلسلے میں جلد از جلد مجھے ضروری معلومات فراہم کرے۔ ان معلومات کے بعد ہی میں سدباب کے لئے کوئی قدم اٹھا سکتی تھی۔

پھر میرا خدشہ درست ہی ثابت ہوا۔ پولیس نے واقعی میرے دفتر کو سیل کر دیا تھا گویا اب میرا دفتر پولیس کی تحویل میں تھا۔ رپورٹ دینے میں عثمانی نے زیادہ تاخیر نہیں کی تھی۔ اسی دوران میں مجھے عارفہ کے گھر والوں کا بھی خیال آیا۔ عارفہ کی گرفتاری سے اس کے گھر والے یقیناً فکر و تشویش میں مبتلا ہوں گے۔ میں نے اس کے گھر فون کیا تو میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ عارفہ کی چھوٹی بہن نے بتایا کہ پولیس والے کسی کو باجی سے ملنے نہیں دے رہے۔

میں نے اسے تسلی دی کہ جلد ہی عارفہ کی ضمانت ہو جائے گی۔ انشاء اللہ دوپہر تک وہ گھر پہنچ جائے گی' میں نے اس کا بندوبست کر دیا ہے۔

عارفہ کی بہن ہی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے والد اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ وہ اپنے طور پر عارفہ کی رہائی کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔

عارفہ کے گھر فون کئے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ انٹرکام پر عثمانی نے مجھے خبر دی۔ ''کرنل شبیر آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میں لائن دے رہا ہوں' بات کیجئے!''

کرنل شبیر دوسرے فون پر تھا اس لئے عثمانی کو میرے ٹیلی فون سیٹ سے اس کا رابطہ قائم کرنا پڑا تھا۔

میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا اور بولی۔ ''جی فرمایئے! کوئی خاص بات؟''

''میں ابھی ابھی متعلقہ تھانے سے ہو کر آ رہا ہوں۔'' کرنل شبیر کی آواز سنائی دی۔ ''تھانے

میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ میں نے عارفہ کی ضمانت کے بارے میں ایس ایچ او سے بات کی تو اس نے بتایا کہ ابھی ایف آئی آر (فرسٹ انویسٹی گیشن رپورٹ) مرتب نہیں ہوئی۔ ایف آئی آر کے بغیر عدالت میں عارفہ کا چالان پیش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مجھے کچھ نروس سا اور گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ میرے استفسار پر وہ بولا کہ پولیس ابھی تفتیش کر رہی ہے۔ ممکن ہے کہ پولیس نے جو غیر قانونی اسلحہ برآمد کیا ہے اس کا تعلق عذرا انٹر پرائزز سے ثابت نہ ہو اور ضروری پوچھ گچھ کے بعد فرم کی منیجر عارفہ کو چھوڑ دیا جائے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آج دوپہر تک صورت حال واضح ہو جائے گی۔ پھر میں فون پر یا براہ راست اس سے مل کر اس سلسلے میں معلوم کر سکتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ اب شاید ضمانت کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”پولیس عارفہ کا بیان لے کر چھوڑ دے گی۔ پھر بھی آپ دوپہر کو فون پر اس کی تصدیق ضرور کر لیں۔ ایس ایچ او سے بات کر کے آپ نے کیا اندازہ قائم کیا؟ کیا میرا قیاس درست ہے۔“

”ناکٹی نائن پرسینٹ!“ کرنل شبیر جواباً بولا۔ اس کے باوجود میں آپ کی ہدایت کے مطابق دوپہر کو تھانے فون کروں گا۔ پھر جو بھی معلوم ہوا اس سے آپ کو مطلع کر دوں گا۔“

”مجھ سے رابطہ قائم نہ ہونے کی صورت میں آپ عثمانی کو اپنی رپورٹ دے سکتے ہیں۔“ میں نے احتیاطاً کہہ دیا۔

”بہتر ہے۔“ اس نے کہا۔

پھر اسے خدا حافظ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

پولیس کے رویے میں اچانک جو تبدیلی آئی تھی وہ میرے لئے غیر متوقع یا ناقابل فہم نہیں تھی۔ اس سلسلے میں یقیناً اوپر سے احکام آ چکے تھے۔ یہ تو ظاہر ہی تھا کہ میرے خلاف قائم کیا جانے والا کیس بے بنیاد اور غلط تھا۔ اس کے لئے پولیس نے کیا طریقہ کار اختیار کیا ہو گا اس سے قطع نظر یہ حقیقت تھی کہ متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او ذہین اور چالاک تھا۔ اس نے ایف آئی آر درج نہیں کی تھی ورنہ جھوٹا کیس بنانے کے سلسلے میں خود اس کی نوکری خطرے میں پڑ جاتی۔ اونچی سطح پر ہونے والی کشمکش میں وہ غریب ناحق مارا جاتا۔ اس نے بھی اپنے کسی ”اوپر والے“ ہی کے ایما پر یہ قدم اٹھایا ہو گا۔ ایسے معاملات میں جب اعلیٰ سطح تک بات پہنچ جاتی ہے تو ”اوپر والے“ عموماً نیچے والوں کو قربانی کا بکرا بنا دیتے ہیں اور خود لاتعلق ہو جاتے ہیں۔

انہی حالات کے پیش نظر مجھے یقین تھا کہ کیس کا رخ بدل جائے گا۔ پھر یہی ہوا بھی۔ اسی روز دوپہر سے پہلے میری فرم کی منیجر کو رہا کر دیا گیا‘ میرے دفتر پر لگائی جانے والی سیل توڑ دی گئی اور پھر دوسرے دن اخبارات میں جو خبر شائع ہوئی اس نے یہ قصہ ہی ختم کر دیا۔ پولیس نے میری فرم کو اور مجھے غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے الزام سے بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔ خبر کی تفصیل یہ تھی کہ اس سلسلے میں پولیس کو ایک گمنام کال موصول ہوئی تھی‘ اسی کے بعد یہ کارروائی عمل میں لائی گئی تھی۔ تفتیش کے بعد معلوم ہوا ہے کہ پولیس نے جہاں سے غیر قانونی اسلحہ برآمد کیا تھا‘ عمارت کا وہ حصہ عذرا انٹر پرائزز کے دفتر کی حدود میں نہیں آتا۔ عذرا انٹر پرائزز کے دفتر سے ملحق ایک کامن باتھ روم میں پولیس کو یہ اسلحہ ملا تھا۔ یہ غیر

قانونی اسلحہ دو ریوالوروں اور چند گولیوں پر مشتمل تھا جسے ایک چرمی تھیلے سے برآمد کیا گیا تھا۔ پولیس سرگرمی سے اس شخص کو تلاش کر رہی ہے جو اس واقعے کا ذمے دار ہے۔ ضروری پوچھ گچھ کے بعد گزشتہ روز ہی پولیس نے عذرا انٹر پرائزز کی منیجر عارفہ کو بھی رہا کر دیا تھا۔

مندرجہ بالا خبر کی اشاعت سے میری پوزیشن صاف ہو گئی تھی۔ اب مجھے ضمانت قبل از گرفتاری کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرے دشمنوں کا منصوبہ قطعی طور پر ناکام ہو گیا تھا۔ وہ مجھے میری محفوظ پناہ گاہ سے باہر نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ اب میری باری تھی۔ میں ڈاکٹر رچرڈ کے نائب سولومن کو بھولی نہیں تھی۔ وہ میری ہی تلاش میں کراچی آیا تھا۔ باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن کا ذہن پڑھ کر مجھے کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئی تھیں جن سے فائدہ اٹھا کر سولومن کا سراغ لگایا جا سکتا تھا لیکن اس سلسلے میں ابھی میں کسی فیصلے تک نہیں پہنچی تھی۔

میری نظر میں سولومن کا سراغ لگانے کے کئی اسباب تھے۔ یہ پہلا سبب تو یہی کہ وہ بہر حال ایک غیر ملکی ایجنٹ تھا‘ اس کی سرگرمیاں میرے ملک کے مفاد میں نہیں تھیں۔ دوسرا سبب یہ کہ اس کا سراغ لگانے کے بعد مجھے ڈاکٹر رچرڈ کے آئندہ منصوبوں کا علم ہو سکتا تھا۔ میں اپنے ذہن کی غیر معمولی صلاحیتوں سے کام لے کر سب کچھ معلوم کر لیتی۔ ایسی صورت میں اپنے حریفوں کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملانا میرے لئے زیادہ آسان ہوتا۔ سولومن کا سراغ ملنے کے بعد میں خود اپنے خلاف کئے جانے اقدامات کا تدارک بھی کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اپنے ملک سے فرار ہونے پر بھی مجبور کر سکتی تھی۔ میرے ملک میں اس کا زیادہ دن قیام کسی صورت میں بہتر نہیں تھا۔

انہی تمام اسباب کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے سولومن سے نبرد آزما ہونے کے لئے اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل مرتب کر لیا۔

اسی روز میں نے ابرار ٹیڈی کے بارے میں ایک فیصلہ کیا تھا۔ وہ ابھی تک میری قید میں تھا۔ سولومن کا سراغ لگانے کے لئے مجھے آپریشن سیل سے نکلنا تھا اس لئے میں پہلے ابرار ٹیڈی کا قصہ ختم کر دینا چاہتی تھی۔ یوں بھی اب شہریار‘ ابرار ٹیڈی کا پشت پناہ کراچی میں نہیں تھا۔ میں نے ابرار ٹیڈی کے بارے میں جو کچھ سوچا تھا اس سے مجھے دہرا فائدہ ہوتا‘ بہ الفاظ دگر ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے۔ ایک طرف تو ابرار ٹیڈی اس قابل نہ رہتا کہ آئندہ اپنی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھ سکتا۔ دوسری جانب میرے حریف شہریار کو بھی کچھ نہ کچھ گزند ضرور پہنچتی۔

اس دن دوپہر کا کھانا کھا کے کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں نے اپنے کمرے سے نکل آئی۔ میرے قدم ڈیوٹی روم کی طرف اٹھ رہے تھے۔

عثمانی غیر متوقع طور پر مجھے ڈیوٹی روم میں دیکھ کر الرٹ ہو گیا۔

”مجھے اس کمرے کی چابی دے دو جہاں ابرار ٹیڈی کو رکھا گیا ہے۔“ میں نے عثمانی کو مخاطب کیا۔

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور کی بورڈ سے ایک چابی اتار کر میرے حوالے کر دی۔ اسی کے ساتھ مجھے مطلوبہ کمرے کا محل وقوع بھی بتا دیا۔

"سیل کی عمارت میں ابرار ٹیڈی کا یہ آخری دن ہے۔" میں نے عثمانی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ "بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ دن ابرار ٹیڈی کی مجرمانہ سرگرمیوں کا آخری دن ہے۔ وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچنے والا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد میں تمہیں اس کے بارے میں مطلع کر دوں گی۔ وہ تمہیں سیل کے اسی کمرے میں گہری نیند سوتا ہوا ملے گا۔ اسی حالت میں تم اسے اپنے آدمیوں سے کہیں بھی چھڑوا سکتے ہو۔" عثمانی سے یہ کہہ کر میں ڈیوٹی روم سے باہر آ گئی۔

عمارت کے عقبی حصے میں کئی کمرے ایسے افراد کے لئے مخصوص تھے جنہیں آپریشن سیل کا "مہمان" بنا لیا جاتا تھا۔ یہ حصہ گویا آپریشن سیل کا "مہمان خانہ" تھا۔ اس حصے میں حفاظتی انتظامات کچھ زیادہ ہی سخت تھے۔ انہی کمروں میں سے ایک کے اندر جیفرسن بھی تھا۔ ان دنوں اس حصے کے صرف دو کمرے آباد تھے۔ ایک میں جیفرسن تھا دوسرے میں ابرار ٹیڈی۔ جلد ہی میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی مطلوبہ کمرے تک پہنچ گئی۔ ابرار ٹیڈی کیوں کہ ایک منجھا ہوا پیشہ ور مجرم تھا اس لئے دروازے کا قفل کھول کر اندر قدم رکھتے ہوئے میں پوری طرح چوکنا تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر لمحے بھر کو حیرت کے آثار نظر آئے' پھر وہ میری طرف گھورنے لگا اور بولا۔ "عذرا خان! تم نے مجھے یہاں کیوں قید کر رکھا ہے؟ اگر میں نے کوئی جرم کیا ہے تو مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔"

"تا کہ تمہارے خیر خواہ تمہاری پشت پناہی کرنے والے فوری طور پر تمہیں پولیس کے چنگل سے نکال لیں!" میرے لہجے میں چبھن تھی۔ رکے بغیر میں نے مزید کہا۔ "سنو! مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ تمہیں پولیس کے حوالے کروں۔ تم خود ہی اپنے ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو گے! تم خود اپنے جرائم کا اعتراف کرو گے۔!"

"ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کر جرائم کا اعتراف!" یہ کہہ کر وہ عجیب سے انداز میں ہنسا' یوں جیسے مجھے خلل دماغ کا شکار سمجھ رہا ہو۔

"کبھی کبھی مردہ ضمیر میں بھی از سر نو زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک تمہارا معاملہ ہے تو مجھے یقین ہے کہ تمہارا ضمیر بالکل مردہ نہیں ہوا تھا بلکہ سو گیا تھا اور اب...... اب تمہارا سویا ہوا ضمیر بیدار ہو رہا ہے۔" پھر میں نے مزید وقت ضائع کئے بغیر اس کے ذہن کو اپنے طاقت ور ذہن کی گرفت میں لے لیا۔

"میرا ضمیر بیدار ہو رہا ہے۔" وہ میرے ذہن کے زیر اثر بڑبڑانے لگا۔ "میرا ضمیر...... بیدار ہو چکا ہے۔ میں...... میں خود کو قانون...... قانون کے حوالے کر دوں گا...... اپنے تمام جرائم کا اعتراف کر لوں گا۔ میرے دل کو اسی وقت سکون مل سکتا ہے...... اسی وقت!"

"تم نے جو عرصہ اس عمارت میں گزارا ہے تمہارے ذہن سے محو ہو جائے گا......! تمہیں کچھ یاد نہیں رہے گا۔ تم ایک گہری نیند سے اٹھو گے اور پھر سیدھے کسی قریبی پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ گے۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ پولیس اسٹیشن پہنچ کر تمہیں اپنے جرائم کا اعتراف کرنا ہے' تمام جرائم کا اعتراف...... ! اس جرم کا اعتراف بھی کہ تم نے شہریار کے ایما پر شیخ مجید پر قاتلانہ حملے کئے تھے۔ اسے قتل کرنے کی کوشش کی

تھی۔"

"ہاں میں اپنے تمام جرائم کا اعتراف کروں گا' اول سے آخر تک!" وہ خوابناک سی آواز میں میرے ایما پر بار بار یہی ایک جملہ دہراتا رہا۔

"اب...... اب تم سونے والے ہو...... تمہیں نیند آ رہی ہے' گہری نیند!"

"میں...... ہاں میں مجھے نیند آ رہی ہے۔" یہ الفاظ بڑبڑاتا ہوا وہ قریب ہی بچھی ہوئی مسہری پر بیٹھ گیا۔

"لیٹ جاؤ...... تم سو رہے ہو...... تمہیں نیند......"

پھر میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ مسہری پر دراز ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں نے جب محسوس کیا کہ وہ قطعی غافل ہو چکا ہے تو اس کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ کمرے کی چابی میں نے دروازے کے قفل ہی میں لگی چھوڑ دی تھی۔ اب اس کے فرار ہونے کا سوال نہیں تھا۔

ابرار ٹیڈی کے ذہن کو اپنی گرفت میں لینے کے بعد مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کئی قتل بھی کر چکا ہے۔ خود کو قانون کے حوالے کر کے اعتراف جرائم کے بعد پھانسی کا پھندا ہی اس کا مقدر بن سکتا تھا۔

"خس کم جہاں پاک!" اپنے کمرے میں واپس آ کر خود بہ خود میرے منہ نکلا اور میں نے طویل سانس لیتے ہوئے انٹر کام کا ریسیور اٹھا لیا۔ ڈیوٹی روم کا بٹن دبا کر عثمانی سے رابطہ قائم ہونے کے بعد میں نے کہا۔ "ابرار ٹیڈی اس وقت گہری نیند میں ہے' تم میری ہدایت پر عمل کر سکتے ہو۔" اسی کے ساتھ میں نے اس سے سیل کے ایک رکن سرفراز کے بارے میں پوچھا۔

سرفراز کو پہلے شہریار کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا' پھر اسے سولومن کو تلاش کرنے کے احکام دیئے گئے تھے۔ اس نے سولومن کو شہریار کی کوٹھی میں داخل ہوتے اور پھر باہر نکلتے بھی دیکھا تھا۔ وہ سولومن کی نشان دہی بہ آسانی کر سکتا تھا۔

"آج صبح سرفراز نے مجھے اپنی رپورٹ دی تھی۔" عثمانی میرے سوال کے جواب میں بتانے لگا۔ "اس نے شہر کے تقریباً سارے ہی بڑے ہوٹل اب تک چیک کر لئے ہیں' سولومن اسے کہیں نہیں ملا۔"

"اس سے فوری طور پر رابطہ قائم کرو اور کہو کہ بلا تاخیر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ جائے۔" میں نے حکم دیا۔ "اسے اپنے ساتھ ایک اٹیچی کیس بھی لانا ہے جس میں روزانہ استعمال کی ضروری اشیا اور کپڑے بھی ہوں۔"

اس کے بعد تقریباً ایک گھنٹے مجھے سرفراز کی آمد کا انتظار کرنا پڑا۔ اسے میں نے اپنے کمرے ہی میں بلا لیا تھا۔ میری ہدایت پر وہ اپنا اٹیچی کیس ڈیوٹی روم میں چھوڑ آیا تھا۔ میں اس عرصے میں اپنا میک اپ کر چکی تھی اور اپنے کپڑے وغیرہ بھی ایک سوٹ کیس میں رکھ لئے تھے۔ دوسرے ضروری سامان کے ساتھ ہی محدود طاقت کے دو ٹرانسمیٹر بھی اسی سوٹ کیس میں تھے۔ یہ دونوں ٹرانسمیٹر بہ ظاہر کھلونے لگتے تھے۔

سرفراز کے آتے ہی میں اس کا میک اپ بھی کرنے لگی۔ میں نے اسی دوران میں اسے اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کر دیا۔

"تمہارا نام کنور خورشید علی ہے اور میں...... گویا مسز خورشید ہوں۔ ہم دونوں لاہور سے کراچی کے تفریحی دورے پر آئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے مجھے کیپٹن شاد کا خیال آ گیا۔ سرفراز کی جگہ اگر اس وقت وہ ہوتا تو اس کا چہرہ قابل دید ہوتا۔ میک اپ کو آخری ٹچ دیتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ "لاہور میں تمہارا ذاتی کاروبار ہے اور تم ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ گلبرگ کے علاقے میں تمہاری کوٹھی ہے۔ لاہور کا پتا ذہن نشین کر لو تاکہ کسی موقع پر ہم دونوں کے بیان میں تضاد نہ ہو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے گلبرگ کے علاقے میں مقیم اپنے ایک جاننے والے کا پتا بتا دیا۔

سرفراز نے زیر لب میرا بتایا ہوا پتا دہرایا۔ میک اپ مکمل ہو گیا تو میں نے اس کے چہرے پر آخری تنقیدی نگاہ ڈالی اور میک اپ کا سامان سمیٹ کر الماری میں رکھ دیا۔ پھر میں نے سرفراز کو چلنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر اپنا سوٹ کیس اٹھانے لگی۔

"لائیے مجھے دیجئے!" یہ کہتے ہوئے سرفراز نے مجھ سے سوٹ کیس لے لیا۔

"یہ ادب و احترام اس عمارت کی حدود تک ختم ہو جانا چاہیے۔" میں نے تاکیداً کہا۔ "تمہیں حقیقت سے قریب تر رہ کر اپنا کردار ادا کرنا ہے تاکہ ہم پر کسی کو شبہ نہ ہو۔"

"جی بہتر ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔

سرفراز کو لئے میں ڈیوٹی روم میں آ گئی۔ وہاں میری ہدایت پر پہلے ہی سے سیل کا ایک رکن موجود تھا جسے ہم دونوں کو کسی ایسی جگہ تک کار میں چھوڑنا تھا جہاں سے ہمیں ٹیکسی مل جائے۔ سرفراز کا اٹیچی کیس، کار میں رکھا جانا تھا، میرا سوٹ کیس بھی سرفراز کے سیل کے اس رکن نے لے لیا اور ڈیوٹی روم سے نکل گیا۔

روانگی سے قبل میں نے مختصراً عثمانی کو بھی اپنا لائحہ عمل بتا دیا اور یہ بھی کہ ہمارا قیام شہر کے کس ہوٹل میں ہوگا! آپریشن سیل کو اپنے اقدامات سے میں بے خبر رکھنا نہیں چاہتی تھی۔

آپریشن سیل کی عمارت سے نکل کر ہمیں ٹیکسی کے لئے طویل سفر نہیں کرنا پڑا۔ سیل کا رکن ہم دونوں کو ٹیکسی میں بٹھا کر واپس چلا گیا۔ احتیاط کے پیش نظر پہلے ہم ایئر پورٹ پہنچے پھر کچھ دیر بعد وہاں سے ایک اور ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن سے مجھے سولومن کے بارے میں صرف ایک ہنٹ ملا تھا۔ اس کے ذریعے ضروری نہیں تھا کہ میں فوری طور پر سولومن تک پہنچ جاتی یا اس کا سراغ لگا لیتی لیکن اس طرح بہرحال اس کی تلاش کا آغاز ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے میرے علاوہ کسی اور کے علم میں یہ بات آتی تو اسے اتنی اہمیت نہ دیتا۔ خود جیفرسن کے نزدیک بھی یہ کوئی اہم بات نہیں تھی مگر میں نے اس کی اہمیت کو فوری طور پر محسوس کر لیا تھا۔ میں نے اسی لئے آپریشن سیل سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جیفرسن کا ذہن پڑھ کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کا نائب سولومن تنہا کراچی نہیں آیا۔ اس کے ہمراہ پانچ بہترین امریکی ایجنٹ اور تھے۔ جیفرسن خود بھی انہی میں سے ایک تھا۔ ان افراد کو خود

ایک دوسرے کے متعلق علم نہیں تھا کہ کون کہاں ٹھہرا ہے! ان میں سے جیفرسن کو صرف ایک ہستی کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا قیام کہاں ہے! اسے بھی محض حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا تھا ورنہ سولومن کسی کو بھی ایک دوسرے کے بارے میں نہیں بتاتا تھا۔ سولومن اس پر خفا بھی ہوا تھا۔ یہ ہستی ان امریکی ایجنٹوں میں بہت اہم تصور کی جاتی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ سولومن کی دست راست بھی تھی اور محبوبہ بھی! اس کا نام جین ہیری تھا۔ ہیری شاید اس کے والد کا نام رہا ہو۔ جین کی بجائے عموماً اسے جینی کہا جاتا تھا۔ یہی جین سولومن کی کمزوری تھی۔ جین کا قیام اسی فائیو اسٹار ہوٹل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں تھا جس کی طرف میری ٹیکسی جا رہی تھی لیکن خود جین کو بھی سولومن نے اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ کہاں ٹھہرا ہے!

جین خطرناک حد تک ذہین اور حسین تھی۔ جیفرسن کے ذہن میں اس کا حلیہ محفوظ تھا۔ یہ حلیہ اتنا منفرد اور نمایاں تھا کہ حلیہ معلوم ہونے کے بعد کوئی اجنبی بھی اسے باآسانی پہچان سکتا تھا۔ اس کے چہرے کے خطوط مشرقی تھے، چہرے کی ساخت اور نقش و نگار بڑی حد تک ایک مشہور اطالوی اداکارہ سے مشابہت رکھتے تھے۔ سولومن اسی لئے کبھی کبھی اسے محبت میں آ کر صوفیہ لارین بھی کہہ دیتا تھا۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ اداکارہ صوفیہ لارین سے مشابہت پر خود جین کو بھی بہت فخر و غرور تھا۔ وہ اکثر اسی غرور کے نشے میں کہا کرتی تھی کہ اگر میں فلم کی طرف چلی جاتی تو صوفیہ لارین کی شہرت کا چراغ گل کر دیتی۔

کراچی آنے کے بعد سولومن نے ایک مرتبہ جیفرسن کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے لئے اسی فائیو اسٹار ہوٹل کے ہال میں بلایا تھا۔ سولومن کو ہدایات دینے میں مقررہ وقت سے کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ یہ واقعہ اسی رات کا تھا جب جیفرسن کو میری کوٹھی پر سولومن کا فراہم کردہ دستی بم پھینکنا تھا۔ سولومن اسی سبب تفصیل کے ساتھ منصوبے کی تمام جزئیات جیفرسن کو بتا رہا تھا۔ جیفرسن سے بات کر کے سولومن کو جن سے ملنا تھا جو اسی ہوٹل کی دوسری منزل پر تھی۔ سولومن نے اسے اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا اور اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں نیچے ہال میں بیٹھا ہوں۔ سولومن کو جب زیادہ دیر ہو گئی تو جین سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ خود ہال میں آ گئی اور برہمی کے انداز میں بولی کہ میں وہاں دوسری منزل پر اپنے کمرے میں تمہارا کب سے انتظار کر رہی ہوں اور تم یہاں بیٹھے ہو۔

سولومن نے جین کی اس بے احتیاطی کو پسند نہیں کیا تھا۔ اس نے بھی جواباً خفگی سے کہا تھا کہ اپنے کمرے میں جاؤ! تمہارے لئے یہی بہتر ہے۔

نہ معلوم سولومن کے لہجے میں ایسی کون سی بات تھی کہ جین سہم گئی تھی اور پھر وہاں نہ رک سکی تھی۔

یوں جیفرسن کے علم میں یہ بات آ گئی تھی کہ جین کا قیام کہاں ہے!

یہی وہ ہنٹ تھا جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ ہر چند کہ خود جین کو بھی خبر نہیں تھی کہ کراچی میں سولومن کا قیام کس جگہ ہے لیکن جین بہرحال اس کی کمزوری تھی۔ وہ جین سے ملنے یا اسے کوئی اہم ہدایت دینے وہاں آ سکتا تھا۔ میں نے اسی ایک قیاس اور امید پر اس فائیو اسٹار ہوٹل کا رخ کیا تھا۔

جیفرسن نے ابھی جو چند باتیں مجھے زبانی نہیں بتائی تھیں اور وہ باتیں میں نے اس کا ذہن پڑھ

کر معلوم کر لی تھیں ان کی وجہ سے بھی سولومن اور اس کے ساتھیوں پر ہاتھ ڈالنا انتہائی ضروری تھا۔

میرے ملک میں سولومن ایسے خطرناک شخص کی آمد کا مقصد محض میری ہی تلاش نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ اور خطرناک منصوبے تھے جن میں سے صرف ایک کے بارے میں جیفرسن کو معلوم تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ خود جیفرسن کو اس خطرناک منصوبے میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔ یہ خطرناک منصوبہ ظاہر ہے کہ میرے ملک کے مفاد میں نہیں تھا۔ جیفرسن نے غالباً یہ بات مجھے اس لئے ابھی نہیں بتائی تھی کہ اپنے تحفظ کی خاطر کسی مرحلے پر مجھ سے سودے بازی کر سکے۔

ان حالات میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں خاموش نہ بیٹھوں۔ حالات و واقعات کی سنگینی اور اپنے حریفوں کی طاقت وقوت کا مجھے پوری طرح احساس تھا۔ ایسے معلوملات میں عموماً جلد بازی کام بگاڑ دیتی ہے۔ صبر وتحمل سے کام لینا میرے لئے بہت ضروری تھا' یعنی میرے حریفوں کو ہوا بھی نہ لگے کہ میں ان کی راہ پر لگ چکی ہوں' اگر انہیں ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ میں ان کے تعاقب میں ہوں تو وہ فوری طور پر کوئی بھی خطرناک قدم اٹھا سکتے تھے۔ پھر وہ اپنے منصوبوں کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے انتہائی تیزی سے کام لیتے۔ میں یہ چاہتی تھی کہ بے خبری میں انہیں چھاپ لوں اور وہ اس بے خبری کے سبب کوئی خطرناک قدم نہ اٹھا سکیں۔

اگر معاملہ صرف اپنے تحفظ کا ہوتا تو ممکن ہے میں اپنی محفوظ پناہ گاہ سے نکلنے کا فیصلہ نہ کرتی مگر بات اس سے آگے کی تھی۔ مجھے اپنی تمام تر غیر معمولی ذہنی قوتوں کو انتہائی احتیاط کے ساتھ بروئے کار لا کر اپنے حریفوں کے منصوبوں کا ناکام بنانا تھا۔

ٹیکسی میں ایئرپورٹ سے ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے جہاں سولومن کی محبوبہ جین کا قیام تھا میں انہی حالات پر غور کر رہی تھی۔ میں اپنے خیالوں میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ جب ٹیکسی رکی تو چونک اٹھی۔

ہماری ٹیکسی اسی فائیو سٹار ہوٹل کے صدر دروازے پر پہنچ کر رک چکی تھی۔ کرایہ ادا کر کے ہم دونوں ٹیکسی سے اترے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ڈکی کھولی ہی تھی کہ ہمارے سوٹ کیس نکال دے کہ ہوٹل کے دو پورٹر تیزی سے ٹیکسی کی طرف لپکے۔ ہمارے سوٹ کیس دیکھ یقیناً انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم ہوٹل میں قیام کی غرض سے آئے ہیں۔ انہوں نے ہمارے سوٹ کیس سنبھال لئے۔

ہوٹل کے اندر پہنچ کر کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا۔ سرفراز نے ہوٹل کے کاؤنٹر پر وہی اندراجات کرائے میں جن کے بارے میں پہلے ہی اسے بتا چکی تھی۔ سرفراز کا رویہ بھی اب میرے ساتھ قطعی بدل چکا تھا۔ وہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنا کردار ادا کر رہا تھا' محبت کرنے والے شوہر کا کردار!

''بیگم!'' اس نے بڑی بے تکلفی سے مجھے مخاطب کیا۔ ''کس منزل پر کمرہ لیں؟ میں نے لاہور ہی میں تم سے کہہ دیا تھا کہ کراچی پہنچ کر ہر معاملے میں تمہاری چلے گی!''

کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا نوجوان مسکراتے ہوئے ہم دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ سرفراز نے مجھ سے یہ سوال دانستہ کیا تھا۔

''میرا خیال تو دوسری منزل پر کوئی سوئٹ لینے کا تھا مگر پہلے ان سے تو پوچھ لو!'' میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے نوجوان کی طرف نظر اٹھائی۔

وہ نوجوان نہایت مودبانہ لہجے میں بولا۔ ''کسی بھی منزل پر آپ کو سوئٹ مل سکتا ہے' اگر دوسری منزل پر چاہیں تو وہاں بھی!''

''تھینک یو!'' میں بولی۔

میرا مقصد حل ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ مجھے دوسری منزل پر ابھی جین کے کمرے کا نمبر نہیں معلوم تھا لیکن مصلحت کے پیش نظر میں اسی منزل پر ٹھہرنا چاہتی تھی۔ اس طرح جین کی تلاش میں کچھ آسانی ہو جاتی۔

ہم ہوٹل کے ضوابط کے مطابق ضروری اندراجات کرانے کے بعد دوسری منزل پر آ گئے۔ احتیاطاً میں نے ایک ماہ کے لئے سوئٹ کی بکنگ کرائی تھی اور مطلوبہ پیشگی رقم بھی ادا کر دی تھی۔

دوسری منزل پر اپنے سوئٹ میں آ کر میں نے پورٹروں کو ٹپ دے کر رخصت کر دیا۔ وہ سوئٹ دو کمروں اور ایک نشست گاہ پر مشتمل تھا۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی ہر سہولت وہاں میسر تھی۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے سوٹ کیس کھول کر روز مرہ استعمال کا ضروری سامان اور کپڑے وغیرہ لکڑی کی بنی ہوئی خوبصورت الماریوں میں رکھ دیئے۔ پھر وہ سوٹ کیس بھی انہی الماریوں کے نچلے خانوں میں رکھ کر انہیں بند کر دیا۔ دونوں کمروں میں سے ایک میرے تصرف میں آ گیا تھا اور دوسرے میں سرفراز نے اپنا سامان سیٹ کر لیا تھا۔ دونوں ٹرانسمیٹروں میں سے ایک میں نے سرفراز کے حوالے کر دیا تھا۔ جسے اس نے میرے ہی سامنے کپڑوں کی تہہ میں چھپا دیا تھا۔ خود میں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

اس ہوٹل میں ہماری آمد کا مقصد وہاں آرام سے اپنے سوئٹ میں بیٹھے رہنا نہیں تھا بلکہ ہمارے پیش نظر کچھ اور ہی تھا۔ اسی ''کچھ اور'' کا پہلا مرحلہ جین کی تلاش تھی۔ میں اور سرفراز اسی لئے زیادہ دیر کمروں میں نہ رہے۔

شام کے پانچ بجے کا وقت تھا اور ہم دونوں گویا دوسری منزل سے نیچے ہال میں چائے پینے جا رہے تھے کیونکہ سرفراز کو بھی میں اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کر چکی تھی اور میں نے اسے بھی جین کا حلیہ بتا دیا تھا۔

اس لئے وہ بھی راہداری میں چلتے ہوئے غافل نہیں تھا۔ ہم دونوں دانستہ آہستہ قدمی سے راہداری میں بڑھ رہے تھے۔

نیچے پہنچنے کے لئے ہم نے لفٹ کے بجائے زینوں کا رخ کیا۔ ہم دونوں ہی کا انداز چہل قدمی اور تفریح کا سا تھا جیسے ہم وہاں صرف انجوائے کرنے آئے ہوں۔

ہال میں پہنچ کر میں نے ہر طرف طائرانہ نگاہ ڈالی۔ بیشتر میزیں خالی تھیں۔ میں نے ہال کے دروازے کے قریب ہی ایک میز کا انتخاب کیا اور سرفراز کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس طرف بڑھ گئی۔ وہاں بیٹھنے کا مقصد یہ تھا کہ ہال میں آنے جانے والوں پر میں نظر رکھ سکوں۔ وہاں مجھے وہ چہرہ نظر نہیں آیا تھا جس کی تلاش تھی لیکن ایک اور چہرے نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔ ملک دلاور کی وہاں

موجودگی میرے لئے قطعی خلاف توقع تھی۔ عموماً وہ "ہوٹل بازی" سے گریز کرتا تھا۔

ملک دلاور تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عرب اپنے مخصوص لباس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی میز پر ناشتے کا خاصا سامان نظر آ رہا تھا۔ میں نے دو ایک بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ عربی زبان سے نا آشنا ہے لیکن میں اسے اس عربی شخص سے گفتگو کرتے دیکھ رہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ دونوں انگریزی میں گفتگو کر رہے ہوں۔

اسی اثنا میں ایک ویٹر ہماری میز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میرا ارادہ کیونکہ وہاں خاصی دیر بیٹھنے کا تھا اس لئے لمبا چوڑا آرڈر دے دیا۔ اس طرح آرڈر کی تکمیل میں بھی دیر ہوتی اور وہاں ہم دونوں کے زیادہ دیر بیٹھے رہنے کا جواز بھی پیدا ہو جاتا۔

بار بار کوشش کے باوجود میں وہاں ملک دلاور کی موجودگی کو اپنے ذہن سے نہ جھٹک سکی۔ میری تشویش کا ایک سبب بھی تھا کہ وہ اکثر میری ٹوہ میں رہتا تھا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں خاصا سمارٹ لگ رہا تھا۔ لباس کے معاملے میں بھی وہ خوش ذوق تھا۔

پھر جب ہمارا آرڈر سرو کیا جا چکا تھا اور میں اپنے لئے کافی بنا رہی تھی تو میں نے ایک ویٹر کو ملک دلاور کی میز کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں پھر ادھر متوجہ ہو گئی۔ اس کی اور میری میز کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں اس کی آواز نہیں سن سکتی تھی۔ پھر بھی میں نے اشاروں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ شاید ویٹر سے بل لانے کیلئے کہہ رہا تھا۔ گویا اب ملک دلاور وہاں سے اٹھ کر جانے والا تھا مگر میرا تجسس ابھی تک برقرار تھا۔ ملک دلاور یہاں کیوں آیا ہے؟ وہ عربی کون ہے؟ کیا یہاں اس کی موجودگی محض اتفاق ہے یا پھر کوئی اور چکر ہے؟ ان سوالوں کے جواب یوں بھی ضروری تھے کہ کسی بھی مرحلے پر میرے معاملات میں ملک دلاور کی مداخلت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

سرفراز بھی ملک دلاور کو میرے ایک پرخلوص دوست کی حیثیت سے پہچانتا تھا۔ اس نے بھی یقیناً میری بے چینی محسوس کر لی تھی اور میری نگاہوں کا تعاقب کر کے ملک دلاور کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اپنا تجسس دور کرنے اور اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب پانے کے لئے اس وقت مجھے ایک ہی خیال آیا۔ اپنے اسی خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر میں نے آگے جھک کر مدھم آواز میں سرفراز کو چند ہدایات دیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی وقت میری نگاہ پھر ملک دلاور کی طرف اٹھی۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اس عربی شخص سے مصافحہ کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ عربی اپنی عبا سنبھالتا ہوا ہال کے دروازے کی طرف بڑھ گیا' مگر ملک دلاور دوبارہ نشست پر بیٹھ گیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ویٹر ابھی تک بل نہیں لایا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ بل کی ادائیگی سے پہلے کس طرح اٹھ سکتا تھا!

بل ادا کرنے کے بعد ملک دلاور وہاں نہ رکتا اور مجھے اس کے ذہن کا جائزہ لینا تھا تاکہ حقیقت حال جان سکوں۔ اس لئے کچھ دیر ملک دلاور کا وہاں رکنا ضروری تھا۔ میں نے اسی سلسلے میں سرفراز کو ضروری ہدایات دی تھیں تاکہ وہ اپنا کردار صحیح طرح ادا کر سکے۔

پھر ذرا ہی دیر بعد ویٹر بل لے کر ملک دلاور کی میز تک پہنچ گیا۔ بل ادا کرتے ہی وہ کھڑا ہو

گیا۔ اسی لمحے میں نے ملک دلاور کے ذہن سے رابطہ قائم کر لیا۔ اب وہ ہال کے دروازے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی میری میز تھی۔ میرے طاقت ور ذہن کے زیر اثر اور میرے ہی ایما پر چلتے چلتے وہ ایک دم میری میز کے قریب سے گزرتے ہوئے رک گیا۔

میں میک اپ میں تھی اس لئے مجھے پہچاننے کا سوال نہیں تھا مگر میں نے اسے ایک اور ہی بات باور کرا دی تھی۔ یہ بات میں نے ہی اس کے ذہن میں ڈالی تھی کہ میں کبھی لاہور میں اس کی کلاس فیلو رہ چکی ہوں۔ وہ اسی لئے ٹھہر کر غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہیلو مسٹر!" معاً میں نے اسے مخاطب کیا۔ میں نے بدلی ہوئی آواز میں یہ الفاظ ادا کئے تھے کیوں کہ وہ مجھے آواز سے بھی پہچان سکتا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ "کیا تکلیف ہے آپ کو؟" یہ اچھا موقع تھا کہ میں اجنبی بن کر اس کی کھنچائی لگا سکتی تھی۔

"تکلیف تو خیر کوئی نہیں مگر جانے کیوں مجھے آپ کا چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔ کہیں آپ کا تعلق لاہور سے تو نہیں؟" اس نے عادت کے مطابق قاف کو کاف ہی بولا تھا۔

"جی ہاں بالکل ہے لاہور سے تعلق! بلکہ ہم دونوں میاں بیوی وہیں سے کراچی گھومنے آئے ہیں مگر تعارف حاصل کرنے کا یہ طریقہ بہت گھس پٹ گیا ہے۔ ایسی صورت میں تو آپ کو اور محتاط رہنا چاہیے کہ میرے شوہر بھی ساتھ ہیں۔"

"نیور مائنڈ مسٹر!" سرفراز بول اٹھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "آپ چاہیں تو کچھ دیر بیٹھ سکتے ہیں۔ میں کوئی تنگ نظر اور دقیانوسی خیالات رکھنے والا شوہر نہیں ہوں۔ اگر آپ میری مسز کو جانتے ہیں تو یہ بات میرے لئے باعث مسرت ہے۔ بیٹھ جائیں' تکلف نہ کریں!" سرفراز نے ہاتھ سے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

یہ عرصہ کافی تھا۔ میں بڑی حد تک ملک دلاور کے ذہن کا مطالعہ کر چکی تھی۔ اب میری فکر و تشویش ختم ہو گئی تھی۔ اسے وہاں دیکھ کر میرے ذہن میں جو اندیشے پیدا ہو گئے تھے وہ غلط ثابت ہوئے تھے۔

ملک دلاور کا بزنس بھی بیرونی ممالک تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ عربی جسے میں نے کچھ دیر پہلے ملک دلاور کے ساتھ دیکھا تھا مشرق وسطیٰ کے ایک ملک قطر کا تاجر تھا۔ وہ ان دنوں پاکستان کے دورے پر آیا ہوا تھا اور اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ دلاور نے اسے گویا آج ٹی پارٹی دی تھی۔ اسی دوران میں اس نے کچھ تجارتی معاملات بھی طے کر لئے تھے۔

ان معلومات کے بعد ملک دلاور کی مزید موجودگی قطعی ضروری نہیں رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا ارادہ بدل گیا۔ وہ اپنی تمام تر خوش مزاجی کے باوجود اس وقت نروس سا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے مواقع کم ہی آتے تھے کہ وہ یوں "ناک آؤٹ" ہو جائے۔ ایسے کشیدہ حالات میں ذہن کو کچھ دیر ریلیکس دینے کا موقع خود بہ خود میرے ہاتھ آ گیا تھا۔ میں اسی لئے اس سے لطف لینے کے لئے بول اٹھی۔ "مسٹر! ہر چند کہ میں نے آپ کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا مگر میرے شوہر آپ کو بیٹھنے کی دعوت دے چکے ہیں ورنہ...... خیر چھوڑیں! اور ہاں یوں ہونقوں کی طرح مجھے نہ دیکھیں۔ چلیے میں بھی

کہہ رہی ہوں کہ بیٹھ جائیں۔"

ملک دلاور کو شاید اب سے پہلے کبھی ایسی صورت حال پیش نہیں آئی ہوگی۔ میرا معاملہ مختلف تھا ورنہ صنف مخالف کے باب میں اس کا رویہ سطحی نہیں تھا۔ وہ عام نوجوانوں سے الگ تھا۔ عموماً وہ ریزرو رہتا تھا۔

میری پیشکش پر وہ اس لئے بوکھلایا ہوا سا درمیانی خالی کرسی پر بیٹھ گیا' پھر خجالت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "معاف کیجئے گا خاتون میں اب بھی یہی کہوں گا کہ ہم پہلے بھی کہیں ضرور مل چکے ہیں۔" وہ مجھی سے مخاطب تھا اور اس کے چہرے سے شرمندگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "ہمیں ان لوگوں سے نہیں جو خواتین سے تعارف حاصل کرنے کے لئے ......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پھر آپ کیسے لوگوں میں سے ہیں؟ خود ہی اس کی بھی وضاحت فرما دیں!" میرے لہجے میں تمسخر تھا۔

وہ میری بات اور میرے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ "اگر میں غلطی پر ہوتا تو ہرگز یہ نہ بتا پاتا کہ آپ کا تعلق کس شہر سے ہے! جہاں تک مجھ یاد پڑتا ہے' آپ میری کلاس فیلو رہ چکی ہیں۔"

"مان نہ مان میں تیرا مہمان!" میں نے اس پر پھر فقرہ لگایا اور مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسنے لگی۔

"پلیز!" سرفراز نے مداخلت کی۔ "کسی کی اتنی انسلٹ نہیں کرتے۔" وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

"اس وقت یہ ہماری میز پر بیٹھے ہیں اور خود ہی نے انہیں بیٹھنے کی دعوت دی ہے۔ تمہارا رویہ میزبانی کے خلاف ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ملک دلاور کی طرف رخ کیا۔ "آپ مائنڈ نہ کیجئے گا' میری وائف ذرا سی شوخ مزاج ہیں مگر دل کی بری نہیں ...... ہاں ابھی تک آپ نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں' خیر میں ہی پہل کئے دیتا ہوں۔ مجھے کنور......"

"نہیں!" میں درمیان میں بول اٹھی۔ "تعارف کی ضرورت نہیں! میرا خیال ہے کہ تعارف کے بعد یہ حضرت مزید کمبل ہونے کی کوشش کریں گے۔" میرا انداز چڑانے والا تھا۔

"آخر آپ مجھے سمجھ کیا رہی ہیں!" میری توقع کے مطابق ملک دلاور کے صبر و برداشت کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔ "کیا آپ مجھے کوئی ایسا ویسا گیا گزرا شخص سمجھ رہی ہیں؟" اس کا چہرہ اپنی توہین پر غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

"ٹیمپر لوز کرنے کی ضرورت نہیں مسٹر اجنبی!" میرے لہجے میں بھی سختی آ گئی۔ "مجھے ایسی کوئی تکلیف نہیں کہ آپ کو سمجھنے کی کوشش کروں۔ آپ ایسے ویسے ہوں کہ کچھ اور ہوں' مجھے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں! از نٹیڈ!"

"اوہ یس!" یہ کہہ کر اس نے ہونٹ بھینچ لئے پھر بولا۔ "سوری...... ویری سوری! میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی۔" یہ کہتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس وقت ملک دلاور کی حالت دیکھ کر مجھے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اسی

سبب اس ڈرامے کو مزید طول نہیں دیا۔ میں اسے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف جاتے دیکھتی رہی۔

پھر ہم نے مزید نصف گھنٹا وہاں گزار دیا' مگر ہمارا وہاں بیٹھنا بے سود ہی رہا۔ مجبوراً ہم دوبارہ اپنے سوئٹ میں آ گئے۔

سرفراز کو بھی میں' سولومن کی محبوبہ جین کے بارے میں بتا چکی تھی۔ اس نے اسی سبب اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس ہوٹل سے کسی دوسرے ہوٹل میں چلی گئی ہو! کسی سبب اس نے یہ ہوٹل چھوڑ دیا ہو!"

"بظاہر تو اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہمیں یہاں آئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے! اتنی جلدی مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"کیوں نہ نیچے کاؤنٹر سے اس سلسلے میں معلوم کر لیا جائے! اس کا روم نمبر بھی معلوم ہو سکتا ہے۔" سرفراز نے تجویز پیش کی۔

"ہرگز نہیں!" میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

سرفراز مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ مجھ سے سوال کرنے کی شاید اس میں ہمت نہیں ہوئی تھی مگر اس کی نگاہیں وضاحت طلب تھیں۔

"تم نے جو کچھ کہا سامنے کی بات ہے اور یہ ممکن بھی ہے۔" میں نے اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ "مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا اصل نام ہی لکھایا ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ یہاں کسی فرضی نام سے ٹھہری ہو! اگر ایسا نہیں بھی ہو تو ہمارا یہ قدم خلاف مصلحت ہوگا۔ کاؤنٹر سے اسے یہ بھی مطلع کیا جا سکتا ہے کہ کوئی اس کی تلاش میں ہے۔ ایسا کسی اور سبب نہیں محض اطلاعاً بھی ہو سکتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے ملنے نہیں پہنچے گا تو ظاہر ہے اسے تشویش ہوگی۔ وہ یہ بھی سوچ سکتی ہے کہ اس ہوٹل میں اس کے قیام کا علم کیسے اور کیوں ہوا؟ ایسی صورت میں اس کا چوکنا ہو جانا لازمی ہے اور میں یہی نہیں چاہتی۔"

سرفراز یقیناً میری بات سے مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ اسی لئے مزید کچھ نہیں بولا۔

"میرے طریقہ کار کے مطابق مقصد کے حصول میں تاخیر تو ہو سکتی ہے مگر محفوظ راستہ یہی ہے۔" میں نے مزید کہا۔

"درست کہہ رہی ہیں آپ!" اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"رات کا کھانا بھی ہم ڈرائنگ ہال میں کھائیں گے۔" میں نے اسے بتایا۔ "اس وقت تک کے لئے تم چاہو تو آرام کر سکتے ہو۔"

"بہتر ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں بھی کچھ دیر آرام کرنے کی خاطر بستر پر دراز ہو گئی۔ ابھی مجھے لیٹے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میرے ذہن میں ایک مانوس سی سرسراہٹ ہوئی اور میں چونک اٹھی۔

عذرا خان! ایک آشنا آواز میرے ذہن میں گونجی۔

موشوروف! بے اختیار میرے ذہن میں اس کا نام آ گیا۔ یہ وہی تھا جس کے متعلق مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔

تو تم آخر مجھے پہچان ہی گئیں......! نہیں' ذہنی رابطہ منقطع کرنے کی ضرورت نہیں...! میں بہر حال ڈاکٹر رچرڈ کی طرح زبردستی تمہیں اپنے ملک کے مفادات کا غلام بنانا نہیں چاہتا۔ میری تم سے صرف ایک درخواست ہے کہ پوری بات جانے بغیر گریز نہ کرنا...... مجھے اپنی بات کر لینے دو... پلیز...! میرا ملک تمہاری مرضی ومنشا کے مطابق تم سے کام لے گا۔ تم اس کی جو چاہو قیمت طلب کر سکتی ہو۔

میں بکاؤ مال نہیں ہوں موشوروف! مجھے کوئی سودے بازی منظور نہیں! میرے ذہن نے خود بہ خود موشوروف کی بات کا جواب دے دیا۔

ہم تم سے جو بھی کام لیں گے اس سے تمہارے ملک کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم محب وطن اور اپنے ملک کی وفادار ہو۔ اس نے مجھے بہلانا چاہا۔

مگر تم لوگ ہوتے کون ہو مجھ سے کوئی کام لینے والے؟ میرا ذہن اس کی باتوں سے مشتعل ہونے لگا۔

وہ یقیناً ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا اسی لیے میرے سخت جواب کے باوجود اپنی ہی رٹ لگائے گیا۔

مجبوراً مجھے وہی حربہ استعمال کرنا پڑا جسے اس سے پہلے بھی ایک بار آزما چکی تھی۔ اسے بھی غالباً احساس ہو گیا تھا کہ میں ذہنی رابطہ منقطع کر رہی ہوں۔ پھر اس کے آخری الفاظ میرے ذہن میں گونجتے گئے۔ مجھے ڈاکٹر رچرڈ کی طرح کوئی جلدی نہیں ہے...... سوچ لو غور کر لو! میں پھر...... اس کی آواز دور ہوتے ہوتے قطعی معدوم ہو گئی۔ میں نے اس سے رابطہ ختم کرنے کی خاطر اپنے ذہن سے ہر خیال کو جھٹک دیا تھا اور میرا ذہن اس وقت کسی سادہ کاغذ کی طرح تھا۔

موشوروف کی شخصیت میرے لئے کسی معمے سے کم نہیں تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ مجھے اس کی حقیقت کا علم ہو چکا ہے وہ قطعی گھبرایا نہیں تھا بلکہ اس نے پینترا بدل لیا تھا۔ میں دیر تک اسی کے متعلق سوچتی رہی اور پھر مجھے جھپکی سی آ گئی شاید ذہنی مشقت نے مجھے تھکا دیا تھا۔

غنودگی ختم ہوئی تو میں نے وقت دیکھا۔ سوا سات بج رہے تھے۔ میں نے بستر چھوڑ دیا اور سرفراز کو آواز دی۔ وہ سویا نہیں تھا اس نے فوراً جواب دیا۔

''تیار ہو جاؤ' ہمیں نیچے چلنا ہے۔'' میں بہ آواز بلند بولی۔ پھر غنودگی کا اثر ختم کرنے کیلئے باتھ روم میں گھس گئی۔

مجھے اور سرفراز کو لباس وغیرہ تبدیل کر کے نیچے ڈائننگ ہال تک پہنچنے میں تقریباً نصف گھنٹا لگا۔

میں نے ڈائننگ ہال میں قدم رکھتے ہی تیزی سے وہاں موجود افراد کا جائزہ لیا اور پھر میری نگاہیں ایک جگہ مرکوز ہو گئیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ یوں اچانک وہ چہرہ سامنے آ جائے گا۔ وہ جین ہی تھی اور اس کی میز زیادہ دور نہیں تھی۔ اس کے ساتھ تین افراد اور بیٹھے تھے جن میں ایک غیر ملکی تھا۔

میں نے سرفراز کو اشارہ کیا اور پھر جین کی میز کے قریب ہی ایک خالی میز پر جا بیٹھی۔ ہال کی نصف سے زیادہ نشستوں پر ملکی اور غیر ملکی افراد بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ ان میں خواتین بھی تھیں اور مرد بھی! جین سے مزید قریب ہو جانے کے بعد میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی بے حد حسین تھی۔ خواتین عموماً اپنی ہی صنف کے اعتراف حسن میں ڈنڈی مار جاتی ہیں مگر میں ان میں نہیں۔ متناسب جسم اور سرخ وسفید رنگت والی جین میرے خیال میں پچیس اور تیس سال کے درمیان رہی ہو گی۔ اسے دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایک خطرناک امریکی ایجنٹ ہے۔

وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے افراد سے دھیمی آواز میں گفتگو کر رہی تھی اس لئے مجھ تک اس کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ ہاں اس کی حرکات وسکنات سے میں بہ خوبی اندازہ لگا سکتی تھی کہ موضوع گفتگو کیا ہو گا۔ مجھے علم تھا کہ لوگوں سے تعلقات بڑھانے کی خاطر جین ایسی شخصیات عموماً اسی طرح کے حربے آزماتی ہیں۔ جین اس وقت اپنے مقابل بیٹھے ہوئے ایک متوسط عمر شخص کا ہاتھ تھامے غور سے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی مدھم آواز میں وہ کچھ بولتی بھی تھی جس کا اظہار اس کے خوبصورت ہونٹوں کی حرکت سے ہوتا تھا۔

شگفتگی و رعنائی اور دلکشی و ادا کی وہ منہ بولتی تصویر کسی بات پر زور سے ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں بھی ایک ردھم اور کشش تھی۔ ہال میں موجود بیشتر افراد اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک ویٹر کو اپنی میز کی جانب آتے دیکھ کر میری توجہ ہٹ گئی۔ میرے اشارے پر سرفراز نے مینو دیکھ کر کھانے کا آرڈر دے دیا اور ویٹر چلا گیا۔

اس کے سراپا اور ظاہری شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد میں نے اپنے لائحہ عمل کے مطابق جلد بازی نہیں کی۔ میں اب اس کے ذہن کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ میرے لئے یہ لمحات انتہائی صبر آزما تھے۔ میں اسی لئے زیادہ دیر توقف نہ کر سکی۔

پہلی بار مجھے ہلکی سی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ذہن میرے طاقت ور ذہن کی نادیدہ لہروں کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔

تمہارے کمرے کا نمبر کیا ہے؟ میں نے اس سے پہلا سوال کیا۔ جواباً اس کے ذہن میں کوئی خیال نہ ابھرا۔ میں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

دو......دو سو چھ! اس کے ذہن کی قوت مدافعت شاید دم توڑ گئی تھی۔

سولومن سے اب تمہاری ملاقات کب اور کہاں ہو گی؟ میں نے اس بار ایک اہم سوال کیا۔

اس مرتبہ بھی جواب ملنے میں تھوڑی سی تاخیر ہوئی مگر اسے جواب دینا ہی پڑا۔ اس سے ملاقات کا کوئی وقت اور مقام طے نہیں۔

کسی ہنگامی صورت حال کے تحت اگر تمہیں اس سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو تم کیا کرو گی؟ میں نے دریافت کیا۔

میں اس کے دیئے ہوئے فون نمبر پر اس سے رابطہ قائم کر لوں گی۔ مجھے اس کے ذہن سے جواب ملا۔

وہ فون نمبر تمہیں یاد ہے؟ ..... اگر یاد ہے تو بتاؤ! مجھ کامیابی کی منزل قریب نظر آنے لگی۔

فائیو...... اس کے ذہن میں فون نمبر گردش کرنے لگا۔

فی الحال اتنی کامیابی بہت تھی۔ میں نے اس کے ذہن کو اپنے طاقت ور ذہن کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ پھر میں سرفراز کی طرف جھک کر دھیمے لہجے میں وہ فون نمبر دہرانے لگی' پھر بولی۔ "یہ فون نمبر ذہن میں محفوظ کرلو تم اوپر جاؤ اور آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کر کے یہ نمبر بتا دو۔ اس کے ابتدائی دو ہندسوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کس علاقے کا نمبر ہو سکتا ہے! مجھے اس فون نمبر کا مکمل پتا چاہئے۔ تم محض میسج دے کر واپس آ جانا' پتے کے انتظار میں رکنا نہیں۔ اس وقت کمانڈر نواز آن ڈیوٹی ہو گا' تم اس سے کہہ دینا کہ میں خود ہی رابطہ قائم کر کے پتا معلوم کرلوں گی۔"

سرفراز کو یہ ہدایات دیتے ہوئے مجھے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس حیرت کا سبب معلوم تھا۔ اس کے لئے یہ بات یقیناً باعث حیرت ہی رہی ہو گی کہ میں نے اچانک خاموش بیٹھے بیٹھے ایک فون نمبر کیسے بتا دیا تھا جس کے متعلق مجھے معلومات مطلوب تھیں۔ پھر بھی وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔

سرفراز کے جاتے ہی میں نے ایک بار پھر گوشہ چشم سے جین کی جانب دیکھا۔ اپن انداز و اطوار سے مجھے وہ کچھ مضطرب سی نظر آئی۔ اب وہ کسی کا ہاتھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ جین کے اس اضطراب سے میں کھٹک گئی۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ اس کے ذہن نے میرے سوالوں کے جواب دینے میں مزاحمت بھی کی تھی۔ میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی قسم کے شک و شبے میں مبتلا ہو چکی ہے؟ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو خطرناک بات تھی۔

میں نے اس کے اضطراب کی وجہ جاننے کے لئے اس بار پھر ذہنی رابطے کا فیصلہ کیا۔ اس بار میں کوئی سوال کئے بغیر خاموشی کے ساتھ اس کے ذہن کا مطالعہ کرنا چاہتی تھی۔

دوسری بار اس نے ذہنی رابطہ قائم کرتے ہوئے مجھے پہلے کی نسبت آسانی ہوئی۔ میں اب اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کا مطالعہ کر رہی تھی۔

اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی خیال ابھر رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے کیا ہو گیا تھا؟ میں بے سبب اپنے ہی آپ سے سوال جواب کیوں کرنے لگی تھی؟

اس خیال کی لہریں معدوم ہو گئیں تو جین کے ذہن میں دوسرے سوالات ابھرنے لگے۔ میں اپنا روم نمبر کیوں یاد کر رہی تھی؟ مجھے سولومن سے ملاقات کا خیال کیوں آ گیا تھا؟ پھر اس نے مجھے جو فون نمبر دیا تھا اسے کیوں اپنے ذہن میں دہرا رہی تھی؟

جواباً اس کے ذہن میں کوئی بات نہ آ سکی۔ پھر وہ ان خیالات کو اپنا وہم جان کر انہیں ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی دوران میں اچانک جانے کیسے اسے میرا خیال آ گیا اور اسی خیال کے حوالے سے اسے وہ ہدایات یاد آنے لگیں جو سولومن نے مجھ سے محتاط رہنے کے لئے اسے دی تھیں۔ جین ان ہدایات کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔ اس وقت بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ عذرا خان ایسی حیرت انگیز ذہنی صلاحیتوں کی مالک نہیں ہو سکتی۔ اسے خواہ مخواہ اتنا خطرناک ثابت کیا جا رہا ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہے

کہ ہم لوگ زیادہ سے زیادہ چوکنا اور محتاط رہیں۔

پھر اس نے میرے خیال کو بھی اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کے ذہن کا مطالعہ کرتے ہوئے میں جان چکی تھی کہ وہ خود سرانہ اور انا پسندانہ مزاج کی مالک ہے۔ اس کا شمار ایسے افراد میں کیا جا سکتا تھا جو دوسروں کی رائے قبول نہیں کرتے اور عموماً اپنی ہی بات کو افضلیت دیتے ہیں۔ میرے متعلق بھی اس کے مختلف الخیال ہونے کا سبب یہی تھا۔

میں اس کے ذہن سے رابطہ منقطع کرنے والی تھی کہ معاً اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے خیالات کی رو ایک اور ہی نکتے پر مرکوز ہوتی جا رہی تھی۔ یہ نکتہ بھی میرے لئے گویا ایک انکشاف ہی تھا۔ مجھے اس پر شدید حیرت ہوئی تھی کہ اس وقت جین کے خیالات کا محور خطرناک روسی ایجنٹ موشوروف تھا۔ وہی جو خود میرے لئے بھی ایک پراسرار ہستی بن چکا تھا۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے متعلق امریکی ایجنٹوں کی حکمت عملی اور مختلف اقدامات کا علم موشوروف کو کس طرح ہو جاتا تھا۔ ان معلومات کا ذریعہ جین ہی تھی۔ یوں جین گویا بہ یک وقت دو کشتیوں میں سوار تھی۔ ایک جانب تو وہ امریکی ایجنٹوں کے ساتھ سرگرم عمل تھی' دوسری طرف مخالف گروہ سے بھی اس کی ساز باز تھی۔ جین کی باطنی شخصیت کا مطالعہ کرنے سے مجھ پر یہ بھی کھلا کہ اس دہرے خطرناک کھیل کا سبب صرف حصول زر نہیں تھا۔ اسے مال و دولت کی کمی نہیں تھی۔ جین کے اس طرز عمل کو اس کی فطرت کا دوغلا پن ہی کہا جا سکتا تھا۔ اسے سنسنی خیزی پسند تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں دو مخالف و متصادم گروہوں کے درمیان اپنی اہمیت سے خوش تھی۔ وہ ایک عرصے سے یہ دہرا اور خطرناک کھیل کھیلتی آ رہی تھی۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ اگر کسی مرحلے پر سولومن کو اس کے دہرے کردار کا علم ہو گیا تو وہ زندہ نہیں بچ سکے گی۔ اس کے باوجود وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔

جین کو اس وقت موشوروف کا خیال اس لئے آیا تھا کہ اس کے پاس ایک اہم اطلاع تھی۔ آئندہ چند روز میں سولومن اپنے ایک خطرناک منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ اس منصوبے کے تحت تمام ہی ملکی و غیر ملکی امریکی ایجنٹ سرگرم عمل ہو جاتے۔ اس کا آغاز میرے ہی شہر سے ہونا تھا۔ یہ اس دور کا ذکر ہے جب میرے ملک کی حکومت رفتہ رفتہ آزادانہ خارجہ پالیسی کی طرف مائل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے تعلقات دنیا کی ایک تیسری بڑی طاقت سے بھی استوار ہو رہے تھے۔ موجودہ حکومت کی خارجہ پالیسی میں یہ ست رفتار تبدیلی بین الاقوامی سطح پر بھی محسوس کر لی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ جو خود کو میرے ملک کا آقا تصور کئے بیٹھے تھے کس طرح خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتے رہتے! اسی لئے ان کے مہرے حرکت میں آ چکے تھے۔ سولومن کا منصوبہ انہی حالات کا پیش خیمہ تھا۔ اس کے منصوبے کی کامیابی کا منطقی نتیجہ موجودہ حکومت کے خلاف ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوتا۔

موشوروف کے لئے یہ اطلاع اہم ہوتی یا نہ ہوتی مگر میرے لئے ضرور اہم تھی۔ مجھ اب اس خطرناک منصوبے کی جزئیات کا علم بھی ہو گیا تھا۔ یہ وہی سازشی منصوبہ تھا جس کے بارے میں چند باتیں مجھے جیفرسن کا ذہن پڑھ کر معلوم ہو گئی تھیں۔

جین کے پاس موشوروف سے رابطے کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جو اہم اطلاع اس تک پہنچا

سکتی۔ سولومن کی طرح موشوروف بھی خود ہی اس سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ عموماً اس کے لئے موشوروف کو جین سے ملاقات کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ وہ ٹیلی پیتھ تھا اور کسی بھی وقت اس کے لئے جین کا ذہن پڑھنا مشکل نہیں ہوتا تھا۔ اس سے جین بھی آگاہ تھی۔

میں اس وقت تک جین کے ذہن کا مطالعہ کرتی رہی جب تک سرفراز واپس نہ آ گیا۔ اسی دوران میں ویٹر ہمارے آرڈر کی ترسیل کر چکا تھا مگر اس کی مداخلت کے باوجود میرا ذہنی ارتکاز برقرار رہا تھا۔

سرفراز کے چہرے پر اطمینان تھا۔ میں نے اس سے اندازہ لگا لیا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کر آیا ہے۔ میں اسی لئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

مجھے دیکھ کر سرفراز بھی اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگا۔ اسی دوران میں اس نے آہستہ سے مجھے بتا دیا کہ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کر کے میں نے کمانڈر نواز کو وہ ٹیلی فون نمبر دے دیا ہے۔

میرے لئے سرفراز کا اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا۔ ظاہر تھا کہ اس نے اس سلسلے میں میری ہدایات بھی کمانڈر نواز تک پہنچا دی ہوں گی۔ اسی لئے بول اٹھی۔ ''ٹھیک ہے' کھانا کھاؤ!''

ہم دونوں ابھی کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ جین کی میز پر بیٹھے ہوئے افراد ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ پھر جین بھی زیادہ دیر نہ بیٹھی۔ وہ بھی بل ادا کر کے ہال کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

اس موقع پر میں نے سرفراز کی بے چینی محسوس کر لی۔ غالباً وہ منتظر تھا کہ میں جین کے کمرے کا نمبر معلوم کرنے کے لئے اسے تعاقب کا حکم دوں گی۔

''کیا بات ہے تم اتنے مضطرب کیوں نظر آ رہے ہو؟'' میں نے نیپ کن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

جواباً سرفراز نے دھیمی آواز میں وہی کچھ کہا جو میں قیاس کر چکی تھی۔

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اس کے کمرے کا نمبر معلوم ہو چکا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے کمرے کا نمبر بتا دیا۔ ''دو سو چھ نمبر ہے۔ ہمارے سوئٹ کا نمبر دو سو دس ہے۔ وہ ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

''مگر آپ......'' وہ کچھ حیران سا نظر آنے لگا۔ ''آپ کو اس کے کمرے کا نمبر کیسے...... معلوم ہو گیا؟'' وہ مجھ سے سوال کرتے ہوئے کچھ ہچکچا رہا تھا اسی لئے رک رک کر بول رہا تھا۔ پھر وہ خود ہی میرے جواب دینے سے پہلے بول اٹھا۔ ''میری غیر موجودگی میں شاید کسی سبب وہ بھی اپنے کمرے تک گئی ہو گی اور آپ نے اس کا تعاقب......''

''نہیں!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ میری آواز بھی اسی کی طرح دھیمی تھی۔ ''نہ وہ تمہاری غیر موجودگی میں یہاں سے اٹھی اور نہ میں نے اس کا تعاقب کیا۔'' میری بات سن کر سرفراز کا چہرہ مجسم سوال بن گیا تھا۔ مجھے اسی لئے کہنا پڑا۔ ''یقیناً تم بھی واقف ہو کہ میرے پاس معلومات حاصل کرنے

کچھ اور ذرائع بھی ہیں۔'' میرا اشارہ اپنے ذہن کی غیر معمولی قوتوں کی طرف تھا۔ سرفراز کو بھی ان کے متعلق علم تھا۔ قاہرہ سے واپس آنے کے بعد خود میں نے ہی آپریشن سیل کے تمام ارکان کی موجودگی میں پہلی بار یہ انکشافات کئے تھے۔

پھر سرفراز نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ ہم دونوں چائے پی کر بل کی ادائیگی کے بعد ڈائننگ ہال سے اٹھ گئے۔ یوں بھی اب وہاں مزید بیٹھنا بے سود ہی تھا۔ اس کے علاوہ اپنے سوئٹ میں پہنچ کر مجھے کمانڈر نواز سے بات کرنے کی بھی جلدی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اس دوران میں کمانڈر نواز بتائے گئے ٹیلی فون نمبر کے مالک کا نام اور پتا معلوم کر چکا ہو گا۔

دوسری منزل پر پہنچنے کے لئے ہم لفٹ میں سوار ہو گئے۔ لفٹ مین جب لفٹ کا دروازہ بند کرنے والا تھا تو ایک دراز قد غیر ملکی تیزی سے اس طرف بڑھا۔ لفٹ میں ہمارے علاوہ اور لوگ بھی تھے۔ مزید افراد کی گنجائش نہیں تھی۔ لفٹ مین اسی لئے اس دراز قد غیر ملکی کی طرف دیکھتے ہوئے معذرت کرنے لگا۔ ''سوری سر!'' پھر اس نے لفٹ کا دروازہ بند کر لیا اور لفٹ کو اوپر لے جانے کے لئے بٹن دبا دیا۔

لفٹ پہلی منزل پر رکی تو اچانک سرفراز مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تم چلو اوپر میں آتا ہوں ابھی!'' یہ کہتے ہی وہ لفٹ سے باہر نکل گیا۔

سرفراز کا رویہ میرے لئے ناقابل فہم تھا۔ میں سمجھ نہیں سکی تھی کہ وہ پہلی منزل ہی پر کیوں اتر گیا تھا!

لفٹ جب دوسری منزل کے لئے روانہ ہو رہی تھی تو میں نے سرفرزا کو تیز قدمی کے ساتھ بائیں جانب جاتے دیکھا تھا اور اس سمت زینہ تھا۔ میں صرف یہی اندازہ لگا سکی کہ کسی سبب وہ نیچے جانا چاہتا ہے۔ میں سمجھی کہ شاید نیچے ڈائننگ ہال میں وہ کوئی چیز بھول آیا ہے۔

دوسری منزل پر پہنچ کر میں لفٹ سے اتر گئی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں نے سرفراز کو آپریشن سیل سے رابطہ قائم کرنے بھیجا تھا تو سوئٹ کی چابی اسے دے دی تھی۔ اس کی واپسی تک بہرحال مجھے راہداری ہی میں رہنا تھا۔ وقت گزاری کی خاطر میں سست قدموں سے راہداری کے مخالف سمت بڑھ گئی۔ راہداری کے آخری سرے پر پہنچ کر میں واپسی کے لئے مڑ گئی۔ اس وقت وہاں صرف چند ہی افراد ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر وہی تھے جو لفٹ میں میرے ہی ساتھ دوسری منزل پر اترے تھے۔ میں اب چہل قدمی کے انداز میں اپنے سوئٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے سوئٹ سے پہلے جین کا کمرا تھا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے سن گن لینا چاہی۔ اندر خاموشی تھی۔ میں قدم بڑھاتی ہوئی اپنے سوئٹ کے دروازے پر آ کے رک گئی۔ میری نظریں اب لفٹ کی طرف تھیں۔ جس کے قریب ہی زینہ تھا۔ چند ہی لمحے بعد میں نے اسی دراز قد غیر ملکی کو زینے سے راہداری پر آتے دیکھا جو لفٹ میں سوار نہ ہو سکا تھا۔ وہ سرمئی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کے سر پر ہیٹ بھی تھا۔ اسے شاید اوپر آنے کی جلدی رہی ہو گی اسی لئے اس نے لفٹ کا انتظار نہیں کیا تھا۔ میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ غالباً اسے اسی جانب کسی کمرے میں جانا تھا۔ وہ غیر

ملکی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جب جین کے کمرے کے سامنے پہنچ کر رکا تو میں چونک اٹھی۔ وہ بیل کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا کہ اسی وقت مجھے راہداری میں سرفراز کی جھلک نظر آئی۔

سرفراز کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے مجھ تک پہنچنے کی زیادہ جلدی نہیں ہے۔ وہ اطمینان سے چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اسی اثنا میں جین کے کمرے کا دروازہ کھل چکا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ دراز قد غیر ملکی اندر چلا گیا اور پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔ سرفراز کا پہلی ہی منزل پر اتر جانا پھر یقیناً اس غیر ملکی کا تعاقب کرتے ہوئے اوپر آنا اور اس غیر ملکی کا جین کے کمرے میں داخل ہونا میرے نزدیک یہ سب کچھ بے معنی نہیں تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔

اپنے قیاسات کے سہارے میں ایک نتیجے تک پہنچی ہی تھی کہ سرفراز مجھ تک پہنچ گیا۔ وہ میرے سیل کا ایک تربیت یافتہ رکن تھا اس لئے اس کی طرف سے کسی قسم کی بے احتیاطی کا سوال نہیں تھا۔ اس نے کچھ کہے بغیر اپنے کوٹ کی جیب سے سوئٹ کے دروازے کی چابی نکالی اور قفل کھولنے لگا۔

سوئٹ کا دروازہ کھلنے کے بعد ہم دونوں بغیر کسی جلد بازی کا مظاہرہ کئے اندر پہنچ گئے۔ سرفراز نے دروازہ بند کر دیا۔

پہلا کمرا نشست گاہ تھا میں وہاں رکے بغیر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سرفراز میرے پیچھے پیچھے تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ سرفراز کچھ کہتا میں اپنے قیاس کے پیش نظر بول اٹھی۔ ''وہ دراز قد غیر ملکی سولومن ہی تھا نا؟''

''حتمی طور پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' سرفراز نے محتاط انداز میں جواب دیا' پھر بولا۔ ''لیکن پچھتر فیصد یہ بات درست ہو سکتی ہے۔'' اس کے بعد وہ مجھے تفصیل سے بتانے لگا۔ ''جب وہ لفٹ کے قریب آیا تو مجھے اس پر ہلکا سا شبہ ہوا تھا کہ ممکن ہے وہ سولومن ہو۔ اپنے اسی شبہے کی تصدیق کیلئے میں نے پہلی منزل پر اتر کر زینے کے ذریعے نیچے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ مجھے زینے کے وسط ہی میں مل گیا۔ میں اوپر سے اتر کر آ رہا تھا اور وہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس دوران میں اس کا میں نے بھرپور جائزہ لے لیا۔ سولومن کی حیثیت سے جو شخص شہریار سے ملا تھا وہ بھی دراز قد ہی تھا۔ چہرے کے نقوش بھی یہی تھے۔ صرف آنکھوں کی پتلیوں اور سر کے بالوں کا رنگ مختلف تھا۔ اس کے علاوہ اس شخص کے چہرے پر گھنی مونچھیں بھی تھیں۔ اس دراز قد غیر ملکی کی پتلیوں کا رنگ بھورا ہے۔ سر کے بال سنہری ہیں اور مونچھیں بھی نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ جب وہ شہریار سے ملا ہو تو میک اپ میں ہو اور اس وقت......''

''سو فی صد ایسا ہی ہے!'' میں نے سرفراز کی بات کاٹ دی۔ ''شہریار سے وہ میک اپ ہی میں ملا ہو گا۔ بالوں کا رنگ بدلنے کے لئے اس نے وگ استعمال کی ہو گی۔ پتلیوں کا رنگ کونٹیکٹ لینس سے بدلا جا سکتا ہے اور چہرے پر مونچھوں کا اضافہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ یقیناً وہ سولومن ہے۔ وہ جین کے کمرے میں گیا ہے' اس سے بھی یہی تصدیق ہوتی ہے۔ سولومن کے ساتھ آنے والے امریکی ایجنٹوں میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے کے ٹھکانے کا علم نہیں' صرف سولومن کو ان کے ٹھکانوں کی خبر ہے۔ ایسی صورت میں یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی اور امریکی ایجنٹ جین سے ملنے آیا ہو۔''

''اگر آپ کو یقین ہے کہ وہ سولومن کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تو یہ موقع بہت غنیمت ہے۔ اس وقت اس پر بہ آسانی ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے۔'' سرفراز پرجوش لہجے میں بولا۔

سرفراز کی تجویز سے میں سوچ میں پڑ گئی۔ ایسا ممکن تھا' میں اپنے ذہن کی غیر معمولی قوتوں کو بروئے کار لا کر اسے بے بس کر سکتی تھی۔ اس سے قطع نظر اگر جسمانی طور پر بھی نبرد آزمائی کی نوبت آ جاتی تو میں پیچھے نہ ہٹتی مگر جانے کیوں میرا ذہن اس تجویز پر عمل کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہو رہا تھا جس بات کو میرا ذہن قبول نہیں کرتا تھا میں عموماً اس پر عمل کرنے سے گریز کرتی تھی۔ بعد میں یہ میرے ہی حق میں بہتر ثابت ہوتا تھا۔ میں نے اپنے اسی تجربے کی روشنی میں اس وقت صبر و تحمل سے کام لیا۔ میری ذرا سی عجلت سارا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ سولومن بہر حال ڈاکٹر رچرڈ کا نائب تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ میرے ذہن کے زیر اثر آ ہی جاتا۔ خود ڈاکٹر رچرڈ اور جرمن سائنس دان شیفرڈ کے سلسلے میں ایسا ہی ہو چکا تھا۔ ان دونوں ہی نے اپنے ذہنوں تک میرے طاقت ور ذہن کی رسائی نہیں ہونے دی تھی۔ یہ واقعہ قاہرہ کا تھا۔ ہاں دوسرے جرمن شیپرڈ کا ذہن میرے زیر اثر ضرور آ گیا تھا ورنہ قاہرہ سے میرا فرار ممکن نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی میرے مدنظر تھی کہ یہاں ہوٹل میں نبرد آزمائی کا نتیجہ سولومن کے لئے نسبتاً سود مند ثابت ہو گا۔ یہاں سے فرار کے بہت سے راستے تھے۔ ہنگامہ آرائی کی صورت میں وہ یہاں سے بچ کر نکل سکتا تھا۔

جب تک میں سوچتی رہی اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچی سرفراز نے مداخلت نہیں کی۔ وہ خاموش بیٹھا میرے بولنے کا منتظر رہا۔

''نہیں!'' بالآخر میں نے اپنا فیصلہ سنا ہی دیا۔ ''اس وقت میں اس پر ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتی۔ آئندہ چند روز میں یقیناً ایک ایسا موقع آنے والا ہے کہ نہ صرف سولومن بلکہ اس کے تمام ساتھیوں پر بیک وقت ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں اس خطرناک منصوبے کی جزئیات آ گئی تھیں جس پر سولومن عمل کرنے والا تھا۔ ''ممکن ہے کہ ہمیں جلد ہی یہ موقع مل جائے۔''

میں نے سرفراز سے جو کچھ کہا تھا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ اس خطرناک منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے ملکی اور غیر ملکی تمام ہی امریکی ایجنٹوں کو کسی ایک جگہ جمع ہونا تھا جہاں سولومن ان سب کو ضروری احکام دیتا۔ اسی کے ساتھ وہ ملک کے مختلف شہروں میں انتشار اور بدنظمی پھیلانے کے طریقہ کار کی بھی وضاحت کرتا۔ صرف سولومن اور جین پر ہاتھ ڈالنے سے زیادہ بہتر تھا کہ ان سب کو رنگے ہاتھوں بیک وقت پکڑ لیا جاتا۔

جین کا ذہن پڑھنے کے باوجود ابھی تک میرے علم میں صرف دو باتیں نہیں آئی تھیں۔ اول یہ کہ سازشیوں کا یہ اجتماع کب ہونا تھا؟ دوم یہ کہ کہاں؟ اگر مجھے اپنے ان دونوں سوالوں کا جواب مل جاتا تو گویا میں بہ آسانی ان کی بساط الٹ دیتی۔

اس وقت جین سے سولومن کی ملاقات بھی میرے لئے معنی خیز تھی۔ یہ ملاقات اسی خطرناک منصوبے کی ایک کڑی بھی ہو سکتی تھی۔

میں ابھی غور و فکر میں غلطاں تھی کہ میری نگاہ سرفراز کے چہرے پر پڑی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ

کچھ کہنا چاہتا ہے اور مجھے کچھ سوچتے دیکھ کر چپ ہے۔

''تم شاید کچھ کہنا چاہتے ہو!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''جی۔'' وہ فوراً بول اٹھا۔ ''اگر آپ کا حکم ہو تو میں سولومن کا تعاقب کروں۔ اس طرح یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہے؟''

میں نے انکار میں سر ہلا دیا' پھر بولی۔ ''یہ بھی مناسب نہیں۔ وہ بہت زیرک قسم کا ایجنٹ ہے۔ یہ مشکل ہی ہے کہ وہ اپنے تعاقب سے بے خبر رہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ یہاں سے سیدھا اسی جگہ جائے جہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ میری تمام احتیاط کا مقصد محض یہ ہے کہ وہ کہیں چوکنا نہ ہو جائے۔ اس کی سکونت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ہمارے پاس ایک اور ذریعہ بھی تو ہے۔ کیا تم وہ فون نمبر بھول گئے؟'' پھر میں نے سرفراز کو بتایا۔ ''یہ وہ فون نمبر ہے جس پر ہنگامی حالات میں جین سولومن سے رابطہ قائم کر سکتی ہے۔ ٹھہرو میں ابھی کمانڈر نواز سے اس کے متعلق معلوم کرتی ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں اٹھی اور الماری سے محدود قوت کا ٹرانسمیٹر نکال لائی۔

کچھ ہی دیر میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے ٹرانسمیٹر پر میرا رابطہ قائم ہو گیا۔ دوسری جانب سے کمانڈر نواز کہہ رہا تھا۔ ''لیس......! آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر...... کمانڈر نواز آن دی لائن...... اوور۔''

''عذرا خان اسپیکنگ کمانڈر!'' پھر میں نے سے مذکورہ ٹیلی فون نمبر کے مالک کا نام اور پتا دریافت کیا۔

جواب میں کمانڈر نواز نے کلفٹن کے علاقے میں قیام پذیر ایک شخص سعید احمد خان کا نام اور پورا پتا بتایا' پھر مزید بولا۔ ''یہ شخص مشہور سیاسی لیڈر عبدالحمید خان کا چھوٹا بھائی ہے۔ عبدالحمید خان تو ہم سے شکست فاش کھانے کے بعد سیاست سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشیں ہو چکا ہے مگر سعید احمد خان ملکی سیاست میں اپنے بڑے بھائی کی جگہ لینے کے لئے کوشاں ہے۔ اوور۔''

''تھینک یو کمانڈر۔ اوور اینڈ آل۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔

کمانڈر نواز نے کم وقت میں نہایت اہم اطلاع فراہم کی تھی۔ سولومن کا تعاقب کرائے بغیر مجھے اس کی پناہ گاہ کا علم ہو گیا تھا اور یہ کامیابی بہرحال کم نہیں تھی۔

''آج کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہمیں سولومن کا پتا معلوم ہو گیا' دوسرا قدم اٹھانے کے لئے شاید ہمیں چند دن انتظار کرنا پڑے۔ یہ دوسرا قدم انشاءاللہ سولومن کے حق میں آخری قدم ثابت ہو گا۔'' میں نے سرفراز کو مخاطب کیا۔ ''اب تم اپنے کمرے میں جا کر سو سکتے ہو۔''

میرے ایما پر سرفراز اثبات میں سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے بھی لباس تبدیل کیا اور بستر پر لیٹ گئی مگر ابھی میرا سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ سونے سے پہلے میں جین کے ذہن کا ایک بار پھر مطالعہ کرنا چاہتی تھی تاکہ مجھے معلوم ہو جائے' سولومن اس سے کیوں ملنے آیا تھا!

میں نے آنکھیں بند کر کے جین کا تصور کیا پھر جلدی ہی اس کے ذہن سے میرے ذہن کا رابطہ قائم ہو گیا۔

پھر مجھے کچھ ہی دیر بعد جو کچھ معلوم ہوا اس سے میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے

مید نہیں تھی کہ سولومن اس قدر جلد بازی سے کام لے گا۔ آئندہ شب ٹھیک نو بجے تمام ملکی اور غیر ملکی مریکی ایجنٹ کلفٹن کی اسی کوٹھی میں جمع ہونے والے تھے جس کا پتا مجھے کمانڈر نواز نے دیا تھا۔ سولومن جین کو یہی اطلاع دینے آیا تھا۔ سولومن نے جین کو یہ بھی بتایا تھا کہ بھاری تعداد میں جو اسلحہ اسمگل کر کے لستان لایا جا چکا ہے وہ بھی کل رات ہی میٹنگ کے بعد اس کوٹھی سے امریکی ایجنٹوں کے ذریعے مختلف مقامات تک پہنچا دیا جائے گا۔

''آئندہ شب نو بجے!'' میں غیر ارادی طور پر بڑبڑائی اور اسی کے ساتھ میری رگوں میں لہو ـمانے لگا۔

اپنے دشمن پر کاری ضرب لگانے کا وقت آ گیا تھا۔

میں جوش جذبات میں بستر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

''سرفراز...... کیا تم سو گئے؟'' میں بلند آواز میں بولی تاکہ دوسرے کمرے تک میری آواز پہنچ سکے۔

''جی ابھی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کوئی حکم؟''

میں نے اس سے اپنے کمرے میں آنے کے لئے کہا اور تیزی کے ساتھ الماری کی طرف بڑھی۔ جب میں الماری سے ٹرانسمیٹر نکال رہی تھی تو سرفراز میرے کمرے میں آ چکا تھا۔

''اب یہاں مزید وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ تم فوراً کپڑے بدل کر نیچے جاؤ اور ہوٹل کے واجبات وغیرہ ادا کر دو! ہم آج رات ہی یہ ہوٹل چھوڑ رہے ہیں۔ میں اس دوران میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے کوئی کار یہاں منگوا لیتی ہوں تاکہ کنوینس کی پرابلم نہ ہو اور ہم جلد از جلد آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر واپس پہنچ جائیں۔''

سرفراز میری ہدایت پر کپڑے بدلنے چلا گیا اور میں ٹرانسمیٹر پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرنے لگی۔

کل رات دشمن پر آخری ضرب لگانے کے لئے مجھے آج ہی رات سے سرگرم عمل ہونا تھا۔

☆......☆......☆

کمانڈر نواز کو یہی علم تھا کہ میں ہوٹل میں چند روز قیام کی غرض سے آئی ہوں اور اس کی وجہ بھی اسے معلوم تھی۔ وہ اسی لئے ٹرانسمیٹر پر میری بات سن کر کچھ حیرت زدہ سے لہجے میں کہنے لگا۔ ''یہی کہا آپ نے کہ میں یہاں سے کوئی کار بھیج دوں تاکہ آپ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ سکیں!'' اس کا لہجہ تصدیق طلب تھا۔ ''اوور!''

''ہاں یہ کہا ہے میں نے۔'' جواباً میں بول اٹھی۔ ''کام ہو گیا کمانڈر!'' میری آواز میں دبا دبا جوش تھا۔ ''اب یہاں مزید رکنے کی ضرورت نہیں' اوور!''

''بہتر ہے۔'' وہ بولا۔ ''نصف گھنٹے کے اندر اندر کار ہوٹل کے گیٹ پر پہنچ جائے گی۔ مزید کوئی حکم؟ اوور!''

''نہیں' اوور اینڈ آل!'' یہ کہہ کر میں نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔

اس دوران میں سرفراز لباس تبدیل کر چکا تھا۔ وہ ہوٹل کے واجبات ادا کرنے چلا گیا اور میں سامان پیک کرنے لگی۔

مجھے اور سرفراز کو تیار ہونے میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہ لگے مگر نصف گھنٹے سے قبل میں ہوٹل کی عمارت سے باہر نہیں آئی۔ صدر دروازے پر کار کا انتظار کرنے سے یہ بہتر تھا کہ ہم ہوٹل ہی میں یہ وقت گزارتے۔ سو میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ ہوٹل کے صدر دروازے پر آتے ہی میں نے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے بھیجے جانے والی نیلی کار کو پہچان لیا۔ ہوٹل کے پورٹر ہمارے سوٹ کیس اٹھائے ساتھ ساتھ ہی تھے۔ میرے ایما پر انہوں نے نیلی کار کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس دوران میں نیلی کار کا ڈرائیور یقیناً ہمیں دیکھ چکا تھا۔ اس نے کار سے اتر کر ڈکی کھول دی۔ پورٹروں نے دونوں سوٹ کیس ڈکی میں رکھ دیے۔ میں نے انہیں ٹپ دے کر رخصت کیا اور پھر کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ سرفراز نے بھی میری تقلید کی۔ پھر کچھ ہی بعد کار وہاں سے روانہ ہو گئی۔

جب میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچی تو رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ سرفراز کو اپنے ساتھ لے جانا سود مند ہی ثابت ہوا تھا۔ اسے جس مقصد سے میں ساتھ لے گئی تھی وہ بہرحال پورا ہو گیا تھا۔ اگر وہ سولومن کی نشان دہی نہ کرتا تو شاید مجھے اتنی جلد کامیابی نہ ہوتی۔ اس کا کام ختم ہو گیا تھا اس لئے میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور خود اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ڈیوٹی روم ہی میں رک گئی۔ آئندہ شب امریکی ایجنٹوں پر ہاتھ ڈالنے کے لئے مجھے آج ہی تمام منصوبہ بندی کرنا تھی۔ کمانڈر

نواز سے اس سلسلے میں گفتگو ضروری تھی کیونکہ وہ صبح اپنی ڈیوٹی آف کر کے چلا جاتا۔ منصوبہ بندی ہی کی غرض سے میں فوری طور پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر آ گئی تھی۔

میں نے مختصراً کمانڈر نواز کو امریکی ایجنٹوں کے خطرناک منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ وہ توجہ سے میری پوری بات سنتا رہا۔ اس نے میری معلومات کے ذرائع سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اسے میرے ذہن کی غیر معمولی قوتوں کا علم تھا۔ اسی سبب شاید اس نے کسی قسم کے سوال سے گریز کیا تھا۔ اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں نے مشورہ طلب لہجے میں کمانڈر نواز سے کہا۔ ''ان کے منصوبے کو ناکام بنانے اور انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کے دو راستے ہیں۔ ہمیں انہی دونوں راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ پہلا راستہ تو یہ ہے کہ میں براہ راست محترم وزیر داخلہ سے رابطہ قائم کر کے انہیں تمام حالات سے باخبر کر دوں۔ پھر وہ خود ہی اس سلسلے میں فوری طور پر احکام جاری کر دیں گے۔ یوں آئندہ شب ان سبھی کو عین موقع پر حراست میں لے لیا جائے گا اور پھر پولیس خود ہی وہاں سے غیر قانونی اسلحہ برآمد کر کے اپنے قبضے میں کر لے گی۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم خود ان پر ہاتھ ڈالیں' پھر بعد میں انہیں قانون کے حوالے کر دیں۔ تمہارے خیال میں کون سا راستہ زیادہ مناسب ہے کمانڈر؟''

کمانڈر نواز فوری طور پر کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے سے غور وفکر کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر کسی قدر جھجکتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ دوسرا راستہ زیادہ مناسب ہے۔''

''اس کی وجہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس طرح دشمن قطعی لاعلمی کا شکار رہے گا جبکہ پہلا راستہ اختیار کرنے کی صورت میں بہرحال یہ امکان ہے اسے کسی طرح اس آپریشن کا علم ہو جائے۔ کچھ علم تو نہیں ہمیں کہ ان کے مہرے کہاں کہاں ہیں! ظاہر ہے کہ آپ کے ذریعے یہ بات محترم وزیر داخلہ کے علم میں آئے گی۔ وہ ہوم سیکرٹری کو حکم دیں گے اور پھر ہوم سیکرٹری آئی جی اور دوسرے حکام کو اس سے آگاہ کرے گا۔ آپریشن سے قبل ڈی آئی جی اور دوسرے حکام کے علم میں بھی لازماً یہ بات آئے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بات اس وقت صرف ہمارے علم میں ہے بہت سے لوگوں تک پہنچ جائے گی۔ ان میں سے کوئی بھی دشمن کا آلہ کار ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں پولیس آپریشن کی ناکامی کا امکان بھی ہے۔'' کمانڈر نواز نے اپنی بات کی وضاحت میں کہا۔

کمانڈر نواز نے جیسے میرے ہی ذہن میں ابھرنے والے خدشات کو زبان دی تھی۔ خود میرے ذہن میں بھی یہ بات کھٹک رہی تھی مگر متعلقہ حکام کو اعتماد میں لئے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے میں کچھ ہچکچا رہی تھی۔ اس سلسلے میں کمانڈر نواز سے مشورہ کرنے کا سبب بھی یہی تھا۔

''تم نے شاید ایک بات کو نظر انداز کر دیا۔'' میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''ان لوگوں کو قانون کے حوالے کرتے ہوئے بہرحال مجھے یہ ثبوت بھی فراہم کرنا ہو گا کہ وہ واقعی کسی ملک دشمن منصوبے کو عملی جامہ پہنانے والے تھے اور یہ کہ جو غیر قانونی اسلحہ ہمارے ہاتھ آئے گا وہ اسی کوٹھی سے برآمد کیا گیا تھا اس کا ثبوت ہم کیا دیں گے؟''

میری بات نے کمانڈر نواز کو سوچ میں ڈال دیا جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' بالآخر وہ بولا۔ ''ہم مطلوبہ ضروری شواہد اور ثبوت فراہم کرنے سے قاصر رہیں گے۔ ہاں اگر ان کی میٹنگ کی کارروائی کسی طرح ریکارڈ کی جا سکے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ ان کے خلاف یہ ایک ناقابل تردید ثبوت ہوگا۔''

''کیا تمہارے خیال میں یہ ممکن ہے کہ ہم ان پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے میٹنگ کی کارروائی ریکارڈ کر سکیں؟'' میں نے پوچھا۔

''حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔'' کمانڈر نواز محتاط لہجے میں بولا۔ ''اس کا انحصار اصل میں وقت اور حالات پر ہے۔ میٹنگ کی کارروائی ریکارڈ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا کوئی آدمی اس وقت ان لوگوں کے قریب ہی کہیں موجود ہو۔ وہ میٹنگ شروع ہونے سے پہلے اندر کوٹھی میں پہنچ جائے اور جب میٹنگ ختم ہونے والی ہو تو ہمیں سگنل دے دے۔ اسی کے بعد ہم کوٹھی پر ریڈ کر دیں لیکن وہ لوگ اتنے بے خبر ہو سکتے ہیں کہ انہیں کوٹھی میں ہمارے آدمی کے داخل ہونے کا علم نہ ہو' یہ ذرا مشکل لگتا ہے۔''

کمانڈر نواز کی بات سے میرے ذہن میں ایک اور اچھوتا خیال آیا۔ اس مسئلے پر اس سے گفتگو کرنا لاحاصل نہیں رہا تھا۔

''کمانڈر! ہمارے علم میں کم از کم تین افراد ایسے ہیں جن کی اس میٹنگ میں شرکت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا' ایک جیفرسن' دوسرا سعید احمد خان اور تیسری جین ہیری! اگر ہم ان تینوں میں سے کسی ایک کی جگہ لے لیں تو کیسا رہے؟'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''یہ تینوں ہی بہرحال ہماری دسترس سے باہر نہیں ہیں۔''

''سعید احمد خان اور جین کے باب میں تو یہ ممکن ہے مگر جیفرسن کس طرح اس میٹنگ میں شریک ہو سکتا ہے' میں نہیں سمجھ سکا۔'' کمانڈر نواز نے کہا۔

''جیفرسن کو کم از کم جین کے بارے میں تو معلوم ہے کہ وہ کہاں ٹھہری ہوئی ہے! وہ گویا کسی طرح میری قید سے رہائی پا کر جین سے ملتا ہے تاکہ سولومن سے رابطہ کی صورت پیدا ہو سکے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں جین فون پر سولومن سے رابطہ قائم کر کے اس سے ہدایت لے گی یا پھر اسے بھی میٹنگ میں شرکت کیلئے کہہ دے گی کہ وہاں سولومن سے ملاقات ممکن ہو گی۔ اس طرح جیفرسن بھی اس میٹنگ میں پہنچ سکتا ہے۔ وہ بہرحال ایک اہم امریکی ایجنٹ ہے اور موجودہ منصوبے میں اسے بھی اہم کردار ادا کرنا تھا۔ ان حالات میں لازماً سولومن اسے نظرانداز نہیں کرے گا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''معاف کیجئے گا ..... میرا خیال اس سے مختلف ہے۔'' کمانڈر نواز میری بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کسی ایسے شخص کو جو دشمن کی قید میں رہ چکا ہو فوری طور پر سولومن اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دے گا۔ وہ یہ سوچ سکتا ہے کہ کہیں رہا ہو کر آنے والا دشمن کی نظر میں نہ ہو اور اسے چارے کے طور پر استعمال نہ کیا جا رہا ہو! میرے خیال میں سولومن ایسا ذہین شخص اس اہم نکتے کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اس اعتبار سے جیفرسن کی جگہ لینا بے سود بھی ثابت ہو سکتا ہے۔''

''تمہاری دلیل مضبوط ہے۔'' میں نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ ''تو پھر اب جیفرسن کے خیال کو ہم ذہن سے نکال دیتے ہیں۔ سعید احمد خان اور جین کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ ان

دونوں میں سے کس کی جگہ لینا بہتر ہو سکتا ہے؟ یہ ذہن میں رہے کہ ہمیں کل رات میٹنگ شروع ہونے سے پہلے ان میں سے کسی ایک کو اغوا کر کے اس کی جگہ لینا پڑے گی۔''

''جہاں تک میرے علم میں ہے سعید احمد خان غیر معمولی تن و توش کا آدمی ہے۔ آپریشن سیل کے ارکان میں کوئی بھی اس قدر فربہ نہیں جو اس کی جگہ لے سکے۔ بھاری جسامت' طویل قد' باہر کو نکلی ہوئی توند اور......''

''مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کمانڈر نواز کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے سعید احمد خان کو کبھی دیکھا نہیں تھا ورنہ اس سلسلے میں اس کا ذکر نہ کرتی۔ ایسی صورت میں بس اب جین ہی رہ جاتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کی جگہ لینا میرے لئے آسان رہے گا۔''

''آپ کے بجائے نرگس بھی اس کی جگہ لے سکتی ہے۔'' کمانڈر نواز نے رائے دی۔

''نہیں!'' میں نے انکار کر دیا۔ ''میں اسے اتنے شدید خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔''

''تو پھر یہ طے ہوا کہ آپ جین کی جگہ اس میٹنگ میں شرکت کریں گی!'' کمانڈر نواز کا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب مسئلہ یہ ہے کہ جین کو کب اغوا کیا جائے؟ اس کا بہروپ بھرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ میرے سامنے ہو۔ ہرچند کہ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پہ مشہور اطالوی اداکارہ صوفیہ لارین سے بہت مشابہت رکھتا ہے مگر میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔ بہتر یہی ہو گا کہ میں اس کی موجودگی میں اپنے چہرے کا میک اپ کروں تاکہ کسی قسم کی کوئی کسر نہ رہ جائے۔ پھر میں اس کی آواز اور لب و لہجے کی نقل بھی کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ میں اس سے گفتگو کروں اور اس کی آواز کے زیر و بم اور حرکات و سکنات کا بہ غور جائزہ لوں تاکہ سولومن کو مجھ پر شک نہ ہو سکے۔''

''پھر تو آج ہی رات اسے اغوا کرنا ضروری ہے۔'' کمانڈر نواز بولا۔

''اور یہ بھی ضروری ہے کہ میں صبح تک ہوٹل پہنچ جاؤں' اسی ہوٹل میں جہاں جین کا قیام ہے۔ زیادہ دیر اس ہوٹل سے اس کی غیر حاضری بھی دشمن کو چوکنا کر سکتی ہے۔ ممکن ہے اس دوران میں دوبارہ سولومن کسی سبب اس سے رابطہ قائم کرے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا' پھر کمانڈر نواز کو جین کے کمرے کا نمبر بتایا اور ضروری ہدایات دے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اپنے کمرے میں آ کر پہلے میں نے میک اپ ختم کیا' منہ دھویا اور پھر لباس تبدیل کر کے بستر پر دراز ہو گئی۔ کچھ دیر میں آرام کر لینا چاہتی تھی کیونکہ رات کا بقیہ حصہ جاگتے ہوئے ہی گزارنا تھا۔ پھر مجھے آرام کا موقع نہ ملتا۔ جب تک جین کو اغوا کر کے وہاں نہ لے آیا جاتا میرے پاس آرام کا وقت تھا۔ کمانڈر نواز سے گفتگو کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچی تھی اگر پہلے پہنچ جاتی تو شاید اس وقت جین بھی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں ہوتی۔ اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کو بروئے کار لا کر میں اسے ہوٹل سے نکال لاتی۔

لیٹے لیٹے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ مجرموں کو ایٹ دی اسپاٹ ہی قانون کے حوالے کیوں نہ کر

دیا جائے! اس طرح میں خواہ مخواہ کے طویل چکر سے بچ سکتی تھی۔ وہیں کے وہیں سارا معاملہ نمٹ جاتا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ قبل از وقت کسی کو کچھ خبر نہ ہو سکے تو وزیر داخلہ کو تمام حالات سے مطلع کر کے اسے کا تدارک کیا جا سکتا تھا۔ آخر وقت تک وزیر داخلہ کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہ ہوتا۔

اس وقت نصف شب کے قریب گزر چکی تھی۔ یہ معاملہ اتنی اہم نوعیت کا تھا کہ میں انہیں سوتے سے بھی بیدار کرتی تو وہ کچھ خیال نہ کرتے۔ ویسے بھی عموماً وہ رات کو دیر سے سونے کے عادی تھے۔ یہی سوچ کر میں بستر سے اٹھی اور میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ اپنے قریب کر لیا۔ میں اب وزیر داخلہ کا وہ ٹیلی فون نمبر ملا رہی تھی جس پر عموماً ایمرجنسی کی صورت میں ان سے رابطہ قائم کیا جاتا تھا۔ یہ فون نمبر بھی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں درج نہیں تھا۔

دوسری جانب کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی' پھر ریسیور اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو!'' غنودگی میں ڈوبی ہوئی بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ میں پہچان گئی یہ وزیر داخلہ ہی کی آواز تھی۔

''میں عذرا خان بول رہی ہوں۔ معذرت خواہ ہوں کہ میں نے ناوقت آپ کو زحمت دی۔'' میں نرمی سے بولی۔

''بس ابھی کچھ دیر پہلے لائٹ آف کر کے سونے لیٹا تھا۔'' وہ بولے۔ ''کوئی بات نہیں' تم کہو! یقیناً کوئی ایسی اہم ہی بات ہو گی جو تم نے اس وقت فون کیا ہے۔''

''جی ہاں۔'' یہ کہہ کر میں نے انہیں مختصراً امریکی ایجنٹوں کے خطرناک منصوبے سے آگاہ کر دیا۔

''کاش تمہاری طرح ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھا کریں۔'' انہوں نے پرتاسف لہجے میں کہا۔

ابھی تک میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ آئندہ شب ہی سے امریکی ایجنٹ اپنے منصوبے پر عمل درآمد شروع کرنے والے ہیں۔

''جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں وہ لوگ تمہاری نظر میں آ چکے ہیں۔'' وہ مزید بولے۔ ''اور یقیناً تم یہ چاہتی ہو کہ کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے ہی ان پر ہاتھ ڈال دیا جائے! یہی بات ہے نا؟''

''میں ان سب کو بیک وقت اور رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتی ہوں۔ آئندہ شب وہ سب ایک جگہ جمع ہونے والے ہیں اور وہیں سے اسلحہ بھی تقسیم ہو گا۔ گویا کل رات سے وہ اپنے منصوبے کا آغاز کرنے والے ہیں' جہاں وہ لوگ میٹنگ کر رہے ہیں مجھے اس جگہ کا بھی علم ہو چکا ہے۔'' میں مزید بتایا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم سب کچھ خود ہی کر چکی ہو!'' وہ پرجوش لہجے میں بولے۔ ''ہمیں تو بس انہیں حراست میں لینا رہ جائے گا!''

''تقریباً صورت حال یہی ہے!'' میں بولی۔ ''بلکہ میں تو اتنا بھی نہیں چاہتی' میرا مقصد انہیں ایٹ دی اسپاٹ قانون کے حوالے کر دینا ہے' مع ثبوت!''

''سمجھا نہیں میں......! وضاحت کرو کہ تم آخر کیا چاہتی ہو؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

''ان کی میٹنگ کی تمام کارروائی ریکارڈ کر لی جائے گی۔ اس میٹنگ میں خود میرے سیل کا ایک اہم رکن میک اپ میں موجود ہو گا جو یہ فرض انجام دے گا۔'' میں نے انہیں دانستہ یہ نہیں بتایا کہ سیل کا وہ اہم رکن کوئی اور نہیں خود میں ہوں گی۔ وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اس طرح انہیں خواہ مخواہ میری طرف سے فکر لاحق ہو جاتی۔ میں اپنے لائحہ عمل کی وضاحت کرتی رہی۔ ''دراصل میٹنگ کی کارروائی کی یہ ریکارڈنگ ان لوگوں کے خلاف ایک ناقابل تردید ثبوت ہو گی۔ پھر جب میٹنگ کے اختتام پر اسلحہ کی تقسیم اور اسے ملک کے مختلف شہروں میں پہنچائے جانے کا مرحلہ شروع ہو گیا تو عین اسی وقت میرے سیل کے ارکان اس کوٹھی پر ریڈ کر دیں گے۔ تمام ایجنٹوں کو حراست میں لینے اور وہاں موجود سارے اسلحہ پر قبضہ کرنے کے بعد مع ثبوت وشواہد ان سب کو قانون کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ میں یہی چاہوں گی کہ اس سلسلے میں میرا نام نہ آئے اور یہی ظاہر کیا جائے کہ قانون کے محافظوں نے خود اپنے طور پر یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کی عملی صورت......''

''ذرا ٹھہرو......!'' وزیر داخلہ نے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''تمہیں اس تمام بکھیڑے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم صرف وہ پتا بتا دو جہاں وہ لوگ میٹنگ کرنے جمع ہوں گے اور یہ کہ میٹنگ کس وقت ہو گی؟ باقی سب کچھ ہم پر چھوڑ دو۔ آخر ہمارے محکموں کو بھی تو کچھ کرنا چاہیے! یہ بھی بہت بڑی بات ہو گی کہ انہیں ایک مصدقہ اطلاع مل جائے گی اور وہ رنگے ہاتھوں ملک دشمن عناصر کو پکڑ لیں گے۔''

جواباً میں نے وہی تمام باتیں دہرا دیں جو کمانڈر نواز نے مجھ سے کی تھیں۔

''تو تمہیں دراصل یہ خطرہ ہے کہ آپریشن سے پہلے کہیں کسی ذریعے سے مجرموں کو علم نہ ہو جائے کہ ان پر ہاتھ ڈالا جانے والا ہے......! بہرحال ان حالات میں نہایت محتاط رہنا ضروری ہے۔ اس امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیا خبر ہمارے درمیان کون ان کا آلہ کار ہو۔ ٹھیک ہے تم جو چاہو گی وہی ہو گا۔ بات مجھ تک رہے گی اور آخر وقت تک کسی کو اس آپریشن کے بارے میں علم نہیں ہو گا۔ تاہم غالباً اس کی عملی صورت کے متعلق کچھ کہنے والی تھیں۔''

''میں چاہتی ہوں کہ اس علاقے میں پہلے سے بھاری تعداد میں مسلح افراد موجود ہوں مگر سادہ لباس میں! آئی جی پولیس یا کوئی اور بڑا ذمے دار افسر اس آپریشن کا نگران ہو۔ اسے بھی اسی علاقے میں موجود ہونا چاہیے۔ آئی جی پولیس یا اس ذمے دار افسر کو صرف یہ بتایا جائے گا کہ اسے پوری طرح مستعد و تیار رہنا ہے۔ اسے وہاں کیوں اور کس غرض سے متعین کیا گیا ہے وقت سے پہلے اس سلسلے میں بھی کچھ نہیں بتایا جائے گا۔ جب میں مجرموں کو حراست میں لے لوں گی تو میری طرف سے اطلاع ملنے کے بعد اسے حرکت میں آنا ہو گا۔ اپنی شناخت کیلئے میں اسے آپریشن سیل کا حوالہ دوں گی۔ آپریشن سیل گویا کوڈ ورڈ ہو گا۔ اسے میری ہدایات پر عمل کرنا ہو گا۔'' پھر میں نے بتایا کہ آپریشن کے نگران کو کلفٹن کے علاقے میں کسی جگہ اپنی جیپ یا کار میں موجود ہونا چاہیے۔

''میں اس سلسلے میں آئی جی پولیس پر اعتماد کر سکتا ہوں۔'' وزیر داخلہ نے کہا۔ ''وہ تمہیں مطلوبہ

جگہ اپنی جیب میں مل جائے گا۔ میں اسے ہدایات دے دوں گا کہ وہ تمہارے احکام پر عمل کرے۔ غالبًا اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا!''

''جی نہیں۔'' میں خوش دلی سے بولی' پھر انہیں بتا دیا کہ امریکی ایجنٹوں کی میٹنگ آئندہ شب کہاں اور کس وقت ہونے والی ہے۔

سعید احمد خان کا نام سن کر وہ یقیناً چونک اٹھے تھے۔ اس کا اندازہ میں نے ان کے لہجے سے لگایا۔ ''حیرت ہے کہ یہ شخص بھی گندا انڈا نکلا۔ میں اسے اس کے بھائی عبدالحمید خان سے مختلف سمجھتا تھا۔ آدمی کا کوئی بھروسا نہیں۔'' ان کی آواز میں تاسف تھا۔ ''بہر حال میں ذاتی طور پر تمہارا تہ دل سے ممنون ہوں کہ تم نے ملک میں انتشار اور بدنظمی پھیلانے والے ایک خطرناک منصوبے کا نہ صرف انکشاف کیا بلکہ اس کا اپنے طور پر تدارک بھی کر لیا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا تمہیں کامیابی عطا کرے۔''

''یہ تو میرا فرض تھا اور نہ صرف میرا بلکہ ہر محبِ وطن شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنے وطن کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا حتی المقدور تدارک اور قلع قمع کرنے سے دریغ نہ کرے۔ میں ایک بار پھر آپ کو ناوقت زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے آخر میں کہا۔

''پاگل ہو تم۔'' ان کے لہجے میں بزرگانہ شفقت تھی۔ ''یہ بھی کوئی معذرت کی بات ہے.... اچھا مزید کوئی اور بات؟''

''جی نہیں' شکریہ! خدا حافظ!'' میں نے کہا۔

انہوں نے بھی جواباً ''خدا حافظ'' کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ریسیور کریڈل پر رکھ کر دوبارہ بستر پر دراز ہوگئی۔ وزیر داخلہ سے گفتگو کر کے میرے ذہن کا ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ اب میں پوری طرح مطمئن تھی کہ ایک بڑا قدم اٹھاتے ہوئے مجھے متعلقہ حکام کا مکمل تعاون حاصل تھا۔ دراصل میں نے بھی کسی کے اعتماد سے بے جا فائدہ نہیں اٹھایا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اگر ان ملک دشمن افراد کو اسلحہ سمیت خود گرفتار کر لیتی اور پھر بعد میں انہیں قانون کے حوالے کرتی تو مجھ پر کسی قسم کا شک نہ کیا جاتا مگر اپنے اعتماد کو داؤ پر لگائے بغیر میرے نزدیک یہی طریقہ زیادہ بہتر تھا جو میں نے اختیار کیا تھا۔ اس طرح میری پوزیشن پوری طرح صاف رہتی اور مجرم بھی کیفر کردار کو پہنچ جاتے۔

رات کو تقریباً دو بجے مجھے کمانڈر نواز نے وہ اطلاع دی جس کی میں بے چینی سے منتظر تھی۔ جین کو اغوا کر کے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لایا جا چکا تھا۔ اب وہ آپریشن سیل کے ''مہمان خانے'' میں تھی۔ کمانڈر نواز نے مجھے اس کمرے کا نمبر بھی بتا دیا تھا اور چابی بھی بھجوا دی تھی۔ اطلاع کے مطابق جین کو بے ہوش کر کے لایا گیا تھا اور اسے اب ہوش آنے والا تھا۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتی مہمان خانے کے اس کمرے تک پہنچ گئی جہاں جین بے ہوشی کی حالت میں موجود تھی۔ قفل کھول کر میں اندر داخل ہوگئی۔ کمرے میں لائٹ جل رہی تھی اور جین سامنے بچھی ہوئی مسہری پر بے سدھ پڑی تھی۔ بلاشبہ اس کا حسن بلا خیز تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک قیامت خوابیدہ ہو۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کو بہ غور جائزہ لیا' پھر بستر کے قریب رکھی ہوئی میز کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وہاں پانی کا جگ اور ایک گلاس موجود تھا۔ میں نے گلاس میں پانی انڈیلا اور

جین کے منہ پر چھینٹے مارنے لگی۔

کچھ ہی دیر بعد اس نے جھرجھری لے کر آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اس طرح اچھل پڑی جیسے کوئی ناقابلِ یقین منظر دیکھ لیا ہو۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور میری طرف انگلی اٹھا کر حیرت سے بولی۔ ''تم..... تم عذرا..... عذرا خان ہونا؟''

''ہاں۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''تم نے یقیناً میری تصویر دیکھی ہوگی اسی لئے مجھے دیکھتے ہی پہچان گئیں؟''

''مگر تم..... تم نے..... مجھے یہاں..... یہاں کیسے..... تمہیں کس طرح معلوم ہو گیا کہ میں.....'' وہ حیران حیران سی رک رک کر بولے جا رہی تھی۔

''جین! مجھے تو تمہارے بارے میں ان باتوں کا بھی علم ہے جو سولومن بھی نہیں جانتا!'' میں یہ کہتے ہوئے مسہری کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تم..... تم عذرا خان مجھے..... جانتی ہو؟'' وہ ابھی تک اپنے حواس پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

''اچھی طرح!'' میں طویل سانس لے کر بولی۔ ''اگر نہ جانتی تو تم اس وقت یہاں نہ ہوتیں۔''

''تو..... تو کیا میں..... میں تمہاری قید میں ہوں.....؟ تم نے مجھے اغوا کرایا ہے مگر کیوں؟''

''ہاں تم میری قید میں ہو جین.....! اور میں نے ہی تمہیں ہوٹل سے اغوا کرایا ہے تاکہ کل رات جو اہم میٹنگ کلفٹن کی ایک کوٹھی میں ہونے والی ہے تم اس میں شرکت نہ کر سکو۔'' میں دانستہ اس سے اپنی گفتگو کو طول دے رہی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ دیر اس سے بات کر سکوں اور اس کی آواز کی نقل کرنا میرے لئے آسان ہو جائے۔

''تو تمہیں اس میٹنگ کے بارے میں بھی معلوم ہو چکا ہے.....! حیرت ہے کہ..... کہ تمہیں کس طرح.....''

''تمہیں شاید میرے بارے میں بتایا گیا ہوگا کہ میں حیرت انگیز ذہنی قوتوں کی مالک ہوں مگر تم نے غالباً سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر یقین نہیں کیا ورنہ مجھ سے اس طرح کے سوالات نہ کرتیں۔ میری معلومات کے ذرائع لامحدود ہیں۔ ان معلومات کو بروئے کار لا کر میں خود سولومن کے ہاتھوں تمہیں قتل کرا سکتی ہوں حالانکہ وہ تم سے عشق کرتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کا بھرپور جائزہ لیا۔

''میں سمجھی نہیں عذرا خان تم کیا کہنا چاہتی ہو.....! تم سولومن کے ہاتھوں میرا قتل..... کس طرح.....؟ کیوں؟ اور کیسے؟'' اس کے چہرے سے الجھن کے ساتھ خوف کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔

''اس کے لئے سولومن کو بس اتنا یقین دلا دینا کافی ہوگا کہ تم روسی ایجنٹ موشوروف کی آلۂ کار بھی بنی ہوئی.....''

''نہیں!'' وہ میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی تقریباً چیخ اٹھی۔ ''تم..... تم عذرا خان' ایسا نہیں کرو گی.....! ہرگز نہیں!''

''کیوں کیا تم مجھے ایسا کرنے سے روک سکتی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''شاید...... نہیں۔'' اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ ''میں نے یقیناً تمہارے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ تم...... تم میرے تصور سے بھی زیادہ خطرناک ہو...... اس سے بھی زیادہ خطرناک جتنا مجھے تمہارے متعلق بتایا گیا تھا...... مگر تم ...... تمہیں میرے قتل سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''لیکن اپنے ملک اور اپنی قوم سے غداری کر کے تمہیں کیا فائدہ ہو رہا ہے؟'' میں نے بھی جواباً اس سے سوال ہی کیا۔ ظاہر ہے میرے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لئے وہ خاموش رہی۔ ذرا توقف سے میں پھر بولی۔ ''جین! تم احساس برتری کا شکار ہو اور یہی احساس اپنی اہمیت جتانے اور منوانے کی خاطر تمہیں غلط راہوں پر لے گیا ہے۔ تم دوسروں کے ساتھ ساتھ خود اپنی نظر میں بھی اہم رہنا چاہتی ہو۔ مجھے بتاؤ کیا تمہارے بارے میں میرا تجربہ غلط ہے؟''

''تم ...... تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر ...... مگر میرے اغوا سے اس کا کیا تعلق؟''

''اغوا کا سبب میں تمہیں بتا چکی ہوں...... میں نہیں چاہتی کہ کل رات سولومن کے ساتھ تمہیں بھی حراست میں لے لیا جائے۔''

''حراست میں؟'' وہ حیرت زدہ سی آواز میں بولی۔ ''تو کیا کل رات سولومن پکڑا جائے گا؟''

''ہاں وہ اب نہیں بچ سکتا!'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''یہ اس کے لئے پہلا موقع ہوگا ورنہ آج تک متعدد ممالک کے حکام اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے۔''

''کبھی کبھی انتہائی چالاک افراد بھی پھنس ہی جاتے ہیں۔'' میں بولی۔

''مگر تم ...... تم مجھے گرفتار ہونے سے کیوں بچانا چاہتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''تمہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہے؟''

''کوئی ہمدردی نہیں!'' میں نے واضح الفاظ میں جواب دیا۔ ''گرفتار تمہیں بھی کیا جائے گا مگر بعد میں! جب سولومن کو گرفت میں لیا جا چکے گا مگر میں تمہیں اس کی وجہ نہیں بتاؤں گی۔''

''کیا تم سے اس سلسلے میں سودے بازی ممکن ہے کہ تم مجھے قانون کے حوالے نہ کرو......؟ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اس کے بعد تمہارے ملک سے چلی جاؤں گی۔'' وہ پرامید لہجے میں بولی۔

''نہیں جین! یہ قطعی ناممکن ہے!'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''رہا میرے ملک سے تمہارے جانے کا مسئلہ تو بہرحال تمہیں یہاں سے جانا تو پڑے گا ہی! ہاں روانگی سے قبل تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر بین الاقوامی قوانین کے تحت ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے سلسلے میں مقدمہ ضرور چلے گا۔''

آخری الفاظ میں نے اس کی آواز اور اسی کے لب و لہجے میں ادا کئے تو وہ چونک اٹھی۔ ''تم ...... تم میری آواز میں بول رہی ہو...... بالکل میری طرح...... ! مگر کیوں......؟'' پھر وہ ایک بار پھر خود ہی چونک کر کہنے لگی ''تم ...... تم یقیناً...... میں سمجھ گئی کہ تم میری جگہ اس میٹنگ میں شرکت کرنا چاہتی ہو اور...... اور تم نے شاید مجھے اسی لئے اغوا کرایا ہے۔ مجھ سے اتنی دیر گفتگو کا مقصد بھی محض یہ تھا کہ تم میری آواز کی نقل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ تم ...... عذرا خان سپر جینیئس ہو......! مجھے تمہاری ذہانت کا اعتراف ہے۔

میں نے آج تک کسی کو اتنی جلدی کسی کی آواز کی نقل کرتے نہیں دیکھا۔''

جین واقعی بے حد ذہین تھی۔ ذرا سی بات سے وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گئی تھی مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ اسے حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ بہرحال میری قید میں تھی۔

''تم نے صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے جین!'' میں نے مسکرا کر بدستور اسی کی آواز اور لب و لہجے میں کہا۔

''اس کے باوجود کہ تم میری آواز کی کامیاب نقل کر رہی ہو اور یقیناً اپنے چہرے پر میرا میک اپ بھی تم ایسا ہی کر لو گی' میں تمہیں سولومن کی طرف سے پوری طرح چوکنا رہنے کی تاکید کروں گی۔ تم اسے نہیں جانتیں' اس کے جسم میں کسی شیطان کی روح ہے۔ وہ آنے والے خطرے کی بو پہلے ہی سے سونگھ لیتا ہے۔ متعدد بار خود مجھے یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ عین وقت پر کسی وجہ کے اس نے اپنا پروگرام بدل دیا اور بعد میں ایسا کرنا ہی سودمند ثابت ہوا۔ اس کی چھٹی حس بہت تیز ہے عذرا خان! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاؤ!'' جین کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ میری ہمدردی میں یہ سب کچھ کہہ رہی ہو۔

''تم میری طرف سے مطمئن رہو جین! اس کے جسم میں شیطان کی روح ہے تو میرے جسم میں رحمان کی! اور شیطان شر کی علامت ہے رحمان خیر کی! میرا ایمان ہے کہ شر پر ہمیشہ خیر ہی غالب آتا ہے۔'' میں دانستہ اب بھی اسی کی آواز میں بول رہی تھی۔ ''اگر تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہیں اسی کمرے میں میک اپ کا سامان منگوالوں تاکہ تم خود میرے میک اپ کا جائزہ لے سکو۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی کمی رہ جائے...... اور ہاں تمہیں ایک زحمت اور ہوگی۔ میں تمہارے لئے دوسرا لباس منگوائے دیتی ہوں' تمہارے لباس کی بھی ضرورت پڑے گی۔ میری اور تمہاری جسمانی ساخت میں کوئی زیادہ فرق نہیں لگتا۔''

اس نے کوئی اعتراض نہ کیا اور میری تجویز پر آمادگی ظاہر کر دی۔ میں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور اشارے سے مسلح محافظ کو قریب بلا کر ضروری ہدایات دینے لگی۔ عین اسی وقت میں نے اپنے بالکل عقب میں جین کی موجودگی محسوس کر لی۔ وہ غالباً بغیر کوئی آواز پیدا کئے پنجوں کے بل تیزی سے چلتی ہوئی میرے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ لحہ بھر کو میں چکرا کر رہ گئی۔ میں اس کی اس حرکت کا مقصد نہ سمجھ سکی۔ پھر مسلح محافظ میری ہدایات سن کر جیسے ہی جانے کیلئے مڑا جین کسی عقاب کی طرح فضا میں اڑتی ہوئی سی اس پر جھپٹ پڑی۔ اس کی تیز رفتاری اور پھرتی حیرت انگیز تھی۔

میری مداخلت سے پہلے ہی وہ مسلح محافظ سے اس کی گن چھیننے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ گن چھینتے ہی وہ اچھل کر ایک طرف ہو گئی تھی اور گن کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ مسلح محافظ زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر خجالت کے آثار تھے۔

''کمرے سے باہر آ جاؤ عذرا خان!'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔ اسی کے ساتھ اس کی انگلی گن کی لبلبی تک پہنچ گئی اور پھر اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ ''میں یہ سوچے بغیر کہ تم کتنی قیمتی عورت ہو' اپنی

زندگی بچانے کے لئے تمہارے سینے میں سوراخ کرنے سے نہیں ہچکچاؤں گی عذرا خان! اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں تم سے جو کچھ کہہ رہی ہوں اس پر فوراً عمل کرو! تم اس عمارت سے نکلنے میں میری رہنمائی کرو گی......! اگر تم نے میرا حکم نہ مانا یا کوئی اور قدم اٹھانے کی کوشش کی تو میں بے دریغ تمہیں گولی ماردوں گی چاہے اس کا انجام خود میری موت ہی کیوں نہ ہو!'' اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ محض مجھے دھمکی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے مجھ پر گولی چلاسکتی تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی تا کہ وہ مطمئن ہو جائے اور اسی کے ساتھ اس کے ذہن کو اپنے طاقت ور ذہن کی گرفت میں لے لیا۔

''گن پھینک دو جین!'' میں نے اسے حکم دیا۔ ''اور پھر کمرے میں آ جاؤ!''

اس نے بغیر کسی تاخیر کے کسی معمول کی طرح میرے حکم پر عمل کیا۔ میں نے محافظ کو گن اٹھانے کا اشارہ کیا اور پھر کمرے کے دروازے کی طرف پلٹی۔ جین گم صم سی مسہری پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔

''اب تم یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گی کیونکہ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا! بولو جین' اب تو یہاں سے فرار کی کوشش نہیں کرو گی نا؟'' اب بھی اس کا ذہن میرے زیر اثر تھا۔

''نہیں اب میں فرار کی کوشش نہیں کروں گی۔'' وہ خواب ناک سی آواز میں بولی۔

میں نے اس کے ذہن کو آزاد کر دیا۔ اب مجھے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا اس لئے کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا۔ دروازہ میں نے اس لئے بھی کھلا رہنے دیا تھا کہ مسلح محافظ میرے کمرے میں سے میک اپ کا سامان اور کپڑوں کا ایک جوڑا لے کر آئے تو اسے دستک نہ دینا پڑے۔ میرے کمرے کا دروازہ بھی مقفل نہیں تھا اور کپڑوں کی الماری میں بھی میں نے تالا نہیں لگایا تھا۔ یہ باتیں میں نے محافظ کو بتادی تھیں۔ کپڑوں کی الماری ہی میں میک اپ بکس بھی تھا۔

قدم قدم چلتی ہوئی میں ایک بار پھر مسہری کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر آ بیٹھی اور اسی وقت مجھے محسوس ہوا جیسے جین منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی تیرتی ہوئی بھی دیکھی' پھر اس کی بڑبڑاہٹ توجہ سے سننے لگی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ ''...... کیا...... مجھے کیا ہو گیا ہے......؟ میں...... میں نے آج تک کسی سے شکست تسلیم نہیں کی پھر...... پھر میں اس عورت سے...... عذرا خان سے کیوں مرعوب ہو گئی؟ میں...... میں نے کیوں اس کے سامنے شکست قبول کر لی؟'' اس کی انا کو یقیناً زبردست ٹھیس لگی تھی۔

''جین!'' میں نے معاً اس کے شانے پر دھیرے سے ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے چونک کر آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے کسی خواب سے جاگی ہو۔

''تم ایک دم اتنی اداس کیوں ہو گئیں جین؟'' میرے لہجے میں نرمی تھی۔

''نن...... نہیں تو!'' اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لئے۔

''پھر تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے تھے؟'' اب بھی میرے لہجے کی نرمی برقرار تھی۔

''اپنی شکست پر!'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں اعتراف کیا۔ ''میں نے زندگی میں پہلی بار کسی سے اپنی شکست قبول کی ہے اور...... اور وہ تم ہو عذرا خان! مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوا!''

''کچھ باتوں کا معلوم نہ ہونا ہی انسان کے لئے بہتر ہوتا ہے جین! تمہیں اعتراف شکست کے بعد پر سکون ہو جانا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

پھر وہ ذرا ہی دیر بعد معمول پر آ گئی مگر اس کے چہرے پر اداسی کا تاثر برقرار رہا۔ اسی دوران میں مسلح محافظ میک اپ بکس اور میرے کپڑوں کا ایک جوڑا دے گیا۔

''لو باتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کر لو۔'' میں نے کپڑے اس کی طرف بڑھا دیئے۔

وہ بغیر کچھ کہے کپڑے لے کر باتھ روم میں چلی گئی اور میں میز پر میک اپ بکس سے سامان نکال نکال کر رکھنے لگی۔ جب وہ کپڑے بدل کر آئی تو میں اپنے چہرے کا میک اپ شروع کر چکی تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ مجھے میک اپ کرتے دیکھتی رہی۔ میک اپ کرتے ہوئے بار بار میں اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ سیاہ تھا اس لئے وگ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ہاں پتلیوں کا رنگ بدلنے کیلئے کانٹریکٹ لینس کی ضرورت پڑی۔

میں نے میک اپ کرنے میں خاصا وقت لگایا پھر آئینے میں اپنے چہرے پر آخری تنقیدی نگاہ ڈال کر جین سے مخاطب ہوئی۔ ''کیا خیال ہے تمہارا' میں تمہاری کاپی لگ رہی ہوں یا نہیں؟'' یہ الفاظ بھی میں نے اسی کی آواز میں ادا کئے تھے۔

''حیرت انگیز!'' اس نے غالباً کھلے دل سے اعتراف کیا۔ ''تم بالکل میری طرح معلوم ہو رہی ہو! سولومن بھی یقیناً دھوکا کھا جائے گا تمہیں دیکھ کر!''

''لباس تبدیل کر آؤں پھر بتانا!'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم شاید اپنا اتارا ہوا لباس باتھ روم میں چھوڑ آئی ہو۔''

اس نے میری بات کی تصدیق کر دی اور میں اس سے کمرے میں تنہا چھوڑ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

باتھ روم سے لباس تبدیل کر کے باہر آنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ جین کا لباس میرے جسم پر قدرے تنگ تھا مگر اتنا نہیں کہ واضح طور پر اسے محسوس کیا جا سکتا۔

''ہاں جین! اب ذرا تنقیدی نظر سے جائزہ لو میرا۔'' میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''کوئی کمی تو محسوس نہیں ہو رہی تمہیں؟''

''بالکل نہیں! تمہیں دیکھ کر اور تمہاری آواز سن کر کوئی بھی اب تم پر شک نہیں کر سکے گا۔ صرف تمہارے چلنے کا انداز مجھ سے ذرا مختلف ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر بولی۔ ''معلوم نہیں کیوں میں تم سے مکمل تعاون کر رہی ہوں! ...... دیکھو یوں...... اس طرح دائیں پیر پر ذرا سا دباؤ ڈال کر چلنے کی کوشش کرو!'' اس نے مجھے چل کر دکھایا۔

میں نے کچھ دیر میں اس کے انداز خرام کو بھی اپنا لیا اور وہ یہ دیکھ کر بچوں کی طرح خوش نظر آنے لگی۔ میں نے اس دوران میں اپنے سینڈل بھی اتار کر اس کے سینڈل پہن لئے تھے۔

''اب میں چلوں گی جین!'' میں بولی۔ ''تم سے اب کل ہی رات ملاقات ہو گی۔'' یہ کہتے ہی

میں دروازے کی طرف مڑ گئی۔

''ٹھہرو عذرا خان!'' عقب سے مجھے اس کی آواز آئی۔

''ہاں کہو!'' میں نے مڑ کر اس سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں ایک بار پھر تم سے وہی درخواست کروں گی کہ مجھے اپنے ملک سے خاموشی کے ساتھ چلا جانے دو اور قانون کے حوالے نہ کرو اس طرح میرا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ جو ایجنٹ اس طرح غیر ممالک میں پکڑے جاتے ہیں پھر ان پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور عموماً انہیں معطل ہونا پڑتا ہے۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''فی الحال میں اس سلسلے میں تم سے کوئی وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ہاں اس وقت اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری درخواست پر ہمدردی سے غور کروں گی مگر اس کا فیصلہ کل ہی ہو گا۔'' میں نے جواباً نرمی سے کہا۔ ''امید ہے کہ تم کل تک میرے فیصلے کا انتظار کرو گی۔''

''مجھے یقین ہے عذرا خان کہ تمہارا فیصلہ میرے ہی حق میں ہو گا۔'' وہ پُر اعتماد آواز میں بولی۔

پھر میں وہاں مزید رکے بغیر میک اپ بکس اٹھائے باہر آ گئی۔ باہر آتے ہی میں نے کمرا مقفل کیا اور مسلح محافظ کی طرف سرسری نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میں نے دانستہ اسے اپنے قریب بلا کر اپنی شناخت نہیں کرائی تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ خود اس ضمن میں کیا قدم اٹھاتا ہے!

میں ابھی چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ اچانک عقب سے اسی مسلح محافظ نے میری پشت پر گن رکھ دی اور پھر سے مجھ سے رکنے کو کہا۔

میں رک گئی اور پھر اپنے مخصوص لہجے میں اس کی کارکردگی کو سراہا۔ اس نے بہر حال مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

یہ تصدیق ہونے کے بعد میں عذرا خان ہوں اس نے مجھے آگے جانے دیا۔ عمارت کے اس عقبی حصے سے ڈیوٹی روم تک پہنچتے پہنچتے مجھے تقریباً پانچ چھ جگہ مسلح محافظوں نے روکا اور مجھے اپنی شناخت کرانا پڑی۔ میں اس وقت جس عورت کے لباس اور میک اپ میں تھی وہ بہر حال آپریشن سیل کی ''مہمان'' تھی۔

میں ڈیوٹی روم میں پہنچی تو پہلی بار کمانڈر نواز بھی مجھے دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس کا ہاتھ ہولسٹر سے ریوالور نکالنے کے لئے کمر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں بول اٹھی۔ ''غلط فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں کمانڈر! یہ میں ہوں۔'' میں اپنی اصل آواز ہی میں بولی تھی۔

''بہت کمال میک اپ کیا ہے آپ نے!'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''اور پھر اس لباس نے مجھے اور بھی کنفیوز کر دیا تھا۔ جین کو اسی لباس میں اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔''

''تھینک یو کمانڈر!'' میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

صبح ہوتے ہوتے مجھے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہو جانا تھا اور اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں اسی لئے آئندہ شب کا تمام پروگرام اسی وقت طے کر دینا چاہتی تھی۔ پہلے تو میں نے کمانڈر کو یہ بتایا کہ وزیر داخلہ سے میری کیا گفتگو ہوئی ہے اور کیا طے پایا ہے! پھر میں نے اسے آئندہ

رات کے لئے ہدایات دیں۔ نو بجے رات کے بعد کمانڈر نواز ان ہدایات کے مطابق سعید احمد خان کی کوٹھی کو آپریشن سیل کے مسلح ارکان کے ساتھ گھیرے میں لے لیتا۔ کوٹھی کے اندر ہونے والی میٹنگ کی تمام کارروائی ایک چھوٹے سے ریسیور کے ذریعے باہر کمانڈر نواز کی کار میں سنائی دیتی رہتی اور وہ یہ تمام گفتگو ریکارڈ کرتا رہتا۔ وہ ریسیور ایک خوبصورت ہیر کلپ کی صورت میں میرے بالوں میں لگا ہوتا۔ یہ گفتگو سنتے ہوئے خود کمانڈر نواز کو طے کرنا تھا کہ کس وقت کوٹھی پر ریڈ کیا جائے! سیل کے نصف ارکان کو اس کے ساتھ کوٹھی میں داخل ہونا تھا اور نصف مسلح ارکان کو باہر ہی موجود رہنا تھا تاکہ کوئی اندر سے بچ کر فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ امریکی ایجنٹوں پر قابو پانے کے بعد مجھے آئی جی سے رابطہ قائم کرنا تھا تاکہ مجرموں کو اس کے حوالے کیا جا سکے۔ اس کے بعد میرا کام ختم ہو جاتا تھا۔

میں کافی دیر کمانڈر نواز کو ایک ایک بات سمجھاتی رہی پھر آخر میں بولی۔ ''کوئی ایسی بات کمانڈر جواب بھی وضاحت طلب رہ گئی ہو؟''

''جین اور جیفرسن کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا۔ کیا وہ دونوں ہی ہماری تحویل میں رہیں گے؟ انہیں آپ قانون کے حوالے نہیں کریں گی؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ان دونوں کا فیصلہ سولومن اور دوسرے امریکی ایجنٹوں کی گرفتاری کے بعد ہو گا۔'' میں نے جواب دیا۔

کمانڈر نواز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر میز کی ایک دراز کھول کر ایک کی رنگ نکالی اور اسے میری طرف بڑھا دیا۔ ''جین کے ہوٹل کے کمرے کی چابیاں آپ اپنے پاس رکھ لیں۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر چابیاں اس سے لے لیں۔ انہیں چابیوں میں جین کی اٹیچیوں اور الماری کی چابیاں بھی تھیں۔ جین یہاں جس کمرے میں تھی اس کی چابی بھی میں نے کمانڈر نواز کے حوالے کر دی۔

پھر تقریباً صبح ساڑھے چھ بجے میں تمام تیاری کر کے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہو گئی۔ آپریشن سیل کی ایک کار کو مجھے کسی ایسی جگہ چھوڑنا تھا جہاں سے بہ آسانی ہوٹل پہنچنے کے لئے ٹیکسی مل جائے۔ میں احتیاط کے پیش نظر آپریشن سیل کی کار میں اس ہوٹل تک نہیں پہنچنا چاہتی تھی جہاں جین ٹھہری ہوئی تھی۔ چلتے ہوئے میں نے محدود طاقت کا ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر بھی اپنے ساتھ پرس میں رکھ لیا تھا تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر سکوں۔ یہ ٹرانسمیٹر بظاہر ایک فاؤنٹین پین نظر آتا تھا۔

اس وقت صبح کے سات بجنے والے تھے جب میں آپریشن سیل کی کار میں صدر پہنچی۔ وہاں سے ٹیکسی ملنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے کار چھوڑ دی اور اس سے اتر کر ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ جلد ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ میں نے ٹیکسی والے کو ہوٹل کا نام بتایا اور پھر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

ٹیکسی والے نے کراچی میں مجھے کوئی اجنبی مسافر سمجھ کر ہوٹل تک پہنچنے کے لئے طویل راستہ اختیار کیا تاکہ کرایہ زیادہ بنے مگر میں خاموش رہی۔ میں اس سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ بہر حال اس نے

مجھے مطلوبہ ہوٹل تک پہنچا دیا اور میں کرایہ ادا کر کے ہوٹل کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دوسری منزل پر کمرا نمبر دو سو چھ کے سامنے پہنچ کر میں نے اطمینان سے قفل کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔

کمرے میں آنے کے بعد میں نے پہلے اس کی اچھی طرح تلاشی لی اور جین کے ایک ایک سامان کا جائزہ لیا۔ اس کا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات بھی میں نے اپنے قبضے میں لے لئے۔ تلاشی کے دوران میں مجھے کوئی ایسی قابل ذکر شے نظر نہ آئی جس سے یہ ثبوت فراہم ہو سکتا کہ جین کوئی غیر ملکی ایجنٹ ہے۔ وہ یقیناً بہت چالاک عورت تھی۔ وہ ٹورسٹ ویزے پر پاکستان آئی تھی۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے میں صبح کا ناشتا کر کے چلی تھی۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں اس لئے میں نے فی الحال سونے کا ارادہ کیا۔ میں نے جین کے ایک سوٹ کیس سے شب خوابی کا لباس نکالا اور پھر اسے زیب تن کر کے بستر پر لیٹ گئی۔

دوپہر کے وقت میں سو کر اٹھی تو خاصی تازہ دم تھی۔ دوپہر کا کھانا میں نے اپنے کمرے ہی میں منگوا لیا۔ پھر شام کو کچھ وقت میں نے ہوٹل کے ہال میں گزارا۔ وہیں میں نے شام کی چائے پی اور جب چھ بج گئے تو اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں رات کو آٹھ بجے کے بعد ہوٹل سے نکلوں گی تاکہ مقررہ وقت تک کلفٹن پہنچ جاؤں۔

ابھی مجھے اوپر آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ خلاف توقع کمرے میں لگی ہوئی بیل بج اٹھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کمرے کے دروازے پر کوئی ہے۔ میں چونک اٹھی کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے؟ بہر حال میں تیز قدم اٹھاتی ہوئی دروازے تک آئی اور بلند آواز میں بیل بجانے والے کا نام پوچھا۔

''سولومن!'' دروازے کی دوسری جانب سے بھاری مردانہ آواز سن کر میرے جسم میں برقی رو سی دوڑ گئی۔

سولومن کی آمد اس وقت میرے نزدیک معنی خیز تھی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ دراز قد غیر ملکی اندر آ گیا جسے میں گزشتہ شب بھی دیکھ چکی تھی۔ سرفراز نے اسی کو سولومن کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔

''اوہ تم!'' میں نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ میں اس وقت جین ہی کی آواز میں اور اسی کے لب و لہجے میں بولی تھی۔

''یس مائی سویٹ ہارٹ!'' اس نے والہانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ میری طرف پھیلا دیئے۔

جین اور سولومن کے تعلق کا مجھے علم تھا اور اس وقت میں جین کا کردار ادا کر رہی تھی مگر یہ صورت حال میرے لئے بہر حال تشویش ناک تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اب تک پھیلے ہوئے تھے اور میرے لئے اس کا مقصد سمجھنا مشکل نہ تھا۔ پھر میں اس کی پیشکش کو نظر انداز کرتے ہوئے کترا کر دروازہ بند کرنے لگی۔

اسی وقت وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ مجبوراً مجھے اس کی کچھ نازیبا حرکات برداشت کرنا

پڑیں۔ جین کا کردار ادا کرتے ہوئے میری مجبوری یہ تھی کہ میں ان ناشائستہ و نازیبا حرکات پر کوئی احتجاج نہیں کر سکتی تھی۔ جین بہر حال اس کی محبوبہ تھی۔

''وھاٹس رونگ ودھ یو جینی ڈارلنگ!'' اس نے غالباً میری سرد مہری محسوس کر لی اور اس کا سبب پوچھنے لگا۔

''نتھنگ سولومن!'' میں اس کی گرفت سے آزاد ہو کر بولی۔ ''کم آن ان دی روم!'' یہ کہہ کر میں تیزی سے اندرونی کمرے کی طرف بڑھی۔

سولومن میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ حد سے بڑھنے لگا تو اسے کس طرح روکا جا سکے گا؟

''جین ڈارلنگ! تم حیران تو ہو گی کہ میں اس وقت کیسے آ گیا؟'' وہ مسہری کے قریب رکھی والی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ہاں حیران بھی ہوں اور خوش بھی!'' میں بھی اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

''دراصل آج جو ہماری اہم میٹنگ ہونے والی تھی میں نے اس کا وقت اور مقام تبدیل کر دیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تمہارے سوا سبھی کو میں اس سے مطلع کر چکا ہوں۔ میں نے سوچا کہ کچھ وقت آج تمہارے ساتھ گزارا جائے اور پھر مقررہ وقت پر ہم دونوں یہیں سے میٹنگ میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہو جائیں۔ تمہارے ساتھ حسین لمحات گزارے ہوئے بھی تو بہت دن ہو گئے نا!'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ خواب ناک اور نشیلا سا ہو گیا۔

سولومن کی بات سن کر میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ اس نے میٹنگ کا وقت اور مقام تبدیل کر کے گویا میرے سارے منصوبے ہی کو چوپٹ کر دیا تھا۔

''مگر کیوں ڈارلنگ اس تبدیلی کی کیا ضرورت تھی؟'' میں بالآخر بول اٹھی۔

''حیرت ہے کہ تم یہ سوال کر رہی ہو جینی ڈارلنگ!'' وہ چونک کر کہنے لگا۔ ''تم تو مجھے اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کس قدر چوکنا رہتا ہوں! پہلے بھی کئی بار ہم کسی ممکنہ خطرے سے بچنے کے لئے عین وقت پر اس طرح کی تبدیلیاں کرتے رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ کسی طرح پہلے سے طے شدہ میٹنگ کا وقت اور مقام لیک آؤٹ بھی ہو جائے تو ہمارے منصوبے پر کوئی فرق نہ پڑے۔''

''معلوم ہے مجھے جانتی ہوں میں!'' میں نے جلدی سے بات بنائی۔ ''مجھے خبر ہے کہ تم ایسے حالات میں کس حد تک رازداری برتنے کے قائل ہو! مجھے بھی تو تم وقت سے پہلے کچھ نہیں بتاتے۔'' یہ کہہ کر میں مسکرائی۔ ''سولومن تم مجھ سے بھی تو پوری راز داری برتتے ہو!''

''اس کا سبب ہرگز یہ نہیں جینی کہ میں تم پر اعتماد نہیں کرتا۔'' اس کے لہجے میں محبت تھی۔ ''بلکہ تم اسے ہمارے کام کا حصہ سمجھ سکتی ہو۔ اچھا خیر چھوڑو ان باتوں کو! اس وقت تو کچھ اور ہی جی چاہ رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور بھرپور انگڑائی لے کر مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ''آؤ اٹھو ادھر آ جاؤ!'' اس کی آواز بوجھل ہونے لگی۔

اس کی بات کا مطلب سمجھ کر میرے سارے جسم میں چونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ آخر کار وہ لمہ ہی گیا تھا جس سے میں خوف زدہ تھی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے وہ قدم اٹھانا ہی پڑا جس سے اب تک گر کر رہی تھی اور اس گریز کی وجہ تھی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کا ذہن میرے طاقت ور ذہن کی گرفت م آ ہی جاتا۔ جین ہی کی طرح اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے میں بھی مجھے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ ایک دم بیڈ پر بیٹھ گیا اور اپنے سر کو جھٹکے دینے لگا۔ اسی کے ساتھ بڑبڑا رہا تھا۔ ''جینی...... کوئی...... کوئی میرے ذہن کو اپنی...... اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے...... مگر میں...... میں ایسا نہیں ہو۔ دوں گا۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ذہن سے خارج ہونے والی نادیدہ لہریں اندھیرے م شگاف ڈالنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سولومن کا ذہن شدید مزاحمت کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ا۔ خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ اب اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا اور اس کی آنکھیں سر، ہوتی جا رہی تھیں۔ میری کوشش اب بھی جاری تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا اور پھر مجھے یوں ا کہ جیسے اس نے اپنا سانس بھی روک لیا ہو۔ اب میرے لئے اس کے ذہن کو گرفت میں لینا یوں بھ ضروری ہو گیا تھا کہ مجھے ہونے والی میٹنگ کے بدلے ہوئے وقت اور مقام کا علم ہو جائے۔ میں اسی کے بعد کوئی مثبت قدم اٹھا سکتی تھی۔

معاً مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئی پھر اسے مخاطب کیا ''سولومن! کیا ہوا تمہیں......؟ ادھر دیکھو میری طرف! کیا بات ہے؟'' میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑا اوپر اٹھائی۔

اسی لمحے اس کی نظریں مجھ سے ملیں اور پھر جیسے وہ پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ میرے ذہن کا نادیدہ طاقت ور لہروں نے اندھیرے میں شگاف ڈال دیا تھا۔ اب اس کا ذہن میری گرفت میں تھا مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اس کا ذہن پڑھ کر یہ معلوم کیا کہ اب میٹنگ کس وقت اور کہاں ہونے والی ہے؟

مجھے جلد ہی جواب مل گیا۔ اب وہ میٹنگ نو بجے رات کی بجائے دس بجے باتھ آئی لینڈ کا ایک کوٹھی میں ہونے والی تھی۔ یہ کوٹھی شہریار کی ملکیت تھی اور عموماً خالی ہی پڑی رہتی تھی۔ سولومن کے پار اس کوٹھی کی چابی موجود تھی۔ شہریار عموماً اپنے مہمانوں کو اس کوٹھی میں ٹھہراتا تھا۔ پاکستان میں اسمگل کا جانے والا اسلحہ بھی اسی کوٹھی میں تھا۔ کوٹھی کے محل وقوع سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ وہی جگہ تھی ز جہار جرمن سائنس دانوں شیفرڈ اور شیپرڈ نے پہلی بار میرے ذہن پر تجربہ کیا تھا۔ سولومن کا ارادہ پہلے ہی سے وہیں میٹنگ کرنے کا تھا۔ اس نے دانستہ پہلی بار اپنے آدمیوں کو غلط اطلاع دی تھی' وقت اور مقام غلط بتا تھا۔

سولومن سحر زدہ سا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھا تھا۔
تمہیں نیند آ رہی ہے......! نیند آ رہی ہے۔ میں نے اس کے ذہن کو ترغیب دی۔

مزاحمت کے سبب یوں بھی اس کا ذہن نڈھال ہو چکا تھا۔ میری ترغیب پر اس کے ذہن نے راثر قبول کیا۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔

سو جاؤ سولومن......! سو جاؤ! میں نے اس کے ذہن پر گہری غنودگی مسلط کر دی اور پھر اسے ہارا دے کر بستر پہ لٹا دیا۔

اب وہ میرے سامنے بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔ میں تیزی سے اٹھی اور اپنا پرس کھول کر محدود افت کا چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکال لیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں ٹرانسمیٹر پر آپرشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر......! کمانڈر نواز آن دی لائن...... آپریشن ہیڈ کوارٹر...... اوور!''

ہری جانب سے میں نے مدھم سے آواز سنی۔

''عذرا خان اسپیکنگ کمانڈر...... میری بات پوری توجہ اور غور سے سنو! سولومن نے اس میٹنگ اوقت اور مقام بدل دیا ہے۔ پتا نوٹ کرو......! باتھ آئی لینڈ کی وہ وہی کوٹھی ہے جہاں سے ایک ر...... '' میں اسے پتا لکھواتے ہوئے کوٹھی کا محل وقوع بھی سمجھانے لگی۔ ''پتا نوٹ کر لیا تم نے......؟ کوٹھی کا ل وقوع سمجھ میں آ گیا تمہاری؟ اوور!''

''جی ہاں...... میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ یہ وہی کوٹھی ہے جس پر ہم ایک بار پہلے بھی ریڈ ر چکے ہیں...... مگر آئی جی پولیس کو بھی اس تبدیلی کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اب اپنی فورس کے ساتھ للن کے بجائے باتھ آئی لینڈ پہنچ سکے۔ آپ نے اس سلسلے میں کیا سوچا؟ اوور!'' کمانڈر نواز نے ایک اہم مسئلے کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔

''یہی ممکن ہے کمانڈر کہ محترم وزیر داخلہ کو نئی صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے ام میں ضروری تبدیلی کر سکیں۔ اس وقت پونے سات بجنے والے ہیں جہاں تک میرا خیال ہے وہ اب اس سلسلے میں احکام دے چکے ہوں گے مگر ابھی وقت ہے۔ یہاں سے انہیں فون کرنا میرے خیال مناسب نہیں۔ تم یہ کرو کہ فون پر میرا اور آپریشن سیل کا حوالہ دے کر انہیں نئی صورت حال سے مطلع کر اور وہ جگہ بھی بتا دو جہاں اب آئی جی کو اپنی جیپ میں موجود ہونا چاہیے۔'' یہ کہہ کر میں نے باتھ آئی لا کے علاقے میں وہ جگہ بتائی جہاں آئی جی کو اپنی جیپ میں ہونا چاہیے تھا تاکہ بروقت اس سے رابطہ الم کیا جا سکے۔ اس کے بعد میں مزید بولی۔ ''تم نے میرے ہی ایما پر وزیر داخلہ کو فون پر نئی صورت حال ہ آگاہ کیا ہے۔ اس کی تصدیق کے لئے صرف اتنا کافی ہے میں ان سے فون پر کہہ دوں کہ انہیں ملنے الی نئی اطلاع درست ہے۔ اس ایک جملے اور اپنا نام بتانے کے بعد میں سلسلہ منقطع کر دوں گی۔ تم فون انہیں یہ بات بھی بتا سکتے ہو تاکہ وہ کسی قسم کے کنفیوژن کا شکار نہ ہوں۔ تم فوراً انہیں فون کرو! میری پوری تم نے سمجھ لی؟ اوور!''

''جی ہاں' میں ابھی انہیں فون کرتا ہوں۔ اوور!''

''تقریباً دس منٹ بعد میں انہیں فون کروں گی۔ اس دوران میں یقیناً تم ان سے بات کر چکے گے۔ اوور اینڈ آل!'' میں نے کمانڈر نواز سے رابطہ منقطع کر کے گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر ٹرانسمیٹر کو

دوبارہ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ سولومن ابھی تک بستر پر بے خبر پڑا ہوا تھا۔

سولومن کو اسی طرح بے بس پڑے دیکھ کر مجھے عجیب سی طمانیت اور سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ وہی خطرناک شخص تھا جسے ڈاکٹر رچرڈ نے میری تلاش میں پاکستان بھیجا تھا۔ وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے میں خیر کامیاب نہیں ہو سکا ہاں خود زیرِ دام آ گیا تھا۔ عورت بڑے بڑے ذہین لوگوں کی کمزوری رہی ہے سولومن کی بھی یہی کمزوری تھی۔ اگر اس میں یہ کمزوری نہ ہوتی تو شاید میں اس کی تلاش میں ناکام رہتی۔

وہ دس منٹ بڑی مشکل سے گزرے۔ میں بار بار گھڑی دیکھتی رہی۔ پھر جب وقت ہو گیا ٹیلی فون پر ہوٹل کے ایکسچینج سے مطلوبہ نمبر ملانے کو کہا۔ مجھے مزید دو تین منٹ انتظار کرنے کے بعد اِم مقصد میں کامیابی ہوئی۔ ہوٹل کی آپریٹر مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ”بات کیجئے!“

”ہیلو!“ میں بول اٹھی۔

”ہاں کہو‘ میں تمہاری ہی کال کا منتظر تھا۔“ دوسری طرف سے مجھے وزیرِ داخلہ کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

جواباً میں نے صرف اتنا کہا۔ ”آپ کو ملنے والی نئی اطلاع قطعی درست ہے۔ میں عذرا خا بول رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے‘ میں سمجھ گیا۔“

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لئے میں نے مزید کوئی بات کئے بغیر ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل رکھ دیا۔

ابھی رات کے دس بجنے میں خاصا وقت تھا۔ سولومن جتنی دیر بھی غافل پڑا رہتا میرے حق میں بہتر تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ روانگی سے صرف آدھے پون گھنٹے پہلے اسے جگاؤں گی تا کہ اس کے ا میں ایک بار پھر شیطانی وسوسے جنم نہ لینے لگیں۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ بیدار ہونے کے بعد اس ردِعمل کیا ہو گا؟

پھر جب سوا نو بج گئے تو میں نے اسے ہلایا جلایا وہ گہری نیند سے چونک کر خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”اٹھ جاؤ سولومن!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”تمہیں سوئے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔“

وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی‘ پھر طویل سانس لے کر کہا۔ ”اوہ مائی گاڈ! سوا نو بج گئے......! مگر شکر ہے کہ ابھی وقت نہیں گزرا۔ جینی! تم جلدی سے چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ......! میں ابھی باتھ روم سے منہ دھو کر آیا...... مگر میں...... میں سو کیوں گیا تھا؟“ وہ بستر سے اٹھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار تھے۔

”معلوم نہیں کیا ہوا تھا تمہیں!“ میں بول اٹھی۔ ”تم کچھ بڑبڑاتے ہوئے بستر پر لیٹ کر قلم غافل ہو گئے تھے۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی دفعہ تمہیں جگانے کی کوشش کی مگر......“

”کوئی...... جینی......! کسی نے میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی اور...... ا میں اسے اس کوشش میں کامیاب نہیں...... پھر...... پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا!“

”کچھ نہیں ہوا‘ بس تم سو گئے تھے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”لیکن...... لیکن جینی......! مجھے...... میں شاید خود نہیں سویا تھا۔ کسی نے مجھے شاید...... شاید سونے کی ترغیب دی تھی اور اس وقت تم...... تم میرے پاس تھیں۔“ وہ رک رک کر کہتا رہا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے ذہن پر زور دے کر کچھ یاد کر رہا ہو۔

میں نے فوراً ہی اس کے ذہن کو دوسری طرف متوجہ کر دیا۔ میں بول اٹھی۔ ”سولومن! تم نے مجھ سے آتے ہی کہا تھا کہ میٹنگ؟ کہیں دیر تو نہیں ہو گئی؟“ میں نے دانستہ سب کچھ جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔

ردِعمل میری توقع کے مطابق ہوا۔ وہ تیزی سے کچھ کہے بغیر باتھ روم میں گھس گیا اور پھر وہیں سے بلند آواز میں بولا۔ ”جلدی کرو جینی! ہمیں دس بجے سے پہلے باتھ آئی لینڈ پہنچنا ہے......! تیار ہو جاؤ!“

میں نے اپنے پرس سے آئینہ‘ پوڈر اور لپ اسٹک نکال کر ہلکا سا میک اپ کر لیا۔ لباس تبدیل کرنا میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس دوران میں سولومن باتھ روم سے نکل آیا۔ وہ بہت عجلت میں تھا۔ اس کے باوجود کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے مجھے خود سے قریب کر کے ایک نازیبا حرکت کی اور میں خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

دوسری منزل سے نیچے پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہ لگی۔ سولومن کے پاس کار تھی۔ اس نے تیزی سے کار میں بیٹھتے ہوئے میرے لئے اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ میں بھی کار میں بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اسی کے ساتھ سولومن نے کار اسٹارٹ کر دی۔

ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں ہوا تھا کہ سولومن نے چونک کر عقبی آئینے میں دیکھا‘ پھر تیزی کے ساتھ کار کو بائیں جانب ایک سڑک پر موڑ دیا۔ سولومن کو یقیناً یہ شبہ ہو گیا تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔ اس نے کار کی رفتار تیز کر دی اور اس کے ساتھ بڑبڑایا۔ ”یہ اس وقت کون پیچھے لگ گیا!“

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سرمئی رنگ کی ایک ڈاج ہماری کار کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس وقت تعاقب کا یہ چکر مجھے بھی گراں گزرا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا اور سولومن کا تعاقب کیوں کر رہا تھا؟

سولومن کی کار تیز رفتاری سے گویا اڑی جا رہی تھی مگر ڈاج کو ڈاج دے کر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ ڈاج بھی تیز رفتاری سے پیچھے آ رہی تھی۔ شاید سولومن اب دانستہ اپنی کار کو شہر کی ایک نواحی بستی کی طرف دوڑا رہا تھا۔ اس طرف ٹریفک برائے نام تھا۔ پھر جلد ہی دونوں کاریں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی ایک سنسان سڑک پر نکل آئیں۔ سولومن نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور کھڑکی سے باہر نکال کر پیچھے پھینک دی۔ اسی کے ساتھ ایک دھماکا ہوا اور میں نے پیچھے آنے والی کار کو تیزی سے کچے میں اترتے دیکھا۔ اس کار کے ڈرائیور نے غالباً سولومن کو کھڑکی سے ہاتھ نکال کر باہر کچھ پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کچے میں اتر کر وہ کار رک گئی تھی۔

سولومن کے لئے اتنی مہلت کافی تھی۔ وہ اپنی کار کو اڑا لے گیا۔ سڑک آگے جا کر دائیں جانب مڑ گئی تھی۔ اب سولومن کی کار تیز رفتاری کے ساتھ اسی طرف بڑھ رہی تھی۔

معاً میں نے اپنے جسم میں سنسنی سی دوڑتی محسوس کی اور اسی کے ساتھ میرے ذہن پر ایک آشنا کیفیت سی طاری ہونے لگی۔ یقیناً کسی ذہن کی نادیدہ لہریں میرے ذہن کی سطح سے ٹکرا رہی تھیں۔ کوئی میرے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ شخص روسی ایجنٹ موشوروف کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر میں نے جیسے کہیں بہت دور سے اس کی آواز آتے سنی۔ وہ مجھی کو پکار رہا تھا۔ عذرا خان...... ! عذرا خان! مجھے اپنے ذہن سے رابطہ قائم کرنے دو...... ! مزاحمت نہ کرو...... یہ تمہارے ہی حق میں بہتر ہے۔ میں تمہیں ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔

پہلے میرا یہی ارادہ تھا کہ اپنے ذہن سے اس کا رابطہ قائم نہ ہونے دوں مگر یہ جاننے کے بعد کہ وہ مجھے کوئی اہم اطلاع دینا چاہتا ہے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

کہو کیا اطلاع دینا چاہتے ہو موشوروف؟ میں نے سوچا۔

وہ اطلاع دینے سے قبل میں تمہیں کچھ اور بھی بتانا چاہتا ہوں۔ اب مجھے اس کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ذرا سوچو عذرا خان اگر میں اس وقت سولومن کو یہ بتا دوں کہ اس کے ساتھ اس کی محبوبہ جین ہیری کے بجائے عذرا خان ہے تو کیسا رہے؟"

اس کے یہ کہتے ہی میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ اسے کس طرح یہ بات معلوم ہو گئی؟ اور پھر خود ہی میرے ذہن میں اس سوال کا جواب آ گیا۔

تم ٹھیک سوچ رہی ہو عذرا خان! مجھے اس کی آواز پھر سنائی دی۔ میں نے جین کے ذہن سے رابطہ قائم کیا تھا مگر مجھے ذرا سی تاخیر ہو گئی ورنہ ہوٹل ہی میں تم پر ہاتھ ڈال دیتا۔ جین ہی کا ذہن پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ تمہاری قید میں ہے اور یہ کہ تم اس کی جگہ لے چکی ہو۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا' مجھے تم پر ہاتھ ڈالنے کے لئے یہ موقع غنیمت معلوم ہوا' لیکن جب میں ہوٹل پہنچا تو تم سولومن کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو رہی تھیں...... ہاں ہاں سرمئی ڈاج میں سولومن کی کار کا تعاقب کرنے والا میں ہی تھا۔ تمہارا خیال درست ہے۔

تم مجھے کیا اہم اطلاع دینے والے تھے؟ میں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

اس اطلاع کی ایک قیمت ہے کیا تم وہ قیمت ادا کر سکو گی......؟ نہیں تم غلط سوچ رہی ہو عذرا خان...... ! وہ قیمت تم خود نہیں ہو...... ! سولومن کو میرے حوالے کر دو! اور یہ تمہارے لئے کچھ مشکل نہیں۔ مجھے اس سے اپنے کچھ پرانے قرض بے باق کرنا ہیں۔ تم بہ آسانی اس کے ذہن پر غنودگی طاری کر کے اور اسے سڑک کے کنارے پھینک کر جا سکتی ہو۔ بولو منظور ہے۔

نہیں! میں نے انکار کر دیا۔ یہ میرا شکار ہے۔

مگر تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ میں تمہارے شکار کو چوکنا بھی کر سکتا ہوں۔ پھر وہ نہ تمہارے ہاتھ لگے گا نہ میرے! ہمارے اختلاف سے وہ فائدہ اٹھا جائے گا۔

تم اس طرح مجھے کوئی اہم اطلاع فراہم کرنے کا دھوکا دے کر اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ موشوروف!

یقین کرو کہ وہ اطلاع کوئی دھوکا نہیں حقیقت ہے۔ بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے گا عذرا خان! تم شائد یہ بھول چکی ہو کہ ڈاکٹر رچرڈ قاہرہ میں ہے اور یہ بھی کہ تمہاری بہن ذکیہ بھی وہیں ہے!

یہ جان کر میں بے چین سی ہو گئی۔ اس سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں نے بے چین ذہن کے ساتھ سوال کیا۔

میں اب آگے تمہیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا جب تک تم سولومن کو میرے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں ہو جاتیں!

تم بارگین کر رہے ہو مجھ سے...... ! مگر کیوں...... ؟ مجھے بتا دو موشوروف کیا ذکیہ خطرے میں ہے؟

ہاں میں تمہیں بارگین کر رہا ہوں' اعتراف ہے مجھے! مگر اس بارے میں مزید کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک کہ تم میری بات نہیں مان لیتیں!

میں تذبذب کا شکار ہو گئی۔ سولومن کو اس کے حوالے کرنے کا مطلب خود اپنے منصوبے پر پانی پھیر لینا ہوتا۔ سولومن ہی نہیں تمام امریکی ایجنٹ جو میٹنگ میں شریک ہونے والے تھے۔ میرے ہاتھ سے نکل جاتے۔ پھر یہ کہ میں نے وزیر داخلہ سے جو کچھ کہا تھا وہ بھی غلط ثابت ہوتا۔ دوسری جانب مجھے ذکیہ کا خیال آ رہا تھا۔ معلوم نہیں' وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو چکی تھی یا ڈاکٹر رچرڈ مجھے زیر دام لانے کے لئے اس پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا! ڈاکٹر رچرڈ سے بہرحال یہ بعید نہیں تھا کہ وہ یہ قدم اٹھانے سے دریغ نہ کرتا۔ قاہرہ میں حالات کیا نیا رخ اختیار کر چکے تھے۔ میں بے خبر تھی اور جو شخص اس سے باخبر تھا وہ مجھ سے اس خبر کی ایک بڑی قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف اپنی بہن کی محبت میرے دل میں جوش مار رہی تھی' دوسری جانب میرا فرض مجھے پکار رہا تھا۔ بالآخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔

میں سولومن کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتی! میں نے موشوروف کو جواب دے دیا۔ تم جو چاہو کر سکتے ہو!

تو کیا میں سولومن کے ذہن سے رابطہ قائم کر کے اسے بتا دوں کہ اس وقت جین کی بجائے تم اس کے ساتھ ہو؟

اسی وقت میرے ذہن میں تیزی سے ایک خیال آیا۔

ایسا نہیں...... ایسا نہیں ہے عذرا خان...... ! تم غلط سوچ رہی ہو! سنو...... !

مگر میں نے پھر اس کی ایک نہ سنی اور اس نے ذہنی رابطہ ختم کر دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ سولومن سے ذہنی رابطہ قائم کرنا جبکہ خود میرے لئے مشکل ثابت ہوا تھا تو موشوروف اس میں کس طرح کامیاب ہو سکتا تھا! وہ یقیناً مجھے گیدڑ بھبکیاں دے رہا تھا۔ پھر یہ کہ اگر اس کے لئے بھی یہ ممکن ہوتا تو سولومن پر قابو پانے کے لئے اسے مجھ سے سودے بازی کی ضرورت پیش نہ آتی۔ خیالوں کی دنیا سے باہر آ کے میں نے سولومن کی طرف دیکھا۔ وہ پورے انہماک سے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ کار ڈرائیور کر رہا تھا۔ غالباً اسی لئے وہ مجھ سے بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ کار ڈرائیونگ کی طرف تھی۔ ابھی دس بجنے میں سات آٹھ منٹ باقی تھے۔ وہ غالباً بروقت باتھ آئی لینڈ پہنچ جانا چاہتا تھا۔

اس اطمینان کے باوجود کہ موشوروف میرے بارے میں سولومن کو کچھ نہیں بتا سکے گا۔ میں پوری طرح مطمئن نہیں تھی۔ میں نے اسی لئے سولومن کے ذہن کا جائزہ لینے کی کوشش کی مگر مجھے مزاحمت

کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے اپنی کوشش فوراً ترک کر دی۔ تیز رفتاری سے کار چلاتے ہوئے ذہنی طور پر انتشار کا شکار ہونے کی صورت میں کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔

چند منٹ اور گزرے پھر سولومن کی کار ہاتھ آئی لینڈ کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ وہ یقیناً بروقت وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس علاقے میں اس وقت خاصی پولیس بھی سادہ لباس میں موجود تھی اور آپریشن سیل کے ارکان بھی! سولومن کو جانے کیسے یہ احساس ہو گیا کہ حالات نارمل نہیں ہیں۔ غالباً یہ اس کی بیدار ذہنی کا ثبوت تھا۔

اس نے مطلوبہ کوٹھی کے گیٹ پر کار روکتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ''جینی! میں کچھ غیر معمولی سی نقل و حرکت اردگرد محسوس کر رہا ہوں۔ عموماً اس وقت یہ علاقہ پرسکون ہوتا ہے مگر......'' وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر کار سے اتر گیا۔

میں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔ اس نے پھاٹک پر لگا ہوا تالا کھول دیا اور پھر کار کو اندر لے آیا۔ کوٹھی میں تاریکی تھی۔

سولومن میرا ہاتھ تھامے آگے بڑھا۔ عمارت کا صدر دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے کوئی سوئچ دبا کر باہر روشنی کر دی تھی۔ اس عمارت میں وہ یقیناً پہلے بھی آتا جاتا رہا تھا ورنہ اسے دشواری پیش آتی۔ عمارت کے اندر داخل ہو کر وہ مختلف سوئچ آن کرتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ مجھے ساتھ لئے ایک ہال کمرے میں آ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میٹنگ کی تمام تیاریاں پہلے سے مکمل تھیں۔ وہاں پچیس تیس کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن کے سامنے ایک بڑی سی میز رکھی تھی۔ میز کی دوسری طرف اونچی پشت کی ایک کرسی تھی۔

سولومن میرے ساتھ اگلی رو کی دو کرسیوں پر آ بیٹھا' پھر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''دس بجنے میں اب صرف چند سیکنڈ باقی ہیں۔ لوگ بس اب آنے ہی والے ہوں گے۔'' اس کے لہجے سے ایک اضطراب سا جھلک رہا تھا۔ ''ہاں تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا جینی!''

''کس بات کا جواب؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہی کہ تم نے بھی اس علاقے میں غیر معمولی نقل و حرکت محسوس کی یا نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں پہلی بار یہاں آئی ہوں اس لئے کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' میں نے محتاط رویہ اختیار کیا۔ ''ممکن ہے یہ محض تمہارا شک ہو۔''

اسی وقت عقب سے قدموں کی چاپ ابھری۔ میں نے ایک غیر ملکی کو ہال کمرے کے دروازے سے اندر آتے ہوئے دیکھا۔

پھر تقریباً چند ہی منٹ میں تمام کرسیاں بھر گئیں۔ آنے والوں نے وقت کی پابندی کا پورا خیال کیا تھا۔ ان میں سولومن کے علاوہ صرف چھ سات غیر ملکی تھے۔ باقی سب مقامی ہی تھے۔ سعید احمد خان کو اس کی غیر معمولی جسامت کے سبب میں نے پہچان لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کئی اور ایسے چہرے میں نے دیکھے جنہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ زیادہ تر افراد ان میں وہی تھے جن کا تعلق دائیں بازو کی

سیاسی جماعتوں سے تھا۔ مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ ان ضمیر فروشوں کے چہروں پر نام کو بھی احساس ندامت کی جھلک نہیں تھی۔

ٹھیک سوا دس بجے میٹنگ کی باقاعدہ کارروائی شروع ہو گئی۔ سولومن اونچی پشت والی کرسی پر جا بیٹھا۔ اسی وقت میں نے بظاہر یوں ہی اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے اپنے بالوں میں لگے ہوئے اس ریسیور کا سوئچ آن کر دیا تھا جس کے ذریعے میٹنگ کی تمام کارروائی اس عمارت سے باہر پہنچ جاتی اور اسے ریکارڈ کر لیا جاتا۔

سولومن کی تقریر شروع ہوئی۔ پہلے اس نے میرے ملک کی سیاسی صورت حال کا تفصیلی جائزہ پیش کیا' پھر اس پر کڑی نکتہ چینی کرنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو اس ملک میں دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کا مستقبل قطعی تاریک ہو جائے گا۔ ہم نے اب تک بہت صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا ہے لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ عملی اقدامات کئے جائیں۔ اس ملک کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کے رجحان کو روکنے کے لئے میری حکومت اسی وقت دباؤ ڈال سکتی ہے جب اندرونی طور پر یہاں کی حکومت کو کمزور کر دیا جائے۔ اس وقت اہم نکتہ یہ ہے کہ دائیں بازو کی جماعتیں صوبائی اور علاقائی بنیادوں پر عوام کو ان کی محرومیوں کا احساس دلائیں۔ چھوٹے چھوٹے علاقائی اور گروہی مفادات کو ہوا دیں اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف مسلح تصادم کے لئے آمادہ کر دیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس سلسلے میں گزشتہ احکام پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے۔ علاقائی اور گروہی نفرتیں رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہیں۔ اب ایک آخری ضرب کی ضرورت ہے۔ اس کا نتیجہ مسلح تصادم کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیے۔ ہم اس کا آغاز اسی شہر سے کریں گے۔ آپس میں اختلافات رکھنے والے گروہوں کے درمیان اسلحہ کی تقسیم کا کام بھی کل سے شروع ہو جائے گا۔ اس شہر کے علاوہ ملک کے دیگر اہم شہروں میں بھی اسی پر عمل ہو گا۔'' پھر سولومن میرے ملک کے مختلف اہم شہروں کے نام گنواتے ہوئے ہر شہر میں انتشار پھیلانے کی ذمہ داری مختلف افراد کے سپرد کرتا رہا۔ ملک دشمن ضمیر فروش یہ ذمے داریاں قبول کرتے رہے۔

اپنی تقریر کے اختتام پر سولومن نے اس کوٹھی سے اسلحہ کی منتقلی کے طریقہ کار کی وضاحت کی۔ اس طریقہ کار کی رو سے آج ہی رات ملک کے مختلف شہروں کے لئے اسلحہ روانہ ہو جانا تھا۔ مختلف شہروں کے باب میں جن افراد کے نام لئے گئے تھے انہیں آج ہی شب وہاں سے اسلحہ لے کر نکل جانا تھا۔ آج رات سولومن اور اس کے نائبین کو اسی کوٹھی میں قیام کرنا تھا۔ سولومن اپنی نگرانی میں اسلحہ کی تقسیم چاہتا تھا۔ اس کے نائبین میں ایک تو جین یعنی میں تھی دوسرے مزید تین امریکی ایجنٹ جو اس کے ساتھ حال ہی میں باہر سے آئے تھے۔

میٹنگ ختم ہونے کا ابھی باقاعدہ اعلان نہیں ہوا تھا کہ اچانک متعدد مسلح نقاب پوش ہال کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں جن سے انہوں نے وہاں موجود تمام افراد کو کور کر لیا تھا۔

''اپنے اپنے ہاتھ اٹھا کر کرسیوں سے کھڑے ہو جاؤ!'' ایک دراز قد نقاب پوش نے بلند آواز میں ان سب کو حکم دیا۔

وہ آواز بدل کر بول رہا تھا مگر میں اسے پہچان گئی۔ کمانڈر نواز کے سوا وہ کوئی اور نہیں تھا۔

تمام ہال کمرے میں سراسیمگی سی پھیل گئی اور لوگوں کے چہرے فق ہو گئے۔ انہوں نے بلا چون و چرا کمانڈر نواز کے حکم کی تعمیل کی تھی۔

پھر کمانڈر نواز نے انہیں ایک اور حکم دیا۔ ''بائیں جانب کی دیوار کی طرف منہ کر کے اور ہاتھ بدستور اٹھائے ہوئے آ کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ تمہارے جسموں کو چھلنی کر دیا جائے گا!''

میری نگاہ سولومن پر تھی۔ اس نے بھی اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے تھے مگر ابھی تک اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ وہ یقیناً آہنی اعصاب کا مالک تھا اس لئے کہ موجودہ صورت حال کے باوجود اس کے چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ معاً اس کی نظر میری طرف اٹھی اور پھر اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس کا سبب لازماً یہی تھا کہ میں نے اب تک ہاتھ نہیں اٹھائے تھے۔

اسی وقت کمانڈر نواز کے اشارے پر ایک مسلح نقاب پوش تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے اپنی اسٹین گن کی نال سولومن کی پشت سے لگا دی۔ سولومن کو کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے قطعی بے بس کر دیا گیا تھا۔ کمانڈر نواز کے حکم پر ہر غیر ملکی کی پشت پر ایک گن مین موجود تھا۔ مقامی افراد نے فوراً ہی اس کے حکم پر عمل کیا تھا اور دیوار کی طرف منہ کئے ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔

صورت حال کو پوری طرح کمانڈر نواز کے قابو میں پا کر میں نے ہال کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ اس کوٹھی سے اسلحہ برآمد کر لینا میرے نزدیک کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ کام پولیس بھی بہ آسانی انجام دے سکتی تھی۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے سولومن کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار دیکھے تھے۔

اس کوٹھی سے وہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی جہاں آئی جی پولیس کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ میں کوٹھی سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس طرف بڑھنے لگی۔ کوٹھی کے باہر بھی میں نے سیل کے مسلح ارکان کو مستعد اور چوکنا پایا تھا۔

کچھ ہی دور چل کر مجھے آئی جی کی جیپ ایک دیوار کی آڑ میں کھڑی نظر آ گئی۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گئی۔

آئی جی نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپریشن سیل!'' میں نے گویا شناختی الفاظ ادا کئے۔

''اوہ یس!'' وہ ایک دم مستعد نظر آنے لگا۔

میں نے اسے جلدی سے کوٹھی کا محل وقوع سمجھایا اور اس پر ریڈ کرنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔

''وہاں پہنچ کر آپ کو ملک دشمن افراد کو حراست میں لینا ہے۔ اس عمارت میں غیر قانونی اسلحہ بھی موجود ہے جو آپ کو برآمد کرنا ہے۔ وہ ملک دشمن اور غیر ملکی ایجنٹ وہاں کیوں اور کس غرض سے جمع ہوئے تھے اور ان کے مذموم ارادے کیا تھے اس کا ثبوت ایک ٹیپ کی شکل میں آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔''

آئی جی نے اسی وقت وائرلیس پر ریڈ کے احکام دے دیئے اور پھر مجھے اپنی جیپ میں بٹھا کر کوٹھی کی طرف چل دیا۔

پھر تمام غیر ملکی ایجنٹوں کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ ان میں سولومن بھی تھا۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ کمانڈر نواز نے میٹنگ کی کارروائی کا ٹیپ بھی آئی جی کے حوالے کر دیا تھا۔ نتیجتاً میں اپنے سیل کے ارکان کو ساتھ لئے کوٹھی سے نکل آئی۔ ابھی تک پولیس اور تمام غیر ملکی ایجنٹ اسی کوٹھی میں تھے۔ پولیس کو بہرحال وہاں سے ابھی غیر قانونی اسلحہ بھی برآمد کرنا تھا۔

ابھی سیل کے ارکان کوٹھی سے نکل کر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے تھے کہ اچانک وہ کوٹھی تاریکی میں ڈوب گئی اور پھر ایک زبردست دھماکا سنائی دیا۔

''کوٹھی کو گھیرے میں لے لو!'' میں نے چیخ کر حکم دیا۔

سیل کے مسلح ارکان تیزی کے ساتھ چاروں طرف پھیل گئے۔ کوٹھی کے اندر سے چیخ پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں حیرت زدہ تھی کہ اچانک صورت حال کس طرح بدل گئی؟ آس پاس کی کوٹھیوں کے مکین بھی حقیقت حال جاننے کیلئے باہر آ گئے تھے۔ میں نے کئی افراد کو کوٹھی کی چار دیواری پر چڑھ کر باہر چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ سیل کے ارکان نے انہیں چھاپ لیا۔ یہ وہی تھے جو اس میٹنگ میں شرکت کرنے آئے تھے۔ اگر سیل کے ارکان نے میرے حکم پر فوراً ہی اس کوٹھی کو دوبارہ اپنے نرغے میں نہ لے لیا ہوتا تو ان میں سے اکثر افراد فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے۔

تقریباً دس پندرہ منٹ یہی افراتفری اور ہنگامہ آرائی جاری رہی پھر کہیں دوبارہ کوٹھی میں روشنی ہوئی۔

میں نے آئی جی کو عجیب بدحواسی کے عالم میں کوٹھی کی عمارت کے صدر دروازے سے نکلتے دیکھا۔ میں تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھی۔

''کیا ہوا تھا؟'' قریب پہنچ کر میں نے اس سے سوال کیا۔

''وہی دراز قد غیر ملکی جسے آپ نے سرغنہ بتایا تھا اور جسے میں نے اپنا ریوالور نکال کر کور کر لیا تھا آپ لوگوں کے جاتے ہی ایک چیخ مار کر سامنے رکھی ہوئی میز پر گر پڑا۔ پھر نہ معلوم کیسے ایک دم ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ اسی کے ساتھ ایک زبردست دھماکا ہوا اور مجھے یوں لگا جیسے ہال میں دھواں پھیل گیا ہو۔ پھر میں نے......''

میں نے آئی جی کی بات کاٹ کر جلدی سے پوچھا۔ ''کیا وہ غیر ملکی ابھی تک حراست میں ہے؟''

''وہ نہ جانے کب اور کیسے فرار ہو گیا......! اس کے علاوہ اور بہت سے افراد غائب ہیں۔'' آئی جی نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

میں نے اس کا جواب سن کر ٹھنڈا سانس بھرا' پھر بولی۔ ''کچھ افراد کو باؤنڈری وال سے چھلانگ لگا کر فرار ہوتے ہوئے میرے آدمیوں نے حراست میں لے لیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان میں وہ دراز قد غیر ملکی نہیں ہوگا۔ بہرحال آپ انہیں دوبارہ اپنی تحویل میں لے لیں۔''

آئی جی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر بتانے لگا کہ اس میز کی نچلی سطح پر ایک الیکٹرک سوئچ موجود تھا جس پر سولومن چیخ کر گرا تھا۔ کسی ایسی ہی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے اس نے پہلے یہ

بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ اسی لئے میز کے قریب ہی رہا تھا کہ موقع ملتے ہی مین سوئچ آف کر دیا اور پھر تاریکی سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو جائے۔

سیل کے ارکان نے فرار ہونے کی کوشش کرنے والے جن افراد کو پکڑ لیا تھا ان میں وہ تین غیر ملکی بھی نہیں تھے جنہیں سولومن کے نائبین کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ بھی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی اور فرد فرار نہیں ہو سکا تھا۔ ان تمام افراد کو دوبارہ پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔

ذاتی طور پر مجھے سولومن اور اس کے تینوں ساتھیوں کے فرار کا بہت افسوس تھا۔ ممکن ہے کہ میں ان لوگوں کو ایٹ دی اسپاٹ قانون کے حوالے کرنے کا فیصلہ نہ کرتی تو یہ صورت حال پیش نہ آتی۔ بہر حال جزوی طور پر ہی سہی میں نے سولومن کے منصوبے کو نا کام بنا دیا تھا۔

باتھ آئی لینڈ سے سیل کے ارکان کو واپسی حکم دے کر میں کمانڈر نواز کے ساتھ کار میں آ بیٹھی۔ میں اب وہاں اس انتظار میں مزید رکنا نہیں چاہتی تھی کہ پولیس غیر قانونی اسلحہ برآمد کر لے۔ یہ کام پولیس کا تھا اور یہ نشان دہی ہونے کے بعد کہ اسلحہ اسی کوٹھی میں ہے پولیس کے لئے اسے برآمد کر لینا مشکل نہ ہوتا۔

''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر ہی چلنا ہے نا؟'' کمانڈر نواز کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''نہیں!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''سولومن کو تلاش کرنے کے لئے ایک اور کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں...... کلفٹن چلو!''

اس امکان کو بہر حال میں نے نظر انداز نہیں کیا تھا کہ سولومن یہاں سے فرار ہو کر وہیں گیا ہو جہاں اس کا قیام تھا۔ ہر چند کہ سعید احمد خان گرفتار ہو چکا تھا لیکن سولومن اب بھی اس کی کوٹھی کو سکونت کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔

میری ہدایت پر کمانڈر نواز نے کلفٹن کا رخ کیا۔

جب ہم کلفٹن پہنچے تو سعید احمد خان کی کوٹھی سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف اوپری منزل کے ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

میرے ایما پر کمانڈر نواز نے کار سے اتر کر بیل بجائی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر ملازم نے پھاٹک کھولا۔ میں بھی اس دوران میں کار سے اتر کر کمانڈر نواز کے قریب پہنچ چکی تھی۔

''جی فرمائیے...... کس سے ملنا ہے؟ صاحب تو ہیں نہیں۔'' ملازم مہذب معلوم ہوتا تھا۔

''ہمیں تمہارے صاحب سے نہیں بلکہ ان کے غیر ملکی مہمان سے ملنا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اوپری منزل کی طرف نگاہ اٹھائی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے آہستہ سے اوپر کی کھڑکی کھولی ہو۔

''میں ابھی انہیں اطلاع کرتا ہوں۔ ابھی تو آئے ہیں وہ......! آپ کا نام؟'' ملازم سے یہ سنتے ہی میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

دوسرے ہی لمحے میں نے کمانڈر نواز کو مخصوص اشارہ کیا۔ اسی کے ساتھ کمانڈر نواز کا جچا تلا ہاتھ ملازم کی کنپٹی پر پڑا اور وہ منہ سے ہلکی سی آواز نکال کر گرنے لگا۔ کمانڈر نواز نے اسے وہیں گیٹ کے قریب لٹا دیا۔ پھر میرے پیچھے کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ ساری کوٹھی میں تاریکی تھی اور صرف اوپری منزل پر ایک کمرا روشن تھا۔ میں نے اس سے یہی اندازہ لگایا کہ سولومن اسی کمرے میں ہو گا۔ اندر قدم بڑھاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اوپر کی طرف دیکھا۔ اسی کمرے کی کھڑکی میں مجھے ہلکی سی جھری نظر آئی تھی جیسے کوئی اس جھری سے جھانک کر نیچے دیکھ رہا ہو۔

گیٹ سے دائیں جانب مڑتے ہوئے میں نے کمانڈر نواز سے مدھم آواز میں کہا۔ ''تم عمارت کی عقبی سمت جاؤ' میں اوپر جاتی ہوں۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میں اس عمارت میں اجنبی تھی اس لئے اوپری منزل تک جانے کے لئے زینے کی تلاش دقت طلب تو ہوئی مگر مجھے بہر حال کامیابی ہو گئی۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اسی وقت میں نے ہلکا سا دھماکا سنا جیسے کوئی بلندی سے کودا ہو۔ یہ آواز اسی سمت سے آئی تھی جدھر سے میں آ رہی تھی۔ نتیجتاً میں الٹے قدموں بعجلت سیڑھیاں پھلانگتی ہوئیں دوبارہ نیچے پہنچی۔ اسی لمحے میری نگاہ ایک سائے پر پڑی جو کھلے ہوئے گیٹ کی طرف لپک رہا تھا۔ شاید اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ پھر مجھے فوراً ہی خطرے کا احساس ہوا۔ وہ سایہ لحہ بھر کو روشنی کے دائرے میں آ گیا تھا اور میں نے اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ لیا تھا۔ وہ سولومن ہی تھا جو غالباً کھڑکی کے ذریعے پہلی منزل سے کود کر گیٹ کی طرف لپکتے ہوئے مجھے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ریوالور کی نال پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں زمین پر لیٹ گئی تھی اور اندھیرے میں وہ شعلہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر گویا ہلکی سی آواز کے ساتھ دیوار میں پیوست ہو گیا تھا۔

سولومن کے کودنے اور پھیر دیوار پر گولی لگنے سے جو آوازیں پیدا ہوئی تھیں انہوں نے کمانڈر نواز کو اس طرف متوجہ کر دیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ اس وقت میں زمین سے اٹھ چکی تھی۔

عین اسی لمحے میں نے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔

''کمانڈر! وہ شاید ہماری کار میں فرار ہو رہا ہے!'' میرے لہجے میں تیز قسم کی سرسراہٹ سی تھی۔

پھر ہم دونوں ہی گیٹ کی طرف دوڑے۔ صورت حال یوں پیش آئے گی اس کا مجھے گمان بھی

نہ تھا۔ کمانڈر نواز کار ہی میں چابی لگی چھوڑ آیا تھا۔ سولومن کے لئے یہ گویا ایک سنہری موقع تھا۔ غالباً اس نے اوپر ہی سے ہمیں دیکھ کر اپنے ذہن میں فرار کا پورا منصوبہ مرتب کر لیا تھا۔

ہم جب بھاگتے ہوئے گیٹ سے نکلے تو دور ہوتی ہوئی کار کی عقبی سرخ بتی جیسے ہمارا منہ چڑا رہی تھی۔ سولومن مجھے ایک بار پھر جل دے کر نکل گیا تھا۔

''جلد بازی میں کھیل بگڑ گیا ورنہ وہ شاید فرار نہ ہو سکتا۔'' میں پر تاسف لہجے میں بولی۔ ''ہم میں سے کسی ایک کو باہر ہی رہنا تھا۔''

جواباً کمانڈر نواز کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے پر بھی ندامت کے آثار تھے حالانکہ اس سلسلے میں صرف وہی قصوروار نہیں تھا۔

''اب ہمیں یہاں سے آپریشن سیل پہنچنے کے لئے بہر حال کسی ٹیکسی کا سہارا لینا پڑے گا' آؤ!'' میں یہ کہتے ہوئی آگے بڑھی۔

وہاں سے ہم پیدل چل دیئے۔ سڑک پر پہنچے تو ہمیں ساحل کی طرف سے ایک بس آتی دکھائی دی۔

''آؤ اسی میں صدر چلتے ہیں وہاں سے کوئی ٹیکسی مل جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے قریب آنے والی بس کو ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کیا۔

یہ فیصلہ میں نے اس لئے بھی کیا تھا کہ اب رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ اس علاقے میں اس وقت کوئی خالی ٹیکسی ملنا محال ہی تھا۔ وہ بس بھی شاید آخری ہی تھی۔ اس میں کم ہی مسافر تھے۔

بس میں صدر تک پہنچنے کے لئے ہمیں خاصا وقت لگ گیا۔ پھر صدر میں بھی ٹیکسی جلدی نہیں ملی۔ بہر حال میں کمانڈر نواز کے ساتھ تقریباً سوا بجے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ سکی۔ ٹیکسی کو ہم نے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے کچھ پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔

مسلسل بھاگ دوڑ اور گزشتہ شب نہ سونے کے سبب میں خود کو کافی تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس تھکن کی ایک نفسیاتی وجہ سولومن کا فرار بھی تھا۔ اگر وہ ہتھے چڑھ گیا ہوتا تو شاید میں اتنی تھکن محسوس نہ کرتی۔ اپنے چہرے سے میں نے جین کا میک اپ ختم کر دیا۔ میرے نزدیک اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میک اپ ختم کرنے کے بعد منہ دھو کر میں بستر پر لیٹ گئی اور پھر جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر میں نے ناشتا کرتے ہی وزیر داخلہ سے گفتگو کرنا ضروری سمجھا۔ اس وقت تک میں اخبار نہیں پڑھ سکی تھی۔ میں نے ان کا نمبر ملایا اور دوسری جانب سے ریسیور اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد ہی ٹیلی فون ریسیو کر لیا گیا۔

''ہیلو!'' مجھے فون پر وزیر داخلہ کی بھاری آواز سنائی دی۔

''عذرا خان......! آداب!'' میں بولی۔

''جیتی رہو......! تم نے دیکھا آج کا اخبار......؟ تمہارا کارنامہ جلی حروف میں شائع ہوا ہے مگر اس کا سارا کریڈٹ پولیس کو یعنی میرے محکمے کو ملا ہے۔''

''ابھی میں اخبار نہیں دیکھ سکی۔'' میں نے بتایا۔

''وہاں سے پولیس نے بھاری تعداد میں اسلحہ برآمد کیا ہے بہر حال اسے میں ذاتی طور پر تمہارا ہی کارنامہ کہوں گا۔ میں نے رات ہی اس سلسلے میں رپورٹ طلب کی تھی اور مجھے اس ٹیپ کے متعلق بھی معلوم ہو گیا تھا جو تم نے آئی جی کے حوالے کیا تھا۔ میں خود ٹیپ سننا چاہتا ہوں جو یقیناً مجرموں کے خلاف ایک ناقابل تردید ثبوت ہے۔ وہ ٹیپ میں نے منگوایا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس اس کوٹھی کے مالک کی بھی تلاش میں ہے جہاں سے اسلحہ برآمد ہوا ہے۔''

''اس کوٹھی کے مالک کے متعلق تو میں بھی آپ کو بتا سکتی ہوں لیکن پولیس یقیناً اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گی۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم! پولیس اس پر کیوں ہاتھ نہیں ڈال سکے گی؟'' انہوں نے قدرے حیرت سے سوال کیا۔

''کوٹھی کا مالک اس سلسلے میں جو بیان دے گا وہ میں عرض کئے دیتی ہوں۔ وہ کہے گا کہ اس کی مستقل سکونت اسلام آباد میں ہے۔ اس کی لاعلمی میں کون لوگ خالی کوٹھی کو اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں اسے معلوم نہیں۔ اس کی یہ لاعلمی تسلیم کر لی جائے گی اور یوں یہ قصہ ختم ہو جائے گا۔''

''مگر وہ شخص ہے کون......؟ بتاؤ تو سہی نا مجھے! ممکن ہے تمہارا قیاس غلط ثابت ہو جائے!''

''میرا خیال ہے کہ خود پولیس کو اپنے طور پر اس سلسلے میں تفتیش کرنے دیں اور آپ براہ راست مداخلت نہ کریں۔ ویسے اس اہم شخص کا نام میں اس شرط پر آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ فی الحال اسے اپنے تک ہی محدود رکھیں تو بہتر ہے۔'' پھر میں نے انہیں شہریار کا نام بتا ہی دیا۔

''تو......تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ...... وہ یعنی شہریار بھی براہ راست ملک دشمن عناصر کی پشت پناہی کر رہا ہے!'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''کراچی ہی کے ایک تھانے میں کل ایک جرائم پیشہ شخص نے خود کو قانون کے حوالے کیا ہے۔ اس کا نام ابرار ٹیڈی ہے۔'' میں نے ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے گویا مزید انکشاف کیا۔ ''اس شخص نے تھانے میں جو بیان دیا ہے وہ بھی آپ ملاحظہ کر لیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ صدر کے مشیر شیخ مجید پر قاتلانہ حملہ کرانے والا کون تھا!''

''کیا...... کیا اس میں بھی شہریار کا ہاتھ تھا؟'' ان کی حیرت بدستور برقرار تھی۔ ''یہ تو گویا اس کے خلاف بہت اہم ثبوت ہو گا۔ مجھے قطعی گمان نہیں تھا کہ وہ اس حد تک بڑھ سکتا ہے۔ بہر حال میں آج ہی بلکہ ابھی ضروری احکام جاری کرتا ہوں تاکہ وہ اہم بیان ریکارڈ پر آ جائے اور اسے کسی طرح تلف نہ کر دیا جائے۔ کیا واقعی شہریار ہی نے شیخ مجید پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا؟''

''آپ اس مجرم کا اقبالی بیان پڑھ کر میری بات پر یقین کر لیں گے کہ حقیقت یہی ہے۔'' میں نے کہا' پھر گزشتہ شب کے بارے میں بتایا۔ ''آپ کے آئی جی صاحب کی حماقت سے اصل مجرم بچ کر نکل گیا ہے اور اس کے تین غیر ملکی ساتھی بھی!'' پھر میں نے مختصراً اصل واقعہ بیان کر دیا۔

”یہ بہت برا ہوا۔“ انہوں نے اظہار افسوس کیا۔ ”مگر مجھے اس کے متعلق نہیں بتایا گیا۔ میں اس سلسلے میں سخت باز پرس کروں گا!“ ان کے لہجے میں سختی آ گئی۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ابھی معاملہ ختم نہیں ہوا۔ ہمیں کسی بھی وقت کسی نئی خطرناک صورت حال کے لئے تیار رہنا چاہیے! ظاہر ہے کہ وہ ایک خطرناک منصوبے کی ناکامی کے بعد کوئی اور حربہ آزمائیں گے۔ جب تک اصل مجرم نہیں پکڑے جاتے خطرہ بدستور ہے!“

”جی ہاں۔“ میں نے ان کے خیال سے اتفاق کیا۔ ”بہر حال میں بے خبر نہیں ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ مجھ سے نہیں بچ سکیں گے۔“

”میں تمہارے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں۔ میں پھر ایک بار تمہیں اپنے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تعاون حاصل کرنے میں تم کسی تکلف سے کام نہیں لو گی۔“

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس یقین دہانی کے بعد کہ اگر ضرورت پڑی تو ان کا تعاون ضرور حاصل کروں گی، سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر اس دن بار بار میرے ذہن میں صرف ایک ہی سوال گردش کرتا رہا کہ سولومن تک پہنچنے کا کیا ذریعہ ہو؟ لے دے کے میرے ہاتھ میں صرف ایک ہی کارڈ تھا، جین! میں سوچ رہی تھی کہ اگر اسے رہا کر دیا جائے تو کیا سولومن اس کے قریب آنے کی کوشش کرے گا؟ موجودہ حالات میں یہ کچھ مشکل ہی نظر آتا تھا کہ سولومن اس کے قریب آتا اور میں جین کو بہ طور چارا استعمال کر سکتی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں نے جین ہی کے میک اپ میں سولومن کو ٹریپ کیا تھا۔

سولومن کے علاوہ مجھے اپنی بہن ذکیہ کی طرف سے فکر لاحق تھی۔ میں اندازہ لگا چکی تھی کہ روسی ایجنٹ مجھے جو اہم اطلاع دینے والا تھا اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ذکیہ سے ضرور تھا ورنہ وہ اس کا نام نہ لیتا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرتے ہوئے میں ذکیہ ہی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ خدا جانے وہ کس حال میں ہو گی! ذکیہ ہی کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک میرے ذہن پر ایک مانوس لذت انگیز کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ میرے ذہن کی وہی کیفیت تھی جس کے زیر اثر مجھے خود بہ خود بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی تھیں۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ چند ہی لمحے بعد کوئی مجھ سے خود میری ہی آواز میں سرگوشیاں کرنے لگا اور یہ سرگوشیاں سن کر میرے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

کچھ دیر بعد وہ کیفیت ختم ہو گئی۔ میری حالت اعتدال پر آ گئی مگر اس کے باوجود اب تک میری سماعت میں وہی الفاظ گونج رہے تھے جو سرگوشیوں میں ادا کئے گئے تھے۔ ”عذرا خان! تمہاری بہن ذکیہ کو ڈاکٹر رچرڈ نے اغوا کر لیا ہے۔ روسی ایجنٹ موشوروف تمہیں یہی اہم اطلاع دینا چاہتا تھا۔“

اب سے پہلے کبھی اس طرح کی سرگوشیاں غلط ثابت نہیں ہوئی تھیں اس لئے میں بے چین ہو گئی۔ موجودہ صورت حال میں میری قاہرہ روانگی ناگزیر ہو گئی تھی۔ میں بہر حال اپنی بہن کو ڈاکٹر رچرڈ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مجھے باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن سے ڈاکٹر رچرڈ کے عیاش طبع ہونے کے بارے میں بھی معلوم ہو چکا تھا۔

یہ سامنے کی بات تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ نے یہ قدم کیوں اٹھایا تھا! اس طرح یقیناً وہ مجھے سامنے

آنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے غالباً اپنے نائب سولومن کی جانب سے ملنے والی اطلاعات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ میں سولومن کے قابو میں نہیں آ سکوں گی۔ اس نے اسی سبب یہ نیا قدم اٹھایا ہو گا۔ یہ جاننے اور سمجھنے کے باوجود کہ ذکیہ کے اغوا کا مقصد دراصل کیا ہے، میں وہی قدم اٹھانے پر مجبور تھی جو ڈاکٹر رچرڈ چاہتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی آیا اگر واقعی ایسا ہوا تھا جیسا میں سوچ رہی تھی تو پھر ڈاکٹر رچرڈ کسی نہ کسی طرح مجھ تک یہ اطلاع ضرور پہنچاتا تاکہ اس کا اصل مقصد حل ہو سکے۔ ڈاکٹر رچرڈ کے اس اقدام کا ایک پہلو اور بھی تھا کہ میری غیر موجودگی میں اس کا نائب سولومن ملک دشمن منصوبوں پر آزادی کے ساتھ عمل کر سکے۔ یوں گویا ڈاکٹر رچرڈ نے یہ دہری چال چلی تھی۔ فی الوقت تو میں نے سولومن کے عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا مگر آئندہ پاکستان سے میری غیر حاضری اس کے حق میں سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کا بچ کر نکل جانا اچھا نہیں ہوا تھا۔ سولومن کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اس کی محبوبہ جین کا خیال آیا۔ وہ ابھی تک میری قید میں تھی۔ قاہرہ روانگی سے قبل اسے بھی قانون کے حوالے کرنا ضروری تھا۔ وہ اتنی چالاک عورت تھی کہ میرے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ہوٹل کے جس کمرے میں وہ ٹھہری تھی وہاں سے بھی مجھے کوئی ایسی شے نہیں مل سکی تھی جس سے یہ ثابت کیا جا سکتا کہ وہ امریکی ایجنٹ ہے۔ ایسی صورت میں صرف ایک یہی راہ تھی کہ جین کو سولومن کی ساتھی ثابت کرنے کے لئے قانون نافذ کرنے والے ادارے میرے بیان پر یقین کر لیتے۔ جن افراد کو گزشتہ شب باتھ آئی لینڈ کی کوٹھی سے حراست میں لیا گیا تھا ان میں جین کو بھی شامل کیا جا سکتا تھا۔ ہر چند کہ یہ بات حقیقت کے خلاف تھی مگر اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ میرا ضمیر اس سلسلے میں یوں مطمئن تھا کہ بہر حال جین امریکی ایجنٹ تھی۔ اگر اسے بھی حراست میں لے لیا جاتا تو غلط نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے ضمیر کو مزید مطمئن کرنے کی اور ایک اور راہ بھی نکالی۔ جین کو قانون کے حوالے کرنے کی خاطر مجھے بہر صورت وزیر داخلہ ہی کا سہارا لینا تھا۔ میں نے انہیں حقائق سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

پھر چند ہی لمحے بعد میں بستر سے اٹھ کر وزیر داخلہ کا ذاتی فون نمبر ملانے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس وقت اپنی قیام گاہ ہی پر ہوں گے۔ دوپہر دو بجے سے چار بجے تک وہ بھی آرام ہی کرتے تھے، اور اس وقت تین بجنے والے تھے۔ یہ ان کے آرام کا وقت تھا مگر مجبوری تھی۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں جلد از جلد تمام معاملات نمٹا کر قاہرہ روانہ ہو جانا چاہتی تھی۔

کچھ ہی دیر کے بعد دوسری جانب سے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا گیا مگر فون ریسیو کرنے والے وزیر داخلہ نہیں تھے۔ میں نے فون پر ایک نسوانی آواز سنی تھی۔ وہ غالباً ان کی بیگم تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا۔ ”وہ اس وقت بیڈ روم میں ہیں اگر آپ کو کوئی بہت ضروری بات نہ کرنا ہو تو چار بجے فون کر لیں۔“

”مجھے کچھ ضروری ہی بات کرنا تھی ورنہ میں اس وقت ہرگز انہیں زحمت نہ دیتی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ ان کے آرام کا وقت ہے“ میں جواباً بولی۔ میں نے اپنا نام بتایا۔

”ہولڈ کریں میں انہیں خبر کرتی ہوں۔“ دوسری طرف سے شائستگی کے ساتھ کہا گیا۔

”شکریہ!“ میں نے کہا اور پھر انتظار کرنے لگی۔

پھر تقریباً دو منٹ کے بعد مجھے وزیر داخلہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''ہاں کہو کیا بات ہے؟''

''پہلے تو میں ناوقت زحمت دینے پر معذرت خواہ......''

''میں تمہارے لئے کوئی غیر نہیں ہوں کہ معذرت کر رہی ہو مجھ سے!'' انہوں نے میری بات کاٹ کر شفقت آمیز انداز میں مجھے ڈانٹا پھر بولے۔ ''تم یہ بتاؤ کہ کس لئے فون کیا ہے؟''

میں نے انہیں مختصراً جین کے بارے میں بتا دیا اور آخر میں بولی۔ ''اس وقت وہ میری تحویل میں ہے اور میں اسے قانون کے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔'' میں اس سے پہلے انہیں یہ بھی بتا چکی تھی کہ میرے پاس جین کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے اور یہ بھی کہ گزشتہ شب اس کی جگہ خود میں امریکی ایجنٹوں کی میٹنگ میں شریک ہوئی تھی۔

''اگر اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تو کم از کم میرے لئے تمہارا صرف یہ کہنا ہی کافی ہے کہ وہ بھی ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھی۔'' انہوں نے پورے اعتماد سے کہا۔ ''رہی اس سلسلے میں ضروری خانہ پری تو اسے بھی گزشتہ شب حراست میں لئے جانے والے افراد کا ساتھی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں میں آئی جی کو اس سلسلے میں فون کر دوں گا۔''

''خود میرے ذہن میں بھی یہی تھا۔'' میں نے اعتراف کیا' پھر بولی۔ ''بس ذرا یہ خیال تھا کہ بہر حال یہ حقیقت نہیں تھی اس لئے......''

وہ ہنسنے لگے' پھر بولے۔ ''تمہاری معصومیت اور دیانت داری تو پسند ہے مجھے......! ذرا سی غلط بیانی تمہارے لئے مسئلہ بن جاتی ہے...... بہر حال اسے اپنے کسی آدمی کے ساتھ پولیس ہیڈ آفس بھیج دو اور اپنے ذہن میں صرف یہ رکھو کہ وہ ایک مجرمہ تھی جسے تم نے قانون کے حوالے کر دیا اور کوئی خاص بات؟''

''نو سر!...... بہت بہت شکریہ!'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ابھی میں نے ریسیور رکھا تھا کہ انٹر کام کی بیل بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری جانب عثمانی تھا۔ اس نے بتایا۔ ''ابھی ابھی آپ کی فرم کی منیجر عارفہ کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ آپ کے نام قاہرہ سے ایک ٹیلی گرام آیا ہے۔''

یہ اطلاع پا کر میں چونک اٹھی اور بولی۔ ''تم نے تفصیلات معلوم کیں؟''

''جی میں وہی بتانے والا تھا۔'' عثمانی نے جواب دیا۔

پھر عثمانی نے وہی کچھ بتایا جس کی مجھے توقع تھی۔ عارفہ نے اسے ٹیلی گرام کا مضمون لکھا تھا۔ ٹیلی گرام ذکیہ ہی نے دیا تھا' گویا اس کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ گزشتہ چند دن سے میں علیل ہوں۔ ان دنوں میں ڈاکٹر رچرڈ کے زیر علاج ہوں۔ اس سے پہلے کہ مرض کوئی تشویش ناک صورت اختیار کر جائے آپ فوراً آ جائیں! میں شدت سے آپ کی منتظر ہوں۔ آپ کی بہن ذکیہ!

ٹیلی گرام کے ذو معنی الفاظ سمجھنا میرے لئے مشکل نہیں تھا اگر مجھے اپنے ذہن کی حیرت انگیز

قوتوں کے ذریعے ذکیہ کے اغوا کا علم نہ بھی ہوتا تو بھی ٹیلی گرام کے الفاظ سے میں اسی نتیجے پر پہنچتی۔

ابھی تک عثمانی نے انٹر کام کا سلسلہ منقطع نہیں کیا تھا۔ میں نے اسے جین کے متعلق ضروری ہدایات دیں' پھر آخر میں کہا۔ ''یہ کام کسی تاخیر کئے بغیر آج ہی ہو جانا چاہیے۔''

''بہتر ہے۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''اور سنو!'' میں مزید بولی۔ ''میرا پاسپورٹ منگوا لو' مجھے فوری طور پر قاہرہ کا ویزا چاہیے! امید ہے کہ اس سلسلے میں تمہارے اثر و رسوخ کام آ سکیں گے۔''

پھر اسی دن تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ رات کی فلائٹ سے قاہرہ کے لئے میری سیٹ بھی کنفرم ہو گئی۔ عثمانی نے انتہائی مستعدی کا ثبوت دیا تھا۔ اسی دوران میں جین کو بھی قانون کے حوالے کیا جا چکا تھا۔

رات کو حسب معمول جب کمانڈر نواز ڈیوٹی پر آیا تو میں نے اسے اپنی قاہرہ روانگی کے بارے میں بتایا۔ اس کے خیال میں فوری طور پر میری روانگی مناسب نہیں تھی۔ اس کا جواز یہی تھا کہ اس طرح سولومن کو من مانی کرنے کی آزادی مل جائے گی۔

قاہرہ پہنچ کر مجھے ڈاکٹر رچرڈ کو کہاں کہاں تلاش کرنا تھا اس سلسلے میں مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن کا ذہن پڑھ کر مجھے پہلے ہی سے ڈاکٹر رچرڈ کے تمام ٹھکانوں کا علم ہو چکا تھا۔

''مجبوری ہے کمانڈر!'' میں طویل سانس لے کر بولی۔ ''اگر ذکیہ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں ہرگز نہ جاتی۔''

''آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتی ہیں۔'' اس نے کہا' پھر پوچھا۔ ''جیفرسن کے متعلق کیا سوچا آپ نے؟''

''فی الحال وہ یہیں رہے گا۔ قاہرہ سے لوٹ کر میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر آپ عذرا خان کی حیثیت سے سفر نہ کرتیں تو زیادہ بہتر تھا مگر...... اب......'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''ہاں اب دیر ہو چکی ہے۔'' میں نے گویا اس کی بات مکمل کر دی۔ ''تمہارا مشورہ یقیناً مناسب تھا مگر اتنی جلد بازی میں کسی نئے پاسپورٹ کا حصول ممکن نہیں تھا۔ میں تمہارے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشات و خطرات کو محسوس کر رہی ہوں۔ ٹیلی گرام بھیجنے کے بعد یقیناً ڈاکٹر رچرڈ میری آمد کا منتظر ہو گا۔ پاکستان سے آنے والی ہر فلائٹ کو اس کے آدمی چیک کریں گے مگر شاید اسے یہ توقع نہ ہو کہ میں اتنی جلدی وہاں پہنچ سکوں گی۔ آج ہی تو اس نے ٹیلی گرام دیا ہے۔ بس یہی ایک ذرا سی امید ہے کہ شاید وہ فوری طور پر میری آمد کا منتظر نہ ہو۔ بہر حال جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔''

میں اس وقت اپنا سامان وغیرہ پیک کر کے ڈیوٹی روم میں بیٹھی تھی۔ وہیں میں نے رات کا کھانا بھی کھایا تھا اور اب چائے پیتے ہوئے بھی کمانڈر نواز سے گفتگو جاری تھی۔ پھر جب ایئر پورٹ جانے کا وقت ہو گیا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی ایک کار میں خود کمانڈر نواز مجھے ایئر پورٹ تک چھوڑنے آیا تھا۔ اپنی ڈیوٹی اس نے سیل کے ایک اور رکن کے سپرد کر دی تھی۔ میرے احکام کے مطابق ڈیوٹی روم کو کسی بھی صورت میں خالی نہیں چھوڑا جاتا تھا۔

میں کیوں کہ میک اپ میں نہیں تھی اس لئے جہاز کی روانگی سے بس کچھ پہلے ہی ایئر پورٹ پر پہنچی تاکہ مجھے وہاں زیادہ وقت نہ گزرانا پڑے۔ جہاز پر سوار ہونے والی میں آخری مسافر ہی تھی۔ وہ ایک غیر ملکی فضائی کمپنی کا جہاز تھا۔

جہاز کی روانگی سے قبل کوئی غیر معمولی بات میں نے محسوس نہیں کی اور پھر بالآخر جہاز کراچی ایئر پورٹ سے پرواز کر ہی گیا۔

سفر کے دوران میں بس کچھ دیر کو میں سو پائی ورنہ میرا ذہن ذکیہ ہی میں الجھا رہا۔

جب جہاز قاہرہ ایئر پورٹ پر اترنے والا تھا تو صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

ایئر پورٹ پر ضروری خانہ پری کے دوران میں میں پوری طرح چوکنا تھی مگر ابھی تک مجھے کوئی ایسا چہرہ نظر نہیں آیا تھا جسے مشتبہ سمجھ سکتی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے ایئر پورٹ ہی کے ایک باتھ روم کا رخ کیا اور پھر جب میں باتھ روم سے نکلی تو میرا چہرہ بڑی حد تک بدل چکا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ تبدیل کرنے کے لئے ریڈی میڈ میک اپ کا سہارا لیا تھا۔ وگ نے میرے بالوں کا رنگ بھی بدل دیا تھا اور کانٹیکٹ لینیز سے میری آنکھوں کی پتلیاں بھی اب سیاہ کی بجائے سبز نظر آ رہی تھیں۔ مجھے اب کوئی عذرا خان کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا تھا۔

اپنے قیام کے لئے میں پہلے ہی ہیلیو پولس شیرٹن کا انتخاب کر چکی تھی۔ یہ فائیو اسٹار ہوٹل ہیلیو پولس کے علاقے میں تھا اور اسی سبب علاقے کے نام سے منسوب تھا۔ یہ علاقہ ایئر پورٹ سے صرف ایک میل کی مسافت پر تھا۔

ایئر پورٹ سے ہیلیو پولس شیرٹن کا سفر میں نے ایک سرکاری ٹیکسی لیموزین میں کیا۔ ان سرکاری ٹیکسیوں کا کرایہ مقرر ہے۔ ایئر پورٹ سے شہر کے کسی بھی حصے میں جانے کے لئے یہ چار گنی لیتی ہیں۔ ہیلیو پولس اپر کلاس آبادی ہے یہاں اسی لئے شیرٹن ایسا فائیو اسٹار ہوٹل تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ ہوٹل چار منزلہ ہے اور بڑے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سات سو بیس کمرے ہیں۔ مجھے یہاں تیسری منزل پر ایک کمرا حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کمرے کا کرایہ ساٹھ گنی یومیہ تھا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے سامان وغیرہ سیٹ کیا۔ غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور پھر ناشتا منگا لیا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں سوچنے لگی کہ ڈاکٹر رچرڈ کی تلاش میں پہلے مجھے کدھر کا رخ کرنا چاہیے؟ امریکی ایجنٹ جیفرسن سے مجھے ڈاکٹر رچرڈ کے تین ٹھکانوں کا علم ہوا تھا۔ ان میں سے ایک ٹھکانہ پرانے قاہرہ میں تھا' ایک جیزا میں اور ایک جدید قاہرہ میں! ڈاکٹر رچرڈ انہی تینوں ٹھکانوں میں سے کہیں ایک جگہ ہو سکتا تھا۔ میں کیونکہ اس وقت جدید قاہرہ میں تھی اس لئے پہلے یہیں کے ایک ٹھکانے کا رخ کرنے کا فیصلہ کیا۔

مہندسین کا علاقہ ہیلیو پولس سے تقریباً آٹھ نو میل کے فاصلے پر تھا۔ مہندس' عربی زبان میں انجینئر کو کہتے ہیں۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ اس اپر کلاس علاقے میں جدید طرز تعمیر پر خوب صورت بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ انہی بنگلوں میں سے ایک بنگلے میں ڈاکٹر رچرڈ کا قیام تھا اور مجھے بنگلا نمبر بھی معلوم تھا۔

ابھی میں اپنے کمرے سے نکلنے ہی والی تھی کہ خلاف توقع کمرے میں موجود ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں چونک اٹھی' میری تشویش کا سبب یہ تھا کہ یہاں مجھے ٹیلی فون کرنے والا کون ہو سکتا تھا؟ مجھے ابھی یہاں آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی تھی! بہرحال الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ میں نے آگے بڑھ کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو مس شازیہ!'' مجھے ٹیلی فون آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ میں نے ہوٹل کے رجسٹر میں یہی نام لکھایا تھا۔ ''آپ کا فون بات کیجئے۔''

''شکریہ!'' میں نے کہا اور پھر دوسری جانب سے بولنے والے کا انتظار کرنے لگی۔

چند ہی لمحے بعد مجھے فون پر ایک آشنا آواز سنائی دی۔ ''عذرا خان! مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی جلد یہاں پہنچ جاؤ گی۔ بہرحال ڈاکٹر رچرڈ قاہرہ میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہے۔''

وہ یقیناً ڈاکٹر رچرڈ ہی بول رہا تھا۔ میں اس کی آواز پہچان چکی تھی۔ فون پر خلاف توقع اس کی آواز سن کر میرے اعصاب پر ایک چھنا کا سا ہوا اور میں فوری طور پر کچھ نہ بول سکی۔

''حیرت ہو رہی ہے نا تمہیں کہ میں نے تمہیں اتنی جلدی کس طرح تلاش کر لیا۔'' وہ یہ کہہ کر آہستہ سے ہنسا۔ ''اگر تمہارے ذہن میں یہ خیال ہو کہ ایئر پورٹ پر میرے کسی آدمی نے تمہیں جہاز سے اترتے دیکھ لیا ہو گا اور پھر ہیلیو پولس تک تمہارا تعاقب کیا ہو گا تو ایسا نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسی صورت میں تم اپنے تعاقب سے غافل نہ رہتیں! تم یقیناً چوکنا ہو جاتیں۔ میں نے اسی لئے دوسرا راستہ اختیار کیا اور تمہیں تلاش کر لیا۔ وہ دوسرا راستہ کیا ہے......؟ میں تمہیں یہ نہیں بتاؤں گا۔''

ڈاکٹر رچرڈ جو کچھ کہہ رہا تھا میرے خیال میں غلط نہیں تھا۔ میں واقعی بہت چوکنا رہی تھی۔ ایئر پورٹ سے ہوٹل تک کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔ پھر ڈاکٹر رچرڈ کو میرے متعلق کیسے معلوم ہو گیا؟ یہ سوال میرے لئے کسی معمے سے کم نہیں تھا۔ میں نے اس کے باوجود جلد ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا۔ اس سے انکار کرنا کہ میں عذرا خان نہیں ہوں بچکانہ بات ہوتی۔ میں اسی لئے فوراً اصل مسئلے پر آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر! تم نے میری بہن کو اغوا کر کے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں اپنے اور میرے درمیان اسے نہیں لانا چاہیے تھا۔ اب......''

''سنو!'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میں نے یہ مجبوری یہ قدم اٹھایا تھا مگر اب فوری طور پر تمہاری بہن کو رہا کیا جا رہا ہے کیونکہ تم یہاں پہنچ گئی ہو۔ تم نصف گھنٹے بعد اسے فون کر سکتی ہو۔ اسے اس کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔''

''اور اس کے باوجود میں تمہارے ہتھے نہ چڑھ سکی تو؟'' میں نے سوال کیا۔

''اول تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ پر یقین لہجے میں بولا۔ ''اس مرتبہ تم پہلے کی طرح قاہرہ سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکو گی' دوسری بات یہ کہ تمہاری بہن بہرحال میری دسترس میں رہے گی۔ میں اسے دوبارہ بھی اغوا کر سکتا ہوں۔ اب تم قاہرہ سے فرار ہونے کا فیصلہ ذرا سوچ سمجھ کر ہی

کرنا؟"

"تم آخر چاہتے کیا ہو مجھ سے؟" میری آواز میں جھنجلاہٹ سی آ گئی جو غالباً میری بے بسی کی دلیل تھی۔

"وہی جو پہلے چاہتا تھا' دوسرا تجربہ......! اور اب اس میں زیادہ وقت نہیں رہا۔"

جس وقت ڈاکٹر رچرڈ یہ الفاظ ادا کر رہا تھا میرے ذہن میں ایک نیا خیال جنم لے رہا تھا۔ میں اس طرح ذکیہ کو اور خود کو اس کی دسترس سے محفوظ رکھ سکتی تھی مگر اس کا انحصار ذکیہ کی رہائی پر تھا۔ اگر ڈاکٹر رچرڈ واقعی ذکیہ کو رہا کر دیتا تو میں اپنے ذہن میں ابھرنے والے نئے خیال کو عملی جامہ پہنا سکتی تھی۔

"کیا سوچنے لگیں تم؟" وہ خاموش پا کر بول اٹھا۔ "کہیں یہ تو نہیں سوچ رہیں کہ اپنے چہرے پر کوئی نیا میک اپ کر کے اس ہوٹل سے کہیں اور منتقل ہو جاؤ......! اگر واقعی تم یہی سوچ رہی ہو تو یہ بے سود ہو گا۔ تم میری نظروں سے نہیں چھپ سکو گی! میں تمہیں بہر حال تلاش کر لوں گا!"

"فی الحال تو میں یہ سوچ رہی ہوں ڈاکٹر کہ تم اپنا وعدہ وفا بھی کرتے ہو یا نہیں!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"یعنی؟" اس نے پوچھا۔

"یہ وعدہ کہ تم میری بہن کو رہا کر رہے ہو!"

"یہ حقیقت ہے عذرا خان!" اس نے مجھے یقین دلایا۔ "اگر میرا ارادہ نہ ہوتا تو ہرگز تم سے اس سلسلے میں کچھ نہ کہتا۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ تم نے مجھ سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا اور نہ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ یہ تو خود میرا فیصلہ ہے جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' نصف گھنٹے کے بعد تم اس کی تصدیق کر سکتی ہو۔ اچھا...... خدا حافظ! مجھے امید ہے کہ جلد ہی تم سے ملاقات ہو گی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ٹیلی فون پر ڈاکٹر رچرڈ سے یہ گفتگو میرے لئے حیران کن ہی تھی۔ خدا جانے اس نے کس طرح یہ معلوم کر لیا تھا کہ میں قاہرہ پہنچ چکی ہوں! نہ صرف یہ بلکہ میک اپ اور نام کی تبدیلی کے باوجود اس نے مجھے تلاش بھی کر لیا تھا۔ اس کی معلومات کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے؟ سوچنے کے باوجود میرے ذہن میں اس سوال کا جواب نہ آ سکا۔ پھر مجھے ڈاکٹر رچرڈ کے یہ الفاظ بھی یاد آئے کہ اگر کوئی اور میک اپ بھی کر کے اپنی شخصیت تبدیل کر لوں تو وہ مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔ بظاہر تو یہ بات ناممکن سی لگتی تھی مگر وہ ڈاکٹر رچرڈ تھا۔ اس نے جس یقین و اعتماد کے ساتھ یہ الفاظ ادا کئے تھے اس سے میں الجھ سی گئی تھی۔ میرے قاہرہ پہنچتے ہی اس نے ذکیہ کو رہا کرنے کی خبر بھی سنا دی تھی۔ یہ بھی میرے لئے حیرت انگیز امر تھا۔ مجھے ذکیہ کی بازیابی کے لئے تگ و دو نہیں کرنا پڑی تھی۔

ڈاکٹر رچرڈ سے گفتگو کرتے ہوئے میرے ذہن میں جو خیال آیا تھا اب میں اسی پر عمل کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور پھر اپنے اٹیچی کیس سے میک اپ کا سامان نکال کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ اپنے چہرے پر نیا میک اپ کرنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ میک اپ کر کے میں نے سامان اٹیچی کیس میں رکھ دیا اور پھر اسے مقفل کر

کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اٹیچی کیس میرے ہاتھ میں تھا۔

کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلنے سے پہلے میں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر جھانکا۔ راہداری میں ایک ویٹر قریب ہی کے ایک کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس ویٹر کے اندر جاتے ہی میں اپنے کمرے سے نکل آئی۔ کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لفٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بھی میں اردگرد سے غافل نہیں تھی۔ یہ امکان بہر حال تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کا کوئی گرگا میرے کمرے کی نگرانی کر رہا ہو۔

پھر لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر پہنچنے اور اس ہوٹل سے نکلنے میں مجھے کوئی قباحت نہ ہوئی۔ یوں بھی صبح کا وقت تھا۔ ہوٹل میں آنے جانے والوں کا خاصا ہجوم تھا۔ میں نے کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں پایا۔ میک اپ کرنے اور ہوٹل سے باہر آنے میں مجھے نصف گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اگر ڈاکٹر رچرڈ نے جھوٹ نہیں بولا تھا یا مجھے دھوکا نہیں دیا تھا تو اب تک ذکیہ کو اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔

ذکیہ کی کوٹھی جیزا میں تھی اور میری منزل وہی تھی۔ جیزا کے ایک علاقے دقی میں پاکستانی سفارت خانے سے کچھ ہی دور ذکیہ کی خوبصورت کوٹھی تھی۔ میری ہی طرح ذکیہ بھی کوٹھی میں صرف اپنے ملازمین کے ساتھ رہتی تھی۔ ہیلیو پولس سے دقی تقریباً تیرہ چودہ میل تھا۔ ہوٹل سے نکل کر میں نے وہاں کے لئے ایک ٹیکسی کر لی۔ ٹیکسی والے نے میٹر کے باوجود وہاں تک کے لئے جو کرایہ طلب کیا میں نے منظور کر لیا۔ مجھے علم تھا کہ ٹیکسی والے قاہرہ میں میٹر سے نہیں چلتے۔ میٹر کے حساب سے بارہ پیاسٹر فی میل کرایہ تھا۔ یوں گویا ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے تقریباً دگنا کرایہ مانگا تھا۔ اگر میں اس سے سودے بازی کرتی تو ممکن ہے وہ کم بھی لے لیتا مگر وقت کی اہمیت کے پیش نظر مجھے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

ٹیکسی تیز رفتاری سے جیزا کی طرف جا رہی تھی اور اس سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ میرا ذہن ڈاکٹر رچرڈ سے نمٹنے کے لئے لائحہ عمل مرتب کرنے میں منہمک تھا۔ ذکیہ کی صورت میں گویا اس کے ہاتھ میری ایک کمزوری آ گئی تھی اور میں اسی کمزوری کا سدباب چاہتی تھی۔

نیل کے ایک پل سے گزر کر جب ٹیکسی جیزا کے علاقے میں داخل ہوئی تو میں اپنے خیالات کی دنیا سے نکل آئی۔ اب میری منزل خاصی قریب آ گئی تھی۔ فائیو اسٹار ہوٹل شیرٹن کی ایک شاخ یہاں بھی تھی۔ یہ کیرو شیرٹن کہلاتا تھا۔ اب میری ٹیکسی کیرو شیرٹن کی تین منزلہ عمارت کے قریب سے گزر کر دقی کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے وہاں پہنچ کر ڈرائیور کی رہنمائی شروع کر دی۔ پھر میری رہنمائی میں کچھ ہی دیر بعد ٹیکسی ذکیہ کی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ کر رک گئی۔ میں نے کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی سے اتر گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے میرا اٹیچی کیس ڈگی سے نکال کر میرے قریب رکھ دیا اور دوبارہ ٹیکسی میں جا بیٹھا۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو میں نے گیٹ کی ایک جانب لگی ہوئی بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

کچھ ہی دیر بعد گیٹ کا ذیلی دروازہ کھل گیا اور ایک شخص نے باہر جھانک کر مجھ سے پوچھا۔

"کس سے ملنا ہے؟" اس نے یہ سوال عربی میں کیا تھا۔ اپنے چہرے سے بھی وہ عرب ہی لگ رہا تھا۔

"مجھے ذکیہ بی بی سے ملنا ہے۔" میں نے بھی عربی ہی کو ذریعہ اظہار بنایا۔

"آپ کا نام؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ مجھے نام سے نہیں پہچان سکیں گی۔" میں نے احتیاط کے پیش نظر کہا۔ "تم ان سے کہنا کہ

ان کی بہن عذرا خان نے پاکستان سے کسی کو ان کے پاس بھیجا ہے۔''

''جی بہتر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ عرب چلا گیا۔ معلوم نہیں کیوں اس نے ذیلی دروازہ دوبارہ اندر سے بند کر دیا تھا۔

وہ عرب مجھے اپنے لباس اور لب و لہجے سے ذکیہ کا ملازم ہی معلوم ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بھی مجھے کچھ شناسا سا لگا تھا مگر یقین کے ساتھ میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ مجھے ذکیہ کی کوٹھی آئے ہوئے ایک طویل عرصہ ہو چکا تھا۔ اگر میں نے کبھی اسے دیکھا بھی تھا تو یہ کافی عرصے پہلے کی بات تھی۔ ذیلی دروازہ بند کرنے کا سبب وہ حالات ہی ہو سکتے تھے جن سے ان دنوں ذکیہ دوچار تھی۔ یقیناً اسی کی ہدایت پر اس کے ملازم اجنبیوں کے سلسلے میں احتیاط سے کام لے رہے ہوں گے۔

ملازم کی واپسی کا مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ جلد ہی لوٹ آیا۔ یوں بھی میں یہاں آ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ اگر ذکیہ وہاں پہنچ نہ چکی ہوتی تو ملازم پہلے ہی مجھے بتا چکا ہوتا کہ وہ موجود نہیں ہے۔ ذیلی دروازہ کھول کر اس بار ملازم باہر آ گیا اور اس نے آگے بڑھ کر میرا اٹیچی کیس میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ذکیہ کے لئے پاکستان اور عذرا خان کا حوالہ یقیناً کافی ثابت ہوا تھا ورنہ ملازم کے رویے میں تبدیلی نہ آتی۔

ذیلی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ملازم نے پھر اندر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ اب عمارت کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ذکیہ مجھے برآمدے ہی میں اپنی منتظر مل گئی۔ ہر چند کہ اس کے چہرے پر پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا مگر اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔

''تشریف لایئے!'' اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔

ظاہر ہے کہ وہ میک اپ کی وجہ سے مجھے نہیں پہچان سکی تھی۔ میں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس کا ملازم میرا اٹیچی کیس اٹھائے میرے ساتھ ہی تھا۔

ذکیہ نے ملازم سے کہا۔ ''اٹیچی کیس مہمان خانے میں پہنچا دو!''

ملازم اثبات میں سر ہلا کر ایک طرف روانہ ہو گیا تو میں خود پر قابو نہ پا سکی۔ میرے دل میں اپنی بہن کے لئے محبت کے جذبات جوش مار رہے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی بہن کو گلے سے لگا لوں۔ نتیجتاً میں ذکیہ کے قریب ہو کر جذباتی لہجے میں بولی۔ ''میں اس گھر میں مہمان نہیں ہوں بگلی!''

لمحہ بھر کو ذکیہ کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار ابھرے اور پھر وہ ''باجی'' کہہ کر میرے سینے سے لگ گئی۔

''آپ کبھی سرپرائز دینے سے باز نہیں آتیں!'' وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔

ذکیہ پہلے بھی کئی بار مجھے مختلف روپ میں دیکھ چکی تھی۔ یہ فقرہ اسی کا ردعمل تھا۔

دیر تک میں اسے سینے سے لگائے رہی۔ پھر وہ مجھے ساتھ لئے اپنی خوابگاہ میں آ گئی۔

''جہاں تک مجھے علم ہے تمہیں اپنی کوٹھی آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی!'' میں آرام سے ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئی بولی۔

وہ میری بات سن کر چونک اٹھی پھر بولی۔ ''جی...... جی ہاں آپ کا خیال درست ہے۔''

''ذکیہ! میں زیادہ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے تم سے صرف اتنا دریافت کروں گی کہ تم جن لوگوں کے درمیان تھیں انہوں نے تمہیں ذہنی یا جسمانی طور پر کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟'' ذکیہ سے یہ سوال کرتے ہوئے جانے کیوں میری آواز کچھ کانپ سی گئی تھی۔

''نہیں......! مگر ذہنی طور پر میں یقیناً پریشان تھی کہ وہ کون لوگ ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں......! پھر آج خلاف توقع انہوں نے مژدہ سنایا کہ مجھے رہا کیا جا رہا ہے...... مگر باجی آپ...... آپ کو یہ سب کچھ کس طرح معلوم ہو گیا......؟ اور آپ بغیر اطلاع کے......''

''مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ تمہیں کب اور کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''یہ پرسوں صبح کی بات ہے۔'' ذکیہ مجھے بتانے لگی۔ ''میں شاپنگ کرنے تحریر اسکوائر گئی تھی۔ کچھ چیزیں خرید کر جب میں اپنی کار میں آ کر بیٹھی تو کسی نے پیچھے سے میرے منہ پر رومال رکھ دیا۔ اس رومال پر شاید بے ہوشی کی کوئی دوا چھڑکی ہوئی تھی۔ چند ہی لمحے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں کچھ اجنبی لوگوں کے درمیان ایک اجنبی جگہ تھی۔ مجھے ان میں سے ایک ادھیڑ عمر غیر ملکی نے بتایا کہ چند دن مجھے ان لوگوں کا مہمان رہنا پڑے گا، پھر مجھے رہا کر دیا جائے گا۔ میرے استفسار کے باوجود انہوں نے زبردستی کی اس میزبانی کی وجہ نہیں بتائی۔ پھر وہ لوگ مجھے ایک عرب خاتون کی نگرانی میں وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے شور مچایا یا کوئی اور حرکت کی تو یہ میرے ہی حق میں غلط ثابت ہو گا۔ ایسی صورت میں میرے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا جائے گا۔ میرے ہاتھ پاؤں ایک کرسی سے بندھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد اس عرب خاتون نے بھی مجھے سمجھایا اور شور نہ مچانے کی تاکید کی۔ اسی کے ساتھ اس نے مجھ سے کہا کہ تمہیں بھوک یا پیاس محسوس ہو تو مجھے بلا تکلف بتا دینا۔ پھر دوپہر ہوئی تو اس نے مجھ سے کھانے کے لئے پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا اور یہ شرط لگائی کہ جب تک وہ عورت مجھے اغوا کرنے والوں کے بارے میں نہیں بتا دے گی میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ اس عورت نے مجھے یقین دلانا چاہا کہ وہ خود ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی مگر مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا اور میں نے کھانا نہیں کھایا۔ رات کو اس نے پھر کھانے کے لئے کہا۔ میں صبح سے بھوکی پیاسی تھی۔ اس عورت نے ضد کی تو مان گئی۔ اس نے خود مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا اور میری خواہش پر قہوہ بنا کر بھی پلایا۔ آپ کو تو معلوم ہے باجی کہ میں نیند کی کتنی کچی ہوں! اس کے باوجود مجھے اس حالت میں نیند نہ آ سکی۔ وہ عورت بھی رات بھر جاگتی رہی تھی۔ دوسرا دن بھی اسی طرح گزرا، رات ہوئی، پھر اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ وہ عورت مجھے ناشتا کرا کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ انہی غیر ملکیوں میں سے ایک وہاں آ گیا اور اس نے مجھے بتایا کہ تمہیں کچھ دیر بعد رہا کر دیا جائے گا۔ مجھے یہ سن کر یقین ہی نہ آیا۔ اس غیر ملکی نے اپنی جیب سے ایک شیشی نکال کر کھولی اور اسے میری ناک سے لگا دیا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے بے ہوشی کی دوا سنگھا رہا ہے۔ میں نے اسی لئے سانس روک لیا مگر کب تک! بالآخر مجھے وہ ناگوار بو سونگھنا ہی پڑی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد میرے ذہن پر تاریکی چھا گئی۔ دوبارہ ہوش

آنے پر میں نے خود کو اپنی کار میں دیکھا۔ میری کار پاکستانی سفارت خانے کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ اب سے تقریباً ایک گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ پھر میں کار ڈرائیو کرتی ہوئی اپنی کوٹھی آ گئی۔'' یہ کہہ کر ذکیہ نے طویل سانس لیا۔

ذکیہ سے ساری تفصیل جاننے کے بعد میرے ذہن سے جیسے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ مجھے ڈاکٹر رچرڈ کی جانب سے جو خدشہ تھا بے بنیاد ثابت ہوا تھا۔ اپنی عیاش مزاجی کے باوجود کسی سبب اس نے ذکیہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے ذکیہ کو مخاطب کیا۔ ''ذکیہ! میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میرے کچھ مخالفین قاہرہ میں تمہاری موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ تمہارا اغوا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں باجی!'' وہ حیران سی ہو کر بولی۔

''تمہیں اغوا کر کے ہی انہوں نے مجھے قاہرہ آنے پر مجبور کیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اور جب انہیں معلوم ہو گیا کہ میں یہاں آ چکی ہوں تو انہوں نے تمہیں رہا کر دیا۔''

''مگر کیوں...... ؟ کیوں باجی...... ؟ وہ آپ کو قاہرہ کیوں بلانا چاہتے تھے؟'' اس کے لہجے میں بدستور حیرت تھی۔

''اس لئے کہ وہ تم پر نہیں مجھ پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں۔''

''پھر...... ؟ پھر اب کیا ہو گا باجی؟'' وہ فکر مند سی نظر آنے لگی۔

''فکر کی اس میں کوئی بات نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''میں اس کا حل سوچ چکی ہوں۔ تمہیں کچھ دن کے لئے قاہرہ کی سکونت ترک کر کے میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔''

مجھ سے یہ سن کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''یہ...... یہ تو بہت اچھا ہے باجی کہ مجھے کچھ دن ہی سہی آپ کے ساتھ رہنے کا موقع مل جائے گا۔''

''تمہارا پاسپورٹ تو تیار ہو گا ہی!'' میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر آج ہی بلا کسی تاخیر کے تم پاکستان کا ویزا حاصل کر لو۔'' میں بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ ابھی وقت ہے تم آج ہی یہ کام انجام دے سکتی ہو۔ پاکستانی سفارت خانہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ تم ابھی کیوں نہ چلی جاؤ!''

میری تجویز پر وہ فوراً آمادہ ہو گئی۔ ''ٹھیک ہے آپ آرام کریں میں ابھی سفارت خانے ہو کر آتی ہوں۔'' یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

عین اسی وقت خواب گاہ میں ایک جانب تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جانے کیوں میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے کا احساس دلایا۔ ذکیہ اس وقت تک ٹیلی فون تک پہنچ چکی تھی۔ میری نظریں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''ہیلو!'' ذکیہ نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ ''جی...... ؟ اچھا! ...... جی ہاں میں انہیں بلاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''باجی آپ کا فون ہے۔''

میں تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گئی اور پھر اس سے ریسیور لے لیا۔ ''ہیلو...... ! عذرا خان۔''

''اب تو تمہیں یقین آ گیا ہو گا عذرا خان کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا!'' دوسری جانب سے مجھے ڈاکٹر رچرڈ کی آواز سنائی دی۔ ''تمہاری بہن خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئی نا؟''

''ہاں...... ! شکریہ ڈاکٹر...... ! اور اس کا بھی شکریہ کہ تم نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔''

''تم نے محسوس کیا عذرا خان کہ تم ہر وقت میری نگاہ میں ہو!'' وہ بولا۔ اس کے لہجے میں احساس تفاخر تھا۔

''یہ کہہ کر تم کیا ظاہر کرنا چاہتے ہو ڈاکٹر؟''

''یہ کہ تم میری دسترس میں ہو اور میں جب چاہوں تم تک پہنچ سکتا ہوں۔ تم بہر حال آج رات میرے پاس ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ہی رات دوسرا تجربہ ہو جائے۔''

''ڈاکٹر! تمہیں مجھ پر دوسرا تجربہ کرنے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔'' میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔ اسی کے ساتھ میں نے لائن کاٹ دی۔

ذکیہ قریب ہی کھڑی میری گفتگو سن رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے ریسیور رکھا وہ بول اٹھی۔ ''کون تھا باجی؟''

''وہی جس نے تمہیں اغوا کرایا تھا۔'' میں نے اسے یہ بتانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

''مگر اسے کس طرح معلوم ہو گیا کہ آپ یہاں میرے پاس ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم اس چکر میں اپنا ذہن نہ الجھاؤ اور میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرو۔ ہاں آتے جاتے محتاط رہنا!'' میں نے اسے تاکید کی اور پھر بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد میرے ایما پر ذکیہ پاکستانی سفارت خانے روانہ ہو گئی۔ اس کی شہریت مصر کی تھی اس لئے اسے پاکستان جانے کے لئے بہر حال ویزا مطلوب تھا۔ میں تنہا اس کی خواب گاہ میں بستر پر دراز ڈاکٹر رچرڈ کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس نے جو دعویٰ کیا تھا سچ کر دکھایا تھا۔ میک اپ کی تبدیلی کے باوجود اس نے نہ جانے کیسے مجھے تلاش کر لیا تھا! یہ امر میرے لئے بہر حال تشویش ناک تھا۔ نہ معلوم اس کے پاس کیا ایسا ذریعہ تھا کہ اسے میرے متعلق بالکل صحیح اطلاع مل جاتی تھی! مجھے یقین تھا کہ جس وقت میں میک اپ کر کے اپنے کمرے سے نکلی تھی کسی کی نظر میں نہیں آئی تھی۔ اس وقت راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ پھر اسے کس طرح خبر ہو گئی تھی کہ میں نیا میک اپ کر کے ذکیہ کی کوٹھی پہنچ چکی ہوں؟ اس سوال نے میرے ذہن کو الجھا دیا تھا۔

پھر وہی ہوا جو ایسے مواقع پر ہوتا تھا۔ میرے ذہن کی حیرت انگیز قوتیں متحرک و بیدار ہو گئیں۔ میں نے اپنے سارے جسم میں ایک لذت انگیز سنسنی سی دوڑتے محسوس کی۔ اس کے چند لمحے بعد ہی گویا مجھے اس سوال کا جواب مل گیا جو کافی دیر سے میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ توقع کے مطابق مجھے خود اپنی ہی سرگوشی سنائی دے رہی تھی۔ میں جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کر رہی تھی۔ ''عذرا خان! پہلے تجربے کے دوران ہی میں ڈاکٹر رچرڈ نے تمہارے ذہن کے ساتھ ایک ایس سگنل سسٹم منسلک کر دیا تھا

کہ تم کہیں بھی ہو اسے تمہاری موجودگی کا علم ہو جائے' تمہارے ذہن سے خارج ہونے والی نادیدہ لہروں کے ذریعے وہ تمہارا سراغ لگا سکے۔ اس سگنل سسٹم کو متحرک و فعال ہونے اور تمہارے ذہن سے مکمل رابطہ پیدا کرنے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔ سو یہ وقت پورا ہو گیا مگر اس دوران میں تم قاہرہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ اسے ڈاکٹر رچرڈ کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سگنل سسٹم پوری طرح تمہارے ذہن سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ اس کے نتیجے میں اس کا دائرہ محدود ہو گیا۔ اب اسے صرف قاہرہ شہر کی حد تک فعال کہا جا سکتا ہے۔ تم قاہرہ میں کہیں بھی ہو ڈاکٹر رچرڈ کو اس سسٹم کے ذریعے تمہارا سراغ مل جائے گا۔" ان الفاظ کے ساتھ یہ سرگوشی ختم ہو گئی۔

چند ہی لمحے بعد میری ذہنی حالت معمول پر آ گئی اور میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میرے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں نے ایک بار پھر میری رہنمائی کی تھی۔

ڈاکٹر رچرڈ کے جال سے نکلنے کے لئے اب پہلی ضرورت یہ تھی کہ میں اس سگنل سسٹم کے حلقہ اثر سے باہر نکل جاؤں۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب کسی بھی طرح میں اس شہر سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں اور اب میں اپنے ساتھ ذکیہ کو بھی لے جانا چاہتی تھی۔

قاہرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی صورت میری نقل و حرکت ڈاکٹر رچرڈ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی چاہے میں کتنی ہی اپنی شخصیت کیوں نہ بدل لوں۔ اس سلسلے اور ان حالات میں میک اپ بے سود ہی تھا۔ ہاں اس طرح اس کے گرگوں کو ضرور دھوکا دیا جا سکتا تھا۔

موجودہ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے میرا ذہن ایک نیا لائحہ عمل مرتب کرنے لگا۔ جب تک ذکیہ سفارت خانے سے لوٹ کر آئی میں ایک نتیجے تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے مجھے آتے ہی خوش خبری سنائی۔ "باجی! ویزا مل گیا۔"

"ویری گڈ!" میں نے اطمینان کا اظہار کیا' پھر بولی۔ "اب فوراً چلنے کی تیاری کر لو' ہمیں یہاں سے جلد از جلد روانہ ہو جانا ہے۔"

"مگر...... مگر باجی ٹکٹ......؟ کسی فلائٹ سے سیٹ بھی تو ریزرو کرانا ہو گی نا!" اس نے کہا۔

"فی الحال اس کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہم براہ راست قاہرہ سے پاکستان نہیں جائیں گے۔" میں نے اپنے لائحہ عمل کے مطابق اسے بتایا۔

"پھر......؟ پہلے یہاں سے کہاں چلنا ہے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ بھی بتا دوں گی' پہلے تم تیار تو ہو جاؤ!" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

ذکیہ نے میری طرف الجھی الجھی نظروں سے دیکھا اور پھر اپنی الماری کی طرف بڑھ گئی جسے کھول کر وہ اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

پھر تقریباً پون گھنٹے کے اندر اندر میں ذکیہ کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھی ہوئی اس کی کوٹھی کے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ مصلحتاً میں نے ابھی اپنے چہرے سے میک اپ ختم نہیں کیا تھا۔ ابھی تک میں نے ذکیہ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میرا ارادہ کہاں جانے کا ہے! میری ہدایت پر اس نے اپنا پاسپورٹ' ویزا اور ضروری کاغذات ساتھ رکھ لئے تھے۔ کار ذکیہ ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔

کچھ فاصلہ طے کرتے ہی ذکیہ نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ "اب تو بتا دیں باجی کہ کہاں کا قصد ہے؟"

"دراصل اس سوال کا جواب خود تمہیں ہی دینا ہے۔" میں طویل سانس لے کر بولی۔ "یہ بتاؤ کہ تم کبھی قاہرہ سے باہر بائی روڈ کسی قریبی بستی یا شہر گئی ہو؟ میرا مطلب یہ ہے کہ تم وہاں تک کار کے ذریعے بائی روڈ جا سکتی ہو؟"

"ہاں ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہاں سے قریب ترین جگہ ستارہ ہے اور میں وہاں کئی بار کار سے گئی ہوں مجھے راستہ معلوم ہے۔ اس کے علاوہ میں ایک مرتبہ کار ہی سے اسماعیلیہ بھی گئی ہوں۔ اب آپ بتائیں کدھر چلوں؟"

"ستارہ یہاں سے کتنی دور ہے اور اسماعیلیہ کا فاصلہ کتنا ہو گا؟ تمہیں معلوم ہے کچھ؟" میں نے مزید دریافت کیا۔

"ستارہ تقریباً تیس چالیس میل ہو گا اور اسماعیلیہ تقریباً ایک سو بیس میل۔ اسماعیلیہ' پورٹ سعید اور سوئز کے درمیان واقع ہے۔" ذکیہ نے جواب دیا۔

"اسماعیلہ سے پورٹ سعید کتنی دور ہو گا؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"پورٹ سعید' اسماعیلیہ سے بہ مشکل اسی نوے میل ہو گا' مگر آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی وجہ ہے نا......! جہاں تک میرے علم میں ہے اسماعیلیہ میں ایئر پورٹ نہیں ہے۔"

"جی ہاں۔" ذکیہ بولی۔ "پورٹ سعید میں ایئر پورٹ ہے۔"

"میں اسی لئے پوچھ رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "تم یوں کرو کہ یہاں سے سیدھی اسماعیلیہ چلو!" میں نے احتیاطاً ستارہ کے بجائے اسماعیلیہ کو ترجیح دی تھی۔ ستارہ کی نسبت وہ قاہرہ سے خاصے فاصلے پر تھا اور یہ امکان نہیں تھا کہ سگنل سسٹم کسی بھی صورت وہاں تک موثر ہو سکتا ہے۔

جہاں تک میرا قیاس تھا خطرہ صرف اسی وقت تک تھا کہ ہم قاہرہ کی حدود میں رہتے۔ قاہرہ کی حدود سے نکلنے کے بعد میری دانست میں خطرہ ٹل جاتا۔ میں اسی لئے پوری طرح مستعد اور چوکنا تھی۔

جیزا سے نکل کر ہم جدید قاہرہ آ گئے اور پھر تحریر اسکوائر کو پیچھے چھوڑ کر شاہراہ اہرام پر نکل آئے۔ قاہرہ کی یہ سب سے طویل شاہراہ ہے۔ تحریر اسکوائر سے یہ بالکل سیدھی مشہور قدیم اہرام مصر تک چلی گئی ہے۔

مجھے اندازہ تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ بہ آسانی قاہرہ کی حدود سے نہیں نکلنے دے گا اور پھر میرا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ اپنی کار کے تعاقب میں ایک نیلی کار میں نے دیکھ لی تھی۔ تحریر اسکوائر سے نکلتے ہی وہ نیلی کار تعاقب کرنے لگی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ذکیہ تھی۔ میرے خیال میں یہ صورت حال مناسب نہیں تھی۔

"ذکیہ!" معاً کچھ سوچتے ہوئے میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اب میں ڈرائیونگ کرنا چاہتی ہوں کار کو تم سڑک کے کنارے روک دو پھر تم میری رہنمائی کرو گی۔"

ذکیہ نے اثبات میں سر ہلایا' پھر کار کی رفتار کم کر کے اسے میری ہدایت پر سڑک کے کنارے

روک دیا۔ میری نگاہ اپنے پیچھے آنے والی کار پر جمی ہوئی تھی۔ اس کی رفتار بھی کم ہوگئی تھی اور اب وہ قریب آتی جا رہی تھی۔ میں نے اس میں دو غیر ملکیوں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر رچرڈ ہی ہوسکتا تھا۔ ادھر وہ نیلی کار قریب آئی ادھر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی لی۔ نیلی کار ہمارے قریب سے گزر گئی۔ میں نے دانستہ فوری طور پر کار اسٹارٹ نہیں کی۔ نیلی کار بھی کچھ فاصلہ طے کر کے سڑک کے کنارے رک گئی۔ میرا ذہن اس وقت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے ایک فیصلہ کیا اور پھر اپنا پرس کھول کر ریوالور نکال لیا۔ ذکیہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسی کے ساتھ کار اسٹارٹ کر دی۔ میرے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا اور بایاں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا۔ نیلی کار اب تک اپنی جگہ کھڑی تھی۔ غالباً ڈاکٹر رچرڈ میری کار کو آگے نکلنے کے بعد ہی اپنی کار اسٹارٹ کرنا چاہتا تھا۔ پھر نیلی کار میرے ریوالور کی رینج میں آ گئی۔ میں نے تیزی کے ساتھ کھڑکی سے ہاتھ نکالا اور پے در پے نیلی کار کے پچھلے دونوں ٹائروں کو نشانہ بنا دیا۔ فائرنگ اور ٹائر برسٹ ہونے سے زبردست دھماکے ہوئے۔ سڑک ویران نہیں تھی اس لئے گزرنے والی گاڑیاں فوراً ہماری طرف متوجہ ہوگئیں میں نے ایکسیلریٹر پر پورا دباؤ ڈال دیا اور میری کار کمان سے چھوٹے ہوئے کسی تیر کی طرح تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

"ریوالور میرے پرس میں رکھ دو!" میں نے اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت قائم رکھتے ہوئے ذکیہ کو مخاطب کیا۔ فائرنگ کر کے ریوالور میں نے اپنی گود میں ڈال لیا تھا۔

ذکیہ نے میری ہدایت پر ریوالور میری گود سے اٹھا لیا اور اسے پرس میں رکھنے لگی۔

ڈاکٹر رچرڈ کو اپنے تعاقب سے روک دینے کے باوجود بھی میں پوری مطمئن نہیں تھی۔ میں اب بھی کسی خطرے کی بو محسوس کر رہی تھی۔ میری کار اب تیز رفتاری سے پرانے قاہرہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں اہرام کے قریب سے گزری اور پھر پرانے قاہرہ کی حدود میں داخل ہوگئی۔ پرانے قاہرہ سے گزر کر ہی مجھے اسماعیلیہ جانے والی سڑک تک پہنچنا تھا۔ ذکیہ میری رہنمائی کر رہی تھی۔ میں نے یہ بات فراموش نہیں کی تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ کا ایک ٹھکانا پرانے قاہرہ میں بھی تھا۔ یہاں بھی میرے لئے خطرہ ہوسکتا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ ٹرانسمیٹر پر اپنے آدمیوں کو میرے بارے میں مطلع کر سکتا تھا۔ کار کی رفتار ابھی تک میں نے کم نہیں کی تھی۔ پھر جلد ہی میری کار پرانے قاہرہ سے بھی گزر گئی اور گویا متوقع خطرہ ٹل گیا۔ اب میں اسماعیلیہ جانے والی سڑک پر نکل آئی تھی۔ یہ سڑک کچھ فاصلہ طے کر کے دائیں جانب مڑ گئی تھی۔ سڑک تقریباً ویران ہی تھی۔ ٹریفک برائے نام تھا۔ قدرے مطمئن ہو کر اب میں نے کار کی رفتار نسبتاً کم کر دی تھی اور اطمینان سے ڈرائیونگ کر رہی تھی کچھ ہی دیر بعد میں سڑک کے موڑ تک پہنچ گئی اور پھر اسی کے ساتھ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ موڑ کاٹتے ہی مجھے ایک بڑی سیاہ وین سڑک پر ترچھی کھڑی نظر آ گئی تھی جس نے راستہ مسدود کر دیا تھا۔ غیر ارادی طور پر میرا پیر بریک تک پہنچ گیا۔ میرا ذہن خطرے کی گردان کر رہا تھا۔ سیاہ وین کی ڈرائیونگ سیٹ خالی تھی۔

ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے کہ اچانک فضا ایک دھماکے سے گونج اٹھی۔ وہ دھماکہ یقیناً گولی چلائے جانے کا تھا۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی میری کار ایک طرف جھک گئی۔

کسی نے فائر کر کے میری کار کے ٹائر کو نشانہ بنا دیا تھا۔

میں نے فوری طور پر کار چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور اسی کے ساتھ دائیں جانب جھک کر کار کا دروازہ کھولتے ہوئے ذکیہ سے کہا۔ "جلدی...... جلدی اترو کار سے!"

ذکیہ کے کار سے اترتے ہی میں بھی تیزی کے ساتھ کار سے اتر گئی اور پھر ذکیہ کا ہاتھ تھامے مخالف سمت دوڑنے لگی۔ اسی وقت مجھے دوسرا دھماکا سنائی دی۔ اس دھماکے سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ فائرنگ دوسری جانب نشیب سے کی جا رہی تھی۔ اس بار غالباً میری کار کے دوسرے ٹائر کو نشانہ بنایا گیا تھا۔

میں ذکیہ کو ساتھ لئے دائیں جانب سڑک کے نشیب میں اتر گئی۔ میں نے اسی دوران میں اپنا پرس کھول کر ریوالور نکال لیا تھا جس میں ابھی چار گولیاں اور باقی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک پر کوئی نہیں تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے چند جھاڑیاں نظر آئیں اور میں ان تک پہنچ گئی۔

جھاڑیوں میں چھپ کر میں نے ریوالور کا رخ سڑک کی جانب کر دیا۔ اسی وقت ذکیہ بول اٹھی۔ "باجی...... ! وہ ایئر...... ایئر بیگ...... وہ تو کار ہی میں رہ گیا۔"

"تو کیا ہوا؟" میں فوری طور پر کچھ سمجھ نہ سکی۔

"وہ کار کی پچھلی سیٹ پر رکھا رہ گیا اور...... اور اسی میں میرا پاسپورٹ' ویزا اور دوسرے ضروری کاغذات ہیں۔" ذکیہ نے بتایا۔

ذکیہ سے یہ سن کر میرا ذہن الجھ گیا۔ اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا ورنہ کار سے اترتے ہوئے ایئر بیگ بھی لیا جا سکتا تھا۔

کار سے وہ ایئر بیگ نکال کر لانا واقعی بہت ضروری تھا۔ میں نے اسی لئے قدرے توقف کے بعد ذکیہ سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو میں ایئر بیگ لے کر آتی ہوں۔"

"نہیں!" اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ...... آپ نہ جائیں...... ! وہاں وہ...... وہ لوگ......"

"پروا نہ کرو!" میں نے اسے تسلی دی۔ "میں بھی خالی ہاتھ نہیں ہوں۔ تم دیکھ ہی رہی ہو کہ میرے پاس بھی ریوالور ہے۔" یہ کہہ کر میں نے آہستگی کے ساتھ اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

پھر چند ہی لمحے بعد میں سینے کے بل ریت پر رینگتی ہوئی سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔ میری نظریں اوپر ہی اٹھی ہوئی تھیں مگر اب تک مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میری راہ مسدود کرنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ سمجھنا میرے لیے دشوار نہیں تھا۔ یقیناً ان لوگوں کا تعلق ڈاکٹر رچرڈ ہی سے تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ نے انہیں ٹرانسمیٹر پر میرے متعلق سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ شناخت کے لئے اتنا کافی رہا ہوگا کہ کار میں سفر کرنے والی دو خواتین ہیں۔ اس کے علاوہ کار کا نمبر اور رنگ بھی بتایا جا سکتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے پرانے قاہرہ میں گھیرنے کے بجائے آبادی سے باہر روکنے اور مجھ پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ میرے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی آ گئے تھے اور یہاں گویا میرا انتظار کر رہے تھے۔ پرانے قاہرہ سے بہ خیریت نکل آنے کے بعد میرا اطمینان غلط ہی تھا۔ میں نے ڈاکٹر رچرڈ کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ بہرحال اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اب مجھے کار سے وہ ایئر بیگ نکال کر اور ذکیہ کو ساتھ لے کر

کسی طرح واپس قاہرہ پہنچنا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ مجھے وہاں پہنچ کر کسی بھی قریبی آبادی کے لئے کوئی بس ملی تو فوراً اس میں سوار ہو جاؤں گی۔ میرا پہلا مسئلہ قاہرہ سے نکلنا تھا۔ مجھے علم تھا کہ پرانے قاہرہ سے مختلف قریبی آبادیوں کے لئے تھوڑی تھوڑی دیر بعد بسیں چلتی رہتی ہیں۔ اگر میں قاہرہ سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی تو پھر کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کسی بھی قریبی آبادی میں پہنچ کر میں وہاں سے کسی ایسے شہر کا رخ کرتی جہاں ایئر پورٹ ہوتا اور میں ہوائی جہاز سے سفر کر سکتی۔ نشیب سے اوپر سڑک کی طرف سینے کے بل رینگتے ہوئے میرے ذہن میں یہی خیالات گردش کر رہے تھے۔

بالآخر میں سڑک تک پہنچ ہی گئی۔ میری کار اور وہ سیاہ وین ابھی تک اسی طرح سڑک پر کھڑی تھیں۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ بظاہر وہاں آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں آہستگی سے اٹھی اور پھر قدرے جھکی ہوئی کار کی طرف بڑھنے لگی۔ نہ معلوم وہ لوگ کہاں تھے جنہوں نے میری کار پر فائرنگ کی تھی! ان کی غیر متوقع خاموشی میری الجھن میں اضافہ کر رہی تھی۔ روک لینے کے بعد ان لوگوں کو بہر حال مجھے تلاش کرنا چاہیے تھا۔ میں اسی الجھن اور کشمکش میں کار تک پہنچ گئی اور پھر اس کا پچھلا دروازہ آہستگی سے کھول لیا۔

دروازہ کھول کر ابھی میں نے ایئر بیگ اٹھایا ہی تھا کہ اپنے عقب میں مجھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں تیزی سے مڑی اور عین اسی وقت کسی نے پیچھے سے میرے ہاتھ پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ ایک دراز قد اور لحیم شحیم حبشی تھا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ مجھے شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ نہ جانے وہ کدھر سے نکل کر اچانک میرے پیچھے آ گیا تھا۔ اس نے مجھے مزاحمت کا موقع دیئے بغیر ریوالور میرے ہاتھ سے چھین کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے خلاف توقع مجھے کسی کھلونے کی طرح اٹھا کر اپنی پشت پر ڈال لیا۔ بلاشبہ وہ زبردست جسمانی قوت کا مالک تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنے دفاع میں کچھ کر سکتی میری آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ میری کنپٹی پر پڑنے والی ضرب اتنی ہی شدید تھی۔ میرے ذہن پر تاریکی سی چھانے لگی۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ وہ حبشی مجھے اپنی پشت پر سوار کئے تیزی سے ایک طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔

پھر نہ جانے مجھے کب ہوش آیا۔ ہوش آنے کے بعد کچھ دیر میں سمجھ ہی نہ سکی کہ کہاں ہوں اور کن حالات سے دوچار ہوں۔ اسی دوران میں مجھے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ کوئی عربی زبان میں کسی سے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھ لے اے زنوبیہ کہ میں نے تیری مجرم کو تیرے قدموں میں لا کر ڈال دیا ہے۔ اب تجھے کیا انتظار ہے! قتل کر دے اسے اور ایک مدت سے جو آگ تیرے سینے میں بھڑک رہی ہے اسے ٹھنڈا کر لے! یہی تو ہے وہ کہ جس کے ہاتھوں تیرا سہاگ اجڑا تھا۔ اسی نے تو تیرے بچوں کے باپ کو ہلاک کر دیا تھا۔“

”ہاں اے طریر میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی' یہ میرے ہاتھوں ضرور قتل ہو گی مگر اس سے پہلے تو اپنا انعام لے لے۔“ مردانہ آواز کے بعد میں نے ایک نسوانی آواز سنی۔

'ہائے زنوبیہ! میں سمجھا نہیں کہ تو مجھے کیا انعام دینا چاہتی ہے!“ مردانہ آواز آئی۔ اسی کے ساتھ رفتہ رفتہ میرے حواس بحال ہونے لگے۔

”تو جوان ہے اے طریر اور یہ عورت خوبصورت ہے۔ میں اسے قتل کرنے سے پہلے بطور انعام ایک پہر کے لئے تجھے بخشتی ہوں۔ بول کیا تجھے یہ انعام منظور نہیں؟“

”تیرا شکریہ اے زنوبیہ! مجھے یہ خوبصورت انعام قبول ہے۔“

اب میں پوری طرح اپنے حواس میں آ چکی تھی۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے مجھ پر ایک قوی الجثہ حبشی نے حملہ کیا تھا اور اسی نے میری کنپٹی پر ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔

”تو پھر میں جا رہی ہوں...... جہاں میں نے اتنا صبر کیا ایک پہر اور صبر کر سکتی ہوں۔“ مجھے نسوانی آواز سنائی دی اور پھر میں نے دور ہوتے قدموں کی آواز سنی۔

یہ عورت اور مرد کون ہیں؟ یہ کیا قصہ ہے؟ یہ لوگ مجھ سے کس کا انتقام لینا چاہتے ہیں؟ میرے ذہن میں پے در پے سوال ابھرنے لگے۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ میرا راستہ روکنے کے والے ڈاکٹر رچرڈ کے آدمی تھے مگر یہ تو کوئی اور ہی معلوم ہو رہے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں ایک بستر پر دراز تھی اور وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ دائیں جانب نگاہ اٹھی تو میں نے ایک دراز قد اور جسیم شخص کو کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرتے دیکھا یہ مجھے وہی حبشی معلوم ہوتا تھا جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ پھر وہ دروازہ بند کر کے پلٹا تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ مسکراتے ہوئے وہ اور بھی بھیانک نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک خاص چمک سی تھی۔ ایسی چمک جو کسی شکاری کی آنکھوں میں اس وقت نظر آتی ہے جب اس کے سامنے اس کا شکار بے بس ہوتا ہے۔ وہ اب قدم بہ قدم میری طرف بڑھ رہا تھا۔

معاً میں بستر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی' پھر اسے عربی زبان میں مخاطب کیا۔ ”تمہیں یقیناً میرے بارے میں کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں وہ نہیں ہوں جس کی شاید تمہیں تلاش ہے۔“

”تو تم ہماری زبان بول لیتی ہو!“ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ مجھے گھورتا ہوا بولا۔ ”میں تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ تم وہی ہو جس کی مجھے ایک عرصے سے تلاش تھی۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ تم ایک نہ ایک دن پھر قاہرہ واپس آؤ گی تو شاید میں تمہاری تلاش میں پاکستان روانہ ہو جاتا۔ بولو کیا تمہیں اقرار نہیں کہ تم عذرا خان ہو؟ میں تمہارے چہرے سے میک اپ ختم کر کے اس کا یقین کر چکا ہوں۔“

”ہاں میرا نام یہی ہے...... مگر مجھ سے کیا دشمنی ہے تمہیں؟“

”شیخ سالم کے محل میں تمہارے ہاتھوں میرا بھائی ابراہیم قتل ہو گیا تھا۔ کیا تم بھول گئیں وہ دن......! لیکن مجھے وہ دن یاد ہے۔ میں بھی شیخ کے محافظوں میں سے ایک تھا۔ اس دن...... ہاں اس دن میں نے عہد کیا تھا کہ میں تم سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لوں گا۔ پھر...... پھر میں اسی لئے اس غیر ملکی ڈاکٹر رچرڈ کا تنخواہ دار ملازم بن گیا۔ میں نے اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلے کہ کسی طرح تمہیں اس ڈاکٹر کی قید سے نکال لے جاؤں مگر تم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ اپنے بھائی کی بیوہ سے میں نے کہا تھا کہ تمہیں اسی کے ہاتھوں قتل کرواؤں گا' سو دیکھ لو کہ میں بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے لئے

مجھے بہت صبر کرنا پڑا۔ ڈاکٹر رچرڈ کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ تمہیں بہرحال ایک دا یہاں ضرور آنا ہے۔ میں نے اسی لئے ڈاکٹر کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ وہ مجھ پر بہت بھروسا کرتا تھا پرانے قاہرہ میں اس کے سارے گرگوں کا نگران میں ہی تھا۔"

وہ حبشی مجھے اپنے بارے میں دیر تک بتاتا رہا اور میں اس کی دشمنی کا سبب سمجھ گئی۔

"اب ایک نیک دل عورت نے بطور انعام تمہیں قتل کرنے سے پہلے ایک پہر کے لئے مجھے بخش دیا ہے اور میں نے اس کا خوبصورت انعام قبول کر لیا ہے۔" وہ حبشی کہہ رہا تھا۔

"لیکن تم شاید بھول رہے ہو کہ کسی بھی لمحے ڈاکٹر رچرڈ یہاں پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ......"

وہ میری بات کاٹ کر زور سے ہنس دیا' پھر بولا۔ "اس کے فرشتوں کو بھی یہ معلوم نہیں ہو گا کہ اس وقت تم ستارہ میں ہو!"

"ستارہ!" میں چونک کر بولی۔

"ہاں یہ مصر کی قدیم بستی ستارہ ہے۔ تم نے شاید اس کے بارے میں سنا ہو۔ دنیا کے قدیم ترین اہرام یہیں ہیں۔ یہیں میرے بھائی ابراہیم کا گھر ہے جس میں اس وقت تم موجود ہو! اب میرا مقصد پورا ہو چکا ہے اس لئے کبھی واپس قاہرہ نہیں جاؤں گا۔ یقیناً ڈاکٹر رچرڈ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں تمہیں لے کر فرار ہو گیا ہوں مگر وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اس حبشی سے یہ معلوم ہونے کے بعد میں اب قاہرہ کی حدود میں نہیں ہوں میرے دل کو بڑا حد تک اطمینان ہو گیا تھا۔ ہاں مجھے ذکیہ کی طرف سے فکر ضرور تھی۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ کہیں وہ ڈاکٹر رچرڈ کے آدمیوں کی نظر میں نہ آ گئی ہو! پھر میں نے سوچا کہ اس حبشی سے ذکیہ کے بارے میں کیوں نہ پوچھا جائے۔

"میرے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تو تھی تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں مجھے کچھ نہیں معلوم!" اس نے جواب دیا۔ "میں تو بس تمہیں پاتے ہی فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔"

"اور تمہارے دوسرے ساتھی......؟ راستہ روکنے کے بعد انہوں نے مجھے تلاش کیوں نہیں کیا؟"

"انہوں نے میرے ہی حکم پر ایسا نہیں کیا۔ دراصل میں تمہارے متعلق ڈاکٹر رچرڈ سے اطلاع پاتے ہی تمام منصوبہ بنا چکا تھا۔ میں تنہا تمہیں تلاش کر کے یہاں لے کر آنا چاہتا تھا۔ اگر میرے ساتھی تمہیں تلاش کر لیتے تو ایسا ممکن نہیں ہوتا۔" اس نے جواب دیا' پھر بولا۔ "خیر اب ان باتوں کو ختم کرو اور اپنی زندگی کی آخری خوشی حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ اپنی بات ختم کرتے ہی وہ میری طرف بڑھنے لگا تھا۔

میں چاہتی تو اس حبشی سے نمٹنے کے لئے اپنے ذہن کی غیر معمولی قوتوں کو بروئے کار لا سکتی تھی مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے طاقت ور مردوں سے نمٹنے کے اور بہت سے گر آتے تھے۔

"رک جاؤ!" میں باآواز بلند بولی۔ "ورنہ تمہیں پچھتانا پڑے گا اور پھر جو کچھ ہو گا اس کی ذمہ

داری تم پر ہو گی۔"

وہ رک تو گیا مگر مجھے ہنستے ہوئے اس طرح دیکھنے لگا جیسے کسی بچے کی شرارت سے محظوظ ہوتے ہیں۔

"اس وقت تم نے مجھ پر غفلت میں حملہ کیا تھا اور میں بے بس ہو گئی تھی لیکن اب...... اب تم اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکو گے۔"

میری بات سن کر اس نے وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا' پھر اچانک اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر گویا مجھ پر ٹوٹ پڑا' مگر اس کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ میں نے اپنی جگہ سے اچھل کر اس کی ٹھوڑی پر زوردار کک لگائی تھی۔ اتنی زوردار کہ اس کی ٹھوڑی کی جلد پھٹ گئی تھی اور اس سے خون بہنے لگا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ گرتے گرتے سنبھل کر دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس بار میری کھڑی ہتھیلی کی ضرب نے گویا اس کی پسلیاں ہلا دیں' پھر دوسرے لمحے میرے پاؤں کی بھرپور ٹھوکر اس کی پنڈلی پر پڑی۔ اس بار اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا تھا۔

میں جیسے اڑتی ہوئی اس تک پہنچ گئی اور اس کے شانے پر ہلکی سی ٹھوکر مارتے ہوئے بولی۔ "ابھی اور خاطر مدارات کروں یا حسرت نکل گئی؟"

اس نے فوراً ہی کروٹ لے کر میرا پیر پکڑنا چاہا مگر میں چوکنا تھی اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔

"اس کا مطلب یہی ہے کہ ابھی حسرت نکلی نہیں!" یہ کہتے ہی میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا اور وہ چھوڑا سا کمرا اس کی چیخوں سے گونجنے لگا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کمرے کے دروازے پر تیز دستکیں سنائی دینے لگیں۔ انہی کے ساتھ ایک مضطرب نسوانی آواز بھی آئی۔ "طریرا...... کیا ہوا طریر؟"

یہ اسی عورت کی آواز ہو سکتی تھی جسے اس حبشی نے اپنے بھائی کی بیوہ بتایا تھا۔ وہ اس حبشی کا نام لے کر اسے پکار رہی تھی۔ اس کی آواز میں ہوش میں آنے کے بعد بھی سن چکی تھی۔

"طریر اس قابل نہیں ہے کہ تمہاری بات کا جواب دے سکے۔" میں نے عربی زبان میں باآواز بلند کہا۔ جو کچھ میں نے اس عورت سے کہا تھا اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ وہ حبشی اب نیم بے ہوشی کی سی حالت میں نڈھال اور لہولہان زمین پر پڑا تھا۔ وہ غالباً اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا۔

میں نے اسے زدوکوب کرنا بند کر دیا تو اس کی چیخیں رک گئیں اور وہ کراہنے لگا۔

"دروازہ کھولو......! کھولو دروازہ!" دروازے کی دوسری جانب سے عورت کی آواز آنے لگی۔ اس کے ساتھ وہ زور زور سے دستک دینے لگی۔

میرا پرس وہیں قریب ہی اس بستر پر رکھا تھا جس پر میں کچھ دیر پہلے دراز تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر پرس اٹھا لیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ پرس میں میرا پاسپورٹ وغیرہ تو موجود تھا مگر رقم غائب تھی اس کے علاوہ میرا ریوالور بھی اس میں نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر زخمی حبشی کی طرف دیکھا۔ رقم یقیناً اسی نے غائب کی تھی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگی۔ پہلے مجھے اس کے کوٹ کی جیب سے اپنا ریوالور ملا' پھر رقم بھی ایک جیب سے برآمد ہو گئی۔ رقم اور ریوالور اپنے پرس میں رکھ کر میں

دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ عورت اب بھی دروازہ پیٹ رہی تھی بلکہ اب اس میں شدت آ گئی تھی۔

"ٹھہرو میں دروازہ کھول رہی ہوں۔" میں نے زور سے کہا تا کہ وہ میری آواز سن لے۔

میرے کہنے پر اس نے دروازہ پیٹنا بند کر دیا اور پھر میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ عورت لپک کر اندر آ گئی۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس کے کولھے پر لات ماری اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "وہ جوان ہے اور تم بھی اتنی بوڑھی نہیں ہو!" یہ اس بات کا جواب تھا جو اس نے میرے متعلق اس حبشی سے کہی تھی۔

وہ حبشی عورت چیختی ہوئی زخمی حبشی کے اوپر جا پڑی۔ میں وہاں مزید رکے بغیر تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گئی۔ باہر آتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا۔

اس چھوٹے سے مکان کے ایک حصے میں دو تین بچے کھیل میں مشغول تھے۔ غالباً وہ بچے اسی عورت کے تھے۔ میں ان سے نظر بچا کر مکان کے بیرونی دروازے سے باہر آ گئی۔ وہ ایک پتلی سی نیم پختہ گلی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی گلی کے ایک سرے کی طرف بڑھنے لگی۔ پھیکی پڑتی دھوپ سے میں نے اندازہ لگایا کہ شام ہو چکی ہے۔

اس گلی سے نکل کر میں ایک پختہ سڑک پر آ گئی تو مجھے اکا دکا افراد ادھر سے ادھر آتے جاتے دکھائی دیئے۔ میں نے انہی میں سے ایک کو روک کر بس اسٹینڈ کے متعلق پوچھا۔ اس ادھیڑ عمر مقامی نے میری رہنمائی کی اور یہ بھی بتایا کہ یہاں آخری بس اب سے پندرہ بیس منٹ بعد اسماعیلیہ کے لئے روانہ ہونے والی ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب سے نصف گھنٹے قبل قاہرہ کے لئے آخری بس روانہ ہو چکی ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس شخص کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھ گئی۔

یوں بھی اب میرا ارادہ قاہرہ جانے کا نہیں تھا۔ قاہرہ واپسی کا مطلب خود کو ایک بار پھر ڈاکٹر رچرڈ کے جال میں پھنسانا ہوتا۔ اس حبشی کی مداخلت نے بہرحال میرے حق میں اتنا ضرور کیا تھا کہ میں قاہرہ سے نکل آئی تھی مگر ذکیہ کا معاملہ جوں کا توں رہا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ مین نے سوچا کہ اسماعیلیہ پہنچ کر اگر ممکن ہوا تو اس سے فون پر رابطہ قائم کروں گی۔

ستارہ کا بس اسٹاپ قدیم اہرام کے قریب ہی تھا۔ بس نصف کے قریب بھری ہوئی تھی۔ مسافروں میں کچھ غیر ملکی بھی تھے۔ یہ غیر ملکی یقیناً وہ تھے جو یہاں قدیم ترین آثار قدیمہ دیکھنے آئے تھے۔ ان میں دو جوان عورتیں بھی تھیں جن کے کاندھوں سے کیمرے لٹکے ہوئے تھے۔ میں بس میں سوار ہو کر انہی دونوں عورتوں کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ان دونوں نے مجھ پر بس ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تھی اور پھر اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے اپنے غیر ملکی ساتھیوں سے بات کرنے لگی تھیں۔

بس کی روانگی تک صرف دو ہی مسافر اور سوار ہوئے۔ وہ مقامی افراد تھے۔ مقررہ وقت سے مزید پانچ منٹ کی تاخیر کے بعد بس وہاں سے روانہ ہوئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ستارہ سے بس کو چلے ہوئے بمشکل آدھا گھنٹا ہوا تھا کہ پیچھے سے ایک جیپ تیزی کے ساتھ بس کو اوور ٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس جیپ میں مسلح افراد سوار تھے جنہوں نے بس ڈرائیور سے بس روکنے کو کہا۔ ڈرائیور یقیناً ان مسلح افراد کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ لوگ لٹیرے ہو سکتے ہیں۔ اس نے بس روکنے

کے بجائے اس کی رفتار اور تیز کر دی۔ بس کے مسافروں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ صورت حال کا اندازہ انہوں نے بھی لگا لیا تھا مگر میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ میں نے بھی ان مسلح افراد کی ایک جھلک دیکھ لی تھی اور مجھے مقامی افراد کے علاوہ ان کے درمیان ایک غیر ملکی بھی نظر آ گیا تھا۔

اچانک ایک زبردست دھماکا ہوا اور اسی کے ساتھ بس لہرا گئی۔ بس کا ڈرائیور اگر حاضر دماغ نہ ہوتا اور فوراً ہی بس کے بریک نہ لگا دیتا تو شدئد بس الٹ گئی ہوتی۔ بس کو روکنے کے لئے جیپ والوں نے اس کے ایک ٹائر کو نشانہ بنا دیا تھا۔

بس کے رکتے ہی اس میں مسلح افراد چڑھ آئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

"ہم کسی کو نہ لوٹیں گے نہ کوئی نقصان پہنچائیں گے۔" ان مسلح افراد میں سے ایک باآواز بلند بولا۔ "ہمیں کسی کی تلاش ہے۔"

ابھی وہ شخص خاموش ہوا تھا کہ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے ڈاکٹر رچرڈ کو بس میں سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ غیر ملکی جس کی میں نے جھلک دیکھی تھی ڈاکٹر رچرڈ ہی تھا۔ گویا وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

مجھے یہ تو یقین ہی تھا کہ وہ لوگ کسی بھی صورت میں مجھ پر گولی نہیں چلائیں گے اور مجھ کو زندہ پکڑنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے اس لئے چند ہی لمحات میں ایک فیصلہ کر لیا اور پھر اپنے قریب ہی کھڑے ہوئے ایک مسلح شخص کی رائفل پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ شخص یقیناً اس خلاف توقع صورت حال کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے رائفل پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ میں نے اس سے رائفل چھین لی۔

"یہی ہے!" معاً ڈاکٹر رچرڈ زور سے چلایا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں رائفل کو دستے کی طرف سے پکڑ کر ان پر سیدھا کر سکتی قریب ہی موجود ایک اور مسلح شخص نے اپنی رائفل کے کندے سے میرے سر پر بھرپور ضرب لگائی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل گیا۔ مجھے چکر سا آ گیا۔ سیٹ پر گرتے گرتے میرے سر پر دوسری ضرب پڑی اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

مجھے جب ہوش آیا تو یوں محسوس ہوا جیسے میں فضا میں ہلکورے سے لے رہی ہوں۔ اسی وقت سر کے پچھلے حصے میں درد کی ٹیس اٹھی اور میرے منہ سے کراہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا ورنہ ہچکولے لیتی ہوئی جیپ کے مسافروں کو خبر ہو جاتی کہ مجھے ہوش آ چکا ہے۔ اسی وقت میری سماعت سے کسی کی آواز ٹکرائی۔ کوئی عربی زبان میں کہہ رہا تھا۔ "ڈاکٹر! یہ عجیب و غریب آلہ مجھے تو دکھائیں جو عذرا خان کی نشاندہی کرتا ہے۔"

"لو دیکھو۔" ڈاکٹر رچرڈ کی آواز جواب میں سنائی دی۔ "اس کے ڈائل پر لگی ہوئی سوئی اب بھی عذرا خان کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ میں نے اسے بڑی محنت سے بنایا ہے۔ میرا کافی وقت اس پر صرف ہوا ہے۔ ہے نا عجیب چیز!"

"ہاں واقعی!" پہلی آواز پھر آئی۔

"ڈاکٹر! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ طریر نے غداری کیوں کی؟" ایک اور آواز ابھری۔

''اس کا کوئی نہ کوئی سبب یقیناً رہا ہوگا۔ مگر ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ فوری طور پر اس کا سراغ لگاتے۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے جواب دیا۔

''لیکن آپ اسے زندہ چھوڑ دیتے تو شاید وہ کچھ بتا سکتا۔''

''نہیں......! اسے غداری کی سزا دینا ضروری تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تم نے اسے عذرا خان کے ساتھ فرار ہوتے دیکھ لیا اور ہم اس کی تلاش میں یہاں تک پہنچ گئے ورنہ عذرا خان ہاتھ سے نکل گئی تھی۔'' یہ ڈاکٹر رچرڈ کی آواز تھی۔

''اس میں اس عجیب وغریب آلے کا بھی بہت دخل ہے۔'' کوئی بولا۔ ''ورنہ ہمیں خبر ہی نہ ہوتی کہ عذرا خان یہاں سے کس طرف فرار ہوئی ہے!''

''مجھے اسی لئے تم لوگوں کے ساتھ آنا پڑا۔ یوں بھی تم میں سے کوئی عذرا خان کو نہیں پہچانتا تھا۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے کہا۔

ان کی گفتگو سن کر مجھے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں خاصی تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں۔ اس دوران میں میرا ذہن کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے آنکھ کے گوشے سے پہلے صورت حال کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر رچرڈ کے علاوہ وہ چار مسلح افراد تھے۔ انہی چاروں افراد میں ایک ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ جیپ کے اگلے حصے میں ڈرائیور کے ساتھ دو افراد اور بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر رچرڈ ایک مسلح مقامی اور میں جیپ کے پچھلے حصے میں تھے۔ میں ڈاکٹر رچرڈ اور اس مقامی شخص کے سہارے درمیان میں بیٹھی تھی۔ ان دونوں نے مجھے سہارا دے رکھا تھا اور میرا سر جیپ کی سیٹ سے ٹکا ہوا تھا۔

پھر میں نے وقت ضائع کئے بغیر جیپ کے ڈرائیور کے ذہن سے رابطہ قائم کر لیا۔

اس کے بعد چند ہی لمحے گزرے تھے کہ جیپ کے ڈرائیور نے سڑک کے کنارے جیپ روک دی۔ میں اسی دوران میں اپنے قریب دائیں جانب بیٹھے ہوئے مقامی کے ذہن سے رابطہ قائم کر چکی تھی۔

''کیا ہوا......؟ یہ تم نے جیپ کیوں روک دی؟'' ڈاکٹر رچرڈ نے حیرت زدہ لہجے میں ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

ابھی اس کی بات پوری ہوئی تھی کہ میرے قریب بیٹھا ہوا شخص اچانک جیپ سے کود کو چیختا ہوا ایک طرف بھاگ اٹھا۔ ''ٹائم بم...... ٹائم بم!'' وہ چیخ رہا تھا۔

''جیپ کے انجن میں کسی نے ٹائم بم رکھ دیا ہے...... اور اور وہ کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔'' یہ کہتے ہی جیپ کا ڈرائیور بھی جیپ سے کود گیا اور پھر وہ بھی بھاگنے لگا۔

''بے وقوف ہو..... احمق ہو تم...... یہ کیسے ہو سکتا ہے! ٹھہرو!...... ٹھہرو!''

ڈاکٹر رچرڈ چیختا رہ گیا مگر وہ سب ایک ایک کر کے جیپ سے کود کر بھاگ نکلے۔ ان کے ذہن میں یہ جھوٹا خوف میں نے ہی پیدا کیا تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ وہ سب بھاگ لئے تو میں نے گوشہ چشم سے ڈاکٹر رچرڈ کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک وہ عجیب وغریب آلہ لگا ہوا تھا۔ جو اس نے اپنے ایک آدمی کو دکھایا تھا۔ میں نے اس کے پیٹ پر اپنی بائیں کہنی سے بھرپور ضرب لگائی۔ وہ چیخ کر جھکا تو میں نے اس کے ہاتھ سے وہ گول سا آلہ چھین لیا پھر اسے جیپ سے نیچے دھکا دے دیا۔

ڈاکٹر رچرڈ منہ کے بل سڑک پر گرا اور فوری طور پر اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں اس دوران اچھل کر جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچ گئی۔ دوسرے ہی لمحے جیپ کا انجن جاگ اٹھا۔ اسی لمحے مجھے اپنے پرس کا خیال آیا جسے میں نے ڈاکٹر رچرڈ کی گود میں پڑا دیکھا تھا۔ میں نے مڑ کر پچھلی نشست پر دیکھا تو پرس مجھے سیٹوں کے درمیان نظر آ گیا۔ اسے اٹھا کر میں نے اپنی گود میں رکھ لیا۔ پھر مجھے اس آلے کا خیال آیا۔ اسے بھی میں نے پرس ہی میں رکھ لیا۔ اب اگر میں قاہرہ میں بھی رہتی تو ڈاکٹر رچرڈ فوری طور پر میرا سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔

وہاں سے فرار ہوتے وقت یہ میرے امکان میں تھا کہ اس فتنے یعنی ڈاکٹر رچرڈ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتی مگر قانون کو میں نے کبھی ہاتھ میں نہیں لیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اپنی جان بچاتے ہوئے کوئی میرے ہاتھوں مارا گیا ہو لیکن اس وقت ایسا نہیں تھا۔ میں ڈاکٹر رچرڈ کو قتل کئے بغیر بھی اپنی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ میں نے اسی لئے سڑک پر زخمی حالت میں پڑے ہوئے ڈاکٹر رچرڈ پر ایک نگاہ ڈالی اور جیپ آگے بڑھا دی۔ اس کا سر سڑک سے ٹکرا گیا تھا جس کی وجہ سے غالباً وہ بے ہوش ہو چکا تھا ورنہ مجھے اس آسانی سے فرار نہ ہونے دیتا۔

جہاں تک میرا اندازہ تھا ڈاکٹر رچرڈ مجھے لے کر قاہرہ ہی جا رہا تھا۔ پہلے میرا ارادہ یہ تھا کہ میں اسماعیلیہ پہنچ کر فون پر اپنی بہن ذکیہ سے رابطہ قائم کروں گی مگر اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اب مجھے خوف نہیں رہا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ مجھے تلاش کر لے گا۔ وہ آلہ میرے قبضے میں آ چکا تھا جس کے ذریعے ڈاکٹر رچرڈ مجھے ڈھونڈ لیتا تھا۔ انہی حالات کے پیش نظر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اب میں قاہرہ پہنچنا چاہتی تھی تاکہ ذکیہ کو اپنے ساتھ ہی لے کر یہاں سے جاؤں۔ ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ذکیہ بہ خیریت اپنی کوٹھی تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو سکی تھی یا ڈاکٹر رچرڈ کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی!

انہی باتوں پر غور کرتے ہوئے میں قاہرہ کی طرف جیپ دوڑاتی رہی۔ جیپ اس وقت شاید ستارہ کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تھا میں اسی سبب پوری طرح تاریکی پھیلتے پھیلتے پرانے قاہرہ کے نواح تک پہنچ گئی۔ نیم تاریکی میں مجھے دور ہی سے سڑک کے کنارے ایک کار کا ہیولا نظر آ گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ وہی جگہ تھی جہاں مجھ پر حملہ کیا تھا اور میری کار پر فائرنگ کی گئی تھی۔ اس کار کے قریب پہنچ کر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ ذکیہ ہی کی کار تھی۔ میں نے جیپ اس کے قریب روک لی۔ کار کا پچھلا دروازہ اب تک کھلا ہوا تھا۔

کار کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں جیپ کو وہیں چھوڑ کر بقیہ سفر کار میں کرتی میں نے اسی لئے ایک اور ہی فیصلہ کیا۔ اپنے اور ذکیہ کے اٹیچی کیس میں نے کار کی ڈکی سے نکال کر جیپ میں رکھ لئے۔ ایئر بیگ بھی اب تک کار کی پچھلی سیٹ پر رکھا تھا۔ اسے بھی میں نے جیپ میں رکھ لیا۔ اسی ایئر بیگ کے سبب اور اسی کے حصول کی خاطر میں اس حبشی کے ہتھے چڑھ گئی تھی جو یقیناً ڈاکٹر رچرڈ کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ اس ایئر بیگ میں ذکیہ کا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تھے جن کے بغیر وہ میرے ساتھ پاکستان نہیں جا سکتی تھی۔ یہ خیریت ہی گزری تھی کہ اس طرف سے گزرنے والے کسی راہ گیر نے کار کی طرف توجہ نہیں دی تھی ورنہ مجھے وہ تمام سامان جوں کا توں نہ ملتا۔ تمام سامان

جیپ میں رکھنے کے بعد میں وہاں سے روانہ ہوگئی۔ سامان کے حصول کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک اور خدشہ سر ابھارنے لگا تھا۔ ذکیہ اگر ڈاکٹر رچرڈ کے آدمیوں سے بچ کر فرار ہوگئی تھی تو کم از کم وہ اپنا ایئر بیگ وہاں سے ضرور لے جاسکتی تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ اسے اتنا موقع نہ ملا ہو۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو!'' دھڑکتے دل کے ساتھ میں زیر لب بڑبڑائی اور پھر جیپ کی رفتار بڑھادی۔

جب میری جیپ پرانے قاہرہ میں داخل ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں کہیں رک کر ذکیہ سے فون پر رابطہ قائم کرلوں!

پرانے قاہرہ کی یہ آبادی قدیم ترین تھی اور مصر قدیمہ کہلاتی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جسے کبھی فسطاط کہا جاتا تھا۔ یہیں مسلمان فاتح مصر نے اپنے خیمے میں کبوتر کا ایک گھونسلہ دیکھ کر شہر بسانے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اس علاقے کے ایک بازار سے گزرتے ہوئے ایک دکان کے قریب جیپ روک دی۔ دکان کے کاؤنٹر پر مجھے ٹیلی فون رکھا نظر آ گیا تھا۔

جیپ سے اتر کر میں دکان کے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے نوجوان سے مخاطب ہوئی۔ ''مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔ کیا اجازت ہے؟'' میں نے یہ بھی الفاظ عربی زبان میں کہے تھے۔

عرب زبان کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں اور کسی غیر ملکی کو اپنی زبان بولتے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس شخص نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرا کر فون میری طرف بڑھا دیا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ ذکیہ کی کوٹھی کا فون نمبر ڈائل کرنے لگی۔

دوسری جانب نمبر ملنے کے بعد کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھالیا۔ ''ہیلو!'' آواز مردانہ تھی۔ غالباً دوسری طرف سے ذکیہ کا کوئی ملازم بول رہا تھا۔

''ذکیہ سے بات کرنا ہے مجھے!'' میں نے جلدی سے کہا۔

''وہ نہیں ہیں گھر پر۔''

''کب سے نہیں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آج صبح ہی سے نہیں ہیں۔ وہ قاہرہ سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ آپ کون بول رہی ہیں؟''

میں نے کوئی جواب دیئے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ میرا خدشہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ ذکیہ اپنی کوٹھی نہیں پہنچی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ذکیہ مجھ سے بچھڑنے کے بعد میرے دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ گویا میں نے جس وجہ سے قاہرہ کا سفر اختیار کیا تھا وہ وجہ بدستور برقرار تھی۔

اب مجھے ڈاکٹر رچرڈ کے قاہرہ پہنچنے سے پہلے پہلے ذکیہ کا سراغ لگانا تھا۔ اگر وہ فتنہ قاہرہ پہنچ جاتا تو پھر میرے لئے دشواریاں پیدا ہو جاتیں مگر ذکیہ کو میں اتنے بڑے شہر میں کہاں تلاش کرسکتی ہوں؟ جیپ میں بیٹھتے ہوئے یہ سوال بار بار میرے ذہن میں گردش کررہا تھا۔

☆......☆......☆

اس میں شک نہیں کہ مجھے قاہرہ میں ڈاکٹر رچرڈ کے تین ٹھکانوں کا علم تھا، مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ ذکیہ کو وہیں رکھا گیا ہوتا۔ انہی میں سے ایک ٹھکانا پرانے قاہرہ میں بھی تھا اور اس وقت میں پرانے قاہرہ ہی میں تھی۔ میں نے سوچا کیوں نہ ذکیہ کی تلاش کا آغاز یہیں سے کیا جائے۔ یوں بھی وہ جگہ یہاں سے قریب تھی جہاں ذکیہ مجھ سے بچھڑی تھی۔ اس امکان کو بہرحال نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ قریب ہی ایک ٹھکانا ہونے کے سبب ان لوگوں نے ذکیہ کو یہیں رکھا ہو۔

قاہرہ میں ڈاکٹر رچرڈ کے ٹھکانوں کے متعلق مجھے باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن کا ذہن پڑھ کر سب کچھ معلوم ہوگیا تھا۔ میں اس وقت انہی معلومات سے فائدہ اٹھاسکتی تھی۔ پرانے قاہرہ کا وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا جہاں ڈاکٹر رچرڈ کا ٹھکانا تھا۔ وہ علاقہ عابدین پیلس کہلاتا تھا۔ یہاں ایک عالی شان عمارت عابدین پیلس کہلاتی تھی۔ عابدین پیلس ہی میں مصر کے مقتول صدر سادات بیٹھتے تھے۔ اس پیلس کی شہرت، انفرادیت اور خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سال کے تین سو پینسٹھ دن کی مناسبت سے تین سو پینسٹھ کمرے تھے۔ عابدین پیلس کا علاقہ قدیم ہونے کے باوجود شان و شکوہ کا حامل تھا۔ پیلس ہی کے قریب المحافظہ (گورنر ہاؤس) تھا۔ اسی علاقے میں قاہرہ کی عظیم ترین لائبریری دارالکتب تھی جس میں لاکھوں کتابیں تھیں۔

عابدین پیلس پہنچنے کے لیے میں نے الازہر کا رخ کیا۔ اس علاقے میں پہنچ کر میں سیدنا حسین کی مسجد کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ایک روایت کے مطابق اس مسجد میں حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک دفن ہے۔ اسی مسجد کے قریب جامعہ الازہر کی وسیع و عریض عمارت نظر آ رہی تھی۔ یہ بھی ایک بڑی مسجد ہے۔ کچھ ہی دیر بعد میں الازہر سے گزر کر عابدین پیلس کے علاقے میں داخل ہوگئی۔ اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے سات بجے تھے۔ بازاروں میں رونق عروج پر تھی۔ ایک بازار سے گزر کر میں نے اقامتی آبادی کا رخ کیا۔ یہ آبادی دارالکتب کی دائیں جانب کچھ فاصلے پر تھی۔

مطلوبہ عمارت تک پہنچنے سے قبل ہی میں نے ایک گلی میں جیپ کھڑی کردی اور پھر پیدل ہی اس طرف بڑھنے لگی جہاں مجھے پہنچنا تھا۔ میں نے احتیاطاً یہ قدم اٹھایا تھا کہ جیپ اس عمارت تک لے جاؤں۔ وہ جیپ بہرحال ڈاکٹر رچرڈ کی تھی اور اسے پہچانا جاسکتا تھا۔

میں جلد ہی اس دومنزلہ عمارت تک پہنچ گئی جس کا بڑا حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ آہنی پھاٹک کی دوسری جانب کمپاؤنڈ میں بھی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ بغیر وقت ضائع کیے میں نے اطراف میں

نظریں دوڑائیں۔ گلی میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر میں پھاٹک پر چڑھ گئی اور پھر کوئی آواز پیدا کیے بنا کمپاؤنڈ میں اتر گئی۔ کمپاؤنڈ میں قدم رکھتے ہی میں نے احتیاطاً اپنا پرس کھول کر چھوٹا سا ریوالور نکال لیا تھا۔ کچھ دیر تک میں دم سادھے اسی جگہ کھڑی رہی، پھر عمارت کی طرف بڑھی۔

عمارت کا صدر دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اس کا اندازہ لگا لیا تھا۔ بظاہر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے عمارت میں کوئی نہیں ہے، لیکن ایسا ہی ہوتا تو دروازے پر تالا ضرور نظر آتا، اس کے علاوہ دوسری منزل پر کسی کمرے میں روشنی بھی نظر نہ آتی۔

اس عمارت میں داخلے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس سوال نے مجھے عمارت کا چاروں طرف سے جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ دبے قدموں باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ میں ایک جانب بڑھتی گئی۔ جلد ہی مجھے دائیں جانب اوپری منزل کی ایک کھڑکی کھلی نظر آ گئی۔ اس کھڑکی سے کچھ فاصلے پر ایک اور کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی مگر وہ کھڑکی بند تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب ہی گندے پانی کی نکاسی کے لیے ایک پائپ دکھائی دے رہا تھا۔ میرے لیے اس پائپ کے ذریعے اوپر چڑھنا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا، ہاں اس کے لیے مجھے اپنے سینڈل اتارنے پڑتے۔ اوپری منزل تک پہنچنے کا یہی ایک واحد راستہ تھا۔ میں نے ہاتھ میں تھاما ہوا ریوالور پرس میں رکھا اور پھر دونوں سینڈل اتار کر انہیں بھی بہ مجبوری پرس ہی میں ٹھونس لیا۔ پھر میں نے پرس کو اپنے کاندھے پر لٹکا لیا۔ چند لمحے سن گن لے کر میں اس پائپ کے ذریعے اوپر چڑھنے لگی۔ کسی عام آدمی کے لیے یقیناً یہ ایک امر محال ثابت ہو سکتا تھا مگر میں بارہا ایسے مراحل سے گزر چکی تھی۔ مجھے اس پائپ کے ذریعے اوپر پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پائپ سے وہ کھلی ہوئی کھڑکی تقریباً دو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں بآسانی اس تک پہنچ گئی اور پھر اس کے ذریعے اندر کود گئی۔ اندر کودتے ہوئے میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ زیادہ آواز نہ ہو اور میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہی تھی۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں کسی کمرے میں ہوں۔ اسی وقت میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند ہوا تو کیا ہو گا؟ کمرے میں تاریکی تھی، مگر میں سوچ تلاش کر کے وہاں روشنی سے بھی گریز کرنا چاہتی تھی۔ میں اسی لیے کچھ دیر خاموشی کے ساتھ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔ پھر جب میری بصارت اندھیرے سے کسی قدر مانوس ہو گئی تو میں نے دروازے کا رخ کیا۔ کمرے کا دروازہ یقیناً باہر سے بند تھا۔ میرا خدشہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ چند لمحے تو میں چکرا کر رہ گئی۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند ہونے کی صورت میں گویا میری اب تک کی ساری جدوجہد پر پانی پھر گیا تھا۔ اس کے باوجود بھی میں ہار ماننے والی نہیں تھی۔ پھر میرے ذہن نے اس کمرے سے باہر نکلنے کی راہ ڈھونڈ ہی لی۔ کمرے میں عمارت کے اندر کھلنے والی دو کھڑکیاں بھی تھیں جو بند تھیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ ان کھڑکیوں میں آہنی جالیاں یا سلاخیں نہیں تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک کھڑکی کھول لی تھی۔ کھڑکی کے باہر پتلی سی راہداری نظر آ رہی تھی۔ اس راہ داری میں کچھ فاصلے پر کم پاور کا ایک بلب روشن تھا، جس کی روشنی اس کھڑکی تک بہت کم آ رہی تھی۔

ابھی تک میں ننگے پاؤں ہی تھی۔ کھڑکی پر چڑھ کر آہستگی سے میں راہداری میں اتر گئی۔ میرے اندازے کے مطابق بائیں جانب وہ کمرا ہونا چاہئے تھا جس کی کھڑکی میں مجھے روشنی نظر آئی تھی۔

میں پنجوں کے بل چلتی ہوئی آگے بڑھی مگر اس سے پہلے اپنے پرس سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ کسی بھی لمحے مجھے ریوالور کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

چند قدم آگے بڑھ کر میری سماعت سے کچھ ایسی آوازیں ٹکرائیں جیسے کچھ افراد کہیں قریب ہی مصروف گفتگو ہوں، پھر میری نگاہ بائیں جانب ایک نیم وا دروازے پر جم گئی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اندر روشنی تھی۔ یہی وہ کمرہ ہو سکتا تھا جس کی کھڑکی سے مجھے روشنی دکھائی دی تھی۔ روشنی یقیناً اسی کمرے سے آ رہی تھی۔ وہاں کچھ افراد ضرور تھے۔ معاً میں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی سرگوشیاں سی کر رہا ہو۔ گفتگو کے دوران میں یہ سرگوشیاں میرے لیے عجیب ہی تھیں۔ میں اب واضح طور پر اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ سرگوشیاں نسوانی تھیں۔ یہ محسوس کرتے ہی میرے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس دروازے کے قریب پہنچ گئی۔

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں سوزی ڈارلنگ!“ کمرے کے اندر سے ایک آشنا آواز سن کر میں چونک اٹھی، مگر فوری طور پر مجھے یاد نہ آ سکا کہ یہ آواز میں نے کب اور کہاں سنی تھی! کوئی کہہ رہا تھا:

”ڈاکٹر رچرڈ آج رات یہاں نہیں آئے گا۔ آج کی رات ہماری ہے۔“

”مگر...... مگر شیفرڈ کیا...... کیا یہ اس سے...... ڈاکٹر رچرڈ سے بے وفائی نہیں ہو گی؟“ جواباً نسوانی آواز سنائی دی۔

شیفرڈ! میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ تو یہ جرمن سائنس دان شیفرڈ ہے! میں نے سوچا۔ مجھے اسی لیے اس کی آواز آشنا معلوم ہوئی تھی۔ کمرے میں اس کے ساتھ جو عورت تھی اس کا نام سوزی تھا اور یہ نام بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن نے اپنی [illegible] حسین بیوی کا یہی نام بتایا تھا جو قاہرہ میں ڈاکٹر رچرڈ کے پاس تھی۔

”ڈاکٹر بھی تمہارے ساتھ کب وفادار ہے!“ سوزی کے سوال کے جواب میں شیفر کی آواز پھر ابھری، ”تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ عذرا خان کی بہن ذکیہ کو یہاں لانے کے بجائے مقطم کیوں لے جایا گیا ہے! آج رات ڈاکٹر رچرڈ بھی وہیں رہے گا۔ عذرا خان کو لے کر بھی وہ وہیں پہنچے گا۔ یقین کرو سوزی آج رات وہ یہاں نہیں آئے گا۔“

اسی وقت میں نے دروازے کی جھری سے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی۔ کمرے کا منظر انتہائی حیا سوز تھا۔

شیفرڈ کی گفتگو سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ذکیہ وہاں نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ مجھے ڈاکٹر رچرڈ کے ناپاک عزائم کا علم بھی ہو گیا تھا۔ جہاں تک میرے علم میں تھا۔ مقطم ایک پہاڑی سلسلے کا نام تھا۔ پرانے قاہرہ ہی میں صلاح الدین ایوبی کا قلعہ تھا۔ یہ آبادی اسی قلعے کی وجہ سے ”قلعہ“ کہلاتی تھی۔ قلعے کے عقب ہی میں یہ پہاڑی سلسلہ تھا۔ اس پہاڑی سلسلے میں ڈاکٹر رچرڈ کا ٹھکانا کہاں تھا؟ یہ سوال میرے لیے انتہائی اہم تھا۔ شیفرڈ کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو میں اس کا ذہن پڑھ کر اپنے سوال کا جواب پا سکتی تھی مگر شیفرڈ ان لوگوں میں سے تھا جن کا ذہن پڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا۔ سوزی کو اگر جگہ کے بارے میں کچھ علم ہو گا یہ ناممکن سی بات تھی۔ اس کے باوجود میں نے ایک موہوم سی

امید کے سہارے اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرلیا۔ اس وقت سوزی کے ذہن میں ڈاکٹر رچرڈ کا خوف ہونے کے باوجود شدید رومانی جذبات تھے۔

مجھے کچھ ہی دیر میں علم ہو گیا کہ سوزی، ڈاکٹر رچرڈ کے اس ٹھکانے سے بے خبر ہے، مگر اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنا قطعی بے سود ثابت نہ ہوا۔ مجھے کام کی ایک بات بہر حال معلوم ہو گئی تھی۔ یہاں سے تقریباً نصف گھنٹے قبل دوسرا جرمن سائنس داں شیپرڈ، جیزا گیا تھا، جیزا میں بھی ڈاکٹر رچرڈ کا ایک ٹھکانا تھا۔ اس کا یہ ٹھکانا جیزا کے علاقے المنیل میں تھا۔

شیفرڈ کو یقیناً یہ معلوم ہوگا کہ مقطم کے پہاڑی سلسلے میں ڈاکٹر رچرڈ کا ٹھکانا کہاں ہے! میں نے سوچا۔ ذکیہ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ بہر حال میری نظر میں آ گیا تھا۔

پھر میں نے وہاں مزید ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ میں جس طرح اس عمارت میں داخل ہوئی تھی اسی طرح باہر آ گئی۔ جرمن سائنس دان شیفرڈ کو یقیناً یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ کوئی چوری چھپے اس عمارت میں داخل ہو کر واپس جا چکا ہے۔ میرا وہاں آنا قطعی طور پر بے مصرف نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مجھے کم از کم یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ذکیہ، ڈاکٹر رچرڈ کی قید میں ہے، اس کے علاوہ یہ کہ ڈاکٹر رچرڈ نے اسے کہاں رکھا ہے!

پرانے قاہرہ سے جیزا کا فاصلہ خاصا تھا، پھر یہ کہ وہاں سے مجھے دوبارہ یہیں آنا تھا اسی لیے میں نے جیپ کو تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔ پرانے قاہرہ سے نکل کر جلد ہی میں شاہراہ اہرام پر آ گئی۔ یہ طویل اور سیدھی سڑک جدید قاہرہ تک جاتی تھی۔ اسی سڑک پر قاہرہ کے کئی مشہور نائٹ کلب تھے۔ جدید قاہرہ سے گزر کر ہی مجھے جیزا میں المنیل پہنچنا تھا۔

شاہراہ اہرام پر اس وقت خاصا ٹریفک تھا مگر ٹریفک کی رفتار سست نہیں تھی۔ میں اسی لیے تیز رفتاری سے جیپ ڈرائیو کرتی رہی۔

اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے جب میں المنیل پہنچنے کے لیے دریائے نیل پر بنے ہوئے ایک پل سے گزر رہی تھی۔ المنیل تقریباً ایک خوبصورت جزیرہ ہے۔ دریائے نیل نے اسے بقیہ خشکی کے راستوں سے کاٹ دیا ہے۔ یہ جزیرہ پلوں کے ذریعے خشکی سے منسلک ہے۔

اپنی مطلوبہ خوبصورت عمارت سے ابھی میں کچھ ہی دور تھی کہ اس کا پھاٹک کھلتا دکھائی دیا۔ چند ہی لمحے بعد ایک سفید کار پھاٹک سے نکل رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر میرا پاؤں بریک پر پہنچ گیا۔ سفید کار اسی طرف آ رہی تھی جدھر سے میری جیپ، عمارت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ کار قریب آئی تو اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر شیپرڈ کو دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ عین اسی لمحے شیپرڈ کی نظر مجھ پر پڑی اور اسے بھی میں نے چونکتے محسوس کیا۔ میرے چہرے پر میک اپ نہیں تھا اس لیے یقیناً شیپرڈ نے مجھے پہچان لیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ صورتحال بگڑ جاتی میں نے فوری طور پر شیپرڈ کے ذہن کو اپنے طاقتور ذہن کی گرفت میں لے لیا۔

یوں ہی رکے بغیر چلتے رہو! میرے ذہن نے اسے حکم دیا۔

شیپرڈ کی کار آگے بڑھ گئی اور پھر میں نے جیپ کو اس کے پیچھے ڈال دیا۔

تم اس وقت کہاں جا رہے ہو جمیرا؟ میں نے اس کے ذہن سے سوال کیا
اوبرج نائٹ کلب۔ اس کے ذہن سے جواب دیا۔
جمیرا نے جس نائٹ کلب کا نام لیا تھا وہ شاہراہ اہرام پر تھا۔ قاہرہ کا یہ قدیم اور معیاری کلب تھا۔
تمہیں اوبرج نائٹ کلب کے بجائے اس وقت مقطم چلنا ہے۔ اس جگہ جہاں قطرہ خان کی سیر کرنے جایا گیا ہے۔ میرے ذہن سے اسے ترغیب ملی۔
اس کے ذہن نے کسی مزاحمت کے بغیر وہ ترغیب قبول کر لی اور پھر میرے ہی ایما پر وہ تیزی سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ اس کے ذہن پر میرے ذہن کی گرفت قائم تھی۔ میرے حق میں وقت یہ بہتر ہی ہوا تھا کہ جمیرا اوبرج نائٹ کلب جانے کیلئے روانہ ہوا تھا دوسری صورت میں تو اس عمارت میں داخل ہونا پڑتا اور پھر وہاں بھی دیر ہو جاتی۔ جمیرا نے اسے... شیرڈ نے اسے بھی بتایا تھا کہ جمیرا جا رہا ہے۔ اوبرج نائٹ کلب کے بارے میں اس نے نہیں بتایا تھا میرے خیال میں اس کی کوئی خاص وجہ رہی ہوگی۔ یہی سوچ کر میں اس کے ذہن کو ٹٹولنے لگی۔ پھر اس کا ذہن پڑھتے ہوئے یہ جان کر میں چونک اٹھی۔ آج اوبرج نائٹ کلب میں جمیرا کو روسی ایجنٹ سے ملنا تھا۔ پہلے کی طرح اس ملاقات کا مقصد بھی میری سودے بازی ہی تھا۔ جمیرا ایجنٹوں سے میرا سودا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے روسی ایجنٹوں کو میرے بارے میں بتا دیا تھا کہ میں پہنچ چکی ہوں اور جلد ہی ڈاکٹر رچرڈ مجھے اپنی گرفت میں لے لے گا۔ اس مرتبہ جمیرا نے پہلی ملاقات کے پیش نظر روسی ایجنٹوں سے پیشگی رقم نہیں لی تھی۔ وہ اس کا منتظر تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ مجھے پہلے یرغمال لے پھر وہ رقم لے۔ روسی ایجنٹوں سے جمیرا کا رابطہ بدستور برقرار تھا اسی کے توسط سے انہیں میرے اغوا کی خبر ملی تھی۔ پھر یہی خبر پرستان میں انہوں نے مشتہر کی تھی۔ گویا قاہرہ میں روسیوں کی معلومات کا ذریعہ جمیرا تھا۔ روسی ایجنٹوں سے ان معلومات کی فراہمی پر خاصا معاوضہ بھی ملا تھا۔

جیزا کی حدود سے نکل کر جب شیلرز کی کار جدید قاہرہ کے ملحقہ علاقوں سے گزر رہی تھی میری جیپ اس کے پیچھے پہنچ چکی تھی۔ جدید قاہرہ کا یہ علاقہ انتہائی مصروف رہتا ہے اور یہاں ٹریفک خاصا ہوتا ہے اس لیے تیز رفتاری برقرار نہیں رہ سکی تھی۔ میری جیپ اس وقت قاہرہ کے مشہور میوزیم کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس میوزیم میں فراعنہ مصر کی ممیاں ہیں۔ فرعونوں کی ممی بھی محفوظ ہے۔ دل میں اب بھی ہزاروں سال کا سوز موجود ہے۔ پہلی بار جب میں نے یہ میوزیم دیکھا تھا تو بہت متاثر ہوئی تھی۔

جدید قاہرہ سے گزرتے ہوئے میں نے اپنے ذہن میں ڈاکٹر رچرڈ کی بابت ایک لائحہ عمل مرتب کر لی۔ وقت اور حالات کے مطابق اس لائحہ عمل میں ترمیم بھی کی جا سکتی تھی۔ مگر اس کا دارومدار اس بات پر تھا کہ مجھ سے پہلے ڈاکٹر رچرڈ مقطم نہ پہنچ سکے۔ اب تک جو حالات پیش آئے ان کے پیش نظر تو مجھے یہی امید تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ میرے لائحہ عمل میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ میں

نے اسے بے ہوشی کی حالت میں قاہرہ سے بہت دور چھوڑا تھا۔ قاہرہ پہنچنے کے لیے اس کے پاس کوئی سواری بھی نہیں تھی۔ وہ جس جیپ میں سفر کر رہا تھا، وہ اس وقت میرے پاس تھی۔

تحریر اسکوائر سے گزر کر شاہراہ اہرام پر آنے کے بعد ٹریفک کا رش قدرے کم ہو گیا اور میری مرضی کے مطابق شیفرڈ نے اپنی کار کی رفتار تیز کر دی۔ پھر پرانے قاہرہ پہنچنے تک کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ مقطم کے پہاڑی سلسلے تک پہنچنے کے لیے قلعے کی آبادی سے گزرنا ضروری تھا اور اس وقت ہم اس سے گزر رہے تھے۔ سامنے ہی مجھے صلاح الدین ایوبی کا شاندار اور خوبصورت قلعہ نظر آ رہا تھا۔ یہ قلعہ بھی میرا دیکھا ہوا تھا۔ اسی قلعے میں ایک خوبصورت محل ہے جو خاندان خدیویہ کے بانی محمد علی پاشا نے تعمیر کرایا تھا جو شاہ فاروق کا جد اعلیٰ بھی تھا۔ اس محل کے علاوہ محمد علی پاشا نے قلعے میں ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جو استنبول کی مسجد کے نمونے پر اسی طرح بنوائی گئی ہے۔ مجھے اس تاریخی مسجد کے بلند مینار بھی نظر آ رہے تھے۔ قلعے کے قریب سے گزر کر اور آبادی کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہماری گاڑیاں آگے پیچھے پہاڑی سلسلے کی طرف روانہ ہو گئیں۔ کچھ دور چل کر راستہ اتنا ناہموار ہو گیا جس پر ڈرائیونگ کرنا سخت مشکل تھا، مگر میں منتظر رہی کہ شیفرڈ خود ہی کہیں کار روک کر پیدل چلنا شروع کرے۔ پھر میری توقع کے مطابق ذرا ہی دیر بعد شیفرڈ نے کار ایک جگہ روک دی۔ میں نے بھی اپنی جیپ کار کے پیچھے ہی کھڑی کر دی۔ وہاں سے پہاڑی سلسلہ قریب نہیں تھا مگر اب مجبوراً پیدل ہی چلنا تھا۔ شیفرڈ نے کار کا دروازہ مقفل کیا اور پھر ایک طرف چل دیا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اس لیے میں نے شیفرڈ کے اور اپنے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رکھا۔ میں اب اس کے تعاقب میں آگے بڑھ رہی تھی۔

اچانک مجھے کچھ بلندی پر روشنی سی نظر آئی جو لمحہ بھر کے لیے نمودار ہو کر غائب ہو گئی تھی۔ روشنی کا وہ دائرہ اسی طرف گردش کرتا ہوا غائب ہو گیا تھا جہاں میں تھی۔ احتیاطاً میں فوراً ہی ناہموار زمین پر اوندھی لیٹ گئی تھی مگر میری نگاہ شیفرڈ کے ہیولے ہی پر جمی ہوئی تھی جو متحرک تھا۔

تقریباً ایک منٹ اور گزرا ہو گا کہ دوبارہ روشنی نظر آئی۔ میں نے اس مرتبہ اندازہ لگا لیا کہ وہ کسی طاقتور ٹارچ کی روشنی تھی۔ کوئی شخص یقیناً نشیب کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس بار وہ روشنی کا دائرہ فوراً غائب نہیں ہوا بلکہ ادھر ادھر حرکت کرنے لگا۔ میں سینے کے بل رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ روشنی کے دائرے کو حرکت میں دیکھ کر میں نے ایک بڑے سے پتھر کے عقب میں پناہ لے لی۔ شیفرڈ کا ہیولا مجھے اب بھی آگے بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ بالآخر وہ روشنی کے دائرے میں آ گیا۔ روشنی کا دائرہ اس پر مرکوز ہو گیا۔

''کون ہو تم؟ رک جاؤ!'' معاً ایک بھاری اور گونج دار آواز سنائی دی۔ یہ الفاظ انگریزی میں ادا کیے گئے تھے مگر بولنے والے کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ مقامی ہے۔

شیپرڈ کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ میرے ذہن کے زیر اثر تھا اس لیے ذرا توقف سے خواب ناک سی آواز میں زور سے بولا۔ ''میں شیپرڈ ہوں۔''

''ہاں ہم نے بھی تمہیں پہچان لیا ہے، تم اوپر آ سکتے ہو۔'' پہلے والی آواز پھر پہاڑیوں میں گونجی۔

شیپرڈ، ٹارچ کے دائرے کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگا۔ میں بھی پتھر کی اوٹ سے نکل آئی مگر کھڑے ہو کر چلنے کی بجائے سینے کے بل ہی رینگتی ہوئی آگے بڑھی۔

جو واقعہ پیش آیا تھا میری توقع کے خلاف تھا۔ مجھے اسی لیے اپنے لائحہ عمل میں کچھ تبدیلی کرنا پڑی۔ اسی تبدیلی کے پیش نظر میں ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھر بہت اطمینان اور بے پروائی کے ساتھ ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی شیپرڈ کے پیچھے چلنے لگی۔ چند ہی لمحے بعد میری بے پروائی رنگ لائی، ایک پتھر لڑھک کر نشیب میں چلا گیا جس سے خاصی آواز پیدا ہوئی۔ فوراً ہی روشنی کا دائرہ حرکت میں آ گیا اور پھر وہ جلد ہی مجھ پر مرکوز ہو گیا۔

''عذرا خان!'' کوئی بے یقینی کے سے انداز میں تقریباً چیخ اٹھا۔

''ہاں وہ عذرا خان ہی ہے!'' معاً شیپرڈ کی تیز آواز سنائی دی۔ ''اسے نشانے پر لے لو! میں ہی اسے اپنے پیچھے لگا کر یہاں لایا ہوں۔''

''عذرا خان!'' کسی نے بلند آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ ''اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو!...... اور اسی طرح آگے بڑھتی رہو!''

میں نے فوراً ہی اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میرا پرس شانے سے لٹکا ہوا تھا۔ غالباً ان کے پاس دوربین بھی تھی کیونکہ درمیانی فاصلہ خاصا تھا۔ انہوں نے شاید دوربین ہی کے ذریعے دیکھا تھا۔ میں قدم بہ قدم آگے بڑھتی رہی۔

ابھی میں نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سی محسوس ہوئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتی کوئی سخت سی چیز میری پشت سے آ لگی جو یقیناً کسی ریوالور کی نال ہی ہو سکتی تھی۔

''بدستور آگے بڑھتی رہو!'' میری پشت پر عقب سے آ کر ریوالور کی نال رکھنے والے نے مجھے حکم دیا۔ مجھے دیکھتے ہی یقیناً وہ شخص کسی اور راستے سے نشیب میں اتر آیا تھا تاکہ میرے لیے اپنی دانست میں فرار کی راہ مسدود کر دے۔

میں اس شخص کی مرضی سے چلتی ہوئی کچھ ہی دیر بعد ایک ہموار سطح پر پہنچ گئی۔ میں نے دیکھا وہاں آس پاس ہی کئی غاروں میں روشنی تھی۔ وہ روشنی گیس لیمپوں ہی کی ہو سکتی تھی۔ انہوں نے کچھ ایسا بندوبست کیا تھا کہ وہ روشنی ان غاروں سے باہر نہ نکل سکے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے وہ روشنی نظر نہ آ سکے۔ اب میرے اردگرد چار مسلح افراد تھے۔ انہی میں سے ایک کے ہاتھ میں طاقتور ٹارچ تھی اور ایک کے گلے میں دوربین لٹک رہی تھی۔ ان کے ساتھ ہی شیپرڈ مطمئن انداز میں کھڑا ہوا تھا۔ جو شخص میری پشت پر ریوالور کی نال رکھ کر مجھے وہاں تک لایا تھا، اب وہ بھی سامنے آ گیا تھا مگر میرے دونوں ہاتھ ابھی تک اٹھے ہوئے تھے۔

''حکم! یہاں عذرا خان اور ذکیہ، دونوں کے لیے خطرہ ہے۔ یہاں یہ محفوظ نہیں ہیں۔'' معاً شیپرڈ نے ایک مقامی شخص کو مخاطب کیا، پھر بغیر رکے بتانے لگا۔ ''عذرا خان کے کچھ ساتھی بھی اس پہاڑی سلسلے تک پہنچ چکے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لوگ کب عذرا خان کی تلاش میں یہاں تک پہنچ

جائیں۔"

"پھر...... پھر تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہئے شیپرڈ؟" اسی مقامی نے سوال کیا جسے شیپرڈ نے حکم کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو فوری طور پر یہاں سے جیزا منتقل کر دیا جائے۔ میں انہیں اپنے ساتھ یہاں سے جیزا لے جاؤں۔" شیپرڈ بولا۔ وہ اس وقت جو کچھ بھی کہہ رہا تھا میرے ہی ذہن کے زیراثر کہہ رہا تھا۔ میں نے ابھی تک اس کے ذہن پر اپنے طاقتور ذہن کی گرفت برقرار رکھی تھی۔

"لیکن ہمیں اس سلسلے میں ڈاکٹر سے اجازت ضرور لینا پڑے گی۔ ڈاکٹر تقریباً آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہاں پہنچنے والا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم کم از کم نصف گھنٹے عذرا خان اور ذکیہ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔" حکم نے شیپرڈ کی بات کے جواب میں کہا۔

"ہیلی کاپٹر کے ذریعے؟" میرے ایماء پر شیپرڈ کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"ہاں۔" حکم نے جواب دیا۔ پھر وہ ڈاکٹر رچرڈ کو پیش آنے والے واقعے کے متعلق بتانے لگا۔ آخر میں وہ بولا۔ "ہوش میں آتے ہی ڈاکٹر نے ٹرانسمیٹر پر ہم سے رابطہ قائم کیا اور ہیلی کاپٹر بھیجنے کا حکم دیا۔ ہم نے یہاں سے فوراً ہی ہیلی کاپٹر روانہ کر دیا۔

"پھر تو یہ اور بھی اچھا ہوا کہ عذرا خان دوبارہ ہمارے ہتھے چڑھ گئی۔" شیپرڈ نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر یقیناً یہ اطلاع پا کر خوش ہو جائے گا۔" پھر وہ رکے بغیر مزید کہنے لگا۔ "آؤ، میں خود ٹرانسمیٹر پر اس سے بات کرتا ہوں...... اور ہاں عذرا خان کو میں لمحہ بھر کے لیے بھی اپنی نظروں سے اوجھل رکھنا نہیں چاہتا! اسے بھی ساتھ لے آؤ! تمہیں شاید معلوم نہیں کہ یہ دنیا کی سب سے خطرناک عورت ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" حکم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم ڈاکٹر سے ٹرانسمیٹر پر اجازت لے لو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے مسلح ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا۔

فوراً ہی ان میں سے ایک میرے عقب میں آ گیا اور اپنی گن میری پشت پر رکھ کر چلنے کو کہا۔

پھر وہ لوگ مجھے انہی روشن غاروں میں سے ایک میں لے آئے۔ غار کے دہانے پر ایک شخص اسٹین گن لیے کھڑا تھا۔ غار میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ ذکیہ پر پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہذیانی انداز میں چیخ اٹھی۔ "باجی!" مجھے وہ آزاد ہی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے گئے تھے۔ میری آمد سے قبل وہ ایک دیوار کا سہارا لیے بیٹھی تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر ان لوگوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ غار کے اندر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں تمام ہی ضروری اشیاء نظر آ رہی تھیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ سے شیپرڈ کا رابطہ جتنی جلدی ہو جائے بہتر ہے۔ میں اس بات سے متفکر ہو گئی تھی کہ وہ جلد ہی ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہاں پہنچنے والا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اس کی آمد سے پہلے ہی ذکیہ کو وہاں سے نکال لے جاؤں۔

غار کے ایک حصے میں مجھے ایک میز پر طاقتور ٹرانسمیٹر رکھا ہوا نظر آیا۔ حکم نے آگے بڑھ کر اس

کا سوئچ آن کر دیا اور پھر مخصوص فریکوئنسی پر ڈاکٹر رچرڈ سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ جلد ہی وہ اپنی پہلی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

جواباً دوسری جانب سے ٹرانسمیٹر پر ڈاکٹر رچرڈ کی آواز سنائی دینے لگی۔ "ڈاکٹر رچرڈ آن دی لائن!...... اوور"

فوراً ہی شیپرڈ آگے بڑھا اور حکم میز کے سامنے بچھی ہوئی کرسی سے اٹھ گیا۔ شیپرڈ نے کرسی پر بیٹھتے ہی ڈاکٹر رچرڈ کو مخاطب کیا۔ "ڈاکٹر!...... شیپرڈ اسپیکنگ...... تم خیریت سے تو ہو؟ اوور۔"

"ہاں...... مگر تم...... تم وہاں مقطم کیسے پہنچ گئے؟ اگر میری سماعت مجھے دھوکا نہیں دے رہی تو ابھی میں نے حکم کی آواز سنی تھی۔ اوور!" ڈاکٹر رچرڈ کی آواز آئی۔

پھر میرے ایماء پر شیپرڈ، ڈاکٹر رچرڈ کو وہ کہانی سنانے لگا جو میں نے ہی اس کے ذہن نشین کی تھی، وہ کہہ رہا تھا۔ "میں نے اسمٰعیلیہ میں عذرا خان کو کچھ لوگوں کے ساتھ اپنے ٹھکانے کے اردگرد منڈلاتے دیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ وہاں تک پہنچنے میں کس طرح کامیاب ہو گئی! میرے لیے وہاں اس پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ میں اسی لیے اسے اور اس کے ساتھیوں کو اپنے پیچھے لگائے مقطم تک لے آیا۔ یہاں میں بآسانی اسے جل دے کر اس کے ساتھیوں سے الگ کرنے اور پھر اس پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ پھر وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ تاریکی سے فائدہ اٹھا کر میں اسے اس کے ساتھیوں سے الگ لے آیا۔ مجھے پر یقین تھا کہ عذرا خان کم از کم مجھے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے گی اور میرا قیاس درست ثابت ہوا۔" یہ کہہ کر شیپرڈ نے وہ واقعہ بیان کیا جو یہاں آنے کے بعد پیش آیا تھا۔

جب شیپرڈ خاموش ہو گیا تو ڈاکٹر رچرڈ کی آواز ابھری۔

"جہاں تک مجھے علم ہے، عذرا خان اکیلی ہی قاہرہ آئی تھی۔ وہ پاکستان سے کسی کو اپنے ساتھ یہاں نہیں لائی، پھر اس کے ساتھی ایک دم کہاں سے سامنے آ گئے! یہ بتاؤ کیا وہ لوگ پاکستانی نظر آتے تھے؟ اوور۔"

"ہاں وہ پاکستانی ہی معلوم ہوتے تھے مقامی نہیں تھے۔" یہ کہہ کر شیپرڈ اصل مقصد پر آ گیا۔ "ڈاکٹر! میرے خیال میں عذرا خان کے ساتھی کسی بھی وقت اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ جگہ محفوظ نہیں رہی۔ میں چاہتا تھا کہ عذرا خان اور اس کی بہن ذکیہ کو فوری طور یہاں سے جیزا لے جاؤں، مگر حکم کا کہنا تھا کہ تمہاری اجازت اس سلسلے میں ضروری ہے۔ اوور۔"

"حکم کا کہنا ٹھیک ہی تھا۔" ڈاکٹر رچرڈ بولا۔ "کیوں کہ تم عذرا خان اور اس کی بہن کو یہاں سے جیزا لے جا کر حماقت ہی کا ثبوت دیتے۔ کیا تم یہ بھول گئے شیپرڈ کہ جیزا کا ٹھکانا بھی عذرا خان کے آدمیوں کی نظر میں آ چکا ہے؟ ابھی خود تمہیں نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے وہیں عذرا خان اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا تھا! اوور۔"

"سوری ڈاکٹر!" شیپرڈ فوراً بول اٹھا۔ "میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی مگر یہ حقیقت ہے کہ عذرا خان اور اس کی بہن ذکیہ یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ انہیں جیزا نہ سہی تو کسی اور جگہ منتقل کرنا فوری طور پر اشد ضروری ہے۔ اوور۔"

"تمہاری بات سے میں متفق ہوں۔" ڈاکٹر رچرڈ نے کہا۔ "تم حکم اور مزید دو ساتھیوں کو لے کر فوراً یہاں سے نکل جاؤ! مگر جیزا کا رخ نہ کرنا! تمہیں مہندسین پہنچنا ہے۔ میں بھی اب مقطم کی بجائے وہیں پہنچوں گا۔ ممکن ہے کہ میں تم سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں اور تم مجھے منتظر پاؤ۔ اگر یہاں سے نکلنے میں عذرا خان کے ساتھی مزاحم ہوں تو تم لوگ بلا دریغ انہیں گولی کا نشانہ بنا سکتے ہو۔ یہ خیال رکھنا کہ ان میں سے کوئی تمہارے تعاقب میں نہ آسکے اور کوئی خاص بات؟ اوور۔"

"نہیں ڈاکٹر، اور کوئی بات نہیں۔" شیپرڈ جواباً بول اٹھا۔ "بس تم سے اجازت لینا مقصود تھی کہ میں عذرا خان اور اس کی بہن ذکیہ کو یہاں سے لے جاؤں۔ اوور۔"

"شیپرڈ! میں تمہاری اس کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ بہرحال پوری طرح چوکنا رہنا! کہیں وہ خطرناک عورت تمہیں بھی جل دے کر فرار نہ ہو جائے۔ اوور اینڈ آل!" ان الفاظ کے ساتھ ہی ڈاکٹر رچرڈ کی آواز آنا بند ہو گئی اور شیپرڈ نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔ پھر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"سنو!" شیپرڈ نے کرسی سے اٹھتے ہی حکم کو مخاطب کیا۔ "تم اپنے ساتھ دو مسلح افراد کو اور لے لو۔ میں اپنی کار ہی میں چلوں گا۔ عذرا خان اور اس کی بہن کو اس جیپ میں بٹھا لینا جو عذرا خان نے ڈاکٹر سے چھینی تھی۔ عذرا خان اسی جیپ میں یہاں تک آئی ہے۔ جیپ تم ڈرائیو کرو گے۔"

"کیا عذرا خان کے ساتھی بھی اسی جیپ میں تھے؟" حکم نے پوچھا۔

"نہیں۔" شیپرڈ نے جواب دیا۔ "وہ لوگ دوسری گاڑی میں تھے۔"

"پھر تو یہ ممکن ہے کہ عذرا خان نے وہ جیپ جہاں چھوڑی ہو وہیں مل جائے۔" حکم کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ پھر اس نے شیپرڈ سے دریافت کیا۔ "کیا ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھنا ضروری ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔" شیپرڈ جواباً بولا۔ "جب ان دونوں کے پہلو سے ریوالوروں کی نالیں لگی ہوں گی تو یقیناً یہ کوئی غلط حرکت نہیں کریں گی۔" پھر شیپرڈ اسے مزید تفصیل بتانے لگا کہ سفر کس طرح کرنا ہے! اس نے کہا "جیپ کے اگلے حصے میں عذرا خان کو بٹھانا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر تم ہو گے، پھر عذرا خان اس کے بعد تمہارا ایک مسلح آدمی، عذرا خان کے پہلو سے ریوالور کی نال لگا کر بیٹھے گا۔ یوں گویا عذرا خان تم دونوں کے درمیان رہے گی۔ اس کی بہن اتنی خطرناک معلوم نہیں ہوتی اس لیے اسے پچھلی سیٹ پر بٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ پیچھے تمہارا دوسرا مسلح آدمی بیٹھ جائے گا۔ کیا خیال ہے، ٹھیک رہے گا نا یہ؟"

"بالکل ٹھیک!" حکم تائید میں بولا۔

"تم میری کار کے پیچھے پیچھے چلے آنا۔" شیپرڈ نے مزید کہا۔ "یہ تو تم سن ہی چکے ہو کہ ہمیں یہاں سے مہندسین چلنا ہے۔"

"ہاں سن چکا ہوں۔" حکم نے تائید میں سر ہلایا۔

پھر طے شدہ منصوبے کے مطابق حکم نے دو مسلح افراد کو ساتھ لے لیا۔ ان دونوں میں سے ایک نے ذکیہ کی پشت پر ریوالور کی نال رکھ دی اور دوسرے نے بھی میرے عقب میں آ کر ایسا ہی کیا۔

آگے آگے حکم ٹارچ روشن کیے ہوئے چلنے لگا۔ درمیان میں ذکیہ اور میں تھی، پھر حکم کے ساتھی اور سب سے پیچھے شیپرڈ چل رہا تھا۔ ہم اسی ترتیب میں جیپ تک پہنچ گئے۔ حکم کو شیپرڈ نے میرے مفروضہ ساتھیوں کے بارے میں جو کہانی سنائی تھی، اس کی روشنی میں وہ بہت چوکنا معلوم ہوتا تھا۔

یہی وہ لمحات تھے جب پہلی بار میں نے ایک نیا ذہنی تجربہ کیا۔ اب تک میں نے اپنے حیرت انگیز ذہن کی قوتوں سے کام لے کر لوگوں کو سو جانے کی ترغیب تو دی تھی اور اس میں کامیاب بھی ہوئی تھی مگر کسی کو بے ہوش نہیں کیا تھا۔ حکم جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے اس کے ذہن کو معمولی سا جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور پھر جھکتا چلا گیا۔ اس کا سر اسٹیئرنگ سے اٹک گیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ٹارچ اپنے ایک ساتھی کو تھما دی تھی۔

حکم کے ذہن پر توجہ دیتے ہوئے شیپرڈ کے ذہن سے میرا رابطہ منقطع ہوا تھا۔ وہ عجیب گومگو کے سے عالم میں ایک طرف کھڑا تھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے! حکم کو اس حال میں دیکھ کر اس کا ایک ساتھی بلند آواز میں بولا۔ "کیا ہوا؟ تمہیں کیا ہوا حکم؟"

اسی وقت میں نے اس شخص کے ذہن پر تصرف کر لیا۔ خفیف سا ایک ذہنی جھٹکا اس کے لیے بھی کافی ثابت ہوا۔ یہ وہی تھا جو میرے عقب میں تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ پہلے زمین پر بیٹھا اور پھر بغیر کچھ کہے ایک جانب لڑھک گیا۔

"یہ...... یہ سب کیا ہے؟...... کیا ہو رہا ہے تم لوگوں کو؟ معاً شیپرڈ تقریباً چیخ اٹھا۔

اب اسی کی باری تھی۔ پھر اس پر بھی وہی گزری۔ حکم کا دوسرا ساتھی یہ دیکھ کر اس قدر بدحواس ہوا کہ ایک دم، ایک جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا اس طرح فرار ہو جانا میرے لیے خطرے کا سبب بن سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے فوری طور پر اس کے ذہن کو گرفت میں لے لیا۔ کچھ ہی دور دوڑ کر اس کے قدم رک گئے۔ پھر میں نے اس کے ہیولے کو بھی زمین پر بیٹھتے دیکھا، ہلکا سا ذہنی جھٹکا اس کے لیے بھی کافی ہوا تھا۔

اس دوران میں اور ذکیہ بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑی رہی تھیں۔ اتنی دیر اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں تاریکی میں کسی قدر دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ اب میرے اور ذکیہ کے سوا وہاں کوئی بھی اپنے پیروں پر نہیں کھڑا تھا اور نہ کوئی ہوش میں تھا۔ میں نے ان لوگوں سے وہیں نمٹنا غنیمت سمجھا تھا۔ اس پہاڑی سلسلے سے باہر نکلنے کے بعد اور آبادی میں پہنچ کر اگر یہی واقعہ پیش آیا ہوتا تو دوسرے افراد اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے جو میں نہیں چاہتی تھی۔ ان سب کے ہوش کھو دینے کے بعد اب میرے اور ذکیہ کے لیے راہ فرار کھلی تھی۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ کب تک بے ہوش رہتے ہیں اس لیے میں جلد سے جلد وہاں سے فرار ہو جانا چاہتی تھی۔ یہی سوچ کر میں وقت ضائع کیے بغیر تیزی سے آگے بڑھی اور جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے بے ہوش حکم کے جسم کو گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا۔

"ذکیہ! حکم کو زمین پر ڈال کر میں نے ذکیہ کو آواز دی جو کچھ ہی فاصلے پر گویا پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔

"جج ...... جی ...... با ...... باجی!" اس کی پھنسی پھنسی مرتعش سی آواز سنائی دی۔ اس کی آواز سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"جلدی سے جیپ میں بیٹھ جاؤ!" میں اس سے بولی، پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

ذکیہ لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور پھر جیپ میں سوار ہوگئی۔ میں نے جیپ کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

"باجی! ان...... ان لوگوں کو...... اچانک کیا ہوا؟" ذکیہ نے جھجکتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ اب بھی اس کی آواز میں خوف تھا۔

"مجھے خود نہیں معلوم!" میں نے ذکیہ کو ٹال دیا۔ "شاید خدا نے اس طرح ہمیں فرار ہونے کا موقع فراہم کیا ہے اور ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یہاں سے ہم سیدھے ایئرپورٹ ہی چلیں گے۔"

"مگر...... مگر میں...... میں شاید آپ کے ساتھ نہیں جا سکوں گی۔" ذکیہ بجھے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

"وہ کیوں؟" میں نے سامنے نظر جمائے ہوئے اسٹیئرنگ کو دائیں جانب گھمایا۔ یہ سوال میں نے بس یوں ہی کر لیا تھا ورنہ مجھے اس کی وجہ معلوم تھی۔

"میرا پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات جس ایئر بیگ میں تھے......"

"وہ ایئر بیگ جیپ کی پچھلی سیٹ پر موجود ہے۔" میں اس کی بات کاٹ کر بول اٹھی۔ اندھیرے کے سبب وہ یقیناً پچھلی سیٹ پر موجود دو سوٹ کیس اور ایئر بیگ نہیں دیکھ سکی تھی۔ یوں بھی ایئر بیگ، سیٹ سے نیچے اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان رکھا تھا۔

میری بات سن کر ذکیہ ایک دم مڑی، پھر آہستہ سے بولی۔ "ہاں سوٹ کیس تو نظر آ رہا ہے...... مگر"

"ایئر بیگ سیٹوں کے درمیان ہے۔" میں نے بتایا۔

ذکیہ نے طویل سانس لیا، پھر اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ہی خوش گواری آ گئی۔ "مگر باجی، یہ...... یہ سامان تو میری کار میں تھا اور کار...... میں کچھ بھی نہیں...... اور یہ جیپ...... یہ کس کی ہے؟"

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ جب میں تمہیں وہاں چھوڑ کر ایئر بیگ لینے چلی گئی تھی تو تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"میں کافی دیر تک وہاں جھاڑیوں میں چھپی آپ کی واپسی کا انتظار کرتی رہی، مگر آپ لوٹ کر نہ آئیں۔ میں سوچ ہی رہی تھی، مجھے کیا کرنا چاہئے کہ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے منہ پر رومال رکھ دیا۔ رومال پر یقیناً بے ہوشی کی دوا چھڑکی گئی تھی۔ میں اسی لیے چند ہی لمحے بعد ہوش کھو بیٹھی۔ پھر مجھے نہ جانے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو یہاں دیکھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے ہماری کار روکی تھی۔ پھر انہیں لوگوں کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید آپ کی تلاش میں ہیں۔ میں دل ہی دل میں خدا سے دعا کر رہی تھی کہ یہ لوگ آپ کو تلاش نہ کر پائیں۔ پھر

جب میں نے آپ کو یہاں دیکھا تو میرا دل بیٹھ گیا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے ذکیہ کی آواز بھرا گئی۔

"پگلی! میں نے محبت سے کہا۔ "یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ ان لوگوں نے مجھے تلاش کر لیا اور اسی جگہ لے آئے جہاں تم تھیں ورنہ میں تمہیں نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتی پھرتی!" میں اصل بات گول کر گئی۔

اب میں اس پہاڑی سلسلے کو پیچھے چھوڑ کر پرانے قاہرہ کی آبادی "قلعے" میں داخل ہو چکی تھی۔ جیپ میں وہاں سے مہندسین تک کا جتنا فاصلہ تھا، میں اس عرصے میں قطعی محفوظ تھی۔ میری کوشش یہ تھی کہ جلد سے جلد ایئرپورٹ پہنچ جاؤں۔ مہندسین میں ڈاکٹر رچرڈ میرا منتظر تھا۔ مقررہ وقت تک گویا اس کے ساتھی مجھے لے کر وہاں نہ پہنچتے تو وہ یقیناً خاموش نہ بیٹھتا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر رچرڈ کو یہ معلوم ہوتا کہ میں، ذکیہ کو لے کر فرار ہو چکی ہوں، قاہرہ سے میری روانگی ضروری تھی۔ مجھے علم تھا کہ میری تلاش میں ڈاکٹر رچرڈ کے آدمی سب سے پہلے ایئرپورٹ ہی کا رخ کریں گے۔ میں نے آبادی میں پہنچتے ہی اسی لیے جیپ کی رفتار انتہائی تیز کر دی یوں بھی اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور ٹریفک کم ہی تھا۔

یہ ضروری نہیں تھا کہ ایئرپورٹ پہنچ کر مجھے فوری طور پر پاکستان جانے والی کوئی فلائٹ مل جاتی، مگر میں اس کا حل سوچ چکی تھی۔ میرا پہلا مسئلہ قاہرہ سے نکلنا تھا۔ مجھے جہاں کی فلائٹ میں بھی جگہ ملتی، فوراً اسے حاصل کر لیتی۔ ذکیہ کے اور میرے پاس یوں بھی انٹرنیشنل پاسپورٹ تھے۔ قاہرہ سے ہم کہیں بھی پہنچ کر دوسرا کوئی جہاز پکڑ سکتے تھے۔

بالآخر نصف شب گزرنے سے قبل ہی میں، قاہرہ ایئرپورٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ میں نے انکوائری پر معلوم کیا کہ پہلے کون سی فلائٹ کہاں کے لیے روانہ ہو رہی ہے؟ اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اس میں جگہ مل سکتی ہے یا نہیں؟

"اب سے نصف گھنٹے کے بعد اجپٹ ایئر کی ایک فلائٹ اسکندریہ جا رہی ہے۔" انکوائری کلرک نے بتایا "اس فلائٹ میں آپ کو دو سیٹیں مل سکتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے فوراً اقرار میں سر ہلا دیا اور پھر وہاں سے بکنگ کاؤنٹر پر آ گئی۔

قاہرہ کے بعد مصر کا بڑا شہر اسکندریہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ قاہرہ سے اس کا فاصلہ دو سو بائیس میل ہے۔ اسکندریہ تک کا سفر قاہرہ سے ہوائی جہاز کے ذریعے بس ایک گھنٹے کا تھا۔ مصر کے مختلف علاقوں سے عموماً لوگ یہاں گرمیوں کے موسم میں تفریح کی غرض سے آتے ہیں۔ یہ شہر سمندر کے کنارے آباد ہے اور وہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے۔ میں ایک بار اسکندریہ بھی جا چکی تھی اور مجھے یہ شہر پسند آیا تھا۔ آج دوسری مرتبہ کسی پروگرام اور ارادے کے بغیر میں وہاں جا رہی تھی اور مجھے وہاں زیادہ رکنا بھی نہیں تھا۔

میں نے اسکندریہ کے دو ٹکٹ لے لیے۔ جہاز کی روانگی میں کیونکہ زیادہ دیر نہیں تھی اس لیے ہمیں فوراً ہی ایک بس کے ذریعے جہاز تک پہنچا دیا گیا۔ میں اور ذکیہ اس جہاز کے آخری مسافر تھے۔ ہمارے سوٹ کیس بھی جہاز میں رکھے جا چکے تھے۔ ذکیہ نے وہ ایئر بیگ شانے پر لٹکا لیا تھا جس میں اس کے ضروری کاغذات تھے۔

جہاز میں سوار ہونے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری دانست میں اب کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ کی جیپ میں نے وہیں ایئرپورٹ پر چھوڑ دی تھی اور اس کی چابی بھی یونہی لگی رہنے دی تھی۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ جیپ کو چرایا بھی جا سکتا ہے۔

مقررہ وقت پر لاچپٹ کا وہ طیارہ قاہرہ ایئرپورٹ سے پرواز کر گیا۔ اس کی اگلی منزل اسکندریہ تھی۔ میری بائیں جانب ذکیہ بیٹھی تھی اور دائیں جانب کی نشست پر ایک غیر ملکی تھا جس پر میں نے صرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی۔ جلد ہی مجھے ایک عجیب سی بو کا احساس ہوا۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ دائیں جانب کی سیٹ پر بیٹھا ہوا غیر ملکی مجھ میں اور ذکیہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ میں نے سرسری انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے لگا۔ بلاشبہ اس کی شخصیت انتہائی پرکشش تھی اس کے جسم پر بہترین تراش کا براؤن تھری پیس سوٹ تھا اور اسی سے میچ کرتی ہوئی ٹائی گلے میں تھی۔ بال سنہرے اور آنکھیں نیلی تھیں جن میں ہلکی سی سرخی نمایاں تھی۔ جب میں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی تو ایک بار وہی مخصوص بو مجھے محسوس ہوئی۔ یہ بو میرے لیے غیر مانوس نہیں تھی۔ پھر جب مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے میں نے یہ بو کب اور کہاں محسوس کی تھی تو میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔ پہلی بار قاہرہ ہی میں یہ بو میں نے اس وقت محسوس کی تھی جب قاہرہ میوزیم کے اس حصے میں گئی تھی جہاں تابوتوں میں مصر کے فراعنہ کی حنوط کی ہوئی لاشیں رکھی تھیں۔ تابوتوں کے قریب پہنچ کر یہ بو اور شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ پرکشش شخصیت کے مالک اس غیر ملکی اور اس بو میں مجھے بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آ رہا تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ یہ بو اسی کی طرف سے آ رہی تھی۔

مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے نہایت شائستگی سے کہا۔ ''کیا میں آپ سے متعارف ہو سکتا ہوں؟'' یہ الفاظ اس نے انگریزی میں ادا کیے تھے۔ ''غالباً آپ انگریزی سمجھ سکتی ہیں!''

''جی ..... جی ہاں!'' میں نے جواباً انگریزی میں کہا۔ ''کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے عذرا خان کہتے ہیں اور یہ.....'' میں نے ذکیہ کی طرف اشارہ کیا ''یہ ذکیہ خان ہے، میری چھوٹی بہن!''

''مجھے ڈگلس کہتے ہیں۔ آپ دونوں سے مل کر خوشی ہوئی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

''سوری!'' میں مسکرا کر بولی۔ ''میں مسلمان ہوں، مردوں سے ہاتھ ملانا ہماری تہذیب میں معیوب تصور کیا جاتا ہے۔''

''اوہ! ...... میں معذرت خواہ ہوں۔'' اس نے کہا اور اسی لمحے میری اور اس کی نظریں مل گئیں۔ پھر میں چند لمحے پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ اس کی نیلی آنکھوں نے جیسے مجھے مسحور کر لیا تھا۔ کوشش کے باوجود میں کسی اور طرف دیکھنے سے قاصر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ناقابل بیان اور عجیب سی کشش تھی۔ ذرا توقف سے اس کے خوبصورت ہونٹوں میں پھر حرکت پیدا ہوئی۔ وہ آہستگی سے بولا۔ ''آپ بے حد حسین ہیں عذرا خان!''

''شکریہ مسٹر ڈگلس!'' غیر ارادی طور پر میں نے کہہ دیا۔ عام حالات میں کسی شخص نے مجھ سے یہ الفاظ کہے ہوتے تو شاید میں ناگواری کا اظہار ہی کرتی، اپنی عادت کے مطابق! مگر نہ جانے کیوں

اس وقت ناگواری کا اظہار کرنے کی بجائے میں نے ڈگلس کا شکریہ ادا کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر سوئی ہوئی عورت جاگ اٹھی ہو جو اپنے حسن کی ستائش چاہتی ہے۔ شاید یہ اس کی سحر انگیز آنکھوں کا اثر تھا۔

''آپ دونوں شاید جڑواں بہنیں ہیں! ڈگلس نے وضاحت طلب لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر اس کے باوجود ہماری شکلیں بہت ملتی جلتی ہیں۔''

''ہاں بہت۔'' وہ بولا۔ ''اسی سبب میں آپ دونوں میں دلچسپی لے رہا تھا جسے شاید آپ نے بھی محسوس کر لیا تھا۔''

ڈگلس نے یہ کہہ کر میرے ذہن میں پیدا ہونے والے ان شکوک و شبہات کو ختم کر دیا جو مجھے ابتدا میں محسوس ہوئے تھے۔ پھر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''فی الحال اسکندریہ۔'' میں نے محتاط لہجے میں صحیح جواب دیا۔

''اسکندریہ میں کچھ اسٹے کرنا ہے، پھر آگے جانا ہے۔'' میں نے دانستہ یہ نہ بتایا کہ اسکندریہ کے بعد میرا ارادہ پاکستان جانے کا ہے۔

''کیا میں یہ پیشکش کر سکتا ہوں کہ اسکندریہ میں آپ جتنے دن بھی چاہیں میری مہمان رہیں؟ یہ ایک دوستانہ پیشکش ہے جسے آپ رد بھی کر سکتی ہیں۔'' وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

میں سوچ میں پڑ گئی کہ اس کی پیشکش مجھے قبول کرنی چاہیے یا نہیں؟ اسی دوران میں ایک بار پھر میری اور اس کی نظریں مل گئیں اور میں نے غیر ارادی طور پر اس کی پیشکش قبول کر لی۔

''بے حد شکریہ!'' وہ بدستور مجھ سے نظریں ملائے رہا۔ اس بار بھی میری نظریں اس کی نظروں میں جیسے الجھ کر رہ گئی تھیں۔ پھر نہ معلوم اس نے کب میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں تو اس وقت چونکی جب وہ ایئرہوسٹس کی آمد پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ ذکیہ بھی میرے ساتھ ہے اور میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

اس نے ایئرہوسٹس کو تین کپ کافی لانے کا آرڈر دیا تھا۔ نہ جانے کب اس نے ایئرہوسٹس کو اشارے سے بلا لیا تھا مجھے خبر ہی نہ ہو سکی تھی۔

کافی پینے کے دوران میں اس سے میری مزید گفتگو ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''مسٹر ڈگلس! آپ کیا کرتے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ ''جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اگر میں شادی کر لیتا تو شاید میرے بعد آنے والی دو تین نسلوں کو بھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

''بڑی دلچسپ بات کر رہے ہیں آپ!'' میں کسی قدر اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

''ہاں دلچسپ بھی اور افسوسناک بھی!'' اس نے یہ کہتے ہوئے طویل سانس لیا۔

''افسوسناک کیسے؟'' میں نے سوال کیا۔

"آپ شاید اس شخص کی محرومی کا اندازہ نہیں لگا سکتی عذرا خان جس کا دل خواہشوں سے خالی ہو جائے۔ یہ بات تو افسوسناک ہونے کے ساتھ بڑی ہولناک بھی ہے مگر شاید آپ یوں آسانی سے میری بات نہ سمجھ سکیں۔" لمحہ بھر کو وہ چپ ہوا، پھر گہرا سانس لے کر بولا۔"میں مختصراً اپنے بارے میں آپ کو کچھ بتا دوں۔ میں امریکی شہر نیویارک کا رہنے والا ہوں۔ نوجوانی ہی میں میرے والدین ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گئے۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ وراثت میں مجھے کئی ملین ڈالر کی دولت ہاتھ آئی اور اتنی ہی مالیت کی جائیداد بھی۔ میرے والد امریکہ کے چند بڑے ایکسپورٹرز میں سے ایک تھے۔ ساری دنیا میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ میں دنیا میں تنہا تھا اس لیے سوچا کہ مزید حصول دولت کس لیے؟ اگر میں اور میرے بعد آنے والی دو تین نسلیں کچھ نہ کریں تو بھی اپنی تمام زندگی عیش سے گزار سکتی ہیں۔ یہی سوچ کر میں نے رفتہ رفتہ سارا کاروبار سمیٹنا شروع کر دیا۔ میرے بینک اکاؤنٹس میں اوراضافہ ہو گیا۔ دنیا کے مختلف بینکوں میں میری اتنی دولت جمع تھی کہ اس کا انٹریسٹ ہی فضول خرچی کے باوجود خاصا بچ جاتا تھا۔ عذرا خان! اول اول میرے دل میں بھی بڑی بڑی خواہشیں تھیں جو ہر نوجوان کے دل میں ہوتی ہیں۔ میں کوئی نیک اور پارسا نوجوان نہیں تھا، مگر میں نے جس شے کی خواہش کی، وہ پوری ہو گئی یہاں تک کہ میرا دل خواہشوں سے خالی ہو گیا۔ پھر میں دیس دیس گھوما اور سیاحت میں دل لگانا چاہا۔ مختلف ممالک میں، میں نے گھر خریدے، وہاں رہا اور جو جی چاہا کیا، مگر کب تک؟ آخر پھر وہی منزل آ گئی کہ اب کیا کیا جائے؟ ان دنوں میں اسی منزل پر ہوں، مصر میں، قاہرہ اور اسکندریہ، دونوں بڑے شہروں میں میرے خوبصورت اور وسیع و عریض گھر ہیں، پھر بھی یقین کریں کہ میں بے گھر ہوں۔ ہندوستان اور مصر میں، میں نے زیادہ وقت گزارا ہے، لیکن اب ان سے بھی اکتا سا گیا ہوں۔ گزشتہ دو ماہ سے میں قاہرہ میں تھا، وہاں سے جی اکتا گیا تو سوچا کہ کچھ دن اسکندریہ میں گزار لوں اسی لیے وہاں جا رہا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"مسٹر ڈگلس! آپ اگر شادی کر لیتے تو شاید آپ کی تنہائی دور ہو جاتی۔" میں نے کہا۔

"میں نے شادی تو نہیں کی، مگر کئی بار بطور تجربہ کئی خواتین کے ساتھ خاصے عرصے تک رہا ہوں، صرف یہ جاننے کے لیے کہ آیا شادی کر کے یا مستقلاً کسی عورت کے ساتھ رہتے ہوئے میں کامیاب زندگی گزار سکتا ہوں یا نہیں؟...... مگر افسوس عذرا خان کہ مجھے ناکامی ہوئی، کوئی عورت میری بے مقصد زندگی کو مقصد نہ دے سکی۔ کبھی کبھی میں زندگی کی اس بے مقصدیت سے ڈر جاتا ہوں کہ کہیں کسی دن گھبرا کر خودکشی پر آمادہ نہ ہو جاؤں!...... آپ کو شاید معلوم ہو عذرا خان کہ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کی نسبت ترقی یافتہ ملکوں میں خودکشی کی شرح زیادہ ہے اور اس کی اصل وجہ زندگی کی یہی بے معنویت ہے۔ کسی خواہش، کسی خواب، کسی مقصد کے بغیر زندگی گزارنا کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ شاید آپ کو ہو سکے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے سے گہرے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

زندگی میں اپنی ٹائپ کا یہ پہلا شخص مجھے ملا تھا۔ اس کا دکھ واقعی عجیب تھا اس نے جو کچھ کہا تھا غلط نہیں تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ دولت مند میں بھی تھی، شادی میں نے بھی نہیں کی تھی، مگر میری زندگی بے مقصد نہیں تھی ورنہ شاید اسی کا سا حشر میرا بھی ہوتا۔

کافی پیتے اور باتیں کرتے ہوئے کب سفر ختم ہو گیا، مجھے کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔

ڈگلس مجھے اور ذکیہ کو اپنے ساتھ لیے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آیا تو ایک لمبی سی سیاہ کار اس کی منتظر تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک قوی ہیکل حبشی شوفر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈگلس پر نظر پڑتے ہی وہ کار سے اترا اور احتراماً سر جھکا کر باری باری کار کے اگلے اور پچھلے دروازے کھول دیئے۔ میں ذکیہ کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی۔ ڈگلس، ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ کار میں بیٹھتے ہوئے حبشی ڈرائیور کی آنکھوں میں مجھے عجیب سی چمک نظر آئی تھی جسے میں کوئی معنی نہ دے سکی۔

سفر کے دوران ہی ڈگلس نے اپنی قیام گاہ کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ اس کی کوٹھی اسکندریہ کی ایک مشہور آبادی ساحل انجمی میں تھی۔ یہ آبادی سمندر کے کنارے تھی۔ سیاح عموماً اسکندریہ کے اسی علاقے میں قیام کرتے ہیں کیونکہ یہ علاقہ پرفضا اور نہایت خوبصورت ہے۔

ڈگلس کی قیام گاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ تھا کہ اس کی کوٹھی کسی چھوٹے محل سے کم نہیں ہو گی۔ وہاں پہنچ کر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ اس کی کوٹھی کافی وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔

سیاہ کار، کوٹھی میں داخل ہونے کے لیے ایک بلند آہنی گیٹ کے سامنے رکی تھی، مگر اسے گیٹ کہنا شاید درست نہیں۔ وہ ایک سیاہ آہنی دیوار ہی کہی جا سکتی تھی کیونکہ مجھے اس میں پٹ نظر نہیں آ رہے تھے۔ کار روک کر ڈرائیور اترا اور اس سیاہ آہنی دیوار کے قریب گیا جس کی دائیں جانب اس نے دیوار میں لگا ہوا کوئی بٹن دبا دیا۔ میں کیونکہ کار میں بیٹھی ہوئی تھی اس لیے صرف یہ محسوس کر سکی کہ بٹن دبانے کے بعد ڈرائیور نے دیوار کے قریب ہو کر کچھ کہا تھا اور پھر جواباً دیوار کے اندر لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر پر کسی کی آواز سن کر دوبارہ کار میں آ بیٹھا تھا۔ یقیناً وہ انٹرکام سسٹم تھا، مگر میں حیران تھی کہ جب بظاہر آہنی دیوار میں کوئی شگاف نظر نہیں آ رہا تو کس طرح کار اندر داخل ہو گی؟ مگر چند ہی لمحے بعد مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ وہ آہنی گیٹ یا سیاہ دیوار، زمین کے اندر دھنستی چلی گئی اور کار کے لیے راستہ بن گیا۔ حبشی ڈرائیور نے اس وقت کار آگے بڑھائی تھی جب وہ گیٹ زمین میں قطعی طور پر غائب ہو گیا تھا۔ اندر پہنچتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا تو گیٹ دوبارہ اپنی جگہ نظر آ رہا تھا۔ وہاں اردگرد کوئی نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس گیٹ کو عمارت کے اندر سے کنٹرول کیا جاتا ہو گا۔ مجھے یہ حفاظتی بندوبست پسند آیا۔ مگر ڈگلس کو اس کی کیا ضرورت تھی، یہ بات سمجھ میں نہ آ سکی۔

کوٹھی کے گیٹ سے عمارت تک پہنچنے کے لیے پختہ اور ہموار سڑک بنی ہوئی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب گھنے پیڑ تھے اور کچھ فاصلے سے روشنی کا بندوبست بھی تھا۔ میں اردگرد کا جائزہ لیتی ہوئی چل رہی تھی۔ آگے جا کر سڑک بائیں جانب مڑ گئی اور عمارت نظر آنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور نے ہمیں عمارت کے صدر دروازے پر اتار دیا۔ دروازے تک پہنچنے کے لیے چند سیڑھیاں چڑھنا پڑیں۔ ڈگلس ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے کار کا ڈرائیور میرے اور ذکیہ کے سوٹ کیس اٹھائے آ رہا تھا۔

"یہ میرا مہمان خانہ ہے۔" ڈگلس نے آگے بڑھ کر عمارت کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

دروازہ کھلتے ہی ایک ناگوارسی بو آئی۔ یہ بو ویسی ہی تھی جیسی پہلی بار میں نے جہاز میں محسوس کی تھی۔ ڈگلس کیونکہ مستقلاً ہمارے ساتھ تھا اس لیے شاید ہماری قوت شامہ اس کی عادی ہوگئی تھی۔ یہاں یہ بو کچھ زیادہ تھی اس لیے میں نے اسے محسوس کرلیا تھا۔ اس عمارت میں داخل ہوتے وقت نہ جانے کیوں میں نے اپنے حواس پر کچھ بوجھ سا محسوس کیا۔ غالباً یہی حال ذکیہ کا بھی تھا جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

''آپ دونوں کسی ایک ہی کمرے میں آرام کرنا پسند کریں گی یا الگ الگ کمروں میں؟'' ڈگلس نے ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''ایک ہی کمرہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہتر ہے۔'' یہ کہہ کر ڈگلس بائیں جانب ایک راہداری میں مڑ گیا۔

ذرا ہی دیر بعد ہم ایک بڑے سے کمرے میں تھے۔ وہاں کچھ فاصلے سے دو بیڈ بچھے ہوئے تھے اور ضروریات کی تمام ہی چیزیں موجود تھیں۔ ڈرائیور نے ہمارے سوٹ کیس، دیوار میں بنی ہوئی ایک الماری کے سامنے رکھ دیئے اور پھر ڈگلس کا اشارہ پا کر وہاں سے چلا گیا۔

''ادھر...... وہ اٹیچ باتھ ہے۔'' ڈگلس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''شکریہ!'' میں نے اخلاقاً کہا اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

دونوں مسہریوں کے سرہانے ایک ایک تپائی پر دو انٹرکام سیٹ رکھے ہوئے تھے۔

''میرا نمبر ایک ہے۔'' ڈگلس نے بتایا۔ ''اگر آپ کو مجھ سے بات کرنا ہو تو ایک نمبر دبا دیں، کچن روم کا نمبر پانچ ہے...... ہاں یاد آیا...... یہ تو میں بھول ہی گیا تھا!...... کچھ کھائیں گی آپ لوگ؟''

''ہاں ضرور!'' میں نے بے تکلفی سے کہہ دیا۔ مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔ بھاگ دوڑ کے دوران میں مجھے رات کا کھانا کھانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

ڈگلس نے آگے بڑھ کر انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا اور پھر کھانے کے متعلق ہدایات دینے لگا۔ پھر انٹرکام کا ریسیور رکھ کر بولا۔ ''کل صبح میں آپ لوگوں کو اپنی کوٹھی کی سیر کراؤں گا۔ یہاں میں نے ایک میوزیم بھی بنایا ہے۔ وہ یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ اس عمارت کے بعد ہی میوزیم کی عمارت ہے۔''

''وری گڈ!'' میں مسکرا کر بولی۔ ''گویا یہاں آپ نے ایک اپنی ہی دنیا الگ بسا رکھی ہے۔''

''سب جی بہلاوا ہے اور کچھ بھی نہیں۔'' وہ طویل سانس لیتے ہوئے کہنے لگا ''آیئے، کھانا لگنے تک ادھر بیٹھتے ہیں۔'' اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔ اس طرح چار پانچ آرام دہ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن کے درمیان ایک سینٹر ٹیبل بھی نظر آ رہی تھی۔

ہم دبیز قالین پر چلتے ہوئے کرسیوں پر آ بیٹھے۔

''آپ کی بہن بہت کم گو ہیں شاید۔'' ڈگلس نے ذکیہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''بڑوں کی موجودگی میں ذرا کم ہی بولتی ہوں میں!'' ذکیہ پہلی بار بولی اور نظر اٹھا کر ڈگلس کی طرف دیکھا۔

ان دونوں کی نظریں ملیں اور میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ میری ہی طرح ذکیہ بھی جیسے

پلکیں جھپکانا بھول گئی ہے۔ پھر خود ہی ڈگلس نے اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔

اس وقت مجھے جانے کیوں جیکب یاد آ گیا۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ اس کی آنکھوں میں ایسی ہی کشش تھی۔ جیکب وہی تھا جو مجھے ہپناٹائز کر کے پاکستان سے قاہرہ لے آیا تھا اور پھر شیخ سالم کے آدمیوں نے اسے قتل کر دیا تھا۔ کہیں ڈگلس بھی تو ہپناٹسٹ نہیں؟ میرے ذہن میں خیال ابھرا۔ پھر میں نے خود ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ میں نے سوچا کہ خطرات سے نبرد آزما ہوتے ہوتے میں خواہ مخواہ شکی مزاج ہوگئی ہوں۔ ہر شخص کو میں شک وشبے کی نظر سے دیکھنے لگی ہوں۔

کچھ دیر کے بعد انٹرکام پر بتایا گیا کہ مہمان خانے کے ڈائننگ روم میں کھانا لگا دیا گیا ہے۔

ڈگلس نے ڈائننگ روم تک ہماری رہنمائی کی۔ وہاں مجھے دو باوردی ملازم مستعد کھڑے نظر آئے۔ انہوں نے ہی ہمارے لیے کرسیاں سرکائیں اور جب ہم بیٹھ گئے تو وہ مودب انداز میں ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

کھانا لذیذ تھا۔ پھر یہ کہ بھوک بھی خاصی تھی۔ میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اخلاقاً ڈگلس نے بھی ہمارا ساتھ دیا حالانکہ وہ لنچ کر چکا تھا۔

میں گزشتہ رات بھی نہیں سو سکی تھی اس لیے بستر پر دراز ہوتے ہی نیند آنکھوں میں کروٹیں لینے لگی۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے میں نے ٹیوب لائٹس آف کر کے زیرو واٹ کا نیلا بلب جلا دیا تھا۔ اس کے علاوہ میں کمرے کا دروازہ بند کرنا بھی نہیں بھولی تھی۔

سونے سے پہلے میں نے ذکیہ کو ''خدا حافظ'' کہا اور پھر دوسری طرف کروٹ لے لی۔ کچھ ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔

سوتے سوتے اچانک میرے ذہن میں روشنی کا تیز جھماکا سا ہوا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میری چھٹی حس کسی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔ میرے حیرت انگیز ذہن نے مجھے شاید اسی لیے بیدار کر دیا تھا۔

معاً میری نگاہ کچھ فاصلے پر اس جگہ پڑی جہاں ذکیہ ایک مسہری پر سوئی تھی۔ مسہری اپنی جگہ سے غائب تھی اور اس کی جگہ مجھے ایک چوکور سا خلا نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ ابھی میں کچھ سمجھ نہ سکی تھی، یہ کیا معما ہے کہ اسی خلا سے مسہری اوپر اٹھنے لگی، مگر اب وہ خالی تھی اس پر ذکیہ نہیں تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مسہری بالکل پہلے کی طرح اپنی جگہ پر آ کر رک گئی عین اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خود میری مسہری زمین کے اندر دھنسنے لگی ہو۔ میں اچھل کر بیٹھ گئی۔ میرا احساس غلط نہیں تھا۔ میری مسہری واقعی کمرے کے فرش میں نصف سے زیادہ دھنس چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے مسہری سے چھلانگ لگا دی۔

اب میں ایک طرف کھڑی ہوئی اپنی مسہری کو کمرے کے فرش میں پیدا ہونے والے خلا کے اندر غائب ہوتا دیکھ رہی تھی۔ کمرے کے فرش پر بچھا ہوا قالین یقیناً مسہریوں کی چاروں طرف سے کٹا ہوا تھا۔ میرے ذہن سے اب بڑی حد تک غنودگی کا غبار چھٹ چکا تھا۔ میں نے اسی لیے آگے بڑھ کر اس خلا میں جھانکا۔ اس تاریک خلا کی سطح میں مجھے ہلکی سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ مسہری غالباً رک چکی تھی۔ میری سمجھ میں اب تک یہ نہیں آ سکا تھا کہ آخر یہ چکر کیا ہے! اچانک مجھے ڈگلس کا خیال آیا میں لپک کر

انٹرکام تک پہنچی اور اس کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر پر انگلی رکھ دی۔ دوسری طرف مجھے بیل بجنے کی آواز سنائی دیتی رہی میں نے انگلی نہیں ہٹائی۔ ذرا دیر بعد ریسور ی اٹھالیا گیا۔

''کون ہے؟...... کیا بات ہے؟'' دوسری جانب سیڈگلس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کی آواز سن کر مجھے سکون وطمانیت کا احساس ہوا۔

''میں...... میں عذرا خان ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا، پھر جو کچھ دیکھا تھا تیزی کے ساتھ بیان کر دیا۔

''یہ انجلا کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ آپ بے فکر رہیں میں......''

''انجلا کون ہے؟'' میں نے ڈگلس کی بات کاٹ کر پوچھ لیا۔

''وہ ایک نیم پاگل، مگر قابل رحم لڑکی ہے۔ میرے ملازمین اسے شاید آج رات اس کے تابوت میں بند کرنا بھول گئے ہوں گے۔''

''تابوت میں؟'' میں حیرت سے بولی۔

''ہاں اسے اپنے تابوت ہی میں پرسکون نیند آتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ مر چکی ہے۔ خود کو وہ ایک بھٹکتی ہوئی روح سمجھتی ہے۔ میرے ملازمین ہی کی بے احتیاطی کی وجہ سے اس عمارت کا خفیہ میکنزم اسے معلوم ہو گیا ہے۔ بہرحال فکر کی کوئی بات نہیں میں آ رہا ہوں۔''

ڈگلس سے گفتگو کے دوران میں میری مسہری اس تاریک خلا سے ابھر کر دوبارہ اپنی جگہ آ چکی تھی۔ ہر چند کہ ڈگلس سے گفتگو کے بعد بڑی حد تک میں مطمئن ہو چکی تھی، لیکن ذکیہ کے اس طرح غائب ہونے سے مجھے فکر ضرور تھی۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ آخر اس خفیہ میکنزم کی یہاں ضرورت کیا تھی؟ میری نظر میں ڈگلس کی شخصیت پراسرار سی ہوتی جا رہی تھی۔

میں ڈگلس کی آمد کے انتظار میں ٹہلنے لگی۔ کمرے کا دروازہ ابھی تک اندر سے بند تھا جسے اب میں اسی وقت کھولتی جب ڈگلس دستک دیتا اور میں اس کی آواز سن کر تصدیق کر لیتی کہ دستک دینے والا وہی ہے۔ ٹہلتے ٹہلتے معاً مجھے کمرے میں عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا، اسی کے ساتھ ایک بو بھی محسوس ہوئی، چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' میں نے بہ مشکل پوچھا کیونکہ میرے ذہن پر غنودگی سی چھانے لگی تھی اور سر چکرا رہا تھا۔

''میں ڈگلس ہوں، عذرا خان! دروازہ کھولیے۔

میں اپنے جسم کی تمام تر قوت جمع کر کے لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔ بڑی مشکل میں دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی اور چٹخنی کھول دی۔ پھر میں اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ میں، ڈگلس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی تھی۔ ہوش و حواس کھونے سے پہلے میں نے ڈگلس کی آواز سنی تھی۔ اس نے کسی سے کہا تھا کہ اسے بھی نیچے تہ خانے میں لے آؤ!

مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو آپریشن ٹیبل سے ملتی جلتی لمبی سی ایک میز پر دراز پایا۔ میرا جسم چمڑے کے تسموں سے جکڑا ہوا تھا۔ میں صرف اپنے سر کو اپنی مرضی سے حرکت دے سکتی تھی۔ میرے جسم پر

ایک سفید چادر پڑی تھی جس کا کچھ درمیانی حصہ غائب تھا جس کے سبب سینے کے نیچے سے لے کر ناف تک میرا پیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس سفید چادر کے سوا مجھے اپنے جسم پر کوئی اور لباس محسوس نہیں ہوا۔ میری دائیں جانب بالکل اسی حالت میں ذکیہ تھی۔ وہ بھی ایسی ہی ایک میز پر دراز تھی مگر ابھی تک اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ میری بائیں طرف بھی ایسی ہی ایک میز تھی اور اس پر بھی ایک غیر ملکی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہوش میں تھی اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں وحشت سی نظر آ رہی تھی۔ اسی میز کی دوسری جانب مجھے ڈگلس کھڑا ہوا دکھائی دیا جس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اسی کے قریب اس کا حبشی ڈرائیور کھڑا تھا۔ سامنے ہی دیوار کے سہارے مجھے تین تابوت کھڑے نظر آ رہے تھے جن میں غالباً حنوط شدہ لاشیں تھیں۔

''عذرا خان! اچھا ہوا تمہیں ہوش آ گیا!'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''کچھ ہی دیر بعد تم ایک سنسنی خیز منظر دیکھو گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ یہی وہ نیم پاگل لڑکی انجلا ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ میں تمہارے سامنے اس کا پیٹ چاک کر کے تمام آلائش نکال دوں گا اور پھر اس کے پیٹ میں مسالا بھر کر اسے سی دوں گا۔ اس کے بعد اس کے جسم کو حنوط کرنے کے لیے مخصوص مسالا لگایا جائے گا۔ میں اس کا پیٹ چاک کرنے سے پہلے اسے بے ہوش بھی کر سکتا تھا مگر اس طرح مجھے اس کی آخری چیخیں سنائی نہیں دیں گی۔ پھر خود تمہارے اور تمہاری بہن کے جسم کو بھی میں اسی طرح ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لوں گا۔

''تم...... تم پاگل ہو...... وحشی ہو، دیوانے ہو...... درندے ہو! میں چیخ اٹھی۔

''مجھے معاف کر دینا عذرا خان! اب میری زندگی میں یہی ایک لذت رہ گئی ہے کہ مرتے ہوئے لوگوں کی آخری چیخیں میرے لیے سکون کا سبب ہوں۔ جس دن مجھے اس کھیل میں بھی لذت محسوس نہ ہوئی، میں اس کھیل سے بھی اکتا گیا، وہ دن شاید میری زندگی کا آخری دن ہو گا! وہ بولا

ڈگلس کے جسم پر اس وقت ایسا لباس تھا جو عموماً ڈاکٹر حضرات آپریشن کرتے ہوئے پہنتے ہیں۔ قریب ہی ایک اسٹینڈ پر ایک ٹرے رکھی تھی جس میں تیز دھار نشتر چمک رہے تھے۔ حبشی گویا اسے اسسٹ کر رہا تھا۔ وہ بھی سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا۔

اب میں اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ ایک خطرناک پاگل کے چنگل میں پھنس چکی ہوں۔ میں نے فوری طور پر اپنے ذہن کی حیرت انگیز خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا اور ڈگلس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

میں نے دوسرے ہی لمحے ڈگلس کو چونکتے دیکھا۔ وہ اس وقت اپنے حبشی ملازم سے ایک نشتر اٹھانے کے لیے کہہ رہا تھا تاکہ اس لڑکی کا پیٹ چاک کر سکے۔

حبشی نے اسے ایک نشتر ٹرے سے اٹھا کر دے دیا۔ ڈگلس کا ذہن شدید مزاحمت کر رہا تھا کہ میں اس سے رابطہ قائم کر کے اسے گرفت میں نہ لے سکوں۔ اس کے چہرے پر مجھے الجھن کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ یقیناً غیر معمولی ذہن کا مالک تھا۔ وہ شاید انہی لوگوں میں سے ایک تھا جن کے ذہن پر تصرف میرے لیے ناممکن ہوتا تھا۔ انہی میں سے ایک ڈاکٹر رچرڈ تھا اور دوسرا جرمن سائنس دان شیفرڈ ان

دونوں کے ذہن بھی میرے زیراثر نہ آ سکے تھے۔ اس کے باوجود میری کوشش جاری تھی۔

”لو یہ دیکھو عذرا خان! ...... ابھی جب میں شگاف لگاؤں گا تو ایک حسین منظر نظر آئے گا۔ تمہیں خون کا فوارہ بلند ہوتا نظر آئے گا اور اس کے ساتھ اس لڑکی کی چیخیں بھی تم سنو گی۔“ ڈگلس نے مجھے مخاطب کیا۔

میں اسی کی طرف دیکھ رہی تھی، مگر میرا ذہن اپنی کوشش میں اب بھی مصروف تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اس بے گناہ لڑکی کو اس وحشی کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا لوں۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ڈگلس نے نوک دار نشتر لڑکی کے پیٹ میں اتار دیا۔ اسی کے ساتھ لڑکی بھیانک انداز میں چیخ اٹھی۔ وہ یقیناً نیم پاگل ہی رہی ہو گی ورنہ اب تک اسے ڈگلس کی خوف ناک باتیں سن کر چیخ اٹھنا چاہئے تھا۔ نشتر ہٹتے ہی خون کی پھوار بلند ہونے لگی۔ ڈگلس نے یقیناً دانستہ تھوڑا سا شگاف کیا تھا تا کہ لڑکی کے تڑپنے، خون بہنے اور چیخنے سے اپنی دانست میں لطف اندوز ہو سکے۔ ڈگلس کی نظریں بلند ہوتی خون کی پھوار پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر عجیب سا سکون نظر آ رہا تھا۔ لڑکی کے منہ سے نکلنے والی کرب آمیز چیخوں نے میرا ذہنی ارتکاز برقرار نہ رہنے دیا میں ڈگلس کو روکنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ خود میرا اور ذکیہ کا بھی ڈگلس کے ہاتھوں یہی حشر ہونے والا تھا۔ ڈگل یقیناً ایک خطرناک قسم کا اذیت پسند تھا۔ چند ہی لمحے بعد اس نے لڑکی کے پیٹ پر دوسری جگہ شگاف ڈالا۔ اس شگاف سے بھی خون کا فوارہ بلند ہوا۔ اسی کے ساتھ ڈگلس بالکل وحشیوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ پھر وہ پے در پے شگاف پر شگاف لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ لڑکی چیختے چیختے خاموش ہو گئی۔ خاصی مقدار میں خون بہہ جانے کے سبب وہ شاید زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔

”عذرا خان!“ ڈگلس پھر ایک بار مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اب تم دیکھو گی کہ میں اس کے پیٹ میں ہاتھ ڈال کر کس طرح ساری آلائش نوچتا ہوں! میں اس خوبصورت لڑکی کے اندر بھری ہوئی ساری گندگی باہر نکال کر پھینک دوں گا تا کہ اس کے پیٹ میں مسالا بھرا جا سکے۔ تم یہی منظر ابھی ایک بار اور بھی دیکھ سکو گی جب یہی سب کچھ تمہاری بہن کے ساتھ ہو گا اور پھر خود تمہاری باری آ جائے گی۔ میری ممیوں کے ذخیرے میں دو ہم شکل بہنوں کی ممیاں یقیناً نئی چیز ہوں گی۔“

ڈگلس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسی پر عمل کرے گا۔ میں اپنے اندر چھپی ہوئی تمام تر حیرت انگیز قوتوں کے باوجود اس کے سامنے بے بس ہو کے رہ گئی تھی۔ اس احساس نے میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑا دی۔ موت تو خیر بارہا میرے قریب آ کر لوٹ چکی تھی مگر میں نے اپنے آپ کو اتنا مجبور محسوس نہیں کیا تھا۔ میرے اس احساس کا بڑا سبب ذکیہ تھی۔ مجھے خود سے زیادہ خیال اس کا تھا۔ اگر میں تنہا ہوتی تو شاید میرے احساسات مختلف ہوتے۔

”تم خاموش کیوں ہو عذرا خان؟ کچھ بول کیوں نہیں رہیں۔“ وہ مجھے خاموش دیکھ کر کہنے لگا۔ ”گڑگڑاؤ نا میرے سامنے! ...... رحم کی اپیل کرو مجھ سے! ...... اس وقت زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ رحم کی بھیک مانگتے ہوئے لوگ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں نے اسی لیے تو تمہارے سامنے اس لڑکی کو تڑپا تڑپا کر قتل کیا ہے..... تم پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا کیا؟ کیا تم ہراساں نہیں ہوئیں؟.....

تمہیں تو خوف زدہ ہو کر چیخ اٹھنا چاہئے تھا!“

”ڈگلس! تم بیمار ذہن کے انتہائی پست آدمی ہو!“ میں نفرت سے بولی۔ ”تمہارا وجود آدمیت کے نام پر دھبا ہے اور سنو! تمہیں سخت غلط فہمی ہے کہ موت اور زندگی پر تمہارا اختیار ہے۔ یہ لڑکی جسے تم نے اپنی دانست میں اپنے اختیار کے سبب قتل کر دیا ہے، اس کی موت اسی طرح لکھی تھی اور.....“

”اور۔ تم دونوں بہنوں کی موت بھی میرے ہاتھوں، اسی طرح لکھی ہے!“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا، پھر زور سے ہنس دیا۔ ”تقدیر!...... احمقوں کا سہارا! تا کہ وہ سکون سے مر سکیں اور تم بھی یقیناً اسی طرح مرنا چاہتی ہو، مگر میں تمہیں سکون سے نہیں مرنے دوں گا۔ تمہیں مجھ سے رحم کی بھیک مانگنا ہی پڑے گی! اگر تم اسی طرح سکون سے مر گئیں تو اسے میں اپنی توہین سمجھوں گا...... اور آج تک میرے ہاتھوں قتل ہونے والوں میں سے کوئی میری توہین کی ہمت نہیں کر سکا۔ اچھا پہلے ایک اور حسین منظر دیکھو! ممکن ہے تمہیں اس سے کچھ عبرت حاصل ہو!“ یہ کہہ کر ڈگلس نے مقتول لڑکی کے چاک شدہ پیٹ میں ہاتھ ڈالا، پھر ایک جھٹکے سے اس کی آنتیں باہر نکال لیں۔

یہ منظر میرے لیے سوہان روح تھا۔ میں نے اسی لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس لڑکی کو قتل ہونے سے نہیں بچا سکی تھی، اس کے باوجود ایک بار پھر ڈگلس کے ذہن کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ اب وہ یہی ہولناک کھیل میری بہن ذکیہ کے ساتھ بھی کھیلنے والا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ناپاک اور مذموم عزائم میں کامیاب ہوتا، مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اس کے ذہن پر اندھیرے کی دبیز چادر سی تنی ہوئی تھی۔ میں اس چادر میں شگاف ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی دونوں آنکھیں بند کر لینے کی وجہ سے مجھے ذہنی یکسوئی حاصل ہو گئی تھی۔

”ارے!...... تم نے تو آنکھیں بند کر لیں! ...... ہو گئیں نا آخر خوف زدہ۔“ مجھے ڈگلس کی آواز سنائی دی۔ ”آنکھیں کھولو عذرا خان! دیکھو کہ میں نے کتنی مہارت اور صفائی کے ساتھ اس کی آنتیں نکال لی ہیں اور اب انہیں اس کے جسم سے الگ کر کے پھینک رہا ہوں۔ دیکھو کہ بظاہر جو لڑکی بے حد حسین نظر آتی تھی، اندر سے کتنی گندی تھی۔“

اس کے بار بار کہنے کے باوجود میں بدستور آنکھیں بند کیے رہی۔

”آنکھیں کھول دو عذرا خان!“ مجھے اس کی آواز نسبتاً قریب سے سنائی دی، اسی کے ساتھ اس کے قدموں کی چاپ بھی ابھری تھی وہ کہہ رہا تھا ”میں تمہیں آنکھیں کھولنے پر مجبور بھی کر سکتا ہوں! تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ اس وقت قطعی طور پر میرے رحم و کرم پر ہو...... کھولو آنکھیں!“ وہ یقیناً میرے قریب پہنچ چکا تھا۔

پھر اس نے ایک ایسی ناشائستہ اور ذلیل حرکت کی کہ میں برداشت نہ کر سکی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور پھر اسے برا بھلا کہنے لگی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس وقت آپے سے باہر ہو گئی تھی اور جو منہ میں آ رہا تھا کہے جا رہی تھی۔

وہ زور زور سے ہنس رہا تھا اور اس کے ہنسنے سے میرے غصے میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

”دیکھا تم نے! میں کس طرح اپنی بات منوا لیتا ہوں!“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

ڈگلس اس وقت آدمی کی بجائے مجھے کوئی خونخوار درندہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خون آلود تھے اور سفید کپڑوں پر بھی جگہ جگہ خون کے چھینٹے تھے۔

''دیکھو اب میں تمہیں اس لڑکی کے دونوں گردے نوچ کر دکھاتا ہوں! مگر آنکھیں بند نہ کرنا ورنہ.....'' اس نے اپنا جملہ دھمکی آمیز انداز میں ادھورا چھوڑ کر اپنے ہاتھ کی حرکت سے ایک نازیبا اشارہ کیا اور میں دانت پیس کر رہ گئی۔

پھر وہ میری میز سے ہٹ کر مقتول لڑکی کی میز تک پہنچ گیا۔ مجبوراً مجھے وحشت و درندگی کا وہ نظارہ دیکھنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے مقتولہ کے دونوں گردے نکال لیے تھے اور انہیں گیند کی طرح فضا میں اچھال کر لپک رہا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کے منہ سے قہقہے ابل رہے تھے۔ معاً مجھے انہی قہقہوں کے درمیان تیز چیخیں سنائی دیں اور میں نے چونک کر دائیں جانب دیکھا، یہ چیخیں یقیناً ذکیہ ہی کی تھیں۔ اس دوران میں اسے نہ جانے کب ہوش آ گیا تھا!

''یہ بہت اچھا ہوا!'' ڈگلس قہقہے لگاتے ہوئے رک کر بولا۔ پھر وہ ذکیہ کے قریب پہنچ گیا۔

''دیکھو...... ادھر اس میز پر جو لاش پڑی ہے نا، اس کا پیٹ چاک کر کے میں نے یہ دونوں گردے نکالے ہیں۔ اسی طرح اب میں تمہارا پیٹ چاک کروں گا۔''

''نہیں! نہیں!'' ذکیہ وحشت زدہ آواز میں اتنی قوت سے چیخی کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔

میرے لہجے میں شاید بے بسی تھی اسی لیے ڈگلس نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر وہ میرے قریب آ گیا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اپنی بہن کی خاطر اب تم مجھ سے رحم کی بھیک مانگنے پر راضی ہو جاؤ گی!''

''نہیں!'' میں سختی سے بولی۔ ''رحم کی درخواست انسانوں سے کی جاتی ہے، درندوں سے نہیں..... اور تم...... یقیناً ایک خطرناک درندے ہو ڈگلس...... ہاں میں تم سے یہ ضرور کہوں گی کہ ذکیہ کی بجائے تم پہلے مجھے اپنی درندگی کا نشانہ بنا دو!''

''ہرگز نہیں!'' وہ گویا فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ 'میں تمہاری یہ بات قطعی نہیں مانوں گا۔ پہلے تمہاری بہن ہی کے پیٹ میں نشتر اترے گا! میں بھی تو دیکھوں کہ تم کب تک پتھر بنی رہتی ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے حبشی ملازم کو مخاطب کیا۔ ''اسٹینڈ اب ادھر لا کر رکھ دو!...... اب دوسرا شکار میرا منتظر ہے۔''

حبشی نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ اسٹینڈ، ذکیہ کی میز کے پاس لا کر رکھ دیا جس پر رکھی ہوئی ٹرے میں چھوٹے بڑے کئی تیز نشتر چمک رہے تھے۔

ڈگلس دوبارہ ذکیہ کے قریب چلا گیا اور پھر اس نے ٹرے سے ایک نشتر اٹھا کر ذکیہ کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''یہ تیز نشتر ابھی چند لمحے بعد ہی تمہارے پیٹ میں شگاف ڈال دیگا جس سے گرم گرم خون ابلنے لگے گا اور......''

اسی لمحے ذکیہ نے زور کی چیخ ماری اور ڈگلس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''بہت ہی بزدل ہے تمہاری بہن!'' ڈگلس میری طرف رخ کر کے بولا۔ ''اتنی سی بات پر دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ اب مجھے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''تمہارا مقصد اسے قتل ہی کرنا ہے تو پھر ہوش میں آنے کا انتظار کیسا!'' میں بول اٹھی۔

''کیا تم اب تک یہ نہیں سمجھ سکیں عذرا خان کہ میرا مقصد محض قتل کرنا نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ غفلت یا بے ہوشی میں کسی کو قتل کرنا میرے نزدیک بالکل فضول ہے۔ جب تک قتل ہونے والا چیخے اور تڑپے نہیں، قتل کا کیا فائدہ!''

اس سے کچھ کہنا، اسے کچھ سمجھانا لاحاصل ہی تھا۔ وہ شرافت و انسانیت کی تمام حدود عبور کر چکا تھا۔ میں نے اسی لیے مزید کچھ کہنا غیر ضروری خیال کیا اور جواباً خاموش ہو گئی۔

''اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو!'' اس نے اپنے حبشی ملازم کو حکم دیا۔

وہ حبشی ملازم بھی مجھے ڈگلس ہی کی طرح شقی القلب معلوم ہوتا تھا۔ ڈگلس نے اس کا انتخاب یقیناً سوچ سمجھ کر کیا ہو گا۔ ایک بے گناہ لڑکی کو اس کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ڈگلس کا حکم سن کر وہ ایک جانب رکھی ہوئی میز سے پانی بھرا ہوا جگ اٹھا لایا اور ذکیہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

ڈگلس سے رحم کی اپیل بھی میرے نزدیک رائیگاں ہی جاتی وہ محض اپنی انا اور تسکین نفس کی خاطر مجھ سے یہ مطالبہ کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے! یہ لمحے بہت قیمتی تھے۔ مجھے انہیں کے دوران میں کچھ نہ کچھ سوچنا اور کرنا تھا۔ ذکیہ کی موت اور زندگی کے درمیان صرف اس کی بے ہوشی حائل تھی۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ ذکیہ کو جلد ہوش نہ آئے لیکن اس ہیبت ناک انجام سے بچنے کا حل یہ نہیں تھا۔

میرے دل سے نکلی ہوئی دعا اس وقت قبول ہو گئی۔ ذکیہ کو جلد ہوش نہ آ سکا، مگر آخر کب تک وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جب اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''تمہاری بہن تو بہت بہادر ہے!'' ڈگلس اس کے قریب ہو کر بولا۔ ''میں نے اس کے سامنے ادھر میز پر پڑی ہوئی لڑکی کا پیٹ چاک کر دیا، پھر اس کی آنتیں نکال کر باہر پھینک دیں، گردے نوچ لیے مگر وہ عذرا نہیں ڈری، پھر تم کیوں اتنا ڈر رہی ہو بولو۔'' ڈگلس کا لہجہ خوف زدہ کر دینے والا تھا۔

ذکیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈگلس کو دیکھتی رہی مگر بولی کچھ نہیں۔ شاید شدید خوف کے سبب اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''سنو لڑکی! ڈگلس نے ذکیہ کو پھر مخاطب کیا۔'' تمہاری موت میں اب بہت کم وقت رہ گیا ہے۔'' نشتر ابھی تک ڈگلس کے ہاتھ میں تھا۔ ''یہ تیز نشتر میں بہت جلد تمہارے پیٹ میں اتار دوں گا اس لیے اگر تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو!'' ڈگلس نے ذکیہ کی آنکھوں کے سامنے نشتر گھمایا۔ ''تم دیکھ رہی ہو، بڑی تیز دھار ہے اس کی...... ہاں بولو! مرنے سے پہلے کچھ تو بولو!...... کچھ اور نہیں تو رحم کی بھیک ہی مانگ لو مجھ سے!...... ممکن ہے اس طرح میرا دل نرم پڑ جائے اور میں تمہیں قتل نہ کروں!'' ڈگلس کے لہجے سے عیاری جھلک رہی تھی۔ وہ ذکیہ کے ساتھ چوہے اور بلی والا کھیل کھیل رہا تھا۔

''خدا...... خدا...... خدا کے لیے......'' ذکیہ یقیناً بہ مشکل بول رہی تھی۔ ''خدا کے لیے...... رحم کھاؤ مجھ پر!''

اسی وقت ڈگلس کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے ذکیہ کے منہ پر الٹا طمانچہ جڑ دیا، پھر برہم آواز میں بولا۔ ''بدقسمت لڑکی! ...... گڑگڑاؤ! روؤ، چیخو، چلاؤ!''

اس کا زوردار طمانچہ کھا کر ذکیہ سسکی لے کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

اچانک کہیں قریب ہی تیز آواز میں گھنٹی بجنے لگی۔ ڈگلس چونک اٹھا اور نشتر ٹرے میں رکھ دیا۔

پھر اس نے اپنے حبشی ملازم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جاؤ اوپر جا کر انٹرکام پر معلوم کرو، کیا بات ہے!''

حبشی ملازم اثبات میں سر ہلا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ معلوم نہیں ڈگلس نے تہ خانے میں انٹرکام کیوں نہیں لگوایا تھا! وہ اب ذکیہ کے پاس سے ہٹ کر کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے اضطراب نمایاں تھا اور چہرے پر کسی قدر جھنجلاہٹ بھی نظر آ رہی تھی۔ اسے غالباً اس وقت کسی قسم کی مداخلت کی توقع نہ رہی ہوگی۔ اس کی جھنجلاہٹ کی وجہ شاید یہی مداخلت تھی۔ میری نظریں اسی کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔

اب حبشی ملازم کو واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس سے پہلے کہ ڈگلس کچھ پوچھتا وہ خود ہی بول اٹھا۔ ''قاہرہ سے عبداللہ کا فون تھا، وہ آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔''

''پھر؟ ...... تم نے کیا کہہ دیا اس سے؟'' ڈگلس نے سوال کیا، پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ''رات ہی کو تو میں وہاں سے آیا ہوں! آخر ایسی کیا ضرورت آ پڑی کہ اس نے......''

''میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ آپ خود ہی اس سے فون پر رابطہ قائم کر کے بات کر لیں گے۔'' حبشی ملازم نے کہا۔

''تم نے اس سے فون کرنے کی وجہ دریافت کی؟'' ڈگلس نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' حبشی نے جواب دیا۔ ''آج صبح ہی صبح ...... فون کرنے سے ذرا پہلے ایک پولیس انسپکٹر عبداللہ سے ملا تھا۔ عبداللہ کا کہنا ہے کہ قاہرہ کی پولیس کو نہ جانے کس طرح یہ سراغ مل گیا ہے کہ چند ماہ پہلے یہ لڑکی آپ سے ملتی رہی ہے۔'' حبشی ملازم نے مقتولہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''پولیس اسی سلسلے میں، یعنی اس لڑکی کی پراسرار گمشدگی کے متعلق آپ سے پوچھ گچھ کرنا چاہتی ہے۔ فی الحال عبداللہ نے آپ کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا ہے کہ اسے نہیں معلوم، آپ کہاں ہیں! عبداللہ آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پولیس والوں کو اسکندریہ کا پتا دیا جائے یا نہیں! کیونکہ اس طرح آپ کے غائب رہنے سے پولیس کو آپ پر شبہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں بات کر لوں گا اس سے! ...... اس ناوقت فون نے سارا مزہ کرکرا کر دیا...... آؤ اب ادھر آ جاؤ!'' ڈگلس یہ کہتا ہوا ذکیہ کی میز کی طرف بڑھنے لگا۔

''ڈگلس! معاً میں نے اسے درمیان میں روک لیا۔ پولیس اب تمہاری راہ پر لگ چکی ہے اور تمہارا انجام بہت قریب ہے اس لیے......''

''فی الحال تو مجھے تمہارا انجام قریب نظر آ رہا ہے عذرا خان!'' وہ میری بات کاٹ کر مجھے تمسخرانہ انداز میں دیکھنے لگا۔ ''تم بار بار خواہ مخواہ احمقانہ باتیں کرنے لگتی ہو کیوں نہ میں تمہاری بہن کی بجائے پہلے تمہی کو موت کا مزہ چکھا دوں! ...... تم نے خود بھی یہی خواہش کی تھی!

''ایسی صورت میں تمہاری ممنون ہوں میں!'' میں فوراً بول اٹھی۔ اس طرح میں اپنی بہن کو تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھنے کی اذیت سے بچنا چاہتی تھی۔

ڈگلس کے کہنے پر حبشی ملازم، نشتروں کی ٹرے والا اسٹینڈ میری میز کے پاس اٹھا کر لے آیا۔

''مجھے اعتراف ہے عذرا خان کہ میری نظر سے تم ایسی بہادر اور باحوصلہ لڑکی نہیں گزری۔'' ڈگلس نے ٹرے سے ایک بڑا نشتر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''موت کو اتنے قریب دیکھنے کے باوجود تمہارے چہرے کا اطمینان حیرت انگیز ہے۔''

''با...... باجی...... جی...... ای......'' اچانک ذکیہ چیخ اٹھی۔

''صبر...... صبر کرو ذکیہ!'' میں نے ڈگلس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نشتر کو اپنے جسم کے قریب ہوتے دیکھا۔

''خدا حافظ ذکیہ! ...... خدا حافظ! مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اب میں زندہ نہیں بچ سکوں گی اسی لیے ذکیہ کو خدا حافظ کہہ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور زیر لب کلمہ پڑھنے لگی۔

☆......☆......☆

یقینی موت کو روبرو دیکھ کر انسان کے دو ہی ردعمل ہوتے ہیں، یا تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے یا پھر بہادری کے ساتھ اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ میری ہنگامہ آرا زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئے جب موت مجھے اپنی رگ جاں سے بہت قریب محسوس ہوئی، لیکن میرے حواس برقرار رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں موت کو جل دے کر نکل گئی۔ اس وقت بھی اپنی موت کا یقین ہونے کے بعد کلمہ پڑھتے ہوئے میں نے حواس نہیں کھوئے تھے۔ میرا ذہن پوری طرح بیدار تھا۔ معاً میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا اور پھر مجھے موت کے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آ گئی۔ اگر روشنی کی یہ کرن مجھے کچھ دیر پہلے نظر آ گئی ہوتی تو شاید وہ لڑکی زندہ بچ جاتی جسے میرے سامنے ڈگلس نے سفاکی سے قتل کر دیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے ڈگلس کے حبشی ملازم کے ذہن کو اپنے طاقتور ذہن کی گرفت میں لے لیا۔ مجھے اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

ڈگلس کے ہاتھ سے نشتر چھین لو! میرے ذہن نے حبشی ملازم کے ذہن کو حکم دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

موت اور زندگی کے درمیان شاید وہ آخری لمحہ تھا جب حبشی ملازم نے میرے حکم پر ڈگلس کے ہاتھ سے اچانک نشتر چھین لیا۔ چند لمحے ڈگلس جیسے کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ تو تصویر حیرت بنا اپنے حبشی ملازم کو دیکھتا رہ گیا۔ میں نے ان لمحات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ جسیم و دراز حبشی نے نشتر ایک طرف پھینک دیا، پھر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کا وزنی مکا، ڈگلس کی کنپٹی پر پڑا۔ ڈگلس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے سر کو جھٹکا دے کر سنبھلنا چاہا، مگر اسی دوران میں حبشی ملازم کے دوسرے مکے نے اسے تیورا کر ڈھیر ہونے پر مجبور کر دیا۔ یقیناً ڈگلس ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ ابھی تک اس کے ذہن پر میری گرفت برقرار تھی۔ پھر وہ میرے ہی ایما پر میری میز کی طرف بڑھا اور قریب آ کر چمڑے کے تسموں سے میرے جسم کو آزاد کر دیا جو سفید چادر میرے جسم پر پڑی ہوئی تھی اسے میں نے اچھی طرح اپنے جسم سے لپیٹ لیا اور پھر ذکیہ کو خود میں نے دوسرے میز سے کھولا۔

''ذکیہ! تم میری طرح فی الحال یہ سفید چادر اپنے جسم سے لپیٹ لو۔'' میں نے ذکیہ کو مشورہ دیا، پھر حبشی ملازم کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''اپنے مالک کو اٹھا کر ایک میز پر لٹا دو اور پھر اس کے جسم کو تسموں سے کس دو! میں نے فرش پر پڑے ہوئے ڈگلس کی طرف اشارہ کیا۔

حبشی ملازم میرے حکم کی تعمیل میں فوراً ہی آگے بڑھا اور جھک کر ڈگلس کے بے ہوش جسم کو فرش سے اٹھانے لگا۔ ذکیہ اب میز سے اٹھ کر میرے قریب آ کھڑی ہوئی تھی، مگر اب تک اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اب سے پہلے اس نے شاید موت کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔

میرے حکم پر جب حبشی ملازم نے ڈگلس کے جسم کو چمڑے کے تسموں سے کس دیا تو ایک خفیہ راستے کے ذریعے مجھے اور ذکیہ کو اس تہ خانے سے نکال دیا۔ اب ہم پھر اسی کمرے میں تھے جہاں ڈگلس نے ہمیں ٹھہرایا تھا۔ وہیں ہمارے اٹیچی کیس بھی تھے۔ میں نے اور ذکیہ نے باری باری باتھ روم میں جا کر لباس زیب تن کیا اور پھر اپنا حلیہ درست کر کے باہر آ گئے۔ حبشی ملازم، پتھر کے کسی مجسمے کی طرح ایک جانب مودب کھڑا ہوا تھا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا صبح کے سوا چھ بج رہے تھے۔

''اب تم ہم دونوں کو ایئرپورٹ تک کار میں چھوڑو گے! میں نے حبشی ملازم کو حکم دیا۔

جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلا دیا، پھر میرے اشارے پر دونوں اٹیچی کیس اٹھا لیے۔ ایئر بیگ میں نے اپنے شانے سے لٹکا لیا تھا۔ حبشی ملازم کے پیچھے پیچھے ہم دونوں اس عمارت کے صدر دروازے تک آ گئے۔ اس نے سیڑھیوں کے نیچے دونوں اٹیچی کیس رکھ دیئے، پھر بولا ''میں گیراج سے کار لے کر ابھی آتا ہوں۔''

''ہاں جاؤ، ہم یہیں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا، اور وہ ایک طرف تیزی سے بڑھ گیا۔

''باجی ابھی ...... ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ...... کہ ہم اس شیطان کے چنگل سے نکل چکے ہیں۔'' ذکیہ نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کی آواز میں ارتعاش تھا اور لہجے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔''

''اس واقعے کو ذہن سے جھٹک دو ذکیہ!'' میں نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''رات گزر چکی ہے اور دیکھو کہ اب ہر طرف صبح کا اجالا پھیل رہا ہے۔ ہم نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا اور اب ہماری آنکھ کھل چکی ہے۔ بھول جاؤ، اس بھیانک خواب کو ذکیہ!''

''ہاں...... ہاں وہ ایک بھیانک خواب ہی تھا۔'' ذکیہ نے گہرا سانس لیا، پھر بولی ''مگر یہ حبشی...... یہ کس طرح ایک دم بدل گیا؟ اور آپ کے حکم......'' ذکیہ کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ ذرا توقف سے وہ چونک کر ایک طرف اشارہ کرنے لگی۔ ''وہ...... وہ کون لوگ ہیں باجی؟ وہ تو ادھر ہی آ رہے ہیں!'' اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

اسی طرف آنے والوں کو میں بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ تین تھے جن میں سے دو قوی ہیکل حبشی تھے۔ وہ اسی عمارت کی دائیں جانب سے نکل کر اچانک ہمارے سامنے آ گئے تھے ان کے اور ہمارے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میں ان کے چہروں پر واضح حیرت کے آثار دیکھ رہی تھی۔ شاید ہم دونوں کا اس طرح عمارت سے باہر آ جانا ان کے لیے حیرت کا سبب تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھیوں سے مدھم آواز میں کچھ کہا اور تیزی سے ہمارے قریب آ گیا۔

''اندر آ جائیں!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر حکمیہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

''کیوں!'' میں نے اس کے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیوں اندر جائیں؟''

''کسی بھی مہمان کو میزبان کے بغیر اس عمارت سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے، سمجھیں آپ!'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ مسٹر ڈگلس کی اجازت کے بغیر باہر نکلی ہیں!''

''تم تو یہ بات اس طرح کہہ رہے ہو جیسے عمارت سے باہر نکلنا کوئی جرم ہو!'' میں پرسکون آواز میں بولی۔

''ہاں یہ جرم ہے!'' اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ ''ہمیں اس پر مجبور نہ کریں کہ ہم آپ کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔ آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ واپس عمارت میں چلی جائیں۔''

''اگر میں تمہارا حکم ماننے سے انکار کر دوں؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تو ہم اپنا حکم منوانا بھی جانتے ہیں!'' یہ کہتے ہی اس نے اپنے حبشی ساتھیوں کو اشارہ کیا جو اس کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے۔

اشارہ پاتے ہی ان دونوں میں سے ایک میری طرف اور دوسرا ذکیہ کی جانب بڑھا۔ میں سمجھ چکی تھی، ڈگلس نے انہیں یہی احکام دیئے ہوں گے کہ ہمیں اس عمارت سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ ان لوگوں کے چہروں پر مجھے حیرت کے آثار نظر آئے تھے، اس کا مطلب یہی تھا کہ انہیں ہمارے باہر نکلنے کی توقع نہیں ہوگی۔

شدید خطرے سے نکل آنے کے بعد اب میرا ذہن ہلکا پھلکا تھا۔ میرے ذہن پر کوئی دباؤ نہیں تھا اسی لیے مجھے تھوڑی سی تفریح سوجھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ دونوں قوی ہیکل حبشی جو میری اور ذکیہ کی طرف بڑھ رہے تھے، اچانک رک کر ایک دوسرے کی طرف پلٹے اور پھر ان میں سے ایک نے دوسرے کے منہ پر زور دار تھپڑ جڑ دیا۔ دوسرے حبشی نے بھی جوابی کارروائی میں دیر نہیں کی۔ اس نے بھی پلٹ کر پہلے حبشی کا ''رخسار'' سہلا دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں ہی آپس میں بھڑ گئے۔ میں، ذکیہ کا ہاتھ تھامے ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

تیسرا شخص غصے سے چیخ اٹھا۔ ''یہ کیا حماقت ہے؟ ...... کیا ہوا تم دونوں...... الگ ہٹو میں کہتا ہوں الگ ہٹو! ...... کیوں لڑ رہے ہو آپس میں؟''

''پہلے اس نے تھپڑ مارا تھا مجھے!'' ایک حبشی نے چلا کر کہا اور اپنے ساتھی کو زمین پر گرانے کے لیے زور لگانے لگا۔

''نہیں! ...... پہلے اس نے مجھے گالی دی تھی۔'' دوسرے حبشی نے اپنی صفائی پیش کی۔

''میں تم دونوں کو حکم دیتا ہوں کہ ایک دوسرے کو چھوڑ دو!'' تیسرے شخص نے زور سے کہا۔ وہ سفید فام تھا۔

''تو کون ہوتا ہے ہمیں حکم دینے والا؟'' ایک حبشی اس کی طرف دیکھ کر غرایا۔

''ہاں یہ کون ہوتا ہے!'' دوسرے حبشی نے بھی پہلے کی تائید کی۔ یہ شاید ہمیں خود سے کمتر سمجھتا ہے۔ اسے شاید اپنی گوری چمڑی پر ناز ہے۔ ''ہم دونوں اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے!''

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ دونوں حبشی، سفید فام شخص پر ٹوٹ پڑے۔ تیسرا شخص یقیناً رتبے میں ان دونوں حبشیوں سے بلند تھا اور اسے توقع نہیں تھی کہ اس کے ماتحت اس پر ہاتھ اٹھا دیں گے۔ غالباً اسی لیے وہ مار کھا گیا۔ وہ ان دونوں کے ہاتھوں پٹتے ہوئے انہیں برا بھلا کہہ رہا تھا اور دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ اسی دوران میں سفید فام شخص معاً چکرا کر زمین پر گر گیا۔ دونوں حبشیوں میں سے کسی کا زبردست مکا کام کر گیا تھا۔

اس کے گرتے ہی دونوں حبشیوں میں سے ایک نے ہانپتے ہوئے اپنے ساتھی کا گریبان تھام لیا۔ ''تم نے اسے کیوں مارا؟''

''میں نے نہیں اسے تم نے مارا ہے!'' دوسرا چیخا۔

''نہیں! یہ حرکت تمہاری ہے!'' پہلے نے جواباً کہا۔

پھر وہ دونوں ایک بار پھر وحشیوں کی طرح ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔

''باجی! ...... کیا یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں؟'' ذکیہ کی کانپتی ہوئی آواز کافی دیر بعد مجھے سنائی دی۔

''ہاں! اور ان کا پاگل پن ہی ہمارے لیے سودمند ہے۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ انہیں اس طرح ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا دینا میرے ہی ذہن کی ''کرشمہ سازی'' تھی۔ میں نے بغیر ہاتھ پیر ہلائے اپنے حیرت انگیز ذہن کی صلاحیتوں سے کام لے کر انہیں نہ صرف ذکیہ سے اور اپنے آپ سے دور رکھا تھا بلکہ قطعی بے بس کر دیا تھا۔ پھر میرے ہی اشارے پر ان میں سے ایک اپنے ساتھی کو دھکا دے کر ایک طرف بھاگ اٹھا۔ دوسرا حبشی اسے گالیاں دیتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا۔ اسی وقت مجھے دور سے ایک لمبی سی سیاہ کار دکھائی دی۔ یہ وہی کار تھی جس میں ڈگلس ہمیں ایئرپورٹ سے یہاں لے کر آیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد سیاہ کار ہمارے قریب آ کر رک گئی۔ حبشی ملازم کار سے اتر آیا۔ سفید فام شخص کو زمین پر بے ہوش پڑے دیکھ کر وہ چونکا۔ ''یہ...... یہ......''

''کچھ نہیں، تم اپنا کام کرو!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر اٹیچی کیسوں کی طرف اشارہ کیا۔

''بہتر ہے۔'' اس نے مودب لہجے میں کہا، پھر کار کی ڈکی کھولنے لگا۔

حبشی شوفر نے ہمارے اٹیچی کیس ڈکی میں رکھ دیئے اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ میں اس دوران میں ذکیہ کو ساتھ لیے کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔

''تمہیں ایئرپورٹ چلنا ہے۔'' میں نے حبشی شوفر کو حکم دیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا کر کار اسٹارٹ کر دی اور بولا ''جی ہاں مجھے معلوم ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں آہستہ سے بولی۔ میں نے جب اسے کار لینے بھیجا تھا اسی وقت بتا دیا تھا کہ ہمیں ایئرپورٹ جانا ہے۔ حبشی شوفر کو وہ بات یاد تھی۔

مجھے علم تھا کہ اندرونی عمارتوں سے اس آہنی گیٹ کا فاصلہ خاصا ہے جو کھلنے کی بجائے زمین میں دھنس جاتا تھا۔ کار ہموار سڑک پر آگے بڑھتی رہی۔ سڑک کی دونوں جانب گھنے درختوں کی قطاریں تھیں۔ کچھ دور جا کر کار دائیں جانب مڑ گئی۔ یہاں سے اب سیدھی سڑک گیٹ تک جاتی تھی۔ وہاں دور و نزدیک کوئی بھی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی نہ رہتا تھا۔

میرے نزدیک ڈگلس ایک خطرناک مجرم تھا۔ ایسا بہرحال نہیں تھا کہ میں نے اسے نظرانداز کر دیا ہو۔ قانون کو ہاتھ میں لینے کی بجائے میں نے اس کے لیے دوسرا راستہ سوچا تھا۔ مجھے اور ذکیہ کو ایئرپورٹ چھوڑنے کے بعد ڈگلس کا وفادار حبشی ملازم میرے حکم پر سیدھا پولیس اسٹیشن کا رخ کرتا۔ پولیس کے روبرو وہ ڈگلس کے تمام سیاہ کارنامے بیان کر دیتا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد ڈگلس کی کوٹھی پر پولیس ریڈ کر دیتی۔ تہ خانے سے مقتول انجلا کی لاش ملنے کے بعد پولیس کو مزید کسی ثبوت کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ڈگلس بھی موقع ہی پر پکڑا جاتا۔ اس کے بچ کر نکل جانے کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ میں اسے تہ خانے میں چمڑے کے تسموں سے بندھا ہوا چھوڑ کر آئی تھی۔ پولیس کو وہ اسی حالت میں ملتا۔ حبشی ملازم، پولیس کو یہ بیان دیتا کہ خود اس نے ڈگلس کو باندھا تھا تا کہ وہ فرار نہ ہو سکے۔ پولیس کے نزدیک حبشی ملازم کی حیثیت سلطانی گواہ کی ہوتی۔

'میں' ڈگلس ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کار رک گئی۔ میں نے چونک کر باہر کی طرف دیکھا۔ سامنے ہی آہنی سیاہ دیوار نظر آ رہی تھی۔ حبشی ملازم کار کا انجن بند کیے بغیر نیچے اتر کر آہنی دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ میری نگاہ اس پر جمی ہوئی تھی۔ حبشی ملازم نے آہنی دیوار کی دائیں جانب پہنچ کر کوئی بٹن دبا دیا، پھر دیوار کے قریب ہو کر کچھ کہا۔

''ذکیہ! اب ہم کچھ ہی دیر بعد اس قید خانے سے نکل کر کھلی فضا میں پہنچ جائیں گے۔'' میں نے ذکیہ کو مخاطب کیا جس کے چہرے سے ابھی تک خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے اسی لیے یہ بات کہی تھی۔

ذکیہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔ اسی وقت مجھے حبشی ملازم لوٹتا دکھائی دیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ کچھ الجھا ہوا سا ہے۔ کار کے قریب آ کر اس نے کھوئی کھوئی سی نظروں سے میری جانب دیکھا، پھر جھک کر بولا۔ آرتھر کہتا ہے کہ جب تک مسٹر ڈگلس کا حکم نہیں ہو گا، وہ گیٹ نہیں کھولے گا۔''

میں اس کی بات سن کر چونک اٹھی۔ آرتھر یقیناً وہی شخص تھا جو گیٹ کے خفیہ میکنزم کو حرکت میں لاتا تھا۔ وہ اسی کوٹھی کی حدود میں بنی ہوئی مختلف عمارتوں میں سے کسی ایک عمارت میں ہو سکتا تھا۔

''تم نے پھر اس سے کیا کہا؟'' ذرا توقف کے بعد میں نے حبشی ملازم سے سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں، میں واپس آ گیا۔'' اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

میں نے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا۔ میرا ذہن اس وقت غیر متوقع صورتحال میں بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''تم گاڑی میں بیٹھو اور مجھے آرتھر کے پاس لے چلو!'' بالآخر میں نے حبشی ملازم کو حکم دیا۔

اس نے سر ہلایا اور پھر کار کا اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ریورس گیئر میں لے کر اس نے کار کو موڑا اور پھر دوبارہ واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

''با...... باجی! اب...... کیا ہو گا؟'' کار واپس عمارتوں کی طرف جانے لگی تو ذکیہ خاموش نہ رہ سکی۔

''تم فکر نہ کرو، کچھ نہیں ہو گا!'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں!'' یہ کہہ کر مجھے خیال آیا کہ حبشی ملازم سے یہ بھی پوچھ لوں کہ گیٹ کھلوانے کے لیے اس نے آرتھر سے کیا کہا

تھا؟ پھر یہی سوال میری زبان پر آ گیا۔

''میں نے اس سے کہا تھا کہ مہمانوں کو ایئرپورٹ چھوڑنے جا رہا ہوں۔'' حبشی ملازم نے بتایا۔

''جواباً وہ کیا بولا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اس نے پوچھا تھا کہ میں کس کے حکم پر ایسا کر رہا ہوں؟ کیا مسٹر ڈگلس نے یہ حکم دیا ہے؟ میں نے انکار کر دیا۔ پھر وہ کہنے لگا کہ جب تک مسٹر ڈگلس۔'' پھر اس نے وہی الفاظ دہرا دیئے جو پہلے بھی کہہ چکا تھا۔

میرا خیال ہے حبشی ملازم اگر یہ بھی کہہ دیتا کہ وہ ہمیں ڈگلس کے حکم پر چھوڑنے جا رہا تھا تو بھی شاید آرتھر، ڈگلس سے تصدیق کیے بغیر گیٹ نہ کھولتا۔ اب مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ ڈگلس کے حکم کے بغیر نہ کوئی اس کوٹھی کی حدود میں داخل ہو سکتا تھا نہ باہر ہی جا سکتا تھا۔ اگر پہلے سے مجھے یہ خدشہ ہوتا تو میں گیٹ کی طرف جانے کی بجائے آرتھر کا بندوبست کرتی۔

حبشی ملازم نے کچھ ہی دیر بعد ایک عمارت کے سامنے کار لے جا کر روک دی۔ عمارت کا دروازہ مجھے بند نظر آ رہا تھا۔

''ذکیہ! تم یہیں کار میں بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ذکیہ کچھ کہنا چاہتی ہو، مگر اس کے ہونٹ صرف خفیف سی حرکت کر کے رہ گئے۔ یقیناً غیر متوقع صورتحال نے اسے مزید خوف زدہ کر دیا تھا۔ میرے کار سے اترتے ہی حبشی ملازم بھی کار کا انجن بند کر کے باہر آ گیا تھا۔

پھر میرے ایما پر حبشی ملازم نے دروازے کی ایک جانب لگی ہوئی کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ دور کہیں عمارت میں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔

دروازہ کھلنے کا انتظار کرتے ہوئے میں اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ کچھ ہی فاصلے پر بائیں جانب ایک اور عمارت نظر آ رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ کوٹھی کتنے رقبے میں پھیلی ہوئی تھی اور وہاں کتنی عمارتیں تھیں۔

دروازہ کھولنے والا ایک پستہ قد سفید فام تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے حبشی ملازم کی طرف دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس کے لہجے میں سخت گیری تھی۔

''مجھے آر...... آرتھر سے ملنا تھا۔'' حبشی ملازم نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' پستہ قد سفید فام نے بدستور سخت لہجہ برقرار رکھا۔

میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں اس سفید فام کے ذہن کو بھی گرفت میں لے چکی تھی۔

''ہاں آؤ...... آؤ! وہ اوپری منزل پر اپنی ڈیوٹی پر ہے۔'' سفید فام کا لہجہ ایک دم بدل گیا اور اس نے راستہ چھوڑ دیا۔

میرے اشارے پر حبشی ملازم آگے بڑھا اور پھر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے عمارت میں داخل ہو گئی۔ سفید فام شخص بھی ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ جلد ہی ہم اوپری منزل پر پہنچنے کے لیے ایک زینے تک پہنچ گئے۔

پھر ہم نے نصف سیڑھیاں ہی عبور کی تھیں کہ اچانک تیز رفتار سائرن کی آواز سے ساری عمارت گونج اٹھی۔ میں تقریباً اچھل پڑی۔

''خطرہ!......خطرہ!'' حبشی ملازم اور پستہ قد سفید فام، دونوں ہی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ابھی میں اس خطرے کی نوعیت کے متعلق ان دونوں سے کچھ پوچھنے والی تھی کہ اچانک ایک گونج دار آواز سنائی دی۔ ''تہ خانے سے دو خواتین فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ وہ دونوں پاکستانی ہیں۔ ان کے ساتھ غدار فرانکو بھی ہے۔ اس کی تصدیق ہو چکی ہے کہ وہ لوگ ابھی کوٹھی کی حدود میں ہیں اور باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ جہاں بھی وہ نظر آئیں انہیں فوری طور پر حراست میں لے لیا جائے اور غدار فرانکو کو دیکھتے ہی گولی مار دی جائے!''

یہی حکم دو مرتبہ مزید دہرایا گیا۔ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ کسی طرح ڈگلس ہوش میں آنے کے بعد آزاد ہو چکا ہے۔ وہ کس طرح ہوش میں آیا اور کیسے آزاد ہوگیا؟ یہ وقت ان سوالوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ مجھے تو اب فوری طور پر آرتھر کو قابو میں کر کے کوٹھی کا گیٹ کھلوانا تھا اور پھر ذکیہ کو ساتھ لے کر یہاں سے فرار ہو جانا تھا۔

ان تمام عمارتوں میں غالباً کسی ایسے ہی وقت کے لیے جگہ جگہ لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے۔ یقیناً کسی ایک سکیورٹی روم سے تمام عمارتوں میں موجود افراد کو کوئی بھی اطلاع دی جا سکتی تھی۔ اب مجھے اس حبشی ملازم کا نام بھی معلوم ہو چکا تھا۔ اسے غدار کہا گیا تھا اور اس کا سبب لازماً یہی رہا ہوگا کہ اس نے عین وقت پر ڈگلس کا کھیل بگاڑ دیا تھا۔

میں اب حبشی فرانکو اور اس پستہ قد سفید فام کے ساتھ زینہ عبور کر کے اوپر منزل پر پہنچ چکی تھی۔ وہ دونوں بالکل گم صم تھے۔

اس چھوٹی سی راہداری کے اختتام پر ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا نظر رہا تھا۔ وہ دونوں اسی کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے تھی۔ معاً مجھے کمرے کے دروازے پر ایک دراز قد شخص نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتی، دراز قد شخص نے فائر کر دیا۔ میں ایک دم فرش پر گر گئی۔ فانکو چیختا ہوا میرے قریب ہی ڈھیر ہوگیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھامے ہوئے تھا جس سے خون ابل رہا تھا۔ گولی اس کے سینے پر لگی تھی۔ پستہ قد سفید فام اچھل کر ایک طرف کھڑا ہوگیا تھا۔

''لڑکی! ہاتھ اٹھا کر سیدھی کھڑی ہو جاؤ!'' دراز قد شخص نے مجھے حکم دیا۔

فرش سے اٹھتے ہوئے میں نے دراز قد شخص کے ذہن کو گرفت میں لے لیا۔ وہ یقیناً آرتھر ہی تھا۔ اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرتے ہی مجھے یہ بات معلوم ہوگئی تھی۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ علم بھی ہوگیا تھا کہ سارا کیا دھرا اسی کا ہے۔ آرتھر کو خبر تھی کہ ڈگلس تہ خانے میں ہے۔ فرانکو نے جب گیٹ کھلوانے کے لیے اس سے کہا اور بتایا کہ وہ مہمانوں کو ایئرپورٹ چھوڑنے جا رہا ہے تو وہ شبے میں پڑ گیا کیونکہ مہمانوں سے متعلق اس کی اطلاعات یہ تھیں، آج انہیں سفر آخرت پر روانہ کر دیا جائے گا۔ اس نے اسی لیے گیٹ نہیں کھولا اور فوری طور پر کچھ افراد کو تہ خانے میں حقیقت حال جاننے کے لیے بھیجا جہاں ڈگلس چڑے

کے تسموں سے بندھا پڑا تھا۔ اس سے کچھ ہی دیر پہلے ڈگلس آزاد ہو چکا تھا اور اسی کے ایما پر سکیورٹی روم سے وہ اعلان کیا گیا تھا جو میں نے بھی سنا تھا۔

میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر آرتھر کا ریوالور اپنے قبضے میں کر لیا، پھر اسے گیٹ کھولنے کا حکم دیا۔

آرتھر نے فوری طور پر میرے حکم کی تعمیل کی۔ پھر میں نے آرتھر اور اس پستہ قد کو وہیں چھوڑا۔ اس عمارت میں شاید وہی دونوں تھے۔ میں انہیں اپنے ساتھ نیچے لے آئی اور پھر نچلی منزل ہی کے ایک کمرے میں ان دونوں کو بند کر دیا۔ ایسا میں نے محض اس لیے کیا تھا کہ جب آرتھر کا ذہن میری گرفت سے آزاد ہو جائے تو وہ دوبارہ گیٹ بند نہ کر سکے۔ ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں تقریباً دوڑتی ہوئی اس عمارت کے صدر دروازے تک پہنچی۔ مجھے ذکیہ کی فکر تھی جسے میں کار میں تنہا چھوڑ آئی تھی۔

پھر جیسے ہی میں اس عمارت کے صدر دروازے سے باہر آئی، میرے حواس پر ایک زناٹا سا گزر گیا۔ سیاہ لمبی کار وہاں سے غائب تھی۔ ذکیہ یقیناً اس کوٹھی میں رہنے والوں میں سے کسی نہ کسی کی نظر میں آ گئی تھی۔ یہ ذہنی جھٹکا ایسا تھا کہ کچھ دیر کو میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج سی ہوگئیں۔ ڈگلس کس قدر خطرناک شخص ہے، مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ ذکیہ کی زندگی شدید خطرے میں تھی۔ میں جلد از جلد ذکیہ تک کس طرح پہنچ سکتی ہوں؟ میرے ذہن میں بار بار یہی سوال تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب تھا کہ میں اپنے آپ کو بھی دانستہ ڈگلس کا قیدی بنا لوں، خود ہی اس کی قید میں چلی جاؤں۔ اس کے بعد ذکیہ کی رہائی کے لیے میں کچھ کر سکتی تھی۔ اس نتیجے پر پہنچنے مین مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔

میں فوراً ہی پلٹی اور دوبارہ اس عمارت میں داخل ہوگئی کیونکہ مجھے بغیر کسی تاخیر کے ڈگلس تک پہنچنا تھا۔

نچلی منزل کے جس کمرے میں، میں نے آرتھر اور اس کے ساتھی کو بند کیا تھا، وہاں تک پہنچنے میں بمشکل مجھے دو منٹ لگے ہوں گے۔ اب ان دونوں کے ذہنوں کو میں نے اپنے طاقتور ذہن کی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ دروازہ کھلتے ہی آرتھر نے اپنی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ اس سے چھینا ہوا ریوالور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں اگر چاہتی تو چھلانگ لگاتے ہی اسے بھون کر رکھ دیتی، مگر میں نے یہی تاثر دیا جیسے آرتھر خود ہی اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے اور اس نے مجھے فائر کرنے کی مہلت نہیں دی۔ اس نے مجھ پر چھلانگ لگاتے ہی میرے اس ہاتھ کی کلائی اوپر اٹھا دی تھی جس میں ریوالور تھا۔ پھر گویا اسی کی جدوجہد کے نتیجے میں میرے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر زمین پر گر گیا تھا۔ آرتھر کے پستہ قد ساتھی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لپک کر ریوالور اٹھا لیا تھا۔

''اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لو!'' آرتھر کا پستہ قد ساتھی میرے پہلو سے ریوالور کی نال لگاتے ہوئے گویا غرایا۔

آرتھر مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی۔

وہ دونوں مجھے اسی حالت میں اوپری منزل پر لے آئے۔ سامنے ہی اس کمرے کا دروازہ اب

تک کھلا ہوا تھا جہاں سے میں، آرتھر اور اس کے ساتھی کو نچلی منزل پر لے گئی تھی۔ اس کمرے میں پہنچ کر آرتھر نے میز پر رکھے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا پھر کوئی نمبر دبا کر دوسری جانب سے کسی کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ میری گرفتاری سے ڈگلس کو آگاہ کرنا چاہتا ہے۔

چند ہی لمحے بعد آرتھر بول اٹھا۔ ''ہیلو سکیورٹی روم!...... دونوں مفرور لڑکیوں میں سے ایک کو میں نے حراست میں لے لیا ہے۔ اس وقت وہ ڈیوٹی روم میں میرے پاس ہے...... جی...... اچھا...... تو کیا دوسری لڑکی بھی پکڑی گئی؟ ویری گڈ!...... ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں...... او کے...... تھینک یو۔''

آرتھر نے براہ راست ڈگلس کی بجائے میری گرفتاری کی اطلاع سکیورٹی روم کو دی تھی اور اب گویا کسی کا منتظر تھا۔ اسی کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ذکیہ واقعی ان کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ اس کے باوجود میں نے آرتھر سے پوچھ ہی لیا۔ ''مسٹر آرتھر! کیا میری ساتھی بھی پکڑی جا چکی ہے؟''

''اوہ یس!'' وہ چہک کر بولا۔ ''اس کوٹھی کی حدود میں داخل ہونے کے بعد آج تک کوئی فرار نہیں ہو سکا۔'' اس کے لہجے میں احساس تفاخر تھا۔ پھر اسی لمحے غالباً اسے کھلے ہوئے گیٹ کا خیال آ گیا۔ اس نے ایک لیور کو حرکت دے کر طویل سانس لیا، پھر خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑانے لگا۔ ''یہ مین گیٹ کیوں کھول دیا تھا!''

آرتھر کو یقیناً یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے میرے ذہن کے زیر اثر آ کر گیٹ کھولا تھا۔

وقت میرے نزدیک بہت دھیمی رفتار سے گزر رہا تھا۔ لحہ لحہ میرے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آرتھر اور پستہ قد شخص کی ڈیوٹی اسی عمارت میں تھی اور وہ غالباً ڈیوٹی چھوڑ کر وہاں سے نہیں جا سکتے تھے۔ اسی لیے شاید آرتھر نے سکیورٹی روم سے رابطہ قائم کیا تھا۔ یقیناً سکیورٹی روم والے ہی مجھے وہاں سے لے کر جاتے۔

خدا خدا کر کے وقت گزرا اور دو مسلح حبشی وہاں آ گئے۔ آرتھر نے مجھے ان دونوں کی تحویل میں دے دیا۔

میں ان دونوں مسلح حبشیوں کے ساتھ اس عمارت سے نکل آئی۔ وہ دونوں مجھے پیدل ہی قریبی عمارت کی طرف لے کر بڑھے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لیے میں جلد ہی ان دونوں کے ساتھ دوسری عمارت تک پہنچ گئی۔ انہوں نے مجھے اس عمارت کے ایک بڑے سے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہاں ڈگلس موجود تھا اور ذکیہ بھی! ذکیہ کو وہاں دیکھ کر جیسے میری جان میں جان آ گئی۔ وہ ایک کرسی پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی اور کرسی کے پیچھے ایک مسلح شخص ریوالور لیے کھڑا تھا۔ وہاں اور بھی خالی کرسیاں تھیں۔ ڈگلس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس پر جا بیٹھی۔ ساتھ آنے والے مسلح حبشیوں میں سے ایک ڈگلس کے اشارے پر میری کرسی کے پیچھے بھی کھڑا ہو گیا۔ دوسرا حبشی کمرے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

''عذرا خان، تم شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تھیں کہ یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤ گی!'' ڈگلس کے لہجے میں چبھن تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ذرا توقف سے وہ پھر بولا سنو! کبھی کبھی میں اپنا دل بہلانے کی خاطر آدمیوں کا شکار بھی کھیلتا ہوں۔ یہ ایک بڑا دلچسپ اور قدیم کھیل ہے۔ اس کھیل میں میرے شکار کو بھی نہ صرف اپنی مدافعت کا حق ہوتا ہے بلکہ اسے شکاری، یعنی مجھے قتل کر دینے کی

بھی پوری آزادی ہوتی ہے۔ تم نے یہاں آتے ہوئے سڑک کی دونوں جانب گھنے درختوں کے سلسلے دیکھے ہوں گے۔ میں اپنے شکار کو انہی کے درمیان چھوڑ دیتا ہوں اور خود بھی اس جنگل میں داخل ہو جاتا ہوں۔ میں بھی مسلح ہوتا ہوں اور میرا شکار بھی! اپنے نشانے کے بارے میں کوئی دعویٰ تو نہیں مجھے مگر لوگ کہتے ہیں کہ ایسا سچا نشانہ کم ہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ بہرحال میں آج تمہارے ساتھ بھی یہی کھیل کھیلنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری بہن یہ کھیل نہیں کھیل سکے گی اور مجھے کوئی مزہ نہیں آئے گا۔ اس کی نسبت مجھے تم زیادہ چالاک اور ہوشیار معلوم ہوتی ہو۔ یہ تو ابتدائی چند منٹ میں شکار ہو جائے گی، مگر شاید تمہیں شکار کرنے میں مجھے خاصا وقت لگے گا۔ میں اس سلسلے میں کوئی ناانصافی نہیں کرتا۔ جتنے راؤنڈ میرے پاس ہوں گے، اتنے ہی تمہیں فراہم کیے جائیں گے۔'' ڈگلس کی تقریر ابھی جاری تھی۔ وہ مجھے اس خطرناک کھیل کے قواعد و ضوابط سمجھا رہا تھا۔

میرے لیے اتنی مہلت بہت تھی۔ ڈگلس کے علاوہ اس کمرے میں جو تین مسلح افراد تھے، میں ان کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔ اب کسی بھی لمحے بازی پلٹنا میرے امکان میں تھا۔ میں نے اسی لیے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید تقریر کرنے سے روک دیا، پھر اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ڈگلس! تم سے بڑا احمق اور بے وقوف میں نے اس روئے زمین پر اور کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔''

وہ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے ایک دم رک گیا، پھر مجھے گھور کر کہا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو تم!...... کیا مطلب ہے تمہارا؟''

میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جسے تم سمجھ نہ سکو! یہ کہہ کر میں ہنس پڑی۔

ڈگلس مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے اسے میری ذہنی صحت پر شک ہو۔

''تم شاید اپنے ان مسلح ساتھیوں پر اس قدر اکڑ رہے ہو...... تو اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اس خناس کو اپنے دماغ سے نکال دو! میں چاہوں تو انہی کے ہاتھوں تمہیں ذلیل کرا سکتی ہوں اگر یقین نہ ہو تمہیں تو یہ بطور نمونہ ایک چھوٹا سا تماشا دکھا سکتی ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں، کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے حبشی سے مخاطب ہوئی۔'' سنو! ریوالور اپنی جیب میں رکھ لو اور اپنے آقا ڈگلس کے دماغ میں کیڑے جھاڑنے کے لیے اس کے سر پر دو جوتے مارو!''

حبشی نے میرا حکم سنتے ہی ریوالور جیب میں رکھ لیا اور پھر جھک کر اپنے جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم!...... ریوالور جیب میں کیوں رکھ لیا احمق آدمی؟...... کیا فرانکو کی طرح تم بھی غداری کرو گے'' ڈگلس چیخ اٹھا۔ اس کا مخاطب وہی حبشی تھا جسے میں نے جوتے مارنے کا حکم دیا تھا۔

''سر! میں غداری نہیں کر رہا۔ میں تو آپ کو صرف دو جوتے لگاؤں گا تاکہ آپ کے دماغ کے کیڑے جھڑ جائیں۔'' حبشی نے بدستور اپنے جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے جواب دیا۔ ظاہر ہے کہ اس نے یہ جواب میرے ہی ایما پر دیا تھا۔

میں نے شدید غصے کے سبب ڈگلس کے چہرے کو سرخ ہوتے دیکھا۔ ''شٹ اپ!'' وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔

اسی دوران میں حبشی اپنا جوتا اتار چکا تھا اور اب وہ جوتا، ہاتھ میں تھامے ڈگلس کی طرف بڑھ

رہا تھا۔

ڈگلس اسے گالیاں دینے لگا۔ پھر اس کمرے میں موجود بقیہ دو مسلح افراد کو حکم دیا۔ ''اسے گولی مار دو!'' اس کے پاس شاید ریوالور نہیں تھا ورنہ وہ خود یہ کر گزرتا۔

''دو جوتے ہی تو کھانا ہیں سر، کھا لیں!...... اس میں اتنے خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے!'' میرے ایما پر ذکیہ کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔

''ہاں ہاں اور کیا سر!'' میری کرسی کے پیچھے کھڑا ہوا مسلح شخص بھی بول اٹھا۔ ''آپ کے دماغ کے کیڑے اسی طرح جھڑ سکتے ہیں!''

''میں...... میں تم سب کو قتل کر دوں گا!'' ڈگلس طیش کے عالم میں اتنی زور سے بولا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔

''تم ایک قابل نفرت حقیر کیڑے ہو ڈگلس!'' میں نے بھی اسے مزید سلگانے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ ''آج کے بعد تم کسی کو قتل نہیں کر سکو گے۔ یہ تمہاری آزادی کا آخری دن ہے!...... سنبھلو ڈگلس! تمہارا وفادار ملازم تم پر جوتا اٹھا رہا ہے!''

وہ حبشی ڈگلس سے کہیں زیادہ لحیم شحیم اور طاقتور تھا اس لیے ڈگلس اس سے نہ بچ سکا۔ پے در پے اس نے ڈگلس کے سر پر دو جوتے لگائے اور پیچھے ہٹ گیا۔ اسے میں نے جو حکم دیا تھا، اس نے تعمیل کر دی تھی۔

زندگی میں شاید ڈگلس کو اتنی ذلت کبھی برداشت نہ کرنا پڑی ہو گی۔ وہ اپنی ذلت پر یقیناً اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے آنسو نظر آ رہے تھے۔

''تم نے دیکھا ڈگلس کہ جو شخص خود کو ہر چیز پر قادر سمجھنے لگتا ہے، اس کا کیا حشر ہوتا ہے! میں نے ڈگلس کو مخاطب کیا جو سر جھکائے کھڑا تھا۔

معاً اس نے سر اٹھایا اور آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''عذرا خان!...... تم...... تم یقیناً جادوگرنی ہو!...... تم نے میرے آدمیوں پر جادو کر دیا ہے ورنہ...... ورنہ...... یہ لوگ میری حکم عدولی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

میں دیکھ چکی تھی کہ اس کمرے میں ٹیلی فون بھی تھا اور انٹر کام بھی! میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈگلس اب میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم بخوشی مجھے اور میری بہن کو یہاں سے جانے دو تو بہتر ہے ورنہ مزید ذلت و رسوائی تمہارا مقدر بن جائے گی۔

''نہیں! وہ چیخ اٹھا۔ ''یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔''

''سنو ڈگلس! تم بازی ہار چکے ہو۔ خود تمہارے بقول میں نے تمہاری وفاداری کا دم بھرنے والوں پر جادو کر دیا ہے۔ میں اگر چاہوں تو یہی لوگ تمہیں گولی بھی مار سکتے ہیں اس لیے ضد نہ کرو! آرتھر کو انٹر کام پر حکم دو کہ وہ گیٹ کھول دے اور پھر میرے لیے ڈرائیور سمیت ایک کار بھی فراہم کرو تاکہ میں ایئر پورٹ پر پہنچ سکوں۔''

''ناممکن!...... میں تمہارا کوئی حکم نہیں مانوں گا!'' اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''اس بات کو بھی اپنے ذہن سے نکال دو کہ اگر تم نے یہ حکم اپنے آدمیوں کو نہ دیا تو میں یہاں سے نہ نکل سکوں گی۔ میں چاہوں تو تمہارے تعاون کے بغیر بھی ایسا ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر کر لو ایسا!...... اگر تم ایسا کر سکتیں تو ہرگز مجھ سے نہ کہتیں کہ......''

''تم نرے گاؤدی ہو!'' مجھے اس کی حماقت پر غصہ آ گیا۔ ''اب تم خود اپنی آنکھوں سے اپنی بے بسی اور ذلت کا منظر دیکھو گے اور سوائے تلملانے کے کچھ اور نہ کر سکو گے!'' یہ کہتے ہی میں نے اس کے مسلح ساتھیوں کو حکم دیا۔ ''اپنے آقا کو گھسیٹتے ہوئے قریبی عمارت کی طرف لے چلو!'' اتنا کہہ کر میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی، پھر پہلی بار ذکیہ کو مخاطب کیا۔ ''ذکیہ! چلو اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

ذکیہ جواباً کچھ کہے بغیر کھڑی ہو گئی۔ اس دوران میں ڈگلس کے ملازمین اس تک پہنچ چکے تھے۔ انہی میں سے ایک نے ڈگلس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ ڈگلس کی حالت اس وقت کسی ایسے چور کی سی تھی جسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ اس کے ملازموں نے میرے ایما پر اپنے اپنے ریوالور جیبوں میں رکھ لیے تھے اور اسے دھکے دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے جا رہے تھے۔ ڈگلس انہیں گالیاں بک رہا تھا۔ میں ذکیہ کا سرد ہاتھ تھامے ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

''ڈگلس! اپنے وفادار ملازمین کو گالیاں نہ دو ورنہ جواباً یہ تمہاری پٹائی کرتے ہوئے چلیں گے۔ تمہاری زبان چلے گی ان کے ہاتھ چلیں گے!'' میں نے ڈگلس کو تنبیہ کی مگر وہ باز نہ آیا۔ مجبوراً میں نے اس کے ساتھیوں کو مار پیٹ کا حکم دے دیا۔ اگر یہ گالیاں بکنے سے باز نہ آئے تو مارو اسے!'' اس حکم کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ڈگلس بڑی فحش گالیاں بک رہا تھا اور میرے ساتھ ذکیہ بھی تھی۔ اس کی موجودگی میں مجھے یہ بات بہت گراں گزر رہی تھی۔

''چپ!...... ابے چپ!'' ڈگلس کے ملازم اسے زدوکوب کرنے لگے۔

اس عمارت سے باہر آ کر ڈگلس زور زور سے چیخنے چلانے لگا۔ میں اس کا مقصد اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس طرح وہ اپنے دوسرے ملازمین کو متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ نامعلوم اس کوٹھی میں ڈگلس نے کتنے ملازمین رکھ چھوڑے تھے۔ میں پوری طرح چوکنا تھی کہ جو بھی آدھر آئے، فوری طور پر اس کے ذہن کو قابو میں کر لوں۔

جس عمارت میں آرتھر تھا اور جہاں میں، ڈگلس کو لے جا رہی تھی، وہاں تک پہنچتے پہنچتے ڈگلس کی چیخ وپکار بالآخر رنگ لے ہی آئی۔ دو سفید فام شخص دوڑتے ہوئے ادھر آ گئے۔ میں نے فوراً ہی ان کے ذہنوں کو بھی گرفت میں لے لیا، پھر انہیں حکم دیا ''اپنے مالک کے منہ پر تھوک دو! اسے شاید غلط فہمی ہو گئی ہے کہ اس نے دولت کے عوض تم لوگوں کو خرید لیا ہے۔''

ان دونوں نے باری باری ڈگلس کے قریب آ کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ پھر جیسے ڈگلس کو سکتہ سا ہو گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان دونوں نوواردوں کو دیکھا اور پھر صرف اتنا کہا۔ ''تم...... تم بھی!'' اس کے بعد ڈگلس نے اپنے چہرے کو اپنی شرٹ کے دامن سے صاف کیا اور سر جھکا لیا۔ اب نہ وہ چیخ چلا رہا تھا، نہ اپنے ملازمین کی گرفت سے نکلنے کے لیے مچل رہا تھا اور نہ انہیں گالیاں بک رہا تھا۔ وہ دونوں نووارد سفید فام میرے ایما پر جدھر سے آئے تھے، اسی طرف واپس چلے گئے تھے۔

دوسری عمارت میں داخل ہونے کے بعد معاً ڈگلس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”ٹھہرو عذرا خان!“ میں اب اس کے آگے آگے چل رہی تھی اس لیے رک کر اس کی طرف مڑی۔ ”ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”مجھے اب یقین ہو چکا ہے کہ تمہارے پاس کوئی پراسرار قوت ہے اور میں اس قوت کو شکست نہیں دے سکتا۔ تمہارے مقابلے پر مجھے اپنی شکست قبول ہے۔ میں تمہیں بخوشی یہاں سے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔ میں تمہیں اور تمہاری بہن کو ایئرپورٹ تک پہنچوا دوں گا۔ تم یہی چاہتی تھیں نا!“

”ہاں میں یہی چاہتی تھی ڈگلس! مگر اب...... اب شاید اس کا وقت گزر چکا ہے۔ میں اب کچھ اور ہی سوچ رہی ہوں، لیکن شاید تم آسانی سے اس پر آمادہ نہیں ہو گے۔“

”تم حکم دو مجھے عذرا خان...... میں...... میں ہر قیمت پر تمہارے حکم کی تعمیل کروں گا۔“ ڈگلس نے مجھے یقین دلایا۔

”سوچ لو ڈگلس...... میرا خیال تو اب بھی یہی ہے کہ تم اپنی زبان پر قائم نہیں رہ سکو گے۔“ میں نے کہا۔

”عذرا خان! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اپنی زبان سے نہیں پھروں گا۔“

”میں نے ابھی کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ تمہاری آزادی کا یہ آخری دن ہے یاد ہے تمہیں؟“

”ہاں...... ہاں کہا تھا تم نے“ وہ بجھے بجھے سے لہجے میں بولا۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔“ میں نے بالآخر وہ بات کہہ دی جو میرے دل میں تھی۔ ”بولو کیا اب بھی تم میرا حکم ماننے پر آمادہ ہو؟“

”اس...... اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم...... تم مجھے خودکشی کا حکم دے رہی ہو یہ...... یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ...... میں خود کو قانون کے حوالے کر دوں۔“

”میں پھر وہی کہوں گی کہ خوشی سے اس پر راضی ہو جاؤ ورنہ میرے پاس دوسرا راستہ بھی ہے۔ یہ تو طے ہے کہ تمہیں خود کو قانون کے حوالے کرنا پڑے گا۔ خواہ اپنی مرضی سے خواہ زبردستی۔ یہ تو تمہارا مقدر ہو چکا ہے ڈگلس۔“ میں نے پرتاسف لہجے میں کہا۔ ”افسوس ہے کہ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“

ابھی میری بات پوری ہوئی تھی کہ سامنے سے دو افراد ایک اسٹریچر اٹھائے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اسٹریچر خالی نہیں تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ لوگ اوپری منزل سے حبشی فرانکو کی لاش اٹھا کر لا رہے تھے جسے آرتھر نے گولی ماری تھی۔ ان دونوں کا تعلق سکیورٹی کے عملے ہی سے ہو سکتا تھا۔ میرے جانے کے بعد آرتھر نے یقیناً اس لاش کی بابت سکیورٹی روم کو بتایا ہو گا اور اب وہ لوگ لاش اٹھا کے لے جا رہے تھے۔

ڈگلس کی حالت دیکھ کر ان دونوں کے چہروں پر حیرت کے آثار ابھرے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور گریبان پھٹا ہوا تھا۔ پھر یہ کہ وہ ملازمین کی گرفت میں تھا۔ دو ملازمین نے اسے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ قریب آ کر وہ لوگ کچھ ٹھٹکے جیسے حقیقت حال جاننا چاہتے ہوں۔ حیرت کے ساتھ ہی ان کے چہروں سے تجسس کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔

اس مرتبہ ڈگلس نے انہیں اپنی مدد کے لیے نہیں پکارا۔ اس کے برعکس اس نے ان دونوں سے کہا۔ ”یہاں نہ رکو! اپنا کام کرو، اس کی لاش کو جلد از جلد ٹھکانے لگا دو۔“

ان دونوں نے اثبات میں سر ہلائے اور پھر آگے بڑھ گئے، لیکن ان کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ڈگلس کی بات سے مطمئن نہیں ہوئے تھے۔

”اب اپنے آقا کو اوپری منزل پر لے چلو!“ میں نے ڈگلس کے ملازمین کو حکم دیا۔

”آخر تم چاہتی کیا ہو عذرا خان؟“ ڈگلس کی آواز میں بے بسی تھی۔ ”اب تو میں تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت بھی دے چکا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے ڈگلس نے قدم بڑھا دیئے کیوں کہ اس کے ملازمین اسے آگے بڑھنے کے لیے دھکا دینے لگے تھے۔

”میں جو چاہتی ہوں تمہیں بتا چکی ہوں ڈگلس!“ میں نے جواب دیا۔ ”تمہیں خود کو قانون کے حوالے کرنا پڑے گا!“

”مگر اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟“

”ہر کام میں فائدے اور نقصان کو نہیں دیکھا جاتا۔ تم متعدد افراد کو قتل کر چکے ہو۔ مجرم ہو تم! اور تمہیں اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔“

”کیا اس سلسلے میں تم سے کوئی سودے بازی نہیں ہو سکتی، اگر تم خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلی جاؤ تو میں اس کی تمہیں منہ مانگی قیمت دے سکتا ہوں۔“ اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ گویا اپنی کمان کا آخری تیر بھی چلا دیا۔

”افسوس ڈگلس کہ میں بکاؤ مال نہیں ہوں تم نے مجھے غلط سمجھا!“ میں نے جواب دیا۔

اب ہم زینے پر چڑھ رہے تھے۔

”دس لاکھ...... پندرہ لاکھ اور...... اور اس سے بھی زیادہ میں دے سکتا ہوں، صرف اس لیے کہ تم اپنی بہن کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ!“ اس نے گویا مجھے للچایا۔

”تمہاری فضول باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔“ میں نے سختی کے ساتھ اس کی پیش کش کو ایک بار پھر مسترد کر دیا۔

”نامعلوم وہ کون سی بری گھڑی تھی جب میں تمہیں یہاں لے کر آیا تھا۔“ ڈگلس منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔

میں خاموش رہی اور سوچنے لگی کہ اسے قانون کے حوالے کرنے کی خاطر مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ زینہ چڑھ کر ہم اس چھوٹی سی راہداری میں آ گئے جس کے اختتام پر آرتھر کا کمرا تھا۔ اس نے غالباً ہمارے قدموں کی چاپ سن لی تھی اسی لیے کمرے سے نکل آیا تھا۔ میں دانستہ وہاں ڈگلس کو لے آئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ آرتھر دور ہی سے حیرت زدہ آواز میں بولا۔ اسی لمحے میں نے اس کے عقب میں پستہ قد شخص کو بھی دیکھا۔

آرتھر کے سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا اور پھر اسے مزید سوال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کا اور پستہ قد شخص کا ذہن بھی میں نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

کچھ دیر بعد سب لوگ آرتھر کے کمرے میں پہنچ گئے، سامنے ہی میز پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے آرتھر کو حکم دیا۔ ''آرتھر! قریبی پولیس اسٹیشن فون کرواور بتاؤ کہ......''

''نہیں!'' ڈگلس درمیان میں بول اٹھا۔ ''میں تمہیں حکم دیتا ہوں آرتھر کہ تم ایسا نہیں کرو گے!''

''اگر تم نے اب درمیان میں مداخلت کی ڈگلس تو میں تمہارے ساتھ بری طرح پیش آؤں گی!'' میں سخت لہجے میں بولی۔ ''تم خاموش رہو گے۔''

میری وارننگ کے باوجود ڈگلس مداخلت سے باز نہ آیا۔ وہ اپنے ملازمین کی گرفت سے نکلنے کے لیے بھی اب دوبارہ مچلنے لگا تھا۔

''آرتھر! یہاں کوئی رسی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''نچلی منزل پر مل جائے گی۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو لے آؤ جا کر!'' میں بولی۔ تمہارا آقا اس طرح نہیں مانے گا۔ اسے رسیوں سے جکڑ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنا پڑے گا۔''

ڈگلس ایک بار پھر چیخنے چلانے لگا اور پھر جب مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا تو وہ گڑگڑا کر مجھ سے رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ آرتھر رسی لینے نچلی منزل پر جا چکا تھا۔

''سوچو ڈگلس کہ اسی طرح کتنے لوگ تمہارے سامنے گڑگڑائے ہوں گے، کیا تم انہیں قتل کرنے سے باز آ گئے۔ تم ایک ایسے ظالم شخص ہو جس پر رحم کرنا ظلم ہے۔ میں نفرت سے بولی۔ اسی وقت قدموں کی قریب ہوتی چاپ سنائی دی۔ غالباً آرتھر نچلی منزل سے رسی لے آیا تھا۔

میری پشت کمرے کے دروازے کی طرف تھی۔ اس لیے کمرے میں داخل ہونے والی ہستی کو فوراً نہ دیکھ سکی۔

''یہ تم لوگ کیا تماشا کر رہے ہو یہاں!'' اچانک ایک تیز اور سخت نسوانی آواز سنائی دی۔ ابھی ابھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگوں نے مسٹر ڈگلس کو پکڑ رکھا ہے اور اب میں خود اپنی آنکھوں سے بھی یہی دیکھ رہی ہوں۔ چھوڑ دو انہیں ورنہ میں تم سب کو گولی مار دوں گی!''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک غیر معمولی عورت تھی، انتہائی تندرست و توانا اور دراز قد۔ ایسے قد کاٹھ اور کسرتی جسم کی عورتیں میں نے کم ہی دیکھی ہیں۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس سے وہ کمرے میں موجود تمام افراد کو کور کیے ہوئے تھی۔

فوری طور پر میں نے اس کے ذہن کو بھی اپنے طاقتور ذہن کی گرفت میں لینا چاہا، مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ اس کا ذہن بھی ڈگلس کی ہی طرح ثابت ہوا تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی میں تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ میں نے پہلے یہ جاننا ضروری سمجھا کہ وہ ہے کون۔ ملازمین میں سے ایک شخص کا ذہن پڑھتے ہی مجھے علم ہو گیا کہ وہ عورت سکیورٹی کے عملے کی نگراں تھی۔ اس کے علاوہ وہ ڈگلس سے محبت بھی کرتی تھی۔ اس کا اور ڈگلس کا جوڑ یقیناً مضحکہ خیز تھا، مگر یہ وقت اس مضحکہ خیزی پر غور کرنے کا نہیں تھا۔

''چھوڑ دو مسٹر ڈگلس کو! ورنہ...'' اس عورت نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ریوالور کو حرکت دی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب عقب سے مجھے آرتھر کی شکل نظر آئی۔ دوسرے ہی لمحے آرتھر نے میرے

ایما پر اس عورت کو پیچھے سے دھکا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے مگر عین وقت پر نہ جانے جس طرح س عورت کو خطرے کا احساس ہو گیا۔ وہ اچھل کر ایک طرف ہوئی اور آرتھر اپنے ہی جسم کے زور میں منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ اس قدر بھاری جسامت کے ہونے کے باوجود اس عورت کا اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ حرکت کرنا میرے لیے تعجب خیز تھا۔ بہرحال مجھے موقع مل گیا۔ میں جیسے اڑتی ہوئی اس پر جا پڑی۔ س بات کو میں نے نظرانداز نہیں کیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے پہلے س عورت کے اسی ہاتھ کو گرفت میں لیا جس میں ریوالور تھا۔ میرا حملہ غیر متوقع تھا اس کے باوجود میں اس کے ہاتھ سے ریوالور نہ چھین سکی۔ اس نے جوابی کارروائی میں دیر نہیں کی تھی اور کسی کھلونے کی طرح مجھے دور اچھال دیا تھا۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید اس افتاد کے بعد اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکتا، مگر میں نے خود کو سنبھال لیا۔

جو دو ملازمین، ڈگلس کو گرفت میں لیے ہوئے تھے، ان کے علاوہ تین افراد کمرے میں ورموجود تھے۔ میں نے انہیں حکم دیا کہ اس عورت پر ٹوٹ پڑیں اور اس سے ریوالور چھین لیں۔ میں راصل اس طرح اس عورت کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانا چاہتی تھی۔

کسی طرح کی پروا کیے بغیر وہ تینوں، اس عورت پر حملہ آور ہو گئے جس کے نتیجے میں آرتھر کو پنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔

پستہ قد شخص کے بائیں بازو میں گولی لگی۔ وہ بھی چیخ کر بازو تھامے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ یسرا شخص بہرحال کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے عورت کے ہاتھ کو جکڑ لیا تھا۔ وہ خص تھا ہی جسیم اور توانا وہ عورت اس شخص سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی، ممکن ہے کہ وہ اپنی لوشش میں کامیاب ہو جاتی کہ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی، میری پہلی ہی کوشش میں اس عورت کے تھ سے ریوالور چھوٹ کر قریبی کھلی ہوئی کھڑکی سے نیچے گر گیا۔ اسی وقت عورت کا گھٹنا اس شخص کے کسی ازک مقام پر لگا جو ابھی تک عورت سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ شخص ذبح ہوتے کسی جانور کی طرح ڈکراتا ہوا جا گرا۔ دوسرے ہی لمحے وہ عورت مجھ سے الجھ پڑی۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ بے پناہ طاقت کی مالک تھی۔ ہ مجھے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑے ہوئے بھینچ رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔

''پیس ڈالو جولی اسے!'' قتل کر دو!'' ڈگلس اچانک چیخ اٹھا۔

''ہاں ڈگلس ڈارلنگ، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' اس عورت نے پرسکون آواز میں جواب دیا جسے ڈگلس نے جولی کہا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے مجھے بھینچنے کے لیے مزید زور لگایا۔

اس عورت کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے میں نے اپنی دونوں کہنیاں اس کے سینے پر گاڑ ھی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ دباؤ بڑھاتی جا رہی تھی۔ وہ عورت کسی خوفناک بلا کی طرح مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ یرے لیے یہ بہت آسان تھا کہ میں ان دونوں ملازمین میں سے کسی ایک کو ریوالور نکال کر فائر کرنے کا کم دے دیتی جو ڈگلس کو پکڑے ہوئے تھے۔ ان کی جیبوں میں ریوالور موجود تھے، لیکن مجھے یہ کچھ اچھا ہیں لگا مجھے اس میں اپنی سبکی محسوس ہوئی۔ میں خود اس عورت سے نمٹنا چاہتی تھی۔

میری کہنیوں کا دباؤ بالآخر اس حد تک بڑھ گیا کہ اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ چند ہی لمحے بعد میں ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے نکل گئی۔ پھر میں نے دوبارہ اسے یہ موقع نہیں دیا کہ وہ مجھے جکڑ سکتی۔ میں نے اچھل کر اس کے سینے پر فلائنگ کک ماری۔ نتیجتاً وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ اس سے پہلے کہ وہ گر کر دوبارہ اٹھنے میں کامیاب ہو جاتی میں نے اس کے سر پر زبردست ٹھوکر لگائی۔ ضرب اتنی شدید تھی جبکہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پھر تو میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ شاید میری کوئی ٹھوکر اس کی کنپٹی پر بھی پڑ گئی اور پھر وہ اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس کا لحیم شحیم جسم کمرے کے فرش پر پھیل گیا۔

میری نگاہ ڈگلس کی طرف اٹھی۔ وہ اس طرح مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی غیر ارضی مخلوق ہوں۔

''اب تم بھی اپنی محبوبہ کی طرح جہان غفلت میں چلے جاؤ تو بہتر ہے۔'' میں تیزی سے ڈگلس کی طرف بڑھی۔

پھر اس سے پہلے کہ ڈگلس کچھ سمجھ پاتا، اس کی کنپٹی پر میرے ہاتھ کی بھرپور ضرب پڑی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا سر ڈھلک گیا۔

''اب اسے چھوڑ دو!'' میں نے اس کے ملازمین کو حکم دیا۔

ڈگلس بھی فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ بھی بے ہوش ہو چکا تھا۔

اس کمرے میں جو کچھ بھی ہوا تھا، ذکیہ کے لیے یقیناً نیا تجربہ تھا بلکہ اسے تجربے کی بجائے مشاہدہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ وہ سکتے کی سی حالت میں کمرے کے ایک کونے میں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ پستہ قد شخص کے بازو کی ہڈی شاید ٹوٹ گئی تھی۔ تکلیف کی شدت کے سبب وہ بھی بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہاں وہ شخص ضرور سنبھل چکا تھا جس کے پیڑو پر جولی نے ضرب لگائی تھی۔

''ذکیہ!'' میں ذکیہ کے قریب جا کر نرمی سے بولی۔ ''ہوش میں آؤ!'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

''جج.... جی!'' اس کی سہمی ہوئی سی آواز بمشکل سنائی دی۔

''کرسی پر بیٹھ جاؤ!'' میں نے اسے سہارا دے کر قریب ہی پڑی ہوئی ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

وہ کرسی پر جیسے ڈھیر ہو گئی۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس کے سامنے بہر حال کچھ دیر قبل ہی ایک شخص قتل کر دیا گیا تھا۔ معمولی قوت برداشت رکھنے والے کسی بھی فرد کے لیے کسی کو قتل ہوتے دیکھنا بہر حال غیر معمولی واقعہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ذکیہ کا ردعمل اسی لیے غیر فطری نہیں تھا۔

''پولیس کو فون کرو!'' میں نے ڈگلس کے ایک حبشی ملازم کو حکم دیا۔ ''فون پر بتاؤ یہاں کئی قتل ہو گئے ہیں۔''

''جی بہتر ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر میز پر رکھے ہوئے فون کے قریب آ گیا۔

قریبی پولیس اسٹیشن کا نمبر ملا کر حبشی ملازم نے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ دوسری جانب سے غالباً پتا پوچھا گیا۔ ملازم نے اسی لیے کوٹھی کا پتا بتا دیا۔

''اب گیٹ بھی کھول دو!'' میں نے مزید حکم دیا۔ ''اور تم میں سے کوئی پولیس کی رہنمائی یہاں

تک کرنے کے لیے گیٹ پر چلا جائے۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک ملازم کو جانے کا اشارہ کیا۔

وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ پولیس کی وہاں آمد خود میرے اور ذکیہ کے لئے بھی الجھن کا سبب بن سکتی ہے اور یہ کہ پولیس کی آمد سے قبل مجھے ذکیہ کو وہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔ اس بات کا ہوش مجھے اس وقت آیا جب پولیس اس کی کوٹھی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی، مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ حبشی ملازم پولیس والوں کے ساتھ اس کمرے میں آ چکا تھا جہاں آرتھر کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

مجھے تو فون پر بتایا گیا تھا کہ یہاں کئی قتل ہو چکے ہیں پھر بقیہ لاشیں کہاں ہیں؟ پولیس انسپکٹر نے حبشی ملازمین کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

میرے خیال میں وہ کوئی احمق پولیس انسپکٹر تھا۔ اسے پہلے یہ سوال کرنا چاہئے تھا کہ قاتل کون ہے اور کہاں ہے؟ مجبوراً مجھے مداخلت کرنا پڑی۔ میں نے کہا ''انسپکٹر صاحب! پہلے آپ ان دونوں بے ہوش افراد کو حراست میں لے لیں۔ یہ دونوں ہی مجرم ہیں۔ یہاں یہ جو لاش پڑی ہے۔ اس شخص کو اس بے ہوش عورت نے گولی مار دی ہے اور......''

''ٹھہریں!'' پولیس انسپکٹر نے میری بات کاٹ دی۔ ''آپ کون ہیں؟ پہلے اپنا تعارف کرائیں۔''

''میرا نام عذرا خان ہے۔'' میں نے جواب دیا، پھر ذکیہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور یہ میری بہن ذکیہ ہے۔ ہم دونوں کا تعلق پاکستان سے ہے۔ پھر میں نے مختصراً پولیس انسپکٹر کو سب کچھ بتا دیا کہ ڈگلس سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی، ہم پر کیا گزری اور واقعات کس طرح رونما ہوئے! انسپکٹر کو میں نے اپنی اور ذکیہ کی اسکندریہ آمد کا سبب محض سیاحت بتایا تھا۔

''حیرت انگیز!...... ناقابل یقین!'' پولیس انسپکٹر نے میری پوری روداد سن کر غیر یقینی انداز میں کہا، مگر جب کچھ ہی دیر کے بعد فرانکو کی لاش بھی برآمد ہو گئی اور تہ خانے میں انجلا کی لاش بھی مل گئی تو پولیس انسپکٹر کو میری باتوں پر یقین کرنا ہی پڑا۔

ڈگلس کی کوٹھی میں تقریباً دو درجن ملازمین تھے جنہیں حراست میں لے لیا گیا۔ ان میں سے صرف چند ملازمین کو ڈگلس کے بارے میں حقیقت کا علم تھا۔ تہ خانے سے گیارہ ممیاں بھی برآمد ہوئیں جن کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ انہیں بھی قتل کیا گیا تھا یا نہیں۔ ویسے امکان یہی تھا کہ وہ گیارہ افراد، ڈگلس ہی کے ہاتھوں مارے گئے ہوں گے۔ ڈگلس اور جولی کو ہوش آ چکا تھا مگر انہوں نے اعتراف جرم سے انکار کر دیا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے ڈگلس کے ملازمین کے علاوہ میرا اور ذکیہ کا تحریری بیان بھی لیا تھا۔

میرا بیان لینے کے بعد انسپکٹر نے مجھ سے کہا تھا۔ ''مس عذرا خان! آپ کیونکہ عینی شاہد ہیں اور آپ کی بہن بھی! اس لیے آپ دونوں کو اس وقت تک اسکندریہ ہی میں رکنا پڑے گا جب تک عدالت میں آپ دونوں کے بیانات نہ ہو جائیں۔''

ظاہر ہے کہ ڈگلس کے خلاف قانونی کارروائی پوری ہونے کے بعد ہی اب میں اسکندریہ سے جا سکتی تھی اس لیے مجبوراً مجھے پولیس انسپکٹر کی بات ماننا پڑی۔

''یہاں آپ کا قیام کیونکہ کسی ہوٹل میں نہیں تھا اس لیے مزید قیام کی خاطر اب آپ کو کسی

ہوٹل ہی کا رخ کرنا پڑے گا۔'' پولیس انسپکٹر کہنے لگا۔ ''آپ یہاں سے میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلیں، وہاں سے کسی سپاہی کو آپ کے ساتھ کر دوں گا تاکہ وہ اس ہوٹل کا پتا نوٹ کر کے لاسکے جہاں آپ قیام کریں...... میں معذرت خواہ ہوں کہ پولیس کو اطلاع دیئے بغیر آپ وہاں سے کسی دوسرے ہوٹل میں منتقل نہیں ہوں گی اور نہ ہی فی الحال اسکندریہ سے جائیں گی۔''

قہر درویش بر جان درویش! مجھے پولیس انسپکٹر کی ہدایات پر عمل کرنا پڑا۔ میں نے قصر راس التین کے علاقے میں ایک مناسب ہوٹل تلاش کیا اور اس میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ ہوٹل شاہ فاروق کے محل سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ پولیس انسپکٹر نے ہمارے ساتھ جو سپاہی بھیجا تھا، وہ ہوٹل کا نام، کمرہ نمبر وغیرہ نوٹ کر کے واپس چلا گیا۔

قصر راس التین دراصل شاہ فاروق کے محل کا نام تھا اسی کی مناسبت سے اس علاقے کا یہ نام پڑ گیا تھا۔

ڈگلس کی کوٹھی سے چلتے ہوئے ہم نے اپنے اٹیچی کیس بھی لے لیے تھے جو سیاہ کار کی ڈکی سے برآمد ہو گئے تھے۔ سیاہ کار کو گیراج میں لے جا کر کھڑا کر دیا گیا تھا، کسی نے اس کی ڈکی کھول کر ہمارے اٹیچی کیس نکالنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

ہوٹل میں آ کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ذکیہ کی حالت بڑی حد تک سنبھل گئی۔ میں اس کے ذہن سے گزرتے ہوئے ہولناک واقعات کا اثر ختم کرنے کے لیے اسے لطیفے سنا رہی تھی۔ پہلے پہل وہ صرف مسکرائی، پھر ہنسنے لگی۔

دوسرے دن صبح ناشتا کرتے ہوئے جب میں انگریزی میں شائع ہونے والے ایک اخبار اجپشین کا مطالعہ کر رہی تھی پہلے ہی صفحے پر ایک نمایاں خبر پڑھ کر چونک اٹھی۔ یہ خبر ڈگلس کی گرفتاری کے متعلق تھی مگر چونکہ اٹھنے کا سبب کچھ اور ہی تھا اس خبر میں تفصیل کے ساتھ وہ پوری کہانی میرے نام سے شائع کی گئی تھی جو کہانی میں نے پولیس انسپکٹر کو سنائی تھی۔ خبر میں ذکیہ کا نام بھی تھا۔

''یہ بہت برا ہوا۔'' میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔

''کیا ہوا باجی؟'' ذکیہ نے سوال کیا۔ ''کیا برا ہو؟'' اس نے میری بات سن لی تھی۔

''کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں!'' میں نے چونک کر جواب دیا۔

''نہیں، کوئی بات ایسی ضرور ہے باجی جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں۔'' ذکیہ فکر مند لہجے میں بولی۔ ''بتائیں نا کیا بات ہے؟''

میں بھلا اسے کس طرح ایک بڑے خطرے سے آگاہ کر دیتی جواب یقیناً ناگزیر تھا۔ اس خبر کی اشاعت کے بعد فوری طور پر میرے دشمن بھی حرکت میں آ گئے ہوں گے۔ ان امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اب تک قاہرہ سے چل چکے ہوں۔ اس سے پہلے کہ میرے دشمن اسکندریہ پہنچ جاتے یا یہاں موجود اپنے گرگوں کو میرے بارے میں ہدایات دے دیتے۔ مجھے ہر قیمت پر اور فوراً اسکندریہ سے فرار ہو جانا تھا۔ اس ضمن میں ذکیہ کو بے خبر رکھنا بھی ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے مختصراً اسے اپنے آئندہ اقدام سے آگاہ کر دیا۔

میرے دشمنوں کے لیے اس ہوٹل کا پتا معلوم کر لینا یقیناً دشوار ثابت نہ ہوتا جہاں میرا قیام تھا۔ موجودہ خطرناک صورتحال میں پہلی ضرورت یہ تھی کہ میں فوری طور پر اس ہوٹل کو خیرباد کہہ دیتی، پھر اپنے اور ذکیہ کے چہرے پر میک اپ کر لیتی تاکہ ہمیں پہچانا نہ جا سکتا۔

اپنے اور ذکیہ کے چہرے پر میک اپ کرنے میں، میں نے بہت تیزی دکھائی، پھر ذکیہ کا ایئر بیگ میں نے اپنے شانے سے لگا کر اپنا اٹیچی کیس اٹھا لیا۔ ذکیہ نے میرے اشارے پر دوسرا اٹیچی کیس اٹھا لیا تھا۔ اب میں خاموشی کے ساتھ اس ہوٹل سے نکل جانا چاہتی تھی۔

کمرے سے نکلتے ہوئے پہلے میں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا راہداری خالی نہیں تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے میں نے اسی لیے کچھ دیر توقف کیا۔ دروازہ میں نے دوبارہ بھیڑ دیا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ دروازے کی دوسری جانب مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر کسی نے کال بیل بجائی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ اس وقت کسی کی آمد میرے لیے غیر متوقع بھی تھی اور خطرناک بھی! ذرا توقف سے پھر بیل بجی۔ میں نے ذکیہ کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا، پھر اٹیچی کیس دروازے ہی کے قریب رکھ کر اس پر ایئر بیگ بھی شانے سے اتر کر رکھنے کے بعد میں نے دروازہ کھول دیا۔

دروازے کے باہر متوسط عمر کا ایک شخص کھڑا تھا جس کے شانے سے کیمرا لٹک رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے مہرے اور حلیے سے مقامی ہی معلوم ہو رہا تھا۔

''جی فرمایئے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں اسکندریہ میں اجپشین میل کا نمائندہ ہوں۔'' اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ آپ مس عذرا خان ہیں نا!''

''جی نہیں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے نام مسز تنویر ہے۔'' میں نے صاف جھوٹ بولا۔

''مگر نیچے کاؤنٹر سے تو مجھے...... یہی ...... کمرے کا نمبر یہی بتایا گیا تھا اور پولیس اسٹیشن سے بھی......''

''سوری مسٹر! میں نے اس کی بات کاٹ دی۔'' آپ کو یا تو غلط نمبر بتایا گیا ہے یا پھر آپ نے غلط سنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں دوبارہ کنفرم کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑ گیا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔

وہ شخص مجھے فراڈ کی بجائے اخباری نمائندہ ہی معلوم ہوا تھا۔ یقیناً وہ اپنے اخبار کی ہدایت پر مجھ سے ملنے آیا تھا میں ابھی تک دروازہ کھولے اس شخص کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوا میں نے ذکیہ کو آواز دی۔

ذکیہ، اٹیچی کیس اٹھائے دوسرے کمرے سے میرے پاس چلی آئی میں بھی اس دوران میں اٹیچی کیس اٹھا چکی تھی اور ایئر بیگ بھی شانے سے لٹکا لیا تھا۔

''اب نکل ہی چلو!'' میں آہستہ سے بولی۔ ''کوئی اور مصیبت گلے نہ پڑ جائے!''

میں، ذکیہ کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھول کر راہداری میں آ گئی۔ اس وقت بھی راہداری خالی نہیں تھی۔ ہم دونوں کو کمرے سے نکلتے ہوئے کئی افراد نے دیکھا تھا مگر اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

ہوٹل کے عقبی دروازے سے نکلتے ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی اور میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک لیا۔ ٹیکسی رک گئی تو میں نے اس کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے ڈرائیور سے ڈکی بھی کھولنے کو کہا۔ وہ ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھول کر اتر آیا اور پھر ہمارے اٹیچی کیس اٹھاتے ہوئے پوچھا کہ کہاں چلنا ہے؟

''ایئرپورٹ۔'' میں نے جواب دیا۔

پھر اس نے ایئرپورٹ تک کا جو کرایہ طلب کیا، میں نے منظور کر لیا۔ کچھ دیر بعد ٹیکسی، اسکندریہ ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئی۔

ہر چند کہ میں نے اپنے اور ذکیہ کے چہرے پر میک اپ کرنے، پھر ہوٹل سے فرار ہونے میں زیادہ دیر نہیں کی تھی لیکن حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دشمن کی نظروں میں آئے بغیر ہم وہاں سے نکل آئے ہیں۔ جس وقت میں ہوٹل کے کمرے سے نکلی تھی، راہداری خالی نہیں تھی، بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ ان میں سے کون دشمن کا آلہ کار تھا، کیا خبر! ہوٹل کے اس کمرے سے باہر نکلنے کا مطلب یہی تھا کہ میں عذرا خان ہوں جو اپنی بہن کے ساتھ فرار ہو رہی ہوں۔ میک اپ سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ میک اپ کی وجہ سے دشمنوں کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ ہم دونوں میں ذکیہ کون ہے اور عذرا خان کون! مجھے اچشین قمیل کا نمائندہ بھی یاد آ رہا تھا۔ وہ یقیناً کاؤنٹر سے میرے کمرے کا نمبر معلوم کر کے دوبارہ اوپر آیا ہوگا۔ پھر یہ بات کھل گئی ہوگی کہ میں فرار ہو چکی ہوں۔

یہی وجوہ تھیں جن کی بنا پر میں ایئرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے بہت چوکنا تھی۔ ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ کہیں ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا تھا؟ مگر ٹیکسی کے پیچھے کئی کاریں تھیں۔ ان کی موجودگی میں یہ سمجھنا مشکل تھا کہ واقعی کوئی کار تعاقب میں ہے یا نہیں!

ابھی ٹیکسی نے نصف سفر طے کیا ہوگا کہ مجھے نیلے رنگ کی ایک کار پر شبہ ہونے لگا۔ وہ ہوٹل ہی سے ٹیکسی کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس میں سوار شخص کو بھی ایئرپورٹ ہی جانا ہو۔ میں اسی لیے تذبذب کا شکار تھی۔ پھر ایئرپورٹ تک وہ نیلی کار ساتھ لگی رہی۔ ٹیکسی سے اترتے ہوئے میں نے اس نوجوان پر اچٹتی سی نظر ڈالی جو اپنی کار کے شیشے چڑھا رہا تھا۔ معاً میری نگاہ اس کے ہاتھ پر پڑی اور میں چونک اٹھی۔ سردیوں کا موسم گزر چکا تھا مگر وہ نوجوان چمڑے کے دستانے پہنے ہوئے تھا۔ یہ بات غیر معمولی تھی اور مجھے چونکا دینے کے لیے بھی کافی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ڈکی کھول کر ہمارے اٹیچی کیس نیچے رکھ دیئے۔ ایئر بیگ میرے شانے ہی سے بدستور لٹکا ہوا تھا۔ میں نے اپنا پرس کھول کر کرایہ ادا کیا، اسی وقت دو پورٹر ہماری طرف لپکے۔ انہوں نے میرے اور ذکیہ کے اٹیچی کیس اٹھا لیے...... میں ذکیہ کے ساتھ ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ کچھ دور چل کر میں نے مڑ کے دیکھا۔ سرمئی سوٹ میں ملبوس نیلی کار والا نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ میں مزید محتاط اور چوکنا ہو گئی۔

انکوائری کاؤنٹر سے معلوم ہوا کہ اب سے تقریباً سوا گھنٹے بعد ایجپٹ ایئر کا ایک طیارہ قاہرہ

روانہ ہونے والا تھا۔ میں نے بکنگ کاؤنٹر سے اسی طیارے کے دو ٹکٹ حاصل کر لیے۔ اسکندریہ سے براہ راست مجھے کراچی کی کوئی فلائٹ نہیں مل سکتی تھی اس لیے قاہرہ ایئرپورٹ پہنچنا ضروری تھا۔ وہاں سے میں کراچی جانے والی کوئی بھی فلائٹ پکڑ سکتی تھی۔ ایسی صورت میں مجھے اور ذکیہ کو اپنا میک اپ بھی ختم کرنا پڑتا کیوں کہ ہم دونوں کو اپنے پاسپورٹ دکھانا پڑتے جن پر ہماری اصل تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

بکنگ کے بعد ہمارا سامان بیگیج روم میں چلا گیا۔ صرف ایئر بیگ میرے پاس رہ گیا۔ فلائٹ میں ابھی کافی وقت تھا اس لیے میں ذکیہ کو ساتھ لیے ایئرپورٹ کافی ہاؤس کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے کچھ بھوک سی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ ناشتا کرتے ہوئے ہی میری نظر اس خبر پر پڑی تھی جس نے فوری طور پر میری تمام تر توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔ پھر ناشتا ادھورا چھوڑ کر ہی میک اپ کرنے میں لگ گئی۔ کافی ہاؤس کی بڑھتے ہوئے میں اپنی اطراف سے غافل نہیں تھی۔ میں نے سرمئی سوٹ والے نوجوان کو اپنے پیچھے آتے دیکھ لیا تھا۔ پھر جب میں کافی ہاؤس کے گیٹ تک پہنچی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بالکل میرے پیچھے بہت قریب آ گیا ہو۔ میں تیزی سے پلٹی۔ اگر مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو شاید پچھتانے کا موقع بھی نہ ملتا۔ وہ سرمئی سوٹ والا نوجوان میرے اور ذکیہ کے بالکل پیچھے پہنچ چکا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ میرے کولہے کی طرف اور دوسرا ذکیہ کی کمر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں، میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ خالی نہیں تھے۔ چمڑے کے دستانے پہننے کی وجہ اب میری سمجھ آ گئی تھی اس کے ہاتھوں میں سوئیاں تھیں جو یقیناً وہ میرے اور ذکیہ کے جسموں میں چبھانا چاہتا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ سوئیاں بے ضرر نہیں رہی ہوں گی۔ میں نے مڑتے ہی تیزی سے اس کے ایک ہاتھ کی کلائی پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ پر اچھل کر لات ماری تا کہ وہ ذکیہ کے جسم میں سوئی نہ چبھو سکے۔ میرا حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ اس نوجوان کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ چیخ نکلنے کا سبب وہ ضرب بھی ہو سکتی تھی جو اس کے دوسرے ہاتھ پر پڑی تھی۔

ہمارے اردگرد کافی لوگ تھے۔ ذرا ہی دیر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ لوگوں نے اس نوجوان کو پکڑ لیا اور زدوکوب کرنے لگے۔ غالباً وہ یہ سمجھے تھے کہ اس نوجوان نے ہمیں چھیڑا ہے۔ میں بھی مصلحتاً اصل معاملہ چھپا گئی۔ میں نے جیسے ہی اس کی کلائی پر ہاتھ ڈالا تھا اس نے سوئی نیچے زمین پر گرا دی جسے میرے سوا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

ہنگامہ آرائی کی وجہ سے ایئرپورٹ سکیورٹی گارڈز بھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ اس نوجوان کو پکڑ کر لے گئے۔

میری اور ذکیہ کی اطراف ابھی تک لوگ جمع تھے۔ ہم دونوں ہی تماشا بن کر رہ گئے تھے۔ ہر نووارد یہی پوچھ رہا تھا کہ کیا ہوا؟

''آؤ ذکیہ اندر چلیں!'' میں ذکیہ کا ہاتھ تھامے لوگوں کے درمیان سے گزر کر کافی ہاؤس میں داخل ہو گئی۔

جب میں ذکیہ کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ گئی تو وہ بولی۔

''باجی! یہ سب کیا ہے؟...... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہنگامے آپ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔''

میں اس کے تبصرے پر مسکرا دی، پھر کہا ''تمہارا تبصرہ غلط نہیں ہے ذکیہ! حقیقت بھی یہی

ہے۔ میری زندگی ہنگاموں ہی سے عبارت ہے۔''

''بھلا بتائیں، اس نوجوان کو آخر کیا پڑی تھی کہ وہ......'' ذکیہ نے غالباً دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں صرف مسکرا کر رہ گئی۔ میں نے ذکیہ کو یہ نہیں بتایا کہ اس نوجوان کا مقصد کیا تھا! اس سوئی کی نوک پر یقیناً کوئی ایسی تیز اثر بے ہوشی کی دوا لگی ہوگی جو ہمارے خون میں شامل ہو کر فوری اثر کرتی۔ اگر میں ذکیہ کو یہ بات بتا دیتی تو وہ خوف زدہ ہو جاتی۔ اسی نکتے نے مجھے یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا کہ وہاں اس نوجوان کے اور ساتھی بھی ہوں گے یا اس کے بعد وہاں پہنچے ہوں گے۔ ہمیں بے ہوش کرنے کے بعد ظاہر ہے کہ وہ تنہا تو کہیں نہیں لے جا سکتا تھا، ایئرپورٹ سے بے ہوشی کی حالت میں ہم دونوں کو وہ لوگ کیسے اور کہاں لے جاتے، یہ میرے سوچنے کا مسئلہ نہیں تھا۔

قاہرہ سے میرے دشمن اتنی جلدی تو اسکندریہ نہیں پہنچ سکتے تھے، ہاں یہ ممکن تھا کہ انہوں نے اسکندریہ میں پہلے سے موجود اپنے کارندوں کو میرے پیچھے لگا دیا ہو۔ بہرحال میرے لیے یہ امر تشویشناک ہی تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سرمئی سوٹ والا وہ نوجوان، میرے دشمنوں ہی کا آلہ کار تھا۔

''یس میڈم! ویٹر کی آواز سن کر میں اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آ گئی۔

کافی کے علاوہ میں نے اپنے اور ذکیہ کے لیے ناشتا بھی منگوا لیا۔ ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا تو اسی وقت میری نظر قریبی میز پر آ کر بیٹھنے والے دو افراد پر پڑی۔ کافی ہاؤس کی زیادہ تر میزیں خالی ہی پڑی تھیں۔ ان دونوں نے ہمارے برابر والی میز ہی کا انتخاب کیوں کیا تھا جب کہ وہ کسی اور میز پر بھی بیٹھ سکتے تھے؟ اسی سوال نے مجھے ان کی طرف بغور دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عام حالات میں شاید میں اس طرف دھیان بھی نہ دیتی۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر لگ رہا تھا، دوسرا نوجوان تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ دونوں ہی کچھ چور چور سے نظر آنے لگے۔ اس لیے میں ان کی طرف سے اور بھی کھٹک گئی۔ ایک اور ویٹر ان کی میز پر بھی آرڈر لینے پہنچ گیا۔ انہوں نے بھی اپنے لیے کافی ہی منگوائی تھی۔ دونوں میزوں کا درمیانی فاصلہ اتنا کم تھا کہ آرڈر دینے والے کی آواز مجھے واضح طور پر سنائی دی تھی۔

اپنے اس شبہے کی تصدیق کرنے کے لیے کہیں ان دونوں کا تعلق میرے دشمنوں ہی سے نہ ہو، میں نے ان میں سے ایک کے ذہن کو پڑھنا شروع کر دیا اور چونک اٹھی۔ میری توجہ کا مرکز پہلے ادھیڑ عمر شخص بنا تھا۔ وہ اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں ان دونوں میں سے عذرا خان کون ہے؟ اس کا ذہن پڑھ کر مجھے بقیہ باتوں کا علم بھی ہو گیا۔ آج ہی صبح ٹیلی فون پر اسے قاہرہ سے ڈاکٹر رچرڈ نے ہدایات دی تھیں۔ اس وقت جو نوجوان اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور وہ سرمئی سوٹ والا دونوں ہی اس کے ماتحت تھے۔ میرے ہوٹل کا پتا اس نے پولیس اسٹیشن سے ایک اخباری نمائندہ بن کر حاصل کیا تھا۔ جس وقت میں ذکیہ کے ساتھ ہوٹل کے کمرے سے نکل رہی تھی، وہ راہداری میں موجود تھا۔ اسی کے ساتھ سرمئی سوٹ والا بھی تھا جسے اس نے میرے پیچھے لگا دیا تھا اور پھر خود دوسری کار میں اس نوجوان کے ساتھ ایئرپورٹ پہنچا تھا۔ اسی نے سرمئی سوٹ والے نوجوان کو وہ سوئیاں فراہم کی تھیں۔

اس شخص کا ذہن پڑھ کر اور ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ

پہلا حربہ ناکام ہونے کی صورت میں اب وہ کیا قدم اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہے! چند ہی لمحے بعد اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے وہ اپنی میز سے اٹھنے والا تھا۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی عذرا خان نہیں ہیں، میں نے گویا اس کے ذہن میں سرگوشی کی۔

مگر کمرے کا نمبر تو وہی تھا جو پولیس والوں نے بتایا تھا۔ میں نے خود ان دونوں کو اسی کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس کے ذہن نے مزاحمت کی۔

کمرے کا نمبر ٹو ون فور تھا، ون ون فور نہیں! یہی نمبر تھا...... یہی، میں نے اس کے ذہن میں بٹھایا۔

ہاں...... ہاں شاید ٹو ون فور ہی تھا۔ وہ سوچنے لگا پھر...... پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عذرا خان پہلی منزل کی بجائے ہوٹل کی دوسری منزل پر تھی اور...... اور ان میں...... ان دونوں میں سے کوئی بھی عذرا خان نہیں ہے!

نہیں!...... عذرا خان تو ابھی تک اسی ہوٹل میں ہے، روم نمبر ٹو ون فور میں! میں نے اسے سمجھایا۔

پھر...... پھر تو مجھے فوراً وہاں پہنچنا چاہئے! میں یہاں ناحق اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔

ہاں تمہیں فوراً وہاں پہنچنا چاہئے! میرے ذہن نے اسے پیغام دیا۔ مجھے علم تھا کہ شہر جا کر جب تک وہ دوبارہ ایئرپورٹ پہنچے گا، میری فلائٹ پرواز کر چکی ہوگی۔

''سنو!'' ادھیڑ عمر شخص نے اپنے نوجوان ساتھی کو مخاطب کیا۔ ''ہمیں فوراً شہر واپس چلنا ہے، مجھ سے ایک حماقت سرزد ہو گئی ہے۔''

''کیسی حماقت؟'' نوجوان نے سوال کیا۔

''یہ وضاحت کا وقت نہیں ہے۔'' ادھیڑ عمر شخص کچھ جھنجھلا سا گیا۔

''مگر وہ...... ویٹر، کافی لے کر آ رہا ہے، اسے......''

''احمق ہو تم بھی!'' یہ کہتے ہوئے ادھیڑ عمر شخص نے اپنی جیب سے پرس نکال کر پچاس اور پچیس پیاسٹر (مصری کرنسی) کے کچھ نوٹ نکالے اور انہیں میز پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اٹھو تم بھی جلدی کرو!''

اسی وقت ویٹر قریب آ گیا۔ ان لوگوں نے صرف کافی کا آرڈر دیا تھا اس لیے انہیں جلدی سرو کر دیا گیا تھا۔

''سر! یہ...... کافی!'' ویٹر نے ادب سے کہا۔

''تم نے کافی لانے میں دیر کر دی، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اس ادھیڑ عمر شخص نے میز پر پڑے ہوئے پیاسٹروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اٹھا لو اور کافی واپس لے جاؤ۔''

''ویری سوری سر کہ مجھے کافی لانے میں دیر ہو گئی!'' ویٹر عاجزی سے بولا اور پھر جھک کر ایک ہاتھ سے نوٹ اٹھانے لگا۔

''کوئی بات نہیں!'' ادھیڑ عمر شخص نے جواباً کہا اور پھر اپنے نوجوان ساتھی کو چلنے کا اشارہ کیا۔

میں نے ان دونوں کو تیز قدمی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا اور طویل سانس لیا۔

اپنے دشمنوں کے منصوبے کو میں نے عمل ہونے سے پہلے ہی ناکام بنا دیا تھا۔ اس ادھیڑ عمر شخص کا ارادہ یہ تھا کہ وہ ویٹر کی مٹھی گرم کر کے کافی میں بے ہوشی کی دوا ملوا دیتا۔ پھر جب ہم دونوں کافی پی لیتے تو کسی

بہانے کچھ دیر بعد وہ دونوں ہمارے میز پر آ بیٹھتے اور پھر جب ہم دونوں پر بے ہوشی کا غلبہ ہونے لگتا تو وہ ہمیں اپنا ہی ساتھی ظاہر کر کے سہارا دے کر وہاں سے لے جاتے۔ اس شخص کا ذہن پڑھ کر مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ خود ڈاکٹر رچرڈ اپنے کچھ خاص گرگوں کے ساتھ بہت جلد اسکندریہ پہنچنے والا تھا۔ یہ بڑی دلچسپ صورتحال تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ تو قاہرہ سے یہاں پہنچ رہا تھا اور میں قاہرہ جا رہی تھی۔

جہاز کی روانگی سے نصف گھنٹے قبل میں، ذکیہ کو ساتھ لیے لابی میں پہنچ گئی۔ کافی ہاؤس میں ذکیہ نے اور میں نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا تھا۔ پھر کافی پی کو ہم دونوں کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ آئی تھیں۔ ان دونوں کے ایئرپورٹ سے چلے جانے کے بعد میں بڑی حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جہاز کی روانگی تک کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

سکندریہ ایئرپورٹ سے قاہرہ کے لیے جب جہاز پرواز کر رہا تھا تو مجھے ذہنی طور پر بہت سکون محسوس ہوا تھا۔ میں ایک بار پھر اپنے دشمن کو جل دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اس وقت صبح کے پونے گیارہ بجنے والے تھے جب جہاز قاہرہ ایئرپورٹ پر اترا۔

جہاز سے اترتے ہی میں، ذکیہ کو اپنے ساتھ لیے باتھ رومز کی جانب چلی گئی۔ میں ضروری کارروائیوں سے پہلے اپنا اور ذکیہ کا میک اپ ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے میں نے انکوائری کاؤنٹر سے معلوم کر لیا تھا کہ ایک غیر ملکی فضائی طیارہ تقریباً پونے دو گھنٹے بعد قاہرہ سے کراچی کے لیے پرواز کرنے والا تھا۔ ٹکٹ لینے اور دیگر ضروری کارروائی میں ایک ڈیڑھ گھنٹا گزر جانا معمولی بات تھی کیونکہ ہمیں بیرون ملک سفر کرنا تھا۔ امیگریشن اور کسٹم کاؤنٹر پر بھی خاصا وقت صرف ہو جاتا۔

لیڈیز باتھ رومز کے نزدیک پہنچ کر موقع ملتے ہی میں، ذکیہ کا ہاتھ تھامے ایک باتھ روم میں گھس گئی۔

پھر جب کچھ دیر بعد باری باری ہم دونوں اس باتھ روم سے نکلے تو ہمارے چہروں پر میک اپ نہیں تھا۔

پہلے میں نے بکنگ کاؤنٹر پر آ کر کراچی کے لیے دو ٹکٹ خریدے، پھر ذکیہ کو ساتھ لے کر امیگریشن کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا ٹکٹ، پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات میں نے اسے تھما دیئے تھے۔ جب میں امیگریشن کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہی تھی تو نہ جانے کیوں مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ عموماً ایسا اس وقت ہوتا تھا جب کوئی غیر متوقع واقعہ پیش آنے والا ہوتا تھا۔

''ذکیہ'' معاً میں نے ذکیہ کا ہاتھ تھام لیا۔

''جی باجی! وہ میرے ساتھ رک گئی اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''دیکھو، اگر کسی بھی سبب جہاز کی روانگی سے قبل کوئی گڑبڑ ہو جائے اور......''

''کیسی گڑبڑ باجی؟'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

''میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتی۔ بہرحال تم پوری توجہ سے میری بات سنو! اگر کسی بھی سبب تم مجھ سے بچھڑ جاؤ تو یہاں قاہرہ میں کسی قیمت پر نہیں رکو گی!''

''پھر؟...... باجی؟'' اس نے سوال کیا۔

''بالفرض تم پاکستان روانہ نہ ہو سکو تو قاہرہ کی بجائے مصر کے کسی بھی شہر، مثلاً اسوان، اسماعیلیہ، پورٹ سعید کہیں بھی چلی جاؤ گی، ہاں اسکندریہ نہ جانا! یہ خیال رکھنا کہ کسی کو معلوم نہ ہو!

......اور......''

''مگر باجی، اب تو ہم نے کراچی کے ٹکٹ بھی خرید لیے ہیں اور کچھ دیر کے بعد ہماری فلائٹ بھی روانہ ہونے والی ہے، پھر آپ یہ کیوں کہہ......''

میں نے کہا نا کہ مجھے خود نہیں معلوم! میری چھٹی حس کسی خطرے کی نشاندہی کر رہی ہے۔ ہاں سنو! اگر تم کسی طرح یہاں سے پاکستان پہنچ سکو تو بہت اچھا ہے۔ تم وہاں پہنچتے ہی ایک ٹیلی فون نمبر پر ایئرپورٹ ہی سے اپنی آمد کی اطلاع دے دینا۔ ٹیلی فون پر تمہارا صرف یہ بتانا کافی ہو گا کہ تم کون ہو پھر ایئرپورٹ پر انتظار کرنا، تمہیں کوئی کار وہاں سے آ کر لے جائے گی۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کا ٹیلی فون نمبر بتایا۔'' اسے دہراؤ...... بلکہ بہتر یہ ہے کہ اسے یاد رکھنے کی بجائے کہیں نوٹ کر لو!
''

ذکیہ نے ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیا۔ اس کے پرس میں ایک پاکٹ ڈائری اور قلم موجود تھا۔

''سنو! وہاں پہنچ کر میری آمد تک تمہیں بہت محتاط رہنا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جہاں جس عمارت میں تمہارا قیام ہو گا تمہیں وہاں سے نکلنا نہیں ہے۔'' میں نے اسے مزید سمجھایا۔

''کراچی میں تو آپ کی کوٹھی بھی ہے، پھر میں وہاں کیوں نہ ٹھہروں!'' وہ بولی۔

''ان دنوں کوٹھی میں کوئی بھی نہیں، ہے کوٹھی مقفل ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اس نے حیرت سے کہا،'' اور آپ کے مستقل ملازمین...... وہ...... وہ کہاں گئے۔''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے ذکیہ!'' میں نے گہرا سانس لیا'' اس وقت میں تمہیں وہ کہانی نہیں سنا سکتی۔ فی الحال وہ باتیں اپنے ذہن میں رکھو جو میں نے تمہیں سمجھائی ہیں۔ ویسے جہاں تمہارا قیام ہو گا، وہاں بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ تمہیں وہاں بھی گھر ہی ایسا آرام ملے گا۔''

''ٹھیک ہے باجی، آپ بے فکر رہیں، میں آپ کی ہدایات پر پورا عمل کروں گی۔'' ذکیہ نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔

فضا کے تناؤ کو کم کرنے کیلئے میں مسکرا دی، پھر بولی'' آؤ اب ضروری کارروائیوں سے نمٹ لیں۔''

ذکیہ میرے ساتھ ساتھ امیگریشن کاؤنٹر پر آ گئی ہم سے پہلے وہاں تین چار افراد اور کھڑے تھے ہم دونوں بھی ان کے پیچھے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ آگے میں تھی اور میرے پیچھے ذکیہ! ذرا ہی دیر بعد ہمارا نمبر بھی آ گیا۔ میں نے اپنے کاغذات اور پاسپورٹ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو تھما دیئے۔ اس شخص کے دائیں بائیں دو افراد کھڑے تھے۔ وہ دونوں بھی جھک کر پاسپورٹ وغیرہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے جسموں پر ایئرپورٹ کے عملے کی وردیاں نہیں تھیں۔ وہ سادہ لباس میں تھے مجھے یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ ان دونوں ہی کے چہروں پر تشویش و تجسس کے آثار تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھ سے پہلے قطار میں جو عورت کھڑی تھی، اسے بھی وہ دونوں بہت گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے جیسے ہی میرا پاسپورٹ کھولا، ان میں سے ایک نے اس کے ہاتھ سے پاسپورٹ گویا اچک لیا، پھر فوراً ہی میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور چونک اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں گیا۔ جب اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب سے باہر آیا تو اس میں پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر

تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں اب تک میرا پاسپورٹ تھا اس نے پاسپورٹ پر لگی ہوئی میری تصویر کو اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویر سے ملایا اور پھر دوبارہ میری طرف دیکھا۔ اس کے بعد وہ معنی خیز انداز میں سر ہلا کر دوسری جانب کھڑے ہوئے اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا جو اسی کی طرف متوجہ تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ان دونوں نے کچھ اشارہ کیا۔ پھر اس شخص نے میرے بقیہ کاغذات بھی کاؤنٹر سے اٹھا کر اپنے قبضے میں کر لیے۔ میرے لیے اس شخص کی حرکات و سکنات عجیب اور نا قابل فہم تھیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے پاسپورٹ اور میرے کاغذات اٹھا لینے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور یہ بات بھی میرے لیے حیران کن ہی تھی۔

پھر میں نے ان دونوں کو ایک لمبا چکر کاٹ کر اندرونی حصے سے باہر آتے دیکھا۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں کاؤنٹر پر موجود شخص سے مخاطب ہوئی۔ ’’مسٹر کیا بات ہے؟...... آپ نے میرا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات ان لوگوں کو کیوں دے دیئے؟‘‘

’’ویٹ اے منٹ پلیز!‘‘ وہ خوش اخلاقی سے بولا۔ ٹیک اے سائٹ!‘‘ اس نے مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا اور کاؤنٹر سے ایک طرف الگ کھڑے ہو جانے کی درخواست کی، پھر سامنے دیکھتے ہوئے اس نے ذکیہ کو مخاطب کیا۔‘‘ پلیز کم آن!‘‘

میں ایک طرف ہو گئی اور ذکیہ نے اپنا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات اس شخص کو دے دیئے وہ جلدی جلدی ان پر ضروری کارروائی کرنے لگا۔

میرے ذہن میں اس وقت خطرے کی گردان ہو رہی تھی، مگر میں خطرے کی نوعیت سمجھنے سے قطعی قاصر تھی۔ میری نگاہیں انہی دونوں افراد پر جمی ہوئی تھیں جن میں سے ایک کے پاس میرا پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات تھے۔ اس شخص نے اب انہیں اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا اور اپنے ساتھی سے کچھ گفتگو کرتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ دونوں میرے قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ ’’مس عذرا خان! پلیز لسن می!‘‘

اس وقت تک ذکیہ کے کاغذات پر ضروری کارروائی ہو چکی تھی اور وہ میرے قریب کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا ’’تم چلو ذکیہ! میں ان سے بات کر کے ابھی آتی ہوں۔‘‘

ذکیہ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

غالباً وہ سمجھ گئی تھی کہ کچھ دیر پہلے میں نے جس خدشہ کا اظہار کیا تھا، وہ سامنے آ چکا ہے۔

’’جاؤ...... خدا حافظ!‘‘ میں نے اسے تذبذب کا شکار ہوتے دیکھ کر کہا۔

’’خدا حافظ!‘‘ مجبوراً اسے بھی کہنا پڑا اور پھر وہ مجھ پر الوداعی نظر ڈالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میں ان دونوں افراد کے ساتھ کاؤنٹر سے ہٹ آئی۔ کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ دونوں رک گئے۔ آس پاس وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ جس شخص کے پاس میرا پاسپورٹ تھا، اچانک اس نے مجھے مخاطب کیا ’’یو آر انڈر اریسٹ مس عذرا خان!‘‘

’’وہاٹ ڈو یو مین؟‘‘ میں نے تیزی سے کہا۔

’’کیا آپ گرفتاری کا مطلب نہیں سمجھتیں؟‘‘ وہی شخص سپاٹ سے لہجے میں بولا۔

’’سمجھتی ہوں، بالکل سمجھتی ہوں! مگر پہلے تو آپ اپنی شناخت کرائیں کہ آپ مجھے گرفتار کرنے کے مجاز بھی ہیں یا نہیں،...... پھر میں اپنا وارنٹ دیکھنا چاہوں گی کہ مجھے کس جرم کے تحت گرفتار کیا جا رہا ہے!

’’کیوں نہیں!‘‘ اس شخص نے اپنے کوٹ کی جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکالا اور میرے سامنے کر دیا۔ ’’انسپکٹر سعید فرام انٹیلی جنس!‘‘

’’اور گرفتاری کا وارنٹ؟‘‘ میں بول اٹھی۔

’’ہم کسی بھی شخص کو وارنٹ کے بغیر بھی حراست میں لینے کے مجاز ہیں مس عذرا خان!‘‘

’’مگر...... مگر یہ تو سراسر دھاندلی ہے! میں نے احتجاج کیا۔

’’ممکن ہے آپ کے ملک میں اسے دھاندلی سمجھا جاتا ہو مگر ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔‘‘ پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ’’مس عذرا خان کا سامان اٹھوا کر وین میں رکھوا دو!‘‘ اس کا ساتھی چلا گیا تو وہ مجھ سے بولا۔ ’’مس عذرا خان! آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے میری ہدایات پر عمل کریں۔‘‘

’’انسپکٹر تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ میں غیر ملکی ہوں اور یہ بھی کہ میری غیر قانونی گرفتاری پر میرے ملک کا سفارت خانہ تمہاری حکومت سے احتجاج بھی کر سکتا ہے! میں تلخ لہجے میں بولی۔ ’’ممکن ہے، اس طرح تمہاری نوکری خطرے میں پڑ جائے۔‘‘

میری بات سن کر وہ آہستہ سے ہنس دیا۔ ’’معلوم ہے مجھے مس! آپ فکر نہ کریں، میں اپنی ذمے داریوں اور اپنے اختیارات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں کبھی اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کرتا، آئیں چلیں میرے ساتھ، آپ نے خاصی بحث کر لی ہے۔‘‘

اگر یہ معاملہ مصری انٹیلی جنس کا نہ ہوتا اور وہ شخص بحیثیت انسپکٹر اپنی شناخت نہ کرا دیتا تو یقیناً میں اس کے ساتھ چلنے پر کسی صورت آمادہ نہ ہوتی۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل نہیں تھا کہ میں اس کے اور اس کے ساتھی کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے کر اپنی جان چھڑا لیتی، مگر ایسی صورت میں میری حیثیت ایک مفرور مجرم کی ہوتی۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ مصری انٹیلی جینس مجھے ایک مفرور مجرم قرار دے دیتی۔ اس طرح آئندہ کے لیے میں کبھی اس ملک کا رخ نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس شخص کے ساتھ ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ گئی۔ وہاں ایک سیاہ بند وین میری منتظر تھی۔ انسپکٹر سعید نے وین کا پچھلا حصہ میرے لیے کھول دیا۔

میں کسی تامل کے بغیر وین میں سوار ہو گئی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد میرا سامان بھی وین ہی میں لا کر رکھ دیا گیا اور وین روانہ ہو گئی۔ انسپکٹر سعید اور اس کا ساتھی وین کے اگلے حصے میں بیٹھے تھے، وین کے پچھلے حصے کو باہر سے مقفل کر دیا گیا تھا۔ میں نے قفل میں چابی گھومنے کی واضح آواز سنی تھی۔

انٹیلی جنس کا دفتر تحریر اسکوائر میں ایک دس منزلہ عمارت کے اندر تھا۔ اسی عمارت میں پولیس ہیڈ آفس اور پاسپورٹ آفسز بھی تھے۔ پرانے طرز پر بنی ہوئی یہی عمارت میری منزل ہو سکتی تھی۔ یہ عمارت میری دیکھی ہوئی تھی۔

جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ مجھ پر کیا الزامات لگائے گئے ہیں اور کس جرم میں مجھے گرفتار کیا گیا ہے، میں اپنی رہائی کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا نہ چاہتی تھی۔ کسی حد تک یہ تو میں سمجھ ہی چکی تھی کہ یہ چال بھی میرے دشمنوں ہی کی طرف سے چلی گئی ہے، لیکن اس کے لیے انہوں نے کیا طریقہ کار اختیار کیا ہوگا، یہ سمجھنا میرے لیے فی الحال ممکن نہیں تھا۔

وین کو ایئر پورٹ سے چلے ہوئے ابھی بمشکل نصف گھنٹہ ہوا تھا کہ اچانک میری سماعت سے ایک زبردست دھماکے کی آواز ٹکرائی۔ اسی کے ساتھ وین ایک طرف جھک گئی۔ یقیناً کسی نے وین کے پچھلے ٹائر پر فائر کیا تھا اور ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ وین فوراً ہی رک گئی تھی۔

میرے اعصاب تن گئے۔ یقیناً کوئی خطرناک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ پے در پے دھماکے سنائی دینے لگے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے دو پارٹیوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو چکا ہے۔ اگر میری گرفتاری میں میرے دشمنوں ہی کا ہاتھ تھا تو پھر یہ حملہ آور کون تھے؟ انہوں نے انٹیلی جنس کی وین پر کیوں فائرنگ شروع کر دی تھی؟ آخر اس سے ان کا مقصد کیا تھا؟ میرے ذہن میں بار بار یہی سوالات چکرا رہے تھے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

میں اس وقت خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ وین کا پچھلا حصہ باہر سے مقفل تھا۔ میری حیثیت کسی ایسی شیرنی کی سی تھی جسے کٹہرے میں بند کر دیا گیا ہو۔

پھر کافی دیر تک فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ میں نے اسی دوران میں پے در پے تین چیخیں بھی سنیں۔ اس کے بعد ایک دم سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر سناٹا طاری رہا اور پھر میں نے کئی قدموں کی چاپ قریب آتے سنی جو غالباً وین کے پچھلے حصے تک آ کر رک گئی۔ اس کے ساتھ ایک دھماکہ ہوا مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کسی نے وین کے قفل پر فائر کیا تھا۔ وین کے قفل پر فائرنگ کرنے والے ظاہر ہے انٹیلی جنس والے نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں قفل پر فائر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کے پاس تو چابی بھی موجود تھی! یہ سوچ کر میرے سارے جسم میں ایک برقی روسی دوڑ گئی۔ کسی بھی لمحے اب وین کا دروازہ کھلنے والا تھا اور پھر......

میں اس سے زیادہ نہ سوچ سکی کیونکہ اس وقت میں نے انتہائی تیز اور ناگوار قسم کی بو محسوس کی اس کے ساتھ میرا سر بری طرح چکرانے لگا۔ حواس کھونے سے پہلے میں سمجھ چکی تھی کہ وین کے پچھلے حصے میں بے ہوشی کی گیس چھوڑ دی گئی ہے۔ گویا وہ جو کوئی بھی تھے بے ہوشی کی حالت میں مجھ پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ یقیناً انہیں علم تھا کہ عالم ہوش میں مجھ پر قابو پانا آسان نہیں ہوگا اور یہ بات صرف میرے دشمنوں کو معلوم تھی۔

☆......☆......☆

مجھے نہیں معلوم کتنی دیر مجھ پر غفلت طاری رہی! رفتہ رفتہ میرے حواس بیدار ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ میں کہاں اور کن حالات کا شکار ہو کر اپنے دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی! انٹیلی جنس والے مجھے ایک بند وین میں قاہرہ ایئر پورٹ سے شہر لے جا رہے تھے کہ راستے میں کچھ افراد نے وین پر حملہ کر دیا تھا۔ پھر فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا اور غالباً انٹیلی جنس والوں کو اس مقابلے میں شکست ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وین کے پچھلے حصے میں بیہوشی کی گیس چھوڑ دی گئی تھی اور میں حواس کھو بیٹھی تھی۔ اندازے کے مطابق اس وقت مجھے اپنے دشمنوں کی قید میں ہونا چاہیے تھا۔

ہوش میں آ جانے کے باوجود ابھی تک میں نے دانستہ اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ مخصوص قسم کی آشنا آوازوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس وقت مجھے کسی ہیلی کاپٹر میں کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ احساس بھی ہو چکا تھا کہ میرا جسم رسیوں کی گرفت میں ہے۔ اپنی دونوں کنپٹیوں پر بھی مجھے ہلکا سا دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ یہ جاننے کے لئے ہیلی کاپٹر میں میرے علاوہ اور کون ہے میں نے آہستگی اور احتیاط سے خفیف سی پلکیں کھولیں۔ وہ ایک چھوٹا سا ہیلی کاپٹر تھا۔ اس میں صرف چار نشستیں تھیں۔ پچھلی دو نشستوں پر میں دراز تھی۔ اگلی نشستوں میں سے ایک پر ہیلی کاپٹر کا پائلٹ اور اس کے برابر والی نشست پر میرا دشمن جان ڈاکٹر رچرڈ بیٹھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ دونوں پیر بھی رسی کی گرفت میں تھے اور میں دائیں کروٹ سے لیٹی ہوئی تھی۔ میرے سر پر ایک خود چڑھا ہوا تھا۔ میری دونوں کنپٹیوں پر اسی خود کا دباؤ تھا۔ میں لاعلم تھی کہ وہ خود مجھے کس لئے پہنایا گیا تھا! ہیلی کاپٹر میں ڈاکٹر رچرڈ کو دیکھ کر میں سمجھ چکی تھی کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں واقعی اپنے دشمنوں کی گرفت میں آ چکی تھی۔

ڈاکٹر رچرڈ کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ میں اس کے ذہن کو اپنے طاقت ور ذہن کی گرفت میں نہیں لے سکتی تھی مگر ڈگلس سے نمٹ کر میرے تجربے میں اضافہ ہو چکا تھا۔ میں ڈگلس کے ذہن پر بھی قابو نہیں پا سکی تھی لیکن اس کے حبشی غلام کے ذریعے مجھے کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ اس وقت ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو میں اپنا آلہ کار بنا سکتی تھی۔ اس خیال نے گویا میرے اندر ایک نئی زندگی کی لہر بیدار کر دی۔ پھر میں نے وقت ضائع کئے بغیر فوری طور پر ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کے ذہن سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ جیسے ہی میں نے یہ کوشش کی میرے سر میں درد کی اتنی شدید لہر اٹھی کہ ضبط کرنے کے باوجود میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ ہیلی کاپٹر کے اندر مخصوص آوازوں کے ہلکے سے شور میں میری کراہ دب گئی ورنہ ڈاکٹر رچرڈ یقیناً میری طرف متوجہ ہو جاتا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے دوبارہ پائلٹ کے ذہن کو گرفت میں لینا

چاہا۔ اس مرتبہ پہلے سے بھی شدت کے ساتھ مجھے اپنے سر میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ اس بار کراہ کی بجائے میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

دوسرے ہی لمحے ڈاکٹر رچرڈ نے پیچھے مڑ کر دیکھا پھر بولا۔ ''ہوش آ گیا تمہیں......! ہوش آتے ہی کہیں تم نے پائلٹ کے ذہن سے تو رابطہ قائم کرنا نہیں چاہا؟'' جواباً میں کچھ نہ بولی تو اس نے مزید کہا۔ ''عذرا خان! اگر واقعی تم نے ایسا ہی کیا ہے تو یہ کوشش مہنگی پڑے گی تمہیں! تمہارے سر میں اتنا شدید درد شروع ہو جائے گا کہ تم چیخنے لگو گی۔ تم نے شاید اس خود پر توجہ نہیں دی جو تمہارے سر پر چڑھا ہوا ہے۔ یہ برین ویوز کنٹرولر ہے۔ جب تک یہ تمہارے سر پر چڑھا ہوا ہے تم اپنے طاقت ور ذہن سے کوئی کام نہیں لے سکتیں!'' یقیناً ڈاکٹر رچرڈ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اب تک پائلٹ کے ذہن سے رابطہ قائم کر چکی ہوتی۔ میں نے اسی لئے یہ کوشش ترک کر دی۔

''ڈاکٹر رچرڈ!'' معاً کچھ سوچ کر میں نے اسے مخاطب کیا اور پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں پہلو کے بل لیٹنے کے بجائے ہاتھ اور پیر بندھے ہونے کے باوجود بیٹھ بھی سکتی تھی۔

''ہاں کہو کیا بات ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔ ''تم شاید اٹھ کر بیٹھنا چاہتی ہو۔'' اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔

میں تقریباً اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے ہاتھ کا سہارا دیا تو مجھے پوری طرح کامیابی ہو گئی۔

''ڈاکٹر! تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں قاہرہ پہنچ چکی ہوں؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''محض قیاس!'' وہ آہستہ سے ہنس کر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں تمہاری نفسیات کو سمجھتا ہوں۔ اخبار میں خبر پڑھتے ہی کہ تم اور تمہاری بہن اسکندریہ میں ہو میں نے سوچا کہ اب وہاں سے فوری طور پر تم فرار ہونے کی کوشش کرو گی۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ تم اپنی بہن کو لے کر مصر کے کسی اور شہر کا رخ کرنے کے بجائے پاکستان جانے کو ترجیح دو گی اور اس کے لئے تمہارا قاہرہ آنا لازمی ہو گا۔ پھر میں نے یہاں ایسا بندوبست کر دیا کہ تمہیں یہاں انٹیلی جنس والے حراست میں لے لیں۔ اسی کے ساتھ میں نے اسکندریہ میں موجود اپنے آدمیوں کو تمہارے پیچھے لگا دیا۔ مجھے علم تھا کہ تم ان لوگوں کے قبضے میں نہیں آؤ گی اور انہیں جل دے کر نکل جاؤ گی۔ پھر یقیناً ایسا ہوا ہو گا ورنہ تم قاہرہ پہنچنے میں کامیاب نہ ہوتیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں سے پاکستان جانے کے لئے تمہیں میک اپ کا سہارا لئے بغیر ہی سفر کرنا ہو گا۔ سو میرے قیاسات درست ثابت ہوئے۔ یہاں میں نے تمہارے لئے پہلے ہی جال بچھا رکھا تھا؟'' یہ کہہ کر ڈاکٹر رچرڈ خاموش ہو گیا۔

اس کی بات سن کر مجھے دل ہی دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ وہ یقیناً انتہائی ذہین شخص ہے۔ اس کا یہ دعویٰ بھی غلط معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ میری نفسیات سے واقف ہے۔

''اب تم غالباً مجھ پر دوسرا تجربہ کرو گے!'' میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

''ہاں عذرا خان!'' اس نے بے جھجک جواب دیا۔ ''اب میں ایک دن بھی نہیں رک سکتا' دوسرے تجربے کا وقت ہو چکا ہے۔''

''اگر آج بھی میں تمہارے قابو میں نہ آتی تو تم کیا کرتے؟'' میں نے سوال۔

''یہ تو میں اسی وقت سوچتا' ممکن ہے کوئی اور راہ نکل آتی۔ اب بھی میں سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''کس سلسلے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے پہلے تجربے کے بعد دوبارہ قابو میں آنے تک خاصا وقت برباد کر دیا ہے۔ قبل از وقت میں یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ دوسرا تجربہ یقیناً کامیاب ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے صاف گوئی سے بتایا۔

''اگر تم اپنے دوسرے تجربے میں کامیاب نہ ہو سکے یعنی میرے ذہن کو امریکی مفادات کا تابع نہ بنا سکے تو پھر کیا کرو گے؟'' میں نے دریافت کی۔

''تو قتل کر دوں گا تمہیں!'' اس نے یہ الفاظ اس طرح ادا کئے جیسے کسی کو قتل کر دینا اس کے نزدیک کوئی خاص بات نہ ہو۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسی ہی بات تھی کہ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے مزید سوال کیا۔ ''مجھے قتل کرنے سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟''

''اسے تم انتقامی کارروائی سمجھ سکتی ہو۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تمہاری وجہ سے میرے بہت سے آدمی مارے جا چکے ہیں' اس کے علاوہ خاصا بڑا سرمایہ بھی ضائع ہو چکا ہے اور اس کا واحد سبب تم ہو! تمہارا قتل کیا جانا گویا تمہاری سزا ہو گی۔''

اس گفتگو کے بعد میں نے اس سے مزید کوئی بات نہیں کی۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ ہیلی کاپٹر پرانے قاہرہ پر پرواز کر رہا ہے۔ اس کا رخ یقیناً مقطم کے پہاڑی سلسلے کی طرف تھا جہاں میں پہلے بھی ایک بار آ چکی تھی۔ ذکیہ کو وہیں رکھا گیا تھا۔ اسی کو رہائی دلانے میں یہاں آئی تھی۔ صلاح الدین ایوبی کے قلعے کی بلند فصیلیں دور سے نظر آ رہی تھیں اور مینار و برج بھی۔

ڈاکٹر رچرڈ نے اس وقت مجھے پوری طرح قابو میں کر رکھا تھا۔ بظاہر کوئی ایسی صورت نظر نہیں آ رہی تھی کہ میں اس کی گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو سکتی۔ میرے طاقت ور ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کو بھی اس نے گویا عارضی طور پر قطعی معطل کر دیا تھا۔ جب تک میرے سر پر وہ خود چڑھا ہوا تھا میں اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کو متحرک نہیں کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ کا یہ خدشہ بھی درست معلوم ہوا تھا کہ ممکن ہے دوسرا تجربہ کامیاب ثابت نہ ہو کیونکہ پہلے تجربے کو خاصا وقت گزر چکا تھا۔ ایسی صورت میں اس نے مجھ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ مجھے قتل کر دے گا۔ دوسرا تجربہ کامیاب ہو جاتا تو بھی ایک طرح سے یہ میری موت ہی ہوتی۔ مجھے گویا ہر دو صورتوں میں موت سے ہم کنار ہونا تھا۔ ایک صورت میں میری شخصیت اور کردار کو قتل کر دیا جاتا' دوسری صورت میں مجھے جسمانی طور پر موت سے دوچار ہونا پڑتا۔ مجھے جسمانی موت تو قبول تھی کہ ایک نہ ایک دن ہر ذی روح کو اس کا مزہ چکھنا ہے مگر اپنے کردار و شخصیت کا قتل منظور نہیں تھا۔ میں اس وقت اسی لئے صدق دل کے ساتھ یہ دعا کر رہی تھی کہ میرے

ذہن پر کیا جانے والا دوسرا تجربہ کامیاب نہ ہو۔ پردیس میں اگر یوں بے یارومددگار مارا جانا ہی میرا مقدر تھا تو مجھے اس پر کوئی ملال نہیں تھا۔ اس کے برعکس میرے دل کو یہ اطمینان تھا کہ میں نے بہرحال اپنی بہن ذکیہ کو دشمنوں کے چنگل سے نکال کر محفوظ ہاتھوں میں پہنچا دیا تھا۔ پاکستان پہنچ جانے کے بعد اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

میں انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ ہیلی کاپٹر ایک ہموار جگہ پر اتر گیا۔ پہلے ڈاکٹر رچرڈ اس کا دروازہ کھول کر نیچے اترا' پھر پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کا انجن بند کیا اور وہ بھی اتر گیا۔ ہیلی کاپٹر میری توقع کے مطابق مقطم کے پہاڑی سلسلے ہی میں ایک جگہ اترا تھا۔ اطراف میں مجھے غار نظر آ رہے تھے۔ ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ ان غاروں سے کئی مسلح افراد نکل کر باہر آ گئے۔ ڈاکٹر رچرڈ نے انہی میں سے دو افراد کچھ حکم دیا اور اسی کے ساتھ ہیلی کاپٹر کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دونوں اپنی اپنی رائفلیں اپنے ساتھیوں کو تھما کر ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھنے لگے۔ پھر کچھ دیر بعد ان دونوں ہی نے مجھے ہیلی کاپٹر سے نیچے اتارا۔

''اس کے پیر کھول دو تاکہ یہ اپنے پیروں سے چل کر غار میں جا سکے۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے ایک شخص کو حکم دیا۔

وہ شخص میرے پیر کھولنے زمین پر بیٹھ گیا۔ اردگرد دوسرے مسلح افراد میری جانب رائفلیں تانے کھڑے تھے۔

''ان مسلح افراد کی کیا ضرورت ہے؟ ڈاکٹر رچرڈ؟'' میں نے ڈاکٹر رچرڈ کو مخاطب کیا۔

''کیوں......؟ ضرورت کیوں نہیں! تم سے میں اچھی طرح واقف ہوں! کسی بھی لمحے تم کوئی خلاف توقع حرکت کر سکتی ہو۔''

''تم انتہائی ذہین شخص ہو کر بھی اس وقت نہایت احمقانہ بات کر رہے ہو۔''

''وہ کیسے؟'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر رچرڈ کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نظر آنے لگے۔ یقیناً اسے میری بات بری لگی تھی۔

''فرض کرو کہ میں کوئی خلاف توقع حرکت کرتی بھی ہوں تو کیا تمہارے یہ مسلح محافظ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی جسارت کر سکتے ہیں؟ گولی مار سکتے ہیں مجھے؟'' ڈاکٹر رچرڈ لاجواب سا نظر آنے لگا' پھر بولا کہ فضول بحث نہ کرو!''

اس دوران میں وہ شخص میرے پیروں کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کر چکا تھا۔ بظاہر میری اس حرکت کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن شاید میں لاشعوری طور پر یوں آسانی سے ڈاکٹر رچرڈ کے قابو میں آنا نہیں چاہتی تھی یا پھر ابھی میں نے ڈاکٹر رچرڈ سے جو کچھ کہا تھا اسے ثابت کرنا مقصود تھا۔

میرے پیر کھول کر وہ شخص ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ میرا دایاں پاؤں تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ پھر میرا گھٹنا اس شخص کی تھوڑی کے نیچے پوری قوت سے پڑا۔ وہ شخص اپنے منہ سے ''اوغ'' کی آواز نکالتا ہوا ڈاکٹر رچرڈ کے اوپر جا پڑا۔ جو قریب ہی کھڑا تھا۔ میری حرکت قطعی خلاف توقع تھی اس لئے ڈاکٹر رچرڈ اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ گر گیا۔

''سنو'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''اپنے مسلح آدمیوں سے کہو کہ مجھے گولی مار دیں۔'' یہ کہتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھلی۔

اس مرتبہ میرا ہدف ڈاکٹر رچرڈ تھا مگر اب وہ ہوشیار ہو چکا تھا۔ وہ ابھی زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اس کے سینے پر کودنا چاہا۔ اس طرح میرے جسم کا سارا بوجھ بھی اس کے سینے پر پڑتا لیکن وہ انتہائی سرعت کا ثبوت دیتے ہوئے پلٹا کھا گیا اور اسی کے ساتھ اس نے میرا ایک پاؤں پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ میں لہراتی ہوئی زمین پر گری' میرا سر زمین سے ٹکرایا۔ اگر میرے سر پر خود نہ چڑھا ہوتا تو یقیناً سخت چوٹ آتی۔ ہاں اس سے یہ ضرور ہوا کہ وہ خود کچھ ڈھیلا ہو گیا۔ میں نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا' دوبارہ خود اور اور سر کو زمین پر پٹخا۔ خود کچھ اور کھسکا تو پھر میں نے سر کو جھٹکا دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ خود ایک طرف جا پڑا۔

اس کے بعد ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر میں نے ان مسلح افراد کے ذہنوں کو اپنے طاقت ور ذہن کی گرفت میں لے لیا۔ ابھی ڈاکٹر رچرڈ زمین سے اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو رہا تھا کہ پانچ رائفلوں کا رخ اس کی طرف ہو گیا۔ میرے ہی حکم پر خود ڈاکٹر رچرڈ کے مسلح آدمیوں نے ڈاکٹر رچرڈ پر رائفلیں تان لی تھیں۔

صورت حال اتنی تیزی سے بدلی تھی کہ شاید ڈاکٹر رچرڈ کچھ سمجھ ہی نہ سکا تھا۔ پھر چند ہی لمحے بعد جب میں اچھل کر کھڑی ہو گئی تو وہ اچانک اٹھا۔ اب اس کے چہرے پر وحشت سی برس رہی تھی۔

ہیلی کاپٹر کا پائلٹ بھی ایک طرف گم صم کھڑا ہوا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ میں نے اسے حکم دیا۔

''میرے ہاتھ کھول دو!''

وہ کسی معمول کی طرح آگے بڑھا اور پھر میرے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔

''ڈاکٹر رچرڈ! میں چاہوں تو خود تمہارے آدمی تمہارے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیں......! بولو ڈاکٹر کیا تم موت کا مزہ چکھنے پر آمادہ ہو؟'' میں نے ڈاکٹر رچرڈ کو مخاطب کیا جو مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر حیران پریشان سا کھڑا تھا۔

''ہاں مجھے معلوم ہے کہ ایسا ممکن ہے مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کرو گی۔ تمہارے سینے میں ایک گداز دل ہے اور تم بے سبب کشت و خون سے گریز کرتی ہو۔''

''اور تم...... تم ڈاکٹر......؟'' میرے لہجے میں چبھن تھی۔ ''تم کسی کو بھی بلا سبب قتل کر سکتے ہو......! تمہارے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہے۔''

اس نے میری بات سن کر سر جھکا لیا۔ اس اثناء میں میرے ہاتھ بھی کھل گئے۔ اب میں پوری طرح آزاد تھی۔

اسی لمحے نہ جانے ڈاکٹر رچرڈ کو کیا ہوا کہ وہ زمین پر گر گیا۔ میں اس عیار شخص کی اس حرکت کو سمجھ نہ سکی۔ مسلح افراد بھی اس وقت کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے جب تک میں انہیں کوئی حکم نہ دیتی۔

میری نظریں ڈاکٹر رچرڈ ہی پر مرکوز تھیں کہ چند ہی لمحے بعد میرے حواس پر ایک زناٹا سا گزر گیا۔ ڈاکٹر رچرڈ کی حرکت کا مقصد اب میری سمجھ میں آ چکا تھا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اس نے ایک بڑا سا

پتھر پھینک کر میرے سر کو نشانہ بنا دیا تھا۔ اس کا نشانہ یقیناً عمدہ تھا۔ پتھر میرے ماتھے پر لگا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ ابھی میں سنبھل نہ سکی تھی کہ دوسرا پتھر میرے سر پر لگا اور پھر میری چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔ ڈاکٹر رچرڈ نے ایک بار پھر بساط الٹ دی تھی۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی تھی۔ میں سر تھامے زمین پر بیٹھ گئی تھی اور پھر شائد کسی طرف لڑھک گئی تھی۔

میرے ذہن پر غالباً بہت دیر تک تاریکی مسلط رہی' پھر یہی تاریکی لو دینے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔ یہ عالم غفلت اور بیداری کے درمیان تھا۔ نہ میں پوری طرح بے ہوش تھی نہ ہوش میں تھی۔ مجھے کہیں دور سے کچھ آشنا آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ انہی آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید میرے ذہن پر دوسرا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ وہ آوازیں ڈاکٹر رچرڈ اور دونوں جرمن سائنس دانوں کی تھیں۔ ڈاکٹر رچرڈ ان دونوں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ پہلے تجربے کی نسبت یہ دوسرا تجربہ بہت اذیت ناک ثابت ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے دماغ کو دھکتے ہوئے جہنم میں ڈال دیا گیا ہے۔

میں نے اسی عذاب سے گزرتے ہوئے ایک مرتبہ جرمن سائنس دان شیفرڈ کی تیز آواز سنی۔

''ڈاکٹر......! یہ کیا کر رہے ہو ڈاکٹر......؟ اس طرح تو...... شاید یہ زندہ نہیں بچ......''

''خاموش رہو!'' ڈاکٹر رچرڈ نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''اب یہ رسک لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں!''

ڈاکٹر رچرڈ کے الفاظ کی گونج ابھی ختم ہوئی تھی کہ میرا وجود گویا دو نیم ہو گیا۔ بے حد اذیت محسوس کی اور پھر میں جیسے کسی اندھے کنویں میں گرتی چلی گئی۔ مجھے یوں لگا تھا کہ وہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہو۔

جانے کتنی دیر کے بعد میرے حواس دوبارہ بیدار ہونے لگے۔ میں نے پہلی آواز ڈاکٹر رچرڈ کی سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اب اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں مگر...... اب...... اب اس کی موت زندگی میرے لئے بے معنی ہے' لا حاصل...... قطعی فضول! یہ...... یہ اب ہمارے کسی کام کی نہیں رہی! کاش...... کاش یہ وقت گزرنے سے پہلے قابو میں آ گئی ہوتی! تو...... تو پھر شاید یہ تجربہ ناکام نہ رہتا۔ پہلے تجربے کے بعد اس کے ذہن میں جو غیر معمولی قوتیں پیدا ہو گئی تھی اس دوسرے تجربے کے دوران میں وہ قوتیں ختم ہو گئی ہیں۔ اب یہ اپنی مرضی سے اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں سے کام نہیں لے سکے گی۔''

''مگر...... مگر ڈاکٹر' اس کے ذمے دار بھی تو خود ہو!'' شیفرڈ کی آواز سنائی دی۔ ''اگر آخری حد تک نہ جاتے تو شاید ایسا نہ ہوتا!''

''اگر ایسا نہ ہوتا تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوتا! تم احمقانہ باتیں کیوں کر رہے ہو شیفر! اگر ہم اس کے ذہن کو امریکی مفادات کے تابع نہیں کر سکتے تو پھر ان قوتوں کا ضائع ہو جانا ہی بہتر ہوتا......! اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی! اب نہ یہ کسی کا ذہن پڑھ سکے گی اور نہ کسی کے ذہن کو قابو میں کر کے اپنا حکم منوا سکے گی۔ یہ اب ایک عام سی عورت ہے جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاں یہ ملال ضرور

ہے کہ میرے ملک کے کچھ بہترین دماغ اسی کی وجہ سے ختم ہو گئے اور خاصا سرمایہ بھی ضائع ہو گیا مجھے اپنے اوپر والوں کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔''

پھر کچھ دیر خاموشی رہی۔ ڈاکٹر رچرڈ کی بات سن کر مجھے بھی افسوس ہوا تھا۔ پہلے تجربے کے بعد مجھے جو قوتیں حاصل ہو گئی تھیں وہ مجھ سے چھین چکی تھیں۔ یہ افسوس ہی کی تو بات تھی۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ اب وہ ہنگامہ آرائی ختم ہو جائے گی جو ایک عرصے سے جاری تھی۔ اسی لمحے مجھے ڈاکٹر رچرڈ کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی اور میرے سارے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر دوسرا تجربہ کامیاب نہ ہوا تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ موت اب مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں خود ہی سن چکی تھی کہ میرے ذہن پر کیا جانے والا دوسرا تجربہ ناکام ہو چکا ہے۔ مجھے قتل کر کے ڈاکٹر رچرڈ گویا انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کے سوا میرے قتل سے بھلا اسے اور کیا فائدہ ہوتا! مگر میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میرے قتل سے بھی اس کا مفاد وابستہ تھا' یہ بات مجھے ذرا ہی دیر بعد معلوم ہو گئی۔

ڈاکٹر رچرڈ جرمن سائنس دان شیپرڈ کی ایک بات کا جواب دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''کسی کو یہ شبہ نہیں ہو سکے گا کہ اسے قتل کر کیا گیا ہے۔ اگر اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی کیا گیا تو پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی بتائے گی کہ حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی ہے۔ اس زہر کی یہی تو خوبی ہے جو میں انجکشن کے ذریعے اس کے جسم میں داخل کروں گا۔'' پھر ڈاکٹر رچرڈ اپنے منصوبے کی وضاحت کرنے لگا۔ ''تم شاید یہ بھول چکے ہو کہ میں اتنے دن سے اس ملک میں کیوں ہوں! میں یہاں صرف عذرا خان کے انتظار میں نہیں تھا۔''

''ہاں ہمیں معلوم ہے ڈاکٹر کہ تم اس عرصے میں مصری فوجی قوت کی تمام تفصیلات معلوم کر چکے ہو جو تمہارا ملک اسرائیل کو فراہم کرنے والا ہے۔'' شیفرڈ نے درمیان میں کہا۔

''وہ تمام اہم تفصیلات میں نے ایک مائکروفلم پر منتقل کر دی ہیں۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے بتایا۔

''میں وہ مائکروفلم عذرا خان کی لاش کے ساتھ اپنے ملک بھیجنا چاہتا ہوں کہ اس سے محفوظ کوئی اور راستہ نہیں۔ عذرا خان کا تابوت لے کر تم...... شیپرڈ تم امریکہ جاؤ گے۔''

''لیکن...... لیکن ڈاکٹر یہ کس طرح ممکن ہے' پاسپورٹ اور دیگر کاغذات......''

ڈاکٹر رچرڈ ہنس پڑا اور شیپرڈ کی بات ادھوری رہ گئی۔ پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ناممکن باتوں کو میں ممکن بنا دیتا ہوں اسی لئے تو میری حکومت مجھے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ سنو۔ عذرا خان کی لاش کے چہرے پر ایک امریکی لڑکی کا میک اپ ہو گا اور اسی کے شناختی کاغذات بھی!''

''اور وہ لڑکی کون ہو گی ڈاکٹر؟'' اس بار شیفر نے سوال کیا۔

''سوزی......! جیفرسن کی بیوی سوزی!'' ڈاکٹر رچرڈ نے جواب دیا۔

''لیکن...... لیکن پھر سوزی یہاں سے کس طرح واپس امریکہ جا سکے گی ڈاکٹر؟'' شیفر نے دریافت کیا۔

''اب اسے کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں رہی۔'' ڈاکٹر رچرڈ کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''وہ ہر

ضرورت سے آزاد ہو چکی ہے۔“

”تمہیں شاید معلوم نہ ہو شیفرڈ کہ میں بے وفا عورتوں کو پسند نہیں کرتا اور جو عورتیں میرے ساتھ بے وفائی کرتی ہیں ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر رچرڈ سفاکی سے بولا۔ مجھے اس وقت وہ منظر یاد آ گیا جب میں نے شیفرڈ کے ساتھ باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن کی بیوی سوزی کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا تھا۔ یقیناً ڈاکٹر رچرڈ کو کسی طرح سوزی کی ان حرکتوں کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے اسی لئے سوزی کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔

”ڈاکٹر!“ شیفرڈ کی آواز میں نے پھر سنی۔ ”تم...... تم شاید مذاق کر رہے ہو‘ کل شام تک تو وہ میرے ساتھ تھی۔“

”اور کل رات وہ میرے ساتھ تھی۔ اپنی زندگی کی آخری رات اس نے میرے ساتھ ہی گزاری تھی۔ سنو شیفرڈ اس نے خود مجھ سے اپنی بے وفائی کا اعتراف کر لیا تھا۔ میں نے اس کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ......“

”اگر یہ سچ ہے ڈاکٹر تو...... تو تم نے اچھا نہیں کیا!“ شیفرڈ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”اس لئے بھی کہ وہ تمہاری بھی منظورِ نظر بن چکی تھی!“ ڈاکٹر رچرڈ کی آواز میں تلخی نمایاں تھی۔

”ہاں مجھے اعتراف ہے ڈاکٹر مگر اس کی...... اتنی سی بات کی اتنی بڑی سزا بہت ہے!“

”خیر سوزی کو بھول جاؤ! اب میں عذرا خان کو سوزی بنا کر امریکہ بھیج دوں گا اور یہ اسی حیثیت سے وہاں دفن کر دی جائے گی۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر رچرڈ بے رحمانہ انداز میں ہنسنے لگا‘ پھر بولا۔ ”یہ خاک عذرا خان ہو گی اور اس کی قبر پر سوزی جیفرسن کا کتبہ لگا ہو گا۔ اس طرح سوزی کے عزیز و اقارب کو بھی صبر آ جائے گا۔ ہاں میں وہ مائیکرو فلم عذرا خان کے پیٹ میں تھوڑا سا شگاف ڈال کر چھپا دوں گا۔ عذرا خان کی لاش کا تابوت ایئرپورٹ سے پہلے سی آئی اے ہیڈ آفس لے جایا جائے گا۔ وہاں میری چھپائی ہوئی مائیکرو فلم نکال لینے کے بعد ہی لاش‘ سوزی کے وارثوں کو دی جائے گی۔ میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔ بس اب عذرا خان کو ہوش آنے والا ہو گا۔ میں انجکشن تیار کرتا ہوں۔“

”ٹھہرو ڈاکٹر!“ شیفرڈ بول اٹھا۔

”ہاں کہو رک کیوں گئے؟“

”تم...... تم کچھ بھول رہے ہو‘ جلدی میں!“ شیفرڈ کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

”کیا......؟ کیا بھول رہا ہوں میں؟“

”یہ کہ عذرا خان حسین بھی ہے‘ جوان بھی اور...... اور اب تک شاید اس نے کسی مرد کو بھی اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ اگر تم اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو کیوں نہ پہلے ہم...... ہم دونوں آج رات ...... اور ...... اور ...... اور اگر شیپرڈ بھی چاہے تو اسے......“ پھر اس ہوس کار شیفرڈ نے ایسے ناشائستہ الفاظ ادا کئے کہ میرا خون کھول اٹھا۔

ڈاکٹر رچرڈ زور سے ہنس پڑا‘ پھر کہنے لگا۔ ”شیفر! تم نے اتنی جلدی سوزی کو بھلا کر دوسری

عورت کی خواہش کا اظہار کر دیا......! خیر تم نے جو کچھ کہا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں [illegible] واقعی تجربے کی ناکامی کے سبب یہ اہم بات بھول ہی گیا تھا۔ یہ آرزو تو ایک مدت سے [illegible] میں مچل رہی تھی مگر تجربے سے پہلے میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسی لئے جیکب کو بھی منع کر دیا تھا اور [illegible] سالم کی بات بھی نہیں مانی تھی لیکن اب...... آج رات میری ہو گی‘ پھر تم اور شیپرڈ اپنی حسرتیں نکال لینا! ہاں یہ خیال رکھنا کہ عذرا خان بہرحال ایک خطرناک عورت ہے۔“

”عورت کیسی ہی خطرناک کیوں نہ ہو ڈاکٹر‘ جب ایک بار اس کے فطری تقاضے بیدار ہو جاتے ہیں تو پھر وہ ان کی تسکین کے بعد ہی کچھ اور سوچنے سمجھنے کی اہل ہوتی ہے۔“ گھٹیا ذہن رکھنے والا شیفرڈ اپنی رائے کا اظہار کرنے لگا۔

ڈاکٹر رچرڈ کی بات سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس وقت میں مقطم کے پہاڑی سلسلے کے بجائے کہیں اور ہوں‘ اس کے علاوہ یہ بھی کہ رات ہو چکی ہے۔ گویا میں سارا دن غفلت کے عالم میں رہی تھی۔

مجھے غالباً وقت سے پہلے ہوش آ گیا تھا ورنہ ان لوگوں کے ناپاک عزائم اور خطرناک منصوبے کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو پاتا۔ یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا۔ قدرت اس طرح شاید مجھے اپنے دفاع کا موقع دینا چاہتی تھی۔ میں نے پلکوں کے درمیان ذرا سی جھری سے اس کمرے کا جائزہ لینا ضروری سمجھا جہاں اس وقت میں ایک میز پر دراز تھی۔ اس میز پر میرا جسم چمڑے کے تسموں کی گرفت میں تھا اور میز ہی کے قریب کئی مشینیں رکھی تھیں جنہیں غالباً تجربے کے دوران میں استعمال کیا گیا تھا۔

”ڈاکٹر! اب تک اسے ہوش کیوں نہیں آیا؟“ معاً شیفرڈ کے قدموں کی چاپ کے ساتھ اس کی آواز بھی آئی۔ وہ میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ہاں اب تک ہوش آ تو جانا چاہیے تھا۔“ ڈاکٹر رچرڈ بھی میز کی جانب پلٹا۔

میں نے دونوں آنکھیں پھر بند کر لیں۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہ سمجھ جائے کہ مجھے ہوش آ چکا ہے۔

صورتِ حال اب میرے لئے پہلے ایسی نہیں رہی تھی۔ اب وہ مجھے زندہ رکھنے پر مجبور نہیں تھے۔ میری ذرا سی غیر ذمے دارانہ حرکت مجھے موت سے ہم کنار کر سکتی تھی۔ میں ان کی نظر میں اب کوئی قیمتی شے نہیں تھی۔ میری حیثیت اب محض ایک حسین و جوان عورت کی تھی جس سے وہ اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تسکین چاہتے تھے۔ میں اب اگر کوئی موقع پا کر فرار ہونے کی کوشش کرتی تو وہ مجھے بے دریغ قتل کر سکتے تھے۔ مجھے اس خطرناک صورتِ حال کا پوری طرح احساس تھا۔

”ویسے یہ اگر ہوش میں نہ بھی آئے تو کیا فرق پڑتا ہے!“ ڈاکٹر رچرڈ کی آواز بہت قریب سے سنائی دی۔ اسی کے ساتھ میں نے اس کے ہاتھ کا لمس اپنے جسم پر محسوس کیا۔ یقیناً مجھے میز پر بے بسی کے عالم میں دراز دیکھ کر اس کے اندر کا شیطان بیدار ہو رہا تھا۔ پھر وہ مزید بولا۔ ”اچھا تم لوگ جاؤ اب!“ اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔ ”اس کے ہوش میں آنے نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا!“ اس کا ہاتھ اب بھی میرے جسم پر متحرک تھا۔

مصلحت اور ضبط و برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہر احتیاط و مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اچانک میں زور سے چیخ اٹھی۔ ''ڈاکٹر اپنی غلیظ حرکت سے باز آ جا!'' اس کے ساتھ میں نے آنکھیں کھول دیں تھیں۔ ''یہ مردانگی نہیں بزدلی ہے۔ مجھے آزاد کر دے پھر دیکھتی ہوں کہ تو میرے جسم کو کس طرح ہاتھ لگاتا ہے!''

''میں بے وقوف نہیں ہوں عذرا خان!'' وہ بے غیرتی سے ہنس دیا۔ ''میں تو پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ تمہیں اسی حالت میں......''

اس نے جو گری ہوئی بات کی تھی پوری نہ ہو سکی کیونکہ میں نے شدید غصے میں اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ اس کے سوا کچھ اور میرے اختیار میں بھی کب تھا!

وہ جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔ پھر بولا۔ ''عذرا خان! تم نے اس طرح اپنی موت کو اور اذیت ناک بنا لیا ہے۔''

''اے ذلیل شخص! تجھے غلط فہمی ہے' موت اور زندگی تیرے اختیار میں نہیں ہے۔'' میں نفرت سے بولی۔

میری بات کا کوئی جواب دیئے بغیر ڈاکٹر رچرڈ' شیفرڈ اور شیپرڈ کی طرف پلٹا۔ ''تم لوگ اب جاؤ بھی نا!''

شیفرڈ نے مجھ پر ایک للچائی ہوئی نظر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شیپرڈ کے چہرے سے مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو' کسی فکر میں ہو! دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر بھی ایک نظر ڈالی تھی۔ معلوم نہیں ڈاکٹر رچرڈ نے اس کی بدلی ہوئی کیفیت کو کیوں محسوس نہیں کیا البتہ مجھے اس کا رویہ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دونوں دروازے سے نکل گئے تو ڈاکٹر رچرڈ نے آگے بڑھ کر اندر سے دروازہ بند کر دیا تھا اور پھر دوبارہ میری میز کے قریب آ گیا۔

کچھ ایسی ہی صورت حال سے زندگی میں ایک مرتبہ اور بھی میں دوچار ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی میرا جسم آزاد نہیں تھا۔ وہ پہلا ہوس کار شیخ سالم تھا جو اپنی ناپاک خواہشوں سمیت دوسرے جہان پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے تو شیشے میں اتار کر مجبور کر دیا تھا کہ وہ میرے ہاتھ پیر کھول دے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر جو کچھ ہوا میں پہلے اپنی آپ بیتی میں لکھ چکی ہوں۔ مختصر یہ کہ شیخ سالم کی ناآسودہ خواہشیں اس کے دل ہی میں رہ گئی تھیں اور وہ مارا گیا تھا مگر ڈاکٹر رچرڈ اس سے مختلف تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا کہ میری آزادی کا مطلب اس کی موت بھی ہو سکتا ہے۔ اسے اسی لئے شیشے میں اتار لینا تقریباً ناممکن ہی تھا۔

''ہاں اب کہو عذرا خان' کیا کہہ رہی تھیں تم؟'' اس نے نزدیک آ کر میری ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شیطنیت ناچ رہی تھی۔ وہ مزید بولا۔ ''تم شاید زندگی اور موت کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں جس کا جواب میں نے نہیں دیا تھا!''

میں اسے نفرت و حقارت سے دیکھتی رہی اور کچھ نہ بولی۔

''تم خوش نصیب ہو عذرا خان کہ اپنی موت سے پہلے زندگی کی ایک مسرت سے آگاہ ہو جاؤ

گی جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ زندگی کا یہ حسین راز تمہارے مرنے سے پہلے معلوم ہو جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میرے جسم کی طرف بڑھے۔

''رک جاؤ ڈاکٹر رچرڈ!'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''کفرانِ نعمت اچھی نہیں ہوتی عذرا خان!'' وہ بے حیائی سے بولا۔

''اگر...... اگر تم نہ مانے تو میں پھر تمہارے منہ پر تھوک دوں گی...... مان جاؤ!''

''ہاں بس یہی تو تمہارے بس میں ہے!'' اس نے ہنس کر گویا میری بے بسی کا مذاق اڑایا۔

میں واقعی بے بس تھی۔ اپنی بے بسی پر دل رونے لگا اور میں نے صدق دل سے اپنے خدا کو یاد کیا۔ وہی صرف مجھے اس شیطان سے بچا سکتا تھا۔ وہ وقت شاید دعا کی قبولیت کا تھا اس کا ناپاک ہاتھ میرے گریبان تک پہنچا ہی تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے در و دیوار ہلنے لگے ہوں۔ دھماکے سے کمرے کا دروازہ اڑ گیا تھا۔ یقیناً دروازے پر کسی نے دستی بم مارا تھا۔ کمرے میں دھواں اور گرد بھر گئی تھی۔ دروازے کے ساتھ ہی دیوار کا کچھ حصہ بھی ٹوٹ کر گرا تھا۔

میں نے ڈاکٹر رچرڈ کو ایک طرف اچھل کر بھاگتے دیکھا۔ وہ اس جانب بھاگا تھا جدھر کھڑکیاں تھیں۔ بھاگتے ہوئے میں نے اسے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکالتے بھی دیکھ لیا تھا۔ ایک کھڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے چٹخنی کھولی' پھر مڑ کے دیکھا۔ اسی وقت کمرے کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے چند مسلح نقاب پوش اندر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں۔

ڈاکٹر رچرڈ کے ریوالور سے پے در پے دو شعلے لپکے اور آگے آنے والا نقاب پوش اپنا سینہ تھامے ڈھیر ہو گیا۔ دونوں گولیاں اس کے سینے میں لگی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے ڈاکٹر رچرڈ نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اگر اسے مزید ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جاتا۔ آگے آنے والے نقاب پوش کے ساتھیوں میں غالباً کسی نے ڈاکٹر رچرڈ کو دیکھ لیا تھا اور پھر اسی سبب کھڑکی کی طرف گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی تھی۔

ظاہر ہے میرے لئے یہ سمجھنا محال ہی تھا کہ آنے والے مسلح نقاب پوش کون ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے! میرے لئے تو اچانک ان کی آمد غیبی امداد ہی ثابت ہوئی تھی۔

نقاب پوشوں میں سے جس نے کھڑکی کی طرف فائرنگ کی تھی وہ تقریباً دوڑتا ہوا کھڑکی تک پہنچ گیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا اور پھر وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں داخل ہونے والے نقاب پوشوں کی تعداد چھ تھی جن میں سے ایک ڈاکٹر رچرڈ کی چلائی ہوئی گولیوں کا شکار ہو چکا تھا۔ دو نقاب پوش اسے اٹھا کر کمرے سے باہر لے جانے لگے۔ ان میں سے ایک دراز قد نقاب پوش نے اپنے ساتھیوں سے دھیمی آواز میں کچھ کہا تھا۔ میں چونک اٹھی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ حملہ آور نقاب پوش روسی تھے۔

یہ بات میرے علم میں تھی کہ جرمن سائنس دان شیپرڈ کا روسی ایجنٹوں سے تعلق رہا ہے۔ اس نے ایک بار روسی ایجنٹوں سے میرا سودا بھی کرنا چاہا تھا۔ تو کیا اس مرتبہ بھی اسی نے ڈاکٹر رچرڈ کو ڈبل کراس کیا ہے؟ میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا اور اسی وقت دو نقاب پوش میری میز کے قریب پہنچ گئے۔

ان میں سے ایک میرے سرہانے آ گیا اور اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ نکالنے لگا۔ دوسرے نقاب پوش نے اپنی جیب سے لمبے پھل والا چاقو نکال کر کھول لیا۔ اس نے چمڑے کے تسمے کھولنے کے بجائے انہیں کاٹ دینا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔ ابھی وہ تسمے ہی کاٹ پایا تھا کہ میرے سرہانے کھڑے ہوئے نقاب پوش نے ایک رومال میرے منہ اور ناک پر رکھ دیا۔ رومال پر چھڑکی ہوئی بے ہوشی کی دوا کی ناگوار بو فوراً ہی میں نے محسوس کر لی۔ پھر میں نے لاکھ ادھر ادھر سر جھٹکا مگر میرے منہ پر ایک مضبوط ہاتھ جما رہا۔ میرا دم گھٹنے لگا اور پھر بے ہوشی کی دوا مجھ پر اثر کرنے لگی۔

ہوش میں آنے پر میں نے خود کو ایک آرام دہ بستر پر دراز دیکھا۔ میں ایک ایسے کمرے میں تھی جو اپنی آرائش اور ساز و سامان کے اعتبار سے بہترین کہا جا سکتا تھا۔ کمرے کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور وہاں ضروریات کی ہر شے نظر آ رہی تھی۔ جس مسہری پر میں دراز تھی اس سے کچھ فاصلے پر ایک آرام دہ کرسی نظر آ رہی تھی۔ اس کرسی پر کوئی شخص نیم دراز سا بیٹھا ہوا پائپ کے کش لے رہا تھا۔ ایک کتاب اس کے زیر مطالعہ تھی۔ وہ باوقار شخص اپنے چہرے کے خدوخال اور جلد کی رنگت سے روسی ہی معلوم ہو رہا تھا۔ کمرے میں سکون اور خاموشی تھی۔

معلوم نہیں کس طرح اس شخص کو یہ احساس ہو گیا کہ میں ہوش میں آ چکی ہوں۔ اس نے کتاب سے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا پھر نرم اور شائستہ لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ’’خوش آمدید عذرا خان!‘‘

میں اس کی آواز سن کر چونک اٹھی اور بے ساختہ بول اٹھی۔ ’’موشوروف!‘‘

’’مجھے یہی توقع تھی کہ آپ میری آواز پہچان لیں گی۔ خادم کو موشوروف ہی کہتے ہیں۔‘‘ وہ مسکرا کر بولا اور پھر اس کی بھوری آنکھیں میرے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔

’’مگر تم ...... تم پاکستان میں تھے!‘‘

’’ہاں مجھے یہاں آئے دو روز ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ جلد ہی آپ قاہرہ کا رخ کریں گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مجھے بھی یہیں ہونا چاہیے تھا۔‘‘

’’کیا تمہیں شیپرڈ نے یہ نہیں بتایا کہ ڈاکٹر رچرڈ کا دوسرا تجربہ ناکام ہو چکا ہے اور یہ کہ اب میں تم لوگوں کے لئے بے سود ہوں؟‘‘

’’اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہوتا تو اس وقت آپ یہاں نہ ہوتیں!‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’مجھے پہلے ہی یہ امید تھی، اس کا تجربہ ناکام رہے گا کیونکہ پہلے تجربے کو خاصا وقت گزر چکا ہے۔‘‘

’’پھر ...... پھر تم ...... میرا مطلب ہے تمہاری حکومت مجھ میں کیوں دلچسپی لے رہی ہے؟‘‘ میں نے سوال کیا اور اسی کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

’’ضروری نہیں خاتون کہ ہمارے سائنس دان بھی ڈاکٹر رچرڈ کی طرح ناکام رہیں!‘‘

’’تو گویا اب امریکیوں کی طرح تم لوگ بھی مجھے اپنا ہدف بنانا چاہتے ہو؟‘‘ میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی شامل تھی۔

’’لفظ ہدف آپ نے غلط استعمال کیا خاتون ......! ہم ان کی طرح زبردستی کے قائل نہیں۔ ہم

رضا کارانہ طور پر آپ سے تعاون کی درخواست کریں گے۔‘‘ اس کا لہجہ بدستور نرم ہی رہا۔

’’اور اگر میں تمہارے ساتھ کسی بھی قسم کے تعاون سے انکار کر دوں تو؟‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

’’مجھے یقین ہے کہ آپ ایسا نہیں کریں گی۔ آپ لازماً واقف ہوں گی کہ میرا ملک انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر ......‘‘

’’موشوروف!‘‘ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ’’تم ناحق وقت ضائع کر رہے ہو! تم مجھے اپنے مخصوص نظریات سے قائل نہیں کر سکو گے۔ تم جس نظریئے کی تبلیغ کر رہے ہو میں اس کا تفصیلی مطالعہ کر چکی ہوں۔‘‘

’’اگر واقعی ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کہہ رہی ہیں تو پھر آپ کے ذہن کی اسکریننگ کرنا پڑے گی۔ پروفیسر میخائیل اس سلسلے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، وہ آپ کے ذہن سے فاسد خیالات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیں گے۔‘‘ موشوروف کہتا رہا۔ ’’یوں بھی ہمارا طریقہ کار امریکیوں سے مختلف ہے۔ پہلے آپ کے ذہن کی اسکریننگ کی جائے گی پھر ......‘‘

’’یوں کیوں نہیں کہتے کہ پہلے میرے ذہن کو روسی مفادات کا غلام بنا دیا جائے گا!‘‘ میں نے تیزی کے ساتھ موشوروف کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

’’روسی مفادات کے بجائے اگر آپ نوع انسانی کے مفادات کہیں تو زیادہ مناسب ہو گا۔ اس کے علاوہ لفظ غلام بھی غلط ہے، اس کی جگہ ہم نوا یا حامی کا لفظ موزوں ہے گویا بات یوں ہوئی کہ آپ کو نوع انسانی کے مفادات کا ہم نوا اور حامی بنا دیا جائے گا!‘‘ وہ بولا۔

موشوروف ایک میٹھی چھری کے مانند تھا۔ اس کا رویہ ڈاکٹر رچرڈ سے قطعی مختلف تھا۔ میں نے چند لمحے توقف کے بعد اس سے دریافت کیا۔ ’’کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے موشوروف کہ اس وقت تمہاری نظر میں میری کیا حیثیت ہے؟ کیا میں خود کو قیدی تصور کروں۔‘‘

’’نہیں!‘‘ وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ ’’آپ کی حیثیت ایک معزز مہمان کی ہے۔ ہاں میں آپ سے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ آپ اس کوٹھی کی حدود سے فی الحال باہر نہ نکلیں کیونکہ باہر آپ کے لئے خطرہ ہو سکتا ہے۔ اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے ڈاکٹر رچرڈ کے گرگے آپ کو پورے قاہرہ میں پاگل کتوں کی طرح تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔‘‘

موشوروف کی اس بات کا مطلب یہی تھا کہ اسے ڈاکٹر رچرڈ کے منصوبے کا بھی علم تھا۔ ظاہر ہے کہ شیپرڈ ہی اس سلسلے میں بھی اس کی معلومات کا ذریعہ بنا ہو گا۔

’’اگر میں تمہاری مہمان بننا پسند نہ کروں تو!‘‘ کچھ سوچ کر میں بولی۔

’’عموماً بعض باتیں انسان کے مفاد میں ہوتی ہیں مثلاً کسی مریض کا آپریشن اس کی زندگی بچا سکتا ہے مگر مریض اس پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں خود اسی کے مفاد کی خاطر اسے آپریشن کرا لینے پر مجبور کر دینا ظلم یا زیادتی نہیں کہلائی جائے گی۔ آپ یقیناً ذہین ہیں کہ اس واضح مثال سے میری بات کا مطلب سمجھ سکتی ہیں۔‘‘

"تو گویا تم لوگ اپنی دانست میں میرے مفاد کی خاطر مجھے زبردستی یہاں روکے رکھو گے! بہ الفاظ دیگر بات وہی ہوئی کہ میں تمہاری قیدی بنی رہوں گی۔"

"کل شام تک پروفیسر میخائیل یہاں پہنچ جائیں گے' پھر فوری طور پر آپ کے ذہن کی اسکریننگ کر دی جائے گی' اس کے بعد آپ پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔" وہ میری بات کو نظر انداز کر کے بتانے لگا۔

"پھر پابندی کی ضرورت بھی کیا رہ جائے گی!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں پھر ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ خود ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں گی۔ اسکریننگ کے بعد آپ کے ذہن میں خوابیدہ قوتوں کو متحرک کرنے کے لئے مختلف تجربات کئے جائیں گے تاکہ ان قوتوں سے انسانیت کی خدمت کا کام لیا جا سکے۔ اس کا فیصلہ پروفیسر میخائیل کریں گے کہ یہ تجربات یہیں ممکن ہیں یا ان کے لئے آپ کو یہاں سے ماسکو لے جانا پڑے گا!"

"موشوروف! تمہارے نزدیک یہ کوئی ظلم یا زیادتی نہیں کہ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف مخصوص نظریات قبول کرنے پر مجبور کر دیا جائے؟"

"میں غالباً وضاحت اور مثال کے ساتھ آپ کے اس سوال کا جواب دے چکا ہوں۔" وہ بولا' پھر اپنے ہاتھ میں سے کتاب ایک طرف بنے ہوئے بک شیلف میں رکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اب اجازت چاہوں گا' آپ آرام کریں۔ ابھی رات کا آخری پہر باقی ہے۔ مجھے آپ کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا تاکہ حقیقت حال بیان کر سکوں۔ اب آپ سے صبح ملاقات ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا جو اندر سے بند تھا۔

"ٹھہرو موشوروف!"

میرے کہنے پر وہ رک گیا اور مڑ کر بولا۔ "جی فرمایئے۔"

"تم نے کہا تھا کہ اس کوٹھی کی حدود سے میں باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔"

"جی...... جی ہاں۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تو کیا میں کوٹھی کی حدود تک آزاد ہوں' یعنی اس کمرے سے نکل سکتی ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ ویسے میں آپ کو آرام ہی کا مشورہ دوں گا۔ یوں بھی کوٹھی کے احاطے میں بلڈ ہاؤنڈ کھلے ہوئے ہیں۔ آپ ان خطرناک کتوں کے بارے میں ضروری معلومات رکھتی ہوں گی۔ میں صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا وہ بھی محض اطلاعاً کہ آپ کوشش کے باوجود اس کوٹھی کی حدود سے باہر نہیں نکل سکیں گی۔"

اس کے بعد موشوروف دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ میں نے بھی اسے مزید نہیں روکا۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ اب میں اس کمرے میں تنہا تھی۔

ڈاکٹر رچرڈ کے دوسرے تجربے کی ناکامی کے بعد میں نے سوچا تھا کہ اب بڑی طاقتوں کے خطرناک ایجنٹوں سے میری جان چھوٹ جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں گویا آسمان سے گر کر کھجور میں

اٹک گئی تھی۔ اب میں روسی ایجنٹوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ موشوروف نے جانے سے قبل جو کچھ کہا تھا اس پر مجھے یقین تھا۔ اس کوٹھی کی حدود سے نکلنا میرے لئے ناممکن ہو گا مگر محض یہ سوچ کر تقدیر پر شاکر ہو جانا میری فطرت کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ میں وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتی۔ میرے پاس گویا کل شام تک کا وقت تھا۔ بقول موشوروف کل شام پروفیسر میخائیل قاہرہ پہنچنے والا تھا۔ آتے ہی وہ میرے ذہن کی اسکریننگ کر دیتا۔ اس کے بعد سب کچھ فضول ہوتا۔ مجھے اس وقت سے پہلے پہلے ہی اپنے فرار کی راہ استوار کرنا تھی۔

میں یہی سوچتی ہوئی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں اس وقت ایک راہداری میں کھڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ راہداری عبور کر کے میں ایک پیسیج سے گزری۔ اب تک مجھے کھلا آسمان نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے ذرا ہی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ عمارت کم از کم دو منزلہ ضرور ہے۔ ایک جگہ میں نے اوپر جانے کے لئے زینہ بھی دیکھا تھا کا دروازہ جالی دار اور آہنی تھا۔ دروازے پر بڑا سا قفل مجھے پہلی ہی نظر میں دکھائی دے گیا تھا۔ وہ کوٹھی خاصی بڑی تھی۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ جگہ ایک بند صندوق کی طرح ہے۔ موشوروف کا اطمینان غلط نہیں تھا کوٹھی کے کسی بھی کمرے کا دروازہ مجھے کھلا نہیں ملا تھا۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کوٹھی میں میرے سوا کوئی متنفس نہیں ہے۔ خاصی دیر کوٹھی کے اندر گھوم پھر کے میں اس کے صدر دروازے تک پہنچ گئی جو ایک چوڑی راہداری کے اختتام پر تھا۔ جگہ جگہ مختلف راہداریوں میں ہلکی پاور کے بلب روشن تھے جن کی وجہ سے مجھے ادھر ادھر آنے جانے اور کوٹھی کا تفصیلی جائزہ لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

صدر دروازہ بھی آہنی اور جالی دار تھا۔ اس کے ذریعے باہر نیم تاریک کمپاؤنڈ میں دیکھنا ممکن تھا۔ اس کے درمیان بھی مجھے ایک مضبوط قفل لگا ہوا نظر آ گیا تھا۔ آہنی دروازے کے گرد اگرد لکڑی کا فریم تھا۔ میں گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں دروازے کی دوسری سمت کمپاؤنڈ میں نگاہ دوڑانے کے لئے اس سے کچھ قریب ہو گئی۔ کمپاؤنڈ میں مجھے بلڈ ہاؤنڈ نظر آ گئے۔ دو جوڑے تھے جو ادھر سے ادھر آ جا کر گویا رکھوالی کر رہے تھے۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا ایک ہاتھ آہنی دروازے پر رکھ دیا اور اسی کے ساتھ میرے جسم کو زبردست جھٹکا لگا اور بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ جھٹکے کی وجہ سے میں راہداری کے فرش پر گر گئی تھی اور میرا سارا جسم اب جھنجھنا اٹھا تھا۔ اس آہنی دروازے میں برقی رو دوڑ رہی ہو گی یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

ابھی میں جھٹکے سے سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اپنے عقب میں مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے کہنیوں کے بل زمین سے اٹھتے ہوئے آنے والے کو دیکھا وہ موشوروف تھا۔ جب تک وہ میرے قریب پہنچا میں اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

"معاف کیجئے گا خاتون میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا کہ اوپری منزل تک جانے والے زینے کے دروازے اور اس دروازے میں برقی رو دوڑ رہی ہے۔ آپ اس سے دور رہیں دراصل میں سمجھ رہا تھا کہ آپ دروازوں کو دور ہی سے مقفل دیکھ کر ان کے قریب نہیں جائیں گی۔ پھر بھی میں معذرت خواہ ہوں۔ بہرحال ان دروازوں میں اتنا کرنٹ نہیں چھوڑا گیا کہ زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ آیئے میں

آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ دوں!'' موشوروف خوش اخلاقی سے بولا۔

مجھے اس وقت موشوروف کی غیر ضروری خوش اخلاقی سے چڑ ہوئی۔ میں نے جواباً ناگواری کے ساتھ تلخ لہجے میں کہا۔ ''شکریہ! مجھے تمہاری رہنمائی کی ضرورت نہیں! میں خود اپنے کمرے تک جا سکتی ہوں مجھے راستہ معلوم ہے!''

''خاتون آپ کا لہجہ بتا رہا ہے کہ آپ خفا ہیں مجھ سے!'' وہ نرم آواز میں کہنے لگا۔

''کیا کوئی قیدی خوش بھی دیکھا ہے تم نے؟''

''مگر آپ قیدی کب ہیں! آپ تو ہماری......''

''معزز مہمان ہیں!'' میں نے چڑ کر اس کی بات پوری کر دی۔ ''یہی کہنے والے تھے نا تم! قیدی کو مہمان کہہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مسٹر موشوروف! میں اپنی حیثیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جھوٹے لفظوں کی پہچان مجھے بخوبی ہے! مجھے اتنا بے عقل کیوں سمجھتے ہو تم کہ تمہاری لفاظی سے متاثر ہو کر میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاؤں گی!''

''میں کیا عرض کر سکتا ہوں......! بہرحال صرف اتنی گزارش کروں گا کہ اگر میری کسی بات سے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دیں۔'' وہ مجسم اخلاق بنا رہا۔

''تم لوگوں کو میں اپنا دشمن سمجھتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو!'' میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔ ''منافقت سے نفرت ہے مجھے!'' یہ کہہ کر میں تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

موشوروف اپنی جگہ کھڑا رہا تھا۔ اس نے میرے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جلدی ہی مختلف راہداریوں سے گزرتی ہوئی میں اس کمرے کی تک پہنچ گئی جو گویا میرے لئے مخصوص تھا اور جہاں مجھے ہوش آیا تھا۔ کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا اس سے میرے نزدیک کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

کمرے میں آ کر میں نے اس کا بھی تفصیلی جائزہ لینا ضروری سمجھا بلکہ میرا خیال تھا جائزے کے دوران میں یہ امکان بہرحال تھا کہ مجھے کوئی کام کی چیز مل جاتی جو بوقت فرار کام آ سکتی۔ اس کمرے میں اٹیچ باتھ روم بھی تھا۔ میں نے اس کا بھی جائزہ لیا' قالین بھی اٹھا کر دیکھا' کمرے میں موجود الماری کی بھی تلاشی لی مگر سب کچھ بے سود ہی ثابت ہوا۔ وہاں مجھے کوئی ایسی شے دستیاب نہ ہو سکی جسے بطور ہتھیار استعمال کیا جا سکتا۔ بک شیلف کے کارنر پر مجھے ایک لائٹر رکھا ہوا نظر آیا۔ غالباً یہ لائٹر موشوروف کا تھا اور وہی یہاں بھول گیا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے میں نے وہ لائٹر وہاں سے اٹھا کر اپنی مسہری کے گدے کے نیچے چھپا دیا۔ پھر میں تھک ہار کے بستر پر لیٹ گئی۔ تھکی ہوئی تو میں تھی ہی اس لئے جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔

صبح مجھے آواز دے کر بیدار کرانے والا ایک اجنبی شخص تھا جو اپنے لباس سے ملازم معلوم ہوتا تھا۔

''صاحب کہہ رہے ہیں کہ اٹھ کر غسل کر لیجئے' وہ آپ ہی کے ساتھ ناشتا کریں گے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں اٹھ گئی۔

رات کو تلاشی کے دوران میں الماری کے اندر مجھے تولیا نظر آ گیا تھا۔ باتھ روم کا رخ کرتے ہوئے میں نے تولیا الماری سے نکالا اور پھر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

غسل کرنے کے بعد وہ بڑا سا تولیا میں اپنے جسم سے لپیٹے ہوئے باہر آ گئی اور تیزی سے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ رات کو وہی لباس زیب تن کر کے سونے کی وجہ سے میرے شلوار سوٹ پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ میری نفاست طبع کو یہ گوارا نہیں ہو رہا تھا جب کہ وہاں الماری میں استری بھی موجود تھی۔ میں نے اپنے کپڑوں پر استری کی اور پھر جب انہیں پہن رہی تھی تو دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

''آپ کا نیاز مند موشوروف۔''

''ذرا ٹھہرو' ابھی کھولتی ہوں دروازہ!''

''بہتر ہے۔''

شلوار سوٹ پہن کر اور دوپٹا اپنے گلے میں ڈالنے کے بعد میں دروازے کی طرف بڑھی۔ تولیا بھیگا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے اسے ایک کرسی کی پشت پر پھیلا دیا تھا۔

''صبح بخیر خاتون!'' دروازہ کھلتے ہی موشوروف ادب سے میرے سامنے جھکا' پھر میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''خاصی تازہ دم معلوم ہو رہی ہیں! آپ کا لباس بھی بے شکن دکھائی دے رہا ہے۔''

اس کا مشاہدہ یقیناً اچھا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ہاں میں نے ابھی کپڑوں کو پریس کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے گیلے بالوں کو ہاتھ سے جھٹکا دیا۔ میں نے ابھی چوٹی نہیں باندھی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ غسل کرنے سے مجھے کچھ تازگی محسوس ہو رہی تھی۔

''ناشتا کمرے ہی میں منگوا لیا جائے یا ڈائننگ روم تک چلنے کی زحمت کریں گی؟'' موشوروف نے پوچھا۔

''تم جو چاہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے ابھی میرے بال گیلے ہیں۔ بال سوکھ جائیں گے تو پھر میں چوٹی باندھوں گی' اس کے بعد ہی ناشتا مناسب رہے گا۔'' یہ کہتی ہوئی میں کمرے کے درمیان پنکھے کے نیچے آ کھڑی ہوئی اور بال خشک کرنے لگی۔

موشوروف اسی کرسی پر جا بیٹھا جہاں رات کو بیٹھا تھا۔ معاً اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''رات کو شاید میں اپنا لائٹر یہاں بھول گیا تھا...... میرا خیال ہے یہاں شیلف پر رکھا تھا' آپ نے تو نہیں دیکھا خاتون؟''

''نہیں!'' میں نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو جھٹکتے ہوئے صاف جھوٹ بول دیا۔

اسی وقت وہی ملازم دوبارہ کمرے میں داخل ہوا جس نے مجھے جگایا تھا۔ موشورف نے مجھ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے خاتون وہیں ڈائننگ روم میں ناشتا کریں گے چل کر! یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ نے جگہ کا انتخاب مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔''

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے کہہ دیا۔

"تم ڈائننگ روم میں ناشتا لگا دو' مس آندرے سے بھی کہہ دو کہ وہیں آجائیں۔" موشوروف نے ملازم کو ہدایت دی۔ موشوروف سے ایک نیا نام سن کر میں چونک اٹھی۔ میں نے اس کی طرف رخ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کون خاتون ہیں جن کا تم نے نام لیا؟"

"میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا خاتون' آندرے میری محبوبہ ہے۔ اس کا پورا نام جولین آندرے ہے۔ آندرے اس کے باپ کا نام تھا جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس کی ماں پہلے ہی مر چکی تھیں۔ آندرے فرانس میں ہمارا ایجنٹ تھا۔ امریکی ایجنٹوں سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ مارا گیا۔ یہ اب سے کئی سال پہلے کی بات ہے۔ یوں جولین تنہا رہ گئی۔ اس کے کچھ عزیز پیرس میں تھے مگر وہ ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ فرانس کے دوران قیام میں وہ میرے بہت قریب آگئی تھی۔ جب اس کا باپ مر گیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ ایک دوست' ایک ساتھی کی حیثیت سے وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ جولین سے مجھے محبت تھی۔ اس نے یہ بھی اسی وقت کہا تھا کہ جب وہ یہ محسوس کر لے گی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں تو ہمیشہ کے لئے میری ہو جائے گی' میں خود بھی اس پر دباؤ نہیں ڈالوں گا۔ جولین سے مجھے محبت تھی۔ میں نے اسی لئے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ میں ایک خطرناک پیشے سے وابستہ ہوں' دیس دیس پھرنا میرا کام ہے اور کچھ خبر نہیں کہ کب اور کہاں زندگی کا یہ سفر ختم ہو جائے' تم کسی اور کا ہاتھ تھام لو! مگر وہ نہ مانی بلکہ اب تو ایک طرح سے اسے میرے دس راست کی سی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک وفادار ساتھی کی طرح ساتھ رہتی ہے۔ ہمیں ساتھ ساتھ رہتے تقریباً چار سال ہو گئے ہیں اور اس عرصے میں ہمارے درمیان حجابات کا ہر پردہ اٹھ چکا ہے۔ میرا خیال ہے خاتون کہ جولین آندرے کا اتنا تعارف آپ کے لئے کافی ہو گا!" موشوروف تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دے کر خاموش ہو گیا۔

مجھے یہ انوکھا تعلق' عجیب رشتہ بڑا مختلف سا نظر آیا۔ اس شخص نے کسی تکلف کے بغیر اپنی محبوبہ کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہماری مشرقی روایات کے پس منظر میں ان دونوں کا یوں ساتھ رہنا کہ حجابات کے تمام پردے بھی اٹھ چکے ہوں عجیب سی بات تھی۔

"جب تم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آچکے ہو تو شادی کیوں نہیں کر لی؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ فیصلہ مجھے نہیں جولین کو کرنا ہے اور اس نے روز اول ہی کہہ دیا تھا کہ میں اس سلسلے میں اسے مجبور نہیں کروں گا۔" موشوروف صاف گوئی سے بولا۔

"ویسے خود تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن چکے ہیں' مجھے اس کی اور اسے شاید میری عادت سی پڑ گئی ہے۔ جب سے وہ میری زندگی میں آئی ہے میں نے کسی عورت کو اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ جولین چاہے ساری عمر مجھ سے باقاعدہ وابستہ نہ ہو مگر مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گی اور میرے لئے بس اتنا ہی کافی ہے۔"

موشوروف کی داستان عشق سن کر میرے دل میں جلد سے جلد اس لڑکی کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا جو اس کی محبوبہ تھی۔ میرے بال خشک ہو چکے تھے سو میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا بیٹھی اور بالوں میں ایک ہیر کریم لگا کر چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا۔ عام مردوں کی طرح موشوروف مجھے بدنظر معلوم نہیں ہوا تھا اور اب اس کی وجہ بھی سامنے آگئی تھی۔ اس کے دل میں پہلے ہی سے کوئی سمایا ہوا تھا۔

"چلو!" میں نے آئینے پر آخری نظر ڈالی اور کھڑی ہو گئی۔

ڈائننگ روم اس کمرے سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہاں ایک حسین و جمیل فرانسیسی لڑکی پہلے ہی سے ہماری منتظر تھی۔ اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ موشوروف نے اس سے میرا تعارف کرایا' اس نے خوش اخلاقی کے ساتھ مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہی جولین آندرے تھی۔ دراز قد' گورا رنگ' نیلی آنکھیں' سنہرے بال اور بے حد متناسب جسم والی وہ بھولی بھالی سی لڑکی مجھے بہت اچھی لگی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسی حسین و پرکشش لڑکیاں کم ہی دیکھی ہیں۔

ناشتا کرتے ہوئے موشوروف نے بتایا کہ جولین بہت اچھی شاطر بھی ہے۔

"اور تم؟" میں نے موشوروف سے پوچھا۔ "شطرنج تو یوں بھی تمہارے ملک کا قومی کھیل ہے۔"

"ہاں مجھے بھی مہرے چلنے آتے ہیں مگر جولین مجھے اکثر مات دے دیتی ہے۔"

"زیادہ صحیح یہ ہے کہ موشوروف کو خود مجھ سے ہار جانے میں مزہ آتا ہے۔" جولین بول اٹھی۔

"ہاں کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں جولین کہ جن سے ہار جانا ہی لطف دیتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا' "اور تم بھی یقیناً ایسے ہی لوگوں میں سے ہو۔"

وہ ہنسنے لگی' ماحول بالکل گھریلو سا تھا۔ مجھے اس وقت قطعی یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میں موشوروف کی قید میں ہوں۔

"آپ کو شطرنج کھیلنا آتی ہے عذرا خان؟" جولین نے مجھ سے پوچھا۔

"کیوں' کیا انہیں بھی ہرانے کا ارادہ ہے؟"

"اوہ نو!" جولین ہنس کر بولی۔ "میں تو یوں ہی وقت گزاری کے لئے کہہ رہی تھی کیونکہ تمہیں ابھی کچھ دیر بعد کہیں جانا بھی تو ہے! اس عرصے میں ان کا جی بہلا رہے گا اور وقت بھی گزر جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے جولین نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

یہ سن کر کہ موشوروف کہیں جانے والا ہے میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا موشوروف کی غیر موجودگی میں کوئی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ یہی سوچتے ہوئے میں نے جولین کی بات کا جواب دیا۔ "ہاں مجھے بھی تھوڑی بہت آتی ہے شطرنج! چال چلنے کی حد تک!"

"ویری گڈ!" جولین نے مسرت کا اظہار کیا۔

"پھر ناشتا کر کے آپ ہمارے ساتھ ہمارے کمرے میں چلئے گا' وہیں شطرنج کھیلیں گے۔"

"جیسے تم کہو!" میں نے آمادگی ظاہر کر دی پھر ہم ڈائننگ روم سے موشوروف کے کمرے میں آ گئے۔ یہ ان دونوں کی خواب گاہ تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں ایک بیڈ تھا مگر میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

ابھی پہلی بازی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی تھی کہ موشوروف بول اٹھا۔ ''سوری خواتین اب اجازت چاہوں گا' دوپہر کو لنچ پر ملاقات ہوگی۔''

جولین نے اور میں نے اسے الوداع کہا اور پھر ہم دونوں کھیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ واقعی اچھی کھلاڑی تھی۔ میری بازی دب رہی تھی۔ مزید ستم یہ ہوا کہ موشوروف کے جاتے ہی میرا ذہن کھیل کی طرف سے ہٹ گیا...... نتیجتاً کچھ ہی دیر میں مجھے شکست ہوگئی۔

''تم بہت اچھا کھیلتی ہو جولین!'' میں نے کھلے دل سے اس کی تعریف کی۔

''جی نہیں کھیل کے آخری حصے میں آپ کی توجہ کھیل پر نہیں تھی ورنہ اتنی جلدی مات نہ ہوتی!'' وہ بولی اور میں چونک اٹھی۔

وہ لڑکی بظاہر جتنی سیدھی سادی معلوم ہوتی تھی حقیقتاً ایسی نہیں تھی۔ اس کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ میں اس دوران میں کھیل کی بجائے فرار کے امکانات کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ دن کے وقت بھی کوٹھی کا صدر دروازہ مقفل نہیں رہتا؟ اور رہتا ہے تو اس کی چابی کس کے پاس ہوتی ہے؟ برقی رو کا سلسلہ کہاں سے منقطع ہوتا ہے......؟ محافظوں کی تعداد کتنی ہے؟ یہ اور ایسے متعلقہ سوالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ اسی سبب کھیل کی طرف سے میری توجہ ہٹ گئی تھی۔

''دوسری بزی لگاؤں؟'' جولین نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا اور وہ بساط پر مہرے لگانے لگی۔

دوسری بازی میں نے نسبتاً توجہ سے کھیلی...... میں پہلی بازی میں اس کے کھیل کا انداز بھی دیکھ چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دوسری بازی برابر رہی۔ دوسری بازی کھیلتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کیوں نہ جولین سے ان سوالوں کے جواب حاصل کر لئے جائیں جو میرے لئے وجہ اضطراب بنے ہوئے ہیں! اس کے ساتھ میں نے یہ بھی سوچا جولین بہ رضا و رغبت ظاہر ہے میرے سوالوں کے جواب نہیں دے گی تو کیا میں اس پر تشدد کر سکوں گی؟

جولین کا تعلق بھی میرے دشمنوں ہی سے تھا مگر جانے کیوں میں خود کو اس پر آمادہ نہ کر سکی کہ اس سے کسی قسم کی زیادتی کروں۔ میں نے اسی سبب کسی اور راہ کی تلاش میں اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کر لیا۔

''رات کو میں ٹھیک طرح سو نہیں سکی جولین!'' میں نے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کچھ دیر آرام کر لوں۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ خوش دلی سے بولی۔ ''چلئے میں آپ کو وہاں تک چھوڑ آؤں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کھڑی ہوگئی۔

پھر وہ میرے ساتھ کمرے تک آئی اور جب میں کمرے میں داخل ہوگئی تو اچانک اس نے ایک خلاف توقع حرکت کی۔ اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی اس کی آواز مجھے سنائی دی۔ ''معاف کیجئے گا عذرا خان موشوروف نے مجھے ایسا ہی کرنے کو کہا تھا۔ کمرے کا دروازہ اب اسی وقت کھلے گا جب موشوروف لوٹ آئے گا۔

ایک بار پھر میں معذرت خواہ ہوں! اوکے۔'' اس کے ساتھ مجھے یوں لگا [illegible]

''جولین......! جولین!'' میں نے اسے بہت آوازیں دیں مگر وہ پلٹ کر [illegible]

مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا کہ میں نے خواہ مخواہ ایک سنہری [illegible]

چاہتی تو اس لڑکی سے بہت کچھ معلوم کر سکتی تھی۔ پھر شائد میں اس کوٹھی سے فرار ہونے [illegible] جاتی۔ اس کوٹھی میں مجھے اب تک موشوروف' جولین اور ایک ملازم کے سوا کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ [illegible] تھا کہ اس کوٹھی میں صرف یہی افراد تھے یا ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ تھے؟ قیاس یہی کہتا تھا کہ وہاں یقینا کچھ اور لوگ بھی ہوں گے۔

کوٹھی کے مکینوں کو اس کمرے کا دروازہ کھولنے پر کس طرح مجبور کیا جا سکتا ہے؟ میرے ذہن میں بار بار یہی سوال گردش کر رہا تھا...... بالآخر جواب مل ہی گیا مگر یہ جواب بہت خطرناک تھا۔ اس طرح میری زندگی شدید خطرے سے دوچار ہو سکتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر کمرے کے اندر آگ لگا دی جائے تو کوٹھی کے مکین یقیناً مجھے آگ میں زندہ جلنے سے بچانے کے لئے دروازہ کھول دیں گے اور میں اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے فرار ہو جاؤں گی۔ اگر کوئی اس طرف متوجہ نہ ہوا؟ یہ دوسرا سوال میرے لئے بہت اہم تھا اور اسی پر میری زندگی یا موت کا دار و مدار تھا۔

کمرے میں آگ لگانا تو میرے لئے مشکل نہیں تھا میرے پاس لائٹر موجود تھا اور کمرے میں ایسی چیزوں کی بھی کمی نہیں تھی جو فوراً جلنے لگتیں لیکن دروازہ کھلنے تک میں خود کو آگ سے کس طرح محفوظ رکھ سکوں گی میری سمجھ میں یہی نہیں آ رہا تھا۔

دروازے کے علاوہ کمرے میں ایک کھڑکی تھی جس میں لوہے کی موٹی سلاخیں تھیں۔ اس کے ذریعے بھی کمرے سے نکلنا مشکل تھا۔ کمرے میں روشندان کوئی نہیں تھا۔

کافی دیر غور و فکر کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچ ہی گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ کسی طرح کمرے کے دروازے میں آگ لگا دی جائے۔ اس طرح پورے کمرے میں آگ کو پھیلتے ہوئے کچھ دیر لگے گی کچھ سوچتے ہوئے میں نے مسہری کا گدا اٹھا کر لائٹر نکال لیا جو رات کو وہاں چھپایا تھا' پھر شیلف سے کچھ کتابیں نکال لیں۔ میں نے ان کتابوں کے اوراق پھاڑ پھاڑ کر دروازے کے قریب ڈھیر کرنا شروع کر دیئے۔ جب میں تین چار موٹی موٹی کتابوں کے اوراق پھاڑ کر دروازے کے قریب ڈھیر کر چکی تو جھک کر لائٹر کا شعلہ کاغذوں کو دکھا دیا۔ کاغذوں میں فوراً آگ لگ گئی۔ لائٹر کھول کر اس کا تمام پٹرول میں نے لکڑی کے دروازے پر چھڑک دیا' پھر ایک جلتا ہوا کاغذ نیچے سے اٹھا کر دروازے کے قریب کر دیا۔

ایسا کرتے ہوئے میں نے پوری احتیاط سے کام لیا تھا کہ کہیں میرے کپڑوں میں آگ نہ لگ جائے۔

جس جگہ میں نے پٹرول چھڑکا تھا وہ جگہ جلنے لگی۔ اس دوران فرش پر بچھے ہوئے قالین نے بھی آگ پکڑ لی تھی۔ میں ذرا فاصلے پر کھڑی ہوئی یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ آگ کے شعلوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے پلنگ پر بچھی چادر بھی آگ میں جھونک دی تھی۔

ذرا دیر بعد کمرے میں اتنا دھواں بھر گیا کہ مجھے سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ اس کے علاوہ آگ کی تپش بھی اب میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک

دوسرا خیال آیا کہ کہیں اس طرح میں خودکشی تو نہیں کر رہی؟ کیوں کہ ابھی تک کوٹھی کے مکین اس طرف سے بے خبر سو رہے تھے لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

ساتھ ہی کھڑکی کا خیال آیا۔ میں نے سوچا اگر کھڑکی کھول دوں تو کمرے میں جو دھواں بھرا ہے وہ اس راستے ... نکل جائے گا۔ لہٰذا میں نے اس پر عمل کیا۔ گھٹن کا احساس کھڑکی کھلنے سے قدرے کم ہو گیا

دروازہ اور اس کے آس پاس کی چیزیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ لپکتے ہوئے آگ کے شعلے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ میں کھڑکی کے قریب کھڑی ہوئی باہر راہداری کو دیکھ رہی تھی۔ میرے کمرے سے ملازموں کا کمرہ کافی فاصلے پر تھا۔ مجھے تو یہ بھی اتنا ضرور معلوم تھا کہ کوٹھی میں ... کی موجودگی میں چوکیدار اور ایک ملازم موجود ہے۔ ... اپنے کمرے میں تھی اور ملازم۔ جانے اتنی بڑی کوٹھی کے کس کونے میں تھا۔ وہ دونوں ہی جیسا میرے کمرے سے بہت دور تھے۔ انہیں اس طرف متوجہ کرنے کی ایک صورت اور بھی تھی کہ میں کھڑکی کے قریب کھڑی ہو کر زور زور سے چیخنے لگوں۔

کھڑکی کے راستے دھواں راہداری میں بھی نکل رہا تھا اور اب اس میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا کہ مجھے کھانسی آنے لگی تھی۔

صورت حال کے خطرے کے پیش نظر میں نے چیخنا شروع کر دیا۔ "آگ... آگ... بچاؤ... بچاؤ... آگ..."

"میں پوری قوت سے چیخ رہی تھی اور اس کے ساتھ کھانس بھی رہی تھی۔

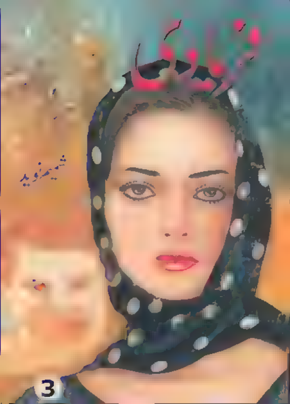
آگ نے اب آدھے سے زیادہ کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کھڑکی بھی اب اس کی زد میں آنے والی تھی۔ اب میرا کھڑکی کے قریب کھڑا رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میرے کپڑوں میں بھی آگ لگ سکتی تھی۔ ... میں جتنی ہوئی کھڑکی سے دور ہٹ گئی۔

معلوم نہیں میری چیخیں کسی نے سنی بھی تھیں یا نہیں! کیوں کہ ابھی کوئی ادھر نہیں آیا تھا۔ کمرے کا درجہ حرارت آگ کی وجہ سے بہت بڑھ گیا تھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہوا تھا۔ اب یہ ڈر کر مجھے خیال آیا تھا کہ میں نے کمرے میں آگ لگا کر غلطی کی ہے۔ جس راہ سے باہر نکلا جا سکتا تھا وہ آگ کی لپیٹ میں تھی۔ میری مراد دروازے سے ہے جو کمرے سے باہر نکلنے کا واحد راستہ تھا اور وہی حصہ سب سے زیادہ متاثر تھا۔

کمرے کا فرنیچر بھی اب جلنے لگا تھا اور آگ تیزی کے ساتھ چھت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے مسہری میں آگ لگ گئی اور اس کے شعلے بھی چھت تک پہنچ گئے۔ تین چوتھائی سے زیادہ کمرہ جل رہا تھا اور اب صرف وہی حصہ باقی بچا تھا جہاں میں کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ میرے قریب ہی باتھ روم کا دروازہ تھا۔ میرے لئے اب یہ صورت رہ گئی تھی کہ میں باتھ روم میں گھس جاؤں۔

فرنیچر کے جلنے کی آواز مجھے بہت بھیانک محسوس ہو رہی تھی۔ اب میں نے چیخنا بند کر دیا تھا کیونکہ یہ بے نتیجہ ہی ثابت ہوا تھا۔

عذرا خان کی پراسرار آپ بیتی ابھی جاری ہے۔ بقیہ واقعات کیلئے تیسرے حصہ کا مطالعہ کریں۔



3

پھر جب کمرے میں رہنا میرے لئے ناممکن ہو گیا تو مجھے مجبوراً باتھ روم کا رخ کرنا پڑا۔ باتھ روم میں بہت بلندی پر ایک روشن دان تھا مگر وہ بند تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کا دروازہ کھولا کمرے کا دھواں اس میں بھی بھر گیا۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے ناقابل برداشت تپش سے بچنے کی خاطر شاور کھول دیا اور کپڑوں سمیت اس کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ باتھ روم کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ دروازہ بند کرنے کی صورت میں اندر موجود دھوئیں سے سانس لینا دوبھر ہو جاتا۔

رفتہ رفتہ آگ باتھ روم کے دروازے تک پہنچ گئی اور پھر دروازہ بھی جلنے لگا۔ باتھ روم میں اب اتنا دھواں بھر چکا تھا کہ مجھے سانس رکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسی وقت مجھے کہیں دور سے کسی نے پکارا۔ "ہدیٰ راشان ... ادھر جان!"

مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ جواب دے سکتی۔ گھٹن کے سبب میرا سانس رکتا جا رہا تھا اور سر چکرانے لگا تھا۔

کسی کے پکارنے کی آواز گویا میرے لئے "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کے مانند تھی۔ ہوش کھونے سے پہلے مجھے یہ اطمینان تو تھا کہ شاید اب مجھے بچا لیا جائے گا مگر یہ خیال بھی تھا کہ میری جدوجہد لاحاصل رہی تھی۔ میں فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

ہوش آنے پر میں نے جولین کو اپنے قریب دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہری فکرمندی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے مجھ پر سوالات کی گویا یلغار کر دی۔ میں نے اسے صرف ایک ہی جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم کہ کمرے میں کیسے آگ لگ گئی!

جولین کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے میرا جواب مطمئن نہیں کر سکا۔ موشو روف ابھی تک نہیں لوٹا تھا ورنہ وہ بھی اس وقت میرے پاس ہوتا۔ یہ صورت حال میرے حق میں تھی۔ میں ابھی سوچ رہی تھی کہ مجھے اس موقع سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہئے کہ جولین بول اٹھی۔ "آپ کے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔ باتھ روم میں جا کر کپڑے بدل لیں۔ میں نے ایک پینٹ اور جیکٹ وہاں کھونٹی پر ٹانگ دی ہے۔"

"شکریہ جولین" میں یہ کہہ کر اس کے بستر سے اٹھ گئی۔

میں اس وقت موشو روف اور جولین ہی کے کمرے میں تھی۔ میں ابھی جولین سے یہ بھی نہیں پوچھ سکی تھی کہ اس نے کس طرح مجھے میرے کمرے سے نکالا تھا اور آگ پر کیسے قابو پا لیا گیا تھا!

باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ اب اس لڑکی پر ذرا بھی ترس نہیں کھاؤں گی اور اس موقع سے پورا فائدہ اٹھا کر یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں گی' اگر موشوروف لوٹ آیا تو شاید پھر مجھے یہ موقع نہ مل سکے۔ باتھ روم گھس کر میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ پھر جب میں لباس تبدیل کر رہی تھی تو اچانک میری نگاہ باتھ روم کی کھڑکی پر پڑی۔ میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔

کھڑکی کھلتے ہی تازہ ہوا کے جھونکے نے مجھے خوش آمدید کہا۔ وہ کھڑکی مجھے اپنی خوش نصیبی کا دروازہ نظر آئی کیونکہ اس کے راستے میں بہ آسانی لان میں کود سکتی تھی۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر مجھے کوٹھی کا پھاٹک نظر آ رہا تھا جس کے برابر غالباً چوکیدار کا چھوٹا سا کمرا بنا ہوا تھا۔ کوٹھی کی چار دیواری خاصی بلند تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ درخت لگے ہوئے تھے۔ کسی بھی درخت پر چڑھ کر چار دیواری کے اوپر پہنچنا محال نہیں تھا۔ اس کے بعد دوسری جانب کود جانا بھی یقیناً مشکل نہ ہوتا۔

فرار کی راہ سامنے تھی۔ اس سلسلے میں اب جولین سے پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ممکن ہے اس وقت میں عجلت میں کوئی ایسا قدم اٹھا بیٹھتی جو میرے لئے آئندہ مشکلات پیدا کر دیتا مگر مجھے فوراً ہی صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ یوں خالی ہاتھ بے سرو سامانی کی حالت میں یہاں سے فرار ہو جانا میرے لئے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ نہ میرے پاس رقم تھی نہ ضروری کاغذات' نہ پاسپورٹ نہ کچھ اور! اسی صورت حال میں اس کوٹھی سے نکل جانے کے باوجود میں قطعی مجبور و بے بس ہوتی۔ ان حالات میں قوی امکان یہی تھا کہ میں دوبارہ گویا شکار کر لی جاتی' میرے لئے قاہرہ سے نکلنا دوبھر ہو جاتا۔ پھر کیا کیا جائے؟ اس سوال نے میری رہنمائی کی۔ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے اسی سوال کے نتیجے میں ایک امکانی راہ نظر آنے لگی۔ اس امکانی راہ کے سبب میں نے آہستگی سے کھڑکی کو بند کر دیا اور پھر باتھ روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی۔

میں نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا جولین میری طرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ''آپ اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں عذرا خان!''

''شکریہ جولین!'' میں یہ کہتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ میرے ہونٹوں پر بھی [illegible] مسکراہٹ آ گئی تھی۔ میں مزید بولی۔ ''تمہارے اور میرے جسم میں زیادہ فرق نہیں۔'' میں اب اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔

جولین کو گمان بھی نہ ہو گا کہ دوسرے ہی لمحے اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے! اس کی کنپٹی پر جب میرے ہاتھ کی بھرپور ضرب پڑی تھی تو وہ مجھے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر اس کا جسم لہرا کر فرش پر گرنے لگا تھا۔ میں نے اس کے گرتے ہوئے جسم کو سنبھال لیا تھا۔ میرے ہاتھ کی نپی تلی ایک ہی ضرب میں وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔

میں نے اسے فرش پر لٹا دیا اور پھر تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا اس پر جلد از جلد عمل کرنا چاہتی تھی کیونکہ موشوروف کسی بھی لمحے واپس آ سکتا تھا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے کمرے میں موجود الماری نظر آ گئی جس کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گئی اور

پھر اس کی تلاشی لینے لگی۔ اوپری خانے میں ایک لیڈیز پرس نظر آیا جو یقیناً جولین ہی کا ہو سکتا تھا۔ الماری میں موجود کپڑوں اور دیگر سامان سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ الماری جولین ہی کے استعمال میں تھی۔ میں نے پرس اٹھا لیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ پرس میں میک اپ کے سامان کے علاوہ ایک چھوٹا سا خوبصورت ریوالور بھی تھا۔ چابیوں کا ایک گچھا اور کچھ رقم بھی مجھے پرس میں ملی۔ رقم چھ سات سو گنی سے زیادہ نہ تھی۔ یہ رقم میرے نزدیک بہت تھوڑی تھی۔ اگر پرس میں زیادہ رقم ہوتی تو یقیناً میں الماری کے سیف کو کھولنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی۔ پرس سے چابیوں کا گچھا نکال کر میں نے سیف کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک چابی لگ گئی اور میں نے سیف کھول لیا۔ سیف کے ایک خانے میں مجھے پچاس اور پچیس گنی کے نوٹوں کی گڈیاں نظر آئیں۔ مصری کرنسی کے علاوہ دیگر کئی اور ممالک کی کرنسی بھی تھی میں نے صرف مصری کرنسی کو ہاتھ لگایا۔ میں نے پچاس گنی کے نوٹوں کی ایک گڈی کھینچ لی۔ پانچ ہزار گنی کی یہ رقم قاہرہ سے فرار کے لئے کافی تھی۔ میں غالباً پہلے بھی یہ لکھ چکی ہوں کہ ایک گنی اس وقت چودہ پاکستانی روپوں کے مساوی ہوتی تھی۔ یوں گویا پانچ ہزار گنی کی رقم ستر ہزار پاکستانی روپوں کے برابر تھی۔

پچاس گنی کے نوٹوں کی وہ گڈی میں نے پرس میں رکھ لی اور پھر سیف بند کر کے چابیوں کا گچھا وہیں اوپری خانے میں رکھ دیا۔ پرس میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ رقم کے علاوہ اس سیف میں کچھ کاغذات بھی تھے مگر یہ وقت ان کے مطالعے کا نہیں تھا۔ ممکن ہے وہ کاغذات اہم ہوں لیکن ان کے چکر میں پڑ کر میں مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ رقم مل جانے کے بعد اب میں جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

پرس ہاتھ میں تھامے الماری بند کر کے میں پلٹی اور جولین پر نگاہ ڈالی۔ وہ ابھی تک فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزرتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھی۔ بظاہر اس کوٹھی سے فرار ہونا بہت آسان نظر آتا تھا مگر اس کے باوجود جانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ باتھ روم میں داخل ہو کر احتیاطاً میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور آگے بڑھ کر وہ کھڑکی کھول دی جو گویا راہ فرار تھی۔ میں پہلے ایک نظر باہر کا دوبارہ جائزہ لینا چاہتی تھی۔

میں ابھی کھڑکی کھولے باہر کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ دور سے کار کے ہارن کی آواز سن کر چونک اٹھی۔ پھر میں نے پھاٹک کے قریب بنے ہوئے کمرے سے ایک مسلح شخص کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس شخص نے پہلے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر جھانکا پھر پھاٹک کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ دوسرے ہی لمحے ایک سیاہ کار اندر داخل ہو گئی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بھیڑ دی مگر تھوڑی سی جھری رہنے دی تاکہ آنے والے کو دیکھ سکوں۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر میں فکر مند ہو گئی وہ موشوروف تھا۔ عین فرار کے وقت اس کی آمد نے مجھے شدید تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

کار اندر آ گئی تو چوکیدار نے پھاٹک بند کر دیا۔ احاطے میں کار کو ایک جانب کھڑا کر کے موشوروف نیچے اتر آیا۔ میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کوٹھی کے صدر دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دوبارہ کھڑکی کھول

دی۔ اب ہر لمحہ بہت قیمتی تھا۔ میں اسی لئے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر باتھ روم کی کھڑکی پر چڑھ کر لان میں کود گئی۔

لان میں کود کر میں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ وہاں بہ ظاہر کوئی نہیں تھا۔ چند لمحے رک کر میں تیزی کے ساتھ کوٹھی کی چار دیواری کی طرف بڑھی۔

میں نے ابھی بمشکل لان کا نصف حصہ عبور کیا تھا کہ اچانک عقب سے ایک تیز اور بھاری آواز سنائی دی۔ ”رک جاؤ عذرا خان!“

بے اختیار میرے قدم رک گئے اور میں نے مڑ کر کوٹھی کی طرف دیکھا۔ کوٹھی کی پہلی منزل کی ایک کھڑکی میں مجھے ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا ریوالور تھا اور ریوالور کی نال کا رخ میری ہی طرف تھا۔ گویا میرا اضطراب قلب بے سبب نہیں تھا۔ میں نے جس راہ فرار کو سہل جانا تھا وہ سہل نہیں تھی۔ موشوروف نے کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ کوئی بھی اس کوٹھی میں اس کے آدمیوں کی نظر میں آئے بغیر نہ داخل ہو سکتا تھا نہ باہر جا سکتا تھا۔

صرف چند لمحے انتہائی تذبذب میں گزرے اور پھر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ میں نے سوچا یہ محض دھمکی ہے یہ شخص مجھے ہرگز گولی نہیں مار سکتا! اس کا مقصد محض مجھے روکنا ہے! امریکیوں کی طرح روسی ابھی میری طرف سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک میں اتنی بے قیمت نہیں تھی کہ مجھے قتل کر دیتے۔ اس خیال نے جیسے میرے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ میں نے مزید کچھ سوچے بغیر دوسرے ہی لمحے چار دیواری کی طرف جست بھرنا شروع کر دی۔

شاید اس شخص کو توقع نہ ہوگی کہ میں یوں موت سے کھیلنے پر آمادہ ہو جاؤں گی اس لئے فوری طور پر اس کی طرف سے کوئی ردعمل نہ ہو سکا۔ میں نے لمحوں میں لان کا بقیہ نصف حصہ عبور کر لیا تھا اور چار دیواری کے قریب ایک پیڑ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اسی وقت مجھے دوبارہ اس شخص کی تیز آواز سنائی دی تھی۔ وہ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”لوٹ آؤ عذرا خان ورنہ میں گولی چلا دوں گا!!“

مجھ پر اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اگر اسے گولی چلانا ہوتی تو اب تک ایسا کر چکا ہوتا۔ اس کی بات پر دھیان دیئے بغیر میں تیزی کے ساتھ پیڑ پر چڑھنے لگی۔ میں نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ وہ شخص مجھے خوف زدہ کر کے روکنے کی خاطر ہوائی فائر بھی کر سکتا ہے مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ شاید وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اب مجھے نہیں روکا جا سکتا یا پھر دن کے وقت مصلحتاً اس نے فائرنگ سے گریز کیا تھا۔ فائر کی آواز آس پاس رہنے والوں کو اس طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ بہر حال فائر نہ کرنے کی وجہ کچھ بھی ہو میں نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور پیڑ پر چڑھنے کے بعد چار دیواری تک پہنچنے میں دیر نہیں کی۔

مجھے بے ہوشی کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا اس لئے میں لاعلم تھی کہ قاہرہ کا یہ کون سا علاقہ ہے! البتہ چار دیواری پر چڑھ کر دوسری جانب دیکھتے ہوئے میں نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ علاقہ قدرے پرسکون اور قاہرہ کی ہنگامہ خیز زندگی سے ذرا الگ تھا۔ چار دیواری سے نیچے گلی میں کودتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ اریب [illegible] کوئی نہیں ہے۔

وہ علاقہ قدیم طرز پر بنی ہوئی بڑی بڑی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ میں جلد از جلد وہاں سے دور

نکل جانا چاہتی تھی۔ گلیوں گلیوں تقریباً دوڑتی ہوئی میں کافی دور ایک سڑک پر نکل آئی۔ اب وہ کوٹھی خاصی پیچھے رہ گئی تھی جہاں سے میں فرار ہوئی تھی۔ موشوروف اور اس کے آدمیوں نے یقیناً مجھے تلاش کیا ہوگا مگر میں ان کے ہاتھ نہیں آ سکتی تھی۔ اس کا سبب وہ پیچ در پیچ متعدد گلیاں تھیں جو اردگرد پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ بھلا مجھے کہاں کہاں اور کس کس گلی میں تلاش کرتے پھرتے!

گلیوں میں اتنی دیر بھٹکنے اور پھر ایک بارونق سڑک تک پہنچنے کے بعد میں جان چکی تھی کہ قاہرہ کے کون سے حصے میں ہوں! جیسا کہ غالباً میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ قاہرہ تین بڑے حصوں میں تقسیم ہے' جدید قاہرہ' پرانا قاہرہ اور جیزہ! یہ جیزہ تھا اور میں اس کی ایک قدیم آبادی زمالک میں تھی۔ یہاں میں پہلے بھی آ چکی تھی۔ یہ قاہرہ کے قدیم امرا کا علاقہ تھا۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہی ہوں اس وقت ایسا ہی تھا۔ ہاں اب اس علاقے میں دوسرے طبقوں کے افراد بھی آباد ہو چکے ہیں اس لئے اس کا شمار اعلیٰ درجے کی آبادیوں میں نہیں ہوتا۔ پہلے یہیں بڑے بڑے ممالک کے سفارت خانے بھی تھے جو اب نہیں ہیں۔ اسی علاقے پر کیا منحصر آبادیاں بنتی بگڑتی ہی رہتی ہیں! تغیر ہی تو زندگی کی دلیل ہے اور زندگی کی ہی دلیل مجھے دیس دیس' نگر نگر بھٹکائے پھر رہی تھی۔ مجھے پاکستان سے مصر آئے کافی دن ہو گئے تھا مگر اب تک یہاں سے واپس جانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ امریکیوں کے چنگل سے نکل کر میں روسی ایجنٹوں کی [illegible] میں چلی گئی تھی لیکن وہاں سے آزادی نصیب ہونے کے باوجود ابھی حالات پوری طرح میرے قابو میں نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ مجھے باآسانی قاہرہ سے نہ نکلنے دیتے۔ میں اس وقت اپنے ذہن میں یہی لائحہ عمل ترتیب دے رہی تھی کہ فوری طور پر کس طرح ان سے محفوظ رہ سکتی ہوں! جب تک مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی میں فیصلہ کر چکی تھی کہ میرا پہلا قدم کیا ہونا چاہیے۔

زمالک سے میں نے جدید قاہرہ کے علاقے تحریر اسکوائر کا قصد کیا۔ وہاں سے تحریر اسکوائر تک چار گنی کرایہ زیادہ تھا مگر میں نے ٹیکسی والے سے بحث نہ کی اور نہ کسی دوسری ٹیکسی کا انتظار کرنا مناسب خیال کیا۔ ظاہر ہے کہ ٹیکسی والا مجھے اس شہر میں اجنبی ہی سمجھ رہا تھا۔ مجھے تو جلد از جلد اس علاقے سے نکلنے کی فکر تھی' اگر وہ اس سے زیادہ کرایہ بھی اس وقت طلب کرتا تو میں انکار نہ کرتی۔ ٹیکسی وہاں سے روانہ ہوئی تو مجھے قدرے سکون محسوس ہوا۔

تحریر اسکوائر پہنچنے تک میرا ذہن آئندہ اقدامات کے متعلق غور وخوض کرنے میں منہمک رہا۔ ایک بڑے سے جنرل اسٹور کے سامنے میں نے ٹیکسی رکوا دی تھی اور کرایہ ادا کر کے اتر گئی تھی۔

اس جنرل اسٹور سے میں نے صرف میک اپ کا ضروری سامان خریدا اور پھر وہاں سے نکل کر ایک قریبی ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہو گئی۔ سب سے پہلے میں نے ایک چھوٹا سا خوبصورت سوٹ کیس خریدا' اسی کے ساتھ ایک لیڈیز پرس بھی! پھر میں دوسری ضروری اشیاء کی خریداری میں مصروف ہو گئی جن میں ریڈی میڈ لباس سرفہرست تھا۔ اس وقت مغربی لباس میری مجبوری تھی اور ضرورت بھی! میں جولین کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھی جسے تبدیل کرنا بے حد ضروری تھا۔ مجھے تلاش کرنے والوں کے لئے یہ لباس واضح شناخت ثابت ہو سکتا تھا۔ سامان کی خریداری میں بھی میں نے بہت عجلت سے کام لیا تھا۔ میرا اس طرح آزادانہ گھومنا پھرنا کسی بھی لمحے مجھے شدید خطرے سے دوچار کر سکتا تھا..... میں ڈاک[illegible] بھی

نہیں بھولی تھی جو گویا اپنے زخموں کو چاٹتا رہ گیا تھا۔ موشوروف نے بھی بتایا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کے گرگے بھی میری تلاش میں پاگل کتوں کی طرح سارے شہر کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ اب ان لوگوں کے نزدیک میری تلاش کا مقصد کچھ اور ہی تھا جس کا تصور بھی میرے لئے سوہانِ روح تھا۔ وہ مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر قتل کر دینے کے بعد اپنے ایک سازشی منصوبے کی تکمیل چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ موشوروف بھی خاموش بیٹھنے والوں میں نہیں تھا۔ یوں گویا میں اس وقت دہرے خطرے سے دوچار تھی۔

اسی دہرے خطرے سے بچنے کی خاطر میں اس وقت ضروری اقدامات کر رہی تھی۔ ان ضروری اقدامات کا پہلا مرحلہ یعنی سامان کی خریداری بہ حسن وخوبی طے ہو چکا تھا اور اب میں تیزی کے ساتھ اس ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے باہر نکل رہی تھی۔ سامان کی قیمت میں نے کاؤنٹر پر ادا کر دی تھی۔

ابھی میں نے سٹور سے باہر قدم رکھا تھا کہ اچانک میرے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور میں چونک اٹھی۔ میرے قدم رک گئے۔ میرے ذہن میں ایک مانوس سی سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔ چند لمحے بعد میرے ذہن میں ایک آشنا آواز گونجی۔ تم کہاں ہو عذرا خان؟

میں اس آواز کو پہچان گئی۔ یہ موشوروف کی آواز تھی۔ مجھے علم تھا کہ موشوروف ایک ٹیلی پیتھ ہے۔ وہ میرے ذہن سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔ اس کے سوال کے جواب میں فوری طور پر میرے ذہن میں ”تحریر اسکوائر“ کا نام آیا۔

اچھا تم اس وقت تحریر اسکوائر پر ہو موشوروف کی آواز پھر سنائی دی۔ تمہارا ارادہ یقیناً کسی ہوٹل میں قیام کا ہوگا؟

نہیں! میرے ذہن نے جواب دیا۔ یہاں سے میں واپس جیزا جاؤں گی اپنی بہن ذکیہ کے گھر جو دقی کے علاقے میں ہے۔

تمہیں اپنی بہن کے گھر کا پتا تو معلوم ہوگا نا! ذرا بتاؤ!

میرے ذہن میں ذکیہ کی کوٹھی کا پتا گھوم گیا۔

شکریہ عذرا خان! ان الفاظ کے ساتھ ہی موشوروف کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ میرے ذہن میں پھر ہلکی سنسناہٹ ہوئی اور پھر ذہنی کیفیت معمول پر آ گئی۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور پھر میرے ہونٹوں پر خود بہ خود مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے موشوروف کی چال خود اسی پر الٹ دی تھی۔ غیر معمولی حالات میں اگر ہوش و حواس قابو میں رکھے جائیں تو اپنے ذہین سے ذہین حریف کو شکست دینا مشکل نہیں ہوتا۔ موشوروف نے اپنے ذہن کی ایک حیرت انگیز قوت سے کام لے کر اپنی دانست میں گویا میرا سراغ لگا لیا تھا اور یہ میرے ذہن کا کمال تھا کہ میں نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ فوری طور پر اس کے سوالوں کا جواب دے کر میں نے اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ میرے ذہن کو مزید کریدنے کی کوشش کرتا۔

موشوروف کا یہ اندازہ درست ہی تھا کہ میں کسی ہوٹل میں قیام کروں گی مگر میرا ارادہ تحریک اسکوئر کے کسی بڑے ہوٹل میں قیام کا نہیں تھا۔ میں کسی اوسط درجے یا کسی تیسرے درجے کے غیر معروف ہوٹل میں وقتی طور پر قیام کرنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر اس سے پہلے ایک اور اہم مرحلہ درپیش تھا' اپنی شخصیت کی تبدیلی کا مرحلہ!

قلوپطرہ ہوٹل کا شمار اوسط درجے کے ہوٹلوں ہی میں تھا۔ وہ بارہ منزل ہوٹل ہلٹن ہوٹل کے مقابل تھا۔ میں اس وقت جہاں کھڑی تھی وہاں سے قلوپطرہ ہوٹل کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لئے پیدل ہی تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی طرف بڑھنے لگی۔ میں اسی ہوٹل میں اپنی شخصیت کی تبدیلی کے مرحلے سے گزرنا چاہتی تھی۔ پھر ظاہر ہے کہ مجھے فوری طور پر وہ ہوٹل چھوڑ دینا پڑتا۔

اس طرح کے مراحل میرے لئے نئے نہیں تھے۔ میں پہلے بھی ایسے مرحلوں سے گزر چکی تھی۔

قلوپطرہ ہوٹل کی طرف بڑھتے ہوئے میں اپنے اردگرد سے پوری طرح چوکنا اور ہوشیار تھی۔ میرے تمام حواس پوری طرح بیدار تھے۔ اسی سبب سوٹ کیس اٹھائے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں نے اس کار کو اپنے قریب رکتے ہوئے فوراً دیکھ لیا جس کا عقبی دروازہ کھول کر تیزی کے ساتھ دو مقامی افراد باہر نکلے تھے۔

خطرہ! خطرہ! میرے ذہن میں تیزی سے یہ الفاظ گونجے اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے سوٹ کیس فٹ پاتھ پر رکھ دیا اور پرس بھی ہاتھ سے جھٹک کر نیچے گرا دیا۔

ان دونوں میں سے ایک کسی عقاب کی طرح مجھ پر جھپٹا اور میری کلائی پر ہاتھ ڈال کر مجھے کار کی طرف گھسیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ دوسرے نے میری کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ گویا وہ دونوں مجھے ایک بھرے پرے بازار سے دن دہاڑے اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے مگر انہیں شاید اندازہ نہیں تھا کہ ان کے مقابل کوئی عام لڑکی نہیں' عذرا خان ہے! مجھے یہ سمجھنے میں کوئی قباحت نہیں ہوئی تھی کہ وہ ڈاکٹر رچرڈ ہی کے گرگے ہو سکتے تھے ورنہ کسی اور کو کیا پڑی تھی جو مجھ پر ہاتھ ڈالتا۔

پھر چند ہی لمحوں بعد اس بھرے بازار میں اردگرد جمع ہو جانے والوں نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔ بظاہر ایک بے بس اور کمزور سی عورت نے ان ”بہادر مردوں“ کو چیخنے چلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس شخص نے میری کلائی پر ہاتھ ڈالا تھا اپنے پیٹ پر میرے گھٹنے کی ضرب کھا کر دور جا گرا تھا۔ وہ جو میری کمر تھامنے کی کوشش میں مصروف تھا اس کی پسلیوں پر میرے بائیں ہاتھ کی کہنی اتنی زور سے پڑی تھی کہ چیخ کر دور ہٹ گیا تھا۔ کار میں ان دونوں کے علاوہ دو افراد اور تھے جن میں سے ایک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دوسرا اس کے برابر والی سیٹ پر! ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص تو مصلحتاً کار سے نہیں اترا مگر دوسرا شخص کار کا اگلا دروازہ کھول کر تیزی سے میری طرف لپکا۔ اسی دوران میں اس کا ایک ہاتھ میں نے کوٹ کی جیب میں رینگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ خود قریب پہنچتا میں اپنی جگہ سے اچھلی اور پھر میری فلائنگ کک نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی جیب سے غالباً ریوالور نکالنا چاہتا تھا مگر اس کی یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی تھی۔ تیسرے ساتھی کی مداخلت نے ان دو کی ہمت بڑھا دی تھی جو پہلے میرے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ اسی دوران میں وہ دونوں میرے قریب آ گئے مگر ان کے چہروں سے واضح طور پر خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اب مجھ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کچھ جھجک رہے تھے۔

”قریب آؤ نا اور قریب! میں نے انہیں گویا غیرت دلائی۔ ”مرد بنو!“ یہ کہتے ہی میں نے پینترا بدلا اور پھر ان دونوں پر ٹوٹ پڑی۔

میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور ان دونوں کے منہ سے

چیخیں نکل رہی تھیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی مجھے ہاتھ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ میں تیسرے شخص کی طرف سے بھی غافل نہیں تھی۔ وہ اب کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ میں جیسے اڑتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی اور پھر میری ایک ٹھوکر نے اسے دوبارہ ڈھیر کر دیا۔ میں نے دوبارہ بھی اس کے زخمی ماتھے کو نشانہ بنایا تھا۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھا کر اس شخص کے دونوں ساتھی تیزی سے کار کی طرف بھاگے۔ وہ اب یقیناً راہ فرار اختیار کرنا چاہتے تھے۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھ پر قابو نہیں پا سکیں گے۔

اردگرد جمع ہو جانے والے لوگوں پر جیسے سحر سا ہو گیا تھا۔ وہ گویا پتھر کے بت بنے ایک ناقابل یقین نظارہ دیکھ رہے تھے۔ غالباً اسی کیفیت کے سبب ان میں سے نہ کسی نے مداخلت کی کوشش کی تھی نہ کوئی کچھ بولا تھا۔ تین تندرست و توانا مردوں کو ایک عورت کے ہاتھوں بری طرح پٹتے دیکھ کر حیرت کے سبب شاید وہ گنگ ہو کے رہ گئے تھے۔ میں چاہتی تو ان تینوں کا یہ حشر کر سکتی تھی کہ وہ زندگی بھر کے لئے معذور ہو جاتے مگر میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔ میرے نزدیک ان کے لئے اتنی ہی سزا کافی تھی۔

کار کی طرف بھاگنے والے دونوں افراد اس قدر بے حواس ہو گئے تھے کہ انہیں اپنے تیسرے ساتھی کا خیال بھی نہیں آیا تھا جو میری ''مشق ستم'' کے لئے وہیں رہ گیا تھا

اس وقت اچانک پولیس کار کا سائرن سنائی دیا اور وہاں موجود افراد جیسے کسی خواب سے جاگ اٹھے۔ پولیس کی آمد سے ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی۔ میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا اور پھر دوسرے ہی لمحے اپنا پرس اور سوٹ کیس اٹھا کر بھاگتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ میں گویا گم ہو گئی۔ میں نے پہلے صرف اتنا دیکھا تھا کہ مسلح پولیس والوں نے اپنی جیپ سے اتر کر اس کار کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا جس میں مجھے اغوا کرنے والے فرار ہونا چاہتے تھے۔

مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ پولیس ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی یا وہاں موجود افراد میں سے جو لوگ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے وہ کیا بیان دیتے! جلد ہی میں جائے وقوع سے خاصی دور تحریر اسکوائر ہی کے ایک حصے قصر العینی کی طرف نکل آئی تھی۔ میڈیکل کالج اور پھر ریڈیو اسٹیشن کی اٹھائیس منزلہ بلڈنگ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں ہلٹن ہوٹل کے قریب پہنچ گئی۔ سڑک کے دوسری جانب قلوپطرہ ہوٹل کی عمارت میں داخل ہو گئی۔

قلوپطرہ ہوٹل کی دوسری منزل پر مجھے ایک کمرا باآسانی مل گیا۔ میں نے خود کو ایک ہندوستانی سیاح ظاہر کیا تھا اور ظاہر ہے کہ ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام بھی غلط ہی لکھوایا تھا۔ مجھے ہوٹل میں زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ میں اسی لئے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق عمل کرنے لگی۔ پہلے میں نے جولین کے لباس سے نجات حاصل کی پھر پرس بھی بدل لیا۔ اس کے بعد اپنے چہرے پر میک اپ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

آدھے پون گھنٹے کے اندر اندر میں مکمل طور پر اپنی شخصیت تبدیل کر چکی تھی۔ میرا رنگ گورا تھا اسی سے فائدہ اٹھا کر میں نے اپنے چہرے پر ایک ادھیڑ عمر یورپی خاتون کا میک اپ کیا تھا۔ اب کوئی مجھے عذرا خان کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا تھا۔

میک اپ سے فارغ ہو کر میں نے تمام سامان سمیٹ کر سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ میرے پروگرام کا دوسرا مرحلہ بھی بخیر و خوبی انجام پا چکا تھا اور اب مجھے اس ہوٹل کو خیر باد کہنا تھا۔ کمرا چھوڑنے سے پہلے میں نے ایک نظر باہر کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ خلاف توقع مجھے راہداری میں کچھ غیر معمولی سی سرگرمی نظر آئی۔ اس وقت دو افراد میرے کمرے کے دروازے کے سامنے ہی سے باتیں کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔

''معلوم نہیں پولیس کو کس کی تلاش ہے! میں نے ابھی نیچے کاؤنٹر پر کچھ پولیس والوں کو پوچھ گچھ کرتے دیکھا تھا۔ وہ کسی عورت......'' میں نے ان دونوں میں سے ایک شخص کے صرف یہی الفاظ سنے پھر وہ دونوں آگے بڑھ گئے اور میں مزید کچھ نہ سن سکی۔

میرے لئے اتنا سن لینا بھی کافی تھی اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ پولیس تحریر اسکوائر پر ہونے والے ہنگامے کی تفتیش کر رہی ہو اور اسے میری تلاش ہو جائے وقوع سے پراسرار طور پر میرا غائب ہو جانا پولیس کے لئے تشویش کا سبب بن سکتا تھا۔ وہ مجھے بھی کوئی مجرمہ تصور کر سکتی تھی اس سلسلے میں پولیس کو وہاں موجود افراد کے بیانات سے بھی مجھ پر یہ شبہ ہو سکتا تھا۔ لوگوں نے اپنے بیانات میں یقیناً یہ بھی بتایا ہو گا کہ میرے پاس ایک سوٹ کیس بھی تھا اور یہ کہ میں غیر ملکی تھی غالباً انہی بیانات کی روشنی میں پولیس اس علاقے کے ہوٹلوں میں چھان بین کر رہی تھی۔

ہرچند کہ میک اپ کے بعد میری شخصیت قطعی طور پر تبدیل ہو گئی تھی اس کے باوجود میں نے اس سوٹ کیس پر فاتحہ پڑھ لینا ضروری سمجھا۔ میرے پرس میں ابھی خاصی رقم تھی اور سامان دوبارہ بھی خریدا جا سکتا تھا۔ میں نے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا اور تمام سامان سمیت وہ سوٹ کیس اسی کمرے میں چھوڑ کر باہر آ گئی۔ راہداری خالی نہیں تھی اور لوگ ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے مگر کسی نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ یوں بھی لوگ ادھیڑ عمر خواتین پر دوسری نظر ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ میرے ہاتھ میں اب صرف ایک پرس تھا نیا پرس! جولین کا پرس بھی میں نے وہیں ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ دیا تھا۔ ہاں اس میں سے ساری رقم نئے پرس میں ضرور منتقل کر لی تھی اور اسی کے ساتھ جولین کا چھوٹا سا خوب صورت ریوالور بھی جو بھرا ہوا تھا وہ ریوالور کسی بھی وقت میرے کام آ سکتا تھا۔

اب میں دوسری منزل سے لفٹ کے ذریعے نیچے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ میری ہی طرح چند اور افراد بھی لفٹ کے منتظر تھے۔ برابر برابر دو لفٹوں کے دروازے تھے۔ دروازوں کے اوپر چمکتے ہوئے روشن ہندسوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ ایک لفٹ گراؤنڈ فلور سے اوپر آ رہی تھی اور دوسری لفٹ اوپری منزلوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ میں نیچے جانے والی لفٹ کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اسی اثنا میں نیچے سے آنے والی لفٹ آ کر رکی۔ لفٹ سے باہر نکلنے والے دو پولیس والوں اور ان کے ساتھ کاؤنٹر کلرک کو دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ پولیس والے لفٹ سے نکل کر کاؤنٹر کلرک کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ لوگ انہیں دیکھ کر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ میری نگاہیں پولیس والوں ہی کے تعاقب میں تھیں۔ وہ راہداری میں اسی کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں سے کچھ ہی دیر قبل میں نکلی تھی۔

پولیس کا اتنی جلدی گویا ''میرا سراغ'' لگا لینا میرے نزدیک کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ محدود

وقت کے اندر اندر کسی مخصوص حلیے کی عورت کا کسی ہوٹل میں قیام باآسانی اس کی نشان دہی کر سکتا تھا کہ مطلوبہ عورت نے کہاں پناہ لی ہے!

میں پولیس کی دسترس میں آنے سے بال بال بچ گئی تھی ورنہ میرے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ قاہرہ کی انٹیلی جنس بھی میری تلاش میں ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر رچرڈ نے کیا چکر چلایا تھا کہ انٹیلی جنس والے میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ قاہرہ ایئرپورٹ سے مجھے انٹیلی جنس والوں ہی نے گرفتار کیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ گرفتاری بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ پوچھ گچھ کے لئے مجھے پولیس ہیڈکوارٹر لایا جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکٹر رچرڈ نے گویا اپنا "شکار" انٹیلی جنس والوں سے چھین لیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈگلس کے معاملے میں بھی اسکندریہ سے میرا فرار غیر قانونی ہی تھا۔ پولیس نے مجھے اور ذکیہ کو ہدایت دی تھی کہ ہم اس وقت تک پولیس کو مطلع کئے بغیر اسکندریہ سے کہیں نہ جائیں جب تک کیس عدالت میں پیش نہ کر دیا جائے۔ اسکندریہ کی پولیس بھی اس سلسلے میں قاہرہ پولیس سے رابطہ قائم کر سکتی تھی۔ یہ بعید نہیں تھا کہ اسکندریہ کی پولیس نے قاہرہ پولیس کو میرا اور ذکیہ کا حلیہ فراہم کر دیا ہو۔ ان حالات میں قاہرہ کی پولیس اور انٹیلی جنس سے میرا دور ہی دور رہنا انتہائی ضروری تھا۔ اس وقت پولیس والوں کو لفٹ سے باہر آتے دیکھ کر اسی لئے ایک دم میرے دل میں دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

پولیس والے ابھی میرے کمرے کے دروازے تک پہنچے تھے کہ اوپر آنے والی لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔ لفٹ خاصی بھری ہوئی تھی مگر اس فلور پر کئی افراد اتر گئے۔ میں لیونلہ سب سے آگے کھڑی تھی اس لئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر لفٹ میں سوار ہو گئی۔ میرے پیچھے دو افراد لفٹ میں مزید سوار ہوئے اور پھر لفٹ مین نے دروازہ بند کر دیا۔

گراؤنڈ فلور پر پہنچتے ہی میں نے ہوٹل کے بیرونی دروازے کا رخ کیا پھر ہوٹل سے نکلتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اعصاب سے ایک بوجھ ہٹ گیا ہو' میں اب اپنی شخصیت کی تبدیلی اور اس ہوٹل سے نکل آنے کے بعد نہ صرف قاہرہ کی پولیس اور انٹیلی جنس سے محفوظ ہو گئی تھی بلکہ اب مجھے ڈاکٹر رچرڈ کے گرگوں کا خوف بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں اب اس علاقے میں مزید وقت گزارنا نہیں چاہتی تھی۔

مخالف سمت ہلٹن ہوٹل کے سامنے مجھے کئی خالی ٹیکسیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ سڑک عبور کر کے میں ایک خالی ٹیکسی تک پہنچ گئی۔

"رم سیس اسکوائر۔" میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا کر کرایا بتایا اور میں ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

رم سیس اسکوائر کا قصد میں نے بے سبب نہیں کیا تھا۔ قاہرہ سے فرار ہونے کے لئے میں نے ذہن میں جو لائحہ عمل ترتیب دیا تھا اس کا دارومدار ایک ایسے شخص پر تھا جو اسی علاقے میں رہتا تھا۔ قاہرہ سے پہلی بار فرار میں بھی وہی شخص میرے لئے اہم ثابت ہوا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر تھا جب پہلے تجربے کے بعد میں ڈاکٹر رچرڈ کی قید سے فرار ہوئی تھی۔

میں سفر کے دوران میں اسی شخص کے بارے میں سوچتی رہی جو جعلی کاغذات اور جعلی پاسپورٹ

فراہم کرتا تھا۔ وہ عیسائی تھا اور اس کا نام جیمس تھا رم سیس چوک کی ایک بلڈنگ میں تیسری منزل پر اس کا فلیٹ تھا۔ تمام تفصیلات اب تک میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔

رم سیس اسکوائر پہنچ کر قاہرہ ریلوے اسٹیشن سے کچھ آگے میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ وہاں ٹیکسی چھوڑ دینے کا سبب ایک فوٹو شاپ تھی' میں نے وہاں اپنے موجود میک اپ میں پاسپورٹ سائز تصویر کھنچوائی اور پھر فوٹوگرافر سے پوچھا کہ جلد از جلد کب تک اس تصویر کی کاپیاں مل سکتی ہیں؟

"اگر بہت جلدی ہے تو آپ کل صبح دس بجے تک اس کے پرنٹ لے سکتی ہیں مگر ارجنٹ......"

"میں سمجھتی ہوں' تم رسید کاٹو!" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

پھر وہ رسید کاٹنے لگا۔ میں نے رسید پر لکھی ہوئی رقم دیکھتے ہوئے پرس کھول کر دس گنی کا ایک نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے رسید مجھے تھما کر بقیہ رقم میرے حوالے کر دی اور خوش اخلاقی سے بولا "تھینک یو!"

رسید اپنے پرس میں رکھ کر میں اس کی دکان سے باہر آ گئی۔ اس وقت مجھے اپنے ذہن میں مخصوص قسم کی سنسناہٹ محسوس ہوئی اور میں چوکنا ہو گئی۔ موشوروف کو میرے ذہن سے رابطہ قائم کئے خاصا وقت گزر چکا تھا۔ اس دوران میں یقیناً وہ معلوم کر چکا تھا کہ میں نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ دوبارہ میرے ذہن سے رابطہ قائم کرنے والا ظاہر ہے کہ وہی ہو سکتا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اس بار بھی میں اسے دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتی اس لئے مجھے دوسری راہ اختیار کرنا پڑی' میں نے اپنے ذہن سے ہر خیال کو جھٹک دیا۔ یہ ترکیب آزمودہ تھی' اس طرح وہ میرے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کے باوجود بھی کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ ذہنی رابطہ ہی قائم نہ ہوتا۔

عذرا خان!...... عذرا خان؟ میرے ذہن میں اس کی آواز گونجتی رہی' وہ مجھے پکارتا رہا اور پھر اس کی آواز معدوم ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی۔

میں اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ وہ صرف اتنا ہی معلوم کرنے میں کامیاب رہا تھا کہ ابھی میں قاہرہ ہی میں ہوں اور میرے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ موشوروف ایک بار ناکامی کے بعد خاموش ہو کر نہیں بیٹھے گا اور پھر یہی ہوا جب تک میں رم سیس چوک پہنچی اس نے دو مرتبہ اور یہی کوشش کی مگر میں پہلے ہی سے چوکنا اور ہوشیار تھی اس لئے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ موشوروف اور اس کے ساتھی مجھے سارے شہر میں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے وہ شخص بھلا چین سے کیسے بیٹھ جاتا جو میری تلاش میں پہلے پاکستان پہنچا تھا اور پھر میرے پیچھے پیچھے ہی مصر آ گیا تھا! یقیناً وہ اپنی اس کھلی شکست پر سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو گا۔

موشوروف ہی کے بارے میں سوچتی ہوئی میں رم سیس چوک کی اس بلڈنگ کے گیٹ میں داخل ہو گئی جس کی تیسری منزل پر جیمس کا فلیٹ تھا۔ لفٹ کے ذریعے میں تیسری منزل پر پہنچی اور پھر مطلوبہ فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ ذرا توقف کے بعد میں نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

کچھ دیر بعد جس شخص نے دروازہ کھولا وہ جیمس ہی تھا' میں اسے پہچان گئی۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" وہ روکھے سے لہجے میں بولا۔

"آپ ہی سے!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"مجھ سے......؟ مگر میں...... میں تو آپ کو نہیں جانتا!" وہ حیرت زدہ اور کچھ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔ ہم دونوں کے درمیان رابطے کی زبان ظاہر ہے انگریزی ہی تھی۔

"مسٹر جیمس؟ شاید آپ بھول چکے ہیں کہ اس سے پہلے بھی ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔" میں نے یوں ہی اندھیرے میں تیر چلا دیا۔

"کب......؟ کہاں.."

"یہ اب سے تقریباً پانچ سال پہلے کی بات ہے جب آپ مسٹر حسان کے پارٹنر تھے۔" یہ حوالہ میں نے جان بوجھ کر دیا تھا۔ پچھلی بار حسان ہی کے ذریعے میں اس تک پہنچی تھی۔ حسان ہی سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ ایک زمانے میں وہ اور جیمس پارٹنر تھے۔

"اچھا...... اچھا...... ہاں شاید...... شاید مل چکا ہوں میں آپ سے!" وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔

حسان کا حوالہ کارگر ثابت ہوا اور جیمس نے مجھے اندر بلانے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ میں کسی جھجک کے بغیر اندر داخل ہوگئی اور وہ مجھے اپنے ساتھ نشست گاہ میں لے آیا۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ جیمس ایسے لوگ بہت محتاط ہوتے ہیں اور جلدی نہیں کھلتے جب تک درمیان میں کوئی معتبر حوالہ نہ ہو۔

"مجھے مسز گرانٹ کہتے ہیں۔" میں ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "شاید آپ کے ذہن سے میرا نام بھی محو ہو......"

"سوری!" وہ بول اٹھا "مجھے واقعی آپ [illegible]ام یاد نہیں رہا تھا' خیر بتائیں کہ آپ نے کیسے زحمت کی؟"

"مجھے پاسپورٹ چاہئے۔" کسی بھی ملک کا انٹرنیشنل پاسپورٹ اور اس سے متعلق ضروری شناختی کاغذات!" میں نے اپنا مدعا بیان کرنے میں دیر نہیں کی۔

جواباً جیمس آہستہ سے ہنسا پھر بولا۔ "سوری مسز گرانٹ! اس سلسلے میں اب آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ اب تو ایک مدت ہوگئی میں نے یہ سب دھندے چھوڑ دیئے اور باعزت زندگی گزار رہا ہوں۔ دراصل حسان ہی نے مجھے اس غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ اس سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد ہی میں نے یہ ناجائز اور خطرناک پیشہ ترک کر دیا تھا اس بات کو بھی برسوں بیت گئے۔"

میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا جس پر جھوٹ لکھا تھا یا تو اس نے ابھی حسان کے حوالے کے باوجود مجھ پر اعتماد نہیں کیا تھا یا پھر وہ ایسی باتیں کر کے اپنا بھاؤ بڑھانا چاہتا تھا۔ پہلی بار جب میں نے اس سے جعلی پاسپورٹ کا سودا کیا تھا اس واقعے کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا۔

"مسٹر جیمس! یا تو تم مجھ سے بے سبب خوف کھا رہے ہو کہ کہیں میرا تعلق یہاں کی پولیس سے نہ ہو یا پھر کوئی اور بات ہے!" یہ کہتے ہوئے میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تم جھوٹ بول کر مجھے نہیں ٹال سکتے! میرے علم و اطلاع کے مطابق تم اب بھی وہی باعزت پیشہ اپنائے ہوئے ہو جس کی تردید کر رہے ہو!" میں نے "باعزت" پر زور دیتے ہوئے کہا پھر مزید بولی۔ "تمہیں شاید یہ

اندازہ بھی ہوگا کہ جو لوگ جعلی پاسپورٹ حاصل کرتے ہیں ان کا تعلق بھی تمہاری ہی طرح کی کسی نہ کسی باعزت پیشے سے ہوتا ہے! تم چاہو تو میرے ان الفاظ کو دھمکی بھی تصور کر سکتے ہو!"

میرے آخری الفاظ سن کر وہ چونک اٹھا اور خجل خجل سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے مسز گرانٹ میں...... میں آپ کے لئے کسی بھی طرح ایک پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات کا بندوبست کر دوں گا حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اب واقعی میں......"

"جھوٹ نہیں جیمس!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم اس طرح نہ صرف میرا بلکہ اپنا وقت بھی ضائع کر رہے ہو!"

"جب میں نے آپ سے کہہ دیا کہ بندوبست ہو جائے گا پھر آپ کیوں مجھے شرمندہ کئے جا رہی ہیں۔" اس نے گویا ہتھیار ڈال ہی دیئے۔ "دراصل اب میں براہ راست یہ کام نہیں کرتا اس میں خطرہ ہی خطرہ ہے اسی لئے......"

"تم رقم بتاؤ!" میں بول اٹھی۔ "نصف رقم میں تمہیں اسی وقت ادا کر دوں گی اور بقیہ نصف کل صبح ساڑھے دس بجے اس وقت جب میں تم سے پاسپورٹ اور کاغذات لینے آؤں گی۔"

"کیوں اسی وقت کیوں نہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"اس وقت جلدی میں میں اپنی پاسپورٹ سائز تصویریں لانا بھول گئی ہوں۔"

میری بات سن کر اس نے طویل سانس لیا پھر بولا "تو آپ کو بھی معلوم ہے مسز گرانٹ!"

"ہاں" میں نے ہنس کر کہا "اور میں تمہاری فنکاری کی معترف ہوں تمہیں ابھی شاید میں نے بتایا تو تھا کہ اب سے پانچ سال قبل بھی مجھے ایسی ہی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس وقت تم اور حسان ایک ساتھ تھے۔ تمہاری مزید تسلی کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ اب تمہارا پارٹنر ممیوں کا کاروبار کرتا ہے! اب تمہیں یقین آیا میری بات پر؟"

"مسز گرانٹ! آپ واقعی بہت باخبر اور ہوشیار عورت ہیں' مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی۔" وہ بولا۔

"اچھا تو پھر اسی اعتراف کے طور پر تم اپنا محنتانہ کچھ کم کر کے بتا دو!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بس آپ خود ہی سمجھ لیں کہ پانچ سال پہلے کے اور اب کے ریٹ میں خاصا فرق آ چکا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس وقت ہم لوگ غالباً پانچ سو یا چھ سو گنی لیا کرتے......"

"غلط!" میں نے اسے ٹوک دیا "میری اطلاع کے مطابق یہ تم اس وقت کا ریٹ بتا رہے ہو!"

جیمس سے کچھ دیر بارگیننگ کے بعد چھ سو گنی پر معاملہ طے ہوگیا۔ میں نے تین سو گنی اسے پیشگی دے دیئے تو وہ اٹھ کر اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات کا انتخاب وہ اسی وقت کر لینا چاہتا تھا۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا بریف کیس تھا جو میں پہلے بھی اس کے پاس دیکھ چکی تھی۔

کچھ دیر تلاش و جستجو کے بعد اس نے ایک پاسپورٹ اس بریف کیس میں سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا اور بولا۔ ''آپ کی عمر کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پاسپورٹ پر جو کوائف درج ہیں میرے خیال میں مناسب ہیں۔''

میں نے وہ پاسپورٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور پھر اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ وہ برطانوی پاسپورٹ تھا اور ابھی اس کی معیاد بھی نہیں نکلی تھی۔ وہ پاسپورٹ کسی بیوہ سارہ نکلسن کے نام جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اس پاسپورٹ کے علاوہ اس عورت سے متعلق دیگر شناختی کاغذات کا مطالعہ بھی بغور کیا۔ پاسپورٹ اور ان کاغذات پر اندراجات کے مطابق وہ عورت ایک ماہ قبل ہی قاہرہ آئی تھی۔ اس کے پاسپورٹ پر عراق کا ویزا بھی لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ قاہرہ سے عراق جانے کا قصد رکھتی تھی اور اسی دوران میں گویا اس کا پاسپورٹ اور کاغذات غائب کر دیئے گئے تھے۔

سارہ نکلسن ابھی قاہرہ ہی میں مقیم تھی یا اپنی ایمبیسی کے ذریعے دوسرا پاسپورٹ بنوا کر عراق یا کہیں اور جا چکی تھی۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جیمس کا ''ماہرانہ'' مشورہ مجھے مناسب ہی معلوم ہوا اور میں نے اسی پاسپورٹ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس پاسپورٹ پر پاکستانی سفارت خانے سے بھی ویزا حاصل کیا جا سکتا تھا مگر اب میرا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

''اچھا جیمس اب کل صبح ٹھیک ساڑھے دس بجے تم سے ملاقات ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر خود بھی کھڑا ہو گیا۔

جیمس سے رخصت ہو کر جب میں رمسیس چوک میں آئی تو شام ہو رہی تھی۔ خطرات کے باوجود ابھی مجھے قاہرہ میں کچھ وقت اور گزارنا تھا۔ جب تک پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات مجھے نہ مل جاتے۔ یہاں سے میرا نکلنا امر محال تھا مگر اب تقریباً تمام ہی مراحل طے ہو چکے تھے۔ میں ذہنی طور پر بڑی حد تک مطمئن تھی۔

مجھے اس بات کا بھی بخوبی احساس تھا کہ تھوڑے بہت سامان کے بغیر کسی بھی ہوٹل میں میرا قیام کرنا مشتبہ صورت حال پیدا کر سکتا ہے۔ میں نے جو ضروری سامان تحریر اسکوائر سے خریدا تھا وہ قلو پطرہ ہوٹل ہی میں چھوڑنا پڑا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے رمسیس چوک سے دوبارہ شاپنگ کی پھر جب میں خریداری سے فارغ ہوئی تو ایک ایئر بیگ میرے شانے سے لٹکا ہوا تھا اور ایک چھوٹا سا سوٹ کیس میرے بائیں ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھ کر اب یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ میں کوئی غیر ملکی ٹورسٹ ہوں۔

رمسیس چوک سے میں نے شارع شریف کے لئے ٹیکسی لی جو وہاں سے تقریباً دو میل کی مسافت پر تھا۔ میں پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ مجھے اب کہاں اور کس ہوٹل میں قیام کرنا ہے! پولیس اور جرائم پیشہ افراد کی توجہ کا مرکز بھی عموماً بڑے ہوٹل ہی ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ جس طبقے سے میرا تعلق تھا وہ طبقہ بھی آرام و آسائش کی خاطر عموماً بڑے ہوٹلوں ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ اوسط درجے یا تیسرے درجے کے ہوٹلوں کی طرف رخ نہیں کرتا۔ اسی سبب میں نے قاہرہ میں گویا آخری شب گزارنے کے لئے ایک ایسے ہی ہوٹل کا انتخاب کیا تھا جس کی طرف میرے دشمن متوجہ نہ ہو سکیں۔ شارع شریف پر واقع ایک نو منزلہ

بلڈنگ کی ساتویں اور آٹھویں منزل اس ہوٹل والوں کے تصرف میں تھی۔ ہوٹل کے کمرے کا کرایہ صرف پانچ گنی یومیہ تھا۔ رمسیس چوک سے ٹیکسی کے ذریعے میں سیدھی وہیں پہنچی اور مجھے ہوٹل کی آٹھویں منزل پر ایک کمرا حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہ ہوئی۔

قاہرہ میں گرمی بس برائے نام پڑتی ہے۔ عموماً موسم معتدل رہتا ہے اسی لئے اوسط درجے یا تیسرے درجے کے ہوٹلوں میں پنکھے نہیں ہوتے ان دنوں بھی موسم معتدل ہی تھا اسی لئے کمرے میں پنکھا نہ ہونے کے باوجود مجھے کسی کمی کا احساس نہ ہوا۔ ہاں یہاں سردی بہت شدید ہوتی ہے مگر یہ سردیوں کا موسم نہیں تھا۔ مجھے جو کمرا ملا تھا وہ سڑک کے رخ پر تھا اور کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس سے تازہ ہوا کمرے میں آ رہی تھی۔ کمرے میں ایک بیڈ کے علاوہ ایک کرسی اور چھوٹی سی میز بھی ایک جانب پڑی ہوئی تھی۔ میں نے وہ میز اور کرسی اٹھا کر کھڑکی کے قریب رکھ دی۔ اپنا سوٹ کیس اور ایئر بیگ بھی میں نے وہیں دیوار سے لگا کر رکھ دیا تھا۔ نیچے کاؤنٹر پر میں کھانے کا آرڈر بھی دے کر آئی تھی اور اب مجھے اسی کا انتظار تھا۔ میں صبح کا ناشتا کئے ہوئے تھی۔ دوپہر کا کھانا گول ہو گیا تھا۔ مجھے اسی لئے اس وقت خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ویٹر کھانا لے آیا۔ پھر جب کھانا کھا کر میں نے چائے پی لی اور ویٹر خالی برتن لے گیا تو کمرے کا درواہ بند کر کے میں کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ بظاہر میری نگاہیں سڑک سے گزرتے ہوئے ٹریفک پر تھیں مگر میرا ذہن کہیں اور ہی تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ مجھے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران میں مجھے چند دن کے لئے بھی سکون کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ کیا میں اس دنیا کی بھیڑ میں کچھ عرصے کے لئے کہیں گم نہیں ہو سکتی؟ صرف چند روز کے لئے۔ کیا یہ امکان نہیں کہ میں اپنے ہر دم کشیدہ اعصاب کو سکون پہنچا سکوں؟ میرے یہ احساسات و جذبات فطری ہی تھے۔ انسانی فطرت بہر حال تغیر چاہتی ہے۔ پہلی بار مجھے یہ خیال اس وقت آیا تھا جب میں جیمس سے گفتگو کر رہی تھی اور اس نے سارہ نکلسن کا پاسپورٹ میرے حوالے کیا تھا۔ اس پاسپورٹ پر عراق کا ویزا لگا دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ یہاں سے پاکستان جانے کی بجائے کیوں نہ کچھ دن عراق میں گزارے جائیں! اس خیال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میرے دشمن قاہرہ میں میری تلاش میں ناکام ہو کر پاکستان ہی کا رخ کرتے۔ میری ہنگامہ پسند فطرت کے پیش نظر وہ ہرگز یہ نہ سوچتے کہ میں نے کچھ دن کسی اور ملک میں سکون سے گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔

عراق بھی میرے لئے نیا نہیں تھا۔ میں وہاں پہلے بھی ایک بار جا چکی تھی۔ خصوصاً عراق کے شہر بغداد سے تو مجھے ایک جذباتی لگاؤ سا محسوس ہوتا تھا۔ قاہرہ کی طرح بغداد کا بھی ایک وسیع تاریخی پس منظر تھا۔ اس شہر نے بڑے عروج و زوال دیکھے تھے۔ اس کی تاریخی حیثیت ہی میرے جذباتی لگاؤ کا سبب تھی۔ وہاں میرے کئی شناسا بھی تھے۔ ان سے میں رابطہ قائم کرتی یا نہ کرتی یہ بعد کی بات تھی مگر یہ طے تھا کہ وہاں مجھے اس شہر کی طرح بے سکونی کا شکار نہ ہونا پڑتا۔

قاہرہ میں وہ میری آخری شب خلاف توقع کسی ہنگامے کے بغیر گزر گئی۔ موشوروف مجھ سے کئی بار ذہنی رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد غالباً میری طرف سے مایوس ہو چکا تھا یا پھر وہ

کسی اور چکر میں تھا۔ صبح جلد ہی میری آنکھ کھل گئی اور میں ناشتا کرنے کے بعد اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق رم سیس اسکوائر روانہ ہوگئی۔ فوٹو گرافر نے مجھے دس بجے کا وقت دیا تھا مگر میں خاصا پہلے وہاں پہنچ گئی۔ پاسپورٹ سائز تصاویر تیار تھیں۔ میں نے ان پر ایک نظر ڈالی اور انہیں اپنے پرس میں رکھ لیا۔

جیمس سے ملاقات کا وقت ساڑھے دس بجے تھا اس لئے میں اطمینان سے چہل قدمی کرتی ہوئی رم سیس چوک پہنچی۔ میں کیوں کہ گزشتہ رات ہی عراق جانے کا فیصلہ کر چکی تھی اس لئے کرنسی کے تبادلے کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ احتیاط کے پیش نظر میں قاہرہ ایئر پورٹ پر کرنسی کا تبادلہ نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ہر بڑے شہر کی طرح قاہرہ میں بھی کچھ ایسے ٹھکانے ضرور ہوں گے جہاں بڑے پیمانے پر غیر ملکی کرنسی کا لین دین کیا جاتا ہوگا مگر میں ان ٹھکانوں سے واقف نہیں تھی۔ اس مسئلے کا حل میں نے یہی سوچا تھا کہ جیمس سے میں کسی ایسے ٹھکانے کا پتا معلوم کرلوں گی۔ وہ یقیناً واقف ہوگا۔ میری یہ احتیاط پسندی بے وجہ نہیں تھی کم از کم موشوروف کو یہ ضرور معلوم تھا کہ میرے پاس صرف مصری کرنسی ہے۔ موشوروف ایسا ذہین اور چالاک شخص اس بات کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا کہ قاہرہ سے فرار ہونے کے لئے مجھے بہر حال کرنسی کا تبادلہ کرانا پڑے گا۔

کبھی تو وقت یوں دبے پاؤں گزر جاتا ہے کہ اس کی آہٹ تک محسوس نہیں ہوتی اور کبھی گزارے نہیں گزرتا۔ اس کا انحصار یقیناً آدمی کی اپنی اندرونی کیفیت اور احساس پر ہوتا ہے ورنہ وقت کی رفتار سدا ایک ہی سی رہتی ہے۔ مجھے کیوں کہ عجلت تھی اس لئے وقت رینگتا محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی صرف دس بج کر چند منٹ ہوئے تھے۔ وقت گزاری کے لئے میں نے رم سیس چوک ہی کے ایک کیفے کا رخ کیا۔

کیفے میں داخل ہوکر میں ایک الگ تھلگ پرسکون سے گوشے میں بیٹھ گئی۔ یوں بھی اس وقت وہاں زیادہ تر میزیں خالی ہی تھیں۔ ویٹر بھی مصروف نہیں تھے اس لئے جلد ہی میرا آرڈر سرو کر دیا گیا۔ میں نے صرف کافی کا آرڈر دیا تھا حالانکہ اس کی بھی کوئی خاص خواہش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں اپنے ہوٹل سے ناشتا کر کے ہی چلی تھی۔ میرا مقصد کیوں کہ محض وقت گزاری تھا اس لئے کافی کا صرف ایک گھونٹ لے کر میں اپنے آئندہ لائحہ عمل پر غور کرنے لگی۔

چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ اچانک خاصے عرصے بعد میرے ذہن پر ایک آشنا لذت انگیز سی کیفیت طاری ہونے لگی اور اسی کے زیر اثر میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ میرے ذہن کی یہ وہی پراسرار کیفیت تھی جب مجھ پر ماضی یا مستقبل کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات ہوتے تھے یا پھر میرا غیر معمولی ذہن کسی مرحلے پر میری رہنمائی کرتا تھا۔ کیف و سرشاری اور خواب و بیداری کے درمیان مجھے خود اپنی ہی آواز اپنے ذہن میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں واضح الفاظ میں خود اپنی ہی آواز سن رہی تھی۔ عذرا خان! تمہارا فیصلہ غلط ہے! تمہیں عراق کی بجائے پاکستان جانا چاہیے۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ تم جذبات سے قطع نظر خود بھی موجودہ حالات کا از سرنو جائزہ لوگی تو اسی نتیجے پر پہنچوگی۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی آواز معدوم ہوگئی۔ پھر رفتہ رفتہ میری حالت معمول پر آ گئی اور میں یوں چونک اٹھی جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے میری آنکھ کھل گئی ہو۔

اس پراسرار ذہنی کیفیت نے میرے ذہن کو کچھ دیر کے لئے الجھا دیا۔ یقیناً کچھ باتیں ایسی تھیں جنہیں میں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اب حالات کا دوبارہ جائزہ لینا ضروری ہو گیا تھا۔ چند لمحات کے لئے میں نے اپنے ذہن کو قطعی خالی چھوڑ دیا تا کہ پرسکون ہوسکوں۔ چند لمحوں کا یہ ذہنی سکون سود مند ثابت ہوا اور پھر گویا میں عقل کی روشنی میں حالات کا تجزیہ کرنے کے قابل ہوئی۔ میرے ذہن میں پے در پے سوالات پیدا ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنے آئندہ اقدامات کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا ان کے متعلق سوچنے لگی۔

قاہرہ سے میں بہ حیثیت عذرا خان نہیں بلکہ ایک اور ہی شخصیت اپنا کر عراق جا رہی تھی۔ ایسی صورت میں وہاں میرا کسی آشنا شخص سے ملنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ بالفاظ دیگر میں گویا قید تنہائی کو سکون و اطمینان کا نام دے رہی تھی۔ کیا میں وہاں اپنے وطن اور اپنے لوگوں سے بچھڑ کر خوش رہ سکتی تھی؟ میری چھوٹی بہن ذکیہ نے مجھے جن حالات میں قاہرہ ایئر پورٹ پر چھوڑا تھا کیا وہ حالات ایسے تھے کہ اسے میری طرف سے کوئی تشویش نہ ہوتی؟ کیا میں ایک اجنبی ملک میں غیر قانونی طور پر داخل ہوکر اور ایک فرضی شخصیت اپنائے ہوئے اطمینان قلب حاصل کر سکتی تھی؟ حالات سے فرار کی اس خواہش کو کیا مثبت طرز فکر کہا جا سکتا ہے؟ ان سوالات کے ساتھ ہی مجھے اور بہت سی باتیں یاد آتی چلی گئیں۔ جس وقت حالات سے مجبور ہوکر میں پاکستان سے قاہرہ روانہ ہوئی تھی وہاں غیر ملکی ایجنٹ سرگرم عمل تھے۔ ڈاکٹر رچرڈ کے نائب سولومن کے ایک خطرناک سازشی منصوبے کو میں نے ناکام بنا دیا تھا مگر سولومن اور اس کے کچھ ساتھی مجھ سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ میری غیر موجودگی میں ان لوگوں نے کیا فتنہ انگیزی کی ہوگی میں اس سے لاعلم تھی۔

میں کافی دیر تک غور وفکر میں ڈوبی رہی اور بالآخر اسی نتیجے پر پہنچی کہ واقعی میرا فیصلہ غلط ہی تھا۔ میرے ذہن نے بروقت میری صحیح رہنمائی کی تھی۔ مجھے عراق نہیں پاکستان ہی جانا چاہئے۔

حالات کا از سرنو تجزیہ کرتے ہوئے مجھے وقت گزرنے کا احساس نہیں رہا تھا۔ میں چونکی اس وقت جب ویٹر کو اپنی میز کی طرف آتے دیکھا وہ غالباً یہی سمجھا ہوگا کہ اب تک میں کافی پی چکی ہوں گی حالانکہ میں نے صرف اس کا ایک ہی گھونٹ لیا تھا۔ کافی یونہی رکھے رکھے ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ کافی کے مگ پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے ویٹر کو کچھ جھجکتے محسوس کیا۔

''لے جاؤ!'' میں نے کافی کے مگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور جلدی سے بل لے آؤ!''

''یس۔'' وہ شائستگی سے بولا اور خالی ٹرے میں کافی کا بھرا مگ رکھ کر لے گیا۔ پھر جلد ہی وہ بل لے کر آ گیا اور میں بل کی ادائیگی کے ساتھ ہی اسے ٹپ دے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے اس کیفے میں بیٹھے ہوئے تقریباً آدھے پون گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا۔

کیفے سے نکل کر میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس بلڈنگ کی طرف چل دی جس میں جیمس کی سکونت تھی۔ اس سے ملنے میں یقیناً کچھ تاخیر ہوگئی تھی لیکن یہ تاخیر میرے ہی حق میں بہتر ثابت ہوئی تھی۔ اس کے فلیٹ تک پہنچتے ہوئے میں یہ سوچ چکی تھی کہ نئی صورت حال کے پیش نظر مجھے اب اس سے کیا گفتگو کرنا ہے!

آج بھی فلیٹ کا دروازہ خود اسی نے کھولا تھا۔ شاید وہ اسی فلیٹ میں اب تنہا ہی رہتا تھا۔

''خوش آمدید مسز گرانٹ!'' اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔ ''میں آپ ہی کا منتظر تھا' آیئے تشریف لایئے!''

''سوری جیمس۔'' میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کچھ دیر ہو گئی حالانکہ میں نے تم سے ٹھیک ساڑھے دس بجے پہنچنے کے لئے کہا تھا۔''

''نیور مائنڈ!'' یہ کہتے ہوئے اس نے مڑ کر فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لئے اسی کمرے میں آ گیا جہاں گزشتہ روز اس سے میری گفتگو ہوئی تھی۔ ''بیٹھیے......! آپ غالباً تصویریں لے آئی ہوں گی؟'' اس نے مجھے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں'' میں نے جواب دیا پھر طویل سانس لیتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''تصویریں تو میں لے آئی ہوں مگر شاید اب ان کی ضرورت پیش نہ آئے!''

''کیوں؟'' وہ چونک کر بولا۔ ''کیا آپ کا پروگرام بدل گیا ہے......؟ ایسی صورت میں آپ نے مجھے جو پیشگی رقم دی تھی وہ......''

''اس کی پروا نہ کرو!'' میں درمیان میں بول اٹھی۔ ''میں اتنی ہی رقم تمہیں اور بھی دے سکتی ہوں' رقم کا کوئی مسئلہ نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے! میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''سمجھ جاؤ گے کوئی ایسی خاص بات نہیں۔'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم اس فلیٹ میں اکیلے ہی رہتے ہو......؟ میری مراد یہ کہ کوئی ملازم وغیرہ تو نہیں؟'' میں نے اس کے چہرے پر فکر وتشویش کے آثار دیکھ کر رکے بغیر مزید کہا۔ ''گھبرانے یا تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ دراصل میں تم سے ایک معاملے میں کچھ تعاون چاہتی ہوں۔''

''سوری مسز گرانٹ! میں اپنی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرتا'' وہ سپاٹ سے لہجے میں بولا۔ نہ معلوم اس کے ذہن مس کیا بات آئی تھی! ''صرف پاسپورٹ کی حد تک......''

''تم شاید کچھ غلط سمجھ رہے ہو جیمس! مسئلہ پاسپورٹ ہی کا ہے' کچھ اور نہیں۔ پہلے میری پوری بات سن لو اس کے بعد تم اپنی مرضی کے مختار ہو گے کہ میرے ساتھ تعاون کرو یا صاف انکار کرو!''

''ٹھیک ہے آپ بتائیں کیا چاہتی ہیں؟'' وہ نیم راضی سا ہو کر بولا۔

''میں دراصل پکا کام چاہتی ہوں۔''

''یعنی؟'' اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''یعنی یہ کہ پاسپورٹ پر تصویر نہ بدلی جائے بلکہ میں پاسپورٹ پر چسپاں تصویر کے مطابق اپنے چہرے پر وہی میک اپ کر لوں۔''

''آپ اگر یہی چاہتی ہیں تو ظاہر ہے مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے......! اس میں بھلا تعاون کرنے کی کیا بات ہے!'' اس کے لہجے کی شگفتگی لوٹ آئی۔

''تم سے محض میں اتنا تعاون چاہتی تھی کہ یہیں تمہارے فلیٹ میں میک اپ کر سکوں۔ میں

نے اسی سبب تم سے یہ سوال بھی کیا تھا کہ اکیلے رہتے ہو یا یہاں تمہارا کوئی ملازم بھی رہتا ہے......؟ میرے اس سوال سے غالباً تم کچھ اور ہی سوچنے لگے!'' اس وقت میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

چند لمحے وہ کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں پڑ گیا ہے۔ بالآخر اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''میری صاف گوئی کو معاف کیجئے گا مسز گرانٹ' اگر یہ کوئی لمبا چکر ہے تو میں اس میں پڑنا نہیں چاہتا ...... اگر آپ کہیں گی تو میں ...... میں آپ کی پیشگی رقم بھی لوٹا سکتا ہوں۔''

میری ریڈنگ کے مطابق وہ ایک جرائم پیشہ اور لالچی آدمی تھا۔ گزشتہ روز میں نے اسے جو دھمکی دی تھی شاید اس کے ذہن پر اب تک اسی کا اثر باقی تھا۔ میں نے اسے راہ راست پر لانے کے لئے باتوں باتوں میں یہ باور کرا دیا تھا کہ میرا تعلق بھی جرائم پیشہ طبقے سے ہے۔ یقیناً اسی لئے وہ مجھ سے کسی بھی طرح کا تعاون کرتے ہوئے خوف کھا رہا تھا۔ ورنہ پیشگی رقم لوٹانے کی بات ہرگز نہ کرتا۔ معاملہ خواہ مخواہ کچھ الجھ سا گیا تھا۔ میرا مقصد محض یہ تھا کہ ایک لمبے چکر سے بچ جاؤں اور جیمس اسی کو کوئی ''لمبا چکر'' سمجھ رہا تھا۔ ایک بار پھر کوئی نئی شخصیت اپنانے کی صورت میں مجھے ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل کا رخ کرنا پڑتا۔ اس میں وقت بھی برباد ہوتا اور خطرات بھی مول لینا پڑتے۔ بہرحال میں نے یوں بات بنتے نہ دیکھ کر بامجبوری دوسرا رخ اختیار کیا اور جیمس سے کہا۔ ''تم اگر اسے کسی سبب کوئی لمبا چکر سمجھ رہے ہو تو میں تمہیں اس پر مجبور نہیں کروں گی۔'' میرے لہجے میں بے اعتنائی تھی۔ پھر میں نے پرس کھول کر تین سوگنی کے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ ''یہ لو بقیہ رقم......! مگر مجھے وہ پاسپورٹ نہیں چاہئے جو تم نے کل میرے لئے منتخب کیا تھا۔''

''پھر؟'' وہ یہ کہتے ہوئے تھوڑا سا آگے جھکا اور نوٹ میرے ہاتھ سے لے لئے۔ اپنی لالچی فطرت کے عین مطابق اس نے میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

''مجھے کسی بھی ملک کا کوئی ایسا پاسپورٹ درکار ہے جس پر پاکستان کا ویزا حاصل کیا جا چکا ہو۔ اس کے لئے میں تمہیں مزید تین سوگنی دے سکتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں روکھا پن تھا۔ میں اس طرح اسے یہ احساس دلانا چاہتی تھی کہ اس نے میرے ساتھ تعاون نہ کر کے گویا اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ پھر ذرا توقف سے میں نے مزید کہا۔ ''تم مجھے محض پاسپورٹ اور اس سے متعلق کاغذات دے دو' تمہارا کام ختم! تمہیں اس پاسپورٹ پر اپنی مہارت دکھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی سمجھے!'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میرے لہجے میں طنز بھی تھا۔

''آپ شاید مجھ سے کچھ خفا ہو گئی ہیں مسز گرانٹ ! میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ آپ پر کوئی الزام تراشی...... میں ...... میں اپنے الفاظ واپس......''

''وہ بات ختم ہو چکی ہے جیمس......! میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے اگر ایسا ممکن ہے تو ٹھیک ہے ورنہ......'' میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے یہ تاثر دیا کہ جیسے اٹھنے والی ہوں۔

''کیوں نہیں مسز گرانٹ......! میرے ذخیرے میں یقیناً کوئی نہ کوئی ایسا پاسپورٹ مل جائے

گا۔ کل رات ایک نئی کھیپ آئی ہے جسے میں اب تک نہیں دیکھ پایا۔ آپ بیٹھیں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" مزید تین سو گنی ملنے کے لالچ نے اسے دوبارہ "خوش اخلاق" بنا دیا تھا۔

نو سو گنی کا مطلب بارہ ہزار چھ سو پاکستانی روپے تھے اور یہ رقم ایک پاسپورٹ کے عوض جیمس ایسے لالچی آدمی کے لئے خاصی بڑی رقم تھی۔ وہ مجھے اس کمرے میں تنہا چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ پھر جب وہ کافی دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک پاسپورٹ اور کچھ کاغذات تھے' چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ اپنے اس "کارنامے" پر مجھ سے داد طلب ہو۔

"یہ لیجئے' مسز گرانٹ......! آپ کا کام بن ہی گیا!" وہ چہکا اور پھر میرے قریب آ کر وہ پاسپورٹ اور کاغذات میرے حوالے کر دیئے۔ اب تو آپ مجھ سے ناراض نہیں؟" یہ کہہ کر وہ دوبارہ سامنے والے صوبے پر بیٹھ گیا۔

میں اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر خاموشی کیے ساتھ اس امریکی پاسپورٹ کو کھول کر دیکھنے لگی۔ پھر میں نے کاغذات پر بھی نظر ڈالی۔

"تھینک یو مسٹر جیمس!" میرے لہجے کی بے رخی برقرار رہی جو بے سبب نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے مزید تین سو گنی کے نوٹ گن کر اسے دے دیئے۔

"میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بتائیں!" جیمس نوٹوں کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے خوش اخلاقی سے بولا۔

"خدمت؟ میں استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔ "رہنے دیں مسٹر جیمس اگر میں نے مزید کچھ کہہ دیا تو آپ اسے بھی کوئی لمبا چکر سمجھیں گے۔"

"میں اپنے الفاظ ایک بار پھر واپس لیتا ہوں مسز گرانٹ......! میں تو آپ ہی کی سہولت کے لئے کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ آپ پاکستان جا رہی ہیں تو یقیناً...... کرنسی...... آپ کو وہاں کی کرنسی بھی مطلوب ہوگی۔ میرا ایک دوست یہ کام کرتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔ یہیں نیچے چوک میں اس کی دکان ہے۔ بینک ریٹ اور......"

"اس تعاون کا بھی شکریہ مسٹر جیمس......! آپ میرے لئے زیادہ فکر مند نہ ہوں' پاکستانی کرنسی کا بندوبست بھی کر لوں گی!" لفظ "تعاون" میں نے دانستہ استعمال کیا تھا۔

"اچھا اب میں سمجھ گیا کہ آپ کو بات ناگوار ہوئی ہے!" وہ جان کر انجان بنتے ہوئے بولا۔

مجھے بڑی "آسامی" سمجھ کر وہ غالباً زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اسی لئے اب خود ہی ہر طرح سے تعاون کی پیشکش کر رہا تھا۔ میری اتنی دیر کی محنت رائگاں نہیں گئی تھی۔ میں اس سے جو تعاون چاہتی تھی مجھے حاصل ہو گیا تھا۔

"تم اب خود ہی مجھے مجبور کر رہے ہو تو ٹھیک ہے۔ میں کچھ ضروری انتظامات کے بعد آ جاؤں گی یہاں......! مگر......"

"ہاں ہاں کہیں!"

"مگر یہ کہ تم کب تک میری واپسی کا انتظار کرو گے؟"

"جب تک کہیں آپ......! اندازاً بتا دیں۔" وہ بولا۔ "یوں بھی آج مجھے کوئی خاص کام نہیں۔"

"تمہارے ملاقاتی عموماً کس وقت آتے ہیں؟" میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"کوئی بھی رات کو دس بجے سے پہلے نہیں آتا۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے رات نہیں ہوگی میں اس سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔"

"یعنی شام تک؟"

"ممکن ہے کہ شام سے پہلے ہی آ جاؤں' یہ کہہ کر میں کھڑی ہو گئی۔ پاسپورٹ اور کاغذات میں نے پہلے ہی اپنے پرس میں رکھ لئے تھے۔

"مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ مسز گرانٹ کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا۔" جیمس میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر میں نے جیمس کو "خدا حافظ" کہا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے لئے دروازہ کھول دیا تھا۔

"میں آپ کا انتظار کروں گا مسز گرانٹ!" اس نے بدستور خوش مزاجی اور "کاروباری اخلاق" کا مظاہرہ کیا۔

"مسز گرانٹ نہیں مسز ماریا ولسن!" میں مسکرا کر آہستگی سے بولی۔ اس نے جو پاسپورٹ میرے حوالے کیا تھا اس پر یہی نام لکھا تھا۔

وہ چونکا' پھر مسکرایا اور بولا "بالکل......! آپ...... آپ اب ماریا ولسن ہیں!" اسے بھی یقیناً پاسپورٹ پر لکھا ہوا نام یاد آ گیا تھا۔

پھر میں مزید رکے بغیر اس کے فلیٹ سے باہر نکل آئی۔

نیچے رمسیس چوک میں آ کر میں نے ایک ٹیکسی ہائیر کی اور قاہرہ ایئر پورٹ پر روانہ ہو گئی۔ میں نے اپنے ذہن میں جو پروگرام ترتیب دیا تھا اب اس پر عمل کرنے میں کسی قسم کی تاخیر نہیں چاہتی تھی۔ ایئر پورٹ پہنچ کر ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد میں کسی بھی پہلی فلائٹ کی بکنگ کرا لینا چاہتی تھی۔

جیمس سے حاصل ہونے والا پاسپورٹ ایک امریکی خاتون کا تھا۔ پاسپورٹ پر اندراج کے مطابق اس کی عمر چالیس سال تھی۔ چہرے کی نقوش بس غنیمت ہی تھے مگر ایسے نہیں کہ انہیں پرکشش کہا جا سکے۔ اپنی تصویر سے وہ کوئی ایسی عورت معلوم نہیں ہوتی تھی کہ بطور خاص لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ بات میرے حق میں تھی۔ پاسپورٹ پر ویزا حاصل کرنے کی تاریخ اب سے ڈیڑھ ماہ قبل کی تھی۔ اسی عرصے میں یقیناً اس نے نیا پاسپورٹ بنوا لیا ہوگا اور قاہرہ سے جا چکی ہوگی۔ میں اس یقین کے باوجود پوری طرح محتاط تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے چہرے پر اس کا میک اپ کرنے اور اس کی شخصیت اپنانے سے پہلے میں نے ٹکٹ لینا ضروری سمجھا تھا۔

ایئر پورٹ پہنچنے تک میں انہی تمام باتوں پر غور کرتی رہی۔ کرایہ ادا کر کے ٹیکسی سے اترتے

ہوئے میں پوری طرح چوکنا ہوگئی تھی۔ وہاں دشمنوں سے مڈبھیڑ ہونے کا امکان بھی تھا اور میرے لئے دوسرے خطرات بھی تھے۔ میں اپنے اردگرد سے قطعی غافل نہیں تھی۔ وہاں ملکی اور غیر ملکی سبھی ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ میں نے بھی خود کو گویا ان کی بھیڑ میں گم کر دیا۔

پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے انکوائری سے ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ میں ایک غیر ملکی فضائی کمپنی کی ایک فلائٹ سے آج ہی رات پاکستان کے لئے روانہ ہو سکتی تھی۔ کسی تاخیر کے بغیر میں نے اسی فضائی کمپنی کی فلائٹ کے لئے بکنگ کرالی اور ٹکٹ لے کر دوبارہ ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر آ گئی۔ اب میری منزل شارع شریف پر واقع وہ ہوٹل تھا جہاں میں گزشتہ روز ٹھہری ہوئی تھی۔ وہاں تک میں نے ایک سرکاری ٹیکسی میں سفر کیا۔ یہ ٹیکسیاں لیموزین کہلاتی ہیں اور ان کے کرائے مقرر ہیں۔

اس بار شاید میری قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ اب میں حریفوں کے پھیلائے ہوئے تمام جال توڑ کر اپنے وطن پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔

اپنے ہوٹل پہنچ کر میں نے کاؤنٹر پر دوپہر کے کھانے کا آرڈر دیا اور پھر اوپری منزل پر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ ایئر پورٹ آنے جانے کے سبب کھانے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ مجھے اسی لئے اس بے مزہ کھانے پر اکتفا کرنا پڑا جو ہوٹل والوں نے فراہم کیا تھا۔

کھانے سے فراغت پا کر میں نے کافی پی اور پھر ہوٹل کے واجبات ادا کر دیئے۔ اب مجھے وہاں مزید قیام کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہاں سے اپنا سامان لے کر میں نے ایک بار پھر رمسیس اسکوائر کا رخ کیا۔

جیمس حسب وعدہ مجھے اپنے فلیٹ پر ہی ملا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

''آپ نہ جانے کب آ جائیں یہی سوچ کر میں نیچے چوک تک بھی نہیں گیا۔'' اس نے کہا۔

جواباً میں نے اس کا شکریہ ادا کیا پھر بولی۔

''جیمس! تم اسی کمرے میں یا پھر اپنے فلیٹ کے کسی اور کمرے میں کچھ دیر کو مجھے تنہا چھوڑ دو! تم یقیناً اپنے فن میں مہارت رکھتے ہو مگر آج تم میری فنکاری بھی دیکھ لو گے'' میرا لہجہ بے تکلفانہ تھا۔

''یقیناً...... یقیناً...... آپ کی مراد میک اپ سے ہے نا!''

میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا' پھر کہا۔ ''ویسے تم مجھے یقین دلا چکے ہو کہ تمہارا کوئی ملاقاتی رات دس بجے سے پہلے نہیں آئے گا' پھر بھی اتنا ضرور خیال رکھنا کہ خلاف توقع کوئی آ جائے تو اندر نہ آئے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ تمہارے کسی ملاقاتی کو یہاں میری موجودگی کا اس وقت تک علم نہیں ہونا چاہئے جب تک میں یکسوئی کے ساتھ میک اپ نہ کر سکوں۔''

''اول تو اس کا امکان قطعی نہیں ہے' اس کے باوجود اگر ایسا ہوا تو میں آپ کی ہدایات پر پورا عمل کروں گا۔ آپ قطعی فکر نہ کریں۔'' وہ بالکل فرمانبردار بنا ہوا تھا۔ ''ہاں ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ وہ آپ نے کرنسی کا بندوبست کر لیا؟'' فوراً ہی وہ اپنے مطلب کی بات پر آ گیا۔

''وہ بات بھی ہو جائے گی پہلے تم مجھے میک اپ سے فارغ ہو لینے دو۔'' میں نے جواب دیا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے جلدی سے سر ہلایا پھر بولا۔ ''آپ اطمینان سے میک اپ کریں

میں اندر چلا جاتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو اس کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند کر لیں۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

''ہاں ضرور!'' میں بلا تکلف بولی۔ ''دروازہ تو بند کرنا ہی پڑے گا! جب تک میں خود دروازہ کھول کر تمہیں آواز نہ دوں مجھے ڈسٹرب نہ کرنا! ویسے مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔'' میں اس کی لالچی طبیعت سے پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ وہ مجھے عیسائی کی بجائے فطرتاً یہودی معلوم ہو رہا تھا۔

پھر وہ سعادت مندی سے اقرار میں سر ہلا کر ''ٹل'' ہی گیا اور میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اسے وہاں سے ٹالنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ میرا اصل چہرہ نہ دیکھ سکے جو میک اپ کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اپنے چہرے پر ماریا ولسن کا میک اپ کرنے کے لئے مجھے بہرحال پہلا میک اپ ختم کرنا پڑتا۔ میک اپ کا جدید ترین ساز و سامان میرے سوٹ کیس میں موجود تھا۔ اس میں وِگیں بھی تھیں' کانٹریکٹ لینس بھی اور مختلف ماسک بھی! ان اشیاء کے علاوہ میں نے مختلف قسم کے لوشن اور بہت کچھ بازار سے خریدا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر مجھے کسی شے کی کمی محسوس نہ ہو۔

میک اپ کرنے سے پہلے میں نے کمرے کی کھڑکیاں بھی چیک کر لیں جو بند تھیں پھر جب میں پوری طرح مطمئن ہو گئی تو اپنے چہرے سے ''مسز گرانٹ'' کا میک اپ ختم کر دیا اور مسز ماریا ولسن کی شخصیت اپنانے کیلئے نیا میک اپ کرنے لگی۔ ماریا کی پاسپورٹ پر چسپاں تصویر میرے سامنے کھلی رکھی تھی۔ میک اپ کرنے میں میں نے خاص توجہ اور اپنی ممکنہ صلاحیت و مہارت صرف کی۔ میں کسی معمولی سی ڈیٹیل کو بھی نظر انداز نہیں کر رہی تھی۔

بطور شناخت پاسپورٹ میں اس کی پتلیوں کا رنگ نیلا لکھا گیا تھا۔ اس کے لئے میں نے کانٹریکٹ لینس کا سہارا لیا تھا۔ میں نے اپنے چہرے کو گویا ''نقل مطابق اصل'' بنانے میں تقریباً ایک گھنٹا صرف کیا اس عرصے میں وعدے کے مطابق جیمس نے مجھے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔ پھر میں نے میک اپ کا تمام سامان سمیٹ کر دوبارہ اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا رخ اب دروازے کی طرف تھا۔ اب تک سب کچھ میری ہی مرضی و منشا کے مطابق ہو رہا تھا اسی لئے میرا موڈ خوشگوار تھا...... میں دانستہ جیمس کی حیرت سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنی آواز بدل کر بولی تھی۔

ذرا دیر بعد ہی جیمس کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت میں صوفے پر آ کے بیٹھ چکی تھی۔ میری توقع کے مطابق وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''مسٹر جیمس مجھے مسز ماریا ولسن کہتے ہیں۔'' میں نے بدلی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا اور مسکرانے لگی۔

''ونڈرفل!'' بالآخر وہ بول اٹھا۔ ''آپ تو آواز بدل کر بھی بول سکتی ہیں! اگر میں خود آپ کو اس کمرے میں چھوڑ کر نہ گیا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا کہ آپ مسز گرانٹ ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ آیا۔

''تھینک یو جیمس!'' میں بولی اور پھر جب وہ قریب آ گیا تو پرس سے ماریا کا پاسپورٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ ''اس پر لگی ہوئی تصویر دیکھو اور بلا تکلف بتاؤ میرے چہرے اور اس تصویر میں تمہیں کوئی

معمولی سا فرق بھی نظر آتا ہے۔ میں اپنی تعریف نہیں تصدیق چاہتی ہوں کہ میری کوشش کامیاب رہی یا نہیں؟''

جیمس نے ماریا کی تصویر اور میرے چہرے کا بغور جائزہ لیا اور بولا۔ ''کوئی فرق نہیں'' یہ کہہ کر اس نے پاسپورٹ مجھے واپس کر دیا۔

''بیٹھو!'' میں نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم نے میرے ساتھ جو تعاون کیا ہے میں اس سے واقعی بہت خوش ہوں' ممنون ہوں تمہاری......! سنو......! پہلے میری بات سن لو بعد میں بولنا......! جو لوگ میرے ساتھ تعاون کرتے ہیں میں ان کے تعاون کو نظر انداز نہیں کرتی میں تمہیں ایک دوست کی حیثیت سے کچھ تحفے دینا چاہتی ہوں۔ ان تحفوں کو تم اس ملاقات کی یادگار سمجھ سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنے سوٹ کیس سے میک اپ باکس نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ''یہ میک اپ کا بہت قیمتی سامان ہے۔ ممکن ہے کبھی تمہیں اس کی ضرورت پیش آئے' رکھ لو؟''

جیمس نے تکلف سے کام نہیں لیا اور وہ باکس لے لیا۔ باحیثیت ماریا ولسن میں جو سامان اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی تھی اس میں جولین آندرے کا ریوالور بھی تھا۔ میں نے پرس کھول کر اس میں سے ریوالور نکالا اور پھر ایک نظر جیمس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا تھا۔

''غلط نہ سمجھو!'' میں نے کہا۔ ''یہ ریوالور میں نے اس لئے نکالا ہے کہ اسے بھی بطور تحفہ تمہیں نذر کرنا چاہتی ہوں۔''

ریوالور خالی نہیں تھا اس لئے میں نے احتیاطاً اس میں سے گولیاں نکال کر درمیان میز پر رکھ دیں۔ وہ ریوالور بھی جیمس نے شکریہ ادا کر کے لے لیا۔ ''ہاں اب کہو تم کرنسی کے تبادلے کی کیا بات کرنا چاہتے تھے؟'' میں نے کہا۔

جواباً جیمس نے وہی بات دہرا دی جو پہلے کہہ چکا تھا۔ کرنسی کے تبادلے میں اس کی دلچسپی کے سبب سے بھی میں خوب واقف تھی۔ ظاہر ہے کہ کرنسی کے تبادلے میں بھی وہ کچھ رقم کمانا چاہتا تھا۔ ٹکٹ خریدنے اور اب تک ہونے والے اخراجات کے بعد میرے پاس کوئی بڑی رقم نہیں بچی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے پاکستانی کرنسی کی بھی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے جیمس کا دل نہیں توڑا کچھ رقم میں نے اسے تبادلے کے لئے دے دی میں نے اس بات کو نظر انداز نہیں کیا تھا کہ ابھی مجھے کسی ہوٹل میں بھی قیام کرنا پڑے گا۔ میری فلائٹ نصف شب کے قریب روانہ ہونا تھی۔ یہ وقت مجھے بہرحال کہیں نہ کہیں گزارنا تھا۔ میں اب جیمس کے فلیٹ میں مزید قیام نہیں چاہتی تھی۔

جیمس کرنسی کے تبادلے کی خاطر مجھے اپنے فلیٹ میں تنہا چھوڑ گیا تھا' جلد ہی وہ لوٹ آیا۔ پھر اس نے مصری کرنسی کے عوض جو پاکستانی روپے دیئے انہیں میں نے گنے بغیر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اس کے بعد میں وہاں نہیں رکی۔ رخصت ہوتے وقت مجھے جیمس کا چہرہ باغ و بہار نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں مجھے گویا جی بھر کے لوٹا تھا۔

ماریا ولسن کی شخصیت اپنانے کے بعد بھی میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا' رمسیس چوک سے لوٹ کر بھی نصف شب تک قیام کے لئے میں نے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں ہی قیام کیا

تھا۔ پھر میں اپنی فلائٹ کے وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایئر پورٹ پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد جب تک میری فلائٹ قاہرہ ایئر پورٹ سے پرواز نہ کر گئی میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکتا ہی رہا کیوں کہ کسی بھی لمحے کوئی غیر متوقع واقعہ پیش آ سکتا تھا۔

قاہرہ میں مجھے پے در پے جو واقعات پیش آئے تھے ان کی روشنی میں کچھ یقین سا نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے حریفوں کے چنگل سے نکل آئی ہوں۔

جہاز کو قاہرہ ایئر پورٹ سے پرواز کئے ابھی چند منٹ گزرے تھے کہ لاؤڈ سپیکر پر جہاز کے کیپٹن کی آواز گونجی۔ پھر اس نے جو اعلان کیا اسے سن کر میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ جہاز ایک بار پھر قاہرہ ایئر پورٹ کی طرف واپس جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

کیپٹن کے اعلان کے مطابق' جہاز کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی۔ اس خرابی کا علم اس وقت ہوا جب جہاز قاہرہ ایئرپورٹ سے پرواز کر چکا تھا۔ کیپٹن نے بتایا تھا کہ یہ خرابی معمولی نوعیت کی ہے اور اس پر جلد ہی قابو پا لیا جائے گا۔ جہاز کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم بآسانی قاہرہ ایئرپورٹ پر اترنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر کیپٹن نے مسافروں سے نظم و ضبط برقرار رکھنے کی اپیل کی تھی۔

جہاز کے کیپٹن کا یہ اعلان بظاہر ایسا نہیں تھا کہ میرے اعصاب جھنجھنا اٹھتے یا میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتی۔ میری فکر و تشویش کا سبب کیپٹن کا لہجہ' اس کی آواز کا زیر و بم اور اس آواز میں چھپا ہوا نامحسوس سا خوف تھا۔ مسافروں میں سے کسی نے ایسا محسوس کیا ہو' نہ کیا ہو مگر میں بہرحال چوکنا ہو گئی۔ مسافروں کو جو کچھ بتایا گیا تھا' میرے خیال میں درست نہیں تھا۔ جہاز یقیناً کسی بڑے خطرے سے دوچار تھا۔ غالباً یہ سوچ کر مسافر بے حواس نہ ہو جائیں انہیں اصل خطرے سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ یہ کوئی غیر اخلاقی یا غیر قانونی بات نہیں تھی' ایسے حالات میں عموماً ذمے دار افراد کا یہی رویہ ہوتا ہے۔ ان پر بہرحال بہت سی قیمتی جانوں کی ذمے داری ہوتی ہے۔

اس اعلان کا مجھ پر جو ردعمل ہوا سو ہوا' جہاز کے دوسرے مسافروں میں بھی کھلبلی سی مچ گئی۔ میری بائیں جانب والی سیٹ پر ایک غیر ملکی نوجوان بیٹھا تھا۔ اعلان سن کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''ڈونٹ وری ینگ بوائے!'' میں نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔ ''ٹیک اٹ ایزی!'' میرے اندازے کے مطابق وہ اسکینڈی نیوین کنٹریز میں سے کسی ایک کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے انگریزی میں اس نوجوان سے فکر نہ کرنے اور پرسکون رہنے کے لیے کہا تھا۔

''اوہ یس...... یس میڈم!'' وہ چونک کر بولا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

کچھ تو مجھے اس نوجوان کی حالت پر رحم آ رہا تھا اور کچھ یہ کہ میں خود بھی شدید خطرے کے احساس کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتی تھی۔ میں اسی لیے اس نوجوان سے گفتگو کرتی رہی۔ چند منٹ کی بات تھی! جو کچھ ہونا تھا انہی چند منٹ میں ہو جانا تھا۔ آدمی کبھی کبھی خود کو بہت بااختیار سمجھ لیتا ہے لیکن زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب اسے بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ وہ قطعی بے اختیار ہے۔ حقیقتاً کچھ بھی اس کے بس میں نہیں۔ اس وقت بھی کچھ یہی صورت تھی۔ میں ہی کیا' ا

حالات میں کوئی بھی تقدیر پر شاکر رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی سبب میں نے خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اپنی توجہ خطرے کی طرف سے ہٹانے کے باوجود گزرتا ہوا ہر لمحہ میرے اعصاب کو کشیدہ کر رہا تھا۔ غیر ملکی نوجوان سے گفتگو کرتے ہوئے بھی بار بار میرے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ جہاز کو اصل خطرہ کیا درپیش ہے؟ اسی دوران میں اچانک مجھے اپنی ذہنی کیفیت بدلتی محسوس ہوئی۔ یقیناً میرے ذہن کی پراسرار حیرت انگیز قوتیں بیدار ہو رہی تھیں۔ مجھے غالباً میرے سوال کا جواب ملنے والا تھا۔ آشنا لذت انگیز سی کیفیت کے زیر اثر میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں' رگ و پے میں ایک نشہ سا دوڑنے لگا۔ میں بات کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گئی۔

''کیا ہوا میڈم؟ غیر ملکی نوجوان کی گھبرائی ہوئی سی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''تھنک!'' میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ''پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می!'' میں نے اسے ٹال دیا کہ کچھ نہیں' براہ مہربانی مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔

''آر یو سلیپنگ؟'' اس نے سوال کیا کہ کیا میں سو رہی ہوں؟

''یس!'' میں نے بمشکل اس کے سوال کا جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

خواب اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں اب مجھے اپنی ہی آواز نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھی۔ مجھے میرا حیرت انگیز ذہن اس سوال کا جواب دے رہا تھا کہ میں جس جہاز میں سفر کر رہی ہوں اسے کس خطرے کا سامنا ہے اور اس کی وجہ کیا ہے! خود میری ہی آواز مجھ سے مخاطب تھی۔ عذرا خان! اس جہاز میں ایک طاقتور ٹائم بم رکھ دیا گیا ہے۔ بم رکھنے والا ایک اسرائیلی ایجنٹ تھا جو ہیتھرو ایئرپورٹ لندن سے اس جہاز میں تہران کے لیے سوار ہوا تھا' مگر قاہرہ ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ انٹرپول (بین الاقوامی پولیس) کے کچھ افراد اس اسرائیلی ایجنٹ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انٹرپول والوں کو شبہ تھا کہ وہ کوئی گڑبڑ ضرور کرے گا کیونکہ اسی جہاز سے فلسطین محاذ آزادی کی ایک اہم شخصیت بھی سفر کر رہی تھی۔ یہ شبہ اس وقت یقین میں بدل گیا جب اسرائیلی ایجنٹ تہران جانے کی بجائے قاہرہ ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ انٹرپول والوں نے فوری طور پر قاہرہ ایئرپورٹ سیکورٹی کے ذمے دار افراد سے رابطہ قائم کیا اور اس اسرائیلی ایجنٹ کو حراست میں لے لیا گیا۔ اسی تفتیش کے دوران میں یہ جہاز پرواز کر گیا۔ اس وقت تک ایسے شواہد نہیں ملے تھے کہ پرواز کو روکا جا سکتا۔ جب یہ شبہ محسوس کیا گیا کہ کہیں فلسطینی سیاسی شخصیت کو ختم کرنے کے لیے جہاز میں بم نہ رکھ دیا گیا ہو تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ جہاز کو دوبارہ قاہرہ ایئرپورٹ پر اتار لیا جائے۔ جہاز کے کیپٹن کو بھی اس ممکنہ خطرے سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ قاہرہ سے پرواز کرنے کے بعد یہ ٹائم بم کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذہن میں جیسے دھماکے سے ہونے لگے اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں' مجھے اس لمحے یوں محسوس ہوا جیسے دنیا پر آخری نگاہ ڈال رہی ہوں۔ وہ لمحات کسی بھی فرد کی زندگی میں انتہائی ہیجان خیز ہوتے ہیں جب اسے یقینی موت کا علم پہلے سے ہو جاتا ہے اور یہاں تو اس سے بھی زیادہ ہولناک صورتحال تھی' یقین اور بے یقینی کی صورت! کیا خبر یہ جہاز اگلے ہی لمحے ٹکڑے ہو کر

فضاؤں میں بکھر جائے' بھک سے اڑ جائے اور کیا معلوم موت دبے پاؤں قریب سے گزر جائے! یقین بہر حال بے یقینی سے غنیمت ہوتا ہے' چاہے موت ہی کا یقین کیوں نہ ہو' لیکن بے یقینی آدمی کو جیتے جی مار دیتی ہے۔ ایسا ہی کچھ عقائد کے باب میں ہے۔ وہ لوگ جن کے عقائد مضبوط ہوتے ہیں' جنہیں اپنے مذاہب پر پختہ یقین ہوتا ہے' ان کے مذہب نے زندگی اور موت کا جو تصور پیش کیا ہے' جو تشریح کی ہے' ان کے عقائد کا حصہ بن جاتی ہے' تو وہ بڑے سکون سے مر جاتے ہیں کہ انہیں یقین ہوتا ہے' زندگی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ اس زندگی کے بعد بھی ایک اور زندگی ہے' اصل زندگی! مگر اس کے برخلاف جو لوگ بے عقیدہ ہوتے ہیں یا پھر تشکیک کی منزل میں ہوتے ہیں' ان کے لیے بڑا عذاب ہے' ایک حد تک زندگی بھی اور مختلف مذاہب نے جو کچھ بتایا ہے' وہ بھی! تشکیک' تذبذب اور بے یقینی کی فضا انہیں بے سکون رکھتی ہے۔ زندگی کی ہر سطح پر یہی عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ کسی بھی امر یا عمل کا طے نہ ہونا کہ وہ ظہور پذیر ہوگا یا نہیں' اضطراب اور بے چینی کا سبب بن سکتا ہے' خصوصاً اہل یقین کے لیے! میری آپ بیتی پڑھتے ہوئے غالباً میرے قارئین نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں بھی اہل یقین میں ہوں۔ سو بے یقینی کی اس فضا میں جس سے میں دوچار تھی' میرے لیے عذاب ناک ہی تھی۔

جہاز کے اندر ہونے والی نقل و حرکت مجھے عجیب سی لگ رہی تھی۔ ایئر ہوسٹس اور اسٹیورڈ' ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ کیپٹن کی ہدایت کے مطابق وہ مسافروں کو پرسکون رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ مسافروں میں خواتین بھی تھیں' مرد بھی اور بچے بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ خواتین خواہ کسی خطہ زمین کی ہوں مردوں سے پہلے جی چھوڑ بیٹھتی ہیں۔ جہاز کے انجن میں خرابی کی تفصیل جاننے کے لیے اسی لیے وہ مردوں کی نسبت زیادہ پیش پیش تھیں۔ ان کے اندر کا [illegible]' انہیں ایئر ہوسٹس سے طرح طرح کے سوالات کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ معلوم نہیں' جہاز کے کیپٹن نے اپنے عملے کو اصل خطرے سے آگاہ کیا تھا یا نہیں! لیکن ایئر ہوسٹس کی مصنوعی مسکراہٹوں اور ایک نوع کی بے چینی سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ممکن ہے وہ اصل خطرے سے بے خبر ہوں۔ پھر بھی بے یقینی کا شکار ہیں۔

وہ چند منٹ میرے ہی لیے نہیں یقیناً جہاز کے بقیہ مسافروں کے لیے بھی گویا صدیوں پر محیط ہو گئے تھے۔ قریبی سیٹ پر بیٹھا ہوا نوجوان غیر ملکی دوبارہ مجھ سے مخاطب نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالی تھی۔ وہ ایک اضطرابی کیفیت میں دانتوں سے اپنے ہاتھوں کے ناخن کتر رہا تھا اور وہی کیا بظاہر مجھے جہاز کا کوئی بھی مسافر نارمل نظر نہیں آ رہا تھا۔ عام حالات میں آدمی اپنے اندر چھپے ہوئے اصل آدمی کے چہرے پر مختلف نقاب ڈالے رہتا ہے مگر جب کسی بھی سبب حالات معمول پر نہیں رہتے تو سارے نقاب ایک ایک کر کے غائب ہو جاتے ہیں اور اصل آدمی کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔ میرے اردگرد اس وقت ایسے ہی چہرے تھے' خوف زدہ چہرے' بے یقین چہرے' رحم طلب چہرے!

مجھے یہ معلوم نہیں تھا اور نہ میں نے معلوم کرنا چاہا کہ فلسطین محاذ آزادی کی وہ اہم سیاسی شخصیت' جہاز کے کس حصے میں ہے جس کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے جنون میں ایک شقی القلب اسرائیلی ایجنٹ نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ مسافروں میں معصوم بچے بھی شامل ہیں' صرف ایک ہی چراغ گل نہیں ہوگا' جانے کتنے گھر بے چراغ ہو جائیں گے۔ شاید ان ننگ انسانیت افراد کے سینوں میں دل

نہیں ہوتے۔ بظاہر آدمی نظر آنے والے یہ افراد یقیناً آدمی نہیں' درندے ہوتے ہیں۔ خطرناک درندے۔ اور درندوں کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے' نہ کوئی قومیت' نہ کوئی قدر' درندے بس درندے ہوتے ہیں۔ آدمی کے دشمن' انسانیت کے دشمن' ہر قدر کے دشمن۔ صفحۂ زمین پر یہ درندے ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ عرصہ دراز سے کچھ ایسے ہی درندے میری توجہ کا مرکز تھے' ان سے میری جنگ جاری تھی' میرے خدا نے مجھے اتنی ہمت دی تھی' اتنا حوصلہ بخشا تھا' ایسی قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی تھیں کہ میں انکے ناپاک عزائم کو خاک میں ملاتی رہوں۔

وہ اذیت ناک لمحات کب اپنے آخری مراحل میں داخل ہوئے' مجھے احساس نہ ہو سکا' میں تو اس وقت چونکی جب ایک بار پھر جہاز کے کیپٹن کی آواز لاؤڈ سپیکر پر سنائی دی۔ مسافروں کو وہ یہ مژدہ سنا رہا تھا کہ کچھ ہی دیر بعد جہاز بخیریت تمام قاہرہ ایئر پورٹ پر اترنے والا ہے۔ جہاز کے دیگر مسافروں کے لیے ممکن ہے یہ اطلاع خوش کن رہی ہو' مگر میری حد تک ایسا نہیں تھا۔ میں جب تک جہاز سے اتر کر دور نہ چلی جاتی میرا اضطراب ختم نہ ہوتا۔ ٹائم بم جہاز کے کس حصے میں تھا اور اسے کس وقت پھٹنا تھا یہ تو خود مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ میرے حیرت انگیز ذہن نے اس سلسلے میں میری کوئی رہنمائی نہیں کی تھی۔ بہر حال اپنے اندر پھیلی ہوئی بے چینی پر قابو پاتے ہوئے میں نے بھی دوسرے مسافروں کی طرح بیلٹ باندھ لی۔

میری سیٹ کھڑکی کے قریب تھی' اسی لیے جب جہاز' ایئر پورٹ پر اترا تو میں کھڑکی سے باہر کا جائزہ لینے لگی۔ رن وے کے اس حصے میں دور تک کوئی اور جہاز نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہاز رکا تو مجھے کافی فاصلے پر کھڑی ہوئی جیپیں نظر آئیں جن میں میرے اندازے کے مطابق فوجی جوان تھے۔

پھر سب کچھ انتہائی سرعت کے ساتھ ہوا۔ تمام مسافروں اور جہاز کے عملے کو اس جہاز سے اتار لیا گیا جن میں خود میں بھی شامل تھی۔

شدید خطرے کی حدود سے نکلتے ہوئے اور دوسرے مسافروں کے ساتھ ایک بس میں سوار ہوتے وقت میں نے صرف اتنا دیکھا کہ کچھ افراد تیزی کے ساتھ اس جہاز کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ ان کے پاس جو سامان تھا' اسے دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ یہ وہ افراد ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر بموں کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر انہیں ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ قاہرہ ایئر پورٹ سکیورٹی کا عملہ یقیناً انتہائی مستعد تھا کہ اس نے محدود وقت میں تمام انتظامات پہلے ہی سے مکمل کر لیے تھے۔

بسوں کے ذریعے جہاز کے مسافروں کو نسبتاً ایک الگ تھلگ حصے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ سکیورٹی کا عملہ' ایئر پورٹ کی عمارت کے اس حصے کی نگرانی کر رہا تھا۔ مسافروں سے کہا گیا تھا کہ قاہرہ سے وہی فلائٹ کچھ ہی دیر بعد دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے گی۔ "فلسطین محاذ آزادی کی اہم سیاسی شخصیت کو غالباً اس حصے کی بجائے وی آئی پی روم یا پھر کہیں کسی اور محفوظ جگہ پر رکھا گیا تھا۔ مجھے ان مسافروں میں کوئی ایسی سیاسی شخصیت نظر نہیں آئی تھی۔ ان تمام انتظامات کا مقصد سمجھنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ اس واقعے کی تشہیر غیر ملکی فضائی کمپنی کے لیے بھی کسی طرح مناسب نہیں تھی اور نہ سیاسی طور پر اصل واقعے کا سامنے آنا بہتر تھا۔

جو واقعہ پیش آیا تھا' اس کی وجہ سے بہت سے مسافر دوبارہ اس جہاز میں سفر کرنے پر آمادہ

نہیں تھے۔ انہوں نے سکیورٹی کے عملے سے اس بات کا اظہار بھی کیا مگر اس طرح دوسری قباحتیں پیدا ہو جاتیں۔ جس بات کو بہ وجوہ صیغہ راز میں رکھا جا رہا تھا' راز نہ رہتی۔ ایسے مسافروں کو سکیورٹی والوں نے پہلے نرمی سے سمجھانا چاہا' پھر بھی وہ بضد رہے تو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ایسا ممکن نہیں۔

میں سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی' مگر ظاہر ہے مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں تو خود اپنے عذابوں کی اسیر تھی اور کسی بھی طرح جلد از جلد قاہرہ سے نکل جانا چاہتی تھی۔ میرے حق میں یہ بہتر ہی ہوا تھا کہ اس جہاز کے مسافروں کو متعینہ حدود سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اور نہ کوئی باہر کا آدمی ان تک پہنچ سکتا تھا۔

مسافروں اور سکیورٹی والوں کے درمیان ابھی تک گویا چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔ سنہرے فریم کا چشمہ لگائے ہوئے ایک بھاری بھرکم ایک شخص سکیورٹی والوں پر اپنا غصہ اتار رہا تھا۔ ''کیا ہم لوگ مجرم ہیں جو ہمیں یہاں اس طرح قیدیوں کی مانند رکھا جا رہا ہے اور نگرانی کی جا رہی ہے؟ جہاز کے انجن میں خرابی ہم نے تو پیدا نہیں کی!''

سکیورٹی کا ایک مسلح نوجوان اس شخص کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

اس پر وہ شخص اور بھی گرم ہو گیا۔ ''میں اپنے سفارتخانے کے ذریعے مصری حکومت سے احتجاج کروں گا۔ آپ کے عملے کی شکایت بھی کروں گا آپ لوگوں نے ہمیں ناحق ٹارچر میں رکھا!''

اس شخص کی تیز آواز سن کر ایک ادھیڑ عمر سکیورٹی افسر ادھر آ گیا۔ اس نے نوجوان سکیورٹی والے سے حقیقت حال معلوم کی' پھر سوٹڈ بوٹڈ' بھاری بھرکم شخص کو مخاطب کیا ''جناب والا! بے شک آپ اپنے سفارت خانے کے ذریعے ہماری حکومت سے احتجاج کیجیے گا' لیکن فی الحال خود بھی پرسکون رہیں اور دوسرے مسافروں میں بھی خواہ مخواہ خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش نہ کریں۔ ہم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں آپ ہی لوگوں کی حفاظت اور بہتری کے لیے کر رہے ہیں۔ ازراہ کرم ہمیں اپنے فرائض ادا کرنے دیں' بصورت دیگر ہمیں کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں اور سمجھدار معلوم ہوتے ہیں' میرے خیال میں آپ میری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے!'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں کچھ سختی آ گئی تھی۔

اس کے بعد کم از کم وہ شخص کچھ نہ بولا اور بڑبڑاتا ہوا ایک طرف جا بیٹھا۔

میں قریب ہی کھڑی تھی۔ سکیورٹی افسر نے میری طرف دیکھا اور شائستہ لہجے میں بولا۔ ''ٹیک اے سیٹ میڈم!'' اس نے مجھ سے بھی کہیں بیٹھ جانے کو کہا۔

''تھینک یو!'' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس طرف بڑھ گئی جہاں اور بھی خواتین بیٹھی تھیں۔

رفتہ رفتہ سکیورٹی کے عملے کا بدلتا ہوا رویہ دیکھ کر وہ لوگ خاموش ہو گئے جو بلا سبب اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد فضائی کمپنی کی جانب سے مسافروں کی خاطر مدارات شروع ہو گئی انہیں مختلف قسم کے مشروبات سرو کیے گئے تھے۔ میں نے محض کافی پینے پر اکتفا کیا تھا۔

اس ''قید'' میں یا اسے جو بھی کہا جا سکے تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا تو دوبارہ بسوں کے ذریعے

مسافروں کو جہاز تک پہنچایا جانے لگا۔ میں نے اس عرصے میں کوئی دھماکا نہیں سنا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ بم کو ناکارہ کرنے والا عملہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ دھماکا ہونے کے وقت سے پہلے ہی کچھ مہربان ہاتھ اس بم تک پہنچ گئے تھے جو اس جہاز اور اس کے مسافروں کو لاتعداد ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا۔ شاید ان مسافروں میں سے کسی کو بھی ابھی سفر آخرت پر روانہ نہیں ہونا تھا اور یہ کیسی عجیب بات تھی وہ سبھی اس سے بے خبر تھے کہ موت ان کی ہمسفر تھی جو کسی بھی لمحے انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی۔ بعض اوقات بے خبری بھی کیسی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ مگر میں اس وقت اس ''نعمت'' سے محروم تھی۔

جہاز کے دوبارہ پرواز کرنے سے قبل کیپٹن نے مسافروں سے معذرت کی کہ انہیں ناحق پریشانی اٹھانا پڑی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد جہاز فضا میں پرواز کرنے لگا۔

جو واقعہ پیش آیا' اس سے براہ راست میرا کوئی تعلق نہیں تھا' میں اس کا سبب نہیں تھی۔ سبب وہ اہم سیاسی شخصیت تھی جس نے قاہرہ میں رک جانے کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔ غالباً وقتی طور پر! کیونکہ اب وہ شخصیت میری ہمسفر نہیں تھی۔ میں نے اپنے فطری تجسس سے مجبور ہو کر اپنے ہمسفروں کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس معاملے میں مزید دلچسپی نہ لینے کی ایک وجہ تو یہی تھی جو ابھی میں نے بیان کی' دوم یہ کہ مجرم پکڑا جا چکا تھا اور اس کا جو اصل مقصد تھا' وہ بھی واضح تھا۔ پھر یہ کہ مشاہدے کے سوا میرے بس میں تھا بھی کیا! ''ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' والا معاملہ تھا اور یہ بھی کہ میں خود غیر معمولی حالات سے گزر رہی تھی۔ اس واقعے کے حوالے سے مجھے اب اپنے وطن میں ہونے والی ریشہ دوانیوں کا خیال آ رہا تھا' میں جن حالات میں اپنے وطن سے قاہرہ روانہ ہوئی تھی' وہ حالات کسی طرح اطمینان بخش نہیں تھے۔ قاہرہ سے کراچی تک کے سفر میں مجھے حالات کا ازسرنو جائزہ لینے کی مہلت مل گئی اور میں نے آئندہ کے لیے کچھ اہم فیصلے کیے۔

پھر جب ایک اعصاب شکن سفر کے بعد جاں فزا اعلان ساعت نواز ہوا کہ جہاز' کراچی ایئرپورٹ پر اترنے والا ہے تو مجھے یوں لگا جیسے میں نے ایک اور محاذ پر اپنے بدخواہوں کو شکست دے دی ہے۔ ان تمام تر کوششوں کا حاصل یہ تھا کہ انہوں نے میرے لیے جو جال پھیلایا ہے' میں اس سے نکل نہ سکوں۔ اپنی دانست میں انہوں نے میرے پر کاٹ دیے تھے' مگر جسے پرواز کی سعادت' قدرت کی طرف سے نصیب ہو' اسے بھلا کون روک سکتا ہے!

ایئرپورٹ پر مجھے کسی بھی مرحلے سے گزرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اپنے شانے پر ایئر بیگ لٹکائے اور ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھائے میں ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ گئی اور بلاتکلف ایک خالی ٹیکسی کی طرف بڑھی۔ اس وقت میرے چہرے پر کیونکہ ایک غیر ملکی عورت کا میک اپ تھا' اس کے علاوہ لباس بھی بدیسی تھا اس لیے مجھے ''آسامی'' جان کر کئی ٹیکسی والے میری طرف متوجہ ہو گئے۔ دو ایک نے الٹی سیدھی انگریزی جھاڑنے کی بھی کوشش شروع کر دی۔

جواباً اور ازراہ تفنن طبع میں نے غیر ملکیوں کے سے لہجے میں ان سے کہا ''ام کو اردو آتا۔ تم ام سے اردو بول سکتا۔''

''تم کدر جائے گا میڈم؟'' ابی ام کو بولو! ٹیکسی والا بول اٹھا جو نسبتاً میرے زیادہ قریب تھا۔

میں نے ایک بڑے ہوٹل کا نام لے دیا۔ اس نے پیسے بتائے جو ظاہر ہے کہ بہت زیادہ تھے۔ یہ بہر حال قاہرہ نہیں کراچی تھا جہاں عموماً ٹیکسیاں میٹر سے چلتی ہیں اسی لیے میں نے بدستور ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا کہ کیا تمہاری ٹیکسی کا میٹر خراب ہے۔

''ابی! اِدر ایئرپورٹ پر آ کر بی میٹر سے چلے گا میم صاحب تو بچوں کو کیا کھلائے گا!'' ٹیکسی ڈرائیور نے گویا عذر پیش کیا۔

اس بحث میں مزید وقت ضائع کرنے کی بجائے میں نے اس سے کہا کہ میٹر ہی سے چلو' بعد میں میٹر کے علاوہ جو چاہو گے لے لینا' مگر صرف اتنے پیسے کہ مجھے اپنے لٹ جانے کا احساس نہ ہو۔ میں نے اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ پہلے بھی پاکستان آ چکی ہوں اور یہ شہر میرے لیے نیا نہیں ہے۔ وہ بھی میرے اردو بولنے سے یقیناً کچھ نہ کچھ اندازہ تو لگا ہی چکا ہوگا اس لیے میٹر سے چلنے پر راضی ہو گیا۔ پھر اسے یہ خیال بھی رہا ہوگا کہ میں میٹر کے علاوہ بھی کچھ پیسے دینے کا وعدہ کر چکی ہوں۔ اس نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا اور ڈکی میں رکھنے لگا۔ میں اس دوران میں ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ ایئر بیگ میں نے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔

میں نے مصلحتاً ٹیکسی والے سے ایک بڑے ہوٹل کا نام لے دیا تھا ورنہ حقیقتاً مجھے ایئرپورٹ سے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر جانا تھا۔ صدر کے علاقے میں داخل ہونے تک میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کچھ نہ کہا اور سفر جاری رہا۔ پھر جب وہ صدر کے علاقے کو ایک جانب چھوڑتے ہوئے میوزک فاؤنٹین سے بائیں جانب مڑا تو میں نے اس سے رکنے کے لیے کہا۔ سڑک کی مخالف سمت مجھے کچھ خالی ٹیکسیاں کھڑی نظر آ گئی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے میرے کہنے پر فٹ پاتھ کے قریب ٹیکسی روک دی' پھر حیرت کا اظہار کرنے لگا کہ ابھی ہوٹل دور ہے' میں وہاں کیوں اتر رہی ہوں؟ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور میٹر دیکھتے ہوئے پرس کھول کر کرائے کے علاوہ اسے پانچ روپے اور تھما دیے اس نے روپے گن کر جیب میں رکھ لیے اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا تاکہ ڈکی سے میرا سوٹ کیس نکال سکے۔ میں اس سے پہلے ہی اتر گئی تھی۔

پھر جب وہ ٹیکسی سیدھی چلی گئی تو میں نے سوٹ کیس اٹھائے ہوئے آنے اور جانے والی دونوں سڑکوں عبور کیں اور مخالف سمت پہنچ گئی۔ وہاں سے میں ایک اور ٹیکسی میں آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کے لیے روانہ ہو گئی۔ میں کیونکہ اس وقت ایک غیر ملکی عورت کی شخصیت اپنائے ہوئے تھی اس لیے یہ احتیاط میرے لیے ضروری تھی۔

اس ٹیکسی کو بھی میں نے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی عمارت سے خاصا پہلے ہی چھوڑ دیا۔ اپنی منزل کی طرف پیدل جاتے ہوئے میری آنکھوں میں اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کا چہرہ گھومنے لگا۔ اسے وہیں ہونا چاہیے تھا جہاں میں جا رہی تھی۔ مجھے اپنے لوگوں پر یقین تھا کہ انہوں نے اس دوران میں ذکیہ کی ہر طرح خبر گیری رکھی ہو گی۔ قاہرہ ایئرپورٹ پر جب وہ مجھ سے رخصت ہونے والی تھی تو میں نے اسے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کا نمبر دے دیا تھا۔ ذکیہ نے یقیناً میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے کراچی پہنچتے ہی آپریشن سیل ہیڈکوارٹر فون کیا ہو گا۔ میں یہی سوچتی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنی منزل سے قریب ہوتی

گئی۔

آپریشن سیل کی عمارت کے صدر دروازے میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ مسلح محافظوں کی نظر میں آ چکی ہوں۔ میں بظاہر لاتعلقی کے انداز میں اس طرف قدم اٹھانے لگی جدھر ڈیوٹی روم تھا۔

ڈیوٹی روم تک پہنچنے سے قبل مجھے کم از کم دو جگہ با آسانی روکا جا سکتا تھا۔ ابھی میں بائیں جانب مڑ کر بمشکل چند قدم چلی ہوں گی کہ میری پشت سے ایک ٹھوس شے آ لگی اور یہ ٹھوس شے کسی رائفل کی نال کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی تھی۔

''رک جاؤ...... کون ہو تم؟ مجھ سے سخت لہجے میں کہا گیا۔

''عذرا خان۔'' میں نے رک کر اطمینان سے بغیر مڑے جواب دیا۔ میں اپنی اصل آواز ہی میں بولی تھی۔

''تم اگر عذرا خان ہو تو پھر وہ کون ہے جو پہلے سے یہاں موجود ہے؟''

میں سمجھ گئی کہ میری اصل آواز سننے کے باوجود محافظ نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا کہ کوئی اور عورت میری آواز کی نقل کر کے اسے بے وقوف بنا سکتی ہے۔ میں اسی لیے مزید شناخت کی خاطر بولی ''تمہیں دھوکا ہوا ہے' وہ عذرا خان نہیں بلکہ عذرا خان کی چھوٹی بہن ذکیہ ہے۔ ویسے بائی دا وے اس وقت ڈیوٹی انچارج کون ہے' عثمانی یا کمانڈر نواز؟''

''سوری میڈم!'' یہ کہتے ہوئے محافظ نے میری پشت سے رائفل کی نال ہٹا لی۔ اسے لازماً اب یقین ہو گیا تھا کہ میں عذرا خان ہی ہوں' کوئی اور نہیں۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں آگے بڑھ گئی۔ پھر مجھے ڈیوٹی روم تک پہنچنے سے پہلے کسی اور محافظ نے نہیں روکا۔ میں بہرحال ان کی مستعدی اور ہر وقت چوکنا رہنے سے خوش ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ میری ہی ہدایات کا نتیجہ تھا کہ چاہے کوئی بھی ہو جب تک وہ اپنی شناخت نہ کرا دے' اسے متعینہ حدود سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔

آپریشن سیل کی عمارت کے مختلف گوشوں میں انتہائی حساس قسم کے مائیکروفون نصب تھے جو دیواروں میں اس طرح لگائے گئے تھے کہ نظر نہ آ سکیں۔ بہ وقت ضرورت ان سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ ان کا تعلق ڈیوٹی روم سے تھا۔ ڈیوٹی روم میں موجود شخص اگر چاہتا تو عمارت کے کسی بھی حصے میں ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا۔ یہ مائیکروفون عموماً اس وقت استعمال کیے جاتے تھے جب کوئی خلاف توقع واقعہ رونما ہو یا پھر کسی سبب ان کے استعمال کی ضرورت پیش آ جائے۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت بھی ڈیوٹی انچارج عثمانی نے ان مائیکروفونز کے ذریعے میرے اور محافظ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی ہو گی۔ دن کے وقت ڈیوٹی پر عثمانی ہی ہوتا تھا۔ میں غالباً پہلے بھی یہ لکھ چکی ہوں کہ بظاہر اس عمارت میں داخل ہونا بہت آسان معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ کوئی بھی شخص بغیر علم و اطلاع کے عمارت کے اندر قدم نہیں رکھ سکتا تھا جب تک خود عمارت کے مکین ایسا نہ چاہیں۔ میری بجائے اس وقت اگر کوئی عورت کسی غلط ارادے سے عمارت میں داخل ہوتی تو اب تک اسے عمارت کے عقبی حصے میں پہنچا دیا جاتا جو ایسے ہی افراد

کے لیے مخصوص تھا۔ سیل کے ارکان اس سے بھی واقف تھے کہ کبھی کبھی دانستہ خود میں بھی انہیں آزمائش میں ڈالتی رہتی ہوں تاکہ وہ ہر وقت چوکنا رہیں۔ وہ اس لیے میرے ساتھ بھی کسی قسم کی رعایت نہیں کرتے تھے۔

میں جب ڈیوٹی روم میں داخل ہوئی تو عثمانی مجھے اپنا منتظر ملا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور خیریت پوچھی۔ میں سوٹ کیس اور ایئر بیگ ایک جانب رکھ کر ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔ طویل سفر نے بہرحال مجھے تھکا دیا تھا۔ عثمانی میری توقع کے مطابق مجھے پہچان گیا تھا' اس نے یقیناً مائیکروفون کے ذریعے میری آواز سن لی ہوگی ورنہ میں نے اپنے چہرے پر ایسا میک اپ کیا تھا کہ میرا کوئی قریبی شناسا بھی مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔

''ذکیہ تو خیریت سے ہے نا؟'' میں نے عثمانی سے پہلا سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ کی ہدایت کے مطابق وہ یہاں آنے کے بعد باہر نہیں گئیں' ہاں وہ آپ کی طرف سے بہت فکر مند تھیں۔ روز ہی آپ کے بارے میں پوچھتی رہتی تھیں کہ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع ملی یا نہیں!''

''ٹھیک ہے اور کوئی خاص بات؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ان کی زبانی ہمیں جن حالات کا علم ہوا' وہ ہمارے نزدیک تشویش ناک تھے۔ میں نے کمانڈر نواز سے اس سلسلے میں بات کی تھی کہ کیوں نہ وہ یا پھر میں' قاہرہ روانہ ہو جائیں ممکن ہے آپ کو ہماری مدد کی......''

''کمانڈر نواز نے یقیناً تمہاری رائے سے اختلاف کیا ہوگا!'' میں درمیان میں بول اٹھی۔

''جی ہاں'' انہوں نے کہا تھا' ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ آپ کو انڈراسٹیمیٹ کریں اور پھر یہ بھی کہ قاہرہ میں آپ کو تلاش کر لینا تقریباً ناممکن ہوگا۔'' عثمانی بتانے لگا۔

''کمانڈر نواز کا اندازہ درست ہی تھا۔ بہرحال تفصیلی گفتگو تم لوگوں سے پھر کبھی ہوگی' فی الحال میرے کمرے کی چابی مجھے دے دو اور یہ بھی بتا دو کہ ذکیہ کس کمرے میں ہے؟''

عثمانی نے میرے کمرے کی چابی مجھے دے دی اور یہ بھی بتا دیا کہ ذکیہ کہاں ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ ذکیہ کے کمرے میں بھی انٹرکام لگا دیا گیا ہے تاکہ بہ وقت ضرورت اسے کوئی پریشانی نہ ہو اور وہ ڈیوٹی روم وغیرہ سے رابطہ قائم کر سکے' میں گویا اب اپنے گھر' اپنے لوگوں میں آ گئی تھی اور مجھے کوئی دھڑکا نہیں رہا تھا۔ یہ میری دنیا تھی' میرے لوگ تھے' یہاں میرا حکم چلتا تھا' اسی لیے تھکن کے باوجود میرا ذہن بہت ہلکا پھلکا تھا۔

ڈیوٹی روم سے نکل کر میں اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ آشنا دیوار و در نے جیسے طویل عرصے کے بعد میری پذیرائی کی' پہلے میں نے اپنے چہرے سے ماریا ولسن کا میک اپ ختم کیا پھر الماری سے کپڑے نکال کر باتھ روم میں گھس گئی۔ نہانے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد انٹرکام پر میں نے کچن روم سے رابطہ قائم کیا' میں نے فی الحال صرف دو کپ چائے لانے کو کہا تھا' کچن روم کے بعد انٹرکام پر میں نے ذکیہ کا نمبر دبایا۔ دوسری جانب سے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا گیا اور مجھے اپنی بہن کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

''ذکیہ! کیسی ہو تم؟ یہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو؟'' میں نے کہا۔

''کون؟...... باجی...... آپ؟......'' اس نے یقیناً میری آواز پہچان لی تھی۔

''ہاں میں ہی بول رہی ہوں۔''

''مگر...... مگر آپ کب...... کب یہاں آ گئیں؟...... مجھے...... مجھے تو کسی نے......''

''ابھی کچھ دیر پہلے یہاں پہنچی ہوں۔ تم ایسا کرو کہ میرے کمرے میں آ جاؤ!'' یہ کہہ کر میں نے اپنے کمرے کا نمبر بتایا اور راستہ بھی سمجھایا۔'' میں نے تمہارے لیے چائے بھی منگوائی ہے چائے پینے کے دوران میں ہم باتیں بھی کرتے رہیں گے۔

''میں آ رہی ہوں...... آ رہی ہوں باجی! اس کے لہجے سے انتہائی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں انٹرکام کا ریسیور رکھ کر اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول دیا' پھر واپس آ کر ایک آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔

جلد ہی ذکیہ میرے کمرے میں آ گئی۔ میں نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا وہ میرے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ میں جانتی تھی کہ یہ محبت کے آنسو ہیں۔

''پگلی!'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اب رونے کی کیا بات ہے' ابھی تک بالکل بچی ہو تم۔'' میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے محبت سے کہا' پھر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''چلو ہنسو' شاباش! ہاں یہ بات ہوئی نا!'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر میں بھی مسکرانے لگی۔ ''چلو بیٹھ جاؤ ادھر۔'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور پھر خود بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''باجی! وہ سب کیا تھا؟ کون لوگ تھے وہ؟'' ذکیہ قدرے توقف کے بعد مجھ سے پوچھنے لگی۔

''بھول جاؤ انہیں' اب وہ قصہ ختم ہو چکا ہے۔ ان واقعات کو ایک خواب سمجھ کر بھلا دو۔'' میں نے بات ٹال دی۔ ''یوں سمجھ لو کہ میرے کچھ دشمن مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے تمہیں ذریعہ بنانا چاہتے تھے اور میں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی' سمجھ گئیں!''

''جی ہاں سمجھ گئی' آپ تو ہیں ہی شروع سے پراسرار' ذکیہ کے مزاج کی فطری شگفتگی لوٹ آئی تھی۔ اس نے یہ جملہ کچھ اس طرح ادا کیا تھا کہ مجھے ہنسی آ گئی پھر ہم دونوں ہی ہنسنے لگیں۔ یوں کبھی کبھی بے فکری سے ہنسنا بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔

اسی دوران میں چائے آ گئی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے ذکیہ سے کہا۔ ''فی الحال احتیاطاً دو ایک مہینے تم قاہرہ نہ جاؤ تو بہتر ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ تم میرے ساتھ رہو تاکہ......''

''این او نو!'' وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''بندی ہرگز آپ کے ساتھ نہیں رہ گئی!''

''وجہ؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''بور ہو گئی میں یہاں! مگر حضور کا حکم تھا کہ اس عمارت سے باہر نہیں نکلنا' سو پڑے پڑے کمرے میں سڑتے رہے' میں اس قید خانے میں رہنے پر ہرگز آمادہ نہیں۔''

''تو تمہیں یہاں رہنے کو کون کہہ رہا ہے پگلوٹ!''

''پھر؟''

"میرے ساتھ کوٹھی میں رہنا۔"

"اور وہاں بھی یہ پابندی ہو گی کہ کوٹھی سے نہیں نکلنا؟"

"نہیں نا! اب ایسی کوئی بات نہیں۔" میں سنجیدہ ہو گئی۔ "ویسے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی کہ میرے ہی پاس رکو' تم جانتی ہو کہ میں نے کبھی تم پر پہرے نہیں بٹھائے اور تمہیں اپنے طور پر زندگی برتنے کی پوری آزادی دی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔

"آپ تو سیریس ہونے لگیں۔" وہ شوخی سے بولی۔

"بکومت اور میری بات سنجیدگی سے سنو!"

"فرمائیے! ہم تو پیدا ہی سننے کے لیے ہوئے ہیں' چھوٹے جو ہوئے۔"

"تم اگر چاہو تو کچھ دن میرے ساتھ رہو اور پھر سوئٹزرلینڈ یا امریکہ وغیرہ گھوم آؤ۔ سیر و تفریح سے تمہاری صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ ان دنوں تم کچھ جھک گئی ہو۔"

"منظور ہے! خرچہ پانی آپ کے ذمے' اس لیے کہ یہ آپ ہی کی تجویز بلکہ حکم ہے' بندی جس کی تعمیل کرے گی۔

"اچھا بندی صاحبہ! آپ چائے پی چکی ہیں' اب یہاں سے ٹہل جائیں' کل ہم کوٹھی میں منتقل ہو جائیں گے۔ اس وقت تک کے لیے یہ قید اور برداشت کر لیں۔

میری بات سن کر وہ کرسی سے اٹھی اور مخصوص انداز میں جھک کر بولی۔ "تھینک یو سوچ' باجی دی گریٹ!" پھر وہ مڑ کر گویا لیفٹ رائٹ کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ذکیہ بچپن ہی سے خوش مزاج' شوخ اور شریر تھی' قاہرہ میں میری وجہ سے اسے جن غیر معمولی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا' ان کے سبب اس کی ساری شوخی رخصت ہو گئی تھی۔ اب کم از کم اس کی حد تک حالات معمول پر آ چکے تھے' اسے میری فکر تھی تو اب میں بھی اس تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اسی لیے اب خوش نظر آ رہی تھی۔ اسے خوش دیکھ کر میرے دل سے دعا نکلی کہ وہ سدا اسی طرح خوش رہے۔ میں نے اس سے جو کچھ کہا تھا درست تھا' قاہرہ سے کراچی تک کے سفر میں' میں نے جو اہم فیصلے کیے تھے' ان میں سے ایک فیصلہ یہ بھی تھا کہ اب میں اپنی کوٹھی ہی میں سکونت اختیار کروں گی۔ اس کے لیے مجھے کیا نئے حفاظتی انتظامات کرنا تھے' میں ان پر بھی غور و خوض کر چکی تھی۔

کمانڈر نواز کے ڈیوٹی پر آنے سے پہلے ہی میں' عثمانی کو مطلع کر چکی تھی کہ وہ رک جائے' سیل کے ان دونوں ذمے دار افراد سے مجھے رپورٹ بھی لینا تھی' انہیں ان حالات سے بھی آگاہ کرنا تھا جن سے میں نبرد آزما رہی تھی اور اپنے آئندہ لائحہ عمل سے بھی انہیں آگاہ کرنا تھا۔ پھر جب وقت مقررہ پر کمانڈر نواز آ گیا تو اس نے انٹرکام پر مجھے اپنی آمد سے مطلع کیا۔

"عثمانی اور تم' دونوں میرے ہی کمرے میں آ جاؤ' ڈیوٹی روم میں کسی اور کی ڈیوٹی لگا دو۔" میں نے کمانڈر نواز سے کہا۔

"جی بہتر ہے' ہم دونوں آ رہے ہیں۔" جواباً کمانڈر نواز بولا۔

میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا' دروازہ پہلے ہی میں کھول چکی تھی' وہ دونوں کچھ ہی دیر بعد

میرے کمرے میں آ گئے۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر رچرڈ کے نائب سولومن اور اس کے ساتھیوں کی کوئی رپورٹ ہے؟ میرے پیچھے انہوں نے کوئی ہنگامہ تو نہیں کیا؟ وہ اب تک مفرور ہیں یا پکڑے گئے؟" میں نے یکے بعد دیگرے کئی سوال کر ڈالے۔ "کراچی کی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ سولومن اور اس کے ساتھی یہاں کوئی ہنگامہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔" کمانڈر نواز محتاط انداز میں بولا بلکہ میرا خیال تو یہ ہے یہاں پولیس اور دوسرے متعلقہ محکموں کے الرٹ ہو جانے کے سبب وہ اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے فرار ہو چکا ہے۔ گزشتہ دنوں مشرقی پاکستان کے کچھ شہروں میں اس طرح کی کچھ گڑ بڑ ہوئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب امریکی ایجنٹوں نے اپنی حکمت عملی تبدیلی کر لی ہے اور وہ اب غالباً وہاں گڑ بڑ پھیلانا چاہتے ہیں۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ سولومن اور اس کے ساتھی یہاں سے فرار ہو کر وہاں پہنچ گئے ہیں۔"

کمانڈر نواز کا تفصیلی جواب سن کر میں کچھ دیر خاموش رہی' پھر بولی "میری غیر موجودگی میں شہریار نے کوئی نئی چال نہیں چلی؟ ان دنوں وہ کہاں ہے؟"

"اسلام آباد میں۔" کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ "اس عرصے میں وہ کراچی نہیں آیا۔"

"کسی اہم شخصیت نے تو اس دوران میں مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"جی ہاں' محترم وزیر داخلہ نے ایک بار فون کیا تھا۔"

"کیا جواب دیا تم نے؟"

"یہ کہ آپ آؤٹ آف سٹیشن ہیں اور ہمیں آپ کے پروگرام کا علم نہیں۔"

"ان دنوں ان کا قیام کہاں ہے؟"

"وہ بھی اسلام آباد میں ہیں۔"

"میرے لیے کوئی پیغام چھوڑا انہوں نے؟"

"وہ صرف یہ کہ جب آپ کراچی آ جائیں تو ان سے رابطہ قائم کر لیں۔"

"میرا خیال ہے کمانڈر نواز کہ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد تم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے' محترم وزیر داخلہ کو بھی اپنے ذرائع سے یہی معلوم ہوا ہے۔ غالباً وہ مجھے اسی سلسلے میں باخبر کرنا چاہتے ہوں گے۔ بہرحال ممکن ہے کوئی اور ہی قصہ ہو' میں ان سے بات کر لوں گی۔ ہاں یاد آیا وہ امریکی ایجنٹ جیفرسن ابھی تک گویا ہمارا مہمان ہے!" میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

"جی ہاں' آپ نے ابھی تک اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" کمانڈر نواز بولا۔

قاہرہ میں میرے ساتھ جو کچھ گزری' اس سے میں تم دونوں کو ابھی آگاہ کر دوں گی تاکہ نئی صورتحال میں تم لوگ بے خبر نہ رہو اور میرے نئے اقدامات کو فالو کر سکو۔ فی الحال جیفرسن کا معاملہ درپیش ہے۔ اس کا فیصلہ میں آج ہی کر دوں گی۔" یہ کہنے کے بعد میں نے مختصراً ان دونوں کو قاہرہ میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر دیا' پھر کمانڈر نواز کو مخاطب کیا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کمانڈر' اب ڈاکٹر رچرڈ اور اس کے گرگے میرا پیچھا نہیں کریں گے؟ اور عثمانی تم بھی تو کچھ بولو!"

"جی ہاں" عثمانی فوراً اٹھا۔ "جو حالات آپ نے بیان کیے ہیں' ان کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا

ہے کہ ڈاکٹر رچرڈ تجربے کی ناکامی کے بعد آپ کی طرف سے مایوس ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ امریکی ایجنٹ بلاسبب آپ کا پیچھا نہیں کریں گے۔

میں نے دانستہ ان دونوں کو یہ بتانا ضروری سمجھا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ مجھ سے اپنی ناپاک خواہشات کی تکمیل بھی چاہتا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ کی بابت انہیں بہرحال یہ علم تھا کہ وہ لوز کیریکٹر بھی ہے۔ عثمانی اپنے خیال کا اظہار کر چکا تو میں نے کمانڈر نواز کو بولنے کا اشارہ کیا۔

''عثمانی کی رائے سے میں جزوی طور پر متفق ہوں' کلیتہً نہیں۔'' کمانڈر نواز نے اپنی عادت کے مطابق محتاط الفاظ میں جواب دیا' پھر ذرا توقف سے اپنی بات کی وضاحت میں بولا۔ ''یہ بات بہرحال امریکی ایجنٹوں سے چھپی نہیں رہ سکے گی کہ تجربے کی ناکامی کے باوجود روسی ایجنٹ آپ کی طرف سے مایوس نہیں ہیں اور یہ کہ وہ آپ کے ذہن پر تجربات کرنا چاہتے ہیں' ممکن ہے جلد یا بدیر وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں کہ ابھی امکانات یکسر ختم نہیں ہوئے۔ یوں ایک بار پھر آپ کے سامنے دہرا خطرہ ہوگا۔ پھر وہ جو ایک مثل ہے نا کہ بلی کھائے نہیں تو اوندھا دے۔ اس کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ میری مراد یہ ہے کہ ایک تو انتقاماً' دوم اس لیے کہ دوسرے بلاک والے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائیں' امریکی ایجنٹ خدانخواستہ آپ کو قتل کر سکتے ہیں' ممکن ہے کہ وہ بلاسبب یہ دردسری مول نہ لیں مگر اس کا امکان بہرحال ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات تو خیر بالکل واضح ہے کہ آپ ہمیشہ سے تخریب کاری اور ملک دشمن سرگرمیوں کے خلاف ہیں۔ وہ لوگ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر ملک میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں اور آپ بہرحال قدم قدم پر انہیں ایسا کرنے سے روکتی رہی ہیں اور آئندہ بھی یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ وہ آپ کے ہاتھوں زک بھی اٹھا چکے ہیں اس صورت میں بھی ان سے ٹکراؤ ناگزیر ہے۔'' کمانڈر نواز یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

میں نے اس کے تجزیے کو پوری توجہ اور انہماک سے سنا' درمیان میں کچھ نہ بولی۔ جب وہ اپنی بات پوری کر چکا تو میں نے کہا۔ ''کمانڈر! میری دانست میں تم نے تقریباً وہی باتیں کی ہیں جن پر میں غور کر چکی ہوں۔ تمہارے اور میرے تجزیے میں زیادہ فرق نہیں' لیکن حالات کا یہ صرف ایک رخ ہے۔ موشوروف کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ کیا وہ ایک ٹیلی پیتھ ہونے کے سبب ڈاکٹر رچرڈ سے زیادہ خطرناک نہیں؟''

''جی ہاں' مگر ڈاکٹر رچرڈ اور اس میں فرق ہے' رویے اور طریقہ کار کا فرق! ڈاکٹر رچرڈ اور دیگر امریکی ایجنٹوں کی طرح اس نے اب تک اوچھے اور گھٹیا ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے۔ آئندہ کیا صورت رہے گی' ظاہر ہے قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں تک اس کے ٹیلی پیتھ ہونے کا تعلق ہے تو آپ خود بتا چکی ہیں کہ اس کے باوجود قاہرہ میں وہ آپ کو تلاش نہیں کر پایا اور یہ بھی کہ آپ کے ٹریپ میں آ گیا۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ آپ کا ذہن پڑھنے میں بھی ناکام رہا۔ گویا اگر آپ چاہیں تو وہ آپ کے ذہن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ ٹیلی پیتھی کے فن کی بابت جہاں تک مجھے علم ہے' کسی ٹیلی پیتھ کے لیے بھی ہر ذہن پڑھ لینا ممکن نہیں ہوتا۔''

کمانڈر نواز کی بات سن کر مجھے ایک اچھا نکتہ سوجھ گیا جو میرے آئندہ لائحہ عمل میں مفید ثابت

ہو سکتا تھا۔ میں نے پہلے اسے اپنے آئندہ لائحہ عمل سے باخبر کیا' پھر بولی ''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ اب میں اپنی کوٹھی ہی میں قیام کرنا چاہوں گی اور اس ضمن میں ضروری حفاظتی انتظامات سے بھی تمہیں آگاہ کر چکی ہوں۔ سو میں کوٹھی کے اندر اور باہر سیل کے ایسے ارکان کا انتخاب کرنا چاہتی ہوں جو مضبوط قوت ارادی کے مالک ہوں اور ان کے ذہن پڑھے نہ جا سکیں۔ ایسے ارکان کا انتخاب مشکل تو ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ حتمی طور پر ظاہر ہے کچھ بھی کسی کے متعلق نہیں کہا جا سکتا' لیکن ارکان کے گزشتہ ریکارڈ اور کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ انتخاب کسی حد تک ممکن ہے۔ ہاں ایک بات شاید میں بھول جاؤں' تم وہ بھی نوٹ کر لو! میرے ذاتی ملازمین کی فہرست سیل کے ریکارڈ میں ہوگی۔ اس میں ان کے نام' پتے اور دیگر تفصیلات درج ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اگر وہ لوگ دوبارہ میری ملازمت میں آنا پسند کریں تو انہیں تلاش کر کے میرے پاس کوٹھی پر بھیج دیا جائے۔ ویسے مجھے امید یہی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا' چاہے اس دوران میں وہ کہیں اور ہی ملازمت کیوں نہ کر چکے ہوں۔ تم لوگ میرے آئندہ اقدامات کے بارے میں سب کچھ سمجھ گئے یا کوئی ابہام باقی ہے؟ میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ابہام تو خیر کوئی نہیں......کمانڈر نواز کچھ کہتے کہتے رک گیا۔''

''ہاں ہاں کہو نا بلا جھجک اپنے خیال کا اظہار کرو!'' میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ ''ممکن ہے تمہارے خیال سے مجھے اتفاق نہ ہو' اس کے باوجود میں تمہاری بات سننا چاہتی ہوں۔''

''میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ جس طرح گزشتہ کچھ عرصے سے آپ انتہائی محتاط قدم اٹھا رہی ہیں...یعنی یہ کہ آپ کا قیام زیادہ تر یہیں اسی عمارت میں رہے' اگر مزید کچھ دن......''

''میں سمجھ گئی تمہاری بات کمانڈر!'' میں نے مسکرا کر کہا' ''تم مجھے ممکنہ خطرات سے بچانا چاہتے ہو...... زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں صرف اتنا کہوں گی کہ اب یہاں سے میری طبیعت اوب چکی ہے' خطرات کے باوجود میں کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں' میں وہی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں جو پہلے بسر کرتی تھی۔ پھر بھی اگر کوئی ایسا وقت آ ہی گیا کہ مجھے دوبارہ روپوشی اختیار کرنا پڑی تو یقین کرو میں اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بناؤں گی' بہرحال یہ عمارت بھی میری ہی ملکیت ہے اور اس سے وابستہ افراد بھی میرے اپنے ہیں۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ قدرے جذباتی ہوگیا۔ ''اب مطمئن ہوئے تم؟''

وہ میرے جاں نثار تھے' مجھ سے محبت کرتے تھے' میرے لوگ تھے' میں ان کے جذبات کی قدر کرتی تھی۔ ہمیشہ ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ مجھے خطرات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میرے سوال کے جواب میں کمانڈر نواز نے اثبات میں سر ہلایا' پھر بولا۔ ''انشاء اللہ کل دوپہر کے بعد تک آپ کے احکام کی تعمیل ہو جائے گی اور آپ اپنی کوٹھی میں قیام کر سکیں گی۔''

''ٹھیک ہے' اب تم دونوں جا سکتے ہو۔''

میری اجازت ملتے ہی وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ان کے سپرد خاصا کام کر دیا تھا جسے بہرحال کل تک پورا ہونا تھا اس لیے انہیں مزید اپنے پاس بٹھائے رکھنا' وقت کا زیاں ہی ہوتا۔ یوں

بھی میں تمام ضروری باتیں کر چکی تھی۔ اس کے علاوہ میں فون پر محترم وزیر داخلہ سے بھی بات کر لینا چاہتی تھی۔ ان دونوں کے جاتے ہی میں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا اور انٹر کام پر ڈیوٹی روم سے رابطہ قائم کر کے اپنے کمرے میں موجود ٹیلی فون سیٹ پر لائن لے لی تاکہ براہ راست اسلام آباد سے بات کر سکوں۔ اس وقت ڈائریکٹ ڈائلنگ کا نظام متعارف نہیں ہوا تھا۔ ٹرنک کال کے لیے خاصا خوار ہونا پڑتا تھا اور لائن فوراً نہیں ملتی تھی۔ میں نے ایکسچینج کو نمبر بتاتے ہوئے مصلحتاً یہ بھی بتا دیا کہ یہ کس کا نمبر ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ آپریٹر مجھے جلدی لائن دے دے اور میری یہ توقع پوری ہوئی۔ نصف گھنٹے بعد ہی میں فون پر وزیر داخلہ سے بات کر رہی تھی۔

''ہاں بھئی عذرا' تم کہاں آؤٹ آف سٹیشن تھیں؟'' انہوں نے حسب معمول شفقت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''آؤٹ آف سٹیشن تھی اور آج ہی یہاں پہنچی ہوں۔'' میں ان سے بلا سبب رازداری برتنے سے اجتناب کرتی تھی۔'' بس اچانک مصر جانا پڑ گیا۔ آپ فرمائیں' میرے لائق کیا خدمت ہے؟ مجھے یہاں آتے ہی آپ کا پیغام مل گیا تھا۔''

''پرسوں غالباً میں کراچی پہنچوں' ابھی کچھ طے نہیں' ممکن ہے مجھے ڈھاکہ جانا پڑے۔ اگر وہاں کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا تو پھر کراچی یقیناً آؤں گا۔ تم سے جو بات کرنا ہے' ذرا تفصیل طلب ہے اس لیے بالمشافہ ملاقات ضروری ہے۔ کل شام تک یہ طے ہو جائے گا کہ مجھے ہی ڈھاکہ جانا ہے یا بغیر میرے جائے کام چل سکتا ہے۔ تم اگر فون پر اویلیبل نہ بھی ہوئیں تو میں تمہارے لیے پیغام چھوڑ دوں گا۔''

میں سمجھ گئی کہ فون پر گفتگو کرنے سے وہ گریز کر رہے ہیں اس لیے بولی۔ ''بہتر ہے' میں آپ کے فون کا انتظار کروں گی۔ کوئی اور حکم؟''

''ایسے لہجے میں بات نہ کرو!'' انہوں نے مجھے محبت سے ڈانٹ دیا'' یہ نہ بھولا کرو کہ میں تمہیں اپنی بچیوں کی طرح سمجھتا ہوں اور بچیوں کو حکم نہیں دیا جاتا! انہیں شفقت و محبت سے ہر بات سمجھائی جاتی ہے۔ خدا حافظ! اسی طرح کے الفاظ وہ پہلے بھی کئی بار کہہ چکے تھے۔

پھر انہوں نے مجھے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور میں مسکرا کر رہ گئی۔ ٹیلی فون کی لائن بے جان ہو چکی تھی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور ان کے دورہ ڈھاکہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ دورہ بے سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ کمانڈر نواز کی رپورٹ کے مطابق مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں یقیناً کوئی گڑبڑ شروع ہو چکی تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ خطہ زمین مغربی پاکستان سے انتہائی فاصلے پر ہونے کے باوجود ایک نظریاتی اخوت کا امین تھا۔ وہاں کی سیاسی صورتحال سے میں بخوبی واقف تھی۔ سرحدوں پر کیا صورت تھی' اس سے بھی ناآشنا نہیں تھی۔ بنگال اپنے باطن اور ظاہر میں کیا تھا' اس کا مشاہدہ بھی میں کئی بار کر چکی تھی۔ ماضی میں پاکستان کے لیے اس خطے نے کیا قربانیاں دی تھیں' یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ وہاں کا افلاس بھی میری نظر میں تھا اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ ہمارے حریف اس خطے کے باسیوں کو کس طرح ایکسپلائٹ کر سکتے ہیں؟

میں ابھی انہی باتوں پر غور و فکر کر رہی تھی کہ انٹر کام کی بیل بج اٹھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

''باجی! میرا خیال ہے کہ جب سے آپ آئی ہیں' اپنے کمرے ہی میں بند ہیں اور آپ کو باہر کے موسم کی کچھ خبر نہیں۔'' یہ ذکیہ تھی۔

''باہر کے موسم کو کیا ہوا؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''سچ باجی' بڑی مزیدار پھوار پڑ رہی ہے۔ میں نے ابھی باہر نکل کر دیکھا تھا۔'' وہ بولی۔ ''ایسے میں کہیں گھومنے چلیں نا۔''

''کھانا کھا لیا تم نے؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا' پھر شرارت بھرے لہجے میں بولی۔ ''آپ اگر اجازت دے دیں تو یہاں کے کچن میں جا کر پکوڑے وغیرہ تل لوں۔''

''ذکیہ!''

''جی ارشاد۔''

''شرارت نہیں' اس بات کو ذہن میں رکھو کہ یہ بہرحال گھر نہیں ہے۔''

''تو پھر گھر کب چلیں گی؟'' وہ بچوں کی طرح ٹھنکی۔

''تم سے کل تک صبر نہیں ہو رہا' کہا تھا نا میں نے کہ کل چلیں گے۔''

''اور آج کا پروگرام آپ نے گول کر دیا؟''

''کون سا پروگرام؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''آج تو کوئی پروگرام نہیں تھا!''

''نہیں تھا تو بنا لیجئے نا! پلیز باجی دی گریٹ۔''

''اچھا کہو' کہاں چلو گی؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کہیں بھی...... بس یہاں سے باہر نکلنے کو جی چاہ رہا ہے۔ کچھ اور نہیں تو لانگ ڈرائیونگ ہی سہی۔''

''دماغ درست ہے تمہارا؟ بارش کے موسم میں لانگ ڈرائیونگ......؟ بارش تیز ہو گئی اور کہیں گاڑی پھنس گئی پھر؟''

''پھر تو سچ اور بھی مزہ آئے گا۔ گاڑی وہیں لاک کر کے چھوڑ دیں گے اور چھم چھما چھم بارش میں بھیگتے ہوئے......''

''ملک عدم سدھار جائیں گے!'' میں نے بظاہر خفگی سے کہا۔ ''بے وقوف کہیں کی!''

''آپ ہی کی بہن ہوں' اب جو چاہے کہہ لیں۔''

جواباً میں نے اسے ایک بار پھر ڈانٹ پلائی۔ وہ خاصے موڈ میں لگ رہی تھی اور میں اندازہ لگا چکی تھی کہ اس وقت وہ ٹالے نہیں ٹلے گی۔ یہی سوچ کر میں نے کہا ''اچھا تم لباس وغیرہ تبدیل کر لو' میں خود تمہارے پاس آتی ہوں۔''

''تھینک یو ویری مچ!'' وہ اپنی کامیابی پر یقیناً خوش ہو گئی اور انٹر کام کا سلسلہ منقطع کر دیا' غالباً

اس خوف سے کہ کہیں میں اپنا ارادہ نہ بدل دوں!

میں نے انہی باتوں سے بچنے کے لیے اب تک گھرداری کا جھگڑا نہیں پالا تھا اور ذکیہ کو بھی خود سے دور دور رکھا تھا۔ میرے سامنے زندگی کے کچھ اور مقاصد تھے جن کے حصول کی خاطر میں کسی کو بھی اپنے پاؤں کی زنجیر بنانا نہیں چاہتی تھی۔ میرا دل بھی جذبات سے خالی نہیں تھا اور نہ یہ کہ میں محسوسات سے عاری تھی مگر حالات کا تقاضا کچھ اور تھا۔ بقول فیض احمد فیض میں اس کی قائل تھی کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا! کسی بھی شخصیت کی تعمیر میں زندگی کے متعلق اس شخصیت کے تصور و خیال کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ پہلا درجہ خیال ہی کا ہے' اس کے بعد عمل کی نوبت آتی ہے گویا بالفاظ دیگر آدمی کا عمل اس کے خیال ہی کا پرتو ہوتا ہے۔ کچھ یہی معاملہ میرے ساتھ تھا۔ سو اسے ایثار و قربانی کا نام دیا جائے یا میری مجبوری تصور کیا جائے' میں بہرحال اپنے خیال و فکر کے دائرے کو نہیں توڑ سکتی تھی۔ اسی دائرے میں رہ کر میں زندگی کے تمام رنگ محسوس کر رہی تھی۔ رنگ تو یوں بھی میری کمزوری تھے۔ مصوری سے میری دلچسپی بے سبب تو نہیں تھی' لیکن کبھی میں نے اپنے اس شوق کو رسوا نہیں کیا تھا۔ میں اس سے آگاہ تھی کہ شوق بہ ہر رنگ رقیب سرو ساماں ہوتا ہے! ذکیہ کو بھی بہت سے شوق تھے جن میں سیر و تفریح اور سیاحت کا شوق سرفہرست تھا۔ میں اس کے مزاج سے واقف تھی اسی لیے اس وقت اس کی بات مان لی تھی۔

حفاظتی انتظامات کے بارے میں کمانڈر نواز کو میں نے جو ہدایات دی تھیں' انہیں کے پیش نظر اسے آگاہ کرنا ضروری تھا کہ میں' ذکیہ کے ساتھ کہاں جا رہی ہوں! سو لباس تبدیل کرنے سے پہلے میں نے اسے انٹرکام پر مطلع کر دیا۔ جب میں' لباس تبدیل کر کے ذکیہ کے کمرے میں پہنچی تو وہ مجھے تیار ملی۔

"پھوار پڑنا تو بند ہو گئی بنو اب کیا ارادے ہیں؟" میں نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔ "کیوں نہ پروگرام منسوخ کر دیا جائے؟"

"مجھے معلوم ہے' آپ مجھے اپنی عادت کے مطابق ستا رہی ہیں ورنہ یہاں تک آنے کی زحمت ہرگز گوارا نہ کرتیں۔ بس اب چلیں' کراچی کے موسم اور کراچی کے بندے بندیوں سے تنگ آ کر ہی تو میں نے قاہرہ میں ڈیرا ڈال رکھا ہے جہاں نہ موسم بے اعتبار ہے نہ بندے!"

"بس رہنے دو اپنے قاہرہ کی تعریفیں!" میں نے اس کے ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"دیکھا ہے تمہارا قاہرہ بھی اور وہاں کے بندے بھی!" باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں ڈیوٹی روم تک پہنچ گئے۔ کمانڈر نواز نے سپورٹس کار کی چابی میری طرف بڑھا دی۔

"شکریہ!" میں نے چابی لیتے ہوئے کہا اور پھر ڈیوٹی روم سے باہر نکل آئی۔

"یہ جو آپ کے بندے ہیں سب کے سب آپ ہی کی طرح پراسرار ہیں۔" ذکیہ نے سپورٹس کار کی طرف بڑھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"ہوں گے' تمہیں ان سے کیا لینا! میں نے اسے ٹال دیا اور کار کے قریب پہنچ کر اس کا دروازہ کھولنے لگی۔

"ویسے باجی یہ عمارت بھی کم پراسرار نہیں ہے۔"

"تو آخر میں کیا کروں' ہے تو ہونے دو نا! تمہارے ذہن پر تو بس ایک لفظ مسلط ہو گیا ہے' یہ

پراسرار ہے! تم کیوں یہ بور باتیں کر کے اپنی تفریح غارت کرنا چاہتی ہو...... چلو بیٹھو!"

"تو اس طرح تو نہ ڈانٹیں نا!" یہ کہتے ہوئے وہ کار میں بیٹھ گئی۔

"اور سنو ذکیہ' یہ بات میں انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں کل کے بعد تم اس عمارت' اس کے مکینوں وغیرہ کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کرو گی' میں نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "اس عمارت کے محل وقوع کا ذکر بھی تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہئے' کسی بھی صورت میں' اگر مجبور نہ ہوتی تو میں تمہیں قاہرہ سے ہرگز یہاں نہ بھیجتی۔"

"اب آپ مجھے اتنی بچی بھی نہ سمجھیں نا!" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "مجھے جس کار میں ایئرپورٹ سے یہاں لایا گیا تھا' اس کے شیشے دھندلے تھے تاکہ مجھے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ عمارت کہاں واقع ہے! اب میں اتنا تو سمجھتی ہوں' آخر آپ کی چھوٹی بہن ہوں!"

"تو اے عزیز از جان' چھوٹی بہن صاحبہ! یہ موضوع ختم...... اب اچھی اچھی پیاری پیاری باتیں کرو۔" میں نے اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا خاک پیاری پیاری باتیں کروں' موڈ تو آپ نے چوپٹ کر دیا' آپ کے ساتھ یہی تو مصیبت ہے کہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ہو جاتی ہیں۔ بس سارے زمانے کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتی ہیں۔ آدمی اچھا خاصا ہنس بول رہا ہے کہ آپ اسے رونے پر مجبور کر دیں گی بلکہ دلائل سے یہ ثابت کر دیں گی کہ یہ وقت واقعی رونے ہی کا ہے اور دوسرے لمحے اس سے کہیں گی کہ تم ہنستے کیوں نہیں؟ ہنسنا تو صحت کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ جو لوگ بغیر ہنسے اس عالم فانی سے کوچ کر جاتے ہیں' قبر میں ان پر سخت عذاب ہوتا ہے اور آخرت میں بھی جواب طلبی ہوتی ہے کہ اے بندے یا بندی جب ہم نے تجھے ہنسنے کی صلاحیت عطا کی تھی تو ساری زندگی تو روتا کیوں رہا؟"

ظاہر ہے کہ میں ذکیہ کی ان باتوں پر ہنس ہی سکتی تھی' سو ہنستی رہی۔ ذکیہ بھی میرا ساتھ دیتی رہی چھوٹی ہونے کے باوجود میں نے اسے اتنی آزادی دے رکھی تھی کہ وہ کھل کر مجھ پر تنقید کر سکے۔ دل میں غبار رکھنے سے یہ بہتر ہے کہ کسی طرح کتھارسس ہو جائے بہرحال اب ذکیہ دوبارہ ڈھب پر آ گئی تھی۔

موسم واقعی اچھا تھا۔ ذکیہ کے ساتھ میں بھی انجوائے کر رہی تھی۔ آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی عمارت اب بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ میں دانستہ سلو ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

"بھوک تو نہیں لگ رہی تمہیں؟" میں نے ایک سڑک پر گاڑی موڑتے ہوئے ذکیہ سے پوچھا۔

"ہاں لگ تو رہی ہے مگر...... مگر آپ مانیں گی نہیں۔"

"کیا نہیں مانیں گی' میں نے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے کہا' پھر اس کی عادت کو مدنظر رکھتے ہوئے بولی "اگر تم کسی ٹھیلے کے پاس گاڑی رکوا کر چاٹ واٹ کھانے کے موڈ میں ہو تو میں واقعی تمہاری بات نہیں مانوں گی۔"

"کر دیا نا آخر آپ نے سارے ڈرامے کا ڈراپ سین...... ویسے آپ یہ کدھر چل رہی

ہیں؟"

"کیوں کیا تم کراچی کے راستے بھول گئیں؟"

"یاد تو ہیں راستے لیکن مجھے کچھ گڑ بڑ لگ رہی ہے۔ کہیں آپ مجھے سیر سپاٹا کرانے کے بہانے اپنے کسی کام سے تو نہیں جا رہیں؟"

"ایسا نہیں ہے بے وقوف! میں تمہاری ہی خاطر باہر نکلی ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "ایک شناسا ہے میرا' بہت دلچسپ شخصیت کا مالک ہے' شگفتہ مزاج اور ذہین...... کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا' تعلقات محض واقفیت کی حد تک ہیں' وہ بھی یک طرفہ۔ میں تو اس کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں مگر وہ میرے متعلق بہت کم جانتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ جب میں یکسانی سے اوب جاتی ہوں تو کبھی کبھار اس سے مل لیتی ہوں۔" پھر میں نے اسے ملک دلاور کے بارے میں بطور تعارف مختصراً کچھ باتیں بتا دیں اور پھر مزید بولی "اس وقت ہم اسی کے ہاں چل رہے ہیں' بہر حال میں یہ ذمہ ضرور لے سکتی ہوں کہ تم وہاں بور نہیں ہو گی اور یہ تمہیں خود ہی وہاں پہنچ کر معلوم ہو جائے گا کہ مجھے اس سے کوئی کام نہیں تھا۔"

"تو گویا اس شخص کی حیثیت درباری مسخرے کی سی ہے۔ جب آپ بور ہوں تو آپ کا موڈ بحال کر دے۔" ذکیہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اب تم اسے اتنا انڈر اسٹیمیٹ بھی نہ کرو' میرے باب میں وہ پُرخلوص ہے۔ اگر ہمارے معاشرے میں عورت اور مرد کے درمیان دوستی کو معیوب تصور نہ کیا جاتا' اسے کوئی اور معنی نہ پہنائے جاتے تو میں اس شخص کو دوست کہنے میں زیادہ عار محسوس نہیں کرتی۔"

ایسی ہی باتوں میں راستہ کٹ گیا اور میں ملک دلاور کی کوٹھی تک پہنچ گئی۔ ملک دلاور کے متعلق میں نے ذکیہ کو یوں بھی پہلے سے آگاہ کر دیا تھا کہ کہیں وہ پٹڑی سے اتر جائے تو ذکیہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

ملک دلاور کے ملازم نے ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کی بجائے بیڈ روم میں پہنچا دیا۔ اس کا سبب ملازم پہلے ہی بتا چکا تھا ملک دلاور بیمار تھا' ہم دونوں خواب گاہ میں داخل ہوئے تو وہ ایزی چیئر پر پیروں پہ کمبل ڈالے کسی سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سلگتی ہوئی سگریٹ تھی' چہرے سے قدرے اضمحلال نمایاں تھا۔ اس عالم میں وہ ملک دلاور کی بجائے کوئی اور ہی شخص معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر چونکا' وش کیا اور پھر کرسی سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"بیٹھے رہو!" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی اس پر ایک فقرہ چست کر دیا۔

"آج تو تم خاصے دیوداس معلوم ہو رہے ہو" فقرہ چست کرنے سے میرا مقصد محض یہ تھا کہ اگر وہ بیماری سے بیزار ہو چکا ہے تو اپنی اصل مزاجی کیفیت کی طرف لوٹ آئے۔

وہ بھلا کہاں فقرہ ہضم کرنے والوں میں سے تھا' فوراً بول اٹھا "دراصل دیوداسیاں نہ ہوں تو دیوداس بننا ہی......"

"اس سے ملو' یہ میری چھوٹی بہن ذکیہ ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اور ذکیہ یہ

ملک دلاور......"

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ذکیہ ہی نے بولنے میں پہل کی "میرا خیال ہے ملک جی کہ رسمی جملوں کا تبادلہ آرام سے بیٹھ جانے کے بعد ہو سکتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو کم از کم میں بیٹھ جاؤں؟"

"ضرور ضرور! تشریف رکھیے!" ملک دلاور نے قریب ہی پڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ملک دلاور پھر ذکیہ سے مخاطب ہوا۔ "اگر آپ اسے رسمی بات نہ کہیں تو مجھے سچ مچ آپ کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ آج پہلی مرتبہ آپ کی باجی جی نے مجھے اپنے کسی رشتے دار سے ملوایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ آ گئی۔

ملک دلاور مزید کچھ کہنے والا تھا کہ ذکیہ بول اٹھی "معاف کیجئے گا ملک جی' میں ان کی چھوٹی بہن ہوں' رشتے دار نہیں۔"

"میرا تو خیال تھا کہ بہن سے بھی رشتہ ہوتا ہی ہے اسی لیے......"

"تم لوگ یہ کیا باتیں لے بیٹھے!" مجھے بولنا ہی پڑا اور میں نے ملک دلاور سے پوچھا "کیا بیمار ہو تم؟" میرا مطلب ہے کہ معمولی بخار وخار ہے یا......"

"بس یہی سمجھ لیں' کوئی خاص بات نہیں۔"

"تم ٹال کیوں رہے ہو مجھے' بتاؤ نا ڈاکٹروں نے کیا تشخیص کیا ہے؟"

"یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ بخار کوئی بیماری نہیں بلکہ کسی نہ کسی بیماری کی علامت ہوتا ہے۔ تو ابھی اس کا سبب معلوم نہیں ہوا ابھی ٹیسٹ وغیرہ ہو رہے ہیں' بخار ٹوٹ نہیں رہا...... خیر چھوڑیں اس ذکر کو' دن بھر یہی قصہ کہانی ہوتی رہتی ہے' آپ سنائیں بڑے دن بعد اس فکیر کا خیال آیا!"

میں یہ بات نوٹ کر رہی تھی کہ ملک دلاور بہت سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا کہ کہیں کوئی ایسا لفظ نہ بول جائے جس میں قاف آتا ہو' مگر غچہ کھا ہی گیا۔ باتوں کی رو میں اور کسی قدر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے وہ قصے کو "کصہ" اور "فقیر" کو "فکیر" کہہ گیا تھا۔ میں عموماً اس مسئلے میں اسے نہیں بخشتی تھی' لیکن اس وقت بیماری کا مارجن دیتے ہوئے میں نے براہ راست "کھنچائی" سے گریز کیا اور بولی۔ "ملک دلاور تمہاری بات سن کر اس وقت ایک بہت پرانا لطیفہ یاد آ رہا ہے مگر بعض لطیفے پرانے ہونے کے باوجود بعض شخصیتوں کے حوالے سے نئے ہو جاتے ہیں تم بھی سنو ذکیہ' بڑا مزیدار لطیفہ ہے۔" یہ کہتے ہی میں نے بغیر لطیفہ سنانے لگی۔ "ایک کشتی میں' ایک امیر اور ایک فقیر سفر کر رہے تھے۔ فقیر کے سر میں شدید خارش تھی۔ وہ بار بار دونوں ہاتھوں سے اپنے گنجے سر کو کھجا رہا تھا۔ امیر کی طبع نازک پر یہ منظر بہت گراں گزر رہا تھا۔ آخر اس نے ایک راہ نکال ہی لی۔ اس نے اشرفیوں سے بھری تھیلی نکالی اور فقیر سے کہا کہ اگر دوسرے کنارے تک پہنچنے سے پہلے تم سر نہ کھجاؤ تو میں تمہیں دو اشرفیاں دے سکتا ہوں' فقیر فوراً اس پر راضی ہو گیا اور امیر سے دو اشرفیاں لے لیں مگر ذرا ہی دیر بعد پھر سخت خارش ہوئی اور اس کا ہاتھ سر کی طرف بڑھنے لگا۔ امیر نے اسے ٹوکا اور پھر مزید دو اشرفیاں اس کی طرف بڑھا دیں۔ فقیر نے کسی نہ کسی طرح اپنے اوپر قابو پا لیا اور سر کھجانے سے باز رہا۔ ایسا ہی وقفے وقفے سے دو مرتبہ مزید ہوا۔ فقیر' اشرفیاں

کماتا رہا اور کشتی کنارے کے قریب پہنچ گئی۔ فقیر کی قوت برداشت اب جواب دے چکی تھی وہ چیخ اٹھا اے امیر! چاہے تو مجھے اشرفیوں سے بھری پوری تھیلی دے دے' میں سر ضرور کھجاؤں گا' پھر وہ فکیر اشرفیاں پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کھجانے لگا۔''

ذکیہ نے یقیناً یہ لطیفہ نہیں سنا تھا اس لیے وہ خوب زور سے ہنسی۔ ملک دلاور بھی خجالت آمیز انداز میں ہنسنے لگا اور میں تو لطیفہ سنا کر ہنس ہی رہی تھی۔

آج تم پر پے در پے پوائنٹ ہو رہے ہیں اس لیے مزہ نہیں آ رہا' ہم لوگ چلتے ہیں۔'' میں ہنستے ہوئے کہنے لگی بقیہ آئندہ سہی۔''

''مگر ابھی تو آئی ہیں آپ...... اور پھر یہ کیا سوچیں گی کہ چائے تک کو نہیں پوچھا۔ اس نے ذکیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایسا بھی کیا ہوائی دورہ۔''

میں نے محسوس کیا کہ ذکیہ مزید رکنے کے موڈ میں ہے اس لیے صرف چائے کی حد تک اس کی بات مان لی۔ خلاف معمولی چائے لے کر آنے والی ایک بڑی بی تھیں' جنہیں پہلے میں نے اس گھر میں نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ان بڑی بی کا چہرہ مانوس سا لگا جیسے انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ اس شبہے کی تصدیق یوں بھی ہوگئی کہ وہ بھی مجھے دیکھ کر چونکی تھیں۔ ٹی ٹرالی سے کپ' چائے دانی وغیرہ نکال کر ہمارے سامنے رکھنے کے بعد بڑی بی فوراً ہی کمرے سے چلی گئی تھیں۔ ذکیہ ساتھ نہ ہوتی تو شاید میں ان بڑی بی کے بارے میں ملک دلاور سے کچھ پوچھ گچھ کر لیتی۔ بہرحال کچھ دیر کو میرا ذہن الجھ سا گیا۔ چائے پینے کے دوران میں بھی میری طرف سے اور دلاور کی جانب سے تھوڑی بہت فقرے بازی ہوتی رہی اور ذکیہ بھی پیچھے نہ رہی مگر میرا ذہن انہی بڑی بی میں الجھا رہا۔ وہ چہرہ میں نے کب اور کہاں دیکھا تھا' مجھے یاد نہیں آ رہا تھا اور یہی میری الجھن کا سبب تھا۔

ملک دلاور کی کوٹھی سے واپسی میں دانستہ میں نے ان بڑی بی کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا کہ ہوں گی کوئی' فی الحال مجھے دیگر اہم مسائل درپیش ہیں۔ میری توجہ ان مسائل کی طرف ہونی چاہیے۔ انہی میں سے ایک مسئلہ باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن کا تھا۔ میں نے کمانڈر نواز سے کہا تھا کہ میں آج اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لوں گی۔

آپریشن سیل ہیڈکوارٹر واپس آنے کے بعد میں نے اور ذکیہ نے رات کا کھانا ساتھ کھایا' پھر میں ذکیہ کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر چلی آئی۔

جیفرسن کی حسین و جمیل بیوی سوزی قاہرہ میں اپنی بے راہ روی کے سبب ڈاکٹر رچرڈ کے ہاتھوں ہلاک ہو چکی تھی۔ جرمن سائنس دان شیفرڈ کے ساتھ میں نے بھی اسے پرانے قاہرہ کی ایک عمارت میں دیکھا تھا' میں ذکیہ کی تلاش میں وہاں پہنچی تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ نے کسی سبب شیفرڈ کو تو بخش دیا تھا لیکن سوزی کی بے وفائی وہ برداشت نہیں کر سکا تھا ان واقعات کا تفصیلی ذکر میں گزشتہ قسطوں میں کر چکی ہوں۔ جیفرسن اس سبب ڈاکٹر رچرڈ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ جیفرسن کی اس کہانی میں کتنی حقیقت تھی اور وہ کس غرض سے میری پناہ میں آیا تھا' اس سے قطع نظر میں اسے یہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیوی کو قتل کیا جا چکا ہے۔... بہرحال یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ ممکن ہے وہ بے وفائی کے باوجود حقیقتاً اپنی بیوی سے

عشق کرتا ہو۔ ایسی صورت میں یہ اطلاع اس کے لیے بہرحال صدمے کا سبب بنتی۔ عشق کی اس سچی یا جھوٹی کہانی پر اگر میں یقین نہ کرتی اور مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ اس شخص نے مجھ سے پناہ مانگی ہے تو معاملہ بالکل سیدھا سادھا تھا۔ میرے نزدیک وہ بہرحال مجرم تھا۔ وہ ان لوگوں کا ساتھی تھا جو میرے ملک کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں ملوث تھے۔ سیل کے ارکان نے اسے اس وقت پکڑا تھا جب وہ میری کوٹھی میں دستی بم پھینکنے والا تھا۔ ایسے میں نے اب تک قیدی کی حیثیت سے اس لیے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر میں رکھا ہوا تھا کہ وقت اور موقع ملنے پر بطور مہرہ اپنے حریفوں کے خلاف اس کے ذریعے کوئی چال چل سکوں۔ نئی صورتحال میں وہ میرے لیے زیادہ اہم نہیں رہا تھا۔ مہرے تو اسی وقت تک اہم ہوتے ہیں جب تک بساط پر ہوں۔ جیفرسن کی حیثیت اب ایک پٹے ہوئے مہرے کی سی تھی۔ میں نے اس لیے اس شب یہ فیصلہ کیا کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر جیفرسن کو قانون کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اپنے اس فیصلے سے میں نے کمانڈر نواز کو بھی آگاہ کر دیا۔

دوسرے دن صبح میں دیر سے سو کر اٹھی' کمانڈر نواز میرے لیے پیغام چھوڑ کر جا چکا تھا۔ آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے کوٹھی میں میری منتقلی کے تقریباً تمام انتظامات وہ مکمل کر چکا تھا۔ اس کی جگہ اب عثمانی چارج لے چکا تھا اور بقیہ جو انتظامات رہ گئے تھے' اس کے سپرد تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ پروگرام کے مطابق دوپہر کے بعد آپ یہاں سے اپنی کوٹھی کے لیے روانہ ہو سکیں گی۔ پھر جب میں اسی دن دوپہر کو اپنے کمرے میں ذکیہ کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی تو انٹرکام پر عثمانی نے مجھے گویا ''اوکے'' کا سگنل دے دیا۔ ذکیہ کو میں پہلے ہی بتا چکی تھی کہ غالباً کھانا کھا کر ہم لوگ یہاں سے چل دیں گے۔ یہ سن کر اس نے زور سے ''اللہ تیرا شکر'' کہا تھا اور مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

کھانا کھا کر اور پھر چائے پینے کے بعد میں ذکیہ کو اپنے ساتھ لیے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے ڈیفنس روانہ ہو گئی۔

ڈیفنس میں جب اپنی کوٹھی کے گیٹ پر میں نے کار روکی اور جب ہارن بجانے پر گیٹ کھل گیا تو مجھے یوں لگا جیسے سب کچھ جوں کا توں ہو۔ میں نے بس ایک نظر چوکیدار کے چہرے پر ڈالی تھی جو ظاہر ہے سیل ہی کا ایک رکن تھا۔ مجھے علم تھا کہ عارضی طور پر میرے تمام ذاتی ملازمین کی جگہ سیل کے ارکان لے چکے ہیں۔ کار گیراج میں کھڑی کرنے کے بعد میں ذکیہ کے ساتھ اندر کوٹھی میں پہنچی تو کمانڈر نواز کے ذہن کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ کوٹھی ایک عرصے خالی پڑی رہی ہے۔

اپنے بیڈروم کے برابر والا بیڈروم میں نے ذکیہ کے حوالے کر دیا جو عموماً خالی پڑا رہتا تھا۔ ذکیہ وہاں اپنا سامان سیٹ کرانے لگی اور میں' کوٹھی کا ایک راؤنڈ لینے باہر آ گئی۔ کوٹھی کے نئے حفاظتی انتظامات میں مجھے بظاہر کوئی نقص نظر نہ آیا۔

شام ساڑھے پانچ بجے فون پر محترم وزیر داخلہ سے خود میری بات ہو گئی۔ ڈھاکہ جانے کا پروگرام توقع کے مطابق منسوخ ہو گیا تھا اور وہ کل صبح کی ایک فلائٹ سے کراچی پہنچ رہے تھے۔ فون پر انہوں نے آئندہ روز کی ملاقات کنفرم کر دی تھی۔ یہ ملاقات کل دوپہر سے پہلے گیارہ بجے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ہونا تھی' میری ہی ہدایت پر انہیں آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے کوٹھی کا فون نمبر دے دیا گیا تھا اور

میں ان کے فون کی منتظر تھی۔ ذکیہ کو میں نے پہلے ہی سونے کا بہانہ کر کے ٹال دیا تھا۔

وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی آئندہ روز میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچ گئی۔ ٹھیک گیارہ بجے مجھے محترم وزیر داخلہ کے سیکرٹری نے اندر بھیج دیا۔ عرصہ دراز کے بعد ان سے میری بالمشافہ ملاقات ہو رہی تھی۔ انہوں نے بڑی محبت و شفقت کا اظہار کیا۔ پھر گویا ہم دونوں ہی اصل موضوع پر آ گئے۔

"تمہارا کیا خیال ہے عذرا' غیر ملکی تخریب کار اب کہاں سرگرم عمل ہوں گے؟" انہوں نے سوال کیا۔

"میرے علم و اطلاع کے مطابق وہ لوگ یہاں سے راہ فرار اختیار کرنے کے بعد اب مشرقی پاکستان پہنچ گئے ہیں۔" میں نے واضح الفاظ میں جواب دیا۔

"ہاں وہاں کچھ گڑ بڑ ہے' مگر ابھی حتمی طور پر کوئی بات سامنے نہیں آئی کہ واقعی یہ وہی لوگ ہیں جو یہاں گڑ بڑ پھیلانا چاہتے تھے۔ ہاں اس غیر ملکی ایجنٹ سولومن کے متعلق ایک رپورٹ ضرور ہے کہ اسے ڈھاکہ میں دیکھا گیا ہے' مگر وہ پکڑا نہیں جا سکا۔ دراصل میری خواہش یہ تھی کہ ہم اپنے طور پر تو جو کچھ کر رہے ہیں' ٹھیک ہے تم بھی ذرا اس معاملے پر غور کر لو اور تمہارے لیے ممکن ہو تو خود ڈھاکہ چلی جاؤ۔ تم اگر چاہو گی تو تمہارے لیے حفاظتی انتظامات کا بندوبست بھی کر دیا جائے گا۔ میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ تمہارے مزاج سے واقف ہوں تم دو ایک بار پہلے بھی چند معاملات میں انکار کر چکی ہو کہ تمہیں کسی قسم کی مدد درکار نہیں۔ ہاں بولو' مجھے دو ٹوک جواب چاہیے۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ تو خود آپ بھی جانتے ہیں کہ میں آپ کا حکم ٹالنے کی جسارت نہیں کر سکتی۔" میں نے جواباً کہا۔ اس بار بھی آپ سے صرف یہی درخواست ہے کہ مجھے اپنے طور پر کام کرنے کی اجازت دے دیں۔"

"تم آخر یہ تکلف آمیز زبان استعمال کرنے سے باز کیوں نہیں آتیں!" انہوں نے محبت آمیز خفگی سے کہا۔

"اس لیے کہ میں بہر حال آپ کو اپنا بزرگ سمجھتی ہوں اور مجھے بچپن ہی سے بزرگوں کا ادب کرنا سکھایا گیا ہے۔"

وہ میری بات سن کر مسکرائے' پھر بولے "اچھا تو پھر تم کب تک وہاں جا سکو گی؟"

"فی الوقت تو میرے لیے کچھ کہنا مشکل ہے' لیکن یہ طے ہے کہ ایز پاسیبل میں ڈھاکہ پہنچوں گی۔ یوں بھی اس معاملے میں پہل میری ہی طرف سے ہوئی تھی۔ میری خود بھی یہی خواہش ہے کہ مجرم جلد از جلد پکڑے جائیں۔"

"کیا میں امید رکھوں کہ تم اس سلسلے میں مجھ سے رابطہ قائم رکھو گی؟"

"میری صاف گوئی کو معاف کیجئے گا' میں یہ وعدہ کرنے سے قاصر ہوں' بہر حال اس میں کوئی کلام نہیں کہ اپنے وطن کے خلاف کی جانے والی کسی بھی سازش اور تخریب کاری کو حتی الامکان کامیاب نہیں ہونے دوں گی اور اس سلسلے میں مجھے جب بھی قانون کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آئی تو اس سے گریز

نہیں کروں گی۔" میں نے پر جوش اور پر یقین لہجے میں کہا۔

"ہاں یاد آیا صدر مملکت سے میں نے بات کر لی تھی وہ تمہیں وقت دینے کے لیے راضی ہیں۔ اشارتاً میں نے ان سے کہا تھا کہ ملک میں تخریب کاری کے واقعات کا سبب ہماری غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی ہے اور ایک سپر پاور ایسا نہیں چاہتی۔ شہریار کے بارے میں بھی ان سے میری بات ہو چکی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں مجھے تحقیقات کی اجازت دے دی ہے۔ صدر مملکت نے مجھ سے کہا ہے' یہ معاملہ کیونکہ خارجہ پالیسی سے متعلق ہے اس لیے بہتر ہے کہ عذرا خان پہلے وزیر خارجہ سے مل لے۔"

"تو کیا وہ میرے نام سے آشنا ہیں؟" میرے لہجے میں حیرت بھی تھی اور ایک نوع کی طمانیت بھی!

"کیوں نہیں! کئی بار تو وہ مختلف معاملات میں میری زبانی بھی تمہارا نام سن چکے ہیں۔ میں انہیں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ تم میری اپنی بچیوں کی طرح ہو۔" ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔ "ہاں تمہیں یہ بتا دوں کہ صدر مملکت' آزادانہ خارجہ پالیسی کے سلسلے میں ہر رکاوٹ کو ختم کرنے کے حق میں ہیں' خواہ وہ کسی بھی سطح پر کیوں نہ ہو!"

"اگر ایسا ہے تو پھر نہ مجھے فی الحال محترم وزیر خارجہ سے ملنے کی ضرورت ہے نہ صدر مملکت سے۔ کبھی کسی مرحلے پر مجھے یہ ضرورت پیش آئی تو میں آپ سے عرض کر دوں گی۔" میں نے مودب لہجے میں کہا۔

اسی وقت صوفے کے قریب ہی ایک تپائی پر رکھے ہوئے انٹر کام کی بیل بج اٹھی۔ محترم وزیر داخلہ نے ذرا سا آگے جھک کر انٹر کام کا ریسیور اٹھا لیا' پھر دوسری جانب سے کچھ سن کر کہا۔ "ہاں ہاں اب بھیج دو!...... ٹھیک ہے مجھے یاد ہے۔"

ان کے آخری الفاظ سن کر میرے ذہن میں فوری طور پر یہی خیال آیا کہ غالباً انہیں کہیں جانا ہے یا کسی اور سے بھی ملنا ہے۔ پھر یہی بات میری زبان پر بھی آ گئی۔

"تو پھر میں اجازت چاہوں گی۔"

"ابھی خاصا وقت ہے' چائے پی کر جانا! آ رہی ہے چائے اور ابھی تو مجھے تمہاری امانت بھی تم تک پہنچانا ہے۔"

"امانت!"

"صدر مملکت نے یہ امانت مجھے تم تک پہنچانے کے لیے کہا تھا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک مہر بند لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "اسے احتیاط سے اپنے پرس میں رکھ لو۔"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ مہر بند لفافہ تھام لیا۔ اس پر ایوان صدر کی مہر تھی۔ یہ بات میرے لیے انتہائی اہمیت کی حامل تھی کہ صدر مملکت نے میرے لیے کوئی مہر بند پیغام بھیجا تھا' وہ بھی ایک ایسی شخصیت کے ہاتھوں جو خود بھی میرے لیے محترم تھی' میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے وہ لفافہ اپنے پرس میں رکھ لیا۔

☆......☆......☆

صدر مملکت کی طرف سے ملنے والا مہر بند لفافہ اپنے پرس میں رکھنے کے بعد میں نے اجازت طلب نظروں سے وزیر داخلہ کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھ گئے اور دوبارہ یاددہانی کرائی کہ چائے آ رہی ہے۔ دراصل اس مہر بند لفافے نے میرے ذہن کو الجھا دیا تھا اور میں جلد از جلد اسے کھول کر پڑھ لینا چاہتی تھی مگر وہاں نہیں۔ چند ہی لمحے بعد چائے آ گئی۔ چائے پینے کے دوران میں بنگال کی سیاسی صورتحال پر گفتگو ہوتی رہی' میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ وزیر داخلہ' بنگال سے متعلق حکومت کے نقطہ نظر کی وضاحت کر دینا چاہتے تھے' جس سے بڑی حد تک میں بھی متفق تھی۔ اس ضمن میں ذاتی طور پر مجھے جہاں جہاں اختلاف تھا' میں نے اس کا اظہار ضروری نہیں سمجھا۔ اختلاف رائے کو کسی بھی جمہوری معاشرے میں صحت مند رجحان تصور کیا جاتا ہے مگر اس کی بھی ایک حد متعین ہے۔ کسی بھی مسلے میں اور کسی سے بھی اختلاف رائے کے باوجود میں اس حد تے تجاوز نہیں کرتی تھی۔ حکومت کے اپنے معاملات تھے' معلومات کے ذرائع تھے اور اپنی حکمت عملی تھی۔ اس سے میرا اتفاق یا اختلاف کسی گنتی میں شمار نہیں تھا۔ ایک فارسی شاعر کے بقول ـ رموز مملکت خویش خسرواں دانند' یعنی مملکت کے رموز سربراہان مملکت خود جانتے ہیں۔

وزیر داخلہ سے ملاقات کے بعد میں' اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی عمارت سے باہر نکل آئی اور اپنی کار میں آ بیٹھی۔ وہاں سے اپنی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے عادت کے مطابق میں چوکنا اور محتاط تھی۔ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ میں آپریشن سیل کے حفاظتی دستے کے حصار میں ہوں' کوئی چاہے بھی تو مجھے معمولی سی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے یہ تمام انتظامات حالات کے پیش نظر کیے تھے۔ سیل کے ارکان میں پاکستان کے ہر صوبے کے افراد تھے اور میں ان کی صلاحیتوں اور مزاج سے بھی بخوبی آگاہ تھی۔ کمانڈر نواز عموماً ان کے روایتی مزاج اور صلاحیت کے مطابق ہی ان سے کام لیتا تھا۔ میرے حفاظتی دستے میں اکثریت اہل پنجاب اور اہل سرحد کی تھی۔ بلوچ' سندھی' مہاجر اور بنگالی بھی سیل سے متعلق تھے۔ ان میں سے اس وقت کچھ کی ڈیوٹی میرے ذاتی ملازمین کی حیثیت سے کوٹھی کے اندر تھی اور کچھ باہر رہ کر کوٹھی کی نگرانی کر رہے تھے۔ کمانڈر نواز نے کچھ دنوں تک فوجی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ اس کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ اس کے آباؤ اجداد افغانستان سے ہجرت کر کے مغلوں کے زمانے میں یہاں آ بسے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے تھے۔ کمانڈر نواز کے اجداد کا پیشہ بھی سپہ گری تھا۔ اس کے مزاج میں نظم و ضبط اسی سبب تھا۔ آپریشن سیل کا نمبر ۲' یعنی عثمانی ہندوستان کی ایک ریاست حیدرآباد دکن کا تھا' وہ دکن کے ایک

مقام گلبرگہ شریف کا رہنے والا تھا۔ اس کا پورا نام عبدالسلام عثمانی تھا۔ مگر خود میں اور سیل کے دوسرے ارکان اسے صرف عثمانی ہی کہتے تھے۔ وہ بھی بڑی خوبیوں کا مالک تھا' ریاست حیدرآباد کو جب ہندوستانی حکومت' ہندوستان میں ضم کر رہی تھی تو وہ کسی طرح بچ کر وہاں سے نکل آیا اور اب نظریاتی طور پر وہ ایک محب وطن پاکستانی تھا۔ میں نے اپنی آپ بیتی کی ابتدائی قسط میں یہ بات لکھی تھی کہ میرے آپ بیتی پڑھتے ہوئے خود بخود میری شخصیت کے اسرار آپ پر کھلتے جائیں گے تو نہ صرف میں اپنی شخصیت سے پردے اٹھاتی جاؤں گی بلکہ مجھ سے متعلق جو افراد ہیں' ان کے بارے میں بھی آپ رفتہ رفتہ سب کچھ جان جائیں گے۔ ابھی میں نے اوپر جو کچھ لکھا' اس کا مقصد محض یہی ہے۔ بات یہ ہے کہ کہا اور لکھا کچھ بھی جائے' مقصد کچھ بھی ہو' لوگ اسے اپنے مفروضات اور تعصبات ہی کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے قطع نظر ماضی میں مجھ پر جو کچھ بیتی ہے' وہ رقم کرتی رہوں گی۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن پر نقش ہے' میرے حافظے کو بھی آپ خداداد صلاحیت ہی کہہ سکتے ہیں۔

اس روز میں' اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے لوٹ کر اپنی کوٹھی پہنچی تو جاتے ہی اپنے کمرے میں بند ہو گئی مجھے مہر بند لفافہ کھولنے کی جلدی تھی۔ احتیاط کے ساتھ لفافہ کھول کر تہ کیا ہوا کاغذ میں نے نکال لیا۔ انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی تحریر پر میں نے ایک نظر ڈالی اور پھر عبارت کے آخر میں صدر مملکت کے دستخط دیکھے۔ صدر مملکت کی طرف سے وہ کوئی پیغام نہیں بلکہ میرے لیے ایک اعزاز تھا مجھے کچھ خصوصی اختیارات تفویض کیے گئے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ مجھے یہ اعزاز میرے مشفق کے ایما پر دیا گیا ہے' جن کے ذریعے مجھے یہ لفافہ ملا ہے۔ ان اختیارات کی رو سے مجھے کم از کم پاکستان کی حد تک کسی بھی صوبے یا شہر میں قانون کا تعاون حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ براہ راست نہیں تو بالواسطہ محترم وزیر داخلہ نے میری بہت سی مشکلات حل کر دی تھیں' جن سے میں قدم قدم پر دوچار ہوتی رہتی تھی۔ اتنا بڑا اعتماد بہر حال ہر شخصیت پر نہیں کیا جاتا' میں نے اسی لیے اسے اعزاز لکھا ہے۔ وہ احتیاط نامہ اپنی کوٹھی کی بجائے میں' آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کے ریکارڈ روم میں رکھنا چاہتی تھی' جہاں میرے اور بھی اہم کاغذات محفوظ تھے۔ میں نے اسی لیے اسے دوبارہ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ میری کوٹھی کے کمروں میں انٹر کام نہیں تھا اور کبھی مجھے یہاں ان کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی تھی' اگر یہاں بھی ایسا ہوتا تو شاید اب تک ذکیہ صبر نہ کرتی۔

اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا' میرا پروگرام یہ تھا کہ کھانا کھا کر اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا چکر لگا آؤں گی۔ حالات کے پیش نظر اس بات کا امکان بھی نظر آ رہا تھا کہ مجھے ڈھاکہ جانا ہی پڑے گا۔ مجھے اس سلسلے میں بھی کچھ ضروری انتظامات کرنا تھے پھر ذکیہ کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ اسے بھی ہموار کرنا پڑتا۔ صبح اس سے ناشتے کے دوران میں سرسری سی گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے اسے صرف یہ بتایا تھا کہ گیارہ بجے میرا ایک اپائنٹمنٹ ہے' واپسی دوپہر تک ہو گی۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کے کچھ ہی دیر بعد سیل کی وہ رکن دبے قدموں اندر آ گئی' جو میری ذاتی ملازمہ خاص کا کردار ادا کر رہی تھی۔ دروازہ کھول کر میں ایزی چیئر پر نیم دراز ہو گئی تھی۔

"ذکیہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہیں اور کئی بار آپ کے بارے میں پوچھ چکی ہیں۔ اس وقت ایک انگریزی اخبار پڑھ رہی ہیں۔" اس نے مودب اور دھیمی آواز میں جواب دیا' پھر بولی' "کھانا لگوا دوں؟"

"ہاں' مگر ذرا جلدی...... کوئی پیغام؟"

"جی نہیں۔" یہ کہہ کر' وہ میرا اشارہ پا کر کمرے سے چلی گئی۔

میں بھی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ذکیہ کو ابھی میری واپسی کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ برابر والا بیڈ روم میں نے اسے دے دیا تھا' میں اپنے کمرے سے نکل کر راہداری میں آ گئی اور ذکیہ کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی۔

"کھلا ہے دروازہ آ جاؤ۔" مجھے ذکیہ کی آواز سنائی دی۔

یہی میرا قیاس بھی تھا کہ دروازہ اندر سے بند نہیں ہوگا' میں دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئی۔ "تو یہ عیش ہو رہے ہیں' دوپہر کے وقت صبح کے اخبار پڑھے جا رہے ہیں۔" میں اس کے بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

مجھے یوں اچانک اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر وہ کچھ ہڑبڑا سی گئی' پھر اس نے اخبار ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہاں کون سے ہر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد اخبارات شائع ہوتے ہیں! صبح کے اخبارات ہی لوگ شام تک چاٹتے رہتے ہیں۔"

"خیر اب ایسا بھی نہیں' شام کے اخبارات بھی ہیں۔"

"جن میں سے زیادہ تر کا گزارہ صبح شائع ہونے والے اخبارات ہی کی کٹنگ پر ہوتا ہے۔" وہ منہ کر بولی۔

میں اس دوران میں اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ "تمہاری گفتگو سے معلوم ہو رہا ہے کہ تم شاید پاکستانی صحافت میں کوئی انقلاب لانا چاہتی ہو!" میں نے ہنس کر کہا۔

"جی نہیں' فی الحال بندی کا کوئی ایسا ارادہ نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے تکیہ اپنی گود میں رکھ لیا۔ "میں تو آپ کی آفر پر غور کر رہی تھی۔"

"کیسی آفر؟"

"یہی کہ آپ کے خرچے پر سوئٹزرلینڈ یا امریکہ وغیرہ گھوم آؤں۔ بقول آپ کے اس سے میری صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔"

"ہوں...... کیا بور ہو گئیں یہاں؟" میں جان کر انجان بن گئی۔ "میں نے تمہارے گھومنے پھرنے پر پابندی تو نہیں لگائی' کہیں بھی گھومو پھرو' گاڑی ہے' ڈرائیور بھی ہے اور یہ سارا شہر بھی تمہارا دیکھا بھالا ہے۔"

"اسی لیے تو گھومنے پھرنے کو جی نہیں چاہتا۔" وہ فوراً بول اٹھی "یہاں کیا دیکھوں کہاں جاؤں؟ کوئی مصروفیت ہی نہیں۔"

"میرے دفتر چلی جایا کرو' اگر مصروفیت ہی کا رونا ہے تمہیں۔"

"یعنی وہ جو سیر و تفریح کی آفر تھی' واپس لے لی آپ نے؟" وہ بولی اور یہی میں اس سے کہلوانا چاہتی تھی۔

"پھر پھوٹو نہ منہ سے!" میں نے بظاہر خفگی کا اظہار کیا اور پھر مسکرانے لگی کہ کہیں وہ سیریس نہ ہو جائے۔

"سچ آپ بہت ہی اچھی ہیں باجی۔"

"یقیناً بہت اچھی ہوں' مگر یہ سمجھ لینا کہ اتنی اچھی بھی نہیں ہوں کہ تمہیں ورلڈ ٹور کے لیے نبلک کاٹ کر دے دوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"خیر یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا' فی الحال یہ بتائیں کہ آج کا کیا پروگرام ہے؟ کوئی اور اپائنمنٹ تو نہیں؟"

"تم کہو تمہارے کیا ارادے ہیں؟" میں نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔ "میرے پروگرام تو بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔"

"اگر آپ کو فرصت ہو تو آج بھی ملک دلاور کی طرف چلیں۔ وہ بندہ واقعی دلچسپ اور فقرے باز تھا' آپ نے اس کے بارے میں غلط نہیں کہا تھا۔"

"ممکن ہے مجھے وقت نہ ملے ادھر جانے کا...... تم خود کیوں نہیں چلی جاتیں میری طرف سے بھی اس کی طبیعت پوچھ لینا۔ راستہ تو تمہارے ذہن میں ہے نا؟"

"جی ہاں' مگر آپ بھی چلتیں تو...... یوں بھی اس سے کل پہلی دفعہ تعارف ہوا ہے' دوسرے ہی ان خود پہنچ جانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا مجھے' وہ بھی آپ کے بغیر!"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ملک دلاور قابل اعتماد بھی ہے اور جیسا کہ شاید میں تمہیں بتا چکی اوں کہ میرا مخلص دوست بھی! ...... بس جو باتیں میں نے تمہیں کل سمجھائی تھیں' ان کا خیال رکھنا' ممکن ہے وہ میرے متعلق تم سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرے یا......"

"میں سمجھتی ہوں۔" ذکیہ نے کہا "اگر میرا موڈ بن گیا تو ادھر چلی جاؤں گی' مگر آپ کے ہارے میں اسے ہوا نہیں لگنے دوں گی اور خود اپنے متعلق بھی کچھ بتاتے ہوئے محتاط رہوں گی۔"

اسی وقت ملازمہ ن یا کر بتایا کہ کھانا لگ چکا ہے' میں ذکیہ کے ساتھ ڈائننگ روم میں آ گئی۔

کھانے کے دوران میں ذکیہ کو میں نے اشارتاً بتایا' ممکن ہے' چند دن کے لئے مجھے ڈھاکہ جانا پڑے' کام ایسا ہے کہ شاید میرے وہاں جائے بغیر نہ بنے۔

"باجی' جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' آپ کو کراچی آئے ہوئے ابھی تیسرا دن پوری طرح نہیں گزرا' ویسے بائی داوے' کیا میں یہاں اکیلی رہوں گی؟"

"کیوں' کیا ہوا؟...... یہ بھی تو تمہارا گھر ہی ہے اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ فوری طور پر میں اھا کہ چلی جاؤں' ابھی تو صرف ارادہ ہے۔"

"میں خوب سمجھتی ہوں' آپ کے ارادوں کو! ادھر ارادہ کیا اور ادھر اڑن چھو! ...... اور میں وچتی ہی رہ جاؤں گی کہ آپ کو کیسے روکا جائے!"

ذکیہ کی بات کے جواب میں ابھی میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میری نگاہ دائیں جانب اٹھ گئی' میں نے اس جانب دبے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ ملازمہ کے بھیس میں وہ بھی سیل ہی کی ایک رکن تھی' جس نے مجھے ہاتھ کے خفیف سے اشارے سے بتا دیا تھا کہ میرے لیے کوئی اہم ٹیلی فون کال ہے۔ اشارہ کر کے ملازمہ واپس چلی گئی میں نے جلدبازی کا مظاہرہ کیے بغیر پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا' پانی پی کر میں نے ذکیہ کو مخاطب کیا' میں تو اب کچھ دیر آرام کروں گی' تم جو چاہو..... دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر میں کھڑی ہوگئی۔

"مجھے یہاں بھی کچھ پراسرار سرگرمیاں محسوس ہونے لگی ہیں۔" ذکیہ نے میری طرف دیکھا' اس کی نگاہوں میں معنی خیزی تھی۔

"بکومت..... یہ میری کوٹھی ہے' وہ جگہ نہیں جہاں تم کل تک تھیں۔" میں ہنس کر بولی "میرا مشورہ ہے کہ کھانا کھا کر تم بھی آرام کرو۔"

"بجا ارشاد!" ذکیہ کی آواز میں نے مڑتے مڑتے سنی۔" آپ کو بھلا کون روک سکتا ہے!

ڈائننگ روم سے نکل کر میرے قدموں میں تیزی آ گئی۔ وہ اہم ٹیلی فون کال میں اپنے بیڈ روم میں ریسیو کرنا چاہتی تھی۔ میرے کمرے میں دو ٹیلی فون سیٹ تھے' جن میں سے ایک کا ایکسٹینشن باہر بھی تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پھر بیڈ کی ایک جانب تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹس کے قریب پہنچ گئی۔ ٹیلی فون پر عثمانی تھا' میں نے اس کی آواز پہچان کر پوچھا "ہاں کیا بات ہے؟"

"سیل کے پٹرولنگ یونٹ کی جانب سے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ایک شخص کو گورا قبرستان سے صدر کی طرف جاتے ہوئے ایک غیر ملکی سفارت کار کی کار سے اترتے دیکھا گیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی ہے۔ وہ کسی ٹیکسی کی تلاش میں معلوم ہوتا ہے۔ سوٹڈ بوٹڈ ہے' ٹائی بھی....."

"ٹھیک ہے' حلیہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں' اگر وہ شخص مشتبہ معلوم ہوتا ہے تو اسے اٹھوا لو' میں خود بھی تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں اور کچھ؟"

"جی نہیں۔" عثمانی نے جواب دیا اور میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ کر لمبا سانس لیا۔

مجھے یوں بھی آپریشن سیل ہیڈکوارٹر جانا ہی تھا' پھر یہ کہ فون پر مزید تفصیلات معلوم کرنا' مناسب بھی نہیں تھا۔

قاہرہ سے آنے کے بعد مجھے اب تک اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ اپنی فرم کی منیجر عارفہ سے فون پر گفتگو کر سکتی۔ میں نے یہ موقع غنیمت جان کر فون پر اپنی فرم کا نمبر ملایا اور اسی کے ساتھ وال کلاک پر نظر ڈالی۔ سوا دو کے قریب ہو رہے تھے۔ لنچ کا وقفہ ختم ہو چکا تھا عارفہ کو اس وقت اپنی سیٹ پر ہونا چاہیے تھا۔ میری توقع چند ہی لمحے بعد پوری ہوگئی۔ آپریٹر نے میری آواز پہچان کر فوراً عارفہ سے میرا رابطہ قائم کرا دیا۔

"ہیلو عارفہ' کیسی ہو؟" میں نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

"ٹھیک..... ٹھیک ہوں میڈم" اچانک فون پر ایک طویل عرصے کے بعد میری آواز سن کر وہ

شاید کچھ بوکھلا گئی۔ "کہاں سے بول رہی ہیں آپ؟"

"یہیں کراچی سے اور کہاں سے۔"

"جی..... جی آداب!"

"تمہیں بڑی جلدی آداب کا خیال آ گیا" میں نے ہنس کر کہا۔ "وعلیکم آداب! کام وام تو ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے؟"

"جی ہاں بالکل..... آپ کب سے دفتر آ رہی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"فی الحال تو اس کا امکان نظر نہیں آ رہا' ویسے اگر موقع ملا تو دفتر کا ایک آدھ چکر لگا لوں گی' تمہیں کوئی دشواری تو نہیں؟"

"قطعی نہیں آپ مطمئن رہیں۔"

"اچھا تو خدا حافظ!" ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور پھر کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر دراز ہوگئی۔

سونے کا تو سوال ہی نہیں تھا' بمشکل نصف گھنٹے میں آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹی رہی' پھر اٹھ کر باتھ روم میں جا گھسی اور لباس تبدیل کر کے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ صدر مملکت کا عطا کردہ خصوصی مختار نامہ میرے پرس ہی میں تھا۔ اپنے کمرے سے نکل کر پہلے میں نے ذکیہ کے بارے میں ایک ملازمہ سے پوچھا' اس نے میرے مشورے پر عمل کیا تھا اور اس وقت اپنے بیڈ روم میں سو رہی تھی۔

سیل کا وہ رکن جو میرے شوفر کا کردار ادا کر رہا تھا' عمارت سے نکلتے ہی میری طرف بڑھ آیا۔ برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب ہی میری کار کھڑی تھی اسے یقیناً عثمانی کے ذریعے یہ پیغام مل چکا ہوگا کہ میں کچھ دیر بعد آپریشن سیل کی طرف جاؤں گی۔

"میڈم! آپ خود کار ڈرائیو کریں گی یا....." اس نے قریب آ کر مودب لہجے میں کہا۔ اپنا جملہ اس نے ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا تھا۔

"نہیں' تم ڈرائیو کرو گے۔"

میرا جواب سن کر وہ پلٹا اور کار کا پچھلا دروازہ میرے لیے کھول دیا' میں کار میں بیٹھ گئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد میری کار آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہاں پہنچتے ہی سیل کے ایک چست و توانا رکن میجر شہباز سے میری ملاقات ہوگئی۔ اس کا لباس دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تو آج کل جوڈو کراٹے کی مشق کرا رہے ہو!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ میرے علم میں تھا کہ وہ بلیک بیلٹ حاصل کر چکا ہے اور فاضل اوقات میں سیل کے ارکان کو ان فنون حرب کی مشق کراتا رہتا ہے' جن سے وہ آشنا ہے۔

"آپ اگر مناسب سمجھیں اور آپ کے پاس وقت بھی ہو تو میں ان دو بندوں کا معائنہ کرانا چاہتا ہوں جنہیں گزشتہ دنوں میں نے اپنا فن سکھایا ہے۔" میجر شہباز بولا' اس کے لہجے میں' میں نے درخواست کا عنصر محسوس کر لیا تھا۔ سیل کے ارکان کی حوصلہ افزائی کی خاطر عموماً میں ان کی کارکردگی کے

مظاہرے دیکھتی رہتی تھی۔ میجر شہباز شاید کسی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔

''چلو تمہارے بندے بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' میں مسکرا کر بولی ''باقی کام بعد میں سہی!''

''بہت بہت شکریہ میڈم!'' یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

میجر شہباز کے ساتھ میں ایک بڑے سے ہال میں آ گئی جو اسی طرح کی مشقوں کے لیے تھا۔ وہاں پہلے ہی سے سیل کے دو ارکان مخصوص لباسوں میں میرے منتظر تھے۔ میجر شہباز کا اشارہ پاتے ہی وہ دونوں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ ان میں سے ایک کی فلائنگ کک کی داد مجھے دینا ہی پڑی۔ میرے خیال میں انہیں ابھی مزید مشق کی ضرورت تھی مگر اس وقت میں نے کچھ نہیں کہا اور ان کی تعریف کر کے اس کمرے سے باہر آ گئی۔ اب میرا رخ ڈیوٹی روم کی طرف تھا۔ میں عثمانی سے براہ راست اس شخص کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی' جس کی بابت مجھے فون پر مطلع کیا گیا تھا۔

ڈیوٹی روم میں عثمانی مجھے منتظر ملا۔

''ہاں اب بتاؤ عثمانی' کیا رہا؟ کیا وہ مشتبہ شخص' مہمان خانے' میں پہنچا دیا گیا؟'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

''جی ہاں!'' عثمانی جواباً بولا۔ اس سے ضروری پوچھ گچھ بھی کی جا چکی ہے' ہمارا شبہ درست ہی ثابت ہوا' اس شخص کے بریف کیس سے کچھ ایسے کاغذات ملے ہیں' جن کی روشنی میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے ایک پڑوسی ملک کے لیے جاسوسی کرتا رہا ہے۔'' یہ کہہ کر عثمانی نے اس ملک کا نام بھی بتایا۔

''یعنی یہ کوئی نیا قصہ معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے خیال آرائی کی' پھر پوچھا کیا اس نے خود بھی اقبال جرم کر لیا ہے؟''

''بڑی حد تک...... وہ انتہائی خوفزدہ معلوم ہوتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تشدد کی نوبت نہیں آئی ہو گی؟''

''جی نہیں میڈم!''

''اور میرے نزدیک یہی بات کچھ الجھا دینے والی ہے' تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ جو لوگ ایسے کام کرتے ہیں فوری طور پر زبان نہیں کھولتے۔''

عثمانی نے میرے خیال کی تائید میں کہا ''مجھے بھی کچھ ایسا ہی شک ہے' ممکن ہے کوئی اور معاملہ بھی ہو' میں آپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کہ اگر آپ خود......''

''میں خود اسے دیکھ لیتی ہوں' تم چابی دو مجھے' میں کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی ''تم اگر مناسب سمجھو تو میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو ٹیپ بھی کر سکتے ہو۔''

عثمانی سے مہمان خانے کے اس کمرے کی چابی لے کر میں ڈیوٹی روم سے نکل آئی' جہاں اس مشتبہ شخص کو رکھا گیا تھا۔ عمارت کے اس عقبی حصے کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ زیادہ عرصے لوگوں کو یہاں نہیں رکھنا چاہئے۔ مجھے باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن کا خیال آ گیا تھا جو ایک عرصے سے یہاں مہمان تھا۔ صدر مملکت کی طرف سے خصوصی مختار نامہ ملنے کے بعد قانون کی مدد حاصل کرنا اب

میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے نہ مجھے اب کسی سفارش کی ضرورت رہی تھی نہ اپنے تعلقات کام میں لانے کی۔ جیفرسن کے بارے میں میرا فیصلہ یہی تھا کہ اسے قانون کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس ضمن میں اب مختار نامے کی رو سے میرا محض یہ تحریری بیان کافی ہوتا کہ یہ شخص ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث رہا ہے۔ باقی کارروائی قانونی ادارے خود کرتے رہتے۔ تحریری بیان کی بھی اس صورت میں ضرورت پڑ سکتی تھی' جب کوئی قانونی ادارہ اس کی ضرورت محسوس کرتا یا مطالبہ کرتا۔ ایسے معاملات میں عموماً قانون نافذ کرنے والا ہر ادارہ خود کریڈٹ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے کسی کریڈٹ سے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ اس کی ضرورت۔ میں تو اپنے طور پر حتی الامکان اپنے ملک کے مفاد کی خاطر جدوجہد کر رہی تھی۔ اسی جدوجہد کے نتیجے میں اب تک بہت سے قانون شکن اور تخریب کار میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ اب جیفرسن کا بھی یہی انجام ہونا تھا۔ حالات کے پیش نظر میں نے اپنے ذہن میں اس کا طریقہ کار وضع کر لیا تھا۔

اپنے نئے مہمان کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں چند لمحے اندر کی سن گن لیتی رہی' میں نے محسوس کر لیا کہ کمرے میں جو شخص بھی ہے' اس نے یقیناً میرے قدموں کی چاپ سن لی ہے اور وہ کمرے کے دروازے کے قریب آ گیا ہے چند لمحے کے بعد میں نے قفل میں چابی گھما کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر روشنی تھی اور میرے سامنے ایک شخص سہما ہوا سا کھڑا تھا۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی' چہرے کے نقوش جاذب نظر تھے' جسم پر عمدہ تراش کا سوٹ تھا' ٹائی بھی باندھے ہوئے تھا۔ اسے لازماً یہ امید نہیں رہی ہو گی کہ اس ماحول میں کوئی صنف نازک اس سے ملنے آئے گی چہرے کی رنگت سے یہی معلوم ہوتا تھا۔

''کمرے میں کرسیاں بھی ہیں' تم بیٹھ جاؤ نا! میں نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔ میں اندر سے دروازہ بند کر دیتی ہوں' پھر ہم دونوں اطمینان سے باتیں کریں گے۔ میرا انداز اور لہجہ دوستانہ تھا پھر یہ دیکھے بغیر کہ اس پر میری بات کا کیا ردعمل ہوا ہے' میں نے مڑ کر دروازہ بند کر دیا مگر اس سے پہلے چابی نکال لی۔ دروازہ بند کر کے چابی اپنے پرس میں ڈالنے کے بعد میں پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ ابھی تک ہونق سا بنا ہوا کھڑا تھا' ہاں اب اس کے چہرے سے خوف کا تاثر بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا۔ اور یہی میں چاہتی تھی۔ خوف کی جگہ حیرت نے لے لی تھی۔ میں نے اس سے بیٹھ جانے کے لیے دوبارہ کہا اور پھر خود ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ میرے دوستانہ رویے پر کچھ اثر یقیناً ہوا تھا' اسی لیے وہ بھی حیران حیران سا سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں ہی پھر بولی ''ڈرنے یا حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں' تم ایک محفوظ جگہ ہو' جہاں کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ وہ سفارت کار جس کی گاڑی سے اتر کر تم شاید کسی ٹیکسی کی تلاش میں تھے' اس کے آدمی بھی یہاں نہیں پہنچ سکتے' اگر تمہارے دل میں اس کی طرف سے یا اس کے آقاؤں کی جانب سے کوئی خوف ہے تو اسے بھلا دو' میں تمہیں اپنے تعارف کے طور پر یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میرا تعلق نہ یہاں کی پولیس سے ہے نہ کسی اور ایسے ادارے سے! لیکن ضرورت پڑنے پر میں ایسے کسی بھی ادارے سے فوری طور پر رابطہ قائم کر سکتی ہوں۔ یہ میں نے تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ تم کسی غلط فہمی کا شکار نہ رہو' تمہیں میرے ہی ایما پر میرے آدمی یہاں لے کر آئے ہیں۔ اب وقت ضائع کیے بغیر سچ سچ مجھے

سب کچھ بتا دو کہ میں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں' پہلے اپنا نام بتاؤ اور یہ بھی کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' یہ کہہ کر میں خاموش ہو گئی اور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

''میرا نام کرشن کمار ہے اور میں اندرون سندھ کا رہنے والا ہوں''

اس نے سندھ کے ایک سرحدی قصبے کا نام لیا۔

''تعلیم کہاں حاصل کی؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''جام شورو یونیورسٹی (سندھ) میں۔''

''کہاں تک؟''

''گریجویٹ ہوں۔''

''کیا تم اس کا ثبوت پیش کر سکو گے کہ تم نے جام شورو یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے؟''

''ثبوت...... جی...... جی ہاں۔''

اس کا جواب سن کر میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تم کچھ گڑبڑا کیوں گئے؟ میرا مطلب ثبوت سے تھا۔''

''اس لیے کہ یہاں میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ ہر وقت آدمی ڈگری ساتھ لیے نہیں پھرتا' خیر اب آگے خود ہی اپنی کہانی بیان کرو کہ کس طرح تم ہمارے ایک پڑوسی ملک کے آلہ کار بن گئے؟''

کچھ دیر اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا رہا' ایک جاتا رہا' پھر اس نے ایک طویل سانس لیا اور مجھ سے سوال کر بیٹھا۔ ''آپ نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے' کیا میں اس پر یقین کر لوں؟''

''نہ کرو یقین' اس سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم میری فکر چھوڑو اور اپنی بات کرو۔''

میرے لہجے میں ہلکی سی سختی آ گئی جس کی ضرورت بھی تھی پھر میں نے کچھ سوچ کر کہا ''تمہارے متعلق جہاں تک میرا اندازہ ہے' تم طالب علمی ہی کے زمانے سے ان لوگوں کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟''

جواباً وہ خاصی دیر خاموش رہا اور میں اسے بولنے پر اکساتی رہی۔ بالآخر اسے میرے سوال کا جواب دینا ہی پڑا۔ ''جی...... جی ہاں' یونیورسٹی ہوسٹل میں رہ کر میں نے کسی طرح گزارہ کر لیا تھا لیکن اب مزید ایک سال وہاں رہ کر فائنل ایئر پورا کرنا مجھے مشکل نظر آتا تھا۔ ہوسٹل کی حالت بہت خراب تھی۔ آئے دن دنگا فساد ہوتا رہتا' راتوں کو اس قدر شور اٹھتا کہ نیندیں حرام ہو جاتیں۔ اس کے باوجود شاید کسی نہ کسی طور میں ان لوگوں کے......''

مزید کچھ کہتے کہتے وہ چپ ہو گیا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں چند لمحے خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی کہ کہیں مظلوم بن کر اس طرح وہ میری ہمدردیاں تو حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ اس امکان کو بہرحال نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چند لمحے اس کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھ کر میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''ہاں تو پھر کیا ہوا؟''

ذرا توقف کے بعد اس نے مجھے رحم طلب نظروں سے دیکھا اور آنسو پونچھنے لگا' پھر اس نے جو

کہانی سنائی' وہ ایک ایسے مظلوم نوجوان کی کہانی تھی جو اپنی طالب علمی کے دوران میں غربت اور لالچ کے سبب پڑوسی ملک کا آلہ کار بن گیا تھا۔ اسے بلیک میل کیا جا رہا تھا اور وہ اس چکر سے نکلنا چاہتا تھا۔ اس کی اور باغی امریکی ایجنٹ کی کہانیاں بڑی حد تک ملتی جلتی تھیں' مگر صرف بظاہر!

اس کی کہانی سنتے ہوئے اور پھر اس کہانی کے اختتام تک میں ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ ''کرشن کمار! تم یقیناً ایک اچھے اداکار ہو' تمہاری تربیت ذہین لوگوں نے کی ہے' تم اگر جاسوسی کا پیشہ اختیار کرنے کی بجائے اداکاری کے فن کو اپناتے تو اس سے زیادہ کامیاب رہتے...... درمیان میں بولنے کی کوشش مت کرو' میں تمہاری پوری کہانی بڑے صبر و ضبط کے ساتھ سن چکی ہوں۔ تم نے ایک بڑے جرم کا اعتراف کرنے کی بجائے نسبتاً چھوٹے جرم کے اعتراف کو غنیمت سمجھا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ تمہیں ریڈ ہینڈڈ پکڑ لیا گیا تھا' تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے ابتداء میں تمہیں اپنے متعلق جو کچھ بتایا تھا' قطعی درست ہے۔ تمہیں قانون کے حوالے کر دیا جائے گا ہمارے ملک میں اقلیتوں کے ساتھ مساوات کا سلوک کیا جاتا ہے اور آئندہ بھی ہماری یہی پالیسی رہے گی' لیکن اس کی آڑ میں اگر کوئی بھی شخص یا حکومت ہماری فراخ دلی اور مہمان نوازی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گی تو اسے ایسا نہیں کرنے دیا جائے گا۔ شرافت' رواداری' بھائی چارے' مساوات اور انسانیت کا مطلب نہ بزدلی ہے' نہ پلہ اور۔'' یہ کہتے ہی میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ...... آپ میری بات تو سن لیں' میرے پاس ہر ثبوت موجود ہے' آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میرے پاس یہاں کی یونیورسٹی کا سرٹیفکیٹ...... ڈگری......!''

''ہوگا ثبوت!'' میں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی ''ثبوت دیکھنا میرا کام نہیں ہے' یہ کچھ اور لوگوں کا کام ہے جو وہ اپنے طور پر انجام دیں گے' اگر تم واقعی بے گناہ ثابت ہوئے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا' خدا حافظ۔''

''بھگوان کے لیے...... خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں......'' وہ رونے لگا مگر میں کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

آدمی کو جہاں نرم ہونا چاہیے' وہاں نرمی اور جہاں سختی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں سخت ہونا چاہیے۔ میں نے بہت سے ایسے مجرموں کے بارے میں پڑھا ہے جنہیں سزائے موت دینے کے لیے پھانسی کے پھندے کی طرف لے جایا جاتا ہے اور وہ آخر وقت تک یہی واویلا کرتے رہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا' کچھ ایسا ہی قصہ اس شخص کا تھا' جس نے اپنا نام کرشن کمار بتایا تھا' مجھے یہ بھی شک تھا کہ اس کا اصل نام یہ نہیں ہے۔

اس کمرے سے نکل کر میں پھر ڈیوٹی روم میں پہنچ گئی۔

''عثمانی! تم نے میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو ریکارڈ کر لی؟'' میں نے سوال کیا۔

''یس میڈم!'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے اس گفتگو کا ٹیپ چاہیے' اس ٹیپ کی ایک نقل ریکارڈ روم میں رہے گی اور ہاں سنو

پہلے فوری طور پر اس کا بندوبست کر دو کہ وہ خودکشی نہ کر سکے۔ یہ لو چابی! مَیں یہاں ڈیوٹی روم میں موجود ہوں۔ یہ بندوبست کر کے جلد واپس آؤ' میں تمہیں کچھ اور ہدایات بھی دینا چاہتی ہوں۔''

عثمانی مجھ سے چابی لے کر چلا گیا اور میں اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ میرا یہ شک درست ہی ثابت ہوا تھا کہ کرشن کمار جو کچھ خود کو ظاہر کر رہا ہے' حقیقتاً وہ نہیں ہے۔

نئی صورتحال میں جلد ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے فوری طور پر کیا نئے اقدام روبہ عمل لانا ہیں۔ مین نے گھڑی میں وقت دیکھا شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کرسی پر آ بیٹھی جہاں کچھ دیر قبل عثمانی بیٹھا تھا۔ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میرا ہی قائم کیا ہوا تھا۔ اس کی بہتر کارکردگی کی خاطر ابتدائی دنوں میں مجھے بہت محنت کرنا پڑی تھی۔ اس عمارت کے بارے میں پہلے بھی میں مختلف تفصیلات لکھتی رہی ہوں۔ کمانڈر نواز' عثمانی اور سیل کے دیگر ارکان کو میں نے ہی جدید تر سہولتیں فراہم کی تھیں تا کہ وہ بہتر فضا' بہترین سہولتوں اور عمدہ ماحول میں اپنی ذہانت و صلاحیت بروئے کار لا سکیں۔ خود میں بھی سیل کے کسی رکن کی جگہ ضرورت پڑنے پر کام کر سکتی تھی۔ مجھ سے زیادہ بھلا اس عمارت کے اسرار کسے معلوم ہوتے! عثمانی کی سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے بائیں جانب ٹیلی فون ڈائریکٹری کے اوپر رکھی ہوئی وہ ڈائری اٹھا لی جس میں ملک اور بیرون ملک کی تمام اہم شخصیات کے ٹیلی فون نمبر درج تھے' اس کے علاوہ دیگر اہم مراکز کے نمبر بھی اس میں درج تھے۔ میں نے اس ڈائری میں ایک نمبر دیکھ کر ٹیلی فون ملایا' دوسری جانب فون اٹینڈ کر لیا گیا تو میں بولی ''مجھے آئی جی صاحب سے بات کرنا ہے...... عذرا خان...... جی...... اچھا! میں ہولڈ کرتی ہوں...... مصروف ہیں؟ جی...... اچھا کتنی دیر بعد؟...... رہنے دیں آپ میں ان کے گھر پر فون کر کے بات...... کیا؟ اچھا میں مزید ویٹ کر لیتی ہوں...... ہاں ہاں' کوئی بات نہیں' آپ صرف میرا نام...... نہیں' میسیج کوئی نہیں!...... جی ہاں......'' پھر تقریباً پانچ منٹ کے بعد مجھے فون پر آئی جی (انسپکٹر جنرل آف پولیس) کی آواز سنائی دی تو میں نے کہا ''جی ہاں' عذرا خان عرض کر رہی ہوں...... پہچان گئے آپ مجھے!...... شکریہ...... ویری سوری کہ آپ اٹھنے والے تھے اور میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا...... نہیں کوئی ایسا اہم معاملہ نہیں' کل صبح کا وقت دے دیجئے!...... جی؟...... ٹھیک ہے' انشاء اللہ میں دس بجے پہنچ جاؤں...... سو کائنڈ آف یو!...... خدا حافظ!''

ٹیلی فون پر آئی جی سے گفتگو کے دوران ہی میں عثمانی واپس آ چکا تھا' میں اس کی سیٹ سے اٹھ گئی۔

''سنو عثمانی!'' میں دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر بولی۔ ''میں تمہیں یہ لفافہ دے رہی ہوں' اس میں جو کچھ بھی ہے' مجھے کل صبح اس کی فوٹو کاپی چاہئے' کل صبح آٹھ اور نو بجے کے درمیان! فوٹو کاپی کے بعد اسے ریکارڈ روم کے سیف میں رکھنا ہے جہاں اور بھی اہم کاغذات محفوظ ہیں۔ کرشن کمار کی گفتگو کا ٹیپ بھی اب کل ہی صبح چاہئے جلدی نہیں ہے' اب یہ بتاؤ کہ کرشن کمار کا بندوست ہو گیا جس کے لیے ابھی میں نے تمہیں بھیجا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے وہ لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا جو پرس سے نکال چکی تھی۔ اس لفافے میں وہی مختار نامہ تھا جو مجھے محترم وزیر داخلہ کی معرفت ملا تھا۔

عثمانی مجھ سے وہ لفافہ لے کر میرے سوال کا جواب دینے لگا۔ اسی کے ساتھ اس کی نگاہ

لفافے کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا ''کرشن کمار کی اصل شخصیت ظاہر ہوتے ہی جو ضروری اقدامات ہیں' ان پر عمل کیا جا چکا ہے' ستر پوشی کے لیے اس کے جسم پر اب صرف ایک کپڑا ہے' کمرہ بھی بدل دیا گیا ہے' اس کے علاوہ یہ کہ اسے آپریشن روم میں استعمال ہونے والی میزوں میں سے ایک میز پر باندھ دیا گیا ہے' چمڑے کے تسموں سے' ڈاکٹر رشید نے اسے بے ہوشی کا انجکشن بھی جڑ دیا ہے اور سیل کے دو مسلح ارکان کی ڈیوٹی بھی نئے کمرے میں لگا دی گئی ہے۔

''ویری گڈ!'' میں نے کھلے دل سے عثمان کی کارکردگی کا اعتراف کیا۔

''تھینک یو میڈم!'' اس نے بھی بطور انکسار میرا شکریہ ادا کیا۔

پھر میں نے عثمانی کو آئندہ صبح کیلئے کچھ اور ضروری ہدایات دیں اور کھڑی ہو گئی۔ اب میرا ارادہ کوٹھی کی طرف واپسی کا تھا۔ واپسی میں بھی میں نے خود کار ڈرائیو نہیں کی۔

کوٹھی پہنچ کر معلوم ہوا کہ ذکیہ کچھ دیر قبل ملک دلاور سے ملنے گئی ہے۔ وہ میرے لیے پیغام چھوڑ گئی تھی کہ فرصت ہو تو میں بھی وہیں آ جاؤں' ذکیہ اور ملک دلاور' دونوں پر ہی مجھے مکمل اعتماد تھا' اس کے باوجود میرے نزدیک ذکیہ بہرحال بچی ہی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی ہوں یا اولاد' بڑے بہن بھائیوں یا والدین کے لیے وہ ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں۔ میں یہ اطمینان بھی کر چکی تھی کہ سیل کے کچھ ارکان ذکیہ کی کڑی نگرانی کے لیے ساتھ ہی گئے ہیں' اس کے باوجود کچھ سوچتے ہوئے میں نے ملک دلاور کا فون نمبر ملا لیا۔ یوں بھی مجھے اس کی عیادت کرنا تھی' جب وہ فون پر آ گیا تو میں نے پہلے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔

''حال ایسا نہیں کہ تم سے کہیں''

''تم ملک دلاور ہی بول رہے ہو نا؟'' میں نے دانستہ حیرت سے کہا۔

''جی بندہ نواز...... آپ کا خادم ہی بول رہا ہے۔''

''اگر تم واقعی ملک دلاور ہی ہو' کوئی اور نہیں تو بیماری نے تمہیں خاصا رومانٹک بنا دیا ہے۔ تم تو اب ایک آدھ مصرع ڈھنگ کا بھی پڑھنے لگے ہو! محض مصرع میں نے اس لیے کہا کہ تمہیں یہ پورا مطلع یعنی غزل کا پہلا شعر یاد نہیں ہو گا۔''

''یہ بات ہے تو پھر سناؤں دوسرا مصرع!''

''نہیں دھمکی دینے کی ضرورت نہیں' تم یقیناً کہیں سے یہ شعر سن بھاگے ہو گے۔ ویسے تمہارے بہکنے اور چہکنے سے کم از کم ایک بات کا اندازہ ہو رہا ہے مجھے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''یا تو تم نے اپنی بیماری کو صبر کر لیا ہے یا پھر تشخیص ہو گئی ہے کہ تمہیں کیوں بخار آتا ہے۔''

''دونوں میں سے فی الحال کوئی بات نہیں' دراصل آپ سے بات ہوتی ہے تو مجھے بخار اتارنے کا چانس مل جاتا ہے۔''

''چانس کو اردو میں 'موقع' کہتے ہیں اور اس میں ایک عدد 'قوئے' بھی آتی ہے' شاید تم نے اسی سے بچنے کے لیے چانس کہا ہے۔''

"میں لاکھ کہتا رہوں' چانس چانس' آپ چانس دیتی کب ہیں!" میرے فقرے کو پیتے ہوئے اپنی دانست میں اس نے انتقامی کارروائی شروع کر دی۔

"کیا فون پر مزید گفتگو کا ارادہ نہیں ہے؟" میں بھی اس کے فقرے کو ٹال گئی۔

"ارے پراسرار خاتون! فون بند کرنے سے پہلے یہ ضرور بتا دیجئے گا کہ کہاں سے بول رہی ہیں' کل آپ نے یہ چانس ہی نہیں دیا کہ اتا پتا معلوم کر سکتا۔"

"کیوں وہ تمہارے کھوجی کیا ہوئے' جو تمہیں میری رپورٹس دیا کرتے تھے؟" میں نے اسے چھیڑا "کیا وہ بھی بیمار ہو گئے؟"

"بیمار تو بس ہم ہیں آپ کے اور یہ بیماری دل آخر ایک دن کام تمام کر دے گی۔"

"اچھا تو تم نے میر تقی میر کی وہ غزل بھی پڑھ لی جس کے ایک مصرع کو نثر میں بیان کر رہے ہو' کیا تمہارے میٹرک کے کورس میں یہ غزل بھی شامل تھی؟"

"کورس میں تو اور بہت کچھ تھا اے پراسرار خاتون! اس سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں کیوں اس بندہ ناچیز کے زخم ہرے کر رہی ہیں' ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس بندے کو میر کے اور کئی شعر یاد ہیں۔ چانس دیں تو سناؤں؟" پھر مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر اس نے میر صاحب کا ایک شعر پڑھا۔

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

"ملک دلاور! تمہاری میڈیکل رپورٹس تو جانے کب آئیں گی' اور کیا خبر ان رپورٹس سے کیا بات سامنے آئے۔ اس سے پہلے میں تمہیں ایک دوستانہ مشورہ دینا چاہتی ہوں' شادی کر لو فوراً بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا' ہاں ایک بات اور سن لو بلکہ گرہ میں باندھ لو کہ جب نکاح پڑھانے والا تم سے 'قبول' کہلوائے تو پوری طرح چوکنا رہنا' یہ لفظ اپنی زبان پر ہرگز نہ لانا' میں تمہیں اس کا 'صحیح طریقہ' بتاتی ہوں! تم یا تو سگھڑ اور نیک بیبیوں کی طرح بس سر ہلا دینا' اگر اس پر بھی اصرار ہو کہ دو تولے کی زبان ضرور ہلاؤ' تو کہنا کہ سانوں منظور اے بادشاہو! سمجھ آ گئی؟"

"آہو!...... ہور گل کرو تسی!"

"زیادہ لہر میں آ کر بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرو' مجھے اتنی پنجابی بہرحال آتی ہے کہ تسی اور اسی کا مطلب سمجھ سکوں' سمجھ آئی!...... اب وہ بات سنو جس کے لیے میں نے تمہیں فون کیا ہے۔"

"لو' میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ نے میری طبیعت پوچھنے کے لیے فون کیا ہو گا' خیر جی دسیں!"

"ذکیہ ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری مزاج پرسی کے لئے روانہ ہوئی ہے' اس سے زیادہ اونگی بونگی نہ ہانکنا' یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ وہ مزاج کی ذرا کڑوی ہے۔"

"آپ ہی کون سی میٹھی ہیں!...... میں آپ کی بات ماننے کو ایک سو ایک پرسینٹ تیار ہوں' مگر ایک ذرا سی شرط ہے۔"

"میں تمہاری کوئی شرط ورط نہیں مانوں گی' بکومت۔"

"تو پھر میں بھی اونگیاں بونگیاں ماروں گا...... بالکل نہیں مانوں گا آپ کی بات' چاہے محترمہ ذکیہ خاتون کا مزاج کڑوا ہو کہ میٹھا!"

"بس تم میں سو خرابیوں کی ایک یہی خرابی ہے کہ کمبل ہو جاتے ہو اسی لیے تو میں تمہیں زیادہ لفٹ نہیں دیتی۔"

"تو نہ دیں لفٹ! کون کہہ رہا ہے لفٹ دینے کو' نتائج کی ذمے داری آپ پر ہو گی مجھ پر نہیں۔ یہ سمجھ لیں کہ ایک عدد ہمشیرہ کا معاملہ ہے' جو اللہ کے فضل سے جوان جہان ہے' آپ کی طرح اور ایک جوان جہان شخص سے ملنے کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔"

"تم بہت اڑیل ٹٹو ہو! بولو تمہاری وہ ذرا سی شرط کیا ہے؟"

"تھوڑا سا شربت...... شربتی آنکھوں والا' یعنی شربت دیدار جو آپ اکثر پلاتی آئی ہیں مگر ابھی تک پیاس......"

میں نے ملک دلاور کی بات پوری ہونے سے پہلے لائن کاٹ دی۔ گزشتہ روز کا سارا انتقام اس نے آج لے لیا' مگر میں نے بھی اسے بخشا نہیں تھا۔

ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی' میں نے فوراً ریسیور اٹھا لیا "ہیلو!...." ملک دلاور کی آواز سنائی دی۔

"یس!...... پی آئی اے انکوائری" میں فوراً آواز بدل کر بولی۔ "سوری رانگ نمبر"

ملک دلاور میرے جھانسے میں آ گیا۔ وہ غالباً یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ میں اپنی کوٹھی ہی سے بول رہی ہوں یا پھر وہ اپنے اندازے کی تصدیق چاہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ وقتی طور پر جھانسے میں آ جانے کے باوجود چین سے بیٹھ جانے والا بندہ ہرگز نہیں۔ وہ ایک بار پھر میرا فون نمبر ملا سکتا ہے اور یہی ہوا۔ ذرا توقف کے بعد پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اس مرتبہ پھر ریسیور اٹھا لیا اور ملک دلاور کی آواز پہچانتے ہی بغیر کسی تاخیر کے آواز بدل کر بولی تھی "پی پی آئی" اس مرتبہ ایک خبررساں ایجنسی کی ٹیلی فون آپریٹر بن گئی تھی۔

"اے پراسرار خاتون! کہیں آپ آواز بدل کر تو نہیں بول رہیں؟"

"واٹ نان سینس" میں نے بدستور بدلی ہوئی آواز میں کہا اور ریسیور رکھ دیا' مگر لائن کاٹ کر اور کریڈل کی بجائے تپائی پر اب ملک دلاور میرا نمبر ملاتا تو اسے لائن انگیج ملتی۔ اس سے جان چھڑانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ میں اسے ستانے کی خاطر یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے شبے کی تصدیق ہو جائے۔ فی الوقت مجھے کوئی ایسا ضروری کام نہیں تھا کہ میں ملک دلاور کے گھر جانے سے گریز کرتی' لیکن ابھی تک کچھ طے نہیں کر پائی تھی' جاؤں یا نہیں؟ یہی سوچتے ہوئے مجھے وہ بڑی بی یاد آ گئیں جنہیں گزشتہ روز میں نے ملک دلاور کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور ان کا چہرہ مجھے آشنا لگا تھا۔ ذکیہ کی موجودگی کے سبب ملک دلاور سے میں ان بڑی بی کے بارے میں کچھ نہ پوچھ سکی تھی جو میرے لیے ذہنی الجھن کا سبب بن گئی تھیں۔ اس وقت بھی اگر میں ملک دلاور کے گھر جانے کا فیصلہ کرتی تو وہاں ذکیہ ہوتی' ملک دلاور سے فون پر فقرے بازی کی فضا میں یہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا' میں اس وقت ملک

دلاور کے گھر جاتی یا نہ جاتی' اس سے بہرحال بڑی بی کے بارے میں استفسار ضروری تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے خود ملک دلاور کا نمبر ملایا' فون ملک دلاور ہی نے اٹینڈ کیا تھا۔

اس مرتبہ میں اپنی اصل آواز میں بول رہی تھی "ملک دلاور تم اتنی بک بک کرتے ہو کہ جو ضروری بات کرنا ہوتی ہے' وہ رہ جاتی ہے۔"

"ارشاد ہو!"

"کل میں نے تمہارے ہاں ایک بڑی بی کو پہلی بار دیکھا تھا اور......"

"دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے" وہ درمیان میں بول اٹھا۔

"تم پھر پٹڑی سے اتر رہے ہو!...... یہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ہے' آپ ہی کچھ ارشاد فرما دیں۔"

"تم بولنے دو جب نا کچھ کہوں' بیچ میں تو بڑ بڑ بولنے لگتے ہو۔" پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا' میں رکے بغیر کہے گئی "ان بڑی بی کا چہرہ مجھے مانوس لگا تھا جیسے پہلے بھی انہیں کہیں دیکھا ہو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ بھی مجھے پہچان گئی تھیں' شاید اسی لیے فوراً چائے سرو کر کے چلی گئیں بلکہ صرف کپ اور چائے دانی وغیرہ سامنے رکھ کر کمرے سے......"

"یہ تو بہت برا ہوا خاتون' اب کیا ہو گا؟...... ویسے میرا خیال یہ ہے کہ وہی ہو گا جو منظور خدا ہو گا! آپ کیا ارشاد فرماتی ہیں بیچ اس مسئلے کے؟"

"دلاور...... ملک دلاور تم...... سمجھ کیوں نہیں رہے۔"

"اس لیے کہ سمجھ ابھی آئی نہیں' کہیں گئی ہوئی ہے!" وہ مجھ پر چوٹ کر گیا۔

"پھر میں بھی شروع ہو جاؤں!...... کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچتے نظر آؤ گے ابھی!"

"پہلی بات تو یہ سن لیں کہ میری صنف کے بارے میں آپ کا غلط خیال ہے' میں بلا تو ہو سکتا ہوں مگر...... خیر چھوڑیں اس بات کو! اور میری بھی ایک بات گرہ میں باندھ لیں...... ویسے معاف کیجیے گا' یہ گرہ میں باندھنا میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا' گرہ لگانا تو میرے خیال میں کہتے ہی باندھنے کو ہیں۔ پھر یہ گرہ میں باندھنا کیا ہوا؟ آپ اردو زبان کی دعویدار ہیں' آپ ہی اس پر لائٹ ڈال سکتی ہیں...... چلیں لائٹ ڈالنے کا کام بعد میں ہوتا رہے گا میں یہ کہہ رہا تھا' آپ ایک بات اپنے دماغ میں اچھی طرح بٹھا لیں کہ ہر بندہ یا ہر بندی آپ کی طرح پراسرار نہیں ہوتا یا ہوتی' آئی سمجھ ان بچاری بڑی بی پر رحم کریں' انہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں آپ نے انہیں کہاں دیکھا ہو گا' یہ بھی مجھے معلوم ہے' مگر بتاؤں گا نہیں' اگر بتایا بھی تو شرط وہی پہلے والی بدستور ہے! چانس چاہیے' دیدار کا چانس!"

"میں تمہیں یہ چانس ضرور دوں گی' آ رہی ہوں!" جھنجلاہٹ میں میری زبان سے یہ بات نکل ہی گئی۔

"بلے بلے!" یہ کہتے ہی ملک دلاور نے خود فون رکھ دیا اور اس کے "بلے بلے" کہنے پر جھنجلاہٹ کے باوجود میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

ملک دلاور سے ذکیہ کے بارے میں پوچھنا کہ وہ پہنچ گئی یا نہیں؟ فضول ہی تھا' وہ کبھی اس کا

صحیح جواب نہ دیتا' اب میں واقعی اس کی کوٹھی جانے کا فیصلہ کر چکی تھی' بڑی بی کے بارے میں اب مجھے کوئی خاص تجسس نہیں رہا تھا۔ ملک دلاور نے اپنی اول فول کے درمیان بہرحال یہ بتا دیا تھا کہ انہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں' یہ بات میرے لیے کافی تھی۔ انہیں میں نے کب اور کہاں دیکھا تھا' یہ میرے لیے زیادہ اہم نہیں تھا۔ اس مرتبہ کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت میں نے ڈرائیور کو ساتھ نہیں لیا۔ ذکیہ بھی بظاہر تنہا گئی تھی۔ میں نے بھی خود ہی کار ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کیا۔ روانگی سے قبل میں نے کوٹھی میں متعین سیل کے ارکان کو بھی باخبر کر دیا تھا کہ کہاں جا رہی ہوں! قاہرہ سے کراچی آئے ہوئے مجھے کئی دن ہو گئے تھے مگر اب تک مخالف محاذ پر خاموشی تھی اور یہ خاموشی کسی طوفان کی آمد کا اشارہ بھی ہو سکتی تھی۔ یہ تو خیر ممکن ہی نہیں تھا کہ میرے حریف مجھے صبر کر لیتے۔ یہ بات بھی ممکن نہ تھی کہ انہیں کراچی میں میری موجودگی کی اب تک خبر نہ لگی ہو۔ ان کے ذرائع سے میں بخوبی واقف تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ تو بڑی حد تک میری سمجھ میں آ گیا تھا' لیکن موشوروف ابھی تک پوری طرح مجھ پر نہیں کھلا تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ کی نسبت موشوروف سے میری معرکہ آرائیاں کم رہی تھیں اس کی حکمت عملی بھی ڈاکٹر رچرڈ سے قطعی مختلف تھی۔ میں اسی سبب اسے ڈاکٹر رچرڈ سے زیادہ خطرناک کہتی اور سمجھتی تھی۔ تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود میں اسی لیے بے حد چوکنا تھی ملک دلاور کی کوٹھی پہنچنے تک میں موشوروف ہی کے متعلق سوچتی رہی۔

کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں مجھے وہ کار نظر آ گئی تھی جو ذکیہ لے کر آئی تھی۔ کار سے اتر کر جلد ہی ملک دلاور کے ملازم کی رہنمائی میں' میں اندر پہنچ گئی۔ ملک دلاور میرے بارے میں اپنے ملازم کو ہدایت دے چکا تھا مجھے اس پر جھنجلاہٹ تو ہوئی کہ ملازم نے ڈرائنگ روم میں کیوں بٹھا دیا مگر میں نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے مجھے پانچ منٹ سے زیادہ ہو گئے تو غصہ آنے لگا۔ اس دوران میں اندرونی سمت سے مجھے کئی بار ملک دلاور اور ذکیہ کے بھرپور قہقہے بھی سنائی دیے۔ جب میرا غصہ بڑھنے لگا تو میں اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس لیے میرے قدموں کی چاپ نہیں ابھر رہی تھی۔ ملازم جیسے مجھے وہاں بٹھا کر بھول ہی گیا تھا۔ یہ تو مجھے خبر تھی کہ ملک دلاور کے گھر میں اس کے اور ملازمین کے سوا کوئی اور نہیں رہتا اس کے علاوہ یہ بھی کہ کوٹھی بھی اندر سے میری دیکھی بھالی تھی۔ ملک دلاور جان بوجھ کر میرا خون کھولا رہا ہے' اس احساس کے باوجود میرا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ ایک مرتبہ پہلے بھی اس نے اسی سے ملتی جلتی ایک حرکت کی تھی آخر میں کب تک اپنا خون کھولاتی رہتی مجبوراً ڈرائنگ روم سے نکل کر پیچ و تاب کھاتی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی' اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کے میں ملک دلاور کے کمرے تک پہنچ گئی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے ملک دلاور!" کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر غصہ ضبط کرتے کرتے میں تقریباً چیخ اٹھی۔

کمرے میں لمحہ بھر کو سناٹا چھا گیا۔ ملک دلاور اور ذکیہ دونوں ہی گنگ سے ہو کر تصویر حیرت بن گئے۔ دلاور کو شاید یہ توقع نہیں رہی ہو گی کہ اس کی شرارت کے نتیجے میں مجھے اس حد تک غصہ آ جائے گا۔ ذکیہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر میں نے خود کو سنبھالا اور پھر زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگی جیسے میرا غصہ مذاق رہا ہو اسی سے شاید ملک دلاور کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے جلدی سے کہا' آپ کب

تشریف لائیں؟ ملازم نے مجھے بتایا ہی نہیں!''

''بہت زیادہ بھولے شاہ نہ بنو ورنہ بری طرح پیش آؤں گی۔'' میں آگے بڑھ کر ذکیہ کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی ''تمہارے ہی ایما پر ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہوگا!...... کچھ بھی سہی میرے نزدیک شرارت سے زیادہ یہ واقعی بدتمیزی ہے۔''

''آپ چاہے بری طرح پیش آئیں یا زیر زبر ہوں' میں حلفیہ یہ بیان دینے کو تیار ہوں کہ یہ بدتمیزی خادم کی نہیں ہے میں ابھی اس ملازم کو بلا کر اس سے پوچھتا ہوں کہ آخر اسے اتنی جرأت کیسے...... سوری کیسے ہوئی کہ آپ جیسی عزت مآب خاتون کو اس نے......''

''اسے تمہاری ہی ہدایت پر کچھ دیر کو کوٹھی سے رفو چکر ہو جانا چاہئے' اگر اس نے یہ نہیں کیا تو بے وقوفی کی ہے۔''

''اگر وہ آپ کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میری ہدایت پر رفو چکر نہیں ہوا تو پھر اسے گھن چکر بنا دوں گا...... سوری' ویری سوری محترمہ عذرا خاتون! غلطی سے سچی بات زبان پر آ گئی۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

''غلطی نہیں مسٹر دلاور! اس لفظ کا تلفظ غا...... لا...... طی ہے'' ذکیہ نے بھی موقع دیکھ کر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

کیا کہا آپ نے طی! ...... میں اسے 'سی' سمجھا تھا۔ خواتین اس لفظ کو برمحل استعمال کرتی ہیں اور کبھی کبھی 'سی' کے بعد 'ہائے اللہ' بھی کہنا ضروری سمجھتی ہیں ہماری زبان میں بھی اسے لفظ کے معنی ہیں اور......''

''مسٹر ملک دلاور! بات 'طی' کی ہو رہی تھی' غلطی کا طی! آپ خواہ مخواہ عورتوں کی طرح 'سی' اور ہائے اللہ'' کرنے لگے'' میری بجائے ذکیہ اسے گھسنے لگی۔

''آپ دونوں محترم خواتین' ایک کو اٹھاؤ دوسری کو بٹھاؤ کی طرح ہیں' یعنی چہرے مہرے اور گفتگو میں بھی! محترمہ ذکیہ خاتون آپ نے اپنی ہمشیرہ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میں اسی لیے تو انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھوا کر بھول گیا تھا۔''

''باجی ٹھیک کہہ رہی تھیں' یہ بہرحال بد اخلاقی تھی۔''

''کبھی کبھی ایسی بھول چوک ہو جاتی ہے' آخر بندہ بشر ہوں' آپ کی باجی کی طرح تو نہیں ہوں نا۔'' پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا ''اگر آپ کو غصہ آ گیا تھا تو سوری''

''اب بھی 'اگر مگر' کی گنجائش رہ گئی ہے۔'' جواباً میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

آپ کے اس طرح آنکھیں دکھانے پر مجھے ایک شعر یاد آ رہا ہے وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ آنکھیں دکھلاتے ہو......''

''میں فوراً بول اٹھی ''ملک دلاور ان بڑی بی کا کیا قصہ تھا' پہلے وہ بتاؤ' نظر نہیں آئیں''' میں نے فوراً ہی ملک دلاور کی توجہ دوسری طرف مبذول کرنا چاہی کیونکہ کبھی کبھی وہ پھکڑ پن پر بھی اتر آتا تھا۔ اس سے بعید نہیں تھا کہ پورا شعرہ پڑھ دیتا۔ ذکیہ کی وہاں موجودگی میں استاد داغ کے ہم عصر امیر مینائی کا

وہ پورا شعر پڑھنا غضب ہو جاتا۔

ملک دلاور بھی ایک کائیاں تھا' میری بات کا مطلب سمجھ گیا شاید اور مسکرانے لگا میں نے تیوریوں پر بل ڈال لیے تو وہ بولا ''ان بڑی بی کو بلواؤں' اگر آپ ملنا چاہیں' وہ گرائیں ہیں اپنی' یعنی پنج دریاؤں میں سے ایک دریا کے کنارے آباد ایک گاؤں کی ہیں۔ انہیں آپ نے کئی سال پہلے نرگس کے گھر ناظم آباد میں دیکھا ہوگا۔ کچھ عرصے وہاں انہوں نے کام کیا تھا' پھر پنجاب چلی گئی تھیں۔ اپنے شوہر کے فوت ہونے پر وہ پھر کراچی آ گئیں' ابھی کوئی ہفتہ بھر پہلے نرگس نے مجھ سے ان کی سفارش کی کہ اپنے پاس رکھ لو۔ دراصل بیچارے غریب غرباء بڑے بڑے لوگوں کو ایک آدھ دفعہ دیکھ کر بھی یاد رکھتے ہیں کہ خدا جانے ان سے کب کیا کام پڑ جائے' ہاں بڑے لوگ بھول جاتے ہیں انہیں! میں نے فون پر آپ سے ٹھیک ہی کہا تھا نا کہ ان بیچاری بڑی بی پر رحم کریں وہ آپ کی طرح پراسرار نہیں ہیں۔''

''تو مسٹر دلاور' آپ بھی باجی کو پراسرار سمجھتے ہیں حالانکہ......

''ذکیہ!'' میں نے ذکیہ کو گھور کر دیکھا۔

''سوری باجی!'' ذکیہ فوراً کٹ ٹو سائز ہو گئی' اس کے ذہن سے اس فضا میں شاید میری ہدایات نکل گئی تھیں۔

''سب پر آپ کی تڑی چلتی ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کاش کوئی آپ کو بھی اپنی تڑی میں رکھنے والا' یعنی آپ کا گھر والا ہوتا۔''

ملک دلاور نے کچھ ایسے لہجے میں یہ جملہ ادا کیا کہ میں ہنس پڑی اور ذکیہ تو میری موجودگی کے سبب جانے کب سے اپنی ہنسی روکے بیٹھی تھی! پھر خاصی دیر تک ہنسی کا دور چلتا رہا۔ ہم تینوں ہی قہقہے لگا رہے تھے' یوں جیسے ساری دنیا میں ہم سے زیادہ خوش کوئی نہ ہو' میں نے اس دوران میں یہ بات بھی محسوس کی کہ ملک دلاور اور ذکیہ دوسری ہی ملاقات میں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں دلاور نے کئی بار یہ کوشش بھی کی کہ میں اپنی سکونت کے متعلق کچھ بتا دوں مگر نہ صرف میں بلکہ ذکیہ بھی اس بات کو گول کر گئی۔ دلاور نے رات کا کھانا کھلا کر ہم دونوں کی جان چھوڑی تھی۔ جب بھی میں اٹھنے کا ارادہ کرتی' وہ اشارتاً امیر مینائی کا شعر سنانے کی ''دھمکی'' دے دیتا اور مجھے مجبوراً مزید بیٹھنا پڑتا۔ واپسی میں ذکیہ اور میں الگ الگ کاروں کے ذریعے اپنی کوٹھی پہنچے۔ ذکیہ کے ساتھ میں نے آج بھی خاصا وقت گزار لیا تھا اس لیے اسے شب بخیر کہا تو وہ مزید گپ شپ کے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن صبح میں جلدی سو کر اٹھ گئی۔ ذکیہ اس وقت تک جاگی نہیں تھی۔ موقع غنیمت جان کر ناشتا کرتے ہی میں تیار ہوئی۔ میں نے اسی عرصے میں ڈرائیور سے کہلوا دیا تھا کہ وہ بھی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر چلنے کے لیے تیار ہو جائے۔ میں عمارت سے باہر آئی تو وہ کار کے قریب مستعد کھڑا تھا۔

میں اپنی منزل پر پہنچ گئی تو مجھے ڈیوٹی روم میں کمانڈر نواز نظر آیا' تمام تیاریاں مکمل ہیں کمانڈر؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جی ہاں میڈم!'' اس نے جواب دیا' پھر مزید بولا ''یہ رہی صدر مملکت کے خصوصی اجازت

نامے کی فوٹو کاپی......" اس نے میری طرف فوٹو کاپی بڑھائی' میں نے اس پر ایک نظر ڈال کر اسے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ "یہ کرشن کمار اور آپ کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ٹیپ ہے۔"

میں نے وہ بھی لے کر پرس میں ڈال لیا اور بولی "کرشن کمار کا کیا حال ہے اب؟ ہوش آ گیا اسے؟"

"ابھی کچھ دیر قبل اسے ہوش میں لایا گیا ہے۔"

"اور دوسرے مہمان' یعنی جیفرسن کے کیا حال چال ہیں؟"

"وہ کچھ پھیلنے کی کوشش کر رہا تھا' جب اسے بتایا گیا کہ یہاں سے کہیں اور منتقل کیا جانے والا ہے' تیار ہو جائے تو وہ آپ سے ایک بار ملنے کی ضد کرنے لگا بہرحال اب وہ راہ راست پر لایا جا چکا ہے۔"

"اور کوئی خاص بات؟" میں نے کمانڈر نواز سے سوال کیا۔

"جی نہیں میڈم!......مزید کوئی حکم ہو تو فرمائیں۔"

"ہاں یاد آیا' وہ میرے ذاتی ملازمین کے سلسلے میں کیا رہا؟" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آج شام وہ کسی وقت کوٹھی پر پہنچ جائیں گے' میں اس سے پہلے آپ کو مطلع کر دوں گا۔" کمانڈر نواز نے بتایا۔

"اچھا تو پھر' میں اب چلتی ہوں' آئی جی سے مجھے دس بجے ملنا ہے اور اس وقت سوا نو ہونے والے ہیں۔" یہ کہہ کر میں ڈیوٹی روم سے باہر نکل آئی۔

دوبارہ اپنی کار میں آ کر بیٹھتے ہی میں نے ڈرائیور سے پولیس ہیڈ آفس چلنے کو کہا' دوسرے ہی لمحے کار اسٹارٹ ہو گئی۔

"زیادہ تیز رفتاری سے چلنے کی ضرورت نہیں' وہاں پہنچنے کے لیے دس بجے تک کا وقت ہے میرے پاس۔" میں نے ڈرائیور کو ہدایت دی اور سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

دس بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے کہ میری کار پولیس ہیڈ آفس کے احاطے میں داخل ہوئی میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے کار ایک طرف پارک کر دی اور جلدی سے اتر کر میرے لیے پچھلا دروازہ کھولا' پھر مودب کھڑا ہو گیا میں کار سے اتر کر پرس تھامے پولیس ہیڈ آفس کی عمارت میں داخل ہو گئی۔

مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ آئی جی میری پذیرائی کے لیے اپنے کمرے سے نکل کر باہر کھڑا ہوگا۔ ذاتی طور پر مجھے یہ کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا خواہ وہ کوئی بھی ہو' اسے غیر ضروری اہمیت دینے سے دیگر اہم امور پر نظر نہیں رہتی۔ اسی خرابی کے سبب یہ مجبوری ہی میں کبھی ادھر کا رخ کرتی تھی۔ ایسے کیس یقیناً اہم ہوتے ہیں اور اخلاق بھی ضروری ہے مگر اس طرح کسی غیر سرکاری شخصیت کی پذیرائی مناسب نہیں ہوتی۔ میں آئی جی سے پہلے بھی مل چکی تھی مگر اس نے اس درجہ پذیرائی کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ شاید اسے سرکاری طور پر میری اہمیت سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ اپنی غیر ضروری پذیرائی پر ناگواری

کے باوجود میں نے بھی اسے وش کیا اور پھر اس کے کمرے میں آ گئی۔

"آپ اپنی کرسی پر تشریف رکھیں۔" میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے کرسی پر بیٹھنا نہیں چاہتا۔

"آپ تو بیٹھیے!" وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

"میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گی' جب تک آپ اپنی کرسی پر نہیں بیٹھ جائیں گے۔ میں آپ کی نہیں اس کرسی کی تکریم چاہتی ہوں' جس پر بیٹھنے سے آپ گریز کر رہے ہیں۔"

"اچھا یہ بات ہے تو پھر میں آپ کے حکم کی تعمیل کیے دیتا ہوں۔" وہ مسکرا کر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

میں نے بھی پھر تکلف نہیں کیا اور اس کے روبرو ایک نشست سنبھال لی۔ اب مزید کسی تکلیف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بطور پیش بندی کہا "میں ناشتا کر کے آئی ہوں' نہ چائے پیوں گی نہ ٹھنڈا! بس وہ بات سن لیں' جس کے لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔"

"جی بالکل فرمائیں۔"

میں نے کچھ کہنے سے پہلے اپنا پرس کھولا اور وہ ٹیپ نکال کر میز پر رکھ دیا' جس پر میری اور کرشن کمار کی گفتگو ریکارڈ کی گئی تھی۔ پھر میں نے اس ٹیپ اور کرشن کمار کے بارے میں آئی جی کو ضروری معلومات فراہم کیں' مگر درمیان میں آپریشن سیل کا ذکر نہ آنے دیا۔

"صد فیصد یہ شخص پڑوسی ملک کا جاسوس معلوم ہوتا ہے' میں آپ کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں' اس شخص کو آپ ہمارے حوالے کر دیں۔"

"وہ بھی ہو جائے گا' ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔"

"جی......جی فرمائیے!"

"سولومن کیس یاد ہے آپ کو؟" میں نے کہا' اس کیس میں خود آئی جی' سولومن کے خلاف آپریشن کا انچارج تھا۔

میری بات سن کر آئی جی چونک اٹھا "جی ہاں بالکل یاد ہے اور......اور ابھی وہ کیس ختم نہیں ہوا۔"

میں نے مختصراً باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن کے متعلق بھی آئی جی کو بتا دیا۔

"لیکن......یہ......یہ شخص اتنے دن سے تھا کہاں؟ آپ نے فرمایا ہے کہ اسے اس وقت پکڑا گیا تھا جب یہ آپ کی کوٹھی میں دستی بم پھینکنے والا تھا۔ واقعات سے تو پتا چلتا ہے کہ یہ سولومن آپریشن سے پہلے کی بات ہے۔"

"جی ہاں' میں نے تصدیق کی۔" سولومن آپریشن پر تو آخری مرحلے میں عمل کیا گیا تھا۔ جیفرسن اس وقت سے اب تک میری تحویل میں رہا ہے' اسے سولومن کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا' لیکن اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اسے بھی آپ کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ میں عرض کر چکی ہوں کہ وہ بھی سولومن کے ساتھیوں میں سے تھا' باقی کارروائی آپ کر سکتے ہیں۔"

"جیفرسن اور کرشن کمار' یہ دونوں اس وقت کہاں ہیں؟ بالآخر وہ پولیس والوں کے مزاج کے مطابق اپنے فطری تجسس کو نہ دبا سکا' اور سوال کر ہی بیٹھا۔

"اس وقت وہ دونوں ایک بند وین میں' میرے آدمیوں کی زیرنگرانی پولیس ہیڈ آفس کے احاطے ہی میں موجود ہیں۔"

"جی؟" آئی جی اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکا۔

"جی ہاں!" میں نے مسکرا کر انکشاف کیا میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لائی تھی کہ آپ کے ہینڈ اوور کردوں۔ مگر ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ سولومن کی طرح وہ دونوں بھی فرار نہ ہو جائیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے سولومن کو آپ کے سپرد کیا تھا تو وہ قطعی بے بس تھا۔"

"آئی جی کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آنے لگے تو...... تو وہ آپ...... آپ ہی تھیں؟"

"بالکل...... کہیں تو یہ بھی بتا دوں کہ سولومن کے فرار کے بعد آپ کس طرح بدحواس ہو کر اس کوٹھی سے نکلے تھے!"

"مجھے یقین آ گیا مجھے!...... آئی ایم ویری سوری! اس...... اس معاملے میں ہرگز ایسا نہیں ہو گا۔" وہ مجھے یقین دہانی کرانے لگا۔

"ایک آخری بات مجھے آپ سے اور عرض کرنا ہے کہ اس وقت بہ مجبوری میں نے سولومن کیس کے حوالے سے جو یہ باتیں آپ سے کی ہیں' میرے اور آپ ہی کے درمیان رہنی چاہئیں' کیا میں یہ توقع رکھوں آپ سے؟...... اس لئے کہ میں اپنے طور پر اور اپنی دانست میں اپنے وطن عزیز کے لیے جو خدمات انجام دے رہی ہوں' کسی بھی سطح پر ان کی تشہیر نہیں چاہتی۔ تشہیر سے میرے کام میں رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی' اس سے زیادہ میں کچھ عرض نہیں کرنا چاہتی۔"

"اس سلسلے میں آپ مجھ پر مکمل بھروسہ کر سکتی ہیں' انشاء اللہ کبھی اور کہیں میری زبان پر یہ بات نہیں آئے گی۔ آئی جی کے لہجے میں خلوص اور اپنا پن تھا۔

"شکریہ!...... اب اٹھیے اور ان دونوں بندوں کو اپنے چارج میں لے لیجیے!...... یا اگر آپ مناسب سمجھیں تو خود باہر تک جانے کی بجائے اپنے کسی ماتحت کی ڈیوٹی لگا دیں تاکہ کمپاؤنڈ میں موجود عام لوگوں کو معاملے کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو سکے۔

"آپ جو بھی فرمائیں میں اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔"

"تو پھر بغیر میرا تعارف کرائے اپنے کسی قابل اعتماد ماتحت کو میرے ساتھ کر دیں' میں وین کی نشاندہی کردوں گی پولیس والے جیسے ہی وین کے قریب پہنچیں گے' میرے آدمی میرا اشارہ پاتے ہی وین کا پچھلا دروازہ کھول دیں گے۔ یہ معاملہ کیونکہ دو غیر ملکی جاسوسوں اور ملکی سالمیت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے میں اتنی احتیاط اور رازداری برت رہی ہوں آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔"

پھر آئی جی نے میرے ایما کے مطابق تمام بندوست کردیا تو میں اس کے کمرے سے نکل آئی۔ ایک پولیس افسر بظاہر اجنبی کی طرح میرے ساتھ ہولیا تھا۔

کمپاؤنڈ میں آپریشن سیل کی بند وین کو میری کار سے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے پولیس افسر کو غیر محسوس انداز میں وین کی نشاندہی کرا دی۔ وہ پولیس افسر' وین کی طرف بڑھ گیا تو میں بھی مزید آگے بڑھی۔ وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر میجر شہباز بیٹھا تھا وہ میرا مخصوص اشارہ پاتے ہی دروازے کو کھول کر نیچے اتر آیا۔

کچھ ہی دیر میں کئی مسلح پولیس والے وین تک پہنچ گئے۔ میں اب اپنی کار تک پہنچ چکی تھی۔ اسی وقت میرے آدمیوں نے وین کا پچھلا دروازہ کھول کر پہلے کرشن کمار کو باہر نکالا' پولیس والوں نے اسے ہتھکڑیاں پہنا دیں اور عین اسی لمحے میرے ذہن میں ہلکی سی سنسناہٹ ہوئی۔ اسی کے ساتھ میں نے شدید خطرہ محسوس کیا۔ میری نظریں کرشن کمار پر جمی ہوئی تھیں جو سینہ تھامے جھکتا چلا جا رہا تھا' اس کے سینے سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

یہ سامنے کی بات تھی کہ کرشن کمار کو گولی کا نشانہ بنایا گیا ہے گولی کسی ایسے ریوالور سے چلائی گئی تھی جس پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا ورنہ یہ دھماکا ضرور سنائی دیتا پھر اس سے پہلے کہ معاملے کی تہ تک پہنچ کر خود مجھے حرکت میں آنا پڑتا سیل کے ارکان نے صورتحال کو تیزی سے سنبھال لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا کسی فاسٹ ایکشن مووی کے مانند تھا۔ ممکن ہے یہ واقعہ بیان کرنے میں مجھے اس سے زیادہ دیر لگ جائے جتنے عرصے میں تیزی کے ساتھ یہ واقعہ رونما ہو گیا' لیکن ہوا سب کچھ بہت جلدی۔

سائیلنسر چڑھے ہوئے ریوالور سے کرشن کمار پر گولی چلانے والا نوجوان ایک کار میں تھا جیسے ہی کرشن کمار کو ہتھکڑیاں پہنائی گئیں اس نوجوان کی کار حرکت میں آ گئی اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرا ہاتھ کار کی کھڑکی سے باہر نکالا اور کرشن کمار کے سینے پر فائر کرتا ہوا سرعت سے کمپاؤنڈ کے گیٹ کی طرف اپنی کار بڑھا لے گیا میری نگاہ کیونکہ کرشن کمار پر تھی اس لیے میں خود یہ سب کچھ نہ دیکھ پائی۔ مجھے بعد میں سیل کے ارکان سے ان ساری تفصیلات کا علم ہوا تھا؟ وہ اپنی اطراف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ حملہ آور نوجوان کی کار کمپاؤنڈ کے مین گیٹ تک نہ پہنچ سکی تھی کہ پے در پے کئی دھماکے ہوئے مگر یہ دھماکے فائروں کے نہیں تھے سیل کے ارکان نے بھی سائیلنسر چڑھے ہوئے ریوالوروں سے حملہ آور کی کار کو نشانہ بنایا تھا۔ دھماکے کار کے اگلے پچھلے ٹائر برسٹ ہونے کے تھے۔ کار کے ٹائر برسٹ ہوتے ہی شاید حملہ آور نوجوان کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا اس نے انتہائی سرعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کار کا دروازہ کھولا اور ایک طرف بھاگ کر قریب ہی کھڑی ہوئی ایک جیپ کی آڑ لینا چاہی اس کے ہاتھ میں ریوالور اب بھی تھا' لیکن جیپ تک پہنچتے پہنچتے وہ چیخ مار کر ڈھیر ہو گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔ سیل کے رکن میجر شہباز نے اس کے ہاتھ کا کامیاب نشانہ لیا تھا۔

پولیس والوں کو غالباً اس وقت ہوش آیا جب حملہ آور نوجوان زمین پر ڈھیر ہو کر دوبارہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا وہ سب تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپکے۔ کرشن کمار کے گولی لگتے ہی سیل کے ایک رکن نے وین کا پچھلا دروازہ بند کر دیا تھا تا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر امریکی ایجنٹ جیفرسن فرار نہ ہو جائے۔

میں جب وین کے قریب پہنچی تو کرشن کمار آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔

پولیس ہیڈ آفس کے کمپاؤنڈ میں کھیلے جانے والے اس خونیں ڈرامے کا علم آئی جی کو بھی ہو گیا مگر جب تک وہ باہر آیا اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا تھا۔ حملہ آور زخمی نوجوان کو کشاں کشاں وہاں سے لے جایا جا چکا تھا میرے ایما پر جیفرسن کو بھی پولیس کی تحویل میں دیا جا چکا تھا اور کرشن کمار کی لاش بھی اٹھوائی جا چکی تھی۔ اس کے علاوہ سیل کے ارکان بھی میرے ہی اشارے پر بند وین میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔

اب اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد مجھے یاد نہیں کہ اس سنسنی خیز واقعے کے چشم دید گواہ وہاں کتنے تھے مگر کیونکہ یہ واقعہ غیر ملکی ایجنٹوں سے متعلق تھا اور میں اسی لیے اتنی رازداری اور احتیاط سے کام لے رہی تھی اسی سبب اس واقعے کی تشہیر کو روک دیا گیا نہ اخبارات کو اس کی ہوا لگنے دی گئی تھی نہ چند افراد کے سوا کسی کو اصل واقعے کے اسباب کا علم ہو سکا تھا۔ آئی جی اور اس کے چند ماتحتوں کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی کہ اصل معاملہ کیا تھا۔

موجودہ حالات کے پیش نظر وہاں میرا مزید رکنا ناگزیر تھا۔ کرشن کمار کے قتل کا معما حل کرنا ہر چند کہ اب پولیس کا دردسر تھا' لیکن ذاتی طور پر خود میں بھی تجسس میں مبتلا تھی ایک شخص جس کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور اسے کب پولیس کے حوالے کیا جائے گا اس شخص کو عین اس وقت کس طرح ٹھکانے لگا دیا گیا۔ جب پولیس اسے اپنی تحویل میں لے چکی تھی؟ آخر کرشن کمار کو قتل کرانے والوں کے ذرائع معلومات کیا تھے؟ میرے اور سیل کے چند ارکان کے سوا کسی کو بھی تو یہ معلوم نہیں تھا کہ کرشن کمار کو پولیس کے حوالے کیا جانے والا ہے پھر کس طرح اور کس سطح پر یہ بات لیک آؤٹ ہوئی؟ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر کرشن کمار کے قتل کو کس خانے میں رکھا جا سکتا تھا؟ وجہ قتل تو ظاہر تھی اسے قتل کرانے والے یہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ وہ اقبال جرم کر لے۔ کرشن کمار کے اس اعتراف کا مطلب کہ وہ واقعی پڑوسی ملک کا جاسوس ہے پڑوسی ملک کے لیے سود مند ثابت نہ ہوتا اس اعتراف سے پہلے ہی اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئی تھی۔

کرشن کمار کے قتل کی وجہ سے میرے ذہن میں جو سوالات پیدا ہوئے انہیں سوالات نے مجھے وہاں مزید رکنے پر مجبور کر دیا' اس الجھی ہوئی گتھی کا ایک سرا بہرحال ابھی میرے ہاتھ میں تھا اور دوسرا کرشن کمار کی کار پر گولی چلانے والا نوجوان تھا۔ سیل کے ارکان کی بیدار مغزی کے سبب وہ حملہ آور نوجوان اگر حراست میں نہ آ گیا ہوتا تو شاید یہ معما' معما ہی رہتا میں اسی غرض سے آئی جی کے ساتھ واپس عمارت کی طرف چلنے لگی۔

''آئی ایم ویری سوری میڈم!'' آئی جی نے میرے ساتھ چلتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

''کس لیے؟...... اس میں آپ کا یا آپ کے آدمیوں کا تو کوئی قصور نہیں ہے جو کچھ ہوا قطعی غیر متوقع تھا۔'' میں نے بھی دھیمے لہجے میں بات کی۔

''آفٹر آل...... میں خود کو اس سے بری الذمہ نہیں سمجھتا' یہ واقعہ بہرحال پولیس ہیڈ آفس کے احاطے میں رونما ہوا ہے۔''

''لیواٹ!'' میں بولی۔ ''میں فوری طور پر اس نوجوان سے ملنا چاہتی ہوں جس نے کرشن کمار پر گولی چلائی تھی اب صرف وہی کلو ہمارے ہاتھ میں رہ گیا ہے۔''

''یقیناً!'' آئی جی میری تائید میں بولا۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد میں آئی جی کے ہمراہ اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں کرشن کمار کے قاتل سے پوچھ گچھ کی جارہی تھی۔ ذرا سی دیر میں پولیس والوں نے مار مار کر اس کا براحشر کر دیا تھا۔ یقیناً وہ نوجوان رحم کا مستحق نہیں تھا اس کی زبان کھلوانا بھی ضروری تھا اور یہ بھی کہ وہ قاتل تھا مگر اس کے باوجود ایک دم ''تھرڈ ڈگری'' کا استعمال مجھے کچھ بھلا نہیں لگا۔ پولیس والوں نے اسے ''فٹ بال'' بنایا ہوا تھا۔ جب آئی جی میرے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا تو ان کا یہ ''کھیل'' ایک دم رک گیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی۔ آئی جی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے پھر اس نے اپنے ماتحتوں کو ڈانٹ پلائی میرے خیال میں بھی وہ لوگ کیس بگاڑ رہے تھے۔ ایسے معاملات میں فوری طور پر تشدد کی بجائے نفسیاتی حربوں سے کام لیا جاتا ہے۔ کسی کو تشدد کر کے زخمی یا ہلاک کر دینا بہت آسان ہوتا ہے مگر اس سے اقبال جرم کرا لینا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً ایسے افراد سے جن پر غیر ملکی جاسوس ہونے کا الزام ہو!

اس حملہ آور نوجوان کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں فرش پر پڑا کراہ رہا تھا اس کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی بھی نہیں کی گئی تھی اس میں شک نہیں کہ بعض کیسز میں ''تھرڈ ڈگری'' کا استعمال ہی سب سے مؤثر ثابت ہوتا ہے اور یہ مثل بھی غلط نہیں کہ مار کے آگے بھوت بھی بھاگتا ہے مگر یہ کلیہ نہیں ہے ہر کیس پر اسے اپلائی نہیں کیا جا سکتا۔ مارشل آرٹ کی تربیت کے دوران میں تو خاص طور پر اس طرح کی مشقیں کرائی جاتی ہیں جس فرد میں جتنی زیادہ قوت برداشت ہوتی ہے وہ اتنا ہی بہتر ثابت ہوتا ہے۔ کئی افراد مل کر ایک فرد کو زدوکوب کرتے ہیں اور وہ مار برداشت کرتا رہتا ہے خود ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ بعینہ یہی طریقہ تربیت ان افراد کا بھی ہوتا ہے جو دوسرے ممالک میں جا کر اپنے ملک کے مفادات کی خاطر جاسوسی کرتے ہیں اسی سبب تھرڈ ڈگری یعنی تشدد ان پر زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ آئی جی کیونکہ سمجھدار تھا اسی لیے اس نے ایسا کرنے پر خفگی کا اظہار کیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ پہلے اس کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کی جانا چاہیے۔'' میں نے آئی جی کو مخاطب کیا۔ ''اس کے بعد بھی اسے پوری طرح اپنے حواس میں آنے کے لیے کچھ وقت لگے گا اسی صورت میں اس سے پوچھ گچھ ممکن ہے آپ کے خیال میں کتنی دیر لگے گی...... میرا مطلب یہ کہ کب تک مجھے انتظار کرنا پڑے گا؟''

آئی جی غالباً میرے سوال کا مقصد سمجھ گیا اور بولا ''کم از کم ایک گھنٹہ!...... اس دوران میں آپ مناسب سمجھیں تو میرے کمرے میں انتظار کر لیں۔ اگر اسے تکلف کا نام نہ دیں تو اس عرصے میں ہم لوگ چائے بھی پی لیں گے۔''

میں نے آئی جی کی دعوت قبول کر لی۔ وہ اپنے ماتحتوں کو ضروری ہدایات دے کر مجھے ساتھ لیے اپنے کمرے میں آ گیا کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے دروازے پر مستعد کھڑے ہوئے کانسٹیبل سے چائے کے لیے بھی کہہ دیا تھا اور یہ بھی کہ کسی کو کمرے میں نہ آنے دیا جائے۔

اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد آئی جی نے کچھ اسی سے ملتے جلتے سوالات شروع کر دیئے جو خود میرے ذہن میں پہلے آ چکے تھے۔

''آپ کے ان تمام سوالوں کے جواب وہی نوجوان دے سکتا ہے جس نے کرشن کمار کو قتل کیا ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''یہ بھی تو امکان ہے کہ وہ محض درمیانی کڑی ہو اور اسے کچھ معلوم نہ ہو۔''

''ممکن ہے'' میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''اسے صرف قتل کرنے کے لیے بھی آلہ کار بنایا جا سکتا ہے' اس کے باوجود اصل مجرم تک پہنچنے کی کوئی نہ کوئی راہ ضرور پیدا ہو جائے گی۔ اس سے قطع نظر یہ بات تو بہرحال واضح ہے کہ کرشن کمار کو قتل کرانے میں کسے دلچسپی ہو سکتی ہے!......

اصل مسئلہ کچھ اور ہے! ...... ابھی تو آپ نے جو سوالات کیے' وہ خود میرے لیے بھی جواب طلب ہیں۔ یہ معاملہ قیاسات پر مبنی معلوم نہیں ہوتا۔ حالات اور واقعات کی روشنی میں یہی ظاہر ہوتا ہے جیسے سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا۔ کوئی بھی ذہین شخص ان واقعات سے یہی نتیجہ اخذ کرے گا۔ میں غیر جانبدارانہ طور پر ان واقعات کو مختصراً بیان کرتے ہوئے ان کا تجزیہ کرتی ہوں۔ اس میں نہ آپ پارٹی ہیں نہ میں! یوں سمجھیے کہ ایک معزز اور بااعتماد شہری کسی ملزم کو پولیس کے حوالے کرنے لاتا ہے۔ عین اس وقت ملزم کو قتل کر دیا جاتا ہے جب وہ پولیس کی تحویل میں دیا جاتا ہے۔ اس واقعے سے کئی سوال ذہن میں ابھرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ معزز شہری جس پر پولیس نے اعتماد کیا' کیا واقعی اعتماد کے قابل تھا؟ نمبر دو یہ کہ اگر وہ اعتماد کے قابل تھا تو کیا اس کے ساتھیوں پر بھی اعتماد کیا جا سکتا ہے! ...... کہیں انہی میں سے کوئی تو اصل مجرم یا مجرموں سے ملا ہوا نہیں تھا؟...... ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ ایسا نہیں تھا' وہ شہری اور اس کے ساتھی قابل اعتماد ہیں تو اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کس طرح اصل مجرم یا مجرموں کو یہ خبر ہوئی کہ ان کا بندہ پولیس کے حوالے کیا جانے والا ہے؟ چلیں یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ کسی طرح قیاس کے سبب یا کسی اور ذریعے سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایسا ہونے والا ہے تو پھر صحیح مقام اور وقت کا تعین کیسے کیا گیا؟ اور پہلے ہی سے ایک شخص کو قتل پر کس طرح مامور کر دیا گیا؟...... یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات ہر ذہین شخص کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں اور......'' میں مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مجھے عقب سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ آنے والا آئی جی کا اردلی تھا جو چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے تھا۔ چائے کے ساتھ دوسرے لوازمات بھی تھے۔

اردلی چلا گیا تو میں نے چائے پیتے ہوئے آئی جی کو مشورہ دیا کہ اس دوران میں کرشن کمار اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو کا ٹیپ سن لے۔ اسے اب تک وہ ٹیپ سننے کا موقع نہیں

ملا تھا جو خود میں نے ہی اسے فراہم کیا تھا۔ کرشن کمار کے قتل کے بعد اب اس ٹیپ کی اہمیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ آئی جی نے کیس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے میرا مشورہ قبول کر لیا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر منگوا لیا اور پھر چند ہی لمحے بعد مقتول کرشن کمار کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

پہلے وہ باتیں سنائی دی تھیں جو ابتدا میں کرشن کمار سے میں نے کی تھیں۔ میں نے اس سے اپنی گفتگو کے آخر میں نام بتانے اور اس جگہ کی نشاندہی کے لیے کہا تھا جہاں کا وہ رہنے والا تھا جواباً کرشن کمار نے کہا تھا۔ ''میرا نام کرشن کمار ہے اور میں اندرون سندھ کا رہنے والا ہوں......'' ٹیپ پر کرشن کمار اور میرے درمیان ہونے والے سوال جواب سنائی دیتے رہے۔ آئی جی توجہ سے سب کچھ سنتا رہا۔ کرشن کمار اپنی کہانی سنا چکا تو میری آواز ابھری۔ ''کرشن کمار! تم یقیناً ایک اچھے اداکار ہو' تمہاری تربیت ذہین لوگوں نے کی ہے تم اگر جاسوسی کا پیشہ اختیار کرنے کی بجائے اداکاری کے فن کو اپناتے تو اس سے زیادہ کامیاب رہتے!

ٹیپ چلتا رہا۔ ''ثبوت دیکھنا میرا کام نہیں ہے' یہ کچھ اور لوگوں کا کام ہے جو وہ اپنے طور پر انجام دیں گے۔ اگر تم واقعی بے گناہ ثابت ہوئے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا' خدا فظ!'' بھگوان کے لیے...... خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں......'' کرشن کمار کی سسکیاں اور رونے کی آواز کے ساتھ میرے قدموں کی دور ہوتی چاپ سنائی دی اور پھر ٹیپ ختم ہو گیا۔ آئی جی نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آف کر دیا۔

آئی جی کے چہرے سے بیک وقت حیرت اور عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا جس کا اظہار اس نے الفاظ میں بھی کیا۔ ''حیرت انگیز مس صدرا خان!...... آپ انتہائی غیر معمولی ذہن کی مالک ہیں...... یہ میں کسی اور...... اور سب نہیں بلکہ حقیقتاً اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ آپ نے مقتول کرشن کمار کی پیتھیٹک سٹوری کے باوجود قطعی صحیح نتیجہ اخذ کیا۔ وہ یقیناً پڑوسی ملک کا جاسوس ہی تھا۔''

''خیر اب وہ قصہ تو تمام ہوا...... اصل مسئلہ ابھی بدستور موجود ہے۔'' میں بول اٹھی ''وہ جگہ جہاں میں نے کرشن کمار کو رکھا تھا اور جہاں اس کا یہ بیان ٹیپ کیا گیا' میرے اور میرے ساتھیوں کے سوا کسی کے علم میں بھی نہیں ہے۔ آپ اسے ایک محفوظ قلعے کے مانند سمجھ سکتے ہیں۔ وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ جن ملک دشمن عناصر سے میں اب تک برسرپیکار رہی ہوں' اپنی تمام تر کوششوں اور ذرائع کے باوجود اس جگہ کا سراغ نہیں لگا سکے۔ یہ خودستائی نہیں حقیقت ہے کہ تخریب کاروں اور ملک دشمنوں کیلئے میں اور میرے ساتھی ہمیشہ خطرناک ثابت ہوئے ہیں۔ ا... میری محفوظ پناہ گاہ ہے۔ اس تک کسی کا پہنچنا ممکن نہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا!...... یہ سب کچھ میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ آپ اس کیس کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں۔ ان حالات میں شخص جو زیر حراست ہے' میری مراد کرشن کمار کے قاتل سے ہے' سو وہ خاصا اہم ہو جاتا ہے۔ اس کا بیان بہت سی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا سکتا ہے' مگر شرط وہی ہے کہ وہ زبان کھول دے یا اس کی زبان کھلوائی جا سکے!''

اگر آپ مائنڈ نہ کریں اور میری درخواست ذاتی طور پر قبول کر لیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ خود آپ اس سے جس طرح بھی چاہیں پوچھ گچھ کریں۔ آپ چاہیں گی تو میں خود بھی آپ کی معاونت کیلئے ساتھ رہوں گا اور اسے اپنے لیے اعزاز سمجھوں گا۔'' آئی جی منکسر المزاجی سے کہنے لگا۔

''اعزاز کیسا جناب!...... مجھے تو آپ حکم دینے کے مجاز ہیں۔ یہ آپ کا محکمہ ہے اور میں بہرحال باہر سے آئی ہوں۔ یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ آپ مجھے اتنی عزت بخش رہے ہیں۔ سرکاری معاملات میں مداخلت میرا منصب نہیں' ہاں ایک شہری ہونے کی حیثیت سے قانون اور قانون کے رکھوالوں کی مدد کرنا میرا فرض ضرور ہے۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ اس حملہ آور نوجوان کا بیان لوں۔ آپ کیلئے میرا دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ اس کیس کو خود ڈیل کرنے کی بجائے اسے سنٹرل انٹیلی جنیس والوں کے سپرد کر دیں۔ ہاں اس سلسلے میں ابتدائی کارروائی اور ضروری خانہ پری بہرحال آپ کی ذمہ داری ہے۔''

آئی جی نے میرے مشورے سے اتفاق کیا' پھر گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اردلی کو بلا کر اپنے ایک ماتحت کو طلب کیا۔ اردلی چلا گیا تو وہ مجھ سے بولا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ اب تک حملہ آور نوجوان اپنے حواس میں آ چکا ہوگا۔ تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔''

میں نے صرف اثبات میں سر ہلانا کافی سمجھا اور خاموشی کے ساتھ آئی جی کے ماتحت کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔

آئی جی کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس کے ایک ماتحت افسر نے یہی رپورٹ دی کہ اب حملہ آور نوجوان اس قابل ہو گیا ہے کہ اس سے ضروری پوچھ گچھ کی جا سکے۔ یہ سنتے ہی آئی جی اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں کی۔

اس کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے جہاں کرشن کمار کے قاتل کو رکھا گیا تھا' میں نے آئی جی کے ماتحت افسر سے سوال کیا۔ ''آفیسر! آپ لوگوں نے اس نوجوان کی تلاشی تو لے لی ہو گی اچھی طرح یا...... نہیں؟

''جی...... جی ہاں...... جی۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''جہاں تک میرا اندازہ ہے آفیسر' آپ کو اس سلسلے میں کوئی علم نہیں...... خیر کوئی بات نہیں' ہم خود ہی وہاں چل رہے ہیں' دیکھ لیں گے۔'' میں نرمی سے بولی۔

آئی جی نے سخت نظروں سے اپنے ماتحت کو دیکھا اور اس کا چہرہ تاریک سا ہو گیا۔ اسے غالباً ''اچھی طرح'' نے گڑبڑا دیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تلاشی سرسری طور پر لی گئی تھی اور بعد میں یہ بات درست بھی ثابت ہوئی۔

ذرا ہی دیر بعد آئی جی' اور آئی جی کا ماتحت افسر' ہم تینوں اس کمرے میں پہنچ گئے۔ پولیس والوں نے بہرحال اتنی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا کہ کرشن کمار کے قاتل کو ایک کرسی سے باندھ کر بٹھا دیا تھا اور کمرے میں ایک مسلح پولیس والا بھی اس کی نگرانی کیلئے موجود تھا۔ میرے کہنے

پر آئی جی نے اپنے ماتحت افسر اور مسلح پولیس والے کو کمرے سے باہر نکال دیا اور پھر اندر سے دروازہ بھی بند کر لیا۔

میں نے قاتل نوجوان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس کے زخمی ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے ایک اور خاص بات نوٹ کی۔ آئی جی کمرے کا دروازہ بند کر کے میرے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ دانستہ میں نے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی۔ فوری طور پر نوجوان نے ردعمل کا اظہار کیا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اسی لمحے میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے زناٹے دار تھپڑ نوجوان کے چہرے پر پڑا۔

''احمق آدمی! تم اپنے سسرال میں نہیں آئے ہو!''

میں نے سخت لہجے میں کہا' پھر اس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر بولی۔ ''یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے ساتھ کسی قسم کی رعایت کی جائے گی! تمہیں دوبارہ فٹ بال' بنایا جا سکتا ہے...... تمہاری انگلیوں کے ناخن کھینچے جا سکتے ہیں!...... تمہارے زخمی ہاتھ کے زخم پر حقیقتاً نمک چھڑکا جا سکتا ہے! ...... اور...... اور تمہیں اسی کمرے میں ذبح کر کے تمہاری لاش بھی ٹھکانے لگائی جا سکتی ہے! ...... وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جس کی تمہیں توقع بھی نہ ہو' مگر ایک بہتری کی صورت بھی ہے' بچاؤ کا راستہ بھی ہے۔'' میں نے بال پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کر لیا تھا اور براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ ''سنو! اپنے ملک...... اپنے وطن کے مفادات کی خاطر جان دے دینا یقیناً بڑی بات ہے لیکن مفادات کی حدیں مقرر ہوتی ہیں!...... اگر ایک ملک کے مفادات سے دوسرے ملک کے مفادات پر ضرب پڑتی ہو تو یہ راہ راست نہیں ہے اور تم...... تم بھی راہ راست پر نہیں ہو!...... نہیں...... بولو مت۔ میں ابھی کچھ نہیں سننا چاہتی اور نہ تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں بے وقوف نوجوان کہ اگر تم خودکشی کا فیصلہ کر چکے ہو تو یہ غلط ہے!...... ابھی تمہیں زندہ رہنا چاہئے!...... یہاں اپنے وطن سے دور ایک اجنبی سرزمین پر تم قتل کر دیئے گئے' مارے گئے تو سوچو ان کیلئے جو تم سے محبت کرتے ہیں اور یہاں سے ہزاروں میل دور تمہاری واپسی کے منتظر ہیں' کیا تم ان سے ملے بغیر مر جانا چاہتے ہو؟...... کیا تمہارے سینے میں دل نہیں ہے؟ کیا کبھی تم نے کسی سے محبت نہیں کی؟ ...... بولو تمہیں کسی سے محبت ہے؟...... جواب دو کہ کیا کوئی اس دنیا میں ایسا ہے جو تمہاری موت پر آنسو بہا سکے؟''

میں نے دیکھا کہ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کی پلکوں کے گوشوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔

''بولو!'' میں نے اس کے بالوں کو جھٹکا دیا۔ ''جواب دو' کون ہے وہ جسے تم سب سے زیادہ چاہتے ہو؟''

''ما...... ماتا جی......'' اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اسی کے ساتھ میں نے اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ آئی جی دور کھڑا ہوا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

نوجوان کے منہ سے نکلے ہوئے ایک لفظ نے میرے کئی سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ اس نے میری باتوں کے جواب میں صرف ''ماتا جی' یعنی 'ماں'' کہا تھا۔ اس ایک لفظ سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی تھی کہ وہ مسلمان نہیں' ہندو ہے' دوسری بات یہ کہ میں نے جو مفروضات قائم کر کے اس سے گفتگو کا آغاز کیا تھا' وہ سو فیصد درست تھے۔ وہ بھی کرشن کمار کی طرح پڑوسی ملک کا ایجنٹ تھا۔

''یہ نوجوان قابل رحم ہے۔'' میں نے آئی جی کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا' ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اسے رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دیں۔ یہ شاید اب خودکشی کا ارادہ بدل دے۔ اس نے کسی ایسے ہی موقع کے لیے اپنے پاس کوئی زود اثر زہر چھپا رکھا ہو گا۔ وہ اس سے لے لیں کیونکہ ابھی اسے زندہ رہنا ہے...... اسے اپنی ماں کے پاس پہنچنا ہے!''

''نہیں!'' وہ نوجوان خلاف توقع ایک دم چیخ اٹھا ''مجھ پر رحم نہ کرو! مجھے قتل کر دو مار دو مجھے!

میری ماں' میری دھرتی ہے! ...... دھرتی ماں! ...... میں اس سے غداری نہیں کر سکتا! ...... میں...... میں تم لوگوں کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گا...... کچھ بھی! ...... چاہے تم لوگ مجھے قتل ہی کیوں نہ کر دو؟ اپنی دھرتی ماں پر قربان ہو جاؤں گا...... امر ہو جاؤں گا!''

''سنو نوجوان!'' میری آواز میں بے حد نرمی تھی۔ ''ہمیں تم سے کچھ نہیں پوچھنا' کچھ بھی نہیں کیونکہ ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ پہلے سے معلوم ہے اور ہم تمہارے اس جذبے کی بھی قدر کرتے ہیں کہ تم اپنی مادر وطن پر قربان ہو جانا چاہتے ہو۔ ہم تمہارے اس جذبے کو سلام کرتے ہیں! تم یقیناً اپنی دھرتی ماں سے محبت کرتے ہو۔ اگر تم یہی چاہتے ہو کہ اپنی دھرتی ماں سے دور یہاں مارے جاؤ اور کوئی تمہیں رونے والا بھی نہ ہو' تمہاری ارتھی بھی نہ اٹھے تو ہم ظاہر ہے کہ تمہاری خواہش کا احترام ضرور کریں گے۔ تمہیں اپنی دھرتی ماں پر قربان ہو کر امر ہو جانا چاہئے۔ تمہاری وہ ماں تمہیں یاد کر کے دم توڑ دے گی جس نے تمہیں جنم دیا تھا!'' میں اپنی بات ختم کر کے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی جس پر وحشت کے سے آثار تھے۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی' پھر یہ خاموشی اسی نوجوان کی آواز سے ختم ہو گئی وہ مردہ سی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''اگر آپ لوگ مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتے تو پھر کیوں آئے ہیں میرے پاس؟''

''صرف یہ بتانے کہ فریب دیا گیا ہے تمہیں!'' دھوکا کیا گیا ہے تمہارے ساتھ! تم لوگوں کے بھولپن' معصومیت اور حب الوطنی کو تمہارے ہی ملک کا ایک مخصوص ٹولا اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے استعمال کر رہا ہے' دھرتی ماں کے نام! ...... صرف تمہی نہیں ہو تم سے نہ جانے کتنے نوجوان اس جنون میں مبتلا ہو کر مارے جا رہے ہیں؟ اور وہ جو اونچے ایوانوں میں بیٹھ کر راج کر رہے ہیں' انہیں تمہاری اور تم ایسے پاگلوں کی کوئی فکر نہیں۔ وہ تمہارا استحصال کر رہے ہیں۔ اپنے اقتدار کو مختلف بہانوں سے قائم رکھنے کیلئے وہ تمہارے خلوص' تمہاری انسانیت اور وطن سے تمہاری محبت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ غربت' بیروزگاری اور جہالت کی طرف سے اپنے عوام کی توجہ ہٹانے اور بٹانے کی خاطر وہ پڑوسی ممالک سے خواہ مخواہ دشمنی کا رویہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ صرف

اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی خاطر ہے۔

اور تم...... تم ایسے نوجوان نادانستگی میں ان کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں! ...... تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ ان کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ پڑوسی ممالک میں اپنے ایجنٹ بھیج کر وہاں گڑ بڑ پھیلانے اور اپنے ملک کے عوام کو دھوکا دینے کا مطلب کیا ہے! ...... سنو میں بتاتی ہوں تمہیں! ...... وہ تمہارے ملک کے بااقتدار افراد تمہارے اوپر جنگ مسلط کرنا چاہتے ہیں اور جنگ اس لیے کہ تمہارے ملک کے عوام بھوکے ننگے ہونے کے باوجود جنگی جنون میں مبتلا ہو جائیں۔ وہ اپنی بھوک بھول جائیں۔ انہیں یہ بات یاد نہ رہے کہ ان کے تن پر کپڑا نہیں' ان کے رہنے کو گھر نہیں ہے! وہ اگر یاد رکھیں تو صرف یہ کہ ملک ہنگامی حالات سے دوچار ہے اور جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ تم ابھی بہت چھوٹے ہو اور نہیں جانتے کہ جنگ کتنی ہولناک چیز ہوتی ہے! ...... مجھے تمہارے ملک کے غریب اور معصوم عوام پر رحم آتا ہے کہ وہ انجانے میں ایک سازش کا شکار ہو رہے ہیں۔ اور سنو؟ تاریخی حقیقتیں اتنی آسانی سے نہیں بدلا کرتیں! اگر تم نے اتہاس (تاریخ) کا مطالعہ کیا ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں جنہوں نے ملک گیری کی ہوس میں خود کو بھلا دیا۔ تمہارے نیتا (لیڈر) جو تقریریں کرتے ہیں' تمہارے ذہنوں میں جو زہر گھولتے ہیں' وہ غلط ہے' انہیں ایک نہ ایک دن دل سے تاریخ کے فیصلوں کو قبول کرنا پڑے گا...... کچھ آ رہا ہے تمہاری سمجھ میں؟'' میں پرجوش لہجے میں بولتے بولتے ایک دم خاموش ہوگئی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس نوجوان کی نظریں نیچی ہیں اور سر جھکا ہوا ہے۔ یقیناً میری باتوں کا اس پر اثر ہوا تھا۔

پھر مجھے اس نوجوان کو رام کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے اس کے مفروضہ نظریات وعقائد پر بھرپور ضرب لگائی تھی اور اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ اس کی قربانی رائیگاں جائے گی اور یہ کہ اسے واقعی مرنا نہیں چاہئے۔ اس کے بعد آئی جی نے نوجوان ہی کی نشاندہی پر اس کے ایک موزے سے چھوٹی سی پڑیا نکال لی جس میں تیز قسم کا زہر موجود تھا۔ وہ کاغذ کی پڑیا' پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی تھیلی میں محفوظ تھی۔

میں نے ابھی تک اس سے دانستہ بیان دینے کیلئے نہیں کہا تھا۔ رفتہ رفتہ میں خود ہی اسے ایسے مرحلے تک لے آئی تھی کہ وہ زبان کھول دے۔ یہ مرحلہ آنے سے پہلے ہی میں نے اشارتاً آئی جی سے کہہ دیا تھا کہ بیان ریکارڈ ہونا چاہئے اور آئی جی نے اس کا بندوبست کرلیا تھا۔

اس نوجوان نے جو حقائق بیان کیے اور جنہیں ریکارڈ بھی کرلیا گیا' وہ مختصراً یہ تھے۔

نوجوان کا نام ہرگوپال تھا اور وہ کرشن کمار ہی کی طرح راجستھان کا رہنے والا تھا۔ کرشن کمار اور وہ غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے سندھ کے علاقے میں داخل ہوئے تھے ان کے پاس تمام ضروری کاغذات موجود تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پاکستانی باشندے ہیں۔ یہ تمام کاغذات جعلی تھے۔ انہیں اس غرض سے پاکستان بھیجا گیا تھا کہ وہ یہاں اہم تنصیبات کے متعلق ضروری معلومات حاصل کریں۔ ان دونوں کو کراچی کے علاوہ پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی جانا تھا' انہیں سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ وہ اپنے ملک کے سفارت کاروں سے انتہائی مجبوری کی حالت میں رابطہ قائم

کریں ورنہ نہیں۔ گوپال کی نسبت کرشن کمار کم ذہین تھا۔ اس میں ایک اور کمزوری بھی تھی۔ وہ فضول خرچ اور سیر وتفریح کا بھی دلدادہ تھا۔ کراچی میں ان دونوں کا قیام یہاں کے ایک بڑے ہوٹل میں تھا۔ گوپال نے اس کی بھی مخالفت کی تھی مگر کرشن کمار نہیں مانا تھا۔ اس نے گوپال سے کہا تھا کہ اگر رقم ختم ہوگئی تو اپنے ملک کے کسی سفارتکار سے رابطہ قائم کرلیا جائے گا اور اس سے اپنی شناخت کرانے کے بعد رقم لے لی جائے گی۔ گوپال نے اس سے بھی اختلاف کیا اور کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ گوپال کو قائل کرنے کی خاطر کرشن کمار نے بالآخر اپنے ملک کے ایک سفارت کار سے رابطہ قائم کر ہی لیا۔ کرشن کمار اپنے مقصد میں کامیاب رہا' اسے خاصی رقم مل گئی تھی اور وہ آئندہ کیلئے بھی معاملہ طے کر آیا تھا۔ کراچی کے دوران قیام میں ان دونوں نے بڑی حد تک اپنے مشن کی تکمیل کرلی' مگر کرشن کمار کی فضول خرچی پھر رنگ لائی چند روز بعد ان دونوں کو کراچی سے لاہور کا رخ کرنا تھا مگر رقم کی پھر ضرورت پڑ گئی تھی۔ اسی دوران میں کرشن کمار نے کرائے پر ایک کار بھی حاصل کرلی تھی جو دونوں ہی کے استعمال میں رہتی تھی۔ جس روز کرشن کمار میرے آدمیوں کے ہتھے چڑھا' کرائے کی کار' گوپال کے مصرف میں تھی۔ کرشن کمار نے گوپال سے کہا تھا کہ وہ سفارت کار سے رقم لے کر ایک مقررہ مقام پر اس کا انتظار کرے گا۔ گوپال کو اس طے شدہ مقام تک پہنچنے میں چند منٹ کی دیر ہوگئی۔ اسی میں کرشن کمار اپنے ملک کے ایک سفارت کار کی کار سے اتر کر سیل کے ارکان کی نظر میں آ گیا۔ جس وقت سیل کے ارکان' کرشن کمار کو اٹھا کر لے جا رہے تھے' گوپال کی کار وہاں پہنچ چکی تھی۔ اسے فوری طور پر گڑبڑ کا احساس ہوگیا۔ اس نے انتہائی محتاط رہ کر سیل کے پٹرولنگ یونٹ کی بند وین کا تعاقب کیا اور آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی عمارت تک پہنچ گیا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ یہ عمارت انٹیلی جینس والوں کی ہے۔ وہ اسی لیے رات بھر دور ہی دور رہ کر عمارت کی نگرانی کرتا رہا۔ پھر جب دوسرے دن صبح وہی بند وین' آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے پولیس ہیڈ آفس کی طرف روانہ ہوئی تو گوپال پھر اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کے بعد جب یہ مرحلہ درپیش ہوا کہ کرشن کمار کو بند وین سے اتار کر حراست میں لے لیا گیا تو گوپال نے اسے قتل کر دینے کا فیصلہ کیا کہ کہیں وہ تشدد کیے جانے پر زبان نہ کھول دے۔ پھر جو کچھ ہوا' میں پہلے بیان کر ہی چکی ہوں۔

گوپال یقیناً ذہین اور انتہائی چالاک نوجوان تھا جس نے سیل کے ارکان کو بھی جل دے دیا تھا۔ وہ پہلا غیر ملکی ایجنٹ تھا جو آپریشن سیل ہیڈکوارٹر تک پہنچ گیا تھا ورنہ اس سے پہلے بھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس واقعے سے یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ تمام تر احتیاط کے باوجود سیل کے ارکان کو مزید احتیاط اور مستعدی کی ضرورت ہے۔ گوپال ہی کی طرح کوئی اور بھی غیر ملکی ایجنٹ ان کا تعاقب کرتا ہوا آپریشن سیل ہیڈکوارٹر تک پہنچ سکتا ہے۔ میرے آدمیوں کو بہرحال اتنا چوکنا تو ہونا ہی چاہئے تھا کہ کہیں کوئی ان کے تعاقب میں تو نہیں! یہ نگلیجنس میرے نزدیک قابل معافی نہیں تھی۔ یہ میرے نزدیک بھیانک غلطی تھی۔ پٹرولنگ یونٹ کے انچارج سے اس ضمن میں جواب طلبی لازمی تھی۔ اسے آخر تعاقب کیے جانے کا احساس کیوں نہ ہو

سکا۔ اس کے علاوہ میجر شہباز بھی قصور وار تھا۔ اس نے بھی غفلت کا ثبوت دیا تھا۔ آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے پولیس ہیڈ آفس تک وین کا تعاقب کیا گیا اور وہ بے خبر رہا۔ گوپال کا بیان سن کر میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا۔ اپنا بیان ریکارڈ کرانے کے بعد وہ اب میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور ان نظروں میں کچھ تقاضا بھی تھا۔ ابھی تک اسے کرسی سے کھولا نہیں گیا تھا۔

''سنو گوپال!'' بالآخر میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میرا کوئی بھی تعلق پولیس یا کسی سرکاری محکمے سے نہیں ہے۔ مجھے تم محض ایک محب وطن شہری سمجھ سکتے ہو۔ یہ بات میں نے تمہارے مقتول ساتھی کرشن کمار سے بھی کہی تھی۔ یقین نہ آئے تو ان سے تصدیق کرلو۔ میں نے آئی جی کی طرف اشارہ کیا۔

''میں صرف قانون کی مدد کی خاطر اب تک تم سے گفتگو کرتی رہی ہوں۔ میں تمہاری نظروں کا مفہوم سمجھ چکی ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو! یہ معاملات سرکاری ہیں جن میں میری مداخلت ممکن نہیں۔ ہاں میں تم سے اتنا وعدہ ضرور کرسکتی ہوں کہ اب اقبال جرم کے بعد تمہارے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، تمہیں اور کرشن کمار کو ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد غیر قانونی طور پر سرحد کراس کر کے اپنے ملک واپس جانا تھا، لیکن اب صورتحال بدل چکی ہے۔ تمہارا ساتھی خود تمہارے ہی ہاتھوں قتل ہو چکا ہے اور یہ قتل میرے ملک کی حدود میں ہوا ہے۔ ہرچند کہ تمہارا ساتھی ہمارے ملک کا شہری نہیں تھا لیکن قتل بہرحال قتل ہوتا ہے۔ تم پر پہلا چارج تو غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے کا ہے، دوسرا چارج میرے ملک کی اہم تنصیبات کے متعلق ناجائز طور پر معلومات اکٹھا کرنا ہے۔ کرشن کمار کے قبضے سے بھی کچھ ایسے ہی کاغذات برآمد ہوئے تھے جو ہمارے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ کاغذات بھی میں قانون کے سپرد کروں گی۔ ایسے ہی کاغذات تمہارے ہوٹل کے اس کمرے سے بھی برآمد کر لیے جائیں گے جہاں تم ٹھہرے تھے۔ تیسرا چارج تم پر قتل کا ہے۔ ان تمام چارجز کے باوجود تمہاری عمر اور ذہانت دیکھتے ہوئے میری خواہش یہی ہے کہ تم زندہ رہو، تمہیں اپنے جرائم کی سزا ضرور بھگتنا پڑے گی، نیز یہ کہ آج کے بعد میرے ملک کے سرکاری اداروں کے ساتھ بھی تمہیں پورا تعاون کرنا پڑے گا اور تعاون کی صورت میں یہی ہے کہ تم سے جو کچھ پوچھا جائے تم پوری سچائی کے ساتھ اس کا جواب دے دو! جبھی تمہاری زندگی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اگر تم نے میری درخواست پر تعاون کیا تو یقیناً ایک روز اپنی دھرتی ماتا کے چرنوں میں پہنچ جاؤ گے اور اپنی ماتا جی کے چرن چھو کر ان کی دعائیں بھی لے سکو گے۔ یہاں سے واپسی کے بعد تمہارے لوگ اور تمہارا ملک تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا، اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تمہیں مجھ سے اگر مزید کچھ کہنا ہو تو بولو...... کیونکہ اب شاید ہماری ملاقات نہیں ہو سکے گی۔''

اس کے چہرے پر حیرانی بھی تھی، دکھ بھی اور میرے لیے پسندیدگی کا عنصر بھی! اس نے میری طرف نظر اٹھائی اور صرف اتنا کہا۔ ''مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا، میں صرف آپ کا نام

جاننا چاہتا ہوں۔ اپنے چھوٹے سے جیون میں اپنی ماتا جی کے بعد میں نے پہلی بار کسی ایسی عورت کو دیکھا ہے جس نے مجھے اتنا متاثر کیا ہے۔ میں شاید جیوت (زندہ) نہ رہوں پر جب تک یہ جیوت (زندگی) ہے، سانس کی ڈور نہیں ٹوٹی، میں آپ کو یاد رکھوں گا۔''

میں اس کی بات سن کر مسکرا دی۔ ''گوپال! میرا نام عذرا خان ہے۔ تم نے صرف یہی پوچھا تھا اور میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا۔ اب میں چلوں گی، بھگوان تمہاری رکھشا (حفاظت) کرے......'' یہ کہہ کر میں نے آئی جی کو اشارہ کیا۔

آئی جی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور میں تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔ باہر آئی جی کے کئی ماتحت موجود تھے۔ وہ سبھی مجھے دیکھ کر ایک دم الرٹ ہو گئے۔ آئی جی بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلا اور اپنے ماتحتوں کو ضروری ہدایات دیتا ہوا میرے ساتھ چلنے لگا۔ وہ غالباً باہر تک مجھے چھوڑنے چل رہا تھا۔

''آپ زحمت نہ کریں، میں چلی جاؤں گی۔'' میں نے اس سے کہا، پھر بولی۔ ''غالباً اب کوئی مسئلہ الجھا ہوا نہیں رہ گیا، آپ سارا معاملہ سنبھال لیں گے!''

جواباً اس نے میرے تعاون پر بے حد شکریہ ادا کیا اور پھر میرے اصرار پر اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

میں جب پولیس ہیڈ آفس کی عمارت سے باہر آئی تو مجھے اپنی کار کا ڈرائیور مستعد و چوکنا ملا۔ میں کار کے قریب پہنچی تو اس نے فوراً ہی پچھلا دروازہ کھولا دیا۔

''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر چلو!'' میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے آہستگی سے ڈرائیور کو ہدایت دی۔

کار کا پچھلا دروازہ بند کر کے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور پھر اگلے ہی لمحے کار سٹارٹ ہو گئی۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا، ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے خلاف توقع تقریباً ڈھائی گھنٹے وہاں گزار دیئے تھے حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ذکیہ کو صبح سوتے ہوئے میں چھوڑ کر آئی تھی۔ بیدار ہونے کے بعد اس نے ملازمین سے یقیناً میرے بارے میں پوچھا ہوگا اور بور ہو کر اسٹڈی میں جا گھسی ہوگی۔ اسے بھی میری طرح مطالعے کا تھوڑا بہت شوق تھا مگر صرف وقت گزاری کی حد تک! اس کے سارے دوست وغیرہ قاہرہ اور دیگر ممالک میں تھے۔ کراچی میں اس کی کوئی ایسی دوست نہیں تھی جس کی کمپنی میں وہ خوش رہ سکتی، اسی لیے مجھے اس وقت اس کا خیال آ گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے پر بھی اگر میں اس سے نہ ملتی تو وہ بہت چیختی، مگر اس وقت میرا آپریشن سیل جانا ضروری تھا، اور یوں بھی دوپہر کے کھانے میں ابھی وقت تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ ذکیہ عموماً دو بجے سے پہلے لنچ نہیں کرتی تھی۔ پولیس ہیڈ آفس سے نکل آنے کے بعد میں نے ڈرائیور سے کہا کہ آپریشن ہیڈکوارٹر سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کرو اور عثمانی سے کہو کہ پٹرولنگ یونٹ کے انچارج کو ہیڈکوارٹر میں فوری طور پر طلب کرے۔ اس کے علاوہ میجر شہباز کی موجودگی بھی وہاں ضروری ہے۔ میں ہیڈکوارٹر کی طرف آ رہی ہوں۔

ڈرائیور نے فوراً ہی میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ اس کا تعلق بھی سیل ہی سے تھا۔ میری کار میں ایسے ہی مواقع کے لیے محدود قوت کا ٹرانسمیٹر موجود تھا۔ ہیڈ کوارٹر جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں سیل کے ارکان کو پیش آنے والے واقعے کے کلائمکس سے آگاہ کر سکوں۔ حتی الامکان میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ میرے لوگ حالات سے پوری طرح واقف رہیں۔ سیل کے وہ ارکان جنہوں نے ذہانت اور مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے کرشن کمار کے قاتل گوپال کو فرار نہیں ہونے دیا تھا' بہر حال داد کے مستحق تھے۔ داد کے ساتھ ہی انہیں بیداد کا سامنا بھی کرنا پڑتا یہ الگ بات تھی۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ کر میں نے اس کمرے کا رخ کیا جو صرف میرے استعمال میں رہتا تھا۔ اس کی ایک چابی اب میں نے بھی احتیاطاً اپنے پاس رکھ لی تھی۔ کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ مجھے کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ میں اپنے کمرے میں پہنچ چکی ہوں۔ میری توقع کے عین مطابق چند ہی لمحے بعد انٹرکام کی بیل بج اٹھی میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

''میڈم! عثمانی کی آواز سنائی دی۔'' پٹرولنگ یونٹ کا انچارج کیپٹن شاد آپ کی آمد سے چند منٹ پہلے یہاں پہنچ چکا ہے۔ میجر شہباز یہیں تھا۔ کیا دونوں کو آپ کے کمرے میں بھیج دوں؟''

''نہیں' دونوں کو نہیں!' میرے لہجے میں ہلکی سی سختی آ گئی'' پہلے کیپٹن شاد کو بھیجو! پھر جب میں کہوں میجر شہباز کو بھیجنا!''

''جی بہتر ہے'' عثمانی کے لہجے میں ہلکے سے خوف کا تاثر تھا۔ اس نے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ کہیں کسی مرحلے پر کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے ورنہ عموماً میرے لہجے میں سختی نہیں ہوتی تھی۔ عثمانی اس سے بھی واقف تھا کہ اپنے لوگوں سے تمام تر خلوص اور محبت کے باوجود میں غلطی کی سزا ضرور دیتی ہوں۔

کچھ ہی دیر کے بعد کیپٹن شاد کمرے میں داخل ہوا اور مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سلام کا جواب دیا اور خلاف معمول اس سے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔

''کیپٹن شاد!'' میں نے اسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔'' تم نے فوج میں ملازمت کی ہے اور میرے ہی ایما پر تمہیں وہاں سے سبکدوش کیا گیا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تمہیں کورٹ مارشل کا مطلب سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگے!''

''مم..... مگر میڈم میرا قصور؟'' اس کا چہرہ اتر گیا۔

''تمہارا قصور اوور کانفی ڈینس ہے! ...... کچھ آیا سمجھ میں! ...... اگر نہیں آیا سمجھ میں تو سنو کہ کرشن کمار کو کڈنیپ کر کے تم جس بند وین میں یہاں لے کر آئے تھے' اس کا تعاقب کیا گیا تھا اور تم ...... تم کیپٹن شاد اتنے احمق اور بے وقوف ہو کہ تمہیں اس کا احساس نہیں ہو سکا۔ تمہاری حماقت کے نتیجے میں یہ عمارت جسے تم لوگ اور میں خود ایک محفوظ قلعہ کہتی تھی' اب محفوظ نہیں رہی۔

اب تم لوگوں کا تعاقب کرتے ہوئے غیر ملکی ایجنٹ یہاں تک پہنچنے لگے ہیں۔ یہ ہے تمہارا قصور! ...... یہ ہے تمہاری غفلت! ...... بولو' کچھ اور بھی سننا چاہتے ہو! .....'' کیپٹن شاد سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر ندامت تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد میں پھر بول اٹھی۔ ''تمہیں یقیناً پتا چل گیا ہو کہ کرشن کمار کو گولی مار دی گئی۔ اس کے ذمے دار بھی تم ہو..... تم کیپٹن شاد!'' پھر میں نے مختصراً اسے گوپال کی روداد سنا دی۔'' اب تم خود ہی بتاؤ کہ بنیادی غلطی کہاں اور کس سے ہوئی؟ تمہاری ہی طرح میجر شہباز بھی سزا سے نہیں بچ سکے گا اور میں اس کے لیے سزا تجویز کر چکی ہوں' مگر اس سے پہلے تمہیں سزا دینا ضروری ہے!''

''میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں میڈم' آپ مجھے جو چاہے سزا دے سکتی ہیں۔'' کیپٹن شاد کے لہجے میں شکست بھی تھی اور دکھ بھی!

''تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اب سے رات بارہ بجے تک پیدل چلتے رہو گے اور اس دوران میں کہیں رکو گے نہیں۔ بارہ بجے رات کے بعد تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔ اس سزا کا اطلاق اسی وقت سے شروع ہو چکا ہے' گو آن!''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔

کیپٹن شاد میری طرف دیکھے بغیر مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ میں نے انٹرکام پر عثمانی کو اس سزا سے آگاہ کر دیا اور ہدایت دی کہ سیل کے کسی رکن کو فوری طور پر کیپٹن شاد کی نگرانی پر مامور کر دیا جائے۔ اگر وہ رات بارہ بجے سے پہلے حکم عدولی کا مرتکب پایا جائے تو دوسرے دن مجھے رپورٹ دی جائے۔ اسی کے ساتھ میں نے اسے مختصراً پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا' پھر میجر شہباز کو کمرے میں بھیجنے کے لیے کہا۔

ابتدا میں میجر شہباز کے ساتھ میرا رویہ نرم رہا۔ میں نے اس سے کہا' تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے انتہائی ذہانت اور بے حد مستعدی کا ثبوت دیا ورنہ کرشن کمار کا قاتل فرار ہو جاتا۔''

''میڈم! یہ آپ ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔''

اس نے انکساری سے کام لیا۔ میری حوصلہ افزائی کے سبب اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

''لیکن میجر! ..... میری تربیت میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ضرور رہ گئی ہے۔'' میرا لہجہ بدل گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم اتنے اندھے نہ ہو جاتے کہ اپنے تعاقب میں آنے والی کار کو بھی نہ دیکھ سکتے! ..... وہ شخص ..... وہ نوجوان جو پولیس ہیڈ آفس کے احاطے میں تمہاری ہی بیدار مغزی کے سبب پکڑا گیا' آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے پولیس ہیڈ آفس تک تمہاری وین کا تعاقب کرتا رہا تھا!''

''یہ ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے! ..... اس نے عمارت کے ..... اس عمارت تک کو.....'' وہ گھبرا کر ہکلانے لگا۔

''میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو!'' میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''تم شاید یہ

کہنا چاہتے ہو کہ اس عمارت کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں تو پھر وہ شخص یہاں کس طرح پہنچ گیا اور کیسے پولیس ہیڈ آفس تک تمہاری وین کا اس نے تعاقب کیا؟...... یہی کہنا چاہتے ہو' نا تم؟''

''جی...... جی...... ہاں میڈم!''

جواباً میں نے اسے کیپٹن شاد کی حماقت سے آگاہ کر دیا' پھر بولی ''کیپٹن شاد کو تم سے پہلے سزا دی جا چکی ہے اور اب تمہاری باری ہے!'' یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی ''اس ہال میں چلو جہاں گزشتہ روز تم نے مجھے اپنے تربیت یافتہ دو آدموں کا تماشا دکھایا تھا! میں لباس تبدیل کر کے وہیں آ رہی ہوں!''

میجر شہباز سر جھکائے کھڑا رہا۔

میں ایک دم چیخ اٹھی جاؤ اور تم بھی لباس تبدیل کر لو۔

''گٹ آؤٹ!'' تمہاری سزا یہی ہے کہ سیل کے ارکان کی موجودگی میں تمہارا سر پر غرور جھکا دیا جائے مجھے معلوم ہے کہ تم بلیک بیلٹ حاصل کر چکے ہو' مگر شاید تمہارے ذہن سے یہ بات نکل گئی ہے کہ بلیک بیلٹ ہی مارشل آرٹ کی معراج نہیں' اس کے بعد بھی بہت سے درجات ہیں جن کا اندازہ تمہیں ابھی ہو جائے گا۔ تمہارے دماغ سے کیڑے جھاڑنا ضروری ہو گیا ہے۔''

سر جھکائے وہ میری ڈانٹ پھٹکار سنتا رہا اور پھر میرے خاموش ہوتے ہی کمرے سے نکل گیا۔ میں نے عثمانی کو انٹر کام پر ہدایت دی کہ اس وقت آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں محافظوں کے علاوہ جتنے ارکان موجود ہیں' وہ فوری طور پر اس ہال میں پہنچ جائیں جہاں جوڈو کراٹے کی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ عثمانی کو یہ ہدایت دے کر میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور کمرے میں موجود الماری سے وہ مخصوص لباس نکال کر پہننے لگی جو ایسی مشقوں کے درمیان ضروری ہوتا ہے۔ سیل کے ابتدائی دنوں میں بہ شرط فرصت خود میں بھی سیل کے ارکان کو تربیت دیتی رہی تھی۔ خود میجر شہباز بھی کافی دن مجھ سے تربیت حاصل کرتا رہا تھا۔

لباس تبدیل کرتے ہی میں ننگے پاؤں ہال کی طرف روانہ ہو گئی۔ جوڈو کراٹے کی تربیت خود میں نے ایک جاپانی ماہر فن سے حاصل کی تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب میں کچھ عرصہ ٹوکیو میں رہی تھی۔ اس وقت میری عمر بمشکل بیس بائیس سال رہی ہو گی۔ یہ فن میں نے محض اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر سیکھا تھا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دست بہ دست لڑائی کا یہ خوف ناک فن زندگی کے کسی مرحلے پر میری ضرورت بن جائے گا۔ میرے جاپانی استاد کا میرے متعلق یہ خیال تھا کہ کم عمری کے باوجود اس کے تمام شاگردوں پر مجھے فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ بلیک بیلٹ حاصل کرنے کے بعد میں نے ذاتی طور پر بھی اس فن میں کچھ اختراعات کی تھیں جنہیں میرے استاد نے سراہا تھا۔ پھر بعد میں بھی میں مشق کرتی رہی تھی۔ عموماً جوڈو کراٹے سے آشنا افراد کو خطرناک تصور کیا جاتا ہے' مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ کم از کم میرا تجربہ یہی ہے اور مجھے اپنے استاد سے یہی سبق ملا تھا۔ تحمل' قوت برداشت اور صبر اس فن کے بنیادی عناصر کہے جا سکتے ہیں۔ تربیت کے آخری مراحل میں یہی سبق دیا جاتا ہے۔ اس فن کا کوئی بھی بڑا فنکار بھی

ٹمپر لوز نہیں کرتا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس فن میں کچھ داؤ انتہائی اذیت ناک ہیں نہ صرف اذیت ناک بلکہ جان لیوا بھی۔ یہ بھی بتاتی چلوں کہ جوڈو اور کراٹے دو الگ الگ فن ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی بھی ایک شخص ان دونوں ہی پر عبور رکھتا ہو۔ ایسا ہی ایک شخص میرا بوڑھا جاپانی استاد بھی تھا۔

ابھی میں نے جوڈو کراٹے کے بارے میں جو کچھ لکھا اس کا مقصد خود ستائی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ جوڈو کراٹے ہی پر منحصر نہیں' کسی بھی فن کو مثبت اور منفی دونوں ہی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فن سے ہٹ کر اس کی واضح اور بڑی مثال اٹیمک انرجی ہے۔ اٹیمک انرجی کو ایٹم بم بنانے کے کام میں بھی لایا جا سکتا ہے اور اس طرح انسان کی ہلاکت کے سامان کیے جا سکتے ہیں اور اسے تعمیری مقاصد کے لیے بھی یوز کیا جا سکتا ہے۔ جس سے انسان کا مستقبل سنور سکتا ہے۔ میں کوئی عالم دین یا مبلغ نہیں ہوں مگر مجھے خیر و شر کا فرق ضرور معلوم ہے۔ میں اپنی آپ بیتی بیان کرتے کرتے کبھی کبھی جو ڈگر سے ہٹ کر باتیں کرنے لگتی ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پڑھنے والے مجھے اور میرے انداز فکر کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ میجر شہباز کو سزا دینے کا مقصد ایک تو وہی تھا جو میں بیان کر چکی ہوں' دوم یہ کہ میں نے اس کے انداز و اطوار میں ایک نوع کا غرور سا محسوس کیا تھا جو پہلے نہیں تھا۔ یہ غرور خود اس کی شخصیت کو تباہ کر سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے اس سے سخت لہجے میں بات کی تھی اور اب عملی طور پر بڑائی کے اس غلط احساس کو ختم کرنے جا رہی تھی۔ سیل کے ارکان کو وہاں اسی غرض سے جمع کیا گیا تھا۔

میں ہال میں پہنچی تو مجھے دیکھتے ہی سناٹا چھا گیا۔ وہاں خاصے افراد جمع تھے۔ ان میں سیل کے وہ ارکان بھی تھے جنہیں خود میجر شہباز نے جوڈو کراٹے کی تربیت دی تھی۔ ہال کا فرش میں نے خاص طور پر بنوایا تھا۔ پختہ فرش کے اوپر ایک تہ خاص قسم کی لکڑی کی تھی۔ یہ لکڑی میں نے جاپان سے درآمد کی تھی۔ مشقوں کے دوران میں کسی نو مشق کو زیادہ چوٹ نہ آ جائے' اسی لیے میں نے اتنا پیسا خرچ کیا تھا اور یہ بھی میری ہی اختراع تھی۔

میجر شہباز جوڈو کراٹے کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ہال کی ایک جانب سر جھکائے کھڑا تھا۔ اسی کے قریب میں نے عثمانی کو کھڑے دیکھا۔ ڈیوٹی روم میں شاید وہ اپنی جگہ سیل کے کسی اور سینئر رکن کو بٹھا آیا تھا۔ ہال میں چاروں طرف قطار باندھے سیل کے ارکان کھڑے تھے۔

میں جلد ہی ہال کے درمیان میں پہنچ گئی اور میجر شہباز کو بھی اشارے سے وہاں آنے کے لیے کہا۔

وہ بوجھل بوجھل سے قدم اٹھاتا ہوا میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''ہا!'' میں نے زور سے نعرہ مار کر پینترا بدلا۔

جواباً میجر شہباز کو بھی ایک دم مستعد ہو جانا پڑا۔

''وار کرو میجر!'' میں چند قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی اور بظاہر بے پروائی سے اپنی جگہ کھڑی ہو گئی۔

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر ایک دم تیزی سے جست بھر کے کسی عقاب

کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں نے بائیں جانب لانگ جمپ لگائی۔ نتیجتاً میجر شہباز کو زمین چاٹنا پڑی' مگر وہ فوراً ہی سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔ میں اسی دوران میں کسی پرندے کی طرح اڑتی ہوئی اس تک پہنچ چکی تھی۔ میری لاتیں اس کے مضبوط سینے پر پڑی تھیں اور وہ ایک بار پھر چیختا ہوا زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ فلائنگ کک لگانے کے بعد میں خود اس طرح اس سے دور گری تھی کہ پہلے اٹھنے میں کامیاب ہو جاؤں اور مجھے چوٹ بھی نہ آئے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہی اور میجر شہباز سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے پہلے ہی کی طرح ایک بار پھر اسے وار کرنے کا موقع دیا ورنہ میں چاہتی تو وہ میرے قریب بھی نہیں آ سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب آیا' میں نے کراٹے کا ایک خطرناک داؤ کیرات اس پر آزمایا۔ میرے ہاتھ کی ضرب اس کے سر پر پڑی تھی' لیکن میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ ضرب شدید اور بھرپور نہ ہو ورنہ اس کی کھوپڑی کے ٹکڑے ہو جاتے۔ میرا مقصد محض اسے ہوش وحواس سے بیگانہ کرنا تھا۔ ضرب پڑتے ہی وہ میرے قدموں میں آ گرا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔

میجر شہباز کو میں نے دانستہ جلدی زیر کیا تھا۔ میں اسے یہ موقع دینا نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے جسم کو چھو بھی سکے۔ عام حالات میں مشق کراتے ہوئے میں نے کبھی کیرات کا داؤ استعمال نہیں کیا تھا' اور اپنے لوگوں پر اس داؤ کے آزمانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اگر اس وقت میجر شہباز کو سزا دینا مقصود نہ ہوتا تو میں ہرگز ایسا نہ کرتی۔ میرے اندازے کے مطابق اب نصف گھنٹے سے قبل اس کا ہوش میں آنا ممکن نہیں تھا۔

میں نے ایک جانب دیوار کے قریب کھڑے ہوئے عثمانی کو ہاتھ کا اشارہ کیا اور پھر بلند آواز میں بولی۔

''عثمانی! اسے یہاں سے اٹھوا لینا' جلد ہی ہوش میں آ جائے گا' فکر کی کوئی بات نہیں۔''

یہ کہہ کر میں ہال کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت میں نے واضح طور پر یہ بات محسوس کی کہ سیل کے کچھ ارکان مجھے خوف زدہ سی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میں خدانخواستہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہوں۔ میں ان کے درمیان سے زیر لب مسکراتی ہوئی گزر آئی۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے پھر لباس تبدیل کیا اور مزید وہاں رکے بغیر' اپنا پرس اٹھائے باہر نکل آئی۔ کمرہ مقفل کر کے جلد ہی میں اپنی کار میں آ بیٹھی۔ اس وقت پونے دو ہو رہے تھے۔

میں آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے کوٹھی پہنچی تو توقع کے مطابق مجھے ذکیہ کا منہ پھولا ہوا نظر آیا۔ ''کیوں' کیا ہوا تمہیں......؟ یہ منہ کیوں پھولا ہوا ہے تمہارا'' میں نے ہنستے ہوئے اس کی کمر پر دھت جما دی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے' میں اسی لیے سیدھی اسی کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

''چھوڑیں رہنے دیں باجی' میں کچھ کہوں گی تو آپ بزرگی کا مارجن لے کر ڈانٹ دیں گی مجھے! وہ سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

''بزرگ تو ہوں میں تمہاری! ......اس سے انکار کیا تو مرغا بنا دوں گی۔ یہ بتاؤ کھانا کھایا ابھی یا نہیں؟''

''نہیں کھایا ابھی اور نہ کھانے کا موڈ ہے۔''

''معلوم ہے آپ کو آج میں نے گیارہ بجے ناشتا کیا تھا؟'' اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ ''یہی سوچ کر کہ شاید اب آپ لوٹ آئیں' اب آ جائیں!''

''کیا تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ میں ناشتہ کر کے نکلی تھی؟'' میں حیرت سے بولی۔

''معلوم تو ہو گیا تھا مگر یہ سوچ کر آپ کا انتظار کرتی رہی کہ چلیں چائے ہی ساتھ پی لیں گے۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔ بس سارا موڈ چوپٹ ہو گیا۔''

''اچھا چلو اب اٹھو ورنہ ٹھکائی لگا دوں گی' جو بات صبح کرنے والی تھیں' اب کھانا کھاتے ہوئے کر لینا۔''

ہم دونوں کھانے کی میز پر آ گئے اور کھانا لگ گیا تو ذکیہ بولی' یہ بات میں کل رات ہی آپ سے کرنے والی تھی' پھر سوچا کہ چلو صبح ناشتے پر بات ہو جائے گی۔'' اس نے ایک ڈش کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بات کرتے ہوئے کچھ جھجک رہی ہے۔ میں بھی اپنی پلیٹ میں سالن نکالنے لگی اور اس کے بولنے کی منتظر رہی۔ ذرا توقف کے بعد بالآخر اس نے وہ ''ضروری بات'' کہہ دی۔ ''باجی! میں لاہور جانا چاہتی ہوں۔''

''تو اس میں مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے چلی جاؤ۔''

''وہ دراصل ......کل ملک دلاور کہہ رہا تھا کہ شاید آپ کی باجی اجازت نہیں دیں گی۔'' وہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔

''کیا تم نے اس سے بھی تذکرہ کیا تھا کہ لاہور جا رہی ہو؟''

''بات یہ ہے کہ اسی کی تجویز تھی لاہور ڈاکٹروں نے اسے تبدیلی آب وہوا کا مشورہ دیا ہے۔''

''تم بات کو اتنا الجھا کیوں دیتی ہو! عجیب لڑکی ہو تم! سیدھے سیدھے یوں کیوں نہیں کہتی کہ تم ملک دلاور کے ساتھ لاہور جا رہی ہو!''

''جی...... جی ہاں' میں یہی کہنا چاہتی تھی...... یوں بھی میں یہاں بہت بور ہو گئی ہوں۔ ملک دلاور بتا رہا تھا کہ وہاں گلبرگ کے علاقے میں اس کی کوٹھی......''

''معلوم ہے مجھے!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی' پھر بولی ''اگر تم لوگوں کا یہی پروگرام بن چکا تھا تو کل بھی مجھے بتا سکتے تھے! آخر اس رازداری کا کیا مطلب ہے!''

''اسی نے کہا تھا کہ آپ ہی بات کر لیجئے گا' اگر میں کہوں گا تو آپ کی باجی ہرگز نہیں مانیں گی اور آپ کو میرے ساتھ لاہور نہیں جانے دیں گی۔''

''ذکیہ! میں سنجیدگی سے بولی۔ ''مجھے تمہارے لاہور یا کہیں بھی جانے پر کوئی اعتراض نہیں' لیکن ملک دلاور کا معاملہ مختلف ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ تم سے اس حد تک قریب ہو جائے

وہ میرا دوست ہے اور میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس دوستی کی بھی حدود مقرر ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ میرے ساتھ مخلص ہے' اس کے باوجود میں تمہیں اس کے ساتھ لاہور جانے کی اجازت نہیں دے سکتی تم کہیں بھی جا سکتی ہو بلکہ بہتر یہ ہے کہ تم امریکہ یا سوئٹزرلینڈ چلی جاؤ۔''

جواباً ذکیہ کچھ نہیں بولی میں بہرحال اس کی بڑی بہن تھی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اسے میری بات ناگوار ہوئی ہے' مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی تھی اس لیے مزید اس سلسلے میں میں نے کوئی بات نہیں کی اور کھانا کھا کر اٹھ گئی۔ ذکیہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ چائے کے لیے میں نے ملازمہ سے کہہ دیا تھا کہ بیڈ روم ہی میں پیوں گی۔

چائے پینے کے دوران میں مجھے ملک دلاور پر غصہ آنے لگا اس نے خواہ مخواہ میرے لیے ایک پرابلم کریئیٹ کر دیا تھا۔ اسے اگر لاہور جانا تھا تو چلا جاتا آخر ذکیہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی کیا تک تھی! اس کے اور میرے تعلقات بہرحال اس حد تک نہیں تھے کہ وہ میرے نجی معاملات میں مداخلت کرنے لگتا' مجھے کچھ کچھ یہ شبہ بھی ہونے لگا تھا کہ ذکیہ اور ملک دلاور ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ قربت مستقبل میں کوئی اور شکل بھی اختیار کر سکتی تھی جو مجھے بہرحال قبول نہیں تھی۔ ملک دلاور کو میں بس ایک مخلص دوست کی حیثیت سے قبول کر سکتی تھی کسی اور حیثیت میں اسے قبول کرنا میرے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ میں اب پچھتا رہی تھی کہ ناحق ذکیہ کو اس سے ملوا دیا مگر اب یہ پچھتاوا فضول ہی تھا میں اسی معاملے پر غور کرتی ہوئی کہ اسے کس طرح ٹیکل کیا جائے بستر پر دراز ہو گئی۔ چائے کی خالی پیالی میں نے قریبی تپائی پر رکھ دی تھی۔ ملک دلاور سے اس سلسلے میں کچھ کہنا لاحاصل تھا وہ مجھے باتوں میں اڑا دیتا ہاں ذکیہ کو میں سمجھا سکتی تھی۔ فی الحال اس کا موڈ ٹھیک نہیں تھا اس لیے میں نے یہی سوچا کہ کوئی مناسب موقع محل دیکھ کر اس سے بات کروں گی۔ اسی ادھیڑ بن میں میری آنکھ لگ گئی۔

زیادہ سے زیادہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے سوئی ہوں گی کہ ایک ملازمہ نے مجھے آ کر جگا دیا وہ بھی سیل ہی کی ایک رکن تھی۔

''سرفراز سے فون پر بات کر لیجیے۔'' ملازمہ نے مجھ سے کہا۔

''سرفراز سے! میں حیرت سے بولی اور اٹھ کر بیٹھ گئی سرفراز بھی سیل کے ذہین ارکان میں سے ایک تھا۔ جو لوگ میری کوٹھی کی نگرانی پر مامور تھے سرفراز ان کا انچارج تھا۔

اسی دوران میں ملازمہ ٹیلی فون سیٹ اٹھا لائی سرفراز نے غالباً جلد بازی میں وہ فون نمبر ملا لیا تھا جس کا ایکسٹینشن میری خواب گاہ کے علاوہ باہر بھی تھا مجھے اسی لیے ملازمہ نے فون اطلاع دی تھی۔ سونے سے قبل عموماً میں اس فون کا سوئچ نکال دیتی تھی تا کہ کوئی اشد ضروری کام تو دوسرے فون پر مجھ سے بات کی جا سکے ورنہ نہیں۔ دوسرا فون نمبر آپریشن سیل کے ارکان کے علاوہ صرف چند خاص لوگوں کے علم میں تھا۔

''ہاں سرفراز کہو کیا بات ہے؟ ...... اور کہاں سے بول رہے ہو تم؟'' میں نے سرفراز کی آواز پہچان کر کہا۔

''آپ کی کوٹھی کے قریب ہی ایک جگہ سے میں فون کر رہا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ سرفراز مزید کچھ کہتا میں بول اٹھی ''تم نے دوسرے نمبر پر رنگ کیوں نہیں کیا؟''

''سوری میڈم جلدی میں وہ نمبر میرے ذہن میں فوری طور پر نہیں آ سکا تھا۔ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ آپ کا روسی مہمان موشوروف اور جولین دونوں آپ کی کوٹھی کی طرف آ رہے ہیں غالباً وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' سرفراز محتاط انداز میں مجھے صورتحال سے آگاہ کر رہا تھا۔ ''آپ کو اطلاع دینا ضروری تھا ورنہ ہم لوگ ان کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔''

فون پر اچانک یہ اطلاع پا کر موشوروف اور اس کی محبوبہ جولین آندرے میری کوٹھی کی طرف بڑھ رہے ہیں میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا مگر میں نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور سرفراز سے کہا ''تم لوگ میرے مہمانوں کی پذیرائی نہ کرو میں خود ان کا استقبال کروں گی انہیں آنے دو! کیا تم میری بات اچھی طرح سمجھ چکے ہو؟''

''جی ہاں میڈم!'' سرفراز نے جواب دیا۔ ''ہم لوگ ان کا استقبال نہیں کریں گے اور آپ کی مزید ہدایات کے منتظر رہیں گے۔''

میں نے فون کا ریسیور رکھ کر ملازمہ سے پوچھا ''کیا ذکیہ اب تک سو رہی ہے؟''

''جی ہاں ان کے کمرے کا دروازہ بند ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تم سب لوگ الرٹ ہو جاؤ! کسی بھی لمحے کوئی خطرناک صورتحال پیش آ سکتی ہے۔ ذکیہ کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دو! جاؤ'' یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

پھر غسل کر کے لباس تبدیل کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ موشوروف کس غرض سے میری کوٹھی کی طرف آ رہا تھا اور کیا نئی چال چلنے والا تھا میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ محدود قوت کا ایک جدید ٹرانسمیٹر سیٹ میں نے اپنے پرس میں رکھ لیا جو بظاہر ایک فاؤنٹین پین معلوم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے پستول اور دیگر ضروری اشیاء بھی اپنے پرس میں رکھ لیں اور پھر اپنے کمرے سے نکل آئی۔ ڈرائنگ روم تک جاتے ہوئے مجھے ایک ملازم سے یہ خبر ملی کہ موشوروف کی کار میری کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ چکی ہے۔ وہ لوگ وائرلیس پر باہر والوں سے رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ ڈرائنگ روم میں آ کر میں نے فوری طور ایسا بندوبست کر دیا کہ اگر موشوروف پرامن فضا میں مجھ سے گفتگو کرنے آیا ہو تو اس کے اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو ریکارڈ ہو جائے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ارادہ ہنگامہ آرائی کا نہیں ہے۔

ڈرائنگ روم سے نکل کر میں نے کوٹھی میں موجود سیل کے ارکان کو کچھ ضروری ہدایات دیں پھر دوبارہ اپنی خواب گاہ کی طرف بھی گئی۔ اسی عرصے میں مجھے یہ بتایا جا چکا تھا کہ موشوروف مجھ سے ملنا چاہتا ہے میں نے ہدایت دی تھی کہ اسے اور جولین کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا جائے کہ میں اپنی خواب گاہ میں ہوں اور یہ کہ ابھی ہم اطلاع کرتے ہیں آپ لوگ انتظار کریں۔ اس

تمام کارروائی کا مقصد محض یہ تھا کہ موشوروف نے مجھے اپنی طرف سے قطعی غافل سمجھے میں نے اس لیے سرفراز اوراس کے ساتھیوں کو بھی کسی قسم کی مداخلت سے منع کر دیا تھا۔ موشوروف کا مجھ سے یوں براہ راست ملنا قطعی خلاف توقع تھا۔ اس نے مجھے یہ سن گن بھی نہیں لگنے دی تھی کہ وہ قاہرہ سے کب کراچی پہنچ گیا! کراچی آنے کے بعد اس نے یقیناً میرے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں اسے یہ علم ہو گیا تھا کہ میں ان دنوں اپنی کوٹھی ہی میں سکونت پذیر ہوں۔ وہ بہرحال میرا حریف تھا اس کا یہ اقدام دلیرانہ ہی کہا جا سکتا تھا کہ میرے متعلق بہت کچھ جاننے کے باوجود وہ براہ راست ملنے آ پہنچا تھا۔ اس کے ذہن میں لازماً یہ بات بھی ہو گی کہ وہ مجھے اپنی قید میں رکھ چکا ہے اور یہ بھی کہ جواباً میں بھی کوئی ایسا ہی قدم اٹھا سکتی ہوں اسی لیے اس طرح اس کی آمد کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد مجھے یہ خبر بھی مل گئی کہ موشوروف اور جولین کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا جا چکا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی میں نے ٹرانسمیٹر پر سرفراز سے رابطہ قائم کیا اور اسے ضروری احکام دیئے اس کے بعد میں اطمینان سے ایزی چیئر پر بیٹھ گئی۔ سرفراز کو ضروری احکام دینے کے بعد اب میرا ذہن بڑی حد تک پرسکون ہو چکا تھا۔ اب ایسی ہیجانی کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد میں نے سرفراز کو اپنی خواب گاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

آپ کے احکام کی تعمیل ہو چکی ہے وہ دونوں قطعی غیر مسلح تھے ان کی کار کی بھی تلاشی لی جا رہی ہے انہیں ڈرائنگ روم تک محدود کر دیا گیا ہے۔ ڈرائنگ روم کی اطراف مسلح ارکان موجود ہیں ان دونوں کو بھی اس سے آگاہ کر دیا گیا ہے جب تک آپ تشریف نہ لائیں وہ صوفوں سے اٹھنے کی بھی کوشش نہ کریں ورنہ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی کر دیئے جائیں گے۔'' سرفراز نے رپورٹ دی۔

''وری گڈ! میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی ''گو آن یور ڈیوٹی!'' میں نے سرفراز سے کہا اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ خواب گاہ سے باہر آ گئی۔

ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ اس طرح خود ہی میرے جال میں پھنس جانے پر موشوروف کا ردعمل کیا ہو گا! مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ غیر معمولی ذہن کا مالک ہونے کے باوجود کراچی آنے کے بعد اس نے مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی؟ وہ ڈاکٹر رچرڈ کا ہم پلہ اور میرے خیال میں اس سے کہیں زیادہ خطرناک اور ذہین شخص تھا۔ کیا آگا پیچھا سوچے بغیر وہ اس آسانی کے ساتھ میری گرفت میں آ سکتا ہے؟ کیا اس نے کوئی ایسا بندوبست نہیں کیا ہو گا کہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں فوری طور پر میری گرفت سے آزاد ہو جائے؟ ان سوالات نے مجھے کچھ مضطرب تو کیا مگر یہ سوچ کر میرا اضطراب مزید نہیں بڑھا کہ چاہے وقتی طور پر سہی صورتحال پوری طرح میرے کنٹرول میں تھی۔

میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچی تو سیل کے دو مسلح ارکان نے مجھے اندر جانے کا راستہ دے دیا ان دونوں کے ہاتھوں میں سٹین گنیں تھیں جن کا رخ اندر بیٹھے ہوئے موشوروف

اور جولین آندرے کی طرف تھا۔

جیسے ہی میں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا موشوروف صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ''خوش آمدید مس عذرا خان!'' اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا اس کی محبوبہ جولین نے بھی صوفے سے اٹھنے میں دیر نہیں کی تھی۔ وہ دونوں بہترین مغربی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ موشوروف تھری پیس میں تھا اور جولین اسکرٹ اور سرخ شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ ''میں بھی آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں عذرا خان!'' جولین بھی پرسکون اور خوشگوار لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

ان دونوں کی اس حسین اداکاری پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور میں نے کہا ''آپ دونوں تشریف رکھیں! آپ تو مجھے اس طرح خوش آمدید کہہ رہے ہیں جیسے میں مہمان ہوں اور آپ میزبان۔'' یہ کہتے ہوئے ان کے مقابل ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

''ہم دونوں اسے اپنا ہی گھر سمجھ کر آئے تھے اسی لیے خود کو مہمان نہیں سمجھ رہے تھے۔'' جولین پھر بول اٹھی۔

''شکریہ! اگر آپ لوگ اسے اپنا گھر سمجھ رہے ہیں۔'' میں بولی اور اسی کے ساتھ میرے لہجے میں ہلکی سی چبھن آ گئی۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں قاہرہ میں آپ دونوں کی مہمان رہ چکی ہوں اور غالباً اب میزبانی کی باری میری ہے۔'' میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے مسٹر موشوروف؟''

''نیک خیال ہے۔'' یہ کہہ کر موشوروف مسکرانے لگا ''مگر ہماری میزبانی لوگوں کو عموماً مہنگی ہی پڑتی ہے اس لیے میں یہی عرض کروں گا کہ آپ میزبانی کا خیال اپنے ذہن میں نہ لائیں تو بہتر ہے آداب میزبانی بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔''

''مسٹر موشوروف! اگر آپ برا نہ مانیں تو ہم لوگ ذومعنی گفتگو کی بجائے صاف صاف الفاظ میں بات کریں تو زیادہ بہتر ہے کیا آپ یہاں اپنی آمد کا مقصد بیان کرنا پسند کریں گے؟'' مجھے اس کے اطمینان وسکون سے الجھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

''کیوں نہیں!'' وہ برجستہ بولا۔ ''میں دراصل آپ سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگنے آیا تھا مجھے اس پر سخت ندامت ہے میں نہیں چاہتا کہ آپ میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار رہیں۔''

غلط فہمی!...... کیسی غلط فہمی؟...... مجھے تو آپ کی طرف سے کوئی غلط فہمی نہیں ہے آپ کھل کر اپنے اور اپنے مقاصد کے متعلق مجھ سے گفتگو کر چکے ہیں میں بھی غالباً واضح طور پر آپ کو یہ جواب دے چکی ہوں کہ میں آپ کے ملک کی آلہ کار نہیں بن سکتی اس میں کسی غلط فہمی کو کیا دخل ہے۔ مسٹر موشوروف؟ میرا لہجہ طنزیہ تھا۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے مس عذرا خان میں نے کبھی آپ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' وہ صاف مکر گیا۔

میں سمجھ گئی کہ موشوروف اس وقت پوری طرح چوکنا اور محتاط ہے وہ یقیناً کوئی ایسی بات

نہیں کہنا چاہتا تھا جو پکڑ میں آ سکے۔ میں نے یہی محسوس کر کے خود وہ باتیں مختصراً دہرا دیں جو اس نے قاہرہ میں اس وقت مجھ سے کی تھیں جب اس نے زبردستی مجھے اپنا ''مہمان'' بنا لیا تھا۔

وہ میری بات پوری ہوتے ہی زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ ''آپ نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہو گا مس عذرا خان! ورنہ آپ نے جتنی باتیں کی ہیں ان میں سے کوئی تو مجھے یاد ہوتی! ......
ہاں مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ جب آپ قاہرہ میں میری مہمان تھیں تو میں نے آپ سے انسان اور انسانیت کے نام پر ایک درخواست کی تھی۔ ہیومن کاز کے لیے تو ہم اپنے بدترین دشمنوں سے بھی گفتگو کرنے اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو تو ہم بہرحال اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ میں نے آپ سے صرف یہ درخواست کی تھی کہ آپ دنیا کے مظلوم عوام کی بھلائی کے لیے اگر ہماری آواز سے آواز ملا سکیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔ وہ درخواست اب تک بدستور قائم ہے۔'' موشوروف نے ڈھکے چھپے لفظوں میں آخر اپنی بات کہہ ہی دی میں اس کی بات کا اصل مقصد سمجھ رہی تھی۔ وہ اب بھی مجھے اپنے ملک کے مفادات کا غلام بن جانے کی دعوت دے رہا تھا۔

''مسٹر موشوروف! کیا آپ یہ بھی دانستہ بھول چکے ہیں کہ آپ نے مجھے قاہرہ میں اپنا مہمان نہیں بنایا تھا بلکہ ایک طرح سے حبس بے جا میں رکھا تھا؟ میں نے پھر چٹکی لی۔

''خیال ہے آپ کا ورنہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اگر ایسا ہی ہوتا تو آپ اب بھی وہیں قاہرہ میں ہوتیں اس کے باوجود اگر آپ نے واقعی ایسا سمجھا تھا تو میں معذرت خواہ ہوں۔''

اس کی گفتگو سے اب مجھے کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ میری کوٹھی میں اس کی آمد کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ اگر میں صحیح خطوط پر سوچ رہی تھی تو پھر اس نے یہاں سے بچ کر نکلنے کی بھی کوئی نہ کوئی راہ ضرور سوچ رکھی ہوگی۔ میں اب جلد از جلد کسی فیصلہ کن مرحلے تک پہنچ جانا چاہتی تھی میں نے اسی لیے براہ راست کسی تکلف کے بغیر گفتگو شروع کر دی۔ ''سنو موشوروف! یہ میرا گھر ہے اور تم اب تک یقیناً یہ اندازہ کر چکے ہو گے کہ اب تم اور جولین میری اجازت اور مرضی کے بغیر یہاں سے نہیں جا سکو گے میں اتنی احمق بہرحال نہیں ہوں کہ تمہارے جھانسے میں آ جاؤں اور واقعی وہی سمجھنے لگوں جو تم نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا ہے! مجھے بتاؤ موشوروف کہ حقیقتاً تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اگر تم نے اب بھی میرے سوال کو ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی تو میں بھی تمہیں اور جولین کو زبردستی اپنا مہمان بنانے سے گریز نہیں کروں گی تم شاید اسے دھمکی سمجھو مگر یہ حقیقت ہے کہ میرا ''مہمان خانہ'' خاصا وسیع اور کشادہ ہے اسے تم اپنے مہمان خانے سے بہر طور بہتر پاؤ گے۔ اس لیے کہ یہاں سے نکلنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہوگا۔''

''خاتون آپ شاید مجھ سے کچھ خفا معلوم ہوتی ہیں۔'' موشوروف اپنے پرسکون لہجے میں بولا۔ پھر جولین سے مخاطب ہوا ''ڈارلنگ! تمہی انہیں کچھ سمجھاؤ کہ یہ اپنی خفگی ختم کر دیں ہم تو انہیں اپنوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے اور سمجھتے ہیں تمہارے ساتھ تو ان کی شطرنج کی بازیاں بھی جم چکی ہیں!''

اس سے پہلے کہ جولین کچھ کہتی' میں بول اٹھی ''موشوروف شاید خود کو اوور اسٹیمیٹ کر رہے ہو! اگر یہاں تم صرف اس غرض سے آئے ہو کہ کوٹھی کا اندر سے جائزہ لے سکو اور اس کے بعد مجھے زیر دام لانے کی کوشش کرو تو تمہاری یہ حسرت دل ہی میں رہ جائے گی تم یہاں سے نہیں نکل پاؤ گے۔''

میں اسے دانستہ غصہ دلانا چاہ رہی تھی' مگر وہ نجانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اس کے چہرے پر لمحہ بھر کو بھی غصے کا تاثر نہ ابھرا۔ وہ بدستور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''خاتون! میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زبردستی کسی کو اپنا مہمان بنا لینا اچھی بات نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ یہ کہ آدمی کو وہی بات کہنا چاہئے جس پر وہ پوری قدرت رکھتا ہو۔ مجھے یا جولین کو زبردستی روکنا آپ کو زیب نہیں دیتا اور نہ ایسا حقیقتاً ممکن ہے۔''

اس کی بجائے کہ میں غصہ دلانے میں کامیاب ہو جاتی' وہ ایسی باتیں کرنے لگا کہ مجھے غصہ آ گیا۔ ''کیا ناممکن ہے؟...... کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ جو مسلح افراد اس کمرے کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں ان کے ہاتھوں میں ہتھیاروں کی بجائے کھلونے ہیں؟''

''میرا خیال یہ ہے خاتون کہ ہتھیار جب تک استعمال نہ کیے جائیں' ان کی حیثیت کھلونوں ہی کی سی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ میری خواہش تھی کہ آپ سے بہتر فضا میں خوش گوار گفتگو ہو' مگر شاید آپ یہ نہیں چاہتیں! میں جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' ہم دونوں کو زبردستی یہاں روکے رکھنا آپ کے امکان میں نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپ کے اخلاق کو کیا ہو گیا ہے کہ اب تک آپ نے ہم سے چائے تک کو نہیں پوچھا! ...... خیر پھر کبھی سہی! موشوروف نے یہ کہہ کر جولین کی طرف دیکھا اور بولا۔

''اٹھو! خاتون کا موڈ آج کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا' پھر کبھی ملیں گے۔'' اسی کے ساتھ وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جولین بھی فوراً ہی کھڑی ہو گئی تھی۔

''بیٹھ جاؤ موشوروف!'' میں تقریباً چیخ اٹھی۔ ''ورنہ مجھے واقعی اس پر مجبور ہونا پڑے گا کہ......

ابھی میں اپنی بات پوری نہ کر سکی تھی کہ اچانک موشوروف نے اپنے دائیں ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ میں صرف یہ دیکھ سکی کہ کوئی گول سی شے اس کی آستین سے نکل کر اس کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ پھر چشم زدن میں ہر طرف گاڑھا دھواں سا پھیلنے لگا۔ میں نے اپنے نتھنوں میں جلن سی محسوس کی اور سانس روک لیا' مگر میرا سر ایک دم چکرانے لگا تھا۔ وہ کوئی انتہائی تیز قسم کی نشہ آور گیس تھی۔ اس گیس کے اثر سے بچنے کے لیے خود موشوروف اور جولین نے کیا کیا تھا' میں صرف یہ قیاس کر سکتی تھی کیوں کہ ان دونوں کے وجود مجھے دھواں دھواں سے معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے گیس سے بچنے کی خاطر یقیناً ماسک پہن لیے ہوں گے۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔ میں چکراتے ہوئے ذہن کے باوجود صوفے سے اٹھ کر ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ پرس اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ ڈرائنگ روم میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا اور اب اس دھوئیں میں کچھ بھی

نظر آ رہا تھا۔ میں اسی حالت میں سانس روک کے سینے کے بل رینگتی ہوئی اندازے سے ڈرائنگ روم کے اس دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی جو اندرونی سمت کھلتا تھا۔ وہ دروازہ ایک برآمدے میں کھلتا تھا جس سے گزر کر میں اپنی ''اسٹڈی'' تک پہنچ سکتی تھی۔ اس دروازے کے باہر بھی سیل کا ایک مسلح رکن متعین تھا اور دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھلنے کے بعد نشہ آور گیس برآمدے میں بھی پہنچ جاتی' مگر یہ خطرہ مجھے بہرحال مول لینا ہی تھا۔ اگر موشوروف میری کوٹھی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کا یہ دعویٰ حقیقت کا روپ دھار لیتا کہ ہم دونوں کو زبردستی یہاں روکے رکھنا آپ کے امکان میں نہیں ہے۔ یہ میری کھلی شکست ہوتی۔ اب بھی میری یہی شاید خواہش تھی کہ اس دعوے کو حقیقت نہ بننے دوں حالانکہ حالات بڑی حد تک میرے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا اچانک اور خلاف توقع ہوا تھا۔ جب خود میں خطرے کا احساس نہ کر سکی تھی تو سیل کے ارکان کیسے قبل از وقت اس کا اندازہ لگا لیتے۔ وہ بھلا نشہ آور گیس کی زد میں آنے سے کس طرح بچ سکتے تھے۔ وہ مسلح ہونے کے باوجود بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ اپنے اندازے کے مطابق بالآخر میں کچھ ہی دیر بعد ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے تک پہنچ گئی' مگر اب سانس روکے رکھنے کے سبب میرا دم گھٹ رہا تھا اور آنکھوں میں بھی انتہائی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ گیس میری آنکھوں پر بھی اثر انداز ہوئی جن سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔

دروازہ کھولتے ہی میں نے باہر جست لگائی اور پھر ادھر ادھر دیکھے بغیر دور تک برآمدے میں دوڑتی چلی گئی۔ میں جلد از جلد گیس کے حلقہ اثر سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر یہ شاید میری بھول تھی۔ وہ نشہ آور گیس میری توقع سے کہیں زیادہ زود اثر اور مہلک تھی۔ ہوا کے ساتھ ساتھ اس کے اثرات دور دور تک پھیل گئے تھے۔ میں نے جیسے ہی رک کر سانس لیا' میری سانس کی نالی اور پھیپھڑوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ اسی کے ساتھ میرا سر اس قدر زور سے چکرایا کہ مجبوراً مجھے زمین پر بیٹھنا پڑا۔ میں نے اس زہریلی فضا میں دوبارہ سانس لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسی عالم میں میری چھٹی حس نے مجھے ایک اور خطرے کا احساس دلایا۔ اس نشہ آور گیس کے سبب موشوروف کو مجھ پر برتری حاصل ہو گئی تھی اور وہ یہاں سے فرار ہونے کی بجائے اس صورتحال سے فائدہ بھی اٹھا سکتا تھا۔ یہ تو میں پہلے ہی سوچ چکی تھی کہ گیس سے بچنے کے لیے موشوروف اور جولین نے گیس ماسک استعمال کیے ہوں گے' اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ان دونوں کو اس گیس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پھر بھلا موشوروف مجھے کیوں نہ تلاش کرتا؟ اس کے لیے یہ سمجھ لینا بعید از امکان نہیں تھا کہ میں بھی نشہ آور گیس کا شکار ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو سکتی ہوں۔ اس نئے خطرے کے احساس نے میرے جسم میں برقی رو سی دوڑا دی اور میں اپنے حواس مجتمع کر کے ایک دم کھڑی ہو گئی۔ پھر میں وہاں مزید ایک بھی لمحے رکے بغیر بائیں جانب بھاگ گئی۔ ساری کوٹھی میں موت کا سا سکوت طاری تھا جیسے وہاں میرے سوا کوئی بھی ذی روح نہ ہو۔ یقیناً کوٹھی کے سارے مکین اس نشہ آور گیس کا شکار ہو کر بے ہوش ہو چکے تھے۔ موشوروف' ڈرائنگ روم سے نکل آنے کے بعد بھی دوبارہ ضرور نشہ آور گیس استعمال کر سکتا تھا۔ غالباً اس نے ایسا ہی کیا تھا تا کہ کوٹھی میں موجود کوئی شخص ہوش میں

رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی جلدی وہاں سناٹا طاری نہ ہو جاتا اور دور دور تک فضا میں اس گیس کے اثرات نہ ہوتے۔

بھاگتے ہوئے میرا رخ کوٹھی کی عقبی سمت تھا۔ اس حالت میں اتنی دیر تک سانس روکے رکھنا میرے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اب کسی بھی لمحے میری قوت برداشت جواب دے جائے گی اور میں ہانپ کر گر پڑوں گی' لیکن ایسا نہیں ہوا اور میں اپنی کوٹھی کی عقبی باؤنڈری وال تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر ایک ہی طویل جست میں باؤنڈری وال عبور کر کے میں کوٹھی کی حدود سے باہر نکل آئی۔

باہر پہنچتے ہی میں نے کئی گہرے سانس لیے اور پھر اپنے پھولے ہوئے سانس کو قابو میں کرنے کے بعد چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ جب میرے حواس بحال ہو گئے اور میں نے اپنی آنکھوں سے بہتا ہوا پانی بھی صاف کر لیا تو اردگرد کا جائزہ لیا۔ گلی میں اس وقت کوئی متنفس نہیں تھا۔ سیل کے وہ ارکان جن کی ڈیوٹی یہاں تھی انہیں بھی یقیناً ہنگامی حالات کے پیش نظر سرفراز نے کوٹھی کے اندر بلا لیا تھا۔

خطرے کی حدود سے نکل آنے کے بعد میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا اور میں نے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا۔ میں اب ہاری ہوئی بازی جیتنا چاہتی تھی۔ حالات ایک بار پھر کسی نہ کسی حد تک میرے حق میں استوار ہو چکے تھے۔ اگر میرا یہ اندازہ درست تھا کہ موشوروف نے فوری طور پر راہ فرار اختیار نہیں کی ہو گی تو اب میں اسے گھیر سکتی تھی۔

پھر میں ایک لمبا چکر کاٹ کر تقریباً دوڑتی ہوئی اس سڑک پر نکل آئی جو میری کوٹھی کے سامنے سے گزرتی تھی۔ میری کوٹھی کا بیرونی گیٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا' مگر اس قدر قریب بھی نہیں تھا کہ میں فوری طور پر پہنچ جاتی۔

ڈیفنس کا یہ اقامتی اور پرسکون علاقہ تھا اس لیے کبھی کبھار ہی کوئی کار وغیرہ ادھر سے گزرتی نظر آ جاتی تھی۔ اس وقت بھی سڑک پر مجھے کوئی سواری نظر نہیں آئی۔ میری کوٹھی کے گیٹ سے کچھ آگے مجھے ایک سائیکل سوار جاتا ضرور دکھائی دیا جو شاید کسی کوٹھی کا ملازم تھا۔

تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میری نگاہ اپنی کوٹھی کے بیرونی گیٹ ہی کی طرف تھی کہ اچانک میں نے گیٹ کھلتے دیکھا اور ایک سفید رنگ کی ڈاٹسن کار باہر آ گئی اور بائیں جانب مڑ کر رک گئی۔ کار کا رخ میری مخالف سمت تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ میری کار نہیں تھی اور اس میں میرا حریف موشوروف ہی ہو سکتا تھا۔ وہ شاید میری تلاش میں ناکام ہونے کے بعد اب وہاں سے فرار اختیار کر رہا تھا۔ میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ اپنے پرس سے ریوالور نکال لیا' لیکن ابھی موشوروف کی کار میرے ریوالور کی رینج سے باہر تھی۔ میں اب تیز تیز چلنے کی بجائے دوڑنے لگی۔ اسی لمحے میں نے جولین کو دیکھا جو میری کوٹھی کا گیٹ بند کر کے کار میں اگلی نشست پر بیٹھ گئی تھی۔

معاً مجھے اپنے عقب سے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی کار یا موٹر سائیکل اس طرف آ رہی ہو۔ بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر دیکھا خاصے فاصلے پر مجھے ایک موٹر سائیکل سوار دکھائی دیا جو

تیزی سے اسی طرف آ رہا تھا۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ فیصلہ کن تھا میں رک گئی اور اپنا ریوالور دوبارہ پرس میں رکھ لیا۔ اس وقت میں نے سفید ڈاٹسن کو حرکت میں آتے دیکھا۔ میں اپنے حریف کو اطمینان کے ساتھ فرار ہوتے دیکھتی رہی۔ اس کا سکون واطمینان اور خود اعتمادی حیرت انگیز تھی۔ اس نے فرار ہوتے وقت ذرا سی عجلت یا بے احتیاطی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی محبوبہ اور دست راست جولین نے میری کوٹھی کا گیٹ بھی بند کیا تھا۔ عموماً ایسے افراد اتنے کول مائنڈڈ نہیں ہوتے۔

ایک آخری امید کے سہارے میں وہاں چند لمحے کھڑی رہی اور اس دوران میں وہ موٹر سائیکل سوار میرے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک لیا تھا۔ وہ ایک نوجوان تھا جو مجھے اس علاقے میں نووارد ہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ میرے قریب اپنی موٹر سائیکل روک کر سوالیہ نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس سے اپنا اصل مدعا بیان کر سکتی۔ موشوروف کی کار اب سیدھی سڑک پر خاصی دور تک پہنچ چکی تھی۔

''سنو!'' میں اس نوجوان کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ ''میں انتہائی مجبوری میں تمہارے ساتھ ایک ناروا سلوک کرنے والی ہوں' مجھے معاف کر دینا' تمہاری موٹر سائیکل تمہارے گھر پہنچ جائے گی!''

''جی......! آپ...... آپ کیا کہہ رہی ہیں' میں سمجھا......''

حیرت زدہ نوجوان کی بات پوری نہ ہو سکی۔ میرا اچا تلا ہاتھ اس کی کنپٹی پر پڑا۔ پھر میں نے اسے اور موٹر سائیکل دونوں ہی کو سنبھال لیا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہی تھی میں نے اس نوجوان کو بے ہوش حالت میں اس طرح ایک کوٹھی کی دیوار کے نیچے لٹا دیا کہ وہ سڑک پر گزرنے والے ٹریفک کی زد میں نہ آ سکے۔ موٹر سائیکل میں نے سٹینڈ پر کھڑی کر دی تھی۔

پھر جب میں موٹر سائیکل پر سوار ہوئی اور سامنے نظر دوڑائی تو موشوروف کی کار میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں نے چشم زدن میں گیئر بدلا اور پھر خطرناک حد تک تیز رفتاری سے موٹر سائیکل دوڑائی۔ میں موٹر سائیکل پر بیٹھی ہوئی ہوا کے کسی تند و تیز جھکڑ کے مانند اپنی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے سے گزر گئی۔ اس کے باوجود میں اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ مجھے دیر ہو چکی ہے اب شاید میں اپنے طاقتور اور ذہین حریف کی گرد بھی نہیں پا سکوں گی۔ اس کے بعد یہی ہوا بھی! کچھ تو میں ڈیفنس ہی کے علاقے میں ادھر ادھر موٹر سائیکل اڑائے پھری کہ شاید موشوروف ابھی اسی علاقے میں ہو' پھر ڈیفنس کی حدود سے نکل کر کالا پل تک جا کے لوٹ آئی۔ موشوروف کی سفید ڈاٹسن کا کہیں دور دور تک کوئی سراغ نہیں تھا۔

اپنی کوٹھی کی طرف واپس آتے ہوئے اس مظلوم نوجوان کا خیال آیا جس کی موٹر سائیکل پر بہ مجبوری میں نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ واپسی میں مجھے تقریباً نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ نوجوان بے ہوشی کی حالت میں اب تک اسی جگہ پڑا ہو گا اور اس دوران میں کسی کی نظر اس پر نہیں پڑی ہو گی۔ اس وقت شام کے پانچ بجنے والے تھے اور یہ علاقہ پرسکون ہونے کے

باوجود ایسا نہیں تھا کہ اس عرصے میں کوئی بھی ادھر سے نہ گزرتا۔ اس خیال کے باوجود میں نے تصدیق ضروری سمجھی۔ وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید کسی خدا ترس شخص نے اس نوجوان کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ ذرا آگے جا کر میں نے موٹر سائیکل موڑ لی۔ اب میں سیدھی اپنی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔

کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ کر میں نے موٹر سائیکل کھڑی کی اور آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے لمبا سانس کھینچ کر یہ دیکھا کہ مہلک گیس کے اثرات اب بھی فضا میں موجود ہیں یا نہیں؟ مجھے اس نشہ آور گیس کے اثرات محسوس نہیں ہوئے۔ موٹر سائیکل اندر لا کر میں نے گیٹ بند کر دیا۔ اسی کے ساتھ میں گیٹ کا ذیلی دروازہ بند کرنا نہیں بھولی تھی۔ سیل کا وہ رکن جو چوکیدار کی حیثیت سے وہاں متعین تھا' توقع کے مطابق بے ہوشی کی حالت میں مجھے ایک پیڑ کے نیچے پڑا ہوا دکھائی دیا۔ کوٹھی مجھے اب تک سناٹے میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی۔ موٹر سائیکل کو گیراج میں کھڑا کر کے میں تقریباً دوڑتی ہوئی عمارت تک پہنچی۔

برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر میں عمارت کے صدر دروازے پر رکی جہاں سیل کا ایک مسلح رکن بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی گن قریب ہی پڑی تھی۔ میں صدر دروازے کے دونوں پٹ کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کھلتے ہی خفیف سا ناگوار بھپکا مجھے محسوس ہوا اس کا مطلب یہی تھی کہ عمارت کے اندر اس مہلک نشہ آور گیس کے ابھی اثرات باقی تھے۔ میں نے اسی لیے فوراً اندر داخل ہونے سے گریز کیا۔ چند لمحے باہر رک کر میں بالآخر راہداری میں داخل ہو گئی۔ دائیں جانب کچھ فاصلے پر ڈرائنگ روم تھا جس کے دروازے میں سیل کے وہ دونوں ارکان بے ہوش پڑے تھے جنہیں سرفراز نے وہاں متعین کیا تھا۔ خود سرفراز بھی راہداری میں ایک طرف اوندھا پڑا تھا۔

وہاں رکے بغیر میں تیزی کے ساتھ اندرونی کمروں کی طرف بڑھ گئی۔ سیل کے ارکان کے ساتھ ہی ساتھ مجھے ذکیہ کی فکر بھی تھی۔ میں پہلے اسے ایک نظر دیکھ لینا چاہتی تھی۔ کہ وہ کس حال میں ہے؟ سیل کے ارکان کو میں نے خاص طور پر یہ ہدایت دی تھی کہ وہ ذکیہ کا خیال رکھیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جائے۔

آگے بڑھتے ہوئے میں جدھر جدھر سے گزرتی تھی کھڑکیاں اور دروازے کھولتی جا رہی تھی تا کہ وہاں سے تازہ ہوا کا گزر ہو سکے اور گیس کے باقی ماندہ اثرات ختم ہو جائیں۔ ذکیہ کے کمرے کے دروازے پر بھی مجھے ایک مسلح رکن بے ہوش پڑا ہوا نظر آیا' مگر یہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنک گیا کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں یقیناً مضبوط اعصاب کی مالک ہوں' لیکن اس وقت لمحہ بھر کو میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے تھے۔ میں بہ عجلت کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ کمرے میں روشنی تھی میں نے انتہائی اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کمرہ خالی تھا اور ذکیہ غائب تھی۔

☆......☆......☆

حیرت و اضطراب کے ابتدائی چند لمحات گزر جانے کے بعد مجھ صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ موشوروف کا وار خالی نہیں گیا۔ میرے بجائے وہ میری بہن ذکیہ کو یرغمال بنا کر لے گیا تھا۔ میری حالت اس وقت چوٹ کھائی ہوئی کسی ناگن کی طرح تھی۔ موشوروف میرے سامنے ہوتا تو میں اس کے ٹکڑے اڑا دیتی۔ اس نے بھی بالآخر وہی گھٹیا حربہ استعمال کیا تھا جو ڈاکٹر رچرڈ آزما چکا تھا۔ موشوروف کے بارے میں میری رائے ذرا مختلف تھی۔ پہلے میرا اندازہ تھا کہ وہ امریکی ایجنٹوں کی طرح اوچھے ہتھکنڈے نہیں آزمائے گا مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ذکیہ بھی وہاں بے ہوشی کی حالت میں موجود ہوتی۔

روسی ایجنٹ موشوروف پر مجھے سخت غصہ آ رہا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ غصے میں عقل خبط ہو جاتی ہے۔ ذکیہ کا خالی کمرا دیکھ کر میرا دماغ قابو میں نہیں رہا تھا ورنہ مجھے ذکیہ کے بیڈ پر پڑا ہوا وہ پرچہ فوراً نظر آ گیا ہوتا جو اس نے میرے ہی نام لکھا تھا۔ اس پرچے پر میری نظر اس وقت پڑی جب میرا ذہن نسبتاً پرسکون ہو گیا تھا اور میں ذکیہ کے کمرے کی تلاشی لے رہی تھی۔ کمرے سے ذکیہ کا سامان بھی غائب تھا۔ اگر اسے موشوروف ہی اغوا کر کے لے گیا ہوتا تو اس کے استعمال میں رہنے والا ضروری ساز و سامان وہیں ہونا چاہیئے تھا۔ یہاں تک کہ باتھ روم میں اس کا ٹوتھ پیسٹ اور برش تک نہیں تھا۔ ذکیہ کا لکھا ہوا پرچہ پڑھنے سے پہلے ہی میں اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے خود ہی گئی ہے مگر کب؟ کہاں؟ اور کیوں؟ ان سوالوں کا جواب مجھے پرچہ پڑھ کر ہی معلوم ہوا۔ ذکیہ نے لکھا تھا۔ ”باجی! آداب قبول کریں۔ ابھی کچھ دیر پہلے کھانا کھاتے ہوئے آپ نے مجھ سے جو کہا تھا وہ میری سماعت میں ابھی بھی تازہ ہے، خصوصاً یہ الفاظ کہ تم کہیں بھی جا سکتی ہو......! ملک دلاور کے سلسلے میں آپ کے لہجے کی سنجیدگی کا مطلب سمجھ لینا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ آپ غالباً میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہیں۔ میں واضح طور پر یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں ملک دلاور میں قطعی انٹرسٹیڈ نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اس کے ساتھ لاہور نہیں جا رہی اور نہ اس سے اب ملوں گی۔ یہ تو خود آپ بھی ایکسیپٹ کر چکی ہیں کہ وہ ایک دلچسپ آدمی ہے۔ میری اس سے دلچسپی صرف اسی حد تک اور محض وقت گزاری کے لئے تھی۔ ملک دلاور کے معاملے سے قطع نظر میں نے آپ کے ساتھ رہتے ہوئے ایک اور بات شدت سے محسوس کی ہے کہ مجھے بہرحال آپ سے الگ رہنا چاہیئے۔ جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں آپ فیملی لائف افورڈ نہیں کر سکتیں۔ آپ کا طرز زندگی جداگانہ ہے۔ اس کا احساس مجھے کئی برس پہلے ہو گیا تھا اسی لئے میں قاہرہ میں

سیٹل ہو گئی اور آپ نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ گزشتہ دنوں کچھ ایسے غیر متوقع حالات پیش آئے کہ خود آپ کو قاہرہ آنا پڑا اور ایک بار پھر وقت نے ہمیں یک جا کر دیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ یک جائی بہ مجبوری آپ نے قبول کی ہو گی۔ آپ کی ہدایات کے مطابق میں یہاں سے قاہرہ نہیں جا رہی بلکہ میرا ارادہ چند ماہ ہندوستان میں گزارنے کا ہے۔ دہلی میں اور کلکتہ میں بھی ہمارے کچھ عزیز ہیں۔ یہ آپ کو علم ہے۔ ابھی میں فیصلہ نہیں کر پائی کہ دہلی میں رہوں گی یا کلکتے جاؤں گی لیکن یہ طے ہے کہ امریکہ یا سوئزرلینڈ نہیں جاؤں گی۔ یہ ساری باتیں آپ سے زبانی کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا اسی لئے تحریر کا سہارا لے رہی ہوں۔ میرے پاس ہندوستان تک پہنچنے کے لئے اخراجات سفر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں ہندوستان کے ایک بینک میں بھی خاصی رقم میرے نام سے جمع ہے۔ یہ میں نے صرف اس لئے لکھا ہے کہ آپ میری طرف سے فکر مند نہ ہوں۔ جس وقت آپ کی نظر سے میری یہ تحریر گزر رہی ہو گی میں کراچی چھوڑ چکی ہوں گی۔ فوری طور پر کراچی چھوڑنے کا سبب محض یہ ہے کہ میں مزید آپ کے لئے پرابلم بننا نہیں چاہتی۔ اس کے علاوہ یہ کہ ملک دلاور کے سلسلے میں آپ کی غلط فہمی بھی دور کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے معمولات سے کسی حد تک مجھے آگہی ہے۔ اس وقت آپ غالباً چائے پی کر سونے کی تیاری کر رہی ہوں گی اور میں یہ پرچہ لکھ کر اپنا سامان پیک کروں گی۔ اس کے بعد خاموشی کے ساتھ نہ صرف آپ کی کوٹھی سے بلکہ عارضی طور پر آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔ میری کوشش یہی ہو گی کہ یہاں سے جاتے ہوئے کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور دوپہر کا وقت اس کے لئے انتہائی مناسب ہے۔ آپ کے زیادہ تر ملازمین بھی اس وقت آرام کرتے ہیں۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہی رہنے دوں گی اور کھڑکی کے ذریعے باہر نکل کر باہر سے کھڑکی بھیڑ دوں گی تاکہ آپ کے ملازمین یہی سمجھتے رہیں کہ میں اندر کمرے میں موجود ہوں۔ یہ سب اس لئے لکھ رہی ہوں کہ آپ کسی الجھن میں نہ پڑیں۔ میں کوٹھی کے عقبی پھاٹک کی طرف سے نکلنے کی کوشش کروں گی۔ بہرحال آپ کی چھوٹی بہن ہوں، ممکن ہے اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں کہ کوئی مجھے یہاں سے جاتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ کسی کی نظر میں نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ کو فیس کرنا نہیں چاہتی۔ اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا تو یقیناً آپ کو فوری طور پر مطلع کر دیا جائے گا کہ میں جا رہی ہوں اور یہی میں نہیں چاہتی۔ امید ہے کہ آپ میری اس گستاخی اور جسارت کو معاف کر دیں گی۔ خدا حافظ! آپ کی ذکیہ۔“

ذکیہ کے اس طرح اچانک بغیر ملے چلے جانے پر مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا اور دوسری طرف یہ اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ وہ ہنگامہ آرائی سے قبل نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً اپنی تحریر کے مطابق میرے ملازمین کی نظر میں نہیں آئی تھی۔ کوٹھی کی عقبی سمت سیل کے جن ارکان کی ڈیوٹی تھی انہیں ہنگامی طور پر کوٹھی کے اندر بلا لیا گیا تھا۔ شاید اسی سبب ان میں سے بھی کسی کی نظر میں ذکیہ نہیں آ سکی ورنہ وہ لوگ مجھے ضرور مطلع کرتے۔ میرے اندازے کے مطابق ذکیہ عین اس وقت کوٹھی کے عقبی پھاٹک تک پہنچی ہو گی جب سیل کے ارکان وہاں سے ہٹے ہوں گے یا پھر ذکیہ نے ان کے وہاں سے ہٹنے کا انتظار کیا ہو گا۔ بہر حال وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ اگر موشوروف کا معاملہ درپیش نہ ہوتا تو یقیناً ذکیہ کی کوشش رائگاں جاتی۔

میں بھی ذکیہ کی طرح جذباتی تھی مگر میں اس کے ساتھ ریشنل بھی! میرے نزدیک دل ہی سب کچھ نہیں، دماغ بھی بہت کچھ ہے بلکہ دماغ کو افضلیت حاصل ہے۔ دل سے کیے گئے فیصلے عموماً عقل کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ صرف دل کی بات مان لینا یا ہر معاملے میں محض عقل کو رہنما ٹھہرانا دونوں ہی رویے میرے خیال میں زندگی کو متوازن نہیں رہنے دیتے۔ دل کے ساتھ پاسبان عقل کا ہونا ضروری ہے۔ ہاں کبھی کبھی اس تنہا چھوڑ دینا زندگی کی یکسانی توڑنے کے مترادف ضرور ہے۔ علامہ اقبال کے اس شعر سے مجھے کلیتہً اتفاق ہے:

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

انسان کی شخصیت میں توازن اسی سے پیدا ہوتا ہے' لیکن یہ ساری باتیں عملی طور پر ذرا مشکل ہیں۔ زندگی اور اس جہان سے جو لوگ سرسری گزر جاتے ہیں وہ ہرجا' جہان دیگر کی آشنائی سے نا آشنا رہتے ہیں۔ ہر چند کہ ذکیہ میری چھوٹی بہن تھی مگر اس نے زندگی کے اتنے نشیب و فراز نہیں دیکھے تھے جن سے میں گزر چکی تھی۔ زندگی کے ساتھ اس کا رویہ ابھی جذباتی سطح سے آگے نہیں بڑھا تھا اور یہ اس کی عمر اور تجربات کا تقاضا بھی تھا۔ وقتی طور پر اس کے جذباتی فیصلے نے مجھے ہلکا سا دھچکا ضرور پہنچایا مگر جلد ہی میں سنبھل گئی۔

یہ بات میرے لئے تعجب خیز نہیں تھی کہ ذکیہ کے کمرے کا دروازہ مجھے کھلا ملا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس کی کڑیاں جوڑنا میرے لئے مشکل نہ تھا۔ میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے سوئی تھی۔ اس دوران میں ذکیہ نے مجھے خط لکھا' پھر اپنا سامان وغیرہ پیک کیا۔ اس میں اسے تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا ہوگا۔ پھر وہ کمرے کی کھڑکی کے راستے عقبی پھاٹک تک پہنچ گئی۔ اسی عرصے میں ملازمہ نے مجھے بیدار کیا اور میں نے سرفراز کو ضروری ہدایات دیں۔ عقبی پھاٹک پر متعین سیل کے ارکان کوٹھی کے اندر آ گئے اور ذکیہ ادھر سے نکل گئی۔ ادھر ذکیہ کا کمرا اندر سے بند ہونے کے سبب یہ سمجھا گیا کہ وہ اپنے کمرے ہی میں ہے حالانکہ اس وقت کمرا خالی تھا۔ میرے حکم پر باہر سے بھی کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا اور پھر وہاں سیل کا ایک مسلح رکن بھی تعینات کر دیا گیا۔ موشوروف سے بچ کر میں کوٹھی سے نکل گئی اور اس دوران میں موشوروف نے مجھے کوٹھی کے اندر تلاش کیا۔ اسی تلاش میں وہ ذکیہ کے کمرے تک پہنچ گیا۔ موشوروف ایسے شخص کے لئے یہ معلوم کر لینا کہ بند کمرے میں کس طرح داخل ہوا جائے؟ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی کے ذریعے ہی کمرے میں گھسنے کی کوشش کی ہوگی۔ کھڑکی پہلے ہی سے کھلی ہوئی تھی۔ موشوروف اندر پہنچا اور پھر اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے کھول دیا۔ کمرے میں کسی کو بھی نہ پا کر وہ وہاں نہیں رکا ہوگا اور دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہوگا۔ میرے ذہن نے جو کڑیاں جوڑی تھیں اس کا ثبوت کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی بھی تھی۔ ذکیہ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہی رہنے دوں گی اور کھڑکی کے ذریعے باہر نکل کر باہر سے کھڑکی بھیڑ دوں گی تاکہ آپ کے ملازمین یہی سمجھتے رہیں کہ میں اندر کمرے میں موجود ہوں۔

اس واقعے سے یہ تصدیق بھی ہو گئی کہ میں بے ہوشی کی گیس پھیلنے کی بعد موشوروف کو میری

تلاش بھی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ دن دہاڑے میری کوٹھی میں گھس کر مجھے اغوا کرنے آیا تھا۔ پہلے اس نے اپنی پیش کش دہرائی اور جب میں نے یہ پیش کش ایک بار پھر واضح الفاظ میں مسترد کر دی تو اس نے دوسرا اور اپنی دانست میں انتہائی حربہ آزمایا۔ اس طرح نہ صرف وہ خود بچ کر نکل جانا چاہتا تھا بلکہ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جانا اس کا مقصد تھا۔

حفاظتی انتظامات کے سلسلے میں اب ایک اور نیا پہلو سامنے آ گیا تھا۔ آئندہ اپنے ذہین حریف کے اس حربے سے بچنے کا بندوبست بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اس تیز گیس کا اثر کتنی دیر تک بے ہوش ہو جانے والوں پر رہتا اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ میں اسی لئے فوری طور پر ذکیہ کے کمرے سے نکل آئی اور فون پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔

ڈیوٹی پر ابھی تک عثمانی ہی تھا' کمانڈر نواز کے پہنچنے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے مختصراً اسے پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کیا' پھر چند ضروری احکام دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ مجھے انتظار کرنا پڑا۔ میڈیکل کور کا انچارج ڈاکٹر رشید اپنے دو معاونین اور سیل کے تقریباً ایک درجن مسلح افراد کے ساتھ میری کوٹی پہنچ گیا۔ سرفراز اور اس کے ساتھیوں کی جگہ سیل کے دوسرے ارکان نے سنبھال لی۔ سیل کے بے ہوش ارکان کو کوٹھی کے مختلف حصوں سے اٹھوا کر ایک بڑے کمرے میں لے آیا گیا اور ڈاکٹر رشید انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ مین بھی اسی کے ساتھ تھی۔ عثمانی نے ڈاکٹر رشید کو بھی آگاہ کر دیا تھا کہ معاملہ کیا ہے!

''ڈاکٹر! آپ کا کیا خیال ہے' یہ کس قسم کی گیس ہو سکتی ہے؟ اب تک ہمارے تجربے میں آنے والی بے ہوشی کی گیسیز اتنی زود اثر اور دیرپا ثابت نہیں ہوئی ہیں۔'' میں نے ڈاکٹر رشید کو مخاطب کیا جو سرفراز کو ایک انجکشن دے کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

''میڈم! فی الحال اس ضمن میں کچھ کہنے سے میں قاصر ہوں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ جس گیس کا یہ لوگ شکار ہوئے ہیں وہ کوئی نئی قسم کی انتہائی زود اثر گیس ہے ورنہ بے ہوشی کا عرصہ اتنا طویل نہ ہوتا۔'' ڈاکٹر رشید نے محتاط انداز میں میرے سوال کا جواب دیا۔

''آپ نے ان سب کا معائنہ کر لیا ہے۔ یہ بتائیں کہ خدانخواستہ ان کی صحت کو تو کوئی خطرہ نہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''میری میراد یہ ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد یہ نارمل ہو جائیں گے نا؟ گیس کا اثر ان کے جسمانی نظام پر تو کوئی......؟'' میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ڈاکٹر رشید کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ممکن ہے ان لوگوں کو کچھ دن بیڈ ریسٹ کی ضرورت پیش آئے۔ ان کے پلس کی رفتار فی الحال اعتدال پر نہیں ہے لیکن اس کے باوجود کوئی تشویش ناک بات نہیں ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں اپنے ساتھ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے جاؤں! وہاں ان کی نگہداشت بہتر طور پر ہو سکے گی۔''

''آپ انہیں یقیناً یہاں سے لے جا سکتے ہیں ڈاکٹر لیکن میں ...... میں فکر مند رہوں گی۔ مناسب یہ ہے کہ انہیں یہیں ہوش آ جائے۔''

''جو آپ فرمائیں۔'' ڈاکٹر رشید نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اسی وقت سیل کے ایک رکن نے مجھے اطلاع دی کہ میری ملازمہ خاص فاطمہ اور چند دیگر پرانے ذاتی ملازمین مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اس ہنگامہ آرائی میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ آج شام ہی ان لوگوں کو بھی آنا تھا۔ کمانڈر نواز نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ آج شام یہ لوگ پہنچ جائیں گے۔

''کہاں ہیں وہ لوگ؟'' میں اپنے پرجوش لہجے پر پوری طرح قابو نہ پا سکی۔ مجھے اپنے ذاتی ملازمین سے کچھ ایسا ہی جذباتی لگاؤ تھا۔ وہ برسوں سے میرے ساتھ تھے اور میں ایک طرح سے ان کی عادی ہو گئی تھی۔

''ہنگامی حالات کے پیش نظر انہیں کوٹھی کے گیٹ پر ہی روک دیا گیا تھا۔'' سیل کے رکن نے جواباً بتایا۔

''نہیں.....! انہیں اندر آنے دو.....! یہ گھر انہی کا تو ہے اور گھر والوں کو اس طرح روکا نہیں کرتے۔'' میرا لہجہ جذباتی تھا۔

سیل کے اس رکن نے حیرت سے میری طرف دیکھا' پھر اقرار میں سر ہلا کر واپس جانے کے لئے مڑا۔

''سنو.....! میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں' ان سب کو وہیں بھیج دو۔'' یہ کہہ کر میں ڈاکٹر رشید سے مخاطب ہوئی۔ ''جب یہ لوگ ہوش میں آ جائیں تو آپ مجھے مطلع کر دیجئے گا۔'' پھر میں نے قریب ہی کھڑے ہوئے سیل کے ایک رکن سے کہا۔ ''گیرج میں ایک موٹر سائیکل کھڑی ہے اس کی چابی میں تمہیں دے رہی ہوں۔ تمہیں فی الحال یہ موٹر سائیکل یہاں سے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے جانا ہے۔'' پھر مختصراً میں نے اسے بتا دیا کہ ضرورتاً وہ موٹر سائیکل مجھے بالجبر ایک نوجوان سے چھیننا پڑی تھی۔ ''اس کے نمبروں سے کل تمہیں یہ پتا لگانا ہے کہ اس کا مالک کون ہے! پھر یہ موٹر سائیکل اس کے گھر پہنچا دینا ہے۔ یہ خیال رہے کہ کسی بھی مرحلے پر تم سامنے نہیں آؤ گے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے موٹر سائیکل کی چابی اپنے پرس سے نکال کر اس کے حوالے کر دی اور پھر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

وہاں سے میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا اور ایزی چیئر پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد میری کوٹھی کا وہ حصہ آباد ہونے والا تھا جو مدت سے ویران پڑا تھا اور وہی حصہ کیا' پوری کوٹھی ہی چند دن پہلے تک غیر آباد تھی۔ عارضی طور پر سرونٹ کوارٹرز میں سیل کے ان ارکان کا قیام تھا جو میرے ذاتی ملازمین کا کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ بھی اک حسن اتفاق تھا کہ اب وہ لوگ کوٹھی چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ نشہ آور گیس کے زیر اثر آنے کے بعد ان سبھی کو کچھ دن بیڈ ریسٹ کی ضرورت تھی۔ اس موقع پر میرے پرانے ذاتی ملازمین کی آمد ایک نیک فال ہی تھی۔ چوکیدار' ڈرائیور اور مالی کے علاوہ میرے ذاتی ملازمین میں فاطمہ سمیت سبھی عورتیں تھیں۔ ان سب کی حیثیت ایک خاندان کی سی تھی۔ آپس میں وہ میل ملاپ سے رہتے تھے۔ میں نے کمانڈر نواز سے جو کچھ کہا تھا درست ثابت ہوا تھا۔ وہ سب اس عرصے میں جہاں جہاں ملازمت اختیار کر چکے تھے میری خاطر اسے چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ ان سب کے علاوہ میرے لئے بھی یہ ایک خوشی کا دن تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ سب فاطمہ کی رہنمائی میں میرے کمرے میں آئے تو میں نے کرسی سے اٹھ کر فاطمہ کو گلے سے لگا

لیا اور فاطمہ میرے گلے سے لگ کر یوں رونے لگی جیسے ایک مدت کے بعد کوئی لڑکی اپنے میکے واپس آتی ہے۔

''آنسو پونچھ لو فاطمہ اور اپنا گھر سنبھال لو۔'' میں نے اسے خود سے جدا کرتے ہوئے کہا۔ پھر میں بقیہ ملازمین سے مخاطب ہوئی۔ ''کیا تم لوگ اپنا سامان لے آئے ہو؟''

''جی ہاں...... باہر لان میں ہمارا سامان رکھا ہے۔ نواز بابو نے ہمیں بتا دیا تھا کہ دوبارہ ہمیں یہیں رہنا ہے۔'' مالی نے سب کی طرف سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے' تم سب لوگ پہلے جس جس کوارٹر میں رہتے تھے اسی میں رہو گے۔ کل صبح تمہیں ایک ایک مہینے کی تنخواہ بھی پیشگی مل جائے گی' فاطمہ سے لے لینا۔ ابھی کچھ دیر بعد سرونٹ کوارٹرز خالی ہو جائیں گے۔ تم سب ان لوگوں کا سامان اٹھوانے میں مدد کرنا' میں ابھی کہے دیتی ہوں۔ تم لوگوں کی غیر موجودگی میں مجھے وقتی طور پر کچھ لوگوں کو یہاں ملازمین کی حیثیت سے رکھنا پڑا تھا۔'' یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھی اور گھر کی چابیاں فاطمہ کے حوالے کر دیں۔ پھر سرونٹ کوارٹرز خالی کرانے کے لئے احکام دینے چل دی۔

میرے ملازمین کمرے سے نکل کر پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

پھر تقریباً ایک گھنٹے میں تمام ضروری ''کارروائی'' مکمل ہو گئی۔ اس عرصے میں نشہ آور گیس کا شکار ہونے والے تمام افراد کو ہوش آ گیا تھا۔ ڈاکٹر رشید کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ ابھی ان لوگوں کو مزید طبی نگرانی کی ضرورت تھی۔ ان سبھی کو آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر منتقل کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ سرونٹ کوارٹرز سے ان کا سامان بھی نکال کر ساتھ ہی بھیج دیا گیا۔ سرونٹ کوارٹرز میں اب میرے دیرینہ ملازمین آباد ہو چکے تھے۔ میری کوٹھی کی نگرانی اب سرفراز اور اس کے ساتھیوں کے بجائے سیل کے دوسرے ارکان کے سپرد کر دی گئی تھی۔

اپنے پرانے ملازمین کی واپسی کے سبب مجھے پہلی بار حقیقتاً یہ احساس ہوا کہ میں اپنی کوٹھی میں لوٹ آئی ہوں اور سب کچھ وہی ہے' جو پہلے تھا۔ رات کا کھانا کھانے سے قبل فون پر میں نے کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کیا۔ میرا حریف موشوروف کراچی پہنچ چکا تھا اور یہاں پہنچتے ہی اس نے پہل کر دی تھی۔ اب گویا میری باری تھی۔ عموماً میں اپنے کسی دشمن کو اتنا موقع نہیں دیتی تھی کہ پلٹ کر وہ دوبارہ مجھ پر وار کر سکے۔ دوسرے وار سے پہلے ہی میں پیش قدمی شروع کر دیتی تھی۔ مشرقی پاکستان روانگی سے قبل موشوروف کو میں کم از کم اس ''دلیرانہ گستاخی'' کا جواب ضرور دینا چاہتی تھی۔ کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کرنے کا سبب یہی تھا۔ عثمانی سے اسے پیش آنے والے واقعے کا علم ہو چکا تھا۔

''کمانڈر! آج کی رات خالی نہیں جانا چاہیے!'' میں نے فون پر کمانڈر نواز سے کہا۔

''لیکن میڈم جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ کہاں ٹھہرا ہے ہم کیا کر سکتے ہیں!'' اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''یہی تو تمہیں آج رات معلوم کرنا ہے! تمہارا کیا خیال ہے' وہ کہاں ٹھہرا ہو گا؟''

''یہاں کے کسی بڑے ہوٹل میں وہ یقیناً نہیں ٹھہرا ہو گا۔'' کمانڈر نواز کے لہجے میں یقین کا

تاثر تھا۔

''یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟''

''اس شخص کی کیریکٹر ریڈنگ کے سبب!'' کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ پھر مزید بولا۔ ''ا تک اس شخص کے حوالے سے اور اس کی بابت جو واقعات وحالات سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں شخص غیر معمولی ذہین ثابت ہوا ہے اور کسی بھی ذہین شخص سے اس قسم کی حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی مطلب یہ کہ وہ کسی بڑے ہوٹل میں قیام کر کے خود کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ میرا خیال ہے کہ خود آ بھی میری بات سے اتفاق کریں گی۔''

''ٹھیک کہتے ہو تم!'' میں نے یہ کہتے ہوئے طویل سانس لیا۔ ''پھر کیا کیا جائے؟ اسے کہ کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے؟''

''دوسرے درجے کے یا تیسرے درجے کے معمولی ہوٹلوں میں!'' کمانڈر نواز بولا۔ ''ا ایسے ہوٹلوں پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔''

''اور ایسے ہوٹلوں کی تعداد تمہارے خیال میں کتنی ہو گی......؟ جواب دیتے ہوئے اس بات خیال رکھنا کہ یہ کراچی شہر ہے......! یہاں کسی کو تلاش کرنا بہرحال آسان نہیں۔''

''دوسرے اور تیسرے درجے کے ہوٹلوں کی کل تعداد کا تو مجھے فی الحال علم نہیں لیکن ان فہرست مرتب کی جا سکتی ہے جو آئندہ بھی ہمارے کام آتی رہے گی۔ پھر بھی یہ ایک لمبا کام ہے جس لئے کئی دن درکار ہوں گے۔ بہرحال اگر آپ کا حکم ہو تو آج ہی رات سے یہ کام شروع کیا جا سکتا ہمارے کام میں آسانی کی ایک صورت بہرحال ہے۔ وہ یہ کہ ہمارا مطلوبہ افراد غیر ملکی ہیں۔ کسی دوسرے درجے کے ہوٹل میں یہ معلوم کر لینا دقت طلب نہیں ہو گا کہ وہاں کوئی غیر ملکی جوڑا قیام پذیر نہیں؟''

''یہ امکان بھی تو ہے کہ وہ دونوں الگ الگ ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوں۔'' میں بول اٹھی۔

''جی ہاں۔'' کمانڈر نواز نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ''ہم اس امکان کو مدنظر رکھیں گے۔''

''میرا مشورہ یہ ہے کمانڈر کہ بڑے ہوٹلوں کو بھی تم ان لسٹ ہی رکھو......! نہ سہی آج ہی رات......! تم ان دونوں کی تلاش شروع کر دو......! میری چھٹی حس کہتی ہے کہ آج کی رات خالی نہ جائے گی۔ میں اس سلسلے میں تم سے رابطہ قائم رکھوں گی۔ او کے؟''

''او کے میڈم!''

کمانڈر نواز سے فون پر گفتگو کرنے کے بعد مجھے ملک دلاور کا خیال آیا۔ اس کی ذرا سی حماقت کے سبب ذکیہ مجھ سے تقریباً ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ اسے بھلا کیا مار پڑی تھی جو وہ ذکیہ کو اپنے ساتھ لاہور لے جانا چاہتا تھا۔ اگر ڈاکٹروں نے اسے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا تھا تو وہ تنہا بھی لاہور یا کہیں اور جا سکتا تھا۔ پھر یہ کہ میرے علم میں کوئی بات لائے بغیر بالا ہی بالا اس نے ذکیہ کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ ہرچند کہ اپنی تمام ترلاف وگزاف کے باوجود ملک دلاور میرے نزدیک لوز کر نہیں تھا اور نہ ہی ذکیہ کوئی بچی تھی۔ اس نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ اس کے باوجود ملک دلاور کی یہ حرکت

ارت مجھے کچھ بھلی معلوم نہیں ہوئی تھی۔ میں اسے لتاڑنا چاہتی تھی۔ ذکیہ تو خیر جا ہی چکی تھی اس لئے میں اپنا سارا غصہ ملک دلاور ہی پر اتارنا چاہتی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے اس کا نمبر ملا لیا۔

فون پر میری آواز سنتے ہی وہ حسب معمول چہکنے لگا اور جواباً میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''ملک دلاور! اپنی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے! اس وقت میں تم سے ایک سنجیدہ مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے بچپنا چھوڑ دو!''

''مگر وہ جو ایک عدد فلمی گانا ہے بچپن کے دن بھلا نہ دینا! اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اس گیت نگار نے غلط بول لکھے ہیں؟''

''یہ بتاؤ کہ تم ذکیہ کے ساتھ لاہور کب جا رہے ہو؟'' میں نے اس کی بات اور اپنے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے قدرے نرمی سے سوال کیا۔

''تو کیا آپ نے محترمہ ذکیہ خان کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دی؟'' اس کے لہجے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے! میں نے تم سے جو کچھ پوچھا ہے اس کا جواب دو!''

''آپ اس سمے مجھے ایک عدد جوان جہان بہن کی بڑی بہن لگنے کے بجائے شہر کوتوال بلکہ کوتوالن معلوم ہو رہی ہیں جو شہر کے اندیشے میں ڈب......''

''بکواس بند کرو!'' میرا موڈ اکھڑ گیا۔ ''ہر وقت کی بک بک اچھی نہیں لگتی۔ اگر تم اب بھی ڈھنگ سے بات کرنے پر راضی نہیں ہوئے تو یہ تمہارے ہی حق میں برا ثابت ہو گا!'' میرے لہجے میں سختی بھی تھی اور دھمکی بھی!

خدا معلوم میرے لہجے کے سبب یا پھر کسی اور وجہ سے ملک دلاور راہ راست پر آ گیا اور بولا۔ ''میں نے آپ کی بہن سے کہہ دیا تھا کہ جب تک آپ اجازت نہیں دے دیں گی میں انہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آپ سے اجازت لے لیں گی۔ کل رات کو میں ان کے فون کا انتظار کرتا رہا مگر ظاہر ہے وہ بھی تو آپ کی بہن ہیں۔ تڑپانا شاید آپ کا خاندانی وتیرہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟'' اپنی بات ختم کرتے کرتے وہ پھر غیر سنجیدہ ہونے لگا۔

''اگر تم میرا ہی خیال معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو ملک دلاور تم انتہائی بے وقوف آدمی ہو! ذکیہ نے تمہیں بہت آسانی سے الو بنا دیا۔ اس کا پروگرام تو آج دوپہر کی ایک فلائٹ سے انڈیا جانے کا تھا۔ اس نے اپنی روانگی سے قبل مجھے بتا دیا تھا کہ تم اس کے فون کا انتظار کر رہے ہو گے۔ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ اپنے پروگرام کے مطابق دوپہر کو روانہ ہو چکی تھی۔ وہ تمہیں درباری مسخرے کا خطاب دے گئی ہے اور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ تم اس جہان فانی میں ذرا لیٹ تشریف لائے ورنہ دو چار صدی پہلے پیدا ہوتے تو کسی دربار سرکار میں مسخرے ہوتے۔ وہ بہرحال ایک ذہین اور بالغ فکر لڑکی ہے اسی لئے میں نے اس کی رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ کیا خبر وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہو!'' یہ سب کچھ کہنے کا مقصد انتقامی کارروائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری بات سن کر ملک دلاور کو غصہ آ جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا بھی!

''کیا آپ یہ سب کچھ سچ کہہ رہی ہیں؟'' اس کی آواز میں غصے کا تاثر تھا۔

''ہاں بھئی بالکل سچ کہہ رہی ہوں اگر تمہیں میری بات پر یقین نہ ہو تو خود یہاں میری کوٹھ
آکر تصدیق کرسکتے ہو ذکیہ واقعی جاچکی ہے۔ اس نے تمہارے متعلق اور بہت سے کمنٹس دیئے تھے
میں صرف اس لئے نہیں بتارہی کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔''

''بتادیں وہ بھی' کوئی حرج نہیں......! میں برا نہیں مانوں گا۔ کم سے کم اس طرح مجھے اپ
حیثیت کا اندازہ تو ہوجائے گا۔''

''چھوڑو بھی ملک دلاور......! میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی ذہنی صدمہ پہنچے۔ یوں بھی تم آ
کل بیمار ہو۔''

''بیمار ضرور ہوں مگر کابل رحم نہیں سمجھ گئیں آپ!''

''تم کل کابل کہہ رہے ہو یا کابل ......؟ میں سمجھی نہیں! ویسے کابل افغانستان کا دارالحکوم
ہے۔ ہاں یاد آیا ذکیہ کہہ رہی تھی کہ جس شخص کا تلفظ تک درست نہ ہو اسے بھلا کیسے گھاس ڈالی جاسکتی
گھاس ڈالنے کا مطلب تو تم اچھی طرح سمجھتے ہوگے نا!''

''جی ہاں! اچھی طرح سمجھتا ہوں گھاس ڈالنے کا مطلب! ...... اور ...... اور آپ کو بھی اچ
طرح سمجھتا ہوں......! مجھے شاید اب آپ کے بارے میں اپنی رائے بدلنا پڑے گی۔ آپ انتہائی بے
اور سفاک عورت ہیں......! آپ کو...... آپ لوگوں کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ...... کہ میں اس شہر
تنہا اور...... اور بیمار ہوں۔ ڈاکٹروں نے مجھے آب و ہوا کی تبدیلی کا مشورہ دیا ہے...... مگر آپ...... آ
کی بہن اور آپ......'' اس کی آواز بھرا گئی اور اسی کے ساتھ اس نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ملک دلاور کے اندر مردی جاگ اٹھی تھی۔ وہ اس بھری دنیا میں واقعی
تھا۔ مال و دولت اور عیش و آسائش ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اس کے خاندانی پس منظر کا علم تھا۔
اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور والدین کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس کے عزیز و اقارب بہت سے تھے
کوئی سگا نہ تھا۔ اس کے باپ نے خاصی دولت چھوڑی تھی اور جائیداد بھی! لاہور کے نواح میں اس
خاصی زمین بھی تھی' زیر کاشت زمین! مگر کافی عرصے پہلے اپنی تنہائی سے گھبرا کر اور اپنے لالچی عز
اقارب سے اکتا کر وہ کراچی میں آبسا تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی ہنسی کے پیچھے کیا دکھ چھپا
ہے! ہر وقت ہنسنے' مسکرانے اور قہقہے لگانے والا شخص ملک دلاور اندر سے دکھی اور اکیلے پن کا شکار
آدمی جب بیمار پڑ جاتا ہے تو کچھ زیادہ ہی حساس ہوجاتا ہے۔ ایسا ہی ملک دلاور کے ساتھ ہوا تھا
عام حالات میں وہ کبھی اپنے دکھ کا اظہار نہ ہونے دیتا۔ باتوں میں ہی باتوں میں محض ''انتقامی کارر
کے طور پر ملک دلاور کے ساتھ زیادتی ہوگئی تھی۔ اسی کے تدارک کی خاطر میں نے فیصلہ کیا کہ آج
اس کی عیادت کرنے ضرور جاؤں گی۔

اس شب رات کو نو بجے کے قریب میں نے کھانا کھایا اور پھر چہل قدمی کی غرض سے اپنی
کے لان میں آگئی۔ ٹہلتے ٹہلتے مجھے ایک بار پھر موشوروف کا خیال آگیا اور میں سوچنے لگی کہ اس وق
جانے وہ کہاں ہوگا؟ میں نے شاعری کے باب میں ایک قسم کی وجدانی کیفیت کے متعلق پڑھا ہے
بھی کہ وجدان کا تعلق شعور سے نہیں ہوتا۔ وجدان کے لغوی معنی کچھ بھی ہوں جو عام شعراء و ناقدین

اس کی جو چاہیں تعریف کریں میں نے اسے ایک ذہنی کیفیت کا نام دیا ہے جس میں انسانی دماغ کے کچھ ایسے خلیے بھی متحرک یا فعال ہوجاتے ہیں جو عام حالات میں غنودہ رہتے ہیں یا کام نہیں کرتے۔ یہ خالصۃً سائنٹفک معاملہ ہے۔ اس کا کوئی تعلق کسی اسرار سے نہیں! تصوف کی ایک اصطلاح کشف کو بھی میں اسی طرح سمجھتی ہوں۔

عقائد کی رو سے وجدان و کشف کی مختلف توجیہات کی جاتی رہیں لیکن میں بڑی صاف گوئی اور سچائی کے ساتھ یہ لکھ رہی ہوں کہ ان توجیہات نے مجھے کبھی مطمئن نہیں کیا۔ ممکن ہے اس کا سبب وہ ذاتی تجربات ہوں جن سے میں اپنی زندگی میں دوچارہ ہوئی۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان کا دماغ' کشف یا وجدان کا اہل نہیں ہوتا۔ سائنسی طور پر اس کا تجزیہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر انسان کے دماغ کے خلیات (سیلز) یکساں طور پر بیدار نہیں ہوتے۔ ان کی تعداد کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوسکتی ہے۔ دانشوروں' فنکاروں' سائنس دانوں' بڑے سیاست دانوں اور خدا کے برگزیدہ بندوں کے دماغ کے خلیات نسبتاً زیادہ بیداری کی حالت میں ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ بھی قادر مطلق کسی بھی فرد کے دماغ کے خوابیدہ خلیات کو متحرک کرسکتا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ یہاں اس لئے عرض کیا کہ میرے بعض قارئین سائنس سے آگہی نہ ہونے کے سبب میری آپ بیتی کو سچ نہیں جانتے۔ وہ اسے کوئی پراسرار عمل سمجھتے ہیں۔ کسی تخلیق کار پر تخلیقی لمحات میں سرشاری و لذت کی جو کیفیت گزرتی ہے اسے کم از کم کوئی فنکار نہیں جھٹلا سکتا۔ وہ بھی تو ایک وجدانی ہی لمحہ ہوگا جس میں ایک بڑے دماغ نے کشش ثقل دریافت کی اور نہاتے ہوئے برہنگی کی حالت میں چیختا ہوا بھاگا کہ میں نے پالیا' پالیا! وجدانی کیفیت کی ایسی متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ یہ سب سائنسی حقیقتیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ ایسی ہی ایک ذہنی کیفیت کا بیان کئی جگہ میری آپ بیتی میں بھی آچکا ہے جسے ابتدا میں خود میں بھی پراسرار ہی سمجھی تھی۔ جس شب کا میں ذکر کررہی ہوں کہ اپنی کوٹھی کے لان میں ٹہل رہی تھی اور روسی ایجنٹ موشوروف کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اسی شب بھی اچانک میں ایک ایسے ہی تجربے سے گزری۔

ٹہلتے ٹہلتے میرے سارے وجود میں ایک لذت انگیز سنسناہٹ ہونے لگی۔ ایک سرشاری کی سی کیفیت میں مجھے اپنے دماغ میں روشنی کے جھماکے سے محسوس ہوئے۔ میں رک کر وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔ کیف و بے خودی کی منزلوں سے گزرتے ہوئے میری پلکیں بوجھل ہوتی گئیں۔ پھر میری آنکھیں بند ہوگئیں اور ذہن بیدار ہوگیا۔ اسی عالم میں اپنے صفحہ ذہن پر میں نے دو دھندلی سی شبیہیں ابھرتے دیکھیں جو رفتہ رفتہ واضح ہوگئیں۔ ان میں سے ایک چہرہ موشوروف کا تھا اور دوسرا چہرہ اس کی فرانسیسی محبوبہ جین آندرے کا! پھر ان دونوں کے چہرے نسبتاً دور ہوتے گئے اور اردگرد کا منظر بھی واضح ہونے لگا۔ وہ دونوں ایک قدیم طرز پر بنی ہوئی عمارت کا گیٹ کھول کر باہر آرہے تھے۔ گیٹ کے باہر ایک کار کھڑی تھی۔ سفید رنگ کی ڈاٹسن! وہ کار میں آبیٹھے اور چند لمحے بعد کار اسٹارٹ ہوگئی۔ کار اس گلی سے نکل کر مین روڈ پر آگئی۔ یہ کراچی ہی کا ایک علاقہ تھا۔ سفید ڈاٹسن' سولجر بازار سے گرومندر کی طرف آنے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پھر میری چشم تصور اس سفید کار کا تعاقب کرتی رہی اور یہ تعاقب میری کوٹھی کے گیٹ پر ختم ہوا۔ اس کے بعد میں نے ان دونوں کو اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے دیکھا۔ منظر کسی تیز رفتار فلم کی طرح جلدی

جلدی بدلنے لگے۔ جلد ہی وہ لمحہ آ گیا جب موشوروف ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ڈرائنگ روم میں دھواں ہی دھواں بھر گیا۔ موشوروف اور جین اس دھوئیں میں غائب ہو چکے تھے اور میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ عین اسی مرحلے پر میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرا سانس تیزی سے چل رہا تھا اور سارے جسم میں سنسناہٹ اب بھی موجود تھی۔ میں بدستور گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر میں میری حالت اعتدال پر آ گئی اور پھر میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ میرے حیرت انگیز ذہن نے ایک معما حل کر دیا تھا۔ میری چشم تصور نے موشوروف کے ذریعے گزرے ہوئے وقت کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میرا ذہین حریف اس شہر میں کہاں ٹھہرا ہوا ہے! خود میرے اور کمانڈر نواز کے قیاسات اس سلسلے میں قطعی غلط ثابت ہوئے تھے۔ موشوروف اور اس کی محبوبہ کا قیام کسی ہوٹل میں نہیں بلکہ ایک کوٹھی میں تھا۔ اس کوٹھی کے گیٹ کی بائیں جانب سنگ مرمر کے ایک چوکور ٹکڑے پر میں نے ''مسکن مجید'' بھی لکھا دیکھا تھا اور کوٹھی کا نمبر بھی مجھے واضح طور پر نظر آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ سفید ڈاٹسن کی نمبر پلیٹ پر بھی میری نظر پڑی تھی۔ اس کار کے نمبر بھی مجھے یاد تھے۔ وہ گلی بھی میرے ذہن میں محفوظ تھی جس کے نکڑ پر ایک شراب خانہ تھا۔ وہاں سے گرو مندر زیادہ دور نہیں تھا۔

لان سے اٹھ کر میں تیزی کے ساتھ کوٹھی میں پہنچی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی سب سے پہلے میں نے کاغذ پر اس کوٹھی کا پتا لکھا' پھر کار کا نمبر بھی لکھ دیا۔ وال کلاک پر میری نظر پڑی تو پونے دس بج رہے تھے۔ کمانڈر نواز سے فون پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا میری چھٹی حس کہتی ہے کہ آج کی رات خالی نہیں جائے گی۔ اس وقت مجھے قطعی یہ اندازہ نہیں تھا کہ حقیقتاً ایسا ممکن ہوگا مگر اب اس کے واضح امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

وقت ضائع کیے بغیر میں نے فون پر فوراً ہی کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کر لیا اور دوسری جانب سے اس کی آواز سنتے ہی بڑے پر جوش لہجے میں کہا۔ ''کمانڈر! بات بن گئی۔ یہ معلوم ہو گیا کہ موشوروف کہاں ٹھہرا ہوا ہے!''

''جی......؟ کمانڈر نواز کی آواز میں شدید حیرت تھی۔ ''ابھی چند گھنٹے پہلے تو آپ نے مجھے اس سلسلے میں احکام دیئے تھے!''

''ہاں......! اور ابھی چند منٹ پہلے مجھے اس کے ٹھکانے کا علم ہوا ہے۔ تم فوری طور اپنے ان تمام آدمیوں کو واپس بلا لو جنہیں موشوروف کی تلاش میں روانہ کیا ہے۔ وہ کسی بڑے یا چھوٹے ہوٹل میں نہیں ٹھہرا۔''

''پھر......؟ پھر وہ کہاں ٹھہرا ہے؟''

''ذرا صبر سے کام لو میں ابھی تمہیں سب کچھ بتائے دیتی ہوں۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی جلد بازی سے کام نہیں لینا۔ میں اس کوٹھی کا پتا تمہیں لکھوا رہی ہوں نوٹ کرو!''

''جی لکھوایئے!'' کمانڈر نواز چند لمحے بعد بولا۔

میں نے اس کوٹھی کا پورا پتا لکھوا کر کمانڈر نواز کو محل وقوع بھی سمجھا دیا اور اسی کے ساتھ سفید

ڈاٹسن کا نمبر بھی لکھوا کر بولی۔ ''تمہیں فوری طور پر یہ معلومات حاصل کرنا ہے کہ یہ کوٹھی کس کی ملکیت ہے اور اس شخص سے موشوروف کا کیا تعلق ہے؟ دوم یہ کہ موشوروف کے پاس جو کار ہے اس کا مالک کون ہے۔ اس طرح ہم ان لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں جو یہاں ہمارے ملک میں روسی ایجنٹوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے میڈم مگر...... مگر کیا آپ آج ہی رات موشوروف پر ہاتھ ڈالنا چاہتی ہیں؟'' کمانڈر نواز نے کچھ جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں بالکل......! لیکن میں وہاں اکیلی ہی جاؤں گی۔ آپریشن سیل کا کوئی بھی رکن میرے ساتھ نہیں ہوگا۔''

''کیا...... کیا میں تنہا جانے کی وجہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟''

''اس کا سبب تم میری انا تصور کر سکتے ہو!'' میں نے وہی کہہ دیا جو میرے دل میں تھا' پھر مزید بولی۔ ''جب موشوروف یہ دلیرانہ قدم اٹھا سکتا ہے کہ میری کوٹھی میں گھس کر بہ خیریت نکل جائے تو عذرا خان میں اتنی ہمت و جرات نہیں کہ اس کا جواب دے سکے! میں سختی کے ساتھ تمہیں تاکید کرتی ہوں کہ تم یا سیل کا کوئی بھی رکن اس کوٹھی کے قریب نہیں آئے گا! اسے تم میرا حکم بھی سمجھ سکتے ہو اور غالباً تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حکم کی خلاف ورزی میں کسی صورت برداشت نہیں کرتی۔ اس سلسلے میں تمہیں جو کام سپرد کیا گیا ہے تم اس سے تجاوز نہیں کرو گے!''

''یقیناً ایسا ہی ہوگا میڈم!'' کمانڈر نواز نے مجھے یقین دلایا۔ ''آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔ میں کچھ اور عرض کرنا چاہتا تھا۔''

''ہاں بولو! کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''آپ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں خود یا سیل کا کوئی بھی رکن اس کوٹھی کے قریب نہیں آئے گا۔ یہ حکم ہے نا آپ کا؟''

''ہاں میں نے یہی کہا ہے...... مگر اس بات کو دہرانے اور تصدیق کرنے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''وہی عرض کر رہا ہوں۔'' کمانڈر نواز نرمی سے بولا۔ ''آپ سے ایک درخواست ہے اگر آپ قبول فرما لیں۔ ہمیں اس علاقے کی ناکہ بندی کی اجازت دے دیں تاکہ کسی مرحلے پر موشوروف بچ کر فرار ہونے کی کوشش کرے تو اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس درخواست کو آپ قبول کر لیں گی۔''

''کمانڈر! تم اگر وکالت کا پیشہ اختیار کر لیتے تو واقعی ایک کامیاب وکیل ثابت ہوتے۔'' یہ کہتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''گھما پھرا کر آخر تم مجھ سے وہ بات منوا لینا چاہتے ہو جو میں نہیں چاہتی۔ یہ بتاؤ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے کہ میں تنہا اس سے نمٹنے کی اہل نہیں ہوں؟''

''کیوں نہیں میڈم!'' وہ پر جوش آواز میں کہنے لگا۔ ''آپ یقیناً اس کے لئے کافی ہیں...... بات صرف امکانات کی تھی اور آپ نے ہمیں خود ہی یہ سبق دیا ہے کہ جذبات سے قطع نظر کسی بھی امکان

کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ جو واقعہ ابھی رونما نہیں ہوا اس کے بارے میں میں قطعی طور پر کوئی حکم لگانا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک ہے کمانڈر......! تم خود میرے ہی دلائل سے مجھے قائل کر رہے ہو۔ تمہیں اس علاقے کی ناکا بندی کرنے کی اجازت ہے اور کچھ؟“

”تھینک یو ویری مچ میڈم!“ کمانڈر نواز کے لہجے میں بے پایاں مسرت تھی۔

اس کے بعد کمانڈر نواز کو ”خدا حافظ“ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ میں نے اسے مصلحتاً یہ نہیں بتایا تھا کہ فوری طور پر میرا ارادہ روانگی کا ہے۔

اپنی کوٹھی سے روانگی میں بمشکل میں نے مزید نصف گھنٹا لیا۔ میں نے اس دوران میں موشوروف سے نمٹنے کی کچھ تیاریاں کر لی تھیں۔ کچھ ایسے ”چٹکلے“ تو بہر حال میرے پاس بھی تھے جو وقتی طور پر ہی سہی موشوروف ایسے شخص کو بھی بدحواس کر دیتے۔ میں پوری تیاری کے ساتھ اپنی کوٹھی سے روانہ ہوئی تھی۔ سیل کے جو ارکان میری کوٹھی کی نگرانی پر مامور تھے انہیں بھی میں نے ٹرانسمیٹر پر یہ حکم دے دیا تھا کہ وہ میرے پیچھے نہ آئیں۔

گرومندر پر پہنچنے میں مجھے دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہاں سے میں سولجر بازار جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے اپنی کار اس شراب خانے کے سامنے فٹ پاتھ کے قریب کھڑی کر دی جو مطلوبہ گلی کے نکڑ پر تھا۔

کار سے اترتے ہی مجھے ایک روزنامے کا صحافی نظر آیا جو مجھے پہچانتا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا شراب خانے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم رک گئے۔ اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ غالباً وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ خدانخواستہ میں بھی اس کی طرح اسی شراب خانے میں جا رہی ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا۔ جواباً میں نے بھی ہاتھ اٹھایا اور پھر اسے نظر انداز کرتی ہوئی تیزی کے ساتھ اس کے قریب سے گزرتی ہوئی گلی میں داخل ہو گئی۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ خواہ مخواہ ”کمبل“ ہونے کی کوشش کرے۔

آہستہ خرامی کے ساتھ میں اس گلی میں بڑھتی چلی گئی۔ اگر اس وقت کوئی مجھے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں کسی خاص مکان کی تلاش میں ہوں۔ میرے انداز و اطوار سے یہی ظاہر تھا۔ میں بغیر کسی ضرورت کے دونوں اطراف مکانوں اور کوٹھیوں کے نمبر پڑھتی ہوئی چل رہی تھی۔ اپنی کار میں نے دانستہ مین روڈ ہی پر چھوڑ دی تھی۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ روانگی سے قبل میں نے اپنے لباس پر بھی خصوصی توجہ دی تھی۔ میرے پیروں میں فل بوٹ تھے جن کے سول ربر کے تھے تاکہ بھاگتے ہوئے زیادہ آواز نہ ہو۔ جوتے بہت ہلکے پھلکے تھے جیسے عموماً کھلاڑی پہنتے ہیں۔ ان کا رنگ گہرا نیلا تھا جو نیم تاریکی میں سیاہی مائل ہی معلوم ہو رہا تھا۔ نسبتاً چست پینٹ کا رنگ بھی سیاہ تھا جس کے ساتھ میں نے ڈھیلی ڈھالی سیاہ شرٹ پہن رکھی تھی۔ میری شرٹ اور پینٹ کی جیبوں میں بھی مختلف سامان تھا جو بہ وقت ضرورت میرے کام آ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے ہاتھ میں سیاہ چمڑے کا ایک بیگ بھی تھا۔ اس بیگ میں بھی ضروری سامان تھا۔ میں اپنی کوٹھی سے پوری تیاری کے ساتھ چلی تھی کہ کسی بھی قسم کے متوقع حالات سے نمٹ سکوں۔

مجھے یقین تھا کہ وہ بھاری تن و توش والا صحافی جو موٹے فریم کی عینک لگائے ہوئے تھا اور جس نے سلام بھی کیا تھا شراب خانے کے دروازے پر مزید کھڑا رہنا پسند نہیں کرے گا۔ شراب کی للک اسے وہاں نہیں رکنے دے گی۔ اپنے اندازے کی تصدیق کیلئے مطلوبہ کوٹھی سے کچھ پہلے میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ میری توقع کے مطابق شراب خانے میں جا چکا تھا۔

وہ گلی تقریباً نیم تاریک تھی اور اس وقت وہاں میرے سوا کوئی تھا بھی نہیں۔ مطلوبہ کوٹھی کے سامنے مجھے سفید ڈاٹسن کار کھڑی ہوئی نظر نہ آئی۔ اب میں اس کے گیٹ تک پہنچ چکی تھی۔ وہاں کار کھڑی نہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا مگر میں نے یہ سوچا کہ شاید اس وقت کار اندر پارک کر دی گئی ہو۔ گیٹ کی دوسری سمت مجھے گھنے درخت نظر آ رہے تھے اور کچھ فاصلے پر بائیں جانب عمارت میں روشنی تھی۔ عمارت میں کوئی نہ کوئی ضرور موجود تھا۔ کوٹھی کا گیٹ بھی اس کی کہنگی کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ لکڑی کے اس گیٹ میں ذیلی دروازہ بھی تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر دیکھا وہ بھی اندر سے بند تھا۔

میں نے لکڑی کے اس گیٹ پر چڑھنے سے پہلے گلی میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور پھر چشم زدن میں اس پر چڑھ کر پنجوں کے بل اندر کود گئی۔ میرے اندر کودنے سے بس ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ میں انتہائی سرعت سے غراہٹ کی سمت پلٹی۔ خوف ناک شکل وصورت کا ایک بلڈ ہاؤنڈ کتا نہ جانے کدھرے سے نکل کر مجھ پر جست لگا چکا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے کریہہ دہانے کا ہدف میری گردن تھی لیکن اس سے پہلے ہی فضا میں اسے میں نے سنبھال لیا۔ میری انگلیاں اس کے نرخرے میں پیوست ہو گئیں۔ پھر چند ہی لمحوں میں اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور میں نے اسے آہستگی سے ایک طرف پھینک دیا۔ آواز نکالے بغیر وہ ملک عدم سدھار چکا تھا۔ اگر میں پوری طرح چوکنا نہ ہوتی یا مجھے اس کی طرف متوجہ ہونے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو وہ مجھے بھنبھوڑ کے رکھ دیتا۔ کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد اس پہلے خطرناک تجربے نے مجھے مزید محتاط کر دیا۔

کوٹھی کے اندر کا ماحول عجیب پراسرار تھا تھا احاطے میں گھنے پیڑ لگے ہوئے تھے جن کے درمیان ایک پختہ پگڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ جو دائیں بائیں بل کھاتی ہوئی عمارت تک چلی گئی تھی۔ اندر پہنچ کر میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہاں کار کھڑی کرنے کی جگہ ہی نہیں تھی۔ کار کو اسی لئے گلی میں گیٹ کے سامنے کھڑا کیا جاتا ہو گا۔ گلی میں کار کی غیر موجودگی سے یہ خیال بھی میرے ذہن میں آیا کہ شاید اس وقت موشوروف کہیں گیا ہوا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی محبوبہ جین آندرے بھی اسی کے ساتھ ہو۔ اگر میرا یہ خیال درست بھی تھا تو مجھے بہر حال ان کی واپسی کا انتظار کرنا تھا اور اس سے پہلے عمارت میں موجود افراد سے بھی نمٹنا تھا۔ یہی سوچ کر میں گیٹ سے ہٹ کر درختوں کے درمیان پہنچ گئی جہاں تقریباً اندھیرا تھا۔ وہاں میں نے چمڑے کے بیگ کی زپ کھول کر اس میں سے سیاہ لبادہ نکالا اور اسے اوپر سے اوڑھ لیا۔ اس سیاہ لبادے میں مرا جسم چھپ گیا۔ اس میں آستینیں بھی تھیں جن میں دونوں ہاتھ ڈال کر کمر کے گرد سلی ہوئی بیلٹ میں نے باندھ لی۔ آنکھوں کی جگہ اس لبادے میں دو سوراخ تھے جن سے میں دیکھ سکتی تھی۔ ہونٹوں اور ناک کا نچلا حصہ کھلا رکھنے کیلئے بھی اس میں جگہ تھی تاکہ بولنے اور سانس لینے میں دشواری نہ ہو۔ اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر کوئی بھی شخص مجھے جرائم پیشہ ہی سمجھ سکتا تھا مگر جرائم کی بیخ کنی

کے لئے اکثر مجھے خود بھی وہی تمام حربے آزمانا پڑے ہیں جو عموماً جرائم پیشہ افراد کے لئے مخصوص ہیں۔ اس وقت بھی میں کسی ایسے منجھے ہوئے جرائم پیشہ شخص کا کردار ادا کر رہی تھی جو اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کسی بھی رکاوٹ کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔

سیاہ لبادہ پہن لینے کے بعد پختہ پگڈنڈی پر چلنے کی بجائے میں درختوں کی آڑ لیتی ہوئی عمارت تک پہنچ گئی۔ عمارت کے سامنے ایک بڑا سا چبوترا بنا ہوا تھا جس کے درمیان اوپر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اوپر ہی عمارت کے صدر دروازے پر ایک بلب روشن تھا۔ میں نے اپنی پینٹ کی جیب سے ریوالور نکال کر اس کی نال پر سائیلنسر چڑھایا اور پھر بلب کو نشانہ بنا دیا۔ سائیلنسر کی وجہ سے گولی چلنے کی آواز تو نہیں ہوئی بلب ٹوٹنے کی آواز ضرور ہوئی اور ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ میں ایک درخت کی آڑ میں چھپی ہوئی صدر دروازے ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دروازے کی دوسری جانب روشنی اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ دروازے کے اوپری حصے کے دونوں پٹوں میں موٹے شیشے لگے ہوئے تھے۔ گہرے سکوت میں بلب ٹوٹنے کی آواز بھی خاصی تیز سنائی دی تھی۔ یہ آواز ممکن ہے عمارت کے مکینوں نے بھی سنی ہو۔ یہ سوچ کر چند لمحے میں نے کسی ردعمل کا انتظار کیا مگر عمارت کا دروازہ کھول کر حقیقت حال جاننے کے لئے کوئی بھی باہر نہیں نکلا۔

کچھ دیر مزید انتظار کرنے کے بعد میں نے چمڑے کے بیگ سے ایک لمبی نال والی شے نکالی جو بظاہر گن ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی نال کا اگلا حصہ کسی پچکاری سے مشابہہ تھا۔ دستے کی جگہ ضخیم تھی اور اندر سے کھوکھلی جس میں ایک سیال مادہ بھرا ہوا تھا۔ لبلبی دبانے سے یہ سیال مادہ اپنے ہدف تک پہنچتا تھا۔ اس کی بھی رینج مقرر تھی۔ عمارت کا صدر دروازہ اس کی رینج سے باہر نہیں تھا۔ میں نے نیم تاریکی بلکہ تقریباً تاریکی میں صدر دروازے کی طرف نالی سیدھی کی اور لبلبی دبا دی۔ خطرناک سیال مادہ لمحوں میں صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ اسی کے ساتھ دروازے میں آگ لگ گئی۔ وہ آتش گیر مادہ تھا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جلتے ہوئے دروازے کی روشنی میں اس کے اوپری حصوں کے شیشوں پر پے در پے دو فائر کیئے۔ صدر دروازے کے قریب ہی دائیں بائیں دو دروازے اور بھی نظر آ رہے تھے مگر ان کے عقب میں روشنی نہیں تھی۔

میرے نزدیک اتنا کافی تھا' اگر اس عمارت میں کوئی موجود تھا تو اسے اب لازماً باہر آ جانا چاہئے تھا۔ پھر چند ہی لمحے بعد میری توقع پوری ہوگئی۔ صدر دروازے کی دائیں جانب والے دروازے کے پیچھے مجھے روشنی نظر آئی۔ غالباً کسی نے اس کمرے کا بلب جلایا تھا۔ ذرا دیر بعد میں نے اس کمرے کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلتے دیکھا مگر فوری طور پر کوئی باہر نہیں آیا۔ میری نظریں دروازے ہی پر مرکوز تھیں۔ وہ دروازہ تھوڑا سا اور کھلا اور مجھے ایک ریوالور کی نال باہر جھانکتی نظر آئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا مسلح تھا۔ غالباً وہ دروازے کی جھری سے پہلے باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے دروازہ کھول دیا اور میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ جین آندرے تھی۔ موشوروف کی فرانسیسی محبوبہ اور دست راست! دروازہ کھولتے ہی فوراً وہ باہر آ گئی اور کسی چوکنا ہرنی کی طرح اس نے انتہائی تیزی سے چاروں طرف دیکھا تھا۔ پھر جلتے ہوئے صدر دروازے کو حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

میں اندھیرے میں پیڑ کی آڑ لئے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ اس وقت اس عمارت میں جین آندرے اکیلی ہے۔ اس کے سوا اندر کوئی اور نہیں ورنہ جین کی بجائے وہی باہر آتا۔ شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں بھی اس کا حسن نمایاں تھا۔ اس کے سنہری بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ قدموں کی چاپ نہ ابھرے اسی سبب دانستہ شاید وہ ننگے پاؤں باہر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا خوب صورت ریوالور تھا اور وہ ریوالور کی نال پر سائیلنسر چڑھانا بھی نہیں بھولی تھی۔

اپنے ہاتھ سے ریوالور رکھ کر میں نے دوبارہ آتش گیر مادہ پھینکنے والا ہتھیار اٹھا لیا۔ اس بار میرا نشانہ صدر دروازے کی بائیں جانب والا دروازہ تھا۔ میں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ وہ خطرناک مادہ جین کے جسم کو مس نہ کر سکے کیونکہ وہ اس دروازے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میری توقع کے عین مطابق اس دروازے نے بھی فوراً آگ پکڑ لی۔ جین کی نگاہ جیسے ہی اس دروازے پر پڑی وہ تقریباً اچھل پڑی۔ شعلوں کی روشنی میں اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور چہرے پر خوف کے آثار تھے۔

ایسے حالات میں آہنی اعصاب رکھنے والے بھی وقتی طور پر حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ جین بھی یقیناً مضبوط اعصاب رکھتی تھی لیکن یہ معما اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ کس طرح ''خود بہ خود'' جلنے لگا؟ آتش گیر مادے کی پتلی سی دھار پر اس کی نظر یقیناً نہیں پڑ سکی تھی۔

خوف واستعجاب کے ان لمحوں سے میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اچانک آواز بدل کر زور سے بولی۔ ''جین! جس طرح یہ دروازہ خود بہ خود شعلوں کی زد میں آ گیا ہے اسی طرح تمہارا وجود بھی شعلوں میں گھر سکتا ہے۔ اگر تم اس سے بچنا چاہتی ہو اور ابھی موت کو گلے لگانا نہیں چاہتیں تو ریوالور پھینک کر چبوترے سے نیچے اتر آؤ!''

جین ایک بار پھر اچھل پڑی مگر اس نے میرا حکم ماننے کی بجائے فوراً خود کو سنبھال لیا اور تیزی کے ساتھ مڑ کر میری طرف فائر کیا۔ اس کی پھرتی اور اتنی جلدی حواس پر قابو پالینا میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ اس نے میری آواز سے اندازہ لگا کر کہ میں کہاں چھپی ہوئی ہوں حیرت انگیز حد تک صحیح نشانہ لیا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی اس درخت کے تنے میں پیوست ہوگئی تھی۔ میں جس کی آڑ لئے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کا نشانہ بہت سچا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کر سکتی میرے ریوالور نے شعلہ اگل دیا اور جین کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر جلتے ہوئے دروازے میں جا گرا۔ میں نے اس کے ریوالور ہی کا نشانہ لیا تھا۔

''اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دو جین......!'' میں نے اسے حکم دیا۔ ''ورنہ اس بار میری چلائی ہوئی گولی تمہارے سینے میں بھی پیوست ہو سکتی ہے۔'' یہ کہتے ہی میں نے ایک فائر اور کیا۔ گولی جین کے بائیں کان کے قریب سے گزر گئی۔

یہ عملی دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور جین نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ اپنا ریوالور اور آتش گیر ہتھیار چمڑے کے بیگ میں رکھا اور اس کی زپ بند کر کے جستیں بھرتی ہوئی لمحوں میں جین کے قریب پہنچ گئی۔

"میں تمہیں لینے آئی ہوں جین......! ہم دونوں شطرنج کھیلیں گے۔" میں نے اپنی اصل آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"تم......تم......عذرا......عذرا خان؟" وہ حیرت زدہ سی آواز میں بولی۔ اس نے مجھے میری آواز سے پہچان لیا تھا۔

"ہاں میں ہی ہوں!" یہ کہتے ہوئے میں نے سیاہ لبادے کی بیلٹ کھول دی اور پھر اسے اتار کر بیگ میں رکھ دیا مگر اس دوران میں میری توجہ جین ہی کی طرف رہی تھی۔ میں نے اس سے مزید کہا۔

"مجھے افسوس ہے جین کہ اس وقت موشوروف یہاں نہیں ہے ورنہ تمہارے ساتھ اسے بھی میں میزبانی کا شرف ضرور بخشتی!"

"مگر......مگر موشوروف تو......"

جین کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ اس سے پہلے میرے ہاتھ کی ضرب اس کے سر پر پڑ چکی تھی۔ اس کا حسین جسم لہرایا اور میں نے فوراً ہی گرنے سے پہلے اسے سنبھال لیا۔

یہ اندازہ لگاتے ہی کہ کوٹھی میں اس وقت صرف جین آندرے ہے موشورف نہیں میں دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر چکی تھی اور اب اسی فیصلے پر عمل درآمد کر رہی تھی۔ موشوروف کو تڑپانے، زچ کرنے اور بہ طور جوابی کارروائی یہ بھی کوئی کم بات نہ ہوتی کہ اس کی محبوبہ اس کی دست راست کو غائب کر دیا جاتا۔ مجھے آخر اس سے اپنا پچھلا قرض بھی تو چکانا تھا! قاہرہ میں اس کی "مہمان نوازی" ابھی میں بھولی تو نہیں تھی! رہا موشوروف تو میرے قیاس کے مطابق جین کی جدائی وہ کسی طور برداشت نہ کر پاتا۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا تھا وہ شخص جین کی قربت کا عادی ہو چکا تھا۔ جین کی غیر موجودگی میں اس کی قوت کار نصف رہ جاتی۔ اگر جین آندرے اس کے لئے ناگزیر نہ ہوتی تو وہ ساری دنیا میں اسے ساتھ ساتھ لئے نہ پھرتا۔ جذباتی رشتے کسی بھی فرد کی کارکردگی پر ہر حال میں اثر انداز ہوتے ہیں جو لوگ نارمل حالات میں انتہائی ذہانت کا ثبوت دیتے ہیں کسی قسم کا جذباتی دھچکا انہیں اندر سے توڑ کے رکھ دیتا ہے۔ نتیجتاً وہ عقل کو بالائے طاق رکھ کر جذباتی رو میں بہہ جاتے ہیں اور اس صورت حال سے ان کے ذہین مخالفین بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ موشوروف کے کیس میں بھی میں یہی حکمت عملی اختیار کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح اس سے نمٹنا میرے لئے آسان ہو جاتا۔

جین کی بے ہوشی کے بعد اب میں اسے جلد از جلد وہاں سے لے کر نکل جانا چاہتی تھی۔ اس نازک سی لڑکی کو میں نے بہ آسانی اٹھا لیا اور پھر تیزی کے ساتھ کوٹھی کے پھاٹک تک پہنچ گئی۔ پھاٹک اب بھی اندر سے بند تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ موشوروف اس وقت کہاں گیا تھا اور کب تک اسے لوٹ کر آنا تھا۔ اس کی واپسی کسی بھی لمحے ہو سکتی تھی۔ پھر وہاں سے جین کو نکال لے جانا اتنا آسان نہ ہوتا۔ مجھے بہرحال رسک تو لینا ہی تھا۔ میں نے اسی لئے جین کے بے ہوش جسم کو پھاٹک کے قریب ایک پیڑ کے نیچے اندھیرے میں ڈال دیا اور پھر پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر نہایت پرسکون انداز میں باہر آ گئی۔ باہر آ کر ذیلی دروازہ میں نے بند کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ گلی عبور کرنے لگی۔ اب میں جلد از جلد اپنی کار تک پہنچنا چاہتی تھی۔

اپنی کار کو اس کوٹھی کے پھاٹک تک لانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ کار کو میں نے پھاٹک کے قریب کھڑا کیا تھا اور اس کا پچھلا دروازہ بھی کھول دیا تھا۔ کار کو میں نے اسٹارٹ ہی رہنے دیا اور اگلا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ اطراف میں نظر دوڑا کر میں پھر پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ جین کا بے ہوش جسم بدستور اسی جگہ پڑا تھا جہاں میں چھوڑ کر گئی تھی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا اور باہر لا کر اسے اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ کار کا پچھلا دروازہ بند کر کے میں نے کوٹھی کا ذیلی دروازہ بھیڑا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی۔ دوسرے ہی لمحے میرے پیر کا دباؤ ایکسیلیریٹر پر پڑا اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ اسی لمحے میری نگاہ عقبی آئینے پر پڑی۔ کافی فاصلے پر عقب سے ایک کار گلی میں داخل ہوتی نظر آئی۔ وہ سفید ڈاٹسن ہی تھی۔ میں نے صرف چند منٹ کے فرق سے بازی جیت لی تھی۔ اب موشوروف کو جب تک صورت حال کی سنگینی کا علم ہوتا میں اس علاقے سے کافی دور نکل چکی ہوتی۔ اس سفید ڈاٹسن میں آنے والا موشوروف کے سوا بھلا اور کون ہو سکتا تھا!

کچھ فاصلہ تیزی سے عبور کر کے میں بائیں جانب ایک گلی میں مڑ گئی۔ پھر گلیوں ہی گلیوں سولجر بازار اور اس کے بعد جماعت خانے کے سامنے سے گزرتی ہوئی گارڈن سے لسبیلہ کی طرف جانے والی روڈ پر نکل آئی۔ لسبیلہ سے ناظم آباد کی طرف جاتے ہوئے میں نے کار میں موجود ٹرانسمیٹر پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔

"ہیلو......ہیلو......عذرا خان اسپیکنگ......! اوور!"

"یس میڈم......! کمانڈر نواز آن دی لائن' اوور۔"

"پروگرام کے مطابق کیا تمہارے آدمی اس علاقے کی ناکابندی کئے ہوئے ہیں؟ اوور۔"

"جی ہاں!" کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ "ابھی کچھ دیر قبل ان کی طرف سے اطلاع ملی ہے کہ آپ اس علاقے سے نکل چکی ہیں مگر اسی کے ساتھ ایک اور اہم خبر ملی ہے کہ اسی دوران میں موشوروف اس کوٹھی کی طرف گیا ہے۔ یقیناً وہ آپ کو اس کوٹھی میں نہیں ملا ہوگا۔ کیا آپ اس اطلاع کے بعد دوبارہ ادھر جائیں گی؟ اوور۔"

"نہیں!" میں نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔ "میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر آ رہی ہوں۔ امید تو نہیں کہ موشوروف کو تمہارے آدمی گھیر سکیں لیکن کوشش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ تمہارے آدمیوں کو جل دے کر نکل جائے گا۔ ایسی صورت میں تمہارے آدمیوں کو اس کوٹھی کی اچھی طرح تلاشی لینا ہے۔ وہاں سے کاغذات کی صورت میں جو کچھ بھی ہاتھ لگے حاصل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ موشوروف کی محبوبہ جین کے استعمال میں آنے والی تمام ضروری اشیاء جن میں کپڑے وغیرہ بھی شامل ہیں وہاں سے لانا ہیں۔ تلاشی میں کسی بھی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی! تم اپنے آدمیوں کو پوری طرح تاکید کر دینا۔ اس کے علاوہ یہ کہ اگر اس دوران میں پولیس کی طرف سے مداخلت ہو تو تمہارے آدمیوں کو وہاں سے فرار ہو جانا ہے اور کسی کو بھی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اگر موشوروف توقع کے مطابق فرار ہو گیا تو فوری طور پر پولیس سے رابطہ قائم کرے گا کہ اس کی کوٹھی میں ڈاکو گھس گئے ہیں وغیرہ! اس لئے کوٹھی کی تلاشی میں انتہائی عجلت اور چوکنا رہنے کی

ضرورت ہے۔ اردگرد کی کوٹھیوں اور مکانوں میں رہنے والے بھی اس کوٹھی میں پراسرار نقل وحرکت اور ہنگامہ آرائی محسوس کر کے پولیس کو مطلع کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ بتاؤ کہ تمہارے آدمیوں کے پاس گیس ماسک ہیں؟ اوور۔''

''انہیں پوری تیاری کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ میڈم تا کہ وہ ہر قسم کی صورت حال سے نمٹ سکیں۔ اوور۔'' کمانڈر نواز جواباً بولا۔

''اوور اینڈ آل!'' یہ کہتے ہی میں نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچنے تک جین بے ہوش ہی رہی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اسے آدھے پون گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ وہاں اسے میرے حکم پر اس کمرے میں رکھا گیا جہاں ایک طویل عرصے سے امریکی باغی ایجنٹ جیفرسن کو رکھا گیا تھا جو اب پولیس کی تحویل میں تھا۔ میرے ''مہمان خانے'' کا یہ حصہ انتہائی محفوظ تھا۔ اس پر شب و روز مسلح محافظوں کی کڑی نظر رہتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ مجھے اب موشوروف کے بارے میں رپورٹ کا انتظار تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے کوٹھی فون کر دیا تھا کہ ممکن ہے آج شب میری واپسی نہ ہو۔ میرے دیرینہ ملازمین کیلئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یوں بھی میں کوٹھی سے رات کا کھانا کھا کر چلی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے۔ رات آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں بھی گزاری جا سکتی تھی۔ اسی لئے احتیاطاً میں نے اپنی ملازمہ خاص فاطمہ کو اس سے مطلع کر دیا تھا تا کہ وہ فکر مند نہ ہو۔ جین کے ہوش میں آنے کے بعد ابھی مجھے اس سے بھی بہت سی باتیں کرنا تھیں اور اس سے پہلے کمانڈر نواز سے بھی کچھ دریافت کرنا تھا۔

اپنی کوٹھی فون کرنے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر انٹرکام پر کمانڈر نواز سے بات کرنے لگی۔ پہلے میں نے اس سے تازہ ترین صورت حال کے بارے میں پوچھا۔ ''کیا رہا کمانڈر؟ ادھر سے کوئی رپورٹ ملی؟''

''جی ہاں۔'' اس نے جواب دیا اور پھر ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ''موشوروف بچ کر نکل گیا۔ آپ کا اندازہ درست ثابت ہوا۔''

''مگر کس طرح؟ تفصیل سے بتاؤ!''

''اندازے کے مطابق موشوروف نے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی غیر معمولی صورت حال کا اندازہ کر لیا ہوگا۔ غالباً اسی لیے وہ وہاں نہیں رکا۔ کار بھی وہ وہیں کوٹھی کے سامنے کھڑی ہوئی چھوڑ گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے سیل کے ارکان اس دھوکے میں آ گئے کہ موشوروف ابھی کوٹھی ہی میں ہے لیکن جب وہ کوٹھی میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی نہیں تھا حالانکہ اسے کار سے اتر کر کوٹھی کے اندر داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔ غالب قیاس یہی ہے کہ وہ کوٹھی کی عقبی دیوار پھاند کر فرار ہوا ہے۔ کوٹھی کے عقب میں ایک اور کوٹھی کا احاطہ تھا۔ اس میں کود کر شاید وہ وہاں رکے بغیر کوٹھی کا پھاٹک کھول کر نکل گیا تھا۔ برابر والی کوٹھی کا چوکیدار بے ہوش ہے۔ سیل کے ارکان ابھی تک کوٹھی کی تلاشی لے رہے ہیں۔'' کمانڈر نواز نے تفصیلی رپورٹ دی۔

''اس کوٹھی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کس کی ملکیت ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی...... اس کوٹھی کا مالک صدر مملکت کا ایک قریبی مشیر شیخ مجید ہے جس سے خود آپ بھی ایک بار مل چکی ہیں۔''

''شیخ مجید!'' میں چونک اٹھی۔ ''وہی نا جسے شہریار قتل کر دینا چاہتا تھا اور جس پر یہیں کراچی میں کئی قاتلانہ حملے بھی ہوئے تھے!'' میں جیسے خود کلامی میں مبتلا تھی۔ ''جہاں تک مجھے یاد ہے اس کا تعلق بائیں بازو کی ایک جماعت سے ہے!''

''صدر مملکت کا مشیر ہونے سے قبل خود شیخ مجید کی سکونت اس کوٹھی میں تھی۔'' کمانڈر نواز مزید بتانے لگا۔ ''مشیر ہونے کے بعد شیخ مجید اپنی ساری فیملی کے ساتھ اسلام آباد منتقل ہو گیا تھا۔ یہ کوٹھی عموماً خالی ہی پڑی رہتی ہے۔ اس کی حیثیت اب شیخ مجید کے مہمان خانے کی سی ہے۔ اب شیخ مجید اسلام آباد سے کراچی آتا ہے تو اپنے بہنوئی مشتاق احمد کے گھر باتھ آئی لینڈ میں ٹھہرتا ہے۔ مذکورہ کوٹھی پر مسکن مجید کا پتھر اسی لئے لگا ہوا ہے۔''

''تو گویا یہ معاملہ بھی اوپر تک گیا ہے۔ شہریار کی طرح بائیں بازو کے افراد بھی اپنے مفادات حاصل کرنے کی خاطر کسی نہ کسی طور غیر ملکی ایجنٹوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کمانڈر کہ موشوروف کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں بھی انتہائی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ جہاں تک شیخ مجید کے بارے میں میری ریڈنگ ہے وہ اپنے نظریات سے قطع نظر بہرحال ایک نڈر اور ذہین سیاست دان ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ شہریار کی طرح گھٹیا ذہنیت کا مالک بھی نہیں ہے۔ اگر اس سے معرکہ آرائی کی نوبت آئی جس کا امکان فی الحال نہیں تو وہ کبھی اوچھے ہتھکنڈے استعمال نہیں کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ روسی ایجنٹ موشوروف سے اس کا تعلق نظریاتی طور پر تو ہو سکتا ہے مگر اس تعلق کی قیمت ملک و قوم سے بے وفائی یا غداری کی صورت میں ادا نہیں ہوگی۔ اس کے باوجود بہرحال یہ بات تشویش ناک ہے کہ اس نے ایک کنفرم غیر ملکی ایجنٹ کو اپنی کوٹھی میں مہمان بنا کر رکھا تھا۔ اس نے اور خود موشوروف نے اپنی بچت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور رکھا ہوگا کہ بات کھل جانے کی صورت میں کیا کہانی سنائی جائے! تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''جی میڈم میں آپ کے خیالات کو فالو کر رہا ہوں۔'' کمانڈر نواز بولا۔

''شیخ مجید اور موشوروف کے تعلق کی وہ کہانی کیا ہے؟ ہمیں اس کا سراغ لگانا پڑے گا۔ عین ممکن ہے کہ تلاشی کے دوران میں کوئی ایسا کلیو ہمارے ہاتھ آ جائے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ موشوروف اور جین بظاہر کس حیثیت سے پاکستان آئے ہیں۔ ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جن کے جواب جاننا ضروری ہیں۔ ہم اسی کے بعد موشوروف پر کوئی چارج لگا کر اسے قانون کے حوالے کر سکتے ہیں جو فی الحال ممکن نظر نہیں آ رہا۔ وہ شخص بلا کا ذہین اور چالاک ہے۔ اول تو اس کا ہاتھ آنا ہی مشکل ہے اور اگر وہ ہاتھ آ بھی گیا تو اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم کرنا آسان نہیں ہوگا۔ ہاں مجھے ایک امید ضرور ہے کہ اپنی دست راست جین کی غیر موجودگی میں اس سے کوئی جذباتی حماقت سرزد ہو جائے اور ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔''

''جین آندرے کے بارے میں قاہرہ سے واپسی کے بعد مختصراً آپ نے کچھ بتایا تھا۔ اس کی

روشنی میں میں یہ عرض کروں گا کہ وہ بھی آسانی سے زبان نہیں کھولے گی۔'' کمانڈر نواز نے کہا۔

''کیا فضول بات کر رہے ہو تم کمانڈر......! اس لڑکی کو انڈر اسٹیمیٹ نہ کرو! زبان کھولنا کیا معنی! وہ تو چیز ہی اور ہے۔ موشوروف نے بے سبب اسے اپنا دست راست نہیں بنا لیا!'' یہ کہہ کر میں نے مختصراً آج رات پیش آنے والے واقعے سے کمانڈر نواز کو آگاہ کیا۔

''آپ کا خیال قطعی درست معلوم ہوتا ہے۔'' کمانڈر نواز میری پوری بات سن کر کہنے لگا۔ ''جین بھی یقیناً غیر معمولی ذہن کی مالک ہے اور آہنی اعصاب رکھتی ہے۔ اس جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو آپ پر فائر کرنے کی بجائے بوکھلا کر ریوالور پھینک دیتی۔''

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں ایک ان ڈور گیمز روم بھی تھا جو عموماً ان دنوں بند ہی پڑا رہتا تھا۔ سیل کے ارکان کو اتنی فرصت ہی نہیں مل پاتی تھی کہ کسی کھیل میں حصہ لے سکیں۔ وہاں دیگر گیمز کے علاوہ شطرنج کی بساط اور مہرے بھی تھے۔ روسیوں کو اس قدیم کھیل سے خصوصی دلچسپی ہے۔ موشوروف بھی روسی تھا اور اسے بھی اپنے ملک کے اس قومی کھیل سے لگاؤ تھا۔ اسی کی وجہ سے جین آندرے کو بھی یہ شوق لگ گیا تھا۔ میں قاہرہ میں جین کے ساتھ شطرنج کھیل چکی تھی۔ اس وقت میری حیثیت ایک قیدی کی تھی اور اب جین میری قید میں تھی۔ کچھ تو نفسیاتی حربے کے طور پر اور کچھ سابقہ حساب چکانے کی خاطر میں نے جین کے ساتھ اس وقت شطرنج کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اسے یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ صرف موشوروف ہی کو ''آداب میزبانی'' نہیں آتے بلکہ میں بھی ان سے واقف ہوں۔ اسی دوران میں جین کو کھیل میں لگا کر میں کچھ کام کی باتیں بھی معلوم کر لینا چاہتی تھی۔ میں نے اسی لئے اس وقت کمانڈر نواز سے کہا کہ جین کے کمرے میں شطرنج کی بساط اور مہرے پہنچوا دو اور یہ بھی چیک کر لو کہ وہ ہوش میں آ چکی ہے یا نہیں!

''میں ابھی آپ کے حکم کی تعمیل کرائے دیتا ہوں۔'' کمانڈر نواز جواب میں بولا۔

''سنو! یہ بھی معلوم کراؤ کہ......''

''میڈم! ایکسکیوزمی...... پلیز ہولڈ آن......! ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا ہے' میں ابھی آپ سے......''

''نیور مائنڈ!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تم بات کر لو اس کے بعد میں تمہیں ضروری ہدایات دے دوں گی۔ میں ریسیور رکھ رہی ہوں' یہ کہہ کر میں نے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا۔

چند ہی منٹ بعد کمانڈر نواز نے خود ہی مجھ سے انٹر کام پر رابطہ قائم کر لیا اور بولا۔ ''جی فرمایئے آپ کیا کہہ رہی تھیں؟''

''تمہیں یہ معلوم کرانا ہے کہ ان دنوں شیخ مجید کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔

''غالباً آپ نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔ آج ہی اس کا ایک بیان چھپا ہے۔ کل شام کراچی ہی میں اس نے مزدور یونینوں کے رہنماؤں کے ایک نمائندہ اجلاس سے خطاب کیا ہے۔ وزیر محنت اور سماجی بہبود بھی اس جلسے میں شریک تھے۔ وزیر محنت نے اس جلسے کی صدارت کی تھی اور شیخ مجید مہمان خصوصی تھا۔''

''سوری کمانڈر! میں آج کا اخبار نہیں دیکھ سکی۔ بہرحال یہ اچھا ہی ہے۔''

''اس کے علاوہ یہ کہ آج رات وہ پاک روس دوستی کی انجمن کی جانب سے ایک دعوت میں بھی شریک تھا۔ آج ہی کے اخبار میں یہ خبر بھی تھی۔'' کمانڈر نواز نے بتایا۔

میں کچھ سوچتے ہوئی بولی ''اور یہ دعوت یقیناً رات گئے تک چلی ہو گی۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

''غالباً آپ اس مکان پر غور کر رہی ہیں کہ موشوروف اسی دعوت میں شرکت کرنے گیا ہوگا!''

کمانڈر نواز میری بات کی تہ تک پہنچ گیا۔

''ہاں میں یہی سوچ رہی تھی۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''مگر اس دعوت میں وہ جین کو کیوں نہیں لے گیا یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی!''

''اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ موشوروف اسی دعوت میں شرکت کرنے گیا تھا تو جین کو ساتھ نہ لے جانے کی وجہ پر خود جین ہی روشنی ڈال سکتی ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ یقیناً رہی ہو گی۔''

''میں کوشش کروں گی کہ جین سے کچھ معلوم کر سکوں۔'' میں نے کہا' پھر پوچھا۔ ''ان لوگوں کی طرف سے کیا خبر ملی جو مسکن مجید کی تلاشی لے رہے تھے؟ غالباً کچھ دیر پہلے ٹرانسمیٹر پر نمبر انہی کی طرف سے کوئی میسیج ملا ہے!''

''وہ لوگ ابھی کوٹھی کی تلاشی لے ہی رہے تھے کہ وہاں پولیس کے پہنچنے کی اطلاع مل گئی۔ پولیس کی وہاں آمد سے قبل ہی وہ وہاں سے نکل آئے اور اب آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر آ رہے ہیں۔''

''تلاشی کے دوران میں کچھ ملا بھی یا......'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کہا تو ہے ان لوگوں نے کہ بہت سے کاغذات ہاتھ لگے ہیں مگر ابھی انہوں نے ان کاغذات کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا۔ کاغذات وہ ساتھ لا رہے ہیں۔''

''اور جین کے کپڑے اور دیگر استعمال کی ضروری اشیاء؟''

''وہ بھی!''

''ٹھیک ہے جب وہ لوگ پہنچ جائیں تو تم مجھے مطلع کرنا میں یہیں اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہوں۔ اب ان لوگوں کی آمد کے بعد ہی میں جین سے ملوں گی۔ تم وہ تمام کاغذات جین کا ضروری سامان اور اس کے کمرے کی چابی میرے پاس بھجوا دینا۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہی ملے گا۔''

''جی بہتر ہے۔'' کمانڈر نواز نے کہا اور میں انٹر کام کا ریسیور رکھ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ مہلت کے ان لمحات سے فائدہ اٹھا کر میں کچھ دیر تک آرام کر لینا چاہتی تھی۔

بستر پر دراز ہوئے ابھی مجھے بہ مشکل چند منٹ ہوئے تھے کہ میں چونک اٹھی۔ میرے دماغ کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور اسی کے ساتھ ساتھ سماعت میں ایک آشنا آواز گونجنے لگی۔ ''فریادی......! فریادی!'' وہ آشنا آواز یقیناً موشوروف کی تھی مگر فوری طور پر حیرت اور غیر متوقع ذہنی رابطہ قائم کرنے کے سبب میری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ وہ خود کو ''فریادی'' کیوں کہہ رہا ہے! یہ تو خود وہ بھی جانتا تھا کہ ایک عرصے قبل فریادی عرف پراسرار فریادی'' کا ڈھونگ کھل چکا تھا۔ میرے لئے یہ عین ممکن تھا کہ میں اس سے ذہنی رابطہ استوار نہ ہونے دیتی مگر اب میں اس پر قادر ہو چکی تھی کہ وہ میرا ذہن نہ پڑھ سکے اور میں اسے ٹریپ بھی کر سکوں۔

قاہرہ میں اس کے ساتھ میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ موشوروف نے اس کے بعد پھر مجھ سے ذہنی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ وہ یقیناً سمجھ چکا تھا اور خود بھی اس نے یہ اعتراف کرلیا تھا کہ میرا ذہن اس کے ذہن سے زیادہ غیر معمولی اور طاقت ور ہے۔ اس کے باوجود اس وقت خود کو اس نے "فریادی" ظاہر کیا ہے یہ سوچ کر میں نے ذہنی رابطہ منقطع نہیں کیا اور اسے وہ سب کچھ کہنے دیا جو کہنا چاہتا تھا۔ عذرا خان! وہ کہہ رہا تھا' آپ کو یاد ہوگا کہ جب پہلی بار میں نے آپ سے ذہنی رابطہ پیدا کیا تھا تو خود کو فریادی ظاہر کیا تھا مگر بعد میں آپ میری حقیقت سے واقف ہوگئی تھیں۔ میں اس وقت فریادی بن کر آپ سے ملنے کا آرزومند تھا اور اسی لئے میں نے وہ سوانگ بھرا تھا لیکن اب...... اب واقعی آپ نے مجھے فریادی بنا دیا ہے۔ میں آپ کے سامنے جین کی خاطر فریاد کناں ہوں۔ یقین کریں کہ میں جین کے بغیر ادھورا رہ گیا ہوں۔

موشوروف میرے ذہن نے اسے مخاطب کیا' میرا خیال ہے کہ تم ٹین ایجرز میں سے نہیں ہو اور عمر کی اس منزل سے بہت آگے نکل چکے ہو جہاں ایسی جذباتی اور غیر منطقی باتیں کسی شخص کو زیب دیتی ہیں۔ اس سے قطع نظر تم نے یہ کس طرح فرض کرلیا کہ تمہاری محبوبہ دل نواز میرے پاس ہے۔ تم آخر اس طرح کیا ظاہر کرنا چاہتے ہو......؟ کیا یہ کہ جین آندرے تمہیں کہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے؟ یا پھر تم اس طرح ایک بار پھر میرا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہے ہو......؟ تم تو شاید اس میں کامیاب نہ ہوسکو لیکن میں اس وقت تمہارا ذہن پڑھنے کی اہل ہوں۔ میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ اس وقت تم نے کہاں پناہ لے رکھی ہے......! اگر کہو تو بتا دوں؟"

اسے شاید میری بات پر یقین نہیں آیا حالانکہ میں نے اس سے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اسی لئے بولا' اچھا تو پھر بتایئے کہ میں اس وقت کہاں ہوں؟"

تم شیخ مجید کے پاس باتھ آئی لینڈ کی ایک کوٹھی میں ہو اور یہ کوٹھی شیخ مجید کے بہنوئی کی ہے۔ اب تمہیں میری بات پر یقین آیا؟

حیرت انگیز......! انتہائی تعجب خیز! موشوروف کے لہجے میں واقعی حیرت تھی مگر...... مگر آپ مجھ سے سچ کیوں نہیں بول رہیں......؟

کس سلسلے میں؟ میں دانستہ انجان بن گئی۔

اسی سلسلے میں کہ جین کو آپ ہی نے اغوا کیا ہے وہ بولا۔ آپ کے سوا کسی میں اتنی جرات اور ہمت نہیں ہوسکتی کہ وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرسکے!

اور موشوروف تمہارے سوا بھی تو آج تک کسی نے اتنی ہمت نہیں کی کہ انتہائی دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے میری کوٹھی میں گھس آیا ہو اور پھر مجھ سے بچ کر نکل گیا ہو......! تم یہ کیوں بھول گئے؟

میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ میری غلطی تھی۔ میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی تھی لیکن اس غلطی کی آپ اتنی بڑی سزا کیوں دے رہی ہیں مجھے؟

میں نے تو تمہیں کوئی سزا نہیں دی۔ تمہیں آخر یقین کیوں نہیں آتا کہ اگر جین کو اغوا کرلیا گیا ہے تو اس میں میرا ہاتھ نہیں۔ تمہارے حریف' یعنی امریکی ایجنٹ بھی تو یہ "کارنامہ" انجام دے سکتے ہیں!

ہرگز نہیں! وہ پریقین آواز میں بولا۔ میری اطلاعات کے مطابق آج کل ان کی توجہ کا مرکز مشرقی پاکستان ہے۔ وہ سب وہیں ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر رچرڈ کا دست راست سولومن بھی ان دنوں ڈھاکہ میں ہے۔ مجھے علم ہوچکا ہے کہ آپ نے اسے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کردیا ہے۔

اور اس کی جگہ یہاں تم نے سنبھال لی ہے! میں نے اس پر طنز کیا۔

یہ محض غلط فہمی ہے آپ کی......! میرا مشن محض آپ کی حد تک محدود تھا۔ میں نے آپ کے ملک میں آنے کے بعد اب تک کوئی غیر قانونی یا ایسا کام نہیں کیا جو آپ کے ملک کے مفادات یا اس کی سالمیت کے خلاف ہو۔ میرے ہاتھ صاف ہیں اور آپ کوشش کے باوجود میرے خلاف کوئی ایسا ثبوت حاصل نہیں کرسکیں گی۔

مجھے تمہاری بات پر یقین ہے موشوروف! تم یقیناً امریکیوں سے زیادہ ذہین اور چالاک ہو۔ تم اپنے پیچھے کوئی ایسا سراغ نہیں چھوڑو گے کہ قانونی گرفت میں آسکو۔ بہرحال مجھے تم سے اور تمہاری فرانسیسی محبوبہ جین سے ہمدردی ہے۔ میں تمہارے لئے دعا ہی کرسکتی ہوں کہ تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی محبوبہ واپس مل جائے لیکن تم اسے اپنے ساتھ تقریب میں کیوں نہیں لے گئے؟ میں نے اس سے دانستہ یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ جواباً اس کے ذہن میں اس وقت وہ بات اور وجہ آجائے جس کی مجھے جستجو تھی لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ موشوروف یقیناً میرا مقصد سمجھ گیا تھا اسی لئے اس نے فوری طور پر مجھ سے ذہنی رابطہ منقطع کرلیا تھا۔ خود اسی نے میرے ذہن کی خوابیدہ صلاحیتوں کو متحرک کیا تھا جو اس کے حق میں ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ جین کو اپنے ساتھ نہ لے جانے میں کوئی نہ کوئی اسرار ضرور تھا ورنہ موشوروف فوری طور پر ذہنی رابطہ منقطع نہ کرلیتا۔ قاہرہ میں ڈاکٹر رچرڈ کے دوسرے تجربے کے بعد میرے ذہن کی وہ صلاحیت ختم ہوگئی تھی کہ میں خود کسی کا ذہن پڑھ سکوں۔ اگر یہ صلاحیت اس وقت بھی برقرار ہوتی تو یہ معما حل کرنا میرے لئے کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ جین کا ذہن پڑھ کر مجھے سب کچھ معلوم ہوجاتا مگر اب اس سے کچھ معلوم کرنے کیلئے مجھے خاصی محنت کرنا پڑتی۔

موشوروف ایک اچھا ٹیلی پیتھ تھا اور یہ بات بھی میرے مدنظر تھی کہ وہ اپنی محبوبہ کا ذہن پڑھ کر بھی بہت سی باتیں معلوم کرسکتا ہے۔ جین کے باب میں اسی لئے میں انتہائی محتاط رویہ رکھنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ جین سے میں جو باتیں بھی کرتی موشوروف کو معلوم ہوسکتی تھیں۔ جین گویا آپریشن سیل کی اس عمارت میں موشوروف کی آنکھوں اور کانوں کا فرض انجام دے سکتی تھی۔ میں نے اسی لئے کمانڈر نواز کو بھی فوری طور پر اس بات سے آگاہ کردیا کہ جین کو صرف اسی ایک کمرے تک محدود رکھا جائے اور پھر اس کی وجہ بھی بتادی۔

"مجھے خود بھی اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ تھا میڈم!" کمانڈر نواز نے کہا۔ "میں اسی سبب سیل کے تمام محافظوں کو انتہائی چوکنا اور محتاط رہنے کی تاکید کرچکا ہوں۔ جین کو اب ہوش آچکا ہے اس کمرے کی چھت اور دیواروں میں لگے ہوئے خفیہ کیمرز کے ذریعے ڈیوٹی روم کے ٹی وی اسکرین پر اس وقت میں اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہوں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ غالباً اس کمرے سے باہر نکلنے کے امکانات کا جائزہ لے رہی ہے۔ اس کی حرکات و سکنات سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ ساؤنڈ سوئچ میں

نے آف کر رکھا ہے کیونکہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ اس کی بے ہوشی ہی کے دوران میں شطرنج کی بساط اور مہرے کمرے میں پہنچا دیئے گئے ہیں...... ہاں وہ لوگ واپس آ چکے ہیں جو موشوروف کی کوٹھی کی تلاشی لے رہے تھے۔ وہاں سے ملنے والے کاغذات اور وہ سامان انہوں نے مجھے پہنچا دیا ہے۔ کیا کاغذات اور سامان میں آپ کے پاس بھیج......''

''نہیں......! میں خود تمہارے پاس آ رہی ہوں اور سنو! تمہارے لئے ایک نئی اطلاع موشوروف ابھی کچھ دیر پہلے تک باتھ آئی لینڈ کی اسی کوٹھی میں تھا جہاں شیخ مجید ٹھہرا ہوا ہے لیکن اب وہاں سے کہیں اور چلا گیا ہوگا۔ وہ اتنا بے وقوف بہرحال نہیں ہو سکتا کہ میرے علم میں یہ بات آ جانے کے بعد بھی وہیں رکا رہے!''

''میڈم! گستاخی معاف کیجئے گا' آپ خبر رساں ایجنسی بھی حیرت انگیز ہے!'' کمانڈر نواز کے لہجے میں شگفتگی تھی۔ ''اگر آپریشن سیل کو اس خبر رساں ایجنسی کا تعاون حاصل نہ ہو تو عضو معطل ہو کر رہ جائے''

کمانڈر نواز کی بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر میں نے ہنستے ہوئے ہی انٹر کام کا ریسیور رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈیوٹی روم میں پہنچ کر میں نے کمانڈر نواز سے وہ تمام کاغذات لے لئے جو موشوروف کی کوٹھی کی تلاشی کے دوران میں ملے تھے۔ ان میں دو انٹرنیشنل پاسپورٹ بھی تھے۔ ایک جین کا پاسپورٹ تھا دوسرا موشوروف کا! وہ دونوں قانونی طور پر پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔ دونوں پاسپورٹوں پر قاہرہ میں موجود پاکستانی سفارت خانے کا ویزا لگا ہوا تھا۔ دونوں ٹورسٹ پاسپورٹ تھے۔ ان کاغذات کی رو سے موشوروف اور جین کی حیثیت ایسے اسکالرز کی تھی جو مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں پر ریسرچ کر رہے تھے۔ وہ دونوں پاسپورٹ روسی حکومت نے جاری کئے تھے۔ انہی کاغذات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جین کو دو ملکوں کی شہریت حاصل تھی جن میں سے ایک فرانس تھا اور دوسرا روس۔ وہ دونوں ممالک میں سے کہیں بھی مستقل سکونت اختیار کر سکتی تھی۔ ان تمام کاغذات میں کوئی ایسا مسودہ یا کاغذ نہیں تھا جو موشوروف یا جین کو غیر ملکی ایجنٹ ثابت کر سکتا۔ قانونی طور پر ان دونوں سے کسی بھی قسم کی باز پرس نہیں کی جا سکتی تھی۔ کراچی آئے انہیں صرف دو دن ہوئے تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے پولیس ہیڈ آفس اور متعلقہ تھانے میں باقاعدہ اندراجات کرائے تھے۔

''ہی از ہے ایکسٹرا آرڈنری۔ انٹلی جینٹ پرسن!'' میں نے وہ کاغذات دیکھنے کے بعد موشوروف کی غیر معمولی ذہانت کی تعریف میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ میرا مخاطب کمانڈر نواز تھا جس نے ڈیوٹی روم میں میرے آتے ہی اپنی ریوالونگ چیئر کا رخ میری طرف کر لیا تھا اور اسی کے ساتھ ٹی وی کا سوئچ آف کر دیا تھا جس کے اسکرین پر اس کمرے کا منظر نظر آ رہا تھا جہاں جین کو رکھا گیا تھا۔ چند لمحے کے توقف سے میں نے کمانڈر نواز کو پھر مخاطب کیا۔ کمانڈر! تم خود بھی ان کاغذات کو دیکھو ممکن ہے میری نظر سے کوئی چیز مس ہو گئی ہو! اس دوران میں تمہاری جگہ میں بیٹھ جاتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں کرسی سے اٹھی اور آگے بڑھ کر وہ کاغذات کمانڈر نواز کے حوالے کر دیئے۔

اس عرصے میں کمانڈر نواز بھی ریوالونگ چیئر سے اٹھ چکا تھا اور میں اس پر بیٹھ کر ٹی وی سوئچ آن کر چکی تھی۔

میں نے ٹی وی اسکرین پر جین کا حیران و پریشان چہرہ دیکھا۔ وہ اس وقت باتھ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسی لمحے میں نے ٹی وی سیٹ کے قریب ہی رکھے بظاہر ایک ویڈیو سیٹ کا سوئچ بھی آن کر دیا جس کے ایک حصے میں چھوٹا سا مائک اور اسپیکر بھی موجود تھا۔ ٹی وی اسکرین پر نظر جمائے ہوئے معاً میں نے جین کو مخاطب کیا۔ ''ہیلو جین......! کہاں جا رہی ہو تم؟ وہ باتھ روم کا دروازہ ہے اور وہاں بھی تم کوئی راہ فرار تلاش نہیں کر پاؤ گی!''

مجھے معلوم تھا کہ اس کمرے میں چھپے ہوئے خفیہ اسپیکر کے ذریعے میری آواز جین تک پہنچ رہی ہوگی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا کہ جین میری آواز سن کر ایک دم ٹھٹک گئی اور اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

''تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو کہو میں تمہاری آواز سن سکتی ہوں...... میرا مشورہ ہے کہ تم آرام سے کرسی پر بیٹھ جاؤ' کمرے میں کئی کرسیاں موجود ہیں اور آرام دہ بستر بھی تمہارا منتظر ہے۔ پھر تم کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو! یہ خیال اپنے ذہن سے بالکل نکال دو کہ تم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتی ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے موشوروف سے بھی میری بات ہو چکی ہے۔ وہ تمہاری طرف سے بہت فکر مند تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ تم خیریت سے ہو اور میری مہمان ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اگر تمہیں نیند نہ آ رہی ہو تو میں تمہارے پاس آ جاؤں۔ میں نے اسی لئے تمہارے کمرے میں شطرنج کی بساط اور مہرے بھی بھجوا دیئے ہیں۔ کیا خیال ہے کہ ایک آدھ بازی ہو جائے؟''

''عذرا خان! مجھے اعتراف ہے کہ آپ موشوروف سے بھی زیادہ حیرت انگیز شخصیت کی مالک ہیں۔'' جین پہلی بار بولی اور پھر میرے مشورے کے مطابق اس میز کے قریب بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی جس کی دوسری سمت بھی ایک کرسی رکھی تھی اور میز پر شطرنج کی بساط نظر آ رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے مزید کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پاکستان ایسے ملک میں بھی اتنا ماڈرن ایکیویمنٹ موجود ہوگا! اس کمرے میں یقیناً حساس مائکس' سپیکرز اور ٹی وی کیمرا لینسیز موجود ہیں جن کے ذریعے آپ مجھے اس وقت کسی ٹی وی اسکرین پر دیکھ بھی رہی ہوں گی اور میری آواز بھی سن رہی ہوں گی۔ یہ سب کچھ ہر چند کہ میرے لئے نیا نہیں لیکن آپ کے ملک میں بھی یہ جدید تر اشیاء اتنی عام ہوں گی میرے لئے واقعی حیرت انگیز بات ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ میری اطلاعات کے مطابق آپ کا تعلق یہاں کی حکومت کے کسی سرکاری ادارے سے نہیں ہے۔ بہرحال آپ آ جایئے میں واقعی اکیلی بور ہو رہی ہوں۔ ہاں وہ موشوروف بھی کیا اسی عمارت کے کسی اور کمرے میں ہے......؟ ویسے مجھے یہ امید تو نہیں کہ وہ بھی آپ کا مہمان بن چکا ہوگا!''

''میں آ رہی ہوں تمہارے پاس......! اسی وقت شطرنج کھیلتے ہوئے تم سے باتیں ہوتی رہیں گی۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں یہ بتاؤ کہ اس وقت تم چائے پینا پسند کرو گی یا کافی؟''

''آپ نے اتنی اپنائیت اور محبت سے پوچھا ہے کہ میں انکار نہیں کر سکتی۔ کافی چل جائے گی

مگر......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کا چہرہ اب قطعی پرسکون نظر آ رہا تھا۔

"مگر کیا.....؟ بولو نا! تکلف کی کوئی ضرورت نہیں.....! کیا بھوک بھی لگ رہی ہے؟"

"نہیں، بھوک نہیں لگ رہی کھانا کھا لیا تھا میں نے.....! اگر ممکن ہو تو بلیک کافی....."

"کیوں ممکن نہیں.....! مل جائے گی مگر میں صرف چائے پیوں گی۔"

"بہت بہت شکریہ مس خان.....! میں انتظار کر رہی ہوں آپ کا!"

اسی کے ساتھ میں نے ساؤنڈ اور اسکرین دونوں کے سوئچ آف کر دیئے اور کمانڈر نواز کی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی جو اس دوران میں میرے قریب ہی آ کھڑا ہوا تھا۔

"شی از ویری چارمنگ اینڈ گریس فل لیڈی۔" کمانڈر نواز نے جین کے غیر معمولی پرکشش حسن کی تعریف کی۔ ایسے مواقع پر جب وہ کسی عورت کی تعریف کرتا تھا تو انگریزی ہی بولنے لگتا تھا۔

جین واقعی انتہائی خوبصورت لڑکی تھی اور کمانڈر نواز بہرحال بے حس نہیں تھا۔ اپنے لوگوں آزادانہ اظہار خیال کی اجازت میں نے ہی دی تھی۔ اس طرح لوگ نارمل رہتے ہیں حبس اور گھٹن کی فضا نہیں رہتی۔ عموماً جب میں خود بھی یہ محسوس کر لیتی تھی کہ کسی سب سیل کا کوئی رکن اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بخل سے کام لے رہا ہے تو میں اسے دانستہ بولنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس کے باوجود کوئی بھی حد ادب سے تجاوز کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں اسی لئے بہترین نظم وضبط کے باوجود ایک طرح کا فیملی اٹماسفیر تھا۔ وہ لوگ ایک حد تک مجھ سے بے تکلف بھی تھے اور میرا ادب بھی کرتے تھے۔ جین کی بابت کمانڈر نواز کے تبصرے پر میں اسی لئے مسکرا دی اور جواباً بولی۔ "آفٹر آل جین از اے ویری بیوٹی فل گرل! بٹ آلسو اے ویری ڈینجرس! ڈونٹ فورگیٹ اٹ!" میں نے بھی جواب میں انگریزی ہی بولی اور اسے یاد دلایا کہ جین خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خطرناک بھی ہے۔

کمانڈر نواز میری بات سے اتفاق کرتا ہوا میرے اشارے پر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے مجھے جین کے کمرے کی چابی دے دی۔

جین کا سوٹ کیس بھی وہیں ڈیوٹی روم میں تھا۔ میں نے وہ بھی اٹھا لیا اور کمانڈر نواز سے کہا۔

"کمرے کا دروازہ میں کھلا ہی رکھوں گی تم میرے لئے چائے اور جین کے لئے بلیک کافی بھجوا دینا.....اور ہاں تم نے کاغذات دیکھے!.....کوئی خاص بات نوٹ کی؟"

"صرف یہ میڈم کہ ہم قانونی طور پر موشوروف یا جین پر کوئی چارج نہیں لگا سکتے۔" اس نے جواب دیا۔

"یہی نتیجہ میں نے بھی اخذ کیا تھا۔ بہرحال جو بھی ہو.....ذہین سے ذہین آدمی بھی کہیں نہ کہیں کوئی غلطی کر ہی جاتا ہے۔ میں اسی کی تلاش میں ہوں۔ ہاں اس ڈاٹسن کار کے نمبر تو ہیں نا تمہارے پاس.....! میرا اندازہ ہے کہ وہ شیخ مجید کی ملکیت ہوگی۔ اس کے باوجود تمہیں کار کے مالک کا سراغ لگانا ہے۔" یہ کہتی ہوئی میں ڈیوٹی روم سے نکل آئی۔ کاغذات میں نے کمانڈر نواز ہی کے پاس چھوڑ دیئے تھے۔

عمارت کے عقبی حصے میں پہنچ کر میں نے مسلح محافظوں کو پوری طرح مستعد وچوکنا محسوس کیا۔ اس کمرے پر محافظوں کی کڑی نظر تھی جس میں جین کو رکھا گیا تھا۔ اس کمرے کے سامنے پہنچ کر میں نے

جین کا سوٹ کیس فرش پر رکھا اور کمرے کا قفل کھول دیا۔ قفل کھول کر چابی میں نے قفل ہی میں لگی رہنے دی پھر دروازے کے دونوں پٹ بھی کھول دیئے۔ دروازہ کھلتے ہی جین نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ سوٹ کیس پر جمی ہوئی تھی۔ غالباً وہ اپنا سوٹ کیس پہچان گئی تھی۔

"جین!" میں نے آگے بڑھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "میں نے تمہارے کپڑے وغیرہ اور دیگر استعمال کی ضروری اشیاء بھی منگوالی ہیں تاکہ تمہیں یہاں کوئی پریشانی نہ ہو۔ تم اپنا ضروری سامان وہ.....ادھر لکڑی کی الماری میں رکھ لینا۔ وہ الماری خالی ہے.....لو..... یہ سوٹ کیس فی الحال الماری کے نچلے خانے میں رکھ دو جب میں چلی جاؤں تو اپنا سامان سیٹ کر لینا۔"

وہ کچھ حیرت زدہ سی اپنی کرسی سے اٹھی اور آگے بڑھ کر سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے لیا اور بولی۔ "شکریہ مس خان!"

پھر اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دائیں جانب رکھی ہوئی لکڑی کی الماری کے نچلے خانے میں اپنا سوٹ کیس رکھ دیا اور الماری بند کر کے دوبارہ کرسی پر آ بیٹھی۔

"آپ نے دروازہ بند نہیں کیا مس خان!"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یوں بھی ابھی ایک ملازم کو ہمارے لئے چائے اور بلیک کافی لے کر آنا ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"یہ جگہ آپ کی کوٹھی کا کوئی حصہ تو نہیں لگتی۔ شاید کوئی اور عمارت ہے۔" اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"تم غلطی پر ہو جین.....! یہ بھی میری کوٹھی ہی کا ایک حصہ ہے۔" میں نے دانستہ اسے غلط جواب دیا۔ "آج شام کو تم نے اور موشوروف نے جلد بازی میں شاید اس حصے پر توجہ نہیں دی۔ تم دونوں نے مجھے تلاش کیا تھا نا؟"

"جی ہاں!" اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ "معلوم نہیں آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں!"

"میں اپنی کوٹھی کے اسی حصے میں آ گئی تھی جہاں تک تم لوگوں کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ دراصل اسٹڈی کے پیچھے جو کئی کمرے تم نے ایک قطار میں دیکھے ہوں گے اور جو تم لوگوں کو باہر سے مقفل ملے ہوں گے یہ وہی کمرے ہیں۔ اسٹڈی ہی کے ایک خفیہ دروازے سے میں اس حصے میں آ گئی تھی اور تم لوگ مجھے ساری کوٹھی میں ڈھونڈتے پھرے ہو گے! کیونکہ یہ حصہ تقریباً ایئر ٹائٹ ہے۔ اس لئے گیس کا اثر یہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ اسے تم میری خفیہ پناہ گاہ بھی کہہ سکتی ہو اور خاص مہمان خانہ بھی! جہاں عموماً میں تم ایسے ہی مہمانوں کو رکھتی ہوں۔" میں بڑی روانی سے بولے جا رہی تھی تاکہ جین میرے ٹریپ میں آ جائے۔ اس کے ذہن کو غلط خطوط پر لگانے سے میرا دہرا مقصد تھا۔ اول تو یہ کہ اس کے ذہن میں یہ بات نہ آ سکے کہ اسے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں رکھا گیا ہے۔ دوم یہ کہ اگر موشوروف اس کا ذہن پڑھے تو کسی اور طرف سوچنے کی بجائے اس کی توجہ کا مرکز میری کوٹھی ہو۔ ذرا توقف کے بعد میں نے میز پر رکھے ہوئے سنگ مرمر کے مہرے بچھی ہوئی بساط پر رکھنا شروع کر دیئے اور بولی "جب تک چائے اور بلیک کافی آئے آؤ ہم بازی تو شروع کر دیں!"

جین بھی بساط پر مہرے سجانے میں میری مدد کرنے لگی اور اسی کے ساتھ کہنے لگی۔ ”آپ کے انداز و اطوار سے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آپ طویل عرصے کے لئے مجھے یہاں قیدی بنا کر رکھنا چاہتی ہیں!“ اس کے لہجے میں ناگواری کی بجائے شگفتگی تھی۔

”فی الحال اس سلسلے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتی!“ میں بولی ”ویسے تمہارا یہ خیال غلط ہے جین کہ میری کوٹھی میں تمہاری حیثیت کسی قیدی کی ہے۔ تم میری مہمان ہو! میں موشوروف کے اس خیال کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے آداب میزبانی نہیں آتے یا میزبانی مجھے مہنگی پڑے گی۔ میں تمہیں کسی قسم کے دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتی۔ موشوروف ابھی میرا مہمان نہیں بن سکتا ہے لیکن مجھے توقع ہے کہ جلد ہی وہ بھی میری میزبانی قبول کر لے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے بساط پر اپنے پورے مہرے لگا دیئے۔ اسی دوران میں جین بھی اپنے مہرے لگا چکی تھی۔

”مس خان! پہلی موو (چال) میری ہوگی۔“ جین نے مسکرا کر کہا۔

”ٹھیک ہے پہلی چال تمہاری ہی سہی!“ میں مسکرا کر بولی۔

”مجھے اس گاؤن سے کچھ الجھن سی ہو رہی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں باتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کرلوں۔ پھر گاؤن پہن لوں گی۔ بیٹھتے ہوئے ریشمی گاؤن بار بار میری ٹانگوں پر سے پھسل رہا ہے اور مجھے نیکڈنیس کا سا احساس ہو رہا ہے۔ کھیلتے ہوئے میری اٹینشن بار بار ادھر ڈائیورٹ ہوگی اور آپ اس سے فائدہ اٹھا کر مجھے مات دے دیں گی جو میں نہیں چاہتی۔“ یہ کہتے ہوئے جین کے چہرے پر ایک سرخی سی دوڑ گئی اور وہ مزید حسین نظر آنے لگی۔

”تم اس وقت مجھے کسی مغربی لڑکی کی بجائے بالکل مشرقی لڑکی معلوم ہو رہی ہو......! جاؤ‘ تبدیل کرلو لباس!“

”تھینک یو مس خان!“ اس نے نرمی سے کہا اور اپنا ریشمی گاؤن سنبھالتی ہوئی اٹھ کر الماری کی طرف چلی گئی جو میرے عقب میں تھی۔

میں سوچنے لگی کہ بظاہر اتنی نرم و نازک اور بے ضرر سی لڑکی کو دیکھ کر کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ حقیقتاً یہ کتنی خطرناک ہوگی! پھر کچھ ہی دیر بعد عملی طور پر اس نے یہ ثبوت فراہم کر دیا کہ واقعی وہ میری توقع سے کہیں زیادہ چالاک اور خطرناک تھی۔

سب کچھ بس چند ہی لمحوں میں ہو گیا تھا۔ مجھے اس وقت خطرے کا احساس ہوا تھا جب جین ”چال“ چل چکی تھی۔ میں نے کمرے کی ٹیوب لائٹ کو ایک زوردار چھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر نیچے بکھرتے دیکھا تھا۔ کمرا تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے شدید قسم کی ناگوار بو محسوس ہوئی تھی اور میں نے اپنا سانس روک لیا تھا۔ عین اسی لمحے عقب سے جین نے میری گردن کو اپنی کلائی کی گرفت میں لے کر دبانا شروع کر دیا تھا اور مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اچانک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا تھا؟ اپنے حواس کھوئے ہوئے میں صرف یہی سوچ سکی کہ جین شاید مجھے یرغمال بنا کر یہاں سے فرار ہو جانا چاہتی ہے اور غالباً وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔

☆......☆......☆

اچانک اور غیر متوقع طور پر پیش آنے والا واقعہ کسی ذہین سے ذہین شخص کو بھی بدحواس کر دیتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں بھی اس وقت اپنے حواس قابو میں نہیں رکھ سکی تھی۔ جب چند ہی لمحات میں جین مجھ پر حاوی آ گئی تھی۔ اس نے انتہائی تیزی اور مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ اسی کے نتیجے میں چاہے وقتی طور پر سہی میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی تھی۔ حواس کھوتے ہوئے اسی سبب میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ جین شاید مجھے یرغمال بنا کر فرار ہونا چاہتی ہے حالانکہ آپریشن سیل سے کسی کا فرار تقریباً ناممکن بات تھی۔

بدحواسی اور مایوسی کے وہ چند لمحے گزرتے ہی میرے سارے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔ میرے تاریک ہوتے ذہن میں روشنی سی ہوگئی۔ اسی کے ساتھ میں اپنی گردن جین کی گرفت میں ہونے کے باوجود ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جین کسی آکٹوپس کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ یقیناً کسی بھی قیمت پر میری گردن پر اپنی کلائی کا دباؤ برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ جین اب تقریباً میری پشت پر سوار تھی۔ اندازے سے میں کرسی اور میز کے درمیان سے نکل آئی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے میں نے جین کے سر کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے جھک کر اسے فرش پر الٹ دیا۔ میری گردن اب اس کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی اور وہ غالباً کمرے کے فرش پر گر کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمرا کیوں کہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اس لئے میں اندازہ ہی لگا سکتی تھی۔ ابھی تک میں نے اپنا سانس روکا ہوا تھا اور اس کا سبب وہ ناگوار بو تھی جو مجھے کچھ دیر پہلے محسوس ہوئی تھی۔ وہ بو یقیناً کسی گیس کی ہو سکتی تھی۔ ایسی ہی بو مجھے اس وقت اپنی کوٹھی میں محسوس ہوئی تھی جب موشوروف اور جین فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے اسی وجہ سے فوراً سانس روک لیا تھا لیکن یہ خطرناک گیس آپریشن سیل کے اس کمرے تک کیسے پہنچ گئی تھی؟ یہ سوال میرے لئے حیران کن ہی تھا۔

پیش آنے والے خلاف توقع واقعے کے حوالے سے میرے ذہن میں اور بھی بہت سے سوالات ابھر رہے تھے مگر جین کے فرش پر گرنے کے چند ہی لمحے بعد کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے کئی طاقتور ٹارچوں کی روشنی بیک وقت کمرے میں در آئی۔ میری نگاہ دروازے کی طرف اٹھی۔ وہاں مجھے کمانڈر نواز اور کئی مسلح محافظ ٹارچیں لئے نظر آئے۔ میں ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر جست بھرتی ہوئی دروازے تک جا پہنچی اور پھر بلند آواز میں ان لوگوں سے پیچھے ہٹ جانے کو کہا۔

اس دوران میں کمانڈر نواز بھی یقیناً فضا میں گیس کی بو محسوس کر چکا تھا۔ اس نے فوراً میرے

حکم کی تعمیل میں اپنے ساتھیوں کو پیچھے ہٹالیا۔

دروازے کے ذریعے ٹارچوں کی روشنی اب بھی کمرے کے اندر پڑ رہی تھی۔ روشنی کے دائرے جین کے جسم پر محیط تھے۔ وہ فرش پر بے سدھ پڑی نظر آ رہی تھی۔ میرے قیاس کے مطابق فرش پر گرنے کے بعد وہ اپنا سانس روک رکھنے میں ناکام ہو گئی تھی اور اسی کے نتیجے میں خواب آور گیس نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔

پھر میری ہدایت کے مطابق سیل کے دو رکن گیس ماسک پہن کر اس کمرے میں داخل ہوئے اور کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ اس کے بعد میرے ہی حکم پر بے ہوش جین کو اسی کمرے کے برابر دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ بے ہوشی کے باوجود وہ محافظوں کی کڑی نگرانی میں تھی۔ اسی حالت میں اس کے جسم کو ریشمی ڈوریوں سے باندھ کر مسہری پر ڈال دیا گیا تھا کیونکہ اب وہ کسی رعایت کی مستحق نہیں رہی تھی۔ اس کا اٹیچی کیس جو کھلا پڑا تھا وہ بھی دوسرے کمرے میں لے آیا گیا تھا۔ سیل کا ایک ڈاکٹر مہلک گیس کے اثرات ختم کرنے اور جین کو ہوش میں لانے کے لئے اسے انجکشن لگا چکا تھا۔

کمانڈر نواز سمیت سیل کے جو ارکان اس وقت میرے اردگرد موجود تھے سبھی کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔ میں نے مختصراً انہیں پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا' پھر بولی۔ ''کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی مرحلے پر ہم سے کوئی حماقت سرزد ضرور ہوئی ہے اور یقیناً وہ حماقت یہ ہے کہ اس اٹیچی کیس کو چیک نہیں کیا گیا!'' میرا مخاطب کمانڈر نواز تھا اور میں اس اٹیچی کیس کی طرف اشارہ کر رہی تھی جو میری کرسی سے کچھ ہی فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔

''ایسا نہیں میڈم!'' کمانڈر نواز جواباً بولا۔ ''میں نے خود اس اٹیچی کیس کو چیک کیا تھا۔ اس میں کپڑوں اور میک اپ کے کچھ سامان وغیرہ کے سوا......''

''ون اے منٹ کمانڈر!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم نے اٹیچی کیس چیک کیا ہوگا مگر شاید سرسری طور پر......! اگر ایسا نہیں تو پھر اس مہلک گیس کو تم کس خانے میں فٹ کرو گے......؟ وہ کہاں سے آ گئی......؟ جین مجھ سے کپڑے تبدیل کرنے کی اجازت لے کر میرے عقب میں موجود لکڑی کی الماری تک گئی تھی جس کے نچلے خانے میں اس نے میرے ہی حکم پر اپنا اٹیچی کیس رکھ دیا تھا جو واقعہ پیش آیا اسی اٹیچی کیس کے کھلنے کے بعد پیش آیا۔ جین نے ٹیوب لائٹ کو فیس پاؤڈر کے ڈبے سے نشانہ بنایا۔ یہ بات تو سمجھ میں آ گئی کیوں کہ اس کمرے کے فرش پر ٹیوب لائٹ کی کرچیوں کے پاس پاؤڈر کا ڈبا بھی میں نے پڑا دیکھ لیا تھا لیکن خواب آور گیس کہاں سے آئی......؟ میرا خیال ہے کمانڈر تم ایک بار پھر اس اٹیچی کیس میں موجود تمام سامان چیک کرو......! ممکن ہے ہمیں اپنے سوال کا جواب مل جائے۔''

''بہتر ہے۔'' یہ کہہ کر کمانڈر نواز اٹیچی کیس کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے اٹیچی کیس اٹھا کر میز پر رکھ لیا اور اسے کھول کر احتیاط سے ایک ایک چیز دیکھنے لگا۔

کپڑے اس نے تہ کھول کھول کر دیکھے اور انہیں ایک طرف ڈھیر کرتا گیا۔ دیگر ضروری اشیاء اور میک اپ کا سامان اس نے ایک طرف سرکا دیا اور اب وہ اٹیچی کیس میں کوئی خفیہ خانہ یا تہ تلاش کر رہا

تھا۔ میں بھی اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی اور پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال برقی رو کی طرح دوڑ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ہیرا اسپرے کا گول بڑا ڈبا میک اپ کے دیگر سامان سے اٹھا لیا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ ٹیوب لائٹ کے ٹوٹنے کا چھناکا ہونے کے بعد ایک خفیف سی آواز بھی سنائی دی تھی۔ اسپرے کی سی آواز! مگر اس پر میں توجہ نہیں دے سکی تھی کیونکہ جین نے مجھے اتنی مہلت نہیں دی تھی۔

ہیرا اسپرے کی مخصوص خوشبو ہوتی ہے۔ میں نے اسے سونگھ کر دیکھا۔ اس کی ناب میرے ناک کے قریب تھی۔ خوشبو کی بجائے مجھے ناگوار بو محسوس ہوئی۔ وہ خواب آور مہلک گیس یقیناً اسی ہیرا اسپرے کے ڈبے میں تھی۔ نادانستگی میں سیل کے ارکان اسے بھی میک اپ کے سامان کے ساتھ اٹیچی کیس میں رکھ کر لے آئے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اس ہیرا اسپرے کے ڈبے میں گیس ہو گی۔

''رک جاؤ کمانڈر! اب مزید تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں۔'' میں بول اٹھی۔ پھر میں نے ہیرا اسپرے کمانڈر نواز کی طرف بڑھا دیا۔ ''اسے سونگھ کر دیکھو تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ اس میں کیا ہو سکتا ہے!''

کمانڈر نواز نے مجھ سے ہیرا اسپرے لے لیا اور پھر اس نے بھی وہی نتیجہ اخذ کیا جو میں پہلے ہی اخذ کر چکی تھی۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''سوری میڈم!''

''کوئی بات نہیں کمانڈر کبھی کبھی غلطی بھی ہو جاتی ہے اور یہ غلطی ایسی ہے جسے حالات کے پیش نظر معاف کیا جا سکتا ہے۔ سہواً اور نادانستگی میں تم سے اور تمہارے آدمیوں سے ایسا ہو گیا۔ اس میں تم لوگوں کی غفلت یا کوتاہی کو کوئی دخل نہیں۔ یہ ہیرا اسپرے دانستہ دیگر سامان کے ساتھ نہیں لایا گیا اور نہ دانستہ تم نے اسے نظر انداز کیا۔''

اس کے بعد خود میں نے میک اپ کا دوسرا سامان اور دیگر ضروری اشیاء کا تفصیلی جائزہ لیا مگر کچھ اور نہیں ملا۔ اسی دوران میں کمانڈر نواز نے مجھے بتایا کہ ڈیوٹی روم میں وہ ٹی وی اسکرین پر اس کمرے کا منظر دیکھ رہا تھا کہ اچانک جین نے فیس پاؤڈر کا ڈبا ٹیوب لائٹ پر کھینچ مارا اور اسکرین تاریک ہو گیا۔ اس کے بعد ہی وہ فوراً حرکت میں آ گیا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یقیناً اب جین کوئی خطرناک حرکت کرنے والی ہے لیکن جب تک کمانڈر نواز اس کمرے تک پہنچا میں حالات پر قابو پا چکی تھی۔

ڈاکٹر رشید کا نائب ڈاکٹر قریشی بھی ابھی تک وہیں موجود تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔

''تمہارے خیال میں جین کو کب تک ہوش آ جائے گا۔''

''ابھی دس پندرہ منٹ اور لگیں گے۔'' ڈاکٹر قریشی نے جواب دیا۔

''ہوں!'' میں کچھ سوچتے ہوئے مزید بولی۔ ''ہوش میں آنے کے بعد گیس کے مہلک اثرات کا اس کے جسم پر کیا ردعمل ہو سکتا ہے؟''

''وہی جو سیل کے ان ارکان پر ہو چکا ہے جو زیر علاج ہیں اور اس گیس کے زیر اثر آ چکے ہیں۔'' ڈاکٹر قریشی نے جواباً کہا۔ پھر تفصیل بیان کرنے لگا۔ ''اب تک اس گیس کے متعلق یہ بات تجربے میں آئی ہے کہ یہ سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں داخل ہو کر آدمی کے خون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا

شکار ہونے والا ہوش آ جانے کے باوجود کم از کم دو ایک روز تک کسی سہارے کے بغیر چل پھر نہیں سکے گا۔ اس کا جسم تقریباً شل رہے گا۔"

"تو پھر میرا خیال ہے کہ جین کے جسم کو ریشمی ڈوریوں کی گرفت میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کمانڈر؟" میں کمانڈر نواز کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"صحیح کہہ رہی ہیں آپ میڈم......! سرفراز اور سیل کے وہ ارکان جو اس گیس کا شکار ہو چکے ہیں ہوش میں ہیں مگر ابھی تک خود اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں ہو سکے ہیں۔" کمانڈر نواز بولا۔

پھر میرے ایما پر جین کے جسم کو ریشمی ڈوریوں کی گرفت سے آزاد کر دیا گیا۔ اس کے جسم پر ابھی تک شب خوابی کا لباس ہی تھا۔ اس نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ لباس تبدیل کرنا محض بہانہ تھا تا کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر راہ فرار اختیار کر سکے اور اس نے یہ کوشش بھی کی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

"کمانڈر! تم میری کوٹھی کی نگرانی کرنے والوں کو پوری طرح چوکنا رہنے کی ہدایت کر دو۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ موشوروف ایک بار پھر آج ہی رات ادھر کا رخ کرے۔" یہ کہتے ہوئے یہ بات میرے مدنظر تھی کہ میں نے جین کو یہی بتایا تھا وہ میری کوٹھی ہی کے ایک حصے میں ہے۔ اگر موشوروف نے اس سے ذہنی رابطہ قائم کیا ہو گا یا کرنے والا ہو گا تو اسے یہی معلوم ہو گا۔

اس کے بعد میری ہدایت پر کمانڈر نواز اور سیل کے تمام ارکان وہاں سے چلے گئے۔ مسلح محافظوں نے کمرے کے باہر اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ اب مجھے جین کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ جین کے کپڑے اور دیگر ضروری اشیاء اٹیچی کیس میں رکھ دی گئی تھیں۔ البتہ وہ ہیر اسپرے کمانڈر نواز میرے ایما پر اپنے ساتھ لے گیا جس میں مہلک گیس بھری ہوئی تھی۔ اٹیچی کیس کو میں نے کمرے میں موجود الماری کے اندر رکھ دیا تھا۔

کچن سے میں نے اپنے لئے چائے اور جین کیلئے بلیک کافی منگوائی تھی جو اب اس کمرے میں سرد کر دی گئی تھی۔ چائے پیتے ہوئے میری نگاہ جین کے معصوم سے چہرے پر ہی تھی۔ صنف مخالف کے لئے یقیناً اس میں بہت کشش تھی۔ موشوروف ایسا شخص یوں ہی اس کا دیوانہ نہیں ہو گیا تھا۔

چائے پینے کے بعد مجھے بس چند منٹ جین کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑا۔ میں مسہری کے قریب اس کے سرہانے کرسی بچھائے بیٹھی تھی۔ ہوش آتے ہی اس نے پھٹی پھٹی سی حیرت زدہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کی نظریں مجھ پر پڑیں۔

میں نے دانستہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی اور نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "اب تمہاری طبیعت کیسی ہے جین؟"

اس کے ہونٹ تو ہلے مگر وہ فوری طور پر کچھ بولنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

"مجھے افسوس ہے جین کہ میری مہمان بننے کے بعد تمہیں اس مشکل سے گزرنا پڑا مگر چندا اس کی ذمے دار خود تمہی ہو۔"

"معاف ... کر دیں ...... مجھے!" اس مرتبہ وہ بولنے میں کامیاب ہو گئی۔ "میں ..... میں

شرمندہ ہوں مس خان!"

"جین! اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ تمہاری جگہ میں بھی ہوتی تو موقع ملنے پر جدوجہد ضرور کرتی۔ کیا میں نے قاہرہ میں ایسا نہیں کیا تھا......؟ بس فرق یہ ہے کہ بالآخر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی تھی اور تم ناکام رہیں...... خیر چھوڑو اس ذکر کو...... ! تمہارے لئے میں نے بلیک کافی منگوالی ہے پیو گی؟"

وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ اسے شاید مجھ سے گزرے ہوئے تلخ واقعے کے بعد یہ توقع نہیں رہی ہو گی کہ میں اس کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آؤں گی۔

"حیرت سے کیا دیکھ رہی ہو مجھے......! بولو پیو گی کافی؟" میں نے مسکراتے ہوئے پھر سوال کیا۔

جی...... جی ہاں مگر میرے جسم میں اتنی طاقت نہیں کہ خود اٹھ کر بیٹھ سکوں۔"

"تو کیا ہوا......! میں تمہیں سہارا دے کر بٹھا دوں گی اور پھر خود ہی کافی بھی پلا دوں گی۔"

"آپ انتہائی مہربان خاتون ہیں عذرا خان!" اس کے لہجے میں اظہار تشکر تھا۔

میں نے کچھ کہے بغیر اس کے لئے کپ میں کافی بنائی اور پھر میز کو مسہری کے قریب کھسکا کر مسہری پر بیٹھ گئی۔ سہارا دے کر میں نے جین کو اٹھایا اور کافی پلانے لگی۔

کافی پلا کر میں نے اسے پھر بستر پر لٹا دیا۔

"مس خان! میں آپ کو ایک ٹیبلیٹ کا نام بتا رہی ہوں۔ یہ ٹیبلیٹ کسی بھی میڈیکل اسٹور سے مل جائے گی۔ عموماً اسے جسمانی درد اور تھکن دور کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے مگر یہی ٹیبلیٹ خواب آور گیس کے اثرات ختم کرنے کیلئے تیر بہدف ہے۔ آپ مجھے یہ ٹیبلیٹ منگوا دیں ورنہ میں دو تین روز تک آپ کے لئے اسی طرح مسئلہ بنی رہوں گی اور میرا جسم شل رہے گا۔"

"ضرور......! بتاؤ تم! میں ابھی اپنے کسی ملازم کو بھیج کر یہ ٹیبلیٹ کسی میڈیکل اسٹور سے منگوا لیتی ہوں۔ کچھ میڈیکل اسٹورز رات بھر کھلے رہتے ہیں۔"

جین نے اس ٹیبلیٹ کا نام بتا دیا۔ وہ ایک عام قسم کی پین کلر ٹیبلیٹ تھی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر کمرے سے نکل آئی۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی کیوں کہ جین بغیر کسی سہارے کے اٹھنے بیٹھنے کی اہل نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کمرے کے باہر مسلح محافظ بھی موجود تھے۔

عمارت کے اس حصے سے نکل کر جلد ہی میں ڈاکٹر رشید کے کمرے تک پہنچ گئی۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ سیل کے جو ارکان خواب آور گیس کا شکار ہونے کے بعد یہاں لے آئے گئے تھے اور ڈاکٹر رشید کے زیر علاج تھے وہ انہی کی نگہداشت اور اپنے ماتحتوں کو ضروری ہدایات دینے کی خاطر ابھی تک سویا نہیں تھا۔ مجھے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھے رہیں ڈاکٹر!" میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "آپ کے زیر علاج افراد کا کیا حال ہے؟"

‘‘غالباً ڈاکٹر قریشی سے آپ رپورٹ لے چکی ہیں۔ فی الحال وہ لوگ خود......’’

‘‘معلوم ہے مجھے!’’ میں نے اس کی بات کاٹ دی‘ پھر جین نے جس گولی کا نام لیا تھا اس کے متعلق پوچھا۔ ‘‘کیا یہ ٹیبلیٹ آپ کے اسٹور میں ہے؟’’

‘‘جی ہاں۔’’ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

‘‘تو پھر آپ کے مریض بہت جلد خود چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ آپ انہیں یہ ٹیبلیٹ دے دیں۔ اس سے گیس کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔’’

‘‘لیکن میڈم‘ یہ تو ایک عام قسم کی پین کلر ٹیبلیٹ ہے جو عموماً معمولی حرارت اور جسم میں درد کے لئے مریضوں کو دی جاتی ہے! گیس کے مہلک اثرات......’’

‘‘یہ مجھے بھی معلوم ہے ڈاکٹر!’’ میں نرمی سے بولی۔ ‘‘آپ ایک ٹیبلیٹ مجھے بھی دے دیں اور اپنے مریضوں کو بھی یہی استعمال کرائیں۔’’ پھر میں نے ڈاکٹر رشید کو بتا دیا کہ اس ٹیبلیٹ کے بارے میں مجھے خود جین ہی نے بتایا ہے۔

‘‘پھر تو یقیناً یہ سود مند ثابت ہو گی۔’’ ڈاکٹر رشید بولا۔ ‘‘آپ تشریف رکھیں میں حاضر ہوتا ہوں ابھی!’’ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

واپسی میں ڈاکٹر رشید کو زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں اس سے وہ ٹیبلیٹ لے کر دوبارہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف روانہ ہو گئی۔

جین مجھے اسی طرح اور اسی حالت میں بستر پر دراز ملی جس طرح میں اسے چھوڑ گئی تھی۔ میں نے اسے وہ ٹیبلیٹ کھلا دی پھر پوچھا۔ ‘‘یہ ٹیبلیٹ کھانے کے کتنی دیر بعد تم نارمل حالت میں لوٹ آؤ گی؟’’

‘‘زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا لگے‘ مگر کمزوری تھوڑی بہت ضرور رہے گی جو دو ایک دن میں ہی دور ہو گی۔’’ اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

‘‘صرف ایک گھنٹا......! حیرت انگیز بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس ٹیبلیٹ کے اجزا خون میں شامل ہوتے ہی بہت جلد اپنا اثر دکھانے لگتے ہیں۔’’

‘‘جی ہاں اس خواب آور گیس کا یہی توڑ ہے جو روسی ڈاکٹروں نے دریافت کی ہے مگر آپ نے اتنی جلدی یہ ٹیبلیٹ کہاں سے منگوالی؟’’

‘‘کہیں سے بھی نہیں‘ یہیں کوٹھی میں موجود تھی۔ تم نے اس کا نام لیا تو مجھے یاد آ گیا کہ شاید کوئی گولی کہیں پڑی ہے ڈھونڈا تو مل گئی۔’’ میں نے بات بنا دی‘ پھر اس سے پوچھنے لگی۔ ‘‘طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد تم سونا پسند کرو گی یا پروگرام کے مطابق شطرنج کھیلنے کا ارادہ ہے؟’’

‘‘کیوں کیا آپ کو نیند آ رہی ہے......؟ ارے ہاں میں پوچھنا تو بھول ہی گئی کہ... کہ آپ کی گردن پر میری کلائی کی گرفت سے کہیں ...’’

‘‘نہیں بھئی تم خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہی ہو!’’ میں نے ہنس کر کہا۔ ‘‘ہاں تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا......؟ مجھے تو ویسے نیند نہیں آ رہی ابھی!’’

‘‘تو کچھ دیر بیٹھی رہیں میرے پاس!’’ وہ بھولپن سے بولی۔ ‘‘ہاں شطرنج کی بازی صبح ہی

جمائیں گے۔ اس وقت سو جاتے ہیں۔’’

‘‘جیسے تمہاری مرضی!’’ میں مسکرا دی پھر مطلب کی بات پر آ گئی۔ ‘‘یہ بتاؤ جین کہ تم آج رات موشوروف کے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟ تم نے تنہا اس کوٹھی میں رہنا کیوں گوارا کیا؟’’

‘‘موشوروف عموماً مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتا۔ عام طور پر تقریبات میں وہ مجھے ساتھ ہی لے جاتا ہے مگر معلوم نہیں آج کیوں اس نے مجھے کوٹھی ہی میں رہنے کی تاکید کر دی تھی۔’’ جین نے کسی توقف کے بغیر میرے سوال کا جواب دیا تھا مگر میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس کا جواب درست نہیں ہے۔ وہ یقیناً مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی۔

‘‘شاید اس لئے جین کہ میں تمہیں اپنا مہمان بنا سکوں!’’ میں نے ہنس کر کہا اور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کچھ خجل خجل سی نظر آنے لگی تھی۔ غالباً اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اسکے جواب سے میں مطمئن نہیں ہوئی۔

‘‘مس خان! آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ مجھے کتنے دن اپنا مہمان بنا کر رکھنا چاہتی ہیں؟’’ اس نے بات کا رخ بدل دیا۔

‘‘آپ سوال تو کریں میں کوشش کروں گی کہ آپ کو اپنے جواب سے مطمئن کر سکوں۔’’

‘‘موشوروف تمہارے بغیر کتنے دن رہ سکتا ہے؟’’ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

‘‘آج سے پہلے کبھی اس بات پر غور تو نہیں کیا لیکن ...... ایک دفعہ ...... کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ غالباً لندن کا ذکر ہے۔ موشوروف کو کسی اہم کام سے تنہا دو روز کے لئے لندن سے باہر جانا پڑا تھا کیونکہ میرا لندن میں ہی رہنا ضروری تھا۔ وہ دو دن وہ دو راتیں کم از کم مجھ پر گراں گزری تھیں...... اور ......اور موشوروف نے بھی بعد میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جہاں تک میرے احساسات و جذبات کا تعلق ہے ہم دونوں ایک دوسرے سے زیادہ عرصے جدا نہیں رہ سکتے۔ ہم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں مس خان!’’ یہ کہتے ہوئے وہ کچھ جذباتی سی ہو گئی۔ ‘‘آپ نے اگر کسی سے محبت کی ہے تو شاید میرے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں۔’’

‘‘لیکن تم دونوں جس پیشے سے تعلق رکھتے ہو اسے دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ عجیب اور ناقابل یقین سی لگتی ہے۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘بہر حال تمہارے جواب سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ کم از کم تین چار دن وہ تمہاری جدائی برداشت کر سکتا ہے۔’’

‘‘چار دن بہت ہیں مس خان!’’ وہ فوراً بول اٹھی۔

‘‘اس کا اندازہ بھی جلد ہو جائے گا تم ابھی سے اتنی فکر مند کیوں ہو رہی ہو؟’’ میں مسکرا کر بولی۔ ‘‘میں دو دلوں کے درمیان زیادہ دیر دیوار نہیں بنوں گی۔’’

‘‘آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں مس خان کہ موشوروف کے بغیر میں ...... میں خود کو کتنا تنہا محسوس کرتی ہوں!’’ اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

‘‘اچھا اب میں چلوں گی جین! مگر چلنے سے پہلے ایک بات ضرور پوچھوں گی کہ اب تو تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گی کہ مجھے مجبوراً تمہارے ساتھ سختی کرنا پڑے؟’’

''حیرت ہے مس خان کہ آپ مجھ سے ایسی باتیں کہہ رہی ہیں!''

''کیوں! اس میں حیرت کی کیا بات ہے جین؟''

''آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے خود ہی تو میرے اظہار ندامت پر یہ کہا تھا کہ تمہاری جگہ میں بھی ہوتی تو موقع ملنے پر جدو جہد ضرور کرتی! پر آپ مجھ سے یہ حق کیوں چھین رہی ہیں......؟''

''اس لئے جین کہ تمہیں اب جدو جہد کا موقع نہیں ملے گا اور اس لئے بھی کہ میں تم پر کوئی سختی کرنا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں اپنی کوٹھی میں مہمان بنا کر ہی رکھنا چاہتی ہوں۔ کسی اور حیثیت سے نہیں..... پھر تم کیوں جدو جہد پر بضد ہو؟''

''مس خان! میں آپ کو مطمئن کرنے یا دھوکا دینے کے لئے یقیناً یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گی مگر ایسا کہنا جھوٹ ہوگا۔ یہ بات میری فطرت کے خلاف ہے کہ میں ہنسی خوشی اور رضا مندی سے کسی کی بھی قیدی رہنا قبول کرلوں چاہے وہ آپ ہی جیسی کوئی نیک دل خاتون کیوں نہ ہو!''

''تو پھر ٹھیک ہے جین تمہیں جدو جہد کرنے اور کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھانے کی میری طرف سے اجازت ہے مگر اس کے ساتھ اپنے ذہن میں یہ بھی رکھنا کہ راہ فرار مسدود کرنے اور تمہاری جدو جہد کو ناکام بنانے کیلئے میں بھی کوئی قدم اٹھا سکتی ہوں۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

''جی ہاں! اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ بالفاظ دگر آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ مجھے اپنے کئے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔''

''سزا کا لفظ ذرا زیادہ ہے اس کی جگہ تدارک زیادہ مناسب ہے۔ میں تمہیں کوئی سزا دینے کے بجائے تمہاری جانب سے کی جانے والی جدو جہد کا تدارک کروں گی۔''

''آپ اسے تدارک کا نام دے لیں مس خان میں سزا ہی کہوں گی۔'' وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

''تم جو چاہے کہو اور جو چاہے سمجھو مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی ہوں۔ اچھا خدا حافظ جین!'' یہ کہتے ہی میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی' پھر اس سے پوچھا۔ ''تم کہو تو ٹیوب لائٹ آف کر کے اس کمرے میں ہلکا نیلا بلب جلا دوں؟ یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ تم خود ابھی اٹھنے قابل نہیں ہو۔''

''شکریہ مس خان!'' اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''ٹیوب لائٹ بجھا کر نیلا بلب ہی جلا دیجئے۔ میں اب سو جانا چاہتی ہوں۔''

مجھے علم تھا کہ جین غلط کہہ رہی تھی۔ وہ سونے والی نہیں تھی۔ اسے یقیناً اس وقت کا انتظار تھا جب خواب آور گیس کا اثر ختم ہو جاتا۔ اسی کے بعد وہ اپنی دانست میں جدو جہد کے لئے کوئی قدم اٹھا سکتی تھی مگر جواباً میں خاموش ہی رہی اور ٹیوب لائٹ بجھا کر کمرے میں ہلکا نیلا بلب جلا دیا۔ پھر میں وہاں مزید رکے بغیر باہر آ گئی۔ باہر آتے ہی میں نے کمرے کا دروازہ مقفل کر دیا تھا اور چابی وہاں موجود ایک مسلح محافظ کو تھما دی تھی کہ وہ ڈیوٹی روم میں پہنچا دے۔

مہمان خانے کے اس حصے سے نکل کر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔ سیل کے محافظ مجھے ہر جگہ مستعد و چوکنا نظر آئے۔ اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے جب میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اپنے بستر پر دراز ہونے سے پہلے میں نے انٹر کام پر جین کے متعلق کمانڈر نواز کو کچھ ضروری ہدایات دیں۔ پھر یہ دریافت کیا کہ میری کوٹھی کی نگرانی اور حفاظت کرنے والوں کی جانب سے کیا کوئی نئی اطلاع موصول ہوئی؟

''جی نہیں میڈم!'' کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ ''وہاں حالات پوری طرح پرسکون ہیں۔ ویسے آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے ان لوگوں کو چوکنا رہنے کی تاکید کر دی ہے۔''

''میرے نزدیک اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ اب تک موشوروف اپنی محبوبہ جین سے ذہنی رابطہ قائم نہیں کر سکا' ممکن ہے اس دوران میں اس نے یہ کوشش کی ہو اور جین کی بے ہوشی کی وجہ سے اپنی کوشش میں ناکام رہا ہو۔ اگر جین سے اس کا ذہنی رابطہ قائم ہو جاتا تو وہ یقیناً نچلا نہ بیٹھتا اور میری کوٹھی کا رخ ضرور کرتا۔''

''کیا خبر اب وہ یہ کوشش کرنے والا ہو'' کمانڈر نواز نے قیاس آرائی کی۔ ''مگر ابھی جین کے متعلق آپ نے جو ہدایات دی ہیں ان کی روشنی میں موشوروف کو ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔''

''کمانڈر! اب میں سونا چاہتی ہوں لیکن صبح تم اپنی ڈیوٹی آف ہونے سے پہلے مجھے جگا کر بات ضرور کر لینا!''

''بہتر ہے میڈم......! میں آپ کو رپورٹ دے کر ہی جاؤں گا۔''

''خدا حافظ!'' میں نے یہ کہہ کر انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا اور پھر بستر پر دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ ذہنی اور جسمانی طور پر میں اس وقت اتنی تھکن محسوس کر رہی تھی کہ لباس تبدیل کرنا بھی گراں محسوس ہو رہا تھا۔

آنکھیں موندے ابھی مجھے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ یوں محسوس ہوا کسی خیال کی لہر میرے ذہن کی سطح سے ٹکرا رہی ہے۔ میں چونک اٹھی اور اسی کے ساتھ میرے ذہن کو خفیف سا جھٹکا محسوس ہوا۔ معاً اپنے ذہن میں مجھے موشوروف کی آواز گونجتی سی لگی۔ ابتدا میں اس کے الفاظ مبہم سے اور غیر واضح تھے۔ پھر آواز واضح طور پر آنے لگی۔ وہ مجھی سے مخاطب تھا۔ آپ میری آواز سن رہی ہیں......؟ آپ تک میری آواز پہنچ رہی ہے نا......؟ بتایئے عذرا خان' سن رہی ہیں آپ میرا آواز؟

ہاں موشوروف! تمہاری آواز مجھ تک پہنچ رہی ہے بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟

میں آپ سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں عذرا خان!

کیسا سودا؟

آپ میری جین کو رہا کر دیں' میں آپ کے ملک سے چلا جاؤں گا۔

کیا تم بھول گئے موشوروف کہ میں نے آج ہی رات تمہیں بتایا تھا کہ جین کو اگر اغوا کر لیا گیا ہے تو اس میں میرا ہاتھ نہیں۔ میں نے دانستہ اپنی بات دہرائی تھی۔

آپ غلط کہہ رہی ہیں عذرا خان! میری جین آپ ہی کی کوٹھی میں قید ہے!

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس سے ذہنی رابطہ قائم کر چکے ہو!

ہاں! اور مجھے اس سلسلے میں جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ قید کے دوران میں وہ ایک بار اب تک فرار ہونے کی کوشش بھی کر چکی ہے۔ کیا اب بھی آپ اس سے انکار کریں گی کہ آپ کی قید میں نہیں ہے؟

موشوروف سے میں یہی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ جین سے اس کا ذہنی رابطہ قائم ہو چکا ہے نہیں؟ اور مجھے اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔

آپ میرے سوال کا جواب دینے سے گریز کیوں کر رہی ہیں عذرا خان؟ بولیں آپ کو یہ سودا منظور ہے یا نہیں؟

اگر میں تمہاری پیشکش قبول بھی کر لوں تو تم اپنے بڑوں کو کیا جواب دو گے موشوروف؟ میں نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

شاید آپ کو یقین نہ آئے عذرا خان کہ اگر جین کی خاطر مجھے اپنا پیشہ بھی ترک کر دینا پڑا تو اس سے گریز نہیں کروں گا۔

مگر یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے موشوروف! تم مجھے بہلانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟

آپ کے سلسلے میں اپنے بڑوں کے سامنے جواب دہی سے میں کس طرح بچ سکتا ہوں' یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں کسی نہ کسی طرح انہیں مطمئن کر دوں گا اور اپنی جان چھڑا لوں گا یہ میرا شریفانہ وعدہ ہے کہ جین کی رہائی کے بعد آپ کے راستے میں نہیں آؤں گا۔

مجھے اس سے پہلے اندازہ نہیں تھا کہ عورت کسی مرد کے لئے اتنی بڑی کمزوری بھی ثابت ہو سکتی ہے! موشوروف ایسا خطرناک' ذہین اور چالاک شخص اپنی محبوبہ کے حصول کی خاطر اتنا بڑا قدم بھی اٹھا سکتا تھا میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

موشوروف نے میرے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات پڑھ لئے تھے اسی لئے وہ کہہ رہا تھا کہ عذرا خان آپ ایک عورت ہیں اور عورت ہونے کے ناتے کسی مرد کے جذبات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتیں لیکن آپ نے تاریخ کا مطالعہ ضرور کیا ہوگا۔ کیا عورتوں کی خاطر جنگیں نہیں ہوئیں؟ کیا مردوں نے عورتوں کے ہی حصول کے لئے اپنی سلطنتیں ختم نہیں کر دیں؟ اپنی جان سے نہیں گزر گئے وہ؟

یہ گئے گزرے زمانوں کی باتیں ہیں موشوروف! وہ زمانہ اور تھا یہ اور زمانہ ہے! تم اتنی آسانی سے مجھے اپنی بات کا قائل نہیں کر سکتے۔ بہرحال مجھے کچھ سوچنے کا وقت دو! کل تک انتظار کرو' تمہیں تمہاری پیشکش کا جواب مل جائے گا۔

ٹھیک ہے عذرا خان میں کل تک انتظار کر لوں گا۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ کا فیصلہ میرے حق ہی میں ہوگا۔ اچھا خدا حافظ! ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے خود ذہنی رابطہ منقطع کر لیا۔

موشوروف سے ذہنی رابطے کے بعد میری نیند اڑ گئی۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ پھر یہ بے چینی اس قدر بڑھی کہ میں بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ بظاہر اس بے چینی کا مجھے کوئی سبب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید موشوروف کا ناقابل فہم رویہ تھا۔ اس رات مجھے بڑی مشکل سے نیند

آئی اور پھر صبح ہوتے ہی بے چینی کا سبب معلوم ہو گیا۔ کمانڈر نواز سے مجھے رپورٹ ملی تھی کہ گزشتہ رات موشوروف نے میری کوٹھی پر زبردست یلغار کی تھی جس کے نتیجے میں سیل کے دو ارکان شدید زخمی ہو گئے تھے۔ دونوں جانب سے فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا مگر میرے آدمیوں نے موشوروف اور اس کے ساتھیوں کو کوٹھی میں داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس معرکہ آرائی میں موشوروف کے کئی آدمی بھی زخمی ہو گئے تھے۔ اطلاعات کے مطابق خود موشوروف کو بھی گولی لگی تھی لیکن اس کے ساتھی اسے زخمی حالت میں اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ سیل کے جو دو ارکان شدید زخمی ہوئے تھے انہیں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے آیا گیا تھا۔

جین کا ذہن پڑھنے کے بعد ہی موشوروف اس دھوکے میں آ گیا تھا کہ میں نے اپنی کوٹھی ہی میں اس کی محبوبہ کو قید کر رکھا ہے۔ اس نے اسی لئے میری کوٹھی پر بھرپور حملہ کیا تھا۔ ایک طرف تو وہ مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کر کے مجھے یہ اطمینان دلا رہا تھا کہ سودے بازی اور انتظار پر آمادہ ہے دوسری جانب عملی اقدام کی تیاری کر رہا تھا۔ موشوروف کی یہ حرکت مجھے بہت ناگوار ہوئی۔ اپنی دانست میں وہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ گزشتہ شب میں کسی قدر تذبذب کا شکار ہو گئی تھی کہ اس کی پیشکش قبول کر لوں یا نہیں! لیکن اب اس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ موشوروف کے قول و فعل پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کسی بھی بہانے اپنی دست راست اور محبوبہ جین کو میرے چنگل سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس کے سوا اس کو کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ یہ ساری باتیں اب جھوٹ ہی لگ رہی تھیں کہ وہ جین کی خاطر اپنا پیشہ ترک کر دے گا۔ میرے راستے میں آئندہ نہیں آئے گا اور یہ کہ میرا ملک چھوڑ کر چلا جائے گا۔ میرے خیال میں وہ اپنے ملک اور اپنے نظریات سے مخلص تھا اور کسی طور پر بھی ان سے غداری کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ گزشتہ رات موشوروف نے جو حرکت کی تھی اس نے مجھے اس کی طرف سے برگشتہ کر دیا تھا۔ معرکہ آرائی میں پہل اس کی طرف سے ہوئی تھی اور میرے نزدیک وہی اس کا ذمے دار تھا۔ عملاً یہ اس سے میرا پہلا تصادم تھا۔ اسی تصادم کے نتیجے میں' میں نے فیصلہ کیا کہ جین بدستور میری قید ہی میں رہے گی۔

ناشتا کرنے سے پہلے میں نے ان زخمیوں کی عیادت ضروری سمجھی جو موشوروف سے معرکہ آرائی کے نتیجے میں زخمی ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر رشید نے رات ہی کو انہیں طبی امداد فراہم کر دی تھی۔ ان دونوں کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ گولیاں ان کے جسموں سے نکالی جا چکی تھیں۔ ڈاکٹر رشید ہی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جین کی بتائی ہوئی ٹیبلیٹ استعمال کرانے کے بعد سرفراز اور اس کے ساتھیوں کی حالت معمول پر آ گئی ہے وہ کسی سہارے کے بغیر چل پھر سکتے ہیں البتہ کچھ جسمانی کمزوری ہے جو دو ایک دن میں دور ہو جائے گی۔ یہ خبر میرے لئے خوش گوار تھی۔

جین کو "مہمان خانے" کے جس کمرے میں رکھا گیا تھا اب وہاں سے بھی ایک اور کمرے میں میری ہی ہدایت کے مطابق منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہ نیا کمرا ہر اعتبار سے انتہائی محفوظ تھا۔ اس نئے کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور ہوا کے گزر کی خاطر کمرے کی اونچی چھت کے قریب صرف چند سوراخ تھے جو نیچے سے دیکھنے پر نظر نہیں آتے تھے۔ کمرے میں موجود ٹیوب لائٹ پر آہنی جالی چڑھی ہوئی تھی تا کہ اسے کوئی چیز پھینک کر توڑا نہ جا سکے۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی ایسی شے نہیں تھی جسے بہ وقت ضرورت

بطور ہتھیار استعمال کیا جا سکے۔ جین کو بحالت بے ہوشی اس نئے کمرے میں منتقل کیا گیا تھا۔ میرے ہی حکم پر رات کو اس کے کمرے میں بے ہوشی کی گیس چھوڑ دی گئی تھی۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد خود میں نے ہی کمانڈر نواز کو یہ احکام دیئے تھے۔ ٹیبلیٹ استعمال کرنے اور خواب آور گیس کا اثر ختم ہونے کے بعد جین کوئی بھی نئی پرابلم پیدا کر سکتی تھی۔ میں اسی لئے اسے بے ہوش ہی رکھنا چاہتی تھی۔

سیل کے ارکان کی عیادت کرنے کے بعد میں نے اپنے کمرے میں ناشتا کیا پھر چائے پیتے ہوئے انٹر کام کا ریسیور اٹھا لیا۔ ڈیوٹی روم سے رابطہ قائم کر کے میں نے جین کے بارے میں معلوم کیا۔ کمانڈر نواز' عثمانی کو چارج دے کر جا چکا تھا۔ عثمانی سے مجھے معلوم ہوا کہ جین ابھی تک بے ہوش ہے۔ اندازے کے مطابق اسے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوش آ سکے گا۔

''عثمانی! جب اسے ہوش آ جائے تو تم اپنی نگرانی میں ناشتا وغیرہ کرا دینا......! تمہیں کمانڈر نواز سے یہ ہدایت مل ہی چکی ہوگی کہ جین کو زیادہ دیر ہوش میں نہیں رکھنا!''

''جی ہاں میڈم! کمانڈر نواز نے مجھے جین کے متعلق تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔'' عثمانی نے جواباً کہا۔

''میں فی الحال ناشتا کر کے یہاں سے جا رہی ہوں۔ ممکن ہے دوپہر کے بعد لوٹوں! اس دوران میں تم لوگوں کو جین کی طرف سے پوری طرح محتاط اور چوکنا رہنا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ گزشتہ روز فون پر ملک دلاور سے میری بات ہوئی تھی اور وہ مجھے کچھ ڈس ہارٹ معلوم ہوا تھا۔ میں اس وقت اسی سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ بہرحال میرا مخلص دوست تھا۔ نادانستگی میں اس کے ساتھ جو زیادتی ہو گئی تھی میں اس کا تدارک کرنا چاہتی تھی۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے تقریباً نو بجے صبح میں اپنی کار میں سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں مجھے شیخ مجید کا خیال بھی آیا مگر ابھی میں اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ وہی پاکستان میں موشوروف کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ رات کو معرکہ آرائی کے لئے موشوروف کو کرائے کے غنڈے بھی یقیناً اسی نے فراہم کئے تھے۔ ورنہ اب تک موشوروف اور جین ہی مجھ سے نبرد آزما رہے تھے۔ اس وقت موشوروف کہاں ہو سکتا تھا اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ محض میرا قیاس ہی تھا کہ وہ زخمی ہونے کے بعد باتھ آئی لینڈ میں شیخ مجید ہی کے پاس ہوگا۔ اس سے بہتر اس کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا علاج بھی وہاں بہتر طور پر اور راز داری کے ساتھ ممکن تھا۔ فی الحال موشوروف کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک کر میں ملک دلاور کے بارے میں سوچنے لگی جس کی کوٹھی اب قریب آتی جا رہی تھی۔ میری کار اب سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

اس روز ملک دلاور مجھے خلاف توقع سنجیدہ اور کچھ اداس سا نظر آیا۔ میں اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ میرے مقابل کچھ فاصلے پر ایک صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بظاہر لاتعلق سا بیٹھا تھا۔

''تم اس وقت مجھے ملک دلاور کی بجائے کسی فلم کے ایسے ہیرو نظر آ رہے ہو جو لن کے ہاتھوں پٹ کر تنہائی میں ٹھنڈی میٹھی آہیں بھر رہا ہو!'' میں نے ملک دلاور کو چھیڑا۔

میری بات سن کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی پھر وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''شکر ہے کہ میں آپ کو نظر تو آ رہا ہوں ورنہ آپ اس سے بھی انکار کر دیتیں تو میں کیا بگاڑ لیتا! ہاں یہ بتائیں کہ آپ کی ہمشیرہ صاحبہ نے میرے بارے میں اور کیا کیا ریمارکس دیئے تھے......؟ انہوں نے مجھے درباری مسخرے کا خطاب دیا' یہ بھی ان کی عنایت ہی ہے!''

''رات گئی' بات گئی!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اب وہ ذکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ کب لاہور جا رہے ہو؟''

''یہاں بھی تنہائی ہے اور وہاں جا کر میں مزید تنہا ہو جاؤں گا۔ اس لئے میں نے لاہور جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

''یہ آخر تمہیں تنہائی کا روگ کب سے اور کہاں سے لگ گیا......؟ میرے مشورے پر تم عمل کرتے تو نہیں! شادی بیاہ کرا لو' گھر والی' گھر والی آ کر تمہاری ساری تنہائی ختم کر دے گی اور پھر دو چار سال میں جب تمہارے گھر کے صحن میں دو چار بچے بیٹ بال کھیلیں گے تو تمہیں تنہائی کا گلہ نہیں رہے گا بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ تم تنہائی کو ترسو گے۔''

''ٹھیک کہتی ہیں آپ!'' یہ کہہ کر اس نے طویل سانس لیا۔ یہ بات بھی اس کے مزاج کے خلاف تھی۔

میں بہت کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح وہ اپنی گزشتہ روش پر آ جائے اور چہکنے لگے مگر ابھی تک اس میں مجھے ناکامی ہی ہوئی تھی۔

''کیا پئیں گی آپ......؟ کافی یا چائے؟'' اس نے بدستور سنجیدہ لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

''ویسے تو میں ابھی ناشتا کر کے آ رہی ہوں مگر چائے چل جائے گی لیکن ایک شرط پر!'' میں نے اس کے اداس چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''وہ شرط بھی بیان کر دیجئے!''

''شرط یہ ہے کہ تم دیوداس بننے کی بجائے ملک دلاور نظر آنے لگو......! اب بہت ہو گئیں یہ ٹھنڈی میٹھی آہیں!...... میں زیادہ دیر یہ بوریت برداشت نہیں کر سکتی!''

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان نظروں میں شکوہ بھی تھا اور گہری اداسی بھی۔

''سنو ملک دلاور! اگر تمہیں ذکیہ کی یا میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ ''میرا مقصد ہرگز تمہاری دل آزاری نہیں تھا۔ اب تو کھل کر مسکرا دو نا!''

معلوم نہیں میرے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ ملک دلاور کے ہونٹوں پر زندہ سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ پھر وہ بولا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا خاتون کہ آپ بھی مجھے اداس دیکھ کر اداس ہو جائیں گی اور یہ بھی کہ میرے بارے میں اس قدر سنجیدہ ہوں گی۔ کہیں میرے ستارے ایک بار پھر تو گردش میں نہیں آنے والے......! میں تو صبر کر چکا تھا آپ کو...... مگر لگتا ہے کہ آپ سے صبر نہیں ہو رہا ہے...... وہ جو کسی

شاعر نے کہا ہے کہ اداس دیکھ کر مجھ کو اداس بیٹھے ہیں......"

"اب اس قدر رفری ہونے کی کوشش نہ کرو کہ شعر بھی پلانے لگو!" میں بظاہر منہ بنا کر بولی۔

"تو چلیں چائے پلوا دیتا ہوں......شربت دیدار کے بدلے یہ سودا بھی مہنگا نہیں ہے۔" بالآخر وہ اپنی سابقہ روش پر آ ہی گیا اور میں یہی چاہتی بھی تھی۔

پھر چائے پینے کے دوران میں بھی اسی طرح کی فقرے بازی ہوتی رہی۔ میں جب کچھ دیر بعد اس کے پاس سے اٹھ رہی تھی تو میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔

"اب کب پھیرا لگائیں گی؟" میں اٹھ کھڑی ہوئی تو اس نے پوچھا۔

"جب بھی موقع ملا آ جاؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔ "تم اپنے علاج کی طرف پوری توجہ دو! اور ڈاکٹر تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دے رہے ہیں تو مان لو ان کی بات! کیا حرج ہے کچھ دن کے لئے لاہور یا کہیں بھی چلے جاؤ!"

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا مگر آدمی کا سوچا پورا کب ہوا ہے۔ میں لاہور چلا تو جاؤں مگر آپ نہیں مانیں گی ہرگز!"

"میرے نہ ماننے کی اس میں کیا بات ہے! میں تو خود تم سے جانے کو کہہ رہی ہوں۔"

"ممکن ہے آپ میری جدائی برداشت کر لیں کہ خاصی کٹھور خاتون ہیں مگر میں کیسے ہجر کے دن اور ہجر کی راتیں گزاروں گا آپ کے بغیر!"

"بس لگ گئی بک بک......! معلوم ہے مجھے کہ تم کتنے بڑے عاشق صادق ہو میرے......! خدا حافظ۔" یہ کہتی ہوئی میں ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"انہی اداؤں نے تو مار رکھا ہے خاتون!" اس نے ہانک لگائی۔ "کاش کبھی آپ میری آنکھوں کے راستے میرے دل میں جھانک کر دیکھ سکیں۔

میں اس کی بات کو نظر انداز کرتی ہوں ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔

بہت دنوں سے میں نے اپنے دفتر کا رخ نہیں کیا تھا۔ اپنی فرم کی منیجر عارفہ سے ملے بھی مجھے خاصے دن گزر چکے تھے۔ میں نے ملک دلاور کی کوٹھی سے نکلتے ہوئے سوچا کہ کیوں نہ آج ادھر بھی ہو لیا جائے! نرگس وغیرہ کو دیکھے بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ کاروبار کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ عارفہ پر مجھے پورا بھروسا تھا۔ وہ کاروباری امور کو بہ حسن وخوبی نمٹانے کی اہل تھی۔ عارفہ ذہین بھی تھی اور ایمان دار بھی۔ ایسے افراد جن لوگوں کو مل جائیں وہ خوش قسمت ہی کہلاتے ہیں اور کم از کم اس معاملے میں واقعی میں خوش قسمت ہی تھی۔ میرے تمام ہی ساتھی ذہین، باوفا اور دیانت دار تھے۔

میں اپنے دفتر پہنچی تو اتنے عرصے بعد مجھے دیکھ کر سبھی کے چہرے کھل اٹھے۔ میں نے دانستہ اپنا کمرا نہیں کھلوایا تھا کیونکہ وہاں زیادہ دیر رہنے کا پروگرام نہیں تھا۔ میں عارفہ ہی کے کیبن میں بیٹھی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹا میں نے اپنے دفتر میں گزارا اور پھر وہاں سے اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔

راستے میں ٹرانسمیٹر پر عثمانی سے مجھے معلوم ہوا کہ رات کو ہونے والی فائرنگ کے سلسلے میں علاقے کی پولیس میری کوٹھی تک پہنچ چکی ہے۔ پولیس یہ تفتیش کر رہی ہے کہ فائرنگ کیوں اور کن لوگوں

کے درمیان ہوئی؟ اس سلسلے میں وہ اس وقت میرے ملازمین کے بیان لے رہی ہے کیونکہ علاقے کے لوگوں نے بیان دیا ہے کہ فائرنگ کی آوازیں میری کوٹھی کی جانب ہی سے سنائی دی تھیں۔

"یقیناً پولیس کو میری بھی تلاش ہوگی! اوور۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ہو سکتا ہے میڈم مگر ابھی یہ بات سامنے نہیں آئی۔ اوور۔" عثمانی نے جواب دیا۔

"میں اس وقت اپنی کوٹھی ہی کی طرف جا رہی ہوں۔ تم نے اچھا کیا مجھے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا اوور اینڈ آل!" یہ کہہ کر میں نے کار میں لگے ہوئے چھوٹے سے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا پھر کار کو تیز رفتاری سے دوڑانے لگی۔ اب میں اپنی کوٹھی تک جلد از جلد پہنچ جانا چاہتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔

پھر جب میری کار اپنی کوٹھی کے گیٹ پر جا کر رکی تو میں نے دیکھا کہ گیٹ کھولتے ہوئے چوکیدار کچھ سہما ہوا سا تھا۔

"کیا بات ہے خان بابا؟ تم مجھے کچھ ہراساں اور خوف زدہ سے نظر آ رہے ہو۔" میں نے اس کے قریب کار روکتے ہوئے پوچھا۔

چوکیدار نے جواباً بتایا کہ ابھی چند منٹ پہلے پولیس والے میری کوٹھی سے گئے ہیں اور وہ فاطمہ کے علاوہ میری دو اور ملازماؤں کو بھی ضروری پوچھ گچھ کے لئے تھانے لے گئے ہیں۔

یہ سن کر میرا پارا چڑھ گیا۔ پھر بھی میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے چوکیدار کو مطمئن کر دیا کہ فکر نہ کرو میں ابھی خود تھانے جا کر ان سب کو لے آتی ہوں۔ یہ کہتے ہی میں نے اپنی کار ریورس میں لی اور کوٹھی کے گیٹ سے باہر آ گئی۔ اس کے بعد میں نے تیزی سے اسٹیرنگ گھمایا اور علاقے کے تھانے کی طرف کار دوڑا دی۔ میری کوٹھی کی اطراف رات کو ہونے والی فائرنگ کے سلسلے میں میرے ملازمین کے بیانات لینا کافی تھا۔ پوچھ گچھ کے بہانے ان کو حراست میں رکھنے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میرے ملازمین کے ساتھ پولیس کا یہ سلوک ناروا تھا اور مجھے اسی پر غصہ آیا تھا۔

جلد ہی میں علاقے کے تھانے تک پہنچ گئی۔ اپنی کار کو ایک جانب پارک کر کے میں تیزی سے اتری اور کار کا دروازہ مقفل کر کے بہ عجلت تھانے کی عمارت کی طرف بڑھی۔ اس تھانے کا انچارج مجھے اچھی طرح جانتا تھا اسی سبب میں اور بھی غصے میں تھی۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس انچارج کا تبادلہ ہو چکا ہے اور اب ایک دوسرا شخص اس کی جگہ سنبھال چکا ہے۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میں تھانہ انچارج کے کمرے کے باہر کھڑے ہوئے ایک سپاہی کے قریب پہنچی۔ اس نے مجھے تھانہ انچارج کے کمرے میں جانے سے روک دیا تھا۔

"صاحب کا حکم ہے کہ کسی کو بغیر ان کی اجازت کے اندر نہ جانے دیا جائے!" سپاہی نے مجھ سے کہا تھا۔

"اپنے صاحب سے جا کر کہو کہ عذرا خان ان سے ملنا چاہتی ہے۔" اسی کے ساتھ میں نے سابقہ تھانہ انچارج کا نام بھی لیا تھا۔

"ان کا تبادلہ ہو چکا ہے جی ملیر تھانے میں!" سپاہی نے بتایا۔ "اب تو......"

اس کے بعد سپاہی نے کیا کہا میں نے نہیں سنا۔ غالباً سپاہی مجھے نئے تھانہ انچارج کا نام بتا رہا تھا مگر اسی دوران میں آگے بڑھ کر میں سپاہی کی پروا کیے بغیر تھانہ انچارج کے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ سپاہی کو میں نے اتنا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ اندر داخل ہونے سے مجھے روک سکے۔

مجھے یوں اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر تھانہ انچارج کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ''کون ہیں جی آپ؟ اور یوں بغیر اجازت منہ اٹھائے کیوں چلی آ رہی ہیں اندر؟'' اس نے پولیس والوں کی مخصوص زبان میں مجھے ڈانٹا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی باہر کھڑا ہوا سپاہی بھی دروازے پر پڑی ہوئی چق اٹھا کر اندر آ گیا اور بولا۔ ''صاحب جی! میں نے ان کو منع کیا تھا اندر جانے سے مگر یہ زبردستی روکنے کے باوجود......''

''اوئے بکواس نہ کر......! جا باہر جا کے کھڑا ہو......! بڑا تمیں مار خان بنتا ہے اور ایک عورت کو اندر آنے سے نہیں روک سکتا!'' انچارج نے سپاہی کو اپنے کمرے سے ڈانٹ کر نکال دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں جی بولو کیا بات ہے؟'' اس نے مجھ سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا۔

''میرا نام عذرا خان ہے اور میں یہیں ڈیفنس میں رہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے اپنا پتا بتایا' پھر بولی۔ ''آپ کے سپاہی میری ملازماؤں کو اٹھا لائے ہیں۔ میں یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ انہیں کس جرم میں......''

''اچھا تو آپ ہیں عذرا خان!'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اچھا ہوا کہ آپ خود ہی تھانے چل کر آ گئیں ورنہ آپ کی برآمدگی کے لئے ہمیں جانے کہاں کہاں چھاپے مارنا پڑتے!''

''وہ کس خوشی میں......؟ پوچھ سکتی ہوں!'' اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

''ابھی معلوم ہوا جاتا ہے!'' وہ اپنی گھنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا' پھر بہ آواز بلند دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہی کو پکارا۔ ''اوئے مدخان!''

''یس سر جناب!'' سپاہی فوراً اندر آ گیا۔

''سب انسپکٹر منیر حسین کو بلاؤ!'' انچارج نے سپاہی کو حکم دیا۔

''بہتر جناب!'' سپاہی لیفٹ رائٹ کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں اپنے علاقے میں ہونے والی کسی بھی گڑبڑ کو برداشت نہیں کرتا۔ آپ نے دفعہ ایک سو سات سترہ کا نام سنا ہے! یہ دفعہ نقص امن میں لگتی ہے۔ اپنے علاقے میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے میں آپ کو اور آپ کی تمام ملازمین کو اندر کر سکتا ہوں۔ اب آیا کچھ آپ کی سمجھ میں!'' وہ مجھے اس طرح گھورنے لگا جیسے مجھے دھمکانا چاہتا ہو۔

میری قوت برداشت اب جواب دینے لگی تھی۔ میں کچھ کہے بغیر آگے بڑھی اور اس کی میز پر دائیں جانب رکھا ہوا فون اپنی جانب کھسکا لیا۔

''اچھا تو اب تڑی دینا چاہتی ہو مجھے!'' وہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ ''گورنر صاحب کو فون کر رہی ہو یا صدر مملکت کو؟''

''تمہیں سبق دینے کے لئے صرف آئی جی بھی کافی ہے احمق آدمی!'' میں آئی جی کے نمبر

ملاتے ہوئے غصے میں پھنکاری۔

''کیا......؟ کیا کہا تم نے مجھے......! احمق آدمی......! اب میں تمہیں اندر کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا!'' وہ بھی غصے میں آ گیا۔ غصے ہی کی وجہ سے شاید اس نے میری پوری بات نہیں سنی تھی ورنہ یہ سن کر کہ میں آئی جی کو فون کر رہی تھی اسے کم از کم یہ تو ضرور چاہئے تھا مجھے فون کرنے سے روک دیتا۔

دوسری جانب سے جلد فون اٹھا لیا گیا اور میں فوراً بول اٹھی۔ ''میں عذرا خان بول رہی ہوں مجھے فوری طور پر آئی جی صاحب سے بات کرنا ہے۔''

''ہولڈ آن پلیز!''

پھر چند ہی لمحے بعد مجھے فون پر آئی جی کی آواز سنائی دی تو میں اپنا غصہ ضبط کرنے کے باوجود خود پر پوری طرح قابو نہ رکھ سکی۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ آپ نے اپنے تھانوں میں کن احمقوں کو بٹھا رکھا ہے جنہیں خواتین سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں! اس بے وقوف آدمی نے میری غیر موجودگی میں میری تین ملازماؤں کو کوٹھی سے اٹھوا لیا ہے اور اب خود مجھے بھی اندر کرنے کی دھمکی دے رہا ہے!''

''آپ کس تھانے سے بول رہی ہیں؟''

''ڈیفنس سے!''

''کیا تھانہ انچارج اس وقت تھانے میں موجود ہے؟''

''جی ہاں! میرے سامنے ہی بیٹھا اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے!'' یہ کہتے ہوئے میں نے تھانہ انچارج کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر اب فکر و پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''آپ اسے فون دیں۔''

''یہ لو بات کرو اپنے بابا جان سے!'' میں نے ٹیلی فون کا ریسیور تھانہ انچارج کی طرف بڑھا دیا۔

''کک...... کیا فون پر آئی...... واقعی آئی جی صاحب ہیں؟'' اس کے لہجے میں خوف تھا اور آواز جیسے بھیک مانگ رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس کی ساری اکڑ فوں ختم ہو گئی تھی اور وہ بھیگی بلی نظر آنے لگا تھا۔ اس نے مجھے سہمی سہمی سی نظروں سے دیکھتے ہوئے ریسیور میرے ہاتھ سے لے لیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ آئی جی نے اس سے کیا کہا! ہاں میں نے اسے ''یس سر'' کہتے اور فون پر اپنا نام بتاتے ہوئے ضرور سنا۔ پھر میں نے اسے گھگیاتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہ آئی جی کی منت سماجت کر رہا تھا کہ اس کا قصور معاف کر دیا جائے وغیرہ!

''بہتر...... بہتر ہے سر! میں...... میں ان سے معافی مانگ لوں گا...... ٹھیک ہے سر......! جی......؟ جی وہ بات یہ تھی کہ ان کی کوٹھی کے آس پاس رات فائرنگ ہوئی تھی اور اسی سلسلے میں تفتیش کی غرض سے ان کی ملازماؤں کو...... جی ہاں بالکل سر......! میں ابھی محترمہ عذرا خان سے اپنے...... اپنی گستاخی کی معافی...... تھینک یو سر......! ویری ویری تھینک یو!'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ آئی جی سے فون پر بات کرتے ہوئے اس کا چہرہ پسینے پسینے ہو گیا تھا۔

عین اسی وقت کمرے میں ایک باوردی پولیس افسر داخل ہوا اور اس نے تھانہ انچارج کو

سیلیوٹ کیا۔

''اوئے منیر حسین! تم میری وردی ضرور اترواؤ گے......! تمہیں کیا پڑی تھی جو تم ان معزز خاتون کی ملازماؤں کو تھانے لے آئے......؟ بولو!''

''سر جی! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ......''

''بکواس نہ کرو زیادہ!'' تھانہ انچارج نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی' پھر اسے حکم دیا۔ ''ان کی تینوں ملازماؤں کو فوراً چھوڑ دو......! جاؤ جلدی کرو......! بلکہ سنو تم خود پولیس جیپ میں کوٹھی تک چھوڑ کر آؤ!''

تھانہ انچارج کا حکم سن کر سب انسپکٹر حیران حیران سا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی میں نے بھی دروازے کا رخ کیا کیونکہ اب وہاں میری موجودگی ضروری نہیں رہی تھی۔

''ذرا سنئے محترمہ خاتون! میری نوکری پر بن جائے گی...... میں...... میں آپ سے اپنی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے تھانہ انچارج اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں اس کی آواز سنتے ہی دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی تھی۔

''معاف کر دیا میں نے تمہیں......! بس......! اب جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھو اور آئندہ کے لئے یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لو کہ ہر فرد کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کیا جاتا! خصوصاً خواتین کے سلسلے میں تمہیں مہذب اور شائستہ ہونا چاہئے!''

''ٹھیک فرما رہی ہیں آپ......! مگر آئی جی صاحب کو یہ کیسے معلوم ہو گا کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو خود فون پر اس کی تصدیق ان سے کر دیں ورنہ خدا معلوم وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ آپ کا تو کچھ نہیں جائے گا محترم مگر میری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔ کسی تھانے میں یہ میری پہلی پوسٹنگ ہے۔ اگر لائن حاضر ہو گیا تو پھر......'' اس کی آواز بھرانے لگی اور مجھے اس پر رحم آ گیا۔

''ملاؤ نمبر! میں کہے دیتی ہوں کہ معاف کر دیا تمہیں۔'' یہ کہہ کر میں میز کی طرف مڑ گئی۔

''آپ...... آپ تشریف رکھیں میں ابھی آئی جی صاحب کا نمبر ملاتا ہوں۔''

پھر اس نے میری ''جان بخشی'' اسی وقت کی جب میں نے فون پر آئی جی سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو اس کی خواہش تھی۔ اس نے مجھ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا نادانستگی میں ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تھانہ انچارج مجھ سے کچھ رقم اینٹھنا چاہتا تھا اسی لئے وہ مجھے ڈرا دھمکا رہا تھا۔ میری ملازماؤں کے ساتھ پولیس کوئی زیادتی نہیں کر پائی تھی کیونکہ میں بروقت تھانے پہنچ گئی تھی۔ تھانے سے کوٹھی پہنچنے کے بعد خود ملازماؤں سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی۔

اب دوپہر ہونے والی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ دوپہر کا کھانا کھا کر اور کچھ دیر حسب معمول آرام کرنے کے بعد ہی اب آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا رخ کروں گی۔

میں اپنی خواب گاہ میں لباس تبدیل کر رہی تھی کہ معاً فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ وہی فون تھا جس

کا نمبر ٹیلی فون ڈائریکٹری میں نہیں تھا۔ میں جلدی جلدی لباس زیب تن کیا اور لپک کر فون کے قریب پہنچ گئی۔ ریسیور اٹھانے میں' میں نے دیر نہیں کی تھی۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی جو میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔

''آداب!'' میں نے فوراً آواز پہچانتے ہی کہا۔ ''حکم فرمائیے میں عذرا بول رہی ہوں۔''

''تم ابھی تک کراچی ہی میں ہو...... ڈھاکہ روانہ نہیں ہوئیں؟''

''جی بس کچھ ایسی ہی پھنس گئی تھی یہاں...... مگر جلد ہی انشاء اللہ آپ کے حکم کی تعمیل کر دوں گی۔''

''یہ تم نے حکم حکم کی کیا رٹ لگا رکھی ہے!'' دوسری جانب سے بات کرنے والی محترم شخصیت نے مجھے ڈانٹ دیا۔ پھر نرم لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے آج کا اخبار دیکھا؟''

''جی میں نہیں دیکھ سکی......! کوئی خاص بات ہے کیا آج کے اخبار میں؟''

''ہاں کم از کم تمہارے لئے اسے خاص ہی کہا جا سکتا ہے۔ شہریار کا نام صدر مملکت کے مشیروں کی فہرست سے خارج کیا جا چکا ہے۔''

''اوہ ونڈرفل!'' میں کوشش کے باوجود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ یہ خبر واقعی میرے لئے خوش خبری کی حیثیت رکھتی تھی۔

''اس کے علاوہ بھی آج کے اخبار میں بہت کچھ ہے۔ تم اخبار پر ایک نظر ڈال لیا کرو! مختصراً میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مشرقی پاکستان میں اب امریکی ایجنٹوں کی سرگرمیاں خاصی تیز ہو گئی ہیں۔ وہاں سے اچھی خبریں نہیں آ رہی۔ تمہارا اب وہاں جلد از جلد پہنچنا گریز ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ پڑوسی ملک کے کچھ تخریب کار بھی وہاں گھس آئے ہیں۔ انتظامیہ ان سے بھی نمٹ رہی ہے۔ امریکی ایجنٹ سولومن کے بارے میں بھی تازہ خبر یہی ہے کہ وہ بھی ڈھاکہ ہی میں ہے۔ اس پر بھی ابھی تک ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بس آج کل ہی میں ڈھاکہ پہنچ جاؤ۔ مجھے تمہاری طرف سے صاف اور واضح جواب چاہئے تاکہ مطمئن ہو سکوں۔''

آپ کی آواز فون پر سن کر میں اندازہ لگا چکی ہوں کہ آپ غالباً اسلام آباد سے بات کر رہے ہیں!''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں آج ہی کراچی سے یہاں پہنچا ہوں...... ہاں تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''کیا آپ مجھے کل تک کی مہلت اور دے سکتے ہیں؟'' میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''بالکل کیوں نہیں......! لیکن کل تم مجھے بھی اطلاع دو گی کہ ڈھاکہ روانہ ہو رہی ہو......! ٹھیک ہے؟''

''جی بہتر ہے' انشا اللہ ایسا ہی ہو گا۔ آپ فون کریں گے یا میں خود......''

''تم جو چاہو......! تم کس وقت اپنی کوٹھی پر ہو گی؟ میں فون کر لوں گا۔''

''کل شام پانچ بجے تک میں یقیناً کسی فیصلے تک پہنچ جاؤں گی۔''

”ٹھیک ہے پھر خدا حافظ! میں کل شام تم سے بات کرلوں گا۔“ اسی کے ساتھ محترم وزیر داخلہ نے فون پر گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مجھے فون کرنے والے وہی تھے۔

فون پر محترم وزیر داخلہ سے گفتگو کرنے کے بعد میں الجھن میں پڑ گئی۔ اگر موشوروف سے چھیڑ چھاڑ شروع نہ ہو جاتی تو میں اسی وقت ڈھاکہ روانہ ہونے کا اقرار کر لیتی۔ موجودہ حالات پر غور وفکر کرتے ہوئے میں نے اس دن کے اخبارات بھی منگوا لئے۔ اخبارات کے مطالعے سے مجھے محترم وزیر داخلہ کی تشویش کے اسباب معلوم ہو گئے۔ مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں واقعی خاصی گڑ بڑ معلوم ہو رہی تھی۔ خبروں سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔ شہریار کی بابت جو خبر شائع ہوئی تھی وہ بھی میری نظروں سے گزری۔ صدر مملکت کی مشاورتی کمیٹی سے بظاہر خود اس نے استعفیٰ دیا تھا لیکن میرے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا کہ اس سے استعفیٰ طلب کیا گیا ہوگا۔ میرے لئے یہ دن بہر حال خوشی کا تھا کیونکہ میرا ایک بڑا حریف مکمل طور پر پسپا ہو چکا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرتے ہوئے بھی میں غور وفکر میں ڈوبی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا قدم اٹھاؤں؟ موشوروف سے نمٹے بغیر میری ڈھاکہ روانگی نہ معلوم کیا گل کھلاتی! خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اس کی دست راست جین میری قید میں تھی۔

مجھے ابھی بستر پر دراز ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بس اچانک ہی میرے سارے جسم میں ایک آشنا لذت انگیز سنسنی کی لہر سی دوڑنے لگی۔ یہ وہی جانی پہچانی کیفیت تھی جس سے میں پہلے بھی متعدد بار گزر چکی تھی۔ کیف وسرشاری کے عالم میں میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر چند ہی لمحوں بعد خود اپنی ہی آواز مجھے اپنی سماعت میں گونجتی محسوس ہونے لگی۔ میرا حیرت انگیز ذہن میری رہنمائی کر رہا تھا۔ میں واضح طور پر خود اپنی آواز سن رہی تھی۔ عذرا خان! روسی سیکرٹ ایجنٹ نے تم سے جو کچھ کہا ہے قطعی درست ہے۔ جین کی خاطر وہ حقیقتاً اسی حد تک جا سکتا ہے کہ تمہارا ملک چھوڑ کر چلا جائے۔ اسے تمہارے معاملے میں پسپائی پر کسی کے سامنے جواب دہی نہیں کرنا پڑے گی کیونکہ خود اسی نے اپنی حکومت کے کچھ اعلیٰ حکام کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ تمہارے حیرت انگیز ذہن پر روسی سائنس دان تجربات کریں۔ اس ضمن میں حکومت ہی کے ایک حلقے کی طرف سے اس کی مخالفت بھی ہوئی مگر اس مخالفت کو وقتی طور پر دبا دیا گیا تھا۔ موجودہ صورت حال میں اگر خود موشوروف تمہارے باب میں اپنی تجاویز واپس لے لیتا ہے تو پھر اس سے باز پرس نہیں کی جائے گی۔ خود روسی حکومت اس معاملے میں اب زیادہ سنجیدہ نہیں ہے۔ وقتی طور پر صرف امریکہ دشمنی کے سبب اسے یہ اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ تمہیں کسی طرح اغوا کر کے اور امریکی ایجنٹوں کے چنگل سے نکال کر ماسکو لے آئے۔ اس سے روسی حکومت کا مقصد امریکی مفادات کو نقصان پہنچانا بھی تھا لیکن اب روسی حکومت تک یہ اطلاعات پہنچ چکی ہیں کہ امریکی ایجنٹ تم میں دلچسپی نہیں لے رہے اور وہ تمہارے ذہن کو اپنے مفادات کا غلام بنانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ روسی حکومت کی طرف سے اب موشوروف پر یہ دباؤ پڑ رہا ہے کہ وہ جلد از جلد کسی نتیجے تک پہنچ جائے ورنہ اپنی تجاویز واپس لے لے۔ گزشتہ شب اس نے جو کچھ کیا اس میں اس کی جین سے جنونی محبت کو دخل تھا۔ اس وقت وہ زخمی حالت میں باتھ آئی لینڈ کی ایک کوٹھی میں پڑا ہوا اپنی محبوبہ کی یاد میں آنسو بہا رہا ہے۔ تم اگر اس حالت میں اس

کی محبوبہ کو اس تک پہنچا دو گی تو وہ تمہارا یہ احسان کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر وہ تمہارے ملک سے چلا جائے گا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع ہے کہ کسی نے اسے یوں بے دست و پا کر دیا ہے۔ جین یا موشوروف پر اس سے پہلے کبھی کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ تمہارے معاملے میں اس وقت موشوروف تذبذب کا شکار ہے کہ پسپائی قبول کرے یا نہیں؟ اس حالت میں اگر وہ تمہارا زیر بار احسان ہو گیا تو یقیناً تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا اور تم امریکی ایجنٹوں سے نمٹنے کے لئے ڈھاکہ روانہ ہو سکو گی۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی آواز آنا بند ہو گئی۔

پھر کچھ دیر میرے جسم پر وہی مانوس لذت انگیز کیفیت طاری رہی اور میں آنکھیں بند کئے بستر پر پڑی رہی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ میر حالت اعتدال پر آ گئی۔ میں ایک انگڑائی لے کر بستر سے اٹھی اور خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ میں نے فوری طور پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا فون نمبر ملایا۔ عثمانی سے میں جین کی خیریت کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ عثمانی نے مجھے فون پر بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جین کو ہوش آیا ہے اور اس وقت اسے دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے کہا جا رہا ہے مگر وہ کسی طرح کھانا کھانے پر راضی نہیں ہو رہی۔ وہ بار بار آپ کے متعلق پوچھ رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ جب تک آپ سے نہیں مل لے گی کھانا ...... نہیں کھائے گی۔ میں خود آپ سے اس سلسلے میں ہدایات لینا چاہتا تھا کہ کیا کیا جائے؟ اسے دوبارہ بے ہوش کر دیا جائے یا آپ خود یہاں تشریف لا رہی ہیں؟

”اسے دوبارہ بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں، میں پہنچ رہی ہوں وہاں! جین کو بھی تم یہ اطلاع دے سکتے ہو۔“ یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

لباس تبدیل کر کے اپنی کوٹھی سے نکلنے میں مجھے آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ڈرائیور کو میں نے ساتھ نہیں لیا تھا اور خود ہی کار ڈرائیو کر رہی تھی۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ کر میں نے ڈیوٹی روم سے جین کے کمرے کی چابی لی اور پھر عمارت کے عقبی حصے کی طرف چل دی۔ عثمانی اس دوران میں مجھے بتا چکا تھا میرا فون آنے کے بعد اور یہ اطلاع ملنے پر کہ میں خود جین کے پاس پہنچ رہی ہوں جین نسبتاً پرسکون ہے۔ ڈیوٹی روم کے ٹی وی اسکرین پر میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس وقت عثمانی اسکرین پر جین کے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ جین سر جھکائے کسی سوچ میں بیڈ پر بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد جب میں جین کے کمرے کا قفل کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ مجھ پر نظر پڑتے ہی برس پڑی۔ وہ انتہائی غصے میں مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ”مس خان! آپ کیسی میزبان ہیں کہ اپنی مہمان کو مسلسل بے ہوشی کی حالت میں رکھے ہوئے ہیں! آخر اس سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ اور یہ کون سے آداب میزبانی ہیں!“

”ایسا میں نے محض اس لئے کیا تھا جین کہ تم ناحق اچھل کود کر کے خود کو نہ تھکاؤ اور آرام سے بستر پر لیٹی رہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اس کی طرف ...... بڑھتے ہوئے مزید بولی۔ ”تم نے آخر کھانا پینا کیوں چھوڑ دیا؟ بغیر کھائے پیئے تو تم کمزور ہو جاؤ گی اور پھر موشوروف سے میں کیا کہوں گی! وہ یہی سمجھے گا کہ میں نے تمہیں دانستہ بھوکا رکھا ہے۔“

میری زبان سے موشوروف کا ذکر سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں اس کے قریب مسہری پر بیٹھ گئی۔

''ہاں بولو! اب کھانا کھا لو گی......؟ میں دراصل ایک ضروری کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو۔ اب میں آ گئی ہوں، کھانا کھا لو!'' میں نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''نہیں!'' اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ''میں کھانا نہیں کھاؤں گی!''

''اس کی کوئی وجہ؟''

''اسے آپ میرا احتجاج سمجھ سکتی ہیں۔ مجھے آپ کی میزبانی قبول نہیں ہے۔'' ''اگر واقعی ایسا ہی ہے کہ تم میری مہمان بن کر مزید یہاں رہنا نہیں چاہتیں تو موشوروف کے پاس بھی پہنچا سکتی ہوں۔'' میں نے اپنی دانست میں اسے چونکانا چاہا۔

''اس کا نام نہ لیں میرے سامنے!'' وہ اداس سے لہجے میں بولی۔ ''اسے میں اتنا بے وفا نہیں سمجھتی تھی!''

''بے وفا!'' اسے چونکانے کی بجائے میں خود چونک اٹھی۔ ''موشوروف نے کیا بے وفائی کی ہے تم سے؟ میں سمجھی نہیں!''

''میں کل رات سے آپ کی قید میں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس دوران میں موشوروف یہ معلوم کر چکا ہوگا میں کہاں قید ہوں! اس کے باوجود......''

''لیکن کیسے جین...... کیا تمہارا ذہن پڑھ کر؟'' میں نے خود اسی سے اعتراف کرانا چاہا۔

''جی ہاں مس خان......! آپ بھی یقیناً اس کے غیر معمولی ذہن سے واقف ہوں گی۔ وہ ایک بہترین ٹیلی پیتھ ہے میرا ذہن پڑھ کر اس سے کے لئے کیا یہ مشکل رہا ہوگا کہ مجھے آپ کی قید سے رہائی دلا سکے!''

''اگر میں یہ کہوں جین کہ موشوروف نے یہ کوشش کی تھی اور اپنی کوشش کے نتیجے میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو؟''

''میں ہرگز اس بات پر یقین نہیں کروں گی!'' وہ پر یقین لہجے میں بولا۔ ''موشوروف اور ناکامی یہ سوچنا بھی میرے لئے محال ہے۔''

''تم غلطی پر ہو جین!'' یہ کہہ کر میں نے گزشتہ شب ہونے والی معرکہ آرائی سے اسے آگاہ کر دیا پھر بولی۔ ''تمہاری ہی جنونی محبت کے نتیجے میں موشوروف اس ہنگامہ آرائی میں زخمی ہو گیا ہے۔''

''نہیں!'' وہ ایک دم بے چین ہو گئی۔ ''کہہ دیجئے مس خان کہ یہ غلط ہے اور...... اور موشوروف زخمی نہیں ہوا۔'' اس کی آواز جذبات کی شدت سے مرتعش تھی۔

''آج ہی تم خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لو گی پھر تمہیں میری بات پر یقین آ جائے گا۔''

''تو...... تو کیا زخمی ہو کر وہ...... وہ...... موشوروف بھی آپ کا قیدی بن چکا ہے؟''

''نہیں جین!'' میں نے اسے بتایا۔ ''وہ اس وقت اپنے ایک پشت پناہ کی کوٹھی میں زیر علاج

ہے۔ میں چاہوں تو تمہاری ہی طرح اسے بھی اپنا مہمان بنا سکتی ہوں لیکن اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں تو اب تمہیں بھی زبردستی اپنا مہمان بنا کر رکھنا نہیں چاہتی!''

''مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا مس خان......! کیا آپ واقعی سنجیدگی سے یہ سب کچھ کہہ رہی ہیں؟'' جین کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور بے یقینی کی کیفیت بھی۔

''سنو جین! کل موشوروف نے میرے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کے بعد ایک سودا کرنے کی پیشکش کی تھی۔ میں نے اسے جواب دینے کے لئے آج تک کا وقت مانگا تھا مگر اس سے صبر نہ ہو سکا اور وہ رات ہی کو تمہیں رہائی دلانے کی خاطر میری کوٹھی پر چڑھ دوڑا۔ اسی کے نتیجے میں وہ زخمی بھی ہوا۔ موشوروف نے مجھ سے یہ سودا کرنا چاہتا تھا کہ اگر میں تمہیں رہا کر دوں تو وہ میرا پیچھا چھوڑ کر میرے ملک سے واپس چلا جائے گا۔ مجھے بتاؤ جین کہ کیا واقعی وہ تمہاری خاطر ایسا کر سکتا ہے؟''

جین نے محتاط الفاظ میں میرے سوال کا جواب دیا۔ ''اگر موشوروف نے ایسا کہا ہے تو یقیناً وہ یہ قدم اٹھانے کا اہل ہوگا۔ میں اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی کہ واقعی وہ میری رہائی کے بعد مزید یہاں نہیں رکے گا لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ موشوروف میری خاطر کوئی انتہائی قدم بھی اٹھا سکتا ہے خواہ یہ انتہائی قدم اٹھانے کے لئے اسے اپنی جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانا پڑے۔''

''مگر ابھی ذرا دیر پہلے تو تم اسے بے وفا کہہ رہی تھیں!'' میں ہنس کر بولی۔

''غلط فہمی ہو گئی تھی مجھے اور...... اور یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے رہائی دلانے کی خاطر زخمی بھی ہو چکا ہے!'' وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر بولی، پھر اسے جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ اس طرح اچانک مجھے مخاطب کیا۔ ''سنئے مس خان! تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟''

''کس بارے میں چندا؟'' میں جان کر انجان سی بن گئی۔

''موشوروف کی پیشکش کے سلسلے میں!''

''پہلے میں خود فون پر اس سے بات کرنا چاہتی ہوں اسی کے بعد کوئی فیصلہ کروں گی۔''

''آپ کو وہ فون نمبر معلوم ہے جہاں......''

''ہاں معلوم ہے مجھے!'' میں اس کی بات کاٹ کر بول اٹھی۔ ''تم اتنے میں کھانا کھاؤ میں موشوروف سے فون پر بات کر کے آتی ہوں۔''

''کہیں یہ سارا چکر آپ نے مجھے کھانا کھلانے کے لئے تو نہیں چلا رہیں؟'' وہ مشتبہ سے لہجے میں مسکرا کر کہنے لگی۔

''اگر تم یہی سمجھ رہی ہو تو ایسا ہی سہی......! ویسے اب یہاں سے تمہارے جانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا اس لئے غیر ضروری اچھل کود سے گریز کرنا! سمجھ رہی ہو نا!''

''جب میری خاطر اتنی بڑی سودے بازی ہو رہی ہے دو حریفوں کے درمیان تو پھر مجھے خواہ مخواہ ہاتھ پیر چلانے کی کیا ضرورت ہے!''

''تو پھر میں تمہارے لئے کھانا بھجوا دوں؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''بھوک ہڑتال ختم کر رہی ہو نا!''

"بالکل ختم!" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا میں اس کے پاس سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "بہرحال ابھی تم میری مہمان ہو اس لئے آداب میزبانی پر برا نہ ماننا' کھانا آنے تک دروازہ مقفل ہی رہے گا۔" یہ کہتے ہوئے میں کمرے سے نکل آئی اور باہر آتے ہی دروازہ بند کر دیا۔

دروازہ مقفل کر کے میں نے چابی ایک مسلح محافظ کے حوالے کر دیا اور اسی سے جین کے لئے کھانا منگوانے کے لئے بھی کہہ دیا۔

"مہمان خانے کی حدود سے نکل کر میں اپنے کمرے میں آ گئی اور انٹرکام پر عثمانی کو تمام حالات سے آگاہ کرنے کے بعد اس سے شیخ مجید کے بہنوئی مشتاق احمد کا ٹیلی فون نمبر معلوم کیا۔ شیخ مجید کا قیام اپنے بہنوئی کی کوٹھی ہی میں تھا۔

یہ محض ایک حسن اتفاق ہی تھا کہ جب میں نے ٹیلی فون نمبر ملایا تو دوسری جانب سے خود شیخ مجید نے ریسیور اٹھایا۔ غالباً اسے کسی کے فون کا انتظار رہا ہو گا اسی لئے اس نے فوراً ریسیور اٹھا لیا۔ "شیخ مجید اسپیکنگ۔"

"میں عذرا خان بول رہی ہوں شیخ صاحب!" میں بول اٹھی۔ "آپ نے پہچانا مجھے؟"

"جی...... جی ہاں...... غالباً ایک بار آپ سے ملاقات بھی ہو چکی ہے۔"

"غالباً نہیں بلکہ یقیناً...... مجھے ایک مبارکباد بھی دینا تھی آپ کو!"

"وہ کس سلسلے میں خاتون؟" اس نے چونک کر کہا۔

"آپ کا حریف شہریار مشاورتی کمیٹی سے استعفیٰ دے چکا ہے کیا یہ بات آپ کے لئے قابل مبارکباد نہیں؟"

"یقیناً ہے...... شکریہ خاتون...... لیکن آپ نے صرف اسی لئے مجھے فون کیا تھا؟"

"جی نہیں ایک چھوٹی سی زحمت اور دینا تھی آپ کو!"

"فرمائیے! میں آپ کی بات توجہ سے سن رہا ہوں۔"

"دراصل مجھے آپ کے ایک غیر ملکی مہمان سے فون پر کچھ ضروری اور اہم گفتگو کرنا ہے اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اسے فون پر بلوا دیں۔" میں نے دانستہ فوری طور پر موشوروف کا نام نہیں لیا۔

"غیر ملکی مہمان...... میں سمجھا نہیں...... میں تو خود یہاں اپنے بہنوئی کا مہمان ہوں۔ آپ کس غیر ملکی مہمان کی بات کر رہی ہیں؟"

"وہی جو گزشتہ رات ایک معرکے میں زخمی ہو چکا ہے!" میں معنی خیز لہجے میں بولی۔ "آپ فرمائیں تو میں اس کا نام بھی بتا دوں! پاکستان میں اسے آپ ہی کی پشت پناہی تو حاصل ہے! زخمی ہونے کے بعد بھلا وہ اور کہاں پناہ لیتا۔"

"معلوم نہیں یہ آپ کیا باتیں کر رہی ہیں! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟"

"شہریار کے استعفے کے بعد تو آپ کی سمجھ میں بہت کچھ آ جانا چاہئے شیخ صاحب!" میرے

لہجے میں چبھن تھی۔ "بیرونی بڑی طاقتوں سے ساز باز کا نتیجہ بالآخر یہی ہوتا ہے۔"

"آپ کے اس طنز کا مطلب بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخر آپ چاہتی کیا ہیں......؟ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میرے ذہن پر آپ کا اچھا تاثر تھا مگر اس وقت خود آپ فضول اور بے معنی باتیں کر کے یہ تاثر خراب کر رہی ہیں!"

"مجھے علم ہے شیخ صاحب کہ آپ میری بات کی تہہ تک پہنچ چکے ہیں اور جو کچھ ڈھکے چھپے لفظوں میں شہریار کے حوالے سے کہہ چکی ہوں اس بھی خوب سمجھ گئے ہیں...... خیر یہ باتیں پھر کبھی سہی اگر آپ کسی سبب یہ اقرار نہیں کرنا چاہتے کہ کوئی غیر ملکی آپ کا مہمان ہے تو اس تک میرا ایک پیغام ضرور پہنچا دیجئے گا کہ میں اس کی محبوبہ جین کی رہائی کے سلسلے میں اس کی پیشکش قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ وہ فون پر مجھ سے بات کر لے۔ زحمت تو ہو گی آپ کو ذرا میرا فون نمبر لکھ لیجئے!" پھر میں نے ذرا توقف سے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا فون نمبر بتا دیا۔ اس کے بعد مزید کوئی بات کئے بغیر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

توقع بھی مجھے یہی تھی کہ شیخ مجید موشوروف کی میزبانی کا اقرار نہیں کرے گا مگر میں نے اپنے ذہن میں پہلے ہی سے اس کا حل سوچ رکھا تھا۔ موشوروف کے فون کا انتظار مجھے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں کرنا پڑا۔ اس کی آواز سے نقاہت کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے اس کی آواز پہچانتے ہی پوچھا۔ "اب تم کیسے ہو موشوروف؟"

"پہلے سے بہتر ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تو شیخ مجید نے تم تک میرا پیغام پہنچا دیا...... وہ تو سرے ہی سے انکاری تھا کہ کوئی غیر ملکی اس کا مہمان ہے۔"

"آپ تو جانتی ہیں عذرا خان کہ ایسے معاملات میں یہی ہوتا ہے۔ بہرحال میں آپ کا انتہائی شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری پیشکش قبول کر لی۔"

"تم نے ناحق بے صبری سے کام لیا...... جب تمہارے میرے درمیان گفتگو ہو چکی تھی تو تمہیں کم از کم ایک دن تو انتظار کرنا ہی چاہئے تھا!"

"میں جلد بازی پر واقعی شرمندہ ہوں عذرا خان...... لیکن اس کا سبب یہ تھا کہ مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔"

"اور اسی بے یقینی کے نتیجے میں تمہیں خواہ مخواہ زخمی ہونا پڑا۔ خیر اب یہ بتاؤ کہ میں جین کو کہاں بھجواؤں......؟ کیا تمہارے پاس براہ راست شیخ مجید کے بہنوئی کی کوٹھی پر یا پھر کہیں اور؟ تم جو کہو میں کرنے کو تیار ہوں۔"

دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی پھر موشوروف نے کی آواز سنائی دی۔ "معلوم نہیں اب بھی مجھے کیوں یقین سا نہیں آ رہا کہ میری جین بخیریت مجھ تک پہنچ جائے گی۔ آپ نے اچانک اس کی رہائی کا فیصلہ کیسے کر لیا......؟ گزشتہ رات کی معرکہ آرائی کے بعد تو مجھے قطعی امید نہ رہی تھی کہ آپ میر درخواست قبول کر لیں گی۔"

"اتنا سمجھ لو موشوروف کہ میں نے یہ فیصلہ تم سے دب کر یا خوف زدہ ہو کر نہیں کیا۔ تمہیں شاید علم ہو کہ میں بھی تمہاری طرح غیر معمولی ذہن کی مالک ہوں اور یہ کہ میری معلومات کے ذرائع بھی حیرت انگیز ہیں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ اب تم صرف اپنی انا کی خاطر میری شکست چاہتے تھے اور تمہاری حکومت کو مجھ میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔"

"حیرت انگیز......! واقعی حیرت انگیز! اس لئے کہ ان باتوں کا علم تو میرے سوا جین کو بھی نہیں تھا پر یہ کس طرح آپ کو معلوم ہو گئیں! یہ واقعی میرے لئے تعجب خیز بات ہے۔" موشوروف کے لہجے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"خیر اب یہ بتاؤ کہ تم دھوکا تو نہیں دو گے مجھے؟" میں بول اٹھی۔

"دھوکا......! کیسا دھوکا عذرا خان؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ اپنے وعدے کے مطابق جین کی رہائی کے بعد میرے معاملے سے ہاتھ کھینچ لو گے نا؟"

"آپ کو تو خود ہی سب کچھ معلوم ہو چکا ہے کہ اس معاملے میں اب میری حکومت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں۔ ہاں یہ دباؤ ضرور ڈالا جا رہا ہے کہ اس معاملے کو پرولانگ نہ کیا جائے! میں نے کچھ مہلت چاہی تھی جو مل گئی تھی لیکن اب میں کھلے دل سے آپ کے مقابل اپنی پسپائی تسلیم کرتا ہوں۔ شاید میری زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقع ہو کہ میں نے خود شکست قبول کر لی ہو۔"

"کبھی کبھی دل کے ہاتھوں آدمی اتنا ہی مجبور ہو جاتا ہے موشوروف! تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ عورت کی خاطر سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں تمہارا عشق مبارک ہو! بولو جین کو میں کہاں بھیجوں؟"

"آپ اسے جہاں سے لائی تھیں وہیں پہنچا دیں......! خود میں بھی اب یہاں سے وہیں جاؤں گا۔ اسی کے ساتھ آپ سے میں چند دن کی اور مہلت چاہوں گا! جب تک میں مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتا یہاں آپ کے ملک سے نہیں جا سکوں گا۔ کیا آپ مجھے چند دن کی یہ مہلت دے سکتی ہیں؟" موشوروف عاجزانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"کیوں نہیں موشوروف......! دراصل مجھے تمہارے یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ اجازت اور مہلت تمہیں اسی صورت میں دی جا رہی ہے کہ تم میرے یا میرے ملک کے خلاف کوئی غلط قدم نہ اٹھاؤ......! اگر اب بھی تم نے ایسا کیا تو اس کی تمام تر ذمے داری خود تمہی پر ہو گی!"

"یقین کریں عذرا خان کہ آپ کو میری طرف سے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ آپ دیکھیں گی کہ موشوروف محسن کش نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ زندگی کے کسی اور موڑ پر ہماری ملاقات ہو ایسی صورت میں آپ موشوروف کو اپنا مخلص دوست اور وفادار ہی پائیں گی!" اس کی آواز میں خلوص تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے موشوروف......! اب سے ایک گھنٹے کے بعد یا ایک گھنٹے کے اندر اندر جین کو اسی کوٹھی میں پہنچا دیا جائے گا جہاں سے میں اسے لے کر آئی تھی اور کچھ؟"

"جی نہیں! میرے لئے یہی سب کچھ ہے۔ ایک بار پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور

گزشتہ رات کی غیر ذمے دارانہ حرکت پر معافی کا خواستگار ہوں۔"

"نیور مائنڈ......! وش یو گڈ لک!" یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اپنے کمرے سے نکل کر میں نے ڈیوٹی روم کا رخ کیا۔ ٹی وی اسکرین پر جین کے کمرے کا منظر تھا اور عثمانی کی نگاہ اسکرین ہی پر تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ میری طرف مڑا۔ میں نے ٹی وی بند کرنے کا اشارہ کیا۔ اس نے فوراً تعمیل حکم کی۔ میں اسکرین پر دیکھ چکی تھی کہ جین کھانا کھا کر پانی پی رہی تھی۔

میں نے مختصراً عثمانی کو اپنے اور موشوروف کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور بولی۔ "زندگی میں پہلی بار اپنے کسی حریف سے میں نے اس طرح کا معاہدہ کیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟ کیا میرا یہ اقدام درست ہے؟ اور کیا واقعی موشوروف اپنے عہد پر قائم رہے گا؟"

"حالات و واقعات کے پیش نظر یہ معاملہ عجیب تو ضرور ہے مگر آپ کے اقدام کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔" عثمانی نے اپنی رائے دی۔

"عثمانی! تم اپنی جگہ یہاں سیل کے کسی اور سینئر رکن کو بٹھا کر خود جین کو اس کوٹھی تک پہنچاؤ گے!" میں نے اسے ہدایت دی۔ "تم چاہو تو اپنی معاونت کے لئے سیل کے کسی اور رکن کو بھی ساتھ لے جا سکتے ہو۔ تیاری کے لئے میں تمہیں صرف پندرہ منٹ دوں گی۔ پندرہ منٹ بعد تم جین کے کمرے میں آ جاؤ گے۔ وہ تمہیں بے ہوشی کی حالت میں ملے گی۔ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ جس حالت میں اسے یہاں لایا گیا تھا اسی میں یہاں سے لے جایا جائے! میں اس سلسلے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی......! اور ہاں جین اور موشوروف کے پاسپورٹ کے علاوہ جو ان کے دیگر ضروری کاغذات ہیں وہ بھی میرے حوالے کر دو۔ وہ پاسپورٹ اور کاغذات بھی جین کے سپرد کر دوں گی کہ وہ انہیں بھی اپنے اٹیچی کیس میں رکھ لے۔"

پھر عثمانی سیل کے ریکارڈ روم سے وہ کاغذات اور پاسپورٹ لے آیا اور میرے سپرد کر دیئے۔ اس کے بعد وہ بولا۔ "جین کے کمرے کی چابی وہیں متعین محافظوں کے پاس ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈیوٹی روم سے نکل آئی۔

جب کچھ دیر بعد میں جین کے کمرے میں پہنچی تو وہ کافی کی چسکیاں لے رہی تھی۔

"جلدی سے کافی پی کر لباس تبدیل کر لو جین......! تمہیں مبارک ہو کہ تم اب سے کچھ دیر بعد اپنے محبوب کے پاس پہنچ جاؤ گی۔"

اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ مزید حسین نظر آنے لگی۔ "کیا موشوروف سے آپ کی بات ہو گئی مس خان؟"

"ہاں جین......! اس نے کھلے دل سے میرے مقابل اپنی شکست قبول کر لی۔ صحت یاب ہونے کے بعد تمہیں وہ یہاں سے لے کر چلا جائے گا۔" میں نے اسے بتایا پھر پاسپورٹ اور کاغذات

اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "یہ بھی تم اپنے ساتھ لے جاؤ! یہ تمہارے اور موشوروف کے پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات ہیں۔ انہیں سنبھال کر احتیاط سے اپنے اٹیچی کیس میں رکھ لو! میں نہیں چاہتی کہ پاکستان سے روانگی میں تم لوگوں کو کسی قسم کی تاخیر یا دشواری ہو!"

"تھینک یو سو مچ مس عذرا خان!" اس نے مجھ سے پاسپورٹ اور کاغذات لے لئے پھر کافی کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "شاید میں زندگی بھر آپ کو نہیں بھول سکوں گی مس خان! آپ جیسی کوئی خاتون پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزری۔"

"اور جین تم بھی مجھے یاد رہو گی تم جیسی بظاہر معصوم لیکن انتہائی خطرناک لڑکی بھی اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھی۔"

جواباً وہ صرف مسکرا دی اور پھر الماری سے اپنا اٹیچی کیس نکال کر اس میں پاسپورٹ اور کاغذات رکھنے لگی۔ اس کے بعد وہ اٹیچی کیس سے اپنا ایک جوڑا نکال کر باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ میں اس کے انتظار میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

جلد ہی لباس تبدیل کر کے جین باتھ روم سے باہر آ گئی۔ ریشمی گاؤن اس کے ایک ہاتھ پر لٹکا ہوا تھا جو وہ اس سے پہلے پہنے ہوئے تھی۔

"ایک افسوس بہرحال رہے گا۔" جین اپنے اٹیچی کیس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی جو اس نے الماری سے نکال کر میز پر رکھ دیا تھا۔

"کس بات کا افسوس؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"موشوروف کو محض میری وجہ سے شکست قبول کرنا پڑی۔" وہ اٹیچی کیس میں اپنا ریشمی گاؤن رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"صرف تمہاری ہی وجہ سے نہیں میری وجہ سے بھی جین!" میں ہنستے ہوئے بولی۔ "میں اس کے قابو میں آنے والی شے نہیں تھی۔"

"ہاں یہ بھی ہے!" وہ بھی ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔ "کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی؟ موشوروف نے مجھے کہاں پہنچانے کو کہا ہے؟"

"تمہارے ساتھ میرا جانا کچھ ایسا ضروری نہیں......! پھر کیا خبر مجھے قریب دیکھ کر موشوروف کا ارادہ بدل جائے......! اور وہ پھر مجھے زیر دام لانے کی خواہش کرنے لگے اس لئے تمہارے ساتھ میرا نہ جانا ہی بہتر ہے۔ تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ تمہیں میں جہاں سے لائی تھی وہیں پہنچوا دوں گی۔ اس سلسلے میں موشوروف سے میری بات ہو چکی ہے۔ خود موشوروف بھی باتھ آئی لینڈ سے۔ اسی کوٹھی میں منتقل ہو رہا ہے ممکن ہے کہ جب تم وہاں پہنچو تو وہ تمہیں اپنا منتظر ملے۔"

جین اس دوران میں اپنا تمام سامان اٹیچی کیس میں رکھ چکی تھی اور اپنی دانست میں چلنے کے لئے بالکل تیار تھی۔

"جین! تمہیں رخصت کرنے سے پہلے میں تمہاری پیشانی پر آخری بوسہ دینا چاہتی ہوں تمہیں

کوئی اعتراض تو نہیں! کیا خبر پھر کبھی تم سے ملاقات ہو یا نہ ہو!"

میری بات سن کر وہ فوراً گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے قریب آ گئی۔

میں نے اس کی روشن اور حسین پیشانی پر بوسہ دیا پھر آہستہ سے بولی۔ "اس آخری بوسے اور آخری جسارت کے لئے مجھے معاف کر دینا جین کہ یہ میری مجبوری تھی!" اسی کے ساتھ میرا ایک نپا تلا ہاتھ جین کی دائیں کنپٹی پر پڑا اور وہ حیران حیران سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔ میں نے دراصل پیشانی پر بوسہ دینے ہی کے بہانے اسے اپنے قریب بلایا تھا ورنہ وہ کھٹک جاتی اور میں اسے اتنی آسانی سے بے ہوش نہ کر پاتی۔ میں نے جین کے بے ہوش جسم کو مسہری پر ڈال دیا۔

جین کے کمرے میں آئے ہوئے مجھے اب تقریباً پندرہ منٹ ہونے والے تھے۔ میں نے عثمانی کو پندرہ منٹ ہی کا وقت دیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد عثمانی کمرے میں داخل ہوا اور پھر اس نے میرے اشارے پر جین کے بے ہوش جسم کو مسہری سے اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ سیل کا ایک اور رکن بھی تھا۔

کچھ ہی دیر میں ایک سیاہ بند وین آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہو گئی۔ عثمانی احتیاطاً وین کے عقبی حصے میں جین کے ساتھ تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سیل کا دوسرا رکن تھا۔

جین کو رخصت کر کے میں اپنے کمرے میں آ گئی اور پی آئی اے انکوائری کا ٹیلی فون نمبر ملایا۔ انکوائری سے مجھے معلوم ہوا کہ آئندہ شب ڈھاکہ کے لئے روانہ ہونے والی ایک فلائٹ میں مجھے سیٹ مل سکتی ہے۔ عثمانی جب جین کو چھوڑ کر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر واپس پہنچ گیا تو میں نے کل رات کی فلائٹ سے سیٹ کی بکنگ کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے آ کر بتایا کہ وہ کوٹھی ویران ہی پڑی تھی جب وہ جین کو لے کر وہاں پہنچا۔ جین کو وہ بے ہوشی کی حالت ہی میں اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت تک یا تو موشوروف وہاں نہیں پہنچ سکا تھا یا اگر وہاں پہنچ چکا تھا تو اس نے سامنے آنے سے گریز کیا تھا۔

دوسرے دن شام ٹھیک پانچ بجے میں اپنی کوٹھی میں محترم وزیر داخلہ کے فون کی منتظر تھی۔ وقت مقررہ پر فون کی گھنٹی بج اٹھی اور میں نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری جانب میری متوقع شخصیت ہی تھی۔ سلام لینے اور دعا دینے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

"میں آج ہی رات کی ایک فلائٹ سے ڈھاکہ روانہ ہو رہی ہوں۔" میں جواباً بولی۔ "آپ کا حکم بھلا میں کس طرح ٹال سکتی ہوں!"

"ویری گڈ!" انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ "مجھے تم سے یہی امید تھی۔ وہاں پہنچ کر تم صوبائی ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری سے پہلے ملنا تا کہ تمہیں یہ علم ہو سکے کہ اب تک پولیس، انٹیلی جنس اور حکومت کے دوسرے اداروں نے امریکی تخریب کاروں سے نمٹنے کے لئے کیا کیا کارروائیاں کی ہیں اور یہ کہ وہ مشرقی پاکستان کے کون سے علاقے میں زیادہ سرگرم عمل ہیں! اس سے یقیناً تمہیں آگے بڑھنے میں آسانی ہو گی۔ حکومت کے تمام ادارے تمہارے ساتھ ہر مرحلے پر پورا تعاون کریں گے بشرطیکہ تم یہ

تعاون قبول کرو!''

''بہتر ہے...... میں ڈھاکہ پہنچ کر آپ کی ہدایت کے مطابق پہلے صوبائی ہوم سیکرٹری ہی سے ملوں گی۔ میری کامیابی کے لئے دعا کیجئے گا!''

''ضرور! تم جس مشن پر اور جس نیک مقصد کے تحت یہاں سے جا رہی ہو وہ قابل ستائش ہے۔ خدا اپنے ایسے نیک بندوں کی مدد ضرور کرتا ہے۔ میں آج ہی مشرقی پاکستان کی انتظامیہ کے نام احکام جاری کر دوں گا اور فون پر چودھری سے بھی بات کرلوں گا کہ وہ تم سے ہر ممکن تعاون کرے۔''

''شکریہ محترم!'' میں نے کہا۔ ''اور کوئی حکم۔''

''بس یہی حکم ہے کہ آئندہ تم یہ لفظ حکم استعمال نہیں کرو گی! خدا حافظ!'' ان الفاظ کے ساتھ ہی ٹیلی فون لائن بے جان ہو گئی۔

پھر اسی شب کراچی ایئر پورٹ سے ڈھاکہ پہنچنے کے لئے جہاز فضا میں بلند ہوا تو نہ جانے کیوں میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ میں اپنے دیرینہ اور خطرناک حریفوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایک بار پھر سرگرم عمل ہو گئی تھی۔ میرے اور میرے دیرینہ حریفوں کے درمیان ہونے والی متوقع جنگ کا انجام کیا ہو گا فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

اطلاعات کے مطابق میرے حریف سولومن کو ڈھاکہ میں دیکھا گیا تھا مگر قانون نافذ کرنے والے اداروں سے اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے تھے۔ سولومن اور اس کے ساتھی امریکی ایجنٹوں کے عزائم تو مجھ پر کھلے ہوئے تھے۔ حکومت وقت سے مغربی پاکستان میں میرے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد سولومن مشرقی پاکستان کو اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ میرے ملک کا یہ حصہ اپنے مخصوص سیاسی حالات اور غربت کے سبب اس کے لئے خاصا سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔

میرے لیے مشرقی پاکستان نیا نہیں تھا۔ پہلے بھی میں متعدد بار یہاں آ چکی تھی۔ چاٹگام سے ڈھاکہ تک یہاں کے سارے ہی اہم شہر میرے دیکھے بھالے تھے۔ یہاں مجھے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ اب سے تین سال پہلے جب میں ڈھاکہ آئی تھی تو سوچا تھا کہ یہاں کمیونیشن سیل ہیڈکوارٹرز کی ایک شاخ قائم کروں مگر مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ البتہ اس ضمن میں چند لوگوں سے میری ابتدائی گفتگو ضرور ہو گئی تھی۔ انہی لوگوں میں سے ایک بہاری نوجوان بابر تھا۔ وہ محب وطن اور مہم جو قسم کا نوجوان تھا۔ اس نے ڈھاکہ میں اپنے طور پر ایک چھوٹی تنظیم کی داغ بیل ڈالی جس کے ارکان اس کے دوست احباب تھے۔ اس تنظیم کا مقصد بھی کم و بیش وہی تھا جس کے لیے میں نے کمیونیشن سیل ہیڈکوارٹر قائم کیا تھا۔ وسائل نہ ہونے کے سبب بابر ناکام رہا تھا۔ اس ناکامی کی بڑی وجہ ملک دشمن عناصر بھی تھے جن کے خلاف بابر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ بابر یو پی کے شہر بریلی کے ایک معزز خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا خاندان بریلی سے ہجرت کر کے ڈھاکہ میں آباد ہوا تھا۔ اس خاندان نے یہاں بھی عزت و شہرت حاصل کر لی تھی۔ بابر کے والد کا شمار ڈھاکہ کے دولت مند بہاری لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بابر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے مگر بابر کے دل و دماغ میں کچھ اور ہی سمائی ہوئی تھی۔ بابر کے والد شیر محمد خان سے میرے تجارتی مراسم تھے۔ انہی کے توسط سے بابر سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ڈھاکہ کے دوران قیام میں بابر اپنے نظریات و خیالات کے سبب مجھ سے خاصا قریب ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر زندگی نے کبھی مہلت دی تو اس کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے میں اس کی مدد ضرور کروں گی۔ ایک طویل عرصے کے بعد اب میں پھر ڈھاکہ آئی تھی تو مجھے بابر یاد آ رہا تھا۔ مجھے پتا ہے کہ اس نے ایک آدھ خط بھی لکھا تھا مگر میں اپنی مصروفیت کے سبب جواب نہیں دے سکی تھی۔ بابر اب بھی ویسا ہی تھا یا اس کے نظریات بدل گئے تھے، یہ مجھے معلوم کرنا تھا۔ تحقیق کر کے میں اس سے بہرحال ملنا ضرور چاہتی تھی۔

زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اس شب بابر کے علاوہ بھی اور بہت سے چہرے بہت سے منظر میری چشم تصور میں ابھرتے رہے پھر انہی چہروں اور انہی منظروں کی دھوپ چھاؤں میں سفر تمام ہو گیا۔ میں جہاز کی سیڑھیوں سے اتر رہی تھی تو صبح کا اجالا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ بنگال کی فرحت بخش ہوا میں گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی میں بس میں آ بیٹھی۔

جلد ہی ضروری کارروائی سے فارغ ہو کر میں باہر نکل آئی۔ میرے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک ایئر بیگ تھا جو میں نے شانے سے لٹکا رکھا تھا' اس کے علاوہ ایک سوٹ کیس تھا جو ایک پورٹر نے اٹھا رکھا تھا۔ میرا ارادہ ایئرپورٹ روڈ ہی کے ایک ہوٹل میں قیام کا تھا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد اس ہوٹل کی جگہ ایک ہسپتال بنا دیا گیا ہے۔ ایئرپورٹ سے اس ہوٹل کا فاصلہ تقریباً دو میل تھا۔ ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر قدم رکھتے ہی کئی ٹیکسی والے میری طرف لپکے۔ پھر انہی میں سے ایک نے پورٹر سے میرا سوٹ کیس لے لیا۔ بقیہ ٹیکسی والے دوسرے مسافروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میرے اشارے پر پورٹر نے سوٹ کیس اس ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کر دیا تھا۔ اپنا ایئر بیگ بھی میں نے ٹیکسی والے کے سپرد کر دیا۔ اس نے ٹیکسی کی ڈکی کھول کر سوٹ کیس اور ایئر بیگ رکھ دیا۔ اسی دوران میں اسے میں نے بتا دیا کہ کہاں چلنا ہے اور پورٹر کو بھی پیسے دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے بعد میں ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ ڈکی لاک کر کے ٹیکسی ڈرائیور بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور پھر دوسرے ہی لمحے ٹیکسی اسٹارٹ ہو گئی۔

ٹیکسی کے آگے بڑھتے ہی میں نے یوں ہی سرسری طور پر اردگرد کا جائزہ لیا۔ ٹیکسیوں کے علاوہ ادھر ادھر پرائیویٹ کاریں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک نیلے رنگ کی کار میری ٹیکسی کے ساتھ ساتھ ہی اسٹارٹ ہوئی۔ اسے ایک متوسط عمر کا شخص ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس شخص پر یوں بھی میری نگاہ پڑی کہ وہ میری ہی طرف متوجہ تھا۔ کار میں اس کے علاوہ پچھلی سیٹ پر دو افراد اور بھی تھے۔ کار ڈرائیو کرنے والے کی آنکھوں پر سیاہ شیشوں کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ میں کوئی نوٹس نہ لیتی۔ اپنے حلیئے اور انداز و اطوار سے وہ اچھے لوگ معلوم نہیں ہو رہے تھے۔

ذرا ہی دیر کے بعد مجھے یہ احساس ہو گیا کہ نیلی کار میری ٹیکسی کا تعاقب کر رہی ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی غالباً سمجھ گیا کہ ٹیکسی کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ بار بار عقبی آئینے پر نگاہ ڈال رہا تھا۔

میری منزل شاہ باغ ہوٹل ابھی دور تھی کہ اچانک پیچھے آنے والی کار کی رفتار تیز ہو گئی۔ شاید وہ لوگ ٹیکسی سے آگے نکل کر اسے روک لینا چاہتے تھے۔ درمیانی فاصلہ تیزی سے کم ہونے لگا۔ ڈرائیور کے چہرے پر میں نے سراسیمگی کے آثار دیکھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی ٹیکسی کی رفتار بڑھا رہا ہے۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ''وہ لوگ آگے نکلنا چاہتے ہیں' انہیں راستہ دے دو۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ٹیکسی کو ایک طرف کر لیا۔ پیچھے آنے والی کار تیزی سے آگے نکل کر میری توقع کے عین مطابق سڑک پر ترچھی کھڑی ہو گئی جس سے راستہ مسدود ہو گیا۔ ذہنی

طور پر ٹیکسی ڈرائیور پہلے ہی سے کسی ایسی صورت حال کیلئے تیار تھا اس لئے اس نے فوراً بریک لگا دیئے اور ٹیکسی رک گئی۔

ٹیکسی رکتے ہی وہ تینوں کار سے اتر آئے تھے اور اب ٹیکسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان تینوں ہی کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

ان میں سے وہی جو کار ڈرائیو کر رہا تھا' ٹیکسی والے سے قریب آ کر مخاطب ہوا۔ ''ان محترمہ کا سامان ہماری کار میں رکھ دو' یہ ہماری مہمان ہیں۔ کرایہ ہم سے لے لو۔'' پھر وہ ذرا سا جھک کر میری طرف متوجہ ہوا۔ ''محترمہ! آپ خود اس ٹیکسی سے اتر کر کار میں بیٹھ جائیں گی یا پھر یہ خدمت مجھے انجام دینا پڑے گی؟'' لفظ ''خدمت'' پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔

''تم لوگوں کو زحمت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ ''میں خود ہی تم لوگوں کی خدمت کرنے پر راضی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ میں نے ان کے چہروں پر حیرت کے آثار دیکھے تھے۔ شاید انہیں مجھ سے یہ توقع ہو گی کہ میں اپنی جاں بخشی کیلئے ان سے التجائیں کروں گی۔

مجھے ٹیکسی سے اتر کر اور ان لوگوں کے مقابل آتے دیکھ کر یقیناً ٹیکسی ڈرائیور کا حوصلہ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ بھی اسی لیے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا تھا' مگر وہ جرات اسے مہنگی پڑی۔ چشمے والے نے اچھل کر اس کے پیٹ پر لات ماری اور وہ چیختے ہوئے اپنا پیٹ پکڑ کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

ان کی طرف سے پہل ہو چکی تھی اس لیے میں نے مزید دیر نہیں کی۔ پہلے میں نے چشمے والے ہی کو سبق دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ میری طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنے ساتھیوں کو حکم دے رہا تھا۔ ''اسے اٹھا کر کار میں ڈال لو۔''

اس کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ آگے بڑھ کر میں نے اس کے منہ پر پنچ مارا اور اس کا منہ دوسری طرف پھر گیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کا اوپری ہونٹ پھٹ گیا تھا جس سے خون بہنے لگا۔ اپنے سربراہ کو زخمی دیکھ کر بقیہ دونوں افراد اچانک مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ان میں سے ایک کی کنپٹی پر میرا گھونسا پڑا اور وہ لہرا کر زمین بوس ہو گیا' دوسرے کے پیٹ پر میرے گھٹنے کی ضرب پڑی اور وہ بھی چیختا ہوا جھکنے لگا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چشمے والے نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور میں تیزی کے ساتھ دائیں جانب ہٹ گئی۔ وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ پھر میں نے ان تینوں ہی کو لاتوں پر رکھ لیا۔ میں انہیں ایسا سبق دینا چاہتی تھی کہ آئندہ وہ کسی اکیلی عورت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔ اس دوران ٹیکسی والا اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔ اس نے شاید اپنی زندگی میں پہلی بار ایک عورت کو تین مردوں پر یوں حاوی آتے دیکھا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ تینوں اس قابل نہیں رہے تھے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے۔ ان میں سے ایک شاید بیہوش ہو چکا تھا۔ لڑائی بھڑائی کے دوران میں انہی میں سے کسی کا پرس سڑک کے کنارے گر گیا تھا اور شاید اسی پرس میں سے وہ تصویر بھی نکل کر باہر گر گئی تھی جس نے مجھے چونک اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تصویر میری تھی۔

میرا ارادہ تھا کہ ان لوگوں کو وہیں اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو جاؤں گی۔ میرے نزدیک وہ معمولی قسم کے غنڈے تھے جو مجھے تنہا دیکھ کر ایئرپورٹ سے میرے پیچھے لگ گئے تھے لیکن اپنی تصویر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جو کچھ ہوا تھا' اتفاقی نہیں بلکہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنی تصویر اٹھا لی اور پھر حملہ آوروں میں سے ایک کے قریب پہنچ کر غرائی۔ ''بولو' یہ تصویر تمہیں کہاں سے ملی؟'' یہ کہتے ہوئے میں بیٹھ گئی اور اس شخص کے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر انہیں جھٹکا دیا۔

''مجھ...... مجھ کو کچھ نہیں معلوم...... یہ...... یہ تصویر اس...... کے پاس تھی۔'' اس شخص نے کراہتے ہوئے کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے اپنے بیہوش ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

بیہوش ہونے والا ان غنڈوں کا سربراہ تھا' وہی چشمے والا جو کار چلا رہا تھا۔ میں نے کراہتے ہوئے اس شخص کے لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ پھر اس کے دوسرے زخمی ساتھی نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ چشمے والے کے ہوش میں آنے کا انتظار فضول ہی تھا۔ معلوم نہیں اسے کب ہوش آتا۔ کچھ سوچ کر میں نے اس کا پرس اٹھا لیا اور پھر اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر جو بھی ملا اسے ایک رومال میں باندھ کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔

اب وہاں مزید رکنا کارآمد نہیں تھا۔ یہی سوچ کر میں نے ٹیکسی والے کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اسی کے ساتھ نیلی کار کے نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیے۔

ذرا ہی دیر بعد ٹیکسی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ڈھاکہ پہنچتے ہی جس انداز سے میرا استقبال ہوا تھا' میرے لیے حیران کن تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ کوئی میرے ڈھاکہ پہنچنے کا منتظر تھا۔ ڈھاکہ میں کون میرا منتظر ہو سکتا تھا' میرے لیے یہ سمجھنا بعید از قیاس تھا کیوں کہ وزیر داخلہ اور آپریشن سیل کے ارکان کے سوا کسی کو بھی میری ڈھاکہ روانگی کا علم نہیں تھا۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر پہلے سے کچھ لوگوں کا میرا منتظر ہونا' اس بات کا ثبوت تھا کہ کچھ افراد کو حتمی طور پر میرے پروگرام کا علم تھا۔ میں انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ ٹیکسی' شاہ باغ ہوٹل کے صدر دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ میں چونک اٹھی اور پھر ٹیکسی سے اتر آئی۔

ٹیکسی رکتے ہی ہوٹل کا ایک پورٹر قریب آ گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ڈکی کھول دی۔ پورٹر نے ڈکی سے میرا سوٹ کیس اور ایئر بیگ نکال لیا پھر ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کر کے میں پورٹر کے ساتھ ہوٹل کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

ہوٹل کی دوسری منزل پر مجھے ایک کمرہ بہ آسانی مل گیا۔ سفر بہرحال سفر ہوتا ہے' چاہے ہوائی جہاز ہی کا کیوں نہ ہو۔ میں نے ناشتہ کمرے ہی میں کیا اور پھر آرام کرنے کیلئے بستر پر دراز ہو گئی۔ فی الحال میں نے ہر خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ ابھی تک میں نے پرس اور اس سامان کا جائزہ بھی نہیں لیا تھا جو حملہ آوروں میں سے ایک کا تھا۔

کچھ دیر کو میری آنکھ لگ گئی' جب میں اٹھی تو سوا دس بج رہے تھے۔ میں باتھ روم میں گھس گئی

اور غسل کر کے لباس تبدیل کر لیا' پھر چائے منگوا لی۔ کچھ دیر سو لینے اور پھر غسل کرنے سے میری تھکن اتر گئی تھی۔ چائے پینے کے دوران میں اپنے ہینڈ بیگ سے میں نے حملہ آور کا پرس اور دوسرا سامان نکال لیا۔ اسی میں میری تصویر بھی تھی۔ اس پرس اور سامان کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ حملہ آور کا نام اکبر تھا اور وہ کسی شخص سبودمکرجی کا آلہ کار تھا۔ مجھے اس کے پرس سے سبودمکرجی کا ایک تحریری پیغام بھی ملا تھا جو انگریزی میں لکھا تھا۔ مکرجی نے اس فلائٹ کا نمبر اور وقت لکھا تھا جس سے میں ڈھاکہ پہنچ رہی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ شناخت کیلئے وہ میری ایک تصویر بھی بھیج رہا ہے۔ اس پیغام کے مطابق اکبر اور اس کے ساتھیوں کو مجھے اغوا کر کے دھان منڈی کی ایک کوٹھی میں پہنچانا تھا۔ اس کے بعد آج رات گرین کلب میں سبودمکرجی سے مل کر اپنا ''محنتانہ'' وصول کرنا تھا۔

سبودمکرجی میرے لیے ایک بالکل اجنبی نام تھا۔ اب سے پہلے نہ میں کبھی اس سے ملی تھی اور نہ ہی میں نے اس کا نام سنا تھا۔ میں حیران تھی کہ اسے اس فلائٹ کا علم کس طرح ہو گیا جس سے میں ڈھاکہ پہنچ رہی تھی؟ پھر یہ کہ میری تصویر اس کے پاس کہاں سے آ گئی؟ ان سوالوں کا فی الحال میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر مکرجی کسی سبب مجھے اغوا کرانا چاہتا تھا اور ایک بار اپنی اس کوشش میں ناکام ہو چکا تھا تو دوبارہ بھی وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ دھان منڈی کی جس کوٹھی میں مجھے اغوا کر کے پہنچایا جانا تھا' اس کا نمبر بھی میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ اب میں ڈھاکہ آ ہی چکی تھی اور اپنے دیرینہ حریفوں کے علاوہ نئے حریفوں سے بھی نمٹنا ہی تھا۔ مجھے زیر دام لانے کی خاطر' انہیں بہرحال سامنے آنا ہی پڑتا۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ اس حرکت کا مقصد وقتی طور پر مجھے الجھانا بھی ہو سکتا ہے تاکہ میں جس مقصد سے ڈھاکہ آئی ہوں اس پر توجہ نہ دے سکوں۔

محترم وزیر داخلہ کی ہدایت پر ڈھاکہ پہنچنے کے بعد مجھے صوبائی ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری سے ملنا تھا۔ میں نے پہلے اسی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہوم منسٹری کے دفاتر گرین روڈ پر ہیں۔ میں نے سوچا کہ پہلے فون پر ہوم سیکرٹری کو اپنی آمد سے مطلع کر دوں۔ میرے سلسلے میں یقیناً اب تک محترم وزیر داخلہ کی طرف سے انہیں ہدایات مل چکی ہوں گی۔

ہوٹل کے کمرے میں فون تو تھا مگر ڈائریکٹ نہیں۔ اس کے علاوہ وہاں ٹیلی فون ڈائریکٹری بھی نہیں تھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہوٹل کی ٹیلی فون آپریٹر سے رابطہ قائم کیا اور اپنا روم نمبر بتا کر بولی۔ ''یا تو آپ خود میرا مطلوبہ نمبر ڈھونڈ کر اس نمبر پر میری بات کرا دیں یا ٹیلی فون ڈائریکٹری میرے کمرے میں بھجوا دیں۔''

''آپ بتائیے کس کا نمبر چاہیے۔ میں نمبر خود تلاش کر کے ملا دوں گی۔ آپ کس سے بات کریں گی؟'' آپریٹر نے نرم اور مہذب لہجے میں کہا۔

''مجھے ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری سے بات کرنا ہے۔ آپ انہیں میرا نام بتا سکتی ہیں۔ عذرا خان نام ہے میرا۔''

''ہوم سیکرٹری!'' آپریٹر کے لہجے میں حیرت تھی اور لہجہ تصدیق طلب سا تھا۔

''ہاں مجھے انہی سے بات کرنا ہے۔'' میں نے تصدیق کر دی۔

''میں نمبر تلاش کر کے ملاتی ہوں' آپ انتظار کیجئے۔''

آپریٹر کی بات سنکر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر تقریباً پانچ منٹ انتظار کرنے کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب سے مجھے آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے بات کرنے کو کہہ رہی تھی۔

''ہیلو...... میں عذرا خان بول رہی ہوں۔ مجھے عبیدالرحمٰن چودھری صاحب سے بات کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں ان کا پی اے بول رہا ہوں میڈم!'' دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی۔ ''آپ ایک منٹ ہولڈ کیجئے چودھری صاحب دوسرے فون پر کسی سے بات کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے' میں ہولڈ کرتی ہوں' تم بات کراؤ۔''

مجھے مزید کچھ دیر انتظار کرنا پڑا اور پھر فون پر ایک بھاری سی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو چودھری اسپیکنگ۔''

''عذرا خان۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا۔ پھر کہا۔ ''میرے متعلق یقیناً آپ کو......''

''اوہ یس یس!'' وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔ ''میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ شاید آپ آج ہی تشریف لائی ہیں آپ کہاں ٹھہری ہیں۔''

''شاہ باغ ہوٹل میں۔'' میں نے بتایا۔

''ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی آپ...... میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں آپ کے قیام کا......''

''شکریہ!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں خود کو یہاں سرکاری مہمان سمجھ کر نہیں آئی...... خیر آپ یہ بتائیں کہ کب مل سکتے ہیں مجھ سے؟''

''جب آپ فرمائیں!'' وہ بولا۔ ''اگر چاہیں تو ابھی آ جائیں' دوپہر کا کھانا میرے ساتھ ہی کھا لیجئے گا۔ اگر آپ حکم کریں تو میں آپ کیلئے گاڑی بھیج دوں؟''

''گاڑی......'' میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''اچھا ٹھیک ہے' بھیج دیجئے۔'' پھر میں نے اسے اپنا روم نمبر بھی بتا دیا۔

''آدھے گھنٹے کے اندر گاڑی پہنچ جائے گی۔'' اس نے بتایا۔

''تھینک یو مسٹر چودھری۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

اگر خود عبیدالرحمٰن چودھری گاڑی بھیجنے کی پیشکش نہ کرتا تو میں شاید اس سے گاڑی کیلئے ہرگز نہ کہتی۔ ڈھاکہ پہنچتے ہی مجھے جو غیر متوقع واقعہ پیش آیا تھا' اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں ذرا احتیاط سے کام لوں۔ اگر یہ سہولت مل رہی تھی' وہ بھی بغیر کہے کہ ہوٹل سے یہ حفاظت میں سرکاری گاڑی میں ہوم منسٹری کے دفتر پہنچ سکتی تھی تو پھر اس میں تکلف سے کام لینے کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی۔ لباس میں پہلے ہی تبدیل کر چکی تھی اور اب مجھے صرف گاڑی کی آمد کا انتظار تھا۔

عبیدالرحمٰن چودھری سے فون پر بات کیے ابھی مجھے دس بارہ منٹ ہوئے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی

خلاف توقع پھر بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھالیا پھر جب آپریٹر نے مجھے بتایا کہ فون پر ایک شخص سبود مکرجی مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے تو میں چونک اٹھی۔

''کیا آپ بات کریں گی؟'' آپریٹر نے مجھے چپ دیکھ کر سوال کیا۔

''ہاں...... ہاں بات کراؤ۔'' میں نے سنبھل کر کہا۔ دوسرے ہی لمحے فون پر ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ وہ شخص انگریزی میں مجھ سے مخاطب تھا۔ ''سبود مکرجی آپ کو ڈھاکہ میں خوش آمدید کہتا ہے عذرا خان۔''

''مگر میں تو تمہیں نہیں جانتی۔'' میں نے پرسکون آواز میں کہا۔

''اگر نہیں جانتیں تو کیا ہوا' اب جان جائیں گی۔ مجھے افسوس ہے عذرا خان کہ ڈھاکہ پہنچنے کے بعد فوری طور پر آپ میری مہمان نہیں بن سکیں۔ میرے آدمیوں کی حماقت کی وجہ سے آپ کو ہوٹل ٹھہرنا پڑا۔ پھر بھی بہت جلد مجھے آپ کی میزبانی کا شرف حاصل ہو جائے گا' شاید آج ہی۔''

''تو یہ تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔'' میرے لہجے میں سختی آ گئی۔

''یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔''

''مگر تم چاہتے کیا ہو مجھ سے؟'' میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''وہی جو خوب صورت عورتوں سے چاہا جا سکتا ہے۔'' اس کا لہجہ مبتذل تھا۔

''ایڈیٹ!'' مجھے غصہ آ گیا۔ ''اگر تم میں ہمت ہے تو سامنے آ کر بات کرو...... یوں کسی چوہے کی طرح بل میں گھس کر کیوں بیٹھے ہو۔''

''خیر آپ کے سامنے تو آنا ہی پڑے گا۔ فی الحال تو میں آپ کی سریلی اور میٹھی آواز سننا چاہتا تھا۔ دیکھ لیں' دل سے دل کو راہ ہوتی ہے...... میں نے کس طرح آپ کو تلاش کر لیا۔'' وہ آہستہ سے ہنسا۔

''یہ کوئی کمال نہیں کیا تم نے۔'' میں مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولی۔ ''جب میں ایئرپورٹ سے ٹیکسی لے کر ہوٹل کیلئے چلی تھی تو تمہارے آدمی میرے اردگرد موجود تھے۔ تمہیں انہی سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں......''

''بہت عمدہ...... واقعی آپ کا اندازہ درست ہے۔'' اس نے میری تعریف کی۔ ''ویسے آپ نے میرے آدمیوں پر بہت ظلم کیا۔ ان میں سے ایک کی کلائی ٹوٹ گئی ہے۔''

''اس کے باوجود تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تم نے سبق حاصل نہیں کیا۔ اس واقعہ سے میں تمہارے ہاتھ پاؤں بھی توڑ سکتی ہوں۔''

''بنگال میں ابھی کوئی ایسا پیدا نہیں ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں توڑ سکے۔'' اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''میرا نام سبود مکرجی ہے عذرا خان۔ آپ ابھی مجھے جانتی نہیں۔''

''مگر میں بنگال میں پیدا نہیں ہوئی سمجھے۔ مجھے تمہارے ہاتھ پاؤں توڑتے ہوئے کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ ویسے تمہاری اطلاع کیلئے عرض کر دوں کہ میں بہت جلد خود ہی دھان منڈی کی اس کوٹھی تک پہنچ جاؤں گی جہاں مجھے پہنچانے کیلئے تم نے اکبر کو حکم دیا تھا۔'' میرے لہجے میں چبھن تھی۔

میری بات پر دوسری طرف چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ غالباً سبود مکرجی کے لیے میری بات

خلاف توقع تھی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے گہرا سانس لیا' پھر بولا۔ ''تو آپ اس کوٹھی کے بارے میں بھی جان گئی ہیں۔''

''ہاں......'' پھر میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ ''اور یہ بھی کہ وہ کوٹھی کس کی ملکیت ہے۔''

''اوہ!'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کو تو آج ہی میرا مہمان بن جانا ہے۔ جلد ہی ملاقات ہوگی آپ سے۔'' اسی کے ساتھ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے لہجے سے جلد بازی کا اظہار ہو رہا تھا۔

فون پر سبود مکرجی سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے خاص طور پر ایک بات نوٹ کی تھی کہ جیسے وہ آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا ہو' مگر یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ جب وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا تو اسے آواز بدل کر بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ دھان منڈی کی وہ کوٹھی اب میری نظر میں اہمیت اختیار کر گئی تھی جہاں مجھے اغوا کر کے پہنچایا جانا تھا۔ یقیناً اس کوٹھی کے ذریعے سبود مکرجی کا کچھ سراغ لگ سکتا تھا ورنہ اس کے لہجے سے تشویش کا اظہار نہ ہوتا۔

سبود مکرجی کا بار بار یہ کہنا کہ مجھے آج ہی اس کا مہمان بن جانا ہے' میرے لیے تشویش اور حیرت کا سبب تھا۔ آخر اس سلسلے میں وہ اتنا پر یقین کیوں تھا؟ یا پھر وہ اس طرح میری خود اعتمادی کو ختم کرنا چاہتا تھا؟ دھان منڈی کی اس کوٹھی کے بارے میں پولیس کے ذریعے بھی معلومات حاصل کرنا آسان تھا' مگر میں براہ راست سبود مکرجی سے نمٹنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری کو کچھ بتانے کا میرا ارادہ نہیں تھا۔

تقریباً پونے گیارہ بجے فون پر ہوم سیکرٹری سے میری بات ہوئی تھی کہ وہ میرے لیے گاڑی بھیج رہا ہے۔ سوا گیارہ بجنے میں دو ایک منٹ باقی تھے کہ فون پر استقبالیہ کلرک نے مجھے مطلع کیا کہ گاڑی آ گئی ہے۔ میں اپنا کمرہ مقفل کر کے نیچے آ گئی۔ وہاں ایک باوردی شخص مجھے اپنا منتظر ملا۔ نہ معلوم کیوں اس شخص کا میرے ذہن پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑا جسے ہوم سیکرٹری نے گاڑی دے کر بھیجا تھا کہ مجھے لے آئے۔ میں اس شخص کی رہنمائی میں ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ صدر دروازے کے سامنے ہی ایک لمبی سی سیاہ کار کھڑی تھی۔

ڈرائیور نے میرے لیے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے میں ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔ ''یہ سرکاری گاڑی تو نہیں لگتی۔ اس کی نمبر پلیٹ......''

''یہ صاحب کی اپنی ذاتی کار ہے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

میں ڈرائیور کے جواب سے مطمئن تو نہیں ہوئی مگر پھر بھی کار میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے کار کا دروازہ بند کر دیا اور پھر اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

ڈھاکہ آتے ہی مجھے غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لئے میں بہت چوکنا اور محتاط تھی۔ شاید اسی سبب میں اس کار کی نمبر پلیٹ پر بھی نگاہ ڈال لی تھی ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کار ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی تو میں نے محسوس کیا کہ ڈرائیور عقبی آئینے میں میرا جائزہ لے رہا ہے۔ ہر چند کہ ڈرائیور کے جسم پر سرکاری وردی تھی اس کے باوجود وہ مجھے کچھ کھٹک رہا تھا۔ اس کی حرکات

وسکنات پر اسی سبب میری نظر تھی۔

کار نے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ میں نے ڈرائیور کو ڈیش بورڈ کا ایک حصہ کھولتے دیکھا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' میں چونک کر بولی۔

''ابھی معلوم ہو جائے گا۔'' اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

''کیا مطلب؟''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ سبود بابو کا انتخاب برا نہیں ہے۔'' اس نے عقبی آئینے میں میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

میں تقریباً اچھل پڑی۔ ''تو...... تو تمہیں سبود مکرجی نے بھیجا ہے...... تم ہوم منسٹری سے نہیں آئے؟''

''اس بیچارے غریب ڈرائیور کو تو نہ جانے کب ہوش آئے گا جس سے میں نے یہ وردی زبردستی اتروائی تھی۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے غالباً کوئی بٹن دبا دیا۔

ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا اور پھر اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان شیشے کی ایک دیوار سی حائل ہو گئی۔ ابھی میں سوچ نہیں سکی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے' میری قوت شامہ کو بدبو سی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد کار کے پچھلے حصے میں ہلکا ہلکا دھواں سا بھرنے لگا۔ جب تک ممکن ہوا میں نے سانس روکا' مگر کب تک آخر بیہوشی کی گیس میرے پھیپھڑوں میں اتر ہی گئی۔ کھانستے کھانستے میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش آنے کے بعد کچھ دیر مجھے یاد ہی نہ آ سکا کہ میں کہاں اور کن حالات سے دوچار ہوں۔ پھر رفتہ رفتہ میرے تمام حواس بیدار ہو گئے۔ مجھے یاد آ گیا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور شاید اب میں سبود مکرجی کی قید میں ہوں۔ میرے لیے ہوم سیکرٹری نے جو گاڑی بھیجی تھی اس کے ڈرائیور کو ہوٹل پہنچنے سے پہلے ہی سبود مکرجی کے آدمی نے بیہوش کر دیا تھا اور سرکاری وردی اتروائی تھی' مگر اس بات کا علم سبود مکرجی کو کیسے ہوا کہ میرے لیے گاڑی بھیجی گئی ہے؟ یہ میرے لیے ایک معمہ ہی تھا۔

میں غالباً کسی آرام دہ بستر پر دراز تھی اور میرے ہاتھ پاؤں بھی آزاد تھے۔ میری اطراف تاریکی پھیلی ہوئی تھی جس سے میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہی تھا کہ میں کہاں ہوں۔

چند لمحے بعد اچانک سناٹا ٹوٹا اور میں نے کچھ سرگوشیاں سی سنیں۔

''سبود! میرا خیال ہے کہ اب اسے ہوش آ گیا ہوگا۔'' یہ کسی عورت کی آواز تھی۔

''ہاں۔'' میں نے جواب میں ایک بھاری اور آشنا سی آواز سنی' مگر مجھے یاد نہ آ سکا کہ پہلے یہ آواز میں نے کہاں سنی تھی۔ پھر وہی آواز مزید سنائی دی۔ ''مگر ابھی میں اس کے سامنے جانا نہیں چاہتا۔''

یہ آواز بہرحال نئی نہیں تھی جو میں نے فون پر سنی تھی۔

''میک اپ کر لو نا! اس میں کیا حرج ہے...... اس نے یوں بھی پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔''

نسوانی آواز پھر آئی۔

''ابھی میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔'' مردانہ آواز پھر ابھری جو شاید سبود مکرجی کی

اصل آواز ہی تھی۔ میرا یہ اندازہ غلط نہیں تھا کہ فون پر وہ آواز بدل کر بول رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

''اس کمرے میں روشنی تو کر دو...... میں بھی تو دیکھوں کہ وہ ہے کیسی جس کا اب تک اتنا نام سنا ہے۔'' نسوانی آواز میں اشتیاق تھا۔

''بظاہر بہت بھولی اور معصوم لگتی ہے وہ...... مگر دراصل کتنی خطرناک ہے' اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ ارے یہ سوئچ...... یہ کس نے دبا دیا تھا' شکنتلا تم بھی بے حد بے پروا رہتی ہو...... اگر اسے ہوش آ گیا ہوگا تو اسے ہماری ساری باتیں سنائی دے رہی ہوں۔ یہ...... یہ سوئچ تو اس لیے ہے کہ اگر ہمیں اس کمرے تک اپنی آواز پہنچانا ہو...... خیر میں اسے بند کیے دیتا ہوں۔''

پھر وہ آوازیں آنا بند ہو گئیں اور دوبارہ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ روشنی ہو گئی۔ میں نے دانستہ فوراً آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

''عذرا خان...... عذرا خان!'' مجھے اچانک وہی آواز سنائی دی جو فون پر میں نے سنی تھی۔ ''اگر تمہیں ہوش آ گیا ہے تو جواب دو۔''

''میں ہوش میں آ چکی ہوں سبود مکرجی!'' معاً میں بول اٹھی۔ ''مگر تم آواز بدل کر کیوں بول رہے ہو؟''

''آواز بدل کر!'' اس کے لہجے اور آواز سے یوں معلوم ہوا جیسے وہ چونک اٹھا ہو۔ ''نہیں تو...... میں اپنی اصلی آواز میں بول رہا ہوں۔''

''جھوٹ بول رہے ہو تم!'' میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس کمرے کا جائزہ لینے لگی جہاں اکیلی تھی۔ اس کمرے میں یقیناً کوئی خفیہ لاؤڈ سپیکر کسی جگہ موجود تھا۔ جس کے ذریعے مجھے سبود مکرجی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی ایسا بندوبست بھی تھا کہ وہ لوگ مجھے دیکھ بھی سکیں اور میری آواز بھی سن سکیں۔ میں وہاں ایک مسہری پر پر دراز تھی۔ مسہری کے علاوہ کمرے میں ایک الماری' ایک میز اور دو کرسیاں بھی تھیں۔ کمرے کا صرف ایک دروازہ تھا جو غالباً باہر سے بند تھا۔ کھڑکی کوئی بھی نہیں تھی۔ ذرا توقف سے میں نے سبود مکرجی کو پھر مخاطب کیا۔ ''شکنتلا سے پوچھو کہ میں اسے کیسی لگی؟ اسے شاید بڑی خواہش تھی مجھے دیکھنے کی۔''

''تو...... تو اس کا مطلب ہے کہ...... کہ تمہیں بہت پہلے ہوش آ گیا تھا...... خیر کوئی...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' سبود مکرجی کی آواز سے کچھ فکرمندی جھلک رہی تھی۔

''فرق پڑتا ہے!'' میں دانستہ ہنس پڑی اور پھر اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔ ''میں نے تمہاری اصل آواز سن لی ہے اور تمہیں شاید یہ جان کر بھی حیرت ہو کہ میں تمہیں تمہاری اصل آواز سے پہچان چکی ہوں۔ کبھی کبھی ذرا سی غلطی بڑے بھیانک نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔''

''اول تو یہ بات غلط ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا ہے' لیکن اگر ایسا ہے بھی تو تمہیں اب اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں مل سکے گا عذرا خان۔'' اس کی آواز میں سختی آ گئی۔

''وہ کس طرح؟'' میں بدستور پرسکون لہجے میں بولی۔

''اس طرح کہ تمہیں یہاں سے رہائی نصیب نہیں ہوگی۔ سمجھ گئیں۔''

''آج تک مجھے میری مرضی کے خلاف کوئی اپنی قید میں نہیں رکھ سکا۔ تم شاید مجھ سے اچھی طرح واقف نہیں ہو۔''

''مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے...... یہ بھی عذرا خان کہ ابھی تک کوئی مرد تمہارے قریب نہیں آ سکا' مگر اب...... اب سبود مکرجی کو تم اپنے قریب آنے سے نہیں روک سکو گی۔''

''تم اس آڑ میں اپنے اصل مقصد کو چھپانا چاہتے ہو یقیناً تم نے محض اسی لیے مجھے اغوا نہیں کرایا۔ تمہارا اصل مقصد کیا ہے اور یہ کہ تم کس کے اشارے پر ناچ رہے ہو' میں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' میں نے پھر دانستہ ایک ایسی بات کہہ دی جس کا مجھے قطعی علم نہیں تھا۔

جواباً خلاف توقع مجھے اس کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ''تم اندھیرے میں تیر چلاتی رہو' ممکن ہے اسی طرح حقیقت تک پہنچ جاؤ' لیکن اتنا یاد رکھنا کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔''

''تم کہتے ہو تو چلو میں یہ کوشش نہیں کروں گی' مگر تم آخر کب تک سامنے نہیں آؤ گے؟ کب تک پردہ نشیں بنے رہو گے؟ شکنتلا ہی کا مشورہ مان لو' میک اپ کر لو اپنے چہرے پر تاکہ میں تمہاری اصل شکل نہ دیکھ سکوں۔ تم اتنا ڈر کیوں رہے ہو مجھ سے...... میں تو پھر ایک عورت ہوں' کمزور اور بے بس مخلوق...... تم تو مرد ہو پھر مرد بنو نا ڈرتے کیوں ہو کیا میری اس دھمکی سے ڈر گئے ہو کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دوں گی...... تو چلو وعدہ...... پہلی ملاقات میں ایسا نہیں ہوگا۔''

''بکومت عذرا خان۔'' وہ برہم ہو گیا۔ ''میں تم سے ہرگز نہیں ڈرتا۔''

''اگر نہیں ڈرتے تو پھر شکنتلا سے یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ ابھی میرے سامنے جانا نہیں چاہتے؟''

''تم شاید اس طرح مجھے غصہ دلا کر یہ چاہتی ہو کہ میں تمہارے آ جاؤں' لیکن...... لیکن......''

''لیکن یہ کہ تم بزدل ہو اور بزدلوں ہی کو غصہ نہیں آتا۔'' میں نے اسے مزید چڑایا۔

''اگر...... اگر تم مجھے بزدل ہی سمجھ رہی ہو تو...... تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے عذرا خان...... اور میں تمہاری یہ غلط فہمی آج ہی دور کر دوں گا۔''

''زندہ باد!'' میں نے اسے مزید بانس پر چڑھایا۔ ''یہ ہوئی نا مردوں والی بات۔''

اس کے بعد سبود مکرجی کچھ نہیں بولا۔ میں نے کئی بار اسے آوازیں دیں مگر جواب میں خاموشی چھائی رہی۔ اس نے شاید وہ سوئچ آف کر دیا تھا جس کے ذریعے کسی اور کمرے میں اس تک میری آواز پہنچ رہی تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہاں سے فرار کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کمرے کی چھت خاصی اونچی تھی جہاں ایک روشن دان نظر آ رہا تھا جو کمرے میں ہوا کے گزر کی خاطر تھا۔ اگر کسی طرح اس روشن دان تک بھی میں پہنچ جاتی تو اس کے راستے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ روشن دان خاصا چھوٹا تھا۔

کمرے کا جائزہ لینے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچی کہ جب تک کوئی شخص کمرے کا دروازہ کھول

کر اندر نہیں آئے گا' یہاں سے فرار ہونے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ میرے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلنے کی منتظر رہوں۔ مجھے یقین تھا کہ سبود مکرجی یا جو بھی اس کا اصل نام تھا' اسے میری بھوک پیاس کا بھی خیال ہوگا۔ اس کمرے میں کھانے پینے کا سامان پہنچانے تو کوئی آئے گا۔ معلوم نہیں اس انتظار میں کتنا وقت گزر گیا۔ بس اچانک ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی اس کمرے کے دروازے کی طرف دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ قدموں کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی عورت ہی ہوسکتی ہے۔ چند لمحوں بعد قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آکر رک گئی اور پھر میں نے قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنی۔ میں تیزی کے ساتھ لپک کر دروازے کے قریب پہنچ گئی۔

ذرا سی دیر بعد دروازے کے دونوں پٹ پورے کھل گئے۔ میں ایک پٹ کی آڑ میں ہوگئی۔ آنے والی ایک دراز قد خوبصورت عورت تھی جس کے لمبے کھلے ہوئے سیاہ بال پشت پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ ساری پہنے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے سے خوف اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ جو میرے لیے غیر متوقع تھا۔ اس کی بڑی حسین آنکھوں میں غالباً خالی کمرہ دیکھ کر لمحہ بھر کو حیرت کا تاثر سا نظر آیا' پھر اس کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ ''عذرا خان عذرا خان! کہاں ہو تم؟'' وہ مجھے پکار رہی تھی۔

میں دیکھ چکی تھی کہ وہ غیر مسلح ہے اور یہ کہ اس پر قابو پانا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ اس لیے فوراً دروازے کی آڑ سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔

اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہاں سے نکل چلو' جلدی!''

''مگر کہاں اور کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس عمارت میں کسی نے آگ لگادی ہے۔'' اس نے تیزی سے بتایا۔ ''کسی بھی لمحے آگ عمارت کے اس حصے تک پہنچ سکتی ہے۔ ہمیں اس سے پہلے ہی نکل جانا چاہیے۔'' یہ کہتے ہی اس نے میرا ہاتھ کھینچا۔

اس کے لہجے سے واضح طور پر معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ مزید کچھ کہے اور پوچھے بغیر میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آگئی۔

وہ ایک چھوٹی سی راہداری تھی جس کے اختتام پر مجھے آگ کے شعلے نظر آرہے تھے۔ وہ عورت میرا بازو پکڑے تقریباً دوڑتی ہوئی اسی طرح بڑھ رہی تھی۔

''تم ادھر کہاں جارہی ہو......؟ ادھر تو آگ لگی ہوئی ہے۔'' میں نے اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا۔

میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے بائیں جانب ایک کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہوگئی اور اندر پہنچتے ہی کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ ایک لائبریری تھی وہاں ہر طرف دیواروں سے لگی کتابوں کی الماریاں نظر آرہی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور دوڑتی ہوئی ایک الماری کے پاس پہنچ گئی۔ میں لائبریری کے وسط میں کھڑی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آگ سے بچنے کیلئے اس نے اسی کمرے کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ میری نگاہ اسی کی نقل و حرکت پر تھی۔

چند ہی لمحے بعد یہ دیکھ کر میں چونک اٹھی کہ بظاہر انتہائی وزنی نظر آنے والی وہ الماری بہت آسانی سے ترچھی ہوگئی تھی۔ الماری کے پیچھے دیوار میں ایک خلا نظر آرہا تھا۔ اس عورت نے مڑ کر مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ خلا اتنا بڑا تھا کہ اس میں ایک شخص داخل ہوسکتا تھا۔ میں قریب پہنچ گئی تو اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا اور اس خلا میں داخل ہوگئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔ وہ ایک صندوق نما سی کوٹھری تھی جس میں نہ کوئی دروازہ تھا نہ کھڑکی۔ اب میں کچھ کچھ سمجھ رہی تھی کہ وہ عورت کسی خفیہ راستے کے ذریعے مجھے اس عمارت سے باہر نکال لے جانا چاہتی ہے۔ اس کوٹھری میں دائیں جانب دیوار پر ایک چوکور خانہ دیوار سے نسبتاً ابھرا ہوا تھا۔ اس عورت نے جیسے ہی اس خانے پر ہاتھ رکھا مجھے یوں لگا کہ میرے قدموں تلے زمین نیچے دھنسنے لگی ہو۔ اس کے ساتھ خلا برابر ہوگیا تھا۔ اب میں اس عورت کے ساتھ جیسے ایک گہرے کنوئیں میں اترتی جارہی تھی۔

کچھ ہی دیر کے بعد ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ زمین کی حرکت رک گئی۔ اسی لمحے میں نے سامنے خلا بنتے دیکھا۔ سامنے نظر آنے والی دیوار دو حصوں میں تقسیم ہوکر دائیں بائیں ہوگئی تھی۔ وہ عورت میرا ہاتھ تھامے اس خلا سے گزر کر ایک لمبی سی سرنگ میں آگئی۔ سرنگ نیم تاریک تھی مگر اس میں ہم دونوں سیدھے آگے بڑھنے لگے۔ میں نے ایک بار مڑ کر دیکھا تو عقب میں خلا برابر ہوچکا تھا۔

میں نے اب تک اس عورت سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے اور اس کا نام کیا ہے؟ سرنگ میں آگے بڑھتے ہوئے یہی سوال میری زبان پر آگیا۔

''میں تمہاری مددگار ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا تعارف کیلئے صرف اتنا ہی کافی ہے؟'' میں نے مزید کہا۔

''تم مجھے سبود مکرجی کی ایک مخلص دوست سکتی ہو۔'' اس نے میرے اصرار پر بتایا۔

''مخلص دوست یا محبوبہ؟'' میرے لہجے میں چبھن تھی۔

''اگر میں اس کی محبوبہ ہوتی تو وہ میرے سامنے تم سے وہ باتیں نہ کرتا جو کی تھیں۔'' اس نے کہا۔

وہ باتیں تو محض بہلاوا تھیں اسی لیے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اصل معاملہ کچھ اور ہے جس پر وہ پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ تم ایسی حسین عورت کی موجودگی میں مجھے مزید یقین ہوگیا ہے کہ اس کے اصل مقاصد کچھ اور ہی ہیں۔''

جواباً اس نے میری بات کی تردید یا تائید نہیں کی اور کہنے لگی۔ ''ہم تقریباً پہنچ گئے ہیں۔''

''مگر کہاں؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''ابھی تم خود ہی دیکھ لوگی۔ یہ سرنگ دائیں جانب مڑ کر ختم ہو جائے گی۔ تمہیں موڑ نظر آرہا ہے نا۔''

''ہاں دیکھ رہی ہوں۔'' میں بولی۔ ''چند قدم کے بعد ہمیں دائیں جانب مڑنا پڑے گا۔''

پھر چند قدم مزید چلنے کے بعد ہم دونوں دائیں سمت مڑ گئے۔ میری نگاہ سامنے اٹھی۔ سرنگ واقعی ختم ہوگئی تھی۔ سامنے دیوار نظر آرہی تھی۔ معاً ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور سامنے کی دیوار دو حصوں میں

بٹ گئی۔ شکنتلا مجھ سے ایک قدم آگے تھی۔ میں نے اسے سرنگ کی بائیں جانب ایک پتھر پر دباؤ ڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب خلا کی دوسری جانب سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ شکنتلا نے مڑ کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پھر آگے قدم بڑھا دیئے۔ میرے ساتھ شکنتلا نے جیسے ہی زینے کی تیسری سیڑھی پر پاؤں رکھا ہلکی سی گڑگڑاہٹ پھر سنائی دی اور ہمارے عقب میں سرنگ کا دہانہ بند ہو گیا۔ زینے میں بھی نیم تاریکی تھی مگر ہمیں اوپر چڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

زینے کے اختتام پر ہمیں ایک بند دروازہ ملا مگر وہ مقفل نہیں تھا۔ شکنتلا نے اس کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور وہ دوسری جانب کھلتا چلا گیا۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ اس عمارت سے نکل آنے کے بعد بھی میں شکنتلا کے ساتھ کسی اور عمارت میں جا پہنچوں گی۔ وہ دروازہ ایک بڑے سے کمرے کا تھا۔ اس میں قدم رکھتے ہی اچانک نہ جانے کدھر سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ یہ آواز سبود مکرجی ہی کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''مجھے یقین تھا شکنتلا کہ تم خطرہ محسوس کرتے ہی عذرا خان کو اس عمارت سے نکال کر یہاں لے آؤ گی۔ تم نے یہ اچھا کیا کہ چلتے چلتے اس عمارت میں آگ لگا دی۔''

یہ سن کر میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میرے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ خود شکنتلا نے اس عمارت میں آگ لگائی تھی۔

''ہاں سبود۔'' شکنتلا بول اٹھی۔ ''اتنی جلدی یہ ممکن نہیں تھا کہ اس عمارت سے ضروری کاغذات اور سارا سامان کہیں اور منتقل کیا جا سکتا...... مگر تم نے بابر کا آئندہ کیلئے کوئی بندوبست بھی نہیں کیا...... وہ آئندہ بھی ہمارے لیے مشکلات پیدا کر سکتا۔''

''شکنتلا ہم یہ باتیں پھر کرتے رہیں گے۔ فی الحال تم عذرا خان کو کسی محفوظ کمرے میں پہنچا کر میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے' میں آ رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہی شکنتلا میری طرف مڑی۔

اگر اس وقت مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی اور میں تیزی کے ساتھ جھک نہ جاتی تو شکنتلا اپنا کام کر چکی ہوتی۔ اس کا ہاتھ بہت تیزی سے گھوما تھا اور نشانہ یقیناً میری کنپٹی ہی تھی۔ میرے جھک جانے سے وہ اپنے ہی زور میں گھوم گئی تھی اور پھر میں نے اسے مزید مہلت نہیں دی تھی۔ میری لات اس کے کولہے پر پڑی تھی اور وہ چیختی ہوئی فرش پر گر گئی تھی۔ اس کے فرش پر گرتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھلی اور جیسے ہوا میں تیرتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر ڈھیر ہو گئی۔ میرے دائیں پیر کی ٹھوکر نے اس کے ماتھے کو نشانہ بنایا تھا۔

معاً ہر طرف سائرن کی سی آواز بلند ہونے لگی۔ شکنتلا بیہوش ہو چکی تھی اور میں سائرن کی آواز سن کر چونک اٹھی تھی۔ یہ آواز لازماً خطرے کی علامت تھی۔ ابھی میں فیصلہ نہیں کر سکی تھی کہ مجھے کیا نیا قدم اٹھانا چاہیے کہ اس کمرے کے دونوں دروازوں سے کئی قوی ہیکل افراد اندر داخل ہوئے وہ سبھی مقامی معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی تعداد نصف درجن کے قریب تھی۔ انہوں نے دونوں طرف سے مجھے گھیر لیا اور پھر نیم دائرے کی صورت میں میرے گرد ان کا گھیرا تنگ ہوا' میں جست لگا کر اس کے درمیان سے نکل گئی۔ زمین پر پاؤں ٹکتے ہی میں اس کمرے کے ایک کھلے ہوئے دروازے کی طرف بھاگی تھی۔

''ادھر...... وہ ادھر گئی ہے...... پکڑو۔'' میں نے اپنے عقب میں شور سنا۔

بغیر مڑے میں تیزی کے ساتھ دروازے سے نکل گئی اور پھر اسی تیزی سے پلٹ کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اب ان لوگوں کے پاس یہی ایک راستہ تھا کہ دوسرے دروازے کا رخ کرتے' مگر اس مہلت سے میں پورا فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ میں ایک راہداری میں دوڑ رہی تھی جس کے اختتام پر مجھے کھلی جگہ نظر آ رہی تھی۔ وہ راہداری عبور کر کے میں ایک بڑے سے صحن میں آ گئی۔ صحن کی دیوار کے قریب مجھے بڑا سا سٹول رکھا نظر آیا۔ میں دوڑتی ہوئی اس سٹول تک پہنچی اور پھر اس پر چڑھ گئی۔ سٹول پر چڑھ کر دیوار تک با آسانی میرے دونوں ہاتھ پہنچ سکتے تھے۔

پھر میں دیوار پر جیسے ہی اپنے دونوں ہاتھ جمائے ایک دم شور سنائی دیا۔ ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ صحن تک آ گئے تھے۔ پیش آنے والے خطرے کے تدارک کی خاطر میں نے لات مار کر سٹول کو گرا دیا تاکہ وہ لوگ فوری طور پر مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ میرے جسم کا سارا وزن میرے دونوں ہاتھوں پر تھا اور میں آہستہ آہستہ اپنے جسم کو اوپر اٹھا رہی تھی۔ جب تک وہ لوگ بھاگتے ہوئے دیوار کے قریب پہنچتے' میں دیوار پر چڑھ چکی تھی۔

میں نے دیوار کی دوسری جانب جھانک کر دیکھا۔ وہ ایک ویران سی گندی گلی تھی۔ میں نے فوراً ہی دیوار سے چھلانگ لگا دی۔ نیچے کودتے ہی میں وہاں رکی نہیں اور فوراً ہی بھاگنے لگی۔ اس گلی کا اختتام ایک سڑک پر ہوا جہاں معمولی سا ٹریفک آ جا رہا تھا۔ سڑک پر میں نے اپنا سانس درست کیا اور پھر مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے دشمن کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے' ٹیکسی والے نے میرے قریب ٹیکسی روک لی تھی۔

''شاہ باغ ہوٹل۔'' میں نے ٹیکسی والے سے کہا اور پھر کچھ سنے بغیر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی والا غالباً میٹر کے علاوہ بھی کچھ طلب کر رہا تھا جس کی مجھے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اس وقت میں ہوم سیکرٹری عبید الرحمٰن چودھری سے ملنے کی بجائے دوبارہ ہوٹل پہنچنا چاہتی تھی۔ ہنگامہ آرائی اور بھاگ دوڑ کے درمیان میرا پرس کہیں گم ہو گیا تھا۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کو بھی میرے پاس پیسے نہیں تھے اور میں پہلی ہی ملاقات میں ہوم سیکرٹری سے اتنی بے تکلف ہونا نہیں چاہتی تھی کہ ٹیکسی کا کرایہ بھی اسی سے ادا کراتی۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے ٹیکسی والے سے انتظار کرنے کو کہا کہ ابھی کرایہ بھجواتی ہوں۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ میٹر سے دو روپے زیادہ چاہئیں اور میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے ایک ویٹر کو بلایا اور اسے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کیلئے پیسے دیئے۔ ویٹر کمرے سے چلا گیا تو میں نے ٹیلی فون آپریٹر سے ہوم سیکرٹری کا نمبر ملانے کو کہا۔ اس وقت شام کے تین بج رہے تھے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اب تک اپنے دفتر میں ہوگا' پھر بھی میں نے چانس لیا تھا۔

کچھ دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر نے بتایا کہ دوسری جانب سے کوئی بھی ریسیور نہیں

اٹھا رہا۔

''پلیز تمہیں ایک زحمت اور دوں گی۔ ڈائریکٹر میں ہوم سیکرٹری کے گھر کا نمبر ہوگا۔ اگر مائنڈ نہ کرو تو اس سے گھر پر میری بات کرا دو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں' میں دیکھتی ہوں۔ آپ ذرا انتظار کیجئے۔'' ٹیلی فون آپریٹر شائستگی سے بولی اور اسی کے ساتھ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر فون ملنے کا انتظار کرنے لگی۔ مجھے اب کچھ کچھ بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ میں نے صبح سے صرف ناشتہ کیا تھا' وہ بھی ہلکا سا۔ ایک بار پھر میں نے ویٹر کو بلوا لیا اور اسے کھانے کا آرڈر دیا۔

ویٹر کے کمرے سے نکلتے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی اور میں نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔ آپریٹر نے بتایا کہ اس وقت عبیدالرحمٰن چودھری گھر پر نہیں ہے۔ اس کی بیوی سے اگر میں بات کرنا چاہوں تو کر سکتی ہوں۔ میں جواباً بولی کہ انہی سے بات کرا دوں میں کم از کم اس کے ذریعے عبیدالرحمٰن چودھری کو کوئی پیغام تو دے ہی سکتی تھی۔

چند لمحے بعد دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''میں مسز چودھری بول رہی ہوں' جی فرمایئے۔''

''سنئے میرا نام عذرا خان ہے۔ آج مجھے چودھری صاحب سے ان کے دفتر میں ملاقات کرنا تھی مگر وقت پر نہیں پہنچ سکی۔ آپ ان سے کہہ دیجئے گا کہ اب میں کل صبح دس بجے ان کے دفتر خود ہی پہنچ جاؤں گی اور یہ میرا فون نمبر بھی لکھ لیں۔'' یہ کہہ کر میں نے ہوٹل کا فون نمبر بتایا۔ ''اگر وہ چاہیں تو اس نمبر پر مجھ سے بات کر لیں یا میرے لیے پیغام چھوڑ دیں۔''

''جی بہتر ہے جیسے ہی وہ گھر پہنچے میں آپ کا پیغام ان تک پہنچا دوں گی۔''

''شکریہ خاتون!'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے جیسے ہی ریسیور رکھا' ایک بار پھر گھنٹی بجنے لگی۔ آپریٹر کی آواز آئی۔ ''سبود مکرجی آپ سے بات کریں گے' بات کیجئے۔''

''ہیلو...... عذرا خان۔''

''ہاں بول رہی ہوں' کہو اب کیا چاہتے ہو؟''

''تم میری توقع سے کہیں زیادہ چالاک نکلیں' مگر زیادہ دیر تم آزاد نہیں رہ سکو گی۔'' اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

''کیا تم نے یہی دھمکی دینے کیلئے مجھے فون کیا تھا۔''

''نہیں' تمہیں ایک بات اور بتانا تھی۔ آج رات پولیس شاہ باغ ہوٹل پر چھاپہ مارنے والی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم بھی شبے میں دھر لی جاؤ۔ پولیس کو ایک مفرور ملزمہ کی تلاش ہے جو حال ہی میں ڈھاکہ پہنچی ہے۔ اس ملزمہ کا تعلق ایک بین الاقوامی گروہ سے ہے جو سمگلنگ میں ماخوذ ہے۔ میرا مشورہ ہے' مخلصانہ مشورہ کہ تم فوری طور پر شاہ باغ ہوٹل چھوڑ دو۔''

''تم یہ نیک اور مخلصانہ مشورہ مجھے کیوں دے رہے ہو؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اس کی وجہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نہیں چاہتا کہ تم پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ اس لیے کہ پولیس کو تو خانہ پری کیلئے کچھ نہ کچھ چاہیے۔'' وہ جواباً بولا۔

''تمہارے مخلصانہ مشورے کا شکریہ...... یاں یہ بتاؤ شکنتلا تو خیریت سے ہے؟ اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں ہرگز اس پر ہاتھ نہ اٹھاتی۔ اپنے باطن میں وہ جیسی بھی ہو مگر بظاہر بھولی بھالی اور معصوم ہی نظر آتی ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ کس طرح تمہارے چنگل میں پھنس گئی۔''

''اسے تو خیر چھوڑو' میرے چنگل میں تو تمہیں بھی آخر کار پھنسا ہے عذرا خان...... کب تک بچی بچی پھرو گی۔''

''تم یہ حسرت لیے شمشان گھاٹ پہنچ جاؤ گے۔ اور تمہی کیا بہت سے اسی آرزو میں اپنی قبروں میں جا سوئے ہیں۔'' میرے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک میں ہی نہیں اور بہت سے تمہارے تیر نظر کا شکار ہو چکے ہیں۔''

''بکواس مت کرو!'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ گھٹیا پن پر اتر آیا تھا۔ اسی کے ساتھ ٹیلی فون کا سلسلہ بھی میں نے منقطع کر دیا۔

اس نے جو کچھ کہا تھا' مجھے محض خوف زدہ کرنے کیلئے بھی ہو سکتا تھا' لیکن اس سے بہرحال ایک بات کا اندازہ ضرور ہو گیا۔ وہ بات یہ تھی کہ اسے میرے اختیارات کا علم نہیں تھا۔ یقیناً وہ بے خبر تھا کہ پولیس میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں بن سکتی۔ اس سے قطع نظر میں نے ایک بات پر اور غور کیا کہ سبود مکرجی نہ صرف مجھے جانتا پہچانتا تھا بلکہ اسے میرے ٹھکانے کا علم بھی تھا۔ میں بہرحال اس کی اپروچ میں تھی۔ وہ جب چاہتا مجھ تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ صورت حال میرے نزدیک مناسب نہیں تھی۔ اس نے خود ہی مجھے یہ ہوٹل چھوڑ دینے کا مشورہ دیا تھا اور میں بھی اسی پر غور کر رہی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ اپنے چہرے پر اگر میک اپ کر لوں اور یہ ہوٹل چھوڑ کر کہیں کسی دوسرے ہوٹل میں منتقل ہو جاؤں تو یقیناً اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں گی اور وہ میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکے گا۔ اس بات کو بہرحال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اصل معاملے سے میری توجہ ہٹانے کیلئے سبود مکرجی کو میرے پیچھے لگا دیا گیا ہو۔ اس کا ثبوت یہ بھی تھا کہ ڈھاکہ پہنچنے کے باوجود میں اب تک ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری سے نہیں مل سکی تھی۔

کافی دیر غور و خوض کے بعد میں نے اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل ترتیب دے لیا۔ اسی دوران میں ویٹر کھانا لے آیا تھا اور میں کھانا بھی کھا چکی تھی۔ کھانے کے بعد چائے پی کر میں نیچے کاؤنٹر پر گئی اور ہوٹل کا حساب کر دیا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ کچھ دیر بعد' یعنی تقریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر ہوٹل چھوڑ دوں گی۔

''میری ایک کزن ملنے آنے والی ہے' وہی یہاں سے میرا سامان لے کر......''

''اچھا اچھا میں سمجھ گیا!'' وہ بولا۔ ''آپ یہ چاہتی ہیں کہ ہم سامان لے جانے سے انہیں نہ

روکیں۔ ٹھیک ہے' احتیاطاً آپ ہمیں ان کا نام بتا دیں تاکہ ہم سمجھ جائیں کہ وہ کوئی اور خاتون نہیں' آپ کی کزن ہیں۔''

''عطیہ شکیل نام ہے اس کا۔'' میں نے یوں ہی ایک نام لے دیا۔

''بہتر ہے۔'' کاؤنٹر کلرک نے ایک کاغذ پر یہ نام لکھا اور کمرہ بھی لکھ دیا۔

کچھ لوگ خاصے سسٹا میٹک ہوتے ہیں' کاؤنٹر کلرک بھی ایسے ہی لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پرچے پر یہ بھی لکھ لیا تھا کہ عذرا خان کی ہدایت کے مطابق ان کا سامان ان کی کزن کو لے جانے دیا جائے گا۔ پرچہ لکھ کر اس نے میری طرف بڑھا دیا۔

''جی؟'' میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''اس پر دستخط کر دیجئے۔'' اس نے نرمی سے کہا اور میری طرف پین بھی بڑھا دیا۔

میں اس کی حرکت پر مسکرانے لگی۔ ''آپ تو اس طرح دستخط لے رہے ہیں جیسے میں اپنی جائیداد کسی کے نام منتقل کر رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پرچے پر دستخط کر دیئے۔

''خانہ پری تو بہرحال ضروری ہے نا۔'' وہ بھی مسکرایا۔ ''کل کلاں کو اس پر اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ میں نے کسی اور کو آپ کا سامان لے جانے کی اجازت کیوں دی۔''

جواب میں مزید کچھ کہے بغیر میں وہاں سے چلی آئی۔ اپنے کمرے میں آکر میں نے سوٹ کیس کھول لیا۔ اس میں میک اپ کا سامان موجود تھا۔

مجھے اپنے چہرے پر میک اپ کرنے میں تقریباً پون گھنٹہ لگا۔ میں نے دانستہ اپنے چہرے پر ایسا میک اپ کیا تھا کہ صنف مخالف کیلئے کوئی کشش نہ رہے جو ایک بار میری طرف دیکھ لے دوبارہ دیکھنے کی خواہش نہ کرے۔ لباس بھی میں نے تبدیل کر لیا تھا۔ اب دیکھنے میں' میں ایک بدشکل سی عورت نظر آ رہی تھی۔ چہرے سے عمر کا اندازہ تیس پینتیس سال سے کم نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ ایسے چہرے عموماً لوگ یاد نہیں رکھتے اور یہی میرا مقصد تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب میں اپنا سامان وغیرہ سمیٹ کر ہوٹل کے کمرے سے نکلی تو کسی نے مجھ سے تعرض نہیں کیا۔ سوٹ کیس اتنا وزنی نہیں تھا کہ میں خود نہ اٹھا سکتی۔ اس لیے ہوٹل کے پورٹر کو میں نے نہیں بلایا تھا۔ ایئر بیگ میں نے اپنے شانے سے لٹکا لیا تھا۔

شاہ باغ ہوٹل کے مقابل ہی ایک فائیو سٹار ہوٹل تھا۔ میں نے اسی کا رخ کیا۔ اس ہوٹل کی شاخیں مغربی پاکستان کے شہروں میں بھی تھیں۔ اس نو منزلہ ہوٹل کی پہلی منزل ہی پر مجھے ایک کمرہ مل گیا۔ یہاں میں نے اپنے اصل نام کی بجائے وہی فرضی نام لکھایا تھا جو شاہ باغ ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک کو بتایا تھا' یعنی عطیہ شکیل اس کے علاوہ میں نے یہ بھی ظاہر نہیں کیا تھا کہ مغربی پاکستان سے آ رہی ہوں۔ میں نے مشرقی پاکستان ہی کے ایک شہر چاٹگام کا پتا لکھا دیا تھا کہ میں وہاں سے آ رہی ہوں۔

ایک نئی حیثیت سے نئے ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد مجھے نسبتاً تحفظ کا احساس ہوا۔ اب میں سبود مکرجی کی پہنچ سے دور ہو چکی تھی۔ صبح سے اب تک پیش آنے والے واقعات کا تجزیہ کرنا میرے لیے موجودہ صورتحال میں سود مند ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے اب یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ شکنتلا کی زبان سے میں نے

بابر کا نام بھی سنا تھا۔ ہر چند کہ یہ نام بہت عام ہے مگر محسوس ہو رہا تھا کہ یہ وہی پرجوش نوجوان ہو سکتا تھا جس سے میں کئی سال قبل ملی تھی۔ شکنتلا نے سبود مکرجی سے اس کا بندوبست کرنے کیلئے کہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سبود مکرجی کیلئے مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اس میں تو خیر کسی شبے یا شک کی گنجائش نہیں تھی کہ سبود مکرجی ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بابر ایسے ہی لوگوں کے خلاف سرگرم عمل رہتا تھا۔ آئندہ روز کے پروگرام میں بابر سے ملاقات بھی اب ضروری ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ہوم سیکرٹری سے مل کر لوٹتے ہوئے بابر سے بھی مل لوں گی۔ وہ بہرحال میرے لیے مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

رات کا کھانا ہوٹل کے ڈائننگ روم میں کھاتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں عبیدالرحمٰن چودھری نے مجھے شاہ باغ ہوٹل میں فون نہ کیا ہو۔ میں نے اس کی بیوی کو ہوٹل کا فون نمبر لکھوا دیا تھا۔ اگر اس نے وہاں فون کیا ہوگا تو اسے یہی بتایا گیا ہوگا کہ میں ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہوں۔ ویسے حالات کے پیش نظر توقع یہی تھی کہ اس نے مجھے اپنے گھر پہنچنے کے بعد فون ضرور کیا ہوگا۔ اسے یقیناً معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس نے جس ڈرائیور کو گاڑی لے کر میرے ہوٹل بھیجا تھا' اس پر کیا گزری۔ ایسی صورت میں اسے میری طرف سے بہرحال فکرمند ہونا چاہیے تھا۔

ڈائننگ ہال سے اٹھ کر میں ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچی اور ٹیلی فون ڈائریکٹر میں ہوم سیکرٹری کے گھر کا فون نمبر دیکھ کر نوٹ کیا۔ اسی کے ساتھ اس کا پتا بھی لکھ لیا اور دفتر کے نمبر بھی لکھ لئے۔ پھر اپنے کمرے میں آکر میں نے ٹیلی فون آپریٹر کو اس کے گھر کا نمبر بتا کر ملانے کیلئے کہا۔

کچھ ہی دیر کے بعد فون پر میں اس سے گفتگو کر رہی تھی۔ مجھے پہچاننے کے بعد وہ بتا رہا تھا۔

''میں نے شاہ باغ ہوٹل فون کیا تھا...... وہاں سے......''

''معلوم ہوا کہ میں ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے اس کی بات پوری کر دی۔ ''آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا۔''

''جی...... جی ہاں...... اور میں اس پر بھی سخت شرمندہ ہوں کہ...... کہ آج صبح میرا ڈرائیور گاڑی لے کر آپ کے ہوٹل نہیں پہنچ سکا۔ دراصل اسے ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اس حادثے کا علم مجھے خاصی دیر کے بعد ہوا ورنہ میں آپ کیلئے دوسری گاڑی بھیج دیتا۔'' یہ کہہ کر وہ کھانسنے لگا۔

''خیر کوئی بات نہیں' میں کل آپ سے دفتر میں مل لوں گی۔'' میں بولی۔ ''آپ کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی لگ رہی ہے۔ کیا بات ہے' طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔''

''جی ہاں! بس کچھ نزلے وغیرہ کا اثر ہے گلے پر۔'' وہ بولا۔

''آپ نے وہ ہوٹل کیوں چھوڑ دیا......؟ اور اس وقت کہاں سے بول رہی ہیں......؟ کیا کسی اور ہوٹل......''

''نہیں جی۔'' نہ معلوم کیوں میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مجھے اپنے موجودہ ٹھکانے کے متعلق کسی کو بھی نہیں بتانا چاہیے۔ یہی سوچ کر میں نے مزید کہا۔ ''دراصل یہاں ڈھاکہ میں میری ایک کزن رہتی ہے۔ اسی کے اصرار پر میں ہوٹل سے یہاں چلی آئی ہوں۔''

''یہاں سے کیا مراد ہے آپ کی؟'' اس نے پوچھا۔

اس کا تجسس مجھے کچھ غیر فطری سا محسوس ہوا' پھر بھی میں نے کہہ دیا۔ ''موتی جھیل ہے اس علاقے کا نام۔''

''احتیاطاً فون نمبر بھی بتا دیجئے تاکہ کبھی ضرورت پڑے تو......''

''یہاں فون نہیں ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''میں ایک ہوٹل سے فون کر رہی ہوں۔''

اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''ہاں آپ پورا پتا بتا دیں تاکہ میں کل صبح گاڑی......''

''اس کی ضرورت نہیں' شکریہ! میں خود دس بجے صبح پہنچ جاؤں گی۔'' پھر میں نے ہنستے ہوئے مزید کہا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ آپ کے ڈرائیور کو پھر کوئی حادثہ پیش آ جائے۔ یوں بھی مجھے پتا ٹھیک سے معلوم نہیں ہے۔''

''لوکیشن تو بتا ہی سکتی ہیں۔''

معلوم نہیں وہ کیوں اس قدر بضد تھا کہ کسی طرح اسے معلوم ہو جائے کہ میں کہاں ٹھہری ہوں۔ میں نے جواباً کہا۔ ''دراصل یہ علاقہ میرے لیے بالکل نیا ہے اس لیے۔''

''خیر کوئی بات نہیں' کل جب میں اپنے ڈرائیور سے آپ کو وہاں چھڑواؤں گا تو معلوم ہو جائے گا۔''

''آپ سے مل کر لوٹنے کے بعد میرا ارادہ یہاں آنے کی بجائے کہیں اور جانے کا ہے۔'' میں نے اس کی اس امید پر بھی پانی پھیر دیا۔

''اوہ...... خیر پھر دیکھا جائے گا' آپ کل ملیں تو سہی۔'' اس کے لہجے سے مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''اچھا تو پھر خدا حافظ۔'' میں نے کہا اور پھر اس کی طرف سے بھی ''خدا حافظ'' سن کر ریسیور رکھ دیا۔

فون پر عبیدالرحمٰن چودھری سے گفتگو کر کے میرا ذہن الجھ سا گیا تھا۔ میری سکونت کے بارے میں وہ کیوں اتنا متجسس تھا' میں سمجھ نہیں سکی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ ہر حال میں یہ جان لینا چاہتا ہو کہ میں کہاں ٹھہری ہوں۔ میرے ذہن میں اس کی ایک وجہ یہی آ سکی کہ شاید محترم وزیر داخلہ نے اسے میری حفاظت کا بندوبست کرنے کے احکام بھی دیئے ہوں گے اور وہ اپنے طور پر میرے علم میں لائے بغیر یہ سارا بندوبست کرنا چاہتا ہوگا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں کوئی اور بات نہیں آ سکی۔ اس کے علاوہ اس کی بھرائی ہوئی آواز بھی میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر کھانس رہا ہو۔ صبح کی نسبت اس وقت فون پر اس کی آواز کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ اس کو بھی میں نے اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کیوں کہ اس وقت رات کے سوا دس بجنے والے تھے۔ میں آج رات زیادہ سے زیادہ آرام کر لینا چاہتی تھی تاکہ کل سے پوری طرح سرگرم عمل ہو سکوں۔ ہوم سیکرٹری سے ملنے کے بعد کل ہی سے میں اپنے حریفوں کے پیچھے لگ جانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد کچھ طے نہ ہوتا کہ مجھے کوئی رات آرام کی نصیب ہو پاتی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح میری آنکھ کھل گئی۔ ساڑھے سات بجے تک میں ناشتہ کر کے تیار ہو

چکی تھی۔ مجھے دس بجے ہوم منسٹری کے دفتر پہنچنا تھا اور اس میں ابھی بہت دیر تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ پہلے بابر سے مل لیا جائے۔ اس کی کوٹھی یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ تیج گاؤں ہی میں اس کے والد مشیر احمد خاں کی کپڑے کی ایک مل تھی اور اسی علاقے میں اس کی سکونت بھی تھی۔ میرے چہرے پر جو میک اپ تھا' وہ یقیناً اس سلسلے میں مسئلہ بنتا' مگر میں' مشیر احمد خاں کے بجائے اب صرف بابر سے ملنا چاہتی تھی۔ اگر میں میک اپ میں نہ ہوتی تو یقیناً مشیر احمد خاں سے بھی ملتی۔

ہوٹل سے نکل کر تیج گاؤں تک کیلئے مجھے بمشکل ایک ٹیکسی مل سکی کیوں کہ وہ علاقہ قریب ہی تھا۔ میٹر کی بجائے ٹیکسی والے نے الگ سے کرایہ طلب کیا تھا۔ دس روپے اس زمانے میں بہت ہوتے تھے۔ بہرحال میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ جب میری ٹیکسی' مشیر احمد خاں کی کوٹھی کے گیٹ پر رکی۔ میں نے ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کیا اور پھر چوکیدار سے مخاطب ہوئی۔ ''مجھے بابر صاحب سے ملنا ہے۔ تم انہیں میرا پیغام پہنچا دو۔''

''مگر بابر بابو تو اب ادھر نہیں رہتا۔'' چوکیدار نے بتایا۔

''کیا مطلب؟ کیا یہ مشیر احمد خاں کی کوٹھی نہیں ہے؟''

''انہی کا کوٹھی ہے' مگر بابر بابو تو پچھلے سال سے نہیں رہتا یہاں۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے' وہ اب کہاں رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابی آپ ٹھیرو یہاں ہم اندر پوچھ کر آتا ہے۔ سنا ہے بادام تلی گھاٹ میں بابر بابو اپنے کسی دوست کے ساتھ رہتا ہے۔''

''پورا پتا معلوم کر کے آنا تاکہ میں اس پتے پر پہنچ سکوں۔'' میں نے چوکیدار کو مزید ہدایت دی۔

چوکیدار سر ہلا کر آگے بڑھ گیا اور میں سوچنے لگی کہ یقیناً باپ بیٹے کے درمیان نظریاتی اختلاف کے سبب علیحدگی ہو گئی ہوگی۔ مشیر احمد خاں پہلے بھی بابر سے نالاں رہتے تھے۔ بابر ان کا ہاتھ بٹانے اور کاروبار میں دلچسپی لینے کی بجائے اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا تھا۔

ذرا دیر بعد چوکیدار لوٹ کر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ بھی تھا۔ آتے ہی وہ بولا۔ ''نسرین بی بی' اس سے ملنے جاتا رہتا ہے' اسی سے یہ پتا لکھوایا ہے۔ وہ بولتا ہے کہ اگر آپ چاہو تو اس سے مل لو۔''

''نہیں۔'' میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے چوکیدار سے پرچہ لے لیا اور واپسی کیلئے مڑ گئی۔

مجھے معلوم تھا کہ نسرین' بابر کی بہن کا نام تھا جو اس سے تین سال چھوٹی تھی۔ وہ اپنے بڑے بھائی کو بہت چاہتی تھی۔ اس کا ثبوت یہ بھی تھا کہ گھر چھوڑ کر جانے کے بعد بھی وہ اپنے بھائی سے ملنے جاتی رہتی تھی۔ مشیر احمد خاں کو یا تو اس بات کا علم نہیں تھا اور اگر معلوم تھا تو وہ درگزر سے کام لیتے ہوں گے۔ ورنہ نسرین' بابر سے ملنے نہ جا سکتی۔

وہاں سے جلد ہی مجھے گرین روڈ کیلئے ایک ٹیکسی مل گئی۔ تیج گاؤں سے گرین روڈ کا فاصلہ کافی

تھا اس لیے ٹیکسی والا میٹر ہی سے چلنے پر راضی ہو گیا تھا۔

ہوم سیکرٹری عبید الرحمٰن چودھری سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے نہ میں نے اسے دیکھا تھا نہ اس نے مجھے۔ اسی سبب اپنے چہرے پر میک اپ سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مقررہ وقت سے نصف گھنٹے پہلے ہی میں وہاں پہنچ گئی۔ مجھے اس کا دفتر تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پی اے نے ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی' پھر پوچھا۔ ''آپ کا نام؟''

''عذرا خان۔'' میں نے بتایا۔

نام بتائے جانے پر میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ ''جی...... جی تشریف رکھئے! صاحب نے بتایا تھا کہ آپ دس بجے تشریف لائیں گی۔ آپ کچھ جلدی آ گئیں۔''

''جی ہاں۔'' یہ کہہ کر میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

پھر مجھے عبیدالرحمٰن چودھری سے ملاقات کیلئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ہی اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلوالیا۔

میں نے اپنے چہرے پر خاصی محنت کی تھی کسی کیلئے یہ اندازہ لگا لینا مشکل ہی تھا کہ میں نے میک اپ کر کے اپنا اصل چہرہ چھپا لیا ہے۔ میں اسی لیے مطمئن تھی' لیکن ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری کے کمرے میں قدم رکھتے ہی یہ اطمینان ختم ہو گیا۔ میں نے واضح طور پر اسے چونکتے دیکھا تھا۔

وہ میری پذیرائی کی خاطر اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا تھا۔ ''یہ آپ نے اپنا اچھا بھلا چہرہ کیوں بگاڑ لیا...... تشریف رکھئے۔'' اس نے کرسی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں نے اس کا جائزہ لیا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی شخصیت انتہائی غیر متاثر کن تھی' سیاہ رنگ' دبلا پتلا جسم اور قد چھوٹا۔ بڑی سی ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا وہ ایک بچہ سا لگ رہا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گئی تھی تو وہ بھی بیٹھ گیا تھا۔

''آپ سے کس نے کہا مسٹر چودھری کہ میں نے اپنا چہرہ بگاڑ لیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''میری دراز میں آپ کی تصویر موجود ہے۔ یہ دیکھئے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی میز کی دراز کھولی اور ایک تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔

وہ میری ہی تصویر تھی جسے دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ میرے چونک اٹھنے کا سبب یہ تھا کہ ایسی ہی تصویر بالکل یہی پوز یا غالباً اسی تصویر کی دوسری کاپی میں نے اکبر کے پاس دیکھی تھی' وہی اکبر جو سیود مکرجی کے ایما پر مجھے اغوا کرنا چاہتا تھا۔ وہ تصویر میری شناخت کیلئے سیود مکرجی نے اکبر کو بھیجی تھی۔

''یہ تصویر آپ کے پاس کہاں سے آئی؟'' میں نے سوال کیا۔

''اسلام آباد سے ہوم منسٹری نے کچھ روز قبل ہمیں بھیجی تھی تاکہ جب آپ یہاں پہنچیں تو ہم آپ کو شناخت کر سکیں۔ میں نے ہی منسٹری سے یہ درخواست کی تھی۔''

''تصویر کی کیا صرف ایک ہی کاپی وہاں سے آئی تھی؟'' میں نے دریافت کیا۔

''جی...... جی ہاں شاید ایک ہی کاپی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''شاید نہیں' یقینی طور پر بتایئے...... یہی...... اسی تصویر کی ایک کاپی میں یہاں کے چند جرائم پیشہ افراد کے پاس بھی دیکھ چکی ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے کے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''جرائم پیشہ افراد کے پاس۔'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''مگر...... ابھی کل ہی تو آپ یہاں آئی ہیں...... اتنی جلدی آپ کی مڈبھیڑ جرائم پیشہ افراد سے کس طرح ہو گئی؟''

''یہ تو خیر بعد کی باتیں ہیں' آپ پہلے سوال کا جواب دیجئے کہ آیا اس تصویر کی دو کاپیاں بھیجی گئی تھیں یا صرف ایک کاپی آئی تھی؟ اور اگر دو کاپیاں بھیجی گئی تھیں تو پھر دوسری کاپی بھی آپ کے پاس ہونا چاہئے...... میرا مطلب ہے کہ آپ کے ریکارڈ میں اس کی دوسری کاپی ہو گی۔''

''میں ابھی معلوم کراتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی اور جب چپراسی اندر داخل ہوا تو اس سے ریکارڈ کیپر کو بلوایا۔ چپراسی حکم سن کر چلا گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''کیا آپ اس تصویر سے متعلق تفصیلات بتانا پسند کریں گی؟'' میں اس معاملے کو کچھ سمجھ نہیں سکا۔''

''سنئے! کل ڈھاکہ پہنچتے ہی مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔'' میں نے اسے بتانا شروع کیا۔ مختصراً میں نے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات سے اسے آگاہ کر دیا اور اس کے چہرے پر ردعمل دیکھنے لگی۔ صرف میں نے اس سے یہ بات چھپالی تھی کہ شاہ باغ ہوٹل کے بعد اب میرا قیام کہاں ہے؟

سیود مکرجی...... وہ زیر لب بڑبڑانے۔ ''یہ نام پہلے بھی کئی بار کئی معاملات میں سامنے آ چکا ہے' مگر ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا کہ یہ شخص کون...... ہاں دھان منڈی کی اس کوٹھی کا کیا نمبر بتایا تھا آپ نے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے قلم ہاتھ میں لے لیا۔

میں نے نمبر لکھا دیا۔ یہ اسی کوٹھی کا نمبر تھا جہاں مجھے سیود مکرجی نے اغوا کر کے لے جانے کا حکم دیا تھا۔

''شاید اس نمبر سے کوئی سراغ مل جائے۔'' اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

''احتیاطاً اس نیلی کار کا نمبر بھی لکھ لیں جس میں اکبر اور اس کے ساتھی میرا تعاقب کر رہے تھے۔'' میں نے اپنے حافظے میں محفوظ نیلی کار کا نمبر بھی لکھوا دیا۔

اسی وقت ریکارڈ کیپر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ عبیدالرحمٰن چودھری نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''سر! تصویر کی دو کاپیاں' اسلام آباد سے بھیجی گئی تھیں جن میں سے ایک آپ کے نام پر چڑھی ہوئی ہے مگر...... مگر سر' دوسری کاپی ہمارے ریکارڈ میں نہیں ہے۔ میں نے بہت تلاش کی لیکن......'' وہ ہکلانے لگا۔

''اسے جانے دیں۔'' میں نے ریکارڈ کیپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبیدالرحمٰن چودھری سے کہا۔ ''اس معاملے میں یہ شخص بے قصور معلوم ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ بات تو تشویش کن ہے۔'' عبیدالرحمٰن چودھری بولا۔ ''ہوم منسٹری کے ریکارڈ روم سے کسی چیز کا اس طرح غائب ہو جانا معمولی بات نہیں ہے۔''

"ہاں یہ تو ہے، مگر آپ اس مسئلے سے پھر نمٹتے رہیے گا۔ یہاں سے وہ تصویر غائب کرنے والا کوئی ایسا ہی بااثر شخص ہوسکتا ہے جو یا تو ریکارڈ روم میں داخل ہوکر خود کوئی چیز نکال لانے کا اہل ہو یا پھر اس کے حکم پر کوئی بھی چیز اس تک پہنچائی جا سکے۔ آپ اس سلسلے میں ضروری کارروائی کیجئے لیکن اس وقت......"

"ٹھیک ہے۔" وہ میرا مقصد سمجھ گیا اور ریکارڈ کیپر کو جانے کی اجازت دے دی۔ اسی کے ساتھ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا پئیں گی؟"

"صرف چائے منگوالیں، باقی کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے میرے انکار کے باوجود چپراسی کو بلا کر چائے کے علاوہ بھی اور بہت کچھ لانے کا حکم دے دیا۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اصل موضوع کی طرف آ جانا چاہئے۔" چپراسی کے کمرے سے نکلتے ہی میں بول اٹھی۔ "یہ بتائیں کہ سولومن اور اس کے ساتھیوں کی بابت کیا تازہ ترین اطلاعات ہیں؟"

"تازہ ترین اطلاعات کے مطابق سولومن اور اس کے ساتھی کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر چند دن سے ڈھاکہ کی نواحی بستیوں میں سرگرم ہیں۔ کل ہی ایک اطلاع یہ ملی ہے کہ سولومن نارائن گنج میں دیکھا گیا ہے۔ نارائن گنج بھی یہاں ڈھاکہ کی ایک نواحی بستی ہے۔"

"ہاں معلوم ہے مجھے۔" میں بولی۔ "ڈھاکہ شہر سے تقریباً چودہ میل ہوگی یہ بستی...... میری معلومات درست ہیں نا؟"

"قطعی۔" اس نے تصدیق کی، پھر کہنے لگا۔ "ہماری لسٹ پر نارائن گنج کا ایک شخص ضیاء الاسلام ہے۔ اسی شخص کی حویلی میں سولومن کو آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ نارائن گنج اور اس کے گردونواح میں اس شخص کی کافی زمین ہے۔ اس شخص کے بارے میں انکوائری کی جا رہی ہے لیکن اب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔"

"فی الحال میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ آپ دھان منڈی کی اس کوٹھی کے متعلق کل تک مجھے معلومات فراہم کر دیں۔ کل میں فون پر آپ سے بات کرلوں گی۔" میں نے کہا۔

"بالکل۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اور حملہ آوروں کی کار کے بارے میں بھی کل تک آپ کو معلومات فراہم کردی جائیں گی۔"

"اس تعاون کا شکریہ۔" وہ بولا۔ "کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ فوری طور پر آپ کا کیا ارادہ ہے......؟ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کیا قدم اٹھانا چاہتی ہیں؟"

"ابھی تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، لیکن شاید مجھے جلد ہی نارائن گنج جانا پڑے۔" میں نے بتایا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ اپنی تفتیش کا آغاز وہیں سے کریں۔ اس سلسلے میں اگر پولیس یا انٹیلی جنس وغیرہ کی مدد چاہئے تو بتا دیں میں اس کا بندوبست کردوں گا۔"

"ابھی میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔" میں نے جواباً کہا۔

اسی وقت چپراسی چائے اور دیگر لوازمات لے آیا۔ چائے پینے کے دوران میں بھی عبیدالرحمٰن چودھری سے امریکی ایجنٹوں ہی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ پھر کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میں نے اس سے رخصت کی اجازت چاہی۔

"اگر آپ مناسب خیال کریں تو میں اپنی کار میں آپ کو موتی جھیل پہنچا دوں؟" وہ مجھے رخصت کرنے سے پہلے بولا۔

"میں نے آپ سے کل کہا تھا نا کہ یہاں سے میرا ارادہ کہیں اور جانے کا ہے۔ فی الحال میں اپنی کزن کے گھر نہیں جا رہی۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے کہا۔

پھر چند ہی لمحے بعد میں اس کے کمرے سے نکل آئی۔ گرین روڈ سے اب میں بادام تلی گھاٹ جانا چاہتی تھی۔ میرے پاس بابر کا پتا موجود تھا۔ وہاں سے مجھے باآسانی ایک ٹیکسی مل گئی۔

عبیدالرحمٰن چودھری سے بظاہر میری ملاقات تسلی بخش ہی کہی جا سکتی تھی۔ امریکی ایجنٹوں کا سراغ لگانے کیلئے مجھے بہرحال ایک سرا مل گیا تھا۔ اس کے باوجود نہ معلوم کیوں کوئی بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی اور اس کھٹک کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ٹیکسی میں بادام تلی گھاٹ پہنچ کر بابر کے دوست کا گھر تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ بابر کے دوست فرید احمد سے میری ملاقات ہوگئی مگر بابر نہیں ملا۔ فرید احمد نے اس کے بارے میں بتایا کہ گزشتہ رات کو بابر کہیں گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا۔ فرید احمد کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ عموماً بابر ایسا کرتا رہتا تھا۔ وہ کئی کئی روز کیلئے غائب ہو جاتا تھا۔ فرید احمد نے مجھ سے پوچھا کہ بابر سے میرا کیا تعلق ہے اور میں اس سے کیوں ملنا چاہتی ہوں؟ مگر میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے کہا کہ پھر بھی آ کر خود اس سے مل لوں گی۔ نام بتانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ بابر مجھے میرے نام سے نہیں پہچان سکے گا۔

بادام تلی گھاٹ سے میں نے اپنے ہوٹل کا رخ کیا۔ ٹیکسی میں ایئرپورٹ روڈ کی طرف جاتے ہوئے مجھے کچھ شبہ سا ہوا کہ میری ٹیکسی کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ سفید رنگ کی ایک ڈاٹسن کار کو میں کافی دیر سے ٹیکسی کے پیچھے پیچھے آتے دیکھ رہی تھی۔ تعاقب کی یقین دہانی کیلئے میں نے ٹیکسی والے سے ایئرپورٹ روڈ کی طرف جانے کی بجائے پہلے مڈفورڈ سٹریٹ چلنے کو کہا۔

بادام تلی گھاٹ کے علاقے سے نکل کر اب میری ٹیکسی بابو بازار سے گزرنے کے بعد چوک بازار کی طرف جا رہی تھی۔

"مجھے کچھ دیر کو مڈفورڈ ہسپتال جانا ہے۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"آپ وہاں اگر زیادہ دیر رکیں تو مجھے چھوڑ دیں۔" ٹیکسی والا بولا۔

"ٹھیک ہے، تم چلو...... ویسے مجھے وہاں بس پانچ منٹ لگیں گے، زیادہ دیر نہیں ہوگی۔"

"پھر کوئی بات نہیں، اتنی دیر میں انتظار کرلوں گا۔"

کچھ ہی دیر کے بعد جب میری ٹیکسی مڈفورڈ ہسپتال کے سامنے رکی تو کچھ فاصلے پر وہ سفید

ڈاٹسن بھی رک گئی۔ میں ٹیکسی سے اتر کر ہسپتال کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ اسی دوران میں میری نگاہ تعاقب کرنے والی کار کی طرف اٹھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر مجھے ایک ایسا چہرہ نظر آیا جسے دیکھ کر میں تقریباً اچھل پڑی۔ وہ شکنتلا تھی۔ میں رکے بغیر تیزی کے ساتھ ہسپتال کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ مجھے حیرانی اس پر تھی کہ میک اپ کے باوجود شکنتلا نے کس طرح میری شناخت کر لی تھی اور کب وہ میرے پیچھے لگ گئی تھی۔

ہر چند کہ یہ ایک غیر اخلاقی سی بات تھی کہ میں ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیے بغیر خاموشی کے ساتھ ہسپتال کے پچھلے دروازے سے نکل جاتی مگر مجبوراً مجھے ایسا ہی کرنا پڑا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ شکنتلا تعاقب کر کے میرے نئے ٹھکانے سے بھی آگاہ ہو جائے۔ اس طرح میں ایک بار پھر اپنے دشمنوں کی نظر میں آ جاتی۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد میں نے ایک خالی ٹیکسی روک لی۔ اب ایک بار پھر میں ایئرپورٹ روڈ کی طرف جا رہی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میک اپ کے باوجود شکنتلا نے مجھے پہچان لیا تھا ورنہ وہ میرے پیچھے نہ لگتی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ شکنتلا کو مجھ پر کیسے شک ہوا؟

اپنے دشمنوں سے چھپنے ہی کی خاطر میں نے میک اپ کیا تھا' لیکن میری یہ کوشش نامعلوم وجوہ کی بنا پر ناکام ہوگئی تھی۔ اب مجھے ایک بار پھر اپنا چہرہ تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے ہوٹل پہنچ کر وہی طریقہ کار اپنایا جس پر گزشتہ روز عمل کر چکی تھی۔ اسی روز میں ایک بار پھر ایک نئی حیثیت سے شاہ باغ ہوٹل میں قیام پذیر ہوئی۔ اس بار بھی مجھے ہوٹل کی دوسری منزل ہی پر ایک کمرہ ملا تھا۔

''کل کرے سو آج کر'' کی مصداق میں اسی دن شام کو نارائن گنج کا ایک چکر لگانے کیلئے اپنے ہوٹل سے نواب پور روڈ کیلئے روانہ ہوگئی۔ میرا ارادہ تھا کہ رات گئے تک ڈھاکہ لوٹ آؤں گی۔ میں نے دانستہ ایسا لباس زیب تن کیا تھا جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں ایک ٹورسٹ ہوں۔

شام ساڑھے پانچ کے قریب میں نارائن گنج پہنچ گئی۔ وہ ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ راہ چلتے ہوئے میں نے ایک شخص سے ضیاء الاسلام کی حویلی کا پتا معلوم کیا اور پھر اس طرف بڑھنے لگی۔ حویلی کی طرف بڑھتے ہوئے میں اپنے ذہن میں آئندہ اقدام کا خاکہ ترتیب دے رہی تھی۔

ضیاء الاسلام کی حویلی کافی وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے وہاں پہنچ کر جب یہ بتایا کہ میں ضیاء الاسلام سے ملنا چاہتی ہوں تو مجھے حویلی کی نشست گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ تقریباً دس پندرہ منٹ بعد بھاری تن و توش کا ایک شخص نشست گاہ میں داخل ہوا اور میں اخلاقاً اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوگئی۔

''بیٹھئے......بیٹھی رہیے۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بھی مجھے بیٹھنے کو کہا۔ پھر بولا۔ ''غالباً پہلی بار آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔'' وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''جی ہاں۔'' میں بولی۔ ''دراصل میں ایک ٹورسٹ ہوں اور مغربی پاکستان کے ایک شہر راولپنڈی سے یہاں آئی ہوں۔ اس بستی میں کوئی ہوٹل وغیرہ نہیں ورنہ میں آپ کو زحمت نہ دیتی۔ میں نے سنا ہے کہ آپ ایک مہمان نواز آدمی ہیں اور اس علاقے میں جو ٹورسٹ وغیرہ آتے ہیں' آپ ہی کی

حویلی میں ٹھہرتے ہیں...... بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اکثر غیر ملکی بھی یہیں آ کر قیام کرتے ہیں۔''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری نگاہ اس کے چہرے پر تھی۔

میری توقع کے مطابق لحہ بھر کو اس کا چہرہ متغیر ہوگیا' پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ غیر ملکیوں کے بارے میں آپ نے کہاں سے سن لیا؟ عرصہ دراز سے کسی غیر ملکی نے اس حویلی میں قیام نہیں کیا۔ بہرحال مجھے آپ کی میزبانی سے خوشی ہوگی۔ آپ کب تک ٹھہریں گی یہاں؟''

''فی الحال تو میں آپ سے صرف ملاقات کرنے آئی تھی۔ میرا ارادہ فوری طور پر یہاں رکنے کا نہیں کیوں کہ اپنا سامان وغیرہ بھی میں ساتھ نہیں لائی۔ ہاں دو ایک روز بعد میں یہاں قیام کی غرض سے آؤں گی۔ اب سے اجازت مل گئی ہے تو مجھے کوئی فکر نہیں رہی۔ آج ہی میں ڈھاکہ لوٹ جانا چاہتی ہوں۔''

''لوٹیں گی تو اس صورت میں جان من جب آپ کو کوئی یہاں سے واپس جانے دے گا۔''

اچانک اس کا لہجہ بدل گیا اور ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ رکے بغیر مزید بولا۔ ''میرے غیر ملکی مہمان تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے عذرا خان...... انہیں بڑی شدت سے تمہارا انتظار تھا' مگر تم اتنی جلدی یہاں پہنچ جاؤ گی یہ توقع خود مجھے بھی نہیں تھی۔''

میں ایک دم اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ میں اپنے دشمنوں کے چنگل میں پھنس چکی ہوں۔

''فضول ہے عذرا خان! فرار کی راہیں مسدود کی جا چکی ہیں۔'' یہ کہتے ہی اس نے تالی بجائی۔ دوسرے ہی لمحے نشست گاہ کے دونوں بیرونی دروازوں پر کئی مسلح افراد نظر آنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن کا رخ میری ہی جانب تھا۔

☆......☆......☆

ایسے لمحات میری زندگی میں بارہا گزرے ہیں' جب موت اور زندگی کے درمیان صرف چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا ہو' مگر میں نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا' میرا ایمان ہے کہ موت کا جو وقت مقرر ہے اس پہلے کوئی بھی مجھے نہیں مار سکتا' اسی کے ساتھ یہ بھی میرے ایمان کا حصہ ہے کہ اپنی تمام تر حیرت انگیز قوتوں کے باوجود میں موت کے لمحے کو نہیں ٹال سکتی۔ اسی یقین نے میرے اندر ایک بے خوفی سی پیدا کردی تھی اور اسی کے سبب موت کو سامنے دیکھ کر بھی میں کبھی نہیں گھبرائی جو مقسوم کردیا گیا ہے' اسے کوئی بدل نہیں سکتا' اس اعتماد نے ہمیشہ مجھے جینے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ اسی حوصلے نے اس وقت بھی میرا ساتھ دیا جب میں نے بہ یک وقت کئی رائفلوں کا رخ اپنی جانب دیکھا۔ ضیاالاسلام کے چہرے سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ میرے ساتھ کسی بھی قسم کی رعایت نہیں کرے گا۔ مجھے پیش آنے والا واقعہ قطعی غیر متوقع تھا ورنہ ممکن ہے کہ میں چوکنا ہونے کی صورت میں اتنی آسانی کے ساتھ اپنے دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ جاتی۔

ضیا الاسلام نے ابھی جو مجھ سے کہا تھا وہ بھی میرے لئے حیران کن ہی تھا۔ نارائن گنج میں میری آمد کا وہ پہلے ہی سے منتظر تھا۔

میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے معاً ضیاالاسلام کو مخاطب کیا۔ ''تمہیں کیسے یقین تھا کہ میں نارائن گنج ضرور آؤں گی؟''

''ہمیں یہ اطلاع مل گئی تھی کہ تم ڈھاکہ پہنچ چکی ہو۔'' وہ بولا۔ ''ڈھاکہ پہنچنے کے بعد تم ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری سے ملو گی' یہ بھی ہمارے علم میں تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ڈھاکہ کی نواحی بستیاں ان دنوں انٹیلی جنس والوں کی نظر میں ہیں۔ ہوم سیکرٹری سے ملنے کے بعد تمہیں یقیناً ادھر ہی کا رخ کرنا چاہئے تھا' لیکن تم اتنی جلدبازی کا ثبوت دو گی یہ توقع ہمیں بہرحال نہیں تھی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ تم دو ایک روز بعد ادھر آؤ گی۔''

''میک اپ کے باوجود تم نے کس طرح مجھے پہچان لیا کہ میں ہی عذرا خان ہوں؟'' میں نے اپنے تجسس کے زیر اثر ایک اور سوال کیا۔

''سنو عذرا خان' یہ مشرق ہے مغرب نہیں! وہ مسکرا کے کہنے لگا۔'' مشرق اور خصوصاً ہمارے ملک کی عورت ابھی اتنی ایڈوانس نہیں ہوئی کہ تن تنہا یوں سیر و تفریح کرتی پھرے۔ وہ بھی اجنبی علاقوں اور اجنبی لوگوں کے درمیان! اور نہ ہی وہ اس طرح کہیں کسی اجنبی سے میزبانی کیلئے کہہ سکتی ہے۔ اس سے قطع

نظر یہ کہ تم نے جس طرح میرے غیر ملکی مہمانوں کا ذکر کیا' اس سے بھی مجھے اشارہ مل گیا کہ تم درحقیقت کون ہو اور کس غرض سے یہاں آئی ہو! یہ بات بہرحال اتنی عام نہیں تھی کہ میری حویلی میں غیر ملکی بھی ٹھہرتے ہیں۔ کسی اجنبی کو یہ علم نہیں ہو سکتا تھا۔ ان باتوں کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا تھا کہ میں جس کا منتظر تھا وہ تمہی ہو!''

اس کی باتوں میں وزن تھا۔ مجھ سے بہرحال غلطی ہوئی تھی اور اب میں غلطی کا خمیازہ بھگتنے والی تھی۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ اور مجھے اپنی قید میں کیوں رکھنا چاہتے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''حیرت ہے عذرا خان کہ تم یہ سوال کر رہی ہو! تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہاری یہاں موجودگی کا مطلب کیا ہے! ...... کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ یہاں تمہاری آمد کے مقصد سے ہم واقف نہیں ہیں! ...... اگر واقعی ایسا ہی ہے تو تم غلطی پر ہو تمہیں آزاد چھوڑ دینا ہمارے عزائم کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرسکتا ہے۔''

''مجھے یہ بتاؤ ضیا الاسلام کہ اپنے وطن سے غداری کرنے پر تمہیں کس چیز نے مجبور کیا؟'' میرے لہجے میں چبھن تھی۔

''غداری! ...... کیسی غداری! ...... ہم اپنے حقوق کے حصول کی خاطر جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں اور یہ جدوجہد بہ یک وقت پورے بنگال سے شروع ہو گی۔''

''پورے بنگال سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے چونک کر دریافت کیا۔

''پورے بنگال سے مراد پورا بنگال ہے۔ بنگال کو دو ٹکڑے کرکے اس پر ظلم کیا گیا ہے۔ ہم بنگال کو پھر ایک دیکھنا چاہتے ہیں۔ جذبات کی رو میں بہہ کر ماضی میں جو غلط فیصلہ کیا گیا تھا' ہم اس فیصلے کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ گریٹر بنگال کا حصول ہماری منزل ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ایک دن ہم اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔''

''ضیا الاسلام! تم یقیناً احمقوں کی جنت میں رہتے ہو' تاریخ کے فیصلے اس طرح نہیں بدلا کرتے۔''

''وہ تاریخ کا فیصلہ نہیں تھا عذرا خان!'' وہ بھرپور یقین کے ساتھ بولا۔ ''وہ ایک جذباتی اور وقتی فیصلہ تھا جسے آنے والا وقت غلط ثابت کردے گا۔ عظیم بنگال کا خواب ایک دن ضرور پورا ہوگا۔ تم دیکھنا عذرا خان کہ ایک دن بنگال آزاد ہو جائے گا۔'' ''کیا اس وقت تم بنگال کو غلام سمجھتے ہو؟''

''ہاں میں اسے غلامی ہی کہوں گا۔ بنگال کو دو ٹکڑے کرکے دو حکومتوں نے اسے اپنا غلام بنالیا ہے۔''

''تم نے یقیناً تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ہرگز ایسا نہ کہتے۔ تم بھول رہے ہو ضیا الاسلام کہ یہ ملک کیوں اور کس لئے حاصل کیا گیا تھا! اگر یہ ملک نہ بنتا تو تم ہندو کے زیردست ہوتے' تمہیں ہندو کی برتری تسلیم کرنا پڑتی اور یوں ایک طرح سے تم اس کے غلام بن جاتے۔''

''اور اب...... اب کیا ہم اپنوں ہی کے زیردست نہیں ہیں؟'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''ہماری زبان کو قومی زبان کی حیثیت حاصل نہیں جبکہ ہم اکثریت میں ہیں۔''

''قومی زبان تو اردو ہے اور اسے خود تمہارے بڑے تسلیم کر چکے ہیں۔''

''ہاں مجھے یاد ہے...... اچھی طرح یاد ہے...... یہیں بنگال میں قائداعظمؒ سے ایک جلسے میں سوال کیا گیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان کیا ہوگی؟ انہوں نے جواب دیا تھا' اردو! اور لفظ ''اردو'' زور دے کر بہ آواز بلند تین بار انہوں نے دہرایا تھا۔ میں اس جلسے میں موجود تھا عذرا خان! یہ واقعہ اس ملک کے بننے سے کچھ دن پہلے کا ہے۔''

''پھر اب تم لوگ اردو کو قومی زبان تسلیم کیوں نہیں کرتے؟''

''اس لئے کہ ہماری قومی زبان...... بنگال کی قومی زبان بنگلہ ہے' اردو نہیں ہے!...... اور ہم بنگلہ کو قومی زبان تسلیم کرا کے رہیں گے!''

''گویا اس طرح تم لوگ قائداعظمؒ کے فرمان کی تردید کرنا چاہتے ہو!''

''تم اسے جو چاہو نام دے سکتی ہو عذرا خان' مگر ہم اپنا یہ حق ضرور حاصل کریں گے۔'' اس کے لہجے میں عزم تھا۔

''میرا خیال ہے' ابھی خود تمہارے ذہنوں میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ تم لوگ دراصل کیا چاہتے ہو؟ ایک طرف تو تم پورے بنگال کی غلامی کا رونا رو رہے ہو اور اس کی آزادی کیلئے جدوجہد کا آغاز کرنا چاہتے ہو' دوسری طرف بنگلہ کو قومی زبان تسلیم کرانے کی بات کر رہے ہو!''

''ہم اچھی طرح جانتے ہیں عذرا خان کہ ہمارا مقصد کیا ہے!'' وہ پریقین آواز میں بولا۔ ''سب کچھ ایک ساتھ نہیں ہو جاتا' مرحلہ وار ہوتا ہے! پہلے ہم اپنی زبان کو قومی زبان تسلیم کرائیں گے پھر دوسرا قدم اٹھائیں گے۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی ناممکن یا انہونی بات نہیں ہے' تم دیکھو گی کہ بہت جلد ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہم اکثریت میں ہیں اور جمہوریت میں اکثریت ہی کی چلتی ہے۔''

''تو تمہارا کہنا یہ ہے کہ مستقبل میں اس ملک کی دو قومی زبانیں ہوں گی ایک بنگلہ اور دوسری اردو!''

''بالکل!...... ہم ایک الگ قوم ہیں اور ہماری قومی حیثیت بہرحال تسلیم کرنا پڑے گی۔''

اس وقت ضیاالاسلام کی باتیں سن کر مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی تھی' ایک ایسا خطرہ جو مستقبل میں میرے ملک پر منڈلانے والا تھا۔ بنگلہ کو قومی زبان تسلیم کرنے کا مطلب بنگالیوں کو بھی ایک الگ قوم تسلیم کرنا ہوتا۔ ایسی صورت میں ایک الگ قوم کی حیثیت سے مستقبل میں وہ الگ ملک کا مطالبہ بھی کر سکتے تھے۔ میرے ذہن میں قائداعظمؒ کے الفاظ گونجنے لگے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں پھر دو قومی نظریئے ہی کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اس وقت یہ مسئلہ نہیں اٹھا تھا کہ بنگال ایک الگ قوم ہیں۔

''تم کس سوچ میں پڑ گئیں عذرا خان!'' ضیاالاسلام نے مجھے خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر ٹوکا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں جو کچھ معلوم ہو چکا ہے کافی ہے' اب تم میری مہمان بن کر آرام کرو! یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی' مگر یہ خیال رکھنا کہ فرار کی کوشش تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے مسلح آدمیوں سے مخاطب ہوا۔ ''انہیں لے جاؤ!''

اسی کے ساتھ مسلح افراد نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا اور پھر اس نشست گاہ سے باہر نکال لائے۔ میری پشت پر ایک رائفل کی نال لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے اس طرح بے بس کر دیا تھا کہ میں ان کے نرغے سے نکلنے کیلئے کوئی قدم نہ اٹھا سکی۔ ضیاالاسلام وہیں نشست گاہ میں رہ گیا تھا۔

وہ مسلح افراد مجھے حویلی ہی کے ایک حصے میں لے آئے۔ یہ حصہ دو کمروں پر مشتمل تھا جس میں ضروریات کی ہر شے موجود تھی۔ ایک کمرہ نسبتاً بڑا تھا۔ دونوں کمروں کے سامنے چھوٹی سی راہداری تھی' پھر صدر دروازہ تھا' راہداری ہی کی ایک جانب باتھ روم اور کچن تھا۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ کچن میں تمام ضروری سامان موجود ہے' میں جب چاہوں وہاں جا کر اپنے کھانے پینے کا بندوبست کر سکتی ہوں۔ میرے لئے کھانے پینے کا سامان لے کر وہاں آنے کی کسی کو ضرورت نہیں تھی۔ چھوٹے کمرے میں آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا' بڑا کمرہ بطور نشست گاہ استعمال کیا جا سکتا تھا' وہاں میز اور کرسیاں بھی تھیں۔ ان لوگوں نے خود مجھے تمام چیزیں دکھا دی تھیں تاکہ وہ چلے جائیں تو مجھے کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں میری حیثیت کسی نظر بند فرد کی سی تھی۔ اسے بہرحال قید کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

وہ لوگ مجھے حویلی کے اس حصے میں چھوڑ کر چلے گئے تو میں بڑے کمرے میں آ کر ایک آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ صدر دروازہ انہوں نے باہر سے مقفل کر دیا تھا۔ میں نے قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنی تھی۔ میں دیکھ چکی تھی کہ دونوں کمروں میں کوئی کھڑکی نہیں ہے' راہداری بھی اوپر سے پٹی ہوئی تھی۔ بظاہر وہاں سے فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ کھانے پینے کا سامان بھی کیونکہ وہیں موجود تھا اس لئے وہاں کسی کے جلد آنے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

وقت سست رفتاری سے گزرتا رہا اور پھر مجھے بھوک محسوس ہونے لگی' وہاں لائٹ بھی تھی۔ میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا رات کے سوا دس بجنے والے تھے۔ میں کمرے سے نکل کر کچن میں آ گئی اور کھانے کا بندوبست کرنے لگی۔ اس میں تقریباً نصف گھنٹہ گزر گیا۔ میں نے دو انڈوں سے آملیٹ بنا لیا تھا اور اسے ڈبل روٹی سے کھا کر چائے پی لی تھی۔

میری سمجھ میں اب تک یہ نہیں آ سکا تھا کہ یہاں سے رہائی کس طرح مل سکتی ہے! میں اسی سوچ بچار میں چھوٹے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گئی پھر نہ معلوم کب میری آنکھ لگ گئی' سونے کا ارادہ نہیں تھا اس لئے کمرے کی لائٹ میں بجھا نہیں سکی تھی۔

معلوم نہیں رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ ایک غیر مانوس سی آواز سن کر میں جاگ اٹھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کہیں قریب ہی کوئی درندہ غرا رہا ہے' پھر اچانک میری سماعت سے ایک تیز اور خوفزدہ سی نسوانی چیخ ٹکرائی۔ اسی کے ساتھ میں بستر پر اچھل کر بیٹھ گئی۔ درندے کے غرانے کی آواز دوبارہ سنائی دی' نسوانی چیخیں پھر ابھریں' اس کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی۔ نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگا جیسے اس درندے نے چیخنے والی کا گلا دبوچ لیا ہو۔

پھر میں دیر تک منتظر رہی کہ کوئی اور آواز سنائی دے' مگر ہر طرف سکوت چھایا رہا۔ درندے کی غراہٹوں اور ان نسوانی چیخوں کو میں کوئی معنی نہیں دے سکی۔ میں نے اٹھ کر قریبی بڑے کمرے اور راہداری کا جائزہ لیا مگر حویلی کے اس حصے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح مجھے نیند آ جائے

مگر کامیاب نہیں ہوئی۔ صبح تک میں جاگتی ہی رہی۔ میں نے اس دوران میں ایک مرتبہ چائے بنا کر بھی پی' صبح ناشتہ بھی مجھے خود ہی بنانا پڑا۔ میں بڑے کمرے میں ناشتہ کر رہی تھی کہ کچھ کھٹکا سا محسوس ہوا جیسے کوئی صدر دروازہ کھول کر اندر آرہا ہو۔ کچھ سوچ کر میں ایک دم اٹھی اور اس کمرے میں موجود الماری کی آڑ میں ہوگئی۔ اب اس کمرے میں داخل ہونے والا فوری طور پر مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ چند لمحے اور گزرے' پھر کمرے کے باہر مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یقیناً صدر دروازہ کھول کر ایک سے زیادہ افراد اندر آئے تھے۔ قدموں کی چاپ سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔

معاً مجھے ایک آشنا آواز سنائی دی' کوئی شخص کسی سے انگریزی میں مخاطب تھا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا کہ عذرا خان اتنی آسانی سے قابو میں آسکتی ہے' کہیں وہ کوئی اور لڑکی تو نہیں؟''

''نہیں' وہ عذرا خان ہی ہوسکتی ہے۔'' جواباً کہا گیا۔ یہ آواز بھی میرے لئے اجنبی نہیں تھی جواباً بولنے والا ضیا الاسلام تھا۔ ''عذرا خان کے سوا یہاں اور کون آسکتا ہے!''

''تمہیں چاہئے تھا کہ اس کا میک اپ ختم کرا کے یقین کرلیتے۔'' انگریزی میں پھر کہا گیا۔ بولنے والا یقیناً امریکی ایجنٹ سولومن ہی تھا۔ ''خیر میں اسے دیکھ لیتا ہوں۔'' آواز دور ہوتی چلی گئی۔ میرے اندازے کے مطابق سولومن اور ضیا الاسلام پہلے میری تلاش میں چھوٹے کمرے کی طرف گئے تھے۔

موقع سے فائدہ اٹھا کر میں پنجوں کے بل چلتی ہوئی بڑے کمرے سے نکل کر راہداری میں آگئی۔ اسی وقت میری نگاہ صدر دروازے پر پڑی جو نیم وا نظر آرہا تھا۔ قدموں کی آواز پیدا کئے بغیر میں تیزی کے ساتھ صدر دروازے کی طرف لپکی۔ ابھی میں دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ عقب سے ضیا الاسلام کی تیز آواز سنی۔ ''رک جاؤ عذرا خان! ورنہ...... ورنہ میں گولی مار دوں گا!''

مڑے بغیر میں نے جست بھری اور پھر صدر دروازے سے باہر نکل گئی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ دروازے کے باہر دو مسلح افراد موجود ہوں گے۔ اسی لئے نادانستگی میں چوٹ کھا گئی۔ مسلح افراد میں سے ایک نے اپنی رائفل کا بٹ میرے سر پر مارنا چاہا تھا اور میں جھکائی دے گئی تھی۔ رائفل کا بٹ میرے شانے پر پڑا تھا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اسی کے ساتھ میں چکرا کر زمین پر گر پڑی۔ بے خبری و بے حواسی کے وہ بس چند ہی لمحے تھے' اگر وہ لمحے کچھ اور طول پکڑ جاتے تو شاید پھر میں کچھ بھی نہ کر پاتی۔ کسی نے جیسے میرے اندر سرگوشی کی' عذرا خان! اگر تم اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکیں تو پھر یہاں سے کبھی فرار نہ ہوسکو گی!

میرے زمین پر گرتے ہی دونوں مسلح افراد مجھ پر جھپٹ پڑے تھے۔ میں نے زمین سے اٹھتے اٹھتے ان میں سے ایک کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی اور وہ شخص منہ کے بل چیخ کر ڈھیر ہوگیا' دوسرے ہی لمحے میں اچھل کر کھڑی ہوگئی اور اس کے سامنے دوسرے مسلح شخص کی رائفل پر ہاتھ ڈال دیا پھر میرے اور اس کے درمیان رائفل چھیننے کیلئے زور آزمائی ہونے لگی۔ رائفل غالباً لوڈ نہیں تھی ورنہ ہم دونوں ہی کو یہ زور آزمائی مہنگی پڑتی۔ وہ شخص مجھ سے رائفل چھیننے کیلئے اپنی طرف زور لگا رہا تھا اور میں اپنی طرف! اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے اچانک رائفل چھوڑ دی اور وہ شخص اپنے ہی زور میں پیچھے جا پڑا۔ اسی دوران میں سولومن اور ضیا الاسلام دونوں ہی باہر آچکے تھے۔ پہلا مسلح شخص ابھی تک زمین ہی پر پڑا تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے ایک بڑے پتھر سے اس کا سر ٹکرا گیا تھا جس کے سبب شاید وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔

''اب یہ کھیل ختم کردو عذرا خان!'' اچانک ضیا الاسلام بھاری آواز میں بولا۔

میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ریوالور نظر آرہا تھا۔ اس کے قریب ہی سولومن کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ جہاں میں کھڑی تھی اسی کی داہنی جانب مجھے ایک زینہ نظر آرہا تھا' زیادہ سوچ بچار کے بجائے میں نے عمل کو ترجیح دی اور دوسرے ہی لمحے زینے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اسی وقت ضیا الاسلام نے مجھ پر فائر کیا اور گولی میرے قریب سے گزر گئی۔

''یہ کیا حماقت کررہے ہو تم!'' میں نے سولومن کی آواز سنی۔ وہ یقیناً ضیا الاسلام کو فائر کرنے پر ڈانٹ رہا تھا۔ ''اسے زندہ پکڑنا ہے!...... اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم کرنا ہے' کیا خبر اس کے پیچھے پیچھے اس کے ساتھی بھی ڈھاکہ پہنچ گئے ہوں یا پہنچنے والے ہوں! وہ اگر ہماری راہ پر لگ گئے تو بہت برا ہوگا۔''

پھر ضیا الاسلام نے مجھ پر دوسرا فائر نہیں کیا اور میں تیزی سے زینے کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

''وہ اوپر گئی ہے...... اسے گھیرو!...... پکڑو!...... نکل کر جانے نہ پائے! ضیا الاسلام بلند آواز میں اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

اب میں سیڑھیاں چڑھ کر حویلی کی چھت پر پہنچ چکی تھی اور نیچے سے مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے چھت کی چار دیواری کے قریب پہنچ کر نیچے جھانکا' بلندی خاصی تھی۔ وہاں سے نیچے کودنا آسان نہیں تھا مگر اس کے سوا مجھے کوئی چارہ کار بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ابھی میں تذبذب کا شکار تھی کہ کیا کروں؟ کئی افراد چھت پر چڑھ آئے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں مجھے رسی کے بڑے بڑے پھندے نظر آرہے تھے۔ رسی کے ایسے پھندے عموماً جانوروں کو قابو میں کرنے کیلئے اوپر کی طرف پھینکے جاتے ہیں۔ اچانک ایک شخص نے رسی کا موٹا پھندا میری طرف پھینکا' پھندا پھینکنے میں وہ شخص یقیناً بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اگر میں تیزی سے ایک طرف نہ ہوجاتی تو میرا جسم پھندے کی گرفت میں آگیا ہوتا پھر اس سے پہلے کہ دوسرا شخص مجھ پر پھندا پھینکتا' میں چھت کی چار دیواری پر چڑھ گئی۔ اب ان لوگوں سے بچنے کی یہی صورت ممکن تھی کہ میں نیچے چھلانگ لگا دیتی اور پھر میں نے یہی کیا۔

اتنی بلندی سے نیچے کودنے کے سبب میرے دونوں پیر جھنجھنا گئے اور میں ایک طرف لڑھک گئی۔ زمین نرم تھی ورنہ مجھے چوٹ ضرور لگتی۔ ان لوگوں کو شاید یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ میں چھت کی چار دیواری پر چڑھ کر نیچے کود جاؤں گی ورنہ وہ اس کا بھی بندوبست ضرور کرتے۔ میں چند لمحے زمین پر پڑی رہی' پھر اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ قدم اٹھاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میرے بائیں پیر کے پنجے میں ہلکی سی سوچ آگئی ہے مگر یہ تکلیف میرے لئے قابل برداشت تھی' میں اپنے جسم کا زیادہ بوجھ دائیں پیر پر ڈال کر آگے بڑھنے لگی' جلد از جلد میں اس حویلی سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔

گھنے درختوں کے ایک جھنڈ سے نکل کر میں کچھ ہی دیر میں ایک نیم پختہ سڑک پر نکل آئی۔ چند ہی لمحے بعد دائیں جانب سے مجھے ایک بس آتی دکھائی دی۔ میں نے اسے روکنے کیلئے ہاتھ اٹھا دیا۔ بس میرے قریب آکر رک گئی۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ بس ڈھاکہ جا رہی تھی' میں اس میں بیٹھ گئی۔

بس میں ڈھاکہ کی طرف جاتے ہوئے میرا ذہن سولومن اور ضیا الاسلام ہی میں الجھا ہوا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ میں ان کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ میرا یہ سفر کامیاب ہی رہا تھا' کم از کم ضیا

الاسلام کے بارے میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ وہ امریکی ایجنٹوں کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔ اس سے میری جو گفتگو ہوئی تھی وہ بھی میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ اس گفتگو کی روشنی میں بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ سازش کا جال بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ بنگال کا جو حصہ ہندوستان میں تھا' وہ بھی اس سازش کی لپیٹ میں تھا۔ بجا طور پر اسے علیحدگی پسندانہ رجحان کہا جاسکتا تھا۔ گریٹر بنگال کا یہ منصوبہ یقیناً امریکیوں ہی کے ذہن کی اختراع تھی۔ اہل بنگال کو محرومی کا احساس دلا کر وہ اپنے مذموم عزائم پورے کرنا چاہتے تھے۔ یہ معاملہ بہرحال ایسا نہیں تھا کہ اسے غیر اہم سمجھ کر ٹال دیا جاتا۔ میرے خیال میں یہ خطرے کی گھنٹی تھی جس کا تدارک فوری طور پر ضروری تھا۔ صدر مملکت کی طرف سے مجھے جو اختیارات حاصل تھے' وہ بھی میری نظر میں تھے مگر میں ان اختیارات کو مناسب موقع پر استعمال کرنا چاہتی تھی۔ جب تک بس ڈھاکہ کی حدود میں داخل نہ ہوگئی میں انہیں خیالات کے تانے بانوں میں الجھی رہی۔

بس سے میں نواب پور روڈ اتر گئی۔ وہاں سے بادام تلی گھاٹ زیادہ دور نہیں تھا اس لئے میں نے ایک بار پھر بابر کو وہاں دیکھ لینے کا فیصلہ کیا۔ گزشتہ روز اس سے میری ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ ابھی صبح کے نو ہی بجے تھے۔ مجھے امید تھی کہ بابر اپنے دوست کے گھر سے نہیں نکلا ہوگا پھر جب میں مطلوبہ مکان تک پہنچی تو میری توقع پوری ہوگئی۔ اگر مجھے مزید پانچ منٹ کی تاخیر ہوجاتی تو شاید بابر سے آج بھی ملاقات نہ ہو پاتی۔ وہ بس کہیں جانے ہی والا تھا۔

دروازے پر دستک کے جواب میں بابر کا دوست فرید احمد ہی آج بھی باہر آیا تھا اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔ کل جب میں آئی تھی تو میرے چہرے پر دوسرا میک اپ تھا۔ وہ اس لئے مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔

''جی فرمایئے!'' اس نے مجھ سے کہا تھا۔

''مجھے آپ کے دوست بابر سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک وقت پر آگئیں آپ...... وہ بس گھر سے نکلنے ہی والا تھا' تشریف لایئے!'' وہ ایک طرف ہوگیا تاکہ میں اندر داخل ہوسکوں۔

میں بلاجھجک دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔ فرید احمد نے مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لاکر بٹھا دیا جو ڈرائنگ روم کے ساتھ ساتھ کسی کی خواب گاہ بھی معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہاں میز کرسیوں کے علاوہ ایک پلنگ بھی پڑا تھا۔

''آپ بیٹھیے' میں بابر کو ابھی بھیجتا ہوں۔'' یہ کہہ کر فرید احمد اندرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد اندرونی دروازے کا پردہ اٹھا کر بابر اس کمرے میں آ گیا۔ اسے میں نے کئی سال بعد دیکھا تھا لیکن پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس عرصے میں صرف اس کی مونچھوں میں اضافہ ہوا تھا۔ پہلے اس کی مونچھیں اتنی گھنی نہیں تھیں۔

''خاتون! آپ کو مجھ سے ملنا ہے نا؟'' بابر میرے قریب آتے ہوئے بولا۔

''ہاں بابر' تمہی سے ملنا ہے مجھے!'' میں نے مسکرا کر کہا۔

میری آواز سن کر وہ چونکا اور پھر مجھے حیران حیران سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''آپ...... آپ کی آواز تک کچھ...... کچھ آشنا سی لگ رہی ہے' مگر صورت...... وہ کہنے لگا۔

''تم یقیناً ایک ذہین نوجوان ہو بابر کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود تمہیں میری آواز یاد رہی' میں تمہیں مزید پریشان نہیں کروں گی۔ اس وقت میرے چہرے پر میک اپ ہے ورنہ تم مجھے دیکھتے ہی پہچان جاتے۔ میں عذرا خان ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''عذرا خان!...... آپ...... آپ کب آئیں؟ اور...... آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں کہاں......''

''میں تمہاری کوٹھی گئی تھی کل'' میں نے بتایا۔ ''وہیں سے مجھے یہاں کا پتا معلوم ہوا' تمہاری بہن نسرین نے یہ پتا لکھ کر دیا تھا۔''

''میں تو مایوس ہی ہوچکا تھا آپ کی طرف سے کہ شاید اب کبھی ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ یہ کہتا ہوا وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔'' یہ بتائیں کہ آپ کہاں ٹھہری ہیں؟''

''ایئرپورٹ کے قریب ایک ہوٹل میں میرا قیام ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور ابھی مجھے یہاں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں۔''

''ٹھہریں'' میں ابھی آیا' ذرا چائے کیلئے کہہ دوں۔'' وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا' پھر خود ہی رک کر بولا۔ ''ارے ہاں ناشتہ بھی کرلیا ہے آپ نے یا نہیں؟''

''تکلف کی ضرورت نہیں بابر' میں ناشتہ کرکے آئی ہوں' ہاں چائے پی لوں گی۔'' میں بولی۔

''اچھا' چلیں چائے ہی سہی!'' یہ کہتے ہوئے وہ اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی' اس سے مل کر مجھے واقعی خوشی محسوس ہورہی تھی۔ ڈھاکہ میں وہ میرے لئے بہت مددگار و معاون ثابت ہوسکتا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ لوٹ آیا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں اب کہیں' یہ اچانک آپ یہاں کیسے آگئیں؟''

''اچانک تو خیر نہیں'' میں نے کہا۔ ''کافی دن سے میرا یہاں آنے کا پروگرام بن رہا تھا' یہاں میں ایک اہم معاملے کی تفتیش کرنے آئی ہوں۔''

''وہ تو میں آپ کے چہرے پر میک اپ دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو بتائیں!''

میں نے چند لمحے توقف کیا' پھر بولی۔ ''یہ بتاؤ بابر' کیا تمہارے ذریعے کچھ دن کیلئے کوئی مکان کرائے پر مل سکتا ہے؟''

''کیا آپ رہیں گی اس میں؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں' میں نے جواب دیا۔'' ہوٹل میں قیام میرے لئے مشکلات پیدا کرسکتا ہے' بہتر یہی ہے کہ......''

''میں سمجھ رہا ہوں'' وہ میری بات کاٹ کر بولا' پھر کہنے لگا۔ ''کیا آپ یہاں میرے ساتھ رہ سکتی ہیں؟''

''تمہارے ساتھ!'' میں حیرت سے بولی۔

''ہاں کیوں کیا حرج ہے! اس مکان میں تین کمرے ہیں اور یہاں میرے ساتھ صرف فرید رہتا ہے' اس کے علاوہ ایک ملازم لڑکا ہے' ہم ایک کمرہ آپ کیلئے سپیئر کرسکتے ہیں۔''

''مگر اس کمرے کی حالت دیکھ کر تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جگہ کی قلت ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں'' وہ بولا' بات یہ ہے کہ تیسرے کمرے کو فرید نے سٹور بنا رکھا ہے۔ اس کی صفائی کی جا سکتی ہے' میری درخواست یہی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ہی رہیں۔''

''تمہارا اصرار ہے تو مان جاتی ہوں میں' پھر بتاؤ' میں کب تک یہاں آ جاؤں؟'' میں نے پوچھا۔

''آج شام تک وہ کمرہ رہنے کے قابل بنا لیا جائے گا' آپ آج ہی آ جائیں' اپنا سامان لے کر!''

''ٹھیک ہے' تو پھر چلتی ہوں اب!''

''اور چائے؟''

''ارے ہاں' وہ تو میں بھول ہی گئی' چلو کچھ دیر اور بیٹھ جاتی ہوں۔''

''آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اہم معاملہ ہے کیا جس کی تفتیش کیلئے آپ یہاں آئی ہیں!'' بابر بولا۔

''یہاں آ جاؤں گی تو اس کے بارے میں بھی تمہیں معلوم ہی جائے گا۔''

ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ ایک پندرہ سالہ لڑکا چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بابر کے اشارے پر وہ درمیانی میز کی طرف بڑھ آیا اور چائے کی پیالیاں ٹرے سے اٹھا کر باری باری میرے اور بابر کے سامنے رکھ دیں۔

ملازم لڑکا' چائے دے کر چلا گیا تو اچانک مجھے ایک خیال آیا اور اسی خیال کے زیر اثر میں نے بابر سے پوچھا۔ ''تم سبود مکرجی کو جانتے ہو؟''

میرے اس سوال پر وہ ایک دم چونک اٹھا۔ ''آپ اسے کیسے جانتی ہیں؟''

''میرا خیال ہے بابر کہ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے!''

''سوری!'' وہ کچھ' جل سا ہو گیا۔'' دراصل غیر متوقع طور پر آپ کی زبان سے سبود مکرجی کا نام سن کر میں کچھ حیران سا ہو گیا تھا' خیر...... اس شخص کو آپ مشرقی پاکستان کے زیر زمین جرائم پیشہ افراد کا بے تاج بادشاہ کہہ سکتی ہیں۔ اسے آج تک صرف چند افراد کے سوا کسی نے نہیں دیکھا۔ ان دنوں میں اس کی راہ پر لگا ہوا ہوں۔''

''شکنتلا کو بھی جانتے ہو تم؟'' میں نے مزید سوال کیا۔

''جی ہاں'' اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''یہ عورت اس کی محبوبہ کہلاتی ہے' یہ بھی سبود مکرجی کی طرح پراسرار ہے۔''

''مراد یہ کہ اسے بھی کسی نے نہیں دیکھا کیا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''جی...... جی ہاں'' مگر ایک بار اس سے میری مڈبھیڑ ہو چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شکنتلا ہی ہو سکتی تھی۔''

''میں اس بات کی تصدیق کر سکتی ہوں کہ تمہاری مڈبھیڑ شکنتلا ہی سے ہوئی تھی یا تم کسی اور سے ٹکرائے تھے؟'' میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''وہ کس طرح؟'' بابر حیران سا ہو کر کہنے لگا۔

''میں تمہیں اس کا حلیہ بتا سکتی ہوں۔'' پھر میں نے شکنتلا کا حلیہ بیان کر دیا۔

''بالکل!...... قطعی یہی حلیہ تھا اس کا!'' بابر نے پرجوش لہجے میں کہا۔

''تو پھر یقین کر لو کہ وہ شکنتلا ہی تھی۔''

''مجھے بالکل یقین آ گیا اور یہ بھی کہ آپ نے شکنتلا کو ضرور دیکھا ہے۔''

اس کے بعد بابر نے مجھے کریدنے کی بہت کوشش کی کہ میں سبود مکرجی اور شکنتلا کو کیسے جانتی ہوں مگر فی الحال میں نے اسے کچھ نہیں بتایا اور چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پھر آپ آج شام کو آ رہی ہیں نا؟'' چلتے چلتے بابر نے تصدیق چاہی۔

''ہاں ضرور!'' میں نے اسے یقین دلایا اور پھر ''خدا حافظ'' کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

بابر سے ملنے کے بعد اب ایک بار پھر میرا ارادہ ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری سے ملنے کا تھا۔ میں نے اسے دھان منڈی کی جس کوٹھی کا نمبر دیا تھا' اس کے بارے میں بھی معلوم کرنا تھا۔ ٹیکسی کر کے میں گرین روڈ کیلئے روانہ ہو گئی۔

عبیدالرحمٰن چودھری کے دفتر پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہے۔ اس سے ملاقات کی خاطر مجھے تقریباً پون گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ مجھے نئے میک اپ میں دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔ اس کے پی اے نے بھی اس وقت حیرت کا اظہار کیا تھا جب میں نے اسے اپنا نام بتایا۔

''آپ کو پھر نئے میک اپ کی ضرورت پیش آ گئی'' عبیدالرحمٰن چودھری نے کہا۔

''ہاں' میں نے ضرورتاً ہی ایسا کیا ہے۔'' میں بولی۔ پھر اس سے پوچھا ''دھان منڈی کی جس کوٹھی کا نمبر میں نے کل آپ کو دیا تھا' اس کے متعلق کچھ معلوم ہوا؟''

''جی ہاں'' اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''وہ کوٹھی حزب اختلاف کے ایک لیڈر ایس رحمٰن کی ہے جس کا قیام ان دنوں مغربی پاکستان میں ہے۔ اطلاعات کے مطابق یہ کوٹھی گزشتہ چھ ماہ سے خالی پڑی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ اس خالی کوٹھی کو اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کر رہے ہیں اور ایس رحمٰن کو اس کا علم نہیں۔''

''یہ کوئی ضروری نہیں۔''

''کیا؟''

''یہی کہ ایس رحمٰن لاعلم ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے مشرقی پاکستان کے بجائے وہ مغربی پاکستان میں کیوں رہ رہا ہے' اور وہاں اس کا قیام کس شہر میں ہے؟''

''یہ تو معلوم نہیں کہ گزشتہ چھ ماہ سے وہ مغربی پاکستان میں کیوں رہ رہا ہے' ہاں یہ ضرور معلوم ہے کہ اس کا قیام راولپنڈی میں ہے۔'' عبیدالرحمٰن چودھری نے بتایا۔

''یہاں اس کے کچھ عزیز و اقارب تو ہوں گے!''

''ممکن ہے کہ ہوں۔''

''تو ان کے بارے میں معلومات حاصل کرائیں۔'' میں نے کہا۔

''بہتر ہے' لیکن...... اس کا فائدہ؟''

''قبل از وقت کچھ کہنا مشکل ہے لیکن اس طرح بات آگے ضرور بڑھ سکتی ہے۔ اس کے عزیز و اقارب میں کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جو سبود مکرجی کے قریب ہو' یا اس کا آلہ کار بن گیا ہو۔ سبود مکرجی نے مجھے اغوا کر کے وہیں لانے کا حکم دیا تھا اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ کوٹھی سبود مکرجی کے تصرف میں رہتی ہے۔''

"جی ہاں، جو واقعہ آپ کو پیش آیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔" عبیدالرحمٰن چودھری میری تائید میں بولا۔

"ضیا الاسلام کے بارے میں تفتیش کچھ آگے بڑھی؟" میں نے دریافت کیا۔

"ابھی تو بات وہیں کی وہیں ہے۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ اسے گرفتار کرلیا جائے؟"

"مگر کس جرم میں؟...... ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں۔" وہ بولا۔

"شبے میں بھی تو گرفتاری ممکن ہے نا!" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اس سے حاصل کیا ہوگا؟"

"سنیں چودھری صاحب، یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ضیا الاسلام، امریکی ایجنٹوں کا آلہ کار ہے اور یہ بھی کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے۔"

"میں ثبوت ہی کی تو بات کر رہا تھا، اگر ثبوت موجود ہے تو پھر گرفتاری یقیناً ہوسکتی ہے۔" اس نے کہا۔

"ثبوت میں خود ہوں!"

"میں سمجھا نہیں۔" وہ چونک کر بولا۔

"میں کل نارائن گنج گئی تھی۔" میں نے گویا انکشاف کیا۔ "گزشتہ رات میں نے ضیا الاسلام ہی کی حویلی میں گزاری ہے۔"

"کیا واقعی؟" عبیدالرحمٰن چودھری حیرت زدہ اور ناقابل یقین سے لہجے میں بولا۔

"ہاں ہاں...... کیوں اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟!"

"ابھی تو آپ آئی ہیں اور اتنی جلدی...... کمال ہے!...... اگر مناسب سمجھیں تو مجھے تفصیلات سے آگاہ کردیں کہ آپ نے کیا معلومات حاصل کیں۔"

جواباً میں نے مختصراً عبیدالرحمٰن چودھری کو دو باتیں بتا دیں جو مجھے معلوم ہوئی تھیں۔ عبیدالرحمٰن چودھری کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا۔

"ان حالات میں ضیا الاسلام پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔ کم از کم وہ ان لوگوں کی نشاندہی تو کر ہی سکتا ہے جو سازش کے اس منصوبے میں اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے اس سلسلے میں؟" یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"میں آپ سے متفق ہوں۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "آپ نے جو کچھ بتایا ہے وہ ایک بڑے خطرے کا پیش خیمہ معلوم ہوتا ہے۔ میں آج ہی ضیا الاسلام کی گرفتاری کے احکام جاری کردیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ خود اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہیں گی۔"

"بالکل۔" میں نے اقرار میں سر ہلایا، پھر مجھے ایک اور بات یاد آگئی۔ "اس کار کے بارے میں کیا معلوم جس کا نمبر میں نے آپ کو دیا تھا؟"

"وہ کار چوری کی ثابت ہوئی۔ تھانہ پرانا پلٹن میں اس کی رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔" عبیدالرحمٰن چودھری نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"اچھا اب میں چلوں گی۔ یہ بتائیں کہ ضیا الاسلام کو حراست میں لینے کے بعد کہاں رکھا جائے گا؟ مجھے کہاں اس سے ملنا ہوگا۔"

"ابھی تو آپ نے چائے بھی نہیں پی، بیٹھیے نا! میں آپ کیلئے چائے منگواتا ہوں۔"

"نہیں چائے رہنے دیں، میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دے دیں۔" میں جلدی سے بولی۔

"آپ ایسا کریں کہ چاہیں تو کل صبح یہیں آجائیں میں خود آپ کو ساتھ لے کر صدر گھاٹ چلوں گا۔ سی آئی ڈی آفس وہیں ہے، میرا خیال ہے کہ ضیا الاسلام سے وہیں پوچھ گچھ کی جائے، کسی تھانے میں اسے نہ رکھا جائے۔"

"آپ کا خیال درست ہے، لیکن میں اگر یہاں آنے کے بجائے سیدھی سی آئی ڈی آفس پہنچ جاؤں تو کیا حرج ہے؟! آپ فون پر میرے بارے میں سی آئی ڈی آفس والوں کو بتا دیں۔"

"جیسا آپ چاہیں، آپ کہتی ہیں تو میں انہیں فون کردوں گا، مگر شناخت کیلئے......"

"صرف میرا نام کافی ہے۔" میں نے اس کی بات پوری کردی۔ "میں انہیں اپنا نام بتادوں گی۔"

"دراصل مجھے بھی تجسس رہے گا کہ آپ کو ضیا الاسلام نے کیا بتایا! میں بھی اسی لئے آپ کے ساتھ چلنا چاہتا تھا۔"

"تو آپ بھی آجائیں وہاں!" میں بولی۔ "کل صبح ساڑھے نو اور دس بجے کے درمیان میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔ آپ خود وہاں ہوں تو شناخت کا مسئلہ بھی نہیں رہے گا۔"

"ٹھیک ہے، میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں، ساڑھے نو اور دس کے درمیان۔" عبیدالرحمٰن چودھری نے کہا۔

پھر میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور وہاں سے اپنے ہوٹل کیلئے روانہ ہوگئی۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے دوپہر کے بارہ بج گئے تھے۔ گزشتہ رات کا بڑا حصہ جاگتے گزرا تھا۔ اس لئے میں تھکن سی محسوس کررہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بستر پر دراز ہوتے ہی میری آنکھوں میں نیند نے جال بننا شروع کردیئے اور کچھ ہی دیر بعد میں سوگئی۔

اس وقت شام کے چار بج رہے تھے جب میری آنکھ کھلی، دوپہر کا کھانا بھی سونے کی وجہ سے گول ہوگیا تھا، بستر سے اٹھ کر میں باتھ روم میں گھس گئی، بابر سے میں نے آج شام ہی سامان لے کر اس کے پاس پہنچنے کا وعدہ کیا تھا، اس لئے غسل کرکے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ناشتہ کیا اور پھر ہوٹل کے واجبات ادا کردیئے۔ سوا پانچ بجے کے قریب میں ایک ٹیکسی کے ذریعے بادام تلی گھاٹ روانہ ہوگئی۔

بابر مجھے اپنا منتظر ملا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی رقص کرنے لگی۔ اس نے کمرے میں میرا سامان، وغیرہ سیٹ کرایا اور پھر میرے لئے چائے بنانے لگا۔ ملازم لڑکے کو وہ چھٹی دے چکا تھا۔ وہ لڑکا صبح آٹھ بجے آتا تھا اور شام پانچ بجے چلا جاتا تھا۔ اس کا دوست فرید احمد بھی اس وقت گھر پر نہیں تھا۔

جب وہ میرے لئے چائے بنا کر لایا تو میں نے اس سے کہا۔ "بابر! تم اس ملازم لڑکے کو مستقل طور پر چھٹی دے سکتے ہو؟"

"اگر آپ کہیں گی تو یقیناً چھٹی دے دوں گا۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "بس تھوڑی بہت پریشانی ہوگی، کام وغیرہ کے سلسلے میں!"

"میں دراصل یہ چاہتی ہوں کہ آزادی کے ساتھ یہاں رہ سکوں۔ مثلاً اس وقت میرے چہرے پر جو

میک اپ ہے اسے ختم کر کے میں نیا میک اپ کرنا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے کہ آئندہ بھی اس کی ضرورت پیش آئے۔ وہ لڑکا یقیناً اس سے کھٹک جائے گا جو میں نہیں چاہتی۔"

"ٹھیک ہے کل صبح وہ آئے گا تو میں اس کا حساب کر دوں گا۔" بابر نے کہا۔

"میں کیونکہ اس وقت نیا میک اپ کرنا چاہتی ہوں اس لئے کوشش کرنا کہ وہ زیادہ دیر یہاں نہ رکے اور اس کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے اٹیچی کیس سے میک اپ کا سامان نکال لیا اور پھر میک اپ کرنے لگی۔ یہ میک اپ میں اس لئے ختم کرنا چاہتی تھی کہ اس میں مجھے ضیا الاسلام اور اس کے آدمی دیکھ چکے تھے۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری کو بھی میں نے اب تک اپنی سکونت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ آج ملاقات کے دوران میں اس نے مجھ سے یہ سوال بھی نہیں کیا تھا۔ غالباً وہ سمجھ چکا تھا کہ میں اس سلسلے میں رازداری سے کام لینا چاہتی ہوں۔

بابر میرے نزدیک قابل اعتبار تھا اسی لئے اس کے کچھ پوچھے بغیر میں نے اسے مختصر طور پر تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔

"مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے مجھے اعتماد کے قابل سمجھا۔" بابر کہنے لگا "میں بھی اپنے بارے میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ میں یہاں نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جو اپنے طور پر جرائم کی تفتیش کرتی ہے اور جرائم پیشہ افراد کو سزائیں دیتی ہے۔ میرا دوست فرید احمد بھی اسی تنظیم کا ایک رکن ہے۔ ان دنوں ہم یہاں کے سب سے بڑے جرائم پیشہ سبودمکرجی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ اسے اس کے انجام تک پہنچا کر دم لیں گے۔ دراصل حزب اختلاف کے کچھ سرکردہ افراد اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں اس پر ہاتھ ڈالنے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ ایک دن ہم اپنے مقصد میں کامیاب ضرور ہوں گے۔"

"حزب اختلاف کے ان لیڈروں میں کیا کوئی ایس رحمٰن بھی شامل ہے؟" میں نے بابر سے سوال کیا۔

"جی ہاں۔" بابر نے جواب دیا۔ "ہمیں خاصے دن بعد اس کا علم ہوا کیونکہ ایس رحمٰن خود ان دنوں مغربی پاکستان کے شہر راولپنڈی میں ہے۔ یہاں دھان منڈی میں اس کی کوٹھی سبودمکرجی کے مصرف میں تھی۔ جب ہمارے آدمیوں نے وہاں ریڈ کیا تو سبودمکرجی وہاں سے فرار ہو گیا۔"

"اور فرار ہوتے ہوتے اس نے کوٹھی میں آگ بھی لگا دی تاکہ تمہارے آدمیوں کو وہاں اس کیخلاف کوئی ثبوت نہ مل سکے۔" میں نے اس کی بات پوری کر دی۔

بابر مجھے حیرت سے دیکھنے لگا تو میں نے اسے اپنی قید اور پھر قید سے فرار کے متعلق بھی بتا دیا جو پہلے نہیں بتایا تھا۔

"آپ نے اس لئے شکنتلا کا حلیہ بتا دیا تھا۔" بابر یہ کہہ کر مسکرایا۔ پھر کہنے لگا۔ "آپ نے جو حالات بتائے ہیں ان کی روشنی میں یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکی ایجنٹوں نے ہی سبودمکرجی کی خدمات حاصل کی ہوں گی تاکہ آپ ان سے دور ہی دور رہیں۔"

"ہاں حالات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے بابر کی بات سے اتفاق کیا۔

"سبودمکرجی کے بارے میں ایک تازہ ترین اطلاع یہ ملی ہے کہ آج رات وہ ڈھاکہ کلب میں ایک غیر ملکی عورت سے ملنے والا ہے۔ یہ عورت فرانس کی رہنے والی ہے اور یہاں ٹورسٹ کی حیثیت سے آئی ہے اس کا نام مادام ژینا ہے۔ اس کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ کسی بین الاقوامی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور یہاں کسی خاص مقصد سے آئی ہے۔ ہمارے آدمی اس عورت کے توسط سے سبودمکرجی کو پہچان لیں گے۔ اس کا بندوبست بھی کر لیا گیا ہے کہ سبودمکرجی کی تصاویر لے لی جائیں۔"

"لیکن بابر یہ ضروری تو نہیں کہ سبودمکرجی اپنی اصل شکل میں ہو ایسی صورت میں تصاویر لینا بے سود ہی ہوگا۔ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تم لوگ سبودمکرجی پر ہاتھ ڈال دو!" میں نے تجویز پیش کی۔ "میرے خیال سے تم لوگوں کو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔"

"دراصل ہم اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے تھے اور یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ مادام ژینا سے اس کی ملاقات کا مقصد کیا ہے! بہرحال جو آپ کی تجویز ہے اس پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے مگر اس کیلئے مجھے ازسرنو پلاننگ کرنا پڑے گی اور اس کیلئے فوری طور پر سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔" بابر نے کہا۔

"اگر تم لوگ مناسب سمجھو تو میں بھی تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں۔" میک اپ ختم کرتے ہوئے میں نے آئینے پر آخری نگاہ ڈالی۔

"اسے ہم لوگ اپنی خوش قسمتی تصور کریں گے۔" بابر پرجوش لہجے میں بولا۔ "نئی حکمت عملی پر عملدرآمد کی خاطر مجھے فوری طور پر اپنے ساتھیوں سے ملنا پڑے گا اس لئے میں اب چلوں گا' واپسی پر مجھے تقریباً اڑھائی تین گھنٹے لگ جائیں گے آپ تیار رہیے گا' ہمیں رات دس بجے تک ڈھاکہ کلب پہنچنا ہوگا۔" یہ کہہ کر بابر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس وقت چھ بج رہے ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے تک لوٹ آؤ گے!...... میں بہرحال تمہیں تیار ہی ملوں گی؟" میں نے کہا۔

"ممکن ہے ساڑھے چھ بجے تک فرید احمد آ جائے۔ آپ اس سے کہہ دیں کہ وہ فوری طور پر لال باغ پہنچ جائے' وہاں میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔" بابر نے چلتے چلتے مجھ سے کہا۔

"میں تمہارے دوست تک تمہارا پیغام پہنچا دوں گی' تم اطمینان سے جاؤ۔"

پھر باہر چلا گیا۔ میں نے مکان کا صدر دروازہ اندر سے بند کر دیا اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس مکان میں اب میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ ہوٹل سے یہاں منتقل ہونا میرے لئے سودمند ہی ثابت ہوا تھا۔ ہوٹل کی نسبت میں خود کو یہاں زیادہ محفوظ تصور کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ بابر کی اور میری راہیں ایک ہی تھیں۔ سبودمکرجی میرے حریفوں میں سے بھی ایک تھا اور بابر بھی اس کے پیچھے لگا ہوا تھا پھر یہ کہ میں تنہا نہیں رہی تھی' بابر اور اس کے ساتھی میرے لئے مددگار و معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ ان پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ بابر سے یہ جان کر سبودمکرجی آج رات ڈھاکہ کلب میں کسی غیر ملکی عورت ژینا سے ملنے والا تھا' میرے دل میں بھی تجسس پیدا ہو گیا تھا' ژینا پر بابر کے آدمیوں کی نظر تھی اور وہ اسے پہچانتے تھے۔ اس کے توسط سے سبودمکرجی کو پہچان لیا جاتا۔

بستر پر نیم دراز ہو کر میں اس وقت تک حالات و واقعات پر غور کرتی رہی جب تک دروازے پر دستک نہ سنائی دی۔ اس وقت ساڑھے چھ بجنے والے تھے۔ بابر نے اپنے دوست فرید احمد کے بارے میں یہی بتایا تھا کہ

وہ اس وقت آئے گا۔ مجھے اسی لئے یہ توقع تھی کہ دروازے پر دستک دینے والا وہی ہوگا۔ میں نے اسی سبب دروازہ کھول دیا اور پھر دروازہ کھلتے ہی مجھے ایک دم پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ میری طرف ایک ریوالور کی نال اٹھی ہوئی تھی' آنے والے دو قوی ہیکل مقامی افراد تھے جن میں سے ایک کے چہرے پر داڑھی تھی' دروازہ کھلتے ہی وہ دونوں اندر گھس آئے تھے۔

''کون ہو تم؟'' ان میں سے داڑھی والے نے سخت لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ اسے شاید توقع نہیں تھی کہ دروازہ کھلنے پر مجھ سے ملاقات ہوگی۔

''مم...... میں...... دردانہ ہوں...... فف...... فرید احمد کی چچازاد۔'' میں نے گھبرانے اور خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے رک رک کر کہا۔

''دروازہ بند کردو اندر سے!'' داڑھی والے نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ ریوالور اس کے ساتھی کے ہاتھ میں تھا۔

''تم...... تم لوگ کیا...... کیا چاہتے ہو؟'' میں نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

''لڑکی یہ بتاؤ کہ بابر اور فرید احمد کہاں ہیں؟ داڑھی والے نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔'' اور تم یہاں کیسے نظر آرہی ہو۔''

''میں...... میں فرید احمد سے ملنے آئی تھی وہ...... وہ کسی ضروری کام سے اپنے دوست بابر کے ساتھ گیا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ میں اس کا انتظار کروں۔ اس نے جلد ہی لوٹ آنے کیلئے کہا تھا۔'' میں بدستور جھوٹ بولتی رہی۔

''انہیں گئے ہوئے کتنی دیر ہوگئی؟'' داڑھی والے نے سوال کیا۔

''ابھی چند منٹ پہلے وہ گئے ہیں۔'' جواباً میں بولی۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جلد واپس نہیں آئیں گے۔'' اس بار ریوالور والا بولا' پھر وہ عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے کہنے لگا ''ہمیں بہرحال ان دونوں کی واپسی کا انتظار کرنا ہے اور یہ بہت اچھا ہے کہ تم یہاں موجود ہو' انتظار کے یہ لمحات ہمیں گراں نہیں گزریں گے۔''

''تم...... تم کیا...... کیا کرنا چاہتے ہو؟...... میں...... میں سمجھی نہیں۔'' اس کے لہجے سے سب کچھ سمجھ جانے اور آنکھوں میں شیطانی چمک دیکھنے کے باوجود میں انجان بن کر بولی۔

''جلد ہی سمجھ جاؤ گی۔'' ریوالور والا ہنسا' پھر داڑھی والے سے بولا ''کیوں استاد' پہلے تم سمجھاؤ گے یا میں اسے سمجھاؤں۔''

''جیسے تمہاری مرضی!...... چلو پہلے تم ہی سہی!...... ریوالور مجھے دے دو!...... اور کہو تو میں کچھ دیر کو دوسرے کمرے میں چلا جاؤں۔'' داڑھی والے نے کہا۔

''دوسرے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں۔'' ریوالور والے نے اپنا ریوالور اسے تھما دیا' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''دیکھو چندا' چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر تم نے یہ کوشش کی تو ہم تمہارے منہ میں کپڑا ٹھونس دیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھا' اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے۔

میں نے اسے قریب آنے دیا اور پھر اچانک اچھل کر اس کے سینے پر اپنے سر کی ٹکر ماری' وہ لڑکھڑا کر

پیچھے ہٹا اور اسی وقت میں نے داڑھی والے کے ہاتھ پر جھپٹا مارا جو قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تو نہیں آسکا مگر اس کے ہاتھ میں بھی نہ رہا اور دور جا گرا۔ میں اسی موقع کی منتظر تھی' بجلی کی طرح کوند کر میں نے ان میں سے ایک کی پنڈلی پر اپنے سیدھے پیر سے بھرپور ضرب لگائی اور دوسرے کے پیٹ پر ناف کے قریب گھونسا مارا۔ وہ دونوں ہی چیخ اٹھے۔ ایک اپنا پیٹ تھامے زمین پر بیٹھنے لگا اور دوسرا جھک کر پنڈلی تھامنے لگا۔ اسی لمحے میں نے باری باری ان کے ماتھوں کو نشانہ بنایا اور وہ چیختے ہوئے زمین پر چت گر پڑے۔ میرے پیر کی بھرپور ٹھوکریں ان کے ماتھوں پر پڑی تھیں' ضربیں شدید تھیں جس کی وجہ سے ان کے ماتھے کی کھال پھٹ گئی تھی اور خون بہنے لگا تھا۔ شدید تکلیف کے آثار ان کے چہروں پر تھے اور اس کے ساتھ ساتھ حیرت بھی نظر آرہی تھی۔ زندگی میں شاید پہلی بار وہ کسی عورت کے ہاتھوں پٹے تھے۔

''اب اٹھو نہ میرے شیرو!'' میں ان کے قریب پہنچ کر تیز لہجے میں بولی۔ ''کوشش کرو مجھے پکڑنے کی۔''

''ہمیں...... معاف...... معاف کردیں!'' داڑھی والا اپنے ماتھے سے خون پونچھتے ہوئے گھگیانے لگا۔

''ہمیں معلوم نہیں تھا کہ...... کہ بابر اور فرید احمد کے بجائے یہاں آپ ہوں گی۔''

داڑھی والے کے ساتھی نے بھی عاجزانہ لہجے میں اسی طرح کے الفاظ کہے۔

''معافی کی صرف ایک صورت ہے کہ تم لوگ یہ بتا دو کہ یہاں تمہیں کس نے اور کیوں بھیجا تھا؟'' میں سخت لہجے میں بولی۔

''ہمیں یہاں اکبر نے بھیجا تھا کہ...... کہ......'' داڑھی والا کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں ہاں' بولو نا! چپ کیوں ہوگئے!'' میں نے اسے ٹوکا۔

''اکبر نے کہا تھا کہ ہم بابر اور فرید احمد کو اس قابل نہ چھوڑیں کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔'' داڑھی والے نے بتایا۔

''ظاہر ہے اس کیلئے اکبر نے تمہیں معاوضہ بھی دیا ہوگا۔'' میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

''جی...... جی ہاں...... دس ہزار طے ہوئے تھے اور...... پانچ ہزار پیشگی مل گئے تھے' بقیہ رقم کام ہونے کے بعد آج ملنا تھی۔''

''کیا تم لوگ جانتے ہو کہ اکبر سیٹھ مکرجی کیلئے کام کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں معلوم ہے ہمیں! مگر اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔''

''کیا تم دونوں میں سے کسی نے سیٹھ مکرجی کو دیکھا ہے؟''

''نہیں'' وہ دونوں باری باری بولے۔ ''اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ بہت پراسرار شخصیت کا مالک ہے۔ کہتے ہیں کہ جو اسے دیکھ لے وہ پھر زندہ نہیں بچتا۔''

اسی وقت اچانک گھر کے دروازے پر دستک سنائی دینے لگی۔

''تم دونوں اسی طرح زمین پر پڑے رہو گے اور اٹھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔'' میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے بلند آواز میں دستک دینے والے کا نام دریافت کیا۔

''فرید احمد'' دروازے کی دوسری جانب سے آواز آئی۔ ''دروازہ کھولیے!''

میں نے فرید احمد کی آواز پہچان کر دروازہ کھول دیا۔

اندر آتے ہی فرید احمد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے میرے چہرے کو بھی حیران حیران سی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کا سبب میرے چہرے پر کیا جانے والا نیا میک اپ ہی ہوسکتا تھا۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے؟ ...... کون ...... کون لوگ ہیں یہ؟'' فرید احمد میری طرف دیکھتے ہوئے رک رک کر بولا۔

''یہ دونوں تمہیں اور بابر کو معذور بنانے آئے تھے اور اب خود قابل رحم نظر آ رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے فرید احمد کو پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا' پھر بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ ان کیلئے اتنی سزا کافی ہے۔ انہیں اب جانے دیا جائے۔ غالباً اب یہ آئندہ ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔'' پھر میں ان دونوں سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں بولو تم لوگ! اب تو ادھر نہیں آؤ گے؟''

''ہرگز نہیں'' دونوں بہ یک زبان بولے۔

''تو پھر اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ!'' میں نے انہیں حکم دیا۔ پھر آگے بڑھ کر فرش پر پڑا ہوا ریوالور اٹھا لیا۔ ریوالور کھول کر میں نے اس کے اندر سے گولیاں نکال لیں اور خالی ریوالور داڑھی والے کو تھما دیا۔'' اسے بھی لے جاؤ' ہاں یہ یاد رکھنا کہ تمہیں میرے بارے میں اکبر کو کچھ نہیں بتانا! ویسے بھی تم لوگوں کیلئے یہ ذلت ہی کی بات ہے کہ تم ایک عورت سے پٹے ہو۔''

داڑھی والے نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور ریوالور میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ''ایسا ہی ہوگا جو آپ نے حکم دیا ہے' ہم اکبر کو کچھ نہیں بتائیں گے' آپ کے بارے میں!''

ذرا ہی دیر بعد جب وہ دونوں چلے گئے تو فرید احمد نے مجھ سے بابر کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

''اس وقت وہ تمہیں لال باغ میں ملے گا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تمہارے لئے پیغام چھوڑ گیا تھا کہ تمہیں بھی وہیں بھیج دیا جائے۔''

وہ میری بات سن کر چونکا' پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں' شاید کوئی خاص بات معلوم ہوتی ہے۔''

''ہاں'' میں بول اٹھی۔ ''آج رات کے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی ہوگئی ہے۔''

وہ پھر چونکا۔ ''کیا بابر نے آپ کو اس سلسلے میں کچھ بتایا تھا؟''

''ظاہر ہے مجھے اس سے آج رات کے پروگرام کا علم ہوسکتا تھا۔'' میں بولی۔

کچھ نہ سمجھنے والے سے انداز میں فرید احمد نے سر ہلایا اور پھر دروازے کی طرف مڑ گیا۔ بڑھتے بڑھتے دروازے کے قریب رک کر اس نے کہا۔ ''کل آپ کے چہرے پر یہ میک اپ نہیں تھا' غالباً ضرورتاً آپ نے نیا میک اپ کیا ہے۔''

''کچھ باتیں صرف سمجھنے کیلئے ہوتی ہیں' پوچھنے کیلئے نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ظاہر ہے کہ ضرورتاً ہی میں نے ایسا کیا ہے اور اب پھر مجھے نیا میک اپ کرنا پڑے گا کیونکہ وہ دونوں مجھے دیکھ چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی کو میرا چہرہ یاد رہے۔ غالباً اب تمہاری تشفی ہوگئی ہوگی۔''

''جی...... جی ہاں۔'' اس نے کہا اور پھر دروازے سے باہر نکل گیا۔

فرید احمد کے دروازے سے نکلتے ہی میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور اپنے کمرے میں آ کر نیا میک اپ کرنے کیلئے سامان نکالنے لگی۔ میں نے فرید احمد سے غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی میں اپنے چہرے پر اب نیا میک اپ کرنا چاہتی تھی۔

چہرے پر نیا میک اپ کرنے میں مجھے تقریباً گھنٹہ بھر لگا۔ میں جان بوجھ کر وقت گزاری کی خاطر آہستہ آہستہ میک اپ کر رہی تھی کیونکہ ابھی ساڑھے نو بجنے میں خاصی دیر تھی۔ بابر نے ساڑھے نو بجے تک لوٹ کر آنے کو کہا تھا کیونکہ دس بجے ڈھاکہ کلب پہنچنا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ کرائے کے ان غنڈوں سے بابر اور فرید احمد پر حملہ کرانے والا حقیقتاً سبود مکرجی ہی تھا۔ اکبر محض درمیانی کڑی تھا۔ شکنتلا نے سبود مکرجی سے میرے ہی سامنے بابر کا کوئی بندوبست کرنے کیلئے کہا تھا۔ ان غنڈوں کا یہاں تک پہنچ جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ سبود مکرجی کو بابر کے ٹھکانے کا علم تھا۔ یہ بات میرے نزدیک خطرناک تھی لیکن اس سلسلے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بابر کی واپسی تک میں انہی تمام باتوں پر غور و خوض کرتی رہی۔ وہ ساڑھے نو بجے سے کچھ پہلے ہی لوٹ آیا تھا۔ اس کے ساتھ فرید احمد نہیں تھا' وہ اکیلا ہی تھا۔

''بابر! اگر وقت ہوتا تو میں تمہارے چہرے پر بھی میک اپ کر دیتی تاکہ سبود مکرجی یا اس کے آدمی تمہیں نہ پہچان سکتے۔'' میں نے بابر کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں یہ یقیناً بہتر ہوتا۔'' بابر نے میری بات کی تائید میں کہا۔ ''لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''فرق تو پڑے گا۔'' میں بولی۔ ''سبود مکرجی تمہیں دیکھ کر چوکنا ہو جائے گا۔''

''پھر آپ ہی بتائیں کہ کیا کیا جائے؟'' اس نے کہا۔

''میرا مشورہ ہے کہ تم کلب کے اندر نہ جاؤ اور باہر ہی رہو۔''

''مگر ایسی صورت میں میرے آدمیوں کی رہنمائی کون کرے گا؟'' بابر اس کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولا جو دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔

''بہرحال یہ باتیں پہلے سے سوچنے کی ہوتی ہیں' فوری طور پر پروگرام میں کوئی تبدیلی تمہارے آدمیوں کو شک وشبے میں بھی مبتلا کر سکتی ہے۔ اب جو ہوگیا' سو ہوگیا' دیکھا جائے گا۔'' یہ کہہ کر میں بابر کے قریب والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بابر پہلے ہی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

میرے کار میں بیٹھتے ہی اس نے کار سٹارٹ کر دی۔ ابھی تک میں نے بابر سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ سبود مکرجی پر ہاتھ ڈالنے کیلئے اس نے کیا بندوبست کیا ہے؟ میں چاہتی تھی کہ اس سلسلے میں خود ہی کچھ بتائے تو بہتر ہے مگر اب تک اس کی طرف سے خاموشی ہی رہی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں ناتجربہ کاری کی وجہ سے اسے یا اس کے دوستوں کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے' اس بارے میں پوچھ ہی لیا۔

''ژینا اور سبود مکرجی کی میز پر جو بیرا سرو کرے گا' وہ ہمارا ہی آدمی ہوگا۔'' بابر نے بتایا۔

وہ مزید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ میں بول اٹھی۔ ''ٹھیک ہے' میں سمجھ گئی' کچھ اور بتانے کی ضرورت

نہیں۔"

یہ سامنے کی بات تھی کہ کھانے پینے کی اشیا میں کوئی ایسی چیز ملا دی جاتی کہ سبودمکرجی بے ہوش ہوجاتا۔ میں نے اسی لئے مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

دس بجے سے کچھ پہلے ہی ہم ڈھاکہ کلب پہنچ گئے۔ ہماری کار رکتے ہی ایک نوجوان تیزی سے قریب آ گیا۔

"ژینا آ چکی ہے' مگر سبودمکرجی شاید ابھی نہیں آیا۔" اس نوجوان نے قریب آ کر بابر سے سرگوشی کی۔ "وہ کلب کے بار روم میں اکیلی ہی بیٹھی ہوئی ہے۔"

"باقی تمام تیاریاں تو مکمل ہیں نا؟" بابر نے بھی دھیمی آواز میں نوجوان کو مخاطب کیا۔

"جی ہاں۔" نوجوان نے جواب دیا۔ "ہوٹل کے مین سوئچ بورڈ کے قریب بھی ہمارا ایک آدمی موجود ہے جو اشارہ پاتے ہی سوئچ آف کر دے گا۔"

"ویری گڈ!" بابر بولا اور پھر کار سے اترتے ہوئے کہا۔ "اب تم جاؤ۔"

وہ نوجوان جس تیزی سے قریب آیا تھا' اسی تیزی سے واپس چلا گیا۔

"بابر! میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ مین سوئچ آف کرانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور تم ایسا کس مرحلے پر کرنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سبودمکرجی کو بے ہوشی کی حالت میں یہاں سے نکال لے جانے کیلئے ہمارے خیال میں یہی تدبیر تھی۔" اس نے جواباً بتایا۔

"بہرحال اب تو تم سب کچھ طے کر چکے ہو' لیکن میرے نزدیک یہ ضروری نہیں تھا۔" میں اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"اس کے سوا اسے یہاں سے نکال کر لے جانے کی اور کیا صورت ممکن تھی؟" بابر نے کہا۔

"جب اس پر بے ہوشی کی دوا اثر کرنے لگتی تو تمہارا کوئی آدمی اسے سہارا دے کر یہاں سے اٹھا سکتا تھا' لوگ یہی سمجھتے کہ وہ زیادہ پی گیا ہے۔"

"اور ژینا؟" اس نے سوال کیا۔ "کیا وہ اس پر کوئی اعتراض نہ کرتی؟"

"ژینا پر بھی تو بیہوشی کی دوا اثر کرتی نا...... وہ آخر کیسے بچ جاتی!"

"دراصل ہم نے صرف سبودمکرجی کو بے ہوش کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔" بابر کہنے لگا۔

"بے ہوشی کی دوا شراب کی بوتل میں بھی تو ملائی جا سکتی تھی!...... بار میں ظاہر ہے کہ وہ دونوں شراب تو پیتے ہی نا!"

"سبودمکرجی شراب نہیں پیتا' ہماری اطلاعات یہی ہیں۔ ایسی صورت میں اس کے کھانے ہی میں بے ہوشی کی دوا ملائی جا سکتی تھی اور یہ ضروری نہیں تھا کہ ژینا بھی کھانا کھاتی۔"

"بہرحال تم جاؤ!...... ویسے یہ بڑی عجیب بات ہے کہ سبودمکرجی شراب نہیں پیتا۔"

ہم دونوں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے کلب کی عمارت میں داخل ہو گئے جہاں دن کا سا سماں تھا۔ بابر اور میں کچھ ہی دیر بعد کلب کے بار میں داخل ہو گئے۔

"بابر! کیا تم شراب پیتے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر ہم دونوں یہاں کس طرح بیٹھیں گے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں اس کا بندوبست بھی کر چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "ہم دونوں کو شراب کے بجائے سادہ مشروب سرو کیا جائے گا۔"

پہلی بار مجھے بابر کی ذہانت پر خوشی ہوئی' اپنی عمر اور تجربے کے مطابق اس نے اپنی دانست میں کوئی بات نظرانداز نہیں کی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لئے ایک میز پر بیٹھ گیا۔

"یہاں سے دائیں جانب جو تیسری میز ہے' اسی پر وہ فرانسیسی عورت ژینا بیٹھی ہے۔" بابر نے مجھے آہستہ سے بتایا۔

میں نے کن انکھیوں سے ژینا کی طرف دیکھا' بلاشبہ وہ مغربی حسن کا شاہکار تھی۔ اس کی عمر تیس اور بتیس کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ سرخ سکرٹ میں اس کا گورا جسم کسی گلاب کے مانند معلوم ہو رہا تھا۔ نقوش پرکشش اور جاذب نظر تھے۔ اس کے سامنے شراب کی بوتل اور پیگ رکھا تھا' پیگ سے ابھی چند گھونٹ پیے گئے تھے۔

ہمیں وہاں بیٹھے چند منٹ ہوئے تھے کہ ایک ویٹر ہماری میز پر آ گیا۔

"ہمارے یہاں آنے سے پہلے کوئی خاص بات تو تم نے نوٹ نہیں کی؟" بابر نے ویٹر کو آرڈر دینے کے بجائے آہستہ سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" ویٹر نے جواب دیا اور بظاہر اس طرح سر ہلانے لگا جیسے آرڈر سن کر اثبات میں سر ہلا رہا ہو۔

پھر وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔ اسے غالباً پہلے ہی سے معلوم تھا کہ کیا کرنا ہے!

بار میں ہلکی ہلکی مغربی موسیقی سنائی دے رہی تھی۔ زیادہ تر میزیں بھری ہوئی تھیں اور لائٹ ڈم تھی۔

ذرا دیر بعد ویٹر ہماری میز پر دو پیگ رکھ کر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سوڈے کی بوتلیں اور شامی کباب بھی تھے۔ بابر نے دونوں پیگ اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لئے اور ان میں سوڈا ملانے لگا۔

اسی وقت میں نے ایک دراز قد شخص کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ژینا کی میز کی جانب بڑھتے دیکھا۔

"وہ دیکھو بابر!" میں نے بابر کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ "شاید تمہارا شکار آ گیا ہے۔"

"یہ سبودمکرجی نہیں ہو سکتا!" بابر کا لہجہ یقینی تھا۔

"تم یہ بات یقینی طور پر کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"سبودمکرجی پستہ قد شخص ہے اور یہ شخص......" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

وہ دراز قد شخص اب ژینا سے کچھ کہہ رہا تھا' میں نے دیکھا کہ ژینا نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ شخص سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟" میں خودکلامی کے سے انداز میں بولی۔ "ژینا کے چہرے سے تو یہی اظہار ہو رہا ہے کہ وہ شخص اس کیلئے اجنبی ہے۔"

میری نگاہیں بدستور انہی دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک میں نے اس دراز قد شخص کو اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالتے دیکھا پھر اس نے کچھ کہتے ہوئے وہ کاغذ ژینا کی طرف بڑھا دیا۔ ژینا نے اس سے کاغذ لے کر اسے کھولا اور پھر پڑھنے لگی۔ دراز قد شخص اس دوران میں خاموش ہی رہا۔ کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر ژینا نے اسے اپنے پرس میں رکھ لیا اور دراز قد شخص سے کچھ کہنے لگی۔ چند ہی لمحے بعد میں نے ژینا کو ویٹر کی طرف اشارہ کرتے دیکھا۔ یقیناً وہ ویٹر کو بلا رہی تھی۔ ویٹر فوراً ہی اس کی میز کی طرف بڑھ گیا۔ ویٹر کے قریب آنے پر ژینا نے اس سے کچھ کہا اور ویٹر اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔ یہی ویٹر ہماری میز پر بھی سرو کر رہا تھا۔ بابر نے بھی اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

ویٹر نے قریب آکر کچھ پوچھے بغیر ہی آہستہ سے بتایا۔ ''وہ بل مانگ رہی ہے' شاید اب وہ اٹھنا چاہتی ہے۔'' یہ کہتے ہی ویٹر الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

''سمجھ میں نہیں آئی یہ بات!'' بابر بڑبڑانے لگا۔ اسے تو یہاں سبود مکرجی سے ملنا تھا' پھر وہ اس سے ملے بغیر کس طرح......''

''میرا خیال ہے بابر کہ وہ سبود مکرجی ہی سے ملنے جارہی ہے۔'' میں بول اٹھی۔

''کیا مطلب؟'' بابر چونک کر بولا۔ ''سبود مکرجی کو تو یہاں آنا تھا!''

''تم شاید یہ بھول گئے ہو بابر کہ اس کا نام سبود مکرجی ہے' یقیناً وہ انتہائی چالاک اور محتاط شخص ہے۔ اس لئے تو اسے آج تک چند افراد کے سوا کوئی اور نہیں دیکھ سکا۔ یہ دراز قد شخص یقیناً سبود مکرجی ہی کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ میرے خیال میں وہ پیغام یہ ہوسکتا ہے کہ کسی سبب میں کلب نہیں پہنچ سکتا' آپ خود فلاں جگہ اس شخص کے ساتھ آجائیں وغیرہ۔''

اگر...... اگر واقعی یہی بات ہے تو...... تو پھر کیا کیا جائے؟'' بابر کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔

''ہم ان دونوں کا تعاقب کریں گے!'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ''اس سے کم از کم سبود مکرجی کے ٹھکانے کا تو علم ہوجائے گا' مگر...... میں کچھ سوچ کر خود ہی چپ ہوگئی۔

''مگر کیا؟'' مجھے خاموش دیکھ کر بابر سے صبر نہ ہوسکا اور وہ بول اٹھا۔

''مگر یہ بابر کہ وہ...... وہ سبود مکرجی کا عارضی ٹھکانا بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے باوجود ہم...... ہم تعاقب ضرور کریں گے۔ تم اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ وہ ہمارے ساتھ نہ آئیں اور یہیں سے واپس چلے جائیں۔ چلو اٹھو جلدی کرو! ویٹر اس کا بل لے کر آتا ہی ہوگا۔''

میری بات سن کر بابر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی کے ساتھ میں نے ویٹر کو قریب آنے کا اشارہ کیا جو میرا اشارہ پاتے ہی تیزی سے میری طرف بڑھ آیا۔

''ہمارا بل بھی لے آؤ' جلدی!'' ویٹر کے قریب آنے پر میں نے۔ ''ژینا کو بل دینے سے پہلے ہمارا بل آنا چاہئے' ہم بھی اٹھیں گے۔''

''بہتر ہے۔'' ویٹر یہ کہہ کر تیز تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔

سبود مکرجی کے نہ آنے سے سارا پروگرام گڑبڑ ہوگیا تھا۔ پھر بھی میں بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کے مصداق کچھ نہ کچھ کرنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔

جلد ہی بابر لوٹ آیا۔ میں نے اس دوران میں بل ادا کردیا تھا۔ اس وقت ویٹر ژینا کی میز پر بل دے رہا تھا۔

''میرا خیال ہے بابر کہ ہمیں پہلے ہی یہاں سے اٹھ جانا چاہئے۔ بابر اپنی کار میں بیٹھ کر ہم ان دونوں کا انتظار کرسکتے ہیں۔ اس طرح انہیں تعاقب کا شک نہیں ہوگا۔'' یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

بابر میرے ساتھ بار سے نکل آیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں کار میں بیٹھے ہوئے کلب کے دروازے پر نگاہ جمائے ہوئے تھے۔ زیادہ دیر ہمیں ژینا کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ژینا اس دراز قد شخص کے ساتھ کلب سے نکلی اور وہ ایک لمبی سی سیاہ کار میں آکر بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی دراز قد شخص بیٹھا تھا۔ ژینا اس کے برابر والی سیٹ پر آگے ہی بیٹھی تھی۔ بابر کی کار کی ڈرائیونگ سیٹ مصلحتاً اب میں نے سنبھال لی تھی۔ اس سیاہ کار کو دیکھ کر بھی میں چونک اٹھی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ وہی کار تھی جس میں اغوا کرکے مجھے لے جایا گیا تھا۔ اس کار کی وجہ سے مجھے مزید یقین ہوگیا تھا کہ ژینا سبود مکرجی ہی سے ملنے جارہی ہے۔ میں نے اس کار کے نمبر کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا حالانکہ یہ ضروری نہیں تھا کہ کار کی نمبر پلیٹ اصلی ہی ہوگی۔

سیاہ کار کچھ آگے بڑھ گئی تو میں نے بھی اپنی کار سٹارٹ کی اور پارکنگ لاٹ سے باہر نکل آئی۔

تعاقب کرتے ہوئے میں نے درمیانی فاصلہ کافی رکھا تھا تاکہ دراز قد شخص کو تعاقب کا شک نہ ہوسکے مگر اس کے باوجود نہ معلوم کیسے وہ کھٹک گیا۔ مجھے اس کا اندازہ یوں ہوا کہ میں نے بلامقصد اسے ادھر سے ادھر مڑتے دیکھا پھر وہ ایک ایسی سڑک پر آگیا جو ڈھاکہ سے ایک نواحی بستی ڈیمرا کی طرف جاتی تھی۔ یہ نواحی بستی ڈھاکہ شہر سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں تھی۔ یوں بھی اس وقت دن کے گیارہ سے زیادہ بجے رہے تھے۔

''بابر! دراز قد شخص کو شاید تعاقب کا علم ہوگیا ہے۔'' میں نے بابر کو مخاطب کیا۔

اس سے پہلے کہ جواب میں بابر کچھ کہتا آگے جانے والی کار کی کھڑکی سے ایک ہاتھ باہر نکلا اور سڑک پر کوئی چیز پھینکی گئی۔ میری نگاہ کیونکہ سیاہ کار ہی پر جمی ہوئی تھی اس لئے میں فوراً چوکنا ہوگئی۔ میرا پیر بریک پڑا۔ اسی کے ساتھ ایک زبردست دھماکے سے فضا گونج اٹھی۔ سیاہ کار سے یقیناً ہینڈ گرنیڈ پھینکا گیا تھا جس سے دھواں پھیل گیا تھا اور اس دھوئیں میں سیاہ کار غائب ہوگئی تھی۔

''اب وہ نہیں چاہتا کہ ہم اس کا تعاقب جاری رکھ سکیں۔'' میں طویل سانس لے کر بولی۔ کار میں نے سڑک کے کنارے روک دی تھی۔'' اور ایسی صورت میں جبکہ وہ تعاقب سے باخبر ہوچکا ہے میرے خیال میں تعاقب فضول ہی ثابت ہوگا۔ وہ کبھی اور کسی بھی صورت میں ہمیں اپنے پیچھے لگا کر سبود مکرجی کے ٹھکانے تک نہیں لے جائے گا۔'' یہ کہہ کر میں نے کار کو ریورس میں لیا' پھر یوٹرن لے کر واپسی کا سفر شروع کردیا۔

''یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔'' بابر کے لہجے میں گہرا تاسف تھا' آج کی ساری بھاگ دوڑ لاحاصل رہی۔''

''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے'' میں دلاسہ دینے والے لہجے میں بولی۔ ''مگر اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں' تم نے بہرحال کوشش کی تھی اور ضروری نہیں کہ کوشش کا نتیجہ کامیابی ہی کی صورت میں سامنے آئے۔ تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں بابر!''

پھر وہ کچھ نہیں بولا اور بقیہ سفر خاموشی سے طے ہوگیا۔ نصف شب کے قریب ہم بادام تلی گھاٹ پہنچ

سکے۔ فرید احمد پہلے ہی گھر پہنچ چکا تھا۔

مختصراً بابر نے اپنے دوست فرید احمد کو پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کیا پھر وہ دونوں کھانے کی تیاری میں لگ گئے۔ رات کا کھانا کھاتے ہوتے ہوتے رات کا ڈیڑھ بج گیا۔ میں نے بابر کو ہدایت کی کہ وہ صبح مجھے آٹھ بجے تک ضرور جگا دے۔ مجھے یاد تھا کہ کل صبح ساڑھے نو بجے سی آئی ڈی آفس پہنچنا ہے۔ ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری کو بھی وہیں پہنچنا تھا۔

دوسرے دن وقت مقررہ پر بابر نے مجھے جگا دیا اور میں ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر نو بجے سے کچھ پہلے ہی جانے کیلئے تیار ہو گئی۔ صدر گھاٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سی آئی ڈی آفس پہنچنے میں مجھے دس پندرہ منٹ ہی لگے۔ ابھی عبیدالرحمٰن چودھری وہاں نہیں پہنچا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو ڈیوٹی پر موجود سی آئی ڈی انسپکٹر نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور اپنی سیٹ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہوم سیکرٹری ان لوگوں کو میرے بارے میں فون کر چکا تھا۔

"تشریف رکھیے آپ!" انسپکٹر نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "شکریہ!" یہ کہتے ہوئے اس کے مقابل میں خالی کرسی پر بیٹھ گئی، پھر بولی۔ "کیا ضیاالاسلام کو گرفتار کر لیا گیا؟"

"جی ہاں" انسپکٹر نے جواب دیا۔ "وہ لاک اپ میں بند ہے۔ اسے کل رات ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔"

"اس سے کچھ پوچھ گچھ کی گئی؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"کس سلسلے میں محترمہ؟" انسپکٹر حیران ہو کر کہنے لگا۔ "ہمیں تو یہی نہیں معلوم کہ اسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟"

اوہ!" میں چونک اٹھی۔ "ٹھیک ہے۔"

پھر مجھے ہوم سیکرٹری کا مزید پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ وہ ٹھیک ساڑھے نو بجے پہنچا تھا۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی سی آئی ڈی آفس کا تمام عملہ مستعد دکھائی دینے لگا تھا۔

"ضیاالاسلام کو لاک اپ سے نکال کر یہیں لے آؤ۔" ہوم سیکرٹری نے ایک انسپکٹر کو حکم دیا پھر بولا۔ "اور سنو! یہاں اس کمرے میں اب کوئی نہیں آئے گا اور نہ اس کے علاوہ یہاں کسی کو نظر آنا چاہئے" اس کے لہجے میں حکم تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے ضیاالاسلام آسانی سے زبان کھول دے گا؟" عبیدالرحمٰن چودھری مجھ سے مخاطب ہوا۔

"بظاہر تو یہ مشکل ہی ہے لیکن میں زبان کھلوانا جانتی ہوں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

عبیدالرحمٰن چودھری یہاں آنے کے بعد میرے چہرے پر نیا میک اپ دیکھ کر چونکا ضرور تھا مگر مصلحتاً کچھ نہیں بولا تھا۔ تنہائی میسر آنے کے بعد اس سلسلے میں پہلی بار وہ بولا۔ "آج پھر آپ کے چہرے پر ایک نیا میک اپ نظر آ رہا ہے۔ کیا آپ روز نیا چہرہ بدل لیتی ہیں؟"

"نہیں نا" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "مجھے ایسا کوئی شوق نہیں، ضرورتاً ایسا کرنا پڑتا ہے۔ ویسے جب آپ یہاں آئے تھے تو میں نے آپ کے چہرے پر حیرانی دیکھ لی تھی۔"

"اور اسی لئے آپ فوراً بول اٹھی تھیں تاکہ آپ کی آواز سن کر میں آپ کو پہچان جاؤں۔" وہ بھی ہنسنے لگا۔

"آپ ٹھیک ہی سمجھے۔"

ابھی ہم دونوں مصروف گفتگو ہی تھے کہ سی آئی ڈی انسپکٹر ایک پتلے دبلے ادھیڑ عمر شخص کو ساتھ لئے کمرے میں داخل ہوا، وہ شخص میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ میں حیران تھی کہ انسپکٹر اسے وہاں کیوں لایا ہے!

"یہ...... یہ کون ہے؟" سی آئی ڈی انسپکٹر اس شخص کو وہاں چھوڑ کر جانے کیلئے مڑا تو میں بول ہی اٹھی۔

"ضیاالاسلام ہے یہ!" انسپکٹر نے میری بات کا جواب دیا اور میں چونک اٹھی۔

"نہیں نا" میں بے یقینی لہجے میں بولی۔ "تم لوگوں کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ضیاالاسلام کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ شخص کوئی اور ہے ضیاالاسلام نہیں ہے!"

"یہ کیا قصہ ہے؟" ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری بھی خاموش نہ رہ سکا۔

"سر! یہ...... ضیاالاسلام ہی ہے!...... ہم اس کی تصدیق بھی کر چکے ہیں۔ یہ نارائن گنج کا رہنے والا ہے اور...... اور گزشتہ چند دنوں سے اسی کی نگرانی بھی کی جا رہی تھی۔" انسپکٹر کا لہجہ یقینی تھا۔ "ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

میں چکرا کر رہ گئی۔ اگر یہی شخص واقعی ضیاالاسلام تھا تو پھر وہ کون شخص تھا جو ضیاالاسلام کی حیثیت سے نارائن گنج کی اس حویلی میں مجھ سے ملا تھا؟

آگے بڑھ کر میں اس ادھیڑ عمر شخص کے قریب پہنچ گئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں بولی۔ "سچ سچ بتا دو کون ہو تم؟ ورنہ...... میں نے دھمکی آمیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میرا نام ضیاالاسلام ہے۔" وہ شخص دھیمے لہجے میں بولا۔ "میں حیران ہوں کہ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے!"

"اگر تم ضیاالاسلام ہو تو وہ کون ہے جو تمہاری حویلی میں خود کو ضیاالاسلام ظاہر کرتا ہے۔" میں نے یہ کہہ کر اس شخص کا حلیہ بتایا جو مجھ سے ملا تھا۔

"میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کا حلیہ آپ نے بتایا ہے۔ میرے ملازمین میں سے بھی کوئی اس حلیے کا آدمی نہیں۔" ادھیڑ عمر شخص نے جواب دیا۔

"تمہارے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو!" میں اس پر چیخ اٹھی۔ "یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری زبان نہیں کھلوا سکتی! مجھے سختی پر مجبور نہ کرو...... یہ ممکن ہی نہیں کہ تمہارے علم و اطلاع کے بغیر کوئی شخص تمہاری حویلی میں خود کو ضیاالاسلام ظاہر کر سکے!" یہ کہہ کر میں سی آئی ڈی انسپکٹر کی طرف مڑی اور اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ سی آئی ڈی انسپکٹر وہاں سے چلا گیا تو میں اس شخص سے دوبارہ مخاطب ہوئی۔ "ہاں اب بولو!...... مجھے یقین ہے کہ تم اس شخص کو ضرور جانتے ہو جس کا حلیہ میں نے تمہیں بتایا ہے۔"

میں نے اس کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے مگر کچھ بتانے سے خوفزدہ ہے۔

"سنو! میں تمہاری زندگی کی ضمانت لیتی ہوں۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا!" میں نے اسے بولنے کی

ترغیب دی۔

''مگر...... مگر وہ...... وہ شکیلہ کی زندگی کی ضمانت کون دے گا جو...... جو ان کی قید میں ہے؟'' بوڑھے کے چہرے پر گہرے دکھ کے سائے پھیل گئے۔

''شکیلہ؟...... یہ کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میری بیٹی...... وہ...... وہ لوگ یقیناً اسے ہلاک کر دیں گے' اگر میں نے کچھ بتایا۔''

''کون لوگ ہیں وہ؟...... تم بتاؤ! یقین کرو ہم تمہاری بیٹی کو ان کی قید سے رہائی دلا دیں گے۔''

پھر ضیا الاسلام بمشکل زبان کھولنے پر آمادہ ہوا۔ اس نے جو داستان سنائی' مختصر یہ تھی کہ جو شخص مجھ سے اس کی حویلی میں ملا تھا وہ اس کا سوتیلا بھائی خورشید الاسلام تھا۔ اس کے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ خورشید الاسلام اس کے والد کی دوسری بیوی کے پہلے شوہر سے تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے خورشید الاسلام اس کے ساتھ اس کی حویلی میں رہ رہا تھا۔ اس سے قبل وہ مغربی پاکستان کے ایک شہر لاہور میں تھا۔ نسلاً خورشید الاسلام بھی بنگالی ہی تھی۔ نارائن گنج پہنچ کر خورشید الاسلام ایک روز اپنی بھتیجی شکیلہ کو اپنے ساتھ ڈھاکہ گھمانے کیلئے لے گیا تھا اور پھر اکیلا ہی نارائن گنج واپس آ گیا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کی باز پرس پر اس نے بتایا تھا کہ شکیلہ بخیریت سے ہے لیکن اس وقت تک بخیریت رہے گی جب تک ضیا السلام اس کے حکم کی تعمیل کرتا رہے گا پھر رفتہ رفتہ خورشید الاسلام نے پوری حویلی پر قبضہ جما لیا تھا۔ ضیا الاسلام کے تمام ملازمین پر بھی اب اسی کا حکم چلتا تھا۔ اس دوران میں فون پر کئی بار شکیلہ سے اس نے ضیا الاسلام کی بات کرادی تھی۔ اس یقین دہانی کیلئے کہ شکیلہ ابھی زندہ اور بخیریت ہے۔ ضیا الاسلام نے یہ بھی بتایا کہ اس کا سوتیلا بھائی یقیناً ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ غیر ملکی افراد بھی اسی وقت سے حویلی میں آنے جانے لگے تھے جب سے خورشید الاسلام وہاں آیا تھا۔

''یہ بتاؤ کہ جب گزشتہ رات تمہیں گرفتار کیا گیا تو خورشید الاسلام کہاں تھا؟'' ضیا الاسلام اپنی داستان سنا چکا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ حویلی ہی میں موجود تھا۔'' ضیا الاسلام نے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے' کیا وہ اب بھی وہیں ہوگا؟'' میں نے مزید سوال کیا۔

''یقینی طور پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس کی سرگرمیاں بہت پراسرار ہیں۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اب کہاں ہوگا!'' اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

''فی الحال ہم تمہیں تمہارے ہی تحفظ کی خاطر اس وقت تک یہیں رکھیں گے جب تک خورشید الاسلام پکڑا نہیں جاتا۔ تمہیں اس کے کسی اور ٹھکانے کا علم ہے؟''

''جی نہیں۔'' وہ بولا۔ ''اکثر وہ کئی کئی دن کیلئے حویلی سے غائب ہو جاتا ہے مگر اس دوران میں وہ کہاں رہتا ہے' کچھ معلوم نہیں۔''

پھر میں نے سی آئی ڈی انسپکٹر کو بلوا لیا اور ضیا الاسلام کو دوبارہ لاک اپ میں بند کرا دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ ہدایت بھی دی تھی کہ اس کی حفاظت کا خاص طور پر خیال رکھا جائے اور کسی بھی شخص کو اس سے نہ ملنے دیا جائے۔

''ضیا الاسلام کی آڑ میں درحقیقت اس کا سوتیلا بھائی کھیل کھیل رہا ہے۔'' میں نے عبیدالرحمٰن چودھری

سے کہا۔ ''میرے خیال میں یہ شخص قطعی بے گناہ ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' عبیدالرحمٰن چودھری نے بھی میرے خیال کی تائید میں کہا' پھر بولا۔ ''اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

''میں آج رات خود پولیس کے ساتھ نارائن گنج جا کر ضیا الاسلام کی حویلی پر ریڈ کرنا چاہتی ہوں۔ خورشید الاسلام کو بہر حال گرفتار ہونا چاہئے کیونکہ اصل مجرم وہی ہے۔''

''تو پھر آپ کہیں تو میں اس سلسلے میں احکام دے دوں؟'' عبیدالرحمٰن چودھری بولا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں آج رات گیارہ بجے یہاں آ جاؤں گی۔ مجھے پولیس پارٹی تیار ملنی چاہئے!''

عبیدالرحمٰن چودھری نے اسی وقت ضروری ہدایات دے دیں اور پھر مجھ سے بولا۔ ''آپ کو میں کہاں چھوڑ دوں؟''

''نواب پور روڈ۔'' میں بولی۔

''مگر آپ نے تو بتایا تھا کہ موتی جھیل میں اپنی کزن کے گھر آپ کا قیام ہے!''

''وہ بھی غلط نہیں بتایا تھا۔ دراصل نواب پور روڈ میں ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں' اس کے بعد ہی گھر جاؤں گی۔''

پھر عبیدالرحمٰن چودھری نے مجھے اپنی کار میں نواب پور روڈ پر امجدیہ ہوٹل کے سامنے اتار دیا اور میں وہاں سے پیدل ہی بادام تلی گھاٹ کی طرف چل دی جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

میں واپس گھر پہنچی تو بابر مجھے اپنا منتظر ملا۔ فرید احمد گھر پر نہیں تھا۔ بابر کو کہیں جانا تھا اس لئے میرا انتظار کر رہا تھا۔

''کہاں جانا ہے تمہیں؟'' میں نے اس سے معلوم کیا۔

جواب میں اس نے ایک فائیو سٹار ہوٹل کا نام لیا' پھر بولا۔ ''یہ معلوم کرنا بھی تو ضروری ہے کہ اس فرانسیسی عورت ژینا اور سیو مکرجی کے درمیان کیا چکر چل رہا ہے! دراصل میں اس کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی کام کی چیز ہاتھ لگ جائے۔''

''اور اگر وہ ہوٹل میں موجود ہوئی تو؟'' میں نے پوچھا۔

''تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' اس نے جواباً کہا۔ ''میں اس سلسلے میں بھی سوچ چکا ہوں' میرے آدمی اسے سنبھال لیں گے۔''

''میں تمہارے معاملے میں مداخلت کرنا تو نہیں چاہتی لیکن اگر کہو تو تمہارے ساتھ چلوں' یوں بھی اب رات تک میں خالی ہی ہوں۔''

''آپ بھی چلیے' کوئی حرج نہیں' ایک سے دو بھلے!'' وہ مسکرا کر بولا۔

''گھر میں تالا ڈال کر جانا پڑے گا۔ اگر اس دوران میں تمہارا دوست فرید......''

''اس کے پاس دوسری چابی ہے۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے' چلو۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ذرا ہی دیر بعد جو دونوں کار میں بیٹھے ہوئے اس فائیو سٹار ہوٹل کی طرف جا رہے تھے جہاں ژینا کا قیام تھا۔ راستے میں بابر نے مجھے ایک سیاہ نقاب دیتے ہوئے کہا۔ ”اسے اپنے پاس رکھ لیں! میں ژینا پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ لٹیرے ہیں اور اسی غرض سے اس کے کمرے میں گھسے ہیں۔ آپ کو بھی چہرے پر نقاب چڑھانا ہوگا اور ...... یہ ریوالور بھی رکھ لیں!“ اس نے ایک ریوالور بھی اپنی کار کے ڈیش بورڈ سے نکال کر مجھے تھما دیا۔

میں نے نقاب اور ریوالور لے کر دونوں چیزیں اپنے پرس میں رکھ لیں۔

مطلوبہ ہوٹل پہنچ کر بابر کے دو ساتھی بھی ہمارے ساتھ ہو لئے جنہیں بابر نے اپنے پروگرام سے آگاہ کردیا۔ وہ دونوں ژینا کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہی سے یہ معلوم ہوا کہ ژینا اس وقت اپنے کمرے ہی میں موجود ہے۔ نو منزلہ ہوٹل کی پانچویں منزل کے ایک کمرے میں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔ لفٹ کے ذریعے ہم چاروں افراد پانچویں منزل پر پہنچ گئے۔ بابر کے اشارے پر اس کے ایک ساتھی نے دروازے پر دستک دی اور پھر فوراً ہی اپنے چہرے پر نقاب چڑھائی پھر جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھولا گیا' وہ اپنی جیب سے ریوالور نکالتا ہوا اندر گھس گیا۔ بابر' اس کے ایک ساتھی اور میں نے بھی اپنے چہروں کو نقاب کے پیچھے چھپانے میں دیر نہیں کی اور پھر ہم بھی کمرے میں داخل ہوگئے۔ ہم سبھی کے ہاتھوں میں ریوالور تھے' لیکن بابر اپنے سبھی ساتھیوں کو یہ ہدایت دے چکا تھا کہ گولی نہیں چلانا۔

کمرے میں پہنچتے ہی میں چونک اٹھی۔ بابر کے اس ساتھی کو ژینا بے بس کر چکی تھی جو کمرے میں سب سے پہلے داخل ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور پشت سے ریوالور کی نال لگی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ ژینا کا تقریباً پورا جسم اس کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

”اپنے اپنے ریوالور پھینک دو!“ خلاف توقع ژینا صاف ستھری اردو میں بولی۔ ”اگر تم لوگوں نے ریوالور نہ پھینکے تو میں تمہارے ساتھی کو گولی مار دوں گی!“ اس کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اگر اس کی بات پر عمل نہیں کیا گیا تو یقیناً وہ گولی چلا دے گی۔

میرے لئے یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ اس عورت نے کس طرح بابر کے ساتھی سے ریوالور چھین کر اسے بے بس کردیا۔

”ریوالور پھینک دو!“ میں نے بابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی ایسا کرنے میں پہل کی۔ بابر اور اس کے ساتھی نے میری تقلید کی۔ اسی وقت ژینا کی تیز آواز سنائی دی۔ ”کمرے کا دروازہ اندر سے بند کردو!“

اس کا یہ حکم میرے لئے غیر متوقع اور حیرت انگیز تھا مگر میں نے پلٹ کر دروازہ اندر سے بند کردیا۔ دوسرا حکم اس نے چہروں سے نقاب اتارنے کا دیا۔ اس پر بھی عمل کیا گیا۔ ابھی تک وہ بابر کے ساتھی کی پشت پر ریوالور رکھے ہوئے تھی اور اسی کے زور پر ہم سے ہر بات منوا رہی تھی' مگر یہ صورتحال جلد ہی بدل گئی۔ خود اسی نے بابر کے ساتھی کی پشت پر ایک لات ماری' پھر بولی کہ تم بھی اب اپنے ساتھیوں کے قریب جا کر کھڑے ہو جاؤ! اس کے ہاتھ میں اب بھی ریوالور تھا جو ہماری طرف اٹھا ہوا تھا۔ بابر کا ساتھی زمین سے اٹھ کر ہمارے قریب آ کھڑا ہوا۔

میرے نزدیک ژینا سے یہ حماقت سرزد ہوئی تھی کیونکہ دوسرے ہی لمحے بابر کے ساتھی نے اس پر چھلانگ لگا دی تھی۔ ژینا کو شاید بابر کے ساتھی سے اس بے جگری کی توقع نہیں تھی۔ وہ اسی لئے فوری طور پر جوابی کارروائی نہ کرسکی۔ بابر کے ساتھی نے ژینا کے ریوالور والے ہاتھ کی کلائی پکڑ کر اوپر اٹھا دی تھی جس کے سبب ریوالور کی نال کا رخ چھت کی طرف ہوگیا تھا' پھر نہ جانے کس طرح ژینا کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر ایک طرف جا گرا۔ اس کے ساتھ بابر کے ساتھی کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں صرف یہ دیکھ سکی تھی کہ ژینا نے گردن کے قریب اس کی کوئی نس دبا دی تھی۔ بابر کا ساتھی چیخ کر کسی مردہ چھپکلی کی طرح ایک طرف جا پڑا تھا۔

”اب تم لوگ بھی چاہو تو اپنی حسرت نکال لو!“ ژینا بازو پھیلا کر تیز لہجے میں بولی۔

اس بار بابر نے پہل کی اور اسے بھی منہ کی کھانا پڑی۔ وہ ژینا کے قریب پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ ژینا نے اچھل کر بابر کے سینے کو اپنے دونوں پیروں سے نشانہ بنایا تھا اور بابر ایک طرف ڈھیر ہوگیا تھا۔ بلاشبہ وہ عورت ایک بہترین لڑاکا تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ بابر کا دوسرا ساتھی آگے بڑھتا' میں ژینا کے مقابل آ گئی۔

”عورتوں پر ہاتھ اٹھانا میں بزدلی سمجھتی ہوں۔ اس نے بڑی نفرت سے کہا۔“ ابھی تمہارا ایک مرد ساتھی اپنے پیروں پر کھڑا ہے' اسے سامنے آنے دو۔“

ژینا کی بات پوری ہونے سے پہلے میرے پاؤں زمین چھوڑ چکے تھے۔ میری فلائنگ کک اس کے سینے پر پڑتی مگر وہ حیرت انگیز طور پر اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ میری اچٹتی ہوئی کک اس کے شانے پر پڑی اور پھر میں زمین پر پہلو کے بل گر گئی۔

”تو تمہیں بھی یہ کھیل آتا ہے!“ ژینا کی آواز مجھے سنائی دی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں فرش سے اٹھنے میں کامیاب ہو جاتی' وہ کسی وحشی درندے کی طرح زقند بھر کے میرے سر پر پہنچ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خود اپنے روبرو ہوں۔ آج سے پہلے کسی عورت کو میں نے اپنا ہم پلہ نہیں پایا تھا۔ میرے اٹھنے سے پہلے ہی اس نے مجھے جکڑ لیا۔ معلوم نہیں اس کے جسم میں کیسی شیطانی قوت تھی کہ مجھے اپنے جسم کی ہڈیاں ٹوٹتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ میں نیچے تھی اور وہ میرے اوپر! اس نے کسی ہشت پا کی طرح میرے جسم کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر کچھ دیر وہ اسی طرح اور دباؤ ڈالے رہی تو شاید میرے حواس قابو میں نہیں رہیں گے۔ چند ہی لمحوں بعد نہ جانے کس طرح اس کے دائیں ہاتھ کی کہنی میری گردن پر آ گئی اور کہنی کا دباؤ گردن پر پڑتے ہی میرا سانس رکنے لگا' اسی کے ساتھ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلنے لگا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کسی کے مقابل خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔

☆......☆......☆

میری گردن پر ژینا کی کہنی کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا' اسی کے ساتھ میرے جسم پر بھی اس کی گرفت مضبوط تھی۔ میرے چہرے سے اس کا چہرہ بھی بہت قریب تھا۔ اتنے نزدیک سے اس کا چہرہ دیکھ کر میں نے وہ خاص بات محسوس کرلی جو دور سے محسوس نہ کرسکی تھی۔ یقیناً یہ اس کا اصلی چہرہ نہیں تھا۔ جلد میں جو قدرتی گداز اور نرمی ہوتی ہے' وہ مفقود تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ میک اپ میں تھی۔ غیر معمولی حالات سے نبرد آزما ہونے کے باوجود میں اس بات کو نظرانداز نہیں کرسکتی تھی۔

مجھے جو واقعہ پیش آیا تھا قطعی غیر متوقع اور اچانک تھا اس لئے میں فوری طور پر سنبھال نہیں سکی تھی اور چوٹ کھا گئی تھی۔ میرے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ژینا غیر معمولی قوتوں کی مالک ہوگی' لیکن اب مجھے پوری طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ میرے مقابل کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔ میں نے اپنے جسم کی تمام قوت صرف کرکے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پیر اٹھانا شروع کردیئے۔ نتیجتاً اس کے پیروں کی گرفت میرے پیروں پر ڈھیلی پڑنے لگی۔ پھر میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو بھی حرکت دی اور اس کی کہنی کو اپنی گردن سے ہٹانے کی جدوجہد کرنے لگی۔ اسی دوران میں مجھے ایک اور تدبیر سوجھ گئی۔ میں نے اچانک پورا زور لگا کا بائیں جانب کروٹ لی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگئی۔ اس سے فوری طور پر میری گردن سے ژینا کی کہنی کا دباؤ ختم ہوگیا' مگر اس کے باوجود وہ ابھی تک میرے جسم کو جکڑے ہوئے تھی۔ چند ہی لمحے بعد ایک اور کوشش کے نتیجے میں مجھے مزید کامیابی حاصل ہوگئی۔ اب ژینا نیچے تھی اور میں اس کے اوپر۔ میں نے اپنی دونوں کہنیاں اس کی پسلیوں میں گاڑ رکھی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ دباؤ بڑھاتی جارہی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ ژینا کی بجائے کوئی اور عورت ہوتی تو فوراً چیخ اٹھی ہوتی' مگر اس نے اف بھی نہ کی' ہاں میں نے اتنا ضرور دیکھا کہ ژینا کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے تھے۔ میرے جسم پر ابھی تک اس کی گرفت برقرار تھی۔

جس طرح میں نے اچانک کروٹ لے کر اس کی برتری ختم کردی تھی' بالکل اسی طرح اس نے تیزی کے ساتھ حرکت کی۔ اس نے انتہائی سرعت کے ساتھ اپنے دونوں پیر سمیٹ کر میرے جسم کو فضا میں اچھال دیا تھا اور پھر اسی تیزی کے ساتھ اچھل کر کھڑی ہوگئی تھی۔ فرش پر گرتے ہی میں نے بھی اٹھنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی تھی۔ ہم دونوں پھر ایک دوسرے کے مقابل آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔

معاً میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''ژینا!...... یا جو بھی تمہارا اصل نام ہے' میں بھی عورتوں پر کبھی

ہاتھ نہیں اٹھاتی اور اسے بزدلی سمجھتی ہوں' مگر......''

میرا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیوں کہ میں نے اسے خود پر جست لگاتے دیکھ لیا تھا۔ ادھر اس نے جست بھری' ادھر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر میں بھی اپنی جگہ سے اچھلی اور پھر ہم دونوں کے جسم فضا میں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ میں عموماً اپنے کسی کم زور حریف پر ایسی صورتحال میں وہ داؤ آزمانے سے گریز کرتی تھی جو اس وقت ژینا پر آزمایا۔ یہ داؤ نہ آزمانے کا سبب یہ تھا کہ اس میں پچاس فیصد سے زیادہ گردن کی ہڈی ٹوٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کے بعد شاذ ہی کوئی شخص بچتا ہے' مگر ژینا کوئی کمزور حریف نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ اس داؤ کا توڑ بھی کرسکتی تھی اور اس نے کسی حد تک ایسا کیا بھی! ورنہ شاید زندہ نہ بچتی۔ میرے ہاتھ کی بھرپور ضرب اس کی گردن کے پچھلے حصے پر نہ پڑ سکی' لیکن بہرحال وہ پورے طور پر داؤ نہ بچاسکی۔ اسی کے نتیجے میں چند لمحوں کے لئے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی۔ میرا اور اس کا جسم فضا میں ٹکرا کر زمین پر آرہا۔ میں تو فوری طور پر زمین سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی' مگر وہ گردن پر ضرب لگنے کے سبب فوراً نہ اٹھ سکی۔ پھر یہی چند لمحے فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ میں کسی عقاب کی طرح فضا میں جست بھرتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی اور پھر میرے دائیں پیر کی ٹھوکر اس کی کنپٹی پر پڑی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ یقیناً بے ہوش ہو چکی تھی۔

دانتوں پسینے آنے کا محاورہ شاید ایسے ہی مواقع کے لئے ہے۔ ژینا کو قابو میں کرنے کے لئے مجھے واقعی دانتوں پسینا آگیا تھا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑتے ہی میرے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگی تھی کہ میں اس کا اصلی چہرہ دیکھ لوں' مگر فوراً ہی مجھے بابر اور اس کے ساتھیوں کا خیال آگیا تھا۔ ژینا سے برسرپیکار ہونے کے دوران میں ان کی طرف میری توجہ نہیں گئی تھی۔ میں نے اب کمرے کا جائزہ لیا تو بابر کے ایک ساتھی کو اس کے قریب پایا۔ یہ وہی تھا جو سب سے پہلے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ بابر کو زمین سے اٹھا رہا تھا۔ بابر آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ژینا کی بھرپور فلائنگ کک بابر کے سینے پر پڑی تھی جس کی وجہ سے وقتی طور پر وہ اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکا تھا۔ بابر کا وہ ساتھی جس نے ژینا پر چھلانگ لگائی تھی' اب تک ایک جانب بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ ژینا نے اس کی گردن کی کوئی نس دبا کر اسے بے ہوش کردیا تھا۔

میں لپک کر بابر کے قریب پہنچ گئی اور اسے سنبھال لیا' پھر اس کے ساتھی کو مخاطب کیا۔ ''تم اسے...... اپنے ساتھی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو!...... یہاں باتھ روم میں پانی ہوگا!''

بابر کا ساتھی میرے کہنے پر اپنے بے ہوش ساتھی کو ہوش میں لانے کے لئے اس کی جانب بڑھ گیا۔

''کیا محسوس کررہے ہو تم؟'' میں نے بابر کو سیدھا کھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں...... پسلیوں میں درد ہے' مگر...... قابل برداشت ہے اب...... میں سہارے کے بغیر کھڑا ہوسکتا ہوں۔'' بابر نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

''تم ادھر صوفے پر جا کر بیٹھ جاؤ!'' میں نے اس سے کہا۔ ''کچھ دیر بعد درد کم ہو جائے گا۔''

''مگر آپ...... آپ نے اسے کس طرح قابو میں کرلیا؟...... میں دیکھ نہیں سکا کہ......'' وہ

آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم کچھ دیر چپ رہو بابر....." میں نے اسے مزید کچھ بولنے سے روک دیا' پھر کہا۔ "اور لمبے لمبے سانس لو!"

بابر میرے کہنے پر ایک صوفے پر جا بیٹھا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میں بابر کے بے ہوش ساتھی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ بابر کا دوسرا ساتھی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر کے بعد ہوش میں آ گیا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی میں تیزی کے ساتھ ژینا کے قریب پہنچ گئی جو زمین پر بے سدھ پڑی تھی۔ بابر بھی صوفے سے اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔ "اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ہوں!" میں نے کہا اور ژینا کے بے ہوش جسم پر جھک گئی۔

میں نے جھکتے ہی ژینا کے سنہری بالوں میں انگلیاں ڈال دیں۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے اس کے بال بھی مصنوعی ہی معلوم ہوئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے سنہری بالوں کو میں نے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور پھر انہیں جھٹکا دیا۔ بالوں کی وگ اس کے سر سے الگ ہوگئی اور اسی کے ساتھ وگ سے منسلک باریک جھلی بھی سکڑنے لگی جو ژینا کے چہرے کی کھال سے چپکی ہوئی تھی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ وہ باریک جھلی بھی ژینا کے منہ سے اتار لی اور ایک دم اچھل پڑی۔ میرے سامنے ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔

"ساوتری!" بے اختیار میری زبان پر اس کا نام آ گیا۔

بابر بھی حیرت سے ساوتری کے سانولے سلونے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس موقع پر وہ بول اٹھا۔ "کیا آپ اسے جانتی ہیں؟"

"ہاں بابر!" میں طویل سانس لیتے ہوئے ایک طرف کھڑی ہوگئی اور وہ وگ ایک طرف ڈال دی۔

"کون ہے؟" بابر سے صبر نہ ہو سکا۔

"مشہور اور انتہائی ذہین بھارتی ایجنٹ ساوتری!" میں نے بابر کو بتا دیا' پھر مزید کہا۔ "اب سے کئی سال پہلے اس سے میری مڈبھیڑ ترکی کے شہر استنبول میں ہوئی تھی' مگر اس وقت دو بہ دو کی نوبت نہیں آئی تھی اور نہ مجھے یہ معلوم ہو سکا تھا کہ ساوتری بھی مارشل آرٹ میں درجہ کمال رکھتی ہے۔"

"اب.....اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟" بابر نے پوچھا۔

"وہی جو یہاں آنے سے پہلے تھا.....بلکہ اب تو یہ اور بھی ضروری ہوگیا ہے۔" میں جواباً بولی۔

"یعنی اس کمرے کی تلاشی؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "بہت سی باتیں تو ساوتری کی شخصیت سامنے آ جانے ہی سے سمجھ میں آ گئی ہیں' لیکن کچھ باتیں تلاشی کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔"

اس کے بعد بابر' میں اور بابر کے ساتھی کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ تلاشی کے دوران میں ساوتری کے کمرے سے فوجی نوعیت کے کچھ نقشے اور کاغذات برآمد ہوئے۔ ان نقشوں میں اہم شخصیات کی نشان دہی بھی کی گئی تھی۔ میں نے یہ کاغذات اور نقشے اپنے قبضے میں کر لیے۔ کاغذات اور نقشوں کے علاوہ ایک ٹرانسمیٹر بھی برآمد ہوا۔ ساوتری کے اٹیچی کیس سے اس کے شناختی کاغذات اور پاسپورٹ بھی ملا۔ اس پاسپورٹ اور کاغذات کی رو سے وہ فرانسیسی شہری تھی اور سیاحت کی غرض سے مشرقی پاکستان آئی تھی۔ پاسپورٹ پر اور کاغذات میں اس کا نام ژینا ہی لکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جاسوسی ہی کی غرض سے یہاں آئی تھی۔ سبودھ مکرجی ایسے شخص سے اس کے تعلق کا سبب بھی یہی ہو سکتا تھا۔ میرے نزدیک اب ہر بات واضح ہوگئی تھی۔

کچھ سوچتے ہوئے میں نے بابر کو مخاطب کیا۔ "دیکھو! اس کے پرس میں ہوٹل کے اس کمرے کی چابی ہوگی' وہ نکال لو۔"

بابر نے چابی تلاش کر کے میری طرف بڑھائی۔

"فی الحال اسے اپنے ہی پاس رکھو۔" میں بولی۔ "اور اب چلنے کی تیاری کرو یہاں سے!"

"کیا ہم اسے اسی حالت میں یہاں چھوڑ جائیں گے؟" بابر نے بے ہوش ساوتری کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں اور کیا!" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کیا تمہارا ارادہ اسے ساتھ لے چلنے کا ہے؟"

بابر خفیف سا ہو گیا۔ "نہیں.....میرا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ....."

"چلو آؤ!" میں نے اس کی بات کاٹ دی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

اس کمرے سے باہر نکلتے ہی میں نے بابر سے چابی لے لی اور کمرے کو مقفل کر دیا۔ پانچویں منزل کے اس مقفل کمرے سے اب ساوتری کا فرار ہو جانا ناممکن ہی تھا۔ ظاہر ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد کمرے کی کسی کھڑکی کے ذریعے وہ پانچویں منزل سے نیچے چھلانگ نہیں لگا سکتی تھی۔

لفٹ کے ذریعے ہم لوگ گراؤنڈ فلور پر پہنچے۔

"تم یہیں ٹھہرو بابر' میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں گراؤنڈ فلور پر موجود ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ کی طرف بڑھ گئی۔

ٹیلی فون بوتھ میں اس وقت ایک شخص موجود تھا جس کی وجہ سے مجھے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ اس شخص کے باہر آتے ہی میں تیزی سے ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہوگئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

ٹیلی فون میں مطلوبہ سکے ڈال کر میں جلدی جلدی ایک نمبر ملانے لگی۔ نمبر ملنے کے چند لمحے بعد ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"میں عذرا خان بول رہی ہوں.....عبیدالرحمٰن چودھری صاحب سے میری بات کرا دیجیے جلدی!" میں نے دوسری جانب سے "ہیلو" سنتے ہی جلدی سے کہا۔

"جی بہتر ہے' ہولڈ کیجیے!" دوسری طرف سے کہا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ہوم سیکرٹری کا پی اے تھا۔

مزید چند لمحے انتظار کرنے کے بعد مجھے فون پر عبیدالرحمٰن چودھری کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو مس خان!.....میں....."

"معاف کیجئے گا چودھری صاحب! ایک ضروری معاملے میں آپ کو زحمت دے رہی ہوں۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"جی جی فرمائیے!"

جواباً میں نے اس فائیو اسٹار ہوٹل اور پھر ساوتری کے کمرے کا نمبر بتایا' پھر بولی۔ "اس کمرے میں اس وقت ایک بھارتی ایجنٹ بے ہوش پڑی ہے۔ اس کے پاس سے فوجی نوعیت کے کچھ نقشے اور کاغذات بھی برآمد ہوئے ہیں جنہیں میں نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک ٹرانسمیٹر بھی اس کے اٹیچی کیس میں ہے' جو میں نے رہنے دیا ہے۔" پھر میں نے ہوم سیکرٹری کو یہ بھی بتا دیا کہ ساوتری کس حیثیت سے پاکستان میں داخل ہوئی تھی' اس کے بعد میں بولی۔ "وہ نقشے اور کاغذات لے کر میں اسی وقت آپ کے دفتر پہنچ رہی ہوں۔ آپ فوری طور پر اسے حراست میں لینے کے احکام جاری کر دیں۔ میرے خیال سے تیج گاؤں تھانے کے عملے کو یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"میرا خیال ہے مس خان کہ انٹیلی جنس والوں کو اسے حراست میں لینا چاہئے۔" ہوم سیکرٹری عبدالرحمٰن چودھری نے کہا۔

"بہرحال آپ جو بھی مناسب سمجھیں۔" میں نے کہا۔

"میں تو وقت بچانے کی خاطر کہہ رہی تھی کہ تیج گاؤں تھانے کی پولیس پہلے اسے گرفتار کر لے' پھر اسے انٹیلی جنس والوں کے سپرد کیا جا سکتا تھا۔ ہاں یہ بتا دوں کہ اس کمرے کو میں باہر سے مقفل کر آئی ہوں اور اور یہ بتانے کی غالباً ضرورت نہیں کہ ہر کمرے کی ایک چابی ہوٹل والوں کے پاس بھی ہوتی ہے' جس سے کمرا کھولا جا سکتا ہے۔"

"مگر آپ...... آپ مس خان' کس طرح اس سے جا ٹکرائیں؟" عبدالرحمٰن چودھری نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ "ابھی چند گھنٹے پہلے تو آپ کو میں نے نواب پور روڈ پر اتارا تھا!" مجھے اس وقت عبدالرحمٰن چودھری کی احمقانہ بات پر غصہ تو آیا' مگر میں ضبط کر گئی اور بولی۔ "میرا خیال ہے چودھری صاحب کہ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ اس وقت تو آپ کو فوری طور پر اس بھارتی ایجنٹ کی گرفتاری کے احکام جاری کرنا چاہئیں!"

"جی...... جی ہاں' ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ مس خان!...... اور پھر آپ تو آ ہی رہی ہیں ناں یہاں میرے پاس!"

"جی ہاں' خدا حافظ!" یہ کہتے ہی میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر ٹیلی فون بوتھ سے باہر آ گئی۔

کچھ ہی فاصلے پر بابر اور اس کے ساتھی میرے منتظر تھے۔ میں نے بابر سے کہا۔

"اور...... اور وہ ساوتری؟...... اس کا کیا ہوگا؟" بابر ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے بولا۔

"اس کا بندوبست میں نے کر دیا ہے' تم بے فکر رہو۔ باقی باتیں گھر واپسی پر ہوں گی۔"

"اگر آپ کو کہیں جانا ہے تو میں گاڑی میں پہنچائے دیتا ہوں۔" بابر نے پیشکش کی۔ "یوں بھی اب مجھے کوئی کام نہیں ہے۔"

"بہتر ہے کہ تم اپنے دونوں ساتھیوں کو ان کے ٹھکانے پر چھوڑ دو' میں چلی جاؤں گی۔"

"ان میں سے ایک کے پاس گاڑی ہے' یہ لوگ میرے بغیر بھی جا سکتے ہیں۔" بابر بولا "ویسے اگر رازداری والی کوئی بات ہے تو میں ضد نہیں کروں گا۔" اس کا لہجہ بجھا ہوا سا تھا۔

"اب تم سے کیا رازداری!...... اگر واقعی تمہارے ساتھیوں کے پاس کنوینس ہے تو پھر تم میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ میں تو تمہارے ساتھیوں کی وجہ سے کہہ رہی تھی' دوسرے یہ کہ ناحق میرے ساتھ چل کر تمہیں بوریت ہی ہوگی۔"

بابر کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ غالباً اپنے اس تجسس کو دور کرنا چاہتا تھا کہ میں نے بھارتی ایجنٹ ساوتری کا کیا بندوبست کیا ہے اور یہ کہ اب کہاں اور کیوں جا رہی ہوں' اس نے میری رضامندی پا کر اپنے دونوں ساتھیوں کو رخصت کر دیا اور مجھے ساتھ لئے اپنی کار میں آ بیٹھا۔

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "کدھر چلنا ہے؟"

"گرین روڈ۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

بابر نے کار آگے بڑھا دی' پھر ذرا توقف سے اس نے پوچھ ہی لیا۔ "ساوتری کا آپ نے کیا......"

"مجھے معلوم تھا کہ تم اس سلسلے میں ضرور سوال کرو گے۔" میں مسکرا کر بولی' پھر اسے مختصراً یہ بتا دیا کہ مشرقی پاکستان کی انتظامیہ میرے ساتھ تعاون کر رہی ہے اور یہ بھی کہ میں نے اس وقت ہوم سیکرٹری کو فون کیا تھا اور اسی سے ملنے جا رہی ہوں تاکہ ساوتری کے کمرے سے جو نقشے وغیرہ برآمد ہوئے ہیں' ہوم سیکرٹری کے حوالے کر دوں۔

بابر نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ مجھے انتظامیہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔

"مگر بابر' میں اپنے طور پر کام کرنے کو زیادہ پسند کرتی ہوں۔" میں نے اپنے دل کی بات اس سے کہہ دی۔

"میں جانتا ہوں آپ کو!" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ آزادانہ طور پر کام کرنے کو ترجیح دیتی ہیں۔"

بابر سے اسی طرح کی گفتگو میں سفر تمام ہو گیا۔ ہوم منسٹری کے دفتر سے کچھ پہلے ہی میں نے کار کو رکوا لیا اور بابر سے وہیں انتظار کرنے کو کہا۔ پھر میں کار سے اتر کر پیدل ہی اپنی منزل کی طرف چل دی۔

عبدالرحمٰن چودھری کو میں نے اپنا ہی منتظر پایا۔ اس کے پی اے نے مجھے یہ کہتے ہوئے فوراً اندر اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا کہ صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

کمرے میں داخل ہو کر جیسے ہی میری نظر عبدالرحمٰن چودھری کے چہرے پر پڑی' میں چونک اٹھی۔ اس کے چہرے سے واضح طور پر فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیوں' کیا ہوا؟ آپ کچھ فکرمند سے نظر آ رہے ہیں!" اس کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے کہا۔ وہ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا

اشارہ کیا، مگر جب تک خود اس کے مقابل ایک کرسی پر نہ بیٹھ گئی وہ کھڑا ہی رہا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد میں نے اپنا سوال پھر دہرایا اور اس کی فکرمندی کا سبب دریافت کیا۔

"وہ نکل گئی۔" عبیدالرحمن چودھری ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے جواباً بولا۔

"کون نکل گئی؟" میں نے دانستہ وضاحت چاہی حالاں کہ میں سمجھ تو گئی تھی کہ وہ کس کا ذکر کرزہا ہے!

"وہی بھارتی ایجنٹ!..... انٹیلی جینس والوں کو اس کے ہوٹل تک پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی..... ابھی ابھی فون پر مجھے انٹیلی جنس والوں کی بجائے تیج گاؤں پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او ہی کو ہوٹل پر چھاپا مارنے کے لئے کہہ دیا ہوتا!" عبیدالرحمن چودھری کے لہجے سے واقعی افسوس کا اظہار ہو رہا تھا۔

"مگر یہ کیسے ہوا؟" میں الجھ کر بولی۔ "پانچویں منزل کے اس مقفل کمرے سے بھلا وہ کس طرح فرار ہوگئی؟"

"اندازہ اور قیاس یہی ہے مس خان کہ آپ کے اس کمرے سے نکلتے ہی اسے ہوش آ گیا ہوگا۔" عبیدالرحمن چودھری بتانے لگا۔ "اطلاعات کے مطابق اس نے کمرے میں موجود فون پر ہوٹل کے منیجر سے بات کی اور اس سے کہا کہ میرے کمرے میں کچھ لٹیرے گھس آئے تھے جو لوٹ مار کے بعد کمرے کی چابی بھی پرس سے لے گئے ہیں اور مجھے کمرے میں بند کر گئے ہیں۔ میرے کمرے کا دروازہ ڈپلی کیٹ چابی سے فوراً کھلوا دیجئے! ہوٹل کے منیجر نے یہ اطلاع پاتے ہی دوسری چابی سے اس کے کمرے کا دروازہ کھلوا دیا۔ اس کے ساتھ اس نے درخواست کی کہ جو نقصان ہوا ہے میں پورا کرا دوں گا اس واقعے کی رپورٹ آپ پولیس میں نہ کریں۔ اس سے ہوٹل کی بدنامی ہوگی۔ وہ اس پر راضی ہوگئی مگر فوری طور پر وہ ہوٹل چھوڑ گئی۔ اس کے جاتے ہی تقریباً پانچ منٹ بعد انٹیلی جنس والے ہوٹل پہنچے اور پھر فون پر مجھے اس ناکامی کی اطلاع دی۔

"اس میں ایک غلطی مجھ سے بھی ہوئی ہے۔" میں خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ "اگر میں وہ وگ اور اس سے منسلک جھلی وہیں نہ پھینک آتی تو شاید وہ اس قدر آسانی سے فرار نہ ہو پاتی۔"

"میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہہ رہی ہیں!" عبیدالرحمن چودھری مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں نے اسے بتایا۔ "وہ میک اپ میں تھی اور میں نے اس کے چہرے پر چڑھی ہوئی جھلی اتار دی تھی۔ اس وقت وہ بے ہوش تھی۔ مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے ابھی بیان کر چکی ہوں۔ قیاس غالب یہی ہے کہ ہوش میں آ کر اس نے وگ دوبارہ اوڑھ لی ہوگی اور اپنے چہرے پر جھلی بھی چڑھا لی ہوگی۔ آپ نے جو واقعہ بیان کیا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اس کے چہرے پر میک اپ نہ ہوتا تو ہوٹل کا منیجر یقیناً اس کی طرف سے کھٹک جاتا اور پھر اسے آسانی سے نہ جانے دیتا!..... خیر غلطی میری بھی ہے اور آپ کی بھی!..... میں نے اس امکان پر بھی غور نہیں کیا تھا کہ کمرے میں موجود ٹیلی فون کے ذریعے وہ ہوٹل کی انتظامیہ سے رابطہ قائم کر کے کمرے کا دروازہ کھلوا سکتی ہے۔" مجھے بھی اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا تھا۔ ساوتری بڑی آسانی سے میری آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہوگئی تھی۔ اب دوبارہ اس کا ہاتھ آنا مشکل ہی تھا۔

"آپ وہ نقشے اور کاغذات لائی ہیں جن کا ذکر فون پر کیا تھا؟" عبیدالرحمن چودھری نے […]ا۔

"ہاں لائی ہوں۔" میں نے اپنا پرس کھول کر نقشے وغیرہ نکال لیے پھر بولی۔ "یہ اچھا ہی ہوا میں نے انہیں اسی وقت اپنے قبضے میں لے لیا ورنہ وہ یہ بھی اپنے ساتھ لے جاتی۔ اب دوبارہ ان […] حصول کی خاطر اسے مزید یہاں رکنا پڑے گا۔ ممکن ہے اس بیچ اس دوران میں پھر ٹکراؤ ہو جائے۔ […]ے مجھے اس کی توقع کم ہی ہے کیوں کہ وہ بہت چالاک عورت ہے۔"

عبیدالرحمن چودھری نقشے اور کاغذات اٹھا کر ان کا جائزہ لینے لگا، پھر بولا۔ "واقعی یہ تو بہت […] نقشے ہیں، دشمن کے ہاتھوں میں ان کا چلا جانا بہت خطرناک ہوتا۔"

"جہاں تک میری معلومات ہیں اسے یہ نقشے وغیرہ فراہم کرنے والا سیبو مکرجی ہے۔" میں نے بتایا۔

"سیبو مکرجی!..... عبیدالرحمن چودھری حیرت زدہ آواز میں بولا۔

"کیوں اس میں اتنے حیران ہونے کی کیا بات ہے چودھری صاحب؟" میں نے حیرت کا […]ب پوچھا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سیبو مکرجی کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں اور وہ ایسے معاملات میں بھی ملوث ہو سکتا ہے! کیا آپ کو یقین ہے کہ سیبو مکرجی ہی نے اس بھارتی ایجنٹ کو یہ نقشے اور کاغذات فراہم کئے ہوں گے؟ میں آپ کی معلومات پر تو کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کر رہا، ہاں معلومات کے ذریعے کے بارے میں ضرور جاننا چاہوں گا۔" عبیدالرحمن چودھری نے اپنی بات کی وضاحت کے ساتھ ساتھ مجھ سے دریافت کیا۔

"اپنی معلومات کے ذریعے کے متعلق کچھ بتانا میں مناسب نہیں سمجھتی۔" میں دوٹوک الفاظ میں بولی۔ "ہاں یہ طے ہے کہ بھارتی ایجنٹ ساوتری اور سیبو مکرجی کے درمیان سازباز تھی اور اس کی گواہ میں خود ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سازباز اسی سلسلے میں ہو سکتی تھی۔"

"آپ خود گواہ ہیں!..... یعنی؟..... کیا؟..... میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔"

"چودھری صاحب! آپ اس معاملے میں اپنے ذہن کو نہ الجھائیں!..... کیوں کہ میں تفصیل کے ساتھ آپ کو سب کچھ نہیں بتا سکوں گی۔ فی الحال اتنا سمجھ لیجئے کہ کل رات مجھے اپنے کچھ ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ سیبو مکرجی، ڈھاکہ کلب میں اس بھارتی ایجنٹ سے ملنے آ رہا ہے۔ اس وقت تک ساوتری کو میں بھارتی ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں پہچان سکی تھی، پھر بھی وہ مشتبہ تھی۔ میرا اصل انٹرسٹ سیبو مکرجی میں تھا۔ بہرحال میری اطلاع کے مطابق سیبو مکرجی اس سے ملنے نہیں آیا۔ وہ بہت چالاک شخص ہے۔ خود آنے کی بجائے اس نے اپنے ایک آدمی کو ڈھاکہ کلب بھیج دیا کہ وہ ساوتری کو اس کے پاس لے آئے۔"

"قطع کلام معاف کیجئے گا مس خان! آپ اس طرح یہ واقعہ بیان کر رہی ہیں جیسے خود اس وقت ڈھاکہ کلب میں موجود تھیں!" عبیدالرحمن چودھری درمیان میں بول اٹھا۔ اس کے بولنے کا سبب ظاہر ہے،

تصدیق ہی ہوسکتا تھا۔

''جی ہاں' میں خود موجود تھی وہاں!'' میں نے تصدیق کردی۔

''بس ایک سوال اور!'' عبیدالرحمٰن چودھری معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ مائنڈ نہ کریں!''

''ہاں ہاں بولیں' میں برا نہیں مانوں گی۔ یقین کریں جس حد تک میں آپ کو بتا سکتی ہوں' ضرور بتاؤں گی۔''

''ہمارے ریکارڈ میں سبودمکرجی کا کوئی فوٹو گراف نہیں ہے۔ اس کے بارے میں شہرت بھی یہی ہے کہ چند افراد کے سوا اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ پھر آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ جو شخص ڈھاکہ کلب میں بھارتی ایجنٹ ساوتری سے آکر ملا تھا' وہ خود سبودمکرجی نہیں تھا؟'' عبیدالرحمٰن چودھری نے تفصیل کے ساتھ سوال کیا۔

''سبودمکرجی کے بارے میں میری معلومات یہ ہیں کہ وہ پستہ قد شخص ہے اور جو شخص ڈھاکہ کلب میں ساوتری سے ملا تھا' دراز قد تھا۔''

''اس شخص' پراسرار شخص سبودمکرجی کے متعلق یہ بتا کر آپ نے میری معلومات میں اضافہ کیا ہے مس خان! مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی' شکریہ!...... ہاں تو آپ بتا رہی تھیں کہ......''

''جی!'' میں پھر گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے کی تفصیل اسے بتانے لگی۔ ''ساوتری کو اس شخص نے ایک پرچہ دیا جو میرے قیاس کے مطابق سبودمکرجی ہی نے بھیجا تھا۔ وہ پرچہ پڑھ کر ساوتری کچھ ہی دیر بعد بل ادا کر کے اس شخص کے ساتھ چلی گئی۔ میں نے اس کا تعاقب کیا' لیکن بدقسمتی سے کسی طرح سبودمکرجی کے آدمی کو تعاقب کا علم ہوگیا اور......'' پھر میں نے وہی سب کچھ دہرا دیا جو پیش آیا تھا۔

میری بات سن کر عبیدالرحمٰن چودھری نے طویل سانس لیا' پھر بولا۔ ''ہمارے محکمے سے بہتر کارکردگی تو آپ کی ہے کہ اتنی جلدی اس پراسرار شخص کی راہ پر لگ گئیں' ہمارا محکمہ تو اب تک اندھیرے ہی میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔''

''مگر اس سے کوئی فائدہ تو نہیں ہوا چودھری صاحب!...... میں تو ایک بھارتی ایجنٹ تک کو گرفتار نہیں کرا سکی اور یقیناً اس میں میری کوتاہی کو بھی دخل ہے۔''

''خیر یہ تو آپ کسرنفسی سے کام لے رہی ہیں' آپ کو یہاں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں!'' یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور چائے لانے کے لئے کہا۔ میرے انکار کے باوجود وہ نہیں مانا تھا۔ چائے پینے سے انکار کا سبب بابر بھی تھا جو میرا انتظار کر رہا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں عبیدالرحمٰن چودھری سے آج رات پولیس ریڈ کے بارے میں بھی بات ہوئی۔ اس نے رات گیارہ بجے پولیس کو تیار رہنے کا حکم دے دیا تھا۔ چائے پی کر میں فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب آپ سے کب ملاقات کا امکان ہے؟'' عبیدالرحمٰن چودھری اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا فی الحال!'' میں نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے کل ہی ملاقات ہو جائے۔''

''آپ کہیں تو میں اپنی کار میں آپ کو چھڑوا دوں!'' اس نے آج بھی اپنی پیشکش دہرائی' پھر اسی کے ساتھ بولا۔ ''ویسے مجھے توقع نہیں کہ آپ میری درخواست قبول کرلیں گی!''

''ایسی کوئی بات نہیں کہ میں دانستہ آپ کی پیشکش قبول نہیں کرتی۔ دراصل میں ناحق آپ کو زحمت دینا نہیں چاہتی۔ اگر کبھی میں نے اس کی ضرورت محسوس کی تو یقین کریں کہ ہرگز تکلف سے کام نہیں لوں گی۔ آپ اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھیں! مہمان نوازی کا شکریہ!'' میں اس کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کر بولی۔ ''خدا حافظ چودھری صاحب!''

''خدا حافظ مس خان!'' یہ کہہ کر عبیدالرحمٰن چودھری اپنی سیٹ کی طرف لوٹ گیا اور میں اس کے کمرے سے نکل آئی۔

ہوم سیکرٹری کے دفتر سے نکل کر میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس طرف چلنے لگی جہاں بابر اپنی کار لئے میرا منتظر تھا۔ ابھی میں نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ ایک موٹر سائیکل میرے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئی اور پھر ذرا ہی دور جا کر رک گئی۔ موٹر سائیکل پر ایک متوسط عمر کا شخص سوار تھا۔ اس شخص پر میں نے اس لئے بھی توجہ دی تھی کہ جب میں ہوم سیکرٹری کے پی اے سے ملی تھی تو اس کے پاس وہی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ واپسی پر وہ پی اے کے پاس مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ اگر وہ کچھ دور جا کر رک نہ جاتا اور رک کر اس طرح موٹر سائیکل کا معائنہ نہ کرنے لگتا جیسے اس میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے تو شاید میں اسے نظر انداز کر دیتی' مگر اس کے رک جانے کی وجہ سے میں چوکنا ہوگئی تھی۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ میری ایک تصویر ہوم منسٹری کے ریکارڈ روم سے غائب ہوکر سبودمکرجی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ یہ شخص سبودمکرجی کا آدمی بھی ہوسکتا تھا۔ ہوم سیکرٹری کے پی اے کے پاس بیٹھنے والا شخص دفتر ہی کا کوئی آدمی ہوسکتا ہے' یہی قیاس اغلب تھا۔

سڑک کے کنارے رکا ہوا وہ شخص زمین پر بیٹھا اپنی موٹر سائیکل کے کسی پرزے کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں اس کے قریب سے ہوکر آگے بڑھ گئی۔ کچھ ہی دور بابر کی کار کھڑی تھی۔ کار کے قریب پہنچ کر دانستہ میں ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے پر رک گئی اور جھک کر بابر سے مخاطب ہوئی۔ ''تم برابر والی سیٹ پر بیٹھ جاؤ' کار میں چلاؤں گی۔ مجھے ایک ذات شریف کو جل دینا ہے جو شاید ہماری کار کا تعاقب کرنے کے چکر میں ہیں۔''

بابر فوراً ہی ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر برابر والی نشست پر جا بیٹھا اور میں کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ کار میں بیٹھتے ہی کن انکھیوں سے میں نے موٹر سائیکل والے کو دیکھا تھا۔ وہ اب سیدھا کھڑا ہوگیا تھا۔ اب وہ کسی بھی لمحے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے ہمارا تعاقب کرسکتا تھا۔ کار میں بیٹھ جانے کے باوجود میں نے فوراً کار اسٹارٹ نہیں کی اور عقبی آئینے میں اس مشتبہ شخص کا جائزہ لینے لگی وہ یقیناً اس میک اپ میں مجھے عذرا خان کی حیثیت سے پہچان چکا تھا۔

''کیا بات ہے آپ کار اسٹارٹ کیوں نہیں کر رہیں؟'' بابر نے پوچھا۔

''ذرا اس شخص کے صبر کا امتحان لے رہی ہوں جو اب اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو چکا ہے۔''

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”وہ اس توقع پر ٹکٹکیں لگا رہا ہے کہ اب کسی بھی لمحے میری کار حرکت میں آ جائے گی۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ اب وہ کس بہانے اپنی جگہ رکا رہتا ہے۔“

عقبی آئینے میں موٹر سائیکل والے کو میں نے کار کی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر چکا تھا' مگر ابھی اسے آگے نہیں بڑھایا تھا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو جانے کے بعد اب اس شخص کا اسی جگہ کھڑا رہنا' اسے مشتبہ ظاہر کر سکتا تھا۔ میں نے جب کار اسٹارٹ نہ کی تو مجبوراً اسے حرکت کرنا ہی پڑی' مگر اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ کچھ دور آگے بڑھ کر وہ دوبارہ واپس جانے لگا۔ پھر جیسے ہی اس نے واپسی کا سفر اختیار کیا' میں نے کار اسٹارٹ کر دی۔

وہ شخص بھی یقیناً عقبی آئینے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کار کے حرکت میں آتے ہی اس نے موٹر سائیکل کا رخ پھر کار کی طرف موڑ لیا' مگر اس طرح کار اور موٹر سائیکل کا درمیانی فاصلہ خاصا ہو گیا۔ گیئر تبدیل کرتے ہوئے میں نے کار کی رفتار مزید بڑھا دی اور وہ موٹر سائیکل والا کافی پیچھے رہ گیا۔

”سنو بابر' اب جو موڑ آ رہا ہے' وہاں سڑک کے کنارے گھنے درخت ہیں۔ میں وہاں کار روک کر اتر جاؤں گی اور پھر تم ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لینا۔ میں کوئی ٹیکسی کر کے گھر پہنچ جاؤں گی۔ ہاں تم سیدھے گھر نہیں پہنچو گے۔ یہ ضروری ہے کہ تعاقب کرنے والے کو معلوم ہو جائے' کار میں اب تم اکیلے ہو۔ اس کے لئے تم کار کو کسی ہوٹل کے سامنے کھڑا کر کے ہوٹل میں چلے جانا۔ جب وہ شخص یہ دیکھے گا کہ میں کار سے غائب ہو چکی ہوں اور تم اکیلے رہ گئے ہو تو پھر تمہارا پیچھا نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود تم چوکنا رہنا کہ کہیں وہ میری طرف سے مایوس ہو کر تمہارے ہی پیچھے لگا ہوا گھر تک نہ آ جائے!...... سمجھ گئے نا؟“

”جی ہاں' اچھی طرح سمجھ گیا' آپ بالکل فکر نہ کریں اور اگر آپ کہیں تو میں اس شخص کو کوئی سبق بھی دے دوں!“ بابر بولا۔

”نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ”یہ تو محض زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ اس سے الجھنا فضول ہو گا۔“

”جو آپ کا حکم!“ اس نے اسی طرح سعادت مندی سے کہا کہ مجھے اپنے آپریشن سیل کا نگران کمانڈر نواز یاد آ گیا۔

چند ہی لمحے بعد موڑ آ گیا۔ میں نے عقبی آئینے میں موٹر سائیکل والے کو دیکھا جو ایک چھوٹے سے دھبے کی صورت نظر آ رہا تھا۔ میں نے بائیں جانب گاڑی موڑ کر روک دی اور پھر فوراً اس سے اتر کر سڑک کے کنارے گھنے درختوں کی طرف لپکنے لگی۔

ذرا ہی دیر کے بعد ایک درخت کے تنے کی آڑ میں چھپی ہوئی میں' بابر کی کار کو آگے بڑھتے دیکھ رہی تھی۔ اب مجھے اس موٹر سائیکل والے کی آمد کا انتظار تھا۔ پھر جب کچھ دیر بعد وہ بھی میرے سامنے سے تیز رفتاری کے ساتھ گزر گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں اسے جل دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میں نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ وہ تعاقب کرنے والا خود ہوم سیکرٹری عبید الرحمٰن چودھری کا آدمی رہا ہو اور اسی کے ایما پر میرا تعاقب کر رہا ہو۔ بہر حال وہ سبود مکرجی کا آدمی رہا ہو یا ہوم

سیکرٹری کا' اب مجھے اس کی طرف سے کوئی کھٹکا نہیں رہا تھا۔ اگر اس وقت بابر میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں اتنی آسانی کے ساتھ اس سے جان نہ چھڑا پاتی۔

گھنے درختوں کی آڑ سے نکلتے ہوئے میں نے ایک ٹیکسی کو قریب آتے دیکھا۔ وہ گرین روڈ کی طرف جا رہی تھی اور یہ توقع کم ہی تھی کہ ٹیکسی والا واپسی کے سفر پر آمادہ ہو جاتا' اس کے باوجود میں تیزی کے ساتھ سڑک کے کنارے آ کھڑی ہوئی۔ ٹیکسی مزید قریب آئی تو یہ دیکھ کر میں مایوس ہو گئی کہ پیچھے ایک سواری بیٹھی تھی۔ میں نے اسے اسی لئے نہیں روکا' مگر خلاف توقع ٹیکسی میرے پاس آ کر رک گئی۔

”کاہاں جائے گا آپ؟“ بنگالی ٹیکسی والے نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے پوچھا۔

”مگر تمہاری ٹیکسی میں تو سواری بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے اسی لئے تمہیں روکا بھی نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔

”یہ شوواری (سواری) نہیں' امارا دوشت (دوست) اے۔ آپ بولو نا کدر جانے مانگتا؟“

میں عموماً کسی ایسی ٹیکسی میں بیٹھنے سے گریز کرتی ہوں جس میں ڈرائیور تنہا نہ ہو' اس کا کوئی دوست یا عزیز بھی ساتھ ہو' مگر اس وقت اس احتیاط کو نظر انداز کر دیا۔

”مجھے بادام تلی گھاٹ جانا ہے۔“ میں نے ٹیکسی والے کو بتایا۔

”ابی ام ادر سے آتا کھالی' پانس ٹوکا (پانچ روپے) بیش (زیادہ) لے گا' بولو چلنا کہ نئیں؟“

”چلو لے لینا!“ میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔

”اے کھوکا! بی تم اور آگے بیٹو!“ ٹیکسی ڈرائیور نے اپنے نوجوان ساتھی کو مخاطب کیا۔

وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ سے اتر کر ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس دوران میں اس نے سر سے پاؤں تک عجیب سی نظروں سے میرا جائزہ لیا اور ان عجیب گستاخ نظروں کا مفہوم سمجھنا میرے لئے دشوار نہیں تھا۔ میں اس لئے مطمئن تھی کہ اس جیسے لفنگوں کا دماغ درست کرنا مجھے خوب آتا تھا۔ پھر بھی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے میں چوکنا ہو گئی۔

میرے بیٹھتے ہی ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی موڑنے کی بجائے اسے پوری سپیڈ میں سیدھا بھگانا شروع کر دیا اور پھر دائیں جانب گرین روڈ کی سمت موڑنے لگا۔

میں نے کسی بھی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر اپنے پرس سے ریوالور نکالا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو بابر نے مجھے ہوٹل جاتے ہوئے دیا تھا۔

”واپس چلو! ورنہ میں تم دونوں کے سروں میں سوراخ کر دوں گی!“ میں نے ریوالور کی نال ٹیکسی ڈرائیور کی گدی سے لگا دی۔

یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں رہا ہو گا کہ ایک اکیلی عورت ایک دم اتنا جارحانہ رویہ بھی اختیار کر سکتی ہے اور یہ کہ اس کے پاس ریوالور بھی ہو سکتا ہے! نتیجتاً وہ بوکھلا گیا اور ٹیکسی سڑک پر لہرانے لگی۔ یوں بھی اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔

”احمق آدمی!“ میں چیخ اٹھی۔ ”اسٹیرنگ سنبھالو! ورنہ میرے مارنے سے پہلے اپنے آپ ہی

خودکشی کر کے مرجاؤ گے! سپیڈ کم کرو اور پھر ٹیکسی روک لو!" اسی کے ساتھ میں نے اس کی گدی سے ریوالور کی نالی ہٹالی کہ کہیں وہ بوکھلاہٹ میں ٹیکسی کو سڑک کے کنارے موجود کسی پیڑ سے نہ ٹکرا دے۔

ریوالور کی ٹھنڈی نال اپنی گدی سے ہٹتے ہی اسے کچھ ہوش آ گیا اور پھر اس نے اسٹیرنگ اچھی طرح سنبھال لیا۔

"روکو ٹیکسی!...... اور پھر ریورس میں لے کر واپس چلو!" میں نے اسے دوسرا حکم دیا۔

"مم...... ما...... گر پشل......" وہ ریوالور کے خوف سے ہکلانے لگا۔

"یقین رکھو میں تمہیں اسی صورت میں گولی نہیں ماروں گی کہ تم میرے حکم پر چلتے رہو!" یہ کہتے ہوئے میں آئینے میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے نوجوان ساتھی کا چہرہ بھی خوف کے سبب مزید تاریک نظر آ رہا تھا۔

بالآخر اسے میرا حکم ماننا ہی پڑا اور ٹیکسی نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور خوف زدہ آواز میں مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اسے پولیس کے حوالے تو نہیں کر دوں گی!

میں یوں بھی معمولی چوراچکوں سے نہیں الجھتی۔ اس کے باوجود جو خود ہی مجھ سے خواہ مخواہ الجھ پڑتا ہے، اسے بخشتی بھی نہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کی بات کے جواب میں چند لمحے خاموش رہ کر میں نے کہا۔

"میں تم دونوں کو پولیس کے حوالے تو نہیں کروں گی، لیکن تمہیں اپنے طور پر سزا ضرور دوں گی تاکہ تم لوگ آئندہ کسی اکیلی عورت کو دیکھ کر گیدڑ سے شیر بننے کی کوشش نہ کرو!" یہ کہہ کر میں چپ ہو گئی اور پھر ٹیکسی ڈرائیور کے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ میں ان دونوں کو کیا سزا دوں گی!

بادام تلی گھاٹ پہنچ کر میں نے نسبتاً کم آباد اور تنگ سی گلی میں ٹیکسی رکوالی اور ان دونوں سے نیچے اترنے کو کہا۔ وہ دونوں حیران حیران سے نیچے اتر آئے۔

"اب تم دونوں ایک دوسرے کی ٹھکائی کرو!" میں نے انہیں حکم دیا، مگر وہ میرا عجیب حکم سن کر ساکت کھڑے رہے۔ گلی میں ادھر ادھر دیکھ کر میں نے اپنا پرس کھول لیا اور پھر ریوالور پر نظر پڑتے ہی مشینی انداز میں وہ ایک دوسرے پر پل پڑے۔ مجھے مزید کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ریوالور میں نے پرس سے نکالتے نکالتے دوبارہ پرس میں رکھ لیا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ وہ ایک دوسرے پر تھپڑ اور گھونسے برساتے رہے اور پھر میرا حکم سنتے ہی کہ بس کرو، وہ ہانپتے ہوئے رک گئے۔ ان میں سے ایک کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور دوسرے کی دائیں بھوں پھٹ گئی تھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ اگر تم بدمعاشی نہ کرتے تو شاید میں تمہیں میٹر سے پانچ روپے زیادہ کرایہ ہی دے دیتی، مگر اب میٹر کے مطابق ہی کرایہ دوں گی۔

اس ابتلا کے بعد شاید ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ملنے کی توقع نہیں رہی تھی۔ اسی لئے جب میں نے میٹر کے مطابق کرایہ اس کی طرف بڑھایا تو وہ حیران سا نظر آنے لگا۔

"رکھ لو، رکھ لو!...... چلو جلدی کرو!" میں نے مزید کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ ڈرتے جھجکتے ہوئے کرایہ لے لیا اور پھر میرے اشارے پر وہ اپنے ساتھی سمیت ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں وہاں سے اس گلی کی طرف چل دی جس میں بابر

کے دوست فرید احمد کا گھر تھا۔

مجھ سے پہلے بابر وہاں پہنچ چکا تھا اور باورچی خانے میں گھسا ہوا دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ملازم کو جواب دے دینے کی وجہ سے اب کھانا وغیرہ بابر اور اس کے دوست ہی کو پکانا پڑتا تھا۔ کبھی ہوٹل سے بھی کھانا آ جاتا تھا اور کبھی وہ لوگ خود ہوٹل میں کھانا کھا آتے تھے۔

کچھ دیر بعد کھانا کھاتے ہوئے میں بابر سے کہہ رہی تھی۔ "آج رات مجھے تمہاری کار کی ضرورت پڑے گی۔"

"لے جائیے گا، اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے! آپ ہی کی کار ہے۔"

"میں نے اس لئے پہلے سے کہہ دیا کہ کہیں رات کو تمہیں کسی جگہ جانا نہ ہو!"

"مجھے تو خیر کہیں نہیں جانا، مگر آپ...... آپ کہاں جا رہی ہیں؟ اگر آپ مناسب سمجھیں تو بتادیں!"

"نارائن گنج جانا ہے مجھے!" میں نے راز داری نہیں برتی، مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ بابر نے بھی مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ بھی غالباً سمجھ گیا تھا کہ میں مزید کچھ بتانا نہیں چاہتی۔

کھانا کھا کر چائے پینے کے بعد میں اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی آئی۔ بابر بیرونی کمرے میں اپنے بستر پر دراز ہو گیا تھا۔

شام ساڑھے چار بجے کے بعد میں سو کر اٹھی۔ اس دوران میں بابر کا دوست فرید احمد بھی آ چکا تھا۔ میں غسل خانے میں گھس گئی اور فرید احمد چائے بنانے لگا۔ شام کی چائے بابر، فرید احمد اور میں نے ساتھ ساتھ پی۔ اسی دوران میں مجھے اس موٹر سائیکل والے کا خیال آ گیا جس نے گرین روڈ سے میرا تعاقب کیا تھا۔ میں نے بابر سے اس کے متعلق پوچھا۔

"آپ جب کار سے اتر گئی تھیں تو میں نے رفتار بہت کم کر دی تھی۔" بابر بتانے لگا۔ "میں چاہتا تھا کہ موٹر سائیکل والا قریب آ جائے اور یہ دیکھ لے کہ میں کار میں تنہا ہوں، مگر کار کی رفتار کم ہوتے ہی اس نے بھی موٹر سائیکل کی رفتار کم کر لی اور درمیانی فاصلہ برقرار رکھا۔ نتیجتاً وہ جناح ایونیو تک میرے پیچھے لگا چلا آیا۔ جناح ایونیو میں گلستان سینما کے قریب ایک ہوٹل کے سامنے میں نے کار روک دی اور ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ موٹر سائیکل والا بھی وہاں پہنچ گیا۔ کار خالی دیکھ کر اس کے چہرے سے انتہائی حیرانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میری توجہ اسی کی طرف تھی۔ پھر وہ ہوٹل میں داخل ہوا اور مجھے ایک میز پر اکیلا بیٹھے دیکھ کر واپس چلا گیا۔ میں چائے پی کر ہوٹل سے نکلا تو وہ اپنی موٹر سائیکل سمیت غائب تھا۔ آپ نے جو تدبیر بتائی تھی، وہ کارگر ثابت ہوئی۔"

"بابر! میں تم سے ایک اور بات بھی کرنا چاہتی تھی، مگر گزشتہ رات اس کا موقع نہیں ملا۔ اچھا ہے کہ اس وقت تمہارا دوست بھی یہاں موجود ہے۔" میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات شروع کی۔ وہ دونوں ہی توجہ سے میری بات سن رہے تھے۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ "کل جو واقعہ یہاں پیش آیا، اس کے بارے میں تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ اس واقعے سے یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ سیو دکرجی تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ خود میں نے بھی شکنتلا کی زبانی

سنا تھا کہ وہ لوگ تمہارا کوئی بندوبست کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات بہرحال خطرے سے خالی نہیں کہ سبود مکرجی کے گرگے تمہارے ٹھکانے سے واقف ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم جلد از جلد یہ جگہ بدل دو! سبود مکرجی ہی کے ایما پر اس کے ایک غنڈے اکبر نے اپنے آدمیوں سے تم پر حملہ کرانے کی کوشش کی تھی۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت یہاں نہ تم تھے اور نہ فرید احمد! نتیجتاً ان غنڈوں کی مڈھ بھیڑ مجھ سے ہوگئی اور پھر انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ انہی غنڈوں نے بتایا تھا کہ وہ پانچ ہزار روپے پیشگی اس کام کے لئے اکبر سے وصول کر چکے ہیں۔ مزید پانچ ہزار روپے انہیں کام ہونے کے بعد ملنے والے تھے۔ میرے خیال میں اکبر اتنا سیدھا نہیں ہوگا کہ ان غنڈوں پر پانچ ہزار روپے چھوڑ دے۔ وہ یقیناً ان غنڈوں سے استفسار کرے گا۔ ان غنڈوں نے اگر پانچ ہزار روپے خرچ نہیں کئے ہوں گے تو اکبر کو واپس کر دیں گے۔ پھر ظاہر ہے کہ اکبر کوئی دوسرا بندوبست کرے گا۔ تم لوگ میری بات سمجھ رہے ہو نا!...... اس صورتحال سے بچنے کا یہی راستہ ہے کہ اس مکان کی سکونت ترک کر دی جائے۔ بولو! کیا کہتے ہو تم لوگ؟'' میں اپنی بات ختم کر کے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

چند لمحے توقف کے بعد بابر میری بات کے جواب میں بولا۔ ''آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں' ہمیں واقعی یہ مکان چھوڑ دینا چاہئے۔ ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ میرے ساتھیوں میں سے کئی ایسے ہیں جو اکیلے رہتے ہیں۔ یہ ممکن ہے ان میں سے کسی کو عارضی طور پر یہاں منتقل کر دیا جائے اور ہم وہاں چلے جائیں۔''

یہ کہہ کر بابر اپنے دوست فرید احمد سے مخاطب ہوا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے فرید' ہم یہاں سے اپنے کس دوست کے گھر منتقل ہو سکتے ہیں؟''

''جعفری یا اقبال' ان دونوں ہی میں سے کسی کے گھر ہم رہ سکتے ہیں۔ ان دونوں کے گھروں میں گنجائش بھی خاصی ہے۔'' فرید احمد نے اپنے دوست کی بات کا جواب دیا۔

بابر نے فرید احمد کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ جعفری کا گھر ٹھیک رہے گا' میں آج ہی اس سے بات کئے لیتا ہوں۔''

''تمہارا یہ دوست رہتا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھ لیا۔ پوچھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے بھی بہرحال بابر ہی کے ساتھ رہنا تھا۔

''جعفری کا گھر عظیم پور میں ہے۔'' بابر نے بتایا۔

اس روز رات کا کھانا' بابر' فرید اور میں نے موتی جھیل کے پربانی ہوٹل میں کھایا جو پلٹن میدان کے عقب میں ہے۔ کھانا کھا کر گھر کی طرف لوٹتے ہوئے بابر نے ایک پٹرول پمپ سے کار کی ٹینکی فل کرالی کیوں کہ آج ہی رات اسی کار میں مجھے نارائن گنج جانا اور آنا تھا۔

شام ہی کو بابر اپنے دوست جعفری سے مکان کی منتقلی کی بات کر آیا تھا۔ جعفری اس پر راضی ہوگیا تھا۔ طے پایا تھا کہ آئندہ روز اپنا اپنا سامان ایک دوسرے کے گھروں میں منتقل کر دیا جائے گا۔ یہ سن کر مجھے اطمینان ہوگیا تھا۔ بس اب ایک ہی رات رہ گئی تھی اور میرے نزدیک یہ اتنے بڑے خطرے کی بات نہیں تھی۔

موتی جھیل سے ہم بادام تلی گھاٹ پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ بادام تلی گھاٹ سے

صدر گھاٹ کا راستہ چند منٹ کا تھا اس لئے میں پونے گیارہ بجے گھر سے نکلی۔ مجھے گیارہ بجے سی آئی ڈی آفس پہنچنا تھا مگر میں کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گئی۔ سادہ لباس میں پولیس پارٹی تقریباً تیار ہی تھی۔ روانگی میں اسی لئے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ایک پولیس انسپکٹر کو میں نے اپنے ساتھ کار میں بٹھا لیا۔ پولیس جیپ میں ڈرائیور سمیت نصف درجن مسلح پولیس والے تھے۔ پولیس انسپکٹر کو یوں بھی میں نے اپنے ساتھ بٹھایا تھا کہ وہ راستہ بتاتا رہے۔ وہ علاقہ بہرحال میرے لئے تقریباً نیا ہی تھا۔ جب ہم سی آئی ڈی آفس سے نکلے تو میری کار آگے آگے تھی اور جیپ اس کے پیچھے۔ ضیاء الاسلام کی حویلی کا سرچ وارنٹ اور خورشید السلام کی گرفتاری کا وارنٹ' دونوں ہی پولیس انسپکٹر کے پاس موجود تھے۔

نصف شب سے کچھ پہلے جب ہم نارائن گنج کی آبادی میں داخل ہوئے تو ہر طرف گہرے سکوت اور اندھیرے کی حکمرانی تھی' کچھ ہی دیر بعد ضیاء الاسلام کی حویلی کے سامنے میں نے اپنی کار روک دی۔ اسی کے ساتھ جیپ بھی رک گئی۔

''تم اترو اور جا کر حویلی کے پھاٹک پر دستک دو!'' میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے پولیس انسپکٹر سے کہا اور پھر خود بھی کار کا انجن بند کر کے نیچے اتر گئی۔

میں نے جیپ میں سوار مسلح افراد کو بھی نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ انہیں یہ احکام ملے تھے کہ جو میں کہوں اس پر عمل کریں۔

''تم میں سے دو' یہیں حویلی کے پھاٹک پر رہو گے!'' میں بولی۔ پھر میں نے ان میں سے دو کی ڈیوٹی حویلی کے عقب میں لگا دی۔ دو افراد کو میرے اور پولیس انسپکٹر کے ساتھ حویلی کے اندر چلنا تھا۔

پولیس انسپکٹر میرے حکم پر حویلی کے ذیلی پھاٹک پر زور زور سے دستکیں دینے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد پھاٹک کے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھل گیا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے ہاتھ میں لالٹین لئے باہر آ گیا۔ حلیے سے وہ چوکیدار ہی معلوم ہوتا تھا۔

چوکیدار کے یہ پوچھنے پر کہ کیا بات ہے؟ اور ہمیں کس سے ملنا ہے؟ پولیس انسپکٹر نے کہا۔

''ہمیں خورشید الاسلام سے ملنا ہے' کیا وہ حویلی میں ہیں؟''

جواب میں چوکیدار نے صاف انکار کر دیا کہ وہاں خورشید الاسلام نام کا کوئی شخص نہیں رہتا اور یہ کہ وہ حویلی ضیاء الاسلام کی ہے۔ اس کے لہجے اور آواز سے جھوٹ کا صاف اندازہ ہو رہا تھا اور یہ بھی کہ وہ کچھ خوف زدہ بھی ہے

''انسپکٹر!'' میں بول اٹھی۔ ''حویلی کے سارے ملازمین اسی کے ہمنوا ہیں۔ یہ لوگ کچھ نہیں بتائیں گے' اندر چلو!...... اور اسے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دو!''

''اے! تم ادھر جیپ کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ!'' پولیس انسپکٹر نے ادھیڑ عمر چوکیدار کو حکم دیا۔

چوکیدار کوئی احتجاج کئے بغیر جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ میں' پولیس انسپکٹر اور دو پولیس والوں کے ساتھ حویلی میں داخل ہوگئی۔ میرے حکم پر سبھی نے اپنے اپنے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لئے تھے۔ پولیس انسپکٹر کے دوسرے ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹارچ بھی تھی اور وہی میرے ساتھ ساتھ آگے چل رہا

تھا۔ حویلی کے احاطے میں ابھی ہم کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ معاً ایک جانب سے کسی درندے کے غرانے کی سی آواز سن کر میں اچھل پڑی اور اسی کے ساتھ میرے قدم رک گئے۔ درندے کی آواز کے فوراً بعد ہلکی سی ایک نسوانی چیخ بھی ابھری اور معدوم ہوگئی۔ بالکل ایسی ہی آواز میں نے اس رات بھی اس حویلی میں سنی تھی جب مجھے یہاں قید کیا گیا تھا۔

''ادھر چلو!'' میں نے اس طرف اشارہ کیا جدھر سے درندے کے غرانے کی آواز آئی تھی۔

ہم سب ذرا ہی دیر بعد بائیں جانب حویلی کے ایک حصے تک پہنچ گئے۔ میرے کہنے پر انسپکٹر نے ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر ڈالی۔ میں اس جگہ کو پہچان گئی۔ حویلی کا یہ وہی حصہ تھا جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ سامنے ہی دروازہ نظر آرہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔

''آؤ میرے پیچھے!'' یہ کہہ کر میں اس دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

پولیس انسپکٹر اور اس کے دونوں ساتھی میرے پیچھے پیچھے اندر آگئے۔ اسی وقت پھر نسوانی چیخ سنائی دی۔ اس مرتبہ وہ بہت واضح اور قریب محسوس ہوئی تھی۔ پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کسی نے چیخنے والی کا گلا دبا دیا ہو۔ حویلی کا وہ حصہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ یہاں دو کمرے تھے' ایک چھوٹا کمرا اور دوسرا بڑا کمرا راہداری عبور کرکے میں اس کمرے میں آگئی جہاں ایک رات بسر کی تھی۔ چیخنے کی آواز اسی سمت سے آئی تھی' مگر وہ کمرا بالکل خالی تھا۔ ٹارچ کی روشنی خالی کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔

''یہاں...... یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' پولیس انسپکٹر کی مرتعش سی آواز ابھری۔ اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے اپنے آپ سے کچھ کہہ رہا ہو۔ اس کی آواز سے خوف کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔

''یہاں دوسرا کمرا بھی ہے' چلو اسے دیکھتے ہیں۔'' میں نے انسپکٹر سے کہا۔

''جج...... جی بہتر ہے۔'' پولیس انسپکٹر بولا۔

عین اس وقت عقب سے ایک بلند قہقہہ سنائی دیا اور میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ خورشید الاسلام ہی کا قہقہہ ہوسکتا تھا۔ معاً میرے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال آیا اور میں چیخ اٹھی۔ ''نکلو یہاں سے!...... جلدی!...... ورنہ ہم چوہوں کی طرح یہاں پھنس کر رہ جائیں گے۔''

''پھنس تو چکی ہو تم عذرا خان اور کیا پھنسو گی!'' عقب سے خورشید الاسلام کی بلند آواز سنائی دی۔

میں بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل کر راہداری میں آگئی اور پھر دروازے کی طرف دوڑی' مگر اسی دوران میں کسی نے باہر سے دروازہ بند کردیا۔ ظاہر ہے کہ دروازہ بند کرنے والا وہی ہوسکتا تھا جس کی تلاش میں' میں یہاں تک آئی تھی' یعنی خورشید الاسلام' اس نے مجھے میری آواز سے یقیناً پہچان لیا تھا اسی لئے میرا نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ مجھے جس بات کا خطرہ تھا' وہی میرے سامنے آگئی تھی۔ میں ان پولیس والوں کے ساتھ واقعی چوہوں کی طرح پھنس کر رہ گئی تھی۔

پولیس انسپکٹر اور دونوں پولیس والے بھی میرے قریب آگئے۔

''یہ...... یہ کیا ہوا؟...... کیا کسی نے دروازہ باہر سے بند کردیا؟'' پولیس انسپکٹر بند دروازے پر ٹارچ کی روشنی ڈالتا ہوا احمقانہ انداز میں بولا۔

میں' پولیس انسپکٹر کی بات سن کر جھنجھلا گئی اور کہا۔ ''کیا تمہیں بند دروازہ نظر نہیں آرہا' انسپکٹر؟''

''جی...... جی ہاں' نظر آرہا ہے' مگر کیوں بند کیا گیا ہے دروازہ؟''

معلوم نہیں کس نے اسے پولیس کے محکمے میں بھرتی کرلیا تھا' صورت دیکھ کر قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس قدر بے وقوف ہوگا۔ میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دانستہ نسبتاً نرم لہجے میں دیا۔ ''دروازے اس لئے بند کئے جاتے ہیں انسپکٹر کہ کوئی باہر نہ نکل سکے۔ اب سمجھ گئے تم کہ دروازہ کیوں بند کیا گیا ہے؟''

''جج...... جی...... جی ہاں سمجھ گیا میں۔'' وہ بے وقوفوں کی طرح یوں سر ہلانے لگا جیسے واقعی اب اصل بات اس کی سمجھ میں آئی ہو۔

مجھے افسوس یہ تھا کہ اس ریڈ کی تمام تر ذمے داری مجھ پر تھی' پولیس انسپکٹر اس کا ذمے دار نہیں تھا۔ اسے تو میرے احکام پر عمل کرنے کو کہا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے ان لوگوں کا خیال بھی تھا جنہیں میں باہر چھوڑ آئی تھی۔ خورشید الاسلام کے آدمی ان پر بھی ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ موجودہ صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔

چند لمحے بعد میں نے انسپکٹر کے ہاتھ سے ٹارچ لے کر دروازے کا جائزہ لیا لکڑی کا وہ دروازہ خاصا مضبوط معلوم ہوتا تھا' لیکن ریوالور کی گولی سے اس میں سوراخ کیا جاسکتا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا۔ ہم چار افراد تھے اور چاروں ہی کے پاس ریوالور تھے اور خاصے فالتو راؤنڈ بھی!

''انسپکٹر! اس چوہے دان سے نکلنے کا بس ایک ہی راستہ ہے۔'' کچھ سوچ کر میں نے انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ ''میں اپنے ریوالور کی نال سے اس دروازے پر چار لکیریں بنا رہی ہوں' تم لوگوں کو باری باری تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ان لکیروں پر فائر کرنا ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے دوبارہ انسپکٹر کو ٹارچ پکڑا دی اور کہا۔ ''تم دروازے پر ٹارچ کی روشنی ڈالو' میں لکیریں کھینچتی ہوں۔''

انسپکٹر نے میرے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور دروازے پر روشنی ڈالنے لگا۔

میں نے آگے بڑھ کر ریوالور کی نال سے لکڑی کے دروازے میں ایک اتنی لمبی لکیر بنائی کہ لکیروں کا چوکور خانہ اتنا وسیع بن سکے جو اس میں سے گزر کر ایک آدمی باہر نکل جائے۔ دو متوازی لکیروں کی لمبائی میں نے زیادہ رکھی تھی بقیہ دو لکیریں اوپر نیچے کھینچ کر میں نے خانہ مکمل کردیا۔ لکڑی مرطوب آب وہوا کی وجہ سے نسبتاً نرم تھی ورنہ اس قدر آسانی سے واضح لکیریں نہ بن پاتیں۔ دروازے سے پیچھے ہٹتے ہوئے میں نے انسپکٹر اور اس کے ساتھیوں سے دریافت کیا۔ ''کیا تم لوگوں کو لکیریں صاف نظر آرہی ہیں؟''

''جی ہاں' نظر آرہی ہیں اور ان پر آپ کی ہدایت کے مطابق فائرنگ کی جاسکتی ہے۔'' انسپکٹر نے میری بات کا جواب دیا اور پھر بقیہ دو افراد نے بھی اس کی تائید میں سر ہلا دیئے۔

''اچھا تو پھر پہل میں کرتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

پھر میں نے یکے بعد دیگرے چھ فائر دروازے پر کئے۔ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ لکڑی کے دروازے میں لکیر کے ساتھ چھ سوراخ ہو گئے تھے۔ دروازہ زیادہ موٹی لکڑی کا بنا ہوا نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ فائرنگ کی آواز خورشید الاسلام کو چوکنا کر دے گی' مگر یہ خطرہ تو بہرحال مول لینا ہی تھا۔

''انسپکٹر! اب تم دروازے پر فائر کرو! ٹارچ مجھے دے دو!...... یہ خیال رکھنا کہ گولی لکیر ہی پر لگنا چاہیے۔'' میں نے اسے ہدایت کی اور پھر اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی۔

پھر انسپکٹر نے یکے بعد دیگرے اس کے دونوں ساتھیوں نے بھی دروازے پر فائرنگ کی۔ فائرنگ کی آواز سے وہ پورا علاقہ گونج اٹھا تھا' مگر حویلی کے مکینوں کے کانوں پر ابھی تک جوں نہیں رینگی تھی۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ باہر موجود پولیس والوں نے بھی اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس سے میں کچھ فکر مند بھی ہو گئی تھی۔

بالآخر کچھ ہی دیر کے بعد میری تدبیر کارگر ثابت ہوئی دروازے کا وہ حصہ چند ہی دھکوں میں دوسری جانب جا گرا جسے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے میں اس چوہے دان سے باہر نکلی اور پھر بقیہ افراد بھی باہر آ گئے۔ حویلی پر سکوت چھایا ہوا تھا' مگر پھاٹک کی جانب سے مدھم مدھم سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں سے یہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بہت سے لوگ آہستہ آوازوں میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے پہلے ادھر ہی کا رخ کیا۔ جن چار پولیس والوں کو میں باہر چھوڑ کر آئی تھی' مجھے ان کی فکر تھی۔ اب تک ہم سب کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

پھاٹک سے نکلتے ہی مجھے لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ ان میں سے اکثر کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں وہ مقامی لوگ تھے اور فائرنگ کی آواز سن کر حقیقت حال جاننے کے لئے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان سے استفسار کئے بغیر ہی میں ان کی وہاں موجودگی کا سبب سمجھ گئی۔ انہیں لوگوں کے درمیان جیپ ہی کے قریب مجھے وہ دو پولیس والے بے ہوش پڑے ہوئے نظر آئے جنہیں میں وہاں چھوڑ گئی تھی۔ چوکیدار غائب تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ جب وہ وہاں پہنچے تھے تو ان دونوں کو اسی طرح زمین پر بے ہوش پڑا ہوا دیکھا تھا۔

''انسپکٹر! تم حویلی کے عقب میں جا کر ان دونوں کو دیکھو جنہیں اس طرف بھیجا گیا۔'' میں نے انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے' وہ دونوں بھی بے ہوش ہی ملیں گے۔ اپنے ساتھیوں کو بھی لیتے جاؤ۔ اگر واقعی وہ بے ہوش ہوں تو انہیں یہاں اٹھا لانا۔''

میرا حکم سن کر انسپکٹر اپنے ساتھیوں سمیت حویلی کی عقبی سمت چلا گیا تھا۔ دو ایک مقامی باشندوں کو بھی اس نے اپنی مدد کے لئے ساتھ لے لیا تھا۔

پھر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ وہ دونوں بھی بے ہوشی ہی کی حالت میں ملے۔ میرے کہنے پر قریب ہی رہنے والا ایک شخص لوٹے میں پانی بھر لایا اور پھر بے ہوش پولیس والوں کو ہوش میں لانے کے لئے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے جانے لگے۔ ان میں سے ایک کو فوراً ہوش آ گیا' بقیہ تین کو ہوش میں لانے کے لئے انسپکٹر کوشش میں لگا ہوا تھا۔ جو پولیس والا ہوش میں آیا تھا' اس کی ڈیوٹی

پھاٹک ہی پر تھی۔ میرے استفسار پر کہ اسے کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ وہ بتانے لگا۔ ''آپ لوگوں کے اندر جانے کے کچھ ہی دیر بعد پھاٹک کے ذیلی دروازے سے کوئی گول سی چیز کسی نے باہر پھینکی جو ہمارے قریب ہی آ کر پھٹی اور پھر ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں' کیا ہوا' مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں گرنے سے بچنے کے لئے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ میری سانس کی نالی اور سینے میں مرچیں بھر گئی تھیں اور سر بری طرح چکرانے لگا تھا۔''

بے ہوش کرنے والی گیس! میرے ذہن میں اس کا بیان سن کا یہی خیال آیا۔ میں نے اس حویلی میں سولومن کو بھی دیکھا تھا۔ یہ ''کارنامہ'' اسی کا ہو سکتا تھا۔ اسی دوران میں بقیہ بے ہوش افراد بھی ہوش میں آ گئے۔ انہوں نے بھی یہی کہانی سنائی تھی۔

مقامی باشندوں کو میں نے بتا دیا تھا کہ ہمارا تعلق پولیس سے ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم لوگ حویلی کی تلاشی لیں تو وہ کسی قسم کا تعرض نہ کریں۔ اب میں حویلی میں دوبارہ داخل ہونا چاہتی تھی۔ ایک مقامی باشندے سے میں نے حویلی کے مکینوں کے بارے میں معلوم کر لیا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق ضیاء الاسلام کے علاوہ حویلی میں اب اس کا سوتیلا بھائی خورشید الاسلام ہی رہتا تھا۔ ضیاء الاسلام کی بیوی کافی عرصے قبل مر چکی تھی' ایک بیٹی تھی جو چھ ماہ پہلے نارائن گنج سے چلی گئی تھی۔ اس کے بارے میں ضیاء الاسلام نے مقامی باشندوں کو یہ بتایا تھا کہ وہ اب اپنی پھوپھی کے پاس ڈھاکہ میں رہتی ہے۔ اب ان دو بھائیوں کے علاوہ حویلی میں صرف نوکر تھے۔

میرے ذہن کے ایک گوشے میں درندے کے غرانے اور نسوانی چیخوں کا معما بھی تھا۔ ابھی تک یہ معما بھی حل نہیں ہو سکا تھا۔ پہلی بار بھی مجھے قید کے دوران میں ایسی ہی آوازیں سنائی دی تھیں۔

جب میں دوبارہ حویلی میں داخل ہوئی تو اس مرتبہ صرف ایک پولیس والے کو پھاٹک پر چھوڑا کیوں کہ وہاں بہت سے مقامی باشندے بھی تھے۔ ان سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ خورشید الاسلام کو یا کسی غیر ملکی کو حویلی سے نکل کر فرار نہ ہونے دیں۔ حویلی کی تلاشی بے سود ہی ثابت ہو گی' اس کا اندازہ مجھے پہلے ہی تھا' مگر اتمام حجت کے طور پر میں اسے مرحلے سے گزر جانا چاہتی ہوں۔

حویلی کی مرکزی عمارت میں مجھے دو ملازمین بے ہوشی کی حالت میں ملے۔ ان میں سے ایک ملازمہ تھی۔ ان دونوں کے سوا حویلی کے اس حصے میں اور کوئی نہیں تھا۔ غالباً ان دونوں کو سوتے ہی میں بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ یہیں ایک کمرے میں مجھے فرش پر غیر ملکی سگریٹ کا خالی پیکٹ پڑا ہوا نظر آیا۔ اس کمرے کی تلاشی لینے پر کچھ اور ایسا سامان بھی ملا جس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ شاید یہ کمرا امریکی ایجنٹ سولومن کے استعمال میں رہا ہو گا۔ حویلی کے اس حصے سے باہر آ کے میری توجہ ایک بار پر اسی طرف مبذول ہو گئی جدھر سے نسوانی چیخ سنائی دی تھی۔ جس حصے میں مجھے قید کیا گیا تھا اسی کے برابر کچھ فاصلے پر ایک دروازہ اور بھی نظر آ رہا تھا جو مقفل تھا۔ پہلے اس طرف میری توجہ نہیں گئی تھی۔ میں نے فائر کر کے تالا توڑ دیا اور اندر ٹارچ کی روشنی کی۔ دروازے کے بعد چھوٹی سی پٹی ہوئی راہداری تھی۔ یہ حصہ بھی دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک کمرے کا فرش چوکور پتھروں کا بنا ہوا تھا اور پتھروں کے درمیان واضح طور پر جھریاں نظر آ رہی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں ان پتھروں کا جائزہ لیتی ہوئی میں آگے بڑھ رہی تھی۔ فرش

ہی پر وہیں ایک طرف مجھے لوہے کا ایک آنکڑا پڑا نظر آیا اور میرے ذہن میں معاً ایک خیال برقی لہر کی طرح دوڑ گیا۔ اس آنکڑے کی وہاں موجودگی میرے خیال میں بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔

"ہاں یہ ممکن تو ہے!" میں آپ ہی آپ بڑبڑائی۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔" میں چونک کر بولی اور پھر فرش سے اس لوہے کے آنکڑے کو اٹھالیا۔

ذرا ہی دیر بعد میں لوہے کے اس آنکڑے کو فرش کے پتھروں پر مار مار کر دیکھ رہی تھی اور غور سے وہ آواز سن رہی تھی جو آنکڑے کے فرش سے ٹکرانے پر سنائی دے رہی تھی۔ آخر کار میری محنت رنگ لائی۔ بائیں دیوار کے قریب ایک چوکور پتھر پر جب لوہے کا آنکڑا پڑا تو واضح طور پر ایسی آواز آئی جیسے پتھر کے نیچے خلا ہو۔ میں نے فرش پر بیٹھ کر پتھر کی چاروں طرف موجود جھریوں کا جائزہ لیا اور پھر اسی آنکڑے کو پتھر کی جھریوں میں پھنسا کر اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی خوشی اور سنسنی سی محسوس ہوئی کہ وہ پتھر اپنی جگہ سے اٹھتا چلا گیا۔

"ارے یہ...... یہ تو کوئی تہ خانہ لگتا ہے!" انسپکٹر بول اٹھا۔ "نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں بھی نظر آرہی ہیں۔" انسپکٹر کے لہجے میں ایسی حیرت تھی جیسے اس نے دنیا کا آٹھواں عجوبہ دیکھ لیا ہو۔

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور پھر اس تہ خانے میں داخل ہونے کے لئے پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔

"انسپکٹر! صرف تم میرے ساتھ آؤ!...... بقیہ افراد اوپر ہی رکیں!" میں نے یہ کہتے ہوئے دوسری سیڑھی پر پاؤں رکھا۔

تہ خانے میں اترنے کے لئے اس زینے میں صرف اتنی ہی گنجائش تھی کہ ایک وقت میں صرف ایک آدمی نیچے اتر سکتا تھا۔ میں چند سیڑھیاں اتر گئی تو انسپکٹر بھی میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ ان سیڑھیوں سے اترتے ہی مجھے بائیں جانب ہلکی سی روشنی نظر آئی اور اس کے ساتھ ایک دروازہ بھی دکھائی دیا جو کھلا ہوا تھا۔ میں نے سیڑھیوں کے نیچے رک کر انسپکٹر کے نیچے اترنے کا انتظار کیا۔ وہ نیچے آگیا تو اسے ساتھ لئے میں آگے بڑھی۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر وہ کھلا ہوا دروازہ تھا جس سے ہلکی سی روشنی باہر آرہی تھی۔

اچانک ایک تیز نسوانی آواز سنائی دی۔ "تم پھر آگئے وحشی' ظالم' درندے!...... پھر آگئے مجھے نوچنے بھنبھوڑنے کے لئے!"

اس کمرے میں موجود عورت ہمارے قدموں کی چاپ سن کر لازماً کسی غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھی۔

میں نے جب اس کمرے میں قدم رکھا تو وہاں ایک نوجوان وحسین لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے جھول رہے تھے۔ وہ کمرے کے فرش پر بچھی ہوئی پیال پر کسی ڈھیر کے مانند بکھری پڑی تھی۔ وہیں ایک جانب چمڑے کا ہنٹر پڑا ہوا تھا۔ وہ لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح مجھے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اس کی عمر اٹھارہ بیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے سر کے بڑے بڑے بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کے خوبصورت رخساروں پر کئی جگہ ہلکی

ہلکی خراشیں نظر آرہی تھیں۔ یہ خراشیں گولائی کی صورت میں تھیں۔

"کون ہو تم؟" میں نے قریب جاکر اسے نرم آواز میں مخاطب کیا۔

"کہیں...... کہیں میں کوئی خواب...... خواب تو نہیں دیکھ رہی!" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

"نہیں' یہ کوئی خواب نہیں حقیقت ہے۔ تم ضیاء الاسلام کی بیٹی ہو اور تمہارا نام شکیلہ ہے۔ بولو یہی نام ہے نا تمہارا؟" میں نے بہ دستور نرم لہجہ برقرار رکھا۔

"آپ...... آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟ ہاں میں...... میں شکیلہ ہی ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھنے لگی اور اٹھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے جسم پر جھولتی دھجیوں کو سنبھالنے لگی جو یقیناً اس کی ستر پوشی کے لئے کافی نہیں تھیں۔

"انسپکٹر! تم اوپر جاؤ اور کہیں سے ایک چادر لے آؤ!"

میرا حکم سن کر انسپکٹر جانے کے لئے پلٹ گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تہ خانے کا وہ کمرا اس کمرے کے نیچے ہی تھا جہاں میں نے ایک شب گزاری تھی۔ اب ان نسوانی چیخوں کا معما کچھ کچھ حل ہوتا جارہا تھا۔ وہ نسوانی چیخیں شکیلہ ہی کی ہو سکتی تھیں' مگر درندے کی غراہٹ اب تک میرے لئے معما ہی تھی۔

میں بھی پیال پر شکیلہ کے قریب ہی بیٹھ گئی اور پھر شفقت ومحبت آمیز لہجے میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "اب تمہاری قید کے دن پورے ہو چکے ہیں شکیلہ! تمہیں جلد ہی اس قید سے رہائی ملنے والی ہے۔"

میرے محبت آمیز سلوک پر وہ رونے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس بے گناہ اور بھولی بھالی لڑکی کو گلے سے لگالیا۔

ہچکیاں لیتے ہوئے اس نے بڑی رقت آمیز آواز میں کہا۔ "اب...... اب میں رہا بھی ہو جاؤں تو کیا...... اس وحشی اور اس درندے نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا۔"

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں شکیلہ! تم بے بس اور مجبور تھیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

پھر میرے استفسار پر شکیلہ مختصراً مجھے اپنی دکھ بھری داستان سنانے لگی۔ اس پردرد کہانی کا خلاصہ یہ تھا کہ خورشید الاسلام نے اسے وہاں قید کر رکھا تھا اور گزشتہ کئی ماہ سے وہ ظالم شخص اس کی عزت و آبرو سے کھیل رہا تھا۔ شکیلہ کے بیان کے مطابق خورشید الاسلام اذیت پسند تھا اور جب اس پر اذیت پسندی کا دورہ پڑتا تھا وہ بالکل کسی درندے کی طرح غرانے لگتا تھا۔ وہ اس وقت کسی آدمی کی بجائے درندہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ عموماً وہ شکیلہ کو زدوکوب کرکے اور اس پر کوڑے برسا کر ہی اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا تھا۔ وہ ایک جنسی جنونی تھا جس کے جذبات کی تسکین اسی طرح ہوتی تھی۔ آج بھی اس نے شکیلہ کو تختہ مشق بنایا تھا۔

شکیلہ اپنی داستان کے آخری مرحلے میں تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ سن کر خاموش ہوگئی۔ یوں بھی اب اس سے پوچھنے کو کیا رہا تھا! انسپکٹر چادر لے کر آگیا تھا۔ میں نے انسپکٹر سے وہ چادر لے کر شکیلہ کو دے دی کہ وہ اپنے جسم کے گرد لپیٹ لے۔ اس نے مجھے ممنون نظروں سے دیکھتے ہوئے چادر

لے لی۔

''شکیلہ! سنو فی الحال میں تمہیں اس حویلی میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ میں یہاں سے تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''مگر کہاں؟'' اس نے سوال کیا۔ ''کیا میرے ابو یہاں حویلی میں نہیں ہیں؟''

''میں تمہیں وہیں لے جاؤں گی شکیلہ' جہاں تمہارے ابو ہیں۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔

''ٹھیک ہے' مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلنے پر راضی ہوں' مگر میرے ابو حویلی میں کیوں نہیں ہیں؟...... اور وہ...... وہ ظالم...... وہ درندہ کہاں ہے؟'' اس کا اشارہ خورشید الاسلام کی طرف تھا۔ ''کیا وہ...... وہ فرار ہوگیا؟''

''ہاں شکیلہ' وہ ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکا' لیکن تم مطمئن رہو' جلد ہی وہ پکڑا جائے گا۔ اسی درندے کی وجہ سے یہاں تمہارے ابو کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی' اس لئے ہم نے پہلے ہی انہیں یہاں سے نکال کر ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے' اس خبیث نے تم پر جو ظلم کیا ہے' اس کا بدلہ اسے ضرور ملے گا۔ چلو آؤ میرے ساتھ!......اور سنو شکیلہ' میں تم سے ایک درخواست اور کروں گی۔ تم ابھی اپنے ابو کو اس ظالم کی داستان نہ سنانا' بس اتنا ہی بتا دینا کہ اس نے تمہیں قید کر رکھا تھا۔'' میں نے شکیلہ کو سمجھایا۔

''مجھ میں اتنی...... اتنی ہمت ہی کب ہے کہ ابو سے اس سلسلے میں کچھ کہہ سکوں۔'' شکیلہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''میں کس زبان سے انہیں اپنے لٹنے کی داستان سنا سکتی ہوں۔''

اس وقت مجھے یاد آیا ضیاء الاسلام نے بتایا کہ خورشید الاسلام نے اسے فون پر شکیلہ کی آواز سنوائی تھی۔ میں نے اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے شکیلہ سے پوچھا۔ ''کیا اس نے شروع ہی سے تمہیں یہیں رکھا تھا؟ یا تم ڈھاکہ میں بھی کہیں رہی تھیں؟''

''وہ مجھے اپنے ساتھ ڈھاکہ گھمانے کے بہانے حویلی سے باہر لے گیا تھا اور پھر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو اسی تہ خانے میں پایا تھا۔ وہ مجھے ڈھاکہ نہیں لے گیا۔ ابتدا ہی سے میں یہیں تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

کچھ سوچ کر کمرے کے دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے ایک اور سوال کیا۔ ''شکیلہ! یاد کرو' اس نے کبھی تمہارے ابو کے لئے تمہارا کوئی پیغام ریکارڈ کیا تھا کہ تم بہ خیریت ہو؟''

''جی ہاں۔'' وہاں جواباً بولی۔ ''میں اس پر آمادہ نہیں ہوئی تھی تو اس نے مجھے بہت مارا تھا اور پھر مجبوراً مجھے وہی سب کچھ کہنا پڑا تھا جو وہ چاہتا تھا' مگر آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔''

''مجھے تمہارے ابو نے یہ بات بتائی تھی کہ فون پر تم نے انہیں اپنی خیریت دی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے میں آگے ہوگئی اور انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ ''تم شکیلہ کے پیچھے چلو گے۔''

پھر آگے آگے میں' میرے بعد شکیلہ اور انسپکٹر' ہم تینوں تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ وہاں موجود پولیس والوں نے شکیلہ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا' مگر مجھ سے کوئی سوال کرنے یا کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکے۔

''میرا خیال ہے شکیلہ کو یہاں اس حویلی کے مرکزی حصے میں تمہارا بھی کوئی کمرا ہوگا۔ میں

چاہتی ہوں کہ وہاں جا کر تم اپنا حلیہ درست کرلو اور لباس بھی بدل لو' اس کے علاوہ کسی اٹیچی وغیرہ میں اپنا ایک آدھ جوڑا بھی رکھ لو۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''میں اس حالت میں تمہیں اپنے ساتھ ڈھاکہ لے جانا نہیں چاہتی۔''

''تو کیا میرے ابو ڈھاکہ میں ہیں؟'' اس نے فوراً سوال کیا۔

''ہاں وہیں ہیں۔'' میں نے بتا دیا۔

پھر وہ میرے ساتھ حویلی کے مرکزی حصے میں آگئی کسی اور شخص کو میں نے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ ان سب سے میں نے باہر ہی انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ شکیلہ میری رہنمائی کرتی ہوئی مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔ کمرے کی حالت دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ شکیلہ کی غیر موجودگی میں بھی پابندی کے ساتھ اس کمرے کی صفائی کی جاتی رہی ہے۔ شکیلہ نے ہاتھ منہ دھونے' بال سنوارنے اور پھر لباس تبدیل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ لکڑی کی بنی ہوئی ایک الماری سے اس نے ایک ایئر بیگ نکالتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ''آپ کہیں تو اس میں اپنے دو ایک جوڑے اور کچھ ضروری سامان رکھ لوں' اٹیچی مل نہیں رہی اس وقت!''

''رکھ لو اسی میں۔'' میں نے اسے اجازت دے دی۔

وہ میرا جواب پا کر اسی ایئر بیگ میں اپنے کپڑے اور دیگر ضروری سامان رکھنے لگی۔ شکیلہ نے تیار ہونے میں خاصی عجلت کا ثبوت دیا تھا' پھر بھی تقریباً نصف گھنٹہ وہاں لگ ہی گیا۔

جب میں شکیلہ کے ساتھ حویلی کی مرکزی عمارت سے باہر آئی تو وہاں بہ دستور سناٹا تھا۔ خورشید الاسلام حویلی سے فرار ہوتے وقت ان ملازمین کو بھی اپنے ساتھ لے گیا جن کی حیثیت اب اس کے گرگوں کی تھی۔

نارائن گنج سے واپسی میں شکیلہ کو میں نے اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھایا اور انسپکٹر سے پیچھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ بقیہ پولیس والے جیپ میں سوار ہوگئے تھے۔ روانگی سے قبل میں نے وہاں کے مقامی باشندوں سے کہہ دیا تھا کہ جلد ہی حویلی کا مالک واپس آجائے گا' اس وقت تک وہ لوگ حویلی کی دیکھ بھال اور نگرانی کریں۔ شکیلہ کو دیکھ کر بھی ان لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ جب ہم ڈھاکہ کی حدود میں داخل ہوئے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہمارا قافلہ صدر گھاٹ میں سی آئی ڈی آفس پہنچ گیا۔ کار سے اترتے ہوئے میں نے انسپکٹر کو شکیلہ کے بارے میں ہدایت دی۔ ''اس لڑکی کی حیثیت یہاں مہمانوں ایسی ہے' اس کے آرام اور حفاظت کا پورا خیال رکھا جائے۔ اس کے متعلق مزید احکام تمہیں کل مل جائیں گے۔''

جواباً انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا' پھر بولا۔ ''آپ اطمینان رکھیں ایسا ہی ہوگا۔''

''تو...... تو کیا آپ چلی جائیں گی اور میں یہاں......''

''گھبراؤ مت شکیلہ!'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تم بہ حفاظت رہو گی۔ میں کل دوپہر تک تم سے آکر ملوں گی۔'' پھر میں اسے ساتھ لئے آگے بڑھی۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟ اور...... اور میرے ابو کہاں ہیں؟ آپ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ یہاں ابو

بھی ہوں گے!..... میں اپنے ابو ..... ابو سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے سے کسی انجانے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ "آپ..... آپ بھی رک جایئے نا یہاں۔"

"نہیں شکیلہ' مجھے جانے دو!" یہ کہہ کر میں نے اسے مختصراً بتادیا کہ وہ کہاں ہے اور یہ بھی کہ اس کے ابو بھی قانون کی حفاظت میں ہیں۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "اس وقت تمہارے ابو سو رہے ہوں گے۔ کل جب میں آؤں گی تو ان سے تمہیں ملوادوں گی۔"

میں نے محسوس کیا' مجھ سے یہ سن کر کہ وہ پولیس کی حفاظت میں ہے' اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ وہ میری طرف متوقع نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کل آپ ضرور آئیں گی نا؟"

"ہاں ضرور!" میں نے اسے یقین دلایا اور پھر اسے انسپکٹر کے حوالے کرنے کے بعد اپنی کار کی طرف پلٹ آئی۔

کار میں بیٹھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ اس بے گناہ لڑکی کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ مجھے خورشید الاسلام پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس وقت اگر وہ میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی چمڑی ادھیڑ دیتی۔ مجھے ایسے ظالم مردوں سے شدید نفرت ہے جو عورتوں کو صنف نازک سمجھ کر ان پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

صدر گھاٹ سے بادام تلی گھاٹ پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ گلی میں ایک طرف کار پارک کر کے میں نیچے اتری اور کار کا دروازہ مقفل کردیا۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ رات کے تقریباً تین بجے اس طرح گھر کا دروازہ کھلا ہونا کسی خطرے ہی کی علامت تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے دروازے سے اندر نظر ڈالی۔ صحن کی لائٹ بجھی ہوئی تھی مگر اندر ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ یہ کمرا بابر کے دوست فرید احمد کا تھا۔ میں نے کسی خطرے کی بو سونگھتے ہی پرس سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ پھر میں نے محتاط انداز میں دروازے کے اندر قدم رکھا۔

صحن میں پہنچ کر میں' فرید احمد کے کمرے کا رخ کر رہی تھی کہ اچانک عقب سے مجھے کافی عرصے کے بعد ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی اور میں تقریباً اچھل پڑی۔

"تم نے واپسی میں بہت دیر کردی عذرا خان!..... بہت دیر انتظار کرایا مجھے!..... خیر اب اپنے ہاتھ سے ریوالور پھینک دو! تمہاری جانب بہ یک وقت کئی ریوالوروں کی نالیں اٹھی ہوئی ہیں!" یہ آواز یقیناً میرے اسی دشمن جاں سبود مکرجی کی تھی جسے میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ وہ میرا سراغ لگاتا ہوا کس طرح وہاں تک آ گیا تھا! پھر یہ کہ اس بار مجھے زیر دام لانے کے لئے اسے خود کیوں حرکت میں آنا پڑا تھا! میرے دل میں یہ اشتیاق بھی پیدا ہوگیا کہ اب تک میں جس شخص کی صرف آواز سنتی آئی ہوں' اسے دیکھ بھی لوں گی۔ مجھے اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لبادے میں چھپا ہوگا اور اس کے چہرے پر بھی سیاہ نقاب ہوگی۔

"عذرا خاں! تم نے اب تک اپنا ریوالور نہیں پھینکا' ریوالور پھینک دو!..... تم گھر چکی ہو۔ تمہاری اطلاع کے لئے میں یہ بتادوں کہ میرے اور میرے آدمیوں کے ریوالوروں کی نالوں پر سائلنسر چڑھے ہوئے ہیں اس لئے ہمیں فائر کرنے میں کوئی قباحت یا جھجک محسوس نہیں ہوگی۔ بہ طور ثبوت یہ

دیکھو!" سبود مکرجی کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ہلکی سی آواز ہوئی اور پھر میرے دائیں کان کے قریب سے سنسناتی ہوئی گولی گزر کر سامنے والی دیوار پر لگی۔ اس کے فوراً بعد وہ پھر بولا۔ "اب آیا تمہیں یقین کہ ایک اور فائر کروں!"

اس نے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کردیا تھا۔ میں واقعی اس کے نشانے پر تھی اور یہ بھی سچ تھا کہ اس کے ریوالور کی نال پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ بے جا ضد میرے لئے اب خطرناک بھی ثابت ہوسکتی ہے' یہی سوچ کر میں نے ریوالور پھینک دیا۔

"تم نے اب کی نہ سمجھ داری کی بات! سبود مکرجی کی آواز سنائی دی۔

اسی لمحے میں نے اچانک مڑ کر دیکھا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پستہ قد سیاہ پوش کھڑا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو دو مسلح افراد بھی موجود تھے۔ سبود مکرجی نے غلط نہیں کہا تھا' ان سبھی کے ہاتھوں میں مجھے ریوالور نظر آ رہے تھے جن کی نالوں پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔

"عذرا خان! تمہیں حیرت تو ہوئی ہوگی مجھے یہاں دیکھ کر!" وہ بولا۔

"ہاں یقیناً میں نے نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا' پھر کہا۔ "حیرت کا ایک سبب تو یہ ہے کہ تمہیں میرے ٹھکانے کا علم کیسے ہوا؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ تم نے خود یہاں آنے کی زحمت کیسے کرلی؟ ایسے کام تو تم عموماً اپنے کارندوں یا کرائے کے غنڈوں سے لیا کرتے ہو!"

"تمہارے پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ جب مجھے تمہارے ہاتھوں اکبر کے بھیجے ہوئے دو کرائے کے غنڈوں کی زبردست پٹائی کا علم ہوا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ تمہی ہوسکتی ہو! تمہارے سوا کوئی اور عورت اتنی نڈر اور بہادر نہیں ہوسکتی جو ان غنڈوں کی پٹائی کرکے انہیں بھاگ جانے پر مجبور کردے۔ اس بات کا علم مجھے آج ہی شام ہوا تھا۔ اس طرح مجھے معلوم ہوگیا کہ تم کہاں چھپی ہوئی ہو! تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں یقینی طور پر تمہیں قابو میں کرکے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اس لئے خود چلا آیا۔ پھر بابر سے بھی مجھے اپنا حساب چکانا تھا۔ اس نے مجھے بہت تنگ کر رکھا تھا۔" سبود مکرجی نے تفصیل کے ساتھ میرے دونوں سوالوں کا جواب دے دیا۔

بابر کا ذکر سن کر میں بے چین ہوگئی۔ مجھے علم تھا کہ سبود مکرجی اس کے لئے کیا حکم دے چکا تھا! میں نے اسی لئے مضطرب آواز میں اس سے پوچھا۔ "بابر کہاں ہے؟"

"اسے میں تم سے پہلے ہی روانہ کر چکا ہوں۔ اس کے ساتھی نے ذرا غیر ضروری بہادری کا ثبوت دینا چاہا تھا' نتیجتاً اس کی لاش اندر کمرے میں پڑی ہوئی ہے' وہ اس طرح اطمینان سے بولا جیسے کسی کو قتل کردینا کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔

فرید احمد کے قتل کی اطلاع پاکر میرے ذہن کو دھچکا سا لگا اور اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ آج ہی رات تو وہ میرے ساتھ تھا۔ اس نے اور بابر نے میرے ساتھ موتی جھیل کے پربانی ہوٹل میں کھانا کھایا تھا۔ اس وقت میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے' اگلے دن کا سورج وہ نہیں دیکھ سکے گا۔ موت بھی کتنی بے رحم ہوتی ہے۔

سبود مکرجی نے شاید میرے چہرے سے میری دلی کیفیت کا اندازہ کرلیا اور بولا۔ "تمہیں شاید

اس نوجوان کے قتل پر دکھ ہوا ہے عذرا خان۔''

''ہاں مجھے بہت دکھ ہوا ہے اس لئے کہ میرے سینے میں تمہاری طرح دل کی جگہ پتھر نہیں ہے۔ تم بہت سفاک اور ظالم شخص ہو سبودھ مکرجی!'' میں نے نفرت' غصے اور حقارت سے کہا۔

''غلط خیال ہے تمہارا میرے بارے میں!'' میں اس وقت کسی کے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھاتا ہوں جب کوئی مجھے اس پر مجبور کرتا ہے۔''

''بکتے ہو تم!'' میں غصے کی وجہ سے تقریباً چیخ اٹھی۔'' مگر تمہارا کہنا درست ہے تو میرے سلسلے میں تمہیں کس نے مجبور کیا ہے؟ بولو!''

''تمہارے خلاف کب میں نے کوئی انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ عذرا خان!...... رہا مجبور کرنے کا معاملہ...... وہ آہستہ سے ہنسا۔ تو میرے دل نے مجھے مجبور کر رکھا ہے۔''

اس کی ڈھٹائی پر میرا دل چاہا کہ میں اس کا منہ نوچ لوں' مگر وہ دسترس سے دور بھی تھا اور محفوظ بھی! میں بس غصے میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

''میرا خیال ہے عذرا خان کہ تم نے خاصی باتیں کر لی ہیں' اب چلنا چاہئے!...... تم تو چل ہی رہی ہو میرے ساتھ' بقیہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔'' سبودھ مکرجی بولا۔ پھر اس نے اپنے دو گرگوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

ان دونوں نے اپنے اپنے ریوالور جیبوں میں رکھ لئے اور میری طرف بڑھنے لگے۔

اسی وقت سبودھ مکرجی نے مجھے تاکید کی۔ ''عذرا خان! کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کرنا ورنہ یقین کرو میں گولی چلانے سے دریغ نہیں کروں گا' اور تمہیں یہ بتادوں کہ مجھے لنگڑی لولی عورتیں بالکل پسند نہیں آتیں۔''

جواباً میں نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ دونوں کس ارادے سے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میری طرف بڑھتے ہوئے ان دونوں ہی نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ سبودھ مکرجی اور میرے درمیان نہ آجائیں۔ وہ دائیں اور بائیں جانب سے میری جانب بہت محتاط انداز میں بڑھ رہے تھے۔ میرے لئے یہ صورت حال تشویش ناک تھی۔ سبودھ مکرجی کی دھمکی ایک طرف مگر یہ حقیقت تھی کہ میرا کوئی بھی غیر ذمہ دارانہ اقدام خود میرے حق میں انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

پھر وہ دونوں چند ہی لمحے بعد دائیں اور بائیں سے آگے بڑھتے ہوئے میرے پیچھے آکر رک گئے۔ اب بھی میں ان کا مقصد نہیں سمجھ سکی تھی۔ معاً انہی میں سے کسی نے میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے انہیں اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ اس کے نتیجے میں میرا پرس زمین پر گر گیا۔ اگر میری طرف بہ یک وقت کئی ریوالوروں کی نالیں نہ اٹھی ہوتیں تو یہ جرأت اس شخص کو بہت مہنگی پڑتی جس نے میرے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔ اچانک مجھے ایک ناگوار سی بو محسوس ہوئی اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک مضبوط ہاتھ میرے منہ اور ناک پر آکے جم سا گیا۔

کلوروفارم! میں نے سوچا' مگر اب کچھ سوچنا فضول ہی تھا۔ میں زیادہ دیر کلوروفارم سے بچنے کے لئے سانس نہ روک سکی اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش آنے پر میرا ذہن کچھ دیر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم رہا' پھر رفتہ رفتہ مجھے یاد آتا گیا کہ میں کن حالات سے دوچار ہوں' آنکھیں کھولنے کے بعد میری پہلی نظر جس چہرے پر پڑی اسے دیکھ کر میرے ذہن کو شدید جھٹکا سا محسوس ہوا۔ میں جس بستر پر دراز تھی' اس کے قریب ہی ایک کرسی پر بھارتی ایجنٹ ساوتری بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر میک اپ نہیں تھا۔

''تمہیں ہوش آگیا عذرا خان!'' وہ مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اسے گھور کر دیکھنے لگی۔

''میں تمہارے ہوش میں آنے ہی کا انتظار کر رہی تھی عذرا خان! تم سے ایک طویل عرصے کے بعد مل کر بہت خوشی ہوئی۔ یاد ہے تمہیں' ہماری آخری ملاقات ترکی میں ہوئی تھی!'' وہ بہ دستور مسکراتے ہوئے بولتی رہی۔'' غالباً ترکی کے شہر استنبول میں!''

''ہاں اچھی طرح یاد ہے ساوتری! میں اس ملاقات کو بھولی نہیں ہوں!'' میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''میری یادداشت میں یہ بھی محفوظ ہے ساوتری کہ میری ہی وجہ سے تمہیں راہ فرار اختیار کرنا پڑی تھی۔''

''ہاں عذرا خان' میں بھی اس بات کو نہیں بھولی۔'' اس نے کہا۔ ''بھگوان نے مجھے اگلے پچھلے سارے حساب چکانے کا یہ اچھا موقع دیا ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم سے یہاں مشرقی پاکستان میں بھی ملاقات ہو جائے گی۔ میں تو یہی سمجھی تھی کہ کبھی مغربی پاکستان جانا ہوا تو تم سے مڈبھیڑ کا امکان ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں تمہیں نہیں پہچان سکی ورنہ مار نہ کھا جاتی تم سے!''

''بس مجھ سے ذرا سی غلطی ہو گئی ورنہ اس وقت تم میرے سامنے بیٹھی باتیں نہ بنا رہی ہوتیں!...... ہاں یہ بتاؤ' سبودھ مکرجی نے تمہیں دوسرے نقشے وغیرہ فراہم کر دیئے یا نہیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا' پھر مزید بولی۔ ''ویسے اس ہوا میں نہ رہنا ساوتری کہ تم یہ نقشے لے کر میرے ملک کی سرحد عبور کر سکو گی۔''

میری بات سن کر وہ زور سے ہنس دی' پھر بولی۔ کون روک سکے گا مجھے!...... جہاں سبودھ مکرجی ایسے ہمارے دوست موجود ہیں' وہاں ہمارے لئے کوئی رکاوٹ' کوئی خطرہ نہیں!''

''تو کیا تم مجھے یہی سب کچھ بتانے کے لئے میرے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھیں؟'' میں چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''نہیں عذرا خان! میرے اس انتظار کی وجہ کچھ اور تھی۔ دراصل میں تم سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتی ہوں۔ وہاں ہوٹل میں مجھے علم نہیں تھا کہ میرے مقابلے پر کون ہے اسی لئے دھوکے میں مار کھا گئی' لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں یقیناً تمہیں زمین چاٹنے پر مجبور کر دوں گی۔ تم پہلی عورت ہو جس کے ہاتھوں مجھے شکست ہوئی ہے اور میں اپنے ماتھے سے شکست کا یہ داغ دھونا چاہتی ہوں۔''

''ساوتری! تم اپنے دل میں یہ حسرت ہی لئے اس دنیا سے جہنم کی طرف سفر کر جاؤ گی۔ بہتر ہے کہ تم ابھی اپنی موت کو دعوت نہ دو! ابھی تم نے اس دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے! ابھی تو میرے خیال میں تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی!'' میرا انداز مذاق اڑانے اور غصہ دلانے والا تھا۔

"شادی تو میری اطلاع کے مطابق تم نے بھی ابھی نہیں کی۔ عذرا خان! تم اگر میرے ہاتھوں ماری گئیں تو تمہیں بھی کوئی رونے والا نہیں ہوگا۔" اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں نے بڑی مشکل سے سبودمکر جی کو اس پر راضی کیا ہے کہ تم سے وو دو ہاتھ کر سکوں۔ مجھے افسوس ہے' اس نے محض اتنی اجازت دی ہے۔ مجھے کہ میں تمہارے ہاتھ پیر توڑ سکوں۔ وہ شاید تمہیں کسی کے ہاتھوں فروخت کر کے لمبی رقم کمانا چاہتا ہے اور میں اس کا نقصان نہیں چاہتی۔"

"مگر یہ سوچ لو ساوتری کہ تمہارے معاملے میں مجھے کسی کے نقصان کا خوف نہیں۔ میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گی اس لئے بھارت میں اپنے کسی چاہنے والے کو آخری خط لکھنا ہو تو لکھ لو پہلے ورنہ پھر تمہیں اس کی مہلت نہیں ملے گی۔" میں نے اس کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ دیر بعد تم یہ سب ڈینگیں مارنا بھول جاؤ گی۔ عذرا خان!...... چلو اٹھو' برابر والے کمرے میں سبودمکر جی' اس کی محبوبہ شکنتلا اور اس کے دوسرے ساتھی تمہاری ذلت کا منظر دیکھنے کے لئے منتظر بیٹھے ہیں۔" ساوتری نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے ساوتری کے اشارے پر اس طرف دیکھا۔ وہاں مجھے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں فوراً ہی اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ کلوروفارم کے سبب ہر چند کہ اب بھی میرا ذہن کچھ بوجھل سا تھا لیکن اس کے باوجود میں اس بڑبول بھارتی ایجنٹ کا چیلنج قبول کرنے پر آمادہ تھی۔ مجھے خود پر بھروسا تھا کہ اس سے شکست نہیں کھاؤں گی۔

ساوتری کے ساتھ ساتھ جب میں برابر والے کمرے میں پہنچی تو مجھے اس کی بات کا یقین آ گیا۔ وہاں سبودمکر جی' شکنتلا اور دوسرے بہت سے افراد موجود تھے۔ کمرا خاصا بڑا تھا۔ وہ سب لوگ دیواروں کے قریب کرسیاں بچھا کر بیٹھے تھے اور کمرے کا درمیانی حصہ انہوں نے خالی چھوڑ دیا تھا۔ سبودمکر جی حسب معمول سیاہ لباس تھا اور اس کا چہرہ بھی نقاب ہی کے پیچھے تھا۔ میرا اور ساوتری کا سنسنی خیز مقابلہ دیکھنے کے لئے وہاں موجود افراد کے چہروں سے اشتیاق کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں اور ساوتری' ہم دونوں کمرے کے درمیان میں کھڑے تھے۔

"حضرات!" اچانک سبودمکر جی نے بلند آواز میں وہاں موجود افراد کو مخاطب کیا۔ "ہر مقابلے کے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں مگر ابھی جو مقابلہ آپ دیکھنے والے ہیں اس کا کوئی اصول' کوئی ضابطہ نہیں' اس میں کچھ بھی فاؤل نہیں' صرف ایک بات فاؤل ہے' وہ یہ کہ دونوں حریفوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو قتل نہیں کرے گا' باقی ہر طرح کی آزادی ہے۔"

"اگر کسی نے ان دونوں میں سے یہ فاؤل کر دیا تو اس پر کیا جرمانہ ہوگا؟" شکنتلا نے سبودمکر جی سے سوال کیا۔

"تو اسے بھی بہ طور جرمانہ قتل کر دیا جائے گا۔" سبودمکر جی کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔

"مجھے یہ شرط منظور نہیں ہے۔" میں بول اٹھی۔ "مقابلہ فیصلہ کن ہونا چاہئے! ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہے گا۔"

"میں عذرا خان کو اپنا خون معاف کرتی ہوں۔" ساوتری نے بلند آواز میں کہا۔ "عذرا خان کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ چاہے تو مجھے قتل کر دے ہاں میں' سبودمکر جی کی شرط قبول کرتے ہوئے اسے قتل نہیں کروں گی اس کے علاوہ یہ کہ اگر اپنی جان بچاتے ہوئے نادانستگی میں میرے ہاتھوں عذرا خان ماری جائے تو میں اس کی ذمے دار نہیں ہوں گی۔ ایسی صورت میں بطور جرمانہ میں وہ رقم سبودمکر جی کو ادا کر دوں گی جو اسے عذرا خان کے بدلے ایک پارٹی سے ملنے والی ہے۔"

ساوتری کی بات سن کر چند لمحے سبودمکر جی خاموش رہا پھر شکنتلا سے کھسر پھسر کرنے لگا۔ میں نے اس دوران میں اپنا دوپٹا گلے سے اتار کر کمرے کے گرد کس کر باندھ لیا۔

"ٹھیک ہے حضرات! مجھے منظور ہے۔" معاً سبودمکر جی کی بلند آواز سنائی دی۔ "مقابلہ فیصلہ کن ہوگا۔ میری طرف سے عذرا خان اور ساوتری دونوں کو اجازت ہے کہ وہ اگر چاہیں اپنے مقابل کو قتل کر سکتی ہیں۔"

سبودمکر جی کے اس اعلان کے ساتھ ہی کمرے میں موت کا سناٹا چھا گیا اور میں ایک دم پینترا بدل کر ساوتری کے سامنے آ گئی۔ زندگی اور موت کا یہ مقابلہ خود میرے لئے بھی انتہائی سنسنی خیز تھا۔

☆......☆......☆

چند لمحے ساوتری میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے گھورتی رہی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ اس طرح میری طاقت کا اندازہ لگا رہی ہو۔ پھر اچانک اس نے اپنے منہ سے تیز اور خوفناک آواز نکالی۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جوڈو کراٹے کی تربیت کے دوران میں یہ سبق بھی دیا جاتا ہے کہ اپنے مخالف پر حملہ کرنے سے پہلے اسے خوف زدہ کرنے کے لیے منہ سے اس طرح کی آوازیں نکالی جائیں۔ میں نے دانستہ اسے پہل کرنے کا موقع دیا تھا۔ اپنے منہ سے تیز آواز نکالتے ہی وہ مجھ پر جھپٹ پڑی تھی۔ اس نے مجھ پر کراٹے کا وار کیا تھا جسے میں نے اپنی بائیں کلائی پر روک لیا تھا۔ میں اس وار سے بچ گئی تو اس نے تیزی سے زمین پر پھسل کر اپنی دائیں ٹانگ میری دونوں ٹانگوں کے درمیان پھنسا کر مجھے گرا دیا۔ اس نے اتنی تیزی اور مہارت کا ثبوت دیا تھا کہ کوشش کے باوجود میں سنبھل نہیں سکی تھی میرے زمین پر گرتے ہی اس نے مجھ پر چھا جانے کی کوشش شروع کر دی تھی' مگر مصلحتاً ابھی میں اس کے حملوں سے صرف بچاؤ کر رہی تھی۔ میں اسے تھکا دینا چاہتی تھی۔ مجھے زمین سے اٹھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ پھر میری طرف لپکی اور اس بار میری گردن کے قریب پٹھوں کو اپنے آہنی پنجے میں لینا چاہا' لیکن میں جھکائی دے کر اس کی گرفت سے بچ نکلی۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے اپنا دایاں پاؤں دائرے کی صورت میں گھمایا اور میں ایک مرتبہ پھر اس کے داؤ سے نہ بچ سکی۔ میں گر پڑی۔ وہ بلاشبہ بہترین لڑاکا ثابت ہو رہی تھی۔ میں کچھ اس طرح زمین پر گری تھی کہ فوری طور پر اٹھنے میں کامیاب نہ ہوئی اور ساوتری کو موقع مل گیا۔ وہ میری پشت پر سوار ہو گئی۔ اس نے میرے جسم پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہوئے اپنے جسم کو اچھالا اور پھر اس کے گھٹنے کی بھرپور ضرب میری کمر پر پڑی۔ اگر میں سختی سے اپنے ہونٹ نہ بھینچ لیتی تو یقیناً میرے منہ سے چیخ نکل جاتی۔ جو لوگ اچھے لڑاکا ہوتے ہیں وہ اپنے حریف کو بے قابو کرنے کے لیے پے در پے اسی جگہ ضربیں لگاتے رہتے ہیں جہاں پہلی بھرپور ضرب پڑ چکی ہوتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ساوتری دوبارہ وہی عمل دہرائے گی۔ پھر یہی ہوا' مگر دوسری ضرب لگانے کی خواہش اسے بہت مہنگی پڑی۔ میں تیزی کے ساتھ کروٹ لے کر ایک طرف ہو گئی تھی۔ ساوتری کا گھٹنا پوری قوت سے زمین پر پڑا اور وہ چیخ اٹھی۔ درد کی شدت سے وہ زمین پر گر کر دہری ہو گئی تھی اور میں اچھل کر کھڑی ہو چکی تھی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ساوتری اب کسی حد تک تھک چکی ہے اور زخمی بھی ہو گئی ہے۔

''ساوتری! معاً میں نے اسے مخاطب کیا۔ اب میری باری ہے۔''

وہ ابھی تک اٹھ نہیں سکی تھی۔ اس نے بڑی مظلوم سی نظروں سے میری طرف دیکھا' پھر بیٹھے

ہی بیٹھے ایک طرف گھسٹنے لگی۔ اسے ستانے کا موقع دیئے بغیر میں نے اس کے زخمی گھٹنے کو نشانہ بنایا۔ میرے دائیں پاؤں کی بھرپور ٹھوکر نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ اسی وقت میں اچھلی اور پھر پوری قوت سے اور اپنے جسم کے پورے بوجھ کے ساتھ اس کی زخمی ٹانگ پر کودی۔ ''چٹ'' کی آواز ہوئی اور میری توقع کے مطابق گھٹنے کے نیچے سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پھر میں دوبارہ اچھلی۔ اس مرتبہ اس کی دوسری ٹانگ کو میں نے نشانہ بنایا اور دوسری ٹانگ بھی گھٹنے کے قریب ہی سے توڑ دی۔ غالباً انتہائی تکلیف کے سبب ساوتری چیخ بھی نہ سکی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہال میں موجود تمام لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔

''سبودمکرجی!'' میری آواز نے ہال پر چھائی ہوئی خاموشی کو توڑ دیا۔ ''شرائط کے مطابق مجھے یہ حق حاصل ہے کہ ساوتری کو جہنم رسید کر دوں۔ تم دیکھ ہی رہے ہو وہ بے ہوش ہو چکی ہے اور مجھے موقع ہے کہ میں اسی حالت میں اسے سفر آخرت پر روانہ کر دوں' مگر میرے خیال میں اس کے لیے اتنی ہی سزا کافی ہے۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی ہیں۔ اب یہ ایک طویل عرصے تک اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکے گی۔ بہر حال میں اپنے حق سے خود ہی دستبردار ہو کر اس کی جان بخشی کرتی ہوں۔''

''تمہاری مرضی!'' سبودمکرجی جواباً بولا۔ ''شرائط کے مطابق ہماری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم اسے چاہو تو قتل کر دو۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''دشمن کے لیے اس سے بڑی کوئی سزا نہیں کہ بااختیار ہونے کے باوجود اسے ختم کرنے کی بجائے معاف کر دیا جائے۔''

''میں تسلیم کرتا ہوں عذرا خان کہ تم واقعی ایک بہادر عورت ہو۔'' سبودمکرجی نے میری تعریف کی۔

''اگر تم یہ تسلیم نہ بھی کرتے تو اس سے میرے لیے کوئی فرق نہ پڑتا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا' پھر بولی۔ ''تم اگر واقعی میری بہادری کے قائل ہو چکے ہو تو پھر مجھے یہاں سے جانے دو۔''

''تمہاری یہ خواہش میں ضرور پوری کر دیتا...... مگر یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔'' وہ عیاری سے بولا۔

''اور اگر میں ساوتری کے ہاتھوں ماری جاتی پھر؟...... پھر کیا تم بااختیار ہو جاتے؟ میرے لہجے میں چبھن تھی۔

''وہ دوسری بات تھی۔ اس کے علاوہ تمہیں یہ بتا دوں' مجھے یقین تھا کہ ساوتری تمہیں زیر نہیں کر پائے گی' میں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ تم سے مقابلہ کر کے اپنی موت کو دعوت نہ دے' لیکن اس نے میری بات نہیں سنی۔'' سبودمکرجی کہنے لگا۔

''تم اگر بااختیار نہیں ہو میرے باب میں تو کیا امریکی ایجنٹ سولومن بااختیار ہے؟'' میں نے اسے ٹٹولنے کی خاطر کہا کیونکہ مجھے شبہ تھا' سبودمکرجی اسی کے ایما پر میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔

میں نے اپنی بات کے ردعمل میں اسے چونکتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر میں نے مزید کہا۔

''تمہیں یقیناً اس سے بھاری معاوضہ ملنے کی امید ہے۔''

"مجھے اعتراف ہے عذرا خان کہ تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔" سبودمکرجی نے تسلیم کیا۔ "سولومن سے بطور پیشگی مجھے اس سلسلے میں اب تک خاصی رقم مل چکی ہے اور ابھی مزید رقم ملنے کی توقع ہے۔"

"تو کیا جیسا کہ ساوتری کہہ رہی تھی، تم مجھے سولومن کے حوالے کر دو گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔ "میرا اور اس کا معاہدہ محض یہ ہے کہ جب تک وہ یہاں بنگال میں سرگرم عمل ہے، میں تمہیں آزاد نہ رہنے دوں۔"

"یعنی مجھے اپنی قید میں رکھو تاکہ اس کے منصوبوں میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور وہ اپنی من مانی کر سکے۔"

"ہاں یہی سمجھ لو عذرا خان! مجھے وہ اسی کا معاوضہ ادا کریگا۔" سبودمکرجی نے جواباً میری بات کی تصدیق میں کہا۔

"اور اگر تم مجھے یہاں قید رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو؟"

"اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا عذرا خان۔" وہ پریقین لہجے میں بولا۔ "ناکامی کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے۔"

ابھی میرا کچھ مزید کہنے کا ارادہ تھا کہ سبودمکرجی نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں میں سے دو افراد کو حکم دیا کہ وہ بے ہوش ساوتری کو وہاں سے اٹھالے جائیں۔ سبودمکرجی کو میں اب تک اس لیے باتوں میں الجھائے ہوئے تھی کہ وہاں سے فرار ہونے کے امکانات کا جائزہ لے لوں۔ دائیں جانب مجھے ہال کا دروازہ نظر آ رہا تھا، مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ دروازہ صرف بھڑا ہوا ہے یا مقفل ہے۔ اب خود ہی سبودمکرجی نے میری یہ مشکل آسان کر دی تھی۔ دو افراد ساوتری کے بے ہوش جسم کو اٹھائے اسی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسی دوران میں مجھے بابر کا خیال بھی آیا تھا جو یقیناً اسی عمارت میں کہیں قید تھا۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اسے رہا کرائے بغیر فرار ہو جاؤں یا اس کی رہائی کے لیے بھی کوشش کروں۔ میں اگر تنہا سبودمکرجی کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتی تو اس کے امکانات کم ہی تھے کہ بعد میں بابر کو رہا کرایا جا سکتا۔

معلوم نہیں کیسے سبودمکرجی کو یہ خیال آ گیا کہ میں فرار کے امکانات کا جائزہ لے رہی ہوں۔ میری نگاہ دروازے کی طرف تھی کہ اچانک اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "سنو عذرا خان!" اسی کے ساتھ اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف تان لیا۔ "تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گی۔"

"کیوں، کیا تمہیں میری طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہے؟" میں نے خود کو پرسکون ظاہر کرنے کے لیے مسکرا کر کہا۔

اسی وقت ہال کا دروازہ کھلا اور سبودمکرجی کے آدمی بے ہوش ساوتری کو اٹھائے باہر نکل گئے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ دروازہ مقفل نہیں ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میرے اور دروازے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ اگر میں طویل جست بھرتی تو ایک ہی دفعہ میں دروازے تک پہنچ سکتی تھی۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اس عمارت میں موجود غالباً تمام ہی افراد ان دو افراد کے علاوہ جو ساوتری کو لے

گئے تھے، اس وقت ہال ہی میں جمع تھے۔ اگر میں اس ہال سے نکل جاتی تو مجھے مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا مگر سبودمکرجی نے ریوالور نکال کر سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔

اگر میں فرار ہونے کی کوشش کروں تو کیا سبودمکرجی مجھے گولی مار سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ میرا ذہن اس سوال کا کوئی حتمی جواب نہ دے گا۔

"عذرا خان۔" اچانک سبودمکرجی کی آواز نے میرے خیالات کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ "تم اس کمرے میں چلی جاؤ!" اس نے ریوالور کی نال سے بائیں جانب اشارہ کیا۔ یہ وہی کمرا تھا جس میں ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو موجود پایا تھا۔

"اور میں انکار کر دوں تو؟" میں نے بدستور نرم آواز میں کہا۔

"تو پھر مجبوراً بالجبر مجھے ایسا کرنا پڑے گا۔ اچھا یہی ہے کہ تم مجھے اس پر مجبور نہ کرو۔" وہ بولا۔

"میں یقیناً اس کمرے میں چلی جاؤں گی، مگر میری ایک شرط ہے۔"

"جو لوگ مجبور ہوتے ہیں عذرا خان، انہیں شرائط پیش کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ پھر بھی کہہ دو، کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

"بابر کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا، پھر جواب سنے بغیر مزید بولی۔ "میرا اندازہ ہے وہ بھی اسی عمارت کے کسی کمرے میں ہوگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم مجھے اور اسے ایک ہی جگہ قید کر دو؟"

جواباً وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا۔ "ٹھیک ہے، تمہیں بھی اسی کمرے میں پہنچا دیا جائے گا، مگر یہ خیال رکھنا کہ کوئی بھی غیر ذمے دارانہ حرکت خود تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگی۔ تمہیں گولی مارتے ہوئے یقیناً مجھے افسوس ہوگا، اس لیے کہ تمہارے اور میرے درمیان براہ راست کوئی رنجش یا دشمنی نہیں ہے۔"

"محض تمہارا خیال ہے سبودمکرجی!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں بہرحال تمہیں اپنا دوست نہیں سمجھتی۔"

"اگر میں تمہارا دوست نہیں تو دشمن بھی نہیں عذرا خان...... میں صرف چند روز تمہیں اپنا مہمان بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ میں نے تم سے چھپائی نہیں، بیان کر دی۔ نہ میرا ارادہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کا ہے نہ تمہیں ہمیشہ یہاں قید رکھنے کا...... میں تمہاری خواہش پوری کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دو ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ "عذرا خان کو بھی بحفاظت اس کمرے میں پہنچا دو، جہاں بابر کو رکھا گیا ہے۔"

وقتی طور پر اب میں نے کسی بھی قسم کی ہنگامہ آرائی کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ بابر سے ملے بغیر اب میں کوئی بھی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔

سبودمکرجی کے گرگوں نے اپنے مالک کا اشارہ پاتے ہی اپنی اپنی جیبوں میں سے ریوالور نکال لیے تھے اور اب وہ دونوں محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اس کے باوجود وہ دونوں بہت چوکنا تھے۔ ان میں سے ایک میری رہنمائی کی خاطر آگے آگے چلنے لگا، دوسرا میرے پیچھے تھا۔ وہ مجھے ساتھ لیے ہال کمرے سے نکل کر ایک چوڑی سی راہداری

میں آ گئے۔ بظاہر میں بے پروائی سے آگے بڑھ رہی تھی مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ میں اردگرد کا جائزہ لیتی ہوئی چل رہی تھی۔ راہداری کے تقریباً وسط میں دائیں جانب اوپری منزل تک جانے کے لیے ایک زینہ تھا۔ میرے آگے آگے چلنے والا اس زینے کی طرف مڑ گیا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے معاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ مجھے یہ سنہری موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ بابر کے متعلق مجھے اتنا تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ وہ اوپری منزل کے کسی کمرے میں قید ہے۔ اگر وہ کمرا مقفل تھا تو اس کی چابی انہی دونوں میں سے کسی ایک کے پاس ہونی چاہیے تھی۔ پھر میں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہیں کی۔ اوپر چڑھتے چڑھتے میں دانستہ لڑکھڑا گئی۔ میرے پیچھے اوپر چڑھنے والا شخص یہی سمجھا ہوگا کہ غالباً سیڑھیوں سے گرتے گرتے میں نے کچھ پکڑنے کے لیے اس کی طرف رخ کیا ہے۔ وہ بے خبری میں مارا گیا۔ میرا ایک ہاتھ بجا تلا اس کی کنپٹی پر پڑا اور اسی کے ساتھ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کا ریوالور چھین لیا۔ وہ شخص کسی بھی قسم کی آواز نکالے بغیر لہرایا اور پھر سیڑھیوں سے نیچے کی طرف لڑھکنے لگا' مگر میں اسی دوران میں بیک وقت دو سیڑھیاں تیزی سے چڑھ کر آگے جانے والے شخص کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

ریوالور کی نال اس شخص کی گدی سے لگاتے ہی میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اپنا ریوالور پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دو ورنہ......'' دھمکی آمیز انداز میں اپنا جملہ میں نے ادھورا چھوڑ دیا۔

اس شخص نے فوراً میرے حکم پر عمل کیا اور پھر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اس کے ساتھی کا ہو چکا تھا' مگر میں نے اسے سیڑھیوں سے نیچے نہ لڑھکنے دیا۔ اس کے جسم کو سنبھال کر میں نے سیڑھی پر لٹا دیا۔ پھر میں جلدی جلدی اس کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر چابی ہوگی تو آگے چلنے والے ہی کے پاس ہوگی تاکہ وہ دروازہ کھول سکے۔ جلد ہی مجھے اس کی جیب میں کی رنگ مل گئی۔ اس میں کئی چابیاں تھیں۔ احتیاطاً اس شخص کا ریوالور بھی میں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ ریوالور بابر کے کام آ سکتا تھا۔

ان دونوں کو بے ہوشی کی حالت میں وہیں چھوڑ کر میں تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ زینہ دائیں جانب مڑ کر ایک آہنی گرل پر ختم ہو گیا جس میں دور ہی سے مجھے بڑا سا قفل لٹکتا نظر آ گیا۔ میں نے ایک ایک کر کے چابیاں قفل میں ڈالیں۔ ایک چابی تالے میں لگ گئی' تالا کھول کر اور گرل کو ذرا سا ایک طرف سرکا کر میں ایک راہداری میں آ گئی۔ بائیں جانب مجھے یکے بعد دیگرے کئی کمروں کے دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ ان تین تین کمروں کے دروازوں میں سے درمیانی کمرے کا دروازہ مجھے بند ملا۔ صرف اسی کمرے کے دروازے میں قفل پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک چابی کے ذریعے تالا کھول لیا اور اندر داخل ہو گئی۔ کمرا روشن تھا اور وہاں بابر مجھے ایک کرسی سے بندھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی گردن ایک جانب ڈھلکی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ لحہ بھر کو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں بابر کو قتل تو نہیں کر دیا گیا؟ لپک کر اس کے قریب پہنچی تو میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں ہوئی کہ اس پر سخت تشدد کیا گیا ہے۔

میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ اسے رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دیا اور پھر ہوش میں لانے کے لیے کوشش کرنے لگی۔ مجھے ایک صراحی بھی کمرے میں نظر آئی اس میں پانی نہ جانے کب کا رکھا ہوا تھا اور صاف بھی نہیں تھا' مگر میرا مقصد اس سے پورا ہو سکتا تھا۔ شیشے کے گندے گلاس میں میں نے پانی انڈیل لیا۔ اسی گلاس سے وہ صراحی ڈھکی ہوئی تھی۔ بابر کو میں نے قریب ہی زمین پر لٹا دیا تھا وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا جس پر خون کی گاڑھی تہ سی جم گئی تھی۔ میں اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

ظاہر ہے کہ اسے فوری طور پر ہوش نہیں آ سکتا تھا۔ میں اسی لیے پوری طرح چوکنا تھی کسی بھی لمحے وہاں کوئی آ سکتا تھا۔ میں جتنی بھی جلد بابر کو لے کر وہاں سے نکل سکتی میرے حق میں بہتر ہی تھا۔ ابھی تو مجھے فرار کا راستہ بھی تلاش کرنا تھا اور کوئی ضروری نہیں تھا کہ میں اس میں کامیاب ہو جاتی۔

سبود مکرجی کے دونوں گرگے بے ہوش ہونے سے قبل چیخ نہیں سکے تھے اس لیے مجھے کسی فوری خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا ورنہ اس اس وقت صورتحال لازماً مختلف ہوتی۔ پھر بھی مجھے یہ خیال تھا کہ اگر وہ دونوں کچھ دیر بعد واپس نہ ہوئے یا کوئی شخص زینے کی طرف آ گیا تو میں خطرے میں گھر جاؤں گی۔

''بابر...... بابر!'' میں بابر کے منہ پر چھینٹے مارتے ہوئے اسے پکارنے لگی۔ ''ہوش میں آؤ بابر!''

اس بار میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ بابر آہستہ سے کراہا اور پھر چند ہی لمحے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح مجھے دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو کہ میں ہی اس کے سامنے ہوں۔

''اٹھو بابر' جلدی کرو!'' میں نے اس کی گردن کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے اٹھنے میں مدد دی اور کہا۔ ''ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔''

''آہ...... آپ یہاں...... کس طرح پہنچ گئیں؟ اس نے اٹھتے ہوئے رک رک کر بمشکل مجھ سے پوچھا۔

''بابر' یہ وقت کسی قسم کی پوچھ گچھ کا نہیں۔ ہم خطرے میں ہیں کیا تم اٹھ کر کھڑے ہو سکتے ہو؟''

''کوشش...... میں کوشش کرتا ہوں۔ ظالموں نے مار مار کر سجا دیا ہے مجھے۔ وہ میرے سہارے اٹھ کر کھڑا ہونے لگا۔

''ہمت کرو بابر!...... ہاں شاباش!'' میں اس کا حوصلہ بڑھانے لگی۔

عین اسی لمحے کہیں قریب ہی سے زبردست دھماکہ سنائی دیا اور میں اچھل پڑی۔ بابر کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ ''یہ کسی فائر کی آواز معلوم نہیں ہوتی۔'' میں نے بابر کو سیدھا کھڑا کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے ہینڈ گرینیڈ پھینکا گیا ہو۔''

''ٹھیک کہتی ہیں آپ!'' بابر نے میرے خیال کی تائید میں کہا۔ ''یہ ہینڈ گرینیڈ ہی کا دھماکا

ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ہلکا سا جوش محسوس ہونے لگا۔ ''ممکن ہے...... میرا اندازہ درست ہو اور......اور......''

بابر کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ پہلا ہی جیسا ایک اور زبردست دھماکا سنائی دیا تھا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے اس کمرے کے درو دیوار لرزنے لگے ہوں۔

''لو بابر' یہ ریوالور۔'' میں نے اسے دونوں ریوالوروں میں سے ایک تھما دیا' پھر بولی ''کیا تم چل سکتے ہو؟''

''ہاں شاید!'' اس نے مجھ سے ریوالور لیتے ہوئے آگے قدم بڑھایا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

''میرا خیال یہ کہ تم سہارا لے کر چل سکتے ہو۔ ٹھیک ہے نا۔''

''ہاں۔'' وہ جواباً بولا۔ ''سہارے کے بغیر شاید میں نہ چل سکوں۔''

میں نے فوراً ہی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اس سے آگے بڑھنے کو کہا۔ اسی وقت فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

''ایسا لگتا ہے بابر کہ جیسے دو گروہوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔'' میں نے بابر کے قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھتے ہوئے خیال آرائی کی' پھر اس سے پوچھنے لگی۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے تم کچھ کہنے والے تھے' کیا بات تھی وہ؟ تم اپنے کسی اندازے سے......''

''جی...... جی ہاں!'' وہ بول اٹھا۔ ''میرے ساتھیوں کے پاس جو اسلحہ ہے اس میں دستی بم وغیرہ بھی ہیں۔ قیاس غالب یہی ہے کہ اس عمارت پر حملہ کرنے والے وہی لوگ ہوں گے۔''

''مگر انہیں کیسے خبر ہو سکتی ہے کہ تم دشمن کی قید میں ہو؟...... پھر یہ کہ دشمنوں نے تمہیں کہاں قید کیا ہے اس سلسلے میں انہیں کیسے علم ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ اب بابر میرے ساتھ ساتھ اس کمرے سے نکل کر راہداری میں آ چکا تھا۔

''آج رات تین بجے کے بعد میرے ایک ساتھی اقبال کو مجھ سے ملنے آنا تھا۔ دراصل صبح کی ایک فلائٹ سے وہ کراچی جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ایئرپورٹ جانے سے پہلے ملتا ہوا جائے گا۔ یقیناً وہ وقت مقررہ پر پہنچا ہو گا اور گھر کی حالت دیکھ کر اسے صحیح اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی ہو گی۔ پھر اس نے دوسرے ساتھیوں کو بھی فوری طور پر اس واقعہ سے آگاہ کر دیا ہو گا۔'' بابر میرے سہارے سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ ''سبودھ مکرجی کے کچھ ٹھکانوں کا ہمیں علم ہے۔ یہ ٹھکانہ بھی انہی میں سے ایک ہے جہاں سبودھ مکرجی کے پائے جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ میرے ساتھیوں نے اسی لیے اس ٹھکانے پر بھرپور حملہ کیا ہو گا۔''

اچانک فائرنگ رک گئی اور میں اس کا سبب نہ سمجھ سکی۔ بابر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا میرے ساتھ نیچے اتر رہا تھا۔ مجھے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ باہر کا چھوٹا سا گروہ جدید ہتھیاروں سے بھی مسلح ہو سکتا ہے۔ فائرنگ رک جانے سے میرا ذہن الجھ گیا تھا۔

زینے سے اترتے ہوئے مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میں نے جن دو افراد کو بے ہوشی کی حالت میں

وہاں چھوڑ گئی تھی وہ بھی غائب تھے۔

سیڑھیوں سے نیچے اتر آنے کے بعد مجھے قدرے گرمی اور تپش کا سا احساس ہوا اور پھر ذرا ہی دیر بعد اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ کسی نے اس عمارت میں آگ لگا دی تھی۔ دائیں جانب راہداری کے آخری سرے پر مجھے شعلے نظر آ رہے تھے۔

''اس عمارت میں آگ لگا کر فرار ہونے والا سبودھ مکرجی اور اس کے ساتھی ہی ہو سکتے ہیں بابر!'' میں نے تیزی سے کہا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا تھا جب میں پہلی مرتبہ سبودھ مکرجی کی قید میں تھی اور شکنتلا میرے ساتھ عمارت میں آگ لگا کر ایک خفیہ راستے سے کسی دوسری عمارت میں پہنچ گئی تھی۔ یقیناً اس عمارت میں بھی کوئی خفیہ راستہ تھا اور اسی کے ذریعے سبودھ مکرجی اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا تھا۔

بابر کو ساتھ لیے میں حتی الامکان تیزی کے ساتھ اسی سمت بڑھ رہی تھی جدھر شعلے نظر آ رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ راہداری کی مخالف سمت میں عمارت کا اندرونی حصہ ہے۔ سبودھ مکرجی کے آدمی مجھے اسی طرف سے لے کر آئے تھے۔ ادھر ہال کمرا اور وہ کمرا تھا جہاں مجھے ہوش آیا تھا۔ میں اسی لیے اس سمت نہیں گئی تھی۔

''مگر ادھر...... ادھر تو آگ ہے۔'' بابر میرے سہارے چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ''آپ اس طرف کیوں......''

''مجبوری ہے بابر'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم اسی سمت سے نکل سکتے ہیں۔ ذرا جلدی قدم بڑھاؤ بابر! ممکن ہے کہ ہم شعلوں کے درمیان سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں' ابھی آگ زیادہ نہ پھیلی ہو۔''

میرے کہنے پر بابر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ ابھی ہم راہداری کے اختتام تک نہیں پہنچے تھے کہ دو افراد کو میں نے شعلوں سے بچتے ہوئے اس طرف بھاگتے دیکھا۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے شعلوں کے درمیان سے گزر کر ہماری سمت آ رہے تھے۔ اس کوشش میں ان دونوں کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔

''بھاگو مت! میں نے بلند آواز میں ان سے کہا۔'' زمین پر لیٹ کر پلٹے کھانے لگو! اس طرح تمہارے کپڑوں میں لگی ہوئی آگ بجھ جائے گی۔''

مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں بابر کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے اور پھر بابر نے بھی میرے اس یقین کی تصدیق کر دی۔ میں نے اسی لیے کپڑوں میں لگی ہوئی آگ بجھانے کا انہیں مشورہ دیا تھا۔ اس طرف سے عمارت کے اندر داخل ہونے والے بہرحال سبودھ مکرجی کے ساتھی نہیں ہو سکتے تھے۔

''وہ...... وہ دونوں اقبال اور...... اور جعفری ہیں۔'' بابر نے پرجوش آواز میں مجھے بتایا تھا۔

میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ دونوں ہی زمین پر لیٹ کر پلٹے کھاتے ہوئے اپنے کپڑوں میں لگی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جلد ہی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ میں بھی بابر کو سہارا دیئے اس وقت تک ان دونوں کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ان میں سے ایک نوجوان کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا معلوم ہوا۔ اسے میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ لیکن یہ موقع تعارف کا یا کچھ پوچھنے کا نہیں تھا۔ ہمیں اس عمارت سے جلد از جلد نکل جانا تھا ورنہ آگ ہمارا راستہ مسدود کر دیتی۔ ہماری زندگی

وہاں بہر حال خطرے میں تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں آگ مزید پھیل گئی تھی۔ اس کے درمیان سے تیزی کے ساتھ بھاگ کر ہی گزرا جا سکتا تھا' لیکن بابر کی حالت اس قابل نہیں تھی۔ اس کے ساتھیوں نے بھی یقیناً یہ اندازہ لگا لیا تھا۔ اسی لیے ان میں سے ایک نے بابر کے منع کرنے کے باوجود اسے اپنی پشت پر اٹھا لیا۔ پھر ہم سب تیر کی طرح شعلوں کے درمیان سے گزر گئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ ہم میں سے کسی کے کپڑوں میں آگ نہیں لگی تھی۔ بائیں جانب زبردست آگ بھڑک رہی تھی' مگر ہمیں اس طرف نہیں جانا تھا۔ ہم دائیں جانب مڑ گئے۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے ٹوٹی ہوئی ایک دیوار کا ملبہ نظر آیا۔ مکان کی یہ دیوار میرے اندازے کے مطابق ہینڈ گرینیڈ سے اڑائی گئی تھی۔ آگ ابھی یہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ وہاں مجھے بابر کے کچھ اور ساتھی بھی دکھائی دیئے جو مسلح تھے۔ وہ لوگ یقیناً دیوار ٹوٹنے کے بعد ہی اندر داخل ہوئے تھے۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اس قدر زبردست دھماکے ہونے کے باوجود اڑوس پڑوس کی کوٹھیوں میں رہنے والوں نے باہر نکل کر حقیقت حال جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی پولیس ابھی تک اس طرف متوجہ ہوئی تھی۔ مجھے علم تھا کہ کوٹھیوں میں رہنے والے عموماً اپنے پڑوسیوں سے واقف نہیں ہوتے۔ یہی حال یہاں کا تھا۔

جب ہم اس کوٹھی سے باہر آئے تو صبح کا ہلکا ہلکا اجالا ہر طرف پھیلنے لگا تھا۔ ایک سیاہ وین باہر کھڑی تھی۔ بابر کے تمام ساتھی اس میں سوار ہو گئے۔ مجھے بھی جگہ کی تنگی ہونے کے باوجود بابر کے ساتھ اسی وین میں بیٹھنا پڑا۔ پھر چند ہی لمحے بعد وین وہاں سے روانہ ہو گئی۔

ہماری وین نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ بائیں جانب کی ایک سڑک سے پولیس جیپ آتی دکھائی دی۔ سائرن بھی بج رہا تھا۔

''غالباً فون پر کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی ہوگی۔'' بابر کے ایک ساتھی نے تبصرہ کیا۔

''ہاں یہی ہو سکتا ہے۔'' بابر نے اپنے ساتھی کی بات سے اتفاق کیا۔

وین سیدھی نکلتی چلی گئی۔ پولیس والوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''یہ کون سا علاقہ ہے؟'' میں نے بابر کے اسی ساتھی سے دریافت کیا جس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا نظر آیا تھا۔

''دھان منڈی کا علاقہ ہے یہ۔'' اس نے جواب دیا۔

میں چونک اٹھی۔ اسی علاقے کی ایک کوٹھی میں پہلے بھی مجھے قید کیا گیا تھا۔

''کیا وہ کوٹھی حزب اختلاف کے لیڈر ایس رحمان کی تھی؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''جی نہیں! ایس رحمان کی کوٹھی' اس کوٹھی سے تیسری ہے۔''

''یہ جواب سن کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ وہی کوٹھی ہو سکتی ہے جس میں ایک سرنگ کے ذریعے میں شکنتلا کے ساتھ پہنچی تھی اور پھر فرار ہو گئی تھی۔ ایس رحمان کی کوٹھی ہی کے قریب وہ کوٹھی بھی تھی۔ سرنگ یقیناً درمیانی کوٹھی کے نیچے ہوگی۔

''یہ کوٹھی کس کی ملکیت ہے؟...... تم لوگوں کو اس کے متعلق بھی کچھ علم ہے؟ میں نے معلوم کیا۔

''ہماری اطلاعات کے مطابق یہ کوٹھی ایس رحمان کے ایک قریبی سسرالی عزیز کی ملکیت ہے۔''

''تو کیا وہ لوگ یہاں نہیں رہتے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں۔ ایک عرصے سے یہ کوٹھی بھی خالی پڑی ہے۔ وہ لوگ اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی سکونت اب چاٹگام میں ہے۔'' مجھے بتایا گیا۔

''دونوں کوٹھیوں کے درمیان والی کوٹھی میں کون رہتا ہے؟'' میں نے یوں ہی دریافت کر لیا۔

''ہمیں اس سلسلے میں کبھی کچھ معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔''

پھر میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور سفر خاموشی سے کٹنے لگا۔ اچانک بابر کی آواز نے اس خاموشی کو توڑ دیا۔ وہ کہنے لگا۔ ''مجھے فرید احمد کی طرف سے فکر ہے۔ معلوم نہیں اس پر کیا گزری ہوگی۔ جب وہ لوگ مجھے میرے کمرے سے نکال کر باہر لے جا رہے تھے تو میں نے ان میں سے دو افراد کو فرید احمد کے کمرے میں بھی داخل ہوتے دیکھا تھا۔''

بابر کی بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یقیناً وہ بے خبر تھا کہ اس کا دوست فرید احمد قتل کیا جا چکا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں بابر کا کوئی ساتھی اسے فوری طور پر اس روح فرسا واقعے کی اطلاع نہ دے دے' بات کا رخ بدل دیا اور فوراً بابر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ''بابر یہ بتاؤ کہ وہ لوگ گھر میں کس طرح داخل ہو گئے تھے؟''

''مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔'' بابر نے جواب میں کہا۔ ''میری آنکھ تو کسی کھٹکے سے کھل گئی تھی' لیکن کچھ سمجھنے سے پہلے ہی وہ میرے کمرے میں گھس آئے تھے۔ ان میں سے ایک نقاب پوش تھا جو سیوو مکرجی ہی ہو سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے بے بس کر کے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور پھر گھر سے نکال کر ایک کار میں مجھے یہاں لے آئے تھے۔ میری آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی گئی تھی' مگر اس وقت جب انہوں نے مجھے کار میں بٹھا دیا تھا۔'' یہ کہہ کر بابر اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ''اقبال میرا اندازہ ہے کہ تم ایئرپورٹ جانے سے پہلے مجھ سے ملنے آئے ہوگے۔ پھر تمہیں......''

''ہاں۔'' اقبال طویل سانس لے کر بولا۔ یہ وہی تھا جس کا چہرہ مجھے آشنا لگا تھا۔ اب مجھے یاد آ گیا تھا کہ فائیو اسٹار ہوٹل میں ساوتری سے نبرد آزمائی کے وقت وہ بھی میرے اور بابر کے ساتھ تھا۔ وہ اب کہہ رہا تھا۔ ''تمہارا اندازہ درست ہے بابر' میں ہی تم سے ملنے وہاں پہنچا تھا۔ مجھے گھر کا دروازہ کھلا ملا تھا۔ پھر جب میں محتاط انداز میں اندر داخل ہوا تو وہاں مجھے تم نہیں ملے۔ فرید احمد کے کمرے میں روشنی تھی۔ میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو...... اقبال کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی تھی۔

میں سمجھ گئی کہ وہ کیا بات کہتے کہتے چپ ہو گیا ہے!

''تو...... تو کیا ہوا؟'' بابر نے بے چینی سے سوال کیا۔

''فرید احمد فرش پر لہولہان پڑا تھا۔'' اقبال بتانے لگا۔ ''پہلی نظر میں یہی سمجھا میں کہ وہ مر چکا ہے' مگر جب جھک کر اسے دیکھا تو اس کی نبض چل رہی تھی۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور اپنی گاڑی میں ڈال کر کرنڈفورڈ ہسپتال لے گیا۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی۔ اسے

انٹینسو کیئر میں داخل کر لیا گیا۔ میں نے پولیس میں رپورٹ بھی کر دی اور رپورٹ میں وہی لکھایا جو مجھے پیش آیا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اس خونیں ہنگامے کا ذمے دار ایک ہی شخص ہو سکتا ہے اور وہ صرف سبودمکرجی ہے۔ مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ اس کے بھیجے ہوئے غنڈے ایک بار وہاں پہنچ چکے ہیں۔ پھر میں نے تمام ساتھیوں کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ بابر کو سبودمکرجی اغوا کر کے لے گیا ہے تاکہ اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر سکے۔ ہم نے اپنے ایک ساتھی کو ہسپتال میں چھوڑا اور پھر سبودمکرجی کے ممکنہ ٹھکانوں میں سے پہلے یہیں حملہ کیا جو کامیاب رہا۔" یہ کہہ کر اقبال خاموش ہو گیا۔

"معلوم نہیں اب فرید کا کیا حال ہو گا!" بابر فکرمند لہجے میں بولا۔

"جب میں ہسپتال سے چلا تھا تو ڈاکٹر اس کے سینے سے گولی نکالنے کے لیے اسے آپریشن روم کی طرف لے جا رہے تھے۔" اقبال بتانے لگا۔ "ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اگر آپریشن کامیابی سے ہو گیا اور اس دوران میں فرید احمد بچ گیا تو پھر اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔"

"اگر...... اگر میرا دوست مر گیا تو...... تو میں سبودمکرجی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا! بابر مٹھیاں بھینچ کر غمگین مگر پرجوش لہجے میں بولا۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ بابر کا دوست فرید احمد ابھی زندہ تھا۔ سبودمکرجی کو یقیناً غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ مر چکا ہے۔ اس نے فرید احمد کی بے ہوشی کو موت پر محمول کیا تھا۔ اگر اقبال بروقت وہاں نہ پہنچ جاتا تو پھر فرید احمد کا بچنا محال تھا۔ اسے طبی امداد ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

اس وین میں ہم سب لوگ، اقبال کے گھر تیج گاؤں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے بابر کے ایک ساتھی نے اس کی مرہم پٹی کی اور اس دوران میں اقبال نے مڈفورڈ ہسپتال فون کر کے یہ معلوم کر لیا کہ فرید احمد کا آپریشن کامیاب رہا ہے اور اب وہ خطرے کی حدود سے نکل چکا ہے۔ یہ خبر سن کر بابر اور اس کے سارے ساتھیوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

یہ رات بڑی ہنگامہ خیز گزری تھی۔ تھکن اور نیند سے میرا برا حال تھا۔ اقبال نے کراچی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اس کی کوٹھی خاصی بڑی تھی۔ مجھے اور بابر کو وہاں وقتی طور پر ایک ایک کمرا مل گیا۔ ہمیں وہاں چھوڑ کر اقبال، مڈفورڈ ہسپتال روانہ ہو گیا۔ اس سے چلتے وقت میں نے کہا تھا کہ اگر واپسی میں ممکن ہو تو میری اٹیچی فرید احمد کے گھر سے لیتا آئے۔ گھر کی چابی اسی کے پاس تھی۔ فرید احمد کو ہسپتال لے جانے سے پہلے اس نے گھر میں تالا ڈال دیا تھا۔ اقبال نے وعدہ کیا تھا کہ لوٹتے ہوئے وہ بادام تلی گھاٹ ہو کر آئے گا۔ ان لوگوں کے درمیان مجھے کسی قسم کی غیریت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ بابر کے دوسرے ساتھی اپنے اپنے گھر روانہ ہو چکے تھے۔ اقبال کی کوٹھی کے دو کمروں میں بابر اور میں تنہا ہی تھے۔ بابر کو سو جانے کی تلقین کر کے میں دوسرے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی۔

دوپہر سوا بارہ بجے کے قریب دروازے کی گھنٹی بجنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ بابر کے زخمی ہونے کے سبب اقبال گیا تھا تو دروازہ بھی میں نے ہی بند کیا تھا۔ میں تھکن کی وجہ سے خاصی گہری نیند سو رہی تھی اس لیے میری آنکھ جلد نہ کھل سکی۔ میں کمرے سے باہر آئی تو بابر کو آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر

پھاٹک کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

"بابر!" میں نے اسے آواز دی تو وہ رک گیا اور مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے مزید کہا۔ "تم جاؤ آرام کرو، میں دروازہ کھولے دیتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں تیز قدموں سے آگے بڑھ کر بابر کے قریب پہنچ گئی۔

آنے والا اقبال ہی تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ فرید احمد کی حالت اب ٹھیک ہے اور اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اس کے ہاتھ میں اپنی اٹیچی بھی دیکھ لی تھی۔ اٹیچی مقفل نہیں تھی اقبال نے میرے ساتھ عمارت کی طرف چلتے ہوئے بتایا۔ "گھر کے صحن میں مجھے ایک لیڈیز پرس بھی پڑا ہوا ملا تھا غالباً وہ آپ ہی کا ہے، میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔ اسے بھی میں نے آگے اٹیچی کیس میں رکھ دیا ہے۔"

"شکریہ!" میں بولی۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ گزشتہ شب بے ہوشی سے قبل میرا پرس، صحن میں گر پڑا تھا۔

"بابر اب کیسا ہے؟" اقبال نے مجھ سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے مگر اسے چند روز آرام کی ضرورت پڑے گی۔ گیٹ کھولنے وہی آ رہا تھا، میں نے اسے واپس کمرے میں آرام کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔" میں نے بتایا۔

پھر اقبال اور میں، اس کمرے میں آ گئے جہاں بابر تھا، ہمیں دیکھ کر وہ اٹھنے لگا۔

"نہیں بابر، تم لیٹے رہو۔" میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔

بابر دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا تو اقبال نے کہا۔ "میرا خیال ہے خاتون کہ بابر اور آپ یہیں میری کوٹھی میں منتقل ہو جائیں۔ فرید احمد کو بھی میں یہیں رکھ لوں گا جب وہ ہسپتال سے صحت یاب ہو کر آ جائے گا۔ اب بادام تلی گھاٹ والے مکان میں آپ لوگوں کا رہنا میرے نزدیک مناسب نہیں ہے کیونکہ وہ سبودمکرجی کی نظر میں آ گیا ہے۔"

"تمہارا کہنا درست ہے۔" میں بول اٹھی "گزشتہ رات یہی بات ہو رہی تھی۔ تمہارا اور جعفری کا نام زیرغور تھا۔ غالباً بابر نے جعفری کو اس لیے ترجیح دی ہو گی کہ تمہارا ارادہ کراچی جانے کا تھا۔ اب قسمت نے ہمیں یہاں بھیج ہی دیا ہے تو ٹھیک ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اب کب تک کراچی جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"میرے کراچی جانے یا نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا خاتون!" اقبال نے جواباً کہا "آپ کے یہاں قیام کے لیے غالباً میری موجودگی ضروری نہیں۔ میں بابر کو اپنے ہی گھر کا ایک فرد تصور کرتا ہوں اور آپ بھی بابر کی دوست ہونے کے ناطے اب غیر نہیں رہی ہیں۔ یوں بھی فی الحال میں نے کراچی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔"

"وہاں تم کس لیے جا رہے تھے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"میری ساری فیملی وہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میرے والد ایک سرکاری ادارے میں افسر ہیں۔ دو ماہ قبل ان کا تبادلہ کراچی ہو گیا تھا۔ میں اس لیے ان کے ساتھ نہ جا سکا کہ میرا ایک سال

ضائع ہو جاتا۔ میں یہاں ایم اے پریولیس میں زیر تعلیم ہوں۔"

"تو ایم اے فائنل تم کراچی یونیورسٹی سے کرو گے!" میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

"جی نہیں۔" وہ بولا۔ "غالباً اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ابو نے کہا تھا کہ وہ جلد از جلد دوبارہ اپنا تبادلہ یہاں کرا لیں گے۔ آج کل کیونکہ یونیورسٹی بند تھی اس لیے میں نے سوچا تھا کہ کچھ دن امی ابو کے پاس رہ آؤں گا مگر اب ارادہ بدل دیا ہے۔"

"تم نے انہیں مطلع بھی کر دیا یا نہیں کہ تم نہیں آ رہے؟" بابر نے سوال کیا۔

"ہاں میں انہیں ابھی تار دے کر آیا ہوں تا کہ وہ فکر مند نہ ہوں' آج ہی خط بھی لکھ دوں گا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی' پھر میں نے ہی ان دونوں کو مخاطب کیا' "سبود مکرجی کے کتنے ٹھکانے تم لوگوں کے علم میں ہیں۔ اور بابر' تم نے اس سلسلے میں مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

دراصل ہم یقینی طور پر کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور نہ پہلے تھے۔" بابر بول اٹھا۔

"سبود مکرجی کی بابت یا' اس کے حوالے سے اب تک تین ایسی جگہوں کا ہمیں سراغ ملا ہے جہاں اس کے پائے جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک ٹھکانے پر پہلے چھاپہ مار چکے ہیں۔ یہ دھان منڈی کی وہی کوٹھی ہے جہاں آپ کو پہلی بار قید رکھا گیا تھا۔ ہم نے محض شک کی بنیاد پر ایسا کیا تھا جو بعد میں درست ثابت ہوا۔ یہ کوٹھی جیسا کہ آپ کے علم میں بھی ہے' حزب اختلاف کے ایک لیڈر الیس رحمان کی ہے۔ سبود مکرجی کا دوسرا ٹھکانہ وہی کوٹھی تھی جہاں گزشتہ رات ہمیں لے جایا گیا تھا ہم نے اس پر ابھی چھاپا نہیں مارا تھا۔ اس پر بھی ہمیں شک ہی تھا۔"

"شک کی وجہ تو ہو گی کوئی؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں وجہ تھی۔" بابر نے جواب دیا۔ "ہماری اطلاعات کے مطابق وہ کوٹھی خالی تھی مگر اس میں کبھی کبھار نقل و حرکت دیکھی گئی تھی۔"

"ہوں!" میں نے طویل سانس لی' پھر بولی۔ "اور تیسرا ٹھکانا؟"

"اسلام آباد روڈ پر لائن سینما کے عقب میں بھی ایک ایسی ہی عمارت ہے جو خالی پڑی رہتی ہے۔ ہمارے کچھ ساتھیوں نے اس عمارت میں بھی لوگوں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ اس عمارت پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا ہے' لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق مالک مکان فی الحال اسے بیچنا نہیں چاہتا۔ وہ مکان کی اتنی قیمت مانگتا ہے کہ کوئی خرید ہی نہ سکے۔"

بابر کی بات سن کر میں نے کہا اگر ایسا ہے تو پھر اس نے برائے فروخت' کا بورڈ وہاں کیوں لگا رکھا ہے؟ تم نے یہ معلوم نہیں کیا؟"

"وہ ایک سنکی سا آدمی ہے یا اگر حقیقتاً سنکی نہیں تو ایسا ظاہر ضرور کرتا ہے۔ میں خود اس سے مل چکا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ مکان بیچے گا تو اسی قیمت پر ورنہ نہیں۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ اتنی قیمت پر تو روز قیامت تک کوئی اس مکان کو نہیں خرید سکے گا۔ جواب میں اس نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کی سکونت بھی اسی علاقے میں ہے۔"

"وہ مکان فروخت ہو چکا ہے بابر...... اور اسے خریدنے والا سبود مکرجی ہی ہو سکتا ہے۔ میں

نے خیال آرائی کی۔ اس نے مالک مکان سے کہہ دیا ہو گا کہ کسی پر یہ بات ظاہر نہ کرے اور برائے فروخت' کا بورڈ دیکھ کر جو اسے تلاش کرتا ہوا مکان خریدنے آئے اسے اتنی قیمت بتا دی جائے کہ وہ اپنا سا منہ لے کر واپس چلا جائے۔"

"مگر اس گورکھ دھندے کی وجہ؟" اقبال نے بھی گفتگو میں مداخلت کی۔

"سیدھی سی بات ہے۔" میں نے کہا سبود مکرجی یہ نہیں چاہتا ہو گا کہ کہیں سے بھی اس کا کوئی سراغ مل سکے۔ بہرحال اس سنکی آدمی سے ضرور ملوں گی تا کہ اپنے اس شبہے کی تصدیق کر سکوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں......؟ آپ کہاں جا رہی ہیں؟" بابر نے پوچھا۔

"فی الحال تو باتھ روم جا رہی ہوں اس کے بعد میرا ارادہ صدر گھاٹ تک جانے کا ہے۔"

"وہاں تک کہیں تو میں اپنی کار میں چھوڑ دوں آپ کو۔" اقبال بولا۔

"نہیں' تم زحمت نہ کرو' اکیلی چلی جاؤں گی میں۔"

"واپسی کب تک ہو گی آپ کی؟" بابر نے دریافت کیا۔ "دوپہر کا کھانا......"

"میرا انتظار نہ کرنا' کیا خبر وہاں کتنی دیر لگ جائے مجھے۔ میں کسی ہوٹل میں کھانا کھا لوں گی۔"

یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں جس کمرے میں سوئی تھی وہاں اٹیچ باتھ روم بھی تھا۔ غسل کر کے کپڑے تبدیل کرنے میں مجھے آدھا گھنٹا لگا اور پھر میں اقبال کی کوٹھی سے باہر نکل آئی۔ باہر آنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اس میک اپ میں سبود مکرجی سے میرا سامنا ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں نیا میک اپ ضروری ہو گیا تھا۔ بے احتیاطی میرے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے' یہ سوچ کر میں دوبارہ کوٹھی میں واپس چلی گئی۔

"کیا کچھ بھول گئی تھیں آپ؟" اقبال نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں' اپنا چہرہ بدلنا بھول گئی تھی۔" میں مسکرا کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"تو...... تو کیا یہ...... یہ آپ کا اصل چہرہ نہیں؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "دراصل میرا اصل چہرہ بہت بھیانک ہے اسی لیے اسے عموماً چھپائے رہتی ہوں۔" میرے لہجے میں شوخی تھی۔

"آپ مذاق کر رہی ہیں شاید۔" وہ ہنس پڑا۔

"میرا اصل چہرہ دیکھ کر تمہیں یقین آ جائے گا۔" میں بدستور شوخ لہجے میں بات کرتی رہی۔

"اچھا ایسا کرو کہ اب میں تم لوگوں کے ساتھ ہی کھانا کھا کر جاؤں گی' کھانے کا بندوبست کر لو' نیا میک اپ کرنے میں اتنی دیر تو لگ ہی جائے گی۔"

"آپ مجھے میک اپ کرنا سکھا دیں گی؟...... مجھے بہت شوق ہے اس کا!" وہ بڑے اشتیاق سے بولا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں' اگر یہاں زیادہ رہنا پڑا تو ضرور سکھا دوں گی۔ اس میں بہرحال وقت لگتا ہے۔"

''شکریہ' پیشگی شکریہ!'' وہ بچوں کی طرح خوش ہوگیا۔

پھر میں اس کمرے میں آ گئی جہاں میری اٹیچی رکھی تھی۔ کمرے کا دروازہ میں نے بند کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اگر اقبال میرا اصل چہرہ بھی دیکھ لیتا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ بابر اور اس کے ساتھیوں کو میں اپنے لوگ ہی سمجھ رہی تھی اور ان کا رویہ بھی میرے ساتھ ایسا ہی تھا۔

اپنے نئے میک اپ پر میں نے خصوصی توجہ دی۔ اس بار میں نے اپنے چہرے پر ایک ادھیڑ عمر بدصورت عورت کا میک اپ کیا تھا اور وگ بھی لگا لی تھی جس کے آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ اب کوئی بھی مرد ایک نظر مجھے دیکھنے کے بعد دوبارہ میری طرف نظر اٹھانا پسند نہ کرتا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میک اپ کرنے میں مجھے تقریباً پون گھنٹا لگ گیا۔

جب میں اپنے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں پہنچی جہاں بابر اور اقبال تھے تو دونوں ہی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''یہ نہ سمجھ لینا اقبال کہ کوئی اجنبی عورت گھر میں گھس آئی ہے۔'' میں ہنستے ہوئے بولی۔ یہ ہے میرا اصل چہرہ! اب تمہیں میری بات کا یقین آ گیا۔''

''نہیں! ...... یہ ...... یہ نہیں ہوسکتا۔'' وہ بے یقینی سے بولا۔ پھر بابر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیوں بابر' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا!''

''ہاں بھئی۔'' بابر ہنس پڑا۔ ''ٹھیک کہہ رہے ہو تم' مگر اس میں اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے!''

بابر کی بات سن کر اقبال کچھ خجل سا ہوگیا۔ پھر وہ بات بدلنے کی غرض سے بولا ''میں آپ کے لیے بھی لنچ باکس لے آیا ہوں' چلیے ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔''

''ویسے آپ نے کمال کر دیا ہے میک اپ میں۔'' بابر اپنے دوست اقبال کا سہارا لیتے ہوئے اٹھنے لگا۔'' قریب سے دیکھ کر بھی کسی کو آپ پر شک نہیں ہوسکتا کہ یہ آپ کا اصل چہرہ نہیں۔''

پھر ہم سب ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ کھانے سے فراغت پا کر حسب عادت مجھے چائے کی خواہش ہوتی۔ چائے کے بغیر میرا کھانا ادھورا ہی رہتا تھا' مگر اس کے لیے اقبال سے کہتے ہوئے مجھے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ بابر نے میری مشکل آسان کر دی اور اقبال خود چائے بنانے چلا گیا۔

اقبال کو واجبی سی چائے بنانا آتی تھی' لیکن کام چل گیا اور میں چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے اب شکیلہ کا خیال آ رہا تھا جس سے میں وعدہ کر آئی تھی کہ آج ضرور آؤں گی۔ اسے اپنے باپ ضیاء الاسلام سے ملنے کی شدید خواہش تھی۔

کوٹھی سے نکل کر کسی ٹیکسی کے انتظار میں میری نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔ تقریباً پانچ منٹ بعد مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور میں صدر گھاٹ روانہ ہوگئی۔

سی آئی ڈی آفس پہنچ کر پہلے میں ضیاء الاسلام سے ملی اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ وہ خاتون جو کل مجھ سے ملی تھیں کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔''

''تم ان سے جو کچھ کہنا چاہتی ہو مجھے بھی بتا سکتے ہو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ وہ مجھے میری

آواز سے نہیں پہچان سکا تھا۔

سی آئی ڈی انسپکٹر کو بھی میں نے بڑی مشکل سے یقین دلایا تھا کہ میں ہی عذرا خان ہوں۔ اس کے لیے میں نے گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے کے بارے میں اسے بتایا تھا۔ وہ میرے میک اپ پر بہت حیران تھا۔ اس کے خیال میں چہرے کو اس طرح یکسر بدل لینا ناممکن ہی تھا۔ میری آواز بھی اسے یہ یقین دلانے میں معاون ثابت ہوئی تھی کہ میں کوئی اور نہیں ہوں۔

میری بات سن کر اس وقت ضیاء الاسلام کچھ دیر خاموش رہا' پھر کہنے لگا ''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں کب تک رہنا پڑے گا؟''

''کیوں' تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے کیا؟'' میں بولی۔

''جی نہیں' لیکن حوالات تو پھر حوالات ہی ہوتی ہے!''

وہ جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اگر آپ مجھے بتا دیتیں کہ یہاں کتنے دن رہنا ہے تو میں ذہنی طور پر مطمئن ہو جاتا۔''

''یہ بتاؤ کہ یہاں ڈھاکہ میں تمہارا کوئی قریبی عزیز ایسا ہے جس کے یہاں تم کچھ دن قیام کر سکو؟ میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ...... جی ہاں۔'' اس نے ذرا توقف سے جواب دیا۔ میری بہن یہاں رہتی ہے' میں اس کے یہاں رہ سکتا ہوں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے' تمہیں آج ہی رہا کر دیا جائے گا مگر ایک بات کا خیال رکھنا کہ تمہیں پوری طرح چوکنا اور محتاط رہنا ہے۔ تمہاری زندگی کو خطرہ بھی پیش آ سکتا ہے۔

''میں ...... میں خیال رکھوں گا اور ...... اور اگر آپ کہیں گی تو گھر سے باہر بھی نہیں نکلوں گا' وہ مجھے یقین دلانے لگا۔

''نہیں تمہیں گھر میں بند نہیں ہونا ...... تم گھر سے ضرور نکلو گے' ہاں شکیلہ کے سلسلے میں یہ تاکید ضرور کروں گی کہ اسے گھر سے تنہا کہیں نہ جانے دینا!''

میری بات کا ردعمل توقع کے مطابق ہوا۔ اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ پھر وہ کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ''شکیلہ ...... وہ ...... وہ تو ...... میں کل بتا چکا ہوں ......''

''شکیلہ کو برآمد کر لیا گیا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''نن ...... نہیں!'' وہ بے اختیار ہو کر جیسے رونے کے قریب ہوگیا۔ ''کیا واقعی وہ ...... وہ مل گئی؟ ...... میری بچی مل ...... مل گئی؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی میں اس سے تمہاری ملاقات کرا دوں گی۔ تمہیں اور اسے تمہاری بہن کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ میں نے تمہیں جو ہدایات دی ہیں ان کا خیال رکھنا۔''

سی آئی ڈی آفس کے ایک کمرے میں ضیاء الاسلام سے میں بات کر رہی تھی کمرے میں اس کے اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ انسپکٹر کو میں نے باہر بھیج دیا تھا۔ اسے بلانے کے لیے میں کرسی سے اٹھ کر دروازے تک پہنچی وہ باہر موجود تھا۔ میرے کسی حکم کے انتظار میں وہ برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔

"سنو انسپکٹر!" میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
"جی فرمائیے!" وہ کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔
"اس لڑکی کو یہاں لے آؤ!" میں نے اسے حکم دیا "اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"بہتر ہے۔" وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر ایک طرف چلا گیا۔
"شکیلہ ابھی آ رہی ہے۔" میں نے کمرے میں واپس آ کر ضیاء الاسلام کو بتایا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ یہ آنسو خوشی ہی کے ہو سکتے تھے۔
"وہ...... وہ شکیلہ آپ لوگوں کو کہاں ملی؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"اسے تمہاری ہی حویلی کے ایک تہ خانے سے برآمد کیا گیا ہے" میں نے اسے بتایا۔
"تہ خانے سے!اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ اچھا تو خورشید الاسلام نے اسی لیے مجھ سے حویلی میں موجود تہ خانوں کے بارے میں پوچھا تھا...... افسوس کہ خود مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ میری...... میری بچی حویلی ہی میں ہے۔"
"اس کی وجہ یہ بھی کہ اس نے فون کر کے تمہاری شکیلہ سے بات کرائی تھی اور تمہیں یہ باور کرا دیا تھا کہ شکیلہ ڈھاکہ میں ہے۔" میں بول اٹھی۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ "تمہاری حویلی میں کتنے تہ خانے ہیں؟"
"دو" اس نے جواب دیا "ایک تہ خانہ حویلی کی مرکزی عمارت کے نیچے ہے۔ اس میں غلہ وغیرہ بھی ذخیرہ کیا جاتا ہے اور دوسرا......"
"دوسرے کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔" میں بول اٹھی۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے حویلی میں کسی اور تہ خانے کے امکان پر غور کیوں نہیں کیا۔ یہ عین ممکن تھا کہ خورشید الاسلام گزشتہ رات اپنے گرگوں کے ساتھ اسی تہ خانے میں چھپ گیا ہو۔ رات کے وقت وہ بھلا جا بھی کہاں سکتا تھا۔ مگر اب کچھ سوچنا فضول ہی تھا۔ وقت گزر چکا تھا۔
چند ہی لمحے بعد شکیلہ انسپکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی پھر باپ اور بیٹی کا ملن میرے لیے انتہائی متاثر کن تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگے ہوئے رو رہے تھے۔ شکیلہ کی تو ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔
"بس کرو شکیلہ!" میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اب تم کیوں رو رہی ہو۔ اب تو تمہارے ابو مل گئے ہیں تم سے!"
شکیلہ نے آنسو بھری آنکھوں سے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر اپنے باپ کے سینے سے الگ ہو گئی۔
ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر میں انسپکٹر کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔
انسپکٹر میرے پیچھے پیچھے آ کر مودب سامنے کھڑا ہو گیا۔
"سنو انسپکٹر!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "میری ہدایات غور سے سنو!"
"جی...... فرمائیے میں توجہ سے سن رہا ہوں۔"
"ضیاء الاسلام کو میں رہا کر رہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کی بیٹی بھی اسی کے ساتھ جائے

گی۔ ان دونوں کو تم پولیس کی کسی بند وین میں اس پتے تک پہنچاؤ گے جو پتا ضیاء الاسلام بتائے گا۔ کام یہیں ختم نہیں ہو گا بلکہ ضیاء الاسلام کی نگرانی کی جائے گی۔ دن کے وقت اور رات کے وقت بھی۔ تمہارے آدمیوں کو یہ خیال رکھنا ہے کہ کوئی بھی شخص ضیاء الاسلام کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ کوئی شخص اگر تمہارے آدمیوں کے علاوہ ضیاء الاسلام کا تعاقب کرتا نظر آئے تو اسے بھی چیک کیا جائے۔ تمہارے آدمیوں کو ایسے کسی شخص کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنا ہیں۔ یوں سمجھو کہ ضیاء الاسلام کو بطور چارا استعمال کیا جا رہا ہے' اصل مجرم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے!...... تم سمجھ رہے ہو میری بات؟"
"جی ہاں بالکل سمجھ رہا ہوں۔ آپ نے جو احکام دیئے ہیں ان کی تعمیل ہو گی۔" انسپکٹر نے جواباً کہا۔
"ٹھیک ہے پھر!...... میں خود تم سے رپورٹ لے لوں گی' فون کر کے یا پھر خود ہی یہاں آ کر!...... تم اپنے ان آدمیوں سے مسلسل رابطہ رکھو گے جنہیں ضیاء الاسلام کی نگرانی پر مامور کرو گے۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی!"
آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ پھر میں واپس کمرے کی طرف مڑ گئی۔ اندر پہنچ کر میں نے ضیاء الاسلام کو مخاطب کیا۔ "تمہاری بہن کہاں رہتی ہے؟"
"جناح ایونیو میں۔" اس نے بتایا۔
میں نے اپنے پرس میں سے قلم اور ایک چھوٹی سی ڈائری نکال کر اس کی طرف بڑھا دی اور کہا "اس پر اپنی بہن کا پورا پتا لکھ دو' اس طرح کہ اگر کوئی اس پتے پر پہنچنا چاہے تو اسے آسانی سے تمہاری بہن کا گھر مل جائے۔"
"جی...... لکھے دیتا ہوں۔" اس نے میرے ہاتھ سے ڈائری اور قلم لے لیا اور پھر قلم کھول کر اس پر اپنی بہن کا پتا لکھنے لگا۔
"ابھی کچھ دیر کے بعد تمہیں پولیس کی ایک بند وین میں اس پتے پر پہنچا دیا جائے گا۔" میں نے اسے بتایا۔
ضیاء الاسلام نے ڈائری پر پتا لکھ کر دے دیا۔ اس پتے پر ایک نظر ڈال کر میں نے ڈائری دوبارہ اپنے پرس میں رکھ لی۔ پتا اس نے میری ہدایت پر ذرا تفصیل سے لکھا تھا۔
"سنو! تمہیں اس وقت تک نارائن گنج کا رخ نہیں کرنا جب تک اس کی اجازت نہ مل جائے! اس دوران میں اگر تم سے خورشید الاسلام ملے تو تمہیں اس کی اطلاع فوری طور پر انسپکٹر کو دینا ہے۔ اس کے لیے تم فون بھی استعمال کر سکتے ہو۔" میں نے مزید ہدایات دیں۔ انسپکٹر بھی کمرے ہی میں تھا۔ میں نے ضیاء الاسلام کو فون نمبر دینے کے لیے کہہ دیا۔
پھر میں وہاں مزید نہیں رکی۔ سی آئی ڈی آفس سے باہر آنے کے بعد میں نے سوچا کہ ہوم سیکرٹری عبدالرحمان چودھری سے بھی مل ہی لینا چاہیے۔ ابھی اس کے دفتر کا وقت ختم نہیں ہوا تھا یہ سوچ کر میں نے گرین روڈ کے لیے ایک ٹیکسی کر لی۔ راستے میں ایک بڑے جلوس کے سبب میری ٹیکسی کو رک جانا پڑا۔ جلوس کے پیچھے پیچھے پولیس کے دو ٹرک بھی تھے۔ جلوس کے شرکاء حکومت کے خلاف نعرے لگا

رہے تھے اسی کے ساتھ وہ بنگلہ کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ بھی کر رہے تھے۔ ہجوم کے آگے ایک جیپ میں چند افراد سوار تھے جو اس جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ نارائن گنج میں خورشید الاسلام نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا' اس کا عملی مظاہرہ شروع ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں وہ لوگ اندر ہی اندر نہ جانے کب سے یہ ساری تیاریاں کر رہے تھے! اس جلوس کی وجہ سے خاصی دیر کے بعد میری ٹیکسی کو آگے بڑھنے کا موقع مل سکا۔

جب میں ہوم سیکرٹری کے دفتر پہنچی تو وہ بس اٹھنے ہی والا تھا۔ وہ مجھے غیر متوقع طور پر دیکھ کر کسی قدر حیران سا ہوا۔ میرے نئے میک اپ پر بھی اس نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ گزشتہ رات کے ریڈ کی وجہ سے آج آپ آرام کریں گی۔'' وہ بولا' پھر کہا ''آج پھر آپ کو میک اپ تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آ گئی!''

''ہاں بغیر ضرورت کے میں ایسا نہیں کرتی۔''

''کل کے ریڈ کی رپورٹ میں نے لے لی تھی'' وہ کہنے لگا۔ ''بہرحال اس حد تک ریڈ کو کامیاب کہا جا سکتا ہے کہ وہ لڑکی برآمد کر لی گئی۔ اب آپ کا ضیاء الاسلام اور اس لڑکی کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟...... کیا ان دونوں کو فی الحال پولیس کی تحویل ہی میں رکھیں گی؟''

''نہیں وہ دونوں اب پولیس کی تحویل میں نہیں رہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے اپنی نئی حکمت عملی سے آگاہ کر دیا۔

''آپ نے میری دانست میں مناسب قدم اٹھایا ہے۔ اس طرح یہ امکان پیدا ہو سکتا ہے کہ خورشید الاسلام سامنے آ جائے گا۔'' اس نے میری حکمت عملی سے اتفاق کیا' پھر کہنے لگا۔ ''ان دنوں پولیس کے لیے ایک اور دردسر پیدا ہو گیا ہے۔ احتجاجی جلسے اور جلوس شروع ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں یہ سب کس پارٹی کی شہ پر ہو رہا ہے۔''

''غالباً میں آپ کو اس گفتگو سے آگاہ کر چکی ہوں جو میرے اور خورشید الاسلام کے درمیان ہوئی تھی۔ حکومت کے خلاف نعرے لگانے والے اور بنگلہ کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کرنے والے' ملک دشمن عناصر ہیں۔ ان افراد کے پیچھے امریکی ایجنٹ ہیں اور وہ مقامی لوگ بھی جو ان ایجنٹوں کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ میری مراد خورشید الاسلام وغیرہ سے ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایسی صورت میں تو خورشید الاسلام کی گرفتاری اور بھی ضروری ہو گئی ہے اسے گرفتار کر کے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے اور تخریب کار عناصر پر ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے۔''

''ہاں' لیکن وہ اتنی آسانی سے گرفتار نہیں ہو گا۔'' میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بس ایک امید ہے کہ وہ ضیاء الاسلام کے چکر میں آ کر ہمارے ہتھے چڑھ جائے۔''

''آپ نے اس کا بندوبست کر تو دیا ہے' اب دیکھیے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے......! ویسے ایک بات میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ آخر ضیاء الاسلام کا پیچھا کیوں کرے گا؟ میرا تو خیال ہے کہ اب وہ موجودہ صورتحال میں ضیاء الاسلام کے قریب نہیں آئے گا۔ عبیدالرحمان چودھری بولا۔

''میں آپ کے خیال سے متفق نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اسے بہرحال ضیاء الاسلام کی طرف سے یہ خطرہ لاحق ہو گا کہ وہ کہیں اس کا راز فاش نہ کر دے۔ ایسی صورت میں اس کی کوشش یہی ہو گی کہ وہ ضیاء الاسلام کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔''

''مگر ضیاء الاسلام تو ہمیں سب کچھ بتا چکا ہے۔''

''لیکن خورشید الاسلام کو تو اس کا علم نہیں نا! وہ یہ جاننے کے لیے بھی ضیاء الاسلام کی تلاش میں ہو سکتا ہے اور اس سے ملنے کی کوشش کر سکتا ہے کہ راز بھی راز ہے یا نہیں!... بہرحال ہمیں آگے بڑھنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تو چاہیے۔''

''چائے منگواتا ہوں میں آپ کے لیے!'' یہ کہہ کر اس نے اپنے چپراسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

''نہیں' میں چائے نہیں پیوں گی اور اب چلوں گی۔'' میں نے چائے پینے سے انکار کر دیا۔

''تو پھر چلیے' میں بھی اٹھ ہی رہا تھا' آپ جہاں کہیں گی چھوڑ دوں گا۔ ویسے ابھی آپ وہیں اپنی کزن کے یہاں ٹھہری ہوئی ہیں نا!...... وہیں موتی جھیل میں؟''

''جی ہاں وہیں ہوں ابھی تک' مگر اس وقت میں ایک اور جگہ جا رہی ہوں۔''

''معاف کیجیے گا مس خان' کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھ پر بھی اعتماد نہیں کرتیں۔''

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ محض آپ کا خیال ہے۔'' میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

''بہرحال اگر مناسب سمجھیں تو ساتھ چلیں ورنہ......'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ناحق آپ کو زحمت ہو گی' لیکن آپ بضد ہیں تو مجھے کاروان بازار چھوڑ دیجیے۔'' میں نے دانستہ ایک ایسی آبادی کا نام لیا تھا جو تیج گاؤں سے ملی ہوئی تھی۔ مجھے دراصل تیج گاؤں جانا تھا' مگر میں اسے یہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ وہاں سے میں بڑی آسانی کے ساتھ چہل قدمی کرتی ہوئی اقبال کی کوٹھی تک پہنچ سکتی تھی۔

میری بات سن کر عبیدالرحمان چودھری کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے کہا۔ ''چلیں آپ نے مجھ پر اتنا اعتماد تو کیا!'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ پھر میں اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ اسے آتے دیکھ کر اس کا ڈرائیور مستعد نظر آنے لگا۔ ہم کار کے قریب پہنچے تو اس نے کار کا پچھلا دروازہ ہمارے لیے کھول دیا۔

''اندر تشریف رکھیے!'' عبیدالرحمن چودھری نے پہلے مجھے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''شکریہ!'' یہ کہہ کر میں اندر بیٹھ گئی۔ پھر عبیدالرحمن چودھری بھی میرے قریب آ بیٹھا۔

''سنو ڈرائیور! پہلے کاروان بازار چلنا ہے' اس کے بعد گھر۔'' جب ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ کے بیٹھ گیا تو عبیدالرحمان چودھری نے اس سے کہا۔

''بہتر ہے سر!'' ڈرائیور نے یہ کہتے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی۔

کار ابھی کچھ ہی دور چلی تھی کہ عبیدالرحمان چودھری بول اٹھا۔ ''آپ کا میں نے بہت نام سنا ہے' مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ میں آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ نے شادی

بھی نہیں کی۔ کیا آپ شادی کے خلاف ہیں؟''

''چودھری صاحب! معاف کیجئے گا' میں ہمیشہ اپنے آپ کو موضوع گفتگو بنانے سے گریز کرتی ہوں۔ بہر حال میں اتنا ضرور عرض کروں گی کہ شادی سے مجھے کوئی اختلاف نہیں' لیکن اپنی حد تک میں شادی افورڈ نہیں کر سکتی۔ رہیں میری ذاتی زندگی کے متعلق دیگر باتیں تو آپ ہی کیا' اور بہت سے لوگ اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ میں کسی کو کچھ بتانا پسند کرتی ہوں۔''

''تو پھر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ نے دانستہ خود کو ایک پراسرار شخصیت بنا رکھا ہے۔''

''جو بھی آپ سمجھیں' میں خود اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔'' میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

عبدالرحمٰن چودھری نے پھر کوئی ذاتی سوال نہیں کیا۔ وہ مجھ سے موجودہ سیاسی حالات پر گفتگو کرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ مشرقی پاکستان کے باسیوں میں دانستہ ایک مخصوص طبقے نے احساس محرومی پیدا کر دیا ہے اور اس سے وہ طبقہ اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی باتوں پر میں بس ''ہاں ہاں'' کرتی رہی۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔

کاروان بازار میں کار داخل ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ ڈرائیور کی رہنمائی کر دیجئے گا کہ کدھر چلنا ہے۔''

''بس یہیں ایک طرف سڑک کے کنارے کار روک دو۔'' عبدالرحمان چودھری کو کوئی جواب دینے کی بجائے میں براہ راست ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔

ڈرائیور نے میری ہدایت کے مطابق کار روک دی تو میں عبدالرحمٰن چودھری کو ''خدا حافظ'' کہہ کر کار سے اتر گئی۔ کار سے اترتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے تھے اور میں اس حیرت کی وجہ جانتی تھی۔ آس پاس کوئی عمارت نظر نہیں آ رہی تھی' ہاں چند قدم کے فاصلے پر بازار ضرور تھا۔ اسے شاید یہ توقع رہی ہوگی کہ میں کسی مکان کے سامنے اتروں گی۔ پھر اس کی کار آگے بڑھ گئی اور میں پیدل اس آبادی کے بازار کی طرف چلنے لگی۔

عبدالرحمان چودھری کی کار میری نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں نے تیج گاؤں کا رخ کیا۔ اس وقت دوپہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

اقبال کی کوٹھی پر مجھے بابر اکیلا ملا۔ اقبال کہیں گیا ہوا تھا۔

اسی رات میں نے سی آئی ڈی آفس فون کیا۔ میں نے اب تک اس انسپکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا جس کے سپرد ضیاء الاسلام کی نگرانی کی تھی۔ مجھے اپنی اس حماقت پر افسوس ہونے لگا ظاہر ہے کہ سی آئی ڈی آفس میں صرف وہی انسپکٹر تو نہیں تھا' پھر بھی فون ملنے کے بعد میں نے کہا۔ ''مجھے کسی انسپکٹر سے ملواؤ' جو بھی ڈیوٹی پر ہو۔''

''بہتر ہے خاتون! مگر آپ کا نام؟ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''میرا نام عذرا خان ہے۔'' میں نے بتایا۔

''ہولڈ کیجئے!''

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا کہ دوسری جانب سے کسی شخص نے کہا۔ ''انسپکٹر سمیع اللہ فرام سی

آئی ڈی آفس۔''

''سنو انسپکٹر! مجھے اس انسپکٹر سے بات کرنا ہے جو کل رات میرے ساتھ نارائن گنج گیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ کل......''

''جی ہاں جی!...... کل رات نارائن گنج میں ضیاء الاسلام کی حویلی پر ریڈ کیا گیا تھا۔ میں بھی آپ کے نام سے واقف ہوں۔ انسپکٹر عبدالرشید سے میری بات ہوئی تھی' مگر وہ جی اس وقت نہیں ہے۔ اس کی ڈیوٹی آف ہو چکی ہے۔''

''اچھا تو اس کا نام عبدالرشید ہے!...... ٹھیک ہے میں کل صبح اس سے بات کرلوں گی۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اقبال کی کوٹھی میں یہ سہولت بھی تھی کہ وہاں فون تھا۔ میں اس لیے بھی وہاں رہنے پر راضی ہو گئی تھی۔

پھر دوسرے دن صبح میں نے سی آئی ڈی انسپکٹر عبدالرشید سے بات کی۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ روز سے اب تک کسی مشتبہ شخص کو ضیاء الاسلام کے قریب نہیں دیکھا گیا۔

''یہ بتاؤ کہ وہ کل سے اب تک باہر بھی نکلا ہے یا نہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔''

انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''وہ کل سے گھر ہی میں ہے۔''

''رات کے وقت بھی نگرانی کی جا رہی ہے نا!'' میں نے تصدیق کی۔

''جی ہاں بالکل۔'' اس نے بتایا۔

''یہ معلوم کر کے بتاؤ مجھے کہ وہاں کوئی فون ہے یا نہیں؟'' پھر میں نے اقبال کا نمبر اسے لکھا دیا۔ ''تم اس نمبر پر مجھے اطلاع دے سکتے ہو۔ اس کے علاوہ اگر کوئی نئی بات سامنے آئے تو بھی اس نمبر پر مجھ سے تمہاری بات ممکن ہے۔ اگر میں نہ ملوں تو تم میرے لیے پیغام چھوڑ سکتے ہو۔''

''بہت بہتر ہے جی...... میں معلوم کراتا ہوں کہ وہاں......''

انسپکٹر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے ریسیور رکھ دیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد انسپکٹر کی طرف سے اطلاع ملی کہ ضیاء الاسلام کی بہن کے گھر فون نہیں ہے۔ پھر دو روز گزر گئے اور کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس دوران میں بس ایک مرتبہ ضیاء الاسلام گھر سے نکلا تھا اور بازار سے کچھ خریداری کر کے واپس آ گیا تھا۔ تیسرے دن انسپکٹر عبدالرشید سے ایک کام کی اطلاع موصول ہوئی۔

''آج دوپہر کے بعد ضیاء الاسلام گھر سے نکلا تو ایک شخص اس کے پیچھے لگ گیا۔ ضیاء الاسلام نے بھی اس شخص کو دیکھ لیا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی تیز تیز قدم اٹھانا شروع کر دیئے تھے۔'' انسپکٹر عبدالرشید فون پر مجھے بتا رہا تھا۔ ''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ضیاء الاسلام اس شخص سے خوفزدہ ہے۔ اس شخص نے ایک گلی سے گزرتے ہوئے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ ہمارے آدمی اس پر نظر رکھے ہوئے تھے پھر اس نے جیسے ہی ریوالور سیدھا کر کے ضیاء الاسلام پر فائر کرنا چاہا' ہمارے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا۔ ضیاء الاسلام اس وقت تک گلی سے نکل کر ایک طرف مڑ چکا تھا۔ اس شخص نے ابھی تک زبان نہیں کھولی

اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ وہ ضیاء الاسلام کو نہیں جانتا۔"

"کیا تم لوگوں کو زبان کھلوانا نہیں آتا؟" میرے لہجے میں کچھ تلخی آ گئی۔

"اس شخص کو خاصا ڈرایا دھمکایا گیا ہے' مگر ابھی اس پر تھرڈ ڈگری استعمال نہیں کی گئی۔ ممکن ہے تھرڈ ڈگری کے استعمال کے بعد وہ زبان کھول دے' مگر اس سے پہلے میں آپ کو اطلاع کر دینا چاہتا تھا۔"

"ٹھیک ہے انسپکٹر میں خود آ رہی ہوں۔" میں بدستور تلخ لہجے میں بولی۔ "کم از کم اس دوران میں تمہیں اس کی شناخت تو کرا ہی لینا تھی!"

"شناخت!" اس کی آواز میں حیرت تھی۔ "مگر کس سے؟"

"مجھے علم نہیں تھا کہ تم اتنی سامنے کی بات نہیں سمجھ سکو گے!...... تمہیں نے تو مجھے ابھی بتایا ہے کہ ضیاء الاسلام اس شخص پر نظر پڑتے ہی تیز تیز قدم اٹھانے لگا تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ضیاء الاسلام اس شخص کو پہچانتا ہو گا۔"

"جی...... جی ہاں' ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔" اس کے لہجے میں خجالت تھی۔

"دراصل بات یہ ہے انسپکٹر کہ کسی بات پر غور کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے' وہ تمہارے پاس نہیں ہے۔" میری آواز میں چبھن تھی۔ "سنو اپنے کسی آدمی کو بھیج کر ضیاء الاسلام کو سی آئی ڈی آفس بلوا لو۔ یہ خیال رہے کہ اسے بحفاظت سی آئی ڈی آفس تک پہنچنا چاہیے۔ اس دوران میں خود میں بھی آ رہی ہوں۔ گرفتار کیے جانے والے شخص سے میرے پہنچنے تک مزید کچھ پوچھ گچھ کر کے اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" انہی الفاظ کے ساتھ میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اس وقت شام کے پونے چار بج رہے تھے۔ میں کیونکہ دوپہر کا کھانا کھا کر سو گئی تھی اور سوتے سے اٹھ کر ہی انسپکٹر عبدالرشید کا فون ریسیو کیا تھا اس لیے غسل کرنے اور لباس تبدیل کرنے میں مجھے آدھا گھنٹا لگ ہی گیا۔

ٹیکسی کے ذریعے میں' سی آئی ڈی آفس پہنچی تو عبدالرشید کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اپنے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔

"ضیاء الاسلام کو بلوا لیا تم نے؟ میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی سوال کیا۔

"جی ہاں' وہ اندر کمرے میں بیٹھا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم نے اس سے تو پوچھ گچھ نہیں کی کچھ؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں' آپ نے منع جو کر دیا تھا!" وہ فرمانبرداری سے بولا۔

"ضیاء الاسلام کے بارے میں تو میں نے تمہیں کوئی ایسی ہدایت نہیں دی تھی۔ تم بھی عجب ٹھس آدمی ہو!" میں نے ناگواری سے کہا' پھر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ انسپکٹر عبدالرشید میرے پیچھے پیچھے کسی سعادت مند بچے کی طرح آ رہا تھا۔ بعض لوگ انگلی پکڑ کر چلنے کے عادی ہوتے ہیں اور خود کوئی قدم اٹھانے کے اہل نہیں ہوتے۔ انسپکٹر عبدالرشید بھی میرے خیال میں ایسے ہی افراد میں سے تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر میں نے ضیاء الاسلام کے چہرے کا جائزہ لیا وہ مجھے کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

"ضیاء الاسلام!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ یہ بتاؤ کہ آج دوپہر کے بعد جب تم اپنی بہن کے گھر سے نکلے تھے تو تمہیں کوئی ایسا شخص تو دکھائی نہیں دیا تھا جسے تم پہلے سے جانتے ہو؟"

میری بات سن کر وہ چونک اٹھا اور پھر بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "جی...... جی ہاں' مگر آپ...... آپ کو کس طرح یہ بات معلوم ہوئی کہ......"

"مجھے کیسے اس بات کا علم ہوا' تم اس جھگڑے میں نہ پڑو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں نے تم سے جو سوال کیا ہے' اس کا تفصیل کے ساتھ جواب دو!" میرا لہجہ حکمیہ تھا۔

"آپ...... آپ نے کیا...... مجھ سے پوچھا تھا؟" وہ میرے سخت لہجے سے ہڑبڑا گیا۔

مجھے اس پر غصہ تو بہت آیا مگر نظر انداز کر گئی۔ وہ خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہا تھا۔ "میں نے پوچھا تھا کہ آج گھر سے نکلنے کے بعد تم جس شخص کو دیکھ کر چونک اٹھے تھے اور تیز تیز قدم بڑھانے لگے تھے وہ کون تھا؟ یقیناً تم اسے اچھی طرح پہچانتے ہو ورنہ اسے دیکھ کر چونک نہ اٹھتے۔" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اپنی بات دہرائی۔

"جی ہاں' جانتا ہوں میں اسے!" ضیاء الاسلام بولا۔ "میں نے خورشید الاسلام کی سفارش پر اسے ملازم رکھا تھا۔ اس کا نام پرفلو ہے۔ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے خطرناک آدمی لگا تھا' مگر بہ مجبوری میں نے خورشید الاسلام کے کہنے پر اسے اپنی کوٹھی میں رکھ لیا تھا۔"

ضیاء الاسلام نے یہ سن کر میں چونک اٹھی۔ میں نے انسپکٹر کی طرف مڑ کر کہا۔ "اسے بھی حوالات سے نکال کر یہاں لے آؤ!"

انسپکٹر میرا حکم سن کر کمرے سے نکل گیا۔ میں اس دوران میں کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ میرے سامنے والی کرسی پر ضیاء الاسلام بیٹھا ہوا تھا۔ اس شخص کو میں نے ضیاء الاسلام کے سامنے اس لیے بلوایا تھا کہ وہ اپنے سامنے ضیاء الاسلام کو دیکھ کر جلد زبان کھول دے۔

کچھ ہی دیر کے بعد انسپکٹر عبدالرشید اس شخص پرفلو کو لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ میری توقع کے مطابق وہ ضیاء الاسلام کو وہاں بیٹھے دیکھ کر تقریباً اچھل پڑا تھا۔

"پرفلو!" میں نے اسے اس کا نام لے کر مخاطب کیا۔ "اب بتاؤ کیا تم انہیں نہیں جانتے؟" میں نے ضیاء الاسلام کی طرف اشارہ کیا۔

وہ نظریں چرانے لگا اور میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں ایک دم کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور پھر مزید کچھ کہے بغیر اس کے قریب پہنچ گئی۔ اچانک میں نے اس کے پیٹ پر گھونسا مارا' ضرب تنی شدید تھی کہ وہ "اوغ" کر کے بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیٹ پر تھے۔

ابھی وہ سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ اس کی پیشانی پر میرے پیر کی ٹھوکر پڑی اور وہ چیخ کر الٹ گیا۔

"بولو پرفلو' مزید خاطر مدارت کروں تمہاری!" میں سخت لہجے میں بولی۔ "تم میرے سوالوں کا جواب دینے پر آمادہ ہوئے یا...... میں نے دھمکی آمیز آواز میں اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

وہ فرش پر پڑا بے بسی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پیشانی پر پڑنے والی ضرب کے نتیجے میں اس کی پیشانی پر دائیں جانب ابھار نظر آ رہا تھا۔

''اٹھو!'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے پہلو پر ٹھوکر ماری۔

وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دو چار مزید ہاتھوں میں اس کا دماغ درست ہو گیا۔ اس نے اقرار کرلیا تھا کہ وہ ضیاء الاسلام کو جانتا ہے اور یہ کہ وہ اس کی کوٹھی کے ملازمین میں شامل تھا۔ اس کے مزید کچھ بتانے سے پہلے میں نے ضیاء الاسلام کو وہاں سے ہٹا دیا۔ میں اسے خوفزدہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ پروفلو اس پر قاتلانہ حملہ کرنے والا تھا تو پھر وہ گھر سے نکلنا بند کر دیتا۔ فطرتاً وہ مجھے ایک بزدل شخص محسوس ہوا تھا۔

''پروفلو! تم نے یہ تسلیم کرلیا ہے' ضیاء الاسلام کو جانتے ہو' اب یہ بھی بتا دو کہ کس کے اشارے پر اسے قتل کرنا چاہتے تھے؟......سنو! میں خود بھی یہ بات جانتی ہوں' لیکن تم سے تصدیق اور اعتراف کرانا چاہتی ہوں۔''

اس کے کس بل میں نے پہلے ہی نکال دیئے تھے' اس لیے وہ میرے سوال کا جواب دینے پر آمادہ ہو گیا۔ توقع کے مطابق اس نے خورشید الاسلام ہی کا نام لیا تھا۔

''تم اس سے کب اور کہاں ملے تھے؟'' میں نے اپنی دانست میں اصل سوال کیا۔ میری اب تک کی پوچھ گچھ کا حاصل یہی سوال تھا۔

پروفلو نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا کہ وہ خورشید الاسلام کے ساتھ ہی بونوگرام روڈ کے ایک مکان میں قیام پذیر ہے۔ مجھے علم تھا کہ بونوگرام روڈ' نواب پور روڈ ہی کے قریب ہے۔ نواب پور روڈ ہی سے ایک سڑک نکلتی ہے جسے بونوگرام روڈ کہا جاتا ہے۔ یہاں زیادہ تر متوسط درجے کے لوگ رہتے ہیں۔

''تم تو نارائن گنج میں تھے' پھر یہاں کب آئے؟'' میں نے سوال کیا۔

جواب میں اس نے بتایا کہ جس رات پولیس ریڈ ہوا تھا' اس کی صبح خورشید الاسلام اسے لے کر ڈھاکہ آ گیا تھا۔

''وہ رات تم لوگوں نے حویلی کے تہ خانے میں گزاری تھی نا؟'' میں نے اپنے اندازے کی تصدیق ضروری سمجھی۔

اس نے جواب اثبات میں دیا۔

اسی وقت مجھے سولومن کا خیال آ گیا اور میں نے پوچھا۔ ''کیا اس رات تہ خانے میں تمہارے ساتھ کوئی غیر ملکی بھی تھا؟''

میرے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں ملا۔ مجھے ایک بار پھر یہ افسوس ہونے لگا کہ اس رات میں نے حویلی کی تلاشی لیتے ہوئے اس امکان پر غور کیوں نہیں کیا کہ وہاں کوئی اور تہ خانہ بھی ہو سکتا ہے اس رات سولومن بھی میرے ہاتھ آ سکتا تھا۔

''کیا بونوگرام روڈ کے اس مکان میں وہ غیر ملکی بھی ٹھہرا ہوا ہے؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

پروفلو نے انکار میں جواب دیا اور پھر کہنے لگا کہ وہ غیر ملکی اس دوران میں بس ایک بار وہاں آیا تھا۔ پھر میں نے اس سے مکان کا محل وقوع اچھی طرح سمجھ لیا۔ آج ہی میں خورشید الاسلام پر ہاتھ ڈال دینا چاہتی تھی۔ میں نے پروفلو سے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ ضیاء الاسلام کو قتل کرنے کے بعد اسے فوری طور پر خورشید الاسلام سے نہیں ملنا تھا۔ خورشید الاسلام رات کے وقت ہی وہاں آتا تھا۔ دن وہ کہاں گزارتا تھا؟ اس سوال کا جواب پروفلو نہ دے سکا۔ جس ریوالور سے وہ ضیاء الاسلام کو قتل کرنے والا تھا' اسے خورشید الاسلام ہی نے دیا تھا۔ میں نے اس ریوالور کو بھی دیکھا۔ وہ امریکی ساخت کا تھا۔

''ٹھیک ہے انسپکٹر!'' میں نے اسے ریوالور واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے ضیاء الاسلام پر قاتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں عدالت کے روبرو پیش کر دو!''

پروفلو مجھ سے رحم کی درخواست کرنے لگا' مگر میرے اشارے پر انسپکٹر نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ پھر میں نے ضیاء الاسلام کو بلوایا اور انسپکٹر سے کہا کہ انہیں بحفاظت ان کی بہن کے گھر بھجوا دو! انسپکٹر نے اس کا بندوبست کر دیا۔

ضیاء الاسلام چلا گیا تو انسپکٹر مجھ سے کہنے لگا۔ ''آپ نے ضیاء الاسلام کو تو کچھ بتایا نہیں' کیس عدالت میں پیش ہوگا تو اس کا بیان بھی......''

''معلوم ہے مجھے!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ضروری نہیں کہ اسی وقت اسے سب کچھ بتا دیا جاتا۔ تم بعد میں اسے یہ سب کچھ بتا سکتے ہو۔ فی الحال وہ خوفزدہ ہو جاتا اور پھر گھر سے بھی نہ نکلتا۔ جب تک خورشید الاسلام گرفتار نہیں ہو جاتا' ضیاء الاسلام کو کچھ نہیں بتانا اور نہ پروفلو کو عدالت میں پیش کرنا ہے۔''

''اس کا سراغ مل ہی گیا ہے۔ آج رات وہ یقیناً گرفتار ہو جائے گا۔'' انسپکٹر بولا۔

''ضروری نہیں انسپکٹر کہ وہ آج ہی رات پکڑا جائے۔'' یہ کہہ کر میں کھڑی ہو گئی۔

''کیا آج رات کے ریڈ میں آپ کو میری ضرورت پڑے گی؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہیں دو سپاہیوں کے ساتھ رات گیارہ بجے تیار ملنا ہے۔''

پھر میں سی آئی ڈی آفس سے ٹیکسی کر کے پنج گاؤں پہنچ گئی۔ آج شام ہی فرید احمد کو ہسپتال سے چھٹی ملنے والی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے کم از کم مزید دو ہفتے آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اقبال اسی کو لینے گیا تھا۔ میں سی آئی ڈی آفس سے واپس پہنچی تو فرید احمد آ چکا تھا۔ میں نے اس کی مزاج پرسی کی بابر کی تنظیم کے اور بھی لوگ فرید احمد کی عیادت کرنے آئے ہوئے تھے۔ وہ سبھی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے درمیان خلوص و محبت دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی' کچھ دیر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

سیودمکرجی کی جانب سے مسلسل خاموشی مجھے کھل رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ کیوں خاموش تھا اور ان دنوں کس چکر میں تھا! ظاہر ہے کہ بھارتی ایجنٹ ساوتری بھی اسی کے پاس تھی۔ امریکی ایجنٹ سولومن کی بھی کچھ خیر خبر نہیں تھی۔ نارائن گنج سے فرار ہونے کے بعد نہ جانے وہ کہاں روپوش ہو گیا تھا! وہ خورشید الاسلام کے ساتھ نہیں تھا' یہ مجھے معلوم ہو چکا تھا' مگر اس کا نیا ٹھکانا کہاں تھا! اس سے میں بے خبر تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کسی ہوٹل میں بھی قیام کر سکتا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ آج رات خورشید

الاسلام کی گرفتاری کے بعد سولومن کا سراغ بھی مل جائے گا۔ خورشید الاسلام کو یقیناً سولومن کے ٹھکانے کا علم ہوگا۔

اسی روز رات کا کھانا ہم لوگوں نے کچھ دیر سے کھایا۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے [illegible] اور قوال نے بھی وقت پر کھانا نہیں کھایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ میرے ہی ساتھ کھانا کھائیں گے۔ فریدہ اور [illegible] کے لیے پرہیزی کھانا پہنچانے کی ذمے داری [illegible] تنظیم کے ایک رکن نے قبول کر لی تھی۔ اسے وقت پر کھانا دے دیا گیا تھا۔ اب وہ بھی تقریباً صحت یاب ہو چکی تھی۔

رات کو وقت مقررہ پر میں سی آئی ڈی آفس پہنچ گئی اور پھر انسپکٹر نوید اور اس کے دو ماتحتوں کو لے کر پولیس ہیڈکوارٹر کی طرف ایک پولیس جیپ میں روانہ ہو گئی۔

مطلوبہ مکان سے کچھ پہلے ہی میں نے پولیس جیپ سڑک کے کنارے رکوا لی۔ پھر انسپکٹر اور اس کے ماتحتوں کو جیپ سے اترنے کے لیے کہا۔

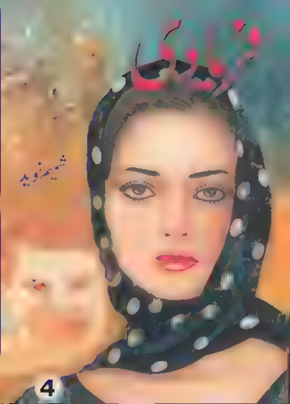
"تم لوگوں کو اس وقت تک گھر کے باہر ہی رہنا ہے جب تک میں تمہیں اندر نہ بلاؤں۔" میں نے انسپکٹر کو ہدایت دی اور آگے بڑھ گئی۔

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا اور میرے ساتھ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

مطلوبہ مکان سے ذرا پہلے میں نے پولیس والوں کو روک دیا اور پھر بجلی کے تل مکان کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اندر روشنی نظر آ رہی تھی۔ پہلے سے اس چھوٹے سے گھر کی بابت میں نے تمام تفصیل معلوم کر لی تھی۔ وہ مکان صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ بیرونی کمرے سے باہر نکلنے کا راستہ تھا اور اسی کو بطور نشست گاہ استعمال کیا جاتا تھا۔ مجھے دستک دینے سے پہلے دروازے سے کان لگا دیے اور اس کے ساتھ میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اندر سے امریکی ایجنٹ سولومن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ غالباً خورشید الاسلام سے ملنے آیا تھا اور اسی سے مخاطب تھا۔ میں تو چھوٹی مچھلی کا انتظار کرنے آئی تھی مگر بڑی مچھلی خود بخود میرے جال میں آ پھنسی تھی۔

☆ ☆ ☆

طاہرہ خان کی پراسرار آپ بیتی ابھی جاری ہے۔ بقیہ واقعات کیلئے حصہ چہارم کا مطالعہ کریں۔


شمیم نوید
4

وجانا پینے کے باوجود کہ اہم اس مکان کی نشست گاہ میں ہمارا انتظار موجود ہے میں نے کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مجھے اس بات کا کافی تجربہ تھا کہ ایسے معاملات میں تھوڑا جلد بازی کا کام بگاڑ دیتی ہے فوراً چوکس ہو گیا اور مجھے اس بات کا ثبوت بھی مل گیا۔ اگر میں فوری طور پر سر کی انگلی سولومن اور اس کے آلہ کار خورشید الاسلام پر ہاتھ ڈال دیتی اور پھر کسی طرح ان دونوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی تو بہت ممکن تھا۔ مشرقی پاکستان زبردست مصیبتوں کا شکار ہو جاتا۔ اس وقت سولومن جو کچھ کہہ رہا تھا میں سانس روکے سن رہی تھی۔

"ابھی مسلح جدوجہد کا وقت نہیں آیا۔" سولومن، خورشید الاسلام سے کہہ رہا تھا جو اس کے ساتھ میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ "اس طرح جلد بازی میں کام بگڑ جائے گا۔ ابھی اندر ہی اندر کام کرنے کی ضرورت ہے۔"

"مگر وہ لوگ تو موجود ہیں جو کر کے بیٹھے تھکے گئے ہیں۔" خورشید الاسلام کی آواز سنائی دی۔ "اسلحہ بھی بڑی تعداد میں تقسیم کیا جا چکا ہے۔ ہم لوگ تو بس آپ کی طرف سے اشارہ کے منتظر ہیں۔ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔"

"تم ابھی کی فکر نہ کرو۔" سولومن کی آواز آئی۔ "کہ تھوڑی سی دیر کی ایک ترکیب میرے ذہن میں ہے۔ اس ترکیب پر عمل کرنے کے لیے فوری طور پر تمہیں چند تصویریں بنانا ہوں گی۔ یہ بات طے ہے کہ اس وقت مسلح جدوجہد کا آغاز ہمارے لیے انتہائی مہنگا ثابت ہو گا۔ ہمارے اندازے کے مطابق ابھی یہاں کے عوام اس صورت میں ہمارا ساتھ نہیں دیں گے اور ہمیں گھر گھر جا کر تلاش کر لیا جائے گا۔ اس نقصان کے بعد تو لوگوں کا بہت دن تک سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن دن اور وقت تو مقرر ہو چکا ہے۔ مقررہ دن اور مقررہ وقت پر مشرقی پاکستان کے تمام شہروں میں بیک وقت ہنگامے شروع ہو جائیں گے۔" خورشید الاسلام کی آواز میں دوبارہ سا جوش تھا۔

"ہمارے طلبا میں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہئے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ چاول تک کے گودام بھارتی بڑی تعداد میں یہاں داخل ہو چکے ہیں اور وہ ہمارے شانہ بشانہ ہنگامہ آرائی میں شریک رہیں گے۔"

"تم لوگوں کو اتنا جذباتی ہو کر کسی بھی قدم اٹھانے پر تیار رہنا چاہئے تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ابھی انتظار کرو اور مجھے اوپر سے ہدایات ملنے دو۔ احکام ملتے ہی ہم مسلح جدوجہد کا

ابھی آغاز نہ کیا جائے' سولومن نے واضح اور صاف الفاظ میں کہا۔

''آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ہم لوگ اپنی تیاریاں جاری رکھیں۔'' خورشید الاسلام بولا۔

''ہاں کہا تھا' مگر اس کا وہ مطلب نہیں تھا جو تم لوگوں نے لیا مگر خیر اب بھی وقت ہے ہم اس قیامت اور تباہی کو روک سکتے ہیں جو خود ہمارے لئے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ تمہیں ابھی اس بات کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا کہ اس ہنگامہ آرائی کا نتیجہ خود تم لوگوں کی تحریک کیلئے کس قدر ہولناک ثابت ہوگا۔''

پھر ان دونوں کے درمیان مزید کچھ دیر مکالمات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ سولومن نے خورشید الاسلام کو اپنی بات ماننے پر راضی کر لیا تھا۔ میں تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ان لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتی رہی۔ اب وہ متوقع ہنگاموں کو فوری طور پر روکنے کیلئے لائحہ عمل بنا رہے تھے۔ اس لائحہ عمل کے مطابق ان دونوں کا فوری طور پر سرحدی شہر جیسور پہنچنا ضروری تھا۔ اس موقع پر میں اگر ان دونوں کو گرفتار کر لیتی تو مشرقی پاکستان زبردست ہنگاموں کی لپیٹ میں آ جاتا اور ان ہنگاموں میں نہ جانے کتنے بے گناہ افراد مارے جاتے! امریکی ایجنٹ سولومن کے کہنے کے مطابق ان ہنگاموں کا نتیجہ خود علیحدگی پسندوں کے حق میں اچھا ثابت نہ ہوتا مگر ضروری نہیں تھا کہ اس کا تجزیہ درست ہی ثابت ہوتا اور حالات کوئی نیا رخ اختیار نہ کر لیتے۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ ان دونوں کو گرفتار کرنے کے بعد ان کی زبان کھلوانے کی کوشش کی جاتی اور ان کی نشاندہی پر تمام ملکی اور غیر ملکی تخریب کاروں کو اس وقت سے پہلے گرفتار کر لیا جاتا جب وہ ہنگامہ آرائی شروع کرتے لیکن اس میں خطرہ تھا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ سولومن ایسے ایجنٹ زبان کھولنے پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ خورشید الاسلام کے بارے میں بھی میری کچھ ایسی ہی رائے تھی۔ موجودہ حالات کے پیش نظر میں نے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا پھر جس طرح کے پنجوں کے بل چلتی ہوئی دروازے تک پہنچی تھی اسی طرح خاموشی اور احتیاط کے ساتھ واپس اس جگہ تک پہنچ گئی' جہاں پولیس والے میرے اشارے کے منتظر تھے۔

''واپس چلو!'' میں نے آہستگی سے انہیں حکم دیا۔

''جی!'' پولیس انسپکٹر عبدالرشید حیرت زدہ سا ہو کر بولا۔ ''آپ واپس چلنے کو کہہ رہی ہیں؟...... کیا......؟

''فضول باتیں نہ کرو! میں نے اسے جھڑک دیا اور پھر اس طرف قدم بڑھا دیئے جہاں پولیس جیپ کھڑی کی گئی تھی۔

کبھی کبھی دانستہ اپنے حریف کو ڈھیل دے دینا بھی سودمند ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ایک ایسا ہی موقع تھا۔ اس وقت سولومن اور خورشید الاسلام کو حراست میں لے لینا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے کچھ اور ہی فیصلہ کیا تھا۔ واپسی میں مجھے نواب پور روڈ پر ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ میں نے پولیس جیپ اس کے قریب رکوا لی۔ ابھی رات کے بارہ نہیں بجے تھے میں نے جیپ سے اترتے ہوئے مدھم لہجے میں انسپکٹر عبدالرشید اور اس کے ماتحتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ اب تم لوگوں کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔ اپنے حیرت زدہ چہروں کے باوجود انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا' ان کیلئے یقیناً یہ بات حیران کن ہی رہی ہوگی' میں خالی ہاتھ واپس جا رہی تھی۔

جیپ سے اتر کر میں ٹیکسی والے سے مخاطب ہوئی اور اسے بتایا کہ مجھے کہاں جانا ہے' میں چاہتی تو پولیس جیپ میں بھی تیج گاؤں جا سکتی تھی' مگر میرے نزدیک یہ مناسب نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو بھی میرے ٹھکانے کا علم ہو۔ اپنے اصل ٹھکانے سے تو میں نے ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن کو بھی بے خبر رکھا تھا۔

ٹیکسی والے نے کوئی جواب دینے سے پہلے میرے سراپا کا جائزہ لیا۔ اس نے مجھے جیپ سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ نصف شب کے قریب ایک جیپ سے اتر کر کسی تنہا عورت کا ٹیکسی میں سفر کرنا یقیناً چونکا دینے والی بات تھی۔ ٹیکسی والے کا تذبذب اس لئے مجھے غیر فطری معلوم نہ ہوا۔ اگر میرے چہرے پر اس وقت ایک ادھیڑ عمر بدصورت عورت کا میک اپ نہ ہوتا تو وہ ٹیکسی والا اور جانے کیا کیا سوچتا! اس دوران میں پولیس جیپ آگے بڑھ چکی تھی۔ پولیس والے سادہ لباس میں تھے' یہ بات بھی ٹیکسی والے کو شبے میں ڈال دینے والی تھی۔

''بولو' چلنا ہے یا نہیں؟ میں نے ٹیکسی والے کو خاموش دیکھ کر کہا۔

''نئیں اور نئیں جائے گا۔'' اس نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر تمہارا میٹر تو ڈاؤن نہیں ہے!...... پھر تم کیوں نہیں چل رہے؟ میں وہاں آس پاس کوئی دوسری خالی ٹیکسی نہ دیکھ کر کہنے لگی۔

''بس بول دیا' ام نئیں جائے گا۔'' اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔

''جانا تو پڑے گا تمہیں'' مجھے بھی ضد ہو گئی۔

''نئیں جائے گا...... نئیں جائے گا' بس۔''

''کیا تمہیں یہ خیال بھی نہیں کہ رات کا وقت ہے اور میں اکیلی ہوں' دوسری کوئی سواری بھی نہیں ہے اس وقت۔''

میری بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ مسلسل انکار کرتا رہا۔ اگر وہاں کوئی اور خالی ٹیکسی ملنے کا امکان ہوتا تو میں ہرگز وہ قدم نہ اٹھاتی جو مجبوراً مجھے اٹھانا پڑا۔

''تمہاری ایسی تیسی!...... تمہارے تو باپ کو بھی چلنا پڑے گا!'' یہ کہتے ہوئے میں جھکی اور پھر دوسرے ہی لمحے ٹیکسی والے کی کنپٹی پر میرا جچا تلا ہاتھ پڑا۔

ٹیکسی والے نے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے مجھے دیکھا' پھر اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا' اس کے بعد اس کی گردن ڈھلک گئی اور سر جھک گیا۔ مین نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اسے باہر گھسیٹ لیا' پھر ایک ہاتھ سے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولنے لگی۔ ٹیکسی والے کو پچھلی سیٹ پر لٹا کر اور دروازہ بند کرنے کے بعد میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی۔

نواب پور روڈ سے تیج گاؤں پہنچنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ راستہ میرا دیکھا بھالا تھا میں نے ٹیکسی سٹارٹ کر دی۔ اس کے ساتھ میں نے ٹیکسی کے اندر جلنے والے چھوٹے بلب بجھا دیئے تھے۔ راستے میں کسی پیٹرولنگ پولیس جیپ سے مڈبھیڑ کا خطرہ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک عورت کو ٹیکسی چلاتے دیکھ کر پولیس والے میری ٹیکسی کو روک بھی سکتے تھے۔ میں نے ٹیکسی سٹارٹ کرتے ہوئے اس کا میٹر بھی ڈاؤن کر دیا

تھا۔

راستے میں دو ایک جگہ مجھے پولیس والے دکھائی دیئے مگر میں ان کی نظر میں آئے بغیر تیزی سے گزر گئی۔ کاروان بازار کے قریب پہنچ کر میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ٹیکسی والا ابھی تک بے ہوش تھا۔ میں نے کچھ فاصلہ مزید طے کر کے سڑک کے کنارے ٹیکسی روک لی اور میٹر دیکھا۔ وہاں تک جتنے پیسے بنے تھے میں نے بے ہوش ٹیکسی والے کے سینے پر رکھ دیئے اور پھر ٹیکسی سے اتر گئی۔ میں نے اس لئے میٹر ڈاؤن کیا تھا وہاں تک زبردستی ٹیکسی لے کر آنا دوسری بات تھی مگر کرایہ بہرحال ٹیکسی والے کا حق تھا اور میں اس کی حق تلفی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہاں سے پیدل اقبال کی کوٹھی تک پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بمشکل دس منٹ کا سفر تھا۔ بہرحال میں اپنی منزل تک پہنچ ہی گئی۔

بیل کے جواب میں میرے لئے کوٹھی کا گیٹ کھولنے والا اقبال تھا۔ میرے اندر آنے کے بعد اس نے گیٹ بند کر دیا پھر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا ”کیا یہاں تک کسی کی گاڑی میں آئی تھیں آپ!“

”نہیں“ میں نے جواب دیا ”ٹیکسی میں آئی ہوں۔“

”حیرت ہے کہ تنہا اتنی رات کے وقت کسی ٹیکسی میں سفر کرتے ہوئے آپ کو کوئی دشواری نہیں ہوئی“ وہ بولا۔

”دشواری کیوں نہیں ہوئی!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”کبھی کبھی اس کیلئے خود ٹیکسی ڈرائیور بھی بننا پڑتا ہے“ یہ کہہ کر میں نے مختصراً آج رات پیش آنے والے واقعے سے اسے آگاہ کر دیا۔

اس دوران میں ہم عمارت تک پہنچ چکے تھے۔ واقعہ سن کر وہ کہنے لگا ”بابر آپ کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے، غلط معلوم نہیں ہوتا۔ آپ واقعی بہت حیرت انگیز ہیں۔“

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بابر اور پھر فرید احمد کے بارے میں پوچھا۔

”وہ دونوں سو چکے ہیں، بس میں آپ کے انتظار میں جاگ رہا تھا“ اس نے بتایا۔

”معاف کرنا اقبال، تم لوگوں کو میری وجہ سے بہت زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے!“

”یہ آپ کیا غیروں کی طرح بات کر رہی ہیں! ... ہم لوگ تو آپ کو بالکل اپنوں کی طرح سمجھتے ہیں“ وہ یہ کہتا اس کمرے کے دروازے تک آ گیا جو میرے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ ”اگر اس وقت چائے پینا چاہیں تو بنا کر لے آؤں!“ وہ مزید بولا۔

چائے پینے کو میرا دل تو چاہ رہا تھا مگر میں نے اس لئے انکار کر دیا کہ ناحق اسے زحمت ہوگی۔ ”نہیں اقبال شکریہ تمہاری پیشکش کا!“ جواباً میں نے کہا۔ ”اب میں سوؤں گی۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ اٹھایا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد لباس تبدیل کر کے مجھے بستر پر دراز ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی، پھر بھی فوری طور پر میری آنکھ نہیں لگی۔ مشرقی پاکستان کے حالات نے مجھے فکرمند کر دیا تھا۔ مجھے اتنا اندازہ نہیں تھا کہ اندر ہی اندر ملک دشمن عناصر اس قدر تقویت حاصل کر چکے ہیں، سب سے نزدیک یہ سب کچھ وہاں کی انتظامیہ کی ڈھیل کا نتیجہ تھا۔ حالات

پر اس کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ بہ یک وقت مشرقی پاکستان کے تمام شہروں میں ہنگامہ آرائی شروع ہو جانا کوئی معمولی بات بہرحال نہیں تھی۔ انتظامیہ کی ایسی غفلت تباہ کن بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ کافی دیر تک مجھے نیند نہ آ سکی اور میں بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ اسی دوران میں اپنے آئندہ اقدامات پر بھی میں غور کرتی رہی۔ اسی سوچ بچار میں جانے کب نیند میری آنکھوں میں کروٹیں لینے لگی اور میں سو گئی۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر میں نے ناشتے سے پہلے فون پر پی آئی اے انکوائری آفس سے رابطہ قائم کیا اور ضروری معلومات حاصل کر لیں، جس وقت میں فون پر بات کر رہی تھی میرے قریب اقبال اور بابر بھی تھے۔ جب ہم لوگ ناشتہ کرنے بیٹھے تو بابر نے اس سلسلے میں مجھ سے استفسار کیا ”کیا آپ کا ارادہ جیسور جانے کا ہے؟“

”ہاں“ میں نے چائے کی پیالی میں کیتلی سے چائے انڈیلتے ہوئے جواب دیا۔ ”آج ہی شام میں روانہ ہو جاؤں گی۔“

”اور واپسی کب ہوگی؟“ اس نے سوال کیا۔

”فی الحال اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی میں“ میں بولی پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا ”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟...... کیا تم سفر کرنے کے اہل ہو؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں“ وہ جلدی سے بول اٹھا ”مجھے آپ کے ساتھ چلتے ہوئے خوشی ہوگی۔“

”تو پھر ٹھیک ہے تم بھی جیسور چلو گے میرے ساتھ۔“ میں نے کہا ”ناشتہ کر کے تم ایئرپورٹ چلے جانا، فلائٹ آج شام کی ہے میں ذرا وزارت داخلہ کے دفتر تک جاؤں گی۔“

پھر بابر اور اقبال کے اصرار پر میں نے ان دونوں کو مختصراً صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ اسی ضمن میں مجھے رات کو پیش آنے والا واقعہ بھی بیان کرنا پڑا۔

”انتہائی تشویشناک اور حیرت انگیز بات بتائی ہے آپ نے“ اقبال نے میری بات سن کر رائے زنی کی۔ ”کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی۔“

بابر بھی خاموش نہ رہ سکا۔ وہ بولا ”تمام ملکی اور غیر ملکی تخریب کاروں کی گرفتاری بہت ضروری ہے، اب نہیں تو وہ کسی بھی وقت کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا کر سکتے ہیں۔ یقیناً آپ اس سلسلے میں وزارت داخلہ کے سیکرٹری سے ملنے جا رہی ہیں تاکہ جیسور پہنچ کر تخریب کاروں کیخلاف کوئی کارروائی کرتے ہوئے کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔“

”ہاں“ میں نے اقرار کیا ”یہ معاملہ ہی ایسا ہے کہ بڑے پیمانے پر آپریشن کی ضرورت ہے۔ اس کیلئے قانون نافذ کرنے والے اداروں کا تعاون بہت ضروری ہے۔“

”ان دنوں ملک کا یہ حصہ جن حالات اور جن سازشوں کا شکار ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے قانون نافذ کرنے والے ادارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ہیں، انہیں کچھ دکھائی دے رہا ہے نہ وہ کچھ سن رہے ہیں، اس کا ذمے دار آخر کون ہے؟“ اقبال کہنے لگا۔

”بہ ظاہر تو اس کی ذمے داری وزارت داخلہ ہی پر عائد ہوتی ہے۔“ میرے کچھ بولنے سے

پہلے بابر بول اٹھا۔

''یہ ظاہر نہیں بلکہ حقیقتاً!'' میں نے کہا ''میں اس سلسلے میں وزارت داخلہ کے سیکرٹری عبدالرحمٰن چودھری سے بھی بات کروں گی۔''

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ہم ناشتے سے فارغ ہوگئے۔ میں ناشتے کی میز سے اٹھ کر اندر اپنے کمرے میں گئی اور پرس سے کچھ رقم نکال کر لے آئی۔

''بابر! یہ رکھ لو۔'' میں نے کئی بڑے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

''کس لئے'' وہ مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہیں ایئرپورٹ جا کر دو ٹکٹ لانے ہیں نا!...... لو رکھ لو'' میں نے اصرار کیا۔

''مگر میرے پاس بھی پیسے ہیں' رہنے دیں نا آپ''

''یہ نہ بھولو کہ میں عمر میں تم سے بڑی ہوں اور تمہیں حکم بھی دے سکتی ہوں!''

میرے اصرار پر اس نے روپے لے لئے' پھر میں فرید احمد کی عیادت کرکے کوٹھی سے نکل گئی۔

ذرا سی دیر بعد میں ایک ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی وزارت داخلہ کے دفتر کی طرف جارہی تھی۔ میں نے اپنی آمد کے متعلق فون پر سیکرٹری کو مطلع کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

عبدالرحمٰن چودھری کا پی اے مجھے غالباً طرح طرح کے میک اپ میں دیکھنے کا عادی ہوچکا تھا۔ اس لئے اب شاید اس نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ یوں بھی میں اس میک اپ میں ایک بار دو روز قبل بھی یہاں آچکی تھی۔ اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور پھر خود ہی ایک چٹ پر میرا نام لکھ کر اندر عبدالرحمٰن چودھری کے پاس بھیج دیا۔ پی اے کی اطلاع کے مطابق ابھی چند منٹ پہلے ہی عبدالرحمٰن چودھری دفتر آیا تھا۔ اس نے مجھے اس لئے فوراً اپنے کمرے میں بلوالیا۔

''آئیے آئیے مس خان'' وہ اپنے روایتی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''صبح ہی صبح کیسے زحمت کی۔''

''تشریف رکھیے'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا پھر اس کے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اچھا ہوا کہ آپ آگئیں'' وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ''میں خود آپ سے رابطہ قائم کرنے کیلئے سوچ رہا تھا مگر میرے لئے آپ نے ایسا ناممکن بنا دیا ہے۔ میں اگر چاہوں بھی تو آپ سے رابطہ قائم نہیں کرسکتا۔''

''آپ کس سلسلے میں مجھ سے رابطہ کرنا چاہتے تھے مسٹر چودھری'' میں نے کچھ کہنے سے پہلے اس سے پوچھ لیا۔

''میں کوشش کرتا ہوں کہ حتیٰ الامکان آپ کی طرف سے باخبر رہوں اور اس کیلئے میرا واحد ذریعہ سی آئی ڈی آفس ہی ہے'' وہ کہنے لگا۔

''ہوں'' میں نے طویل سانس لیا ''تو آپ کو گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے کی رپورٹ مل گئی۔''

''جی ہاں!..... اور مجھے اس شخص کی گرفتاری کا علم بھی ہوگیا تھا جس نے ضیاالاسلام پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔''

''اور اب آپ یقیناً اس شش و پنج میں ہوں گے کہ خورشید الاسلام کے ٹھکانے کا علم ہونے کے باوجود میں نے اسے گرفتار کیوں نہیں کیا؟..... اور یہ کہ وہاں تک پہنچنے کے باوجود خالی ہاتھ کیوں لوٹ آئی؟ یہی بات ہے نا؟''

''قطعی ایسا ہی ہے!'' اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''مجھے واقعی اس پر شدید حیرت ہوئی۔ رات ہی کو فون پر انسپکٹر عبدالرشید نے مجھے اطلاع دے دی تھی۔ میں اگر چاہتا تو اپنے اختیارات سے کام لیتے ہوئے رات ہی کو خورشید الاسلام کی گرفتاری کے احکام جاری کرسکتا تھا لیکن اس طرح کی مداخلت آپ کو اطلاع دیئے بغیر مجھے کچھ مناسب سی معلوم نہیں ہوئی' میں نے سوچا کہ آپ نے اس شخص کو اگر گرفتار نہیں کیا تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی' یہ کہہ کر عبدالرحمٰن چودھری سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''جی ہاں بالکل وجہ تھی'' میں نے کہا پھر چبھتی ہوئی آواز میں بولی ''وجہ سن کر یقیناً آپ کو اپنی وزارت کی کارکردگی کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔''

''میں کچھ سمجھ نہیں سکا مس خان کہ آپ کیا کہنا چاہتی ہے۔'' وہ الجھے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

''میں سمجھاتی ہوں آپ کو مسٹر چودھری'' یہ کہہ کہ میں نے تفصیل کے ساتھ وہ تمام باتیں بیان کردیں جو امریکی ایجنٹ سولومن کی زبان سے سنی تھیں۔

سب کچھ سن کر کچھ دیر کو وہ گم صم سا ہوگیا پھر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا ''تو بات اس حد تک آگے بڑھ چکی ہے۔''

''جی ہاں مسٹر چودھری'' میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ ''مجھے یہ پوچھنے کا اختیار تو نہیں کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کیوں گہری نیند سو رہے ہیں مگر یہ ضرور جاننا چاہوں گی......''

''میں سمجھ رہا ہوں' آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھا۔ ''یقیناً اس کی ذمے داری وزارت داخلہ پر عائد ہوتی ہے' میں اس ضمن میں سختی کے ساتھ متعلقہ محکموں سے جواب طلبی کروں گا جو کچھ آپ نے بتایا ہے' وہ واقعی ہمارے لئے قابل شرم ہے۔''

میں نے ابھی اسے آئندہ اپنے اقدامات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

''آپ نے انتہائی تدبر کا ثبوت دیا ہے۔ ان حالات میں ان ملک دشمنوں پر ہاتھ ڈالنا یقیناً بہتر نہ ہوتا لیکن اب..... اب تو ان کا ہاتھ آنا مشکل ہی ہے۔'' وہ بولا

''ابھی کچھ باتیں میں نے آپ کو نہیں بتائیں مسٹر چودھری'' میں نے کہا۔ ''انہیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑا جاسکتا میں ان کے تمام منصوبے سے واقف ہوں۔ جیسور پہنچ کر ان کی اگلی منزل کون سی ہوگی اور ان کا اجتماع کہاں ہوگا یہ سب کچھ میرے علم میں ہے۔''

''پھر..... پھر تو انہیں بہت آسانی سے گرفتار کیا جاسکتا ہے'' عبدالرحمٰن چودھری پرجوش لہجے

میں کہنے لگا۔

''اتنا آسان بھی نہیں مسٹر چودھری' جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بے حد احتیاط اور رازداری کی ضرورت ہے۔ ملکی اور غیر ملکی تمام تخریب کاروں پر بہ یک وقت ہاتھ ڈالنے کیلئے ایک بڑے آپریشن کی ضرورت ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ سے تعاون چاہتی ہوں۔''

''میری وزارت آپ سے ہر ممکن تعاون کرنے پر راضی ہے۔ آپ حکم تو کریں۔'' اس نے کہا۔

پھر میں نے اسے تمام تر جزئیات کے ساتھ اپنے آیندہ اقدامات سے آگاہ کردیا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔

''میں جیسور میں آپ کیلئے وہ تمام تر انتظامات کرادوں گا جو آپ چاہتی ہیں۔'' اس نے مجھے یقین دلایا۔ ''بس ذرا آپ کی شناخت کا مسئلہ ہے وہاں کے حکام......''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں'' میں درمیان میں بول اٹھی' صدر مملکت کی طرف سے جاری کردہ خصوصی مختار نامے کی فوٹو کاپی میرے پاس موجود ہے' یقیناً میری شناخت کیلئے اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ ذاتی طور پر کوئی لیٹر وغیرہ دینا چاہیں تو بھی مجھے اعتراض نہیں۔''

میری مراد محض یہ تھی کہ عذرا خان آپ ہی ہیں' اس کی تصدیق حکام ضرور چاہیں گے' خصوصاً ملٹری انٹیلی جنس والے' عبیدالرحمٰن چودھری نے کہا ''گڑبڑ بھی یہ ہے کہ آپ میک اپ میں ہوں گی۔''

عبیدالرحمٰن چودھری غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کی تصدیق بہرحال ضروری تھی کہ میں کوئی اور نہیں عذرا خان ہی ہوں۔ معاملہ کیونکہ ایک بڑے آپریشن کا تھا جس میں ملٹری انٹیلی جنس کے تعاون کی بھی ضرورت تھی' اس لئے بالاخر مجھے یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ میں میک اپ کے بغیر جیسور میں موجود ملٹری انٹیلی جنس کے حکام سے ملوں گی۔

میرا فیصلہ سن کر عبیدالرحمٰن چودھری نے اطمینان کا اظہار کیا' اب کوئی مسئلہ نہیں رہے گا آپ بے فکر رہیں۔ میں آج ہی تمام بندوبست کردوں گا۔ جیسور پہنچ کر آپ کو کسی بھی قسم کی دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

''مسٹر چودھری آپ ملٹری انٹیلی جنس والوں کو اس بات سے ضرور آگاہ کردیں کہ میں اپنے اقدامات میں کوئی مداخلت پسند نہیں کرتی' انہیں مجھ سے تعاون کرنا ہے' مجھ پر حکم نہیں چلانا!..... آپ سمجھ گئے میری بات؟''

''بالکل سمجھ گیا'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں آپ کے مزاج سے بڑی حد تک واقف ہوچکا ہوں مس خان'' یہ کہہ کر اس نے اپنے چپراسی کو بلانے کیلئے گھنٹی بجائی۔

''مسٹر چودھری اگر آپ چائے منگوانے کیلئے چپراسی کو بلا رہے ہیں تو زحمت نہ کریں' میں چائے پی کر آئی ہوں' میں حفظ ماتقدم کے طور پر بولی۔

''مجھے یاد ہے' پہلے بھی آپ چائے پیئے بغیر چلی گئی تھیں' آج میں اس طرح نہیں جانے دوں گا۔''

میں نے اس کے لہجے میں خلوص کی جھلک محسوس کر کے مزید انکار نہیں کیا' اس دوران میں چپراسی آگیا۔ عبیدالرحمٰن چودھری نے اس سے چائے لانے کو کہا۔

''آپ اگر چاہیں تو میں جیسور میں آپ کے ٹھہرنے کا بندوبست بھی کردوں گا۔'' چپراسی چلا گیا تو اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''نہیں'' اس کی ضرورت نہیں ہے' میں کسی بھی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گی'' میں نے پیشکش مسترد کردی۔

''میں اس لئے تو کہہ رہا تھا جیسور ایک چھوٹا سا شہر ہے' وہاں زیادہ اچھے ہوٹل نہیں ہیں' دراصل اس کی حیثیت سرحدی فوجی چھاؤنی کی سی ہے'' وہ کہنے لگا۔

''چھوٹے بڑے ہوٹل سے میرے لئے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا' میں دراصل آزاد فضا کی قائل ہوں' کسی قسم کی پابندی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی'' میں اپنی بات پر قائم رہی۔

''جیسے آپ کی مرضی! میں تو آپ ہی کی سہولت کیلئے عرض کررہا تھا'' عبیدالرحمٰن چودھری بولا۔

پھر چائے آنے اور چائے پینے کے دوران میں اس سے کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی' چائے پیتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

وزارت داخلہ کے دفتر سے میں واپس اقبال کی کوٹھی پہنچی تو بابر ایئرپورٹ سے ٹکٹ لے کر آچکا تھا۔ اس کے استعمال کا بہت سا سامان ابھی بادام تلی گھاٹ والے مکان ہی میں تھا۔ میں آگئی تو وہ اقبال کے ساتھ اس کی گاڑی میں وہاں جاکر اپنا سوٹ کیس و دیگر ضروری اشیاء لے آیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں کچھ دیر آرام کرنے اپنے کمرے میں آگئی۔ بابر کے چہرے پر میک اپ کرنا میں نے اس لئے بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ جیسور پہنچ کر خود مجھے بھی میک اپ ختم کردینا تھا۔ ہر چند کہ اس میں خطرہ تھا لیکن یہ خطرہ مجھے بہرحال مول لینا تھا۔ ہاں ڈھاکہ کی حد تک میں اسی میک اپ میں رہنا چاہتی تھی۔ سبود مکرجی کے خطرے کو میں نے ابھی نظرانداز نہیں کیا تھا۔ اس کی مسلسل خاموشی مجھے کسی خطرے کا پیش خیمہ معلوم ہورہی تھی۔

تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد میں اٹھ گئی۔ غسل کر کے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد میں نے اپنا اٹیچی کیس اور ایئر بیگ ٹھیک کیا۔ اسی دوران میں اقبال میرے لئے چائے لے کر آگیا۔ میں نے اس سے بابر کے بارے میں پوچھا کہ وہ تیار ہوگیا یا نہیں؟

''جی ہاں'' وہ بالکل تیار ہے'' اقبال نے جواب دیا' پھر بولا ''اگر فرید بالکل صحت یاب ہوتا تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتا مگر اسے میری ضرورت ہے ابھی۔''

''ہاں'' اس کی نگہداشت کیلئے تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے'' میں نے اس کی تائید میں کہا ''خیر پھر کبھی سہی''

پھر اقبال کی گاڑی میں میں اور بابر وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ وہاں سے ایئرپورٹ دور ہی کتنا تھا! میرے ہی ایما پر بابر ایئرپورٹ لاؤنج میں مجھ سے الگ بیٹھا تھا۔ ایسا میں نے محض احتیاطاً کیا تھا۔ ابھی جہاز کی روانگی میں کچھ وقت تھا۔ ویٹنگ لاؤنج میں صرف وہی افراد بیٹھے

تھے جنہیں اس فلائٹ سے سفر کرنا تھا۔ مجھے ابھی وہاں بیٹھے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ میں نے ایک خوبصورت عورت کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ سبز رنگ کی پھولدار ساری پہنے ہوئے تھی۔ اس کی طرف متوجہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ اس نے بہت غور سے میرے چہرے کا جائزہ لیا تھا' یوں جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ فطری سی بات ہے کہ عورتیں عموماً عورتوں ہی کے قریب بیٹھنا پسند کرتی ہیں لیکن میں اس کی طرف سے کچھ کھٹک گئی تھی اس لئے جب وہ میرے بالکل قریب دائیں جانب آ کر بیٹھ گئی تو میں چوکنا ہو گئی۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا اشارہ دے رہی تھی۔ بظاہر میں اس عورت کی طرف سے بے پروا مگر حقیقتاً اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ میرے دائیں شانے سے ایئر بیگ لٹکا ہوا تھا جو اس عورت اور میرے درمیان حد فاصل تھا۔ ایئر بیگ میں ہلکا پھلکا کچھ سامان تھا جو سفر کے دوران میں میرے کام آ سکتا تھا۔ میں نے اس لئے اسے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ عورت کن اکھیوں سے میرا جائزہ لے رہی ہے اور کچھ بے چین سی بھی ہے۔ اس کا بایاں ہاتھ ساری کے پلو سے چھپا ہوا تھا۔ اس نے ایک بار ساری کا پلو اس طرح اٹھایا کہ میرے ایئر بیگ کا کچھ حصہ بھی اس میں چھپ گیا پھر میں نے پلو کے نیچے خفیف سی حرکت محسوس کی۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ اس عورت کا ہاتھ میرے ایئر بیگ کی زپ تک پہنچ چکا ہے۔

آخر یہ کیا چاہتی ہے؟ میں نے سوچا۔ رقم میرے پرس میں تھی جو بائیں ہاتھ میں تھا۔ اس لمحے میں نے زپ کھلنے کی بے حد خفیف سی آواز سنی۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے ایک دم اس عورت کی طرف پلٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے ساری کا پلو ہٹا دیا۔ مجھے اس عورت کے دوسرے ہاتھ میں ایک چوکور پیکٹ نظر آیا جسے وہ یقیناً میرے ایئر بیگ میں رکھنے والی تھی مگر میں نے عین موقع پر اسے پکڑ لیا تھا۔

ذرا سی دیر میں وہاں افراتفری پھیل گئی۔ وہ عورت مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے چیخنے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ پر میری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کی جگہ کوئی مرد بھی ہوتا تو اپنا ہاتھ نہ چھڑا پاتا۔ اسی دوران میں نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا چوکور پیکٹ نیچے پھینک دیا تھا۔ اس وقت ایئرپورٹ سکیورٹی کا ایک افسر وہاں پہنچ گیا۔ میرے اور اس عورت کے گرد وہاں موجود افراد جمع ہو گئے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں سکیورٹی افسر سے کچھ کہتی وہ عورت بول اٹھی۔ ''اس عورت نے خواہ مخواہ میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے اور چھوڑ نہیں رہی'' وہ سکیورٹی افسر سے میری شکایت کر رہی تھی۔ ''میں جب یہاں آ کر بیٹھی تو یہ عورت اپنے بیگ میں اس پیکٹ کو سنبھال کر رکھ رہی تھی' میری کہنی لگنے سے پیکٹ نیچے گر گیا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا'' وہ سامنے پڑے ہوئے پیکٹ کی طرف دوسرے ہاتھ سے اشارہ کرنے لگی۔

''خاتون! کیا ہے اس پیکٹ میں؟'' اس سکیورٹی افسر کا لہجہ میرے لئے خلاف توقع تھا۔ اس کے لہجے میں ایسی سختی تھی جیسے سارا قصور میرا ہی ہے اور وہ مجھے ہی اصل قصوروار تصور کر چکا ہے۔ اس نے مزید کہا ''ان محترمہ کا ہاتھ چھوڑ دیجئے آپ''

''یہ جھوٹ بول رہی ہے' بالکل سفید جھوٹ'' میں نے مصلحتاً اس عورت کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے

کہا کیونکہ اب وہ اتنے آدمیوں کے درمیان سے بھاگ نہیں سکتی تھی۔ اس کے بعد میں نے مزید کہا ''یہ عورت میرے ایئر بیگ کی زپ کھول کر یہ سامنے پڑا ہوا پیکٹ اس میں رکھنا چاہتی تھی کہ بروقت میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے فوراً پیکٹ نیچے پھینک دیا۔''

''آپ سچ کہہ رہی ہیں یا یہ محترمہ' اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے'' سکیورٹی افسر کے لہجے سے جانبداری کا اظہار ہو رہا تھا ''آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ کا بیان درست ہے؟'' سکیورٹی افسر مجھ سے مخاطب تھا۔

اس وقت تک بابر بھی میرے قریب آ چکا تھا۔ وہ اسی موقع پر بول اٹھا ''میں نے بھی اس عورت کو ایئر بیگ کی زپ کھولتے دیکھا تھا' یہ خاتون سچ کہہ رہی ہیں۔''

''جھوٹا ہے یہ شخص'' وہ عورت ہاتھ اٹھا کر چیخی ''یہ وہاں دور بیٹھا تھا' اسے کس طرح نظر آ سکتا ہے کہ......''

بابر مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سکیورٹی افسر نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا پھر جھک کر سامنے پڑا ہوا پیکٹ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا ''پہلے یہ پیکٹ تو دیکھ لیا جائے کہ اس میں ہے کیا! جو یہ دونوں خواتین اسے اپنی ملکیت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں'' یہ کہتے ہوئے اس نے پیکٹ اٹھا کر اسے سونگھا پھر جلدی جلدی کاغذ کی تہیں کھولنے لگا۔ اسی عرصے میں سکیورٹی کے عملے کا ایک اور شخص بھی وہاں آ چکا تھا۔

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اس پیکٹ میں کوئی غیرقانونی شے ہی ہوگی اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ پیکٹ میں تقریباً ایک سیر چرس تھی' وہاں موجود افراد بھی اس پیکٹ سے چرس برآمد ہوتے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ میں اچھی طرح اس تمام ڈرامے کا مقصد سمجھ چکی تھی یقیناً کوئی شخص میرا کوئی حریف مجھے اس چکر میں پھنسا کر جیسور جانے سے روکنا چاہتا تھا مگر وہ کون ہو سکتا تھا؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میرا حریف سبود مکرجی ہی تھا لیکن اسے میری جیسور روانگی کا علم کیسے ہو سکتا تھا؟ میں انہیں سوالوں کے گرداب میں پھنسی ہوئی تھی کہ سکیورٹی افسر نے مجھے مخاطب کیا اور میں چونک اٹھی ''جی فرمائیے! مجھ سے آپ نے کچھ کہا؟'' میں بول اٹھی۔

''جی ہاں'' وہ جواباً بولا۔ مجھے افسوس ہے کہ ضروری تفتیش کے سلسلے میں آپ کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا'' آپ دونوں میں سے یہ پیکٹ کس کا ہے؟ اس بات کا فیصلہ تو ہونا ہی چاہئے نا! آپ اب اس فلائٹ سے بھی سفر نہیں کر سکیں گی۔''

''یہ سراسر دھاندلی ہے' ظلم ہے'' بابر نے سکیورٹی افسر سے کہا ''میں جب کہہ رہا ہوں کہ اس عورت نے میرے سامنے ان خاتون کے ایئر بیگ میں......''

''ٹھیک ہے' آپ بھی چلئے'' سکیورٹی افسر نے بابر کی بات کاٹ دی۔ ہم آپ کا بیان بھی لیں گے مگر یہ خیال رہے کہ اس کیلئے آپ کو بھی یہ فلائٹ مس کرنا پڑے گی۔''

اس دوران میں میرا ذہن انتہائی تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ میرے نزدیک یہ سارا ڈرامہ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ میں اس صورتحال سے نکلنے کی ایک راہ سوچ چکی تھی' اس لئے بابر کے مزید کچھ کہنے سے پہلے بول اٹھی۔

"نوجوان" تم کیوں اس چکر میں پھنس کر اپنی راہ کھوٹی کر رہے ہو! میں اس جھوٹی عورت اور اس چکر سے تن تنہا بھگت لوں گی۔"

بابر میرا اشارہ سمجھ کر خاموش ہوگیا پھر اس نے سکیورٹی افسر کے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ دونوں سکیورٹی والے مجھے اور اس عورت کو لے کر لاؤنج سے باہر آگئے وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر لیڈیز باتھ رومز تھے۔

"پلیز! میں ذرا باتھ روم جانا چاہتی ہوں" میں نے سکیورٹی افسر کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا' پھر رک گئی۔

"ٹھیک ہے' ہو آیئے! مگر یہ خیال رکھیے گا کہ اس طرف دوسرا کوئی دروازہ نہیں ہے جہاں سے آپ بچ کر نکل سکیں" سکیورٹی افسر کے لہجے میں استہزا تھا "ہم یہاں باہر آپ کے منتظر ہیں۔"

احمق کہیں کا! میں نے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ سکیورٹی افسر نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس حصے میں داخل ہونے کا ایک ہی دروازہ تھا۔ میں تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتی ہوئی ایک خالی باتھ روم میں داخل ہوگئی اور پھر اندر سے اس کی چٹخنی چڑھا دی۔ میں نے نسبتاً صاف باتھ روم کا انتخاب کیا تھا پھر بھی وہاں بدبو تھی مگر یہ وقت ان چیزوں پر دھیان دینے کا نہیں تھا۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر اپنے چہرے پر چڑھی ہوئی جھلی اور اس سے منسلک وگ الگ کردی' ان دونوں چیزوں کو میں نے ایئر بیگ میں رکھ دیا۔ ایئر بیگ میں ایک شال بھی موجود تھی۔ وہ میں نے [illegible]ں کر اوڑھ لی تاکہ اس کے نیچے میری قمیض کا رنگ چھپ جائے۔ ایئر بیگ میں کوئی زیادہ قیمتی چیزیں نہیں تھیں۔ میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا' چہرے سے میک اپ ختم ہونے اور شال اوڑھنے کے بعد اب مجھے پہچان لینا ممکن نہیں رہا تھا۔ اگر میرے شانے پر وہ ایئر بیگ بھی لٹک رہا ہوتا تو شاید مجھ پر شک کیا جاتا۔ باتھ روم سے نکل کر میں باہر لگے ہوئے واش بیسن کی طرف بڑھی اور ہاتھ دھوتے ہوئے ایک اچٹتی ہوئی نظر سامنے لگے ہوئے آئینے پر ڈالی اور مطمئن انداز میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ باہر نکلتے ہی میری نگاہ اس عورت اور سکیورٹی افسر پر پڑی' مگر میں نے فوراً ہی دوسری طرف نگاہ پھیر لی اور لاتعلقی کے سے انداز میں ویٹنگ لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ سکیورٹی افسر نے تو مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی البتہ میں نے اس عورت کو ضرور چونکتے دیکھا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ عورت بحیثیت عذرا خان یقیناً مجھ سے واقف رہی ہوگی۔

جب میں اپنا ٹکٹ دکھا کر دوبارہ ویٹنگ لاؤنج میں داخل ہوئی تو اس فلائٹ کے مسافر ایئر پورٹ کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ فلائٹ کا وقت ہوگیا تھا اور ایک بس مسافروں کو جہاز تک لے جانے والی تھی۔ میری نظریں بابر کو تلاش کر رہی تھیں' جلد ہی مجھے اپنی تلاش میں کامیابی ہوگئی۔ وہ مجھے ایک جانب کھڑا ہوا نظر آ گیا۔ اس کے چہرے سے اضطراب اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا' وہ ان مسافروں سے الگ کھڑا تھا جو بس میں بیٹھنے کیلئے نظم و ضبط کے ساتھ باری باری آگے بڑھ رہے تھے' میں بابر کے قریب پہنچ گئی۔

"یہاں الگ کیوں کھڑے ہو!" میں نے اسے مخاطب کیا' فلائٹ کا وقت ہوگیا ہے' چلو نا۔"

وہ مجھے اپنے قریب دیکھ کر چونک اٹھا اور پھر اس کے چہرے سے اطمینان کا اظہار ہونے لگا۔ وہ میرے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگا "میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ کہیں۔۔۔"

"فی الحال کسی تبصرے سے گریز کرو! تمہاری اطلاع کیلئے صرف اتنا بتا دوں کہ وہ عورت مجھے پہچانتی ہے" میری آواز دھیمی تھی۔ "ہم جتنی جلدی جہاز میں سوار ہوسکیں بہتر ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے حریف اپنی ایک چال کی ناکامی کے بعد کوئی دوسرا حربہ آزمانے کی کوشش کریں۔"

جواباً بابر نے میری ہدایات پر عمل کیا اور مزید کچھ نہ بولا۔ "ہم دونوں بس میں سوار ہوگئے' بس چلنے والی تھی کہ میں نے دو افراد کو اس میں سوار ہوتے دیکھا' ان میں سے ایک غیر ملکی تھا۔ وہ دونوں ہماری بائیں جانب والی ایک خالی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر چونک اٹھی۔ خورشید الاسلام اور سولومن کے قد اور جسامت ان دونوں نوواردوں سے مماثل تھی۔ جیسور جانے والی یہ پہلی فلائٹ تھی اور یہ عین ممکن تھا کہ وہ دونوں بھی اس فلائٹ سے سفر کرتے۔ ان دونوں کے اصل چہرے میک اپ کے پیچھے چھپے ہوسکتے تھے۔ اگر وہ دونوں واقعی سولومن اور خورشید الاسلام تھے تو یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھٹک سکتے تھے' مگر ظاہر ہے اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا پھر میں ذرا سی ترچھی ہو کر بیٹھ گئی کہ ان کی نظروں میں نہ آسکوں۔

"کیا بات ہے' آپ کچھ فکر مند سی نظر آ رہی ہیں" بابر نے دھیمی آواز میں مجھ سے سوال کیا۔ اس نے میری پریشانی محسوس کرلی تھی۔

"بائیں طرف ایک سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو افراد میری پریشانی کا سبب ہیں" میں نے بھی بہت دھیمی آواز میں اسے صورتحال سے آگاہ کردیا۔ ان میں سے ایک سولومن اور دوسرا خورشید الاسلام ہوسکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ بات کیوں میرے ذہن سے نکل گئی تھی کہ وہ دونوں بھی جیسور پہنچنے کیلئے پہلی ہی فلائٹ کو ترجیح دیں گے' بہرحال اب جو ہوگا دیکھا جائے گا ادھر اس طرح نہ دیکھنا کہ انہیں کسی قسم کا شبہ ہوجائے۔"

جہاز کے قریب پہنچ کر بس رک گئی اور مسافر اترنے لگے۔ میں دانستہ ذرا تاخیر سے اتری تاکہ وہ دونوں جہاز میں پہلے سوار ہوجائیں پھر جب میں نے جہاز میں سوار ہونے کیلئے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو ان دونوں کو آخری سیڑھی سے جہاز میں داخل ہوتے دیکھا' میری نگاہ انہی دونوں پر تھی۔ میں اب تک اس بات سے لاعلم تھی کہ وہ دونوں مجھے دیکھ چکے ہیں یا نہیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے دانستہ اس طرح شال اوڑھ لی کہ میرا نصف سے زیادہ چہرہ چھپ گیا۔ ایک عورت ہونے کے ناطے مجھے اس طرح اپنا چہرہ چھپانے کی آزادی تھی۔ جہاز میں داخل ہوتے وقت میں نے اپنا چہرہ مزید چھپا لیا کہ اس کے سوا ان دونوں کی نظروں سے بچنے کی کوئی اور صورت نہیں تھی۔ ایک ایئر ہوسٹس نے میری اور بابر کی رہنمائی کی اور ہم دونوں اپنی سیٹوں تک پہنچ گئے۔ میں اس دوران میں ان دونوں کو اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھتے ہوئے دیکھ چکی تھی' وہ دونوں دائیں حصے میں تیسری قطار کی نشستوں پر بیٹھے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد جب جہاز جیسور کیلئے ڈھاکہ ایئرپورٹ سے پرواز کرگیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس کے ساتھ مجھے ایئرپورٹ پر پیش آنے والا واقعہ یاد آنے لگا۔ میں اب تک کسی نتیجے پر نہیں

پہنچ سکی تھی کہ مجھے اس چکر میں پھنسانے والا کون ہوسکتا تھا۔ میری جیسور روانگی کا علم صرف چند افراد کو تھا۔ ان میں سے ایک یعنی بابر میرے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ بابر کا دوست اقبال اس بات سے واقف تھا' ان دونوں پر کسی قسم کا شک کرنا خود اپنے آپ پر شک کرنے کے مترادف تھا۔ اب صرف ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری رہ جاتا تھا۔ کیا وہ دشمنوں کا آلہ کار ہوسکتا ہے؟ بہت دیر تک میرا ذہن اسی ایک سوال سے الجھارہا پھر میں نے سوچا کہ یہ بھی تو ممکن ہے وزارت داخلہ میں دشمن کے کچھ ایسے آلہ کار موجود ہوں جو ہوم سیکرٹری کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہوں۔

اس موقع پر مجھے یاد آیا کہ وزارت داخلہ کے ریکارڈ سے میری تصویر بھی غائب کردی گئی تھی۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں دشمن کے آلہ کار یقیناً موجود ہیں۔ عبیدالرحمٰن چودھری نے ظاہر ہے ٹرنک کال کے ذریعے جیسور کے حکام کو میرے متعلق ہدایات دی ہوں گی۔ اگر اس کی نگرانی کی جارہی ہے تو اس کی فون کالز بھی چیک کی جاسکتی ہیں' انہیں ٹیپ بھی کیا جاسکتا ہے! یہی ممکن ہے میں نے یہ سوچتے ہوئے گہرا سانس لیا' مگر اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا۔ میک اپ کے باوجود کس طرح پہچان لیا گیا' اس میک اپ میں بحیثیت عذرا خان مجھے پہچاننے والوں میں ایک شخص اور بھی تھا جسے میں اب تک نظرانداز کرتی آئی تھی۔ وہ شخص ہوم سیکرٹری کا پی اے تھا' وہ بھی تو دشمنوں سے ملا ہوسکتا ہے۔ حقیقت کیا تھی' کیا نہیں' اس سلسلے میں محض قیاس ہی کیا جاسکتا تھا۔ سوچتے سوچتے جب میرا ذہن تھک گیا تو میں نے آنکھیں بند کرلیں اور کچھ دیر کیلئے ہر خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

''کیا سوگئیں آپ؟'' چند ہی لمحے بعد بابر نے مجھے مخاطب کیا اور میں چونک اٹھی۔

''نہیں'' میں نے جواب دیا۔ ''بس ذرا اس طرح کچھ دیر آرام کررہی تھی' تم کہو کیا کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''میں اب تک اس واقعے کا کوئی سبب تلاش نہیں کرپایا جو ویٹنگ لاؤنج میں پیش آیا تھا۔ معلوم نہیں' وہ عورت کون تھی اور اس نے وہ حرکت کیوں کی؟ بابر نے کہا'' آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ عورت آپ کو پہچانتی ہے' کیا آپ بھی اسے جانتی ہیں؟''

''نہیں' میں اسے نہیں جانتی مگر اندازہ ضرور لگاسکتی ہوں کہ وہ کون ہوگی؟...... تمہارے کہنے پر میں اس کے قد و قامت اور جسامت پر غور کررہی ہوں...... سبودمکرجی کی ملازمہ اور دست راست شکنتلا کا قد و قامت بھی یہی تھا۔ اگر وہ شکنتلا ہی تھی تو یقیناً میک اپ میں ہوگی کیونکہ میں اس کا اصل چہرہ دیکھ چکی ہوں۔''

''لیکن سبودمکرجی کو یہ علم کس طرح ہوسکتا ہے کہ آپ آج کس فلائٹ سے اور کہاں کیلئے روانہ ہورہی ہیں؟''

''بابر! تمہارے ذہن میں جو سوالات ابھر رہے ہیں' میں ابھی ان سب پر اچھی طرح غور کرچکی ہوں' فی الحال یوں سمجھ لو کہ قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ کسی طرح اور کسی بھی ذریعے سے سبودمکرجی کو یہ اطلاع مل گئی کہ میں جیسور جارہی ہوں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ امریکی ایجنٹ سولومن کیلئے کام کررہا ہے۔ سولومن سے اس کا یہ معاہدہ ہے' وہ مجھے کسی بھی صورت اپنے چکر میں پھنسائے

رکھے تاکہ سولومن آزادی کے ساتھ وہ سب کچھ کرتا رہے جو کرنا چاہتا ہے۔ میری جیسور روانگی کی بات جاننے کے بعد اس نے مجھے پھانسنے کیلئے اپنی محبوبہ شکنتلا کو استعمال کیا۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ اس نے پہلے سے سکیورٹی افسر کو بھی سانٹ لیا ہو۔ اس کا ثبوت سکیورٹی افسر کا میرے ساتھ سخت رویہ تھا' وہ غیر جانبدار معلوم نہیں ہوتا تھا۔''

''اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ حرکت سبودمکرجی ہی کی تھی تو کیا وہ یہ نہیں جانتا ہوگا کہ آپ اپنے اثر و رسوخ کے سبب اس الزام سے بچ جائیں گی؟'' بابر بولا۔

''یقیناً جانتا ہوگا'' میں نے کہا ''اس کا مقصد فوری طور پر اس طرح مجھے جیسور روانہ ہونے سے روکنا تھا' بعد میں لازماً وہ مجھے زیر دام لانے کیلئے کوئی اور حربہ آزماتا۔''

''ایک اور بات بھی سمجھ میں نہیں آئی' کہ میک اپ کے باوجود اس عورت نے آپ کو کیسے پہچان......''

''ایک بات ہی کیا بابر' بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آرہیں ابھی...... انشاء اللہ وقت آنے پر ساری باتیں واضح طور پر سامنے آجائیں گی۔'' میں نے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ بابر یقیناً ایک ذہین نوجوان تھا' اس لئے اس کے ذہن میں ابھی وہی سوالات پیدا ہورہے تھے جن پر میں پہلے ہی غور کرچکی تھی۔ میں نے ان سوالوں پر غور کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا تھا' وہ قیاسات پر مبنی تھا اور کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ درست ہی ہوتا۔ یہی سبب تھا کہ اس سے میں نے بابر کو آگاہ نہیں کیا۔

میں اس سے پہلے کبھی جیسور نہیں گئی تھی مگر بابر نے وہ شہر دیکھا تھا۔ بابر نہ صرف جیسور دیکھ چکا تھا بلکہ بڑی حد تک گردونواح کی آبادیوں سے بھی واقف تھا۔

اس وقت سورج ڈوب رہا تھا جب جہاز جیسور ایئرپورٹ پر اترا۔ میں نے جہاز سے اترتے ہوئے بھی احتیاط سے کام لیا تھا اور اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ ان دونوں مشتبہ افراد کی نظر میں نہ آسکوں۔ میرا نصف چہرہ شال میں چھپا ہوا تھا۔ ان دونوں کو میں نے پہلے جہاز سے اتر جانے دیا تھا۔

جیسور ایئرپورٹ سے بابر نے ایک ٹیکسی کی اور پھر ہم دونوں ایک متوسط درجے کے ہوٹل تک پہنچ گئے۔ اس ہوٹل میں برابر برابر دو کمرے حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہ بنا۔ ہوٹل کے زیادہ تر کمرے خالی ہی پڑے تھے۔

''بابر! تم نہا دھو کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد میرے کمرے میں آجانا!'' میں نے اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے کہا۔

''بہتر ہے'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد ہم دونوں لباس وغیرہ تبدیل کرکے ایک ساتھ چائے پی رہے تھے۔

''کل صبح میں یہاں کے حکام سے ملوں گی'' میں نے بابر کو بتایا۔

''کل صبح!'' وہ حیرت سے بولا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ آج ہی رات......''

''آج کی رات آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟'' بابر نے سوال کیا۔

"اس بات کی تصدیق کہ جو کچھ میں نے سنا ہے اور ان لوگوں کا منصوبہ ہے' اس میں کسی قسم کی تبدیلی تو نہیں کی گئی' میں نے جواب دیا۔

"مگر تصدیق کی صورت کیا ہوگی؟" بابر نے پوچھا۔

"ریلوے سٹیشن کے قریب تیسرے درجے کا ایک ہوٹل ہے۔" میں نے بابر کو اس ہوٹل کا نام بتایا۔ ان دونوں کو اس ہوٹل میں ٹھہرنا تھا غالباً تیسرے درجے کے اس ہوٹل کو انتخاب انہوں نے کسی خاص سبب سے کیا ہوگا...... ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس ہوٹل کو وہ اپنے لئے محفوظ تصور کرتے ہوں یا ان کا خیال ہو کہ وہاں ان کی موجودگی کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا جائے گا۔ بہرحال جو کچھ بھی رہا ہو' ہم ان دونوں کو وہاں چیک کرسکتے ہیں۔ ایسے کسی ہوٹل میں کسی بھی غیر ملکی کی بابت معلومات حاصل کرنا کچھ ایسا مشکل نہ ہوگا۔ اس ہوٹل میں شاید وہی ایک غیر ملکی قیام پذیر ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کھانا وغیرہ کھا کر ہم اسی طرف چلیں؟"

"جو آپ کی مرضی' بابر جواباً بولا۔ "یہاں سے ریلوے سٹیشن زیادہ دور نہیں ہے' واکنگ ڈسٹینس پر ہے' اس بہانے کھانا کھا کر چہل قدمی بھی ہوجائے گی۔"

"اگر وہ دونوں وہاں ہوئے تو یہ تصدیق ہوجائے گی۔ کہ ان کا پروگرام حسب دستور برقرار ہے۔" میں بولی۔ "اس کے علاوہ یہ بھی علم ہوجائے گا کہ مجھے جن دو مسافروں پر شک تھا وہ درست تھا یا نہیں!"

"اس طرح کسی خطرے کا امکان تو نہیں؟ آپ اور میں دونوں ہی میک اپ میں نہیں ہیں۔ میرے لئے تو خیر کوئی ایسی فکر کی بات نہیں لیکن آپ کو شاید وہ لوگ میک اپ کے بغیر پہچان لیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اس کی تائید میں کہا کم از کم میرے لئے میک اپ ضروری ہوگا۔ میرے اٹیچی کیس میں میک اپ کا سامان موجود ہے۔ اس میں ایسا ریڈی میڈ میک اپ بھی ہے جس کیلئے زیادہ وقت درکار نہیں ہوگا اور اسے بہ آسانی ختم بھی کیا جاسکتا ہے۔"

اس گفتگو کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میں اور بابر اس ہوٹل سے ساتھ ساتھ نکلے۔ اب میرے چہرے پر میک اپ تھا اور بالوں کا رنگ بھی وگ کی وجہ سے بدلا ہوا تھا۔ بابر کے لئے میں نے میک اپ ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ہم لوگ چہل قدمی کرتے ہوئے مطلوبہ ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے۔

ابھی ہم ریلوے سٹیشن تک نہیں پہنچے تھے کہ اچانک مخالف سمت سے میں نے اس شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا جس پر مجھے خورشید الاسلام ہونے کا شبہ تھا۔ اسے میں نے جہاز میں ایک غیر ملکی کے ساتھ دیکھا تھا مگر اس وقت وہ تنہا نظر آرہا تھا۔ ہماری بائیں جانب چند قدم کے فاصلے پر ایک چائے خانہ تھا' وہ شخص اس چائے خانے میں داخل ہوگیا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بابر کے ساتھ اس چائے خانے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازے سے اندر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔

سٹیشن سے کچھ دور اس چائے خانے میں اس وقت کچھ زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ وہ لہراتا ہوا کونے والی ایک میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کونے والی اس میز پر پہلے سے ایک مقامی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ میں ایک سرسری سی نظر ڈالتی ہوئی چائے خانے کے دروازے سے آگے بڑھ گئی۔ بابر میرے ساتھ تھا۔

"یہ تو انہی دونوں میں سے ایک ہے" بابر نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ہاں تم ٹھیک سمجھے" میں نے اس کی تائید کی۔ "یہ وہی ہے!...... اور اب میں نے اسے چلتے ہوئے بھی دیکھ لیا ہے۔ یہ سو فیصد خورشید الاسلام معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چلنے کا انداز بالکل وہی ہے اور جسامت کے بارے میں تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔"

"پھر کیا خیال ہے' اس ہوٹل تک چلیں گی؟" بابر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں!...... یہ معلوم کرنا تو بہرحال ضروری ہے کہ وہ دونوں وہاں ٹھہرے بھی ہیں یا نہیں!" میں بولی۔

"لیکن یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ہوٹل میں ٹھہرنے والے وہی ہیں؟" بابر نے سوال کیا "ظاہر ہے کہ انہوں نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنے اصل نام تو لکھوائے نہیں ہوں گے۔"

"میں تم سے کہہ چکی ہوں نا کہ اس ہوٹل میں اگر کسی غیر ملکی کا قیام ہوگا تو وہ صرف سولومن ہی ہوسکتا ہے' پھر ہم یہ بھی معلوم کرسکتے ہیں کہ وہ آج ہی آیا ہے یا نہیں۔"

پھر ہم دونوں اس ہوٹل تک پہنچ گئے۔ باہر سے بھی وہ ہوٹل تیسرے درجے ہی کا دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ لوگ اندر بیٹھے ہوئے گندی میز کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان میں کوئی عورت مجھے نظر نہیں آئی' کسی ایسے ہوٹل میں ایک عورت ہونے کے ناطے میرا داخل ہونا کچھ مناسب نہیں تھا' یہی سوچ کہ میں اندر جانے سے رک گیا۔

"بابر" میں نے اپنے خیال کا اظہار بابر سے بھی کردیا۔ پھر بولی "تم اندر جاکر کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے ضروری معلومات حاصل کرآؤ' میں یہیں باہر ٹہلتی ہوں۔ غالباً تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کیا معلومات حاصل کرنا ہیں۔"

"ٹھیک ہے' میں چلا جاتا ہوں' آپ یہیں باہر رکیں۔" بابر نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور پھر اس ہوٹل میں داخل ہوگیا۔

میں چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھ گئی۔ میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ اگر ڈھاکہ ایئرپورٹ پر مجھے چرس کے چکر میں پھنسانے والا اسبود مکرجی ہی تھا تو پھر اس کے ذریعے امریکی ایجنٹ سولومن کو بھی یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ میں جیسور کا رخ کررہی ہوں۔ ایسا ممکن بھی تھا اور نہیں بھی بہرحال یہ بات تھی میرے لئے تشویشناک اس طرح ملک دشمن عناصر چوکنا ہوسکتے تھے اور اپنے منصوبے میں بھی کوئی ترمیم کرسکتے تھے۔

میں یہی سب کچھ سوچتی ہوئی ذرا آگے نکل گئی اور پھر ہوٹل کی طرف پلٹ آئی۔ بابر کو ہوٹل میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ میں ہوٹل کے سامنے سے گزری ہی تھی کہ اسے اندر سے باہر آتے دیکھ لیا تھا۔

"کیا رہا؟" عقب سے بابر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا تو میں نے اسے پوچھا۔

"وہ دونوں مارٹن اور عبدالکلام کے نام سے اس ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے آج ہی وہ کمرہ حاصل کیا ہے۔" بابر نے بتایا۔

"تمہیں کوئی دقت تو نہیں ہوئی معلومات حاصل کرنے میں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں" اس نے جواب دیا۔ "میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا تھا کہ مجھے اپنے ایک غیر ملکی دوست کی تلاش ہے جسے آج ہی جیسور پہنچنا تھا۔ اس کا نام میں نے یونہی ولسن بتا دیا تھا۔ جواباً مجھے بتایا گیا کہ اس نام کا کوئی شخص اس ہوٹل میں نہیں ٹھہرا۔ ہاں ایک غیر ملکی ضرور آج آیا ہے' مگر اس کا نام مارٹن ہے اور اس کے ساتھ ایک مقامی شخص عبدالکلام بھی ہے۔ میں چاہوں تو اس سے مل کر پوچھ گچھ کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں میرا غیر ملکی دوست تنہا ہی آنے والا تھا پھر میں کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔"

"ویری گڈ" میں نے کھلے دل سے بابر کی تعریف کی۔ اس نے بہر حال اپنی ذہانت سے کام لے کر بغیر شک کی فضا پیدا کئے جو معلوم کرنا تھا معلوم کر لیا تھا۔

"کیوں نہ خورشید الاسلام کو چیک کیا جائے کہ وہ اس چائے خانے میں کس سے اور کیوں ملنے گیا ہے؟" بابر نے چائے خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے تجویز پیش کی۔

"اس کی ضرورت نہیں" میں نے انکار کر دیا' میں نہیں چاہتی کہ اب کل رات سے پہلے ان دونوں میں سے کسی کو چھیڑا جائے۔"

پھر ہم دونوں اسی ہوٹل میں واپس آ گئے جہاں ہمارا قیام تھا۔ رخصت ہونے سے قبل بابر نے میرے کمرے میں چائے پی' پھر اٹھ گیا۔ ریڈی میڈ میک اپ ہوٹل پہنچتے ہی میں نے ختم کر دیا تھا۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کرنے کے بعد نو بجے کے قریب بابر کو اپنے ساتھ لئے میں ہوٹل سے نکل آئی۔ میں اس وقت میک اپ میں نہیں تھی اس لئے احتیاطاً شال اوڑھ رکھی تھی اور میرا نصف سے زیادہ چہرہ شال میں چھپا ہوا تھا۔ آج مجھے اس ایریئے کے ملٹری انٹیلی جنس انچارج سے ملنا تھا۔ بابر اور میں اس لئے اس وقت ایک ہاتھ رکشا میں بیٹھے ہوئے ملٹری چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے جو شہر سے ذرا باہر تھی۔ ممنوعہ علاقہ شروع ہونے سے پہلے ہم نے رکشا چھوڑ دیا۔ چلتے چلتے ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری سے میں نے ملٹری انٹیلی جنس کے ایریا انچارج کا نام پوچھ لیا تھا۔ اس سڑک پر پیدل ہی آگے بڑھتے ہوئے ہم دونوں اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں سڑک کو آہنی زنجیر باندھ کر عام ٹریفک کیلئے روک دیا گیا تھا۔ وہاں مسلح فوجی بھی نظر آ رہے تھے ہم ان کے قریب پہنچ گئے۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک فوجی کو اپنی طرف متوجہ کیا اور جب وہ قریب آ گیا تو اس سے بولی

"مجھے کرنل صبور سے ملنا ہے' میرا نام عذرا خان ہے۔"

سڑک کی بائیں جانب ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا۔ وہ فوجی ہم دونوں کو وہاں لے گیا۔ وہاں کئی فوجی افسران نظر آ رہے تھے۔ ایک میز کے پیچھے کرسی پر بھی ایک فوجی افسر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کرسیوں پر دوسرے فوجی بھی بیٹھے تھے' کئی کرسیاں خالی بھی تھیں۔

جو مسلح فوجی ہمیں اس کمرے میں لے کر آیا تھا اس نے میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے فوجی افسر کو سلیوٹ کیا پھر اسے ہمارے بارے میں بتایا۔

"آپ لوگ تشریف رکھیے!" فوجی افسر نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

ہم دونوں خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کرنل صاحب کی طرف سے ہمیں آپ کے آنے کی اطلاع مل چکی ہے۔" فوجی افسر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ اپنی شناخت کرا دیجئے۔"

میں نے پرس کھول کر اپنے شناختی کاغذات نکالے اور پھر انہیں فوجی افسر کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ!" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے کاغذات لے لئے' پھر ان کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران میں وہاں موجود فوجی افسر میں سے ایک نوجوان افسر کو بار بار چور نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے محسوس کیا۔ یہ میرے لئے ایسی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر نوجوان کسی حسین دوشیزہ یا خوبصورت عورت کو دیکھتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی نظروں کی تپش خواتین بہت جلد محسوس کر لیتی ہیں۔ وہ نوجوان فوجی افسر بھی مجھے ایسے ہی دل پھینک نوجوانوں میں سے ایک معلوم ہو رہا تھا۔ کاغذات کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد فوجی افسر نے انہیں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے محترمہ آپ کرنل صاحب سے مل سکتی ہیں مگر معاف کیجئے گا' آپ کے ساتھی کو یہیں آپ کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔" ہمیں صرف آپ کے بارے میں یہ حکم ملا ہے کہ......"

"ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں" میں فوراً بول اٹھی۔

اس کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں باہر ایک جیپ کھڑی دیکھ چکی تھی۔ اسی جیپ میں بٹھا کر مجھے کرنل صبور کے پاس بھیج دیا گیا۔ جیپ کا ڈرائیور اس وقت کسی سبب موجود نہیں تھا اس لئے ادھیڑ عمر فوجی افسر نے نوجوان فوجی افسر کی یہ پیشکش مسکراتے ہوئے قبول کر لی تھی کہ وہ مجھے کرنل صبور کے دفتر تک چھوڑ دے گا۔

راستے میں نوجوان فوجی افسر نے کچھ جھجکتے ہوئے مجھے مخاطب کیا "آپ...... کیا آپ کرنل صاحب کی کوئی عزیز ہیں۔"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ میں اخلاقاً اگلی نشست پر ہی بیٹھی تھی کیونکہ وہ نوجوان بہر حال ڈرائیور نہیں تھا۔

"مگر کرنل صاحب کے بارے میں تو ہم نے سنا ہے کہ وہ بہت خشک آدمی ہیں" نوجوان فوجی افسر کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا" میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ مجھے اس کی بات ناگوار محسوس ہوئی تھی۔ "کیا اب آپ کی رائے بدل گئی ہے؟...... انہیں آپ مجھ سے ملنے کے سبب رنگین مزاج سمجھنے لگے ہیں۔"

"آئی ایم ویری سوری مس" وہ ایک دم بوکھلا گیا' میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا' آپ...... آپ شاید کچھ غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"میں بچی نہیں ہوں مسٹر!" میرے لہجے کی سختی برقرار رہی۔ "آپ اب اس سلسلے میں مزید کچھ نہ کہیں تو زیادہ بہتر ہے۔"

"ب...... بہتر ہے" وہ کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ "ایک درخواست ہے آپ سے کہ ابھی جو بات

میں نے کہی تھی، اس کا ذکر کرنل صاحب سے......"

"جانتی ہوں میں!...... آپ کے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

پھر بقیہ راستے میں اس کے اور میرے درمیان خاموشی ہی رہی۔ اس دوران میں اس نے مجھے چور نظروں سے بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جیپ اس نے ایک بیرک کے سامنے روک لی تھی، پھر مجھ سے کہا تھا "وہ سامنے والی بیرک ہے، بیرونی کمرے میں کرنل صاحب کا سٹاف بیٹھتا ہے اور اندر......"

"شکریہ" میں اس کی بات کاٹتی ہوئی جیپ سے اتر گئی۔

"سنیئے" میں نے بیرک کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے عقب سے پھر اس کی آواز سنی۔ "اپنا وعدہ یاد رکھیے گا کرنل صاحب سے وہ بات......"

اس کا لہجہ کچھ ایسا ہی تھا کہ جھنجھلاہٹ کے بجائے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"سو نائس آف یو" وہ بھی میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مسکرایا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔

میں دوبارہ بیرک کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں سوچ رہی تھی کہ آج کل کے نوجوان کس قدر نا آسودہ ہیں! ان کی نظریں ہر حسین چہرے کے گرد گھومنے لگتی ہیں، خواہ اس سے شناسائی ہو نہ ہو!

اندر ایک بڑے سے کمرے میں مختلف میزوں پر فوجی وردیوں میں ملبوس افراد کو میں نے کام کرتے دیکھا۔ اندر قدم رکھتے ہی دائیں جانب ایک نشست پر بیٹھے ہوئے باوردی شخص نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر کے پوچھا۔ "ادھر تشریف لائیے!...... کیا آپ محترمہ عذرا خان ہیں؟"

"جی ہاں" میں اس کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے مجھے اپنی میز کے سامنے خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر بولا "میں ابھی کرنل صاحب کو آپ کی آمد سے مطلع کرتا ہوں۔"

میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے ایک چٹ پر میرا نام لکھا اور پھر ایک اردلی کے ہاتھوں وہ چٹ کرنل صبور کو بھیج دی۔ اس کے بعد مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کرنل صبور نے مجھے اپنے کمرے میں بلوا لیا۔

میں اندر پہنچی تو دراز قد اور بارعب کرنل صبور نے اپنی کرسی سے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔

"آیئے تشریف لائیے مس عذرا خان!"

"شکریہ" میں بولی اور پھر اس کے اشارے پر ایک خالی کرسی کی طرف بڑھ گئی۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس صدر مملکت کی طرف سے جاری کردہ مختار نامہ بھی ہے جس میں قانون نافذ کرنے والے تمام محکموں اور اداروں کو آپ سے تعاون کا حکم دیا گیا ہے۔ مجھے آپ ایسی شخصیت سے مل کر انتہائی خوشی محسوس ہو رہی ہے، مزید خوشی اس وقت ہوگی جب میرا محکمہ آپ کے کسی کام آ سکے گا۔ ہوم سیکرٹری جناب عبیدالرحمٰن چودھری سے فون پر میری بات ہو چکی ہے۔ انہوں نے فون پر مجھے تفصیل تو نہیں بتائی مگر یہ اشارہ ضرور کیا ہے کہ آپ کچھ ملک دشمن افراد کی سرکوبی کیلئے میرے محکمے کا تعاون چاہتی ہیں۔ میں اس ضمن میں آپ سے تفصیل جاننا چاہوں گا۔"

کرنل صبور کو میں نے مختصراً تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔ اس کے ساتھ امریکی ایجنٹ سولومن کے بارے میں یہ بھی بتا دیا کہ وہ مغربی پاکستان میں اپنے عزائم کی ناکامی کے بعد یہاں آیا ہے اور یہ کہ اب اس کا منصوبہ کیا ہے!

"آپ نے تو مجھے یہ سب کچھ بتا کر حیرت میں ڈال دیا" کرنل صبور نے میری بات سن کر کہا۔ "تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں میرا محکمہ مجرمانہ غفلت کا شکار ہے۔ آپ نے جو معلومات حاصل کی ہیں وہ یقیناً گراں قدر ہیں۔"

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں کرنل تو اس آپریشن کی نگرانی میں خود کرنا چاہوں گی۔" میں نے کہا۔

کرنل صبور میری بات سن کر کچھ دیر کو چپ ہو گیا پھر بولا۔ "معاف کیجئے گا ایسا ممکن نہیں ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ہمارے محکمے سے متعلق نہیں ہیں، ہاں یہ ممکن ہے کہ اس اہم آپریشن کے نگراں کے ساتھ آپ بھی رہیں اور وہ آپ کے مشوروں پر عمل کرے۔"

کرنل صبور کی مجبوری میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اگر آپریشن کا نگراں میرے مشوروں پر عمل کرتا، تب بھی بات وہی تھی، یعنی وہی ہوتا جو میں چاہتی۔ میں نے اس لئے اپنی بات پر زیادہ اصرار نہیں کیا اور صرف اتنی شرط رکھی کہ میرے مشورے کے بغیر آپریشن انچارج کوئی قدم نہ اٹھائے۔ کرنل صبور نے بخوشی میری بات مان لی۔

"ویسے یہ آپریشن اتنا اہم ہے کہ خود مجھے اس کی نگرانی کرنا چاہیئے۔" کرنل صبور نے اپنی رائے کا اظہار کیا، یوں تو وہ تمام علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے لیکن آپ نے جو محل وقوعہ بتایا ہے میں اسے دن ہی میں دیکھ لینا چاہتا ہوں، کیا خیال ہے آپ چلنا پسند کریں گی؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں!" میں نے فوراً رضامندی کا اظہار کر دیا۔

"اگر ہم لوگ اب چلیں تو دوپہر تک واپس آ سکتے ہیں۔ محل وقوع کا معائنہ کرنے کے بعد ممکن ہے آپ کے یا میرے ذہن میں کوئی نئی بات آ سکے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ" میں نے کرنل صبور کی تائید میں کہا، پھر بولی "میرے ہمراہ میرا ایک ساتھی بھی ہے جسے وہاں انکوائری پر روک لیا گیا ہے، وہ قابل اعتماد ہے اگر......" میں مزید کچھ کہتے ہوئے جھجکنے لگی۔ مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ کرنل صبور سے بابر کے متعلق ایسے الفاظ کہوں جنہیں وہ کوئی اور معنی پہنا سکے۔

"ہاں ہاں کہیں، کیا بات ہے؟ کیا آپ اپنے ساتھی کو بھی وہاں لے جانا چاہتی ہیں؟" کرنل صبور میری ادھوری بات کا مطلب سمجھ گیا۔

"جی...... جی ہاں، اسے میں ڈھاکہ ہی سے اپنے ساتھ لائی ہوں" میں نے کہا۔

"اگر آپ کو اس پر اعتماد ہے تو میں کیا اعتراض کر سکتا ہوں! ویسے یہ معاملہ ایسا ہے کہ جتنے کم لوگوں کے علم میں آئے بہتر ہے۔" کرنل صبور بولا۔

پھر انکار کے باوجود کرنل صبور نے میرے لئے کافی منگوا لی۔ اس کے بعد وہ چلنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں کافی پی چکی تھی، میں بھی کھڑی ہو گئی۔

’’میں تو ڈرائیور کو بھی ساتھ لینا نہیں چاہتا‘ ہاں اپنے ایک ماتحت کو ضرور ساتھ لے چلوں گا۔‘‘ کرنل صبور نے کہا۔

وہاں سے روانگی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کرنل صبور نے اپنے ماتحت میجر حکیم اللہ کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ جیپ اس کو ڈرائیو کرنا تھی۔ روانگی سے قبل کرنل صبور نے اسے مختصراً حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ میجر حکیم اللہ کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد جیپ‘ انکوائری کے سامنے رک گئی اور وہاں موجود مسلح فوجیوں نے کرنل صبور کو سلیوٹ کئے۔ کرنل صبور نے ایک فوجی کو مخاطب کیا۔ ’’اندر انکوائری آفس میں جو صاحب سادہ کپڑوں میں بیٹھے ہیں‘ ان سے کہو کہ انہیں محترمہ عذرا خان بلا رہی ہیں۔‘‘

’’یس سر!‘‘ فوجی اپنے افسر کا حکم سن کر تیزی کے ساتھ انکوائری آفس کی طرف بڑھ گیا۔

بابر کو باہر آنے اور پھر جیپ کے اندر بیٹھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کے میرے برابر بیٹھتے ہی جیپ دوبارہ سٹارٹ ہو گئی تھی۔ کرنل صبور جیپ کی اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں نے بابر سے اس کا تعارف کرایا۔ کرنل صبور نے مڑ کر بابر سے مصافحہ کیا اور پھر ان دونوں ہی نے رسمی جملوں کا تبادلہ کیا۔ بابر کو ابھی کیونکہ کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ جیپ کہاں اور کیوں جا رہی ہے۔ اس لئے وہ کچھ حیران حیران سا تھا۔ میں نے اس کی حیرانگی دور کرنے کیلئے بتا دیا کہ ہم لوگ سرحدی بستی بینا پل چل رہے ہیں۔ وہاں سے اندر قریبی جنگل میں جائیں گے جہاں آج رات ملکی اور غیر ملکی تخریب کاروں کا اہم اجتماع ہونے والا ہے۔

بینا پل تک کا سفر جیسور سے جیپ میں نصف گھنٹے سے زیادہ کا نہیں تھا۔ جہاں تک جیپ کا جانا ممکن تھا ہم نے بمبئی سے گزرنے کے بعد جیپ میں سفر کیا‘ پھر جیپ سے اتر گئے۔ جنگل میں مجھے کئی جگہ فوجیوں کی نقل و حرکت بھی نظر آئی تھی۔ میں اور بابر اگر کرنل صبور کے ساتھ نہ ہوتے تو یقیناً فوجی ہم دونوں کو روک کر پوچھ گچھ ضرور کرتے کہ ہم ادھر کہاں جا رہے ہیں؟ اب ہم چاروں افراد جنگل میں پیدل سفر کر رہے تھے۔ مجھے اس وقت بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کافی دور پیدل چلنا پڑے گا۔

’’میرا خیال ہے‘‘ میجر کہ پیڑوں سے گھرے ہوئے جس میدان کا ذکر محترمہ عذرا خان نے کیا ہے اسے ادھر ہونا چاہئے‘‘ کرنل صبور نے اپنے ماتحت میجر حکیم اللہ کو مخاطب کیا۔

’’جی ہاں سر!‘‘ میجر حکیم اللہ نے کرنل صبور کی بات سے اتفاق کیا۔ ’’وہ میدان اسی طرف ہے۔‘‘

جیسے جیسے ہم لوگ آگے بڑھ رہے تھے ویسے ویسے جنگل مزید گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اس گھنے جنگل میں ہم لوگ پیدل چلتے رہے تب کہیں جا کر گھنے درختوں کے درمیان سے گزر کر ہم اس میدان میں پہنچے۔

’’مس خان‘ آپ یقیناً بہت تھک گئی ہوں گی‘ پیدل چلتے چلتے‘‘ کرنل صبور میرے چہرے پر شاید تھکن کے آثار تلاش کرنے لگا۔

’’نہیں کرنل‘ ایسی کوئی بات نہیں ہے‘ میں خاصی سخت جان واقع ہوئی ہوں‘‘ میں نے مسکراتے

ہوئے جواباً کہا۔

پھر کرنل صبور اور میں نے اس میدان کی اطراف کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ میں نے ایک جگہ رک کر اپنے پیروں سے سینڈل اتار دیئے اور پھر ایک بلند درخت پر تیزی کے ساتھ چڑھ گئی۔ میں دراصل درخت پر چڑھ کر ادھر ادھر کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔

جب میں تیزی سے درخت پر چڑھ رہی تھی کو کرنل صبور نے ’’ونڈر فل‘‘ کہا تھا اور پھر مجھے درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھنے لگا تھا۔ اس درخت کی سب سے بلند شاخ پر چڑھ کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا‘ ہر طرف گھنا جنگل تھا اور پیڑ ہی پیڑ نظر آ رہے تھے‘ جلد ہی میں نیچے اتر آئی۔

’’یہاں سے بھارتی سرحد کتنی دور ہو گی کرنل؟‘‘ میں نے اپنے سینڈل پہنتے ہوئے کرنل صبور سے دریافت کیا۔

’’بمشکل ایک ڈیڑھ میل ہو گی‘‘ کرنل صبور نے جواب دیا۔ ’’مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں؟‘‘

’’بس یوں ہی میرے ذہن میں یہ بات آ گئی تھی۔‘‘ میں نے کہا‘ پھر مزید بولی ’’میں نے ایک بات اور بھی سنی ہے کہ اس راستے آدمیوں کو بھی ادھر سے ادھر سمگل کیا جاتا ہے‘ کیا یہ درست ہے کرنل؟‘‘

’’آپ نے کچھ غلط نہیں سنا مس خان‘‘ کرنل صبور نے میری تائید کی پھر بتانے لگا۔ ’’یہ خاصا بڑا علاقہ ہے اور بارڈر کے ساتھ ساتھ دونوں جانب گھنا جنگل ہے‘ کچھ جرائم پیشہ افراد دونوں جانب ایسے ہیں جو اس غیر قانونی کاروبار میں ملوث ہیں۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ دونوں ہی جانب سرحدوں کے کچھ پاسبان ایسے ہیں جن کی آنکھوں پر رشوت کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ وہ اپنا حصہ وصول کر کے اس کاروبار میں ملوث افراد سے نظر بچا لیتے ہیں۔ سرحدی علاقہ اتنے بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے کہ قدم قدم پر فوجی کھڑے کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ سمگلنگ میں ملوث افراد اس سے فائدہ اٹھا کر مختلف چور راستوں سے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ لوگ پکڑ بھی لئے جاتے ہیں مگر کم ہی ایسا ہوتا ہے۔‘‘

کرنل صبور اور میں‘ ہم دونوں نے مزید کچھ دیر ادھر ادھر گھوم کر اس جگہ کے گرد و نواح کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اس دوران میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات بھی کرتے رہے۔ بابر اور میجر حکیم اللہ اس عرصے میں اس میدان کے وسط میں گھاس پر بیٹھے ہم دونوں کے لوٹنے کا انتظار کرتے رہے۔ بابر کے چہرے سے تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔ یوں بھی اسے بستر علالت سے اٹھے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اگر مجھے پہلے سے یہ اندازہ ہوتا کہ اتنی دور تک پیدل چلنا پڑے گا‘ تو شاید میں اسے اپنے ساتھ لے کر نہ آتی اور فوجی چھاؤنی ہی سے ہوٹل بھیج دیتی۔

واپسی میں کرنل صبور نے متوقع آپریشن پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری زیادہ تر باتوں اور مشوروں سے اتفاق کر رہا تھا۔ اس نے بس دو ایک بار ہی مجھ سے اختلاف کیا‘ مگر جب میں نے بحث کر کے اسے قائل کر دیا تو وہ میری بات مان گیا۔ اس میں بے جا قسم کا افسرانہ غرور یا انا

نہیں تھی۔ مجھے اس کی یہ بات پسند آئی تھی۔

جیپ تک واپس پہنچنے میں تقریباً اتنا ہی وقت لگا جتنا وہاں جاتے ہوئے لگا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اگر کرنل صبور میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں اس گھنے جنگل میں راستہ بھول جاتی۔

میرے اور کرنل صبور کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ رات کو ٹھیک نو بجے وہ مجھے ہوٹل سے پک کرلے گا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ ٹھیک نو بجے میں اسے ہوٹل کے گیٹ پر منتظر ملوں گی۔ مجھے اور بابر کو کرنل صبور نے ہوٹل کے سامنے اتار دیا تھا' پھر وہ روانہ ہوگیا تھا۔

ہم دونوں ہوٹل پہنچے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہوچکا تھا۔ میں نے اور بابر نے ساتھ کھانا کھایا اور چائے پی۔

''کیا رات کو آپ مجھے ہوٹل ہی میں چھوڑ جائیں گی؟'' بابر نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے مجھ سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم اس وقت بھی خاصے تھک گئے ہو کیا کرو گے رات کو ساتھ جاکر'' میں بولی۔

''آپ جو بھی کہیں!'' بابر نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔

''تو پھر ایسا ہے کہ تم یہیں ہوٹل میں رہنا' رات کو...... نصف شب کے قریب تو آپریشن شروع ہوگا' پھر معلوم نہیں اس میں کتنی دیر لگے۔''

میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر وہ کچھ بجھ سا گیا ہے' وہ یقیناً رات کو میرے ساتھ چلنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک مہم جو نوجوان ہے۔ کسی ایسے نوجوان کیلئے یہ ایک اچھا موقع تھا مگر اس کی موجودگی یا غیر موجودگی سے آپریشن پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اس لئے میں اسے ٹال ہی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ میرے کمرے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں بستر پر دراز ہوگئی۔ اس سے پہلے میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ رات کو کیونکہ مجھے جاگنا تھا اس لئے اس وقت شام تک سو کر اپنی نیند پوری کرلینا چاہتی تھی۔ آپریشن کے تمام انتظامات کی طرف سے اب میں قطعی بے فکر ہوچکی تھی۔ کرنل صبور سے مل کر مجھے خاصا اطمینان ہوگیا تھا۔ میرے نزدیک وہ ایک ذہین افسر تھا۔ اس کی جانب سے کسی طرح کی کوتاہی میرے خیال میں ممکن نہیں تھی۔ اس اطمینان اور بے فکری کے نتیجے میں جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔

اس وقت شام کے سوا پانچ بجنے والے تھے' جب میں سو کر اٹھی' غسل کر کے کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے میں مجھے مزید آدھا پون گھنٹہ لگ گیا۔ اپنے کمرے سے نکل کر میں نے برابر والے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ بابر بھی جاگ چکا تھا۔

''بابر میرے کمرے میں آجاؤ' میں چائے منگوا رہی ہوں'' یہ کہہ کر میں واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

بابر کے آنے سے پہلے میں بیرے کو بلا کر چائے کا آرڈر دے چکی تھی۔

''تم کچھ بیزار بیزار سے لگ رہے ہو کیا بات ہے؟'' میں نے بابر کو مخاطب کیا۔

جواباً اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی پھر وہ بولا ''نہیں ایسی .... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''مجھے تمہاری بیزاری کا سبب معلوم ہے' مگر......'' میں اسے سمجھانے لگی کہ اس معاملے میں ملٹری انٹیلی جنس والے پیش پیش ہیں اس لئے تمہاری وہاں موجودگی مناسب نہیں ہے۔

''جی .... جی ہاں میں سمجھتا ہوں' آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔'' وہ میرے سمجھانے پر کہنے لگا۔

''اگر تم یہی سمجھتے ہو تو پھر یوں منہ پھلا کر تو نہ بیٹھو'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''تمہاری حالت تو اس وقت کسی ایسے بچے کی سی ہو رہی ہے جسے کھیلنے سے منع کر دیا گیا ہو۔''

میری بات پر وہ ہنسنے لگا۔ میں یہی چاہتی بھی تھی۔ آج دوپہر سے میرے اور اس کے درمیان جو کچھ کھنچاؤ سا پیدا ہوگیا تھا' ختم ہوگیا۔ میں نے اس کی دل جوئی کی خاطر تفصیل کے ساتھ آپریشن سے متعلق تمام انتظامات کا ذکر کیا۔

''تمہارے خیال میں کیا ان سب انتظامات کے بعد تخریب کار بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔'' میں نے اس کی رائے معلوم کی۔

''تقریباً ناممکن ہے کہ ان میں سے کوئی بھی گرفتار ہونے سے بچ سکے'' بابر نے بلاجھجک اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ''وہ جگہ کیونکہ میں خود بھی دیکھ چکا ہوں جہاں وہ لوگ جمع ہونے والے ہیں اس لئے پریقین انداز میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا منصوبہ بے داغ ہے۔ اسے ان لوگوں کی بدقسمتی ہی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں انہیں چاروں طرف سے بڑی آسانی سے گھیر لیا جائے گا۔''

میں اور بابر باتیں کرتے رہے' اسی طرح رات کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے تک میں کھانے وغیرہ سے فارغ ہوچکی تھی۔ جب کرنے کو کچھ نہ ہو تو وقت مشکل سے گزرتا ہے۔ وہ آدھا گھنٹہ بھی مجھے خاصا گراں گزرا۔ کرنل صبور کے انتظار میں تقریباً پانچ چھ منٹ پہلے ہی میں ہوٹل کے گیٹ پر آکر کھڑی ہوگئی۔

کرنل صبور ٹھیک نو بجے اپنی جیپ میں ہوٹل تک پہنچ گیا۔ جیپ میں اس وقت وہ تنہا ہی تھا اور خود ہی جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اس کے برابر اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ دوسرے ہی لمحے جیپ روانہ ہوگئی۔

''مس خان! آپ کے پاس ریوالور ہے؟'' کرنل صبور نے مجھ سے سوال کیا۔

''جی نہیں'' میں نے جواب دیا۔

''احتیاط میں ایک ریوالور اور لیتا آیا تھا'' یہ کہہ کر اس نے اپنی شرٹ کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر ایک ریوالور نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ لوڈ ہے' ذرا احتیاط سے اسے اپنے پرس میں رکھ لیں۔''

میں نے شکریہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ریوالور لے کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔

''ضروری نہیں کہ اس کی نوبت آجائے مگر بطور احتیاط اس کا پاس ہونا ضروری ہے'' کرنل صبور بولا پھر وہ مجھے آپریشن سے متعلق تمام انتظامات سے آگاہ کرنے لگا۔

کرنل صبور کی اطلاع کے مطابق اس وقت تک اس میدان کو ملٹری کے جوان اپنے گھیرے میں لے چکے تھے۔ میدان کی چاروں طرف جو گھنے درخت تھے' ملٹری کے جوان ان پر چڑھے ہوئے تھے۔ ایسا میری ہی تجویز پر اس لئے کیا گیا تھا کہ وہاں اس میدان میں آ کر جمع ہونے والوں کو راستے میں کوئی غیر معمولی نقل و حرکت نظر نہ آئے۔ وہاں متعین سرحدی فوجی جوانوں کو بھی خبردار کر دیا گیا تھا کہ وہ رات کے وقت پیٹرولنگ کرتے ہوئے اس طرف نہ آئیں۔ یوں بھی جنگل کا وہ ایسا حصہ تھا جہاں تک فوجی جوان عموماً نہیں جاتے تھے۔ تخریب کاروں نے بھی بہت سوچ سمجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ میدان کی طرف مختلف درختوں پر میری تجویز کے مطابق بیٹری سے جلنے والی سرچ لائٹس کا بھی بندوبست کر دیا گیا تھا۔ یہ سرچ لائٹس آپریشن انچارج یعنی کرنل صبور کے حکم پر بیک وقت روشن ہونا تھیں۔ ان کا رخ میدان کی طرف تھا۔ سرچ لائٹس روشن ہوتے ہی میدان میں موجود تمام تخریب کاروں کو رائفلوں کے نشانے پر لے لینا تھا۔ اس کے بعد صرف چند افراد درختوں پر چڑھے رہتے' بقیہ نیچے اتر کر تمام تخریب کاروں کو حراست میں لے لیتے۔

آپریشن کی تفصیلات سننے کے بعد میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی آپریشن میں ''آپریشن سیل'' کے ارکان کے بجائے ملٹری والے میرے ساتھ تھے۔ میرا ملٹری سے کوئی تعلق تھا نہ حکومت کے کسی اور قانون نافذ کرنے والے ادارے سے۔ اسی لئے ہمیشہ میری پہلی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے طور پر کسی سے کوئی مدد لئے بغیر سرگرم عمل رہوں مگر اس وقت مجبوری تھی۔ میں تن تنہا زیادہ سے زیادہ سولومن اور خورشید الاسلام پر ہاتھ ڈال سکتی تھی جو ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے لیکن تمام تخریب کاروں کو زیر دام لانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

جیپ سرحدی بستی بینا پل کی حدود میں داخل ہوئی تو کرنل صبور نے مجھ سے دریافت کیا۔

''آپ گھڑ سواری کر لیتی ہیں؟''

''جی ہاں'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا پھر ''کیا آپ نے اس وقت جنگل میں سفر کرنے کیلئے گھوڑوں کا بندوبست کیا ہے؟''

''جی مس خان'' کرنل صبور بولا ''یہاں سے مقررہ جگہ تک کا فاصلہ خاصا ہے اس لئے میں نے یہ بندوبست کیا تھا۔''

''معاف کیجئے گا کرنل میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم گھوڑوں پر سفر کریں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں دور دور تک رات کے سناٹے میں سنائی دیں گی اور......''

''مگر ابھی تو آپ کی اطلاعات کے مطابق تخریب کاروں کے اجتماع میں خاصا وقت ہے۔'' کرنل صبور میری بات کاٹ کر بولا۔ ''ویسے بھی زمین کچی ہے' ٹاپوں کی آوازیں زیادہ دور تک سنائی نہیں دیں گی' اس کے باوجود بھی آپ وہاں تک پیدل سفر کرنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں میں نے تو آپ ہی کی سہولت کیلئے یہ بندوبست کیا تھا۔''

''مگر آپ نے فیصلہ مجھی پر چھوڑ دیا ہے کرنل تو میں پیدل چلنے کو ترجیح دوں گی۔'' میں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔ ''دراصل میں کسی بھی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔ بہرحال میں معذرت خواہ

ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو بھی پیدل اتنا طویل اور تھکا دینے والا سفر طے کرنا پڑے گا۔ میں بلا سبب ایسا نہیں کر رہی بلکہ ایک امکان کے تحت یہ احتیاط برت رہی ہوں۔ اجتماع سے پہلے بھی تخریب کار' راستے کا جائزہ لینے کیلئے کہ کسی قسم کا خطرہ تو نہیں اپنے کسی آدمی کو بھیج سکتے ہیں۔''

''مس خان'' آپ واقعی بہت ذہین ہیں۔ آپ نے جس خطرے کا اظہار کیا ہے' وہ میری نظر ہی نہیں تھا۔'' کرنل صبور نے میری تعریف کرتے ہوئے بات مان لی۔ وہ یقیناً ایک وسیع القلب شخص تھا' عموماً بڑے افسران ایسے نہیں ہوتے اور وہ اپنی رائے سے اختلاف پسند نہیں کرتے۔

جنگل کے ابتدائی حصے میں پہنچ کر جیپ رک گئی۔ اسی وقت ایک باوردی فوجی دو گھوڑوں کی لگامیں تھامے ایک طرف سے جیپ کے قریب آ گیا۔

''لے جاؤ انہیں' ان کی ضرورت نہیں ہے۔'' کرنل صبور نے ان فوجی سے کہا' پھر جیپ کو ذرا سا اور آگے بڑھا کر ایسی جگہ کھڑا کر دیا کہ آسانی سے نظر نہ آ سکے' پھر وہ جیپ سے اتر گیا' میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

کرنل صبور کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹارچ بھی تھی جسے اس نے روشن کر لیا تا کہ راستہ نظر آتا رہے' جنگل میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

''کرنل! کیا آپ ٹارچ جلائے بغیر آگے بڑھ سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں شاید ایسا ممکن ہے۔ بس ذرا دیر کچھ دشواری ہوگی۔ جب آنکھیں اندھیرے سے کچھ مانوس ہو جائیں گی تو کوئی دقت نہیں ہوگی۔ غالباً آپ کو ٹارچ جلانے پر اعتراض......''

''نہیں' میں اس کی بات کاٹ کر بول اٹھی۔'' میں بس یہ چاہتی ہوں کہ اشد ضرورت کے وقت ٹارچ جلائی جائے۔''

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی کرنل صبور نے ٹارچ بجھا دی تھی۔ ٹارچ بجھنے کے سبب ہم دونوں ہی کچھ دور تک بہت سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے رہے کیونکہ راستہ ناہموار تھا' اس کے بعد آنکھیں رفتہ رفتہ اندھیرے سے مانوس ہو گئیں پھر بقیہ سفر ہم نے نسبتاً اطمینان سے کیا۔ دوپہر کے مقابلے میں اس وقت ہمیں مقررہ جگہ تک پہنچنے میں نسبتاً زیادہ دیر لگی تھی۔ اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے جب ہم وہاں پہنچے۔

کرنل صبور کے ساتھ میں بھی ایک درخت پر چڑھ گئی۔ ادھیڑ عمری کے باوجود کرنل صبور کی پھرتی قابل داد تھی۔ دوپہر کو جب میں ایک پیڑ پر چڑھی تھی تو کرنل صبور نے ''ونڈر فل'' کہہ کر مجھے داد دی تھی۔ اس وقت میں نے بھی اسی کے لہجے میں ''ونڈر فل'' کہا تو وہ آہستہ سے ہنس دیا۔

ساڑھے گیارہ بجے اور بارہ بجے کے درمیان ان تمام تخریب کاروں کو وہاں پہنچ جانا تھا۔ اب ان کی آمد میں کم وقت رہ گیا تھا۔ جیسے جیسے مقررہ وقت قریب آتا جا رہا تھا میرے دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے اس درخت کی سب سے بلند شاخ کا انتخاب کیا تھا تا کہ ارد گرد نگاہیں دوڑا سکوں' کچھ وقت اور گزر گیا پھر اچانک گھنے درختوں کے درمیان مجھے متحرک روشنی سی نظر آئی جو اسی طرف بڑھ رہی تھی۔

"کرنل!" میں آہستہ سے بولی۔ وہ ایک اور شاخ پر مجھ سے کچھ نیچے بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے مس خان؟" کرنل صبور نے بھی بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

"وہ آ رہے ہیں۔" میں نے اپنی مرتعش آواز پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد مختلف سمتوں سے متحرک روشنیاں میدان کی طرف بڑھنے لگیں۔ ان میں سے کچھ افراد ہمارے اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ ہمیں ان کے قدموں کی چاپیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ' آٹھ' دس' دس افراد کی ٹکڑیاں درختوں سے گھرے ہوئے اس میدان میں آ کر جمع ہونے لگیں۔ ان میں سے اکثریت نے چھوٹی چھوٹی مشعلیں روشن کی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار بھی تھے۔ میری نگاہیں بے چینی سے ادھر ادھر حرکت کر رہی تھیں۔ مجھے جن دو اہم شخصیتوں کا انتظار تھا' ابھی وہ نظر نہیں آئی تھیں۔ امریکی ایجنٹ سولومن اور خورشید الاسلام دونوں ہی ابھی تک وہاں نہیں پہنچے تھے۔ میدان میں اس وقت تقریباً سو افراد سے زیادہ جمع ہو چکے تھے۔ چند منٹ سے ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا' انتظار کا ایک ایک لمحہ مجھ پر قیامت بن کر گزر رہا تھا۔

☆......☆......☆

کچھ وقت اور گزرا تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کہیں امریکی ایجنٹ سولومن اور خورشید سلام چوکنا تو نہیں ہو گئے؟ انہوں نے خطرے کی بو تو نہیں سونگھ لی جو رات کے بارہ بجنے میں اب صرف د منٹ باقی رہ گئے تھے۔ ان دونوں کو اب تک وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ میری نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی یں جدھر میدان میں جمع مسلح افراد رخ کئے بیٹھے تھے۔ اندازے کے مطابق وہ دونوں کو اسی طرف سے ا چاہئے تھا۔ سو سے زیادہ تخریب کاروں اور ملٹری کے جوانوں کی موجودگی کے باوجود ہر طرف سناٹا تھا۔ ریب کار بھی بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے میں خفیف سی آہٹ بھی واضح طور پر سنائی دے سکتی ی۔ میرے کان بھی کسی متوقع آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔

اس وقت ٹھیک بارہ بجے تھے جب مجھے میدان کی ایک جانب سے کسی کے قدموں کی چاپ ائی دی اور میرے اعصاب تن گئے۔ میدان میں جمع افراد بھی اسی طرف دیکھنے لگے تھے پھر چند ہی لمحوں ے بعد درختوں کی آڑ سے نکل کر خورشید الاسلام میدان میں آ گیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر میک پ نہیں تھا۔ اسی کے عقب میں مجھے سولومن نظر آیا۔ اس کا چہرہ بھی میک اپ سے بے نیاز تھا۔ ان وں کو آتے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرے خدشات بے سبب ثابت ہو گئے تھے۔

وہ دونوں، مسلح تخریب کاروں کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور پھر سولومن بیٹھ گیا۔ اس کے ، خورشید الاسلام نے تقریر شروع کی۔ اس کی تقریر کا خلاصہ یہی تھا کہ اس وقت مسلح جدوجہد کا آغاز کرنا مان وہ ثابت ہو سکتا ہے اس لئے فی الحال اسے ترک کر دینا چاہئے۔ اپنی تقریر میں بحیثیت دوست اس ہ امریکی ایجنٹ سولومن کا حوالہ بھی دیا کہ ہمارے دوستوں کا بھی یہی مشورہ ہے جس سے ہمیں ہر طرح ا امداد ملتی رہی ہے۔ خورشید الاسلام کی تقریر ہی سے یہ معلوم ہوا کہ اس وقت میدان میں جو مسلح تخریب ، جمع تھے انہی کو مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں میں پہنچ کر وہاں موجود ملک دشمن عناصر کے ساتھ مل کر لح جدوجہد کا آغاز کرنا تھا۔ ان تمام افراد کو آئندہ روز جیسور سے روانہ ہو جانا تھا۔

خورشید الاسلام کی تقریر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ تخریب کاروں میں سے ایک نے کھڑے ہو کر ہ کہنے کی اجازت چاہی۔

"بیٹھ جائیں!" خورشید الاسلام نے ہاتھ سے بیٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا۔ "ابھی ے بات ختم نہیں ہوئی جب میں اپنی بات پوری کر لوں گا تو آپ کو بھی اظہار رائے کا موقع دوں گا پھر ر میں اپنے محترم امریکی دوست سے بھی گزارش کروں گا کہ وہ بھی آپ لوگوں کو صورتحال سے آگاہ

کریں۔" یہ کہہ کہ خورشید الاسلام نے پھر اپنی تقریر شروع کردی مگر غالباً جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ لوگ اس کی تقریر زیادہ توجہ اور دلچسپی سے نہیں سن رہے۔ اس نے شاید اسی لئے جلد تقریر ختم کردی۔ اپنی تقریر کے اختتام پر اس نے اسی شخص سے بولنے کیلئے کہا تھا جو تقریر کے دوران میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔

اس شخص نے اٹھ کر بڑے پرجوش الفاظ میں خورشید الاسلام کی تقریر سے اختلاف کیا۔ اس کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ اس موقع کو نہ گنوایا جائے، خواہ اس کیلئے کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دینا پڑیں۔

جواباً خورشید الاسلام دوبارہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اس شخص کی پرجوش تقریر کا جواب دیا پھر اس نے اپنے دلائل کی تائید میں سولومن کو تقریر کی دعوت دی۔

سولومن نے دھیمے اور نرم لہجے میں لوگوں کو مخاطب کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بڑی اچھی بنگالی بول رہا تھا۔ لوگوں کو متاثر کرنے کیلئے یہ بھی اس کا ایک حربہ تھا۔ اس نے کہا کہ امریکی ہائی کمان کی رپورٹ کے مطابق بھی بنگال کے عوام کسی صورت اس تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ ابھی یہ سب کچھ قبل از وقت ہے۔ اس طرح آپ لوگوں کی قربانیاں رائیگاں جائیں گی اور آپ کی تحریک کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اگر آپ لوگوں نے مصلحت وقت کو نہ سمجھا تو یہ نقصان اٹھانے کے بعد بہت دن تک نہ سنبھل سکیں گے۔ اس سے قطع نظر آپ لوگوں کو یہ بات بھی بہرحال مدنظر رکھنا چاہئے کہ آپ کی تحریک کا اصل مقصد گریٹر بنگال کا حصول ہے۔ بنگال کے صرف اس حصے ہی میں نہیں دوسرے حصے میں بھی مسلح جدوجہد کا آغاز ہونا چاہئے۔ امریکی ہائی کمان کے نزدیک بنگال کے دونوں حصوں میں ایک ساتھ مسلح جدوجہد کا آغاز ہونا چاہئے۔ اسی غرض سے میں جلد ہی مغربی بنگال کا دورہ کرنے والا ہوں تاکہ وہاں کی صورتحال کا بھی جائزہ لیا جاسکے۔ آپ لوگوں کو کسی قیمت پر یہ بات نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ صرف پاکستان ہی نے نہیں، ہندوستان نے بھی بنگال کے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ ہمیں آدھے بنگال کی نہیں پورے بنگال کی آزادی مطلوب ہے۔

سولومن کی تقریر مدلل اور انتہائی متاثر کن تھی۔ اس کی تقریر ابھی جاری تھی کہ میں نے جھک کر کرنل صبور کو مخصوص اشارہ کیا۔ میرے خیال میں تخریب کاروں کو زیردام لانے کا یہ مناسب وقت تھا۔ سب بڑی توجہ اور انہماک سے سولومن کی تقریر سن رہے تھے۔

"دوسرے ہی لمحے میں نے کرنل صبور کو شرٹ کی جیب سے ریوالور نکالتے دیکھا۔ اس نے ریوالور کی نال اوپر اٹھائی اور اسی کے ساتھ فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ یہ ہوائی فائر اس بات کا اشارہ کہ تخریب کاروں کیخلاف کارروائی شروع کردی جائے۔ دھماکہ ہوتے ہی مختلف حصوں سے طاقت سرچ لائٹس کی روشنیوں نے اس میدان میں دن کا سا سماں پیدا کردیا۔ چاروں طرف سے مسلح فوجی پیڑوں سے کودکود کر پوزیشن سنبھالنے لگے۔

اسی وقت کرنل صبور کی بھاری آواز گونجی۔ "تم لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اس لئے اپنے ہتھیار پھینک کر کھڑے ہوجاؤ ورنہ تمہیں بھون کے رکھ دیا جائے گا۔"

اس غیر متوقع افتاد نے تخریب کاروں کو جیسے پتھر کے مجسموں میں تبدیل کردیا تھا۔ وہ سب خوف زدہ سے اپنی اپنی جگہ بے حس وحرکت بیٹھے رہ گئے تھے۔ میری نگاہ سولومن پر جمی ہوئی تھی جس کی نظر

تیزی سے حرکت کررہی تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی حیرت تھی کہ اس کے چہرے سے کسی قسم کی بدحواسی کا اظہار نہیں ہورہا تھا، ہاں خورشید الاسلام کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ فوری طور پر میں سولومن کے اطمینان کی وجہ نہ سمجھ سکی، مگر چند ہی لمحے کے بعد میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ سولومن نے انتہائی سرعت کے ساتھ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا تھا۔ اس دھویں میں سولومن کا وجود غائب ہوگیا تھا۔

اصل مجرم راہ فرار اختیار کرنے والا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے پیڑ سے چھلانگ لگا دی۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ میں ایک ایسے پیڑ پر چڑھی ہوئی تھی جو جائے وقوع کے بہت قریب تھا۔

"عذرا خان!" مجھے اپنے عقب میں کرنل صبور کی آواز سنائی دی، مگر میں رکی نہیں۔ کرنل صبور نے یقیناً مجھے پیڑ سے چھلانگ لگا کر اس سمت بھگتے ہوئے دیکھ لیا تھا، جدھر دھواں ہی دھواں نظر آرہا تھا۔ اس وقت کرنل صبور نے مجھے آواز دی تھی، اس لمحے میں نے دھوئیں کے حصار سے ایک ہیولے کو تاریکی میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا تھا، پھر ظاہر ہے کہ میں کس طرح رک سکتی تھی۔ وہ ہیولا سولومن کے سوا کسی اور کا نہیں ہوسکتا تھا۔ بھاگتے ہوئے میں نے ریوالور بھی نکال لیا تھا، بڑی بڑی جستیں بھرتی ہوئی میں بھی اس میدان سے نکل کر گھنے جنگل میں پہنچ گئی۔ مجھے اپنے آگے آگے کسی کے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں کسی بھی قیمت پر سولومن کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ مغربی پاکستان میں بھی وہ میرے ہتھے چڑھتے چڑھتے رہ گیا تھا۔ بھاگتے ہوئے میں نے ایک بار اندازے سے اس پر فائر بھی کیا مگر غالباً وہ یا تو ریوالور کی رینج سے دور تھا یا پھر میرا نشانہ صحیح نہیں تھا۔ جواباً اس نے فائر کرنے کی حماقت نہیں کی تھی ورنہ لازماً اسے یہ کوشش مہنگی پڑتی۔

سولومن کے قدموں کی آواز کا تعاقب کرتے ہوئے میں اندھیرے میں کافی دیر تک حتی الامکان تیزی کے ساتھ دوڑتی رہی۔ مسلسل اندھیرے میں دوڑنے کے سبب میری آنکھیں کسی قدر اندھیرے سے مانوس ہوگئی تھیں، پھر بھی کئی بار میں درختوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ابتداء میں دوڑتے ہوئے میں نے سمت کا خیال رکھا تھا مگر اب کئی بار بائیں اور دائیں مڑنے کے بعد مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ وہ میدان کس سمت تھا جہاں سے میں نے سولومن کا تعاقب شروع کیا تھا! مگر ظاہر ہے کہ سب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

اچانک دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں رک گئیں نیتجتاً مجھے بھی رکنا پڑا۔ اب مجھے کچھ کچھ اپنی غلطی کا احساس ہورہا تھا۔ مجھے اس اجنبی، گھنے اور تاریک جنگل میں اس طرح سولومن کا تعاقب نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس طرح میری زندگی بھی خطرے میں پڑسکتی تھی۔ میرا رخ اسی طرف تھا، جدھر سے کچھ دیر پہلے تک سولومن کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اب آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے احتیاطاً اپنے سینڈل اتار کر ایک ہاتھ میں لے لئے اور پنجوں کے بل بے آواز قدموں سے، آگے بڑھنے لگی۔ سولومن کو علم تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے اور یہ بھی کہ تعاقب کرنے والا اکیلا ہے۔ سولومن ایسا چالاک اور عیار شخص کسی فرد واحد کو اس گھنے جنگل میں دھوکا دے کر بہ آسانی ختم کرسکتا تھا۔ مجھے اس خطرے کا پوری طرح احساس تھا۔ سولومن بھاگتے بھاگتے رک کیوں گیا ہے؟ اس سوال نے

میرے ذہن کو الجھا دیا تھا۔

محتاط انداز میں آگے بڑھتے ہوئے معاً مجھے کافی فاصلے پر روشنی کی ایک چھوٹی سی لکیر دکھائی دی اور میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ روشنی چند ہی ساعتوں کے بعد معدوم ہوگئی تھی۔ میں نے تیزی سے اسی سمت بڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی میں نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ یوں جیسے کوئی بھاری پتھریلی سل اپنی جگہ سے سرکی ہو۔ میں نے احتیاط کو چھوڑ کر تیزی کے ساتھ اس طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ تجسس سے قطع نظر اس کا سبب یہ تھا کہ میرا ذہن ایک نتیجے تک پہنچ چکا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ گڑگڑاہٹ بے وجہ نہیں تھی۔ جنگل میں موجود کسی خفیہ راستے کے ذریعے سولومن فرار ہو کر میری دسترس سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کے قدموں کی آواز رکنے کا سبب بھی غالباً یہی رہا ہوگا کہ وہ اس خفیہ راستے کے آغاز تک پہنچ گیا ہوگا۔

دوڑتے دوڑتے اچانک اپنے سامنے ایک عجیب اور ناقابل یقین منظر دیکھا کہ میرے قدم رک گئے، میرے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک پختہ قبر نظر آ رہی تھی۔ اس قبر کا تعویذ اٹھا ہوا تھا جس کی وجہ سے خلاء نظر آ رہا تھا۔ تعویذ آہستہ آہستہ بند ہوتا جا رہا تھا۔ میری نگاہ لوح مزار پر پڑی جو ٹیڑھی تھی، میں حیرت سے قبر کے پختہ تعویذ کو بند ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ٹیڑھی لوح بھی اب سیدھی ہوتی جا رہی تھی۔ اس لوح اور قبر کے تعویذ کے درمیان یقیناً کوئی نہ کوئی رابطہ تھا، جب میں اس قبر تک پہنچی تھی تو تعویذ اس حد تک نیچے آ چکا تھا کہ خلا میں اترنا ممکن نہیں رہا تھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا محال نہیں تھا کہ وہ خفیہ راستہ ہی تھا جس کے ذریعے سولومن فرار ہوا ہے۔

”میں تمہیں اتنی آسانی سے فرار نہیں ہونے دوں گی، سولومن!“ میں زیر لب بڑبڑا کر آگے بڑھی۔

میری جگہ ان حالات میں اگر کوئی مرد بھی ہوتا تو شاید وہ فیصلہ نہ کرتا جو میں نے کیا۔ قبر کا تعویذ اب اپنی جگہ آ چکا تھا اور لوح بھی سیدھی ہو چکی تھی۔ میں نے پہلے قبر کا چاروں طرف سے جائزہ لیا۔ اس وقت مجھے ٹارچ کی کمی محسوس ہوئی پھر میں سنگ مرمر کی لوح پر ہاتھ پھیر کر دیکھنے لگی۔ میں نے لوح کو دائیں جانب جھکے ہوئے دیکھا تھا، اس لئے اسے دوبارہ دائیں جانب جھکانے کیلئے زور لگانے لگی، مگر اپنے جسم کی پوری قوت صرف کرنے کے باوجود میں اسے اپنی جگہ سے ہلانے میں ناکام رہی۔ معلوم نہیں کس طرح اس قبر کا تعویذ اوپر اٹھتا تھا۔ خاصی دیر کوشش اور زور آزمائی کے بعد میں مایوس ہوگئی۔ معلوم نہیں وہ خفیہ راستہ جنگل کے کس حصے میں نکلتا تھا! کسی ایسے ہی آڑے وقت کیلئے غالباً سولومن نے یہ خفیہ راستہ نظر میں رکھا ہوگا۔ اس خفیہ راستے کے بارے میں اسے یقیناً مقامی ایجنٹوں ہی نے بتایا ہوگا۔

سولومن کے فرار کے بعد اب میرے لئے یہی صورت رہ گئی تھی کہ واپسی کا سفر شروع کروں۔ مجھے سمتوں کا اندازہ نہیں تھا، اس لئے اندازے ہی کی بنیاد پر یہ سفر شروع ہوا، گھڑی کی چمکتی ہوئی سوئیوں میں وقت دیکھا تو مجھے حیرت سی ہوئی۔ رات کے دو بجے رہے تھے، مجھے بھاگ دوڑ میں اتنا اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ جس میدان سے میں نے سولومن کا تعاقب شروع کیا تھا وہاں تک دوبارہ واپسی میں مجھے دو اڑھائی گھنٹے لگ جانا معمولی بات تھی۔ اس وقت تک کرنل صبور اور ملٹری والے وہیں موجود رہیں گے، یہ بھی ناممکن سی بات تھی لیکن مجھے اس بات کا ضرور یقین تھا کہ کرنل صبور نے میری

تلاش میں اپنے آدمیوں کو ادھر ادھر ضرور دوڑایا ہوگا، اس امید پر کہ مجھے تلاش کرتا ہوا کوئی فوجی جوان مل جائے، میں آگے بڑھتی رہی۔

میں اپنی دانست میں اس میدان کی طرف تقریباً ایک گھنٹے تک آگے بڑھتی رہی اور پھر مجھے احساس ہونے لگا کہ شاید میں اس جنگل میں راستہ بھول گئی ہوں۔ کچھ دیر ستانے کیلئے میں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی۔ مسلسل بھاگنے اور چلنے کی وجہ سے اب میں کچھ تھکن محسوس کرنے لگی تھی۔ میری چاروں طرف سناٹا اور اندھیرا تھا، اپنی ساری زندگی میں اب سے پہلے میں کبھی ایسے غیر یقینی حالات سے دوچار نہ ہوئی تھی۔ خیریت یہ تھی کہ اب تک اس جنگل میں کسی جنگلی درندے سے میرا سامنا نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں ہمیشہ فوجی جوانوں کی نقل و حرکت رہتی تھی، قیاس غالب یہی تھا کہ فوجی جوانوں نے اس جنگل کو درندوں سے صاف کر دیا تھا۔ کچھ دیر ستانے کے بعد میں اٹھ کھڑی ہوئی اور دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ ایک ایسا سفر جس کی منزل کا مجھے علم نہیں تھا! ذرا سی دیر بعد گھنے درختوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب میری راہ میں ایک خشک نالہ تھا۔ اس میں پانی بہنے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس لئے اندھیرے کے باوجود میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ نالہ خشک ہی ہے اس کی گہرائی کا میں کوئی اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ نالے کی دوسری جانب درختوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ وہ نالہ اتنا چوڑا تھا کہ طویل جست لگا کر بھی اسے عبور کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس پر غالباً آنے جانے والوں نے کسی درخت کا تنا کاٹ کر ڈال دیا تھا ورنہ میرے لئے راہ مسدود ہو جاتی۔ اس کے باوجود سینڈل پہنے ہوئے اس پتلے تنے پر چل کر نالہ پار کرنا مشکل تھا۔ تنا بھی سیدھا نہیں تھا بلکہ کئی جگہ سے مڑا ہوا تھا۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر سینڈل اتار کر ہاتھ میں لے لئے اور پھر نالہ عبور کرنے کیلئے تنے پر قدم رکھ دیا۔ اجنبی جنگل میں کسی درخت کے تنے پر چلتے ہوئے میری حالت سرکس میں کام کرنے والی لڑکیوں جیسی تھی۔ مجھے اس غیر ہموار تنے پر چلنے کیلئے بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا پڑ رہے تھے۔ اپنے جسمانی توازن کو برقرار رکھنے میں بھی مجھے بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ بار بار میرا جسم کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف جھک جاتا تھا اور سنبھلنے کیلئے مجھے اپنے دونوں بازوؤں کو حرکت میں لانا پڑتا تھا۔ اگر میں نالہ عبور کرتے ہوئے اپنا توازن برقرار نہ رکھ پاتی تو معلوم نہیں کیا صورت پیش آتی! خدا معلوم وہ نالہ کتنا گہرا تھا! جب میں سولومن کا تعاقب کرتی ہوئی جنگل میں آگے نکل گئی تھی تو اس وقت یہ نالہ میرے راستے میں نہیں آیا تھا، اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ وہ راستہ ہرگز نہیں تھا، مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا! میں یقیناً راستہ بھٹک کر کسی اور طرف نکل آئی تھی۔ خدا خدا کر کے میں نے نالہ عبور کیا اور سینڈل پہن کر ایک بار پھر گھنے جنگل میں داخل ہوگئی، آگے بڑھتے ہوئے میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ پیڑوں کے درمیان ایک سرنگ سی تھی، گھنے درختوں کی شاخیں اس طرح اوپر جا کے مل گئی تھیں جیسے وہ شاخیں نہ ہوں، سرنگ کی چھت ہو۔ ان گھنے درختوں کے درمیان وہ سرنگ نما راستہ تھا جس پر میں چل رہی تھی۔ سرنگ نما وہ راستہ ختم ہوا تو دوبارہ میں درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان پہنچ گئی۔ میں نے گھڑی میں پھر وقت دیکھا۔ اب پونے چار بجنے والے تھے۔ اندھیرے میں ان درختوں کے جھنڈ سے نکلنے کے بعد میں ایک چکنی اور گیلی ڈھلان تک جا پہنچی۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی اور میرا پیر پھسل گیا۔ پھسلتے ہوئے میں نے دیکھ لیا کہ تیزی

کے ساتھ میرا جسم پانی کی طرف بڑھتا جارہا ہے۔ جنگل کے درمیان وہ کوئی چھوٹی سی جھیل تھی۔ میں نے پھسلتے ہوئے ڈھلان کی جھاڑیاں پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے ہاتھ میں آکر پھسل گئیں۔ اس سے بس اتنا ہوا کہ پھسلنے کی رفتار ذرا کم ہوگئی۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں کسی جھیل میں زیادہ پانی نہ ہو، مگر کچھ ہی دیر بعد میرا یہ خدشہ غلط ثابت ہوا۔ جھیل میں بس کمر تک پانی تھا، جلد ہی میں دوسرے کنارے تک پہنچ گئی۔

جھیل سے نکل کر اوپر چڑھنے میں مجھے خاصی دشواری ہوئی مگر میں جھاڑیوں کو مضبوطی سے پکڑتی ہوئی کسی نہ کسی طرح اوپر پہنچ ہی گئی، کیونکہ جھیل کی دوسری جانب بھی پھسلواں ڈھلان تھی۔ کپڑے گیلے ہو کر میرے جسم سے چپک گئے تھے، میں نے انہیں جھٹک کر پانی جھاڑا اور پھر آگے بڑھنے لگی۔ یہاں جنگل اتنا گھنا نہیں تھا، پیڑ قریب قریب ہونے کے بجائے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تھے۔ یہ جھیل بھی پہلے میرے راستے میں نہیں پڑی تھی، مجھے اس وجہ سے بھی مزید یقین ہوگیا کہ یہ کوئی اور ہی راستہ ہے۔

جھیل عبور کر کے منگل میں آگے بڑھتے ہوئے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک میری سماعت سے ''ہالٹ!'' کی آواز ٹکرائی۔ اس کے ساتھ میرے قدم رک گئے۔ یہ آواز سن کر میرے سارے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ میرے ذہن میں آیا کہ بالآخر میں اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو ہی گئی۔ وہ فوجی یقیناً مجھے منزل تک پہنچا دیں گے۔

''ہینڈز اپ!'' مجھے ان فوجیوں کی طرف سے دوسرا حکم ملا جن کے ہیولے مجھے کچھ فاصلے پر نظر آرہے تھے، وہ تعداد میں دو تھے اور میری ہی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ یہ ضروری تھا تاکہ وہ لوگ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ جب تک شناخت نہ ہو جاتی مجھے ان کے حکم کی تعمیل کرنا تھی۔

وہ دونوں بھاری قدموں سے چلتے ہوئے میرے قریب آگئے اور پھر اچانک ان میں سے ایک نے اپنی ٹارچ روشن کرلی، روشنی کا دائرہ میرے چہرے پر پڑا اور میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اتنی دیر اندھیرے میں رہنے کے سبب میں اچانک روشنی کا سامنا نہیں کرسکی تھی اور اپنی دونوں آنکھیں بند کرلی تھیں پھر جب میں نے محسوس کیا کہ روشنی کا دائرہ میرے چہرے سے ہٹ گیا ہے تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ روشنی کا دائرہ اب میرے پورے جسم پر حرکت کرتا ہوا سینے پر آ کے رک گیا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اب ٹارچ بجھا دی جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا روشنی کا دائرہ اسی ایک جگہ حرکت کرتا رہا۔ مجھے ان فوجیوں کی یہ حرکت بہت چھچھوری اور گھٹیا محسوس ہوئی۔ پاکستانی فوجیوں سے مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ کسی عورت کے ساتھ وہ ایسی نازیبا حرکت کریں گے۔ مجھے غصہ آ گیا۔

''یہ کیا گھٹیا حرکت ہے؟ ٹارچ بجھاؤ!'' میں غصے پر قابو نہ رکھ سکی۔ ''تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں کون ہوں!''

''کیوں کیا تم پردھان منتری (وزیراعظم) پنڈت جواہر لال نہرو کی دھرم پتنی (بیوی) ہو؟'' ان میں سے ایک چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو؟...... دھرم پتنی؟ میرا ذہن چکرا گیا۔ فوری طور پر میں کچھ نہ سمجھ سکی، پھر جب میں نے اس فوجی کے لہجے پر غور کیا تو میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یقیناً وہ

بھارتی فوجی تھے۔

''تم لوگوں کو اتنی جرات کیسے ہوئی کہ پاکستان کی پاک سرزمین پر تم نے قدم رکھا؟'' میں نے پرجوش آواز میں انہیں مخاطب کیا۔ ''کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے جسم گولیوں سے چھلنی کردیئے جائیں گے!'' میں حقیقت سے بے خبران پر برس پڑی۔ اس وقت جوش اور غصے میں مجھے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ ان دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں ہیں۔

میری بات سن کر وہ دونوں زور سے ہنس پڑے، پھر ان میں سے ایک انتہائی لچر لہجے میں کہنے لگا۔ ''میری بلبل، تم اسے کیا پاکستان سمجھ رہی ہو؟ یہ بھارت کی دھرتی ہے، بھارت کی پاکستانی سرحد تو یہاں سے کئی میل پیچھے ہے۔''

''کیا بکواس کررہے ہو تم!'' مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

''تم جیسی سندر ناری (خوبصورت عورت) پر غصہ کچھ جچتا نہیں لگتا ہے کہ تم ہمارے علاقے میں جاسوسی کرنے آئی ہو! اگر ایسا ہی ہے تو ہم تمہارا سواگت واستقبال اچھی طرح کریں گے۔ تمہیں جیون بھر ! ساری زندگی یاد رہے گا کہ کبھی بھارتی جوانوں سے پالا پڑا تھا، ہم اس رات کو تمہارے لئے یادگار بنا دیں گے۔''

اس بھارتی فوج نے مجھ سے جو کہا تھا وہ اس کی گھٹیا ذہنیت کا غماز تھا۔ اس کی بات سن کر میرا خون کھول اٹھا اور میں کوشش کے باوجود خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں دانت پیس کر بولی۔ ''کمینے! تو کیا میرے لئے اس رات کو یادگار بنائے گا، تیری حسرت تیرے دل ہی میں رہ جائے گی او میں تجھے جہنم رسید کردوں گی۔'' پھر میں نے نتائج کی پروا کئے بغیر ان پر چھلانگ لگا دی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی عورت اتنی دلیری اور بے جگری کا ثبوت دے سکتی ہے۔ وہ اسی لئے بے خبری میں چوٹ کھا گیا۔ اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ کر دور جا گری۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں رائفل تھی جس پر میں چھلانگ لگاتے ہی ہاتھ ڈال دیا تھا اور اب وہ میرے قبضے میں آچکی تھی۔ وہ فوجی چاروں شانے چت زمین پر پڑا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ اس فوجی کا ساتھی یقیناً صورتحال کی سنگینی کا اندازہ نہیں کرسکا تھا مگر میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھی۔ میں تیزی کے ساتھ جھپٹ کر اس کے عقب میں پہنچ گئی اور رائفل کی نال کے اگلے حصے پر لگی ہوئی سنگین کی نوک اس کی پشت پر رکھ دی۔

''رائفل دور پھینک دو! ورنہ...... میں نے دھمکی آمیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی پشت پر دباؤ ڈالا۔

اس فوجی نے فوراً میرے حکم کی تعمیل میں اپنی رائفل دور پھینک دی اور پھر بغیر میرے مزید حکم دیئے اپنے دونوں ہاتھ بھی اٹھا دیئے۔

اس وقت مجھے دائیں جانب ہلکی سی آہٹ سنائی دی اور میں تیزی سے ادھر مڑ گئی۔ میں نے جس فوجی سے رائفل چھینی تھی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ یہاں سے بچ کر نکل جاؤ گی تو یہ بڑا مشکل ہے!'' وہ مجھے گھورتا ہوا

بولا۔ تم واقعی تربیت یافتہ پاکستانی جاسوس ہو، اس کا یقین ہوگیا ہے اب مجھے!'' یہ کہتا ہوا وہ قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

''رک جاؤ..... اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہے تو اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا!'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔'' رائفل کا رخ اس کی جانب تھا۔

میری دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا، میرے اس کے درمیان فاصلہ کم ہونے لگا، میں تذبذب میں پڑگئی۔ مجھے اب یقین ہوگیا تھا کہ میں راستہ بھٹک کر ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوچکی ہوں۔ ایسی صورت میں فائر کرنا خود اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، اطراف میں موجود بھارتی فوجی فائر کی آواز سنتے ہی اس طرف دوڑ پڑتے اور پھر بالآخر مجھے گھیر لیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ میں تن تنہا کب تک ان کا مقابلہ کرسکتی تھی۔ شدید خطرے کے وقت میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی ایسا ہی تھا۔ ان دونوں کو میں نہتا کرچکی تھی۔ غیر مسلح ہونے کی صورت میں ان دونوں کیلئے میں کافی تھی۔ میں انہیں با آسانی زیر کرسکتی تھی یہی سوچ کر فائر کرنے کے بجائے میں نے اپنے ہاتھ سے رائفل پھینک دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ابھی میں اپنے فیصلے پر عمل کرنے والی تھی کہ ایک غیر متوقع واقعہ پیش آگیا۔ جو فوجی قدم قدم میری طرف بڑھ رہا تھا، اس نے شاید میرا ہی داؤ مجھی پر الٹنا چاہا تھا۔ اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی تھی۔ نتیجتاً اس کی طرف تنی ہوئی رائفل کی نال پر لگی سنگین اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔ اس وقت اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے رائفل کی نال پکڑ کر اپنے سینے سے سنگین نکالنے کی کوشش کررہا تھا، مگر جلد ہی اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے جھٹکا دے کر سنگین اس کے سینے سے باہر نکال دی۔ خیریت یہ ہوئی تھی کہ اس کی چیخ زیادہ بلند نہیں ہوسکی تھی ورنہ میرے لئے یہ خطرناک ثابت ہوتا۔ اس تمام عرصے میں دوسرا فوجی ذرا ہی فاصلے پر ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ سنگین نے شاید زمین پر پڑے ہوئے فوجی کا دل چھید دیا تھا ورنہ اتنی جلدی وہ جہنم رسید نہ ہوتا۔ میں نے جھک کر اس کی ناک پر ہاتھ رکھا، اس کا سانس بند ہوچکا تھا۔

''خس کم جہاں پاک!'' میں زیر لب بڑبڑا کر دوسرے فوجی کی طرف متوجہ ہوئی، اس کا بھی کوئی بندوبست کرنا ضروری تھا، اردگرد شاید ان دو فوجیوں کے سوا مزید فوجی نہیں تھے ورنہ وہ اب تک وہاں پہنچ چکے ہوتے، رائفل اب تک میرے ہاتھ میں تھی۔

میں دوسرے فوجی کے سامنے پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر گڑگڑانے لگا۔ ''دیوی جی! مجھے..... مجھے قتل نہ کریں، مم..... میں نے تو آپ سے کچھ..... کچھ نہیں کہا! میرے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔''

فطرتاً وہ فوجی مجھے بزدل معلوم ہوا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''میں تمہیں قتل نہیں کروں گی، تمہارے ساتھی کو بھی میں نے قتل نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنی حماقت کے نتیجے میں مارا گیا ہے۔''

''کک..... کیا شنکرم..... مر گیا؟'' وہ ہکلایا۔ مرنے والے کی طرف اس کی پشت تھی اس لئے وہ حقیقت سے بے خبر رہا تھا۔

''ہاں وہ مر گیا!'' میں نے جواب دیا۔'' اس نے بغیر سوچے سمجھے مجھ پر چھلانگ لگا دی تھی۔ نتیجتاً اس کے سینے میں خود اسی کی رائفل کی سنگین اتر گئی، تم یقیناً ایسی جرات نہیں کروگے۔''

''بل..... بالکل نہیں دیوی جی!..... میں..... میں تو.....، خوف کے سبب وہ ہکلانے لگا اور اپنی بات بھی پوری نہ کرسکا۔

''تم اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو اور کوئی حماقت نہیں کروگے تو پھر جو کچھ میں پوچھ رہی ہوں، اس کا بالکل صحیح صحیح جواب دیتے جاؤ!'' میں نے اس کے خوف زدہ چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ضرور..... ضرور پوچھیں دیوی جی!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں..... میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے پر راضی ہوں۔''

''پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں سے کوئی قریبی آبادی کتنی دور ہے؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

''زیادہ دور نہیں ہے، مشکل سے چار پانچ میل کا فاصلہ ہوگا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''چوبیس پرگنہ نام ہے اس آبادی کا!'' وہ پوچھے بغیر ہی تفصیل بتانے لگا۔'' وہاں ریلوے سٹیشن بھی ہے جہاں سے آپ کو کلکتہ پہنچنے کیلئے ٹرین مل سکتی ہے۔''

''مگر مجھے کلکتہ نہیں جانا۔'' میں نے دانستہ اور مصلحتاً اسے غلط راہ پر ڈالنے کیلئے کہا اور پھر بنگال ہی کے ایک اور شہر کا نام لے کر بولی۔'' مجھے آسنسول پہنچنا ہے۔''

''یہ چھوٹی لائن ہے۔'' وہ بولا اب اس کا خوف میرے نرم رویئے کے سبب بڑی حد تک کم ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''اگر آپ آسنسول جانا چاہتی ہیں تو بھی پہلے آپ کو کلکتہ ہی جانا پڑے گا، یہاں سے جو ٹرین آپ کو ملے گی وہ کلکتہ کے ایک ریلوے سٹیشن سیالدہ تک پہنچا دے گی، پھر آپ کو وہاں سے پاوڑہ ریلوے سٹیشن جانا پڑے گا۔ آسنسول کیلئے پاوڑہ کے سٹیشن سے ہی کوئی ٹرین آپ کو مل جائے گی۔'' اس نے تفصیل کے ساتھ بتایا۔ میرے کہنے پر اب اس نے اپنے دونوں ہاتھ بھی نیچے کرلئے تھے۔

میں اس سے پہلے بھی کلکتہ جاچکی تھی۔ وہ میرا دیکھا ہوا شہر تھا، جو کچھ وہ بھارتی فوجی بتا رہا تھا، بالکل درست تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میرے سوالوں کے غلط جواب نہیں دے رہا، پھر میں نے اس سے آخری اہم سوال کیا کہ میں بھارتی فوجیوں کی نظر میں آئے بغیر کس طرح قریبی ریلوے سٹیشن تک پہنچ سکتی ہوں؟

میرے اس سوال کا جواب بھی اس نے بڑی تفصیل سے دیا پھر آخر میں کہنے لگا۔ ''یہ وہ راستہ ہے جس سے عموماً سمگلر آتے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ فوجیوں کی نظر میں آئے بغیر اپنا دھندہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کیلئے انہیں ہمارے بڑے افسران کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔''

''معلوم ہے مجھے۔'' میں بولی۔ اس سلسلے میں کرنل صبور سے میری بات ہوئی تھی اور اس نے بھی میری بات کی تصدیق کی تھی۔ فوجیوں کی نظر سے بچ کر نکلنے کا یقیناً یہی راستہ تھا۔ وہ بھارتی فوجی میری صحیح رہنمائی کررہا تھا۔ اس نے جو راستہ بتایا تھا، زیادہ مشکل یا پیچیدہ نہیں تھا۔ یہ راستہ میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا تھا۔ اس نے راستے کی کچھ نشانیاں بھی بتائی تھیں، وہ بھی میرے ذہن میں تھیں۔ میرے لئے محفوظ راستہ تو یہ تھا کہ ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد دوسرے بھارتی فوجی کو بھی موت

ی نیند سلا دیتی تاکہ وہ میرے بارے میں اپنے دوسرے ساتھیوں یا اپنے افسران کو کچھ نہ بتا سکتا مگر صرف اتنی سی بات کیلئے ایک انسان کو قتل کر دینا میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔ ہر چند کہ وہ ایک ایسے ملک کا فوجی تھا جس کی نظر میں ہمیشہ سے میرے ملک کا وجود کھٹکتا رہا تھا اور کبھی اس کے حکمرانوں نے دل سے میرے ملک کے وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا لیکن اس کا ذمہ دار صرف وہ فوجی نہیں تھا میں نے اس لئے اس کی جان لینے کے بجائے تھوڑا سا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔

مجھے علم تھا کہ اس وقت میں اس بھارتی فوجی سے جو وعدہ بھی لوں گی، موت کے خوف میں وہ اسے پورا کرنے کا اقرار کرلے گا، مگر بعد میں اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکے گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس سے اپنے متعلق کسی کو کچھ نہ بتانے کا وعدہ نہیں لیا۔ اگر وہ میرے بارے میں اپنے ساتھیوں یا افسران کو کچھ بھی نہ بتاتا تو اپنے ساتھی کے متعلق کیا جواب دیتا کہ وہ کس طرح مر گیا؟

اپنے فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے میں نے احتیاطاً رائفل پر لگی ہوئی سنگین الگ کرلی جو خون آلود تھی۔ فوجی مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھ کر سہم گیا۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اسے دلاسہ دیا۔ ''میں تمہیں قتل نہیں کروں گی، مگر تمہیں بے ہوش ضرور ہونا پڑے گا۔''

''نن..... نہیں..... نہیں دیوی جی۔'' اس نے خوفزدہ آواز میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھ اس طرح اٹھا دیئے جیسے مجھے وہ کہنا چاہتا ہو شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے دھوکا دے کر قتل کر دینا چاہتی ہوں، اس کی آواز کا خوف اس کی غمازی کر رہا تھا۔

''تم ناحق ڈر رہے ہو۔'' میں یہ کہتی ہوئی اس کی طرف مڑی، میں سوچ رہی تھی کہ ناحق اسے بے ہوش کرنے کے بارے میں بتایا، وہ لاعلم ہی رہتا تو اچھا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے، میں تمہیں بے ہوش بھی نہیں کروں گی، مگر اس صورت میں تمہیں میری ایک بات ماننا پڑے گی، اب میں اس کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔''

''تو..... بولا کیا بات ہے دیوی.....'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میرا دایاں ہاتھ اٹھ چکا تھا۔ سنگین میں نے بائیں ہاتھ میں لے لی تھی۔

میں نے اس کی کنپٹی کو نشانہ بناتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ضرب ذرا بھرپور لگے تاکہ وہ جلد ہوش میں نہ آسکے اور مجھے اس دوران میں اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور ہونے کا موقع مل جائے۔ اس وقت میرے ذہن میں دور تک یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ضرب اس کیلئے جان لیوا ثابت ہوگی۔ اس کا اندازہ مجھے کچھ ہی دیر بعد ہوگیا جب میں اس کی تلاشی لے رہی تھی۔ کنپٹی پر بھرپور ضرب پڑتے ہی اس کا جسم لہرا کر زمین پر آرہا تھا، مگر میں اس کی تلاشی نہ لیتی تو اسی غلط فہمی میں مبتلا رہتی کہ وہ صرف بے ہوش ہوا ہے۔

تلاشی لینے کا مقصد ہندوستانی کرنسی کا حصول تھا کیونکہ میرے پاس صرف پاکستانی کرنسی تھی جو اس ملک میں میرے لئے وقتی طور پر بے کار تھی۔ اس چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر جس کی بابت مجھے بھارتی فوجی نے بتایا تھا کرنسی کا تبادلہ ظاہر ہے ناممکن ہی تھا، مگر ایسا ممکن بھی ہوتا تو میں یہ خطرہ مول نہ

لیتی۔ جب میں ہندوستانی کرنسی کی تلاشی میں اس فوجی کی جیبیں ٹٹولنے کیلئے جھکی تو اس کی ناک سے خون بہتے دیکھ کر میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا پھر میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا تو میرے خدشے کی تصدیق ہوگئی۔ اس کی حرکت قلب بند ہو چکی تھی، غالباً اس کی کنپٹی پر لگنے والی بھرپور ضرب کے سبب دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

مجھے اس بھارتی فوجی کے مرنے کا بہت افسوس ہوا، کیونکہ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا اسے قتل نہیں کروں گی۔ اس کی نسبت پہلے فوجی کی موت پر مجھے قطعی رنج نہیں ہوا تھا پھر اپنے دل کو میں نے یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔ میرے نزدیک وہ مصلحت یہی ہوسکتی تھی کہ میں اس خطرناک علاقے سے کسی خطرے کے بغیر نکل جاؤں۔

ان دونوں بھارتی فوجیوں کی جیبوں سے مجھے زیادہ رقم نہ مل سکی، مگر یہ رقم اتنی ضرور تھی کہ میں بہ آسانی کلکتہ پہنچ سکتی تھی۔ کلکتہ کے ایک علاقے پارک سرکس میں میرے کچھ ننھیالی عزیز رہتے تھے، فوری طور پر میں ان میں کسی ایک کے یہاں ٹھہر سکتی تھی۔

جب میں وہاں سے چلی تو صبح کے آثار پیدا ہو چلے تھے، میں نے اس لئے ٹارچ لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ میرے ہاتھ میں جو رائفل تھی وہ بھی میں نے وہیں پھینک دی تھی۔ میرے خیال میں مجھے اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یوں بھی میرے پرس میں وہ ریوالور موجود تھا جو مجھے کرنل صبور نے دیا تھا۔ ضرورت کے وقت وہ میرے کام آسکتا تھا۔

بھارتی فوجی کے بتائے ہوئے راستے پر میں کچھ دور سیدھی چلی اور پھر دائیں جانب ایک پگڈنڈی پر چلنے لگی۔ یہی وہ راستہ تھا جو بھارتی فوجی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق، سمگلر اپنی آمدورفت کیلئے استعمال کرتے تھے۔ ابھی میں جنگل ہی میں تھی کہ اس راستے پر مخالف سمت سے مجھے دو آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ انہوں نے بھی مجھ کو دیکھ لیا تھا یا نہیں، میں ان سے بچنے کی خاطر ایک پیڑ کے پیچھے چھپ گئی تاکہ وہ گزر جائیں تو دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کروں۔ پیڑ کی آڑ میں چھپنے کی وجہ سے وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔ صبح کے اجالے میں مجھے ان دونوں کی صورتیں بھی نظر آگئی تھیں۔ ان میں سے ایک نوجوان تھا جس کی عمر بمشکل 25 سال رہی ہوگی، اس کے شانے سے ایک ایئر بیگ لٹکا ہوا تھا، وہ پینٹ اور شرٹ پہنے ہوئے تھا اور دوسرا گنجا اور جسیم تھا، اس کے چہرے پر داڑھی تھی، وہ قمیص اور تہبند پہنے ہوئے تھا۔

کچھ دیر انتظار کے بعد میں نے پیڑ کی آڑ میں رہتے ہوئے یہ جاننے کیلئے مخالف سمت جھانک کر دیکھا کہ وہ دونوں آرہے ہیں یا نہیں! مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ درختوں کے درمیان وہ پگڈنڈی سونی پڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید ان دونوں نے راستہ بدل لیا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے پیڑ کی آڑ سے نکلنے ہی والی تھی کہ مجھے اپنے بالکل پیچھے ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی اور اسی لمحے میں تیزی کے ساتھ مڑی، میرے سامنے وہی گنجے سر اور داڑھی والا اپنے میلے دانت نکالے کھڑا تھا جسے کچھ دیر پہلے میں نے مخالف سمت سے آتے دیکھا تھا۔ نوجوان اس کے ساتھ نہیں تھا، اس کی آنکھوں میں مجھے شیطانی چمک نظر آرہی تھی، اپنے بشرے سے وہ مجھے بنگالی ہی معلوم ہوا تھا۔ وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے؟ اور کیا چاہتے ہو تم؟'' میں نے اس سے سخت لہجے میں سوال کیا۔ اس نے یقیناً مجھے پیڑ کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور راستہ بدل کر پیچھے سے مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی یہ حرکت بھی اس بات کا ثبوت تھی کہ اس کے ارادے نیک نہیں ہیں۔

''ٹوکا!'' میری بات کے جواب میں وہ دانت نکال کر بولا، پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں جو کچھ اس نے کہا وہ یہ تھا کہ میرے پاس جتنی رقم ہے خاموشی سے اس کے حوالے کردوں ورنہ وہ بھارتی فوجیوں کو میرے بارے میں بتا کر مجھے پکڑوا دے گا۔

وہ شخص مجھے کسی سمگلر کے بجائے کوئی معمولی لٹیرا معلوم ہوا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں نے سنگین اپنے پیچھے چھپالی تھی۔ اس نے جب مجھے پکڑوا دینے کی دھمکی دی اور اس کے ساتھ رقم کا مطالبہ کیا تو میں نے اپنا وہ ہاتھ آگے کرلیا جس میں سنگین تھی۔ میں ڈپٹ کر بولی۔ ''یہ دیکھ رہے ہو تم کیا ہے! اس سے میں ایک منٹ میں تمہاری آنتیں باہر کرسکتی ہوں، تم اگر خیریت چاہتے ہو تو اپنا راستہ لو ورنہ نتائج کی ذمہ داری تمہی پر ہوگی۔''

''تم اس کو چلائے گا!'' وہ میرا مضحکہ اڑانے والا انداز میں زور سے ہنس پڑا۔

اسے ڈرانے کیلئے میں نے ہاتھ بلند کرکے سنگین کو ہوا میں گردش دی، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے سنگین چھیننے کی کوشش کی۔ میں سمجھ گئی کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا۔ دوسرے ہی لمحے میری بھرپور لات اس کے پیٹ پر پڑی، وہ ''اوح'' کرتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ لیا پھر میری دوسری جچی تلی ٹھوکر اس کی بائیں کنپٹی پر پڑی اور وہ چیختا ہوا لمبا ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا، وہ بے ہوش ہوگیا تھا اور دو تین گھنٹے سے پہلے اس کا ہوش میں آنا محال تھا۔

اس سے نمٹ کر مجھے اس کے نوجوان ساتھی کی فکر ہوئی، اسے یہیں کہیں قریب ہی ہونا چاہئے تھا۔ یہ سوچ کر میں کہیں راہ نہ بھٹک جاؤں، میں نے اس نوجوان کی تلاشی کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر وہ خود ہی مجھ سے بھڑنے کی کوشش کرے گا تو دیکھا جائے گا۔ یہی سوچتی ہوئی میں دوبارہ اسی پگڈنڈی پر آگئی اور چوکنا انداز میں اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے آگے قدم بڑھانے لگی۔

ابھی اس پگڈنڈی پر میں کچھ دور ہی چلی تھی کہ دائیں جانب پیڑوں کی قطار میں سے ایک پیڑ کے پیچھے کسی کو چھپتے دیکھا اور میرے اعصاب تن گئے۔ اس راستے پر مجھے ابھی تک کوئی فوجی تو نظر نہیں آیا تھا، مگر اسے بالکل محفوظ قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ سمگلرز کی آمدورفت نے اس راستے کو بھی بڑی حد تک مخدوش اور پرخطر بنا دیا تھا۔ خطرے کے احساس ہی نے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ میں پیڑ کے پیچھے چھپنے والے کے بارے میں معلوم کروں، کچھ سوچ کر میں نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے اس شخص کو دیکھا ہی نہیں ہے اور آگے بڑھتی رہی۔ تھوڑا فاصلہ طے کرکے اچانک میں دائیں جانب پیڑوں کی قطار کے درمیان گھس گئی اور پیڑوں کی آڑ لیتے ہوئے اس طرف بڑھنا شروع کیا جہاں ایک شخص کو چھپتے دیکھا تھا۔ حتیٰ الامکان قدموں کی آواز پر قابو پاتے ہوئے میں اس شخص کے عقب میں پہنچ گئی۔ اس کی پشت میری جانب تھی اور میں پنجوں کے بل اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا، یہ اس گنجے شیطان کا ساتھی وہی

نوجوان تھا جسے میں نے پہلی بار اس راستے پر آتے دیکھا تھا۔ اس کے شانے سے اب بھی ایئر بیگ لٹکا ہوا تھا، وہ مجھے کوئی مقامی نوجوان نہیں لگتا تھا۔ اس نوجوان کے بالکل پیچھے پہنچ کر میں نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی سنگین اس کی پشت پر رکھ دی اور وہ تقریباً اچھل پڑا۔

''اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دو!'' میں نے اسے حکم دیا۔ اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی تو میں نے دوسرا حکم دیا۔ ''ہاتھ اٹھاتے ہوئے میری طرف مڑو!'' میں نے سنگین اس کی پشت سے ہٹالی۔

دوسرے ہی لمحے وہ میری طرف مڑا میں نے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھیں، وہ انتہائی خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا، پھر رکے بغیر دوسرا سوال اٹھایا۔ ''اور یہاں تم کیا کررہے ہو؟''

چند لمحے وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا، پھر اس طرح کھنکھارنے لگا جیسے بولنے کی کوشش کررہا ہو، مگر اس کی قوت گویائی کام نہ دے رہی ہو۔

''خاموش کیوں ہو؟ بولو!'' میں نے اسے چپ دیکھ کر ڈانٹا اور دھمکی آمیز انداز میں سنگین کو حرکت دی۔''

''مم...... میں...... میرا نام طا...... طالب ہے اور...... اور یہاں مجھے وہ...... وہ انتظار کرنے کیلئے کہہ گیا تھا مگر...... لیکن ابھی تک نہیں لوٹا۔''

''کون نہیں لوٹا؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''میں...... میں اس کا نا...... نام نہیں جانتا؟'' اس نوجوان نے ہکلا کر جواب دیا، پھر ''گنجے شیطان'' کا حلیہ بتانے لگا۔

''عجیب بات ہے کہ وہ تمہارے ساتھ تھا اور تم اس کا نام تک نہیں جانتے!'' میں نے کہا اور پھر اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اسی خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا ''کیا وہ گنجا تمہیں سرحد عبور کرانے کیلئے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا؟''

''جج...... جی ہاں!'' اس نے اقرار کیا۔ ''ہندوستانی سرحد عبور کر کے مجھے بحفاظت پاکستانی سرحد کی حدود میں پہنچانے کیلئے پانچ سو روپے لئے تھے اس نے!''

پھر میرے اصرار پر اس نوجوان نے ہندوستان چھوڑ کر غیر قانونی طور پر پاکستان میں داخل ہونے کی جو وجہ بیان کی اسے سن کر میں بہت متاثر ہوئی۔ اس نوجوان کے والدین اور دیگر عزیز واقارب بھی ہندوستان کے ایک شہر میرٹھ میں تھے اور وہ تنہا پاکستان جا رہا تھا۔ مغربی پاکستان کے شہر حیدرآباد میں اس کے کچھ ننھیالی عزیز تھے وہ انہی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ میرٹھ میں ہونے والے ہندو مسلم فساد کے دوران میں قتل ہوجانے والے ایک ہندو کے قتل کا جھوٹا الزام اس نوجوان پر لگا دیا گیا تھا۔ کچھ دنوں وہ نوجوان اپنے رشتے داروں کے یہاں چھپتا پھرا مگر جب پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارنے لگی تو مجبوراً اس کے والدین کو اپنے بیٹے کی زندگی بچانے کیلئے دل پر پتھر رکھ کر ایک فیصلہ کرنا پڑا۔ اس طرح ان کا بیٹا نظروں سے دور تو ہوجاتا مگر زندہ بچ جاتا۔ اس نوجوان کے چند عزیز کاروباری

ضرورت کے تحت کلکتہ میں سکونت پذیر تھے۔ اس کے والدین نے انہی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسے کلکتہ بھیج دیا جہاں سے اسے ''گرو نیا پاسپورٹ'' یعنی غیرقانونی طور پر سرحد عبور کرکے پہلے مشرقی پاکستان پھر وہاں سے مغربی پاکستان اپنے عزیزوں کے پاس پہنچنا تھا۔

اس نوجوان کی دردبھری کہانی سن کر میں نے اسے دلاسہ دیا اور بتایا کہ جو شخص تمہیں اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا، وہ کچھ فاصلے پر بے ہوش پڑا ہے کیونکہ اس نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی تھی پھر میں اسے اپنے ساتھ اس جگہ تک لے گئی جہاں وہ ''گنجا شیطان'' اب تک بے ہوش پڑا تھا۔

''جب یہ ہوش میں آجائے گا تو تم دوبارہ سفر کرسکو گے، اس وقت تک یہیں اس شخص کے پاس رہو۔'' میں نے نوجوان سے کہا۔

مجھے اب معلوم ہوگیا تھا کہ جس شخص کو میں کوئی لٹیرا سمجھتی تھی، وہ درحقیقت ایک طرح کا سمگلر ہی تھا۔ وہ آدمیوں کو سمگل کرتا تھا۔ اس موقع پر مجھے ایک اور خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی اس گنجے شیطان کی خدمات حاصل کروں؟ میرے پرس میں خاصی رقم پاکستانی کرنسی کی صورت میں موجود تھی۔ وہ لالچی شخص یقیناً پاکستانی کرنسی بھی بطور معاوضہ قبول کرسکتا تھا پھر میں یہ سوچنے لگی کہ میرے اور اس شخص کے درمیان تکرار ہوچکی ہے کہیں وہ مجھ سے انتقام لینے کی خاطر مجھے پھنسا نہ دے کیا اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟ اگر اس سے معاملہ طے ہوجاتا تو میں دوبارہ اپنے ملک واپس پہنچ سکتی تھی۔ میں کافی دیر تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑی رہی۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ بھارتی فوجیوں کو کسی بھی وقت ان دو فوجیوں کے بارے میں بھی معلوم ہوسکتا تھا جو میرے ہاتھوں قتل ہوچکے تھے۔ ایسی صورت میں یقیناً فوجی حرکت میں آجاتے اور ان فوجیوں کے قاتل کی تلاش میں اردگرد کا سارا علاقہ چھان مارتے۔ یوں میرے لئے خطرہ بڑھ جاتا۔ ''گنجے شیطان'' کو میرے اندازے کے مطابق ہوش میں آنے کیلئے کم از کم ابھی دو اڑھائی گھنٹے اور لگتے، ان دو فوجیوں کے قاتل کو تلاش کرنے کیلئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ لوگ اس راستے کو نظرانداز کردیتے، پھر کیا ہوتا؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

''گنجے شیطان'' کے ہوش میں آنے اور پھر اس سے سودے بازی کرنے میں بہرحال رسک تھا اور میں اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ یہ رسک لے سکتی۔ ''گرو نیا پاسپورٹ'' کا غیرقانونی کاروبار میرے خیال میں عام تھا۔ اگر وہ نوجوان یہ بندوبست کرسکتا تھا تو کلکتہ پہنچ کر خود میں بھی ایسے لوگوں کو یا ان کے ایجنٹوں کو تلاش کرسکتی تھی جو یہ ''کاروبار'' کرتے تھے۔ اس سے قطع نظر یہ بات بھی تھی کہ یہاں چلتے چلتے میں بہت تھک گئی تھی۔ اب دوبارہ اتنا ہی طویل سفر پیدل طے کرنا اگر ناممکن نہیں تو میرے لئے مشکل ضرور تھا پھر میری چھٹی حس بھی مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ کچھ دیر غوروفکر کرنے کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس علاقے سے جتنی جلد ممکن ہو نکل جاؤں۔

''اچھا طالب میں چلتی ہوں اب!'' میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔ ''میری دعا ہے کہ خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے اور تم اپنی منزل تک پہنچ جاؤ۔''

''اگر آپ اس شخص کے ہوش میں آنے تک رک جائیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوتا۔'' وہ نوجوان لجاجت سے بولا۔ ''مجھے تنہا یہاں خوف محسوس ہوگا۔''

''میں اگر یہاں مزید رک سکتی تو ضرور رک جاتی، مگر مجبوری ہے، مجھے جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم بھی کسی مشکل میں پھنس جاؤ۔''

''ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔'' اس نے بجھی ہوئی سی آواز میں کہا۔

میں اسے ''خدا حافظ'' کہہ کر مزید وقت وہاں ضائع کئے بغیر پیڑوں سے نکل کر اسی پگڈنڈی پر ہولی جس پر پہلے سفر کر رہی تھی۔

اس پگڈنڈی کا اختتام کھیتوں کے سلسلے پر ہوا۔ جنگل سے نکل کر کھیتوں میں موجود قدآدم پودوں کے درمیان خود کو چھپاتے ہوئے آگے بڑھنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ بھارتی فوجی کی فراہم کردہ اطلاعات اب تک درست ہی ثابت ہورہی تھیں۔ انہیں کھیتوں کے درمیان میں نے سنگین پھینک دی تھی کیونکہ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اطلاع کے مطابق اب مقامی آبادی زیادہ دور نہیں تھی۔ کھیتوں ہی سے بلندی کی جانب میں نے نگاہ ڈالی تو ایک سڑک نظر آئی۔ اس وقت سڑک سے ایک فوجی ٹرک گزر رہا تھا۔ سڑک پر مجھے اکادکا راہ گیر اور فوجی جوان بھی آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب سیدھے سفر کرنے کے بجائے کھیتوں ہی کھیتوں مجھے دائیں جانب بڑھنا چاہئے تاکہ فوجیوں سے مڈبھیڑ کا امکان نہ رہے۔ اگر میں سیدھی ہی چلی جاتی تو سڑک کے دامن میں پہنچ جاتی، مگر ابھی کھیتوں سے نکل کر سڑک تک پہنچنا میرے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔

صبح کے آثار اب ہر طرف پوری طرح ظاہر ہوچکے تھے۔ صبح کے اجالے میں مجھے ہر شے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے کچھ کچے پکے مکانات نظر آنے لگے۔ یہ مقامی آبادی تھی یہاں مجھے فوجیوں کی نقل وحرکت نظر نہ آئی، میں کھیتوں سے نکل کر جلد ہی سڑک پر پہنچ گئی۔ ذرا دور چل کر مجھے ایک چھوٹا سا بازار ملا، دکانیں ابھی بند تھیں۔ اس بازار سے گزر کر مجھے کشتیوں کے بنے ہوئے ایک پل کے اوپر سے گزرنا پڑا۔ کشتیوں کے اس پل کے متعلق بھی مجھے بھارتی فوجی نے بتایا تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس فوجی کی فراہم کردہ اطلاعات کتنی درست اور اہم تھیں! مقامی ریلوے سٹیشن وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جب میں وہاں پہنچی تو صبح کے سوا چھ بج رہے تھے۔ اسے میں نے اپنی خوش قسمتی ہی خیال کیا کہ سات بجے یعنی صرف پون گھنٹے کے بعد ایک ٹرین وہاں سے کلکتہ کے ریلوے سٹیشن سیالدہ کیلئے مجھے مل سکتی تھی۔ یہ اطلاع مجھے چوبیس پرگنہ ریلوے سٹیشن کے سٹیشن ماسٹر سے حاصل ہوئی تھی۔ اس نے بڑے مشتبہ سے انداز میں سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا تھا، مگر کہا کچھ نہیں تھا۔ ظاہر ہے میری حالت دگرگوں تھی، میرے کپڑے جگہ جگہ سے گندے اور مسلے ہوئے تھے۔ سر کے بال الجھے ہوئے اور گردآلود تھے، وہ کیا مجھے کوئی بھی اس حالت میں دیکھ کر شک میں مبتلا ہوسکتا تھا۔

سٹیشن پر مجھے اکادکا مسافر ہی نظر آرہا تھا۔ میں سٹیشن ماسٹر کے کمرے سے نکل کر ٹکٹ ونڈو کی طرف بڑھی اور سیالدہ کا ٹکٹ لے کر میں ایک طرف بڑھ گئی۔ میرا رخ اس طرف تھا جہاں دو ایک مسافر اپنے سامان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی ان کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔

ابھی پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے ایک سپاہی کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے

ادھر آتے دیکھا۔ میں دانستہ دوسری طرف دیکھنے لگی، ذرا ہی دیر بعد وہ سپاہی میرے پاس پہنچ کر رک گیا اور پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''ارے تم کہاں سے آرہی ہو۔''

''کیا تم نے مجھ سے کہا تھا؟'' میں انجان سی بن کر سپاہی سے بولی تو اس نے اپنا سوال دہرایا، جواباً میں نے کہا ''یہاں جو لوگ آتے ہیں کہیں جانے کیلئے آتے ہیں، میں آ نہیں جارہی ہوں۔''

''زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھیں۔'' وہ پولیس والوں کے مخصوص لہجے میں بولا صورت سے وہ بالکل چپڑقناتی معلوم ہورہا تھا مگر اپنی وردی کی وجہ سے برف خانے کے کسی چمار کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں سب سمجھ رہا ہوں کہ تم کہاں سے آئی ہو! خیریت چاہتی ہو تو میرے ساتھ چلو! مجھے سٹیشن ماسٹر نے سب کچھ بتادیا ہے۔'' اس نے اپنی دانست میں اندھیرے میں تیر چلایا۔

''مگر کیوں اور کہاں چلوں تمہارے ساتھ؟'' مجھے اس پر غصہ آنے لگا، وہ خواہ مخواہ میری راہ کھوٹی کررہا تھا، وہ تو میں سمجھ گئی تھی کہ سٹیشن ماسٹر ہی نے اسے میرے پیچھے لگایا ہوگا۔

''تھانے چلو، تھانے! اور کیا میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا!'' وہ منہ بنا کر بولا۔

کچھ سوچتے ہوئے میں نے کہا۔ ''اچھا چلو تھانے!...... دیکھتی ہوں تم میرا کیا بگاڑ لیتے ہو۔''

نتیجتاً میں اس پولیس والے کے ساتھ سٹیشن کے چھوٹے سے آہنی پھاٹک کی طرف بڑھنے لگی میں نے واضح طور پر سپاہی کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے، اسے شاید یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ میں اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوجاؤں گی۔

پھاٹک سے کچھ پہلے ہی سپاہی رک گیا اور مجھ سے بولا۔ ''ٹھہرو! یہ بتاؤ کہ تم سرحد پار سے آئی ہو نا؟'' اس کے لہجے میں اب نرمی تھی۔

''میں کہیں سے بھی آئی ہوں، تمہیں کیا!'' میں اسے نرم پڑتے دیکھ کر اور شیر ہوگئی۔

''دیکھو بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' وہ مجھے سمجھانے لگا۔ ''ہمیں نہیں معلوم کون تمہیں ادھر لایا ہے، مگر ہمیں ہمارا حصہ نہیں ملا۔''

میں نے اس کی بات سن کر طویل سانس لیا اور سوچا کہ یہ بات تھی جس کو اس شخص نے فسانہ بنا دیا تھا۔ میں نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔ ''بولو کیا چاہیے؟''

''بیس روپے تو دو کم سے کم!'' اس نے بلا جھجک رشوت طلب کی۔

''یہ تو بہت ہیں۔'' میں نے یوں ہی کہہ دیا، پانچ ہی روپے دینے کو بتائے گئے تھے مجھے تو میں اندھیرے میں تیر چلا رہی تھی حالانکہ اتنی کم رشوت طلب کرنے پر مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔

''اور وہ جو سٹیشن ماسٹر بیچ میں ٹپک پڑا ہے، اسے بھی تو کچھ دینا پڑے گا۔'' وہ گویا مجھے قائل کرنے لگا۔

''تو ٹھیک ہے، پانچ روپے اسے دے دینا، پانچ تم رکھ لینا۔'' اس سے یہ بات کہتے ہوئے مجھے خود عجیب سا لگ رہا تھا مگر میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ کلکتہ پہنچ کر میں کرنسی کا تبادلہ کہاں کراتی پھروں گی۔ اس لئے جتنے کم پیسوں میں کام چل جائے ٹھیک ہے۔ اپنے پرس سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر میں نے سپاہی کی طرف بڑھایا تو اس نے یوں نوٹ میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا جیسے دیر کرنے کی

صورت میں نوٹ غائب ہوجائے گا۔ مجھے اس کی یہ حالت دیکھ کر بنگال کی غربت کا خیال آگیا۔

سپاہی کو چلتا کرکے میں پھر مسافروں کے قریب اس طرح آ کھڑی ہوئی جیسے انہی کے ساتھ ہوں۔ اس کے بعد ٹرین آنے تک کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

ٹرین کے زیادہ تر ڈبے خالی تھے۔ میں ایک خالی ڈبے میں سوار ہوگئی پھر جب کچھ دیر کے بعد ٹرین وہاں سے روانہ ہوئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

مختلف سٹیشنوں پر رکتی ہوئی ٹرین سست رفتاری سے سفر طے کرتی رہی اور میں اپنے خیالوں میں کھوئی رہی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک طویل عرصے کے بعد ایسی بے سروسامانی کے عالم میں ہندوستان کا سفر کرنا پڑے گا۔ پہننے تک کیلئے میرے پاس کپڑے نہیں تھے۔ میرے پاس پاسپورٹ تھا نہ دیگر ضروری کاغذات! کلکتہ کے ایک علاقے پارک سرکس میں یوں تو میرے کئی دور کے عزیزوں کے گھر تھے مگر میرا ارادہ رشتے کی ایک خالہ کے گھر ٹھہرنے کا تھا۔ وہ میری امی کی چچازاد تھیں۔ سفر کے دوران میں مجھے بابر کا بھی خیال آیا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ کرنل صبور اسے میرے بارے میں مطلع کرہی دیتا۔ اگر ایسا ہوتا بھی تو وہ نوجوان میری طرف سے انتہائی فکر مند ہوجاتا۔ مجھے جیسور کے اس ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر یاد تھا جہاں میں بابر کے ساتھ ٹھہری تھی۔ کلکتہ پہنچ کر اسی ہوٹل کے پتے پر بابر کو میں اپنی خیریت کا تار دے سکتی تھی۔ اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں تھی۔ کلکتہ سے تار موصول ہونے پر اسے شاید حیرت تو ہوتی مگر میری خیریت مل جاتی۔ اسے تار میں یہ لکھ سکتی تھی کہ وہ میرا انتظار نہ کرے اور ڈھاکہ لوٹ جائے۔

راستے میں دو ایک مسافر میرے ڈبے میں چڑھے اور پھر کسی چھوٹے سے سٹیشن پر اتر گئے، مگر میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور نہ انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔ بہرحال خیالوں ہی خیالوں میں وہ سفر تمام ہوگیا اور میں ہندوستان کے سب سے بڑے شہر کے ریلوے سٹیشن سیالدہ پر اتر گئی۔

سٹیشن کی عمارت سے باہر آکر میں نے پارک سرکس کیلئے ایک ٹیکسی کرلی، وہاں سے پارک سرکس کا کرایہ خاصا بنتا مگر ابھی میرے پرس میں بھارتی کرنسی موجود تھی۔

کلکتہ شہر اسی طرح بارونق اور پرہجوم تھا جیسا میں نے برسوں پہلے دیکھا تھا۔ میں نے دنیا کے بہت سے بڑے شہر دیکھے ہیں مگر کلکتہ کی بات ہی کچھ اور ہے جسے شاید لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ اس شہر کی ایک عجیب سی مخصوص خوشبو ہے۔ ایک ایسی خوشبو جسے بھولنا ممکن نہیں۔ اردو کے دو بڑے شاعروں غالب اور داغ نے بھی اپنے اشعار میں اس شہر کا ذکر کیا۔ غالب کا شعر یہ ہے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پر مارا کہ ہائے ہائے

داغ نے یوں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے:

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

سو یہ جو بہ قول غالب سینے پر تیر مارنے والی کیفیت ہے تو کلکتے کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہے۔

میری اس بات کی تصدیق وہ لوگ زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جنہوں نے کبھی یہ شہر دیکھا ہے یا اس میں رہے ہیں۔ میری ٹیکسی ہنستے بولتے جیتے جاگتے جگمگاتے شہر کی سڑکوں سے گزر رہی تھی اور میں اس شہر کے حسن اور خوشبو کو اپنے اندر اترتے محسوس کر رہی تھی۔ کلکتہ بنگال کا دل ہے اور بنگال جادو کی سرزمین ہے۔ یہ جادو اس شہر میں بولتا نظر آتا ہے، قدم قدم اور روشن روشن۔

پارک سرکس صاف ستھرا علاقہ ہے۔ ٹیکسی جب اس کی حدود میں داخل ہوئی تو میں ٹیکسی ڈرائیور کی رہنمائی کرنے لگی۔ سبھی کچھ اسی طرح برسوں پہلے جیسا تھا۔ مجھے وہاں ذرا سی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ میں اس لئے پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ ڈرائیور کی رہنمائی کرتی ہوئی اپنی رشتے کی خالہ کے دو منزلہ مکان کے سامنے پہنچ گئی۔

''بس یہیں روک دو ٹیکسی!'' میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اور پھر میٹر دیکھ کر کرایہ ادا کیا۔ اس کے بعد میں ٹیکسی سے اتر گئی۔

سامان کے بغیر اور اپنی حالت دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا کہ خالہ اور ان کے گھر والے کیا سوچیں گے، مگر مجبوری تھی میں برسوں بعد ان کے گھر جا رہی تھی اور مجھے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہئے تھا لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ اس حالت میں میرا کسی ہوٹل کی طرف رخ کرنا بھی مناسب نہیں تھا، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ میرے پاس بھارتی کرنسی بھی بقدر ضرورت نہیں تھی۔ میں جن لوگوں کے گھر آئی تھی ان سے اپنی بے سروسامانی کے بارے میں کیا کہنا تھا، یہ پہلے ہی سوچ چکی تھی۔

میں نے کال بیل بجائی تو کچھ ہی دیر کے بعد ایک نوجوان نے دروازہ کھول دیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اس طرح حیرت زدہ سا ہو گیا جیسے میری بجائے اس نے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو؟ اسے میں نے اب سے تقریباً آٹھ سال پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مشکل سے دس سال کا رہا ہوگا۔ اس کے چہرے کے نقوش سے میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ خالہ کا چھوٹا بیٹا زاہد تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں۔

''زاہد!'' اچانک میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہارا نام یہی ہے، کیا تم مجھ سے اندر آنے کو نہیں کہو گے؟''

''یہ..... یہ آپ کی آواز کو کیا ہو گیا؟ بھاری بھاری سی لگ رہی ہے!..... آئیں اندر آ جائیں، وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ گیا، پھر بولا۔ ''آپ واپس بھی آ سکتی ہیں یہ..... یہ تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا، امی حیران رہ جائیں گی آپ کو دیکھ کر!''

معلوم نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میری آواز بھاری ہو گئی ہے، میں واپس آ گئی ہوں، آخر ان باتوں کا کیا مطلب تھا؟ مگر اس وقت میں نے زاہد سے کوئی سوال نہیں کیا اور گھر میں داخل ہو گئی۔

''امی اوپر ہیں! زاہد میرے ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔'' وہیں چلیے، وہ اوپر کی منزل کی طرف جانے والے زینے کی طرف بڑھنے لگا۔

میں کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چلنے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ خالہ جان اور خالو جان کا کمرہ اوپر کی

منزل ہی پر تھا۔

اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں مجھ سے پہلے ہی داخل ہو کر زاہد نے بلند آواز میں ہانک لگائی! امی یہ دیکھیں کون آیا ہے!..... محترمہ ذکیہ خانم کی واپسی ہوئی ہے۔''

میں یہ سن کر چونک اٹھی اور یک بہ یک میرے ذہن میں کئی سوال ابھرے، کیا میری چھوٹی بہن ذکیہ کراچی سے یہاں کلکتہ آ گئی تھی؟ کیا وہ یہاں آ کر کہیں چلی گئی تھی کہ زاہد اس کی واپسی کی بات کر رہا تھا؟ کیا زاہد مجھے ذکیہ سمجھ رہا تھا؟ ایسا بعید از قیاس بھی نہیں تھا کیونکہ ذکیہ اور میری صورتیں بہت ملتی جلتی تھیں۔ ہمارا قد اور جسامت بھی تقریباً یکساں تھی۔ ہاں ہماری آوازوں میں نمایاں فرق تھا۔ انہی سوالوں کے حصار میں میرے قدم کمرے کی طرف بڑھے۔

''اے کیا کہہ رہا ہے تو؟..... کیا واقعی وہ واپس آ گئی ہے؟'' میں نے خالہ کی آواز سنی۔

اسی لمحے میں نے کمرے میں قدم رکھا اور زاہد بول اٹھا۔ ''یہ لیجئے مسماۃ ذکیہ خانم بہ نفس نفیس امی جان کے حضور میں حاضر ہیں۔'' زاہد نے شرارت آمیز آواز میں میری آمد کا اعلان کیا، پھر میری طرف مڑ کر کہنے لگا۔ ''تشریف لائیے محترمہ! ہماری امی نے آپ کو شرف باریابی دے دیا ہے۔''

''آداب خالہ جان!'' میں نے آگے بڑھ کر خالہ کو سلام کیا۔

خالہ جان اپنا چشمہ ناک پر جماتے ہوئے حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں، پھر ان کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ ''جیتی رہ بیٹی، مگر تم..... تم..... اگر میری نظریں مجھے دھوکہ نہیں دے رہیں تو تم عذرا ہو!..... میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

''جی ہاں خالہ جان!'' میں ان کے قریب چوکی پر بیٹھ کر بولی۔

''یا حیرت!'' زاہد منہ بنا کر کہنے لگا۔ ''اچھی خاصی ذکیہ خانم ذرا ہی دیر میں عذرا خانم بن گئیں!''

''ارے تمہارا سامان کہاں ہے بیٹی..... کیا نیچے رکھا.....''

''یہ سامان کے بغیر ہی وصول ہوئی ہیں امی۔'' زاہد نے خالہ جان کی بات کاٹ کر بتایا۔ ''تم نے آنے سے پہلے ذکیہ ہی کی طرح نہ کوئی خط لکھا، نہ کسی اور طرح اطلاع دی۔'' خالہ شکایت کرنے لگیں۔

''بس خالہ جان ایک دم پروگرام بن گیا۔'' میں نے جواباً کہا۔ پھر اپنے تجسس کے تحت ذکیہ کے بارے میں پوچھنے لگی۔

''ابھی تم آئی ہو، منہ دھو کر کچھ کھا پی لو اور پھر تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔'' خالہ کے لہجے میں فکر و پریشانی کا عنصر نظر آیا، نہا دھو کر کپڑے بھی بدل لو! تم شاید ٹرین کے ذریعے آئی ہو، اسی لئے تمہارے کپڑے اتنے میلے ہو رہے ہیں!''

''مگر بدلیں گی کہاں سے کپڑے۔'' زاہد پھر درمیان میں بولا۔ ''یہ تو خالی ہاتھ آئی ہیں۔''

''کیا واقعی؟'' خالہ نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

''ٹرین میں میرا سوٹ کیس اور ایئر بیگ چوری ہو گیا اور اس وجہ سے.....''

''خیر کوئی بات نہیں میں تمہارے لئے ناہید یا مہ جبیں کے کپڑے نکالے دیتی ہوں۔'' خالہ

بولیں۔ ''میرا خیال ہے ناہید کے کپڑے تمہارے ٹھیک آجائیں گے۔''

''مگر یہ دونوں ہیں کہاں خالہ جان؟ نظر نہیں آرہیں!'' میں نے پوچھا۔ وہ دونوں خالہ کی بیٹیاں تھیں۔

''کالج گئی ہیں دونوں۔'' خالہ نے بتایا۔ ''بس اب دو ایک گھنٹے بعد آجائیں گی۔''

''اور یہ حضرت کچھ پڑھتے لکھتے نہیں؟'' میں نے زاہد کی جانب اشارہ کیا۔

''آج ہماری ڈیوٹی تھی گھر پر اس لئے یونیورسٹی نہیں گئے...... اوہ معاف کرنا یونیورسٹی نہیں بلکہ کالج!'' خالہ کے بجائے زاہد ہی نے میری بات کا جواب دیا، پھر اپنی ماں سے کہنے لگا۔ ''امی اگر میں اس خاتون کیلئے ایک عدد جوڑے کے بجائے کئی جوڑوں کا بندوبست کردوں تو کیا انعام دیں گی مجھے؟''

''یہ تو نے خاتون خاتون کی کیا رٹ لگا رکھی ہے، باجی کیوں نہیں کہتا!'' خالہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''معاف کیجئے گا محترمہ عذرا خانم میں اس لئے اپنی کسی کزن کو باجی یا ہمشیرہ نہیں کہتا کہ کیا خبر ان میں کسی کے ساتھ زندگی بھر کیلئے قسمت پھوٹ جائے! آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔''

بہت ہی شریر ہے یہ بیٹی! تم اس کی باتوں کا برا نہ ماننا، دل کا برا نہیں ہے۔ خالہ سمجھانے لگیں، پھر انہیں زاہد کی بات یاد آگئی۔ ''وہ تو کپڑوں کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟''

''انعام گول کر گئیں آپ خیر کوئی بات نہیں، ان محترمہ سے لے لوں گا۔ ذکیہ خانم کا سوٹ کیس کس دن کام آئے گا جو وہ شاید اپنی ہمشیرہ محترمہ ہی کیلئے بھرا ہوا چھوڑ گئی ہیں۔''

''ارے یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔'' یہ ٹھیک ہے، خالہ بولیں، پھر مجھ سے کہا بیٹی تم زاہد کے ساتھ نیچے چلی جاؤ! یہ تمہیں وہ کمرہ دکھا دے گا جس میں ذکیہ کو ہم نے ٹھہرایا تھا۔ ذکیہ کے استعمال کا سارا سامان اسی کمرے میں بند ہے، وہ کمرہ ہم نے بند کردیا تھا۔ زاہد! یہ لے چابی!'' خالہ نے اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر زاہد کو دے دیا۔

''آیئے محترمہ عذرا خانم! تشریف لے چلیے!'' زاہد مجھ سے کہنے لگا۔

''پہلے تو تم یہ سن لو کہ میرا نام عذرا خان ہے، خانم نہیں ہوں میں! اور ذکیہ بھی اپنے نام کے ساتھ خان لگاتی ہے۔'' میں یہ کہتے ہوئے چوکی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''خان تو آپ دونوں ہرگز نہیں لگتیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ مجھے خانم اچھا لگتا ہے، لیکن آپ کے پرزور اصرار پر آپ کو خان کہنے پر راضی ہوسکتا ہوں بلکہ اگر آپ کہیں گی خان صاحب...... اور معاف کیجئے گا خان صاحبہ بھی کہہ سکتا ہوں۔'' زاہد کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

''ہر وقت بک بک نہ کیا کر!'' خالہ نے اسے ڈانٹا۔ بس ذرا موقع ملنا چاہئے، شروع ہوجاتا ہے فوراً۔''

اس دوران میں زاہد کمرے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا اور میں اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ نیچے آکر اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا، پھر بولا۔ ''تشریف لے جایئے عذرا! اس کمرے میں باتھ روم بھی ہے، جب ری کنڈیشن ہوجائیں تو اوپر آجایئے گا، میں چلا'' وہ جانے کیلئے مڑ گیا۔

''ری کنڈیشن، پر مجھے ہنسی آگئی۔ زاہد واقعی ایک خوش مزاج نوجوان تھا۔ وہ چلا گیا تو میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ذکیہ کا سوٹ کیس مجھے ایک جانب رکھا نظر آگیا۔ میں نے اسے اٹھا کر مسہری پر رکھ لیا۔ سوٹ کیس مقفل نہیں تھا۔ اسے کھول کر میں نے ایک سوٹ شلوار قمیض کا نکال لیا۔ ذکیہ کے کپڑے میرے جسم پر فٹ آسکتے تھے۔ اس کے سوٹ کیس ہی سے میں نے ایک تولیہ بھی نکال لیا اور پھر کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔

نہا کر میں خاصی فریش ہوگئی، کپڑے بدل کر میں نے ہلکا سا میک اپ کیا۔ میک اپ کا سامان وہیں سنگھار میز پر موجود تھا۔ جب میں کچھ دیر بعد اوپر کی منزل پر پہنچی تو خالہ باورچی خانے میں تھیں، کمرے میں زاہد اکیلا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا، ارے واقعی آپ تو ری کنڈیشن ہوگئیں، تھوڑی پر سیاہ تل بھی لگالیتیں تو اچھا تھا۔''

''وہ کس خوشی میں؟'' میں مسکرا کر بولی۔

''تاکہ آپ کی بھولی بھالی پیاری پیاری سی صورت کو نظر نہ لگے۔'' وہ بے تکلفی سے کہنے لگا۔

''تم بہت فری ہونے کی کوشش کررہے ہو! یہ مت بھولو کہ میں عمر میں تم سے کئی سال بڑی ہوں۔''

''آپ مجھے زندگی میں پہلی خاتون ملی ہیں جنہوں نے اپنی عمر زیادہ ہونے کا اعتراف کیا ہے، ویسے بائی دا وے عورت ذات کی عمر زیادہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زیادہ عمر کی عورتوں کیلئے آخر برابر کی عمر کے لڑکے کہاں ملتے ہیں! یوں بھی یہ سنت ہے، وہ شرارت آمیز انداز میں مسکرایا۔

''کیا مطلب؟...... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

''وہی کہنا چاہتا ہوں جو آپ کی بہن سے کہنا چاہتا تھا مگر انہوں نے نہیں سنا خیر وہ نہ سہی آپ ہی سہی! عمر میں دو چار سالوں کے ہیر پھیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا! پھر یہ کہ آپ بھی تو انہی محترمہ کی ہم شکل ہیں! بس ذرا آواز میں فرق ہے، تو ہوا کرے۔''

''کیا ذکیہ سے تم اظہار محبت کرنا چاہتے تھے؟'' میں نے کہا، میں بہرحال ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو ایسی باتیں سن کر شرما کے سر جھکا لیتی ہیں۔

''ہاں اور کیا! اس کیلئے پہلا حق تو کزنز ہی کا ہوتا ہے نا!'' وہ بلا جھجک کہنے لگا۔

''تم تو مجھے اس معاملے میں خاصے سیریس معلوم ہورہے ہو۔'' میں اسے گھورنے لگی۔ ''سوچ لو کہیں بعد میں سر پر ہاتھ رکھ کر رونا نہ پڑے کہیں پچھتانا نہ پڑے!''

''وہ تو خیر شادی کا دوسرا نام ہی پچھتاوا ہے، مگر کچھ پچھتاوے ایسے ہوتے ہیں جن کے بغیر جینے کا لطف نہیں آتا۔ کیا خیال ہے، آپ مجھے پچھتانے کا موقع دیں گی؟ اس کا انداز خاصا بے تکلفانہ تھا۔ مجھے اس معاملے میں ہچکچانے یا شرماتے نہ دیکھ کر وہ اور ''رواں'' ہوگیا تھا۔ اس نے براہ راست مجھ سے شادی کی پیشکش کردی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دے پاتی، خالہ کمرے میں آگئیں۔ وہ پسینے پسینے ہورہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر میں جلدی سے بولی۔ ''ارے خالہ جان، آپ نے کیوں زحمت کی، میں خود باورچی خانے میں جاکر اپنے لئے سالن وغیرہ گرم کرلیتی۔''

''ہاں کیوں نہیں!'' زاہد بولا اٹھا۔ ''ویسے بھی مستقبل قریب میں انہی کو باورچی خانہ سنبھالنا پڑے گا۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے!'' خالہ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا، جا چل کے باورچی خانے سے کھانا لے آ! میں نے عذرا بیٹی کیلئے گرم گرم روٹیاں ڈال دی ہیں۔ روٹی دان سلیپ پر رکھا ہے، وہ بھی اٹھا لانا۔'' یہ کہہ کر خالہ نے مجھے اپنے پاس چوکی پر بٹھالیا۔

''ٹھیک ہے، لے آتا ہوں، آپ کہتی ہیں تو ورنہ......''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اور خالہ کی نظر بچاتے بچاتے مجھے منہ چڑایا، پھر کمرے سے نکل گیا۔

مجھے اس کی حرکت پر ہنسی آگئی، وہ واقعی بہت شریر تھا۔ مجھے اس کی شرارتیں دیکھ کر ملک دلاور یاد آگیا، مگر وہ زاہد سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔

ذرا ہی دیر بعد زاہد باورچی خانے سے کھانا لے آیا، مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی، اس لئے فوراً کھانا کھانے لگی۔

''معلوم ہو رہا ہے امی کہ محترمہ عذرا خان کئی دن کی بھوکی ہیں، دبادب بغیر لقمے چبائے نوالے......''

''تو نہیں مانے گا زاہد کے بچے، خالہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ابھی تو میں خود بچہ ہوں! آپ ابھی سے کہاں میرے بچوں کو پکارنے لگیں!'' زاہد نے اپنی ماں کو بھی نہیں بخشا۔

اس کے ٹوکنے پر میں کچھ خفیف سی ہوگئی تھی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ شدید بھوک کی وجہ سے میں کچھ زیادہ ہی تیزی سے کھانا کھا رہی تھی۔ کھانا کھا کر پانی پینے کے بعد میری آنکھیں جیسے خود بخود بند ہونے لگیں۔ ہرچند کہ مجھے ذکیہ کے بارے میں جاننے کا خاصا تجسس تھا لیکن کھانا کھاتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''خالہ جان میں اب سوؤں گی، سفر نے خاصا تھکا دیا ہے۔'' میں نے کہا، فی الحال کھانا کھا کر چائے پینا بھی مجھے بڑا دوبھر معلوم ہو رہا تھا اور چائے کے بغیر میرا کھانا ادھورا ہی رہتا ہے۔

''ٹھیک ہے بیٹی جا کر آرام کرو، تم واقعی بہت تھکی لگ رہی ہو۔'' خالہ نے مجھے اجازت دے دی۔

''خود ہی جاگ جائیں گی یا جگایا جائے آپ کو؟'' زاہد نے پوچھا۔

''میں خود شام تک اٹھ جاؤں گی تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' میں نے اسے جواب دیا۔

اس وقت دوپہر کے پونے دو بجنے والے تھے جب میں نیچے کمرے میں پنکھا چلا کر بستر پر دراز ہوگئی۔ بستر پر لیٹنے کے کچھ ہی دیر بعد میں نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ دستی گھڑی اتار کر میں نے سرہانے رکھ دی تھی۔ اس میں وقت دیکھا تو رات کے نو بج چکے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں پورے

سات گھنٹے گہری نیند سوئی تھی اور کسی نے مجھے نہیں جگایا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے باہر مجھے روشنی نظر آ رہی تھی اور گھر میں موجود افراد کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر کے تمام افراد اس وقت موجود تھے۔ خالہ کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام ناصر تھا، اس سے چھوٹی ناہید تھی، پھر زاہد اور سب سے چھوٹی مہ جبیں تھی۔ خالو جان کا اپنا کاروبار تھا۔ کینگ سٹریٹ میں ان کی چشمے کی دکان تھی اور وہ صرف ہول سیل کام کرتے تھے۔ اچھا خاصا کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ میں کچھ دیر بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی، تھکن ابھی پوری طرح اتری نہیں تھیں۔ آج رات کو مزید آرام کرنے کا موقع مل جاتا تو آئندہ روز صبح میں بالکل تروتازہ اٹھتی۔

ذرا دیر بعد میں نے بستر سے اٹھ کر کمرے میں روشنی کر دی پھر اس سے پہلے کہ کوئی کمرے میں روشنی دیکھ کر اندر آتا، میں باتھ روم میں گھس گئی۔ سونے کی وجہ سے کپڑوں میں شکنیں پڑ گئیں تھیں، اس لئے میں نے ذکیہ کے سوٹ کیس سے ایک اور جوڑا نکال کر پہن لیا تھا۔

سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر میں بالوں میں کنگھا پھیر رہی تھی کہ زاہد اور اس کی دونوں بہنیں کمرے میں آگئیں۔

''خاتون! آپ تو اپنے ساتھ جتنے بھی گدھے، گھوڑے لائی تھیں، سبھی بیچ کر ایسی سوئیں کہ......''

''کبھی تالو سے زبان بھی لگا لیا کرو، بولے چلے جاتے ہو بس!'' زاہد کی بڑی بہن نے اس کی پشت پر دھول جماتے ہوئے کہا۔

میں ناہید اور مہ جبیں کو خوش آمدید کہنے کیلئے اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ دونوں باری باری میرے گلے سے لگیں۔

''اپنی اپنی قسمت ہے!'' زاہد نے معنی خیز انداز میں شرارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اس طرح کہا کہ مجھے ہنسی آگئی۔ اس نے مزید کہا۔ ''ہمیں تو رشک آ رہا ہے لوگوں پر!''

''کاش تم بھی لڑکی ہوتے!'' میں نے اس پر بے جھجک فقرہ چست کیا۔ ''یہی کہنا چاہتے تھے نا تم!''

''سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا!'' وہ ٹھنڈا سانس بھر کے بولا۔

''اور بھئی ناہید، تمہارے بھائی جان اور خالو جان آگئے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، وہ دونوں اوپر ہیں اور آپ کے منتظر ہیں، ابو نے کہا تھا کہ جب تک آپ خود نہ اٹھیں آپ کو نہ جگایا جائے۔'' ناہید نے میری بات کا جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں ابھی چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں جلدی جلدی بالوں میں کنگھا پھیرنے لگی۔۔

پھر کچھ ہی دیر بعد میں ناہید، مہ جبیں اور زاہد کے ساتھ اوپر کی منزل پر پہنچ گئی۔ خالو اور خالہ اپنے کمرے میں تھے اور وہیں ناصر بھی تھا۔

''آداب خالو جان۔'' میں نے جھک کر خالو کو سلام کیا، پھر ناصر کے سلام کا جواب دیا۔ وہ

زاہد کے برعکس انتہائی سنجیدہ نوجوان تھا۔ اس نے مجھے باجی ہی کہا تھا۔

جواباً خالو جان نے مجھے دعا دی، پھر کہنے لگے۔ ''اچھا ہوا بیٹی کہ تم آ گئیں، ہم ذکیہ کی طرف سے، بہت فکرمند تھے۔ بات ایسی ہے کہ کسی عزیز رشتے دار کے سامنے ہم زبان بھی نہیں کھول سکتے جب تک بات اس گھر کی حدود سے باہر نہیں نکلتی، لیکن بیٹی، ایک نہ ایک دن تو لوگوں کو معلوم ہو ہی جائے گا اور...... اور میں اس دن سے ڈر رہا ہوں۔ تم سے کیونکہ کبھی خط و کتابت کا سلسلہ نہیں رہا اس لئے ہمارے پاس تمہارا پتا نہیں تھا ورنہ ہم تمہیں اس کے بارے میں ضرور خط لکھتے۔''

خالو کی بات سے میرے ذہن میں خاصا تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ ذکیہ کی بابت آخر ایسی کیا بات تھی جس کیلئے انہوں نے اتنی تمہید باندھی تھی؟ میرے ذہن میں یہ سوال ابھرنا فطری ہی تھا، جیسے ہی ان کی بات پوری ہوئی میں فوراً بول اٹھی، مگر خالو جان آخر ہوا کیا ہے یہ تو بتائیں!''

''تمہاری بہن ذکیہ نے شادی کر لی ہے۔'' یہ انکشاف کرتے ہوئے ان کی آواز میں گہرا دکھ تھا۔

''کیا؟'' میں حیرت سے بولی۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''ذکیہ نے شادی کر لی؟...... یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''یہ ہو چکا ہے بیٹی اور...... اور بہت برا ہوا ہے۔ اس لڑکی نے ایک ہندو سے شادی کی ہے۔'' خالو نے جیسے دھماکہ کیا۔

''نہیں!'' میں تقریباً چیخ اٹھی۔ ''یہ ناممکن ہے!...... ایسا...... ایسا نہیں ہو سکتا! کبھی نہیں! وہ...... وہ میری بہن ہے...... وہ ایسا نہیں کر سکتی!''

''ہمیں علم تھا بیٹی کہ تمہیں یہ بات سن کر انتہائی صدمہ ہوگا، مگر تمہیں بتانا تو تھا!''

مجھے جیسے اپنا وجود ریزہ ریزہ محسوس ہو رہا تھا جو بات میرے علم میں آئی تھی اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ''یہ کیا...... کیا ہو گیا...... ؟ کیسے ہو گیا؟'' میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگی اور پھر میری پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھکنے لگیں۔ مجھے اتنا شدید صدمہ ہوا تھا کہ کچھ دیر یہ خیال بھی نہ آیا، ان لوگوں سے اس اندوہناک واقعے کی تفصیل پوچھ سکوں، میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہے جا رہے تھے۔

پھر خالہ نے اٹھ کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور میری پشت پر ہاتھ پھیر کر بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہنے لگیں۔ ''نہ رو بیٹی!...... صبر کر!'' وہ بھی رونے لگی تھیں۔

میری حالت اعتدال پر آنے میں کچھ وقت لگا اور میں نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لئے۔

''یہاں کب آئی تھی؟'' میں نے سنبھل کر پہلا سوال کیا۔

''اب سے غالباً پندرہ دن پہلے!'' خالو نے میری بات کا جواب دیا۔ وہ یقیناً سمجھ گئے تھے کہ میں تفصیلات جاننا چاہتی ہوں، اسی لئے مزید میرے سوال کئے بغیر وہ بتانے لگے۔ ''بمشکل ایک ہفتہ خیریت سے گزرا ہوگا کہ وہ ایک رات دیر سے گھر آئی، تمہاری خالہ نے وجہ دریافت کی تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔ تمہاری خالہ کا کہنا ہے کہ اس کی حالت عجیب سی تھی، وہ کھوئی کھوئی سی تھی اور یوں

ہاتیں کر رہی تھیں جیسے نیند میں بول رہی ہو، کیوں ناصر کی ماں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' خالو نے خالہ سے تصدیق چاہی۔

''ہاں بیٹی!'' خالہ بولیں۔ ''تمہارے خالو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس رات ذکیہ نے کھانا بھی نہیں کھایا اور کہنے لگی، کھانا کھا کر آئی ہوں۔ میں نے پوچھا، کہاں سے؟ تو میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولی، مجھے نیند آ رہی ہے سونے دیں۔ پھر میں اس کے کمرے سے نکل آئی۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئیں اور خالو کی طرف دیکھنے لگیں۔

''خالو نے غالباً ان کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ لیا اور خود بقیہ واقعہ بتانے لگے، دوسرے دن صبح ناشتا کرتے ہی وہ گھر سے نکل گئی اور......''

''ایک منٹ خالو جان۔'' میں نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا۔ ''صبح ذکیہ کی کیا کیفیت تھی، کیا وہ رات ہی کی طرح سوئی سوئی معلوم ہو رہی تھی؟''

''میں تو خیر جلدی ناشتا کر کے دکان چلا گیا تھا، تمہاری خالہ وغیرہ اس بات کا جواب دے سکتی ہیں۔'' خالو بولے۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بیٹی اس کی حالت رات کی طرح ہی تھی، وہ چپ چپ تھی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس نے کوئی بات کی ہو، وہ اس روز دیر سے سو کر اٹھی تھی۔ ناشتا اس نے کمرے ہی میں کیا تھا، شاید اس روز مہ جبیں کالج نہیں گئی تھی وہی اس کے کمرے میں ناشتا لے کر گئی تھی۔'' خالو نے یہ کہہ کر سوالیہ نظروں سے مہ جبیں کو دیکھا۔

''جی امی، میں ہی باجی کیلئے ناشتا لے کر گئی تھی، مہ جبیں نے تصدیق کی، پھر مزید کہنے لگی۔ ''عموماً ذکیہ باجی مجھ سے بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتی تھیں، مگر اس روز انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ معلوم نہیں وہ کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھیں! میں جب ناشتا لے کر کمرے میں گئی تھی تو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنے بال سنوار رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا ''باجی'' ناشتا کر لیجئے، جواباً انہوں نے بس اتنا کہا کہ رکھ دو! میری طرف مڑ کر دیکھنے کی بھی انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ان کی آواز مجھے عجیب سی اور سپاٹ لگی تھی اور ان کا رویہ بھی اس روز میرے ساتھ مختلف تھا۔ میں ہری کے قریب تپائی پر ناشتا رکھ کر چلی آئی تھی۔''

مہ جبیں خاموش ہو گئیں تو خالو نے بولنا شروع کیا۔ میں ان لوگوں کی ایک ایک بات بڑی توجہ ے سن رہی تھی۔ خالو کہہ رہے تھے۔ ''اس روز رات گئے تک ہم نے ذکیہ کے لوٹنے کا انتظار کیا مگر وہ نہیں الی۔ رات کے شاید دو بج رہے تھے کہ تمہاری خالہ نے مجھے جگا کر بتایا کہ ذکیہ ابھی تک نہیں آئی میں یشان ہو گیا کہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا پھر صبح تک میں ناصر کو ساتھ لئے مختلف ہسپتالوں کے چکر کاٹتا رہا، وچ کر کہیں خدانخواستہ وہ کسی حادثے کا شکار تو نہیں ہو گئی! مگر وہ ہمیں کہیں نہیں ملی۔ دوسرا دن بھی اس کی تلاش میں گزرا۔ اس دن میں دکان بھی نہیں کھول سکا، ناصر، زاہد اور میں ہم تینوں اسے تلاش......''

''آپ نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی؟'' میں نے خالو کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

''بدنامی کے ڈر سے ہم نے ایسا نہیں کیا لیکن شہر کے تقریباً سبھی تھانوں میں اپنے طور پر ہم

نے اسے دیکھا۔ وہ ہمیں کہیں نہیں ملی، اگلے روز میں تو دکان پر چلا گیا مگر ناصر اور زاہد اس کی تلاش میں لگے رہے، خالو بتاتے رہے، یہ اب سے کوئی تین دن پہلے کی بات ہے کہ ناصر کو ذکیہ ایک شخص کے ساتھ نظر آ گئی، وکٹوریہ میموریل کے قریب ناصر نے ان دونوں کو دیکھا تھا۔''

''بہتر یہ ہے کہ خود ناصر تمہیں اس روز پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتائے۔'' خالو نے مداخلت کی اور خالو نے بھی اس بات سے اتفاق کیا۔

''ہوا یہ باجی!'' ناصر نے مجھے بتانا شروع کیا۔'' ذکیہ کو دیکھ کر میں تیزی کے ساتھ اس کے قریب پہنچا، لمحے بھر کو اس کے چہرے پر ہلکی سی خوشی اور آشنائی کا سا تاثر ابھرا، پھر چہرہ سپاٹ سا ہو گیا۔ میں نے اسے مخاطب کیا، نام لے کر تو وہ مجھے اجنبیوں کی طرح دیکھنے لگی، اسی لمحے اس کے ساتھ جو شخص تھا وہ بول اٹھا کہ یہ میری مسز ہیں، آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان کا نام ذکیہ نہیں کرشنا کماری ہے۔ مصلحتاً میں نے اس شخص سے معذرت کی اور وہاں سے ہٹ گیا۔ ذکیہ بنارسی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ماتھے پر بندیا اور مانگ میں سیندور تھا۔ سیندور انہی ہندو عورتوں کی مانگ میں ہوتا ہے جو شادی شدہ ہوتی ہیں۔ یہ دیکھ کر میرے ذہن کو دھچکا سا لگا، دور رہ کر میں نے ان دونوں پر نظر رکھی، کچھ دیر بعد وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپنی جگہ سے اٹھے اور چلتے ہوئے ایک کار تک پہنچ گئے۔ میں نے اپنے سکوٹر پر ان دونوں کا تعاقب کیا۔ ٹالی گنج کی ایک بڑی سی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر وہ کار رک گئی، وہ دونوں کار سے اتر کر کوٹھی میں چلے گئے۔ دوسرے دن میں نے اس کوٹھی کے مکین کے متعلق معلومات حاصل کیں، اس کا نام جانکی پرشاد شرما تھا اور وہ دہلی کا رہنے والا تھا، وہاں اس کی ایک کلاتھ مل تھی۔ کلکتہ میں اس کے خاصے عزیز رشتے دار تھے، مگر وہ کسی کے یہاں نہیں ٹھہرا تھا اور ٹالی گنج کے علاقے میں وہ کوٹھی کرائے پر لی تھی۔ اس کی کار کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بھی کرائے کی تھی یا نہیں۔ کوٹھی میں اس کے ساتھ ایک بنگالی نوجوان ہرنارائن چٹرجی بھی قیام پذیر تھا۔ یہ بنگالی نوجوان کلکتہ کی خاصی مشہور شخصیت تھا۔ وہ پورے بنگال میں متعدد سٹیج شو کر چکا تھا، جہاں وہ اپنے حیرت انگیز جادوئی کرتب دکھا چکا تھا۔ چالیس سالہ جانکی پرشاد جب سے کلکتہ آیا تھا ہرنارائن چٹرجی اس کے ساتھ تھا۔ یہ نوجوان ایک پراسرار شخصیت کا حامل تھا۔ جانکی پرشاد شرما کو کلکتہ میں قیام کئے تقریباً ایک ماہ ہو چکا تھا۔ ابھی دو روز پہلے ہی اس نے ذکیہ سے شادی کی تھی۔ اس شادی میں اس کے تمام ہی عزیز رشتے دار شریک ہوئے تھے۔ ذکیہ کے بارے میں اس نے اپنے عزیزوں کو بتایا تھا کہ وہ ایک بے آسرا ہندو لڑکی ہے جسے اپنا کر اس نے ایک نیک کام کیا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ ذکیہ شادی کرنے سے پہلے ایک اناتھ آشرم (یتیم خانہ) میں رہتی تھی۔ ہندو رسم و رواج کے مطابق اس نے باقاعدہ ذکیہ سے شادی کی تھی۔ محلے والوں کی بڑی تعداد کو بھی اس شادی میں مدعو کیا گیا تھا۔ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے ذکیہ اور جانکی پرشاد شرما کو اگنی (آگ) کے گرد پھیرے لگاتے دیکھا تھا۔''

ناصر نے یقیناً بڑی قیمتی معلومات حاصل کی تھیں۔ میں نے اس کے خاموش ہوتے ہی سوال کیا۔ ''تم جب ذکیہ سے ملے تھے تو تم نے اسے کس حالت میں پایا تھا؟''

''میں آپ کو تفصیل بتا تو چکا ہوں۔'' ناصر بولا۔ ''آپ اور کیا معلوم کرنا چاہتی ہیں باجی؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہیں ہوش و حواس میں معلوم ہو رہی تھی جس کے متعلق خالہ جان بتا چکی ہیں؟'' میں نے کہا۔

''اس پر میں نے زیادہ غور نہیں کیا، وہ جواباً کہنے لگا، میری اس سے ملاقات چند لمحوں پر مشتمل تھی۔ اس دوران میں وہ بالکل خاموش ہی رہی تھی۔ مجھے بس اتنا محسوس ہوا تھا جیسے وہ کسی سوچ میں گم ہو۔ اس کے علاوہ میں نے اور کوئی خاص بات محسوس نہیں کی۔''

''ہوں!'' میں نے ہنکارا بھرا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''پھر اس دن کے بعد ذکیہ سے کوئی ملا یا وہ کسی کو کہیں نظر آئی؟''

''یہ پرسوں ہی کی تو بات ہے باجی کہ میں نے تمام معلومات حاصل کی تھیں۔'' ناصر کہنے لگا۔ ''بس کل کا دن خالی گیا ہے۔''

ایک اور خاص بات بتانا تو تم لوگ بھول ہی گئے!'' خالہ بولیں۔ ''جس دن سے ذکیہ یہاں سے گئی ہے دو مرتبہ ہمارے گھر چوری کی کوشش کی جا چکی ہے۔ ایک بار رات کے وقت اور ایک دفعہ دن میں! تمہارے خالو اور ناصر نے گھر کے آس پاس کچھ مشتبہ افراد کو چکر لگاتے دیکھا ہے۔ معلوم نہیں وہ یہاں سے کیا چرانا چاہتے ہیں!''

''تم بھی بس ایک ہی ناصر کی ماں!'' خالو بولے۔ ''بھلا چوری کی ان کوششوں سے ذکیہ کا کیا تعلق! ہاں مشتبہ افراد کا معاملہ کچھ گڑبڑ لگتا ہے۔''

''خالو جان! جو کچھ خالہ نے کہا ہے، بے مقصد نہیں ہے، یقیناً ذکیہ کے معاملے سے اس کا تعلق ہے، ٹھہریں میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں جا رہی ہو بیٹی؟'' خالہ نے پوچھ لیا۔

''ابھی نیچے سے ہو کر آ رہی ہوں خالہ جان۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے ذکیہ کا سوٹ کیس اور دوسرا سامان دیکھنا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں کمرے سے نکل گئی۔

نیچے کمرے میں آ کر میں نے ذکیہ کا سوٹ کیس کھولا اور پھر اس میں پاسپورٹ اور دیگر شناختی کاغذات تلاش کرنے لگی۔ یہ چیزیں مجھے جلد ہی اس کے سوٹ کیس میں مل گئیں۔ میں نے ویزا دیکھا اور پھر مختلف اندراجات کا مطالعہ کرنے لگی۔ ذکیہ نے تین مہینے کا ویزا حاصل کیا تھا جسے ختم ہونے میں ابھی خاصے دن باقی تھے۔ کلکتہ آ کر بھی اس نے باقاعدہ اپنی آمد کی اطلاع قریبی پولیس تھانے میں دی تھی۔ یہ کاغذات اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ مسلمان ہے، اس کا نام ذکیہ خان ہے اور یہ کہ ہندوستانی شہری نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق جانکی پرشاد شرما انہیں کاغذات کے حصول کیلئے کوشش کر رہا تھا۔ چند ہی دن کے اندر دو مرتبہ اس گھر میں چوری کی کوشش سے یہی ثابت ہو رہا تھا۔ یہ بہت اچھا ہوا تھا کہ ناصر نے وہ کوٹھی دیکھ لی تھی جہاں ذکیہ ایک نو بیاہتا ہندو عورت کی حیثیت سے رہ رہی تھی، ورنہ اس کی تلاش میرے لئے ایک مسئلہ بن جاتی۔ پاسپورٹ اور دیگر کاغذات دیکھ کر میں نے انہیں واپس سوٹ کیس میں نہیں رکھا اور سوٹ کیس بند کر کے کھڑی ہو گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید قدرت نے مجھے اس لئے کلکتہ بھیجا ہے حالانکہ میرے یہاں پہنچنے کے امکانات قطعی نہیں تھے۔

میں نے کمرے کی لائٹ آف کی تو اچانک مجھے صحن کی جانب سے ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا، میں چونک اٹھی۔ اسی وقت نامعلوم کیسے صحن میں جلنے والا بلب بھی بجھ گیا۔ میری چھٹی حس خطرے کی گردان کرنے لگی، تیزی سے میں مسہری کی طرف لپکی۔ اس کے سرہانے پر میرا پرس رکھا تھا ہوا تھا جس میں ریوالور موجود تھا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر میں نے پرس ڈھونڈ لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے ذکیہ کا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات اس کے اندر رکھ کر ریوالور باہر نکال لیا۔ پرس کو میں نے مسہری کا گدا اٹھا کر اس کے نیچے رکھ دیا اور سیدھی کھڑی ہوگئی۔

اسی وقت کسی کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی، کوئی کسی سے کہہ رہا تھا۔ ''وہ... وہ ادھر...... وہ کمرہ ہے جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی، ادھر چلو!''

میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی پھر میں نے کئی قدموں کی چاپ کمرے کی طرف بڑھتے محسوس کی۔ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دو افراد سے زیادہ ہیں۔

''یہ کون ہے نیچے؟ خالو کی تیز آواز مجھے سنائی دی۔ ان کی آواز کا ارتعاش میں نے محسوس کر لیا تھا۔

''خاموش رہو!'' سرسراتی ہوئی ایک تیز سرگوشی جواباً ابھری۔ ''اگر تم نے شور مچایا تو پھونک دیئے جاؤ گے۔''

''عذرا بیٹی!'' میں نے خالہ کی روہانسی آواز سنی۔ ''ارے وہ تو نیچے ہی گئی ہے، کچھ کرو ناصر کے ابو!''

میری دانست میں یہ اچھا نہیں ہوا تھا، گھر میں گھسنے والوں کو خالو کی آواز سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نیچے کوئی موجود ہے، میں اس دوران میں کمرے کی آڑ میں ہو گئی تھی۔

''ہوشیار رہنا کوئی لڑکی نیچے بھی ہے، ایک سرگوشی ابھری۔

''لڑکی ہی تو ہے باس اس سے اتنا کیا ڈرنے کی کیا بات ہے! ہم اسے بھی اٹھا کر لے چلیں گے۔'' جواباً کسی نے دھیمی آواز میں کہا۔

''خاموش رہو احمق آدمی! تمہیں لڑکی کی پڑی ہے! پہلے ہمیں وہ کام کرنا ہے جس کیلئے یہ خطرہ مول لیا ہے۔'' پہلے شخص کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''شور بالکل نہ کرنا! کہیں وہ لوگ مشتعل ہو کر نیچے موجود عذرا کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔'' میں نے خالو کی آواز سنی جو بمشکل سننے میں کامیاب ہوئی تھی۔

اسی وقت کسی ٹارچ کا روشن دائرہ کمرے کے دروازے سے اندر چکراتا ہوا مجھے نظر پڑا اور اس کے ساتھ میرے اعصاب تن گئے۔

☆......☆......☆

''میرے پیچھے آؤ...... یہی وہ کمرہ ہے۔'' ایک شخص کی آواز ابھری جو ان لوگوں کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب تھا۔

میں سانس روکے کھلے ہوئے دروازے کے دائیں پٹ کے پیچھے چھپی ہوئی کھڑی تھی پھر پہلا شخص کمرے میں داخل ہوا، اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں ریوالور تھا۔ اس کے پیچھے تین افراد اور کمرے میں آ گئے۔ ان سبھی کے ہاتھوں میں مجھے ریوالور نظر آ رہے تھے۔ اب میں ان سب کے عقب میں تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ معمولی چور اچکے نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ خطرناک قسم کے جرائم پیشہ افراد معلوم ہو رہے تھے۔ مسلح ہونے کی صورت میں ان سے بھڑ جانا میرے نزدیک دانشمندی یا بہادری ہرگز نہیں تھی۔ میری نگاہیں انہیں پر جمی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک کے شانے سے بڑا سا چرمی ایئر بیگ بھی لٹکا ہوا تھا۔ معلوم نہیں اس میں کیا تھا اور وہ کس غرض سے ساتھ لایا گیا تھا۔ ٹارچ کی روشنی کا دائرہ اب ادرگرد چکرا کر ذکیہ کے سوٹ کیس پر رک گیا تھا۔ کچھ دیر قبل میں نے اسی سوٹ کیس میں سے ذکیہ کا پاسپورٹ اور دیگر ضروری شناختی کاغذات نکال کر اپنے پرس میں رکھ دیئے تھے۔ وہ پرس اس وقت مسہری کے گدے کے نیچے تھا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے پرس وہاں چھپا کر حماقت ہی کا ثبوت دیا تھا مگر اس وقت مجھے موجودہ صورتحال کا اندازہ نہیں تھا۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ دروازے کی آڑ میں زیادہ دیر میں ان لوگوں کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکوں گی۔ پاسپورٹ اور دیگر کاغذات کی تلاش میں وہ لوگ کمرے میں ایک ایک گوشے کی تلاشی لیں گے۔ میری طرف سے کسی قسم کا خطرہ محسوس ہونے پر وہ مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔

حالات کے پیش نظر میرا ذہن جلد ہی ایک فیصلے تک پہنچ گیا۔ پھر میں نے اس فیصلے پر عمل کرنے کی خاطر فوراً ہی اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میری پوری کوشش یہی تھی کہ دروازے کی آڑ سے نکلتے ہوئے خفیف سی آہٹ بھی نہ ہو۔ پنجوں کے بل چلتی ہوئی کوئی آواز پیدا کیئے بغیر میں دروازے کی آڑ سے نکل کر ہوا کے تیز جھونکے کے مانند کمرے سے نکل گئی۔ ریوالور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ باہر تاریکی تھی۔ کمرے سے نکلتے ہی میں نے تیزی کے ساتھ دروازے کے دونوں پٹ بند کر دیئے اور پھر باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس وقت کمرے کے اندر کئی حیرت زدہ سی آوازیں ابھریں اور معدوم ہو گئیں۔

میں پلٹی ہی تھی کہ لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے خطرے کا احساس ہو گیا۔ پلٹتے ہی ایک سائے کو کسی چیتے کی طرح میں نے اپنی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ شخص انہی لوگوں کا ساتھی تھا

جو کمرے میں تھے۔ اس شخص کو وہ لوگ کمرے کے باہر کسی متوقع خطرے کے سدباب کی خاطر چھوڑ گ تھے۔ میں اس شخص کی جھپٹ سے بچنے کیلئے اچھل کر بائیں جانب ہوگئی۔ اس کے ساتھ میں نے ا دائیں ٹانگ کو حرکت دی۔ میری لات اس کے پیٹ پر پڑی اور وہ چیختا ہوا زمین پر گر گیا پھر اس سے پ کہ وہ اٹھنے میں کامیاب ہوتا میری ٹھوکر اس کے سر پر پڑی اور وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کرتے کرتے بڑا۔ میں نے ریوالور نال کی طرف سے پکڑ کر اس کے سر کے پچھلے حصے کو نشانہ بنایا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

اس وقت میری نگاہ مکان کی اوپر کی منزل کی طرف اٹھی۔ وہاں بھی مجھے تاریکی نظر آئی۔ سمجھ گئی کہ ان لوگوں نے گھر میں داخل ہوتے ہی بجلی کا مین سوئچ آف کر دیا ہوگا۔ اب تک میں اس با سے لاعلم تھی کہ وہ لوگ گھر میں کس طرح داخل ہوئے تھے۔ ان حالات میں یہ تو ممکن نہیں تھا کہ گھر وا میں سے کسی نے گھر کا صدر دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہو۔

کمرے میں بند افراد نے اب تک دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا اور نہ ان میں سے کسی نے درو کھولنے کو کہا تھا۔ اس سے میں نے یہی قیاس کیا کہ وہ لوگ خاصے منجھے ہوئے تھے۔

میں کمرے کے دروازے سے آگے بڑھنے والی تھی کہ معاً چونک اٹھی۔ میں نے واضح طو اندر سے کمرے کی چٹخنی لگائے جانے کی آواز سنی تھی۔ ان لوگوں کی اس حرکت کا مقصد میرے نزدیک تھا کہ کوئی دروازہ کھول کر اندر کمرے میں نہ جاسکے، مگر کیوں؟ وہ ایسا کیوں چاہتے تھے؟ اس سوال مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا، وہ لوگ بہرحال احمق تو نہیں تھے کہ دانستہ خود کو اس کمرے میں کر لیتے، ان کی اس حرکت کا اصل مقصد یقیناً کچھ اور ہی تھا۔

تیزی سے لپک کر میں صحن میں پہنچی اور پھر منہ اوپر کر کے آواز دی۔ ''زاہد، نیچے آ جلدی!...... میں نے ان لوگوں کو کمرے میں بند کر دیا ہے۔''

''آ رہا ہوں میں!'' جواباً فوراً زاہد کی آواز سنائی دی۔

''ناصر! تم بھی اس کے ساتھ نیچے آ جاؤ!'' خالو کی آوز ابھری، ''خدایا خیر!'' خالہ کی آواز میں نے سنی۔

کچھ ہی دیر بعد ناصر اور زاہد میرے پاس پہنچ چکے تھے۔ میں نے زاہد سے کہا'' مین سوئ دیکھو جلدی!''

زاہد میری بات سن کر ایک طرف لپک گیا۔ اس وقت ناصر نے پوچھا۔ ''آپ...... آپ کہ تھیں اور ان لوگوں کو کیسے کمرے میں بند کر دیا؟''

''یہ بعد کی باتیں ہیں، یہ بتاؤ کہ یہاں سے قریبی پولیس سٹیشن کتنی دور ہے؟'' میں اس بات کا جواب دیئے بغیر پوچھنے لگی۔

''تقریباً ایک میل ہوگا۔'' ناصر نے بتایا۔

عین اس وقت صحن میں روشنی ہوگئی۔ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ یقیناً مین سوئچ آف کیا گیا تھا جسے زاہد نے آن کر دیا تھا۔ اوپر کی منزل پر روشنی ہوگئی تھی۔

''ارے وہ...... وہ سٹور کا دروازہ کیسے کھلا ہوا ہے؟'' ناصر نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''کیوں؟ تمہیں اس کا دروازہ کھلنے پر حیرت کیوں ہے؟'' میں نے پوچھا اور اس طرف نگاہ اٹھائی۔

''اس لئے کہ اس میں گھر کا سارا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا ہے اور کوئی وہاں نہیں جاتا۔'' ناصر نے بتایا۔

اس لمحے زاہد صدر دروازے کی طرف سے صحن میں آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے صدر دروازہ دیکھا، وہ اندر سے بند ہے نا؟''

''جی ہاں بند ہے۔'' زاہد نے جواب دیا۔

''تو پھر یہ لوگ، گھر میں کیسے داخل ہوئے؟'' میں خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی، پھر میرا ذہن سٹور کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف مبذول ہو گیا اور میں تیزی سے ادھر بڑھی۔ زاہد میرے ساتھ تھا۔ ادھر بڑھتے ہوئے میں نے زاہد سے پوچھا، سٹور کا دروازہ باہر سے تم لوگ بند نہیں کرتے کیا؟''

''اول تو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، دوم یہ کہ اس کی کنڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔''

''زاہد کا جواب سن کر میں نے طویل سانس لیا اور سٹور کے دروازے تک پہنچ کر اس سے بولی۔'' بلب تو ہوگا اس میں؟''

''جی ہاں! میں ابھی جلاتا ہوں، ذرا راستہ دیجئے۔''

میں ایک طرف ہٹ گئی اور زاہد سٹور میں داخل ہو گیا۔ چند ہی لمحے بعد سٹور میں روشنی ہوگئی۔ اس کے ساتھ زاہد کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔ سامنے ہی دیوار میں لگے ہوئے ایک پرانے آہنی جنگلے کی سلاخیں غائب نظر آ رہی تھیں۔ لکڑی کی چوکھٹ ٹوٹی ہوئی تھی۔ چوکھٹ ہی کو توڑ کر غالباً سلاخیں نکالی گئی تھیں۔ سلاخیں نکالے جانے سے اتنا خلا پیدا ہو گیا تھا کہ ایک آدمی با آسانی اس سے گزر کر سٹور میں آ سکتا تھا۔ خلا کی دوسری جانب نیم تاریکی تھی۔

''لاش!...... لاش!'' اچانک صحن سے ناصر کی تیز آواز بلند ہوئی۔

میں فوراً پلٹی اور صحن میں ناصر کو تلاش کرنے لگی۔ زاہد بھی میرے پیچھے سٹور سے نکل آیا تھا۔ میں نے ذکیہ کے کمرے کے سامنے پڑے ہوئے بے ہوش شخص کے قریب ناصر کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''یہ صرف بے ہوش ہے، مرا نہیں۔'' میں نے ناصر کو تسلی دی اور اوندھے پڑے ہوئے اس شخص کو سیدھا کر دیا۔

''ارے یہ...... یہ تو وہی ہے!'' ناصر ڈری ڈری سی آواز میں بولا۔

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''انہیں مشتبہ افراد میں سے ایک جو کئی دن سے ہمارے گھر کے آس پاس نظر آ رہے تھے۔'' ناصر کے بجائے زاہد نے میرے سوال کا جواب دیا۔

''عذرا بیٹی! کیا میں بھی نیچے آ جاؤں؟ خالہ کی بلند آواز سنائی دی۔

"چاہیں تو آ جائیں، یہاں اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

میں نے بھی بلند آواز میں جواباً کہا پھر مجھے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے ریوالور کا خیال آیا نامعلوم کیوں زاہد اور ناصر کی توجہ اس طرف نہیں گئی تھی ورنہ وہ حیرت کا اظہار ضرور کرتے۔ میں نے ا دونوں کی نظر بچا کر ریوالور کو اپنی قمیض کے دامن میں چھپالیا اور پھر اسے نیفے میں اڑس لیا کہ اس کے کوئی اور صورت نہیں تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ خالو کی نظر اس پر پڑے۔

"اب یہ بتاؤ کہ تم میں سے کون تھانے فون کرے گا کیونکہ تمہارے یہاں تو فون ہے نہیں اگر تھانہ قریب ہوتا تو خود جا کر اطلاع دی جاسکتی تھی مگر ناصر نے بتایا ہے کہ......"

"میں چلا جاتا ہوں! ناصر میری بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھا۔" قریب ہی دو گھر چھ کر رحیم صاحب کے گھر فون ہے وہاں سے میں تھانے فون کر دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تم چلے جاؤ۔" میں بولی۔ "مگر کہو گے کیا؟"

"یہی کہ کچھ لوگ ہمارے گھر میں چوری کرنے داخل ہوئے تھے ہم نے انہیں ایک کمر میں بند کر دیا ہے۔" ناصر بولا۔

"اور یہ بھی بتا دینا کہ وہ لوگ مسلح ہیں، اس کے ساتھ اس بے ہوش شخص کے متعلق بھی ک دینا۔"

"اس..... اس کے بارے میں کیا کہوں؟" ناصر نے پوچھا۔

"یہ کہ ایک شخص کو ہم نے بے ہوش کر دیا ہے اور کیا کہو گے!" میں نے بتایا۔ "اب تم ج جلدی سے!"

"اسے..... ناصر کو کہاں بھیج رہی ہو عذرا بیٹی؟" عقب سے خالو کی آواز آئی۔

"تھانے فون کرنے بھیج رہی ہوں خالو جان!" میں نے ان کی طرف مڑتے ہوئے جواب دیا۔

پھر ناصر، تھانے فون کرنے چلا گیا اور میں نے مختصر خالو کو پیش آنے والے واقعے سے آ کر دیا۔

"تم بہت بہادر ہو عذرا بیٹی!" خالو مرعوب سے لہجے میں بولے۔ "تمہاری جگہ ناہید یا جبیں میں سے کوئی ہوتی خدانخواستہ تو......" "ایسی کوئی بات نہیں خالو جان!" میں نے ان کی بات کا دی اور پھر ذکیہ کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اندر کی سن گن لینے لگی۔

خلاف توقع مجھے اندر کمرے میں کوئی آہٹ محسوس ہوئی نہ کسی قسم کی آواز! مجھے اس پر حیر ہوئی۔

"سٹور کی دوسری جانب کوئی گلی ہے نہ زاہد؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے زاہد سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" زاہد نے جواب دیا۔ "اچھا تو تم میرے ساتھ چلو وہاں! خالو جان! آپ یہیں ٹھہریں میں آتی ہوں ابھی۔" میں نے کہا۔

"مگر..... تم..... تم کیوں..... کیوں جا رہی ہو وہاں؟" خالو جان کچھ گھبرا گئے۔

"جس طرح وہ لوگ گھر میں داخل ہوئے تھے، اسی طرح کہیں اس کمرے سے غائب نہ ہو جائیں۔ آپ بےفکر رہیں، میں آتی ہوں ابھی! آؤ زاہد!"

پھر اس سے پہلے کہ خالو مزید کچھ کہتے میں نے زاہد کا ہاتھ پکڑ لیا اور صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

ایک لمبا چکر کاٹ کر میں، زاہد کے ساتھ اس پتلی سی نیم تاریک گلی میں پہنچ گئی اور وہاں پہنچنے کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے وہاں پہنچنے کیلئے اتنا لمبا چکر کاٹنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں سٹور سے ہو کر اور اس خلا سے گزر کر بھی گلی میں پہنچ سکتی تھی جس کے ذریعے وہ لوگ گھر میں داخل ہوئے تھے۔

"ذکیہ کے کمرے کی طرف چلو۔" میں نے زاہد سے کہا۔ "تمہیں اندازہ تو ہو گا کہ وہ کس طرف....."

"جی ہاں، کیوں نہیں!" زاہد فوراً بول اٹھا۔ "یہ..... ادھر بس یہیں!"

میں نے اوپر نگاہ اٹھائی اور چونک اٹھی۔ اسی وقت میرے منہ سے نکلا۔ "چوٹ ہو گئی!..... وہ لوگ فرار ہو گئے!"

"مگر کیسے؟" زاہد نے پوچھا۔ "آپ یقینی طور پر یہ کس طرح کہہ سکتی ہیں؟"

"اوپر دیکھو!..... ادھر!..... کچھ آیا نظر؟" میں نے کہا۔

"ہاں..... وہ روشن دان..... کھلا ہوا بلکہ ٹوٹا ہوا روشندان ہے، تو کیا وہ....."

"جی جناب!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اس میں اتنی گنجائش ضرور ہو گی کہ ایک ایک کر کے وہ لوگ باہر کود سکیں۔ ٹھہرو..... تم ذرا یہاں بیٹھ جاؤ!"

میرے ایما پر زاہد زمین پر بیٹھ گیا اور جب میں اس کے کاندھوں پر چڑھی تو وہ شرارت سے باز نہ رہ سکا۔ "ارے ارے محترمہ! یہ کیا بے تکلفی ہے؟ شادی سے پہلے میں ہرگز آپ کا بوجھ اٹھانے پر تیار نہیں ہوں۔"

"چلنے لگی تمہاری زبان!" میں ہنس کر بولی اور پھر اس سے اٹھنے کیلئے کہا۔

"یا الٰہی خیر!" زاہد یہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

اب میں بہت اطمینان سے اس ٹوٹے ہوئے روشندان سے اندر جھانک کر دیکھ سکتی تھی، اندر اندھیرا تھا۔

"زاہد! میں اس روشندان کے ذریعے اندر جا رہی ہوں۔" تم گھر میں جا کر کمرے کا دروازہ باہر سے کھول دو!" یہ کہہ کر میں نے اپنے جسم کا توازن برقرار رکھتے ہوئے اس روشندان پر ایک پیر اٹھا کر رکھا۔ روشندان کے اندر ایک ہاتھ ڈال کر میں نے اپنے جسم کو سنبھال رکھا تھا، پھر میں نے دوسرا پیر بھی اٹھا لیا۔

اس تنگ روشندان سے اندر جاتے ہوئے مجھے دشواری تو ہوئی مگر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ وہ روشندان، باتھ روم کا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ مجھے کھلا ہی ملا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اندر

کمرے میں کوئی نہیں ہوگا اور میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ میں نے کمرے میں روشنی کردی۔ کمرہ واقعی خالی تھا مگر اس کی کوئی چیز اپنی جگہ نہیں تھی، پورا کمرہ الٹ پلٹ نظر آرہا تھا۔

اسی وقت میری سماعت سے ایک چیخ ٹکرائی اور میں اچھل پڑی۔ یہ چیخ گھر کے اندر ہی سے سنائی دی تھی۔ غیر ارادی طور پر میں دروازے کی طرف لپکی جس کی چٹخنی اندر سے لگی ہوئی تھی۔ چٹخنی کھول کر میں نے دروازہ دھڑ دھڑا دیا مگر کسی نے فوراً دروازہ نہیں کھولا۔

وہ چیخ کس کی ہوسکتی ہے؟ میں سوچنے لگی۔ مجھے صرف اتنا اندازہ ہوسکا تھا کہ چیخنے والا کوئی مرد ہے۔ معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ بے ہوش شخص تو ہوش میں نہیں آگیا جسے میں کمرے کے دروازے پر بے سدھ پڑا ہوا چھوڑ آئی تھی۔

''ارے یہ...... یہ نیچے کیا ہورہا ہے؟'' خالہ کی تیز آواز میں نے سنی پھر انہوں نے اپنے بیٹے ناصر اور زاہد کو باری باری آوازیں دیں۔

چند ہی لمحے بعد مجھے زاہد کی آواز سنائی دی۔ ''کیا بات ہے امی؟...... پھر اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔ ''ارے...... اب...... ابو...... یہ کک...... کیا ہوا؟''

''زاہد! دروازہ کھولو!'' میں نے بلند آواز میں زاہد کو مخاطب کیا اور دروازے پر زور سے دستک دی۔

ذرا دیر بعد زاہد نے دروازہ کھول دیا اور میں کمرے سے باہر آگئی۔ مجھے جس بات کا خدشہ تھا وہی ہوئی، بے ہوش شخص غائب تھا۔ دروازہ کھول کر زاہد پھر اپنے والد کی طرف پلٹا جو سر جھٹک کر کہنیوں کے بل زمین سے اٹھنے کی کوشش کررہے تھے

میں بھی خالو کے قریب پہنچ گئی اور بولی۔ ''کیا ہوا خالو جان! آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''ہاں ...... ٹھیک ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولے، پھر پانی مانگا۔ میں نے خالو جان کو سنبھال لیا۔ وہ زمین ہی پر بیٹھے گئے تھے۔ زاہد دوڑ کر ان کیلئے پانی لے آیا، میں خالو کو پانی پلانے لگی۔

''زاہد!'' خالہ کی آواز پھر اوپر سے سنائی دی۔ ''ارے کچھ بتاؤ تو سہی ہوا کیا؟ یہ تیرے ابو کیوں چیخے تھے؟'' خالہ نے یقیناً اپنے شوہر کی آواز پہچان لی تھی۔

''کچھ نہیں امی!...... کوئی خاص بات نہیں، آپ آرام سے بیٹھی رہیں۔'' زاہد نے نیچے سے ہانک لگائی۔

''چاہو تو انہیں بھی نیچے بلالو۔'' میں نے زاہد کو مشورہ دیا۔ ''اب سارا کھیل تو ختم ہو ہی گیا ہے۔'' میری آواز میں تھکن تھی۔ اگر مجھے ذرا سا بھی یہ گمان ہوتا کہ اس بے ہوش شخص کو ہوش آجائے گا تو ہرگز وہاں خالو کو تنہا نہ چھوڑتی۔ وہ شخص جرائم پیشہ شخص بھلا خالو کے قابو میں آنے والا کب تھا!

میرے کہنے پر زاہد نے خالہ کو نیچے بلالیا۔ ان کے ساتھ ناہید اور مہ جبیں بھی نیچے آگئیں۔ اس دوران میں خالو کو سہارا دے کر میں نے صحن ہی میں موجود ایک چارپائی پر لٹادیا۔ خالہ انہیں اس طرح چارپائی پر لیٹے دیکھ کر گھبرا گئیں اور بولیں۔ ''ارے یہ ناصر کے ابو کو کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ہوا بھئی!...... کیوں خواہ مخواہ سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے تم نے!'' خالو بظاہر خفگی

سے بولے۔

میں نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی تو مڑ کر دیکھا، آنے والا ناصر تھا۔ اس کے چہرے پر بھی صحن کا منظر دیکھ کر حیرات نظر آنے لگی۔

''کیوں ناصر، کر آئے فون؟'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''جی ہاں مگر...... اس نے اپنے والد کی طرف اشارہ کیا۔

''ابھی معلوم ہوجائے گا تمہیں بھی!...... کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر میں خالو کی طرف پلٹی اور ان سے پوچھا۔ ''ہاں خالو جان، اب بتایئے کیا ہوا تھا؟''

''اب میں ٹھیک ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگے۔

''کچھ دیر اور لیٹے رہتے تو اچھا تھا۔'' میں بولی۔

''نہیں اب اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ اپنی دائیں کنپٹی سلاتے ہوئے بولے، پھر کہنے لگے۔

''جب تم اور زاہد دونوں چلے گئے تو کچھ دیر کے بعد اچانک وہ ملعون ہوش میں آگیا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ میں چکرا کر رہ گیا کہ کروں تو کیا کروں! ابھی میں کچھ سوچ نہ سکا تھا کہ وہ ایک دم اٹھا اور مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے شاید یہاں میری سیدھی کنپٹی پر گھونسا مارا تھا اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی پھر مجھے بڑے زور کے چکر آگئے تھے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اس کے بعد میں شاید زمین پر لیٹ گیا تھا۔ جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے زاہد کو اپنے قریب دیکھا اور پھر......''

''تو کیا وہ...... وہ بے ہوش آدمی ہوش میں آکر بھاگ گیا یہاں سے!'' ناصر بول اٹھا۔

''میں نے تو پولیس والوں کو بتایا تھا کہ......''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے ناصر کو سمجھایا۔

''انہیں حقیقت سے باخبر کیا جاسکتا ہے، خیر تم تو ایک اسے رو رہے ہو بقیہ سب بھی رفو چکر ہوچکے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' ناصر چونک کر بولا اور یہی کیفیت خالو کی ہوئی۔

مختصراً میں نے ان دونوں کو بتایا کہ گھر میں گھسنے والے کس طرح راہ فرار اختیار کرچکے ہیں۔

اسی وقت مجھے اپنے پرس کا خیال آیا جس میں ذکیہ کا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات تھے۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ چیزیں ان لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہوں جو اسی غرض سے یہاں آئے تھے!

''میں ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ ذکیہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔

کمرے کی حالت دگرگوں تھی۔ ان لوگوں نے فرار ہونے سے قبل پاسپورٹ اور دیگر کاغذات یقیناً تلاش کیے تھے لیکن انہیں اس کیلئے زیادہ وقت نہیں مل سکا تھا۔ سوٹ کیس کے سارے کپڑے باہر نکلے ہوئے تھے، مسہری کی چادر نیچے پڑی تھی مگر گدا اٹھا ہوا نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میری جان میں جان آگئی۔ میں نے گدا الٹ کر دیکھا تو میرا پرس موجود تھا۔ جلدی سے میں نے پرس اٹھا کر کھول دیا۔ ذکیہ کا پاسپورٹ وغیرہ اس میں موجود تھا۔ میں نے اپنے نیفے سے ریوالور نکال کر پرس میں رکھ دیا۔

''یہ چپکے چپکے یہاں کیا ہو رہا ہے محترمہ؟'' عقب سے زاہد کی آواز سن کر میں چونک اٹھی۔

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ اگر پولیس یہاں آ گئی اور اس نے کمرے کی تلاشی لی تو کوئی مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس پرس کو یہاں نہیں ہونا چاہئے۔ یہی سوچ کر میں نے زاہد کو مخاطب کیا۔ ''سنو زاہد! تم یہ پرس اپنے کمرے میں احتیاط سے رکھ آؤ! اس میں کچھ ضروری چیزیں ہیں، میں نہیں چاہتی کہ وہ پولیس کی نظر میں آئیں۔''

''نوجوان لڑکوں کے کمروں میں خواتین کے پرس پائے جانا ہرچند کہ بدنامی کی بات ہے، پھر بھی آپ کی بات میں نہیں ٹال سکتا کیونکہ ایک نہ ایک روز تو آپ کا پرس میرے ہی کمرے میں ہوگا۔'' وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا اور پھر میرے ہاتھ سے پرس لے لیا۔

میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہنے لگی۔ ''پرس کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہیں، سمجھے!''

''جی سمجھ گیا!'' وہ بظاہر منہ بنا کر بولا۔ ''مجھے خواتین کے پرس کھول کر دیکھنے کا کوئی ایسا شوق نہیں۔''

''کمرے سے باہر نکلتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ خواہ مخواہ پولیس کا چکر چل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے ملک کی طرح یہاں کے پولیس والے بھی کم نہیں تھے۔ اس میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو عوام کی مشکلات کم کرنے کے بجائے عموماً بڑھا دیتے ہیں۔ کچھ سوچ کر میں نے خالو اور گھر کے دیگر افراد کو یہ بھی سمجھایا کہ وہ مجھے پاکستانی ظاہر نہ کریں۔

''پھر!'' خالو میری بات سن کر پوچھنے لگے۔ ''اگر وہ تمہارے بارے میں کوئی سوال کریں تو ہم کیا کہیں؟''

''یہ کہ میں، دہلی سے آئی ہوں اور جو رشتہ ہے وہ تو ظاہر ہے۔'' میں نے کہا۔

پھر کوئی آدھے گھنٹے کے بعد پولیس آئی۔ سب سے پہلے میں نے ہی بیان دیا تاکہ اس کی روشنی میں خالو، ناصر اور زاہد اپنے بیانات دے سکیں۔ میں نے خود پولیس انسپکٹر سے اپنا تعارف کرا دیا تھا۔ خالو کو یا کسی اور کو اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ذکیہ کا ذکر میں اپنے بیان میں دانستہ گول کر گئی تھی۔

میرا بیان لیتے ہوئے پولیس انسپکٹر نے کئی بار مجھے حیرت سے دیکھا اور جب بیان دے چکی تو وہ کہنے لگا۔ ''آپ عام عورتوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی نڈر معلوم ہوتی ہیں!...... اس طرح ان مسلح افراد کو کمرے میں بند کر دینا بہرحال معمولی بات نہیں، پھر یہ کہ باہر جو شخص موجود تھا اسے بھی آپ نے بے ہوش کر دیا، تعجب کی بات ہے۔''

''یہ بس اتفاق ہی تھا، انسپکٹر کہ میرا گھونسا اس کی کنپٹی پر پڑ گیا اور وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔'' میں نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

پولیس انسپکٹر نے سٹور اور ذکیہ کے کمرے کا معائنہ کیا، پھر اسے جیسے کوئی بات یاد آ گئی۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''آپ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا مقصد یہاں چوری کرنا تھا۔ یہ بتائیے آپ کی کوئی چیز چوری ہوئی یا نہیں؟''

''جی نہیں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''ان لوگوں کو اس کا موقع نہیں مل سکا جس کمرے میں انہیں بند کیا گیا تھا وہاں کوئی ایسی قیمتی شے نہیں تھی، مگر کمرے کی حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں زیور وغیرہ یا نقد رقم کی تلاش ہوگی جو انہیں نہیں ملی۔''

''کسی پر شک ہے آپ لوگوں کو؟'' انسپکٹر کی مخاطب صرف میں ہی نہیں تھی۔

''جی نہیں۔'' خالو نے جواب دیا۔ ''وہ شخص جو بے ہوش تھا اسے اور چند دیگر افراد کو ہم نے گھر کی اطراف میں کئی دن سے منڈلاتے ضرور دیکھا تھا۔''

''آپ کو یہ بات اپنے بیان میں لکھوانا چاہئے تھی اور اس شخص کا حلیہ بھی!'' انسپکٹر کس قدر ناگواری سے بولا۔

خدا خدا کر کے تقریباً ایک گھنٹے بعد پولیس والے ٹلے۔ اس وقت رات کے سوا گیارہ بج رہے تھے۔

صبح سے پہلے یہ ممکن نہیں تھا کہ سٹور کے جنگلے اور باتھ روم کے ٹوٹے ہوئے روشن دان کی مرمت کرائی جا سکتی...... باتھ روم کا دروازہ تو خیر بند کیا جا سکتا تھا مگر سٹور کے دروازے میں کنڈی نہیں تھی۔ کسی طرح ناصر اور زاہد نے ایک بھاری الماری کھسکا کر اس جگہ پہنچائی جہاں خلا تھا۔ صبح تک کیلئے یہ بندوبست کافی تھا، پھر بھی مزید احتیاط کی خاطر یہ فیصلہ کیا گیا کہ صبح تک باری باری ناصر، زاہد اور میں جاگتی رہوں۔ خالو نے بھی کہا تھا کہ وہ بھی ہمارا ساتھ دیں گے مگر میں نے منع کر دیا تھا۔ خالو، خالہ اور ان کی دونوں بیٹیوں کو ہم نے اوپر کی منزل پر بھیج دیا تھا اور ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ زینے کا دروازہ بند کر لیں۔

اس تمام بھاگ دوڑ میں نہ تو مجھے یہ خیال رہا تھا کہ میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا، نہ ان لوگوں کو یہ بات یاد رہی تھی۔ جب خالو وغیرہ اوپر کی منزل پر سونے کیلئے چلے گئے تو سب سے پہلے زاہد نے اپنے مخصوص لہجے میں اس کا ذکر کیا۔ ''محترمہ! کیا رات بھر بھوکا رہنے کا خیال ہے؟ آپ نے کھانا تو کھایا ہی نہیں! مجھے یہ بات اس لئے یاد آ گئی کہ میں خود بھی بھوکا ہوں۔ گھر کے سب لوگوں نے کھانا کھا لیا تھا، بس میں آپ کی خاطر بھوکا رہ گیا تھا کہ آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔''

''تو پھر صبر کرو اب۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے کوئی خاص بھوک نہیں۔''

''لیکن مجھے تو ہے جناب والا، وہ شوخی سے بولا:

''اور جناب والا! آپ کی خالہ بھی بھول گئیں کہ ان کے لخت جگر اور ان کی ہونے والی......! اس نے کن انکھیوں سے اپنے بڑے بھائی ناصر کی طرف دیکھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا، پھر اسی سے کہا۔ ''ناصر بھائی آپ بہت اچھے ہیں۔''

''سمجھ رہا ہوں، تمہاری اس تعریف کا مطلب!'' ناصر بھی مسکرا دیا۔ ''تم چاہتے ہو میں اوپر جا کر کھانا لاؤں۔''

''آپ تو ناصر بھائی واقعی بہت ذہین ہیں، اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔'' زاہد نے برجستہ کہا۔

"اچھا بھائی لا دیتا ہوں کھانا! بس!" ناصر یہ کہہ کر اوپر کی منزل کی طرف جانے والے زینے کی طرف بڑھا۔

"اور سنیئے عذرا خانم!...... آئی ایم سوری خان صاحبہ! بھائی ناصر چائے بھی بہت اچھی بناتے ہیں۔" ناصر کے جاتے جاتے زاہد نے زور سے کہا۔

شرم آنی چاہئے تمہیں، بڑے بھائی سے کام کراتے ہوئے۔" میں نے کہا۔

"کچھ دن کی تو بات ہے، پھر تو سب کچھ آپ خود سنبھال لیں گی۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"کبھی منہ دیکھا ہے آئینے میں؟" میں نے اسے چڑایا۔

"بالکل دیکھا ہے، مجھے تو کوئی عیب نظر نہیں آتا، آپ کی بات تیسری ہے۔"

"یہ دوسری کی بجائے تیسری کہنے کی کیا تک ہے؟"

"دوسرا تو آئینہ ہوا نا!" یہ کہہ کر وہ خود ہی زور سے ہنس پڑا۔

اس دوران میں ناصر زینے کا دروازہ کھلوا کر اوپر جا چکا تھا، میں نے زاہد سے کہا۔ "ویسے تم ہو بہت ڈھیٹ ہڈی!"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟...... یہ تو بڑے راز کی بات تھی۔

آپ تو واقعی بہت قابل معلوم ہوتی ہیں حالانکہ صورت دیکھ کر بالکل اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔" وہ مجھے گھورنے لگا۔

"اور تم!...... تم صورت سے بھی احمق لگتے ہو اور ہو بھی واقعی احمق!"

"ایسے ہی کسی موقع کیلئے چچا غالب فرما گئے ہیں کہ:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب......"

"تمہیں بھی شعر پڑھنے کی بیماری ہے!" میں بول اٹھی۔

"تو کیا مجھ سے پہلے بھی کوئی ایسا تھا جو آپ کو شعر سنایا کرتا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو مجھے سوچنا پڑے گا۔ آپ کو اپنا کر کہیں میں غلطی تو نہیں کر رہا! جیون بھر کا معاملہ ہے، ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا جائے تو بہتر ہے۔"

"ہاں سوچ لو اچھی طرح! میرے بہت سے بوائے فرینڈز ہیں۔" میں اسے تپانے کیلئے بولی۔

"ویسے محترمہ! میرا خیال یہ ہے کہ ہم لوگ مشرق میں رہتے ہیں، مغرب میں نہیں جہاں جوان جہان آپ جیسی لڑکیوں کا جوان لڑکوں سے ملنا جلنا اور انہیں دوست بنانا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔" وہ بظاہر سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"مگر میرے تو دوست مرد ہیں۔" میں اپنی بات پر بدستور قائم رہی۔ "اور ان سے میری بے تکلفی بھی ہے، میں یہ اس لئے بتا رہی ہوں کہ کہیں تم زندگی بھر کیلئے مجھے اپنا کر پچھتاؤ نہیں اور سر پر ہاتھ رکھ کے رونے نہ لگو، سچ بات تو بتا دینا چاہئے نا۔"

"لیکن آپ نے ان سے عشق تو نہیں لڑایا ہوگا نا!"

"اپنے بارے میں تو معلوم ہے مگر ان کے متعلق کیا کہہ سکتی ہوں، میں! کیا خبر ان میں کتنے مجھے چاہتے ہیں، عشق کرتے ہوں مجھ سے!"

"کرتے ہوں تو کرتے رہیں، بھاڑ میں جائیں، بس اپنا سکہ کھرا ہونا چاہئے۔ ویسے بغیر رقیب کے عشق میں مزہ بھی تو نہیں آتا۔"

"رقیب کے بغیر یا رقیبوں کے بغیر۔"

"تو کیا کئی عدد ہیں؟" اس نے یہ الفاظ اس طرح گھبرا کر ادا کئے کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ معاً خوابناک سی آواز میں بولا۔ "جب آپ ہنستی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے دور کسی مندر میں گھنٹیاں سی بجنے......"

"بس بس!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "بہت گھس پٹ گیا ہے یہ جملہ، کوئی اور مثال دو۔"

"مثال کیا خاک دوں، وہ ناصر بھائی جو آ رہے ہیں، سارا رومان خاک میں مل گیا۔ خیر باقی آئندہ!"

میں نے مڑ کر دیکھا، ناصر ٹرے میں کھانا لے کر آ رہا تھا، صحن ہی میں بچھی ہوئی چارپائی پر میں اور زاہد کھانا کھانے لگے۔

"اس سے پہلے کہ تم چائے کی فرمائش داغ دو، میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔" ناصر نے زاہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"گڈ ناصر بھائی!" زاہد چہکا۔ "بڑا بھائی ہو تو آپ کی طرح! ایسا کیجئے گا کہ رات کیلئے تھرماس میں بھی چائے لیتے آیئے گا۔"

"اچھا بھائی، لے آؤں گا!" ناصر طویل سانس لے کر بولا اور دوبارہ اوپر چلا گیا۔

ناصر کے جاتے ہی زاہد نے ایک لقمہ بنا کر میرے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آ کریں!"

"ارے ارے! یہ کیا بچپنا ہے!...... ہاتھ ہٹاؤ!" اس کی شرارتیں حد سے تجاوز کرنے لگیں تو میں نے سخت رویہ اپنا لیا۔

"بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک دوسرے کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤ تو محبت بڑھتی ہے۔" اس نے میرے سخت رویئے کا کوئی اثر نہیں لیا۔

"کوئی چیز ہوگی تو بڑھے گی نا!"

"یعنی آپ کو مجھ سے محبت ہی نہیں ہوئی ابھی تک!" بہت افسوس کی بات ہے خاتون! یہاں تو ہم آپ کی محبت میں بڑی سنجیدگی سے گریبان چاک کرنے پر غور کر رہے ہیں اور آپ ہیں کہ ابھی تک آپ کے کان پر جوں نہیں رینگ رہی۔ اس لئے بائی داوے ایک بات بتائیں گی آپ کہ کس مٹی کی بنی ہوئی ہیں؟"

"خاموش رہنے کا کیا لو گے تم؟"

"آپ دے نہیں سکیں گی، ویسے بتا دیتا ہوں کہ کہیں آپ کسی اور غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ مجھے بس اقرر چاہئے، اقرار محبت!" اس کی شوخی بدستور قائم رہی اور مزید بولا۔ "اقرار کے بہت سے طریقے ہیں، اگر آپ کہیں تو بتاؤں مثلاً شرما کے سر جھکا لینا، اپنے ہاتھ کی انگلی میں ڈوپٹے کا پلو لپیٹنا وغیرہ! آپ بس شرما کے سر جھکالیں، میں سمجھ جاؤں گا آپ نے اقرار کرلیا ہے۔"

"میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں، سمجھے!" میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"معاف کیجئے گا، سبھی لڑکیاں ایسے ڈائیلاگ بولتی ہیں اور پھر ایک دن واقعی شرما کے سر جھکا لیتی ہیں۔"

"اب تم جو چاہے بکواس کرتے رہو، میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔"

"یہ بھی اقرار محبت کا ایک طریقہ ہے۔ لڑکیوں کی خاموشی کا مطلب بھی رضامندی ہوتا ہے، یہ میں جانتا ہوں۔"

اس نے مسکرا کر کہا، پھر بولا۔ "ہاں وہ میں ایک بات تو بھول ہی گیا، ناصر بھائی آگئے تو وہ بات رہ جائے گی۔ اب سے چار بجے صبح تک ہم دونوں جاگ کر ڈیوٹی دیں گے، پھر ناصر بھائی کو جگا دیں گے اور ہم جا کر سو جائیں گے، کہیں کیسا؟"

"بالکل غلط!" میں بولی۔ "دو، دو گھنٹے ہم تینوں جاگیں گے، مجھے تمہارے ساتھ جاگنے کا کوئی شوق نہیں۔" میں نے یہ کہہ کر منہ بنایا۔

میں تو اس طرح یہ چاہ رہا تھا کہ ابھی سے آپ کو میرے ساتھ جاگنے کی پریکٹس ہوجائے!...... یوں بھی اکیلے آپ بور ہوجائیں گی۔"

"ایک شرط پر میں تمہاری بات مان سکتی ہوں کہ تم میرا دماغ نہیں چاٹو گے۔"

"منظور ہے!" وہ خوشی سے کھل اٹھا، محبت میں بڑی طاقت ہے، پتھر بھی پگھل جاتے ہیں۔"

"پتھر کہہ رہے ہو تم مجھے!" میں نے بظاہر خفگی کا اظہار کیا۔

"ہرگز نہیں...... مم...... میں تو ایک...... ایک مثال دے رہا تھا۔ اس مثال کا ہرگز آپ سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ اس طرح سٹپٹا کر بولا کہ مجھے ہنسی آگئی۔

اس دوران میں ہم نے کھانا کھالیا۔ ناصر اوپر کی منزل سے چائے بنا کر لے آیا، کھانا کھا کر ہم نے چائے پی۔

"ناصر بھائی! آپ سو جائیں جا کر، ہم آپ کو صبح چار بجے جگا دیں گے۔" زاہد نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ہم سے کیا مراد ہے تمہاری...... کیا تمہارے ساتھ باجی بھی جاگیں گی؟"

"ہاں۔" میں بول اٹھی۔ "اس طرح وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ یوں بھی صبح چار بجے سے چھ بجے تک کا وقت زیادہ خطرے کا نہیں۔"

ناصر چاہتا تو کہہ سکتا تھا کہ میں بھی تو اکیلا جاگوں گا، مگر وہ کچھ نہ بولا اور میرے کہنے پر سونے چلا گیا۔ وہ نچلی منزل ہی کے ایک کمرے میں گیا تھا۔

"اچھا اب آپ کوئی عمدہ سی پیار بھری کہانی سنائیں تاکہ وقت آسانی سے کٹ جائے۔" زاہد نے ناصر کے جاتے ہی کہا۔

"شیر کی کہانی سنو گے یا چڑیا کی؟"

"میں اپنی یا آپ کی کہانی سنانے کو نہیں کہہ رہا۔" اس نے فقرہ لگایا۔

مجھے علم تھا کہ وہ خاموش نہیں رہے گا اور خود میں بھی یہی چاہتی تھی مگر اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس کے ساتھ خوش گپیوں میں چار گھنٹے بہت آسانی سے گزر گئے اور پھر اس نے ناصر کو جگا دیا۔ میں ذکیہ کے کمرے میں سونے آگئی اور زاہد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی۔ کسی نے مجھے جگایا نہیں تھا۔ زاہد اب تک اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ خالو اس دن دکان پر نہیں گئے اور نہ ہی ناصر گیا۔ خالو صبح ہی جا کر کو سٹور کی مرمت کرانے آدمیوں کو لے آئے تھے۔ سٹور کے بعد ذکیہ کے باتھ روم کی باری تھی۔ سٹور کی مرمت کا کام بس ختم ہونے والا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ زاہد اب تک سو رہا ہے تو اسے ستانے کیلئے بس اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

وہ جو چادر اوڑھ کر سو رہا تھا میں نے گھسیٹ لی اور زور سے بولی۔ "اٹھو شہزادے یہ خواب خرگوش کے مزے لینے کا وقت گزر چکا ہے۔"

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور مجھ پر نظر پڑتے ہی کہا۔ "آنکھیں بند تھیں تو بھی آپ سامنے تھیں اور اب آنکھیں کھولی ہیں تو آپ کا روئے زیبا نظر آرہا ہے۔"

"تو تم خواب میں مجھے دیکھ رہے تھے؟"

"جی ہاں حضور!" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "خواب میں تو بڑی مہربان نظر آرہی تھیں مجھ پر!"

"خوابوں کی تعبیر الٹی ہوتی ہے، یہ بھی سنا ہے تم نے!" میں نے کہا، پھر بولی۔ "اگر ناشتہ ساتھ کرنا ہے تو جلدی سے نہا دھولو۔" یہ کہہ کر میں جانے کیلئے مڑ گئی۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں!" میں نے عقب سے زاہد کی آواز سنی۔ آپ کے ساتھ کھانے پینے کا مزہ تو کچھ اور ہی ہے۔"

اپنے کمرے میں آ کر میں نے باتھ روم کا رخ کیا، مگر وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے استعمال کیا جاسکتا۔ روشندان کے توڑے جانے کی وجہ سے وہاں خاصی مٹی وغیرہ پڑی تھی۔ مجبوراً مجھے ناصر کے کمرے کا رخ کرنا پڑا۔ میری رہنمائی ناہید نے کی تھی۔ میرا کمرہ کیونکہ الٹ پلٹ پڑا تھا اس لئے ناہید اور مہ جبیں اس کی صفائی کر کے چیزوں کو ترتیب سے رکھنا چاہتی تھیں۔ انہیں میرے جاگنے ہی کا انتظار تھا۔ اس روز وہ دونوں بھی کالج نہیں گئی تھیں۔ ناصر ابھی سو رہا تھا اس لئے میں آہستہ قدموں کے ساتھ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

نہا کر کپڑے بدلنے کے بعد میں ناصر کے کمرے سے نکلی تو زاہد بھی اپنے کمرے کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اس دوران میں ناہید اور مہ جبیں نے میرے کمرے کی حالت سدھار دی تھی۔

"ناشتہ۔" میں لے آؤں باجی؟" ناہید نے مجھ سے پوچھا۔

’’ہاں لے آؤ!‘‘ میری بجائے زاہد بول اٹھا۔ میں بھی یہیں ناشتہ کروں گا۔‘‘ زاہد میر۔ ساتھ ساتھ ہی کمرے میں آ گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور زاہد ناشتہ کر رہے تھے۔ اس وقت میرا ذہن ذکیہ میں الجھا ہوا تھا اس کی بازیابی جلد از جلد ضروری تھی۔ میں خالو، خالہ اور ناصر کے بیانات سن کر ایک نتیجے تک پہنچ چکی تھی ذکیہ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں یقیناً اس کی مرضی کو دخل نہیں تھا خود میں بھی ایک بار کچھ ایسے حالات سے دوچار ہو چکی تھی۔ اس وقت جب مجھے میری مرضی کیخلاف کراچی سے قاہرہ لے جایا گیا تھا مجھے مسز جیکب بننے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

’’یہ کس سوچ میں کھوئی ہوئی ہیں خاتون محترم؟‘‘ زاہد نے مجھے خاموش دیکھ کر مخاطب کیا۔

میں نے اس سے کچھ چھپانا غیر ضروری سمجھا اور بولی۔ ’’ذکیہ کے بارے میں سوچ رہی ہول کہ اس کی بازیابی کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔‘‘ میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

ایک صورت میرے ذہن میں بھی ہے، اگر آپ کہیں تو بتاؤں۔‘‘ وہ بھی سنجیدگی سے بولا۔

’’ہاں کہو!‘‘ میں نے کہا۔

’’ہم اس سلسلے میں پولیس کا سہارا کیوں نہ لیں؟‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ میں نے چونک کر پوچھا۔

’’فرض کریں کہ ہم ان کے اغوا کی رپورٹ درج کرا دیتے ہیں اور پھر مجرموں کی نشاندہی بھی کر دیتے ہیں تو ......‘‘ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

’’اپنی بات پوری کرو!‘‘

’’مگر ایک قباحت ہے اس میں!...... اگر ذکیہ خاتون نے خود اس سے انکار کر دیا کہ وہ ذکیہ ہیں تو پھر اس صورت میں کیا ہوگا؟‘‘ زاہد نے اپنی بات پوری کی۔

’’اس امکان کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔‘‘ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ’’لیکن ہم پولیس کے سامنے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اس کا نام کرشنا کماری نہیں ذکیہ ہے اور یہ بھی کہ وہ نہ ہندو ہے. اور نہ ہندوستانی شہری!‘‘

’’ٹھیک کہتی ہیں آپ، ذکیہ خاتون کے پاسپورٹ اور دیگر ضروری شناختی کاغذات سے با آسانی یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے، لیکن بات وہی ہے کہ......‘‘

’’تو صبر نہیں ہوا تم سے!‘‘ میں نے اسے گھور کر دیکھا...... تم نے میرا پرس کھول کر دیکھ ہی لیا۔‘‘

’’کیا کرتا!...... آپ نے تجسس ہی اتنا پیدا کر دیا تھا...... ویسے پرس میں مجھے ایک خطرناک چیز بھی نظر آئی تھی، آپ تو بڑی خطرناک خاتون ہیں۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے سب، مگر یہ خیال رکھنا، وہ ریوالور بھرا ہوا ہے، کہیں اسے کھولنے کی کوشش نہ کرنا اور بچوں کا کھلونا نہیں ہے۔‘‘ میں نے اسے تاکید کی، پھر دوبارہ ذکیہ کے موضوع پر آ گئی۔ ’’ہاں تم کیا کہہ رہے تھے؟ کیا بات ہے وہی؟‘‘

’’میرا مطلب یہ ہے کہ سب کچھ ثابت کرنے کے بعد اگر آپ کی ہمشیرہ نے کرشنا کماری بنے رہنے پر اصرار کیا تو کیا ہوگا؟‘‘

’’تمہاری یہ بات قابل غور ہے۔‘‘ یہ کہہ کر میں سوچ میں پڑ گئی۔ جانکی پرشاد شرما یہ کہہ سکتا تھا کہ کوئی اور لڑکی بھی اس کی بیوی کی ہم شکل ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ پولیس کچھ نہ کر پاتی۔ یوں بھی ہندوستانی مسلمانوں کی نسبت وہاں کی پولیس ہندوؤں کا ساتھ دیتی ہے۔ یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی۔

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تو خالو مرمت کرنے والوں کو لے کر کمرے میں آ گئے، زاہد نے مجھ سے اپنے کمرے میں چلنے کو کہا اور میں راضی ہو گئی۔

’’دیکھیں خاتون، آپ کے آنے سے اس کمرے میں کیسی بہار سی آ گئی ہے!‘‘ زاہد پھر غیر سنجیدہ ہو گیا۔

’’زاہد! اگر تم نے فضول باتیں کیں تو میں چلی جاؤں گی یہاں سے!‘‘

’’آپ نہیں خاتون، بہاریں روٹھ کر چلی جائیں اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہوں گا اس لئے خود کوشٹ اپ کئے لیتا ہوں، اب خوش ہیں نا آپ! ذرا سی مسکرا تو دیں تاکہ مجھے یقین ہو جائے، آپ ناراض نہیں ہیں۔‘‘

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور میں نے کہا ’’دراصل اس وقت میرا ذہن ذکیہ کے معاملے میں بری طرح الجھا ہوا ہے۔‘‘ ’’ہاں تو پھر کیا سوچا آپ نے؟...... کوئی بات آئی ذہن میں؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’موجودہ حالات میں پولیس رپورٹ تو بیکار ہی رہے گی، کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔ سب سے پہلے تو میں خود وہ کوٹھی دیکھنا چاہتی ہوں جہاں ذکیہ کو رکھا گیا ہے۔ ناصر سو کر اٹھ جائے تو میں اسے ساتھ لے کر ٹالی گنج جاؤں، ممکن ہے کوئی ایسی صورت بھی پیدا ہو جائے کہ میں ذکیہ سے مل لوں یا وہاں پہنچ کر کوئی اور نئی راہ سوجھ جائے۔‘‘

’’یہ لوگ جو رات کو پورے گھر میں گھس آئے تھے، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟...... کہیں انہیں ذکیہ خاتون کے پاسپورٹ وغیرہ کی تلاش تو نہیں؟‘‘

’’تم بالکل ٹھیک سمجھے۔‘‘ میں نے اس کی تائید میں کہا۔

’’وہ لوگ یقیناً اسی غرض سے آئے تھے اور یہ تو تم سمجھ ہی سکتے ہو کہ انہیں یہاں بھیجنے والا کون ہو سکتا ہے!‘‘

’’جانکی پرشاد شرما۔‘‘ زاہد فوراً بولا۔ ’’پاسپورٹ اور ان کاغذات کو حاصل کرنے کے بعد اسے ہماری طرف سے کسی قانونی کارروائی کا خطرہ نہیں رہے گا۔‘‘

’’زاہد! اس بات سے ایک اور نتیجہ بھی تو نکلتا ہے۔‘‘ میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ ’’ممکن ہے کہ ذکیہ پوری طرح اس کے قابو میں نہ ہو اور پولیس کے سامنے یہ اصرار کرنے کے قابل نہ ہو کہ وہ کرشنا کماری ہے؟‘‘

"ہوتو سکتا ہے یہ..... مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ذکیہ خاتون نے یہ سب کچھ کس طر
برداشت کرلیا؟..... آپ کی بات سے یہ تاثر ملتا ہے، جیسے انہیں سب کچھ کرنے پر کسی طرح مجبور کیا گیا ہے اور انہوں نے راضی بہ رضا یا دانستہ ایسا نہیں کیا۔"

"تم یہ بات نہیں سمجھ سکو گے۔" میں ابھی اسے یہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ ذکیہ کو ہپناٹائز کر گیا ہے اور وہ اپنے حواس میں نہیں ہے، وہ اس بات پر مشکل ہی سے یقین کرتا۔ ہم ابھی یہی بات کررہے تھے کہ ناہید مجھے تلاش کرتی ہوئی وہاں آگئی، آتے ہی اس نے کہا۔ "اس زاہد کے بچے نے آپ پر قبضہ جمالیا ہے، ہم سے تو آپ کی باتیں ہی نہیں ہوئیں۔"

"ابھی کہاں قبضہ جمایا ہے!" زاہد بول اٹھا۔ "اس کے لئے تو پہلے بات پکی ہونا ضرور ہے۔ میں اپنی طرف سے آپ کو نامزد کرتا ہوں۔ ان کی طرف سے باقی بزرگ ہیں ہی! کیا خیال آپ کا!..... میری طرف سے بات چلانے کی آپ کو پوری آزادی ہے۔"

"شرم کرو تم سے بڑی ہیں یہ! تمہیں ان کو باجی کہنا چاہئے!" ناہید بولی۔

"دیکھیں، بڑی چھوٹی سے کچھ نہیں ہوتا، اپنی اپنی قسمت ہے یہ!"

"باجی! آپ اسے بکنے دیں! میرے ساتھ چلیں!"

"چلو!" میں اٹھ کھڑی ہوئی..... ناہید کی اس بات نے مجھے خجل سا کردیا تھا کہ زاہد نے پر قبضہ جمالیا ہے..... مجھے بہر حال گھر کے دوسرے افراد کو بھی وقت دینا چاہئے تھا۔

پھر میں ناہید کے ساتھ اوپر کی منزل پر چلی گئی، وہاں مہ جبیں اور خالہ بھی میری منتظر تھیں خالہ نے چھوٹتے ہی رات کا ذکر چھیڑ دیا۔

"اب چھوڑیں بھی امی، بہت ہوگیا یہ قصہ! کوئی اور بات کریں۔" ناہید درمیان میں بو اٹھی۔ مہ جبیں نے بھی اس کی تائید کی۔

وہ دونوں مجھے اپنے ساتھ اوپر کی منزل کے ایک اور کمرے میں لے گئیں۔ ہم دوپہر ہو تک وہیں گپ شپ کرتے رہے۔ اس دوران میں مہ جبیں اپنی امی کا ہاتھ بٹانے باورچی خانے میں گئی۔ دوپہر کا کھانا کھانے سے کچھ پہلے ناصر بھی سو کر اٹھ گیا۔ کھانا سب نے ساتھ ہی کھایا۔ اس وقت تک خالو باتھ روم کا روشندان ٹھیک کرا چکے تھے۔

کھانا کھا کر میں نیچے اپنے کمرے میں آگئی۔ ناصر میرے ساتھ تھا۔ میں خالو وغیرہ سامنے اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کھانا کھاتے وقت وہ میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے سے کہہ دیا تھا کہ کچھ بات کرنا ہے۔ ہر چند کہ زاہد سے میں نے کچھ نہیں کہا تھا مگر وہ بھی ناصر کے سا آگیا تھا۔

"ایسی راز داری کی کوئی بات نہیں۔" میں بول اٹھی۔ "مجھے تم سے جو کچھ کہنا ہے، زاہد کو معلوم ہے۔"

"جی ہاں ناصر بھائی!" زاہد بچوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔ "ہمیں پہلے ہی وہ بات معلوم۔ جو آپ کو اب معلوم ہوگی۔"

"تم اتنے بڑے ہوگئے ہو مگر ابھی تک وہی بچوں کی سی حرکتیں ہیں، کچھ سنجیدگی اختیار کرو! ہر وقت ٹھٹھول اچھی نہیں لگتی۔" ناصر نے اسے گھور کر دیکھا، وہ بہر حال زاہد سے بڑا تھا اور اسے ڈانٹ بھی سکتا تھا۔ زاہد سنجیدہ نظر آنے لگا تو اس نے مجھے مخاطب کیا، ہاں باجی بتایئے کیا بات ہے۔"

آج ٹالی گنج چلنا ہے تمہیں میرے ساتھ!" میں نے اسے بتایا۔ "ذکیہ کو جانکی پرشاد شرما نے جس کوٹھی میں رکھا ہوا ہے میں اس کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔"

"کب چلنے کا ارادہ ہے، آپ کا؟" ناصر نے پوچھا پھر خود ہی بولا۔ "اس وقت تو دوپہر ہے، خاصی تیز دھوپ پڑ رہی ہے، اگر شام کو چلیں تو کیسا ہے؟"

"نہیں!" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "میرے خیال میں یہی وقت مناسب ہے، شام کو کیا خبر وہ لوگ کہیں گھومنے پھرنے نکل جائیں۔"

"تو کیا آپ کا ارادہ ان سے ملنے کا ہے؟" ناصر نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ابھی میں اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکی، راستے میں یا وہاں پہنچ کر سوچ لوں گی۔ سکوٹر تو ہے نا تمہارے پاس۔"

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر تم تیار ہو جاؤ جلدی سے، میں بھی کپڑے بدل لیتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں زاہد کی طرف مڑی۔ "تم میرا پرس لے آؤ ذرا اپنے کمرے سے جا کر!"

"کچھ خطرناک ارادے لگتے ہیں آپ کے، کیونکہ پرس میں......"

"جاؤ، فضول باتیں نہ کرو!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ناصر کو بھی میرے پاس ریوالور کا علم ہو جائے۔ اگر رات کو مجبوری نہ ہوئی تو میں زاہد کے پاس پرس نہ رکھواتی۔

پھر زاہد اور ناصر دونوں ہی کمرے سے نکل گئے۔ میں نے ذکیہ کا سوٹ کیس کھول کر اس میں سے ایک ساڑھی نکالی اور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

باتھ روم سے میں ساڑھی باندھ کر نکلی تو زاہد میرا پرس لے کر آ چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔ "غضب ناک! آج اس شہر کے باسیوں کی ہر طرف آئی صدا مار چلا مار چلا خیر نہیں۔" پھر اس نے ایک عامیانہ سا شعر پڑھا:

زلف بکھرا کے صنم جب سر بازار چلا
ہر طرف آئی صدا مار چلا مار چلا

میں سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر بال سنوارنے لگی اور اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ ممکن ہے زاہد مزید کچھ کہتا کہ ناصر کمرے میں آ گیا۔ وہ بولا۔ "باجی! اباجی سے کیا کہا جائے گا کہ ہم لوگ کہاں جارہے ہیں؟"

"گھومنے جا رہے ہیں بس!" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"اس بھری دوپہر میں؟" زاہد بول اٹھا۔ "آپ کو تو بہانہ بنانا بھی نہیں آتا۔" اس سے تو بہتر

ہے میٹنی شو کا بہانہ کر دیں۔ یوں بھی سوا دو بج رہے ہیں اب!''

''چلو یہی سہی! فلم دیکھنے کا کہہ دیں گے، مگر نہیں...... کہیں ناہید اور مہ جبیں......''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ!'' ناصر میری بات کاٹ کر بولا۔ ''فلم کا کہا تو وہ دونوں بھی پیچھے لگ جائیں گی۔''

''تو کیا گھومنے کو کہیں گی تو وہ ساتھ چلنے کو نہیں کہیں گی؟'' زاہد نے کہا۔

''سکوٹر پر ظاہر ہے کوئی ایک فرد ہی جا سکتا ہے۔ ان سے کہہ دیا جائے گا کہ......''

''ضروری نہیں کہ سکوٹر ہی لے جایا جائے، ٹیکسی میں بھی جا سکتے ہیں۔'' زاہد پھر بولا۔

''اچھا تو پھر......'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ایک اور بہانہ ہے میرے پاس! مجھے واقعی یہ کام ہے بھی! میں خود خالہ جان سے کہہ آتی ہوں کہ ناصر کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔'' میں نے جوڑا باندھتے ہوئے آئینے پر نگاہ ڈالی اور پھر چند لمحے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ناصر! تم یہیں رکو میں اوپر خالہ جان کے پاس سے ہو کر آتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، جب تک میں سکوٹر نکالتا ہوں، آپ ہو آئیں اوپر!'' ناصر بولا۔

میں کمرے سے نکل کر اوپر کی منزل کی طرف جانے والے زینے کی طرف بڑھنے لگی۔

اوپر پہنچی تو ناہید مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''باجی ساڑھی تو آپ پر بہت جچ رہی ہے، ساڑھی ہی پہنا کریں آپ!''

''کیوں بیٹی، کہیں جا رہی ہو؟'' خالہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں خالہ جان!'' میں جواباً بولی۔ کچھ خریداری کرنا ہے اور دو ایک ٹیلی گرام بھی دینا ہیں۔ ناصر کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں، آپ فکر نہ کیجئے گا، شام تک ہم لوٹ آئیں گے۔''

''بیٹی! وہ تم نے ذکیہ کے بارے میں کچھ سوچا؟'' خالو نے مجھ سے دریافت کیا۔ ''اس مسئلے کا کوئی حل تو سوچنا پڑے گا نا۔''

''بالکل خالو جان!'' میں نے کہا۔ ''شام کو آ کر آپ سے بات کروں گی۔''

''ذرا دھوپ ڈھل جانے دیتیں بیٹی، پھر چلی جاتیں تو اچھا تھا۔'' خالہ نے کہا۔

''ٹیلی گرام دینا ضروری نہ ہوتا تو میں شام کو ہی چلی جاتی۔ میں نے کہا۔ ''تھکی ہوئی نہ ہوتی تو کل ہی ٹیلی گرام دے دیتی۔''

''جانے دو ناصر کی ماں! ٹیلی گرام دینا ضروری ہی ہوگا ورنہ...... عذرا بیٹی تو خود سمجھدار ہے، خالو بول اٹھے۔

''میں روک تو نہیں رہی!'' خالہ نے کہا۔ ''میں تو دھوپ کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔''

''اچھا خالہ جان خدا حافظ!...... آداب خالو جان!'' یہ کہہ کر میں جانے کیلئے مڑ گئی۔

میں نیچے پہنچی تو ناصر کو سکوٹر صاف کرتے دیکھا، زاہد میرے قریب آ کر دھیمی آواز میں بولا۔

''عیش ہو گئے ناصر بھائی کے!...... کاش وہ کوٹھی اس خاکسار نے دیکھی ہوتی اور آپ اس خادم کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سکوٹر پر سفر کرتیں!'' یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

''شرم نہیں آتی تمہیں، اپنے بڑے بھائی سے رقابت محسوس کر رہے ہو!'' میں نے بھی آہستہ سے کہا۔

''یہ عشق ظالم ہے ہی ایسی بلا! وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ......''

''بس بس!...... کوئی شعر سنانے کی کوشش نہ کرنا، تمہیں ایک سے ایک گھٹیا شعر یاد ہے۔'' یہ کہہ کر میں تیز قدموں سے ناصر کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ ہی دیر کے بعد میں ناصر کے ساتھ سکوٹر پر بیٹھی ہوئی وہاں سے روانہ ہو رہی تھی۔ زاہد گھر کے دروازے پر کھڑا ہمیں جاتا دیکھ رہا تھا۔ سکوٹر آگے بڑھا تو اس نے ہاتھ بلند کر کے فضا میں لہرایا، جواباً میں نے بھی ہاتھ لہرا کر اسے ''خدا حافظ'' کہا۔

''ناصر! پہلے ٹیلی گرام دینا ہے، یہ خیال رکھنا۔'' میں نے ناصر کو مخاطب کیا۔

''ٹھیک ہے، راستے میں جو پہلا ٹیلی گراف آفس پڑا، وہاں سکوٹر روک لوں گا۔'' وہ بولا۔

''ہاں ایک بات اور پاکستانی کرنسی بھی تبدیل کرانا ہے۔'' میں نے مزید کہا۔

''دھرم تلے سے کرا لیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔

پارک سرکس ہی کے پوسٹ آفس کے سامنے ناصر نے سکوٹر روک لیا اور پھر ہم دونوں اندر چلے گئے۔ میں نے مختصر الفاظ میں بابر کو اپنی خیریت سے آگاہ کیا اور لکھا کہ وہ میرا انتظار نہ کرے، اچھا کہ واپس چلا جائے۔

ناصر میرے قریب ہی کھڑا تھا جب میں ٹیلی گرام لکھ رہی تھی، ٹیلی گرام دے کر ہم لوٹ رہے تھے تو وہ پوچھنے لگا۔ ''باجی! کیا مشرقی پاکستان سے آ رہی ہیں؟''

''ہاں!'' میں نے جواب دیا اور پھر فوراً موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر بولی۔ ''ناصر تم نے اس پراسرار نوجوان ہرنارائن چٹرجی کو دیکھا ہے، وہی جانکی پرشاد شرما کا میجیشن دوست؟''

''میں نے اسے قریب سے نہیں دیکھا۔'' ناصر نے بتایا۔ ''کچھ دن پہلے اس کا ایک شو ہوا تھا، اس میں گیا تھا میں! مگر ظاہر ہے وہ سٹیج پر تھا اور میں پبلک میں اتنی دور سے......''

''سمجھ گئی میں!'' میں بول اٹھی، موضوع گفتگو بدلنے سے میرا مقصد پورا ہو گیا تھا اور اب ہم دونوں پوسٹ آفس سے نکل کر باہر کھڑے ہوئے سکوٹر تک پہنچ چکے تھے۔

وہاں سے ہم دھرم تلہ پہنچے۔ حسب معمول وہاں بڑی رونق تھی۔ بڑے نوٹوں میں میرے پاس خاصی کرنسی تھی جو میں نے ہندوستانی روپوں میں تبدیل کرا لی۔ اب مجھے اپنے اخراجات کی طرف سے فکر نہ رہی۔ میں خالو یا خالہ سے اس سلسلے میں کوئی مدد لینا نہیں چاہتی تھی۔ کرنسی کی تبدیلی کے بعد سکوٹر کا رخ ٹالی گنج کی طرف ہو گیا جو ہماری منزل تھی۔

ٹالی گنج پہنچ کر میرے ایما پر ناصر نے مطلوبہ کوٹھی کے سامنے سکوٹر نہیں روکا اور کوٹھی کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر گیا پھر میرے کہنے پر ناصر نے اس کوٹھی کی اطراف میں کئی چکر لگائے۔ میں نے اچھی طرح اردگرد کا جائزہ لے لیا تو ایک ہوٹل کے سامنے سکوٹر رکوا کر ناصر سے کہا۔ ''تم یہاں اس ہوٹل میں بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔''

''کہاں جارہی ہیں آپ؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''میں اس کوٹھی میں جانا چاہتی ہوں۔'' میں نے اسے بتا دیا۔ ''بس اب تم جاؤ، میری طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور مڑ گئی۔

اس ہوٹل سے کوٹھی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ جلد ہی میں اس کے گیٹ پر پہنچ گئی پھر میں نے کال بل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

کال بل کے جواب میں ایک نوجوان گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر آیا اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آنے لگے جو میرے لئے غیر متوقع نہیں تھے۔

''ہٹو نہ سامنے سے! مجھے اندر آنے دو!'' میں آواز بدل کر بولی۔ میں نے کوشش کی تھی کہ ذکیہ کی آواز میں بول سکوں اور میری یہ کوشش کامیاب رہی تھی۔

''مم...... مگر آپ کب لوٹیں؟ آپ تو مالکن...... نارائن بابو کے ساتھ آج ہی صبح...... گئی تھیں...... پھر...... پھر؟'' وہ نوجوان ملازم ایک طرف ہٹتے ہوئے ہکلانے لگا۔

میں اس کی حیرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گیٹ کے اندر داخل ہوکر آگے قدم بڑھا چکی تھی۔ سامنے ہی برآمدے کی سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچ گئی۔ نوجوان ملازم گیٹ بند کرکے اس طرف آنے لگا، میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''سنو! اپنے مالک سے جاکر کہو کہ ابھی ہمیں دھرم تلہ چلنا ہے، وہ جلدی سے تیار ہوجائیں۔''

''جی...... ٹھیک ہے مالکن!'' نوجوان ملازم نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ایک جانب بڑھا۔

وہ کوٹھی میرے لئے اجنبی تھی اس لئے نے ملازم کو بہانہ بنا کر جانکی پرشاد شرما کے پاس بھیجا تھا تاکہ مجھے معلوم ہوجائے، وہ کوٹھی کے کس حصے میں اور کہاں ہے۔

ذرا دیر توقف کے بعد میں نے ملازم کا تعاقب شروع کردیا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ملازم کے کہے ہوئے الفاظ بھی گونج رہے تھے۔ اس کی بات سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ ذکیہ جانکی پرشاد کے دوست ہرنارائن کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھی۔ ملازم کو حیرت شاید اس بات پر تھی کہ وہ تنہا کیسے لوٹ آئی! ذکیہ کی آواز میں بولنے کی وجہ سے وہ مجھے ذکیہ ہی سمجھا تھا۔

دبے قدموں سے نوجوان ملازم کا تعاقب کرتی ہوئی میں جانکی پرشاد شرما کی خواب گاہ تک پہنچ گئی۔ وہ غالباً اس وقت یا تو آرام کررہا تھا یا سو رہا تھا۔ ملازم دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوگیا تھا۔ خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہوا ہی تھا اور شاید جانکی پرشاد شرما جاگ رہا تھا۔

چند ہی لمحے بعد میں نے اندر سے ایک بھاری مردانہ آواز آتے سنی۔ ''کیا بک رہے ہو تم یہ کیسے ہوسکتا ہے!'' یہ آواز جانکی ہی کی ہوسکتی تھی۔

میں خواب گاہ کے دروازے سے لگی ہوئی سب کچھ سن رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ملازم جواب میں کچھ کہتا، میں خواب گاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوکر ذکیہ کی آواز میں بولی، ''کیوں پیارے جانکی، ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟''

میرے سامنے چالیس سالہ ایک شخص آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس

کے چہرے پر اضافی حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے تھا اور ہونٹوں میں سگار تھا، ہاتھ میں ایک کتاب تھی، قریب ہی میز پر ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ وہ غالباً اس وقت مطالعے میں مصروف تھا۔

''اے! تم جاؤ اپنا کام کرو!'' میں نے نوجوان ملازم کو حکم دیا۔ اسی وقت میری نگاہ کتاب کے ورق پر پڑی اور میں چونک اٹھی۔ کتاب اس کی گود میں رکھی تھی اور میں اس کا نام پڑھ چکی تھی۔

نوجوان ملازم میرا حکم سنتے ہی وہاں سے چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کردیا۔

''ہاں ڈارلنگ، اب کہو تم مجھے دیکھ کر اتنے حیران پریشان کیوں نظر آرہے ہو؟'' میں دروازہ بند کرکے اس کی طرف قدم قدم بڑھتے ہوئے بولی۔

''تم...... تم...... کیا...... کیسے؟...... کیا وہ...... ہرنارائن تمہیں اپنے...... اپنے ساتھ دلی نہیں لے گیا؟ اور...... مگر صبح سے تم...... تم کہاں تھیں؟''

جانکی پرشاد کی بات سن کر میں چونک اٹھی۔ یہ اطلاع میرے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی کہ اس نے اپنے دوست ہرنارائن چٹرجی کے ساتھ ذکیہ کو دلی بھیج دیا تھا۔ چند لمحے میں اس لئے خاموش رہی، پھر جلدی میں نے خود پر قابو پالیا۔ اب میں اس کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ مجھے اپنے غصے پر بھی قابو پانے میں دشواری پیش آرہی تھی کیونکہ میرے سامنے اس وقت وہ شخص تھا جو میری بہن کی تباہی کا سبب بنا تھا۔

''جانکی پرشاد شرما! معاً میں نے اسے اپنی اصل آواز میں مخاطب کیا۔'' تم مجھے جو کچھ سمجھ رہے ہو، میں وہ نہیں ہوں، میرا نام ذکیہ نہیں عذرا خان ہے، ذکیہ کی بڑی بہن عذرا خان۔''

''ب...... بڑی...... بڑی بہن!...... وہ ہکلانے لگا۔

''مم...... مگر تم...... تم تو پا...... پاکستان میں تھیں!''

''تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگیا تھا!...... یقیناً ذکیہ کو ہپناٹائز کرکے تم نے یہ ساری معلومات حاصل کی ہوں گی!...... میری اطلاع اور اندازے کے مطابق تمہاری عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہے، پھر یہ...... یہ کتاب کس لئے پڑھ رہے تھے تم؟...... جوان رہنے کے طریقے!...... تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟'' میں اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''یہ...... یہ کتاب تو بس...... یوں ہی وقت...... وقت گزاری کیلئے پڑھ رہا تھا۔'' وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

میں اس کے بالکل قریب پہنچ گئی اور پھر اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

میں نے ایک جھٹکے سے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کردیا اور سخت لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ ذکیہ کہاں ہے؟''

''اسے میں نے ہرنارائن کے ساتھ آج ہی صبح دلی بھیج دیا ہے۔'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا۔

''مگر کیوں؟......تم اس کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟''

میں نے اس کے گریبان کو جھٹکا دیا، پھر خود ہی مزید بولی۔ ''شاید تم اس لئے یہاں رک گئے تاکہ ذکیہ کا پاسپورٹ اور دیگر شناختی کاغذات اپنے لوگوں کے ذریعے حاصل کرسکو، بولو کیا میرا اندازہ صحیح ہے۔''

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا، محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''کل رات کی رپورٹ تو تمہیں کرائے کے ان غنڈوں سے مل گئی ہوگی نا!'' میری بات سن کر اس نے پھر سر ہلا دیا۔ میں نے مزید کہا۔ ''اب جو کچھ میں پوچھ رہی ہوں، وہ صحیح صحیح بتاتے جاؤ! اگر تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دوں گی۔''

معلوم نہیں اسے غیرت آ گئی یا اچانک کیا ہوگیا کہ اس نے مجھے زور کا دھکا دیا اور میں سنبھل نہ سکی۔ میرے ہاتھ سے اس کا گریبان چھوٹ گیا اور میں دور جا گری۔''

''اب تک میں عورت سمجھ کر تم پر ہاتھ نہیں اٹھا رہا تھا تو تم شیر ہی ہوئے جا رہی تھیں!'' اس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔ شاید اسے یہ احساس ہوگیا تھا کہ اس کے مقابلے پر ایک عورت ہے جسے وہ با آسانی زیر کرسکتا ہے۔ غیر متوقع طور پر دھکا دینے کے سبب میں دور جا گری تھی، اس سے شایا اس کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

غصہ ضبط کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جانکی پرشاد کی اس حرکت نے مجھے مشتعل کر دیا۔ میں ایک دم اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

''آج تک تو نے شاید عورت کا ایک ہی روپ دیکھا ہوگا!'' میں دانت پیس کر بولی۔ ''میں تجھے عورت کا دوسرا روپ دکھاتی ہوں ابھی!'' یہ کہتے ہی میں جیسے اڑتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی، پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ میرا الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ اسی کے ساتھ میری لات اس کے پیٹ کے نچلے حصے پر پڑی اور وہ چیختا ہوا جھک گیا۔ میں نے اس کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اسے سیدھ کھڑا کر دیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''بولو بس اتنا ہی کافی ہے یا ابھی اور گھڑائی کروں!'' اس کا چہرہ اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

''مجھے چھوڑ...... چھوڑ دو! میں...... میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ قصوروار...... اصل قصوروار میں نہیں، ہر...... ہرنارائن چٹرجی ہے۔'' وہ رک رک کر بولا۔ ''اسی نے مجھے بہکایا تھا۔

میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے، پھر اس نے جو کہانی سنائی اسے سن کر جیسے میرے سینے کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اس وقت مجھے جو خوشی محسوس ہوئی، میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتی۔ میرے لئے یہ بات باعث مسرت ہی تھی کہ اب تک میری بہن کی عزت و آبرو محفوظ تھی۔

جانکی پرشاد شرما کسی قابل نہیں تھا، مگر اس نے اپنی ماں کی آخری خواہش کے احترام میں اب سے پانچ سال قبل شادی کر لی تھی۔ چند روز بعد اس کی بیمار ماں مر گئی تھی، باپ پہلے ہی مر چکا تھا۔ جانکی پرشاد کی بیوی نے چند دن اس آسرے پر گزار دیئے کہ اس کا شوہر اپنا علاج کرا رہا تھا لیکن جلد ہی اس پر یہ حقیقت ظاہر ہوگئی کہ اسے بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ نتیجتاً اس نے عدالت سے رجوع کیا اور اپنے شوہر

ے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس نے بھری عدالت میں کہہ دیا تھا کہ میرا شوہر کسی قابل نہیں ہے اور میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس مقدمے کی وجہ سے جانکی پرشاد کی بڑی بدنامی ہوئی تھی...... بدنامی کے اس داغ کو دھونے کی خاطر پہلے اس نے یہ سوچا تھا کہ کسی غریب لڑکی سے شادی کرے گا اور اس کی آنکھوں پر مال دولت کی پٹی باندھ کر زبان نہ کھولنے دے گا، مگر وہ ابھی اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا تھا کہ اس کی ملاقات ہرنارائن چٹرجی سے ہوگئی۔ ایک دوست نے اس سے ملوایا تھا۔ دہلی میں ہرنارائن چٹرجی کے دو ایک شو ہوئے، پھر وہ بمبئی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہاں بھی اسے اپنے شو کرنا تھے۔ اس دوران میں چند دن وہ جانکی پرشاد کا مہمان بھی رہا اور ان دونوں کے درمیان بے تکلفی ہوگئی۔ جانکی پرشاد نے اپنا مسئلہ اس سے بیان کر دیا۔ ہرنارائن چٹرجی نے اسے کلکتہ آنے کی دعوت دی اور کہا کہ بمبئی کچھ روز رہ کر میں کلکتہ پہنچ جاؤں گا، تم وہاں آ جاؤ، تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہرنارائن چٹرجی نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ تمہارا علاج بھی کرسکتا ہوں۔ چند روز بعد جانکی پرشاد کو ہرنارائن چٹرجی کا خط ملا۔ یہ خط اس نے کلکتہ ہی سے لکھا تھا۔ جانکی پرشاد، دہلی میں کچھ کاروباری مصروفیات کے سبب فوراً کلکتہ نہ جاسکا س نے ہرنارائن چٹرجی کو لکھا کہ میں دو ایک ماہ بعد آ سکوں گا اور روانگی سے قبل تمہیں مطلع کر دوں گا، مگر سے دہلی میں تین ماہ لگ گئے۔

اس عرصے میں ہرنارائن چٹرجی کو جنوبی ہند جانا پڑا اور یوں ایک بار پھر فرصت کے باوجود جانکی پرشاد کلکتہ نہ جاسکا۔ جنوبی ہند کے دورے سے، دو ماہ بعد لوٹ کر ہرنارائن چٹرجی خود دہلی آ گیا اور پھر وہ جانکی پرشاد کو چند روز بعد اپنے ساتھ کلکتہ لے گیا۔

کلکتہ پہنچ کر چند دن جانکی پرشاد نے ایک ہوٹل میں گزارے اور پھر ٹالی گنج کے علاقے میں ایک کوٹھی کرائے پر لے لی۔ اسی کے اصرار پر ہرنارائن چٹرجی بھی اس کوٹھی میں ساتھ رہنے لگا اور اس نے جانکی پرشاد کا علاج شروع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ علاج میں تقریباً چھ ماہ لگیں گے، اس سے پہلے جانکی پرشاد کسی قابل نہ ہو سکے گا۔

بدقسمتی سے اسی عرصے میں ایک شام گرانڈ ہوٹل میں جانکی پرشاد شرما اور ہرنارائن چٹرجی نے ذکیہ کو دیکھ لیا۔ ذکیہ ان کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھی تھی۔ معلوم نہیں ہرنارائن چٹرجی کو کیا سوجھی کہ اس نے جانکی پرشاد سے کہا کہ تم کہو تو میں اس خوبصورت لڑکی کو تمہارے ساتھ چائے پینے پر مجبور کرسکتا ہوں۔ جانکی پرشاد کو اس کی بات پر یقین نہ آیا اور وہ بولا کہ یہ ممکن نہیں۔ ہرنارائن چٹرجی نے کہا کہ ابھی تم میری پراسرار قوتوں سے واقف نہیں اس لئے ایسا کہہ رہے ہو، چائے ساتھ پی لینا تو خیر بڑی معمولی سی بات ہے، میں تو اسے ٹالی گنج تک ساتھ لے جاسکتا ہوں۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ ان دونوں کے درمیان دس ہزار روپے کی شرط لگ گئی۔ جانکی پرشاد کا کہنا تھا کہ وہ لڑکی، یعنی ذکیہ ہرگز ان کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ اور ہرنارائن چٹرجی بضد تھا کو وہ ذکیہ کو ساتھ چلنے پر راضی کرسکتا ہے، نتیجتاً ہرنارائن اپنی میز سے اٹھ کر ذکیہ کی میز پر پہنچ گیا اور اس نے ذکیہ سے کچھ کہا۔ ذکیہ نے اسے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے مگر جلد ہی اس کا چہرہ سپاٹ اور جذبات سے عاری نظر آنے لگا۔ ہرنارائن اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ ذکیہ کی اور اس کی نظریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں، پھر کچھ ہی

دیر بعد ذکیہ اپنی میز سے اٹھ کر ہرنارائن کے ساتھ جانکی پرشاد کی میز پر آگئی پھر ان لوگوں نے ساتھ چائے پی اور کچھ دیر وہاں رک کر ٹالی گنج کیلئے روانہ ہوگئے۔ ذکیہ بھی ان کے ساتھ تھی۔

اس روز تقریباً نصف شب تک ذکیہ جانکی پرشاد کی کوٹھی میں رہی۔ اس دوران میں جانکی پرشاد ذکیہ میں دلچسپی لینے لگا۔ ہرنارائن نے دوسرے دن صبح اسے گرانڈ ہوٹل میں آنے کی تاکید کی تھی۔ جب ذکیہ چلی گئی تو جانکی پرشاد نے ہرنارائن سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور یہ بھی پوچھا کہ تم نے کس طرح ذکیہ کو قابو میں کر کے اپنی بات ماننے پر مجبور کردیا؟ ہرنارائن نے اسے بتایا کہ میں ہپناٹزم کا بھی ماہر ہوں اور میں نے اس لڑکی کو ہپناٹزم کر کے اپنا حکم ماننے پر مجبور کیا تھا۔ اگر وہ تمہیں واقعی پسند آگئی ہے تو میں اسے تمہارے ساتھ شادی کرنے پر بھی راضی کرسکتا ہوں۔ جانکی پرشاد بولا کہ وہ تو مسلمان ہے، پھر یہ کس طرح ہوسکتا ہے، ہرنارائن نے کہا کہ میں اس کے ذہن سے سب کچھ کھرچ کر پھینک دوں گا مگر اس میں وقت لگے گا۔

پھر ہرنارائن چٹرجی ہی نے ساری منصوبہ بندی کی۔ دوسرے دن ذکیہ وقت مقررہ پر گرانڈ ہوٹل پہنچ گئی اور یہ دونوں اسے ٹالی گنج لے آئے۔ سب سے پہلے ہرنارائن نے ذکیہ کو ٹرانس میں لے کر اس کے ماضی کے متعلق تمام حالات سے آگاہی حاصل کرلی پھر اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ تمہارا نام کرشنا کماری ہے اور تم ایک اناتھ آشرم میں پل کر جوان ہوئی۔ ہرنارائن کے استفسار پر ذکیہ نے تنویمی کیفیت میں خالو کے گھر کا پتا بھی بتا دیا تھا اور یہ بھی کہ اس کا پاسپورٹ اور دیگر شناختی کاغذات کہاں رکھے ہیں! گھر کے اندر کا نقشہ بھی اسی سے پوچھ کر ہرنارائن نے بنایا تھا۔ ہرنارائن پاسپورٹ اور دیگر کاغذات اس لئے حاصل کرنا چاہتا تھا کہ اس بات کا کوئی ثبوت کسی کے پاس نہ رہے کہ ذکیہ مسلمان ہے اور ہندوستانی نہیں۔"

جن جرائم پیشہ افراد سے میرا سامنا ہوا تھا، ان سے بھی جانکی پرشاد کو ہرنارائن ہی نے بلوایا تھا۔ ہرنارائن نے انہیں گھر کے اندرونی حصے کے بارے میں وہ معلومات فراہم کردی تھیں جو ذکیہ سے حاصل کی تھیں اور انہیں اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا گھر کا نقشہ بھی دے دیا تھا۔ ادھر تو بھاری معاوضے کا نصف وصول کر کے وہ جرائم پیشہ افراد پاسپورٹ وغیرہ کے حصول میں لگ گئے، ادھر جانکی پرشاد نے ہندو رسم رواج کے مطابق ذکیہ سے شادی کرلی۔ اسلامی نقطہ نظر سے اسے نکاح نہیں کہا جاسکتا تھا۔

گزشتہ شب جب جرائم پیشہ افراد کو پھر میری وجہ سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو ہرنارائن نے جانکی پرشاد کو ایک اور مشورہ دیا کیونکہ جانکی پرشاد ذکیہ سے اپنی دانست میں شادی کرلینے کے باوجود خوفزدہ تھا۔ جب تک پاسپورٹ اور دیگر کاغذات ہتھے نہ چڑھ جاتے، جانکی پرشاد کا خوف ختم نہ ہوتا کہ کہیں وہ کسی لمبے چکر یا قانون کی گرفت میں نہ آجائے۔

جانکی پرشاد کے ساتھ اس کا ایک بااعتماد خاندانی ملازم بھی کلکتہ آیا تھا۔ جب ہرنارائن نے اسے یہ مشورہ دیا کہ ذکیہ کو میرے ساتھ دہلی بھیج دو اور تم پاسپورٹ وغیرہ ملنے تک یہیں رکو تو اس نے اپنے خاندانی ملازم دھرم ویر کو بھی ذکیہ اور ہرنارائن کے ساتھ دہلی بھیجنے کی حامی بھرلی۔ گزشتہ رات ہی صبح دہلی روانہ ہونے والی ایک فلائٹ کے تین ٹکٹ حاصل کرلئے گئے اور پھر آج ہی صبح دھرم ویر، ذکیہ اور ہرنارائن

چٹرجی تینوں دہلی روانہ ہوگئے۔ جانکی پرشاد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مجھے ہرنارائن پر پورا بھروسہ نہیں تھا اس لئے ذکیہ کے ساتھ دھرم ویر کو ہدایات دے کر بھیجا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس دوران میں وہ ہرنارائن چٹرجی کو خاصی بڑی رقم دے چکا ہے، جو پچاس ہزار سے تجاوز کررہی تھی۔

جانکی پرشاد شرما سے پورے واقعات سننے کے بعد میں نے طویل سانس لیا، پھر بولی۔ "تمہیں جس چیز کی تلاش ہے اور تم جس کے حصول کی خاطر یہاں رکے ہو، وہ میرے پاس ہے۔ یہ دیکھو!" یہ کہہ کر میں نے اپنا پرس کھولا اور پاسپورٹ وغیرہ نکال کر اسے دکھانے لگی۔" دیکھا تم نے جانکی پرشاد! ...... اس پاسپورٹ اور ان کاغذات کے ذریعے میں یہ ثابت کرسکتی ہوں کہ وہ جس کا نام تم نے کرشنا کماری رکھ دیا ہے اور جسے تم ہندو ظاہر کررہے ہو۔ اس کا اصل نام ذکیہ ہے، وہ مصر کی شہری ہونے کے ساتھ پاکستان کی شہری بھی ہے۔ میں مصری اور پاکستانی سفارتخانوں کے ذریعے بھی تمہاری حکومت کو اس طرف متوجہ کر کے تمہاری ناک میں نکیل ڈال سکتی ہوں۔ تم نے یا تمہارے عیار دوست ہرنارائن چٹرجی نے اس معاملے کو جتنا سہل سمجھ لیا تھا، یہ اتنا سہل ہرگز نہیں ہے۔ تم پر بہ یک وقت ہندوستانی قانون کے مطابق کئی دفعات لگیں گی۔ تمہاری ساری عزت خاک میں مل جائے گی اور تمہیں گرفتار کرلیا جائے گا!"

میرا مقصد اسے خوفزدہ کرنا تھا اور میں اس میں کامیاب تھی۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ "لیکن تم اگر چاہو تو اب بھی تمہارے لئے ایک موقع ہے۔" یہ کہہ کر میں اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی اور پاسپورٹ وغیرہ دوبارہ پرس میں رکھنے لگی۔

"میں ...... میں تمہاری ہر بات ماننے پر راضی ہوں، تم جو ...... جو بھی کہو، وہ عاجزانہ آواز میں بولا۔ "تم ...... تم میرے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہ کرو!"

تو پھر تمہیں ذکیہ کو میرے حوالے کرنا پڑے گا اور اس کے لئے میرے ساتھ تمہارا دہلی چلنا ضروری ہے۔ بولو تم اس پر راضی ہو؟"

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا، پھر مجھے ایک اور بات یاد آگئی۔ "کیا تم ان جرائم پیشہ افراد سے رابطہ قائم کرسکتے ہو کسی طرح جنہیں پاسپورٹ وغیرہ کے حصول کی خاطر تم نے پیشگی دس ہزار روپے دیئے ہیں؟"

"ہاں! ...... ان کا فون نمبر ہے میرے پاس۔" وہ بولا۔

"تو پھر ابھی میرے سامنے انہیں فون کرو کہ اب تمہیں مزید ان کی خدمات کی ضرورت نہیں انہیں تم یہ بھی بتاؤ گے کہ ایک اور ذریعے سے تمہیں پاسپورٹ اور وہ کاغذات مل چکے ہیں۔"

جانکی پرشاد بہرحال کاروباری ذہنیت کا مالک تھا، اس لئے بولا۔ "اور وہ دس ہزار روپے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا! کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ لوگ کام نہ ہونے کی صورت میں پیشگی دی جانے والی رقم واپس کردیں گے۔ تم چاہو بھی تو ان سے وہ رقم واپس نہیں لے سکو گے اس لئے بھول جاؤ اس رقم کو! اور جانکی پرشاد، وہی رقم کیا تمہیں تو اس رقم کو بھی صبر کرنا پڑے گا جو اپنے عیار دوست ہرنارائن چٹرجی کو تم نے دی ہے یا اس نے تمہیں بے وقوف بنا کر وصول کی ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ دس ہزار تو کچھ بھی نہیں ہیں۔"

"اس کیلئے ہرنارائن نے تو مجھے مروا ہی دیا۔" وہ بڑبڑایا۔

ٹیلی فون خواب گاہ ہی میں ایک تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ میرے ایما پر جانکی پرشاد نے ایک ڈائری میں مطلوبہ نمبر دیکھا اور پھر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

سلسلہ ملتے ہی وہ کسی طوطے کی طرح میرا پڑھایا ہوا سبق دہرانے لگا۔ دوسری طرف سے غالباً پیشگی رقم کے بارے میں کچھ کہا گیا تو جانکی پرشاد نے مردہ کی آواز میں کہا۔ "وہ مجھے معلوم ہے، مجھے پیشگی دی جانے والی رقم نہیں چاہئے، ہاں ٹھیک ہے، جب پھر بھی مجھے تم لوگوں کی ضرورت پڑی تو فون کرلوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے رسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"جانکی پرشاد! اب ایئرپورٹ انکوائری فون کر کے معلوم کرو کہ دہلی کیلئے کس وقت کوئی فلائٹ مل سکتی ہے!" میں نے اسے دوسرا حکم دیا، دوسیٹوں کی بات کرنا ہے تمہیں!"

تعمیل حکم میں وہ پھر نمبر ملانے لگا، انکوائری سے معلوم ہوا کہ آج رات میں ایک فلائٹ دہلی جارہی ہے اور اس میں دوسیٹیں مل سکتی ہیں۔

"ٹھیک ہے! ہم اس فلائٹ سے دہلی چلیں گے۔ میں رات کو نو بجے یہاں پہنچ جاؤں گی، پھر ہم دونوں یہیں سے ڈم ڈم ایئرپورٹ چلیں گے۔ اس دوران میں ایک تو تمہیں اس فلائٹ کے دوٹکٹ لینا ہیں، دوسرے یہاں سے روانگی کی تیاری کرنا ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ کسی قسم کی چال بازی دکھانے کی کوشش کی تو یہ تمہارے حق میں بہت خطرناک ہوگا۔ میں تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گی! بولو میری ہدایات پر عمل کرو گے تم؟" میں نے اسے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یقین رکھو عذرا خان! میں تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔" اس کے لہجے میں مجھے سچائی محسوس ہوئی۔

"اگر ایسا ہے واقعی تو پھر ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں نے پرس کھولا اور اس میں سے کئی بڑے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "لو! یہ میرے ٹکٹ کے پیسے رکھ لو۔"

"نہیں۔" اس نے انکار کردیا۔ "تمہارا ٹکٹ میں لوں گا کیونکہ میری ہی وجہ سے تمہیں دہلی جانا پڑ رہا ہے۔"

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ میرے ٹکٹ کیلئے پیسے لے لے مگر اس نے نہیں لئے، پھر میں نے بھی مزید اصرار نہیں کیا اور بولی۔ "اچھا اب میں چلتی ہوں، رات کو ملاقات ہوگی۔"

جانکی پرشاد مجھے کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑنے آیا۔ اس کا نوجوان ملازم مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جانکی پرشاد کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ مجھ سے پوچھ سکتا، میں کہاں ٹھہری ہوں، میں اس کی کوٹھی سے نکل کر اس ہوٹل کی طرف چل دی جہاں ناصر کو چھوڑ آئی تھی، واپسی میں مجھے یقیناً توقع سے زیادہ دیر ہوگئی تھی اس لئے ناصر بے چینی سے میرا انتظار کررہا تھا۔ اس بے چینی کے عالم میں وہ ہوٹل سے نکل کر باہر ٹہلنے لگا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے مضطرب چہرے پر اطمینان وسکون کے آثار نظر آنے لگے۔

میں ناصر کے قریب پہنچی تو وہ بولا۔ "میں آپ کی طرف سے بہت فکرمند ہوگیا تھا، آپ نے لوٹنے میں بہت دیر کردی۔"

"ہاں ناصر! مگر میں کامیاب لوٹی ہوں۔ مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ اتنی دیر لگ جائے گی۔" میں بولی۔

"کامیاب لوٹی ہیں، اس سے کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا ذکیہ سے ملاقات ہوگئی آپ کی؟" اس نے پرتجسس آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "فی الحال گھر چلو وہیں چل کر بتاؤں گی کہ کامیابی سے کیا مراد ہے میری!"

ناصر نے سکوٹر سٹارٹ کیا اور میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں گھر سے اڑھائی بجے کے قریب روانہ ہوئے تھے اور اس وقت سوا پانچ بج رہے تھے، گھر پہنچتے پہنچتے چھ بج جاتے۔ میرے پاس وقت کم تھا، نو بجے مجھے پھر ٹالی گنج پہنچنا تھا مگر میں نے یہ بات ناصر کو نہیں بتائی تھی۔

میرے کہنے پر ناصر نے تیز رفتاری کا ثبوت دیا اور ہم چھ بجے سے پہلے ہی پارک سرکس پہنچ گئے۔ میں ناصر کو ساتھ لئے اوپر کی منزل پر پہنچ گئی کیونکہ خالو، خالہ وغیرہ وہیں تھے اور مجھے ہرحال ان سے اجازت لینے کے ساتھ ساتھ انہیں کچھ بتانا بھی تھا تاکہ وہ مطمئن ہوجائیں۔ زاہد بھی اس وقت اوپر کی منزل ہی پر تھا۔ گھر کا دروازہ ہمارے لئے مہ جبیں نے کھولا تھا، وہ بھی اس وقت جب اس نے ناصر کی آواز پہچان لی تھی۔

اوپر کی منزل کے کمرے میں پہنچ کر میں خالو کے قریب ہی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی اور پھر انہیں مخاطب کیا۔ "خالو جان! پہلی خوش خبری تو آپ کیلئے یہ ہے کہ ذکیہ اور اس ہندو تاجر کی شادی ایک فراڈ کے سوا کچھ نہیں تھی۔ مختصر تو میں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ ذکیہ کی عزت و آبرو پوری طرح محفوظ ہے۔" پھر میں نے بغیر رکے مزید کہا۔ "گزشتہ شب جو واقعہ پیش آیا، اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں اب آپ کو قطعی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر عذرا بیٹی! تم یہ سب کچھ اتنے یقین سے کس طرح کہہ رہی ہو، خالو بول اٹھے۔

"فی الحال کیونکہ مجھے آج ہی رات دہلی جانا ہے اور میرے پاس وقت کم ہے، اس لئے تفصیلات نہیں بتا سکوں گی۔"

"کیا؟" خالہ چونک کر بولیں، تم دلی جارہی ہو! مگر کیوں۔"

"ذکیہ کو لینے!" میں نے مختصر جواب دیا۔

"لیکن وہ تو یہیں تھی!" خالو نے کہا۔

"مگر اب نہیں ہے۔" میں نے بتایا۔

"تم واپس تو یہیں آؤ گی نا اسے لے کر؟" خالہ نے پوچھا۔

"جی ہاں!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواباً کہا۔ "لیکن واپسی میں کتنے دن لگیں گے، فی الحال میں نہیں بتا سکتی۔ یوں بھی وہاں بہت سے عزیز ہیں، ہمارے، ان سے بھی ہم موقع غنیمت جان کر مل لیں گے۔ ویسے میری کوشش یہی ہوگی کہ جلد واپسی ہوجائے۔ میں ذکیہ کا سامان بھی ساتھ لے جانے کی اجازت چاہتی ہوں۔"

"ارے بیٹی، اس میں اجازت کی کیا بات ہے!" خالہ بولیں۔ "تم اور ذکیہ دونوں ہی ہمارے لئے ایک جیسی ہو، تمہاری ہی بہن کا سامان ہے لے جاؤ، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"ابو اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی ان کے ساتھ دہلی گھوم آؤں، یوں بھی کالج کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔" زاہد اپنے والد سے کہنے لگا۔

"بھئی اپنی ماں سے پوچھو، میں کچھ نہیں جانتا۔" خالو بولے اور خالہ کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں سر ہلا کر انکار کر دیا۔

"کیا کرے گا تو دہلی جا کر! خواہ مخواہ خرچہ ہوگا، خالہ نے خالو کا اشارہ سمجھ لیا۔

"ابو یہ بڑی غلط بات ہے!" زاہد بولا۔ "آپ خود تو منع کرتے نہیں، امی کو اشارہ کر دیتے ہیں۔ میں نے سب دیکھ لیا ہے ہاں!" اس کا لہجہ بچوں جیسا تھا۔

خالو ہنس پڑے پھر بولے۔ "بھئی تم جانو اور تمہاری ماں جانے! مجھے بیچ میں نہ لاؤ۔ اگر یہ تمہیں جانے دے تو چلے جاؤ۔"

"آپ کی مرضی ہوگی تبھی تو امی جانے دیں گی نا، زاہد نے کہا، پھر بالکل بچوں کی طرح اپنی ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر دہلی جانے کی ضد کرنے لگا۔ آخر کار اسے اجازت مل ہی گئی۔ طے یہ ہوا کہ ناصر اسی وقت دہلی جانے والی فلائٹ کا ٹکٹ لینے روانہ ہو جائے اور زاہد اپنے کپڑے وغیرہ نیز دیگر سامان کی تیاری میں لگ جائے۔

میں نیچے کمرے میں آ کر ذکیہ کا سوٹ کیس اور ایئر بیگ درست کرنے لگی۔ مجھے زاہد کے دہلی جانے پر خوشی تھی۔

جانکی پرشاد کو دو ٹکٹ لینا تھے، میں نے سوچا تھا کہ زاہد کی سیٹ اس سے بدل لوں گی۔ سامان کی تیاری کے دوران میں خالہ جان اور ناہید نے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر لیا۔

ناصر جلدی ٹکٹ لے کر آ گیا۔ ساری تیاری سات بجے تک ہو گئی پھر سب نے ساتھ ناشتہ کیا۔

زاہد اور میں پونے آٹھ بجے کے قریب ایک ٹیکسی کے ذریعے ٹالی گنج روانہ ہو گئے۔ جب میں نے ایئر پورٹ کے بجائے ٹیکسی والے سے ٹالی گنج چلنے کو کہا تو زاہد چونک اٹھا۔ ناصر ٹیکسی لے کر آیا تھا اور سامنے ہی کھڑا تھا۔ اسے بھی حیرت سی ہوئی، جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا کیونکہ اسے بھی میں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

"ہم ٹالی گنج ہو کر ایئر پورٹ جائیں گے، ابھی فلائٹ کی روانگی میں خاصا وقت ہے اور یہ بات میں نے اس لئے ذرا بلند آواز میں کہی کہ ناصر بھی سن لے۔

ٹیکسی آگے بڑھی تو ناصر نے ہاتھ ہلا کر ہمیں "خدا حافظ" کہا، جواباً میں نے اور زاہد نے بھی اسے "خدا حافظ" کہا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

ایک تو یہ وجہ تھی کہ زاہد میرے ساتھ چل رہا تھا، دوم اس سے میری قدرے بے تکلفی بھی تھی۔ اس لئے مختصراً میں نے دھیمی آواز میں اسے حالات سے آگاہ کر دیا۔ وہ غیر یقینی کے سے انداز میں

میری طرف دیکھنے لگا تو میں نے ذکیہ کی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"آپ تو اچھی خاصی آفت کی پرکالہ ہیں۔ ان حسابوں تو آپ سے ڈرنا چاہئے۔" زاہد نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی۔

"اسی لئے تو میں کہہ رہی تھی تم سے کہ کہیں زندگی بھر کیلئے مجھے اپنا کر تمہیں پچھتانا نہ پڑے!" میں نے اسے چھیڑا۔

"دیکھیں محترمہ! بیوی بیوی ہی رہتی ہے! وہ چاہے کتنی خطرناک کیوں نہ ہو، اسے اپنے مرد سے دب کر رہنا پڑتا ہے۔"

"گزر گئے وہ زمانے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

پھر ہم دونوں انہی خوش گپیوں میں نو بجے سے پہلے ہی ٹالی گنج پہنچ گئے۔ جانکی پرشاد کے ملازم نے ہمارا سامان برآمدے میں رکھ دیا۔ میں نے پیسے دے کر ٹیکسی والے کو رخصت کیا اور پھر زاہد کو ساتھ لے کر اس کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

"تمہارے مالک کہاں ہیں؟" میں نے ملازم سے معلوم کیا۔

"وہ اپنے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

معلوم نہیں کیوں مجھے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی ایک انجانے سے خطرے کا احساس ہوا تھا اور میں چوکنا ہو گئی تھی۔ زاہد میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، کچھ دیر بعد میں زاہد کے ساتھ جب جانکی پرشاد کی خواب گاہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اچھل پڑی، سامنے ہی دو افراد اپنے ہاتھوں میں ریوالور لئے ہوئے کھڑے تھے۔ صورت ہی سے وہ خطرناک قسم کے غنڈے نظر آ رہے تھے۔

"آؤ عذرا خانم! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے! جانکی پرشاد ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ تم خاصی خطرناک عورت ہو۔ اس کا کچھ اندازہ ہمیں کل رات ہی ہو چکا ہے، جب ہم پارک سرکس کے اس گھر میں داخل ہوئے تھے! ہمیں تم سے کل رات کا حساب بھی چکانا ہے۔" ان دونوں میں سے ایک چیختے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے اس کی آواز سے اسے پہچان لیا۔ یہ ان لوگوں کا سرغنہ تھا جو گزشتہ شب خالہ کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

"تم دونوں ہاتھ اٹھا لو!" اس شخص نے اپنے ریوالور کو جنبش دے کر حکم دیا۔

اس وقت اس کے کسی ساتھی نے کمرے کی چٹخنی اندر سے بند کر دی۔ وہ غالباً دروازے کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اپنے عقب میں چٹخنی کی آواز سن کر مڑ کے اسے دیکھا تو یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ جانکی پرشاد تھا اور مجھے اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور نظر آ رہا تھا اور ریوالور کی نال میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ میں نے پلٹ کر زاہد کی طرف دیکھا تو مجھے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی نظر آئیں۔

☆...☆......☆

اس کوٹھی میں قدم رکھتے ہی مجھے جس انجانے خطرے کا احساس ہوا تھا وہ اب میرے سامنے آ گیا تھا۔ اس وقت اگر میں اکیلی ہوتی تو شاید اتنی نہ گھبراتی زاہد بھی میرے ساتھ تھا اس لئے مجھے خود سے زیادہ اس کی فکر تھی۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ موت تین مسلح افراد کی صورت میں مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ میں اپنی ہنگامہ خیز زندگی میں اب تک متعدد بار ایسے خطرناک حالات کا سامنا کر چکی تھی، لیکن زاہد کے لئے یقیناً یہ صورت حال بالکل نئی اور انتہائی خطرناک تھی۔ گھبراہٹ میں یا خوف زدہ ہو کر وہ کوئی ایسا قدم بھی اٹھا سکتا تھا جو اس کے اور میرے لئے مہلک ثابت ہوتا۔

میں نے چند ہی لمحوں میں صورتحال کی سنگینی کا پوری طرح جائزہ لے لیا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا، انتہائی تیزی کے ساتھ کرنا تھا، ابھی تک میں نے یا زاہد نے اس شخص کے حکم کی تعمیل میں ہاتھ نہیں اٹھائے تھے۔ ریوالور میرے پرس میں تھا اور پرس میرے الٹے ہاتھ کی کلائی سے لٹکا ہوا تھا۔

''عذرا خان!'' معاً اس شخص نے مجھے پھر سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ اسے میرا نام یقیناً جانکی پرشاد شرما ہی نے بتایا ہوگا۔ ''تم نے اور تمہارے ساتھی نے ابھی تک ہاتھ نہیں اٹھائے!'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے ریوالور کو حرکت دی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے میں نے اس کے حکم پر عمل نہیں کیا تو وہ گولی چلا دے گا۔

میں اس دوران میں اپنے الٹے ہاتھ کو خفیف سی حرکت دے کر غیر محسوس انداز میں پرس کھول چکی تھی۔ مزید مہلت حاصل کرنے کی خاطر میں نے اس شخص کو مخاطب کیا۔ ''تمہیں تو میرا نام معلوم ہو گیا، مگر تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا!'' میرا لہجہ پرسکون تھا۔

''خود کو اس طرح کی باتیں کر کے یہ ظاہر نہ کرو کہ تم بہت نڈر عورت ہو!'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تین تک گنتی گنوں گا، اگر تم نے گنتی پوری ہونے سے پہلے ہاتھ نہ اٹھائے۔''

''تو تم مجھے گولی مار دو گے!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم یہی کہنا چاہتے ہو، نا!... لو گولی ہی مارنا ہے تو پھر گنتی گننے کی کیا ضرورت ہے!''

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں اور گنتی شروع کر دی۔ ''ایک...... دو...''

''تین!'' اس کی بجائے میں نے بلند آواز میں کہا اور اسی کے ساتھ میرا الٹا ہاتھ اوپر اٹھا۔ میں نے اپنے پرس کو فضا میں اچھال دیا تھا۔

میری یہ حرکت اس شخص کے لئے یقیناً ناقابل فہم اور غیر متوقع ہی تھی۔ میری توقع کے عین

مطابق اس شخص اور اس کے ساتھی کی نظریں پرس کے ساتھ ساتھ اوپر اٹھ گئی تھیں اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ پرس کو اوپر اچھالنے سے قبل میں نے اس میں سے اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ ان دونوں پر گولی چلانے سے پہلے یہ بہت ضروری تھا کہ ان کی توجہ چند لمحے کو کسی اور طرف مبذول کر دی جائے۔ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ دونوں میری طرف متوجہ ہوتے، میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر فائر کر دیا۔ کمرا دھماکے سے گونج اٹھا اور اسی کے ساتھ اس شخص کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میری چلائی ہوئی گولی نے اس کی کلائی کو چھید دیا تھا۔ ابھی پہلی چیخ معدوم نہیں ہوئی تھی کہ دوسری چیخ ابھری۔ یہ چیخ میرے دوسرے فائر کے جواب میں سنائی دی تھی۔ اس شخص کا ساتھی بھی چیخ مارتا ہوا اپنی دائیں کلائی تھامے فرش پر گر پڑا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں سے ریوالور چھوٹ کر دور جا گرے تھے۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور غیر متوقع طور پر ہوا تھا کہ جانکی پرشاد کچھ نہ سمجھ سکا تھا۔ میں نے الٹے ہاتھ سے ان دونوں کو نشانہ بنایا تھا۔ اگر میرا نشانہ ذرا سا بھی چوک جاتا تو اس وقت صورتحال یقیناً مختلف ہوتی۔ ان دونوں پر فائر کرتے ہی جب میں جانکی پرشاد کی طرف تیزی سے پلٹی تو اسے تصویر حیرت بنا ہوا دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ریوالور ہونے کے باوجود وہ بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا اس لئے مجھے اس پر فائر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ میں نے اپنی جگہ سے جست بھری اور پھر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔

اب میرے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ میں ان دونوں غنڈوں کی طرف سے بے خبر نہیں تھی۔ جیسے ہی میں ان کی طرف پلٹی، ان میں سے ایک کو فرش پر پڑے ہوئے ریوالور کی طرف گھسٹتے دیکھا اور میرے ہونٹوں پر زہریلی سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں جیسے اڑتی ہوئی اس کے سر پر پہنچ گئی۔ اسی کے ساتھ میری ٹھوکر اس کی پیشانی پر پڑی اور وہ چیخ اٹھا۔ اس کا ساتھی بھی قریب ہی فرش پر پڑا ہوا تکلیف سے کراہ رہا تھا۔

''زاہد! دونوں ریوالور اٹھا لو!'' میں نے زاہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی حالت بھی جانکی پرشاد سے مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی اب تک پتھر کے کسی مجسمے کی طرح کھڑا ہوا تھا، یوں جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھا۔

جب زاہد نے دونوں ریوالور اٹھا لئے تو میں نے پرس اٹھانے کو کہا۔ پرس کھلا ہونے کی وجہ سے کئی چیزیں ادھر ادھر بکھر گئی تھیں۔ زاہد نے انہیں بھی فرش سے اٹھا کر پرس میں رکھ لیا۔ میں نے اس دوران میں ان دونوں زخمی غنڈوں کی تلاشی لے لی تھی۔ ان کے پاس کوئی اور ہتھیار نہیں تھا۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر میں، جانکی پرشاد کی طرف پلٹی۔ اب اس کے چہرے پر حیرت کی بجائے شدید خوف کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''جانکی پرشاد! ادھر آؤ!'' میں نے اسے حکم دیا۔

اس نے میرے حکم کی تعمیل میں قدم اٹھائے تو میں نے واضح طور پر اس کے پاؤں کانپتے دیکھے۔

مجھے اس کی حالت دیکھنے کے باوجود اس پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ سارے ہنگامے کی جڑ وہی تھا۔ ظاہر ہے کہ اسی نے ان غنڈوں سے رابطہ قائم کر کے انہیں وہاں مجھ سے نمٹنے کے لئے بلایا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے دونوں ریوالور بھی زاہد کے سپرد کر دیئے، پھر جانکی پرشاد کی طرف بڑھی۔ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر غالباً جانکی پرشاد نے میرا ارادہ بھانپ لیا اور ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔

''مجھے معاف کر دو عذرا خان! مجھ سے غلطی ہوگئی۔''

''اور تمہیں اس غلطی کی سزا بہرحال بھگتنا پڑے گی!'' یہ کہہ کر میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

مجھے اذیت دینے کے بہت سے ایسے طریقے معلوم ہیں کہ آدمی اپنے ہوش وحواس میں بھی رہے۔ سو میں نے انہی طریقوں پر عمل کرتے ہوئے جانکی پرشاد پر اپنا غصہ اتار دیا۔ کمرا اس کی چیخوں سے گونجتا رہا اور میں اسے زدوکوب کرتی رہی۔ میں اسے اس طرح مار رہی تھی کہ چوٹ کا کوئی نشان اس کے چہرے یا جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر نظر نہ آئے۔

جب میرا غصہ قدرے کم ہوا تو میں نے اسے ایک کرسی پر دھکیل دیا اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پھر میں ان دونوں غنڈوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

ان دونوں کی کلائیوں سے خاصا خون بہہ چکا تھا جس کی وجہ سے ان کے چہروں پر نقاہت نظر آ رہی تھی۔ اب وہ فرش سے اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔

''ہاں، اب تم لوگ کہو، کیا چاہتے ہو؟'' میں نے ان دونوں کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم...... ہمیں جا...... جانے دیں ہمیں!...... ہم بہت شرمندہ ہیں۔'' ان میں سے ایک بولا جس کے دائیں رخسار پر زخم کا لمبا نشان تھا۔

''کیا تم اس لئے شرمندہ ہو کہ ایک عورت پر قابو نہ پا سکے؟'' میں نے طنز کیا۔ ''کل رات کا حساب نہیں چکاؤ گے؟''

''نن...... نہیں!'' وہ کراہتے ہوئے جواباً بولا، پھر کہا۔ ''ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ کا تعلق بھی ہمارے طبقے سے ہے ورنہ...... ورنہ کبھی ہم...... آپ کے مقابلے پر آنے کی ہمت نہ کرتے۔''

مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آنے لگی۔ وہ اپنی طرح میرے متعلق بھی یہ سمجھا تھا کہ میں بھی اس کی طرح جرائم پیشہ ہوں۔ میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنا ضروری نہ سمجھا۔ مجھے علم تھا کہ ان دونوں کو فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔ ایسی حالت میں انہیں وہاں مزید رکنے پر مجبور کرنا بے رحمی کے مترادف ہے۔

''تم لوگ جا سکتے ہو!'' میں نے انہیں جانے کی اجازت دے دی، پھر مزید کہا۔ ''غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب تم لوگ اس معاملے سے دور ہی رہو گے!...... ہاں ٹھہرو، یہ اپنے خطرناک کھلونے بھی لیتے جاؤ، مجھے ان کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے زاہد سے ان دونوں کے ریوالور لے لئے اور خالی کر کے ان دونوں کو دے دیئے۔

''اس سے پہلے ہماری آپ سے...... ملاقات نہیں ہوئی، شاید آپ...... آپ کا تعلق کسی اور

شہر سے ہے۔'' زخمی غنڈوں میں سے ایک نے کہا۔

''اس چکر میں نہ پڑو کہ میں کہاں کی ہوں، کہاں کی نہیں!'' یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھی۔

دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے چٹخنی کھول دی اور پھر انہیں باہر نکل جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں میری طرف حیرت زدہ سی نظروں سے دیکھتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ انہیں شاید توقع نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی سے ان کی جان چھوڑ دوں گی کیوں کہ وہ میرے ہاتھوں جانکی پرشاد کا حشر دیکھ چکے تھے۔ وہ چلے گئے تو میں نے دوبارہ دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

''جانکی پرشاد! جہاں تک میرا اندازہ ہے تم نے آج رات دہلی جانے والی فلائٹ کے ٹکٹ نہیں لئے ہوں گے!'' میں قدم قدم چلتی ہوئی جانکی پرشاد کے قریب پہنچ گئی۔ اب اس کی حالت کسی قدر سنبھل چکی تھی۔ وہ خاموش رہا تو میں پھر سخت لہجے میں بولی۔ ''بولو! خاموش رہنے سے کام نہیں چلے گا! اگر تم کچھ نہ بولے تو میں دوبارہ تمہاری خاطر مدارات شروع کر دوں گی!'' آخری الفاظ میں دھمکی تھی اور میری آواز میں بھی مزید سختی آ گئی تھی۔

''نن...... نہیں!'' وہ خوف زدہ سی آواز میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''تو پھر میں جو کچھ پوچھ رہی ہوں، شرافت سے بتا دو!'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

پھر بھرائی ہوئی آواز میں اس نے میری بات کی تصدیق کر دی، پھر مزید بتایا، ان غنڈوں سے اس نے یہ سودے بازی کی تھی کہ وہ مجھ سے ذکیہ کا پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات حاصل کر کے اسے دے دیں گے اور مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس نئے سودے کے تحت ان غنڈوں نے جانکی پرشاد سے مزید دس ہزار روپے اینٹھ لئے تھے۔

''تم سے بڑے سرمایہ دار کے لئے اب تک خرچ ہونے والی رقم کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔'' میں اس کی روداد سن کر بولی، پھر کہا۔ ''بہرحال اب میں کوئی معاملہ تمہارے اوپر چھوڑنا نہیں چاہتی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر تمہیں میرے ساتھ تیار ہو کر یہاں سے چلنا ہے!'' میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''مم...... مگر کہاں؟...... تم مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہو؟'' اس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔ ''اور...... اور یہ کس طرح ہو سکتا ہے!''

''میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔'' میں درشت لہجے میں بولی۔ ''میں نے جو کچھ کہا ہے، وہی ہوگا!''

''لیکن یہ...... یہ کوٹھی میں نے جس سے کرائے پر لی تھی، ابھی تو اس...... اس سے بھی بات کرنا ہے اور...... اور کرائے کی کار بھی......''

''سب کچھ آج ہی رات ہوگا!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''میں جو کچھ کہتی جاؤں، تم اس پر عمل کرتے جاؤ!''

''ٹھ...... ٹھیک ہے، مجھے...... مجھے منظور ہے۔'' اس نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔

''مگر آدھے...... آدھا گھنٹہ بہت کم ہے۔''

"ہم بھی تمہاری مدد کرائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور پھر یہاں ایک ملازم بھی تو ہے!"

پھر سامان کی پیکنگ اور کوٹھی میں تالا ڈال کر وہاں سے روانگی میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ دو بڑے سوٹ کیس، ایک بڑا ایئر بیگ اور ایک بستر بند پر جانکی پرشاد کا سامان مشتمل تھا۔ اس کے باوجود بہت سا سامان اسے اپنے ملازم کو دینا پڑا تھا اور کچھ سامان اس نے مجبوراً کوٹھی ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے ملازم کا حساب بھی کر دیا تھا۔ کرائے کی کار میں اس کا اور میرا تمام سامان رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے کار کی واپسی کا سب سے آخر میں فیصلہ کیا تھا۔

جانکی پرشاد نے جس شخص سے کوٹھی کرائے پر لی تھی، اس کا قیام بھی وہیں ٹالی گنج میں تھا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں بیٹھی۔ جانکی پرشاد کی رہنمائی میں بہت جلد ہم کوٹھی کے مالک کے گھر تک پہنچ گئے۔ فوری طور پر کوٹھی خالی کرنے پر اس نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔ جواباً جانکی پرشاد نے دہلی میں ایک ضروری کام کا بہانہ کر دیا تھا۔ کوٹھی کے مالک کو چابی دے کر اور اس کا حساب صاف کرنے کے بعد میں نے کار کا رخ دھرم تلے کی طرف کر لیا۔

دھرم تلے میں انڈین ایئر لائن کے آفس پہنچ کر سب سے پہلے میں نے زاہد کا ٹکٹ واپس کیا جو اسی رات کی ایک فلائٹ کا تھا۔ کچھ رقم کاٹ کر بقیہ رقم مجھے واپس مل گئی۔ دوسرے دن صبح دہلی جانے والی ایک فلائٹ کے تین ٹکٹ، جانکی پرشاد نے میرے ایما پر حاصل کئے۔ پھر جب ہم ٹکٹ لے کر لوٹ رہے تھے تو کار میں بیٹھنے کے بعد اپنے اور زاہد کے ٹکٹ کی رقم میں نے جانکی پرشاد کو دینا چاہی، مگر اصرار کے باوجود اس نے رقم نہیں لی۔ دھرم تلے ہی میں اس کمپنی کا دفتر بھی تھا جس سے جانکی پرشاد نے کرائے پر کار حاصل کی تھی، مگر پہلے میں نے چاندنی کے علاقے میں ایک اوسط درجے کے ہوٹل کا رخ کیا۔ وہاں رات بھر کے لئے کمرے حاصل کرنے میں کوئی قباحت پیش نہ آئی۔ میں نے ایک، ڈبل بیڈ روم اور ایک سنگل روم حاصل کیا تھا۔ سنگل روم میں جانکی پرشاد کا سامان رکھوا کر اپنا اور زاہد کا سامان میں نے ڈبل روم میں رکھوایا۔ پھر میں، زاہد کو وہیں ہوٹل میں چھوڑ کر جانکی پرشاد کے ساتھ کار واپس کرنے چلی گئی۔

اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے دس بجنے والے تھے جب میں جانکی پرشاد کے ساتھ ہوٹل کی طرف ایک ٹیکسی میں واپس آ رہی تھی۔ کرائے کی کار واپس کر دی گئی تھی۔

واپس ہوٹل پہنچ کر ہم نے ساتھ ہی کھانا کھایا، پھر اپنے کمروں کا رخ کیا۔ جانکی پرشاد کے کمرے کو میں نے احتیاطاً باہر سے مقفل کر دیا اور خود اسے بھی اس بات سے بے خبر نہیں رکھا تھا۔ میں اب کوئی رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔

زاہد کو ساتھ لئے میں جب ڈبل بیڈ روم میں داخل ہوئی تو خاصی دیر کے بعد وہ چہکنے لگا۔

"کچھ دن پہلے میں نے ایک بہت پرانی فلم دیکھی تھی، اس فلم کا نام ہنٹر والی تھا۔ آپ ہو بہو مجھے وہی ہنٹر والی ہیروئن معلوم ہو رہی ہیں، مار دھاڑ سے بھرپور حسینہ!"

میں ہنس پڑی، پھر بولی۔ "میں تو خیر جو بھی لگ رہی ہوں، مگر تم ہرگز ہیرو نہیں لگ رہے!"

"وہ کیوں؟...... بالکل ہیرو ہوں میں!" وہ اکڑ کر بولا۔

"اب سے کچھ دیر پہلے تک تمہاری سٹی گم تھی، اب کوئی خطرہ نہیں رہا تو تم چہکے ہو!"

"میری سٹی مجھے واپس مل چکی ہے محترم خاتون!...... مگر......" وہ کچھ کہتے کہتے سنجیدہ ہو گیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "آپ ہیں واقعی حیرت انگیز خاتون! آپ کو دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اندر سے اتنی نڈر ہوں گی! اس وقت جب میں نے خود کو کئی مسلح افراد کے نرغے میں محسوس کیا تھا تو واقعی میرے حواس گم ہو گئے تھے۔"

"چلو تمہیں اعتراف تو ہے اس کا!" میں نے ہنس کر کہا۔ "ورنہ مرد حضرات عموماً موقع پر شیخی بھارنے سے باز نہیں آتے۔"

"مگر ہر عورت بھی تو آپ کی طرح نہیں ہوتی کہ سامنے موت کھڑی ہے اور سکون و اطمینان سے ڈائیلاگ بولے جا رہے ہیں!"

"دراصل ایسے مواقع پر حواس کھو دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر آدمی اپنے حواس برقرار رکھے تو خراب سے خراب اور خطرناک صورتحال میں بھی اپنے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال سکتا ہے، مگر اس کے لئے خاصی ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ کاش مجھے آپ کے ساتھ رہنے کا موقع مل جاتا! میرے خیال میں آپ سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ آپ کا نشانہ بھی کمال کا ہے۔ الٹے ہاتھ سے اس طرح صحیح نشانہ لینا میرے لئے انتہائی حیرت کی بات ہے۔" اس نے مزید کہا۔

"یہ بھی تربیت اور مشق کی بات ہے۔ تم بھی چاہو تو ایسا کر سکتے ہو، یہ کوئی ناممکن بات نہیں۔"

"مجھے تو ریوالور چلانا بھی نہیں آتا، نشانہ لینا تو الگ رہا خاتون!" وہ مسکرایا۔ "ہاں زبان ضرور چلا سکتا ہوں۔"

"اور صرف زبان چلانے سے ہر جگہ کام نہیں چلتا۔" میں ہنس کر بولی۔ "بلکہ بعض مواقع پر تو زبان بھی گنگ ہو جاتی ہے۔"

"خیر اب تو جیون بھر آپ کا ساتھ رہے گا، سب کچھ سیکھ جاؤں گا!" وہ شرارت پر اتر آیا۔

"میرے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے باوجود بھی تمہارے دماغ سے یہ خناس نہیں نکلا؟" میں اپنا سوٹ کیس کھولتے ہوئے بولی۔ اس میں سے میں رات کو پہننے کے لئے کپڑے نکالنا چاہتی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ "تم نے اس وقت جانکی پرشاد کی حالت دیکھی تھی جب میں اس کی ٹھکائی لگا رہی تھی؟"

"وہ ہولناک منظر یاد دلا کر آپ مجھے ہرگز خوف زدہ نہیں کر سکتیں! آپ سے مجھے ہرگز ایسی کوئی توقع نہیں کہ اپنے ہونے والے سرتاج کے ساتھ ایسا سلوک کریں گی۔"

"مگر میرے ہونے والے پیارے سرتاج بلکہ خود ساختہ سرتاج، اگر کبھی کوئی ایسی صورت حال پیش آ گئی جیسی آج سامنے آئی تو تم کیا کرو گے؟"

"صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں نہیں، میری بیوی بہادر ہے!" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"اور ایسا کہتے ہوئے تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئے گی؟"

"آئے گی تو مگر کیا کیا جا سکتا ہے! آپ ایسی خاتون سے شادی کر کے مجھے ہر طرح کا تحفظ

حاصل ہو جائے گا۔''

''زندہ باد!'' میں ہنس دی۔ ''آج تک تو عورتیں تحفظ حاصل کرتی آئی تھیں، اب مرد بھی یہ خواہش کرنے لگے!''

''زمانہ بھی تو بہت بدل گیا ہے خاتون! اب اگر عورتیں پچھلا قرض اتارنے لگیں تو کیا مضائقہ ہے۔ ایک عمر مردوں نے عورتوں کو تحفظ فراہم کیا ہے۔ اب عورتوں کی باری سہی!''

''اس سے اچھا تو یہ ہے کہ مرد چوڑیاں پہن لیں۔'' میں نے اسے تپانے کی خاطر کہا۔

''دیکھئے خاتون، میرا اور دوسرے مردوں کا معاملہ قطعی مختلف ہے۔ یوں بھی آپ مجھ سے عمر میں بڑی ہیں کئی سال اگر......''

''اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ!'' میں نے سوٹ کیس سے ایک جوڑا نکال کر سوٹ کیس کو بند کرتے ہوئے کہا۔ ''صبح جلدی جاگنا ہے، سونے کی تیاری کرو اب!'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں ابھی باتھ روم سے لباس تبدیل کر کے آتی ہوں، اتنے میں تم بھی کپڑے وغیرہ نکال لو۔''

جواباً اس نے ٹھنڈا سانس بھرا، پھر بولا۔ ''ویسے ابھی سونے کے لئے بالکل دل نہیں چاہ رہا مگر میں آپ کا حکم مان کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے جیون ساتھی بنا کر آپ فائدے ہی میں رہیں گی۔ میں ایک فرماں بردار شوہر ثابت ہوں گا۔''

میں اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ پھر جب کچھ دیر بعد میں لباس تبدیل کر کے باہر نکلی تو وہ بھی شب خواب کا [illegible] اپنے سوٹ کیس سے نکال چکا تھا۔

''اب آپ تشریف لے جایئے!'' میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

''وہ تو خیر میں تشریف لے ہی جا رہا ہوں، میں تو دراصل یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ بعض جسموں پر ہر لباس اتنا حسین کیوں لگتا ہے! کچھ بھی پہن لیں، حسن اور......''

''بس بس!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ بولنے سے روک دیا۔ ''تمہاری تعریف کا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں جو اپنے حسن کی تعریف سن کر......''

''پہلے تو شرما جاتی ہیں، پھر شرما کر سر جھکا لیتی ہیں۔'' زاہد نے اپنی دانست میں میرا جملہ پورا کردیا۔ ''آپ شاید تعریف پروف واقع ہوئی ہیں۔''

''جی ہاں، بالکل!'' میں بولی۔ ''اب تم مزید دماغ چاٹنے سے باز آؤ گے یا نہیں!'' میں نے اسے سخت نظروں سے دیکھا۔

''اب اس طرح بھی نہ دیکھیں کہ خوف آنے لگے۔ شاید کسی ایسے ہی موقع کے لئے ایک شاعر نے......''

''میں ہرگز شعر نہیں سنوں گی!'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

''ہائے کیا زمانہ آگیا ہے! میر اور غالب کی روحیں اپنے مرقدوں میں کیا کیا نہ تڑپتی ہوں گی!'' یہ کہتا ہوا وہ باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی میں نے جانکی پرشاد کے کمرے کا تالا کھول دیا۔ پھر میں نے دستک

دے کر دروازہ کھلوایا۔ وہ اس وقت تک سویا ہی ہوا تھا۔

''جلدی سے نہا دھو کر تیار ہو جاؤ! وقت کم ہے۔'' میں نے اسے تاکید کی اور پھر اپنے کمرے میں آ کر زاہد کو جگا دیا۔

''ہائے کیا غضب کردیا آپ نے!'' وہ جماہی لیتے ہوئے بولا۔ ''بس کچھ دیر اور رک گئی ہوتیں تو قاضی جی نکاح پڑھا چکے ہوتے، میرا اور آپ کا! پھر اس کے بعد......''

''فضول باتیں نہیں!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جلدی سے اٹھ جاؤ!'' یہ کہہ کر میں نے تولیا اور ایک ساری، سوٹ کیس سے نکال لی۔

''شکریہ!'' زاہد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کس بات کا شکریہ ادا کر رہے ہو؟'' میں نے باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''ساری کے انتخاب کا!'' وہ بولا۔ ''ساری باندھ کر تو آپ بس غضب ڈھانے لگتی ہیں۔ آپ کے دراز قد پر ساری بہت اچھی لگتی ہے۔''

''تمہیں فضول باتوں کے سوا کچھ نہیں آتا۔'' میں بڑبڑاتی ہوئی باتھ روم میں داخل ہوگئی۔

پھر ہوٹل سے روانگی میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ہم مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی ایئر پورٹ پہنچ گئے۔

ضروری کارروائیوں سے گزر کر ہم جلد ہی جہاز میں سوار ہوگئے۔ میری دائیں جانب زاہد اور بائیں طرف جانکی پرشاد بیٹھا تھا۔ میں دانستہ ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی۔

''معلوم نہیں یہ رقیب روسیاہ ہمارے درمیان کہاں سے آٹپکا!'' زاہد ترچھی نظروں سے جانکی پرشاد کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

''درمیان میں تو میں ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ رقیب روسیاہ سے اگر تمہاری مراد جانکی پرشاد سے ہے، تو وہ تم سے دور بیٹھا ہے۔''

''مگر آپ سے تو قربت ہے! آپ نے کسی سے عشق کیا ہوتو جانیں کہ اپنے محبوب کے قریب کسی کو دیکھ کر دل ناتواں پر کیا گزرتی ہے!'' یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

اسی وقت جہاز کے پرواز کرنے کا اعلان ہوا اور اسی کے ساتھ مسافروں سے بیلٹ باندھنے کی درخواست کی گئی۔

کچھ ہی دیر کے بعد جہاز ڈم ڈم ایئر پورٹ سے پرواز کرگیا۔

سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ زاہد کی دلچسپ اور شرارت آمیز باتوں میں معلوم ہی نہ ہوا کہ وقت کس طرح گزر گیا! اس دوران میں جانکی پرشاد سے میں دو ایک بار ہی مخاطب ہوئی تھی، وہ بھی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ دہلی میں اس کا قیام کہاں ہے! اس نے بتایا تھا کہ قرول باغ میں اس کی کوٹھی ہے۔

پالم کے ہوائی اڈے سے ہم ایک ٹیکسی میں قرول باغ روانہ ہوگئے۔ دہلی کو میں اپنے خوابوں کا شہر کہتی ہوں کیوں کہ میرا بچپن یہیں گزرا ہے۔ ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے میں جیسے بہت دور نکل گئی۔ مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا تھا۔ معلوم نہیں زاہد نے کیسے میری محویت محسوس کرلی اور بول اٹھا۔ ''میرا

خیال ہے خاتون کہ آپ واپس آجائیں۔''

میں چونک اٹھی اور کچھ خجالت سی محسوس کرنے لگی۔ ''کیا بات ہے؟'' میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ میرے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھا تھا اور جانکی پرشاد ٹیکسی ڈرائیور کی رہنمائی کے لئے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔

''بب...... بات تو کچھ بھی نہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''میں دراصل یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ہمارا قیام دہلی میں کہاں ہوگا؟'' اس نے بات بنائی۔

''تم ابھی کہہ رہے تھے کہ کوئی بات نہیں اور پھر دوسرے ہی لمحے دہلی میں قیام کے بارے میں پوچھنے لگے!'' میں منہ بنا کر بولی، پھر کہا۔ ''ابھی کچھ طے نہیں۔ پہلے تو ہمیں ذکیہ سے ملنا ہے، اس کے بعد ہی کچھ سوچا جائے گا۔'' میں نے دانستہ لفظ ''ملنا'' استعمال کیا تھا حالانکہ یہاں مسئلہ ذکیہ کی بازیابی کا تھا، ملاقات کا نہیں۔ میری اس احتیاط کا سبب ٹیکسی ڈرائیور تھا۔

زاہد شاید سمجھ گیا کہ میں اس موضوع پر فی الحال بات کرنا نہیں چاہتی اس لئے وہ مزید کچھ نہ بولا اور اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ٹیکسی جب قرول باغ کی حدود میں داخل ہوئی اور جانکی پرشاد ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت دینے لگا تو میں چوکنا ہو کر بیٹھ گئی۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ذکیہ کی بازیابی میں اب زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔

ایک بڑی سی کوٹھی کے گیٹ پر جانکی پرشاد نے ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور سے ہارن بجانے کو کہا۔ ذرا ہی دیر بعد کوٹھی کے ذیلی پھاٹک سے ایک مسلح چوکیدار باہر آیا۔ وہ گورکھا تھا۔ جانکی پرشاد پر نظر پڑتے ہی اس نے فوجی انداز میں اسے سلیوٹ کیا۔ وہ بوڑھا مجھے ریٹائرڈ فوجی ہی لگا۔ اس نے کوٹھی کا گیٹ کھولنے میں زیادہ دیر نہیں کی تھی۔ ٹیکسی گیٹ سے گزر کر اندرونی عمارت کی جانب بڑھی۔ ٹیکسی کے اندر داخل ہوتے ہی مستعد گورکھا چوکیدار نے پھاٹک بند کر دیا تھا۔

ٹیکسی عمارت کے قریب رکی اور جانکی پرشاد اس سے اتر گیا۔ اس نے اترتے ہی اپنے کئی ملازمین کو نام لے کر پکارا۔ پھر ذرا سی دیر میں ٹیکسی کے گرد ملازمین کی بھیڑ سی لگ گئی اور وہ سامان اتارنے لگے۔ اس دوران میں جانکی پرشاد نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کر دیا۔ میں اور زاہد بھی ٹیکسی سے اتر کر جانکی پرشاد کے قریب کھڑے ہو گئے تھے۔

''کوٹھی میں تمہارے علاوہ اور کون رہتا ہے؟'' میں نے جانکی پرشاد سے پوچھا۔

''میری ایک ودھوا موسی (بیوہ پھوپھی) اور ان کے بچوں کے علاوہ میری چھوٹی بہن پدمنی یہاں رہتی ہے۔ پدمنی کی ابھی شادی نہیں کی میں نے!'' اس نے جواب دیا، پھر کہنے لگا۔ ''آپ دونوں میرے ساتھ آیئے، ملازمین سامان لے آئیں گے اندر!''

''چلو!'' میں نے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔ پھر زاہد کا ہاتھ تھامے اس کے ساتھ چلنے لگی۔

برآمدے سے گزر کر ابھی ہم صدر دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے کہ اچانک میری

سماعت سے ایک تیز نسوانی چیخ ٹکرائی اور میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ چیخ اس عمارت کے ایک حصے ہی سے سنائی دی تھی۔ ابھی میں، جانکی پرشاد سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ نہ جانے کدھر سے ایک وحشت زدہ سی نوجوان لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور ''بھیا'' کہہ کر جانکی پرشاد سے چپٹ گئی۔ ہم بھی رک گئے۔

''کیا ہوا پدمنی؟''...... تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟'' جانکی پرشاد نے اس لڑکی کی پشت پر تھپکی دیتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

''بھیا! وہ...... وہ آپ کا بنگالی دوست...... وہ......'' لڑکی جو جانکی پرشاد کی بہن تھی سسک اٹھی اور اپنی بات پوری نہ کر سکی۔

''ہاں ہاں کہو، کیا بات ہے؟ کیا کیا اس نے؟'' جانکی پرشاد نے اپنی بہن سے پوچھا۔

''وہ جس عورت کو اپنے ساتھ لایا تھا، کل سے اسے نہ جانے کیا...... اذیب دے رہا ہے بھیا!...... کل ساری رات بھی ہم نہیں سو پائے۔ موسی بھی رات بھر جاگتی رہیں۔'' پدمنی جلدی جلدی بتا رہی تھی اور اس کی بات سن کر میرا خون کھول رہا تھا۔ ''کل رات کئی دفعہ ہم نے اس عورت کی چیخیں سنیں۔ آج...... آج صبح موسی نے اسے بلا کر پوچھا تو وہ بولا کہ وہ...... وہ عورت نیم پاگل ہے۔ میں بھی اس وقت موسی کے پاس تھی۔ وہ...... اس کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بھیا! اس نے موسی سے بھی کہا تھا کہ وہ...... وہ عورت...... اس عورت سے آپ نے شادی کر لی ہے۔ بولیں بھیا، وہ جھوٹ بول رہا تھا نا!''

میری قوت برداشت اب جواب دے چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ جانکی پرشاد، پدمنی کی بات کا کوئی جواب دیتا، میں بول اٹھی۔ ''پدمنی! مجھے وہاں لے چلو!''

پدمنی نے چونک کر پہلی بار میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یقیناً اس کی وجہ ذکیہ اور میرے چہرے کی مشابہت تھی۔

''ہاں چلو پدمنی!'' جانکی پرشاد نے پدمنی کو خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دونوں شاید مہمان خانے میں ہیں!''

''جی...... جی ہاں بھیا! وہ...... وہیں۔'' پدمنی جواباً بولی۔

''جلدی وہاں چلو جانکی!'' میرے لہجے میں تختی آ گئی۔

''تم موسی کے پاس جاؤ پدمنی!'' جانکی پرشاد میرے ساتھ ایک طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی وہیں آ رہا ہوں۔''

''ٹھیک...... ٹھیک ہے بھیا! میں...... میں تو خود وہاں جانا نہیں چاہتی، مجھے آپ کے بنگالی دوست سے ڈر لگتا ہے۔'' وہ کہتی ہوئی پدمنی دائیں جانب ایک راہداری میں مڑ گئی۔

''معلوم نہیں یہ کم بخت دھرم ویر کہاں ہے!'' جانکی پرشاد میرے ساتھ چلتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

دھرم ویر کا نام میں نے اس کی زبان سے کلکتے میں بھی سنا تھا۔ یہ شخص جانکی پرشاد کے بااعتماد ملازمین میں سے ایک تھا اور اسی کو جانکی پرشاد نے کلکتے سے اپنے بنگالی دوست ہرنارائن چڑجی اور ذکیہ

کے ساتھ گزشتہ روز دہلی بھیجا تھا۔

مختلف راہداریوں سے گزار کر جانکی پرشاد مجھے اور زاہد کو عمارت کے اس حصے میں لے آیا جو بقیہ عمارت سے نسبتاً الگ تھلگ تھا۔ یہ حصہ بھی کئی کمروں پر مشتمل تھا۔ دائیں جانب ایک کمرے کی کھڑکی مجھے کھلی ہوئی نظر آئی۔ اس کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ میں جیسے ہی کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب پہنچی مجھے کمرے کا عجیب منظر نظر آیا اور میرے قدم جیسے خود بہ خود رک گئے۔ سامنے ہی مجھے ایک آرام کرسی پر ذکیہ نیم دراز دکھائی دی۔ وہ بے حس و حرکت آنکھیں کھولے اپنے سامنے کھڑے ہوئے ایک پستہ قد شخص کی طرف پلک جھپکائے بغیر دیکھے جا رہی تھی۔ پستہ قد شخص کی پشت کھڑکی کی طرف تھی۔ آرام کرسی کے قریب ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی کھڑا تھا جو اپنے لباس سے کوئی ملازم معلوم ہو رہا تھا۔

معاً میں نے پستہ قد شخص کو کچھ بڑبڑاتے سنا۔ اس کی آواز دھیمی تھی اس لئے میں یہ نہ سمجھ سکی کہ اس نے کیا کہا تھا۔

جواباً ذکیہ کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی اور پھر وہ ایک دم چیخ اٹھی۔ ''نہیں!''

''تمہیں سب کچھ بھولنا پڑے گا...... بھولنا پڑے گا۔'' پستہ قد شخص کی آواز اس بار نسبتاً واضح تھی۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پستہ قد شخص کون ہو سکتا ہے اور وہ اس وقت کیا کھیل کھیل رہا تھا۔ یقیناً وہ ذکیہ کو ہپناٹائز کر کے اس کے ذہن سے ماضی کی ہر یاد کو کھرچ دینا چاہتا تھا اور ذکیہ کا ذہن مدافعت کر رہا تھا۔

''اپنا یہ کھیل بند کر دو ہرنارائن چٹرجی!'' میں بے اختیار چیخ اٹھی۔

پستہ قد شخص میری آواز سن کر اچھل پڑا اور پھر اس نے مڑ کر دیکھا۔ اسی کے ساتھ ذکیہ کے جسم کو جھٹکا سا لگا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ یقیناً تنویمی عمل برقرار نہ رہنے کے سبب بے ہوش ہو گئی تھی۔

''کون ہو تم؟'' وہ غصے سے بولا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''ابھی بتاتی ہوں میں تمہیں کہ کون ہوں!'' میں اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکی اور ایک ہی جست میں کھڑکی کے ذریعے کمرے میں پہنچ گئی۔ اسی دوران میں زاہد اور جانکی پرشاد دروازے کے ذریعے کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

''ارے تم...... تم جانکی!...... تم کب آئے؟ اور تمہارے ساتھ یہ کرشنا کماری کی ہم شکل......''

ہرنارائن چٹرجی کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی میں اس پر کسی عقاب کی طرح جھپٹ پڑی تھی۔ میرے نزدیک ذکیہ کے معاملے میں اصل مجرم وہی تھا۔ جانکی پرشاد سے کہیں زیادہ یہ شخص قصوروار تھا جس نے اپنے ذہن کی غیر معمولی قوتوں کو کام میں لا کر ذکیہ کو قطعی بے بس کر دیا تھا۔ میری کھڑی ہتھیلی اس کے شانے پر پڑی تو وہ چیخ اٹھا۔ میں نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میری پہلی ٹھوکر اس کی دائیں پنڈلی پر پڑی تھی اور وہ چیختا ہوا بیٹھ گیا تھا، پھر دوسری ٹھوکر سر پر پڑی تھی جس سے یقیناً اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے!''

ہرنارائن چٹرجی کو زدوکوب کر کے میرے دل کی کچھ بھڑاس نکل گئی تو میں رک گئی۔ وہ میرے قدموں میں پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔

''اٹھ کر کھڑا ہو جا!'' میں نے اسے حکم دیا۔

جانکی پرشاد نے اس دوران میں ذرا بھی مداخلت نہیں کی تھی۔ ذکیہ کے قریب کھڑا ہوا اس کا ادھیڑ عمر ملازم بھی اپنی جگہ کسی بت کی طرح ایستادہ رہا تھا۔ میرے حکم پر نارائن چٹرجی ہانپتا کانپتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں تجھ سے جو کچھ پوچھ رہی ہوں، مجھے اس کا صحیح جواب چاہئے ورنہ میں تیری کھال ادھیڑ دوں گی!'' میں نے ہرنارائن چٹرجی کو مخاطب کیا، پھر میں نے ذکیہ کی ذہنی حالت کے بارے میں سوال کیا۔ ''بتا کہ تو نے اس کے ذہن کو کس حد تک مفلوج کر دیا ہے؟''

''ابھی...... مجھے چوتھائی حد تک کامیابی ہوئی تھی۔ یہ ابھی...... ابھی صرف اپنا نام بھول سکی ہے اور...... اور یہ کہ کہاں کی رہنے والی ہے!'' ہرنارائن چٹرجی نے رک رک کر بتایا، پھر خود ہی کہنے لگا۔ ''تم...... تم شاید اس کی بڑی بہن عذرا خان ہو!...... اس نے تمہارے متعلق بھی بہت کچھ بتایا تھا، مگر...... مگر تم تو......''

''ہاں میں پاکستان میں تھی۔ تم شاید یہی کہنا چاہتے ہو...... تو سنو کہ مجھے یہاں تمہاری موت کھینچ لائی ہے۔ تم نے دولت کے لالچ میں آ کر میری بہن کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کی سزا موت سے کم نہیں ہو سکتی! مگر تمہاری موت آسان نہیں ہوگی ہرنارائن......'' معاً میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور میری بات ادھوری ہی رہ گئی۔ ہرنارائن چٹرجی سے بات کرتے ہوئے میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ مجھے اس سے نظریں نہیں ملانا چاہئیں۔ اس طرح وہ مجھے بھی ہپناٹائز کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

''عذرا خان!'' وہ مجھ سے نظریں ملاتے ہوئے بولا۔ ''تم اب وہی کرو گی، میں تمہیں جس کا حکم دوں گا۔ تمہیں نیند آ رہی ہے...... تم سو رہی ہو!''

ہرنارائن چٹرجی اس بات سے یقیناً آگاہ نہیں تھا کہ میں خود ایک غیر معمولی ذہن کی مالک ہوں۔ وہ بس چند ہی لمحے تھے کہ میں اس کے زیر اثر آ گئی تھی۔ ان ابتدائی چند لمحات کے گزرتے ہی میں نے اپنے ذہن کو اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا اور پھر زور سے ہنس پڑی۔

''احمق آدمی! تم پر میرا جادو نہیں چلے گا۔'' میں نے اس کا مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنس کر کہا۔ ''میں ذکیہ نہیں عذرا خان ہوں!''

میری بات کے ردعمل میں اس کے چہرے پر وحشت سی برسنے لگی۔ معلوم نہیں وہ زیر لب کیا بڑبڑانے لگا تھا!

''جانکی پرشاد! یہ ادھیڑ عمر ملازم شاید وہی ہے جس کا نام مجھے تم نے دھرم ویر بتایا تھا!'' میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

''جی...... جی ہاں، یہ وہی ہے۔'' جانکی پرشاد جواباً بولا۔

پھر میں نے براہ راست دھرم ویر کو مخاطب کر کے اس سے گزشتہ روز سے اب تک کی روداد

جاننا چاہی۔ اس نے اجازت طلب نظروں سے جانکی پرشاد کی طرف دیکھا۔ پھر جب جانکی پرشاد نے اسے بولنے کی اجازت دے دی تو اس نے بتایا کہ میں نے گزشتہ روز سے اب تک چٹرجی بابو کو اکیلا نہیں چھوڑا۔ انہوں نے کئی بار چاہا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں مگر مجھے اپنے مالک کی ہدایات یاد تھیں۔ اسی وجہ سے میں نے چٹرجی بابو سے نظریں بھی نہیں ملائیں۔ مالک نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔ اسی وجہ سے میں، چٹرجی بابو کے جادو سے بچا رہا۔ کل سے اب تک انہوں نے کرشنا بی بی پر اسی طرح کئی بار عمل کیا اور میں یہیں موجود رہا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اس طرح کرشنا بی بی کا علاج کر رہے ہیں۔ میں نے ایک بار کہا بھی کہ مالک آجائیں تو آپ علاج شروع کر دیجیے گا پر یہ نہیں مانے۔

دھرم ویر کے بیان کی روشنی میں مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ ذکیہ کی طرف سے ہرنارائن چٹرجی کی نیت صاف نہیں تھی۔ جانکی پرشاد نے اس پر بلا سبب شبہ نہیں کیا تھا۔ یہ جاننے کے بعد ایک بار پھر مجھے شدید غصہ آگیا۔ نتیجتاً ہرنارائن چٹرجی کو دوبارہ میرے ہاتھوں پٹنا پڑا۔ اس بار وہ اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ میرے ایما پر اسے وہیں مسہری پر ڈال دیا گیا۔

"ہاں چٹرجی بابو، اب تمہارا دماغ کچھ درست ہوا؟" میں مسہری کے قریب جا کر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی، پھر کہا۔ "میں ایک شرط پر تمہاری جاں بخشی کر سکتی ہوں کہ تم ذکیہ کو پھر اس کی سابقہ حالت میں واپس لے آؤ۔ بولو مرنا چاہتے ہو یا تمہیں میری بات منظور ہے؟"

اس میں اب اتنا دم خم نہیں رہا تھا کہ انکار کر سکتا۔

"کتنے دن لگیں گے اس میں؟" میں نے دریافت کیا۔

"فی الحال یقینی طور پر..... میں کچھ..... کچھ کہہ نہیں سکتا۔" وہ رک رک کر کہنے لگا۔ "دو تین روز میں بھی یہ کام ہو سکتا ہے اور..... ہفتہ..... ہفتہ بھر بھی لگ سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے طویل سانس لیا، پھر جانکی پرشاد سے مخاطب ہوئی۔ "سنو! جب تک ذکیہ کی حالت معمول پر نہیں آجاتی، ہم یہیں رہیں گے اور اس شخص کی حیثیت....." میں نے ہرنارائن چٹرجی کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہارے اس عیار دوست کی حیثیت اس دوران میں ایک قیدی کی سی ہوگی۔ اگر اس عرصے میں یہ شخص یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تو پھر تمہاری خیریت نہیں ہوگی! سمجھ گئے؟"

"بالکل سمجھ گیا عذرا جی!" جانکی پرشاد فوراً بول اٹھا۔ "میں اسے ابھی کوٹھی کے تہ خانے میں بند کرائے دیتا ہوں تاکہ یہ یہاں سے نہ بھاگ سکے۔"

"تم اس سلسلے میں جو چاہے کرو، میں نے بہرحال اپنا مقصد بیان کر دیا۔ ہمارا سامان اپنے ملازمین سے یہیں بھجوا دو!" میں نے کہا۔

پھر عمارت کے اسی حصے کا ایک کمرا ہمارے لئے صاف کرا دیا گیا۔ ہمارا سامان بھی وہیں منگوا دیا گیا تھا۔ اپنے ملازمین کے ذریعے جانکی پرشاد، زخمی ہرنارائن چٹرجی کو وہاں سے اٹھوا کر لے گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ میرے ساتھ کسی بھی قسم کا دھوکا نہیں کرے گا۔ مجھے دھوکا دینے کا وہ خاصا نتیجہ بھگت چکا تھا۔

ذکیہ جس کمرے میں تھی، وہیں میرے ایما پر جانکی پرشاد نے ایک اور بیڈ ڈلوا دیا تھا۔ وہ اب تک بے ہوش تھی۔ میں نے اسے آرام کرسی سے اٹھا کر مسہری پر لٹا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد جانکی پرشاد واپس آگیا اور پوچھنے لگا کہ ہم کھانا کتنی دیر بعد کھائیں گے؟ اسی کے ساتھ اس نے مجھے یقین دلایا کہ اب ہرنارائن چٹرجی فرار نہیں ہو سکتا، میں نے اسے تہ خانے میں بند کر دیا ہے۔

"یہ خیال رکھنا جانکی پرشاد کہ اسے ابھی زندہ رکھنا ہے! اس سے مجھے ابھی کام لینا ہے، مرہم پٹی کرا دینا اس کی! اسی کے ساتھ جو تمہارے ملازمین اس کے پاس ضرورتاً تہ خانے میں جائیں، انہیں تاکید کر دینا کہ اس سے نظر نہ ملائیں! خود تمہیں بھی اس بات کا خیال رکھنا ہے!" میں نے اسے سمجھایا۔

"مجھے علم ہے آپ بے فکر رہیں! میں آپ کی ہدایات پر پورا عمل کروں گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا، پھر بولا۔ "وہ آپ نے کھانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا!"

"ایسا کرو کہ اپنے کسی ملازم کو بھیج کر جامع مسجد کے کسی ہوٹل سے ہمارے لئے کھانا منگوالو! تم لوگ گوشت وغیرہ نہیں کھاتے ہوگے!" میں بولی۔

"میں تو خیر گوشت کھا لیتا ہوں۔" جانکی پرشاد نے اعتراف کیا اور مجھے اس پر حیرت ہوئی۔ وہ بہرحال برہمن تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "میرے سوا گھر میں کوئی اور گوشت خور نہیں اس سے کبھی کبھار ہوٹل میں جا کر اپنا شوق پورا کر لیتا ہوں، مگر یہ بات گھر والوں کے علم میں نہیں۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑا۔ "میں منگواتا ہوں آپ لوگوں کے لئے کھانا!"

جانکی پرشاد چلا گیا تو میں ذکیہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ تھوڑی دیر کی کوشش سے اسے ہوش آگیا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ میرے چہرے پر نظر پڑتے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک سی نظر آئی تھی۔ میں نے ہرنارائن کے بیان کی تصدیق کے لئے اس سے پوچھا۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

وہ چند لمحے کھوئی کھوئی سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ "میرا..... میرا نام کرشنا..... کرشنا کماری ہے۔"

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور وہ مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کا جواب سن کر مجھے یقین آگیا تھا کہ ہرنارائن نے مجھ سے غلط بیانی نہیں کی تھی، اس کے باوجود میں نے دوسرا سوال بھی کر ہی لیا۔ "تم کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"مم..... میں ہندوستان..... ہندوستانی ہوں میں!" وہ اٹک اٹک کر بولتی رہی پھر چند لمحے بعد ہی اس کے لہجے میں روانی آگئی۔ "میری پرورش ایک اناتھ آشرم (یتیم خانے) میں ہوئی تھی.....؟" پھر وہ رٹا رٹایا سبق سنانے لگی۔ یہ تمام باتیں وہی تھیں جن کا علم مجھے پہلے سے تھا۔ ہرنارائن چٹرجی نے ہپناٹائز کر کے یہ ساری غلط باتیں اس کے ذہن میں بٹھا دی تھیں۔ وہ بالکل مشینی انداز میں بولے جا رہی تھی۔ آخر میں اس نے کہا۔ "میرے پتی (شوہر) کا نام جانکی پرشاد شرما ہے۔ چند ہی دن پہلے میرا ان سے وواہ (شادی) ہوا ہے۔ میرے پتی مجھے بہت چاہتے ہیں اور میں بھی ان سے پریم (محبت) کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ اس کا لہجہ کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا اور آواز سپاٹ تھی۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ملول کا لولی پر اپنا حق [illegible] اس کی آنکھیں سوئی سوئی سی تھیں اور پلکیں بوجھل تھیں۔

''تم مجھے جانتی ہو۔ میں کون ہوں؟'' میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ...... میں شاید جانتی ہوں آپ کو'' اس کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا اور پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔ پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''آپ...... آپ شاید...... عذرا باجی ہیں...... ہاں عذرا باجی ہیں آپ!''

مجھے یہ جان کر خوشی محسوس ہوئی کہ اس نے میرا چہرہ پہچان لیا تھا۔ میں نے اسی لئے بات اور آگے بڑھائی۔ ''تمہاری باجی ہوں نا میں!''

''ہاں...... ہاں، باجی...... میری باجی ہیں آپ!'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرے۔

''میرے بارے میں تمہیں اور کیا معلوم ہے؟''

''آپ...... آپ کے بارے......'' وہ اپنے ہاتھ سے پیشانی رگڑنے لگی۔ یوں جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''میں بتاتی ہوں تمہیں اپنے متعلق!'' یہ کہہ کر میں اسے گزشتہ ماضی قریب کی بہت سی باتیں یاد دلانے لگی اور نہ بیچ بیچ میں ان باتوں کی تصدیق کراتی رہی۔ میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے دانستہ اس کا نام بھی لیا۔ تمہیں یہ سب باتیں یاد ہیں نا ذکیہ؟''

''ذکیہ!...... کون ذکیہ؟...... مم...... میرا نام تو کرشنا کماری ہے اور میں ایک اناتھ آشرم......'' اس کا ذہن پھر بھٹک گیا۔

''سنو!'' میں نے درمیان ہی میں اس کی بات کاٹ کر اسے چپ رہنے پر مجبور کر دیا۔ میں نہیں چاہتی کہ بار بار وہ ان باتوں کو دہرائے جو اس کے ذہن میں بٹھا دی گئی تھیں۔ اس طرح وہ باتیں اس کے ذہن میں مزید پختہ ہو جاتیں۔ میں ایک بار پھر اسے ماضی قریب کی باتیں یاد دلانے لگی۔ ''تمہیں یاد ہے نا کہ تم مصر سے پاکستان آئی تھیں؟''

''مصر...... ہاں مصر ہی سے میں پاکستان گئی تھی اور...... اور پھر......''

''پھر وہاں سے ہندوستان آ گئی تھیں۔'' میں نے اس کی آسانی کے لئے بات پوری کر دی۔ ''تم پاکستان کے شہر کراچی سے کلکتہ ہی آئی تھیں نا!''

''جی...... جی ہاں!'' مستقل ذہن پر زور دینے کی وجہ سے اس کا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ ''میں کراچی سے کلکتہ...... ہاں وہیں آئی تھی۔''

موقع غنیمت جان کر میں نے زاہد کو اس کے سامنے کر دیا۔ ''اسے زاہد کو تو اچھی طرح پہچانتی ہو نا تم! یہ زاہد ہی ہے نا!''

''ہاں، یہ...... زاہد...... یہ زاہد...... ہے۔ مم...... میں اسے پہچانتی ہوں۔'' وہ دھیمی آواز میں

بولی۔

''اچھا اب تم سو جاؤ، کافی تھک گئی ہو۔'' میں نے اس سے کہا۔

وہ فوراً ہی کسی سعادت مند بچی کی طرح نیچے کھسک کر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر کچھ ہی دیر میں وہ بے خبر سو گئی۔

میری دانست میں اس وقت کے لئے یہی بہت تھا۔ میں اس کے دماغ پر فی الحال اس سے زیادہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ میری یہ کامیابی یا کوشش بھی موجودہ حالات میں کم نہیں تھی کہ اس نے مجھے اور زاہد کو پہچان لیا تھا۔ اس کے علاوہ ماضی قریب کی بہت سی باتوں کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ میرے خیال میں اسے معمول پر لانے میں کسی ہپناٹسٹ کو زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ اگر ہرنارائن چٹرجی یہ کوشش کرتا تو کامیابی کے مزید امکانات تھے کیونکہ ذکیہ کا ذہن اس سے مانوس ہو چکا تھا۔ وہ ہرنارائن چٹرجی کے ٹرانس میں رہ چکی تھی اور اس کا ذہن ہرنارائن کے احکام ماننے کا عادی ہو چکا تھا۔ ذکیہ کے ذہن کو معمول پر لانے کا کام کوئی اور ہپناٹسٹ بھی انجام دے سکتا تھا مگر ایسی صورت میں زیادہ وقت لگتا۔ میں نے اسی لئے ہرنارائن ہی کو ترجیح دی تھی اور وہ اس وقت تھا بھی میرے قابو میں!''

میں اس وقت اس درجہ خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ کمرے میں زاہد کی موجودگی کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مجھے مخاطب کیا تو میں چونک اٹھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''خاتون! آپ نے اس بات پر بھی غور کر لیا ہے کہ زور زبردستی سے کسی کا دل نہیں جیتا جا سکتا!''

میں اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکی اور اس سے وضاحت چاہی۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ صاف صاف کہو!''

جواباً وہ بولا۔ ''جانکی پرشاد پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟'' اس کے لہجے سے خدشات کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''کیا وہ آپ کی زبردستی کو دل سے قبول کر لے گا؟''

''دل سے قبول کرے یا نہ کرے۔ لیکن اسے بہرحال وہی کرنا پڑے گا جو میں چاہوں گی!'' میں نے جواب دیا۔

''ویسے یہ سب چکر ہے کیا؟ میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آیا۔'' اس نے کہا۔

''تم اپنے چھوٹے سے دماغ پر زیادہ زور نہ ڈالو اور جو کچھ ہو رہا ہے، خاموشی سے دیکھتے رہو!'' مجھے اس پر فقرہ چست کرنے کا موقع مل گیا۔

''آپ کے بڑے سے دماغ میں کیا ہے، مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں! مجھے تو بس یہ خبر ہے کہ میری تفریح غارت ہو رہی ہے۔''

''اگر واقعی تمہیں اپنی تفریح غارت ہونے کا خیال ہے تو میں اجازت دیتی ہوں۔ تم چاہو تو اسی وقت جا سکتے ہو۔''

''تفریح اور آپ کے بغیر! میں نے آپ سے یہ کب کہا ہے کہ دہلی میں لنڈورا پھرنا چاہتا ہوں!''

"تو پھر صبر کرو! میں تو اس وت تک یہاں سے نہیں جاسکتی جب تک ذکیہ کی حالت معمول پر نہ آجائے۔"

"لیکن اب محترمہ کو آخر ہوا کیا؟ یہ خود کو آخر کرشنا کماری کہنے پر کیوں بہ ضد ہیں؟"

"اتنا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے باوجود بھی تمہاری کھوپڑی میں کچھ نہیں آیا، حیرت ہے!"

"سنا اور دیکھا تو ہے بہت کچھ، مگر ان باتوں پر یقین سا نہیں آرہا۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی اپنا نام ہی بھول جائے؟"

پھر میں نے مختصراً زاہد کو ہپناٹزم کے بارے میں بتایا۔ اس نے ہپناٹزم کے متعلق سنا ضرور تھا مگر تفصیلات کا علم اسے نہیں تھا۔ اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں نے اسے سمجھایا۔

"یہ کوئی جادو ٹونا نہیں بلکہ ایک سائنسی علم ہے! اب سمجھے کچھ!"

"بات تو سمجھ میں آگئی مگر حیرت اب بھی ہے۔ میری نظر سے اب تک کوئی ایسا شخص نہیں گزرا۔"

"یہاں ہندوستان اور پاکستان میں اس کے عالم بہت کم ہیں، ہاں مغربی ممالک میں یہ علم اتنا اجنبی نہیں ہے۔" میں نے بتایا۔

"کچھ بھی ہو، یہ علم ہے خطرناک!" زاہد نے اپنے خیال کا اظہار کیا، پھر اسے جیسے کوئی بات یاد آگئی اور بولا۔ "مگر آپ نے تو ہرنارائن چٹرجی سے کچھ اور ہی کہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس نے شاید آپ کو بھی ہپناٹائز کرنا چاہا تھا اور آپ نے کہا تھا کہ مجھ پر تمہارا جادو نہیں چلے گا۔ وہ کیا قصہ تھا؟"

"مختلف ذہن مختلف صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں کچھ ذہن ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ہپناٹائز نہیں کیا جاسکتا! یہ اپنے اپنے ذہن کی قوت مدافعت کی بات ہے۔ اگر کوئی شخص یہ بات اپنے دماغ میں بٹھالے کہ اسے کسی کے زیر اثر نہیں آنا اور اس کے ذہن میں قوت مدافعت بھی ہو تو اسے ہپناٹائز نہیں کیا جاسکتا۔" میں نے تفصیل سے جواب دیا۔

"ویسے ہرنارائن چٹرجی زندگی بھر آپ کو بھول نہیں سکے گا۔ شاید ہی وہ کبھی کسی عورت کے ہاتھوں اتنا پٹا ہو! اس وقت تو آپ کوئی خوف ناک شیرنی ہی معلوم ہوتی ہیں جب کسی پر جھپٹ جھپٹ کر حملہ آور ہوتی ہیں۔ میں نے آپ کے ہاتھوں دو بندوں کو پٹتے دیکھا ہے۔"

"حیرت تو یہ ہے کہ تم نے اس کے باوجود کوئی عبرت حاصل نہیں کی!" میں ہنس کر بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ کتنی بھی ہاتھ چھوٹ سہی، اپنے مجازی خدا پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گی بلکہ نیک بیبیوں کی طرح اس کے ہر ستم پر صبر شکر کریں گی۔ نیک بیبیاں تو وہی کہلاتی ہیں ناجن کے جنازے ہی شوہر کے گھر سے نکلتے ہیں، جیتے جاگتے وہ کبھی شوہر کے گھر کی چوکھٹ سے باہر قدم نہیں رکھتیں۔"

زاہد کے ساتھ اسی طرح کی باتوں میں تقریباً گھنٹہ بھر گزر گیا۔ اب مجھے بھوک محسوس ہونے لگی تھی کیوں کہ دوپہر کے تین بجنے والے تھے۔ صبح کا ناشتا کرنے کے بعد ابھی تک میں نے یا زاہد نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ مزید دس منٹ انتظار کے بعد جانکی پرشاد کی صورت نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک ملازم

بھی تھا جو کھانا لایا تھا۔

"معاف کیجئے گا، کھانے میں دیر ہوگئی۔ جانکی پرشاد نے معذرت کی۔" دراصل راستے میں کار خراب ہوگئی تھی اس وجہ سے دیر ہوگئی اگر مجھے اتنی دیر ہو جانے کا اندازہ پہلے سے ہوتا تو آپ لوگوں کے لئے چائے وغیرہ ہی بھیج دیتا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اخلاقاً کہا۔ پھر ذکیہ کو جگانے لگی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ بھی کچھ کھالے۔

پھر جانکی پرشاد نے بھی وہیں اپنا کھانا منگوالیا۔ وہ بھی اب تک بھوکا تھا۔ ہم سب نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ ذکیہ سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھی جانکی پرشاد نے ایک دو لقمے ہمارے کھانے سے بھی لئے۔ میں نے اس دوران میں یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ جانکی پرشاد، ذکیہ کی طرف دیکھنے سے اجتناب کررہا تھا۔

"اپنے دوست کی مرہم پٹی کرادی تم نے؟" میں نے پانی پی کر گلاس رکھتے ہوئے جانکی پرشاد سے ہرنارائن چٹرجی کے بارے میں دریافت کیا۔

"جی ہاں!" اس نے جواب دیا۔ "میرے ایک ملازم نے اس کی مرہم پٹی کردی ہے اور میں نے اسے کھانا بھی بھجوا دیا ہے۔ ملازم ہی کے ذریعے اُس نے مجھ سے یہ کہلوایا ہے کہ میں اس سے مل لوں۔ معلوم نہیں وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے!"

"تو ملے نہیں تم!..... مل لو! وہ بس تمہیں بھڑکانے اور بہکانے کی کوشش کرے گا، میں بولی۔

"اور اگر تم اس پر راضی نہ ہوئے تو وہ اصرار کرے گا کہ تم اسے رہا کردو۔"

"میں اسی لئے تو نہیں ملا اس سے!" جانکی پرشاد نے کہا۔ "خواہ مخواہ پریشان کرے گا وہ مجھے!"

"خیر تمہاری مرضی!" میں نے طویل سانس لے کر کہا، پھر بولی۔" آج شام ہی سے میں ذکیہ کے ذہن کو معمول پر لانے کی ابتدا کرنا چاہتی ہوں۔ شام کو تم مجھے اور ذکیہ کو لے کر تہ خانے میں چلو گے!..... ہاں یہ بتاؤ، وہاں روشنی کا بھی بندوبست ہے؟ وہاں تو اندھیرا ہوگا نا!"

"لالٹین کا بندوبست کرنا پڑے گا، وہاں بجلی نہیں ہے۔ جانکی پرشاد نے بتایا۔ "بہرحال آپ بے فکر رہیں، کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ ہرنارائن کو تہ خانے سے نکال کر یہاں لے آیا جائے۔"

"نہیں!" میں نے انکار کردیا۔ "خود ہمیں وہاں چلیں گے۔"

کھانا کھانے کے بعد ہم نے چائے پی اور پھر شام کو ساڑھے پانچ بجے آنے کے لئے کہہ کر جانکی پرشاد وہاں سے چلا گیا۔ چائے پی کر ذکیہ ابھی تک کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے لیٹ جانے کو کہا۔ پھر زاہد سے بولی کہ تم بھی اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کرلو۔ زاہد نے میری تجویز قبول کرلی اور اور اٹھ کر برابر والے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے احتیاطاً اس سے کہہ دیا تھا کہ اندر سے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں بند کر کے لیٹے۔ خود میں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اپنے بستر پر دراز ہونے کے کچھ

ہی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی تھی۔

پھر شام کو ساڑھے پانچ بجے جانکی پرشاد ہی نے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر مجھے جگایا تھا۔ زاہد کو میں نے سونے ہی دیا تھا اور منہ ہاتھ دھو کر ذکیہ کو ساتھ لے جانکی پرشاد کے ساتھ چل دی تھی۔

عمارت کا وہ حصہ جہاں تہ خانہ تھا۔ سرونٹ کوارٹرز کے سامنے تھا اوپر جو کمرے وہاں بنے ہوئے تھے، وہ اسٹورز کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ انہی دونوں کمروں میں سے ایک کمرے کی کوٹھری کے اندر تہ خانے میں اترنے کا راستہ تھا جو ایک بھاری پتھر کی سل سے ڈھکا ہوا تھا۔ جانکی پرشاد کے دو ملازموں نے وہ بھاری سل بہ مشکل اٹھائی اور نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں نظر آئیں۔ دونوں ملازمین کو جانکی پرشاد نے اوپر ہی چھوڑ دیا اور لالٹین اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر پہلے وہی تہ خانے میں اترا۔ زینہ زیادہ کشادہ نہیں تھا اس لئے ذکیہ کو ساتھ لے کر اترنے میں مجھے کچھ دشواری ہوئی۔ وہ بہ دستور گم صم تھی، یوں جیسے نیند میں چل پھر رہی ہو۔

نیچے بانوں سے بنی ہوئی ایک چارپائی پر مجھے ہرنارائن چٹرجی بیٹھا ہو نظر آیا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہاں اس چارپائی کے علاوہ بس ایک صراحی نظر آئی جو ایلومونیم کے ایک میلے سے گلاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہاں مجھے بدبو بھی محسوس ہوئی۔ وہیں ایک طرف باتھ روم کا دروازہ کھلا نظر آرہا تھا اور غالباً اس کی صفائی نہیں کی گئی تھی۔ یہ جگہ کسی بھی طرح رہنے کے قابل نہیں تھی۔

''جانکی پرشاد شرما!'' معاً ہرنارائن چٹرجی کی آواز سے تہ خانہ گونج اٹھا۔ ''تم اپنی دوستی کی پوری قیمت وصول کر چکے ہو! پھر کس بات کا گلہ ہے تمہیں؟''

''یہاں اس تہ خانے میں میری حالت جانوروں سے بدتر ہے۔ بدبو کے مارے میرا دماغ پھٹا جارہا ہے۔'' اس کے لہجے میں دکھ تھا۔ پھر اس کا لہجہ احتجاجی ہوگیا۔ وہ اب براہ راست مجھ سے مخاطب تھا۔ ''سنو عذرا خان! اگر مجھے اس تہ خانے سے نہ نکالا گیا تو چاہے تو مجھے مار ڈالو میں تمہارے کسی حکم کی تعمیل نہیں کروں گا!''

ہرنارائن چٹرجی کی بات سن کر میں چند لمحے خاموش رہی۔ خود میرے لئے بھی تعفن کے سبب وہاں کھڑا رہنا محال ہو رہا تھا۔ ذرا توقف کے بعد ہرنارائن چٹرجی کی بجائے میں نے جانکی پرشاد کو مخاطب کیا۔ ''کیا مہمان خانے کے کسی کمرے میں اسے یہاں سے منتقل نہیں کیا جاسکتا؟''

''کیوں نہیں!'' جانکی پرشاد جواباً بولا۔ ''میں نے تو یہ سوچ کر اسے یہاں رکھا تھا کہ اس کے یہاں سے فرار ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ اگر کہیں تو....''

''تو پھر ٹھیک ہے، اسے اوپر مہمان خانے ہی میں لے آؤ، میں چلتی ہوں ذکیہ کو لے کر!'' یہ کہہ کر میں، ذکیہ کا ہاتھ تھامے تہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ اگر میں وہاں مزید کچھ دیر رک جاتی تو شاید ابکائیاں لینے لگتی۔ معلوم نہیں ہرنارائن چٹرجی نے اتنا وقت وہاں کس طرح گزار لیا تھا۔

عمارت کے اس حصے میں آتے ہوئے میں نے راستہ اپنے ذہن میں رکھا تھا اس لئے واپسی میں مجھے کوئی قباحت نہیں ہوئی۔ میں مہمان خانے میں پہنچ گئی۔ اس وقت تک زاہد بھی جاگ چکا تھا۔ وہ

اپنے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں آگیا جہاں میں، ذکیہ کے ساتھ تھی۔

''آپ کہاں گئی تھیں؟'' مجھے دیکھتے ہی اس نے سوال کیا۔ ''میں تو پریشان ہوگیا تھا۔'' یہ محترمہ بھی مجھے نظر نہ آئیں تو اور بھی فکر ہوگئی۔'' اس نے ذکیہ کی طرف اشارہ کیا۔

''تم تو گھوڑے اور گدھے سبھی بیچ کر سو گئے تھے۔ اگر اس دوران میں ہمیں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آجاتا پھر؟'' میں نے اسے چھیڑا اور ذکیہ کو مسہری پر بٹھا دیا۔

''آپ اور کوئی ناخوش گوار واقعہ! یہ دو متضاد باتیں ہیں۔ خاتون! یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ ناخوش گوار واقعات خواتین کی بجائے مردوں کو پیش آرہے ہیں۔ اب تک تو خادم حسین، یعنی آپ کے ہونے والے اس سرتاج کا تجربہ یہی ہے، آگے اللہ کو اختیار ہے۔ ویسے کیا کسی خفیہ مشن پر گئی تھیں، آپ دونوں خواتین؟'' زاہد حسب معمول چہکنے لگا۔

''تمہیں کچھ یاد تو رہتا نہیں حالانکہ تمہارے ہی سامنے جانکی پرشاد سے میری بات ہوئی تھی کہ....'' پھر میں نے اسے حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

''حد ہے آپ سے بھی! ارے مجھے جگا لیا ہوتا! یوں غیر مردوں کے ساتھ/ جوان جہان دوشیزاؤں کا تنہا جانا خطرناک بھی ہوسکتا ہے، وہ بھی ایک تہ خانے میں! چیخنے چلانے کے باوجود کوئی وہاں نہ پہنچ پاتا اور پھر میں ساری زندگی سر پکڑ کر روتا رہتا۔''

''بکو مت!'' اس نے بات ہی کچھ اس انداز میں کی کہ میں جھینپ سی گئی۔

کچھ دیر کے بعد جانکی پرشاد شرما اپنے دو ملازمین کے ساتھ ہرنارائن چٹرجی کو لے کر آگیا۔ ہرنارائن چٹرجی نے آتے ہی میرا شکریہ ادا کیا، پھر بولا۔ ''آپ اگر برا نہ مانیں تو میں کہوں کہ یہاں زیادہ بھیڑ بھاڑ مناسب نہیں رہے گی۔''

خود مجھے بھی اس کا اندازہ تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ میں بولی۔ ''ٹھیک کہتے ہو تم! مگر میں یہاں ضرور رہوں گی۔''

''کسی ایک فرد کے رہنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔'' اس نے کہا۔

پھر زاہد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جانکی پرشاد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اپنے دونوں ملازمین کو اس نے پہلے ہی مہمان خانے کا ایک کمرا صاف کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ دونوں کمرے کی صفائی کے لئے چلے گئے تھے۔ میرے کمرے کے سامنے والا خالی کمرا ہرنارائن چٹرجی کو دیا گیا تھا۔ دونوں کمروں کے درمیان خاصی چوڑی راہداری تھی۔

جب سب چلے گئے اور کمرے میں میرے اور ذکیہ کے علاوہ صرف ہرنارائن چٹرجی رہ گیا تو میرے ایما پر ہرنارائن چٹرجی نے ذکیہ کو اپنے ٹرانس میں لے لیا۔

ذکیہ کی اور اس کی نظریں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ اس کے کہنے پر میں نے ذکیہ کو ایک آرام کرسی پر بٹھا دیا تھا اور خود برابر کھڑی ہوگئی تھی۔

''تمہارا کیا نام ہے؟'' ہرنارائن چٹرجی نے پہلا سوال کیا۔ ذکیہ نے میری توقع کے مطابق وہی جواب دیا جو پہلے سے اس کے ذہن میں بٹھا دیا گیا تھا۔ ہرنارائن چٹرجی دھیمے اور نرم لہجے میں اس

کے ذہن کو نئی ترغیب دینے لگا۔ ''نہیں!...... تم کرشنا کماری نہیں ہو، تمہارا نام ذکیہ ہے۔ میں جو کہہ ر(ہا) ہوں اسے اپنے ذہن میں محفوظ کرلو۔ تم نہ ہندو ہو اور نہ تمہارا نام کرشنا کماری ہے۔ تمہارا نام...... اصل نا(م) ذکیہ ہے اور تم مسلمان ہو۔ میرے ساتھ ساتھ یہ الفاظ دہراؤ! تمہارا نام...... کہو میرا نام ذکیہ ہے اور......''

''میرا نام ذکیہ ہے اور میں مسلمان ہوں۔'' ذکیہ کی مدھم اور نیند میں ڈوبی ہوئی سی آواز سنائ(ی) دیتی رہی۔

بار بار ہرنارائن چٹرجی اس سے چند فقرے کہلواتا رہا اور ذکیہ اس کی ہدایت پر ان فقروں کو دہراتی رہی۔ کچھ ہی دیر میں اس کی آواز سے تھکن اور غنودگی کا اظہار ہونے لگا۔ ہرنارائن چٹرجی نے اسے سو جانے کی ترغیب دی اور اسی کے ساتھ کہا۔ ''جب تم جاگو گی تو تمہیں اپنا نام یاد رہے گا...... اب سو جاؤ...... گہری نیند سو جاؤ!''

ذرا سی دیر میں ذکیہ بے خبر سو گئی اور میں نے اسے آرام کرسی سے اٹھا کر مسہری پر لٹا دیا۔ مسلسل ذہنی دباؤ کا اس کی صحت پر بڑا اثر پڑا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔

اس دوران میں ملازمین سامنے والا کمرا صاف کر چکے تھے۔ میں نے ہرنارائن چٹرجی سے اس کمرے میں چلنے کے لئے کہا تو وہ بولا۔ ''مجھے اس کمرے میں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ مجھے ایک قیدی نہ سمجھا جائے؟...... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک آپ کی بہن کا ذہن معمول پر نہیں آتا، یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔''

''ہرنارائن! میری نرمی سے اب تم زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو!'' میں نے نسبتاً سخت لہجے میں کہا۔ ''یہی بہت ہے کہ تمہیں میرے کہنے پر اس تہ خانے میں نہیں رکھا جا رہا۔ آؤ چلو!''

وہ کچھ کہے بغیر میرے ساتھ چلنے لگا۔ میں خود اس کمرے کا جائزہ لینا چاہتی تھی جہاں اسے رہنا تھا۔ اسے بہرحال اس کی مرضی کے خلاف ایک قیدی کی حیثیت سے وہاں رہنے پر مجبور کیا جا رہا تھا اور وہ فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اپنے کمرے سے نکل کر میں نے زاہد اور جانکی پرشاد کو بھی آواز دے لی۔ وہ دونوں برابر والے کمرے سے نکل آئے۔ ہم سب سامنے والے کمرے میں ایک ساتھ داخل ہونے والے تھے کہ اچانک ہرنارائن چٹرجی کو جانے کیا سوجھی کہ وہ پلٹ کر ایک دم بھاگا اور اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند کرنے لگا مگر عین وقت پر میں نے اپنا پیر دروازے میں پھنسا دیا۔ دروازہ اب اس وقت تک بند نہیں ہو سکتا تھا جب تک میں کواڑوں کے درمیان سے اپنا پیر نہ کھینچ لیتی۔

''عذرا خان! اپنا پیر نکال لو ورنہ میں اسے کچل دوں گا!'' وہ باہر سے چیخا اور اسی کے ساتھ میرے پیر پر سخت دباؤ پڑا۔

دباؤ اتنا شدید تھا کہ میرے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ کمرے میں میرے علاوہ جانکی پرشاد اور زاہد دونوں موجود تھے، مگر ان دونوں ہی کی صورت حال سمجھنے میں ذرا دیر لگ گئی۔ میں نے اپنے پیر پر سے دباؤ کم کرنے کے لئے کواڑوں کے درمیان جھری میں اپنے دونوں ہاتھ ڈال دیئے اور دروازہ کھولنے کے لئے زور لگایا۔

ہرنارائن شاید سمجھ گیا کہ زیادہ دیر دروازے پر اپنی گرفت برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ اس نے اچا(نک)

لئے ایک جھٹکے سے دروازے کے پٹ چھوڑ دیئے۔ دروازہ جھٹکے سے کھلنے کی وجہ سے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ میں لڑکھڑا کر گرنے والی تھی کہ پیچھے سے زاہد نے مجھے سنبھال لیا۔ سنبھلتے ہی میں نے کھلے ہوئے دروازے سے باہر جست لگا دی۔ ہرنارائن موقع سے فائدہ اٹھا کر پہلے ہی وہاں سے بھاگ چکا تھا۔ میں تیزی سے دوڑتی ہوئی عمارت کے اس حصے سے نکلی تو کافی فاصلے پر ہرنارائن کو باؤنڈری وال کی طرف بھاگتے دیکھا۔

''رک جاؤ ہرنارائن!'' میں دوڑتے ہوئے چیخی، مگر وہ نہ رکا اور نہ پلٹ کر دیکھا۔

باؤنڈری وال زیادہ اونچی نہیں تھی اسے بہ آسانی عبور کیا جا سکتا تھا۔ پستہ قد ہونے کے باوجود وہ ذرا سی کوشش کر کے اس پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاتا۔

لحہ لحہ اس کا اور میرا درمیانی فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مجھ سے تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے پہلے عمارت کی چار دیواری تک پہنچ گیا اور اس پر چڑھنے کے لئے اچھلنے لگا۔ اس نے غالباً دانستہ پھاٹک کا رخ نہیں کیا تھا کیوں کہ وہاں ایک مسلح گورکھا موجود تھا۔ اسے شاید یہ خدشہ رہا ہوگا کہ جانکی پرشاد نے اس گورکھے کو بھی ہدایات دے دی ہوں گی کہ ہرنارائن فرار ہونے کی کوشش کرے تو ایسا نہ کرنے دیا جائے۔ مجھے علم نہیں کہ جانکی پرشاد نے ایسا کیا تھا یا نہیں، لیکن ہرنارائن نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔

دو ایک بار اچھلنے کے بعد ہرنارائن کے ہاتھ چار دیواری تک پہنچ ہی گئے۔ بھاگتے ہوئے میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اب آہستہ آہستہ اپنے جسم کو اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے اس نے جوتے نہ جانے کب اور کہاں اتار دیئے تھے۔ چار دیواری مجھ سے چند گز کے فاصلے پر رہ گئی تو ہرنارائن بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اب اس کے دونوں بازو چار دیواری پر تھے اور وہ پیروں کے پنجوں کو دیوار پر جما کر اوپر اٹھ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے میں نے کئی لمبی جستیں بھریں تا کہ اس کے دوسری طرف کودنے سے پہلے چار دیواری تک پہنچ جاؤں۔ میری یہ جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔ اس سے پہلے کہ ہرنارائن چار دیواری پر چڑھ کر دوسری طرف کودتا، میں نے اچھل کر اس کا ایک پیر پکڑ لیا۔ اس نے اپنا دوسرا پیر پوری قوت سے میری کلائی پر مارا اور اسی کے ساتھ پیر کو جھٹکا دیا، مگر وہ گرفت میری تھی۔ میں نے اسے چار دیواری سے نیچے گھسیٹ لیا۔

تیز دوڑنے کی وجہ سے میرا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ ہرنارائن نے غالباً یہ سمجھا کہ یہ آخری موقع ہے۔ اگر اس نے اس موقع سے بھی فائدہ نہ اٹھایا تو پھر اسے رہائی نہ مل سکے گی۔ زمین کچی تھی اس لئے چار دیواری سے گر کر اسے چوٹ نہ لگی اور وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خلاف توقع اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ ذہنی طور پر میں اس کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے چوٹ کھا گئی۔ میں گر پڑی اور اسی کے ساتھ ہرنارائن نے میری کنپٹی پر زور دار گھونسا مارنا چاہا لیکن اب میں ہوشیار ہو چکی تھی۔ اس کا گھونسا میری کنپٹی کی بجائے ماتھے پر پڑا۔ ضرب خاصی شدید تھی، مگر جوڈو اور کراٹے کی تربیت کے دوران میں خاص طور پر ضربیں سہنے کی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ میں نے بھی یہ مشقیں کی تھیں اسی لئے وہ ضرب سہہ گئی۔ اب اس کے دونوں ہاتھ میری گردن تک پہنچ گئے تھے اور وہ میری گردن دبانے کی کوشش کر رہا

تھا۔

میں نے اپنی گردن کی نسیں حتیٰ الامکان طور پر اکڑا لیں اور پھر تیزی کے ساتھ اپنے دونوں پیر سمیٹ کر ہرنارائن کے جسم کو فضا میں اچھال دیا۔ پھر مجھے اچھل کر کھڑا ہونے میں دیر نہیں لگی۔ میں ایک ہی زقند میں اس جگہ پہنچ گئی جہاں ہرنارائن گرا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ اپنی جگہ بے حس وحرکت پڑا تھا، مگر میری حیرت جلد ہی دور ہوگئی۔ میں نے اس کے سر کے قریب ایک بڑا سا پتھر پڑا دیکھ لیا تھا۔ یقیناً اس کا سر پتھر سے ٹکرا گیا تھا اور اسی سبب اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔ اس کی قسمت میں شاید اس وقت میرے ہاتھوں پٹنا نہیں لکھا تھا۔ اگر وہ ہوش میں ہوتا تو میرے ہاتھوں اس کی بڑی درگت بنتی۔

اچانک اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سن کر میں نے مڑ کے دیکھا۔ جانکی پرشاد، زاہد اور چند ملازمین اسی طرف بھاگتے ہوئے آرہے تھے۔ میں اپنے کپڑوں سے مٹی جھاڑنے لگی۔

''کیا ہوگیا اسے؟'' جانکی پرشاد نے قریب آکر ہرنارائن چڑجی کی طرف اشارہ کیا جو زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔

''بے ہوش ہوگیا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے مختصراً اس کے فرار کی کوشش ناکام بنانے، خود پر حملہ کرنے اور بے ہوش ہوجانے کی وجہ بیان کی، پھر اسے اٹھوا کے چلنے کو کہا۔

جانکی پرشاد کے اشارے پر اس کے ملازمین نے بے ہوش ہرنارائن کو وہاں سے اٹھالیا۔ میں زاہد کے ساتھ ساتھ تیز قدمی سے مہمان خانے کی طرف چلنے لگی۔

''کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ہنگامے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔'' زاہد میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا: ''آپ بھی خاتون مجھے ایسی ہی ہستیوں میں سے ایک لگتی ہیں۔''

''مقصد کیا ہے تمہارا اس بات سے؟'' نہ معلوم کیوں مجھے اس وقت جھنجھلاہٹ سی محسوس ہورہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے میری آواز میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سختی آگئی۔

''معاف کیجئے گا، آپ تو اس وقت لڑنے کے موڈ میں معلوم ہورہی ہیں۔ آپ ایسی مار دھاڑ سے بھرپور خاتون کے مقابل میں ہرگز آنا پسند نہیں کروں گا۔ آپ تو خیر دنیا میں بہت کچھ دیکھ چکی ہوں گی لیکن اس خادم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا اس لئے سوری، ویری سوری!'' وہ سہم جانے کی اداکاری کرنے لگا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ غالباً میرے مزاج میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو جانے کا سبب ہرنارائن تھا جس نے بلاوجہ اس وقت میری اچھی خاصی پریڈ کرادی تھی اور یہ جھنجھلاہٹ ناحق زاہد پر اتر گئی تھی۔ میں اسی سبب اپنے اور زاہد کے درمیان خواہ مخواہ کے کھنچاؤ کو ختم کرنے کے لئے زبردستی مسکرانے لگی تھی حالانکہ ابھی تک مجھے ہرنارائن پر سخت غصہ آرہا تھا۔

زاہد کے ساتھ میں پھر مہمان خانے کے اس کمرے میں آگئی جہاں ہرنارائن کو رہنا تھا۔ ابھی تک میں اس کا جائزہ نہیں لے سکی تھی۔ اس کمرے میں بھی ایک کھڑکی تھی جو اندر ہی سے بند ہوتی تھی مگر یہ غنیمت تھا کہ کھڑکی کے بیرونی حصے میں لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ اگر کھڑکی کے ساتھ لوہے کی گرل نہ ہوتی تو میں ہرگز ہرنارائن کو اس کمرے میں نہ رہنے دیتی۔ جس کمرے میں خود میرا قیام تھا اس کی کھڑکی

کے ساتھ گرل نہیں تھی۔ میری توجہ اسی وجہ سے پہلے کھڑکی ہی کی طرف گئی تھی۔ کمرے میں ایک باتھ روم بھی تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھول کر بھی دیکھا۔ باتھ روم میں ایک چھوٹا سا روشن دان تھا جس کے اوپر لوہے کی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں باتھ روم سے باہر نکل رہی تھی کہ جانکی پرشاد اور اس کے ملازمین نے بے ہوش ہرنارائن کو کمرے میں موجود مسہری پر ڈال دیا اور پھر جانکی پرشاد کے اشارے پر باہر چلے گئے۔

''معلوم نہیں اسے یہاں کیا تکلیف تھی جو اس طرح بھاگ رہا تھا۔'' جانکی پرشاد، ہرنارائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔

''اپنی تکلیف اس نے مجھے بتائی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ایک قیدی کی حیثیت سے یہاں نہیں رہنا چاہتا۔''

''مگر یہاں اسے کیا تکلیف ہوئی! ہاں تہ خانے کی بات دوسری تھی۔''

''یہ دراصل احساس کی بات ہے۔ قید پھر قید ہوتی ہے! چاہے اس میں قیدی کو کتنی ہی سہولتیں فراہم کیوں نہ کردی جائیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں گی یا اس کمرے میں تالا ڈال دیا جائے؟'' جانکی پرشاد نے پوچھا۔

''ہاں میں اس کے ہوش میں آنے تک یہاں رکنا چاہتی ہوں۔ ویسے میرے اندازے کے مطابق اسے جلدی ہوش آجائے گا۔ تم اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارو ذرا! دراصل میں اسے آخری بار سمجھانا چاہتی ہوں کہ اب اگر اس نے کوئی ایسی احمقانہ حرکت کی تو یہ حرکت اسے بہت مہنگی پڑے گی۔''

وہیں ایک میز پر مسہری کے قریب ملازمین نے جگ میں پانی بھر کے رکھ دیا تھا اور گلاس بھی پاس ہی رکھا تھا۔ میرے کہنے پر جانکی پرشاد نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور پھر بے ہوش ہرنارائن چڑجی کے منہ پر ہاتھ سے چھینٹے مارنے لگا۔ اس کا نتیجہ کچھ ہی دیر میں ظاہر ہوگیا۔ ہرنارائن نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کی رگیں کھنچ سی گئیں۔ واضح طور پر وہ خوف زدہ نظر آرہا تھا۔

''ہرنارائن!'' میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بہ مشکل نرم آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ''جو کچھ ہوچکا ہے اسے بھول جاؤ! میں نے تمہارا یہ قصور بھی معاف کردیا ہے کہ تم نے میری گردن دبا کر مجھے قتل کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ تمہارا یہ قصور میں نے یہ سوچ کر معاف کردیا ہے کہ تمہاری جگہ اگر مجھے کہیں قید کردیا جاتا تو میں بھی وہاں سے فرار ہونے کے لئے سب کچھ کر گزرتی۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تم ایک بار پھر ایسی احمقانہ حرکت کروگے۔ ہم نے تمہیں کسی بری نیت سے قید نہیں کیا۔ ہمارا مقصد تم بہ خوبی جانتے ہو کہ ہم ایک بے گناہ لڑکی کو ذہنی طور پر پوری طرح صحت مند دیکھنا چاہتے ہیں اور تمہیں نے اسے اس حال پر پہنچایا ہے۔ اس بات کو تم محض دھمکی خیال نہ کرنا کہ اب اگر تمہاری طرف سے کوئی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا گیا یا تم نے فرار ہونے کی کوشش کی تو یقین کرو میں تمہاری دونوں ٹانگیں توڑ دوں گی۔ پھر تمہاری ساری زندگی گھسٹتے ہوئے گزرے گی!'' میرے آخری الفاظ میں سختی بھی تھی اور

دھمکی بھی! ذرا توقف سے میں پھر بولی۔ ''کیا چاہتے ہو تم؟...... زندگی بھر کی معذوری یا چند دن کے بعد رہائی؟ یقین کرو ہرنارائن، ذکیہ کے ٹھیک ہوتے ہی تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔''

''مم...... مجھے...... رہائی چاہیے!'' وہ اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''میں اب...... اب یہاں سے فرار ہونے کی کو...... کوشش نہیں کروں گا۔''

''شکریہ ہرنارائن!'' میں نے کہا، پھر جانکی پرشاد سے بولی۔ ''اپنے دوست کو پانی پلاؤ، اسے شاید پیاس لگی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے زاہد کو چلنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ گئی۔ مجھے جانکی پرشاد سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ہرنارائن کو پانی پلانے کے بعد جب باہر نکلے تو اس کا کمرہ مقفل کر دے۔

زاہد کو ساتھ لئے میں راہداری عبور کر کے اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ذکیہ کا بستر خالی تھا۔ چند لمحے سناٹے کے عالم میں گزرے۔ میرے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔ پھر شاید زاہد نے مجھے مخاطب کیا تھا اور میں اپنے حواس میں آ گئی تھی۔ معاً میرے ذہن میں آیا کہ ذکیہ باتھ روم بھی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے اس کی آنکھ کھل گئی ہو اور اسے باتھ روم جانے کی ضرورت پڑ گئی ہو۔ میں نے اپنے پریشان دل کو سمجھایا اور پھر باتھ روم کی طرف بڑھی۔

ذرا سے دباؤ پر باتھ روم کا دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

''جانکی!'' میں پلٹ کر غضب ناک انداز میں چیخ اٹھی۔

میرے چہرے پر شاید ایسے ہی قہر وغضب کے تاثرات ہوں گے کہ زاہد سہم کر رہ گیا تھا۔ وہ ایک جانب سہما ہوا سا کھڑا تھا۔

''کیا ہوا؟'' چند لمحے بعد ہی جانکی پرشاد کی خوفزدہ سی آواز سنائی دی۔ وہ کمرے میں قدم رکھ چکا تھا۔

''بتاؤ جانکی، ذکیہ کہاں ہے؟'' میں نے پرغضب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ...... وہ تو یہیں...... یہیں تو تھیں...... ابھی کچھ...... کچھ دیر پہلے تک!'' جانکی پرشاد ٹپٹا گیا۔ اس کی نگاہیں سارے کمرے میں گردش کر رہی تھیں۔

''سنو جانکی!'' میں دانت پیس کر بولی۔ ''تمہیں شاید ابھی پوری طرح اندازہ نہیں کہ میں حقیقتاً کتنی خطرناک ہوں، تمہاری مرضی و ایما کے بغیر اسے یہاں سے غائب نہیں کیا جا سکتا!...... میں اس کوٹھی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی جانکی!...... اگر ذکیہ نہ ملی تو تمہیں میرے ہاتھوں قتل ہونے سے کوئی نہیں بچا سکے گا!''

میری نگاہ اس وقت دروازے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی راہداری میں ہے یا راہداری سے گزر رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی جگہ سے جست بھری اور جانکی پرشاد کے قریب سے گزرتی ہوئی راہداری میں پہنچ گئی۔ کچھ ہی فاصلے پر میں نے ہرنارائن چڑجی کو بھاگتے دیکھا اور میرا خون کھول اٹھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میرے آواز دینے پر جانکی پرشاد اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ آیا تھا۔ اس سے ایسا شاید بوکھلاہٹ میں ہوا تھا، دانستہ نہیں۔ ہرنارائن چڑجی نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب

ہو جاتا، میں مجسم قہر بنی زقندیں بھرتی ہوئی اس کے سر پر پہنچ گئی۔

بھاگتے ہوئے میں نے پیچھے سے اس کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگ پھنسا دی تھی اور وہ چیختا ہوا منہ کے بل زمین پر گر گیا تھا۔ اگر وہ گرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ آگے نہ کر لیتا تو اس کا چہرہ بھرتا بن جاتا۔ میں نے جھک کر اس کے کالر میں ہاتھ ڈال دیا اور غصے میں بولی۔ ''کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کفار لا اعتبار!''

پھر میں نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور سیاہ چہرہ خوف سے مزید سیاہ ہو گیا تھا۔ میں اسے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اس کے کمرے تک لے آئی اور اندر دھکا دے کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ ہرنارائن سے کسی اور وقت بھی نمٹا جا سکتا تھا۔ اس وقت تو مجھے ذکیہ کی فکر تھی۔

زاہد اور جانکی پرشاد بھی اس وقت کمرے سے نکل کر راہداری میں آ گئے تھے جب میں ہرنارائن کو گھسیٹتی ہوئی لا رہی تھی۔ ہرنارائن کا کمرہ بند کر کے میں جانکی پرشاد کی طرف پلٹی اور اسے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بولو جانکی، اب تمہارا کیا حشر کروں؟''

''مم...... مگر میں...... میں تو بے قصور ہوں!...... میں نے تو کچھ...... کچھ بھی نہیں کیا۔'' وہ گڑگڑانے لگا۔

''یہ مت بھولو جانکی کہ اس کوٹھی میں تمہاری جوان بہن بھی موجود ہے۔''

میری بات سن کر اس کا چہرہ زرد سا پڑ گیا، پھر اس کے ہونٹ کانپے۔ ''بھگوان کی سوگند (قسم) مم...... مجھے کچھ بھی نہیں معلوم کہ ذکیہ یہاں سے کہاں غائب ہو گئی!''

جانکی پرشاد کے لہجے سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا، مگر میں کس طرح مطمئن ہو جاتی! اگر وہ اس سازش میں شریک نہیں تھا تو پھر اور کون ذکیہ کو غائب کر سکتا تھا؟ میں نے اس وقت ذکیہ کو آخری بار مسہری پر محو خواب دیکھا تھا جب ہرنارائن کو اس کے کمرے میں لے جا رہی تھی۔ جانکی پرشاد اس وقت زاہد کے ساتھ تھا۔ پھر وہ بھی میرے ساتھ ہرنارائن کے کمرے میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد ہرنارائن نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ پھر جانکی پرشاد اور زاہد دونوں عمارت کے اسی حصے سے نکل کر کچھ ملازمین کے ساتھ باہر آ گئے تھے۔ میرے خیال میں یہی وہ وقت ہو سکتا تھا جب ذکیہ کو غائب کیا گیا تھا۔ جتنی دیر ہم لوگ عمارت کے اس حصے سے باہر رہے تھے، ذکیہ مہمان خانے میں اکیلی ہی رہی تھی۔ اس کوٹھی میں ملازمین کے علاوہ گنتی کے چند افراد تھے جن میں سے جانکی پرشاد اور ہرنارائن ہمارے ساتھ رہے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ جانکی پرشاد کی بہن پدمنی، اس کی بیوہ پھوپھی اور بچے کوٹھی میں تھے۔ ان افراد پر بھی کسی طرح کا شبہ فضول ہی تھا۔ یہ لوگ اب تک عمارت کے اقامتی حصے سے باہر نظر نہیں آئے تھے۔ یہ سبھی عمارت کے ایک خاص حصے تک محدود تھے۔ اس سے قطع نظر کہ ذکیہ کو وہاں سے کس نے اور کیوں غائب کیا، یہ بات واضح تھی کہ اسے غائب کرنے میں جانکی پرشاد کے ملازمین ہی کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ میں چند ہی لمحوں میں اس نتیجے تک پہنچ چکی تھی۔ ان حالات میں پہلی ضرورت ساری کوٹھی کی تلاشی لینا تھی۔

”جانکی! اپنے تمام ملازمین کو یہ حکم دے دو کہ ان میں سے کوئی بھی اس وقت تک کوٹھی سے باہر نہیں نکلے گا جب تک میں ساری کوٹھی کی تلاشی نہیں لے لوں گی!“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے جانکی پرشاد کو حکم دیا۔ ”کوٹھی کے گورکھا چوکیدار کو ہدایت دے دو کہ وہ اس دوران میں نہ کسی کو باہر جانے دے نہ اندر آنے دے! جاؤ جلدی سے یہ حکم دے کر...... مگر ٹھہرو! میں خود تمہارے ساتھ چلتی ہوں!“

جانکی پرشاد کے ساتھ میں آگے بڑھی تو زاہد بھی ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ میں نے اسے ساتھ چلنے سے نہیں روکا۔ کمرے سے نکلتے ہی میری نگاہ سامنے والے کمرے کے دروازے پر پڑی جو غیر مقفل تھا۔

”اس کمرے کا تالا کہاں ہے؟“ میں نے جانکی پرشاد سے پوچھا۔

”کمرے کے اندر ہی کھڑکی کی گر پر رکھا ہوا ہے۔“ جانکی پرشاد نے جواب دیا، پھر میرا مقصد سمجھ کر بولا۔ ”میں ابھی تالا لگائے دیتا ہوں۔“

پھر ہرنارائن چڑجی کے کمرے کو مقفل کر کے جانکی پرشاد نے میرے حکم کی تعمیل میں اپنے ملازمین کو ہدایات دیں۔ میرے ہی ساتھ وہ کوٹھی کے گیٹ تک بھی گیا تاکہ مسلح گورکھا چوکیدار کو بھی ضروری ہدایت دے سکے۔ گورکھا چوکیدار نے اندر سے گیٹ بند کر دیا اور مستعد انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”سنو!“ میں نے گورکھا چوکیدار کو مخاطب کیا۔ ”تم نے کسی لڑکی کو تو کسی ملازم کے ساتھ کوٹھی سے باہر جاتے نہیں دیکھا؟ ابھی آدھے گھنٹے کے اندر!“

”جی نہیں!“ چوکیدار نے جواب دیا۔ ”آدھے گھنٹے کیا، بہت دیر سے نہ کوئی باہر گیا نہ اندر آیا۔“

گیٹ سے واپسی میں سب سے پہلے میں نے عمارت کے اس حصے کی تلاشی لینے کا اظہار کیا جہاں اس کوٹھی کے مکینوں کی سکونت تھی۔ جانکی پرشاد مجھے اور زاہد کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ یہ حصہ خاصا وسیع اور متعدد کمروں پر مشتمل تھا۔

پدمنی نے اپنے بھائی کے ساتھ مجھے اور زاہد کو دیکھ کر استفسار کیا۔ ”کیا بات ہے بھیا!...... آپ اپنے مہمانوں کو یہاں کیوں لائے ہیں!“

”میں انہیں کوٹھی کا یہ حصہ بھی دکھانا چاہتا تھا...... بس اور کوئی بات نہیں۔“ جانکی پرشاد نے بات بنائی۔ ”یہ...... یہ لوگ بھی اپنی کو...... کوٹھی بنوا رہے ہیں اور انہیں میری کوٹھی بہت پسند آئی ہے اسی وجہ...... سے...... تم سمجھ رہی ہو...... نا؟“

جانکی پرشاد تو اپنی بہن کو جھوٹ بول کر مطمئن کر رہا تھا اور میں تیز نظروں سے اس کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ کمرا اس کی بہن پدمنی ہی کا تھا۔ میں نے تلاشی میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیا، پدمنی کے بیڈ کی چادر اٹھا کر بھی میں نے اس کے نیچے جھانک کر دیکھا اور باتھ روم کا بھی جائزہ لیا۔

جب ہم پدمنی کے کمرے سے نکلے تو وہ بھی ساتھ چلنے لگی، مگر جانکی پرشاد نے اسے روک دیا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ہاں تم ایسا کرو، جلدی سے موسی کے پاس جا کر انہیں کچھ دیر کو اپنے کمرے میں لے آؤ! بیو اور رانی کو بھی ساتھ ہی لے آنا۔ اتنے میں ان لوگوں کو دوسرے کمرے دکھاتا ہوں۔“

بیو اور رانی شاید اس کی پھوپھی کے بچوں کے نام تھے۔ پدمنی اپنے کمرے سے نکل کر ایک طرف بڑھ گئی اور جانکی پرشاد ہمیں ایک اور راہداری میں لے آیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ میں نے اس حصے کی تلاشی لی، مگر حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ ذکیہ کہیں نہیں ملی۔ پھر اگلے دو گھنٹے بھی اسی کارعبث میں صرف ہوئے۔ میں نے اس دوران میں تہ خانے کے علاوہ کوٹھی کا ایک ایک گوشہ کھنگال لیا تھا۔ واپس آ کر میں نے مہمان خانے کے سارے کمرے بھی کھلوا کر دیکھ لئے تھے۔

اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ذکیہ اس کوٹھی میں نہیں ہے۔ اس عرصے میں میرا ذہن برابر سوچتا رہا تھا۔ مجھے اب یہ بات بھی کھٹکنے لگی تھی کہ ذکیہ کو اس وقت غائب کیا گیا تھا جب ہرنارائن کوٹھی سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کہیں یہ سوچا سمجھا منصوبہ تو نہیں تھا؟ یعنی ادھر تو میں، ہرنارائن کی طرف متوجہ ہو جاؤں، ادھر ذکیہ کو غائب کر دیا جائے؟ ہرنارائن تو کہیں اس سازش کا ذمے دار نہیں؟“

میں نے جتنا بھی ان سوالوں پر غور کیا، میرا شبہ قوی سے قوی تر ہوتا گیا۔ اس وقت میرے ایما پر جانکی پرشاد نے اپنے تمام ملازمین کو مہمان خانے میں بلا لیا تھا۔ ان میں کچھ عورتیں بھی تھیں۔ گورکھا چوکیدار کو وہاں بلانے سے خود میں نے منع کر دیا تھا۔ جانکی پرشاد کے ملازمین میرے سامنے کھڑے تھے اور میں ان سب کے چہروں کا باری باری جائزہ لیتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ان سب کو میں نے ایک قطار میں اپنے کمرے کے باہر کھڑا کر دیا تھا۔

معاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور اسی کے تحت میں نے مڑ کر جانکی پرشاد سے پوچھا۔

”تمہارے ملازمین میں سے کوئی کم تو نہیں؟ یہ تمہارے تمام ملازمین ہیں نا!“

میرا سوال سن کر جانکی پرشاد نے ان سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ”یہ کالیا کہاں گیا؟ اور...... رگھو بھی نظر نہیں آ رہا!“

میں چونک اٹھی، پھر ان ملازمین کو مخاطب کیا۔ ”کیا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ کالیا اور رگھو کہاں ہیں؟“

جواباً ان سبھی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر مزید پوچھ گچھ پر یہ معلوم ہوا کہ انہیں کافی دیر سے کسی نے نہیں دیکھا۔

”کیا ان دونوں میں سے کوئی اس وقت تہ خانے میں بھی گیا تھا جب ہرنارائن وہاں تھا؟“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے جانکی پرشاد سے دریافت کیا۔

”میں نے ہرنارائن کی نگرانی کے لئے انہی دونوں کی ڈیوٹی لگائی تھی اور...... اور شاید رگھو اس کے لئے دوپہر کا کھانا لے کر تہ خانے میں گیا تھا۔“ جانکی پرشاد نے جواباً بتایا۔

”تم نے ان دونوں کو یہ تاکید کر دی تھی کہ وہ ہرنارائن سے نظریں نہ ملائیں؟“ میں نے جانکی پرشاد سے پھر سوال کیا۔

”جی...... جی ہاں“ وہ بولا۔

"تم سب لوگ جاؤ!" میں نے ملازمین سے کہا۔ وہ سب چلے گئے تو میں جانکی پرشاد سے بولی۔ "عموماً جس بات کے لئے آدمی کو منع کیا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ لاعلم ہوتا ہے، اپنے تجسس سے مجبور ہوکر دانستہ وہی حرکت کرتا ہے۔ یقیناً تمہارے ان دونوں ملازمین میں سے کسی نے تمہارا کہنا نہیں مانا اور...... اور اسے ہرنارائن چڑجی نے ہپناٹائز کرکے اپنا حکم ماننے پر مجبور کردیا۔ پھر شاید دوسرے ملازم کو بھی پہلے ملازم کے ذریعے ہرنارائن چڑجی نے اپنے جال میں پھنسا لیا پھر جب ہرنارائن نے دانستہ ہمیں اپنے پیچھے لگالیا تو وہ دونوں ذکیہ کو لے کر فرار ہوگئے۔ اس کے لئے انہوں نے گیٹ کا رخ کرنے کی بجائے کہیں سے بھی عمارت کی چاردیواری عبور کرلی ہوگی۔ وہ دو تھے اس لئے ذکیہ کو سنبھالنے میں انہیں زیادہ دقت پیش نہیں آئی ہوگی۔" میں جیسے اپنے آپ سے باتیں کررہی تھی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا، ہرنارائن چڑجی ہی ذکیہ کو یہاں سے فرار کرانے کا اصل ذمے دار ہے!" زاہد بول اٹھا۔

"ہاں!..... اور اب میں اسی سے سب کچھ اگلواؤں گی کہ اس نے ان دونوں ملازمین کے ذریعے ذکیہ کو کہاں بھجوایا ہے!...... میں اس کی چمڑی ادھیڑ دوں گی! اسے ہر قیمت پر زبان کھولنا پڑے گی!" میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ اس انکشاف نے میرا خون کھولا دیا تھا کہ سخت نگرانی میں ہونے کے باوجود ہرنارائن چڑجی اپنی چال چل گیا تھا۔ معاً میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے جانکی پرشاد سے کہا۔ "اس کمینے کے کمرے کا تالا کھولو!"

جانکی پرشاد میرے ایما پر آگے بڑھا اور کمرے کا تالا کھول کر الگ ہٹ گیا۔ اس کے الگ ہٹنے کا مطلب غالباً یہی تھا کہ میں خود کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جاؤں۔ میں اس کی اس حرکت پر کچھ کھٹکی تو ضرور، مگر دوسرے ہی لمحے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

میری پہلی نظر سامنے بائیں جانب بچھی ہوئی مسہری پر پڑی اور میں چکرا کر رہ گئی۔ مسہری خالی تھی۔ ہرنارائن چڑجی مجھے کمرے میں نظر نہیں آیا۔ اسی لمحے عقب سے مجھے زاہد کی چیخ سنائی دی، مگر اس سے پہلے کہ میں پلٹ کر دیکھتی، میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کسی نے میرے سر پر کوئی بھاری شے دے ماری تھی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل گیا اور پھر میں اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ میرا وجود جیسے کسی گہرے اور اندھیرے کنوئیں میں اترتا جارہا تھا۔ اپنے حواس کھونے سے پہلے میرا آخری احساس یہ تھا کہ کوئی میرے اوپر جھک رہا ہے۔ وہ جھکنے والا کون تھا، میں یہ نہیں دیکھ سکی۔ میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔

☆......☆......☆

معلوم نہیں میں کب ہوش و حواس سے بیگانہ رہی۔ پھر میرے ذہن سے آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی اور میں نے اپنے سر کے پچھلے حصے میں دکھن محسوس کی۔ اسی کے ساتھ مجھے ایک ایک کر کے گزرے ہوئے واقعات یاد آتے گئے۔ کسی نے کوئی بھاری چیز میرے سر پر ماری تھی اور میں بیہوش ہوگئی تھی۔ میں کہاں اور کن لوگوں کے درمیان تھی؛ مجھے یہ بھی یاد آ گیا۔ میں اپنی آنکھیں کھولنا چاہتی تھی کہ میری سماعت سے ایک جانی پہچانی آواز ٹکرائی۔ یہ آواز جانکی پرشاد شرما کی تھی۔ "مگر میرے ملازمین کے ذریعے تم نے ذکیہ کو کہاں بھجوایا ہے؛ یہ اب تک نہیں بتایا۔"

"وہ جہاں بھی ہے محفوظ ہے۔" جواباً ہرنارائن چٹرجی کی آواز ابھری۔ "ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ وہ تمہیں واپس مل جائے گی مگر......" اس نے معنی خیز انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مگر...... مگر کیا؟...... تم صاف بات کیوں نہیں کررہے؟" جانکی پرشاد فوراً ہی بول اٹھا۔

"میں اس بات کو نہیں بھول سکتا جانکی پرشاد شرما کہ تم نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔" ہرنرائن کے لہجے میں شکایت تھی۔ "اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم نے اپنے ملازم دھرم ویر کو میرے پیچھے سائے کی طرح لگا رکھا تھا۔ اس نے مجھے ایک لمحے کو بھی ذکیہ کے ساتھ تنہا نہیں چھوڑا۔ سچ کہو جانکی؛ تمہیں مجھ پر شبہ تھا نا کہ میں کہیں تمہاری امانت میں خیانت نہ کردوں؟"

"ہاں مجھے اعتراف ہے۔" جانکی پرشاد کی آواز سنائی دی۔ "میں نے تمہاری نظریں پہچان لی تھیں۔ تم جن نظروں سے ذکیہ کو دیکھتے تھے؛ ان سے میں نے حقیقت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اگر وہ میری پتنی (بیوی) نہ ہوتی تو شاید میں درگزر کر جاتا اور تمہیں وہ سب کچھ کرگزرنے دیتا جو تم چاہتے تھے۔ ذرا سوچو ہرنارائن اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے۔"

"جانکی پرشاد! بھگوان کرے اگر میں تمہاری طرح کسی قابل نہ ہوتا تو اپنے کسی دوست کی خواہش پوری ہونے سے نہ روکتا۔ اس میں خود میرا ہی فائدہ ہوتا کہ ہمیشہ کیلئے بدنامی سے بچ جاتا۔ جب میں ایک بچے کا باپ بن جاتا تو کوئی میری طرف انگلی نہ اٹھا سکتا...... مگر جانکی پرشاد تمہارے اندر اتنی عقل

نہیں تھی اسی لیے میرے راستے کی دیوار بن گئے اور تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ تمہاری خالی جھولی میں وہ حسین تحفہ ڈالنے والا کون تھا۔ عذرا خان کے درمیان میں آنے کے بعد تو تم بالکل ہی بدل گئے۔ اس کی باتوں میں آ کر تم نے مجھے یہاں قید کر دیا۔ اگر میں خود اپنی ذہانت سے کام لے کر یہاں سے ذکیہ کو غائب کرا دینے کا منصوبہ نہ بناتا تو تم نے تو یہ فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ ذکیہ کو عذرا کے حوالے کر دو گے۔''

''لیکن...... لیکن آج جب تم نے مجھے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا تو...... تو کیا میں نے تمہیں ساتھ دینے کا یقین نہیں دلایا تھا......؟ اور کیا...... کیا میں نے تمہارا ساتھ نہیں دیا؟ اگر میں ایسا نہ کرتا تو عذرا خان اس وقت تمہارے قابو میں نہ ہوتی۔'' جانکی پرشاد نے کہا اور میں اس کی بات سن کر چونک اٹھی۔ پھر چند ہی لمحے بعد مجھے اس ہولناک حقیقت کا علم ہو گیا کہ میں اپنی مرضی سے اپنے جسم کو حرکت نہیں دے سکتی۔ میرا جسم رسیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

''معاف کرنا جانکی پرشاد۔'' تم نے بالکل آخری مرحلے میں میرا ساتھ دیا' وہ بھی مجبوراً۔''

ہرنارائن کی آواز پھر سنائی دی۔ ''اور اگر کہو تو میں اس کی وجہ بھی بتا دوں۔'' ہرنارائن کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ''تمہیں میں نے بتا دیا تھا کہ ذکیہ میرے قابو میں ہے۔ تم اسے دوبارہ حاصل کرنے کیلئے میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے' مگر اب...... اب جانکی پرشاد! میرا پلہ بھاری ہے۔ میں اپنے وعدے سے تو نہیں پھروں گا کہ ذکیہ کو تمہارے حوالے کر دوں لیکن اس کیلئے تمہیں بھی میری ایک شرط ماننا پڑے گی اور اس میں ایک طرح سے تمہارا ہی فائدہ ہے۔''

''پہلے تو تم نے کسی شرط کا ذکر نہیں کیا تھا۔ خیر پھر بھی بولو کیا شرط ہے تمہاری؟ اگر میرے بس میں ہوا تو میں تمہاری شرط ضرور مان لوں گا۔'' جانکی پرشاد کا لہجہ مصالحانہ تھا۔

''تم ذکیہ کے اور میرے تعلقات پر کوئی اعتراض نہیں کرو گے۔ بیوی وہ تمہاری ہی کہلائے گی اور تمہارے ہی بچے کو جنم بھی دے گی لیکن......''

''نہیں!'' جانکی پرشاد تقریباً چیخ اٹھا۔ ''ہرگز نہیں...... میں کچھ بھی سہی مگر یہ...... بے غیرتی اور بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔'' اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''تو پھر ذکیہ کو بول جاؤ وہ اسی شرط پر تمہیں واپس مل سکتی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔'' ہرنارائن اپنی بات پر اڑا رہا۔

''ہرنارائن یہ نہ بھولو کہ تم اس وقت میری ہی کوٹھی میں ہو۔'' جانکی پرشاد کی آواز میں دھمکی تھی۔ ''تم اگر صرف عذرا خان کی حد تک بات رہنے دیتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا مگر تم تو حد سے بڑھ رہے ہو۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو جانکی پرشاد۔'' ہرنارائن کی آواز میں بھی تیزی آ گئی۔

''اگر تم میری بات کو دھمکی سمجھ رہے ہو تو پھر دھمکی ہی سہی۔ تم میری مرضی کے بغیر اس کوٹھی سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔ زیادہ چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرو نارائن! میں تم سے نظریں نہیں ملاؤں گا۔''

''جانکی پرشاد! تم ناحق بنا بنایا کھیل بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔'' ہرنارائن کا لہجہ بدل گیا۔

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو' مجھ سے بگاڑ کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔''

''اگر تم مصالحت چاہتے ہو تو پھر ذکیہ کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر...... میرا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنائے بغیر فوری طور پر میرے حوالے کر دو...... عذرا خان کے بارے میں مجھے اپنے وعدے کا پاس ہے۔ میں تمہارے راستے کی دیوار نہیں بنوں گا۔''

''ذکیہ کے سلسلے میں اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو؟'' ہرنارائن نے کہا۔

''تو پھر ظاہر ہے میں بھی اپنے وعدے پر قائم نہیں رہوں گا۔ ذکیہ اگر مجھے نہیں ملی تو پھر تمہیں بھی نہیں ملے گی۔''

''وہ کیسے جانکی پرشاد؟'' ہرنارائن کے لہجے میں تمسخر تھا۔

''تمہارے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ اس میں نے یہاں سے کہاں بھجوایا ہے۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے تم سے کچھ پوچھنے کی۔ عذرا خان خود ہی تم سے سب کچھ اگلوا لے گی۔'' جانکی پرشاد کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''کیا مطلب...... تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔''

''کیوں مجھے ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے۔'' جانکی پرشاد کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے قدموں کی چاپ اپنی طرف بڑھتے محسوس کی۔

''رک جاؤ جانکی پرشاد! اسے نہ کھولو...... مجھے تمہاری بات منظور ہے۔'' ہرنارائن جلدی سے بولا۔ ''اگر تم نے اس فتنے کو آزاد کر دیا تو خود تمہاری بھی شامت آ جائے گی۔''

''وہ تو خیر جو ہو گا دیکھا جائے گا لیکن اب تم عذرا خان کو اسی وقت ہاتھ لگا سکتے ہو جب ذکیہ کو میرے حوالے کر دو' اس سے پہلے نہیں۔'' جانکی پرشاد ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

''دیکھو جانکی پرشاد ضد نہ کرو کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں کہ میں ذکیہ کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

''ہاں مجھے اب تم پر یقین نہیں رہا۔'' جانکی پرشاد بلا جھجک بولا۔

''میری بات پر یقین کرو جانکی پرشاد کہ ابھی میں تمہارے ساتھ چل کر......''

''تم مجھے یقیناً دھوکا دینا چاہتے ہو ہرنارائن! میں یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ اگر ایسا

نہیں تو پہلے میرے ساتھ چلو اور ذکیہ کو میرے حوالے کر دو۔"

"مجھے بس کچھ دیر کی مہلت دے دو جانکی پرشاد! میں تمہارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوں۔"

تا کہ اس عرصے میں تم ایک طرف تو عذرا خان سے اپنی نا آسودہ خواہشوں کی تکمیل کر لو اور دوسری طرف مجھے جل دے کر فرار ہو جاؤ۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" جانکی پرشاد بولا۔

میں اب تک بڑے صبر و تحمل کے ساتھ ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ حالانکہ میرا ذہن سلگ رہا تھا۔ اگر میں آزاد ہوتی تو ان دونوں عیاروں کی کھال ادھیڑ دیتی جو خود میرے اور میری بہن کے بارے میں انتہائی نازیبا گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے اس دوران میں پلکوں کے درمیان خفیف سی جھری بنا کر کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں میں بیہوش ہوئی تھی۔ اس کمرے میں مجھے زاہد نظر نہیں آیا تھا۔ ان لوگوں نے زاہد کو یقیناً کسی اور کمرے میں رکھا تھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں تھا کہ مجھے بیہوش کرنے والا ہرنارائن چٹرجی ہی تھا۔ وہ یقیناً پہلے سے میری آمد کا منتظر رہا ہوگا۔ میرے سر پر عقب سے ضرب لگائی گئی تھی' اس کا مطلب یہ تھا کہ جس وقت میں کمرے میں داخل ہوئی تھی' ہرنارائن دروازے کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ زاہد کی چیخ بھی میں نے بیہوش ہونے سے پہلے سنی تھی۔ زاہد کے ساتھ جانکی پرشاد تھا اس لئے اس پر لاعلمی میں وار کرنے والا جانکی پرشاد ہی ہو سکتا تھا۔ جانکی پرشاد کو میں ہرنارائن کے کمرے ہی میں چھوڑ آئی تھی۔ غالباً ہرنارائن نے اسی وقت جانکی پرشاد سے ساز باز کی تھی۔

جانکی پرشاد اور ہرنارائن کی گفتگو سن کر میں اندازہ لگا چکی تھی کہ ذکیہ کے سلسلے میں ہرنارائن کی نیت صاف نہیں ہے۔ خود جانکی پرشاد بھی اب یہ بات سمجھ چکا تھا اسی لیے پہلے ذکیہ کی بازیابی پر زور دے رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان اختلاف میرے لیے سود مند ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ابھی تک ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے اور اپنی اپنی بات پر بضد تھے۔ کچھ ہی دیر میں ان کی گفتگو میں تلخی آ گئی۔ پھر نوبت ہاتھا پائی پر پہنچ گئی۔ پہل کرنے والا ہرنارائن ہی تھا۔ اب میں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"تو اپنے ملازمین کی مدد کیلئے تو اس وقت پکارے گا جانکی جب میں تجھے اس کی مہلت دوں گا۔" ہرنارائن نے جانکی پرشاد کو زمین پر گرا لیا تھا اور اس کی گردن دبا رکھی تھی۔ جس کی وجہ سے جانکی پرشاد قطعی بے بس ہو گیا تھا۔ گردن پر دونوں ہاتھوں سے دباؤ ڈالتے ہوئے ہرنارائن کہہ رہا تھا۔ "میں ابھی تجھے بیہوش کر کے باتھ روم میں بند کر دوں گا پھر میں جو چاہوں گا کروں گا۔ تو مجھے نہیں روک سکے گا۔ پھر عذرا خان ہو گی اور میں۔ اس کے بعد میں یہاں سے فرار ہو جاؤں گا' سنا کچھ؟ اب تیری بیوی میرے تصرف میں ہو گی۔"

معلوم نہیں اس دبلے پتلے شخص کے جسم میں کون سی شیطانی طاقت حلول کر گئی تھی کہ وہ خود سے زیادہ جسیم اور بظاہر طاقتور جانکی پرشاد پر حاوی آ گیا تھا۔ جانکی پرشاد ابھی تک مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ

ہرنارائن کی گرفت سے نکلنے کیلئے بری طرح مچل رہا مگر ہرنارائن اسے اٹھنے نہیں دے رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ دونوں پٹوں کے درمیان تھوڑا سا خلا تھا۔ اچانک میں' جانکی پرشاد کے ملازمین کو بلانے کیلئے زور زور سے چیخنے لگی۔ ہرنارائن نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ جانکی پرشاد نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی گرفت سے اپنی گردن چھڑا لی۔ اس کے ساتھ وہ بھی اپنے ملازمین کے نام لے لے کر انہیں پکارنے لگا۔ ہرنارائن نے فوراً ہی خطرہ محسوس کر کے جانکی پرشاد کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

رات کے سناٹے میں یقیناً میری اور جانکی پرشاد کی آوازیں دور تک سنی گئی ہوں گی۔ میں اب بھی چیخے جا رہی تھی۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ مجھے راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

اسی کے ساتھ مجھے زاہد کی تیز آواز سنائی دی۔ "میں آ رہا ہوں...... آ رہا ہوں۔"

زاہد کی آواز سن کر میں حیران رہ گئی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ وہ بھی میری طرح قید میں ہوگا۔ پھر وہ کس طرح آزاد ہو گیا۔

پھر مجھے مزید کچھ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ زاہد کمرے کا بھڑا ہوا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ صورتحال بگڑتے دیکھ کر ہرنارائن نے بھاگنے کی کوشش کی مگر جانکی پرشاد نے اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ وہ دونوں پھر ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ اس دوران میں زاہد نے تیزی کے ساتھ میرے جسم سے لپٹی ہوئی رسی کھول دی۔ میں اچھل کر کھڑی ہوئی تھی کہ جانکی پرشاد کے کئی ملازم بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ہرنارائن ایک بار پھر جانکی پرشاد کو دھکا دے کر دروازے کی طرف بھاگا۔

"اسے پکڑ لو۔" جانکی پرشاد چیخ اٹھا۔ اس کا ہاتھ ہرنارائن کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ ابھی وہ زمین پر ہی پڑا ہوا تھا۔

ملازمین کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی میں ہرنارائن پر چھلانگ لگا چکی تھی۔ پھر اسے میں نے کسی ایسے خوف زدہ چوہے کی طرح دبوچ لیا جو بلی سے بچ کر کسی بل میں چھپ جانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔

اس کے بعد کچھ ہی دیر میں جانکی پرشاد کے ملازمین نے ہرنارائن کو رسیوں میں جکڑ کر مسہری پر ڈال دیا۔

"اب تم لوگ جا سکتے ہو۔" میں نے ملازمین سے کہا۔ "اور سنو اب اگر اس طرف سے تمہیں چیخ و پکار سنائی دے تو ادھر آنے کی ضرورت نہیں ہم دراصل اس شخص کی کچھ خاطر مدارت کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے ہرنارائن کی طرف اشارہ کیا۔

''مگر...... مگر...... ابھی ٹھہر...... ٹھہر جاؤ۔'' جانکی پرشاد خوف زدہ سی آواز میں بولا۔ میں اس کے خوف کو سمجھ رہی تھی۔ وہ یقیناً میری طرف سے خوف زدہ تھا۔

''نہیں' انہیں جانے دو۔'' میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ''اب ان کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' یہ کہتی ہوئی میں' جانکی پرشاد کے قریب پہنچ گئی اور دھمکی آمیز آواز میں اس سے بولی۔ ''مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں' جانے دو اپنے ملازمین کو۔''

''ٹھٹ...... ٹھیک ہے' جاؤ تم لوگ۔'' جانکی پرشاد نے ملازمین کو جانے کی اجازت دے دی۔

ملازمین کے چہروں پر حیرت کے آثار تھے۔ وہ لوگ یقیناً اس ہنگامے کی وجہ نہیں سمجھ سکے تھے' مگر ان میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ پوچھ سکتے۔ وہ کمرے سے نکل گئے۔

''زاہد! کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دو۔'' میں نے زاہد کو اشارہ کیا اور زاہد فوراً ہی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''مم...... مگر کیوں؟'' جانکی پرشاد گھبرا کر بولا۔ ''دروازہ کیوں بند کرا رہی ہیں آپ؟''

''اس لیے کہ تم چیخو چلاؤ یا تمہارے دوست ہرنارائن واویلا مچائے تو زیادہ دور تک آواز نہ جا سکے۔'' میرا لہجہ بدل گیا۔ ''تم دونوں عیاروں کو میں سزا دینا چاہتی ہوں۔ تم دونوں ہی انتہائی کمینے اور دھوکے باز ہو۔ میں نے تم دونوں کی ساری باتیں سن لی ہیں۔''

''لیکن آپ...... آپ نے تو کہا تھا کہ...... کہ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں' پھر یہ......''

''تو اب میں کب یہ کہہ رہی ہوں کہ تم ڈرو مجھ سے۔'' میں اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''میرا سودا تو تم نے کر ہی لیا تھا' ذکیہ کے بدلے' پھر اب ڈرنے کی کیا بات ہے۔''

''اس...... اس نے...... ہرنارائن نے مجھے ورغلا دیا تھا ورنہ میں...... میں ہرگز......''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میرا الٹا ہاتھ اس کے رخسار پر پڑا۔ ''ذلیل آدمی تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا...... اور اب معصوم بن رہا ہے۔''

زاہد اب اندر سے کمرے کی چٹخنی لگا کر میرے قریب آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

''ہاں زاہد پہلے تم بتاؤ' تمہارے ساتھ کیا گزری؟ تم کہاں تھے؟'' میں نے پہلے زاہد سے استفسار کیا۔

''جب آپ کمرے میں داخل ہوئیں تو اچانک اس شخص نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تالا میرے سر پر دے مارا اور میں زمین پر گر کر بیہوش ہو گیا۔ ہوش آنے پر میں نے آپ کے چیخنے کی آوازیں سنیں۔ مجھے اس نے سامنے والے کمرے میں زمین پر ڈال کر باہر سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا اور......''

''اور یہ بھول گیا تھا کہ کمرے میں کھڑکی بھی ہے۔'' میں نے اپنی دانست میں زاہد کی بات مکمل کر دی۔ ''میری چیخیں سن کر تم یقیناً کھڑکی ہی سے کود کر باہر آئے ہو گے۔''

''جی ہاں! زاہد نے جواب دیا۔'' اگر آپ کی طرح مجھے بھی یہ رسی سے باندھ دیتا تو میں کمرے سے نکلنے میں کامیاب نہ ہوتا۔''

میں زاہد کی بات سن کر جانکی پرشاد کی طرف مڑی۔ اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔ ''ہاں جانکی! بولو اب میں تمہارا کیا حشر کروں؟''

''اصل...... اصل مجرم ہرنارائن ہے...... آپ اسے تو کچھ نہیں کہہ رہیں اور مجھے......''

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں اسے چھوڑ دوں گی' مگر پہلے تو تمہاری باری ہے۔ تم اگر اس کے بہکائے میں نہ آتے تو اتنا وقت ضائع نہ ہوتا اور میں اب تک ذکیہ کو تلاش کر چکی ہوتی۔ تم نے درمیان میں دھوکا دے کر نہ صرف میری عزت و آبرو کو خطرے میں ڈال دیا بلکہ ذکیہ کی بازیابی میں بھی تاخیر کا سبب بنے۔ میں بھلا تمہیں کس طرح معاف کر سکتی ہوں۔''

''جانکی پرشاد پر مجھے واقعی بہت غصہ آ رہا تھا۔ پھر میں نے اس پر اپنا غصہ اتارنا شروع کر دیا۔ وہ تو میری قسمت ہی اچھی تھی کہ ان دونوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا ورنہ اس کمینے شخص نے میری عزت و آبرو خاک میں ملوانے کیلئے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

میرے ہاتھوں پٹ کر جانکی پرشاد کچھ ہی دیر میں نڈھال ہو گیا۔ اب وہ زمین پر پڑا ہوا گڑگڑا کر روتے ہوئے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اسے زدوکوب کرتے ہوئے میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ اس کے جسم پر کوئی زخم نہ آئے۔ بند چوٹیں کھلی چوٹوں سے زیادہ اذیت دیتی ہیں' یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ اسی کے نتیجے میں جانکی پرشاد تکلیف سے بری طرح کراہ رہا تھا۔ جانکی پرشاد کو اس طرح زدوکوب کرنے کا مقصد شدید غصے کے علاوہ ہرنارائن چترجی کو مرعوب وخوف زدہ کرنا بھی تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ جلد سے جلد زبان کھول دے۔ میری چھوٹی بہن ذکیہ اس وقت کہاں ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب صرف ہرنارائن ہی دے سکتا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے اور ہرنارائن کے خوف زدہ چہرے کا جائزہ لے کر میں نے اچانک زاہد کو مخاطب کیا۔ ''اب دوسرے مگر اصل بدمعاش کی باری ہے' اسے کھول دو زاہد۔''

''نن...... نہیں!'' ہرنارائن چیخ اٹھا۔ ''مجھے مارنے...... مارنے کی ضرورت نہیں میں...... میں سب کچھ بتانے پر راضی ہوں۔''

''مگر میں نے ابھی تم سے کچھ پوچھا ہی کب ہے۔'' میری آواز میں تلخی اور چبھن تھی۔

''معاف...... معاف کر دو عذرا خان!'' زاہد اس کے قریب پہنچ گیا تو وہ گھگیانے لگا۔

''معافی تلافی کا وقت اب گزر چکا ہے ہرنارائن! تمہیں اب اپنے کیے کی سزا بھگتنا ہی پڑے گی۔ میں سخت لہجے میں بولی اور پھر زاہد سے کہا۔ ''جلدی کھولو اسے۔''

زاہد میرے حکم کی تعمیل میں اس کے جسم کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کرنے لگا۔

''عذرا خان! کیا تم یہ نہیں جاننا چاہتیں کہ میں نے تمہاری بہن ذکیہ کو یہاں سے اغوا کرا کے کہاں بھیجا ہے؟'' ہرنارائن رسیوں کی قید سے آزاد ہوتے ہی بولا۔

''بالکل جاننا چاہتی ہوں' لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم انتہائی دھوکے باز شخص ہو۔ تمہارے قول وفعل کا کوئی اعتبار نہیں۔ تم مجھے کسی غلط راستے پر بھی لگا سکتے ہو اس لیے میں تمہاری کچھ خاطر مدارت کرنا چاہتی ہوں تاکہ تمہیں جھوٹ بولنے کے انجام کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے۔ یہ کہتے ہوئے میں اس کی طرف بڑھی۔ وہ ابھی تک مسہری سے اترا نہیں تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور پھر اسے ایک جھٹکے سے نیچے گھسیٹ لیا۔ اس دوران میں اس کی قمیص کا گریبان بھی پھٹ گیا۔

''بھگوان کیلئے چھوڑ دو مجھے۔'' وہ زمین پر پڑا ہوا دونوں ہاتھ جوڑ کر گھگیانے لگا۔

میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور پھر اسے اٹھ کر کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ میرا حکم سن کر وہ کھڑا تو ہو گیا مگر اس کی ٹانگیں واضح طور پر کانپ رہی تھیں۔ بظاہر اس وقت وہ بہت مظلوم لگ رہا تھا لیکن میں اس کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ وہ مظلوم نہیں ظالم تھا جس نے میری بہن کی زندگی ہمیشہ کیلئے تباہ کر دینا چاہی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے میری عزت و آبرو سے بھی کھیلنے کا ناپاک منصوبہ بنالیا تھا۔ اگر قدرت میرا ساتھ نہ دیتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں یقیناً بے عزت و بے آبرو ہو کر زندہ رہنا پسند نہ کرتی اور میرا خون ناحق اس کے دامن پر ہوتا۔ یہ شخص عبرتناک سزا کا مستحق تھا مگر ابھی میں اسے یہ سزا دینا نہیں چاہتی تھی۔ پہلے ذکیہ کی بازیابی ضروری تھی۔

چند ہی لمحے بعد کمرہ ہرنارائن کی چیخوں سے گونجنے لگا۔ میں اس کا بھی وہی حشر کر رہی تھی جو اس کے ساتھی اور دوست جانکی پرشاد کا حشر کر چکی تھی۔ اسے بھی میں نے شدید اذیت دی مگر بیہوش نہ ہونے دیا اور نہ کوئی زخم لگنے دیا۔ اس دوران میں وہ گڑگڑاتا رہا' عاجزی کرتا رہا' میرے پیروں پر اپنا سر رکھ کر رحم کی بھیک مانگتا رہا مگر جب تک میرے دل کا غبار نہ نکل گیا' میرے ہاتھ نہ رکے۔

پھر میں نے اس سے وہ سوال کیا جس کیلئے بہت دیر سے میں خود کو روکے ہوئے تھی۔

''اسے..... ذکیہ کو میرے کہنے پر جانکی پرشاد کے دونوں ملازم مرگھو اور کالیا یہاں سے علی گڑھ لے گئے ہیں۔'' اس نے رک رک کر کراہتے ہوئے انکشاف کیا۔

''علی گڑھ!'' میں حیرت سے بولی۔ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ دوسری جانب یہ سن کر بھی میرا خون کھول رہا تھا کہ اس خبیث شخص نے مجھے ایک لمبے چکر میں پھنسا دیا تھا۔

''ہاں عذرا خان!'' اس نے تصدیق کی۔ ''علی گڑھ کے بازار حسن میں ایک طوائف انوری ے میرے پرانے تعلقات ہیں۔ میں نے ان دونوں کو انوری کے نام ایک پرچہ لکھ کر دیا تھا کہ میں بہت لد علی گڑھ آؤں گا' اس وقت تک ذکیہ کو تم بحفاظت اپنے پاس رکھنا۔''

''جہاں تک میرے علم میں ہے علی گڑھ میں دو بازار حسن ہیں۔'' میں اپنے ذہن پر زور دینے لی مگر مجھے ان بازاروں کے نام یاد نہیں آئے۔

''جی ہاں' ٹھیک..... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' وہاں دو ہی بازار حسن ہیں' ایک کا نام مدار گیٹ ہے اور دوسرا حکیم کی سرائے کہلاتا ہے۔'' انوری بائی کا کوٹھا حکیم کی سرائے میں ہے۔''

''تمہیں یقین ہے ہرنارائن کہ ذکیہ وہاں محفوظ رہے گی؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اچھا۔

''انوری بائی پرانے ڈیرے دار طوائف ہے۔ وہ پیشہ نہیں کرتی' صرف گاتی ہے۔ آپ..... اپ یقین کریں کہ ذکیہ کی عزت و آبرو کو وہاں کوئی..... خطرہ نہیں ہو سکتا۔''

''کیا تم نے ان دونوں ملازمین کو بھی وہیں ذکیہ کے پاس رہنے کا حکم دیا تھا؟''

''جی نہیں!'' ہرنارائن نے میرے سوال کا جواب دیا۔ ''میں نے انہیں ہپناٹائز کر کے ان کے انوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ ذکیہ کو انوری بائی کے حوالے کر کے وہ اس واقعے کو قطعی بھول جائیں گے' اسی کے ساتھ یہ بھی کہ کبھی آئندہ جانکی پرشاد کی کوٹھی کا رخ نہیں کریں گے۔''

ہر چند کہ ہرنارائن نے مجھے یقین دلایا تھا کہ ذکیہ انوری بائی کے کوٹھے پر پوری طرح محفوظ رہے گی لیکن میرے دل کو اطمینان نہیں ہوا تھا۔ وہ بہرحال ایک طوائف کا کوٹھا تھا جہاں کسی بھی باعزت عورت کی موجودگی کسی طور بھی مناسب نہیں تھی۔ علی گڑھ شہر کا فاصلہ دہلی سے کچھ زیادہ نہیں تھا۔ وہاں کوئی ائرپورٹ نہیں تھا' اس لئے ٹرین یا بس کے ذریعے ہی سفر ممکن تھا۔ وہاں پہنچ کر میرے لیے انوری بائی کے کوٹھے کا سراغ لگا لینا کچھ مشکل نہ ہوتا۔ میں جب چھوٹی سی تھی تو اپنے پاپا کے ساتھ ایک بار علی گڑھ کی نمائش دیکھنے گئی تھی۔ ہر سال وہاں نمائش لگتی تھی جو دور دور تک بہت مشہور تھی۔ علی گڑھ کی بس دھندلی سی یادیں میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ پاپا مجھے علی گڑھ یونیورسٹی بھی دکھانے لے گئے تھے جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہی وہ عظیم درس گاہ تھی جس نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت علی گڑھ کیلئے کون سی پہلی ٹرین مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ابھی میں یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکی تھی کہ ہرنارائن کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے جاؤں یا نہیں۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے میں بہرحال یہ خدشہ تھا کہ راستے میں وہ کوئی گڑبڑ نہ پھیلا دے۔ میں پاکستانی شہری تھی اور یہ بات ہرنارائن جانتا تھا۔ علی گڑھ کا ویزا تو الگ میرے پاس تو ہندوستان میں آمد کیلئے پاسپورٹ تک نہیں

تھا۔ میری قانونی پوزیشن مستحکم نہیں تھی اور ہرنارائن ایسا عیار شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اگر وہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیتا تو ذکیہ کی بازیابی کی بجائے میں ایک اور ہی چکر میں پھنس کر رہ جاتی۔ میرا ذہن تیزی سے کسی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

''یہ بتاؤ ہرنارائن کہ کیا انوری بائی تمہاری تحریر پہچانتی ہے؟'' میں نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک ہرنارائن سے سوال کیا۔ سچ اور جھوٹ کے اندازہ لگانے کیلئے میری نگاہیں ہرنارائن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کسی بھی مرحلے پر جھوٹ بول کر وہ مجھے مشکل میں پھنسا سکتا تھا۔ میرا سابقہ ایک ایسے شخص سے تھا جو کئی بار مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر چکا تھا۔ مجھے اس شخص سے ضروری معلومات بھی حاصل کرنا تھیں اور چوکنا رہ کر یہ اندازہ بھی لگانا تھا کہ حاصل کردہ معلومات درست ہیں۔

میرے سوال کے جواب میں ہرنارائن بولا۔ ''بہت دن ہوئے میں نے اسے ایک بار خط لکھا تھا۔ میں اس وقت کلکتہ میں تھا۔ یقینی طور پر مجھے نہیں معلوم کہ انوری بائی میری تحریر پہچان لے گی۔''

ہرنارائن نے بڑے محتاط انداز میں جواب دیا تھا جس سے میں سوچ میں پڑ گئی۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ ہرنارائن نے جو خط جانکی پرشاد کے ملازمین کو دیا تھا' اس کی تحریر سے وہ نئی تحریر ملا کر دیکھی جا سکتی تھی جو میں اب اس سے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ دونوں تحریریں ملنے کی صورت میں انوری بائی کو یقین ہو جاتا کہ اسے خط لکھنے والا ہرنارائن ہی ہے۔ اس نتیجے تک پہنچ کر میں نے ہرنارائن کو مخاطب کیا۔ ''تم انوری بائی کو خط لکھو کہ وہ ذکیہ کو میرے حوالے کر دے۔''

اپنی بات کے ردعمل میں اسے میں نے قدرے چونکتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے جو کچھ اس سے کہا' اسے شاید اس کی توقع نہیں تھی' چونکنے کا سبب میرے نزدیک یہی تھا۔ اس نے کسی حیل وحجت کے بغیر انوری بائی کو خط لکھنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ پھر جب وہ کچھ دیر بعد مسہری پر بیٹھا ہوا میرے حکم کی تعمیل کر رہا تھا تو اسے اردو میں خط لکھتے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اردو لکھنا پڑھنا بھی جانتا ہوگا۔ اس سے انور بائی کے لیے خط لکھوا کر میں نے اپنے پرس میں رکھ لیا۔

اب جانکی پرشاد کی حالت بھی بڑی حد تک سنبھل چکی تھی۔ میں نے گھڑی میں دیکھا تو رات کا ایک بجنے والا تھا۔ شام ہی سے بھاگ دوڑ اور ہنگامہ آرائی کے سبب اب تک نہ میں نے کچھ کھایا تھا نہ زاہد نے۔ ذکیہ کے غائب ہو جانے سے میری ساری بھوک پیاس ختم ہو گئی تھی اور غالباً زاہد کی بھی یہی کیفیت تھی۔

پھر مجھے اور زاہد کو اپنا سامان سمیٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جانکی پرشاد کو میں بتا چکی تھی کہ فوری طور پر روانہ ہونا چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے اس سے ایک بات اور بھی زور دے کر کہی تھی کہ فی الحال ہرنارائن کی حیثیت بدستور قیدی کی ہوگی۔ جب تک میں علی گڑھ سے ذکیہ کو لے کر لوٹ آؤں تمہیں

ہرنارائن کو اپنا قیدی بنا کر رکھنا ہے۔ اگر یہ فرار ہو گیا تو پھر میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ جواباً جانکی پرشاد نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ہر قیمت پر میرے حکم کی تعمیل کرے گا۔

میں نے جانکی پرشاد سے جو کچھ کہا تھا' بے سبب نہیں تھا۔ اس امکان کو میں نے مدنظر رکھا تھا کہ ہرنارائن مجھے دھوکا بھی دے سکتا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہی ہوتا اور ہرنارائن بھی ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر ذکیہ کی بازیابی ناممکن ہو جاتی۔ تمام تر احتیاط کے باوجود ایک نکتہ میرے ذہن میں نہیں آیا جس کا احساس مجھے بعد میں ہوا۔ اس کا ذکر میں بعد ہی میں کروں گی۔ اس وقت تو میں بڑی حد تک مطمئن ہو کر جانکی پرشاد کی کار میں زاہد کو لیے دہلی ریلوے سٹیشن کی جانب روانہ ہو گئی۔ کار فراہم کرنے کیلئے میں نے ہی جانکی پا شاد سے کہا تھا۔ جانکی پرشاد نے اپنے ڈرائیور کو ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔

قرول باغ سے جانکی پرشاد کی کار دہلی ریلوے سٹیشن کیلئے روانہ ہوئی تو اس وقت رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ میں اور زاہد' کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ زاہد کی خوش مزاجی حالات کی نذر ہو چکی تھی۔ میں بھی سوچ میں کھوئی ہوئی تھی' زاہد بھی کسی سوچ میں گم نظر آ رہا تھا۔

کار نے ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ زاہد نے آہستگی سے مجھے مخاطب کیا۔ ''سنئے خاتون' اگر وہ دونوں ہی عیار کہیں روپوش ہو گئے تو؟''

''میرا خیال ہے کہ اب جانکی پرشاد اس کی باتوں میں نہیں آئے گا۔ وہ اس کی بڑی سزا بھگت چکا ہے۔ پھر یہ کہ اسے ایسا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' میری آواز بھی دھیمی ہی تھی۔

''آپ کی صحبت میں رہ کر مجھے بھی کچھ سوچنے سمجھنے اور آنکھیں کھلی رکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔'' زاہد بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ان دونوں پر کسی طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔''

''تم یہ بات کر رہے ہو تو اس کی کوئی وجہ بھی یقیناً تمہارے ذہن میں ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''تم جو کچھ سوچ رہے ہو یا جو بات تمہارے ذہن میں آ رہی ہے' بلا جھجک مجھ سے کہہ دو۔ ممکن ہے اس طرح ہم کسی بہتر نتیجے پر پہنچ سکیں۔'' میری آواز اب بھی دھیمی ہی تھی۔ اس کی وجہ جانکی پرشاد کا ڈرائیور تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہماری باتیں سن لے۔

''فرض کریں کہ ہرنارائن نے آپ سے جھوٹ بولا ہے۔'' زاہد نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشات کا اظہار کیا۔ ''سابقہ واقعات کی روشنی میں اس امکان کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا نا کہ وہ عیار آدمی ہمیں ایک بار پھر دھوکا دے سکتا ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟ آپ میرے خیال سے متفق ہیں نا؟''

''تمہاری بات سے مجھے اتفاق ہے آگے کہو۔'' میں نے جواباً کہا۔

''ہرنارائن کے جھوٹ بولنے کی صورت میں آپ کی ہمشیرہ کو علی گڑھ کی بجائے کہیں اور ہونا

چاہئے۔'' زاہد نے پھر اپنی بات شروع کی۔ ''کچھ دیر کو یہ مان لیتے ہیں کہ علی گڑھ کی بجائے آپ کی ہمشیرہ یہیں دہلی میں ہیں اور ہرنارائن نے واقعی ہمیں غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔ ایسی صورت میں ہم تو علی گڑھ روانہ ہو جائیں گے اور وہ جانکی پرشاد کو اصل بات بتا کر اپنے ساتھ ملا لے گا تا کہ اسے آپ کی واپسی تک وہاں قید نہ رکھا جا سکے۔ آپ کے خوف سے ذکیہ خاتون کو ساتھ لے کر اگر وہ دونوں ہی کہیں روپوش ہو جاتے ہیں تو پھر آپ کیا کریں گی؟ کیا انہیں اتنے بڑے ملک میں تلاش کرنا آسان ہو گا؟''

زاہد کی بات سن کر میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اس کی بات بے وزن نہیں۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں وہ نکتہ بھی آیا تھا جسے پہلے میں نظر انداز کر گئی تھی۔ یہ نکتہ زاہد کی بات ہی سے میرے ذہن میں آیا تھا۔ میں نے زاہد سے اس کا اظہار کر دیا۔ ''ایک امکان اور بھی ہے' اسے بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ہرنارائن نے جھوٹ نہیں بولا اور ذکیہ واقعی علی گڑھ میں اس کے بتائے ہوئے پتے پر ہے تو بھی ذکیہ کو ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ غائب کر سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' زاہد نے چونک کر پوچھا۔

''تمہیں یہ تو علم ہے ہی کہ ضروری نہیں ہمیں علی گڑھ کیلئے فوری طور پر کوئی ٹرین مل جائے۔ اس میں تاخیر بھی ہو سکتی ہے۔ اس دوران میں ہرنارائن' جانکی پرشاد سے ساز باز کر کے کار کے ذریعے ہم سے پہلے علی گڑھ پہنچ سکتا ہے۔'' میں نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔

''مگر اس کی کار تو اس وقت ہمارے پاس ہے۔'' زاہد نے اعتراض کیا۔

''ضروری تو نہیں کہ اس کے پاس یہی ایک کار ہو' پھر اگر ایسا ہو بھی تو یہ کار ہمیں سٹیشن پر چھوڑ کر بہرحال واپس جائے گی۔ وہ دونوں فوری طور پر ٹرین کے ذریعے ہماری روانگی سے قبل علی گڑھ کیلئے روانہ ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے' کار کے ذریعے انہیں علی گڑھ پہنچنے میں زیادہ وقت نہ لگے اور ہم سے پہلے وہ ذکیہ کو وہاں سے لے اڑیں۔''

''یہ..... پھر تو یقیناً آپ سے غلطی ہو گئی ہے اور اب..... اب اس کا ازالہ کس طرح.....''

''ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔'' میں زاہد کی بات کاٹ کر بولی۔ پھر فوراً ہی ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ''سنو ڈرائیور! ہمیں واپس کوٹھی لے چلو۔''

''جی؟'' ڈرائیور کی آواز میں حیرت تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے کار کی رفتار کم کرنا شروع کر دی تھی۔

''ہاں' ہمیں واپس چلنا ہے' جلد کرو۔'' میں نے کہا۔ پھر بات بنائی۔ ''ہم اپنی ایک ضروری چیز وہیں بھول آئے ہیں۔''

''بہتر ہے میڈم!'' یہ کہہ کر ڈرائیور نے کار روک لی اور پھر اسے واپسی کیلئے موڑنے لگا۔

کار دوبارہ قرول باغ کی طرف واپس جانے لگی تو زاہد بولا۔ ''اب آپ کیا قدم اٹھائیں گی؟''

''اب ہم کار کے ذریعے ہی علی گڑھ جائیں گے اور ہمارے ساتھ ہرنارائن بھی ہو گا۔'' میں نے طویل سانس لے کر زاہد کی بات کا جواب دیا۔ ''ایسی صورت میں تو کسی دھوکے کا امکان نہیں ہو گا نا؟'' ٹرین کی بجائے کار میں سفر کرنے کی وجہ سے یہ خدشہ بھی نہیں ہو گا کہ ہرنارائن کہیں راستے میں کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔ وہ پوری طرح ہمارے قابو میں ہو گا۔'

''بالکل ٹھیک ہے۔'' زاہد نے میری بات سے اتفاق کیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ہماری کار قرول باغ کے علاقے میں داخل ہو رہی تھی۔ مجھے اب اتنا وقت ضائع ہو جانے پر افسوس ہو رہا تھا۔ کاش پہلے ہی یہ باتیں میرے ذہن میں آ گئی ہوتیں۔

''ارے!'' اچانک میں نے کار ڈرائیور کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز سنی۔ پھر وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ''یہ تو صاحب ہی کی کار معلوم ہو رہی ہے۔''

میں ڈرائیور کی بات سنتے ہی جیسے اچھل پڑی اور دوسرے ہی لمحے ڈرائیور سے سوال کیا۔ ''تم کس کار کی بات کر رہے ہو؟''

''وہ جو ابھی کچھ فاصلے پر بائیں جانب مڑی ہے۔ میرے خیال میں وہ ہمارے صاحب ہی کی کار ہے اور..... اور جہاں تک میرا خیال ہے خود صاحب ہی اسے چلا رہے تھے۔''

''ڈرائیور جلدی کرو اسی طرف چلو جدھر تمہارے صاحب کی کار گئی ہے۔'' میں نے اسے حکم دیا۔ ''اسی طرف بتا رہے ہو نا تم؟'' میں نے سامنے بائیں جانب جانے والی ایک چھوٹی سی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے بھی اب کچھ فاصلے پر ایک کار تیزی سے جاتی نظر آ گئی تھی اور یہ یقیناً وہی کار تھی' ڈرائیور نے جس کا تذکرہ کیا تھا۔

ڈرائیور میرے حکم پر عمل کرتے ہوئے کسی قدر ناگوار سے لہجے میں کہنے لگا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا میڈم کہ آپ کیا چاہتی ہیں۔ صاحب نے مجھ سے آپ کو سٹیشن پہنچانے کیلئے کہا تھا مگر آپ آدھے راستے سے ہی پھر کوٹھی لوٹ آئیں اور اب صاحب کی کار کے پیچھے چلنے کو کہہ رہی ہیں۔ اگر میں آپ کی بات ماننے سے انکار کر دوں تو؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے کار کی رفتار کم کر دی۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہو تم..... کار کی رفتار بڑھاؤ..... وہ کار خاصی آگے نکل گئی ہے۔''

''جی نہیں' میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' اس نے کار کی رفتار بڑھانے کی بجائے اسے سڑک کے کنارے روکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو کچھ گھپلا لگ رہا ہے۔ میں بھلا آپ کے کہنے پر صاحب کی کار کا پیچھا

"کیوں کروں......نہیں جی......نن.....!"

ڈرائیور کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیوں کہ اس سے پہلے ہی میں نے پیچھے سے ان کی کنپٹی پر ایک جچا تلا ہاتھ مارا تھا۔ نتیجہ ڈرائیور کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی اور وہ سیٹ پر ڈھے گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر یہ قدم اس لیے اٹھایا تھا کہ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ ڈرائیور سے بحث و مباحثے میں آگے جانے والی کار میری نظروں سے اوجھل ہو سکتی تھی۔

"جلدی اترو زاہد۔" میں تیزی کے ساتھ کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ زاہد نے بھی کار سے اترنے میں دیر نہیں کی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "اگلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ!" پھر میں نے انتہائی سرعت سے ڈرائیور کو اس کی سیٹ سے گھسیٹ کر نیچے سڑک کے کنارے ڈال دیا اور پھر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں بیہوش ڈرائیور کو کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال سکتی۔ یہ سب کارروائی چند لمحوں میں مکمل ہو گئی تھی۔ میں نے حتی الامکان سرعت کا ثبوت دیا تھا۔

میں نے جب کار سٹارٹ کی تو کافی فاصلے پر کسی ننھے سے سرخ ستارے کی طرح آگے جانے والی کار کی عقبی سرخ روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں ہر قیمت پر ان عیاروں کی کار تک جلد از جلد پہنچ جانا چاہتی تھی۔ میرے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ جانکی پرشاد اس وقت اپنی کار میں اس جگہ جا سکتا تھا جہاں ذکیہ تھی اور میرے اندازے کے مطابق ہرنارائن چٹرجی بھی اس کے ساتھ تھا۔

میرے پاؤں کا دباؤ ایکسیلیٹر پر بڑھتا گیا اور رفتار بتانے والی سوئی سو کے ہندسے کو چھونے لگی۔ اگلی کار میں جانے والوں کو بھی غالباً تعاقب کا علم ہو گیا تھا اسی لیے انہوں نے بھی اپنی کار تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دی لیکن اس وقت تک درمیانی فاصلہ بہت کم ہو چکا تھا۔

"زاہد! ذرا میرے پرس سے ریوالور نکالنا۔" میں نے زاہد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ پرس میرے اور زاہد کے درمیان سیٹ پر پڑا تھا۔

"جی......جی!" وہ حیرت سے بولا۔ اس کی سمجھ میں یقیناً یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔

"جلدی کرو! میں اب اس کھیل کو مزید طول دینا نہیں چاہتی۔" میں تیزی سے بولی۔ میری نگاہیں اگلی کار پر جمی ہوئی تھیں۔

وقت بے وقت کیلئے میں ہمیشہ اپنا ریوالور لوڈ کر کے پرس میں رکھتی تھی۔ میری کار اور آگے جانے والی کار کے درمیان اب زیادہ فاصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ میرے ریوالور کی رینج میں تھی۔ زاہد نے جب پرس سے میرا ریوالور نکال کر مجھے دیا تو میں نے بائیں ہاتھ سے سٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے اپنی کار کو تھوڑا سا بائیں جانب موڑا۔ اسی کے ساتھ میرا دایاں ہاتھ کار کی کھڑکی سے باہر نکلا اور پھر دوسرے ہی لمحے فضا

دھماکے سے گونج اٹھی۔ میں نے آگے جانے والی کار کے ایک پچھلے ٹائر کو نشانہ لیا تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ کار کا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ دھماکہ ہوتے ہی میں نے اپنی کار کو بریک لگا دیا تھا۔ اگر میں فوری طور پر ایسا نہ کرتی تو میری کار اگلی کار سے جا ٹکراتی جو کچھ فاصلے پر رک چکی تھی۔

وقت ضائع کیے بغیر میں نے تیزی کے ساتھ اپنی کار کا دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور اب بھی موجود تھا۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر میں نے یکے بعد دیگر دو افراد کو کار سے اتر کر بھاگتے دیکھا۔ میں ان دونوں کو پہچان گئی۔ وہ جانکی پرشاد شرما اور ہرنارائن چٹرجی ہی تھے۔

"رک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گی۔" میں نے ان دونوں کو للکارا۔ اسی کے ساتھ ایک ہوائی فائر بھی کر دیا۔

بھاگتے بھاگتے اچانک جیسے ان دونوں کے پیروں میں کسی نے زنجیر ڈال دی۔ وہ رک گئے۔ میں دوڑتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی۔ میرے کہے بغیر ہی ان دونوں نے ہاتھ اٹھا لئے تھے۔ غالباً ان دونوں ہی میں سے کسی کے پاس ریوالور نہیں تھا ورنہ وہ جوابی کارروائی ضرور کرتے۔

"کتے کی دم ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔" میں نے ان دونوں کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں بھی کتے کی دم کی طرح ہو۔ آخر تم لوگ اپنی کمینگی سے باز نہیں آئے۔"

اعتراف جرم میں ان دونوں کے سر جھک گئے۔

"بولو کہاں جا رہے تھے تم لوگ؟" میں نے سوال کیا' پھر دھمکی دی۔ "اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو تمہارے جسموں کو گولیوں سے چھلنی کر دوں گی۔"

"یہ...... یہ اس نے...... ہرنارائن نے کہا تھا کہ ہم کار کے ذریعے عذرا خان سے پہلے علی گڑھ پہنچ سکتے ہیں اور......" جانکی پرشاد ہکلانے لگا۔

"اور عذرا خان کے علی گڑھ پہنچنے سے پہلے ذکیہ کو وہاں سے لے کر کہیں روپوش ہو سکتے ہیں۔"

مین نے جانکی پرشاد کی بات پوری کر دی۔ "بولو یہی منصوبہ تھا تمہارا؟"

"مم...... میرا نہیں' یہ ہر...... ہرنارائن کا منصوبہ تھا۔" جانکی پرشاد نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔

مجھ سے اپنا غصہ برداشت نہ ہو سکا اور پھر میری لات جانکی پرشاد کے پیٹ پر پڑی۔ "اور تو...... تو کمینے پھر اس کی باتوں میں آ گیا۔"

جانکی پرشاد چیختا ہوا دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس دوران میں زاہد بھی میرے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ریوالور اسے تھما دیا اور پھر جانکی پرشاد کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

مجھے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ وہ کہیں شدید زخمی نہ ہو جائے۔

جانکی پرشاد آج ہی پہلے بھی میرے ہاتھوں خاصا پٹ چکا تھا۔ دوسری بار بری طرح زدوکوب کیے جانے پر اس کی حالت ذرا ہی دیر میں قابل رحم ہوگئی۔ اس کا چہرہ لہولہان ہوگیا تھا۔ ہونٹ پھٹ گئے تھے‘ ایک رخسار اور پیشانی سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ وہ تقریباً نیم بیہوشی کی حالت میں زمین پر پڑا ہوا سسک رہا تھا۔

اب اس بات کی تصدیق ہوچکی تھی کہ ذکیہ واقعی علی گڑھ ہی میں تھی۔ ایسی صورت میں اگر میں ان دونوں کو قتل کردیتی تو ذکیہ کی بازیابی میں مجھے دقت پیش نہ آتی۔ میرا رویہ اسی لیے اب ان دونوں کیلئے انتہائی بے رحمانہ ہوگیا تھا۔ جانکی پرشاد جب اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ رہا تو میں ہرنارائن پر جھپٹ پڑی۔ لاتوں‘ گھونسوں اور ٹھوکروں نے اسے بھی کچھ ہی دیر میں حال سے بے حال کردیا۔ میری بے رحمی کے نتیجے میں ہرنارائن کے ہاتھ کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی اور تکلیف کی شدت سے وہ بیہوش ہوگیا۔ مجھ پر اس وقت جنون سا سوار تھا۔ اسی سبب مجھے فوری طور پر یہ احساس نہ ہوسکا کہ وہ بیہوش ہو چکا ہے اور میں اس کے لہولہان جسم کو روئی کی طرح دھنتی رہی۔

”یہ...... یہ بیہوش ہو چکا ہے یا پھر......“ زاہد نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کی آواز میں خوف اور ارتعاش تھا۔ شاید اسی لیے وہ اپنا جملہ پورا نہیں کرسکا تھا۔

زاہد کی بات سن کر میرے ہاتھ رک گئے۔ ہرنارائن واقعی بے ہوش ہو چکا تھا۔ پھر میں نے پلٹ کر سسکتے ہوئے جانکی پرشاد کی طرف دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے اس کی کنپٹی پر ٹھوکر ماری۔ وہ بھی بیہوش ہوگیا۔ ان دونوں کے جسموں پر شدید زدوکوب کیے جانے کے سبب اتنے زخم تھے کہ وہ طویل عرصے تک بستر علالت سے نہیں اٹھ سکتے تھے۔ میرا ذہن اس وقت تیزی سے کام کررہا تھا۔ میں اپنے آئندہ اقدامات کے متعلق سوچ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے بڑی بڑی جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے ان دونوں کے بے ہوش جسموں کو گھسیٹ کر جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دونوں اب دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکتے تھے۔ ان کے جسموں کو میں نے جھاڑیوں میں اس لیے چھپایا تھا کہ اس راستے سے گزرتے ہوئے کسی کار والے کی نظر ان پر نہ پڑے۔ ایسی صورت میں عین ممکن تھا کہ انہیں ہسپتال پہنچا دیا جاتا اور انہیں جلد ہوش آجاتا۔ ان پر کسی کی نظر نہ پڑتی تو دو تین گھنٹے بعد ہوش میں آنے کے باوجود وہ جلد ہسپتال نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اگر وہ جلد ہسپتال پہنچ جاتے تو ان کے ہوش میں آتے ہی پولیس ان سے پوچھ گچھ کرتی۔ مجھے پھنسوانے کیلئے وہ پولیس کو کوئی الٹا سیدھا بیان بھی دے سکتے تھے۔ جانکی پرشاد بہرحال دہلی کے بڑے سرمایہ داروں میں سے ایک تھا اور بارسوخ بھی تھا اس لیے فوری طور پر پولیس حرکت میں آجاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتحال میرے حق میں بہتر نہ ہوتی۔ یہ بھی امکان تھا کہ علی گڑھ پولیس کو وائرلیس پر میرے متعلق ہدایات دے دی جاتیں۔ پھر ادھر میں علی گڑھ پہنچتی‘ ادھر پولیس

مجھے حراست میں لے لیتی۔ ان تمام خدشات سے بچنے کا محفوظ طریقہ تو یہ تھا کہ میں ان دونوں کو قتل کر دیتی‘ مگر کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے میں گریز کرتی تھی۔ انہیں قتل نہ کرکے میرے لیے خطرہ تو پیدا ہو گیا تھا لیکن میں اس خطرے سے نمٹ سکتی تھی۔

”آؤ زاہد اب چلیں۔“ میں نے ان دونوں کے بیہوش جسم جھاڑیوں میں چھپا کر کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”یہ...... یہ تو لے لیں!“ زاہد نے میرا ریوالور میری طرف بڑھایا۔

”لاؤ۔“ میں نے اس سے ریوالور لے لیا۔

چند ہی قدم کے فاصلے پر سڑک کے کنارے وہ کار کھڑی تھی جس میں ہم نے یہاں تک سفر کیا تھا۔ بہتر صورت تو یہی تھی کہ میں کار کے ذریعے ہی علی گڑھ جاتی مگر مجھے راستہ معلوم نہیں تھا۔ میں نے اسی لیے ٹرین ہی کے ذریعے سفر کرنے کو ترجیح دی تھی۔ جانکی پرشاد کی کار میں صرف سٹیشن تک ہی جانا میرا مقصد تھا۔ کار کو میں وہیں چھوڑ دیتی مگر زاہد میرے ارادے سے لاعلم تھا۔ اس نے اسی لیے کار میں بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھا۔ ”کیا اب کار ہی کے ذریعے علی گڑھ تک چلنے کا ارادہ ہے؟“

”نہیں!“ میں نے کہا۔ پھر اسے اپنے ارادے سے آگاہ کرتے ہوئے مزید بولی۔ ”یہ کار یوں بھی راستے میں چیک کی جاسکتی ہے اور ظاہر ہے‘ میں یہ ثابت نہیں کرسکوں گی کہ کار میری ہی ہے۔ موجودہ حالات میں اس کار کے ذریعے سفر کرنا ہمارے لیے کسی خطرے کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے۔ تم نے شاید اس کار کے ڈرائیور کو فراموش ہی کردیا ہے جسے میں بے ہوش کرکے سڑک کے کنارے ڈال آئی ہوں۔ وہ بھی ہمارے لئے کوئی مصیبت کھڑی کرسکتا ہے۔ کیا خبر وہ ہوش میں آنے کے بعد کوٹھی کا رخ کرے اور وہاں جانکی پرشاد کو نہ پاکر تھانے چلا جائے اور کار چوری کیے جانے کی رپورٹ لکھوا دے۔“

میں نے یہ کہتے ہوئے کار کو موڑا اور پھر اسی سمت چلنے لگی جدھر سے آئی تھی۔ وہ راستہ میرے ذہن میں تھا۔ وہاں سے میں بہ آسانی ریلوے سٹیشن پہنچ سکتی تھی۔

زاہد نے میری بات سن کر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ مجھے کچھ سہما سہما دکھائی دے رہا تھا۔

ہر چند کہ اس وقت میرا ذہن بھی بڑی حد تک پرسکون نہیں تھا مگر زاہد کو گم صم دیکھ کر میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کچھ بولو نا! تم تو خاصی چہکنے والی شے ہو۔ زندگی میں اس طرح کے واقعات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ان کا دل پر اتنا اثر نہیں لیتے۔“

”ممکن ہے آپ کیلئے اس طرح کے واقعات نئے نہ ہوں مگر اب...... اب سے پہلے بھی میں ایسے واقعات سے نہیں گزرا۔“ زاہد نے صاف گوئی اور سنجیدگی سے کہا۔

”پہلے ایسے واقعات سے نہیں گزرے تھے تو کیا ہوا‘ اب گزر گئے۔ میرے ساتھ رہو گے تو

یہی عیش ہوں گے۔'' میں آہستہ سے ہنسی۔

''آپ اسے عیش کہہ رہی ہیں' حیرت ہے ارے میرا تو ڈھیروں خون خشک ہو چکا ہے۔ اگر مجھے پہلے سے یہ علم ہوتا کہ تفریح کی بجائے یہ صورتحال پیش آئے گی تو ہرگز آپ کے ساتھ دہلی آنے کی ضد نہ کرتا۔'' زاہد کا لہجہ اب قدرے معمول پر آتا جا رہا تھا۔

''اور اس پر حضور والا جیون بھر نبھانے کے دعوے فرما رہے تھے۔'' میں نے کار کو ذیلی سڑک سے بڑی سڑک پر موڑتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''اگر جیون بھر اسی طرح مجھے ساتھ نبھانا پڑا تو پھر میرے جیون کی امر کہانی وقت سے پہلے ہی دی اینڈ ہو جائے گی۔ اور میرے وجود سے جنم لینے والی آئندہ نسلیں وجود میں آئے بغیر ہی ملک عدم کی طرف ریس لگانے پر مجبور ہو جائیں گی۔ میرے اکسانے پر زاہد اب اس اصل موڈ کی طرف لوٹنے لگا۔

''مجھے اب اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔''

''کیسے فیصلے پر؟'' میں نے دانستہ انجان بن کر پوچھا تا کہ مزید بولتے رہنے سے اس کے دل کا غبار نکل جائے کیوں کہ وہ خاصی دیر محض تماشائی بنا رہا تھا' ایسے منظروں کا تماشائی جنھوں نے اس کے اعصاب پر اثر ڈالا تھا۔ میرا منشا یہ تھا کہ اس کی توجہ کسی اور طرف مبذول کر دوں تا کہ وہ نارمل ہو جائے۔

''وہی آپ کو جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ۔'' زاہد نے بظاہر منہ بنا کر کہا۔ پھر بولا۔ ''اب تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ میرا اور آپ کا نباہ ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ جہاں دو برتن ہوتے ہیں کھڑکتے ہی ہیں۔ میاں بیوی میں کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی مسئلے پر تو تو تکار ہو ہی جاتی ہے۔ فرض کریں آپ کو میں نے اپنی گھر والی بنا لیا اور کبھی کھٹ پٹ ہو گئی تو کیا ہو گا؟ آپ تو کراٹے کے ایک ہی وار میں چیں بلوا دیں گی مجھے۔''

''اسی لیے تو مغرب کی تقلید میں ہمارے یہاں بھی یہ فیشن اب بڑے گھرانوں میں عام ہوتا جا رہا ہے کہ لڑکی اور لڑکے کو اتنا موقع ضرور دیا جائے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔''

''اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ ایک دوسرے کو کچھ زیادہ ہی سمجھ لیتے ہیں' اتنا کہ پھر انہیں شادی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔'' وہ بولا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب اپنی روایات سے ہٹ کر دوسروں کی روایات اپنائی جائیں گی تو ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں۔''

''ویسے لڑکی آپ ایسی ہنٹر والی اور لڑکا مجھ ایسا شریف و مسکین ہو تو یہ آزادی دینے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے بائی داوے میں آپ کو کیسا لگا؟ آپ نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا۔ یوں بھی ہمارے مذہب میں لڑکی کی رضامندی کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اگر میں چاہوں بھی تو آپ کی مرضی کے بغیر

آپ کو اپنی گھر والی نہیں بنا سکتا کیوں کہ آپ ان لڑکیوں میں سے تو ہیں نہیں کہ بہ وقت نکاح عزیز رشتے داروں میں سے کوئی آپ کا سر پکڑ کر ہلا دے' پھر کہے کہ لڑکی نے 'ہاں' کر دی۔''

''تم مجھے خاصے لپڑ چونچ لگتے ہو۔'' میں نے بڑی سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''یہ لفظ لپڑ چونچ کس زبان کا لفظ ہے خاتون محترم؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''اور اگر زحمت نہ ہو تو اس کے معنی بھی بتا دیجئے۔''

''زحمت تو خیر ہو گی مگر تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس سے پالا پڑا تھا' بتائے دیتی ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''لپڑ چونچ کا مطلب بس لپڑ چونچ ہوتا ہے' لیکن اگر کوئی پھر بھی نہ سمجھے تو اسے آئینہ دکھایا جا سکتا ہے۔ تمہیں بھی آئینہ دیکھنے کی پوری آزادی ہے۔ دراصل اس لفظ کے معنی نہیں بتائے جاتے' یہ صرف دیکھنے کی چیز ہوتا ہے۔''

انہی خوش گپیوں میں ہم دہلی ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ کار ہم نے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر کے سامان اتار لیا۔ کار کی چابی میں نے اسی میں لگی ہوئی چھوڑ دی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح کار چوری بھی ہو سکتی تھی لیکن ظاہر ہے کہ میں اس کی پروا کیوں کرتی۔

جس وقت ہم سٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے رات کے تین بجنے والے تھے۔ انکوائری سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ کیلئے ہمیں ساڑھے تین بجے ایک ٹرین مل سکتی تھی۔ میں نے اسی ٹرین کے دو ٹکٹ لے لئے۔ ہمارے پاس اتنا زیادہ سامان نہیں تھا جسے خود اٹھانے میں دقت ہوتی۔ ہم دونوں کے پاس دو ایئر بیگ اور دو ہی سوٹ کیس تھے جنہیں ہم نے خود ہی اٹھا لیا اور دو نمبر پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ رات ہونے کے باوجود سٹیشن پر خاصی چہل پہل تھی۔ انکوائری ہی سے میں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ ہم نے جس ٹرین کے ٹکٹ لئے ہیں وہ صبح ساڑھے چھ بجے علی گڑھ پہنچے گی۔ گویا صرف تین گھنٹے کا سفر تھا۔

ہم نے کیوں کہ اب تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا اس لئے ٹرین آنے سے قبل کچھ بسکٹ وغیرہ اور چائے پر گزارہ کر لیا۔ ہر چند کہ چائے بہت بدذائقہ تھی مگر میں نے اسے حلق میں انڈیل ہی لیا۔ ٹرین کی آمد سے پہلے کئی قلیوں نے ہمارا سامان اٹھانا چاہا مگر میں نے انکار کر دیا اور وہ منہ بناتے ہوئے چلے گئے۔ اس وقت تک پلیٹ فارم پر خاصی بھیڑ ہو چکی تھی۔

ٹرین آئی تو رش دیکھ کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ قلیوں کو منع کر کے میں نے اچھا نہیں کیا تھا' لیکن ظاہر ہے اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجبوراً میں نے سامان زاہد کے حوالے کیا اور ایک ڈبے کی کھڑکی پر چڑھ گئی۔ زاہد ''ارے ارے'' ہی کرتا رہ گیا اور میں کھڑکی پر چڑھ کر ڈبے میں کود گئی۔ کیوں کہ ڈبے کے دروازے پر بے پناہ ہجوم تھا۔ اس سے گزر کر ڈبے میں گھسنا ممکن ہی نہیں تھا۔ کئی قلی اپنے سروں پر سامان لادے بیک وقت ڈبے کے دروازے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ مسافران کے علاوہ

تھے۔

''لاؤ سوٹ کیس اٹھا کر دو۔'' میں نے ڈبے کی کھڑکی سے اپنا آدھا جسم باہر نکالتے ہوئے زاہد کو مخاطب کیا۔

''میاں عورت ہو تو ایسی۔'' کسی مسافر نے اپنے ساتھی سے کہا۔ اس نے یقیناً کھڑکی کے راستے مجھے ڈبے میں گھستے دیکھا ہوگا۔

''ہاں بھئی ہاں ٹھیک کہتے ہو تم لمڈا ابھی باہر کھڑا ہے اور لمڈیا اندر بھی پہنچ گئی۔ واہ جی واہ!'' دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کی تائید میں کہا۔

''اس دوران میں زاہد نے ایک سوٹ کیس اٹھا کر مجھے تھما دیا تھا۔ میں نے سوٹ کیس لیتے ہوئے ان دونوں کو گھور کر دیکھا۔ وہ ڈبے کے سامنے ہی کھڑے تھے۔ دونوں ہی ادھیڑ عمر تھے۔

''میاں' گھور کے تو ایسے دیکھ رہی ہو کہ آنکھوں میں نگل لو گی۔ ''ایں!'' ان میں سے ایک پان چباتے ہوئے ٹھیٹ دلی والوں کے لہجے میں بولا۔ اس شخص نے بالکل لڑاکا عورتوں کی طرح ہوا میں ہاتھ نچا کر یہ جملہ اس طرح ادا کیا کہ بمشکل میں نے اپنی ہنسی روکی۔ ''میاں'' شاید اس کا تکیہ کلام تھا۔

''کیا اپنی بیوی کو بھی میاں کہتے ہو بڑے میاں؟'' میری بجائے زاہد نے اس شخص کو رگیدا۔

''کیا کہا میاں صاحب زادے۔'' وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

''میاں میں اپنی بیوی کو میاں کیوں کہنے لگا جورو کہتا ہوں میں اسے جورو۔''

''چھوڑو زاہد!'' میں نے مداخلت کی۔ ''تم بقیہ سامان دو ادھر۔ ان کے منہ لگنے سے کیا فائدہ''

''تم نے پھر مجھ سے بدتمیزی کی۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بلبلایا۔ ''تم کیا سمجھ رہی ہو مجھے۔ خاندان مغلیہ سے تعلق ہے میرا۔''

''جائز یا ناجائز؟'' زاہد سے ضبط نہ ہو سکا۔

پھر اگر وہاں موجود افراد میں بیچ بچاؤ نہ کرا دیتے تو ہاتھا پائی پر نوبت آ جاتی۔ اسی دوران میں ٹرین نے پہلی سیٹی دی اور میں نے زاہد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''دوسرا سوٹ کیس اٹھاؤ جلدی کرو ورنہ ٹرین چھوٹ جائے گی۔''

زاہد نے جلدی سے دوسرا سوٹ کیس مجھے دیا۔ پھر دونوں ایئر بیگ ڈبے کے اندر پھینک دیئے۔

''تم بھی ادھر ہی سے آ جاؤ۔'' میں نے دوسری سیٹی سن کر زاہد کی طرف ہاتھ بڑھا دیا کیوں کہ ڈبے کے دروازے پر اب بھی خاصا رش تھا۔

زاہد نے میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر وہ بھی کھڑکی پر چڑھ کر ڈبے میں آ گیا۔ چند ہی لمحے بعد تیسری سیٹی ہوئی اور ٹرین حرکت میں آ گئی۔

ڈبے کے اندر خاصی گھچا پچ تھی۔ ایک لحیم شحیم عورت اپنے کوئی درجن بھر بچوں سمیت پوری ایک سیٹ گھیرے بیٹھی تھی اور ایک منحنی سا آدمی ان بچوں میں ایک کو سیٹ پر سے اٹھا کر خود اس جگہ بیٹھ رہا تھا۔ اس نے عورت سے کہا۔ ''ارے بیگم! انہیں گن تو لو کہیں کوئی رہ نہ گیا ہو۔'' بچے ایک دوسرے پر لدے ہوئے تھے۔ دو بچوں کو ان میاں بیوی نے اپنی گودوں میں بٹھایا ہوا تھا۔

عورت فوراً بچوں کو گننے لگی۔ میں اور زاہد سامنے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں کھڑکی کے قریب تھی' پھر زاہد بیٹھا تھا کیوں کہ اس سیٹ پر بقیہ دو افراد مرد تھے۔ زاہد کو شرارت سوجھی۔ اس نے عورت سے کہا۔ ''انہیں تو آپ نے گنا ہی نہیں۔'' زاہد کا اشارہ عورت کے شوہر کی طرف تھا۔

زاہد کی بات سن کر میری ہنسی چھوٹ گئی اور بقیہ دو مسافر بھی ہنسنے لگے۔ عورت برقع اوڑھے ہوئے تھی مگر نقاب اٹھی ہوئی تھی۔

عورت نے تو زاہد کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کا شوہر تنتنا گیا۔ ''میں تمہیں بچہ نظر آ رہا ہوں' میں۔''

''ہرگز نہیں' میں نے کب کہا آپ کو بچہ۔'' زاہد شوخ لہجے میں بولا۔ ''آپ تو مجھے بالکل بوڑھے لگ رہے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔''

''اے خدا نہ کرے تیرے منہ میں خاک۔'' عورت بھی چیخ اٹھی۔ ''قبر میں پاؤں لٹکائیں میرے ہوتے سوتے...... اللہ نظر بد سے بچائے ابھی تو جوان ہیں یہ۔''

''مگر محترمہ یہ راز کی بات آپ کو سرعام تو نہیں کہنا چاہیئے نا۔'' زاہد پھر باز نہ آیا اور اس بار بھی بڑا بھرپور قہقہہ پڑا۔

''ارے بیگم تم نقاب ڈال کر دوسری طرف منہ پھیر لو' یہ مجھے کوئی لچا لفنگا معلوم ہوتا ہے۔'' منحنی شوہر نے اپنی لحیم شحیم بیوی سے کہا۔

''بس کرو زاہد' بہت ہو گیا۔'' میں ہنستے ہوئے بولی۔ ''ان غریبوں کو نہ ستاؤ۔''

''غریب ہو گی تو۔'' عورت جو اپنے شوہر کے مشورے پر نقاب ڈال چکی تھی دوبارہ نقاب اٹھا کر مجھ سے الجھ پڑی۔ ''اری تو سمجھ کیا رہی ہے ہمیں۔ ہم کیوں غریب ہوتے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ غریب ہوگا تیرا یہ لچا شوہر۔'' اس نے زاہد کی طرف اشارہ کیا۔ ''بے حیا کہیں کی' شوہر کا نام لیتی ہے۔''

''لو زاہد تمہیں ابھی سے لچے شوہر کا خطاب مل گیا' مبارک ہو۔'' میں نے زاہد سے سرگوشی کی۔

اس عورت کی بات کو میں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

''کیسی کھسر پھسر کر رہی ہے اپنے میاں سے اب۔ کر دیا نا میں نے وال خانہ بند۔'' وہ عورت میرے جواب نہ دینے سے اور بھی شیر ہو گئی۔

''دیکھو اب زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں خاموش بیٹھو۔'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''ورنہ تم انہیں نہیں جانتیں' یہ بڑی خطرناک شے ہیں۔'' زاہد فوراً بول اٹھا۔ ''اگر اب تم نے کچھ کہا تو یہ تمہاری چھٹنکی میاں کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیں گی۔''

''ہائے کیا کہا تو نے مجھے۔ چھٹنکی...... میں تجھے ابھی بتاتا ہوں ذرا ہٹیو تو گلو کی ماں ادھر میں دیکھتا ہوں اس لفنگے کو۔'' منحنی شوہر خود کو چھٹنکی کہنے پر آپے سے باہر ہو گیا۔ بے چارے بچے سہم کر رہ گئے اور مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ بات نہ بڑھے' یہ سوچ کر میں نے اس شخص سے معذرت کی۔ ''معاف کر دیجئے' غلطی ہو گئی۔''

''بس پھر اپنے شوہر کو لگام دے کر رکھ ورنہ اب اس نے کچھ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا میں بہت خراب آدمی ہوں۔''

''وہ تو صورت ہی سے ظاہر ہو رہا ہے۔'' زاہد بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''پھر بتاؤں ابھی۔'' اس نے زاہد کی طرف دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔ ''اگر تیری بیوی معافی نہ مانگ لیتی تو ہڈی پسلی ایک کر دیتا ابھی۔''

''وہ تو کانپ ٹھڈے بتا رہے ہیں تمہارے۔ ہڈیاں گوشت چھوڑ کر باہر آ رہی ہیں۔'' زاہد بھی ترکی بہ ترکی بولا۔

''چپ ہو جاؤ نا زاہد۔'' میں نے زاہد کا ہاتھ دبایا' پھر آہستہ سے بولی۔ ''ذرا بچوں کی طرف دیکھو غریب کیسے خوف زدہ سے بیٹھے ہیں۔''

آہستہ بولنے کے باوجود بھی اس لڑاکا عورت نے میری بات سن لی اور چیخ کر اپنی کرخت آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''کیوں ری تو نہیں مانے گی پہلے تو مجھے اور میرے میاں کو غریب کہہ رہی تھی اب اگر تو نے میرے بچوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو تیری چٹیا پکڑ کے گھما دوں گی تجھے۔''

''اپنی بیگم کو سمجھا لیں' یہ حد سے بڑھ رہی ہیں۔'' میں نے اس عورت کو کوئی جواب دینے کی بجائے اس کے شوہر سے شکایت کی۔

''جیسا کہو گی بی بی' ویسا سنو گی۔ میں کیا کر سکتا ہوں تم جانو یہ جانیں۔'' وہ شخص رکھائی سے بولا۔ شاید وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ میں اس کی بیوی سے دب گئی ہوں اور اس کے ڈیل ڈول نے مجھے متاثر کر دیا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو شہہ دینے کی خاطر مزید کہا۔ ''عورتوں کے جھگڑے میں مرد نہیں بولتے' نہ میں تمہیں کچھ کہنے سے روک رہا ہوں نہ انہیں۔ مجھے درمیان میں نہ گھسیٹو تم اپنا جھگڑا خود نمٹاؤ۔''

''تو پھر ہو جائے ایک فری سٹائل مقابلہ۔'' زاہد چہکا۔ ''میری طرف سے پوری اجازت ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو تم۔'' میں نے زاہد کو گھور کے دیکھا۔ ''بہتر یہ ہے کہ اب تم خاموش ہی رہو۔ یہ سارا جھگڑا تمہیں نے کھڑا کیا ہے۔''

''میں اسی لیے تو اس جھگڑے کو بٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دو چار کراٹے کے ہاتھ کھا کر اس ڈبل ڈیکر کے دماغ کے کیڑے جھڑ جائیں گے۔'' زاہد اس عورت کی طرف دیکھ کر بولا۔

میں سمجھ گئی کہ زاہد نے دانستہ اس عورت کو چڑانے کیلئے یہ بات کہی ہے اس لیے فوراً پینترا بدل لیا اور اس عورت سے مخاطب ہوئی۔ ''بہن ان کی بات کا برا نہ ماننا' ان کا دماغ کچھ چلا ہوا ہے۔ اگر تمہیں ان کی بات سے تکلیف ہوئی ہے تو میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔''

''جب تک یہ تمہارے پیر پکڑ کر معافی نہ مانگیں' ہرگز معاف نہ کرنا۔'' زاہد نے اس عورت سے کہا۔

''ارے چپ بیٹھا رہ بس۔'' خلاف توقع وہ عورت میری حمایت کرنے لگی۔ ''یہ بے چاری مجھے کسی شریف گھر کی لگتی ہے' تو ہی لچا اس سے جڑ گیا ہے۔''

''ہائے ابھی کہاں یہ واقعہ پیش آیا ہے فی الحال تو حسرت ہی میں دن گزر رہے ہیں۔''

میں نے یہ بات محسوس کر لی کہ زاہد نے اپنی حماقت آمیز باتوں سے مجھے بھی تماشا بنا دیا ہے۔ اب ان میاں بیوی کی بجائے ہماری سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں مسافر ہمیں دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ اسی سبب ان مسافروں میں سے ایک نے زاہد کو مخاطب کیا۔ ''کیوں بھئی ابھی صرف نکاح ہوا ہے' رخصتی نہیں ہوئی؟''

یقیناً زاہد کو بھی اب خیال آ گیا کہ اس نے میرے ساتھ خود کو بھی تماشا بنا لیا ہے۔ وہ اسی لیے فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے غالباً میرے چہرے پر بھی ناگواری کے آثار دیکھ لیے تھے۔ جس شخص نے زاہد کو مخاطب کیا تھا' اس کی بات پی جانا ہی غنیمت تھا اور زاہد نے اپنے رویے سے اس شخص کو کوئی جواب نہ دے کر یہی ظاہر کیا تھا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

وہ عورت یقیناً عقل سے پیدل ہی تھی۔ وہ حقیقتاً یہی سمجھی کہ زاہد پاگل ہے۔ اس نے اسی لیے مجھ سے ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا شروع ہی سے تمہارے میاں کا دماغ چلا ہوا ہے' بہن یا کچھ دن ہوئے ہیں؟ ویسے صورت سے تو بالکل ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔''

''پہلی بات تو یہ سن لیں کہ میں ان کی بیوی نہیں ہوں۔'' میں نے عورت کی غلط فہمی دور کر دی۔

"کیا؟" وہ عورت حیرت سے بولی۔ "اتنی دیر سے میں اور یہ" اس کا اشارہ اپنے شوہر کی طرف تھا۔ "اسے تمہارا میاں کہہ رہے ہیں مگر تم نے یا اس نے پہلے تو کچھ نہیں کہا۔"

"یہ میری خالہ کے بیٹے ہیں اور یہ بھی بتا دوں کہ میں عمر میں بھی بڑی ہوں ان سے۔" میں نے مزید کہا۔

"مگر تم لگتی نہیں ہو بڑی...... جوڑ تو لگتا ہے' تم دونوں کا۔" وہ عورت کہے گئی۔ "دو ایک سال سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہاں۔" اس کا انداز رازدارانہ تھا۔ "لڑکا اچھا ہے' اپنے ماں باپ سے کہہ کر بات پکی کرالو۔" پھر اچانک اسے کچھ خیال آ گیا۔

"اے لو میں بھی نگوڑی کیسی بات کر رہی ہوں۔ یہ تو پاگل ہے۔"

پھر میں نے بڑی مشکل سے نیند آنے کا بہانہ کر کے اس باتونی عورت سے اپنی جان چھڑائی اور سچ مچ بند کھڑکی سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ بار بار اس عورت کے پاگل کہنے پر زاہد کا چہرہ متغیر ضرور ہوا تھا مگر وہ ضبط کر گیا۔ کچھ بولا نہیں تھا۔

"اب مجھے پاگل بنا کر خود خواب خرگوش کے مزے تو نہ لیں۔" چند ہی لمحے بعد زاہد نے سرگوشی کی۔ "میں آپ کو اطمینان سے نہیں سونے دوں گا ہاں۔"

"اگر میں نے آنکھیں کھول دیں تو یہ عورت پھر بکواس شروع کر دے گی۔" میں آنکھیں بند کیے ہوئے' بہت دھیمی آواز میں بولی' یوں جیسے سوتے میں بڑبڑا رہی ہوں۔

"کچھ بھی ہو' میں تو بور ہو جاؤں گا۔" زاہد کی سرگوشی مجھے پھر سنائی دی۔

اسی وقت گاڑی کسی چھوٹے سے سٹیشن پر رکنے لگی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ بیٹھے بیٹھے ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا اس لیے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں چلیں خاتون؟ ابھی تو علی گڑھ بہت دور ہے۔" میرے سیٹ سے اٹھتے ہی زاہد کہنے لگا۔

"معلوم ہے مجھے۔" میں بولی۔ "آؤ ذرا دروازے تک ہی ہو آئیں' کچھ تو فضا بدلے گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے اس عورت کی طرف دیکھا جو میری سامنے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت اپنے ایک بچے کو گود میں لٹا کر تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میرے کہنے پر زاہد بھی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈبے میں بہت ہجوم تھا۔ لوگوں نے اپنا ساز و سامان بھی راستے ہی میں رکھا ہوا تھا۔ میں اور زاہد بمشکل دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ مگر وہاں بھی یہی عالم تھا۔ بند دروازے کے سامنے لوگ اپنے اپنے بکسوں اور دیگر سامان پر نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔

"فضا بدلنا مشکل ہے خاتون! صبر کریں۔" زاہد نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"ہاں صبر ہی کرنا پڑے گا فی الحال تو لیکن ذرا یہ سوچو کہ کسی کو اگر کہیں اترنا ہوا تو وہ کس طرح اترے گا یہاں تو راستہ ہی نہیں۔" میں بولی۔

"لوگ جب کھڑکیوں کے ذریعے ڈبوں میں کود سکتے ہیں تو باہر بھی نکل سکتے ہیں۔" زاہد نے مسکرا کر جواباً کہا۔ اس طرح اس نے مجھ پر فقرہ چست کیا تھا۔ رش کی وجہ سے دہلی ریلوے سٹیشن پر مجھے یہی راہ اپنانا پڑی تھی۔

ہم دونوں واپس ہو رہے تھے تو راستے میں ایک نوجوان نے دانستہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ایسی حرکت کی کہ مجھے غصہ آ گیا۔ ہجوم میں بعض نوجوان موقع سے فائدہ اٹھا کر ایسی ہی گھٹیا حرکتیں کر گزرتے ہیں اور عموماً شریف خواتین اپنی رسوائی کے خوف سے خاموش ہی رہتی ہیں۔ ایسی گھٹیا ذہنیت رکھنے والے نوجوانوں اور مردوں کو میں معاف کرنے کی قائل نہیں تھی۔ میں نے اسی لیے پلٹ کر اس نوجوان کا شانہ پکڑ لیا۔ "اے ادھر دیکھو۔"

اس نے جیسے ہی پلٹ کر دیکھا' چٹاخ کی آواز سے سارا ڈبہ گونج اٹھا۔ اس کے منہ پر پڑنے والا میرا تھپڑ اتنا ہی زوردار تھا۔ وہ نوجوان ہکا بکا سا رہ گیا۔

"آئندہ جب بھی تمہارے دل میں کسی عورت پر دست درازی کی ناپاک خواہش پیدا ہو تو یہ تھپڑ یاد کر لینا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا' پھر بولی۔ "دفع ہو جاؤ۔"

اس نوجوان کی شامت اعمال ہی نے آواز دی تھی کہ وہ اپنی ذلیل حرکت پر شرمندہ ہونے کی بجائے مجھ سے الجھ پڑا۔ اسی دوران میں گاڑی چل پڑی۔ ہر طرف سے "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ وہ نوجوان اکیلا نہیں تھا' اس کے کئی اور ساتھی بھی اردگرد موجود تھے۔ شاید اسی لیے اسے مجھ سے الجھنے کی ہمت ہو گئی تھی۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب زاہد نے مداخلت کی۔ نوجوان کے ایک ساتھی نے اس پر ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ جواباً زاہد بھی اس سے گتھ گیا تھا۔ اچانک ایک مخصوص آواز سن کر میں چونک اٹھی' یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے گراری والا چاقو کھلنے کی آواز واضح طور پر پہچان لی تھی۔ میں تیزی کے ساتھ اس طرف گھومی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ان نوجوانوں کے پاس کوئی ہتھیار بھی ہو گا اور نہ یہ توقع تھی کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔ زاہد کی یہ خوش قسمتی ہی تھی کہ جس نوجوان نے اسے مارنے کیلئے چاقو کھولا تھا' اس پر فوراً ہی میری نظر پڑ گئی۔ وہ قریب ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ زاہد کے پہو میں چاقو اتار دیتا' میں نے تیزی سے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی پھر ایک ہی جھٹکے میں چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ اسے شاید کسی عورت سے یہ امید نہ رہی ہو گی اسی لیے اس کے چہرے پر حیرانی تھی۔ ایک وہی کیا' اردگرد موجود جتنے لوگوں نے بھی یہ ناقابل یقین منظر دیکھا تھا' ان کے چہروں

سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نوجوان کی کلائی چھوڑ کر میں فوراً جھکی اور کھلا ہوا چاقو اٹھا لیا۔ زاہد جس نوجوان سے گتھم گتھا تھا' میں نے اس کی پشت پر چاقو کی نوک رکھ دی۔

''الگ ہٹ جاؤ ورنہ.....'' اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر میں نے چاقو کی نوک کا دباؤ بڑھا دیا' پھر میں نے کہا۔

''میرے ہاتھ میں چاقو ہے۔'' میرے لہجے میں دھمکی تھی۔

ممکن ہے کہ ڈبے میں موجود لوگ بیچ بچاؤ کرا دیتے مگر کھلا ہوا چاقو دیکھ کر سبھی سمٹ کر دور ہو گئے تھے۔ اس نوجوان کے علاوہ جس کے منہ پہ میں نے زوردار تھپڑ مارا تھا' اس کے تین ساتھی اور تھے۔ چار تو وہ اور دو میں اور زاہد' ہم چھے افراد بقیہ بھیڑ سے الگ ہو گئے تھے۔ ہمارے گرد لوگ ایک دائرے کی صورت میں کھڑے تھے۔

جو نوجوان زاہد سے بھڑا ہوا تھا' اس پر میری دھمکی کا فوراً اثر ہوا۔ وہ الگ ہٹ گیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر زاہد نے اس کے منہ پر ایک گھونسا جڑ دیا۔ میں دانستہ اس طرح کھڑی ہوئی تھی کہ وہ چاروں نوجوان میرے سامنے رہیں۔ چاقو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اس لیے ان میں سے کسی میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''تم پیچھے ہٹ جاؤ زاہد۔'' میں نے زاہد کو ہاتھ سے پیچھے ہٹا دیا' پھر ان نوجوانوں سے بولی۔

''آؤ آگے بڑھو! میں بھی تو دیکھوں تمہاری ماؤں نے تمہیں کتنا دودھ پلایا ہے۔''

''بات نہ بڑھاؤ لڑکی۔'' ان میں سے وہی نوجوان ہتک آمیز لہجے میں بولا۔ ''میرا چاقو مجھے واپس کر دو ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ تم ہمیں نہیں جانتیں ورنہ یہ جرأت کبھی نہ کرتیں۔''

''کیوں' کیا تم بڑے پھنے خاں ہو؟ ہمت ہے تو چھین لو مجھ سے چاقو! جس طرح میں نے تم سے چھینا تھا۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' وہ غرایا۔ ''تو پھر سنبھلو!'' یہ کہتے ہی وہ میری طرف جھپٹا۔

اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب پہنچتا میری دائیں ٹانگ بلند ہوئی اور اس کے پیٹ پر پڑی۔

ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ چیخ مارتا ہوا نیچے گر پڑا۔

میں سمجھ گئی تھی کہ ان نوجوانوں میں وہی زیادہ ''دادا گیر'' تھا۔ اس کا ایک ثبوت اس کے پاس چاقو کی موجودگی بھی تھی۔ لوگ تو تصویر حیرت بنے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے اور انتہائی تعجب کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی یہ جھگڑا ختم کرانے کی عملی کوشش تو کجا زبانی طور پر بھی کچھ نہیں کر رہا تھا۔

''تم میں سے کسی اور کے دل میں حسرت ہے زمین چاٹنے کی؟'' میں نے بقیہ تینوں نوجوانوں سے کہا۔

ان تینوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا' کوئی بھی کچھ نہ بولا' ہاں مجھے کینہ توز نظروں سے وہ سب ضرور گھورتے رہے۔ وہ نوجوان اب کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے پیٹ پر میں نے لات ماری تھی۔ میرے نزدیک اب ان میں سے کسی کے پاس وہ چاقو رہنا اچھا نہیں تھا۔ وہ پھر کسی حماقت کے مرتکب ہو سکتے تھے۔ یہی سوچ کر میں نے کھڑکی کے سامنے بائیں جانب کھڑے ہوئے ایک آدمی کو ہٹایا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ گراری والا چاقو چلتی ہوئی ٹرین سے باہر پھینک دیا۔

وہ نوجوان میرے ہاتھوں خاصے ذلیل ہو چکے تھے۔ انہیں ان کے کیے کی خاصی سزا مل چکی تھی اس لیے میں اب بات کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ میں نے بارہا مواقع پر یہ بات محسوس کی ہے کہ کسی فرد کی بجائے عوت کے ہاتھوں پٹ کر مرد حضرات اپنی سبکی زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ اسی کا اظہار ان نوجوان کے چہروں سے ہو رہا تھا۔

میں زاہد کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ رہی تھی کہ عقب سے ایک نوجوان کی آواز سنائی دی۔ ''ہم دیکھ لیں گے تمہیں' علی گڑھ آنے دو۔''

یہ سن کر میں چونک اٹھی کیوں کہ مجھے بھی علی گڑھ ہی کے سٹیشن پر اترنا تھا۔ ان نوجوانوں کو میں نے پلٹ کر قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ انہیں بھی علی گڑھ جانا ہے۔

''ایک عورت کو دھمکی دیتے ہو شرم آنا چاہیے تمہیں۔'' کسی نے ان نوجوانوں کو ملامت کی پھر دوسرے لوگ بھی انہیں سمجھانے بجھانے لگے۔

میں لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی زاہد کو ساتھ لیے واپس اپنی سیٹ پر آ گئی۔ جھگڑے میں زاہد کے کپڑے پھٹ گئے تھے اس لیے وہ اپنا سوٹ کیس اتار کر کپڑے نکالنے لگا۔ ہماری سیٹ پر بیٹھے ہوئے بقیہ دو مسافروں کو بھی جھگڑے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ زاہد سے جھگڑے کی وجہ پوچھنے لگے۔ لحیم شحیم عورت کا منحنی شوہر بھی پچھلی رنجش بھول کر زاہد سے ہمدردی جتانے لگا۔ اسی وقت اس کی بیوی نے آہستہ سے کچھ کہا۔ وہ اپنے شوہر سے مخاطب تھی۔ میں نے اس کی بات سن لی مگر پی گئی۔ وہ جھگڑے کا سب زاہد کے مفروضہ پاگل پن کو بتا رہی تھی۔

علی گڑھ سٹیشن پر وہ نوجوان کوئی ہنگامہ کھڑا کر سکتے ہیں' مجھے اس کا اندازہ تھا لیکن ظاہر ہے میں ڈرنے والی نہیں تھی۔ زاہد باتھ روم میں جا کر کپڑے بدل آیا۔

''تمہیں مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں تھی' میں خود ان سے نمٹ لیتی۔'' میں نے زاہد سے کہا۔ ''تم تو اچھی طرح جانتے ہو مجھے۔''

''بس جب اس کمینے نے آپ کا تھپڑ کھا کر مزید زبان درازی کی اور الٹا آپ کو قصور وار ٹھہرایا کہ آپ خود بدکردار ہیں اور..... تو پھر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا' میں اس پر ہاتھ چھوڑ بیٹھا۔ مجھے اندازہ

نہیں تھا کہ پیچھے اس کا ایک اور ساتھی کھڑا ہے۔ اس نے عقب سے مجھے جکڑ لیا تھا۔ پھر ظاہر ہے مجبو مجھے بھی ہاتھ پاؤں چلانا پڑے۔'' زاہد نے اپنی صفائی پیش کی۔

''خیر جو ہو گیا' اب آئندہ کیلئے ایک بات اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھالو۔'' میں زاہد سمجھانے لگی۔ ''جب تک تم میرے ساتھ ہو کسی ایسی صورت حال میں مداخلت نہیں کرو گے۔''

''یہ اگر آپ کا حکم ہے تو پھر ماننا ہی پڑے گا۔'' وہ طویل سانس لے کر بولا۔

''ہاں تم اسے میرا حکم ہی سمجھ لو کیوں کہ آئندہ بھی ایسے مراحل پیش آ سکتے ہیں۔''

''غالباً وہ لوگ بھی علی گڑھ ہی جا رہے ہیں۔ انہوں نے......''

''ہاں!'' میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''وہاں اتر کر وہ کوئی گڑبڑ کر سکتے ہیں۔ تم کوشش کرنا کہ الگ تھلگ رہو۔''

''اور اگر کوئی خود ہی مجھ سے بھڑ گیا تو؟'' زاہد نے سوال کیا۔

''اول تو میں انہیں یہ موقع ہی نہیں دوں گی کہ وہ تمہاری طرف متوجہ ہو سکیں' پھر بھی ایسا ہو جائے تو ظاہر ہے تمہیں اپنا دفاع تو کرنا ہی پڑے گا۔''

زاہد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر فکر و پریشانی کے آثار تھے۔ اس کا سبب مجھے معلوم تھا۔ وہ بہر حال ایک شریف نوجوان تھا۔ پہلے بھی یقیناً ایسے حالات سے اس کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے اس کی توجہ ممکنہ جھگڑے سے ہٹانے کیلئے اس پر فقرے بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی جواب دینے لگا اور میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی۔

مقررہ وقت پر ٹرین علی گڑھ اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ میں پہلے ہی اوپر سے سامان اتار چکی تھی۔ ٹرین کے آہستہ ہوتے ہی کئی قلی ہمارے ڈبے میں چڑھ آئے تھے۔ میں نے مصلحتاً ایک قلی کر لیا۔ دونوں سوٹ کیس اس نے اپنے سر پر رکھ لیے اور ایئر بیگ شانوں سے لٹکا لیے۔

میں قلی کے پیچھے ڈبے سے اتر رہی تھی کہ عقب سے ایک آواز ابھری۔ ''اے راجیش مزہ آ گیا وہ بھی یہیں اتر رہی ہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ آواز انہی نوجوانوں میں سے کسی ایک کی تھی جن سے میرا جھگڑا ہوا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے اور میں نے زاہد کا ہاتھ تھام لیا۔

ٹرین وہاں زیادہ دیر نہیں رکی۔ میں اور زاہد قلی کے ساتھ سٹیشن کے ایک گیٹ سے باہر نکل رہے تھے کہ ٹرین چھوٹ گئی۔ میں اپنی اطراف سے پوری طرح چوکنا تھی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ نوجوان کچھ فاصلے سے ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ ان کے پاس سامان برائے نام تھا اس لیے انہوں نے کوئی قلی بھی نہیں کیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ طالب علم تھے اور علی گڑھ سے دو ایک روز کیلئے

دہلی تفریح کرنے گئے تھے۔

سٹیشن کی عمارت سے باہر نکل کر میں نے کچھ سوچتے ہوئے قلی سے اپنا سامان نیچے رکھوا لیا۔

''کیوں جی' کیا کوئی سواری نہیں چاہیے؟'' میں قلی کو اس کی اُجرت دینے لگی تو وہ بولا۔

''نہیں' ابھی نہیں۔'' میں نے اسے مختصر سا جواب دیا' پھر پوچھا۔ ''یہ بتاؤ یہاں سٹیشن کے قریب کوئی ہوٹل وغیرہ ہے؟''

قلی کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک سائیکل رکشا والا قریب آ کر بولا۔ ''ہاں جی' ریلوے روڈ پر کئی ہوٹل ہیں اور ٹھنڈی سڑک پر بھی ایک اچھا ہوٹل ہے۔ اس کے علاوہ ایک مسافر خانہ بھی ہے۔''

دہلی بھر کے متعدد ہوٹلوں میں میرا قیام رہ چکا تھا' لیکن آج تک کسی مسافر خانے میں ٹھہرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں نے چینج کی خاطر زاہد سے کہا۔ ''کیوں' کیا خیال ہے' مسافر خانے ہی میں کیوں نہ ٹھہرا جائے۔''

''ہاں جی! اس میں پیسے بھی بہت کم لگیں گے۔'' رکشہ والا بول اٹھا۔

''مسافر خانے میں ٹھہریں گی آپ؟'' زاہد حیرت سے بولا۔

''کیوں' کیا مضائقہ ہے۔ وہاں آدمی ہی ٹھہرتے ہیں نا۔'' یہ کہہ کر میں نے رکشہ والے سے سامان اٹھانے کو کہا اور پھر ادرگرد نگاہ دوڑائی' کچھ ہی فاصلے پر مجھے وہ نوجوان نظر آ گئے۔ وہ ہماری ہی طرف تیز قدمی سے بڑھ رہے تھے۔

ٹرین سے جو مسافر اترے تھے وہ مختلف سائیکل رکشوں' تانگوں اور یکوں میں بیٹھ کر وہاں سے جا چکے تھے۔ قلی بھی چلا گیا تھا۔ سامنے ہی تانگا سٹینڈ نظر آ رہا تھا مگر وہاں اس وقت صرف ایک تانگا کھڑا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور یوں بھی علی گڑھ ایسے شہر میں زیادہ ٹریفک نہیں ہوتا۔ وہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جہاں صبح ہی صبح زیادہ ٹریفک کا سوال ہی نہیں تھا۔ ایک سائیکل رکشہ بھی کچھ فاصلے پر کھڑا تھا مگر رکشہ والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ آس پاس ہمارے رکشہ والے' میرے اور زاہد کے علاوہ وہی چاروں نوجوان نظر آ رہے تھے۔

جلد ہی وہ چاروں ہمارے قریب پہنچ گئے۔ میں نے دانستہ پہل نہیں کی۔ رکشہ والا اس عرصے میں ہمارا سامان رکشے میں رکھ چکا تھا اور اب ہمارے رکشے میں بیٹھنے کا منتظر تھا۔

ان نوجوانوں میں سے ایک نے مجھے یا زاہد کو مخاطب کرنے کی بجائے رکشہ والے سے کہا۔

''اے! ان کا سامان نیچے پھینک دے' تیرے رکشہ میں ہم جائیں گے۔''

''م...... مگر جناب' میں ان سے بات کر چکا ہوں اور...... پھر آپ تو چار آدمی ہیں' رکشہ میں کس طرح جا......''

"بکواس نہ کر جو کچھ تجھ سے ہم کہہ رہے ہیں وہ کر۔" یہ کہتے ہوئے اس نوجوان نے رکشہ والے پر ہاتھ اٹھا دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ رکشہ والے کے منہ پر پڑتا' میں نے جھپٹ کر اس نوجوان کا ہاتھ پکڑ لیا اور غرائی۔ "اس غریب سے کیوں الجھ رہے ہو' مجھ سے بات کرو نا۔"

وہ تو یہ چاہتے ہی تھے کہ کسی بہانے جھگڑا کھڑا ہو جائے اور انہیں موقع مل گیا' مگر میں پہلے ہی سے چوکنا تھی۔ ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہی تھی' دوسرا مجھ پر جھپٹا تو میں نے اپنی جگہ سے اچھل کر اپنا نشان قدم اس کے سینے پر ثبت کر دیا۔ وہ چیخ مار کر زمین پر گرا۔ اسی وقت پہلے نوجوان نے میری گرفت سے ہاتھ چھڑانے کیلئے زور لگایا۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ پکڑے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کے شانے پر کھڑی ہتھیلی ماری اور وہ بھی چیختا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ بقیہ دو نوجوان مجھ پر حملہ آور ہوتے میں نے انہیں بھی یکے بعد دیگرے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ ایک کے پیٹ میں میری کہنی کی ضرب لگی تھی اور دوسرے کے پیٹ پر بھرپور لات۔

"اٹھو بہادرو! پھر کوشش کرو ایک بار۔" میں نے ان میں سے ایک کو ٹھوکر مار کر لمبا لٹا دیا۔ دوسرا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا کراہ رہا تھا۔

اسی وقت سٹیشن کی عمارت سے ایک سپاہی باہر نکلا اور دور ہی سے للکارا۔ "یہ کیا غنڈہ گردی ہو رہی ہے یہاں۔"

میں نے اس کی آواز سن کر ہی اس طرف دیکھا تھا۔ سپاہی پر نظر پڑتے ہی وہ چاروں نوجوان اٹھ کر بھاگنے لگے۔

"رک جاؤ!" سپاہی نے پھر انہیں صدا لگائی' مگر وہ نہ رکے۔ اس کوشش میں ایک نوجوان کچھ دور جا کر گر بھی گیا۔ اس نوجوان کے ساتھیوں نے اسے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ نتیجتاً وہ پولیس والے کے ہتھے چڑھ گیا۔ پھر پولیس والا مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا بات تھی؟

میں نے ٹرین میں ان نوجوانوں سے جھگڑے کا ذکر گول کر دیا اور صرف یہیں پیش آنے والا واقعہ بتا کر رکشہ والے سے اس کی تصدیق کرا دی۔

"غنڈہ گردی کرتے ہو ہیں...... عورتوں کو چھیڑتے ہو۔" پولیس والے نے اس نوجوان کو دھول جماتے ہوئے کہا۔ "چلو تھانے۔"

پولیس والا اس نوجوان کو لے کر چلا گیا تو میں رکشہ میں بیٹھ گئی اور میرے اشارے پر زاہد بھی میرے قریب آ بیٹھا اور رکشہ چل پڑا۔

"اس وقت تم نے ذہین اور فرماں بردار بچوں کی طرح میرا حکم مان کر مجھے خوش کر دیا ہے۔"

میں نے زاہد کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم خاموشی سے دور کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔"

"آپ نے اس خادم کو کارگزاری دکھانے کا موقع ہی نہیں دیا۔" وہ بھی جواباً مسکرا کر بولا۔

"ویسے وہ نوجوان بھی ہمیشہ یاد رکھیں گے آپ کو اور آئندہ کسی عورت سے الجھتے ہوئے سو دفعہ سوچیں گے کہ کہیں وہ آپ کی طرح ہنٹر والی حسینہ نہ ہو۔"

زاہد کی بات سن کر میں ہنسنے لگی۔ رکشہ کچھ دور چل کر بائیں جانب مڑا اور رکشہ والا نیچے اتر گیا۔ سامنے ہی چڑھائی نظر آ رہی تھی۔ رکشہ والا رکشہ کا ہینڈل پکڑے پیدل اسے کھینچ رہا تھا۔

"ٹھہرو!" میں نے رکشہ والے کو مخاطب کیا۔ "ہم لوگ اترے جاتے ہیں۔"

مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگا تھا کہ میں اور زاہد رکشہ میں بیٹھے رہیں اور غریب رکشہ والا ہانپتے ہوئے پیدل ہمارا بوجھ کھینچتا رہے۔ میرے کہنے پر رکشہ والا رک گیا۔ میں اور زاہد رکشہ سے اتر کر اس کے ساتھ پیدل چلنے لگے۔ اسی دوران میں رکشہ والے نے مجھ سے کہا کہ آپ نے سٹیشن سے باہر نکلنے کیلئے غلط گیٹ کا انتخاب کیا۔ اگر آپ کو مسافر خانے ہی جانا تھا تو دوسرے گیٹ سے نکل کر ریلوے پل عبور کرنے کے بعد مال گودام کے پاس سے گزر کے سامنے ہی مسافر خانے پہنچ جاتے۔ اتنا لمبا چکر نہ کاٹنا پڑتا۔

رکشہ والے کی صاف گوئی سے میں متاثر ہوئی۔ ورنہ عموماً بڑے شہروں میں تو خود ٹیکسی اور رکشہ والے اجنبی سواریوں کو لمبا چکر کاٹ کر منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ مطلوبہ جگہ چاہے قریب ہی کیوں نہ ہو' یہ لوگ اجنبیوں کو خاصا گھما کر وہاں پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ زیادہ کرایہ وصول کر سکیں۔

چڑھائی ختم ہوگئی تو رکشہ والے نے ہم سے رکشہ میں بیٹھنے کو کہا۔ پھر تقریباً بمشکل پانچ سات منٹ بعد ہی ہم مسافر خانے پہنچ گئے۔ رکشہ والے نے غلط نہیں کہا تھا۔ مسافر خانہ سٹیشن کے عقب ہی میں تھا اور ہم واقعی ریلوے پل عبور کر کے وہاں تک با آسانی پہنچ سکتے تھے۔ ریلوے پل' مسافر خانے کے سامنے سے نظر آ رہا تھا۔

مسافر خانہ کسی قدیم سرائے کا سا منظر پیش کر رہا تھا۔ بڑے سے پرانی طرز کے پھاٹک سے ہم اپنا سامان اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ سامنے ہی مسافر خانے کا بڑا صحن تھا جس کی اطراف چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ پھاٹک سے اندر پہنچتے ہی ہم نے مسافر خانے کے دفتر کا رخ کیا۔

جلد ہی ضروری خانہ پری اور کچھ رقم پیشگی ادا کر کے ہم ایک کوٹھری میں پہنچ گئے۔

"یہاں آ کر تو یہ معلوم ہو رہا ہے خاتون کہ ہم کئی صدی پیچھے لوٹ گئے ہیں۔" زاہد نے اندر پہنچتے ہی تبصرہ کیا۔

"آدمی کو ہر حال میں جینے کا سلیقہ آنا چاہیے۔" میں بولی۔ "کبھی کبھی ایسا بھی سہی۔"

ہمارے ساتھ ہی مسافر خانے کے عملے کا ایک شخص ہاتھ میں جھاڑو لیے وہاں آ گیا تھا۔ اس نے جھاڑو دی' پھر ہمیں خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ کوٹھری میں دو کھری چارپائیاں پڑی تھیں۔ میں نے اپنے سوٹ کیس سے دو چادریں نکال کر ان چارپائیوں پر بچھا دیں۔ اس کے بعد ہم نے کوٹھری ہی میں چائے اور بسکٹ منگوا لیے۔ یہ بسکٹ بے حد لذیذ تھے۔ زاہد نے مجھے بتایا کہ علی گڑھ کے یہ بسکٹ دور دور تک مشہور ہیں اور انہیں مٹری کے بسکٹ کہا جاتا ہے۔

"کیا خیال ہے خاتون کچھ دیر آرام نہ کر لیا جائے۔" زاہد نے تجویز پیش کی۔ ہم دونوں ناشتہ کر چکے تھے۔

"ایسا کرو کہ تم سو جاؤ' میں یوں بھی تمہیں اپنے ساتھ نہ لے جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں چلتی ہوں۔ جتنی جلدی ذکیہ کو اس ماحول سے نکال لیا جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔"

"مگر آپ اکیلی......"

"ہاں مجھے تنہا ہی جان دو۔" میں نے زاہد کی بات کاٹ دی۔ "کیا خبر وہاں کیا صورت پیش آئے؟ میں نہیں چاہتی کہ اپنے تحفظ کے ساتھ مجھے تمہارے تحفظ کی فکر بھی لاحق رہے۔"

"کب تک اندازاً لوٹ آئیں گی؟" اس نے پوچھا۔

"کیا کہہ سکتی ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ جہاں مجھے پہنچنا ہے وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔" میں نے کہا۔ پھر بولی۔ "تم آرام سے بے فکر ہو کر سو جاؤ' میں تمہیں آ کر جگا لوں گی۔" یہ کہہ کر میں اپنا پرس اٹھائے کوٹھری کے دروازے کی طرف بڑھ گئی' پھر زاہد کو مخاطب کیا۔ "کوٹھری کا دروازہ بند کر لو اندر سے۔"

زاہد نے دروازہ بند کر لیا تو میں مسافر خانے کے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگی۔ اب صبح کے پونے آٹھ بج رہے تھے۔ مسافر خانے کی عمارت سے باہر نکلتے ہی مجھے ایک خالی رکشہ نظر آ گیا۔ مجھے اپنی منزل کا علم تھا۔ میں نے رکشہ والے سے حکیم کی سرائے چلنے کو کہا۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید رکشہ والا میری زبان سے حکیم کی سرائے کا نام سن کر چونک اٹھے گا' مگر خلاف توقع ایسا نہیں ہوا۔ اس بات کا علم مجھے بعد میں ہوا کہ حکیم کی سرائے صرف بازار حسن ہی نہیں ہے۔ وہاں شریف گھرانوں کی آبادی اکثریت میں ہے اور طوائفوں کے کوٹھے اقلیت میں ہیں۔ رکشہ والے نے اسی لیے حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھے کرایہ بتایا اور میں رکشہ میں بیٹھ گئی۔

آدھے گھنٹے سے پہلے ہی رکشہ والے نے مجھے حکیم کی سرائے پہنچا دیا۔ میں آبادی شروع ہوتے ہی رکشہ سے اتر گئی تھی۔ ذرا دور چل کر دائیں جانب مجھے ایک بک ڈپو کا بورڈ نظر آیا۔ پتلا دبلا

دکان کا مالک اس وقت اپنی دکان کھول کر سامان باہر نکال رہا تھا۔ دکان کے ساتھ ہی ایک زینہ اوپر جانے کیلئے نظر آ رہا تھا۔

"سنئے۔" میں نے دکان دار کو مخاطب کیا۔ "مجھے انوری بائی کے کوٹھے کی تلاش ہے' کیا آپ میری رہنمائی کر سکیں گے؟"

"حیرت ہے محترمہ کہ خود بہ خود بالکل ٹھیک جگہ پہنچ گئی ہیں۔" دکان دار نے جواب دیا۔ "آپ اس وقت انوری بائی کے کوٹھے کے بالکل نیچے کھڑی ہیں۔ یہ...... ادھر اوپر جانے کیلئے زینہ ہے۔" اس نے مڑ کر زینے کی طرف اشارہ کیا۔

مجھے بھی واقعی اس پر حیرت ہوئی کہ میں نے پہلے آدمی سے انوری بائی کے کوٹھے کا پتا پوچھا اور بغیر کسی قباحت کے وہاں تک خود پہنچ گئی۔ میں نے دکاندار کا شکریہ ادا کیا۔

"کوئی بات نہیں محترمہ۔" دکان دار خوش اخلاقی سے بولا۔ پھر کہنے لگا۔ "ویسے اس وقت آپ کو کوئی بھی جاگتا ہوا نہیں ملے گا۔"

"جی۔" میں یہ کہہ کر آگے بڑھی اور پھر اوپر جانے کیلئے زینے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ دکان دار نے جو کچھ کہا تھا' اس کا اندازہ خود مجھے بھی تھا۔ کوٹھوں کے باسی تو راتوں کو جاگتے ہیں اور دن میں سوتے ہیں' مگر مجھے تو اسی وقت انوری بائی سے ملنا تھا۔ میں دن چڑھنے اور اس کے سو کر اٹھنے کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

زینے کے اختتام پر میں چکرا کے رہ گئی۔ سامنے دیوار تھی اور دائیں بائیں دونوں جانب مجھے بند دروازے نظر آ رہے تھے۔ معلوم نہیں ان میں سے انوری بائی کے کوٹھے کا دروازہ کون سا تھا۔ پھر مجھے دکان دار کی بات یاد آئی۔ میں جب اس کی دکان کے سامنے کھڑی تھی تو اس نے کہا تھا کہ آپ اس وقت انوری بائی کے کوٹھے کے بالکل نیچے کھڑی ہیں۔ میں نے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ مجھے جس دروازے پر دستک دینا چاہیے وہ دائیں جانب ہی کا دروازہ ہو سکتا ہے۔ دروازے کی ایک جانب مجھے الیکٹرک کال بیل کا سوئچ بھی نظر آ گیا۔ میں نے اس پر انگلی رکھ دی اور کہیں دور سے گھنٹی بجنے کی مجھے آواز آئی۔

چند لمحے کال بیل کے سوئچ پر دباؤ ڈال کر میں نے انگلی ہٹا لی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ مگر سونے والے نہ جاگے۔ مجھے دوبارہ گھنٹی بجانا پڑی۔ اس مرتبہ مجھے مایوسی نہ ہوئی۔ دروازے کے پیچھے مجھے کسی کے قدموں کی قریب ہوتی آواز سنائی دی' پھر یہ آواز دروازے کے قریب آ کر رک گئی اور دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھولنے والا لاغر اور مدقوق سے چہرے والا ایک شخص تھا۔ وہ واسکٹ' چوڑی دار پائجامہ اور کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ دروازہ کھولتے ہی وہ منہ بنایا ہوا بولا۔ "کون

ہے بھئی؟ کیا ہے؟ صبو صبو جگا دیا۔" پھر وہ مجھے دیکھ کر چونک اٹھا اور یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ میں سمجھ گئی کہ اس کی وجہ ذکیہ کے اور میرے چہرے کی حیرت انگیز مشابہت ہی رہی ہو گی۔ اس شخص نے یقیناً ذکیہ کو بھی دیکھا ہو گا۔ وہ انوری بائی کا کوئی پرانا ملازم معلوم ہوتا تھا۔

"مجھے انوری بائی سے ملنا ہے۔" میں نے اس شخص کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"مم...... مگر بائی...... بائی جی تو سو رہی ہیں ابھی۔" اس نے جواب دیا۔

"تم انہیں جا کر جگا دو' میرا ان سے ملنا اسی وقت بہت ضروری ہے ورنہ وہ کسی مشکل میں بھی پھنس سکتی ہیں۔" آخری الفاظ میں نے محض اس لیے کہے کہ وہ شخص زیادہ حیل حجت نہ کرے۔

"مشکل میں...... سمجھا نہیں میں۔" وہ ہکلایا۔

"تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں' میں تم سے جو کہہ رہی ہوں اس پر عمل کرو۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"آپ مجھے گالیاں کھلوائے بغیر نہیں مانیں گی...... آئیں آ جائیں اندر جگاتا ہوں میں انہیں۔"

میں بلا جھجک اندر داخل ہو گئی۔ انوری بائی کے ملازم نے مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لا کر بٹھا دیا۔ جو آئینوں سے سجا ہوا تھا۔ غالباً یہ وہی کمرہ تھا جہاں ناچنا گانا ہوتا تھا۔ دو اطراف قالین بچھے ہوئے تھے اور دیواروں سے گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ میں ایک گاؤ تکیے پر کہنی ٹیکے اس کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ دائیں جانب اندر جانے کا دروازہ تھا۔ دروازے کی ایک جانب ہارمونیم' طبلہ اور دوسرے ساز رکھے تھے۔ کمرے کے وسط میں شاید رقص کیلئے خالی جگہ تھی۔ میں اپنی زندگی میں پہلی بار کسی طوائف کے کوٹھے پر آئی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ مجھے انوری بائی کی آمد کا انتظار کرنا پڑا۔ وہ بھی مجھ پر نظر پڑتے ہی چونکی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہو گی مگر چہرہ اب بھی پرکشش تھا۔ اس کے جسم پر لباس بھی قیمتی اور اچھا تھا۔ بناؤ سنگار اور میک اپ کے بغیر بھی وہ بری معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ میرے قریب آ بیٹھی۔

"ہاں بی بی' کہو کیا ضروری کام ہے مجھ سے کہ تم نے میرے سو کر اٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا؟" انوری بائی نے مجھ سے پوچھا۔ اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

میں نے جواباً اپنا پرس کھول کر ہرنارائن کا خط نکالا اور اسے تھما دیا۔ "یہ خط پڑھ لیں' آپ کی سمجھ میں سب کچھ آ جائے گا۔" میں نے کہا اور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

وہ خط کھول کر پڑھنے لگی۔ پھر پڑھنے کے بعد خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

"ہرنارائن...... کون ہرنارائن؟" پھر وہ مجھ سے براہ راست مخاطب ہوئی۔ "بی بی! میں تو اس نام کے کسی

ہی جاتی۔ ۔۔ ہی یہاں کوئی کسی لڑکی کو لے کر آیا ہے؟"

"انوری بائی" میں ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ "مجھے بے
نانے کی کوشش مت کرو۔ کیا تم یہ بتا سکتی ہو کہ مجھے دیکھ کر کیوں چونک اٹھی تھیں؟"

لڑکی! میں تمہیں اپنے چونکنے کی وجہ بتا دوں گی مگر اس سے پہلے ایک بات سن لو یہ نوری
بالا ہے۔ یہاں اونچی آواز میں بولنے کی جرأت آج تک کسی کو نہیں ہوئی۔ اب میرے چونکنے کی
اور اس کی تصدیق میں اپنے کوٹھے کے ہر فرد سے کرا سکتی ہوں کہ تمہاری شکل میری مرحومہ نوجوان
بیٹی سے بہت ملتی ہے جس کے انتقال کو ابھی ایک برس بھی نہیں ہوا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے انوری
آواز میں پہلے ایسی سختی نہیں تھی۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

فوری طور پر میرا ذہن چکرا کے رہ گیا اور میں یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ انوری بائی جھوٹ بول رہی
ہر بار اس چڑیل نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ میں نے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھی ہوئی انوری بائی پر ڈالی اور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یا تو انوری بائی سچ بول رہی ہے یا پھر وہ ایک بہترین اداکارہ ہے۔ کسی طوائف سے اداکاری کی توقع کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں تھی۔ معاً میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اگر وہ سچ بول رہی تھی اور بقول اس کے میری شکل اس کی مرحومہ بیٹی سے ملتی ہے تو پھر مجھے دیکھ کر وہ بک ڈپو والا کیوں نہیں چونکا تھا جس نے یہاں تک میری رہنمائی کی تھی' اس کی دکان زینے کے پاس ہی تھی۔ اس نے بھی بارہا انوری بائی کی مرحومہ بیٹی کو آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ جوان موت یوں بھی لوگوں کے ذہن سے جلد نہیں نکلتی۔ میرے ذہن میں پیدا ہونے والا یہ خیال ایسا تھا کہ میں ایک بار پھر انور بائی کی طرف سے شک وشبہے میں پڑ گئی۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر ہرنارائن چٹرجی مجھے غلط راہ پر ہی ڈالنا چاہتا تو انوری بائی کا نام کیوں لیتا؟ وہ کوئی بھی فرضی نام لے دیتا اور اس نام کی کوئی طوائف یہاں مجھے ملتی ہی نہیں۔

''معاف کرنا بی بی' یہ میرے سونے کا وقت ہے۔'' اچانک انوری بائی بول اٹھی۔ ''تم اپنی مزید تسلی کیلئے چاہو تو شام کو آجانا۔''

''نہیں انوری بائی!'' میرا لہجہ پھر بدل گیا۔ ''میں یہاں سے خالی ہاتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔ تمہیں ذکیہ کو میرے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہرنارائن چٹرجی کو بھی اچھی طرح جانتی ہو اور یہ بھی یقین ہے کہ گزشتہ رات اسے یہیں لایا گیا ہے۔''

خلاف توقع میری بات کے ردعمل میں پہلے کی طرح اس نے غصے کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس کی تیوریوں پر بل پڑے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میری حیرت کی وجہ یہ بھی تھی کہ ابھی چند لمحے پہلے اس کے چہرے پر حزن وملال چھایا ہوا تھا اور اب وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے مخاطب کیا' ''تمہارے بیان کے مطابق اس لڑکی کو گزشتہ رات یہاں لایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے یہیں ہونا چاہئے' ہے نا؟'' اس کے لہجے میں سوال تھا۔

''ہاں بالکل! وہ یہیں ہے۔'' میں نے برجستہ جواب دیا۔

''سنو لڑکی! میں جو کچھ کہنے والی ہوں اس سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تم سے دب کر یا خوف زدہ ہو کے ایسا کہہ رہی ہوں۔ میری طرف سے کھلی اجازت ہے کہ تم اس لڑکی کیا نام بتایا تم نے......؟ ہاں ذکیہ! اسے تم یہاں تلاش کرسکتی ہو۔'' انوری بائی نے مجھے پیشکش کی۔

انوری بائی غالباً اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ اس طرح مجھے اس کی بات پر یقین آ جائے گا اور میں اس کے کوٹھے کی تلاشی نہیں لوں گی۔ یہی سوچ کر میں نے فوراً اس کی پیشکش قبول کر لی اور اسی کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

''بڑی ضدی ہو تم۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر خود بھی کھڑی ہوگئی۔ ''آؤ میرے ساتھ! اگر تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں ہرگز اسے یہ پیشکش نہ کرتی۔''

میں انوری بائی کے ساتھ اندرونی دروازے سے گزر کر چھوٹے سے ایک صحن میں پہنچ گئی۔ صحن کی دونوں جانب مجھے کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔ سامنے باورچی خانہ نظر آرہا تھا۔ دائیں جانب ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

''یہ میرا کمرہ ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں اس لیے شاید تم اسے دیکھنا چاہو گی۔'' انوری بائی میرے ساتھ اس کمرے کے کھلے دروازے سے آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

''ٹھہر جائیں' میں یہ کمرہ بھی دیکھوں گی۔'' میں نے اس سے رک کر کہا۔

''ٹھیک ہے' مجھے کوئی اعتراض نہیں' دیکھ لو۔'' وہ پلٹ کر کہنے لگی۔

میں بلاجھجک اس کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

''بے وقوف لڑکی! میں نے عقب سے انوری بائی کی آواز سنی اور اسی لمحے چونک اٹھی۔ پھر جیسے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا میرے سارے جسم میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ اس عیار طوائف نے تیزی کے ساتھ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ اس نے واقعی غلط نہیں کہا تھا۔ مجھ سے جلد بازی میں حماقت ہی سرزد ہوگئی تھی۔ اس عیار عورت نے مجھے بہت آسانی سے بیوقوف بنا کر اپنے کوٹھے کے ایک کمرے میں قید کر دیا تھا۔ میں تقریباً دوڑتی ہوئی دروازے تک پہنچی اور اسے دھڑ دھڑانے لگی۔ ''دروازہ کھولو انوری بائی...... دروازہ کھولو۔'' میں چیخنے لگی۔

''اس کوٹھے کے در و دیوار نے نہ جانے کتنی بار ایسی صدائیں سنی ہیں۔ خاموشی سے اپنی تقدیر کو قبول کرلو لڑکی ورنہ تم نے زیادہ شور کیا تو مجھے ابھی جبار خاں کو بلوانا پڑے گا۔ وہ تمہارے سارے کس بل نکال دے گا۔'' باہر سے مجھے انوری بائی کی آواز سنائی دی۔

''انور بائی! تو مجھے نہیں جانتی کہ میں کون ہوں۔ تجھے اپنی اس جرأت بلکہ حماقت کی سزا بھگتنا

پڑے گی۔" میں نے غصے میں دانت پیستے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

جواباً انوری بائی کا قہقہہ سنائی دیا اور پھر دور ہوتے قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ مجھے اس کمرے میں قید کر کے جا رہی تھی۔ میں نے بہت دروازہ پیٹا' اسے آوازیں دیں مگر اس کے کان پر جوں نہ رینگی۔ میں نے دیکھا کہ کمرے کا دروازہ خاصا مضبوط ہے اور اسے ٹکریں مار کر توڑنا' ممکن نہیں ہے۔ مایوس ہو کر میں نے اس کمرے کا تفصیلی جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مجھے امید تو نہیں تھی کہ فرار کی کوئی راہ ہو گی پھر بھی میں اپنا اطمینان کر لینا چاہتی تھی۔

اس کمرے میں ہوا داخل ہونے کیلئے ایک روشن دان تو ضرور تھا مگر کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ ایک طرف پرانی طرز کی اونچے سرہانے والی مسہری پڑی تھی۔ دیواروں میں دو الماریاں بھی بنی ہوئی تھیں جو مقفل تھیں۔ دائیں جانب دیوار سے لگی دو آرام کرسیاں پڑی تھیں جن میں سے ایک پر مجھے سبز رنگ کی ساری پڑی نظر آئی۔ میں جھپٹ کر کرسی کے پاس پہنچی اور وہ ساڑی اٹھا لی۔ ساری کے ساتھ ہی بلاوز بھی تھا جو نیچے گر گیا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ یقیناً یہ وہی ساڑی تھی جو کل ذکیہ پہنے ہوئے تھی۔ اس ساڑی کی وہاں موجودگی اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ ذکیہ اس کمرے میں آئی تھی اور اس نے یہاں اپنا لباس تبدیل کیا تھا یا پھر اسے مجبور کیا گیا تھا کہ اس سے زیادہ میں نہ سوچ سکی اور میرا ذہن سلگ اٹھا۔

"نہیں!" میں تقریباً چیخ اٹھی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

پھر؟ میرے ذہن میں اندیشوں کے سانپ رینگنے لگے۔ میں اپنے دل کو تسلی دینے لگی کہ ہرنارائن نے کہا تھا' انوری بائی پرانی ڈیرے دار طوائف ہے۔ وہ پیشہ نہیں کرتی' صرف گاتی ہے۔ ذکیہ کی عزت و آبرو کو وہاں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔

"پھر اتنی جلدی یہ...... یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ "وہ...... وہ گزشتہ رات ہی تو یہاں...... یہاں لائی گئی ہے۔"

اب اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ہرنارائن چٹرجی نے مجھ سے غلط بیانی نہیں کی تھی' انوری بائی ہی نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور اس کی کوئی نہ کوئی وجہ یقیناً تھی۔ یہی سوچتے ہوئے میں وہیں دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور حالات پر غور کرنے لگی۔

ذکیہ کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ اس سے کوئی بھی بات با آسانی منوائی جا سکتی تھی۔ اس کا ذہن نیم خوابیدگی کے عالم میں تھا۔ یہ صورتحال یقیناً انوری بائی کے حق میں تھی۔ ذکیہ کو لباس تبدیل کیوں کرایا گیا؟ میرے نزدیک یہ بھی ایک اہم سوال تھا۔ انوری بائی نے مجھے بھی قید کر لیا تھا' یہ میرے لیے کوئی ایسی تشویش ناک بات نہیں تھی اور نہ میں اس کے کسی غنڈے سے ہراساں تھی جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ مجھے بس زاہد کی فکر تھی۔ وہ میری طرف سے یقیناً پریشان ہو جاتا۔ ہر چند کہ میں اس سے کہہ آئی تھی کہ واپسی

کب تک ہو گی' کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ویسے میں نے اسے اپنے ساتھ یہاں نہ لا کر اچھا ہی کیا تھا۔ وہ ساتھ ہوتا تو مجھے اس کے تحفظ کی بھی فکر ہوتی۔

عموماً نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے طوائفوں کے کوٹھوں پر لایا جاتا ہے اور پھر وہ زندگی بھر اس حال سے نہیں نکل پاتیں۔ انہیں اول تو اس قابل ہی نہیں چھوڑا جاتا کہ وہ کسی کو منہ دکھا سکیں پھر بھی وہ فرار ہونے کی کوشش کرتی ہیں تو طوائفوں کے پالتو غنڈے انہیں ایسا نہیں کرنے دیتے۔ اگر سینکڑوں ایسی لڑکیوں میں سے کوئی باہمت لڑکی' غنڈوں کو بھی جل دے کر نکل جاتی ہے تو اسے معاشرہ قبول نہیں کرتا۔

مجھے ان تمام باتوں کا علم تھا مگر میری خود اعتمادی نے یہاں آنے سے پہلے ان باتوں پر غور کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ میں تو خود اپنے پیروں سے چل کر ایک طوائف کے کوٹھے تک پہنچ گئی تھی اور اکیلی بھی تھی پھر بھلا انوری بائی اس سنہری موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتی۔ میں جوان بھی تھی اور حسین بھی۔ انوری بائی مجھے خاصے مہنگے داموں کسی رئیس یا نواب کے ہاتھوں بیچ سکتی تھی۔ ذکیہ کے متعلق بھی شاید اس نے یہی سوچا تھا۔ مجھ پر یہ بات بھی چھپی ہوئی نہیں تھی کہ جو طوائفیں محض گانے بجانے کا ڈھونگ رچاتی ہیں اور اونچی ڈیرے دار طوائفیں کہلاتی ہیں وہ کھلے عام پیشہ نہیں کرتیں اور نہ ہر کس و ناکس ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکتا ہے۔ عموماً ان میں سے بہت سی کسی بڑے پیسے والے کی پابند ہوتی ہیں' یعنی اس کے علاوہ وہ کسی اور سے مخصوص تعلقات نہیں رکھتیں۔ انہیں "رکھیل" کہا جاتا ہے۔ یہ اس وقت تک پابند ہوتی ہیں جب تک انہیں ہر ماہ مقررہ رقم اپنے شکار سے ملتی رہتی ہے۔ جب یہ رقم ملنا بند ہو جاتی تو وہ اپنے جسم کا کوئی اور مستقل گاہک ڈھونڈ لیتی ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک حسن و جوانی ان کا ساتھ دیتی ہے۔ اس لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس عرصے میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لیں۔ روزانہ کوٹھے پر مجرا اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ کوئی تگڑی آسامی پھانس لیں۔ یہ ڈیرے دار طوائفیں عام پیشہ ور طوائفوں سے زیادہ مہنگی اور اپنی دانست میں زیادہ باعزت ہوتی ہیں کیوں کہ یہ کھلے عام نہیں چھپ کر گانے بجانے کی آڑ میں پیشہ کرتی ہیں۔ ان کے گاہک عموماً بڑے بڑے جاگیردار' زمیندار' رئیس اور نواب زادے ہوتے ہیں کیوں کہ ان کے مطالبات پورے کرنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہوتا۔

میرے خیال میں انوری بائی ہرنارائن چٹرجی کو اچھی طرح جانتی تھی' لیکن ان دونوں کے درمیان تعلقات زیادہ گہرے نہیں تھے اسی لیے انوری بائی کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ حسین و نوجوان ذکیہ کو دیکھتے ہی اس نے یقیناً یہ فیصلہ کر لیا ہو گا کہ ہرنارائن چٹرجی سے تعلقات بگڑیں یا رہیں' ذکیہ کو اس کے حوالے نہیں کیا جائے گا' اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ہرنارائن کا خط پڑھ کر ذکیہ کو میرے حوالے کر دیتی۔ میری یہاں آمد سے تو اسے مزید فائدہ ہو گیا تھا۔ اب وہ ذکیہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی کسی آغوش کی زینت بنانے کے منصوبے سوچ رہی ہو گی۔ یقیناً اسے یہ تجربہ بھی ہو گا کہ یہاں لائی جانے والی باعزت لڑکیاں

آسانی سے اپنی عزت و آبرو کے سودے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ میں نے ایسے بہت سے قصے سنے تھے طوائفیں ایسی لڑکیوں کو اپنی راہ پر لگانے کیلئے کیا حربے استعمال کرتی اور کیا کیا ظلم ڈھاتی ہیں' لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایک دن خود میں بھی ایسے ہی حالات کا شکار ہو جاؤں گی۔ تقدیر نے میرے ساتھ بھی ہمیشہ عجیب عجیب کھیل کھیلے تھے اور کبھی مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ کراچی سے ڈھاکہ پھر ڈھاکہ سے کلکتہ اور کلکتہ کے بعد میں دہلی سے ہو کر علی گڑھ پہنچ گئی تھی۔ غیر متوقع پیش آنے والے واقعات نے مجھے بھارت آ کر بھی سکون نہیں لینے دیا تھا۔ یہاں آتے ہی میں ذکیہ کے معاملے میں الجھ گئی تھی۔ اس معاملے میں کامیابی سے قریب تر ہونے کے باوجود ابھی میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ ذکیہ ایک بار بازیاب ہو کر پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

میں اپنی سوچوں میں گم رہی اور وقت گزرتا رہا۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو احساس ہوا کہ مجھے اس کمرے میں قید ہوئے تین گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ میں سوچنے لگی کہ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ میں سوچنے لگی۔ پھر جلد ہی مجھے اپنے اس سوال کا جواب مل گیا۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا' اس پر عمل کرنے کی صورت میں انوری بائی یقیناً بوکھلا جاتی اور کمرے کا دروازہ کھول کر حقیقت حال ضرور معلوم کرتی اور یہی میرا مقصد تھا۔

میرا پرس میرے پاس تھا اور اس میں بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ میں نے پرس کھول کر اس میں سے ریوالور نکال لیا' پھر دوسرے ہی لمحے میں نے دروازے کی طرف فائر کر دیا۔ کمرہ زبردست دھماکے سے گونج اٹھا۔ گولی دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ میں لپک کر دروازے کے پاس پہنچی اور گولی سے پیدا ہو جانے والے سوراخ سے باہر دیکھنے لگی۔ میں نے صحن میں بھاگ دوڑ سی مچتے دیکھی۔ مجھے دو نوجوان و حسین لڑکیاں بھی نظر آئیں اور دو مرد بھی۔ ان میں سے ایک وہی مدقوق چہرے والا تھا جس نے میرے لیے دروازہ کھولا تھا۔

''یہ دھماکہ کیسا تھا؟'' ان سبھی کی زبانوں پر یہی ایک سوال تھا۔ پھر میں نے انوری بائی کو بھی سامنے والے ایک کمرے سے نکلتے دیکھا۔ وہ حواس باختہ سی نظر آرہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کمرے میں سو رہی تھی۔ غالباً دھماکے ہی سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے بھی صحن میں موجود افراد سے وحشت زدہ لہجے میں وہی سوال کیا۔

''اس...... اس کمرے میں دھماکہ ہوا تھا باجی۔'' ایک لڑکی نے انوری بائی کے سوال کا جواب دیا۔ ''میں باورچی خانے سے نکل رہی تھی کہ اچانک دھماکہ ہوا اور میں نے اس کمرے کے دروازے سے ایک شعلہ سا نکلتے دیکھا۔''

''بخشو!'' انوری بائی نے مدقوق چہرے والے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جی باجی جی!'' وہ فوراً سعادت مندی سے بولا۔

''جلدی سے جبار خاں کو بلا کر لا' معلوم نہیں کیا چکر ہے یہ۔ بس کتے کی چال جائیو اور بلی کی چال واپس آئیو۔'' انوری بائی نے اسے حکم دیا۔

''بس یوں گیا اور یوں آیا۔'' مدقوق چہرے والے بخشو نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''اور دیکھ پہلے ایوب کے ہوٹل میں جھانکی مار لیو' ممکن ہے وہ وہاں بیٹھا ہو۔'' بخشو کے جاتے جاتے انوری بائی نے ہانک لگائی۔

میں سمجھ گئی کہ انوری بائی میں اتنی ہمت نہیں کہ خود کمرے کا دروازہ کھول کر حقیقت حال معلوم کر سکے۔ اس نے اسی لیے جبار خاں کو بلوایا تھا جو میرے خیال میں کوئی غنڈہ ہی ہو سکتا تھا۔ میں دروازے کے سوراخ سے اس لیے بھی باہر جھانک کر دیکھتی رہی کہ شاید ذکیہ مجھے نظر آ جائے مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق ذکیہ بھی میری ہی طرح کسی کمرے میں قید تھی۔

اچانک صحن میں لگی ہوئی کال بیل زور سے بجنے لگی اور انوری بائی چونک اٹھی۔ اس نے دوسرے ملازم کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے اس طرف لپکا جدھر نشست گاہ تھی۔ اسی سے گزر کر بیرونی دروازے تک پہنچا جا سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اس ملازم نے آ کر بتایا کہ نیچے بازار کے دکان دار دھماکے کے بارے میں معلوم کر رہے ہیں۔

''کہہ دو ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ہمارے یہاں نہیں ہوا دھماکہ۔'' انوری بائی نے ملازم سے کہا اور برا سا منہ بنا کر سر جھٹکتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ ''سارے جہاں کا درد انہی کم بختوں کے کلیجوں میں اٹھنے کو رہ گیا ہے۔ بات بے بات منہ اٹھائے چلے آتے ہیں جیسے یہ ان کی اماں کا گھر ہو۔'' پھر اس نے صحن میں موجود دونوں لڑکیوں کو حکم دیا۔ ''چلو اپنا اپنا کام کرو۔''

ان میں سے ایک باورچی خانے میں چلی گئی اور دوسری نے ایک کمرے کا رخ کیا۔ انوری بائی بھی واپس اسی کمرے میں گھس گئی جس سے نکلی تھی۔ پھر ذرا ہی دیر بعد وہ تولیا اور کپڑے لیے باہر آئی اور غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے اس سے یہی اندازہ لگایا کہ جبار خاں کی آمد جلد متوقع نہیں ہے ورنہ انوری بائی غسل خانے کا رخ نہ کرتی۔ اب صحن میں کوئی نہیں تھا اس لیے میں دوبارہ کرسی پر آ کے بیٹھ گئی۔ اب انتظار کے سوا میرے پاس کوئی اور صورت نہیں تھی۔ ریوالور میں نے پرس میں رکھ لیا تھا۔ یہ انتظار پورے ایک گھنٹے پر محیط تھا۔ اس دوران میں کئی بار میں نے دروازے کے سوراخ سے باہر جھانک کر دیکھا تھا۔ چند قدموں کی چاپ دروازے کی طرف بڑھتے سن کر میں تیزی کے ساتھ دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت مجھے

انوری بائی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔ ''تم اس پنچھی کو بھی وہیں لے جاؤ جہاں رات والی لڑکی کو لے گئے ہو۔ میں یہاں ہنگامہ نہیں چاہتی۔ ان بازار والوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔''

''میں انوری بائی کی بات سن کر چونک اٹھی۔'' رات والی لڑکی ظاہر ہے کہ ذکیہ ہی ہو سکتی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اب چند ہی لمحوں میں مجھے کوئی فیصلہ کرنا تھا۔

''پہلے اس کے دیدار تو کر لوں کہ وہ اس قابل ہے بھی یا نہیں؟'' جواب میں ایک بھاری مردانہ آواز مجھے سنائی دی۔

''رات والی سے بھی زیادہ خوبصورت ہے یہ بالکل اسی کی ہم شکل لگتی ہے۔'' انوری بائی کی آواز پھر ابھری۔ اسی کے ساتھ قدموں کی چاپ آنا بند ہوگئی۔ وہ یقیناً دروازے تک آ کے رک گئی تھی۔ اچانک انوری بائی پھر فکر مند سے لہجے میں بولی۔ ''سوچ لو پھر جبار خاں میں دروازہ کھول دوں؟''

''ہاں ہاں کھول دو دروازہ! لڑکی ہے کوئی شیر تو نہیں۔'' مردانہ آواز میں بے فکری تھی۔

''اور وہ دھماکہ......؟ تم نے اس......''

''دروازہ کھولو گی جبھی تو معلوم ہوگا کہ کیا چکر تھا وہ۔'' وہ انوری بائی کی بات کاٹ کر بولا اور اسے ہدایت دی۔ ''دروازہ کھول کر تم ایک طرف ہٹ جانا۔''

اسی دوران میں میرا ذہن ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ اسی کے نتیجے میں ریوالور پرس سے نکال کر میں نے اپنے نیفے میں اڑس لیا تھا اور اطمینان سے مسہری پر آ کے بیٹھ گئی تھی۔

چند لمحے اور گزرے پھر دروازہ کھل گیا۔ جبار خان یقیناً کوئی محتاط اور چالاک شخص تھا۔ اس نے فوراً کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق دروازے کی طرف دوڑ لگا دی' مگر اس سے پہلے کہ دروازے سے نکلتی ایک لحیم شحیم دراز قد شخص نے اچانک کمرے میں گھس کر مجھے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

''کہاں چلیں میری فاختہ!'' اس نے مبتذل لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

''چھوڑ دو مجھے۔'' میں اس کی گرفت سے نکلنے کیلئے مچلنے لگی۔ اس نے مجھے اپنے دونوں بازوؤں کے حصار میں لے رکھا تھا۔

''چھوڑ بھی دوں گا میری بلبل' مگر پہلے......'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور مجھے سینے سے لگا کر بھینچنا چاہا۔

میں نے اپنی دونوں کنیاں اس کے سینے میں اڑا دیں اور وہ اپنی ناپاک خواہش پوری نہ کر سکا۔ پھر میں نے اس کی گرفت سے نکلنے میں دیر نہیں کی۔ میں اس سے چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

اسی دوران میں انوری بائی بھی کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ جبار خاں کی بائیں طرف کھڑی تھی اور جبار خاں دروازے کے سامنے دونوں پیر پھیلائے کھڑا ہوا مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ وہ اپنی ایک مونچھ کو بل دے کر مرعوب کن لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''آؤ! کوشش کرو دروازے سے باہر نکلنے کی۔ اگر تم کامیاب ہوگئیں تو میں اپنی مونچھیں منڈوا دوں گا۔''

جواباً میں نے سہم جانے کی اداکاری کی اور ہکلاتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''خدا کیلئے مجھے جا...... جانے دو۔'' اس لڑکی سے کیا رشتہ ہے تمہارا جسے ڈھونڈنے تم یہاں آئی تھیں؟'' اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔ میں سمجھ گئی کہ انوری بائی اسے سارا قصہ سنا چکی ہے۔

''وہ...... وہ میری چھو...... چھوٹی بہن ہے۔ اسے اور...... اور مجھے چھوڑ دو' میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' میں نے واقعی ہاتھ جوڑ لیے۔ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

''میں نے ٹھیک کہا تھا نا جبار خاں' اس سے بھی اچھی ہے نا یہ؟'' انوری بائی نے جبار خاں کو مخاطب کیا۔

''ہاں! مجھے تمہارا مشورہ منظور ہے' میں اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا مگر تمہیں بھی میری ایک بات ماننا پڑے گی انوری بائی۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''بولو کیا بات ہے؟ صاف صاف کہو!'' انوری بائی بولی۔ ''یہ لڑکی مجھے پسند آ گئی ہے۔ آج تک کوئی لڑکی اس طرح میری گرفت سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کی نتھ میں اتاروں گا۔''

''سوچ لو' پھر زیادہ رقم نہیں ملے گی ہمیں۔'' انوری بائی کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ایک سودے میں تھوڑا سا گھاٹا سہی۔'' وہ میری طرف ندیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''پھر ساری زندگی تم اسے چلاؤ گی' پیسے ہی پیسے ہوں گے اور ہاں اگر میں نے اس کی نتھ اتار بھی لی تو تمہارے پاس بہت سی ایسی ترکیبیں ہیں کہ اسے کسی اناڑی گاہک کے سامنے کنواری بنا کر پیش کر سکو۔ تمہیں معلوم ہے انوری بائی کہ میں نے آج تک کسی بھی لڑکی کی نتھ اتارنے کی خواہش تم سے نہیں کی۔ میں جانتا ہوں کہ اس طرح نئے مال کے دام کم اٹھتے ہیں' مگر اس بار میری خاطر اپنا تھوڑا سا نقصان برداشت کر لو۔''

''منظور ہے مجھے۔'' انوری بائی غالباً بادل ناخواستہ بولی۔

اس کے چہرے سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ ذرا توقف سے اس نے مزید کہا۔ ''جب اس کے کس بل اچھی طرح نکل جائیں تو اسے یہاں چھوڑ جانا۔''

''وہ جو لڑکی ہے نا' اس کی بہن! وہ بالکل موم کی گڑیا ہے۔ بے ضرر ہے وہ بالکل۔ اسے وہاں میرے پاس رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج شام ہی کو میں اسے یہاں پہنچا جاؤں گا۔ وہ تمہیں قطعی

پریشان نہیں کرے گی۔ اس سے جو کہو خاموشی سے مان لیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا سودا تو تم باتھریں کے لالہ گوپال سے کرلو۔ وہ بوڑھا گدھ ایسی ہی لڑکیاں پسند کرتا ہے جو ذرا بھی مزاحمت نہ کریں۔'' جبار خاں نے مشورہ دیا پھر بولا۔ ''اپنے بخشو کو بھیج کر تانگا منگوالو کوئی اور اس سے کہہ دینا کہ پچھلی گلی میں تانگا لاکر کھڑا کردے۔ تانگے پر چادر بھی بندھے گی۔''

''میں ابھی بخشو کو تانگا لینے بھیجتی ہوں۔'' یہ کہہ کر انوری بائی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

انوری بائی کے جاتے ہی جبار خاں نے مجھے مخاطب کیا۔ ''لڑکی اگر تم نے شور شرابا کیا تو مجبوراً مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا اور اگر خاموشی سے میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگئیں تو......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور خود ہی انکار میں سر ہلا کر بڑبڑایا۔ ''نہیں تم راستے میں بھی کوئی ہنگامہ کھڑا کرسکتی ہو؟''

''نن...... نہیں میں ایسا...... ایسا نہیں کروں گی۔'' میں نے خوف زدہ ہونے کی کامیاب اداکاری کی۔

''تمہاری بات پر پورا یقین ہے مجھے۔'' وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ ''معلوم ہے مجھے تم بالکل شور نہیں کروگی اور اس وقت بھی بالکل خاموش رہوگی جب میں تمہیں......'' اس نے آہستہ آواز میں نہایت گھٹیا اور فحش بات کی جسے سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ اگر مصلحت میرے پیش نظر نہ ہوتی تو میں اسی وقت اس کی کھال ادھیڑ دیتی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں میرے چہرے پر غصے کے شدید تاثرات دیکھ کر وہ چونک نہ اٹھے' اپنا سر جھکالیا۔ اسے اس کمینے نے کچھ اور ہی معنی دیے اور بولا۔ ''یوں شرما کے سر جھکا کے ابھی سے تو تیر نہ چلاؤ میرے دل پر۔ تم تو ابھی سے پاگل کیے دے رہی ہو۔''

جواباً میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا ورنہ میرا دل تو یہ چاہ رہا تھا اسے وہ سناؤں اور ایسا سبق دوں کہ اس کی سات پشتیں یاد کریں اور آئندہ وہ کسی لڑکی کو بری نظر سے نہ دیکھ سکے۔

''بھیج دیا میں نے بخشو کو۔'' انوری بائی کمرے میں داخل ہوکر بولی' پھر کہا۔ ''لو میں یہ بھی لے آئی ہوں۔'' اس نے دو بڑے بڑے رومال جبار خاں کی طرف بڑھائے اور بولی۔ ''اب جلدی سے تیاری کرلو! ممکن ہے بخشو کو نیچے ہی کوئی تانگا مل جائے۔''

جبار خاں نے انوری بائی سے رومال لے لیے اور میری طرف بڑھا۔ میں سمجھ گئی کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ میرے منہ میں رومال ٹھونسنے کے بہانے وہ دست درازی بھی کرسکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں جلدی سے بول اٹھی۔ ''کک...... کیا چاہتے ہو تم؟...... تم جو...... جو بھی کہو گے مم...... میں مان لوں گی۔''

''اچھا تو پہلا حکم مان کر ذرا فرماں برداری کا ثبوت دو۔'' قریب آکر وہ ہنستے ہوئے بولا' پھر ایک رومال میری طرف بڑھا کر کہا۔ ''لو اسے اپنے منہ میں ٹھونس لو اس طرح رومال منہ میں ٹھونسنا ہے کہ تمہاری آواز نہ نکل سکے۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے رومال لے لیا اور پھر اسے اپنے منہ میں ٹھونسنے لگی۔

''تم تو واقعی بڑی فرماں بردار نکلیں۔'' وہ میری بے بسی پر ہنسا۔ ''اب دیکھنا یہ ہے کہ آج رات کو بھی تم فرماں برداری کا ثبوت دیتی ہو یا نہیں۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''ویسے اپنی پسند بتا دوں میں تمہیں مجھے بہت زیادہ فرماں بردار لڑکیاں پسند نہیں آتیں۔ جب تک تھوڑی بہت روک ٹوک نہ ہو مزہ نہیں آتا مجھے۔ اچھا اب دوسری طرف گھوم جاؤ۔''

میں نے بلاتامل دوسری طرف منہ کرلیا اور اس نے میرے منہ پر پٹی باندھ دی۔ اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ وہ دوبارہ میرا منہ اپنی طرف کرنے کے بہانے کچھ اور ہی گھٹیا حرکت کرنا چاہتا ہے مگر میں نے اسے موقع نہیں دیا اور تیزی سے اس کی طرف گھوم گئی۔

''ہائے ظالم!'' اس نے آہستہ سے کہا' پھر انوری بائی سے بولا۔ ''برقع بھی چاہیے گا۔''

''اچھا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''ایک برقع پہنا کر تم رات کو......''

''آجائے گا وہ بھی!'' جبار خاں نے ہاتھ اٹھا کر انوری بائی کی بات کاٹ دی' پھر ہنس کر بولا۔ ''برقع ہی کیا وہ برقع والی بھی رات کو آجائے گی' تم اس وقت تو برقع لے کر آؤ۔''

انوری بائی تیزی سے باہر نکل گئی اور اسی تیزی سے جبار خاں میری طرف بڑھا' میرے منہ پر پٹی باندھنے کے بعد وہ جو ذلیل حرکت کرنا چاہتا تھا' قریب آتے ہی اس نے اسی حرکت کا اعادہ کیا' مگر میں پھرتی کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی اور اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ فضا میں جھول کر رہ گیا۔

اس کے چہرے پر لمحہ بھر کو جھنجلاہٹ نظر آئی' پھر جانے کیا سوچ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اچھا تو تم نے ابھی سے روک ٹوک شروع کردی' مگر میں بھی تمہاری......''

اسی وقت بخشو کمرے میں داخل ہوا اور اس کے قدموں کی چاپ سن کر جبار خاں نے مڑ کر دیکھا۔

''تانگا لے آیا ہوں میں اور اسے پچھلی گلی ہی میں کھڑا کیا ہے۔'' بخشو بول اٹھا۔

''چادر بھی باندھ دی کہ نہیں؟'' جبار خاں نے سوال کیا۔ ''وہ تو بائی جی نے مجھ سے......''

'ارے او بخشو! کہاں مرگیا کم بخت...... لے یہ چادر تو باندھ جاکر تانگے پر۔'' انوری بائی کی آواز قریب آتی گئی۔

''آیا بائی جی!'' اس نے جواباً ہانک لگائی اور دوڑتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔

''لے جلدی کر۔'' کمرے کے دروازے سے انوری بائی کی آواز سنائی دی۔ پھر میں نے اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ برقع تھا۔

میں نے خود ہی آگے بڑھ کر برقع اس سے لے لیا اور پہننے لگی۔ میں جبار خاں کو قریب آنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

جب میں نے برقع پہن لیا تو انوری بائی نے کہا۔ ''اب نقاب بھی ڈال لو چہرے پر۔''

اس حکم کی بھی میں نے فوراً تعمیل کی۔ میں خاموشی کے ساتھ ان لوگوں کے ہر حکم کی تعمیل کر رہی تھی۔ نقاب ڈالنے کا مقصد بھی مجھ سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس طرح میرے منہ پر بندھی ہوئی پٹی چھپ گئی تھی۔ میرا پرس میری کلائی میں پڑا ہوا تھا۔ میں اسے نہیں بھولی تھی۔

''ارے جبار خاں ایک بات تو تم نے اس سے پوچھی ہی نہیں کہ وہ دھماکہ کیسا تھا؟'' انوری بائی اچانک چونک کر بولی۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک ایسی بات کہی کہ جبار خاں بھی چونک اٹھا۔ انوری بائی نے کہا تھا۔ ''دھماکے کی وہ آواز ایسی تھی جیسے کسی نے فیر کیا ہو۔ اس کمرے میں اس کے سوا کوئی اور تھا بھی نہیں۔''

''تم نے پہلے مجھ سے یہ بات نہیں کہی تھی کہ دھماکے کی آواز کسی فائر کی سی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ اس کی نگاہ میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ پھر وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ''اگر واقعی وہ آواز فائر ہی کی تھی اور اسی کمرے سے آئی تھی تو...... تو اس لڑکی کے پاس کوئی خطرناک کھلونا ضرور ہونا چاہیے۔'' پھر وہ انوری بائی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم اس کے پرس کی تلاشی لو اگر اس نے وہ پستول کہیں چھپا نا دیا ہوگا تو اسے پرس ہی میں ہونا چاہیے۔''

بات ابھی صرف پرس کی تلاشی تک محدود تھی اور اس کا تدارک میں پہلے ہی کر چکی تھی۔ ممکن ہے میرے قریب آ کر انوری بائی میرے کپڑوں کی تلاشی بھی لینے لگتی' یہ سوچ کر میں نے خود ہی اپنا پرس اس کی طرف بڑھا دیا اور پھر ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

انوری بائی نے پرس کھول کر اس کا جائزہ لیا' پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے جبار خاں سے کہنے لگی۔ ''اس میں تو کوئی پستول وستول نہیں ہے' اس نے شاید کہیں چھپا......''

''تانگے والا جلدی کر رہا ہے بائی جی۔'' بخشو کی چنچناتی ہوئی آواز دور سے سنائی دی اور انوری بائی کی بات پوری نہ ہو سکی۔

''اگر اس کے پرس میں پستول نہیں ہے تو پھر اس نے لازماً اسے یہیں کمرے میں چھپا دیا ہو گا۔'' جبار خاں جلدی سے بولا۔ ''ویسے کوٹھی پہنچ کر میں بھی اس سے پوچھوں گا کہ اس نے پستول کہاں چھپایا ہے۔ اس وقت تو چلنے دو۔''

اسی لمحے بخشو نے پھر ہانک لگائی۔ جواباً انوری بائی تنک کر بولی۔ ''ارے کوئی آسمان تو نہیں ٹوٹا پڑ رہا۔ چل جا کے کہہ' آ رہے ہیں ابھی۔'' پھر اس نے پرس مجھے تھما دیا۔ ''یہ لو اور اب پلٹو تو نیچی آواز

میں بات کرنا مجھ سے۔ ویسے تو جبار خاں تمہیں یہاں کے سارے ادب آداب سکھا دے گا۔''

پھر میں جبار خاں اور انوری بائی کے ساتھ اس کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی۔ وہاں مجھے وہ دونوں لڑکیاں بھی نظر آئیں جنہیں میں نے دروازے کے سوراخ سے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی آگے بڑھی اور انوری بائی کو مخاطب کیا۔ ''باجی! ایک نظر ہمیں بھی تو دکھا دیں اس کا چہرہ۔''

''کیا کرو گی اس کا چہرہ دیکھ کر...... رات والی کو دیکھا تھا نا' اسی کی ہم شکل ہے بالکل بس اس کا جسم اس سے زیادہ متناسب اور اچھا ہے۔ چلو بھی جبار خاں' لے جاؤ اسے۔'' انوری بائی نے صحن کے ایک کونے والے چھوٹے سے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

میں نقاب کے اندر سے سب کچھ دیکھ رہی تھی اور یہ بھی سن چکی تھی کہ تانگے کو عقبی گلی میں لانے کو کہا گیا تھا۔

وہ ایک پتلا سا زینہ تھا جس سے ایک وقت میں صرف ایک آدمی نیچے اتر سکتا تھا۔ جبار خاں میرے آگے آگے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھی۔ انوری بائی اوپر ہی رہ گئی تھی۔ زینے کے نیچے بخشو کھڑا تھا۔ جیسے ہی جبار خاں نیچے پہنچا' تانگے والے نے سلام کھاں صاحب کہہ کر اس کا استقبال کیا۔ وہ یقیناً جبار خاں کو جانتا تھا۔

جبلد خاں نے اس کے سلام کا جواب دے کر مجھ سے تانگے کے پچھلے حصے میں بیٹھنے کو کہا اور خود اگلے حصے کی طرف بڑھا۔ میں چادر اٹھا کر تانگے میں سوار ہو گئی۔

''اور بھئی نظیرے' کیا حال چال ہیں تیرے؟'' جبار خاں تانگے میں سوار ہو کر تانگے والے سے مخاطب ہوا۔

''گجر رہی اے کھاں صاحب تمہاری دعا سے۔'' تانگے والے نے جواب دیا اور پھر تانگا آگے بڑھا دیا۔

یا تو بخشو نے تانگے والے کو بتا دیا تھا کہ کہاں جانا ہے یا پھر تانگے والے کو جبار خاں کا ٹھکانہ معلوم تھا۔ نہ جبار خاں نے اس سلسلے میں کچھ کہا تھا نہ تانگے والے نے پوچھا تھا۔ میرے ذہن میں جبار خاں کی کہی ہوئی ایک بات کھٹک رہی تھی۔ اس نے کسی کوٹھی کا ذکر کیا تھا جہاں مجھے لے جانا تھا۔ میرے نزدیک کسی غنڈے کا کوٹھی میں رہنا حیرت ہی کی بات تھی۔

تانگا اپنی رفتار سے سفر طے کرتا رہا۔ تانگے پر کیوں کہ چادر بندھی ہوئی تھی اس لیے مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کن راستوں سے گزر رہا ہے۔ تانگے کو حکیم کی سرائے سے چلے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا اور سفر ابھی جاری تھا۔

اچانک ایک بھاری اور تیز آواز سن کر میں چونک اٹھی۔ کسی نے تانگے والے سے تانگا روک

لینے کو کہا تھا‘ مگر یہ آواز جبار خاں کی نہیں تھی۔

’’رکومت! تیزی سے نکل چلو نظیرے!‘‘ جبار خاں کی سرسراتی ہوئی آواز میں نے سنی۔ اس کی آواز سے واضح طور پر فکر و تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

’’مگر...... مگر کہاں صاحب‘ وہ...... وہ...... ارے وہ دیکھو...... وہ بھاگ کر آرہے ہیں تانگے کی طرف!‘‘

’’تم بھگاؤ گے گھوڑے کو بے وقوف آدمی‘ جلدی۔ جلدی کرو۔‘‘ جبار خاں اونچی مگر قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے حقیقت حال جاننے کیلئے مڑ کر دیکھا تانگے والا اپنے گھوڑے کو بھگانے کیلئے اس پر قمچیاں برسا رہا تھا اور سامنے دونوں جانب سے تقریباً آٹھ دس افراد لاٹھیاں ہوا میں لہراتے ہوئے تانگے کی طرف جھپٹ رہے تھے۔

’’آج ہم تمہیں بچ کر نہیں نکلنے دیں گے جبار خاں۔‘‘ ایک بلند آواز سنائی دی۔ اسی کے ساتھ کسی نے پھر تانگے والے سے تانگا روکنے کو کہا۔

دید شنید اور جان پہچان اپنی جگہ مگر تانگے والے کو اپنی زندگی بھی عزیز تھی۔ اس نے یقیناً صورتحال کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر وہ تانگہ نہیں روکے گا تو وہ لوگ زبردستی تانگہ روک لیں گے اور پھر جبار خاں کے ساتھ اس کی شامت بھی آجائے گی۔ غالباً یہی سوچ کر اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ میرے لیے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ لٹھ بند افراد جبار خاں کے دشمن ہی ہو سکتے ہیں۔ تانگے والے کو لگام کھینچتے دیکھ کر جبار خاں تقریباً چیخ اٹھا۔ ’’ابے یہ کیا کر رہا ہے حرام زادے! کیا تو بھی میرے دشمن سے ملا ہوا ہے۔‘‘

چند ہی لمحے بعد تانگہ رک گیا تھا۔ تانگے والا‘ جبار خاں کی بات سنی ان سنی کر گیا تھا۔

پھر میں نے جبار خاں کو ’’یاعلی‘‘ کا فلک شگاف نعرہ مار کر تانگے سے چھلانگ لگاتے دیکھا۔

’’دیکھنا بچ کر نہ بھاگنے پائے آج اس کی لاش گرانا ہے۔‘‘ کوئی زور سے چیخا۔

میں نے دیکھا کہ جبار خاں نے تانگے سے چھلانگ لگاتے ہی انہی افراد میں سے ایک کی لاٹھی چھین لی تھی اور اس کوشش میں کسی دوسرے شخص کی لاٹھی کا اچٹتا ہوا وار اس کے شانے پر پڑا تھا۔ اگر وہ فوراً ہی گھوم نہ جاتا تو یقیناً اس کیلئے یہ وار کاری ثابت ہوتا۔

اپنے دس دشمنوں کے درمیان جبار خاں اکیلا کھڑا ہوا تھا اور اب تک اس نے کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ مجھے وہ یوں جی داری سے لڑتے ہوئے اچھا لگا‘ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹک سکتا تھا۔ اس کے دشمن غالباً اسے ابھی تھکا رہے تھے‘ اس کے بعد وہ

بھرپور اور بہ یک وقت حملہ کرتے۔

میں سن ہی چکی تھی کہ ان لوگوں کا مقصد جبار خاں کو ٹھکانے لگانا ہے۔ اگر وہ لوگ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتے تو میں ایک بار پھر ذکیہ تک پہنچنے میں ناکام ہو جاتی اور پھر مجھے ازسر نو ہاتھ پاؤں مارنا پڑتے۔ یہ سوچ کر فوری طور پر میں نے ایک فیصلہ کیا اور دوسرے ہی لمحے اپنی منہ پر ٹھنسا ہوا رومال نکال کر برقع اتارنے میں بھی دیر نہیں کی تھی۔ تانگے والا لڑائی دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اس نے میری طرف دھیان ہی نہ دیا اور میں تانگے پر بندھی ہوئی چادر اٹھا کر تانگے سے اتر گئی۔ اپنا پرس بھی میں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

علی گڑھ میرے لیے ایک اجنبی شہر تھا اور میں تو اس سے بھی واقف نہیں تھی کہ وہ کون سا علاقہ ہے۔ کیا معلوم حالات اچانک کیا نیا رخ اختیار کر لیتے میں نے اسی لیے اپنے نیفے میں اڑسا ہوا ریوالور نہیں نکالا ورنہ وہ جھگڑا ختم کرانا چند لمحوں کا کام تھا۔ میں انہیں ریوالور کی زد پر لے کر جبار خاں سے دور ہٹ جانے کا حکم دیتی اور دھمکانے کیلئے ایک ہوائی فائر بھی کر دیتی‘ بس پھر ان کی ساری بہادری دھری کی دھری رہ جاتی۔ وہ الگ ہٹنے پر مجبور ہو جاتے۔

’’تانگے سے اترتے ہی میں تیز قدمی کے ساتھ اس طرف بڑھی جہاں معرکہ گرم تھا۔ یہ راستہ نسبتاً ویران اور کچا تھا۔ دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ تانگے والے نے غالباً مختصر راستہ اختیار کرنے کیلئے ادھر کا رخ کیا تھا۔ بائیں جانب مجھے درختوں کا سلسلہ اور حد بندی نظر آرہی تھی۔ وہ غالباً کوئی باغ تھا۔ اطراف پر ایک نگاہ ڈال کر آگے بڑھتے ہوئے مجھے یہ اندازہ بہرحال ہو گیا کہ یہ علاقہ شہر سے باہر ہے۔

تیزی سے ان لوگوں کی طرف لپکتے ہوئے اچانک مجھے جبار خاں کی تیز چیخ سنائی دی۔ کسی کی لاٹھی کا وار کام کر گیا تھا۔ میں نے جبار خاں کو ان لوگوں کے نرغے میں دیکھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر تو جیسے میں اڑتی ہوئی ان تک پہنچ گئی۔ میں نے ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان پر اپنی دہشت بٹھانے کیلئے اپنی تربیت کے مطابق منہ سے بھیانک اور تیز آواز نکالی اور پھر اچھل کر ایک شخص کے شانے پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ اسی کے ساتھ اس شخص کے شانے کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی اور وہ چیخ مار کر ڈھیر ہو گیا۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ میں ایک ہی جست بھر کے لاٹھی تک پہنچ گئی۔ دوسرے ہی لمحے لاٹھی میرے ہاتھ میں تھی۔

جبار خاں زخمی ہونے کے باوجود اب تک لاٹھی چلا رہا تھا۔ وہ یقیناً اس فن میں ماہر تھا ورنہ اب تک دشمنوں کے وار سے نہ بچا رہتا۔

اپنے ایک ساتھی کو گرتے دیکھ کر چند لمحے کیلئے ان لوگوں کی توجہ بٹ گئی۔ جبار خاں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان کے ایک اور ساتھی کو لمبا لمبا لٹا دیا۔ ان لوگوں کیلئے یہ امر یقیناً حیرت ہی کا

باعث رہا ہوگا کہ ایک عورت اتنے مردوں کے مقابل آ گئی تھی اور ان کے ایک ساتھی کو اس عورت نے زخمی کر دیا تھا۔ یہ لمحات حیرت میرے حق میں سودمند ثابت ہوئے۔ ان پر حملہ کرنے میں پہل میں نے ہی کی۔ لاٹھی کو میں نے کسی نیزے کی طرح استعمال کیا تھا۔ جس شخص کے سینے پر لاٹھی کی ضرب پڑی تھی وہ سینہ تھامے بیٹھتا چلا گیا تھا' پھر اوندھے منہ زمین پر آ رہا تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر چار پانچ افراد تو جبار خاں سے نبرد آزما رہے اور دو نے مجھ پر بیک وقت حملہ کیا۔ ان کی لاٹھیاں ایک ساتھ اٹھیں اور بھرپور آواز کے ساتھ زمین سے ٹکرائیں کیوں کہ عین اسی لمحے میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ اب میں ان کی پشت پر تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دوبارہ مجھ پر وار کرتے' ان میں سے ایک اور اپنا پہلو دبائے ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے پلٹ کر میری لاٹھی پر لاٹھی ماری۔ میں نے لاٹھی ہاتھ سے چھوڑ کر ہوا میں جست بھری اور پھر میرے نشان قدم اس شخص کے سینے پر ثبت ہو گئے۔ میری فلائنگ کک اتنی بھرپور تھی اور اس میں اتنی شدت تھی کہ اس شخص کے سینے کی پسلیاں سلامت رہنا مشکل تھا۔ وہ سر کے بل کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح یوں گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔

جبار خاں کے دشمنوں کی تعداد اب نصف رہ گئی تھی اور وہ سب کے سب اب تک جبار خاں ہی کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبار خاں بڑی اچھی لاٹھی چلا رہا تھا مگر لگتا تھا جیسے وہ اب تھکتا جا رہا ہو۔ وہ اپنی جگہ پھرکنی کی طرح گھومتا ہوا اپنے دشمنوں کے وار سے بچ رہا تھا۔

میرے اور ان لوگوں کے درمیان چند گز کا فاصلہ تھا۔ میں زمین پر پڑی ہوئی ایک لاٹھی اٹھا کر جستیں بھرتی ہوئی ان لوگوں تک پہنچ گئی' مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ جبار خاں کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے لاٹھیوں کی ضربیں بچاتا ہوا زمین پر بیٹھتا جا رہا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی لاٹھی کی ضرب اس کے سر پر نہ لگے۔

میں نے اپنے منہ سے پھر ایک وحشیانہ آواز نکالی اور ان لوگوں پر ٹوٹ پڑی جو غالباً جبار خاں کے گرنے کے منتظر تھے۔ پہلے ہی حلے میں دو کو میں نے زمین بوس کر دیا۔ اب میرے مقابلے پر صرف تین افراد رہ گئے تھے' لیکن ان میں سے صرف دو نے مجھ پر حملہ کیا۔ ایک شخص زمین پر بیٹھے ہوئے جبار خاں پر لاٹھی کا وار کرنے کیلئے اپنے ہاتھ بلند کر چکا تھا۔ اپنے اوپر حملہ آور ہونے والے دونوں افراد کو غچہ دیتی ہوئی میں جبار خاں پر حملہ کرنے والے کی طرف جھپٹی۔ وہ میری طرف سے بے خبر تھا۔ اس لیے چوٹ کھا گیا۔ میری لاٹھی کی بھرپور ضرب اس شخص کی کمر پر پڑی تھی اور اس کے ہاتھ اٹھے رہ گئے تھے۔ وہ چیختا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا اور لاٹھی بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

جبار خاں کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ میری کوئی مدد کر سکتا اور نہ مجھے اس کی ضرورت ہی تھی۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اس کے سر' ٹانگوں اور ہاتھوں پر چوٹیں آئی تھیں۔ وہ زمین پر بیٹھا ہوا پھٹی پھٹی

آنکھوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ یوں جیسے اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو۔ میں نے بس ایک نظر اس پر ڈالی تھی بلکہ زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ مجھے بس اتنی ہی مہلت مل سکی تھی کیوں کہ جبار خاں کے دشمنوں میں سے دو جو ابھی ڈھیر نہیں ہوئے تھے' مجھ پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ میں اگر اچھل کر تیزی کے ساتھ پیچھے نہ ہٹ جاتی تو ان دونوں کی لاٹھیاں میرے سر کے ٹکڑے اڑا دیتیں۔ انہوں نے کچھ اتنی ہی قوت سے وار کیے تھے۔ پیچھے ہٹ کر میں نے ایک بار پھر لاٹھی کو نیزے کی طرح ہاتھوں میں سنبھالا۔ وہ دونوں چوکنا ہو گئے کیوں کہ اس طرح انہوں نے میرے ہاتھوں اپنے ایک ساتھی کو شکار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئے۔ مجبوراً مجھے لاٹھی کو نیزے ہی کی طرح ان کی طرف پھینکنا پڑا اور میرا نشانہ خالی نہیں گیا۔ اس طرح لاٹھی تو میرے ہاتھ میں نہ رہی مگر ان میں سے ایک ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس شخص کی کنپٹی کو نشانہ بنایا تھا۔ نتیجہ وہ لہرا کر زمین پر آ رہا تھا۔

اب میرے مقابل صرف ایک شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور میں خالی ہاتھ تھی۔ وہ اسی لیے شیر ہو گیا اور میرے مقابلے پر ڈٹا رہا ورنہ اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ کر اسے راہ فرار اختیار کر لینا چاہئے تھی۔ اس نے مجھے اتنی مہلت نہیں دی کہ میں پیچھے ہٹ کر اس پر جوڈو یا کراٹے کا کوئی داؤ آزمانے کیلئے پینترا بدل سکتی۔ مجبوراً مجھے اس کے وار کو اپنے ہاتھوں پر روکنا پڑا' مگر اس کے ساتھ میں نے اس کی لاٹھی بھی دونوں ہاتھوں سے پکڑ لی۔ پھر میں نے وہی لاٹھی اس سے چھین کر اس کی کمر میں ڈال دی اور زور دار جھٹکا دیا۔ میں اس وقت اتنی ہی بے رحم بن گئی تھی کہ یہ بھی نہ سوچا کہ اس طرح میرے مدمقابل کا حشر کیا ہوگا۔ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے وہ فوراً ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اب تک اس کے جسم کا بوجھ لاٹھی پر تھا۔ میں نے لاٹھی چھوڑ دی تو اس کا جسم زمین پر آ رہا۔ دراصل مجھے جلدی یہ تھی کہ جبار خان کو جلد از جلد طبی امداد مل جائے۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے کہیں اس کی زندگی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ اسی لیے اس آخری شخص سے نمٹ کر میں جبار خاں کی طرف لپکی۔ اس کے سر سے اب بھی خون بہہ رہا تھا مگر ابھی وہ ہوش میں تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور پھر تانگے والے کی طرف ہاتھ ہلا کر قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس طرح بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا جیسے کسی نے اسے پتھر بنا دیا ہو۔ اس کی شدید حیرت یقیناً خلاف توقع نہیں تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں یقیناً کسی عورت کو اس طرح لٹھ بند مردوں سے لڑتے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ بدستور اسی طرح بیٹھا رہا تو میں نے اسے آوازیں دیں۔ "اے نظیرے۔ نظیرے!" سفر کے دوران میں مجھے اس کا نام معلوم ہو گیا تھا جو نظیر رہا ہوگا جسے بگاڑ کر "نظیرے" بنایا گیا تھا۔

اپنا نام پکارے جانے پر وہ اس طرح چونک کر میری طرف دیکھنے لگا جیسے کسی خواب سے جاگا۔

"تانگا قریب لے آؤ نظیرے!" میں نے جبار خاں کو سہارا دے کر آگے بڑھتے ہوئے زور سے کہا۔ جبار خاں میرے ساتھ تقریباً گھسٹ رہا تھا۔ اس کے قدم بمشکل اٹھ رہے تھے۔

"لایا تانگا' ابھی لے کر آیا۔" جواباً اس نے پرجوش آواز میں کہا۔

نصف فاصلہ طے کر ہی چکی تھی۔ جبار خاں کے جسم کا سارا بوجھ مجھ پر تھا۔ میرے کپڑے بھی اس کے خون سے تر ہو گئے تھے۔

تانگا قریب آ گیا تو میں نے تانگے والے کی مدد سے جبار خاں کو تانگے پر چڑھایا اور پھر پچھلی نشست سے بڑا سا وہ رومال اٹھا لیا جو میرے منہ پر بندھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سر پر کس کر رومال باندھ دیا تاکہ خون زیادہ نہ بہے۔ اس کے بعد میں پہلی نشست پر چلی گئی اور تانگے والے سے کہا۔ "جتنی تیزی کے ساتھ تم جبار خاں کی کوٹھی تک پہنچ سکتے ہو پہنچنے کی کوشش کرو۔ یہ جبار خاں کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

میری بات سنتے ہی تانگے والے نے گھوڑا دوڑا دیا۔ جبار خاں کو میں نے اگلی نشست پر تقریباً لٹا دیا تھا۔ اس کی کوٹھی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ جلد ہی تانگا وہاں پہنچ گیا۔ وہاں میں نے کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں دو نوجوانوں کو تاش کھیلتے دیکھا۔ تانگا رکتے ہی وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں نے تانگے سے کود کر ان دونوں کو پکارا۔ "سنو! جبار خاں شدید زخمی ہو گئے ہیں جلدی آؤ یہاں۔"

وہ دونوں نوجوان تاش میز پر پھینک کر تیزی سے تانگے کی طرف بھاگتے ہوئے آئے۔

"کیا ہوا...... ؟ کیا ہوا استاد کو؟" ان میں سے ایک نے جبار خاں پر نظر پڑتے ہی گھبرا کر مجھ سے پوچھا۔

"یہ ساری باتیں پھر ہوتی رہیں گی' پہلے انہیں اندر لے چلو۔ انہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

ان نوجوانوں نے جبار خاں کو تانگے سے اتارا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ انہیں اپنے استاد سے محبت تھی۔ وہ جبار خاں کو تقریباً اپنے ہاتھوں پر اٹھائے اندر لے جانے لگے۔

"تمہارے کتنے پیسے ہوئے؟" میں نے تانگے کی پچھلی سیٹ سے اپنا پرس اور برقع اٹھاتے ہوئے تانگے والے سے پوچھا۔

"پانچ روپے بنتے ہیں مگر مم...... میں جی آپ..... آپ سے نہیں لوں گا پیسے۔ کھدا کھاں صاحب کو جندگی دے' ان سے پھر کبھی لے لوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کی باگیں ہلائیں اور تانگا آگے بڑھ گیا۔

میں کوٹھی کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر کھلے ہوئے صدر دروازے کی طرف لپکی جس سے وہ نوجوان جبار خاں کو لیے ہوئے اندر گئے تھے۔ کوٹھی میں ان دو نوجوانوں کے علاوہ پانچ چھ اور نوجوان بھی تھے۔ صدر دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے اس کا اندازہ ہو گیا۔ ان نوجوانوں نے اندر داخل ہوتے ہی غالباً چیخ چیخ کر کوٹھی میں موجود اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی جمع کر لیا تھا۔ اب وہ جبار خاں کو ہاتھوں ہاتھ اٹھائے ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ خیریت یہ ہوئی کہ شاید ایسے ہی کسی غیر متوقع حادثے سے نمٹنے کیلئے وہاں فرسٹ ایڈ بکس موجود تھا۔ ایک نوجوان کہیں کسی اور کمرے سے اسے اٹھا لایا۔

جبار خاں کو اس کمرے میں موجود ایک بڑی سی مسہری پر لٹا دیا گیا تھا۔ اس نے اس قدر خون بہہ جانے اور چوٹیں کھانے کے باوجود اب تک حواس نہیں کھوئے تھے۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو بے ہوش ہو جاتا۔ وہ سبھی جبار خاں کی طرف متوجہ ہونے کے سبب ابھی تک مجھ سے کچھ نہ پوچھ سکے تھے۔

جبار خاں کے سر کا زخم صاف کر کے میں نے ہی دوا لگائی اور پھر پٹی باندھ دی۔ کھلی چوٹ صرف یہی تھی باقی خراشیں وغیرہ تھیں اور بند چوٹیں تھیں۔

"یہاں قریب ہی کوئی ڈاکٹر مل سکے گا؟" میں نے ایک نوجوان سے سوال کیا۔

"جی..... جی ہاں!" نوجوان نے جواب دیا۔ "کک...... کیا ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "ان کا تفصیلی معائنہ ضروری ہے اور دوا بھی ظاہر ہے ڈاکٹر ہی دے سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آیا۔" وہ نوجوان تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اس موقع پر جبار خاں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ وہ غالباً ڈاکٹر کو نہیں بلانا چاہتا تھا۔ جبار خاں ایسے لوگوں کے مزاج سے میں آشنا تھی۔ ایسے لوگ کسی بھی مرحلے پر اپنے چھوٹوں یا اپنے شاگردوں کے سامنے کسی بھی طرح کی کمزوری ظاہر نہیں کرتے۔

"اگر دودھ ہو تو گرم کر کے لے آؤ۔" میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے نوجوان کو مخاطب کیا۔

"ہاں ہاں' کیوں نہیں ہوگا میں لے کر آتا ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"تم ٹھہرو' میں لاتا ہوں۔ تمہیں باورچی خانے میں جانے کا اتفاق ہی کب ہوتا ہے۔" ایک اور نوجوان بول اٹھا۔

میں اس سے سمجھ گئی کہ وہاں کوئی عورت یا کوئی ملازم نہیں ہے بلکہ جبار خاں کے چیلے چانٹی ہی

وہاں رہتے ہیں اور وہی باورچی خانہ بھی سنبھالتے ہیں۔

وہ نوجوان کچھ دیر بعد دودھ لے کر آ گیا تو میں نے جبار خاں کو ہاتھ کا سہارا دے کر اٹھایا اور گرم گرم دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس سے پہلے کہ کچھ کہنے کیلئے اس کے ہونٹ کانپتے مگر میں نے اسے بولنے نہیں دیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت وہ کتنی شدید اذیت سے گزر رہا ہوگا۔ بند چوٹیں کتنی تکلیف دیتی ہیں' مجھے اچھی طرح علم تھا۔ اسے دودھ پلا کر میں نے پھر لٹا دیا۔

کسی ڈاکٹر کا مطب یا اس کی کوٹھی قریب ہی تھی اسی لیے اس نوجوان کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی جو ڈاکٹر کو بلانے گیا تھا۔ خلاف توقع ڈاکٹر نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا کہ جبار خاں کو وہ چوٹیں کیسے لگیں۔ وہ غالباً جبار خاں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے چوٹوں کا تفصیلی جائزہ لیا' پھر سر پر ٹانکے لگائے اور دوا لگا کر بینڈیج کر دی۔ جہاں جہاں بند چوٹوں سے جسم پر نیل پڑ گئے تھے وہاں بھی اس نے کسی دوا کی ہلکی سی مالش کی' پھر الٹے ہاتھ کی کہنی کے قریب سوجن کو دیکھا اور ہاتھ سیدھا کرنے لگا۔ تکلیف کے سبب جبار خاں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔ ڈاکٹر نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ہاتھ چھوڑ دیا اور بولا۔ ''کہنی میں فریکچر معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جلد از جلد ایک ایکسرے کرا لیں' فی الحال میں بینڈیج کر دیتا ہوں۔'' پھر اس نے لکڑی کی کوئی پٹی مانگی۔

ایک نوجوان لکڑی کی پٹی ڈھونڈنے چلا گیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر نے جبار خاں کو ایک انجکشن دیا اور پرچے پر کچھ دوائیں بھی لکھ کر دیں۔ میں نے محسوس کر لیا کہ ڈاکٹر وہاں مجھے دیکھ کر کچھ حیران سا تھا۔ وہ کئی بار مجھے اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھ چکا تھا۔ اس کی حیرانی کا سبب شاید میرے کپڑوں پر لگا ہوا خون بھی تھا۔

''کوئی تشویش کی بات تو نہیں ڈاکٹر؟'' میں نے دانستہ ڈاکٹر سے انگریزی میں بات کی۔ اس سے میرا مقصد ڈاکٹر پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہوں' کوئی گری پڑی لڑکی نہیں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے انگریزی ہی میں مزید کہا۔ خون خاصا بہہ گیا ہے' اگر آپ چاہیں تو گلوکوز کی ڈرپ بھی لگا دیں میں ان کی دیکھ بھال کر لوں گی۔''

میری بات سن کر وہ چونکا پھر کہنے لگا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں۔'' اس نے بھی گفتگو کیلئے انگریزی ہی کا سہارا لیا تھا۔ ''اگر آپ ان کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں تو اچھا ہے۔ ڈرپ بھی ان دواؤں کے ساتھ میڈیکل سٹور سے منگوا لیں۔ جب ڈرپ آ جائے تو مجھے بلوا لیجئے گا۔ کسی کو میرے ساتھ میرے مطب بھیج دیں' میں ڈرپ سٹینڈ دے دوں گا۔''

''ڈرپ لگانے کیلئے آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میں لگا لوں گی ڈرپ۔'' میں نے

''دین ویل اینڈ گڈ۔'' وہ شانے اچکا کر بولا۔

پھر لکڑی کی پٹی بھی ڈھونڈ کر لے آئی گئی اور ڈاکٹر نے جبار خاں کی کلائی کے نیچے اسے رکھ کر بینڈیج کر دی۔ وہی نوجوان جو ڈاکٹر کو لے کر آیا تھا' ڈاکٹر کے ساتھ ڈرپ سٹینڈ لینے چلا گیا۔ اسی کو میں نے دواؤں کا پرچہ بھی دے دیا تھا۔

جبار خاں کی حالت اب پہلے سے خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ مسہری کے قریب اس کے سرہانے بچھی ہوئی ایک کرسی پر میں بیٹھی تھی۔ دو کرسیاں اور بھی وہاں پڑی تھیں۔ ان پر دو نوجوان بیٹھے تھے اور کرسیوں کے ہتھوں پر بقیہ نوجوان براجمان تھے۔ وہ سبھی جبار خاں کو پرتشویش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ ''اب فکر کی کوئی بات نہیں' اللہ نے تمہارے استاد کی زندگی بچا لی ہے۔ ہاں اگر فوری طور پر طبی امداد نہ ملتی تو خطرے کی بات تھی۔ ڈاکٹر نے جو دوائیں لکھی ہیں' انہیں کھلانے اور ڈرپ چڑھنے کے بعد ان کی حالت مزید بہتر ہو جائے گی۔''

''مگر..... مگر آپ..... آپ کون ہیں؟ ہم نے پہلے آپ کو کبھی استاد کے ساتھ نہیں دیکھا۔'' ایک نوجوان بالآخر اپنے تجسس سے مجبور ہو کر مجھ سے سوال کر ہی بیٹھا۔

''میں کون ہوں؟'' یہ کہتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''یہ تو تمہارے استاد جبار خاں کو بھی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ تمہارے استاد کو تو ابھی میرا نام تک نہیں معلوم۔ ویسے میں تم لوگوں کو اپنا نام ضرور بتاؤں گی۔ میرا نام عذرا خان ہے اور میں اس لڑکی کی بڑی بہن ہوں جسے کل رات انوری بائی کے کوٹھے سے یہاں لایا گیا ہے۔''

''کیا؟'' کئی نوجوانوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ ان کے چہروں پر حیرت کے آثار تھے۔

''یقین نہ آئے تو اپنے استاد سے پوچھ لینا۔'' میں بدستور مسکرا کر بولی۔ پھر کہا۔ ''میری بہن کو ایک شخص ہرنارائن نے دہلی سے اغوا کرا کے یہاں انوری بائی کے پاس بھیج دیا تھا۔ میں اسی شخص سے انوری بائی کے نام یہ خط لکھا کر یہاں پہنچ گئی کہ میری بہن کو میرے حوالے کر دیا جائے۔ میں انوری بائی سے آج صبح جا کر ملی تو اس نے ہرنارائن کو پہچاننے ہی سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی نیت میں فتور آ چکا تھا۔ پھر اس نے دھوکا دے کر مجھے بھی ایک کمرے میں قید کر دیا۔ آج دوپہر کو اس نے تمہارے استاد کو بلوایا۔ اس کی نیت مجھ پر بھی خراب ہو گئی تھی۔ تم لوگ تو طوائفوں کے ہتھکنڈے سمجھتے ہی ہو گے۔'' یہ کہہ کر میں نے قدرے توقف کیا۔

''جی تو پھر..... پھر کیا ہوا؟'' مجھے خاموش دیکھ کر ایک نوجوان اپنی بے چینی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''انوری بائی میری بہن کی طرح مجھ پر بھی ہاتھ صاف کر کے اپنی دانست میں دہرا مال کمانا

چاہتی تھی۔ میں نے تمہارے استاد اور اس کے درمیان ہونے والی کچھ باتیں سن لی تھیں۔ اس وقت جب انوری بائی تمہارے استاد کو ساتھ لیے اس کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں مجھے قید کیا تھا۔ ہاں میں تم لوگوں کو درمیان میں ایک بات بتانا بھول ہی گئی۔ جب انوری بائی نے مجھے اس کمرے میں بند کر دیا اور تقریباً تین گھنٹے گزر گئے تو میں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کیلئے اپنے پرس سے ریوالور نکال کر فائر کر دیا۔ اسی کے بعد اس نے تمہارے استاد کو بلوایا تھا۔ انوری بائی اور تمہارے استاد کی بات سن کر مجھے معلوم ہو گیا کہ میری بہن، تمہارے استاد کے قبضے میں ہے۔ میں نے اسی لیے یہاں تک پہنچنے کی خاطر کوئی مزاحمت نہیں کی۔ پھر تمہارے استاد نے انوری بائی سے رضامندی کا اظہار کر دیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر تیار ہیں۔ تم لوگوں کو یقیناً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مجھے انوری بائی نے کس لیے تمہارے استاد کے ساتھ بھیجا تھا۔ بہرحال میرے منہ میں ایک رومال ٹھونس کر اور اوپر سے دوسرا بڑا رومال میرے منہ پر باندھ کر برقع پہنا کے چہرے پر نقاب ڈال کے مجھے کوٹھے کی پچھلی گلی میں لایا گیا جہاں پہلے سے ایک تانگا منتظر کھڑا تھا۔ تانگے پر بھی چادر بندھی ہوئی تھی۔'' میں دلچسپی کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات ان نوجوانوں کو سنا رہی تھی۔ وہ بھی توجہ اور دلچسپی سے یہ سب کچھ سن رہے تھے۔'' تانگا وہاں سے چل دیا اور پھر کوئی نصف گھنٹے چلنے کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جس کے سبب تمہارے استاد کی یہ حالت ہوئی۔ تانگے کو دس لٹھ بند افراد نے گھیر لیا۔ تمہارے استاد نے تانگے سے چھلانگ لگا کر ان میں سے ایک کی لاٹھی چھین لی اور پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔ مجبوراً مجھے بھی تمہارے استاد کا ساتھ دینا پڑا۔ پھر وہ لوگ تو خیر لمبے ہو گئے مگر تمہارے اساتذ کی حالت شدید زخمی ہو جانے کی وجہ سے میرے لیے تشویش کا سبب بن گئی۔ میں نے انہیں تانگے میں ڈالا اور یہاں لے آئی۔ تانگے والا تمہارے استاد کو جانتا تھا اس لیے سیدھا یہاں لے آیا۔'' میں نے دانستہ جبار خاں کے دشمنوں سے نبرد آزمائی کے واقعات انتہائی اختصار سے بیان کیے تھے تاکہ اس سے میری خودستائی کا پہلو نہ نکلے۔

اس موقع پر جبار خاں بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ''عذ...... عذرا خان! پورے...... واقعات بتاؤ۔''

''یہی تو پورے واقعات تھے جو میں نے ابھی بتائے ہیں اور کیا بتاؤں!'' میں نے مسکرا کر جبار خاں کی طرف دیکھا۔

''نن...... نہیں! انہیں یہ...... بھی بتاؤ عذرا خان کہ تم...... تم نے ان کے استاد کی جان بچائی ہے۔ آج تم نہ ہوتیں تو...... تو عنایت اور اس...... اس کے شاگرد ان کے استاد کو ختم کر دیتے۔'' جبار خاں نے یہ کہہ کر اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ یقیناً وہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے جو پین کلر گولیاں لکھ کر دی تھیں، ابھی اسے نہیں دی گئی تھیں۔

''میرا خیال ہے جبار خاں کہ تم مزید کچھ دیر خاموش پڑے رہو تو اچھا ہے۔'' میں نے اسے

تاکید کی۔ ''تم یہ باتیں اپنے شاگردوں کو کچھ دیر بعد بھی بتا سکتے ہو جب تمہاری طبیعت کچھ سنبھل جائے۔''

''ہم عنایت کو زندہ نہیں چھوڑیں گے!'' وہاں موجود نوجوان پر جوش لہجے میں بولے۔

''اور ہم آپ کے احسان مند ہیں کہ......''

''نہیں، میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔'' میں نے اپنے قریب کرسی پر بیٹھے ہوئے نوجوان کی بات کاٹ دی۔

اسی وقت ڈاکٹر کے ساتھ جانے والا نوجوان، ڈرپ سٹینڈ اور دوائیں لے کر آ گیا۔ میں نے جبار خاں کو گولیاں کھلائیں اور پھر ڈرپ لگا دی۔

رفتہ رفتہ دی ہوئی دواؤں، انجکشن اور ڈرپ کا اثر ہونے لگا۔ جبار خاں کے مرجھائے ہوئے چہرے پر تازگی نظر آنے لگی۔ ہر چند کہ اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کے بارے میں مجھے فکر تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے مگر دانستہ میں نے اس ضمن میں کوئی بات نہیں کی۔ اس کوٹھی میں آئے ہوئے مجھے تقریباً دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ ابھی تک میرے جسم پر خون آلود کپڑے ہی تھے۔ میں چاہتی تھی کہ جبار خاں کو پوری ڈرپ چڑھ جائے اور وہ ٹھیک طرح بولنے کے قابل ہو جائے تو پھر ذکیہ کے بارے میں کوئی بات کروں۔ قدرت نے خود بخود میرے حق میں حالات سازگار کر دیئے تھے۔ مجھے جبار خاں پر احسان کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ جبار ایسے لوگ اپنے محسنوں کے لیے جان تک دینے سے گریز نہیں کرتے۔ میں اسی لیے کچھ مطمئن سی تھی۔

ڈرپ ختم ہونے ہوالی تھی کہ جبار خاں نے اپنے ایک شاگرد کو مخاطب کیا۔ ''رات کو اس لڑکی کے ساتھ میں جو اٹیچی لے کر آیا تھا، اس میں کپڑے ہیں وہ لا کر عذرا خان کو دے دو تاکہ یہ کپڑے بدل لیں۔'' وہ نوجوان اٹھ کر جانے لگا تو جبار خاں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ''اور سنو! کچھ کھانے پینے کا بھی بندوبست کرو۔ صبح سے انہوں نے کچھ کھایا پیا بھی تو نہیں ہوگا۔''

اس نوجوان کے ساتھ ہی ایک اور نوجوان اٹھ کر چلا گیا۔ یہ وہی تھا جو جبار خاں کیلئے دودھ لے کر آیا تھا۔

ذکیہ کیلئے کپڑوں وغیرہ کا بندوبست انوری بائی ہی نے کیا ہوگا۔ مجھے اس کے کوٹھے پر جو لڑکیاں نظر آئی تھیں ان کے جسم اور قد بھی تقریباً مجھ ایسے ہی تھے۔ یہ کپڑے انہی کے ہو سکتے تھے۔ انوری بائی نے احتیاطاً ذکیہ کے کپڑے بدلوا دیئے ہوں گے۔ یہ بات بھی میرے لیے سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ ایسا اس وقت کیا گیا ہوگا جب ذکیہ کو جبار اپنے ساتھ یہاں لا رہا ہوگا۔

ذرا ہی دیر بعد ایک اٹیچی آ گئی۔ میں نے اسے کھول کر ایک جوڑا نکال لیا۔ ایک نوجوان نے باتھ روم تک میری رہنمائی کی۔ کپڑے بدل کر آنے کے بعد میں نے ڈرپ کی سوئی نکال دی۔ ڈرپ ختم

ہو چکی تھی۔ جبار خاں کی دوا کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ میں نے دوا کھلانے کیلئے اسے سہارا دے کر اٹھانا چاہا تو وہ بول اٹھا۔ ''نہیں اس کی ضرورت نہیں اب میں خود اٹھ سکتا ہوں۔'' پھر وہ دائیں کہنی کے بل آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی طبیعت کی بحالی میں یقیناً قوت ارادی کو بھی دخل تھا۔

دوا کھا کر وہ گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گیا تو میں نے کہا۔ ''جبار خاں! اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''بالکل ٹھیک ہوں میں' تم میری فکر نہ کرو۔'' اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا' پھر کہنے لگا۔ ''عذرا خان! میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے لڑاکا لوگ دیکھے ہیں' مگر یقین کرو کہ میری نظر سے کوئی ایسی عورت تو خیر بہت دور کی بات ہے' مرد بھی نہیں گزرا۔'' پھر وہ اپنے شاگردوں کو میری رزم آرائی کے متعلق تفصیل کے ساتھ بتانے لگا اور آخر میں بولا۔ ''ان دس میں سے میں نے تو صرف ایک ہی کو گرایا تھا' بقیہ نو افراد عذرا خان کے ہاتھوں ڈھیر ہوئے۔ یہ بجلی کی طرح کوند کر اپنے دشمن پر ٹوٹتی ہیں۔''

''تمہی لوگ بتاؤ کیا کوئی عذرا خان کو دیکھ کر یہ یقین کر سکتا ہے کہ انہوں نے دس لٹھ بندوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا ہو گا۔'' پھر وہ اصل موضوع کی طرف آ گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں اب بتاؤ' تمہاری بہن کا کیا قصہ تھا؟ اسے کب' کہاں اور کیسے اغوا کر لیا گیا تھا اور وہ انوری بائی کے کوٹھے تک کس طرح پہنچی؟''

میں نے اسے مختصراً تمام حالات بتا دیے۔ مصلحتاً یہ نہیں بتایا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے اور یہ بھی کہ ذکیہ مصر کی شہری ہے۔ میں نے خود کو اور ذکیہ کو دہلی کی ظاہر کیا تھا۔ ذکیہ' دہلی سے کلکتے گھومنے کیلئے گئی تھی اور وہاں اسے یہ واقعات پیش آئے۔ پھر میں کلکتہ پہنچی اور مجرموں کے پیچھے لگ گئی۔ بقیہ واقعات جس طرح پیش آئے تھے' میں نے اسی طرح بیان کر دیئے تھے۔

جبار خاں اور اس کے شاگرد مبہوت سے ہو کر میری باتیں سن رہے تھے۔ یقیناً ان کیلئے ہپناٹزم حیرت انگیز بات تھی۔ میں نے تمام واقعات بیان کر دیئے تو جبار خاں نے تبصرہ کیا۔ ''میں نے ہپناٹزم کے بارے میں سنا ضرور تھا مگر آج یقین آ گیا۔ میں جبھی تو تمہاری بہن کو دیکھ کر حیران تھا۔ اس کی آنکھیں سوئی سوئی سی تھیں اور کسی بھی بات سے اس میں انکار کی جرأت ہی نہیں تھی۔''

''جبار خاں میری بات کا برا نہ ماننا مگر پھر بھی میں اپنی تسلی کیلئے تم سے ایک سوال ضرور کروں گی کہ تم نے میری بہن کی اس حالت سے کوئی فائدہ تو نہیں اٹھایا؟''

''نہیں عذرا خان!'' اس نے فوراً جواب دیا۔ ''برے لوگوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں' میں نے آج تک کسی کی امانت میں خیانت نہیں کی۔ تمہاری بہن میرے پاس انوری بائی کی امانت تھی اور یہ امانت میں اسی طرح اسے واپس کرنا چاہتا تھا جس طرح مجھے ملی تھی۔ میں واضح الفاظ میں تمہیں بتا دینا

چاہتا ہوں کہ تمہاری بہن کی عزت و آبرو قطعی محفوظ ہے اور..... اور اب میں اسے تمہارے حوالے کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ تمہارے احسان کا بدلہ تو نہیں مگر اس طرح میرا ضمیر کچھ نہ کچھ مطمئن ضرور ہو جائے گا کہ جس عورت نے میری زندگی بچائی تھی میں نے.....''

''لیکن انوری بائی سے تم کیا کہو گے؟'' میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''انوری بائی سے میں نمٹ لوں گا' تم اس کی فکر نہ کرو۔ تمہیں شاید یہ غلط فہمی ہے کہ میں اس کا آلہ کار ہوں۔ تو ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے اور اس کے تعلقات کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ ہمارے درمیان برابری کے تعلقات ہیں۔ تمہیں شاید یہ سن کر بھی حیرت ہو کہ وہ ایک زمانے میں میری رکھیل رہ چکی ہے۔ رکھیل کا مطلب تو سمجھتی ہو تم؟''

''ہاں سمجھتی ہوں۔'' میں نے جواباً کہا۔

''اپنے بارے میں مختصراً میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں علی گڑھ ہی کے ایک قصبے کا رہنے والا ہوں۔ اپنے عزت دار باپ کا نام بتا کر میں ان کی روح کو شرمندہ نہیں کروں گا۔ بہرحال میرا تعلق ایک نواب خاندان سے ہے۔ میرے مرحوم والد نے مجھے تعلیم کی غرض سے یہاں بھیجا تھا۔ یہ حویلی جس میں اس وقت تم بیٹھی ہو میرے والد نے اس غرض سے خریدی تھی کہ یہاں دوران تعلیم میں ان کی اولاد ٹھہر سکے۔ میرے بڑے بھائیوں کا قیام بھی یہیں ہوتا تھا۔ جب وہ زیر تعلیم تھے۔ میں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ یہاں آ کر میں بری صحبت میں پڑ گیا۔ اس کی اطلاع میرے والد کو بھی ہوئی اور انہوں نے مجھے عاق کر دیا۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا اور بڑے بھائیوں نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔ والد کی موت کے بعد میں نے اپنی بستی کا رخ نہیں کیا اور یہاں کا ہو رہا۔ پھر میں نے تعلیم کو خیر باد کہہ کر وہ راہ اپنا لی جس پر قدم رکھنے کے بعد واپسی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ مجھ سے پہلے اس شہر میں جن لوگوں کا رعب و دبدبہ تھا' ظاہر ہے ان سے میری ٹھن گئی۔ میرے ہاتھوں دو افراد مارے بھی گئے' مگر ثبوت نہ ہونے کے سبب مجھے بری کر دیا گیا۔ وہ شخص عنایت جس کے سینے پر لاٹھی مار کر تم نے اسے گرا دیا تھا' میرے ہاتھوں مارے جانے والے گروہ بند رفاقت کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ مجھ سے اپنے بھائی کا انتقام لینا چاہتا ہے اور..... اور یہ جنگ جاری ہے۔'' اپنی بات ختم کرتے ہوئے جبار خاں نے طویل سانس لیا' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''میری ایک خواہش ہے عذرا خان کہ چند دن کیلئے مجھے اپنی میزبانی کا موقع دے دو۔''

''جیسا کہ میں بتا چکی ہوں میرے ساتھ کلکتے سے میرا خالہ زاد بھی یہاں آیا ہے۔ وہ اسٹیشن کے قریب مسافر خانے میں میرے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔ اسے میری طرف سے سخت تشویش ہو گی۔ میں اب ذکیہ کو لے کر جلد سے جلد اس کے پاس پہنچ جانا چاہتی ہوں پھر کبھی علی گڑھ آئی تو میں ضرور تمہاری مہمان

رہوں گی۔''

میرے کہنے کے باوجود جبار خاں نے ضد کر کے آئندہ روز تک کیلئے مجھے روک ہی لیا۔ طے یہ ہوا کہ میں مسافر خانے جا کر زاہد کو اپنے ساتھ یہیں لے آؤں اور کل شام یہاں سے دہلی کے لیے روانہ ہو جاؤں۔ جبار خاں نے اس محبت اور خلوص کے ساتھ اصرار کیا تھا کہ میں آئندہ روز تک رکنے پر مجبور ہو گئی۔

وہاں سے جبار خاں کے ایک شاگرد کی معیت میں مسافر خانے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ذکیہ کو ایک نظر دیکھنا ضروری سمجھا۔

ذکیہ اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک نظر آئی اور میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح کھوئی کھوئی سی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں جبار خاں کے ایک شاگرد کو ساتھ لیے اس کوٹھی سے نکلی۔ تھوڑا فاصلہ طے کر کے ہم سڑک پر نکل آئے اور ہمیں ایک سائیکل رکشہ مل گیا۔ جبار خاں کے اس شاگرد کا نام متین تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کون سا علاقہ ہے؟''

''میرس روڈ۔'' اس نے بتایا۔ وہ مجھ سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ علی گڑھ ایسے چھوٹے سے شہر کا وہ علاقہ مجھے بہت پرسکون معلوم ہوا۔ میری زندگی کا بڑا حصہ بڑے شہروں میں گزرا تھا جہاں بہت شور ہوتا ہے۔ مجھے اسی لیے یہاں کا سکون اور خاموشی اچھی لگ رہی تھی۔ رکشہ میں بیٹھ کر میں اردگرد کا نظارہ کرتی ہوئی خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اب شام ہو چلی تھی۔ فرحت بخش ہوا کے جھونکے مجھے تروتازگی بخش رہے تھے۔ میرے اطمینان قلب کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں بالآخر ذکیہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس وقت اگر میرے ذہن پر کوئی فکر سوار تھی تو وہ زاہد کی طرف سے تھی۔ میں دن بھر غائب رہی تھی اور زاہد یقیناً میری طرف سے پریشان ہوگا۔

کوئی آدھے پون گھنٹے کے بعد میں مسافر خانے پہنچ گئی۔ میرے اصرار کے باوجود متین نے رکشہ کا کرایہ خود ادا کیا تھا۔ مسافر خانے کے صدر دروازے سے ہم اندر داخل ہو رہے تھے کہ میری نظر زاہد پر پڑی۔ وہ صدر دروازے ہی کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آ رہا تھا۔

''ارے ارے' یہ تم کہاں سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہو۔'' میں نے دور ہی سے بلند آواز میں زاہد کو مخاطب کیا کیوں کہ اس کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ لپک کر میرے قریب آ گیا۔ ''حد کر دی آپ نے بھی۔'' اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

''مگر تم یہ جا کہاں رہے تھے اے عزیز از جان۔'' میں نے شوخ لہجے میں مسکرا کر کہا۔

''تھانے میں رپٹ لکھانے جا رہا تھا کہ ایک عدد جوان جہان حسینہ بہ عمر...... چلیں عمر چھوڑیں' عورتوں کی عمر کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور......'' اچانک وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نظر میرے قریب کھڑے متین پر پڑ گئی تھی اور اس نے بلا تکلف متین کو مخاطب کر لیا تھا۔ ''آپ کی تعریف؟ آپ کس تقریب میں یہاں تشریف فرما ہیں؟''

متین کے کچھ کہنے سے پہلے میں بول اٹھی۔ ''یہ میرے ساتھ ہیں۔ ان کا نام متین ہے۔'' میں نے تعارف کرایا' پھر متین کی طرف مڑ کر بولی۔ ''اور متین' یہی وہ ذات شریف ہیں' یعنی میرے خالہ زاد جن کی طرف سے میں فکر مند تھی۔''

''میں سمجھ گیا تھا۔'' متین خوش اخلاقی سے بولا مصافحے کیلئے زاہد کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

زاہد نے گرم جوشی کا جواب گرم جوشی سے دیا۔ پھر میں نے اسے یہ خوشخبری سنائی کہ ذکیہ مل گئی ہے۔

''جی چاہتا ہے۔ اس خوشی میں آپ سے لپٹ جاؤں مگر ڈر یہ ہے کہ کہیں اس کا مطلب کچھ اور ہی نہ سمجھا جائے۔ آپ نے اس طرح کی خبریں تو اخبار میں پڑھی ہی ہوں گی کہ شارع عام پر ایک نوجوان جوڑے کو......''

''بس کرو!'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''کچھ بھائی متین کا خیال کرو۔ تمہارے بارے میں یہ کیا سوچیں گے۔ گرمی بھی اتنی نہیں پڑ رہی کہ تم سے اس طرح کی باتوں کی توقع ہو۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے بتایا کہ ہم اسی وقت مسافر خانہ چھوڑ رہے ہیں۔

''مگر وہ مسمات کہاں ہیں جن کی خاطر ہم یہاں آئے تھے' یہ تو ابھی میں نے پوچھا ہی نہیں۔''

زاہد کا موڈ خوش گوار تھا۔ اس کا اشارہ ذکیہ کی طرف تھا۔

''یہاں سے ہم وہیں چلیں گے۔'' میں بولی۔ ''ذکیہ بخیریت ہے۔ کل تک کیلئے ہم ان لوگوں کے مہمان ہیں۔'' میں نے متین کی طرف اشارہ کیا۔

پھر ہمیں وہاں سے روانگی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ واپسی میں ہم نے میرس روڈ کیلئے ایک تانگا کر لیا تھا۔ تانگے میں متین آگے بیٹھا تھا اور میں زاہد کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔

''ویسے بائی داوے یہ لوگ ہیں کون؟'' زاہد نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

''تم انہیں ہمارے دوست اور بہی خواہ سمجھ سکتے ہو۔ انہی لوگوں نے ذکیہ کی بازیابی میں میری مدد کی ہے۔'' میں نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔ زاہد کو میں بلاسبب ان لوگوں کا کچا چٹھا سنانا نہیں چاہتی تھی۔ یوں بھی اگر اس کے علم میں یہ بات آتی کہ ہم لوگ جرائم پیشہ افراد کے مہمان ہیں تو وہ فکر و تشویش میں مبتلا ہو جاتا۔

''اچھا تو آپ مردوں سے بھی دوستی کرتی ہیں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''اگر پہلے مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس قدر آزاد خیال ہیں تو ہرگز آپ سے شادی کا فیصلہ نہ کرتا۔''

''اب بھی کیا بگڑا ہے۔ ابھی تو بیٹی باپ کے گھر ہے اپنا فیصلہ تبدیل کر لو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یوں بھی عشق میں، میں ون وے ٹریفک کی قائل نہیں ہوں۔ تمہارا فیصلہ یکطرفہ ہے جہاں تک مردوں سے دوستی کا تعلق ہے تو اچھی طرح سوچ سمجھ لو شادی کے بعد بھی یہی لیل و نہار ہوں گے' میں تمہاری خاطر اپنے درجنوں مرد دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔''

''تو کیا تعداد درجنوں تک ہے۔'' وہ منہ بنا کر کہنے لگا۔ ایک آدھ رقیب روسیاہ تو خیر عشق کے نصاب میں لازمی سبجیکٹ کی حیثیت رکھتا ہے مگر درجنوں رقیب میرے بس کی بات نہیں۔ آپ ہی کا حوصلہ ہے جو بیک وقت درجنوں سے نباہ رہی ہیں۔'' اس نے مجھ پر فقرہ چست کیا۔

''تمہارے خیال میں کیا مرد بہت معصوم ہوتے ہیں۔ انہیں تو ان کی سرشت اور ایک سے وفا نہ کرنے کی عادت دیکھ کر مذہب نے بھی کئی کئی عورتیں رکھنے کی اجازت دی ہے۔ مرد بھی عجب بے وفا حیوان ہے' میری مراد حیوان ناطق' یعنی بولنے والے حیوان سے ہے۔ تم بھی حیوان ناطق ہونا۔''

''اب حیوان کہیں یا کچھ اور مجھے تو یہ معلوم ہے کہ اس حیوان کے بغیر عورت کو چین نہیں آتا بلکہ بعض عورتیں تو صرف ایسے ہی مردوں کو پسند کرتی ہیں جن میں زیادہ حیوانیت ہوا۔ بیچ اس مسئلے کے آپ کیا فرماتی ہیں؟'' زاہد خاصا بے باک ہوتا جا رہا تھا' مگر یہ غنیمت تھا کہ اس کی آواز خاصی دھیمی تھی اور میں بھی مدھم آواز میں بات کر رہی تھی۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ متین ہماری باتیں سنے۔ وہ بہرحال ہمارے لیے ایک اجنبی ہی تھا۔ زاہد سے باتیں کرتے ہوئے میں راستے کو بھی اپنے ذہن میں محفوظ رکھتی جا رہی تھی۔

زاہد کی دلچسپ باتوں میں سفر اس طرح کٹ گیا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ واپسی میں بھی کرایہ متین ہی نے دیا' پھر میرا اور زاہد کا سامان اٹھانے لگا مگر میں نے منع کر دیا۔

جب ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو ساڑھے سات بجنے والے تھے۔ میرے اور زاہد کیلئے ایک کمرے کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں اس کمرے کے سامنے تھا جہاں گزشتہ شب سے ذکیہ کی سکونت تھی۔

رات کا کھانا بہت پرتکلف اور عمدہ تھا۔ میں اس دوران میں جبار خاں سے زاہد کا تعارف بھی کرا چکی تھی۔ زاہد نے بعد میں اس پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ پوری کوٹھی میں کوئی عورت نہیں تھی۔ میں نے اس کی بات ٹال دی تھی۔ کچھ وقت میں نے جبار خاں کے پاس گزارا تھا' پھر اس کمرے میں آ گئی تھی جو ہمارے قیام کیلئے مخصوص کیا گیا تھا۔ وہ کمرہ خاصا بڑا تھا اور اس میں مزید ایک پلنگ آ سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے ذکیہ کا پلنگ بھی وہیں اٹھوا لیا۔

''کیوں' کیا تنہا اس کمرے میں میرے ساتھ سوتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ آپ کو جو اپنی بہنا کا پلنگ بھی بچھوا لیا۔'' زاہد نے مجھے چھیڑا۔

''کبھی اپنی چونچ بند بھی رکھا کرو۔'' میں نے بظاہر منہ بنا کر کہا۔ ''تم ایسے کوئی تیس مار خاں نہیں ہو کہ تم سے ڈرا جائے۔ آئینے میں کبھی اپنی شکل غور سے دیکھی ہے بھیگی بلی دکھائی دیتے ہو۔'' یہ کہہ کر میں اسے چڑانے کی خاطر زور سے ہنس دی۔

''ہرگز نہیں میں آپ کی بات پر سخت احتجاج کرتا ہوں۔ میں بھیگا بلا تو ہو سکتا ہوں بھیگی بلی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آپ کے حق پر میں بھلا کیسے ڈاکہ ڈال سکتا ہوں۔'' اس نے کہا' پھر غور سے میرے کپڑوں کو دیکھنے لگا اور بولا۔ ''جہاں تک مجھے یاد ہے' آپ جب مسافر خانے سے روانہ ہوئی تھی تو یہ کپڑے پہنے ہوئے نہیں تھیں' پھر......''

''معاف کیجئے گا محترمہ آپ کی سرگرمیاں مجھے بہت پراسرار معلوم ہوتی ہیں۔ یہ سارا چکر سمجھ میں نہیں آیا میری پہلے تو آپ نے ذکر نہیں کیا تھا اپنے ان دوستوں کا پھر یہ اچانک کہاں سے ٹپک پڑے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ یقیناً مجھ سے کچھ نہ کچھ چھپا رہی ہیں۔''

''بقول تمہارے میری سرگرمیاں پراسرار ہیں تو پھر پوچھنا کیا! صبر کرو۔'' میں نے کہا اور پھر ذکیہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جو اپنے پلنگ سے اٹھ رہی تھی۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔

''باتھ روم جاؤں گی۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

ہمیں ایسا کمرہ فراہم کیا گیا تھا جس میں باتھ روم بھی تھا۔ میں نے باتھ روم تک اس کی رہنمائی کی اور واپس آ گئی۔

اس رات میں نے سونے سے پہلے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کمرے میں ایک کھڑکی بھی تھی جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی سے باہر لگے ہوئے درخت اور پودے نظر آ رہے تھے۔ معلوم نہیں کیا سوچ کر جبار خاں نے باہر بھی روشنی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کھڑکی میں کیوں کہ لوہے کی گرل نہیں لگی ہوئی تھی اس لیے میں نے اسے بھی بند کر دینا مناسب خیال کیا۔

''آپ تو بالکل اس طرح [illegible] دشمن کے حملے کا اندیشہ ہے۔'' زاہد نے اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا۔

''کیوں' احتیاط کیا بری بات [illegible]

زاہد نے جو کچھ کہا تھا وہ تو [illegible]

محسوس ہو رہی تھی اور میں اپنی اس بلا [illegible]

کھڑکی بند کرنے کے بعد میں نے بڑا بلب بجھا [illegible]

گئی تھی۔ میری دائیں جانب زاہد کا پلنگ تھا اور بائیں جانب ذکیہ سو رہی تھی۔

''اچھا بھئی زاہد' خدا حافظ میں تو سو رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''خدا حافظ!'' جواباً وہ بولا۔ ''خدا کرے آپ کو اچھے اچھے خواب نظر آئیں۔ کوشش کیجئے گا کہ ان خوابوں میں میرے سوا کوئی اور آپ کا ہم سفر نہ ہو۔''

''بکومت!'' میں جھنجلا گئی۔ ''سوتے سوتے بھی چین نہیں۔''

''کسے...... آپ کو یا مجھے؟'' زاہد باز نہ آیا۔ ''اگر میری طرح آپ بھی بے چین ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا بقولِ شاعر کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔''

میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خاموش رہوں۔ میں جواباً کچھ کہتی تو وہ بھی شروع ہو جاتا۔ یوں بھی ایک چپ سو کو ہراتی ہے۔

''ارے کیا خفا ہو گئیں آپ؟'' اس نے پھر ہانک لگائی۔

''اگر خوابوں میں ہم سفری والی بات بری لگ گئی ہے تو میری طرف سے صرف خوابوں کی حد تک اجازت ہے کہ......''

''تم خاموشی سے نہیں سوؤ گے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔

''میں نے سونے سے کب منع کیا ہے! میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ......''

''کچھ نہیں کہہ رہے تھے تم! سمجھ گئے اب میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف سے کروٹ لے لی۔

پھر زاہد کچھ نہیں بولا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ میں واقعی اب کچھ نہیں بولوں گی اور یہ کہ اب سونا چاہتی ہوں' حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میری آنکھوں میں نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کی وجہ وہی بے چینی تھی۔ میرا اب تک کا تجربہ یہ تھا کہ اس طرح بلا سبب بے چینی مجھے کسی خطرے کی آمد سے پہلے ہی محسوس ہوتی تھی۔ میری آنکھوں سے نیند اڑ جانے کی وجہ یہی تھی۔ میں نے بہت سوچا کہ مجھے یہاں کیا غیر متوقع خطرہ پیش آ سکتا ہے؟ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن تھک گیا تو کچھ غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ یوں بھی گزشتہ رات میں ایک پل کو بھی نہیں سو سکی تھی۔ نیند آنا فطری بات تھی۔ کچھ ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔

معلوم نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ کسی نے کمرے کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑانا شروع کر دیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں ایک دم بستر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت زاہد بھی جاگ اٹھا اور مجھ سے بولا۔ ''کیا بات ہے؟ یہ دروازہ کون پیٹ رہا ہے؟''

''مجھے خود نہیں معلوم!'' میں نے زاہد کی بات کا جواب دیا۔ میرے ذہن میں خطرے کی

گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''پوچھتی ہوں ابھی۔'' دروازے پر اب بھی زور زور سے دستک دی جا رہی تھی۔ ''میں نے بلند آواز میں پوچھا۔ 'کون ہے دروازے پر؟'' اسی کے ساتھ آگے بڑھ کر میں نے بڑا بلب جلا دیا۔

''پولیس!'' جواباً ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''دروازہ کھول دو فوراً ورنہ اسے توڑا بھی جا سکتا ہے۔'' آواز میں دھمکی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دستک دینے والے واقعی پولیس والے ہی تھے۔ دروازہ کھلتے ہی ایک پولیس انسپکٹر اور تین سپاہی تیزی کے ساتھ کمرے میں گھس آئے۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ملنے والی اطلاع بالکل صحیح تھی۔ یہاں واقعی رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں!'' پولیس انسپکٹر کی آواز سے غرور و تکبر کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''گرفتار کر لو ان ٹخیائیوں اور اس عیاش نوجوان کو۔''

پولیس انسپکٹر اگر اتنی گھٹیا اور نازیبا زبان استعمال نہ کرتا تو شاید میرے صبر کا پیمانہ اتنی جلدی لبریز نہ ہوتا۔

''ٹخیائیاں تیری ماں بہنیں ہوں گی!'' میں غصے کی زیادتی سے بے قابو ہو کر تقریباً چیخ اٹھی اور پھر دوسرے ہی لمحے انسپکٹر کے منہ پر میرا الٹا ہاتھ پڑا۔

پولیس انسپکٹر چند لمحے کو سکتے میں رہ گیا۔ مجھے علم تھا کہ اس کیفیت سے نکل کر وہ کیا قدم اٹھا سکتا ہے۔ جو سپاہی اس کے ساتھ آئے تھے وہ مسلح نہیں تھے' یہ میں پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ صرف پولیس انسپکٹر کے پہلو سے ریوالور لٹکا ہوا تھا۔ میں نے کسی تامل کے بغیر اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور اچھل کر دور ہٹ گئی۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس کا ریوالور خالی تھا یا بھرا ہوا۔ میں نے یہ کارروائی محض حفظ ماتقدم کے طور پر کی تھی۔ احتیاطاً میں اپنا ریوالور تکیے کے نیچے رکھ کر سوئی تھی جو بھرا ہوا تھا۔ کوئی رسک نہ لینے کی خاطر کہ کیا خبر پولیس انسپکٹر کا ریوالور خالی ہو میں جست بھر کر اپنے پلنگ تک پہنچ گئی اور تکیے کے نیچے سے اپنا ریوالور نکال کر اسے بھی پولیس انسپکٹر اور سپاہیوں کی طرف تان لیا۔ ابھی تک وہ سب مبہوت سے کھڑے تھے۔

''اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ میں تم سب کو پھونک دوں گی۔'' میں نے پولیس انسپکٹر کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ انہوں نے فوری طور پر میرے حکم کی تعمیل میں اپنے ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔

''تم...... تت تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' پولیس انسپکٹر مردہ سی آواز میں ہکلا کر بولا۔

''تم نے نا صرف سر...... سرکاری کارروائی میں مداخلت کی ہے بلکہ......''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

اٹھانے کو تو میں یہ قدم اٹھا بیٹھی تھی لیکن اب میرا ذہن تیزی سے اس کا کوئی حل تلاش کرنے

کی کوشش میں مصروف تھا۔ میرے لیے یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں تھا کہ یہ کارروائی جواباً جبار خاں کے دشمنوں کے ایما پر کی گئی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت جبار خان اور اس کے شاگرد بھی زیر حراست تھے ورنہ پولیس انسپکٹر اتنی آسانی سے میرے کمرے تک نہ پہنچ جاتا۔ انہیں شاید پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ جو پولیس والے اس وقت میرے کمرے میں موجود تھے' ان کے علاوہ کتنے اور پولیس والے کوٹھی میں موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ پہلے ان کا تو کوئی بندوبست کیا جائے۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ میں نے ان چاروں کو کمرے کے باتھ روم میں بند کر دیا۔ انھوں نے میرے ہاتھوں میں دو دو ریوالور دیکھ کر کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی تھی۔

''زاہد! تم یہیں ٹھہرو' میں ابھی کوٹھی کا ایک چکر لگا کر آتی ہوں بلکہ بہتر ہے کہ تم کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لو۔ جب تک واپس آ کر میں تم سے دروازہ کھولنے کو نہ کہوں' ہرگز دروازہ نہ کھولنا۔'' میں نے زاہد سے کہا اور پھر تیزی کے ساتھ کمرے کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

چند قدم آگے بڑھتے ہی میں نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیے جانے کی آواز سنی تھی۔ مگر مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں اب بھی ریوالور موجود تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوٹھی میں کوئی ذی روح موجود نہ ہو۔ میں تقریباً دوڑتی ہوئی اس کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں جبار خاں کو ہونا چاہئے تھا۔ میں وہاں پہنچی اور رک کر اندر کی سن گن لی۔ اندر سناٹا چھایا ہوا تھا مگر کمرہ روشن تھا۔ چند لمحے بعد مین نے اندر جھانک کر دیکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ جبار خاں کی مسہری بھی خالی پڑی تھی۔ وہاں سے میں نے ایک راہداری عبور کر کے صدر دروازے کا رخ کیا۔

دور ہی سے مجھے صدر دروازہ کھلا نظر آ گیا۔ میں دوڑتی ہوئی وہاں تک پہنچی۔ میں نے دروازے کے ایک پٹ کی آڑ میں ہو کر باہر دیکھنے لگی۔ سامنے ہی برآمدے کی سیڑھیوں کے نیچے مجھے ایک پولیس جیپ نظر آ گئی۔ جیپ کے پاس دو پولیس والے کھڑے تھے۔ برآمدے کا بلب بھی روشن تھا۔ پولیس والوں کے قریب ہی مجھے جبار خاں اور اس کے تمام شاگرد نظر آ گئے۔ وہ سبھی ہتھکڑیاں پہنے ہوئے تھے۔ ایک غیر ملک میں قانون ہاتھ میں لینے کے بعد اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ زاہد اور ذکیہ کو ساتھ لے کر کسی طرح وہاں سے فرار ہو جاتی' مگر فرار کی راہ مسدود تھی۔ معلوم نہیں پولیس نے جبار خاں اور اس کے ساتھیوں پر کیا چارج لگا کر انہیں حراست میں لیا تھا لیکن مجھے اس وقت ان لوگوں سے زیادہ اپنی فکر تھی۔ مجھے ہر قیمت پر جلد از جلد یہاں سے زاہد اور ذکیہ کے ساتھ فرار ہونا تھا ورنہ میں پولیس کے ہتھے چڑھ جاتی تو پولیس والے انتقاماً نہ جانے میرا کیا حشر کرتے۔

☆......☆......☆

ان فیصلہ کن لمحات میں میرے پاس سوچنے سمجھنے کیلئے زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ پولیس انسپکٹر اور تین سپاہی جنہیں میں باتھ روم میں بند کر کے آئی تھی زیادہ دیر تک واپس نہ آئے تو باہر موجود پولیس والوں کو یقیناً کسی نہ کسی گڑبڑ کا احساس ہو جاتا۔ پھر کیا صورتحال پیش آتی' کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے اس امکان پر بھی غور کیا کہ اس کوٹھی کا عقبی دروازہ بھی ہو گا' لیکن اسے ان حالات میں تلاش کرنا مشکل ہی تھا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی میرے مدنظر تھی۔ مجھے یہاں سے فرار ہو کر ریلوے سٹیشن تک پہنچنے کیلئے بہرحال کوئی نہ کوئی سواری درکار تھی۔ مسافر خانے سے آتے ہوئے میں نے راستے کو اپنے ذہن میں رکھا تھا اور ریلوے سٹیشن' مسافر خانے کے سامنے ہی تھا۔ میرس روڈ سے ریلوے سٹیشن کا فاصلہ خاصا تھا اور وہاں تک ذکیہ کو ساتھ لے کر پیدل سفر کرنا محال ہی تھا۔ میں اگر اکیلی ہوتی تو مجھے کوئی فکر نہ ہوتی۔ اس وقت رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔ راستے میں گشتی پولیس سے مڈبھیڑ ہونے کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ میں گشتی پولیس کے اس سوال کا تسلی بخش جواب نہ دے پاتی کہ رات کے وقت پیدل کہاں اور کیوں جا رہی ہوں۔ علی گڑھ ایسے چھوٹے شہر کے اس پرسکون علاقے میں اس وقت کوئی سواری ملنا بھی ناممکن تھا۔ پھر...... پھر کیا کیا جائے؟ یہی ایک سوال بار بار میرے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ پھر یوں ہوا کہ اچانک میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ اس مسئلے کا حل میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ اگر تھوڑا بہت خطرہ تھا تو میں اپنی زندگی میں جانے کتنی بار ایسے خطرات سے نبرد آزما ہو چکی تھی۔

جیپ کے قریب جو دو پولیس والے کھڑے تھے' ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مجھے رائفل نظر آ رہی تھی۔ میں نے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا پھر اس فیصلے پر عمل کرنے کیلئے میں دروازے کی آڑ سے نکل آئی۔ میری نگاہ اب برآمدے میں لگے ہوئے بلب پر مرکوز تھی۔ پولیس انسپکٹر سے میں نے جو ریوالور چھینا تھا' اسے اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر بلب کا نشانہ لیا۔ دانستہ میں نے بلب پر فائر کرنے سے گریز کیا تھا تا کہ باہر موجود پولیس والوں کو خطرے کی شدت کا احساس نہ ہو سکے۔ میرا پھینکا ہوا ریوالور توقع کے مطابق بلب سے ٹکرایا اور ہلکے سے دھماکے کے ساتھ اندھیرا پھیل گیا۔ اندھیرا ہوتے ہی میں تیزی کے ساتھ برآمدہ عبور کر کے پولیس والوں کے عقب میں پہنچ گئی۔ میرا پہلا شکار وہ سپاہی تھا جس

کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے پیچھے سے اس کے گلے کو اپنے دائیں ہاتھ کی کلائی اور بازو کی گرفت میں لے لیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ میری گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کرتا' بائیں ہاتھ میں موجود ریوالور کا دستہ اس کی کنپٹی پر پڑا۔ اسی دوران میں دوسرے سپاہی کو جانے کس طرح صورتحال کا اندازہ ہو گیا۔ وہ چند ہی قدم کے فاصلے پر اس رسی کا سرا پکڑے ہوئے کھڑا تھا جو گرفتار ہونے والوں کی ہتھکڑیوں سے منسلک تھی۔ اس نے رسی کا سرا چھوڑ کر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میں رائفل والے سپاہی کے ڈھیلے پڑتے ہوئے جسم کو چھوڑ کر الگ ہٹنے والی تھی۔ اندھیرے میں مجھے سپاہی کی پرچھائیں تیزی سے اپنے قریب آتی محسوس ہوئی تھی مگر خطرے کا احساس ہونے کے بعد اس سے بچنے کیلئے کچھ کرنے سے پہلے سپاہی نے مجھے پیچھے سے جکڑ لیا۔ میں تیزی سے جھکی اور اسے اپنی پشت پر اٹھا کر سامنے پٹخ دیا۔ میرا جسم اس کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ پھر میں نے اس سپاہی کو زمین سے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے دائیں پیر کی ایک ہی بھرپور ٹھوکر اس کی کنپٹی پر پڑی تھی۔

جبار خاں اور اس کے شاگرد تصویرِ حیرت بنے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ جب دوسرا سپاہی بھی بے ہوش ہو گیا تو میں ان لوگوں کی طرف پلٹی۔

میں' جبار خاں کے قریب پہنچی تو اس نے مجھے پہچان لیا اور حیرت سے بولا۔ ''عذرا خان!''

''ہاں میں عذرا خان ہوں۔'' میں نے پرسکون آواز میں اس کی بات کا جواب دیا' پھر بولی۔ ''اگر تم چاہو تو اپنے شاگردوں کے ساتھ فرار ہو سکتے......''

''مگر وہ...... وہ پولیس انسپکٹر اور سپاہی کہاں ہیں جو اندر۔''

میں نے اس کی بات کاٹ دی اور پھر اسے مختصراً پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا' پھر بولی۔ ''ان حالات میں فوری طور پر میرا یہاں سے فرار ہونا ضروری ہے اور تم چاہو تو خود بھی یہی راستہ اختیار کر سکتے ہو۔ ان دونوں پولیس والوں میں سے کسی ایک کے پاس ہتھکڑیوں کی چابیاں مل جائیں گی میں تم لوگوں کی ہتھکڑیاں کھول دوں گی۔''

چند لمحے جبار خاں خاموش رہا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''عذرا خاں! ہماری فکر چھوڑو اور تم نکل جاؤ۔ موجودہ حالات میں ہمارا فرار ہونا ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ پولیس سے نمٹنا میں جانتا ہوں۔ پولیس نے مجھے اور میرے آدمیوں کو یہاں عیاشی کا اڈا چلانے کے جرم میں گرفتار کیا ہے' لیکن تم لوگوں کے فرار ہونے کے بعد وہ مجھ پر یہ جرم ثابت نہیں کر سکے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سب کچھ کس کے اشارے پر ہوا ہے۔ یہ جوابی کارروائی ہے اور اس کا ذمے دار یقیناً میرا حریف عنایت ہے۔ اس نے پولیس انسپکٹر کو اس کام کیلئے لمبی رشوت کھلائی ہوگی۔ خیر میں اس سے بھگت لوں گا۔ میرے پاس ان

چھوٹے پولیس افسران سے نمٹنے کے ذرائع بھی ہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے' میں نکل جاتی ہوں۔'' جبار خاں کے چپ ہوتے ہی میں بول اٹھی۔ ''میں اپنی بہن ذکیہ اور زاہد کو لے کر ابھی آئی۔''

''مگر تم اس وقت کہاں اور کیسے جاؤ گی؟'' جبار خاں نے سوال کیا۔

''تمہیں ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' میں یہ کہتی ہوئی تیزی کے ساتھ برآمدے کی طرف بڑھی۔ جو کچھ میں نے سوچا تھا' ابھی جبار خاں کو نہیں بتایا تھا۔ اسے شاید مجھ سے یہ توقع نہیں ہوگی کہ میں ریلوے سٹیشن تک پہنچنے کیلئے پولیس جیپ استعمال کروں گی حالانکہ ان دونوں پولیس والوں کو بیہوش کرنے کا اصل مقصد یہی تھا۔ اس طرح ایک طرف تو میری راہ میں مزاحم ہونے والا کوئی نہیں رہا اور دوسری طرف پولیس جیپ بھی میرے قبضے میں آ گئی تھی۔

جلد ہی میں اس کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی جہاں ذکیہ اور زاہد کو چھوڑ کر گئی تھی۔ دروازے پر دستک دیتے ہوئے میں نے زور سے کہا۔ ''زاہد! دروازہ کھول دو۔''

''کون؟'' زاہد نے اندر سے سوال کیا۔ وہ شاید میری آواز ٹھیک طرح سن نہیں سکا تھا کیونکہ اسی وقت اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یہ آوازیں باتھ روم میں بند پولیس والوں ہی کی ہو سکتی تھیں۔

''میں عذرا خان ہوں زاہد! دروازہ کھولو۔'' میں نے ایک بار پھر زور سے کہا۔

دوسرے ہی لمحے زاہد نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اس دوران میں غالباً دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے زاہد کو مخاطب کیا۔ ''جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے نکل چلو اور...... اور ذکیہ کو بھی جگا دو!'' میں نے ذکیہ کے بستر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک اس تمام ہنگامے سے بے خبر گہری نیند سو رہی تھی۔

اسی وقت پھر باتھ روم کی طرف سے پولیس انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے دھمکیاں دینے لگا' اسی کے ساتھ باتھ روم کا دروازہ کھولنے کیلئے اصرار کرنے لگا۔

میں باتھ روم کے سامنے پہنچ کر بولی۔ ''خواہ مخواہ چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا انسپکٹر۔ اس لیے کہ ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ خاموش رہو اور زیادہ بکواس نہ کرو۔ میں تمہاری دھمکیوں سے مرعوب ہونے والی نہیں ہوں۔ عنایت سے رشوت لینے کے بدلے چند گھنٹے کی قید کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔''

''تم...... تم کون ہو؟ اور...... اور عنایت...... عنایت کو کیسے جانتی ہو؟'' پولیس انسپکٹر نے سوال

یا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔ اب تمہیں مزید بکواس کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اب تم کتنے بھی چیخو چلاؤ' میری طرف سے تمہیں کوئی جواب نہیں ملے گا۔'' یہ کہہ کر باتھ روم کے دروازے سے ہٹ گئی۔

میرے کہنے سننے کے باوجود پولس انسپکٹر کی زبان بند نہیں ہوئی' مگر میں اس کی پروا کیے بغیر سے اپنا سامان سمیٹتی رہی۔ اپنا ریوالور میں نے پرس میں رکھ دیا۔ اس دوران میں ذکیہ کو بھی زاہد جگا دیا تھا۔ وہ حیران حیران سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ذکیہ اور زاہد کو ساتھ لیے اور سامان اٹھائے میں اس کوٹھی کے احاطے میں پہنچ گئی۔ میرے اشارے پر زاہد نے اپنی اور ذکیہ کی اٹیچیاں' پولیس جیپ میں رکھ دیں۔ میں نے بھی اپنا سوٹ کیس اور ایئر بیگ' جیپ کی پچھلی نشست پر رکھ دیا۔

''عذرا خان!'' جبار خاں میرے قریب آتے ہوئے حیرت سے بولا۔ ''کیا...... کیا تم اس پولیس جیپ میں سٹیشن تک جاؤ گی؟''

''ہاں...... کیوں' اس میں حرج بھی کیا ہے۔'' میں نے نرم اور پرسکون آواز میں کہا۔

''یہ...... یہ بہرحال خطرے...... کی بات ہے۔'' وہ جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔

''اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی تو نہیں ہے اور جہاں تک خطرے کا سوال ہے جبار خاں' تو میری زندگی خطرات ہی سے عبارت ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے طویل سانس لیا۔

''تم...... تم ریلوے سٹیشن تک پہنچ تو جاؤ گی نا؟ راستہ معلوم ہے نا؟'' جبار خاں کے لہجے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مسافر خانے سے یہاں آتے ہوئے میں نے راستہ اپنے ذہن میں محفوظ رکھا تھا۔ مسافر خانے کے سامنے ہی تو ہے ریلوے سٹیشن؟''

''خدا کرے تم بہ حفاظت اس شہر سے نکل جاؤ۔'' جبار خاں نے مجھے دعا دی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں ایک دن بھی اپنا مہمان نہ بنا سکا۔ بہرحال میں تمہیں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ پھر کبھی علی گڑھ آنا ہو تو مجھے بھولنا مت ملنا ضرور۔''

''وعدہ!'' میں خوش مزاجی سے بولی۔ ''اگر علی گڑھ کبھی آنا ہوا تو تم سے ملے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر میں جیپ میں سوار ہو گئی۔

توقع کے مطابق جیپ کی چابی اگنیشن ہی میں مجھے لگی ہوئی ملی۔ میرے برابر ہی ذکیہ بیٹھی تھی' زاہد۔ ہم تینوں ہی جیپ کی اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے اور ہمارا سامان پچھلی نشستوں پر رکھا تھا۔ میں

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ جبار خاں نے اس پر حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا کہ مجھے ڈرائیونگ بھی آتی ہے۔ اس کیلیے تو میرا پورا وجود ہی حیرت انگیز رہا ہو گا۔

جیپ سٹارٹ کر کے میں نے جبار خاں کو خدا حافظ کہا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا پیر ایکسیلٹر پر پہنچ گیا۔ اسی کے ساتھ جیپ آگے بڑھ گئی۔ وہاں اتنی گنجائش تھی کہ جیپ کو ریورس میں لیے بغیر میں نے اسے کوٹھی کے کھلے ہوئے گیٹ کی طرف موڑ لیا۔

میرس روڈ سے مسافر خانے تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مسافر خانے کا بڑا پھاٹک بند تھا۔ لکڑی کے پھاٹک کا ذیلی دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے پھاٹک سے کچھ پہلے ہی جیپ روک دی اور پھر جیپ سے اتر گئی۔ ذکیہ اور زاہد نے بھی میری تقلید کی۔ زاہد نے اور میں نے جیپ سے سامان اتارا اور پھر ہم سب سڑک عبور کر کے سامان اٹھائے ریلوے سٹیشن کی طرف بڑھنے لگے۔

میرا ارادہ یہ تھا کہ اس وقت علی گڑھ سے کہیں بھی جانے کیلیے مجھے جو پہلی ٹرین ملے گی' اس میں سوار ہو کر جاؤں گی۔ پولیس کے خطرے سے بچنے کیلیے اس شہر سے میرا جلد از جلد نکل جانا ہی بہتر تھا۔ ریلوے سٹیشن کی انکوائری پر پہنچ کر میں نے معلومات حاصل کیں۔ پندرہ منٹ بعد ہی ایک ٹرین وہاں پہنچنے والی تھی مگر وہ ٹرین' دہلی کے مخالف سمت جا رہی تھی۔ مجبوراً میں نے اسی ٹرین کے تین ٹکٹ کانپور تک کے خریدے اور پلیٹ فارم نمبر دو پر آ گئی۔

پلیٹ فارم پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ وہ ٹرین دہلی سے ہی آ رہی تھی اور لطف یہ کہ مجھے دہلی ہی جانا تھا' مگر مجبوراً دہلی مزید دور ہو رہی تھی۔ میرا مقصد محض علی گڑھ چھوڑنا تھا' وہ بھی جلد از جلد۔ کانپور پہنچ کر دہلی جانے والی کسی ٹرین کا انتظار کرنا میرے لیے کسی خطرے کا سبب نہ ہوتا' لیکن علی گڑھ ریلوے سٹیشن پر رک کر دہلی جانے والی ٹرین کا انتظار میرے لیے خطرناک تھا۔

''یہ آپ کانپور کیوں چل رہی ہیں؟'' زاہد چپ نہ رہ سکا۔

اس نے مجھے کانپور تک کے لیے ٹکٹ خریدتے دیکھ لیا تھا مگر اس وقت خاموش رہا تھا۔

''بس یوں ہی تفریحاً۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ پھر بولی۔ ''ویسے اللہ تبارک تعالیٰ نے انسان کو اسی لیے عقل سلیم سے نوازا ہے کہ وہ اسے استعمال بھی کرے۔'' زاہد کو اس وقت چھیڑنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کے چہرے پر نظر آنے والا کھنچاؤ ختم ہو جائے جو یقیناً غیر متوقع حالات کی دین تھا۔

''کبھی کبھی اور بعض معاملات میں عقل استعمال نہ کرنا انسان اور خصوصاً عورتوں کے حق میں سودمند ثابت ہوتا ہے۔'' زاہد کا موڈ خوشگواری کی طرف مائل ہو [illegible] ''مثلاً اگر [illegible] حضرات عشق کے معاملے میں عقل استعمال کرنے لگیں تو ہرگز عورت ایسی مخلوق کی زلفوں [illegible]''

''آؤ ادھر بیٹھتے ہیں۔'' پھر ہم سب ایک قریبی بنچ پر بیٹھ گئے [illegible] خاموش تھی۔

ٹرین آنے تک زاہد بڑی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔

میں نے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ لیے تھے۔ اس لیے سیٹ ملنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ اس ڈبے میں ہمارے علاوہ صرف چند ہی مسافر تھے' ان میں سے بھی اکثر سو رہے تھے۔ جس سیٹ پر ہم بیٹھے تھے اس کی اوپر والی برتھ خالی تھی۔ میں نے ذکیہ کو اسی پر لٹا دیا۔ مجھے بالکل بچوں کی طرح اس کی دیکھ بھال کرنا پڑ رہی تھی۔ ذرا ہی دیر کے بعد ٹرین نے آخری سیٹی دی اور علی گڑھ سٹیشن سے روانہ ہو گئی۔

''چلو کسی طرح یہاں سے نکلے تو۔'' میں نے طویل سانس لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ظاہر ہے کہ میرا مخاطب زاہد ہی تھا۔

''اگر برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں۔'' زاہد شرارتی لہجے میں بولا۔

''ایک کیا تم دو باتیں کہو میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔'' میں نے مسکرا کر اسے اجازت دے دی۔

''آپ کا ساتھ نبھانا ہے بڑی جان جوکھوں کا کام۔ میں یا جو بھی آپ کا جیون ساتھی بنا اسے دانتوں پسینا آ جائے گا۔ خیر یہ بات تو طے شدہ ہے' آپ ایک اور بات بتائیے جو مجھے اکثر پریشان کرتی رہتی ہے۔ یہ محاورہ جو ابھی میرے منہ سے سلپ ہوا ہے 'دانتوں پسینا آ جانا' یہ مجھے قطعی غیر حقیقی لگتا ہے۔ دانتوں کو پسینا کس طرح آ سکتا ہے؟ ناک' کانوں' گالوں اور ماتھوں حتیٰ کہ ہاتھوں اور پیروں پسینا آ جانا تک سمجھ میں آتا ہے کہ ایسا ممکن ہے مگر دانتوں پسینا آ جانا عقل میں نہیں آتا۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے کیوں کہ آپ کو وافر مقدار میں عقل سلیم عطا کی ہے اس لیے آپ اس محاورے پر بھرپور لائٹ ڈال سکتی ہیں۔ جی تو ارشاد ہو۔''

ابھی زاہد کی بات ختم ہوئی تھی کہ میری سماعت سے ایک مدھم سی نسوانی آواز ٹکرائی اور میں چونک اٹھی۔ ''نہیں...... شا...... شادی سے پہلے ہم...... میں ہرگز تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

''خاموش پڑی رہو بے وقوف عورت ورنہ میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔'' جواب میں ایک مردانہ سرگوشی ابھری۔ نیچے کچھ مسافر آ کر بیٹھ گئے ہیں۔

پھر زور سے چوڑیاں کھنکیں اور وہی نسوانی آواز سنائی دی۔ ''چھوڑ دو! تم زبردستی میری عزت نہیں لوٹ......'' پھر یوں لگا جیسے عورت کے منہ پر مرد نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔

میں اور زاہد جس سیٹ پر بیٹھے تھے اس کے سامنے والی سیٹ پر کچھ سامان رکھا تھا اور اوپر برتھ کی طرف سے مجھے یہ آوازیں سنائی دی تھیں۔ زاہد نے اور میں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ یقیناً زاہد نے بھی ان دونوں کی آوازیں سن لی تھیں۔ میں نے جو کچھ سنا تھا' اسے سن کر یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہیں تھا کہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ زبردستی کر رہا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کیلئے اجنبی

نہیں تھے۔ یہ سوچ کر میرا خون کھول اٹھا۔ چوڑیوں کی کھنک اب بھی سنائی دے رہی تھی جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ عورت مزاحمت کر رہی ہے۔

ایک دم میں سیٹ سے اٹھ کھڑی ہو گئی اور پھر سخت آواز میں برتھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہو رہا ہے یہ؟ نیچے اترو برتھ سے۔'' اوپر نیم تاریکی تھی۔

میری آواز کے ساتھ ہی چوڑیوں کی کھنک رک گئی اور پھر جھنجلائی ہوئی مردانہ آواز آئی۔

''کون ہو تم......؟ میں کیوں اتروں برتھ سے تم کون ہوتی ہو مجھے یہ حکم دینے والی؟''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں مزید سوال کیا۔ ''اور کون ہے اوپر تمہارے ساتھ؟''

''میری بیوی ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''اول تو تم جھوٹ بول رہے ہو کہ تمہارے ساتھ تمہاری بیوی ہے اور اگر یہ سچ بھی ہے تو قانونی طور پر تم یوں کھلے عام ٹرین میں ہنی مون نہیں منا سکتے۔'' میرے لہجے میں چبھن تھی۔ ''شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ تم خاموشی سے نیچے آ جاؤ ورنہ میں تمہارا دماغ بھی درست کر سکتی ہوں۔ تم نے یقیناً لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا ہے' ہاتھ ہٹا لو اس کے منہ سے تاکہ وہ تمہارے جھوٹ کی تصدیق کر سکے۔''

میری آواز سن کر ایک ادھیڑ عمر جوڑا بھی اس طرف متوجہ ہو گیا اور مرد اپنی سیٹ سے اٹھ کر آ گیا۔

''کیا ہوا؟'' اس شخص نے آتے ہی مجھ سے سوال کیا۔

''آپ اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھیں' جو کچھ بھی ہوا ہے میں اس سے نمٹ لوں گی۔'' اس شخص سے یہ بات میں نے اس لیے کہی تھی کہ لڑکی جس کی آواز میں نے سنی تھی' بے عزت نہ ہو۔''

''یہاں جو میاں بیوی بیٹھے تھے وہ...... وہ کہاں گئے؟'' اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''میاں بیوی!...... آپ کو کیسے معلوم کہ وہ میاں بیوی تھے؟'' میں بولی۔

''ہم یہاں بیٹھے تھے جہاں آپ آ کر بیٹھی ہیں۔ ان دونوں سے بات ہوئی تھی ہماری...... ہم نے یہ سوچ کر کہ ان دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اپنی سیٹ بدل لی تھی...... اس لیے کہ وہ دونوں بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے بات کر سکیں۔'' اس شخص نے بتایا' پھر آہستگی سے بولا۔ ''ویسے مجھے کچھ شک ضرور تھا کیوں کہ لڑکی کچھ ڈری ڈری سی لگ رہی تھی۔''

میں نے یہ دیکھ کر کہ وہ شخص پہلے ہی سے ان دونوں سے واقف تھا' اس سے دوبارہ اپنی سیٹ جانے کو نہیں کہا اور بولی۔ ''آپ کا شک غلط نہیں تھا۔ اس بات کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر

میں ایک بار پھر برتھ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''تم اب نیچے اتر رہے ہو یا میں خود تمہیں نیچے گھسیٹ لوں۔''

''کیا وہ دونوں اوپر برتھ پر......'' ادھیڑ عمر شخص نے حیرت بھرے لہجے میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

میری بجائے زاہد نے اس شخص کی بات کا جواب دیا۔ ''جی ہاں بزرگو! آپ ٹھیک سمجھے۔ یہ خاتون ظالم سماج بن کر دو جوان دلوں کے ملاپ کے درمیان دیوار بن گئی ہیں۔''

''مگر یہ...... یہ تو انتہائی بے شرمی اور بے غیرتی کی بات ہے کہ چلتی ٹرین میں......''

''جی ہاں وہ گھر جا کر بھی اپنی حسرتیں پوری کر سکتے تھے' مگر عشق میں اکثر دامن ضبط ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔'' زاہد بولا۔

زاہد کی بات ختم ہوتے ہی ایک نوجوان برتھ سے نیچے اتر آیا۔ اس کے چہرے سے شدید غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور لباس شکن آلود تھا۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے کن جہانوں کی سیر پر نکلنے والا تھا۔ اس کے ایک رخسار پر لپ سٹک بھی لگی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ لڑکی ابھی اوپر برتھ ہی پر تھی اور نیم تاریکی میں اس کے متحرک جسم سے میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ جلدی جلدی اپنے بے ترتیب لباس کو درست کر رہی تھی۔ اس کی وجہ سے چوڑیاں بھی بار بار کھنک رہی تھیں۔

''جی فرمایئے!'' وہ نوجوان برہم آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اب کہئے آپ کیا کہہ رہی تھیں اور مجھے کیا قانون پڑھا رہی تھیں؟''

''پہلے تو تم اپنا لہجہ درست کرو۔'' میں نے بھی سخت لہجے میں جواباً کہا۔ ''پھر یہ بتاؤ کہ تم اس لڑکی کو بہلا پھسلا کر کہاں سے بھگا کر لائے ہو؟''

''میں اسے بھگا کر نہیں لایا بلکہ وہ میری بیوی ہے۔'' اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اے لڑکی! اگر تم نے اپنا لباس درست کر لیا ہو تو تم بھی نیچے اتر آؤ۔'' میں نے برتھ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''وہ کیوں اتر آئے نیچے!'' نوجوان بھڑک کر بولا۔ ''تمہیں جو بھی بات کرنا ہے' مجھ سے کرو۔''

''میں لڑکی سے تمہارے بیان کی تصدیق چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں' کیا تم خدائی فوجدار ہو...... تصدیق کرنا چاہتی ہو۔ واہ...... بہت خوب!'' وہ نوجوان منہ بگاڑ کر بولا۔

اس موقع پر وہ ادھیڑ عمر مسافر بھی خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے نوجوان کو مخاطب کیا۔ ''بالکل

تصدیق کریں گے ہم لوگ...... اپنی حالت تو دیکھو ذرا تم! شرم آنا چاہیے تمہیں۔''

''نیچے آ جاؤ سلمٰی۔'' مجبوراً بحث مباحثے کے بعد اس نوجوان کو لڑکی سے کہنا ہی پڑا۔ ''بتاؤ ان لوگوں کو کہ تم میری کون ہو۔''

ذرا ہی دیر بعد گھبرائی ہوئی لڑکی بھی نیچے اتر آئی۔ اس کی حالت بھی نوجوان سے مختلف نہیں تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر حزن و ملال اور شرمندگی کے آثار دیکھے۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اس کا جسم متناسب اور قد نکلتا ہوا تھا۔ گورے کتابی چہرے پر ایک لٹ جھوم کر اس کے حسن میں اضافہ کر رہی تھی۔ ہونٹوں سے کچھ لپ سٹک غائب تھی' کچھ موجود تھی۔ بلاشبہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی اور کسی شریف گھرانے کی فرد معلوم ہوتی تھی۔

''سلمٰی! تم میری بیوی ہو نا!'' نوجوان نے لڑکی کو مخاطب کیا۔

جواب میں لڑکی نے نظر اٹھائے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''لڑکی!'' معاً میں بول اٹھی۔ ''جھوٹ نہ بولو! یہ جھوٹ تمہاری زندگی تباہ کر دے گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا' وہ پھر ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ اس وقت کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے تمہاری باتیں سنی ہیں۔ کیا میں تمہارے وہ الفاظ دہراؤں جو ابھی ذرا ہی دیر پہلے تم اس نوجوان سے کہہ رہی تھیں۔''

لڑکی نے سر اٹھا کر بڑی مظلوم سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''اس نوجوان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہماری موجودگی میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' میں نے اس کی ہمت بندھائی۔ ''اگر یہ تمہیں کہیں سے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے آیا ہے تو یقین کرو میں خود تمہیں تمہارے والدین تک پہنچا دوں گی۔''

''ہاں بیٹی بتا دو سچ سچ جو بات ہے' ہم تمہاری مدد کریں گے۔'' ادھیڑ عمر مسافر بھی بول اٹھا۔

''م...... میں ب...... اس کی بیوی نہیں ہوں۔'' لڑکی نے بھر آئی ہوئی آواز میں کہہ ہی دیا۔

''سلمٰی!'' نوجوان تقریباً چیخ اٹھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو تم!''

''مت لاؤ اپنی ناپاک زبان پر میرا نام!'' لڑکی دکھ اور حقارت بھرے لہجے میں نوجوان سے بولی۔ ''تم...... تم مجھے تباہ کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ تم...... تم نے وعدہ کیا تھا کہ...... کہ شادی سے پہلے میرے...... میرے جسم کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔ مم...... میں تمہارے فریب میں آ گئی اور...... اور اب...... میں اپنے گھر والوں کو کیا...... کیا منہ دکھاؤں گی۔'' لڑکی رونے لگی۔

''ہاں اب کہو تیس مار خاں!'' میں نے اچانک غصے میں نوجوان کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

''تم ایک مجبور اور بے بس لڑکی کو دھوکا دے کر اس سے شادی کر لو گے' اس کی عزت و آبرو لوٹ لینا چاہتے تھے۔ بولو اب تمہیں پولیس کے حوالے کیا جائے یا خود میں تمہیں اس ذلیل حرکت کی سزا دوں۔'' یہ کہتے وئے میں نے اس کے گریبان کو جھٹکا دیا۔

لڑکی کے بیان کی روشنی میں وہ نوجوان مجرم ثابت ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے مزید ڈھٹائی سے گریز کیا اور سر جھکا لیا۔ اسی وقت ادھیڑ عمر مسافر کو اس کی بیوی نے آواز دے لی اور وہ چلا گیا۔ غالباً پلیس کا ذکر میری زبان سے سن کر اس نے معاملے سے لاتعلق ہی رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مجھے اس لڑکی کا نام لڑکے کی زبانی معلوم ہو چکا تھا اس لیے میں نے نام لے کر اسے مخاطب کیا۔ ''سلمٰی ! تم بیٹھ جاؤ ادھر...... اور زاہد تم سامنے والی سیٹ پر چلے جاؤ۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے نوجوان کا گریبان چھوڑ دیا اور بولی۔ ''ادھر بیٹھو ! اب تمہاری تقدیر کا فیصلہ یہ لڑکی کرے گی جسے تم مجبور و بے بس سمجھ رہے تھے۔''

پھر اس لڑکی سلمٰی نے روتے اور سسکتے ہوئے مجھے اپنی ساری روداد سنا دی۔ وہ دہلی کے ایک محلے چتلی قبر کی رہنے والی تھی۔ اس نوجوان کا تعلق لکھنؤ سے تھا اور وہ لڑکی کو وہیں لے جا رہا تھا۔ لڑکی کے گھر کے بالکل سامنے جو لوگ رہتے تھے' وہ نوجوان انہی کے یہاں مہمان بن کر آیا تھا۔ لڑکی نے خود بھی اس بات کا اعتراف کیا اس نوجوان کو شہہ دینے میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ ان دونوں میں سے لڑکی اپنے عشق میں سچی تھی مگر حالات نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نوجوان صرف ہوس کا بندہ تھا۔ اسی نے لڑکی کو گھر سے بھاگنے پر راضی کیا تھا اور لڑکی نے اسی کے ایما پر اپنی ماں کے زیورات چرا کر اس کے حوالے کر دیئے تھے۔ کچھ نقد رقم بھی لڑکی نے اس نوجوان کے حوالے کی تھی۔ نوجوان نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ لکھنؤ پہنچ کر اس سے شادی کر لے گا۔ لڑکی گھر سے بھاگنے پر اس لیے بھی آمادہ ہو گئی تھی کہ جہاں اس کے والدین نے رشتہ کیا تھا وہ لڑکی اسے پسند نہیں تھا۔ جلد ہی اس لڑکی کی شادی ہونے والی تھی۔

سلمٰی سے اس کی روداد سن کر میں نے کہا۔ ''اب کیا تم اس لڑکے کو قبول کر لو گی جس سے تمہارے والدین تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''ظاہر ہے اب...... اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' لڑکی سسکی لے کر بولی۔

''کیا رشتہ کرنے سے پہلے تمہارے والدین نے تمہاری مرضی یا رضامندی......''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟'' لڑکی نے میری بات کاٹ دی۔ ''ہمارا تعلق جس طبقے سے ہے وہاں ایسی کوئی روایت نہیں۔''

''افسوس کہ ہمارے مذہب نے لڑکی کو جو حق دیا ہے والدین اسے اس حق سے محروم کر دیتے

ہیں۔ خیر میں اس سلسلے میں تمہارے والدین کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔''

''تو...... تو کیا آپ...... آپ واقعی مجھے میرے گھر پہنچائیں گی؟'' لڑکی نے آنسوؤں سے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔

''ہاں' کیوں نہیں!'' میں نرمی سے بولی۔ ''جب میں نے تم سے یہ وعدہ کیا ہے تو اسے ضرور پورا کروں گی۔'' پھر میں اس نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ کسی بے وفا مرد کا وعدہ نہیں ہے جو پورا نہ ہو سکے۔ یہ ایک عورت کا وعدہ ہے۔''

''اور وہ...... وہ......'' لڑکی کچھ کہتے ہوئے جھجکنے لگی۔

''ہاں کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔ جھجکنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے لڑکی سے کہا۔

''مم...... میں زیورات...... اپنی امی کے زیورات کے بارے میں کہنا چاہتی......''

''وہ زیورات تمہارے اس جھوٹے عاشق کو واپس کرنا پڑیں گے' تم فکر نہ کرو اور نہ صرف وہ زیورات بلکہ تم نے اسے جو رقم دی تھی وہ بھی اسے دینا پڑے گی۔'' میں نے نوجوان کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس نے واپسی سے انکار کیا تو میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔'' پھر میں براہ راست اس نوجوان سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں بھئی بولو' کیا کہتے ہو؟ زیورات اور رقم واپس کرنے پر تیار ہو یا نہیں؟''

اس نوجوان کی حالت کسی کھسیانی بلی ایسی تھی۔ وہ مجھ سے الجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں کیوں اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہوں۔ اس نے کہا۔ ''یہ میرا اور سلمٰی کا معاملہ ہے' ہم دونوں آپس میں نمٹ لیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اس معاملے سے الگ رہیں۔ زیورات یا رقم سے آپ کا کیا تعلق؟ میں آپ کو کیوں زیورات وغیرہ دوں؟''

''سنو اے ناکام عاشق اب کھمبا نوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔'' میرے لہجے میں تمسخر تھا۔

''تمہاری جلد بازی نے سارا کام بگاڑ دیا۔ ذرا ٹھنڈی کر کے کھاتے اور اسے آہستہ آہستہ اپنی راہ پر لگانے کی کوشش کرتے تو یہ لڑکی اپنی مجبوری و بے بسی کے ہاتھوں ایک دن تمہاری ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل پر آمادہ ہو ہی جاتی۔ لکھنؤ پہنچ کر تو یہ تمہارے ہی رحم و کرم پر ہوتی نا۔ اسے شادی کے وعدے پر لگائے رہتے اور جب اس سے دل بھر جاتا تو دھتا بتا دیتے۔ یہ کیا کر لیتی تمہارا بس رو پیٹ کر چپ ہو جاتی پھر چاہے تو اسے کسی کے ہاتھوں بیچ دیتے یا کوٹھے کی زینت بنا دیتے' یہ کچھ نہ کہتی۔ یہ جو کوٹھے آباد ہیں تو یہ پیشہ کرنے والی عورتیں' آسمان سے نہیں ٹپکتیں ہیں۔ کیا خبر کتنی سلمائیں تم ایسے فریبی عاشقوں کے ہاتھوں اپنی عزت و آبرو گنوا کر بازار حسن کی رونق بن جاتی ہیں۔ میں تم سے زیورات اور رقم لے کر اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی بلکہ تم خود اس لڑکی کی امانت اس کے حوالے کر دو۔''

پھر کافی بحث و مباحثے کے بعد وہ نوجوان زیورات اور رقم سلمٰی کو دینے پر آمادہ ہوا۔ میرے

کہنے پر سلمیٰ نے اب اپنے آنسو پونچھ لیے تھے' مگر اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار بدستور تھے۔ زیورات اور رقم سلمیٰ کے حوالے کر کے وہ نوجوان مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچا چبا جائے گا۔ میں نے بہرحال لقمہ تر اس کے منہ سے چھین لیا تھا۔ سلمیٰ کو وہ لقمہ تر سمجھ ہی تو رہا تھا۔ میں نے تو خیر اس کے یوں گھورنے پر کچھ نہیں کہا مگر زاہد خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے نوجوان کو مخاطب کیا۔

''پیارے بھائی! اب تمہارے ٹنڈیلے بڑھ چکے ہیں اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم بھی پھوٹ ہی لو یہاں سے۔ اس ڈبے میں بہت سی سیٹیں خالی ہیں' کہیں بھی دھونی رما لو۔''

''یہیں بیٹھوں گا میں!'' وہ اکڑ گیا۔ ''تم کون ہوتے ہو مجھے یہاں سے اٹھانے والے۔ اب مجھ سے بکواس کی تو دماغ درست کر دوں گا تم لوگ آخر سمجھ کیا رہے ہو اپنے آپ کو۔''

''دراصل میرا دماغ تو درست ہے' تمہارے ہی کچھ سکرو ڈھیلے ہو گئے ہیں' کہو تو کس دوں۔'' زاہد اس سے الجھ پڑا۔

اس نوجوان نے آستینیں چڑھا لیں' مگر اس سے پہلے کہ زاہد اور اس کے درمیان ہاتھا پائی کی نوبت آ جاتی' مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ لگایا کیوں کہ میں پہلے ہی اس سے تپی بیٹھی تھی۔ لڑکی کے ساتھ زبردستی پر میں نے اسے یہ سوچ کر معاف کر دیا تھا کہ لڑکی بھی اس معاملے میں کسی حد تک ملوث ضرور تھی۔ اگر وہ لڑکی اس نوجوان کو پہلی ہی منزل پر روک دیتی تو وہ آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرتا۔ اس بات کا ثبوت نوجوان کے رخسار پر لپ سٹک کا نشان تھا۔ لڑکی نے یقیناً ایک حد تک اسے ڈھیل دی تھی اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔ پھر جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تو اس نے مزاحمت شروع کر دی تھی۔ میری اسی درگزر سے نوجوان شاید اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ زاہد سے بھی غالباً اسی لیے وہ الجھتے ہوئے نہیں جھجکا تھا۔ تھپڑ کھا کر چند لمحے کو تو وہ سناٹے میں بیٹھا رہ گیا' پھر ایک دم ہی جیسے اسے طرارہ آ گیا۔ اس نے اٹھ کر مجھے زور سے دھکا دیا۔ اس کی یہ حرکت میرے لئے خلاف توقع ہی تھی۔ میں اسی لیے لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گری اور میرے سر کا پچھلا حصہ عقبی برتھ سے ٹکرا گیا جس پر ذکیہ سو رہی تھی۔ میری آنکھوں میں ترمرے سے ناچ گئے اور میں' سلمیٰ کے برابر نشست پر گری۔

''میں کچھ نہیں بول رہا تو تو طرم خاں کی بچی ہی بنے جا رہی ہے۔ اب ہاتھ اٹھا کر دیکھ' ہاتھ توڑ دوں گا تیرے!'' نوجوان اپنے انجام سے بے خبر ہو کر مجھ پر برس پڑا۔ پھر مزید برا بھلا کہنے لگا۔ ''تو مجھے کسی کوٹھے پر بیٹھنے والی لگتی ہے تو نے اسی لیے سلمیٰ کو میرے خلاف ورغلایا ہے اور... ''

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی زاہد اس پر ٹوٹ پڑا۔ میں اس دوران میں سنبھل چکی تھی۔

''زاہد تم الگ ہٹ جاؤ' اس کمینے کو میں سبق سکھاؤں گی۔'' میں نشست سے اٹھتے ہوئے بولی۔

وہ نوجوان اور زاہد ایک دوسرے سے اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ زاہد کیلئے میرا حکم ماننا مشکل تھا۔ پھر میں نے ہی ان دونوں کو الگ کیا اور نوجوان کے شانے پر کھڑی ہتھیلی کی ضرب لگائی۔ وہ چیخ کر بیٹھتا چلا گیا۔ اس دوران میں اس کے پیٹ پر میری لات پڑی اور وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر سیٹوں کے درمیان ڈھے گیا۔

''اٹھو تیس مار خاں! ہاتھ توڑو میرے۔'' میں نے ہلکی سی ٹھوکر اس کے پہلو پر لگائی۔

نوجوان کی چیخ پکار سن کر ڈبے میں موجود سوتے جاگتے چند مسافر ذرا ہی دیر میں حقیقت حال معلوم کرنے کیلئے وہاں جمع ہو گئے۔ میں نے جھک کر نیچے پڑے ہوئے نوجوان کا گریبان پکڑا اور اسے اٹھا کر سامنے والی سیٹ پر بٹھا دیا۔

لوگوں کو جب زاہد نے بتایا کہ وہ نوجوان ایک لڑکی کو بھگا کر لے جا رہا تھا اور پھر ادھیڑ عمر شخص نے بھی تائید کی تو سبھی مسافر اس نوجوان کے خلاف ہو گئے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ کانپور پہنچ کر نوجوان کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ میں کچھ نہیں بولی کیوں کہ میری رائے اس تجویز کے حق میں نہیں تھی۔ پولیس کیس بننے کی صورت میں سلمیٰ کو بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ پولیس بھی درمیان میں دونوں پارٹیوں کو چھیلنے کی کوشش کرتی۔ میں اسی لیے درمیان میں پولیس کو مڑ بھنانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ لوگ حقیقت حال جاننے کے بعد اپنی اپنی سیٹوں پر جا بیٹھے۔

دو ہی ضربوں میں نوجوان کے حواس اب تک قابو میں نہیں آئے تھے۔ اس کے چہرے سے تکلیف و اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی وقت میری نگاہ سلمیٰ کی طرف اٹھ گئی۔ مجھے یہ دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ نوجوان کیلئے اس کے چہرے پر ہمدردی کے جذبات تھے۔ عورت فطری طور پر گداز دل ہوتی ہے۔ ایک عورت ہونے کے ناتے یہ بات مجھے بخوبی معلوم تھی۔ جب تک عورت پر ظلم کی انتہا نہ کر دی جائے وہ صدائے احتجاج بلند نہیں کرتی۔ مرد کی نسبت عورت میں برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ جانب داری نہیں حقیقت ہے۔

کچھ ہی دیر بعد جب اس نوجوان نے کراہنا بند کر دیا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت قدرے سنبھل چکی ہے تو اسے مخاطب کیا۔ ''اب کھڑے ہو جاؤ! یہاں سے اپنا سامان سمیٹو اور کسی دوسری سیٹ پر جا بیٹھو۔ میرا خیال ہے تمہاری اتنی خاطر مدارات کافی ہے اور تم مزید طلب نہیں کرو گے۔ میں تمہاری منحوس شکل اب دیکھنا نہیں چاہتی۔ اور وہاں صرف اپنا سوٹ کیس اٹھانا سلمیٰ کا نہیں۔''

اس نے کچھ کہے بغیر میرے حکم کی تعمیل میں اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ پھر وہ وہاں سے اٹھ کر دروازے کے قریب ایک سیٹ پر جا کے بیٹھ گیا۔ اسی کے بعد گاڑی کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔

وہ ایک چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ نوجوان خاموشی سے دروازہ کھول کر وہاں اتر گیا۔ میں چاہتی تو اسے روک سکتی تھی مگر ایسا نہیں کیا۔ یقیناً وہ نوجوان پولیس کے خوف کے سبب اپنی منزل سے پہلے ہی اتر گیا تھا۔ میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ اس کے گاڑی سے اتر جانے کے بعد سلمٰی بھی پولیس کے چکر سے بچ گئی تھی۔ اس سٹیشن پر گاڑی زیادہ دیر نہیں رکی اور دوبارہ چل دی۔

میں نے کانپور تک سفر کے دوران میں محسوس کر لیا کہ زاہد اس لڑکی کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ تھی بھی ایسی ہی۔ اس میں صنف مخالف کیلئے بلا کی جنسی کشش تھی۔ نوجوان کے جانے کے بعد لڑکی سامنے والی سیٹ پر جا بیٹھی۔

زاہد کی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''کیوں' کیا یہ لڑکی زیادہ ہی پسند آ گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو بات کروں اس کے والدین سے تمہارے لیے۔''

وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر شرمندہ سا ہو گیا' پھر آہستگی سے کہنے لگا۔ ''آپ کی نظریں بہت تیز ہیں۔''

''ویسے یہ بات ہے بری۔'' میں آہستہ سے مسکرا کر بولی۔

''عشق کا دعویٰ کسی سے اور نظریں کسی اور پر۔'' پھر میں نے اسے گھسنے کی خاطر خالطے رومانی لہجے میں روایتی ہیروئنوں کی طرح کہا۔ ''مجھے گمان بھی نہ تھا زاہد کہ تم اتنی جلدی بدل جاؤ گے۔''

میری اداکاری پر وہ ہنس پڑا' پھر بولا۔ ''آپ کے اندر اداکاری کی بڑی صلاحیتیں ہیں۔ کاش فلم انڈسٹری آپ کی ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتی۔''

''تم مجھے کسی اور ہیرو کے ساتھ دیکھ کر جلتے نہیں؟'' میں نے بھی ہنس کر کہا۔

''ہاں جلتا تو ضرور مگر رقیب کے بغیر عشق کرنے میں کیا خاک مزہ آتا ہو گا۔''

زاہد سے ایسی ہی باتیں کرتے ہوئے سفر ختم ہو گیا۔ جب ہم کانپور ریلوے سٹیشن پر اترے تو صبح ہو چکی تھی۔ سلمٰی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہم نے وہیں سے ریلوے سٹیشن پر ناشتہ کیا پھر میں نے ریلوے انکوائری سے دہلی جانے والی کسی ٹرین کی بابت معلومات حاصل کیں۔ دہلی جانے کیلئے ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک ٹرین مل سکتی تھی۔ میں نے چار ٹکٹ خرید لیے۔ سلمٰی نے اپنے ٹکٹ کے پیسے دینا چاہے مگر میں نے انکار کر دیا۔

''اب تم میری ذمے داری ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ پھر دوسرے درجے کے ویٹنگ روم کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ ہمیں بہرحال یہ ڈیڑھ گھنٹہ تو ٹرین کے انتظار میں گزارنا ہی تھا۔ ہمارے علاوہ ویٹنگ روم میں صرف دو مسافر تھے۔ ہمیں داخل ہوتے دیکھ کر انہوں نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ چہرے سے وہ دونوں ہی مجھے کچھ اچھے نہیں لگے حالانکہ ان کے جسموں پر عمدہ لباس تھا مگر یہ بہترین لباس

بھی ان کی سرشت چھپانے میں ناکام تھا۔ ہم بیٹھ گئے تو وہ ہماری طرف اشارے کر کے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ مجھے ان کی یہ حرکت بھی گراں گزری۔ وہ ندیدوں کی طرح مجھے' ذکیہ اور سلمٰی کو دیکھ رہے تھے۔ یوں جیسے ہم تینوں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں یا اس سے پہلے انہوں نے خوبصورت لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں۔

میں نے ان کی طرف سے نظر ہٹا لی۔ یہ سوچ کر کہ دیکھتے ہیں تو دیکھتے رہیں' ہماری صحت پر کیا فرق پڑتا ہے مگر ذرا ہی دیر بعد وہ فقرے بازی پر اتر آئے۔ بات تو وہ ایک دوسرے سے کر رہے تھے مگر نشانہ ہم ہی تھے۔ یہ صورتحال میرے لئے مزید گراں ہونے لگی۔ زاہد کے چہرے پر بھی مجھے ناگواری کے اثرات نظر آنے لگے۔

''زاہد! تم ان لفنگوں سے الجھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔'' میں نے زاہد کو تاکید کی۔ دانستہ میں نے یہ جملہ بلند آواز میں کہا تھا تاکہ وہ دونوں بھی سن لیں۔

''کچھ ہمارے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا محترم حسینہ؟'' ان میں سے ایک براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

''جی ہاں' آپ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا میں نے۔'' میں خاموش نہ رہ سکی۔

''تو پھر مکرر ارشاد۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا اور اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

''پیارے! ذرا دروازہ بند کر دو تاکہ ان کے ارشادات باہر تک سنائی نہ دیں۔'' اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے تیزی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا اور اسے کھولتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ چاقو کی نوک میری آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے وہ چبھتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

''ہاں اب فرماؤ' کیا کہہ رہی تھیں تم؟''

اس دوران میں اس کا ساتھی ویٹنگ روم کا دروازہ بند کر چکا تھا۔

''سنو میرا نام پرکاش ہے اور میرے ساتھی مجھے حسینوں کا شکاری کہتے ہیں۔ تم اپنے لباس سے مجھے مسلمان معلوم ہوتی ہو اور مجھے مسلمان ہی لڑکیاں زیادہ پسند آتی ہیں۔'' اس نے پھر اپنے چاقو والے ہاتھ کو حرکت دی' پھر بولا۔ ''چلو اٹھو' ادھر باتھ روم میں چلو! زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ اتنے میں گوپال یہاں رہے گا۔''

میں بالکل اسی طرح اٹھی جیسے اس کے حکم کی تعمیل میں ایسا کر رہی ہوں۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کا ساتھی بھی چاقو کھول کر قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ اچانک میں نے اپنے منہ سے بھیانک آواز نکالی اور اسی کے ساتھ اپنی جگہ سے اچھلی۔ ان دونوں ہی کو میں نے بیک وقت نشانہ بنایا تھا۔ دونوں کی کلائیوں پر میرے ہاتھوں کی کھڑی ہتھیلیاں پڑی تھیں۔ اسی کے ساتھ ان کے ہاتھوں سے چاقو چھوٹ کر

نیچے گر پڑے تھے۔ وہ دونوں یقیناً قابلِ رحم نہیں تھے۔ میں نے اسی لیے ان پر رحم نہیں کیا۔ میں انہیں اس وقت تک لاتوں اور گھونسوں سے ضربیں لگاتی رہی جب تک وہ ڈھیر نہ ہو گئے۔ وہ نہ صرف غنڈے تھے بلکہ متعصب قسم کے ہندو بھی تھے۔ میری مناسب ''خاطر مدارات'' نے ان کے چہرے بگاڑ دیئے تھے۔ ان دونوں ہی کے چہرے لہولہان ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ سے چہروں کی کھال پھٹ گئی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔

''چلو اٹھو۔ ادھر باتھ روم میں چلو۔'' میں نے اس شخص کے سر میں ٹھوکر ماری جس نے کچھ دیر پہلے مجھے یہی حکم دیا تھا۔ ''اٹھو! ورنہ ٹھوکریں مار مار کر تمہارا مغز بہا دوں گی۔''

وہ شخص اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا اس لیے مجبوراً کہنیوں کے بل باتھ روم کی طرف گھسٹنے لگا۔

''تم بھی!'' میں نے دوسرے شخص کے شانے پر ٹھوکر لگائی۔ دوسرے نے بھی باتھ روم کی طرف گھسٹنا شروع کر دیا۔

''جوتا کاری کیلئے مجھے ہندو مرد ہی پسند آتے ہیں' تبھی ایسے متعصب ہندو!'' میں نے پہلے شخص کو پھر ٹھوکر ماری۔ ''آج کی ذلت یاد رکھنا اور آئندہ کبھی کسی مسلمان لڑکی پر دست درازی کی کوشش مت کرنا کمینے۔'' میرے لہجے میں غصہ بھی تھا اور حقارت بھی۔

بالآخر وہ دونوں گھسٹتے ہوئے باتھ روم کے دروازے تک پہنچ گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور اسی کے ساتھ بدبو کا بھبکا محسوس کیا۔ وہاں کوئی قے کر کے پانی بہائے بغیر چلا گیا تھا۔ پھر بھی مجھے ان دونوں پر ترس نہیں آیا۔ میں نے ٹھوکر مار مار کر انہیں باتھ روم میں دھکیل دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اندر سے ان دونوں کے الٹیاں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں سن کر میری طبیعت بھی متلانے لگی۔

''زاہد! سامان اٹھاؤ اور یہاں سے چلو۔'' میں نے اپنے سوٹ کیس اور ایئر بیگ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

سلمٰی کو میں نے اپنی طرف حیرت سے دیکھتے محسوس کیا۔ میرے کہنے پر اپنی اٹیچی خود اس نے اٹھالی تھی۔

پھر جب ہم ویٹنگ روم کا بند دروازہ کھول کر باہر نکل رہے تھے تو زاہد مجھ سے بولا' بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہنگامے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اچھا بھلا گاڑی کا انتظار کر رہے تھے کہ ان کم بختوں کی کھال کھجانے لگی جو باتھ روم میں پڑے الٹیاں کر رہے ہیں۔''

کسی دوسرے ویٹنگ روم کا رخ کرنے کی بجائے ہم لوگ وہیں پلیٹ فارم پر ایک خالی بنچ کی

طرف بڑھ گئے۔ دہلی کیلئے ٹرین ملنے میں ابھی خاصا وقت تھا' مگر ہمیں بہرحال انتظار تو کرنا تھا۔ وقت گزاری کیلئے میں نے سلمٰی سے گفتگو شروع کر دی۔ وہ بتانے لگی کہ اس کے والد کی کپڑے کی دکان ہے' اور یہ کہ بقیہ بہنیں اور سب بھائی اس سے چھوٹے ہیں۔

''تمہاری شادی کیا دہلی ہی میں ہو رہی تھی۔'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ لوگ ہمارے رشتے دار ہی ہیں۔ ہمارے یہاں رشتے داروں ہی میں شادیاں ہوتی ہیں۔''

''لڑکا کیا کرتا ہے؟''

''آوارہ گردی اور غنڈہ گردی۔'' اس نے تلخی سے جواب دیا۔

''کیا تمہارے والدین کو یہ بات نہیں معلوم؟''

''معلوم ہے' مگر وہ کہتے ہیں کہ شادی کے بعد ذمے داری پڑے گی تو وہ راہ راست پر آ جائے گا۔ دراصل ہمارے خاندانوں میں لڑکے کم ہیں اور لڑکیاں زیادہ ہیں۔''

''ہوں!'' میں نے طویل سانس لیا' پھر بولی۔ ''ویسے ترجیح تو اپنے ہی لوگوں کو دینا چاہئے لیکن یہ صورتحال ہے تو روایتوں سے چمٹے نہیں رہنا چاہیے۔ شادی کسی بھی کلمہ گو سے ہو سکتی ہے۔''

''اب کون سمجھا سکتا ہے ان لوگوں کو جو خاندانوں سے باہر شادی کو گناہ تصور کرتے ہیں۔ ہمارے چچا نے اس سلسلے میں پہل کرنا چاہی تھی مگر سارے خاندان نے ان کی مخالفت کی۔ نتیجتاً انہیں میری چچا زاد کا رشتہ ختم کرنا پڑا۔'' سلمٰی دکھ بھرے لہجے میں بتانے لگی۔

''بہرحال میں تمہارے والدین کو اس سلسلے میں سمجھاؤں گی کہ وہ تمہاری زندگی تباہ نہ کریں اور رشتے داروں ہی میں شادی کرنا ہے تو کوئی اور لڑکا دیکھیں۔'' میں نے سلمٰی کو تسلی دی۔

اس گفتگو کے دوران میں زاہد خاموش ہی رہا تھا۔ ذکیہ کا وجود ہونے اور نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ بدستور خاموش تھی۔

'آپ کو دیکھ کر مجھے رشک آتا ہے۔'' سلمٰی نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''وہ کیوں بھئی؟'' میں مسکرا کر بولی۔ ''مجھ میں تو ایسی کوئی خاص بات نہیں۔''

''اگر میں خود اپنی آنکھوں سے ان لفنگوں کو آپ کے ہاتھوں پٹتے ہوئے نہ دیکھ لیتی تو کبھی کسی بات پر یقین نہ کرتی کہ ایک عورت بھی بیک وقت دو مردوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ جب کہ ان دونوں کے پاس چاقو بھی تھے۔ جب اس لفنگے نے چاقو کھولا تھا تو میری جان ہی نکل گئی تھی۔''

''تمہیں نہیں معلوم سلمٰی کہ یہ کیا آفت چیز ہیں؟'' زاہد نے ہماری گفتگو میں مداخلت کی۔

''میں نے انہیں ہنٹر والی کا خطاب کچھ سوچ سمجھ کر ہی دیا ہے۔''

''ہنٹر والی..... میں سمجھی نہیں۔'' سلمٰی حیران سی ہو کر بولی۔

''بکومت!'' میں نے زاہد کو جھڑک دیا۔'' ہر وقت بے تکی باتیں نہیں کرتے۔''

''آپ تو مجھے اس طرح ڈانٹ رہی ہیں جیسے واقعی میری ہونے والی شریک حیات ہوں حالانکہ ابھی خاندان کے بزرگوں کو اس بات کا قطعی علم نہیں ہے۔'' زاہد شرارت پر آمادہ تھا۔

''سوچ لو میرا شریک بننا تمہیں مہنگا پڑے گا۔''

''عشق میں مہنگا اور سستا نہیں دیکھا جاتا۔ یقین نہ ہو تو سلمٰی سے پوچھ لیں۔'' زاہد نے سلمٰی کو بھی نہ بخشا۔''ان کا عشق ٹریجڈی پر ختم ہوا ہے مگر ضروری نہیں کہ ہر عشق کا انجام یہی ہو۔ عشق کا ڈراپ سن چند روتے بسورتے بچوں پر بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''ابھی تو ماشاء اللہ تم خود برخوردار ہو، تمہیں ابھی سے ان بچوں کا غم کھائے جا رہا ہے جو معرض وجود میں نہیں آئے۔'' میں ہنس کر بولی۔

''برخوردار ضرور ہوں مگر آپ کی طرح برخود غلط نہیں ہوں میں آپ نے کبھی میرے عشق پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کرتیں ہمیشہ بچہ کہہ کر ٹال جاتی ہیں۔'' زاہد اب اپنی عادت سے مجبور ہو کر اور سلمٰی کی موجودگی کا خیال کیے بغیر چہکنے لگا تھا۔

میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ معاً میری نگاہ دائیں جانب اٹھی اور میں چونک پڑی۔ مجھے سلمٰی کے عاشق کو وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ ہماری ہی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لکھنؤ جانے کیلئے دوسری گاڑی مل سکتی تھی۔ وہ یقیناً کسی اور ٹرین سے یہاں پہنچا تھا۔

''سلمٰی!'' قریب آتے ہی اس نے براہ راست سلمٰی کو مخاطب کیا۔

سلمٰی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔''تم ..... تم کیا بات ہے؟''

''میں سخت شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دو اور ..... اور ذرا ادھر الگ آ کر میری ایک بات سن لو۔'' نوجوان عاجزانہ لہجے میں بولا۔''اچھا ہوا کہ تم دوبارہ مجھے مل گئیں۔''

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننا۔'' سلمٰی نے بے اعتنائی سے کہا۔ میں نے فی الحال مداخلت ضروری نہیں سمجھی۔

''کیا..... کیا تم سارے عہد و پیماں بھول گئیں سلمٰی مجھے جب اپنی غلطی کا احساس ہے تو..... تو پھر کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں۔''

''میرا خیال ہے پیارے بھائی کہ اب ان باتوں کا وقت گزر چکا ہے۔'' زاہد بول اٹھا۔''تم ٹھنڈے ٹھنڈے ٹہل لو تو اچھا ہے۔''

نوجوان نے زاہد کو گھور کر دیکھا مگر فوراً ہی میری طرف دیکھتے ہوئے نرم پڑ گیا۔ اس نے زاہد

سے کہا۔''آپ مجھے سلمٰی سے بات کرنے دیں۔'' اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

''جاؤ سلمٰی اس کی یہ آخری حسرت بھی پوری کر ہی دو۔'' میں بولی۔''لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ تمہیں اس کے بہکانے میں نہیں آنا..... جاؤ برابر والی بنچ خالی ہے بیٹھ کر بات کر لو۔''

''شکریہ بہت بہت شکریہ خاتون۔'' وہ نوجوان میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

سلمٰی میرے کہنے پر کچھ جھجکتی ہوئی سی بنچ سے کھڑی ہو گئی۔

''ظالم سماج ایک دم محبت کرنے والوں پر مہربان کیسے ہو گیا؟'' ان دونوں کے جاتے ہی زاہد نے مجھ پر فقرہ چست کیا۔

''پہلے تو تمہی نے ظالم سماج کا کردار ادا کیا تھا بلکہ ظالم سماج کی بجائے رقیب روسیاہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ جھگڑے اور ہاتھا پائی کی ابتداء تو تمہی سے ہوئی تھی۔''

''اب دیکھنا یہ ہے کہ سنگ دل محبوب کا دل موم ہوتا ہے یا نہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔''یہ جو آپ کی صنف ہے اسے بغیر مردوں کے چین بھی تو نہیں آتا۔''

''اور تمہاری صنف، یعنی مردوں کو عورتوں کے بغیر ٹھنڈک پڑتی ہے۔ بس ذرا کوئی خوب صورت چہرہ نظر آیا اور اس کے پیچھے دم ہلانا شروع کر دی۔''

''حد ادب مانع ہے ورنہ اس دم ہلانے والی بات کا جواب میں ضرور دیتا۔ آپ نے اشرف المخلوقات کو ایک جانور سے تشبیہ دے کر کچھ اچھا نہیں کیا۔''

میں برابر والی بنچ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ نوجوان نے سلمٰی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور سلمٰی اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا رہی تھی۔ نوجوان غالباً اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلمٰی بار بار انکار میں سر ہلا رہی تھی۔

میری تقلید میں زاہد ادھر دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔''آپ نے سلمٰی کو جو پٹی پڑھائی ہے' اسے مدنظر رکھتے ہوئے دو دلوں کا ملن مجھے مشکل ہی معلوم ہو رہا ہے۔''

''ہونا بھی چاہئے مشکل!'' میں سنجیدگی سے بولی۔''اگر لڑکیاں ذرا بولڈ ہو جائیں تو پھر لڑکے انہیں آسانی سے ٹریپ نہیں کر سکتے۔''

''جس طرح کہ آپ بولڈ ہیں بلکہ آپ کو تو ایکسٹرا بولڈ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ آپ تو مجھے عشق پر دف معلوم ہوتی ہیں۔ کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا آپ پر۔''

نوجوان بہت ڈھیٹ ثابت ہوا۔ سلمٰی کے ساتھ ساتھ وہ میرے پاس آ کر بولا۔''آپ ہی سلمٰی کو سمجھائیں یہ واپس اپنے گھر جا کر بدنام ہو جائے گی۔ اسے اس کے گھر والے قبول نہیں کریں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ اب یہ تمہارا مسئلہ نہیں رہا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔''اب تم اپنا

راستہ لو ورنہ میں..... ’’ دانستہ میں نے دھمکی آمیز انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

’’دیکھ لینا سلمیٰ کہ تم مجھے ٹھکرا کر ایک دن پچھتاؤ گی۔ اب بھی موقع ہے‘ میرا بڑھایا ہوا ہاتھ تھام لو۔‘‘ اس نے سلمیٰ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

سلمیٰ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ میں نے یہ دیکھ کر کہا۔ ’’بہت ہو چکا‘ اب تمہیں کوئی رومانی مکالمہ بولنے کی ضرورت نہیں۔‘‘ میرے لہجے میں سختی آ گئی اور اسی کے ساتھ تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

نوجوان نے میری ناگواری اور بدلے ہوئے لہجے کو یقیناً محسوس کر لیا اور اپنی سابقہ محبوبہ سے بولا۔ ’’اچھا سلمیٰ خدا حافظ ..... ہمیشہ کیلئے خدا حافظ۔‘‘

سلمیٰ نے آہستہ سے ’’خدا حافظ‘‘ کہہ دیا اور پھر وہ نوجوان تیزی کے ساتھ سیدھا بڑھتا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں سلمیٰ سے مخاطب ہوئی۔ ’’مجھے خوشی ہوئی سلمیٰ کہ تم نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ جو نوجوان زندگی بھر ساتھ دینے اور اپنے وعدے نبھانے کا عہد کر کے سفر کے پہلے ہی مرحلے میں اپنے وعدوں سے انحراف کرنے لگے‘ اس پر بھروسا نہیں کرنا چاہئے۔ وہ زندگی کے کسی بھی مرحلے پر دھوکا دے سکتا ہے۔‘‘

جواباً سلمیٰ کچھ نہ بولی۔ اس کے چہرے سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ چاہے اس نوجوان نے اسے محبت کا فریب دیا ہو مگر وہ اپنے جذبوں میں سچی تھی۔

کچھ دیر ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ٹرین آنے میں اب صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔

’’کیا بج گیا؟‘‘ زاہد نے مجھے گھڑی میں وقت دیکھتے پا کر پوچھا۔

میں نے وقت بتایا اور کہا۔ ’’اب بس کچھ ہی دیر بعد ہم دہلی جانے کیلئے ٹرین میں سوار ہو جائیں گے۔‘‘

’’خدا کرے کہ دہلی تک سفر کے دوران میں آپ کی قسمت زور نہ مارے۔‘‘ زاہد عجیب سے انداز میں بولا۔

’’قسمت زور مارنے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’آپ کی قسمت میں ہنگامے ہی ہنگامے لکھے ہیں اس لیے کہہ رہا ہوں خاتون!‘‘ وہ بظاہر منہ بنا کر کہنے لگا۔ ’’جب سے آپ کا ساتھ ہوا ہے زندگی سے اعتماد اٹھ گیا ہے کہ کیا خبر کون سا لمحہ آخری لمحہ ثابت ہو۔ دو گھڑی آپ کے قرب کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملا۔‘‘

’’تمہیں دھوکا ہوا ہے جس خوشبو کی تم میرے قرب یا میرے جسم کی خوشبو سمجھ رہے ہو وہ دراصل فارن فرانسیسی سینٹ کی خوشبو ہے۔‘‘

’’مجھے یقین ہے آپ سینٹ نہ بھی لگائیں تو آپ کے جسم سے خوشبو آئے گی۔‘‘

’’خوشبو نہیں بلکہ بُو وہ بھی پسینے کی۔‘‘

’’آپ میں تو نام کو حسِ جمال نہیں۔ میرے لطیف و نازک احساسات و جذبات کو آپ نے پسینے میں نہلا دیا۔ کاش آپ بظاہر جیسی نرم و نازک نظر آتی ہیں حقیقتاً بھی ویسی ہی ہوتیں۔ خیر چھوڑیں‘ یہ میرا دکھ ہے اور اسے میں خود ہی برداشت کر لوں گا۔ یہ بتائیے کہ دہلی میں کہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟‘‘

’’صادق ماموں کو تو جانتے ہو گے تم۔‘‘ میں بولی۔

’’جانتا تو نہیں‘ ہاں نام سنا ہے۔ وہی تو نہیں جو کسی انگریزی اخبار میں کام کرتے ہیں؟‘‘

’’ہاں وہی! وہ دراصل میری امی کے چچا زاد ہیں۔ باڑا ہندو راؤ میں رہتے ہیں‘ وہیں ٹھہرنے کا خیال ہے۔ ویسے تو دہلی میں اور بھی عزیز ہیں مگر میں صرف تمہاری وجہ سے وہاں قیام کو ترجیح دے رہی ہوں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے میرے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

’’میری وجہ سے کیوں؟‘‘ توقع کے مطابق زاہد نے سوال کیا۔

’’یہ تو تمہیں وہیں چل کر معلوم ہو گا چندا! پہلے سے کچھ بتا کر میں سسپنس ختم کرنا نہیں چاہتی۔‘‘

’’بتا دیں نا!‘‘ وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔ ’’آپ کو میرے سر کی قسم!‘‘

’’پہلے ناک پر انگلی رکھ کر گھٹر بیویوں کی طرح کہو‘ آپ کو میرے سر کی قسم!‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔

’’اچھا آپ میرا مذاق اڑا رہی ہیں تو پھر میں نہیں پوچھتا۔‘‘ اس نے منہ پھلا لیا۔

کچھ دیر وہ منہ پھلائے بیٹھا رہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ ’’اچھا بتاتی ہوں‘ مگر پہلے دانت دکھاؤ..... ہنسو!‘‘

میری بات سنتے ہی وہ ہنس پڑا‘ پھر بولا۔ ’’مجھے آپ کا اس طرح جلانا بالکل اچھا نہیں لگتا‘ ہاں۔‘‘

’’دراصل بات یہ ہے زاہد کہ مجھے تمہاری ایک خواہش کا خیال آ گیا۔ تم نے کہا تھا نا کہ رقیب کے بغیر عشق کرنے میں مزہ نہیں آتا۔ تو صادق ماموں کے گھر میں تمہیں ایک چھوڑ کئی رقیب مل جائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات تمہیں اور بتا دوں کہ جب میری امی جان حیات تھیں تو صادق ماموں نے اپنے بڑے فرزند ارشد علی کیلئے میرا رشتہ مانگا تھا۔ بہرحال خاصے دن بات چلی تھی مگر اس سے پہلے کہ بیل منڈھے چڑھتی‘ امی کا انتقال ہو گیا۔ ارشد علی سلمیٰ‘ میرے بارے میں اس حد تک سنجیدہ ہو گئے تھے کہ موصوف نے سنا ہے اب تک شادی نہیں کی۔ یہ اب کی نہیں برسوں پہلے کی بات ہے۔ اب کہو‘ آئے ,,

گا نا مزہ عشق میں؟'' میں نے ہنستے ہوئے بات ختم کی۔

''بس مجھے ایک بات بتا دیں کہ کہیں آپ نے بھی تو میاں ارشد علی سلمہ کے عشق میں مبتلا ہو کر اب تک شادی نہیں کی۔ کہیں آپ تو سیریس نہیں؟؟''

''اگر میں یہ نہ بتاؤں تو؟'' مجھے شرارت سوجھی۔ ''اور ہاں صادق ماموں کے اور بھی دو عدد فرزند ارجمند ہیں جو کنوارے ہیں وہ بھی میری نظر کرم کے متمنی ہو سکتے ہیں۔''

''ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ پاتیں تو پھر چار کیسے رہیں گی۔ آپ کو کوئی ایک تلوار ہی پسند کرنا ہوگی۔'' زاہد کا جملہ ذومعنی تھا۔ عموماً وہ مبتذل جملوں سے گریز کرتا تھا مگر نہ معلوم کیسے یہ جملہ اس کی زبان پر آ گیا تھا۔ اس نے بھی غالباً میرے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ سے میری ناگواری کو محسوس کر لیا اور فوراً بات بدل دی۔ ''یہ بتائیں کہ پہلے سلمیٰ کو اس کے گھر چھوڑیں گی یا.....''

زاہد کی بات پوری نہ ہو سکی کہ دائیں جانب سے مجھے ٹرین کی سیٹی سنائی دی۔ ٹرین لیٹ نہیں ہوئی تھی اور وقت مقررہ پر آ گئی تھی۔ میں نے یہاں سے بھی سیکنڈ کلاس ہی کے ٹکٹ لیے تھے' یہی وجہ تھی کہ ٹرین میں سیٹ باآسانی مل گئی۔ پھر جب کچھ دیر بعد کانپور ریلوے سٹیشن سے ٹرین روانہ ہوئی تو زاہد نے اپنا سوال دہرایا۔

''پہلے ہم صادق ماموں ہی کے گھر چلیں گے کیوں کہ سامان اٹھائے کہاں پھریں گے۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''دیکھیں جی سیریس ہونے کی نہیں ہو رہی۔'' زاہد بولا۔ پھر اس نے میرے لہجے کی نقل اتاری۔ ''دانت دکھائیں' جلدی سے' ہنسیں قلقلا کے۔''

مجھے واقعی ہنسی آ گئی۔ یوں بھی مجھے اس کی جو بات ذرا مبتذل محسوس ہوئی تھی اس کا دوبارہ ذکر کرنا مزید ابتذال کا سبب ہوتا۔ میں نے اسی لیے بات ٹال دی۔ اگر زاہد ساتھ نہ ہوتا تو ٹرین میں کانپور سے دہلی تک کا سفر مجھے بور کر دیتا۔ راستے میں علی گڑھ سٹیشن بھی پڑا اور زاہد نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں اس سٹیشن پر اتری نہ زاہد کو اترنے دیا۔ میں بہرحال احتیاط سے کام لینا چاہتی تھی۔ علی گڑھ کی پولیس یقیناً اب تک مجھے تلاش کر رہی ہوگی' میں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ دہلی تک سفر میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

دہلی سٹیشن پر اترتے ہی زاہد نے آواز بلند کی ''اللہ تیرا شکر ہے۔'' کہا اور اس طرح کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کی وجہ یقیناً کسی ہنگامے کے بغیر سفر تمام ہونا تھا۔

ریلوے سٹیشن کی عمارت سے باہر نکل کر ہم نے ایک ٹیکسی کر لی۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک سکھ تھا۔ زاہد اس کے برابر اگلی نشست پر بیٹھا تھا' میں' ذکیہ اور سلمیٰ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ سٹیشن سے نکلتے

ہی میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ وہاں جو گہما گہمی ہونا چاہئے تھی' نہیں تھی۔ گاڑیاں اور لوگ بھی کم ہی تھے۔

پھر اس سے پہلے میں یا زاہد ٹیکسی والے سے کچھ پوچھتے وہ خود ہی بول اٹھا۔ ''معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے جی لوگوں کو! ذرا سی بات پر ہنگامہ کر دیتے ہیں۔''

''کیوں' کیا ہوا......؟ کیا یہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟'' زاہد نے ٹیکسی والے سے پوچھا۔

''ہاں جی!'' اس نے طویل سانس لیا۔ ''بات اور بڑھ گئی تو کرفیو لگ جائے گا' سنا ہے ایک مہاسبھائی مارا گیا ہے' کچھ کہتے ہیں کہ ابھی وہ زندہ ہے۔ زندہ ہو تو اچھا ہے ورنہ مر گیا تو بات بڑھ جائے گی۔ مصیبت ہر طرح ہم غریبوں کی ہے جی جو روز کنواں کھودتے ہیں' روز پانی پیتے ہیں۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ہندو مہاسبھا' متعصب ہندوؤں کی سیاسی جماعت تھی۔ اسی سے وابستہ افراد کو ''مہاسبھائی'' کہا جاتا تھا۔ سفر کے دوران میں ٹیکسی والے سے مزید تفصیلات کا علم ہوا۔ کل رات جامع مسجد کے علاقے میں مسلمانوں نے ایک ہندو کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ اس کے پاس کپڑے کا ایک تھیلا تھا جس میں سور کا کٹا ہوا سر برآمد ہوا تھا۔ وہ اس ناپاک جانور کا سر یقیناً کسی ایسی جگہ پھینکنے جا رہا تھا جہاں اس کے پائے جانے سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ یہ حربے بہت پرانے تھے۔ عموماً مسجدوں کو اس طرح ناپاک کرنے کی سازش کی جاتی تھی۔ اس کا مقصد کسی بھی طرح مسلمانوں کو ظلم و بربریت کا نشانہ بنانا ہوتا تھا۔ ایسی ترکیبیں ہندو مہاسبھا سے متعلق ارکان ہی کرتے تھے۔ اس طرح ایک طرف تو ان متعصب ہندوؤں کو مسلمانوں سے لڑنے کیلئے ایک بہانہ ہاتھ آ جاتا تھا' دوسری طرف ہنگامہ آرائی سے انہیں کانگریس حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ٹیکسی والے کی اطلاع کے مطابق مسلمانوں نے اس ہندو کی حرکت سے مشتعل ہو کر اسے بے حد مارا پیٹا تھا۔ آج کے اخبارات میں اسی متعصب جماعت کے لیڈروں نے بڑے اشتعال انگیز بیانات دیئے تھے جس سے شہر کی فضا کشیدہ ہو گئی تھی۔ اخباری اطلاع کے مطابق فتنہ پرور مہاسبھائی ابھی مرا نہیں تھا مگر مہاسبھائی یہی کہتے پھر رہے تھے کہ رات کو وہ شخص مر گیا ہے۔ مہاسبھائی لیڈروں کا کہنا یہ تھا کہ مسلمانوں نے ایک ہندو کو اپنے علاقے میں قتل کرنے کی حد تک مارنے پیٹنے کے بعد سور کے کٹے ہوئے سر کی افواہ اڑائی ہے۔ جن لیڈروں کے بیانات اخباروں میں شائع ہوئے تھے ان سبھی کا تعلق ہندو مہاسبھا سے تھا اس لیے زخمی شخص کو اسی جماعت کا سمجھ لیا گیا تھا۔

باڑا ہندو راؤ تک جاتے ہوئے میں نے بازاروں کو بند دیکھا۔ پولیس کے دستے ادھر ادھر گشت کرتے پھر رہے تھے۔ تقسیم سے پہلے باڑا ہندو راؤ میں مسلمانوں کی خاصی آبادی تھی مگر اب ایسا نہیں تھا۔ اب اس محلے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی [illegible] ''باڑے'' کی بجائے

جامع مسجد کا رخ کیوں نہ کیا جائے۔ یہ خالص مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ تھا اسی لیے ہندوؤں کی نظر میں کھٹکتا رہتا تھا' مگر اب ہماری ٹیکسی خاصی آگے نکل آئی تھی۔ میں نے اسی لیے جامع مسجد چلنے کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ یوں بھی مجھے سلمٰی کو اسی علاقے میں پہنچانا تھا لیکن اب اس کا انحصار حالات پر تھا۔ صادق ماموں کے گھر پہنچ کر ہی میں کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ وہاں پہنچنے کے بعد صحیح طور پر حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

دہلی آئے مجھے برسوں بیت گئے تھے۔ پھر یہ کہ کچھ نئی تعمیرات بھی ہو گئی تھیں اس لیے صادق ماموں کا گھر میرے ذہن سے نکل گیا۔ وقتی طور پر اس سے کچھ پریشانی تو ہوئی مگر جلد ہی ان کا گھر مل گیا۔ ہماری ٹیکسی ان کے گھر کے دروازے پر رکی تو شام کے چار بج رہے تھے۔ سامان ٹیکسی سے اتار کر اور کرایہ ادا کر کے میں نے ٹیکسی والے کو رخصت کر دیا۔ زاہد اس دوران میں کال بیل بجا چکا تھا۔ شہر کے حالات سن کر سلمٰی کچھ فکر مند سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے بھی شاید یہ بات محسوس کر لی تھی کہ موجودہ حالات میں اسے فوری طور پر اس کے گھر نہیں پہنچایا جا سکتا۔

میں جب پہلے آئی تھی تو صادق ماموں کا مکان دو منزلہ تھا مگر اب تین منزلہ ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے بھی مکان ڈھونڈنے میں پریشانی ہوئی تھی۔

کال بیل کے جواب میں ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔ میں جلدی سے آگے بڑھی۔ وہ ارشد کا چھوٹا بھائی معلوم ہوتا تھا مگر ماجد تھا یا شاہد یہ میں نہیں پہچان سکی۔

''یہ صادق علی صاحب ہی کا گھر ہے؟'' میں نے نوجوان سے سوال کیا۔

''جی..... جی ہاں!'' نوجوان نے جواب دیا۔ ''آپ..... آپ کہاں سے آئی ہیں؟''

''پاکستان سے۔'' میں جواباً بولی۔

''پاکستان سے!'' وہ کچھ حیران سا ہوا۔ ''آ..... آئیے اندر..... اندر آ جائیے۔''

''صادق ماموں ہیں گھر پر؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں' وہ کچھ ہی دیر بعد دفتر جانے والے تھے۔'' نوجوان نے بتایا' پھر دروازے سے ا طرف ہٹتے ہوئے اندر آنے کیلئے کہنے لگا۔ ''یقیناً وہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا' لیکن اسے صادق ماموں ن غالباً یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں اپنوں ہی میں سے ہوں۔ اس نے اسی لیے راستہ چھوڑ دیا تھا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ تم ماجد ہو یا شاہد؟'' میں نے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا نام واحد ہے۔'' اس نے بتایا تو میں حیران رہ گئی۔ ''ماجد بھائی اور شاہد بھائی دونوں م سے بڑے ہیں۔''

''ارے تم..... تم اتنے بڑے ہو گئے۔'' میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ ''پہلے جب میں ال

تھی تو تم ذرا سے تھے۔''

''واحد..... اے واحد کون آیا ہے بھئی؟'' دور سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

پھر اگلے ہی چند لمحات میں جیسے اس گھر میں عید ہو گئی۔ صادق ماموں اور ممانی' مجھے اور ذکیہ کو دیکھ کر کھل اٹھے۔ دونوں زاہد سے مل کر بھی خوش ہوئے۔ سلمٰی کے بارے میں مصلحتاً مجھے جھوٹ بولنا پڑا کہ وہ میری سہیلی کی چھوٹی بہن ہے اور کلکتہ سے میرے ساتھ یہاں آئی ہے۔ میں نے سلمٰی کے متعلق مزید بتایا۔ ''یہ کلکتہ گھومنے گئی تھی' اپنی بڑی بہن کے ساتھ۔ ابھی وہ وہاں مزید رہنا چاہتی تھی مگر اس کا دل وہاں نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی بڑی بہن نے مجھ سے جب یہ سنا کہ میں دہلی جا رہی ہوں تو اسے میرے ساتھ کر دیا۔ اس کا گھر چتلی قبر پر ہے' کچھ دیر بعد میں اسے خود پہنچا دوں گی۔''

''مگر بیٹی شہر کے حالات تو اس قابل نہیں ہیں کہ تم وہاں جاؤ'' صادق ماموں محبت آمیز لہجے میں بولے۔ ''سب سے زیادہ کشیدگی جامع مسجد کے علاقے ہی میں ہے۔''

''خیر دیکھا جائے گا۔ اگر آج نہیں تو کل صبح میں اسے چھوڑ آؤں گی۔''

''اور یہ ذکیہ کیوں کھوئی کھوئی سی ہے؟'' صادق ماموں سے ذکیہ کی حالت چھپی نہ رہ سکی۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ماموں!'' میں نے بتایا۔

''تو پھر اسے آرام کرنے دو۔'' ماموں نے کہا' پھر ممانی سے بولے۔ ''ارے بھئی سنو' ذکیہ بیٹی کو اوپر والی منزل پر لے جاؤ' ماجد اور شاہد کی دلہنوں سے کہنا کہ اس کا خیال رکھیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ماموں؟'' میں نے خوشگوار حیرت کے ساتھ کہا۔ ''کیا ماجد اور شاہد دونوں کی شادیاں کر دیں؟''

''ہاں ابھی گزشتہ سال ہی دونوں کے فرض سے نمٹا ہوں؟'' صادق ماموں نے بتایا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تمہارا پتا نہ ہونے کے سبب میں تمہیں مدعو نہ کر سکا اور ہاں ذکیہ کے بارے میں یہ سنا تھا کہ قاہرہ میں رہتی ہے۔'' اس کا لہجہ جواب طلبی کا سا تھا۔

''جی ہاں۔'' میں بولی۔ ''ذکیہ وہیں رہتی ہے۔ پچھلے دنوں ہی یہ پاکستان آئی تھی تو میں نے اسے یہاں عزیز رشتے داروں سے ملنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہاں پاکستان میں کچھ دن رہ کر یہاں چلی آئی۔ پھر میں نے بھی سوچا کہ بہت دن ہو گئے ہیں' ایک چکر ہی لگا لوں یہاں کا۔''

''بہت اچھا کیا تم نے بیٹی!'' تم دونوں بہنوں کو تو دیکھنے کیلئے آنکھیں ترس گئی تھیں۔'' ماموں کے لہجے میں محبت کی چاشنی تھی۔

ممانی' ذکیہ کو اپنے ساتھ اوپری منزل پر لے جانے لگیں تو میں نے سلمٰی سے کہا۔ ''تم بھی ذکیہ کے ساتھ جا کر آرام کر لو' تھک گئی ہو گی۔''

میری بات سن کر سلمٰی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے احسان مندی اور ممنونیت کی پرچھائیاں سی نظر آئیں۔ میں نے اس کے متعلق دروغ مصلحت آمیز کا سہارا لے کر اس کی عزت رکھ لی تھی' یہ ممنونیت اسی سلسلے میں تھی۔

اپنے امیدوار ارشد علی کی بابت کچھ پوچھتے ہوئے مجھے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی' پھر بھی ہمت کر کے میں نے دریافت کر ہی لیا۔ ''اور سنائیں ماموں' ارشد کی شادی بھی کر دی نا؟''

''نہیں بیٹی!'' صادق ماموں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''وہ شادی پر آمادہ ہی نہیں ہوا تو مجبوراً مجھے ماجد اور شاہد کی شادیاں کرنا پڑیں۔''

''یہ سن کر جانے کیوں مجھے دکھ سا ہوا کہ ایک شخص نے محض میری خاطر زندگی کے سفر میں تنہائیوں کو اپنا ساتھی بنا لیا تھا۔

''یہ سب حضرات ہیں کہاں ماموں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ماجد اور شاہد کو تو دوپہر کا کھانا کھا کر سونے کی بیماری ہے' دونوں پانچ بجے سے پہلے نہیں اٹھتے اور ابھی ساڑھے چار ہی بجے ہیں۔ ارشد میرے کہنے پر ذرا شہر کے حالات کی سن گن لینے گیا ہے کیوں کہ مجھے فیصلہ کرنا تھا آج دفتر جاؤں کہ نہیں۔ وہ آتا ہی ہوگا۔'' صادق ماموں نے جواباً بتایا۔ پھر اچانک وہ چونک کر بولے۔ ''حد ہوگئی۔''

''کیا ہوا ماموں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''تمہاری ممانی بھی سٹھیا گئی ہیں' بڑھاپے میں اور میری عقل بھی خبط ہوگئی ہے۔ ابھی تک میں نے تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں۔'' ماموں کے لہجے میں تاسف تھا۔

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ماموں۔ اپنا گھر ہے' یہاں ہم تکلف تو کر ہی نہیں سکتے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے واقعی نہیں کھایا' مگر کم از کم میں تو نہانا چاہوں گی۔''

''یہ کی تم نے اپنوں والی بات۔'' صادق ماموں میری بے تکلفی سے خوش ہو گئے۔ ''تمہاری آمد کی خوشی میں آج میں چھٹی کیے ہی لیتا ہوں' حالات سازگار ہوں یا نہ ہوں' ابھی دفتر فون کر کے کہہ دیتا ہوں کہ آج نہیں آؤں گا' رات کی شفٹ کیلئے کوئی بندوبست کر لیں۔''

''کیا اب آپ شفٹ انچارج ہو گئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ کیوں کہ میری اطلاعات کے مطابق وہ سینئر سب ایڈیٹر تھے۔

''ہاں بیٹی! دو سال ہو گئے اب تو! ویسے اخبار کی نوکری ہے بہت مشکل مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک بار اس کا مزہ لگ جائے تو ساری زندگی یہ چسکا چھوٹتا نہیں۔''

صادق ماموں کا مکان خاصا بڑا تھا۔ تیسری منزل پر ہم سب نے باری باری غسل کر کے لباس

تبدیل کیے کیوں کہ ریل کے سفر میں خاصا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ ہم نہا دھو کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ ممانی نے آ کر بتایا' دوسری منزل پر ہمارے لیے کھانا لگا دیا گیا ہے۔ ہم دوسری منزل پر آ گئے۔ میں نے پہلی بار ماجد اور شاہد کی دلہنوں کو دیکھا۔ وہ دونوں مجھے اچھی لگیں۔ صادق ماموں کی ایک بیٹی بھی تھی جو بچپن میں آٹھ نو سال کی ہو کر مر گئی تھی اسی لیے انہیں خاندان بھر کی بچیوں سے بہت محبت تھی اور ان بچیوں میں میرا نمبر پہلا تھا۔ وہ مجھے اپنی سگی بیٹی ہی کی طرح چاہتے تھے۔ انہوں نے اسی لیے اس وقت جب میں صرف پندرہ سال کی تھی تو مجھے میری امی سے اپنے بڑے بیٹے ارشد کیلئے مانگا تھا۔ امی اور ان کے درمیان زبانی طور پر کچھ بات ہو بھی گئی تھی مگر باقاعدہ بات پکی نہیں ہوئی تھی۔ پھر حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔ امی کا انتقال ہو گیا اور ابو ہمیں لے کر پاکستان آ گئے۔ اس کے بعد تو جیسے سبھی عزیز رشتے دار چھوٹ گئے۔ کسی سے مدتوں کوئی رابطہ نہ رہا۔ ابو کی وفات کے بعد حالات نے مزید پلٹا کھایا اور مجبوراً مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑا۔ میں نے نہ صرف اپنی ذمے داری اٹھائی بلکہ اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کی نگہداشت بھی کی اور اسے بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کیلئے سہارا دیا۔

ہم نے ابھی کھانا شروع کیا تھا کہ ماجد اور شاہد اپنے کمروں سے نکل آئے۔ انہوں نے بھی ہماری آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ صادق ماموں بھی نیچے سے اوپری منزل پر آ گئے تھے اور مجھے ان کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ پھر مجھے اس تشویش کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ وہ ارشد کی طرف سے پریشان تھے جسے گئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔

''شہر کی فضا ٹھیک نہیں ہے' اس لڑکے کو اب تک واپس آ جانا چاہئے تھا۔'' صادق ماموں جیسے خود کلامی میں مصروف تھے۔ ''میں نے ناحق اسے بھیجا۔''

ممانی بھی فکر مند لگ رہی تھیں مگر خاموش تھیں۔ ''ہم کھانا کھا کر اٹھنے والے تھے کہ ارشد کا سب سے چھوٹا بھائی واحد بھاگا بھاگا اوپر آیا اور آتے ہی بولا۔ ''ابو! بھائی جان آ رہے ہیں۔ میں نے انہیں گھر کی طرف آتے دیکھا ہے۔ ان کے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے تو؟'' صادق ماموں یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ابو آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا۔'' واحد نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

''دیکھتا ہوں میں ابھی۔'' صادق ماموں یہ کہہ کر تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئے۔

''خدا خیر کرے۔'' ممانی کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ پھر واحد کی اطلاع درست ثابت ہوئی۔ ارشد کی قمیص خون آلود تھی اور اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے نیچے صحن میں اوپری منزل کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ وہ صادق ماموں کو بتا رہا تھا کہ شہر کی فضا مزید کشیدہ ہو گئی ہے اور باڑے کے چوراہے پر بھی کسی نے ایک مسلمان لڑکے کو چاقو مار دیا ہے' لوگ اسے زخمی حالت میں ہسپتال لے گئے

ہیں۔ چوراہے کے قریب ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانب سے ایک دوسرے پر پتھراؤ کیا جا رہا ہے۔ میں بھی اسی میں گھر گیا تھا۔ محلے ہی کے ایک ڈاکٹر سے مرہم پٹی کرا کے آ رہا ہوں۔

اونچا پورا قد' سرخ و سفید رنگ' کھڑا ناک نقشہ اور بڑے بڑے لہریے دار بال' یہ تھا ارشد علی! جسے میرا امیدوار ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ اسے جب میری آمد کے بارے میں بتایا گیا تو وہ کچھ دیر کو نہ جانے کہاں کھو سا گیا۔ یوں جیسے بیتے ہوئے دنوں کا حساب کر رہا ہو۔ وہ مجھ سے ملنے کو کچھ ہی دیر بعد اوپری منزل کے زینے کی طرف بڑھا۔ صادق ماموں اپنے موٹے فریم کے چشمے کو صاف کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ میں کھڑکی سے ہٹ گئی۔

''بندہ تو خاصا گریس فل لگتا ہے۔'' زاہد نے مجھ سے سرگوشی کی۔

میں ''ہوں ہاں'' کر کے اس کی بات ٹال گئی۔ معلوم نہیں کیوں ارشد کا سامنا کرتے ہوئے مجھے کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان نہ تو کبھی بے تکلفی رہی تھی نہ ہی کبھی عشق وغیرہ کا چکر چلا تھا۔ اگر وہ مجھے چاہتا بھی تھا تو یہ یکطرفہ معاملہ تھا۔ اس کی چاہت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی بات کافی تھی کہ اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ شادی میں نے بھی نہیں کی تھی مگر اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ میں جس طرح کی زندگی گزار رہی تھی' ایک گھریلو عورت کیلئے ایسی زندگی گزارنا ممکن نہیں تھا۔ میں شاید اپنی آپ بیتی میں پہلے بھی کہیں یہ بات لکھ چکی ہوں کہ میں شادی شدہ زندگی گزارنا افورڈ نہیں کر سکتی۔

نہ چاہنے کے باوجود بھی مجھے ارشد کا سامنا کرنا ہی پڑا۔ اس نے مجھے کچھ اس انداز سے دیکھا کہ میری نظریں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ اس سے پہلے کبھی کسی مرد کے روبرو میں نے خود کو اتنا نروس محسوس نہیں کیا تھا۔ سلام کے تبادلے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیسی ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں۔'' جواب دیتے ہوئے میری نظریں بدستور جھکی رہیں۔ پھر میں نے اخلاقاً پوچھا۔ ''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی آپ کو؟''

''جی نہیں۔'' اس نے شائستگی سے جواب دیا۔ پھر اس نے مجھ سے اپنے گھر والوں کی موجودگی کے باوجود وہ بات کہہ دی جو اب تک کسی نے نہ پوچھی تھی' نہ کہی تھی۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''شادی تو آپ نے اب تک کر لی ہوگی۔'' انداز تصدیق طلب تھا۔

''یہ حادثہ ابھی میری زندگی میں رونما نہیں ہوا۔'' میں نے بلا جھجک اس کی غلط فہمی دور کر دی اور ردعمل دیکھنے کیلئے ایک دم نگاہ اوپر اٹھائی۔

''اچھا..... آپ نے بھی شادی نہیں کی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں عجیب سی طمانیت تھی۔

''ارے بیٹے تم یہ خون آلود کپڑے تو بدل لو۔'' ممانی نے ارشد کو مخاطب کیا۔

''جی امی' بدل لیتا ہوں۔ دراصل ان کی آمد کے بارے میں سن کر کچھ خیال ہی نہیں رہا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ماموں! سفر کی وجہ سے کچھ تھکن سی ہو گئی ہے' اگر آپ کی اجازت ہو تو آرام کر لیں ہم لوگ؟'' میں نے صادق ماموں سے کہا۔

''ہاں ہاں ضرور' کیوں نہیں!'' صادق ماموں جلدی سے بولے۔ پھر میں وہاں نہیں رکی۔ مجھے وہاں عجیب سی بے نام بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ زاہد' ذکیہ اور سلمٰی بھی میرے ساتھ تیسری منزل پر آ گئے۔ اوپر آتے ہی زاہد خاموش نہ رہ سکا۔ ''معاملہ کچھ گمبھیر معلوم ہو رہا ہے خاتون! بندہ تو گلے گلے آپ کے عشق میں ڈوبا معلوم ہوتا ہے۔''

''خواہ مخواہ بے پر کی نہ اڑاؤ۔'' میں نے ہنس کر ٹالنا چاہا۔

''آپ کے دل میں بھی مجھے چور لگتا ہے محترمہ! موصوف کے سامنے بڑی شرما کے نظریں جھکائے بیٹھی تھیں۔''

''تو پھر تمہارے کلیجے پر سانپ کیوں لوٹ رہے ہیں؟''

''لو اور سنو! اس ڈرامے کا اصل کردار تو ہم ہی ہیں۔ ہمیں فکر نہیں ہوگی تو کسے ہوگی۔''

''رقابت محسوس ہونے لگی تمہیں؟'' میں نے اسے چڑایا۔

''ایسی ویسی! بہت زبردست قسم کی رقابت۔ میرے سامنے تو آپ پٹاپٹ بولتی رہتی ہیں مگر ان حضرات کے سامنے بولتی کیوں بند ہو گئی تھی؟''

''ہرگز نہیں!'' میں نے انکار کیا۔ ''تم کیا دیکھ نہیں رہے تھے' میں کیا چپ بیٹھی تھی۔''

''بس رہنے دیں' زیادہ اپنی صفائی پیش نہ کریں۔''

''میں کیوں صفائی پیش کرتی تمہارے سامنے! کیا میں ڈرتی ہوں تم سے۔''

''بس یہی تو غلطی ہو گئی خاتون کہ میں نے شروع سے آپ پر اپنا رعب نہیں رکھا۔''

''اور تمہارے خیال میں' میں تمہارے رعب میں آ جاتی؟..... فضول باتیں چھوڑو اور جا کر سامنے والے کمرے میں آرام کرو' مجھے کمر سیدھی کرنے دو۔''

''تو میں نے کب آپ کو روکا ہے۔ لیٹ جائیں۔''

''تم یہاں سے ٹلو تو میں لیٹوں نا۔..... تمہاری ہی وجہ سے یہ غریب سلمٰی نہیں لیٹی ابھی۔'' میں نے سلمٰی کی طرف اشارہ کیا جو قریب ہی ایک چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں ذکیہ میرے کہنے پر فوراً لیٹ گئی تھی۔ اس کی چارپائی میرے قریب ہی بچھی ہوئی تھی۔

"ویسے آپ کہتی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں' لیکن ان خاتون کا بہانہ نہ بنائیں۔" اس نے سلمٰی کی طرف اشارہ کیا۔ "انہیں یہاں میری موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں۔ کیوں خاتون' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" وہ براہ راست سلمٰی سے مخاطب ہوا۔

"جی...... ہاں...... مم...... مجھے بھلا کیا اعترض ہوتا۔"

"اخلاقاً کہا ہے سلمٰی نے! تم باتوں میں نہ آ جانا۔" میں ہنس کر بولی۔

زاہد میری بات سنی ان سنی کر کے پھر سلمٰی سے مخاطب ہوا۔ "مجھے لگتا ہے سلمٰی کہ آپ کو بھی نیند نہیں آ رہی۔ ایسا کیوں نہ کریں کہ انہیں سونے دیں یہاں اور ہم دونوں دوسرے کمرے میں چلیں۔"

"جی...... جی...... جی ہاں...... جی نہیں۔" سلمٰی زاہد کی شرارت پر بوکھلا گئی اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"ابھی اقرار اور ابھی انکار! آپ کی انہی اداؤں نے تو اس غریب کا کونڈا کر دیا محترمہ جو کانپور ریلوے سٹیشن پر ٹاپا رہ گیا اور آپ اسے ان معزز خاتون کے بہکائے میں آ کر ٹکا سا جواب دے آئیں۔" زاہد مجھے ہنستے دیکھ کر اور "پھیل" گیا۔

میں نے سلمٰی کے چہرے پر شرمندگی کے آثار دیکھ کر زاہد کو ڈانٹا۔ "اب تم میرے ساتھ ساتھ سلمٰی پر بھی فقرے بازی کرنے لگے! چلو نو دو گیارہ ہو جاؤ یہاں سے فوراً۔"

زاہد ہنستا ہوا کمرے سے چلا گیا تو میں نے سلمٰی کو سمجھایا کہ وہ دل کا برا نہیں' بس ذرا سا شرارتی ہے۔

"جی سمجھتی ہوں میں۔" سلمٰی نے آہستہ سے کہا۔ "وہ آپ کو بھی ستاتے رہتے ہیں۔"

"اچھا اب میں تو سو رہی ہوں کچھ دیر کو۔ بہتر ہے تم بھی آرام کر لو۔" یہ کہتے ہوئے میں بستر پر دراز ہو گئی اور ذکیہ کی طرف دیکھا وہ بے خبر سو رہی تھی۔

سفر کی تھکن تو تھی ہی اس لیے جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔ گزشتہ رات میں کچھ ہی دیر کو سو سکی تھی۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر سو پائی تھی کہ یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسی وقت میری سماعت سے کچھ وحشیانہ نعرے ٹکرائے۔ کچھ دیر کو نیند کے غلبے کی وجہ سے میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ پھر رفتہ رفتہ میں جیسے اپنے حواس میں آ گئی۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں کہاں اور کن حالات میں ہوں۔ اسی وقت زاہد سامنے والے کمرے سے بھاگتا ہوا آیا اور آتے ہی گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "لگتا ہے ہندو بلوائیوں نے اس محلے پر حملہ کر دیا ہے۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے قریبی سڑک پر لوگوں کا ہجوم دیکھا ہے۔ وہ لوگ اسی طرف آ رہے ہیں۔"

"کیا؟" میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ پاکستان میں رہتے ہوئے آئے دن میں اخبارات میں فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں پڑھتی رہتی تھی مگر میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایک دن میں خود ان فسادات میں گھر جاؤں گی۔

دھماکوں کی آوازیں سن کر سلمٰی بھی جاگ اٹھی تھی اور اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار نظر آ رہے تھے۔

بے اختیار میرا ہاتھ سرہانے رکھے ہوئے اپنے پرس کی طرف بڑھا جس میں ریوالور موجود تھا۔ میں نے جلدی سے پرس کھول کر ریوالور نکال لیا اور زاہد سے بولی۔ "چلو مجھے دکھاؤ تم نے کہاں سے بلوائیوں کو دیکھا تھا۔" پھر مجھے سلمٰی کا خیال آ گیا اور میں نے اس سے کہا۔ "تمہیں گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی میں' زاہد کے ساتھ سامنے والے کمرے میں پہنچنے کیلئے دروازے کی طرف تیزی سے بڑھی۔

اسی وقت پھر دو دھماکے ہوئے۔ اسی کے ساتھ زینے کی جانب سے بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ کوئی یقیناً اوپر آ رہا تھا۔ میں اس طرف کوئی توجہ دیئے بغیر زاہد کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچ گئی۔ سامنے ہی بائیں جانب کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں جن میں سے ایک کھڑکی کا پٹ قدرے کھلا ہوا تھا۔ میں لپک کر اس تک پہنچ گئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر مجھے ایک مکان سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا بلوائیوں نے یقیناً اس مکان میں آگ لگا دی تھی۔ اسی مکان سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی وجہ سے قریبی سڑک کا منظر میری نظروں سے چھپ گیا جس کے بارے میں زاہد نے بتایا تھا کہ وہاں اس نے ہجوم دیکھا تھا۔

"عذرا...... عذرا بیٹی!" مجھے صادق ماموں کی آواز عقب سے سنائی دی۔

صادق ماموں شاید سامنے والے کمرے میں تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ارشد علی ہاتھ میں بندوق سنبھالے کمرے میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اس کے گلے میں کارتوسوں کی پیٹی پڑی تھی۔ پھر صادق ماموں بھی اس کمرے میں آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں بھی دو نالی بندوق تھی اور گلے میں کارتوسوں کی پیٹی۔

"عذرا بیٹی! تم اپنی بہن ذکیہ اور اس نوجوان اور دوسری لڑکی کو لے کر نچلی منزل پر اپنی ممانی کے پاس چلی جاؤ۔" صادق ماموں نے مجھے مخاطب کیا۔ "حالات کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ بلوائی ہمارے مکان پر بھی حملہ کر دیں۔ ہم اسی لیے پہلے سے تیار رہنا چاہتے ہیں۔" اسی وقت ان کی نگاہ میرے ہاتھ میں موجود ریوالور پر پڑی۔ "ارے...... یہ تمہارے پاس ریوالور......"

"جی ہاں ماموں...... مگر افسوس میرے پاس اس کی گولیاں نہیں ہیں۔" میرے لہجے میں

تاسف تھا۔ بس جو گولیاں ہیں' اسی میں ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو ہمارے پاس دو بندوقیں اور کافی تعداد میں کارتوس بھی ہیں۔ اگر انہوں نے ہمارے گھر پر حملہ کیا تو ہم انہیں بھون ڈالیں گے۔ تم جاؤ نیچے۔"

"نہیں ماموں!" میں نے کہا۔ "ذکیہ' سلمٰی اور زاہد کو میں نیچے چھوڑ کے آتی ہوں مگر میں خود واپس یہاں آ جاؤں گی۔ جو دو چار گولیاں اس ریوالور میں ہیں' وہ رائیگاں نہیں ہوں گی۔" میں یہ کہتے ہی زاہد کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چلی آئی۔

دوسرے کمرے میں آ کر میں نے ریوالور اپنے بستر پر رکھ دیا اور ذکیہ کو بیدار کیا۔ وہ اتنے ہنگامے کے باوجود ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ جلد ہی میں ذکیہ کو سہارا دیتی ہوئی زاہد اور سلمٰی کو ساتھ لیے نیچے پہنچ گئی۔ سارے ہی گھر والوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ سب لوگ ایک بڑے کمرے میں جمع تھے۔

میں واپس جانے لگی تو عقب سے ممانی کی آواز سنائی دی۔ "تم...... کہاں جا رہی ہو عذرا بیٹی؟"

"اوپر ماموں کے پاس جا رہی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی میں تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

تیسری منزل پر پہنچ کر میں نے اپنا ریوالور اٹھا لیا جسے دانستہ وہاں چھوڑ گئی تھی اور پھر سامنے والے کمرے میں داخل ہو گئی۔ صادق ماموں نے مڑ کر مجھے دیکھا اور بولے۔ "عذرا بیٹی! تم نہیں مانیں نا۔"

"میرا تو خیال ہے ماموں کہ آپ بھی اپنی بندوق اور کارتوس پیٹی مجھے دے کر آرام سے نیچے چلے جائیں۔ میں اور ارشد کافی ہیں یہاں۔" میں کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم عذرا بیٹی! میرے ہوتے تمہیں بندوق اٹھانا پڑے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔"

"آپ کو بندوق چلانا آتی ہے؟" ارشد نے پلٹ کر مجھ سے سوال کیا۔

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"اسی وقت بیک وقت کئی دھماکے ہوئے اور فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ پہلے کی نسبت نعرے اب قریب سنائی دیئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بلوائی قریب آتے جا رہے تھے۔ دھماکے اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ مسلح بھی تھے۔

"ابو وہ......وہ دیکھیے! بلوائی ماسٹر رحمت کے مکان میں آگ لگا رہے ہیں۔" ارشد نے مضطرب آواز میں صادق ماموں کو مخاطب کیا۔

میں نے بھی کھڑکی سے وہ منظر دیکھا جس مکان کو ارشد نے کسی ماسٹر رحمت کا بتایا تھا' وہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ اس گلی کا پہلا مکان تھا جس میں صادق ماموں کا یہ تین منزلہ مکان تھا۔

"وہ...... وہ اب...... اب ادھر ہی رخ کریں گے۔ ارشد بیٹے اس...... اس لیے پہلے ہی سے، ہوائی فائرنگ شروع کر دو تا کہ وہ ادھر......"

"نہیں ماموں!" میں مضبوط و مستحکم لہجے میں بولی وہ فائر کی رینج میں ہیں ہمیں براہ راست ان کو گولی کا نشانہ بنانا چاہیئے۔"

مگر میری بات پوری ہوتے ہی ارشد نے ہوائی فائر کر دیا۔

"یہ خودکشی ہے ارشد!" میں نے کہا۔ "اس طرح انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور وہ یہ جان جائیں گے کہ گولی کہاں سے چلائی جا رہی ہے۔ بندوق مجھے دو! مجھے دو بندوق۔" میری رگوں میں لہو سنسنانے لگا۔ مری نظریں اس ہجوم پر جمی ہوئی تھیں جس میں بہت سے بلوائی مشعلیں لیے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ ایک ہوائی فائر کے جواب میں ہماری طرف پے در پے کئی فائر کیے گئے۔ وہ صرف پانچ مسلح افراد کا ٹولہ تھا جو اس ہجوم کے آگے آگے تھا۔ انہی کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں' بقیہ بلوائیوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں' چھریاں اور بھالے تھے۔

ان فائروں کے جواب میں صادق ماموں نے اس بار دو ہوائی فائر کیے اور مجھے ان پر غصہ آنے لگا۔ اسی غصے کے عالم میں جانے کب اور کیسے میں نے ارشد کی بندوق اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ اس سے پہلے میں اپنا ریوالور زمین پر پھینک چکی تھی۔ وہ اس وقت بے سود تھا۔ ارشد میرا منہ دیکھتا رہ گیا۔

"کیا کر رہی ہو تم یہ عذرا؟" صادق ماموں چیخ اٹھے۔

"وہ جو آپ نہیں کر رہے اور وہی جو مجھے کرنا چاہیئے ماموں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ایک مسلح بلوائی کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔

اس کے گرتے ہی ہجوم مزید مشتعل ہو کر نعرے لگاتا ہوا سیدھا صادق ماموں کے گھر کی طرف بڑھا۔ میرا نشانہ خالی نہیں گیا تھا۔ میں نے مسلح بلوائی کا سینہ چھید دیا تھا۔ چند لمحوں کو تو میں بھی گھبرا گئی کہ اس مشتعل ہجوم کو آگے بڑھنے سے نہ روکا جا سکا تو کیا ہوگا۔ ایسی صورت میں کیا ہوتا' یہ سوچنا بھی میرے لیے سوہان روح تھا۔

☆......☆......☆

اگر صورت حال سنگین ہوتو عموماً لوگوں کے حواس قابو میں نہیں رہتے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ خطرناک حالات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن یہ حقیقت ہے میں جلد ہی خود پر قابو پا لیتی ہوں اور پھر میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی صورت حال خطرناک تھی۔ سینکڑوں مشتعل بلوائی اپنے ایک مسلح ساتھی کی موت کے بعد تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان میں مسلح افراد صرف چار ہی تھے۔

اس دوران میں صادق ماموں اپنی بندوق لوڈ کر چکے تھے۔ میں نے اپنی خالی بندوق ارشد علی کی طرف بڑھاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''آپ اسے لوڈ کریں!'' یہ کہتے ہی میں صادق ماموں کی طرف پلٹی اور ان کے ہاتھ سے بندوق لے لی۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

میں نے پوزیشن لیتے ہوئے نشانہ لیا اور پھر مزید دو مسلح افراد کو پے در پے دو گولیاں چلا کر جہنم رسید کر دیا۔ اب صرف دو مسلح افراد رہ گئے تھے۔ بلوائیوں کے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اپنے دو مسلح ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر یقیناً ان کے حوصلے پست ہونے لگے تھے۔ جواباً بقیہ دو مسلح افراد نے کھڑکی کی طرف فائرنگ کی۔ پے در پے کئی دھماکے ہوئے۔ ایک گولی نے قریبی کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ فائر کرتے ہی میں کھڑکی سے ہٹ گئی۔ بلوائی غالباً سمجھ چکے تھے کہ ان پر صادق ماموں کے گھر کی تیسری منزل سے فائرنگ کی جا رہی ہے۔

لوڈ کرنے کے لئے خالی بندوق صادق ماموں کو تھما کر میں نے ارشد علی کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس نے مجھے بندوق دینے کی بجائے خود کھڑکی سے فائر کر دیا۔ اس نے جلد بازی دکھائی تھی اس لئے پہلی گولی ضائع گئی البتہ دوسری گولی کسی بلوائی کی بجائے ایک اور شخص کے سر میں لگی۔ جواباً پھر گولیاں چلیں اور اس بار کھڑکی کے دونوں پٹ چھلنی ہو گئے۔ جہاں سے ہم فائرنگ کر رہے تھے ہم میں سے کوئی اگر اس وقت کھڑا ہوتا تو یقیناً نشانہ بن جاتا۔

''پہلے مسلح بلوائیوں کو نشانا بنانا ضروری ہے' اگر ہم نے انہیں ٹھکانے لگا دیا تو پھر بقیہ بلوائیوں کو بھاگنے پر مجبور کر دینا مشکل نہیں ہوگا۔'' میں نے صادق ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ان سے بندوق لے لی جسے وہ لوڈ کر چکے تھے۔ ''اب صرف دو مسلح بلوائی ایسے رہ گئے ہیں جن کے پاس بندوقیں ہیں' انشاء اللہ اس بار انہی کی باری ہے۔''

میں آہستہ آہستہ کھڑی ہوئی اور باہر جھانک کر دیکھا ہجوم اپنی جگہ کھڑا ہوا نعرے لگا رہا تھا۔

''آگے بڑھو... ! آگے بڑھو!'' مگر کسی میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ دونوں مسلح بلوائی اپنی اپنی بندوقیں لوڈ کر رہے تھے اور یہ موقع میرے لئے غنیمت تھا۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ میں نے تیزی کے ساتھ ان میں سے پہلے شخص کے سر کا نشانہ لیا۔ وہ اپنی بندوق لوڈ کر کے اس کی نال سیدھی کر رہا تھا مگر اسے گولی چلانے کی حسرت ہی رہ گئی۔ میری چلائی ہوئی گولی نے اس کے سر کو متعدد ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا۔ اسی عرصے میں دوسرا مسلح بلوائی کھڑکی کی طرف فائر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر میں فائر کرتے ہی جھک نہ گئی ہوتی تو میرا بھی وہی حشر ہوتا جو میرے ہاتھوں اس کے ساتھی کا ہو چکا تھا۔ کھڑکی سے گزر کر گولی سامنے والی دیوار میں چھت کے قریب لگی۔ پھر دوسرا فائر بھی ہوا۔ دوسری گولی کھڑکی کی چوکھٹ میں لگی۔

ابھی میں نے ایک فائر کیا تھا' دوسری گولی میری بندوق میں باقی تھی' میں پھر سیدھی ہوئی' اسی کے ساتھ ارشد علی نے بھی پوزیشن لے لی مگر اس سے پہلے میں نے باقی بچ جانے والے ایک بلوائی کا سینہ چھید دیا۔ ارشد علی کی چلائی ہوئی دونوں گولیاں دوسرے بلوائیوں کے لگیں۔

اپنے پانچ مسلح ساتھیوں اور تین دیگر افراد کو ہماری گولیوں کا نشانہ بنائے جانے کے بعد بلوائیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ ان کی بڑی تعداد پیچھے ہٹنے لگی۔

''اب صرف ہوائی فائرنگ کی ضرورت ہے۔'' میں آہستہ سے بولی۔

پھر مزید تین چار گولیوں نے بلوائیوں کے قدم بالکل اکھاڑ دیئے حالانکہ یہ محض ہوائی فائرنگ تھی۔ ذرا ہی دیر میں وہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

''یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ اپنے ساتھ مرنے والوں کی لاشیں بھی لے گئے ورنہ ہمارے لئے مسئلہ ہو جاتا۔'' صادق ماموں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''عذرا! آپ کا نشانہ بہت اچھا ہے۔'' ارشد علی مجھ سے مخاطب ہوا۔

''شکریہ!'' میں جواباً بولی۔

''ہاں بیٹی' واقعی! میں تو حیران رہ گیا یہ دیکھ کر! اور ماشاء اللہ تمہارے اعصاب بھی بے حد مضبوط ہیں۔'' صادق ماموں نے بھی میری تعریف کی۔

''بس آپ بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔'' میں نے انکساری کے ساتھ کہا۔ پھر آگے بڑھی اور جھک کر زمین پر پڑا ہوا اپنا ریوالور اٹھا لیا۔

''آؤ چلو اب نیچے چلتے ہیں'' صادق ماموں بولے۔ ''تمہاری ممانی گھبرا رہی ہوں گی۔''

''ہاں چلئے۔'' میں نے تائید کی۔

اس کمرے سے نکل کر میں سامنے والے کمرے میں گئی اور ریوالور اپنے تکئے کے نیچے رکھ کر الٹے پیروں لوٹ آئی۔ ارشد علی اور صادق ماموں کمرے کے باہر رک کر میرا انتظار کر رہے تھے۔ میرے قریب پہنچتے ہی صادق ماموں نے کہا۔ ''ارشد کا کہنا ہے کہ شاید اب وہ لوگ آدھی رات کے بعد یا پھر صبح کے قریب دوبارہ حملہ کریں گے۔''

''جی ہاں۔'' میں تائید میں بولی۔ ''اس امکان کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

"عذرا بیٹی! ایسی صورت میں ہمارا چوکنا رہنا بہت ضروری ہے۔ مجھے اور ارشد کو یہیں تیسری منزل پر سونا چاہئے۔" صادق ماموں نے تجویز پیش کی۔ "ہم دونوں باری باری جاگتے رہیں گے۔"

"اور ماموں آپ نے اپنی اس بھانجی کو قطعی نظر انداز کر دیا!" میں نے شکایتی لہجے میں ان سے کہا۔ "ابھی ذرا دیر پہلے آپ میری تعریف کر رہے تھے۔"

"تم سفر کی وجہ سے تھکی ہوئی تھیں اس لئے آرام کر لیتیں تو بہتر تھا۔" صادق ماموں بولے۔ "میں اور ارشد کافی ہیں۔"

"آپ اور ارشد نہیں بلکہ صرف میں اور ارشد!" میں روا روی میں کہہ گئی۔ اس وقت میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی کہ ارشد مجھ سے جذباتی وابستگی بھی رکھتا ہے۔

"اچھا تو پھر یوں کرتے ہیں کہ میں اور ارشد اس کمرے میں رہیں گے جہاں سے فائرنگ کر رہے تھے تم سامنے والے کمرے میں سو جانا۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہم جگا لیں گے تمہیں۔"

"آپ کی تجویز منظور ہے مجھے مگر اس میں صرف اتنی سی ترمیم کر لیجئے کہ میری جگہ سوئیں گے آپ! میں اور ارشد باری باری جاگ کر دوسرے کمرے میں......"

"بڑی ضدی ہو تم!" صادق ماموں میری بات کاٹ کر بولے۔ "چلو یہی سہی مگر! نیچے تو چلو پہلے۔" وہ زینے کی طرف بڑھے۔

میری اور صادق ماموں کی گفتگو کے درمیان ارشد بالکل خاموش رہا تھا مگر میں نے اس کے چہرے پر مسرت کے آثار محسوس کر لئے تھے۔ مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا مجھے اس بے باکی کے ساتھ اور بلند ہو کر یہ تجویز پیش نہیں کرنا چاہئے تھی کہ میں ہی ارشد کے ساتھ رہوں گی مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

ہم سب دوسری منزل پر پہنچے تو سب گھر والوں کے چہرے کھل اٹھے۔ صادق ماموں نے ممانی کو مخاطب کیا۔ "سنو بھی! بلوائی بھاگ گئے۔"

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" ممانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اور تمہیں یہ سن کر مزید خوشی اور حیرت ہوگی کہ اس کا سہرا تمہاری بھانجی کے سر ہے۔" صادق ماموں کے لہجے میں انتہائی محبت اور خوشی تھی۔

"چلیں کسی بہانے ان کے سر پر سہرا تو بندھا!" زاہد نے برجستہ کہا۔

سبھی کو علم تھا کہ میں نے شادی نہیں کی اس لئے زاہد کے فقرے کی معنویت مزید بڑھ گئی۔ ماجد، شاہد اور واحد تینوں ہی زور سے ہنس پڑے اور میں کچھ خجل سی ہو گئی۔

ارشد علی نے میرے متغیر چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائیوں کو ڈانٹ دیا۔ "خاموش ہو جاؤ! کیا کھی کھی کھی لگا رکھی ہے!"

تینوں کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ ممانی بولیں۔ "اے میری بیٹی کے سر پر سہرا باندھنا کون سا مشکل ہے! لاکھوں میں ایک ہے ماشاء اللہ! اگر ماں باپ زندہ ہوتے تو کب کی......"

"بھئی تم نے یہ کیا قصہ نکال لیا! رات کے نو بج رہے ہیں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو!" صادق ماموں نے بھی غالباً محسوس کر لیا کہ یہ ذکر مجھے گراں گزر رہا ہے۔

"کھانا تو پک گیا ہے آپ کہیں تو یہیں منگوا لو دلہنوں سے!" ممانی بولیں۔

"ہاں منگوا لو!" صادق ماموں نے اجازت دے دی۔ ابھی تک ان کے اور ارشد کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ انہوں نے اپنی بندوق کمرے کے کونے میں رکھ دی اور کارتوسوں کی پیٹی بھی! ارشد نے بھی ان کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔

ماجد اور شاہد کی دلہنیں نیچے کھانا لینے چلی گئیں۔ ممانی نے واحد کو بھی ان کے ساتھ نیچے بھیج دیا تاکہ سامان اوپر لانے میں ان دونوں کی مدد کرے۔ اس دوران میں صادق ماموں نے بتایا کہ میں، ارشد اور عذرا اوپر تیسری منزل پر سوئیں گے اس لئے بقیہ افراد کے سونے کا بندوبست دوسری اور نچلی منزل پر کرنا پڑے گا۔ صادق ماموں نے اس کی وجہ بھی بتا دی۔

"اللہ اپنا رحم ہی کرے اور وہ موئے رات کو پھر نہ آئیں۔" ممانی آہستہ سے بولیں۔

"آئیں یا نہ آئیں مگر ہمیں چوکنا تو رہنا ہی پڑے گا نا!" صادق ماموں نے کہا۔

"ماموں! میں بھی اوپر آپ ہی لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔" زاہد بول اٹھا۔

"نہیں!" صادق ماموں کے بولنے سے پہلے میں بول اٹھی۔ "اوپر بچوں کا کوئی کام نہیں۔ کیا خبر واقعی رات کو حملہ ہو جائے!" مجھے زاہد پر فقرے بازی کا موقع مل گیا۔ میں نے اس سہرے والے فقرے کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔

ماجد اور شاہد میری توقع کے مطابق ہنس پڑے۔

زاہد شرمندگی کی بجائے ڈھٹائی پر اتر آیا اور کہنے لگا۔ "میں کب کہتا ہوں کہ بچہ نہیں! اس لئے تو آپ کے ساتھ اوپر سونے کی ضد کر رہا ہوں کہ مجھے یہاں اکیلے ڈر نہ لگے۔" وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

"تم خاصے شریر لگتے ہو زاہد میاں!" صادق ماموں بھی ہنسنے لگے۔ "اگر واقعی ایسی بات ہے تو چلو تم بھی اوپر ہی سو جانا میرے پاس! اب خوش!"

"ماموں زندہ باد!" زاہد نے نعرہ لگایا اور سب ہنسنے لگے۔

جب ہم سب کھانا کھانے بیٹھے تو زاہد دانستہ میرے پاس بیٹھا۔ میری دوسری جانب ارشد بیٹھا تھا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ زاہد کے لئے ارشد کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کی جھلکیاں تھیں۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی اس کا اظہار ہوا۔ زاہد تو خیر شرارت کے موڈ میں تھا مگر ارشد سنجیدہ معلوم ہو رہا تھا۔

ہوا یہ کہ ارشد نے قیمے کی ڈش میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "عذرا! آپ قیمہ تو لیں نا!"

اسی وقت زاہد نے دوسری طرف سے چٹنی کی پلیٹ بڑھائی۔ "ارے یہ آپ چٹنی تو لیں نا! آپ خواہ مخواہ تکلف کر رہی ہیں اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔"

ماجد اور شاہد کے علاوہ ان دونوں کی دلہنیں بھی زاہد کی حرکت پر ہنس پڑیں۔ ان لوگوں کو کیوں کہ یہ علم بھی تھا ارشد میرا امیدوار رہ چکا ہے اس لئے "اپنا ہی گھر سمجھیں" کے الفاظ بڑے معنی خیز ثابت

ہوئے۔ ارشد نے اپنے ہاتھ سے ڈش رکھ دی اور پھر وہ کھانے کے دوران میں دوبارہ مجھ سے مخاطب نہیں ہوا۔ وہ بس زاہد کو گھور کر رہ گیا تھا۔ اگر زاہد مہمان نہ ہوتا تو شاید ارشد اس سے الجھ پڑتا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا' پھر ذکیہ اور سلمٰی کے لئے دوسری منزل پر سونے کا بندوبست کر دیا گیا۔ میرا بستر اور زاہد کا بستر اوپر ہی رہنے دیا گیا۔ صادق ماموں اور ارشد کے لئے تجویز کے مطابق تیسری منزل پر ہی بستر بچھائے گئے۔ زاہد اور صادق ماموں ایک کمرے میں اور میں ارشد کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گئی۔ ہم دونوں کے سرہانے دیوار سے لگی بھری ہوئی بندوقیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ خاصی تعداد میں کارتوس بھی ہمارے پاس تھے۔

''ارشد پہلے آپ سو جائیں میں آپ کو......'' یہ کہتے ہوئے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔

''اس وقت ساڑھے دس بجنے والے ہیں ڈھائی بجے میں جگا دوں گی آپ کو اور اگر اس دوران میں کوئی گڑ بڑ ہو گئی تو بھی جگا لوں گی آپ کو! ٹھیک ہے نا؟'' میں نے تصدیق طلب نظروں سے ارشد کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال تھا عذرا کہ آپ سو جاتیں۔'' ارشد بولا۔ ''آپ یوں بھی سفر کی وجہ سے تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔''

''تین چار گھنٹے تو سو لی ہوں میں وہ کافی ہے۔ یوں بھی مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی۔''

''نیند تو خیر مجھے بھی نہیں آ رہی۔'' ارشد نے کہا۔ ''چلیں کچھ دیر باتیں کرتے ہیں کیا خبر پھر ہمیں یہ موقع ملے نہ ملے۔'' ارشد کی آواز میں عجیب سی حسرت تھی۔

میں چونک اٹھی اور نہ جانے کیوں پہلی بار کسی مرد کے روبرو میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں آہستہ سے بولی۔ ''آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں مجھ سے؟''

''یہ تو خود...... خود مجھے بھی نہیں معلوم۔'' وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہنے لگا۔ ''اگر...... اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں آپ سے کہ ابھی تک...... ابھی تک آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''ہر چند کہ یہی سوال میں آپ سے بھی کر سکتی ہوں ارشد مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ پھر مزید بولی۔ ''ارشد! آپ جو کچھ سننا چاہتے ہیں شاید میں وہ...... وہ بات نہ کہہ سکوں اس لئے پہلے ہی معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میں ایک گھریلو عورت کی حیثیت سے اپنی زندگی نہیں گزار سکتی۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کیوں؟'' اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔

''میں گھریلو ذمے داریاں اٹھانے کی خود کو اہل نہیں پاتی۔'' میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

''میرا طرز فکر قطعی جداگانہ ہے۔ میں زندگی کو عام لوگوں کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ میرے نزدیک زندگی کا مقصد کچھ اور ہے۔ وہ مقصد کیا ہے؟ میں اس کی وضاحت نہیں کر سکوں گی۔ اسے میں صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتی ہوں۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر میں نے اپنی سگی بہن ذکیہ کو بھی اپنے پاس نہیں رکھا۔ میں آپ کو واضح طور پر یہ بھی بتا دوں کہ آج تک نہ کوئی مرد میرے قریب آیا نہ میں نے کسی کو اپ

قریب آنے کی اجازت دی۔''

''کہیں تو ایسا تو نہیں کہ کسی وجہ سے آپ...... آپ مردوں سے نفرت کرتی......''

''ہر گز نہیں!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے مردوں سے ہر گز نفرت نہیں ہے۔ مردوں سے دور رہنے کا سبب وہی ہے جو میں بیان کر چکی ہوں۔''

''کیا کبھی کبھی آپ کو اس طرح ادھورے پن کا احساس نہیں ہوتا؟'' ارشد نے سوال کیا۔

''اب تک ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے شاید کہ مجھے اس کی فرصت ہی نہیں ہوئی کبھی! میں بے حد مصروف رہتی ہوں۔''

''یہ صاحب زادے زاہد آپ سے خاصے بے تکلف لگتے ہیں۔'' ارشد کے دل کا چور بولا۔

''ہاں۔'' میں نے اقرار کیا۔ ''مگر میں واضح طور پر آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اس بے تکلفی کا مطلب کچھ اور نہیں۔ زاہد سے تو خیر عزیز داری ہے اگر آپ میرے ایک اور بے تکلف دوست ملک دلاور کی باتیں سن لیں تو یقیناً کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ہر چند کہ ہمارے مشرقی معاشرے میں کسی لڑکی کے لئے یہ بات معیوب تصور کی جاتی ہے کہ اس کے مرد دوست ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ذاتی طور پر میں اسے برا نہیں سمجھتی۔ بات دراصل حدود کی ہے اور دوستی کی بھی حدود ہوتی ہیں۔ اگر کوئی لڑکی ان حدود کو برقرار رکھتی ہے تو کسی لڑکے سے اس کی دوستی میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میرے ان خیالات کو آپ میری وسیع النظری یا آزاد خیالی پر بھی محمول کر سکتے ہیں۔''

''سنا ہے کہ پاکستان میں آپ کا خاصا بڑا کاروبار ہے۔ کیا آپ خود اس کی نگرانی کرتی ہیں؟'' ارشد نے پوچھا۔

''ٹھیک سنا ہے آپ نے! مگر میرے ادارے میں اکثریت پڑھی لکھی خواتین کی ہے۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میری منیجر بھی ایک خاتون ہیں۔'' میں نے ارشد کی بات کا اصل مقصد سمجھتے ہوئے حقیقت کا اظہار کیا۔ پھر مزید بولی۔ ''میرے خیال میں اگر پڑھی لکھی ذہین خواتین کو موقع دیا جائے تو وہ مردوں سے زیادہ سود مند ثابت ہوتی ہیں اور ذاتی طور پر مجھے اس کا تجربہ ہے۔''

''جہاں تک میرے علم میں ہے آپ تنہا رہتی ہیں کیا کبھی کسی مرد کے بغیر آپ نے خود کو غیر محفوظ تصور نہیں کیا؟'' ارشد نے سوال کیا۔

''بالکل نہیں' کبھی نہیں!'' میرے لہجے میں پختگی تھی۔ ''میں اپنی کوٹھی میں بالکل تنہا نہیں رہتی بلکہ میری ملازمائیں بھی ساتھ رہتی ہیں۔ جہاں تک غیر محفوظ ہونے کا تعلق ہے تو آج تک اس باب میں خود کو میں نے کسی مرد کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ میرے متعلق کچھ اندازہ تو آپ کو ہو ہی گیا ہو گا اب تک! میں اپنا تحفظ کرنا اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ اگر اسے میری خود ستائی نہ سمجھیں تو میں ہر وہ کام کسی مرد سے بہتر طور پر انجام دے سکتی ہوں جس پر کوئی جری اور ذہین مرد فخر کر سکتا ہے۔''

''خوشی ہوئی آپ سے یہ سن کر!'' ارشد مرعوب سے لہجے میں بولا۔ ''اگر تمام لڑکیاں آپ کی طرح ہو جائیں تو اس معاشرے سے مرد کی برتری ختم ہو سکتی ہے۔''

''مجھے مرد کی برتری پر کوئی اعتراض نہیں لیکن عورتوں کی حق تلفی کو ضرور غلط سمجھتی ہوں۔'' میں

نے اپنی رائے کا اظہار ضروری سمجھا تا کہ ارشد میری طرف سے غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ ''عورت اور مرد کو لازم وملزوم سمجھتی ہوں مگر ان فیشن ایبل عورتوں کے حق میں نہیں جو خواہ مخواہ برابری کے حقوق کی آڑ میں مردوں پر اپنا حکم چلانا چاہتی ہیں۔ میرے نزدیک وہ ایک طرح کے احساس کمتری کا شکار ہیں۔''

ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ باہر سے ہلکا سا شور سنائی دیا۔ میں لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ ارشد بھی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ پولیس کا ٹرک مجھے گلی کے نکڑ پر کھڑا دکھائی دیا۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ٹرک سے غیر معینہ مدت کے لئے کرفیو لگائے جانے کا اعلان کیا جا رہا تھا۔

''اب آ گئی مصیبت!'' ارشد خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کرفیو لگنا تو اچھا ہے اس سے ہنگامہ آرائی ختم ہو جائے گی کیا ہندو کیا مسلمان کوئی گھر ہی سے نہیں نکل سکے گا کرفیو میں!''

''عذرا! آپ نہیں جانتیں یہ پاکستان نہیں ہندوستان ہے۔ یہاں کرفیو لگا کر بلوائیوں کو تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔'' ارشد کے لہجے میں دکھ تھا۔

''میں آپ کی بات کا مطلب سمجھی نہیں۔''

''اب وہی ہوگا جو اس سے پہلے ہوتا آیا ہے۔ کرفیو لگا کر یک طرفہ کارروائی کی جائے گی۔ پولیس مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لے گی' گرفتار کرے گی انہیں اور ...... اور پھر پولیس کے تحفظ میں ہندو بلوائی مسلمانوں پر حملہ کریں گے۔'' ارشد یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔

اسی وقت میں نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی اور مڑ کر دیکھا۔ وہ صادق ماموں تھے۔ ''کیا ہوا ارشد یہ شور کیسا تھا ابھی؟''

ارشد نے انہیں کرفیو لگائے جانے کے متعلق بتایا۔ میں نے ان کے چہرے پر بھی فکر وتشویش کے آثار دیکھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ارشد کی بات درست تھی۔

''ان بندوقوں کا کیا کیا جائے ارشد بیٹے؟'' صادق ماموں آگے بڑھتے ہوئے بولے۔

''کیوں ماموں کیا لائسنس نہیں ہیں ان کے آپ کے پاس؟'' ارشد کے کچھ کہنے سے پہلے میں بول اٹھی۔

''لائسنس تو ہیں عذرا بیٹی مگر ان ... ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں۔ اگر تلاشی لی گئی جو متوقع ہے تو ... تو اس کے باوجود کہ ہمارے پاس ان کے لائسنس ہیں یہ دونوں بندوقیں وقتی طور پر ضبط کر لی جا سکتی ہیں۔ جھگڑوں کے دوران میں عموماً وہ ہتھیار بھی قریبی تھانوں میں جمع کرا لئے جاتے ہیں جن کے لائسنس ہوتے ہیں۔'' صادق ماموں نے مجھے سمجھایا۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ماموں! ہتھیار ایسے ہی کسی وقت کے لئے ہوتے ہیں کہ آدمی اپنا تحفظ کر سکے۔ یہ تو ظلم ہے۔'' میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔

وہ اس ظلم کی یہ تاویل دیتے ہیں کہ اس طرح خون خرابہ روکنے میں مدد ملتی ہے۔ بظاہر ہندوؤں کا ایسا اسلحہ بھی ضبط کر لیا جاتا ہے ایسے موقعوں پر مگر صرف کاغذ پر حقیقتاً نہیں۔''

''پھر تو ابو وہی ترکیب آزمانا پڑے گی جو پہلے آزمائی تھی۔'' ارشد نے کہا۔ پھر وہ میری طرف مڑ کر بولا۔ ''گزشتہ سال جھگڑے میں ابو نے دونوں بندوقیں اور سارے کارتوس پلاسٹک کے ایک مضبوط اور بڑے تھیلے میں بند کر پانی کی ٹنکی میں وہ تھیلا ڈال دیا تھا۔ تلاشی میں اسی لئے بندوقیں برآمد نہیں ہو سکی تھیں۔''

''مگر کیا پولیس کے علم میں یا اس کے ریکارڈ میں یہ نہیں تھا کہ آپ کے پاس بندوقیں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں!'' صادق ماموں نے جواب دیا۔ ''مگر وہ اس علاقے کی پولیس نہیں تھی۔ عموماً گھروں کی تلاشی اور اسلحے کی برآمدگی کا کام رینجرز سے لیا جاتا ہے جن کے علم میں یہ نہیں ہوتا کہ کس کے پاس ہتھیار ہیں کس کے پاس نہیں! اس سلسلے میں وہ تلاشی کو کافی سمجھتے ہیں۔'' پھر اچانک صادق ماموں کو کچھ یاد آ گیا۔ ''ارشد! جن لوگوں نے حملہ کیا تھا ان کے ذریعے پولیس کے علم میں یہ بات آ گئی ہو گی کہ بلوائیوں پر کس گھر سے گولی چلائی گئی تھی...... ! یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ایسی صورت میں ہماری گرفتاریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ یاد ہے تمہیں کہ گزشتہ سال صرف ہوائی فائرنگ کرنے پر مجھے اور تمہارے تینوں چھوٹے بھائیوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی تھی کہ تم گھر پر نہیں تھے ورنہ تمہیں بھی گرفتار کر لیا جاتا۔ پھر عورتیں گھر میں اکیلی رہ جاتیں اور رات کو کرفیو لگنے کے بعد جو حملہ کیا گیا وہ کامیاب رہتا' اگر تم بھی گھر نہ پہنچ گئے ہوتے!'' صادق ماموں گزشتہ سال ہونے والے جھگڑے کی تفصیلات بتاتے رہے۔

میں ان تفصیلات سے جو باتیں سمجھ سکی وہ یہ تھیں کہ پہلے کرفیو لگا کر تلاشی لی گئی' اسلحہ ضبط کر لیا گیا اور گھر کے مردوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا پھر نہتی عورتوں' بچوں اور بوڑھوں پر بلوائیوں کو حملہ کرنے کی چھوٹ دے دی گئی۔ اس گھر کی خوش قسمتی یہ تھی کہ صادق ماموں کی ذہانت کے سبب اسلحہ برآمد نہ ہو سکا اور جب گھر کے مردوں کو گرفتار کر لیا گیا تو ارشد موجود نہ تھا۔ وہ اس واقعے کے بعد گھر پہنچا۔ پھر بلوائیوں نے یہ سمجھ کر جب رات کو حملہ کیا گھر میں کوئی مرد نہیں تو وہ اچانک ہونے والی ہوائی فائرنگ سے ڈر کر بھاگ گئے ورنہ جانے کیا ہوتا!

باڑے ہی میں دو ایک عزیزوں کے اور بھی گھر تھے۔ صادق ماموں کا مشورہ یہ تھا کہ ارشد اور اس کے تینوں چھوٹے بھائی وہاں چلے جائیں تا کہ گرفتاری سے بچ سکیں اور بعد میں گھر آ جائیں۔ صادق ماموں خود گھر پر رہنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر پولیس انہیں گرفتار کر کے بھی لے گئی تو بعد میں گھر کی حفاظت کے لئے چاروں بھائی موجود رہیں گے۔

صادق ماموں کی تجویز غلط نہیں تھی مگر ارشد انہیں اور بقیہ بھائیوں کو کسی عزیز کے گھر چلے جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ میرے لئے قابل شرم بات ہے کہ میں تو کہیں جا کر چھپ جاؤں اور پولیس آپ کو پکڑ کر لے جائے! پچھلے سال کی بات اور تھی' میں گھر پر تھا ہی نہیں لیکن اس بار اگر گرفتاری کا موقع آیا تو میں گرفتاری پیش کروں گا!'' اس کا لہجہ پر جوش تھا۔

''احمقانہ بات نہ کرو! میری بات سمجھو! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسی میں ہماری بھلائی ہے۔'' صادق ماموں نے ارشد سے کہا مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔

"ماموں! اگر آپ میرے مشورے کو اہمیت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔" میں نے مداخلت کی۔

"ہاں بولو بیٹی!" ان کی آواز میں نرمی آ گئی۔

"میرا مشورہ یہ ہے کہ گھر میں موجود زاہد سمیت تمام مردوں اور نوجوانوں کو پولیس یا رینجرز کی آمد کے وقت یہاں نہیں ہونا چاہئے۔ جب وہ تلاشی لے کر یہاں سے چلے جائیں گے تو یکے بعد دیگرے گھر واپس آنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے عذرا بیٹی!" صادق ماموں میرے چپ ہوتے ہی بولے۔ "تلاشی کے وقت گھر میں صرف عورتیں ہوں کوئی مرد موجود نہ ہو یہ قطعی مناسب نہیں۔"

"میں جو یہاں موجود ہوں گی۔" میں بولی۔

"تو کیا آپ خود کو مرد سمجھتی ہیں خاتون محترم؟" اچانک مجھے زاہد کی آواز سنائی دی اور میں چونک اٹھی۔ وہ نہ جانے کب سے دروازے کے قریب کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا اور ایک دم کمرے میں آ کر اس نے مجھے چونکا دیا تھا۔

زاہد کی آمد مجھے گراں نہیں گزری مگر میں نے ارشد کے چہرے پر ضرور ناگواری کے آثار دیکھے۔ اسی سبب میں نے زاہد کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اس سے نرمی کے ساتھ کہا۔ "زاہد! تم اپنے کمرے میں جاؤ، ہم لوگ کچھ سنجیدہ باتیں کر رہے ہیں۔"

"تو میں بھی سنجیدہ ہو جاؤں گا، آپ لوگ اپنی گفتگو جاری رکھیں۔" وہ بظاہر سنجیدگی سے بولا مگر اس کے لہجے سے شرارت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے تم ہماری سنو ضرور مگر درمیان میں بولنا مت!" ارشد نے سپاٹ لہجے میں زاہد سے کہا۔

معلوم نہیں زاہد اس موقع پر کیوں کچھ نہیں بولا! وہ شاید ارشد کے تیور بھانپ گیا تھا۔ پھر یہ کہ خود میں نے بھی آنکھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا تھا۔

پھر صادق ماموں کو میں نے ضد کر کے اپنی بات ماننے پر مجبور کر ہی دیا۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق دونوں بندوقیں اور کارتوس بڑے سے پلاسٹک کے تھیلے میں بہت اچھی طرح پیک کر کے پانی کی بڑی ٹنکی میں ڈال دیئے گئے جو تیسری منزل کی چھت پر تھی۔ میں نے اپنا ریوالور بھی اسی تھیلے میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد دو دو کر کے گھر میں موجود تمام مرد خاموشی کے ساتھ قریبی عزیزوں کے گھر پناہ لینے چلے گئے۔ ممانی یہ دیکھ کر گھبرانے لگیں تو میں نے انہیں تسلی دی۔ میرے سمجھانے بجھانے سے وہ چپ تو ہو گئیں مگر ان کے چہرے پر فکر مندی کے آثار بدستور موجود رہے۔

ذکیہ، سلمیٰ، میں، ممانی اور دونوں بہنیں مردوں کے جاتے ہی نچلی منزل پر آ گئے تھے۔ اس واقعے کو مشکل سے پون گھنٹا ہوا تھا کہ کال بیل تیزی سے بجنے لگی۔ کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھنے والا شاید انگلی ہٹانا بھول گیا تھا۔ گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔

"یا الٰہی خیر!" ممانی گھبرا گئیں اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"آپ فکر نہ کریں ممانی، بیٹھی رہیں! میں جا کر دیکھتی ہوں کون ہے!" میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خدا کرے پولیس والے یا فوجی نہ ہوں۔" ممانی منہ ہی منہ میں بولیں۔

"اگر وہ بھی ہوئے تو کیا ہے! آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ان سے میں نمٹ لوں گی۔" کہتی ہوئی میں تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

پھر میں نے صدر دروازے تک پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ گھنٹی اب تک بج رہی تھی

"کون ہے؟" میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

"پولیس۔" جواباً کہا گیا۔ "دروازہ کھول دو!"

دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے اس کی ایک جھری سے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر مجھے باوردی پولیس والے اور فوجی نظر آ رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھول دیا پھر بولی۔ "جی فرمائیے؟"

"کیا گھر میں کوئی مرد نہیں ہے؟" آگے جو پولیس والا کھڑا تھا اس نے سوال کیا۔ اپنی وردی سے وہ انسپکٹر معلوم ہو رہا تھا۔

"جی نہیں، اس وقت گھر میں کوئی مرد موجود نہیں۔" میں نے جواب دیا اور سامنے دیکھا۔ سامنے ہی فوج کا ایک ٹرک کھڑا تھا جس میں کچھ پولیس والے بھی نظر آ رہے تھے۔ ٹرک سے صرف دو پولیس والے اور دو مسلح فوجی اتر کر گھر کے دروازے تک آئے تھے۔

"یہ صادق علی کا گھر ہے نا؟" پولیس انسپکٹر بولا۔

"جی ہاں انہی کا گھر ہے۔" میں نے تصدیق کی، پھر دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔ "اگر آپ انہیں جانتے ہیں تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ ایک اخبار میں ملازم ہیں ان کی ڈیوٹی رات کی ہے۔"

"ان کے جوان لڑکے بھی تو ہیں کئی وہ کہاں ہیں؟" پولیس افسر نے سوال کیا۔ وہ غالباً اسی علاقے کا تھا اور غالباً صادق ماموں کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ میرے نزدیک یہ بات خطرناک تھی۔

"ان کا کوئی لڑکا بھی اس وقت گھر پر نہیں ہے۔" میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

"ہوں!" پولیس انسپکٹر نے ہنکارا بھرا پھر بولا۔ "سمجھا! وہ لوگ یقیناً گرفتاری کے خوف سے فرار ہو گئے ہیں۔" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ "خیر کوئی بات نہیں وہ ہوں نہ ہوں ہم گھر سے اسلحہ تو برآمد کر ہی لیں گے۔ لڑکی ہمیں گھر میں آنے کا راستہ دو!"

"کیا مطلب؟" میں سب کچھ جان کر انجان بن گئی۔

"ہم تلاشی لیں گے گھر کی۔" اس نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ اس کی دائیں جانب ایک ایس آئی کھڑا تھا جو مجھے بڑی ندیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب سے میں نے دروازہ کھولا تھا یہ بات محسوس کر رہی تھی مگر دانستہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔

"اب ہٹ بھی جاؤ نا راستے سے ورنہ......" ایس آئی بول اٹھا۔ اس نے دھمکی کے انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''آپ لوگوں کے پاس اس گھر کی تلاشی کا وارنٹ ہے؟'' میں نے کہا۔

''وارنٹ تو ہم خود ہیں!'' یہ کہہ کر ایس آئی آگے بڑھا اور مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کرنے لگا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جان کر دانستہ ایک گھٹیا حرکت بھی کی تھی۔

اپنے غصے پر قابو پانے کے باوجود جواباً ہٹتے ہٹتے میں نے اس کی گردن پر نپا تلا ہاتھ مارا۔ میری کھڑی ہتھیلی اس کے نرخرے پر پڑی اور وہ منہ سے ہلکی سی آواز نکالتے ہوئے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اس پر کاری وار کرتے ہوئے کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔

''ارے! اسے کیا ہوا؟'' پولیس انسپکٹر گیٹ کے اندر قدم رکھتا ہوا بولا۔ اسی دوران میں ایس آئی لمبا لمبا لیٹ گیا۔

''معلوم نہیں اسے کیا ہوا! یہ مجھے زبردستی پکڑ کر الگ ہٹا رہا تھا کہ میرا ہاتھ اس کی گردن پر لگ گیا۔ اسی کے بعد یہ بیٹھتا چلا گیا۔'' میں نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

انسپکٹر نے مجھے گھور کر دیکھا پھر بے ہوش ایس آئی کو وہاں سے اٹھوا کر ٹرک میں ڈلوا دیا۔

''چلو گھر کی تلاشی دو!'' انسپکٹر کے لہجے میں سختی آ گئی۔ ٹرک سے اتر کر دو سپاہی اس کے ساتھ گھر میں داخل ہو گئے تھے۔ فوجی باہر ہی کھڑے رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ فوجیوں کے تحفظ میں پولیس اپنی من مانی کر رہی تھی۔

مجبوراً میں اس پولیس انسپکٹر کی رہنمائی کرنے لگی۔

''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس گھر سے فائرنگ کی گئی ہے اس لئے بہتر ہے کہ تم لوگ اسلحہ ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم سختی بھی کر سکتے ہیں۔ بتاؤ اسلحہ کہاں چھپایا گیا ہے؟'' اندر گھر کے صحن میں پہنچ کر پولیس انسپکٹر نے مجھ سے کہا۔

''یقیناً کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے۔ یہاں سے فائرنگ نہیں کی گئی۔ جب گھر میں کوئی مرد ہی موجود نہیں تو فائرنگ کون کرتا! اور یہاں اسلحہ بھی نہیں ہے آپ تلاشی لے سکتے ہیں۔ گھر کی تمام خواتین اس سامنے والے کمرے میں جمع ہیں۔ آپ سارے گھر کی تلاشی لے لیں۔ اس کمرے کو چھوڑ کر! بعد میں اگر کہیں گے تو خواتین کسی اور کمرے میں چلی جائیں گی پھر آپ اس کمرے کی بھی تلاشی لے سکتے ہیں۔'' میں نے انسپکٹر کی بات کا نرمی سے جواب دیا۔

''لڑکی! مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو!'' اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ''ہماری اطلاعات کے مطابق اس گھر میں دو بندوقیں اور کافی کارتوس موجود ہیں۔ ایک بندوق کا لائسنس صادق علی کے نام ہے اور دوسری بندوق کا لائسنس ارشد علی کے نام!''

''مجھے اس کا علم نہیں کیوں کہ میں یہاں مہمان ہوں۔'' میں نے اپنی لاعلمی کا جواز پیش کیا۔

''مہمان سے کیا مطلب ہے تمہارا؟'' پولیس انسپکٹر بے یقینی سے بولا۔

''میں اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ آج ہی کلکتے سے یہاں آئی ہوں۔ ہم لوگ وہیں کلکتے میں رہتے ہیں۔'' میں نے وضاحت کی۔

''صادق علی سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔

''بھانجی ہوں میں ان کی۔'' میں نے بلا جھجک جواب دیا۔

پولیس انسپکٹر نے چند لمحے کچھ سوچا پھر مجھ سے کہا کہ گھر کی چابیاں چاہئیں صادق علی کی بیوی سے لے آؤ۔

مجھے مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی۔ پھر پولیس والوں نے گھر کا ایک ایک کمرا اچھی طرح دیکھا' بند الماریاں بھی کھول کر دیکھیں۔ بڑے بڑے صندوق کھولے' غرض یہ کہ اپنی دانست میں انہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی مگر نہ بندوقیں ملیں نہ کارتوس! میں ان کے ساتھ ساتھ رہی کہ کہیں موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ کوئی قیمتی چیز غائب نہ کر دیں۔ پولیس انسپکٹر تیسری منزل پر بھی گیا اور اس کی چھت پر بھی چڑھا لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ پھر وہ سپاہیوں سمیت نیچے صحن میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر شدید جھنجلاہٹ کے آثار تھے۔

''عورتوں سے کہو کہ وہ کسی اور کمرے میں چلی جائیں میں اس کمرے کی بھی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔'' اس نے سخت لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

میں نے انسپکٹر کے اس حکم کی تعمیل بھی کرا دی۔ جب عورتیں اس کمرے سے نکل کر دوسرے قریبی کمرے میں جا رہی تھیں تو انسپکٹر اس طرح انہیں گھور رہا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ اسلحہ چھپا کر لے جا رہی ہوں۔ پھر اس آخری کمرے کی بھی تلاشی لی گئی اور نتیجہ صفر ہی نکلا۔ اس تمام کارروائی میں دو گھنٹے سے زیادہ صرف ہوئے کیونکہ پولیس والوں نے گھر کے ایک ایک کونے کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے جب پولیس والوں کو ناکام و نامراد صادق ماموں کے گھر سے لوٹنا پڑا۔

پولیس کو تلاشی لے کر گئے ہوئے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے شدید بے چینی محسوس ہونے لگی۔ یہ ایسی بے چینی تھی جو مجھے فطری طور پر کسی خطرے کے وقت محسوس ہوتی تھی۔ میں اس وقت نچلی منزل پر تھی۔ تلاشی کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ممانی بڑی حد تک مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ وہاں مجھے ارشد کے وہ الفاظ یاد آئے کہ گزشتہ سال تلاشی کے بعد صبح ہونے سے پہلے بلوائیوں نے دوبارہ حملہ کیا تھا۔ کہیں اس بار بھی ایسا نہ ہو! میں نے سوچا اور اپنی بے چینی کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ میں تیزی سے اٹھی اور پھر ممانی کے استفسار سے پہلے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں اب چھت پر موجود پانی کی ٹنکی سے بندوقیں اور کارتوس نکال لینا چاہتی تھی۔

میں تقریباً دوڑتی ہوئی گھر کی چھت پر پہنچ گئی۔ اس وقت میں نے اطراف میں نگاہ دوڑائی اور میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ کافی فاصلے پر مجھے کچھ مشعل بردار افراد اسی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ لوگ باڑے کے چوارہے سے زیادہ دور نہیں تھے۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ بلوائی دوبارہ حملہ کرنے آ رہے تھے۔ اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ انتظامیہ ہندو بلوائیوں سے ملی ہوئی تھی۔ میں لپک کر ٹنکی کے قریب پہنچ گئی پھر اس پر رکھا ہوا بھاری پتھر زور لگا کر ہٹانے لگی۔ پتھر اتنا بھاری تھا کہ ایک فرد کے لئے اسے کھسکانا مشکل تھا مگر میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے جسم کی تمام طاقت صرف کر کے اسے اپنی جگہ سے تھوڑا سا کھسکا دیا پھر میں ٹنکی پر چڑھ گئی اور پتھر کھسکانے سے جو خلا پیدا ہوا تھا اس میں ہاتھ ڈال دیا۔ بندوقیں میرے سامنے ہی وہاں چھپائی گئی تھیں۔ پہلی بار مجھے ناکامی

ہوئی۔ میرا ہاتھ ٹنکی کی دیوار کے سہارے کھڑی ہوئی بندوق تک نہ پہنچ سکا۔ مجبوراً میں پتھر پر سینے کے بل لیٹ گئی تاکہ مزید گہرائی تک اپنا ہاتھ لے جاسکوں۔ میرا ہاتھ بازو تک پانی میں ڈوب گیا اور پھر مجھے کامیابی ہوگئی۔ میں نے پلاسٹک کی تھیلی کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ خاصی وزنی تھی مگر پانی میں اس کا وزن ختم ہوگیا تھا۔ اس لئے میں باآسانی اسے اوپر کھینچنے میں کامیاب ہوگئی۔ ٹینکی سے اتر کر میں نے اس تھیلی کو نیچے اتارا اور پھر تیسری منزل کے اسی کمرے میں آگئی جہاں سے آج بلوائیوں پر فائرنگ کی تھی۔

خاصی احتیاط کے ساتھ کہ کارتوس گیلے نہ ہوں میں نے بندوقوں اور کارتوسوں کی بیلٹوں کو پلاسٹک کی تھیلی سے نکال لیا۔ پھر دونوں بندوقوں کو لوڈ کر دیا۔ دونوں لوڈ بندوقوں کو کھڑکی کے قریب دیوار کے سہارے کھڑا کر کے میں کمرے سے نکل کر تیزی کے ساتھ زینے کی طرف بڑھ گئی۔ اب میں ممانی کو صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہتی تھی۔

نچلی منزل پر پہنچ کر جب میں نے ممانی کو متوقع حملے کے بارے میں بتایا تو وہ گھبرا گئیں۔

''اب...... اب کیا ہوگا عذرا بیٹی؟ تمہارے ماموں بھی گھر پر نہیں ہیں!''

''میں جو ہوں ممانی!'' میں نے انہیں تسلی دی پھر بتایا کہ پانی کی ٹینکی سے بندوقیں اور کارتوس نکال لئے ہیں اور یہ کہ میں بندوق چلانا جانتی ہوں۔

''تم...... تم بیٹی...... ہم سب کو بھی وہیں لے چلو۔'' ممانی خوف زدہ آواز میں کہنے لگیں۔

''آپ کیا کریں گی ممانی وہاں رہ کر! یہاں رہیں اطمینان سے۔'' میں نے انہیں سمجھایا مگر وہ نہ مانیں۔

مجبوراً مجھے ان سب کو اپنے ساتھ تیسری منزل پر لے جانا پڑا۔ ان سب کو میں نے سامنے والے کمرے میں بستروں پر بٹھا دیا۔ ذکیہ میرے کہنے پر لیٹ گئی تھی۔ ممانی کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور ان کے ہونٹ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ ممانی کی نسبت دونوں دلہنیں خوف زدہ ہونے کے باوجود قدرے ہمت کا ثبوت دے رہی تھیں اور سلمیٰ بھی بظاہر پرسکون معلوم ہو رہی تھی۔

ان سب کی طرف سے مطمئن ہو کر میں سامنے والے کمرے میں آگئی اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ مشعلیں اب خاصی قریب آگئی تھیں مگر اب وہ لوگ اس گلی میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ وہ لوگ نعرے لگانے کی بجائے بڑی خاموشی کے ساتھ آگے بڑھتے آرہے تھے۔

میری نگاہیں گلی اور اطراف میں حرکت کر رہی تھیں۔ گلی میں روشنی تھی۔ اچانک اس گلی کی ذیلی گلی سے میں نے دو افراد کو نکل کر گلی میں آتے دیکھا اور میں نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ ان میں سے ایک یقیناً زاہد تھا اور دوسرا واحد۔ وہ تیزی کے ساتھ گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں جلدی سے سامنے والے کمرے میں پہنچی اور ماجد کی دلہن سے کہا کہ وہ جا کر دروازہ کھول دو' زاہد اور واحد آرہے ہیں۔ واپسی میں دروازہ بند کرنا نہ بھولنا!

وہ میرے کہنے پر اپنی جگہ سے اٹھی تو میں نے دروازے تک آتے ہوئے اس کی ٹانگیں کانپتی ہوئی دیکھیں۔

''تم رہنے دو بیٹھ جاؤ جا کر! میں خود نیچے چلی جاتی ہوں۔'' میں نے اس سے کہا۔

''میں دروازہ کھولے دیتی ہوں۔'' سلمیٰ اٹھ کھڑی ہوئی۔

سلمیٰ کی حالت مجھے بہتر معلوم ہوئی اور میں نے اسے دروازہ کھولنے بھیج دیا۔

پھر کچھ ہی دیر بعد زاہد اور واحد تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ واحد تو دوسرے کمرے ہی میں رہا مگر زاہد میرے پاس آگیا۔

''تم بھی وہیں جاؤ!'' میں نے کھڑکی سے باہر کا جائزہ لیتے ہوتے کہا۔

''بڑی مشکل سے تو یہ چانس ملا ہے خاتون! ہمیں بھی تو تنہائی میں اپنے ساتھ رہنے کا موقع عنایت فرما دیں یا سارے موقع رقیب روسیاہ کے لئے ہیں۔'' اس کا اشارہ ارشد کی طرف تھا۔

''بکومت! اس وقت صورت حال سنگین ہے؟'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''سنگین صورت حال ہی کو تو اہل دل رنگین بنا دیتے ہیں۔'' وہ میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا اور پھر باہر کا جائزہ لیتے ہوئے چونک کر بولا۔ ''ارے وہ...... وہ دیکھیں مشعلیں لئے......''

''معلوم ہے مجھے! تم سے پہلے دیکھ چکی ہوں میں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''اگر مجھے بھی بندوق چلانا آتی تو آپ کے شانہ بہ شانہ دشمنوں کا نشانہ لیتا۔'' زاہد بولا۔ ''ہاں وہ تلاشی ہوگئی نا! ہم نے چھت پر چڑھ کر فوجی ٹرک کو یہاں سے جاتے دیکھا تھا۔

''ہاں ہوگئی اور ظاہر ہے وہ یہاں سے اسلحہ برآمد نہیں کر سکے۔'' میں نے جواب دیا اور کھڑکی سے گلی کی نکڑ کی طرف دیکھا۔ ابھی تک بلوائی وہاں نہیں پہنچے تھے۔

چند منٹ اور تذبذب میں گزرے۔ پھر میں نے ایک گھر سے شعلے اٹھتے دیکھے۔ وہ گھر وہاں سے تیسری گلی میں تھا۔ بلوائیوں ہی نے یقیناً اس گھر میں آگ لگائی تھی۔

''وہ گھروں میں آگ لگا رہے ہیں۔'' زاہد بول اٹھا۔ وہ بھی کھڑکی سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔

''بہتر یہ ہے کہ تم رننگ کمنٹری نشر کرنا بند کر دو! میرے پاس بھی آنکھیں ہیں' مجھے بھی سب کچھ نظر آرہا ہے۔'' مجھے زاہد کا بولنا گراں گزر رہا تھا۔

''آپ تو ناحق کاٹنے کو دوڑ رہی ہیں مجھے! حالانکہ میں نے خود اپنی ان گنہگار آنکھوں سے آپ کو اپنے رقیب کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرتے دیکھا ہے۔ میں خاموش نہیں رہ سکتا!''

''اگر خاموش نہیں رہ سکتے تو دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔'' میں بولی۔

''آپ اس طرح مجھے ناراض کر کے اپنا مستقبل تاریک کر رہی ہیں۔ یہ نہ بھولیں کہ میں آپ کو اپنی زوجہ بنانے کا فیصلہ کر چکا......''

''زاہد!'' میں نے تیز آواز میں اسی کی بات کاٹ دی۔ ''وقت اور موقع بھی دیکھ لیا کرو کبھی! لوگوں کی جان پر بنی ہوئی ہے اور تم بے تکی باتیں کئے جا رہے ہو!''

پھر زاہد کے دل میں جانے کیسے نیکی آگئی کہ خاموش ہوگیا مگر وہاں سے ٹلا نہیں۔ ذرا ہی دیر کے بعد بلوائیوں کا مشعل بردار ہجوم اس گلی میں داخل ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ اس بار ان کے ساتھ بندوق بردار لوگوں کا ٹولہ نہیں تھا۔ ان کے نزدیک غالباً اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ان سبھی کے ہاتھوں

مین تلواریں، چاقو، بھالے اور لاٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ ٹین کے کنستر اٹھائے ان کے ساتھ آگے آگے چل رہے تھے۔ ان کنستروں میں یقیناً مٹی کا تیل تھا۔ وہ مسلمانوں کے گھروں میں مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا رہے تھے۔ گلی میں گھستے ہی انہوں نے ایک مکان کے دروازے اور اس کی اطراف مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی۔ پھر وہ خاموشی سے دبے قدموں آگے بڑھے۔ جس مکان میں انہوں نے آگ لگائی تھی اس میں موجود افراد مدد کے لئے چیخنے چلانے لگے۔ اب وہ ہمارے گھر کی طرف آ رہے تھے۔

میں نے پوزیشن لے کر اس گلی کے ایک مکان میں آگ لگانے والے شخص کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ میری چلائی ہوئی گولی اس بلوائی کے پہلو میں گھس گئی اور وہ پچھاڑ کھا کر گرا۔ دوسرا فائر میں نے ہوا میں کیا۔

''بھاگو......! بھاگو!'' کا شور مچ گیا۔ جس بلوائی کو گولی لگی تھی وہ اسے بھی اٹھا لے گئے۔ انہیں یقیناً اپنے اوپر فائرنگ کی توقع نہیں رہی ہوگی۔ ان کے آقاؤں نے یقین دلایا ہوگا کہ مزاحمت نہیں کی جائے گی۔ اسی سبب وہ گھبرا کر بھاگ اٹھے تھے۔ گولیوں کا جواب دینے کے لئے ان کے پاس اس وقت بندوقیں نہیں تھیں۔

پے در پے دو دھماکوں کی آوازیں یقیناً قانون کے ان رکھوالوں نے بھی سن لی ہوں گی جن کے تحفظ میں ہندو بلوائی مسلمان گھروں کو آگ لگا رہے تھے۔ انہیں موقع واردات پر پہنچنے میں اسی لئے زیادہ دیر نہیں لگی مگر اس وقت تک بلوائی فرار ہو چکے تھے۔

پھر صبح تک ان گلیوں میں سخت پہرا رہا۔ فوجی ٹرک ادھر سے ادھر گشت کرتے رہے۔ نتیجتاً صادق ماموں، ارشد اور اس کے دونوں بھائیوں کو گھر لوٹنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس دوران میں فائر بریگیڈ کے عملے نے اس علاقے میں پہنچ کر رسمی کارروائی کر دی تھی۔ رسمی اس لئے کہ جب تک آگ بجھانے والا عملہ وہاں پہنچا وہ مکان جل کر خاک ہو چکے تھے جن میں بلوائیوں نے آگ لگائی تھی۔ ہم لوگ صبح ہونے تک جاگتے رہے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جن مکانوں کو آگ لگائی گئی تھی ان کے مکین اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے یا نہیں یا وہ زندہ ہی جل گئے!

اس وقت صبح کے پونے آٹھ بج رہے تھے جب صادق ماموں، ارشد اور اس کے بھائی گھر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ فوج اور پولیس کا مشترکہ سخت پہرا اب اس علاقے سے ہٹ گیا تھا۔ فوجی ٹرک اب غالباً گلیوں کی بجائے سڑکوں پر گشت کر رہے تھے۔ صادق ماموں اور ان کے تینوں بیٹے بھی رات بھر نہیں سو سکے تھے۔

''اس وقت تو میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ ''عذرا بیٹی جب میں نے بلوائیوں کو اپنے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نیاز علی کی چھت پر کھڑا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔'' صادق ماموں کہہ رہے تھے۔ ''تمہاری ہمت اور حوصلے کو شاباش ہے بیٹی!'' یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔

اس کے بعد میں نے صادق ماموں کے استفسار پر تلاشی کا واقعہ بیان کیا پھر جو کچھ صبح ہونے تک پیش آیا تھا بتانے لگی۔

اس دن کے بعد تیسرے روز صبح صرف دو گھنٹے کے لئے کرفیو کھلا۔ ان تین دن کے درمیان دوبارہ بلوائیوں کو باڑے پر حملے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہندوؤں کا اس علاقے میں جانی نقصان زیادہ ہوا تھا۔ مسلمان اتنے نہیں مارے گئے تھے۔ ہمیں شہر بھر کی خبریں مل رہی تھیں۔ کچھ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے کچھ لوگوں کی زبانی! دوسرے دن سے صادق ماموں اپنے اخبار کے دفتر جانے لگے تھے۔ ان کے دفتر والوں نے انہیں لینے کے لئے گاڑی بھیج دی تھی۔ پریس کارڈ ان کے پاس پہلے ہی سے موجود تھا۔ صحافیوں کو ہندوستان میں بھی کرفیو سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ صادق ماموں سے بھی ہمیں شہر کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ان خبروں کے مطابق پہلے دن کے جھگڑے میں تو مسلمان زیادہ مارے گئے تھے مگر پھر پانسا پلٹ گیا تھا۔ مجموعی طور پر سو کے قریب ہندو کام آئے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد ساٹھ سے زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ ہاں ان کا مالی نقصان بہت ہوا تھا۔ تیسرے دن کرفیو میں جب وقفے کا کیا گیا تو سلمیٰ مجھے بے چین نظر آنے لگی۔ دو گھنٹے میں جامع مسجد جا کر واپس آنا ممکن تو تھا مگر شہر کی فضا اب بھی خراب تھی۔ میں نے اسی لئے اسے سمجھا دیا کہ جب امن و امان ہو جائے گا تو میں خود تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گی۔

حالات معمول پر آنے میں پورا ایک ہفتہ مزید لگ گیا۔ اس عرصے میں گھر کے اندر پڑے پڑے زاہد بور ہونے لگا۔ وہ اکثر مجھ سے کہتا کہ خاتون آپ کے ساتھ تو آ کر میں پھنس گیا۔ اچھی سیر ہو رہی ہے دہلی کی! ہاں ارشد علی بہت خوش تھا اور ظاہر ہے یہ بات زاہد سے بھی چھپی ہوئی نہیں تھی۔ جس روز پہلی بار سارے دن کے لئے کرفیو کھلنے کا اعلان ہوا میں نے سلمیٰ سے کہا کہ ناشتا وغیرہ کر لو آج تمہارے گھر چلیں گے۔ زاہد بھی اس وقت موجود تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا پھر بولا۔ ''تم بھی ساتھ چھوڑے جا رہی ہو سلمیٰ! اب میں بھلا تمہارے ساتھ ہنس بول کر کس طرح ان خاتون کو چڑاؤں گا!''

اس دوران میں زاہد، سلمیٰ سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا اور وہ اپنی دانست میں اس سے بے تکلف ہو کر مجھے ''سلگاتا'' تھا حالانکہ میں اس سے خوش ہوتی تھی کہ کسی بہانے وہ ہنس بول تو رہا ہے۔

''آپ ابھی تو رہیں گے نا دہلی میں! گھر ملنے آتے رہئے گا۔'' سلمیٰ نے اخلاقاً مسکرا کر کہا۔

''یہ خاتون تم سے ملنے کی اجازت دیں گی جب آؤں گا نا!''

''میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم ایک چھوڑ دس لڑکیوں سے ملو۔''

''دس تو خیر زیادہ ہیں چار میں گزارہ ہو جائے گا اور اسلام نے بھی مرد ذات کے لئے اتنا ہی کوٹا مقرر کیا ہے۔ ویسے آپ کی دریا دلی کا میں دل سے قائل ہو گیا۔ مستقبل کی ہر زوجہ کو آپ ہی کی طرح ہونا چاہئے۔ وہ عورتیں مجھے ایک آنکھ تو کیا دونوں آنکھیں نہیں بھاتیں جو سوکنوں سے جلتی ہیں۔ ملنساری اور محبت سے رہنا اچھا ہوتا ہے۔'' زاہد شرارت پر آمادہ رہا۔

''یہ تم نے مجھے زوجہ کیوں بنا ڈالا؟'' میں نے آنکھیں نکالیں۔

''دیکھیں خاتون میں نے مستقبل کی بات کی ہے حال کی نہیں۔ اب نہیں، آج نہ سہی تو ایک نہ ایک روز تو اس خادم کو آپ کا مجازی خدا بننا ہی پڑے گا۔ پھر کیا حرج ہے کہ ابھی سے کچھ پریکٹس کر لی

جائے۔ بات دراصل یہ ہے کہ......'' سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے زاہد نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ''لو وہ آ گئے حضرت رقیب! کرلو دکنداری!''

میں نے مڑ کر دیکھا تو ارشد آ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''امی بتا رہی تھیں کہ آپ سلمٰی کو ان کے گھر چھوڑنے جامع مسجد کی طرف جا رہی ہیں!'' اس کا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''سلمٰی کے والدین پریشان ہوں گے اس کی طرف سے۔''

''کہیں تو میں بھی ساتھ چلا چلوں! ابھی بہرحال شہر میں کچھ نہ کچھ کشیدگی تو باقی ہے نا!'' ارشد نے پیشکش کی۔

''میں جا رہا ہوں ان کے ساتھ آپ فکر نہ کریں۔'' میرے کچھ بولنے سے پہلے زاہد نے ارشد سے کہا۔

''تم سے میں نے کب ساتھ چلنے کو کہا ہے!'' میں نے دانستہ زاہد کو کیوں چڑایا حالانکہ میں اسی کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ وہاں ارشد کا ساتھ جانا قطعی مناسب نہیں تھا۔

''کچھ باتیں انڈرسٹوڈ ہوتی ہیں خاتون!'' زاہد نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا' پھر جواباً مجھے پریشان کرنے کے لئے ارشد سے بولا۔ ''میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ یہ خاتون آپ کو ہرگز اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گی! اگر میری بات پر آپ کو یقین نہ ہو تو ساتھ چلنے کے لئے کہہ کر دیکھ لیں۔''

ارشد کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ میں نے اسی لئے زاہد سے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ بچپنا ہے زاہد! کیوں فضول باتیں کر رہے ہو تم!''

''اگر یہ بات ہے تو پھر میں ان کے ساتھ ضرور جاؤں گا اور تم... تم ہرگز نہیں جاؤ گے!'' ارشد غصے میں زاہد سے بولا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پیارے بھائی!'' زاہد میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

اس نے بلا سبب مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ سلمٰی کی پردہ پوشی کے لئے میں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ ارشد کو اس کے گھر لے جانے کا مطلب اسے اصل حقیقت سے آگاہ کرنا ہوتا جو میں کسی صورت نہیں چاہتی تھی۔ زاہد کو اسی بات کا یقین تھا۔ اس نے اسی لئے مجھے پریشان کرنے اور ارشد کو نیچا دکھانے کے لئے یہ بچکانا شرارت کی تھی۔

''عذرا! میں آپ کے ساتھ چلوں گا! تیار ہو جائیں آپ!'' ارشد نے یہ کہہ کر مجھے امتحان میں ڈال دیا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی صورت اپنی بات منوائے بغیر نہیں مانے گا۔ زاہد کی بات کو اس نے خواہ مخواہ اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔

کچھ سوچ کر میں نے ارشد کو مزید مشتعل نہ ہونے دیا اور اس طرح زاہد کا منہ بھی بند ہو گیا۔ میں نے ارشد سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا کہ اسے ہی ساتھ لے جاؤں گی۔ اب وہ اپنے کمرے میں لباس تبدیل کرنے گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی زاہد بول اٹھا۔ ''ارے خاتون یہ کیا کر رہی ہیں آپ! اس طرح تو آپ جھوٹی ثابت ہو جائیں گی اور ان سلمٰی بیگم کا بھی بھانڈا پھوٹ جائے گا کہ یہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر تھک ٹھک کر اپنے عاشق نامراد کے ساتھ چل دی تھیں۔''

''بکواس مت کرو! تمہارا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ میں کسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں کسے نہیں!'' میں اس پر گرم ہو گئی۔

''میری بلا سے! آپ اپنے ساتھ کالے چور کو لے جائیں مجھے کیا! میں تو صرف سلمٰی بیگم سلمہ کی ہمدردی میں کہہ رہا......''

''بس بس! بہت ہو گئی ہمدردی! بڑے آئے سلمٰی کے ہمدرد اور اس کی عزت کا خیال کرنے والا! اگر ایسا ہی ہوتا تو تم ہرگز ارشد کو غصہ دلا کر میرے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرتے۔ اب تو میں ارشد ہی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی' تم یہیں جھک مارتے رہنا!''

''آپ نے تو شادی سے پہلے ہی لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ اس کے لئے تو ساری عمر پڑی ہے خاتون! یہ عمر تو دل پشوری کرنے کی ہے۔''

''اٹھو سلمٰی!'' میں سلمٰی سے مخاطب ہوئی۔ ''ابھی ناشتا بھی کرنا اور کپڑے بھی بدلنا ہیں۔'' یہ کہہ کر میں کھڑی ہو گئی۔ ''زاہد کو یہیں ٹھنڈی میٹھی آہیں بھرنے کے لئے چھوڑ جائیں گے۔''

پھر ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے ارشد سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع نکال ہی لیا۔ اسے میں نے مختصراً سلمٰی کے بارے میں بتا دیا۔ وہ میری بات سن کر حیران رہ گیا۔

''زاہد کے علم میں کیوں کہ یہ باتیں تھیں اسی لئے اس نے آپ کے ساتھ شرارت کی تھی اور وہ مجھے بھی اس طرح پریشان کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے ارشد کو بتایا۔

''آپ نے واقعی ایک نیکی کا کام کیا ہے۔'' ارشد میری تعریف کرنے لگا۔ ''ایک لڑکی کو آپ نے تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ مزید یہ کہ اسے آپ نے رسوا بھی نہیں ہونے دیا۔ امی کو اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے تو کسی قیمت پر اسے یہاں رکھنے پر راضی نہ ہوتیں۔''

''میرا بھی اسے یہاں رکھنے کا ارادہ نہیں تھا بس حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے کہ وہ یہاں آ کر پھنس گئی۔'' میں بولی۔

''وہ خیر ٹھیک ہے مگر یہ زاہد میری سمجھ نہیں آیا۔ آپ کو پریشان کر کے اور مجھے غصہ دلا کر اسے کیا ملا!''

''کچھ نہیں محض شرارت!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''وہ آپ کے اور میرے بارے میں جو باتیں کرتا ہے اگر آپ سن لیں تو چراغ پا ہو جائیں۔''

''کیا باتیں کرتا ہے؟'' ارشد متجسس نظر آنے لگا۔

''یہاں آنے سے پہلے میں نے اسے آپ کے اور اپنے رشتے کی بابت بتا دیا تھا بس اسی کی آڑ لے کر مجھے چھیڑتا رہتا ہے۔''

''آپ کو برا نہیں لگتا؟''

''نہیں تو! اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے! برا تو جب لگتا کہ ان باتوں میں حقیقت ہوتی۔''

''اچھا تو پھر میں چلوں آپ کے ساتھ یا نہیں؟''

''مرضی ہے آپ کی! میں نے پہلے سے آپ کو اس لئے سلمٰی کے متعلق بتا دیا کہ وہاں جا کر

آپ مجھے جھوٹا نہ سمجھیں۔ ویسے اسی شرارتی کو ساتھ جانے دیں تو بہتر ہے اس لئے کہ وہ گھر میں پڑے پڑے بہت بور ہو گیا ہے۔ وہ کلکتے سے میرے ساتھ دلی گھومنے آیا تھا اور جھگڑے کی وجہ سے گھر میں بند ہو کر رہ گیا۔'' میں نے ارشد کی بات کا جواب دیا۔

ارشد نے میرے ایما کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا ارادہ موقوف کر دیا۔ میں ارشد کے ساتھ اس کے کمرے سے نکلی تو زاہد صحن میں تھا۔ اس نے معنی خیز نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور پھر اس طرح ہماری جانب سے منہ پھیر لیا جیسے ناراض ہو۔ میں اسی کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر چکی تھی مگر ابھی تک اس نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ میں اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ ارشد دوسری منزل پر جانے کیلئے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ تم نے منہ کیوں پھلا رکھا ہے بچوں کی طرح؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''آپ کو ہم سے کیا رقیبوں سے ملیں خوب اکیلے میں!'' وہ اداس آواز بنا کر بولا۔ ''میں نے بھی اب کلکتے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کر لی بس دلی کی سیر! یہاں جھگڑے کی خبر سن کر امی ابو الگ پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔''

''اتنے خفا ہو مجھ سے......! اچھا ایک بات بتاؤ' اگر میں ارشد کی بجائے تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں اس وقت تو پھر تمہارا فیصلہ بدل جائے گا نا؟ پھر تو کلکتے واپس جانے کی بات نہیں کرو گے......؟ ہاں تو واپسی میں ٹیلی گرام بھی دے دینا خالو کو کہ خیریت سے ہو۔''

میری بات سن کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی اور بولا۔ ''مجھے معلوم ہے آپ دل کی بری نہیں ہیں بس اوپر اوپر سے تھوڑی سی کڑوی ہیں۔''

''تو پھر اسی خوشی میں جلدی سے جا کر کپڑے بدل لو۔ سلمیٰ تیار ہو چکی ہے اور میں بھی کپڑے بدل چکی ہوں۔'' میں نے کہا۔

پھر پندرہ بیس منٹ بعد ہی میں سلمیٰ اور زاہد کو ساتھ لئے صادق ماموں کے گھر سے نکلی۔ سلمیٰ کا سوٹ کیس زاہد نے اٹھا رکھا تھا۔ باڑے کے چوراہے تک ہمیں پیدل ہی چلنا پڑا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے میں نے کئی مکان جلے ہوئے دیکھے۔ علاقے میں کرفیو نہ ہونے کے باوجود پولیس کا گشت جاری تھا۔ چوراہے پر ہم ٹیکسی کے انتظار میں کچھ دیر کھڑے رہے۔ سلمیٰ گھر ہی سے برقع اوڑھ کر چلی تھی۔ برقع اس کے سوٹ کیس میں موجود تھا جو اس نے سفر کے دوران اتار دیا تھا۔ اب وہ اپنے گھر واپس جا رہی تھی اس لئے برقع اوڑھنا ضروری تھا۔ ایک خالی ٹیکسی دیکھ کر زاہد نے اسے روک لیا اور پھر ہم اس میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور سکھ ہی تھا۔ دلی میں ٹیکسی اور رکشا ڈرائیوروں کی اکثریت سکھوں ہی کی ہے۔ زاہد ڈرائیور کے پاس آگے بیٹھ گیا تھا۔ سوٹ کیس کیونکہ زیادہ بڑا نہیں تھا اس لئے ہم نے اسے پچھلی نشست ہی پر اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

ٹیکسی آگے بڑھی تو زاہد سکھ ڈرائیور سے شہر کے حالات معلوم کرنے لگا۔

''کیا بتائیں جی' اس ہنگامے نے تو تنگ کر دیا! دھندا نام کو نہیں رہا۔ نئی دلی میں شہر سے اتنی خالی ٹیکسیاں پہنچ گئیں یہاں کرفیو لگنے کی وجہ سے کہ دو دو گھنٹے خالی کھڑا رہنا پڑا۔'' شہر کے حالات بتانے

کی بجائے ٹیکسی والا اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ گیا۔

زاہد نے اسے ٹوک دیا مگر اس طرح کہ وہ محسوس نہ کرے اور پھر اصل مسئلے کی طرف لے آیا۔

''ویسے تو امن چین ہو گیا ہے اب مگر کچھ خبر نہیں کب پھر یہ آگ بھڑک اٹھے!'' ٹیکسی والے نے کہا۔ ''دیکھیں جی اس ملک پر تو ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی سبھی کا حق ہے۔ پچھلی باتوں کو اب اکھاڑنے سے کیا فائدہ! پاکستان بننا تھا سو بن گیا۔ اب مسلمانوں سے ہندوؤں کا یہ کہنا تو غلط ہے نا جی کہ تم پاکستان جاؤ! اور یہ کہ تم نے الگ ملک بنا لیا ہے تو پھر وہاں کیوں نہیں جاتے! جنہیں پاکستان جانا تھا جی وہ تو چلے گئے مگر یہاں کے مسلمان بچارے اب تک پاکستان بننے کا قرض ادا کر رہے ہیں۔''

ٹیکسی والے کی بات سن کر میرا دماغ سنسنانے لگا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے نہ جانے کیوں مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے ہم لوگ خود غرض ہیں جنہوں نے ان مظلوم مسلمانوں کے لئے پاکستان کے دروازے بند کر لئے ہیں۔ پھر جب تک ٹیکسی جامع مسجد کے علاقے میں داخل نہ ہو گئی یہی خیالات میرے دل و دماغ پر کچوکے لگاتے رہے۔ میں اس وقت خیالوں کی دنیا سے باہر آئی جب زاہد نے ٹیکسی والے کے ایما پر مجھ سے پوچھا کدھر چلنا ہے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سلمیٰ کی طرف دیکھا اور پھر وہ راستہ بتانے لگی۔

وہاں سے چتلی قبر زیادہ دور نہیں تھی۔ جلد ہی سلمیٰ کے کہنے پر ایک گھر کے سامنے زاہد نے ٹیکسی رکوا لی۔ گھر کی کرسی اونچی تھی۔ گھر کے سامنے اونچا پختہ اینٹوں کا چبوترا بنا ہوا تھا۔ ہم سب ٹیکسی سے اتر گئے۔ میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پرس کھولا۔

''رہنے دیں خاتون میں کرایہ ادا کر چکا ہوں۔'' زاہد مجھ سے مخاطب ہوا۔

اسی وقت ایک چھوٹا سا بچہ گھر کے دروازے سے نکلا۔ سلمیٰ کی نقاب اٹھی ہوئی تھی۔ بچے نے اسے دیکھا تو خوشی سے ''باجی آ گئیں' باجی آ گئیں'' کہتا ہوا گھر کے اندر بھاگ گیا۔

میں نے سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ اب اپنا سوٹ کیس خود ہی اٹھائے ہوئے تھی۔

''رو مت سلمیٰ!'' میں آہستہ سے بولی۔ ''اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم بغیر اپنی عزت و آبرو گنوائے اپنے گھر واپس آ گئی ہو ورنہ جو لڑکیاں ایک بار ماں باپ کی دہلیز عبور کر لیتی ہیں وہ اپنا سب کچھ لٹا کر ہی لوٹتی ہیں۔''

میرے کہنے پر سلمیٰ نے اپنے آنسو پونچھ لئے' پھر آگے چلنے لگی۔ چبوترے پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھ کر جب ہم چبوترے پر پہنچے تو گھر کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان جو صورت سے سلمیٰ کا چھوٹا بھائی معلوم ہو رہا تھا باہر نکلا۔ سلمیٰ کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ بے اختیار اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ ''باجی!''

سلمیٰ نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور رونے لگی۔

''ارے باجی' اندر تو چلیں آپ تو یہیں رونے لگیں!'' نوجوان کہنے لگا' پھر وہ اپنی بہن کو سنبھالے ہوئے اندر گھر میں چلا گیا۔ اس نے اپنی بہن کے ہاتھ سے سوٹ کیس بھی لے لیا تھا۔

''لیجئے خاتون' اور کیجئے نیکی! وہ مسمات تو گئیں اور ہمیں یہاں ٹاپتا چھوڑ گئیں۔ کیا واپس چلیں؟'' زاہد چہکنے لگا۔

''صبر تو کرو ذرا! ابھی وہ غریب اپنی دہلیز پار کر کے اندر گئی ہے' اندر جا کر ہی تو ہمارے بارے میں کچھ گھر والوں کو بتائے گی۔'' میں نے کہا۔

''آپ تو زنانہ سواری ہیں اندر جاسکتی ہیں' میں باہر کھڑے ہو کر انتظار کر لوں گا۔''

''نہیں۔'' میں نے انکار کر دیا۔ ''یہ مناسب نہیں ہے۔ سلمٰی ابھی ہمیں خود ہی اندر بلوائے گی۔''

پھر ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسی نوجوان نے جو سلمٰی کو اندر لے گیا تھا ہمارے لئے گھر کی بیٹھک کھول دی جس کا دروازہ گھر کے دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ''آیئے آپ لوگ اندر بیٹھک میں آ جایئے!'' نوجوان نے ہمیں مخاطب کیا۔

''چلو بھئی زاہد!'' میں نے زاہد سے کہا اور پھر آگے بڑھنے لگی۔

وہ نوجوان ہمیں بیٹھک میں بٹھا کر پھر اندرونی دروازے سے گھر میں چلا گیا۔ اس گھر اور نشست گاہ کا ایک نظر جائزہ لے کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں وہاں بیٹھے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہی نوجوان اندرونی دروازے سے بیٹھک میں داخل ہوا اور مجھ سے بولا۔ ''آپ کو امی اندر بلا رہی ہیں۔''

میں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور نوجوان کے ساتھ اندر چلی گئی۔ وہ پرانے طرز تعمیر پر بنا ہوا بڑا سا گھر تھا۔ صحن خاصا بڑا تھا۔ صحن کی ایک جانب بچھی ہوئی چوکی پر ایک ادھیڑ عمر عورت اور سلمٰی بیٹھی ہوئی تھی۔ چوکی کی اطراف گھر کے افراد جمع تھے۔ جن میں ایک نوجوان لڑکی اور اس سے چھوٹی عمر کے لڑکے لڑکیاں تھیں۔ وہ بھی غالباً سلمٰی کے بہن بھائی تھے۔ سلمٰی نے برقع اتار دیا تھا اور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ ادھیڑ عمر عورت جو سلمٰی کی ماں لگتی تھی وہ بھی رو رہی تھی۔ مجھے آتے دیکھ کر بڑی بی نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے اور پھر قریب پہنچنے پر مجھے بھی ہاتھ پکڑ کر چوکی پر بیٹھا لیا۔ میں نے انہیں سلام کیا۔

میرے سلام کا جواب دے کر انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بی بی! یہ تو بس روئے ہی جا رہی ہے کچھ بتا نہیں رہی۔ تمہی بتاؤ کہ یہ تمہیں کہاں ملی؟''

''آپ کے شوہر گھر پر نہیں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ صبح ہی دکان پر چلے جاتے ہیں۔'' بڑی بی نے بتایا۔

''اگر آپ انہیں بلوا دیں تو بہتر ہے میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی۔''

''نہیں بی بی! جو بتانا ہے تم مجھے بتا دو! وہ غصے کے بہت تیز ہیں' سلمٰی کو گھر میں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔'' بڑی بی خوف زدہ سی آواز میں بولیں۔

میں کچھ سوچنے لگی' پھر بولی۔ ''تو پھر ایسا کریں کہ سلمٰی کو گھر کے کسی کمرے میں چھپا دیں۔ میں ان سے بات کر کے پہلے انہیں ہموار کر لوں گی پھر سلمٰی کے بارے میں بتاؤں گی۔''

''مگر بی بی میں ان سے کیا کہلواؤں؟ کیا کہلوا کر انہیں دکان سے بلواؤں؟'' بڑی بی نے کہا' پھر سلمٰی کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔ ''اری تو ہی سب کچھ کیوں نہیں بتا دیتی! تجھے تو اپنے ابا کے غصے کی خبر ہے ... ! تجھ پہ جو گزری ہے بتا دے مجھے! میں انہیں سمجھا بجھا لوں گی۔''

''اگر سلمٰی آپ کو سب کچھ بتا بھی دے تو بھی میں آپ کے شوہر سے بات ضرور کرنا چاہوں گی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ ان سے یہ کہلوا دیں کہ کچھ لوگ سلمٰی کے بارے میں کوئی خبر لے کر آئے ہیں اور ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ فوراً آ جائیں گے۔''

بالآخر بڑی بی راضی ہو گئیں اور انہوں نے سلمٰی کے بھائی کو یہی پیغام دے کر دکان پر بھیج دیا۔ دکان جامع مسجد کے علاقے ہی میں تھی اس لئے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑتا۔ میں نے سلمٰی کے بھائی سے جاتے جاتے یہ بات پوچھ لی تھی۔ وہ چلا گیا تب میں بڑی بی سے اجازت لے کر دوبارہ بیٹھک میں آ گئی۔ سلمٰی کو بڑی بی نے میرے ہی سامنے گھر کے ایک اندرونی کمرے میں چھپا دیا تھا۔

''دی اینڈ ہو گیا عشق کے ڈرامے کا؟'' زاہد مجھے آتے دیکھ کر' اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''نہیں! ابھی صرف پردہ اٹھا ہے اور اسٹیج پر ہیروئن کے ابا حضور کی آمد کا انتظار ہے۔'' میں نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے خوش گوار لہجے میں کہا اور مسکرانے لگی۔

''ویسے یہ ڈراما کتنے ایکٹ کا ہے ... ؟ اور وہ مسمات ہیروئن کیا کر رہی ہیں؟''

''ہیروئن بابل کے گھر آ کر فی الحال ٹسوے بہا رہی ہیں' نہ منہ سے کچھ بول رہی ہیں نہ سر سے کھیل رہی ہیں اور انہوں نے ساری ذمے داری ہدایت کار یعنی مجھ پر ڈال دی ہے۔'' پھر میں نے زاہد کو بڑی بی سے ہونے والی بات بتا دی۔

''پھر تو مجبوری ہے۔ آپ ہی کو سب کچھ کرنا ہے۔ خدا کرے ہیروئن کے ابا زیادہ سٹھیائے ہوئے نہ ہوں۔ بڑی بی کی باتیں سن کر تو میں ڈر گیا ہوں۔'' زاہد بولا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''سارے ہی مرد اپنی بیویوں پر رعب گانٹھنے کے لئے خود کو غصے کا بہت تیز ظاہر کرتے ہیں۔ گھر میں تو بیوی کے سامنے بادشاہ سلامت بنے رہتے ہیں اور گھر کے باہر لوگوں کے رو بہ رو بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ ساری اکڑ فوں بس بیویوں کے لئے ہوتی ہے۔''

''آپ کی باتوں سے تعصب کی بو آ رہی ہے۔ لگتا ہے آپ کو شوہروں کا خاصا تجربہ ہے۔''

''بکومت!'' میں اس کے ذو معنی فقرے پر سخت لہجے میں بولی۔ ''اسے تجربہ نہیں مشاہدہ کہتے ہیں۔''

''آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں بھی کیا آپ کے لئے روایتی شوہروں کی طرح ثابت ہوں گا؟''

''میں مردوں کی بات کر رہی تھی۔'' میں نے بھی موقع دیکھ کر اس پر فقرہ چست کیا۔

''تو کیا آپ مجھے دودھ پیتا بچہ سمجھتی ہیں؟ آپ ایک بار میری زوجہ تو بن کر دیکھیں' پھر آپ خود ہی کہہ اٹھیں گی کہ.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی زبان سے غالباً کوئی مبتذل جملہ نکلنے والا

تھا۔ پھر مجھے اپنی جانب گھورتے دیکھ کر بھی وہ کچھ بوکھلا سا گیا تھا۔

جب تک سلمٰی کا بھائی اپنے باپ کو دکان سے بلا نہ لایا' زاہد اور میرے درمیان اسی طرح کی نوک جھونک جاری رہی۔

بڑے میاں کی چندیا پر برائے نام بال تھے۔ چہرہ گول اور پھولا ہوا تھا تھا۔ جسم فربہی کی طرف مائل تھا' عمر پچاس کے قریب ہوگی' قد چھوٹا تھا۔ وہ جب بیٹھک میں داخل ہوئے تو میں اور زاہد نے انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دے کر وہ بھی ایک خالی مونڈے پر میرے سامنے بیٹھ گئے۔

''میرا نام عذرا خان ہے اور یہ میرے کزن زاہد ہیں۔'' میں نے بڑے میاں سے اپنا اور زاہد کا تعارف کرایا۔

''تم اندر جاؤ اور ان لوگوں کے لئے چائے بنوا کر لاؤ۔'' بڑے میاں نے اپنے نوجوان بیٹے کو مخاطب کیا جو ابھی بیٹھک ہی میں تھا۔ وہ چلا گیا تو بڑے میاں نے اپنا تعارف کرایا۔ ''مجھے عبدالوحید کہتے ہیں' انصار نے بتایا تھا کہ آپ لوگ سلمٰی کے متعلق کوئی اطلاع لے کر آئے ہیں!'' انصار غالباً سلمٰی کے بھائی کا نام تھا۔ بڑے میاں کی بات سے یہی ظاہر ہوا تھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''سلمٰی خیریت سے ہے' اگر گزشتہ دنوں جھگڑا نہ ہو جاتا تو وہ اب سے بارہ تیرہ دن پہلے اپنے گھر پہنچ جاتی۔''

''وہ ہے کہاں؟ اور ...... اور آپ لوگ کون ہیں؟ وہ وہ آپ کو ملی کہاں؟'' بڑے میاں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

''میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی لیکن اس شرط پر کہ آپ سلمٰی کو معاف کر دیں گے۔''

''میں تو معاف کر دوں گا اسے کہ اس کا باپ ہوں مگر '' بڑے میاں کی آواز بھاری ہو گئی۔ ''مگر یہ دنیا اسے معاف نہیں کرے گی۔'' ان کے لہجے میں دکھ تھا۔

پھر میں نے انہیں ابتدا سے سب کچھ بتانا شروع کر دیا۔ ٹرین میں جو واقعہ پیش آیا تھا' اسے مصلحتاً میں نے دوسرے انداز میں بیان کیا۔ میں نے بتایا۔ ''ان دونوں کے درمیان کسی بات پر تلخی ہو گئی غالباً رقم اور زیور پر! وہ لڑکا سلمٰی سے زیور اور رقم لینا چاہتا تھا اور سلمٰی اس پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ زیور اور رقم اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ سلمٰی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس نوجوان نے زبردستی زیور اور رقم اس سے لینا چاہی۔ میں سب کچھ اب تک خاموشی سے دیکھتی رہی مگر اس موقع پر خاموش نہ رہ سکی۔ میری مداخلت پر وہ نوجوان بہت برہم ہوا اور پھر سلمٰی سے میں نے سب کچھ قبلوا لیا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ نوجوان بدکردار اور لالچی ہے۔ مختصراً یہ کہ میں نے سلمٰی کی جان اس سے چھڑا دی اور اسے اس کی بھیانک غلطی کا احساس دلایا۔ سلمٰی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میرے سمجھانے بجھانے پر وہ اپنے گھر لوٹنے پر راضی ہو گئی۔ پھر میں اسے لے کر دہلی آ گئی۔ یہاں باڑا ہندوراؤ میں میرے رشتے کے ماموں کا گھر ہے۔ میں وہیں جا کر ٹھہری' بدقسمتی سے اس دن ہندو مسلم فساد شروع ہو گیا اور میں سلمٰی کو یہاں نہ پہنچا سکی۔ اس دوران میں سلمٰی سے مجھے آپ لوگوں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا۔ وہ یہاں آنے سے خوف زدہ تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ پہلے میں خود تمہارے گھر والوں کو سمجھاؤں گی پھر تمہیں تمہارے گھر لے جاؤں

گی۔'' یہ کہہ کر میں نے ٹھنڈا سانس بھرا' پھر مزید بولی۔ ''غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ یقیناً سلمٰی کی غلطی تھی۔ اسے اپنے والدین کی عزت کا خیال کرنا چاہئے تھا مگر اسی کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہوں گی کہ والدین کو بھی اولاد کی مرضی اور پسند و ناپسند کا خیال رکھنا چاہئے۔'' میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ اسی وقت سلمٰی کا بھائی چائے رکھ کر چلا گیا اور ہم چائے پینے لگے۔

بڑے میاں یقیناً جہاں دیدہ آدمی تھے اس لئے میرے معنی خیز لہجے کو سمجھ گئے اور بولے۔ ''یہ بات آپ غالباً ہم لوگوں کے بارے میں کہہ رہی ہیں!''

''جی ہاں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''آپ نے جہاں سلمٰی کا رشتہ طے کیا تھا وہ لڑکا ٹھیک نہیں ہے۔ سلمٰی اس نوجوان کے بہلاوے میں اسی لئے آ گئی کہ آپ لوگوں نے ایک آوارہ لڑکے سے اس کا رشتہ کر دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً وہ غلط قدم نہ اٹھاتی۔ میری اس صاف گوئی کو معاف کر دیجئے گا۔ میں آپ کو مشورہ دوں گی کہ وہاں سے رشتہ ختم کر کے کوئی اور بہتر لڑکا......''

''اب وہ قصہ ختم ہو چکا ہے۔'' بڑے میاں نے میری بات کاٹ کر طویل سانس لیا۔ ''دو روز پہلے چوری کے الزام میں پولیس اسے پکڑ لے گئی ہے اور چوری کا سامان بھی ان لوگوں کے گھر سے پکڑا گیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرا فیصلہ غلط تھا لیکن سلمٰی کو بھی یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔ اس نے ہمارے ماتھے پر بدنامی کا داغ لگا دیا ہے جو لڑکیاں اس طرح گھر سے بھاگ جاتی ہیں انہیں کوئی قبول نہیں کرتا' یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتی ہوں گی۔ اب تو اس واقعے کے بعد اپنے دوسرے بچوں کی شادیاں کرنا بھی مجھے مشکل ہو جائے گا۔''

''آپ یقیناً بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر ضروری تو نہیں کہ صرف برادری میں رشتہ کیا جائے۔'' میں بولی۔

''میرے ایک دوست نے اپنے لڑکے کے لئے سلمٰی کا رشتہ مانگا تھا یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ وہ لوگ ہماری برادری کے نہیں ہیں۔ میں تو کچھ راضی بھی تھا مگر سلمٰی کی ماں نے صاف انکار کر دیا۔''

''کیا آپ کے دوست کو اس واقعے کا علم ہے؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں' وہ اس شہر میں نہیں رہتا! میرٹھ کا ہے وہ۔''

''ان کے لڑکے کا کہیں رشتہ تو نہیں ہوا ابھی؟''

''جہاں تک میرے علم میں ہے ابھی اس کا رشتہ کہیں نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے ضرور خط لکھتا۔''

''تو پھر بس ہاں کر دیجئے۔'' میں جلدی سے بولی۔ ''بلکہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ خود میرٹھ جا کر بات کر آئیں۔''

''لیکن سلمٰی کی ماں کو کون سمجھائے گا! وہ تو برادری سے باہر رشتے کے لئے کسی صورت آمادہ نہیں پھر وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ لڑکی اتنی دور چلی جائے گی!'' بڑے میاں بولے۔

''موجودہ حالات میں یقیناً وہ سمجھ داری کا ثبوت دیں گی۔ آپ ان کی طرف سے فکر نہ کریں'

میں انہیں خود سمجھا لوں گی۔"

"تمہیں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں میں۔" بڑے میاں عجیب سے لہجے میں بولے۔ اب وہ "آپ" سے "تم" پر آ گئے تھے جو ظاہر ہے بے تکلفی اور اپنائیت کا اظہار تھا۔

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ دیکھ کر کہ تم کتنی نیک، بے غرض اور شریف بچی ہو!" بڑے میاں بھرائی ہوئی سی آواز میں بولے۔ "تم نے میری بچی کی زندگی تباہ ہونے سے بچالی ہے اللہ تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔"

"یہ تو بس اللہ کا کرم ہے کہ سلمیٰ تباہ ہونے سے بچ گئی۔ اس میں میرا کوئی دخل نہیں۔ اب یہ بتائیں کہ اگر میں سلمیٰ کو لے آؤں تو آپ اسے معاف کر دیں گے نا؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی! وہ..... وہ تو میرے دل کا ٹکڑا ہے۔ میں..... میں خود تمہارے ساتھ اسے لینے چلوں گا اور..... اور اسے اپنے سینے سے لگا لوں گا۔" یہ کہتے ہوئے بڑے میاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ یقیناً اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتے تھے۔

"تو اگر آپ اپنی بیٹی کو سینے سے لگانا چاہتے ہیں تو جائیں گھر میں اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔" میں نے گویا انکشاف کیا۔

"کک..... کیا کہہ رہی ہو تم.....؟ کیا واقعی.....؟ سلمیٰ گھر میں ہے؟" بڑے میاں اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں سلمیٰ کے ابا یہ بچی ٹھیک کہہ رہی ہے، سلمیٰ آ گئی ہے۔" اندرونی دروازے کی طرف سے مجھے بڑی بی کی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ دروازے کے قریب کھڑی بیٹھک میں ہونے والی سب گفتگو سن رہی تھیں۔

بڑے میاں فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے۔ بیٹھک میں اب صرف زاہد رہ گیا۔ اس نے بڑے میاں کے جاتے ہی کہا۔ "ٹھیک کہہ رہی تھی آپ! بڑے میاں تو خاصے نرم مزاج اور گداز دل نکلے۔"

"ہر باپ اپنی اولاد کے لئے اتنا ہی نرم اور گداز دل ہوتا ہے، بظاہر چاہے وہ سخت نظر آتا ہو۔" میں بولی۔

اس کے بعد میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی۔ سلمیٰ کی ماں نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں مجھے سمجھانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ بڑی بی نے خود ہی مجھ سے میرٹھ میں رشتے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ اب رشتے داروں میں سے کوئی سلمیٰ کو قبول نہیں کرے گا۔ سلمیٰ سے مل کر اور پھر کسی دن آنے کا وعدہ کر کے میں وہاں سے چلی آئی۔ اس کے والدین نے بھی دوبارہ آنے پر اصرار کیا تھا۔

سلمیٰ کے معاملے سے نمٹ کر اب مجھے ذکیہ کی فکر تھی۔ میں اس کا علاج جلد از جلد شروع کرانا چاہتی تھی۔ دوسرے دن ارشد کو ساتھ لے کر میں دہلی کے ایک ماہر نفسیات سے ملی۔ ذکیہ کو اسے دکھانے سے قبل میں خود پہلے بات کر لینا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر نے میری باتیں توجہ سے سنیں اور پھر کہا کہ علاج مشکل نہیں، مریضہ کو لا کر دکھائیں۔ ڈاکٹر کی فیس تو خاصی تھی مگر اس سے مل کر میں مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ ایف آ

سی ایس تھا۔ اگلے روز میں ذکیہ کو لے گئی۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور کچھ دوائیں تجویز کیں۔ اسی دن سے ذکیہ کا علاج شروع ہو گیا۔

ایک ہفتے کے علاج میں ذکیہ بڑی حد تک نارمل ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ پورے ایک ماہ پابندی سے علاج کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عرصہ مجھے دہلی ہی میں مجبوراً گزارنا تھا۔ اس دوران میں زاہد کے ساتھ دہلی کی سیر بھی کی جا رہی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ اب ہم ذکیہ کو بھی اپنے ساتھ لے جانے لگے تھے۔ نظام الدینؒ، قطب، لال قلعہ اور دیگر تاریخی مقامات سبھی کی، ہم نے جی بھر کے سیر کی۔ ذکیہ پر اس کا بھی خوشگوار اثر مرتب ہو رہا تھا۔ عموماً ارشد بھی ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ اب زاہد اور ارشد کے درمیان صلح ہو چکی تھی۔ ارشد اب زاہد کے مزاج کو سمجھ گیا تھا اور خود بھی اس کی شرارتوں سے محظوظ ہونے لگا تھا۔

یونہی تین ہفتے اور گزر گئے اسی دوران میں مجھے خیال آیا کہ میری پاکستان واپسی کی کیا صورت ہو گی؟ میں اس مسئلے پر غور کر رہی تھی کہ مجھے یاد آیا صدر مملکت کی جانب سے مجھے جو مختار نامہ جاری کیا گیا تھا اس کی فوٹو کاپی میرے پرس میں موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ غیر قانونی طور پر دوبارہ سرحد عبور کرنے کی بجائے پاکستان کے سفیر متعین دہلی سے کیوں نا ملوں! اس سلسلے میں وہ مختار نامہ میرے کام آ سکتا تھا۔ سفیر پاکستان کو بہرحال اتنے اختیارات حاصل تھے کہ وہ میرے لئے پاکستانی پاسپورٹ فراہم کر دیتا۔ یہی سوچ کر میں نے سفیر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا جو آسان ثابت نہ ہوا۔ مجھ سے سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری نے پوچھا کہ آپ کیوں ملنا چاہتی ہیں؟ جب تک آپ مجھے اس سلسلے میں مطمئن نہیں کر دیں گی محترم سفیر سے آپ کی ملاقات ممکن نہیں ہے۔

"میں آپ کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتی، معذرت خواہ ہوں۔ میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

"پھر آپ کی ملاقات مشکل ہے۔" اس نے بھی مجھے صاف جواب دے دیا۔

مجبوراً مجھے مختار نامہ دکھانا پڑا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "تو آپ پاکستانی ہیں؟"

"جی ہاں؟" میں نے اقرار کیا۔ مجھے علم تھا کہ اس مختار نامے کی رو سے نہ صرف میں پاکستانی تھی بلکہ انتہائی اہم شخصیت کی مالک تھی۔ فرسٹ سیکرٹری مرعوب نظر آنے لگا۔

"میں محترم سفیر سے آپ کی ملاقات کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔" وہ نرمی سے بولا۔ اس کا لہجہ اب بدل گیا تھا۔ "کب ملنا چاہتی ہیں آپ ان سے؟"

"اگر آج ہی ممکن ہو تو بہتر ہے۔" میں بولی۔

"اس وقت تو وہ سفارت خانے میں موجود نہیں، ایک ضیافت میں شرکت کرنے گئے ہیں۔ آپ کل صبح نو بجے تشریف لے آئیں۔"

"بہت بہت شکریہ!" یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھنے لگی۔

"ٹھہریئے! چائے تو پیتی جائیے!" اس نے کہا۔

"کل سہی!" میں یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دوسرے دن صبح وقت مقررہ پر میں سفارت خانے پہنچ گئی۔ سفیر کو غالباً فرسٹ سیکرٹری نے صدر مملکت کی جانب سے جاری کردہ مختار نامے کے متعلق بتا دیا تھا۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے ملا۔ اس سے گفتگو کے آغاز ہی میں میں نے مختار نامہ پرس سے نکال کر دکھایا۔ اس نے مختار نامہ مجھ سے لے کر پڑھا پھر کہا ''اس مختار نامے کی رو سے مملکت پاکستان سے متعلق تمام حکام کو آپ کے ساتھ بھرپور اور ممکنہ تعاون کے لئے حکم دیا گیا ہے۔ یقیناً آپ کا شمار ان ہستیوں میں ہے جن پر صدر مملکت ذاتی طور پر اعتماد کرتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کروں گا۔ فرمایئے۔''

''مجھے پاکستانی پاسپورٹ چاہئے۔'' میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

''پاکستانی پاسپورٹ!'' وہ حیرت سے بولا۔ ''کیا آپ کا پاسپورٹ کھو گیا ہے؟''

''جی نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''میں پاسپورٹ کے ذریعے ہندوستان میں داخل نہیں ہوئی۔''

وہ میری بات سن کر چونک اٹھا۔ ''یعنی...... یعنی آپ پاسپورٹ کے بغیر سرحد عبور کر کے آئی ہیں؟''

''جی ہاں مگر اس میں میری مرضی کو دخل نہیں تھا۔ اگر آپ اصرار کریں گے تو میں وہ حالات و واقعات بھی آپ کو بتا دوں گی جن کے سبب ایسا ہوا مگر بہتر یہ ہے کہ اس سلسلے میں مجھ سے کچھ دریافت نہ کریں۔ میرے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ جس راستے سے آئی ہوں اسی سے واپس چلی جاؤں لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ مشرقی پاکستان کے باڈر سے متعلق تو آپ کو بھی معلومات ہوں گی!''

''تو آپ ادھر سے آئی ہیں!''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا' ''مگر اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ میں راستہ بھول کر ہندوستانی سرحد میں داخل ہو گئی تھی۔''

میری بات سن کر سفیر کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ آپ کو پاکستانی پاسپورٹ مل جائے گا لیکن اگر آپ مناسب خیال کریں تو......'' وہ کچھ کہتے ہوئے جھجکنے لگا۔

''میں سمجھ رہی ہوں آپ میرے متعلق تجسس میں مبتلا ہیں۔ میں آپ کا تجسس دور کر دوں گی کیونکہ آپ ایک ذمے دارانہ عہدے پر فائز ہیں اور راز داری برت سکتے ہیں۔''

پھر میں نے مختصراً اسے پاکستان اور خصوصاً مشرقی پاکستان میں امریکی ایجنٹوں کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا' پھر بتایا کہ خود وزیر داخلہ نے مجھے اس سلسلے میں مشرقی پاکستان بھیجا تھا۔ اس کے بعد میں نے جیسور میں ملٹری ریڈ کے بارے میں بتایا۔

''امریکی ایجنٹوں کا سرغنہ سولومن بھی ان تخریب کاروں کے درمیان موجود تھا جس پر میں ہاتھ ڈالنا چاہتی تھی۔'' میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے سولومن کے فرار اور اس کے تعاقب کا ذکر کیا۔ پھر راستہ بھول کر ہندوستانی سرحد میں داخل ہو جانے کے متعلق بتایا۔

''آپ کا تعلق سنٹرل انٹیلی جینس سے ہے؟'' سفیر نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''حیرت ہے۔'' وہ چونک کر بولا۔

''ہاں حیرت کی بات تو ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ ایسی شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ بہر حال جیسا کہ میں نے وعدہ کیا ہے پاسپورٹ آپ کو مل جائے گا۔ اپنی تصویر اور دیگر کوائف میرے فرسٹ سیکرٹری کو دے جائیں اور کل ہی پاسپورٹ لے جائیں۔ تصویر تو ہے نا آپ کے پاس؟''

''جی ہاں' لائی ہوں میں اور کوائف بھی ایک کاغذ پر لکھ دیئے ہیں جن کا اندراج پاسپورٹ پر ضروری ہوتا ہے۔''

''تو پھر مجھ کو دے دیں۔''

میں نے پرس کھول کر اپنی تصویر اور وہ کاغذ سفیر کو دے دیا جس پر میرے کوائف درج تھے۔

پھر سفیر کے اصرار پر میں چائے پی کر وہاں سے چلی آئی۔ دوسرے روز مجھے پاسپورٹ مل گیا۔ اب میں قانونی طور پر جب چاہے پاکستان جا سکتی تھی۔

ذکیہ کی بابت اس کے معالج نے جو کچھ کہا تھا صحیح ثابت ہوا۔ اب وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکی تھی۔ وہ ابھی مزید کچھ دن ہندوستان میں گزار کر مصر جانا چاہتی تھی۔ زاہد ابھی میرے ساتھ ہی تھا۔ اب میں پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن ابھی تک یہ طے نہیں کیا تھا کہ مجھے مشرقی پاکستان کا رخ کرنا چاہئے یا مغربی پاکستان جانا چاہئے! میں بہر حال جس غرض سے مشرقی پاکستان گئی تھی وہ مقصد بڑی حد تک تخریب کاروں کی گرفتاری کے بعد پورا ہو چکا تھا مگر وہاں امریکی ایجنٹ سولومن کے ساتھ اب بھی موجود تھے۔ سولومن دوبارہ بھی وہاں پہنچ کر کوئی ہنگامہ کھڑا کر سکتا تھا۔ میں اسی لئے تذبذب کا شکار تھی۔ ایک روز صبح میں اس انگریزی اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی جس میں صادق ماموں کام کرتے تھے تو ایک تصویر پر نظر پڑتے ہی تقریباً اچھل پڑی۔ وہ بھارتی وزیر اعظم کی تصویر تھی جس میں وہ ایک غیر ملکی شخص سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ میرے چونک اٹھنے کا سبب یہی غیر ملکی شخص تھا۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتی تھی۔ میں بڑی بے چینی کے ساتھ تصویر کے ساتھ دیئے گئے کیپشن کو پڑھنے لگی اور پھر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے دوبارہ اس کیپشن کو پڑھا اور میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اب ہندوستان میں میرا مزید قیام کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

اخبار میرے ہاتھ میں تھا اور نظریں بھی ابھی تک اسی پر جمی ہوئی تھیں مگر میرا ذہن کہیں اور ہی تھا۔ جو تصویر میں نے اخبار میں دیکھی تھی اس کے نیچے لکھا تھا۔ ''انڈو امریکن فرینڈ شپ سرکل واشنگٹن کے پریذیڈنٹ پروفیسر ہاورڈ بھارتی وزیراعظم سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔'' بظاہر اس عبارت میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی اگر میں اس غیر ملکی شخص کی اصل شخصیت سے واقف نہ ہوتی تو یقیناً اس تصویر کو نظر انداز کر دیتی۔ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ میرے نزدیک بھارتی وزیراعظم سے اس غیر ملکی شخص کی ملاقات انتہائی اہمیت کی حامل تھی۔ اس تصویر کے ساتھ ہی چھوٹی سی ڈبل کالم خبر بھی تھی جسے میں پڑھ چکی تھی۔ اس خبر کے مطابق وہ غیر ملکی شخص گزشتہ روز پرائم منسٹر ہاؤس میں بھارتی وزیراعظم سے ملا تھا اور یہ ملاقات تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی تھی۔ اس ملاقات میں بھارت میں متعین امریکی سفیر بھی موجود تھا۔ خبر کے مطابق پروفیسر ہاورڈ ان دنوں بھارت کے دورے پر آیا ہوا تھا اور بھارتی وزیراعظم سے اس نے باہمی دلچسپی کے امور پر بات چیت کی تھی۔ باہمی دلچسپی کے امور پر ہی گفتگو مجھے کسی بین الاقوامی سازش کا پیش خیمہ محسوس ہو رہی تھی۔ میرے وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ اپنے جس بڑے دشمن سے میں ایک عرصے برسر پیکار رہی تھی اور جو مجھے قتل کر دینا چاہتا تھا اسے میں قاہرہ کی بجائے بھارت کے دارالحکومت میں دیکھوں گی۔ یہ وہی شخص تھا جس کا ایک نائب سولومن میرے ملک میں علیحدگی پسند عناصر کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ امریکی سفیر کی موجودگی میں بھارتی وزیراعظم سے اس کی ملاقات کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ امریکی حکومت براہ راست اس معاملے میں دلچسپی لے رہی تھی۔ بھارتی وزیراعظم سے ملاقات کرنے والا غیر ملکی شخص ڈاکٹر رچرڈ تھا جس کے عزائم سے میں بخوبی آگاہ تھی۔ پروفیسر ہاورڈ بن کر بھرتی وزیراعظم سے اس کا ملنا میرے لئے تعجب خیز نہیں تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ ایسے افراد کے نہ معلوم کتنے روپ ہوتے ہیں! بھارت کی پاکستان دشمنی کے پس منظر میں ڈاکٹر رچرڈ کا بھارتی وزیراعظم سے ملنا میرے نزدیک معنی خیز تھا۔

ڈاکٹر رچرڈ اگر ہندوستان کی بجائے پاکستان میں ہوتا تو میرے لئے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا آسان تھا لیکن یہاں ایسا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ ایسی صورت میں مجھے خود ہی پر انحصار کرنا تھا۔ سب سے پہلے میرے لئے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کا قیام دہلی میں کہاں تھا! یہ معلوم کرنے کے بعد ہی میں اگلا قدم اٹھا سکتی تھی۔ ذاتی دشمنی سے قطع نظر ڈاکٹر رچرڈ میرے ملک کا دشمن بھی تھا۔ اسے ٹھکانے لگا کر یقیناً میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہوتا۔ اس اہم معاملے پر سوچتے سوچتے میرا ذہن تھک گیا تو اپنی توجہ مبذول کرنے کے لئے میں دوبارہ اخبار پڑھنے لگی۔ سٹی پیج پر شائع ہونے والی سنگل کالم خبر کی

ایک سرخی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ''پروفیسر ہاورڈ کے اعزاز میں عشائیہ۔'' میں تیزی کے ساتھ اس خبر کو پڑھ گئی اور اسی کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ خبر کے مطابق آج رات نو بجے ایک فائیو اسٹار ہوٹل اشوکا میں ہند امریکی دوستی کی ایک مقامی انجمن ڈاکٹر رچرڈ کے اعزاز میں ایک عشائیہ دے رہی تھی۔ عموماً ایسی تقریبات میں مقامی صحافیوں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے تاکہ پریس کوریج ہو سکے۔ میں نے سوچا کہ صادق ماموں اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں اور ان کے توسط سے مجھے اس تقریب کا دعوت نامہ مل سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بھری پری تقریب میں تو ڈاکٹر رچرڈ پر قاتلانہ حملہ کرنا ممکن نہیں تھا مگر تقریب ختم ہونے کے بعد میں اس کا تعاقب کر کے یہ ضرور معلوم کر سکتی تھی کہ اس کا قیام کہاں ہے!

صادق ماموں اخبار میں نائٹ شفٹ کی ذمے داریاں پوری کر کے صبح چار بجے کے قریب آتے تھے اور پھر نیند پوری کرنے کے لئے دوپہر تک سوتے رہتے تھے۔ وہ اسی لئے اب تک سوئے ہوئے تھے۔ جب وہ سو کر اٹھ جاتے تو میں ان سے تقریب کے دعوت نامے کی بات کر سکتی تھی۔ قدرت نے ڈاکٹر رچرڈ تک پہنچنے کے لئے خود بخود راہ استوار کر دی تھی۔

میں ابھی اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ عقب سے قدموں کی چاپ ابھری' اسی کے ساتھ زاہد کی آواز سنائی دی۔ ''کن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہیں خاتون؟''

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کچھ نہیں...... آؤ!''

وہ میرے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر کہنے لگا۔ ''حضرت رقیب سے آج ایک خبر سنی ہے کہ حضور والا بلکہ والی بوریا بستر باندھ کر یہیں سے اپنے میکے یعنی پاکستان سدھارنے والی ہیں۔ کیا میں اس خبر کو صحیح سمجھ لوں یا محض افواہ پر محمول کروں؟''

''میرا تو خیال تھا کہ اپنے رقیب سے تمہاری صلح ہو چکی ہے!'' میں مسکرا کر بولی۔ میرا اشارہ ارشد علی کی طرف تھا جسے زاہد اپنی دانست میں اپنا رقیب سمجھتا تھا۔

''صلح ہو گئی ہے اسی لئے تو حضرت رقیب کہہ رہا ہوں ورنہ رقیب روسیاہ کہتا۔ بہرحال آپ میرے سوال کو باتوں میں نہ اڑائیں' خبر کی تصدیق یا تردید کریں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں ارادہ تو کیا تھا مگر شاید اب چند دن مزید رکنا پڑے۔''

''یہ ارادہ کہیں حضرت رقیب کے ایما پر تو نہیں بدلا؟''

''نہیں' ارشد کو تو ابھی اس کا علم بھی نہیں۔ میں نے ابھی کچھ ہی دیر پہلے مزید چند دن یہاں رکنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کہیں کوئی چکر تو نہیں چل رہا؟''

''کیسا چکر؟''

''وہی چکر جو ازل سے چلتا آ رہا ہے دو دلوں کے ملن کا چکر! اور اس ملن کے کچھ ہی دن بعد خواتین کا جی متلانے لگتا ہے اور سچ مچ چکر آنے لگتے ہیں!''

''یہ تم نے کیا بکواس شروع کر دی!'' میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر جھنجھلا گئی۔

''حقائق کو آپ بکواس نہیں کہہ سکتیں خاتون! آپ لاکھ نہ چاہیں مگر ایک نہ ایک دن آپ کو

بھی سچ مچ چکر آنے لگیں گے۔ دراصل ملن کے اس چکر کا منطقی نتیجہ چکر ہی ہیں۔''

''کیسا ملن، کس سے ملن؟ یہ تم نے کیا فضول باتیں شروع کر دیں!'' میں منہ بنا کر بولی۔

''میرا مطلب یہ تھا کہ کہیں پچھلی محبتوں کے زخم پھر سے تو ہرے نہیں ہو گئے جو آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا! حضرت رقیب جب آپ کی واپسی کا ذکر کر رہے تھے تو بڑے اداس تھے اور ظاہر ہے کہ یہ اداسی آپ سے بھی چھپی نہ رہ سکی ہو گی۔ خواتین کے متعلق یہ بھی تو غلط یا صحیح مشہور ہے کہ وہ بڑی نرم دل ہوتی ہیں خاص طور پر اپنے عاشق کی اداسی تو وہ برداشت کر ہی نہیں سکتیں۔''

ابھی زاہد کی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ ذکیہ بھی کمرے میں آ گئی۔ اس نے آتے ہی مجھے مخاطب کیا۔ ''باجی! کیا خیال ہے آج فلم نہ دیکھی جائے کوئی؟''

''یہ تمہیں اچانک فلم دیکھنے کی کیا سوجھ گئی؟''

''بس جی چاہ رہا ہے باجی!'' اس کا انداز بالکل ضدی بچوں ایسا تھا۔ ''نائٹ شو ٹھیک رہے گا میں نے ارشد بھائی سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ راضی ہیں مگر اس شرط پر کہ آپ بھی چلیں گی۔''

''سوری رانگ نمبر!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''آج ممکن نہیں۔''

''بھئی زاہد آپ ہی سمجھائیں نا باجی کو!'' ذکیہ ٹھنک کر بولی۔ ''کبھی کبھار تو ہم فلم کے لئے کہتے ہیں۔''

''سمجھ جائیں خاتون ورنہ اللہ آپ سے سمجھے گا!'' زاہد مجھ سے مخاطب ہوا۔

اگر مجھے آج رات نو بجے اشوکا ہوٹل کی اس تقریب میں شرکت کرنا ضروری نہ ہوتا جس میں ڈاکٹر رچرڈ آ رہا تھا تو یقیناً ذکیہ کی بات مان لیتی۔ بڑی مشکل سے میں نے ذکیہ کو سمجھایا کہ آج رات مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔

''اب آپ کے ضروری کام یہاں دہلی میں بھی شروع ہو گئے!'' ذکیہ منہ بنا کر کہنے لگی۔ پھر بولی۔ ''اچھا تو پھر کل کا وعدہ کر لیجئے ہاں!''

''کل کی بات کل کرنا! اس وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' میں نے یہ سوچ کر کیا معلوم کل کیا صورت ہو وعدہ نہ کیا۔ پھر میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''ذکیہ! کیا ضروری ہے کہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جاؤں، تم زاہد اور ارشد چلے جاؤ نا!'' یہ کہتے ہوئے بس اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ایسا خیال آیا کہ سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ذکیہ کو میں نے ڈاکٹر رچرڈ ہی کے خیال سے تو اب تک قاہرہ نہیں جانے دیا تھا اور وہ ان دنوں دہلی میں تھا۔ ایسی صورت میں ذکیہ کا آزادی سے گھومنا پھرنا کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔

مجھے گم صم دیکھ کر زاہد نے ٹوکا۔ ''خاتون! یہ آپ بیٹھے بیٹھے کہاں غائب ہو گئیں؟''

زاہد کے ٹوکنے پر میں چونک اٹھی اور بولی۔ ''ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟''

''آپ ہی ذکیہ خاتون کو ایک نیک مشورہ دے کر ایک دم اتنا غفیل ہو گئی تھیں ہم تو کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔''

''زاہد! اتنا غفیل کیا ہوتا ہے؟'' ذکیہ نے ہنس کر پوچھا۔

''کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں غفیل نامی ایک شخص ہوا کرتا تھا جس طرح کہ حکایتوں میں ہوا کرتا ہے۔ بھائی غفیل کے بڑے بھائی کفیل نے ایک رز.....''

''زاہد'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''پلیز اس وقت تم بے پر کی نہ اڑاؤ!'' پھر کچھ سوچتے ہوئے میں نے ذکیہ سے کہا۔ ''فی الحال کچھ دن کیلئے تم سیر و تفریح کے سارے پروگرام موقوف کر دو!'' میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''وہ کیوں باجی! یہ اچانک......'' ذکیہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ''ابھی تو کچھ دیر پہلے آپ کہہ رہی تھیں کہ میں زاہد اور ارشد بھائی کے ساتھ......''

''کوئی وجہ ہے نا اس کی!'' میرے لہجے کی سنجیدگی برقرار تھی۔

''وہی تو یہ جاننا چاہ رہی ہیں محترم خاتون!'' زاہد بھی بولے بغیر نہ رہ سکا۔

زاہد کی بجائے میں نے ذکیہ کو مخاطب کیا۔ ''میں تمہیں اس کی وجہ بتا دوں گی۔''

''ٹھیک ہے آپ کا حکم ہے تو پھر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' ذکیہ نے سعادت مندی کے ساتھ کہا۔

''ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔'' میں نے طویل سانس لے کر مزید کہا۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی کہ تم میری بات نہیں ٹالو گی۔''

''اور وہ وجہ تو رہ گئی!'' زاہد نے مداخلت کی۔

''اس وجہ کا تعلق تم سے نہیں ذکیہ سے ہے سمجھے کچھ!'' میں نے زاہد کو آنکھیں دکھائیں۔ ''تمہیں ذکیہ کی طرف سے وکالت کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''اس موقع پر مجھے فارسی کی ایک مثال یاد آ رہی ہے' سگے باش برادر خورد نہ باش! اس کا مطلب سلیس اردو میں یہ ہے کہ کتا ہو چھوٹا بھائی نہ ہو۔ اب آپ اس مثل کو اگر چاہیں تو برادر خورد کی جگہ ہمشیرہ خورد میں بھی بدل سکتی ہیں۔'' زاہد نے حسب عادت چوٹ کی۔

''اس طرح شائد تم خود کو پڑھا لکھا ثابت کرنا چاہتے ہو!'' میں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے اردو کی ایک کہاوت نہیں سنی شاید' پڑھیں فارسی بیچیں تیل' یہ دیکھو قدرت کے کھیل۔''

پھر مزید کچھ دیر نوک جھونک کے بعد زاہد نے میری جان بخش دی۔ اسی روز دوپہر کو موقع دیکھ کر میں نے صادق ماموں سے بات کی۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں اکیلے تھے۔ توقع کے مطابق مجھے ان کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے' پھر انہوں نے کہا۔ ''حیرت ہے عذرا کہ تم اس بور تقریب میں جانا چاہتی ہو! وہاں چند رسمی قسم کی تقریروں کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ ان تقریروں میں ہندوستان اور امریکہ کے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا جائے گا اور آئندہ کے لئے تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کی بات ہو گی اور بس! تم آخر کیوں جانا چاہتی ہو وہاں؟''

صادق ماموں کا سوال میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں اس کے لئے پہلے سے تیار تھی اسی سبب فوراً بول اٹھی۔ ''دراصل ماموں جان میں نے اشوکا ہوٹل نہیں دیکھا اس بہانے اسے اندر سے دیکھ لوں گی۔ آپ کو تو معلوم ہے مجھے سیر و سیاحت کا کتنا شوق ہے!''

"مگر اس کے لئے اس تقریب میں جانا تو ضروری نہیں۔ تم کسی بھی دن ارشد کے ساتھ وہاں جاسکتی ہو۔" صادق ماموں بولے۔

"فضول خرچی کی میں قائل نہیں' وہاں ہم لوگ جائیں گے تو ظاہر ہے کچھ کھانا پینا پڑے گا۔" میں نے جواز پیش کیا۔ "ایسے ہوٹلوں میں تو صرف ناشتا کرنا بھی بہت مہنگا ہوتا ہے۔"

میری بات پر صادق ماموں مسکرائے پھر کہنے لگے۔ "یہ بات کسی مرد کے ذہن میں نہ آتی۔ اسی لئے تو عورتوں کو کفایت شعار کہا جاتا ہے۔ میں ابھی فون کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ دعوت نامہ مل جائے گا۔" یہ کہہ کر صادق ماموں اٹھ کھڑے ہوئے۔ فون انہی کے کمرے میں تپائی پر ایک جانب رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے فون پر پہلے اپنے دفتر کے رپورٹنگ روم سے بات کی پھر کوئی نمبر لکھا اور سلسلہ منقطع کر کے وہ نمبر ملانے لگے۔ چند ہی لمحے بعد غالباً دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔ صادق ماموں نے اپنا تعارف کریا' پھر مطلب کی بات کرنے لگے۔ انہوں نے فون پر بات کرنے والے کو بتایا تھا کہ میری ایک عزیزہ اس تقریب میں شریک ہونا چاہتی ہے۔ دوسری جانب سے شاید نام پوچھا گیا کیونکہ چند لمحے توقف کے بعد صادق ماموں نے میرا نام لیا تھا۔ پھر وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ "ٹھیک ہے آپ دعوت نامہ میرے دفتر بھجوا دیں۔ شکریہ!" یہ کہہ کر انہوں نے کریڈل پر ریسیور رکھ دیا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "لو بھئی تمہارا مسئلہ حل ہو گیا۔ میں کچھ دیر بعد دفتر جاؤں گا تو دعوت نامہ وہاں پہنچ چکا ہوگا۔ میں اپنے ساتھ واحد کو دفتر لے جاؤں گا وہ دعوت نامہ لے کر آ جائے گا۔"

"میری ذرا سی خواہش کی خاطر ناحق آپ کو زحمت ہو رہی ہے۔" میں بولی۔

"نہیں بیٹی زحمت کی اس میں کیا بات ہے! مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ اچھا چلو اب کھانا کھاتے ہیں۔" وہ کھڑے ہو گئے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد صادق ماموں نے کچھ دیر آرام کیا پر واحد کو لے کر اپنے دفتر روانہ ہو گئے۔

واحد گھنٹے بھر بعد لوٹا تو میری بدقسمتی سے اس وقت میرے پاس زاہد اور ارشد بھی بیٹھے تھے۔ اس کے ہات میں دعوت نامہ تھا۔ میں نے اسے فی الحال دعوت نامہ نہ دینے کے لئے آنکھ سے اشارہ بھی کیا مگر وہ "جی باجی" کہہ کر دعوت نامہ میری طرف بڑھانے لگا۔ مجبوراً مجھے اس سے دعوت نامہ لینا پڑا جس پر انگریزی میں میرا نام ٹائپ کیا گیا تھا۔

"آپ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مجھ سے باجی!" واحد پھر بول اٹھا۔

"کچھ نہیں بھئی!" میں نے بمشکل اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پا کر کہا۔ "تم جاؤ!" اس جھنجلاہٹ کے سبب میں اس غریب کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی اور وہ کمرے سے چلا گیا۔ دراصل غلطی میری ہی تھی۔ مجھے پہلے ہی واحد سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ دعوت نامہ اس وقت مجھے دے جب میرے پاس کوئی نہ ہو۔

"کیا ہے یہ؟" زاہد کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ارشد بول اٹھا۔ "لفافہ تو بہت خوبصورت ہے۔"

"کچھ نہیں ایک تقریب کا دعوت نامہ ہے۔" میں نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

"تقریب..... ؟ کیسی تقریب..... ؟ آپ نے ذکر نہیں کیا اس کا..... ! اور یہ..... یہ دعوت نامہ واحد کیوں لایا ہے؟" ارشد کے لہجے میں تجسس تھا۔

مجھے جس بات کا ڈر تھا وہی ہوئی مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے زاہد بول اٹھا۔ "ارے جناب ان خاتون کی سرگرمیاں انتہائی پر اسرار ہیں۔ یہ دوسروں پر تو گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دیتی ہیں اور خود اڑی اڑی پھرتی ہیں۔"

"بکواس نہ کرو!" میں نے زاہد کی طرف دیکھ کر کہا پھر ارشد سے مخاطب ہوئی۔ "دراصل..... " میں نے ارشد سے بھی مجبوراً وہی بہانہ کیا جو صادق ماموں سے کر چکی تھی۔

ارشد کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ میرے چپ ہوتے ہی زاہد شوخ لہجے میں ارشد سے بولا۔ "پیارے بھائی! غم نہ کرو' انہیں اکیلے اکیلے سیر سپاٹے کرنے دو' ہم دونوں بھی دکلے دکلے گھومیں پھریں گے اور انہیں اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔"

"میاں! تمہارے ساتھ گھوم پھر کے کیا مجھے اپنے دماغ کے کیڑے جھڑوانے ہیں!" ارشد ہنس کر بولا۔

"ویسے کیڑے جھڑوانا صحت کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ پیارے بھائی! یقین نہ ہو تو ان خاتون سے پوچھ لیں۔" زاہد بدستور چہکتا رہا۔

"کیا یہ بھی تمہاری خدمات حاصل کر چکی ہیں اس سلسلے میں؟" ارشد ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"ابھی انہوں نے اس خادم کو خدمت کا موقع کہاں دیا ہے! ابھی تو یہ اپنے پہلے ہی طالبان خدمت کی درخواستوں پر غور وخوض نہیں کر پائیں' اپنی باری تو بعد میں آئے گی۔" زاہد نے ایک ساتھ اور ایک ہی تیر سے مجھے اور ارشد دونوں کو نشانہ بنایا۔

"تمہیں خواتین کی خدمت کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر اب تک لنڈورے کیوں پھر رہے ہو؟" ارشد نے بھی جواباً اسے رگیدا۔

"اپنے پیش روؤں کی تقلید کر رہا ہوں۔" زاہد نے پھر ارشد پر چوٹ کی۔

ارشد کا یہ کمزور پہلو تھا اس لئے اس کے چہرے پر قدرے ناگواری کے آثار نظر آنے لگے۔ میں نے فضا کے تکدر کو دور کرنے کیلئے زاہد کی طرف دیکھتے ہوئے ارشد سے کہا۔ "آپ نے بے نتھے بیل دیکھے ہیں' یہ حضرت بھی انہی میں سے ہیں۔ انہیں بس سینگ مارنے کا شوق ہے۔"

"سوچ لیں خاتون اگر آپ انے اس خادم کو بیل کہہ رہی ہیں تو پھر آپ کو بھی اپنی جنس پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ ویسے باتوں باتوں میں آپ کو میں ایک دھمکی دینا تو بھول ہی گیا! اگر اب آپ نے میری شان میں کوئی ایسی ویسی نازیبا بات کی تو ذکیہ خاتون کو سب کچھ بتا کر آپ کی طرف سے ہشکا دوں گا۔ میں انہیں بتا دوں گا کہ آپ پر گھر سے نہ نکلنے کی پابندی لگا کر آپ کی باجی محترمہ اکیلے اکیلے اپنا شوق پورا کر رہی ہیں۔ بولیں جلدی سے اپنے الفاظ واپس لے رہی ہیں یا میں جاؤں ابھی آپ کی بہنا کے پاس!"

"دیکھو زاہد اگر اس سلسلے میں تم نے ذکیہ کو کچھ بتایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا!" میں نے

سخت لہجے میں کہا۔

''تو پھر واپس لیں اپنے الفاظ! کہیں کہ میں بے نتھا بیل نہیں ہوں۔'' وہ بولا۔

''اچھا الفاظ واپس!'' میں نے مسکرا کر کہہ دیا کیوں کہ اس شرارتی سے بعید نہیں تھا کہ وہ شرارت ہی شرارت میں اپنی دھمکی کو سچ ثابت کر دکھاتا۔

''یہ ذکیہ پر گھر سے نہ نکلنے کی پابندی لگانے کا کیا قصہ ہے؟'' ارشد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''کیا یہ موصوف ٹھیک کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا پھر بات بنائی۔ ''دراصل ڈاکٹر کی ہدایت پر میں نے ایسا کہا ہے۔''

''لیکن ذکیہ تو اب بالکل نارمل ہو چکی ہے اور پہلے...... پہلے تو ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا کہ ذکیہ کو سیر و تفریح کی ضرورت......''

''وہ پہلے کی بات تھی۔'' میں بات کاٹ کر بولی۔ ''اب نارمل ہونے کے بعد اسے کچھ دن مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

''سب بہانے ہیں پیارے بھائی' اکیلے گھومنے کے!'' زاہد بولا۔ وہ ارشد سے مخاطب تھا۔ ''چلیں ذکیہ خانم کے متعلق ان کی بات سچ بھی مان لی جائے تو یہ مجھے اور آپ کو چھوڑ کر کیوں اکیلے اس تقریب میں جا رہی ہیں؟ آپ تو خدانخواستہ مینٹل کیس نہیں ہیں! اور اپنے بارے میں ایک سو ایک فیصد مجھے معلوم ہے کہ......''

''تم مینٹل کیس ہو۔'' میں نے جلدی سے زاہد کی بات پوری کر دی۔

''جی نہیں' مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''مینٹل کیس ہونا آپ کی بہن اور آپ ہی کو مبارک ہو۔''

''سنو زاہد!'' ارشد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ایسی کوئی بات کبھی ذکیہ کے سامنے نہ کرنا! اس سے اس کے ذہن پر غلط اثر پڑے گا۔''

''معلوم ہے مجھے پیارے بھائی! یہ تو میں ان محترمہ کو سلگانے کے لئے کہہ رہا تھا۔'' زاہد نے کہا۔

''یہ الگ بات کہ سلگانے کے شوق میں اکثر خود ہی تمہیں سلگنا پڑتا ہے۔'' میں مسکرا کر بولی۔

''کیا خیال ہے عذرا' چائے نہ پی لی جائے؟'' ارشد نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں کوئی مضائقہ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

پھر کچھ دیر بعد ہم سب نے چائے پی اور وہ دونوں میرے کمرے سے چلے گئے۔ تنہائی ملتے ہی جانے کیوں مجھے کچھ بے چینی محسوس ہونے لگی۔ میں آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹ گئی لیکن ذرا ہی دیر میں بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ بستر سے اٹھ کر میں ٹہلنے لگی۔ عموماً اس قسم کی بے چینی کسی خطرے ہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی تھی۔ میں نے کافی دیر سوچا مگر خطرے کی نوعیت میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ بار بار میرے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ مجھے کس شخص کی طرف سے اور کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟

بظاہر تو خطرے کی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر میں نے یہ سوچ کر اپنے ذہن کو مطمئن کرنا چاہا کہ دہلی میں ڈاکٹر رچرڈ کی موجودگی لاشعوری طور پر میرے ذہن کی بے چینی کا سبب ہے' مجھے شاید لاشعوری طور پر اس کی طرف سے کسی خطرے کا اندیشہ ہے۔ مجھے یہ محسوس کر کے حیرت ہوئی کہ اس کے بعد میری بے چینی کچھ کم ہو گئی۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ میرا سوچنا درست ہی ہے۔

اسی روز شام کو چھ بجے کے قریب غیر متوقع طور پر شاہد نے مجھے آ کر بتایا کہ میرا فون ہے۔

''میرا فون!'' میں حیرت سے بولی پھر کہا۔ ''تم نے پوچھا کون بات کرنا چاہتا ہے؟''

''یہ تو نہیں پوچھا میں نے مگر لہجے سے وہ غیر ملکی معلوم ہوتا ہے۔ وہ بات تو اردو ہی میں کر رہا تھا مگر......''

''غیر ملکی!'' میں بڑبڑائی اور اسی کے ساتھ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ میں تیزی کے ساتھ اپنے کمرے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی صادق ماموں کے کمرے تک پہنچی کیوں کہ فون انہی کے کمرے میں تھا۔ ریسیور الگ رکھا تھا۔ میں نے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے اٹھا کر کان سے لگایا اور بولی۔ 'ہیلو! میں عذرا خان بول رہی ہوں۔''

جواب میں دوسری جانب سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی جسے سن کر میرے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ الفاظ انگریزی میں ادا کئے گئے تھے۔ ''ہاؤ آر یو مائی سویٹ ہارٹ؟''

''ہو آر یو؟'' میں نے دانستہ انجان بن کر کہا۔ ''پرہیپس یو آر اے باسٹرڈ!''

''ناٹ باسٹرڈ ڈیٹ یور لور مائی سویٹ ہارٹ!'' وہ بے حیائی سے ہنس کر بولا۔ ''یور لور ڈاکٹر رچرڈ!'' پھر وہ کہنے لگا کہ اتنے دنوں بعد تمہاری آواز سن کر میرے سارے جسم میں لذت آمیز سنسنی دوڑ گئی ہے اور میں خود کو جوان محسوس کرنے لگا ہوں۔

''لگتا ہے ڈاکٹر رچرڈ کہ اب تمہارا آخری وقت آ ہی گیا ہے اور تمہاری موت میرے ہاتھوں سے لکھی ہے۔'' میں نے دانت پیس کر انگریزی میں کہا۔

''مگر اس سے پہلے ایک بار' بس ایک بار میرے دل کی حسرت پوری کر دو!'' وہ ڈھٹائی سے کہنے لگا۔ ''میری جان! تمہیں نہیں معلوم کہ یہ تمہارے عشق نے مجھ پر کیا ستم ڈھایا ہے۔''

''کیا تم نے یہی بکواس کرنے کے لئے فون کیا تھا مجھے؟'' میں غصے سے بولی۔ ''میں فون بند کر رہی......''

''نہیں نہیں' ایسا نہ کرنا میری جان! ابھی تو مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ آج دیدار کرا رہی ہو نا؟ میرا مطلب ہے اشوکا ہوٹل کے عشائیے میں آ رہی ہو؟''

میں نے اس کی بات سن کر طویل سانس لیا پھر بولی۔ ''تو تمہیں معلوم ہو ہی گیا!''

''سولومن سے مجھے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ تم مشرقی پاکستان سے ہندوستان آ چکی ہو۔ پاکستان سے پہلے ہمارے ایجنٹوں نے یہ تصدیق کر دی تھی کہ تم وہاں نہیں ہو۔ اس کا یہی مطلب ہو سکتا تھا کہ ابھی تم ہندوستان ہی میں ہو مگر ہندوستان میں کس جگہ ہو اس سلسلے میں معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ تم نے ہندوستان میں اتنی دیر کیوں لگا دی! ہم لوگ اور خاص طور پر تمہارا یہ بوڑھا عاشق تمہاری

طرف سے بہت فکر مند تھا۔ تم خود ہی سوچو کہ اگر کسی بوڑھے عاشق کی نوجوان محبوبہ گم ہو جائے تو اس کے دل پر کیا گزر سکتی ہے! میں نے سولومن کو سختی کے ساتھ حکم دیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح تمہیں تلاش کرے اور تمہیں...... تمہیں میرے پاس قاہرہ بھیج دے تاکہ میں اپنے ارمان پورے کرنے کے بعد تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں کیونکہ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے بعد میری محبوبہ کسی اور شخص کے پہلو کی زینت بنے۔'' ڈاکٹر رچرڈ انگریزی میں روانی سے بولے جا رہا تھا۔ ''تمہاری وجہ سے پاکستان میں ہمارے کاز کو شدید نقصان پہنچا ہے اور ہمارے ایجنٹوں کی بڑی تعداد گرفتار کر لی گئی ہے یا انہیں ٹھکانے لگا دیا گیا ہے جن میں سے بہت سے تمہارے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ تم ہمارے لئے ایک مستقل خطرے کی حیثیت اختیار کر گئی ہو اور ماضی میں بھی ہمیں تمہارے ہاتھوں متعدد بار بے شمار نقصانات اٹھانا پڑے ہیں اس لئے اب میرے ملک کی ہائی کمان یہ چاہتی ہے کہ ہمیشہ کیلئے اس خطرے کو ختم کر دیا جائے۔ گزشتہ ماہ مجھے قاہرہ میں اپنی ہائی کمان کی طرف سے یہ احکام ملے تھے۔ اسی کے بعد میں نے سولومن کو تمہاری تلاش کا حکم دیا اور جب وہ مقررہ مدت میں تمہیں نہ ڈھونڈ سکا تو مجبوراً مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ تو سنو میری جان! تمہارا یہ بوڑھا عاشق تمہاری ہی تلاش میں ہندوستان آیا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں نے تمہاری تلاش کا منصوبہ بنا لیا تھا جس کے متعلق سو فی صد مجھے یقین تھا کہ یہ منصوبہ کامیاب رہے گا۔ اسی منصوبے کے تحت اپنی حکومت اور امریکی سفیر کی مدد سے میں دانستہ میک اپ کے بغیر بھارتی وزیر اعظم سے ملا۔ مجھ ایسے شخص کے لئے یہ ایک خطرناک قدم تھا مگر تمہارے عشق میں مجھے یہ قدم بھی اٹھانا پڑا۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنے اعزاز میں آج امریکی سفیر سے کہہ کر ایک عشائیے کا بندوبست بھی کرایا۔ مجھے یقین تھا کہ تم ہندوستان کے جس شہر میں اور جہاں بھی ہو گی بھارتی وزیر اعظم کے ساتھ میری تصویر دیکھ کر چونک اٹھو گی اور پھر میرا عشق تمہیں کشاں کشاں دہلی آنے پر مجبور کر دے گا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ تم میرے اعزاز میں دیئے جانے والے عشائیے میں بھی ضرور شرکت کی کوشش کرو گی۔ میں نے اسی لئے احکام دیئے تھے کہ عشائیے میں مدعو کی جانے والی تمام خواتین کو چیک کیا جائے اور اگر آخری دن یعنی آج کوئی خاتون عشائیے کا دعوت نامہ کسی ذریعے سے حاصل کرنا چاہے تو فوری طور پر مجھے اس کی رپورٹ دی جائے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم نے دعوت نامے کے حصول کی خاطر کوئی فرضی نام استعمال نہیں کیا۔ پھر ظاہر ہے کہ وہ ذریعہ معلوم کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی جسے تم نے دعوت نامے کیلئے استعمال کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ دعوت نامے کی سفارش تمہارے کسی صحافی عزیز نے کی تھی۔ اس کا بھی سراغ مل گیا' پھر بقیہ معلومات بھی حاصل کر لی گئیں جس کے نتیجے میں اس وقت میں تمہیں فون کر رہا ہوں' اگر تم اس تقریب کے لئے دعوت نامہ حاصل نہ کرتیں اور میری یہ توقع پوری نہ ہوتی تو مجھے مزید کچھ سوچنا پڑتا لیکن اب ...... اب میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب میری جان ہجر کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تم خود ہی مجھ تک چلی آؤ گی یا میرے آدمیوں کو یہ زحمت اٹھانا پڑے گی؟'' ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے مجھے بولنے کا موقع دیا۔

''ڈاکٹر رچرڈ! تمہاری موت خود ہی تم تک پہنچ جائے گی' اپنی موت کا انتظار کرنا! خدا حافظ!''

یہ کہتے ہی میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

جب میں فون پر ڈاکٹر رچرڈ سے بات کر کے صادق ماموں کے کمرے سے نکل رہی تھی تو جیسے میرا پورا وجود آندھیوں کی زد پر تھا اور میں ان تیز آندھیوں میں کسی تنکے کی طرح اڑی جا رہی تھی۔

اب مجھے جلد از جلد چند اہم اقدامات اٹھانا تھے۔ ان اقدامات میں سب سے پہلا اقدام اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کے تحفظ کا تھا۔ ایسی صورت میں جب کہ ڈاکٹر رچرڈ کو میری سکونت کے متعلق علم ہو چکا تھا اور اب اس سے مجھے برسر پیکار ہونے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا ذکیہ میرا ویک پوائنٹ بن سکتی تھی۔ میرے خیال میں اب اسے دہلی میں نہیں رہنا چاہئے تھا۔ مجھے خود سے زیادہ ذکیہ کی فکر تھی۔ میں نے اسے فوری طور پر گھر پر تلاش کیا۔ وہ مجھے شاہد کی دلہن کے پاس مل گئی۔

''آیئے باجی!'' شاہد کی دلہن نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''شکریہ! مجھے ذرا ذکیہ سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔ ذکیہ! آؤ ذرا!''

''کبھی ہمیں بھی بلا لیا کریں خاتون...... ! ہم سے بھی ضروری بات کر لیا کریں۔'' عقب سے مجھے زاہد کی آواز سنائی دی۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ دروازے سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے میرا جملہ سن لیا ہو گا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم سے بھی ضروری بات کرنا ہے مگر پہلے میں ذکیہ سے بات کر لوں۔ اتنے میں تم فون پر ایئر پورٹ انکوائری میں یہ معلوم کرو کہ کلکتے کے لئے پہلی فلائٹ کس وقت مل سکتی ہے!''

''کلکتے کے لئے فلائٹ...... ! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ خاتون.... ؟ کیا تنگ آ گئی ہیں اس فقیر پر تقصیر سے؟'' زاہد بولا۔

''تم سے جو کہا ہے وہ کرو!'' یہ کہہ کر میں نے ذکیہ کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اسے بہر حال اعتماد میں لینا ضروری تھا۔

ذکیہ میرے ساتھ اٹھ آئی اور ساتھ ہی زاہد بھی باہر نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے ایک بار پھر مجھ سے کہا۔ ''کیا واقعی آپ سیریس ہیں' کچھ بتائیں تو سہی کہ آخر چکر کیا ہے؟''

''بتا دوں گی' تم پہلے ایئر پورٹ انکوائری سے ضروری معلومات حاصل کر لو۔ میں اپنے کمرے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گئی۔ پھر میں ذکیہ کو جلد ہی اپنے کمرے میں لے آئی اور احتیاطاً اندر سے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔

''کیا اتنی راز داری کی بات ہے باجی؟'' ذکیہ حیران ہو کر بولی۔

''ہاں ذکیہ!'' میں نے طویل سانس لے کر جواب دیا اور آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

ذکیہ بھی میری تقلید میں سامنے کرسی پر آ بیٹھی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''ذکیہ! تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ میں نے اب تک تمہیں قاہرہ جانے سے کیوں روک کے رکھا تھا!''

''جی ہاں' جانتی ہوں میں!'' ذکیہ نے فوراً جواب دیا۔ ''وہاں میرے لئے کچھ خطرات تھے۔''

''وہی خطرات اب یہاں دہلی میں پیدا ہو گئے ہیں۔ میں نے اسی وجہ سے آج صبح تمہیں گھر سے باہر نہ نکلنے کی تاکید بھی کی تھی لیکن اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تمہیں فوری طور پر دہلی سے کہیں

اور چلا جانا چاہئے۔ اس کے لئے فی الحال محفوظ جگہ میرے نزدیک کلکتہ ہے۔ تم وہاں جا سکتی ہو۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک اور تجویز بھی ہے کہ تم فی الوقت کراچی چلی جاؤ مگر وہاں تمہیں کلکتے کی طرح آزادی نہیں ملے گی۔ تمہیں میرے آدمیوں کی نگرانی میں رہنا پڑے گا جس طرح پہلے رہی تھیں۔''

''نہیں باجی!'' اس نے بے ساختہ جواب دیا۔ ''پہلے بھی میں وہاں بہت بور ہو گئی تھی اس سے تو اچھا ہے کہ میں کلکتے چلی جاؤں۔''

''پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

''باجی! یہ آپ کے چکر کیا ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں؟ یہاں بھی آپ کو سکون نہیں۔''

میں اس کی بات سن کر مسکرا دی اور پھر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ اسی کے ساتھ زاہد کی آواز آئی۔ ''فریادی حاضر ہے ملکہ عالیہ! در دولت کھول دیجئے!''

کشیدہ اعصاب کے باوجود اس وقت زاہد کی آواز سن کر مجھے ہنسی آ گئی اور میرے اشارے پر ذکیہ نے دروازہ کھول دیا۔

''تو بند کمرے میں ملکہ عالیہ کے اس خادم کے خلاف سازش تکمیل پا چکی ہے!'' زاہد نے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے عجیب مضحکہ خیز انداز میں چاروں طرف دیکھا جیسے سازش کرنے والوں کو تلاش کر رہا ہو۔

''زاہد! اگر تم اب سے دو تین صدی پہلے ہوتے تو یقیناً کسی دربار میں مسخرے ہوتے۔ تمہاری ساری حرکتیں درباری مسخروں ایسی ہیں۔'' میں نے موقع غنیمت جان کر اس پر فقرہ لگایا پھر اسے مزید بولنے کا موقع دیئے بغیر فوراً کہنے لگی۔ ''ایئر پورٹ انکوائری سے کلکتے جانے والی فلائٹ کے بارے میں معلوم کیا تم نے؟''

''جی ہاں کیوں نہیں! لیکن فلائٹ کے بارے میں اس وقت کچھ بتایا جائے گا جب ملکہ عالیہ اس راز سے پردہ اٹھا دیں گی کہ یہ سب کیا چکر چلایا جا رہا ہے؟'' وہ بولا۔

''تمہارا اندازہ درست تھا۔ بند کمرے میں تمہارے خلاف سازش کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق تم پہلی فلائٹ سے ذکیہ کو ساتھ لے کر کلکتے روانہ ہو رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''کیا..... کیا مطلب..... ؟ یعنی ملکہ عالیہ نے اس خادم کو دربار بدر کرنے کا فیصلہ.....''

''جی ہاں' فیصلہ ہو چکا ہے اور اب تمہیں اس پر عمل کرنا ہے!'' میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ ''اب جلدی سے بتا دو کہ انکوائری سے کیا معلوم ہوا؟''

پھر زاہد نے بتا دیا کہ آج رات نصف شب کے قریب کلکتے کے لئے ایک فلائٹ مل سکتی ہے مگر وہ اس وقت تک ذکیہ کو ساتھ لے کر کلکتے جانے پر بظاہر آمادہ نہیں تھا جب تک اسے وجہ نہ بتا دی جاتی کہ فوری طور پر ایسا کیوں کیا جا رہا ہے! نتیجتاً مجھے سنجیدہ ہونا پڑا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ بعض ناگزیر وجوہ ایسی ہیں جو ناقابل بیان ہیں۔ تمہارے لئے بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ یہاں ذکیہ محفوظ نہیں ہے اور تمہیں اسے بحفاظت کلکتے لے جانا ہے۔

''تو کیا ان خبیثوں ہرنارائن جی اور جانکی پرشاد نے پھر کوئی چکر چلا دیا ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے

کہ ابھی کچھ دیر پہلے کسی نے آپ کو فون بھی کیا تھا۔'' زاہد نے قیاس آرائی کی۔

''نہیں یہ اور معاملہ ہے۔'' میں نے دروغ گوئی سے اجتناب کیا۔

مجھے سنجیدہ دیکھ کر زاہد نے پھر کوئی سوال نہیں کیا البتہ وہ کچھ اداس سا ضرور ہو گیا۔ وہ غالباً ذہنی طور پر اچانک مجھ سے جدا ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ مجھے اس سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا لیکن دل میرا بھی اداس تھا۔ اس کے ساتھ بہر حال میرا وقت اچھا گزر جاتا تھا۔

''تم اس طرح ایک دم اداس ہو گئے جیسے کوئی لڑکی پہلی بار میکے سے سسرال جاتی ہے۔'' میں نے فضا میں پھیل جانے والی اداسی کو دور کرنے کے لئے ہنس کر زاہد سے کہا۔

''بس رہنے دیں' آپ بڑی وہ ہیں!'' اس نے یوں منہ بنا کر یہ الفاظ ادا کئے کہ میرے ساتھ ساتھ ذکیہ بھی زور سے ہنس پڑی۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد میں نے زاہد کو ٹکٹ لینے بھیج دیا اور اس کے جاتے ہی اپنا سامان بھی جلدی جلدی پیک کرنے لگی۔ اسی کے ساتھ ساتھ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے مالی صورت حال کا بھی جائزہ لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ذکیہ کی ہندوستان کی کئی بینکوں میں خاصے پیسے پڑے تھے۔ گزشتہ دنوں اس نے میرے ایما پر دہلی کی ایک بینک سے خاصی رقم نکلوائی تھی۔ اس رقم میں سے میں نے کچھ نہیں لیا تھا کیونکہ میرا ارادہ اس وقت پاکستان واپسی کا تھا اور اتنی رقم میرے پاس تھی کہ پاکستان پہنچ جاتی مگر اب کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میری پاکستان واپسی کب ہوتی! میں نے اسی لئے ذکیہ سے اتنی رقم لے لی کہ اگر دو ایک مہینے دہلی میں گزارنا پڑیں تو مجھے پریشانی کا سامنا نہ ہو۔

اپنا سامان پیک کرنے کے بعد میں نے صادق ماموں کو ان کے دفتر فون کیا۔ میری اور ذکیہ کی اچانک روانگی سے وہ کچھ پریشان ہو گئے۔ بہر حال میں نے انہیں کسی طرح سمجھا بجھا گیا۔ اب دوسرا مرحلہ ممانی اور ارشد علی سے بات کرنے کا تھا۔ معلوم نہیں ارشد علی کو کیسے سن گن ہو گئی کہ میں روانگی کی تیاری کر رہی ہوں۔ نتیجتاً وہ دوڑا دوڑا تیسری منزل پر میرے کمرے میں چلا آیا جہاں ذکیہ بھی میرے ساتھ تھی۔

''یہ اچانک آپ..... آپ اور..... اور.....'' جوش و جذبات کے سبب اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ''آپ کہاں جا رہی ہیں..... ؟ کیا کسی سے کوئی بات ہو گئی؟''

''نہیں بھئی' ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔'' میں نے مسکرا کر اپنے ایئر بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔

''پھر..... پھر اچانک کیوں جا رہی ہوں؟'' اس نے سوال کیا۔

''ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا نا! پھر آج ہی چلے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے!''

''نہیں میں نہیں مان سکتا..... ! کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے ورنہ دو چار روز پہلے سے آپ نے اس سلسلے میں کچھ کہا ہوتا۔ یہ..... یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ سنئے عذرا! اگر..... اگر میرے گھر کے کسی فرد نے آپ کی دل آزاری کی ہے تو..... تو میں اس کی طرف سے معافی مانگ..... مانگ لیتا ہوں' مگر آپ کو یوں..... یوں نہیں جانے دوں گا' خفا ہو کر!'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے ارشد علی کی آواز بھرا گئی۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ! بخدا کسی نے میری دل آزاری نہیں کی اور یقین کریں کہ میں ہرگز خفا نہیں ہوں۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"آپ..... آپ قسم کھا رہی ہیں تو یقین کئے لیتا ہوں۔" اس کے لہجے میں عجیب سی بے بسی تھی۔ "ویسے کیا پاکستان واپس جا رہی ہیں؟"

"ابھی نہیں! مگر کہاں جا رہی ہوں یہ بتانا میرے لئے مشکل ہے مگر اتنا وعدہ رہا کہ اگر موقع ملا تو میں پاکستان روانہ ہونے سے پہلے ایک بار آپ لوگوں سے ملنے ضرور آؤں گی۔"

"آپ..... ہندوستان ہی میں رہیں گی تو کیا کلکتے جا رہی ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"کلکتے ڈکیہ جا رہی ہے زاہد کے ساتھ!" میں نے بتایا۔

"کیا؟" وہ چونک کر بولا۔ "تو یہ..... یہ بھی جا رہی ہیں؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "زاہد آج رات کی ایک فلائٹ کے ٹکٹ لینے گیا ہے مگر میں ان دونوں کے ساتھ کلکتے نہیں جا رہی۔"

"اور جہاں جا رہی ہیں اس کے بارے میں بتانا نہیں چاہ رہیں۔ خیر نہ بتائیں لیکن اپنا وعدہ ضرور یاد رکھیے گا۔ پاکستان واپس جانے سے پہلے ملنے آئیں گی!"

"انشاء اللہ میں پوری کوشش کروں گی کہ اپنا وعدہ وفا کر سکوں۔" میں نے پر یقین لہجے میں کہا۔

ارشد علی سے نمٹنے کے بعد دوسرا مرحلہ ممانی کو یہ یقین دلانا تھا کہ میں کسی سے خفا ہو کر نہیں جا رہی۔ بہرحال یہ مرحلہ بھی کسی طرح طے ہو گیا۔ اب مجھے زاہد کی واپسی کا انتظار تھا۔ اس سے بھی میں آخری ملاقات کر لینا چاہتی تھی کیونکہ اب کلکتے جانے کا میرا ارادہ نہیں تھا۔

زاہد ٹکٹ لے کر لوٹا تو مجھے تیار دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ "ارے یہ آپ کہاں جانے کو پر تولے بیٹھی ہیں؟"

"ہاں زاہد میں تم دونوں سے پہلے جا رہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"مگر کہاں خاتون محترم.....؟ یہ..... یہ بھی خوب رہی! آپ نے اپنے متعلق تو بتایا ہی نہیں تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ یہیں رہیں گی۔"

"اچھا اب چلنے دو!" میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ایئر بیگ میں پہلے ہی اپنے شانے سے لٹکا چکی تھی۔ "زندگی رہی تو انشاء اللہ پھر کبھی ملاقات ہو گی۔ تم بھی تو آؤ کبھی پاکستان!"

جواباً میں نے زاہد کا چہرہ متغیر دیکھا اور اسی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ پہلی بار وہ مجھے انتہائی اداس نظر آیا تھا۔ اپنی آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس نے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا تھا۔ یقیناً اس کے دل میں میرے لئے بہت خلوص تھا۔

مین نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ تھپتھپایا اور بھاری آواز میں بولی۔ "پاگل ہو تم بالکل.....! ہنسو دانت دکھاؤ!"

اور وہ ہنس دیا۔ اسی کے ساتھ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ پھر میں سب لوگوں کو

خدا حافظ کہہ کر صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ کسی کو اپنے ساتھ چلنے سے میں نے پہلے ہی منع کر دیا تھا۔ چلتے چلتے پلٹ کر میں نے ارشد کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور محسوس کیا کہ اس کی پلکوں کے گوشے بھی پرنم ہیں۔ جواباً اس نے بھی ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہا تھا۔

مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ میں کہاں قیام پذیر ہوں ڈاکٹر رچرڈ نے میری نگرانی شروع کرا دی ہو گی۔ اس کے گرگے ادھر ادھر منڈلا رہے ہوں گے۔ میں دانستہ ان کی نظر میں آنا چاہتی تھی تاکہ ڈاکٹر رچرڈ کو یہ خبر مل جائے کہ میں نے اپنا ٹھکانا بدل لیا ہے۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ صادق ماموں کا گھر محفوظ ہو جائے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے صادق ماموں یا ان کے گھر والے کسی مشکل میں پھنس جائیں۔ یہ جنگ میری تھی اور میں اسے تنہا لڑنا بہتر سمجھتی تھی۔ کسی خالی ٹیکسی کے لئے مجھے پیدل باڑا ہندو راؤ کے چوراہے تک آنا پڑا۔ وہاں مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ میں کن انکھیوں سے اردگرد کا جائزہ لیتی ہوئی تیز قدمی سے خالی ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگی۔ ٹیکسی کے قریب پہنچ کر میں نے اس کے ڈرائیور سے کہا۔ "کناٹ پیلس چلو گے؟"

"ہاں جی کیوں نہیں..... ! بیٹھیں جی!" ٹیکسی والا بولا پھر میرے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھ کر کہنے لگا۔ "کہیں تو ڈگی کھول دوں جی؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں' صرف ایک سوٹ کیس اور یہ ایئر بیگ ہی تو ہے! اسے میں اپنے ساتھ رکھ لوں گی۔" یہ کہہ کر میں نے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ پہلے میں نے سوٹ کیس اندر سیٹ پر رکھا پھر خود بیٹھ گئی۔

ابھی میں ٹیکسی کا دروازہ بند کرنے والی تھی کہ اچانک ایک قوی ہیکل شخص کھلے دروازے سے اندر آ گیا۔ وہ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ پھر مجھے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس نے تیزی کے ساتھ دروازہ بند کیا اور پھر ریوالور کی ٹھنڈی نال میرے پہلو پر رکھ دی۔

"چیخنے چلانے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ریوالور کی نال پر دباؤ بڑھایا۔ اس کا لہجہ درندے کی غراہٹ سے مشابہہ تھا۔

اسی دوران میں ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اس نے ایک نظر مڑ کر دیکھا اور عجیب سے انداز میں مسکرایا' پھر ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ٹیکسی ڈرائیور بھی میرے اغوا کی سازش میں شریک تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور سوچا کہ ڈاکٹر رچرڈ کے مقامی گرگوں نے پہلے ہی سے ہر ممکن تیاری کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ کو غالباً یہ اندیشہ رہا ہو گا کہ اس کا فون ملنے کے بعد میں فوری طور پر اپنا ٹھکانا تبدیل کر دوں گی۔ مجھے اغوا کرنیوالے اس کے گرگے ہو سکتے تھے۔

باڑا ہندو راؤ کے چوراہے سے ٹیکسی قطب روڈ سے ہو کر لاہوری گیٹ کی طرف مڑ گئی اور پھر جی بی روڈ پر آ گئی۔ یہ سڑک زیادہ مصروف نہیں تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ لوگ مجھے نئی دہلی لے جا رہے ہیں جو شخص میرے پہلو پر ریوالور رکھے ہوئے تھا وہ پوری طرح میری طرف متوجہ تھا۔ مجھے اسی لئے اب تک اپنی مدافعت میں کوئی قدم اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس میں کسی قسم کا شک کرنا حماقت ہی ہوتی کہ میری ذرا سی غلطی میرے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ ریوالور یقیناً بھرا ہوا تھا اور اس کے ٹریگر پر قوی

ہیکل شخص کی انگلی تھی۔ اسے ٹریگر دبانے میں لمحہ بھر بھی نہ لگتا اور گولی میرے پہلو میں سوراخ کر دیتی۔

''تم لوگ کون ہو اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' میں نے قوی ہیکل شخص کی توجہ مبذول کرنے کی خاطر سوال کیا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور مجھے کہاں جا سکتے ہیں!

''عذرا خان! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم کون ہیں اور یہ بھی کہ ہم تمہیں کہاں لے جا رہے ہیں! بننے کی کوشش نہ کرو!'' قوی ہیکل شخص نے مجھے میرا نام لے کر مخاطب کیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ یقیناً تمہیں میری تصویری دکھائی گئی ہو گی ورنہ ظاہر ہے کہ تم مجھے کس طرح پہچانتے!'' میں بولی۔

''اگر ایسا بھی ہے تو پھر......؟ خاموش رہو......! باتیں بنانے کی زیادہ ضرورت نہیں! تم مجھے نہیں جانتیں میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔'' وہ سختی سے بولا۔

''ارے!'' اچانک میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ''یہ...... یہ دروازہ...... ٹیکسی کا دروازہ کیسے کھل گیا!''

میری اداکاری یقیناً اتنی اچھی رہی ہو گی کہ وہ بے وقوف بن گیا۔ بس ایک لمحے کو اس کی توجہ میری طرف سے ہٹ گئی اور پھر یہی ایک لمحہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ اوپر اٹھ گیا۔ اس کے ساتھی ٹیکسی ڈرائیور کا یقیناً آخری وقت آ گیا تھا اس لئے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی اس کی کھوپڑی کے پچھلے حصے میں گھس گئی۔ قوی ہیکل شخص نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ٹریگر دبا دیا تھا۔ جیسے ہی گولی چلی میں نے الٹے ہاتھ سے قوی ہیکل شخص کی کنپٹی پر نپا تلا ہاتھ مارا اور وہ جھوم گیا۔

ٹیکسی سڑک پر کسی شرابی کی طرح ادھر سے ادھر لہرا رہی تھی اور کسی وقت بھی کوئی حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کا سر اسٹیرنگ سے جا لگا تھا اور چاروں طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ میں تیزی سے اٹھی اور پیچھے ہی سے اسٹیرنگ سنبھال لیا اور ایک ممکنہ حادثے سے بچ گئی۔ میں نے ٹیکسی کو کچے میں اتار کر اس کا انجن بند کر دیا تھا۔

اس ٹیکسی میں ایک شخص بے ہوش تھا اور دوسرا قتل کیا جا چکا تھا۔ ٹیکسی رکتے ہی میں تیزی کے ساتھ اپنا سوٹ کیس اور ایئر بیگ اٹھا کر اس سے اتر گئی۔ اب میں جلد از جلد وہاں سے دور ہو جانا چاہتی تھی۔ اس لئے پیدل ہی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی خاصی دور نکل گئی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے جلد ہی ایک خالی ٹیکسی آتی دکھائی دے گئی اور میں نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک لیا۔

ذرا ہی دیر کے بعد میں اس دوسری ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی کناٹ پیلس کی طرف جا رہی تھی اور گزرے ہوئے ہولناک واقعے کی بابت سوچ رہی تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ اور میرے درمیان معرکہ آرائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے مرحلے میں اس کے گرگوں کو میرے ہاتھوں شکست ہو چکی تھی۔ ان دونوں کو شاید اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی اعتماد تھا ورنہ وہ وہاں موجود اپنے دوسرے ساتھیوں سے اس ٹیکسی کا تعاقب کرنے کے لئے بھی کہہ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہاں صرف وہی دو نہیں رہے ہوں گے ان کے اور ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں گے۔ اگر کسی دوسری ٹیکسی یا کار میں تعاقب کیا جاتا تو پھر میرا بچ نکلنا اتنا

آسان نہ ہوتا۔

ڈاکٹر رچرڈ سے نبرد آزما ہونے کے لئے میں اپنے ذہن میں منصوبہ بندی کر چکی تھی اور میں نے اسی پر عمل کرنے کے لئے کناٹ پیلس کا رخ کیا تھا۔

میری ٹیکسی کرزن روڈ سے گزر کر کناٹ پیلس کی حدود میں داخل ہو گئی تو میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ''مجھے سنٹرل کورٹ ہوٹل جانا ہے۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے زبان سے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر جلدی ہی مطلوبہ ہوٹل کے سامنے پہنچ کر ٹیکسی روک دی۔ وہ اوسط درجے سے نسبتاً بہتر ہوٹل تھا۔

ہوٹل کے رجسٹر میں دانستہ میں نے اپنا صحیح نام نہیں لکھایا۔ مجھے وہاں ایک کمرا آئندہ روز تک کیلئے حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی حالانکہ میں نے کمرا آئندہ روز تک کے لئے بک کرایا تھا مگر مجھے وہاں بس تھوڑا ہی وقت گزارنا تھا۔ اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کرنے کی خاطر فوراً ہی میں ہوٹل سے نکل گئی۔ اس وقت پونے آٹھ بج رہے تھے اور میرے پاس وقت کم تھا۔

کناٹ پیلس کے ایک بڑے اسٹور سے مجھے ضروری سامان خریدنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور میں ہوٹل واپس آ گئی۔ اپنا کمرا اندر سے بند کر کے میں نے وہ سامان اپنے سامنے کھول کر رکھ لیا جو خرید کر لائی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میرے چہرے پر ایک ادھیڑ عمر ہندوستانی عورت کا میک اپ تھا۔ میں نے آئینے پر آخری نظر ڈالی اور اپنے بالوں کی وگ کا جائزہ لیا۔ وگ ٹھیک ہی تھی میں نے صرف اس میں صرف اتنی ترمیم کی تھی کہ کچھ بال چہرے کی مناسبت سے سفید کر لئے تھے۔ میک اپ کا سامان اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر میں نے لباس بھی تبدیل کر لیا۔ اب میرے جسم پر ساری تھی۔ ماتھے پر میں نے بندیا بھی لگا لی تھی۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود میرا چہرہ پر کشش ہی رہا تھا۔ میں جاتی بہاروں کی آخری شام کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ میرا متناسب جسم بھی اس کے لئے مناسب تھا۔ میرے چہرے سے وقار و تمکنت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود ظاہر ہے نوجوان میری طرف متوجہ نہ ہوتے ہاں پختہ عمر کے مردوں کے لئے میرے وجود میں اب بھی کشش باقی تھی۔

اپنا سامان پیک کر کے میں نے اپنے کمرے کے دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری میں اس وقت اکا دکا افراد ادھر سے ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ میرے پاس وقت کم تھا اس لئے مزید انتظار کرنا ممکن نہیں تھا کہ راہداری میں کوئی نہ ہو۔ میں اسی لئے تھوڑا سا خطرہ مول لینے پر آمادہ ہو گئی اور سوٹ کیس اٹھائے تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ کمرا میں نے مقفل نہیں کیا تھا۔ ہوٹل کی عمارت سے باہر آتے ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔

''اشوکا ہوٹل'' میں نے ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

اس طرح کے حالات میرے لئے نئے نہیں تھے۔ پہلے بھی کئی بار میں ایسے حالات سے گزر چکی تھی۔ اپنی شخصیت کی تبدیلی کے بعد میں بڑی حد تک خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ اب میں ڈاکٹر رچرڈ کے مقامی گرگوں کی نظر میں نہیں آ سکتی تھی۔ میرے حق میں ڈاکٹر رچرڈ کی بوالہوسی سود مند ہی ثابت ہوئی تھی۔ اگر مجھے قتل کرنے سے پہلے وہ اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی آرزو نہ کرتا تو شاید اس وقت میں زندہ نہ ہوتی۔

قدرت برائی میں بھی بعض افراد کے لئے بھلائی کے پہلو رکھتی ہے۔ اگر ڈاکٹر رچرڈ اپنے ملک کی ہائی کمان کے احکام کی رو سے مجھے صرف قتل ہی کرانا چاہتا تو جس وقت میں صادق ماموں کے گھر سے باہر نکلی تھی یا پھر ٹیکسی میں بیٹھی تھی تو اس کے گرگے مجھے آسانی سے گولی مار دیتے لیکن مجھے اغوا کرا کے پہلے وہ اپنی ہوس کی تسکین چاہتا تھا اسی لئے میں زندہ بچ گئی تھی۔

جب میں اشوکا ہوٹل پہنچی تو رات کے نو بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ ٹھیک نو بجے ایک ہال میں ڈاکٹر رچرڈ کے اعزاز میں عشائیہ دیا جا رہا تھا جس میں وہ پروفیسر ہارڈ کے نام سے شرکت کر رہا تھا۔ اب سب کچھ مجھ پر واضح ہو چکا تھا کہ یہ سارا چکر مجھے زیر دام لانے کے لئے چلایا گیا تھا۔ خود ڈاکٹر رچرڈ فون پر اس سلسلے میں مجھے بتا چکا تھا لیکن میں نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ وہ ایک تیر سے دو شکار کر رہا ہو۔ ایک طرف تو اس کا مقصد مجھے ٹھکانے لگانا ہوا اور دوسری جانب وہ ہندوستانی حکومت سے ساز باز کر رہا ہو۔ وہ بہر حال اس پوزیشن میں تھا کہ اپنے ملک کی جانب سے پاکستان دشمنی کے باب میں کوئی تجویز پیش کر سکتا یا کسی سازش کی راہ ہموار کر سکتا۔ ہندوستان کی نظر میں تو ہمیشہ پاکستان کا وجود کھٹکتا رہا تھا۔ پاکستان کے خلاف دو دشمن بہر حال ایک ہو سکتے تھے۔

اشوکا ہوٹل میں ایک ہندو عورت کی حیثیت سے میں نے ایک کمرا حاصل کر لیا اور پھر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ہوٹل کی انکوائری سے میں نے کچھ سوچ کر پروفیسر ہارڈ کے بارے میں معلوم کیا مگر میرا قیاس غلط ثابت ہوا۔ پروفیسر ہارڈ وہاں نہیں ٹھہرا تھا۔ انکوائری سے میں آہستہ قدمی کے ساتھ ہوٹل کے اس ہال کی طرف روانہ ہو گئی جہاں ڈاکٹر رچرڈ کو عشائیہ دیا جا رہا تھا۔ انکوائری ہی سے میں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ وہ ہال ہوٹل کی پہلی منزل پر تھا۔ جب میں وہاں پہنچی تو سوا نو بج رہے تھے مگر غالباً ابھی تقریب شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس عشائیے کے دعوت نامے کے ایک سرے پر میں واضح الفاظ میں یہ لکھا ہوا دیکھ چکی تھی کہ دعوت نامہ ساتھ لائیے۔ عموماً دعوت ناموں پر ایسی عبارت لکھی ہوتی ہے مگر مجھے یہ بھی علم تھا کہ دعوت نامے چیک نہیں کیے جاتے جب تک کہ کوئی اہم شخصیت اس تقریب میں شرکت نہ کر رہی ہو اور اس کی حفاظت مقصود نہ ہو یا وہاں سکیورٹی کا عملہ متعین نہ ہو۔

میں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ ہال کے دونوں دروازوں پر کچھ لوگ کھڑے تھے جو آنے والوں کے دعوت نامے دیکھ کر انہیں اندر جانے دے رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ڈاکٹر رچرڈ واقعی شیطانی ذہانت کا مالک تھا۔ اس نے یہ امکان ختم کر دیا تھا کہ میں میک اپ کر کے یعنی اپنا چہرہ تبدیل کر کے کسی اور حیثیت سے اس تقریب میں شرکت کر سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت تک اسے یہ اطلاع مل چکی ہو گی کہ میں اس کے گرگوں کو جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکی ہوں۔ غالباً اسی کے بعد اس نے دعوت ناموں کی چیکنگ کا حکم دیا ہو گا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ اب تک آ چکا تھا یا نہیں! مگر توقع یہی تھی کہ وہ آ چکا ہو گا۔ ہمارے لوگوں کی طرح عموماً غیر ملکی افراد وقت کے معاملے میں بے پروا نہیں ہوتے۔ اب یہی ممکن تھا کہ میں ہال کے باہر رہ کر تقریب ختم ہونے کا انتظار کرتی کیوں کہ میرے پاس اس تقریب کا جو دعوت نامہ تھا اس پر میرا نام لکھا ہوا تھا۔ گیٹ پر جو لوگ دعوت نامے دیکھ رہے تھے انہیں یقیناً میرے بارے میں

پہلے سے بتایا گیا ہو گا۔ دعوت نامے پر میرا نام دیکھ کر وہ لوگ نہ صرف مجھے نظر میں رکھتے بلکہ فوری طور پر ڈاکٹر رچرڈ کو بھی یہ اطلاع پہنچا دیتے کہ میں میک اپ میں ہوں اور ہال کے اندر داخل ہو چکی ہوں۔ پھر انہی افراد کی نشان دہی پر ڈاکٹر رچرڈ کے گرگے مجھے گھیر لیتے۔ وہاں میں کسی ایک جگہ کھڑی نہ رہی اور ادھر ادھر چہل قدمی کرنے لگی۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو۔ یہی ظاہر کرنے کے لئے میں کئی بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی بھی دیکھ چکی تھی۔ ہال کے باہر ذرا فاصلے پر ایک جانب دیوار سے لگے ہوئے صوفے بھی پڑے تھے مگر میں ان پر نہیں بیٹھی۔ ٹہلتے ہوئے میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

میں یہ تو معلوم کر ہی چکی تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ اس ہوٹل میں نہیں ٹھہرا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تقریب ختم ہونے کے بعد وہ اسی جگہ جاتا جہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے جب اس تقریب کا دعوت نامہ حاصل کیا تھا اسی وقت ڈاکٹر رچرڈ کے تعاقب کا فیصلہ کر چکی تھی اور اب بھی صورت حال بدل جانے کے باوجود میں اپنے فیصلے پر قائم تھی۔ فائیو اسٹارز ہوٹلز میں قیام کرنے والے مسافروں کو ہوٹل والے مناسب معاوضے پر کنوینس کی سہولت بھی فراہم کر دیتے ہیں لیکن کار کے ساتھ ڈرائیور بھی ہوتا ہے۔ غالباً اس لئے کہ کہیں کوئی ہوٹل کی کار لے کر ہی رفو چکر نہ ہو جائے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب مجھے کار اور ڈرائیور کا بندوبست کر ہی لینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ مجھے ڈاکٹر رچرڈ کا تعاقب کرنے کیلئے کسی نہ کسی سواری کی ضرورت تھی۔ کار کے ڈرائیور سے یہ بات چھپانا ممکن نہیں تھا کہ اسے کسی کا تعاقب کرنا ہے۔ میں نے اس کا حل بھی سوچ لیا تھا۔ اب تک میں نے یہ سوچ کر کار کی بات نہیں کی تھی کہ کہیں ڈاکٹر رچرڈ اسی ہوٹل میں نہ ٹھہرا ہو!

اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ مجھے کار فراہم کر دی گئی اور ڈرائیور بھی باوردی تھا۔ اس کے جسم پر اشوکا ہوٹل کی وردی تھی۔ ڈرائیور مجھے ایک چاق و چوبند نوجوان نظر آیا۔ میں نے اسی وقت سے اس کی ڈیوٹی لگا دی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''دیکھو اگر تم نے بہتر طور پر خدمات انجام دیں تو میں تمہیں خوش کر دوں گی۔ یہ لو!'' یہ کہہ کر میں نے سو روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ کوئی شریف اور خود دار نوجوان معلوم ہوتا تھا اس لئے اس نے فوراً نوٹ میرے ہاتھ سے نہیں لیا اور بولا۔ ''میڈم آپ یقین کریں کہ میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی اور میں آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ نوٹ واپس اپنے پرس میں رکھ دیجئے اس کی ضرورت نہیں۔ ہوٹل کی طرف سے مجھے اچھی تنخواہ ملتی ہے اور...... اور میں بخشش نہیں لیتا کیوں کہ میں اسے رشوت سمجھتا ہوں۔''

میں دنیا کے متعدد ممالک میں گھومی ہوں اور دنیا کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں قیام کیا ہے مگر میرا یہ پہلا تجربہ تھا کہ کسی ہوٹل کے ملازم نے ٹپ لینے سے انکار کیا تھا۔

''مجھے تمہارے جذبات و خیالات جان کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی!'' میں متاثر ہو کر بولی۔

''تم اسے بخشش یا رشوت نہ سمجھو بلکہ ایک بڑی بہن کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔'' میں نے نوٹ پھر اس کی طرف بڑھایا مگر اس نے معذرت کر لی۔ مجبوراً مجھے نوٹ واپس اپنے پرس میں رکھنا پڑا اور اس سے کہا۔

''مجھے اب سے کچھ دیر کے بعد کہیں جانا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم کار میں نیچے موجود رہو اور میں فوری

طور پر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوسکوں۔ ویسے نام کیا ہے تمہارا؟''

''محمد رئیس۔'' اس نے اپنا نام بتایا پھر کہا۔ ''آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی میڈم! میں آپ کو نیچے کار میں منتظر ملوں گا۔ آپ کا حکم ہو تو میں ابھی سے جا کر کار میں بیٹھ جاؤں!''

''کار یقیناً نیچے پارکنگ لاٹ میں ہوگی۔ چلو میں بھی نیچے تمہارے ساتھ چلتی ہوں تاکہ کار بھی دیکھ لوں اور وہ جگہ بھی بتا دوں جہاں تمہیں کار لے کر میرا انتظار کرنا ہے۔'' میں بولی۔

''بہتر ہے چلئے۔'' وہ شائستگی سے بولا اور پھر میرے ساتھ زینے کی طرف بڑھنے لگا۔

''تم مجھے تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہو۔'' میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''جی میڈم! میں گریجویٹ ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو پھر تم نے کسی ملازمت کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اور ڈرائیور بننا کیوں قبول کرلیا؟'' میں دانستہ اس سے ذاتی نوعیت کے سوال کر رہی تھی تاکہ اس کے اور میرے درمیان زیادہ تکلف کی فضا نہ رہے اور میں اس سے اپنے مطلب کی بات کرسکوں۔

میری بات سن کر وہ نوجوان تلخ سے انداز میں ہنسا۔ ''میڈم! ملازمت کہاں ملتی ہے! اور...... اور معاف کیجئے گا مسلمانوں کے لئے تو ملازمت کے دروازے بالکل بند ہیں۔ بے روزگاری کا سامنا یوں تو یہاں آباد تمام ہی افراد کے لئے ہے۔ مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے تو یہ مسئلہ لاینحل ہے۔ میں نے ملازمت کے حصول کی خاطر پورے ایک سال ٹھوکریں کھائی ہیں اور پھر مجبور ہو کر ڈرائیور بننا قبول کیا ہے۔''

میں اس نوجوان ڈرائیور سے اسی طرح کی باتیں کرتی ہوئی نچلی منزل پر پہنچ گئی۔ پھر وہ پارکنگ لاٹ سے نیلے رنگ کی ایک ایمبیسڈر کار ڈرائیو کرتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں مجھے چھوڑ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' پھر آگے بڑھ کر اگلی نشست پر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

''جی کدھر چلوں؟'' اس نے مجھ سے دریافت کی۔

میں نے اس کی رہنمائی کی اور ہوٹل سے ذرا فاصلے پر سڑک کے کنارے کار رکوا لی۔ وہاں کاروں کا زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ ''تم یہیں مجھے ملنا!'' میں اس سے بولی۔

''بہتر ہے میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' وہ ادب سے بولا۔

''دیکھو رئیس مجھے دراصل ابھی یہ علم نہیں کہ روانگی میں کتنی دیر لگے گی۔ میری روانگی جلدی بھی ہوسکتی ہے یہی سوچ کر میں ابھی سے تمہیں یہاں انتظار کرنے کی زحمت دے رہی ہوں' تم کوئی خیال نہ کرنا!'' میرے لہجے میں اپنائیت تھی۔

''ارے میڈم یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں! یہ تو ڈیوٹی ہے میری...... ! آپ تو شرمندہ کر رہی ہیں مجھے!'' اس نے لجاجت کے ساتھ کہا۔

''رئیس! ایک بات اور بتا دوں تمہیں کہ مجھے جہاں جانا ہے اس کے متعلق معلوم نہیں۔'' میں نے مطلب کی بات شروع کردی۔

''جی میڈم! میں...... میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔'' وہ حیرت سے بولا۔

''دراصل تمہیں ایک کار کے پیچھے چلنا ہے۔'' میں دانستہ لفظ ''تعاقب'' سے گریز کیا تھا۔

''بہتر ہے میڈم!'' اس نے سعادت مندانہ انداز میں سر ہلایا۔ ''آپ جس کار کے پیچھے کہیں گی میں چلنے لگوں گا۔''

''مگر اس میں تمہیں ذرا احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ میں جن صاحب کے گھر کا پتا معلوم کرنا چاہتی ہوں انہیں اس بات کا علم نہیں ہونا چاہئے۔'' میں نے محتاط انداز و الفاظ میں اپنا مدعا بیان کردیا۔ ''تم میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟ تمہیں تھوڑے سے فاصلے کے ساتھ ان صاحب کی کار کے پیچھے چلنا پڑے گا۔''

میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر وہ چونک اٹھا ہے۔ وہ نوجوان یقیناً ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چونک اٹھنے کا سبب یہی ہوسکتا تھا کہ وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا ہے۔

''تو یوں کہیں میڈم کہ مجھے کسی کار کا تعاقب کرنا ہے اور محتاط رہنا ہے کہ آگے جانے والی کار میں بیٹھے ہوئے افراد کو اس کا علم نہ ہو کہ ان کا تعاقب کیا جارہا ہے۔'' اس نے واضح الفاظ میں میرے دل کی بات کہہ دی جسے میں الٹ پھیر کر دوسرے الفاظ میں کہہ رہی تھی۔

تم ٹھیک ہی سمجھے رئیس!'' میں نے اعتراف کرلیا۔

''معاف کیجئے گا میڈم عموماً میں اس قسم کے کام نہیں کرتا اور میرے ہوٹل کی انتظامیہ کے بھی اس سلسلے میں واضح احکام ہیں کہ ایسے معاملات میں ملوث نہ ہوا جائے...... لیکن نہ معلوم کیوں تھوڑے سے عرصے میں مجھے آپ کے لہجے اور انداز سے اپنائیت سی محسوس ہوئی ہے۔ آپ کی زبان بھی بہت صاف ستھری ہے اور لگتا ہے کہ آپ نے اردو بھی پڑھی ہے۔ ہمارے ہوٹل میں عام طور پر جو افراد آ کر ٹھہرتے ہیں ان کی گردنیں غرور و تکبر سے اکڑی ہوتی ہیں اور وہ ہم ایسے گولوں کو منہ نہیں لگاتے مگر آپ...... آپ ایسی نہیں ہیں۔ میں...... میں آؤٹ آف داوے جا کر بھی آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا اور...... اور مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ جذباتی ہوگیا تھا۔

''بہت بہت شکریہ رئیس!'' میں نے کہا اور پھر کار سے اترنے کے لئے دروازہ کھولنے لگی۔

''رکئے!'' وہ بولا۔ ''میں آپ کو ہوٹل تک چھوڑ کر پھر یہاں آ جاتا ہوں بیٹھی رہئے!'' یہ کہتے ہوئے اس نے کار کا انجن اسٹارٹ کردیا۔

''ذرا سا ہی تو فاصلہ ہے میں پیدل چلی جاؤں گی تم زحمت نہ کرو!'' میں نے کہا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا میں کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

وہاں سے پیدل ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئی جو سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔

جب میں واپس ہوٹل کی پہلی منزل کے اس ہال تک پہنچی جہاں ڈاکٹر رچرڈ کے اعزاز میں عشائیہ دیا جارہا تھا تو تقریب شروع ہوئے تقریباً پون گھنٹا ہوچکا تھا۔

مجھے مزید آدھے گھنٹے تقریب ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ ہال سے پہلا آدمی باہر آیا تو میں تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئی۔ نچلی منزل پر پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اب میرا رخ ہوٹل

کے صدر دروازے کی طرف تھا۔ یہیں سے گزر کر ڈاکٹر رچرڈ کو مارکنگ لاٹ کی طرف جانا تھا اور میں سے اپنی آنکھوں سے کسی کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔

جو لوگ اس تقریب میں شریک تھے انہیں صدر دروازے سے گزرتے ہوئے میں بغور دیکھتی رہی مگر اب تک مجھے ڈاکٹر رچرڈ نظر نہیں آیا تھا۔ میری نگاہیں ہوٹل کے زینے سے اتر کر صدر دروازے کی طرف آنے والوں پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک میری نظر ایک آشنا سے چہرے پر پڑی۔ یہ امریکی سفیر تھا جس کی تصویر میں نے اخبار میں دیکھی تھی۔ اسی کے ساتھ مجھے وہ چہرہ نظر آ گیا جسے دیکھنے کے لئے میں بے چین تھی۔ وہ ڈاکٹر رچرڈ ہی تھا اور اس کے چہرے پر مجھے گہری سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ ان دونوں کے آگے پیچھے مسلح محافظ تھے مگر سادہ لباس میں۔ ان کے ہاتھ اپنے کوٹوں کی جیبوں میں تھے۔ میں نے اسی سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ مسلح محافظ ہی ہو سکتے ہیں۔ یقیناً ان کی جیبوں میں بھرے ہوئے ریوالور تھے جو وہ کسی بھی لمحے جیبوں سے نکال سکتے تھے۔ انہی کے جلو میں امریکی سفیر اور ڈاکٹر رچرڈ دونوں مارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے دور سے ان دونوں کو رکتے اور پھر دو مختلف کاروں میں بیٹھتے دیکھا۔ ان دونوں ہی کے لئے ان کاروں کے ڈرائیوروں نے دروازے کھولے تھے۔ ان مسلح محافظوں میں سے دو کو میں نے ڈاکٹر رچرڈ کی کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ بقیہ دو محافظ امریکی سفیر کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھ گئے تھے۔

ڈاکٹر رچرڈ کی سفید کار اب کسی بھی لمحے حرکت میں آ سکتی تھی۔ میں اسی لئے اب جلد از جلد اپنی کار تک پہنچ جانا چاہتی تھی اسی لئے تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اسی وقت پہلی بار مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نکتہ فراموش ہی کر دیا تھا کہ جہاں اپنی کار کھڑی کی ہے اگر ڈاکٹر رچرڈ کی کار ہوٹل سے نکل کر اس کی مخالف سمت روانہ ہوگئی تو کیا ہوگا! اپنی کار کو مجھے ہوٹل کی حدود میں رکھنا چاہئے تھا مگر اب ظاہر ہے کہ وقت گزر چکا تھا۔

میں بہر حال انتہائی تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنی کار تک پہنچ گئی مگر اس میں بیٹھی نہیں۔ میں اس کے قریب کھڑے ہو کر ہوٹل کے گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی تا کہ ڈاکٹر رچرڈ کی کار کو گیٹ سے نکل کر کسی طرف جاتے دیکھ سکوں اور فوری طور پر اپنی کار کا رخ تبدیل کرا سکوں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ہوٹل سے نکلنے والی کاریں خاصی تھیں جن کی وجہ سے مجھے اپنی کار تک پہنچنے کی مہلت مل گئی تھی۔

''یس میڈم!'' میری کار کے ڈرائیور نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''بس چند لمحے رکو!'' میں نے تیزی سے کہا اور اسی لمحے مجھے ڈاکٹر رچرڈ کی سفید کار نظر آ گئی جو ہوٹل کے گیٹ سے نکل کر اسی طرف آ رہی تھی۔ قدرت میرا ساتھ دے رہی تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ کی کار مخالف سمت نہیں مڑی تھی۔ میں جلدی سے کار کا اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی اور کار ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ''اس کار کا رنگ سفید ہے رئیس اور وہ ہوٹل کے گیٹ سے نکل چکی ہے تم انجن اسٹارٹ کر دو!''

''بہتر ہے میڈم!'' کار ڈرائیور کا ہاتھ حرکت میں آ گیا اور دوسرے ہی لمحے کار کا انجن جاگ

اٹھا۔

''ویری گڈ!'' میں نے کار ڈرائیور کی تعریف کرتے ہوئے عقبی آئینے پر نگاہ مرکوز کر دی۔ چند ہی لمحے بعد مجھے سفید کار آتی دکھائی دے گئی۔ ''یہی ہے۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ رئیس بھی میری تقلید میں عقبی آئینے پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ اس نے بھی سفید کار کو دیکھ لیا اور مجھے بتایا کہ میں بھی سفید کار کو دیکھ چکا ہوں۔

''ہمیں اسی کا تعاقب کرنا ہے۔'' میں نے بلا جھجک کہا۔

''آپ مطمئن رہیں میڈم! میں اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا اور اسی کے ساتھ یہ کوشش کروں گا کہ ان لوگوں کو تعاقب کا احساس نہ ہو۔'' اس نے مجھے یقین دلایا۔

کار ڈرائیور رئیس کی بات ختم ہوئی تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ کی کار ہماری کار کے قریب سے گزر گئی۔ میری نگاہ اسی کی طرف تھی۔ میں نے ڈاکٹر رچرڈ کی بس ایک جھلک دیکھی۔ وہ دونوں مسلح محافظوں کے درمیان کار کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں ہی مسلح محافظ غیر ملکی تھے اور کار ڈرائیور بھی غیر ملکی ہی تھا۔ وہ سب امریکی لگ رہے تھے۔

رئیس نے بھی ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا اسی لئے قدرے حیرت سے بولا۔ ''وہ لوگ تو غیر ملکی ہیں میڈم!'' رئیس کو شاید یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ جس کار کا اسے تعاقب کرنا ہے اس میں غیر ملکی ہوں گے۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا پھر بولی۔ ''اب اپنی کار آگے بڑھاؤ درمیان میں کئی دوسری کاریں آ چکی ہیں۔''

میری بات سنتے ہی رئیس نے کار آگے بڑھا دی اور ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ ہمایوں روڈ پر ہماری کار آگے بڑھتی رہی۔ سفید کار میری نظر میں تھی۔ ہمایوں روڈ ختم ہوا تو شاہجہان روڈ کا موڑ آیا مگر سفید کار اسے پیچھے چھوڑتی ہوئی مان سنگھ روڈ کی طرف بڑھ گئی۔ تعاقب جاری رہا۔ بائیں جانب کچھ دیر بعد اکبر روڈ کا موڑ آیا مگر ڈاکٹر رچرڈ کی کار سیدھی مان سنگھ روڈ پر ہی آگے بڑھتی رہی پھر راج پتھ اور انڈیا گیٹ والا چوراہا آیا۔ ہماری دائیں جانب ایک سڑک انڈیا گیٹ کے لئے جا رہی تھی اور بائیں طرف راج پتھ تھا۔ سفید کار چوراہے کو بھی عبور کر گئی۔ مجھے علم تھا کہ مان سنگھ روڈ آگے جا کر اشوکا روڈ سے مل جاتی ہے اور اس سے پہلے بائیں جانب ڈاکٹر راجندر پرشاد روڈ پڑتا ہے۔ میری توقع کے مطابق ڈاکٹر رچرڈ کی کار بائیں جانب ڈاکٹر راجندر پرشاد روڈ کو پیچھے چھوڑتی اشوکا روڈ پر مڑ گئی۔ سفید کار اور میری کار کے درمیان اب بھی خاصہ فاصلہ تھا۔ سفر بدستور جاری تھا۔ پھر سفید کار ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں سے چھ بڑی سڑکیں مختلف سمتوں میں جاتی تھیں جن میں سے ایک سمت سے ہماری کار آ رہی تھی لیکن سفید کار کسی سڑک پر مڑے بغیر سیدھی چلتی رہی۔ اشوکا روڈ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ پھر ایک چھوٹا چوراہا آیا اور سفید کار دائیں جانب چھوٹی سی سڑک پر مڑ گئی۔ یہ راستہ میرے ذہن میں نہیں تھا اسی لئے میں نے اس کے متعلق اپنے ڈرائیور رئیس سے دریافت کیا۔

''میڈم! یہ سڑک آگے جا کر پارلیمنٹ اسٹریٹ سے مل جائے گی۔'' رئیس نے میری بات کا جواب دیا۔

اس سڑک پر اس سفید کار اور ہماری کار کے درمیان کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی۔ یوں بھی اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک خاصا کم ہو گیا تھا۔ پھر یہ علاقہ بھی پر سکون معلوم ہوتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خطرہ سر ابھارنے لگا کہ کہیں ڈاکٹر رچرڈ کو تعاقب کا شک نہ ہو جائے یہی سوچ کر میں نے رئیس سے درمیانی فاصلہ مزید بڑھانے کے لئے کہا اور اس نے فوراً کار کی رفتار کم کر دی۔

پارلیمنٹ اسٹریٹ میں عموماً ان افراد کی کوٹھیاں تھیں جو برسراقتدار پارٹی کانگریس سے تعلق رکھتے تھے اور قومی اسمبلی کے رکن بھی تھے۔ یہ علاقہ بے حد صاف ستھرا اور انتہائی پر سکون تھا۔ اب ہماری کار اسی علاقے میں تھی جہاں بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ اسی علاقے میں ڈاکٹر رچرڈ کی سفید کار جے سنگ روڈ پر مڑ چکی تھی اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے رئیس کو اپنی کار کی رفتار نہیں بڑھانے دی۔ ابھی ہماری کار جے سنگ روڈ تک نہیں پہنچی تھی اور پارلیمنٹ اسٹریٹ ہی پر تھی۔

پھر جب رئیس پارلیمنٹ اسٹریٹ سے اپنی کار کو جب بائیں جانب جے سنگ روڈ پر موڑنے والا تھا تو اچانک میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ دوسرے ہی لمحے میں اپنا پرس کھول کر اس میں سے ریوالور نکال چکی تھی مگر مجھے اپنا ریوالور استعمال کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ جیسے ہی ہماری کار جے سنگ روڈ پر مڑی کچھ ہی فاصلے پر سڑک کے کنارے مجھے ڈاکٹر رچرڈ کی کار کھڑی دکھائی دی اور عین اسی لمحے بیک وقت دو شعلے میری کار کی طرف لپکے۔ میری کار کی طرف یقیناً سائیلنسر لگے ہوئے ریوالوروں سے فائر کئے گئے تھے ورنہ دھماکے ضرور سنائی دیتے۔

''جھک جاؤ رئیس!'' میں جھکتے ہوئے چیخی۔

رئیس بھی میرے ساتھ جھک گیا۔ اسی کے ساتھ اس نے بریک لگائے۔ دوسرے ہی لمحے پے در پے دو تیز دھماکے ہوئے اور کار آگے کی طرف جھک گئی۔ انہوں نے کار کے دونوں اگلے ٹائروں کو نشانہ بنایا تھا۔ مجھے جس بات کا خدشہ تھا سامنے آ گئی تھی۔ میری کار پر حملے کا مطلب یہی تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کو تعاقب کا علم ہو گیا تھا۔ اس علاقے میں یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی کیونکہ اس وقت آگے پیچھے جانے والی دو کاروں کے سوا وہاں کوئی سواری نہیں تھی۔

ٹائر برسٹ ہوتے ہی وقت ضائع کئے بغیر میں تیزی سے کے ساتھ کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی تھی پھر بائیں جانب جھاڑیوں میں رینگ گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری کار کے ٹائر برسٹ کرنے کے بعد ڈاکٹر رچرڈ دوسرا قدم بھی اٹھائے گا۔ جھاڑیوں کی آڑ لیتی ہوئی میں سینے کے بل رینگتی ہوئی سفید کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چند ہی لمحے بعد مجھے سفید کار کی جانب سے دو افراد محتاط انداز میں اپنی کار کی جانب بڑھتے نظر آ گئے۔ وہ چوپایوں کی طرح دونوں ہاتھ پیروں کے بل سڑک کے کنارے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ وہی دونوں مسلح محافظ ہو سکتے تھے جنہیں میں نے ڈاکٹر رچرڈ کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان دونوں کو میری کار کی طرف سے فائرنگ کا خدشہ تھا۔ میں سینے کے بل رینگتی ہوئی سوچ رہی تھی کہ اب سفید کار میں ڈرائیور اور ڈاکٹر رچرڈ کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ یہ میرے لئے اچھا موقع تھا۔ یہ سوچ کر میں مزید تیزی کے ساتھ آگے

بڑھنے لگی۔

جب سفید کار کے قریب پہنچی تو دیکھا ڈاکٹر رچرڈ کار کے باہر کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ڈرائیور کار ہی میں بیٹھا تھا۔ میرے اور ڈاکٹر رچرڈ کے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ تھا۔ میں ذرا اور آگے بڑھی اور پھر ڈاکٹر رچرڈ کے عقب میں پہنچ گئی۔ اب اس کی پشت میری جانب تھی۔ جھاڑیوں سے میں رینگتی ہوئی سڑک کے قریب کچے میں آ گئی اور پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چند ہی قدم پر ڈاکٹر رچرڈ کھڑا تھا۔

میں جھپٹ کر اس کے قریب پہنچ گئی اور اس کی پشت پر اپنے ریوالور کی نال رکھ کر غرائی۔

''ڈاکٹر رچرڈ! تمہاری موت تم تک پہنچ چکی ہے ریوالور پھینک دو!''

اس نے ریوالور پھینکنے میں دیر نہیں کی اور پر سکون لہجے میں بولا۔ ''عذرا خان! تم واقعی بے انتہا ذہین عورت ہو۔ میں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود تم تک نہیں پہنچ سکا مگر تم...... تم مجھ تک پہنچ گئیں۔ تم جیسی ذہین اور بہادر عورت کو قتل کرتے ہوئے مجھے واقعی بہت افسوس ہوگا۔''

''افسوس کا موقع تو تمہیں اس وقت ملے گا ڈاکٹر جب تم میرے ہاتھوں سے قتل ہونے سے بچ جاؤ گے!'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

ابھی میری بات پوری ہوئی تھی کہ اپنے پیچھے مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور میں ایک دم پلٹی پھر اگر میں تیزی سے جھک نہ جاتی تو لوہے کی ایک راڈ میرے سر پر پڑتی اور میرے چودہ طبق روشن ہو جاتے۔ وہ ڈاکٹر رچرڈ کا ڈرائیور تھا جسے میں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ جانے کب انتہائی خاموشی کے ساتھ کار کا دروازہ کھول کر مجھ پر لوہے کی راڈ سے حملہ کرنے میرے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ جھکتے ہوئے میں نے اس پر فائر کیا اور میری چلائی ہوئی گولی اس کے پیٹ میں گھس گئی۔ وہ چیختا ہوا منہ کے بل زمین پر آ رہا۔

ڈاکٹر رچرڈ کے لئے یہ موقع غنیمت ثابت ہوا۔ اس نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا اور میں اپنا وزن برقرار نہ رکھ سکی۔ میں ڈرائیور کے اوپر گری مگر فوراً ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت ڈاکٹر رچرڈ کی ایک ٹانگ فضا میں بلند ہوئی اور میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میرے سیدھے ہاتھ کی کلائی پر بھرپور ضرب پڑی تھی اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔

اب میں ڈاکٹر رچرڈ کی طرح غیر مسلح ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی کلائی کی تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر رچرڈ پر چھلانگ لگائی مگر وہ شیطان صفت شخص انتہائی تیزی کے ساتھ ایک طرف ہو گیا اور میں زمین پر آ رہی مگر میرے دوبارہ اٹھنے سے پہلے وہ مجھ پر جست لگا چکا تھا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود اس کے جسم کی پھرتی حیرت انگیز تھی۔ میں اگر تیزی کے ساتھ کروٹ نہ لے لیتی تو اس کے جسم کا سارا بوجھ میرے سینے پر پڑتا۔ اس کے دونوں پیر میرے سینے پر ہوتے۔ کروٹ لے کر اٹھتے ہوئے جھپٹ کر میں نے اس کی ایک ٹانگ گھسیٹ لی۔ وہ چیختا ہوا زمین پر آ رہا اور میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

اسی وقت میری نگاہ سامنے سے دوڑ کر آتے ہوئے ایک شخص پر پڑی اور پھر ایک شعلہ اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ دوڑتے ہوئے اس شخص نے مجھ پر فائر کیا تھا مگر گولی نشانے پر نہ بیٹھی اور میرے قریب سے گزر گئی۔

میں نے کار کی طرف جست بھری اور قریب پہنچتے ہی اس کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کار کی چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر کار اسٹارٹ کی اور ایکسلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ کار بندوق کی نال سے نکلی ہوئی گولی کی طرح طوفانی انداز میں آگے بڑھی اگر میں اتنی تیز رفتاری سے کار میں بیٹھ کر وہاں سے راہ فرار اختیار نہ کرتی تو یقیناً مجھے روک لیا جاتا جس شخص نے مجھ پر فائر کیا تھا وہ کار کے ٹائر پر فائر کر کے برسٹ کر دیتا۔

تیز رفتاری سے کار دوڑاتی ہوئی میں اس علاقے کو جلد ہی پیچھے چھوڑ آئی مگر مجھے رئیس کی طرف سے فکر تھی۔ نہ معلوم اس کا ان لوگوں نے کیا حشر بنایا ہوگا! حالات کچھ اس طرح پیش آئے تھے کہ راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی اور صورت نہیں رہی تھی۔

اب میں جلد از جلد اشوکا ہوٹل پہنچ کر وہاں سے بھی فرار ہو جانا چاہتی تھی کیونکہ اب وہاں میں محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ رئیس میرے دشمنوں کے ہتھے چڑھ چکا تھا اور ظاہر ہے کہ میرے دشمن اس کی زبان کھلوانے میں دیر نہ لگاتے۔ پھر انہیں میرے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ میں کہاں اور کس حیثیت سے ٹھہری ہوں!

پارلیمنٹ اسٹریٹ سے اشوکا ہوٹل کا خاصہ فاصلہ تھا جو میں نے تیز رفتاری سے عبور کر لیا۔

ڈاکٹر رچرڈ کی کار کو چھوڑنے سے پہلے میں نے اس کی تلاشی لی تو ایک بریف کیس میرے ہاتھ لگ گیا۔ اسی بریف کیس میں مجھے ایک ریوالور اور اس کی گولیاں بھی مل گئیں۔ ریوالور بھرا ہوا تھا۔ بریف کیس میں کچھ کاغذات بھی تھے اور خاصی غیر ملکی کرنسی بھی! کچھ مقامی کرنسی بھی مجھے ملی۔ میں نے بریف کیس کار ہی میں چھوڑ دیا مگر کرنسی' کاغذات اور ریوالور اپنے قبضے میں کر لیا۔ وہ بریف کیس یا تو خود ڈاکٹر رچرڈ کا تھا یا پھر کار میں سفر کرنیوالے ان دونوں مسلح محافظوں میں سے کسی ایک کا! کاغذات دیکھ کر اس سلسلے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا مگر وقت کاغذات دیکھنے کا نہیں تھا۔ میں نے سارا سامان اپنے پرس میں ٹھونسا اور کار سے اتر گئی۔ کار کو میں نے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دیا تھا اور پیدل ہوٹل کی طرف بڑھ گئی تھی۔

ہوٹل کی جانب بڑھتے ہوئے مجھے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے بلا سبب ایک سنہری موقع ضائع کر دیا۔ ڈاکٹر رچرڈ کو یہ بتانا کچھ ایسا ضروری تو نہیں تھا کہ اسے قتل کرنے والی میں ہوں۔ اسے میں اپنی کمزوری اور خودستائی کا جذبہ ہی کہوں گی کہ دشمن پر اپنی برتری ثابت کی جائے۔ جب میں جھاڑیوں کی آڑ لے کر رینگتی ہوئی ڈاکٹر رچرڈ کے قریب پہنچ گئی تھی تو مجھے اسی وقت اسے گولی مار دینا چاہئے تھی۔ اس وقت وہ میری طرف سے قطعی بے خبر تھا۔ اب دوبارہ ایسا کوئی موقع ملنا مشکل ہی تھا۔

اشوکا ہوٹل میں اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ اپنے چہرے پر نیا میک اپ کر کے لباس تبدیل کیا کیونکہ مجھے اس میک اپ میں ڈاکٹر رچرڈ دیکھ چکا تھا۔ نیا میک اپ کر کے لباس تبدیل کرنے میں مجھے بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ میرے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں اسی لئے اپنا سوٹ کیس اٹھائے تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

جس وقت میں ہوٹل کے صدر دروازے سے باہر نکل رہی تھی میں نے کچھ ہی فاصلے پر ایک پولیس جیپ رکتے دیکھی اور پھر اس میں ایک پولیس انسپکٹر کے ساتھ چند سپاہیوں کو تیزی کے ساتھ اترتے

دیکھا۔ اگر مجھے وہاں سے روانگی میں مزید چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو شاید پولیس کے ہتھے چڑھ جاتی۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس میری ہی تلاش میں وہاں آئی تھی۔

ہوٹل سے باہر آتے ہی میں نے ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے مگر عموماً بڑے ہوٹلوں کے آس پاس رات کے وقت بھی ٹیکسیاں ملنا مشکل نہیں ہوتا۔ ایک خالی ٹیکسی خود ہی میرے قریب آ کر رک گئی۔

''یس میڈم!'' ٹیکسی والے نے مجھے مخاطب کیا۔ ''کہاں جائیں گی؟''

''کناٹ پیلس میں میرینا ہوٹل۔'' میں نے ٹیکسی والے کو بتایا۔

''تو پھر بیٹھئے!'' وہ بولا۔

میں نے ایک نظر ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے کا جائزہ لیا اور وہ مجھے کچھ اچھا آدمی معلوم نہیں ہوا۔ اس وقت میں کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

''نہیں ابھی مجھے اپنے ساتھی کا انتظار ہے جو ہوٹل سے نکل کر یہاں پہنچنے والا ہے۔'' میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

''تو ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے ساتھی کا انتظار کر لیجئے۔'' وہ بولا!

''نہیں میں خود جا کر دیکھتی ہوں کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگا دی!'' یہ کہہ کر میں ہوٹل کی طرف مڑی۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور میں دوبارہ ہوٹل کی طرف چل دی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور مجھے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

میرے ذہن میں یہ نیا خیال آیا تھا کہ کسی اور ہوٹل کا رخ کرنے کی بجائے میں ''اشوکا'' ہی میں کیوں نہ رک جاؤں۔ ڈاکٹر رچرڈ کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میں ''اشوکا'' ہی میں ہوں گی۔ وہ تو یہی سمجھتا کہ اشوکا ہوٹل سے فرار ہو کر میں کسی اور ہوٹل میں جا ٹھہری ہوں۔ ''اشوکا'' سے فرار ہو کر میں ''اشوکا'' ہی کے ایک کمرے میں نئے نام سے ٹھہر جاؤں گی۔ یہ سوچنا ڈاکٹر رچرڈ کیلئے یقیناً ممکن نہ ہوتا۔

پھر مجھے اشوکا ہوٹل میں نئی حیثیت سے ایک اور کمرا حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اب تک میں رات کا کھانا بھی نہیں کھا سکی تھی۔ مجھے اس کی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی۔ میں نے پہلے کھانا کمرے ہی میں منگوا کر کھایا پھر چائے پینے کے بعد جب ویٹر برتن لے گیا تو میں ڈاکٹر رچرڈ کی کار میں موجود بریف کیس سے ملنے والے کاغذات کا جائزہ لینے لگی۔

ان کاغذات ہی میں مجھے ایک پاسپورٹ ملا یہ کسی شخص ہیرلیس کا پاسپورٹ تھا جس میں پاسپورٹ سائز تصویر بھی تھی۔ تصویر دیکھ کر میں اس شخص کو پہچان گئی۔ یہ غیر ملکی شخص ڈاکٹر رچرڈ کے محافظوں میں سے ایک تھا۔ مزید کاغذات کا جائزہ لینے کے بعد مجھے پتا بھی مل گیا جہاں ہیرلیس دہلی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ کر چونک اٹھی کہ وہ پتا پارلیمنٹ اسٹریٹ ہی کی ایک کوٹھی کا تھا۔ کیا میں اس شخص کے ذریعے ڈاکٹر رچرڈ تک پہنچ سکتی ہوں؟ میں نے سوچا اور پھر میرا ذہن اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ شخص میرے لئے سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ خود ڈاکٹر رچرڈ بھی

اسی کوٹھی میں ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

ڈاکٹر رچرڈ پر ہاتھ ڈالنے کا سنہری موقع کھونے کے بعد میں کچھ مایوس ہو گئی تھی لیکن اب پھر میرے ہاتھ میں ایک کارڈ آ گیا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ یہ کارڈ آج ہی رات کیوں نہ آزمایا جائے! یہی سوچ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹیکسی کے ذریعے اس علاقے تک پہنچنا مشکل نہیں تھا مگر وہاں سے واپسی میں مجھے ٹیکسی ملنا ناممکن ہوتا۔ ٹیکسی والے سے یہ بات بھی کی جا سکتی تھی کہ وہ واپسی کے لئے وہیں رک کر میرا انتظار کرے مگر ضروری نہیں تھا کہ وہ ٹیکسی والا اس پر آمادہ ہو جاتا۔ میں نے اسی لئے ایک بار پھر ہوٹل سے ہی کار حاصل کرنے کو ترجیح دی۔

''میڈم! آپ کو کار فراہم کی جا سکتی ہے مگر اس کے لئے آپ کو صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔'' ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر نے مجھ سے کہا۔

''مگر کار تو مجھے اسی وقت چاہئے!'' میں زور دے کر بولی۔ ''تعجب ہے مجھے کہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل اپنے مسافروں کو یہ سہولت فراہم نہیں کر سکتا۔'' میرے لہجے میں کسی قدر خفگی تھی۔

''آپ خفا نہ ہوں میڈم! تشریف رکھئے میں کوشش کرتا ہوں۔'' وہ لجاجت سے کہنے لگا۔

میں قریب ہی پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی اور وہ کسی کے نمبر فون پر ملانے لگا۔

فون پر بات کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ کو آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں اس زحمت کے لئے معافی چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں آپ مجھے فون پر کار کے آنے کی اطلاع دے دیجئے گا۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے مطلوبہ رقم ادا کی اور اپنے کمرے کا نمبر بتا کر چلی آئی۔

اس نے یقیناً کسی ایسی کمپنی سے رابطہ قائم کیا تھا جو کرائے پر کاریں فراہم کرتی ہو گی۔ پھر آدھے گھنٹے سے پہلے ہی مجھے اس نے کار آنے کی اطلاع فون پر دے دی۔ اپنے کمرے سے چلتے وقت میں نے اپنے پرس میں وہ ریوالور رکھ لیا تھا جو مجھے ڈاکٹر رچرڈ کی کار سے ملا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ہیرلیسن کا پتا بھی ایک بار پھر دیکھ لیا تھا۔

میری توقع کے مطابق کار کے ایک ساتھ ایک سکھ ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اس نے میرے لئے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔ جب ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

''پارلیمنٹ اسٹریٹ چلو!''

''بہتر ہے جی!'' یہ کہہ کر سکھ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر دی اور اسی کے ساتھ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں آج ہی رات ایک بار پھر ڈاکٹر رچرڈ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں اسی لئے اضافہ ہوا تھا۔

☆...☆...☆

اشوکا ہوٹل کی حدود سے میری کار باہر نکل آئی تو میں نے پہلی بار عقبی آئینے میں سکھ ڈرائیور کے چہرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ کار کے اندر روشنی تھی اس لئے مجھے ایسا کرنے میں دشواری پیش نہ آئی۔ کسی کا چہرہ پڑھ کر اس کی شخصیت اور کردار کے بارے میں اندازہ لگا لینا میرے لئے مشکل نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ نصف شب گزرنے کے بعد کسی اکیلی عورت کا ایک اجنبی مرد ڈرائیور کے ساتھ ہونا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا، مگر میں ایسے چھوٹے موٹے خطرات کو خاطر میں لانے کی قائل نہیں تھی۔ جلدی میں میک اپ کرنے کے سبب میں اس بات کا خیال نہیں رکھ سکی تھی کہ میرا چہرہ زیادہ پرکشش نظر نہ آئے۔ متناسب جسم کے ساتھ قبول صورت عورتیں بھی مردوں کے لئے وجہ کشش بن جاتی ہیں، میں یہ بھی بہ خوبی جانتی تھی۔ سکھ ڈرائیور کا چہرہ پڑھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ نشے کا عادی ہے، دوم یہ کہ عیاش بھی ہے، مگر جرائم پیشہ یا خطرناک نہیں۔ میری تسلی کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ نشہ کرنا یا اس کا عیاش ہونا میرے لئے کوئی بڑا خطرہ نہیں تھا، پھر بھی میرا چوکنا رہنا ضروری تھا۔ سکھ ڈرائیور کی طرف سے قدرے اطمینان کے بعد میرا ذہن ایک بار پھر اپنے حریف ڈاکٹر رچرڈ کی جانب مبذول ہو گیا۔

ڈاکٹر رچرڈ اپنی حکومت کے ایما پر میری تلاش میں قاہرہ سے دہلی آیا تھا۔ اس کا مقصد مجھے قتل کرنا تھا تاکہ میں آئندہ اس کے ملک کے مخصوص مفادات کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکوں۔ میرے ہاتھوں اب تک متعدد بہترین امریکی ایجنٹ مارے جا چکے تھے اور بیشتر گرفتار ہو چکے تھے۔ میں کم از کم اپنے ملک کی حد تک امریکی ایجنٹوں اور ان کے مقامی کارندوں کے لئے ایک مستقل خطرے کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اس بات کا اعتراف خود ڈاکٹر رچرڈ نے بھی کیا تھا اسی لئے اس کے ملک کی حکومت مجھے راستے سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ امریکی ایجنٹوں کے لئے دنیا کے کسی بھی ملک اور کسی بھی حصے میں مجھ سے برسرپیکار ہونا مسئلہ نہیں تھا۔ تقریباً ساری ہی دنیا میں امریکی ایجنٹوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ میں اتنی بے خبر نہیں تھی کہ یہ سمجھ لیتی کہ ڈاکٹر رچرڈ کو ختم کر دینے سے بات ختم ہو جائے گی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ عیار میرے ہاتھوں مارا بھی جاتا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لے لیتا، لیکن وہ دوسرا شخص جلد مجھے نہ سمجھ پاتا اور نہ میرے حربوں کا فوری طور پر کوئی توڑ کر سکتا۔ اس کے علاوہ یہ کہ ڈاکٹر رچرڈ ایسے ذہین و عیار شخص کی جگہ پر کرنا اس کے آقاؤں کے لئے مشکل ثابت ہوتا۔ یوں انہیں میرے ہاتھوں ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا۔ ایسی صورت میں یہ امکان بھی تھا کہ وہ مجھ پر دوبارہ ہاتھ ڈالنے کی حماقت نہ کرتے۔ ڈاکٹر رچرڈ کی موت سے ایک فائدہ یہ بھی ممکن تھا کہ وقتی طور پر ہی سہی، میرے ملک میں امریکی ایجنٹوں کی سرگرمیاں رک

جاتیں۔ میرا ذہن انہی خیالوں میں الجھا رہا اور راستہ طے ہوتا رہا۔ میں ڈرائیور کی طرف سے چوکنا تھی اس لئے راستے پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی کہ وہ صحیح سمت جا رہا ہے یا نہیں! مگر ڈرائیور نے کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہیں کی اور نصف گھنٹے سے کچھ پہلے ہی پارلیمنٹ اسٹریٹ کی حدود میں داخل ہو گیا۔

''کدھر چلنا ہے میڈم؟'' سکھ ڈرائیور نے مجھ سے رہنمائی چاہی۔ کار کی رفتار اس نے کچھ کم کر دی تھی۔

جواباً میں نے اسے اس کوٹھی کا نمبر بتایا جہاں ڈاکٹر رچرڈ کا محافظ ہیریلیسن ٹھہرا ہوا تھا، پھر اس نے کہا۔ ''تم ایک طرف کار روک کر کسی قریبی کوٹھی کا نمبر پڑھ لو، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمیں کس طرف چلنا ہے! تمہیں زحمت تو ہو گی مگر......'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں میڈم، زحمت کی کوئی بات نہیں، میں دیکھ لیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کار سڑک کے کنارے روک لی اور پھر اس سے اتر گیا۔

سارا علاقہ خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا مگر وہاں روشنی کا معقول بندوبست تھا۔ بجلی کے کھمبے قریب قریب لگے ہوئے تھے۔ دور دور تک سڑک پر کوئی دوسری سواری یا کوئی راہ گیر نظر نہیں آ رہا تھا۔ جلد ہی ڈرائیور لوٹ آیا اور اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مجھے بتایا کہ مطلوبہ کوٹھی میرے اندازے کے مطابق عقبی سڑک پر ہونا چاہئے۔ اسی کے ساتھ اس نے قریبی کوٹھی کا نمبر بھی بتایا۔

مطلوبہ کوٹھی کی تلاش میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ہر کوٹھی کے گیٹ پر نمبر لکھے ہوئے تھے اس لئے تلاش میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ایک پختہ گلی تھی اور مطلوبہ کوٹھی اس کے ایک سرے پر تھی۔ میں نے ڈرائیور سے گلی کے دوسرے سرے کی طرف چلنے کو کہا تو وہ کچھ حیران سا ہوا۔

''تم وہاں رک کر میری واپسی کا انتظار کرو گے اور جب تک میں لوٹ نہیں آؤں گی، تم وہیں رکو گے۔ واپسی میں مجھے دیر بھی لگ سکتی ہے۔'' میں نے ڈرائیور کو ہدایت دی۔

میرے کہنے پر اس نے گلی کے دوسرے سرے پر لے جا کر کار روک دی اور میں کار سے اتر کر پیدل مطلوبہ کوٹھی کی طرف بڑھنے لگی۔ مطلوبہ کوٹھی کے سامنے کار نہ رکوانے کی وجہ سے سکھ ڈرائیور شک و شبے کا شکار ہو سکتا تھا لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ احتیاط کا تقاضا بھی تھا کہ کار اس کوٹھی سے دور کھڑی کی جائے۔

ابھی میں اس گلی کے درمیان تک پہنچ سکی تھی کہ کچھ ہی فاصلے پر دائیں جانب ایک کوٹھی کے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھلا۔ اسی کے ساتھ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں چونک کر غیر ارادی طور پر اپنی جگہ رک گئی۔ پھر میری آنکھوں نے حیرت انگیز منظر دیکھا۔ پھاٹک کے ذیلی دروازے سے ایک نوجوان لڑکی وحشت زدہ ہرنی کی طرح بھاگتی ہوئی گلی میں آ گئی۔ اس کے لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور لباس بے ترتیب سا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں یہ بھی دیکھ لیا کہ اس لڑکی کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور منہ بھی کسی کپڑے سے بندھا ہے۔ وہ وحشت زدہ سی میری ہی طرف بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے پیروں میں بھی جوتے نہیں تھے۔ ننگے پیر، کھلے بال اور بے ترتیب لباس کے ساتھ اس عالم میں کسی نوجوان لڑکی کا رات کے وقت ایک کوٹھی سے فرار ہونا مجھے بہت کچھ سمجھا گیا۔

اس پر کیا بیتی ہو گی اور وہ کن حالات کا شکار ہونے والی تھی، یہ سمجھنا میرے لئے دشوار نہیں تھا۔ وہ لڑکی ابھی میرے قریب ہی پہنچی تھی کہ پھاٹک کے ذیلی دروازے سے دو آدمی بھاگتے ہوئے گلی میں آ گئے۔ ان میں سے ایک دراز قد تھا اور دوسرا گٹھے ہوئے جسم کا ایک پستہ قد شخص! ان دونوں ہی کے ہاتھوں میں مجھے کھلے چاقو نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں نے میری اور لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر وہ جھپٹ پڑے۔

''اب مزید بھاگنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے لڑکی سے کہا۔ ''تم بے فکر رہو، میں ان دونوں کو سنبھال لوں گی۔'' یہ کہتے ہی میں نے لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اپنے پیچھے کر لیا۔

وہ دونوں اس دوران میں جھپٹتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ قدرت نے اسی لڑکی کی مدد کے لئے شاید مجھے وہاں بھیجا تھا۔

''اے! کون ہو تم؟ ہٹ جاؤ سامنے سے!'' دراز قد شخص کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

''سنو استاد! یہ بھی تو کچھ ایسی بری نہیں۔ شرما بابو ایک کی بجائے دو دو چوزوں کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔'' پستہ قد شخص اپنی تیز چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے ٹٹولتے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔

''خیال برا نہیں۔'' دراز قد شیطانی انداز میں مسکرایا، پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مگر یہ...... یہ اتنی رات گئے اکیلی یہاں کہاں سے ٹپک پڑی!''

''میں بتاتی ہوں تمہیں!'' میں بول اٹھی۔ اسی کے ساتھ میرے دائیں پیر نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔

پھر دراز قد شخص کے پیڑو پر میرے پیر کی بھرپور ضرب پڑی تھی اور وہ منہ سے ''اوہ'' کہتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ میری یہ خطرناک ضرب غیر متوقع تھی اس لئے پستہ قد شخص آنکھیں پھاڑے اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ اس کی حیرت زدگی سے میں نے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ میں نے اس سے چاقو چھین لیا تھا۔ اس عرصے میں زمین پر بیٹھا ہوا شخص آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اٹھتے ہی اس نے مجھ پر چاقو سے حملہ کیا۔ میں نے جھکائی دے کر اس کے وار کو ناکام بنا دیا، پھر اپنے ہاتھ میں چاقو سنبھالے اس کے سامنے آ گئی۔ وہ بھی جھکا ہوا تھا اور میں بھی! پستہ قد شخص اچھل کر دور ہٹ گیا تھا کہ کہیں وہ جھپٹ میں نہ آ جائے۔

مجھ پر حملہ کرنے کے لئے میرے مقابل نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا، میں نے تیزی کے ساتھ جھپٹ کر اس کی کلائی اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑ لی۔ اسی کے ساتھ دائیں ہاتھ سے میں نے اس کے رخسار پر چاقو کا چرکا لگایا۔ اگر وہ جلدی سے اپنا چہرہ پیچھے نہ ہٹا لیتا تو زخم گہرا لگتا۔ قوس کی صورت میں خون کی بوندیں اس کے رخسار پر ابھریں اور پھر بہنے لگیں۔ ابھی تک اس کی کلائی میری گرفت میں تھی۔ اس نے بھی میرے دائیں ہاتھ کی کلائی پکڑنے میں دیر نہیں کی اور میں دوبارہ اسے زخم نہ لگا سکی۔

اب اس کے اور میرے درمیان زور آزمائی ہونے لگی۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور تھا، لیکن ذہین اور پھرتیلا نہیں، غالباً اسی لئے چوٹ کھا گیا۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں اپنی ایک ٹانگ پھنسا کر اسے گرا دیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں، پستہ قد شخص کی طرف سے غافل ہو گئی تھی۔ اس

نے پیچھے سے مجھ پر چھلانگ لگادی تھی۔ وہ خاصا بھاری تھا اور غیر متوقع طور پر میرے اوپر آ رہا تھا اسی لئے میں سنبھل نہ سکی اور میں زمین پر گر گئی۔ وہ میری پشت پر سوار تھا۔ چاقو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے گرتے گرتے چاقو کا رخ بدلا اور پھر دوسرے ہی لمحے پستہ قد کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ چاقو کی نوک اس کے شانے میں اتر گئی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اچھل کر میری پشت سے ہٹ گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی مجھ پر حملہ آور ہوسکتا میں تیزی کے ساتھ اٹھی اور دیکھا کہ دراز قد شخص مجھ سے چند ہی قدم کے فاصلے پر زمین سے اٹھنے کی کوشش کررہا تھا، مگر وہ خالی ہاتھ تھا۔ گرتے ہوئے چاقو شاید اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میں کسی عقاب کی طرح گویا اڑتی ہوئی اس تک پہنچ گئی۔ میں نے بھی اپنے ہاتھ سے چاقو دور پھینک دیا اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے بائیں ہاتھ کی ضرب لگائی۔ اس کا منہ اوپر اٹھا تو میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ اس بار میں نے اس کی کنپٹی کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ بڑا نپا تلا ہاتھ تھا۔ نتیجتاً دوسرے ہی لمحے وہ شخص لہراتا ہوا زمین پر آ رہا۔ عین اسی وقت میں نے اپنی طرف پستہ قد شخص کو جھپٹتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ غالباً اس نے اپنے ساتھی کے ہاتھ سے گرے ہوئے چاقو کو ڈھونڈ لیا تھا اور پھر اسے قبضے میں کرکے مجھ پر جھپٹ پڑا تھا۔ میں انتہائی پھرتی سے ایک طرف ہوگئی اور وہ اپنے زور میں آگے بڑھتا چلا گیا، لیکن اسی کے ساتھ منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اپنی دائیں ٹانگ آگے بڑھادی تھی۔ وہ میری ٹانگ ہی سے الجھ کر زمین پر گرا تھا۔ پھر میں نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ پے در پے میری دو تین ٹھوکروں نے اسے بھی ہوش وحواس سے بیگانہ کردیا۔ میری آخری بھرپور ٹھوکر اس کی کھوپڑی پر پڑی تھی۔

ان دونوں بدمعاشوں سے نبرد آزما ہوتے وقت میں اس لڑکی کی طرف توجہ نہیں دے سکی تھی جو اس ہنگامے کا سبب بنی تھی۔ اب جو ان دونوں سے نمٹ کر میں نے اس لڑکی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو چونک اٹھی۔ گلی سنسان پڑی تھی اور اس لڑکی کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ یقیناً وہ خوف کے عالم میں موقع غنیمت جان کر وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ شاید اسے میری اس بات پر یقین نہیں آیا تھا کہ میں ان دونوں بدمعاشوں کو سنبھال لوں گی۔ یہ سوچ کر وہ لڑکی اس حالت میں کسی اور حادثے کا شکار نہ ہو جائے یا پھر کسی غنڈے کے ہتھے نہ چڑھ جائے، مجھے اس کی طرف سے تشویش ہوئی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ اپنے منہ پر بندھا ہوا کپڑا بھی نہیں کھول سکتی تھی۔ اسی بے بسی کے عالم میں کوئی بھی شخص بہ آسانی اسے اپنے قابو میں کرسکتا تھا۔

میری وہاں آمد کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا لیکن میں ایک اور ہی قصے میں الجھ گئی تھی۔ انسانی ہمدردی کا تقاضا یہی تھا کہ پہلے میں اس لڑکی کی مدد کرتی۔ میں اسی خیال سے اپنی کار کی طرف پلٹی۔ میں جب کار کے قریب پہنچی تو خلاف توقع کار کی تمام لائٹس بجھی ہوئی نظر آئیں۔ گلی کے نکڑ پر بجلی کا کھمبا لگا ہوا تھا۔ اس کی مدھم سی روشنی پڑ رہی تھی۔ اسی مدھم روشنی میں ڈرائیونگ سیٹ مجھے خالی نظر آئی۔ کار کے شیشے بھی چڑھے ہوئے تھے، اچانک میں نے کار میں ہلکی سی جنبش محسوس کی مگر کار اپنی جگہ کھڑی رہی۔ پھر مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ کار کی پچھلی نشست پر کوئی موجود ہے۔ میں نے کار کے پچھلے دروازے کے شیشے سے جب اندر دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا۔ دو سائے مجھے ایک دوسرے سے الجھے نظر آئے۔ ان

میں سے ایک یقیناً سکھ ڈرائیور تھا اور دوسری وہی مظلوم لڑکی ہوسکتی تھی جسے میں نے غنڈوں سے بچایا تھا۔ سکھ ڈرائیور یقیناً اس لڑکی کو زیر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا اور شاید ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک لحہ بھی ضائع کئے بغیر کار کا دروازہ کھولنا چاہا مگر دروازہ نہ کھل سکا۔ میں سمجھ گئی کہ دروازہ اندر سے مقفل ہے۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنے شانے سے لٹکا ہوا پرس کھول کر اس میں سے ریوالور نکال لیا۔ سکھ ڈرائیور اپنی جدوجہد میں اتنا مصروف تھا کہ یقیناً اسے کار کے باہر کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔ میں نے ریوالور کا دستہ کار کے شیشے پر مارا۔ دانستہ میں نے ہلکی ضرب لگائی تھی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ اس طرح سکھ ڈرائیور میری طرف متوجہ ہوجائے گا اور اگر وہ پھر بھی دروازہ نہ کھولے تو میں شیشہ توڑ کر دروازہ کھول دوں۔

میری ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ اندر متحرک سائے ایک دم جیسے بے جان ہوگئے۔

"دروازہ کھولو!" میں تقریباً چیخ اٹھی۔ مجھے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہورہا تھا۔

ذرا ہی دیر کے بعد کار کا دروازہ کھل گیا اور سکھ ڈرائیور باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے باہر نکلتے ہی کار کی طرف رخ کرکے سخت لہجے میں کہا۔ "باہر نکلو!"

"کون ہے اندر؟" میں نے جان کر انجان بنتے ہوئے سوال کیا۔

"معلوم نہیں کک...... کون لڑکی ہے! زبردستی کار میں گھس کر بیٹھ گئی ہے اور...... نکل نہیں رہی۔ سکھ ڈرائیور نے میری بات کا جواب دیا۔

"اور تم اسے باہر نکالنے کی کوشش کررہے تھے! ہیں نا؟"

"جج...... جی ہاں میڈم!" وہ کچھ گھبرا کر بولا۔ اس کی نظریں میرے ہاتھ میں موجود ریوالور پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے اپنے غصے پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے مصلحت وقت کے پیش نظر سکھ ڈرائیور سے کہا۔

"تم اپنی سیٹ پر جاکے بیٹھو، میں اس لڑکی کو دیکھتی ہوں۔ کار میں روشنی بھی کردینا!"

"جی...... جی بہتر ہے میڈم!" وہ جلدی سے بولا اور پھر کار کا اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میں نے اس دوران میں پرس کھول کر ریوالور اس میں رکھ دیا اور پھر کار کے اندر روشنی ہوتے ہی اندر نگاہ ڈالی۔ وہی مظلوم لڑکی پچھلی سیٹ پر بے حال سی پڑی تھی۔ اس کی ساڑی مسلی ہوئی بے ترتیب تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی ساڑی درست کی اور پھر اسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے تیزی سے اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیئے، پھر منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھولنے لگی۔ لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لڑکی کے منہ سے کپڑا کھولتے ہی میں نے سکھ ڈرائیور کو حکم دیا۔ "واپس چلو!" میں فی الحال جلد از جلد وہاں سے دور چلا جانا چاہتی تھی کیوں کہ کسی بھی وقت بے ہوش غنڈے ہوش میں آکر کوئی ہنگامہ کھڑا کرسکتے تھے۔

"میرا حکم سن کر سکھ ڈرائیور بولا۔ "میڈم! یہ...... یہ لڑکی؟"

"اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے!" میرے لہجے میں قدرے سختی آ گئی۔ "یہ لڑکی

اب میرا مسئلہ ہے۔"

سکھ ڈرائیور کو میرے حکم پر کار اسٹارٹ کرنا ہی پڑی۔ لڑکی ابھی تک خاموش ہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جارہے تھے۔ میں نے اسی کی ساری کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے، پھر اسے تسلی دینے لگی کہ اب تم خود کو قطعی محفوظ سمجھو اور سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اس سکھ ڈرائیور نے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی؟

"اس... اس نے کو...... کوشش تو کی تھی اور...... اور شاید یہ...... یہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ اگر آپ...... آپ چند...... چند لمحے اور نہ آتیں تو...... تو یہ!......" لڑکی رک رک کر میرے سوال کا جواب دینے لگی۔ "م...... میں اس...... اس گلی سے نکل کر بھاگ رہی تھی کہ...... کہ اس نے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا اور...... اور پھر گھسیٹتا ہوا کار......"

"یہ جھوٹ بول رہی ہے میڈم!" سکھ ڈرائیور بول اٹھا۔

"تم خاموش رہو!" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ پھر لڑکی سے بولی۔ "تم وہاں سے کیوں بھاگ اٹھی تھیں؟"

"میں...... میں سمجھی تھی کہ وہ...... وہ دونوں شاید آپ...... آپ کے قابو میں نہیں آئیں گے۔ مجھے معاف کر دیجئے کہ میں...... میں نے ایسا کیا۔" لڑکی کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ اب وہ بڑی حد تک خود پر قابو پا چکی تھی، مگر اب بھی سکھ ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر خوف کے سائے سے محسوس ہونے لگتے تھے۔

"میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ تم قطعی محفوظ ہو، تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اب مجھے اپنے بارے میں بلا کسی جھجک کے سب کچھ صاف صاف بتا دو! میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہاری مدد کروں گی اور تم جہاں کہو گی تمہیں پہنچا دوں گی۔" میرے لہجے میں نرمی تھی جس کا لڑکی پر اثر ہوا اور وہ مجھے اپنی کہانی سنانے پر راضی ہو گئی۔ میں نے سکھ ڈرائیور سے کہا کہ وہ کار کی رفتار کر کر دے۔

اس لڑکی نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا مختصراً کچھ یوں تھا۔ اس کا نام سروج تھا اور وہ بی اے کی طالبہ تھی۔ آج شام اسے ایک مقامی کالج کے قریب سے اغوا کیا گیا تھا۔ اسے اغوا کرانے والا کون تھا؟ وہ اس سے لاعلم تھی۔ ہاں وہ اغوا کرنے والوں کو ضرور پہچانتی تھی۔ یہ وہی دونوں بدمعاش تھے جن سے مجھے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ وہ دونوں اسی عیاش بوڑھے کے نوکر معلوم ہوتے تھے جس نے سروج کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی مگر نشے کی زیادتی کے سبب وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا اور پھر نشے ہی کے زیر اثر اسے نیند آ گئی تھی۔ سروج کو صرف اس بوڑھے کی دست درازیوں کا شکار ہونا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ اپنی مدافعت میں صرف اپنی ٹانگیں استعمال کر سکی تھی۔ انہی کی مدد سے اس نے بوڑھے کو حد سے نہیں گزرنے دیا تھا۔ پھر بوڑھا تھک تھکا کر سو گیا تھا۔ سروج کی یہ خوش قسمتی تھی کہ نشے میں بوڑھا کمرے کا دروازہ لگانا بھول گیا تھا۔ بوڑھے کے بے خبر ہوتے ہی وہ نکل بھاگی تھی مگر باہر دونوں غنڈے موجود تھے جو اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ سروج کا گھر قرول

باغ میں تھا۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا باپ وکیل تھا۔

سروج سے اس کی کہانی سن کر مجھے یہ اطمینان ہوا کہ وہ بے آبرو ہونے سے بچ گئی تھی۔ اس میں کچھ تو اس کی ہمت و حوصلے کو دخل تھا اور کچھ اس کی خوش قسمتی نے مجھے بروقت وہاں پہنچا دیا تھا ورنہ ظاہر ہے کہ وہ ان غنڈوں سے نہ بچ سکتی اور دوبارہ ان کے ہتھے چڑھ جاتی۔

"میرا خیال ہے سروج کہ تمہیں اسی وقت تمہارے گھر پہنچا دوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

ہاں! مگر...... مگر میں...... میں اپنے پتا جی کو کس طرح اس...... اس واقعے کے بارے میں بتا سکوں گی!" اس معصوم لڑکی کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آنے لگے۔

"تمہاری والدہ بھی تو ہوں گی! تم انہیں بتا دینا۔" میں نے مشورہ دیا۔

جواباً سروج نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولی۔ "سورگ باش ہو چکی ہیں۔" اس نے اپنی والدہ کی وفات کے بارے میں بتایا، پھر خود ہی کہنے لگی۔ "ہاں بھابی سے میں یہ سب کچھ کہہ سکتی ہوں۔" پھر شاید اسے میرا شکریہ ادا کرنے کا خیال آ گیا۔ اس نے کہا۔ "میں آپ کی آبھاری (شکر گزار) ہوں کہ آپ نے مجھے بچا لیا ورنہ میں برباد ہو جاتی۔ آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

"یہ تو فرض تھا میرا!" میں نے کہا۔ "میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میری بجائے تمہیں اوپر والے کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ اسی نے تمہیں بچایا ہے۔"

"اب تک آپ نے مجھے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں!" سروج بولی۔ "آپ اتنی رات گئے وہاں کیسے پہنچ گئیں؟"

"میرے متعلق بس اتنا جان لو کہ میں تمہارے شہر میں اجنبی ہوں۔ میں یہاں اشوکا ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ وہاں پارلیمنٹ اسٹریٹ میں اپنے ایک شناسا سے ملنے گئی تھی۔ کار سے اتر کر میں اس کوٹھی کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں مجھے جانا تھا کہ میری نظر تم پر پڑ گئی۔ پھر کیا ہوا؟ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے!" پھر میں نے اسے اپنا وہ فرضی نام بھی بتا دیا جو اشوکا ہوٹل میں لکھوایا تھا اور یہ بھی کہ میں بمبئی سے وہاں سیر و سیاحت کی غرض سے آئی ہوں۔ یہی معلومات میں نے ہوٹل والوں کو بھی اپنے متعلق فراہم کی تھیں۔ اسی کے ساتھ میں نے سکھ ڈرائیور کو قرول باغ چلنے کا حکم دیا۔ پہلے وہ میرے ایما پر اشوکا ہوٹل کی طرف جا رہا تھا مگر اب اس نے کار کا رخ تبدیل کر لیا۔ کار اب قرول باغ کی طرف جا رہی تھی۔

"پتا جی کا خیال یقیناً غلط ہی تھا۔" سروج نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "آخر آپ...... آپ بھی تو مسلمان ہیں!"

"کس سلسلے میں تمہارے پتا جی کا خیال غلط تھا سروج؟" میں نے اس سے پوچھا۔ اسے میں نے اپنا نام زینب بتایا تھا اور یہ اسی کا ردعمل تھا۔

"یہی کہ مسلمان اچھے نہیں ہوتے۔" اس نے صاف گوئی سے بتا دیا۔

"ممکن ہے ان کا ایسا ہی تجربہ رہا ہو، لیکن میں تمہیں ایک بات ضرور بتانا چاہتی ہوں۔ ہر فرقے، ہر مذہب اور ہر قوم میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی! اچھے یا برے ہونے کا تعلق کسی

خاص فرقے یا مذہب کے ماننے والوں سے نہیں ہوتا۔ نہ سارے ہندو ایک سے ہوتے ہیں نہ مسلمان!‘‘ یہ کہتے ہوئے میری نگاہ عقبی آئینے کی طرف اٹھی۔ سکھ ڈرائیور ہمیں دونوں کو آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے مصلحتاً اب تک اسے نظر انداز کیا ہوا تھا ورنہ وہ یقیناً سزا کا مستحق تھا۔ اس نے ایک مظلوم لڑکی کی بے بسی سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ وہ اس لڑکی کی مدد کرنے کی بجائے موقع سے فائدہ اٹھا رہا تھا کہ میں پہنچ گئی۔ پشت پر ہاتھ بندھے ہونے کے سبب وہ لڑکی اس کے لئے لقمہ تر ہی ثابت ہوتی مگر میں نے وہ لقمہ تر اس کے حلق سے نیچے نہیں اترنے دیا تھا۔

وقتی طور پر اس لڑکی کی وجہ سے میرا طے شدہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا لیکن ابھی رات باقی تھی۔ میں اس لڑکی کو اس کے گھر پہنچا کر دوبارہ پارلیمنٹ اسٹریٹ پہنچ سکتی تھی۔ میں نے اسی لئے فیصلہ کرلیا تھا کہ قرول باغ میں سروج کے گھر رکوں گی نہیں اور اسے گھر کے دروازے سے چھوڑ کر چلی آؤں گی۔ میں یقیناً ایسا ہی کرتی مگر قرول باغ پہنچ کر صورت حال بدل گئی۔ سروج کے گھر کا دروازہ اتنی رات گئے بھی کھلا ہوا ہی تھا۔ غالباً سبھی گھر والے جاگ رہے تھے۔ جب میری کار اس کے گھر کے سامنے رکی تو اس کا بڑا بھائی اپنا سکوٹر لے کر باہر نکل رہا تھا۔ وہ شاید سروج کی تلاش میں کہیں جا رہا تھا۔ کار رکنے کے بعد جیسے ہی سروج اتر کر گھر کے دروازے کی طرف بڑھی، اس کے بھائی نے اسے دیکھ لیا۔ سروج ’’بھیا‘‘ کہہ کر اس کے گلے سے لگ گئی۔ پھر سروج کا بڑا بھائی وہیں سے مسرت بھرے انداز میں چیخ اٹھا ’’پتا جی! یہ دیکھیں سروج واپس آ گئی!‘‘

چند ہی لمحے بعد گھر کے دروازے سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلا۔ اس دوران میں سروج اپنے بھائی کے گلے سے الگ ہو چکی تھی۔ پھر وہ اس ادھیڑ عمر شخص سے چپٹ کر رونے لگی جو یقیناً اس کا باپ ہی ہوسکتا تھا۔ میری کار قریب ہی کھڑی تھی مگر میں نیچے نہیں اتری تھی۔ سروج کے باپ اور اس کے بھائی کی موجودگی میں اب ان لوگوں سے ملے بغیر واپس چلا جانا مجھے مناسب معلوم نہ ہوا۔ اس طرح وہ نہ معلوم کیا سوچتے! اور پھر سروج کا بیان بھی ان کی نظر میں مشتبہ ہو جاتا۔

اپنے باپ سے الگ ہو کر سروج اچانک مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ’’زینب دیدی! آپ..... آپ نہیں ملیں گی میرے پتا جی سے!‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

’’کیوں نہیں سروج! ضرور ملوں گی تمہارے پتا جی سے!‘‘ میں یہ کہتے ہوئے کار سے اتر آئی اور پھر سروج کے باپ کے قریب پہنچ کر کہا۔ ’’نمستے وکیل صاحب!‘‘

ادھیڑ عمر شخص نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر دعا دی۔ ’’جیتی رہو!‘‘

اس کے بعد میں سروج اور اس کے باپ کی ضد پر اندر گھر میں چلی آئی۔ میں نے سوچا کہ اب یہاں آ تو گئی ہوں، پھر کیوں نہ سروج کو استفسار سے بچالوں مگر یہ بات سروج کے سامنے کرنے کی نہیں تھی۔ میں اسی لئے سروج سے مخاطب ہوئی۔

’’سروج! تم میرے لئے عمدہ سی چائے بنا کر لاؤ اتنے میں تمہارے پتا جی سے بات کرتی ہوں۔‘‘ سروج کا بھائی اپنا سکوٹر گھر میں لانے کے لئے چلا گیا۔

’’بالکل دیدی! ابھی آپ کے لئے چائے بنا کر لائی!‘‘ سروج یہ کہہ کر گھر کے اندرونی حصے کی

طرف چلی گئی اور میں اس کے باپ کی رہنمائی میں نشست گاہ کے اندر داخل ہوگئی۔

’’آپ یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ سروج مجھے کہاں ملی؟‘‘ میں نے صوفے پر بیٹھتے ہی بات شروع کردی۔ میرا مخاطب سروج کا باپ تھا۔

’’ہاں ضرور!‘‘ سروج کا باپ بولا۔ ’’میں نے تھانے میں بھی رپورٹ لکھا دی تھی، مجھے وہاں بھی جا کر بتانا پڑے گا کہ میری بیٹی گھر آ گئی ہے۔‘‘

’’پہلے میں مختصراً اپنا تعارف کرادوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں یہاں اشوکا ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ زینب نام ہے میرا اور بمبئی سے یہاں سیر وسیاحت کے لئے آئی ہوں۔ جو کار آپ نے باہر دیکھی تھی، وہ بھی اشوکا ہوٹل والوں نے میرے لئے فراہم کی ہے۔ آپ کا تعارف سروج مجھ سے کرا چکی ہے۔‘‘ یہ کہہ کر مختصراً میں نے تمام واقعات بیان کردیئے۔ سکھ ڈرائیور کا قصہ میں گول کر گئی تھی۔

’’بھگوان نے مجھ پر بڑی دیا کی بیٹی کہ تم وہاں پہنچ گئیں۔ یقیناً تم ایک بہادر لڑکی ہو ورنہ ان غنڈوں کو نیچا نہ دکھا پاتیں۔ ہاں، یہ بتاؤ کہ اس کوٹھی کا نمبر کیا تھا؟‘‘ سروج کے باپ نے پوچھا۔

اسی وقت سروج چائے لے آئی۔ اس نے ابھی تک اپنا حلیہ بھی درست نہیں کیا تھا۔ چائے کے ساتھ بسکٹ، پاپڑ اور پھل بھی تھے۔

’’ارے لڑکی! تم نے یہ کیا تکلف کر ڈالا!‘‘ میں نے محبت سے سروج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سروج نے سینٹرل ٹیبل پر ٹرے رکھ دی اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’یہ تکلف نہیں دیدی! لیجئے کھائیے!‘‘ اس نے بسکٹ کی پلیٹ اور دوسرا سامان میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

’’تم ایک ہی کپ چائے کیوں لائی ہو؟ میں نے سروج کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اپنے پتا جی کے لئے بھی تو چائے لاؤ!‘‘

’’پتا جی رات کو چائے نہیں پیتے۔‘‘ سروج نے جواب دیا۔

’’تم کھاؤ پیو بیٹی! میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے سروج کے باپ نے کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اسی وقت سروج کا بھائی بھی وہاں آ گیا۔ سروج کا باپ اس سے مخاطب ہوا۔

’’ستیش بیٹے! تم ایسا کرو کہ تھانے چلے جاؤ۔ انسپکٹر سنہا سے میرا نمستے کہنا اور انہیں بتانا کہ سروج گھر آ گئی ہے، وہ فکر نہ کریں! باقی تفصیل میں خود انہیں بتادوں گا۔‘‘

ستیش اپنے باپ کا حکم سن کر وہاں سے چلا گیا۔ سروج بھی اسی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ غالباً سمجھ گئی تھی کہ میں اسی کی مشکل آسان کررہی ہوں۔

’’ہاں تو بیٹی، میں تم سے پارلیمنٹ اسٹریٹ کی اس کوٹھی کا نمبر پوچھ رہا تھا۔‘‘ سروج کے بوڑھے باپ نے مجھے مخاطب کیا۔

’’نمبر تو میں نہیں دیکھ سکی، ہاں اس کوٹھی کی نشان دہی ضرور کرسکتی ہوں، مگر میرا خیال ہے کہ آپ اس معاملے پر خاک ہی ڈال دیں تو اچھا ہے، بلا سبب بدنامی ہوگی۔‘‘

’’تمہارا مشورہ یقیناً بہتر ہے، بیٹی، مگر ان لوگوں کو سزا تو ملنا چاہیے نا! اگر سزا نہ ملی تو ان کے

حوصلے اور بڑھ جائیں گے۔ ظلم پر خاموش رہنا بھی تو ظالم کا ساتھ ہی دینا ہے نا!''

''تو پھر یہی ایک صورت ہے کہ میں وہاں آپ کے ساتھ چل کر کوٹھی کی نشاندہی کردوں۔''
میں کچھ الجھنے لگی۔

''میرا خیال یہ ہے کہ میں سروج اور تمہیں تھانے لے جاؤں، وہاں تم دونوں کے بیانات لکھے جائیں اور پھر اسی وقت پولیس اس کوٹھی پر چھاپہ مارے۔'' بوڑھے کا لہجہ پر جوش تھا۔ ''دیکھو بیٹی، میں ایک وکیل ہوں۔ میری ساری عمر قانون کے ساتھ لڑتے ہوئے گزری ہے۔ اگر میں ہی ذرا سی بدنامی سے ڈر کر چپ بیٹھ جاؤں تو پھر کون قانون کے احترام کے لئے آواز اٹھائے گا! بولو، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''
پھر میرے جواب سے پہلے بوڑھا خود ہی بول اٹھا۔ ''وہ شخص جس نے آج میری بیٹی کو اٹھوایا ہے، کل کسی اور کی بیٹی کو بھی اغوا کرسکتا ہے۔ سماج کے ایسے کسی گھناؤنے کردار کو کھلے بندوں من مانی کرنے کے لئے کھلا نہیں چھوڑنا چاہئے!''

''آپ کے خیالات قابل قدر ہیں وکیل صاحب! مگر جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے، وہ عیاش بوڑھا اور اس کے پالتو غنڈے اب تک وہاں سے راہ فرار اختیار کر چکے ہوں گے۔'' میں نرمی سے بولی۔

''لیکن وہ کوٹھی تو وہاں موجود ہوگی۔ پولیس کے لئے یہ سراغ لگانا کون سا مشکل ہوگا کہ وہاں کون رہتا ہے! اگر وہ خبیث بوڑھا اور اس کے پالتو غنڈے اس وقت وہاں نہ بھی ملے تو پولیس جلد انہیں مفرور قرار دے کر ڈھونڈ نکالے گی۔ میں جہنم تک ان کا پیچھا کروں گا اور کسی قیمت پر ان کو گرفتار کرائے بغیر نہیں چھوڑوں گا!'' بوڑھے کا لہجہ حتمی تھا۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ سروج کا باپ کسی صورت نہیں مانے گا اور قانونی کارروائی ضرور کرے گا۔ اخلاقاً اور قانوناً مجھے اس کا ساتھ دینا چاہئے تھا، اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے مجبوراً بوڑھے کی بات مان لی مجھے اندازہ تھا کہ اس کارروائی میں بقیہ رات گزر جانا مشکل نہیں اس لئے فی الحال ڈاکٹر رچرڈ کو صبر ہی کیا جاسکتا تھا۔ اس کے خلاف اب میں آئندہ شب ہی کوئی قدم اٹھا سکتی تھی۔ میرے لئے ایک بات اور بھی باعث تشویش تھی کہ رات کے ایک بجے کے قریب پارلیمنٹ سٹریٹ میں اپنی موجودگی کا جو جواز میں نے سروج کے باپ کو دیا تھا، وہی پولیس کے سامنے بھی دہرانا پڑتا۔ اگر پولیس کو میرے بیان پر ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو میرے لئے مسئلہ پیدا ہوسکتا تھا۔ میں وہاں اپنے کسی آشنا یا دوست کی کوٹھی کی موجودگی کس طرح ثابت کرتی! لیکن اب یہ سب کچھ سوچنا لاحاصل تھا۔ تیر تو کمان سے نکل ہی چکا تھا۔

میری آمادگی کے بعد بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم بیٹھو، میں ابھی سروج سے تیار ہونے کے لئے کہہ کر آتا ہوں تاکہ اسے تھانے ساتھ لے جایا جاسکے۔''

مجبوراً مجھے اقرار میں سر ہلانا پڑا۔ ''ٹھیک ہے، آپ کہہ آئیں اس سے!''

''تم یہ پھل تو لو نا!'' وہ چلتے چلتے بولا۔

''شکریہ! میں بس اب چائے پیوں گی۔'' میں نے چائے کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

پھر وہاں سے روانگی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس دوران میں سروج کا بڑا بھائی تھانے سے واپس آچکا تھا۔ اسے گھر ہی پر چھوڑ دیا گیا۔ سروج اور اس کا باپ میری ہی کار میں علاقے کے تھانے پہنچے۔

میں نے راستے میں سروج کو صورتحال سے آگاہ کردیا تھا۔ وہ میرے ساتھ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔ میں نے دھیمی آواز میں سکھ ڈرائیور کے قصے کو گول کرجانے کی بھی تاکید کردی تھی۔

''مگر دیدی! میں پتا جی کے سامنے کس طرح پولیس والوں کو یہ بیان دوں گی؟'' سروج نے پریشان سا ہوکر کہا تھا۔

''جب تمہارا بیان ہوگا تو تمہارے پتا جی کو میں وہاں سے ہٹوا دوں گی۔'' میں نے اسے مطمئن کردیا تھا۔

تھانے پہنچتے ہی مجھے اس بات کا احساس ہوگیا کہ سروج کا باپ بااثر آدمی ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ تھانہ انچارج اس وقت تھانے میں موجود تھا ورنہ عموماً رات کے وقت تھانیدار حضرات ''گشت'' پر ہوتے ہیں مگر صرف روزنامچے کے مطابق! درحقیقت وہ اس وقت اپنے گھر خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔

''ادھر پدھاریئے وکیل صاحب!'' تھانیدار انسپکٹر سنہا نے سروج کے باپ کو دیکھ کر کرسی سے اٹھتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ ادھر بھی ایک کرسی رکھی تھی، دیوار سے لگی ہوئی اس کے ساتھ ہی ذرا فاصلے پر دو کرسیاں پڑی تھیں۔

''دھنیہ واد!'' سروج کا باپ شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں بس اب چلنے ہی والا تھا، اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔'' تھانیدار بولا۔ ''ابھی آپ کا پتر ستیش مجھے بتا گیا تھا کہ بٹیا گھر آ گئی ہے۔''

''میں اس وقت نہ آتا سنہا جی مگر بات ہی کچھ ایسی ہے کہ مجھے فوری طور پر آپ کو کشٹ (تکلیف) دینا پڑا۔ میرا وچار ہے کہ میرے کچھ کہنے کی بجائے آپ سروج کا اور ان شریمتی جی کا بیان لے لیں باقاعدہ! پھر خود ہی آپ کو جانکاری ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ میں اس بیچ یہاں نہ رہوں تاکہ سروج بلاکھٹک سب کچھ بتا سکے۔ یہ بیانات ہونے کے بعد آپ خود ہی پہچان جائیں گے کہ میں کیا چاہتا ہوں اور یہ کہ پولیس کو کیا قدم اٹھانا ہے!'' سروج کا باپ جہاں دیدہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے خود ہی سروج کی مشکل آسان کردی تھی۔

''ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ باہر برآمدے میں تشریف رکھیں۔'' پھر تھانیدار نے اپنے اردلی کو بلا کر حکم دیا۔ ''دیوان جی کو بلاؤ! ان سے کہنا کہ بیان لینے ہیں۔''

اردلی کے ساتھ ساتھ سروج کا باپ بھی باہر چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اوسط عمر کا پولیس والا ہاتھ میں ایک رجسٹر اٹھائے کمرے میں آگیا اور پھر پہلے سروج کا بیان لکھا جانے لگا۔ اس دوران میں انسپکٹر سنہا، سروج سے کچھ سوالات بھی کرتا رہا۔ اس نے اپنے بیان میں میرا ذکر بھی کیا تھا۔ عموماً جب دو افراد کا بیان لیا جانے والا ہو تو پولیس والے ایک دوسرے کے سامنے ان کے بیان نہیں لیتے تاکہ بیانات

میں اگر تضاد ہوتو سامنے آجائے، مگر انسپکٹر سنہا نے سروج کے باپ سے تعلقات کی بنا پر غالباً ایسا نہیں کیا تھا۔

سروج کے بعد میرا بیان ہوا۔ میں نے اپنے بیان میں بتایا کہ وہ اپنے ایک واقف کار سے ملنے پارلیمنٹ اسٹریٹ گئی تھی کہ راستے میں مجھے سروج مل گئی۔ اس سے پہلے مختصراً میں نے اپنا تعارف بھی کرادیا تھا جو وہی تھا جس کا پہلے ذکر کرچکی ہوں۔ ان دونوں غنڈوں پر برتری حاصل کرنے کی وجہ میں نے یہ بتائی کہ جوڈو کراٹے سے واقفیت کے سب مجھے ان دونوں کو زیر کرنے میں آسانی ہوئی تھی۔ انسپکٹر سنہا نے مجھ سے بھی سوالات کئے، مگر یہ سوالات ان دونوں غنڈوں کے حلیے سے متعلق تھے۔ مجھے جس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں میرے واقف کار کے بارے میں سوال نہ کیا جائے، وہ بات سامنے نہیں آئی۔ ہاں میں نے واضح طور پر یہ بات ضرور محسوس کی کہ ان دونوں غنڈوں کو زیر کرلینے کے ذکر پر انسپکٹر سنہا کے چہرے پر بے یقینی کے سے تاثرات ضرور پیدا ہوئے تھے۔ میرے نزدیک یہ فطری بات تھی۔ عام حالات میں ایک عورت دو مسلح مردوں، وہ بھی غنڈوں کا مقابلہ کس طرح کرسکتی ہے! میں نے اپنے بیان میں یہ بھی واضح کردیا تھا کہ مجھے اس کوٹھی کا نمبر معلوم نہیں البتہ اس کی نشاندہی ضرور کرسکتی ہوں۔

''تو پھر آپ کو اس کوٹھی کی نشاندہی کرنے ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔'' انسپکٹر سنہا میرا بیان لکھے جانے کے بعد مجھ سے بولا۔

''میں اس کے لئے تیار ہوں جناب!'' میں نے جواباً کہا۔

میرا جواب سن کر انسپکٹر سنہا نے سروج کے باپ کو اندر بلالیا۔ اس سے پہلے وہ چائے کے لئے اردلی سے کہہ چکا تھا۔

''وکیل صاحب، چائے پی کر چلتے ہیں وہاں اگر آپ برا نہ مانیں تو سروج کو بھی ساتھ لے چلیں۔ اس طرح مزید تصدیق ہو جائے گی اور قانونی تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے۔'' انسپکٹر سنہا کا لہجہ معذرت خواہانہ سا تھا۔

''ضرور سنہا جی!'' سروج کے باپ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کسی بھی قانونی کارروائی سے بھلا میں آپ کو کیسے روک سکتا ہوں! میں تو خود قانون کے لئے لڑتا ہوں۔''

''شکریہ وکیل صاحب!'' انسپکٹر سنہا نے کہا، پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''ایک بات بتاؤں آپ کو وکیل صاحب کہ مجرموں کا ہاتھ آنا ذرا مشکل ہی لگتا ہے جیسا کہ......''

''مجرم نہیں سنہا جی! ابھی ملزم کہیں!'' سروج کے باپ نے انسپکٹر سنہا کی بات کاٹ دی۔ ''کوئی بھی شخص قانونی طور پر اس وقت مجرم کہلاتا ہے جب اس پر جرم ثابت ہو جائے۔''

انسپکٹر سنہا یہ سن کر ہنستے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ کا سا قانون پسند شخص میری نظر سے نہیں گزرا۔ حالانکہ اس معاملے سے براہ راست آپ کا تعلق ہے مگر قانونی تقاضے اس کے باوجود پوری طرح آپ کی نظر میں ہیں۔''

''انسپکٹر صاحب! آپ نے ابھی جو کچھ کہا خود میں نے بھی وکیل صاحب سے اسی خدشے کا اظہار کیا تھا لیکن اس سلسلے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ وہاں پہنچ کر مجرم... سوری ملزم کے متعلق معلوم تو ہو ہی

جائے گا کہ وہ کون ہے!'' میں بول اٹھی۔

''ظاہر ہے ہمیں وہاں جاکر تفتیش تو کرنا ہی ہے۔'' انسپکٹر سنہا نے کہا۔ اسی وقت اردلی چائے لے آیا۔ انسپکٹر سنہا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''ابھی میں فون پر پارلیمنٹ اسٹریٹ تھانے سے بھی بات کئے لیتا ہوں۔ ہمارے وہاں پہنچنے میں کیوں کہ دیر لگ سکتی ہے اس لئے... پھر وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے بعد میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''آپ کچھ محل وقوع بتا سکتی ہیں؟''

''میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ اس شہر میں اجنبی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اچانک مجھے سکھ ڈرائیور کا خیال آ گیا۔ اسی کے ساتھ ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آئی۔

''پھر بیکار ہے پارلیمنٹ اسٹریٹ تھانے سے بات کرنا!'' انسپکٹر سنہا بول اٹھا۔ ''اگر کوٹھی کا نمبر نہیں معلوم تو کم از کم محل وقوع معلوم ہونا ضروری تھا تاکہ پارلیمنٹ اسٹریٹ تھانے والے ہم سے پہلے وہاں پہنچ کر ملزموں کو فرار ہونے سے روک سکتے۔''

''کوشش کرلیجئے انسپکٹر، لیکن خاصا وقت گزر چکا ہے، یہ واقعہ ہوئے! مشکل ہی ہے کامیابی! ویسے جہاں تک محل وقوع کی بات ہے تو ابھی مجھے سکھ ڈرائیور کا خیال آیا۔ یہ کار مجھے اشوکا ہوٹل والوں نے فراہم کی ہے اور یقیناً اسے چلانے والا ایک پیشہ ور ڈرائیور ہوگا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ پیشہ ور ڈرائیور علاقوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات!'' انسپکٹر سنہا میری بات سن کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے ''ایک اور بات!'' کہہ کر اسے بولنے سے روک دیا اور مزید کہا۔ ''مجھے جس کوٹھی میں جانا تھا اس کا نمبر بھی معلوم ہے مجھے، لکھیں! وہ کوٹھی اس گلی کے ایک سرے پر ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔''

میری بات سنتے ہی انسپکٹر سنہا بولا۔ ''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ فی الحال کم از کم اس گلی کی ناکہ بندی کرائی جاسکتی ہے، ہاں نمبر بتائیے!''

میں نے ہیریسن کی کوٹھی کا نمبر اسے لکھوادیا، پھر بولی۔ ''جس کوٹھی سے سروج نکلی تھی وہ کوٹھی گلی کے وسط میں تھی۔''

نمبر ملنے کے بعد اب ڈرائیور سے کچھ پوچھنے کی ضروت نہیں، پولیس تلاش کرلے گی اس گلی کو!'' یہ کہتے ہوئے انسپکٹر سنہا نے دائیں جانب رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کو اپنی طرف کھسکایا اور پارلیمنٹ سٹریٹ تھانے کا نمبر ملانے لگا مگر کئی بار کوشش کے بعد نمبر ملا۔ انسپکٹر سنہا نے فون پر تھانیدار کے بارے میں پوچھا جو غالباً تھانے میں نہیں تھا۔ اس نے شاید کسی سب انسپکٹر کو پورے واقعہ سے آگاہ کرکے کچھ ہدایات دیں۔ اس سے پہلے وہ اپنا تعارف بھی کراچکا تھا۔ فون پر بات کرنے کے بعد وہ سروج کے باپ سے مخاطب ہوا۔ ''وکیل صاحب! میرے امکان میں جو کچھ تھا کرلیا، آگے بھگوان جانے! ویسے میری دلی تمنا ہے کہ ملزمان پکڑے جائیں۔''

''اس دوران میں خود انسپکٹر سنہا، میں اور سروج بھی چائے پی چکے تھے۔ سروج کے باپ نے چائے پینے سے معذرت کرلی تھی۔

''تو پھر چلتے ہیں بھگوان کا نام لے کر!'' انسپکٹر سنہا اٹھ کھڑا ہوا۔

سروج اور اس کا باپ میری ہی کار میں بیٹھے۔ انسپکٹر سنہا جیپ میں بیٹھا تھا اور اس نے اپنے ساتھ ایک سب انسپکٹر اور دو مسلح سپاہیوں کو بھی لے لیا تھا۔ آگے آگے ہماری کار تھی اور پیچھے پولیس کی جیپ تھی۔ میں نے کار میں بیٹھتے ہی سکھ ڈرائیور کو پارلیمنٹ سٹریٹ میں جائے وقوعہ پر چلنے کی ہدایت دے دی تھی۔ پہلے ہی کی طرح سروج اب بھی میرے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کا باپ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا۔

''زینب بیٹی! بمبئی میں تم کہاں رہتی ہو؟'' کار کے آگے بڑھتے ہی سروج کے باپ نے مڑتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

''میں بمبئی جا چکی تھی اس لئے جواب دینے میں دیر نہیں کی اور بولی۔ ''عبدالرحمٰن سٹریٹ پر۔''

''تمہارے پتا جی کیا کرتے ہیں؟ اور برا نہ مانو تو یہ بھی بتادو کہ اکیلے دہلی کیوں آئیں؟'' سروج کے باپ نے دوسرا سوال داغ دیا۔

''انکل! اکیلے دہلی آنے کی وجہ تو یہ ہے کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی ہوں، دوسرے یہ کہ مجھے اپنی حفاظت کرنا اچھی طرح آتا ہے اسی لئے میرے ڈیڈی اکثر کہتے ہیں کہ میں ان کی بیٹی نہیں بیٹا ہوں۔''

''ٹھیک ہی کہتے ہیں تمہارے ڈیڈی! یہ بات مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے! سروج کو جو واقعہ پیش آیا اور تم نے اسے غنڈوں سے جس طرح بچایا، اس کا ثبوت ہے۔ تمہاری جگہ اگر کوئی نوجوان ہوتا تو شاید گھبرا جاتا اور ان غنڈوں سے الجھنے کی کوشش نہ کرتا۔ ہاں تو تم نے اپنے ڈیڈی کے بارے میں نہیں بتایا کہ.....''

''ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے۔'' میں جان چھڑانے کے لئے فوراً بول اٹھی۔ اور انکل، آپ کو یہ سن کر مزید حیرت ہوگی کہ میں بزنس میں پوری طرح ڈیڈی کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔'' اس بزنس کا حوالہ میں نے اس لئے دیا تھا کہ اگر سروج کا باپ اس سلسلے میں کوئی سوال کرے تو بہ آسانی اس کا جواب دیا جا سکے۔ یہی بزنس کراچی میں خود میرا بھی تھا اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ بھارتی امپورٹر ایکسپورٹر عموماً کن اشیاء کی درآمدات و برآمدات میں دلچسپی لیتے ہیں!

''زینب بیٹی! یہ جان کر بڑی پرسنتا (خوشی) ہوئی کہ تم کاروبار میں اپنے ڈیڈی کا ہاتھ بٹاتی ہو۔ بھگوان تمہیں سدا خوش رکھے۔ تم بہت ذہین اور بہادر لڑکی ہو۔''

باتوں ہی باتوں میں سفر طے ہوگیا۔ جس وقت ہماری کار پارلیمنٹ سٹریٹ پہنچی تو صبح کے چار بجنے والے تھے۔ میرا یہ اندازہ ٹھیک ہی تھا کہ آج رات ہیرلیسن پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہے۔ جائے وقوعہ پر ہم سے پہلے پولیس موجود تھی۔ انسپکٹر سنہا کی ہدایت کے مطابق پارلیمنٹ سٹریٹ تھانے کے پولیس والوں نے دونوں جانب سے گلی کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔

انسپکٹر سنہا جیپ سے اترا اور اسی کے ساتھ بقیہ پولیس والے بھی میری ہدایت پر ڈرائیور نے گلی کے باہر ہی کار روک لی تھی۔ میں، سروج اور اس کا باپ، تینوں کار سے اتر گئے۔ اس وقت میں نے سکھ ڈرائیور کی طرف دیکھا تو وہ بڑی میٹھی نظروں سے سروج کو دیکھ رہا تھا۔ سروج ہلکا سا میک اپ کرنے

اور لباس تبدیل کرنے کے بعد مزید حسین نظر آ رہی تھی۔ سکھ ڈرائیور کو مصلحتاً میں نے نظر انداز کر دیا تھا اس لئے وہ ابھی سدھرا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک تھی۔ میں نے اسی وقت دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اسے سزا ضرور دوں گی تا کہ آئندہ کے لئے اسے نصیحت ہو جائے۔

انسپکٹر سنہا کے ساتھ میں سروج کا ہاتھ تھامے مطلوبہ کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ گئی۔ دونوں غنڈوں بے ہوشی کی حالت میں جہاں میں چھوڑ گئی تھی، وہ جگہ خالی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ہوش میں آگئے ہوں گے اور پھر اپنے ''آقا'' سمیت غائب ہو گئے ہوں گے۔ میں نے انسپکٹر سنہا کو وہ جگہ بھی دکھائی تھی جہاں ان غنڈوں سے میں نبرد آزما ہوئی تھی۔

توقع کے مطابق وہ کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے پھاٹک پر بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا۔ انسپکٹر سنہا نے ٹارچ روشن کر لی اور پھر اس کا دائرہ ایک نیم پلیٹ پر جا کر رک گیا۔ میں نے بھی نام پڑھا۔ نیم پلیٹ پر ٹھاکر بلویر سنگھ لکھا ہوا تھا، نیچے ایکس ایم پی اے درج تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کوٹھی کسی ٹھاکر بلویر سنگھ کی تھی جو سابق رکن پارلیمنٹ رہ چکا تھا۔

''جب اس دیش کے نیتاؤں (لیڈروں) کا یہ حال ہے تو بھگوان ہی اس کی رکھشا (حفاظت) کرے گا۔'' سروج کے باپ کی آواز سنائی دی جس میں تاسف تھا۔ اس نے بھی یقیناً نیم پلیٹ پڑھ لی تھی۔

''واقعی یہ بڑے دکھ کی بات ہے۔'' انسپکٹر سنہا نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ پھر کہنے لگا۔ ''وکیل صاحب! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، پچھلے دنوں دہلی میں جو رائٹ ہوا تھا انہی ٹھاکر بلویر سنگھ کے بیانات اخباروں میں چھپے تھے۔ ان کا تعلق ہندو مہا سبھا سے ہے شاید!''

''شاید نہیں یقیناً!'' سروج کے باپ نے تصدیق کی۔ ''اور اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ ہے سنہا جی کہ میں خود بھی اسی جماعت کا ایک رکن ہوں، مگر...... اب...... اب میں اس جماعت اور اس کے لیڈروں پر لعنت بھیجتا ہوں!'' اس کا لہجہ جذباتی ہوگیا۔ ''میں پہلی فرصت میں اس سے استعفیٰ دے دوں گا!''

کیوں کہ اب وہاں مزید رکنا لاحاصل ہی تھا اس لئے انسپکٹر سنہا نے سروج کے باپ کو مخاطب کیا۔ ''وکیل صاحب! کیا خیال ہے، اب واپس چلا جائے؟''

''ہاں اب آپ ٹھاکر بلویر سنگھ کو مفرور قرار دے کر اس کی تلاش شروع کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہاں سے فرار ہو کر ہاتھرس ہی گیا ہوگا۔ آپ اس سلسلے میں ہاتھرس کی پولیس سے رابطہ قائم کریں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہاتھرس اس کا آبائی قصبہ ہے اور پچھلے الیکشن میں وہ وہیں سے کامیاب ہوا تھا۔'' سروج کے باپ نے کہا۔

''مجھے یہ علم نہیں تھا وکیل صاحب کہ ٹھاکر بلویر سنگھ کا تعلق ہاتھرس سے ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ نے بتا دیا، اس سے اس کی تلاش میں آسانی ہو جائے گی۔'' انسپکٹر سنہا بولا۔ ''میں کل ہی ہاتھرس کی پولیس سے رابطہ قائم کر لوں گا، مگر ایک خدشہ ہے مجھے کہ کہیں وہ...... خیر بعد میں دیکھا جائے گا۔''

''بولیس نا سنہا جی، کیا بات ہے؟ آپ کچھ کہتے کہتے رک کیوں گئے؟ ممکن ہے، میں کوئی بہتر

مشورہ دے سکوں آپ کو" سروج کے باپ نے استفسار کیا۔

"مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ کسی طرح یہ ثابت نہ کردے کہ آج کی رات دہلی میں تھا ہی نہیں بلکہ ہاتھرس یا کہیں اور تھا۔ اس طرح کیس کمزور ہو جائے گا۔" انسپکٹر سنہا نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"ممکن ہے اس کیس سے بچنے کے لئے وہ ایسا کرے، لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں، آپ اس پر کیس تو بنائیں! جھوٹے گواہ بہرحال جھوٹے ہوتے ہیں اور انہیں عدالت میں گھیرنا مشکل نہیں ہوتا۔ یہ میری فیلڈ ہے۔ میں سچائی پر ہوں اس لئے مجھے یقین ہے کہ بھگوان میری سہایتا (مدد) کرے گا۔" سروج کا باپ بولا، پھر واپسی کے لئے مڑا۔ "آیئے چلیں!"

پولیس جیپ میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ اس میں سروج اور اس کا باپ، دونوں وہاں سے واپس قرول باغ جاسکتے۔ اس بات کا احساس مجھے پہلے ہی ہوگیا تھا کہ ان دونوں کو واپس ان کے گھر بھی چھوڑنا پڑے گا۔ میں نے اسی لئے ہیر لیسن پر آج کی رات ہاتھ ڈالنے کا خیال اپنے ذہن سے پہلے ہی نکال دیا تھا۔

"ہم لوگوں کی وجہ سے تمہیں بہت زحمت اٹھانا پڑی ہے زینب بٹی!" سروج کا باپ میری کار میں بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ سروج پہلے ہی کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ چکی تھی اور میں ابھی باہر ہی کھڑی تھی۔

اسی وقت انسپکٹر سنہا نے مجھے مخاطب کیا۔ سنیے مس زینب! بیان کے ساتھ آپ کے ہوٹل کا پتا تو خیر ہم نے لکھ ہی لیا ہے، اگر ضرورت پڑی تو آپ سے رابطہ قائم کرلیا جائے گا۔ یہ بتا ئیں کہ آپ ابھی کتنے دن اور دہلی میں ہیں؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی انسپکٹر!" میں نے جواب دیا۔ "ممکن ہے ہفتہ بھر یہاں رہوں یا پھر دو چار دن ہی میں چلی جاؤں۔ ابھی مجھے آگرے بھی جانا ہے۔"

"اگر آپ کو کوئی زحمت نہ ہو مس زینب تو دہلی چھوڑنے سے پہلے ہمیں مطلع کر دیجئے گا۔ ویسے اسے پولیس کی طرف سے کوئی پابندی نہ سمجھئے گا۔"

"تھینک یو انسپکٹر!" میں نے جواب دیا۔ "میں انشاء اللہ آپ کو اطلاع دے کر دہلی سے جاؤں گی۔" یہ کہہ کر میں کار میں بیٹھ گئی اور ڈرائیور کو قرول باغ چلنے کے لئے کہا۔

صبح کے پانچ بج رہے تھے جب میری کار قرول باغ پہنچی۔ سروج اور اس کے باپ نے بہت کہا کہ صبح ہونے والی ہے، میں کچھ کھا پی کر جاؤں مگر میں نے معذرت کرلی۔ ان دونوں نے میری معذرت اس شرط پر قبول کی کہ میں پھر کبھی ضرور آؤں گی۔

"اب کدھر چلنا ہے میڈم؟" ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"وہاں چلو جہاں تمہارے اور میرے سوا کوئی اور نہ ہو۔" میں نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

"جج...... جی میڈم...... مم...... مم...... میں آپ...... کا مطلب سمجھا نہیں!" وہ آئینے میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب تک اتنے بھولے بھی نہیں کہ میری بات کا مطلب نہ سمجھ سکو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"سمجھ...... سمجھ گیا!" اس کی آواز شدت جذبات سے کانپنے لگی۔ "میں...... میں اکیلا ہی رہتا

ہوں پہاڑ گنج میں! کک...... کیا خیال ہے وہیں چلیں؟ بعد میں آپ کو ہوٹل چھوڑ دوں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے، اپنے ہی گھر چلو! یوں بھی تمہیں رات بھر جاگنے کے بعد آرام کی ضرورت ہے۔" لفظ "آرام" پر میں نے زور دیا تھا۔

میں نے آئینے میں اس کے چہرے کو "گل وگلزار" دیکھا۔ وہ زیر لب کوئی پنجابی لوک گیت گنگنانے لگا۔ کار کی رفتار بھی اس نے خاصی بڑھا دی۔ یقیناً وہ جلد سے جلد مجھے لے کر اپنے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے دانستہ غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا۔ "جہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی اور نہ ہو" سے میرا مطلب کچھ اور ہی تھا مگر میری توقع کے مطابق اس نے ان الفاظ سے دوسرا مطلب اخذ کیا تھا۔ اگلی نشستوں اور پچھلی سیٹوں کے درمیان جو جگہ تھی وہاں اب تک وہ رسی پڑی ہوئی تھی جس سے سروج کے ہاتھ باندھے گئے تھے اور وہ کپڑا ابھی پڑا تھا جو اس کے منہ پر بندھا تھا۔ میں نے آہستہ سے جھک کر رسی اور کپڑا اٹھایا اور اپنے پرس میں رکھ لیا۔ سکھ ڈرائیور کو سزا دینے کے لئے میں اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے چکی تھی۔

قرول باغ سے پہاڑ گنج تک کا سفر کار کی تیز رفتاری کے سبب جلد ہی ختم ہوگیا۔ کار اب ایک پرانے سے مکان کے سامنے رک گئی تھی۔ اس مکان کے سامنے پیپل کا ایک پیڑ تھا۔ میں کار سے اتر گئی اور اسی کے ساتھ سکھ ڈرائیور کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"نیچے کے دو کمرے میرے پاس ہیں، اوپر مالک مکان رہتا ہے۔" ڈرائیور نے مجھے بتایا اور پھر کار کا دروازہ مقفل کر دیا۔

وہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے لوگ یوں بھی گہری نیند میں ہوتے ہیں۔ سکھ ڈرائیور نے گھر کے دروازے پر پڑا ہوا تالا کھولا، پھر دروازے کو دھکا دیا۔

"آیئے مس زینب!" اس نے پہلی بار مجھے "میڈم" کی بجائے اس نام سے مخاطب کیا جو وہ سفر کے دوران میں کئی بار سن چکا تھا۔ جب میں بلا جھجک گھر میں داخل ہوگئی اور اس نے گھر کا دروازہ اندر سے لگا دیا تو مزید بولا۔ "آپ ابھی تک واقعی مس ہی ہیں یا......" اس نے معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر ایک دم مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لینے کے لئے آگے بڑھا۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "اتنی بے صبری نہ دکھاؤ!...... اندر کمرے میں تو چلو!"

پھر چھوٹا سا صحن عبور کر کے میں اس کے ساتھ ایک کمرے میں آ گئی جو گندگی اور بے ترتیبی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ سامنے ہی دیوار سے لگی ایک چارپائی پر میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے میں نے پلٹ کر کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند کردیا اور اپنے "عاشق نامراد" کی طرف پلٹ کر بولی۔ "مجھے بھی تمہاری طرح کسی کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے میں بڑا لطف آتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

"میری خواہش ہے کہ جس طرح سروج کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ پر بھی کپڑا بندھا تھا اور تم اس پر دست درازی کررہے تھے، بالکل اسی طرح میں"

"مگر اس کی کیا ضرورت ہے!" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ میری خواہش ہے۔ کیا تم میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کر سکتے؟"

"چلو آج یہی سہی!" وہ ہنس کر بولا۔ "مگر یہاں کوئی رسی وغیرہ نہیں ہے۔"

"میرے پاس ہے رسی اور منہ پر باندھنے کے لئے کپڑا بھی موجود ہے۔" میں نے اپنا پرس کھول کر دونوں چیزیں نکال لیں۔

"مگر یہ چیزیں تمہارے پاس کہاں سے آ گئیں؟" اس نے حیران سا ہو کر کہا۔

"یہ وہی رسی ہے جس سے اس لڑکی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور کپڑا بھی۔"

"اوہ اچھا سمجھا! یہ چیزیں کمرہ میں سے اٹھا لی ہوں گی تم نے۔" وہ زور سے ہنس پڑا۔ اب وہ "آپ" سے "تم" تک آ گیا تھا۔

میں اس کے قریب کھسک کر بولی۔ "اب دیر نہ کرو، جلدی ادھر منہ کر لو۔"

"میری زندگی میں اس طرح کا یہ پہلا تجربہ ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور پھر میرے کہنے پر اپنے دونوں ہاتھ بھی پیچھے کر لئے۔ ہوس واقعی انسان کی عقل خبط کر دیتی ہے۔

میں نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور جلدی سے اس کے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ رسی پہلے ہی میرے ہاتھ میں تھی۔

"دیکھو منہ پر کپڑا نہ باندھنا ورنہ اس طرح لطف آدھا رہ جائے گا۔" اس نے کہا۔

"جب ضرورت ہوگی کھول دوں گی، تم بے فکر رہو۔" میں نے یہ سوچتے ہوئے کہا کہ مزاحمت نہ کرے۔

وہ پھر بے وقوف بن گیا اور کپڑا بھی منہ پر بندھوا لیا۔ کپڑا میں نے اس سے پہلے باندھنا ضروری سمجھا تھا کہ وہ چیخ نہ سکے۔ اب وہ قطعی بے بس تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اس کے کولہے پر ایک لات ماری اور وہ سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر جا گرا۔ میں نے کمرے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو ربڑ کا ایک پائپ نظر آ گیا۔ آگے بڑھ کر میں نے وہ پائپ اٹھا لیا۔

پھر میری "وحشت درازیاں" شروع ہو گئیں۔ میں اس وقت تک اسے پیٹتی رہی جب تک اس کی آنکھوں سے آنسو نہ بہنے لگے۔

"کیسا! اب تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ کسی بے بس سے فائدہ اٹھانے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔" میرے لہجے میں نفرت و حقارت تھی۔ اس کے ساتھ میں نے ربڑ کا پائپ اپنے ہاتھ سے پھینک دیا۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا۔

وہ زور زور سے کراہنے لگا۔ آنسو اب تک اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"آج کی یہ مار زندگی بھر یاد رکھنا اور کبھی کسی عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں چاہتی تو تمہیں جہنم رسید بھی کر سکتی تھی لیکن میرے خیال میں تمہارے لئے اتنی سزا کافی ہے۔ مگر بول، پھر سے ایسا کرو گے؟" میں نے ہاتھ بھی کھول دیئے۔

مجھے تو قطعی توقع نہیں تھی کہ اتنی مار کھانے کے بعد وہ کوئی انتقامی کارروائی کر سکے گا لیکن ہاتھ کھلتے ہی

بستر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ میں کی ہوئی کرپان نکالی اور دانت پیستے ہوئے غرایا۔ "میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا بدمعاش عورت۔"

میں اچھل کر اگر ذرا سی پھرتی نہ دکھاتی تو وہ سیدھا میرے ہی اوپر آتا۔ اس نے بمشکل اپنے جسم سنبھالا اور بستر کے قریب زمین پر آ رہا۔

"تجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے ہاتھوں اتنی مار کھا کر بھی تمہیں بچنے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔" یہ کہتے ہی میں نے اپنی جگہ سے اچھل کر اس کے سینے پر دونوں ایڑیاں ماریں اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیچے گرا۔ اس کے گرتے ہی میں نے ایک ٹھوکر اس کی دائیں کلائی پر ماری اور کرپان اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور کونے میں جا گری۔ ٹھوکر پڑتے ہی وہ چیخ اٹھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی مضروب کلائی تھام لی تھی۔ دو ایک ٹھوکروں نے اس کے کس بل نکال دیے۔

"بس کرو! تمہیں اپنے خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دو!" وہ گڑگڑانے لگا۔ ایک ٹھوکر کے نتیجے میں اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا چہرہ بھیانک لگ رہا تھا۔

"اب تم اس قابل نہیں رہے کہ مجھے ہوٹل چھوڑ سکو اس لیے میں خود ہی تمہیں چھوڑے جا رہی ہوں۔ یہاں سے میں کسی ٹیکسی کے ذریعے ہوٹل چلی جاؤں گی۔ میری نصیحت یاد رہے گی نا تمہیں؟"

میرے دھمکی آمیز لہجے کے جواب میں اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا۔"

پھر میں وہاں ایک منٹ بھی نہیں رکی۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا وہاں آتے ہوئے میں نے راستہ نظر میں رکھا تھا اس لیے ان گلیوں سے نکل کر ایک بڑی سڑک تک پہنچنے میں مجھے دشواری پیش نہ آئی۔ اب صبح ہو چکی تھی اور سڑک پر ٹریفک آتا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ جلد ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور میں اس میں بیٹھ کر اشوکا ہوٹل روانہ ہو گئی۔

آج کی رات ڈاکٹر رچنا کے باس میں بے مصرف ہی بیت گئی تھی لیکن میرے دل کو یہ اطمینان بہرحال تھا کہ میں نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ ہونے سے بچا لی تھی۔ یہ کسی عورت کے لیے کام کرنے کی خوشی کچھ اور ہی ہوتی ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے ناشتہ کیا اور پھر جب ویٹر برتن لے کر چلا گیا تو لباس تبدیل کرنے کے بعد میں بستر پر دراز ہو گئی۔ اب مجھے تازہ دم ہونے کے لیے بھرپور نیند کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میں بستر پر لیٹنے کے دو چار منٹ بعد ہی بے خبر سو گئی

دوپہر دو بجے کے بعد میری آنکھ کھلی تو میں بستر سے اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی۔ پھر نہا کر باہر نکلنے کے بعد میں نے میک اپ کیا۔ اسی دوران میں مجھے اپنی چھوٹی بہن زیبو اور زاہد کا خیال آیا۔ پروگرام کے مطابق ان دونوں کو گزشتہ شب کی فلائٹ سے کلکتہ روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ زاہد میرے سامنے ہی ٹکٹ لے آیا تھا۔ مجھے توقع تو یہی تھی کہ وہ دونوں پروگرام کے مطابق رات ہی کی فلائٹ سے کلکتہ پہنچ گئے ہوں گے۔ پھر بھی میں اپنے قیاس کو یقین میں بدلنا چاہتی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ وہیں ہوٹل سے اپنے دوستوں کے گھر فون کر کے اس سلسلے میں تصدیق کر لوں۔ مگر پھر احتیاطاً ارادہ تبدیل کر دیا۔ کمرے ہی میں کھانا منگوا کر کھانے اور پھر چائے پینے کے بعد میں ہوٹل سے نکل آئی۔ اب مجھے کسی پبلک کال

فون بوتھ کی تلاش تھی۔ جلد ہی میری تلاش بار آور ثابت ہوئی۔ مجھے سڑک کے کنارے ایک ٹیلی فون بوتھ نظر آ گیا جو اس وقت خالی تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس تک پہنچ گئی اور اپنا پرس کھول کر سکے نکال لئے۔ پھر میں نے ٹیلی فون بوتھ کے اندر گھس کر پہلے سکے ڈالے اور پھر صادق ماموں کا ٹیلی فون نمبر ملایا جو مجھے زبانی یاد تھا۔

دوسری جانب کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی، پھر کسی نے ریسیور اٹھایا اور کہا۔ "ہیلو؟" آواز مردانہ تھی اور میں اس آواز کو پہچانتی تھی۔

"آداب! میں علیما خان بول رہی ہوں۔ کیسے ہیں آپ ارشد؟" میں نے کہا۔

"ارے آپ... خوش قسمتی ہے میری کہ میں نے ہی آپ کا فون ریسیو کیا۔ کیا آپ دہلی ہی میں ہیں؟"

"کیوں، کیا دہلی کی بجائے کسی اور شہر سے فون نہیں کر سکتی؟" میں ہنس کر بولی۔

"بالکل کر سکتی تھیں، مگر اس صورت میں آپ کی آواز اتنی واضح اور صاف سنائی نہ دیتی۔" ارشد نے جواب دیا۔ پھر مجھ سے تصدیق چاہی۔ "میرا اندازہ درست ہے نا؟"

"اگر آپ کا اندازہ ابھی دہلی ہی میں رہنے کا تھا تو پھر یقیناً درست ہے۔" اس نے کہا اور پھر قدرے [illegible] تھا۔

"[illegible]"

"مگر پہلے آپ یہ بتائیں کہ کہاں ٹھہری ہیں؟" اس نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

"ایک ہوٹل میں۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "مگر میں یہاں [illegible] اس لئے ظاہر ہے ہوٹل کا نام بتانا بھی فضول ہے۔"

"حیرت ہے کہ دہلی میں اتنے سارے عزیز رشتے دار موجود ہیں اور آپ ہوٹل میں ٹھہری ہیں۔ مزید حیرت کی بات میرے لئے یہ ہے کہ آپ... آپ اکیلی ہونے کے باوجود"

"یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ میں پہلے بھی کئی بار دنیا کے بہت سے ہوٹلوں میں رہ چکی ہوں۔ پھر آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے اپنی خالاؤں کے مردوں سے زیادہ [illegible] ہے۔ رہی یہ بات جو رشتے داروں کی دہلی میں موجودگی کے باوجود میں نے ہوٹل میں قیام کو کیوں ترجیح دی تو اس کی کچھ نہ کچھ وجہ تھی جسے بیان کرنا میرے نزدیک ضروری نہیں۔ ہاں تو پہلے وہ بات ہو جائے جس کے لئے میں نے فون کیا تھا۔"

"جی فرمائیے!"

"مجھے ڈیکی اور زبیدہ کے بارے میں پوچھنا تھا۔ کیا وہ کل رات کی فلائٹ سے روانہ ہو گئے" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں میں خود ان دونوں کو ایئرپورٹ چھوڑنے گیا تھا۔" ارشد علی نے بتایا۔ "وہ دونوں لندن روانہ ہو چکے ہیں۔"

"ویری گڈ!" کہہ کر میں نے طویل سانس لیا۔ یہ اطلاع پا کر میرے ذہن سے ایک

بوجھ اتر گیا تھا۔

"آپ کو اپنا وہ وعدہ تو یاد ہے نا کہ پاکستان روانگی سے قبل ملنے آئیں گی؟" اس نے یاد دہانی کرائی۔

"ہاں اچھی طرح یاد ہے اور انشاء اللہ میں اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ ویسے گھر میں کسی کو یہ نہ بتائیے گا کہ میں ہوٹل میں ٹھہری ہوں۔"

"بہتر ہے۔" وہ بولا۔ پھر کہنے لگا۔ "ویسے پاکستان جا کر ہم لوگوں کو بھول تو نہیں جائیں گی؟"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے، اپنوں کو کون بھلاتا ہے؟"

"یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ ہمیں اپنا سمجھتی ہیں۔"

اسی وقت میری نگاہ ٹیلی فون بوتھ کے باہر کھڑے ہوئے ایک نوجوان پر پڑی۔ اسے بھی فون کرنا تھا اور بوتھ سے میرے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔ یہی دیکھ کر میں نے ارشد علی کو "خدا حافظ" کہا اور پھر ریسیور کریڈل پر لٹکا کر بوتھ سے باہر آ گئی۔ میرا قیاس درست ثابت ہوا۔ میرے باہر نکلتے ہی وہ نوجوان بوتھ میں گھس گیا تھا۔

ہوٹل کی طرف لوٹتے ہوئے میری نگاہ اس جگہ پڑی جہاں گزشتہ شب میں نے وہ کار کھڑی کی تھی جس سے مجھے ڈاکٹر وچھڈا کے ایک محافظ ہیر لیسن کا پتا ملا تھا۔ وہ جگہ اس وقت خالی تھی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کار، پولیس نے تلاش کر کے اس کے مالک تک پہنچا دی تھی۔ ویسے ایسا ہونے والا تھا۔ کار کا اس کے مالک تک واپس پہنچ جانا میرے نزدیک کسی صورت مناسب نہیں تھا۔ اس طرح میرے دشمنوں کو علم ہو جاتا کہ اس کار میں موجود بریف کیس سے کاغذات غائب کر دیئے گئے ہیں۔ ابھی میں ہیر لیسن کا پتا بھی تھا [illegible] کار سے غائب کرنے کا شبہ مجھ پر کیا جا سکتا تھا اور اس صورت میں میرے دشمنوں کا چوکنا ہو جانا لازمی امر تھا۔ ہیر لیسن اپنا ٹھکانا بدل بھی سکتا تھا۔ پھر میں اندھیرے میں رہ جاتی اور ڈاکٹر وچھڈا تک پہنچنے کا ذریعہ ختم ہو جاتا۔ میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے سوچا کہ رات کا انتظار کرنے کی بجائے کیوں نہ اسی وقت ہیر لیسن سے نمٹ لیا جائے! اس وقت رات کی نسبت مجھے [illegible] وقت میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ وقت اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ میں فوری طور پر حرکت میں آ جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ ہوٹل سے کوئی کار حاصل کرنے کی بجائے میں نے ٹیکسی کو ترجیح دی۔ میرا پرس اس وقت بھی میرے پاس تھا اور اس میں ریوالور بھی موجود تھا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو مجھے ڈاکٹر وچھڈا کی کار سے ملا تھا۔ بوقت ضرورت میں اسے استعمال کر سکتی تھی۔

ابھی میں نے ہوٹل کی حدود میں قدم نہیں رکھا تھا اور سڑک ہی پر تھی۔ پارلیمنٹ اسٹریٹ جانے کے لئے میں سڑک کے ایک کنارے پر رک کر کسی خالی ٹیکسی کا انتظار کرنے لگی۔ دوپہر کا وقت تھا اس لئے جلد ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور میں پارلیمنٹ اسٹریٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں گزشتہ رات دو مرتبہ مطلوبہ جگہ جا چکی تھی اور راستہ اپنے ذہن میں رکھا تھا اس لئے پارلیمنٹ اسٹریٹ پہنچ کر ہیر لیسن کی کوٹھی تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ پھر بھی ہوا یہی! پارلیمنٹ اسٹریٹ کی حدود میں داخل ہونے کے بعد میں نے ٹیکسی ڈرائیور کی رہنمائی شروع کر دی اور اس گلی تک پہنچ گئی جس میں گزشتہ رات دو مرتبہ آ چکی تھی۔

ٹیکسی کو میں نے گلی کے ایک سرے پر رکوا لیا تھا، دوسرے سرے پر ہیریسن کی کوٹھی تھی۔ ابھی میں ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے لئے اپنا پرس کھول کر پیسے نکال رہی تھی کہ اچانک میری نگاہ ایک کار پر پڑی۔ وہ کار گلی سے نکلی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر میں تقریباً اچھل پڑی۔ بلاشبہ وہ ہیریسن ہی تھا۔ اس کار کی پچھلی سیٹ پر بھی دو افراد بیٹھے تھے مگر میں ان کے چہرے واضح طور پر نہیں دیکھ سکی۔ وہ کار تیزی کے ساتھ میری ٹیکسی کے قریب سے گزر گئی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ عین وقت پر وہاں پہنچ گئی تھی اور ابھی ٹیکسی نہیں چھوڑی تھی۔

"سنو" میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کیا "ابھی جو کار گلی سے نکل کر سڑک پر مڑی ہے اس کے پیچھے چلو۔"

ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کرنے کی بجائے میری طرف مڑ کر دیکھا اور بولا۔ "معاف کیجئے گا خاتون، میں ایسے چکروں میں نہیں پڑتا۔"

میرے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنے پرس سے سو کا ایک نوٹ نکال کر ڈرائیور کی طرف بڑھایا اور کہا۔ "کیا اب بھی نہیں؟"

ڈرائیور نے ایک نظر میری طرف دیکھا، پھر میرے ہاتھ میں سو روپے کے نوٹ پر نگاہ ڈالی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں اب سوچا جا سکتا ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے نوٹ میرے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

پھر ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کرنے میں دیر نہیں کی۔ ہیریسن کی کار اس دوران میں سڑک پر کافی آگے نکل چکی تھی مگر کار کا نمبر اور رنگ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ نیلے رنگ کی کار تھی اور اس کے نمبروں سے ظاہر تھا کہ وہ غیر ملکی سفارت کاروں کے استعمال میں رہتی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور تیز رفتاری کے ریکارڈ قائم کرتا ہوا جلد ہی اس کار تک پہنچ گیا۔

"کار کے پیچھے اس طرح چلنا ہے کہ کار والوں کو شبہ نہ ہونے پائے۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت کر دی۔ میں اس ٹیکسی ڈرائیور کو معقول معاوضہ ادا کر چکی تھی اس لئے جو ہدایت بھی دی اس سے بے جھجک کہہ دیا تھا کیونکہ اس وقت نیلی کار اور میری ٹیکسی بالکل آگے پیچھے تھیں۔ ان کے درمیان کوئی اور کار وغیرہ نہیں تھی۔

میری ہدایت پر ٹیکسی ڈرائیور نے رفتار کچھ کم کر دی اور اس طرح درمیانی فاصلہ بڑھ گیا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد ایک کار نے میری ٹیکسی کو اوورٹیک کیا اور درمیان میں آ گئی۔ اب میں مطمئن ہو گئی۔ مجھے فی الحال یہ معلوم نہیں تھا کہ اس وقت ہیریسن کہاں اور کیوں جا رہا تھا؟ یہ خبر بھی کہ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے دو افراد کون ہیں!

اسی انداز میں تعاقب جاری رہا۔ پارلیمنٹ ہاؤس بہت پیچھے رہ گیا اور پھر راشٹرپتی بھون بھی گزر گیا۔ نیلی کار کا سفر جاری تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ نیلی کار والے لوگ کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔" ٹیکسی والے نے تبصرہ کیا۔ میں ٹیکسی والے کے اس تبصرے کا مقصد سمجھ گئی اور فوراً بولی "کرایہ اس سو روپے کے نوٹ میں شامل نہیں جو تمہیں دیا جا چکا ہے۔ منزل پر جتنے پیسے بنتے ہوں گے وہ میں تمہیں الگ دوں گی۔"

"شکریہ خاتون!" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "میں بھی سوچ رہا تھا کہ کہیں آپ نے پیشگی میں تو سو کا نوٹ نہیں دیا؟"

میں جواباً خاموش رہی۔ مجھے اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید نیلی کار پالم کے ہوائی اڈے کی طرف جا رہی ہے۔ پھر کچھ ہی دیر بعد نیلی کار سردار پٹیل روڈ پر پہنچی تو میرا قیاس یقین میں بدلنے لگا۔ پٹیل روڈ عبور کرنے کے بعد جب نیلی کار مزید آگے ہی بڑھتی رہی اور آگے جا کر پالم کی جانب جانے والے راستے پر مڑی تو پھر مجھے یقین ہو گیا کہ اس کی منزل پالم ایئرپورٹ ہے۔ میں سوچنے لگی کہ ہیریسن، دہلی سے کہیں جا رہا ہے یا پھر ان دو افراد میں سے کوئی ایک جو کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے دو افراد میں سے ایک ڈاکٹر چڈھا ہوگا۔ میں اسی لئے اس وقت بری طرح چونک اٹھی تھی جب یہ طویل سفر ختم ہوا تھا۔

نیلی کار کے رکتے ہی پچھلا دروازہ کھول کر ڈاکٹر چڈھا باہر نکلا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ مجرم اب میرے ہاتھ سے نکلنے والا ہے۔ ڈاکٹر چڈھا کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھنے والا اس کا دوسرا محافظ تھا۔ ہیریسن اور دوسرا محافظ دونوں اس وقت بھی کوٹ پہنے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے۔ ان کے کوٹ کی جیبوں میں بھرے ہوئے ریوالور ہی ہو سکتے تھے۔

میری ٹیکسی اس نیلی کار سے کچھ ہی فاصلے پر جا کر کھڑی ہوئی تھی۔ نیلی کار کا ڈرائیور ڈکی کھول کر اس میں سے سامان باہر نکال رہا تھا۔ ڈاکٹر چڈھا کے محافظ اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ سامان سمیت ایئرپورٹ پر آنے کا مقصد ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر چڈھا دہلی سے جا رہا تھا۔ مگر کیوں اور کہاں؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

میرا خیال تھا کہ یہ آخری موقع ہے۔ اگر یہ موقع تمہارے ہاتھ سے نکل گیا تو تمہارا حریف راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ کسی نے جیسے میرے اندر سرگوشی کی۔

اسی وقت ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے مخاطب کیا۔ "خاتون! اب کیا ارادہ ہے؟ واپس چلنا ہے یا یہیں اتریں گی؟"

اس موقع پر مجھے ٹیکسی والے کی مداخلت گراں گزری مگر اسے کچھ تو جواب دینا ہی تھا اس لئے بولی۔ "ابھی ذرا کچھ دیر ٹھہرو، میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔"

کچھ سوچنے سمجھنے کے لئے میرے پاس بہت کم وقت تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر مجھے کسی فیصلے پر پہنچنا تھا۔ اگر میرے پاس وقت کم نہ ہوتا تو ممکن ہے میں وہ انتہائی قدم نہ اٹھاتی۔ میرے پرس میں پستول موجود تھا اور ڈاکٹر چڈھا ابھی میری رینج میں تھا۔ مجھے علم تھا کہ اس پرہجوم جگہ ڈاکٹر کو گولی کا نشانہ بنا کر فرار ہو جانا آسان کام نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھے بہرحال خطرہ تو مول لینا ہی تھا مگر اس سے پہلے اپنے فرار کی راہ استوار کرنا تھی۔ چند لمحوں کے اندر ترتیب دیئے جانے والے منصوبے کے مطابق میں نے تیزی کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھ کر ٹیکسی ڈرائیور کی کنپٹی پر ایک ہاتھ مارا اور وہ اسٹیئرنگ پر جھکتا چلا گیا۔ میرا اندازہ ایسا تھا جیسے اس کے کان میں کچھ کہنے کے لئے جھکی

ہو۔ میں نے حتی الامکان یہ کوشش کی تھی کہ میری اس حرکت پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ ٹیکسی ڈرائیور پہلے ہی بے ہوش ہو چکا تھا۔ اب میں اسے ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹانا چاہتی تھی تا کہ ڈاکٹر رچرڈ کو نشانہ بنانے کے بعد اسی ٹیکسی کے ذریعے وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں دائیں جانب کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور پھر ڈرائیونگ سیٹ والا اگلا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ بے ہوش ڈرائیور کے جسم کا بوجھ دروازے پر ہوگا۔ چنانچہ دروازہ کھلتے ہی اس کا بے ہوش جسم ٹیکسی سے باہر گرنے لگا۔

"ارے۔۔۔ ارے اسے کیا ہوا؟" اپنے قریب ہی سے مجھے ایک حیرت زدہ سی مردانہ آواز سنائی دی۔

یہ آواز سنتے ہی میں تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ یوں جیسے میں ٹیکسی کے قریب سے گزر رہی تھی۔ قدم آگے بڑھاتے ہوئے میرے انداز میں لاتعلقی تھی۔

ذرا سی دیر میں وہاں ہجوم ہو گیا۔ خلاف توقع صورتحال بدل گئی تھی۔ کسی نے شاید مجھے اس ٹیکسی سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھولتے ہوئے کسی کی نظر مجھ پر پڑی تھی وہ لوگ مجھ سے اس سلسلے میں استفسار ضرور کرتے۔ اب میں بھی اس ہجوم میں ایک تماشائی کی حیثیت سے شامل تھی مگر کن انکھیوں سے ڈاکٹر رچرڈ کی طرف دیکھ رہی تھی جو وہاں سے چند گز کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ خود وہ اور اس کے دونوں محافظ بھی ہجوم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں نئی صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ کار کا ڈرائیور ڈگی سے سامان نکال کر اسے بند کر رہا تھا۔ اب کسی بھی لمحے ڈاکٹر رچرڈ ایئرپورٹ کی عمارت کا رخ کر سکتا تھا۔ میں نے آہستگی کے ساتھ پرس کھول کر اس میں ہاتھ ڈال دیا مگر فوری طور پر ریوالور باہر نہیں نکالا۔ اس سے پہلے میں ارد گرد کا جائزہ لے لینا چاہتی تھی۔ وہ ہجوم میرے اور ڈاکٹر رچرڈ کے درمیان آ گیا تھا۔ مجھ سے ذرا ہی فاصلے پر ایک سکوٹر والا بھی تماشا دیکھنے کی غرض سے رک گیا تھا۔

اپنے پرس سے ریوالور نکالتے ہوئے میری نظر اسی پر تھی کیونکہ وہ مجھ سے نسبتاً زیادہ قریب تھا اور اس طرح کھڑا تھا کہ اس کی نظر میرے ریوالور پر پڑ سکتی تھی۔ سکوٹر والے اور میرے درمیان جو فاصلہ تھا، میں اسی کے درمیان سے فائر کرنا چاہتی تھی۔

اچانک ڈاکٹر رچرڈ نے اپنے دونوں محافظوں سے کچھ کہا اور سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پلٹ کر ایئرپورٹ کی عمارت کا رخ کیا۔ اس نے آگے بڑھنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا تھا کہ میں نے اس کا نشانہ لیا۔ اپنے دشمن کی پشت کا نشانہ لیتے ہوئے میں کچھ جھجک گئی۔ دشمن پر پیچھے سے حملہ کرنا بہادری نہیں تھی۔ اسی خیال نے مجھے تذبذب کا شکار کر دیا تھا ورنہ میں فوراً ہی گولی چلا دیتی۔ ڈاکٹر رچرڈ اس دوران میں اپنی جگہ سے ایک قدم آگے بڑھ چکا تھا جب میں نے اس کا نشانہ لے کر فائر کیا تو عین اسی وقت اس کا ایک محافظ اٹیچی کیس اٹھانے جھکا۔ وہ اچانک ڈاکٹر رچرڈ اور میرے درمیان آ گیا تھا۔ زبردست دھماکا ہوا اور میری چلائی ہوئی گولی ڈاکٹر رچرڈ کے جسم میں پیوست ہونے کی

بجائے اس کے محافظ کی گردن میں گھس گئی۔

فائر کرتے ہی میں نے تیزی کے ساتھ ریوالور اپنے پرس میں رکھ لیا تھا۔

دھماکا ہوتے ہی ہجوم بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگا۔

"گولی اس نے چلائی ہے۔۔۔ اس عورت نے" سکوٹر والا بھاگتے ہوئے لوگوں سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ میری طرف اٹھا ہوا تھا۔ یقیناً اس نے مجھے فائر کرتے دیکھ لیا تھا۔

میں نے سکوٹر والے کے چیخنے کی پروا کئے بغیر تیزی سے اطراف کا جائزہ لیا۔ میں نے جس ٹیکسی میں ایئرپورٹ تک سفر کیا تھا، اس کا بے ہوش ڈرائیور اپنی ٹیکسی کے قریب ہی بے ہوش پڑا تھا اور ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہجوم ٹیکسی کی اطراف سے چھٹ چکا تھا۔ دوڑتے بھاگتے لوگوں کے درمیان سے میں بھی بھاگتی ہوئی ٹیکسی تک پہنچی اور تیزی کے ساتھ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

"وہ۔۔۔ وہ بھاگی جا رہی ہے۔۔۔ بھاگ رہی ہے وہ۔" سکوٹر والا میرے لئے مصیبت بن گیا۔ مگر کوئی بھی اس کی بات نہیں سن رہا تھا مگر وہ چیخے جا رہا تھا۔

میں نے ٹیکسی سٹارٹ کی اور دائیں جانب سٹیئرنگ گھمایا۔ وہ سکوٹر والا دائیں جانب ہی تھا۔

"پکڑو۔۔۔ پکڑو اسے" سکوٹر والا ایک طرف دیکھتے ہوئے زور سے چیخا۔

میری نگاہ بھی ادھر اٹھ گئی۔ کچھ پولیس والے اسی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ یقیناً سکوٹر والا انہی کی طرف دیکھ کر زور سے چیخا تھا۔

میں اس دوران میں ٹیکسی کو دائیں جانب موڑ چکی تھی۔ میرا جی تو یہی چاہا تھا کہ ٹیکسی اس سکوٹر پر چڑھا دوں جو بلا سبب میرے لئے مصیبت بن گیا تھا مگر میں نے اسے سائیڈ مارنے پر اکتفا کیا۔ اسی کی چیخ کے نتیجے میں پولیس والوں نے مجھے فرار ہوتے دیکھ لیا تھا۔

میں نے پلٹ کر اس سکوٹر والے کو نہیں دیکھا۔ ہاں اس کی چیخ ضرور سنی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا سائیڈ لگنے سے وہ صرف زخمی ہی ہو سکتا تھا۔

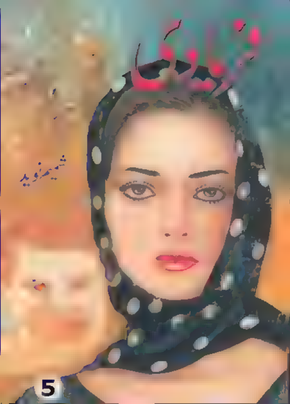
میں تیزی کے ساتھ ایئرپورٹ کی حدود سے نکل رہی تھی کہ تبھی آئینے میں مجھے ایک پولیس جیپ اپنے تعاقب میں نظر آئی۔ میں جب وہاں سے چلی تھی تو آس پاس مجھے کوئی پولیس جیپ نظر نہیں آئی تھی۔ معلوم نہیں، عین وقت پر وہ پولیس جیپ کہاں سے آ گئی تھی اور اب وہی میرے پیچھے لگ گئی تھی۔

پولیس جیپ اور ٹیکسی کے درمیان فاصلہ کم ہونے لگا تو میں نے ایکسیلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ چند منٹ کے بعد ٹیکسی ہوا سے باتیں کرنے لگی اور پولیس جیپ کافی پیچھے رہ گئی۔ کچھ فاصلے پر چوراہا تھا۔ سیدھا جانے کی صورت میں میری ٹیکسی ... روڈ پر پہنچ جاتی اور پھر میں دائیں جانب ایک سڑک پر ... سردار پٹیل روڈ پر نکل جاتی۔ اسی روڈ پر ... سے دلی شہر کا رخ کیا جا سکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ سیدھا جانے کی بجائے میں نے رفتار کم کئے بغیر بائیں جانب ٹیکسی موڑ دی۔ میری جگہ اگر کوئی اناڑی ڈرائیور ہوتا تو یقیناً ٹیکسی الٹ جاتی۔ مگر میں نے خطرناک حد تک ٹیکسی ایک جانب جھک جانے کے باوجود اسے بے قابو نہ ہونے دیا۔ پولیس جیپ کے

"مجھے آپ سے تو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے جناب" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔
"یہ تو خیر میں بھی سمجھ گئی پاپا کہ تمہاری کہانی میں جان نہیں ہے۔" چچا پاپا بھی بول پڑی۔
"تمہاری کہانی [illegible] علاوہ ورنہ جھوٹ بولنا تمہارے حق میں غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"
"کیا غلط ثابت ہو سکتا ہے میں کچھ نہیں" میں اپنے فیصلے پر قائم رہتے ہوئے بولی ورنہ میں تو یہ چاہ رہا تھا کہ ان دونوں کو بتا ہی دوں، میں در اصل کون ہوں۔
"سمجھ جاؤ گی مگر شاید اس وقت جب چاچا پاپا ان کے گلے پہنچ کر"
"مگر اس بند کرو" میں اپنے فیصلے پر قائم رہ کر بولی۔ "تم دھوکے باز ہو بنتے جا رہے ہو۔ رکو گاڑی" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میں چیخ پڑی۔
"اور نہ رکوں گاڑی تو تم کیا کرو گی" وہ استہزائیہ ہنستے ہوئے غرایا۔
"تو میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گی" یہ کہتے ہی میں نے اپنے پرس سے ریوالور نکال لیا۔
سوچیں، اسے کوئی تیسرا ہوتا تو تمہیں رہی ہو گی کہ میرے پاس ریوالور ہو گا۔ وہ اسی لئے چونک اٹھا۔
"گاڑی چلاؤ۔ رکنے کیوں لگے" اس نے مجھے چڑانے والے انداز میں کہا۔
میں نے پیچھے سے ریوالور کی نال اس کی گردن پر رکھ دی۔ وہ بولا "تمہیں وہاں تک گنتی گی گرم تم نے گنتی ختم ہونے سے پہلے گاڑی نہ روکی تو"
"اور اس کے ساتھ تم بھی عالم بالا کی سیر پر روانہ ہو جاؤ گی" وہ میری بات کاٹ کر زور سے ہنس پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی تھی۔
اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "میں گنتی شروع کر رہی ہوں، ایک"
"[illegible]" چپ پاپا جو اب تک خاموش بیٹھی رہی تھی، بول پڑی۔ "میں کوشش کرتی ہوں کہ تمہیں کم سے کم [illegible]" یہ کہہ کر چاچا پاپا سے سوچیں [illegible] مس کا کام اس نے [illegible] تھا۔ "دیکھو ریحہ، یہ گاڑی [illegible] معلوم نہیں ہوا [illegible] کیسی ہوا ہو تو بات بڑھ رہی ہے۔"
"ہرگز نہیں" فریحہ فیصلہ کر چکی تھی۔ "تمہیں معلوم ہے چچا پاپا کہ میں نے بڑی بڑی ضد کی اور [illegible] لوگوں کو سیدھا کرنا ہے یہ تو کوئی چیز ہی نہیں" یہ کہتے ہوئے وہ چپ پاپا کی طرف متوجہ تھا۔
میں اس کے بیرل تک سامنے سے آتے ہوئے ایک تیز رفتار ٹرک پر پڑی اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ ٹرک انتہائی قریب آ چکا تھا۔ [illegible] نے بچاؤ کی کوشش کی کہ سامنے سے نکل جائے مگر [illegible] اس ٹرک سے ٹکرا گئی۔ [illegible] کب میرے ہاتھ [illegible] سے چادر [illegible] چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

ظہرا ثنا خان کی [illegible] آپ بیتی ابھی جاری ہے۔ بقیہ واقعات کیلئے حصہ پنجم کا مطالعہ کریں۔


شمیم نوید
5

اپنے ذہن میں مجھے روشنی کے جھماکے سے محسوس ہونے۔ اس کے ساتھ میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہونے لگے۔ پھر مجھے اپنے سر کے اوپری حصے میں تکلیف کا احساس ہوا اور غیر ارادی طور پر میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ بے اختیار میرا ہاتھ سر تک پہنچ گیا جس میں شدید دکھن ہو رہی تھی۔ کچھ دیر مجھے یاد ہی نہ آسکا کہ میں کہاں ہوں اور کن حالات سے دوچار ہوں! مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ہواؤں میں اڑی جا رہی ہوں۔ اپنے سر کے بالوں میں مجھے [illegible] ابھار سا محسوس ہوا تھا جو یقیناً کسی چوٹ کے سبب تھا۔ سر کے اسی حصے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں [illegible] میرے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اسی جھٹکے سے سر کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا اور میرے [illegible] سے کراہیں نکل گئیں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور خود کو ایک کار کی پچھلی سیٹ پر دراز پایا۔ [illegible] حادثہ یاد آ گیا۔ میں اسی کے نتیجے میں ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی، مگر [illegible] تھا۔ [illegible] تھی اور جو شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا وہ [illegible] تھا۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسی دوران میں [illegible] شخص نے پہلو بدلنے کے بعد میری طرف مڑ کر دیکھا۔ [illegible]

''ہوش آ گیا آپ کو؟'' اس [illegible] شخص نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بھاری آواز میں کہا۔

''جی... جی ہاں'' میں نے جواب دیا پھر پوچھنے لگی ''کیا آپ نے مجھے اس کار سے اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈالا تھا [illegible] حادثہ پیش آیا تھا؟''

اجنبی نے میری بات کی تصدیق کی، پھر بتانے لگا ''میں بائی روڈ جے پور سے دہلی آ رہا تھا کہ راستے میں مجھے سڑک پر ایک کار کھڑی نظر آئی جسے یقیناً کوئی خطرناک حادثہ پیش آیا تھا۔ کار کا بونٹ اندر کی طرف دھنس گیا تھا اور '' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا، پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ ''کار میں سوار افراد شاید آپ کے عزیز...''

''نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ان سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا، آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بلا جھجک کہہ سکتے ہیں۔''

''تو پھر تو پھر آپ ان کی کار میں ''

''میں نے ان سے لفٹ لی تھی۔'' میں نے اس کا سوال پورا ہونے سے پہلے ہی بتا دیا۔

"اگر آپ خود کو اب بہتر محسوس کر رہی ہوں تو آگے آ جائیں۔" اس نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد متعلقہ لوگوں کو اس حادثے کی خبر دے دوں اور آپ کو بھی کسی قریبی ہسپتال پہنچا دوں۔ ویسے بظاہر تو آپ ٹھیک ٹھاک لگ رہی ہیں، کوئی اندرونی چوٹ آئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔"

یہ سن کر وہ مجھے کسی قریبی ہسپتال تک پہنچانا چاہتا ہے، میں چونک اٹھی اور فوراً بولی۔ "ٹھیک ہوں میں بالکل! مجھے کوئی اندرونی چوٹ نہیں آئی۔ ہسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں مجھے!" یہ کہتے ہی میں کار کا دروازہ کھول کر اتر گئی اور پھر اگلا دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس شخص کا جائزہ لیا وہ متوسط عمر کا ایک شخص تھا۔ اس کے جسم پر براؤن کوٹ اور اسی سے ملتی ہوئی پینٹ تھی، سفید قمیص پر سرخ ٹائی باندھے ہوئے تھا، ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں اور جیسا کہ میں بتا چکی ہوں چہرہ لمبوترا تھا، آنکھیں چھوٹی اور سر پر سیاہ گھنے بال تھے؟

"میرا نام مہیش اگروال ہے۔" اس نے مجھ سے اپنا تعارف کرایا۔

"اور مجھے زینب کہتے ہیں۔" میں نے بھی جواباً اپنا فرضی نام بتا دیا، پھر بولی "ہاں اب بتائیے کہ اس حادثے کے بارے میں آپ کیا کہتے کہتے رک گئے تھے؟"

"وہ دونوں جو کار کی اگلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے، اس حادثے کا شکار ہو گئے۔" مہیش اگروال کے چہرے پر تاسف تھا۔

"یہ بات میں اسی وقت سمجھ گئی تھی جب آپ نے بتایا تھا کہ کار کا بونٹ اندر کی طرف دھنس گیا تھا۔ میں نے کہا۔ مجھے ان دونوں کی موت کا قطعی افسوس نہیں تھا مگر محض مہیش کی خاطر میں نے بھی ان کی موت پر دکھ کا اظہار کیا۔ میرے افسوس نہ کرنے کا سبب یہ تھا کہ اپنی موت سے قبل وہ دونوں مجھ پر اپنے باطن کا اظہار کر چکے ہیں۔ وہ میرے اغوا کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

"آپ نے ان دونوں سے کہاں لفٹ لی تھی؟" مہیش نے سوال کیا اور اس کا یہ سوال میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔

"یہیں اسی سڑک پر!" میں نے بلا جھجک جواب دے دیا اور پھر مہیش کو بھی وہی کہانی سنا دی جو مرنے والوں کو سنا چکی تھی۔ "جب وہ بدمعاش ٹیکسی والا مجھے انتقاماً یہاں اتار کر چلا گیا تو میں دور تک پیدل چلی اور پھر عقب سے وہی کار آتی دکھائی دی جسے حادثہ پیش آیا تھا۔ میں نے ان سے دہلی تک کے لیے لفٹ لے لی، مگر ان کی کار میں بیٹھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ کچھ اچھے لوگ نہیں تھے؟" پھر میں نے چمپا بائی اور فرید سے ہونے والی گفتگو سے مہیش کو آگاہ کر دیا، لیکن یہ بات گول کر گئی کہ میں نے ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ اسی کے ساتھ ہی میں نے کار سے ٹرک کے ٹکرا جانے کا واقعہ سنایا۔

"شاید آپ سے اسی تو تکار کے سبب وہ شخص سامنے سے آنے والے ٹرک کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔" مہیش نے اظہار خیال کیا "پھر بتائیے" "مجھے وہاں صرف کار نظر آئی تھی۔ وہ ٹرک والا حادثے کے بعد یقیناً اپنا ٹرک لے کر فرار ہو گیا تھا۔"

"ہاں یہی ہو سکتا ہے۔" میں تائید میں بولی۔ ٹرک کو شاید زیادہ نقصان نہیں پہنچا ہوگا۔"

"بہرحال اس ہولناک حادثے میں آپ کا زندہ بچ جانا ایک چمتکار (معجزے) سے کم نہیں۔"

مہیش بولا، پھر مجھ سے پوچھا۔ "آپ کو میں کہاں چھوڑ دوں؟"

"کسی بھی ایسی جگہ جہاں سے مجھے کوئی ٹیکسی مل سکے۔" میں بولی اور اس کے ساتھ اس کا شکریہ بھی ادا کیا کہ اس نے میری مدد کی ورنہ میں ابھی اسی کار میں پڑی ہوتی۔

"آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے جی، میں نے کوئی احسان نہیں کیا آپ پر!" وہ خوش اخلاقی سے بولا، پھر کار اسٹارٹ کرنے لگا۔

کار ابھی گڑگاؤں روڈ پر ہی تھی مگر ایئرپورٹ کی طرف جانے والا راستہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر بائیں جانب ایک سڑک کا موڑ نظر آ رہا تھا۔ میں ادھر ہی سے ایئرپورٹ آئی تھی۔ مجھے علم تھا کہ یہ سڑک آگے جا کر سردار پٹیل روڈ سے مل جاتی ہے اس روڈ سے گزر کر کار شہری حدود میں داخل ہو جاتی ہے اور وہاں مجھے کوئی ٹیکسی باآسانی مل سکتی تھی۔

میرا بیگ ابھی تک میرے شانے سے لٹکا ہوا تھا مگر ریوالور بے ہوشی کے دوران میں ہاتھ سے چھوٹ کر یقیناً اسی کار میں گر گیا تھا جسے حادثہ پیش آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اس ریوالور کے بارے میں مہیش سے کچھ نہیں پوچھ سکتی تھی اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ ریوالور مہیش نے دیکھا ہی ہو۔ جب مجھے ہوش آیا تھا تو میں مہیش کی کار میں گڑگاؤں روڈ ہی پر تھی۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہی تھی۔ میں اس خطرناک حادثے میں اپنی زندگی بچ جانے کا شکر دل ہی دل میں ادا کر رہی تھی۔ سر پر معمولی چوٹ کے علاوہ مجھے معمولی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔

"دہلی میں کہاں رہتی ہیں آپ؟" معاً مہیش نے سوال کیا تو میں چونک اٹھی کیونکہ میرا ذہن گزرے ہوئے واقعات میں منہمک تھا۔

"باڑا ہندوراؤ میں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اچھا۔" اس نے سر ہلایا، پھر اپنے بارے میں بتانے لگا۔ "یہاں چاندنی چوک میں گرودوارہ سیس گنج کے قریب میرے چاچا رہتے ہیں، میں انہی کے گھر ٹھہروں گا۔ ویسے میں خود جے پور میں رہتا ہوں، اپنی ملازمت کی وجہ سے! میں جے پور میں ایک پرائیویٹ فیکٹری میں منیجر ہوں۔

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر!" میں نے پہلی بار رسمی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ "آپ یقیناً نیک آدمی ہیں ورنہ کون کسی کے کام آتا ہے!"

"نیک آدمی!" وہ آہستہ سے ہنسا۔ "ہرگز نہیں جی! میں نیک آدمی نہیں ہوں۔ کوئی اندر سے کیسا ہے، اگر یہ بھید کھل جائے تو دنیا میں بڑا فساد ہو، مثلاً جب میں آپ کے جسم کو اپنے بازوؤں پر اٹھا کر اپنی گاڑی کی طرف لا رہا تھا تو میرے اندر شیطان جاگ اٹھا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے اندر سر اٹھاتے ہوئے شیطان پر قابو پایا تھا۔ اب بتائیے کیا آپ مجھے نیک آدمی کہیں گی؟" اس نے حیرت انگیز صاف گوئی سے کہا۔

"ہاں اب بھی میں آپ کو نیک آدمی ہی کہوں گی۔" میں نے بغیر جھجکے جواب دیا۔ "اپنے اندر موجود شیطان پر قابو پانا ہی تو نیکی ہے!"

"یہ جان کر مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ ایک مسلمان لڑکی اتنے صاف دل اور کھلے ذہن کی بھی

ہوسکتی ہے۔ آپ کی تربیت یقیناً اچھے ماحول میں ہوئی ہے۔ میں نے بہرحال آپ کی بے ہوشی کے دوران میں جو کچھ چند لمحوں کو سوچا، اس پر میں شرمندہ ہوں۔"

"اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں، پھر بھی اگر آپ شرمندگی محسوس کر رہے ہیں تو یہ آپ کی نیک نیتی ہے۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ ان کا ایک دوسرے کی طرف کھنچنا فطری عمل ہے، مگر ہر عورت، ہر مرد کے لیے اور ہر مرد، ہر عورت کے لیے نہیں ہوتا! بس اتنی سی بات اگر لوگوں کی سمجھ میں آ جائے تو خاصا فتنہ و فساد ختم ہو جائے۔"

"ٹھیک کہتی ہیں آپ!" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

مجھے یوں لگا جیسے مہیش کے دل پر لگا ہوا کوئی زخم ہرا ہو گیا ہے، مگر میں نے اس کے زخم کو نہیں کریدا، وہ کچھ کھو سا گیا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر مہیش نے عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

"ہاں کی ہے، مگر کسی شخص سے نہیں۔" میں نے مسکرا کر اس کی بات کا جواب دیا۔

"یعنی؟...... اگر کسی شخص سے نہیں تو پھر کس سے محبت کی ہے آپ نے؟" وہ حیران سا ہو کر بولا۔

"محبت کرنے کے لیے کسی شخص کا وجود میرے نزدیک ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ "جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں نے اپنے نظریات سے محبت کی ہے۔" میں نے وہی کہا تھا جو میرے ذہن میں تھا "اور میرے نظریات مجھے حب الوطنی اور مظلوموں کی مدد کا درس دیتے ہیں۔"

"آپ یہ ناقابل یقین سی باتیں کر رہی ہیں۔ میری صاف گوئی کو معاف کر دیجیے گا، مگر جہاں تک میرے علم میں ہے اس دیس میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت اس دیس، اس دھرتی سے محبت نہیں کرتی اور میں اسے کوئی جرم نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک یہ فطری بات ہے کیونکہ دین دھرم کے ماننے والوں نے دونوں کے بیچ نفرت کی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ متعصب ہندو بار بار مسلمانوں کو یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ یہ ان کا وطن نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آئے دن ہندو مسلم فسادات نہ ہوتے۔ مسلمان ہونے کے باوجود آپ کے منہ سے حب الوطنی کی بات سن کر مجھے اسی لیے حیرت ہوئی ہے۔"

"مہیش بابو! آپ نے خود اکثریت کی بات کی ہے اور ظاہر ہے کہ اقلیت اکثریت سے الگ ہوتی ہے۔ نہ سارے مسلمان ایک سے ہوتے ہیں نہ ہندو! میرے جو خیالات تھے میں نے صاف گوئی کے ساتھ آپ پر ظاہر کر دیئے۔ آپ نے خود ایک ہندو ہو کر ہندوؤں کے ظلم و تعصب کا اعتراف کیا ہے، یہ بڑائی ہے آپ کی!"

"میں بھی پہلے اپنے دوسرے ہم مذہبوں کی طرح تھا مگر اب ایک واقعے نے مجھے اندر سے بدل دیا ہے۔ میرا جیون ایک مسلمان ہی کی دین ہے۔ اس غریب نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر مجھے بچایا تھا۔ یہ واقعہ اب سے پانچ سال پہلے کا ہے۔ یہیں دہلی میں ہندو مسلم فساد کے دوران میں شاید مجھے قتل کر دیا جاتا، اگر وہ نیکی کا فرشتہ مجھے نہ بچا لیتا اور وہ نیکی کا فرشتہ ایک مسلمان تھا۔"

پھر مہیش مجھے اپنے ساتھ گزرا ہوا وہ روح فرسا واقعہ بتانے لگا۔ جامع مسجد کے علاقے میں اسے ایک مسلمان نے دو دن تک اپنے گھر میں چھپا کر رکھا تھا اور پھر موقع ملتے ہی اسے وہاں سے نکلوا دیا تھا۔ جب مہیش فرار ہو رہا تھا تو کچھ شرپسندوں نے اسے دیکھ لیا تھا، لیکن اس شخص نے اپنی جان پر کھیل کر ان شرپسندوں کو مہیش کا تعاقب کرنے سے روک لیا تھا۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ واقعہ سنتی رہی۔ اسی دوران کار شہر کی حدود میں داخل ہو گئی۔

"بس مجھے یہیں کہیں اتار دیجیے!" مہیش واقعہ سنا چکا تو میں نے اس سے کہا۔ "یہاں سے مجھے کوئی سواری مل جائے گی۔"

مہیش نے پیشکش کی کہ میں آپ کو باڑا ہندو راؤ چھوڑ دیتا ہوں، مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر اس نے سڑک کے کنارے کار روک دی اور میں اس کا شکریہ ادا کر کے اتر گئی۔ اب میں جلد از جلد اشوکا ہوٹل پہنچنا چاہتی تھی تاکہ اگر میک اپ نہیں تو کم از کم اپنا لباس تبدیل کر لوں۔ اس لباس میں مجھے پالم ایئرپورٹ پر متعدد لوگوں نے گولی چلاتے دیکھا تھا، پھر پولیس نے بھی میرا تعاقب کیا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ کے جس محافظ کی گردن میں گولی لگی تھی، میرے نزدیک اس کا بچنا محال ہی تھا۔ ایسی صورت میں پولیس سرگرمی کے ساتھ میری تلاش میں ہو گی، مجھے اس بات کا پورا احساس تھا۔ یہ معاملہ کیونکہ ایک غیر ملکی کے قتل کا تھا اس لیے بھی پولیس فوری طور پر حرکت میں آ گئی ہو گی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی میری نظر میں تھی کہ جس ٹیکسی ڈرائیور کو میں نے بے ہوش کیا تھا، وہ بھی پولیس سے میرا حلیہ بیان کر سکتا تھا اور پولیس کو یہ بھی بتا سکتا تھا کہ اس نے مجھے کہاں سے ٹیکسی میں بٹھایا تھا! وہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے پہچان بھی سکتا ہے۔ اس خیال نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ احتیاط اور دور اندیشی کا تقاضا یہ تھا کہ میں نہ صرف لباس بلکہ میک اپ اور موجودہ حلیے سے بھی جس قدر جلد ممکن ہو جان چھڑا لوں۔ اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس قتل کی وجہ سے وقتی طور پر ڈاکٹر رچرڈ نے دہلی سے روانگی موقوف کر دی ہو۔ خود پولیس بھی اس قتل کے ایک عینی شاہد کی حیثیت سے اسے روکنے کی کوشش کر سکتی تھی۔

مہیش کی کار سے اتر کر مجھے وہاں زیادہ دیر کسی خالی ٹیکسی کا انتظار نہیں کرنا پڑا اور میں اشوکا ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں میرا ذہن پیش آنے والے واقعات اور ڈاکٹر رچرڈ کے بارے میں سوچتے ہوئے بہت تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں اب اپنے آئندہ اقدامات کے متعلق منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ میرے ہاتھوں ڈاکٹر رچرڈ کا جو محافظ مارا گیا تھا، وہ ہیرلیسن نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی میرے ہاتھ میں ایک کارڈ موجود تھا۔ اگر ڈاکٹر رچرڈ دہلی میں رک گیا تھا تو ہیریسن سے اس کا پتا معلوم کیا جا سکتا تھا۔ قوی امکان یہی تھا کہ خود ڈاکٹر رچرڈ بھی اسی کوٹھی میں ٹھہرا ہوا تھا جہاں ہیریسن کا قیام تھا۔ اس خیال یا قیاس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے پارلیمنٹ اسٹریٹ ہی سے اس کار کا تعاقب شروع کیا تھا جس میں ڈاکٹر رچرڈ ایئرپورٹ جا رہا تھا۔

ٹیکسی جب اشوکا ہوٹل پہنچی تو دن ڈھل چکا تھا۔ میں کرایہ ادا کر کے تیزی کے ساتھ ہوٹل کی عمارت میں داخل ہوئی اور پھر اپنے کمرے تک پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ اشوکا ہوٹل کی طرف آتے ہوئے میں نے جو کچھ سوچا تھا، اب اس پر جلد از جلد عمل کرنا چاہتی تھی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے

بعد میں نے سب سے پہلے لباس تبدیل کیا، پھر اپنے سوٹ کیس سے میک اپ کا سامان نکالنے لگی۔ مجھے علم تھا کہ ٹیکسی والے کے بیان کی روشنی میں پولیس کی پہلی توجہ ہوٹل ہی کی طرف ہوتی۔

اپنے چہرے پر نیا میک اپ کرنے کے بعد میں آئینے پر آخری نظر ڈال رہی تھی کہ میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے کا احساس دلایا۔ میں نے انتہائی سرعت کے ساتھ میک اپ کا سامان سمیٹ کر سوٹ کیس میں رکھ دیا اور پھر نہ جانے کس خیال کے تحت سوٹ کیس سے اپنا پاسپورٹ، دیگر ضروری کاغذات اور ساری رقم نکال کر اپنے بڑے سے پرس میں منتقل کر لی، کسی ممکنہ خطرے نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ سوٹ کیس میں اب صرف میرے کپڑے اور دوسرا ضروری سامان تھا جو روزمرہ کے استعمال میں آتا ہے، اس کے علاوہ پلاسٹک کا وہ بڑا تھیلا بھی تھا جس میں میک اپ کا سامان بھرا ہوا تھا۔ ابھی میں وہاں سے روانگی کا فیصلہ کر رہی تھی کہ اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ سوٹ کیس کو ایک طرف سرکا کر میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

”کون ہے؟“ میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے بلند آواز میں سوال کیا۔ دانستہ میں آواز بدل کر بولی تھی۔

”پولیس! دروازہ کھولیے!“ باہر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

میں جو خطرہ محسوس کر رہی تھی اور میری چھٹی حس نے جس سے مجھے آگاہ کیا تھا، وہ خطرہ اب میرے کمرے کے دروازے تک آ پہنچا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد کچھ سوچتے ہوئے میں نے دروازہ کھول دیا اور چونک اٹھی۔ ایک پولیس انسپکٹر اور دو سپاہیوں کے ساتھ مجھے وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی نظر آیا جس کی ٹیکسی میں ایئر پورٹ تک میں نے سفر کیا تھا اور پھر اسے بے ہوش کر کے وہاں سے فرار ہو گئی تھی۔

”جی فرمائیے؟“ میں نے پولیس انسپکٹر کو مخاطب کیا۔

جواباً پولیس انسپکٹر نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے مڑ کر سوالیہ نظروں سے ٹیکسی ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے انکار میں سر ہلا دیا۔

”آپ...... آپ مس زینب تو معلوم نہیں ہوتیں!“ پولیس انسپکٹر بولا۔

اس کی بات سے میں سمجھ گئی کہ اسے میرے سابقہ حلیے کا علم تھا اور وہ یہ بھی معلوم کر چکا تھا کہ مطلوبہ حلیے رکھنے والی ہوٹل کے کس کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے اور یہ کہ اس کا نام کیا ہے!

”جی ہاں میرا نام زینب نہیں عالیہ ہے۔“ میں نے بلا جھجک بتایا۔ ”میں زینب کی سہیلی ہوں۔“

”تو پھر مس زینب کہاں ہیں؟“ پولیس انسپکٹر اندر کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

”وہ کسی ضروری کام سے ابھی کچھ دیر پہلے ہوٹل سے باہر گئی ہے، آتی ہی ہو گی، مگر انسپکٹر، بات کیا ہے؟ میں بدستور بدلی ہوئی آواز ہی میں بول رہی تھی۔

”ہمیں ایک قتل کے سلسلے میں مس زینب کی تلاش ہے۔“ انسپکٹر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا اور میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

”قتل!“ میں نے چونک اٹھنے کی اداکاری کی۔

”جی ہاں قتل! ہم مس زینب کا انتظار کریں گے اور...... اور آپ کو بھی ان کا انتظار ہے اس

لیے ہمارے ساتھ اندر چلیے!“ اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

”مگر میں...... میں کیوں...... میرا کیا...... تعلق ہے قتل سے!“

”قتل سے نہیں تو مس زینب سے تو آپ کا تعلق ہے! آپ ہی نے تو ابھی اعتراف کیا ہے کہ مس زینب سہیلی ہیں آپ کی!“

”لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ...... آپ مجھے......“

”لیکن ویکن کچھ نہیں، اندر چلیں آپ!“ پولیس انسپکٹر کے لہجے میں سختی آ گئی۔

مجبوراً مجھے پولیس والوں کے ساتھ اندر کمرے میں چلنا پڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی پولیس والوں کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ پولیس انسپکٹر نے اندر آتے ہی سپاہیوں کو تلاشی کا حکم دیا۔ کمرے میں میرے ایک سوٹ کیس اور ایئر بیگ کے سوا تھا ہی کیا جس کی تلاشی میں پولیس والوں کو دقت پیش آتی۔ سپاہیوں نے دونوں چیزیں پولیس انسپکٹر کے سامنے لا کر رکھ دیں۔

میرا ذہن اس صورتحال سے نمٹنے کی کوئی راہ سوچنے میں مصروف تھا کہ معاً مجھے اپنے سارے وجود میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن میں روشنی کے جھماکے سے ہو رہے ہیں۔ ایسا اس وقت بھی ہوا تھا جب مجھے مہیش کی کار میں ہوش آیا تھا۔ میں اپنی اس ذہنی کیفیت کو سمجھ نہ سکی۔ میرے ذہن میں ایک برقی رو سی دوڑ رہی تھی، اس کے ساتھ ایک کیف آور خمار سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس خمار کے زیر اثر میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور پھر چند ہی لمحے بعد جیسے خود بخود میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ پولیس انسپکٹر کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی جو سپاہیوں کو میرا سوٹ کیس کھولنے کا حکم دے رہا تھا۔

”مگر سر، اس میں تالا لگا ہوا ہے!“ یہ آواز شاید کسی سپاہی کی تھی۔

”تو تالا توڑ دو احمق آدمی!“ پولیس انسپکٹر نے سپاہی سے کہا تھا۔

بس چند ہی لمحے اور گزرے ہوں گے کہ اچانک میرے ذہن پر چھایا ہوا خمار غائب ہو گیا۔ میں خود کو بہت تر و تازہ محسوس کرنے لگی۔ اسی کے ساتھ میں نے ایک نمایاں فرق اور بھی محسوس کیا جو میرے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا۔ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد میرے وجود میں سوئی ہوئی پراسرار قوتیں ایک بار پھر جاگ اٹھی تھیں۔ میرے ذہن کا افق اب پہلے کی طرح وسیع ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں کیوں قدرت نے میرے اندر خوابیدہ پراسرار قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ بظاہر اس کا سبب مجھے وہ حادثہ ہی معلوم ہو رہا تھا جس سے میں آج ہی دوچار ہوئی تھی۔ اس وقت بھی ہوش آتے ہی مجھے اپنے ذہن میں روشنی کے جھماکے محسوس ہوئے تھے۔ میرا دل خوشی کے سبب انتہائی تیزی سے دھڑکنے لگا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب میرے اردگرد جو لوگ موجود تھے، ان کے ذہن پڑھنا یا انہیں اپنے طاقتور ذہن کا تابع بنا لینا میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔

میں نے ایک سپاہی کو اپنے سوٹ کیس کا تالا کھولنے کے لیے زور آزمائی کرتے دیکھا تو فوراً ہی اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اب اس کا ذہن میرے قابو میں تھا۔

”رک کیوں گئے تم؟“ انسپکٹر نے اسے ڈانٹا۔

"یہ قطعی غیر قانونی حرکت ہے۔" سپاہی نے میرے ذہن کے زیراثر اپنے افسر کو جواب دیا۔ "ہمارے پاس اس کمرے کی تلاشی کا وارنٹ نہیں ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" انسپکٹر غصے سے بولا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں بول اٹھی۔ "تمہیں اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔"

"مجھے میرے اختیارات تم بتاؤ گی!" اس نے مجھے آنکھیں دکھائیں۔ "تم خود کو زیرحراست سمجھو!"

"وہ کس خوشی میں؟ میں مضحکہ اڑانے والے لہجے میں بولی۔

"یہ تجھے تھانے چل کر معلوم ہوگا جب میں تیری......" پولیس انسپکٹر آپے سے باہر ہوگیا اور اسی سبب اس نے ایک ایسی فحش گھٹیا اور نازیبا بات کہی کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔

کمرے میں "تڑاخ" کی زوردار آواز گونجی۔ پولیس انسپکٹر کے رخسار پر پڑنے والا تھپڑ اتنا ہی زوردار تھا۔

پولیس انسپکٹر کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ایک عورت اس پر ہاتھ چھوڑ سکتی ہے، غالباً وہ اسی لیے چند لمحے مبہوت سا کھڑا رہا۔ پھر جب اسے اپنی توہین کا خیال آیا تو کسی شکاری جانور کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھی، مگر خود مجھے اس سے نہیں الجھنا پڑا۔ خود اسی کے ماتحت سپاہیوں نے میرے ذہن کے زیراثر اور میرے ہی حکم پر اسے پکڑ لیا تھا۔ انسپکٹر مجھے اور سپاہیوں کو گالیاں دیتے ہوئے گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے حرام زادو چھوڑ دو! ورنہ میں...... میں......"

"اچھا اس کی یہ حسرت بھی پوری ہو جانے دو!" میں نے دونوں سپاہیوں کو حکم دیا۔ "چھوڑ دو اسے! دیکھوں یہ میرا کیا بگاڑ لیتا ہے!" اسی کے ساتھ میں چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"میں تو ابھی پچھاڑ کے تجھے......" پولیس انسپکٹر دونوں سپاہیوں کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی مغلظات بکتا ہوا میری طرف لپکا۔

"چلو بس بہت ہوگئی بہادر، مرغا بن جاؤ اب!" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے اس کے ذہن کو اپنے قابو میں لے لیا تھا۔

اچانک آگے بڑھتے بڑھتے وہ ایک دم رک گیا اور پھر "بہتر ہے میڈم" کہہ کر جھکا اور مرغا بن گیا۔ یہ منظر دیکھ کر ٹیکسی ڈرائیور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"کھڑے ہو جاؤ اب!" میں نے پولیس انسپکٹر کو دوسرا حکم دیا۔ "سپاہیوں کو لے کر دفع ہو جاؤ یہاں سے!" اسی کے ساتھ میں نے اس کے ذہن کو مزید حکم دیا کہ جو واقعہ پیش آیا ہے، اسے وہ قطعی بھول جائے گا پھر یہی حکم میں نے ان دونوں سپاہیوں اور ٹیکسی ڈرائیور کو بھی دیا تھا۔

میرے حکم کی تعمیل میں پولیس انسپکٹر نے دیر نہیں کی اور سپاہیوں کو ساتھ لے کر کمرے سے نکل گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی اس کے ساتھ تھا۔ ان لوگوں کے جاتے ہی خود میں بھی اپنا سوٹ کیس اور ایئر بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد جب میں ہوٹل کے عقبی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی تو

ہوٹل کی سکیورٹی کا ایک باوردی شخص لپکتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟" سکیورٹی والے باوردی شخص نے مجھ سے سوال کیا۔

میں رکی اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ موقع اس سے الجھنے کا نہیں تھا، اس لیے میں نے دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن کو قابو میں لے لیا، پھر بولی۔ "اباؤٹ ٹرن!" وہ فوراً میرا حکم سنتے ہی مڑا۔ میں نے مزید کہا۔ "لیفٹ رائٹ...... لیفٹ رائٹ!" اور وہ واقعی "لیفٹ رائٹ" کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

ہوٹل کے عقبی دروازے سے نکل کر میں نے ایک لمبا چکر کاٹتے کے بعد سامنے کے حصے کا رخ کیا۔ میں اگر چاہتی تو نیا میک اپ اور نئی شخصیت اختیار کرنے کے بعد کسی دوسرے ہوٹل کا بھی رخ کر سکتی تھی، لیکن میں نے اسے غیرضروری سمجھا۔ اشوکا ہوٹل ہی میں میں نے اب نرگس کے نام سے ایک کمرا حاصل کر لیا تھا اور یہ ظاہر کیا تھا کہ لکھنؤ سے سیر و تفریح کی خاطر دہلی آئی ہوں۔ لکھنؤ کا ایک فرضی پتا بھی میں نے لکھوا دیا تھا۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنے ذہن میں پہلے سے ترتیب دیئے ہوئے منصوبے کے مطابق ایک کار کا بندوبست بھی کر لیا۔ ہوٹل کے کمرے میں اپنا سامان رکھنے کے بعد میں نیچے آ گئی۔

استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود شخص نے میرے ایما پر اس کار کے ڈرائیور کو بلایا جسے میرے تصرف میں دے دیا گیا تھا۔ اس نوجوان ڈرائیور کو دیکھ کر میں چونک اٹھی وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ وہی تعلیم یافتہ نوجوان ڈرائیور تھا جس نے مجھے اپنا نام محمد رئیس بتایا تھا۔ اشوکا ہوٹل سے جب پہلی بار میں ڈاکٹر رچرڈ کا تعاقب کرتی ہوئی پارلیمنٹ اسٹریٹ پہنچی تھی اور ڈاکٹر رچرڈ سے میری معرکہ آرائی ہوئی تھی تو یہی نوجوان ڈرائیور میرے ساتھ تھا۔ مجھے علم نہیں ہو سکا تھا کہ اس پر کیا گزری تھی۔ میں تو ڈاکٹر رچرڈ کی کار لے کر وہاں سے فرار ہو گئی تھی۔ محمد رئیس جو کار چلا رہا تھا، اس کار کے دونوں اگلے ٹائر ڈاکٹر رچرڈ کے مسلح محافظوں نے برسٹ کر دیئے تھے۔ رئیس کو میں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بہ مجبوری اپنی جان بچانے کی خاطر وہاں سے راہ فرار اختیار کر گئی تھی۔ اس وقت میں، رئیس سے ایک ہندو عورت کے روپ میں ملی تھی۔ میرے چہرے پر نیا میک اپ ہونے کی وجہ سے رئیس تو ظاہر ہے کہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا مگر میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

"آیئے میڈم!" اس نے نرمی اور خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے مخاطب کیا۔

"چلو۔" یہ کہہ کر میں اس کے ساتھ ہو لی۔

"آپ یہاں انتظار کیجئے میڈم، میں کار لے کر حاضر ہوتا ہوں۔" ہوٹل کے بیرونی دروازے سے نکلتے ہی رئیس نے مجھ سے کہا اور پھر پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گیا۔

جلد ہی وہ کار لے کر میرے پاس پہنچ گیا اور پھر میرے لیے کار کا پچھلا دروازہ کھولنے کے لیے اترنے لگا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "رہنے دو، میں خود دروازہ کھول کر بیٹھ جاؤں گی۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھی اور کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

"تھینک یو ویری مچ میڈم!" رئیس نے میرا شکریہ ادا کیا، پھر دریافت کیا۔ "کہاں چلنا ہے ہمیں میڈم؟"

"پارلیمنٹ اسٹریٹ!" میں آہستہ سے بولی اور اس کا ردعمل دیکھنے کے لیے سامنے لگے

ہوئے آئینے پر نظر جما دی، جس میں اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا، میری توقع کے مطابق وہ چونکا ضرور تھا مگر کچھ کہے بغیر اس نے کار اسٹارٹ کر دی تھی۔ میں نے اسے کریدنے کے لیے دانستہ کہا" تم چونک کیوں اٹھے پارلیمنٹ اسٹریٹ چلنے کے بارے میں سن کر؟"

"نن...... نہیں تو میڈم!" وہ اس طرح بولا جیسے میں نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

"کیا پارلیمنٹ اسٹریٹ سے تمہاری کوئی تلخ یاد وابستہ ہے؟" میں پھر بول اٹھی۔

"جی...... جی نہیں میڈم، ایسی...... ایسی کوئی بات نہیں ہے"

"مگر تمہارا لہجہ تمہارے بیان کی تصدیق نہیں کر رہا! کوئی بات ضرور ایسی ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو!" میں بدستور اصرار کرتی رہی۔

"پرسنل سی بات ہے میڈم اس لیے...... بہرحال آپ کا اصرار ہے تو عرض کر دیتا ہوں۔ پرسوں کی رات کا واقعہ ہے۔" پھر وہ مجھے میرے ہی بارے میں بتانے لگا کہ میں نے کس طرح اس کی ہمدردی حاصل کر کے اسے ایک کار کے تعاقب پر مجبور کیا۔ "یقیناً وہ کوئی جرائم پیشہ عورت تھی میڈم!" یہ کہہ کر اس نے کار پر حملے اور پھر میرے خاموشی کے ساتھ کار سے اتر جانے کے متعلق بتایا اور کہنے لگا۔ "اس عورت کے کار سے اترنے کے کچھ ہی دیر بعد دو مسلح افراد نے اچانک مجھ پر حملہ کیا اور پھر میرے سر پر کچھ مار کے مجھے بے ہوش کر دیا جب مجھے ہوش آیا تو وہ حملہ آور بھی وہاں نہیں تھے اور وہ عورت تو پہلے ہی فرار ہو چکی تھی۔ صبح تک مجھے وہیں خوار ہونا پڑا۔ صبح ہوئی تو میں نے ہوٹل فون کر کے تمام واقعہ بیان کیا اور ہوٹل سے دوسری کار بھیجی گئی تا کہ میری کار کو وہاں سے لایا جا سکے جس کے دونوں اگلے ٹائر بیکار ہو چکے تھے۔ تو یہ بات تھی میڈم! بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عورت ہوٹل سے اپنا سامان لے کر فرار ہو گئی تھی۔ عجیب چالاک عورت تھی وہ!" یہ کہہ کر رئیس خاموش ہو گیا۔

رئیس سے اس شب کا واقعہ سننے کے بعد میرے ذہن سے ایک بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ڈاکٹر رچرڈ کے مسلح محافظوں نے اسے غیر متعلق شخص سمجھ کر ہی نقصان نہیں پہنچایا ہو گا۔ اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہو سکتی تھی۔ ہوٹل کی وردی نے رئیس کی جان بچا لی تھی ورنہ میرے دشمن اسے بھی میرا ہی ساتھی سمجھ کر زندہ نہ چھوڑتے۔

رئیس سے وہ واقعہ سن کر میں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا جس پر اسے حیرت ہونا ہی چاہئے تھی۔ وہ اسی لیے مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔ "میڈم! آپ کو یہ واقعہ سن کر حیرت نہیں ہوئی؟"

"ہاں کیوں نہیں!" میں جلدی سے بولی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ "تمہارا خیال درست ہی معلوم ہوتا ہے وہ عورت یقیناً خطرناک رہی ہو گی۔" میں نے دانستہ "جرائم پیشہ" نہیں کہا تھا۔ ظاہر ہے کہ خود اپنے لیے میں کس طرح ایسے الفاظ استعمال کر سکتی تھی۔

"حیرت کی بات تو یہ ہے میڈم کہ وہ پارلیمنٹ اسٹریٹ سے فرار ہو کر کسی سواری کے بغیر اشوکا ہوٹل کس طرح پہنچ گئی؟ اور پھر وہاں سے بھی اپنا سامان لے کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئی اور کسی نے اسے ہوٹل سے فرار ہوتے بھی نہیں دیکھا!"

"ہاں واقعی حیرت کی بات ہے!" میں نے اس کی تائید میں کہا لیکن میرے لہجے میں کوئی گرم

…شی نہیں تھی اور نہ حیرت! ایسا میں نے دانستہ کیا تھا تا کہ رئیس کو میری عدم دلچسپی کا احساس ہو جائے اور وہ اس موضوع پر مجھ سے مزید گفتگو نہ کرے۔

میری توقع پوری ہوئی کیوں کہ رئیس اس کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔ پھر بقیہ سفر خاموشی ہی …ے گزرا۔ میں نے اس خاموشی سے فائدہ اٹھایا تھا اور اپنے آئندہ اقدامات کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ میرے ذہن میں خوابیدہ حیرت انگیز قوتیں اچانک بیدار ہو گئی تھیں اور میں ان سے فائدہ …ٹھانا چاہتی تھی۔ ان حیرت انگیز قوتوں کی بیداری کے بعد اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونا اور پھر انہیں زیر …ر لینا میرے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ اگر ابھی تک ڈاکٹر رچرڈ دہلی ہی میں تھا تو اب اس کا سراغ لگا لینا بھی میرے لیے آسان تھا۔

پارلیمنٹ اسٹریٹ کی حدود شروع ہو گئیں تو میں رئیس کی رہنمائی کرنے لگی۔ اب سے پہلے …یں کئی مرتبہ اس علاقے کا چکر لگا چکی تھی۔ اس لیے مطلوبہ گلی تک پہنچنا میرے لیے دشوار ثابت نہ ہوا۔ …اس کوٹھی کا نمبر بھی میرے ذہن میں محفوظ تھا جہاں ڈاکٹر رچرڈ کے محافظ ہیرلیسن کا قیام تھا اور میں اسی کی …لاش میں یہاں تک آئی تھی۔

میں نے گلی کے مخالف سرے پر کار رکوا دی اور پھر اس سے اترتے ہوئے کار کے ڈرائیور …س کو مخاطب کیا۔ "تم یہیں رک کر میرا انتظار کرو! اگر مجھے دیر بھی ہو جائے تو رکے رہنا!"

"بہتر ہے میڈم!" رئیس کچھ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ اسے شاید یہ توقع نہیں رہی ہو گی کہ …بس یوں اسے کہیں رکنے کے لیے کہہ کر چلی جاؤں گی۔

رئیس کے الجھے ہوئے لہجے کو نظر انداز کر کے میں کار سے اتر گئی اور پھر پیدل گلی میں داخل …ہوئی۔ گلی کے وسط میں پہنچ کر غیر ارادی طور پر میری نگاہ اس کوٹھی کی طرف اٹھ گئی جس سے ایک نوجوان و …ین ہندو لڑکی سروج نکل کر وحشت زدہ انداز میں بھاگی تھی اور دو غنڈے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ یہ …اقعہ گزشتہ رات کا تھا اور اسی واقعے کے سبب میں ڈاکٹر رچرڈ پر ہاتھ نہ ڈال سکی تھی۔ اس کوٹھی کے پھاٹک …اب تک بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا میں تیز قدمی کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔

اس وقت میں قطعی غیر مسلح تھی۔ میرے بیگ میں ریوالور نہیں تھا، لیکن مجھے اس کی پروا نہیں …تھی۔ اپنے پاس کوئی ہتھیار نہ ہونے کے باوجود مجھے خود پر اعتماد تھا کیونکہ دشمنوں کے خلاف سب سے بڑا …ہتھیار میرا ذہن تھا۔ پھر یہ کہ مجھے مارشل آرٹ کی مہارت پر بھی بھروسا تھا۔

جلد ہی میں، ہیرلیسن کی کوٹھی تک پہنچ گئی۔ میں نے کوٹھی کے آہنی پھاٹک کے سامنے رک کر …ردگرد کا جائزہ لیا اور پھر آہنی پھاٹک کی دائیں جانب لگے ہوئے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ کہیں …ور سے گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے بعد میں نے بٹن سے انگلی ہٹا لی اور کسی کی آمد کا انتظار کرنے …لگی۔ میں اس دوران میں کوٹھی کے اندر روشنی دیکھ چکی تھی جس کا مطلب تھا کہ کوئی اندر موجود ہے۔

آہنی پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھلنے میں چند منٹ لگے۔ دروازہ کھولنے والا ایک مقامی آدمی تھا …جو اپنے لباس سے نوکر معلوم ہوتا تھا۔

"مجھے مسٹر ہیرلیسن سے ملنا ہے۔" میں نے نوکر کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

"آپ کا نام؟" نوکر نے دریافت کیا۔

"میرا نام نرگس ہے، لیکن وہ مجھے نام سے نہیں پہچان سکیں گے کیونکہ میں ان کے لیے اجنبی ہوں۔ تم ان سے کہہ دو کہ میں، سولومن کا ایک ضروری پیغام لے کر آئی ہوں۔" میں نے دانستہ ڈاکٹر رچرڈ کے نائب سولومن کا نام لیا تھا تاکہ مجھے فوراً اندر بلا لیا جائے۔ مجھے یقین تھا کہ ہیرلیسن، سولومن کو جانتا ہو گا۔

"سو......لومن کہا نا آپ نے؟" نوکر نے تصدیق چاہی۔

"ہاں سولومن!" میں بولی۔

نوکر سر ہلاتا ہوا اندر چلا گیا۔ پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھلا ہی چھوڑ گیا تھا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ نوکر کی واپسی کا انتظار کیے بغیر کیوں نہ کوٹھی میں داخل ہو جاؤں اور اچانک ہیرلیسن پر حملہ کر کے اسے قابو میں کر لوں، مگر میں نے اس خیال پر عمل نہیں کیا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں ہیرلیسن کو تلاش کرنا محال ہی تھا۔

نوکر کی واپسی کا مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے کہا۔ "اندر آ جائیے!" یہ کہہ کر مجھے راستہ دینے کے لیے وہ سامنے سے ہٹ گیا۔

میں نے ذیلی دروازہ عبور کیا اور پھر نوکر کی رہنمائی میں عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔ دونوں جانب لان تھا اور لان کے درمیان پختہ چوڑا راستہ بنا ہوا تھا۔ اسی راستے کے اختتام پر عمارت کی دائیں جانب مجھے ایک کار کھڑی دکھائی دی جسے میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ یہ وہی کار تھی جس کا تعاقب میں نے ایئرپورٹ تک کیا تھا۔ کار پر نظر پڑتے ہی مجھے ڈاکٹر رچرڈ کا خیال آیا۔ خود ڈاکٹر رچرڈ بھی اسی عمارت میں موجود ہو سکتا ہے، یہ سوچ کر میرے اعصاب تن گئے۔ اب نوکر عمارت کے برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ گیا تھا اور میں اس کے پیچھے تھی۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر نوکر نے مجھے مڑ کر دیکھا اور پھر اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا عمارت کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

کچھ ہی دیر کے بعد میں اس نوکر کی رہنمائی میں ایک بڑے سے بنے سجائے ڈرائنگ روم تک پہنچ گئی۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور وسط میں نیم دائرے کی صورت میں بہترین صوفے رکھے تھے۔ جن کے درمیان بڑی سی سنٹرل ٹیبل تھی۔ میں صوفوں کی طرف بڑھ گئی اور وہ نوکر واپس چلا گیا۔

میں جہاں بیٹھی تھی اس کے سامنے خاصے فاصلے پر ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جو غالباً عمارت کے اندر جانے اور ڈرائنگ روم میں آنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں اس سے بے خبر کہ آئندہ لمحات میرے لیے کتنے خطرناک ثابت ہوں گے، اطمینان و سکون کے ساتھ ہیرلیسن کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد اچانک سامنے والے دروازے کی جانب سے مجھے قدموں کی چاپ ابھرتی سنائی دی۔ عمارت کے اندرونی حصے سے کوئی ڈرائنگ روم کی طرف آ رہا تھا۔ میرا دل تیزی کیساتھ دھڑکنے لگا اور اسی وقت مجھے کسی خطرے کا احساس بھی ہوا۔ میری نگاہیں سامنے والے دروازے کی طرف

اٹھی ہوئی تھیں۔

معاً دروازے کا پردہ اٹھا اور پھر جو شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ دوسرے ہی لمحے میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ آنے والے کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نال میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ ریوالور کی نال پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔

"بیکار ہے عذرا خان! آنے والا کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔" بیٹھ جاؤ تم پھنس چکی ہو!"

"سولومن" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "تم......تم یہاں! مگر تم نے میک اپ کے باوجود مجھے کس طرح پہچان لیا؟" یہ کہہ کر میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

جواباً سولومن نے قہقہہ لگایا، پھر بولا۔ "یہاں تک تمہارے سوا اور کون پہنچ سکتا تھا عذرا خان...... وہ بھی خود میرا پیغام لے کر!" یہ کہہ کر سولومن نے ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ہیرلیسن اندر آ جاؤ اور اندر آ کر ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لو!"

بے ارادہ میری نگاہیں ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے ڈاکٹر رچرڈ کے محافظ ہیرلیسن کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا اس نے سولومن کے حکم ہی کی تعمیل کی، پھر میری طرف ریوالور کا رخ کر کے دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ اس کے ریوالور کی نال پر بھی سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ اور وہ انتہائی چوکنا نظر آ رہا تھا۔

"دیکھ لو ہیرلیسن کہ ڈاکٹر رچرڈ کا اندازہ کتنا درست تھا! عذرا خان خود ہی چل کر ہمارے پاس پہنچ گئی نا!" سولومن نے ہیرلیسن کو مخاطب کیا، پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔ "مگر تم کل رات کیوں نہیں آئیں؟ ڈاکٹر رچرڈ نے تو یہاں تمہارے استقبال کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ تم ضرور آؤ گی! تم نے جنگلی جانوروں کو پکڑنے کے آہنی شکنجے یقیناً دیکھے ہوں گے عذرا خان! ڈاکٹر رچرڈ نے کوٹھی میں جگہ جگہ شکنجے رکھوا دیئے تھے تاکہ تم فرار نہ ہو سکو۔"

"ڈاکٹر رچرڈ کو یقین کیوں تھا کہ میں آؤں گی؟" میں نے یونہی سوال کر دیا حالانکہ مجھے اس سوال کا جواب معلوم تھا۔ میرا مقصد دراصل کچھ سوچنے کے لیے مہلت حاصل کرنا تھا۔

"حیرت ہے عذرا خان کہ یہ تم پوچھ رہی ہو!" سولومن بولا۔ "ظاہر ہے کہ بقول ڈاکٹر تم ہیرلیسن کی کار لے کر فرار ہو گئی تھیں اور اس کار میں ہیرلیسن کا بریف کیس بھی تھا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر رچرڈ، عذرا خان ایسی انتہائی ذہین و چالاک عورت سے اس حماقت کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ بریف کیس پر توجہ نہیں دے گی، اسی بریف کیس میں ہیرلیسن کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات تھے جن میں اس کوٹھی کا پتا بھی تھا۔"

"کیا تم بھی کل رات میرے یہاں آنے کے منتظر تھے؟" میں نے سولومن سے پوچھا۔

"نہیں! میں آج اس وقت یہاں پہنچا تھا، جب ڈاکٹر رچرڈ ایئرپورٹ روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔" سولومن نے میری بات کا جواب دیا۔

"مگر ڈاکٹر رچرڈ یہاں سے کہاں اور کیوں چلا گیا؟ اس نے تو مجھے ایک اور ہی کہانی سنائی تھی۔" میں دانستہ گفتگو کو طول دے رہی تھی اور اس سے میرے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد تو یہ کہ موجودہ

صورتحال سے کس طرح نمٹا جائے، میں یہ سوچ سکوں، دوم یہ کہ باتوں ہی باتوں میں اگر ممکن ہو تو سولومن سے کچھ کام کی باتیں معلوم کر سکوں۔

''میرے علم میں نہیں کہ ڈاکٹر نے تمہیں کیا کہانی سنائی تھی!'' سولومن میری بات کے جواب میں بولا۔

''اس نے کہا تھا کہ وہ محض میری خاطر ہندوستان آیا ہے تا کہ مجھے قتل کر سکے۔ اوپر والوں نے میرے قتل کے احکام جاری کر دیئے ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔

''ڈاکٹر نے تم سے غلط نہیں کہا!'' سولومن نے کہا۔ ''مگر تم دانستہ ایک بات چھپا گئیں عذرا خان!'' سولومن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ شیطانی مسکراہٹ!

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''قتل سے پہلے کی بات! کیا ڈاکٹر رچرڈ نے تم سے نہیں کہا کہ تمہیں قتل کرنے سے پہلے وہ اپنی بوڑھی آرزوؤں کی تکمیل چاہتا ہے؟'' سولومن کا شیطانی لہجہ بدستور برقرار تھا۔

''وہ بوڑھا گدھ یہی حسرت اپنے دل میں لیے ایک دن جہنم رسید ہو جائیگا۔'' میری آواز میں نفرت و حقارت تھی۔

''اور میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے عذرا خان؟ میں تو بوڑھا نہیں ہوں!'' وہ مجھے مخصوص بے باک نظروں سے دیکھتا ہوا چند قدم آگے بڑھ آیا۔

''بکواس مت کرو!'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''یہ بکواس نہیں حقیقت ہے عذرا خان!'' اس کی آواز میں سختی آ گئی۔ ''کیا تم جینی کو بھول گئیں؟'' اس کا اشارہ اپنی محبوبہ جین ہیری کی طرف تھا جسے جینی کہا جاتا تھا۔ بہت عرصے پہلے کراچی میں وہ میرے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اسے میں نے قانون کے حوالے کر دیا تھا۔ کچھ توقف کے بعد سولومن نے مجھے گھورتے ہوئے مزید کہا۔ ''مجھے تم سے جینی کا بھی انتقام لینا ہے اور یہ انتقام اتنا بھیانک ہوگا عذرا خان کہ تمہاری روح تک لرز اٹھے گی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر رچرڈ سے میں نے اجازت لے لی ہے۔ جینی کی قیمت صرف یہی نہیں کہ تمہاری دوشیزگی ختم کر دوں بلکہ...... خیر ابھی میں یہ ذکر نہیں چھیڑنا چاہتا، وقت آنے پر تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا کتنا بھیانک انجام ہوتا ہے۔ تم مرنے کی دعائیں مانگو گی مگر تمہیں موت نہیں آئے گی! میں، میں تمہارے جسم میں ایسی خطرناک بیماری کے جراثیم داخل کر دوں گا کہ تمہاری حالت فاحشہ عورتوں سے بدتر ہو جائے گی اور تمہیں ہر وقت، ہر لمحہ کسی کے قرب کی طلب محسوس ہوگی! پھر جب تمہیں اس کے لیے ترسایا جائے گا تو تم خود اپنے جسم کو نوچو گی، بھنبھوڑو گی! اس کے بعد تمہارا جسم آہستہ آہستہ گلنا شروع ہو جائے گا مگر اس تمام عمل میں ایک عرصہ لگے گا، تقریباً پورا ایک سال! یہ کہہ کر سولومن وحشیانہ انداز میں قہقہے لگاتے ہوئے کہنے لگا۔'' جینی؟ آج کا دن میرے لیے خوش قسمتی کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اب میں عذرا خان سے تمہارا انتقام لوں گا!'' وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

''میرا خیال ہے سولومن کہ تمہاری ذہنی حالت اس وقت درست نہیں اور تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' وہ ہنستے ہنستے چپ ہوا تو میں پرسکون آواز میں بولی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو عذرا خان! مگر میرا یہ حال تمہیں نے بنایا ہے تم ہی اس کی ذمے دار ہو! جینی سے بچھڑ کر میں ادھورا رہ گیا ہوں۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''جینی کو بھول جاؤ سولومن! ورنہ شاید تم اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھو گے۔'' میرا لہجہ ایسا تھا جیسے مجھے اس سے ہمدردی ہو۔ میری طرف دو ریوالوروں کی نالیں اٹھی ہوئی تھیں، لیکن میں اس طرح بات کر رہی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو، جیسے مجھے اپنی زندگی کی پروا نہ ہو یا پھر میں دشمن کی بجائے دوستوں میں بیٹھی ہوں۔

چند لمحے خاموشی رہی، پھر دوبارہ میں نے ہی سولومن کو مخاطب کیا۔ ''تم نے یہ نہیں بتایا سولومن کہ ڈاکٹر رچرڈ یہاں سے کیوں چلا گیا؟''

''ممکن ہے میں عام حالات میں تمہارے سوال کا جواب دینے سے گریز کرتا، لیکن اب تم میرے قابو میں آ چکی ہو اس لیے تمہیں کچھ بتانا خطرناک نہیں۔ ڈاکٹر رچرڈ کو فوری طور پر یہاں سے انڈونیشیا پہنچنے کے احکام ملے تھے۔ وہاں انڈونیشیا میں معاملہ خاصا آگے بڑھ چکا ہے۔ ہماری حکومت چاہتی ہے کہ صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ صدر سوئیکارنو کا جھکاؤ کمیونسٹ ممالک کی طرف ہے۔ ہم بہت جلد انڈونیشیا میں اپنے مقاصد حاصل کر لیں گے۔ ڈاکٹر رچرڈ اسی سلسلے میں وہاں گیا ہے اور تمہارا معاملہ ایک شرط پر میرے سپرد کر گیا ہے۔ وہ شرط سمجھ ہی گئی ہو گی تم! تمہارے جسم میں خطرناک بیماری کے جراثیم داخل کرنے سے پہلے اسے مطلع کر دیا جائے تا کہ وہ بھی میرے بعد اپنی حسرت پوری کر سکے اور......''

سولومن اس کے بعد اور نہ جانے کیا کیا بکواس کرتا رہا! میں تو یہ سن کر سناٹے میں آ گئی تھی کہ انڈونیشیا میں صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹا جانے والا ہے۔ امریکہ اپنے مفادات کے حصول کی خاطر انڈونیشیا میں انتہائی قدم اٹھانے کی تیاریاں کر رہا ہے، یہ خبر میرے لیے بے حد اہم تھی۔ انڈونیشیا بہرحال ایک اسلامی ملک تھا اور ذاتی طور پر صدر سوئیکارنو کی شخصیت عالمی سیاست میں میرے نزدیک بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ صدر سوئیکارنو کو میں انڈونیشی قوم کا نجات دہندہ تصور کرتی تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے میں نے سولومن سے ایک اور اہم سوال کیا۔ ''صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ غالباً کسی فوجی انقلاب ہی کے ذریعے الٹا جائے گا! میرا خیال درست ہے نا سولومن؟''

''تو تمہارا ذہن ابھی تک وہیں اٹکا ہوا ہے!'' سولومن ہنس کر بولا۔ پھر کہا۔ ''تم نے صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے عذرا خان! وہاں ہم فوجی انقلاب ہی کی راہ استوار کر رہے ہیں۔''

سولومن کی بات سن کر میں نے ایک طویل سانس لیا۔ یہ تو میں سمجھ ہی چکی تھی کہ اپنے محافظ کے قتل ہونے کے باوجود ڈاکٹر رچرڈ، دہلی سے روانہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر رچرڈ ایسے شخص کو روک لینا ظاہر ہے کہ پولیس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس ضمن میں امریکی سفیر کا ایک فون ہی کافی رہا ہوگا۔ ڈاکٹر رچرڈ تو ایسی شخصیت کا مالک تھا کہ اس کے لیے وہ فلائٹ بھی لیٹ کی جا سکتی تھی جس سے اسے سفر کرنا تھا۔ مجھے سولومن سے ابھی کچھ اور بھی معلوم کرنا تھا۔ یہ موقع ایسا تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔ یہی سوچ کر میں بول اٹھی۔ ''سولومن! تم خود اتنے عرصے کہاں رہے؟ مشرقی پاکستان سے فرار ہوئے تو

تمہیں خاصا عرصہ گزر چکا ہے؟''

''میں کلکتے میں تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس خطے میں مجھے جس مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے، وہ مقصد میں ضرور حاصل کروں گا! وقتی طور پر مجھے ناکامی ہو سکتی ہے عذرا خان! جیسا کہ تمہاری وجہ سے ہوا، لیکن میری اس بات کو یاد رکھنا، ہم نے مشرقی پاکستان میں ایسے بیج بو دیئے ہیں کہ وہ ایک نہ ایک دن پاکستان سے الگ ہو جائے گا۔ ہمارے منصوبے دیرپا ہوتے ہیں۔ خورشید الاسلام کی جذباتی حماقت کی وجہ سے گریٹر بنگال کی تحریک کو فی الحال نقصان پہنچا ہے مگر میں نے اس عرصے میں اس نقصان کی تلافی کر دی ہے۔''

''وہ کس طرح سولومن؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اس طرح کہ اس تحریک کے بہت سے جیالے ہندوستان سے مشرقی پاکستان پہنچ چکے ہیں۔'' سولومن نے جواب دیا۔'' اب وہ لوگ ان کی جگہ کام کریں گے جنہیں گرفتار کیا جا چکا ہے۔ اس تحریک کو کامیاب ہونے میں وقت تو لگے گا مگر یہ بات یقینی ہے کہ اسے کبھی نہ کبھی کامیابی حاصل ہو جائے گی۔''

''مگر اس سے تمہارے ملک کو کیا حاصل ہوگا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''حیرت ہے عذرا خان کہ تم یہ سوال کر رہی ہو! تمہیں علم ہے کہ بھارت آزادانہ خارجہ پالیسی پر عمل کر رہا ہے وہ اس خطے میں ہمارے مفادات پورے نہیں کر سکتا اس لیے گریٹر بنگال کی صورت میں ہم یہاں ایک نئی مملکت کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں اور اس نئی مملکت پر ظاہر ہے کہ ہماری بالادستی ہوگی اور یہاں ہم اپنے فوجی اڈے قائم کر سکیں گے تاکہ رشیا اور چین پر دباؤ رکھا جا سکے۔ ابھی بنگال کے بھارتی حصے میں ہمارا کام ابتدائی مراحل میں ہے اسی لیے مجھے یہاں خاصے دن خود رہ کر از سر نو منصوبہ بندی کرنا پڑی۔'' سولومن نے تفصیل کے ساتھ میری بات کا جواب دیا۔

''کیا تم لوگوں نے اس امکان پر بھی غور کیا ہے کہ کہیں وہ نئی مملکت، بھارت کے زیر اثر تو نہیں آ جائے گی!'' میں نے کہا۔

''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اسی لیے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس نئی مملکت میں بنگال کا وہ حصہ بھی شامل ہو جو اس وقت بھارت میں شامل ہے۔'' سولومن نے بتایا۔

''معاف کرنا سولومن، مجھے تو یہ سب ایک احمقانہ خواب معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے آقاؤں نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ بھارتی بنگال میں ایک طویلے عرصے سے کمیونسٹ پارٹی غالب ہے اور اس وقت جو کانگریس نے دھاندلی سے یہاں حکومت بنا لی ہے یہ زیادہ عرصے نہیں چل سکے گی۔'' میں نے اسے حقائق سے آگاہ کیا۔

''ہمارے کام کرنے کے لیے یہی سنہری موقع ہے۔ جب تک بنگال میں حکمراں کانگریس پارٹی کی بالادستی قائم رہے گی ہمارے لیے آسانیاں رہیں گی۔ بقول تمہارے کانگریس پارٹی کی حکومت یہاں زیادہ عرصے نہ بھی رہی اور اس صوبے میں کمیونسٹ پارٹی برسر اقتدار آ گئی تو ہم اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کر لیں گے۔''

''اور پھر اس صورت میں تمہارا ہدف صرف مشرقی پاکستان ہوگا۔ تم صرف اسے اپنی سازشوں کا نشانہ بناؤ گے! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

''تم خطرناک حد تک ذہین ہو عذرا خان!'' وہ بولا۔'' اوپر والوں نے تمہارے قتل کا فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے۔ تم نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔''

سولومن سے مجھے بڑی قیمتی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں اب اس سے مزید کچھ معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس سے گفتگو کے دوران میں میرا ذہن یہ فیصلہ بھی کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں اپنی آپ بیتی میں غالباً پہلے بھی یہ لکھ چکی ہوں کہ ہر ذہن کو تابع بنانا ممکن نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر رچرڈ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا، مگر سولومن کے خلاف کبھی مجھے اپنے طاقتور ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کو استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مجھے اسی لیے علم نہیں تھا کہ اس کے ذہن پر غلبہ پا سکوں گی یا نہیں۔ وہ بہرحال کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اسے ڈاکٹر رچرڈ کے نائب کی حیثیت حاصل تھی۔ میرے ذہن کی حیرت انگیز قوتیں میری قوت ارادی کی تابع تھیں اور یہ اسی وقت بیدار ہوتی تھیں جب میں ارادہ کرتی تھی۔ پھر وہ لمحہ آ ہی گیا کہ میرے ذہن کی خوابیدہ قوتیں میرے ارادے کے زیر اثر بیدار ہو گئیں۔ ان قوتوں کا ہدف سولومن کا ذہن تھا۔

میری نگاہیں سولومن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میرے خیال کی نادیدہ لہریں اس کے ذہن سے ٹکرا رہی تھیں۔

میں نے اسے اچانک چونکتے دیکھا اور پھر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اسے یقیناً یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''نہیں!'' وہ ایک دم چیخ اٹھا اور اپنے سر کو جھٹکا دیا۔

اس عرصے میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ سولومن کا ذہن بھی مخصوص ساخت کا حامل ہے اور میں اس پر غلبہ نہیں پا سکوں گی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے ذہن سے اپنی گرفت ختم کر دی۔ میں پہلے ہی سوچ چکی تھی کہ اسی صورت میں مجھے دوسرا قدم کیا اٹھانا ہوگا! دوسرے ہی لمحے ہیرلیسن کا ذہن میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ ہیرلیسن کے ذہن نے قطعی مدافعت نہیں کی اور میرے زیر اثر آ گیا۔

''ہیرلیسن! سولومن کو گولی مار دو!'' میں نے حکم دیا مگر میرے لب ساکت رہے۔ یہ حکم میرے ذہن سے ہیرلیسن کے ذہن میں منتقل ہوا تھا۔

میرے حکم پر ہیرلیسن نے عمل کرنے کے لیے اپنے جسم کو حرکت دی اور وہ تیزی سے سولومن کی طرف مڑا۔ اسی کے ساتھ اس کے ریوالور کا رخ بھی سولومن کی طرف ہو گیا تھا۔ سولومن کیونکہ پہلے ہی خطرے کی بو سونگھ چکا تھا اور غالباً اسے میری جانب سے کسی ایسے اقدام کی توقع تھی وہ اس لیے ہیرلیسن کے جسم کی حرکت کے ساتھ ہی جھک گیا۔ ہیرلیسن کے ریوالور کی نال سے شعلہ نکلا مگر سولومن بچ گیا۔

دوسرا فائر کرو، میں نے ہیرلیسن کے ذہن کو اسی لمحے دوبارہ حکم دیا۔

ہیرلیسن نے دوبارہ سولومن کا نشانہ لے کر گولی چلائی مگر سولومن اس وقت تک اپنی جگہ سے چھلانگ لگا چکا تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم کے اس دروازے کی طرف چھلانگ لگائی تھی جس پر پردہ پڑا ہوا

تھا اور جس کے ذریعے عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ چھلانگ لگاتے ہوئے سولومن نے ہیرلیسن پر فائر بھی کیا تھا خود تو وہ ہیرلیسن کی چلائی ہوئی دوسری گولی سے بچ گیا تھا مگر ہیرلیسن نہ بچ سکا۔ سولومن کی چلائی ہوئی گولی نے ہیرلیسن کی کلائی چھید دی تھی اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی چیخ بھی میں نے سنی تھی۔

پانسا پلٹتے دیکھ کر میں نے تیزی کے ساتھ حرکت کی اور اچھل کر سامنے والے بھاری صوفے کی آڑ لے لی۔ میں بہرحال غیر مسلح تھی اور سولومن کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔

''عذرا خان! تم یہاں سے بچ کر نہیں نکل سکتیں اس لیے خود کو میرے حوالے کر دو۔'' سولومن نے باآواز بلند مجھے مخاطب کیا، پھر دھمکی دی۔ ''سنو! میں ڈاکٹر رچرڈ کی طرح ہوس کا غلام نہیں ہوں کہ انتہائی قدم نہ اٹھا سکوں۔ میں تمہیں بلادریغ گولی مار سکتا ہوں۔''

میں نے بائیں جانب دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ہیرلیسن اپنی زخمی کلائی پکڑے تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس سے چند فٹ دور اس کا ریوالور قالین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے ذہن پر ابھی تک میرا غلبہ تھا۔ اس سے پہلے کہ سولومن میرے قریب پہنچتا یا کوئی اور حرکت کرتا، میں نے زخمی ہیرلیسن کے ذہن کو حکم دیا۔ ریوالور اٹھا کر مجھے دے دو!

میرے حکم پر ہیرلیسن کراہتا ہوا آگے بڑھا۔ سولومن ابھی تک اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھا تھا بلکہ اس نے دروازے کے ایک پٹ کی آڑ لے لی تھی۔ اسے یقیناً یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ اگر اسے میری طرف سے یہ خطرہ نہ ہوتا تو شاید وہ اب تک میرے قریب پہنچ چکا ہوتا۔ صوفے کی آڑ سے میں، سولومن پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

''رک جاؤ ہیرلیسن!'' اچانک سولومن کی تیز آواز گونجی۔ سولومن نے یقیناً ہیرلیسن کو ریوالور کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ''رک جاؤ ہیرلیسن، ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا!''

سولومن کی وارننگ کے باوجود ہیرلیسن نہیں رکا اور اس نے کراہتے ہوئے ریوالور اٹھانے کے لیے جھک کر اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا، عین اسی لمحے اندرونی دروازے کی طرف سے ایک شعلہ ہیرلیسن کی طرف لپکا۔

لیٹ جاؤ! میں نے ہیرسن کو حکم دیا۔

میرے حکم کی تعمیل میں اگر ہیرلیسن سے ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو اس کی کھوپڑی کے چیتھڑے اڑ جاتے۔ سولومن کی چلائی ہوئی گولی اس کے سر کے قریب سے گزرتی ہوئی سامنے دیوار میں گھس گئی تھی۔ اسی دوران میں بھاری صوفے کو میں نے آہستہ آہستہ اس طرف دھکیلنا شروع کر دیا تھا جہاں ہیرلیسن کا ریوالور پڑا تھا۔ صوفے کے نیچے ربر کے چھوٹے چھوٹے گول پہیے لگے ہوئے تھے ورنہ اسے حرکت دینا میرے لیے ممکن نہ تھا۔

ریوالور اٹھا کر سینے کے بل رینگتے ہوئے میری طرف بڑھو۔ میں نے صوفے کو غیر محسوس طور پر آگے بڑھاتے ہوئے ہیرلیسن کے ذہن کو حکم دیا۔

مجھے علم تھا کہ ہیرلیسن کو ایسا کرتے دیکھ لیا جائے گا، مگر اس سے میں فائدہ اٹھا کر صوفے

اور ریوالور کے درمیانی فاصلے کو مزید کم کر سکتی تھی۔

ہیرلیسن کی زخمی کلائی سے اب تک خون بہہ رہا تھا مگر تکلیف و اذیت میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ میرا حکم ماننے پر مجبور تھا۔ ہیرلیسن کو ریوالور اٹھا کر میری طرف سینے کے بل رینگتے دیکھ کر غالباً سولومن وہ بات سمجھ گیا جو اب تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ اسی کے ردعمل میں اس کے ریوالور نے پھر شعلہ اگلا اور ڈرائنگ روم میں ہیرلیسن کی آخری چیخ گونج اٹھی۔ گولی اس کی کنپٹی پر لگی تھی۔ سولومن نے یقیناً اسے جان بوجھ کر ختم کیا تھا تاکہ میں اسے سولومن کے خلاف استعمال نہ کر سکوں۔ اس نے شاید بہت پہلے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہیرلیسن کا ذہن میرے طاقتور ذہن کی گرفت میں آ چکا ہے۔ اسے میرے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل تھیں۔ انہی معلومات میں یہ بھی تھا کہ میں غیر معمولی ذہنی قوتوں کی مالک ہوں اور یہ کہ میرے ذہن میں حیرت انگیز قوتیں خوابیدہ ہیں جو کسی بھی وقت متحرک ہو سکتی ہیں۔ اگر میں پہلے خود اس کے ذہن کو قابو میں کرنے کی کوشش نہ کرتی تو وہ اس سے بے خبر رہتا کہ میرے ذہن کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو چکی ہیں۔ پھر وہ چوکنا نہ ہوتا اور شاید بے خبری میں مارا جاتا۔ میں اگر ہیرلیسن کے ذہن کو قابو میں کر لیتی اور اسے سولومن کو گولی مار دینے کا حکم دیتی تو پھر سولومن زندہ نہ بچتا، مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

ہیرلیسن کی طرف متوجہ ہونے کے سبب سولومن چند لمحے کو میری طرف سے غائب ہو گیا اور میں نے اس کی غفلت سے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ اب ہیرلیسن کے ہاتھ میں موجود ریوالور اور میرے درمیان بہ مشکل تین فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں صوفے کو آہستہ آہستہ دھکیلتی ہوئی ہیرلیسن کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ صوفے کو دھکیلنے کی وجہ سے میں خود بھی سولومن پر نظر نہ رکھ سکی تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہونے کے سبب مجھے سولومن کے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے سکی تھی اور وہ فرشتہ اجل بن کر میرے عقب تک آ پہنچا تھا۔

میں مڑی تو اس پر میری نظر پڑی۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا نشانہ میں تھی۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا عذرا خان کہ تم نہتی ہونے کے باوجود شیر کی کچھار میں گھسنے کی ہمت کروگی! کھڑی ہو جاؤ دونوں ہاتھ اٹھا کر ورنہ میں گولی مارنے میں دیر نہیں کروں گا!'' آخری الفاظ اس نے سخت لہجے میں ادا کیے۔

مجبوراً مجھے اٹھ کر کھڑا ہونا پڑا۔ میں دانستہ اس کی طرف رخ کر کے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر انتہائی چوکنا انداز میں کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کہنے پر ابھی تک اپنے دونوں ہاتھ نہیں اٹھائے تھے۔

''ہاتھ اٹھاؤ اوپر۔'' اس نے سخت آواز میں مجھے حکم دیا۔ ''عذرا خان! میں ابھی خود اپنے ہاتھوں سے اپنے ایک بہترین ساتھی کو قتل کر چکا ہوں اور اس کی ذمے دار صرف تم ہو اس لیے تمہاری کوئی بھی غیر ذمے دارانہ حرکت مجھے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ تمہارے حق میں فی الحال یہی بہتر ہے عذرا خان کہ مجھے مشتعل نہ کرو اور میں تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو!''

میں نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے، پھر کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''سولومن! کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہاری محبوبہ جینی کی جگہ لے سکوں؟''

میری توقع کے مطابق وہ حقارت آمیز انداز میں ہنسا، پھر کہنے لگا۔ ''دنیا کی کوئی دوسری عورت جینی کی جگہ نہیں لے سکتی!'' اس کا لہجہ جذباتی تھا۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب آدمی جذباتی ہوتا ہے تو وہ اپنے ذہن پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ جذبات کے سبب اس کے ذہن کی مدافعتی قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔ میں نے اسی لیے دانستہ ایک ایسی بات کہی تھی جس کے ردعمل میں سولومن جذباتی ہو گیا تھا۔ فوری طور پر میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ بس چند ہی جذباتی لمحے تھے جن کے زیراثر آ کر سولومن کے ذہن کی قوت مدافعت قدرے کمزور پڑی تھی۔ اسی کے نتیجے میں مجھے سولومن کے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا پہنچانے کا موقع مل گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا، میرا دایاں پیر نیم دائرے کی صورت میں گھوم گیا۔ میرا نشانہ اس کا دایاں ہاتھ تھا جس میں وہ ریوالور پکڑے ہوئے تھا۔ نتیجتاً ریوالور اس کی گرفت میں نہ رہ سکا۔

دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا اور اپنے سر کو جھٹکتا ہوا آگے بڑھا۔ میرا پیر دوبارہ فضا میں بلند ہوا مگر اس بار سولومن نے انتہائی سرعت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک دم پیچھے ہٹ کر میرا وار خالی جانے دیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ بھی میری ہی طرح مارشل آرٹ کا ماہر ہو گا لیکن اس امکان کو میں نے بہرحال اپنے ذہن میں رکھا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے جوابی حملے سے میں نے خود کو بچا لیا۔ اگر اس کی بیک کک میرے منہ پر پڑی ہوتی تو یقیناً میں زخمی ہو جاتی۔ اس نے تیزی سے اپنی ایڑی پر گھوم کر بیک کک سے میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی جو اس کی مہارت کا ثبوت تھا۔

''ہا!'' میں اپنے منہ سے ہیبت ناک آواز نکالتی ہوئی کسی عقاب کے مانند اس پر جھپٹی۔ اس کے ساتھ میں نے اپنے جسم کو فضا میں اچھالا تھا۔ یہ جوڈو کا ایک مخصوص داؤ تھا۔ میرے دونوں پیر اس کی گردن کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ دوسرے ہی لمحے میرے جسم کے بوجھ سے وہ نیچے آ رہا۔ مگر خلاف توقع کسی اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے دوسرے ہی لمحے مجھ پر جست لگائی۔ میں ابھی فرش سے نہیں اٹھ سکی تھی۔ اس کے حملے سے بچنے کی خاطر میں نے اپنے دونوں پیر عین اس لمحے اوپر اٹھا دیئے جب وہ میرے جسم پر گر کے مجھے اپنی گرفت میں لینے والا تھا۔ میرے دونوں پیر اس کے سینے پر تھے ایک بار میں نے انہیں نیچے کیا اور پھر پوری قوت سے اس کے جسم کو دور اچھال دیا۔ پھر میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ سولومن ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے کے قریب جا کر گرا تھا۔ اس نے غالباً اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مجھے زیر نہیں کر سکے گا، پھر بھی میرے ذہن میں یہ بات دور تک نہیں تھی کہ اچانک وہ بھاگ اٹھے گا۔ فرش پر گرنے کے بعد اٹھتے ہی وہ ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے کی طرف بھاگا اور پھر اس سے پہلے کہ میں اس کا پیچھا کر سکتی اس نے دروازہ دوسری طرف سے بند کر دیا۔ میں نے واضح طور پر چٹخنی لگائے جانے کی آواز سنی تھی۔

فوری طور پر میں نے ڈرائنگ روم میں پڑے ہوئے سولومن اور ہیرلیسن کے ریوالوروں کو اپنے قبضے میں لے لیا، ان دونوں ہی ریوالوروں میں ابھی گولیاں باقی تھیں۔ اب میں غیر مسلح نہیں تھی۔

میرے دونوں ہاتھوں میں بھرے ہوئے ریوالور تھے۔ میرا یہ فوری اقدام خود حفاظتی کے سبب تھا۔ حالات ابھی غیر یقینی تھے اور کسی بھی لمحے خطرہ دوبارہ میرے سر پر منڈلا سکتا تھا۔

معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں سولومن دوسری طرف سے جا کر ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ باہر سے بند نہ کر دے! یہ خیال آتے ہی میں بیرونی دروازے کی طرف لپکی جس کی چٹخنی اندر سے ہی ہوئی تھی۔ چٹخنی کھول کر جیسے ہی میں نے دروازے سے باہر قدم رکھا، گیند ایسی کوئی شے میرے قریب آ کر گری اور پھر ہلکے سے دھماکے کے ساتھ پھٹ گئی۔ اس کے ساتھ میری اطراف دھواں پھیلنے لگا۔

خطرہ! خطرہ! میرا ذہن گردان کرنے لگا۔

میں نے اپنی سانس کی نالی میں شدید جلن محسوس کی۔ میری اطراف چکراتا ہوا دھواں میرے سانس کے ساتھ پھیپھڑوں میں داخل نہ ہو جائے، اسی خیال سے میں نے سانس روک لیا۔ وہ کوئی تیز اثر گیس تھی جس نے وقتی طور پر جیسے میرے اعصاب کو شل کر دیا تھا۔ کوشش اور ارادے کے باوجود میں اپنی جگہ سے قدم آگے بڑھانے میں خود کو ناکام محسوس کر رہی تھی۔ یہ ظاہری بات تھی کہ وہ گیند میری طرف پھینکنے والا سولومن ہی ہو سکتا تھا۔ سولومن ایسے لوگ کسی ایسے ہی نازک وقت کے لیے اس طرح کے کرتب دکھانے کی خاطر خود کو ہمیشہ تیار رکھتے ہیں۔ اس نوع کے تجربات مجھے پہلے بھی ہو چکے تھے۔

سانس کی نالی میں جلن اور سوزش ہونے کی وجہ سے مجھے زور کی کھانسی اٹھ رہی تھی مگر کسی نہ کسی طرح میں اب تک خود پر قابو پائے ہوئے تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں کھانسنے لگی تو پھر اس خطرناک گیس کو اپنے حواس پر مسلط ہونے سے نہیں روک سکوں گی۔ میں اب تک سانس روکے دھوئیں میں کھڑی تھی اور میری آنکھوں سے بھی مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اپنی آنکھوں میں مجھے شدید جلن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جو اسی گیس کا نتیجہ تھی۔ میری جلد پر بھی وہ گیس اثر انداز ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی ہوں۔

ایک جست! بس ایک بھرپور جست! میرے ذہن نے مجھے ترغیب دی اور میں نے اپنے جسم کی تمام تر قوت صرف کر کے جست بھری اور اس دھوئیں کے حصار سے باہر آ گئی۔ میں اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ وہ دھواں کسی صحرائی بگولے کی طرح ایک ہی جگہ چکرائے جا رہا تھا۔ دھواں کے اس حصار سے نکلتے ہی میں نے لمبے لمبے سانس لیے تھے جن سے مجھے سکون محسوس ہوا تھا اور سانس کی نالی میں جو جلن تھی، وہ بھی پہلے کی نسبت کم ہو گئی تھی۔ ابھی میرے حواس پوری طرح بحال نہ ہو سکے تھے کہ عقب سے جیسے کوئی بھاری پہاڑ میرے سر پر آ رہا۔ میری آنکھوں کے آگے ستارے ناچ گئے۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر میرا ذہن کسی اندھیرے اور گہرے کنویں میں اترتا چلا گیا۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ کسی نے میرے گرتے ہوئے جسم کو اپنے کشادہ بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ وہ شخص سولومن کے سوا اور کون ہو سکتا تھا!

معلوم نہیں مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ اپنی حالت دیکھ کر مجھے انتہائی بے بسی محسوس ہوئی۔ میرے جسم پر برائے نام لباس تھا اور چاروں طرف تیز روشنی تھی۔ اسی تیز روشنی میں بار بار مزید تیز روشنی

کے جھماکے ہو رہے تھے۔ یہ روشنی کے جھماکے یقیناً کسی کیمرے کی فلش کے تھے۔ اس نیم برہنگی کے عالم میں سامنے کھڑا ہوا ایک شخص میری تصویریں کھینچ رہا تھا اور وہ شخص سولومن تھا۔ میرا جسم چمڑے کے تسموں کی گرفت میں تھا وہ کوئی لمبی سی میز تھی جس پر میں لیٹی ہوئی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر چمڑے کے تسموں کی مضبوط گرفت میں تھے۔ اس کے علاوہ کمر کے گرد بھی تسمہ بندھا ہوا تھا۔

خدا جانے کیسے سولومن کو یہ احساس ہو گیا کہ میں ہوش میں آ چکی ہوں پھر روشنی کا آخری جھماکا ہوا اور سولومن اپنا کیمرا وہیں موجود ایک کرسی پر رکھ کر میرے قریب آ گیا۔

عذرا خان!'' وہ خواب آلود سی آواز میں بولا۔ ''آج میں پہلی بار تمہارا خوبصورت چہرہ اور حسین ترین جسم اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ یقین کرو میں نے اپنی ساری زندگی میں ایسا حسین اور متناسب جسم نہیں دیکھا۔ تمہارے جسم سے تو روشنی سی پھوٹ رہی ہے...... تم تو عذرا خان، روشنی اور خوشبو کا امتزاج ہو!'' سولومن کی آواز جذبات کی شدت کے سبب مرتعش تھی۔ اس کی بات سن کر میں سمجھ چکی تھی کہ بے ہوشی کے دوران ہی میں وہ میرے چہرے کا میک اپ ختم کر چکا ہے۔

میری زندگی میں کم ہی مواقع ایسے آئے ہوں گے کہ میں نے خود کو انتہائی بے بس محسوس کیا ہو اور یہ بھی ایک ایسا ہی موقع تھا۔ اس صبر آزما حالت سے نکلنے کی بس ایک ہی صورت تھی۔ وہ صورت ہر چند کہ میرے لیے کسی قدر خجالت و شرمندگی کا سبب تھی مگر اپنی زندگی بچانے کے لیے اس کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔

میرے قریب کھڑے ہوئے سولومن کی نظریں بار بار میرے جسم کے نشیب و فراز پر کسی ندیدے بچے کی طرح بھٹک رہی تھیں۔ اسی کے ساتھ اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ چند ہی لمحے بعد اس کے ہاتھوں کا لمس میرے جسم نے محسوس کیا۔

''سو...... سو...... لومن ڈارلنگ!'' میں نے یہ کہہ کر سسکاری لی اور اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر کیا جیسے اس کے لمس نے مجھ دیوانہ بنا دیا ہے۔

اس نے بے یقینی کے سے انداز میں میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ میں نے اسے مزید دیوانہ بنانے کی خاطر اپنے دل پر انتہائی جبر کر کے کچھ ایسے الفاظ ادا کیے جنہیں عام حالات میں قابل شرم ہی کہا جا سکتا ہے؟ میں ایک خاص مقصد کے تحت اس کے جذبات کو مزید مشتعل کرنا چاہتی تھی۔ ردعمل میں اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور چہرہ تمتما اٹھا۔ پھر وہ میرے چہرے پر جھکا اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''عذ...... عذرا ڈا...... ڈارلنگ...... مائی سویٹ ہارٹ...... آئی ول شیور......'' اس کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسے الفاظ سنے جنہیں سننے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

آخر کار وہ لمحہ آ ہی گیا جس کی خاطر میں نے انتہائی روحانی اذیت برداشت کی تھی۔ میں نے اچانک اپنی ذہنی قوتوں کو بیدار کیا اور سولومن کے جذبات سے مغلوب ذہن کو بھرپور گرفت میں لے لیا۔ مجھے برائے نام مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس احساس کے بعد کہ میں اس کے ذہن کو اپنے طاقتور ذہن کی گرفت میں لے رہی ہوں اور لمحہ لمحہ اپنی گرفت سخت کرتی جا رہی ہوں وہ اس گرفت سے نکلنے کے لیے

اپنے ذہن کو ترغیب دینے لگا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ بے لگام اور مشتعل جذبات کو چند لمحوں کے اندر قابو میں کر لینا کسی طور ممکن نہیں تھا۔

''سولومن!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے مخاطب کیا۔

''ہاں۔'' وہ کسی سحر زدہ شخص کی طرح بولا۔

''تم میرے ہر حکم کی تعمیل کرو گے!''

میں تمہارے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔'' اس نے میرے الفاظ گویا دہرائے۔

''میرے ہاتھ کھول دو! میں نے اسے پہلا حکم دیا۔

وہ کسی معمول کی طرح میرے ہاتھوں کو چمڑے کے تسموں کی گرفت سے آزاد کرنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی ایسے شخص کے ذہن پر قابو پایا تھا جس کا ذہن غیر معمولی تھا اور ایسے ذہن کے لوگوں کو ٹرانس میں لینا ممکن نہیں ہوتا۔ کبھی کی پڑھی ہوئی کوئی بات میرے حافظے میں رہ گئی تھی جس نے آج نہ صرف میری عزت و آبرو بچا لی تھی بلکہ مجھے ایک لرزہ خیز موت سے بھی بچا لیا تھا۔ وہ کسی مشہور ماہر نفسیات کے لکھے ہوئے صرف یہ دو جملے تھے کہ جب آدمی جذباتی ہوتا ہے تو وہ اپنے ذہن پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ جذبات کے سبب اس کے ذہن کی مدافعتی قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔ ماہر نفسیات کے اس دعوے کا آج میں نے عملی طور پر کامیاب تجربہ کیا تھا۔ ہر چند کہ اس تکلیف دہ تجربے نے میری روح کو وقتی طور پر انتہائی اذیت پہنچائی تھی مگر اس کی کامیابی میری زندگی کی ضامن بن گئی تھی۔

اب میرا ایک طاقتور حریف پوری طرح میرے قابو میں تھا۔ بازی الٹ گئی تھی جس کے نتیجے میں میری بجائے میرے دشمن کی زندگی شدید خطرے میں تھی۔

سولومن میرے ہاتھ کھول کر کسی روبوٹ کی طرح پیچھے ہٹ گیا۔ پھر میں نے اپنی کمر اور دونوں پیر خود تسموں کی گرفت سے آزاد کر لیے۔ مجھے اسی کمرے میں اپنا لباس بھی مل گیا جسے میں نے تیزی کے ساتھ زیب تن کر لیا۔ لباس کے قریب ہی میرا بیگ بھی پڑا ہوا تھا اور سینڈل بھی، میں نے انہیں بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔

آج مجھ پر یہ راز منکشف ہوا تھا کہ غیر معمولی ذہن رکھنے والے افراد کے ذہن کو کس طرح زیر کیا جا سکتا ہے اور میرے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی۔

سولومن ایسے انتہائی عیار اور خطرناک دشمن پر قابو پا لینے کے بعد اسے زندہ چھوڑ دینا حماقت ہی ہوتی۔ میں نے اسی لیے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا، مگر اس سے پہلے مجھے اس کا ذہن پڑھ کر بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔ مجھے علم تھا اور خود سولومن بھی اس بات کا اقرار کر چکا تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں سرگرم عمل تمام امریکی ایجنٹوں کا سربراہ وہی تھا۔ مجھے صرف اپنے ملک کے دونوں حصوں میں تخریبی کارروائیوں میں ملوث ملکی و غیر ملکی ایجنٹوں سے دلچسپی تھی۔ میں نے اپنے بیگ سے کاغذ اور قلم نکال لیا، پھر سولومن سے ضروری معلومات حاصل کر کے لکھنے لگی۔

میں ایک کرسی پر آرام سے بیٹھی تھی اور سولومن میرے سامنے کسی بے ضرر غلام کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس سے میں جو سوال بھی کر رہی تھی، اس کا وہ تفصیل سے اور کسی مزاحمت کے بغیر جواب دیئے جا

رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ اب بھی مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں خصوصاً کراچی اور اسلام آباد میں خاصے غیر ملکی امریکی ایجنٹ موجود تھے حالانکہ اپنے ملک کے وزیر داخلہ سے گفتگو کے بعد اور ان کی فراہم کردہ اطلاعات کی روشنی میں خود میں بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھی کہ سولومن اپنے تمام ساتھیوں سمیت مشرقی پاکستان چلا گیا ہے۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں بھی تقریباً پچاس غیر ملکی ایجنٹ موجود تھے جن کے اصلی اور فرضی نام پتے میں نے نوٹ کر لیے۔ مقامی ایجنٹوں کی تعداد کیونکہ سینکڑوں میں تھی اس لیے ان میں سے صرف میں نے اہم اور انتہائی فعال وسرگرم ایجنٹوں کے نام پتے درج کیے۔ ان کی تعداد سو کے قریب تھی۔ ان ایجنٹوں میں سے تقریباً نصف اہم سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔

سولومن سے یہ اہم اور قیمتی معلومات حاصل کرنے میں مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ لگ گیا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ مجھے اس کوٹھی میں داخل ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتی تھی کہ اشوکا ہوٹل کا ڈرائیور رئیس اب تک میرے انتظار میں کار لیے اسی جگہ کھڑا ہوگا جہاں میں اسے چھوڑ آئی تھی۔ پھر ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ سولومن نے میرے چہرے کا میک اپ ختم کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ رئیس کے لیے میں اب میک اپ ختم ہوجانے کے بعد اجنبی ہی ہوتی۔ اس مسئلے کے حل کی خاطر میں نے سولومن سے اس کی کار کی چابی کے بارے میں دریافت کیا جسے میں نے عمارت کے باہر کھڑا دیکھا تھا۔

"اس کی چابیاں، ہیرلیسن کے پاس ہوں گی، مجھے علم نہیں۔" سولومن نے جواباً بتایا۔

میں نے کاغذ اور قلم اپنے بیگ میں رکھا اور پھر سولومن سے کہا۔ "مجھے ڈرائنگ روم میں لے چلو!" یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ ہیرلیسن کی لاش وہیں تھی۔ پھر معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں سولومن نے میری بے ہوشی کے بعد ہیرلیسن کی لاش وہاں سے ہٹا تو نہیں دی! اور میرا خیال غلط ثابت نہیں ہوا۔ ہیرلیسن کی لاش ڈرائنگ روم سے ہٹائی جا چکی تھی۔ سولومن کے جواب سے پہلی بار یہ بات بھی میرے علم میں آئی کہ اس کوٹھی میں چوکیدار یا اس ملازم کے علاوہ جو مجھے ڈرائنگ روم تک پہنچ گیا تھا تین افراد اور بھی تھے، ایک دیسی باورچی اور دو غیر ملکی! وہ دونوں غیر ملکی بھی امریکی ایجنٹ تھے۔ ان میں سے ایک سولومن کے ساتھ کلکتے سے آیا تھا، دوسرا ہیرلیسن کے ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہتا تھا۔ انہیں دونوں غیر ملکیوں نے سولومن کے حکم پر کوٹھی کے عقبی باغ میں گڑھا کھود کر ہیرلیسن کی لاش کو دفن کر دیا تھا۔ ان معلومات کے بعد میں نے سولومن کو ڈرائنگ روم میں چلنے سے روک دیا۔

جہاں تک میرا اندازہ تھا ہیرلیسن کو انہی کپڑوں میں دفن کر دیا گیا تھا جو وہ پہنے ہوئے تھا۔ عموماً اس قسم کے حالات میں غیر ضروری تاخیر نہیں کی جاتی۔

کار کی چابی اس شخص کے پاس ہوسکتی ہے جو اسے ڈرائیو کرتا تھا، معاً مجھے خیال آیا اور میں نے سولومن سے اس شخص کے کمرے کی بابت دریافت کیا، پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "تم خود اس سے کار کی چابیاں لے آؤ! میں یہیں تمہاری منتظر ہوں، مگر میرے بارے میں تم اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دو گے!" میرا لہجہ حکمیہ تھا۔

سولومن نے اقرار میں سر ہلایا اور پھر اس کمرے کے بند دروازے کی چٹخنی کھول کر باہر نکل گیا۔

کمرے سے سولومن کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور میں چونک ل اسی کے ساتھ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میں تیزی کے ساتھ اس کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل آئی۔ میں نے سوچا کہ کہیں سولومن کے ذہن پر ے ذہن کی گرفت ختم تو نہیں ہوگئی اور میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ میں اس کے ذہن سے رابطہ قائم ہیں کر سکتی تھی۔ میرے ذہن کو لگنے والا جھٹکا بے سبب نہیں تھا۔

عذرا خان! فرار ہو جاؤ یہاں سے! میرے اندر سے ایک سرگوشی ابھری۔

پھر میں نے اندازے سے ایک سمت دوڑ لگا دی۔ قدرت شاید مجھ پر مہربان تھی کہ میں نے ت کا صحیح اندازہ لگایا۔ میں کچھ ہی دیر بعد ایک طویل راہداری سے گزر کر اس عمارت کے صدر دروازے ا پہنچ گئی۔ اس کا یقین کہ وہ صدر دروازہ ہی تھا مجھے اس وقت ہوا جب میں نے ایک پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر برآمدے میں روشنی تھی اور سامنے ہی برآمدے کے اختتام پر مجھے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہیں اسی دروازے سے عمارت میں داخل ہوئی تھی۔

ابھی میں نے دروازے سے باہر قدم رکھا تھا کہ عقب سے مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور ایک آشنا آواز نے دھمکی دی۔ "رک جاؤ عذرا خان ورنہ میں تمہارا جسم گولیوں سے چھلنی کر دوں گا!" یہ آواز بڑی غضب ناک تھی جیسے چوٹ کھایا ہوا کوئی سانپ پھنکارا ہو۔ پھنکارنے والا سولومن ہی تھا۔

پھر اس نے راہداری میں بھاگتے ہوئے مجھ پر سائیلنسر لگے ہوئے ریوالور سے فائر بھی کیا۔ سناتی ہوئی گولی مجھ سے بس ایک انچ کے فاصلے پر دروازے کی چھوکھٹ میں پیوست ہوگئی تھی۔ سولومن نے اپنی دھمکی پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی تھی، مگر میں اس دوران میں دروازہ عبور کر چکی تھی۔ اسی کے ساتھ میں نے خطرہ مول لے کر انتہائی تیزی کے ساتھ دروازے کے دونوں پٹ بند کر کے باہر سے اس کی چٹخنی لگا دی تھی۔ پھر میں دروازے کے سامنے سے ہٹ کر جست بھرتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ گئی اور انہیں پھلانگ کر کوٹھی کے پھاٹک کی طرف دوڑی۔

"کون ہے؟" پھاٹک کی ایک جانب بنی ہوئی چوکیدار کی کوٹھی سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ اس نے یقیناً میرے قدموں کی تیز چاپ سن لی تھی اور وہ ابھی تک شاید جاگ ہی رہا تھا۔ جب میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو پھر اس نے با آواز بلند اپنا سوال دہرایا۔

میں اس کے سوال کی پروا کیے بغیر بھاگتی ہوئی کوٹھی کے پھاٹک تک پہنچ گئی۔

"کون ہو تم؟...... رک جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا!"

یہ سنتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا، چوکیدار اپنی کوٹھری کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی جس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا، میں نے اسی لیے اپنے طاقتور ذہن کو استعمال کرنے میں دیر نہیں کی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے چوکیدار کے ذہن سے رابطہ قائم کیا اور پھر اسے ہوش وحواس سے بیگانہ کرنے کے لیے ایک خفیف سا ذہنی جھٹکا کافی ثابت ہوا۔ اس کا جسم لہرا کر زمین پر آ رہا اور میں مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ذیلی پھاٹک کھول کر باہر آ گئی۔

اس کوٹھی سے نکل کر میں تیز قدمی کے ساتھ گلی کی مخالف سمت بڑھنے لگی۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اشوکا ہوٹل کا ڈرائیور رئیس ابھی تک کار لیے میرے انتظار میں اسی جگہ موجود ہو جہاں میں اسے چھوڑ گئی تھی۔ شاید وہ دعا کی قبولیت کا وقت تھا یا پھر وہ نوجوان ڈرائیور انتہائی فرض شناس تھا۔ وہ مجھے کار لیے اسی جگہ کھڑا نظر آیا۔ وہاں روشنی تھی۔

میں کسی جھجک کا مظاہرہ کیے بغیر کار کا پچھلا دروازہ کھولنے لگی۔

''ارے ارے کون ہیں آپ؟'' رئیس احتجاجاً بولا۔

پھر اس سے پہلے کہ رئیس مزید کچھ کہتا یا مجھے کار میں بیٹھنے سے روکتا، میں نے اس کے ذہن کو قابو میں کر لیا۔

''اشوکا ہوٹل چلو!'' میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے اسے حکم دیا۔

''بہتر ہے میڈم!'' جواباً اس کی خواب آلود سی آواز سنائی دی۔ پھر دوسرے ہی لمحے کار کا انجن جاگ اٹھا۔

کار پارلیمنٹ اسٹریٹ کی حدود سے باہر نکل آئی تو خطرے کا احساس میرے اعصاب سے ہٹ گیا۔ مجھے اس کا بے حد ملال تھا کہ میری ذرا سی غلطی سے سولومن ایسا خطرناک دشمن زندہ بچ گیا تھا۔ اگر میں اسے کار کی چابیاں لینے نہ بھیجتی تو شاید اس کے ذہن سے میرے طاقتور ذہن کی گرفت ختم نہ ہوتی۔ ایسا غالباً اس کے غیر معمولی ذہن کی وجہ سے ہوا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان شاید زیادہ فاصلہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسی وجہ سے غالباً میرے ذہن کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی، لیکن اس میں زیادہ قصوروار میں بھی نہیں تھی۔ پہلے کبھی مجھے کسی غیر معمولی ذہن پر قابو پانے کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اگر میں غیر مسلح نہ ہوتی تو شاید فرار ہونے کو ترجیح نہ دیتی۔ میں سولومن کو تو خیر ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی مگر اس سے مجھے انتہائی قیمتی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اسے میں اپنی بڑی کامیابی سمجھنے میں بجانب تھی۔ ان اہم معلومات کا تقاضا یہ تھا کہ میں جلد از جلد پاکستان پہنچ جاتی۔ اشوکا ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے میں فوری طور پر پاکستان روانگی کا فیصلہ کر چکی تھی۔

کار اشوکا ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں پہنچ گئی تو میں نے کار کے ڈرائیور کے ذہن سے یہ بات محو کر دی کہ کسی اجنبی عورت نے پارلیمنٹ اسٹریٹ سے اشوکا ہوٹل تک اس کی کار میں سفر کیا ہے۔ اسے صرف یہ یاد رکھنا تھا کہ وہ ہوٹل سے ایک عورت نرگس کو لے کر پارلیمنٹ اسٹریٹ گیا تھا اور وہی عورت اس کی کار میں ہوٹل واپس آئی تھی۔

میرے ایما پر اس نے کار روک دی اور میں کار سے اتر گئی تو اس کے ذہن کو میں نے آزاد کر دیا۔ وہ کار کو پارکنگ لاٹ کی طرف لے کر چلا گیا۔ میں ہوٹل کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اندر پہنچ کر بلا جھجک میں نے زینے کا رخ کیا میرا کمرا پہلی ہی منزل پر تھا اور اس کی چابی میرے پرس میں موجود تھی۔

اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے اطمینان سے قفل کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد میں نے فوری طور پر استقبالیہ سے رابطہ قائم کیا اور نرگس

کی حیثیت سے بات کی کہ میں فوری طور پر ہوٹل چھوڑ رہی ہوں، میرا بل بھجوا دیجیے۔

''ایک منٹ ٹھہریے!'' دوسری طرف سے کہا گیا، پھر کچھ توقف سے ایسی آواز سنائی دی جیسے استقبالیہ پر بیٹھا ہوا شخص اپنے کسی ساتھی سے کچھ دریافت کر رہا ہو، پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''میڈم! یہاں آپ کے نام پر ایک کار کی بھی اینٹری ہے۔''

''جی ہاں!'' میں فوراً بولی۔ ''میں ابھی اسی کار میں ہوٹل واپس پہنچی ہوں۔''

''سوری میڈم! کار کے ڈرائیور نے ابھی واپسی کی رپورٹ نہیں کی۔ میں ابھی معلوم کر کے آپ کو رنگ کرتا ہوں اور بل بھی بھجواتا ہوں۔''

''تھینک یو!'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

میرا سامان ابھی تک پیک تھا جو صرف ایک سوٹ کیس اور ایئر بیگ پر مشتمل تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے میں نے ایک بار پھر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا اور آپریٹر سے کہا کہ ایئرپورٹ انکوائری سے میری بات کرائے۔ میں کسی پہلی فلائٹ سے پاکستان روانہ ہو جانا چاہتی تھی۔ جلد ہی آپریٹر نے نمبر ملا دیا۔ میں ہولڈ کیے ہوئے تھی انکوائری سے معلوم ہوا کہ صبح سات بجے کراچی جانے والی ایک فلائٹ میں مجھے جلد مل سکتی ہے۔ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور ریسیور رکھتے ہی ایک بار پھر گھنٹی بج اٹھی۔ ٹیلی فون پر ہوٹل کی طرف سے مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ کار کے ڈرائیور نے واپسی کی رپورٹ کر دی ہے اور چند منٹ کے بعد میرے کمرے میں واجبات کا بل بھجوایا جا رہا ہے۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے پونے دو بجنے والے تھے۔ صبح سات بجے کی فلائٹ سے کراچی روانہ ہونے کے لیے مجھے ایک گھنٹے قبل ایئرپورٹ پہنچ جانا چاہیے تھا تاکہ امیگریشن وغیرہ کے چکروں سے نمٹا جا سکے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی میرے پاس چند گھنٹے تھے اور میں ایک شخص سے کیا ہوا وعدہ وفا کر سکتی تھی۔ وہ شخص ارشد علی تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان روانگی سے قبل ملنے ضرور آؤں گی۔ باڑا ہندوراؤ سے پالم ایئرپورٹ تک کا سفر میرے اندازے کے مطابق تقریباً ایک گھنٹے کا تھا۔ پانچ بجے صبح میں وہاں سے ایئرپورٹ روانہ ہو سکتی تھی۔ اتنی صبح ویسے بھی ٹریفک برائے نام ہوتا ہے۔ ایئرپورٹ پہنچنے میں اس سے زیادہ دیر نہ لگتی۔

ہوٹل کے واجبات ادا کر کے وہاں سے روانگی میں مجھے مزید پندرہ منٹ لگے۔ میری درخواست پر ہوٹل والوں نے میرے لیے ٹیکسی کے بجائے ایک کار کا بندوبست کر دیا تھا جو مجھے باڑا ہندوراؤ تک چھوڑ کر لوٹ آتی۔ میں نے ہوٹل کے بل کے ساتھ ساتھ اس ''اضافی خدمت'' کی بھی ادائیگی کر دی تھی۔ اس بار بھی کار ڈرائیور رئیس ہی تھا مگر اب میں اس کے لیے ایک اجنبی عورت تھی۔ میں نے دانستہ ہوٹل کے کاؤنٹر کا رخ نہیں کیا تھا کہ کہیں کسی کو مجھ پر شک نہ ہو جائے کہ میں ''نرگس'' نہیں کوئی اور ہوں۔

پھر میں نے جو کچھ سوچا تھا اسی پر عمل کیا۔ ارشد علی اور سارے لوگ خلاف توقع مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ صادق ماموں بھی کچھ دیر بعد اپنے اخبار کے دفتر سے گھر آ گئے اور یوں ان سے بھی ملاقات ہو گئی۔ میں نے جاتے ہی سب کو اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا۔ میرے ایما پر ارشد علی نے اسی وقت

اپنے چھوٹے بھائی کو مطلوبہ فلائٹ کا ٹکٹ لینے ایئرپورٹ بھیج دیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ وہ ایئرپور
ہی پر رہے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے تقریباً ڈھائی گھنٹے ان لوگوں کے ساتھ گزارے اور
پانچ بجے کے قریب ایک ٹیکسی میں ارشد علی کے ساتھ ایئرپورٹ روانہ ہوگئی۔

ارشد علی کا وہ اداس چہرہ میں آج تک نہیں بھول سکی جب وہ مجھے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ
تھا۔ اس کے دل میں یقیناً میرے لیے شدید محبت تھی۔

وقت مقررہ پر جہاز پالم کے ہوائی اڈے سے کراچی کے لیے پرواز کر گیا۔ میرے وطن کی مٹ
مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ نئے ہنگامے، نئی معرکہ آرائیاں مجھے آواز دے رہی تھیں۔

☆......☆......☆

اب وہ شہر بہت پیچھے رہ گیا تھا جسے خدائے سخن میر تقی نے "عالم میں انتخاب" کہا تھا۔ جہاز اس شہر کو پیچھے چھوڑتا ہوا سینکڑوں فٹ بلندی پر ہواؤں کا سینہ چاک کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا مگر ذہنی طور پر ابھی میں اسی شہر کے گلی کوچوں میں تھی۔ یہی وہ شہر تھا جہاں میں نے آنکھیں کھولیں۔ اس شہر سے میرے بچپن اور پھر جوانی کی بہت سی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں مگر اب دانستہ اور شعوری طور پر ایک اور شہر میرے خوابوں کا امین بن چکا تھا۔ وہ شہر کراچی تھا جس سے جدا ہوئے مجھے تقریباً چار ماہ ہو چکے تھے۔

یہ چار ماہ کا عرصہ میں نے مشرقی پاکستان کے ایک شہر ڈھاکہ اور جیسور کے علاوہ بھارت کے دو بڑے شہروں کلکتہ اور دہلی میں گزارا تھا۔ طویل عرصے کے بعد کراچی لوٹتے ہوئے ایک طرف تو مجھے بچھڑ جانے والوں کی یاد آ رہی تھی۔ دوسری جانب ان لوگوں کا خیال آ رہا تھا جو کراچی میں یقیناً میری واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ جو بچھڑ گئے تھے اس وقت ان کے چہرے میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ انہی چہروں میں ایک چہرہ ڈھاکہ کے ایک باحوصلہ نوجوان بابر کا تھا۔ مشرقی پاکستان کے دوران قیام میں بابر اور اس کے ساتھیوں نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ بھارت پہنچنے کے بعد صرف بابر ہی تھا جس سے میں نے رابطہ قائم کیا تھا۔ اس رابطے کی وجہ یہ تھی کہ میں اسے جیسور کے ایک ہوٹل میں چھوڑ گئی تھی۔ میں نے اسے ٹیلی گرام کے ذریعے ہدایت دی تھی کہ ڈھاکہ واپس چلے جاؤ۔ وہ بابر ہی تھا جس نے مجھے مشرقی پاکستان میں "آپریشن سیل" کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔

یادوں کے نگار خانے سے جو دوسرا چہرہ بار بار جھانک کر مجھے اپنی متوجہ کر رہا تھا وہ زاہد کا چہرہ تھا۔ ہر چند کہ زاہد سے میری کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی لیکن ایسے نوجوان مجھے پسند ہیں۔ میرے نزدیک زاہد جیسے نوجوان ہی جینے کا فن جانتے ہیں۔ انہیں نہ صرف خود زندگی سے مسرتیں کشید کرنا آتی ہیں بلکہ وہ دوسروں کو بھی اس پر اکساتے ہیں۔ میرے صفحہ ذہن پر ابھرنے والا تیسرا اداس چہرہ ارشد علی کا تھا اور اس چہرے کی اداسی کا سبب مجھ سے بہتر بھلا کون جانتا! ارشد علی یقیناً میرے بارے میں انتہائی سنجیدہ تھا۔ اسی لئے اس نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ اسے میں نے دہلی کے دوران قیام میں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ مجھے اپنے دل سے نکال کر شادی کر لے مگر وہ سمجھنے اور سمجھانے کی حدود سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

میرے عشق میں وہ ساری زندگی تنہا گزار دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ارشد علی کے یک طرفہ عشق کی شدت بھی میرے دل میں ایسے جذبات بیدار نہ کر سکی تھی جسے محبت کا نام دیا جا سکے اور یہ میری سنگ دلی نہیں مجبوری تھی۔ میری زندگی کا مقصد اور ہی تھا۔ میں خود ارشد علی سے بھی صاف صاف کہہ چکی تھی کہ ازدواجی زندگی

بسر کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔

میں اپنے خیالوں میں کھوئی تھی کہ جہاز کے مسافروں میں ناشتہ شروع کیا جانے لگا اور میری توجہ ادھر ہوگئی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر چائے پیتے ہوئے میرا ذہن ایک بار پھر ان حالات میں الجھ گیا جن سے گزر کر میں نے فوری طور پر پاکستان پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وزیر داخلہ کے ایما پر میں جس مقصد سے مشرقی پاکستان گئی تھی ایک بڑے ملٹری آپریشن کے بعد بڑی حد تک اس میں کامیابی ہوگئی۔ جب تک سولومن سے میری مڈ بھیڑ نہیں ہوئی تھی میں اس کامیابی کو نوے فی صد سمجھ رہی تھی لیکن اب میرے نزدیک یہ کامیابی پچاس فیصد رہ گئی تھی۔ بقیہ پچاس فیصد کامیابی حاصل کرنے کیلئے مجھے کراچی پہنچنے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ ہندوستان سے فوری طور پر میری روانگی دراصل اسی سبب تھی۔ سولومن سے حاصل ہونے والی معلومات نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ میری پاکستان واپسی کی دوسری وجہ برادر ملک انڈونیشیا میں متوقع فوجی انقلاب کی خبر تھی۔ یہ خبر میرے نزدیک انتہائی اہمیت کی حامل تھی۔ میں چاہتی تھی کہ یہ اہم خبر جلد از جلد انڈونیشیا کے نجات دہندہ صدر سوئیکارنو تک پہنچ جائے اور وہ اس سلسلے میں کوئی حکمت عملی وضع کر سکیں۔ اس کے لئے میں اپنے ملک کے سفارتی ذرائع کو استعمال کر سکتی تھی۔ اپنے ملک کے برسراقتدار افراد تک یہ خبر پہنچانا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔

سفر ہی کے دوران میں مجھے ''آپریشن سیل'' سے وابستہ جانبازوں کا خیال آیا۔ چار ماہ سے ان سب کو تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ درحقیقت مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ کراچی واپس ہونے میں اتنا عرصہ لگ جائے گا ورنہ میں پہلے ہی کوئی ایسا بندوبست کر جاتی کہ انہیں پابندی سے تنخواہیں ملتی رہتیں۔ ایسا دوسری بار ہوا تھا۔ ایک مرتبہ اس وقت جب میں طویل عرصے قاہرہ میں رہی تھی دوسری بار اب لوگوں کو یہ زحمت اٹھانا پڑی تھی۔ میں نے آئندہ کے لئے اس مسئلے کا حل بھی سوچ لیا۔ ''آپریشن سیل'' سے وابستہ افراد کو میں اپنے پرسنل اکاؤنٹ سے تنخواہیں دیتی تھی لیکن غیر متوقع صورت حال میں یہ طریقہ کار بدلا بھی جا سکتا تھا۔ اس کے لئے مجھے ''آپریشن سیل'' کے انچارج کمانڈر نواز اور اپنی فرم عذرا انٹرپرائزز کی منیجر عارفہ کو ضروری ہدایت دینا تھیں۔ وقتی طور پر ضرورتاً عذرا انٹرپرائزز سے ''آپریشن سیل'' کے افراد کو تنخواہیں دی جا سکتی تھیں۔ میری فرم کی منیجر عارفہ میرے ذاتی ملازمین کے سلسلے میں یہی طریقہ کار اپناتی تھی۔ جب میں کراچی سے باہر ہوتی تھی تو عارفہ ہر ماہ وقت مقررہ پر فرم کے اکاؤنٹ سے ان کی تنخواہیں ادا کر دیتی تھی۔ ان ملازمین کا تعلق میری کوٹھی سے تھا۔ عارفہ کو ان ملازمین کے بارے میں کافی عرصے پہلے میں یہ ہدایت دے چکی تھی۔ اب یہی طریقہ کار میں نے ''آپریشن سیل'' سے وابستہ افراد کے لئے طے کیا تھا تاکہ آئندہ انہیں کسی پریشانی کا سامنا نہ ہو۔ مجھے یہ سوچ کر انتہائی مسرت ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اتنے سارے افراد کی روزی کا ذریعہ مجھ کو بنا رکھا تھا اور میں نے دانستہ کبھی اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں برتی تھی۔ میرے نزدیک ان تمام افراد کی حیثیت ایک بڑے خاندان کی سی تھی اور اس خاندان کی ذمے داری مجھ پر تھی۔ ان سب کے دکھ سکھ میرے اپنے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلسل چار ماہ ''آپریشن سیل'' سے وابستہ افراد کو تنخواہ نہ ملنے پر مجھے بے حد ملال تھا۔

میرا تمام سفر مختلف خیالات کے حصار میں گردش کرتے ہوئے گزرا اور پھر بالآخر اس اطلاع نے میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی کہ جہاز اب کراچی ایئرپورٹ پر اترنے والا ہے۔ میں جیسے اپنے گھر لوٹ آئی تھی۔

میرے پاس برائے نام سامان تھا اس لئے ضروری کارروائی میں دیر نہیں لگی اور میں ایئرپورٹ لی عمارت سے باہر نکل کر کسی خالی ٹیکسی کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگی۔

ذرا ہی دیر بعد مجھے ٹیکسی مل گئی اور میں اس میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگئی۔ میرے لھریلو ملازمین کے لئے یہ کوئی بات نہیں تھی کہ میں اتنے دن بعد گھر لوٹ کر آئی تھی۔ وہ سبھی مجھ سے بت کرتے تھے مگر ان میں سے کسی کو بھی میرے معاملات میں مداخلت کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

میری ٹیکسی ڈیفنس کے علاقے میں داخل ہوئی تو میں ڈرائیور کی رہنمائی کرنے لگی اور پھر جلد ں اپنی کوٹھی تک پہنچ گئی۔ کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے ٹیکسی رکوا کر میں نے ڈرائیور سے ہارن بجانے کو لہا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے وقفے وقفے سے دو تین بار ہارن بجایا چوکیدار نے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر آنے میں دیر نہیں کی۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اسی کے ساتھ اس کا ہاتھ پیشانی تک پہنچ گیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور ٹیکسی کے لئے پھاٹک کھول دیا۔ ٹیکسی کوٹھی کی حدود میں داخل ہوگئی۔ میں نے سب کچھ اسی طرح پایا جیسا چھوڑ کر گئی تھی۔ میری توقع لے مطابق پورچ میں ٹیکسی رکتے ہی میرا ایک ملازم تیزی سے قریب آ گیا۔ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی سے اتر گئی۔ ملازم کو میں نے ایئر بیگ اور سوٹ کیس لانے کی ہدایت کرتے ہوئے برآمدے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

میں کوٹھی میں داخل ہوگئی پھر جب تک میں اپنے بیڈ روم میں پہنچی سارے ملازمین کو میری آمد لی خبر مل گئی۔ میری ملازمہ خاص فاطمہ میرے ساتھ ساتھ ہی بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی۔ میں اس سے خیریت دریافت کرتی ہوئی اپنے بیڈ کے قریب ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔ ایک ہی نظر میں بیڈ روم لی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہاں روزانہ صفائی ہوتی رہی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔

''میڈم! کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ کیا کھانا پسند کریں گی؟'' فاطمہ نے بڑی محبت سے پوچھا۔

''جو کھلا دو گی کھا لوں گی' فی الحال تو تم عمدہ سی چائے پلوا دو! پھر میں نہاؤں گی اس کے بعد کھانا کھاؤں گی۔'' میں نے جواباً کہا پھر بولی۔ ''کوئی خاص بات تو اس عرصے میں......''

''ہاں یاد آیا میڈم!'' فاطمہ اس طرح چونک کر بولی جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ ''آپ کا حکم ہو تو میں آپ کی آمد سے کمانڈر صاحب کو مطلع کر دوں؟ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ آئیں انہیں فون کر دوں۔''

''تم رہنے دو میں خود فون پر بات کر لوں گی۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں اتنے میں آپ یہ فہرست دیکھ لیں۔'' فاطمہ نے قریبی ریک سے ایک کاپی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں تاریخ اور ان سب لوگوں کے نام اور پیغام

درج ہیں جنہوں نے آپ کی غیر موجودگی میں فون کئے تھے۔''

''گڈ!'' میں نے فاطمہ سے کاپی لے لی۔ ''یہ تم نے اچھا کیا۔''

''شکریہ میڈم!'' یہ کہہ کر فاطمہ میرے لئے چائے بنانے چلی گئی۔ اسی وقت ملازم میرا سوٹ کیس اور ایئر بیگ لے آیا اور میری ہدایت پر انہیں ایک طرف رکھ کر چلا گیا۔

میں اس کاپی کا مطالعہ کرنے لگی۔ میری غیر موجودگی میں مجھے فون کرنے والوں میں ایک تو میری فرم کی منیجر عارفہ تھی۔ دوسرے کمانڈر نواز اور پھر دلاور! ان تینوں افراد نے مجھے ہر دوسرے تیسرے دن فون کئے تھے لیکن تقریباً دو ماہ بعد! غالباً ابتدائی دو ماہ کے عرصے میں ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

انہی آخری دو ماہ کے دوران میں تین بار وزیر داخلہ نے بھی فون پر مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہا تھا۔ آخری فون کے ساتھ یہ پیغام بھی درج تھا کہ میں جب بھی کراچی پہنچوں فوری طور پر ان سے رابطہ قائم کروں۔ دلاور بھی یقیناً میری طرف سے فکر مند تھا۔

فاطمہ جب تک چائے بنا کر لائی میں اس کاپی کو دیکھ چکی تھی۔ میں نے اسے کاپی دے دی اور ٹی ٹرالی اپنی طرف کھسکا لی۔

''میڈم! آپ کے لئے چائے بنا دوں؟'' فاطمہ بولی۔

''نہیں تم جاؤ میں بنا لوں گی۔'' میں نے چائے کی پیالی میں چینی ڈالتے ہوئے کہا۔

اپنے لئے چائے بنا کر پینے کے بعد میں باتھ روم میں گھس گئی اور پھر نہا کر لباس تبدیل کر لیا۔

گزشتہ رات میں سو نہیں سکی تھی اس لئے جی چاہ رہا تھا سو جاؤں مگر اس سے پہلے میں چند افراد کو فون کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کھانا کھانے کے بعد سونے کا فیصلہ کیا تھا۔

پہلا فون میں نے ''آپریشن سیل'' کو کیا۔ توقع کے مطابق کمانڈر نواز ہی نے فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف سے مخصوص لہجے میں ''جی فرمایئے'' سنتے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ کمانڈر نواز ہی ہے۔

''ہیلو کمانڈر! کہو کیسے ہو؟ میں ابھی کچھ دیر پہلے کراچی پہنچی ہوں اور اپنی کوٹھی سے بول رہی ہوں۔''

''آ...... آپ...... آپ! ...... آدا...... آداب!'' میں نے کمانڈر نواز کی آواز سن کر محسوس کیا جیسے وہ میری آواز سنتے ہی کچھ بوکھلا سا گیا ہو یا جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا کہ فون پر اس سے مخاطب ہونے والی میں ہوں۔

''آداب!'' میں نے کہا۔ پھر بولی۔ ''یہ تم بوکھلائے ہوئے سے کیوں لگ رہے ہو کمانڈر؟ کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟''

''ج...... جی ہاں! م...... میں تو آپ کی تلاش میں مشرقی پاکستان تک ہو آیا ہوں میڈم!'' اس نے بتایا۔

''کیا مطلب؟'' میں اس کی بات سن کر چونک اٹھی۔ ''مگر تم...... تم وہاں کیوں گئے تھے؟ اور...... اور میری تلاش سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''بات ذرا وضاحت طلب ہے میڈم اور......'' میں نے محسوس کیا کہ کمانڈر نواز مزید کچھ کہتے

ہوئے ہچکچا رہا ہے۔

''تمہارے خیال میں فون پر بات کرنا کچھ مناسب نہیں ایسا ہی ہے نا؟'' میں نے قیاس کی بنیاد پر کہا۔

''جی ہاں یہی بات ہے۔'' کمانڈر نواز بولا۔ میرا قیاس درست ثابت ہوا۔

''اگر ایسا ہے تو پھر تم اپنا چارج کسی اور کو دے کر میرے پاس آ جاؤ! دوپہر کا کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھا لینا۔'' میں نے کہا۔

''شکریہ میڈم! میں پہنچ رہا ہوں۔''

''میں کھانے پر تمہارا انتظار کروں گی۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر دوسرا نمبر ملانے لگی۔ دوسری طرف سے لائن انگیج ملی۔ میں نے کریڈل پر ریسیور رکھ کر اپنے بیڈ کے سرہانے لگی ہوئی بیل کا بٹن دبایا۔

فاطمہ کو آنے میں دیر نہیں لگی۔ میں نے اس سے کہا کہ کمانڈر نواز بھی دوپہر کا کھانا یہیں کھائے گا۔ وہ ''بہتر ہے'' کہہ کر چلی گئی۔

میں نے دوبارہ فون پر اپنی فرم کا نمبر ملایا جو پہلے انگیج ملا تھا۔ اس بار نمبر مل گیا اور دوسری جانب سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ''یس! عذرا انٹرپرائزز۔''

''عذرا خان بول رہی ہوں میں۔ خیریت سے تو ہو تم شبانہ؟'' میں نے کہا۔

''آداب میڈم!'' شبانہ جلدی سے بولی۔ پھر کہا۔ ''جی ہاں میڈم میں بالکل خیریت سے ہوں۔''

''عارفہ سے بات کراؤ'' میں بولی۔

''جی ابھی!'' میری فرم کے استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی شبانہ کی آواز سنائی دی۔ پھر میں نے اسے عارفہ سے بات کرتے سنا۔ وہ عارفہ سے کہہ رہی تھی۔ ''میڈم بات کریں گی آپ سے!'' پھر وہ عارفہ کا جواب سن کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''بات کیجئے میڈم!''

''ہاں بھئی عارفہ کیا حال ہیں تمہارے؟'' میں نے عارفہ کے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ''کام تو ٹھیک چل رہا ہے؟''

''جی ہاں میڈم! بالکل ٹھیک چل رہا ہے مگر آپ کہاں ہیں؟ آپ کی صورت کو تو آنکھیں ترس گئیں۔'' عارفہ کی آواز میں دبا دبا سا جوش تھا۔ مجھ سے اتنے دن بعد بات کر کے وہ یقیناً بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ بغیر رکے مزید بولی۔ ''دفتر کب آ رہی ہیں آپ؟''

میں اس کی بات سن کر ہنس دی پھر کہا۔ ''ارے بھئی میں ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو کراچی پہنچی ہوں دفتر بھی آ جاؤں گی۔ کچھ آرام تو کر لینے دو مجھے!''

''نہیں آپ صحیح صحیح بتایئے کب آ رہی ہیں؟'' اس کے لہجے میں بچوں ایسی معصومیت تھی۔

''اچھا دیکھو کل کسی وقت موقع ملا تو آ جاؤں گی۔ فی الحال تو بس تمہیں یہ بتانے کے لئے فون کیا تھا کہ میں کراچی آ گئی ہوں۔''

''دیکھئے آیئے گا ضرور کل!''

''آ جاؤں گی' آ جاؤں گی بابا! خدا حافظ!'' اسی کے ساتھ مجھے وہ بات یاد آ گئی جو میں نے سفر کے دوران میں ''آپریشن سیل'' سے وابستہ افراد کی تنخواہوں کی بروقت ادائیگی کے بارے میں سوچی تھی۔ اسی خیال سے میں نے مزید کہا۔ ''مجھے خود بھی تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔''

''پھر تو مجھے یقین آ گیا کہ آپ ضرور آئیں گی۔''

''اچھا عارفہ کل تک کے لئے خدا حافظ!'' میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر کے دلاور کی فرم کا فون نمبر ملانے لگی۔ وزیر داخلہ سے فون پر گفتگو کرنے کو فی الحال میں نے موقوف کر دیا تھا۔ کمانڈر نواز سے گفتگو کے بعد ہی اب میں ان سے رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔

ملک دلاور کے فرم کے ٹیلی فون آپریٹر نے مجھے بتایا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھانے اپنی کوٹھی روانہ ہو چکا ہے۔ اسے دفتر سے چلے تقریباً بیس پچیس منٹ ہو چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق دلاور کو اب تک اپنی کوٹھی پہنچ جانا چاہئے تھا۔ میں نے اسی لئے اس کی کوٹھی کا نمبر ملا دیا۔ دوسری جانب سے اس کے ملازم نے ریسیور اٹھایا اور بتایا کہ دلاور ابھی کوٹھی پہنچا ہے اور باتھ روم میں ہے۔

''میں ہولڈ کئے ہوئے ہوں۔'' میں بولی۔ ''تمہارے صاحب باتھ روم سے نکل آئیں تو بتا دینا میرا فون ہے۔'' اپنا نام میں اسے پہلے ہی بتا چکی تھی۔

''بہتر ہے جی!'' ملازم کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ تقریباً دو منٹ بعد ملک دلاور نے فون اٹینڈ کیا۔

''ایسے موقع کے لئے بھی یکینا شاعروں نے بہت سے شعر کہے ہوں گے جب اچانک کسی کا محبوب مل جائے مگر اس وکت......''

''تمہاری طرف سے قوئے کی بجائے پے در پے کوئے کا استعمال یہ بتا رہا ہے کہ تم ہوش و حواس میں نہیں ہو ورنہ کم از کم مجھ سے بات کرتے ہوئے تم ایسے الفاظ بولنے سے ہمیشہ گریز کرتے ہو جن میں قاف شامل ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم موقع کو موکع یقیناً کو یکینا اور وقت کو وکت نہ کہتے۔'' میں نے ملک دلاور کی کھنچائی شروع کر دی۔

''آپ کی رس بھری آواز سن کر بھلا کون کافر ہوش میں رہ سکتا ہے......! خیر یہ بتائیں کہ اتنے دن کے لئے آپ کہاں اڑن چھو ہو گئی تھیں؟''

''گڈ! اب تم کچھ سنبھل کر بول رہے ہو۔ معلوم ہو رہا ہے سمجھ آ گئی ہے۔'' میں نے اس پر ایک اور فقرہ چست کیا' پھر بولی۔ ''یہ تم نے فون کر کے میری ملازمہ کا ناک میں دم کیوں کر رکھا تھا؟''

''دراصل آپ کی صحبت میں رہ کر اس کی آواز بھی کچھ رسیلی ہو گئی ہے اسی لئے آپ کی غیر موجودگی میں اسی سے ٹھرک مٹا لیا کرتا تھا۔''

''آ گئے نا گھٹیا زبان استعمال کرنے پر!''

''ٹھرک مٹانا میرے خیال میں کوئی گھٹیا بات نہیں۔ خیر یہ بتایئے کہ شربت دیدار کب پلوا رہی ہیں؟''

''میں نے تمہیں اس لئے فون نہیں کیا تھا کہ تم بکواس شروع کر دو!'' میں نے اپنے لہجے میں تنی پیدا کر لی۔

''ہائے ہائے کیا زمانہ آ لگا ہے کہ اس عہد کی حسینائیں شربت دیدار کو بکواس کہنے لگی ہیں......! ہاں وہ آپ میرا سوال گول مول کر گئیں کہ کہاں تھیں اتنے دن؟ نصیب دشمناں کہیں کسی کے ساتھ کسی پر فضا مکا...... میرا مطلب ہے کہ کسی پر فضا جگہ ہنی مون منانے تو نہیں گئی تھیں؟'' اس کے لہجے میں بدستور شوخی تھی۔

''ہاں گئی تھی ہنی مون منانے پھر؟ تم کون' قاضی کہ ملا؟'' میں نے اسے چڑانے کی خاطر کہا۔

''ناممکن! وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا سو اس خادم کی نظر میں آپ بھی ایک ایسا ہی نغمہ ہیں! 'میٹھا چاند' منانے کے لئے آپ کو مجھ ایسے کسی دیوانے کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی خاتون!''

'ہنی مون' کا ترجمہ 'میٹھا چاند' سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔

''آپ ہنستی ہیں تو یوں لگتا ہے خاتون جیسے ساری کائنات ہنسنے لگی ہو۔ دور جیسے کسی مندر میں......''

''بہت گھسا پٹا حملہ ہے! مندر میں گھنٹیاں بجنا یا جلترنگ بج اٹھنا سن سن کر اب ابکائی آنے لگی ہے۔''

''یہ حالت آپ کی کب سے ہے خاتون؟ ابکائیاں آنا خواتین کے لئے کوئی اچھی علامت نہیں۔ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ آپ مجھ سے ایک عرصے نہیں ملیں پھر بھی ابکائیاں شروع ہو گئیں؟''

''لچر باتیں نہ کرو!'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''میں فون بند کر رہی ہوں۔''

''ارے ایسا غضب نہ کیجئے گا! اتنے دن بعد تو دل میں جینے کی امنگ پیدا ہوئی ہے۔ یہ بتائیں اپنی کوٹھی ہی سے بول رہی ہیں نا؟''

''ہاں!'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم وقت بے وقت فون کر کے مجھے بور کرنے لگو۔ یوں بھی میں بہت تھکی ہوئی ہوں' کھانا کھا کر سونے کا ارادہ ہے۔''

اسی وقت میری نگاہ فاطمہ پر پڑی۔ میرے قریب آ کر اس نے انتظار کیا کہ میں فون پر اپنی بات ختم کر لوں تو وہ کچھ کہے۔ وہ میری مزاج آشنا تھی۔ اسے علم تھا کہ میں فون پر جب کسی سے بات کر رہی ہوں تو مداخلت پسند نہیں کرتی۔

ممکن ہے ملک دلاور ابھی آسانی سے میری جان نہ چھوڑتا مگر اس کی بات کاٹ کر میں بول اٹھی۔ ''اچھا دلاور میں تمہیں پھر فون کروں گی' فی الحال خدا حافظ!'' پھر اس سے پہلے کہ ملک دلاور مزید کچھ کہتا میں نے ریسیور رکھ دیا اور فاطمہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میڈم! کمانڈر نواز تشریف لے آئے ہیں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا ہے۔'' فاطمہ نے بتایا۔

''کھانے میں کتنی دیر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

"تیار ہے میڈم! آپ کہیں تو کھانا لگوا دوں ڈرائنگ روم میں؟"

"ہاں لگوا دو!" میں سر ہلا کر بولی۔ "کھانا لگ جائے تو آ کر بتا دینا میں ڈرائنگ روم میں جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

بیڈ روم ہی میں موجود ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود پر میں نے ایک نظر ڈالی۔ سر کے بال ابھی کچھ گیلے تھے جنہیں میں نے کھلا ہی رہنے دیا۔ عام طور پر گھر میں رہتے ہوئے میک اپ سے میں اجتناب کرتی تھی۔ اس وقت بھی میں نے میک اپ سے گریز کیا اور اپنی خواب گاہ سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔

کچھ ہی دیر کے بعد جب میں اندرونی دروازے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو کمانڈر نواز احتراماً مجھے دیکھ کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھے رہو کمانڈر!" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا' پھر آگے بڑھ کر اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی اور بولی۔ "ہاں اب کہو فون پر تم کیا کہنا چاہتے تھے؟"

"میڈم! یہ اب سے تقریباً اڑھائی مہینے پہلے کی بات ہے کہ محترم وزیر داخلہ نے فون پر مجھ سے رابطہ قائم کیا۔"

"کیا؟" میں چونک اٹھی۔ "انہوں نے تم سے رابطہ قائم کیا......؟ مگر کیوں؟"

"میں وہی عرض کر رہا ہوں میڈم! انہوں نے فون پر مجھے بتایا کہ جیسور کے قریبی جنگلات سے آپ پراسرار طور پر غائب ہو گئی ہیں۔ محترم وزیر داخلہ نے یہ بھی تفصیل سے بتایا کہ آپ وہاں کیوں اور کس غرض سے گئی تھیں! اس کے علاوہ یہ بھی کہ آپ ایک غیر ملکی شخص کا تعاقب کرتی ہوئی جنگل میں روپوش ہو گئی تھیں۔ مجھے جو حالات بتائے گئے تھے اور جن کا مجھے خود بھی پہلے سے علم تھا ان کی روشنی میں غیر ملکی کا حلیہ جاننے کے بعد میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ غیر ملکی سولومن کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ آپ اسی کا تعاقب کرتے ہوئے آخری بار دیکھی گئی تھیں' اس اطلاع نے مجھے مزید فکر مند کر دیا۔ پھر میں نے......"

"ذرا ٹھہرو!" میں نے کمانڈر نواز کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ "تمہیں وزیر داخلہ نے یہ نہیں بتایا کہ انہیں میرے متعلق یہ تمام تفصیلات کس سے معلوم ہوئی تھیں؟"

"جی ہاں بتایا تھا۔" کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ "محترم وزیر داخلہ کو یہ تمام اطلاعات مشرقی پاکستان کے ہوم سیکرٹری عبید الرحمان چودھری نے فراہم کی تھیں۔ ہوم سیکرٹری کو ملٹری انٹیلی جنس کے ایریا انچارج کرنل صبور نے ان تمام واقعات سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کیا تھا۔"

یہ سن کر میں نے طویل سانس لیا پھر بولی۔ "ہاں تو پھر؟ وزیر داخلہ نے تمہیں کیوں یوں تمام اطلاعات فراہم کیں؟"

"محترم وزیر داخلہ نے مجھے بتایا تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس والے وہ سارا جنگل کھنگال چکے ہیں اور انہیں آپ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ "آپریشن سیل" کے نگران کی حیثیت سے کیوں کہ وہ مجھے جانتے ہیں اس لئے وہ یہ چاہتے تھے میں اب آپ کا سراغ لگاؤں۔ اس سلسلے میں بذات خود کراچی تشریف لائے اور

مشرقی پاکستان کے ہوم سیکرٹری عبید الرحمان چودھری کے نام ایک خط بھی دیا۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ پہلے میں ہوم سیکرٹری سے ملوں پھر ڈھاکہ سے جیسور جاؤں۔ آپ کی تلاش کے سلسلے میں انہوں نے یقین دلایا تھا کہ متعلقہ ادارے مجھ سے پورا تعاون کریں گے۔ محترم وزیر داخلہ سے ملاقات کے بعد میں نے "آپریشن سیل" کے قدیم ارکان کی ایک میٹنگ طلب کر لی اور اس میں تمام واقعہ بیان کر دیا۔ سبھی ارکان نے مجھ سے اتفاق کیا کہ مجھے مشرقی پاکستان ضرور جانا چاہئے۔ اسی کے ساتھ یہ طے پایا کہ میں تنہا وہاں نہ جاؤں' عثمانی' کیپٹن شاد اور سرفراز بھی میرے ساتھ جائیں۔" کمانڈر نواز مجھے میری ہی تلاش کا فسانہ سناتا رہا۔ "ہم چاروں ڈھاکہ پہنچے مگر ہوم سیکرٹری سے صرف میں ہی ملا۔ انہیں میں نے بتا دیا تھا کہ میرے تین اور ساتھی بھی اسی غرض سے ساتھ آئے ہیں۔ انہوں نے میرے ساتھ پورا تعاون کیا اور جیسور میں ملٹری انٹیلی جنس کے ایریا انچارج کرنل صبور کے نام خط لکھ کر دیا۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اس وقت تک آپ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ بہر حال میں اپنے ساتھیوں کو لے کر جیسور پہنچ گیا۔ تفتیش کے دوران میں کرنل صبور سے مجھے معلوم ہوا کہ جب آپ پہلی بار ان سے ملی تھیں تو کوئی نوجوان بھی آپ کے ساتھ تھا لیکن ملٹری آپریشن کے دوران میں آپ کے ساتھ وہ نوجوان نہیں تھا۔ آپ نے جس ہوٹل میں قیام کیا تھا وہاں سے بھی تصدیق ہو گئی کہ آپ ہوٹل میں تنہا نہیں ٹھہری تھیں۔ ہوٹل والوں سے معلوم ہوا تھا کہ دوسرے دن وہ نوجوان بھی وہاں سے چلا گیا تھا۔ میرے خیال میں اگر وہ نوجوان ہمیں مل جاتا تو شاید ہم کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتے مگر کرنل صبور نے اس نوجوان کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی......"

"اور یہی اس کی غلطی تھی۔" میں درمیان میں بول اٹھی۔ "تم نے بالکل صحیح خطوط پر سوچا تھا اگر کرنل صبور اس نوجوان سے دوسرے روز مل لیتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ میں کہاں ہوں! بہر حال تم آگے غالباً یہی بیان کرو گے کہ تمہیں میری تلاش میں ناکامی ہوئی اور پھر تم مجبوراً کراچی لوٹ آئے!"

"جی...... جی ہاں مگر میڈم وہ نوجوان کون تھا؟" کمانڈر نواز بے چینی سے بولا۔ "اور اسے یہ کیسے معلوم تھا کہ آپ کہاں ہیں! پھر وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا؟"

"میں تفصیل کے ساتھ......" ابھی میں مزید کچھ کہنے والی تھی کہ فاطمہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"میڈم! کھانا لگا دیا گیا ہے۔" فاطمہ نے بتایا۔

"چلو اٹھو کمانڈر پہلے کھانا کھا لیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

پھر ہم ڈرائنگ روم سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے میں نے دانستہ گفتگو سے گریز کیا کیونکہ وہاں فاطمہ کے علاوہ ایک اور ملازم بھی موجود تھا۔ کھانا کھا کر ہم دونوں پھر ڈرائنگ روم میں آ گئے اور اسی کے ساتھ فاطمہ نے ہمارے لئے وہیں چائے بھی بھیج دی۔

"یہاں سے روانگی کے بعد واپسی تک کیا واقعات پیش آئے یہ میں تمہیں مختصراً بتائے دیتی ہوں۔ پھر تمہیں اپنے تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔" میں نے چائے پینے کے دوران میں گفتگو شروع کی۔ "اگر مجھے ذرا بھی اس کا اندازہ ہو جاتا کہ بات اس حد تک بڑھ جائے گی اور تم لوگوں کو میری تلاش میں مشرقی پاکستان تک جانا پڑے گا تو میں یقیناً تمہیں ضرور مطلع کر دیتی کہ کہاں ہوں! بہر حال تم

لوگوں کو اس سلسلے میں جس ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا اس پر مجھے بے حد افسوس ہے۔'' یہ کہہ کر میں پیش آنے والے واقعات سے کمانڈر نواز کو آگاہ کرنے لگی۔

ہر چند کہ میں نے واقعات بیان کرنے میں اختصار سے کام لیا تھا مگر کتنے اختصار سے کام لیتی! اس میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ کمانڈر نواز خاموشی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا تھا۔ ہندوستان میں پیش آنے والے ذکیہ کے واقعے کو میں نے مزید اختصار سے بیان کیا تھا۔

میں اپنی بات ختم کر چکی تو کمانڈر نواز بولا۔ ''سبود مکرجی کا کردار انتہائی حیرت انگیز ہے میڈم! اس کی اطلاعات کے ذرائع بھی محدود معلوم نہیں ہوتے۔''

''ہاں کمانڈر!'' میں طویل سانس لے کر بولی۔ ''وہ شخص یقیناً میرے لئے ایک معمے کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب ایسا نہیں۔'' میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

''یعنی میڈم...... کیا اب آپ یہ معمہ حل کر چکی ہیں؟'' کمانڈر نواز کے لہجے میں تجسس تھا۔

''ہاں کمانڈر!'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہیں میں ابھی بتا چکی ہوں نا کہ سولومن سے مجھے انتہائی قیمتی معلومات حاصل ہوئی تھیں' اگر مجھے یہ معلومات حاصل نہ ہوتیں تو شاید سبود مکرجی ساری زندگی میرے لئے معمہ ہی بنا رہتا۔ سولومن نے مجھے جن امریکی ایجنٹوں کے اصلی اور فرضی نام بتائے تھے ان میں سبود مکرجی کا نام بھی شامل تھا۔ وہ دراصل دہری زندگی گزار رہا تھا۔ ایک طرف تو وہ قانون کا محافظ بنا ہوا تھا اور دوسری طرف سے قانون شکن! مجھے خود بھی اس پر کئی بار شبہ ہوا مگر یہ شبہ یقین میں نہ بدل سکا۔ کمانڈر! تم خود بھی تو اس سے مل چکے ہو' بتاؤ وہ کون ہو سکتا ہے؟''

''میں...... ! میں مل چکا ہوں اس سے میڈم...... ! پھر تو وہ...... وہ ہوم سیکرٹری عبید الرحمان چودھری کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا!'' کمانڈر نواز سوچتے ہوئے بولا۔

''میں نے تم سے جو حالات بیان کئے اور پھر جو واضح اشارہ دیا اس کے بعد یہی ایک نام سامنے آتا ہے۔ تم نے قطعی نتیجہ اخذ کیا۔'' میں نے کہا پھر مزید بولی۔ ''کچھ باتیں ایسی تھیں جو صرف عبید الرحمان چودھری ہی کے علم میں تھیں۔ مثلاً مشرقی پاکستان میں عبید الرحمان چودھری کے سوا کسی کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ میں وہاں پہنچ رہی ہوں۔ وہاں پہنچتے ہی مجھ پر حملہ ہونا اور اغوا کی کوشش اس شخص پر شبہ کرنے کی دعوت دیتی تھی لیکن ریکارڈ فائل سے میری تصویر غائب ہونا اس سمت بھی اشارہ کرتا تھا کہ ممکن ہے اس کے محکمے میں کوئی اور کالی بھیڑ موجود ہو۔ پھر جب میں ڈھاکہ سے جیسور کے لئے روانہ ہو رہی تھی تو یہ بات بھی عبید الرحمان چودھری کے علم میں تھی۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اس کی محبوبہ شکنتلا نے اسی لئے مجھے چرس کی اسمگلنگ کے چکر میں پھنسانے کی کوشش کی تھی تاکہ میں جیسور روانہ نہ ہو سکوں۔ اس وقت بھی مجھے اس پر شبہ ہوا تھا لیکن یہ شبہ اسی وقت یقین میں بدل سکا جب سولومن نے اس کی تصدیق کر دی۔''

''مگر میڈم! ایک بات الجھا دینے والی ضرور ہے' اگر عبید الرحمان چودھری ہی سبود مکرجی تھا اور امریکی ایجنٹ سولومن کا آلہ کار بنا ہوا تھا تو پھر اس نے جیسور کے قریبی جنگل میں ہونے والے اجتماع کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟'' کمانڈر نواز نے ایک اہم سوال کیا جو یقیناً اس کی ذہانت کا ثبوت تھا۔

''اس پر سفر کے دوران میں خود میں نے کافی غور کیا تھا کمانڈر!'' میں جواباً بولی۔ ''اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ یہ ممکن نہیں رہا ہو گا کہ پورے مشرقی پاکستان سے جمع ہو کر جیسور پہنچنے والے افراد کو روکا جا سکے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ سولومن سے عین وقت پر عبید الرحمان چودھری کا رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ پھر اس نے مجبوراً دوسری چال چلی اور مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میرے خیال میں اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ عبید الرحمان چودھری کی گرفتاری کے بعد خود ہی تمام واقعات سامنے آ جائیں گے۔''

''ہاں کمانڈر تم وہ فہرست لے جاؤ۔'' میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''وہی فہرست جو میں نے سولومن سے پوچھ گچھ کے دوران میں ترتیب دی تھی۔ میں ابھی وہ لا کر تمہیں دیتی ہوں۔ تم اسے ٹائپ کرا لینا! اس کی ایک نقل ''آپریشن سیل'' کے ریکارڈ میں بھی رکھنا ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر میں ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ وہ فہرست میرے پرس میں تھی اور پرس بیڈ روم میں تھا۔ یہ فہرست غیر ملکی اور مقامی امریکی ایجنٹوں کے ناموں پر مشتمل تھی۔ فہرست میں سب کے اصلی اور فرضی نام درج تھے اور مکمل پتے بھی جو مقامی ایجنٹ اہم سرکاری عہدوں پر فائز تھے ان کے عہدے اور کوائف بھی میں نے لکھ لئے تھے۔

وہ فہرست لا کر میں نے کمانڈر نواز کے حوالے کر دی تو وہ بولا۔ ''میڈم! غالباً اب آپ ان تمام غیر ملکی اور امریکی ایجنٹوں پر بہ یک وقت ہاتھ ڈالنے کے لئے محترم وزیر داخلہ سے رابطہ قائم کریں گی؟ میرا قیاس درست ہے نا؟''

''ہاں تم ٹھیک سمجھے کمانڈر!'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کے لئے ایک بڑے آپریشن کی ضرورت ہے اور میں چاہتی ہوں کہ ملک کے دونوں حصوں میں ایک ساتھ یہ آپریشن ہو تاکہ دشمنوں کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکے۔ یہ آپریشن جس قدر جلد ہو بہتر ہے۔ وزیر داخلہ سے رابطہ قائم کرنے سے پہلے یہ اچھا ہوا کہ تم سے میری تفصیلی گفتگو ہو گئی۔''

''معاف کیجئے گا میڈم ایک سوال اور!'' کمانڈر نواز کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''ہاں ہاں بولو کیا کہنا چاہتے ہو!''

''مجھے اس بات کا کوئی اندازہ یا علم نہیں کہ جس شخص کے ذہن کو قابو میں کر کے اس سے کچھ معلومات حاصل کی جاتی ہیں کیا اپنے ذہن کی آزادی کے بعد اسے وہ تمام باتیں یاد رہتی ہیں؟''

''تم نے بہت اہم سوال کیا ہے کمانڈر! میں تمہاری ممنون ہوں کہ تم نے اس طرف مجھے متوجہ کیا۔ تمہارے سوال کی وجہ میں سمجھ چکی ہوں۔ تم دراصل سولومن کی طرف سے فکر مند ہو۔ اب تک کے تجربات کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ جب کوئی شخص ٹرانس میں ہوتا ہے تو اس کے شعور کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ لاشعور بیدار ہو جاتا ہے جس کے سبب وہ سب کچھ سچ سچ بتانے پر مجبور ہو جاتا ہے پھر جب اس کے ذہن کو آزاد کر دیا جاتا ہے تو عموماً اسے کچھ یاد نہیں رہتا کہ نیم خوابیدگی سے عالم میں وہ کیا کیا بتا چکا ہے! پھر بھی احتیاطاً ٹرانس ہی کے دوران میں اسے یہ حکم دے دیا جاتا ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ سب کچھ بھول جائے گا کہ اس سے کیا کیا پوچھا گیا تھا اور اس نے کیا جواب دیئے تھے۔ بدقسمتی سے مجھے یہ موقع نہیں مل سکا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں سولومن کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ میں تمہیں غالباً

بتا چکی ہوں کہ سولومن غیر معمولی ذہن کا مالک ہے۔ ایسی صورت میں یہ خطرہ بہرحال موجود ہے کہ جب اس کے ذہن پر میری گرفت برقرار نہیں رہی تو اسے سب کچھ یاد آ گیا ہو جو میں نے اس سے معلوم کیا تھا۔“

”پھر تو یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے میڈم کہ آپ جلد از جلد محترم وزیر داخلہ سے رابطہ قائم کریں‘ اگر واقعی سولومن کو یہ احساس ہو گیا کہ ٹرانس کی حالت میں آپ اس سے کیا معلومات حاصل کر چکی ہیں تو پھر وہ پاکستان میں موجود امریکی ایجنٹوں کو چوکنا کر دے گا۔ پھر ان پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہو جائے گا۔“ کمانڈر نواز نے کہا پھر خود ہی مجھے بتایا۔ ”آج کے اخبار میں محترم وزیر داخلہ کا ایک بیان چھپا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کل تک لاہور میں تھے۔“

”ٹھیک ہے میں تمہارے جاتے ہی ان کے پرسنل سیکرٹری کو اسلام آباد فون کرتی ہوں۔ اسے یقیناً ان کے پروگرام کا علم ہو گا اور وہ شاید یہ بھی بتا سکے کہ لاہور میں ان سے کس نمبر پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے!“ میں بولی۔ کمانڈر نواز نے واقعی ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی تھی۔

”لیکن میڈم کیا آپ فون پر ان سے یہ ساری گفتگو کریں گی؟“ کمانڈر نواز نے پوچھا۔

”نہیں‘ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ فون پر طے ہو سکے‘ اس کے لئے وزیر داخلہ سے میری ملاقات ضروری ہے اور میں فون پر ان سے ملاقات کے لئے ہی کہوں گی۔“ میں نے جواباً کہا۔ ”اب تم جا سکتے ہو کمانڈر!“ یہ کہتے ہوئے مجھے ”آپریشن سیل“ کے ارکان کی تنخواہوں کا خیال آ گیا۔ ”اور ہاں کمانڈر تم لوگوں کو بتا دینا کہ کل صبح ان کے تمام بقایا جات ادا کر دیئے جائیں گے‘ میری مراد چار ماہ کی تنخواہوں سے ہے! میں انتہائی شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے تم سب کو یہ زحمت اٹھانا پڑی۔“

”ارے میڈم‘ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں! ہم لوگوں کو کوئی زحمت نہیں ہوئی! ویسے بھی ہر ماہ ہم لوگوں کو اتنی تنخواہیں دی جاتی ہیں کہ تمام اخراجات کے بعد بھی ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم بچ رہتی ہے جو ایسے ہی مواقع پر کام آتی ہے۔“ کمانڈر نواز پرخلوص لہجے میں بولا۔

”میں آئندہ کے لئے ایسا بندوبست کر رہی ہوں کہ پھر کبھی تم لوگوں کو ایسی صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑے اور ہاں کمانڈر‘ مشرقی پاکستان جانے کے سلسلے میں جو اخراجات ہوئے وہ کس نے برداشت کئے تھے؟ مجھے اس رقم کا بھی تخمینہ چاہئے!“

”میڈم! سب نے اپنا اپنا خرچہ خود اٹھایا تھا۔“ کمانڈر نواز نے بتایا۔ ”کسی اور کی بابت تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا‘ ہاں اپنے متعلق یہ ضرور عرض کروں گا کہ مشرقی پاکستان میں ہونے والے اخراجات قطعی نہیں لوں گا! آخر ہم لوگوں کا بھی تو کوئی فرض ہے میڈم!“

”تمہارے فرائض میں اچھی طرح جانتی ہوں‘ اگر تم لوگوں نے کل مجھے ہونے والے اخراجات کے متعلق نہ بتایا تو پھر میں خود اپنے طور پر ایک اندازہ لگا کر رقم ادا کر دوں گی اور پھر دیکھوں گی کہ تم چاروں میں کون رقم لینے سے انکار کرتا ہے! کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو میرا حکم ماننے سے انکار کر دے!“

”مگر میڈم......“

”اگر مگر کچھ نہیں! میں نے جو کہہ دیا وہی ہو گا‘ خدا حافظ!“ یہ کہتے ہی میں صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میرے تیور دیکھ کر کمانڈر نواز نے مزید کچھ نہیں کہا اور چلا گیا۔ اپنے بیڈ روم میں آتے ہی میں نے اسلام آباد فون ملانے کی کوشش شروع کر دی۔ جلد ہی میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی۔

وزیر داخلہ کے پرسنل سیکرٹری کو میں نے جیسے ہی اپنا نام بتایا اس نے کہا۔ ”سر نے مجھے ہدایت دی تھی کہ آپ کا فون جب بھی آئے آپ کو اس فون نمبر سے مطلع کر دیا جائے جس پر آپ سر سے رابطہ قائم کر سکتی ہیں۔ گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے سر جب بھی کہیں جاتے ہیں وہاں سے مجھے اپنا فون نمبر ضرور لکھوا دیتے ہیں تا کہ میں آپ کو مطلع کر سکوں‘ سر سے آپ کہاں اور کس نمبر پر بات کر سکتی ہیں! اس مرتبہ بھی سر نے لاہور پہنچتے ہی اپنا فون نمبر بتایا تھا اور پوچھا تھا کہ آپ کا فون تو نہیں آیا! میں کافی دن سے آپ کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔“

میری دانست میں پرسنل سیکرٹری خواہ مخواہ بات کو طول دیئے جا رہا تھا اس لئے موقع ملتے ہی میں بول اٹھی۔ ”آپ مجھے ان کا فون نمبر دے دیں۔“

”مجھے افسوس ہے محترمہ کہ اب فون نمبر دینا بے کار ہو گا......“

”وہ کیوں؟“ میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔

”اس لئے محترمہ کہ سر لاہور سے اسلام آباد کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔“ پرسنل سیکرٹری نے بتایا۔

اپنے سوال کا جواب سن کر میں نے طویل سانس لیا پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”ان کی فلائٹ اب تک اسلام آباد پہنچے گی کچھ معلوم ہے آپ کو؟“

”آپ ایک گھنٹے بعد انہیں فون کر سکتی ہیں۔“

”شکریہ! ویسے آپ انہیں اسلام آباد پہنچتے ہی میرا یہ پیغام دے دیجئے گا کہ میرا فون آیا تھا اور یہ بھی کہ میں کراچی پہنچ چکی ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ وزیر داخلہ کا پرسنل سیکرٹری مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی باتونی معلوم ہو رہا تھا یا پھر اسے یہ احساس تھا کہ میں یقیناً کوئی اہم شخصیت ہوں جس سے رابطہ قائم کرنے کے لئے وزیر داخلہ بے چین ہیں۔

اسلام آباد فون کر کے میں بستر پر لیٹ گئی۔ اب مزید ایک گھنٹے انتظار کے بغیر میرے لئے کوئی صورت نہیں تھی۔ تھکن کے باوجود میں کوشش کرنے لگی کہ جاگتی رہوں مگر نہ معلوم کب مجھے نیند آ گئی۔ میری آنکھ فون کی گھنٹی سے کھلی۔ عموماً جب میں یہ چاہتی تھی کہ سوتی رہوں اور کوئی فون کال مجھے ڈسٹرب نہ کرے تو بیڈ روم میں موجود ٹیلی فون کے سیٹ کا سوئچ نکال دیتی تھی ایسی صورت میں خواب گاہ کے ٹیلی فون سیٹ کی گھنٹی نہیں بجتی تھی اور باہر اس فون نمبر کا جو ایکسٹینشن تھا اس پر فاطمہ یا کوئی اور ملازم فون ریسیو کر لیتا تھا۔ اس وقت کیوں کہ میرا ارادہ سونے کا نہیں تھا اس لئے فون کا سوئچ نہیں نکالا تھا اسی لئے گھنٹی بجنے لگی تھی۔ میں نے کروٹ لے کر بیڈ کے سرہانے موجود تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا اور بولی۔ ”عذرا خان۔“

"شکر ہے خدا کا کہ اتنے طویل عرصے بعد تمہاری آواز تو سنی!" دوسری جانب سے وزیر داخلہ کی بھاری آواز سنائی دی۔

"آداب!" وزیر داخلہ کی آواز سنتے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "میں نے فون کیا تھا آپ کو۔"

"جیتی رہو! مجھے یہاں آتے ہی معلوم ہو گیا تھا۔" وزیر داخلہ نے مجھے دعا دیتے ہوئے کہا پھر بولے۔ "یہ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ مجھے تو تم نے ڈرا ہی دیا تھا!"

"عرض کروں گی لیکن اس سے بھی ضروری بات ایک اور ہے۔"

"ہاں کہو کیا بات ہے؟" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھے۔

"آپ سے فوری ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو اس میں کیا قباحت ہے! تم اسلام آباد آ جاؤ......! اور اگر تم مزید دو دن انتظار کر سکو تو خود میرا پروگرام کراچی آنے کا ہے۔ بولو کیا کہتی ہو؟ اسلام آباد آ رہی ہو یا وہیں انتظار کرو گی میری آمد کا؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"ممکن ہے کہ آپ یہاں نہ آ رہے ہوتے تو میں خود اسلام آباد پہنچ جاتی لیکن اب......" میں کچھ سوچنے لگی اور پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ "نہیں دو دن بہت ہوتے ہیں کھیل بگڑ بھی سکتا ہے۔"

"یہ تم مجھ سے کچھ کہہ رہی ہو یا اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو؟ کیا قصہ ہے؟ صاف صاف بتاؤ! کس کھیل کے بگڑ جانے کا خدشہ ہے تمہیں؟"

"سوری!" میں سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگی تھی۔ فی الحال فون پر صرف اتنا ہی عرض کر سکتی ہوں کہ آپ نے مجھے جس غرض سے مشرقی پاکستان بھیجا تھا یہ کھیل بھی اسی کا حصہ ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ......! تو پھر تم یہیں آ جاؤ!" وہ بولے۔ "میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں یقیناً کوئی اہم بات ہی ہو گی جو تم فون پر نہیں بتا رہیں۔"

"اہم ہی نہیں انتہائی اہم!" میں پرزور لہجے میں بولی۔

"اگر ایسا ہے تو پھر...... پھر تم نہ آؤ یہاں! میں اپنے دوسرے پروگرام ملتوی کر کے کل ہی کراچی پہنچ رہا ہوں! انشاء اللہ کل دوپہر سے پہلے! وہاں پہنچتے ہی تمہیں فون کر دوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ!" میں خوش ہو گئی۔

"پاگل لڑکی!" وہ آہستہ سے ہنس کر بولے۔ "شکریہ ادا کیا جا رہا ہے! یوں جیسے کوئی ذاتی کام ہو...... اچھا خدا حافظ!" ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

دنیا میں اب کم لوگ رہ گئے تھے جو اس بے تکلفی اور محبت کے ساتھ مجھے "پاگل لڑکی" کہنے کا حق رکھتے ہوں۔ وزیر داخلہ بھی ایسے ہی لوگوں میں تھے۔ ان کا شمار کم از کم میرے لئے ایسے بزرگوں میں تھا جن کے سامنے بچہ بننے کو جی چاہتا ہے۔ یہ انہی کے خلوص و محبت کا نتیجہ تھا کہ میں اپنے اخراجات اور اپنے رسک پر مشرقی پاکستان گئی تھی ورنہ حکومت کے معاملات سے میرا کیا تعلق!

وزیر داخلہ سے گفتگو کرنے کے بعد کسی حد تک میرا ذہن مطمئن ہو چکا تھا اس لئے جیسے ہی میں

دوبارہ بستر پر لیٹی میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور پھر میں کچھ ہی دیر میں نیند کی مہربان آغوش میں پہنچ گئی۔ میں خاصی گہری نیند سوئی تھی۔ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا' مجبوراً فاطمہ نے مجھے جگایا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ غالباً اس نے یہ سوچ کر روشنی نہیں کی تھی کہ سو کر اٹھتے ہی مجھے روشنی ناگوار محسوس نہ ہو۔ اسے میں نے اس کی آواز سے پہچانا تھا۔

"کیا بج گیا ہو گا فاطمہ؟" میں نے لیٹے ہی لیٹے انگڑائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"رات کے پونے نو بجنے والے ہیں میڈم!" فاطمہ نے جواب دیا۔

"ارے اتنی رات ہو گئی!" میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں نے دانستہ آپ کو نہیں جگایا تھا میڈم تاکہ آپ کی نیند پوری ہو جائے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ملک دلاور صاحب بھی آئے تھے۔ ان سے بھی میں نے کہہ دیا تھا کہ آپ سو رہی ہیں۔ وہ خاموشی سے واپس چلے گئے۔ میں نے ٹھیک کیا نا میڈم آپ کو نہ جگا کر؟"

"بالکل ٹھیک کیا' تم بہت اچھی ہو۔" میں نے اسے خوش کرنے کے لئے کہا۔

"شکریہ' بہت بہت شکریہ میڈم!" فاطمہ واقعی خوش ہو گئی۔

گہری نیند سونے کی وجہ سے طبیعت میں کچھ بھاری پن سا آ گیا تھا سو میں نے غسل کیا اور پھر فاطمہ کے اصرار پر برائے نام کھانا کھایا کیونکہ کھانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں اپنی کوٹھی ہی کے لان میں چہل قدمی کے لئے باہر آ گئی۔ میرا پورا لان خوشبودار پھولوں سے مہک رہا تھا۔ مجھے لان میں ٹہلتے ہوئے خاصی فرحت محسوس ہوئی۔ مالی بابا نے میری غیر موجودگی میں بھی پھولوں کی اچھی طرح نگہداشت کی تھی۔ لان پر ٹہلتے ہوئے مجھے ملک دلاور کا خیال آ گیا۔ اس سے ملے ہوئے مہینوں گزر گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اسی کی کوٹھی کا چکر لگا آؤں مگر اس سے پہلے یہ تصدیق ضروری تھی کہ وہ اپنی کوٹھی میں موجود ہے یا نہیں! اور یہ تصدیق ظاہر ہے فون ہی پر ممکن تھی۔ میں اپنی خواب گاہ میں پہنچی اور اس کا فون نمبر ملایا۔ فون اسی نے ریسیو کیا تھا۔

"سوری دلاور کہ تم آئے تو میں سو رہی تھی۔" میں نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔

"بس رہنے دیں! آپ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ نام کو بھی مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔" اس نے روٹھنے کی اداکاری کی۔

"خیر یہ تو تم صحیح کہتے ہو۔ ایسے کسی احمقانہ چکر سے میں قطعی طور پر محفوظ ہوں۔ بہرحال اگر تم چاہو تو اس وقت میں تمہارے پاس آ سکتی ہوں۔"

"کیا واکعی؟" وہ جھونک میں پھر "واقعی" کو "واکعی" کہہ گیا۔

"ہاں واکعی!" میں نے دانستہ "ق" کی جگہ "ک" ہی بولا۔

"دیکھئے آپ نے پھر اردو کی ٹانگ توڑنا شروع کر دی! بس آپ کی انہیں باتوں سے تو جی جلتا ہے۔"

"میری باتوں سے اگر تمہارا جی جلتا ہے تو پھر چھوڑو میں نہیں آتی۔"

"آئیں جی ضرور آئیں' ہمارے جی کا کام ہی جلنا ہے' سو جلنے دیں۔ آپ نے وہ گانا ضرور

سنا ہو گا‘ جی جلتا ہے تو جلنے دے‘ آنسو نہ بہا فریاد نہ کر۔‘‘ پھر اس نے یہی گانا ترنم سے بھی گانا شروع کر دیا۔

’’دلاور! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس گانے سے نفرت کرنے لگوں؟‘‘

’’وہ کیوں جی؟‘‘

’’تمہاری بے سری آواز میں یہ خوبصورت گانا سن کر ظاہر ہے اس سے نفرت ہی ہو گی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے ’جی‘ کی جگہ ’دل‘ ہے گانے میں!‘‘

’اس سے کوئی فرک...... اوہ سوری...... آپ سے تو بات کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ کو اپنی گھر والی بنانے کے بعد پہلی کوشش میں یہی کروں گا کہ پنجابی سکھا دوں۔ پھر ہم دونوں پنجابی میں عشقیہ ......ہیت تیرے کی! پھر کاف آ گیا...... ! خیر چھوڑیں یہ بتائیں کتنی دیر میں اپنا دیدار کرا رہی ہیں۔ ہاں ایک فرمائش ہے اگر پوری کر دیں۔‘‘

’’بولو بھی نا اب!‘‘ اسے خاموش دیکھ کر میں نے بظاہر غصے سے کہا۔

’’پہلے آپ وعدہ کریں کہ میری فرمائش ضرور پوری کریں گی۔‘‘

’’تم کچھ بکو گے بھی کہ نہیں!‘‘

’’اسیں بکدے نہیں فرماندے آں! سو بادشاہو گل ایہہ اے۔‘‘

’’دسو!‘‘ میں بھی پنجابی بولنے لگی۔

’’تسی ساڑی دے وچ بڑے سوہنے لگدے او......‘‘

’’بکومت!‘‘ یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

ملک دلاور اکثر مجھ سے ساری پہننے کی فرمائش کرتا رہتا تھا اور اس کی فرمائش سن کر مجھے عجیب سی کوفت محسوس ہوتی تھی۔ یوں جیسے میں کوئی شو پیس ہوں۔ میں نے جب اس فرمائش پر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا تو اس نے اسے میری چڑ بنا لیا۔ یہ مجھے بھی معلوم تھا کہ مجھ ایسی دراز قد خواتین پر ساری بھلی لگتی ہے مگر میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ کسی کو بھلا لگنے کے لئے ساری باندھوں۔ یوں بھی ملک دلاور سے میرا ایسا کوئی جذباتی رشتہ یا تعلق نہیں تھا جو وہ یہ فرمائش کرتا۔ خود وہ بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا اور اسی لئے مجھے چڑاتا رہتا تھا۔

فون پر ملک دلاور سے بات کرنے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا اور جوابی کارروائی کے طور پر جینز اور شرٹ پہن لی۔ وہ اس لباس سے چڑتا تھا۔ مغربی لباس اسے پسند نہیں تھے لیکن اس کی پسند اور ناپسند میرا مسئلہ نہیں تھا۔ لباس تبدیل کر کے میں نے ڈرائیور کو بلایا اور گاڑی نکالنے کے لئے کہا۔ میں باہر آئی تو وہ کار لئے موجود تھا۔

ڈرائیور نے میرے لئے کار کا پچھلا دروازہ کھولا تو میں بولی۔ ’’نہیں میں خود ڈرائیو کروں گی تم رہنے دو!‘‘

اس نے کار کی چابیاں میری طرف بڑھا دیں اور پچھلا دروازہ بند کر کے کار کا اگلا دروازہ میرے لئے کھول دیا۔ میں آگے بڑھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مجھے ڈرائیور سے یہ پوچھنے کی

ضرورت نہیں تھی کہ کار کی ٹنکی میں پٹرول موجود ہے یا نہیں! یہ اس کی ڈیوٹی تھی کہ جو کار میرے حوالے کی جائے وہ ’’ان آرڈر‘‘ ہو۔

میں نے کار اسٹارٹ کی اور پھر کوٹھی کے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے رفتار قدرے کم کر دی۔ چوکیدار نے میرے لئے گیٹ کھول دیا۔

ابھی میں ڈیفنس ہی کے علاقے میں تھی کہ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ نیلے رنگ کی ایک کار میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ میں نے عقبی آئینے میں نیلی کار کا جائزہ لیا۔ اسے کوئی نوجوان ڈرائیو کر رہا تھا۔ میری کار سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اس بات نے مجھے کچھ الجھن میں ڈال دیا۔ وہ نوجوان مجھے اناڑی معلوم ہوا۔ کسی ’’کھلاڑی‘‘ سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ابتدا ہی میں ایکس پوز ہو جائے گا۔ میں نے اپنے شبہے کو یقین میں بدلنے کے لئے اپنی کار مختلف سڑکوں پر دوڑانا شروع کر دی۔ وہ نوجوان بدستور میرا تعاقب کرتا رہا۔ اس کا چہرہ مجھے کچھ کچھ آشنا سا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں‘ مگر کہاں؟ یہ مجھے یاد نہ آ سکا۔

میرے لئے یہ جان لینا کہ وہ نوجوان کون ہے اور کیوں میرا تعاقب کر رہا ہے قطعی مشکل نہ تھا مگر میں غالباً پہلے بھی اپنی آپ بیتی میں یہ لکھ چکی ہوں کہ ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کو ہمیشہ اسی وقت بروئے کار لاتی تھی جب کوئی اور راستہ نہ ہو۔

کچھ سوچ کر میں نے اچانک کار کی رفتار بڑھا دی۔ ردعمل فوراً ہی ظاہر ہو گیا۔ اس نوجوان نے بھی کار کی رفتار بڑھا دی۔ چند ہی لمحے بعد میں نے ایک دم گیئر بدل کر کار کو آہستہ کیا اور پھر بریک لگا دیئے۔ نتیجتاً نیلی کار اور میری کار کے درمیان فاصلہ فوری طور پر ختم ہو گیا‘ اگر وہ نوجوان فوراً ہی اپنی کار کو بریک نہ لگاتا تو اس کی کار کا اگلا حصہ میری کار کے پچھلے حصے سے ٹکرا جاتا۔

وہ ایک پختہ اور نیم تاریک سی گلی تھی۔ میرے تعاقب میں آنے والی کار کچے میں اترے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ میں نے اپنی کار روک دی تھی اس لئے اس نوجوان کو بھی رکنا پڑا تھا مگر اس نے اب تک ہارن نہیں دیا تھا۔ میں اپنی کار سے اتر کر سیدھی اس کے پاس پہنچی اور بغیر کسی جھجک کے اسے مخاطب کیا۔ ’’کیا خیال ہے ہمارے درمیان تعارف نہ ہو جائے!‘‘

وہ کچھ ٹپٹا سا گیا۔ اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لباس سے وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کا فرد معلوم ہو رہا تھا۔ چہرے سے وہ کوئی جرائم پیشہ نوجوان نہیں لگتا تھا۔

’’بولو چپ کیوں ہو؟‘‘ میں نے اسے مخاطب کیا۔ پھر اچانک میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ ’’تم میری کار کا تعاقب کیوں کر رہے ہو؟‘‘

’’مم...... میں...... ! نن...... نہیں تو۔‘‘ وہ ہکلانے لگا۔ اس کے چہرے سے انتہائی گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

معاً میں نے اس کی کار کا دروازہ کھول دیا اور ڈپٹ کر بولی۔ ’’نیچے اترو!‘‘

’’لے...... لیکن کیوں؟ آپ...... آپ کو غلط...... شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔‘‘ وہ اور بھی گھبرا گیا۔

اس کا یوں اتنا گھبرا جانا میرے لئے خلاف توقع تھا۔ اس کے چہرے پر بھی بھولپن تھا۔ پھر وہ میرا تعاقب کیوں کر رہا تھا؟ اس سوال کا جواب میرے ذہن میں آیا تو تھا مگر اس جواب کو قبول کرنے میں مجھے تامل ہو رہا تھا۔

''کیا غلط ہے اور کیا صحیح یہ معلوم کرنا میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ تم خود بتا دو کہ میرا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟'' میں نے جھک کر اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اس بار میرے لہجے میں زیادہ سختی نہیں تھی۔ میں اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ نوجوان میرے لئے خطرناک نہیں ہو سکتا۔

''اب...... اب آئندہ ایسا...... ایسا نہیں کروں گا۔'' اس نے یہ الفاظ کہہ کر گویا ''اعتراف جرم'' کر لیا تھا۔ وہ بڑی مظلوم نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہوں!'' میں نے ہنکارا بھرا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے کہ تم آئندہ میرا تعاقب نہیں کرو گے مگر اس وقت کیوں تعاقب کر رہے تھے؟ یقین کرو کہ جب تک تم میرے اس سوال کا جواب نہیں دو گے میں تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گی! اور اگر تم نے مجھے زیادہ پریشان کیا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے......''

''نہیں!'' وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے بول اٹھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''تو پھر میرے سوال کا جواب دے دو!'' میں بضد رہی۔

''دراصل آپ...... آپ مجھے اچھی...... اچھی لگتی ہیں۔'' اس نے کسی لڑکی کی طرح شرما کر یہ جملہ ادا کیا اور نظریں جھکا لیں۔ میرے ذہن میں جو بات آئی تھی اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔

''تو اس میں اتنے شرمانے یا ڈرنے کی کیا بات ہے! مگر کسی کے اچھا لگنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس کا تعاقب شروع کر دیا جائے!''

میرے لہجے اور الفاظ کا اس پر مثبت ردعمل ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ مجھے قطعی معصوم لگ رہا تھا۔

''آؤ کسی ہوٹل میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ یہ جگہ گفتگو کے لئے مناسب نہیں ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔ میں دراصل اس کے متعلق جاننا چاہتی تھی کہ وہ ہے کون اور یہ کہ میں کب سے اسے ''اچھی'' لگتی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ مجھے اس کا چہرہ جانا پہچانا سا کیوں لگا تھا!

میری بات سن کر اس کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہونے لگا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

''ڈرنے یا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نرمی سے بولی۔ ''میری کار کے پیچھے پیچھے آؤ!'' یہ کہہ کر میں اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔

مجھے سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی جانا تھا اسی لئے میں نے سوچا کہ نرسری کے کسی ہوٹل میں اس نوجوان سے کچھ دیر بات کر کے ملک دلاور کی طرف روانہ ہو جاؤں گی۔ میں نے کار آگے بڑھاتے ہوئے عقبی آئینے میں دیکھا۔ نیلی کار بھی سٹارٹ ہو چکی تھی۔ شاید میری گفتگو سے اس نوجوان میں کچھ حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نوجوان نے اس انداز میں میرے لئے

پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

نرسری پہنچ کر میں نے ایک ہوٹل کے سامنے اپنی کار روک لی۔ اس نوجوان نے بھی اپنی کار ایک طرف پارک کر دی اور پھر ڈرتا جھجکتا ہوا میرے قریب آنے لگا۔ بلاشبہ وہ وجیہہ و خوبصورت نوجوان تھا میں نے مسکرا کر اور دانستہ اس کی گھبراہٹ کم کرنے کے لئے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

''آؤ!'' میرا انداز دوستانہ تھا۔ اسی وقت مجھے ملک دلاور کا خیال آیان کہ اگر وہ مجھے اس اجنبی نوجوان کے ساتھ ہاتھ تھامے آگے بڑھتے ہوئے دیکھ لے تو نہ جانے کیا کیا گل افشانی شروع کر دے۔

''کیا پیو گے؟'' میں نے بلاجھجک اس سے پوچھا۔ اب ہم دونوں ہوٹل کے ایک فیملی کیبن میں آ کر بیٹھ چکے تھے اور میں مینو دیکھ رہی تھی۔

''جو...... جو بھی چاہئے منگوا لیں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''لو یہ مینو دیکھ لو خود ہی!'' میں نے مینو اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ...... یہ ملک شیک ٹھیک رہے گا۔'' وہ مجھ سے مینو لے کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے مگر میں کافی پیوں گی۔'' میں نے کہا اور اسی وقت ایک بیرا ہمارے کیبن میں آ گیا۔ میں نے اسے ایک کافی اور ایک ملک شیک لانے کا آرڈر دیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں اس نوجوان سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں اب تعارف ہو جائے۔ پہلے میں اپنا تعارف کراتی ہوں۔ میرا نام......''

''عذرا خان ہے۔'' اس نے میری بات پوری کر دی۔ ''میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں...... یہ...... یہ بھی کہ آپ...... آپ نے شادی بھی نہیں کی اور...... آپ کے علاوہ کوٹھی میں صرف ملازمین رہتے ہیں۔''

''بہت خوب!'' میں مسکرا کر بولی۔ ''تم واقعی مجھے جانتے ہو مگر کس طرح؟''

''میں آپ کی کوٹھی کے ساتھ والی کوٹھی میں ہی رہتا ہوں اور......''

''کہیں تم میجر صاحب کے بیٹے تو نہیں ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ مجھے علم تھا کہ میری کوٹھی کی دائیں جانب ایک ریٹائرڈ میجر کمال حسین کی کوٹھی تھی۔

''جی ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرا نام ارشاد حسین ہے۔''

''اب میں سمجھی کہ مجھے تمہارا چہرہ جانا پہچانا سا کیوں لگ رہا تھا!'' میں بولی۔

''آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟'' اچانک اس نے سوال کیا۔

''میری صورت شکل ہی ایسی نہیں کہ کوئی مجھے پسند کر لیتا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''غلط کہہ رہی ہیں آپ......! آپ تو لاکھوں میں ایک ہیں۔'' اس کے لہجے میں بڑی برجستگی تھی۔

''اچھا! حیرت ہے۔'' میں ہنستی رہی۔ ''تم سے پہلے کبھی کسی نے مجھ سے یہ بات نہیں کہی۔ خیر یہ بتاؤ کہ اب سے پہلے تو کبھی تم نے میرا تعاقب نہیں کیا پھر آج ایسی کیا خاص بات ہو گئی تھی کہ تم اس پر مجبور ہو گئے؟''

''دراصل مہینوں بعد آپ کو دیکھا تھا۔ آپ نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں! بس دل...... دل پر

قابو نہ رکھ سکا۔ کچھ دیر پہلے میں نے اپنی کوٹھی میں سے آپ کو لان میں ٹہلتے دیکھا تھا۔ پھولوں کے درمیان خود آپ بھی مجھے ایک خوبصورت پھول معلوم ہو رہی تھیں۔ پھر آپ اندر چلی گئیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں آپ کو دیکھے جاؤں، دیکھے جاؤں! پھر میں نے آپ کو کار میں بیٹھ کر پھاٹک کی طرف بڑھتے دیکھا تو خود بھی نیچے آ کر اور اپنی کار باہر نکال کر آپ کی کار کا تعاقب کرنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے ایسا کیوں کیا! خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا! بہر حال میں...... میں اس پر شرمندہ ہوں۔“

میرے کچھ کہنے سے پہلے بیرا ملک شیک اور کافی لے آیا۔ وہ چلا گیا تو میں نے ارشاد سے کہا۔”جو ہوا اسے بھول جاؤ! یہ بتاؤ کہ مجھ سے پہلے بھی کبھی تم نے کسی لڑکی کا تعاقب کیا ہے یا تمہیں کوئی لڑکی پسند آئی ہے؟ مجھ سے تم بلا جھجک بات کرو، بالکل یہ سمجھ کر جیسے تمہارے سامنے تمہارا کوئی دوست بیٹھا ہے۔“

”نہیں!“ اس نے فوراً جواب دیا۔”مجھ سے ضرور کئی لڑکیوں نے اظہار محبت کیا ہے، مگر...... مگر میں نے صرف...... جب سے ہوش سنبھالا ہے آپ...... صرف آپ ہی کو چاہا ہے۔“

”کیا کبھی تمہارے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرو۔“

”بہت دفعہ سوچا مگر ہمت نہیں ہوئی۔“ اس نے صاف گوئی اور بھولپن سے کہہ دیا۔

”پھر آج کیسے ہمت ہو گئی؟“

”اگر آج بھی خود آپ میری حوصلہ افزائی نہ کرتیں تو...... تو شاید یہ حسرت زندگی بھر میرے دل ہی میں رہتی۔“

”دیکھو ارشاد میں بہت صاف گو ہوں۔ کبھی یک طرفہ محبت نہیں ہوتی۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ اگر واقعی تمہارے دل میں میری چاہت ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ تم جب چاہو بلا جھجک مجھ سے مل سکتے ہو، میری کوٹھی میں آ سکتے ہو لیکن مجھ سے جواباً اظہار محبت کی توقع نہ رکھنا ورنہ تمہیں مایوسی ہو گی۔ میری تمہاری صرف دوستی ہو سکتی ہے اور دوستی کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ دراصل تم جس عمر میں ہو یہ عمر ایسے ہی نرم و نازک جذبوں کی عمر ہوتی ہے۔ میں تمہیں کسی ناصح کی طرح نہیں ایک دوست کی طرح سمجھا رہی ہوں، وہ بھی محض اس لئے کہ تم مجھے معصوم لگتے ہو۔ بولو میری دوستی قبول ہے تمہیں؟“

میری بات سن کر وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا، مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔

”بولو نا ارشاد، چپ کیوں ہو؟“

”کیا...... کیا آپ کو مجھ سے محبت نہیں......؟ واقعی محبت نہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو...... تو پھر میری زندگی بے مقصد ہے۔“ اس کے لہجے میں بلا کی اداسی تھی۔

”میں تمہیں بتا چکی ہوں نا کہ محبت یکطرفہ نہیں ہوتی!“ میری آواز میں نرمی تھی۔”میرا خیال ہے کہ محبت کو تم نے بہت محدود معنوں میں سمجھا ہے۔ محبت تو ایک لامحدود جذبہ ہے۔ دو دوستوں کے درمیان بھی تو محبت ہوتی ہے۔ اتنی کہ وہ ایک دوسرے کے لئے جان دے دیتے ہیں۔ والدین بھی تو اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ کیا تمہارے والدین نے تمہیں محبت نہیں دی؟“

”دی ہے محبت......! اور میری امی تو مجھ پر جان چھڑکتی ہیں۔“

”اور یقیناً تم بھی ان سے محبت کرتے ہو گے! پھر تم اپنی زندگی کو بے مقصد کس طرح کہہ سکتے ہو!“ میں اسے نرمی سے سمجھاتی رہی۔”سنو ارشاد! محبت کا صرف ایک ہی رخ نہیں، وہی مخصوص رومانی رخ جو تمہاری عمر کے نوجوان دیکھتے ہیں۔ محبت کے اور بہت سے رخ ہیں۔ اپنی زمین سے محبت، اپنے عقائد و نظریات سے محبت، اپنی اقدار، اپنی زبان، اپنی ثقافت سے محبت! مجھے فطری تقاضوں سے ہرگز انکار نہیں، ان کی تکمیل ضروری ہونا چاہئے بلکہ صاف لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ عورت اور مرد دونوں ہی کے جسمانی تقاضوں کو پورا کرنا ایک فطری عمل ہے جسے بہر حال پورا کرنا چاہئے لیکن میں تم سے صرف ایک مطالبہ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ مطالبہ غور و فکر کا ہے۔ غور و فکر سے تمہیں یہ معلوم ہو گا کہ جسمانی تقاضے تو جانور بھی پورے کر لیتے ہیں مگر انسان اور جانور میں فرق ہوتا ہے۔ انسان بھی اپنے جسمانی تقاضے ضرور پورے کرتا ہے لیکن حیوانی سطح پر آ کر نہیں۔ انسان اور جانور میں جو فرق ہے وہ اقدار کا ہے۔ سوچو وہ کیا جذبہ ہے جو ایک انسان کو جام شہادت پینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ کیا بات تھی جس نے سقراط کو زہر پینے پر مجبور کر دیا تھا! زندگی بذات خود ایک مقصد ہے۔ جتنے مذاہب ہیں جتنے فنون لطیفہ ہیں سبھی زندگی کرنا سکھاتے ہیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری باتیں؟“

”جی...... جی ہاں سمجھ رہا ہوں۔“ اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آتی سنائی دی۔

”اگر سمجھ رہے ہو تو پھر کبھی زندگی کو بے مقصد نہ کہنا! نہیں کہو گے نا؟“

”نن...... نہیں۔“ وہ جیسے بمشکل بولا۔

”ملک شیک پیو!“ یہ کہہ کر میں کافی کا گھونٹ لینے لگی۔

جب وہ ملک شیک اور میں کافی پی چکی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ مضطرب سا ہے۔ میں نے اس سے اضطراب کی وجہ پوچھی تو کچھ جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔”میرے والدین میری شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میں...... میں اب تک انکار کرتا رہا ہوں اور...... اور اس انکار کی وجہ آپ...... آپ تھیں۔ کیا...... کیا اب...... اب آپ کے انکار کے بعد میں...... شادی کر لوں؟“

”ہاں کیوں نہیں! میں کہہ چکی ہوں نا تم سے کہ جسمانی تقاضے بھی ضرور پورے ہونا چاہئیں۔ شادی کے بعد بھی ہماری دوستی برقرار رہے گی۔“

”آپ...... آپ سچ کہہ رہی ہیں نا......! مجھ سے ملتی رہیں گی نا شادی کے بعد بھی؟“

”کیوں نہیں بھئی ضرور ملتی رہوں گی!“ میں نے زور دے کر کہا۔

”اگر...... اگر آپ مجھ سے ملتی رہیں تو...... تو پھر شاید میری زندگی بے مقصد نہیں رہے گی۔“ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

میں نے فضا کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لئے دانستہ ہنس کر کہا۔”اگر تمہاری بیوی نے منع کر دیا کہ مجھ سے نہ ملو تو پھر کیا کرو گے تم؟“

”یہ ہرگز نہیں ہو سکتا!“ وہ پرجوش آواز میں بولا۔”مجھے آپ سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا!“

"تو پھر ملاؤ دوستی والا ہاتھ!" میں نے مسکرا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر میں نے اس کے ہونٹوں کو کانپتے دیکھا۔ پھر اس کا سر آہستہ آہستہ جھکنے لگا۔ میں اس کا مقصد سمجھ گئی۔

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا اور بولی۔ "دوستی کی حدود ہوتی ہیں، خصوصاً خواتین کے ساتھ دوستی برقرار رکھنے کے لئے ان حدود کا احترام ضروری ہوتا ہے۔ ہماری دوستی بھی اسی صورت میں کامیاب رہ سکتی ہے جب ہم دونوں ان حدود سے تجاوز نہ کریں۔"

"مم...... میں شرمندہ ہوں کہ...... کہ اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا۔ جب...... جب آپ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تو......تو مجھے یوں لگا جیسے سارے جہان کی دولت میرے ہاتھ میں آ گئی ہو۔ آپ کا حکم ہے تو آئندہ کبھی میں...... میں ایسی جسارت نہیں کروں گا جو...... کرنے والا تھا۔"

مجھے اس کے معصوم جذبات محبت کا خیال نہ ہوتا تو شاید میں اسے جھڑک دیتی لیکن اس کا دل توڑنا میں نے گناہ کے مترادف جانا اور نرمی سے وہ بات سمجھا دی جو ضروری تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس نوجوان کے اظہار محبت میں متاثر ہوئی تھی لیکن اس کی وجہ انسان دوستی کے سوا کچھ اور نہیں تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں اسے میں نے مثبت انداز فکر کی طرف راغب کر دیا تھا اور میرے نزدیک یہ ایک نیک کام تھا۔ میں نے اسے واضح الفاظ میں جو باتیں سمجھائی تھیں شاید اس کے والدین بھی نہ سمجھا پاتے۔ مجھ سے مزید چند ملاقاتوں کے بعد وہ راہ راست پر آ سکتا تھا۔

ویٹر کو بلا کر میں بل دینے لگی تو اس نے روکنا چاہا مگر میں نہیں مانی۔ "میں نے تمہیں دعوت دی تھی تم نے نہیں! آئندہ تمہاری باری سہی!" پھر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اگر مجھے اس وقت اپنے ایک دوست سے ملنے نہ جانا ہوتا تو ابھی مزید کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارتی۔"

"تو...... تو آپ کے اور...... اور دوست بھی ہیں...... مرد دوست؟" اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں! اپنے جس دوست سے ملنے میں اس وقت جا رہی ہوں وہ بہت دلچسپ آدمی ہے۔ کبھی تم سے بھی ملواؤں گی۔" میں آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "بات یہ ہے ارشاد کہ ہم لوگ جس معاشرے میں رہتے ہیں اس میں عورت اور مرد کی دوستی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اور اس کی بنیادی وجہ عورت پر عدم اعتماد ہے جسے ذاتی طور پر میں تسلیم نہیں کرتی۔ اگر عورت خود خراب نہیں ہے تو اسے دنیا کا کوئی مرد خراب نہیں کر سکتا! اسے غلط راہ پر نہیں چلا سکتا! ہاں زبردستی کی بات اور ہے مگر ہر عورت کمزور نہیں ہوتی، مرد اس سے اپنی ناجائز خواہشات پوری نہیں کرتا۔ جہاں تک خود میرا معاملہ ہے میں کسی بھی مرد کے مقابل خود کو کمزور نہیں سمجھتی!"

باتیں کرتے ہوئے ہم ہوٹل سے نکل آئے تھے۔ ارشاد میری بات سن کر بولا۔ "آپ بڑی عجیب باتیں کرتی ہیں۔ میں نے ایسی باتیں کسی سے نہیں سنیں، صاف، کھری اور سچی باتیں!"

"شکریہ!" میں مسکرائی اور پھر "خدا حافظ" کہہ کر اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔

نرسری سے ملک دلاور کی کوٹھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھی اس لئے میں جلد ہی وہاں پہنچ گئی۔

راستے میں غیر متوقع طور پر رک جانے کی وجہ سے مجھے دیر ہو گئی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے، اگر میں نے دلاور سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو نرسری ہی سے لوٹ جاتی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دلاور سحر خیزی کا عادی تھا اور یہ بات میرے علم میں تھی جو لوگ سحر خیزی کے عادی ہوتے ہیں عموماً جلدی سو جاتے ہیں یا پھر دوپہر کھانا کھانے کے بعد ضرور سوتے ہیں تاکہ ان کی نیند پوری ہو جائے۔ ملک دلاور اپنی نیند پوری کرنے کے لئے بوقت ضرورت دونوں ہی طریقے استعمال کرتا تھا، اگر وہ کسی سبب رات کو ...ہادی نہیں سو پاتا تھا تو دوپہر کو سو کر نیند پوری کر لیتا تھا۔ جب میں پہنچی تو دلاور بے چینی سے میرا منتظر تھا اس کا اظہار ڈرائنگ روم میں اس کی چہل قدمی سے ہو رہا تھا۔

"ارے آپ تو بہت جلدی آ گئیں! ابھی آدھی رات تو نہیں ہوئی!" وہ مجھے دیکھتے ہی کسی ...نی مرغی کی طرح کڑکڑایا۔ "راستے میں کیا کوئی را......"

"ہاں ہاں، کہو نا رکیب! یہی کہہ رہے تھے نا تم؟" میں یہ کہتی ہوئی خود ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ شاید ملک دلاور نے جل کر مجھ سے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔

"جی کہہ رہا تھا پھر؟"

"اگر تم یہی کہہ رہے تھے تو تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ واقعی ایسا ہی ہوا۔ بڑا کیوٹ نوجوان ہے وہ! کبھی تم سے اسے ملواؤں گی۔" میں نے اسے چڑانے کی خاطر کہا۔

"کیا وہ مجھ سے بھی زیادہ ہینڈسم اور کیوٹ ہے؟" اس نے گردن اکڑا کر کہا۔

"تم اور کیوٹ! یہ دونوں متضاد باتیں ہیں۔ معلوم ہے تم کیسے لگتے ہو! کیا تم نے کبھی غور سے آئینے میں خود کو نہیں دیکھا ہو گا۔ میں بتاتی ہوں تمہیں کہ درحقیقت تم کیا ہو! تمہارا سر کیوں کہ چھوٹا ہے اس لئے مینگ برائے نام ہے۔ مینگ سمجھتے ہو نا تم......! اسے دماغ بھی کہا جاتا ہے۔ تمہاری پیشانی میونسپلٹی کی بے مرمت سڑک معلوم ہوتی ہے اور آنکھیں چپٹی کے بٹ، منہ لیٹر بکس لگتا ہے اور ناک پر شاید بچپن ہی سے پہیہ پھرا ہوا ہے۔ چہرے پر اس کی موجودگی کا یقین بڑی تلاش کے بعد ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے فی الحال اتنا کافی ہے باقی آئندہ!"

"کیوں چہرے سے نیچے نہیں اتریں گی!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "تبصرے کے لئے ابھی تو بہت کچھ ہے خاتون! بس ذرا جرأت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔"

"تم جسے جرأت کہہ رہے ہو میں اسے بیہودگی کہتی ہوں۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "اچھا چلو ...کی چھوڑو اور یہ بتاؤ تمہارا کام دھندا تو ٹھیک چل رہا ہے؟"

"جی ہاں دعا ہے آپ کی......! میں اتنی دیر سے کھڑا ہوں کیا آپ مجھ سے بیٹھنے کو نہیں کہیں گی؟"

"گھر تمہارا ہے یا میرا؟ میں تو اس کے باوجود کہے بغیر بیٹھ گئی تھی۔"

"شاید اس لئے کہ اسے آپ اپنا گھر سمجھتی ہیں۔" وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر اسی صوفے پر بیٹھ گیا جس پر میں بیٹھی تھی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "ویسے بھی آج نہیں تو کل یہ گھر آپ ہی کا کہلایا جائے گا۔" اس نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

"کیا تم اسے بیچ رہے ہو میرے ہاتھوں؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے تو کبھی اسے خریدنے کی بات نہیں کی!" میں نے اسے گھنے لگی۔

"آپ کو کیا خبر خاتون کہ آپ کیا کیا خرید چکی ہیں! ارے آپ نے تو ہمیں بھی خرید لیا ہے۔"

"تمہاری اس بات سے کم از کم یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ تم بکاؤ مال ہو' اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہیں ہرگز نہ خرید پاتی۔ خیر جب تم اپنی زبان سے یہ حقیقت تسلیم کر چکے ہو تو پھر آج سے تمہیں میرا ہر حکم ماننا پڑے گا۔ میں اگر تم سے مرغا بن جانے کو بھی کہوں گی تو تمہیں انکار نہیں کرنا ہو گا۔"

"مجھے معلوم نہیں کہ مرغے اپنی اپنی مرغیوں کی فرماں برداری کرتے ہیں یا نہیں لیکن میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔" اس نے مجھ پر چوٹ کی۔

"زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کرو!" میں نے منہ بنا لیا۔

"ہاں یہ تو بتائیں کہ ہنی مون منانے آپ گئی کہاں تھیں؟"

"تمہارے دماغ کو پھر گرمی چڑھنے لگی!" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"زندہ بھی رہنے دیں گی یا نہیں! یا یونہی آنکھوں آنکھوں میں کتل...... یہ کم بخت زبان کسی دن میرے ہاتھوں......"

"کتل ہو جائے گی۔" میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اسی کے لہجے میں بات پوری کر دی' پھر اسے چڑانے کی خاطر ہنسنے لگی۔

جھینپ مٹانے کی خاطر ملک دلاور بھی ہنسی میں میرا ساتھ دینے لگا' پھر بولا۔ "کیا پئیں گی' شربت دیدار کے بدلے!"

"تمہاری کاروباری ذہنیت نہیں بدلے گی' ہر معاملے میں کچھ لو کچھ دو کے اصول پر چلتے ہو۔" میں بولی۔

"آپ بھی تو کاروباری ہیں' اکیلا میں ہی تو نہیں! اسی لئے تو کہتا ہوں کہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" وہ چہکا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو باتوں ہی باتوں میں ایک گھنٹا گزر گیا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ ملک دلاور جلدی سونے کا عادی ہے اس لئے گھڑی دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے! یہ ایک دم کیا ہوا آپ کو! کہیں کسی نا ہنجار کھٹمل نے تو نہیں کاٹ لیا آپ کو!" دلاور نے مجھے اٹھتے دیکھ کر بولا۔

"بس اب چلوں گی' تم آرام کرو!" میں نے کہا۔

"میری فرمائش پوری نہیں کی نا آپ نے! ساڑی باندھ کر نہیں آئیں نا! یہ لعنتی لباس بہت اچھا لگتا ہے آپ کو!" وہ میرے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کہنے لگا۔

"میری مرضی میں جو چاہوں پہنوں! تمہیں اس سے کیا!"

"بس ایک بار میرے نکاح میں آ جائیں آپ! پھر دیکھتا ہوں کس کی مرضی چلتی ہے!"

"اسی حسرت میں ٹنڈ یلے بڑھ جائیں گے تمہارے!" میں نے ہنس کر کہا۔

"خاتون' یہ ٹنڈ یلے کیا ہوتے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کسی اہل زبان کی جوتیاں سیدھی کرو تو معلوم ہو گا تمہیں کہ ٹنڈ یلے کسے کہتے ہیں!"

"مگر وہ اپنی جوتیاں ٹیڑھی رکھتے ہی کیوں ہیں کہ جنہیں سیدھی کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ خود اہل زبان بھی خاصے ٹیڑھے ہوتے ہیں اور جوتیوں کے ساتھ ساتھ انہیں بھی سیدھا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہاں یاد آیا آپ بھی تو اہل زبان ہیں پھر کیوں نہ آپ ہی سے ابتدا کر دی جائے۔"

"خواتین سے گفتگو کرتے ہوئے تہذیب و شائستگی کا خیال رکھنا چاہئے سمجھے!" میں نے برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"آپ کے آنکھیں دکھانے پر مجھے پھر وہی شعر یاد آ رہا ہے جس بن کر آپ آگ بگولہ ہو جاتی ہیں' وہی شعر جس کا دوسرا مصرع یہ ہے وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے۔"

اس وقت تک میں آگے بڑھ کر اپنی کار تک پہنچ چکی تھی اس لئے دانستہ سنی ان سنی کر گئی اور اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ "اچھا خدا حافظ!"

"اس شعر کا پہلا مصرع بھی سنا دوں؟" وہ باز نہ آیا۔

"بکواس نہ کرو!" یہ کہتے ہوئے میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ میں نے دانستہ شیشہ نیچے نہیں کیا تھا۔

ملک دلاور نے ہاتھ اٹھا کر مجھے "خدا حافظ" کہا اور میں اس کی کوٹھی کے احاطے سے نکل آئی۔ اپنی کوٹھی کی طرف لوٹتے ہوئے راستے میں مجھے شہریار کی کار نظر آئی۔ وہ خود ہی کار ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کی کار پر فلیگ بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے کافی دن بعد دکھائی دیا تھا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ شہریار صدر مملکت کے با اعتماد مشیروں میں سے ایک تھا مگر اب اسے معزول کیا جا چکا تھا۔ معزولی کے بعد اس کے خلاف تحقیقات بھی ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں ان کا کیا ہوا! میں نے اس سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ میرے لئے یہی بہت بڑی بات تھی کہ اسے معزول کر دیا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ معزولی کے بعد وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کے لئے کار آمد نہیں رہا تھا۔ اس کی تخریبی سرگرمیاں ختم ہو گئی تھیں۔ مجھ سے ٹکرانے کے نتیجے ہی میں اسے یہ دن دیکھنا پڑے تھے۔

اس شب اپنی کوٹھی پہنچ کر بستر پر دراز ہونے کے بعد معلوم نہیں کیوں بار بار مجھے ارشاد کا خیال آ رہا تھا۔ وہ بھی عجیب نوجوان تھا اور اس کی محبت بھی عجیب تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ مجھے پسند کرنے لگا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کافی طویل عرصے سے میرے عشق میں مبتلا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس نے اظہار عشق کی جرات نہیں کی تھی۔ جب مجھے خاصی دیر کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی تو میں ارشاد کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر مجھے نہیں معلوم کب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح میں سو کر اٹھی تو خاصی فریش تھی۔ نہا کر لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے ناشتہ کیا اور پھر فاطمہ کو بلایا۔ وہ آ گئی تو میں نے کہا۔ "سنو فاطمہ! اگر میرا کوئی فون آئے تو یہ نمبر دے دینا کہ مجھ سے

اس نمبر پر بات کی جا سکتی ہے۔" یہ کہہ کر میں اسے "آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر" کا نمبر لکھ کر دے دیا۔

مجھے کیوں کہ بینک ہو کر "آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر" جانا تھا اس لئے ڈرائیور کو ساتھ نہیں لیا۔ کوٹھی کے گیٹ سے میری کار باہر نکلی ہی تھی کہ سامنے کچھ فاصلے پر دائیں جانب ارشاد کو سڑک کے کنارے کھڑا ہوا دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ میں نے کار اس کے قریب لے جا کر روک دی اور اسے مخاطب کیا۔ "ارے تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

"آپ کا انتظار۔" اس نے عالم وارفتگی میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"آپ کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے!" اس نے برجستہ جواب دیا پھر بولا۔ "میں تو برسوں سے یہاں کھڑا ہوتا آیا ہوں مگر آج سے پہلے کبھی آپ نے توجہ نہیں دی۔"

"ارے تو پاگل تم کوٹھی میں آ جاتے۔ میں نے تو کل ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ جب چاہو مجھ سے آ کر مل سکتے ہو۔"

"ایک تو ہمت نہیں ہوئی دوسرے یہ سوچا کہ شاید ابھی آپ سو کر نہ اٹھی ہوں۔ رات کو آپ یوں بھی دیر سے لوٹی تھیں۔"

اس کی بات سن کر میں چونک اٹھی۔ "تو تم اس وقت تک میری واپسی کا انتظار کرتے رہے تھے؟"

"یہ میری لئے کوئی نئی بات نہیں۔ میں تو اکثر آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے واپسی کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ انہی دو مواقع پر تو آپ مجھے نظر آتی ہیں۔"

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "آؤ بیٹھ جاؤ گاڑی میں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر کار کا دروازہ کھول دیا۔ "میں بینک جا رہی ہوں وہاں تک تمہارا ساتھ رہے گا۔ پھر مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ واپسی میں تمہیں میں یہاں اتار دوں گی۔"

وہ کار میں بیٹھ گیا۔ اسی کی نظریں میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ "کیا دیکھ رہے ہو" میں نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"اپنے اس خواب کی تعبیر جو میں نے گزشتہ شب دیکھا تھا۔" وہ جیسے خواب کے عالم میں بولا۔

"خواب میں کیا دیکھا تھا تم نے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"آپ..... آپ ہمیشہ کے لئے میری ہو گئی ہیں اور..... اور....." اس کی آواز جذبات کے سبب مرتعش ہونے لگی اور وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

"ارشاد! کیا تمہیں معلوم ہے کہ خواب کی تعبیر الٹی ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم.....! لیکن مجھے..... مجھے اپنے خواب بہت عزیز ہیں۔"

"میں نے کل تمہیں کچھ سمجھایا تھا نا!"

"تو..... تو کیا آپ..... آپ مجھ سے میرے خواب..... میرے خواب بھی چھین لینا چاہتی ہیں!" اسکی آواز میں دکھ تھا۔

"نہیں ارشاد یہ بات نہیں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تم خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ جاؤ!"

"میں..... میں کوشش کروں گا۔" اس نے بجھے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

بینک میری کوٹھی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے کار روک کر ارشاد سے بھی اترنے کو کہا۔ پھر اس کے ساتھ بینک میں داخل ہو گئی۔ اندر پہنچ کر میں ارشاد کے ساتھ ایک خالی صوفے پر بیٹھ گئی پھر اپنا پرس کھول کر قلم اور چیک بک نکال لی۔ چیک پر مطلوبہ رقم لکھنے سے پہلے چند لمحے میں نے حساب لگایا کہ کتنی رقم کافی رہے گی! "آپریشن سیل" کے ارکان کی چار ماہ کی تنخواہوں کے علاوہ مجھے کچھ اور رقم کی بھی ضرورت تھی۔ اس رقم کا بھی اندازہ لگا کر میں نے چیک پر مطلوبہ ہندسے لکھ دیئے۔ ارشاد میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اتنی..... آپ اتنی رقم نکلوا رہی ہیں؟" وہ حیرت سے بول اٹھا۔ "کیا..... کیا کریں گی اتنی رقم کا؟"

"تمہیں شاید یہ علم نہیں کہ میں امپورٹ ایکسپورٹ کرنے والی ایک بڑی فرم کی بھی مالک ہوں۔ ظاہر ہے کہ کاروباری ضروریات ہی سے یہ رقم نکلوا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے چیک پر دستخط کئے اور پھر اسے چیک بک سے الگ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم بیٹھو میں ٹوکن لے لوں۔" یہ کہتے ہوئے قلم اور چیک بک میں نے پرس میں رکھ لی۔

پھر جب کچھ دیر بعد میں کیش لے کر ارشاد کے ساتھ بینک سے نکل رہی تھی تو ارشاد نے کہا۔ "آپ تو خاصی دولت مند معلوم ہوتی ہیں!"

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے دولت مند ہونا بری بات ہے!" میں نے ہنس کر کہا۔

"کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ دولت صرف ایک مخصوص طبقے میں گردش کر رہی ہے۔ اس کی وجہ سے غریب اور غریب ہو رہے ہیں اور دولت مند مزید دولت مند! کاش ان دولت مندوں کو غریبوں کا خیال بھی ہو' کاش ان کی دولت غریبوں کے کام آئے' نیک مقاصد میں خرچ ہو مگر شاید..... شاید ایسا کبھی نہیں ہو گا۔"

میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ارشاد! تمہارے خیالات قابل ستائش ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم دولت مند طبقے کے فرد ہونے کے باوجود ایسا سوچتے ہو۔ آؤ بیٹھو!" میں نے کار میں بیٹھ کر اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔ پھر وہ بیٹھ گیا تو مزید بولی۔ "لیکن ارشاد میری ایک بات یاد رکھنا کہ سبھی دولت مند ایک سے نہیں ہوتے۔ خلفائے راشدین میں سے ایک یعنی تیسرے خلیفہ عثمان غنیؓ بھی اپنے زمانے کے انتہائی دولت مند شخص تھے مگر انہوں نے دولت ہمیشہ نیک مقاصد میں خرچ کی۔ تو یہ طے ہوا کہ دولت مند ہونا برا نہیں' دولت کو محض اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنانا برا ہے' اسے ناجائز استعمال کرنا غلط ہے' اس کے ذریعے دوسروں کا استحصال کرنا ظلم ہے۔"

"معاف کیجئے گا' کیا آپ نے بھی اس پر عمل کیا؟" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"یقیناً! لیکن میں تمہیں تفصیلات سے آگاہ نہیں کروں گی اس لئے کہ اس سے خودستائی کا پہلو

نکلتا ہے۔ میری زندگی کا ایک خاص مقصد ہے جو میں اپنی دانست میں پورا کر رہی ہوں۔''

میری کار اب کوٹھی کے نزدیک پہنچنے والی تھی مگر ارشاد کے کہنے پر کچھ پہلے ہی میں نے کار روک دی۔ وہ شاید یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی جاننے والا اسے میری کار سے اترتے ہوئے دیکھے۔ میرے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اس کے دل میں چور تھا پھر بھی میں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور اسے ''خدا حافظ'' کہہ کر ''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر'' کی طرف روانہ ہو گئی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے میرے ذہن میں ارشاد ہی کا خیال تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اس کے ذہن سے میرا خیال نہ نکل سکا' میں اسے ''راہ راست'' پر لانے میں یوں ناکام رہی تو پھر اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کو بروئے کار لاؤں گی۔ میں اس کے ذہن سے اپنی محبت کے نقوش کھرچ دوں گی۔ میرے اور اس کے لئے یہی بہتر تھا۔

گزشتہ روز ہی میں کمانڈر نواز کو بتا چکی تھی کہ ''آپریشن سیل'' آؤں گی اس لئے جب وہاں پہنچی تو تقریباً سبھی ارکان موجود تھے۔ ان سب کو میں نے ''آپریشن سیل'' کے بڑے ہال میں جمع کیا اور پھر تنخواہوں کی بروقت ادائیگی نہ ہونے پر معذرت کی۔ پھر میرے ایما پر سب کو واجبات ادا کر دیئے گئے۔

کمانڈر نواز اور اس کے بقیہ تین ساتھیوں نے میری تلاش میں مشرقی پاکستان جا کر جو اخراجات کئے تھے وہ بھی میری ضد پر انہیں لینا پڑے۔ میں اپنے لوگوں کے درمیان پہنچ کر آج بہت خوش تھی۔ میں نے ان سے جی بھر کے باتیں کیں۔ کمانڈر نواز انہیں پہلے ہی ان واقعات سے آگاہ کر چکا تھا جو مجھے مشرقی پاکستان اور بھارت کے دوران قیام میں پیش آئے تھے۔ اس کے علاوہ جن امریکی ایجنٹوں کی فہرست گزشتہ روز میں نے اسے ٹائپ کرنے کو دی تھی وہ بھی مجھے دے دی۔

مجھے ''آپریشن سیل'' پہنچے ابھی تقریباً دو گھنٹے ہوئے تھے کہ وزیر داخلہ کا فون آ گیا۔ وہ کراچی پہنچ چکے تھے اور اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں میرے منتظر تھے۔ میں فوری طور پر ان سے ملنے روانہ ہو گئی۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچنے میں مجھے بمشکل آدھا گھنٹہ لگا۔

وزیر داخلہ اپنی روایت کے مطابق مجھ سے اخلاق و محبت کے ساتھ ملے۔ پھر چائے پینے کے دوران انہیں میں نے مختصراً تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ دانستہ میں نے انہیں اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کی بیداری کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ جب انہوں نے امریکی ایجنٹوں کی فہرست پر نظر ڈالی تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی حیرت کا سبب وہ اعلیٰ سرکاری افسران تھے جن کے نام اس فہرست میں درج تھے۔

''میں چاہتی ہوں کہ ان سب پر ایک ساتھ ہاتھ ڈالا جائے تاکہ ان میں سے کسی کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکے۔'' میں نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو...... لیکن امریکی ایجنٹوں کی ان پے در پے ریشہ دوانیوں کی روشنی میں میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ ہمیں اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کرنا ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں ایک اہم میٹنگ ضروری ہے جس میں صدر مملکت بھی ہوں' وزیر خارجہ بھی' میں بھی اور ...... اور تم بھی!'' وزیر داخلہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

''میں!'' میں حیرت سے بولی۔ ''اس میٹنگ میں بھلا میں کس حیثیت سے شریک ہو سکتی ہوں؟''

''تم ایک طویل عرصے سے غیر ملکی ایجنٹوں کے خلاف سرگرم عمل ہو اس کا علم صدر مملکت کو بھی ہے۔ یوں بھی میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ تمہیں میں نے مشرقی پاکستان بھیجا تھا اس کا بھی انہیں علم ہے۔ تم نے مجھے مشرقی پاکستان کے بارے میں جو ہولناک باتیں بتائی ہیں میں چاہتا ہوں کہ خود تم صدر مملکت کو ان سے آگاہ کرو! یہ انتہائی اہم بات ہے کہ مشرقی پاکستان میں امریکی ایجنٹوں کی شہ پر علیحدگی کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ اگر ابھی سے اس کا تدارک نہ کیا گیا تو خدانخواستہ بڑے بھیانک نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ برادر اسلامی ملک انڈونیشیا کے متعلق بھی تمہاری فراہم کردہ اطلاع بیحد اہم ہے۔ میں آج ہی صدر مملکت سے بات کرتا ہوں۔ اس وقت وزیر خارجہ بھی اسلام آباد میں ہیں اگر صدر مملکت نے اجازت دے دی تو پھر تمہیں آج ہی میرے ساتھ اسلام آباد چلنا پڑے گا۔ ایک اور اہم مسئلہ بھی ہے کہ ہم کسی ثبوت کے بغیر ان تمام افراد کو کس طرح حراست میں لے لیں جن کے نام تمہاری فراہم کردہ فہرست میں ہیں؟ اس کا بھی کوئی حل سوچنا پڑے گا۔ بہر حال تم ذہنی طور پر میرے ساتھ اسلام آباد چلنے پر تیار رہو۔''

''اگر آپ کا حکم ہے تو بہر حال اس مجھے اس کی تکمیل کرنا پڑے گی۔'' میں نے جواباً کہا۔

پھر وزیر داخلہ نے بتایا کہ میں اپنی کوٹھی میں ان کے فون کا انتظار کروں۔ اس گفتگو کے بعد میں وزیر داخلہ سے اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کوٹھی پہنچنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد وزیر داخلہ نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ آج شام چار بجے میں ایئر پورٹ پہنچ جاؤں۔ مجھے ان کے ساتھ اسلام آباد چلنا ہے۔ ٹکٹ کا بندوبست وہ کر چکے تھے۔ صدر مملکت سے ان کی بات ہو گئی تھی۔

اپنے ملک کے صدر سے پہلی بار میری ملاقات ہونیوالی تھی اور یہ ملاقات انتہائی اہم تھی۔ اس ملاقات میں ملک کی خارجہ پالیسی کا رخ متعین کیا جانا تھا۔ غالباً اسی لئے میں ایک عجیب سی سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ یہ میرے لئے بہر حال بڑے اعزاز کی بات تھی کہ میں ایک ایسی میٹنگ میں شرکت کرنے اسلام آباد جا رہی تھی جس میں صدر مملکت' وزیر داخلہ' وزیر خارجہ اور میرے سوا کوئی اور فرد شامل نہیں تھا۔

☆......☆......☆

اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے اور مجھے شام چار بجے ایئر پورٹ پہنچنا تھا۔ گزشتہ روز میں نے اپنی فرم کی منیجر عارفہ سے دفتر آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن مجھے صبح سے اب تک وہاں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں ایک طویل عرصے سے اپنے دفتر نہیں گئی تھی اس لئے خود میرا دل بھی وہاں جانے کو چاہ رہا تھا۔ نرگس، بلقیس، ساجدہ وغیرہ کو بھی عرصہ دراز سے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ وقت کم ہونے کے باوجود میں نے سوچا کہ دفتر ضرور جانا چاہئے۔ وہیں سے میں نے ایئر پورٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ عارفہ پر مجھے پورا اعتماد تھا کہ وہ تمام کاروباری معاملات بخیر و خوبی نمٹا سکتی ہے۔ وہ ذہین اور ایماندار تھی اسی اعتماد کے سبب میرے علاوہ میرے ہی ایما پر بینک میں اس کے دستخط بھی میری فرم کی جانب سے تسلیم کئے جاتے تھے۔ دفتر جانے کی وجہ کاروباری معاملات کا جائزہ لینا نہیں بلکہ عارفہ اور دیگر افراد سے ملاقات کرنا تھا۔

کوٹھی سے روانگی میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ فاطمہ نے میرے سوٹ کیس میں تمام ضروری اشیاء رکھ دی تھیں۔ میں نے اس دوران میں دوپہر کا کھانا کھا لیا تھا۔ کوٹھی سے چلتے ہوئے میں نے ڈرائیور کو اس لئے ساتھ لیا کہ وہ ایئر پورٹ سے کار واپس لا سکے۔ پہلے میں نے اسے اپنے دفتر چلنے کے لئے کہا۔

میں دفتر پہنچی تو جیسے سارے دفتر میں عید سی ہو گئی۔ اپنے دفتر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سامنے میز پر رکھے گلدان کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری آمد سے پہلے ہی کمرے کی اچھی طرح صفائی کرا دی گئی تھی۔ گلدان میں تازہ گلاب مہک رہے تھے۔ عارفہ کو علم تھا کہ مجھے گلاب بہت پسند ہیں۔

''دیکھو بھئی عارفہ میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی۔'' میں نے اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مگر کیوں میڈم؟'' عارفہ حیرت سے بولی۔ ''اتنے دن بعد تو آپ آئی ہیں پھر بھی......''

اسی وقت میز کی بائیں جانب رکھا ہوا انٹر کام گنگنا اٹھا اور عارفہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ میں نے انٹر کام اٹھایا تو شبانہ نے بتایا کہ نرگس مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

''بھیج دو اسے!'' میں نے جواباً کہا پھر مزید بولی۔ ''دفتر کا جو فرد بھی مجھ سے ملنا چاہے تو بغیر اجازت لئے اسے میرے پاس بھیج سکتی ہو۔'' یہ کہہ کر میں نے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا۔

چند ہی لمحے بعد نرگس کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے سلام کر کے عارفہ کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نرگس سے میں نے اس کے بھائی کی خیریت معلوم کی جو فالج کے سبب چلنے پھرنے سے معذور

تھا۔ ابھی میں نرگس سے اپنی بات پوری نہ کر سکی تھی کہ یکے بعد دیگرے دفتر کی دوسری لڑکیاں میرے کمرے میں آ گئیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ کرسیاں کم پڑ گئیں۔ وہ سبھی مجھ سے محبت کرتی تھیں اور اسی سبب ملنے کی مشتاق تھیں۔ ان سبھی کا ایک سوال تھا کہ میں اب دفتر کیوں نہیں آتی؟

''گزشتہ کئی ماہ سے میں اپنی ذاتی مصروفیات کے سبب ملک سے باہر تھی اس لئے دفتر نہیں آ سکی۔ اس وقت بھی مجھے اسلام آباد جانے کے لئے ایئر پورٹ پہنچنا ہے اس لئے تفصیلی ملاقات پھر سہی۔ میں نے کل تمہاری منیجر عارفہ سے دفتر آنے کا وعدہ کر لیا تھا اس لئے آ گئی ورنہ شاید نہ آ پاتی۔ اب تم لوگ جاؤ مجھے عارفہ سے چند منٹ بات کر لینے دو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ وہ سب چلی گئیں تو میں عارفہ سے مخاطب ہوئی۔ ''عارفہ! تفصیلات سے قطع نظر یہ بات تمہارے علم میں ہے نا کہ اس فرم کے علاوہ میری ایک اور ذمے داری بھی ہے؟''

''جی...... جی میڈم! آپ کا اشارہ غالباً آپریشن سیل کی طرف ہے۔'' عارفہ قدرے تاخیر سے کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک سمجھیں تم! دراصل میں یہ چاہتی ہوں کہ جن دنوں کسی سبب میرا قیام بیرون ملک ہو آپریشن سیل سے وابستہ ارکان کی تنخواہیں عذرا انٹر پرائزز کے اکاؤنٹ سے ادا کی جاتی رہیں جس طرح میرے ذاتی ملازمین کی تنخواہیں میری غیر موجودگی میں ادا کی جاتی ہیں۔ آپریشن سیل کے انچارج کمانڈر نواز سے تو مل ہی چکی ہو تم، وہ بھی تمہیں اچھی طرح جانتا ہے۔ میں اس سلسلے میں اسے تاکید کر دوں گی کہ تنخواہوں اور دیگر اخراجات کی ایک لسٹ تمہیں فراہم کر دے۔ ہر ماہ جتنا ٹوٹل اماؤنٹ بنتا ہے میرا خیال ہے کہ وہ اس فرم سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ میرے پرسنل اکاؤنٹ میں تم رقم جمع نہ کرا سکو گی۔''

''مگر میڈم! اس رقم کے متعلق فرم کے اکاؤنٹ میں کیا شو کیا جائے گا؟'' عارفہ نے دریافت کیا۔

''اکاؤنٹ میں یہ کل رقم میرے نام لکھی جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''جیسا کہ اس وقت ہوتا ہے جب تم فرم کے اکاؤنٹ سے میرے پرسنل اکاؤنٹ میں رقم جمع کراتی ہو۔''

''ویسے معاف کیجئے گا میڈم' کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ آپریشن سیل ہے کیا؟ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا دفتر کہاں ہے؟''

عارفہ کی بات سن کر میں مسکرا دی اور بولی۔ ''کبھی فرصت ہوئی تو بتاؤں گی تمہیں! اس وقت تو چلنے دو مجھے۔'' یہ کہتے ہی میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''سوا تین بجنے والے ہیں اور مجھے چار بجے بہرصورت ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔''

''کب تک واپسی ہو گی وہاں سے؟'' عارفہ میرے ساتھ ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ممکن ہے کل ہی واپسی ہو جائے' کچھ کہہ نہیں سکتی یقینی طور پر! کیوں کیا تمہیں کوئی خاص بات کرنا تھی؟''

"جی ہاں کچھ کچھ بزنس ڈسکشن تھا۔ میں چاہتی تھی کہ نئے سال کا بجٹ آنے سے پہلے کچھ......"

"ٹھیک ہے میں سمجھ گئی اسلام آباد سے واپسی پر تم سے بات ہو گی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور دفتر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

میں نے محسوس کیا کہ عارفہ مجھ سے مزید کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کسی وجہ سے جھجک رہی ہے۔ اس وقت تک میں دفتر کے صدر دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ عارفہ میرے ساتھ ہی تھی۔

"تمہیں کچھ کہنا ہے مجھ سے کوئی ضروری بات؟" میں نے دروازے پر رکتے ہوئے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"جی...... جی ہاں میڈم! کہنا تو تھا مگر......"

"پھر کہہ ہی دو ورنہ مجھے الجھن رہے گی کہ نہ معلوم تمہیں کیا کہنا تھا! جھجکنے کی ضرورت نہیں۔"

"دراصل جب آپ نے اسلام آباد جانے کا ذکر کیا تھا تو اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا مگر پھر دوسری بات چھڑ گئی۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ آپ...... آپ کہیں میری بات سے خفا نہ ہو جائیں! لیکن اب آپ کے استفسار پر...... بات یہ بھی میڈم کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ چند روز بعد بجٹ اناؤنس ہونے والا ہے اور...... اور یہ بھی آپ کے علم میں ہے کہ ہر بار امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس اس سے متاثر ہوتا ہے۔ کچھ اشیاء پر ڈیوٹی کم کر دی جاتی ہے کچھ پر بڑھا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ اسلام آباد میں ہائی سرکل ہی میں موو کریں گی تو اگر بجٹ آنے سے پہلے کسی ذریعے سے ہمیں یہ اشارہ مل جائے کہ کن اشیاء پر ڈیوٹی بڑھ رہی ہے اور کن پر کم کی جا رہی ہے تو اس سے چند ہی روز میں لاکھوں روپے کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔" عارفہ نے کچھ جھجکتے ہوئے اپنی بات تفصیل سے بیان کر دی۔

عارفہ کی بات سن کر میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا پھر بھی میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے مزید وضاحت چاہی۔ "ان معلومات کے حصول سے غالباً تمہارا مقصد یہ ہے کہ جن اشیاء پر ڈیوٹی کم کی جانے والی ہے اور وہ ہمارے سٹاک میں ہیں انہیں فوری طور پر سیل کر دیا جائے کیونکہ بجٹ آنے کے بعد ان کی قیمتیں گر جائیں گی۔ اس کے علاوہ جن اشیاء پر ڈیوٹی بڑھنے والی ہے انہیں ہم ذخیرہ کر لیں بلکہ مارکیٹ میں موجود ان اشیاء کو بڑی سے بڑی تعداد میں خرید لیں موجودہ ریٹ پر! پھر بجٹ آنے کے بعد ان اشیاء کو بڑھی ہوئی قیمتوں کے ساتھ فروخت کریں۔ تم یہی چاہتی ہو نا عارفہ؟"

عارفہ میرے لہجے سے اندازہ نہ لگا سکی کہ میں کیا سوچ رہی ہوں! وہ اسی لئے "جی ہاں میڈم" کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگی۔

میری بجائے کوئی بھی کاروباری شخص ہوتا اور اسے ایسا مشورہ دیا جاتا تو وہ نہ صرف اسے قبول کر لیتا بلکہ مشورہ دینے والے کو بھی شاباش دیتا یا پھر وہ خود ہی اپنے ذرائع اور مواقع سے فائدہ اٹھا چکا ہوتا مگر میں ایسے لوگوں میں سے نہیں تھی۔ مجھے اسی لئے عارفہ کی بات سن کر دکھ ہوا۔

"عارفہ!" میں نے اپنے غصے اور ناراضگی پر قابو پاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "مجھے افسوس

ہ اتم نے ایسی بات کہی! یقیناً تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ جہاں تک میں سمجھی ہوں میری دفتر ۔ غیر حاضری نے تمہیں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کاروباری بنا دیا ہے اور شاید اسی سبب تم جائز اور اجا' کے فرق کو بھول گئی ہو۔ فی الحال میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں تمہیں تفصیل سے یہ بات سمجھاتی ا. بجٹ کی آمد سے پہلے جو بڑے بڑے تاجر اسلام آباد کے چکر لگاتے نظر آتے ہیں میں انہیں ناجائز ناقع خور' ذخیرہ اندوز اور ملک دشمن تصور کرتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آج کے بعد تم اپنی سوچ کا رخ یل کر دو گی اور آئندہ کبھی مجھے انڈر اسٹیمیٹ نہیں کرو گی!"

"سوری...... ویری سوری میڈم! میں...... مم...... میں تو خود سوچ رہی تھی کہ کہیں آپ کو میری ات ناگوار نہ ہو۔ آئی...... آئی ایم ویری ویری سوری! ایکسٹریملی سوری! پلیز ایکس کیوز می میڈم!" یہ کہتے ہوئے عارفہ کی آواز بھرا گئی۔

"نیور مائنڈ! مجھے خوشی ہے کہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میرے لئے یہی کافی ہے' خدا حافظ!" یہ کہتے ہی میں زینے کی طرف بڑھ گئی۔

عارفہ سے گفتگو میں مزید دیر ہو گئی تھی اس لئے نیچے آ کر کار میں بیٹھتے ہی میں نے ڈرائیور کو تیز رفتاری کے ساتھ ایئر پورٹ چلنے کی ہدایت دی اور کہا کہ چار بجے تک بہر حال مجھے ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔

"بہتر ہے میڈم!" ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "چار بجے تک میں آپ کو ایئر پورٹ پہنچا دوں گا۔"

"گڈ!" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گئی اور ایک بار پھر میرا ذہن عارفہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ بظاہر اس نے میرے ہی فائدے کی بات کی تھی۔ اتنے دن اسے میرے ساتھ کام کر کے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ میں تجارت میں دیانت کی قائل ہوں۔ وہ اسی لئے اپنی بات کہتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اب سے پہلے اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔ غالباً اسے یہ اندازہ نہیں ہو گا کہ میں اس معاملے میں انتہا پسند ثابت ہوں گی یا اس کی بات کو ملک دشمنی پر منتج کروں گی۔ آج اس سے بات کرتے ہوئے کوشش کے باوجود میرے لہجے میں قدرے سختی آ گئی تھی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ عارفہ کی آواز اس لئے معذرت چاہتے ہوئے بھرا گئی تھی۔

مجھے دولت کی ہوس نہیں تھی ورنہ شاید میں دنیا کی چند امیر ترین افراد میں سے ایک ہوتی۔ دولت کمانے کے لئے میرے پاس ذرائع بھی تھے اور متعدد مواقع بھی! میں نے ان ذرائع اور مواقع کو استعمال تو کیا مگر جائز حدود میں رہ کے! دولت کے لئے کبھی میں نے حدود سے تجاوز نہیں کیا اور ہمیشہ جائز کے فرق کو مدنظر رکھا۔ شاید اسی لئے قدرت نے مجھے ہمیشہ نوازا اور مجھے کبھی دولت کی کمی کا احساس نہیں ہوا' نہ ہی کبھی اس کی وجہ سے میرا کوئی کام رکا۔ میں اس باب میں قطعی مطمئن تھی۔

میرے پیش نظر اگر زندگی کے اعلیٰ تر مقاصد نہ ہوتے اور ان کے حصول کی خاطر مجھے خاصی دولت درکار نہ ہوتی تو شاید میں عذرا انٹر پرائز قائم نہ کرتی۔ ایک اکیلی جان پر کیا خرچ ہوتا! میں بغیر کوئی کام کئے ساری زندگی عیش و عشرت کے ساتھ گزار سکتی تھی مگر یہ زندگی میرے نزدیک بے معنی تھی۔ مجھے

اس لئے مستقبل آمدنی کے حصول کی خاطر تگ و دو کرنا پڑی تا کہ وہ اخراجات برداشت کر سکوں جو میری روحانی مسرت کا سبب تھے اور جنہیں برداشت کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان اخراجات کا تعلق ''آپریشن سیل'' سے تھا اور ''آپریشن سیل'' میرا ایک ایسا خواب تھا جسے میں نے حقیقت بنا دیا تھا۔ یہی وہ خفیہ ادارہ تھا جس سے ملک دشمن افراد کی روح فنا ہوتی تھی۔ ''آپریشن سیل'' ہی ملکی اور غیر ملکی جرائم پیشہ تخریب کار عناصر اور شر پسندوں کے لئے ایک آہنی دیوار بن گیا تھا جسے گرانا ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس ادارے کا وجود اب حکومت کی اعلیٰ سطح پر بھی محسوس کیا جانے لگا تھا۔ اسی کے نتیجے میں اس وقت میں اسلام آباد جا رہی تھی۔

میں جن دنوں کا ذکر کر رہی ہوں ان دنوں بھی یہی صورت حال تھی۔ میں ملک دشمن عناصر سے بر سرِ پیکار تھی۔ بڑی حد تک میں نے ایسے عناصر کے وجود سے اپنے ملک کو پاک کرنے کے سامان کر لیے تھے مگر جب سے میری ملاقات وزیر داخلہ سے ہوئی تھی رہ رہ کر ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ میں نے انہیں ملکی اور غیر ملکی ان تمام تخریب کاروں کی مکمل فہرست فراہم کر دی تھی جن کے عزائم انتہائی خطرناک تھے اور انہیں ہر قیمت پر گرفتار کیا جانا ضروری تھا۔ ان کی گرفتاری میرے ملک کے مفاد میں تھی لیکن وزیر داخلہ کا یہ کہنا کہ ہم کسی ثبوت کے بغیر ان تمام افراد کو کس طرح حراست میں لے لیں جن کے نام تمہاری فراہم کردہ فہرست میں ہیں؟ خود میرے لئے یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے قانون کی مجبوریوں کا علم تھا۔ ایسی صورت میں صرف یہی ایک راہ رہ جاتی تھی کہ جس طرح اب تک میں ملک دشمنوں سے نمٹتی آئی تھی اسی پر عمل کرتی اور حکومت کو اس معاملے میں نہ پڑنے دیتی۔ صدر مملکت کے سامنے بھی ان ملک دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے میں نے یہی تجویز پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اپنے دفتر سے ایئر پورٹ پہنچنے تک میں اسی امکانی گفتگو کے متعلق سوچتی رہی جو صدر مملکت سے ہونا تھی۔ میرے ڈرائیور نے مجھے چار بجے سے تین منٹ پہلے ہی ایئر پورٹ پہنچا دیا تھا۔ ایئر پورٹ پر میرا استقبال کرنے کے لئے وزارت داخلہ کا ایک بڑا افسر موجود تھا۔ اسی نے میرا ٹکٹ میرے حوالے کیا اور بتایا کہ محترم وزیر داخلہ بس ایئر پورٹ پہنچنے ہی والے ہیں۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ وزیر داخلہ وقت کے بہت پابند تھے۔ نہ وہ کبھی قبل از وقت پہنچتے تھے نہ بعد از وقت! اس روز بھی یہی ہوا۔ ٹھیک چار بجے وہ ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ فلائٹ کا وقت سوا چار بجے تھا۔ انہوں نے مجھے پہلے سے اپنا منتظر پا کر خوشی کا اظہار کیا۔ ان کے آتے ہی میں نے اپنے ڈرائیور کو واپسی کے لئے کہہ دیا۔ میرا سوٹ کیس وہ پہلے ہی کار سے اتار کر میرے حوالے کر چکا تھا۔

پھر مطلوبہ فلائٹ میں سوار ہو کر کراچی سے اسلام آباد روانگی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میری سیٹ وزیر داخلہ کے برابر تھی۔

''ہاں بھئی عذرا' میں تم سے ایک بات تو پوچھنا بھول ہی گیا۔'' وزیر داخلہ نے مجھے بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ ان کے لہجے میں اپنا پن تھا۔

''جی فرمایئے!'' میں ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''تم کہاں ٹھہرنا پسند کرو گی؟ چاہو تو میری کوٹھی میں ٹھہر سکتی ہو' چاہو تو اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس

میں! کیوں کہ بہر حال تم صدر مملکت کی مہمان ہو۔''

''جہاں آپ کا حکم ہوگا ٹھہر جاؤں گی۔ ویسے آپ کے اہل خانہ کو زحمت نہ ہو اس لئے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک صورت اور بھی ہے کہ میں کسی ہوٹل میں ''

''بالکل نہیں!'' انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ ''تم وہاں خود نہیں بلکہ صدر مملکت کی دعوت پر جا رہی ہو۔ تمہاری حیثیت ایک سرکاری مہمان کی ہے اس لئے وہی دو صورتیں مناسب ہیں جو میں نے بیان کی ہیں۔ جہاں تک میرے اہل خانہ کا تعلق ہے تو انہیں کوئی زحمت نہیں ہوگی۔ میری کوٹھی کا ایک حصہ مہمانوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ تم اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا چاہو تو اس پر بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر ہوٹل ...... ہرگز نہیں!''

طے یہی ہوا کہ مجھے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس ہی میں ٹھہرنا تھا۔ سفر ہی کے دوران میں وزیر داخلہ نے مجھے یہ بتا دیا تھا کہ رات کا کھانا ایوان صدر ہی میں کھانا ہے۔

کراچی میں وزیر داخلہ سے میری ملاقات کیوں کہ مختصر سی تھی اور میں نے مختصراً ہی انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا تھا اس لئے اسلام آباد جاتے ہوئے مجھے ان سے تفصیلی گفتگو کا موقع مل گیا۔ اس موضوع پر گفتگو خود انہوں نے ہی شروع کی تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے اس لئے میں بھی آہستہ آواز میں بات کرتی رہی تا کہ ہم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کوئی اور نہ سن سکے۔ یوں بھی ہماری گفتگو کا زیادہ حصہ اشاروں کنایوں پر مشتمل تھا۔

روانگی سے قبل وزیر داخلہ کے عملے نے ان کی اسلام آباد واپسی سے متعلقہ افراد کو مطلع کر دیا ہوگا اس لئے ایئر پورٹ پر ایک کار ہماری منتظر تھی۔ وزیر داخلہ نے ڈرائیور سے پہلے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس چلنے کو کہا۔

وزیر داخلہ کی کار میں میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچی تو سرکاری افسر مہمان داری نے میرا استقبال کیا۔ وزیر داخلہ مجھے وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔

اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں میری حیثیت صدر مملکت کے مہمان کی تھی اس لئے وہاں کا عملہ انتہائی مستعد اور چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی مجھ سے شام کے ناشتے کی بابت دریافت کیا گیا مگر میں نے صرف چائے پر اصرار کیا جو فوراً سرو کر دی گئی' جس کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا اس کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ بہترین فرنیچر اور ضروری سامان سے کمرا سجا ہوا تھا۔

اسلام آباد آنے کے بعد مجھے صدر مملکت کے ایک قریبی مشیر شیخ مجید کا خیال آیا۔ شیخ مجید وہی تھا جس کے قتل کا منصوبہ صدر مملکت کے ایک اور سابق مشیر شہریار نے بنایا تھا مگر میری مداخلت کی وجہ سے شہریار کا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا کراچی میں کافی عرصے قبل شیخ مجید سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ کبھی اسلام آباد آنا ہوا تو ضرور ملوں گی۔ شیخ مجید کا تعلق بائیں بازو سے تھا اور اسی لئے وہ امریکہ کی طرف پاکستان کے جھکاؤ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک نڈر شخص تھا اور اپنے نظریات سے مخلص بھی! وہ اس لئے مجھے پسند آیا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ جس جلسے میں اسے تقریر کرنا ہے وہاں اس

پر مخالفین کی جانب سے قاتلانہ حملہ کیا جائے گا اس نے جلسے میں تقریر کرنے کو ملتوی نہیں کیا تھا۔ اپنے کا
سے مخلص افراد کو ہمیشہ سے میں پسند کرتی ہوں اسی لئے اس ایک ہی ملاقات کے نقوش اب تک میرے
ذہن پر ثبت تھے۔ ظاہر ہے کہ ڈنر کے وقت ہی ایوان صدر سے میری طلبی ہوتی اور اس میں ابھی خاصی د
تھی۔ میرے ذہن میں اسی لئے یہ خیال آیا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر شیخ مجید سے کیوں نہ ملا جائے
اس سے ملاقات کر کے ایک تو ایفائے وعدہ ہو جاتا دوسرے ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر گفتگو کا موقع
جاتا۔ وہ بہر حال ایک بیدار ذہن سیاست دان تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ صدر مملکت سے بھی قریب تھا۔ ا
سے گفتگو کے دوران میں مجھے کسی نہ کسی حد تک صدر مملکت کے خیالات و نظریات کا علم ہو جاتا۔ انہیں تما
باتوں پر غور کرتے ہوئے میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اس کے دفتر اور گھر کا فون نمبر تلاش کیا۔
وقت کیوں کہ دفتر کا نہیں تھا اس لئے میں نے گھر پر فون کیا۔

دوسری جانب کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی پھر ریسیور اٹھا لیا گیا۔ ''ہیلو!'' آواز نسوانی تھی۔

''شیخ صاحب گھر پر تشریف رکھتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کون صاحبہ بول رہی ہیں؟'' سوال کے جواب میں سوال ہی کیا گیا اور اس کی مجھے تو ق
بھی تھی۔ مجھے علم تھا کہ عموماً شیخ مجید ایسے صاحب مرتبہ افراد ہر ایک سے بات نہیں کرتے۔

''میرا نام عذرا خان ہے اور میں کراچی سے آئی ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''آپ ہولڈ کیجئے میں ابھی صاحب کو دیکھتی ہوں کہ وہ ہیں یا نہیں؟''

''اچھا میں ہولڈ کئے رکھتی ہوں تم دیکھ کر بتاؤ!''

فون پر بات کرنے والی نے ''صاحب'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس سے میں سمجھ گئی کہ وہ شیخ
مجید کی کوئی ملازمہ تھی۔ گھر کے ملازمین کو عموماً علم ہوتا ہے کہ ''صاحب لوگ'' گھر پر ہیں یا نہیں! لیکن انہیں
یہی تاکید ہوتی ہے کہ واضح طور پر کوئی جواب نہ دیں اور فون کرنے والے کی بابت معلوم کر لیں۔ اس
طرح یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ''صاحب'' جس سے بات کرنا چاہتے ہیں کرتے ہیں اور جس سے نہیں تو اس
سے کہہ دیا جاتا ہے کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔

شیخ مجید ایسے لوگوں سے متعدد افراد روزانہ ملتے رہتے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ ان
سب کو یاد رکھیں مگر میری اس سے ملاقات ذرا مختلف نوعیت کی تھی۔ مجھے اسی لئے یقین تھا کہ وہ مجھے پہچان
جائے گا۔ یوں بھی اعلیٰ سرکاری حلقوں میں میرا نام جانا پہچانا تھا۔ خود شیخ مجید بھی ملاقات سے قبل میرا نام
سن چکا تھا۔ اس نے مجھ سے ملاقات کے دوران میں خود ہی اس بات کا اعتراف کیا تھا۔

کچھ دیر انتظار کے بعد فون پر ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو! میں شیخ مجید بول رہا
ہوں۔''

''آداب!'' میں بولی۔

اس نے بھی آداب کا جواب دیا پھر بولا۔ ''کیا آپ یہیں اسلام آباد آئی ہوئی ہیں؟''

''جی ہاں!'' میں نے جواباً کہا۔ ''آپ نے مجھے غالباً پہچان لیا ہے! آپ سے ایک بار کراچی
میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ کافی عرصے پہلے کی بات ہے جب آپ ایک جلسے میں......''

''سب کچھ یاد ہے مجھے......! اچھی طرح یاد ہے۔ آپ کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی تھی۔ آپ
ایسی پراسرار خاتون کو بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کا قیام کہاں ہے تا کہ ملاقات کی کوئی
صورت سوچی جا سکے۔ آپ مزید کچھ دیر فون نہ کرتیں تو نکل گیا ہوتا۔ دراصل کل مجھے ایک خاص مسئلے پر
پریس کانفرنس کو ایڈریس کرنا ہے اسی سلسلے میں اپنے کچھ قریبی ساتھیوں سے مشورہ کرنے جا رہا تھا جن کا
قیام یہیں اسلام آباد میں ہے۔'' شیخ مجید نے تفصیل سے بتایا۔

''پھر تو آپ سے ملاقات مشکل ہی ہے۔'' میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں خود
آپ سے کچھ ضروری گفتگو کرنا چاہتی تھی۔''

''کہیں پھر تو میرے قتل کے سامان نہیں ہو رہے خاتون؟'' شیخ مجید ہنس کر بولا۔

''نہیں شیخ صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں بھی ہنس دی پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''میں نے
آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اسلام آباد آئی تو ضرور ملوں گی اس لئے ایفائے وعدہ کی خاطر فون کر لیا تھا۔
ویسے یہ علم ضرور تھا کہ آپ ایک سیاست دان ہیں، ضروری نہیں کہ آپ سے ملاقات ہو ہی جائے۔''

''ویسے آپ کب تک ہیں یہاں؟'' شیخ مجید نے ذرا توقف سے دریافت کیا۔

''آج رات تک تو یقینی ہوں لیکن کل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھا لیں۔ میں نو بجے تک فارغ ہو جاؤں گا' یعنی
گھر واپس آ جاؤں گا۔ نو بجے آپ جہاں کہیں گاڑی بھیج دوں پتا لکھا دیجئے مجھے! کھانے کے بعد وہ بات
بھی ہو جائے گی جو آپ مجھ سے کرنا چاہتی ہیں۔''

''شکریہ شیخ صاحب! رات کے کھانے پر میں...... ایوان صدر میں مدعو ہوں۔'' میں نے کچھ
سوچتے ہوئے دانستہ اسے ایک ایسی بات بتا دی جو صرف چند افراد کے علم ہی تھی۔ اس کا مقصد اپنی اہمیت
جتانا نہیں بلکہ شیخ مجید کے ذہن میں تجسس بیدار کرنا تھا۔

''ایوان صدر میں!'' توقع کے مطابق وہ حیرت سے بولا۔

''جی ہاں! میں صدر مملکت ہی سے ملنے اسلام آباد آئی ہوں اور اسی ضمن میں ملاقات سے قبل
آپ......''

''ایک منٹ ٹھہریئے' سوچنے دیجئے مجھے!'' پھر کچھ دیر وہ خاموش رہا' اس کے بعد کہنے لگا۔

''آپ یقیناً آٹھ بجے سے پہلے تو ایوان صدر نہیں جائیں گی اور اس وقت چھ بج رہے ہیں۔ اس کا
مطلب یہ ہے کہ دو گھنٹے آپ کے پاس ہیں۔ آپ اپنا پتا بتائیے میں اپنے ڈرائیور کو کار دے کر بھیج رہا
ہوں۔ پریس کانفرنس کل شام کو ہے اس لئے میں کل صبح بھی اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر سکتا ہوں۔''

''شیخ صاحب! میں یہاں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر
آپ خود ہی یہاں آنے کی زحمت کر لیں تو بہتر رہے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کراچی سے میں وزیر
داخلہ کے ساتھ آئی ہوں اور آٹھ بجے سے پہلے وہ بھی فون پر مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ
مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہیں اور میں انہیں یہاں نہ ملوں۔''

''اوہ!'' شیخ مجید کے لہجے سے معلوم ہوا کہ وہ میری بات سن کر کچھ مزید حیران ہوا ہے۔ وزیر

داخلہ کے ساتھ کراچی سے اسلام آباد آنا اور پھر صدر مملکت سے ملاقات یقیناً اس کے لئے حیرت ہی کا سبب رہی ہوگی۔ ذرا سے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے خاتون میں آ رہا ہوں۔“

”بہت بہت شکریہ شیخ صاحب!“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسی کے ساتھ لائن بے جان ہوگئی۔

شیخ مجید سے ملاقات اس لئے بھی میری نظر میں ضروری تھی کہ بائیں بازو کے سیاست دانوں کا نقطہ نظر میری سمجھ میں آسکے۔ موجودہ سیاسی حالات میں وہ کس نہج پر سوچ رہے تھے۔ شیخ مجید سے مل کر باآسانی مجھے معلوم ہوسکتا تھا۔

مجھے زیادہ دیر شیخ مجید کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ بیس منٹ بعد ہی اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ بیڈروم سے ملحق ہی خوب صورت ڈرائنگ روم تھا۔ وہیں شیخ مجید سے میری ملاقات ہوئی۔

میرے مقابل آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہی شیخ مجید نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ تو خاصی اہم خاتون معلوم ہوتی ہیں! یقین کیجئے پہلی ملاقات میں مجھے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا۔“

”خیال ہے آپ کا شیخ صاحب ورنہ میں پہلے بھی غیر اہم تھی اور آج بھی غیر اہم ہوں۔“ میں نے انکساری کا اظہار کیا۔

”ظاہر ہے کہ غیر اہم شخصیات ہی کو ایوان صدر میں مدعو کیا جاتا ہے...... خیر حکم فرمائیں اس خادم کو کیوں یاد کیا ہے؟“

”آپ تو مخدوم ہیں شیخ صاحب! اس لئے کہ صاحب اقتدار ہیں۔ خادم تو ہم لوگ ہیں۔“

”میرے نزدیک اقتدار آنی جانی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ کل آپ یہ سن لیں..... خیر چھوڑیئے۔“

میں اس کی بات سن کر ذرا بھی نہیں چونکی کیوں کہ اس کی آمد کے ساتھ ہی میں نے اس کے ذہن کو ٹٹولنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی قوت ارادی مضبوط تھی۔ اس لئے مجھے کسی قدر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر بالآخر چند ہی لمحوں میں اس کا ذہن میرے لئے ایک کھلی کتاب کے مانند ہوگیا تھا اور میں اسے پڑھ رہی تھی۔ جو بات کہتے کہتے وہ رک گیا تھا مجھے معلوم ہو چکی تھی۔ میں اسی لئے مسکراتے ہوئے بولی۔

”مجھے معلوم ہے شیخ صاحب کہ آپ اپنے نظریات کے سبب خاصے ریشنل آدمی ہیں اور محیر العقول باتوں پر یقین نہیں رکھتے لیکن اگر میں یہ بتا دوں کہ کل کی پریس کانفرنس میں آپ کیا اعلان کرنے والے ہیں تو کیا آپ کو یقین آجائے گا کہ ماورائے عقل بھی بہت کچھ ہے؟“

”میں نے آپ کی شہرت تو یہی سنی ہے خاتون! ایک بار خود مجھے بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے جب آپ نے مجھ پر قاتلانہ حملے کی پیش گوئی کی تھی لیکن معاف کیجئے گا اس ذاتی تجربے کے باوجود میں ماورائے عقل باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔“ شیخ مجید صاف گوئی سے بولا۔

”اگر آپ کو یقین نہیں تو اب یقین دلائے دیتی ہوں میں!“ میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

”تو سنئے کہ آپ اور آپ کے توسط سے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے تمام وہ افراد جو اس وقت موجودہ حکومت میں شامل ہیں حکومت سے علیحدگی کا اعلان کرنے والے ہیں۔ کیوں؟ اگر آپ کہیں تو میں اس کا جواب بھی دے سکتی ہوں۔“

میری بات سن کر شیخ مجید کے چہرے پہ شدید حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔ چند لمحے کمرے میں بوجھل سا سکوت طاری رہا پھر شیخ مجید ہی کی آواز سے یہ سکوت ٹوٹا۔ وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”حیرت انگیز.....! انتہائی حیرت انگیز! یہ..... یہ بات تو ابھی صرف چند انتہائی بااعتماد افراد تک محدود تھی پھر..... پھر کس طرح نہیں.....“

”غلط سوچ رہے ہیں آپ شیخ صاحب!“ میں اس کا ذہن پڑھتے ہوئے بول اٹھی۔ ”انٹیلی جنس کے علم میں یہ بات نہیں اور نہ انٹیلی جنس سے میرا کوئی تعلق ہے۔“

شیخ مجید تقریباً اچھل پڑا۔ وجہ یہی تھی کہ وہ جو کچھ سوچ رہا تھا میں نے بتا دیا۔

”آپ..... آپ بے حد خطرناک خاتون ہیں۔“ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ”مجھے آپ سے نہیں ملنا چاہئے تھا۔“

”آپ کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے شیخ صاحب! اگر آپ مجھ سے نہ ملتے تو یہ بات آپ کے علم میں نہ آتی کہ بائیں بازو والے ایک غلط وقت پر فیصلہ کر رہے ہیں۔“

”کیا دلیل ہے آپ کے پاس کہ ہمارا فیصلہ غلط ہے؟“ اس نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

”یہ کہ اس طرح آپ لوگ اپنے مخالفوں کے لئے کھلا میدان چھوڑ دیں گے جو سراسر ایک بھیانک سیاسی غلطی ہوگی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔“

”لیکن صدر مملکت کا رویہ ہمارے ساتھ مصالحانہ نہیں۔ وہ ہماری بات نہیں سنتے۔“ شیخ مجید بولا۔

”اور یہ بھی تو درست ہے کہ دائیں بازو والوں کی گرفت بھی اب ان پر مضبوط نہیں رہی خصوصاً شہریار کی معزولی کے بعد!“

”پھر بھی اس سے ہمیں کیا فائدہ؟ ملک کی خارجہ پالیسی کا ابھی تک کوئی واضح رخ متعین نہیں ہوسکا۔ ایسی صورت میں ہم لوگ خود پر یہ الزام کیوں لیں کہ ہم نے ایک آمر کی حکومت کا ساتھ دیا۔“ شیخ مجید اب کھل کر بات کر رہا تھا۔

”یہ بھی خوب کہی آپ نے شیخ صاحب!“ میں آہستہ سے ہنس دی۔ ”آپ یا آپ کے ساتھیوں کو اس الزام کا خطرہ تھا تو پھر اب تک حکومت کا ساتھ کیوں دے رہے تھے! اور ہاں ایک بات تو بتایئے کہ جس نظام حکومت کی تائید آپ لوگ کرتے ہیں کیا اس میں ون پارٹی گورنمنٹ نہیں ہوتی؟ کیا اسے آمریت نہیں کہا جاسکتا؟“

”ٹھیک کہتی ہیں آپ! مگر وہ آمریت کسی شخص واحد کی نہیں ہوتی۔ خیر یہ ایک لمبی بحث ہے۔ میرے خیال میں یہ اس کا موقع نہیں۔ آپ تو مجھ سے وہ بات کریں جس کے لئے مجھے بلایا تھا۔“

”میرا خیال ہے شیخ صاحب کہ میں وہ بات کر چکی ہوں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”پھر بھی آپ واضح الفاظ میں سننا ہی چاہتے ہیں تو یہ عرض کروں گی کہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے صرف چند روز انتظار کر لیجئے۔“

''اس سے کیا ہوگا؟'' اس نے سوال کیا۔

''جو آپ چاہتے ہیں۔'' میرے لہجے میں اعتماد تھا۔

شیخ مجید نے میری طرف غیر یقینی سی نظروں سے دیکھا۔ ابھی تک اس کے ذہن پر میری نظر تھی۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ جانتی ہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں!''

''بالکل جانتی ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ لوگ خارجہ پالیسی میں ایسی واضح تبدیلی چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کا جھکاؤ صرف دائیں جانب نہ رہے' بالفاظ دیگر ہم پر امریکہ کی برتری نہ رہے۔ بتایئے غلط تو نہیں کہہ رہی میں؟''

''آپ کا خیال یا قیاس درست ہے۔'' شیخ مجید نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن موجودہ حالات میں کیا ایسا ممکن ہے؟''

''جی ہاں بالکل ممکن ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس جواب کی وجہ کو میں آپ کی لاعلمی پر بھی محمول کر سکتا ہوں کہ آپ کو بعض حقائق کا علم نہیں۔''

''غلط خیال ہے آپ کا!'' میں بول اٹھی۔ ''آپ کا اشارہ امریکی ہوائی اڈوں کی طرف ہے جو امریکہ نے یہاں ہمارے ملک میں کافی عرصے سے قائم کر رکھے ہیں۔''

میری بات سن کر وہ تقریباً اچھل پڑا حالانکہ یہ اہم بات مجھے اس کا ذہن پڑھ کر ہی معلوم ہوئی تھی۔ امریکہ نے اپنے حریف سوویت روس کو اپنے دباؤ میں رکھنے کیلئے پاکستان میں انڈر گراؤنڈ ایئر بیس قائم کر رکھے تھے۔ اس وقت تک سوویت وزیراعظم خورشچیوف نے پاکستان میں امریکی ہوائی اڈوں کی موجودگی کا انکشاف نہیں کیا تھا۔

''حیرت ہے کہ آپ ...... آپ یہ سب کچھ جانتی ہیں عذرا خان! اور ...... اور پھر بھی آپ کا کہنا ہے کہ آپ کا تعلق انٹیلی جنس سے نہیں!''

''شیخ صاحب! آپ اس بات پر کتنی بھی حیرت کریں لیکن حقیقت یہی ہے۔ نہ صرف انٹیلی جنس سے بلکہ حکومت کے کسی بھی ادارے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''

اسی وقت شیخ مجید کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر میری بات واقعی درست ہے تو پھر یقیناً میں کوئی اہم غیر ملکی ایجنٹ ہوں۔ میری توجہ اس کے ذہن پر اب تک مرکوز تھی۔

''آپ کا یہ خیال بھی قطعی غلط ہے شیخ صاحب!'' میں نے پرسکون آواز میں کہا۔

''کک ...... کیا خیال؟'' شیخ مجید گھبرا سا گیا۔ یوں جیسے عین موقع پر اسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔

''یہی کہ میں کوئی غیر ملکی ایجنٹ ہوں۔'' میں نے بڑے اطمینان سے کہہ دیا۔

''مم ...... مگر میں ...... میں نے یہ ...... یہ کب کہا ہے!'' گھبرا جانے کے باوجود وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''ہر بات زبان ہی سے کہنا ضروری نہیں ہوتا شیخ صاحب!'' میرے لہجے میں چبھن تھی۔

''سوری مس عذرا خان کہ آپ نے ایسا قیاس کیا۔'' وہ اپنے دفاع میں بولا۔

''قیاس اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے شیخ صاحب اور میں یہ فرق اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ بہرحال آپ کو اختیار ہے میرے بارے میں جو چاہے سوچیں۔ مجھے آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ کل ہونے والی پریس کانفرنس میں حکومت سے اپنی علیحدگی کا اعلان نہ کریں' یہی آپ کے اور ملک کے حق میں بہتر ہے۔''

''ٹھیک ہے ایسا نہیں ہوگا۔'' اس نے مجھے یقین دلایا۔ ''مجھے کھلے دل سے اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ انتہائی خطرناک حد تک ذہین خاتون ہیں۔ ہر چند کہ میں پراسرار باتوں پر یقین نہیں رکھتا مگر آپ کی شخصیت کو ضرور پراسرار کہوں گا۔''

''شکریہ شیخ صاحب!'' میں مسکرا کر بولی' پھر مزید کہا۔ ''ایک بات میں آپ کو اور بتا دوں' بہت ممکن ہے کہ صدر مملکت انتخابات کے انعقاد پر بھی راضی ہو جائیں گے جو آپ لوگوں کی دیرینہ خواہش ہے۔''

''اگر ایسا ہوا تو واقعی یہ ایک حیرت انگیز اقدام ہوگا۔''

''قوموں کے عروج و زوال اور ان کے مستقبل کا تعین کرنے میں بعض لمحات بڑے اہم ہوتے ہیں اور میرے نزدیک یہ لمحات اب بہت قریب آ چکے ہیں۔''

''کاش ایسا ہی ہو۔'' اس نے طویل سانس لے کر کہا پھر بولا۔ ''کیا میں صدر مملکت سے آپ کی ملاقات کا سبب پوچھ سکتا ہوں۔''

''جی نہیں۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہہ دیا۔ ''میں معذرت خواہ ہوں کہ اس سلسلے میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔''

''لگتا ہے کہ شاید صدر مملکت کو بھی پیش گوئیوں سے دلچسپی ہوگئی ہے۔'' اس نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

''ضروری نہیں شیخ صاحب کہ اندھیرے میں چھوڑا جانے والا ہر تیر نشانے پر لگ ہی جائے۔'' میں مسکرا کر بولی۔

جواباً شیخ مجید بھی مسکرانے لگا اور اسی وقت اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا ایک افسر کمرے کے دروازے پر نظر آیا۔ وہ اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''آ جایئے! کیا بات ہے؟'' میں نے اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔

''میڈم! آپ کا فون ہے۔'' وہ ادب سے بولا۔ ''آپ چاہیں تو یہاں موجود ٹیلی فون سیٹ پر کال ٹرانسفر کر دی جائے یا پھر......''

''کس کا فون ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''محترم وزیر داخلہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

میں چونک اٹھی۔ شیخ مجید سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اب

پونے آٹھ بجنے والے تھے۔ میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور شیخ مجید سے بولی۔ ''میں ابھی حاضر ہوئی۔'' یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی جس کی حیثیت میرے بیڈ روم کی تھی۔ کال ٹرانسفر کرانے میں دیر لگتی اور میں وزیر داخلہ کو انتظار کرانا نہیں چاہتی تھی۔ خواب گاہ میں بیڈ کے قریب ہی ایک تپائی پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ریسیور اٹھالیا۔ ''ہیلو!''

''ہاں بھئی عذرا تمہارے لئے گاڑی روانہ ہو چکی ہے تم تیار ہو جاؤ! یہ گاڑی تمہیں لے کر ایوان صدر آجائے گی۔ میں یہاں پہنچ چکا ہوں۔'' وزیر داخلہ کی مانوس آواز سنائی دی۔

''میں بالکل تیار ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ویری گڈ!'' انہوں نے کہا۔ ''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں یہاں! فارن منسٹر بھی آنے والے ہوں گے۔ خدا حافظ!'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں بیڈ روم سے دوبارہ ملحقہ کمرے میں پہنچ گئی اور شیخ مجید سے کہا۔ ''اچھا شیخ صاحب پھر ملاقات ہوگی۔ اب کچھ دیر بعد مجھے ایوان صدر پہنچنا ہے۔''

میری بات سنتے ہی شیخ مجید صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''اگر کل تک رکنا ہو یہاں تو پھر مجھے ضرور مطلع کر دیجئے گا۔ میں اپنے ڈرائیور کو بھیج کر آپ کو بلوالوں گا۔ ابھی آپ سے باتیں کر کے جی نہیں بھرا۔ آپ واقعی حیرت انگیز شخصیت کی مالک ہیں۔''

''دیکھئے اگر کل بھی یہاں مجھے رکنا پڑا تو آپ سے یقیناً رابطہ قائم کروں گی۔'' میں نے وعدہ کر لیا پھر مزید بولی۔ ''ویسے امکان کم ہی ہے۔''

''اگر آپ سے کل ملاقات نہ ہو سکی تو پھر جب میرا کراچی آنا ہوا آپ سے ملوں گا لیکن ...''

''غالباً آپ کے پاس میرا فون نمبر اور پتا نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے اپنا بزنس وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔ اس وزیٹنگ کارڈ میں میری فرم کے ٹیلی فون نمبر بھی تھے اور میری کوٹھی کا فون نمبر بھی! اس کے علاوہ فرم اور کوٹھی کے پتے بھی اس میں موجود تھے۔

''شکریہ!'' شیخ مجید نے وزیٹنگ کارڈ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

پھر شیخ مجید کو رخصت کر کے میں بیڈ روم میں آ گئی۔ اس سے میری ملاقات خاصی نتیجہ خیز ثابت ہوئی تھی۔ اس کا ذہن پڑھ کر مجھے ایک ونگ کے خیالات کا علم ہو چکا تھا۔ دوسرے ونگ یعنی دائیں بازو کے بارے میں خود مجھے بہت کچھ علم تھا۔ اب میں صدر مملکت سے گفتگو کرنے کیلئے تقریباً ویل انفارمڈ تھی۔

جب میں لباس تبدیل کر کے چہرے پر ہلکا سا میک اپ کر رہی تھی تو اطلاع ملی کہ وہ کار آ چکی ہے جو مجھے ایوان صدر لے جائے گی۔ میں نے تیزی سے میک اپ کیا اور پھر اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی عمارت سے باہر آ گئی۔ سامنے ہی لمبی سی سفید کار کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے میرے لئے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور میں آگے بڑھ کر کار میں بیٹھ گئی۔

اس ایئر کنڈیشنڈ کار میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے ایوان صدر تک کا سفر بیس پچیس منٹ پر مشتمل تھا۔

ایوان صدر کا حفاظتی عملہ میرے ساتھ انتہائی شائستگی سے پیش آیا۔ میرے پاس یوں بھی کوئی ایسی شے نہیں تھی جس پر اعتراض کیا جا سکتا۔ میں نے خود ہی اپنا پرس ان لوگوں کی طرف بڑھا دیا تھا جسے انہوں نے کھول کر دیکھنے کے بعد مجھے واپس کر دیا تھا' شکریے کے ساتھ!

پھر وہ لمحہ جلد ہی آ گیا جب میں ایک وجیہہ اور پروقار شخصیت کے روبرو تھی۔ یہ صدر مملکت کی شخصیت تھی جنہیں اب سے پہلے میں نے صرف تصویروں میں دیکھا تھا۔ وزیر داخلہ ان سے میرا تعارف کرا رہے تھے اور میں جیسے ان کی شخصیت کے سحر میں گم تھی۔ گرے کلر کا سوٹ ان کے دراز قد پر سج رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی شفیق مسکراہٹ تھی' آنکھیں تیز چمکیلی اور روشن تھیں جیسے ہر شے کی گہرائی تک پہنچنے کی اہل ہوں۔

''صدر محترم!'' میرے لب پہلی بار کھلے۔ ''اگر آپ اسے کوئی رسمی جملہ تصور نہ کریں تو مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔''

''تھینک یو عذرا!'' انہوں نے جواباً کہا۔ ''مجھے تم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا اسی لئے تمہیں بھی دیکھ کر مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔''

میں نے بھی ان کا شکریہ ادا کیا پھر وزیر داخلہ نے وزیر خارجہ سے میرا تعارف کرایا۔ نوجوان وزیر خارجہ کی شخصیت بھی میرے لئے متاثر کن تھی۔

''عذرا! تمہیں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اب تک تم نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں تم انہیں انجام دینے کی اہل ہو گی۔'' صدر مملکت نے میری تعریف کی۔

''میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا محترم صدر! یہ سب میرے محسن اور بزرگ کی حوصلہ افزائی ہے۔'' میں نے وزیر داخلہ کی طرف دیکھتے ہوئے انکساری سے کہا۔

''کیا خیال ہے پہلے کھانا نہ کھا لیا جائے پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔'' صدر مملکت نے وزیر داخلہ کو مخاطب کیا۔

''نیک خیال ہے۔'' وزیر داخلہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

یہ سن کر صدر مملکت اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے ساتھ ہی وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ نے بھی ان کی تقلید کی۔

ڈنر خاصا پر تکلف تھا جس سے فارغ ہو کر صدر مملکت اور وزیر داخلہ نے کافی پی۔ وزیر خارجہ اور میں نے چائے پی تھی۔

چائے پینے کے بعد ہم ایوان صدر ہی کے ایک اور کمرے میں آ گئے اور پھر گویا کلوز ڈور میٹنگ شروع ہو گئی۔

''عذرا!'' صدر مملکت نے مجھے مخاطب کیا۔ ''تم بتاؤ کہ مشرقی پاکستان کے حالات کیا ہیں؟''

جواباً میں نے بولنا شروع کیا۔ میں نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسند عناصر کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا اور واضح طور پر یہ بھی بتایا کہ گریٹر بنگال کی تحریک کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہے۔ امریکی ایجنٹ وہاں کس طرح سرگرم عمل ہیں اور انہوں نے کیا طریقہ کار اپنا رکھا ہے میں نے سب کچھ بیان کر دیا۔ صدر

مملکت اور دونوں وزراء میری باتیں غور سے سنتے رہے۔

''تشویش ناک بات یہ ہے صدر محترم کہ کچھ اعلیٰ سرکاری افسران بھی امریکی ایجنٹوں کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے مشرقی پاکستان کے ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری کا نام بطور مثال پیش کیا۔ پھر بتایا کہ وہ کس طرح دوہری زندگی گزار رہا ہے!

اس پر میں نے صدر مملکت کو چونکتے دیکھا۔ انہوں نے وزیر داخلہ کی طرف بڑے معنی خیز انداز میں دیکھا تھا۔

''جیسور کے قریبی جنگلات میں ملٹری آپریشن کی رپورٹ ملنے اور بڑی تعداد میں ملک دشمنوں کی گرفتاری کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ بڑی حد تک خطرہ ٹل گیا ہے مگر تمہارے بیان سے اس کی نفی ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہاں ابھی معاملہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔'' صدر مملکت مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''جی ہاں صدر محترم!'' میں ادب سے بولی۔ ''میں نے محترم وزیر داخلہ کو ایک لسٹ دی ہے جس میں ملک کے دونوں حصوں میں سرگرم عمل ملکی اور غیر ملکی امریکی ایجنٹوں کے اصل اور فرضی نام پتے درج ہیں۔ انہی میں وہ اعلیٰ سرکاری افسران بھی ہیں جو امریکی ایجنٹوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔''

''آپ نے اس سلسلے میں کوئی کارروائی کی؟'' صدر مملکت نے وزیر داخلہ سے سوال کیا۔

''جی نہیں۔'' وزیر داخلہ نے صاف گوئی سے کہا' پھر مزید بولے۔ ''اس سلسلے میں کوئی کارروائی کرنے میں یہ قباحت ہے کہ ان تمام افراد کے خلاف ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''کیوں عذرا کیا تم ان لوگوں کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکیں؟'' صدر مملکت مجھ سے پوچھنے لگے۔

''جی نہیں صدر مملکت!'' میں جواباً بولی ''اور اس کی وجہ ہے۔'' یہ کہہ کر میں انہیں امریکی ایجنٹ سولومن کے بارے میں بتانے لگی۔ میں نے انہیں یہ تو نہیں بتایا کہ پراسرار قوتوں کے ذریعے سولومن سے میں نے سب کچھ معلوم کیا تھا۔ ہاں یہ ضرور بتا دیا کہ دہلی میں اس سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا اور میں اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ پھر وہ میرے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا مگر میں نے اس دوران میں اس سے بہت قیمتی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ میں نے صدر مملکت کو یہ بھی بتایا کہ سولومن ہی ہندوستان اور پاکستان میں امریکی ایجنٹوں کا سربراہ ہے۔

''اسی صورت میں تو فوری طور پر ان تمام ملکی اور غیر ملکی ایجنٹوں کی گرفتاری بہت ضروری تھی جن کے نام پتے حاصل ہو گئے تھے۔'' صدر مملکت کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ ''اب ان لوگوں کا ہاتھ آنا آسان نہیں ہوگا۔ عذرا کے چنگل سے نکلنے کے بعد اس نے تمام ملکی اور غیر ملکی ایجنٹوں کو پیش آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا ہوگا اور...... اور اب تک وہ سب انڈر گراؤنڈ جا چکے ہوں گے۔ اس کے باوجود ان کی گرفتاری کے اقدامات ضروری ہیں' بہت ضروری!'' یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگے پھر قدرے توقف سے بولے۔ ''ہاں...... صرف یہی...... یہی ایک راستہ ہے۔''

اس سے پہلے کہ صدر مملکت سے کوئی وضاحت کی درخواست کرتا وہ خود ہی ہمیں بتانے لگے۔ انہوں نے ملکی اور غیر ملکی ایجنٹوں کی گرفتاری کے مسئلے کا حل تلاش کیا ہے! ہر چند کہ یہ حل قطعی غیر جمہوری

ان دونوں وزراء نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ صدر مملکت ایک صدارتی حکم جاری کرنا چاہتے تھے جس کی رو سے کسی بھی شخص کو حراست میں لیا جا سکتا تھا اور گرفتار ہونے والا شخص کسی بھی عدالت سے رجوع نہیں کر سکتا تھا۔ اس شخص کی گرفتاری کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ صدر مملکت کے اس حکم نامے کا نام اسی نشست میں ڈیفنس آف پاکستان رول تجویز کیا گیا۔ اسے یہ نام اس وقت کے وزیر داخلہ نے دیا تھا۔ یہی حکم نامہ بعد میں ڈی پی آر کے مختصر نام سے مشہور ہوا۔ اس حکم نامے کو کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی رو سے کسی بھی شخص کو لامتناہی مدت کے لئے حراست میں رکھا جا سکتا تھا۔

''اس حکم سے ہمیں ایک اور فائدہ ہوگا کہ ہم اپنے سیاسی مخالفین کو بھی زیر کر سکیں گے۔ ڈی پی آر کے تحت ان میں کسی کو بھی ہم جب چاہیں گے گرفتار کر لیں گے۔'' صدر مملکت نے تائید طلب انداز سے وزیر داخلہ کی طرف دیکھا۔

وزیر داخلہ نے صدر مملکت کی تائید کی اور ان کی رائے سے پورا اتفاق کیا مگر مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔ اپنے سیاسی حریفوں سے اس طرح نمٹنا انصاف کے خلاف تھا لیکن ظاہر ہے کہ یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میرا مسئلہ صرف ان افراد کی گرفتاری تھا جو میرے ملک کے خلاف سرگرم عمل تھے اور یہ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ میں اسی لئے کچھ نہیں بولی۔

وزیر خارجہ نے اب تک ہونے والی گفتگو میں زیادہ حصہ نہیں لیا تھا۔ یوں بھی گفتگو اب تک داخلی مسائل ہی پر ہو رہی تھی۔ سرمئی سوٹ اور سرخ ٹائی میں وزیر خارجہ کی شخصیت بھی خاصی جچ رہی تھی۔ یہ بات پہلے سے میرے علم میں تھی کہ صدر مملکت انہیں بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کا سبب وزیر خارجہ کی ذہانت تھی۔ صدر مملکت انہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ وزیر خارجہ کو صدر مملکت ہی کی جوہر شناس نظروں نے اس مقام تک پہنچایا تھا۔

جب ملکی اور غیر ملکی ایجنٹوں کی گرفتاری کا مسئلہ حل ہو گیا تو موجودہ حالات میں خارجہ پالیسی پر بحث آئی۔ بحث کا آغاز صدر مملکت ہی نے کیا تھا۔ ان کے خیال میں اب وقت آ گیا تھا کہ ہر معاملے میں آنکھیں بند کر کے امریکی تجاویز قبول نہ کی جائیں۔ پھر انہوں نے وزیر خارجہ کی طرف دیکھتے ہوئے ان سے خیالات کا اظہار کرنے کو کہا۔

''امریکی ایجنٹ اپنی حکومت کے ایما پر ہمارے ملک میں جو خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں وہ ہماری سلامتی کے خلاف ہے۔'' وزیر خارجہ نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''وہ مشرقی پاکستان کو ہم سے الگ کرنا چاہتے ہیں اور یہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جائے گا! ہمیں اس وقت ایک ایسی آزاد خارجہ پالیسی کی ضرورت ہے کہ کسی بھی سپر پاور کا ہم پر حکم نہ چل سکے۔ مسلم ورلڈ کے علاوہ ہمیں کمیونسٹ ممالک سے بھی اپنے تعلقات استوار کرنا چاہئیں جن میں سرفہرست چین ہے جو بلاشبہ دنیا کی تیسری بڑی طاقت بن کر ابھر رہا ہے۔ چین سے ہمارے تعلقات کی صورت میں بھارت کا دباؤ بھی ہم پر کم ہو جائے گا۔ بھارت اور چین کے تعلقات خراب ہیں۔ ایسی صورت میں جب ہم چین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے تو وہ یقیناً ہمیں خوش آمدید کہے گا۔''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب سہروردی ملک کے وزیراعظم تھے تو انہوں نے اس میں پہل کی تھی۔ میری مراد پاک چین تعلقات سے ہے۔'' وزیر داخلہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ ''سہروردی کے بعد اس سلسلے میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' وزیر خارجہ نے وزیر داخلہ کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ ''گزشتہ چند بر کے دوران میں چین اور پاکستان ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں۔ میرا چین کا دورہ اسی سلسلے کی تھی لیکن ابھی تک امریکہ کی وجہ سے یہ تعلقات مستحکم نہیں ہو پائے۔ امریکہ چین سے ہمارے تعلقا اپنے حق میں بہتر نہیں سمجھتا۔ جہاں تک میرا خیال ہے میرے چین کے دورے کے بعد ہی سے ام ایجنٹوں نے پاکستان میں ریشہ دوانیاں شروع کی ہیں۔ ہمیں اب امریکہ کے چنگل سے نکلنا ہوگا! اسی سوویت روس کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات کبھی بہتر نہیں رہے۔''

''اگر تمہارا یہی خیال ہے کہ گومگو کی اس کیفیت سے ہمیں نکلنا چاہیے تو پھر کھل کر ا اقدامات کرنا ہوں گے جس سے ساری دنیا پر واضح ہو جائے کہ اب ہم امریکہ کے زیر اثر نہیں چاہتے۔'' صدر مملکت نے وزیر خارجہ سے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''اس کے نتائج کیا ہوں اس سوال پر بھی ہمیں غور کرنا ہوگا۔ یہ معاملہ بہرحال اتنا آسان نہیں ہے۔''

''نتائج تو ظاہر ہیں!'' وزیر خارجہ نے کہا۔ ''امریکی امداد اور قرضوں میں کمی کر دی جائے گی''

''تو پھر یہ کمی کس طرح پوری کی جا سکے گی؟'' صدر مملکت نے سوال کیا۔

''ظاہر ہے کہ ہم اپنے پیداواری وسائل بڑھانے کے ساتھ ساتھ مسلم ورلڈ سے تعاون کی اپ کریں گے۔ پاکستان دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور مسلم ممالک بھی ہماری امداد کرنے یا سے تعاون کرنے میں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ پھر چین سے بہتر تعلقات استوار ہونے کی صورت میں بھ ہمیں یقیناً اپنی معیشت کو سہارا دینے میں مدد ملے گی۔ امریکہ اس وقت مشرقی پاکستان میں جو کھیل کھ چاہتا ہے وہ ہمارے ساتھ کھلی دشمنی ہے اور دشمنی کا جواب دوستی نہیں ہوتا۔ ہم اتنی مہنگی دوستی افورڈ نہیں ک سکتے۔'' وزیر خارجہ کی باتیں یقیناً حقائق پر مبنی تھیں۔ میں خود کو ان کے خیالات سے متفق محسوس کر رہی تھی۔

صدر مملکت نے بھی وزیر خارجہ کی باتوں سے اتفاق کیا اور اس اتفاق کا مطلب ملک کی آئند خارجہ پالیسی میں واضح تبدیلی تھی۔

''خارجہ پالیسی میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ امریکہ کو ایسا کوئی موقع نہ دیا جائے جو وہ عالمی برادری میں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کر سکے۔ اس کے پاس بہرحال ایک کارڈ ایسا ہے جسے وہ ہر موقع پر پاکستان کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔'' وزیر خارجہ کچھ سوچتے ئے کہنے لگے۔

''ہاں تم نے کچھ دن قبل بھی اس طرف اشارہ کیا تھا۔'' صدر مملکت بولے۔ ''یہی کارڈ ہے نا اس کے پاس کہ پاکستان میں ایک غیر جمہوری حکومت ہے جسے عوام کی تائید حاصل نہیں! جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ کوئی اہم بات نہیں۔ گزشتہ دنوں میں نے اس مسئلے پر بہت غور و فکر کیا ہے اور کچھ پرانے سیاست دانوں سے بھی بات کی ہے۔ ان میں سے ایک سیاست دان نے بڑی حوصلہ افزا باتیں کی ہیں۔

است دان تحریک پاکستان میں بھی اہم کردار ادا کر چکا ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ اس سلسلے ں ایک لائحہ عمل بنا کر دے۔ عوام کی تائید کا کیا طریقہ کار ہونا چاہیے اس پر کام ہو رہا ہے اور جب میں ام سے مطمئن ہو گیا تو انتخابات کا اعلان بھی کر دیا جائے گا۔ جن خطوط پر اس سلسلے میں کام ہو رہا ہے ن کی روشنی میں بلاتامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ حکومت کو عوام کی تائید حاصل ہو جائے گی' پھر اس مت کو غیر جمہوری حکومت نہیں کہا جا سکے گا۔''

''اگر ایسا ہو گیا تو اس سے عالمی برادری میں پاکستان کا وقار بلند ہو جائے گا۔'' وزیر داخلہ نے ہا۔

''اور پھر امریکہ کے پاس پاکستان کے خلاف کوئی کارڈ نہیں رہے گا۔'' وزیر خارجہ بھی بولے۔

''اب مسئلہ رہ جاتا ہے موجودہ حالات کے پیش نظر مشرقی پاکستان میں حکومت کی حکمت عملی میرا خیال ہے کہ اس میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔'' صدر مملکت' وزیر داخلہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''شرقی پاکستان کے عوام کو امریکہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے جن خطوط پر ایکسپلائٹ کر رہا ہے ان کا توڑ نا چاہیے۔''

''اگر صدر مملکت اجازت دیں تو میں بھی کچھ عرض کروں!'' میں بول اٹھی۔

''ہاں ہاں کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟ تمہاری بات اس لحاظ سے بھی زیادہ اہمیت کی ہو گی کہ تم نے ل ہی میں وہاں کا دورہ کیا ہے اور براہ راست امریکی ایجنٹوں سے نبرد آزما رہی ہو۔ یقیناً تم نے ان ات کا قریب سے جائزہ لیا ہو گا جن سے امریکہ فائدہ اٹھا کر مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے بیج بو ا ہے۔'' صدر مملکت نے کہا۔

''صدر محترم!'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''مشرقی پاکستان میں بے حد غربت ہے۔ وہاں کے ام میں بے پناہ احساس محرومی ہے اور امریکہ ان کے اسی احساس محرومی کو اپنے طور پر ایکسپلائٹ کرتا ہا ہے۔ پڑھے لکھے طبقے میں یہ احساس محرومی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ......'' میں کچھ کہتے کہتے گئی۔ مجھے معاً یہ احساس ہوا تھا کہ جو بات میری زبان پر آنے والی ہے صدر مملکت اسے پسند نہیں ریں گے کیونکہ مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا تھا یا ہو رہا تھا یہ انہی کی پالیسیوں کا نتیجہ تھا۔

''بلا جھجک کہو جو کہنا چاہتی ہو۔'' صدر مملکت نے یقیناً یہ محسوس کر لیا کہ میں کچھ کہتے ہوئے لک رہی ہوں۔

صدر مملکت کی حوصلہ افزائی کے باوجود میں نے مصلحتاً وہ بات نہیں کی جو میرے دل میں تھی۔ اصل میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ مشرقی پاکستان کے عوام سے انصاف نہیں کیا گیا۔ ون یونٹ بنا کر ان سے کے حقوق چھین لئے گئے ہیں۔ مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگ ان پر مسلط کر دیئے گئے ۔ ہر شعبے میں یہی حال ہے مگر میں نے صرف احساس محرومی کی وجہ ان امپلائمنٹ کو بتایا جو نصف سچائی ا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو عذرا! بے روزگاری کا سد باب ضروری ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اقدامات بھی لازمی ہیں۔" صدر مملکت نے میری بات سن کر کہا۔

"بے روزگاری کا سد باب اس طرح ہو سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں زیادہ سے زیادہ صنع لگائی جائیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "اس طرح وہاں کے باشندوں کو بڑی تعداد میں روزگار فراہم سکتا ہے۔ ہماری وزارت صنعت کو چاہئے کہ وہ صنعتکاروں کو وہاں صنعتیں لگانے کی ترغیب دے۔ ا سلسلے میں انہیں ٹیکسوں کی چھوٹ بھی دی جاسکتی ہے۔ صنعتکاروں کو اگر اس طرح کی ترغیبات دی جا تو یقیناً وہ مشرقی پاکستان میں مزید صنعتیں لگانے پر آمادہ ہو جائیں گے۔"

صدر مملکت نے میری تجویز کو پسند کیا پھر مزید بولے۔ "ان لوگوں کا ایک کامپلیکس زبان ہے۔ گزشتہ دو تین ماہ سے زبان کے مسئلے پر بھی مختلف طلبہ تنظیمیں مظاہرے کرتی رہی ہیں۔ میں عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ بنگلہ زبان کو بھی قومی زبان کا درجہ کیوں نہ جائے! میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا فرق پڑے گا۔"

یہ سن کر میں سناٹے میں رہ گئی۔ میرے خیال میں یہ ایک بھیانک سیاسی غلطی تھی اور اس اثرات دور رس تھے۔ مستقبل میں یہ "سیاسی رشوت" انتہائی تباہ کن نتائج کی حامل ہو سکتی تھی۔ میں نے سب کچھ سوچا تو ضرور مگر بولی نہیں۔ مجھے اس بات کا پورا احساس تھا کہ میں اس وقت ایک ایسی شخصیہ کے سامنے بیٹھی ہوں جسے ملک کے اعلیٰ ترین اختیارات حاصل ہیں۔ اس کے کہے ہوئے الفاظ قانو درجہ رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں بنگلہ زبان یا ملک میں بولی جانے والی کسی بھی اور زبان کو قومی زبا درجہ دینا نظریہ پاکستان کے خلاف تھا۔ پاکستان اسلام اور اردو زبان کے نام پر ہی تو حاصل کیا گیا تھا میں غالباً اپنی سرگزشت میں پہلے بھی یہ کہیں لکھ چکی ہوں کہ قائداعظمؒ نے ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہو تین بار یہ بات زور دے کر کہی تھی کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہو گی۔

"آپ کچھ دیگر اقدامات کا بھی ذکر کر رہے تھے۔" وزیر داخلہ نے صدر مملکت کو یاد دلایا۔

"دیگر اقدامات میں ایک تو یہی زبان کا مسئلہ تھا۔ آپ کو شاید یاد ہو گا کہ مرحوم وزیراع لیاقت علی خان کے زمانے میں بھی یہ مسئلہ بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھا تھا مگر اسے طاقت کے ذریعے دبا گیا تھا۔ وہ تحریک غالباً طلبہ نے چلائی تھی۔ ڈھاکہ میں شہید چوک اسی واقعے کی یادگار ہے۔ طلبہ پر گ چلائی گئی تھی اور بڑی تعداد میں طلبہ مارے گئے تھے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ زبان کا مسئلہ بہ پرانا ہے اور یہ کسی بھی وقت پھر اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے کے حل سے موجودہ حکومت کو مشرقی پاکستہ کے عوام کی ہمدردیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔" صدر مملکت نے وزیر خارجہ سے را طلب کی۔

"یہ مسئلہ یقیناً غور طلب ہے لیکن فوری طور پر میں اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا" وزیر خارجہ نے بڑی ذہانت اور دانش مندی سے اپنا دامن بچایا۔

"بہر حال یوں سمجھیں کہ کہیں کسی محاذ پر ہمیں ان کے مطالبات ماننے ہیں اور کسی مرحلے پر سختی کے ساتھ ان سے نمٹنا ہے۔ ملک دشمن عناصر کو بہر صورت برداشت نہیں کیا جائے گا خواہ اس کے لئے طاقت ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑے!" صدر مملکت کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"عذرا کے پاس ایک اور اہم اطلاع بھی ہے جس کا تعلق ہمارے ایک برادر اسلامی ملک انڈونیشیا سے ہے۔" وزیر داخلہ نے صدر مملکت کو مخاطب کیا۔

صدر مملکت نے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر رچرڈ کے بارے میں بتایا کہ وہ امریکہ کا خطرناک ایجنٹ ہے اور اس کا ہیڈ کوارٹر مصر کے شہر قاہرہ میں ہے۔ اندازے کے مطابق ڈاکٹر رچرڈ ہی تمام ایشیائی ممالک میں پھیلے ہوئے امریکی ایجنٹوں کا سربراہ ہے اور سولومن بھی اسی کا دست راست ہے۔ ڈاکٹر رچرڈ اور بھارتی وزیراعظم کی ملاقات کا بھی میں نے ذکر کیا' پھر مزید بتایا کہ ڈاکٹر رچرڈ بذات خود بھارت سے انڈونیشیا روانہ ہو چکا ہے۔ امریکہ انڈونیشیا میں صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں امریکی ایجنٹ خاصی راہ ہموار کر چکے ہیں۔ صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹنے کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ساری ہی عالمی برادری پر بات منکشف ہو چکی ہے کہ صدر سوئیکارنو اپنے ملک میں سوشلسٹ معاشرے کا قیام چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ امریکہ یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے! اطلاع کے مطابق فوجی انقلاب کے ذریعے صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ لٹ دیا جائے گا اور پھر جو بھی حکومت آئے گی وہ امریکہ کی حامی ہو گی۔

میں نے محسوس کیا کہ وزیر خارجہ میری بات بڑی توجہ سے سن رہے ہیں۔

اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "برادر اسلامی ملک ہونے کے ناتے ہمارا فرض ہے کہ ہم انڈونیشیا کو اس خطرے سے فوری طور پر آگاہ کر دیں۔"

"یقیناً!" صدر مملکت نے میری بات ختم ہوتے ہی کہا۔ پھر وہ وزیر خارجہ سے مخاطب ہوئے۔ "میرا خیال ہے کہ یہ اطلاع انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ میں خود صدر سوئیکارنو کو ایک خط لکھ کر اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں اور میرا یہ خط لے کر خود تم انڈونیشیا جاؤ گے۔"

ظاہر ہے کہ صدر مملکت کا یہ کہنا وزیر خارجہ کے لئے حکم ہی کا درجہ رکھتا تھا اس لئے انہوں نے فوراً انڈونیشیا جانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

اس واقعے کے بعد جب سن پینسٹھ میں پاک بھارت جنگ ہوئی تو صدر سوئیکارنو نے پاکستان کے اس احسان کا بدلہ اتار دیا۔ صدر سوئیکارنو نے اس جنگ میں انڈونیشی بحری افواج کو پاکستان کے ڈسپوزل پر چھوڑ دیا تھا اور یہ بہت بڑی بات تھی۔ پینسٹھ کی جنگ میں اسی لئے بھارت پاکستان پر بحری راستے سے حملہ نہیں کر سکا تھا۔

صدر مملکت سے اس روز ہونے والی تفصیلی ملاقات میرے نزدیک انتہائی اہمیت کی حامل ثابت ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں بہت سی ایسی باتیں میرے علم میں آئی تھیں جو بعد میں پاکستان کی تاریخ کا

حصہ بن گئیں اور جن کے بڑے دور رس نتائج نکلے۔ یہ ملاقات رات گیارہ بجے تک جاری رہی۔ اس دوران میں ایک مرتبہ چائے کا دور اور چلا تھا۔

واپسی میں مجھے وزیر داخلہ نے اپنی کار میں بٹھالیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں خود تمہیں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس چھوڑ دوں گا۔

سفر کے دوران میں جب وزیر داخلہ نے اچانک مجھ سے صدر مملکت کے مشیر شیخ مجید سے ملاقات کی بابت دریافت کیا تو میں چونک اٹھی۔ انہیں اس ملاقات کا علم ہو جانا میرے لئے تعجب خیز تھا۔ اسی عالم حیرت میں میں نے ان سے ایک بچکانہ سوال کہ آپ کو اس ملاقات کا علم کیسا ہوا؟ حالانکہ اگر میں خود اپنے ذہن سے یہ سوال کرتی تو مجھے اس کا جواب مل جاتا۔ سیدھی سی اور سامنے کی بات تھی کہ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرائے جانے والے لوگ معمولی حیثیت کے نہیں ہوتے۔ اسی سبب ان پر نظر بھی رکھی جاتی ہے اور ان کے متعلق اوپر والوں کو رپورٹ بھی دی جاتی ہے۔ وزیر داخلہ کو انہی ذرائع سے شیخ مجید اور میری ملاقات کا علم ہوسکتا تھا مگر فوری طور پر یہ بات میرے ذہن میں نہیں آسکی تھی۔

میرے سوال کے جواب میں وزیر داخلہ مسکرا کر بولے۔ ''حیرت ہے عذرا کو تم ایسی ذہین لڑکی یہ سوال کر رہی ہے!'' پھر انہوں نے وہی سب کچھ صاف صاف بتا دیا جس کا میں اوپر ذکر کر چکی ہوں۔ اس کے بعد وہ بولے۔ ''یہ تو ظاہر ہے کہ شیخ مجید سے تم پہلے بھی کبھی مل چکی ہو گی۔ مجھے صرف یہ پوچھنا تھا کہ اس ملاقات میں اس نے کوئی خاص بات تو نہیں کی؟ یہ میں اس لئے بھی دریافت کر رہا ہوں کہ ان دنوں اس کی رپورٹس کچھ اچھی نہیں ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ وہ اور اس کا پورا گروپ صدر مملکت کے اقدامات سے کچھ مطمئن نہیں ہے۔''

پھر میں نے وزیر داخلہ سے کچھ نہیں چھپایا۔ مختصراً میں نے انہیں تمام بات بتا دی۔

میری بات سن کر وزیر داخلہ بہت خوش ہوئے اور بولے۔ ''عذرا! تم نے واقعی ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس موقع پر جب کہ خارجہ پالیسی میں واضح تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں حکومت سے بائیں بازو کے افراد کی علیحدگی یقیناً حکومت کے آئندہ اقدامات کو مشتبہ بنا دیتی۔ عجیب سا لگتا ہے کہ تمہارا تعلق بزنس کمیونٹی سے ہے۔ تمہیں تو پولیٹیشن ہونا چاہئے تھا۔ تمہارے اندر تمام ایسے جراثیم موجود ہیں جو ایک بیدار ذہن سیاست دان میں ہونا ضروری ہیں۔''

''کیوں شرمندہ کر رہے ہیں مجھے! میں کیا میری بساط کیا!'' میں نے انکساری سے کام لیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کل ٹھہرو گی نا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے اب اس کی ضرورت نہیں رہی میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ یوں بھی میں کافی عرصے سے باہر رہی ہوں اور اس وجہ سے اپنی فرم کی طرف توجہ نہیں دے سکی اس لئے بہتر یہی ہے کہ کل کسی پہلی فلائٹ سے واپس کراچی چلی جاؤں۔'' میں نے عذر پیش کیا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ میں تمہارا نقصان نہیں چاہتا۔ ویسے صدر

مملکت سے تمہاری گفتگو مجھے پسند آئی۔ تم نے بڑی متوازن گفتگو کی۔ میں نے کئی بار یہ محسوس کیا کہ صدر مملکت تمہاری بات نہایت توجہ اور انہماک سے سن رہے ہیں۔ تمہاری یہ تجویز بھی بہترین تھی کہ مشرقی پاکستان میں نئی صنعتیں لگائی جائیں اور صنعت کاروں کو اس کی ترغیب دینے کے لئے ٹیکسوں میں کچھ چھوٹ دی جائے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے کچھ دن بعد اناؤنس ہونے والے بجٹ میں تمہاری اس تجویز پر عمل درآمد کی ابتدا ہو جائے گی۔''

''مجھے یہ خوشی ہے کہ میں آپ کی توقعات پر پوری اتری کیوں کہ آپ ہی کے ایما پر صدر مملکت نے مجھے شرف ملاقات دیا تھا ورنہ مجھے اس اہم میٹنگ میں شریک نہ کیا جاتا جس میں ملک کی خارجہ پالیسی کو ایک نئی نہج پر استوار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔''

اسی گفتگو کے دوران میں ہماری کار اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی حدود میں داخل ہو گئی۔

''تمہیں کل صبح نو بجے تک کراچی جانے والی کسی پہلی فلائٹ کا ٹکٹ مل جائے گا۔'' وزیر داخلہ نے کہا۔

''لیکن میں ...... میں خود بھی سفر کے اخراجات برداشت کر سکتی ہوں پھر اس کی کیا ضرورت ہے!''

''لڑکی! تم میری نہیں صدر مملکت کی مہمان تھیں اور یہ حکم انہی کا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ان کا حکم پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔''

''پھر تو مجھے مجبوراً لکیر کا فقیر بننا پڑے گا۔'' میں ہنس کر بولی۔

''ہاں۔'' وزیر داخلہ بھی ہنس دیئے پھر بولے۔ ''تم نے مجھے جو لسٹ دی تھی ان تمام افراد کی گرفتاری کے احکام میں صدراتی حکم کے فوراً بعد جاری کر دوں گا۔ مجھے توقع ہے کہ کل ہی صدر مملکت یہ نیا حکم جاری کر دیں گے اور پھر کل ہی اس کی رو سے کارروائی شروع کر دی جائے گی۔ تمہاری خواہش کے مطابق بیک وقت ملک کے دونوں حصوں میں آپریشن ہو گا۔ بڑے پیمانے پر!'' ان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی کار رک گئی مگر وہ مزید بولتے رہے۔ ''تمہارے اطمینان کے لئے آپریشن شروع ہو چکا ہے' میں کل رات فون پر تم سے بات کر لوں گا۔''

''بہتر ہے۔'' میں بولی۔ ''ویسے میں اس آپریشن کے نتائج جاننے کے لئے بھی انتہائی بے چین رہوں گی اگر......''

''اندازہ ہے مجھے' پورا اندازہ ہے۔'' وزیر داخلہ نے کہا۔ ''میں تمہیں یقیناً باخبر رکھوں گا۔''

''اچھا اب اجازت ہے۔'' میں بولی۔

''ہاں جاؤ اب آرام کرو جا کر! خدا حافظ!'' وہ بولے۔

''خدا حافظ!'' یہ کہہ کر میں کار سے اتر گئی اور پھر اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیور نے صدر دروازے ہی کے سامنے کار روکی تھی۔

دروازے ہی پر ایک استقبالیہ افسر موجود تھا۔ اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور سلام بھی کیا۔ میں سر کے خفیف سے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگی تو اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تقریباً نصف گھنٹے قبل شیخ مجید نے فون کیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ اس کے فون کرنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ میں کل اسلام آباد میں رک رہی ہوں یا نہیں!

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور پھر فون پر شیخ مجید کا نمبر ملایا۔ مجھے علم تھا کہ یہ خبر بھی وزیر داخلہ تک پہنچ جائے گی اور ممکن ہے فون بھی ٹیپ کیا جائے کہ میں نے اس سے کیا بات کی ہے مگر مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ شیخ مجید سے ہونے والی ملاقات کے متعلق وزیر داخلہ کو سب کچھ بتا چکی تھی۔

دوسری جانب سے فون اٹھانے میں دیر نہیں کی گئی۔ فون پر شیخ مجید ہی تھا۔ اس نے میری آواز پہچانتے ہی کہا۔ ”مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور فون کریں گی۔“

”کیا کوئی خاص بات تھی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”صدر مملکت سے آپ کی ملاقات خاصی طویل رہی۔ ظاہر ہے کہ آپ ابھی لوٹی ہیں ورنہ اس سے پہلے فون کرتیں!“ اس نے پر اشتیاق لہجے میں کہا۔

”اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں شیخ صاحب کہ یہ ملاقات کس سلسلے میں تھی تو آپ کو مایوسی ہو گی۔“ میں نے صاف گوئی اختیار کی۔

”مجھے علم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ایسی باتیں فون پر نہیں کی جاتیں۔“ وہ آہستہ سے ہنس کر بولا پھر کہنے لگا۔ ”میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کل ملاقات کی کوئی صورت ہے؟“

”جی نہیں، میں کل صبح پہلی فلائٹ سے کراچی روانہ ہو رہی ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”بہر حال آپ اپنا وعدہ یاد رکھیے گا اب کراچی آئیں تو ملئے گا ضرور!“

”ممکن ہے کہ آئندہ ہفتے مجھے کراچی آنا پڑے۔ میں فون پر آپ سے رابطہ قائم کر لوں گا۔ بہر حال زحمت ناوقت کے لئے معذرت خواہ ہوں، خدا حافظ۔“

جواباً میں نے بھی ”خدا حافظ“ کہہ کر ریسیور رکھ دیا پھر بستر پر دراز ہو گئی۔ کمرے کا دروازہ میں پہلے ہی بند کر چکی تھی مگر کمرے میں زیرو پاور کا بلب جلانے اور دیگر روشنیاں گل کرنے کے لئے مجھے دوبارہ بستر سے اٹھنا پڑا۔

ملکی اور غیر ملکی ایجنٹوں کی گرفتاری کا مسئلہ حل ہونے کے بعد اب میرا ذہن قدرے پرسکون ہو چکا تھا لیکن ایک سوال مجھے بار بار پریشان کر رہا تھا کہ میرے ذہن کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد کہیں سولومن کو یہ احساس تو نہیں ہو گیا کہ وہ مجھے سب کچھ بتا چکا ہے؟ اس سوال کا جواب اگر اثبات میں تھا تو پھر میری ساری تگ و دو پر پانی پھر جاتا۔ میں اسی سوال پر غور کر رہی تھی کہ اچانک میرے سارے

جسم میں ایک لذت انگیز سرسراہٹ سی دوڑنے لگی۔ مجھ پر وہی آشنا کیفیت طاری ہونے لگی جو خود میرے لئے بھی ایک معمہ تھی۔ اس کیفیت میں مجھ پر عموماً مستقبل کے اسرار منکشف ہو جاتے تھے۔ گہرے سرور انگیز نشے کی سی حالت میں میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور پھر مجھے خود اپنی آواز سنائی دینے لگی حالانکہ میرے لب ساکت تھے۔ میں اپنی آواز واضح طور پر سن رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے جو سوال بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا مجھے اس کا جواب مل رہا تھا۔

عذرا خان! تمہارے ذہن کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی سولومن کو شدید خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا کہ وہ تمہیں کیا کیا بتا چکا ہے! ظاہر ہے کہ اس نے فوری طور پر اپنے ساتھیوں کو خطرے سے آگاہ کر دیا اور وہ روپوش ہو گئے۔ تمہارے لئے شاید یہ بات بھی تعجب خیز ہو کہ اس نے صرف اپنے ہم وطن ایجنٹوں کو خطرے سے آگاہ کیا ہے جو مقامی اعلیٰ افسران یا دیگر افراد اس کے آلہ کار بنے ہوئے تھے وہ ابھی تک پیش آنے والے خطرے سے بے خبر ہیں۔ ان میں سے صرف مشرقی پاکستان کے ہوم سیکرٹری عبید الرحمان چودھری کی دوسری حیثیت بھی ہے۔ وہ سبود مکر جی کی حیثیت سے اب بھی سولومن کے کام آ سکتا ہے۔ بقیہ مقامی ایجنٹوں کو خطرے سے آگاہ نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا راز کھل جانے کے بعد اب وہ سولومن کے لئے سودمند نہیں رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ روپوش ہو گئے اور اپنے سرکاری عہدوں پر برقرار نہ رہ سکے تو سولومن کے کس کام کے......! اور سنو خان! سولومن تمہیں آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہے۔ تمہاری تلاش میں وہ دہلی سے کراچی پہنچ چکا ہے۔ وہ ہر قیمت پر تمہیں اپنے راستے سے ہٹا کر اپنے آقاؤں کے حکم کی تعمیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ سولومن کے آقا تمہاری موت کا حکم جاری کر چکے ہیں۔ تمہارے سر پر شدید خطرہ منڈلا رہا ہے عذرا خان اور تمہیں اس خطرے سے اسی صورت میں نجات مل سکتی ہے کہ تم سولومن کو ختم کر دو۔ سولومن اس وقت کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں چینی سیاح کے روپ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کا فرضی نام چن ای ہے۔

پھر مجھے اس ہوٹل کا نام بھی معلوم ہو گیا جہاں سولومن کا قیام تھا۔ اس کے بعد آواز آنا بند ہو گئی۔

اس پراسرار آشنا تجربے کے چند لمحوں بعد ہی میری حالت اعتدال پر آ گئی۔ سولومن کی طرف سے مجھے جو خطرہ تھا وہ قطعی درست ثابت ہوا تھا۔ یہ بات میرے لئے کسی بڑی تشویش کا سبب نہیں بن سکتی تھی کہ میرے سر پر شدید خطرہ منڈلا رہا تھا اور یہ کہ سولومن دہلی سے کراچی پہنچ چکا تھا۔ میری تو ساری زندگی ہی خطرات سے عبارت تھی۔ میں اب تک خطرات ہی سے کھیلتی آئی تھی۔ میرا ایمان تھا کہ ہر ذی روح کی طرح ایک دن مجھے بھی مرنا ہے، میری موت کا بھی ایک وقت مقرر ہے اور وقت سے پہلے دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت کی آغوش میں نہیں پہنچا سکتی۔ میرے اطمینان کا ایک سبب وہ پراسرار اور حیرت انگیز قوتیں بھی تھیں جو قدرت نے مجھے باطل قوتوں سے اپنا دفاع کرنے کے لئے عطا کی تھیں۔ انہی پر اسرار قوتوں کے سبب میں ہمیشہ اپنے حریفوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی مجھے

اپنے خطرناک دشمن پر یہ برتری حاصل تھی کہ اس کے نئے بہروپ سے میں آگاہ ہو چکی تھی۔

سولومن کے بارے میں یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ کراچی میں کہاں اور کس نام سے ٹھہرا ہوا ہے میرے سامنے تین راستے تھے۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ میں خود کراچی پہنچ کر اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتی۔ دوسری راہ یہ تھی کہ میں اسی وقت فون پر ''آپریشن سیل'' سے رابطہ قائم کرتی اور کمانڈر نواز کو تمام صورت حال سے آگاہ کر کے یہ حکم دیتی کہ سولومن کو اغوا کر لیا جائے۔ تیسرا راستہ یہ تھا کہ میں اس سلسلے میں حکومت کا سہارا لیتی۔ میں فون پر وزیر داخلہ سے رابطہ قائم کر کے انہیں یہ اہم اطلاع دے سکتی تھی۔ میں ان تینوں ہی صورتوں پر غور کرنے لگی۔

کراچی پہنچ کر کوئی قدم اٹھانے میں صرف ایک اندیشہ تھا کہ کہیں کسی سبب سولومن اس فائیو سٹار ہوٹل سے غائب نہ ہو جائے۔ سولومن ایسے ذہین اور عیار افراد مستقل طور پر کسی ایک بہروپ میں نہیں رہتے اور نہ ہی کسی ایک جگہ ٹھہرتے ہیں۔ وہ جلد جلد اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں اور اسی کے ساتھ اپنا بہروپ بھی! اس اہم نکتے پر غور کرنے کے بعد میں نے بقیہ دو صورتوں کا جائزہ لیا۔

کچھ ہی دیر غور و خوض کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ مجھے کراچی پہنچنے سے قبل ہی کوئی قدم اٹھانا چاہئے۔ اس ضمن میں ظاہر ہے کہ میں خود اپنے وسائل یعنی ''آپریشن سیل'' ہی پر زیادہ اعتماد کر سکتی تھی۔ میں نے اسی لئے وزیر داخلہ کو فی الحال کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی موجودہ معاملہ براہ راست مجھی سے متعلق تھا۔ فی الوقت سولومن میرے ملک کے خلاف کسی سازش کا منصوبہ نہیں بنا رہا تھا بلکہ اس کا مقصد مجھے راستے سے ہٹانا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ معاملہ میرے اور اس کے درمیان تھا اور خود مجھے اس سے نمٹنا چاہئے تھا۔

پھر میں نے آپریشن سیل کا نمبر ملانے میں دیر نہیں کی۔ چند لمحے بعد ہی دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا اور عثمانی کی آواز سنائی دی۔

''عثمانی! میں اسلام آباد سے عذرا خان بول رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آداب! فرمائیے میڈم؟'' اس کی آواز میں مستعدی آ گئی۔

''سولومن کراچی پہنچ چکا ہے۔ وہ ایک چینی سیاح کے بہروپ میں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آج ہی رات اس پر ہاتھ ڈال دیا جائے! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ کہاں اور کس نام سے ٹھہرا ہوا ہے!''

یہ کہہ کر میں نے اس فائیو سٹار ہوٹل کا نام بتا دیا جہاں سولومن کا قیام تھا پھر یہ بھی کہ اس کا فرضی نام چن ای ہے۔ اس کے بعد میں بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو یہ معلوم کرنے میں زیادہ قباحت نہیں ہو گی کہ اس ہوٹل کے کس کمرے میں وہ موجود ہے۔ ذرا نام پتا دہراؤ!''

عثمانی نے ہوٹل کا نام بتایا اور سولومن کا فرضی نام بھی!

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ پھر بولی۔ ''آج رات سولومن کو ہر قیمت پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں ہونا چاہئے!'' میرا لہجہ تاکیدی تھا۔ ''ایسے مواقع بار بار ہاتھ نہیں آتے۔ تم اگر

مناسب سمجھو تو کمانڈر نواز کو بھی آپریشن سیل بلا لو۔ میں یہاں سے کل صبح کی فلائٹ سے کراچی کے لئے روانہ ہو جاؤں گی۔''

''میڈم! آپ مطمئن رہیں میں سنبھال لوں گا۔ اس سلسلے میں کمانڈر نواز کو زحمت دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

''میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ یہاں اس کی آمد کا مقصد مجھے قتل کرنا ہے۔''

''میں سمجھ گیا میڈم!'' عثمانی بولا۔ ''آپ یہ چاہتی ہیں کہ اس کی طرف سے متوقع حملے سے قبل ہی اسے زیر کر لیا جائے۔''

''تم ٹھیک سمجھے!'' میں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو جاؤ گے...... اور ہاں سنو میں یہاں تمہاری رپورٹ کی منتظر رہوں گی۔ میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوئی ہوں' یہاں کا نمبر لکھ لو!'' یہ کہہ کر میں نے اسے ٹیلی فون نمبر لکھوا دیا۔

''اور کوئی خاص بات میڈم!'' عثمانی نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواباً کہا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا مگر نیند میری آنکھوں سے جیسے کوسوں دور جا چکی تھی۔ اس وقت اگر میں خود کراچی میں موجود ہوتی تو یقیناً اتنی فکر مند نہ ہوتی۔ عثمانی کی ذہانت پر مجھے پورا اعتماد تھا اسی لئے میں نے کمانڈر نواز کو ''آپریشن سیل'' بلوانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ میرے نزدیک عثمانی ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کا اہل تھا۔ کمانڈر نواز اور عثمانی کی تربیت براہ راست میں نے ہی کی تھی۔

محتاط اندازے کے مطابق سولومن پر ہاتھ ڈالنے کی کارروائی میں کم از کم دو گھنٹے لگ جانا معمولی بات تھی۔ مجھے تین بجے کے بعد ہی عثمانی اس سلسلے میں رپورٹ دے سکتا تھا۔

پھر میرے لئے دو گھنٹے گزارنا مشکل ہو گیا۔ میں بستر پر لیٹ تو گئی مگر کروٹیں بدلتی رہی۔ جب تین بج گئے تو میں بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اب کسی بھی لمحے ٹیلی فون کی گھنٹی بج سکتی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ میرا اضطراب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مزید پندرہ منٹ اسی اضطراب میں گزر گئے۔ ٹھیک سوا تین بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ فون کرنے والا عثمانی ہی تھا۔

''میڈم! ہم ابھی ابھی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچے ہیں اور......''

''یہ بتاؤ کہ سولومن کو قابو کر لیا گیا یا نہیں؟'' میں اس کی بات کاٹ کر بے صبری سے بولی۔

''جی ہاں میڈم!'' عثمانی نے جواب دیا۔ ''وہ اس وقت آپریشن سیل کے مہمان خانے میں ہے۔''

''ونڈرفل!'' یہ کہتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ میرے نزدیک عثمانی نے بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے مزید کہا۔ ''کیا سولومن ہوٹل کے کمرے میں اکیلا ہی تھا؟''

''جی ہاں میڈم وہ تنہا ہی تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمیں اس پر قابو پانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔'' عثمانی بتانے لگا۔ ''ہم نے ایک ربڑ کے پائپ کے ذریعے اس کے کمرے میں بے ہوش کرنے والی گیس چھوڑ دی تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد ہم چہروں پر گیس ماسک چڑھا کر اور کمرے کا تالا توڑ کر اندر گھس گئے تھے۔ وہ ہمیں مسہری پر بے ہوشی کی حالت میں ملا تھا۔ ابھی تک وہ بے ہوش ہے۔''

''ظاہر ہے کہ تم جانتے ہی ہو وہ کتنا خطرناک اور عیار شخص ہے۔ اسے سخت پہرے میں رکھا جائے! بلکہ جب تک میں خود کراچی نہ پہنچ جاؤں کوئی بھی مہمان خانے کے اس کمرے کو نہ کھولے جہاں اسے رکھا گیا ہے۔

''بہتر ہے میڈم!'' عثمانی سعادت مندی سے بولا۔

اسی لمحے کچھ سوچ کر میں نے عثمانی سے پوچھا۔ ''وہ ہوٹل کے جس کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا تم لوگوں نے اس کی تلاشی بھی لی؟''

''تلاشی......؟ جی نہیں میڈم! میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔''

''غلطی کی تم نے۔'' میں نے کہا۔ ممکن ہے تلاشی میں کوئی کام کی چیز ہاتھ آ جاتی۔ بہر حال......''

''اگر آپ کا حکم ہو میڈم تو ابھی وقت ہے ہم اس کے کمرے کی تلاشی......''

''نہیں اب رہنے دو۔ اچھا خدا حافظ! کل ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہر چند کہ مجھے کامیابی کی خبر مل چکی تھی پھر بھی جانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اپنے اتنے بڑے حریف کے اس آسانی سے زیر ہونے کی مجھے توقع نہیں تھی۔ نیند مجھے ابھی بھی نہیں آ رہی تھی پھر بھی میں سونے کی کوشش کرنے لگی۔ جانے کب میری آنکھ لگی اور پھر اسی وقت بیدار ہوئی جب کوئی میرے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ استقبالیہ افسر تھا۔ اس نے مجھے کراچی جانے والی ایک فلائٹ کا ٹکٹ دیتے ہوئے وقت بھی بتایا کہ کتنے بجے فلائٹ روانہ ہوگی۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور فلائٹ کا وقت ساڑھے دس بجے تھا۔

پھر غسل کر کے لباس تبدیل کرنے اور ناشتے سے فارغ ہونے میں میں نے انتہائی سرعت کا ثبوت دیا۔ ساڑھے نو بجے میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی ایک کار میں ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہو چکی تھی۔

فلائٹ مقررہ وقت پر روانہ ہوگئی۔ ذہن پر نیند کا غبار ہونے کے باوجود میں سولومن ہی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کراچی ایئر پورٹ سے سیدھی ''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر'' ہی جاؤں گی۔ پھر میں نے کراچی پہنچ کر اسی پر عمل کیا۔ مجبوراً مجھے ٹیکسی میں سفر کرنا پڑا تھا جسے میں نے ''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر'' کی عمارت سے کچھ پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد میں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سوٹ کیس اٹھائے پیدل چلتی ہوئی ''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر'' کی عمارت میں داخل ہو رہی تھی۔ ڈیوٹی روم میں کمانڈر نواز تھا۔ وہیں میں نے اپنا سوٹ کیس چھوڑا اور پھر کمانڈر نواز کے ساتھ مہمان خانے کے اس کمرے کی طرف چل دی جہاں سولومن کو رکھا گیا تھا۔ مہمان خانے کی حدود میں داخل ہوتے ہی دو مسلح گارڈ ہمارے ساتھ ہو گئے۔ کمانڈر نواز نے مقفل کمرے کے سامنے پہنچ کر اس کا دروازہ کھولا۔ اندر روشنی تھی۔ میں نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا میری سماعت سے ایک زہریلا قہقہہ ٹکرایا۔ قہقہہ لگانے والا وہ چینی تھا جو سامنے ہی بچھی ہوئی مسہری کے قریب کھڑا تھا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے اسے ڈانٹ کر پوچھا۔

''میں چن ای ہوں عذرا خان! اور اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں تو اس بات کی تصدیق کر سکتی ہو کہ میرے چہرے پر میک اپ نہیں ہے!'' اس ادھیڑ عمر چینی کے لہجے میں چبھن تھی۔

میں چکرا کر رہ گئی کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے! کیا سولومن پھر کوئی چال چل گیا؟ مگر کیسے؟ فوری طور پر یہ معمہ میری سمجھ میں نہ آ سکا۔

☆......☆......☆

اب تک میرے ذہن کی پراسرار اور حیرت انگیز قوتوں نے مجھے [illegible] کیا تھا۔ مجھے پیش آنے والے گزشتہ تجربات اس کا ثبوت تھے۔ اسلام آباد کے دوران قیام میں [illegible] انہی قوتوں کے ذریعے مجھ پر یہ منکشف ہوا تھا کہ سولومن ایک چینی سیاح کے روپ میں ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ عثمانی کی زیرقیادت آپریشن سیل کے ارکان نے میرے ہی حکم پر اس شخص کو اغوا کیا تھا جو اس وقت میرے روبرو کھڑا ہوا تھا۔ اس کا زہریلا قہقہہ اور لہجے کی چبھن بھی میرے لئے معنی خیز تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ اس کا نام چن ای ہے اور اس کے چہرے پر میک اپ نہیں ہے کہ اس نے مجھے میرا نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں اس کیلئے اجنبی نہیں تھی، کم از کم اس حد تک کہ وہ میرا نام جانتا تھا۔ اس کے برعکس وہ ادھیڑ عمر چینی میرے لئے قطعی آشنا نہیں تھا۔۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں اس کا چہرہ محفوظ نہیں تھا۔ اس کا یہ کہنا کہ وہ چن ای ہے یہ بھی بے معنی نہیں تھا۔ یہ الفاظ دیگر اس بات کا مطلب یہ تھا کہ وہ سولومن نہیں ہے۔ بطور ثبوت اس نے اپنے چہرے پر میک اپ نہ ہونے اور اس کی تصدیق کر لینے کا جواز پیش کیا تھا۔

ان ساری باتوں پر تیزی سے سوچتے ہوئے میں نے اس ادھیڑ عمر چینی کے چہرے کا غور سے جائزہ لیا پھر میں نے چند قدم آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''اگر تم واقعی چن ای ہو تو پھر سولومن کہاں گیا؟'' یہ سوال کرتے ہوئے میرے لہجے میں سختی تھی۔

''کون سولومن؟ میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔'' ادھیڑ عمر چینی نے بلا جھجک میرے سوال کا جواب دیا۔

''نہیں جانتے تو پھر اب جان جاؤ گے!'' یہ کہتے ہی میرا دایاں ہاتھ بلند ہوا۔

ادھیڑ عمر چینی ''اوغ'' کرتا ہوا جھکتا چلا گیا، اس کے پیٹ پر پڑنے والا مکا اتنا ہی زوردار تھا۔

''بولو! اب سمجھ میں آیا تمہارے کہ سولومن کون ہے؟'' میں نے اس کے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیا جس کے نتیجے میں وہ پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر خلاف توقع اذیت کے آثار نہیں دیکھے، یقیناً اس میں خاصی قوت برداشت رہی ہو گی۔

''سنو عذرا خان! سولومن کون ہے یہ تو میں واقعی نہیں جانتا، ہاں مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ جیک کی دشمنی تمہیں مہنگی پڑے گی۔'' وہ اردو بڑی صاف بول رہا تھا اور یہ میرے لئے کوئی تعجب خیز بات

نہیں تھی۔ ہندوستان اور پاکستان میں سکونت پذیر بہت سے ایسے چینیوں کو میں جانتی تھی جو اہل زبان کی طرح اردو بولتے تھے۔ میں نے اب اس کے بال چھوڑ دیئے تھے وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بڑے پراعتماد لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''جیک مجھے تمہاری قید میں زیادہ دیر نہیں رہنے دے گا، وہ بہت جلد مجھے یہاں سے نکال کر لے جائے گا۔''

''کمانڈر!'' میں نے اس چینی کی بات کو نظر انداز کر کے مڑتے ہوئے کمانڈر نواز کو مخاطب کیا۔ وہ مجھ سے چند قدم پیچھے کھڑا تھا۔ ''اس سے جیک کی کہانی بعد میں سن لی جائے گی، پہلے یہ تصدیق ضروری ہے کہ یہ واقعی چن ای ہے۔''

''بہتر ہے میڈم!'' کمانڈر نواز یقیناً میرا اشارہ سمجھ گیا، وہ کمرے سے نکل گیا۔

کمرے کے باہر دونوں مسلح گارڈ دروازے کے قریب مستعد کھڑے تھے۔ انہیں میں سے ایک کمانڈر نواز کا حکم سن کر چلا گیا، دوسرا گارڈ وہیں چوکنا کھڑا رہا۔ میں اس دوران میں کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتی رہی، جس بات کی تصدیق یا تردید کسی دوسرے ذریعے سے بھی کی جاسکے اس کیلئے میں اپنے ذہن کی حیرت انگیز صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے گریز کرتی تھی ورنہ وہ معمہ حل کرنا میرے لئے کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔

اس عرصے میں کئی بار اس ادھیڑ عمر چینی نے مزید کچھ کہنا چاہا، مگر میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا اور اس کی بات نہیں سنی۔

کچھ ہی دیر بعد گارڈ لوٹ آیا اور اس نے ایک چھوٹی سی بوتل کمانڈر نواز کو تھما دی۔ بوتل کے منہ پر سپرے پشر بھی لگا ہوا تھا۔ کمانڈر نواز بوتل کا ڈھکنا کھول چکا تھا اور اب چن ای کی طرف بڑھ رہا تھا، میری نظر چن ای کے چہرے پر تھی جو پرسکون تھا۔

کمانڈر نواز نے چن ای کے قریب پہنچ کر بوتل میں موجود محلول اس کے چہرے پر سپرے کر دیا۔ چن ای نے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔

نتیجہ وہی نکلا جس کا مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ چن ای نے اپنی شرٹ کے دامن سے خود ہی اپنا چہرہ صاف کر لیا تھا۔

''میرا خیال ہے کمانڈر کہ اس شخص کو اب یہاں مہمان خانے میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں اب ذرا ایٹ ایز ہو کر اس کی بقیہ کہانی سننا چاہتی ہوں۔ یہ شخص صرف آلہ کار ہے لیکن سولومن نے اسے کس طرح اپنا آلہ کار بنایا، ممکن ہے اس سوال کا جواب ہمارے لئے سولومن تک پہنچنے کی راہ ہموار کر دے۔ ڈیوٹی روم سے میرا سوٹ کیس میرے کمرے میں بھجوا دو اور پھر اسے بھی کچھ دیر بعد وہیں لے آؤ۔''

''میڈم آپ کے کمرے کی چابی......''

''وہ میرے پاس ہے۔'' میں، کمانڈر نواز کی بات کاٹ کر بولی اور پھر اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں غالباً پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی وسیع و عریض عمارت میں ایک کمرہ

میرے لئے مخصوص تھا۔ اس ساؤنڈ پروف ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں میری ضروریات کی تمام اشیاء رہتی تھیں، اس وقت میں وہیں جا رہی تھی۔ گزشتہ شب میں صرف تین چار گھنٹے ہی سو پائی تھی۔ چن ای کے معاملے سے نمٹنے کے بعد میرا ارادہ وہیں آرام کرنے کا تھا۔ میں جب مہمان خانے کی حدود سے نکل کر عمارت کے دوسرے حصے میں داخل ہو رہی تھی تو مجھے ایک طرف سے کیپٹن شاد آتا دکھائی دیا۔ وہ بھی سیل کے ذہین و نوجوان ارکان میں سے ایک تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب بھی میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر آئی تھی اور کیپٹن شاد بھی وہاں ہوتا تھا تو کسی نہ کسی بہانے مجھ سے ملنے یا میرے سامنے پڑنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ اس کی وجہ میرے علم میں تھی۔ میرے نزدیک کوئی بھی شخص کلیتہً فرشتہ نہیں ہوتا، ہر شخص میں خیر بھی ہوتا ہے اور شر بھی! نیک و بد کا تعین اس سے ہوتا ہے کہ اس پر خیر غالب ہے یا شر! جس طرح آپریشن سیل کے ہر رکن کے بارے میں مجھے تمام تفصیلات و جزئیات کا علم تھا، اسی طرح کیپٹن شاد کا باطن بھی مجھ پر عیاں تھا۔ وہ حسن پرست تو تھا مگر اس کی یہ حسن پرستی کرپشن کی حدود میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ میرے باب میں بھی اس کی یہی کمزوری اکثر ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ میں آدمی کو ایک حد تک مارجن دینے کی قائل ہوں۔ اسی سبب سب کچھ علم میں ہونے کے باوجود میں نے کبھی کیپٹن شاد کو سرزنش نہیں کی۔ بھلا عورت سے زیادہ کسی مرد کی نظر کو کون پہچان سکتا ہے! سو میں بھی اس کی نظروں کو پہچانتی تھی۔ اس وقت بھی اسے یہ اطلاع مل گئی ہوگی کہ میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں موجود ہوں اسی لئے وہ اس طرف آنکلا ہوگا ورنہ ''مہمان خانے'' کی جانب کیوں آتا! یہی سوچ کر اس پر نظر پڑتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی پھر دانستہ میں نے اس سے لطف لینے کی خاطر قریب پہنچ کر اس کے سلام کا جواب دیتے ہی ایک ایسا سوال کر دیا کہ وہ بوکھلا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ تم ادھر کہاں جا رہے ہو؟

''میڈم! وہ...... وہ...... کمانڈر...... کمانڈر نواز......''

''ہاں ہاں کہو، کیا ہوا، کمانڈر نواز کو؟'' میں حسب توقع اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو کر بولی۔

''وہ...... وہ مجھے کمانڈر نواز سے ایک...... ایک ضروری مسئلے پر بات کرنا تھی۔'' اس نے بات بتائی۔

''اور وہ ضروری مسئلہ یقیناً فوری نوعیت کا ہوگا!''

''جی...... جی ہاں۔'' وہ روا روی میں کہہ گیا۔

''میرے ساتھ آؤ!'' میں آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو میں نے مزید کہا۔ ''میرا خیال ہے کیپٹن کہ فوری نوعیت کے اس ضروری مسئلے سے میری آگاہی بھی تمہارے لئے شاید سودمند ہی ثابت ہوگی۔ تو پھر کیوں نہ تم مجھے بھی اس مسئلے سے آگاہ کر دو۔''

''دراصل میڈم...... وہ ایک پرسنل مسئلہ ہے ورنہ ظاہر ہے کہ میں...... میں......''

''میں سمجھتی تھی کہ تم خاصے ذہین نوجوان ہو، تمہیں اتنی جلدی نہیں ''ممیانا'' چاہئے تھا!''

''جی! ...... جی میڈم...... مم...... میں سمجھا نہیں آپ کیا...... کیا کہہ رہی ہیں!''

''میں سمجھاتی ہوں تمہیں! دراصل آدمی کے پاس کسی سوال کا مناسب یا درست جواب نہیں

ہوتا تو وہ تمہاری طرح مم...... میں...... مم میں، کرنے لگتا ہے۔ میں اسی کو ''ممیانا'' کہتی ہوں۔ ایسے مواقع پر آدمی، آدمی نہیں رہتا میرے نزدیک بکری بن جاتا ہے۔ اب تو سمجھ گئے نا تم میری بات! تم ایسے ذہین نوجوان کو بہر حال بکری نظر نہیں آنا چاہئے۔ اپنے اندر خوداعتمادی پیدا کرو کیپٹن شاد اور یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ تمہاری کسی بھی کمزوری کے سبب کبھی تمہیں ٹریپ بھی کیا جاسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں تم سے جو کچھ کہہ رہی ہوں تم اسے بخوبی سمجھ رہے ہو، اس لئے میری بات کا جواب دینے یا یہ سمجھانے کی حماقت نہ کرنا کہ میرے قیاسات غلط ہیں۔'' کیپٹن شاد سے یہ باتیں کرتی ہوئی میں اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر اس سے بھی اندر آنے کیلئے کہا۔

میری توقع کے مطابق کمرہ صاف ستھرا تھا۔ میں نے ایئر کنڈیشنر آن کر دیا اور پھر بیڈ کے قریب پڑی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔ کیپٹن شاد اب بھی کھڑا ہوا تھا

''وہ کرسی ادھر اٹھا کر لے آؤ اور بیٹھ جاؤ!'' میں نے دیوار کے قریب موجود کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

کیپٹن شاد نے میرے کہنے پر عمل کیا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔

''گزشتہ رات کے آپریشن کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم ہے؟'' میں نے کیپٹن شاد سے پوچھا۔

''جی، میڈم! اس نے جواب دیا۔'' میں خود بھی اس میں شریک تھا۔''

''تمہیں یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ وہ آپریشن بے سود ثابت ہوا۔''

ردعمل میں کیپٹن شاد چونک اٹھا، پھر بولا۔ ''مگر کیسے میڈم، وہ اطلاع تو خود آپ نے دی تھی!''

''ہاں کیپٹن!'' میں طویل سانس لے کر بولی۔ ''اور وہ اطلاع غلط نہیں تھی، اب دیکھنا یہ ہے کہ سولومن کس طرح ہمیں ٹریپ کر گیا! وہ ادھیڑ عمر چینی سولومن نہیں ہے۔''

''پھر، پھر کون ہے وہ؟ اور......''

''ابھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون ہے! خود تو وہ ایک اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے دانستہ کیپٹن شاد کو وہ باتیں بتا دیں جو چن ای نے کہی تھیں۔ یہ باتیں بتانے کا مقصد محض یہ تھا کہ میں جان سکوں، کیپٹن شاد ان سے کیا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ جب اسے میں وہ باتیں بتا رہی تھی تو آپریشن سیل ایک محافظ ڈیوٹی روم سے میرا سوٹ کیس اٹھا کر وہاں پہنچا گیا تھا۔ اپنی بات ختم کرکے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کیپٹن! میں ذرا باتھ روم سے فریش ہو کر آتی ہوں، تم اتنے میں اس معمے کو حل کرو!'' یہ بات میں نے کیپٹن شاد کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہی تھی۔ وہ میری بات سن کر کچھ سوچنے لگا تھا۔ یقیناً فوری طور پر وہ کوئی نتیجہ نہیں نکال پایا تھا۔

باتھ روم میں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں باہر آئی تو کمانڈر نواز چن ای کو وہاں لے کر آچکا تھا۔ میں نے چن ای کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اب اس کے چہرے پر پہلے جیسا اطمینان و سکون نہیں رہا تھا۔ غالباً وہ سمجھ چکا تھا کہ اسے اس عمارت سے نکال کر لے جانے

والے شخص کا دعویٰ درست نہیں تھا۔ اس کے پیچھے دو مسلح گارڈ کھڑے تھے۔ کمانڈر نواز اس کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

میں دوبارہ آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر نیم دراز ہوگئی۔ ہاں میں نے اب اپنی کرسی کا رخ ذرا سا تبدیل کرایا تھا۔ کرسی پر نیم دراز ہوتے ہی میں نے دونوں گارڈز کو کمرے سے چلے جانے کا اشارہ کیا تھا۔ میرے خیال میں اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ گارڈز چلے گئے تو میں نے کیپٹن شاد کو مخاطب کیا۔ ”ہاں کیپٹن، کچھ سوچا تم نے اس شخص کے بارے میں۔“

”جی ہاں میڈم۔“ کیپٹن شاد نے فوراً جواب دیا۔ ”اس شخص کو استعمال کیا گیا ہے اور خود بھی یہ اس بات سے لاعلم ہے کہ نادانستگی میں یہ کتنا بڑا خطرہ مول لے چکا ہے۔ سولومن ایسے عیار مجرم سے یہ بعید نہیں کہ اس نے اسے اپنا نام جیک بتایا ہو۔“

”گڈ!“ میں نے کیپٹن شاد کے تجزیے کی تعریف میں کہا۔ ”خود میرا بھی یہی خیال تھا۔“ پھر میں نے کمانڈر نواز کی طرف دیکھا۔ ”تم کیا کہتے ہو کمانڈر؟“

”میں کیپٹن سے کسی حد تک متفق ہوں۔“ کمانڈر نواز نے محتاط لفظوں میں جواب دیا۔ ”ویسے اصل کہانی ابھی یہ خود بیان کردے گا۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے چن ای کی طرف گھور کر دیکھا پھر کہنے لگا۔ ”چن ای اس سے پہلے کہ تمہاری کھال ادھیڑ دی جائے، تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو!“ کمانڈر نواز کے لہجے کی دھمکی نے خاطر خواہ اثر کیا۔ چن ای کا چہرہ بجھ گیا۔

”مجھے ...... مجھے خبر نہیں تھی کہ ...... کہ وہ مجھے ملٹری والوں کے چکر میں پھنسا کر خود نکل جائے گا۔“ چن ای مردہ سی آواز میں بولا۔ یقیناً وہ کمانڈر اور کیپٹن کے لفظوں سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے اسے یہ علم نہیں تھا کہ ”آپریشن سیل“ کے ارکان کا ملٹری سے کوئی تعلق نہیں اور یہ درجہ بندی فوجی خطوط پر سیل کے ان سینئر ارکان نے کی تھی جو ملٹری کی ملازمتوں سے ریٹائر ہوکر ”سیل“ سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ملٹری کے انہی سینئر ارکان نے بعد میں نئے آنے والوں کی تربیت کی تھی۔ خود میں نے کمانڈر نواز یا کیپٹن شاد نے چن ای کی اس غلط فہمی کو دور نہیں کیا تاکہ وہ اپنی زبان کھولنے میں مزید تاخیر نہ کرے۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“ میں نے چن ای سے سوال کیا۔

”میں آپ کو نہیں جانتا، میں نے جیک ہی سے پہلی بار آپ کا نام سنا تھا۔“ چن ای جواباً بولا۔

”اس نے تمہیں بتایا تو ہوگا میرے بارے میں؟“

”جی ہاں! اس نے کہا تھا کہ ایک خطرناک عورت میری دشمن ہے اور مجھے خطرہ ہے وہ اپنے آدمیوں کے ذریعے میرے اغوا کی کوشش کرے گی۔“

”پھر تم اس کی جگہ اغوا ہونے پر آمادہ ہوگئے؟“

”اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ میں تمہیں عذرا خان کی قید سے نکال کر لے آؤں گا۔“

”اور تم نے یقین کرلیا۔“

”جی ...... جی ہاں ...... اس لئے کہ میں اپنی زندگی کی قیمت پانچ لاکھ سے زیادہ نہیں سمجھتا۔“

”اس نے تمہیں پوری رقم ادا کردی تھی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ایک لاکھ ایڈوانس دیئے تھے ابھی تک، باقی رقم بعد میں دینے کا وعدہ کیا تھا۔“ چن ای نے صاف گوئی سے بتا دیا۔

”تمہاری اس سے ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟ کیا تم اسے پہلے سے جانتے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ کیا وہ خود تم سے ملا تھا؟“

”نہیں! میں اسے پہلے سے نہیں جانتا تھا اور نہ وہ خود مجھ سے ملا تھا۔ میں ہی اسے موٹا شکار سمجھ کر اس سے ملا تھا۔“

لفظ ”شکار“ سے بات واضح ہوگئی تھی کہ چن ای ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور وہ سولومن کو شکار کرنے کے چکر میں خود شکار ہوگیا تھا پھر بھی ابھی پوری بات واضح نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے اور کمانڈر نواز نے اس سے مزید سوالات کیے۔ ان متعدد سوالات کے جوابات میں نہ صرف چن ای کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگیا تھا، سولومن کس طرح بچ نکلا، یہ بات بھی سامنے آگئی۔ چن ای کی خود اپنی کہانی بھی کم دلچسپ و دلگداز نہیں تھی مختصراً پہلے میں وہی بیان کررہی ہوں۔

کلکتہ میں لویر چیت پور روڈ پر چن ای کی جوتوں کی دکان تھی۔ وہاں وہ لویز چیت کے عقب میں چیناپاڑے میں رہتا تھا۔ وہ ایک شریف اور کاروباری آدمی تھا۔ اپنی بیوی اور بیٹی سے اسے بڑی محبت تھی۔ کسی لین دین کے معاملے میں اپنے ایک ہم قوم و ہم پیشہ شخص ہوفن سے اس کا جھگڑا ہوگیا۔ اس زمانے میں ہوفن نیا نیا کلکتہ میں آکر آباد ہوا تھا۔ اسی لئے چن ای اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا نہ اسے یہ معلوم تھا کہ ہوفن اتنا منتقم مزاج ہوگا۔ جھگڑا صرف چند ہزار کی رقم کا تھا جس نے دشمنی کی شکل اختیار کرلی۔ ہوفن بددیانتی پر آمادہ تھا اس لئے چن ای اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ کچھ کاروباری لوگ درمیان میں پڑے اور نتیجتاً ہوفن کو وہ رقم ادا کرنا پڑی جو وہ ہضم کرجانا چاہتا تھا، مگر دشمنی برقرار رہی پھر کچھ ہی عرصے کے بعد چن ای کی دکان میں آگ لگ گئی لیکن آگ لگانے والے کا سراغ نہ مل سکا۔ چن ای کا کاروبار تباہ ہوگیا، اسے ہوفن پر شبہ تھا جس کا اظہار اس نے پولیس کے سامنے بھی کیا مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے پولیس ہوفن پر ہاتھ نہ ڈال سکی۔ اسی واقعے کے چند ماہ بعد چن ای کا گھر بھی جلا دیا گیا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب چن ای گھر میں نہیں تھا۔ چن ای کی بیوی اور بیٹی اس قدر جھلس گئیں کہ دو روز بعد ہسپتال میں انہوں نے دم توڑ دیا۔ اس مرتبہ بھی پولیس کو ہوفن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ یہ بات چن ای کو کافی عرصہ گزر جانے کے بعد معلوم ہوئی کہ ہوفن ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور پولیس سے اس کی ساز باز تھی۔ تباہ حال چن ای اپنی بیوی اور بیٹی کے غم میں کچھ دنوں نیم پاگل سا پھرتا رہا پھر اس کے زخم قدرے مندمل ہوگئے تو وہ سراپا انتقام بن گیا۔ چن ای کا بھتیجا ژانگ بھی اس انتقام میں شریک تھا۔ چن ای ہی کے ایما پر ژانگ نے ہوفن کی نوجوان و حسین بیٹی پر ڈورے ڈالے۔ ہوفن نے ایک برطانوی عورت سے شادی کی تھی جو مرچکی تھی۔ ہوفن کی بیٹی فینی مشرق و مغرب کے حسن کا امتزاج تھی۔ چن ای کا بھتیجا ژانگ بھی کم وجیہہ نہیں تھا۔ وہ بہرحال فینی کو فریب محبت دینے میں کامیاب ہوگیا۔ آگ میں جھلس کر مر

جانے والی چن ای کی بیٹی ژانگ کی منگیتر تھی! اس لئے بھی ژانگ اور چن ای کا دشمن مشترکہ تھا۔ چن ای اور ژانگ نے ہوفن کے قتل کا منصوبہ بنایا اور اسی کے ساتھ فینی کو لے کر کلکتہ سے فرار ہو جانے کا فیصلہ بھی کرلیا۔ سب کچھ ان دونوں نے پہلے سے طے کرلیا تھا۔ وہ کلکتہ سے بھاگ کر پہلے مشرقی پاکستان اور پھر مغربی پاکستان آنا چاہتے تھے۔ ایک رات منصوبے کے مطابق ژانگ فینی کو اپنے ساتھ لے کر اپنے ایک دوست کے گھر چھپ گیا۔ اسی رات چن ای نے ہوفن کو قتل کردیا پھر اس سے پہلے کہ ہوفن کے قتل کا راز فاش ہوتا چن ای، ژانگ اور فینی کلکتہ سے فرار ہو گئے۔ غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرانے والوں سے چن ای پہلے ہی معاملہ طے کر چکا تھا۔

سرحد عبور کرتے ہوئے خلاف توقع ژانگ ہندوستانی فوج کے ہاتھوں مارا گیا مگر چن ای، فینی کو ساتھ لئے جنگل میں روپوش ہو گیا پھر کسی طرح بھٹکتا ہوا وہ مشرقی پاکستان کے ایک سرحدی قصبے میں پہنچ گیا۔ وہاں سے وہ اپنے منصوبے کے مطابق جیسور، پھر ڈھاکہ اور چاٹگام پہنچا۔ چاٹگام سے پانی کے ایک جہاز کے ذریعے وہ کراچی آ گیا۔ تھوڑی بہت رقم اب بھی اس کے پاس تھی جس سے وہ کراچی میں جوتوں کا کاروبار شروع کر کے باعزت طور پر روزی کمانا چاہتا تھا مگر چن ای کو یہ علم نہ تھا کہ کلکتہ اور کراچی میں بہت فرق ہے۔ چن ای کو کراچی آئے ابھی صرف دو سال ہوئے تھے۔ اس دو سال کے عرصے میں اس ظالم شہر نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ ابتدا میں فینی بہت ملول و افسردہ رہی کہ اس کا محبوب ژانگ اس سے بچھڑ گیا تھا جس کی خاطر اس نے اپنے باپ ہوفن سے بے وفائی کی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ وہ بھولی او ور معصوم لڑکی نہ تو اپنے باپ کے کرتوتوں سے واقف تھی اور نہ اس خطرناک کھیل سے جو چن ای اور ژانگ نے اس کے ساتھ کھیلا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اب اس کا باپ اس دنیا میں موجود نہیں۔ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھر سے باہر قدم رکھتے ہی اس نے ژانگ کو بتا دیا تھا کہ اب اس گھر میں واپسی ممکن نہیں ہوگی۔ وہ اپنے باپ کی سخت گیری اور غصے سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس نے اپنی ماں کو اکثر اپنے غصہ ور باپ کے ہاتھوں پٹتے دیکھا تھا۔ سو یوں فینی کیلئے واپسی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس کی دانست میں چن ای ہی اس کے لئے سب کچھ تھا۔ وہ اسی لئے چن ای کو ڈیڈی کہنے لگی تھی۔ اپنے دشمن ہوفن کو قتل کرنے کے بعد چن ای کے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ بڑی حد تک ٹھنڈی پڑ چکی تھی لیکن وہ یہ بات نہ بھلا سکا کہ فینی اس کے دشمن کی بیٹی ہے۔ ایک ایسا ناقابل معافی دشمن جس نے اس کا بھرا پرا گھر اجاڑ دیا تھا۔ اسے دربدر کردیا تھا۔ ایک طرف وہ حصول معاش کی جنگ لڑ رہا تھا، دوسری طرف اس کے اپنے وجود میں ایک جنگ جاری تھی۔ فینی اسے ڈیڈی کہہ کر پکارتی تو وہ اندر ہی اندر سلگنے لگتا۔ اسے اپنی نوجوان بیٹی یاد آ جاتی۔ چن ای کے اندر شیطان اور انسان کی جنگ جاری رہی اور پھر ایک دن شیطان جیت گیا۔ یہی وہ دن تھے جب چن ای حصول معاش کی جنگ میں اپنی شکست قبول کر چکا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں ایک تیر سے دو شکار کئے۔ چن ای کو یہ راہ خود اسی کے ایک پڑوسی نے سمجھائی تھی۔ باتوں باتوں میں چن ای کے منہ سے ایک دن یہ نکل گیا تھا کہ فینی اس کی بیٹی نہیں ہے۔ یہ سن کر اس کے پڑوسی نے کہا تھا کہ تمہارے گھر میں تو ہیرا چھپا ہو پھر تم کیوں اتنے پریشان ہو، کیوں غربت و افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ چن ای کے پڑوسی نے

اسے ایک شخص سے ملوایا جو ایسے ہی ''ہیروں'' کا کاروبار کرتا تھا۔

فینی تو پہلے ہی چن ای کا اصل چہرہ دیکھ چکی تھی۔ اس رات جب چن ای پر شیطان غالب آ چکا تھا۔ اس رات جب چن ای نے پھول ایسی معصوم خواہشوں کو ہوس کا کفن پہنا دیا تھا۔ اس رات جب اس نے اپنے دشمن کی بیٹی سے اپنی بے گناہ مقتول بیوی اور بیٹی کا انتقام لیا تھا۔ اسی رات کے بعد فینی نے چن ای کا ایک نیا روپ دیکھا تھا اور پھر اسے ڈیڈی کہنا چھوڑ دیا تھا۔

پھر جب اس ''ہیرے کی پہلی بولی لگی تو'' ہیرا چپ رہا، اب احتجاج کرنے کو تھا بھی کیا اس کے پاس!

ایک ہی سال میں چن ای کی قسمت بدل گئی۔ اس نے ایک متوسط طبقے کی آبادی میں سکونت برقرار رکھنے کے بجائے نسبتاً ایک بہتر آبادی میں چھوٹا سا خوبصورت گھر خرید لیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ابتدا ہی میں اسے ایک بڑا ''کاروباری'' مل گیا تھا اور اس نے اس کاروبار کے سارے رموز و نکات سمجھ لئے تھے۔ فینی واقعی اس کیلئے ہیرا ثابت ہوئی تھی۔ آئندہ ایک سال میں چن ای ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے چھوٹا سا گھر بیچ کر بڑا سا بنگلہ خرید لیا تھا۔ اب اس کے پاس صرف فینی ہی نہیں کئی اور بھی ہیرے تھے۔ وہ خود ایک بڑا کاروباری بن چکا تھا اور صرف بڑے بڑے ہوٹلوں میں اٹھنا بیٹھنا اور کاروبار کرنا پسند کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک بڑے ہوٹل میں دو روز قبل جیک سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ خود اسی نے جیک پر اپنا جال پھینکا تھا۔ اس کیلئے اس نے فینی کو آگے بڑھایا تھا۔ چن ای کا خیال تھا کہ فینی کے بلاخیز حسن کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا بھی۔ فینی نے وہ رات جیک کے ساتھ کسی بڑے ہوٹل میں گزاری۔ ایک رات کے پانچ ہزار کم نہیں تھے، دوسرے دن صبح چن ای جب فینی کو لینے ہوٹل پہنچا تو جیک نے اس سے ایک ایسی ناقابل یقین بات کہی کہ چن ای مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ جیک نے اس سے کہا تھا کہ فینی تو ایک رات میں پانچ ہزار کماتی ہے، مگر تم چن ای پانچ لاکھ کما سکتے ہو۔ کس طرح؟ یہ میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب تم فینی کو چھوڑ کر واپس میرے پاس آ جاؤ گے۔

واپسی میں چن ای نے دیر نہیں کی۔ وہ جیک کے کمرے میں پہنچا تو جیک نے اپنا بریف کیس کھول کر بڑے نوٹوں کی گڈیاں میز پر پھینک دیں اور بولا، بطور پیشگی یہ ایک لاکھ روپے تم اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔ چن ای نے پوچھا کیا مجھے کسی شخص کو قتل کرنا ہے؟ جیک نے انکار میں گردن ہلا دی اور مسکرا کر کہا، تمہیں کسی کو قتل نہیں کرنا بلکہ ایک شخص کی زندگی بچانا ہے اور وہ شخص خود میں ہوں۔

پھر جیک نے چن ای کو بتایا کہ ایک خطرناک عورت عذرا خان میری زندگی کے درپے ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں وہ مجھے اغوا نہ کرا لے۔ سو چند دن کیلئے تمہیں میری شخصیت اپنانا پڑے گی اور میں تمہاری شخصیت اپنا لوں گا۔ ہم ایک اور ہوٹل میں برابر برابر کمرے حاصل کریں گے، جہاں تم دن کے وقت جیک ہو گے اور میں چن ای۔ رات بارہ بجے کے بعد ہم دونوں اپنے کمرے بدل لیا کریں گے اور اپنی شخصیتیں بھی! چن ای نے خطرے کے باوجود یہ سودا قبول کرلیا۔ یوں جیک چن ای بن گیا اور چن ای جیک! وہ دونوں اب ایک نئے فائیو سٹار ہوٹل میں منتقل ہو گئے تھے۔ شخصیتوں کی یہ تبدیلی چن ای کیلئے ایک نیا تجربہ تھا۔ میک اپ کے بعد وہ خود بھی اپنے آپ کو آئینے میں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

منصوبے کے مطابق گزشتہ رات بارہ بجے جیک نے اپنا اور چن ای کا میک اپ ختم کر دیا اور کمرے تبدیل کر لئے۔ اسی رات جیک نے چن ای کو یقین دلایا تھا کہ اگر عذرا خان کے آدمی تمہیں اغوا کر کے لے بھی گئے تو میں تمہیں ہر قیمت پر اس کی قید سے چھڑا لاؤں گا۔ یوں چن ای مطمئن ہو کر سو گیا تھا پھر اسی کو سولومن سمجھ کر میرے آدمی اغوا کر کے لے آئے تھے۔

چن ای کی پوری داستان سننے کے بعد میرے لئے ہی کیا، کمانڈر نواز اور کیپٹن شاد کیلئے بھی یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ جیک ہی سولومن تھا۔ اپنی داستان سنانے کے بعد چن ای مجھے رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ایک بات اور بتاؤ چن ای، تمہارا بینک بیلنس کتنا ہوگا؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے بہ ظاہر ایک غیر متوقع سوال کیا۔

''بینک بیلنس۔'' اس کے چہرے سے حیرت اور کسی قدر خوف کا اظہار ہونے لگا۔

''ہاں ہاں بینک بیلنس! اگر صحیح فگر یاد نہیں تو اندازاً بتا دو۔''

''اڑھائی تین لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہوں گے۔'' اس نے فکر مند سے لہجے میں جواب دیا۔

''اور وہ ایک لاکھ روپے جو تم نے جیک سے کمائے تھے؟''

''وہ...... وہ الگ ہیں...... فینی کے پاس! انہیں میں بینک میں جمع نہیں کرا سکا تھا۔''

''اور تم جس بنگلے میں رہتے ہو، اس کی قیمت کتنی ہوگی؟''

''میں...... سمجھا نہیں، آپ یہ...... یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہیں!، وہ زچ سا ہو کر بولا۔

''تم سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے صرف اس کا جواب دو، میرے لہجے میں قدرے سختی آ گئی۔

''ڈیڑھ لاکھ میں خریدا تھا میں نے وہ بنگلہ۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا کل اثاثہ کم از کم بھی پانچ لاکھ تو ہوگا ہی۔'' میرا انداز تصدیق طلب تھا۔

''ج...... جی ہاں...... ہوگا اتنا!''

''اب آخری سوال! تمہیں وہ باعزت زندگی پسند تھی جو تم کلکتہ میں بسر کرتے تھے یا یہ زندگی پسند ہے جو ان دنوں بسر کر رہے ہو؟''

میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے سوال کے جواب میں وہ فوراً کچھ نہیں بولا۔ میں اس کی آنکھوں میں نمی تیرتی دیکھ رہی تھی۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ گناہوں کی دلدل میں پھنس جانے کے باوجود بھی اس کا ضمیر بالکل مردہ نہیں ہوا تھا۔

میرے سامنے اس وقت ایک قاتل، ایک قانون شکن، ایک زانی اور عصمت فروشی کا گھناؤنا دھندا کرنے والا ایک گناہ گار شخص کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ آج سے پہلے یقیناً کسی نے اسے خود اس کے ضمیر کی عدالت میں کھڑا نہیں کیا تھا۔ میں نے کبھی بگڑے ہوئے معاشرے کو سدھارنے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ یہ میرا مطلب تھا۔ میرے خیال میں یہ فرض کچھ اور لوگوں کا تھا۔ ہاں یہ

ضرور ہے کہ میں نے اپنی بساط کے مطابق اپنے وطن کیخلاف ہونے والی سازشوں سے نمٹنے کی کوشش کی، خود کو میں نے کبھی اوور اسٹیمیٹ نہیں کیا۔ مجھے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ میری سازی تگ و دو سمندر میں قطرے کے مانند تھی پھر بھی اس روز چن ای کی دلگداز داستان سن کر جانے کیوں مجھے یہ خیال آیا کہ اس برے آدمی کو ایک بھلا انسان بنایا جا سکتا ہے۔ یہ شخص برا نہیں تھا مگر وقت اور حالات نے اسے برا بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

''چن ای، میں نے اسے مخاطب کیا۔'' اپنے آنسو پونچھ لو! اور میری بات غور سے سنو! میں نے تم سے جو کچھ پوچھا اور تم نے جو کچھ مجھے بتایا، اس کی روشنی میں تمہارے لئے ایک ہی راستہ ہے۔ جو کچھ ہو چکا اسے بھولنے کی کوشش کرو اور اسے اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کر لو۔ تمہارے پاس اتنا اثاثہ موجود ہے کہ تم ازسرنو اپنی زندگی کا آغاز کر سکتے ہو۔ وہی زندگی جس کا خواب تم نے کراچی آتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''مم...... مگر محترم خاتون؟'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''میں...... میں اب چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتا! اگر میں نے یہ فیصلہ کر بھی لیا تو...... تو اس گناہ کے کاروبار میں ملوث دوسرے لوگ مجھے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ ان کے مفادات بھی تو اس کاروبار سے وابستہ ہیں۔ وہ جن لوگوں نے مجھے تحفظ دے رکھا ہے اور اس کے عوض مجھ سے ہر ماہ بھاری رقم وصول کرتے ہیں، کیا مجھے ایسا کرنے دیں گے؟''

چن ای غلط نہیں کہہ رہا تھا، مجھے اس سے ان باتوں کی پہلے سے توقع تھی اور میں اس کا ایک حل بھی سوچ چکی تھی۔

''تمہارے سوال کا جواب اس پر منحصر ہے، چن ای کہ تم واپسی کے سفر میں کتنے مخلص ہو؟'' میں معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''اگر آدمی کا عزم پختہ ہو تو پھر کوئی دنیاوی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکتی! بتاؤ کیا تمہیں ہوفن کو قتل کرنے سے کوئی روک سکا؟ کیا تمہیں ایک ملک کی سرحد عبور کر کے دوسرے ملک میں داخل ہونے سے روک لیا گیا...... ایسا نہیں ہوا نا! کیا وجہ تھی اس کی؟...... صرف یہی نا کہ تمہارا عزم غیر متزلزل تھا، بولو کیا غلط کہہ رہی ہوں میں؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ! مگر، مگر اس وقت مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری تھی، مجھے اپنی زندگی کی پرواہ بھی نہیں تھی اور اب......''

''اور اب بھی سب کچھ ہو سکتا ہے چن ای!'' میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔ ''اس کیلئے تمہیں صرف یہ شہر چھوڑنا پڑے گا، بہت خاموشی کے ساتھ!''

''لیکن...... لیکن فینی؟...... کیا...... کیا میں اسے اس جہنم میں چھوڑ جاؤں؟'' چن ای کا لہجہ جذباتی تھا۔ ''میں نے...... میں نے ہی تو اس کی زندگی تباہ کی ہے...... میں ہی تو مجرم ہوں اس کا! میں......'' اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

''کیا تم فینی سے محبت کرتے ہو؟''

''ہاں...... ہاں شاید!''

''اور وہ؟''

"وہ...... وہ شاید نفرت کرتی ہوگی مجھ سے!"

اس ادھیڑ عمر چینی کی محبت بڑی عجیب تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی سے محبت کرتا تھا جو اس کی بیٹی کی ہم عمر تھی۔ اسے اپنے دشمن کی بیٹی سے محبت تھی، نفرت اور محبت کا ایسا امتزاج میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس لڑکی سے محبت بھی کرتا تھا اور اسے دوسروں کی آغوش کی زینت بھی بناتا تھا۔ معاً مجھے ان دوسری لڑکیوں کا خیال آیا جو فینی ہی کی طرح چن ...... کے چنگل میں تھیں، سو میں نے چن ای سے ان کے بارے میں بھی پوچھ لیا۔

"ان کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ ان کے گناہ گار اور لوگ ہوں گے، وہ پہلے ہی سے پیشہ ور تھیں، انہیں میں نے یہیں کے بازار حسن سے خریدا تھا، انہیں میں دوبارہ فروخت بھی کرسکتا ہوں اور چاہوں تو آزاد بھی کرسکتا ہوں۔"

"تم ان بدنصیب لڑکیوں کو دوبارہ فروخت کرنا پسند کرو گے یا انہیں آزاد کرنے کو ترجیح دو گے؟" میں نے چن ای کو ٹٹولنے کی خاطر کہا۔

"جب میں یہ زندگی ترک کرنے پر آمادہ ہوں تو...... تو پھر انہیں آزاد کرنے کو ترجیح دوں گا۔" میرے لئے مسئلہ صرف اور صرف فینی کا ہے۔"

"تمہارے بیان کے مطابق فینی اس سے بے خبر ہے کہ تم اس کے باپ کے قاتل ہو، یہی بات ہے نا؟" میں بولی۔

"ہاں اسے یہ بات نہیں معلوم۔" چن ای نے اپنے بیان کی تصدیق میں کہا۔

"تو سنو چن ای، اس بے خبر لڑکی کو ساری روداد از اول و آخر سنا دو جو تم نے مجھے سنائی ہے، پھر فیصلہ اس پر چھوڑ دو! مجھے یقین ہے کہ تمام حقائق کا علم ہونے کے بعد وہ تمہیں معاف کردے گی۔ اس کا بھی اب اس دنیا میں کوئی نہیں اور تم بھی تنہا ہو۔ اگر وہ بخوشی تمہاری محبت قبول کرلیتی ہے، عمروں کے فرق کے باوجود وہ تمہیں اپنانے پر آمادہ ہوجاتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کسی نئے شہر میں نئی زندگی شروع کرنے کے بعد تم اس کا ہاتھ کسی نوجوان کے ہاتھ میں دے دینا! تمہارے پاس یقیناً اتنا سرمایہ ہے کہ تم کسی بھی دوسرے شہر میں جاکر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرسکتے ہو۔"

میری بات سن کر چن ای کچھ دیر اس طرح خاموش کھڑا رہا جیسے دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کررہا ہو۔ میری نگاہیں اس کے متغیر چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"محترم خاتون!" بالآخر چن ای بول اٹھا۔ "آپ نے مجھ سے اتنے سوال کئے اور میں نے آپ کو سب سوالوں کے صحیح جواب دیئے، کیا آپ مجھے بھی ایک سوال کرنے کی اجازت دیں گی؟" اس کے لہجے میں میرے لئے احترام تھا۔

"ضرور! بولو کیا سوال کرنا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"آپ نے مجھے جو کچھ سمجھایا، جو کچھ بھی کرنے کی ہدایت دی، اس سے آپ کو کیا فائدہ؟ کیا آپ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اس شہر میں ایک میں ہی نہیں، بہت سے چن ای ہیں، بہت سی بیٹیاں ہیں!" وہ جذباتی نظر آنے لگا جس کا ثبوت اس کی آواز کا زیروبم اور چہرے کے تاثرات تھے۔

چن ای کی بات کا جواب میں نے بہت نرمی سے دیا۔ "مجھے معلوم ہے چن ای وہ بھی جو تم نہیں کرسکے اس سلسلے میں میرا کیا مطمع نظر ہے، بطور مثال ایک سیاستدان کے قول سے واضح کرسکتی ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ ممکن ہے جو پیڑ ہم آج لگا رہے ہیں خود اس کی چھاؤں میں نہ بیٹھ سکیں مگر ہمارے بچے اس کی چھاؤں میں ضرور بیٹھیں گے، اس لئے ہمیں پیڑ لگا دینا چاہئے۔ اس سے قطع نظر ایک بات اور سنو! یہ جو ہمارا معاشرہ ہے، افراد ہی کا مجموعہ ہے۔ ہر فرد اگر یہی سوچ کر خود کو بدلنے کی کوشش نہ کرے کہ صرف اس کے راہ راست پر آجانے سے کچھ نہیں ہوگا تو یہ معاشرہ کبھی نہیں بدل سکتا! یہ بات میں صرف اپنے ملک کے معاشرے کیلئے نہیں تمام دنیا کے معاشروں کیلئے کہہ رہی ہوں میرا ایمان ہے کہ آخری فتح صرف اور صرف خیر کی ہوتی ہے اور میں تمہیں خیر کی طرف جانے کو کہہ رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا ضمیر بھی میری بات کی گواہی دے رہا ہوگا۔ میں اندازہ لگا چکی ہوں کہ ابھی تمہارا ضمیر بالکل مردہ نہیں ہوا، اس میں زندگی باقی ہے۔" چن ای سر جھکائے میری بات سن رہا تھا اور اب آخری بات بھی سن لو! مجھے معلوم ہے، آدمی بڑی عجیب شے ہے، کبھی کبھی جذباتی لمحوں میں وہ خود کو بدلنے کا فیصلہ کرلیتا ہے لیکن جب یہ لمحے گزر جاتے ہیں تو وہ پھر پچھلی ڈگر پر چلنے لگتا ہے۔ ممکن ہے تمہارے ساتھ ایسا نہ ہو اور تم اپنے فیصلے پر قائم رہو مگر کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آکر اگر تم اپنے فیصلے پر قائم نہ رہے تو اس کے تمہیں سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے! تمام معاملات نمٹانے اور اس شہر سے ہجرت کرجانے کیلئے میں تمہیں ایک ہفتے کا وقت دے رہی ہوں۔ اس کے بعد تمہیں اس شہر میں نظر نہیں آنا چاہئے! اس ایک عرصے کے دوران میں میرے آدمی تم پر نظر رکھیں گے۔ یہاں تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اسے بھلا دینا، میری طرف سے اب تم آزاد ہو، تمہیں تمہارے گھر چھڑوا دیا جائے گا، آج ہی!"

"اور...... اور وہ جیکب؟...... اگر وہ......"

"وہ اب تم سے ملنے کی خود ہی کوشش نہیں کرے گا۔" میں نے اسے فکرمند محسوس کرکے سمجھایا۔ "وہ ایک بین الاقوامی مجرم ہے اور ایسے لوگ کبھی ایک جگہ نہیں ٹھہرتے، وقتی طور پر وہ تم ایسے لوگوں کو اپنا آلہ کار بناتے ہیں اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں کو انہوں نے اپنا آلہ کار بنایا تھا، ان کا کیا حشر ہوا!"

چن ای کے چہرے سے اطمینان کا اظہار ہونے لگا، میری بات یقیناً اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"کمانڈر، اسے لے جاؤ۔" کمانڈر نواز سے میرا اتنا ہی کہنا کافی تھا۔ وہ سن ہی چکا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں، اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ چن ای کو اس عمارت سے لے جانے سے پہلے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ لینا ضروری ہے اور یہ کہ اسے کسی بند وین میں اس کے گھر تک پہنچانا ہے۔!

میرا حکم سن کر کمانڈر نواز اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو چن ای!"

چن ای نے کمانڈر نواز کے ساتھ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ایک بار رک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، شاید عقیدت اور شکر گزاری کے آنسو! میں نے نظریں جھکالیں اور اس وقت تک اسی طرح بیٹھی رہی جب تک کمانڈر نواز چن ای کو لے کر کمرے سے چلا نہ گیا۔

کیپٹن شاداب بھی میرے کمرے میں موجود تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "دوپہر کا کھانا کھا

لیا تم نے؟''

''جی نہیں میڈم!'' اس نے جواب دیا۔

''تو پھر منگوا لو کچن سے! مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے، میرے ساتھ ہی کھا لینا۔''

کیپٹن شاد نے انٹرکام پر کچن سے رابطہ قائم کیا اور کھانا لانے کو کہہ دیا، پھر جب وہ میرے ساتھ کھانا کھا کر چائے پی رہا تھا تو کمانڈر نواز نے اسے کسی کام سے طلب کیا۔ وہ بہر حال ''آپریشن سیل'' کا انچارج تھا، اس کے باوجود اس نے کیپٹن شاد کی طلبی سے پہلے میری اجازت ضروری سمجھی تھی۔ کیپٹن شاد سے مجھے یوں بھی کوئی کام نہیں تھا۔ میرا مقصد تو محض کچھ دیر اسے اپنے پاس بٹھانا تھا تا کہ مجھ سے ملنے کیلئے آئندہ وہ مختلف حیلے بہانے نہ ڈھونڈے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے دانستہ اسے اتنی لفٹ دی تھی۔ وہ چائے پینے کے بعد میرا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

کچن کا ملازم جب کھانے اور چائے کے برتن لے گیا تو میں نے اپنا کمرہ اندر سے لاک کر دیا، اسی کے ساتھ ایک سوئچ آن کر دیا۔ یہ سوئچ میرے کمرے کے باہر لگے ہوئے سرخ بلب کا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب میں آرام کر رہی ہوں یا کوئی ایسا کام جس میں مداخلت نہیں چاہتی۔ شب خوابی کا لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے کمانڈر نواز کو بھی انٹرکام پر بتا دیا آرام کر رہی ہوں اور جب سو کر اٹھوں گی تو خود ہی اس سے رابطہ قائم کر لوں گی۔

شام پانچ بجے کے قریب میں سو کر اٹھی پھر نہا کر تازہ دم ہونے اور لباس تبدیل کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اپنے بال ڈرائر سے خشک کرنے کے بعد میں نے چہرے پر ہلکا سا میک اپ کیا اور کمرے کے باہر جلنے والے سرخ بلب کا سوئچ آف کر دیا۔ اس کے بعد میں نے انٹرکام پر کچن کے نگراں سے دو چائے بھجوانے کو کہا، پھر رابطہ منقطع کر کے سات نمبر پر انگلی رکھ دی۔ یہ ڈیوٹی روم کا نمبر تھا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے والا کمانڈر نواز ہی تھا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں آنے کو کہا اور اٹھ کر کمرے کا لاک کھول دیا۔ کراچی پہنچنے کے بعد اب تک مجھے موقع نہیں ملا تھا کہ کمانڈر نواز کو موجودہ حالات سے آگاہ کر سکتی اور سولومن سے نمٹنے کیلئے کوئی لائحہ عمل طے کر سکتی۔ میں اسے حالات و واقعات سے آگاہ کرنے کے علاوہ اس سے مشورہ بھی کرنا چاہتی تھی۔

کمانڈر نواز میرے کمرے میں آ گیا تو میں نے گفتگو شروع کی۔ پہلے میں نے اسے اسلام آباد کے سفر کی مختصر روداد سنائی مگر اس پر اپنی کسی رائے سے گریز کیا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ خود اس گفتگو پر کوئی تبصرہ کرے جو ایوان صدر میں ہوئی تھی۔

''یہ بات ہر حال میں خوش آئند ہے کہ صدر مملکت انتخابات پر آمادہ نظر آ رہے ہیں، لیکن

.....''

''رکومت، بلا جھجک کہو جو کہنا چاہتے ہو!''

''بہتر ہے۔'' وہ شائستگی سے بولا۔ ''ایک تو یہ بات کھٹک رہی ہے کہ صدر مملکت جو حکم نامہ جاری کرنے والے ہیں، وہ ملک دشمن عناصر کیخلاف استعمال ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی مخالفین کے لئے بھی ہر وقت سر پر لٹکتی ہوئی ایک تلوار کے مانند ہو جائے گا۔ آپ نے بھی یقیناً اس متوقع حکم نامے کے اس

تاریک پہلو پر غور کیا ہوگا۔ دوسرا مسئلہ مشرقی پاکستان کا ہے۔ وہی زبان کا پرانا مسئلہ! اس مسئلے کا یہ حل ہے کہ بنگلہ زبان کو ملک کی دوسری زبان تسلیم کیا جائے، میری مراد عملی صورت سے ہے ورنہ تو غالباً چھپن ہی میں کچھ سیاسی عاقبت، نااندیشوں نے اپنے اقتدار کو استحکام بخشنے کیلئے اسمبلی سے بات منوا لی تھی۔ کمانڈر نواز بولتا رہا۔'' میری ناقص رائے میں مشرقی پاکستان کا مسئلہ لسانی نہیں معاشی ہے۔ اس مرحلے پر آ کر بنگلہ زبان کو

حقیقتاً دوسری زبان کا درجہ دے دیا گیا تو اس سے ملک کے دونوں حصوں کے درمیان فاصلہ کم ہونے کے بجائے زیادہ بڑھ

جائے گا۔ یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں، اس کے اثرات بہت دور تک جائیں گے۔ آئندہ برسر اقتدار آنے والوں کیلئے یہ ایک مثال ہو جائے گی پھر وہ بھی معاشی مسئلے کو لسانی رخ دیتے رہیں گے تا کہ عوام اپنے اصل مسائل پر سوچنے کے بجائے لسانی بنیادوں پر سوچنے لگیں اور حکمران طبقہ اپنی حکمرانی کو طول دیتا رہے۔''

کمانڈر نواز کے خیالات میرے انداز فکر سے مختلف نہیں تھے، مگر اس وقت کے حالات میں اختلاف رائے کا مطلب کچھ اور تھا۔ کسی بھی آمرانہ طرز حکومت میں اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم تھی۔ اس کے علاوہ میں اپنی حدود و حیثیت سے بھی واقف تھی۔ میرا مشن ملک دشمن عناصر کیخلاف سرگرم رہنا تھا، اس سے نہ کوئی آمر اختلاف کر سکتا تھا نہ کوئی ایسا حکمران جسے عوام نے منتخب کیا ہو، ہاں ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر مجھے اپنی ذاتی رائے رکھنے کا حق ضرور حاصل تھا۔ یہی سب کچھ میں نے کمانڈر نواز کو بھی سمجھایا، پھر میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ سولومن میری اطلاعات کے مطابق کراچی پہنچ چکا ہے اور اس کی یہاں آمد کا مقصد کیا ہے! اسی کے ساتھ یہ بھی کہ غیر ملکی امریکی ایجنٹ انڈر گراؤنڈ جا چکے ہیں۔

''میڈم! موجودہ حالات سولومن اندھیرے کے ایک تیر کے مانند ہے جو خدانخواستہ کسی بھی وقت اپنا ہدف تلاش کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارا چوکنا رہنا بہت ضروری ہے۔'' کمانڈر نواز نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، اسے کس طرح سامنے لایا جا سکتا ہے؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

میرے اس سوال میں جو اشارہ چھپا ہوا تھا، کمانڈر نواز جیسے ذہین شخص کیلئے اسے سمجھنا محال نہیں تھا۔ وہ اسی لئے فوراً بول اٹھا۔ ''میڈم! میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں کہ آپ کیا چاہتی ہیں!...... مگر میرے خیال میں یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہئے!''

''کون سا خطرہ کمانڈر؟'' میں دانستہ انجان بن گئی اور اس سے وضاحت چاہی۔

''یہی کہ آپ سولومن کو خود پر حملے کا موقع دیں۔'' وہ برجستہ بولا، اس نے یقیناً میرا اشارہ سمجھ لیا تھا۔

''تمہارے خیال میں اگر یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہئے تو پھر یہ بتاؤ کہ سولومن پر ہاتھ ڈالنے

کیلئے دوسرا کیا راستہ اختیار کیا جائے؟''

میرے سوال کا وہ فوری طور پر جواب نہ دے سکا۔ اس کی پیشانی کی لکیروں سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ میرے سوال نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔

''میں سمجھتی ہوں کمانڈر کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ فی الحال ہمارے پاس نہیں ہے۔'' کمانڈر نواز کو خاموش دیکھ کر میں بول اٹھی۔ ''اس مسئلے کو یوں سمجھنے کی کوشش کرو کہ میری جگہ کوئی اور ایسا فرد ہے جسے سامنے لاکر سولومن تک پہنچایا جاسکتا ہے تو کیا ہمیں یہ کوشش نہیں کرنا چاہئے؟''

''آپ درست کہہ رہی ہیں میڈم! یقیناً ہمیں یہ کوشش کرنا چاہئے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ شخصیتیں بہرحال اکاؤنٹ کرتی ہیں۔ میری صاف گوئی پر مجھے معاف کردیجئے گا۔ میڈم زندگی اور موت کی جنگ میں حقائق کو مفروضات سے نہیں بدلا جاسکتا۔ زندگی کے کسی بھی مرحلے پر آدمی اپنا قیمتی سرمایہ سب سے آخر میں اور بہ مجبوری داؤ پر لگاتا ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کی حیثیت ایک قیمتی سرمائے کی سی ہے۔''

''تم جذباتی ہوگئے کمانڈر! انہی جذبات کی رو میں بہہ کر تم شاید یہ بھول گئے کہ عذرا خان لقمہ تر تو نہیں ہے پھر یہ بھی تو سوچو کہ ایسا پہلی بار تو نہیں ہورہا! ایسے کھیل تو ہم پہلے بھی کھیلتے آئے ہیں۔ ایک بات اور بھی ذہن میں رکھا کرو کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ وفاداروں اور جاں نثاروں کا ایک ایسا قبیلہ موجود ہے جو خیروشر کی جنگ میں میرا ہم نوا بھی ہے اور ہم قدم بھی! میں جانتی ہوں کہ اس قبیلے کے افراد کا مسئلہ حصول معاش نہیں بلکہ یہ افراد اس لئے میرے ساتھ ہیں کہ ان کے اور میرے نظریات ایک ہیں۔ تم ...... تم بھی تو کمانڈر اسی قبیلے کے ایک فرد ہونا! بولو کیوں ہو تم میرے ساتھ؟...... کیا میرا تجزیہ غلط ہے؟''

''قطعی صحیح تجزیہ ہے آپ کا!'' کمانڈر نواز نے مجھ سے اتفاق کیا۔

''اکثر تم ایک اور بات بھول جاتے ہو کمانڈر! وہ یہ کہ قدرت نے شر کیخلاف سینہ سپر ہونے کیلئے مجھے کچھ ایسی قوتوں سے بھی نواز رکھا ہے جو قدم قدم پر میری رہنمائی کرتی رہتی ہیں۔ قدرت کا یہ عطیہ میرے لئے ہمیشہ ڈھال بنا رہا ہے۔ بتاؤ مجھے یہ کس طرح معلوم ہوگیا کہ سولومن امریکہ سے کراچی پہنچ چکا ہے اور اس کے کیا ارادے ہیں!...... میرے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں ہی نے تو مجھے اس سے آگاہ کیا کہ وہ کس ہوٹل میں اور کس حیثیت سے ٹھہرا ہوا ہے! یہ الگ بات کہ وہ اتنا عیار نکلا، پھر بھی ہمیں جل دے گیا۔''

''مجھے سب کچھ معلوم ہے میڈم! سب کچھ جانتا ہوں میں! لیکن یہ تربیت بھی تو آپ ہی نے ہمیں دی ہے کہ ہر بات کا فیصلہ حقائق اور دلائل کی روشنی میں کریں۔''

''دلیل تو میں تمہیں دے چکی کمانڈر! فی الحال سولومن کو زیردام لانے کیلئے ہمارے پاس کوئی متبادل راستہ نہیں ہے۔'' میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

پھر کمانڈر نواز، اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں بولا۔ وہ غالباً اندازہ لگا چکا تھا کہ میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گی۔ اس کے جذبات یقیناً میرے لئے قابل قدر تھے مگر یہ معاملہ کم از کم میری حد تک جذباتی نہیں

تھا۔ سیدھی سیدھی بات یہ تھی کہ میں اسے یعنی سولومن کو اپنی طرف متوجہ رکھنا چاہتی تھی تاکہ اس کا تخریبی ذہن میری ہی طرف لگا رہے۔ اسے میرے ملک کیخلاف تخریبی سرگرمیوں کی مہلت نہ مل سکے۔ اس میں ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ یا اس کے قریبی ساتھیوں میں سے کوئی میرے ہتھے چڑھ جاتا۔ یہ بھی میرے ملک کے مفاد میں ہوتا۔ کمانڈر نواز سے گفتگو کرتے ہوئے میں اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کرچکی تھی۔ اُن کو خود پر حملہ کرنے کیلئے موقع دینا خطرناک ضرور تھا مگر اس سے بھی زیادہ وہ بات تھی جس کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ میں نے اس دوران ان ہدایات پر غور کیا جو مجھے کمانڈر نواز کو دینا تھیں۔ وہ بھی شاید سمجھ گیا تھا کہ میں کچھ سوچ رہی ہوں اسی لئے کچھ نہ بولا، پھر میری ہی آواز نے سکوت توڑا۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا کمانڈر نواز سے بیان کردیا۔ مجھ پر حملہ ہونے کی صورت میں کیا حفاظتی انتظامات ضروری ہیں اور یہ کہ حملہ آور دشمنوں کو کس طرح گھیرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں میری ہدایات ہی کی روشنی میں کمانڈر نواز نے بھی کتنی تجاویز پیش کیں۔ یہ سبھی تجاویز میں نے قبول کرلیں۔ ان تجاویز کو قبول کرنے کا سبب ایک طرف تو خود کمانڈر نواز کو ممکنہ خطرات سے مطمئن کرنا تھا، دوسری جانب حفاظتی انتظامات کو مزید بہتر بنانا تھا۔ میری ہدایات اور کمانڈر نواز کی تجاویز کے بعد اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ مجھ پر حملہ کرنے والے بچ کر نکل جاتے یا یہ کہ وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہوجاتے۔

آئندہ کیلئے لائحہ عمل طے کرنے کے بعد اس کی روشنی میں مختلف اقدامات ضروری تھے۔ انہی اقدامات کی تکمیل کے بعد مجھے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے نکلنا تھا۔ ان اقدامات کی تکمیل کیلئے جانے سے پہلے کمانڈر نواز نے مجھے چن ای کے متعلق بھی رپورٹ دے دی۔ چن ای کو اس کے بنگلے پر چھڑوایا جاچکا تھا اور سیل کے دو افراد بنگلے کی نگرانی پر مامور کردیئے گئے تھے۔ یہ امکان کم ہی تھا کہ سولومن اب چن ای سے رابطہ قائم کرتا مگر میں سولومن سے اچھی طرح واقف تھی۔ اگر واقعی اسے فینی پسند آگئی تھی تو پھر وہ دوبارہ بھی اس کے قرب کی خواہش کرسکتا تھا۔ عورت جن لوگوں کی کمزوری ہوتی ہے وہ عموماً خطرات کو خاطر میں نہیں لاتے اور سولومن بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ اس کے علاوہ نگرانی کا ایک مقصد چن ای پر اس وقت تک نظر رکھنا بھی تھا۔ جب تک وہ یہ شہر نہ چھوڑ جاتا۔ اس عرصے میں وہ خود بھی اپنا ارادہ بدل سکتا تھا اور اسے ارادہ بدلنے پر مجبور بھی کیا جاسکتا تھا۔

مجھے ابھی مزید کچھ وقت آپریشن سیل ہیڈکوارٹر میں گزارنا تھا، اسی لئے کچھ تو وقت گزاری کی خاطر اور کچھ اپنے ذہن کو ریلیکس دینے کیلئے میں نے فون پر ملک دلاور سے گفتگو کا ارادہ کیا اور انٹرکام پر ڈائریکٹر لائن دینے کو کہہ دیا۔ میرا خیال تھا کہ اب تک ملک دلاور اپنے دفتر سے گھر پہنچ چکا ہوگا اور ذرا ہی دیر بعد میرے اس خیال کی تائید ہوگئی۔

''ہیلو ملک دلاور! زندہ ہو ابھی تک؟'' میں نے اس کی آواز سنتے ہی اسے چھیڑا۔

''جی ہاں خاتون، زندہ ہوں۔ دراصل اب محبت کا ٹرینڈ بدل گیا ہے۔ آج کے زمانے میں بغیر محبوبہ کے جینے کی عادت بھی ڈالنا پڑتی ہے۔'' حسب توقع وہ چونکنے لگا۔

''تمہاری باتوں سے تو ایسا معلوم ہورہا ہے۔ ملک دلاور کہ تم اب بڑے ہوگئے ہو!'' میں نے

جان بوجھ کر اظہار حیرت کیا۔

''اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے خاتون کہ اس بات کا علم آپ کو اب اس عمر میں ہوا۔ آپ کی عمر تک پہنچتے پہنچتے تو بر کی تلاش میں بہت سی دوشیزاؤں کی آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ آپ چاہے ساٹھ برس کی ہو جائیں کہلائیں گی کنواری کنیا ہی! اس داغ کو دھونے کا اب بھی چانس ہے خاتون! ایک دروازہ آپ کیلئے اب بھی کھلا ہے۔ اگر آپ کو میرے بڑے ہونے کا احساس ہو ہی گیا ہے تو پھر دیر نہ کریں۔ پہلے آئیں اور پہلے پائیں کی بنیاد پر آپ سے بات ہو سکتی ہے۔''

''کیوں، کیا تمہارے دروازے پر کنواری کنیاؤں کا کیو لگنے والا ہے؟'' میں نے اس کا مذاق اڑایا۔ ''اگر تم ایسے ہی شہزادہ گلفام ہوتے تو اب تک لنڈورے نہ پھر رہے ہوتے۔''

''شہزادہ گلفام دراصل شہزادی گل اندام کی تلاش میں ہے، اس لئے اسے لنڈورا تو پھرنا ہی پڑے گا۔ ویسے ایک بات بتائیں، یہ ایک اچانک گدھے کے سر سے سینگ کی طرح کہاں غائب ہو جاتی ہیں؟''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں تمہارے سر سے کبھی غائب نہیں ہوئی!'' میں نے اس پر چوٹ کی۔

وہ ہنس پڑا۔ ''اچھا تو آپ مجھے گدھا بتا رہی ہیں!''

''بنی بنائی چیز دوبارہ نہیں بتائی جاتی ملک دلاور! میں نے اس پر پھر فقرہ لگایا۔

''لگتا ہے آج آپ کی طبیعت بہت رواں ہے اور سنا ہے کہ آپ کا دل بھی ابھی جوان ہے۔ ایسے میں ہر دوشیزہ کو پیا ملن کی چاہت ہوتی ہے تو پھر آ جائیں نہ ادھر! اسلام آباد کے موسم کی رپورٹ بھی مل جائے گی مجھے!'' آخری جملہ اس نے مضحکہ خیز انداز میں ادا کیا۔

''تو پھر تم نے میرے پیچھے اپنی سی آئی ڈی لگا دی!'' میں اس کی بات سن کر چونکتے ہوئے بولی۔

''آخر کریں بھی کیا ہم غریب لوگ! وہ ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہنے لگا۔ خیر خبر تو رکھنا پڑتی ہے نا اپنے دلبروں کی!''

''اور یہ خیر خبر رکھنے کا نتیجہ تم کئی دفعہ بھگت چکے ہو! بیٹھے بٹھائے تم پر آخر میرا بھوت کیوں سوار ہو جاتا ہے کہ میں کہاں جا رہی ہوں، کیا......''

''دھیرج خاتون دھیرج!'' ملک دلاور میری بات کاٹ کر بولا۔ ''اگر لیٹے لٹائے کام چل سکتا ہے تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔''

''تم جانتے ہو مجھے دلگر باتیں بالکل پسند نہیں۔'' میں نسبتاً سخت لہجے میں بولی تا کہ وہ بالکل پٹڑی سے نہ اتر جائے۔ کبھی کبھی وہ پھکڑ پن پر بھی اتر آتا تھا۔

''دیکھیں جی، ابھی آپ کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا مجھ پر لازم نہیں ہوا، ہاں دو بول پڑھوا لیں تو دوسری بات ہے۔''

''تم اسی حسرت میں کسی دن ملک عدم سدھار جاؤ گے اور تمہارے پیچھے تمہیں کوئی رونے والا

بھی نہ ہو گا۔''

''رونے والا نہیں بلکہ رونے والی کہیں! اسی کیلئے تو بار بار آپ پر پٹو ڈالنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں مگر آپ کسی چکنی مچھلی کی طرح ہر دفعہ پھسل جاتی ہیں۔ آپ کو صبر کر کے آپ کی بہن ذکیہ خاتون کو پھانسنے کی کوشش کی تھی، لیکن آپ تو اتنی کٹھور ثابت ہوئیں کہ اس بیچاری ہی کو یہاں سے اڑن چھو کر دیا۔ ہائے اس ایک دل پر کتنے داغ لگائے ہیں آپ نے! کاش کبھی آپ کو......''

''ٹھہرو ذرا!'' میں نے انٹرکام کی بیل سن کر ملک دلاور کی بات کاٹ دی۔ ''ہولڈ کرو ذرا ٹیلی فون کا ریسیور رکھ کر میں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا۔'' ہاں!''

''میڈم! ریڈیو پر خبریں آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ اہل صدر مملکت سے ہونے والی گفتگو کے بعد یقیناً آپ خبریں سننا چاہیں گی۔ میں ریڈیو سیٹ بھجوا دوں؟''

''میرا خیال ہے کمانڈر کہ شاید میری الماری میں...... ریڈیو سیٹ موجود ہے، دیکھتی ہوں!'' یہ کہہ کر میں نے انٹرکام کا ریسیور بھی میز پر رکھ دیا اور پھر اٹھ کر سامنے دیوار سے لگی ہوئی آبنوسی لکڑی سے بنی ہوئی بڑی سی الماری کھول کر دیکھنے لگی۔ الماری کے درمیانی خانے میں مجھے ریڈیو سیٹ نظر آ گیا جسے میں نے نکال لیا اور دوبارہ کرسی پر آ بیٹھی۔ پہلے میں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا اور کمانڈر نواز سے کہا۔

''ریڈیو سیٹ ہے یہاں! تم نے اچھا کیا مجھے خبروں کی یاد دہانی کرا دی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھتے ہوئے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ خبریں آنے میں اب صرف دو منٹ باقی تھے! اسی لئے میں نے بہ عجلت ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور ملک دلاور سے بولی۔ ''سنو کل اتوار ہے نا اور تم ظاہر ہے گھر ہی پر رہو گے، میں کل کسی وقت آؤں گی تمہارے پاس اس وقت تم میرا بقیہ مغز چاٹ لینا! خدا حافظ!'' یہ کہتے ہی میں نے ریسیور رکھ دیا۔

ملک دلاور کو آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا ٹیلی فون نمبر معلوم نہیں تھا اس لئے مجھے یہ خطرہ نہیں تھا کہ وہ دوبارہ فون کر کے اچانک گفتگو منقطع ہو جانے کا ''انتقام'' لے گا۔ میں اپنی کوٹھی یا دفتر سے فون کرتی تو یہ خطرہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت ملک دلاور سے گپ لڑانا ضروری نہیں تھا، میرے نزدیک خبریں سننا نسبتاً زیادہ اہم تھا۔

پھر خبروں کا وقت ہوتے ہی میں نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔ ''یہ ریڈیو پاکستان ہے، اب آپ شکیل احمد کی زبانی خبریں سنیئے!'' میں نے اپنے پسندیدہ نیوز کاسٹر کی آشنا آواز سنی اور ہمہ تن گوش ہو گئی۔

اپنی سرگزشت پڑھنے والوں سے میں ایک بار پھر ایک وضاحت کرنا چاہتی ہوں۔ یہ وضاحت میں اپنی سرگزشت کی ابتدائی قسطوں میں بھی کر چکی ہوں کہ میری آپ بیتی میں بیشتر نام فرضی ہیں، کسی خاص گروہ، کسی شخصیت یا کسی بھی سیاسی تنظیم یا جماعت کو بدنام کرنا میرا مقصد نہیں ہے اور نہ یہ کہ میں اپنے ملک کی سیاسی تاریخ لکھ رہی ہوں۔ میں نے اس سے پیش نظر واقعات خصوصاً سیاسی واقعات کے بیان میں دانستہ ابہام رکھا ہے تا کہ مجھ پر یہ الزام عائد نہ کیا جا سکے کہ میں کسی خاص شخصیت کو بدنام کرنا چاہتی ہوں۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس سرگزشت کا قاری اس عہد کا تعین کرے جس میں یہ واقعات پیش

آئے۔ اسی احتیاط کو مدنظر رکھ کر چند واقعات کو میں نے اپنے ملک کی سیاسی تاریخ کے تسلسل میں بیان نہیں کیا اور انہیں جان بوجھ کر آگے پیچھے کر دیا ہے۔ اب تک میری شعوری کوشش یہی رہی ہے کہ یہ ابہام برقرار رہے مگر اس کی وجہ وہی ہے جو میں اوپر بیان کر چکی ہوں، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس وضاحت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ سیاست کا کوئی بھی طالب علم بھول سے اعتراض کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ یہ واقعہ فلاں سن میں نہیں بلکہ فلاں سن میں ہوا یا فلاں سن میں ملک کا سربراہ اور کہلاتا تھا یا یہ کہ فلاں وزیر خارجہ فلاں سن میں تھا، فلاں میں نہیں۔ دانستہ پیدا کردہ یہ ابہام میری کسی لاعلمی یا بدنیتی پر مبنی نہیں ہے۔ اس کا مقصد محض یہ ہے کہ میں جو کچھ تھی یا ہوں مجھے وہی سمجھا جائے اور مجھ پر جانبداری کا لیبل نہ لگایا جائے۔

دوبارہ میں نے یہ وضاحت، سچی کہانیاں کے مدیر شمیم نوید کے ایما پر بھی کی ہے جو میری آپ بیتی کو انگریزی سے اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ ان سے گزشتہ دنوں جب میں چند روز کیلئے کراچی آئی تھی تو فون پر بات ہوئی تھی۔ شمیم نوید کا کہنا یہ تھا کہ جب میری سرگزشت کی ابتدائی قسطیں شائع ہوئی تھیں "سچی کہانیاں" اس وقت اتنی بڑی تعداد میں شائع نہیں ہوتا تھا جتنا اب شائع ہوتا ہے۔ اس لئے دوبارہ وضاحت کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس وضاحت کے بعد میں پھر اس شب کا ذکر کروں گی جب ریڈیو پر خبریں سن رہی تھی۔

خبریں میری توقع کے مطابق تھیں۔ پہلی خبر وہی تھی جو میں سننا چاہتی تھی۔ صدر مملکت نے ایک حکم نامے کے ذریعے بغیر کسی ثبوت کے ملک کے مفاد میں کسی بھی شخص کی گرفتاری کو گویا قانونی حیثیت دے دی تھی۔ دوسری اہم خبر میرے لئے یہ تھی کہ ملک کے وزیر خارجہ، صدر مملکت کا ایک خصوصی پیغام لے کر انڈونیشیا روانہ ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کی خبروں کا تعلق گزشتہ شب اسلام آباد میں ہونے والی اس اہم میٹنگ سے تھا جس میں وزیر داخلہ کے ایما پر میں نے بھی شرکت کی تھی۔

صدر مملکت کی جانب سے جاری ہونے والا حکم نامہ ممکن ہے آیندہ ملک دشمن عناصر کیخلاف استعمال ہوتا لیکن موجودہ صورتحال میں یہ بے اثر ہو گیا تھا۔ اصل مجرم بہرحال اس کی زد میں آنے سے بچ نکلے تھے۔ اپنی حیرت انگیز ذہنی صلاحیتوں کے ذریعے گزشتہ رات ہی یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی۔ اس حکم نامے کا ایک مثبت پہلو صرف نہ تھا کہ میرے ملک میں موجود امریکی ایجنٹوں کے بہت سے آلہ کار اب ان کیلئے بے سود ہو گئے تھے۔ ملک دشمنوں کی نظر میں اب یہ مہرے پٹ چکے تھے، پھر وہ بھلا انہیں بچانے کی کوشش کیوں کرتے! اب ازسرنو بساط بچھانے اور نئے مہرے تلاش کرنے میں انہیں بڑا وقت لگتا۔ ان پٹے ہوئے مہروں میں سے بس ایک ان کے کام کا تھا یعنی مشرقی پاکستان کا ہوم سیکرٹری عبیدالرحمن چودھری! مگر اس کی ایک اور شخصیت بھی تھی۔ وہ بہ یک وقت قانون کا محافظ بھی تھا اور قانون کا مجرم بھی، غالباً اب امریکی ایجنٹ ایک گھاگ مجرم کی حیثیت سے اسے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

خبریں سننے کے بعد میں نے ریڈیو بند کر دیا۔ مجھے خبروں پر بندھے ٹکے تبصرے سے کوئی ایسی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ذرائع ابلاغ سے وابستہ وہ افراد مجھے ہمیشہ مظلوم نظر آئے ہیں جن بیچاروں کا مقصد حصول رزق کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا جو حکومت بھی آتی ہے یہ مظلوم طبقہ اپنے حصے کے جائز رزق کو

ل کی خاطر اسی حکومت کے راگ گانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے علاوہ اخبارات ال بھی غیر جمہوری حکومت میں اس عذاب سے نہیں بچ پاتے۔ میں جس دور کا ذکر کر رہی ہوں وہ بھی غیر جمہوری دور تھا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ سیاستدانوں نے ایک شخص کو آمر مطلق بننے کا موقع ں دیا! میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتی اور نہ یہ میرا منصب ہے۔ میں نے کبھی اپنے دائرہ کار سے قدم نہیں رکھا مگر کبھی اور کسی بھی صورت میں ان قوتوں سے مصالحت نہیں کی جن کا مقصد میرے ملک کو اسان پہنچانا تھا۔ یہی سب تو تھا کہ اپنے ملک کیخلاف سرگرم عمل سولومن اور اس کے ساتھیوں پر ہاتھ الے کیلئے مجھے اپنی جان کی پروا بھی نہیں تھی۔

ریڈیو بند کئے ابھی چند منٹ گزرے ہوں گے کہ انٹرکام پر کمانڈر نواز نے بتایا کہ اسلام آباد وزیر داخلہ کا فون ہے اور وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

"کراؤ بات!" میں نے آگے بڑھ کر سامنے میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا ا ں کے ساتھ دوسرے ہاتھ سے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔

چند ہی لمحوں بعد فون پر وزیر داخلہ کی آشنا آواز سنائی دی۔ میں نے انہیں سلام کیا جواباً انہوں لے عادی پھر بولے۔ "تم نے خبریں سنیں ریڈیو سے؟"

"جی ہاں سن چکی ہوں، مگر ......" میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ میں یہ سوچنے لگی تھی کہ وزیر اخلہ کو امریکن ایجنٹوں کے متعلق فون پر کچھ بتایا جائے یا نہیں؟

"عذرا! تم چپ کیوں ہو گئیں؟ کہو نا کیا بات ہے؟ تمہارے ہی ایما پر تو صدر مملکت کی منظوری ے بعد وہ حکم نامہ جاری کیا گیا ہے!"

اس دوران میں مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ وزیر داخلہ کو حقائق سے آگاہ کرنے میں وئی حرج نہیں۔ "اصل مجرم یعنی غیر ملکی ایجنٹ میری اطلاعات کے مطابق انڈر گراؤنڈ چلے گئے ہیں۔ وہ ے ہاتھ نہیں آ سکیں گے۔"

"یہ اطلاع تمہیں کن ذرائع سے اور کب ملی۔" وزیر داخلہ کے لہجے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کراچی پہنچنے سے پہلے ہی مجھے یہ اطلاع مل گئی تھی اور میرے ذرائع سے آپ واقف ہیں۔" میرا اشارہ "آپریشن سیل" کی طرف تھا۔ ظاہر ہے کہ میں انہیں اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتو ے بارے میں کیا بتاتی! میں نے اسی لئے بات بنا دی تھی پھر میں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے انہیں مزید بتایا۔ "خود سولومن بھی دہلی سے کراچی پہنچ چکا ہے۔ میرے آدمیوں نے گزشتہ شب اس پر ہاتھ النے کی کوشش کی تھی مگر وہ اپنی جگہ ایک اور شخص کو پھنسا کر نکل گیا جو محض آلہ کار تھا۔"

"کمال عیار شخص ہے۔ یہ سولومن بھی! حیرت ہے کہ وہ تمہارے آدمیوں کے نرغے میں بھی نہ آ سکا!" اسی کے ساتھ مجھے تم پر اور تمہارے معلومات کے ذرائع پر بھی تعجب ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق خود تمہی نے کراچی میں اپنے آدمیوں کو سولومن کے بارے میں یہ خبر دی تھی کہ وہ کراچی کے کس

فائیو سٹار ہوٹل میں کس حیثیت سے ٹھہرا ہوا ہے!''

وزیر داخلہ کی یہ بات سن کر میں چونک اٹھی اور پھر مجھے وہ فون یاد آ گیا جو میں نے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس راولپنڈی سے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کیا تھا۔ یقیناً وہ فون یا تو ٹیپ کیا گیا تھا یا پھر دوسرے دن صبح وزیر داخلہ کو اس کی رپورٹ دی گئی تھی۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں صرف چند لمحے لگے پھر وزیر داخلہ کی نظر میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کیلئے میں فوراً بول اٹھی۔ ''ایک دوست فرما رہے ہیں، لیکن میرے آدمی صرف آپریشن سیل ہیڈکوارٹر تک محدود نہیں رہتے، ان میں سے کچھ افراد براہ راست میرے رابطے میں بھی رہتے ہیں اور یہ بات تو آپ بھی بخوبی سمجھتے ہیں کہ اس جدید سائنسی دور میں رابطے کا ذریعہ صرف ٹیلی فون ہی نہیں ہے!'' میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

''سمجھ گیا میں! وزیر داخلہ نرم آواز میں بولے۔ ''مجھے تو اس پر بے پناہ خوشی ہے کہ تم اتنی باخبر اور مستعد رہتی ہو۔'' تو جو معاملات میرے پورے محکمے کے بس میں نہیں آتے تم محدود وسائل کے باوجود ان پر قابو نہ پاسکتیں۔ میں نے اس وقت تمہیں دو وجوہ سے فون کیا تھا۔ پہلی وجہ تو یہ جاننا تھی کہ سولومن تمہارے ہتھے چڑھ گیا یا نہیں! اس کا جواب مجھے مل گیا مگر اسی کے ساتھ تمہاری طرف سے تشویش بھی لاحق ہوگئی۔''

وزیر داخلہ کی تشویش سے آگہی میرے لئے مشکل نہیں تھی۔ میں نے فون پر عثمانی کو گزشتہ شب یہ بھی بتایا تھا کہ سولومن دہلی سے کراچی کیوں آیا ہے! میں اسی لئے وزیر داخلہ کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔ ''قطع کلامی کی معافی چاہتی ہوں۔ میری طرف سے آپ قطعی فکرمند نہ ہوں۔ میں تمام حفاظتی انتظامات کر چکی ہوں، اب آپ فرمائیے، کیا کہہ رہے تھے؟''

''وہ تو ٹھیک ہے عذرا کہ تم یقیناً حفاظتی انتظامات کر چکی ہوگی، لیکن تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو وزارت داخلہ کے تحت قانون نافذ کرنے والی مختلف ایجنسیاں بھی تمہاری حفاظت کیلئے مستعد ہوسکتی ہیں۔ تم بہرحال کم از کم میرے لئے بہت قیمتی ہو۔''

''اس عزت افزائی اور محبت کا بہت بہت شکریہ! انہیں رسمی الفاظ نہ سمجھئے گا، میں نے صدق دل کے ساتھ اور ذاتی طور پر آپ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ دراصل میری خواہش اور درخواست یہ ہے کہ مجھے میرا مسئلہ خود نمٹنے دیں۔ اگر کبھی کسی مرحلے پر میں نے خود کو مجبور یا بے بس محسوس کیا تو صدر مملکت کی طرف سے جاری کردہ خصوصی اختیار نامہ میرے پاس موجود ہے۔ میں ان اختیارات کو ضرور استعمال کرواں گی لیکن صرف اسی صورت میں جب میرے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں ہوگا۔ میں پھر یاددہانی کی غرض سے عرض کر رہی ہوں کہ فون کرنے کی دو وجوہ آپ نے بتائی تھیں جن میں سے مجھے ابھی صرف ایک وجہ کا علم ہوا ہے اور میں دوسری وجہ جاننے کی منتظر ہوں۔''

اس موقع پر صدر مملکت کی طرف سے جاری کردہ خصوصی اختیار نامے کا ذکر میں نے وزیر داخلہ کو مزید مطمئن کرنے کیلئے کیا تھا اور میری توقع پوری ہوگئی۔

''ٹھیک ہے میں تمہارے معاملات میں غیرضروری مداخلت نہیں چاہتا۔'' وزیر داخلہ نے کہا۔

''اگر تم اپنے حفاظتی انتظامات سے مطمئن ہو تو مجھے بھی مطمئن سمجھو!'' پھر انہوں نے مجھے فون کرنے کی دوسری وجہ بیان کردی۔ ''صدر مملکت نے آج صبح ہی وہ حکم نامہ جاری کردیا تھا جس کی خبر ابھی کچھ دیر قبل ریڈیو سے نشر ہوئی ہے۔ ملک کے دونوں حصوں میں آج دوپہر کے بعد بڑے پیمانے پر آپریشن شروع کر دیا گیا ہے۔ اعلیٰ سرکاری حکام جو ملک دشمنوں کے آلہ کار بنے ہوئے تھے بہ یک وقت ان سب کے خلاف کارروائی شروع کردی گئی ہے جس کے نتائج آج رات تک سامنے آجائیں گے۔ اب تک وصول ہونے والی رپورٹس کے مطابق کوئی غیرملکی ایجنٹ نہیں پکڑا جاسکا۔ یہ تمہاری اس اطلاع کا ثبوت ہے کہ وہ سب انڈر گراؤنڈ چلے گئے ہیں۔ بہرحال اسے بھی ہم اپنی بڑی کامیابی تصور کریں گے کہ مقامی ایجنٹ یا بہ [illegible] دیگر غیرملکیوں کے تمام آلہ کار پکڑ لئے جائیں۔ دیکھو کیا صورت رہتی ہے!''

''میری اطلاعات کے مطابق سولومن نے صرف اپنے ہم وطنوں کے علاوہ ایک مقامی ایجنٹ کو [illegible] ہے اور اس کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے۔ بقیہ تمام مقامی ایجنٹ اس آپریشن سے نہیں بچ سکیں گے [illegible] نہایت رازداری کے ساتھ اچانک اور بہ یک وقت شروع کیا گیا ہے۔''

''تمہارا اشارہ کہیں مشرقی پاکستان کے ہوم سیکرٹری عبیدالرحمٰن چودھری کی طرف تو نہیں، وہی [illegible] دوہری زندگی بسر کر رہا تھا؟ وزیر داخلہ نے وضاحت چاہی۔

''جی ہاں، وہی! وہ بھی انڈر گراؤنڈ جا چکا ہے۔'' میں نے تصدیق کردی۔

''عذرا! ظاہر ہے کہ یہ اطلاع بھی تمہیں گزشتہ شب ہی ملی ہوگی اور گزشتہ شب تم سٹیٹ گیسٹ ہاؤس راولپنڈی میں تھیں۔ راولپنڈی میں بیٹھ کر تمہیں مشرقی پاکستان تک کی رپورٹ مل گئی۔ یہ امر میرے لئے انتہائی حیرت ناک بھی ہے اور باعث مسرت بھی۔ مشرقی پاکستان کے دوران قیام میں یقیناً تم نے اعلیٰ خطوط پر وہاں بھی اپنی ذیلی تنظیم قائم کردی ہوگی جن پر یہاں قائم کی ہے ورنہ تمہیں اتنی جلدی وہ اطلاع نہ مل جاتی جس سے ابھی تک اس ملک کا وزیر داخلہ ہونے کے باوجود میں بے خبر ہوں۔''

''میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔'' میں نے ان کی غلط فہمی دور کرنا ضروری سمجھا۔ ''میں نے کوشش ضرور کی تھی اور ممکن ہے اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوجاتی! اگر مجھے مزید کچھ عرصے وہاں رہنے کا موقع مل جاتا! اس کے باوجود میں وہاں اپنے کچھ ہم خیال لوگ ایسے چھوڑ آئی ہوں جن سے میرا رابطہ ہے۔ میں اس پوزیشن میں ہوں کہ کسی بھی وقت آپریشن سیل کا ذیلی ادارہ وہاں قائم کرسکوں۔''

وزیر داخلہ سے فون پر میں یہ ساری گفتگو کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بہ مجبوری مجھے ایسا کرنا پڑا۔ اس کی بڑی وجہ وزیر داخلہ پر میرا ذاتی اعتماد بھی تھا۔ مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ یہ مزید گفتگو انہوں نے وزیر داخلہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ میرے ایک مخلص بزرگ کی حیثیت سے کی تھی۔ انہوں نے ایک بزرگ کی حیثیت سے مجھے کچھ نصیحتیں کی تھیں اور کچھ ہدایات دی تھیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ میں اپنے دشمنوں سے چوکنا رہنے کے ساتھ ساتھ اپنی صحت کا بھی خیال رکھوں۔ ہر بزرگ کی طرح انہیں بھی میں پہلے کی نسبت جسمانی طور پر کچھ کمزور نظر آئی تھی۔ میں نے بھی انہیں ایک فرمانبردار خورد کی طرح یقین دلایا تھا کہ آئندہ اپنی صحت کا خیال رکھوں گی۔

فون پر وزیر داخلہ سے گفتگو میں خاصا وقت گزر گیا تھا اور اب رات کے نو بجنے والے تھے کمانڈر نواز کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا تھا مگر وہ ابھی تک آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں موجود تھا اس کی وجہ ان احکام اور ہدایات کی تکمیل تھی جو میں نے اسے دی تھی۔ کراچی ایئر پورٹ سے میں سیدھی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر آئی تھی اور اب تک یہاں سے باہر نہیں نکلی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اب تک تمام انتظامات مکمل ہو جانا چاہئیں تھے۔ ابھی یہ خیال میرے ذہن میں آیا ہی تھا کہ انٹر کام گنگنا اٹھا میں نے ریسیور اٹھایا۔

”میڈم! آپ کیوں کہ محترم وزیر داخلہ سے فون پر گفتگو کر رہی تھیں اس لئے میں نے مداخلت نہیں کی۔“ دوسری جانب سے بولنے والا کمانڈر نواز تھا۔ ”آپ کے احکام کی تعمیل ہو چکی ہے۔“

”گڈ کمانڈر!“ میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”اب میں بھی یہاں سے اپنی کوٹھی جا رہی ہوں اور میرا خیال ہے کہ تم بھی عثمانی کو چارج دے کر گھر جا کر آرام کرو! خدا حافظ!“

”تھینک یو میڈم، خدا حافظ!“ کمانڈر نواز کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی جو سوٹ کیس میں کراچی سے اسلام آباد اپنے ساتھ لے گئی تھی اسے بھی ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔

میں اپنا کمرہ مقفل کر کے مڑی ہی تھی کہ ”سیل“ کے ایک رکن نے سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لینے کیلئے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ لائیے میڈم یہ مجھے دے دیجئے۔ وہ غالباً پہلے ہی کمانڈر نواز کے ایما پر وہاں موجود تھا۔ نہیں تم جاؤ یہ اتنا بھاری نہیں کہ میں اسے خود نہ اٹھا سکوں۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر کے خفیف اشارے سے انکار کیا پھر مزید بولی تم لوگ میری عادتیں خراب نہ کرو اس عمارت کی حدود میں ہم سب برابر ہیں، کوئی چھوٹا بڑا نہیں خواہ وہ میں ہی کیوں نہ ہوں! یہ بات میں ذاتی سطح پر کہہ رہی ہوں تنظیمی معاملات الگ ہیں۔“ یہ وضاحت کر کے میں اس طرف بڑھنے لگی جدھر ”سیل“ کا کار پارکنگ تھا۔

کار پارکنگ کی طرف بڑھتے ہوئے دور ہی سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ سب کچھ میری ہدایات اور کمانڈر نواز کی تجاویز کے مطابق ہوا ہے۔ نیلے رنگ کی ایک کار کے قریب ہی مجھے سرفراز کھڑا نظر آ گیا۔ میں اپنی سرگزشت میں پہلے بھی اس کا ذکر کر چکی ہوں، وہ ”سیل“ کا ایک ذہین نوجوان رکن تھا۔ اس نے میرے قریب پہنچتے ہی کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کار میں بیٹھ گئی۔ کار سرفراز ہی کو ڈرائیو کرنا تھی۔ میں نے سوٹ کیس اپنے برابر ہی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔

میری کار کی روانگی سے پہلے پارکنگ سے دو موٹر سائیکل سوار روانہ ہوئے پھر ان کے پیچھے ایک جیپ آگے بڑھی۔ جیپ کے آگے بڑھتے ہی سرفراز نے کار سٹارٹ کر دی۔ میری کار کے عقب میں ایک سیاہ وین کھڑی تھی۔ کار کے حرکت میں آتے ہی اس کا انجن بھی جاگ اٹھا۔

”آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر“ سے ڈیفنس کی طرف جاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ سرفراز شارٹ کٹس سے گریز کر رہا تھا۔ وہ نسبتاً کشادہ راستوں کو ترجیح دے رہا تھا، خصوصاً ایسے راستوں کو جہاں ٹریفک کا بہاؤ ہو۔ اس کا سبب سمجھنا میرے لئے مشکل نہ تھا۔ ٹریفک کے بہاؤ میں میری کار کے آگے

پیچھے چلنے والی گاڑیوں کی موجودگی کو بطور خاص محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جب ڈیفنس کی حدود شروع ہوئی تو اچانک مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی اور میں چوکنا ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ بے چینی اس وقت مزید بڑھ گئی جب میری کار اس راستے پر مڑی جو سیدھا میری کوٹھی کی طرف جاتا تھا، میری کوٹھی کے سامنے سے جو سڑک گزرتی تھی، یہ ذیلی سڑک آگے جا کر اسی سے مل جاتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میری کار کے آگے چلنے والی جیپ اور اس سے بھی آگے جانے والی دو موٹر سائیکلیں دائیں اور بائیں جانب مڑ گئیں۔ اسی کے چند لمحے بعد میری کار پر دائیں اور بائیں دونوں جانب سے بہ یک وقت جیسے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ فائرنگ یقیناً خودکار ہتھیاروں سے کی جا رہی تھی۔ یقیناً میرے دشمن وہاں پہلے ہی سے میری آمد کے منتظر تھے۔ مجھے چاروں طرف دھماکے ہی دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ میرا دشمن میرے اندازے سے کہیں زیادہ ذہین اور باخبر ثابت ہوا تھا۔ وہ خطرناک کھیل آج ہی رات شروع ہو گیا تھا جس کی توقع مجھے آئندہ روز تھی۔

☆......☆......☆

اردگرد ہونے والے دھماکوں سے یقیناً میرے لہو کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود اگر کوئی اس وقت میرے چہرے کا جائزہ لیتا تو اسے میرے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ نظر آتی۔ ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' سے میں جس کار میں چلی تھی، وہ بلٹ پروف تھی ورنہ بیک وقت دونوں جانب سے گولیوں کی بارش میں اس کا حلیہ بگڑ گیا ہوتا۔ دشمن کی جانب سے غیر متوقع حملہ ہونے کے باوجود میں قطعی مطمئن تھی۔ میں نے اپنے دشمن کے لیے جو جال بچھایا تھا وہ اس جال میں وقت سے پہلے آ پھنسا تھا

میرے ایما پر حملہ ہوتے ہی سرفراز نے کار روک کر ٹرانسمیٹر کا سوئچ آن کر دیا تھا ٹرانسمیٹر پر کیپٹن شاد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ بتا رہا تھا ''ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ان میں سے دو کو ہم گرا چکے ہیں، بقیہ چھ فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ہم انہیں فرار نہیں ہونے دیں گے اوور!''

''کیپٹن شاد سے کہو کہ انہیں زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کرے!'' میں نے سرفراز کو مخاطب کیا

''یس میڈم'' کہہ کر سرفراز نے میرا حکم ٹرانسمیٹر پر کیپٹن تک پہنچا دیا۔

دشمن دو طرف سے گھر چکا تھا اور اب اس کا بچ کر نکل جانا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ کیپٹن شاد اس پارٹی کا انچارج تھا جسے غیر متوقع حملہ ہونے کی صورت میں دشمن پر عقب سے حملہ کرنا تھا میری کار کے ساتھ جو جیپ اور بند وین تھی ایک طرف تو ادھر سے دشمن کی فائرنگ کا جواب دیا جا رہا تھا، دوسری جانب دشمن کی عقب سے اس پر فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ وہ چھ مسلح افراد درمیان میں پھنس گئے تھے جن میں سے تین دائیں جانب اور بقیہ بائیں جانب سے فائرنگ کر رہے تھے موجودہ صورت میں اگر وہ مزید معرکہ آرائی جاری رکھتے تو اس کا مطلب خودکشی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ غالباً اسی سبب انہوں نے جلد ہی ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا دیئے۔ انہیں میرے آدمیوں نے فوری طور پر حراست میں لے لیا۔

فائرنگ رکتے ہی میں کار سے اتر کر تیزی کے ساتھ زیر حراست افراد تک پہنچ گئی۔ انہی کے قریب دو افراد زمین پر خون میں لت پت پڑے تھے میری نگاہیں ایک خاص چہرے کو تلاش کر رہی تھی جو ان میں نہیں تھا۔ وہ چہرہ سولومن کا تھا حملہ آور سبھی غیر ملکی تھے مگر ان میں سولومن کے نہ ہونے سے مجھے مایوسی ہوئی اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ سولومن میک اپ میں بھی ہو سکتا ہے! ممکن ہے انہی اجنبی چہروں میں سے کوئی چہرہ اس کا بھی ہو۔

''کیپٹن! یہ دونوں صرف زخمی ہیں یا......'' میں نے زمین پر پڑے ہوئے دونوں غیر ملکیوں کی

طرف اشارہ کیا اور دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

کیپٹن شاد نے جھک کر ان دونوں غیر ملکیوں کا جائزہ لیا، پھر سیدھا کھڑا ہو کر بولا ''میڈم! یہ دونوں مر چکے ہیں، ایک کے سر میں گولی لگی ہے اور دوسرے کے سینے پر۔''

''انہیں اٹھواؤ یہاں سے، جلدی کرو!'' میں تیزی سے بولی۔ ''دھماکوں کی آوازیں یقیناً دور دور تک سنی گئی ہوں گی۔ ممکن ہے پولیس پہنچنے والی ہو۔''

پھر سب کچھ بہت تیزی کے ساتھ ہوا۔ دونوں غیر ملکیوں کی لاشیں وہاں سے اٹھوا لی گئیں اور جن چھ افراد کو زندہ گرفتار کر لیا گیا تھا، انہیں بھی لاشوں ہی کے ساتھ ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' روانہ کر دیا گیا۔ کیپٹن شاد ان سب کو لے کر روانہ ہوا ہی تھا کہ ایک پولیس جیپ وہاں پہنچ گئی میں اس وقت اپنی کار میں بیٹھنے والی تھی۔ پولیس جیپ کو آتے دیکھ کر میں رک گئی۔ میری کار کے پیچھے بند سیاہ وین کھڑی تھی پولیس جیپ اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ آئی۔ ڈرائیور سمیت پولیس جیپ میں پانچ افراد سوار تھے ایک باوردی پولیس انسپکٹر، ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹوں پر تین مسلح سپاہی نظر آ رہے تھے۔ جیپ رکتے ہی پولیس انسپکٹر اپنا بھاری تن و توش سنبھالتا ہوا نیچے اترا اور میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کسی مجرم کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

''ہوں!'' پولیس انسپکٹر میرے قریب آ کر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''پورا گینگ ساتھ ہے اور تم ان کی سرغنہ معلوم ہوتی ہو!''

''بالکل ٹھیک سمجھے تم! میں واقعی ان کی سرغنہ ہوں کمال ہے تمہیں یہ راز کی بات کیسے معلوم ہو گئی!''

''اوئے زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نیں اے! سدی سدی گل کر کتھوں ہت مارا اے، ہور مال کتھے اے؟ اے فیر فورا ایویں تو نئیں ہوئے نا۔ توں مینوں چکر نئیں دے سکدی میرا ناں چوہدری فیاض اے انسپکٹر چودھری فیاض! میرے علاکے دے وچ میری مرضی بنا پرندہ پر نئیں مار سکدا، سمجھ آئی!'' وہ سینہ پھلا کر مجھے رعب میں لینے کے لیے گھورنے لگا۔

''فیاض جی! میں بلا جھجک اس کے لہجے میں بولی ''تینوں اے وردی عزیز اے!'' میں نے اس کے سینے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔

''اوئے ہت ہٹا!'' اس نے کسی بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح ''بدک'' کر میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''چودھری فیاض نوں کوئی زنانی مم نئیں کر سکدی!'' پھر اسے غالباً وہ بات یاد آ گئی جو میں نے کہی تھی اسی لیے وہ شاید چونک کر بولا ''اوئے اے وردی دی کی گل کیتی تو نے؟''

معلوم نہیں کیوں مجھے اس شیخی خورے پولیس انسپکٹر پر رحم آنے لگا جو لاعلمی میں احمقانہ حرکتیں کر رہا تھا بہت سے عام اجڈ پولیس افسروں میں سے وہ بھی ایک تھا اس کی یہ غیر شائستگی، غلط ماحول اور تربیت کا نتیجہ تھی۔ قصور صرف اس کا نہیں بلکہ اس سسٹم کا تھا جس نے اسے معزز شہریوں اور قانون کا احترام کرنے اور کرانے کی بجائے ایک غیر مہذب اور ناپسندیدہ شخصیت بنا دیا تھا

''سنو چودھری فیاض، ادھر آؤ میری بات سنو!'' میرا لہجہ بدل گیا

"اوئے ہرگز نہیں" وہ برف خانے کی چمار کی طرح اکڑ گیا۔ "تم کو میرے ساتھ تھانے چلنا پڑے گا! پھر اس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ "اوئے سب نوں پھڑ لو!"

"سوچ لو چودھری فیاض، تمہیں یہ کھیل مہنگا پڑے گا۔" میری آواز میں اب بھی نرمی تھی۔ "بہتر یہی ہے کہ الگ چل کر میری ایک بات سن لو۔"

پولیس انسپکٹر کے بالکل پیچھے جو سپاہی کھڑا تھا، وہ شاید منہ چڑھا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں اپنے افسر کو مشورہ دیا۔ "سر جی! اتھوں ای مک مکا کر لو، تھانے لے جانڑ دی کی لوڑ اے!"

"اوئے توں چپ رے!" پولیس انسپکٹر نے اسے ڈانٹ دیا "افسر توں اے کہ میں آں!"

یوں تو پولیس انسپکٹر نے اپنے منہ چڑھے سپاہی کو ڈانٹ دیا تھا۔ لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے مشورہ پسند آیا تھا۔ یہ محسوس کرتے ہی میں پھر بول اٹھی۔ "چودھری صاحب! مجھے اور میرے ساتھیوں کو تھانے چلنے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن میں بات بڑھانا نہیں چاہتی"

اتنی دیر میں غالباً پولیس انسپکٹر یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ میں کوئی "سہل شکار" نہیں ہوں۔ وہ اسی لیے کچھ سوچ کر مجھ سے الگ چل کر بات کرنے پر آمادہ ہو گیا ہم دونوں سڑک سے اتر کر بقیہ پولیس والوں سے اتنی دور آ کر رک گئے کہ کوئی ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکے۔

"ہن دسو کی گل اے؟" پولیس انسپکٹر کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ مجھ سے سودے بازی چاہتا ہو

"سنو! میرا نام عذرا خان ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا پرس کھول کر وزیٹنگ کارڈ نکال لیا۔ "یہ لو، اس پر میرا پتا درج ہے۔ میں اسی علاقے میں اس سامنے والی کوٹھی میں رہتی ہوں" میں نے اسے وزیٹنگ کارڈ دے کر اپنی کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ "تم شاید اس علاقے میں نئے آئے ہو اور مجھے نہیں جانتے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ میرے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تم اپنے افسران سے مشورہ ضرور کر لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے۔" پھر میں نے اس کے ڈی آئی جی اور دوسرے اعلیٰ پولیس افسران کے نام لیے اور کہا۔ "تم ان میں سے کسی کو فون کر کے میرے بارے میں ہدایات لے لو تو بہتر ہے۔ پھر تم جو چاہے کرنا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ اپنے افسران کے نام سن کر وہ بڑی حد تک ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ کسی عام شہری کو علاقے کے ایس پی، ڈی ایس پی، اس کے علاوہ ڈی آئی جی کرائمز اور آئی جی کے نام یاد نہیں ہوتے۔

"کارڈ میں میری کوٹھی اور فرم کے فون نمبر موجود ہیں اور پتا بھی لکھا ہے۔ تم جب چاہو خود مجھ سے مل سکتے ہو یا فون پر رابطہ قائم کر سکتے ہو، مگر مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"او تو سب ٹھیک ہے اے میڈم جی پر گل سمجھ نہیں آئی!" پولیس انسپکٹر مرعوب کن لہجے میں کہنے لگا۔

"کیا بات سمجھ میں نہیں آئی، تمہارے؟" میں نے پوچھا۔

"دور دور تک زبردست فائرنگ کی آواز سنی گئی ہے جی!" پولیس انسپکٹر نے اپنی بات کی

وضاحت میں کہا۔

"لگدا تھا کہ دو گروہوں کے درمیان بھاری مقابلہ ہو رہا ہے۔ موقع واردات پر پہنچنے کے بعد آپ اور آپ کے ساتھیوں کو یہاں دیکھا گیا۔"

"بھول جاؤ یہ سب کہانی انسپکٹر! تم اپنی کارکردگی ہی ظاہر کرنا چاہتے ہو تو نامعلوم شرپسندوں کے خلاف ایف آئی آر درج کر لو کہ انہوں نے بلاسبب علاقے میں اشتعال پھیلانے کے لیے فائرنگ کی جس سے کوئی ہلاک یا زخمی نہیں ہوا اور یہ کہ پولیس نامعلوم شرپسندوں کی سرگرمی کے ساتھ تلاش کر رہی ہے وغیرہ۔ اس طرح یہ ہوگا کہ اگر یہاں سکونت پذیر افراد میں سے کسی نے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کر کے پیش آنے والے واقعے کی ذاتی طور پر رپورٹ کی تو تمہارا دامن بچا رہے گا۔ ایسی صورت میں تم سے باز پرس نہیں ہوگی۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے نا! میں اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کا جائزہ لے کر بولی۔

"اے گل تے چنگی اے میڈم جی، پر......" وہ کچھ کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

"ہاں ہاں بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے جھجکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"اصل گل سمجھ نہیں آئی۔" آخر اس نے کہہ ہی دیا۔

مصلحتاً میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے کسی طرح مطمئن کر دوں اسی لیے "اصل گل" کی بجائے ایک اور کہانی سنا دی۔ "میرا وزیٹنگ کارڈ دیکھ کر تم نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ میں ایک کاروباری شخصیت ہوں۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا میرا بڑا بزنس ہے۔ میرے بہت سے کاروباری حریف بھی ہیں جو مجھے اپنے مفاد میں راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ میں اسی لیے اپنے ساتھ ہمیشہ مسلح محافظ رکھتی ہوں۔ آج جب میں اپنی کوٹھی کی طرف لوٹ رہی تھی تو کچھ نامعلوم افراد نے میری کار پر فائرنگ کی، مگر جوابی فائرنگ کے بعد وہ فرار ہو گئے۔" اپنی بات کے ردعمل میں مجھے پولیس انسپکٹر کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے جیسے اس کی ذہنی الجھن دور ہو گئی ہے۔

"ٹھیک اے میڈم جی، اب جاؤ! اگر آپ نوں کسی پہ شبہ اے تیں دس دیو، میں اس کا حشر نشر......"

"نہیں چودھری فیاض، وہ لوگ تمہارے بس کے نہیں ہیں۔ میں خود نمٹ لوں گی ان سے!" میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی، پھر بولی۔ "اچھا تو میں چلتی ہوں۔"

"بے شک جی بے شک، اب جاؤ میڈم جی!" وہ سر ہلاتا ہوا میرے ساتھ اپنے ہمراہی پولیس والوں کی طرف بڑھنے لگا۔

پولیس والوں سے نمٹنے میں خواہ مخواہ تقریباً نصف گھنٹا صرف ہو گیا تھا، مگر مجبوری تھی۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ کہیں فائرنگ کے تبادلے میں "سیل" کا کوئی رکن معمولی یا شدید زخمی نہ ہو گیا ہو اس کے علاوہ میں اس تشویش میں بھی مبتلا تھی کہ اتنے بڑے منظم حملے کے دوران میں سولومن نے کیوں دامن بچایا؟ اسے تو خود اپنے غیر ملکی ساتھیوں کی رہنمائی کے لیے موقع پر موجود ہونا چاہیے تھا۔

انہیں خیالات کے گرداب میں ڈوبتی ابھرتی ہوئی میں کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھتے ہی

سرفراز نے کار سٹارٹ کر دی۔ میری کوٹھی وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ مجھے وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' سے جو لوگ میرے ساتھ آئے تھے، ان سبھی کو میری کوٹھی کے گرد ایک ایسا حفاظتی حصار قائم کرنا تھا کہ ان کی نظر میں آئے بغیر کوئی بھی کوٹھی کی حدود میں داخل نہ ہو سکے۔ کمانڈر نواز نے ان سب کا نگراں سرفراز کو مقرر کیا تھا جسے کوٹھی کے اندر رہ کر ٹرانسمیٹر پر باہر موجود افراد سے رابطہ قائم رکھنا تھا۔ یہ سب کچھ پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ میرے کوٹھی سے کہیں جانے کی صورت میں یہی لوگ ساتھ ہوتے، مگر ایسی صورت میں ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' کو کم از کم نصف گھنٹے پہلے مطلع کرنا ضروری تھا۔ اس کا سبب اس حفاظتی دستے کو الرٹ کرنا تھا جس کی ذمے داری کیپٹن شاد پر تھی۔ یہ دوسرا حفاظتی دستہ کسی بھی غیر متوقع حملے کی صورت میں دشمن کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا جس کا عملی ثبوت آج ہی رات مل چکا تھا۔ دو طرف سے گھر جانے کے بعد دشمن کے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں نے کمانڈر نواز کے مشوروں اور تجاویز کی روشنی میں ذہین اور عیار دشمن سے نمٹنے کے لیے جو حکمت عملی طے کی تھی، وہ ہر طرح سے سود مند ثابت ہوئی تھی۔ پھر بھی میرے ذہن میں کوئی شے کھٹک رہی تھی۔ غالباً اس کی وجہ سولومن کا ہاتھ نہ چڑھنا تھا۔ اس نے مجھ پر بھرپور اور منظم حملہ کرانے کے لیے کسی مقامی شخص کو استعمال نہیں کیا تھا۔ وہ اب میرے بارے میں خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ پیشہ ور قاتلوں اور جرائم پیشہ افراد میرا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گے۔ اسے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو اپنی جان کی پروا کیے بغیر مجھے ہر ممکن صورت میں راستے سے ہٹا دیتے۔ یہ اعتماد بہرحال وہ اپنے ساتھیوں اور ہم وطنوں پر کر سکتا تھا جو ایک خاص مشن پر اس کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ انہیں میں سے دو نے اپنی جان دے کر سولومن کے اعتماد کو یقین میں بدل دیا تھا۔ وہ دونوں اپنے لوگوں اور اپنی زمین سے دور ہمیشہ کے لیے ایک تاریک شب کا حصہ بن گئے تھے۔ ان لوگوں سے نفرت کے باوجود میرے دل میں ان کی عزت تھی۔ انہوں نے بہرحال اپنے مقصد اور اپنے ملک کے مخصوص مفادات کی خاطر جان دے دی تھی۔ خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہوں میرے نزدیک ایسے لوگ قابل تعظیم ہوتے ہیں جو اپنے ملک و قوم کے لیے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں۔ حب الوطنی کسی خاص خطے کسی مخصوص علاقے یا کسی ایک ہی جغرافیائی وحدت تک محدود نہیں ہوتی۔ یہاں وقت، حالات اور مختلف جغرافیائی تقسیم میں اس کے معنی ضرور بدل جاتے ہیں۔ جنہیں ہم ملک دشمن کہتے ہیں، وہ اپنے ملک میں محب وطن اور ہیرو کہلاتے ہیں۔ سو جو دو غیر ملکی آج شب میرے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے، ان کی موت میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔

ذہن میں ایک بے نام کھٹک سی اور دل پر ایک بوجھ سا لیے سرفراز کے ہمراہ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ راستے میں میری ملازمہ خاص فاطمہ مل گئی۔ مجھے سلام کرنے کے بعد فاطمہ نے بتایا کہ ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' سے عثمانی کا فون آیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ملک دلاور کے فون کی اطلاع بھی دی۔

''ٹھیک ہے، میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں، بات کر لیتی ہوں اس سے...... اور ہاں میری

خواب گاہ کے برابر والا کمرہ صاف کرا دو، یہ وہاں ٹھہریں گے۔'' میں نے سرفراز کی طرف اشارہ کیا، پھر مزید بولی۔ ''کھانا بھی لگوا کر مجھے آ کے بتانا!''

فاطمہ اثبات میں سر ہلا کر چلی گئی۔ اس دوران میں میرا ایک ملازم، کار سے میرا سوٹ کیس نکال کر میری خواب گاہ میں پہنچا گیا۔

میں جب اپنی خواب گاہ کے دروازے میں داخل ہونے لگی تو محسوس کیا کہ سرفراز اندر قدم رکھتے ہوئے کچھ جھجک رہا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ میرے ساتھ میری کوٹھی کے اندرونی حصے میں آیا تھا۔ میں بہرحال غیر شادی شدہ تھی اور جنس مخالف سے تعلق رکھتی تھی۔ کسی ایسی ہستی کی خواب گاہ میں قدم رکھتے ہوئے اس کی جھجک فطری تھی۔

''آؤ...... آ جاؤ، جھجکنے کی ضرورت نہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایک مشرقی عورت ہونے کے باوجود اور تمام مشرقی اقدار پر یقین رکھتے ہوئے دقیانوسی ذہن کی مالک نہیں ہوں۔ آج کی مشرقی عورت نے خود کو جتنا کمزور اور بے بس سمجھ لیا ہے درحقیقت وہ مرد کے مقابلے میں اتنی کم تر اور مجبور نہیں ہے۔ ہاں اس کے لیے اسے مرد کے قدم سے قدم ملا کر چلنا پڑے گا اور اپنا سارا بوجھ مرد کے کاندھوں پر ڈالنے کی بجائے اس میں حصہ بٹانا ہوگا۔ اسی صورت میں وہ اپنے صحیح راستے کا تعین کر سکتی ہے۔'' یہ کہتی ہوئی، میں سرفراز کو ساتھ لیے اپنی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' سرفراز بولا۔ ''مگر اس سلسلے میں ہماری مشرقی عورت کا نقطہ نظر کچھ اور ہے۔''

سرفراز کے الفاظ ختم ہونے سے پہلے میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے کا اشارہ کیا اور میں چونک کر خواب گاہ کا طائرانہ جائزہ لینے لگی۔ سرفراز بھی مجھے دیکھ کر چوکنا نظر آنے لگا۔ اسی وقت میرے بیڈ کے قریب رکھی ہوئی تپائی پر موجود فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''تم ادھر کرسی پر بیٹھو، میں فون دیکھتی ہوں۔'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے سرفراز سے کہا۔

بیڈ کے قریب پہنچ کر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہیلو عذرا خان۔'' یہ کہہ کر میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''آداب میڈم!'' دوسری طرف سے عثمانی کی آواز سنائی دی۔ ''میں اس سے پہلے بھی آپ کو رنگ کر چکا ہوں، مگر......''

''معلوم ہو چکا ہے مجھے، آگے کہو! کوئی خاص بات؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر دریافت کیا۔

''گرفتار ہونے والے چھ مجرموں میں سے دو آپریشن سیل ہیڈکوارٹر پہنچنے سے پہلے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔'' عثمانی نے خلاف توقع اطلاع دی۔

''وہ کیسے؟'' میرے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

''ان میں سے کسی کے پاس دھواں چھوڑنے والے بم تھے۔ معلوم نہیں کیسے انہوں نے وہ بم، بندوین کے پچھلے حصے میں چھوڑ دیئے۔ سیل کے دو ارکان بھی گرفتار ہونے والوں کے ساتھ تھے۔ دھوئیں

کی وجہ سے ان کا دم گھٹنے لگا تو انہوں نے مجبوراً وین کو روک کر اس کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔'' عثمانی تفصیلات بتانے لگا۔'' پہلے سیل کے دونوں ارکان بری طرح کھانستے ہوئے وین سے کودے، پھر انہی کے ساتھ گرفتار کیے جانے والے وین سے نکل کر بھاگے۔ جس جگہ یہ واقعہ پیش آیا، وہاں دور دور تک اندھیرا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ کیپٹن شاد کو خطرے کا احساس ہوتا، ان غیر ملکیوں میں سے دو اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر نہ جانے کدھر نکل گئے۔ بقیہ چار افراد نے بھی کوشش کی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھالیں، مگر ان کی کوشش ناکام بنادی گئی۔ ان چاروں میں سے ایک کیپٹن شاد کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ بقیہ تین میں سے دو کو ان کے پیروں پر فائر کر کے گرا لیا گیا، تیسرے شخص نے بازی الٹتے دیکھ کر ہاتھ اٹھا دیئے اور زخمی ہونے سے بچ گیا۔ اب آپریشن سیل میں تین غیر ملکیوں کی لاشیں ہیں، دو زخمی ہیں اور ایک ''مہمان خانے'' میں ہے۔

''ویری بیڈ، ویری ہوپ لیس!'' میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ ''کیپٹن شاد سے شدید قسم کی حماقت سرزد ہوئی ہے۔ اسے گرفتار کیے جانے والوں کی پہلے تلاشی لینا چاہئے تھی۔''

''میں نے اس سے جواب طلب کیا تھا۔ جواباً اس نے بتایا ہے کہ آپ کے حکم پر اسے لاشوں اور گرفتار کیے جانے والے افراد کو فوری طور پر وہاں سے لے کر روانہ ہونا پڑا ورنہ وہ تلاشی ضرور لیتا۔'' عثمانی نے جواباً کہا

''بہرحال اس کا کہنا غلط نہیں ہے۔ صورتحال کچھ ایسی تھی کہ خود میرا دھیان بھی ادھر نہیں گیا۔ میں چاہتی تھی کہ پولیس کی وہاں متوقع آمد سے پہلے کیپٹن شاد، لاشوں اور گرفتار ہونے والوں کو لے کر نکل جائے۔ اب تم یہ کرو کہ جو تین غیر ملکی تمہاری تحویل میں ہیں اور جو تین مارے جا چکے ہیں، ان کے بارے میں فوری طور پر مجھے یہ رپورٹ دو کہ ان میں سے کسی کے چہرے پر میک اپ تو نہیں ہے، ان میں سے کوئی ایک بھی سولومن ہو سکتا ہے۔ یہ میرا قیاس ہے۔ اگر ان میں کوئی خود سولومن رہا ہو گا تو وہ دو فرار ہونے والوں میں سے ایک ہو گا۔ پھر بھی تصدیق ضروری ہے۔ میں عثمانی کو ہدایات دیتی رہی۔'' ایک کام اور کرو غیر ملکی ایجنٹوں کی جو لسٹ وزیر داخلہ کو ہم نے دی ہے اور جو ''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر'' کے ریکارڈ میں بھی موجود ہے اس میں یہ دیکھ کر بتاؤ کہ صرف کراچی میں کتنے غیر ملکی ایجنٹ تھے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ان کی تعداد دس سے زیادہ نہیں تھی۔

''بہتر ہے میڈم۔'' عثمانی سعادت مندی سے بولا، پھر پوچھنے لگا۔ ''ان لاشوں کے بارے میں کیا حکم ہے جنہیں فی الحال سردخانے میں رکھوا دیا گیا ہے؟ کیا یہ تصدیق ہونے کے بعد کہ ان کے چہروں پر میک اپ نہیں، انہیں ٹھکانے لگا دیا جائے؟''

''نہیں، ابھی جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ تم سے میں نے جو رپورٹ طلب کی ہے، فی الحال اس پر توجہ دو۔ میں اس دوران میں سوچتی ہوں کہ اگلا قدم کیا اٹھانا چاہئے۔'' یہ کہہ کر میں نے عثمانی کو مختصراً دیر سے کوٹھی پہنچنے کی وجہ بھی بتا دی، پھر ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر'' سے مجھے جو رپورٹ ملی تھی، وہ بھی بہرحال تشویش ناک تھی، اس کے باوجود میری چھٹی حس ابھی تک بیدار تھی۔ میں ایک نوع کی بے نام سی بے چینی محسوس کر رہی تھی جس کی

بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔

سرفراز مجھ سے کچھ کہنے والا تھا کہ اسی وقت خواب گاہ کے دروازے سے فاطمہ اندر داخل ہوئی اور بتایا کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔

''آؤ سرفراز۔'' میں بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔''

''ہوا کیا میڈم؟ آپ کچھ پریشان معلوم ہو رہی ہیں۔'' سرفراز میرے ساتھ خواب گاہ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔

جواباً میں نے عثمانی سے ملنے والی رپورٹ اسے بتا دی، پھر بولی۔ ''بس کبھی کبھی یہی ذرا ذرا سی حماقتیں مشکلات پیدا کر دیتی ہیں۔''

''یہ بات تو ہے میڈم۔'' سرفراز نے میری بات کی تائید میں کہا۔ ''غیر معمولی ہنگامی حالات کے باوجود ہمیں اپنے ذہنوں کو پوری طرح بیدار رکھنا چاہئے ورنہ ذرا سی بھی غفلت کے سنگین نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اگر میں، کیپٹن شاد کی جگہ ہوتا تو شاید مجھ سے بھی بھول ہو جاتی۔ بہرحال آدمی تجربات ہی سے سیکھتا ہے۔''

ایسی ہی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔ میز پر کھانا لگ چکا تھا۔ میری بے چینی اب تک برقرار تھی جس کا سبب ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ فاطمہ کے علاوہ وہاں دو ملازم اور تھے۔ ان میں سے ایک چہرہ میرے لیے نیا تھا جسے دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ میری کوٹھی میں چوکیدار، مالی اور ڈرائیور کے علاوہ صرف ملازمائیں تھیں۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ میری اجازت کے بغیر کسی کو کوٹھی میں ملازم رکھا گیا ہو یا قیام کی اجازت دی گئی ہو۔

فاطمہ میری مزاج شناس تھی۔ اس نے یقیناً یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اس اجنبی نوجوان کی موجودگی مجھے پسند نہیں آئی۔ وہ اسی لیے میرے قریب آ کر معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''بی بی جی، یہ نذیراں باورچن کا بھانجا ہے اور کل ہی فیصل آباد سے آیا ہے۔ کل سے نذیراں کو بخار آ رہا ہے۔ یہ لاہور میں تھا پہلے۔ وہاں ایک بڑی کوٹھی میں کک تھا۔ پچھلے دنوں اس نے نذیراں کو خط لکھا تھا کہ اس کے صاحب لوگ مستقل طور پر پاکستان سے کینیڈا جا رہے ہیں۔ نذیراں نے اسے یہاں بلوا لیا کہ کسی کوٹھی میں کک لگوا دے گی۔ یہاں یہ آیا تو نذیراں کی طبیعت خراب تھی، سو کل سے اس نے کچن سنبھال رکھا ہے۔ آپ یہاں نہیں تھیں اس لیے مجبوراً اپنی ذمے داری پر میں نے اسے کام پر لگا لیا ورنہ تو......''

''ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں۔'' میں کھانے کی میز پر بیٹھنے کے بعد اپنی پلیٹ میں سالن نکالنے لگی۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میری کوٹھی کے ملازمین کے عزیز، رشتے دار آتے جاتے رہتے تھے، لیکن وہ سرونٹ کوارٹر کی حدود ہی تک رہتے تھے۔ یہ بہرحال نئی بات تھی کہ ان میں سے کوئی پہلی بار میری کوٹھی کے اس حصے میں داخل ہوا تھا جو صرف میرے لیے مخصوص تھا یا پھر وہاں میرے ذاتی ملازمین آ جا سکتے تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے ڈائننگ ہال کے دروازے پر کسی بت کی طرح کھڑا ہوا وہ نوجوان مجھے

عجیب سا لگا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔

''اے تم آ دھر آؤ۔'' معاً میں نے اس نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

وہ میری آواز سن کر اس طرح چونک اٹھا جیسے کوئی خلاف توقع بات ہو گئی ہے۔ اس کا انداز قطعی غیر فطری تھا۔

''میں جی...... میں...... آؤں؟'' اس نے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے حیرت سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ہاں، تمہیں کو بلا رہی ہوں میں۔'' جواباً میں نے تصدیق کی۔

وہ ڈرتا جھجکتا سا قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''ہاں بیگم صاحب جی، حکم؟''

میں نے قدرے مڑ کر اس کے چہرے کا بھرپور جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی نشے کا عادی تھا، چہرے پر عام نوجوانوں ایسی معصومیت بھی نہیں تھی۔ مجموعی طور پر وہ چہرہ کسی ایسے نوجوان کا چہرہ تھا جس کا تعلق جرائم سے رہا ہو۔ اتنی فیس ریڈنگ تو بہرحال مجھے آتی تھی۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' میں نے کھانے سے ہاتھ روک کر دانستہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''فضلے جی۔'' یہ کہہ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔ مجھے اس سے یہی توقع بھی تھی جس کے دل میں چور ہوتا ہے وہ عموماً نظر ملا کر بات نہیں کرتا۔

''اچھا جاؤ تم۔'' میں بولی اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

کھانا کھاتے ہوئے ایک ملازمہ نے آ کر بتایا کہ عثمانی کا فون ہے۔

''ان سے کہو کہ میں ڈائننگ روم میں ہوں، ابھی خود انہیں فون کر لوں گی۔'' میں نے ملازمہ کو جواب دیا۔

ملازمہ میرا جواب سن کر واپس چلی گئی۔ کھانا کھاتے ہوئے دو ایک بار میں نے کن انکھیوں سے فضلے کی طرف دیکھا۔ وہ قدرے مضطرب اور نروس سا دکھائی دے رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں کھانا کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور فاطمہ سے کہا کہ چائے خواب گاہ میں بھجوا دے۔

سرفراز کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر میں نے ''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر'' کے نمبر ڈائل کیے۔ سلسلہ فوراً ہی مل گیا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے والا عثمانی ہی تھا۔

''ہاں عثمانی، کیا رپورٹ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میڈم! غیر ملکی ایجنٹوں کی لسٹ کے مطابق کراچی میں صرف آٹھ افراد تھے۔'' عثمانی نے بتایا۔

میں چونک کر بولی۔ 'اور عثمانی، یہ ہماری کتنی بڑی کامیابی تھی کہ ہم نے بیک وقت ان سبھی کو قابو میں کر لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سولومن نے اپنی بچی کھچی تمام قوت کے ساتھ مجھ پر فیصلہ کن حملہ

کیا تھا۔ اس کا یہ اندازہ کتنا درست ثابت ہوا تھا کہ میں کراچی پہنچنے کے بعد بہرحال اپنی کوٹھی کا رخ ضرور کروں گی۔ اسی لیے اس نے وہاں پہلے سے اپنے آدمیوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس کے دو خطرناک ساتھی بچ کر نکل گئے۔''

''پھر بھی میڈم، اس حملے کی ناکامی سے سولومن کے حوصلے پست ہو جانا چاہئیں۔'' عثمانی نے رائے زنی کی۔

''غلط خیال ہے تمہارا۔'' میں نے عثمانی کی رائے سے اختلاف کیا۔ ''چوٹ کھایا ہوا سانپ اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ سولومن کی حالت اس وقت کسی چوٹ کھائے ہوئے سانپ ایسی ہو گی۔ اس کے علاوہ تمہیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اب بھی پاکستان کے مختلف شہروں میں غیر ملکی ایجنٹوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ سولومن انہیں جب چاہے کراچی پہنچنے کا حکم دے سکتا ہے۔ جہاں تک میں، سولومن کو سمجھ سکی ہوں اس کی اب تک جدوجہد اور مسلسل ناکامیوں کے باوجود پیہم تگ و دو کا صرف ایک سبب ہے کہ ہر ناکامی کے بعد اس میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ عام لوگوں سے اس کی نفسیات قطعی مختلف ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے ملک کی طرف سے ہندوستان اور پاکستان میں موجود تمام غیر ملکی ایجنٹوں کا سربراہ نہ ہوتا۔ یہ باتیں میں نے تمہیں اس لیے بتائی ہیں عثمانی کہ تم آئندہ سولومن ایسے انتہائی عیار اور خطرناک دشمن کو انڈر اسٹیمیٹ نہ کرو۔ ہاں میں تم سے ایک بات تو پوچھنا بھول ہی گئی۔'' میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''جی فرمائیے میڈم۔'' عثمانی بول اٹھا۔

''یہاں میری کوٹھی کے قریب فائرنگ کا جو تبادلہ ہوا تھا، اس میں سیل کا کوئی رکن تو زخمی نہیں ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی ہاں میڈم، اندھا دھند فائرنگ کے نتیجے میں سیل کے تین افراد کو گولیاں لگی تھیں، مگر وہ شدید زخمی نہیں ہوئے۔ ان میں سے بس ایک کو میڈیکل کور کے انچارج ڈاکٹر رشید نے ایمرجنسی میں داخل کر لیا ہے اس کے شانے کی ہڈی میں گولی پیوست ہو گئی تھی جسے ڈاکٹر رشید نے آپریشن کر کے نکال دیا ہے۔ آپریشن کے بعد اب اس کی حالت بہتر ہے۔ ڈاکٹر رشید کا کہنا ہے کہ اسے کم از کم ایک ہفتے بیڈ ریسٹ کی ضرورت پڑے گی۔''

''کچھ کچھ اندازہ تھا مجھے کہ بے دریغ فائرنگ کے نتیجے میں ہمارا بھی نقصان ہو سکتا ہے۔ تم میری طرف سے سیل کے زخمی ارکان کی عیادت ضرور کر لینا۔ میں خود بھی کل آ کر ان کی مزاج پرسی کروں گی۔ ہاں وہ تم نے ان لوگوں کے چہروں پر میک اپ کی تصدیق کی؟'' میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے آخر میں پوچھا۔

''ان میں سے کسی کے چہرے پر بھی میک اپ نہیں تھا۔ ان سب کے ناموں کی تصدیق بھی کر لی گئی ہے۔ یہی نام غیر ملکی ایجنٹوں کی فہرست میں بھی موجود ہیں۔''

عثمانی کی اس اضافی کارکردگی پر مجھے خوشی ہوئی۔ اس نے فرار ہو جانے والے دو غیر ملکی ایجنٹوں کے ناموں کا سراغ بھی لگا لیا تھا۔ ''ویری گڈ عثمانی، تم اچھے جا رہے ہو۔ مجھے تم سے ایسی ہی

توقعات رہتی ہیں۔‘‘ میں نے عثمانی کی تعریف اور حوصلہ افزائی میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

’’عزت افزائی ہے میڈم آپ کی۔‘‘ وہ اپنی عادت کے مطابق انکسار سے بولا۔

ابھی فون پر عثمانی سے میری گفتگو جاری تھی کہ فاطمہ چائے کی ٹرالی لیے خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کے لیے کہا تاکہ وہ واپس نہ چلی جائے۔

’’عثمانی، کیا تم نے زندہ بچ جانے والوں میں سے کسی غیر ملکی ایجنٹ سے سولومن کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کی؟‘‘

’’جی نہیں میڈم۔‘‘ اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ’’مجھے اس سلسلے میں آپ کے حکم کا انتظار تھا۔ یوں بھی ان میں سے دو زخمی ہیں اور ڈاکٹر رشید کے چارج میں ہیں۔‘‘

’’زخمی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا عثمانی، کیا تم نے اس امکان پر غور نہیں کیا کہ ان سے ہمیں سولومن کے بارے میں کوئی کام کی بات معلوم ہوسکتی ہے؟‘‘

’’یقیناً میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی میڈم، لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ سولومن ایسے شخص نے اس بات کو نظر انداز نہیں کیا ہوگا۔ اگر ان میں سے کسی کو سولومن کے موجودہ ٹھکانے کا علم رہا ہوگا تو وہ اب تک ٹھکانا بدل چکا ہوگا۔‘‘ عثمانی نے وضاحت کی۔

’’بات صرف دشمن کا ٹھکانا معلوم ہونے کی نہیں ہوتی بلکہ اور بھی بہت سی کام کی باتیں ہوتی ہیں جو ایسے لوگوں سے معلوم ہوسکتی ہیں۔‘‘

’’بجا فرما رہی ہیں آپ میڈم۔‘‘ عثمانی نے اعتراف کیا۔

’’کل صبح مجھے اس سلسلے میں تفصیلی رپورٹ چاہیے۔‘‘ میرا لہجہ تاکیدی تھا۔ ’’ہاں ایک بات کا اندازہ خود تمہیں بھی ہوگا کہ ایسے لوگ آسانی سے زبان نہیں کھولتے۔ ایسی صورت میں میری جانب سے تمہیں پورے اختیارات ہیں۔ ان سے کچھ بھی معلوم کرنے کے لیے تم آخری حد تک جاسکتے ہو۔ تمہیں تشدد کا ہر حربہ آزمانے کی اجازت ہے۔ ممکن ہے اس کے نتیجے میں کوئی اپنی زندگی سے بھی گزر جائے۔ میں ایسی صورت میں بھی تم سے جواب طلب نہیں کروں گی۔

’’میرے خیال میں اس کے لیے آج کی رات کافی ہے۔‘‘ میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

’’قطعی میڈم! مجھے امید ہے کہ میں حسب سابق آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا۔ کل صبح اس سلسلے میں یقیناً آپ کو رپورٹ مل جائے گی میڈم!‘‘ عثمانی کے لہجے میں اعتماد تھا۔ پھر اس نے ’’آپریشن سیل ہیڈکوارٹر‘‘ کے سرد خانے میں محفوظ غیر ملکی ایجنٹوں کی لاشوں کے بارے میں پوچھا۔

’’ان کا فیصلہ بھی کل ہوگا عثمانی! پھر یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ان میں مزید کسی لاش کا اضافہ بھی ہوسکتا ہے!‘‘ میرے لہجے میں معنی خیزی بھی تھی اور سفاکی بھی۔ اپنے ملک کے خلاف سازش کرنے والوں کے معاملے میں میرا مزاج اتنا ہی سخت تھا اور میرے مزاج کی اس سختی سے آپریشن سیل کا ہر رکن اچھی طرح واقف تھا۔

’’بہتر ہے میڈم! کل صبح میں آپ کو رپورٹ دینے کے بعد ہی اپنی ڈیوٹی آف کروں گا۔‘‘ عثمانی بولا۔

’’اس کی ضرورت نہیں ہے عثمانی! تم اپنے مقررہ وقت پر ڈیوٹی آف کرکے جاسکتے ہو۔ رپورٹ تم کمانڈر نواز کو بھی دے سکتے ہو۔ میں خود فون کرکے اس سے رپورٹ لے لوں گی۔‘‘

’’جو آپ کا حکم میڈم!‘‘

’’خدا حافظ‘‘ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا۔ فاطمہ اب تک خواب گاہ میں موجود تھی۔ اس دوران میں اس نے میرے اور سرفراز کے لیے چائے بنا دی تھی۔ میں نے ٹی ٹرالی سے اپنے لیے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے فاطمہ کو مخاطب کیا۔ ’’نذیراں کی طبیعت اب کیسی ہے؟‘‘

’’کل سے بہت بہتر ہے بی بی جی! بخار بھی اتر گیا ہے، بس کھانسی رہ گئی ہے۔‘‘ فاطمہ نے جواب دیا۔

’’تو پھر اس کا مطلب ہے ہے وہ یہاں چل کر آنے کے قابل ہے!‘‘ میں بولی۔

’’بالکل بی بی جی! اگر کہیں تو اسے بلا لاؤں۔‘‘ فاطمہ جلدی سے کہنے لگی۔

’’اس وقت وہ اس کا بھانجا فضلے کہاں ہے؟‘‘ میں نے معلوم کیا۔

’’وہیں نذیراں کے کوارٹر میں ہوگا۔ میں نے اسے ادھر ہی جاتے دیکھا تھا۔‘‘ فاطمہ نے بتایا۔

’’نذیراں کو تم میرے پاس بھیج دو اور فضلے پر نظر رکھو!‘‘ میں نے فاطمہ کو تاکید کی۔

’’برابر والے کمرے کی صفائی ہوگئی ہے بی بی جی!‘‘ فاطمہ نے سرفراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’ٹھیک ہے، جب انہیں وہاں جانا ہوگا چلے جائیں گے۔ تم جا کر نذیراں کو بھیج دو یہاں!‘‘

’’اچھا بی بی جی‘‘ کہہ کر فاطمہ کمرے سے چلی گئی۔

میری طبیعت کا اضطراب بدستور تھا اور اب تک اس کی کوئی وجہ سامنے نہیں آئی تھی۔ سرفراز بہرحال ایک ذہین نوجوان تھا۔ اس سے بھلا یہ بات کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے نسبتاً محتاط اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ’’کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے میڈم جو آپ کے لیے فکرمندی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ کیا میں وہ بات پوچھ......‘‘

’’بیکار ہے۔‘‘ میں اس کی بات کاٹتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ’’تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میں ابھی خود اپنی تشویش و فکرمندی کی وجہ نہیں سمجھ سکی۔ ہاں میں یہ بات یقینی طور پر کہہ سکتی ہوں کہ نامعلوم خطرہ آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہا ہے اور ہم ابھی تک اس کی نوعیت و حقیقت سے بے خبر ہیں۔‘‘

سرفراز کے علم میں یہ بات تھی کہ میرا ذہن کچھ پراسرار حیرت انگیز قوتوں کا مالک ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ عموماً میری پیش گوئیاں سچ ثابت ہوتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میری زبان سے کسی متوقع خطرے کے ذکر پر وہ بھی فکرمند سا ہوگیا۔ اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا تھا۔ اب اطمینان کی جگہ اس کے چہرے پر کچھ کھنچاؤ سا پیدا ہوگیا تھا۔ ’’آپریشن سیل ہیڈکوارٹر‘‘ سے وہ ایک چھوٹا سا چرمی بیگ اپنے ساتھ لے کر چلا تھا جو اس وقت اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے علم تھا کہ اس چرمی بیگ میں ریوالور اور دیگر ضروری اشیاء کے علاوہ محدود فریکوئنسی کا ٹرانسمیٹر بھی ہے۔ کوٹھی کی اطراف موجود حفاظتی دستے سے رابطہ قائم کرنے کے لیے اس نے مجھ سے اجازت چاہی اور چرمی بیگ کی زپ کھولنے لگا۔ اس سے سرفراز کا مقصد

ایک طرف تو سیل کے ارکان کو کسی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے چوکنا رہنے کی تاکید کرنا تھا، دوسری جانب یہ رپورٹ لینا تھا کہ کوٹھی کی اطراف کسی مشتبہ فرد کو تو نہیں دیکھا گیا! اسی دوران میں سرفراز اور میں نے چائے پی لی تھی۔

"تم ایسا کرو سرفراز کہ ادھر باتھ روم میں چلے جاؤ! میں نہیں چاہتی کہ اس دوران میں نذیراں آ جائے تو اسے کچھ معلوم......"

"ٹھیک ہے میڈم!" میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی سرفراز اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ہاتھ کے اشارے سے اسے باتھ روم کی سمت بتا چکی تھی۔

سرفراز اٹھ کر گیا ہی تھا کہ فاطمہ اپنے ساتھ نذیراں کو لے کر آ گئی۔ میں نے نذیراں کے چہرے پر پہلی ہی نظر ڈال کر اندازہ لگا لیا کہ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی ہے۔

"تم جاؤ فاطمہ! اور یہ ٹرالی بھی لیتی جاؤ۔"

فاطمہ چلی گئی تو میں نے ایک بار پھر گہری نظروں سے نذیراں کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر بیماری کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

"پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ نذیراں کہ واقعی کل سے تمہیں بخار آ رہا تھا یا......" میں نے اس کے چہرے پر بدستور نظریں جمائے رکھیں۔

"مجھے معاف کر دیں بی بی جی۔ میں نے فضلے کی خاطر فاطمہ سے جھوٹ بولا تھا تاکہ وہ کام پر لگ جائے۔ اور...... اور اگر آپ کو اس کا پکا ہوا کھانا پسند آ جائے تو میں اسے بھی آپ سے اجازت لے کر اپنے ساتھ یہیں کوٹھی میں نوکر رکھوا لوں۔" نذیراں میری نظروں کی تاب نہ لا کر سچ بولنے لگی۔

"تمہارا بھانجا نشہ کرتا ہے نا؟" میں نے اس طرح سوال کیا جیسے مجھے پہلے ہی سے یہ بات معلوم ہو اور سوال کرنے کا مقصد محض تصدیق ہو۔

"پہلے...... پہلے تو کرتا تھا بی بی جی...... پر جی اب کی خبر نہیں۔ ویسے اس نے مجھے جیل سے خط لکھا تھا کہ اب میں بالکل بدل گیا ہوا اور...... اور شرافت کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"جیل سے خط لکھا تھا اس نے تمہیں!" میں چونک کر بولی۔ "فاطمہ نے تو مجھے کچھ اور بتایا تھا کہ وہ لاہور میں......"

"وہ سب جھوٹ تھا بی بی جی! میں دراصل یہ بات چھپانا چاہتی تھی کہ فضلے جیل کاٹ کر آیا ہے۔ آپ کو خبر ہے بی بی جی کہ ایسے کسی بندے کو کہیں کوئی نہ روزگار دیتا ہے نہ ہی نوکر رکھتا ہے۔ وہ لاہور جیل سے سات سال کی سزا کاٹ کر رہا ہونے والا تھا۔ کھیتوں میں پانی دینے کے جھگڑے پر سرے زمیندار کے ایک آدمی کا اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ وہ جس زمیندار کا کارندہ تھا، اس نے پھانسی تو خیر نہ ہونے دی، ہاں سات سال کی سزا ہو گئی۔ جب وہ سزا کاٹ رہا تھا تو کسی سیاسی قیدی کے ساتھ اسے خدمت پر لگا دیا گیا اسی عرصے میں اس نے عمدہ کھانا پکانا سیکھ لیا ورنہ اسے کچھ نہیں آتا تھا۔ یہی بات اس نے مجھے خط میں بھی لکھی تھی اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ اب گاؤں واپس جانا نہیں چاہتا۔ اگر وہ جیل سے رہا ہو کر واپس گاؤں پہنچ گیا تو اس کے ہاتھوں مارے جانے والے شخص کے رشتے دار اسے زندہ نہیں

چھوڑیں گے۔ فضلے میری بہن اور بہنوئی کا اکلوتا تھا اور اس سات سال کے عرصے میں دونوں ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اب میرے سوا فضلے کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ بس وہ کبھی کبھار مجھے ہی جیل سے خط لکھتا رہتا تھا۔ اب پچھلے مہینے جب اس کا یہ خط ملا کہ اسے رہائی ملنے والی ہے تو میں نے لکھ دیا کہ تو سیدھا یہاں آ جا، تیرے لیے کام کا بندوبست ہو جائے گا۔ آپ کو تو خبر ہے بی بی جی کہ یہاں بڑی کوٹھیوں میں ملازموں کی ضرورت تو پڑی ہی رہتی ہے۔ یہی سوچ کر فضلے کو میں نے یہاں بلا لیا۔ بی بی جی! میرا اللہ ...ال گواہ ہے، میرا ارادہ کم سے کم آپ سے کچھ بھی چھپانے کا نہیں تھا، ہاں میں کوٹھی کے کسی اور ملازم کو فضلے کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے نذیراں کی آواز بھرا گئی۔ اس کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اپنے بھانجے کے بارے میں اس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ البتہ ایک بات میرے ذہن میں ضرور کھٹکی۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے نذیراں، تم گزشتہ پانچ سال سے یہاں ہو، پھر فضلے کو تمہارا پتا کیسے معلوم ہوا؟" میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کا اظہار کر دیا۔

"آپ کو یاد ہوگا بی بی جی کہ ڈھائی تین سال پہلے میں ایک مہینے کی چھٹی لے کر گاؤں گئی تھی۔ اس وقت میری بہن فوت ہو گئی تھی۔ پہلی دفعہ فضلے کو اسی وقت خط لکھا تھا میں نے اور اسی خط میں یہاں کا پتا بھی لکھا تھا۔"

نذیراں کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ سرفراز باتھ روم سے نکل کر تیز قدمی کے ساتھ میری طرف بڑھا۔ میں نے اس کی ہیجانی کیفیت اس کے چہرے سے محسوس کر لی۔ ٹرانسمیٹر پر یقیناً اس نے کوئی ایسی بات سنی تھی جس نے اسے ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی غیر متوقع بات ہو سکتی تھی۔

ممکن ہے کہ میں، فضلے کے بارے میں نذیراں سے کچھ اور پوچھ گچھ بھی کرتی، لیکن موقع محل دیکھتے ہوئے بات مختصر کر دی۔ میں نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے نذیراں، مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی اور اپنے بھانجے کے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ کوٹھی کی حدود میں چوکیدار، مالی اور ڈرائیور کے سوا کوئی اور فرد ملازم نہیں ہے اور ان میں سے بھی کسی کو بلاضرورت اصلی کے سکونتی حصے میں آنے کی اجازت نہیں۔ مجھے تمہارے بھانجے سے ہمدردی ہے مگر میں اسے یہاں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ یہاں کے سوا تم اسے کہیں بھی ٹک رکھوا سکتی ہو۔ کل بہرحال اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اسے کہیں نوکری ملنے میں دو ایک دن لگ بھی جائیں تو وہ تمہارے کوارٹر کی حدود سے باہر نہیں نکلے گا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کوٹھی کے اندر نہیں آئے گا۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

"جیسا آپ کا حکم بی بی جی! میں ابھی اس سے کہہ دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر نذیراں میری خواب گاہ سے چلی گئی۔

اس دوران میں سرفراز میری ایزی چیئر کے قریب آ کر دوسری کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ جب میں نذیراں سے گفتگو کر رہی تھی تو وہ بار بار کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔

"ہاں سرفراز، اب تم کہو کیا بات ہے؟ کیا باہر والوں سے کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے

تمہیں؟'' میں نے سرفراز کو مخاطب کیا۔

''اس ملازمہ کے بھانجے فضلے کو حفاظتی دستے کے ان ارکان نے کوٹھی کا عقبی گیٹ پھلانگ فرار ہونے سے پہلے پکڑ لیا ہے اور اب وہ آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ تلاشی لینے پر فضلے کے پاس ایک غیر ملکی ساخت کا ریوالور بھی برآمد ہوا ہے جسے اس نے گرفتاری سے قبل اپنے بچاؤ میں استعمال چاہا تھا مگر اسے اتنی مہلت نہیں مل سکی۔ ریوالور کے علاوہ اس کے پاس سے پچاس ہزار روپے بھی ملے جو بڑے نوٹوں کی صورت میں ہیں۔'' سرفراز نے ایک ہی سانس میں ساری رپورٹ دے دی۔

سرفراز کی رپورٹ سن کر کچھ دیر کو جیسے میں سناٹے میں رہ گئی۔ فضلے کے پاس سے بھاری اور غیر ملکی ساخت کا ریوالور برآمد ہونا، پھر فرار ہونے کی کوشش! یہ سب کچھ بے مقصد نہیں ہوسکتا میرے ذہن نے ایک حتمی نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں کی اور اسی نتیجے کے ردعمل میں مجھ پر بھی ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ میرے قیاسات کے مطابق اب کسی بھی لمحے کچھ ہوسکتا تھا۔ میں ایک دم ایزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر میں نے تیزی کے ساتھ ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' کے نمبر ڈائل کیے۔

''بم ڈسپوزل اسکواڈ'' کو فوری طور پر میری کوٹھی بھیجو!'' میں نے عثمانی کی آواز پہچانتے ہی دیا۔'' میں یہاں سے فوراً اپنے طارق روڈ والے فلیٹ میں منتقل ہو رہی ہوں۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ کو خالی ملے گی۔ ان لوگوں کو ہدایت کر دو کہ وہ فلیٹ کے فون نمبر پر مجھے رپورٹ دیں۔'' یہ کہتے ہی میں ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا۔

میرے ذہن نے فوری طور پر ممکنہ خطرے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ عثمانی سے میں نے یہ کہنے ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ بم ڈسپوزل اسکواڈ کے علاوہ آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے دوسرے حفاظتی د کو بھی بلا تاخیر کیپٹن شاد کی رہنمائی میں روانہ ہو جانا ہے۔ موجودہ صورتحال میں اتنا وقت نہیں تھا کہ کوٹھی میں رہ کر دوسرے حفاظتی دستے کے وہاں پہنچنے کا انتظار کر سکتی۔

پھر سب کچھ طوفانی رفتار سے ہوا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر کوٹھی خالی کر دی گئی۔ اس وق رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ کوٹھی میں اس وقت کل آٹھ ملازمین تھے جن میں پانچ ملازمائیں تھ اور تین ملازم۔ ان سب کو ایک بڑی وین میں بٹھا دیا گیا۔ وہ سبھی حیران تھے کہ نصف شب کے قر اچانک کوٹھی کیوں خالی کی گئی ہے اور انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے! لیکن میں نے کسی کو بھی کچھ نہیں تھا۔ نذیراں اپنے بھانجے فضلے کی طرف سے پریشان تھی کہ آخر وہ کہاں چلا گیا۔ میرے ایما پر حفا دستے کے ارکان فضلے کو بھی ساتھ لے کر طارق روڈ چل رہے تھے۔ اصل کہانی تو مجھے اسی کی زبانی معا ہوسکتی تھی کہ وہ کب اور کس طرح میرے دشمن کا آلہ کار بنا اور یہ بھی کہ میرا قیاس درست تھا بھی یا نہ میرا قیاس یہ تھا کہ وہ میری کوٹھی کے کسی حصے میں کوئی طاقتور بم رکھ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور ٹائم بم اسے میرے دشمن ہی نے دیا ہوگا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کوٹھی سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرتا اور نہ ا کے پاس سے غیر ملکی ساخت کے ریوالور کے ساتھ پچاس ہزار روپے کی رقم برآمد ہوتی۔ کہانی کی تقر ساری کڑیاں میں اپنے ذہن میں جوڑ چکی تھی اب محض اس کی تصدیق باقی تھی

کوٹھی سے میں بلٹ پروف کار ہی میں روانہ ہوئی تھی کار سرفراز ڈرائیو کر رہا تھا۔ میری کار

پیچھے وہ بڑی وین تھی جس میں میری کوٹھی کے تمام ملازمین سوار تھے۔ اس وین کو میرا ڈرائیور چلا رہا تھا میری کار کے آگے جیپ میں سیل کے مسلح ارکان تھے اور ان کے آگے دو موٹر سائیکلوں پر مسلح گارڈ ملازمین کی بڑی وین کے عقب میں سیل کی بند سیاہ وین تھی اور اس میں بھی سیل کے مسلح ارکان تھے تاکہ عقب سے حملہ ہونے کی صورت میں وہ دیوار بن جائیں۔

مجھے یہ توقع تو نہیں تھی کہ سولومن دہری چال چلنے کے باوجود مزید کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس کرے گا، اس کے باوجود میں پوری طرح چوکنا تھی میرے قریب پچھلی نشست پر اسٹین گن رکھی تھی۔ میں کسی بھی لمحے اپنے دشمن کے لیے جہنم کا دہانہ کھول سکتی تھی۔ سرفراز بھی غیر مسلح نہیں تھا۔

ڈیفنس سے طارق روڈ کا فاصلہ ہی کتنا ہے، ہمیں وہاں پہنچنے میں بمشکل پندرہ منٹ لگے ہوں گے وہ بھی اس لیے کہ میرے ایما پر کار، جیپ، موٹر سائیکلوں اور ویگنوں کی رفتار کم رکھی گئی تھی راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا فضلے اس سیاہ بند وین میں تھا جو سب سے پیچھے آ رہی تھی۔

طارق روڈ کے اس چار کمروں والے فلیٹ میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی دو کمرے ملازمین کو دے دیئے گئے ایک کمرے میں صرف ملازمائیں تھیں اور دوسرے کمرے میں مرد ملازمین۔ ان سب سے میں نے کہہ دیا تھا کہ یہاں صرف ایک آدھ گھنٹا گزارنا ہے، پھر واپس کوٹھی پر چلنا ہے اس کے ساتھ میں نے انہیں یہ ہدایت بھی دی تھی کہ اس دوران کسی کو بھی اپنے کمروں سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔ وہ دونوں کمرے فلیٹ کی اندرونی سمت میں تھے۔ سرفراز کے ہمراہ میں ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ وہیں ٹیلی فون بھی تھا۔

''اب ذرا تم اس فضلے کو بلواؤ! میں ایک صوفے پر نیم دراز ہو کر سرفراز سے مخاطب ہوئی۔

سرفراز نے چرمی بیگ کھول کر ٹرانسمیٹر نکال لیا اور پھر اس پر بند سیاہ وین سے رابطہ قائم کر کے فضلے کو اوپر لانے کا حکم دیا۔

جلد ہی سیل کے دو ارکان فضلے کو کشاں کشاں اوپر لے آئے۔ اس کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ دونوں ہاتھ بھی موڑ کر پشت پر باندھ دیئے گئے تھے۔ میرے کہنے پر پہلے اس کی آنکھوں سے سیاہ پٹی کھولی گئی، پھر اس کے منہ پر بندھی ہوئی پٹی بھی کھول کر منہ میں ٹھنسا ہوا رومال بھی باہر نکال لیا گیا۔

فضلے حواس باختہ سا ہو کر گہرے گہرے سانس لے کر ہونقوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگا۔

وہ ایک جرائم پیشہ شخص تھا جس نے پورے سات سال جیل میں گزارے تھے۔ کوئی ایسا شخص جو سات سال جیل میں گزار چکا ہو، ہر فن میں تقریباً طاق ہو کر باہر نکلتا ہے۔ ایسے کسی شخص سے سچ اگلوا لینا مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں ہوتا۔ میں اس وقت کسی قسم کا شور شرابا نہیں چاہتی تھی۔ یوں بھی اردگرد دوسرے آباد فلیٹ تھے۔ رات کے سکوت میں ذرا سی بھی آواز خاصی دور تک سنائی دیتی ہے۔ میں نے اس لیے بہ مجبوری دوسرا راستہ اختیار کیا۔

''فضلے ادھر دیکھو میری طرف!'' میں نے اچانک اسے مخاطب کیا۔

ادھر فضلے کی نظریں میری نظروں سے ملیں، ادھر میرے طاقتور ذہن نے اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کا جسم بھی قطعی بے حرکت تھا، یوں جیسے وہ کسی جیتے جاگتے انسان کی بجائے کسی بے جان مجسمے میں تبدیل ہو گیا ہے۔

''فضلے! تمہیں میرے سوالوں کے جواب بالکل درست دینا ہیں۔ تم جو کچھ بتاؤ گے سچ بتاؤ گے، جھوٹ نہیں بولو گے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے نرمی سے کہا۔

''ہاں میں سب کچھ سچ بتاؤں گا، جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' جواباً فضلے کی مدھم سی آواز ابھری۔ جیسے وہ نیند میں بول رہا ہو۔

''تمہیں غیر ملکی ساخت کا ریوالور اور پچاس ہزار روپے کی رقم کس نے دی؟'' میں نے پہلا سوال کیا۔

''ریوالور اور روپے مجھے آج صبح دس بجے رحمت کاکا سے ملے تھے۔'' فضلے نے جواب دیا۔

''یہ رحمت کاکا کون ہے اور تم اسے کیسے جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''رحمت کاکا میرے ساتھ لاہور جیل میں تھا۔ پچھلے سال اپنی رہائی سے پہلے اس نے مجھے اپنا کراچی کا پتا دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جیل سے رہا ہو کر میں سیدھا کراچی آ جاؤں۔ جیل میں وہ کئی برس میرے ساتھ رہا تھا۔ میں نے اسے جیل ہی میں بتا دیا تھا کہ کراچی میں میری خالہ بھی رہتی ہے جو ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں ملازم ہے۔ رحمت کاکا نے جیل میں مجھے یقین دلایا تھا کہ کراچی آنے کے بعد میرے عیش ہو جائیں گے۔ میں پرسوں ہی کراچی آ گیا تھا مگر خالہ سے کل رات ملا ایک دن اور رات میں نے رحمت کاکا کے ڈیرے پر گزارا تھا۔ کل صبح کوئی نو بجے کے قریب رحمت کاکا، کا ایک دوست کسی غیر ملکی شخص کو لے کر اس سے ملنے آیا۔ میں بھی اس وقت رحمت کاکا کے پاس تھا۔ رحمت کاکا کے دوست جمال دین نے اس غیر ملکی کا تعارف رحمت کاکا سے کرایا۔ وہ غیر ملکی، رحمت کاکا سے کوئی خاص کام لینا چاہتا تھا، مگر شاید اسے وہاں میری موجودگی پسند نہیں آ رہی تھی، پھر اس نے کہہ ہی دیا کہ میں اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے رحمت کاکا نے برابر والے کمرے میں بھیج دیا۔'' فضلے رکے بغیر کسی روبوٹ کی طرح بولے جا رہا تھا'' اس کا سارا جسم ساکت تھا، صرف ہونٹ ہل رہے تھے۔ اس کے ذہن پر میرے طاقتور ذہن کی گرفت اب بھی برقرار تھی۔ اسی کے زیر اثر فضلے روانی کے ساتھ بولے جا رہا تھا میں توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔

پھر فضلے نے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے تجسس کے سبب رحمت کاکا اور اس غیر ملکی کی باتیں سن لیں اور چونک اٹھا وہ غیر ملکی، ڈیفنس کی جس کوٹھی میں رحمت کاکا کے ذریعے ٹائم بم رکھوانا چاہتا تھا، وہ میری کوٹھی تھی۔ غیر ملکی نے میرا پورا نام اور پتا رحمت کاکا کو بتایا تھا۔ سودا دو لاکھ روپے میں طے ہوا تھا۔ فضلے اپنی خالہ نذیراں کو میری معرفت ہی خط لکھتا تھا اس لیے اسے میرا پورا نام پتا زبانی یاد تھا۔ فضلے نے اسے اپنی خوش قسمتی سمجھا کہ کراچی پہنچنے کے دوسرے ہی دن اسے ایک بڑا ہاتھ مارنے کا بہت آسان موقع مل گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ رحمت کاکا جب یہ سنے گا کہ جس کوٹھی میں ٹائم بم رکھنا ہے، وہ وہاں بہ آسانی داخل ہو سکتا ہے تو رحمت کاکا یہ اہم کام اس کے

سپرد کر دے گا پھر یہی ہوا بھی! فضلے کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ رحمت کاکا نے اس سے جھوٹ بولا کہ مجھے اس کام کے ایک لاکھ روپے ملے ہیں جس میں سے تمہیں پچاس ہزار روپے دے سکتا ہوں فضلے کے لیے پچاس ہزار روپے بھی ایک بڑی رقم تھی۔ اس نے صرف یہ شرط رکھی کہ رقم یک مشت اور کام ہونے سے پہلے ادا کر دی جائے۔ بظاہر کچھ دیر بحث اور ٹال مٹول کے بعد رحمت کاکا پچاس ہزار روپے دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اس نے فضلے کو حفاظت کی خاطر غیر ملکی ساخت کا ایک ریوالور بھی دیا فضلے یہ بھی جان چکا تھا کہ اس غیر ملکی سے رحمت کاکا ایک لاکھ روپیہ پیشگی وصول کر چکا ہے۔ اسی ایک لاکھ روپے میں سے پچاس ہزار اس نے فضلے کو ادا کیے تھے۔ بقیہ ایک لاکھ روپے آئندہ روز کام ہونے کے بعد رحمت کاکا کو ملنے والے تھے اسی شام رحمت کاکا کے دوست جمال دین نے ایک سوٹ کیس رحمت کاکا کے ڈیرے پر پہنچا دیا اور بتایا کہ کہ آئندہ رات ساڑھے بارہ بجے اس سوٹ کیس میں موجود ٹائم بم پھٹ جائے گا۔ کوٹھی میں ٹائم بم رکھنے والے شخص کو وہاں سے ہر قیمت پر ساڑھے بارہ بجے رات سے پہلے نکل جانا چاہئے اس سوٹ کیس کے لیے ہدایت کی گئی تھی کہ اسے کوٹھی کے اس حصے میں رکھا جائے جو میری خواب گاہ سے قریب ہو فضلے گزشتہ شب ہی میری کوٹھی پہنچ گیا۔ اپنی خالہ کو خط وہ پہلے ہی لکھ چکا تھا اسی لیے اس کی آمد غیر متوقع نہیں تھی۔ گزشتہ شب ہی اس نے اپنی مطلب براری کے لیے خالہ کو شیشے میں اتار لیا جیل میں وہ کھانا پکانا سیکھ ہی چکا تھا اس لیے بات بن گئی۔ نذیراں نے فاطمہ سے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے اسے کچن سنبھالنے کی اجازت دلا دی اور یوں فضلے کو کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ جس سوٹ کیس میں ٹائم بم تھا اسے فضلے نے خواب گاہ سے متصل اس کمرے میں ایک بڑی سی پینٹنگ کے پیچھے چھپا دیا تھا جسے میں فارغ اوقات میں سٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتی تھی۔

فضلے کا بیان ابھی جاری تھا اور میری نگاہ وال کلاک پر تھی ساڑھے بارہ بجنے میں صرف چار منٹ باقی رہ گئے تھے میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ ابھی تک بم ڈسپوزل اسکواڈ کی طرف سے یہ پیغام موصول نہیں ہوا تھا کہ بم کو تلاش کر کے ناکارہ بنا دیا گیا ہے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ کے ارکان کی زندگی بھی خطرے میں تھی اگر وقت مقررہ سے پہلے وہ لوگ بم تلاش نہ کر پاتے تو کوٹھی کھنڈر بننے کے ساتھ ساتھ ان کے جسم بھی فضا میں چیتھڑے بن کر اڑ جاتے۔

فوری طور پر میرا ذہن دوسری طرف منتقل ہو جانے کی وجہ سے فضلے کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ وہ بے ہوش ہو کر گرنے والا تھا کہ اس کے عقب میں کھڑے ہوئے گارڈز نے اسے سنبھال لیا۔

''اسے لے جاؤ!'' میں تیزی سے بولی یہ کہتے ہوئے میری نظر ایک بار پھر وال کلاک پر جم گئی تھی اب ہولناک تباہی میں صرف ساڑھے تین منٹ رہ گئے تھے اور فون ابھی تک خاموش تھا ''سرفراز! ٹرانسمیٹر پر فوراً آپریشن سیل سے رابطہ قائم کرو'' میری آواز کوشش کے باوجود شدت جذبات سے مرتعش ہو رہی تھی مجھے اپنی کوٹھی کی ممکنہ تباہی سے زیادہ بم ڈسپوزل سکواڈ کے عملے کی فکر تھی میری کوٹھی سے زیادہ ان کی جانیں قیمتی تھیں مجھے علم تھا کہ بم ڈسپوزل سکواڈ کے عملے کے پاس ٹرانسمیٹر بھی ہوتا ہے، لیکن اس کی فریکوئنسی کیا ہو گی، مجھے معلوم نہیں تھا ان لوگوں سے کس فریکوئنسی پر بات کی جا سکتی ہے، یہ ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' ہی کو معلوم ہو سکتا تھا۔

سرفراز نے تیزی کے ساتھ میرے حکم کی تعمیل میں ٹرانسمیٹر پر عثمانی سے رابطہ قائم کر لیا رابطہ ملتے ہی میں نے ٹرانسمیٹر تقریباً جھپٹ لیا اور تیزی سے بولنے لگی ’’عثمانی! میری میری بات غور سے سنو! ساڑھے بارہ بجے وہ بم پھٹ جائے گا جو میری کوٹھی میں رکھا گیا ہے ابھی بم بلاسٹ ہونے میں تقریباً تین منٹ باقی ہیں۔ تم فوراً بم ڈیسپوزل سکواڈ کے عملے سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کر کے اسے مطلع کر دو کہ ٹائم بم میری خواب گاہ سے متصل سٹوڈیو میں ایک بڑی سی پینٹنگ کے پیچھے سوٹ کیس میں ہے۔ ان لوگوں کو یہ اطلاع دے کر نتائج سے مجھے فوری طور پر آگاہ کرو! اوور اینڈ آل!‘‘ وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے عثمانی کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

اب ساڑھے بارہ بجنے میں صرف سوا دو منٹ رہ گئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر ایک ہیجانی کیفیت سی طاری ہوتی جارہی تھی۔

پھر صرف پندرہ سکینڈ باقی رہ گئے تھے کہ ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔

’’مجھے دو!‘‘ میں نے سرفراز سے ٹرانسمیٹر لے لیا۔

’’ہیلو آپریشن سیل کالنگ! عثمانی آن دی لائن! اوور۔‘‘

’’ہیلو عثمانی! عذرا خان اسپیکنگ، رپورٹ پلیز ہری اپ! اوور

’’خطرہ ٹل گیا میڈم! ابھی ابھی ٹرانسمیٹر پر بم ڈیسپوزل اسکواڈ کے انچارج نے اطلاع دی ہے کہ بم کو ناکارہ بنایا جا چکا ہے۔ میں نے جب ٹرانسمیٹر پر بم کے محل وقوع سے انہیں آگاہ کیا تھا تو وہ لوگ سٹوڈیو تک پہنچ چکے تھے۔ اینی مور آرڈر میڈم؟ اوور!‘‘

’’نو...... تھینکس گاڈ! اوور اینڈ آل!‘‘ میں نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کرتے ہوئے طویل سانس لیا اتنی دیر، ہیجانی کیفیت سے دوچار رہنے کے سبب میرا سانس قابو میں نہیں رہا تھا میں نے اپنے تنفس کو اعتدال پر لانے کے لیے گہرے گہرے سانس لیے، پھر سرفراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

’’کہو یہ سنسنی خیز تجربہ تمہیں کیسا لگا؟‘‘ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

’’اعصاف شکن!‘‘ سرفراز نے اعتراف کیا۔ ’’آج سے پہلے میں نے وقت کی قدر و قیمت کو کبھی اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا میڈم!‘‘

’’ہاں سرفراز، وقت بہت مہربان بھی ہوتا ہے اور انتہائی ظالم بھی! اس کا فیصلہ حالات و واقعات کرتے ہیں کہ وقت مہربان ہے یا نامہربان! خیر اس بحث کو چھوڑو، اس وقت تو عمدہ سی کافی پینے کو جی چاہ رہا ہے یہ فلیٹ ایک عرصے سے میرے زیر استعمال نہیں رہا، معلوم نہیں کچن میں کافی اور خشک دودھ ہوگا بھی یا نہیں! اگر یہاں سامان ہوا کافی کا تو پھر کافی پی کر چلیں گے ورنہ کوٹھی پہنچنے تک صبر کرنا پڑے گا تم ذرا فاطمہ کو بلاؤ!‘‘

میری بات سن کر سرفراز اٹھا اور ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔ وہ لوٹا تو سراسیمہ سی فاطمہ اس کے ساتھ تھی۔

’’ارے فاطمہ، تم اتنی پریشان کیوں نظر آ رہی ہو؟‘‘ میں نے آہستہ سے ہنس کر فاطمہ کو مخاطب کیا

’’نن...... نہیں تو بی بی جی!‘‘ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

’’جاؤ کچن میں جا کر دیکھو، کافی بنانے کا سامان اگر موجود ہو تو دو کپ کافی جلدی سے بنا کر لے آؤ، پھر واپس کوٹھی چلنا ہے۔‘‘

’’اچھا بی بی جی! میں تو سمجھی تھی کہ شاید ہمیں ساری رات یہیں گزارنا پڑے گی‘‘ فاطمہ کوٹھی واپس چلنے کی خبر سن کر خوش ہو گئی۔

’’میں نے تو غالباً یہاں پہنچتے ہی تم لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ بس ایک آدھ گھنٹا یہاں گزارنا ہے تم نے شاید میری بات سنی نہیں ہوگی۔‘‘ میں بولی۔

’’ضرور کہا ہوگا بی بی جی، میں نے ہی شاید آپ کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ دراصل وہ نذیراں سارے راستے اپنے بھانجے فضلے کا ذکر کر کر کے میرے کان کھا گئی تھی کہ خدا معلوم وہ کہاں گیا! اچھا میں ابھی کچن کا چکر لگا کر آتی ہوں‘‘ یہ کہہ کر فاطمہ تیزی کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

’’سرفراز! ذرا ٹرانسمیٹر پر نیچے وین سے معلوم کرو فضلے کو ہوش آیا یا نہیں؟‘‘

میرا حکم سن کر سرفراز نے ٹرانسمیٹر پر نیچے موجود وین سے رابطہ قائم کیا۔ ٹرانسمیٹر پر جو اطلاع موصول ہوئی، وہ میرے لیے خلاف توقع تھی بے ہوشی کی حالت میں نیچے پہنچتے ہی فضلے کے ناک سے خون بہنے لگا تھا جو اب تک بہہ رہا تھا اچانک ذہنی رابطہ منقطع ہونے اور اس کی وجہ سے اس کے ذہن کو جھٹکا لگنے سے شاید دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی تھی۔

’’فضلے کو فوری طور پر آپریشن سیل ہیڈکوارٹر لے جانے کا حکم دو!‘‘ میں نے سرفراز سے کہا ’’شاید اس کی زندگی بچائی جا سکے۔‘‘

سرفراز نے ٹرانسمیٹر پر میرا حکم دہرا دیا، پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔ ’’میڈم! سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک اسے کیا ہو گیا؟‘‘

’’نادانستگی میں اس کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا ہے اور امکان یہ ہے کہ اس کے دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی ہے۔‘‘ میں نے سرفراز کی بات کا جواب دیا، پھر مزید وضاحت کی۔ ’’جب کوئی ذہن کسی طاقتور ذہن کی گرفت میں ہوتا ہے تو دانستہ بھی کم طاقت ذہن کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے اور کبھی نادانستگی میں بھی ایسا ہو جاتا ہے ایسا اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب کوئی طاقتور ذہن کسی بھی سبب اچانک دوسری طرف متوجہ ہو جائے اس سے کم طاقت ذہن کو جھٹکا لگتا ہے اور یہ جھٹکا بے ہوشی کے علاوہ دماغ کو شدید نقصان پہنچانے کا سبب بھی بن سکتا ہے دراصل جب فضلے کا ذہن میرے طاقتور ذہن کی گرفت میں تھا تو اس سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ بم ساڑھے بارہ بجے پھٹ جائے گا، میرا ذہن فوری طور پر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ اسی کے نتیجے میں فضلے کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور وہ بے ہوش ہو گیا، مگر مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ نادانستگی میں اس کی زندگی خطرے سے دوچار ہو جائے گی۔‘‘

’’میڈم! اس کو شاید مکافات عمل کہتے ہیں۔ وہ ظالم بیک وقت اتنے سارے لوگوں کی زندگی سے کھیل رہا تھا، قدرت نے خود اس کی زندگی خطرے میں ڈال دی۔‘‘

میں نے سرفراز کی رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کسی بھی شخص کی موت میرے لیے بہرحال باعث

مسرت نہیں ہو سکتی تھی۔

فاطمہ کو کچن میں شاید کافی، خشک دودھ وغیرہ مل گیا تھا اسی لیے فوراً اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً اب تک وہ واپس آ کر سامان نہ ملنے کی اطلاع دے چکی ہوتی۔ پھر میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ کچھ ہی دیر بعد فاطمہ کافی لے کر آ گئی۔

جب کسی شے کی طلب محسوس ہو اور وہ بروقت مل جائے تو بڑا لطف دیتی ہے۔ کافی نے اس وقت میرے کشیدہ اعصاب کو خاصا سکون فراہم کیا۔

کافی کے میں آخری گھونٹ لے رہی تھی کہ ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ سرفراز نے سوئچ آن کر دیا۔ فضلے کو ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' لے جانے والی وین سے یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ وہ راستے ہی میں دم توڑ گیا ہے۔ اب وین کے ساتھ جانے والے سیل کے ارکان میرے حکم کے منتظر تھے کہ فضلے کی لاش کا کیا کیا جائے؟

''فی الحال فضلے کی لاش، آپریشن سیل، کے سردخانے میں رکھ دی جائے، صبح میں اس سلسلے میں کچھ سوچ کر بتاؤں گی۔ لاش وہاں پہنچانے کے بعد ان لوگوں کو میری کوٹھی پر اپنی ڈیوٹی سنبھالنا ہے۔'' میں نے سرفراز کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

سرفراز نے ٹرانسمیٹر پر میرا حکم متعلقہ افراد تک پہنچا دیا۔

آج کی شب بھی بڑی عجیب تھی۔ فضلے کی موت کی خبر ملنے کے ساتھ آج رات مرنے والوں کی تعداد پانچ ہو گئی تھی۔ زندگی کے پانچ چراغ گل ہو گئے تھے۔ کیسی عجیب ہے یہ زندگی بھی کہ جس کا کوئی بھروسا نہیں۔ کون کب مٹی کے بے جان ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گا، کچھ خبر نہیں۔ میں سوچنے لگی کہ شاید اسی لیے انسانوں سے کہا گیا ہے کہ زمیں پر اکڑ کر نہ چلو!

ہر چند کہ فضلے سے مجھے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی، پھر بھی میرا دل کچھ اداس ہو گیا۔ شاید اس کا لاشعوری سبب یہ رہا ہو کہ نادانستگی ہی میں سہی، اس کی موت کی ذمے دار بہر حال میں ہی تھی۔ بوجھل سے احساس کے ساتھ میں اٹھ کھڑی ہوئی اور سرفراز سے کہا، نیچے موجود افراد کو ٹرانسمیٹر پر بتا دو کہ اب یہاں سے کوٹھی چلنا ہے۔ پھر میں نے گاڑیوں کی ترتیب بتائی۔ ''آگے موٹر سائیکل سوار ہوں گے، ان کے پیچھے میری کار، پھر ملازمین کی بڑی وین اور آخر میں جیپ ساتھ چلے گی۔''

پھر طارق روڈ کے اس فلیٹ سے کوٹھی کی طرف روانگی میں صرف چند منٹ لگے۔ گاڑیوں کی ترتیب وہی تھی جو میں نے سرفراز کو بتائی تھی۔ راستے میں میں نے محسوس کر لیا کہ کیپٹن شاد کی سرکردگی میں دوسرا حفاظتی دستہ بھی کچھ فاصلے سے ہمارے تعاقب میں آ رہا ہے۔

میری کار گورا قبرستان سے گزر رہی تھی تو اچانک میرے ذہن میں ایک خدشہ ابھرا۔ ہر چند کہ عثمانی ایسے شخص سے مجھے کسی حماقت کی توقع نہیں تھی مگر موجودہ حالات میں اس کا امکان موجود تھا کہ ذرا سی بات اس کے ذہن سے محو ہو گئی ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سرفراز سے کہا کہ ٹرانسمیٹر پر عثمانی سے میری بات کراؤ!

سرفراز نے عثمانی سے رابطہ قائم کرنے میں دیر نہیں کی اور چھوٹا سا ریڈیو ٹرانزسسٹر ایسا ٹرانسمیٹر

مجھے تھما دیا۔

''ہیلو عثمانی! بم ڈسپوزل سکواڈ کی میری کوٹھی سے واپسی کے بعد کیا وہاں کوٹھی کی نگرانی کے لیے کسی کو چھوڑا گیا ہے؟ اوور!'' میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشے کے تحت دریافت کیا۔

''جی ہاں میڈم! ظاہر ہے کہ کوٹھی کو اس طرح کھلا ہوا اور بے حفاظت کس طرح چھوڑا جا سکتا تھا! میں نے بم ڈسپوزل سکواڈ کے ساتھ ہی دو مسلح گارڈز بھیج دیئے تھے تا کہ سکواڈ کی واپسی کے بعد وہ دونوں کوٹھی کی نگرانی کر سکیں۔ آپ کا ارادہ کیا ہے اب؟ کیا آج رات طارق روڈ والے فلیٹ ہی میں رہیں گی؟ اوور۔''

''میں وہاں سے چل چکی ہوں اور راستے میں ہوں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہنگامی حالت میں بھی تمہارا ذہن بیدار رہتا ہے۔ اب میں کوٹھی ہی جا رہی ہوں۔ خدا حافظ، اوور اینڈ آل!''

عثمانی سے ٹرانسمیٹر پر بات کر کے میرا ذہن مطمئن ہو گیا۔ ٹرانسمیٹر میں نے سرفراز کو واپس کر دیا۔

ہیجان خیز لمحات گزر جانے کے بعد مجھے توقع تھی کہ اب میرے کشیدہ اعصاب کو سکون مل جائے گا، مگر نا معلوم کیوں ایک بار پھر میں بے چینی محسوس کرنے لگی تھی۔

خدایا! یہ کیسا اضطراب ہے؟ کیا وجہ ہے اس کی؟ کیا آج کی رات سکون سے نہیں گزرے گی۔ ابھی اس رات کی تاریکی میں کتنے طوفان اور چھپے ہوئے ہیں؟ شدید بے چینی کے سبب پے در پے سوالوں نے میرے ذہن پر یلغار سی کر دی۔ چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ میرے سارے جسم میں ایک آشنا سرور انگیز لہر سی دوڑنے لگی۔ اس کے ساتھ میری پلکیں بوجھل ہو کر بند ہوتی چلی گئیں۔ میں اسی پراسرار تجربے سے گزر رہی تھی جو مجھ پر عموماً ماضی مستقبل کی بہت سی باتیں منکشف کر دیتا تھا۔ میرے ذہن میں خوابیدہ پراسرار قوتیں بیدار ہو گئی تھیں۔ پھر خود میں نے اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی سنی حالانکہ میرے لب ساکت تھے۔ میری ہی آواز رفتہ رفتہ مجھ پر واضح ہوتی گئی۔

عذرا خان، تمہارا دشمن سولومن تم پر ایک کاری ضرب لگا کر جا چکا ہے۔ دیکھ لو کہ تمہاری کوٹھی کھنڈر بن چکی ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں بند آنکھوں سے ایک ہولناک منظر دیکھنے لگی۔ میری کوٹھی کا منظر میرے صفحہ ذہن پر واضح اور قطعی صاف نظر آ رہا تھا۔ میری کوٹھی سے شعلے اور دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ پھر منظر بدلا اور میں نے کوٹھی کے آہنی گیٹ کے سامنے دو لاشیں پڑی ہوئی دیکھیں اور میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ لیا۔ ان دونوں لاشوں کے چہرے میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ یہ دونوں سیل کے ارکان تھے۔ ان دونوں کی لاشیں برابر برابر پڑی تھیں اور دونوں کے سینوں پر ایک بڑا سا کاغذ رکھا تھا جس پر کوئی عبارت موٹے حروف سے لکھی ہوئی تھی۔ یہ عبارت میں نہ پڑھ سکی۔ پراسرار سرور انگیز کیفیت کے دوران میں اچانک غیر متوقع صدمے کی وجہ سے وہ کیفیت برقرار نہ رہ سکی اور میرے ذہن کا سکرین بجھ گیا۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ شدید صدمے اور غصے کی وجہ سے میں ایک دم چیخ اٹھی تھی۔ ''سولومن! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی! نہیں! ...... ہرگز نہیں!''

"کیا ہوا میڈم، کیا ہوا؟" سرفراز نے گھبرا کر مجھے مخاطب کیا۔

"کیا نہیں ہوا سرفراز...... کیا نہیں ہوا...... سب کچھ تباہ ہو گیا...... تباہ ہو گیا سب کچھ۔" میں ہذیانی انداز میں چیخ اٹھی۔ "ابھی تم...... لوگ بھی سب کچھ...... وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے جو میں دیکھ چکی ہوں۔

جواباً سرفراز خاموش رہا۔ غالباً اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اپنے حواسوں میں نہیں ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ میں پوری طرح اپنے حواسوں میں تھی، ہاں صدمے اور شدید غصے کی وجہ سے میری بات کا ابلاغ صحیح طور پر نہیں ہو رہا تھا۔ کیا تباہ ہو گیا؟ کیسے تباہ ہو گیا؟ اور اس تباہی کا ذمے دار کون ہے؟ یہ سارے ہی سوالات تو تشنہ جواب تھے، مگر صدمے اور غصے میں آدمی اظہار و ابلاغ کے ربط کو فراموش کر جاتا ہے۔ یہی حال میرا تھا۔

پھر چند ہی منٹ بعد میں ڈیفنس پہنچ چکی تھی اور وہی منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا جسے میں اپنی چشم تصور سے پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔

گورا قبرستان سے ڈیفنس تک پہنچتے پہنچتے میں نے خاصی حد تک اپنے حواس پر قابو پالیا تھا۔ میری کوٹھی کے سامنے آس پاس کی کوٹھیوں کے لوگ جمع تھے۔ ان میں زیادہ تعداد گھریلو ملازمین کی تھی۔ انہی لوگوں کے درمیان میں نے اس نوجوان ارشاد کو بھی دیکھا جو مجھ سے خصوصی جذباتی لگاؤ رکھتا تھا۔ مجھے کار سے اترتے دیکھ کر وہ تیر کی طرح میری طرف لپکا اور قریب آ کر جذبات سے بوجھل آواز میں کہنے لگا۔ "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ کوٹھی میں نہیں تھیں۔"

"ہوا کیا تھا؟" میں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا

"پے در پے دھماکے سنائی دیئے تھے اور پھر آپ کی کوٹھی سے شعلوں اور دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے تھے یہ ابھی ذرا ہی دیر پہلے کی بات ہے میں بس سونے ہی والا تھا۔" ارشاد نے بتایا، پھر کہنے لگا "معلوم نہیں کسی نے ابھی تک فائر بریگیڈ والوں کو بھی فون کیا ہے یا نہیں! ٹھہریئے، میں ابھی اپنی کوٹھی سے فون کر کے آتا ہوں۔" یہ کہتے ہی ارشاد تیزی کے ساتھ اپنی کوٹھی کی طرف بڑھ گیا۔

ڈیفنس ایسے علاقوں میں سکونت پذیر بڑے لوگوں کو ایک دوسرے کے معاملات سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی کہ وہ آرام و سکون کو خیر باد کہہ کر برے بھلے وقت میں کسی کے کام آسکیں مجھے اس کا اچھی طرح اندازہ تھا میرے ساتھ سیل کے جو ارکان اور ذاتی ملازمین تھے، وہ سبھی گاڑیوں سے اتر کر پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے تباہ ہوتی کوٹھی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ابھی تک کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے دو لاشیں بھی پڑی ہیں دوسرے حفاظتی دستے کے ارکان بھی وہاں پہنچ چکے تھے میری ایک جانب سرفراز اور دوسری جانب کیپٹن شاد چوکنا کھڑے تھے میں نے ان دونوں کو اپنے ساتھ آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ دھواں اس قدر تھا کہ لوگ کوٹھی کے گیٹ سے خاصے فاصلے پر کھڑے تھے۔ اسی دھوئیں کی وجہ سے یقیناً ان لوگوں نے کوٹھی کے سامنے پڑی ہوئی لاشوں کو نہیں دیکھا تھا۔

"کیپٹن شاد، تم بند سیاہ وین کوٹھی کے گیٹ کے پاس لے آؤ، جلدی کرو، تمہیں یہاں سے دو لاشیں لے کر فوری طور پر آپریشن سیل پہنچنا ہے۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"لاشیں میڈم؟" کیپٹن شاد حیرت زدہ سا ہو کر بولا۔

"ہاں لاشیں کیپٹن شاد، اپنے پیاروں کی لاشیں!" یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

دبیز دھوئیں کے بادلوں میں کھانستی ہوئی، میں سرفراز کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ سرفراز بھی کھانس رہا تھا مگر اس کے باوجود میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ کیپٹن شاد میرے حکم کی تعمیل میں واپس چلا گیا تھا۔

بالآخر میں اپنی کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ ہی گئی دھوئیں کے باوجود مجھے دونوں لاشیں نظر آ گئیں اور ان کے سینوں پر رکھا ہوا بڑا سا کاغذ بھی دکھائی دے گیا جس پر کوئی عبارت درج تھی۔ وہ کاغذ میں نے تیزی سے جھک کر اٹھا لیا دھوئیں کے اور اندھیرے کے سبب فی الحال کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنا ممکن نہیں تھا میں نے اسی لیے اس کاغذ کو تہ کر کے اپنے پرس میں رکھ لیا کیپٹن شاد نے خاصی سرعت کا ثبوت دیا۔ وہ اپنے ساتھ موجود بند سیاہ وین لے کر گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔

بند سیاہ وین میں موجود سیل کے ارکان نے تیزی کے ساتھ دونوں لاشوں کو اٹھا کر وین کے پچھلے حصے میں رکھ دیا اور پھر وہاں سے وین کی روانگی میں دیر نہیں لگی ان دونوں لاشوں کے قریب آتشیں ہتھیار بھی ہونا چاہئیں تھے جو نہیں تھے ظاہر ہے کہ انہیں دشمن نے اپنے قبضے میں لے لیا ہو گا

اب دھوئیں کے سبب کھانستے کھانستے میرا اور سرفراز کا برا حال ہو چکا تھا وہاں سے لاشیں اٹھائے جانے کے فوراً بعد ہم دونوں ہی تیزی سے پیچھے ہٹ آئے اسی وقت کہیں دور سے فائر بریگیڈ کے سائرن سنائی دینے لگے۔ غالباً وہاں کے کسی نیک دل باسی نے ارشاد سے پہلے فائر بریگیڈ والوں کو فون پر آگ لگنے کی اطلاع دے دی تھی ورنہ اتنی جلدی وہ لوگ وہاں نہ پہنچ پاتے

اتنی زبردست تباہی کے بعد یہ ذرا مشکل ہی تھا کہ کوٹھی میں موجود کوئی قیمتی شے جلنے یا تباہ ہونے سے بچ گئی ہو اب وہاں رکنا لاحاصل ہی تھا۔

پھر میں نے وہاں سیل کے چند ارکان اور مرد ملازمین کو چھوڑ دیا ملازماؤں کو سیل کے دو ارکان کے ساتھ طارق روڈ والے فلیٹ میں بھیج دیا اس کے بعد خود میں نے "آپریشن سیل" جانے کا فیصلہ کیا۔

جب میں اپنی بلٹ پروف کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہونے والی تھی تو ارشاد کو تیزی کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھا میں کار کا دروازہ بند کرتے کرتے رک گئی۔

"آپ...... آپ اب کہاں جائیں گی؟" وہ بھاگتا ہوا میری کار کے قریب پہنچ کر بولا۔

"آپ کی کوٹھی تو تباہ ہو چکی ہے، پھر...... آپ رات کہاں گزاریں گی؟"

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں اس کے بھولپن اور معصومیت پر مسکرا اٹھتی، مگر اس وقت میری جذباتی کیفیت کچھ اور ہی تھی میں نے اسی لیے غیر جذباتی سے لہجے میں جواباً کہا۔ "تم جا کر آرام کرو، میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں خدا حافظ" یہ کہہ کر میں نے کار کا دروازہ بند کر لیا۔ اسی کے ساتھ سرفراز نے کار اسٹارٹ کر دی۔

جب میری کار وہاں سے روانہ ہو رہی تھی تو فائر بریگیڈ کا عملہ اپنے فرائض کی ادائیگی کا آغاز کر چکا تھا۔

میری کار کے ساتھ دو موٹر سائیکل سوار اور ایک جیپ اب بھی تھی کار ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کر پائی تھی کہ میں نے کار کے اندر لائٹس آن کر دیں اور اپنے پرس سے وہ تہ کیا ہوا کاغذ نکال لیا جو لاشوں کے اوپر رکھا تھا۔ میری نگاہ سیاہی مائل اس سرخ عبارت پر جمی ہوئی تھی اور میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا میں نے پہلی ہی نظر میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ عبارت خون سے لکھی گئی ہے پھر اس کی تصدیق بھی ہوگئی وہ انگریزی عبارت، سولومن کی جانب سے میرے نام مندرجہ ذیل پیغام پر مشتمل تھی۔

عذرا خان! میں یہ عبارت تمہارے آدمیوں کے خون میں انگلیاں ڈبو کر لکھ رہا ہوں۔ اس سے تم میرے شدید غصے، نفرت اور انتقام کا اندازہ لگا سکتی ہو۔ میں نے تمہاری حویلی کو کھنڈر بنا دیا ہے اور تمہارے لیے اپنی طرف سے لاشوں کی صورت میں یہ دو تحفے چھوڑے جا رہا ہوں۔ آگ اور خون کے اس کھیل کی ابتدا تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔ آج رات تم نے میرے دو ساتھیوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا، سو جواباً میں بھی ایسا ہی کر رہا ہوں میرے چار ساتھی تمہاری قید میں ہیں، اگر تم نے کل صبح تک انہیں آزاد نہ کر دیا تو بھیانک نتائج کی ذمے داری خود تم پر ہوگی مجھے معلوم ہے کہ تم ایک خود سر اور ضدی عورت ہو، تم اگر اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہیں تو اپنے چار ساتھیوں کے بدلے میں تمہارے دگنے آدمیوں کو خاک و خون میں نہلا دوں گا یہ بات بھی اپنے ذہن میں رکھنا عذرا خان کہ جس طرح میں نے تمہاری کوٹھی کو کھنڈر بنا دیا ہے، بالکل اسی طرح تمہارے امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر بھی کھنڈر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اگر تم یہ نہیں چاہتیں تو پھر میرے ساتھیوں کو رہا کر دو مجھے تم ایسی ذہین عورت سے یہ امید ہے کہ اپنی تباہی و بربادی کو آواز نہیں دو گی۔

تمہارا دشمن

سولومن

اپنے جاں نثاروں کے خون سے لکھی ہوئی وہ عبارت پڑھ کر میری رگوں میں لہو سنسنانے لگا۔

سولومن اور میرے درمیان ہونے والی جنگ کا دائرہ اب مزید وسیع ہو گیا تھا۔ یہ سرد جنگ اب کشت و خون کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ آج رات سولومن نے مجھے شدید مالی اور جانی نقصان پہنچایا تھا مالی نقصان کی تو خیر مجھے زیادہ پروا نہیں تھی لیکن جانی نقصان نے مجھے انتہائی صدمہ پہنچایا تھا ہر چند کہ سولومن کو زیادہ جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا جس سے وہ ابھی لاعلم تھا، یعنی اس کے تین اور میرے دو جاں نثار مارے گئے تھے مگر ظاہر ہے کہ اس سے میرے بے قرار دل کو قرار نہیں آ سکتا تھا۔

سولومن نے اپنے پیغام میں میری فرم کے بارے میں جو دھمکی دی تھی، اسے بھی میں محض دھمکی نہیں سمجھ رہی تھی اپنے ہم وطنوں کی موت اور گرفتاری نے اسے انسان کے بجائے ایک وحشی درندہ بنا دیا تھا۔ ایسے عالم میں وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا تھا۔ اس کے باوجود سولومن کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے کا کوئی سوال نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھیوں کو رہا کر دوں۔

میرے پاس کچھ کرنے کے لیے صرف آج کی شب تھی جس کے گزرنے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے ان چند گھنٹوں میں مجھے ہر قیمت پر سولومن کا سراغ لگا کر اس تک پہنچنا تھا ورنہ آنے والا دن نہ جانے کتنے بے گناہوں کی موت کا پیغام لے کر آتا میری فرم کا دفتر جس عمارت میں تھا، وہ کئی منزلہ تھی

اور اس میں دیگر فرموں کے بھی دفاتر تھے۔ اس عمارت کو بم سے اڑانے کی صورت میں نہ صرف میری فرم کے ملازمین کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی بلکہ اس عمارت میں موجود سبھی افراد بے خبری کی موت مارے جاتے۔

میری کار تیزی کے ساتھ آپریشن سیل کی طرف اڑی جا رہی تھی، مگر اس سے بھی تیز رفتار میرا ذہن تھا جو ناامیدی کے اندھیرے میں شگاف ڈال کر امید کی کسی کرن کا متلاشی تھا اب سے پہلے متعدد بار میری زندگی، موت کے شدید خطرے سے دوچار ہوئی تھی مگر یہ معاملہ قطعی مختلف تھا مجھے اپنی زندگی نہیں، دوسروں کی زندگی کو ہر قیمت پر بچانا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ پہلے کبھی میں ایسے صبر آزما اور حوصلہ شکن لمحات سے نہیں گزری تھی۔ اگر میں نے آج ہی رات اس ہولناک مسئلے کا کوئی حل تلاش نہ کیا تو آنے والا دن کتنی بڑی تباہی اور ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا، اس کا مجھے پوری طرح احساس تھا۔

☆......☆......☆

آہنی اعصاب رکھنے والوں کا ذہن بھی پے در پے غیر متوقع واقعات پیش آنے کی وجہ سے کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی مرحلے پر الجھ ہی جاتا ہے۔ میں بھی آج شب کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہوئی تھی۔ میرا دشمن آج ہی رات مجھ سے ٹکرا جائے گا، میرے لئے یہ غیر متوقع تھا۔ پھر فضلے کے ذریعے، میری کوٹھی میں ٹائم بم رکھوانا بھی ایسا ہی واقعہ تھا۔ اس کے بعد میری کوٹھی کو تباہ کیا جانا اور سیل کے دو ارکان کا قتل بھی اسی زمرے میں آتا تھا۔ یہ سارے واقعات اچانک اور پے در پے پیش آئے تھے۔ مجھے یہ توقع بھی نہیں تھی کہ سولومن میرے امپورٹ ایکسپورٹ کے دفتر کو بھی کھنڈر میں تبدیل کرنے کی دھمکی دے گا۔ اسکے تین جاں نثار میرے آدمیوں کے ہاتھوں مارے جاچکے تھے اور تین قید میں تھے۔ سولومن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو دھمکی دینے کی پوزیشن میں نہ ہوتا، مگر وہ تو کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ناکامیوں سے مایوس ہو جانا جیسے اس کی سرشت ہی میں داخل نہیں تھا۔ ناکامیاں اسے مزید متحرک اور خطرناک بنا دیتی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ وہ میرے دو جیالوں کو قتل کرسکتا نہ میری کوٹھی کو کھنڈر بنا پاتا۔ سولومن ایسے لوگوں میں سے تھا کہ تن تنہا بھی ناقابل یقین تباہی و ہلاکت کا سبب بن سکتا تھا۔

اس وقت بھی میرا ذہن الجھا ہوا ہی تھا جب میری کار ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' کی حدود میں داخل ہوئی۔ ذہن الجھا ہو تو کسی مسئلے کا حل فوراً سمجھ میں نہیں آتا۔ غالباً اسی لئے مجھے ابھی تک کوئی راہ نہیں سوجھی تھی۔ میرا ذہن اس نکتے پر اٹک گیا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے مجھے سولومن کا سراغ لگا لینا ہے تاکہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ اس تک کس طرح پہنچا جاسکتا ہے؟ میرا ذہن اسی سوال کا جواب تلاش کرنے میں الجھا ہوا تھا۔

''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' پہنچنے کے بعد میں نے پہلے اس حصے کا رخ کیا جو سیل کی میڈیکل کور کے تصرف میں تھا۔ میڈیکل کور کا انچارج ڈاکٹر رشید اپنے ایک معاون کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ پہلے میں نے سیل کے اس رکن کو دیکھا جس کے شانے کی ہڈی میں گولی لگی تھی۔

''ڈاکٹر! یہ بے ہوش ہے یا اسے کوئی خواب آور دوا دے کر تم نے سلا دیا ہے؟'' میں نے ڈاکٹر رشید سے پوچھا کیوں کہ سیل کا وہ رکن بے حس و حرکت بستر پر پڑا ہوا تھا۔

''میڈم! اسے میں نے ہی سلا دیا ہے کیوں کہ تکلیف زیادہ تھی۔ گولی خاصی اندر تک اتر گئی تھی۔'' ڈاکٹر رشید نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلایا اور پھر ڈاکٹر رشید کے ساتھ بقیہ دو زخمیوں کی عیادت کی۔ وہ

دونوں ہوش میں تھے۔ ان میں سے ایک کی پنڈلی میں، دوسرے کے بازو میں گولیاں لگی تھیں۔ ان زخموں کے علاوہ ان کے بقیہ جسم پر بھی معمولی زخم تھے۔

وہاں مجھے سولومن کے زخمی ساتھی نظر نہیں آئے۔ میں نے ڈاکٹر رشید سے ان کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے علم تھا کہ ان دونوں سے اس وقت پوچھ گچھ کی جارہی ہوگی تاکہ سولومن کا کوئی سراغ مل سکے۔ عثمانی کو یہ حکم میں نے دیا تھا۔ ان دو زخمیوں کے علاوہ سولومن کا ایک اور ساتھی قید میں تھا۔ اسے بھی اس وقت ''مہمان خانے'' سے متصل اس حصے میں ہونا چاہئے تھا جہاں ایسے مجرموں کی زبان کھلوانے کا تمام ساز و سامان موجود تھا۔ یہ حصہ ساؤنڈ پروف تھا تاکہ تشدد کی صورت میں مجرموں کی چیخ و پکار وہیں تک محدود رہے۔

امکان تو نہیں تھا کہ ان لوگوں سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جاتی، پھر بھی ایک موہوم سی آس کے تحت میرے قدم اس حصے کی طرف اٹھنے لگے۔

میں جیسے ہی اس حصے میں پہنچی، مسلح گارڈز کی ایڑیاں بج اٹھیں۔ سر کے اشارے سے میں ان کے سلام کا جواب دیتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ سامنے کچھ ہی فاصلے پر ایک دروازہ نظر آرہا تھا جس کی دائیں اور بائیں جانب دو مسلح چوکنا گارڈز کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے فوجی انداز میں سلیوٹ کئے اور میرے لئے دروازہ کھول دیا۔

دروازے سے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی مجھے عثمانی نظر آگیا۔ اس کے ساتھ سیل کے تین ارکان اور بھی تھے۔ دائیں جانب ستون سے ایک غیر ملکی بندھا ہوا تھا اور اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں ایک آہنی شکنجے میں تھیں اور سیل کا ایک رکن آہستہ آہستہ شکنجے کی گرفت سخت کرتا جارہا تھا۔ انگلیاں یقیناً کچل گئی تھیں کیوں کہ شکنجے سے خون زمین پر ٹپک رہا تھا۔ دوسرے غیر ملکی کو ایک میز سے باندھا گیا تھا اور برقی رو اس کے جسم سے گزاری جارہی تھی۔ وہ بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اچھلتا تھا۔ میز کے قریب سیل کا دوسرا رکن موجود تھا۔ تیسرا غیر ملکی الٹا چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ فرش پر پانی سے بھرا ٹب رکھا تھا۔ رسی کی گرفت ڈھیلی کرکے اس کا جسم نیچے لایا جاتا اور پھر سر پانی میں ڈوب جاتا۔ کچھ دیر بعد اس کا سر پانی سے نکال لیا جاتا۔ گردن تک پانی میں ڈوبنے کے سبب اس کا جسم بری طرح جھٹکے کھانے لگتا تھا۔

مجھے کمرے میں آتے دیکھ کر عثمانی تیزی سے میرے قریب آگیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو ایک نظر دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اسے اب تک کامیابی نہیں ہوسکی۔ پھر میرے استفسار پر اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔

''عثمانی! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آج ہی رات یہاں آسکوں گی ورنہ اس تماشے کی ضرورت ہی نہ آتی۔'' میں معنی خیز لہجے میں عثمانی سے بولی۔

''میں کچھ سمجھ نہیں سکا میڈم، آپ......''

''ابھی سمجھ جاؤ گے جب ان میں سے ہر ایک فرفر اپنا سبق سنانا شروع کردے گا!'' یہ کہتے ہوئے میں ستون سے بندھے ہوئے شخص کی طرف بڑھی۔ قریب پہنچ کر میں نے سیل کے رکن کو مخاطب

کیا۔ ’’شکنجہ کھول دو!‘‘

’’بہتر ہے میڈم!‘‘ سیل کا رکن میرے حکم کی تعمیل میں شکنجہ کھولنے لگا۔

سیل کا رکن میرے اشارے پر شکنجہ کول کر پیچھے ہٹ گیا تو میں نے آگے بڑھ کر ستون سے بندھے ہوئے غیر ملکی کی بھوری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ اسی کے ساتھ میرا طاقت ور ذہن متحرک ہوگیا۔ اب اس غیر ملکی کا ذہن میری گرفت میں تھا۔ اس کے ذہن نے مدافعت نہیں کی تھی۔ اس نے اب کراہنا بھی بند کر دیا تھا۔

’’سولومن کہاں ہے؟‘‘ میں نے اس سے براہ راست سوال کیا۔

اس کا جواب میری توقع کے خاف نہیں تھا۔ ’’وہ اس وقت کہاں ہوگا، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔‘‘ وہ جیسے نیند کے عالم میں بول رہا تھا۔

’’عذرا خان پر حملہ کرنے کے بعد تمہیں اس کی رپورٹ کسے دینا تھی؟ اور کہاں؟‘‘ میں نے کچھ سوچ کر دوسرا سوال کیا۔

’’رپورٹ مجھے نہیں، رابرٹ کو دینا تھی۔ سولومن کا حکم بھی ہمیں اسی کے ذریعے ملا تھا اور اسی نے سولومن کے ایما پر حملے کی منصوبہ بندی کی تھی۔‘‘ غیر ملکی نے جواب دیا۔

اس جواب کے بعد میں نے اس غیر ملکی کے ذہن کو آزاد کر دیا اور عثمانی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

عثمانی میری سوالیہ نظروں کا مطلب سمجھ گیا اور بولا۔ ’’افسوس میڈم کہ ان تینوں میں سے کسی کا نام رابرٹ نہیں۔ آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی طرف آتے ہوئے جو دو قیدی فرار ہوئے تھے، انہی میں سے ایک کا نام رابرٹ تھا۔‘‘

’’تو ان کا لیڈر رابرٹ تھا جو فرار ہو چکا ہے!‘‘ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ’’رپورٹ اسی کو دینا تھی۔ یقیناً اسے ہی یہ علم رہا ہوگا کہ سولومن کہاں ہے اور اس سے کس طرح رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے! ان تینوں سے کچھ معلوم ہونا، ممکن نہیں۔ ان پر مزید تشدد کی ضرورت نہیں عثمانی!‘‘

’’تو پھر انہیں یہاں سے مہمان خانے میں منتقل کر دیا جائے میڈم؟‘‘ عثمانی میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

’’ہاں، مگر اس سے پہلے انہیں طبی امداد ضرور دی جائے۔‘‘ میں نے جواباً کہا، پھر بولی۔ ’’سیل کے جو دو ارکان آج رات مارے گئے ہیں مجھے ان کے بارے میں تفصیلات چاہئیں۔ ریکارڈ روم سے ان دونوں کی فائلیں نکلوا کر کمرے میں بھیج دو۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔‘‘

’’میڈم! میں ان کی فائلیں نکلوا چکا ہوں۔ فائلیں ڈیوٹی روم میں ہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان فائلوں کی ضرورت پڑے گی۔‘‘ عثمانی بولا۔

’’تم نے فائلیں دیکھیں؟‘‘ میں نے دریافت کیا۔

’’جی ہاں میڈم! وہ دونوں مستقل یہیں آپریشن سیل ہیڈکوارٹر میں رہتے تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق سرحد کے ایک گاؤں بٹ خیلہ سے تھا اور دوسرا پنجاب کے ایک شہر ملتان کا رہنے والا تھا۔

ملتان سے تعلق رکھنے والے کے ورثاء میں صرف ایک بوڑھا باپ تھا جو مرحوم کو عاق کر چکا تھا۔ وہ ملتان سے سکونت ترک کر کے گزشتہ سال کراچی آ گیا تھا، مگر اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ مرحوم رکن کا خیال تھا کہ اس کا باپ کراچی آ کر کسی حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔ سرحد کے رہنے والے رکن کے والدین اور چھوٹا بھائی خاندانی دشمنی میں مارے گئے تھے اور بڑا بھائی عرصہ دراز سے لاپتا ہے۔ اس کا ذہنی توازن بھی ٹھیک نہیں تھا۔ عثمانی نے تفصیل کے ساتھ مجھے سیل کے مقتول ارکان کے متعلق بتایا۔

میں نے طویل سانس لیا، پھر کہا۔ ’’تو پھر یوں کرو عثمانی کہ ان دنوں کی تدفین یہیں اسی عمارت کی حدود میں عقبی سمت کرادو! عقبی سمت میں جو چھوٹا سا باغ ہے، وہ اس کے لئے مناسب رہے گا۔ صبح سے پہلے ان کی تدفین ہو جانا چاہئے اور ہاں...... بقیہ چار لاشیں بھی تو ہیں! ان کی تدفین......‘‘ میں سوچ میں پڑ گئی۔ ان چار لاشوں میں سے ایک لاش فضلے کی تھی، بقیہ تین غیر ملکیوں کی لاشیں تھیں۔

’’میڈم! یہ چاروں لاشیں منگھوپیر کی پہاڑیوں کے پیچھے بھی تو دفن کی جاسکتی ہیں! پہلے بھی تو......‘‘

’’بالکل ٹھیک ہے۔‘‘ میں بول اٹھی۔ ’’ابھی صبح ہونے میں دیر ہے، اس سے پہلے ہی رات کے اندھیرے میں یہ کام ہونا چاہئے!‘‘

’’ہو جائے گا میڈم!‘‘ عثمانی سر ہلا کر بولا۔ ’’آپ مطمئن رہیں۔ وہ...... ان تینوں غیر ملکیوں کے بارے میں کیا سوچا آپ نے میڈم؟ کیا یہ یہیں رہیں گے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’جو لسٹ میں نے وزیر داخلہ کو دی تھی، اس میں ان تینوں کے نام بھی تھے۔ کل صبح انہیں وزارت داخلہ کے سپرد کر دیا جائے گا یوں بھی یہ اب ہمارے کسی کام کے نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے ٹھیک سوچا ہے نا؟‘‘

عثمانی نے میری رائے سے اتفاق کیا، پھر مجھ سے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں پوچھنے لگا۔

’’فی الحال تو ایک اور اہم مسئلہ درپیش ہے جس کا مجھے کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنا ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا پرس کھول کر وہ تہ کیا ہوا کاغذ عثمانی کی طرف بڑھا دیا جو سولومن کی سفاکی کا ثبوت تھا۔ اسی پر وہ دھمکی بھی تحریر تھی جس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ ’’اسے پڑھ لو عثمانی! تم سمجھ جاؤ گے کہ میں کس الجھن میں گرفتار ہوں!‘‘

خون سے لکھی ہوئی وہ تحریر پڑھ کر کاغذ اس نے مجھے واپس کر دیا۔ اس کے چہرے سے بھی فکرمندی کا اظہار ہونے لگا تھا۔

’’عثمانی! میں نے تمہیں جو احکام دیئے ہیں، ان کی تعمیل کے بعد میرے کمرے میں آ جاؤ! ممکن ہے اس دوران میں کوئی حل تمہارے ذہن میں آ جائے یا پھر مجھے کوئی راہ سوجھ جائے!‘‘

پھر میں وہاں مزید رکے بغیر اپنے ساؤنڈ پروف کمرے کی طرف روانہ ہوگئی۔ عثمانی وہیں رہ گیا تھا۔

ساؤنڈ پروف کمرے کی ایک چابی میرے پرس میں تھی۔ کمرا کھول کر میں نے لائٹ جلائی اور دروازہ بند کر کے مسہری کے قریب رکھی ہوئی ایزی چیئر پر نیم دراز ہوگئی۔ میں نے نفسیات کی کسی کتاب

میں پڑھا تھا کہ اگر ذہن الجھا ہو اور کسی مسئلے کا حل سمجھ میں نہ آ رہا ہو تو کچھ دیر کے لئے ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دینا چاہئے، پھر از سرِ نو مسئلے کا حل سوچنا چاہئے۔ اس وقت میں نے اسی پر عمل کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر اپنے ذہن کو مکمل آرام دینے کے بعد میں نے دوبارہ سوچنا شروع کر دیا اور اس بار مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ مسئلے کا ایک حل میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ اب صبح ہونے سے پہلے سولومن کا سراغ لگانا ضروری نہیں رہا تھا۔

مسہری کے سرہانے ایک تپائی پر انٹرکام اور ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ میں ایزی چیئر سے اٹھ کر مسہری کے سرہانے بیٹھ گئی اور انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا۔ ڈیوٹی روم کے لئے میں نے سات نمبر کا بٹن دبایا۔ عثمانی کی غیر موجودگی میں سیل کے ایک اور سینئر رکن نے دوسری جانب سے ریسیور اٹھایا۔ میں نے اس سے ٹیلی فون لائن دینے کو کہا اور انٹرکام کا ریسیور رکھ کر ٹیلی فون کے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

ٹیلی فون پر میں نے اپنی فرم کی منیجر عارفہ کا نمبر ملایا۔ توقع کے مطابق دیر تک گھنٹی بجتی رہی اور پھر نیند میں ڈوبی ہوئی ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ میں پہچان گئی۔ وہ عارفہ کے بوڑھے باپ کی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ مجھے جانتے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرانے اور انہیں سلام کرنے کے بعد نرمی سے کہا۔ ”معاف کیجئے گا محترم کہ ناوقت آپ کو زحمت دی۔ مجھے ذرا عارفہ سے بات کرنا تھی۔ اگر زحمت نہ ہو تو اسے جگا دیں۔“

”زحمت کی کیا بات ہے بیٹی! میں ابھی بلاتا ہوں عارفہ کو۔ ظاہر ہے کہ کوئی ضروری بات ہی ہو گی جو تم نے اس وقت فون کیا۔“ پھر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ بڑے میاں یقیناً اپنی بیٹی کو جگانے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ ان کے قدموں کی ہلکی سی چاپ مجھے دور ہوتی سنائی دے رہی تھی۔

چند منٹ انتظار کے بعد دوسری جانب سے عارفہ کی آشنا آواز آئی۔ ”ہیلو!“

”عارفہ! معاف کرنا کہ تمہیں اس وقت جاگنا پڑا۔“ میں نے کہا۔ ”دراصل معاملہ ہی ایسا تھا کہ......“

”ارے میڈم، کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ!“ عارفہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ”آپ فرمائیے کیا بات ہے؟“

”میں چاہتی ہوں عارفہ کل صبح عذرا انٹرپرائزز کا دفتر نہ کھلے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ دفتر کی چابیاں تمہارے پاس ہوتی ہیں، لیکن فرم کے عملے کو اس کی اطلاع دینا ضروری ہے۔ وجہ سمجھ ہی سکتی ہو تم دفتر پر تالا پڑا دیکھ کر وہ نہ جانے کیا سمجھیں گے! اب دفتر اس وقت تک نہیں کھلے گا جب تک میں تمہیں دفتر دوبارہ کھولنے کی اجازت نہ دے دوں۔ تم ایسا کرو کہ عملے کے جن افراد کے پاس فون ہیں، انہیں فون پر مطلع کر دو اور بقیہ کو خود ان کے گھر جا کر یہ اطلاع کر دو! صبح دفتری اوقات شروع ہونے سے پہلے پہلے سب کو اطلاع ہو جانا چاہئے۔ ہاں یہ بتاؤ، تمہیں سب کے پتے معلوم ہیں؟“ میں نے آخر میں پوچھا۔

”اکثر کے پتے معلوم ہیں مجھے میڈم!“ عارفہ نے جواب دیا۔ ”مگر یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے پاس جن لوگوں کے فون نمبر ہیں ان سے وہ پتے معلوم کر لوں گی جو میرے علم میں نہیں ہیں۔ بہر حال آپ کے حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔“

”ویری گڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ میں خوش ہو کر بولی۔

”میڈم! یہ مسئلہ کیا ہے؟ کیا کچھ بتانا پسند کریں گی؟“ عارفہ کی آواز میں جھجک سی تھی۔

”تمہیں تو علم ہے عارفہ کہ فرم کے علاوہ بھی میری دیگر دلچسپیاں اور مصروفیات ہیں۔“ میں عارفہ کو بتانے لگی۔ ”تم سے کبھی براہ راست تو ان مصروفیات کے بارے میں میری بات نہیں ہوئی، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اپنے طور پر تم نے کوئی نہ کوئی اندازہ ضرور لگا لیا ہو گا۔ مختصراً یوں سمجھ لو کہ میں جن لوگوں کے خلاف برسرِ پیکار ہوں، ان کی طرف سے مجھے خدشہ ہے، کہیں وہ میری فرم اور اس کے عملے کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ ان حالات میں میرے پاس اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں تھی کہ اس وقت تک کے لئے فرم کا دفتر بند کر دیا جائے جب تک معاملات اعتدال پر نہ آ جائیں۔“

”ایسا ہے میڈم تو آپ کا فیصلہ قطعی درست ہے۔“ عارفہ میری تائید میں بولی۔

”ہاں ایک بات اور سنو عارفہ!“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے کل صبح کے اخبار میں تم میری کوٹھی کی تباہی کی خبر پڑھو۔ اس سے فکر مند نہ ہونا! اس میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ جس وقت کوٹھی کو تباہ کیا گیا، کوٹھی خالی تھی۔“

”اور میڈم، آپ کے ملازمین؟“ عارفہ نے سوال کیا۔

”انہیں میں پہلے ہی کوٹھی سے نکال کر لے جا چکی تھی۔“ میں جواباً بولی۔

”یہ خبر سن کر بہت افسوس ہوا میڈم!“ عارفہ نے افسوس کا اظہار کیا۔

اظہارِ افسوس پر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، پھر کہا۔

”شکر کی بات یہ ہے کہ عارفہ کہ صرف مالی نقصان ہوا۔ مال کا بدل تو ہے، جان کا نہیں۔ اچھا عارفہ، خدا حافظ!“

”خدا حافظ میڈم!“ دوسری طرف سے عارفہ کی آواز آئی اور میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا۔

اسی وقت عثمانی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میں نے دانستہ دروازہ اندر سے مقفل نہیں کیا تھا۔

”میڈم! اس مسئلے کا فی الحال ایک ہی حل سمجھ میں آتا ہے۔“ عثمانی قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ہاں کہو!“ میں بولی۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ عثمانی کے ذہن میں بھی وہ بات آتی ہے یا نہیں جس پر میں نے عمل کیا تھا! وہ بہر حال سیل کا ایک ذہین فرد تھا۔

عثمانی نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ وہ بولا۔ ”فی الحال فرم بند کر دی جائے میڈم!“

”مجھے خوشی ہوئی عثمانی کہ تم میری توقع پر پورے اترے۔“ میں نے اس کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”آپ کی عزت افزائی ہے میڈم! یہ سب آپ کی تربیت کا نتیجہ ہے!“ عثمانی نے انکساری سے کہا۔ یہ انکساری اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ وہ ایزی چیئر کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

میں نے عثمانی کو بتا دیا کہ اس سلسلے میں ضروری احکام دے چکی ہوں۔

''لیکن میڈم! اس کا علم بہرحال سولومن کو نہیں ہوگا۔ جہاں تک میرے علم میں ہے، اس بلڈنگ میں دیگر اداروں کے بھی دفاتر ہیں اگر سولومن نے کوئی انتقامی کارروائی کی تو دوسرے اداروں کے افراد کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس کا بھی تدارک ہونا چاہئے۔'' عثمانی نے ایک اور نکتہ مجھے سمجھایا۔

تمہارا کہنا بالکل درست ہے۔'' میں فکرمند لہجے میں بولی، پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس کے تدارک کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وزارت داخلہ ہی اس سلسلے میں ضروری اقدامات کر سکتی ہے۔ دفاتر کا وقت شروع ہونے سے پہلے بلڈنگ کے صدر دروازے پر سادہ پولیس والے متعین کر دیئے جائیں جو کسی بھی شخص کو بلڈنگ میں داخل نہ ہونے دیں، اس کے علاوہ بلڈنگ کی اطراف موجود رہ کر وہ بلڈنگ کی نگرانی کریں۔ یہی سادہ لباس والے مشتبہ افراد کو بھی چیک کر سکتے ہیں۔ یہ تو ہوئی ایک حفاظتی تدبیر! دوسری حفاظتی تدبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سادہ لباس پولیس والوں کے ساتھ ساتھ سیل کے کچھ ارکان بھی وہاں موجود رہیں۔ یہ لوگ اپنے طور پر کسی بھی ممکنہ تخریبی کارروائی کا تدارک کریں گے۔ جہاں تک قیاس کام کرتا ہے، سولومن کسی بھی طرح بلڈنگ کے اندر کوئی ٹائم بم وغیرہ رکھنے یا رکھوانے کی کوشش کرے گا۔ ٹھہرو، میں وزارت داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری سے فون پر رابطہ قائم کرتی ہوں۔''

''مگر میڈم، اس وقت؟'' عثمانی حیرت سے بولا۔

''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔ ''اسے اس وقت اپنے دفتر میں ہونا چاہئے! تمہیں شاید میں نے بتایا نہیں کہ آج رات ملک کے دونوں حصوں میں بہ یک وقت غیرملکی ایجنٹوں اور مقامی ملک دشمن افراد کے خلاف ایک بڑا آپریشن شروع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وزارت داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری کو آن ڈیوٹی ہونا چاہئے۔ وہ مجھے جانتا بھی ہے، اس لئے میں جو کچھ چاہتی ہوں، اس میں دشواری نہیں ہوگی۔ پھر بھی کوئی مسئلہ ہوا تو میں صدرمملکت کی طرف سے جاری کردہ خصوصی اختیار نامہ دکھا کر وزارت داخلہ کے افسران کو اپنے ساتھ تعاون پر مجبور کر سکتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے انٹرکام پر ڈیوٹی روم سے وزارت داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری کا نمبر مانگا۔ ڈیوٹی روم میں تمام اہم شخصیات اور اہم سرکاری اداروں کے نمبر موجود رہتے تھے۔

میں جب وزیر داخلہ کے ساتھ اسلام آباد جا رہی تھی تو ایئرپورٹ پر وزارت داخلہ کی طرف سے میرا استقبال ڈپٹی سیکرٹری ہی نے کیا تھا اور ٹکٹ بھی اسی نے میرے حوالے کیا تھا۔ یقیناً وہ اس سے واقف تھا کہ ملک کی سرکردہ شخصیات سے میرے ذاتی مراسم ہیں۔ اسی سے میں ان غیرملکی ایجنٹوں کے متعلق بھی بات کر سکتی تھی جو میری قید میں تھے۔

ڈیوٹی روم سے مطلوبہ فون نمبر ملنے میں دیر نہیں ہوئی۔ میں نے فون پر ڈپٹی سیکرٹری کا نمبر ملایا۔ یہ نمبر براہ راست تھا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے میں دیر نہیں ہوئی۔

''ہیلو! میں عذرا خان بول رہی ہوں۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا۔ ''مجھے ڈپٹی سیکرٹری نسیم احمد سے بات کرنا ہے۔''

''جی فرمایئے، بول رہا ہوں میں!'' دوسری طرف سے شائستگی کے ساتھ کہا گیا۔

''آج کے آپریشن میں یقیناً کوئی غیرملکی ایجنٹ آپ کے ہتھے نہیں چڑھ سکا ہوگا، میرا کہنا درست ہے نا؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

مجھے اندازہ تھا کہ ڈپٹی سیکرٹری مجھ سے اس خفیہ آپریشن کے بارے میں سن کر چونک اٹھے گا اور یہ بھی میں جانتی تھی کہ ممکن ہے کہ وہ کسی آپریشن کا اعتراف ہی نہ کرے۔ یہی ہوا بھی! ڈپٹی سیکرٹری نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''محترمہ! میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کس آپریشن کی بات کر رہی ہیں!''

''اسی آپریشن کی جناب جس کی خاطر اس وقت آپ اپنے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ بہرحال آپ اس سلسلے میں اسلام آباد سے فون پر رابطہ قائم کر کے یہ تصدیق کر سکتے ہیں کہ آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہئے یا نہیں! میں نے آپ کے اظہار لاعلمی کا کوئی خیال نہیں کیا۔ آپ کو وہی کہنا چاہئے تھا جو کہا! بہرحال یہ آپریشن انتہائی راز داری کا حامل تھا۔ مجھے اس آپریشن کے متعلق آپ سے کچھ اہم بات کرنا ہے اور ایک ضروری اطلاع بھی فراہم کرنا ہے، مگر آپ پہلے اسلام آباد سے تصدیق کر لیں۔ میں آپ کو دس منٹ کے بعد پھر فون کروں گی۔'' یہ کہہ کر میں نے مزید کچھ کہے سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا، پھر عثمانی کو مخاطب کیا۔

''تم جاؤ، میں معاملات سنبھال لوں گی۔''

عثمانی میرا حکم سن کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ عثمانی کو گئے ابھی پانچ چھ منٹ ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب سے عثمانی کی آواز سنائی دی۔ ''میڈم! ڈپٹی سیکرٹری آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''کراؤ بات!'' میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کا نمبر کیسے معلوم ہوا!

''ہیلو محترمہ! میں نسیم احمد بول رہا ہوں۔'' چند ہی لمحے بعد ڈپٹی سیکرٹری کی آواز فون پر سنائی دی۔

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر آپ کو میرا نمبر کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے یہ نمبر اسلام آباد سے دیا گیا ہے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ پہلے آپ کی کوٹھی کا نمبر ٹرائی کروں، اگر آپ وہاں نہ ملیں تو اس دوسرے نمبر پر آپ سے فوری رابطہ قائم کروں۔''

''ہوں!...... تو آپ نے تصدیق کر لی اسلام آباد سے؟''

''جی ہاں! مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپریشن کے سلسلے میں آپ کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اگر کسی معاملے میں آپ وزارت داخلہ سے تعاون چاہیں تو وہ بھی فوری طور پر آپ کو فراہم کیا جائے۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ پہلے......''

''میں آپ کی مجبوریاں سمجھتی ہوں۔'' میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپریشن کے سلسلے میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ آپریشن شروع ہونے سے قبل ہی غیرملکی ایجنٹوں کو اس بات کا علم ہو گیا تھا۔ وہ اسی لئے انڈرگراؤنڈ چلے گئے۔''

''مگر خاتون، یہ آپریشن تو بہت خفیہ تھا۔ اس کا علم غیرملکی ایجنٹوں کو کیسے قبل از وقت ہو گیا؟''

ڈپٹی سیکرٹری نے حیرت سے کہا۔

"اسے صرف ان کا قیاس کہا جاسکتا ہے کہ ان کے خلاف فوری طور پر کوئی قدم اٹھایا جانے والا ہے۔ انہیں کم از کم اتنا ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ وہ اب محفوظ نہیں رہے۔ خیر...... اس بحث کو فی الحال چھوڑیں اور میں جو عرض کرنے والی ہوں اسے توجہ سے سنیں۔"

"جی فرمائیے!" ڈپٹی سیکرٹری فوراً بولا۔

"کراچی میں آپ کو فراہم کردہ لسٹ کے مطابق آٹھ غیر ملکی ایجنٹ تھے۔ ان میں سے تین میری تحویل میں ہیں جنہیں میں آپ کے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔ ان تینوں کے نام آپ کو لسٹ میں مل جائیں گے۔ آپ جہاں کہیں ان کو بھجوا دیا جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے یہ کام ہو جائے۔"

"مگر محترمہ، یہ...... یہ لوگ آپ کو کہاں مل گئے؟ اور...... آپ نے ان پر کیسے قابو پالیا؟" ڈپٹی سیکرٹری کی آواز میں حیرت تھی۔

"آپ مجھے نہیں جانتے ورنہ یہ سب پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔" میں نے جواباً کہا اور جو کچھ کہا وہ غلط نہیں تھا۔ ڈپٹی سیکرٹری سے میرا تفصیلی تعارف نہیں تھا۔ وہ مجھے بس نام کی حد تک جانتا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں بولی۔ "اس چکر میں نہ پڑیں کہ وہ لوگ مجھے کہاں ملے؟ یا میں نے ان پر کیسے قابو پایا؟ مجھے تو صرف اتنا بتادیں کہ ان تینوں کو کہاں بھیج دوں؟ میں جلد از جلد انہیں قانون کے حوالے کردینا چاہتی ہوں۔ ہاں یہ خیال رکھئے گا کہ اس سلسلے میں میرا نام کہیں نہیں آنا چاہئے آپ اسے اپنی کارکردگی ظاہر کریں گے۔"

"لیکن یہ تو آپ کے ساتھ......"

"جو میں کہہ رہی ہوں وہی کریں!" میرے لہجے میں ہلکی سی سختی آگئی۔ اس کے "لیکن" اور "مگر" سے میں اب بور ہونے لگی تھی۔ میں نے مزید کہا۔ غالباً اسلام آباد سے بھی آپ کو یہی ہدایت دی گئی ہے کہ میں جو کہوں اس پر عمل کریں!"

"سوری!" اس نے معذرت چاہی، پھر بولا۔ "یہ سب تو میں صرف اپنا تجسس دور کرنے کے لئے پوچھ رہا تھا۔ بہر حال آپ حکم کریں، میں خود پولیس کے کسی ذمے دار افسر کو چند سپاہیوں کے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ آپ پتا بتادیں۔"

چند لمحے میں نے کچھ سوچا، پھر بولی۔ "ٹھیک ہے نصف گھنٹے بعد آپ کے آدمیوں کو فرید ہال کے سامنے ایک بند سیاہ وین نظر آئے گی میرے آدمی اس وین میں موجود تینوں غیر ملکی ایجنٹوں کو پولیس کے حوالے کردیں گے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھی...... ٹھیک ہے خاتون! لیکن آپ اگر چاہیں تو میں پولیس کو وہاں بھی بھیج سکتا ہوں جہاں وہ لوگ...... میرا مطلب ہے کہ اس وقت غیر ملکی ایجنٹ موجود......"

"مسٹر نسیم! پلیز اب اگر مگر نہ کیجئے میں ان تینوں کو بھیجنے کے انتظامات کرتی ہوں، آپ اپنا ذمے داری پوری کریں! اور ہاں پولیس والوں سے کہہ دیں کہ وہ شناخت کے لئے صرف میرا نام استعمال

کریں اور میرے آدمیوں سے مزید کسی گفتگو سے گریز کریں۔ مجھے آپ سے بھی ایک ضروری بات کرنا ہے، لیکن اس کے لئے میں آپ کو پانچ دس منٹ بعد فون کروں گی۔ اتنے میں آپ پولیس کو ضروری احکام دے دیں تاکہ وہ مقررہ جگہ بروقت پہنچ جائے۔"

"بہت بہتر ہے محترمہ! آدھے گھنٹے کے بعد فرید ہال کے سامنے پولیس پہنچ جائے گی اور آپ نے جو فرمایا ہے، اس کے خلاف نہیں ہوگا میں آپ کے فون کا منتظر رہوں گا۔" ڈپٹی سیکرٹری کے لہجے سے اب سعادت مندی کا اظہار تھا۔

"شکریہ" یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا اور انٹرکام پر عثمانی سے رابطہ قائم کرلیا۔ "عثمانی! ان تینوں غیر ملکی ایجنٹوں کے بارے میں وزارت داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری سے میری بات ہوگئی ہے۔" پھر عثمانی کو میں نے تفصیل سے آگاہ کیا، اس کے بعد ہدایت دی۔ "خیال رکھنا کہ سیل کا کوئی رکن پولیس کی نظر میں نہ آئے اس کے لئے سیاہ نقابیں بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔"

"بہتر میڈم! میں ابھی یہ بندوبست کئے دیتا ہوں کہ بند سیاہ وین مقررہ وقت پر فرید ہال کے سامنے پہنچ جائے میرا خیال ہے میڈم کہ وین پر نمبر پلیٹ بھی نہیں ہونی چاہئے۔"

"تمہارا خیال ٹھیک ہے، نمبر پلیٹ کی ضرورت نہیں۔" میں بولی "ہاں عثمانی تمہیں تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تینوں قیدیوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہونی چاہئیں!"

"آپ نے یاددہانی کرادی میڈم، شکریہ!" عثمانی بولا۔ اس نے غالباً یہ بات دانستہ نہیں کی تھی کہ اسے بھی قیدیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھنے کا خیال تھا۔ وہ بہر حال ایک باتہذیب شخص تھا اور اخلاقیات کے تقاضے سمجھتا تھا۔

انٹرکام پر عثمانی کو ہدایت دینے کے بعد میں نے کچن سے رابطہ قائم کیا اور چائے لانے کو کہا۔ آج تو ساری رات بھاگ دوڑ میں گزر رہی تھی۔ اب تک مجھے کچھ دیر آرام کرنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا اور فی الحال اس کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا ابھی تو مجھے ڈپٹی سیکرٹری سے گفتگو کرنا تھی۔

کچن سے چائے آگئی تو میں نے اس کا گھونٹ لیتے ہوئے ڈپٹی سیکرٹری کا فون نمبر ملایا۔ فون انگیج ملا تو میں نے ریسیور رکھ دیا اور چائے پینے لگی۔ پھر میں نے چائے پینے کے بعد ہی دوبارہ فون نمبر ملایا۔ اس بار فون مل گیا۔ میں نے مختصراً ڈپٹی سیکرٹری سے اپنا مدعا بیان کردیا۔

"اگر مگر چونکہ چنانچہ اس کی کچھ عادت ہی تھی جس سے شاید وہ کوشش کے باوجود اجتناب نہیں کرپاتا تھا۔ میری بات سن کر اسی لئے وہ بولا۔ "بہتر ہے محترمہ، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر عمل ہوگا، مگر میں صرف...... معذرت کے ساتھ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس کی یقیناً کوئی وجہ ہوگی جو آپ اس بلڈنگ میں کسی کا داخلہ......"

"اور آپ وہ وجہ جاننا چاہتے ہوں گے؟" میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ میرے لہجے میں طنز تھا۔

"اگر مناسب سمجھیں تو بتادیجئے، ممنون ہوں گا میں آپ کا!" ڈپٹی سیکرٹری خاصی ڈھیٹ قسم کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ میرے طنزیہ لہجے کی بھی اس نے پروا نہیں کی تھی۔

"تو سنیے! جس بلڈنگ کا میں نے آپ کو پتا بتایا ہے اور کہا ہے کہ اس میں کسی کو داخلے کی اجازت نہ دی جائے اس میں ٹائم بم رکھے جانے کا امکان ہے! اب سمجھے کچھ آپ!...... اب آپ اس بلڈنگ میں ٹائم بم رکھے جانے کی وجہ دریافت کریں گے...... ہے نا؟" میرے لہجے میں اب واضح طور پر چبھن اور جھنجلاہٹ تھی۔

"ج...... جی ہاں!" وہ جھونک میں کہہ گیا اور پھر جب غالباً اسے میرے لہجے کا خیال آیا تو "جی نہیں...... جی نہیں" بول اٹھا۔

اس کی بوکھلاہٹ پر مجھے ہنسی آ گئی مگر دل ہی دل میں! اسی لئے میں نے سنجیدہ مگر نرم آواز میں کہا۔ "آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے مسٹر نسیم کہ غیر ملکی ایجنٹ مٹی کے بنے ہوئے نہیں ہوتے۔ ان سے معرکہ آرائی مہنگی پڑتی ہے یہ جو میں تین غیر ملکی ایجنٹوں پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوئی ہوں تو اس کے عوض مجھے اپنی کوٹھی کو کھنڈر میں تبدیل کرانا پڑا ہے جس کے متعلق شاید آپ کل کے اخبار میں پڑھ لیں گے۔ غیر ملکی ایجنٹوں نے انتقاماً میری کوٹھی تباہ کردی ہے، اور اب یہ دھمکی دی ہے کہ اگر ان تینوں ایجنٹوں کو صبح سے پہلے رہا نہ کیا گیا جو میری قید میں ہیں تو میری امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم کو بھی کھنڈر بنا دیا جائے گا۔ میری فرم اسی بلڈنگ میں ہے جس کا پتا میں نے آپ کو دیا ہے اب تمام بات سمجھ میں آ گئی آپ کے!"

"بالکل سمجھ گیا محترمہ، قطعی! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ غیر ملکی ایجنٹوں اور آپ کے درمیان ٹھنی ہوئی ہے۔ اگر آپ اس سلسلے میں مجھ سے مزید کسی تعاون...... میرا مطلب ہے کہ خدانخواستہ اگر آپ خود کو غیر محفوظ تصور کر رہی ہوں تو آپ کی حفاظت کا بندوبست......"

"شکریہ بہت بہت! مجھے اپنی کوئی فکر نہیں۔" میں درمیان میں بول اٹھی۔ "میں نے تو یہ بندوبست بھی کرلیا تھا کہ میری فرم کے عملے کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جاسکتا، مگر مجھے اس بلڈنگ میں موجود دیگر اداروں کے دفاتر میں کام کرنے والوں کا خیال بھی آ گیا کہ کہیں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے! میں نے اسی سلسلے میں آپ کو زحمت دی ورنہ مجھے اپنی یا اپنے عملے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ تو پھر میں مطمئن ہو جاؤں کہ آپ اس معاملے کو سنبھال لیں گے؟"

"قطعی خاتون!" اس نے مجھے اطمینان دلایا۔ "میں اس بارے میں اسی وقت احکام جاری کردیتا ہوں، آپ بے فکر رہیں!"

"شکریہ مسٹر نسیم!" میں نے کہا، پھر بولی۔ "دانستہ طور پر میرے متعلق آپ کو جو باتیں معلوم ہوگئی ہیں مسٹر نسیم، انہیں اپنی ذات تک محدود رکھئے گا، یہ میری آپ سے درخواست ہے، اس امید کے ساتھ کہ میری درخواست رد نہیں کی جائے گی۔"

"درخواست کیسی خاتون، مجھے آپ حکم دے سکتی ہیں۔ اسلام آباد سے مجھے آپ کی بابت ایسے ہی احکام ملے ہیں۔ آپ مجھے حکم دینے کی اہل ہیں۔ میں خود بھی یہ سمجھ چکا ہوں کہ کسی سبب آپ کسی بھی معاملے میں اپنا نام نہیں چاہتیں اور ظاہر ہے کہ اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔"

"جو میں آپ کو ہرگز نہیں بتاؤں گی!" یہ کہتے ہوئے میں نے ہنس کر سلسلہ منقطع کردیا۔

اب میرا ذہن بڑی حد تک ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ سولومن کی طرف سے جو انتقامی کارروائی متوقع تھی، میں نے اس کا تدارک کردیا تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔

سونے سے پہلے میں نے انٹرکام پر عثمانی کو بتایا کہ اگر کوئی ضروری بات ہو تو مجھے جگایا جائے ورنہ سونے دیا جائے۔ کمرے کا دروازہ میں نے اندر سے مقفل کردیا تھا اور سوئچ آن کردیا تھا جس کے ذریعے میرے کمرے کے باہر لگا ہوا سرخ بلب روشن ہو جاتا تھا۔ اس سرخ بلب کا مطلب یہ تھا کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ بستر پر دراز ہونے کے کچھ ہی دیر بعد مجھے گہری نیند آ گئی۔

گہری نیند سونے کی وجہ ہی تھی کہ دیر تک میں خواب اور بیداری کی ملی جلی کیفیت میں انٹرکام کی گھنٹی بجتے سنتی رہی اور انٹرکام کا ریسیور نہیں اٹھایا۔ جب ذہن سے نیند کا غبار کچھ چھٹا تو میں نے چونک کر انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیٹے لیٹے ہی کروٹ بدل کر میں نے ریسیور اٹھالیا اور بولی۔ "ہیلو!"

"محترم وزیر داخلہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں میڈم!" دوسری طرف سے کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔ "کیا لائن دے دوں بات کریں گی ان سے آپ؟"

"ہاں کمانڈر!" میں نے کہنی کے بل اٹھتے ہوئے کہا۔ "دے دو لائن!" اس کے ساتھ میری نظر سامنے وال کلاک پر پڑی۔ اس وقت صبح کے سوا آٹھ بجنے والے تھے۔ میں صبح پانچ بجے کے قریب سوئی تھی۔ یوں میں تقریباً تین گھنٹے ہی سو سکی تھی اور مجھے جاگنا پڑا تھا۔ انٹرکام کا ریسیور رکھ کر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا۔

"بات کیجئے میڈم!" کمانڈر نواز نے مجھے خاطب کیا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے فون پر وزیر داخلہ کی آواز سنی۔ "تم خیریت سے تو ہو؟ آج کا اخبار دیکھ کر تو میرے ہوش ہی اڑ گئے تھے!"

"اللہ کے فضل اور آپ بزرگوں کی دعاؤں سے میں بالکل خیریت سے ہوں۔ ویسے میں نے ابھی آج کا اخبار نہیں دیکھا، ہاں توقع تھی کہ خبر ضرور آئے گی۔" میں نے کہا۔

"تصویر بھی چھپی ہے بھئی! میں تو ایک بار آچکا ہوں تمہاری کوٹھی میں [illegible] دیکھ کر تو معلوم ہوتا ہے کہ کوٹھی تو کھنڈر بن گئی ہے۔ یہ تو میں سمجھتا ہوں لاکھوں روپوں کا نقصان ہوگیا تمہارا اتنی بڑی کوٹھی دوبارہ بنوانا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہوگا تمہارے لئے! مجھے بڑا دکھ ہوا تمہارے اس نقصان پر! یہ غیر ملکی ایجنٹوں ہی کی انتقامی کارروائی لگتی ہے جن کے لئے تم نے پاکستان کی زمین تنگ کردی ہے۔"

مختصراً میں نے وزیر داخلہ کو ان واقعات سے آگاہ کردیا جو گزشتہ شب پیش آئے تھے۔ سیل کے دو ارکان کی ہلاکت کا سن کر بھی وزیر داخلہ نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا اور مجھے صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔ "عذرا خان! اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا اجر دے گا تم کسی ذاتی غرض کے بغیر جس طرح ملک وقوم کی خدمت کررہی ہو یہ تمہارا ہی حوصلہ ہے۔"

پھر مزید کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد سلسلہ منقطع ہوگیا۔ وزیر داخلہ نے اس کی تصدیق کردی تھی کہ مقامی ایجنٹ تو گزشتہ رات کے آپریشن میں پکڑے جاچکے تھے مگر کوئی غیر ملکی ایجنٹ گرفتار نہیں ہوسکا۔ مشرقی پاکستان میں سیودکمر جی بھی ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا، یہ وہی تھا جو دوہری زندگی بسر کررہا تھا،

ایک طرف تو وہ مشرقی پاکستان کا ہوم سیکرٹری تھا، عبیدالرحمٰن چودھری! دوسری جانب وہ جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ سبود مکرجی تھا۔

وزیر داخلہ سے فون پر گفتگو کے بعد مجھے ملک دلاور کا خیال آیا۔ اخبار پڑھ کر یقیناً اس کے بھی ہوش اڑ ے ہوں گے، میں نے سوچا اور پھر فون پر اس کا نمبر ملانے لگی۔ کم و بیش اسی وقت ملک دلاور گھر سے دفتر جاتا تھا۔

دوسری طرف سے فون اٹھانے والا ملک دلاور کا ایک ملازم تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”عذرا خان بول رہی ہوں، میں! تمہارے صاحب ابھی دفتر گئے یا نہیں؟ اگر نہیں گئے تو ان سے کہو میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”معلوم ہوتا ہے آج صاحب کا ارادہ دفتر جانے کا نہیں ہے۔ انہوں نے دفتر جانے کے لئے کپڑے بھی نہیں بدلے۔ میں ان سے ابھی آپ کے فون کا کہتا ہوں۔“ ملازم نے کہا۔

ملک دلاور کا مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ”خاتون آج تو آپ نے ڈرا ہی دیا تھا مجھے!“ وہ چھوٹتے ہی بولا۔

”کیوں کیا ہوا؟ اب تو تم خاصے بڑے ہو گئے ہو! سوتے سوتے ڈر گئے یا جاگتے میں؟“ میں ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

”خدا سمجھے ان اخبار والوں سے! لکھا ہے ابھی تک کوٹھی کے ملبے سے کوئی لاش نہیں ملی، لیکن اندازہ ہے کہ اس قدر تباہی کے بعد کوٹھی کا کوئی مکین زندہ نہیں بچا ہوگا۔ کہیں آپ عذرا خان کا بھوت تو نہیں ہیں؟“ رفتہ رفتہ ملک دلاور کی فطری شوخی اس کے لہجے سے جھلکنے لگی تھی۔

”میں تو سمجھا آپ کا اس دنیا سے رحلت کر جانے کے بعد مجھے بھی بصد حسرت و یاس کسی کو اپنے پیچھے چھوڑے بغیر ہی کوچ کرنا پڑے گا۔“

”میں نے اسی لئے تمہیں فون کرنا ضروری سمجھا تھا کہ کہیں اس غم میں تم سچ مچ ہی صدمے سے نڈھال ہو کر سفر آخرت پر روانہ نہ ہو جاؤ، لیکن تم تو خاصی ڈھیٹ ہڈی ثابت ہوئے۔“

”آپ ایک بار مر کر تو دیکھیں، پھر اس طرح کی شکایت آپ کو زیب نہیں دے گی محترم خاتون! ویسے لگتا ہے کہ آج کل آپ نے کوئی بڑا چکر چلا رکھا ہے ورنہ کوٹھی کی تباہی تک نوبت نہ پہنچتی۔ میری مانیں تو اب شادی بنا ہی لیں! کیا فائدہ کہ دل کی حسرت دل ہی میں رہ جائے! یوں بھی کسی بن بیاہی عورت کا دنیا سے اٹھ جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے! تم بھی تو ابھی بن بیاہے ہو!“

”تو پھر ہم دونوں کا مسئلہ تو ایک ہی ہوا نا!“ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ اب بھی وقت ہے مان جائیں! اگر یہ رشتہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تو ساری عمر دکھ بھرے فلمی گیت گاتے ہوئے گزر جائے گی۔“

”میرا خیال ہے ملک دلاور کہ آدمی کو کبھی کبھار آئینے میں اپنی شکل بھی دیکھنا چاہئے! میں تمہیں بھی یہی مشورہ دے سکتی ہوں۔“

”دیکھا ہے آئینہ بھی خاتون! ہم تو محبت کی اس منزل میں ہیں کہ آئینے میں بھی اپنی بجائے

آپ ہی کی شکل نظر آتی ہے۔“

”ملک دلاور! اگر واقعی ایسا ہے تو یہ تشویش ناک بات ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہاری جنس بدل رہی ہو! تم فوری طور پر کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا طبی معائنہ کراؤ!“ موقع دیکھ کر میں نے اس پر چوٹ کی۔

”اگر آپ ڈاکٹری معائینے کے بعد ہی ہاں کریں گی تو یہ خادم اس پر بھی تیار ہے۔ آپ ہر طرح اپنا اطمینان کر لیں، اس خادم کو کوئی اعتراض نہیں۔“

”بس آ گئے چھچھوری باتوں پر! اسی لئے تو تمہیں منہ لگانے کو جی نہیں چاہتا!“

”ارے ارے یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ! کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا! یہ دیکھو ایک جوان جہان لڑکی دن دیہاڑے ایک نوجوان کو منہ لگا رہی ہے! معلوم ہے آپ کو ایسی حرکتوں پر پولیس پکڑ بھی لیتی ہے! کیا اخبار میں آپ نے ایسی خبریں نہیں پڑھیں کہ فلاں مقام پر سر عام ایک جوڑا بوس و کنار میں مصروف تھا کہ فلانے ایس ایچ او کی گاڑی ادھر سے گزری اور فرض شناس ایس ایچ او نے رنگے ہاتھوں اس جوڑے کو موقع پر پکڑ لیا!“

”اور تم بھی اتنی دیر سنبھل سنبھل کر بولنے کے باوجود موقع پر پکڑے ہی گئے! بڑے بچ رہے تھے بڑا کاف بولنے سے!“ میں ہنس کر اس کی بات ٹال گئی۔

”اکیلا پکڑا گیا تو کیا فائدہ! آپ کے ساتھ کسی دن پکڑا جاؤں تو بات بھی ہے! رنگے ہاتھوں پکڑا جاؤں تو اور بھی اچھا ہے۔ بولیں راضی ہیں؟“

”گھٹیا قسم کی باتیں کر کے شاید تم یہ چاہتے ہو کہ میں فون بند کر دوں! کم از کم تمہیں خواتین سے مہذب گفتگو کا سلیقہ تو آنا ہی چاہئے! تم آخر کب بڑے ہو گے ملک دلاور!“

”میں تو کبھی کا بڑا ہو چکا ہوتا، مگر آپ ہی نے ایسا نہیں چاہا۔ میری عمر کے تو کئی کئی بچوں کے ابا حضور بن چکے ہیں!“

”تو تمہیں کس نے روکا ہے ابا حضور بننے سے!“

”مگر آپ بھی تو اماں حضور بننے پر راضی ہوں مسمات! ایک ہاتھ سے تو کبھی تالی نہیں بجتی!“

”یقیناً آج تمہارا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے جبھی احمقانہ باتیں کئے جا رہے ہو۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔“

”ارے اپنا نمبر تو دے دیں کہ کبھی کبھار آپ کی رس بھری آواز ہی سن لیا کروں۔ شربت آبدار پلانا تو آج کل آپ بالکل بھول ہی گئی ہیں۔ ویسے بائی دا وے کہاں رہ رہی ہیں؟...... اگر کوئی پریشانی ہو تو غریب خانہ موجود ہے۔ یوں بھی ایک نہ ایک دن ہمیشہ کے لئے آپ کو اسی گھر میں آنا ہے۔“

”بس یہی حسرت دل میں لئے ٹھنڈی میٹھی آہیں بھرتے ہوئے تم ایک دن اس جہان فانی سے کوچ کر جاؤ گے اور لوگ تمہاری وفات حسرت آیات پر یہ مصرع پڑھیں گے کہ حسرت ان غنچوں پہ

ہے جو بن کھلے مرجھا گئے!"

"تو پھر کھلنے بلکہ کھل کھیلنے کا ایک دن چانس دے دیں نا۔"

"بکومت!" میں نے یہ کہتے ہی ریسیور رکھ دیا۔ میرا مقصد اسے محض اپنی خیریت دینا تھا جو پورا ہو چکا تھا۔

باتھ روم جانے سے پہلے میں نے انٹرکام پر کمانڈر نواز سے گزشتہ رات کی رپورٹ لی۔ اس نے بتایا کہ سیل کے مقتول افراد کی تدفین ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ رات ہی کو تینوں غیرملکیوں کی لاشیں بھی فضلے کی لاش کے ساتھ منگھوپیر کی پہاڑیوں کے پیچھے دفنا دی گئی ہیں۔ زندہ بچ جانے والے غیر ملکی ایجنٹوں کو بھی پولیس کے حوالے کیا جا چکا ہے۔ عثمانی اسے چارج دینے سے پہلے یقیناً تفصیلی رپورٹ دے کر گیا تھا۔

کمانڈر نواز سے رپورٹ لینے کے بعد مجھے سیل کے ان ارکان کا خیال آیا جنہیں رات کو میں اپنے مرد ملازمین کے ساتھ اپنی کوٹھی کے باہر چھوڑ آئی تھی۔ اب وہاں ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کمانڈر نواز سے کہا کہ ان لوگوں کو وہاں سے بلوالو! اور میرے ملازمین تک یہ پیغام پہنچادو کہ وہ طارق روڈ والے فلیٹ میں چلے جائیں۔

"ممکن ہے میڈم کہ کوئی قیمتی چیز تباہ ہونے سے بچ گئی ہو!" کمانڈر نواز نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "اگر آپ نے ملازمین کو وہاں سے ہٹا دیا تو کوئی شخص بھی وہاں سے......"

"میں سمجھ رہی ہوں کمانڈر، تم کیا کہنا چاہتے ہو! امکان تو خیر نہیں کہ کوئی قیمتی شے تباہی سے بچ گئی ہو، پھر بھی تم چاہو تو سیل کے ارکان کو اس بے مصرف کام پر لگا سکتے ہو کیونکہ اس ملبے میں کوئی شے تلاش کر لینا صرف میرے ملازمین کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔" میں نے بے دلی سے کہہ دیا۔ اسی وقت مجھے کوٹھی کے گیراج کا خیال آیا جو کوٹھی کے اقامتی حصے سے الگ تھا۔ وہاں میرے استعمال میں رہنے والی دو کاریں تھیں۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ کاریں تباہ ہونے سے بچ گئی ہوں۔ یہی سوچ کر میں نے کمانڈر نواز کو ان کے بارے میں بتا دیا، پھر کہا۔ "میرا ڈرائیور وہیں ہوگا اور اس کے پاس کاروں کی چابیاں بھی ہوں گی۔ اگر واقعی کاریں تباہی سے بچ گئی ہوں تو انہیں فی الحال آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کے گیراج میں کھڑا کردو۔"

"بہت بہتر ہے میڈم!" کمانڈر نواز جواباً بولا۔ "میں سیل کے مزید چند ارکان کو آپ کی کوٹھی بھیج رہا ہوں تاکہ قیمتی اشیاء کی تلاش کا کام جلد نمٹ جائے۔"

"تم جو بہتر جانو کرو کمانڈر مجھے کوئی اعتراض نہیں!" یہ کہہ کر میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا اور پھر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

نہا کر کپڑے بدلنے کے بعد کچن سے میں نے ناشتا منگوالیا۔ ناشتا کرتے ہوئے میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل پر غور کرنے لگی۔ کوٹھی کی تباہی کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر بھی ضروری تھی۔ عارضی طور پر طارق روڈ والے فلیٹ میں رہا جا سکتا تھا مگر وہاں مستقل سکونت میرے لئے ممکن نہیں تھی۔ میں جن حالات

سے نبرد آزما تھی، ان میں فلیٹ کی نسبت کوٹھی میرے لئے زیادہ محفوظ تھی۔ جس کنسٹرکشن کمپنی کو میں نے پہلے کوٹھی بنانے کا ٹھیکہ دیا تھا، اس سے اب بھی بات کی جا سکتی تھی۔ میری کوٹھی کا ایک نقشہ آپریشن سیل کے ریکارڈ روم میں بھی موجود تھا۔ میں چاہتی تھی کہ یہ کام فوری طور پر شروع ہو جائے۔ ملبا ہٹانے کا کام بھی کمپنی ہی کے سپرد کیا جا سکتا تھا۔ کنسٹرکشن کمپنی کا پروپرائٹر ملک دلاور کے دوستوں میں سے تھا اس لئے تعمیری اخراجات میں بھی اس سے رعایت کرائی جا سکتی تھی، اس کے علاوہ کم سے کم وقت میں کام ختم کرنے کے لئے بھی کہا جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا، کیوں نہ آج یہ مسئلہ ہی حل کر لیا جائے۔ آپریشن سیل سے باہر نکلنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں اپنے دشمن کو خود پر حملہ کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ اسے سامنے لانے کی صرف یہی ایک تدبیر تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر انٹرکام پر میں نے کمانڈر نواز کو اپنے پروگرام سے مطلع کیا۔ اسی کے ساتھ ریکارڈ روم سے کوٹھی کا نقشہ نکلوا کر بھیجنے کو بھی کہہ دیا۔

میں تقریباً دس بجے سے پہلے پوری تیاری کے ساتھ آپریشن سیل سے روانہ ہوگئی۔ میری اطراف مسلح محافظوں کا حصار تھا۔ میری بلٹ پروف کار کو گزشتہ روز کی طرح آج بھی سرفراز ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اسے بتا چکی تھی کہ کہاں چلنا ہے! آپریشن سیل سے چلتے ہوئے کمانڈر نواز کے مشورے پر میں نے بلٹ پروف جیکٹ بھی زیب تن کر لی تھی۔ بھرے ہوئے ریوالور کے ساتھ ایک اسٹین گن بھی میرے پاس موجود تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرا دشمن اس وقت شدید جھنجھلاہٹ کا شکار ہوگا اور اس جھنجھلاہٹ میں وہ کوئی بھی غلط قدم اٹھا سکتا تھا۔

ابھی میری کار کو آپریشن سیل سے روانہ ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ کال آپریشن سیل سے تھی۔ سرفراز نے آواز بڑھا دی تاکہ میں بھی موصول ہونے والا پیغام سن لوں۔ میں بھی پیغام سننے کے لئے آگے کی طرف جھک گئی۔ پیغام دینے والا کمانڈر نواز تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "عذرا انٹرپرائزز کے دفتر کے باہر ابھی کچھ دیر پہلے ایک نوجوان کو پکڑا گیا ہے جس کے پاس فرم کی منیجر عارفہ کے لئے ایک گفٹ پیکٹ تھا۔ گفٹ پیکٹ کو کھول کر دیکھا گیا تو اس میں ایک بڑے سے کیک کے نیچے ٹائم بم چھپا ہوا تھا۔ سادہ لباس پولیس والے اس نوجوان، سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ نوجوان محض کرائے کا ٹٹو ہو سکتا ہے۔ اوور!"

"کمانڈر نواز کا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے۔" میں نے سرفراز سے کہا۔

سرفراز نے میری بات دہرا کر ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔

"میڈم! معلوم ہوتا ہے کہ سولومن کو یہ خبر نہیں ہوگی کہ عذرا انٹرپرائزز کا دفتر بند پڑا ہے ورنہ وہ یہ حماقت نہ کرتا۔" سرفراز مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تمہارا خیال ٹھیک ہے سرفراز! دراصل سولومن نے دفتری اوقات شروع ہونے سے کافی پہلے ساری تیاری کر لی ہوگی۔ ممکن ہے بعد میں اسے حقیقت کا علم ہوا ہو اور اس وقت وہ اس پوزیشن میں نہ رہا ہو کہ اس نوجوان سے رابطہ قائم کر سکے۔ پھر بھی یہ طے ہے کہ اب تک اسے صورتحال کی تبدیلی کا علم ہو گیا

ہوگا۔'' میں نے جواباً کہا۔

''یہ بات اس لئے بھی یقینی ہے میڈم کہ سولومن بہرحال اپنے منصوبے کی کامیابی کی طرف سے غافل تو نہیں ہوگا نا! ممکن ہے وہ خود یا اس کا کوئی دست راست اس نوجوان کی نگرانی بھی کر رہا ہو جسے آلہ کار بنایا گیا ہے۔'' سرفراز نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''قرین قیاس یہی ہے جو تم کہہ رہے ہو جسے آلہ کار بنایا جاتا ہے، اس پر نظر رکھی جاتی ہے۔'' میں نے کہا اور کھڑکی کے شیشے سے اس پار رواں دواں زندگی کو دیکھنے لگی۔

میرے ایما پر سرفراز نے کار کی رفتار خاصی کم رکھی تھی۔ اس لئے بیس پندرہ منٹ کا راستہ دگنے وقت میں طے ہوا۔ کار رکتے ہی میں دروازہ کھول کر اتر گئی۔ سٹین گن میں نے کار ہی میں چھوڑ دی تھی البتہ ریوالور میرے پرس میں موجود تھا۔ مجھے سامنے نظر آنے والی بلڈنگ کی پہلی منزل پر جانا تھا۔ اپنے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے میں تیز قدموں سے اوپر جانے والے زینے کے قریب پہنچ گئی۔

اوپر پہنچ کر میں، ملک دلاور کے دفتر میں داخل ہوئی اور استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے ملک دلاور کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ملک دلاور دفتر میں موجود ہے۔

کچھ ہی دیر بعد میں، ملک دلاور کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آیئے تشریف لایئے خاتون! زہے نصیب کہ آپ نے......''

''زیادہ لن ترانی کی ضرورت نہیں!'' میں ہاتھ اٹھا کر بولی، پھر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے ابھی!''

''کیوں، کیا نکاح خواں کا انتظام ہو گیا؟'' وہ حسب معمول چہکا، پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ''مجھے آپ جیسی نیک دل خاتون سے یہی امید تھی کہ میری درخواست نہیں ٹھکرائیں گی۔''

''یہ تمہارے سر پر ہر وقت شادی کا بھوت کیوں سوار رہتا ہے! کبھی کچھ اور بھی سوچ لیا کرو! مگر تم بھی کیا کرو مجبوری ہے۔'' میں نے بہ ظاہر تاسف کے ساتھ کہا۔ ''سوچنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔ کبھی کبھی تو یہی سوچ کر تم پر رحم آنے لگتا ہے۔''

''بس رہنے ہی دیں، میں جانتا ہوں آپ کو اچھی طرح! رحم اور آپ کو مجھ پر آ جائے، ناممکن!'' وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ ''آپ سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کبھی پیار کی ایک نظر ہی سے دیکھ لیا کریں۔ اس وقت کیسے یاد آ گئی اس غریب کی، یہ تو بتا دیں!''

''میں نے کہا نا تم سے کہ تمہیں ساتھ لے جانا ہے۔'' میں بولی۔ ''تم ادھر ادھر کی ہانکنے لگے۔ دراصل تمہیں ساتھ لے کر جمشید کے پاس چلنا ہے۔''

''اچھا اب سمجھا!'' وہ سنجیدہ ہو گیا۔ آپ نے شاید پہلے بھی اسے ہی کوٹھی کی تعمیر کا ٹھیکہ دیا تھا!''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں ساتھ لے جانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ پیسوں اور وقت کے معاملے میں کچھ رعایت کر دے۔''

''اسے بالکل رعایت کرنا پڑے گی!'' ملک دلاور پریقین لہجے میں بولا۔ ''ٹھہریئے، میں فون پہلے بات کر لیتا ہوں اس سے! تاکہ وہ ہمیں اپنے دفتر ہی میں مل جائے۔'' یہ کہہ کر ملک دلاور نے اپنی میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکا لیا اور نمبر ملانے لگا، پھر بڑبڑایا۔ ''شاید یہ نمبر نہیں ہے اس کا!'' اس نے ریسیور رکھ کر اپنی میز کی دراز سے ایک ڈائری نکالی اور مطلوبہ نمبر تلاش کرنے لگا۔ ''ہاں...... یہ!'' اس نے نمبر دہرائے اور پھر وہی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ نمبر ملانے کے کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ''ہیلو! جمشید صاحب ہیں؟ ......جی؟ ......سائٹ پر گئے ہوئے ہیں؟...... کب تک آ جائیں گے؟...... اچھا...... اچھا ٹھیک ہے۔ اگر اس دوران میں ان کا فون آ جائے تو بتا دیجئے گا ملک دلاور کا فون آیا تھا۔ وہ اپنے دفتر میں میرا انتظار کریں۔ جی...... جی ہاں میں ساڑھے گیارہ سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا...... خدا حافظ!'' یہ کہہ کر ملک دلاور نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''جمشید اس وقت اپنے دفتر میں موجود نہیں ہے۔ اس کے سیکرٹری نے بتایا ہے کہ آدھے پونے گھنٹے میں وہ سائٹ سے لوٹ آئے گا۔ اس وقت تک آپ چائے پئیں گی یا کافی چلے گی؟''

''جو چاہو منگوا لو! مقصد تو وقت گزاری ہے۔'' میں نے کہا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گئی۔

ملک دلاور نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور اسے چائے لانے کو کہا، پھر چپراسی چلا گیا تو وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ سے میں آج صبح بھی پوچھ رہا تھا کہ اب کہاں ٹھور ٹھکانا ہے، مگر آپ نے نہیں بتایا، تو بتا دیں کہاں رہ رہی ہیں؟''

''تم کیوں میری فکر میں دبلے ہوتے رہتے ہو! آخر کہیں تو رہ رہی ہوں گی۔''

''آپ کی فکر اگر میں نہیں کروں گا تو کون کرے گا! کسی نے کتنا سچ کہا ہے کہ عورت اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہیں۔ مجھے بہرحال یہ فخر حاصل ہے کہ میں آپ کی زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیا ہوں۔''

''چلو اچھا ہوا کم از کم آج ایک غلط فہمی تو دور ہو ہی گئی کہ تم آدمی ہو۔ اب میں تمہیں آدمی نہ ...ہائے پہیا سمجھا کروں گی۔'' میں ہنستے ہوئے بولی۔

''خاتون! آپ کو شاید معلوم نہیں کہ جب آپ ہنستی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے......''

''دور کسی مندر کی گھنٹیاں بجنے لگی ہوں۔'' میں بول اٹھی۔ ''یہی کہنا چاہتے تھے نا تم؟''

''جلترنگ بج اٹھنے والی بھی تو ایک مثال ہے نا!'' وہ بولا۔

''وہ مثال بھی خاصی گھس پٹ گئی ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''تم لوگوں کو کوئی مثال نئی نہیں سوجھتی!''

''عورتیں بھی تو وہی صدیوں پرانی ہیں، پھر ظاہر ہے کہ نئی مثالیں کہاں سے آئیں!''

''تو پھر تکلیف ہی کیا ہے مثالیں دینے کی! عورتوں کے سر پر سینگ تو نکلنے سے رہے!''

''ویسے عورتوں کے سر پر سینگ تو ہوتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ نظر نہیں آتے ہوں۔''

"تم ذرا بچ کر ہی رہنا! کہیں کوئی عورت تمہیں سینگ نہ مار دے!"

ملک دلاور سے اسی نوک جھونک کے دوران میں چائے آ گئی۔ چائے پیتے ہوئے بھی ہم ایک دوسرے پر فقرے بازی کرتے رہے اور ہنستے رہے۔ ملک دلاور کے ساتھ بہرحال وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ میرے جاننے والوں میں اس کے سوا کسی سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔

"کیا خیال ہے، اب چلا جائے، گیارہ بجنے والے ہیں۔ تم نے غالباً ساڑھے گیارہ بجے تک وہاں پہنچنے کے لئے فون پر کہا تھا۔" میں نے ملک دلاور سے کہا۔

"ہاں بس اب چلتے ہیں۔ میں ذرا ایک فون کرلوں۔" جواباً ملک دلاور بولا اور پھر کسی سے فون ملا کر کاروباری گفتگو کرنے لگا۔

پھر جب کچھ دیر بعد ملک دلاور میرے ساتھ اپنے دفتر سے نکل رہا تھا تو میں نے اس سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم میری گاڑی میں چلو، واپسی میں تمہیں میں چھوڑتی ہوئی چلی جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی!" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس بہانے اور کچھ دیر آپ کے پہلو میں بیٹھنے کا م...... وہ میرا مطلب ہے کہ چانس مل جائے گا۔" ملک دلاور "موقع" کو "موکع" کہتے کہتے گڑبڑا گیا۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ میرے سامنے کوئی ایسا لفظ اس کی زبان پر نہ آئے جس میں "ق" آتا ہو۔ یہ اس کی دکھتی رگ تھی۔

میں اس بوکھلاہٹ پر ہنسنے لگی، پھر بولی "موقع کی بجائے تم نے چانس بول کر اپنی گھسائی کا موقع ضائع کردیا۔ خیر پھر سہی!"

نیچے آ کر میں نے ملک دلاو کو اپنے ساتھ کار کی پچھلی نشست پر بٹھالیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ سرفراز نے اسٹین گن چھپا دی تھی حالانکہ میں اسے سیٹ پر رکھا ہوا چھوڑ گئی تھی۔

ملک دلاور نے سرفراز کو جمشید کے دفتر کا پتا بتایا اور سرفراز نے کار اسٹارٹ کردی میں پہلے ہی سرفراز اور ساتھ چلنے والے سیل کے دوسرے ارکان کو پورے پروگرام سے آگاہ کر چکی تھی کیوں کہ میری کار کے آگے آگے بھی ایک جیپ اور دو موٹر سائیکلیں چل رہی تھیں۔ اگر انہیں پہلے سے علم نہ ہوتا کہ کدھر چلنا ہے تو آگے چلنے کی بجائے مجبوراً انہیں میری کار کے پیچھے چلنا پڑتا۔

جب ملک دلاور کو ساتھ لئے میں، کنسٹرکشن کمپنی کے دفتر پہنچی تو جمشید کو منتظر پایا۔ وہ ایک سلجھا ہوا کاروباری آدمی تھا۔ کچھ تو اتنا بڑا ٹھیکہ ملنے اور کچھ ملک دلاور سے دوستی کے سبب اس نے تعمیری اخراجات مناسب ہی بتائے۔ ہاں وقت کے معاملے میں وہ میری بات نہیں مان سکا۔ میں چاہتی تھی کہ خواہ دن رات کام کرنا پڑے، کوٹھی کی از سر نو تعمیر ایک ماہ کے اندر مکمل ہو جائے، مگر جمشید دو ماہ سے کم عرصے میں کام ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے پاس دوسری کوٹھیوں کی تعمیر کے ٹھیکے بھی تھے جو زیر تعمیر تھیں۔ میں اس کے کام سے مطمئن تھی اس لئے بہ مجبوری وقت کے معاملے میں مجھے اس کی بات ماننا ہی پڑی۔ پھر میں نے کوٹھی کا نقشہ بھی اس کے حوالے کردیا اور پیشگی رقم کا چیک بھی کاٹ کر دے دیا۔ جمشید نے اسی رقم میں ملبا ہٹانے کی ذمہ داری بھی قبول کرلی تھی۔ اس نے آئندہ روز سے

کام شروع کرانے کا وعدہ کرلیا تھا اور یہی میری مرضی تھی۔

ملک دلاور کے دفتر کی طرف لوٹتے ہوئے اچانک مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ عموماً ایسا اس وقت ہوتا تھا جب کوئی خلاف توقع واقعہ پیش آنے والا ہو۔ میں چوکنا ہوگئی۔ چند ہی لمحے بعد ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ میرے ساتھ اس وقت کار میں کیوں کہ ملک دلاور بھی موجود تھا اس لئے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آن کرتے ہوئے سرفراز یقیناً جھجک رہا تھا۔ اسے میں نے فوراً ہی محسوس کرلیا۔ میں تو پہلے ہی سے چوکنا تھی۔ ایسے میں ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہونا میرے نزدیک بہت اہم تھا۔

"سرفراز! دیکھو کیا بات ہے!" میں نے سرفراز کو مخاطب کیا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ وہ ٹرانسمیٹر کا سوئچ آن کردے۔ میرا یہ کہنا اس کے لئے ایک طرح کی اجازت بھی تھی۔

فوراً ہی سرفراز نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آن کردیا۔ میں نے ٹرانسمیٹر پر سیل کے ایک رکن کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "نیلے رنگ کی ایک کار چند منٹ سے ہمارا تعاقب کررہی ہے۔ اب وہ ہماری وین کو اوور ٹیک کرکے آگے نکلنا چاہتی ہے۔ کار میں دو غیر ملکی ہیں جن میں سے ایک ڈرائیونگ کررہا ہے اور ایک اگلی سیٹ پر ہے۔ اس کار کو اوورٹیکنگ کرنے دی جائے یا روک دیا جائے؟ اوور!"

"سرفراز! نیلے رنگ کی کار کو اوورٹیک کا موقع دے دیا جائے، لیکن اسی کے ساتھ اسے نشانے پر رکھا جائے۔" میں نے ہدایت دی، پھر مزید کہا۔ "آگے چلنے والی جیپ کو بھی تم الرٹ کردو! اگر نیلے رنگ کی کار سے میری کار پر فائرنگ ہو تو پھر اسے بچ کر نہ نکلنے دیا جائے!"

سرفراز نے میرے احکام کی تعمیل میں پہلے پیچھے چلنے والی وین کو ہدایت دی، پھر کار کے آگے چلنے والی جیپ میں سوار سیل کے ارکان تک میرا پیغام پہنچایا۔

میں نے اس دوران میں دانستہ ملک دلاور کو قطعی نظر انداز کردیا تھا جیسے وہ میرے ساتھ ہی نہ ہو۔ ہاں میں نے ایک بار کن انکھیوں سے اس کے حیرت زدہ چہرے کو ضرور دیکھا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ سرفراز نے اسٹین گن عقبی نشست کے نیچے ہی چھپائی ہوگی، سو میں نے جھک کر اسے نکال لیا۔

"ارے ارے...... خاتون! یہ آپ نے کیا مار دھاڑ سے بھرپور فلم شروع کردی!" ملک دلاور میرے ہاتھ میں سٹین گن دیکھ کر بول اٹھا۔

"خاموش بیٹھے رہو! یہ فضول باتوں کا وقت نہیں ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا اور کھڑکی کے شیشے سے باہر کا جائزہ لینے لگی کیوں کہ اب کسی بھی لمحے وہ مشتبہ نیلی کار میری کار کے قریب سے گزر سکتی تھی۔

پھر چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ ایک نیلی کار بائیں جانب سے تیزی کے ساتھ میری کار کے قریب آ گئی۔ میں نے کار کے پچھلے دروازے کی کھڑکی میں گن کی نال دیکھی اور اسی لمحے کئی باتیں ایک ساتھ رونما ہوئیں۔ گن کی نال سے شعلہ لپکا، میں نے اپنی کار کے دروازے کا بلٹ پروف شیشہ اوپر کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور ملک دلاور نے میرے دونوں شانے پکڑ کر مجھے جھکنے پر مجبور کردیا۔

اس وقت ملک دلاور کی مداخلت مجھے گراں گزری۔ میں جھنجلا گئی۔ میں اپنی کار کے دروازے

کا بلٹ پروف شیشہ اتار کر سٹین گن سے نیلی کار کو نشانہ بنانا چاہتی تھی، مگر عین موقع پر ملک دلاور نے سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ اس نے یقیناً نیلی کار سے فائر ہوتے دیکھ لیا تھا اور جو کچھ کیا تھا اپنی دانست میں میری زندگی بچانے ہی کے لئے کیا تھا۔ ظاہر ہے، اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میری کار بلٹ پروف ہے۔ یہ سب کچھ سمجھنے اور جاننے کے باوجود میں تیز لہجے میں بولی۔ ''چھوڑو مجھے!'' ان الفاظ کے ساتھ ہی میں ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس وقت تک میری کار رک چکی تھی۔ برابر ہی نیلے رنگ کی کار کھڑی ہوئی تھی جسے میرے آدمی گھیرے میں لے چکے تھے۔

نیلی کار کے گرد میرے آدمیوں کا ہجوم دیکھ کر اس بھری پری سڑک پر سے گزرنے والے یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ شاید کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ حقیقت حال جاننے کے لئے اس طرف بڑھ رہے تھے۔

''سرفراز! ان سے کہو کہ دونوں غیر ملکیوں کو قابو میں کر کے انہیں بند سیاہ وین میں بٹھا دیں اور پھر جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ وہ آپریشن سیل کی طرف چلیں، میں ان کے پیچھے آ رہی ہوں۔'' میں نے سرفراز کو حکم دیا۔

سرفراز اثبات میں سر ہلا کر تیزی کے ساتھ کار سے اتر گیا۔ ہجوم کو دیکھ کر میں نے سٹین گن دوبارہ پچھلی سیٹ کے نیچے چھپا دی تھی۔

نیلے رنگ کی کار کے پچھلے دروازے کی کھڑکی سے میں نے گن کی جو نال دیکھی تھی، اس پر سائیلنسر بھی تھا۔ یقیناً میرا دشمن کسی کو اس طرف متوجہ کئے بغیر خاموشی سے اپنا کام کر کے فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ اگر دھماکا ہوتا تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور پھر اس کا فرار ہو جانا آسان نہ ہوتا۔

''آج معلوم ہوا خاتون کہ آپ کتنی خطرناک چیز ہیں!'' معاً ملک دلاور مجھ سے مخاطب ہوا ''اور یہ بھی پتا چل گیا کہ اپنے ساتھ آپ پوری پلٹن لے کے چلتی ہیں۔''

سنسنی خیز لمحات سے گزرنے کے باوجود ملک دلاور کی بات سن کر میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ایسے وقت میں بھی اس کے لہجے کی شوخی برقرار تھی، اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ بھی مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بدستور مسکرا کر کہا۔ ''اگر تمہیں یہ راز کی بات معلوم ہو گئی ہے کہ میں کتنی خطرناک ہوں تو پھر آئندہ مجھ سے بچ کر ہی رہنا!''

''اس میں بچ کر رہنے کی کیا بات ہے خاتون! یہ تو میرے لئے فخر کی بات ہے۔ آپ کو ہمیشہ کے لئے اپنے پلے سے باندھ کر کم از کم لوگوں سے میں یہ تو کہہ سکوں گا میں نہیں میری جورو بہادر ہے۔''

ملک دلاور سے بات کرتے ہوئے میری نظر ہجوم ہی پر تھی۔ میں نے سرفراز کو بھیڑ سے نکل اپنی کار کی طرف آتے دیکھا سیل کے چند ارکان ایک بے ہوش غیر ملکی شخص کو سنبھالے ہوئے کار کے پاس کھڑی ہوئی وین کی طرف لے گئے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب میں ٹھیک طرح اس غیر ملکی کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔ ہاں ایک نظر میں مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ بہر حال میرا اصل شکار یعنی سولومن نہ تھا۔

نیلی کار میں دو غیر ملکی تھے مگر میرے آدمی ایک ہی کو وین کی طرف لے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور پھر فوری طور پر جو خیال میرے ذہن میں آیا، سرفراز کے بیان سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ سرفراز نے بتایا تھا کہ دونوں غیر ملکیوں میں سے ایک فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہ وہی تھا جو کار کی پچھلی سیٹ پر تھا اور جس نے میری کار پر فائر کیا تھا۔

ممکن ہے، سرفراز اس سلسلے میں مزید تفصیلات بتاتا کہ میں نے ''ٹھیک ہے'' کہہ کر اسے اور کچھ کہنے سے روک دیا۔ میرا اشارہ سمجھ کر وہ چپ ہو گیا۔ ملک دلاور کے سامنے میں تفصیلات جاننے سے دانستہ گریز کر رہی تھی۔

''اچھا سرفراز، اب پہلے ملک دلاور کے دفتر چلو!'' میں نے سرفراز سے کہا۔ ''انہیں ان کے دفتر چھوڑنا ہے۔''

''میرا خیال ہے خاتون کہ اس وقت آپ کچھ جلدی میں ہیں، میں یہیں اتر جاتا ہوں، کوئی ٹیکسی کر کے اپنے دفتر چلا جاؤں گا۔'' ملک دلاور بولا۔

''اب ایسی بھی جلدی نہیں ہے کہ تمہیں راستے میں اتار کر چلتی بنوں۔'' میں نے جواباً کہا، پھر سرفراز کو مخاطب کیا۔ ''چلو سرفراز!''

سرفراز اس دوران میں کار سٹارٹ کر چکا تھا۔ اس نے میرا حکم سنتے ہی کار آگے بڑھا دی۔ اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ میری کار کے آگے چلنے والی جیپ غائب ہے۔ جیپ کی جگہ اب ان دو موٹر سائیکل سواروں نے لے لی تھی جو پہلے جیپ کے آگے چل رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ سرفراز سے اس سلسلے میں استفسار کروں مگر ملک دلاور کی موجودگی کے سبب اپنا ارادہ بدل دیا۔

''میں تو سوچ رہا تھا کہ ٹیکسی میں جانے کو کہوں گا تو جان چھوٹ جائے گی اور اس طرح کسی پیش آنے والے ممکنہ خطرے سے بچ جاؤں گا، لیکن لگتا ہے خاتون کہ آج آپ میرا دی اینڈ لگوا کر ہی رہیں گی۔'' ملک دلاور میری طرف دیکھ کر خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔

''بے فکر رہو، تمہاری دی اینڈ کم از کم اس کار میں نہیں لگے گا اس لئے کہ یہ بلٹ پروف ہے۔'' میں مسکرا کر بولی۔

میری بات سن کر وہ چونک اٹھا اور بولا۔ ''جبھی تو میں سوچ رہا تھا کہ وہ گولی جو چلائی گئی تھی کہاں اڑن چھو ہو گئی! آج تک بلٹ پروف جیکٹ کے بارے میں تو سنا تھا بلٹ پروف کار کے متعلق پہلی بار سن رہا ہوں۔''

''نہ صرف سن رہے ہو بلکہ اسے میں چڈو بھی کھا رہے ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یہ چڈو کیا لڈو ہی کی طرح کوئی مٹھائی ہوتی ہے خاتون؟'' اس نے بہ ظاہر بھولپن سے پوچھا۔

''ارے واہ! تم تو بہت ذہین نکلے! میں تو تمہیں نرا گاؤدی سمجھ رہی تھی۔ کوئی تمہاری صورت دیکھ کر یہ اندازہ لگا ہی نہیں سکتا کہ تم اس قدر ذہین ہو گے اور تمہاری عقل دانی اتنی بڑی ہو گی۔ کمال ہے!

تم نے تو آج واقعی حیرت میں ڈال دیا مجھے!'' موقع دیکھ کر میں اس کی کھنچائی کرنے لگی۔

''معلوم نہیں، مجھے اسوقت ایک شعر بے اختیار کیوں یاد آرہا ہے! وہی شعر جو آپ کو بھی بے حد پسند ہے، آنکھیں دکھلاتے ہو والا! تو عرض کیا ہے، آنکھیں......''

میں نے تیزی کے ساتھ ملک دلاور کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گھور کر دیکھا۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سرفراز کے سامنے پٹری سے اتر جائے۔ مذکورہ شعر سنانے کی دھمکی کا مقصد میں سمجھ گئی تھی۔ ملک دلاور سرفراز کی موجودگی میں یقیناً یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کھنچائی لگائی جائے۔ یہ شعر وہ ایسے ہی مواقع پر سنانے کی دھمکی دیا کرتا تھا جب میری کسی بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ ہو اور وہ میری زبان بند کرنا چاہتا ہو۔ معلوم نہیں اچھے خاصے سنجیدہ شعرا بعض شعر ایسے کیوں لکھ جاتے ہیں جنہیں برسرمحفل پڑھنا ناشائستگی کہلائے! دلاور کی دھمکی کا یہ اثر ہوا کہ پھر میں نے سارے راستے اسے نہیں چھیڑا۔ مجھے خاموش رہنے پر مجبور کرکے اپنی دانست میں وہ مسکرا مسکرا کر چڑاتا رہا۔

میری کار جب ملک دلاور کے دفتر کے سامنے رکی تو وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر کار سے اترتے ہوئے بولا۔ ''شعر ڈیو رہا۔''

میں ''دفع ہو جاؤ'' کہنے ہی والی تھی کہ وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ کار کا دروازہ وہ آگے بڑھنے سے پہلے ہی بند کر گیا تھا۔ دروازہ بند ہوتے ہی سرفراز نے کار آگے بڑھادی تھی۔

''ہاں سرفراز، اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟ فائر کرنے والا کس طرح بچ کر نکل گیا؟...... اور ہاں سنو، اب آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر چلنا ہے۔''

''میں ادھر ہی چل رہا ہوں میڈم!'' سرفراز نے جواب دیا، پھر مجھے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔

سرفراز نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جب نیلی کار سے میری پر فائر کیا گیا تو سیاہ وین سے اس کے دونوں پچھلے ٹائروں کو نشانہ بنا دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ حملہ آور فرار نہ ہوسکیں۔ جیسے ہی نیلے رنگ کی کار کے ٹائر برسٹ ہوئے اور وہ رک گئی تو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص کار کی بائیں جانب دروازہ کھول کر باہر کودا۔ اسی وقت پیچھے سے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نیلی کار کے قریب آکر رکی اور کار سے کودنے والا اس پر سوار ہوگیا۔ قرائن سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایسی ہی صورت حال سے نمٹنے کے لئے حملہ آوروں کی کار سے کچھ فاصلے پر انہی کا ایک ساتھی، موٹر سائیکل پر آرہا ہوگا۔ موٹر سائیکل جب زگ زیگ کے انداز میں تیز رفتاری کے ساتھ موقع واردات سے فرار ہو رہی تھی تو میری کار کے آگے موجود جیپ سے اس پر فائرنگ کی گئی، مگر موٹر سائیکل سوار خوش قسمتی سے بچ گیا۔ اس کا سبب اس کی زگ زیگ ڈرائیونگ تھی۔ یقیناً اسے پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ اس پر فائرنگ کی جائے گی۔ سیل کے ان ارکان نے جو جیپ میں سوار تھے۔ حملہ آوروں کو فرار ہوتے دیکھا تو ان کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔

دوسرا غیر ملکی جو نیلی کار ڈرائیو کر رہا تھا، سیل کے ارکان کو وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ملا تھا۔ اچانک تیز رفتار کار کے پچھلے دونوں ٹائر برسٹ ہونے اور پورے بریک لگانے کے سبب اس شخص کا سر

شاید ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا، سیل کے ارکان اس تک پہنچ گئے تھے۔ سیل کے ارکان ہی میں سے کسی نے اس کی کنپٹی پر گھونسا مار کر اسے بے ہوش کر دیا تھا تا کہ وہ مزاحمت نہ کر سکے۔ وہ نیم بے ہوشی کے باوجود اپنی جیب سے ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سرفراز پوری رپورٹ دے چکا تو میں بولی۔ ''جہاں تک میرا اندازہ ہے، میری کار پر فائر کر کے فرار ہو جانے والا، سولومن ہی ہوسکتا ہے۔ کسی اور شخص سے اتنی حیرت انگیز پھرتی اور بیدار مغزی کی مجھے توقع نہیں ہے۔ کراچی میں صرف اس کے آٹھ ہم وطن تھے۔ ان میں سے تین مارے گئے اور تین زیر حراست ہیں۔ وہ دو افراد جو فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے، اس حملے میں سولومن کے ساتھ ہوسکتے ہیں۔ ان دو افراد سے بھی ایک ہمارے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اب یوں سمجھو کہ جب تک سولومن دیگر شہروں میں موجود اپنے ساتھیوں کو یہاں نہیں بلوالیتا، اس کے ساتھ صاف ایک ہم وطن اور جاں نثار ہوگا۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ یہاں اس شہر میں سولومن کے مزید ساتھیوں کی آمد سے پہلے اس پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں۔''

میری رائے سے سرفراز نے اتفاق کیا۔

''تم ٹرانسمیٹر پر جیپ سے رابطہ قائم کرو!'' میں نے سرفراز کو حکم دیا۔ ''توقع تو خیر نہیں کہ سولومن ایسا عیار شخص زیر دام آجائے، پھر بھی معلوم تو ہو کہ تعاقب کا کیا نتیجہ رہا!''

میرے ایما پر سرفراز جیپ سے رابطہ کرنے لگا۔ پھر جب رابطہ قائم ہوگیا تو اس نے ٹرانسمیٹر کی آواز بڑھادی۔

''سرفراز آن دا لائن! رپورٹ پلیز اوور!''

میں ہمہ تن گوش ہوگئی۔ دوسری جانب سے سیل کے ایک سینئر رکن نے رپورٹ دی۔

میرے لئے رپورٹ خاصی چونکا دینے والی تھی۔ رپورٹ کے مطابق جیپ میں سوار سیل کے ارکان نے حملہ آوروں کی موٹر سائیکل کو نظروں سے اوجھل انہیں ہونے دیا تھا۔ باتھ آئی لینڈ تک موٹر سائیکل کا تعاقب کیا گیا تھا۔ جیپ اور موٹر سائیکل کا فاصلہ لحہ بہ لحہ کم ہوتا جارہا تھا اور ممکن تھا کہ وہ فائر کی رینج میں آجاتی، مگر اس سے پہلے ہی صورت حال بدل گئی۔ حملہ آوروں کی موٹر سائیکل ایک کوٹھی کے کھلے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ گیٹ پر مسلح اور باوردی سنتری پہرا دے رہے تھے، لیکن انہوں نے موٹر سائیکل کو نہیں روکا تھا۔ وہ کوٹھی برسراقتدار ایک اہم شخصیت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ سیل کے ارکان اس میں داخل نہیں ہوسکتے تھے۔

صدر مملکت کے ایک مشیر شہریار کے بعد یہ دوسری اہم، بااثر اور برسراقتدار شخصیت تھی جو غیر ملکی ایجنٹوں سے ربط ضبط رکھنے کے سلسلے میں سامنے آئی تھی۔

ریٹائرڈ جنرل حامد علی کی شخصیت بہرحال ایسی نہیں تھی کہ اس پر بہ آسانی ہاتھ ڈالا جاسکتا۔ ملک دشمن خطرناک امریکی ایجنٹ سولومن اس وقت ایک ایسے شخص کی کوٹھی میں پناہ لئے ہوئے تھا جو نہ صرف برسراقتدار تھا بلکہ صدر مملکت سے بھی اس کے قریبی مراسم تھے۔

میں چکرا کر رہ گئی کہ مجھے ان حالات میں کیا قدم اٹھانا چاہیے! مجھے اپنے دشمن کی پناہ گاہ کا علم ہو چکا تھا، مگر میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ اسی بے بسی کے عالم میں مجھے صدر مملکت کی طرف سے جاری کردہ خصوصی اختیار نامے کا خیال آیا۔ اسی کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوگیا۔ بعد میں چاہے کچھ بھی ہوتا، فی الحال میں نے اپنے اختیار سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں ہر قیمت پر آج سولومن ریدام لانا چاہتی تھی۔

''سرفراز جتنی جلد ممکن ہو، آپریشن سیل ہیڈکوارٹر پہنچنے کی کوشش کرو! وقت بہت کم ہے۔'' میری آواز میں دبا دبا سا جوش تھا۔

چند ہی لمحے بعد میری بلٹ پروف کار تیز رفتاری کا نیا ریکارڈ قائم کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

اس وقت مجھ پر ایک ہیجان سا طاری تھا جب میں "آپریشن کمل ہیڈکوارٹر" تک پہنچا
یعنی حسن عابد علی سے گلہ کرنے کا موقع بھی پا سکتا تھا۔ مگر میں نے اب تک جو وہاں کی کارروائی کی تھی اسے ملک
کے مفاد کی خاطر میں بڑی سے بڑی، بااثر اور صاحب اختیار شخصیت سے ٹکرا سکتی تھی مال کی شہ بھی پیچھے
دی تھی۔ اب اس کا خیال تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو لاکھوں روپے سے تعمیر شدہ کوٹھی اور اس میں موجود قیمتی
سامان کی تباہی کے بعد میں سوامن کی دشمنی میں آ جاتی اس ملک دشمن غیر ملکی ایجنٹ نے جن
خطرناک وحشت گردوں اور تخریب کاروں کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا، انہیں میں نے قاتلوں کے حوالے کر دیا
تھا آج اس کا ایک اور تخریب کار ساتھی پکڑا گیا تھا جسے مجھ سے پہلے "آپریشن کمل ہیڈکوارٹر" پہنچا دیا گیا
تھا۔ یہ اسی کار کو ڈرائیو کر رہا تھا جس سے مجھ پر حملہ کیا گیا تھا سوامن کے بارے میں اس سے کوئی اہم بات
معلوم ہو سکتی تھی لیکن فی الحال میرے پاس وقت نہیں تھا حقیقت ہی کی کے سبب میں نے اپنے گھر کے
رخ نہیں کیا اور ڈیوٹی پہ میں کمانڈر رضوی کے پاس پہنچ گئی

کمانڈر رضوان مجھے ڈیوٹی روم میں آتے دیکھ کر ہی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"بیٹھو کمانڈر!" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا پھر ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ
گئے بولی۔ "اسلام آباد میں انچارج سے فوری طور پر میری بات کراؤ۔ مگر ان سے رابطہ کا علم نہ ہو سکے
اور وزارت داخلہ کے سیکرٹری کو سر دار لالا چوہدری کرو۔ میں جس نتیجے پر پہنچی ہوں 'ہوم منسٹر' بھی اور وزارت داخلہ کو میں مجھے
"انچارج" کہتی تھی اور کمانڈر رضوان اس سے واقف تھا۔

"ہو گئے سمجھو!" یہ کہہ کر کمانڈر رضوان کسی خودکار مشین کی طرح حرکت میں آ گیا
آج صبح ہی وزیر داخلہ نے فون پر مجھ سے بات کی تھی مجھے علم تھا کہ وہ اسلام آباد ہی میں ہیں
ریٹائرڈ جنرل حامد علی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے میں وزیر داخلہ کو صورتحال سے مطلع کرنا چاہتی تھی۔
چونکہ صدر مملکت کی طرف سے جاری کردہ اختیار نامہ میرے پاس موجود تھا جس کی رو سے وزارت داخلہ
مجھ سے ہر ممکن تعاون پر مجبور تھی مگر یہ معاملہ خود حکومت میں شامل ایک اہم شخصیت سے متعلق تھا حامد علی
سابق فوجی ہونے کے علاوہ صدر مملکت سے بھی گہرے مراسم رکھتا تھا نیز ایک وزارت کا قلمدان بھی اس
کے پاس تھا اس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملک دشمن غیر ملکی ایجنٹ وحشت گردوں اور
تخریب کاروں سے اس کا تعلق یا کوئی رابطہ ہو سکتا ہے۔

وزیر داخلہ سے فوری طور پر رابطہ قائم نہیں ہو سکا کیونکہ وہ اپنے دفتر میں نہیں تھے انہیں

صدر میں طلب کرلیا گیا تھا اور وہاں ان سے رابطہ ممکن نہیں تھا صدر مملکت نے انہیں کسی مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے بلایا تھا یہ معلومات ان کے پرائیویٹ سیکرٹری نے فراہم کی تھیں جو مجھے اچھی طرح جانتا تھا اس نے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ جیسے ہی محترم وزیر داخلہ سے رابطہ قائم ہوا، میں انہیں بتا دوں گا، آپ نے فون کیا تھا کوئی پیغام ہو تو دے دیجئے!

بات ایسی تھی جو میں اس سے نہیں کہہ سکتی تھی اس لیے اس سے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں پھر فون کرلوں گی۔

وزارت داخلہ کے سیکرٹری سے البتہ بات ہوگئی اس نے حامد علی کا نام سننے کے بعد مجھ سے درخواست کی کہ محتاط قدم اٹھائیں اور براہ راست ان پر ہاتھ ڈالنے سے فی الحال گریز کریں سولومن اور اس کے ساتھی کے خلاف آپ کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہیں۔

سیکرٹری کا مشورہ یہ تھا کہ میں پہلے وزیر داخلہ سے بات کرلوں

''اور ان سے بات کرنا اس وقت ممکن نہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے وجہ بھی بتا دی۔

''میرے بھی علم میں ہے خاتون کہ وہ ایوان صدر میں ہیں، لیکن کچھ دیر انتظار کیا جا سکتا ہے۔''

''اور اس انتظار کا مطلب آپ جانتے ہیں!...... سولومن فرار ہو جائے گا وہاں سے!'' میری آواز میں تیزی آ گئی۔

''اگر آپ کو یہ خطرہ ہے تو اپنے رسک پر جو چاہیں ایکشن لے سکتی ہیں میں اس سلسلے میں کچھ عرض نہیں کرسکتا ہمارا محکمہ بہرحال آپ کے ساتھ تعاون پر مجبور ہے۔ اب تک ہمیں اوپر سے ایسے ہی احکام ملتے رہے ہیں'' سیکرٹری کے لہجے میں بے بسی سی تھی۔

''بلکہ اس کے لیے محترم وزیر مملکت کی کوٹھی پر ریڈ کرنا پڑے گا اور......''

''ظاہری بات ہے'' میں اس کی بات کاٹ کر بول اٹھی۔ ''میں اس سلسلے میں ہر رسک لینے پر تیار ہوں۔''

''بہتر ہے خاتون!'' سیکرٹری مردہ سی آواز میں بولا۔ میں کراچی میں موجود ڈپٹی سیکرٹری نسیم احمد کو فون پر ابھی احکام جاری کر دیتا ہوں۔ آپ اس سے دس منٹ کے بعد خود بھی رابطہ قائم کرسکتی ہیں سولومن کی شناخت کے لیے بھی آپ کو زحمت کرنا پڑے گی۔''

''میں اس کے لیے تیار ہوں، زحمت کی کوئی بات نہیں۔ شکریہ!'' یہ کہتے ہی میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں اب مزید کسی قسم کی تاخیر نہیں چاہتی تھی میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

ابھی میرے پاس دس منٹ کا وقت تھا اور اس مختصر سے وقت میں بھی بہت کچھ سوچا جا سکتا تھا۔ وقت اگر محدود ہو تو میرا ذہن اور بھی تیزی سے کام کرتا تھا۔ دس منٹ کا انتظار مجھے ملا ضرور تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ بیوروکریسی کے اپنے انداز واطوار ہوتے ہیں۔ بیوروکریٹس کی دنیا ہی الگ ہے۔ ایک طرف تو یہ وزراء کی ناک کا بال ہوتے ہیں، دوسری جانب اصل اقتدار انہی کے پاس ہوتا ہے۔ وزراء تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ حکومتیں بھی بدلتی رہتی ہیں، مگر یہ لوگ اپنے عہدوں سے نہیں ہلتے صدر اور وزیراعظم کی کرسیاں بھی اتنی مضبوط نہیں ہوتیں جتنی مضبوط کرسیاں بیوروکریٹس کی ہوتی ہیں

بعض اوقات تو سیکرٹری لیول کے بیوروکریٹس وزراء کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ جانتے ہیں، ممکن ہے جو آج وزیر ہے کل نہ رہے، مگر ہمیں رہنا ہے۔ وزارت داخلہ کے سیکرٹری سے بات کرتے ہوئے مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا تھا مجھے کوفت سی ہوئی تھی، اس کی باتوں سے! خواہ مخواہ اس نے اتنا وقت ضائع کر دیا تھا اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں نے اسلام آباد بات کر کے غیر دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے دس منٹ بعد ہی ہو گیا۔

وزارت داخلہ کا ڈپٹی سیکرٹری نسیم احمد، آئی جی پولیس، کمشنر کراچی، ڈی آئی جی، غرض کہ کوئی بھی ذمے دار شخص مجھے ایسا نہ مل سکا جس سے رابطہ قائم کر کے میں، سولومن کی گرفتاری میں قانون کی مدد لے سکتی کمانڈر نواز فون کر کر کے تھک گیا، مگر ہمت نہیں ہارا۔

اسی دوران میں ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔

''کمانڈر! رہنے دو، اب اس وقت تک کسی بھی ذمے دار اعلیٰ سرکاری افسر سے رابطہ قائم نہیں ہوسکتا جب تک سولومن فرار نہیں ہوجاتا۔'' میرے لہجے میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی۔ ''غلطی میری ہی ہے، مجھے اس سلسلے میں سرخ فیتے، پر بھروسا نہیں کرنا چاہئے تھا تم ٹرانسمیٹر اٹینڈ کرو!''

ٹرانسمیٹر پر کیپٹن شاد تھا جو میرے لیے اندھیرے میں روشنی کی کرن ثابت ہوا۔ وہ بھی اسی جیپ میں تھا جس نے باتھ آئی لینڈ تک سولومن کا تعاقب کیا تھا۔ ہرچند کہ میں نے یہ احکام نہیں دیئے تھے کہ حامد علی کی کوٹھی کی نگرانی کی جائے مگر کیپٹن شاد نے اپنے طور پر اسے ضروری سمجھا تھا۔ جیپ میں سوار سیل کے تین افراد کو اس نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ان ارکان میں سے دو کی ڈیوٹی اس نے حامد علی کی کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف لگائی تھی اور خود ایک رکن کے ساتھ بیرونی سمت کی نگرانی سنبھال لی تھی۔ ڈرائیور سمیت جیپ میں چھ ارکان سوار تھے۔ جن میں سے دو ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' واپس پہنچنے والے تھے۔ کیپٹن شاد کی رپورٹ کے مطابق ابھی تک حامد علی کی کوٹھی سے کوئی شخص بھی باہر نہیں نکلا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سولومن اپنے ایک ساتھی سمیت ابھی تک حامد علی کی کوٹھی میں موجود تھا۔ کیپٹن شاد نے مجھ سے اس سلسلے میں احکام لینے کی خاطر ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کیا تھا۔

کیپٹن شاد کی بیدار ذہنی اور بروقت اقدام سے میں بہت خوش ہوئی۔ میں نے کمانڈر نواز کو پینل سے ہٹا کر خود اس کی سیٹ سنبھال لی اور ٹرانسمیٹر پر براہ راست کیپٹن شاد سے مخاطب ہوئی۔ میں نے پہلے اسے شاباش دی، پھر کہا۔ ''تمہاری مدد کے لیے میں فوری طور پر سیل کے مزید ارکان کو بھیج رہی ہوں۔ جو حامد علی کی کوٹھی کو نرغے میں لے لیں گے۔ اس وقت تک کے لیے تم پر یہ اہم ذمے داری ہے کہ سولومن یا اس کے ساتھی کو بچ کر نہ نکلنے دو۔ تمہیں ان دونوں ملک دشمنوں کو گولی مارنے کا اختیار بھی ہے۔ اپنے ساتھیوں تک بھی میرا حکم پہنچا دو! لیکن اس کا خیال رکھنا کہ کوئی بے گناہ شخص فائرنگ کی زد میں نہ آ جائے۔ تمہیں کچھ اور پوچھنا ہے؟ اوور۔''

اسی کے ساتھ میں نے کمانڈر نواز کو تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کرتے دیکھا۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا ڈیوٹی روم سے باہر نکل گیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ اسے کس بات کی جلدی ہے! اس نے سن لیا تھا کہ

میں کیا چاہتی ہوں!

اس اثنا میں کیپٹن شاد دوسری جانب سے بولا۔ ’میڈم! ممکن ہے سولومن میک اپ کر کے کوٹھی سے نکلنے کی کوشش کرے۔ میرا قیاس کہتا ہے کہ وہ کوئی ایسا بہروپ بھرے گا جو اسے غیر ملکی نہ سمجھا جا سکے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے، اسے گولی نہیں ماری جا سکتی، اس پر صرف شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسی کوئی صورت پیش آئے تو کیا کیا جائے؟ اوور۔“

کیپٹن شاد نے جو کچھ کہا تھا، قرین قیاس تھا۔ میں اسی لیے سوچ میں پڑ گئی اور فوری طور پر اس کے سوال کا جواب نہ دے سکی۔

چند لمحے غور کرنے کے بعد میں بول اٹھی۔ ”کیپٹن! ایسے کسی مشتبہ شخص کو گولی کا نشانہ نہیں بنانا! لیکن اسے حراست میں لینا ضروری ہے۔ اوور!“

”بہتر ہے میڈم! اور کوئی حکم؟“

”نو! اوور اینڈ آل۔“ یہ کہتے ہی میں نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔ کمانڈر نواز ابھی تک ڈیوٹی روم میں واپس نہیں آیا تھا۔ میں آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ اپنے معاملات آئندہ مجھے خود ہی نمٹانا چاہئیں، حکومت وقت سے قدم قدم پر مدد لینا میرے لیے نامناسب ہے۔ اگر حکومت کرنے والے ہی یا قانون کے رکھوالے مستعد و چوکنا ہوتے، باخبر و باشعور ہوتے تو پھر مجھے ملک دشمنوں سے برسرپیکار نہ رہنا پڑتا۔

اس معاملے میں کیونکہ ایک اہم شخصیت ملوث تھی اسی لیے میری ساری جدوجہد پر پانی پھر گیا تھا۔ جو لوگ برسراقتدار تھے، بھلا ان کے ماتحت خود انہی کے خلاف کوئی قدم کس طرح اٹھا سکتے تھے! یہ میری خام خیالی تھی، جو میں سمجھ بیٹھی تھی کہ وزارت داخلہ کا سیکرٹری میری بات مان جائے گا۔ مجھ سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں، حامد علی کے خلاف قانون کی مدد حاصل کرنا چاہتی ہوں، اس پر یقیناً الٹا اثر ہوا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر کہ کہیں بعد میں وہ مورد الزام نہ ٹھہرے، ایسی محتاط چال چلی تھی جس نے میرے عزائم کو کچھ دیر ہی کے لیے سہی متزلزل کر دیا تھا۔ نسیم احمد یا کسی اعلیٰ سرکاری افسر سے رابطہ قائم نہ ہونا بے معنی نہیں ہو سکتا تھا۔ ذہن یہی کہتا تھا کہ وزارت داخلہ کے سیکرٹری نے اپنے ماتحت یعنی ڈپٹی سیکرٹری کو حکم دیا ہوگا کہ کسی صورت فی الحال مجھ سے بات نہ کی جائے۔ اس طرح سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔ ڈپٹی سیکرٹری نے یہی حکم آئی جی وغیرہ تک بھی پہنچایا ہوگا ورنہ کسی نہ کسی سے تو میرا رابطہ قائم ہو ہی جاتا میں انہی خیالوں میں سرگرداں تھی کہ کمانڈر نواز، ڈیوٹی روم میں واپس آ گیا۔ میں اس کی نشست سے اٹھ گئی۔

”کمانڈر! سیل کے ارکان کو باتھ آئی لینڈ روانہ کر آئے؟“ میں نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یس میڈم!“ اس نے جواب دیا، پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔

”ویری گڈ!“ میں بولی۔ ”مجھے تم سے اسی تیزی کی توقع تھی۔“

”تھینک یو میڈم!“ اس نے مسکرا کر کہا اور پینل کی طرف متوجہ ہو گیا۔“ میں کیپٹن شاد کو مطلع

کیے دیتا ہوں۔

کمانڈر نواز نے کیپٹن شاد کو ٹرانسمیٹر پر اطلاع دے دی کہ بیس مسلح ارکان ”آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر“ سے روانہ ہو چکے ہیں۔ کیپٹن شاد کو یہ اطلاع دے کر اس نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کیا ہی تھا کہ میں اس سے مخاطب ہو گئی۔ ”یہ بتاؤ کمانڈر کہ موجودہ صورتحال میں سولومن، حامد علی کی کوٹھی سے نکلنے کی کوشش کر سکتا ہے یا نہیں؟“

”وہ راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کر بھی سکتا ہے اور نہیں بھی! حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا میڈم! کمانڈر نواز نے محتاط جواب دیا۔

”دونوں صورتوں کی وضاحت کرو، مگر اس سے پہلے اچھی سی کافی پلوا دو!“

کمانڈر نواز نے انٹرکام پر کچن سے رابطہ قائم کر کے کافی لانے کو کہہ دیا، پھر اپنی بات کی وضاحت میں بولا۔ سولومن کو معلوم ہو چکا ہے میڈم کہ ہمارے آدمیوں نے باتھ آئی لینڈ تک اس کا تعاقب کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم اس کے ٹھکانے یا پناہ گاہ سے واقف ہو چکے ہیں۔ ایسی صورت میں ممکن ہے، وہ کوئی خطرہ مول نہ لے اور وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے۔ یہی سبب وہاں اس کے مزید ٹھہرنے یا رکنے کا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ آپ سے آگاہ ہے اور یقیناً یہ بات سمجھتا ہوگا کہ کوٹھی سے باہر اس کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس کا تعاقب کرتے ہوئے حامد علی کی کوٹھی تک پہنچ سکتے ہیں، با آسانی وہاں سے نہیں جائیں گے اور ایسا ہی عملاً ہوا بھی ہے۔ وہ کوٹھی وزیر مملکت ریٹائرڈ جنرل حامد علی کی ہے۔ یہ بات بھی سولومن لازماً جانتا ہوگا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ حامد علی کی کوٹھی اس کے لیے ایک ایسی محفوظ پناہ گاہ ہے جہاں تک قانون کے لمبے ہاتھ بھی نہیں پہنچ سکتے۔ خطرے کی صورت میں یہ امکان بھی ہے کہ سولومن اس محفوظ پناہ گاہ سے باہر نہ نکلے۔

”قانون کے لمبے ہاتھ وہاں تک پہنچ سکیں یا نہ پہنچ سکیں کمانڈر، لیکن سولومن آج رات تک اس کوٹھی سے باہر نہ نکلا تو میں اس تک ضرور پہنچنے کی کوشش کروں گی!“ میری آواز پر جوش تھی۔

”اگر اس معرکے میں آپ مجھے بھی اپنے ساتھ رکھیں میڈم تو میں ممنون ہوں گا۔“ کمانڈر نواز کے لہجے میں درخواست کا عنصر شامل تھا۔

”ہاں، یقیناً! تمہیں بھی میرے ساتھ رہنا ہوگا، یہ میں پہلے ہی سوچ چکی ہوں۔ آج آپریشن انچارج تمہی ہو گے۔“

کمانڈر نواز سے میری گفتگو جاری تھی کہ کچن سے کافی آ گئی۔ ابھی میں نے کافی کا ایک گھونٹ لیا تھا کہ کمانڈر کے سامنے رکھے ہوئے تین ٹیلی فون سیٹوں میں سے ایک کی گھنٹی بجنے لگی۔ کمانڈر نواز نے کافی کا کپ ایک طرف رکھ کے ریسیور اٹھا لیا۔ ”یس! جی سر!...... جسٹ اے منٹ سر!“ یہ کہہ کر کمانڈر نواز نے ریسیور پر ہاتھ رکھ لیا اور مجھ سے بولا۔ ”وزیر داخلہ کا فون ہے، وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

لمحہ بھر کو میں نے سوچا اور پھر دھیمی آواز میں کہہ دیا۔ ”ان سے کہہ دو کہ میں موجود نہیں ہوں، کوئی پیغام ہو تو دے دیں۔“

کمانڈر نواز نے اثبات میں سر ہلایا، پھر ریسیور سے ہاتھ ہٹا کر بولا۔ ''سر! کچھ دیر پہلے تک میڈم موجود تھیں۔ وہ ابھی نکلی ہیں۔ کوئی میسج ہو تو دیدیجیے!...... جی...... جی...... ہاں سر...... میں انہیں ٹرانسمیٹر پر میسج دے دوں گا کہ وہ آپ سے بات کرلیں...... جی...... جی سر!...... مجھے نہیں معلوم سر!...... میڈم سے اس سلسلے میں ابھی کوئی بات نہیں ہوئی...... بہتر ہے سر!...... خدا حافظ۔''

''کیا میسج دیا ہے انہوں نے؟'' میں نے کمانڈر نواز کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر کمانڈر نواز نے اپنی ریوالونگ چیئر کا رخ میری طرف کرلیا اور بولا۔ ''انہوں نے کہا ہے کہ ریٹائرڈ جنرل حامد علی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔ جب میں نے کہا کہ آپ موجود نہیں ہیں تو وہ بولے، تم ٹرانسمیٹر پر تو عذرا خان سے رابطہ قائم کرسکتے ہو نا؟ میرا جواب اثبات میں سن کر انہوں نے آپ کے لیے وہ پیغام دیا جو میں ابھی عرض کرچکا ہوں۔ پیغام دینے سے پہلے انہوں نے پوچھا تھا کہ کیا حامد علی کے خلاف کوئی ایکشن لیا جاچکا ہے؟ میں نے لاعلمی ہی کا اظہار کیا تھا۔

''ٹھیک کیا تم نے!'' میں نے طویل سانس لیا، پھر بولی تمہارا کیا خیال ہے کمانڈر کہ ہمارا پہلا طریقہ کار مناسب تھا یا موجودہ طرز عمل درست ہے؟ وزارت داخلہ اپنے طور پر کس معاملے میں کیسے منتی ہے، وہ جانے! ہم اپنے سابقہ لائحہ عمل پر چلیں تو کیا حرج ہے! اس طرح وزارت داخلہ یا اعلیٰ برسراقتدار افراد قدم قدم پر ہمارا راستہ روکتے رہے تو ہم عضو معطل ہوکر رہ جائیں گے۔ رموز مملکت، سیاست اور اقتدار سے ہمیں تو کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر کارپردازان حکومت مصلحت کا شکار ہیں تو ہم کیوں ان کی طرف دست تعاون بڑھائیں۔ ہمیں تو کوئی لالچ نہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ محترم وزیر داخلہ سے میں نے فوری طور پر بات نہیں کی۔ میں دراصل اس معاملے پر غور وفکر کرنے کے بعد کسی ایک نتیجے میں پہنچنا چاہتی ہوں۔ پھر میں اسی نتیجے کی روشنی میں ایچ ایم سے بات کروں تو مناسب ہے۔''

میری بات سن کر کمانڈر نواز چند لمحے خاموش رہا پھر کہنے لگا۔ ''میڈم! اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ پہلے ہم جس طرح کسی پابندی کے بغیر کام کر رہے تھے، اب وہ بات نہیں رہی۔ اس کی وجہ کئی ہیں جن میں بڑی وجہ ایچ ایم سے آپ کے ذاتی مراسم، ہیں موجودہ حالات میں ہماری پالیسی لچک دار ہونی چاہیے۔ ان حالات میں وزارت داخلہ سے قطعی طور پر لاتعلق ہونا بھی نامناسب ہے اور زیادہ تعلق رکھنا بھی قرین مصلحت نہیں ہے۔ وزیروں، سفیروں اور ان کے عمال کی ایک الگ سائیکی ہوتی ہے ہم جسے عہد فراموش اور جھوٹ کہتے ہیں، وہ اسے سیاست ومصلحت وقت کا نام دیتے ہیں۔ مختصراً صرف اتنا عرض کروں گا کہ نہ ان کی دوستی اچھی! نہ دشمنی اچھی! ہمیں بین بین چلنا پڑے گا۔''

کمانڈر نواز کی بات میں وزن تھا، سو میں نے اس سے اتفاق کیا اور وزیر داخلہ کا نمبر ملانے کو کہا میں اس دوران میں سوچ چکی تھی کہ مجھے ان سے کیا بات کرنا ہے! ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ سلام دعا کے بعد میں نے وزیر داخلہ سے کہا۔ ''میں کچھ ہی دور گئی تھی کہ کمانڈر نواز کا پیغام ملا اور میں واپس آ گئی حکم فرمائیں!''

''بھئی یہ تم نے کیا نیا قصہ شروع کردیا ہے؟'' وزیر داخلہ نے کہا، پھر کہنے لگے۔ ''تمہارے آدمیوں کو یا خود تمہیں جنرل حامد علی کی طرف سے شدید غلط فہمی ہوگئی ہے۔ وہ ایک معزز شخصیت ہیں۔ ان

کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ وہ سولومن ایسے کسی غیر ملکی ایجنٹ کی پشت پناہی کریں گے۔ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے کہ تم مجھ پر شک کرنے لگو۔''

''کچھ عرض کرنے کی اجازت ہے؟'' میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا کیونکہ وزیر داخلہ مجھ سے ہمیشہ اپنی بیٹیوں کی طرح بات کرتے تھے اور میں بھی ان کا اسی طرح احترام کرتی تھی جیسے وہ میرے بزرگ ہوں۔

''ہاں ہاں بولو!'' وزیر داخلہ میرے سوال کے جواب میں بولے۔

میں نے از اول تا آخر انہیں پورا واقعہ سنا دیا کہ کس طرح مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور کس نے کیا! کیسے میرے آدمیوں نے حامد علی کی کوٹھی تک سولومن کا تعاقب کیا!

دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی۔ میں بھی کچھ نہ بولی۔ پھر وزیر داخلہ خود ہی بولے۔ ''حامد علی کے متعلق تو میں اب بھی وہی کہوں گا جو کہہ چکا ہوں۔ ان کی شخصیت کسی بھی قسم کے شک وشبہے سے بالاتر ہے۔ ہاں ایک بات ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے......'' یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہوگئے۔ غالباً وہ اپنے طور پر کوئی نتیجہ اخذ کرنا چاہ رہے تھے۔ ذرا توقف کے بعد ان کی آواز پھر آئی۔ ''تمہارے علم میں شائد یہ بات نہ ہو کہ آج ہی صبح کی ایک فلائٹ سے حامد علی اسلام آباد پہنچے ہیں۔ ایوان صدر میں ابھی کچھ دیر پہلے وہ بھی میرے ساتھ تھے۔''

میں چونک اٹھی وزیر داخلہ کی فراہم کردہ اطلاع میرے لیے واقعی نئی اور اہم تھی۔ ''سنو عذرا لگتا ہے کہ حامد علی کا کوئی قریبی عزیز یا ان کے ذاتی عملے کا کوئی شخص، سولومن کی پشت پناہی کررہا ہے اور حامد علی اس سے لاعلم ہیں۔ خود ان سے گفتگو کرکے بھی میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔'' وزیر داخلہ مجھے نرمی اور محبت کے ساتھ سمجھانے لگے۔ ''حامد علی کا کوئی قریبی آدمی اس معاملے میں ملوث ہے۔ جب میں اور حامد علی ایوان صدر سے لوٹے اور اپنے سیکرٹری سے میری بات ہوئی تو میری ہی طرح خود حامد علی بھی حیران رہ گئے۔ وہ میرے ہی ایما پر میرے دفتر ساتھ ساتھ چلے آئے تھے۔ مجھے ان سے ایک معاملے میں مشورہ کرنا تھا۔ تم میری بچیوں کی طرح ہو اس لیے میں تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ میری وزارت کا سیکرٹری، حامد علی کے قریبی عزیزوں میں سے ہے۔ میرے ہی سامنے اور میرے ہی دفتر میں اس نے مجھے اور حامد علی کو تمہارے فون کے بارے میں بتایا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ تم کیا چاہتی ہو! ہم دونوں کیونکہ ایوان صدر میں تھے اس لیے سیکرٹری نے اپنے طور پر کسی طرح اس معاملے کو سنبھال لیا۔ تم سمجھ ہی گئی ہوگی کہ اس نے کیا کیا ہوگا۔ کراچی میں کسی بھی ذمے دار سرکاری افسر سے تمہارا رابطہ اس نے فوری طور پر نہ ہونے دیا۔ حامد علی تم سے قطعی واقف نہیں تھے۔ انہوں نے اسی وجہ سے سخت برہمی کا اظہار کیا۔ وہ تو اسی وقت صدر مملکت سے بات کرکے تمہارا خصوصی اختیارنامہ منسوخ کرانا چاہتے تھے، مگر میں نے ان سے تمہارا غائبانہ تفصیلی تعارف کرا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں تمہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ وہ ٹھنڈے پڑ گئے اور پھر ہم دونوں ہی سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کرنے لگے کہ وہ کون شخص ہوسکتا ہے جو کوٹھی کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کررہا ہے؟ ابھی اس سوال کا حتمی جواب حامد علی کو نہیں مل سکا، لیکن انہوں نے کراچی میں موجود اپنے عملے کو الرٹ کردیا ہے کہ جب تک وہ کراچی نہ پہنچ جائیں کسی کو

بھی کوٹھی کی حدود سے باہر نہ نکلنے دیا جائے، خواہ ان کا کوئی قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔ وہ آج شام تک کراچی پہنچ رہے ہیں۔ تم خود ان سے مل سکتی ہو۔ وہ تو خود سولومن کی گرفتاری میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے پر آمادہ ہیں۔ حامد علی کا وہ فون نمبر لکھ لو جس پر تم براہ راست ان سے بات کر سکتی ہو۔ یہ نمبر ٹیلی فون ڈائریکٹری میں نہیں ہے" وزیر داخلہ نے نمبر بتایا اور میں نے جلدی سے نوٹ کر لیا۔

"جی لکھ لیا نمبر" میں نے بتایا۔

"اب یہ بتاؤ، ان حالات میں حامد علی کی کوٹھی پر ریڈ ان کی توہین کے مترادف ہے یا نہیں؟" وزیر داخلہ نے مجھ سے سوال کیا۔

"بات کسی کی توہین کی نہیں جناب، اصل مسئلہ سولومن اور اس کے ایک ساتھی کی گرفتاری کا تھا۔" میں جواباً بولی

"معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے مجھے تم سے توقع ہے کہ تحمل اور صبر سے کام لو گی۔ آج شام تک کی تو بات ہے نا!"

"ٹھیک ہے، آپ کے حکم پر میں اپنی حکمت عملی تبدیل کر لوں گی۔"

"یہ ضروری ہے، عذرا! ورنہ اس طرح حکومت کی بہت بدنامی ہو گی۔ میں ذاتی طور پر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ حامد علی کا دامن صاف ہے۔ تم خود ان سے ملو گی تو اسی نتیجے پر پہنچو گی۔ ویسے تم حفظ ماتقدم کے طور پر ان کی کوٹھی کو اپنے ارکان کے ذریعے نگرانی میں لے سکتی ہو تا کہ سولومن اگر وہاں ہو تو باہر نہ نکل سکے۔ خود میں بھی انٹیلی جینس کو یہی احکام جاری کر چکا ہوں۔" وزیر داخلہ نے بتایا۔

"میں پہلے ہی اس کا بندوبست کر چکی ہوں جناب!"

میں نے وزیر داخلہ سے یہ بات نہیں چھپائی اور اس کی وجہ تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ انٹیلی جینس والے میرے آدمیوں پر شک کریں اور میرے ارکان ان پر! مقصد دونوں کا ایک ہی تھا اس لیے آپس کے ٹکراؤ کا نتیجہ سولومن کے حق میں جاتا۔

"تو پھر میں انٹیلی جینس والوں سے کہہ دیتا ہوں کہ جو شخص بھی تمہارا حوالہ دے، اسے مشتبہ نہ سمجھا جائے۔" وزیر داخلہ نے کہا۔

"میرے نام کی بجائے بطور کوڈ، آپریشن سیل بہتر رہے گا۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا اور وضاحتاً بولی۔ "یہ میں اس لیے بھی کہہ رہی ہوں جناب کہ سولومن بھی میرا حوالہ دے سکتا ہے۔ اسے علم ہے کہ میرے آدمی کوٹھی کے باہر موجود ہیں۔

"مناسب ہے۔" وزیر داخلہ بولے۔ "تم ایسا کرنا کہ رات کو نو دس بجے کے درمیان گھر کے فون نمبر پر مجھ سے بات کر لینا تا کہ مجھے اطمینان ہو جائے۔"

"بہتر ہے، میں فون کر لوں گی۔"

"تم مطمئن تو ہوئیں یا نہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

میرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے جناب کہ آپ ذاتی طور پر حامد علی کو جانتے ہیں۔ بہ حال میری طرف سے کوئی غیر ذمے دارانہ قدم نہیں اٹھایا جائے گا۔ آئندہ کے لیے صرف ایک

رخواست آپ سے کرنا ہے۔ گر قبول افتد......"

"تم کھو نا تکلف سے کام نہ لو!" وزیر داخلہ میری بات کاٹ کر بولے۔ "میں اپنے طور پر زادانہ کام کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے سرخ فیتے والوں کے ساتھ نتھی نہ کیا جائے۔ میری اس گستاخی کو معاف لر دیجئے گا مجھے آپ کے سیکرٹری کی یہ حرکت قطعی پسند نہیں آئی کہ اس نے مجھے لاعلمی میں رکھ کر تعاون لرنے کی بجائے کسی بھی سبب عدم تعاون کا ثبوت دیا۔ اس سے میرا کوئی علاقہ نہیں کہ وہ حامد علی کا عزیز فایا نہیں تھا۔ اسے بہر حال مجھے تاریکی میں نہیں رکھنا چاہیئے تھا۔" میں نے بلا تکلف دل کی بات کہہ دی۔

میں اس پر اسے خاصی ڈانٹ پلا چکا ہوں، کہو تو فون پر اس سے معذرت کے لیے کہہ دوں کہ م سے معافی مانگ لے۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آئندہ خود ہی آپ کے سوا ان بیوروکریٹس سے اجتناب رتنے کی کوشش کروں گی۔ جو دہری چالیں چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس شخص نے خواہ مخواہ میرے کیے ھرے پر پانی پھیرنے کا بندوست کر دیا تھا۔ بہر نو میں کسی بھی صورت میں حکومت کا آلہ کار بننے پر راضی ہیں ہوں۔ آئندہ اگر میں اپنے اقدامات سے آپ کے محکمے کو آگاہ نہ کروں تو مجھ سے گلہ نہ کیجئے گا۔ وجہ یہ کہ حکومت، سیاست اور اقتدار سے مجھے کوئی رغبت نہیں اور آپ خود بھی یہ بات بہتر سمجھتے ہیں۔"

"تم خاصی تیز بول رہی ہو! وزیر داخلہ آہستہ سے ہنس دیئے۔ "تمہارے معاملات میں آئندہ یرا محکمہ مداخلت نہیں کرے گا، یہی چاہتی ہو نا تم؟"

"جی!"

"تو اس میں اتنا سیریس ہونے کی کیا بات ہے بھئی! تعاون کا مطلب تعاون ہی ہو گا۔ عدم تعاون نہیں! اور کچھ؟"

"جی نہیں، شکریہ! مجھے کچھ اور عرض نہیں کرنا۔"

"وہ جو تم پر حملے کے دوران میں غیر ملکی پکڑا گیا ہے، اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟"

"نہیں جناب! ابھی مجھے اس سے ملنے کا موقع نہیں مل سکا۔"

"بہر حال میں یہ چاہتا تھا کہ تم اس سے پوچھ گچھ کر کے اسے بھی قانون کے حوالے کر دو۔"

"میرا بھی یہی ارادہ تھا جناب! میں اسے بھی پہلے پکڑے جانے والے غیر ملکی ایجنٹوں کی طرح وزارت داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری کے حوالے کر دوں، اگر ان سے میرا رابطہ قائم ہو گیا!" آخری الفاظ میں نے دبی زبان میں استعمال کیے تھے۔

"اب غصہ تھوک دو نا! رابطہ کیوں نہیں ہو گا! ان لوگوں کو تو تمہارا ممنون ہونا چاہیئے کہ تمہاری کارکردگی کو اپنے کھاتے میں ڈالتے رہتے ہیں۔ اچھا عذرا میں رات کو تمہارے فون کا منتظر رہوں گا، خدا حافظ!"

میں نے بھی "خدا حافظ" کہہ کر ریسیور رکھ دیا، پھر کمانڈر نواز کو مختصراً اس گفتگو سے آگاہ کیا جو فون پر وزیر داخلہ سے ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس نے صرف میری باتیں سنی تھیں۔ دوسری طرف سے کیا کہا جا رہا تھا، وہ اس سے بے خبر تھا۔

"میڈم! میرا مشورہ ہے کہ آپ اس سلسلے میں ریٹائرڈ کرنل شبیر احمد سے بات کر لیجیے۔"

کمانڈر نواز میری پوری بات سن کر بولا۔ "بہر حال سیل کے سینئر ارکان میں سے ہیں عموماً اہم مشوروں کے لیے آپ انہیں پہلے بھی طلب کرتی رہی ہیں۔ جنرل حامد علی سے یقیناً وہ بخوبی واقف ہوں گے کیونکہ کرنل بھی سابق فوجی ہیں ہر چند کہ ایچ ایم نے جنرل حامد علی کی بابت پوری یقین دہانی کرا دی ہے، پھر بھی ہمیں اپنے طور پر انکوائری کر لینا چاہیے۔"

"تمہارا مشورہ مناسب ہے کمانڈر! انہیں بلا لو۔ ویسے بھی اب کھانے کا وقت ہو رہا ہے اور عموماً دوپہر کا کھانا کھا کے کرنل سو جاتے ہیں۔ تم انہیں فون پر مطلع کر دو کہ آج میرے ساتھ کھانا کھا لیں۔ میں اب مہمان خانے کی طرف جا رہی ہوں تاکہ اس غیر ملکی ایجنٹ سے کوئی کام کی بات معلوم کر سکوں جو مجھ پر حملے کے وقت کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ پھر میں اپنے کمرے میں چلی جاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی چلتے چلتے میں نے کمانڈر نواز کو تاکید کی۔ "کیپٹن شاد کی طرف سے غافل نہ رہنا! اس سے مسلسل رابطہ رکھنا اور کوئی نئی بات ہو تو مجھے انٹرکام پر بتا دینا۔"

ڈیوٹی روم سے نکل کر میں عمارت کے اس حصے میں آ گئی جو "مہمان خانہ" کہلاتا تھا۔ اپنی سرگزشت میں پہلے بھی میں کئی بار "سیل" کے اس حصے کا ذکر کر چکی ہوں۔ یہاں آنے کے بعد کوئی بڑے سے بڑا مجرم فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ قدم قدم پر یہاں مسلح اور چوکنا گارڈز کا پہرا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں جدید ترین حفاظتی انتظام بھی تھا۔ یہاں جو کچھ ہوتا تھا، ڈیوٹی روم میں بیٹھ کر دیکھا اور سنا جا سکتا تھا۔ یہاں کے ہر کمرے اور راہداریوں میں خفیہ کیمرے نصب تھے۔ کیمروں کے ساتھ ساتھ ڈکٹافون بھی تھے۔ اول تو گارڈز ہی کو جل دینا ممکن نہیں تھا، پھر بھی کوئی ذہین و عیار مجرم اس میں کامیاب ہو جاتا تو ڈیوٹی روم میں موجود سیل کے انچارج کو فوری طور پر اس کی خبر ہو جاتی۔ جب کوئی مجرم اس قید خانے میں ہوتا تھا تو ڈیوٹی روم میں رکھا ہوا ٹی وی سیٹ چلتا رہتا تھا۔ سیل کا انچارج مختلف چینلز پر قید خانے کے مختلف حصوں کو اسکرین پر دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت بھی جب میں ڈیوٹی روم میں موجود تھی تو پینل کی ایک جانب ٹی وی سکرین روشن تھا۔ سکرین پر قید خانے کے مین انٹرنس کا منظر تھا اور مسلح گارڈز وہاں مستعد کھڑے نظر آ رہے تھے۔

یہ "دنیا" میری اپنی تخلیق کردہ تھی۔ اس کی خاطر میں نے پانی کی طرح پیسہ بہایا تھا۔ "آپریشن سیل ہیڈکوارٹر" کی وسیع و عریض عمارت کو میں نے ایک ایسا محفوظ قلعہ بنا دیا تھا کہ وہاں پرندہ پر نہ مار سکے۔ میری ساری کائنات یہی تھی۔ یہ عمارت اور اس میں رہنے بسنے اور آنے جانے والے ذہین بہادر اور جاں نثار لوگ! ان سب لوگوں کا مقصد جو سیل کے ارکان کہلاتے تھے، صرف ایک تھا۔ یہ سب ایک تھے۔ یہاں کوئی تفریق نہیں تھی۔ مختلف قومیتوں کے لوگ شانے سے شانہ ملا کر ایک منزل کی طرف گامزن تھے۔ ان سب کا مشن ان کا حاصل حیات یہ تھا کہ اپنے ملک اور اپنی پاکستانی قوم کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں، دہشت گردوں، تخریب کاروں اور ضمیر فروشوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھیں۔ ایسا ہی ایک بیرونی دشمن اس وقت میرے جاں بازوں کے نرغے میں تھا۔ تو پھر وہ کیوں مستعد و چوکنا نہ ہوتے۔ میں جدھر سے بھی گزری فوجی انداز میں مسلح گارڈز کی ایڑیاں بجتی رہیں اور میں سر کے اشارے سے جواب

دیتی ہوئی اس کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی جس میں سولومن کا ایک ساتھی قید تھا۔

دروازے پر متعین دو مسلح گارڈز میں سے ایک نے قفل کھول دیا اور میں دونوں پٹ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ سامنے ہی کرسی پر بیٹھا ہوا غیر ملکی اچھل کر کھڑا ہو گیا اور مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سٹ ڈاؤن!" میں نے اسے مخاطب کیا مگر وہ نہیں بیٹھا۔

میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے میں نے فوری طور پر اپنے ذہن میں خوابیدہ حیرت انگیز قوتوں کو بیدار کر لیا اور غیر ملکی کے قریب پہنچتے ہی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کے ذہن نے معمولی سی مزاحمت کی اور پھر میرے طاقتور ذہن کی گرفت میں آ گیا۔ اب میں اس کے ذہن کو کسی کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتی تھی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر کسی بے حس و حرکت مجسمے کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا۔

اس امریکی نژاد کا نام ڈک تھا۔ پاکستان آنے سے قبل وہ انڈونیشیا میں تھا۔ سولومن نے پاکستان آتے ہی انڈونیشیا سے اس کا تبادلہ پاکستان کرا لیا تھا۔ سولومن کو ڈک کی بے جگری اور ذہانت پر اعتماد تھا۔ "آپریشن سیل ہیڈکوارٹر" کی طرف بندوین میں جاتے ہوئے ڈک ہی نے دھوئیں کا بم پھینکا تھا اور پھر رابرٹ کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دھوئیں کا چھوٹا سا پلاسٹک بم اس کے کوٹ کی جیب میں تھا۔ اگر میرے آدمی یعنی سیل کے ارکان قیدیوں کی تلاشی لے لیتے اور جلد بازی سے کام نہ لیتے تو یقیناً ڈک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتا۔

ڈک کا ذہن پڑھنے کے بعد مجھے صرف ایک کام کی بات معلوم ہو سکی، مگر میرے لیے وہ بات بہت اہم تھی۔ اس بات کا تعلق حامد علی کی کوٹھی میں سولومن کے عارضی قیام سے تھا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوا تھا، اس کی روشنی میں مزید معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔

مجھے اس فائیو سٹار ہوٹل کے ان کمروں کے نمبر بھی معلوم ہو گئے جن میں ڈک اور رابرٹ ٹھہرے ہوئے تھے۔

سولومن کے ساتھیوں میں سے صرف ڈک اور رابرٹ کو یہ معلوم تھا کہ سولومن کہاں پناہ لیے ہوئے ہے!

جب میں ڈک کا ذہن پڑھ کر ضروری معلومات حاصل کر چکی تو اس کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ ڈک کے جسم کو جھٹکا سا لگا اور وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ میں جانے کے لیے مڑی تو ڈک تیزی سے بولا۔ "لسن می عذرا خان! آئی لو یو، یو آر اے گریٹ وومین!" اس کے لہجے میں بلا کی عیاری تھی وہ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ میں بھی عام عورتوں کی طرح اپنی تعریف سن کر بانس پر چڑھ جاؤں گی۔

جواباً میں نے ڈک کو پلٹ کر دیکھا اور سخت آواز میں بولی "تم ایک احمق اور بے وقوف آدمی ہو۔ میں تمہارے معاشرے کی کوئی بے باک عورت نہیں ہوں جو آئی لو یو سنتے ہی مرد پر ریجھ جاتی ہے۔ اگر میں واقعی عظیم عورت ہوں تو تم انتہائی پست اور گھٹیا مرد ہو!" یہ الفاظ میں نے انگریزی میں ہی ادا کیے تھے۔

پھر میں وہاں مزید رکے بغیر جب تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تو ڈک بھی میرے پیچھے لپکا تھا۔ دروازے پر متعین گارڈز نے اسے قابو میں کر کے دوبارہ کمرے کے اندر دھکیل دیا تھا اور وہ چیختا رہ گیا تھا۔

عمارت کے اس حصے سے نکل کر میں اپنے ساؤنڈ پروف کمرے میں آ گئی اور انٹرکام پر کمانڈر نواز سے بات کی۔ ''کمانڈر!'' میں اس امریکی ایجنٹ سے ضروری معلومات حاصل کر چکی ہوں۔ ہمارے لیے وہ اب بیکار ہے تم وزارت داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری نسیم احمد سے فون پر میری بات کرا دو تاکہ اس ملک دشمن کو بھی قانون کے حوالے کر دیا جائے۔''

''میڈم! کیا اس سے کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟'' کمانڈر نواز نے پوچھا۔

''ہاں مگر اس کا انحصار جنرل حامد علی سے میری ملاقات پر ہے۔ تم نے کرنل شبیر احمد کو اطلاع دے دی کہ میں ان کی منتظر ہوں؟''

''جی میڈم! اندازے کے مطابق وہ اب تک اپنی کوٹھی سے چل چکے ہوں گے۔'' کمانڈر نواز نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، نسیم احمد سے بات کراؤ!'' یہ کہہ کر میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا اور ایزی چیئر پر نیم دراز ہوگئی۔ ذرا ہی دیر کے بعد انٹرکام کی گھنٹی پھر بجی اور کمانڈر نواز نے بتایا کہ فون پر وزارت داخلہ کا ڈپٹی سیکرٹری نسیم احمد مجھ سے گفتگو کا منتظر ہے۔ میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھ کر فون کا ریسیور اٹھا لیا اور مجھے کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی وہ نسیم احمد سے کہہ رہا تھا۔ ''میڈم سے بات کیجئے!''

''ہیلو نسیم احمد صاحب؟'' میں بول اٹھی۔

''جی بول رہا ہوں۔'' نسیم احمد کی آواز سنائی دی۔ ''حکم فرمائیے!''

''حکم دینا تو آپ جیسے حاکموں کا کام ہے، ہم تو درخواست ہی کر سکتے ہیں جناب!'' میری آواز میں چبھن تھی۔ ''آپ لوگوں سے تو ہمارا رابطہ ہی قائم ہو جائے تو ہم خود کو خوش نصیب سمجھنے لگتے ہیں! لگتا ہے کہ اسلام آباد سے آپ کو نئے احکام مل چکے ہیں ورنہ حسب معمول اس وقت آپ کسی اہم میٹنگ میں ہوتے۔''

''آئی ایم ویری سوری کہ آپ کو میری وجہ سے زحمت اٹھانا پڑی۔ مم...... میں واقعی میٹنگ میں تھا۔''

میں آہستہ سے اس کی حماقت پر ہنس دی۔ وہ اب بھی جھوٹ بول کر بات بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سنیں مسٹر نسیم احمد! میرا نام عذرا خان ہے اور مجھے بے وقوف بنانا آسان نہیں ہوتا۔ بطور ثبوت میں آپ کو یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ اسلام آباد سے آپ کے باس نے پہلے کیا احکام دیئے تھے...... یہی نا کہ کوئی بھی ذمے دار اعلیٰ سرکاری افسر مجھ سے رابطہ قائم نہ کرے اور اگر میں یہ کوشش کروں تو اہم میٹنگوں کا بہانہ کر دیا جائے۔ یہ جاننے کے باوجود بھی مجھے آپ لوگوں سے کوئی شکایت نہیں اس لیے کہ میں آپ لوگوں کی مدد اور تعاون کے بغیر بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں۔''

''آپ...... میری بات تو سنیں محترمہ!...... کم از کم مجھے اپنی صفائی کا موقع دیں۔'' وہ بولا۔

''میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ مجھے علم ہے کہ اعلیٰ سرکاری افسران اپنے اوپر والوں کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ میں نے اس وقت آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ ایک اور ملک دشمن غیرملکی ایجنٹ میرے قبضے میں آ چکا ہے۔ اس کا نام ڈک ہے اور یہ سولومن کے خاص ساتھیوں میں سے ایک ہے۔ یہ خطرناک اور عیار ایجنٹ ہے اس لیے بے ہوشی کی حالت میں اسے آپ لوگوں کے سپرد کیا جائے گا۔ گزشتہ رات ہی کی طرح آج رات بھی اسے میرے آدمی رات ایک بجے فریر ہال تک بند سیاہ وین میں لے کر آئیں گے۔ شناخت وہی ہوگی جو کل تھی۔ اس گرفتار کو بھی آپ اپنے محکمے کے کھاتے میں ڈال لیجیے گا۔ ڈک کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے جو وزارت داخلہ کو فراہم کی گئی ہے۔ ڈک اور اس کا ایک ساتھی جس فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اس کا نام اور کمروں کے نمبر بھی لکھ لیجیے تاکہ آپ کا محکمہ ڈک کے خلاف ثبوت تلاش کر سکے۔ اس کا دوسرا ساتھی رابرٹ ابھی میرے ہاتھے نہیں چڑھ سکا، مگر ہوٹل کے کمروں میں اس کا سامان موجود ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ کے علم میں یہ بات لا کر کہ یہ لوگ ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں آپ کا محکمہ ان کا سامان اپنے قبضے میں لے سکتا ہے۔ ممکن ہے ان کے سامان میں سے کوئی ایسی چیز مل جائے جو آپ کے کام کی ہو۔ ہوٹل کا نام اور کمروں کے نمبر لکھ لیجیے! میں نے نسیم احمد کو اتنی مہلت دی کہ وہ قلم اور کاغذ اٹھا سکے۔

''بہت بہت شکریہ محترمہ! میں نے ہوٹل کا نام اور کمروں کے نمبر لکھ لیے ہیں۔ فوری طور پر آپ کے حکم کی تعمیل ہو جائے گی، مگر میں ایک بات معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ کس طرح ان خطرناک لوگوں کا سراغ لگا لیتی ہیں اور اس پر کمال یہ کہ انہیں گرفتار بھی کر لیتی ہیں؟'' نسیم احمد اپنی عادت کے مطابق پوچھ بیٹھا۔

''یہ بات آپ اگر اپنے وزیر داخلہ سے معلوم کریں تو زیادہ بہتر ہوگا مسٹر نسیم احمد!'' میں نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

''لل...... لیکن محترمہ...... یہ تو ایک ناممکن سی بات ہے۔ مم...... میری یہ جسارت کیسے ہو سکتی ہے کہ......''

''تو پھر صبر کریں، بزرگوں نے کہا ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے! رات کو ایک بجے ڈک کو آپ لوگوں کے حوالے کر دیا جائے گا، بس اتنا یاد رکھیے اور فضول قسم کی لایعنی باتوں میں نہ پڑیے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ وہ کیوں نہیں ہوا خدا حافظ!'' میں نے مزید کچھ سنے بغیر ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس سے مزید مغز ماری کا مطلب وقت کا زیاں ہی ہوتا۔ وہ اپنے ٹائپ کا الگ ہی آدمی تھا ہر شے کی جڑ بنیاد کھودنے والا کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے دماغوں کو ضروری اور غیر ضروری ہر طرح کی معلومات کا سٹور بنا لیتے ہیں۔ نسیم احمد بھی مجھے ایسے ہی لوگوں میں سے لگتا تھا۔ اس سے بات کر کے میں نے انٹرکام پر کمانڈر نواز کو بتا دیا کہ آج رات ٹھیک ایک بجے ڈک کو بے ہوشی کی حالت میں قانون کے سپرد کیا جانا ہے۔ باقی تفصیل اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی، اتنا ہی بتا دینا کافی تھا۔ یوں بھی رات کو عثمانی کی ڈیوٹی ہوتی جو کمانڈر نواز کی غیر موجودگی میں سیل کے انچارج کے فرائض انجام دیتا تھا۔ کمانڈر نواز کو محض

اپنے نائب عثمانی تک میرے احکام پہنچاتا تھے۔

میں نے ابھی انٹرکام کا ریسیور نہیں رکھا تھا کہ کمانڈر نواز نے کرنل شبیر احمد کے آنے کی اطلاع دی۔

"انہیں میرے کمرے میں بھیج دو!" یہ کہہ کر میں نے انٹرکام پر کچن کا نمبر ملایا اور کھانا لانے کے لیے کہہ دیا۔ میں نے بتا دیا تھا کہ میرے ساتھ کرنل شبیر احمد بھی کھانا کھائیں گے۔ کرنل کا نام میں نے اس لیے بھی بتایا تھا کہ وہ گوشت کے سوا کچھ اور نہیں کھاتے تھے۔ میرا کک اس سے واقف تھا۔

کرنل شبیر احمد سے بہت دنوں بعد میری ملاقات ہو رہی تھی۔ ان دنوں پے در پے معرکہ آرائیاں اتنی مہلت ہی نہیں دے رہی تھیں کہ میں اپنے دیرینہ رفیقوں سے مل سکوں۔ "آپریشن سیل ہیڈکوارٹر" سے وابستہ بیشتر افراد کی تربیت میں کرنل کا بڑا حصہ تھا۔ کرنل میرے ابتدائی رفیقوں میں سے تھے۔ "سیل" کے ارکان میں فوجی ڈسپلن انہی نے قائم کیا تھا۔ وہ بے غرض، بے لوث آدمی تھے، میں اسی لیے ان کی بڑی عزت کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان کی آمد سے قبل ہی دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی تھی۔

میرے کمرے کی طرف آتے ہوئے دور ہی سے انہوں نے مجھ دیکھ لیا اور ہاتھ ہلایا۔ وہ پینسٹھ سال کی عمر میں بھی تندرست وتوانا نظر آتے تھے۔ صحت بھی اچھی تھی اور ڈیل ڈول بھی خاصا تھا۔ ہونٹوں کے ایک گوشے میں سگار دبا ہوا تھا، سر پر ہیٹ تھا اور سفید بش شرٹ اور سفید پینٹ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ چہرے پر گھنی سفید مونچھیں ان کی بھاری بھرکم شخصیت کو مزید بارعب بناتی تھیں۔ سرخ وسفید چہرے پر بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ذہانت کی چمک نظر آتی تھی۔ خوش مزاج اور زندہ دل آدمی تھے ورنہ اس عمر تک پہنچ کر آدمی عموماً چڑچڑا اور خشک طبیعت ہو جاتا ہے۔

"ارے آپ تو اس طرح میرا استقبال کرنے دروازے پر کھڑی ہیں جیسے میں یہاں مہمان آیا ہوں۔" قریب آ کر کرنل نے خوش مزاجی سے کہا۔

"آیئے کرنل، تشریف لایئے!" میں نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے انہیں کمرے میں داخل ہونے کی جگہ دی۔

جب ہم دونوں کمرے میں آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے تو کرنل نے اپنی بشرٹ سے لائٹر نکال کر بجھا ہوا سگار سلگایا اور بولے۔ "لگتا ہے آج کل آپ کی مصروفیت کچھ بڑھ گئی ہیں۔ پہلے تو کبھی آپ فون کر لیا کرتی تھیں، مگر بہت دن سے یہ رسم بھی اٹھ گئی ہے۔"

"رسم کا لفظ آپ نے خوب استعمال کیا کرنل!" میں آہستہ سے ہنس دی، پھر انہیں بتایا۔

"دراصل گزشتہ دنوں واقعی بہت مصروفیت رہی، کچھ عرصہ بنگال میں گزرا، پھر ہندوستان جانا پڑا اور یہاں آتے ہی اللہ کے نیک بندوں نے سانس لینے کی مہلت نہیں دی، وہی چکر اب تک چل رہا ہے، ملک دشمن چین سے نہیں بیٹھنے دے رہے، غیرملکی ایجنٹ بھی سرگرم عمل ہیں اور ہمارے ملک کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے مختصراً انہیں سولومن کے متعلق بتایا۔

"یہ بندہ تو بڑی زبردست شے لگتا ہے!" کرنل نے سولومن کی شخصیت پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا۔ "اس کا علاج تو بس گولی ہے اور کچھ نہیں!"

"یہی میں نے بھی سوچا ہے مگر وہ تو بجلی کی طرح کوند کر ایک دم غائب ہو جاتا ہے۔ میں نے اسی سلسلے میں آپ کو زحمت دی ہے۔ بات یہ ہے کہ کرنل کہ اگر ہمارے کچھ ضمیر فروش لوگ ایسے خطرناک دشمنوں کی پشت پناہی نہ کریں تو انہیں بآسانی گھیرا جا سکتا ہے۔"

"سارا قصہ اور سارا رونا تو اسی کا ہے!...... ویسے ہر قوم میں ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ تاریخ بھی ایسے ضمیر فروشوں کے ذکر سے بھری پڑی ہے مگر ہمارے یہاں کیونکہ غربت زیادہ ہے، ہم پس ماندہ ہیں اس لیے جلد ترغیب کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

کرنل کی بات ختم ہوئی تھی کہ کچن سے کھانا آ گیا۔ ہماری گفتگو کچھ دیر کے لیے رک گئی۔ سنٹرل ٹیبل پر کھانا لگا دیا گیا اور کرنل کھانے میں مصروف ہو گئے تو میں اصل موضوع کی طرف آ گئی

"کرنل! آپ ریٹائرڈ جنرل حامد علی سے تو واقف ہوں گے!"

"ہاں ہاں، ان سے کون واقف نہیں! کیوں ان کا ذکر کیسے نکل آیا؟" کرنل نے ڈش سے مرغی کی ران اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"سولومن اور اس کا ایک ساتھی اس وقت حامد علی ہی کی کوٹھی میں پناہ لیے ہوئے ہے۔"

"ناممکن!" کرنل اس طرح چونک کر بولے جیسے انہیں میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔

"آپ اسے ناممکن کیوں کہہ رہے ہیں؟" میں نے نرمی سے دریافت کیا۔

"اس لیے کہ میں جنرل کو اب سے نہیں، مدتوں سے جانتا ہوں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کسی ملک دشمن کی پشت پناہی کریں۔" کرنل پریقین لہجے میں بولے۔

"مگر یہ اطلاع قطعی درست ہے کرنل!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا، پھر انہیں آج پیش آنے والے واقعے سے بھی آگاہ کر دیا۔

"حیرت انگیز اور ناقابل یقین سی بات ہے، لیکن آپ بھی جو واقعہ بتا رہی ہیں، وہ بھی ناقابل تردید ہے، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جنرل حامد علی کا نام ہمیشہ ایسے محب وطن جنرلوں میں شامل رہا ہے جو ملک وقوم کی خاطر وقت پڑنے پر اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔ فوج کی ملازمت کے دوران میں بھی ان کا اور میرا ساتھ رہا ہے۔ انہیں میں نے کبھی کسی سازش میں شریک نہیں دیکھا...... ان تمام باتوں کے باوجود موجودہ صورتحال میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کو خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے کرنل کے لہجے میں تاسف تھا۔

کرنل شبیر احمد سے مجھے جو کچھ پوچھنا تھا، پوچھ چکی تھی، یوں بھی وہ دوپہر کا کھانا کھا کے سونے کے عادی تھے۔ اس لیے کھانے کے بعد انہیں میں نے مزید نہیں روکا۔ جب میں نے کرنل کو رخصت کیا تو پونے تین بجنے والے تھے۔ حامد علی سے مجھے شام کو فون پر بات کرنا تھی، پھر ان سے ملنا تھا۔ گزشتہ رات جاگتے گزری تھی اور صبح کے وقت بمشکل میں تین گھنٹے سو پائی تھی اس لیے ذہن پر نیند کا غبار چھایا ہوا تھا۔ کیا خبر آنے والی رات بھی میرے لیے اپنے دامن میں ہنگامے سمیٹ کر لائے، یہ سوچ کر میں نے شام تک سو جانے کا فیصلہ کیا اور کمانڈر نواز کو اس سے آگاہ کر دیا۔ وہ اس دوران میں پیش آنے والی کسی غیرمتوقع صورتحال سے نمٹ سکتا تھا۔

اندر سے کمرہ مقفل کر کے میں نے دروازے کے باہر لگا ہوا سرخ بلب جلا دیا جس کا سوئچ کمرے ہی میں تھا۔ اس سرخ بلب کے روشن ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ایمرجنسی کے سوا مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ بستر پر دراز ہوتے ہی میری بوجھل پلکیں جیسے خود بخود بند ہونے لگیں۔ پھر جلد ہی میں بے خبر سو گئی مگر بار بار آنکھ کھلتی رہی۔ ذہن پر جب کوئی فکر سوار ہو تو پرسکون نیند نہیں آتی۔ آنکھ کھلتی تو میں وال کلاک کی طرف دیکھتی اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگتی۔ اسی میں شام کے پانچ بج گئے۔ میں نے بستر سے اٹھ کر منہ دھویا، پھر انٹرکام پر کمانڈر نواز کو جنرل حامد علی کا وہ فون نمبر دیا جو وزیر داخلہ نے مجھے لکھوایا تھا، نمبر لکھوا کر میں نے اسے ہدایت کی۔ ''اس نمبر پر رنگ کر کے دیکھو کرنل حامد علی کراچی پہنچا یا نہیں! اگر اس سے رابطہ ہو جائے تو میری بات کرا دو، تھوڑی تھوڑی دیر بعد رنگ کرتے رہو!''

کمانڈر نواز کو ہدایت دے کر میں نے لباس تبدیل کیا کہ اگر فوری طور پر حامد علی سے ملنے جانا پڑے تو مجھے دیر نہ لگے۔ حامد علی سے تقریباً ایک گھنٹے تک فون پر رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ جواباً یہی بتایا جاتا رہا کہ وہ ابھی کراچی نہیں پہنچے ہیں۔ کمانڈر نواز نے اس کی وائف کو میسج دیدیا تھا کہ میں بات کرنا چاہتی ہوں۔

اس ایک گھنٹے کے دوران میں مجھے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع مل گیا۔ اسی کے ساتھ کیپٹن شاد سے بھی رپورٹ لے لی۔ کیپٹن کی رپورٹ کے مطابق کوئی شخص بھی کوٹھی سے باہر نہیں نکلا تھا۔ کیپٹن شاد ہی نے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ کوٹھی کا گیٹ اندر سے بند کر لیا گیا ہے اور مسلح گارڈز کو بھی اندر بلا لیا گیا ہے۔

حامد علی سے فون پر رابطہ قائم ہونے سے پہلے میں اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل ترتیب دے چکی تھی۔ اس لائحہ عمل کے مطابق اگر سولومن اب تک حامد علی کی کوٹھی ہی میں چھپا ہوا تھا تو اس کا بچ کر نکل جانا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ ''سیل'' کے ان ارکان کو واضح ہدایات دے چکی تھی جو حامد علی کی کوٹھی کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ وہ بھی جدید ترین ہتھیاروں سے لیس تھے۔

چھ بجنے والے تھے جب کمانڈر نواز نے مجھے انٹرکام پر بتایا کہ حامد علی اپنی کوٹھی میں آ چکا ہے اور فون پر مجھ سے بات کرنے کا منتظر ہے۔ میرے کہنے پر کمانڈر نواز نے فون کی لائن دے دی اور میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

''آداب جنرل صاحب! میں عذرا خان عرض کر رہی ہوں۔'' میں نے شائستگی سے کہا۔

''آداب!'' جواباً جنرل حامد علی کی بھاری آواز سنائی دی ''مجھے آج ہی اسلام آباد میں آپ کے متعلق کچھ باتوں کا علم ہوا ہے اور اس وقت سے اب تک حیران ہوں، مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صدر مملکت نے آپ کی خصوصی خدمات کے پیش نظر ایک اختیار نامہ بھی دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملک و قوم کے لیے آپ نے کچھ ایسی ہی قابل فخر خدمات انجام دی ہوں گی جو آپ کو خصوصی اختیارات دیئے گئے ہیں، ایسے اختیارات جو کسی سویلین کو آج تک نہیں دیئے گئے! میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کو میرے بارے میں کیا غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو مجھ سے مل لیجیے۔ میں اسی لیے فوری طور پر اسلام آباد میں اپنے تمام پروگرام منسوخ کر کے کراچی آیا ہوں۔ میں اپنے طور پر بھی خود کو اتنا بے بس تصور نہیں کرتا کہ میری

لاعلمی میں کوئی غیر ملکی ایجنٹ میری کوٹھی میں پناہ لے لے اور میں اسے گرفتار نہ کر سکوں، ممکن ہے کہ جب تک آپ آئیں، وہ غیر ملکی اور اس کا ساتھی پکڑا جا چکا ہو۔ میں ابھی ابھی کوٹھی پہنچا ہوں تو آپ کا پیغام ملا ہے۔ کیا آپ کا منتظر رہوں؟''

''میں تو خود بھی آپ کے کراچی پہنچنے کی منتظر تھی۔ آپ سے مل کر مجھے انتہائی مسرت ہو گی اگر اجازت ہو تو میں ابھی حاضر ہو جاؤں؟''

''بالکل تشریف لائیے، میں گارڈز کو ہدایات کر دیتا ہوں کہ آپ کو آنے دیا جائے۔''

''ایک درخواست ہے آپ سے!''

''جی فرمائیے!''

''میرے آنے سے پہلے غیر ملکی ایجنٹوں کی تلاش کے سلسلے میں آپ کوئی قدم نہ اٹھائیں۔''

''یہ کیوں چاہتی ہیں آپ؟''

''وجہ آپ کو اس وقت خود معلوم ہو جائے گی جب میں وہاں پہنچوں گی۔ مجھے آپ کی کوٹھی تک پہنچنے میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے، بس اتنی دیر کے لیے آپ سے درخواست کر رہی ہوں۔''

''اگر آپ اس میں کوئی مصلحت سمجھتی ہیں تو مجھے کوئی انکار نہیں۔ تشریف لائیے! آپ کی آمد سے قبل میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔''

''بہت بہت شکریہ! میں جلد از جلد پہنچ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔

تمام انتظامات پہلے ہی کیے جا چکے تھے اس لیے مجھے ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' سے روانگی میں ذرا بھی تاخیر نہیں ہوئی۔ سرفراز کی بجائے اب میری بلٹ پروٹ کار کمانڈر نواز ڈرائیو کر رہا تھا۔ عثمانی کو اس نے آج وقت سے کچھ پہلے طلب کر لیا تھا تاکہ میرے ساتھ چل سکے اور اس کی غیر موجودگی میں عثمانی اس کے فرائض سنبھال سکے۔ خود کمانڈر نواز ہی نے مجھ سے یہ درخواست کی تھی جسے میں نے قبول کر لیا تھا۔

راستے ہی میں میرے ایما پر ٹرانسمیٹر کے ذریعے کمانڈر نواز نے کیپٹن شاد اور ''سیل'' کے دیگر جاں بازوں کو الرٹ کر دیا تھا۔

کمانڈر نواز نے خاصی تیز رفتاری کا ثبوت دیا۔ میں نے حامد علی کو جو وقت دیا تھا، اس سے پہلے ہی پہنچ گئی۔

حامد علی کی تصویریں وزیر مملکت ہونے کی وجہ سے آئے دن اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔ اس کا چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ چھریرے بدن کا وہ دراز قد شخص اس وقت چہرے سے فکرمند نظر آ رہا تھا جب میں اس سے ملی۔ کمانڈر نواز کو میں نے باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ یوں بھی اس وقت اس کی حیثیت میرے ڈرائیور کی تھی۔ نشست گاہ میں صرف میں ہی داخل ہوئی تھی جہاں حامد علی میرا منتظر تھا۔ کمانڈر نواز کو عمارت کے اس حصے میں روک لیا گیا تھا جو حامد علی کے پرسنل سٹاف کے لیے مخصوص تھا۔ مجھے بھی ادھر ہی

سے گزر کر نشست گاہ تک آنا پڑا تھا۔

اپنے طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق نشست گاہ میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنے پراسرار ذہن کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر لیا تھا اور حامد علی کا ذہن پڑھنے لگی تھی۔ اس نے مجھ سے قریبی صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور خود بھی کھویا کھویا دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”معلوم نہیں یہ میرے دماغ میں سرسراہٹ سی کیسی ہو رہی ہے! یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سر کو جھٹکا۔

وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ میں اس کے ذہن کو پڑھ رہی ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا ”کبھی کبھی جب آدمی پر ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ اپنے ذہن کو کچھ دیر بالکل خالی چھوڑ دیں، کچھ نہ سوچیں اور نہ کوئی بات کریں، یہ کیفیت ختم ہو جائے گی۔“ میرے یہ الفاظ دراصل حکم کا سا درجہ رکھتے تھے کیونکہ حامد علی کا ذہن، میرے طاقتور ذہن کی گرفت میں تھا۔

حامد علی صوفے سے پشت لگا کر آرام سے خاموش بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن پڑھنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ جو کچھ مجھے جاننا تھا میں جان چکی تھی حامد علی کے ذہن سے اپنے ذہن کی گرفت ختم کرتے ہی میں چوکنا ہو کر بیٹھ گئی۔ غیر ملکی ایجنٹ اور سولومن کے دست راست ڈک کا ذہن پڑھ کر مجھے جس بات کا علم ہوا تھا، اس کی تصدیق ہو چکی تھی۔

”محترم! آپ کا قیاس قطعی درست ہے۔“ میں نے حامد علی کو مخاطب کیا۔ ”آپ کے بھتیجے فرحان کے غیر ملکی مہمانوں کے سوا اس کوٹھی میں موجود کسی بھی فرد پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔“

حامد علی میری بات سن کر چونک اٹھا۔ اب وہ اپنے حواس میں تھا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر بولا ”آپ...... کیا آپ فرحان کو جانتی ہیں؟“

”نہیں، میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا، نہ کبھی ملاقات ہوئی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”پھر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ میرا بھتیجا ہے اور یہ کہ اس کوٹھی میں اس کے دو غیر ملکی مہمان بھی موجود ہیں؟“ حامد علی کے لہجے کی حیرت برقرار تھی۔

”مجھے تو یہ بھی علم ہے محترم کہ فرحان آپ کے چھوٹے بھائی کا بیٹا ہے اور آپ کے چھوٹے بھائی لاہور میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ فرحان طویل عرصے سے امریکہ میں زیر تعلیم رہا ہے اور تین مہینے قبل وہ پاکستان آیا ہے۔ مزید یہ کہ لاہور سے کراچی آئے اسے چند روز ہوئے ہیں اور وہ یہاں سیر و تفریح کی غرض سے آیا ہے۔ گزشتہ روز ہی سے دونوں غیر ملکی یہاں مہمان ہیں، آپ کے نہیں فرحان کے مہمان!“

”لیکن آپ...... آپ ناقابل یقین سی باتیں کر رہی ہیں...... ان...... باتوں کا علم تو کسی کو نہیں۔“ حامد علی ایک دم بول اٹھا۔

”مگر مجھے علم ہے!“ میں بولی۔ میں نے اس کے بھتیجے فرحان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا،

اسی کا ذہن پڑھ کر بتایا تھا۔ حامد علی کی حیرانی بلاسبب نہیں تھی“ میرا خیال ہے محترم کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ ممکن ہے سولومن نے خطرے کی بو سونگھ لی ہو اور ایسی صورت میں وہ خون خرابے پر بھی اتر سکتا ہے۔“

میرے الفاظ نے تازیانے کا کام کیا۔ حامد علی کے اندر سویا ہوا جنرل بیدار ہو گیا۔ وہ اچانک صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اگر واقعی فرحان کے وہ دونوں امریکی دوست، ملک دشمن ہیں تو میں انہیں شوٹ کر دوں گا! آپ یہاں بیٹھئے میں ابھی......“

حامد علی کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک دھماکہ ہوا، پھر پے در پے کئی فائر ہوئے۔ حامد علی نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا اور نشست گاہ کے دروازے کی طرف دوڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکی کیونکہ آتش و آہن کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ میری آمد سے یقیناً سولومن نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور اب فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

بھاگتے ہوئے میں نے بھی اپنے پرس سے ریوالور نکال لیا اور اسی کے ساتھ محدود فریکوئنسی کا ٹرانسمیٹر بھی! ٹرانسمیٹر پر کیپٹن شاد سے میں نے صرف ایک لفظ کہا اور اسے دوبارہ پرس میں ڈال لیا۔ وہ کوڈ ورڈ میں اس کا اشارہ تھا کہ دشمن فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے، اسے بچ کر نہ نکلنے دیا جائے! ایسے ہی مواقع کے لیے میں نے کچھ کوڈ ورڈز مقرر کر رکھے تھے تاکہ انتہائی کم وقت میں میسج کنوے ہو سکے۔

مجھے اندازہ تھا کہ حامد علی عمارت کے اسی حصے کا رخ کرے گا جہاں غیر ملکیوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔ میں اسی لیے اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔

عمارت کا وہ عقبی حصہ تھا جہاں تک میں حامد علی کے عقب میں دوڑتی ہوئی پہنچی۔ دوڑتے ہوئے دوبارہ حامد علی نے مجھے اپنے پیچھے آنے کو منع کیا تھا، مگر میں سنی ان سنی کر گئی تھی۔

جو منظر مجھے وہاں نظر آیا اسے دیکھ کر میں سناٹے میں رہ گئی۔ انیکسی کے باہر کھلی جگہ میں سولومن، ایک نوجوان کی کنپٹی پر ریوالور رکھے ہوئے آہستہ آہستہ کوٹھی کے عقبی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دوسرے غیر ملکی کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی جس سے وہ فائرنگ کرتا ہوا سولومن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سولومن کے شانے سے ایک ایئر بیگ بھی لٹکا ہوا تھا۔

وہ لمحہ میری زندگی اور موت کے درمیان حد فاصل تھا جب میں ایک دم دیوار کی آڑ میں ہو گئی تھی۔ سنسناتی ہوئی کئی گولیاں میرے قریب سے گزر گئی تھیں۔ سولومن کے ساتھی رابرٹ نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

حامد علی کو بھی خطرے کا احساس ہو گیا تھا اور وہ فائر ہوتے ہی زمین پر لیٹ گیا تھا۔

”جنرل!“ معاً سولومن کی بلند آواز گونجی ”میں تمہارے بھتیجے کو موت کی نیند سلا دوں گا، اگر تمہارے گارڈز نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی! ان سے کہو کہ یہ پیچھے ہٹ جائیں!“

اسی وقت میں نے رابرٹ کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ لیا تھا مگر وہ میری طرف سے چوکنا تھا۔ وہ تیزی سے جھک گیا۔

”جنرل! اس پاگل عورت کو روکو، اب اگر اس نے گولی چلائی تو......“

سولومن کا فقرہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ حامد علی نے لیٹے ہی لیٹے سولومن کی طرف فائر کر دیا۔ حامد علی کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ اس کے مدمقابل کون ہے! گولی سولومن کے بجائے فرحان کے پیٹ میں لگی۔ سولومن تیزی سے پینترا بدل کر فرحان کے پیچھے چلا گیا تھا۔ فرحان کو اس نے بطور ڈھال استعمال کیا تھا۔

پیٹ میں گولی لگتے ہی فرحان کی دلدوز چیخ سنائی دی تھی۔ اسی کے ساتھ حامد علی بھی چیخ اٹھا تھا۔ ''فرحان بیٹے!''

عین اسی لمحے میں نے سولومن کو کوٹ کی جیب سے کچھ نکالتے دیکھا اور چونک اٹھی۔ لمحے بھر کو وہ میری طرف سے غافل ہو گیا تھا اور اسی لمحے سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس پر فائر کر دیا۔ میں صرف اس کے ہاتھ کا نشانہ لے سکی تھی اس کا بقیہ جسم زخمی فرحان کی آڑ میں تھا۔ اس بار میرا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔

''عذرا خان! سولومن کسی زخمی درندے کی طرح چیخا۔

میں نے صرف سولومن کی آواز سنی اور یہ نہ دیکھ سکی کہ اچانک اتنا زبردست دھما کہ کیسے ہوا! فائر کرتے ہی میں دیوار کی آڑ میں ہو گئی تھی۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو رابرٹ کی گولیوں کا نشانہ بن جاتی۔

''مجھے نکل جانے دو جنرل ورنہ میں اس کوٹھی کو کھنڈر بنا دوں گا!......لو یہ اور لو!'' سولومن کے الفاظ ختم ہوتے ہی دوسرا زبردست دھماکا ہوا۔

سولومن یقیناً ہینڈ گرنیڈ سے تباہی پھیلا رہا تھا۔ انیکسی کا ایک حصہ قطعی منہدم ہو چکا تھا اور اب اس درندہ صفت شخص سے یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ اس حصے کو بھی ملبے کا ڈھیر بنا دیتا جہاں میں اور حامد علی تھے۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ حامد علی کو ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر حامد علی مارا جاتا تو پھر اس کا بچ کر نکل جانا محال ہوتا۔ وہ تباہی و بربادی کا اسی لیے مظاہرہ کر رہا تھا کہ حامد علی مجبور ہو کر اسے فرار ہونے کا موقع دے دے۔

معاً فضا میں مجھے ایک مخصوص گیس کی ہلکی سی بو محسوس ہوئی تو میں نے انتہائی سرعت کے ساتھ اپنے پرس سے گیس ماسک نکال لیا۔ میں پوری تیاری سے آئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ بے ہوش کر دینے والی گیس کی بو تھی۔ سولومن نے ایک اور نیا حربہ استعمال کیا تھا۔ گیس ماسک چہرے پر چڑھا کر میں نے فوری طور پر اپنے طاقتور ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کو بیدار کر لیا جنہیں استعمال کرنے کا موقع مجھے اب تک نہیں ملا تھا۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ میں سولومن کے ذہن کو گرفت میں نہیں لے سکتی مگر رابرٹ کو یقیناً اپنے اشاروں پر نچا سکتی تھی دوسرے ہی لمحے رابرٹ کے ذہن سے میرا رابطہ قائم ہو گیا۔ اس کے ذہن نے ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ وہ غفلت میں مارا گیا۔

رابرٹ! تمہارا باس غدار ہے، اسے گولی مار دو! میرے ذہن نے رابرٹ کے ذہن کو حکم دیا۔

اسی لمحے اچانک رابرٹ کے ذہن پر تاریکی کی چادر پھیل گئی۔ اس کی چیخ سن کر میں اچھل پڑی تھی۔ یقیناً کسی نے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔ ذہن تاریک ہو جانے کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ چیخ سے پہلے میں نے فائر کی آواز نہیں سنی تھی اور یہ امر میرے لیے باعث حیرت تھا۔

میں نے دیوار کی آڑ سے جھانک کر دیکھا تو ہر طرف دھواں سا پھیلا ہوا تھا اور اس میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ سارے ''کرتب'' میرے اسی عیار دشمن سولومن کے تھے جو موت کا حصار توڑ کر ہر قیمت پر فرار ہو جانا چاہتا تھا۔

میری نگاہ اس طرف اٹھی جہاں ایک ستون کے برابر حامد علی زمین پر لیٹا ہوا فائرنگ کر رہا تھا۔ میں نے اس کے جسم کو بے حس و حرکت دیکھا۔ وہ یقیناً بے ہوش ہو چکا تھا۔ دھوئیں کے مرغولے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ سولومن کہاں ہے اور حامد علی کے بھتیجے فرحان کا کیا حشر ہوا۔

''میڈم! اچانک قریب ہی سے مجھے کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی اور اسی وقت ایک فائر ہوا۔

گولی آواز پر چلائی گئی تھی اور گولی چلانے والا سولومن کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں لرز کر رہ گئی۔ کمانڈر نواز مجھے بے حد عزیز تھا۔

میں نے کمانڈر نواز کو سینے کے بل رینگتے ہوئے ایک سمت سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے اسے تیزی کے ساتھ دیوار کی آڑ میں گھسیٹ لیا۔

کمانڈر نواز پر فائر کیا گیا تھا، اس کا مطلب یہی تھا کہ سولومن ابھی وہاں سے فرار نہیں ہو سکا۔ میں نے اندازے سے پے در پے فائر اسی طرف کر دیئے جدھر سے فائر کیا گیا تھا۔ میں اسے کمانڈر نواز کی حماقت ہی کہوں گی کہ اس نے اب تک اپنے چہرے پر گیس ماسک نہیں چڑھایا تھا۔ اسی سبب اب وہ اپنا سینہ پکڑے بری طرح کھانس رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس طرح اور کدھر سے مجھ تک پہنچ گیا تھا! مگر یہ وقت کچھ پوچھنے کا نہیں تھا۔ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کمانڈر کو اب تک گیس ماسک جیب سے نکالنے کی مہلت نہ ملی ہو۔

میرے فائروں کے جواب میں دوسری جانب سے فائر نہیں ہوا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ اسی وقت میں نے کمانڈر نواز کو چہرے پر گیس ماسک چڑھاتے دیکھا۔ اسے یا تو اب اس کی مہلت مل گئی تھی یا پھر اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اب وہ دیوار سے ٹیک لگائے میرے قریب ہی کھڑا تھا۔

حامد علی کے گارڈز موت کے اس کھیل میں غالباً اس لیے خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے کہ کہیں فرحان ان کے ہاتھوں سے نہ مارا جائے! وہ کس طرف تھے میں یہ نہیں دیکھ سکی تھی البتہ سولومن نے ان کے قریب ہی کہیں موجودگی کا انکشاف کر دیا تھا ورنہ وہ حامد علی سے گارڈز کو پیچھے ہٹا لینے کیلئے نہ کہتا۔

کوٹھی کی دونوں سمتوں میں میرے جیالے بھی موجود تھے اور انٹیلی جنس والے بھی! مجھے اسی لیے قدرے اطمینان تھا کہ سولومن فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ پھر بھی میں تذبذب کا شکار تھی۔ دھوئیں کے بم پھینک کر وہ ان کی نظروں سے بھی اوجھل ہو سکتا تھا۔ اسی دھوئیں نے مجھے بے بس سا کر رکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے اب کیا قدم اٹھانا چاہیئے!

یہ شاید میری خوش بختی ہی تھی کہ گہرے دھوئیں کے درمیان سے نکل کر ایک ہیولا مجھے سینے کے بل رینگتا ہوا بائیں جانب موجود ایک درخت کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ میرے سارے جسم میں تیز سنسنی

کی لہر سی دوڑ گئی۔ گہرے دھوئیں میں سے باہر آنے والا سولومن ہی ہو سکتا تھا۔ وہ درخت عقبی پھاٹک سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ سولومن غالباً اس درخت پر چڑھ کر عقبی پھاٹک سے باہر چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ میں نے لمحے بھر کی بھی تاخیر کیے بغیر سولومن یا اس ہیولے کا نشانہ لیا اور ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔

زندگی میں شاید کبھی میں اتنی نہ جھنجلائی ہوں گی جتنی اس وقت جھنجلائی۔ میرے ریوالور میں گولیاں ختم ہو چکی تھی۔ وہ ہیولا اب تیزی سے رینگتا ہوا درخت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میرے پرس میں گولیاں موجود تھیں مگر جب تک میں ریوالور لوڈ کرتی وقت نکل جاتا۔ میں نے کمانڈر نواز کی طرف دیکھا اس کے ہاتھ میں ریوالور موجود تھا اور ریوالور کی نال پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ اس نے یا تو سولومن کو نہیں دیکھا تھا یا پھر ابھی تک اس کے حواس قابو میں نہیں آئے تھے۔ بہر حال میں نے اپنا ریوالور لوڈ کرنے کی بجائے کمانڈر نواز کے ہاتھ سے اس کا ریوالور جھپٹ لیا۔ اب وہ ہیولا بڑی حد تک واضح ہو چکا تھا۔ کسی بندر ایسی پھرتی کی طرح وہ درخت کے تنے پر چڑھ رہا تھا۔

میرے ذہن پر یا تو جھنجلاہٹ کا غلبہ تھا یا پھر میں نے عجلت سے کام لیا تھا ورنہ میرا نشانہ خطا نہ جاتا۔ یوں بھی متحرک ہدف کا نشانہ لینا آسان نہیں ہوتا۔ میری چلائی ہوئی گولی، سولومن کے دونوں پیروں کے درمیان درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی تھی۔ سولومن کو یقیناً یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس پر فائر کیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ انتہائی تیزی کے ساتھ تنے کے اس حصے کی طرف نہ چلا جاتا جو میری نظروں سے قدرے اوجھل تھا۔ مجھے یہ احساس تو ہو رہا تھا کہ کوئی تیزی سے درخت پر چڑھ رہا ہے مگر میں اسے نشانہ نہیں بنا سکتی تھی۔

بے دلی سے میں نے دوسرا فائر کیا مگر مجھے اندازہ تھا کہ میں سولومن کو نشانہ نہیں بنا سکوں گی۔

وہی ہوا بھی! وہ درخت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

عذرا خان! اس بے جگر شخص کو دیکھو! کسی نے جیسے میرے ذہن میں سرگوشی کی۔ یہ تمہارا اور تمہارے ملک وقوم کا دشمن ہے۔ اس میں اتنی ہمت و جرأت ہے کہ یہ موت کو خاطر میں نہیں لا رہا۔ یہ اجل گرفتہ اپنی حیات مختصر کے آخری لمحے تک جدوجہد کر رہا ہے! اور تم اپنے ساتھ ایک پوری ''فوج'' لے کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر پائیں! تم موت سے خوفزدہ ہو کر کسی بزدل کی طرح یہاں چھپی ہو! کیا تم واقعی مرنے سے ڈرتی ہو؟ اگر ایک عذرا خان ملک وقوم پر قربان ہو گئی تو کون سی قیامت آ جائے گی! دیکھ لو کہ وہ اکیلا ہے، تمہارا دشمن! اور تم اپنے جیالوں کے ساتھ ہو۔ تم اکیلی نہیں ہو! تمہارا پلہ بھاری ہے۔ تمہارے اور اس شخص کے درمیان اگر کوئی فرق ہے تو صرف حوصلے کا فرق ہے۔ تمہارے اندر حوصلہ نہیں اور وہ باحوصلہ ہے! وہ بے خوف ہے اور تم خوف زدہ ہو!

یہ میرے ضمیر کی آواز تھی اور میں نے اس آواز پر ہمیشہ لبیک کہا ہے۔ وہ بس چند ہی لمحے تھے جنہوں نے میری کایا پلٹ دی میں بجلی کی طرح کوند کر دیوار کی آڑ میں نکل گئی۔ یقیناً میرا دشمن غافل نہیں تھا۔ اس نے مجھ پر گولیوں کی بوچھار کر دی مگر اب مجھے کسی شے کی پروا نہیں تھی۔ میں آگ کے اس دریا کو عبور کر گئی کہ ابھی وقت قضا دور تھا۔ اگر لمحہ آخر تقدیر ہو چکا تھا تو ایک گولی بھی کافی تھی۔ میرے دشمن نے مجھے نہیں اپنی موت کو نشانہ بنانا چاہا تھا۔ گولیاں میرے اردگرد سے گزریں تو ضرور لیکن میرے جسم پر

معمولی سی خراش بھی نہیں آئی جو لوگ موت سے ڈر کر بھاگتے ہیں، انہیں موت کہیں بھی اور کسی بھی لمحے دبوچ لیتی ہے اور جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا جانتے ہیں، موت کو بھی ان کا راستہ روکنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ شاید میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے وجود میں بجلیاں سی بھر گئی تھیں اور میرے تمام حواس پوری طرح بیدار تھے۔ مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس وقت میرے کیا احساسات تھے جب میں اس درخت تک پہنچنے کے بعد تیزی سے اس کے تنے پر چڑھ رہی تھی اور سولومن مجھ پر مسلسل فائرنگ کر رہا تھا۔ جوابی فائر میں نے بھی کیے تھے، غالباً اسی لیے وہ شاخوں اور پتوں کے درمیان کہیں چھپ گیا تھا اور میں اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مقصد محض مجھے خوف زدہ کرنا ہو سکتا تھا۔ اگر میں اسے نظر آ جاتی تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ اس کے نشانے سے میں واقف تھی۔ وہ تو آواز پر فائرنگ کرتا تھا۔ پیڑ پر چڑھ کر میں نے اپنا سانس درست کیا اور اوپر نظر اٹھائی۔ ابھی سورج پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا مگر اطراف میں دھواں تھا اسی کی وجہ سے فضا میں کثافت تھی اور میری بصارت اس کثافت سے متاثر ہو رہی تھی۔ اچانک میری سماعت نے کچھ اوپر ہلکی سی سرسراہٹ محسوس کی اور میں نے گولی چلا دی۔ ریوالور کی نال پر سائیلنسر چڑھا ہونے کے سبب فائر کی آواز نہیں ہوئی۔ مجھے سولومن نظر نہیں آ رہا تھا سرسراہٹ سے میں اتنا ہی نتیجہ اخذ کر سکی کہ وہ نہایت محتاط انداز میں اپنی جگہ بدل رہا ہے۔ میں نے شاخوں کا سہارا لے کر مزید اوپر چڑھنے کا قصد کیا اور اپنی پوزیشن تبدیل کر لی۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ نیچے والے کی نسبت اوپر والا زیادہ محفوظ ہوتا ہے اور بہتر پوزیشن میں بھی! اب میرا رخ عمارت کی طرف تھا اور میں آہستہ آہستہ شاخوں پر پیر رکھتی ہوئی اوپر چڑھ رہی تھی۔ مجھے اسی دوران میں اچانک یوں لگا جیسے پیڑ کی اوپر شاخوں کو زور سے ہلایا گیا ہو۔ وہ نچلی شاخیں بھی ہلنے لگی تھیں جن کا سہارا لے کر میں مزید اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوئی بندر جیسے کسی بڑی اور مضبوط شاخ کو پکڑ کر جھولتا ہے اور اس وقت دوسری شاخیں بھی زور زور سے ہلنے لگتی ہیں، میں ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اس سے سولومن کا مقصد کیا تھا، یہ مجھے چند ہی لمحے بعد معلوم ہو گیا۔

ایک بڑی شاخ کو میں نے عمارت کی نصف منہدم چھت کی طرف تیزی سے جھکتے دیکھا اور اسی لمحے مجھے سولومن نظر آیا۔ اس نے عمارت کی چھت پر کودنے کی کوشش میں پیڑ کی شاخ چھوڑ دی میں نے اس کا نشانہ لیا مگر فائر نہ کر سکی۔ وہ عمارت کی چھت پر ایک طرف بھاگنے لگا تھا۔

میرے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں بھی سولومن کی تقلید کروں۔ سو میں انتہائی تیزی سے درخت کی اوپری شاخوں تک پہنچی اور وہی حرکت کی جو سولومن نے کی تھی۔

جب تک میں نیم منہدم عمارت کی چھت پر پہنچی، سولومن زقندیں بھرتا ہوا چھت کے کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ چھت خاصی بڑی تھی۔ میرے اور سولومن کے درمیان بھی خاصا فاصلہ تھا، پھر بھی میں نے دیکھ لیا کہ اس نے اپنے بیگ سے کوئی شے نکال کر نیچے پھینکی ہے۔ سولومن کی پشت میری جانب تھی۔ دھماکہ ہوا تو میں سمجھ گئی کہ وہ ہینڈ گرنیڈ تھا۔ ہینڈ گرنیڈ پھینکتے ہی وہ ہٹ گیا تھا ورنہ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جاتا۔ نیچے سے اس پر زبردست فائرنگ ہوئی تھی۔ فائرنگ کرنے والے میرے ہی جیالے ہو سکتے تھے یا پھر ان ہی کے ساتھ انٹیلی جینس والے بھی! میں نے گیس ماسک اتار دیا۔

''سولومن! میں اس کی طرف بھاگتے ہوئے چیخ اٹھی۔ ''آج فیصلے کا دن ہے، تم بچ نہیں سکتے! ہتھیار پھینک دو۔''

وہ چونک کر پلٹا اور مجھ پر فائر کردیا جو میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں اس کے پلٹتے ہی چھت پر لیٹ گئی تھی اور گولی میرے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس بار میں نے یاد رکھا تھا کہ ریوالور سے کتنے فائر کر چکی ہوں! یہ ریوالور میرا نہیں کمانڈر نواز کا تھا۔ یہ امکان بھی تھا کہ اس نے بھی کوئی فائر کیا ہو میں نے اسی لیے لیٹے لیٹے پرس کھول کر گولیاں نکالیں اور ریوالور لوڈ کر لیا۔ یہ مہلت میرے لیے غنیمت ثابت ہوئی تھی کیونکہ ریوالور خالی تھا۔ چھت پر کودنے کے بعد میں نے اسی اندیشے کے تحت سولومن کا نشانہ نہیں لیا تھا کہ کہیں ریوالور خالی نہ ہو!

ریوالور لوڈ کرتے ہوئے چند ہی لمحوں کو میں سولومن کی طرف سے غافل ہوئی تھی کہ اس نے کہرام بپا کردیا۔ پے درپے زبردست دھماکے اور چیخیں سنائی دیں اور پھر گہرا دھواں پھیلنے لگا۔ لیٹے ہی لیٹے میں نے سولومن کی پشت کا نشانہ لینا چاہا مگر اسی لمحے اس نے چھت سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ایک بار پھر گیس ماسک کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ میں اٹھ کر چھت کے کنارے کی طرف بھاگی وہاں تک پہنچنے میں مجھے بمشکل چند ساعتیں لگی ہوں گی۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو مجھے دھواں ہی دھواں نظر آیا۔ یہ سوچے بغیر کہ میں کتنی بلندی پر ہوں، دوسرے ہی لمحے میں نے بھی نیچے چھلانگ لگا دی۔ بلندی یقیناً زیادہ نہیں تھی اور میں اپنے جسم کو بھی سمیٹے ہوئے تھی اس لیے نیچے کودنے سے خفیف سا جھٹکا تو لگا مگر چوٹ نہیں آئی۔

معاً میں نے ایسی آوازیں سنیں جیسے کوئی شخص کسی موٹر بائیک کو سٹارٹ کرنے کے لیے کک لگا رہا ہوں، دھویں کے مرغولوں میں کچھ نظر تو آ نہیں رہا تھا، میں اسی لمحے اس آواز کے تعاقب میں بھاگی۔

ابھی میں نے زیادہ فاصلے طے نہیں کیا ہوگا کہ میرا پیر کسی شے سے ٹکرایا اور میں اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ بے سدھ گرتے ہوئے میں نے اپنے حواس برقرار رکھے اور ہوا میں ہاتھ چلائے کہ گرنے سے پہلے کچھ پکڑ لوں اور مجھے ناکامی نہیں ہوئی وہ کوئی ٹھوس شے تھی جسے پکڑتے ہی میں نے اپنے جسم کو سنبھال لیا تھا۔

دبیز دھوئیں میں مجھے ایک جیپ کا ہیولا نظر آیا۔

جیپ خالی ہی تھا۔ گرتے ہوئے اسی کا دروازہ میرے ہاتھ آ گیا تھا جو کھلا ہوا تھا وہ جیپ جس کی بھی تھی یا تو وہ شخص جیپ سے اتر کر لقمہ اجل بن چکا تھا یا پھر شدید زخمی تھا یا کہیں آس پاس بے ہوش پڑا تھا۔ میں جس شے سے ٹکرائی تھی، جھک کر اسے ٹٹولا تو جھرجھری سی آ گئی خون کی چپ چپاہٹ میں نے محسوس کر لی تھی۔ جیپ کے قریب ہی پڑی ہوئی وہ کسی کی لاش ہی تھی۔ ممکن ہے یہ اسی جیپ کے مالک کی لاش ہو یہ سوچ کر میرے دل پر چوٹ سی لگی یا تو وہ میرا ہی کوئی جاں باز تھا یا انٹیلی جینس کا کوئی آدمی جو دستی بم کا ٹکڑا لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔

رنج کی اس فضا میں کسی موٹر سائیکل کے سٹارٹ ہونے کی آواز نے مجھے متحرک کر دیا۔ وہ آواز عقب سے آئی تھی اور فاصلہ زیادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں سرعت سے جیپ میں سوار ہوئی اور

اگنیشن میں لگی ہوئی چابی کو گھمایا۔ جیپ سٹارٹ کرنے میں مجھے چند ہی لمحے لگے۔

تیزی سے میں نے جیپ کا رخ تبدیل کیا جیپ کسی شے سے ٹکرائی مگر میں نے پروا نہ کی اور پھر ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔ دھوئیں کی وجہ سے میں صرف اندازے کے مطابق موٹر سائیکل کی آواز کی طرف بڑھ رہی تھی۔

چکراتے ہوئے دھوئیں کے اس حصار سے نکلتے نکلتے جیپ کئی بار اچھلی بے قابو ہوئی جگہ جگہ ٹکرائی مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور بالآخر وہاں سے نکل ہی آئی۔ اب سارے منظر واضح تھے اور فضا آلودہ نہیں تھی میں نے ایک ہاتھ سے گیس ماسک اتار کر پرس میں رکھ لیا، اس سے پہلے جیپ میں سوار ہونے کے بعد ریوالور بھی پرس میں رکھ چکی تھی۔ غیر آلودہ فضا میں پہنچ کر مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ سرکاری جیپ تھی اس میں سوار کوئی انٹیلی جینس ہی کا شخص ہو سکتا تھا۔

کافی فاصلے پر مجھے ایک بائیک کی ریڈ لائٹ نظر آ رہی تھی اور میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں اسی کے ساتھ لحہ بہ لحہ میں جیپ کی رفتار بڑھاتی جا رہی تھی سڑک پر ٹریفک برائے نام تھی مجھے تیز رفتاری میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

اتنی تباہی و بربادی پھیلا کر درجنوں تجربہ کار مسلح آدمیوں کے نرغے سے نکل جانا ہنسی کھیل نہیں تھا۔ سولومن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید فرار ہونے کا تصور بھی نہ کر پاتا، مگر وہ تو کچھ اور ہی شے تھا۔ جان ہتھیلی پر رکھنا شاید اسی کو کہتے ہیں لیکن ابھی موت اس کے تعاقب میں تھی۔ معلوم نہیں اسے یہ احساس تھا بھی یا نہیں!

میرے کپڑے گرد آلود اور شکن شکن تھے۔ حلیہ بگڑا ہوا تھا مگر اس وقت مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ ہوش اگر تھا تو صرف یہ کہ کسی بھی قیمت پر مجھے سولومن کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا۔

جیپ اور موٹر بائیک کا درمیانی فاصلہ خاصا کم ہو گیا تھا۔ اب سولومن فائر کی رینج میں تھا میں نے پرس سے ریوالور نکال کر دائیں ہاتھ میں لے لیا اور بائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر جیپ سے باہر دور تک دیکھا۔ سائیلنسر کی وجہ سے مجھے خطرہ نہیں تھا کہ فائر کی آواز سن کر لوگ میری طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ ہاں قریب سے کسی کار یا دیگر سواری میں گزرنے والا میرے ہاتھ میں ریوالور ضرور دیکھ لیتا جس کی مجھے زیادہ پروا نہیں تھی۔ عموماً ایسے مواقع پر لوگ کسی خطرے سے دوچار ہونے کی بجائے خاموشی سے فرار ہو جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

دایاں ہاتھ جیپ سے باہر نکال کر میں نے سولومن پر فائر کیا۔ گولی اس کے سر پر لگنے کی بجائے شانے پر لگی اور موٹر سائیکل کی سیٹ سے اچھل کر وہ سڑک کے کنارے جا پڑا۔ میں اسے پہچان چکی تھی۔ وہ سولومن ہی تھا اس کے چہرے پر میک اپ نہیں تھا۔ خالی موٹر بائیک بائیں جانب سڑک کے نشیبی حصے میں جا گری۔

میری جیپ آندھی اور طوفان کی طرح اس جگہ پہنچ گئی جہاں سولومن زمین سے اٹھ کر خون آلود شانہ پکڑے بائیں سمت نشیب میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جیپ رکتے ہی میں نے اپنا پرس تھاما اور باہر چھلانگ لگا دی۔ میرے ہاتھ میں اب بھی ریوالور تھا۔ زخمی سولومن کے بائیں شانے پر اب بھی ایئر بیگ لٹکا ہوا تھا اور اسی ایئر بیگ میں وہ تباہ کن بم تھے جنہوں نے اسے موت کے گھیرے سے نکالا تھا اس میں ہینڈ گرنیڈ بھی تھے، دھوئیں کے بم بھی اور بے ہوش کر دینے والی گیس کے چھوٹے پلاسٹک بم بھی! اس کے علاوہ بیگ میں اور بھی خطرناک ہتھیار تھے۔

میں سولومن کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کا تعاقب کرتے ہوئے میں ساحل سمندر کے قریب ایک ایسے علاقے میں آ گئی تھی جہاں کنسٹرکشن کا کام ہو رہا تھا۔ یہ علاقہ تقریباً سنسان سا تھا دن کے وقت یہاں یقیناً مزدور اور دوسرے لوگ موجود رہتے ہوں گے مگر اب تاریکی پھیلنے لگی تھی اور دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

زخمی حالت میں نو تعمیر اور ادھورے تعمیر شدہ بنگلوں کی طرف بھاگتے ہوئے سولومن کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ سفاک و خطرناک شخص اب میرے رحم و کرم پر تھا۔ اس کی گردن پر نہ جانے کتنے بے گناہوں کا خون تھا۔ اس کی موت عبرتناک ہونی چاہیے تھی اسی خیال کے پیش نظر میں نے اس کی ٹانگوں پر فائر کیا، گولی کھا کر وہ منہ کے بل کچی زمین پر گر پڑا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کے زخمی ہاتھ میں ریوالور تھا۔ معلوم نہیں اس نے کب اور کیسے بھاگتے بھاگتے ریوالور نکال لیا تھا! گرتے ہی اس نے مجھ پر گولی چلائی مگر لا حاصل! وہ شاید اپنے حواس کھوتا جا رہا تھا کیونکہ گولی مجھ سے کافی دور سے گزر گئی تھی۔

میں ابھی سڑک پر تھی اور وہ بھاگ کر ایک نو تعمیر بنگلے کے قریب پہنچ کر میری چلائی ہوئی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ گولی اس کی دائیں ران میں لگی تھی۔

''سولومن!'' میں نے سڑک سے نشیب میں اترتے ہوئے بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔

''اب تم جنگ ہار چکے ہو! بہتر یہی ہے کہ خود کو تقدیر کے حوالے کر دو!...... ممکن ہے کہ اس طرح......''

میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ فضا ایک دھماکے سے گونج اٹھی۔ زمین سے اٹھے بغیر اور نو تعمیر بنگلے کے گیٹ کی طرف گھسٹتے ہوئے سولومن نے مجھ پر فائر کر دیا تھا اور اس بار سولومن کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔ اس نے بھی میرے شانے کو نشانہ بنایا تھا یا پھر میرے سینے کی بجائے گولی شانے میں لگی تھی۔

میرے دائیں شانے میں آگ سی اترتی چلی گئی اور ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ شدید اذیت کی وجہ سے اور سولومن کے مزید خطرناک عزائم سے بچنے کے لیے میں زمین پر اوندھی لیٹ گئی میرے شانے سے خون بہہ رہا تھا۔ اگر میں بروقت نہ لیٹ گئی ہوتی تو سولومن کی طرف سے کیے جانے والے دوسرے فائر کی زد سے نہ بچ سکتی۔

میرا دشمن خود شدید زخمی ہونے کے باوجود مجھے بھی زخمی کر چکا تھا اور میں غیر مسلح تھی۔ ریوالور مجھ سے دور تھا۔ تکلیف و اذیت کے باوجود میں لڑھکتی ہوئی اس جگہ تک پہنچ گئی اور ریوالور کو بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔

میں نے بائیں ہاتھ کو بلند کر کے سولومن کا نشانہ لیا جو نو تعمیر بنگلے کے کھلے گیٹ کے اندر گھستا ہوا داخل ہو رہا تھا۔

زندگی اور موت کی یہ جنگ مجھے ہر قیمت پر جیتنا تھی، نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر الٹے ہاتھ سے سولومن پر فائر کر دیا، وہ اس وقت اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح بنگلے کے اندر پہنچ جائے، جس پر ابھی رنگ و روغن ہونا باقی تھا۔ پہلا فائر رائیگاں گیا تو میں نے وقت ضائع کیے بغیر دوسرا فائر کر دیا۔ اس بار گولی اس کے کولہے میں لگی۔ اسی کے ساتھ میں نے اس کی چیخ بھی سنی۔ میری چلائی ہوئی گولی شاید اس کے کولہے کی ہڈی میں پیوست ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود وہ گیٹ کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب میں کھلے میں تھی اور سولومن آڑ میں! ایک بار پھر اس کا پلا بھاری تھا۔ اب تک میری چلائی ہوئی تین گولیاں اسے شدید زخمی کر چکی تھیں۔ پہلی گولی اس کے دائیں ہاتھ میں لگی تھی، اس وقت جب وہ حامد علی کی کوٹھی میں تباہی مچا رہا تھا، میری دوسری گولی نے اس کے بائیں شانے کو نشانہ بنایا تھا اور تیسری گولی ابھی چند لمحے پہلے اس کے کولہے میں اتر چکی تھی پھر بھی وہ ہوش و حواس میں تھا مگر سولومن ایسے کسی شخص کے لیے یہ بات قابل حیرت نہیں تھی۔

میرے شانے سے خون بہہ رہا تھا اور میں شدید تکلیف میں تھی، لیکن یہ وقت ہی تو میری قوت ارادی کی آزمائش کا تھا۔ صرف چند لمحے میں بے حس و حرکت زمین پر لیٹی رہی، پھر نو تعمیر بنگلے کی طرف سینے کے بل میں نے رینگنا شروع کر دیا۔ زمین سے اٹھ کر کھڑا ہو جانا حماقت ہی ہوتی۔ اس طرح سولومن مجھے با آسانی شکار کر لیتا۔

براہ راست بنگلے کے گیٹ کی طرف جانا اپنی موت کو خود دعوت دینے کے مترادف ہوتا، اسی خیال کے تحت میں نے اپنا رخ تبدیل کر لیا، اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی آیا۔ میں نے اس پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی۔

میرے پرس میں ٹرانسمیٹر موجود تھا۔ میں نے اس پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر لیا محدود فریکوئنسی کا وہ چھوٹا سا منی سائز ٹرانسمیٹر کم از کم کراچی کی حدود تک بہر حال کارآمد تھا۔

''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر'' کا چارج اس وقت عثمانی کے پاس تھا۔ ٹرانسمیٹر پر میری آواز پہچان کر وہ اپنی باری آنے پر شدید حیرت سے بولا ''میڈم! آپ کہاں ہیں؟ کمانڈر کی آخری رپورٹ کے مطابق آپ سولومن سے معرکہ آرائی میں مصروف تھیں۔ پھر...... پھر نہ سولومن کا کوئی سراغ ملا اور نہ آپ کی خبر ملی۔ اوور!''

''وقت کم ہے عثمانی! مختصر بات کرو! اس وقت بھی میرے اور سولومن کے درمیان موت اور زندگی کی جنگ جاری ہے۔ اس جنگ کا انجام کیا ہوگا، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مم...... مجھے گولی لگ چکی ہے مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں، گولی نے فی الحال میرے دائیں ہاتھ کو بیکار کیا ہے، پھر بھی میں بائیں ہاتھ سے فائر کر رہی ہوں۔ وہ لوکیشن نوٹ کرو جو میں بتا رہی ہوں۔'' کراہتے ہوئے میں نے عثمانی کو اچھی طرح لوکیشن سمجھا دی اور پھر ''اوور اینڈ آل'' کہنے والی تھی کہ زبردست دھماکہ ہوا۔

سولومن نے گیٹ کے باہر دستی بم پھینکا تھا جس سے دور تک گرد و غبار اڑنے لگا تھا۔ میں کیونکہ پہلے ہی اپنا رخ تبدیل کر چکی تھی اس لیے صرف گرد و غبار کی زد میں آئی اور مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

ٹرانسمیٹر کا سوئچ اب تک آن تھا اس لیے دھماکے کی آواز یقیناً عثمانی کو بھی سنائی دی ہوگی۔
اس خیال سے کہ کہیں عثمانی کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے، میں نے سلسلہ منقطع کرنے سے پہلے کہا۔

”عثمانی! اس نے ہینڈ گرنیڈ پھینکا تھا مگر میں دور تھی، مجھے...... کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ تم پوری لوکیشن سمجھ تو چکے ہو، نا؟...... جہاں تم لوگوں کو سڑک کے کنارے بائیں جانب جیپ کھڑی ملے گی، اسی کے بالکل مقابل بائیں سمت ہی کچھ فاصلے پر وہ نوتعمیر بنگلہ ہے، پہلی رو کا پہلا بنگلہ! اس پر رنگ و روغن بھی ابھی نہیں ہوا ہے، سمجھ گئے؟ اوور!

”جی...... جی ہاں میڈم میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ میں...... میں خود آ رہا ہوں اور کچھ؟ اوور! عثمانی کی آواز شدت جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ میرے جیالے مجھ پر کتنی جان چھڑکتے ہیں اور میں اس کی نظر میں کس قدر قابل تعظیم ہوں!

پھر مزید کچھ کہے بغیر میں نے ”اوور اینڈ آل کہا اور ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔

اب میرا ذہن ہر فکر سے آزاد ہو چکا تھا اگر میں زندگی کی جنگ ہار بھی جاتی تو آخری لمحات میں مجھے یہ ملال نہ ہوتا کہ میری لاش موت کے بعد وہیں نہ جانے کب تک بے گوروکفن پڑی رہے گی۔

جنگ تو جنگ ہوتی ہے، اس میں فتح بھی ہوتی ہے اور شکست بھی! باشعور و باہوش وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے آخری سانس تک جنگ آزما رہنے کے باوجود یہ نہیں بھولتے کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی ہوتا ہے۔ یعنی ہمیشہ فتح مند رہنے والے شکست بھی کھا جاتے ہیں۔ مجھے باشعور ہونے کا دعویٰ تو خیر بھی نہیں رہا لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ ہر عروج کو ایک روز زوال آمادہ ہونا پڑتا ہے۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ فتح ہمیشہ سچائی کی ہو اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ خیر و شر کی پیکار میں بھی کبھی شر بھی خیر پر غالب آ جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ٹیپو سلطان شہید نہ ہوتے! تاریخ کے صفحات ایسی متعدد مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ سو میں غافل نہیں تھی خیر کے لیے برسرپیکار ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بالآخر غالب خیر ہی رہے۔

تکلیف و اذیت کے ان لمحات میں مایوسی تو مجھے نہیں تھی لیکن کوئی خوش فہمی بھی بعید از حقائق تھی۔ پوری طرح تاریکی پھیل جانے سے پہلے میں اپنے دشمن جاں تک پہنچ جانا چاہتی تھی ورنہ وہ تاریکی سے فائدہ اٹھا کر میری نگاہوں سے جانے کب تک کے لیے اوجھل ہو جاتا پھر دوبارہ کوئی ایسا موقع ملنا محال ہی تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے حتی الامکان تیزی کے ساتھ زمین سے اٹھ کر بنگلے کی طرف دوڑنا شروع کر دیا میں نے اپنے دشمن کو اس قدر زخمی کر دیا تھا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اسی لیے اب مجھے اس کی طرف سے یہ خطرہ نہیں رہا تھا کہ زمین سے اٹھ کر دوڑتے ہوئے وہ مجھے گولی مار سکتا ہے ہاں پہلے جب وہ اس بنگلے میں داخل نہیں ہوا تھا تو یہ خطرہ بہرحال تھا اب تو میں اس کی نظروں سے اوجھل تھی۔ پھر یہ کہ بنگلے کے گیٹ سے بھی فاصلے پر تھی۔ میرے اندازے کے مطابق سولومن گیٹ ہی کے قریب لیٹا ہوا یا بے سدھ پڑا ہوا اس جدوجہد میں مصروف تھا کہ میں بنگلے کے قریب نہ آ سکوں اس نے کچھ دیر پہلے اسی لیے دستی بم، گیٹ کے باہر پھینکا تھا۔

میں اس بنگلے کے کمپاؤنڈ کی دیوار تک پہنچنے سے پہلے رک گئی میں اپنے دشمن کو غفلت میں

رکھنے کی خاطر اب دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی تاکہ وہ میرے قدموں کی چاپ سن کر چوکنا نہ ہو جائے۔

دیوار کے قریب پہنچ کر میں نے دوسری جانب موجود سولومن کی موجودگی کو محسوس کرنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکی دوسری طرف معمولی حرکت کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں سولومن بے ہوش تو نہیں ہو گیا؟ پھر خود ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا وہ سولومن تھا، کوئی اور نہیں کہ اس کی قوت ارادی اتنی جلدی جواب دے جاتی۔

بنگلے کے اندر سناٹا طاری تھا جیسے اس میں کوئی ذی روح نہ ہو میں نے چند لمحات میں ایک فیصلہ کر لیا میں دایاں ہاتھ تو اٹھا بھی نہیں سکتی تھی۔ سو ریوالور منہ میں دبا لیا پرس پہلے ہی میرے بائیں شانے سے لٹک رہا تھا بنگلے کی دیوار میرے سر سے کچھ بلند تھی اور میں دوسری طرف جھانک کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے دوسری جانب پہنچنے کے لیے اسی دیوار پر چڑھنا تھا۔

میں نے اپنا بایاں ہاتھ بلند کیا اور پنجے دیوار پر جما دیا پھر آہستہ آہستہ اپنے جسم کا سارا بوجھ بائیں ہاتھ پر ڈال دیا اور اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ دایاں ہاتھ زخمی ہونے کی وجہ سے مجھے صرف بائیں ہاتھ پر تمام بوجھ ڈالنا پڑ رہا تھا۔ یہ مشکل تو ضرور تھا کہ میں اس طرح دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاتی، لیکن ناممکن بہرحال نہیں تھا۔ سو جو کام ناممکن نہ ہو اس کے لیے جان لڑائی جا سکتی ہے۔

آہستہ آہستہ میرا جسم اوپر اٹھتا گیا میں اس کوشش میں پسینے پسینے ہو گئی لیکن حوصلہ نہ ہارا اور دیوار پر چڑھ ہی گئی۔

کمپاؤنڈ وال پر چڑھتے ہی میں نے ریوالور بائیں ہاتھ میں لے لیا تھا۔ کمپاؤنڈ میں میری نظر گیٹ کے قریب گئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ گیٹ کے سامنے دائیں جانب ڈھیر سارا خون پڑا تھا اسی کے ساتھ اندرونی دروازے تک خون اس طرح پھیلا ہوا تھا جیسے کوئی گھسٹتا ہوا بنگلے کے اندر گیا ہو۔ ایک طرف کمپاؤنڈ ہی میں دروازے کا ایک پٹ پڑا ہوا تھا۔ میں دراصل جس بنگلے کو نوتعمیر سمجھ رہی تھی وہ تعمیر شدہ نہیں تھا بلکہ وہاں ابھی خاصا کام باقی تھا۔ وہ علاقہ اس زمانے میں کیونکہ آبادی سے دور تھا اور وہ دور بھی آج کل کی طرح ڈاکوں اور لوٹ مار کا دور نہیں تھا۔ غالباً اسی لیے زیرتعمیر بنگلے کو مزدور وغیرہ اسی طرح کھلا چھوڑ گئے تھے۔

میں دھیرے سے احتیاط کے ساتھ کہ آواز نہ ہو کمپاؤنڈ میں اتر گئی۔ یہ بات مجھ پر واضح ہو چکی تھی کہ دستی بم گیٹ سے باہر پھینک کر سولومن وہاں رکا نہیں ہو گا وہ بنگلے کے اندر ہی تھا، خود اسی کا خون یہ نشاندہی کر رہا تھا۔

بنگلے کے صدر دروازے کا بھی ایک پٹ چڑھا ہوا تھا اور دوسرا باقی تھا۔ میں خون کے نشانات دیکھتی ہوئی راہداری سے صحن میں آ گئی۔ عین اس وقت ایک طرف سے گولی چلی اور میرے پہلو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور میں اوندھے منہ زمین پر گر پڑی اسی کے ساتھ ایک زہریلا قہقہہ میری سماعت میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترتا چلا گیا اور وہ مجنونانہ قہقہہ سولومن کا تھا۔ نیم تاریکی میں پہلے وہ مجھے نظر نہیں آ سکا۔ اس کا زہریلا قہقہہ سن کر میں نے دائیں جانب گردن گھمائی کہ

مجھ پر اسی طرف سے فائر ہوا تھا اور قہقہے کی آواز بھی ادھر ہی سے آئی تھی۔

اس وحشیانہ قہقہے کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ سولومن کو اپنی فتح کا یقین ہو چکا تھا۔

دائیں جانب بنے ہوئے نوتعمیر کمرے کے برآمدے میں وہ ایک ستون کی آڑ میں تھا لیکن یہ آڑ برائے نام ہی تھی۔ صرف اس کا سر میری نظروں سے اوجھل تھا میں نے اپنے پہلو میں لگی ہوئی آگ اور بہتے ہوئے خون کو نظرانداز کر کے لیٹے ہی لیٹے کروٹ لی اور پھر جیسے مجھ پر جنون طاری ہو گیا یکے بعد دیگرے میں نے اپنے ریوالور میں موجود باقی تمام گولیاں سولومن کے جسم میں اتار دیں اور میرا ریوالور خالی ہو گیا۔ میں نے ہر گولی پر اس کے جسم کو اچھلتے اور تڑپتے دیکھا پھر وہ آخری منظر میرے لیے بڑا ہولناک تھا جب تڑپتے ہوئے سولومن نے مجھ پر شاید آخری فائر کیا۔

میں اس وقت زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ جیسے قضا کا شعلہ میں نے اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ میرے چہرے کا رخ سولومن ہی کی طرف تھا مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں نے اپنا سر جھکانا چاہا تھا کہ گولی سر میں نہ لگے مگر کامیابی نہیں ہو سکی تھی اس ظالم نے یقیناً میرے سر ہی کا نشانہ لیا تھا۔

سر میں گولی لگتے ہی میرے اردگرد اندر اور باہر تاریکی پھیلتی چلی گئی تھی۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ میں موت کی مہربان آغوش میں جا رہی ہوں معلوم نہیں میں کلمہ بھی پورا پڑھ سکی تھی یا نہیں!

☆......☆......☆

انجانی سی دنیا، خواب خواب سی فضا، کیفیت درد میں ڈوبی ہوئی سی شب تار، کبھی اجالا، کبھی اندھیرا اور ان کے درمیان میرا وجود ہوش بھی اور بے ہوشی بھی، خوابیدگی بھی اور بیداری بھی! تاب گفتن بھی اور ناگفتی بھی، منظر دھندلے بھی اور واضح بھی! شعور سے لاشعور کا سفر، سرحد ادراک سے ماورائے ادراک کی جھلک! خوں رنگ تماشا اور کرب و اذیت جسم میں اترتے ہوئے تیر اور چمکیلے نشتر! جانے اور انجانے چہروں کا ہجوم اور ان چہروں پر فکر وتردد کے آثار آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی، لرزیدہ لبوں پر شاید حرف دعا! مجھے نہیں معلوم کہ گردش روز و شب کے درمیان کب تک اور کتنے عرصے میں اسی حال میں رہی، کتنے دن زندگی اور موت کے درمیان میرا وجود ہوش اور بے ہوشی کے درمیان رہا۔ اس عرصے میں جو کچھ میں نے محسوس کیا بیان کر چکی ہوں کہ اس کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں۔

جب میرے شعور نے حواس پر پہلی دستک دی تو میں نے خود کو آشنا در و دیوار کے درمیان پایا اور پھر مجھے سب کچھ یاد آتا گیا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ میں زندہ ہوں، موت میری رگ جاں تک نہیں پہنچ سکی، خدائے بزرگ و برتر نے مجھے بچا لیا تھا کہ وہی ہر شے پر قادر ہے۔ میرے خدا نے مجھے نئی زندگی دی تھی۔ اس کی عطا اور احساس شکر میں میری آنکھیں نم ہو گئیں، پھر یادوں کے غبار میں مجھے ایک سفاک و بے رحم چہرہ نظر آیا۔ یہ چہرہ میرے دشمن جاں کا چہرہ تھا۔ سولومن کا چہرہ! اس کے اور میرے درمیان موت وحیات کی کشمکش جاری تھی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ مجھے موت کے اندھیروں میں دھکیل دے اور میری سعی یہ تھی کہ اس بھیڑیئے کو اس کے انجام تک پہنچا دوں۔ اس جنگ میں غالب کون رہا؟ کلیتہ اس سوال کا جواب ابھی میرے پاس نہیں تھا۔ جزوی طور پر میرا زندہ وجود اس کا جواب ضرور تھا کہ میرا دشمن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ سولومن اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا یا نہیں؟ یہ سوال بھی تشنہ جواب تھا۔ اس سوال کا جواب یقیناً کمانڈر نواز دے سکتا تھا جو میرے بیڈ کی دائیں جانب فکرمند سا کھڑا تھا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی مگر نقاہت اور شدید کمزوری کے سبب میری آواز نہ نکل سکی۔

میڈیکل کور کے انچارج ڈاکٹر رشید نے غالباً میرے ہونٹوں کی حرکت سے یہ سمجھ لیا کہ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ وہ کمانڈر نواز ہی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ وہ تھوڑا سا جھکا اور نرم لہجے میں بولا۔

”میڈم! آپ سے درخواست ہے کہ فی الحال بولنے سے گریز کریں۔ ہر چند کہ آپ خطرے کی حدود سے نکل آئی ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو بچا لیا مگر ابھی آپ کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے۔ ہم آپ کو بلڈ بھی دے رہے ہیں اور گلوکوز کی ڈرپ بھی چڑھ رہی ہے۔ کل تک انشا اللہ آپ کی طبیعت اور

سنبھل جائے گی۔ اس وقت تک اپنے ذہن کو پرسکون رکھیں۔"

جواباً میں نے پلکیں جھکا کر ڈاکٹر رشید کو اطمینان دلایا کہ اس کی ہدایات پر عمل کروں گی۔ میں نے اثباتی انداز میں پلکیں جھپکائی تھیں۔ وہ اس لئے مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ اپنے معاون سے اس نے انجکشن کی سرنج لی اور بیڈ کی دوسری جانب آ کر میرے بائیں شانے میں انجکشن لگا دیا۔

وہ شاید کافی تیز اثر مسکن دوا تھی جو ڈاکٹر رشید نے انجکشن کے ذریعے میرے جسم میں اتاری تھی۔ اس کے زیر اثر کچھ ہی دیر کے بعد مجھ پر غفلت طاری ہونے لگی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر شب و روز اس طرح دبے پاؤں گزرنے لگے کہ مجھے ان کے گزرنے کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ سکون آور دواؤں کے زیر اثر عموماً میں غفلت کا شکار رہتی۔ اس دوران میں میرے زخم بھرتے گئے اور اسی عرصے میں مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو گیا جسے جاننے کیلئے میری روح مضطرب تھی۔

میرے لئے سب سے بڑی خوش خبری یہ تھی کہ سولومن اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ سمندر کے کنارے واقع زیر تعمیر بنگلوں میں سے ایک بنگلے میں سیل کے ارکان کو گولیوں سے چھلنی سولومن کی لاش مل گئی تھی۔ اس بنگلے کا پتا میں نے ہی ٹرانسمیٹر پر سیل کے نائب انچارج عثمانی کو دیا تھا۔ وہیں عثمانی کو میرا لہولہان جسم بنگلے کے صحن میں پڑا نظر آیا تھا۔ یہ وہی زیر تعمیر بنگلہ تھا جس میں سولومن اور میرے درمیان آخری معرکہ آرائی ہوئی تھی۔

سولومن کی لاش قانون کے حوالے کر دی گئی تھی اور مجھے بے ہوشی کی حالت میں عثمانی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے آیا تھا۔ میری زندگی خطرے میں تھی اس لئے میڈیکل کور کے انچارج ڈاکٹر رشید کے ایما پر ملک کے ایک بڑے سرجن کی خدمات فوری طور پر حاصل کر لی گئی تھیں۔ کمانڈر نواز خود سرجن سے ملا تھا اور کسی طرح گراں قدر معاوضے پر اسے راضی کر لیا تھا کہ وہ ایک بڑے پرائیویٹ ہاسپٹل میں میرے سر کا آپریشن کرے جس میں گولی پیوست تھی۔ خود ڈاکٹر رشید اور دیگر کئی سرجنوں نے اس اہم آپریشن میں ملک کے اس مایہ ناز سرجن کی معاونت کی تھی۔ وزارت داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری سے رابطہ قائم کر کے کمانڈر نواز نے یہ بندوبست کر لیا تھا کہ پولیس کیس نہ بنے اور قانون کے روبرو اس سلسلے میں کوئی وضاحت نہ کرنا پڑے۔ وزیر داخلہ سے مجھے رات نو اور دس بجے کے درمیان اسی شب خون پر بات کرنا تھی مگر انہیں اس سے پہلے ہی کراچی سے جنرل حامد علی کے ذریعے رپورٹ مل گئی کہ اس کی کوٹھی میں کیا ہنگامہ برپا ہو چکا ہے!

جس وقت میرے سر کا آپریشن ہو رہا تھا اور میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی، وزیر داخلہ نے آپریشن سیل سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ وہ یہ جاننے کیلئے انتہائی بے چین تھے کہ میں کہاں اور کس حال میں ہوں اور یہ بھی کہ سولومن بچ کر نکل گیا یا پکڑا گیا؟ وزیر داخلہ کا فون سیل کے ایک سینئر رکن نے ریسیو کیا تھا کیونکہ عثمانی اور کمانڈر نواز اس پرائیویٹ ہسپتال میں تھے جہاں میں تھی۔ یہ یقین ہونے کے بعد کہ دوسری جانب سے وزیر داخلہ ہی بول رہے ہیں سیل کے اس رکن نے مختصراً وزیر داخلہ کو صورتحال سے آگاہ کر دیا۔

یہ جاننے کے بعد کہ میری زندگی خطرے میں ہے وزیر داخلہ ایک خصوصی طیارے کے ذریعے

اسی رات کراچی پہنچ گئے۔ انہوں نے مجھے بیٹی کہنے کا حق نبھا دیا۔ وہ سیدھے اس ہسپتال پہنچے جہاں میں زیر علاج تھی۔ مجھے فوری نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا تھا۔ وزیر داخلہ کی آمد پر ہسپتال میں کھلبلی مچ گئی۔ ملک کے جس بڑے سرجن نے میرا آپریشن کیا تھا خود وہ اور دوسرے سرجن ہسپتال میں طلب کر لئے گئے۔ اسی رات ڈاکٹروں کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا۔ اس میڈیکل بورڈ کو شب و روز میری خبر گیری رکھنا تھا۔ پاکستانی سرجنوں ہی کے ایما پر نیورو سرجری کے دو سرجن امریکہ اور برطانیہ سے بھی بلا لئے گئے اور یہ سب کچھ سرکاری سطح پر ہوا۔ پاکستانی سرجن کیونکہ میری زندگی کی ضمانت دینے پر تیار نہیں تھے اور ابھی میرے سر کا ایک اور آپریشن بھی ہونا تھا۔ اس لئے وزیر داخلہ نے غیر ملکی سرجنوں کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ وہ اس بات پر بھی راضی تھے کہ اگر مجھے علاج کی غرض سے برطانیہ، امریکہ یا کسی اور ملک لے جانا پڑے تو لے جائیں۔

دوسرے دن شام ڈھلے غیر ملکی سرجنوں نے میرا معائنہ کیا اور یہ طے ہوا کہ میرا دوسرا آپریشن ایک ہفتے کے بعد کراچی ہی میں ہو گا۔ مجھے کہیں لے جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ البتہ انہوں نے غیر ممالک سے مزید تین سرجنوں کو پاکستان بلانے کی تجویز رکھی۔ وزیر داخلہ نے فوری طور پر اس کا بندوبست بھی کر دیا۔ میرے دوسرے آپریشن سے ایک روز قبل تینوں غیر ملکی سرجن کراچی پہنچ گئے۔ ان تینوں کی معائنہ رپورٹ حیرت انگیز تھی۔ ان کے خیال میں میرے دماغ کا جو حصہ گولی لگنے سے ڈیمج ہوا تھا اس کے بعد میری موت یقینی تھی۔ اب تک میرا زندہ رہنا ان کیلئے باعث حیرت تھا۔ انہوں نے اپنی معائنہ رپورٹ میں لکھا تھا کہ اب تک کوئی انسانی دماغ اتنے بڑے حادثے اور نقصان پہنچنے کے باوجود حرکت میں نہیں رہ سکا۔

پہلے آپریشن کے دوران میں میرے سر کے اگلے حصے میں پیوست گولی نکال دی گئی تھی۔ اس سے میرے دماغ کے جن حصوں کو نقصان پہنچا تھا اور جواب بیکار ہو چکے تھے، دوسرے آپریشن میں انہیں میرے بقیہ دماغ سے کاٹ کر نکالنا تھا اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اسی غرض سے غیر ملکی سرجنوں کو پاکستان بلایا گیا تھا کیونکہ ذرا سی بھی لغزش کے ہولناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔

غیر ملکی سرجنوں کیلئے بھی میرا دوسرا آپریشن ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ خود بھی اس آپریشن میں عمومی دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ بھی حکومت پاکستان کے مہمان تھے اور انہیں تمام سہولتیں فراہم کی جا رہی تھیں۔ میرے شانے اور پیٹ کا آپریشن اسی ایک ہفتے کے دوران میں کر دیا گیا تھا۔ شانے سے بھی گولی نکال دی گئی تھی، پہلو میں جو گولی لگی تھی وہ آر پار ہو گئی تھی۔ اس لئے سرجن اس کی طرف سے مطمئن تھے البتہ شانے کی ہڈی کو تھوڑا سا نقصان پہنچا تھا جسے کور کر لیا گیا تھا۔

کمانڈر نواز نے مجھے بتایا تھا کہ دوسرا آپریشن آٹھ گھنٹے سے زیادہ جاری رہا تھا اور اس عرصے میں وزیر داخلہ ہسپتال ہی میں رہے تھے۔ انہوں نے فون پر صدر مملکت کو بھی میرے بارے میں رپورٹ دے دی تھی۔ صدر مملکت نے خصوصی ہدایات دی تھیں کہ ہر قیمت پر میری زندگی کو بچایا جائے۔ ان کے کہنے کے مطابق میں اپنے ملک و قوم کا سرمایہ تھی۔

دوسرے آپریشن کے بعد جب غیر ملکی اور پاکستانی سرجن آپریشن روم سے باہر نکلے تھے تو وزیر

داخلہ باہران کے منتظر تھے۔ آپریشن کامیاب رہا، یہ سن کر وزیر داخلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کمانڈر نواز نے خود اپنی اور سیل کے دوسرے ذ... ارکان کی کیفیت بیان نہیں کی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ خود ان کی حالت بھی وزیر داخلہ سے مختلف نہیں ہوگی۔

غیر ملکی سرجن میرے دماغ کا آپریشن کر کے انتہائی حیرت زدہ تھے۔ اس حیرت کا بڑا سبب خود میرا حیرت انگیز دماغ تھا۔ میرے دماغ کے جن حصوں کو نقصان پہنچا تھا اور جو بے کار ہو گئے تھے ان کی جگہ دماغ کے ان حصوں نے کام شروع کر دیا تھا جو اس حادثے سے پہلے غیر متحرک تھے۔ سرجری کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ عجیب اور ناقابل یقین واقعہ تھا۔ جو فرائض دماغ کے وہ حصے انجام دیتے تھے جو بے کار ہو چکے تھے، فعل اب دماغ کے دوسرے حصے انجام دینے لگے تھے جو پہلے بغیر متحرک اور خوابیدگی کی حالت میں تھے۔ سرجن تو یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوا مگر میں اس کی وجہ سمجھ سکتی تھی۔

وہ ہستی جو ہر شے پر قادر ہے اور وہ ہستی جو ایک قطرہ ناپاک سے انسان کے وجود کی تشکیل کر سکتی ہے اور وہ کہ جس کے قبضے میں ہماری جان ہے وہ جو ہمیں جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے وہ جو روز قیامت ہمیں خاک سے اٹھا کر دوبارہ ہمارے جسموں کو زندگی دے گا ہماری تجسیم کرے گا اس ہستی کیلئے کسی مردے میں جان ڈال دینا کون سی بڑی بات ہے! یہ جسم اسی کا تو ہے۔ اسی نے تو اس کے افعال متعین کئے ہیں سو کیا وہ اس کے افعال کی ترتیب نہیں بدل سکتا! کیا وہ دماغ کے ان حصوں کو بیدار نہیں کر سکتا جو غنودگی کی حالت میں ہوں یا غیر متحرک ہوں! یقیناً اس ہستی سے کچھ بعید نہیں۔ مجھے اسی لئے غیر ملکی سرجنوں کی طرح حیرت نہیں ہوئی۔ کمانڈر نواز سے یہ واقعات سن کر اپنے خدا پر میرا ایمان اور بھی پختہ ہو گیا، جہاں انسانی عقل حیرت میں ڈوب جائے وہیں سے تو قادر مطلق کے اختیارات کی سند ملتی ہے۔ سو میرے باب میں بھی یہی ہوا تھا۔ قضا و قدر کے فیصلے کرنے والی ذات مجھ حقیر سے شاید ابھی اور بہت سے کام لینا چاہتی تھی۔

ریٹائرڈ جنرل حامد علی کی کوٹھی میں سولومن سے معرکہ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ انٹیلی جنس کے دو افراد اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے جاں بحق ہو گئے تھے۔ میرے جیالے کارکنوں میں سے چار کارکن شدید زخمی ہوئے تھے۔ انہی زخمی ہونے والوں میں کیپٹن شاد بھی تھا۔ دستی بم کا ایک ٹکڑا اس کے سینے پر لگا تھا۔ کیپٹن شاداب بھی زیر علاج تھا۔ حامد علی کا بھتیجا فرحان بھی زخموں کی تاب نہ لا کر دوسرے دن چل بسا تھا۔ حامد علی کے ذاتی ملازمین میں سے ایک ملازم بھی مارا گیا تھا۔ اس کی کوٹھی کا عقبی حصہ تقریباً کھنڈر بن گیا تھا۔ اس قدر جانی و مالی نقصان کے باوجود اگر سولومن بچ کر نکل جاتا تو یقیناً مجھے رنج ہوتا لیکن وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ خود میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ دوسرے آپریشن کے دس روز بعد کمانڈر نواز مجھے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے آیا تھا کیونکہ میں خطرے کی حدود سے نکل آئی تھی۔ اس وقت سے اب تک میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کے اس حصے میں تھی جو سیل کی میڈیکل کور کیلئے مخصوص تھا۔ یہیں دوسرے کمرے میں کیپٹن شاد بھی تھا۔ ڈاکٹر رشید اور اس کے معاونین نے میری نگہداشت میں رات دن ایک کر دیئے تھے۔ اس دوران میں کئی بار وزیر داخلہ نے فون پر کمانڈر نواز سے میری خیریت معلوم کی تھی۔ ایک بار فون پر میری ان سے بات بھی ہو چکی تھی پھر وہ میری طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔

مکمل طور پر صحت یاب ہونے اور بستر علالت سے اٹھنے میں مجھے تقریباً اڑھائی مہینے لگ گئے۔ اس عرصے میں میری کوٹھی دوبارہ تعمیر ہو چکی تھی۔ میرے ہی ایما پر میرے ذاتی ملازمین طارق روڈ والے فلیٹ سے اب دوبارہ کوٹھی میں منتقل ہو چکے تھے۔ کیپٹن شاد کے سینے کا زخم ابھی نہیں بھرا تھا اس لئے وہ ڈاکٹر رشید کی ہدایت پر اب تک صاحب فراش تھا۔

جس روز مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ سولومن جہنم رسید ہو چکا ہے اس روز میں نے اپنی فرم کی منیجر عارفہ سے فون پر بات کر لی تھی۔ دوسرے ہی دن سے عذرا انٹر پرائزز کا دفتر دوبارہ کھل گیا تھا۔ دشمن کی طرف سے اب مجھے فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نئی حکمت عملی اختیار کرنے اور سولومن کی جگہ کسی اور خطرناک ایجنٹ کو پاکستان بھیجنے میں یقیناً وقت لگتا اور میں اس مہلت سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

مجھے اپنی زندگی کو پھر سے معمول پر لانے میں تین ماہ کا عرصہ لگا۔ میں اب آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کے بجائے اپنی کوٹھی میں رہ رہی تھی۔ مجھے یہ جان کر بھی بڑا سکون ہوا تھا کہ میرے ذہن کی حیرت انگیز قوتیں پہلے ہی کی طرح برقرار تھیں، انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا یا اگر وقتی طور پر کوئی نقصان پہنچا بھی تھا تو اس کا تدارک ہو چکا تھا۔ میں اس کا تجربہ بھی کر چکی تھی۔

وزیر داخلہ نے ریٹائرڈ جنرل حامد علی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، درست ثابت ہوا تھا۔ حامد علی واقعی ایک محب وطن شخص تھا۔ خود میں اس کا ذہن پڑھ کر اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ وہ ملک دشمن عناصر کا آلہ کار نہیں ہے۔ سارے فساد کی جڑ اس کا بھتیجا فرحان تھا جو خود اس کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ سولومن کے ایک پرانے ساتھی ڈک کا ذہن پڑھ کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ سولومن کا آلہ کار حامد علی کا بھتیجا فرحان ہے۔ سولومن ہی نے کسی برے وقت میں مدد اور پناہ حاصل کرنے کیلئے فرحان کو لاہور سے کراچی بلایا تھا۔ فرحان جب امریکہ میں زیر تعلیم تھا تو اسے امریکی ایجنٹوں نے اپنا آلہ کار بنا لیا تھا تا کہ پاکستان میں اس سے کام لے سکیں۔ سولومن سے ذاتی طور پر فرحان کے مراسم تھے۔ فرحان عیاش طبع نوجوان تھا اور اس کی اسی کمزوری سے سولومن نے فائدہ اٹھایا تھا۔ فرحان نے سولومن اور اس کے ساتھی رابرٹ کا تعارف حامد علی سے اپنے دوستوں کی حیثیت سے کرایا تھا۔ سولومن کی حقیقت سے حامد علی قطعی لاعلم تھا۔ اسی لاعلمی کے نتیجہ میں اسے نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے ڈک اور حامد علی کے ذہن پڑھ کر معلوم ہوئی تھیں۔ سولومن کے ساتھی رابرٹ پر کس نے گولی چلائی تھی یہ بھی اب مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ رابرٹ کو ٹھکانے لگانے والا کمانڈر نواز تھا۔ اس نے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے رابرٹ کو نشانہ بنایا تھا اسی لئے مجھے فائر کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی کمانڈر نواز بھی اسی طرف دوڑ پڑا تھا جہاں میرے اور سولومن کے درمیان معرکہ آرائی جاری تھی۔ اب میرے ذہن میں کوئی ایسا سوال نہیں تھا جو تشنہ جواب رہ گیا ہو۔

ملک دشمن عناصر سے طویل ترین رزم و مبازرت نے اور پھر لمبے عرصے اکتا دینے والی علالت نے ذہنی اور جسمانی طور پر خاصا تھکا دیا تھا۔ اسی سبب میں اپنے کاروبار پر بھی مناسب توجہ نہیں دے سکی تھی۔ میں نے اسی لئے باقاعدگی کے ساتھ اپنی فرم کے دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ سولومن کی موت کے بعد میں ایک حد تک مطمئن تو ہو گئی تھی مگر اس غلط فہمی کا شکار بہر حال نہیں تھی کہ غیر ملکی ریشہ دوانیاں میرے

ملک میں ختم ہو جائیں گی اور وہ جنہوں نے اقتصادی طور پر چھوٹے ممالک کو ایک طرح سے اپنا غلام بنا رکھا ہے میرے ملک کو صبر کر کے خاموشی سے بیٹھے رہیں گے پھر بھی فی الحال امن و امان تھا اور مجھے کچھ دن کیلئے ہی سہی سکون کا سانس لینے کی مہلت مل گئی تھی۔ میری فرم پر بھی اس کا اچھا اثر پڑا تھا۔ وہ معاملات جو ایک عرصے سے پینڈنگ میں پڑے تھے انہیں میں نے نمٹا دیا تھا۔ میری زندگی ایک بار پھر اسی ڈگر پر آ گئی تھی جس پر پہلے گامزن تھی۔ وہی کاروباری مصروفیات، غیر ملکی تجارتی وفود سے مذاکرات و معاملات، وہی میٹنگز اور دورے! میری فرم کی منیجر عارفہ ان دنوں بہت خوش تھی کیونکہ اس کی بیشتر ذمہ داریاں خود میں نے سنبھال لی تھیں۔

ملک دلاور بھی کیونکہ امپورٹ ایکسپورٹ کی فیلڈ میں تھا اس لئے اس سے بھی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ میں کبھی کبھار اس کی طرف نکل جاتی تھی اور کبھی وہ فون کر کے میری کوٹھی پر آ جاتا تھا۔

ایک دن شام کو میں اپنے دفتر سے اٹھنے والی تھی کہ ملک دلاور کا فون ملا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''آج رات کا کیا پروگرام ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہاں سے اٹھ کر گھر ہی جاؤں گی، کیوں کیا تم آ رہے ہو؟''

''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''میں نے آج اپنے کچھ غیر ملکی مہمانوں کو ایک ہوٹل میں کھانے پر مدعو کیا ہے، آپ بھی آ جاتیں تو خوشی ہوتی مجھے!''

''آ جاؤں گی، ہوٹل کا نام اور وقت بتاؤ!''

جواباً ملک دلاور ایک فائیو سٹار ہوٹل کا نام اور وقت بتا کر کہنے لگا۔ ''آج سنہرے بالوں والی وگ لگا کر آئیے گا، وہ آپ پر بہت جچتی ہے۔''

''شروع کر دی تم نے بکواس! اگر تم نے حسب معمول میرے بالوں کو موضوع گفتگو بنایا تو میں نہیں آؤں گی۔''

''تو پھر آخر بتا کیوں نہیں دیتیں کہ بیٹھے بٹھائے آپ کو اپنی چاند پر استرا پھروانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔''

''یہ ضروری تو نہیں کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں۔''

''اچھا خیر آ جائیے گا، یہ وعدہ رہا کہ آپ کی زلف گرہ گیر کا ذکر نہیں چھیڑوں گا۔''

''میں نے ''خدا حافظ'' کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ ہر چند کہ میں نے وگ کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا مگر ملک دلاور کی تیز نظروں سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی تھی کہ میں وگ لگائے ہوئے ہوں۔ سر کے آپریشن کے دوران میں مجھے بالوں سے محروم ہونا پڑا تھا۔ صحت یابی کے بعد میں نے وگ استعمال کرنا شروع کر دی تھی کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ کچھ نہیں تھا۔ پہلی ملاقات میں ملک دلاور نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا اور اسی دن سے میرا خون پینا شروع کر دیا تھا۔ مجھے چھیڑنے کیلئے اسے ایک مستقل موضوع مل گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں ملک دلاور کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ مجھے اپنے سر کے بالوں سے کیوں محروم ہونا پڑا۔

دفتر سے اٹھ کر جب میں اپنی کوٹھی پہنچی تو خلاف توقع ارشاد کو اپنا منتظر پایا۔ یہ وہی پڑوسی نوجوان تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں۔ اسے میں نے اپنی کوٹھی میں آنے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میری ایک ملازمہ نے بتایا تھا کہ وہ ڈرائنگ روم میں میرا انتظار کر رہا ہے۔

میں ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے سے گہری اداسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ ارشاد!'' میں اس کے مقابل والے صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ''تم آج اتنے اداس کیوں نظر آ رہے ہو!''

''میرے ابو پھر میری شادی پر اصرار کر رہے ہیں۔''

ارشاد نے صوفے پر دوبارہ بیٹھ کر نظریں جھکاتے ہوئے بتایا۔

''یہ تو خوشی کی بات ہے''

''مگر میں...... میں خوش نہیں ہوں۔'' اس کی آواز بھر آنے لگی۔ ''میں جانتا ہوں کہ...... کہ آپ کے قابل نہیں ہوں اور...... اور کبھی آپ کو نہیں اپنا سکوں گا لیکن...... لیکن میں آپ...... آپ کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں...... میں تنہا تو زندگی گزار سکتا ہوں مگر اپنے خوابوں سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔''

''ارشاد!'' میں نے اسے نرمی سے جواب دیا۔ ''میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ عشق کبھی یکطرفہ نہیں ہوتا، میرے دل میں تمہارے لئے ہمدردی اور خلوص کے جذبات تو ہیں مگر انہیں کوئی اور نام دینا ممکن نہیں۔ میرا راستہ مختلف ہے۔ میں ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتی۔ ان حالات میں یہی بہتر ہے کہ میرا خیال تم اپنے ذہن سے نکال دو۔''

''کاش میں ایسا کر سکتا۔'' اس کی آواز میں بے بسی تھی۔

''تم ایسا کر سکتے ہو!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''ادھر دیکھو!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''تمہیں یاد ہے ارشاد کہ جب تمہاری اور میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو تم نے مجھ سے کوئی وعدہ کیا تھا!''

''ہاں مجھے یاد ہے وہ وعدہ۔'' وہ مجھ سے نظریں چرانے لگا، پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔

''میں نے اپنے دل کو بہت سمجھایا، بہت جبر کیا خود پر! مگر آپ کو نہ بھول سکا۔''

''میں نے یہ وعدہ تو نہیں لیا تھا تم سے کہ مجھے بھول جاؤ! میں نے تم سے صرف یہ وعدہ لیا تھا کہ شادی کر لو گے اور تم اس پر آمادہ ہو گئے تھے!'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''میرے نزدیک یہ بے وفائی ہے، فریب ہے، دھوکا ہے! میں خود کو یہ فریب نہیں دے سکتا۔!!

ارشاد کی آواز پر جوش ہوتی گئی۔ ''ہاتھوں میں ہاتھ کسی کا اور دھیان کسی اور کا، آنکھوں میں خواب کسی اور کے ہوں، سامنے کوئی اور ہو! سیج کسی کی اور تصور کسی کا! میں...... میں اسے منافقت سمجھتا ہوں اور...... اور میں کچھ بھی سہی منافق نہیں ہوں۔''

''میں تمہیں منافقت کا سبق نہیں دے رہی، زندگی گزارنا سکھا رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے مجھے

خود اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

''اگر زندگی یہی ہے تو مجھے ایسی زندگی نہیں چاہئے! میں اپنے عشق میں سچا ہوں اور اس سچ کو جھوٹ کے پردے میں چھپانا نہیں چاہتا۔''

پہلے میں سمجھی تھی کہ ارشاد سنبھل جائے گا، مجھ سے ملتا جلتا رہے گا تو اس کے وجود میں جو تشنگی ہے رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کے دل میں لگی ہوئی آگ کچھ اور بھڑک اٹھی تھی۔ میرے لئے یہ بڑا انوکھا تجربہ تھا۔ وہ جو یہ کہتے ہیں کہ عشق کبھی یکطرفہ نہیں ہوتا، شاید غلط کہتے ہیں۔ میں عجب شش و پنج میں پڑ گئی کہ اسے کس طرح سمجھاؤں! میں انتہائی قدم اٹھانے سے گریز کر رہی تھی۔

''ارشاد!'' کچھ دیر توقف کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''تم اگر اپنے عشق میں سچے ہو تو پھر میری طرح تمہیں بھی ساری عمر تنہا گزارنا پڑے گی۔ کیا تم ایسا کر سکو گے!''

''میرے عشق کا مقدر اگر یہی ہے تو مجھے ساری عمر تنہا رہنا منظور ہے۔'' اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''اس کے سوا ایک اور بھی صورت ہے۔'' میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''اس طرح تمہاری زندگی برباد ہونے سے بچ جائے گی۔''

''وہ کیا صورت ہے؟'' اس نے بھولپن سے سوال کیا۔

''وہ یہ کہ تمہارے ذہن سے عشق کا بھوت اتر جائے!'' میں نے جواباً کہا۔

ارشاد مجھے عجیب سے نظروں سے دیکھنے لگا۔ یوں جیسے اسے اپنی ساعت پر یقین نہ آیا ہو کہ اس نے جو کچھ سنا ہے وہی کہا گیا ہے۔

''سنو ارشاد!'' میرا خیال تھا کہ تم زندگی کی تلخ حقیقتوں کو قبول کر لو گے اور تمہارے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک جائیں گے لیکن جوش عشق میں تمہیں نہ میری مجبوریوں کا دھیان رہا، نہ اپنی محرومیوں کا! اگر ساری زندگی تمہیں یہی احساس محرومی رہا تو تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ کچھ نہیں بن سکو گے! وقت کی بے رحم ہوا تمہیں کسی ایسے خزاں رسیدہ پتے کی طرح اڑاتی رہے گی جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ تم نے مجھ سے محبت کی ہے، سچی محبت! سو میں اس محبت کا قرض اسی طرح اتار سکتی ہوں کہ تمہاری زندگی کو رائیگاں نہ جانے دوں اور اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ میں تمہارے ذہن سے نقوش محبت مٹا دوں۔ مجھے اس فیصلے تک پہنچنے میں اس لئے دیر لگی کہ میں اسے بے رحمانہ عمل سمجھ رہی تھی لیکن اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ یہ بے رحمی نہیں، ایک زندگی کی ضرورت ہے! ادھر دیکھو میری آنکھوں میں۔''

ارشاد نے سہمے سہمے سے انداز میں میری طرف نظریں اٹھائیں اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں خوابیدہ حیرت انگیز پراسرار قوتیں پیدا ہو گئیں۔ میرے طاقت ور ذہن نے ارشاد کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں اس کے ذہن پر نقش اپنی محبت کی تحریر پڑھنے لگی۔ اس نے واقعی غلط نہیں کہا تھا کہ جب سے ہوش سنبھالا تھا، صرف اور صرف مجھی کو چاہا تھا، مجھی سے محبت کی تھی۔ اس کے ذہن میں میری محبت کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ اس کے ذہن کا مطالعہ میرے لئے ایک نیا تجربہ ثابت ہوا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ اس کے ذہن سے محبت کے نقوش مٹانے کا آغاز کیا اور حیرت زدہ رہ گئی۔ مجھے شدید

مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا ذہن میرے ذہن کا حکم ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ میں پہلی بار کسی ایسی صورتحال سے دوچار ہوئی تھی۔ ایک ذہن پوری طرح میرے قابو میں ہونے کے باوجود میرے احکام سے روگردانی کر رہا تھا۔ میں نے ارتکاز توجہ بڑھا دی۔ ارشاد کا جسم کانپنے لگا اور پھر ایک دم اس کا ذہن تاریک ہو گیا۔ میرے ذہن کو خفیف سا جھٹکا لگا اور اس کے ذہن سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

''میں نے دیکھا کہ ارشاد بے سدھ صوفے پر پڑا ہے۔ میرے طاقتور ذہن کی مضبوط گرفت اس سے برداشت نہ ہو سکی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

ارشاد کو ہوش میں لانے کیلئے میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے پھر کچھ ہی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''کیا ہوا تمہیں؟ ٹھیک تو ہو تم؟'' میں نے خجالت آمیز آواز میں اس سے پوچھا۔

''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے، معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے!'' وہ بڑبڑایا۔

''تم جا کے آرام کرو، کل میں کسی وقت تمہارے والد صاحب سے آ کر بات کروں گی کہ وہ تمہاری شادی کرنے پر اصرار نہ کریں۔'' میں نے کہا اور اس سے نظریں بچانے لگی۔ معلوم نہیں میں خود کو کیوں مجرم تصور کر رہی تھی!

''آپ آئیں گی نا؟'' اس نے یہ سوال درخواست کے سے انداز میں کیا۔

''ہاں ضرور آؤں گی۔'' میں نے وعدہ کر لیا۔

میری بات سن کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جب وہ ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس کے پیر کانپ رہے تھے، ذہن پر سخت گرفت کا اثر اس کے جسم پر بھی ہوا تھا۔

ارشاد چلا گیا مگر میں دیر تک گم صم سی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے اس معصوم نوجوان پر ظلم کیا ہو۔ اس کے سچے جذبوں کا مذاق اڑایا ہو۔ اس بے گناہ کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی ہو۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اس کے ذہن پر میرے ذہن کی گرفت کچھ اور سخت ہو جاتی تو بے ہوشی ایک ابدی نیند میں بدل سکتی تھی۔ بہ الفاظ دیگر ارشاد موت سے ہمکنار ہوتے ہوتے بچا تھا، جذبات محبت میں اتنی شدت بھی ہو سکتی ہے یہ آگہی میرے لئے قطعی نئی تھی۔ میرے ذہن کی حیرت انگیز قوتیں بھی ارشاد کے ذہن سے نقوش محبت مٹانے میں ناکام رہی تھیں۔ میں نے اس سے یہی نتیجہ نکالا کہ آدمی عشق میں فنا تو ہو سکتا ہے جھک نہیں سکتا۔ ارشاد کے ذہن کی شدید مزاحمت کے مقابل اگر میں اپنے ذہن کی گرفت مزید سخت کرتی چلی جاتی تو نتیجہ ہولناک ہی نکلتا۔ ارشاد موت کی آغوش میں پہنچ جاتا۔ خدانخواستہ ایسی صورتحال پیش آ جاتی تو ساری زندگی میرا ضمیر مجھ پر ملامت کرتا رہتا۔

اپنی نوعیت کا یہ عجیب معاملہ تھا جس کا کوئی حل فی الحال میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں انہیں خیالوں میں سرگرداں تھی کہ فاطمہ کی آمد سے چونک اٹھی۔ وہ مجھ سے شام کی چائے کیلئے پوچھنے آئی تھی۔ میں نے اس سے وہیں ڈرائنگ روم میں چائے لانے کو کہہ دیا اور ایک بار پھر ارشاد کے بارے میں سوچنے لگی۔

میرا ذہن کیونکہ الجھا ہوا تھا اس لئے چائے پی کر میں اپنی خواب گاہ سے متصل سٹوڈیو میں چلی آئی۔ جب بھی مجھ پر کوئی ایسی کیفیت طاری ہوتی تھی تو میں رنگوں سے کھیلنے لگتی تھی۔ اس سے میرے ذہن کو سکون مل جاتا تھا۔

رنگوں کی دنیا میں کھو کر مجھے یاد ہی نہ رہا کہ کسی سے کوئی وعدہ کیا ہے۔ فاطمہ نے جب آ کر بتایا کہ ملک دلاور کا فون آیا ہے تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، ہاتھ سے برش رکھ کر میں خواب گاہ میں پہنچی اور مسہری کے قریب تپائی پر رکھا ہوا ٹیلی فون ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہیلو دلاور!''

''بڑا خراب امپریشن پڑا ہے آپ کا میرے غیر ملکی مہمانوں پر! بے چارے اب تک آپ کی یاد میں بھوکے بیٹھے ہیں۔ میں نے لاکھ چاہا کہ صرف باتوں سے ان کا پیٹ بھرا جائے مگر......''

''سوری دلاور!'' میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''میں بالکل بھول گئی تھی، وعدہ کر کے! بس آ رہی ہوں۔''

''وعدہ کر کے بھول جانا تو آپ کی ادا ہے۔ بہرحال مزید انتظار کر لیتا ہوں، آ جائیے!''

میں نے مزید کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا، پھر باتھ روم میں کپڑے بدلنے گھس گئی۔

اپنی کوٹھی سے روانگی میں مجھے چند منٹ لگے۔ اگر صرف دلاور میرا منتظر ہوتا تو شاید میں اسے ٹال دیتی لیکن غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں تھا۔ مطلوبہ ہوٹل پہنچ کر میں نے اس کے پارکنگ لاٹ میں اپنی کار پارک کی اور ڈائننگ ہال میں پہنچ گئی۔ ڈائننگ ہال کے ایک کونے میں دلاور مجھے ایک بڑی سی میز پر بیٹھا ہوا نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ تین غیر ملکی بھی تھے، دو مرد اور ایک عورت! دلاور نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا، جواباً میں بھی ہاتھ ہلاتی ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگی۔ غیر ملکیوں نے بھی پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

میں میز کے قریب پہنچی تو دلاور نے اپنی کرسی سے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔ اس کی تقلید میں تینوں غیر ملکی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''پلیز سٹ ڈاؤن!'' میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سب سے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

دلاور نے ان تینوں سے میرا تعارف کرایا۔ بلڈاگ کی سی شکل والے کا نام ٹام تھا، لمبوترے چہرے والے کا نام جیمس اور سبز آنکھوں والی اس غیر ملکی حسینہ کا نام لیوسی تھا۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی اور پرکشش بھی! ان تینوں کا تعلق برطانیہ سے تھا اور وہ بزنس ٹرپ پر پاکستان آئے تھے۔ وہ سب ایک ہی برطانوی فرم سے متعلق تھے جو پاکستان کی کچھ مصنوعات اپنے ملک میں درآمد کرنا چاہتی تھی۔ لیوسی کا تعارف کراتے ہوئے دلاور نے ''مس'' بھی کہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی غیر شادی شدہ تھی۔ یوں بھی وہ مجھے ایک دوشیزہ ہی لگ رہی تھی۔ یہ بات میرے لئے باعث تعجب تھی کہ لیوسی اپنے دونوں ساتھیوں سے عمر میں کم ہونے کے باوجود اس چھوٹے سے تین رکنی وفد کی نگران تھی۔ اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ لیوسی کی شخصیت میں معلوم نہیں ایسی کیا بات تھی کہ میں اس کے ساتھ محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔

کھانا کھانے کے دوران میں لیوسی مجھ سے اس طرح بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتی رہی جیسے رے اور اس کے درمیان برسوں کی شناسائی ہو۔ وہ انتہائی خوش مزاج اور خوش گفتار تھی۔ اس کے برعکس ام اور جیمس خشک مزاج معلوم ہوتے تھے۔ وہ دونوں دلاور سے کاروباری گفتگو میں مصروف تھے۔

پہلی ملاقات میں لوگ عموماً خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کیلئے ایک دوسرے سے ایسی باتیں ی کر جاتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسے فقرے یگانگت کی فضا پیدا کرنے کی خاطر لے جاتے ہیں مثلاً یہ کہ میں نے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ ہرچند کہ لیوسی کو دیکھ کر میرا پہلا احساس یہی تھا کہ اس کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ ہاں دلاور کی موجودگی بھی تھی۔ اب تک وہ ''بے سرا'' نہیں ہوا تھا مگر اسے بے سرا ہونے میں دیر بھی نہیں لگتی تھی۔

''میں پہلی بار آپ کے ملک میں آئی ہوں۔'' لیوسی مجھ سے مخاطب تھی۔ ''مجھے آپ لوگوں ے مل کر بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔''

لیوسی انگریزی میں بات کر رہی تھی مگر اس کا تلفظ اور لہجہ برطانوی نہیں تھا۔ یہ بات میرے لئے لینا چونکا دینے والی تھی مگر میں نے اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ مجھے لہجے کے فرق نے چونکا دیا ہے۔ اابا میں بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتی رہی اور بولی کہ مجھے بھی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ لہجے کا فرق جو میں نے محسوس کیا، انہیں کو اس کا احساس ہو سکتا ہے جو خود ایک عرصے سے انگریزوں کے رمیان رہ چکے ہوں۔

ٹام اور جیمس دلاور کے دائیں بائیں سامنے والی نشستوں پر بیٹھے تھے اور لیوسی میری ساتھ والی رسی پر تھی۔

کھانا کھا کر جب کافی کا دور چل رہا تھا تو دلاور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مس لیوسی کا رہ آپ کو دیکھا بھلا سا محسوس نہیں ہوا؟'' وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

''محسوس تو ہوا تھا لیکن میں نے اس کا اظہار یوں نہیں کیا کہ مس لیوسی خود بتا چکی ہیں پہلی بار کستان آئی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مگر گزشتہ سال ساری دنیا ہی کے اخبارات میں مس لیوسی کی تصویریں شائع ہوئی تھیں، یقیناً کستانی اخبارات میں بھی تصاویر چھپی ہوں گی۔'' لیوسی کا ایک ساتھی جیمس بول اٹھا۔

''میں یہی انہیں بتانے والا تھا کہ مس لیوسی برطانیہ کی طرف سے عالمی مقابلہ حسن میں بھی رکت کر چکی ہیں۔'' دلاور نے جیمس کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔

''لیکن جہاں تک میرے علم میں ہے مقابلہ حسن کیلئے عمر کی قید بھی ہوتی ہے اور مس لیوسی ....'' میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

''آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو گی کہ مس لیوسی کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔'' اس بار م نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''کیوں مس لیوسی میرا اندازہ درست ہے؟'' ٹام نے تائید طلب انداز میں لیوسی طرف دیکھا۔

"اوہ یس!" لیوسی نے مسکرا کر تائید کی۔

یہ معمہ تو حل ہو گیا تھا کہ مجھے لیوسی کا چہرہ کیوں اجنبی نہیں لگا تھا۔ ممکن ہے میں نے اس کی تصاویر اخبارات میں دیکھی ہوں لیکن وہ بیس سال کی ہے، میرے لئے یہ بات قابل یقین سی نہیں تھی۔ میری نظریں مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔ خواتین کہیں کی بھی کیوں نہ ہوں عموماً اپنی عمر کم ہی بتاتی ہیں لیکن عالمی مقابلہ حسن کے منصفین برتھ سرٹیفکیٹ بھی دیکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں گزشتہ سال لیوسی مقابلہ حسن میں کس طرح شرکت کر سکتی تھی یہ سمجھنا میرے لئے محال تھا۔

لیوسی کا لہجہ اور پھر عمر کا معاملہ مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ وہ خود کو جو کچھ ظاہر کر رہی ہے دراصل ویسی نہیں ہے۔

دلاور خاصی دیر سر میں رہنے کے باوجود بالآخر "بے سرا" ہو ہی گیا۔

"آپ تو اسی طرح مجھے وعدہ فردا پر ٹالتی رہیں گی، کیا خیال ہے اگر میں اس حسینہ عالم سے رشتہ محبت استوار کر لوں!" دلاور میری طرف شریر نظروں سے دیکھنے لگا۔ "اس کی سبز جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب کر شاید آپ کی محبت کا نشہ اتر جائے!"

دلاور نے اردو میں بات کی تھی اس لئے میں بھی اردو ہی میں اس سے مخاطب ہوئی۔ "میرا خیال ہے کہ یہ تمہیں گھاس نہیں ڈالے گی۔"

"تو کیا ہوا!" آپ نے اب تک کون سی گھاس ڈال دی ہے، کوشش کرے انسان تو کیا نہیں ہو سکتا!" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"تمہاری بات سے کم از کم یہ تو ثابت ہو ہی گیا کہ انسانوں کی نسل سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ورنہ گھاس ڈالے جانے کا انتظار نہ کرتے۔" میں نے موقع غنیمت جان کر اس پر چوٹ کی پھر بولی۔ "ویسے یہ بداخلاقی ہے کہ ان لوگوں کی موجودگی میں تم ایسی زبان میں بات کر رہے ہو جو یہ نہیں جانتے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اچانک لیوسی اردو میں بولی اور میں ہی کیا دلاور بھی چونک اٹھا۔ "میں مسٹر دلاور کی بات سمجھ سکتی ہوں۔"

"دلاور بغلیں جھانکنے لگا۔ خلاف توقع لیوسی کو اردو بولتے سن کر وہ کچھ خفیف سا ہو گیا تھا۔ وہ خفت مٹانے کیلئے لیوسی سے بولا۔ "معاف کیجئے گا مس لیوسی! یہ جو خاتون ہیں عذرا خان، ان سے میری نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔"

"سچ بتائیں مسٹر دلاور، ان سے آپ کی صرف نوک جھونک چلتی ہے یا کچھ اور بھی چلتا ہے؟" لیوسی نے ہنس کر پوچھا۔ "اگر کچھ اور نہ چلتا تو آپ انہیں مجھ سے اظہار محبت کی دھمکی نہ دیتے!"

"اب آپ سے کیا چھپانا مس لیوسی! ان کیلئے ٹھنڈی میٹھی آہیں بھرتے ہوئے ایک عمر ہو گئی۔" دلاور پٹڑی سے اتر گیا، "مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

"بکواس بند کرو دلاور!" میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ یہ جاننے کے بعد کہ لیوسی بھی اردو جانتی ہے مجھے یہ سطحی گفتگو گراں گزرنے لگی تھی۔ میں نے اسی لئے دلاور کو ڈانٹ دیا تھا اور پھر بلاتوقف موضوع گفتگو بدلنے کیلئے لیوسی سے پوچھا تھا۔ "تم نے اردو کہاں سیکھی؟ ہرچند کہ تمہارا لہجہ غیر ملکیوں جیسا

لی ہے مگر تلفظ صاف ہے۔"

"اردو کے علاوہ مجھے کئی اور مشرقی زبانیں بھی آتی ہیں۔" میں عربی اور فارسی بھی لکھ سکتی ہوں۔ پہلے میں نے عربی اور فارسی ہی سیکھی تھی پھر ہندی پڑھی پھر اس کے بعد اردو سیکھنا میرے لئے مشکل ثابت نہیں ہوا!" لیوسی نے سنجیدگی سے بتایا۔

"لیوسی! میرا خیال ہے کہ ٹام اور جیمس خاصے بور ہو چکے ہیں۔" میں نے موضوع گفتگو بدلنے کیلئے کہا۔ "شاید یہ اردو نہیں جانتے، ہمیں ان کے صبر کا امتحان نہیں لینا چاہئے۔"

"ہاں ان دونوں کو اردو نہیں آتی۔" لیوسی بولی۔ ویسے بھی اب خاصی دیر ہو چکی ہے ہمیں اٹھنا ہئے۔"

میں خود بھی چاہ رہی تھی میں نے اسی لئے لیوسی کی رائے سے اتفاق کیا۔ دلاور ابھی اٹھنے کے وڈ میں نہیں تھا مگر مجبوراً اسے بھی اٹھنا پڑا۔ لیوسی اور اس کے ساتھیوں کا قیام اسی فائیو سٹار ہوٹل میں تھا۔ لاور نے آئندہ روز صبح ملنے کا وعدہ کر کے انہیں رخصت کیا۔

بل ادا کر کے دلاور اٹھنے لگا تو میں نے اسے جھاڑ پلائی۔ "تمہاری اسکریو ہر وقت ڈھیلے کیوں ہتے ہیں! وقت موقع تو دیکھ لیا کرو! خود بھی تماشا بنتے ہو اور مجھے بھی ناحق بور کرتے ہو۔"

"یہ بوریت تو اسی وقت ختم ہو گی مسمات جب آپ اور میں ایک ڈوری سے بندھ جائیں گے ر، میں تماشا بنوں گا نہ آپ بور ہوں گی۔" دلاور اٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ خود سوچیں کہ ایک نہ ایک دن آپ کو پیا کے دیس سدھارنا ہی ہے اور کوئی نہ کوئی خوش بخت آپ کا پیا ضرور بنے گا پھر مجھ میں کیا ابی ہے!"

"احمق ہو تم!" میں جھنجلا گئی۔ "اگر تم نے اپنی حماقتیں نہ چھوڑیں تو میں تم سے ملنا جلنا بند ردوں گی!"

میرے سنجیدہ لہجے کا دلاور پر اثر ہوا اور پھر اس نے مزید چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ پارکنگ لاٹ میں ر ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

گھر لوٹتے ہوئے مجھے رات کے تقریباً دس بج گئے۔ میری ملازمہ خاص فاطمہ بے چینی سے ری آمد کی منتظر تھی۔ اس نے بتایا "جب آپ گئی ہیں پڑوسی میجر صاحب تین چار دفعہ فون کر چکے ہیں، ر کچھ دیر پہلے آخری مرتبہ ان کا فون آیا تھا کہ ان کے بیٹے ارشاد کی حالت بہت خراب ہے، وہ اسے ال لے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ جیسے ہی آپ آئیں تو ہسپتال پہنچ جائیں۔"

فاطمہ سے یہ خبر سن کر مجھے شاک سا لگا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے معلوم کیا۔ "ہسپتال کا پتا بتایا ہے میجر صاحب نے؟"

"جی ہاں بی بی جی، میں نے لکھ لیا ہے، یہ رہا، فاطمہ نے ایک پرچہ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس سے پرچہ لے کر پڑھا۔ وہ ایک معروف پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ میں نے وہ پتا پرس میں رکھ لیا اور الٹے قدموں کوٹھی کے پورٹیکو میں کھڑی ہوئی اپنی کار تک پہنچ گئی۔ ارشاد کے والد رڈ فوجی تھے۔ ان سے میرے تعلقات واجبی سے تھے، اتنے واجبی کہ برسوں تک ایک دوسرے کے

پڑوس میں رہتے ہوئے نہ کبھی وہ میری کوٹھی میں آئے تھے نہ میں ہی ان کی کوٹھی میں گئی تھی ہاں ان کے بارے میں مجھے یہ ضرور معلوم تھا کہ وہ ایک مہذب اور شریف آدمی ہیں۔ ارشاد ان کی اکلوتی اولاد تھا، ان کا نام کمال حسین تھا مگر فوج سے سابقہ وابستگی کے سبب سبھی انہیں ''میجر صاحب'' کہتے تھے۔

میرے لئے یہ بات باعث تشویش تھی کہ ارشاد کی حالت خراب ہونے پر انہوں نے مجھ ست رابطہ کیوں کیا! میرے ان کے مراسم بہرحال اس نوعیت کے نہیں تھے۔ دوسری بات یہ تشویش کی تھی کہ ارشاد کے ذہن کو کہیں نادانستگی میں کوئی نقصان تو نہیں پہنچ گیا؟ آج شام جب وہ میرے پاس سے گیا تھا تو سر میں شدید درد بتا رہا تھا اور میں نے اسے آرام کا مشورہ دیا تھا۔

اپنی کوٹھی سے مطلوبہ پرائیویٹ ہاسپٹل پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی کیونکہ میں نے خاصی تیز رفتاری کا ثبوت دیا تھا۔

ریٹائرڈ میجر کمال حسین مجھے ہسپتال کے ایمرجنسی سیکشن میں مل گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر دھچکا سا لگا کہ ان کے چہرے پر میری طرف نظر اٹھتے ہی ناگواری کے اثرات ابھر آئے تھے۔ انہوں نے سپاٹ ت لہجے میں میرے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ''ارشاد اندر ہے وہ ڈاکٹر صاحب آپ کے منتظر ہیں۔ انہوں نے سامنے ہی نظر آنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا جو بھرا ہوا تھا۔

''بہتر ہے۔'' میں نے بھی جواب سردمہری سے دیا۔ مجھے کمال حسین کی تیوریوں پر پڑے ہوئے بل پسند نہیں آئے تھے۔

وہ پرائیویٹ ہسپتال ایک مشہور نیوروفزیشن کا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس وقت خود وہ اند، کمرے میں ارشاد کے پاس موجود ہوگا۔ ذاتی طور پر میں اس سے ان دنوں واقف ہوئی تھی جب خو زیرعلاج تھی۔

کمرے کا دروازہ کھول کر جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا، ڈاکٹر نے مڑ کر میری طرف دیکھا سامنے ہی بیڈ پر ارشاد آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔

''آیئے محترمہ! میں آپ ہی کا منتظر تھا۔'' ڈاکٹر نے میرے سلام کا جواب دیتے ہی کہا۔

''جی ڈاکٹر صاحب، فرمایئے!'' میں آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

''یہاں بات کرنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ آپ میرے روم میں چلیں۔'' ڈاکٹر بولا۔ ''ا۔ انجکشن دے دیا ہے۔'' اس نے ارشاد کی طرف اشارہ کیا۔ ایک گھنٹے سے پہلے اسے ہوش نہیں آئے گا، اا عرصے میں آپ سے میں وہ باتیں کرسکوں گا جو ضروری ہیں۔''

جیسی آپ کی مرضی! میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر مجھے ساتھ لئے ہوئے کمرے سے نکلا تو میجر صاحب لپک کر قریب آ گئے۔ ''ڈاکٹر ا. کیا حال ہے ارشاد کا!''

''اب یہ خاتون آ گئی ہیں تو فکر و پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' ڈاکٹر نے میجر کمال حسین کہا۔ ''اگر یہ نہ آتیں تو تشویش کی بات ہوسکتی تھی۔''

مجھے ڈاکٹر کی بات عجیب سی لگی مگر میں کچھ بولی نہیں۔

''فی الحال ارشاد گہری نیند سو رہا ہے آپ چاہیں تو اس کے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔ ایک گھنٹے سے پہلے اس کی نیند نہیں ٹوٹے گی۔ آپ مطمئن رہیں، اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، احتیاطاً میں ایک ڈاکٹر کی ڈیوٹی بھی یہاں لگا دیتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے میجر صاحب کو مطمئن کرنے کیلئے مزید کہا پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ ''آیئے خاتون!''

میں ڈاکٹر کے ساتھ ہسپتال کی پہلی منزل کے اس کمرے میں آ گئی جس پر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

''تشریف رکھیے خاتون!'' ڈاکٹر بڑی سی میز کے عقب میں رکھی ہوئی اپنی ریوالونگ چیئر کی طرف بڑھتے ہوئے مجھ سے بولا۔ میں اس کے مقابل پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی تو اس نے کہا۔ ''ایکس کیوز می، ونس اے منٹ!'' یہ کہہ کر اس نے دائیں جانب میز پر موجود انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔ ہیلو! ڈیوٹی روم ...... پلیز اٹینڈ اے پیشنٹ ان ایمرجنسی روم نمبر ٹو۔''

اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ سب کیا چکر ہے اور ڈاکٹر نے مجھے کیوں ہسپتال بلوایا ہے؟ ارشاد کی شدید علالت سے آخر میرا کیا تعلق ہے؟ اسی سبب ڈاکٹر کے کچھ کہنے سے پہلے میری زبان پر یہی معاملات آ گئے۔

''ابھی عرض کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر شائستگی سے بولا۔ ''ذاتی طور پر خود میرے لئے بھی ارشاد کا کیس انتہائی دلچسپ ہے۔ میں آپ کو ابتداء سے ساری بات بتاتا ہوں۔ میجر صاحب سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں، وہ میرے ہی شہر کے ہیں، ہم دونوں کلاس فیلو بھی رہے ہیں۔ آج دو گھنٹے پہلے انہوں نے مجھے فون کیا کہ ارشاد کی طبیعت خراب ہے اور ان کا جو فیملی ڈاکٹر ہے اس کی سمجھ میں کیس نہیں آ رہا۔ انہوں نے مجھے جو علامات بتائیں وہ تشویشناک تھیں۔ ناک سے خون بہنے کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔ بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ جائے تو بھی ناک سے خون آنے لگتا ہے۔ میرے کہنے پر میجر صاحب کے فیملی ڈاکٹر نے بلڈ پریشر چیک کیا جو نارمل تھا۔ مختصر یہ کہ میں خود میجر صاحب کی کوٹھی پہنچ گیا۔ اس وقت تک ارشاد کی ناک سے خون بہنا بند ہو چکا تھا اور اس پر نیم غشی سی طاری تھی۔ اسی حالت میں اسے میں نے بڑبڑاتے سنا۔ وہ بار بار آپ کا نام لے رہا تھا۔ اس کا طبی معائنہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے ذہن کو کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے اور یہی صدمہ برین ہیمبرج کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ صدمے کی وجہ سمجھنے میں ارشاد کی بڑبڑاہٹ نے میری مدد کی۔ نیم بے ہوشی میں وہ جو کچھ بڑبڑا رہا تھا اس سے مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں قباحت نہیں ہوئی کہ یہ عشق میں ناکامی کا صدمہ ہے۔ میجر صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ عذرا خان کن خاتون کا نام ہے اور ارشاد سے ان کا کیا تعلق ہے؟ میجر صاحب نے بتایا کہ کچھ عرصے سے ارشاد پڑوسی کی کوٹھی میں سکونت پذیر ایک خاتون کے یہاں آتا جاتا ہے۔ انہیں کا نام عذرا خان ہے۔ جو نتیجہ میں نے اخذ کیا تھا اس سے میجر صاحب کو بھی آگاہ کر دیا۔ اسی کے بعد میجر صاحب نے یہ بتایا کہ آپ ایک غیر شادی شدہ خاتون ہیں اور یہ بھی کہ ارشاد ایک عرصے سے شادی نہ کرنے پر بضد ہے۔ میجر صاحب کی بیگم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آج شام ارشاد آپ کی کوٹھی گیا تھا اور جب سے آیا تھا خاموش خاموش اور گم صم سا تھا۔ میں کیونکہ ایک سائیکسٹ بھی ہوں اس لئے درمیانی کڑی جوڑنے میں مجھے دیر نہ

لگی۔ یقیناً آپ کے اور ارشاد کے درمیان آج شام کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی جس سے ارشاد کو شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہوگا۔ اپنی والدہ کے استفسار پر سر درد بتانا بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بحیثیت ڈاکٹر اب تک میرے تجربے میں کوئی ایسا کیس نہیں آیا کہ عشق میں ناکامی کا نتیجہ برین ہیمرج کی طرف کسی شخص کو لے جائے۔“

میں توجہ اور انہماک سے ڈاکٹر کی باتیں سنتی رہی اور درمیان میں کچھ نہیں بولی۔ ریٹائرڈ میجر کمال حسین کے خشک رویئے کی وجہ اب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ یقیناً میری طرف سے اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے کہ میں نے ان کے نوجوان اور اکلوتے بیٹے کو اپنے دام عشق میں گرفتار کر لیا ہے۔ ہر چند کہ موجودہ صورتحال میرے لئے اور میری عزت نفس کیلئے ایک تازیانے کی سی حیثیت رکھتی تھی اور خجالت و شرمندگی کے احساسات کے ساتھ ساتھ میرے ذہن پر جھنجھلاہٹ کا بھی غلبہ تھا مگر میں خواتین کے اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتی جسے بے زبان کہا جاتا ہے یا جو اپنے نام کے ساتھ کسی مرد کا نام سنتے ہی شرما کر دوہری ہو جاتی ہیں۔

”خاتون!“ ڈاکٹر مجھ سے ہنوز مخاطب تھا۔ ”بحیثیت ڈاکٹر میں آپ سے درخواست گزار ہوں کہ اس کیس کو سمجھنے اور اسے ڈیل کرنے میں میری مدد کریں۔ طبی معائنے کے مطابق ابھی ارشاد کے دماغ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا لیکن تدارک نہ ہوا تو اس کے برین پر دوسرا اٹیک بھی ہو سکتا ہے جو ممکن ہے جان لیوا ثابت ہو۔ ٹو بی ویری فرینک آپ مجھے ایک تعلیم یافتہ خاتون معلوم ہوتی ہیں۔ میں یہ جاننا چاہوں گا کہ جو نتیجہ حالات و واقعات سے اخذ کیا گیا ہے کیا وہ درست ہے؟ واضح الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ کیا واقعی یہ عشق میں ناکامی ہی کا کیس ہے؟ کیا ارشاد اور آپ کے درمیان کوئی گہرا جذباتی رشتہ ہموار ہو چکا تھا؟ اور کیا یہ حقیقت ہے کہ ارشاد کو آپ کی طرف سے آج کوئی شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے؟“ یہ کہہ کر ڈاکٹر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

یہ معاملہ ایک بے قصور و بے گناہ نوجوان کی زندگی اور موت کا تھا۔ قصوروار بہر حال میں ہی تھی۔ مجھے حقیقت کا علم تھا۔ طبی معائنے اور نیم بے ہوشی میں ارشاد کی بڑبڑاہٹ سن کر ڈاکٹر جس نتیجے پر پہنچا تھا وہ سراسر درست نہیں تھا۔ یہ کیس شدید ذہنی صدمہ پہنچنے کا نہیں تھا اور نہ محض اس وجہ سے ارشاد کے دماغ کو نقصان پہنچا تھا۔ میں نے آج اس سے جو کچھ کہا تھا، کم و بیش پہلے بھی کہہ چکی تھی۔ اسے ذہنی صدمہ اس صورت میں پہنچ سکتا تھا جب یہ باتیں پہلی بار اور اچانک خلاف توقع اس سے کی جاتیں۔ ارشاد کے دماغ کو نقصان پہنچنے کا اصل سبب اس کے ذہن پر میرے طاقتور ذہن کی گرفت تھی جو نادانستگی میں نہیں بلکہ دانستہ میں نے سخت کر دی تھی تاکہ اس کے ذہن سے اپنی محبت کے نقوش مٹا سکوں۔ اگر اس کا ذہن شدید مزاحمت نہ کرتا تو یقیناً یہ صورتحال پیش نہ آتی لیکن یہ بات میں ڈاکٹر کو نہیں بتا سکتی تھی۔ ڈاکٹر کے سوالوں کے جواب میں کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے کہنا شروع کیا۔ ”ڈاکٹر! یہ اب سے چند ماہ پہلے کی بات ہے جب مجھے پہلی بار یہ علم ہوا کہ ارشاد مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے ڈاکٹر کو ارشاد سے پہلی تفصیلی ملاقات کا واقعہ سنا دیا اور یہ بھی بلا جھجک بتا دیا کہ معاملہ یکطرفہ تھا۔ ”پھر وہ مجھ سے اکثر ملتا رہا اور میں اسے سمجھاتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سمجھانے بجھانے سے راہ راست پر آ جائے گا اور

جب شادی کے بعد اس کے جسمانی تقاضے پورے ہو جائیں گے تو میرے عشق کا بھوت اس کے سر سے اتر جائے گا، مگر وہ وعدہ کرنے کے باوجود شادی پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ مجھے آج یہی بتانے آیا تھا کہ اس کے والد شادی کرنے پر اصرار کر رہے ہیں لیکن وہ کسی صورت اس پر آمادہ نہیں۔ شادی نہ کرنے کی وجہ اس نے یہی بتائی تھی کہ میرے علاوہ کسی اور کو قبول نہیں کر سکتا۔“ اتنا کہہ کر میں نے مصلحتاً غلط بیانی سے کام لیا کیونکہ مجھے ڈاکٹر سے اصل بات چھپانا تھی۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا۔ ”اب تک میں نے ارشاد کو نرمی اور محبت سے سمجھایا تھا آج سوچا کہ ممکن ہے سختی کرنے سے وہ باز آ جائے اور میرا خیال اپنے دماغ سے نکال دے، سو یہی سوچ کر میں نے سخت رویہ اختیار کیا اور اسے اپنی کوٹھی سے یہ کہہ کر نکال دیا کہ آئندہ یہاں قدم نہ رکھنا! میں واضح طور پر آپ کو بتا چکی ہوں اور اب پھر اپنی بات دہرا رہی ہوں کہ ارشاد سے مجھے کوئی جذباتی وابستگی نہیں۔ سمجھانے بجھانے کو محض آپ انسانی ہمدردی کا نام دے سکتے ہیں۔ یوں بھی میری اور اس کی عمر میں خاصا فرق ہے۔“

”تو پھر میں نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا درست ہی تھا۔“ ڈاکٹر طویل سانس لے کر بولا۔ ”خلاف توقع آپ کے سخت رویئے سے ارشاد کو شدید ذہنی صدمہ پہنچا اور معاملہ برین ہیمبرج تک پہنچ گیا۔ اس سے کم از کم ایک بات ضرور معلوم ہوئی کہ اس کا عشق چاہے یکطرفہ سہی مگر اس میں شدت یقینی تھی۔ اب مسئلہ اسے دوسرے اٹیک سے بچانے کا ہے اور اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ انسانیت کے ناطے ہی سہی میرے ساتھ تعاون کریں۔ انسانی زندگی بچانا میرے نزدیک کار ثواب ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ بھی اس سے اتفاق کرتی ہوں گی۔“

”اس سلسلے میں آپ مجھ سے کیا تعاون چاہتے ہیں ڈاکٹر؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ جب ہوش میں آ جائے تو اس کے روبرو ہوں، نہ صرف یہ بلکہ آپ اسے اپنی محبت کا یقین بھی دلا دیں۔“ ڈاکٹر نے متوقع نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”حالانکہ یہ میرے لئے مشکل ضرور ہوگا مگر میں اس کی زندگی بچانے کیلئے یہ جھوٹ بول دوں گی۔ انسانی زندگی بچانے کیلئے حرام شے بھی حلال ہو جاتی ہے۔“ ”ڈاکٹر! یہ تو محض وقتی طور پر جھوٹی تسلی دینے کی بات ہے۔“

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں خاتون!“ ڈاکٹر کے چہرے سے فکر و تردد کے سائے چھٹ گئے۔

”میجر صاحب کیونکہ آپ کے دوست بھی ہیں اس لئے ذاتی طور پر میں آپ سے یہ درخواست کروں گی ڈاکٹر کہ آپ انہیں بھی حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ وہ شاید میری طرف سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔“ میں نے ڈاکٹر سے وہ بات کہہ دی جو مجھے کھل رہی تھی۔

”قطعی!“ ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میجر صاحب کے سامنے میں آپ کی پوزیشن صاف کر دوں گا۔ ان کی باتوں سے میں نے بھی یہی تاثر قبول کیا تھا جس کا ابھی آپ نے اظہار کیا ہے۔ آپ مطمئن رہیں میں ان کی غلط فہمی دور کر دوں گا۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر نے پہلو بدلا، پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔

”ایک پرسنل سوال ہے، اگر آپ برا نہ مانیں تو عرض کروں۔“

"آپ غالباً یہ پوچھیں گے ڈاکٹر کہ میں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی! میرا قیاس غلط تو نہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک سمجھیں آپ! میں یہی پوچھنا چاہتا تھا۔"

ڈاکٹر بھی مسکرا دیا۔

"اگر میں اس کا جواب نہ دینا چاہوں تو؟"

"تو پھر میں اصرار نہیں کروں گا کیونکہ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔"

"شکریہ ڈاکٹر!" میں بولی۔ "اس میں راز کی کوئی بات نہیں۔ میں دراصل جیسی زندگی گزار رہی ہوں یا گزارنا چاہتی ہوں اس میں کسی مرد کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کی کوئی نفسیاتی وجہ نہیں، نہ یہ بات ہے کہ میں مردوں کو ناپسند کرتی ہوں۔"

مجھے اور ڈاکٹر کو گفتگو کرتے ہوئے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ اس دوران میں ڈاکٹر نے میرے لئے چائے بھی منگوالی تھی۔ جب میں چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی میز پر رکھ رہی تھی تو انٹرکام پر ڈاکٹر کو بتایا گیا کہ ارشاد کو ہوش آ رہا ہے۔

"آیئے چلیں۔" ڈاکٹر مجھے ارشاد کے ہوش میں آنے کے متعلق بتا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں ڈاکٹر کے ساتھ نیچے کمرے میں پہنچی تو وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے علاوہ ارشاد کے والد کمال حسین بھی تھے۔ ڈاکٹر کے ساتھ مجھے آتے دیکھ کر اس وقت بھی ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"میجر! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کچھ دیر کیلئے باہر چلے جایئے۔" ڈاکٹر نے کمال حسین سے کہا۔

"وہ تو میں چلا جاتا ہوں لیکن ڈاکٹر سنیں...... آپ بھی ذرا سنیں ارشاد کیا بڑبڑا رہا ہے! یہ...... یہ ظلم ہے سراسر!" یہ کہتے ہوئے کمال حسین نے میری طرف دیکھا تھا۔

مجھے کمال حسین کا یہ رویہ ناگوار تو ہوا مگر اپنا غصہ پی گئی۔ میرا جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ ان سے کہہ دوں، یہ ظلم خود آپ کے بیٹے نے اپنے آپ پر کیا ہے لیکن یہ موقع ان باتوں کا نہیں تھا۔ میں کمال حسین کو نظرانداز کرنے کی غرض سے آگے بڑھ کر ارشاد کے سرہانے پہنچ گئی پھر میں نے بھی اس کی واضح بڑبڑاہٹ سنی اور اپنی تمام تر بے باکی کے باوجود ایک شرمندگی سی محسوس کی۔ یوں جیسے بھرے بازار میں کسی نے میرے سر سے چادر کھینچ لی ہو۔

ارشاد وقفے وقفے سے بڑبڑا رہا تھا۔ "میری زندگی...... میری جان...... عذرا خان! میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا...... نہیں جی سکتا!...... مجھ پر رحم کرو مجھے اپنی مہربان آغوش میں لے لو...... مجھ سے میرے خواب نہ چھیننا مجھے زندہ رہنے دو!"

میں نے کن انکھیوں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کمرے میں اب ڈاکٹر کے سوا کوئی نہیں تھا اور وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود دوسرا ڈاکٹر اور کمال حسین دونوں کمرے سے باہر جاچکے تھے۔

"آپ نے سنا عذرا خان! پلیز میری مدد کیجئے! اسے آہستہ آہستہ ہوش میں لانے کی کوشش کیجئے! اس کے سرہانے بیٹھ جایئے! اسے احساس دلایئے کہ آپ اس کے پاس ہیں اور...... اور اگر چاہیں

تو میں...... میں بھی کمرے سے باہر چلا جاتا ہوں تاکہ آپ کو کوئی جھجک کم از کم یہاں میری موجودگی سے محسوس نہ ہو۔" ڈاکٹر نرمی سے بولا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر، میں اسے سنبھالنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ کمرے سے چلے جائیں! تشویش کی کوئی بات ہوئی تو میں آپ کو بلالوں گی۔ میں نے ڈاکٹر کی تجویز قبول کرلی۔ میں واقعی اس کے سامنے بلاجھجک محبت کی اداکاری نہ کرسکتی۔

"مجھے یقین ہے خاتون، اگر اسے یہ احساس ہوگیا کہ آپ اس کے قریب موجود ہیں تو اس کی حالت سنبھل جائے گی، میں باہر ہی موجود ہوں، آپ فکر نہ کیجئے گا۔ اگر خدانخواستہ اس کی ناک سے پھر خون بہنے لگے تو مجھے فوراً مطلع کردیجئے گا۔ خداحافظ!" یہ کہہ کر ڈاکٹر تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے کمرے کا دروازہ بھی بھیڑ دیا تھا۔

ارشاد کی آنکھیں بند تھیں اور اب بھی وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بڑبڑا رہا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میں اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور پھر اسے نام لے کر پکارنے لگی۔ "ارشاد!...... میں آ گئی ہوں...... تمہاری عذرا تمہارے پاس موجود ہے۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے اپنی موجودگی کا یقین دلانے کی خاطر اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی وقت میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ ارشاد کی زندگی بچانے کیلئے میں اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کو بھی بروئے کار لاسکتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرلیا پھر میرے ذہن نے اس کے ذہن کو حکم دینا شروع کردیا۔ ارشاد! تم ہوش میں آرہے ہو، آنکھیں کھولو ارشاد!...... آنکھیں کھولو! میں نے یہ دیکھ کر خوشی محسوس کی کہ ارشاد نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ارشاد! تم پوری طرح ہوش وحواس میں ہو۔ عذرا خان نے تمہیں کوئی ذہنی اذیت نہیں دی۔ وہ تمہاری ہمدرد ہے، تمہاری بھلائی چاہتی ہے۔ اس لمحے میں نے محسوس کیا جیسے ارشاد کے ذہن کی رگیں کھلتی جارہی ہوں۔ نقوش محبت جو پہلے میرے ذہن کی سخت گرفت سے مٹ سے گئے تھے نمایاں ہوگئے۔ میرے لئے یہ بڑا انوکھا تجربہ تھا۔ ارشاد! میرے ذہن نے ایک بار ارشاد کے ذہن کو مخاطب کیا، تم بالکل صحت مند اور تندرست وتوانا ہو تمہارے سر میں بھی اب درد نہیں ہے، تم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کررہے ہو۔ بولو...... بولو ارشاد! تم ہوش میں ہونا؟"

ہاں میں ہوش میں ہو۔ وہ خوابیدہ سی آواز میں بولا۔

"تم ایک گہری اور پرسکون نیند سے بیدار ہورہے ہو...... تم جاگ رہے ہو ارشاد!" یہ کہتے ہوئے بہت آہستگی کے ساتھ میں نے اس کے ذہن سے اپنے ذہن کا رابطہ منقطع کرلیا۔ ارشاد کے جسم کو خفیف سا جھٹکا لگا اور وہ چونک کر میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

"آپ!...... ہم کہاں ہیں؟...... یہ کون سی جگہ ہے؟" ارشاد کی آواز حیرت کے باوجود نارمل تھی۔

"تمہاری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ تمہارے والد تمہیں یہاں لے آئے تھے۔" میں اسے بتانے لگی۔ "یہ ایک پرائیویٹ ہاسپٹل ہے یہاں میں تمہیں دیکھنے آئی تھی۔"

"میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو میری وجہ سے زحمت اٹھانا پڑی۔" ارشاد نرمی سے بولا پھر

پوچھنے لگا۔ ''مگر ابو کہاں ہیں اور مجھے کیا ہو گیا تھا؟''

''تمہارے ابو کمرے کے باہر موجود ہیں۔ تمہارے سر میں شدید درد تھا جس کی شدت سے تم بے ہوش ہو گئے تھے اور کوئی خاص بات نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''مگر اب تو میرے سر میں بالکل درد نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا۔

''لیٹے رہو!'' میں نے اس کے سینے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ لٹا دیا پھر بولی۔ ''پہلے ڈاکٹر صاحب تمہیں دیکھ لیں اور اٹھنے کی اجازت دے دیں تبھی تم اٹھ سکو گے۔ ٹھہرو، میں ابھی انہیں بلاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں بستر سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

مجھے اس وقت عجیب سی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ اپنی کامیابی کی خوشی تھی اور اس کی خوشی بھی کہ میری ہی ایک غلطی کی وجہ سے ارشاد کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی اور میں اسے دوبارہ ہوش و حواس کی دنیا میں واپس لے آئی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے باہر دیکھا تو کچھ فاصلے پر کمال حسین اور ڈاکٹر محو راز و نیاز تھے۔ یقیناً ڈاکٹر نے کمال حسین کو حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا کیونکہ اس بار میں نے ان کے چہرے پر اپنے لئے ناگواری کے اثرات نہیں دیکھے تھے۔

دروازہ کھلتے ہی ڈاکٹر فوری طور پر میری طرف متوجہ ہو گیا تھا کیونکہ اس کی نظریں باتیں کرتے ہوئے بھی دروازے ہی کی طرف تھیں۔ وہ لپک کر میرے قریب آ گیا۔

''مبارک ہو ڈاکٹر! آپ کا مریض پوری طرح ہوش میں آ گیا۔'' میں نے اسے خوش خبری سنائی۔

''ارے آپ تو جادوگر نکلیں! حیرت ہے کہ اتنی جلدی کس طرح۔''

''آپ خود معائنہ کر لیجئے!'' میں دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

ڈاکٹر کمرے میں داخل ہو گیا اور پھر بیڈ کے قریب پہنچ کر ارشاد کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ اسے کیا خبر تھی کہ ارشاد کو مکمل طور پر ہوش و حواس میں لانے کیلئے میں نے کیا نسخہ آزمایا ہے! ڈاکٹر نے پہلے ارشاد کی نبض دیکھی پھر بلڈ پریشر چیک کیا۔ اس کے بعد دل کی دھڑکن سنتا رہا، ٹمپریچر بھی لیا۔ اس کے علاوہ دیر تک تفصیلی معائنہ کرتا رہا۔ اس دوران میں کمال حسین بھی کمرے میں آ گئے۔

''حیرت انگیز!'' آخر ڈاکٹر سیدھا کھڑا ہو کر بولا۔ ''ہر چیز اس وقت نارمل ہے حالانکہ جب میں اسے یہاں لے کر آیا تھا تو نہ نبض نارمل تھی، نہ بلڈ پریشر، نہ ہی ہارٹ بیٹ! ...... یہ بتاؤ ارشاد کہ اس وقت تمہیں اپنا سر تو بھاری محسوس نہیں ہو رہا؟''

''قطعی نہیں ڈاکٹر!'' ارشاد نے جواب دیا۔ ''میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔''

''سر میں ہلکا سا درد بھی محسوس نہیں کر رہا۔'' ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔

''بالکل نہیں ڈاکٹر! ...... مجھے تو یہاں لگ رہا ہے جیسے میں بھرپور نیند لے کر اٹھا ہوں، بالکل تازہ دم!''

''مبارک ہو میجر!'' ڈاکٹر نے کمال حسین کی طرف مڑ کر کہا۔ آپ چاہیں تو احتیاطاً صبح تک

کیلئے ارشاد کو یہاں چھوڑ دیں ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ میں اس کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہوں۔''

''ارشاد کی ماں رات بھر میں آدھی رہ جائے گی۔ اگر آپ مطمئن ہیں تو پھر ہمیں گھر جانے ہی دیں۔'' کمال حسین نے کہا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' ڈاکٹر بولا پھر ارشاد کو مخاطب کیا۔ ''اٹھو چل کر دیکھو کہ کمزوری تو محسوس نہیں ہوتی!''

ارشاد اطمینان کے ساتھ بیڈ سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، یوں جیسے وہ بیمار ہی نہ رہا ہو۔

''گڈ!'' ڈاکٹر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اب تم گھر جا سکتے ہو۔''

''وہ ایک منٹ یہیں ٹھہرو تم! کمال حسین نے ارشاد سے کہا۔ میں ذرا ان سے ایک ضروری بات کر لوں۔'' انہوں نے میری طرف دیکھا اور پھر بولے۔ ''ذرا آپ آیئے!''

میں سمجھ گئی کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہوں گے! بہر حال میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔ وہ مجھے ایک ستون کی آڑ میں لے آئے۔

''میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ ڈاکٹر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ تو ہماری محسن ہیں، میں آپ کا انتہائی ممنون ہوں، مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دیجئے گا۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے کمال حسین کی آواز بھاری ہو گئی۔

''کوئی بات نہیں محترم، آدمی کو غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ ارشاد کے بارے میں آپ سے میری ایک درخواست ہے کہ شادی کے معاملے میں اس پر جبر نہ کریں۔ میں وعدہ تو نہیں کرتی لیکن کوشش ضرور کروں گی کہ وہ اس پر آمادہ ہو جائے۔'' میں نے کمال حسین کو سمجھایا۔

کمال حسین مجھے تشکر آمیز نظروں سے دیکھنے لگے پھر میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور ارشاد کو خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔ کمال حسین کو ڈاکٹر نے چائے پلانے کیلئے روک لیا تھا۔ جب میں ہسپتال سے اپنی کوٹھی کی طرف لوٹ رہی تھی تو رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام تھی، گاڑی چلاتے ہوئے اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ذہن پر دھند سی چھانے لگی ہو پھر اسی دھند میں بجلی کا ایک کوندا سا لپکا اور میرے وجود میں برقی لہر دوڑ گئی۔ میں خود یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر مجھے کیا ہو رہا ہے! میں نے کسی ممکنہ حادثے سے بچنے کیلئے اپنی کار کو بریک لگائے اور اسے سڑک کے ایک کنارے روک لیا۔ اسی وقت پھر میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک آشنا سی نسوانی آواز نے سرگوشی کی۔ عذرا خان! تمہاری زندگی کے دن اب پورے ہونے والے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تم سسک سسک کر مرو بہتر یہ ہے کہ خود اپنی زندگی ختم کر لو۔ تمہارے پرس میں ریوالور تو موجود ہے نا! پرس کھول کر ریوالور نکالو اور اس کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ کر فائر کر دو! اس طرح تم آسانی سے مر جاؤ گی، ہے نا ریوالور تمہارے پاس؟''

''ہاں میرے پرس میں ریوالور موجود ہے۔'' میرے ہونٹ جیسے خود بخود حرکت کرنے لگے۔

تو پھر نکالو ریوالور! جلدی کرو! وہی آشنا نسوانی سرگوشی سنائی دی۔

مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں جو کچھ کر رہی ہوں، غلط ہے مگر میرا جسم میرے ارادوں کے بجائے اس پراسرار سرگوشی کے حکم کا تابع ہو گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے ریوالور نکال لیا۔

دیکھ لو عذرا خان کہ تمہارے ریوالور میں گولیاں بھی ہیں یا نہیں؟ میرے ذہن میں پھر سرگوشی ہوئی۔

میں نے ریوالور چیک کیا، ریوالور لوڈ تھا۔

ٹھیک ہے ریوالور لوڈ ہے! اب تم اس کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ لو!

میں نے اس پراسرار سرگوشی کے حکم کی تعمیل میں ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ لی۔ اسی لمحے میرے صفحہ ذہن پر ایک چہرہ ابھرا اور میرے حواس جھنجھنا اٹھے۔ یہ چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا، میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”لیوسی تم!“

ہاں میں عذرا خان! اس بار میرے ذہن میں سرگوشی گونجی تو میں چونک اٹھی۔ وہ آشنا نسوانی سرگوشی لیوسی ہی کی تھی۔ سنو عذرا خان! میں تم سے سولومن کا انتقام لینے پاکستان آئی ہوں اور تمہیں میرے انتقام سے کوئی نہیں بچا سکے گا! تمہیں اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں پر بڑا ناز تھا مگر دیکھ لو کہ میرے طاقت ور ذہن نے کتنی آسانی سے تمہارے ذہن کو اپنا غلام بنا لیا! ڈرو مت عذرا خان کہ موت تمہاری تقدیر بن چکی ہے۔ فائر کرو تا کہ میرے سینے میں بھڑکتے ہوئے انتقام کے شعلے سرد پڑ جائیں!

میرے وجود میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے چاہا کہ اپنی کنپٹی سے ریوالور کی نال ہٹا لوں مگر ناکام رہی۔

☆......☆......☆

ان لمحات کی ہولناکی محسوس کر کے میرا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان ایک لحہ بھی فیصلہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔ بس اتنی ہی سی تو بات تھی کہ میں اپنے ریوالور کا ٹریگر دبا دیتی اور ریوالور کی نال سے گولی نکل کر میری کنپٹی میں پیوست ہو جاتی۔ اب تک لیوسی کے ہر حکم کی تعمیل کرنے کے باوجود میرے ذہن نے لیوسی کا صرف یہی حکم نہیں مانا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی میرے ذہن میں قوت مزاحمت موجود تھی۔

تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا لیوسی کی آواز نے میرے پورے وجود کو جیسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ خودکشی کرنا پڑے گی' خود کو گولی مارنا پڑے گی۔ ”نہیں۔“ میں تقریباً چیخ اٹھی۔ ”میں تمہارا حکم نہیں مانوں گی۔“ میرے لہجے میں سرکشی تھی اسی وقت میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے میرے ذہن سے لیوسی کے ذہن کی گرفت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اپنی قوت ارادی سے کام لے کر میں نے اپنے ذہن کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ اسی کے ساتھ میرے دماغ کی رگوں پر شدید دباؤ پڑا اور میں نے انتہائی اذیت محسوس کی۔

میں بھی دیکھوں گی عذرا خان کہ تم مجھ سے کب تک بچو گی۔ لیوسی کی آواز کہیں دور سے سنائی دی اور میرے صفحہ ذہن سے اس کے چہرے کے خطوط غائب ہونے لگے۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ آج تو تم بچ گئی ہو لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہو گا۔ لیوسی کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور پھر تاریکی پھیل گئی۔ یہ جھٹکا بالکل ایسا تھا جیسے میرے جسم کو کرنٹ لگا ہو۔ ذہن ہی کے ساتھ ساتھ میرے جسم کو بھی جھٹکا محسوس ہوا تھا۔ میرے جس ہاتھ میں ریوالور تھا وہ ہاتھ جیسے کسی مضبوط گرفت سے آزاد ہو گیا تھا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا تھا اور میرا ہاتھ ڈھیلا ہو کر ایک طرف یوں جھول گیا تھا جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔ کچھ دیر تک میرے تمام جسم میں سنسناہٹ سی ہوتی رہی اور پھر معمول پر آنے لگی۔

سولومن کی موت کے بعد ایک بار پھر وہ خطرناک کھیل شروع ہو چکا تھا جس کی مجھے توقع تھی۔ خود لیوسی نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے سولومن کا انتقام لینے پاکستان آئی ہے ورنہ لیوسی کو سمجھنا میرے لیے مشکل ہو جاتا۔

اس بار میرے مقابل خود میری ہی صنف تھی' کوئی مرد نہیں تھا۔ لیوسی میرے لیے کتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ مجھے پہلی ہی مرتبہ ہو چکا تھا۔ وہ یقیناً حیرت انگیز ذہنی قوتوں کی مالک تھی ورنہ یوں میرے طاقت ور ذہن پر غلبہ حاصل نہ کر لیتی۔ ملک و قوم کے مفادات کے ساتھ ساتھ اب

میرے اور امریکی ایجنٹوں کے درمیان ذاتی طور پر بھی نفرت و انتقام کی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ جب تک میں موجود ہوں انہیں اپنے مقاصد کے حصول میں کامیابی نہیں ہو گی۔ یہی سبب تھا کہ اب ان کا پہلا ہدف میں ہی تھی۔

میری حالت اعتدال پر آ گئی تو میں نے کار سٹارٹ کرنے سے پہلے ٹرانسمیٹر پر آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے رابطہ قائم کر لیا۔ طویل عرصے کے بعد خلاف توقع وہ بھی نصف شب گزرنے کے بعد ٹرانسمیٹر پر میری آواز سن کر سیل کا نائب عثمانی حیرت زدہ سی آواز میں بولا۔ ''میڈم آپ؟ اوور!''

''ہاں میں عثمانی۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''کھیل دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔'' یہ کہہ کر مختصراً میں نے پیش آنے والے واقعہ سے عثمانی کو آگاہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ اسے میں نے لیوسی اور اس کے دونوں ساتھیوں کے متعلق بتا دیا' پھر بولی۔ ''توقع تو نہیں ہے کہ وہ لوگ اب بھی اسی فائیو سٹار ہوٹل میں ہوں' پھر بھی چیک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں گھر پہنچنے کے بعد تم سے اس سلسلے میں رپورٹ لوں گی۔ ہوٹل کے کن کمروں میں وہ تینوں ٹھہرے ہیں' یہ میرے علم میں نہیں۔ مجھے صرف ہوٹل کا نام معلوم ہے جو تمہیں بتا چکی ہوں۔ اوور۔''

''بس ٹھیک ہے۔ اوور اینڈ آل!'' یہ کہتے ہی میں نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا اور پھر اپنی کار سٹارٹ کرنے لگی۔ اس سے پہلے ریوالور اٹھا کر میں اپنے پرس میں رکھ چکی تھی۔

''عذرا خان!'' اچانک مجھے عقبی نشست سے ایک آشنا آواز سنائی دی۔ اسی کے ساتھ کوئی سرد اور ٹھوس شے میری گدی سے آ لگی جو کسی ریوالور کی نال ہی ہو سکتی تھی۔ معلوم نہیں وہ شخص کب میری کار کا دروازہ کھول کر اندر آ بیٹھا تھا اور مجھے اس کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔ شاید یہ وہ لمحات تھے جب لیوی نے میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں نے کار روک دی۔

''کون ہو تم؟'' غیر ارادی طور پر بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

''اتنی جلدی بھول گئیں مجھے!'' آج ہی تو تم سے ملاقات ہوئی تھی۔''

میں اس کی آواز سے اسے پہچان چکی تھی۔ کسی بلڈاگ کی سی شکل والا وہ غیر ملکی لیوسی کا ساتھی ٹام تھا۔

''میں انہی تینوں میں سے ایک ہوں عذرا خان جن کی تلاش میں تم نے ابھی اپنے آدمیوں کو روانہ کیا ہے' تمہارا اندازہ صحیح ہے۔ ہم تینوں نے واقعی وہ ہوٹل چھوڑ دیا ہے۔''

''ٹام!'' میں نے اسے اس کا نام لے کر مخاطب کیا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟'' یوں میری کار میں سوار ہو کر مجھ پر ریوالور تان لینے کا کیا مقصد ہے؟'' میری آواز میں سختی تھی۔

''میرا بھی وہی مقصد ہے عذرا خان جو لیوسی کا مقصد تھا'' اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''لیوسی کا حکم تھا کہ اگر تم خود اپنے آپ کو گولی نہ مار سکو تو میں یہ فرض پورا کر دوں۔''

''پھر تمہیں کیا انتظار ہے یہ فرض پورا کیوں نہیں کرتے؟'' میں نے بے خوفی سے کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔'' ٹام عجیب سے لہجے میں بولا۔

''اس بات کا مجھے گولی مارنے سے کیا تعلق ہے؟' میں نے سوال کیا۔

''تعلق ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں' مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم ایک مشرقی عورت ہونے کے ناتے اب تک باکردار رہی ہو' کیا یہ درست ہے؟''

''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔ میں کچھ کچھ سمجھتی جا رہی تھی کہ ان باتوں سے اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

''اگر واقعی ایسا ہی ہے عذرا خان' تو تم زندگی کی ایک بڑی نعمت سے محروم رہی ہو اور میں نہیں چاہتا کہ اسی محرومی کے عالم میں مر جاؤ۔'' آخر کار اس کی زبان پر وہ بات آ ہی گئی جس کیلئے اس نے تمہید باندھی تھی۔ اس نے مزید کہا۔ ''میں تمہیں قتل کرنے سے پہلے زندگی کی اس نعمت سے فیض یاب ہونا چاہتا ہوں۔'' اس نے واضح الفاظ میں مجھے گناہ کی ترغیب دی۔

میں نے اب دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے ذہن کو اپنے طاقت ور ذہن کی گرفت میں لینے کی خاطر اپنی حیرت انگیز قوتوں کو بیدار کر لیا۔

''فضول ہے عذرا خان!'' وہ بول اٹھا۔ ''تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اگر تم میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے سکتیں تو نہ لیوسی یہ خطرہ مول لیتی' نہ میں تمہارے قریب آنے کی ہمت کرتا۔''

ٹام نے جو کچھ کہا غلط نہیں تھا۔ میں اس کے ذہن پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ اسے یقیناً یہ احساس ہو چکا تھا کہ میں اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنا چاہتی ہوں۔

''عذرا خان! تمہارے لیے اب یہی بہتر ہے کہ پچھلی سیٹ پر آ جاؤ۔'' ٹام نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

''ٹھیک ہے ٹام!'' میں نے طویل سانس لیا۔ ''اگر موت میری تقدیر بن چکی ہے تو پھر مجھے تمہاری پیشکش قبول ہے۔'' میرا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

''تم واقعی ایک ذہین عورت ہو عذرا خان!'' ٹام کی آواز سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید مجھے زبردستی کرنا پڑے گی۔'' ان الفاظ کے ساتھ اس نے ریوالور کی سرد نال میری گدی سے ہٹا لی' پھر مزید بولا۔ ''ادھر ہی سے آ جاؤ دروازہ کھول کر نیچے اترنے کی ضرورت نہیں۔ اپنا پرس بھی اگلی نشست پر چھوڑ دینا۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ اس میں ریوالور موجود ہے۔''

میری رضامندی کے باوجود ٹام بہت محتاط تھا۔ اس نے مجھے کچھ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے کسی آکٹوپس کی طرح فوراً ہی مجھے جکڑ لیا تھا۔ میرے جسم پر اس کی گرفت خاصی سخت تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس میرے جسم کی ہڈیاں چٹخ جائیں گی اور میرا دم گھٹ جائے گا۔

''ریشم ایسا یہ جسم میرے حصے میں آئے گا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔'' اس کی آواز خوابناک سی ہو گئی۔ اس کی دراز دستیاں' گستاخیوں کی حدود کو عبور کر رہی تھیں۔

اپنے غصے اور نفرت پر قابو پانے میں مجھے انتہائی دشواری پیش آ رہی تھی۔ میں یہ سب کچھ ایک خاص مقصد کے حصول کی خاطر برداشت کر رہی تھی۔

''ٹام!'' اس کی دراز دستیوں کے جواب میں اپنی آواز کو بھی میں نے خوابناک بنا کر کہا۔ ''تم

واقعی ایک جری مرد ہو۔ مرنے سے پہلے مجھے افسوس نہیں ہوگا کہ میں زندگی کی سب سے بڑی نعمت سے محروم اس دنیا سے جا رہی ہوں۔"

"عذرا خان!" وہ جیسے گنگنایا۔ "کاش میں زندگی بھر کے لیے تمہیں اپنا سکتا۔"

"ٹام! کاش میں بھی ساری زندگی اسی طرح تمہاری بانہوں کے حصار میں قید رہ سکتی۔" میں نے اس کے جذبات کو بے قابو کرنے کیلئے کہا۔

جواباً وہ دیوانہ سا ہو گیا اور اس کی یہ دیوانگی مجھے مہنگی پڑنے لگی۔ اس نے ایسی نازیبا حرکات شروع کر دی تھیں جو کسی بھی صورت میں میرے لیے قابل قبول نہیں تھیں مگر میں نے اسے روکا نہیں۔ اگر میں اسے روک دیتی تو اپنے مقصد میں ناکام ہو جاتی۔ میں چاہتی تھی کہ اس کی دیوانگی نقطہ عروج پر پہنچ جائے۔ اس کیلئے مجھے بڑی روح فرسا صورتحال سے گزرنا پڑا۔ شاید اتنا کرب میں نے زندگی میں کبھی برداشت نہ کیا ہو جو ان لمحات میں برداشت کیا۔ ٹام کا غلیظ اور قابل نفرت وجود مجھے اپنی ناآسودہ خواہشوں کا شکار بنانے ہی والا تھا کہ میرے ذہن کی حیرت انگیز قوتیں بیدار ہو گئیں۔ وہ مجھ پر جھکا ہی تھا کہ اچانک میں نے اس کے ذہن کو اپنے طاقتور ذہن کی گرفت میں لے لیا۔ بے قابو جذبات کے طوفان میں اسے میں نے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ ٹام پر قابو پانے کا یہی ایک واحد ذریعہ تھا کہ میں اس کے جذبات کو انتہائی حد تک بے قابو کر دیتی اور مجھے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ یہی حربہ میں نے ایک مرتبہ سولومن پر بھی آزمایا تھا۔ مگر وہ میری ذرا سی غفلت کے سبب بچ گیا تھا۔ عام حالات میں جن لوگوں کے ذہنوں کو قابو میں نہیں کیا جا سکتا' اگر کسی طرح ان کے شہوانی جذبات کو پوری طرح بھڑکا دیا جائے تو ان کو قابو میں کیا جا سکتا ہے' اس کا مجھے علم تھا۔ ٹام بھی کیوں کہ مضبوط قوت ارادی اور غیر معمولی ذہن کا مالک تھا اس لیے اسے بھی اسی طرح زیر دام لانا ممکن تھا۔ میں نے اب تک اسی لیے اس کی نازیبا حرکات کو برداشت کیا تھا۔

عین ممکن تھا کہ ٹام کے ذہن کو اپنی گرفت میں لینے کے بعد لیوسی کے متعلق مجھے کوئی اہم بات معلوم ہو جاتی مگر اس وقت میں اس قدر غصے میں تھی کہ ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ دراصل ٹام کی ناقابل برداشت حرکتوں نے مجھے انتہائی مشتعل کر دیا تھا۔ میں جس حالت میں اس وقت تھی وہ میرے لیے انتہائی قابل شرم تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وقت ضائع کیے بغیر ٹام کے ذہن کو گرفت میں لیتے ہی میں نے زبردست جھٹکا دیا۔ نتیجتاً اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی اور پھر جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹام کی ناک سے خون بہنے لگا۔ یقیناً اس کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ گئی تھی۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گئی کہ کہیں اس کے خون سے میرے کپڑے نہ خراب ہو جائیں۔

میں اپنے بے ترتیب لباس کو درست کرنے لگی۔ اس دوران میں ٹام کا جسم ایک بار زور سے کانپا اور پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ اسے میرے ساتھ دراز دستیوں کی سزا مل چکی تھی۔

کار کا دروازہ کھول کر میں نیچے اتری اور پھر کار کا دروازہ کھول کر ٹام کے مردہ جسم کو کار کے اندر سے گھسیٹ کر باہر سڑک پر ڈال دیا۔ اپنی کار کا پچھلا دروازہ بند کر کے میں ایک بار پھر ڈرائیونگ سیٹ

آ بیٹھی اور کار سٹارٹ کر دی۔

کچھ دیر پہلے میں جن اذیت ناک لمحوں سے گزری تھی اس کی اذیت مجھے اب تک محسوس ہو ہی تھی۔ اسی اذیت کے زیر اثر میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ ٹام کی جامہ تلاشی لے کر مجھے کوئی کام ا چیز مل سکتی تھی' کوئی ایسی چیز جس سے لیوسی کا سراغ لگانے میں مدد ملتی۔ یہ خیال مجھے اس وقت آیا جب میں خاصا فاصلہ طے کر چکی تھی۔ اب اس جگہ واپس جانا خطرے سے خالی نہ ہوتا جہاں میں نے ٹام کی لاش پھینکی تھی۔ جامہ تلاشی لیتے ہوئے کوئی پولیس وین بھی اس طرف آ سکتی تھی۔ اگر آدمی پر جذبات غالب ہوں تو شعور کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اسی کے نتیجے میں ٹام اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور اسی کے سبب وقتی طور پر میں بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی تھی۔ ہاں میرے اور ٹام کے جذبات مختلف ضرور تھے۔ اس کے جذبات ہوس کے آئینہ دار تھے اور میرے جذبات نفرت اور غصے پر مشتمل تھے۔

آتش و آہن کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے میں پوری طرح چوکنا اور محتاط ہو چکی تھی۔ دشمن کی طرف سے اب کسی بھی وقت کہیں بھی مجھ پر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ آج ہی رات دو مرتبہ میں دشمن کے قاتلانہ حملوں سے بچی تھی۔ اس احساس کے پیش نظر اپنی کوٹھی کے گیٹ پر کار روکتے ہوئے میں نے اطراف کا جائزہ لیا اور چونک اٹھی۔ یقیناً کچھ لوگ میری کوٹھی کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ میری عقابی نظروں سے چھپ نہیں سکے تھے۔

کوٹھی کا گیٹ کھلوانے کیلئے میں نے ہارن دیا۔ مسلح چوکیدار نے گیٹ میں بنے ہوئے چھوٹے سے ایک خانے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ میں نے کار کے اندر کی لائٹ آن کر دی تاکہ وہ مجھے پہچان لے۔ یہ میری ہی تاکید تھی کہ بغیر پہچانے گیٹ نہ کھولا جائے۔ چند ہی لمحے بعد میں کار اندر لے گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے فون پر آپریشن سیل کے نائب عثمانی سے رابطہ کیا۔ اس کا "لیں" سنتے ہی میں بول اٹھی۔ "میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ کچھ لوگ میری کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں' یں ابھی ابھی کوٹھی پہنچی ہوں' معلوم کراؤ کہ یہ کون لوگ ہیں اور پھر مجھے رپورٹ دو اور وہ ہوٹل والا معاملہ کیا ہوا؟ کچھ معلوم ہوا؟"

"میں نے جن ارکان کو ہوٹل بھیجا تھا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر یہ اطلاع دی ہے کہ آج ہی رات وہ تینوں غیر ملکی ہوٹل سے جا چکے ہیں۔" عثمانی کا جواب میری توقع کے مطابق ہی تھا۔ پھر وہ مزید بولا۔ "آپ کی طرف سے یہ اطلاع ملتے ہی کہ کھیل شروع ہو چکا ہے میں نے آپ کی کوٹھی کی نگرانی اور حفاظت کیلئے فوری طور پر سیل کے کچھ ارکان کو مامور کر دیا تھا۔ آپ نے انہی کو دیکھا ہوگا' مگر انہیں اتنا بے محتاط بہرحال نہیں ہونا چاہئے تھا کہ نظر میں آ جائیں۔"

"اس میں ان لوگوں کا کچھ زیادہ قصور نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ علاقہ ہی ایسا ہے کہ رات کے وقت یہاں کسی کی موجودگی کو محسوس کر لینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ بہرحال تم اچھے جا رہے ہو۔" میں نے عثمانی کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ وہ ایک بیدار ذہن شخص تھا اور کوئی حکم دیئے بغیر کوئی قدم اٹھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ ہر چند کہ میں نے اسے اپنی کوٹھی کی نگرانی یا حفاظت کا حکم نہیں دیا تھا مگر اس

نے صورتحال کے پیش نظر خود ہی یہ قدم اٹھالیا تھا۔

میری منہ سے اپنی تعریف سن کر عثمانی نے شکریہ ادا کیا' پھر بولا۔

''کوئی اور حکم میڈم؟''

''نہیں۔'' میں بولی' پھر اسے مختصراً اپنے اوپر ہونے والے دوسرے قاتلانہ حملے سے آگاہ کر دیا۔ میں نے دانستہ تفصیل بتانے سے گریز کیا تھا اور ٹام کی موت کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں سے ٹام کو مغلوب کر کے ٹھکانے لگا دیا۔

''میڈم! ٹام کو ٹھکانے لگانے کے بعد یقیناً آپ نے اس کی جامہ تلاشی بھی لی ہو گی' کیا اس کے پاس سے کوئی کام کی......''

''نہیں' مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا۔'' میں عثمانی کی پوری بات سنے بغیر ہی بول اٹھی' مجھے توقع تھی کہ عثمانی یہ سوال نہیں کرے گا کہ موقع کیوں نہیں ملا؟ مجھ سے متعلق افراد یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر میں کسی بات کی خود ہی جب تک وضاحت نہ کر دوں' انہیں وہ بات تفصیل کے ساتھ نہیں پوچھنا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اختصار کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے جو میں انہیں بتانا کسی مصلحت کے پیش نظر ضروری نہیں سمجھتی۔

''آئندہ کیلئے ہمارا کیا لائحہ عمل ہو گا میڈم؟'' عثمانی نے سوال کیا۔

''ابھی تو اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا' اس مسئلے پر کل بات ہو گی۔'' میں نے جواب دیا' پھر تاکید کی۔ ''بہرحال تم لوگوں کو بروقت الرٹ رہنا ہے۔ کیا خبر کس وقت کیا ضرورت پیش آ جائے۔ ممکن ہے کہ وہ مجھے الجھا کر درپردہ اپنے کسی منصوبے کی تکمیل کیلئے راہ ہموار کرنا چاہتے ہوں۔''

''جی ہاں میڈم' یہ امکان بھی ہے۔'' عثمانی نے میری بات سے اتفاق کیا۔

''یہ بات ذہن میں رکھنا کہ لیوسی ہمارے لیے سولومن سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ لیوسی کی حیرت انگیز قوتیں ہیں۔ اچھا عثمانی' خدا حافظ۔'' میں نے یہ کہتے ہی ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور پھر لباس تبدیل کرنے باتھ روم میں گھس گئی۔

اس رات میں دیر تک لیوسی ہی کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر میری آنکھوں میں نیند کروٹیں لینے لگی۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر میں نے ملک دلاور کو اس کی کوٹھی فون کیا۔

''زہے نصیب آج سویرے سویرے ہی کانوں میں رس گھل گیا۔'' میری آواز سن کر وہ بول اٹھا۔

''مجھے تم سے ایک بات معلوم کرنا تھی دلاور۔''

''ایک کیا جی' دو باتیں معلوم کریں' مگر ٹھہریں شاید آپ نے غلط نمبر ڈائل کر دیا ہے' یہ انکوائری آفس نہیں ہے۔'' وہ چہکنے لگا۔

''تو پھر ٹھیک ہے میں ٹیلی فون بند کیے دیتی ہوں۔''

میں نے اسے دھمکی دی۔

''آپ تو سیریس ہو گئیں ہیں مسمات میں تو بس یوں ہی دل پشوری کر رہا تھا۔ ارشاد ہو۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''یہ بتاؤ لیوسی سے تمہاری ملاقات پہلی بار کب اور کہاں ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے آپ کو اس سلسلے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ حکم کریں گی تو میں اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا' میں تو بس یوں یہ دھمکی دے رہا تھا آپ کو۔''

''دلاور!'' میں سخت لہجے میں بولی۔ ''تم سنجیدہ نہیں ہو گے۔''

''میں کئی دفعہ سنجیدہ ہو چکا ہوں' مگر آپ ہی رنجیدہ کر دیتی ہیں۔ آخر آپ کب تک اس طرح میرے دل سے کھیلتی رہیں گی۔''

''میں سمجھ گئی کہ اس وقت دلاور سنجیدگی سے بات کرنے پر آمادہ نہیں اس لیے مزید کچھ کہے بغیر ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میرے خیال میں مجھے فون کرنے والا ملک دلاور ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے ریسیور اٹھاتے ہی اسے تنگ کرنے کو کہہ دیا۔ ''میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔''

''مگر میں تو تم سے بات کرنا چاہتی ہوں عذرا خان!'' دوسری طرف سے ایک آشنا نسوانی آواز سنائی دی۔

میں چونک اٹھی کیونکہ وہ آواز لیوسی کی تھی۔ مین نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کیا کہنا چاہتی ہو تم؟''

''ٹام کو قتل کر کے تم نے اچھا نہیں کیا عذرا خان!' وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ حماقت تمہیں مہنگی پڑے گی۔''

''تو کیا میں اسے اجازت دے دیتی کہ مجھے قتل کر دے۔'' جواباً میں بھی درشت آواز میں کہا۔ ''سنو لیوسی! نفرت اور انتقام کی آگ میں صرف دوسرے ہی کا دامن نہیں جلتا' کبھی کبھی اس آگ میں آدمی خود بھی جل جاتا ہے۔ تمہارا انجام بھی مجھے مختلف نظر نہیں آتا۔''

''دھمکی دے رہی ہو مجھے۔'' یہ کہہ کر وہ استہزائیہ آواز میں ہنسی' پھر کہنے لگی۔ 'ابھی تم لیوسی کو نہیں جانتیں اسی لیے بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو' تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے مقابل کون ہے؟'' ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک دم ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

جرائم پیشہ یا ملک دشمن افراد کی طرف سے اس طرح دھمکیاں میرے لیے نئی بات نہیں تھی۔ بہرحال یہ خوشی تھی کہ پہلے ہی معرکے میں مجھے نہیں لیوسی کو نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ میں ناشتے کیلئے اٹھ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔

''ہیلو!'' اس مرتبہ میں نے محتاط رویہ اختیار کیا حالانکہ توقع تھی کہ فون ملک دلاور ہی کا ہو گا۔

''ارے آپ تو سچ مچ خفا ہو گئیں! اتنی دیر سے آپ کا نمبر ملا رہا تھا' لائن ہی نہیں مل رہی تھی' ریسیور اٹھا کر کریڈل سے الگ رکھ دیا تھا؟'' دوسری جانب سے بولنے والا ملک دلاور ہی تھا۔ ''اس بار پلیز فون نہ بند کر دیجئے گا۔ میں اب سنجیدہ ہوں' پوچھیں کیا پوچھ رہی تھیں؟''

''کچھ نہیں پوچھنا مجھے۔'' میں سخت لہجے میں بولی۔

''مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ مجھ میں دلچسپی لینا نہ چھوڑ دیں اس لیے بتا ہی دیتا ہوں جو آپ نے پوچھا ہے۔'' دلاور نے کہا' پھر بتایا۔''یہ ایک ہفتے پہلے کی بات ہے لیوسی سے مجھے سیٹھ عباس نے ملوایا تھا۔''

''سیٹھ عباس نے۔'' میں چونک اٹھی۔ کیوں کہ تجارت پیشہ طبقے میں سیٹھ عباس کی ساکھ اچھی نہیں تھی۔ اس پر سمگلنگ کے چکر میں ایک دفعہ مقدمہ بھی چل چکا تھا مگر عدم ثبوت کے سبب اور مقدمے کے گواہوں کا اپنے بیانات پر قائم نہ رہنے کی وجہ سے وہ بچ گیا تھا۔ نچلے درجے کے پولیس اہلکاروں کو خرید لینا یا اپنے حق میں کر لینا سیٹھ عباس ایسے شاطر افراد کیلئے زیادہ مشکل نہیں ہوتا پھر ظاہر ہے کہ ثبوت کہاں سے ملے گا۔

''ہاں اسی نے ایک تقریب میں ملوایا تھا۔'' دلاور نے تصدیق کی۔''یوں لگتا تھا جیسے لیوسی اس کی پرانی ملاقات بھی ہو اور بے تکلفی بھی۔''

''دلاور تم کب تک دفتر پہنچو گے؟ میں تفصیل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں' کیا ہوا کوئی خاص بات ہے؟'' دلاور بولا۔

''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔''تمہیں اسی لیے سنجیدہ ہونا پڑے گا۔''

''میں ڈیڑھ گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا دفتر آ جایئے آپ۔''

''آتی ہوں میں۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر کچھ سوچ کر دوبارہ ریسیور اٹھایا' اس بار میں آپریشن سیل کا نمبر ملا رہی تھی۔ لائن پر مجھے کمانڈر نواز ملا کیوں کہ اب اس کی ڈیوٹی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔''کمانڈر! عثمانی سے تمہیں رپورٹ مل گئی۔''

''جی ہاں میڈیم!'' کمانڈر جواباً بولا۔''میں کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ آپ کا فون نہ آ گیا ہوتا میں بس فون کرنے ہی والا تھا۔''

''ہاں بولو' کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''حفاظتی اقدامات کیلئے اگر آپ بلٹ پروف کار استعمال کریں تو زیادہ مناسب ہے میڈم!'' اس نے مشورہ دیا۔

''ویری گڈ کمانڈر! ایسا لگتا ہے کہ تم ٹیلی پیتھ ہو گئے ہو۔'' میں یہ کہہ کر آہستہ سے ہنس دی

''میں نے اسی لیے فون کیا تھا کہ بلٹ پروف کار بھیج دو۔''

کسی متوقع حملے کے ساتھ ساتھ اگر حملہ آوروں کو گھیرنے کا بندوبست بھی کر لیا جائے تو.....

''میں سمجھ گئی کمانڈر۔'' میں نے کہا۔''میری طرف سے اجازت ہے' مگر اس میں زیادہ دیر نہیں لگنا چاہئے' مجھے ملک دلاور کے دفتر پہنچنا ہے۔''

''بہتر ہے میڈم! مگر بہرحال ایک گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ڈرائیونگ نہ کریں تاکہ حملے کی صورت میں آپ کو کچھ کرنے کا موقع مل جائے۔ اس وقت کیپٹن شاد اور سرفراز دونوں ہی ہیڈ کوارٹر میں نہیں ہیں انہیں ایمرجنسی کال پر بلانا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے میرے پاس اتنا وقت ہے خدا حافظ۔'' میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر ناشتہ کر کے لباس تبدیل کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ آپریشن سل سے بلٹ پروف کار آنے سے پہلے ہی میں تیار ہو چکی تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی اس روز کے اخبارات دیکھ رہی تھی کہ ایک ملازمہ نے مجھے کیپٹن شاد کے آنے کی اطلاع دی۔ یہ سنتے ہی میں اخبار رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں باہر آئی تو پورٹیکو میں بلٹ پروف کار کھڑی دیکھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کیپٹن شاد بیٹھا ہوا تھا جو اب پوری طرح صحت مند ہو چکا تھا۔ سولومن سے آخری معرکہ آرائی میں کیپٹن شاد شدید زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ کار سے اترنے لگا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور پھر خود آگے بڑھ کر کار کا پچھلا دروازہ کھول لیا۔

''کیسے ہو کیپٹن؟'' میں نے پچھلی نشست پر بیٹھ کر کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ کیپٹن شاد سے خاص عرصے کے بعد میری ملاقات ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہوں میڈم! عنایت ہے آپ کی۔'' کیپٹن شاد نے یہ کہتے ہوئے کار سٹارٹ کر دی۔

''معلوم ہے تمہیں کیپٹن' کدھر چلنا ہے؟'' میں نے کیپٹن شاد سے دریافت کیا۔

''جی ہاں میڈم! کمانڈر نے مجھے بتا دیا تھا۔'' کیپٹن شاد نے جواب دیا۔

کوٹھی کے گیٹ سے نکل کر میں نے ارد گرد نظریں دوڑائیں تو کچھ فاصلے پر ایک جیپ دکھائی دی۔ جیپ کو میں نے پہچان لیا وہ آپریشن سیل کی جیپ تھی۔ دائیں جانب مجھے ایک سیاہ وین نظر آئی۔ اس وین کا تعلق بھی آپریشن سیل ہی سے تھا۔ اسی وقت کیپٹن شاد نے مجھے بتایا کہ جو حفاظتی دستہ اس وقت میرے ساتھ چل رہا تھا' اس کا انچارج سرفراز تھا۔ کوٹھی کے گیٹ سے میری کار کے باہر آتے ہی جیپ حرکت میں آ گئی تھی۔ سیاہ وین کچھ ہی دیر بعد میری کار کے پیچھے چلنے لگی۔

''میڈم! پچھلی سیٹ کے نیچے سٹین گن موجود ہے۔'' کیپٹن نے مجھے مطلع کیا۔

''آل رائٹ۔'' میں آہستہ سے بولی۔

دشمن کی طرف سے کیا جانے والا کوئی بھی حملہ اب خود اسی کیلئے خطرناک ثابت ہوتا۔ میں حفاظتی انتظامات سے پوری طرح مطمئن تھی۔ ملک دلاور کے دفتر پہنچنے تک میں لیوسی اور سیٹھ عباس کے تعلق کے بارے میں سوچتی رہی۔ ایک حلقے میں سیٹھ عباس کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ بین الاقوامی جرائم پیشہ زیر زمین دنیا سے اس کا تعلق ہے مگر قانون اب تک اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکا تھا۔ سیٹھ عباس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا یہ بھی تھا کہ برسر اقتدار کچھ اہم شخصیات سے بھی سیٹھ عباس کے مراسم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے خلاف ہونے والی کسی کارروائی کا علم اسے پہلے سے ہو جاتا تھا اور وہ حفاظتی تدابیر کر لیتا تھا۔ اس کے برعکس عوام میں سیٹھ عباس کی عزت تھی۔ وہ کئی فلاحی اداروں کی مالی معاونت کرتا تھا اور ان کا سرپرست تھا۔ سیٹھ عباس بظاہر ایک بڑا تاجر تھا مگر تاجر پیشہ طبقے میں اسے زیادہ عزت حاصل نہیں تھی۔ اس کی وجہ سیٹھ عباس کا مشتبہ کردار تھا۔ ملک دلاور سے بھی اس کے واجبی سے تعلقات تھے۔ کئی بار اس نے میرے قریب آنے کی بھی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے لفٹ نہیں دی تھی۔

میرے پہنچنے سے کچھ ہی دیر پہلے دلاور اپنے دفتر پہنچا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔

''وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا۔''

''بس بس آگے نہ پڑھنا ورنہ پچھتاؤ گے۔'' میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آگے ایک ایسا لفظ مصرع میں آنے والا ہے' جس میں بڑی لے ''کوئے'' ہے۔''

''آپ کو تو بس یہی ''کوئے کوئے'' ایک دن لے ڈوبے گی۔'' ملک دلاور برا سا منہ بنا کر کہنے لگا۔ ''لگتا ہے کہ آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گی۔''

''اچھا فضول باتیں چھوڑو' کام کی بات کرو۔ فون پر تم سیٹھ عباس اور لیوسی کے بارے میں کیا بتا رہے تھے!'' میں نے دریافت کیا۔ 'یاد کرو کہ لیوسی سے تمہارا تعارف کراتے ہوئے سیٹھ عباس نے کیا کہا تھا؟''

ملک دلاور کچھ دیر خاموش رہا جیسے کوئی بات یاد کر رہا ہو پھر بولا۔ ''سیٹھ عباس نے لیوسی سے کہا تھا کہ ہمارے ملک میں کم ہی خواتین تجارت پیشہ ہیں۔ ان کی ایک قریبی دوست عذرا خان بھی انہی خواتین میں سے ہیں۔ اس پر لیوسی نے آپ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جواباً میں نے کہہ دیا تھا کہ کسی دن ملاقات کرا دوں گا۔ پھر گزشتہ روز لیوسی ہی نے اس سلسلے میں مجھے فون کیا تھا اور میں نے اس کی دعوت کر دی تھی' اسی کے ساتھ آپ سے ملوانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔''

میرے لیے ملک دلاور کی بات خاصی معنی خیز تھی۔ یقیناً لیوسی نے مجھ سے ملاقات کیلئے سیٹھ عباس کو استعمال کیا تھا۔ اس کیلئے لیوسی نے سیٹھ عباس کو پہلے سے ہموار کر لیا ہوگا۔

میں دلاور کی بات سن کر اپنے خیالوں میں کھو گئی تو دلاور بول اٹھا۔ ''کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ یہ انکوائری کمیشن کس لیے بٹھایا گیا ہے۔''

دلاور کا تجسس فطری تھا مگر ظاہر ہے کہ میں اسے کس طرح کچھ بتا سکتی تھی' اسی لیے ہنس کر ٹال گئی اور صرف اتنا کہا۔ ''ضروری نہیں کہ تمہیں ہر بات بتا دی جائے۔''

''اور اگر میں آپ کے سوالات کا جواب نہ دیتا پھر؟'' اس نے بالکل بچوں کی طرح چڑ جانے کی اداکاری کی۔

''پھر کچھ بھی نہ ہوتا' میں تمہیں لفٹ دینا چھوڑ دیتی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ویسے تو مجھے یہ رقابت کا چکر لگتا ہے۔ اگر آپ نے مجھے اندھیرے میں رکھا تو میں سچ مچ لیوسی پر عاشق ہو جاؤں گا۔''

''ضرور عاشق ہو جانا اگر وہ تمہیں مل جائے! تم تو ابھی سے اور اس کا نام لیتے ہی پیدل ہو گئے ہو اور ''کوئے کوئے'' کرنے لگے ہو۔ خدانخواستہ اگر وہ تمہیں مل گئی تو پھر ہمیشہ کیلئے پیدل ہو جاؤ گے۔''

''اب تو میں یقیناً اس سے عشق لڑا کر آپ کو چڑاؤں گا اور ''کوئے'' بھی بولوں گا کر لیں کیا کرتی ہیں میرا۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے کچھ کرنے کی! لیوسی خود ہی تمہارے چودہ طبق روشن کرنے کیلئے کافی

ہے' مگر افسوس کی یہ بات ہے کہ اب وہ تم سے نہیں ملے گی۔''

''کیوں' کیا آپ نے اسے میری طرف سے بدکا دیا ہے؟''

''مجھے کیا پڑی ہے اسے بدکانے کی! تم جانو وہ جانے' ویسے اگر اتفاق سے لیوسی تمہیں مل ہی جائے تو مجھے ضرور مطلع کر دینا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''میں آپ کو یہ کیوں بتاؤں کہ آج شام چار بجے وہ میرے دفتر آنے والی ہے۔'' دلاور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''یہ بھی نہ بتانا کہ لیوسی نے یہ وعدہ تم سے کل کیا تھا۔''

''بالکل نہیں بتاؤں گا کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

''تو پھر میری اس بات کو بھی ٹھیک ہی سمجھو کہ لیوسی اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گی۔''

''آپ اگر سانس نہ لیا کرتیں تو اللہ کی بڑی برگزیدہ بندی ہوتیں۔''

''یہ تم کیا بے پر کی اڑانے لگے۔''

''پیش گوئیاں تو اللہ کے نیک بندے ہی کرتے ہیں نا! آپ کو ابھی سے یہ الہام ہو گیا کہ لیوسی آج شام مجھ سے ملنے نہیں آئے گی' یہ کمال ہے کہ نہیں۔''

''دیکھ لینا خود شام دور ہی کتنی ہے۔'' میں بولی' پھر کہا۔ ''اچھا اب میں چلوں گی۔''

''لیں یہ بھی خوب رہی! اتنی جلدی آپ کیسے جا سکتی ہیں ابھی تو میں نے ٹھیک طرح سے شربت دیدار بھی نہیں پیا۔ آپ کیلئے میں اچھی سی کافی منگواتا ہوں۔ آپ کافی پئیں' میں اتنے میں شربت دیدار پیتا رہوں گا۔''

پھر میں نے لاکھ انکار کیا مگر دلاور نے کافی پئے بغیر مجھے نہ اٹھنے دیا۔ چلتے وقت میں نے ملک دلاور کو لیوسی کے بارے میں کچھ بتانا ضروری سمجھا تاکہ وہ لاعلمی میں لیوسی کے کسی فریب کا شکار نہ ہو جائے۔ وہ بہرحال میرا بہی خواہ تھا۔

''دلاور! اول تو مجھے یقین ہے کہ لیوسی اب تم سے نہیں ملے گی لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا اور وہ تم سے ملتی ہے تو اس کی طرف سے محتاط اور چوکنا رہنا۔ وہ ایک خطرناک عورت ہے۔ یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ بعد میں تم پچھتانے سے بچ سکو۔''

''بڑا ظلم ہے خاتون کہ آپ اس دوشیزہ کو عورت کہہ رہی ہیں۔ ابھی تو وہ کسی ننھے منے کی امی حضور بھی نہیں بنی۔'' دلاور غیر سنجیدہ ہی رہا' مگر میرا فرض پورا ہو گیا۔ میں نے اسے متوقع خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔

دلاور اخلاقاً مجھے اپنے دفتر کے باہر تک چھوڑنے آیا اور میں اسے خدا حافظ کہہ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ نیچے پہنچ کر کار میں بیٹھنے کے بعد کیپٹن شاد سے میں نے کہا۔ ''اب میں دفتر چلوں گی۔ ٹرانسمیٹر پر تم سرفراز کو مطلع کر دو۔ جب تک میں دفتر میں رہوں تم لوگ دفتر کی نگرانی کرتے رہو گے۔''

''اوکے میڈم!'' یہ کہہ کر کیپٹن شاد نے کار میں موجود ٹرانسمیٹر پر سرفراز سے رابطہ قائم کیا اور اسے میرا پیغام دے دیا۔

دلاور کے دفتر سے اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اور نیا خیال آیا۔ ٹرانسمیٹر پر میں نے کمانڈر نواز کو حکم دے دیا کہ سیٹھ عباس کی نگرانی شروع کرا دی جائے۔ لیوسی کا سراغ لگانے کیلئے فی الحال سیٹھ عباس ہی میرے سامنے تھا۔ احتیاطاً میں نے لیوسی کا حلیہ بھی بتا دیا تھا اور اس کے زندہ بچ جانے والے ساتھی جیمس کے بارے میں بھی ضروری معلومات فراہم کر دی تھیں۔ کمانڈر نواز کو ان دونوں کا تفصیلی حلیہ بتانے کے بعد میں نے شہر کے دوسرے ہوٹلوں میں بھی ان دونوں کو تلاش کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

اپنے دفتر پہنچ کر میں کام میں مصروف ہو گئی۔ میں جلد از جلد ایسے تمام دفتری امور نمٹا لینا چاہتی تھی جن کے لئے میرا دفتر آنا ضروری ہو۔ موجودہ حالات میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ مجھے کب دفتر سے غائب ہونا پڑے۔ اپنی منیجر عارفہ کو بلا کر بھی میں نے یہ بات کہہ دی تھی تاکہ کوئی دفتری معاملہ ایسا نہ رہ جائے جو میری دفتر میں غیر موجودگی کے سبب پینڈنگ میں پڑ جائے۔

دوپہر کو میں اپنے دفتر سے لنچ کیلئے اٹھنے والی تھی کہ کمانڈر نواز کا فون آ گیا۔ فون پر اس نے مجھے ایک چونکا دینے والی اطلاع دی تھی۔

کمانڈر! ذرا تفصیل سے بیان کرو کہ کوٹھی کے اندر سیل کے ارکان نے کسی غیر ملکی عورت کی موجودگی کس طرح محسوس کر لی؟'' میں نے کمانڈر نواز سے دریافت کیا۔

''میڈم! انہوں نے طاقتور دوربین استعمال کی تھی۔ دوربین کے ذریعے انہوں نے سیٹھ عباس کے ساتھ اس کی کوٹھی کے لان میں ایک غیر ملکی عورت کو دیکھا ہے۔ اس عورت کا حلیہ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب ٹھیک طرح نہیں دیکھا جا سکا مگر لگتا یہی ہے کہ وہ لیوسی ہی ہو سکتی ہے۔ ہوٹل کی سکونت ترک کرنے کے بعد ممکن ہے اس نے سیٹھ عباس کی کوٹھی کو محفوظ پناہ گاہ تصور کیا ہو۔'' کمانڈر نواز نے تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دیا۔

''نگرانی سخت کرا دو اور اس غیر ملکی عورت کو اپنے آدمیوں کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دو۔'' میں نے پرجوش آواز میں کہا۔ کیوں کہ مجھے اتنی جلدی کامیابی کی امید نہیں تھی۔

''بہت بہتر میڈم' آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔'' کمانڈر نواز نے مجھے یقین دلایا۔

''سیٹھ عباس کا فون بھی ٹیپ ہونا چاہیے' تمہیں اس کا بندوبست بھی کرنا ہے۔'' میں نے مزید حکم دیا۔

''یہ بندوبست بھی آج ہی ہو جائے گا۔'' کمانڈر نواز نے جواباً کہا۔

''تم مجھے رپورٹ دیتے رہو گے۔ شام تک میں دفتر ہی میں رہوں گی اور یہاں سے اٹھ کر سیدھی کوٹھی جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی۔ جن دنوں میں اپنے دفتر میں پابندی سے بیٹھتی تھی عموماً ایک قریبی ہوٹل میں لنچ کر لیا کرتی تھی۔ آج میرا ارادہ اسی ہوٹل میں لنچ کرنے کا تھا۔ وہ ہوٹل میرے دفتر سے اتنے قریب تھا کہ میں وہاں تک پیدل چل کر ہی جاتی تھی۔

دفتر کی عمارت سے میں نیچے اتر آئی تو کیپٹن شاد کار سٹارٹ کر کے قریب لے آیا۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں کو بھی دوپہر کا کھانا کھانا ہو گا۔ یہی سوچ کر میں پیدل ہوٹل جانے کی بجائے کار میں بیٹھ

گئی اور کیپٹن شاد کو ہوٹل کے بارے میں بتایا' پھر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم لوگ بھی کھانا کھا لو اسی ہوٹل میں! کیا خبر پھر موقع ملے نہ ملے۔''

''جو آپ کا حکم ہو۔'' کیپٹن شاد بولا۔ پھر اس نے ٹرانسمیٹر پر سرفراز کو ہوٹل کا پتا بتا دیا اور کار سٹارٹ کر دی۔

''ہوٹل پہنچ کر کھانا کھاتے ہوئے میں' لیوسی اور سیٹھ عباس ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ ان دونوں میں کیا قدر مشترک تھی' ابھی تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اسی مسئلے پر غور کرتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں اس طرح اپنے حیرت انگیز ذہن کی پراسرار قوتوں کی ایک نئی جہت کا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔

کیپٹن شاد سرفراز اور سیل کے دیگر ارکان بھی میرے اردگرد مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ان کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ قطعی اجنبیوں ایسا تھا۔ میں نے کھانا کھا کر چائے پی اور انتظار کرنے لگی کہ میرے محافظ بھی کھانے سے فارغ ہو جائیں۔

کھانے کا بل ادا کر کے میں اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک اپنے ذہن میں مجھے سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہ کیفیت گزشتہ رات کی سی تھی جب لیوسی نے میرے ذہن سے رابطہ قائم کیا تھا۔

ہر خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دو! میرے ذہن میں سرگوشی ہوئی۔ یہ آواز خود میری اپنی تھی۔ عذرا خان! لیوسی تمہارے ذہن سے رابطہ قائم کرنا چاہتی ہے اور اس سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ تمہارا ذہن بالکل خالی ہو۔

میں نے اپنے ذہن کی اس تاکید پر عمل کیا اور چند ہی لمحے بعد وہ سنسناہٹ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی۔

لیوسی کے نادیدہ حملے سے مدافعت کی راہ خود ہی میرے حیرت انگیز ذہن نے تلاش کر لی تھی۔ معلوم نہیں وہ مجھ پر کیا حربہ آزمانے والی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ لیوسی کسی نہ کسی طرح مجھے نقصان ہی پہنچانا چاہتی ہو گی۔

اس تجربے سے گزرنے کے بعد میں وہاں مزید نہیں رکی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سیل کے ارکان اس دوران میں اپنے بل ادا کر کے وہاں سے اٹھ چکے تھے۔ میں ہوٹل سے نکل کر اپنی بلٹ پروف کار کی طرف بڑھ رہی تھی کہ معاً ایک شخص' میرے اور کار کے درمیان آ گیا۔ میں نے اسے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھ لیا تھا اور اسی لمحے میری چھٹی حس نے مجھے خطرے کا احساس دلا دیا تھا۔ وہ شخص تیزی سے میرے قریب آیا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب سے باہر آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کی نال پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ ادھر اس نے پستول نکالا' ادھر میری دائیں ٹانگ دائرے کی صورت میں تیزی سے گھومی۔

اس شخص کی دائیں کلائی پر پڑنے والی میرے پیر کی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ چیخ اٹھا۔ پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فٹ پاتھ پر جا گرا تھا۔

''کیا ہوا......؟ کیا ہوا؟'' آس پاس موجود لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ انہوں نے

یقیناً اس شخص کی چیخ ہی سنی تھی۔ ہوا کیا تھا' یہ کوئی نہ دیکھ سکا تھا۔

اس سے پہلے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والا فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا' سیل کے ارکان اس پر جھپٹ پڑے۔ انہی میں سے کسی نے اس شخص کی کنپٹی پر جچا تلا ہاتھ مارا تھا اور پھر اسے آناً فاناً میں بند سیاہ وین کی طرف گھسیٹ لے گئے تھے۔ وہاں موجود افراد کچھ نہ سمجھ سکے کہ اچانک چند ہی لمحوں میں کیا ہو گیا اور سیاہ وین حرکت میں آ گئی۔ میں اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر اپنی کار میں بیٹھ گئی۔

''آپریشن سیل کی طرف چلو!'' میں نے کار میں بیٹھتے ہی کہا' پھر کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے مزید بولی۔ ''سرفراز سے بھی کہہ دو کہ کدھر چلنا ہے۔''

کیپٹن شاد نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور کار سٹارٹ کرتے ہی ٹرانسمیٹر پر سرفراز کو میرا پیغام پہنچا دیا۔ ہر چند کہ مجھے یقین تھا کہ مجھ پر قاتلانہ حملے کے پیچھے لیوسی ہی کا ہاتھ ہوگا اور قاتلانہ حملہ کرنے والا اسی کا آلہ کار ہوگا مگر اس شخص سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی تھی۔ اس کا زندہ ہاتھ آ جانا بہتر ہی ہوا تھا۔

''میڈم! وہ شخص اچانک کدھر سے آپ کے سامنے آ گیا تھا؟ میں تو اس وقت چونکا تھا جب اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور پھر پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ غالباً وہ آپ پر گولی چلانا چاہتا تھا اور آپ نے اسے یہ موقع نہیں دیا۔'' کیپٹن شاد مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ہاں کیپٹن!'' میں نے تصدیق کی۔ ''آخری لمحات میں مجھے خطرے کا احساس ہو گیا تھا ورنہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کے پستول کی نال پر سائیلنسر بھی چڑھا ہوا تھا اس لیے وہ مجھے گولی مار کر اطمینان سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ کسی کو فائر کی آواز ہی سنائی نہ دیتی تو کچھ معلوم ہی نہ ہوتا کہ کیا ہوا ہے۔''

''میڈم! اگر آپ خود بھی ہر لحہ چوکنا اور محتاط نہ رہیں تو سارے حفاظتی اقدامات بے سود رہیں۔'' کیپٹن شاد بولا۔

جواباً میں نے کچھ نہیں کہا۔ اپنی تعریف سن کر عموماً میں خاموشی ہی اختیار کر لیتی تھی۔ اس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ میں اب اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتی۔ میری اس عادت سے تقریباً سیل کے تمام ہی اہم ارکان واقف تھے اور کیپٹن شاد بھی انہی میں سے تھا۔ اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

آپریشن سیل پہنچنے کے بعد مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے کو ''مہمان خانے'' میں پہنچا دیا گیا۔ راستے ہی میں اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اب اسے ہوش آ چکا تھا۔ میں وقت ضائع کئے بغیر ''مہمان خانے'' کے اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں اس شخص کو رکھا گیا تھا۔ وہ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ!'' میں نے اسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔

میرے حکم پر وہ بیٹھا نہیں اور کرسی کے قریب ہی کھڑا رہا۔

''سنو!'' اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے ہاتھ پیر سلامت رہیں اور تم خود اپنے پیروں پر چل کر

یہاں سے جاؤ تو میں جو کچھ پوچھ رہی ہوں' اس کا جواب دو۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''بولو اپنے ہاتھ پیر تڑوانا ہیں یا زبان کھولنے پر آمادہ ہو؟''

''تم مجھے دھمکی دے رہی ہو۔'' وہ گردن اکڑا کر بڑی نخوت سے بولا۔ ''تمہیں معلوم بھی ہے' میں کون ہوں؟''

''یہ نہ سمجھنا کہ تم نے مجھے دھوکے سے یہاں قید کر لیا ہے تو میں ڈر جاؤں گا۔ تمہاری اطلاع کیلئے عرض ہے کہ اب تک میں چالیس قتل کر چکا ہوں۔ بارہ سال کی عمر میں پہلا قتل کیا تھا میں نے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اس طرح سینہ پھلا لیا جیسے کوئی قابل فخر کارنامہ انجام دیا ہو۔

''تو تم ایک پیشہ ور قاتل ہو!'' میں بولی۔

''ہاں! اور ایک بہترین وکیل بھی ہوں۔ ایک کیس میں مجھے لمبی سزا ہو گئی تھی۔ جیل ہی میں رہ کر میں نے وکالت کا امتحان پاس کیا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔'' یہ کہہ کر میں نے طویل سانس لیا' پھر بولی۔ ''مجھے تم سے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ میرے قتل پر تمہیں کس نے مامور کیا تھا؟ تمہیں اس سوال کا جواب ضرور دینا پڑے گا۔''

''اس سوال کا جواب دینا میرے کاروباری اصولوں کے خلاف ہے۔'' وہ بلا جھجک بولا۔

''تمہارے کاروباری اصولوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں!'' میری آواز میں سختی آ گئی۔ ''یوں بھی اب تمہارا کاروبار اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ ہر مجرم کی زندگی میں ایک دن مکافات عمل کا ضرور ہوتا ہے اور وہ دن آ چکا ہے۔''

''کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ تم یہ بات کس سے کہہ رہی ہو۔'' اس کی آواز میں تکبر تھا۔ ''ایک عورت ہونے کے سبب میں اب تک تم پر ہاتھ اٹھانے سے گریز کر رہا ہوں۔ میرے اس گریز کو میری کمزوری نہ سمجھو۔''

''تو تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گے؟'' میں نے حجت تمام کرنے کی خاطر آخری بار کہا۔

''ہرگز نہیں!'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر جواب دیا۔ ''اگر تمہیں اپنے بارے میں یہ غلط فہمی ہے کہ میری زبان کھلوا سکتی ہو تو کوشش کر لو۔''

''زبان تو تمہیں کھولنا ہی پڑے گی۔'' یہ کہتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھلی اور میری بھرپور فلائنگ کک اس کے چوڑے چکلے سینے پر پڑی۔

وہ زمین پر گر پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ پاتا' میں جیسے اڑتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے میری ٹانگ پکڑ کر گھسیٹنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میری لات اس کے جبڑے پر پڑی تھی۔ پھر میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا اور زمین سے اٹھنے ہی نہیں دیا۔ میری ضربوں سے اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔

''اب کہو کچھ دماغ درست ہوا؟'' میں نے اس کے گھٹنے کا نشانہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میرے سوال کا جواب دینا ہے یا مزید خاطر مدارات کی ضرورت ہے۔''

زمین پر پڑے پڑے اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا پھر کراہتے ہوئے کہنے لگا۔

”میری زندگی میں تم پہلی عورت ہو جس نے مجھے متاثر کیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں ایک ہو جائیں! میں نے تمہارے قتل کا جو معاوضہ وصول کیا ہے واپس کر دوں گا۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو تم!“ میں جھنجھلا کر بولی۔ ”مت بھولو کہ تم میری قید میں ہو۔“

”تو مجھے اس سے کب انکار ہے۔ میں تو ہمیشہ کے لئے تمہاری قید میں رہنا چاہتا ہوں۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بکومت!“ میں نے ڈانٹ دیا۔ ”میں نے تم سے جو کچھ پوچھا ہے' اس کا جواب دو۔“

”تمہاری خاطر میں اپنے کاروباری اصولوں کی قربانی دینے کو بھی تیار ہوں' لیکن اس صورت میں تمہیں میری درخواست قبول کرنا پڑے گی۔“

”تم آخر کس غلط فہمی میں مبتلا ہو بے وقوف آدمی! میں تمہاری کھال ادھیڑ دوں گی۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ نتیجتاً اس شخص کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں مگر میں اسے ٹھوکروں پر رکھے رہی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ وہ اب بھی زبان نہیں کھول رہا تھا۔

جس سے میں اب تک گریز کر رہی تھی بالآخر اس شخص کی زبان کھلوانے کیلئے وہی راہ اختیار کرنی پڑی۔ میں ہر معاملے میں اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتیں استعمال کرنے سے اجتناب کرتی تھی۔ ان کے استعمال کرنے سے اجتناب کرتی تھی۔ ان کے استعمال سے مجھے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوتا تھا جیسے ان قوتوں کے بغیر میں کچھ بھی نہیں ہوں۔

اس شخص کا ذہن میرے طاقتور ذہن کی گرفت میں آ گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ واقعی وہ ایک خطرناک پیشہ ور قاتل تھا۔ مجھے قتل کرنے کیلئے اس کی خدمات سیٹھ عباس نے حاصل کی تھیں۔ یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی۔ اب یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ سیٹھ عباس پوری طرح لیوسی کا آلہ کار بنا ہوا تھا۔ سیٹھ عباس سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی جو وہ مجھے قتل کراتا۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرانے میں یقیناً لیوسی کا ہاتھ تھا۔

مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے کا نام نادر تھا جو متعدد قتل کرنے کے باوجود اب تک قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکتا آیا تھا۔ میرے نزدیک وہ شخص معاشرے کا ناسور تھا اور کسی بھی طرح قابل معافی نہیں تھا۔ میں نے اسی لیے بلاتوقف اسے موت کی میٹھی نیند سلا دیا۔ موت سے کم سزا اس کیلئے کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے بھی میں نے اپنے طاقتور ذہن کی حیرت انگیز قوتوں سے قتل کیا تھا۔ اگر اس کی موت کا سبب دریافت کرنے کیلئے پوسٹ مارٹم کیا جاتا تو وجہ برین ہیمبرج ظاہر ہوتی۔

مجھے جو کچھ معلوم کرنا تھا میرے علم میں آ چکا تھا۔ اس لیے میں وہاں مزید نہیں رکی۔ میں سمجھ چکی تھی کہ لیوسی اب ٹام کی ہلاکت کے بعد مزید اپنے ہم وطنوں کو میرے ہاتھوں ختم کرانا نہیں چاہتی۔ وہ اسی لیے مجھے راستے سے ہٹانے کی خاطر اب مقامی پیشہ ور قاتلوں کو استعمال کر رہی تھی۔

ڈیوٹی روم میں کمانڈر نواز موجود تھا۔ میں نے اسے نادر کی لاش ٹھکانے لگوانے کا حکم دیا' پھر

خود ہی مختصراً اس پیشہ ور قاتل کے بارے میں کمانڈر نواز کو بتا دیا۔ اپنے اگلے اقدام سے کمانڈر نواز کو مطلع کرنے کے بعد میں وہاں سے چل دی۔ میں جب ڈیوٹی روم سے باہر نکل رہی تھی تو میرے ہی حکم پر کمانڈر نواز ٹرانسمیٹر پر سیل کے ان ارکان کو میرا پیغام دے رہا تھا جو سیٹھ عباس کی کوٹھی کی نگرانی کر رہے تھے۔

ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے جو اچھوتا خیال میرے ذہن میں آیا تھا' اب میں اسی پر عمل کرنا چاہتی تھی۔

سیٹھ عباس کی کوٹھی ہل پارک کے قریب تھی۔ جلد ہی میں وہاں تک پہنچ گئی۔ میں نے راستے میں وہاں موجود سیل کے ارکان سے یہ تصدیق کر لی تھی کہ سیٹھ عباس ابھی اپنی کوٹھی ہی میں ہے۔

”کیپٹن! یہاں کہیں رکنا نہیں ہے۔“ میں نے کیپٹن شاد کو ہدایت دی۔ ”جب تک میں تمہیں نہ روکوں اسی کوٹھی کے اردگرد چکر لگاتے رہو۔“

کیپٹن شاد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یقیناً وہ میرے اس حکم کا مطلب یہی سمجھا ہو گا کہ میں اس کوٹھی کی اطراف کا جائزہ لینا چاہتی ہوں حالانکہ میرا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ میں نے کیپٹن شاد کو حکم دے کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر اپنے ذہن کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے لگی۔ پھر میں نے سیٹھ عباس کا تصور کیا اور اس کے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ حیرت انگیز طور پر مجھے اپنے اس نئے تجربے میں ناکامی نہیں ہوئی۔ سیٹھ عباس کے ذہن سے میرے ذہن کا رابطہ قائم ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کبھی میں نے اتنے فاصلے سے کسی کے ذہن سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔

میں سیٹھ عباس کا ذہن پڑھنے لگی۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ لیوسی کی اصل شخصیت سے سیٹھ عباس لاعلم تھا۔ لیوسی اس سے ایک بین الاقوامی جرائم پیشہ گروہ کے نمائندے کی حیثیت سے ملی تھی۔ میرے بارے میں لیوسی نے سیٹھ عباس کو یہ بتایا تھا کہ اس کا گروہ مجھے قتل کرانا چاہتا ہے اور وہ اسی لیے پاکستان آئی ہے۔ سیٹھ عباس کے لیے یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے لیوسی کی ہر ممکنہ مدد کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیوسی نے پہلے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جس کیلئے سیٹھ عباس نے راہ ہموار کر دی تھی۔ پھر لیوسی نے خود پس پردہ رہ کر سیٹھ عباس کے ذریعے نادر کی خدمات حاصل کی تھیں تاکہ اس خطرناک قاتل کے ہاتھوں مجھے ٹھکانے لگوا سکے۔ مجھ سے ملاقات ہونے سے قبل لیوسی ایک فائیو سٹار ہوٹل میں سکونت پذیر تھی' مگر اب جیمس کے ہمراہ وہ سیٹھ عباس کی کوٹھی میں رہ رہی تھی۔

سیٹھ عباس کا ذہن پڑھ کر مجھے ایک اور کام کی بات معلوم ہوئی۔ لیوسی سیٹھ عباس سے ایک بڑا سودا کرنے والی تھی۔ اس سودے کا تعلق جدید اسلحہ کی سمگلنگ سے تھا۔ لیوسی سستے داموں اسے یہ اسلحہ فراہم کرنے والی تھی اور میرے نزدیک یہ بلا سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ لیوسی یقیناً میرے ملک میں تخریب کاری کے کسی بڑے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی جس کی ہوا بھی اس نے سیٹھ عباس کو نہیں لگنے دی تھی۔ سیٹھ عباس اس سودے پر ابھی پوری طرح آمادہ نہیں تھا کیوں کہ اس سے پہلے اس نے کبھی کوئی ایسا سودا نہیں کیا تھا۔ سیٹھ عباس اس لیے یہ سودا نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اسے اسلحہ کی فروخت کے ذرائع معلوم نہیں تھے اور لیوسی نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ لیوسی نے اسی لیے سیٹھ عباس کو یقین دلایا تھا کہ پہلے تم اسلحہ

تو سستے داموں خرید لو پھر میں خود اس کی فروخت کا بندوبست بھی کرا دوں گی۔ سیٹھ عباس نے جواباً لیوسی سے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر لیوسی خود اسلحہ کی فروخت کے راستوں سے واقف ہے تو پھر لیوسی اس سے سودا کیوں کر رہی ہے؟ واقعی ایسا ہے تو پھر لیوسی خود ہی یہ منافع بخش کام کیوں نہیں کر لیتی؟ اس معاملے میں اسے کیوں شریک کر رہی ہے؟ جو لوگ خود کاروبار میں دیانت سے کام نہیں لیتے وہ دوسروں کو بھی بددیانت سمجھ کر ان کی نیت پر شک کرتے ہیں۔ سیٹھ عباس بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا۔

لیوسی اور سیٹھ عباس کے درمیان ایک اور قدر مشترک کا علم بھی مجھے سیٹھ عباس کا ذہن پڑھ کر ہی ہوا۔ یہ قدر مشترک ان دونوں کی بے راہ روی اور بدکرداری تھی۔ ہرچند کہ ان دونوں کی عمروں میں خاصا فرق تھا' اس کے باوجود ان کے درمیان تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ پہل لیوسی ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ لیوسی کا تعلق ایسی کج رو خواتین میں سے تھا جو اپنے سے دگنی عمر کے مردوں کو پسند کرتی ہیں۔ اس کا اقرار خود وہ اپنی زبان سے بھی کرتی تھی۔ نوجوانوں کو وہ اناڑی کہتی تھی۔ سیٹھ عباس کی شخصیت کا یہ رخ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ اس معاملے میں وہ چھپا رستم نکلا تھا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ لیوسی ایسی خواتین کیلئے مردوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ خود اس کا ہم وطن جیمس عمر میں اس سے بہت بڑا تھا۔ پھر اس نے سیٹھ عباس سے کیوں تعلقات استوار کیے؟ اس سوال کا جواب میرے نزدیک یہی تھا کہ لیوسی اس طرح سیٹھ عباس کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی تھی۔ ایسی حسین ترین غیر ملکی ایجنٹ میرے نزدیک انتہائی خطرناک ہوتی ہیں جو اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اپنے جسم کو ذریعہ بنانے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ لیوسی یقیناً خطرناک حد تک حسین تھی۔ اس کے جسم کی رشوت کو ٹھکرا دینے کا حوصلہ ہر فرد میں نہیں ہو سکتا تھا۔ مشرقی مردوں کو مغربی عورتوں کی بے باکی اور بے حیائی دیوانہ بنا دیتی ہے۔ یہ بات بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ سیٹھ عباس بھی اسی لیے لیوسی کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

تفصیل کے ساتھ سیٹھ عباس کے ذہن کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے آنکھیں کھول دیں۔

اسی کے ساتھ سیٹھ عباس کے ذہن سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ اسی وقت مجھے ایک اور خیال آیا کہ اگر ممکن ہو تو لیوسی کے ساتھ جیمس کے ذہن کو بھی پڑھ لوں۔ میرے اندازے کے مطابق جیمس کو بھی سیٹھ عباس کی کوٹھی میں ہونا چاہئے تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور جیمس کا تصور کرنے لگی۔ اس طرح میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ٹام کی طرح جیمس بھی مضبوط قوت ارادی کا مالک ہے یا نہیں اور اس کے ذہن سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ جیمس بھی وہیں تھا۔ میرے ذہن سے خارج ہونے والی نادیدہ لہریں اس کے ذہن سے ٹکرائیں تو اس کا ذہن بے چین ہو گیا۔ یقیناً اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نتیجتاً اس کے ذہن نے مزاحمت شروع کر دی۔ اسی لمحے مجھے لیوسی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''جیمس! کیا ہوا؟ تم بات کرتے کرتے ایک دم چپ کیوں ہو گئے؟''

''مجھے محسوس ہو رہا ہے لیوسی کہ کوئی میرا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' یہ جیمس کی آواز تھی۔

''تم تو جانتے ہو کہ اس صورتحال سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے۔'' لیوسی کی آواز سنائی دی۔

''یہ کوشش صرف عذرا خان کر سکتی ہے' مگر اس وقت تک تو اسے قتل کیا جا چکا ہو گا۔ سیٹھ عباس نے کہا تھا کہ جس پیشہ ور قاتل کو عذرا خان کے قتل پر مامور کیا گیا ہے وہ کبھی ناکام نہیں رہا۔ اب تک سیٹھ عباس کو عذرا خان کے قتل کی اطلاع مل جانا چاہیے تھی۔ میں ابھی انٹرکام پر اس سے پوچھتی ہوں۔''

لیوسی جو کچھ اپنے ساتھی جیمس سے کہہ رہی تھی' وہ مجھے بھی سنائی دے رہا تھا۔ یہ بھی میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ ہرچند کہ میں ابھی تک جیمس کا ذہن پڑھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی لیکن میں نے رابطہ منقطع نہیں کیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جو کچھ جیمس کہہ رہا تھا یا سن رہا تھا مجھے واضح طور پر سنائی دے رہا تھا۔

چند ہی لمحے بعد میں نے لیوسی کی آواز سنی۔ وہ غالباً انٹرکام پر سیٹھ عباس سے بات کر رہی تھی۔ ''عذرا خان کو قتل کر دیا گیا یا نہیں......؟ کیا......؟ ابھی تک کنفرم نہیں ہو سکا۔ مجھے کنفرم کر کے بتاؤ ڈیر...... یہ بہت ضروری ہے...... مجھے تو یہ لگتا ہے کہ وہ پیشہ ور قاتل اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا...... کوئی ضروری نہیں کہ وہ قتل کی جا چکی ہو۔ تم اسے نہیں جانتے کہ وہ کتنی چالاک اور خطرناک ہے۔ ہاں وہ مجھے یاد ہے' تم نہ بھول جانا...... ہاں میں شام پانچ بجے تک تیار ہو جاؤں گی۔ یہ تو طے ہے نا کہ وہ وزارت دفاع کے جوائنٹ سیکرٹری کا برادر نسبتی ہے؟ اچھا ٹھیک ہے...... تم فی الحال تو عذرا خان کے قتل کی تصدیق کر کے مجھے بتاؤ...... اگر تم اپنی خواب گاہ میں ہو اور کہیں نہیں جا رہے تو میں کچھ دیر کے بعد آتی ہوں۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی لیوسی کی آواز آنا بند ہو گئی۔

''ابھی عذرا خان کے قتل کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے نا؟'' جیمس کی آواز سنائی دی۔ وہ یقیناً لیوسی سے مخاطب تھا۔

''ہاں! یہ نہ بھولو کہ عذرا خان کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ اسے قتل کرنا ہنسی کھیل نہیں۔ خیر تم یہ بتاؤ کہ کیا اب بھی تم وہی کیفیت محسوس کر رہے ہو؟ یعنی کوئی تمہارا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے؟''

''ابھی تک تو وہی کیفیت ہے مگر میں نے اسے اس کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔'' جیمس نے جواب دیا۔

''ایسا کرو کہ کچھ دیر کوئی بات نہ کرو اور اپنے ذہن کو خالی چھوڑ دو۔'' لیوسی نے اپنے ساتھی کو مشورہ دیا۔

جیمس نے یقیناً لیوسی کے مشورے پر عمل کیا۔ ان دونوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ اب جیمس کے ذہن سے مزید رابطہ قائم رکھنا لاحاصل ہی تھا۔ میں نے اس لیے آنکھیں کھول دیں۔

ہرچند کہ میں جیمس کا ذہن پڑھنے میں ناکام رہی تھی لیکن مجھے کام کی ایک بات معلوم ہو گئی تھی۔ آج شام لیوسی کو سیٹھ عباس کسی ایسے شخص سے ملوانے والا تھا جو وزارت دفاع کے جوائنٹ سیکرٹری کا برادر نسبتی تھا۔ میرے لیے اب یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ لیوسی کی پاکستان آمد کا مقصد محض مجھے راستے سے ہٹانا نہیں تھا۔ اس کے سوا بھی لیوسی کے مقاصد تھے جن کی تکمیل کیلئے وہ فی الوقت سیٹھ عباس کو آلہ کار بنائے ہوئے تھی۔

مختلف اہم سرکاری محکموں میں امریکی ایجنٹوں کے آلہ کار زیر دام آ چکے تھے۔ سولومن سے معرکہ آرائی کے دوران میں خود میری ہی فراہم کردہ اطلاعات پر اعلیٰ سرکاری افسران کو ہر اہم محکمے سے الگ کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے جن کے خلاف واضح ثبوت مل گئے تھے' وہ اس وقت جیل میں تھے اور جو براہ راست ملوث نہیں تھا اور جن سے ابھی کوئی کام نہیں لیا گیا تھا' انہیں یا تو قبل از وقت ریٹائر کر دیا گیا تھا یا پھر ملازمت سے جواب دے دیا گیا تھا۔ یہی اعلیٰ سرکاری افسران امریکی ایجنٹوں کی معلومات کا ذریعہ تھے۔ ان کے خاتمے سے یقیناً امریکی ایجنٹوں پر کاری ضرب لگی تھی۔ لیوسی اب میرے ملک میں ازسرنو مختلف سرکاری محکموں میں اپنے آلہ کار بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وزارت دفاع کے جوائنٹ سیکرٹری تک پہنچنے کیلئے اسے ایک ذریعہ مل گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لیوسی دوسری وزارتوں کے اہم اور اعلیٰ سرکاری افسران تک پہنچنے کیلئے بھی ذرائع کی تلاش میں ہو گی۔ اگر ابتدائی مرحلے میں ہی لیوسی کو روک دیا جاتا تو بعد میں مشکلات پیدا نہ ہوتیں۔

سوچتے سوچتے اچانک میں نے کیپٹن شاد کو مخاطب کیا۔ ''واپس دفتر چلو اور سرفراز کو بھی بتا دو۔''

''جی میڈم!'' کیپٹن شاد بولا اور پھر ٹرانسمیٹر پر سرفراز کو میرا پیغام دے دیا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''معاف کیجئے گا میڈم' کیا آپ کچھ دیر کیلئے سو گئی تھیں؟''

میں اس کی بات سن کر ہنس پڑی' پھر بولی۔ ''تو کیا تم مجھے ہی دیکھ رہے تھے؟''

اس بات پر کیپٹن شاد کچھ سٹپٹا سا گیا۔ ''نن...... نہیں تو میڈم...... بس ایک بار عقبی آئینے پر میری نظر اتفاقاً پڑ گئی تھی تو...... تو میں نے آپ کی آنکھیں بند دیکھی تھیں۔ اس سے میں یہی سمجھا کہ...... کہ شاید آپ کو نیند آ گئی ہے۔''

''میں آنکھیں بند کر کے کچھ سوچ رہی تھی۔'' یہ کہہ کر میں نے بات ٹال دی۔

اپنے دفتر پہنچنے کے بعد میں نے ٹیلی فون پر کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کیا۔ ''یس میڈم!'' کمانڈر نواز میری آواز سن کر بولا۔

''کمانڈر! تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وزارت دفاع کا سیکرٹری کون ہے اور پھر یہ سراغ لگانا ہے کہ اس کے برادر نسبتی کا کیا نام ہے اور وہ کہاں رہتا ہے؟ یہ معلومات مجھے پانچ بجے سے پہلے مل جانا چاہئیں۔'' میں نے کہا۔

''میں کوشش کروں گا میڈیم کہ آپ کے حکم کی تعمیل وقت سے پہلے کر سکوں۔'' کمانڈر نواز نے جواب دیا۔

''آج شام پانچ بجے کے بعد لیوسی' سیٹھ عباس کے ساتھ اسی جوائنٹ سیکرٹری کے برادر نسبتی سے ملنے جا رہی ہے۔ یقیناً سیٹھ عباس کے اس سے تعلقات ہوں گے۔ تمہارے جو آدمی سیٹھ کی کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں انہیں تاکید کر دو کہ وہ اس طرح ان دونوں کا تعاقب کریں کہ لیوسی کو کوئی شبہ نہ ہو سکے۔ لیوسی کو اگر تعاقب کیے جانے کا ذرا سا بھی شک ہو گیا تو بات بگڑ جائے گی۔ لیوسی کا کھیل سمجھ رہے ہو نا تم کمانڈر؟''

''جی ہاں میڈم!'' کمانڈر نواز جواباً بولا۔ ''وہ پھر بساط پر مہرے جمانے کا آغاز کر رہی ہے' مگر میڈم آپ...... آپ کو یہ اہم خبر کیسی ملی؟''

میں آہستہ سے ہنس دی' پھر کہا۔ ''کمانڈر! تمہارے لیے تو یہ کوئی نئی بات نہیں کہ میری معلومات کے کچھ اور پراسرار ذرائع بھی ہیں۔ پہلے بھی تو ایسا ہوتا رہا ہے۔''

''جی...... جی ہاں!...... میں سمجھ گیا۔''

''کیا سمجھ گئے؟'' میں نے دانستہ کمانڈر نواز سے پوچھا۔

''وہی جو مجھے سمجھنا چاہئے تھا میڈم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو کچھ ایسی حیرت انگیز صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں جو عام آدمیوں میں نہیں ہیں۔ آپ ہمیشہ انہی کے سبب باطل پر غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ انہی صلاحیتوں کی وجہ سے آپ بہت سے ایسے واقعات کی پیش گوئی کر دیتی ہیں جو بعد میں سچ ثابت ہوتے ہیں۔''

''تم نے تو اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔'' میں ہنستے ہوئے بولی' پھر پوچھا۔ ''سیٹھ عباس کے فون کے ٹیپ کرنے کا بندوبست کیا تم نے؟''

''جی ہاں میڈم' بندوبست ہو گیا ہے۔'' کمانڈر نواز نے بتایا۔

''اب تک کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں میڈم! سیٹھ عباس نے اب تک صرف دو فون کیے ہیں اور دونوں کا تعلق اس کے کاروبار سے ہے۔''

''اسے بھی تو کسی نے فون کیا ہو گا؟''

''جی ہاں' مگر یہ فون بھی کاروباری تھے۔'' کمانڈر نواز نے کہا' پھر بولا۔ ''میڈم! کیوں نہ لیوسی پر ہاتھ ڈال دیا جائے۔''

''ایسا کرنا ابھی قبل از وقت ہو گا۔ پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ہمارے ملک میں آ کر وہ کیا کیا کر چکی ہے اور اس کے عزائم کیا کیا ہیں؟ وہ اب تک یقیناً خالی تو نہیں بیٹھی رہی ہو گی۔ اس نے کچھ نہ کچھ تو کیا ہی ہو گا۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب سے یہاں آئی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں فی الحال اسے چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔ تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کمانڈر کہ سولومن کے ساتھیوں' یعنی ان غیر ملکی ایجنٹوں پر ابھی ہم ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جو روپوش ہو گئے تھے۔ سولومن کی جگہ اب لیوسی نے لے لی ہے تو وہ یقیناً اپنے ان ہم وطنوں سے رابطہ قائم کرے گی اور عین ممکن ہے کہ رابطہ قائم کر بھی چکی ہو۔ ہم لیوسی کے ذریعے ان تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔'' میں نے تفصیل سے کمانڈر کو بتایا۔

''میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی میڈم! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' کمانڈر نواز نے میری بات سے اتفاق کیا۔

''ایک بات تمہیں اور بتا دوں کہ لیوسی تخریب کاری کا کوئی بڑا منصوبہ بنا رہی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے کمانڈر نواز کو اسلحہ کی سمگلنگ کے بارے میں مختصراً بتا دیا۔ اس کے ساتھ اس بات سے بھی آگاہ کر

دیا کہ لیوسی' سیٹھ عباس سے کس حیثیت سے ملی ہے۔

''تو سیٹھ عباس اس سے واقف نہیں کہ لیوسی امریکی ایجنٹ ہے۔'' کمانڈر نواز بولا۔

''ہاں فی الحال تو ایسا ہی ہے' لیکن لیوسی ایسی چالیں چل رہی ہے کہ سیٹھ عباس اگر کسی مرحلے پر اس کی اصل شخصیت سے بھی واقف ہو جائے تو کوئی فرق نہ پڑے۔ وہ آہستہ آہستہ کسی مکڑی کی طرح سیٹھ عباس کو اپنے جال میں پھانستی جا رہی ہے۔ فی الحال میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ لیوسی' سیٹھ عباس پر زیادہ بھروسہ اور تکیہ کرنے لگے۔ یہ میرے آئندہ لائحہ عمل کیلئے ضروری ہے۔ میں اس وقت کا انتظار کرنا چاہتی ہوں جب لیوسی کیلئے سیٹھ عباس ناگزیر ہو جائے۔ تم میری بات کچھ سمجھے؟''

''کچھ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ غالباً کسی خاص مرحلے پر لیوسی سے اس کا یہ سہارا چھین لینا چاہتی ہیں۔'' کمانڈر نواز نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''تم بالکل صحیح سمجھے کمانڈر! مگر شاید یہ نہیں سمجھے ہو گے کہ ایسا کس طرح ممکن ہے؟ مختصراً بس یہ سمجھ لو کہ اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لانے کے بعد میرے لیے یہ بہت آسان ہو گا کہ لیوسی سے اس کی یہ بیساکھی چھین لوں۔ بہرحال ابھی آئندہ کیلئے میں واضح طور پر کوئی لائحہ عمل تشکیل نہیں دے سکی۔ میرے لائحہ عمل کا انحصار آئندہ پیش آنے والے واقعات پر ہو گا۔ مجھے معلوم ہے لیوسی میری طرف سے بھی غافل نہیں رہے گی کیوں کہ اسے یقیناً میری طرف سے خطرہ ہو گا۔ وہ لازماً جانتی ہے میں اس کے مقاصد کے حصول میں روڑے اٹکا سکتی ہوں۔ وہ اسی لیے کل سے اب تک تین بار مجھ پر قاتلانہ حملے کرا چکی ہے۔ ان حالات میں نہ صرف مجھے بلکہ تم سب کو بھی انتہائی محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ لیوسی ہمارے لیے سولومن سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے کیوں کہ وہ غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کی مالک ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے گزشتہ شب پیش آنے والے واقعہ سے مختصراً کمانڈر نواز کو آگاہ کر دیا جب لیوسی نے مجھ سے خودکشی کرانا چاہی تھی۔

''تو پھر واقعی لیوسی سولومن سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔'' کمانڈر نواز بولا۔ ''آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ خطرناک عورت اسے راستے سے ہٹا چکی ہوتی۔''

''میں اسی لیے ایک بار پھر یہ تاکید کر رہی ہوں کہ ہمارے آدمیوں کو بہت محتاط رہنا ہے اور اس خطرناک عورت سے دور دور رہ کر اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا ہے۔''

''لیوسی کی نگرانی کرنے والے سیل کے ارکان کو میں ایک بار پھر چوکنا رہنے کی تاکید کروں گا۔''

''نہیں تم احتیاطاً لیوسی کی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں سے بھی آگاہ کر سکتے ہو۔''

''بہتر ہے اور کوئی خاص بات میڈم؟''

''نہیں۔'' میں بولی' پھر بتایا۔ ''شام پانچ بجے تک میں دفتر ہی میں ہوں' تم یہیں مجھے رپورٹ دو گے۔ خدا حافظ۔'' یہ کہتے ہی میں نے فون بند کر دیا۔

اس وقت شام کے چار بجنے والے تھے جب میری ٹیلی فون آپریٹر نے انٹرکام پر بتایا کہ فون پر کمانڈر نواز مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ ''بات کراؤ۔'' میں نے یہ کہہ کر انٹرکام کا ریسیور رکھ کر ٹیلی فون

کا ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری جانب سے کمانڈر نواز کی آواز سنائی دی۔

''ہاں کہو کمانڈر!'' میں اس کی آواز سن کر بولی۔

''وزارت دفاع کے جوائنٹ سیکرٹری کا نام سید ظہور حسین زیدی ہے۔ یہاں کراچی میں وہ اپنے بڑے برادر نسبتی کے یہاں ٹھہرتا ہے جس کا نام سجاد حسین زیدی ہے۔ ظہور کی پوسٹنگ اسلام آباد میں ہے۔ ان دنوں وہ کراچی آیا ہوا ہے' سکونت سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں ہے۔'' کمانڈر نواز نے رپورٹ دی۔

''اور کوئی خاص بات معلوم ہوئی ظہور حسین یا اس کے برادر نسبتی کے بارے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں میڈم!'' کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ ''البتہ سیٹھ عباس کی کوٹھی سے لیوسی نے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں قیام پذیر غیر ملکی شخص گلبرٹ کو فون کیا تھا۔ لیوسی آج رات اس سے دس بجے ہوٹل میں ملنے والی ہے۔''

''گڈ نیوز!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''سیٹھ عباس کا فون ٹیپ کرنا سودمند ثابت ہو رہا ہے۔ گلبرٹ امریکی ایجنٹ ہی ہو سکتا ہے اور اس سے لیوسی کی ملاقات معنی خیز ہو سکتی ہے۔ تم ہوٹل کا نام بتاؤ' میں خود گلبرٹ کو چیک کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کمانڈر کہ گلبرٹ کا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا جو میں نے وزارت داخلہ کو فراہم کی تھی۔ اس کی نقل سیل کے ریکارڈ روم میں ہو گی' تم مجھے چیک کر کے بتاؤ یہ شخص سولومن کے ان ساتھیوں میں سے معلوم ہوتا ہے جو روپوش ہو گئے تھے۔

جواباً کمانڈر نواز نے پہلے اس فائیو سٹار ہوٹل کا نام بتایا جہاں گلبرٹ ٹھہرا ہوا تھا پھر بولا۔ ''میں ریکارڈ روم میں موجود مطلوبہ فہرست دیکھ کر آپ کو فون کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے' میں تمہارے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ممکن ہے لیوسی' گلبرٹ سے کوئی خاص کام لینا چاہتی ہو۔ ایسی صورت میں اگر گلبرٹ کو غائب کر دیا جائے تو لیوسی یقیناً اپنے کسی اور ساتھی سے وہ کام لینے کیلئے رابطہ قائم کرے گی۔ اس طرح لیوسی کا ایک اور ساتھی سامنے آ جائے گا۔ میں اسی پر غور کر رہی تھی کہ کمانڈر نواز کا دوبارہ فون آ گیا۔ اس نے تصدیق کر دی تھی کہ گلبرٹ کا نام اس فہرست میں موجود ہے جو وزارت داخلہ کو فراہم کی گئی تھی۔

گلبرٹ کو غائب کرنے کی دو صورتیں تھیں۔ پہلی صورت تو یہ کہ پولیس اسے گرفتار کر لیتی۔ اس کیلئے مجھے وزارت داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری نسیم احمد کو فون کرنا پڑتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ گلبرٹ پر میرے آدمی ہاتھ ڈالتے۔ پھر اس سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد اسے قانون کے حوالے کر دیا جاتا۔ یہ صورت مجھے زیادہ مناسب معلوم ہو رہی تھی۔ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ گلبرٹ کو اپنے کچھ اور ساتھیوں کے نام پتے بھی معلوم ہوتے۔ اس طرح ایک ہی تیر سے کئی شکار ہو جاتے۔ گلبرٹ اگر زبان کھولنے پر آمادہ نہ ہوتا تو میں اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتوں کو بروئے کار لا کر اس سے ضروری معلومات حاصل کر سکتی تھی۔

کچھ دیر مزید غور وفکر کرنے کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچ ہی گئی اور میں نے آپریشن سیل کا نمبر ڈائل کر دیا۔

''ہیلو کمانڈر!'' دوسری جانب سے ریسیور اٹھائے جانے کے بعد میں بولی۔

''لیس میڈم!'' کمانڈر نواز فوراً بولا۔

''کیا خیال ہے کمانڈر' گلبرٹ کو اپنا مہمان کیوں نہ بنا لیا جائے؟'' میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

''جو حکم ہو آپ کا میڈم!''

''میں تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتی تھی۔''

''اس طرح لیوسی کے چوکنا ہو جانے کا بہرحال خطرہ ہے' یہ سوچ لیجئے۔'' کمانڈر نواز نے کہا۔ ''گلبرٹ غائب ہو گیا تو لیوسی کو یہی شبہ ہوگا کہ......''

''یہ خطرہ تو مول لینا پڑے گا کمانڈر!'' میں نے کمانڈر نواز کی بات کاٹ کر کہا۔ ''لیوسی کو ہم اس طرح سب کچھ کر گزرنے کی آزادی تو نہیں دے سکتے نا۔ اور وہ اپنے ساتھیوں کی مدد ہی سے کچھ کر سکے گی۔''

''جی ہاں میڈم' یہ تو درست ہے۔'' کمانڈر نواز نے مجھ سے اتفاق کیا' پھر بولا۔ ''اگر آپ کا حکم ہو تو گلبرٹ کو مہمان بنا لیا جائے؟''

''ہاں فی الحال یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ جب تمہارا مہمان بن جائے تو میں خود اس کی مزاج پرسی کرنے پہنچ جاؤں گی۔ میں خود تم سے اس سلسلے میں رپورٹ لے لوں گی۔ پھر تو یہ کام بلا تاخیر ہو جانا چاہئے۔''

''آپ مطمئن رہیں میڈم کوتاہی نہیں ہوگی۔'' کمانڈر نواز نے مجھے یقین دلایا۔

''تم سے مجھے یہی توقع ہے کمانڈر! او کے۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھتے ہوئے وال کلاک پر نظر ڈالی ساڑھے چار بجنے والے تھے۔

مزید پندرہ منٹ بعد میں دفتر سے اٹھ گئی۔ نیچے پہنچ کر میں نے کیپٹن شاد کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اس نے ٹرانسمیٹر پر سرفراز کو بتا دیا کہ کدھر چلنا ہے۔ پھر کار اسٹارٹ ہو گئی۔

اپنے دفتر سے سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی پہنچنے میں مجھے تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا کیونکہ یہ ٹریفک کے ہجوم کا وقت تھا۔ کئی جگہ سگنلز پر رکنا پڑا۔ میری ہدایت کے مطابق کیپٹن شاد مطلوبہ کوٹھی کے گردونواح میں چکر کاٹنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق لیوسی اور سیٹھ عباس اب وہاں پہنچنے ہی والے تھے۔ سیل کے جن ارکان کو سیٹھ عباس اور لیوسی کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا' میرے ایما پر ٹرانسمیٹر کے ذریعے کیپٹن شاد نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے بتایا کہ لیوسی اور سیٹھ عباس راستے میں ہیں' انہیں یہ علم نہیں تھا کہ وہ دونوں کہاں جا رہے ہیں۔

''ان سے پوچھو کہ اس وقت وہ کہاں سے گزر رہے ہیں؟'' میں نے کیپٹن شاد سے کہا۔

کیپٹن شاد نے میرا سوال دہرا دیا تو دوسری طرف سے بتایا گیا۔ ''ہم کشمیر روڈ سے گزر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے' اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ چند منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ مزید کچھ نہیں پوچھنا' ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دو۔''

میرے حکم پر کیپٹن شاد نے ''اوور اینڈ آل'' کہہ کر ٹرانسمیٹر کا سوئچ بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد میری کار ایک لمبا چکر کاٹ کر پھر اس سڑک پر آ گئی جس کی دائیں جانب پانچویں کوٹھی سجاد حسین زیدی کی تھی۔ ابھی میری کار اس کوٹھی کے گیٹ سے دور تھی کہ مخالف سمت سے ایک بڑی سی سفید کار آ کر رک گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اسی کار میں لیوسی وہاں پہنچی ہے۔ میرے چہرے پر کیونکہ میک اپ نہیں تھا اور لیوسی مجھے پہچانتی تھی' اس لئے میں اگلی اور پچھلی نشست کے درمیان جھک کر بیٹھ گئی۔ اس سے میرا مقصد تھا کہ میری کار لیوسی کی کار کے قریب سے گزرے تو اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ احتیاطاً میں نے کیپٹن شاد کو تیزی سے وہاں سے گزرنے کا حکم بھی دے دیا تھا۔

میری کار کافی آگے نکل آئی تو میں نشستوں کے درمیان سے اٹھ کر پھر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے اسی کے ساتھ اپنے ذہن کی خوابیدہ حیرت انگیز قوتوں کو بیدار کر لیا تھا جو میرے ارادے کی پابند تھیں۔ آنکھیں بند کر کے میں نے سیٹھ عباس کا تصور کیا اور پھر اس کے ذہن سے میرا رابطہ قائم ہو گیا۔ اب سیٹھ عباس جو کچھ بھی سنتا یا کہتا مجھے بھی سنائی دیتا۔ لیوسی اور سجاد حسین کے درمیان جو گفتگو بھی ہوتی میں اسے سننے کی اہل تھی۔

''آج ہی اگر ظہور حسین زیدی سے بھی ملاقات ہو جائے تو اچھا ہے۔'' میں نے لیوسی کی آواز سنی جو یقیناً سیٹھ عباس سے مخاطب تھی۔

''اس سے تم نہ ہی ملو تو اچھا ہے۔'' سیٹھ عباس جواباً ہنسا۔

''وہ کیوں؟'' لیوسی نے پوچھا۔

''حسین عورتیں اس کی کمزوری ہیں۔'' سیٹھ عباس نے بتایا۔ ''اور تم سے ابھی میرا دل نہیں بھرا۔''

''چپ ہو جاؤ' شاید ادھر کوئی آ رہا ہے۔'' لیوسی آہستہ آواز میں بولی۔

خود مجھے بھی کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ذرا ہی دیر بعد آنے والے سے سیٹھ عباس نے لیوسی کا تعارف کرایا تو معلوم ہوا وہ سجاد حسین تھا۔

''سجاد! تمہاری ہی طرح میری دوست لیوسی کو بھی پامسٹری سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ یہ حال ہی میں امریکہ سے آئی ہیں۔ میں اس لیے انہیں تم سے ملانے لے آیا۔'' یہ آواز سیٹھ عباس کی تھی۔

پھر سجاد اور لیوسی پامسٹری کے متعلق ایک دوسرے سے گفتگو کرنے لگے۔ ان دونوں ہی کی گفتگو سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ انہوں نے اس موضوع پر خاص پڑھا ہے۔

''عجیب بات یہ ہے خاتون کہ میرے بہنوئی اس علم پر قطعی یقین نہیں رکھتے' نہ میرے گھر والے اسے مانتے ہیں۔'' مجھے سجاد حسین کی آواز سنائی دی۔

لیوسی شاید کسی ایسے ہی موقع کی منتظر تھی۔ وہ فوراً بول اٹھی۔ ''آپ ان سے میری بس ایک ملاقات کرا دیں' وہ پامسٹری کے قائل ہو جائیں گے۔''

"اتفاق سے آج کل وہ اسلام آباد سے آئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے انہیں قائل کرلیا تو میں آپ کو مان جاؤں گا۔"

"اگر وہ اس وقت کوٹھی میں ہیں تو بلوالیں' آپ ابھی دیکھ لیں گے کہ وہ کس طرح قائل ہوتے ہیں۔" لیوسی نے جلدی سے کہا۔

"دیکھتا ہوں جا کر ویسے ابھی کچھ دیر پہلے وہ کہیں جانے کیلئے تیار ہو رہے تھے۔" سجاد حسین نے بتایا۔

"تو پھر جلدی جا کر دیکھیں' کہیں وہ نکل نہ جائیں۔"

لیوسی کے لہجے سے بے چینی جھلک رہی تھی۔ وہ یقیناً آج ہی ظہور حسین سے بھی مل لینا چاہتی تھی۔

پھر میں نے قدموں کی چاپ دور ہوتے سنی۔ سجاد حسین یقیناً اپنے بہنوئی کو دیکھنے گیا تھا۔ وزارت دفاع کے جوائنٹ سیکرٹری ظہور حسین کے بارے میں لیوسی کو سیٹھ عباس نے جو کچھ بتایا تھا' ذرا ہی دیر بعد اس کا ثبوت مل گیا۔ حسین عورتیں واقعی اس کی کمزوری تھیں۔ پہلی ملاقات ہی میں اس نے لیوسی سے دوسری ملاقات کی راہ ہموار کر لی تھی۔ یہ ملاقات سیٹھ عباس کے گھر ہونا تھی۔ سجاد حسین شاید اپنے بہنوئی کی کمزوری سے واقف نہیں تھا ورنہ اسے لیوسی سے نہ ملواتا۔ اپنے دعوے کے مطابق لیوسی نے ظہور حسین کو پامسٹری کا قائل کرلیا تھا۔ ظہور حسین کو کسی ضروری کام سے جانا تھا ورنہ وہ شاید مزید بیٹھتا۔ ظہور حسین سے ملاقات کا مقصد پورا ہو گیا تھا اس لیے لیوسی مزید وہاں نہ رکی اور چائے پیتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب وہاں میرا ٹھہرنا بھی لاحاصل تھا اس لیے میں نے کیپٹن شاد سے اپنی کوٹھی چلنے کو کہا۔

شام کے سات بج رہے تھے جب میں نے کمانڈر نواز سے گلبرٹ کے بارے میں رپورٹ لی۔ میری توقع کے مطابق گلبرٹ کو اس کے ہوٹل سے اغوا کر کے آپریشن سی ہیڈ کوارٹر کے "مہمان خانے" میں پہنچا دیا گیا تھا۔ میں اسی وقت آپریشن سیل روانہ ہوگئی۔

آپریشن سیل پہنچ کر کمانڈر نواز سے معلوم ہوا کہ گلبرٹ کے سامان سے ایک ڈائری ملی ہے جس میں کچھ لوگوں کے نام پتے اور فون نمبر درج ہیں۔ میں نے کمانڈر نواز سے وہ ڈائری لے لی۔ اسی وقت مجھے ایک خیال آیا اور میں نے وہ ڈائری کمانڈر نواز کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "غیر ملکی ایجنٹوں کی جو فہرست ہمارے پاس ہے' اس میں چیک کرو کہ ان میں سے کس کس کا نام اس فہرست میں موجود ہے' ان میں سے جس کا نام بھی اس فہرست میں ہوگا وہ یقینی طور پر امریکی ایجنٹ ہوگا۔ میں اب مہمان خانے کی طرف جا رہی ہوں۔ گلبرٹ سے ظاہر ہے ابھی پوچھ گچھ نہیں کی گئی ہوگی۔"

"جی ہاں میڈم!" کمانڈر نواز جواباً بولا۔ "مجھے آپ کی آمد کا انتظار تھا۔"

"میں کوشش کرتی ہوں کہ وہ زبان کھول دے۔" یہ کہہ کر میں ڈیوٹی روم سے نکل آئی۔

جب میں مہمان خانے کے اس کمرے میں پہنچی جہاں گلبرٹ کو رکھا گیا تھا تو اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی معصومیت اور صنف مخالف کیلئے

انتہائی کشش تھی۔ وہ سر جھکائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور پھر مظلوم سے لہجے میں بولا۔ "مجھے کیوں اغوا کرایا گیا ہے؟" اس کی آواز میں بھی نرمی اور شائستگی تھی۔

"گلبرٹ! اتنی کم عمری میں تم کس طرح اس چکر میں پھنس گئے؟" میں نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"معاً گلبرٹ اپنی جگہ سے اچھلا اور حیرت انگیز تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے جسم کو اس طرح جکڑ لیا جیسے کوئی آکٹوپس اپنے شکار کو قبضے میں کر لیتا ہے۔' مجھے اپنے جسم کی ہڈیاں چٹختی محسوس ہونے لگیں۔ اس نوجوان کے جسم میں بلا کی قوت تھی۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا جو بھڑا ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے مسلح محافظ اس سے بے خبر تھے کہ اندر مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔

جسمانی طور پر گلبرٹ حیرت انگیز قوت کا مالک تھا مگر وہ میرے ذہن کی پراسرار قوتوں کے سامنے ٹک نہ سکا۔ اس پر ہاتھ ڈالنا سودمند ثابت ہوا۔ میرے ملک میں موجود تمام امریکی ایجنٹ تہ دام آ گئے' سوائے جیمس اور لیوسی کے۔ وہ دونوں بچ کر نکل گئے۔ انہیں اپنے آقاؤں کی طرف سے فوری طور پر انڈونیشیا جانے کے احکام ملے تھے۔ ایئرپورٹ سے فون پر مجھے یہ اطلاع خود لیوسی ہی نے دی تھی۔ اس نے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ میں نے اپنے بڑوں سے درخواست کی تھی کہ مجھے صرف چند روز پاکستان میں مزید رہنے دیا جائے مگر افسوس میری درخواست قبول نہیں کی گئی۔ ہاں میں نے یہ وعدہ ضرور لے لیا کہ مجھے جلد ہی پھر تمہارے ملک آنے کا موقع دیا جائے گا تاکہ میں تم سے نہ صرف سولومن کا انتقام لے سکوں بلکہ اپنے تمام ساتھیوں کا بدلہ لے سکوں۔ لیوسی ہی نے میرے اس خیال کی بھی تصدیق کر دی تھی کہ اب میرے ملک میں نئے لوگ بھیجے جائیں گے۔ نئے امریکی ایجنٹوں کے آنے اور قدم جمانے میں خاصا وقت لگ جاتا اس لیے فی الحال میرے اور میرے ملک کیلئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جن دنوں مجھے کچھ سکون کے لمحات میسر آ جاتے تھے تو کاروباری مصروفیات کے علاوہ میرا زیادہ تر وقت مطالعے میں گزرتا تھا۔ تاریخ سے بھی مجھے خصوصی شغف تھا۔ ان دنوں میں تاریخ ہی کا مطالعہ کر رہی تھی۔ میں نے مغلوں کے اس عہد کے متعلق کچھ نادر و کمیاب کتب جمع کی تھیں جو تاریکی میں تھا۔ اسی دوران میں مجھے ایک عجیب اور پراسرار تجربہ ہوا۔ میرا ذہن جو لاکھوں سال پر محیط تھا' اس کا مجھے عملی تجربہ ہوا۔ میرا ذہن ماضی اور مستقبل دونوں میں سفر کر سکتا تھا۔ مغلوں کی عظیم الشان حکومت کس طرح اور کیوں بہادر شاہ ظفر کے عہد تک صرف دہلی کے لال قلعے تک محدود رہ گئی تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس نے میرے ذہن کو ماضی کے سفر پر آمادہ کیا۔ میں جب چاہتی لمحہ موجود میں لوٹ کر آ سکتی تھی۔ میری کیفیت اس وقت بڑی عجیب سی تھی جب میں ماضی کے اس پراسرار سفر پر روانہ ہو رہی تھی۔ یہ تجربہ میرے لیے بالکل نیا' حیرت انگیز اور انتہائی دلچسپ تھا۔

میرا ذہن مغلوں کے اس دور میں پہنچ گیا جب ہندوستان پر اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت تھی۔ میں نے اورنگزیب کا دربار دیکھا اور اس نوجوان کو بھی دیکھا جو جنگ کے تپتے ہوئے صحراؤں سے پہلی بار دربار میں آیا تھا۔ اس نوجوان کا نام عبداللہ خاں تھا' اسی کا چھوٹا بھائی حسین علی خاں تھا۔ بڑے

بھائی عبداللہ خاں کو مغلیہ تاجدار نے محلات شاہی کا نگران اعلیٰ مقرر کیا اور چھوٹے بھائی حسین علی خاں کو جس کی عمر صرف انتیس سال تھی صوبہ عظیم آباد کا صوبیدار بنا دیا۔ ان دونوں ہی کو بادشاہ وقت کا احسان مند ہونا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ عبداللہ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی کو احسان فراموشی پر آمادہ کرلیا۔ اورنگ زیب دکن چلا گیا۔ شاہجہان آباد میں عبداللہ رہا' حسین علی خاں عظیم آباد روانہ ہو گیا۔ دونوں بھائیوں نے خلوت میں جو گفتگو کی تھی' اسے ایک کنیز نگار نے سن لیا۔ عبداللہ خاں کا مقصد اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کرنا تھا اور یہ راز راز نہیں رہ سکا۔ عبداللہ ہر قیمت پر یہ چاہتا تھا کہ راز افشا نہ ہو۔ اس نے اسی لیے ایک کنیز کو اپنا آلہ کار بنایا۔ اس کنیز کا نام ماہ رخ تھا۔ محلاتی سازشیں جنم لینے لگیں اور عبداللہ خاں ان سے نمٹنے کیلئے تگ و دو کرنے لگا۔ ماہ رخ' نواب بادشاہ بیگم کی خادمہ خاص تھی۔ عبداللہ خاں نے اسے اپنے خلوت کدے میں بلوالیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی نگار اور ماہ رخ ہی تک بات پہنچ پائی ہے' اگر ان دونوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو یہ راز ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جائے گا۔ اگر آج میں ماہ رخ سے نہ ملا اور وہ مجھ سے متاثر نہ ہوئی تو شاید نواب بادشاہ بیگم تک وہ راز پہنچ جاتا جس کے افشا کا مطلب ہم دونوں بھائیوں کی موت ہوتا۔ یہی سوچتے ہوئے عبداللہ خاں کے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے ابھی کئی اہم باتوں کا جاننا ضروری تھا۔ یہ معاملہ زندگی اور موت کا تھا اور عجلت بنا بنایا کھیل بگاڑ بھی سکتی تھی۔

☆......☆......☆

اپنے صفحہ ذہن پر میں گزرے ہوئے وقت کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے میری آنکھوں کے سامنے فلم چل رہی ہو۔ میرے ذہن کا ماضی میں سفر بظاہر فکشن لگتا ہے مگر حقیقت یہی ہے جو میں لکھ رہی ہوں۔ اس سائنٹفک عہد میں آدمی کے دماغ پر خاصا کام ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود ابھی پوری طرح اس کو سمجھا نہیں گیا۔ خدا وہ دن جلد لائے جب یہ اسرار' اسرار نہ رہیں۔ نوع انسانی کے اجتماعی تجربات ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ کیا کبھی کبھی آپ کو محسوس نہیں ہوتا کہ جو کچھ لمحۂ موجود میں ہے پہلے بھی گزر چکا ہے؟ یہ کوئی اسرار نہیں بلکہ انسانی دماغ ہی کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ اس کا ثبوت خود میری ذات' میرا ذہن ہے۔ مجھے پیش آنے والے وہ پراسرار تجربات ہیں جن کا تعلق میرے ماضی سے ہے۔ ان تجربات کو خود میں بھی سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں اور وہ تمام ذہن بھی جو انسانی دماغ پر دنیا بھر میں کام کر رہے ہیں۔

گزشتہ قسط میں سہواً حسین علی خان کی عمر انیس سال شائع ہوگئی ہے جبکہ انتیس سال ہونا چاہئے تھی۔ یہ کمپوزنگ کی غلطی تھی مجھے خوشی ہے کہ لوگ اتنی توجہ سے میری تحریر پڑھتے ہیں۔ بہرحال میں نے اپنے مسودے میں 29 سال ہی عمر لکھی تھی۔ کچھ لوگوں نے میری توجہ اس طرف مبذول کرائی' میں ان کی ممنون ہوں۔ خود شمیم نوید صاحب کو بھی یہ شکایت ہے کہ میں مسودہ صاف نہیں لکھتی اور انہیں انگریزی سے اردو میں میری سرگزشت لکھتے ہوئے بڑی دقت پیش آتی ہے۔ خیر اس لاحاصل مضمون نگاری کو یہیں چھوڑتے ہیں۔ آیئے میرے ساتھ ساتھ ماضی کے سفر پر چلیے! میں جو کچھ دیکھ اور سن رہی ہوں آپ کو بھی دکھانا اور سنانا چاہتی ہوں۔

عبداللہ خاں اپنی زندگی کو خطرے میں محسوس کر رہا تھا پھر بھی اس کا ذہن پوری طرح بیدار تھا۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ماہ رخ کے دل میں اس کیلئے کوئی نرم گوشہ ضرور موجود ہے ورنہ وہ یہ اطلاع اس تک نہ پہنچاتی کہ نگار نے کیا سنا تھا!

''ماہ رخ! جب تم مجھے اطلاع پہنچانے یہاں آرہی تھیں تو کیا اس بات سے ناواقف تھیں کہ رات کے وقت محل کا محافظ دستہ تمہیں اس مشتبہ حالت میں گرفتار بھی کرسکتا ہے؟'' عبداللہ خان نے کچھ سوچتے ہوئے ماہ رخ سے سوال کیا۔

''مجھے معلوم تھا مگر جو کچھ ہوا میری توقع کے عین مطابق تھا۔ میں جانتی تھی کہ ایسی صورت میں مجھے آپ ہی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ میں نے اسی لئے گرفتار ہونے کے بعد اتنا ہنگامہ کیا۔ مجھے علم تھا

کہ آپ کا کمرا دور نہیں ہے۔آپ یقیناً شور سن کر بیدار ہو جائیں گے۔'' ماہ رخ نے جواب دیا۔

''تم نے واقعی بہادری اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔'' عبداللہ خان نے اسے ستائش کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر بولا'' نگار کے بارے میں کچھ اور''

'' کچھ اور سے حضور کی مراد؟''

'' یہ کہ وہ دلاور خاں کی محبوبہ ہے' اس کے علاوہ نگار کے بارے میں مزید باتیں۔''

''وہ اپنی ماں اور بڑے بھائی کے ہمراہ قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی تدریوں میں سے ایک میں رہتی ہے جہاں دوسری کنیزوں اور محلات کے ملازمین کی سکونت ہے' اس کا بڑا بھائی محمد نواز شاہی مطبخ میں ملازم ہے'' ماہ رخ نے بتایا۔

''اس کی قیام گاہ کی کوئی خصوصی شناخت؟'' عبداللہ خاں نے پھر سوال کیا۔

''تمام تدریاں ایک سی بنی ہوئی ہیں' پھر بھی نگار کی تدری تک پہنچنا مشکل نہیں۔ جب آپ قلعہ کے پھاٹک کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں گے تو دائیں جانب تیسری تدری اس کی ہے' اس کے علاوہ یہ کہ اس قطار میں نگار کی تدری کے سامنے ہی گلاب کے گملے رکھے ہیں کیونکہ اسے گلاب کے پھولوں سے جنون کی حد تک عشق ہے اسی لئے اکثر کنیزیں اسے نگار کی بجائے گلاب بھی کہتی ہیں' آپ ... آپ یہ سب کچھ اتنی تفصیل سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' گفتگو کرتے کرتے ماہ رخ کو کچھ خیال آ گیا'' اس میں نگار کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ یہ سب شرارت اور سازش دلاور خاں کی ہو سکتی ہے۔''

نگار کے بارے میں پوچھ گچھ کئے جانے کے سبب ماہ رخ اس کی طرف سے فکر مند ہو گئی تھی۔ شاید وہ کسی حد تک یہ بات سمجھ گئی تھی کہ عبداللہ خاں یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہا ہے!

عبداللہ خاں کو ماہ رخ کی ذہانت کا قائل ہونا پڑا۔ اسی کے ساتھ وہ سوچنے لگا کہ میں نے نگار کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے اگر وہی فیصلہ ماہ رخ کیلئے بھی نہیں کیا تو یہ میرے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔

واقعات اس تیزی سے پیش آئے تھے کہ عبداللہ خاں کے ذہن میں دور دور تک اب عشق کا تصور نہیں تھا ورنہ وہ سب نہ ہوتا جو اچانک ہو گیا۔

اس وقت عبداللہ خاں کے ذہن میں صرف یہ تھا کہ مجھے کسی بھی طرح ان زبانوں کو ہمیشہ کیلئے خاموش کر دینا ہے جن پر یہ بات آ سکتی ہے کہ میں اور حسین علی خاں حکومت کے خلاف کسی سازش کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے اس کا ذہن ایک اور طرف بھٹک گیا۔ کیا مجھے اور ماہ رخ کو باغ میں ایک یک جا دیکھنے والی بھی نگار ہی تھی؟ ایسا ممکن تھا کہ کیوں کہ نگار صبح سے ہی عبداللہ خاں کی طرف سے شک میں پڑ چکی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ عبداللہ کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہی ہو لیکن یہ صرف ایک قیاس تھا جس کا درست ہونا یقینی نہیں تھا۔ عبداللہ خاں اسی پر غور کر رہا تھا۔

عبداللہ خاں کو خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر ماہ رخ نے اسے مخاطب کیا'' آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' میرا خیال ہے کہ اب مجھے جانا چاہئے۔ زرینہ بڑی شریر ہے اور امی جان بھی اس کی ہر بات کا یقین کر لیتی ہیں۔ اگر اس دوران میں امی جان کی آنکھ کھل گئی تو وہ مجھے گھر میں نہ پا کر یہ سوچیں گی کہ میں زرینہ کے گھر ہوں گی۔ انہوں نے اگر زرینہ کے گھر جا کر میرے بارے میں پوچھ گچھ کی تو زرینہ

انہیں بتا سکتی ہے' میں کہاں ہو سکتی ہوں! ایسی صورت میں ناحق مجھے امی جان کے سامنے شرمندہ ہو پڑے گا۔'' ماہ رخ ایک ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے بولی۔

''وہی زرینہ جو آج صبح اس وقت ہمارے قریب سے گزر رہی تھی جب ہم دونوں محو گفتگو تھے جسے تم نے اپنی سہیلی بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ بیگم ارجمند بانو کی منہ چڑھی کنیز ہے؟ کیا تم اسے بتا کر آئی تھیں کہ کہاں جا رہی ہو؟'' عبداللہ خاں نے دریافت کیا۔

''ہاں وہی زرینہ! وہ بڑی آفت کی پرکالا ہے۔ اسی نے آج صبح مجھے اور آپ کو گفتگو کرتے دیکھ کر نہ جانے کیا کیا اندازے قائم کر لئے! وہ صبح ہی سے میری ٹوہ میں لگی ہوئی تھی کہ میں آپ سے کب اور کہاں ملتی ہوں! باغ میں مجھے اور آپ کو پیڑوں کے جھنڈ میں چھپ کر اسی نے دیکھا تھا' مجھے اس نے سب کچھ بتا دیا تھا اور چھیڑتے ہوئے بولی تھی کہ اگر میں پکڑی جاتی تو سارا بھانڈا پھوڑ دیتی۔'' ماہ رخ نے ایک اور عقدہ حل کر دیا۔

ماہ رخ کی بات سن کر عبداللہ خاں کے ذہن میں سے ایک اور بوجھ ختم ہو گیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ الجھنیں خود بخود ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ اب اس کے سامنے صرف ایک مسئلہ تھا کہ آیا نگار کے ساتھ ماہ رخ کو بھی ٹھکانے لگا دیا جائے یا معاف کر دیا جائے۔ وہ کافی دیر سوچ کر آخر ایک نتیجے پر پہنچ ہی گیا۔

''ماہ رخ! تم نے مجھے جو اطلاعات فراہم کی ہیں' وہ یقیناً بہت اہم ہیں۔ میں تمہاری ذہانت' بہادری' اور خدمت سے خوش ہوا۔ تمہیں ان خدمات کے صلے میں کوئی انعام نہ دینا ظلم ہے'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے خود عبداللہ خاں کو اپنی آواز اجنبی اجنبی سی اور غیر مانوس سی محسوس ہو رہی تھی۔''

''انعام؟'' ماہ رخ جیسے کچھ بھی نہ سمجھ پائی' پھر اس سے پہلے کہ ماہ رخ کچھ سمجھ پاتی۔ عبداللہ خاں کا بایاں ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا اور دائیں ہاتھ سے اس نے قریب پڑا ہوا خنجر ماہ رخ کے سینے میں دستے تک اتار دیا۔ ماہ رخ کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں جیسے وہ اب بھی کچھ نہ سمجھ پائی ہو۔ اس کے سینے سے خون ابل ابل کر قالین میں جذب ہونے لگا۔

ماہ رخ کا جسم جب تک تڑپ تڑپ کر ساکت نہ ہو گیا۔ عبداللہ کا ہاتھ اس کے منہ سے نہ ہٹا۔ عبداللہ خان نے اس دوران میں پوری طرح خیال رکھا تھا کہ خون کے چھینٹے اس کے لباس پر نہ آنے پائیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ماہ رخ کے قتل کو خودکشی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جھک کر احتیاط کے ساتھ ماہ رخ کے سینے سے خنجر کھینچا اور پھر وہی خنجر ماہ رخ کے دائیں ہاتھ پر رکھ دیا۔ ماہ رخ کا جسم ابھی گرم تھا۔ عبداللہ خاں نے اس کی مٹھی بند کر دی اور ہاتھ کو کچھ دیر پکڑے رہا تا کہ جسم ٹھنڈا ہونے کی صورت میں انگلیاں اکڑ جانے کے بعد خنجر ماہ رخ کے ہاتھ میں رہے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ کچھ دیر بعد جب عبداللہ خاں نے ماہ رخ کا ہاتھ چھوڑا تو مٹھی پھر کھل گئی۔ ماہ رخ کو اس کمرے میں آئے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا اور وہ مزید احتیاط کر کے زیادہ دیر لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اسی لئے خنجر کو ہتھیلی پر رکھنا ہی کافی سمجھا۔

عبداللہ خاں کی نظر ماہ رخ کے چہرے کی طرف اٹھی تو ایک لمحے وہ کانپ کر رہ گیا۔ اسے یوں

محسوس ہوا جیسے ماہ رخ مسکرا رہی ہے۔ وہ چند لمحے ماہ رخ کا چہرہ غور سے دیکھتا رہا ماہ رخ کے چہرے سے حیرت انگیز طور پر کرب کے آثار غائب ہو چکے تھے اور ایک عجیب سا بھولپن عود کر آیا تھا۔ گلاب کی پنکھڑیوں ایسے ہونٹ اب بھی تروتازہ لگ رہے تھے۔ ہر چند کہ وہ زلفیں اب ہمیشہ کیلئے بے سایہ ہو چکی تھیں مگر سرخ وسفید چہرے کے گرد اس طرح بکھری ہوئی تھیں جیسے کالی کالی مست گھٹائیں روشن چاند کو چھپا لینا چاہتی ہوں۔ شراب سی آنکھیں بند تھیں مگر ان پر گھنی پلکوں کے سائے اب بھی حسین لگ رہے تھے۔ سانچے میں ڈھلے ہوئے اس جسم کے نشیب وفراز ہر چند کہ اپنی معنویت کھو چکے تھے لیکن ان میں اب بھی ایک بلاوا تھا۔

چند لمحوں کے لئے عبداللہ نے اپنے ضمیر پر ایک بوجھ سا محسوس کیا۔ اسے ندامت سی ہوئی۔ اس کے ہاتھ سے کسی بے گناہ کا شاید وہ پہلا قتل تھا مگر یہ لمحے بڑے نازک لمحے تھے۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اب تو اسے قتل کے الزام سے بچنا تھا اور اس عرصے میں وہ یہ تدبیر سوچ چکا تھا۔

اس نے خود کو سنبھالا اور دروازہ کھولنے کیلئے بڑھا۔ دروازہ کھول کر اس نے باہر مستعد کھڑے ہوئے محافظ کی طرف دیکھا۔ محافظ' سپاہیوں کے جاتے ہی دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا۔

''محافظ دستے کے سپاہیوں کو بلاؤ!'' عبداللہ نے حکم دیا۔

حکم سن کر محافظ نے ادب سے گردن جھکائی اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔ عبداللہ خاں پھر کمرے میں آ گیا۔ اسی وقت اس کی نظر ایک چھوٹی سی صندوقچی پر پڑی۔ یہ صندوقچی خود اس نے ماہ رخ کی مرہم پٹی کیلئے نکالی تھی۔ اس نے جلدی سے وہ صندوقچی اٹھائی اور کھلے ہوئے صندوق میں بند کر دی۔ پھر اس نے وہ سیاہ لبادہ لاش کے قریب ڈال دیا جو ماہ رخ اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے سوچا کہ ماہ رخ کا زخمی بازو دیکھ کر لوگ شک میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں' لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی آ سکتا ہے کہ بازو کب اور کیسے زخمی ہوا؟ اور یہ کہ مرہم پٹی کس نے کی پھر اس نے خود ہی اپنی تسلی کیلئے ان سوالوں کا جواب بھی سوچ لیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ سپاہی ان تمام باتوں پر غور نہیں کریں گے' رہے دوسرے لوگ تو ان کیلئے ماہ رخ کی خودکشی ہی معمہ بن جائے گی کہ آخر وہ رات کے وقت اس طرح سیاہ لبادے میں چوری چھپے کیوں نکلی تھی؟ اور پھر اس نے زبان کھولنے پر موت کو ترجیح کیوں دی؟ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ راہداری میں بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید محافظ دستے کے سپاہی آ رہے تھے۔

ذرا دیر بعد عبداللہ خاں کا ذاتی محافظ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے سپاہیوں کے آنے کی اطلاع دی۔ اس کی نظر شاید ابھی ماہ رخ کی لاش پر نہیں پڑی تھی ورنہ اس کا بدحواس ہو جانا لازمی تھا۔

''انہیں اندر آنے دو۔'' عبداللہ خاں نے جواباً اپنے محافظوں سے کہا۔

چند لمحے بعد چار سپاہی کمرے میں داخل ہوئے اور عبداللہ خاں کو ادب سے سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ یہ وہی چاروں تھے جنہوں نے ماہ رخ کو مشتبہ حالت میں پکڑا تھا۔

''اس کی لاش اٹھا لے جاؤ! اس نے کچھ بتانے سے پہلے ہی خودکشی کر لی۔'' عبداللہ خاں نے اس طرف انگلی اٹھائی جہاں ماہ رخ کی لاش پڑی تھی۔

عبداللہ خاں کے الفاظ سپاہیوں پر جیسے بجلی بن کر گرے۔ ان سب کی نظریں بیک وقت اس

طرف اٹھیں جدھر عبداللہ خاں نے اشارہ کیا تھا۔ ماہ رخ کی لاش دیکھ کر وہ سب اس طرح اچھل پڑے جیسے انہوں نے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔ ان کے چونکنے کا سبب غالباً یہ بھی تھا کہ ان کا ذہن اس نقاب پوش کے پردے میں کسی عورت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں رہا ہو گا۔

وہ ابھی حیرت زدہ ہی تھے کہ عبداللہ نے انہیں پھر مخاطب کیا ''کیا تم میں سے کوئی اسے پہچانتا ہے کیوں کہ اس نے مجھے اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا؟ اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ اسے میں نے یہیں کہیں محل میں دیکھا ہے۔ یا شاید کوئی کنیز ہے۔''

عبداللہ خاں کی بات سن کر چاروں سپاہی آگے بڑھے اور ماہ رخ کی لاش کے قریب پہنچ کر اسے دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک چونک اٹھا۔ اس نے غالباً مقتولہ کو پہچان لیا تھا۔ ''یہ تو نواب بادشاہ بیگم کی خادمۂ خاص ماہ رخ ہے!'' سپاہی کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔ پھر وہ عبداللہ خاں کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔ ''مگر... مگر حضور... یہ یہاں... کیوں آئی تھی؟ اور... پھر اس نے خودکشی کیوں کر لی؟... سوال یہ ہے کہ...'' سپاہی نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اس کا بازو بھی زخمی ہو گیا اور پٹی بندھی ہوئی ہے۔'' دوسرے سپاہی نے جھک کر خیال آرائی کی۔

اس سپاہی کی یہ بات عبداللہ خاں کیلئے خلاف توقع تھی۔ وہ اسی لئے سخت لہجے میں بولا۔ ''میں نے تم لوگوں کو یہاں تفتیش کرنے نہیں بلایا! سمجھ گئے' اس کی لاش اٹھاؤ اور کمرے سے نکل جاؤ!''

عبداللہ خاں کو خفا دیکھ کر سپاہی مشینی انداز میں جھکے اور انہوں نے ماہ رخ کی لاش اٹھا لی۔

لاش اٹھا کر سپاہی ابھی کمرے کے دروازے ہی تک پہنچے تھے کہ عبداللہ نے انہیں پھر مخاطب کیا۔ ''اس کا یہ سیاہ لبادہ بھی لیتے جاؤ!''

ایک سپاہی پلٹا اور تیزی کے ساتھ قالین پر پڑا ہوا سیاہ لبادہ اٹھا کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ عبداللہ خاں کی ناراضگی پر سپاہی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خوفزدہ ہو گئے تھے۔

سپاہی لاش اٹھا کر کمرے سے نکل گئے تو عبداللہ نے اپنے ذاتی محافظ کو حکم دیا کہ فوراً میرے ملازمین کو بلا لاؤ!

عبداللہ خاں اپنے کمرے سے وہ خون آلود قالین بھی اٹھوا دینا چاہتا تھا۔

ملازمین کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے چہروں پر خوف کے آثار تھے۔ شاید انہیں عبداللہ خاں کے ذاتی محافظ نے تمام واقعہ بتا دیا تھا۔

قالین بھی کمرے کے فرش سے اٹھا لیا گیا تو عبداللہ خاں اپنے کمرے سے نکلا اور ذاتی محافظ سے نرمی کے ساتھ بولا۔ ''تم کچھ تھکے تھکے دکھائی دے رہے ہو' جا کر آرام کرو! تمہاری آنکھوں میں نیند معلوم ہو رہی ہے۔''

''جی... جی حضور؟... نہیں' م... میں ٹھیک ہوں۔''

ذاتی محافظ خلاف توقع اپنے اوپر کرم دیکھ کر ہکلایا کیوں کہ رات بھر دروازے کے باہر مستعد چوکنا کھڑے رہنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔

"میں نے تم سے جو کہا ہے، وہی کرو! میں غیر ضروری باتیں سننا پسند نہیں کرتا" اس بار مصلحت کے پیش نظر عبداللہ خاں کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔ ذاتی محافظ نے اسی میں بہتری سمجھی کہ چپکے سے کھسک جائے اور مزید کچھ نہ بولے۔

عبداللہ خاں کا ذاتی محافظ اپنی ادائیگی فرض کے چکر میں خواہ مخواہ اس منصوبے کو خاک میں ملائے دے رہا تھا جس پر عبداللہ خاں کو عمل کرنا تھا۔ محافظ کی دروازے پر موجودگی میں عبداللہ خاں راز داری کے پیش نظر اپنے کمرے میں نہیں نکل سکتا تھا۔ کمرے سے باہر نکلنے کے لئے عبداللہ خاں دریچہ بھی استعمال کر سکتا تھا مگر وہ اس طرف سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ادھر سے جانے کی صورت میں اسے قلعے کے پھاٹک تک پہنچنے کیلئے ایک لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔ اس طرح وہ محل کے محافظ دستے کی نظروں میں بھی آ سکتا تھا۔

نگار کو ٹھکانے لگانے کیلئے عبداللہ خاں کی نظر میں یہ وقت بہت مناسب تھا۔ محافظ دستے کے جو چار سپاہی، محل کے اس حصے میں متعین تھے جہاں عبداللہ خاں کا قیام تھا، وہ ماہ رخ کی لاش لے کر وہاں سے جا چکے تھے۔ عبداللہ خاں کسی کی نظر میں آئے بغیر اس حصے سے گزر سکتا تھا۔ محافظ دستے کے وہ سپاہی جو محل کے دوسرے حصوں میں سے تھے۔ ان کی طرف سے بھی کم از کم اس وقت عبداللہ خاں کو کوئی فکر لاحق نہیں تھی۔ اب تک وہ سبھی ماہ رخ کی پراسرار خودکشی کے بارے میں جان چکے ہوں گے اور وہ تجسس کے تحت ماہ رخ کی لاش دیکھنے دوڑ پڑے ہوں گے۔

عبداللہ خاں جب اپنے کمرے سے نکلا تو اس کے سر پر کلاہ نہیں تھی اور چہرہ بھی سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

قلعے کے پھاٹک تک پہنچنے میں عبداللہ خاں کو زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ توقع کے عین مطابق اس طرف قطعی سناٹا تھا۔ ماہ رخ کی سکونت ان تدریوں میں سے ایک تھی جو قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ مخالف سمت بنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں شاہی محلات تھے۔

وقت ضائع کئے بغیر عبداللہ خاں نگار کی تدری کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنے لباس میں پوشیدہ رسی نکالی۔ دوسرے ہی لمحے وہ تدری کی چھت کے ایک کنگورے میں کمند ڈال چکا تھا۔

چھت پر پہنچ کر عبداللہ خاں نیچے کی سن گن لینے لگا۔ اسی دوران میں اس نے کنگورے سے رسی کا پھندا نکال لیا تھا اور رسی کو دوبارہ چھپا لیا تھا۔

عبداللہ خاں کو یہ خبر نہیں تھی کہ اس تین دالانوں والے گھر کے کس کمرے میں نگار سو رہی ہو گی! اسی لئے وہ بہت محتاط اور چوکنا تھا۔

چھت سے زینے کے ذریعے اتر کر وہ بآسانی گھر میں پہنچ گیا۔ صحن سے گزر کر وہ ایک دالان میں داخل ہوا۔ سامنے ہی آتش دان پر فانوس جل رہا تھا مگر اس کی لو مدھم تھی۔ اس دالان میں صرف ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ پنجوں کے بل چلتا ہوا وہ چارپائی کے پاس پہنچ گیا۔ سونے والا جو کوئی بھی تھا ہلکی سی خنکی کے سبب سر تک چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ عبداللہ خاں الجھن میں پڑ گیا۔ سونے والے کا چہرہ دیکھنا

اس کیلئے ضروری تھا۔ ماہ رخ کی اطلاع کے مطابق اس گھر میں تین افراد کو ہونا چاہئے تھا۔ انہی میں سے ایک جوان لڑکی تھی اور عبداللہ خاں کو اسی کی تلاش تھی۔

معاً عبداللہ خاں کی توجہ سونے والے کے خراٹوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ یہ خراٹے کسی لڑکی کے نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر اس کی نظر آتش دان پر فانوس کے قریب رکھی ہوئی تلوار کی جانب اٹھی۔ اس کے بعد اس نے چارپائی کے برابر مردانہ جوتے رکھے ہوئے دیکھے۔ اس چارپائی پر سونے والا نگار کا بھائی محمد نواز ہی ہو سکتا تھا۔ تمام شواہد اسی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ خود نگار اور اس کی ماں، دونوں دوسرے دالان میں ہوں گے۔

عبداللہ خاں دبے پاؤں اس دالان سے نکل کر دوسرے قریبی دالان میں گھس گیا۔ خلاف توقع وہاں مکمل تاریکی تھی۔ عبداللہ خاں آگے بڑھتے بڑھتے ہوئے ٹھٹک کر رک گیا اور پھر واپس دالان کے دروازے پر آ گیا۔ تاریکی کا اس نے یہی مطلب لیا کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ وہ پھر صحن میں آ گیا اور بائیں سمت کے دالان کی طرف بڑھا۔ جب اس نے دالان کی طرف نگاہ ڈالی اور قریب گیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اندازے کے مطابق اس دالان میں مدھم روشنی ضرور ہونا چاہئے تھی مگر وہ دالان بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

یہ کیا چکر ہے؟ عبداللہ خاں کے ذہن میں سوال ابھرا۔ صورتحال برخلاف ہونے کے باوجود عبداللہ خاں کا ذہن بیدار تھا۔ اس نے سوچا، فانوس میں تیل کم ہو گا اور جب دالان میں سونے والے سو گئے ہوں گے تو فانوس بجھ گیا ہو گا۔

عبداللہ خاں کے پاس کوئی ایسے شی نہیں تھی کہ جسے روشن کر کے وہ دونوں تاریک دالانوں کا جائزہ لے سکتا۔ اب اس کے لئے یہی ایک صورت تھی کہ وہ پہلے دالان والا مدھم فانوس اٹھا لاتا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ پھر برابر والے دالان ہی میں اسے دو چارپائیاں بچھی ہوئی نظر آ گئیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کے چہرے بھی چادروں میں چھپے ہوئے ملیں تو کیا ہو گا؟ مگر ایسا نہیں ہوا۔

دالان کے دروازے کے قریب ہی بڑھیا کی چارپائی بچھی ہوئی تھی جو نگار کی ماں ہو سکتی تھی۔ دوسری چارپائی پر نگار ہی کو ہونا چاہئے تھا جسے عبداللہ خاں نے سرسری طور پر صرف ایک بار دیکھا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب محل کا تمام عملہ اس کے روبرو پیش ہوا تھا لیکن عبداللہ خاں کو اس کی شکل اب یاد نہیں رہی تھی، اگر اسے یقین نہ ہوتا کہ اس گھر میں موجود جوان لڑکی نگار ہی ہو سکتی ہے تو نگار کو پہچان نہیں سکتا تھا۔

عبداللہ خاں دوسری چارپائی کے سرہانے کھڑا ہوا تو اس نے اپنا سانس تک روک لیا۔ فانوس کو اس نے آہستہ سے قریبی آتش دان پر رکھ دیا۔ وہاں ایک اور بجھا ہوا فانوس پہلے ہی موجود تھا۔ جس سے یہ تصدیق ہو گئی کہ اس دالان کا فانوس تیل نہ ہونے کے سبب بجھا ہو گا۔ فانوس کی مدھم روشنی ایک حسین چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس حسین چہرے پر ایک لٹ بکھری ہوئی تھی۔ اس حسن خوابیدہ کو دیکھ کر عبداللہ خاں مبہوت سا ہو گیا۔ وہ کسی بھی طرح ماہ رخ سے کم حسین نہیں تھی۔ عبداللہ خاں ایک اور پری چہرہ کو ہمیشگی کی نیند سلانے والا تھا۔ ایک ایسی نیند جس کے بعد کوئی بیدار نہیں ہوتا۔ یہ اس کی بقا کا مسئلہ تھا۔ عبداللہ خاں کو

اپنے تحفظ کیلئے اس حسن خوابیدہ کو راستے سے ہٹانا تھا۔

اچانک عبداللہ خاں کا ایک ہاتھ تیزی سے آگے بڑھا اور اس ماہ وش کے منہ پر جم گیا۔ وہ کسمسا کر بیدار ہی ہونے والی تھی کہ عبداللہ خاں کے سیدھے ہاتھ نے حرکت کی۔ ایک خنجر فضا میں لہراتا ہوا ایک خوب رو کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ عین اسی لمحے عبداللہ خاں کسی چوکنا آہو کی طرح اچھل پڑا۔ گھر کے دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔

"کون؟" قریب ہی بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹی بڑھیا نند اسی آواز میں زور سے بولی۔ وہ غالباً چوکنا سونے کی عادی تھی۔

دستک پھر ہوئی اور اس عالم میں نہ جانے کس طرح عبداللہ خاں کا ہاتھ اپنے "شکار" کے منہ سے قدرے ہٹ گیا۔ کربناک گھٹی گھٹی سی چیخ دالان میں گونج اٹھی۔ اسی کے ساتھ بڑھیا کی چیخ ابھری۔ بیدار ہو کر وہ عبداللہ خاں کو دیکھ چکی تھی۔ عبداللہ خاں تیر کی طرح لپک کر دالان سے نکلا۔ بڑھیا دوبارہ چیخی۔

عبداللہ خاں دالان سے نکل کر جیسے ہی صحن میں پہنچا تو کسی سے ٹکرا گیا۔ بدحواسی کے باوجود اس چیختے ہوئے شخص کو عبداللہ نے دھکا دیا اور صحن عبور کرکے زینے پر چڑھتا چلا گیا۔

"دوڑو... ! پکڑو! ... چور... چور"

صدائیں عبداللہ خاں کا تعاقب کرتی رہیں اور وہ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری تدری کی چھت پر زقندیں لگاتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ قلعے کی دیوار کے اختتام پر پہنچ کر وہ رکا اور ایک تدری کی چھت سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے نیچے چھلانگ لگادی۔

"وہ کودا! ... وہ رہا!" کوئی بہت زور سے چیخا۔

عبداللہ خان نے پلٹ کر دیکھنا مناسب نہیں سمجھا اور تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا اس طرف چلا گیا جدھر سے محل کے اس حصے میں پہنچ سکتا تھا۔ جہاں اس کا قیام تھا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرکے وہ کچھ دیر بعد اپنے بے ترتیب سانس درست کرتا رہا۔ اس کی پشت دروازے سے لگی ہوئی تھی۔ ابھی اس کا سانس قابو میں نہیں آیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

کون ہوسکتا ہے؟ اس نے سوچا اور اسی کے ساتھ اسے غصہ بھی آ گیا۔ غصہ آنے کے سبب یہ خیال تھا کہ کمرے کے دروازے پر دستک دینے والے کو بہرحال یہ خیال رکھنا چاہئے تھا کہ یہ وقت اس کے سونے کا تھا۔ وہ غصے کے عالم میں دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ اچانک اسے اپنے حلیے کا خیال آ گیا۔ اس کے چہرے پر نقاب تھی' ہاتھ میں خون آلود خنجر اور کمر سے رسی لٹک رہی تھی۔ وہ دروازہ کھولتے کھولتے رک گیا۔ دستک دوبارہ ہوگئی اس نے تیزی کے ساتھ نقاب' خنجر اور رسی اپنی مسہری کے نیچے ڈال دی۔

"کون ہے؟" اس نے کسی قدر خفگی کے ساتھ دستک دینے والے کو مخاطب کیا۔

"حضور! میں دلاور خاں ہوں۔" دستک دینے والے نے ادب سے جواب دیا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ یہ سونے کا وقت ہے!" دروازہ کھولتے ہی عبداللہ سخت لہجے میں بولا۔

دلاور خاں سخت بدحواس اور گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ بولا' ہنگامے کی وجہ سے یا نہ جانے کس وجہ سے نواب بادشاہ بیگم بیدار ہوگئی ہیں اور انہوں نے اسی وقت حضور کو یاد فرمایا ہے۔"

"ہنگامہ؟... کیسا ہنگامہ؟" سب کچھ جانتے بوجھتے عبداللہ خاں انجان بن گیا۔

"ایک تو حضور' ماہ رخ کی خودکشی کا ہنگامہ' دوسرے ابھی کچھ دیر پہلے ایک کنیز رابعہ کو کوئی قتل کرکے فرار ہوگیا" دلاور خاں نے بتایا۔

"رابعہ؟" عبداللہ خاں چونک کر زیر لب بولا۔

"جی حضور! مجھے ابھی ابھی یہی معلوم ہوا ہے۔ میں خود وہاں نہیں جاسکتا کیوں کہ نواب شاہ بادشاہ بیگم نے طلب کرلیا تھا۔"

دلاور خاں کی بات سن کر عبداللہ خان کو کچھ اطمینان محسوس ہوا۔ اس نے سوچا' ممکن ہے دلاور خاں کو اطلاع ملی ہو اور ایسا ممکن بھی تھا۔ ابھی قتل کو دیر ہی کتنی ہوئی تھی یا تو دلاور خان کو اطلاع دینے والا غلط فہمی کا شکار تھا۔ یا پھر دلاور خاں نے غلط سنا تھا۔ عبداللہ خاں نے اسی لئے دلاور خاں سے مزید سوال نہیں کیا۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس معاملے میں پوچھ گچھ کرکے وہ اپنی دلچسپی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"چلو!" اس نے اپنے سر پر کلاہ رکھتے ہوئے دلاور خاں کو مخاطب کیا۔

اب دلاور خاں اور عبداللہ خاں' نواب بادشاہ بیگم کی طلبی پر ان کے محل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عبداللہ خاں سمجھ چکا تھا کہ نواب بادشاہ بیگم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہے۔ وہ یقیناً عبداللہ خاں سے ماہ رخ کی خودکشی کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی ہوں گی کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ اس جواب طلبی کے لئے ذہنی طور پر عبداللہ خاں خود کو تیار کرتا جارہا تھا۔

"ان دونوں ہی کی رنجش و رقابت اب ہمیشہ کیلئے ختم ہوگئی۔ دلاور خاں بولا۔ اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔"

چلتے چلتے دلاور خاں کے اچانک بولنے سے عبداللہ خاں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا مطلب؟"... کیسی رنجش؟... کن دونوں کی رنجش؟"

"رابعہ اور ماہ رخ دونوں ہی نواب بادشاہ بیگم کی کنیزیں تھیں۔ ماہ رخ سے پہلے رابعہ ان کی خادمہ خاص تھی مگر گزشتہ چھ ماہ سے ماہ رخ یہ فرائض ادا کررہی تھی۔ دونوں اسی لئے ایک دوسرے کے سائے تک سے جلتی تھیں اور حضور' یہ کتنی عجیب و پراسرار بات ہے کہ دونوں ایک ہی رات ختم ہوگئیں! ایک نے خودکشی کرلی' دوسری کو قتل کردیا گیا۔" یہ کہتے ہوئے دلاور خاں نے ٹھنڈا سانس لیا۔

دلاور خاں کی بات سن کر عبداللہ خاں کا ذہن چکرا گیا۔ وہ سوچنے لگا' کیا میں نے واقعی نگار کی بجائے رابعہ کو قتل کیا ہے؟ کیا ماہ رخ نے میرے ذریعے رابعہ سے اپنی رنجش کا انتقام لیا ہے؟ کیا ماہ رخ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟ یہ سوچتے ہوئے عبداللہ خاں کے قدم آگے بڑھتے رہے مگر وہ سوالوں کے حصار سے نکل نہیں سکا۔ ماہ رخ نے کہیں میری گفتگو سے یہ اندازہ تو نہیں لگالیا کہ نگار کے بارے میں میرا کیا ارادہ ہے؟ اس سوال کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک اور سوال آیا۔ میرے ذریعے ماہ رخ اپنی رقیب کو ختم کرا کے مجھے کیسے مطمئن کرتی؟ وہ تو اس بات سے قطعی لاعلم تھی کہ اس کی زندگی کا چراغ گل کر

دیا جائے گا!

اس وقت عبداللہ خاں کا ذہن اس آخری سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ ابھی تو اس بات کی بھی تصدیق ہونا باقی تھی کہ اس کے ہاتھوں قتل ہونے والی واقعی رابعہ ہی تھی' نگار نہیں۔

رونے پیٹنے کی آوازیں سن کر عبداللہ خاں کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ دلاور خاں اور عبداللہ خاں اس وقت اس طرف سے گزر رہے تھے جہاں ماہ رخ کی سکونت تھی۔ عبداللہ خاں کی آنکھوں میں ماہ رخ حسین کا چہرہ گھوم گیا جو اب ایک حسین یاد بن کر رہ گیا تھا۔

''یہ رات بڑی عجیب اور ہولناک ہے حضور عالی! ایک رات میں دو موتیں۔ ایسا کوئی واقعہ اس سے پہلے یہاں نہیں ہوا۔'' دلاور خاں کی آواز میں لرزش تھی۔

''تمہارے خیال میں کیا وہ قاتل پکڑا جاسکے گا جس نے رابعہ کو قتل کیا؟'' دلاور خاں کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے عبداللہ خاں نے سوال کیا۔

''جی ہاں حضور! قلعے کے محافظ حرکت میں آچکے ہیں۔ داروغہ دلدار علی نے مجھے رابعہ کے قتل کی اطلاع دی تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ قلعے اور شاہی محلات کا ایک ایک چپہ چھان مارے گا۔ میں نے اسے حکم دیا تھا کہ ہر قیمت پر قاتل کو گرفتار کرلیا جائے قاتل اگر قلعے کے اندر ہی موجود ہوا تو گرفتار ہونے سے نہیں بچ پائے گا۔''

عبداللہ خاں نے اس پر کسی بھی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ کچھ ہی دیر بعد دلاور خاں کے ساتھ نواب بادشاہ بیگم کے حضور میں پہنچ گیا۔ اسے تنہا ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کمرے کے درمیان ایک بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے عبداللہ خاں کو ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اسے مخاطب کیا گیا۔

''عبداللہ خاں! ہم نے تمہیں اس لئے طلب کیا ہے کہ تمہیں ضروری ہدایات دے سکیں! ہم تمہارے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ اس طرح کے ہنگامے ہمیں قطعی ناپسند ہیں۔ ہمارا حکم ہے کہ جلد از جلد ہماری خادمہ خاص کی پراسرار خودکشی سے پردہ اٹھایا جائے! ابھی ابھی ہمارے علم میں یہ بھی لایا گیا ہے کہ ایک اور کنیز قتل کر دی گئی ہے اور قاتل فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ محلات اور قلعے میں امن وامان کی بحالی کے ذمے دار تم ہو! اس طرح کی لاقانونیت برداشت نہیں کی جائے گی! اب تم جاسکتے ہو!''

اس آواز میں ایسا رعب' ایسا جلال تھا کہ کوشش کے باوجود عبداللہ خاں کچھ نہ کہہ سکا۔ وہاں سے نکل کر دلاور خاں کے ساتھ داروغہ دلدار علی کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ آخر اسے بھی تو کسی پر اپنا غصہ اتارنا ہی تھا!

داروغہ دلدار علی اسے قلعے کے دروازے پر مل گیا۔ اس نے راستے میں سپاہیوں کو ہر طرف ''قاتل'' کی تلاش میں مصروف دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی داروغہ دلدار علی نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔

''قاتل کا پتا چلا؟'' عبداللہ خاں نے اس کے سلام کا جواب دیئے بغیر سوال کیا۔

''جی ... وہ ... سپاہی... ابھی تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ... بچ کر نہیں جاسکتا! حضور... میں...''

عبداللہ خاں نے میں درمیان میں ہی داروغہ کی بات کاٹ دی اور سخت لہجے میں بولا۔ ''قتل ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا ہے اور تم اب تک قاتل کو گرفتار نہیں کر سکے۔''

''رابعہ کے والد کا بیان ہے کہ قاتل فرار ہوتے وقت اس سے ٹکرایا تھا اور پھر چھت پر چڑھ گیا تھا۔ ایک خفیف سا امکان یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ... قلعے کی دیوار پر چڑھ کر قلعے سے باہر کود گیا ہو۔'' داروغہ دلدار علی نے ڈرتے ہوئے اپنا خیال کا اظہار کیا۔

''تمہاری عقل یقیناً گھاس چرنے گئی ہے!...'' ''قلعے کی دیوار'' تدری کی چھت سے بہت بلند ہے۔ قاتل کس طرح قلعے کی دیوار پر چڑھ کر باہر کود سکتا ہے؟ عبداللہ درشت لہجے میں بولا۔

''بجا فرمایا حضور!... بجا فرمایا'' کچھ دیر کو داروغہ دلدار علی گھبرا گیا پھر ہمت کر کے بولا۔ ''قاتل کے پاس رسی بھی تو ہوسکتی ہے جس کے ذریعے کمند ڈال کر۔''

''بس بس زیادہ تکے نہ مارو!'' عبداللہ خاں نے اس کی بات پھر کاٹ دی۔ ''صبح ہونے سے پہلے پہلے میں قاتل کو گرفتار دیکھنا چاہتا ہوں!'' اس نے فیصلہ کن آواز میں کہا اور دلاور خاں کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا' پھر وہ کچھ سوچ کر پلٹا اور داروغہ دلدار علی کو مخاطب کیا۔

''مجھے واقعے کی پوری تفصیل سے آگاہ کرو۔ داروغہ دلدار علی اسے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ اس سے اسے ایک اور بات معلوم ہوئی کہ جب وہ رابعہ کے سینے میں خنجر پیوست کر چکا تھا تو دروازے پر دستک کس نے دی تھی؟ اسی دستک سے رابعہ کی ماں بیدار ہوئی تھی۔'' دستک دینے والا ماہ رخ کا بھائی التمش تھا۔ وہ اپنی بہن کے انتقال کی اطلاع دینے آیا تھا۔

یہ تمام واقعہ تفصیل کے ساتھ عبداللہ خاں نے اس لئے سنا کہ اسے یقین ہو جائے کہ مقتولہ رابعہ ہی تھی۔ اب اسے یہ بھی یقین ہو چکا تھا کہ ماہ رخ نے رابعہ سے اپنی دیرینہ رقابت و دشمنی کا انتقام لینے کیلئے اس کو استعمال کیا تھا۔

عبداللہ خاں قلعے کے پھاٹک ہی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ وہاں سے رابعہ کا گھر زیادہ دور نہیں تھا' جہاں سے رونے دھونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آس پاس کے رہنے والے بھی وہاں جمع ہو رہے تھے۔ ماہ رخ نے اسے پھاٹک کے پاس سے تیسری تدری بتائی تھی۔ اس نے ایک بار پھر تدریوں کو گنا کہ گنتی میں غلطی تو نہیں ہوگئی' مگر گنتی صحیح تھی۔ اس تدری کے صدر دروازے پر گلاب کے گملے بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ماہ رخ نے جان بوجھ کر اس کے ہاتھوں رابعہ کو قتل کرایا تھا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ماہ رخ نے نگار کے بارے میں بھی جھوٹ بولا ہو؟ عبداللہ خاں سوچنے لگا مگر اسے کم ازکم یہ بات جھوٹ نہ لگی۔ اس بات کے سچ ہونے کا ثبوت یہ تھا کہ عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی ماہ رخ نے نگار کے حوالے سے وہ گفتگو بھی عبداللہ خاں کو بتائی تھی۔

''کہیں یہ قتل کسی ذاتی رنجش کا نتیجہ تو نہیں؟ رابعہ کے برابر والی تدری میں کون رہتا ہے؟'' عبداللہ خاں نے کچھ سوچ کر دلدار علی کو اچانک مخاطب کیا۔

''ایک شخص محمد نواز جو شاہی مطبخ میں ملازم ہے برابر رہتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی بہن نگار بھی رہتی ہے۔ نگار محل میں کنیز ہے۔ دوسری طرف... دلدار علی بتاتا رہا مگر عبداللہ کو جو معلوم کرنا تھا' وہ معلوم ہو چکا تھا۔ دلدار علی کا جواب سن کر عبداللہ خاں اچھل پڑا تھا' پھر وہ سوچنے لگا کہ ماہ رخ نے تیسری تدری بتائی تھی یا چوتھی؟ کہیں مجھ سے سننے میں سہو تو نہیں ہو گیا۔

''محمد نواز نے اور اس کنیز نگار کے بارے میں تم نے معلومات حاصل کیں؟'' عبداللہ خاں نے دلدار علی سے سوال کیا۔

''جی ہاں حضور!'' دلدار علی فوراً بولا اور پھر مزید سوال کئے بغیر بتانے لگا کہ نگار اپنے بھائی کے ساتھ تنہا رہتی ہے۔

داروغہ دلدار علی ہی سے عبداللہ خاں کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نگار کی کوئی ضعیف ماں نہیں۔ نواز اور نگار کے والدین کافی عرصہ قبل انتقال کر چکے تھے۔ عبداللہ خاں رابعہ کے گھر میں جس شخص سے ٹکرایا تھا' وہ نگار کا بھائی یا باپ نہیں بلکہ رابعہ کا بوڑھا باپ تھا۔

ان حقائق کی روشنی میں عبداللہ خاں کو اب یقین ہو چکا تھا کہ ماہ رخ نے دانستہ ہی اس کے ہاتھوں رابعہ کو قتل کرایا تھا۔ اس سلسلے میں اگر عبداللہ خاں اس سے جواب دہی کرتا تو وہ کہہ سکتی تھی کہ میں نے تیسری تدری نہیں چوتھی بتائی تھی۔

اگر ماہ رخ زندہ ہوتی تو اپنے اس جھوٹ کا کیا جواز پیش کرتی کہ نگار کی ایک ضعیف ماں بھی ہے؟ عبداللہ خاں کے ذہن میں سوال ابھرا۔ پھر اس نے خود اس سوال کا جواب تلاش کر لیا کہ ماہ رخ کی منصوبہ بندی میں یہی ایک خامی تھی جس سے اس کا جھوٹ پکڑا جاتا۔ شاید وہ جلدی میں رابعہ کو ٹھکانے لگوانے کی جستجو میں اس نکتے کو فراموش کر بیٹھی تھی۔

جو کچھ گزر چکا تھا' سو گزر چکا تھا۔ گردش وقت اب پیچھے کی طرف نہیں لوٹ سکتی' مگر عبداللہ خاں کے لئے لمحہ فکریہ یہ تھا کہ نگار اب تک زندہ تھی! وہ نگار جس کے سینے میں ایک ایسا راز چھپا ہوا تھا جس کے ظاہر ہونے کا مطلب صرف اور صرف موت تھا' عبداللہ خاں اور اس کے چھوٹے بھائی حسین علی خاں کی موت! اس راز کے افشا ہونے کی صورت میں عبداللہ خاں کے سارے سنہرے خواب بکھر سکتے تھے اور عبداللہ خاں کو اس کا پورا احساس تھا۔ اسی راز کو راز رکھنے کی خاطر تو اس کے ہاتھوں ایک ہی رات میں دو قتل ہو چکے تھے۔ وہ جان پر کھیل گیا تھا مگر سب کچھ بے سود رہا تھا۔

موجودہ حالات میں اور نواب بادشاہ بیگم کی تنبیہ کے بعد کیا محتاط قدم اٹھایا جائے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے؟ یہی سوچتا ہوا عبداللہ خاں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ پھر آرام دہ بستر پر دراز ہونے کے باوجود بہت دیر تک اس کا ذہن اسی سوال میں الجھا رہا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو پتا چلا کہ اسے بیگم ارجمند بانو اور تینوں شہزادوں محمد کریم' فرخ سیر اور ہمایوں بخت کی روانگی کے انتظامات کرنا ہیں۔ ان سب کو ایک طویل سفر پر یعنی بنگال روانہ ہونا تھا۔ بنگال میں شہزادہ عظیم الشان ان کا منتظر تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ بادشاہ اورنگزیب عالمگیر' بنگال کے صوبیدار رحمت خاں کی طرف سے نا مطمئن تھا

اورنگ زیب عالمگیر نے بنگال کے نظم وضبط اور امن وامان کی بحالی کیلئے تین چار ماہ قبل شہزادہ عظیم الشان کو وہاں بھیجا تھا۔ شہزادے کو یہ احکام دیئے گئے تھے کہ اگر وہ بنگال کے صوبیدار کی طرف سے مطمئن نہ ہو تو فوراً بادشاہ کو اس کی اطلاع دے۔ شہزادے کو مستقلاً بنگال میں قیام نہیں کرنا تھا اس لئے وہ اپنی بیگم ارجمند بانو اور تینوں بیٹوں کو دارالخلافہ ہی میں چھوڑ گیا تھا۔ شہزادہ محمد کریم اور فرخ سیر جوان تھے مگر شہزادہ ہمایوں بخت کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ شہزادہ عظیم الشان نے بنگال پہنچ کر وہاں کی صورتحال بادشاہ وقت کو تفصیل کے ساتھ تحریر کر دی تھی۔ بادشاہ نے فوری طور پر صوبیدار رحمت خاں کو معطل کر کے اس کی جگہ شہزادہ عظیم الشان کو بنگال کا صوبیدار مقرر کر دیا تھا۔ یہ احکام بادشاہ نے دکن روانگی سے قبل ہی دے دیئے تھے۔ اب شہزادہ عظیم الشان کو مستقل طور پر بنگال ہی میں رہنا تھا۔ اس صورتحال میں شہزادے نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اپنے بیوی بچوں کو بھی بنگال ہی بلا لے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے تین فرزند تھے' شاہ عالم' اعظم شاہ اور کام بخش! شہزادہ عظیم الشان شاہ عالم کا بیٹا اور اورنگزیب کا پوتا تھا۔ اورنگزیب کو شاہ عالم کے فرزندوں میں سب سے زیادہ محبت عظیم الشان ہی سے تھی۔ اسی سبب عظیم الشان پر بادشاہ وقت کا خصوصی التفات رہتا تھا اور شہزادہ عظیم الشان تھا بھی ذہین اور بہادر!

بیگم ارجمند بانو کو تینوں شہزادوں کے ساتھ جلد سے جلد بنگال روانہ ہونا تھا اور ان کے تمام انتظامات عبداللہ خاں کو کرنا تھے۔ عبداللہ خاں اسی لئے بہ ذات خود محل کے اس حصے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں بیگم کا قیام تھا۔

عبداللہ خاں جب وہاں پہنچا تو اس کے عملے کے دوسرے افراد پہلے سے موجود تھے۔ انہی میں اس کا نائب دلاور خاں بھی تھا۔ کنیزیں ادھر سے ادھر آ جا رہی تھیں۔ اپنے نائب سے عبداللہ خان انتظامات کی تفصیلات دریافت کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک جانے پہچانے سے چہرے پر پڑی۔ وہ کنیز بھی اسے دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔

زرینہ! عبداللہ خاں کے ذہن میں ایک نام گونجا۔ ہاں وہ زرینہ ہی تھی۔ آج اسکے چہرے پر بلا کی اداسی تھی اور یہ عجیب بات تھی کہ اس اداسی میں زرینہ کا حسن کچھ اور نکھر آیا تھا۔ عبداللہ خاں اس کی اداسی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ وہ شاید اپنی سہیلی ماہ رخ کی اچانک موت پر غمزدہ تھی۔ ایک تپائی پر رکھا ہوا گلدان زرینہ ریشمی کپڑے سے صاف کر رہی تھی۔ دلاور کو وہیں چھوڑ کر عبداللہ خاں زرینہ کی طرف بڑھ گیا۔

''تم آج بہت اداس نظر آ رہی ہو! عبداللہ خاں نے اس کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔''

''آداب!'' زرینہ نے سوال کا جواب دینے سے پہلے کہا' پھر بولی' ملول تو شاید آپ بھی ہوں گے حضور!'' زرینہ کی آواز سرگوشی کی حد سے آگے نہیں بڑھی تھی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو زرینہ!'' عبداللہ خاں آہستہ سے بولا۔ ''لیکن تم چاہو تو میرے دامن سے گرد ملال جھاڑ سکتی ہو۔'' عبداللہ کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''کیا حضور ایک جان لے کر خوش نہ ہوئے جو اس کنیز کی جستجو ہے!'' زرینہ کی آواز میں بہ

یک وقت شوخی اور اداسی شامل تھی۔

"زرینہ!" عبداللہ خاں نے چونک کر کہا۔ چونک اٹھنے کا سبب خود اس کے دل کا چور تھا۔ اس نے لمحہ بھر توقف کے بعد زرینہ کو مخاطب کیا۔" میں اس بات سے آگاہ ہوں کہ تم مجھے اور ماہ رخ کو خلوت میں دیکھ چکی ہو لیکن یقین کرو کہ ماہ رخ کی بے وقت جدائی نے مجھے تنہا کر دیا ہے۔ میری روح کی تشنگی کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ باغ کی اس سرسری سی ملاقات نے میرے وجود میں نہ جانے کتنے سوئے جذبوں کو بیدار کر دیا ہے! نہ جانے میری پیاس کتنی بڑھا دی ہے! میں تم سے اپنا دکھ بیان کر کے اپنی روح کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں' میں تم سے کچھ دیر ماہ رخ کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا ہوں' ماہ رخ جواب کبھی نہیں لوٹے گی' کبھی نہیں! کیا تم آج اسی جگہ اور اسی وقت مجھے مل سکتی ہو جہاں کل تم نے مجھے اور ماہ رخ کو دیکھا تھا؟"

عبداللہ خاں کی بات سن کر ماہ رخ کی سہیلی رزینہ کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ وہ عبداللہ خاں کی بات سے متاثر معلوم ہو رہی تھی۔ پھر بھی اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ جیسے کسی سوچ میں کھو گئی تھی۔

اسے خاموش دیکھ کر عبداللہ خان پھر بول اٹھا۔" زرینہ! بولو کیا تم میرے زخمی دل پر مرہم رکھنے نہیں آؤ گی"

"میں کوشش کروں گی کہ حضور کا حکم پورا کر سکوں۔" زرینہ کے ہونٹوں کو بالآخر حرکت ہوئی۔

"یہ حکم نہیں زرینہ' درخواست ہے" عبداللہ خان نے اسے رضامند کرنے کیلئے ایک اور حربہ آزمایا۔ وہ بہرحال شاہی محلات کا نگران اعلیٰ تھا۔ اس حیثیت کے باوجود کوئی ایسی بات ایک کنیز سے کہہ دینا متاثر کن ہی ہو سکتا تھا' سو ہوا۔

زرینہ نے اسے اپنے آنے کا یقین دلایا تو جیسے اس کی تشنہ آرزوؤں کو ساحل مل گیا۔ وہ گزشتہ دن کی محرومی کو زرینہ کا قرب پا کر بھلا دینا چاہتا تھا۔

بیگم ارجمند بانو کے محل سے نکل کر عبداللہ خاں داروغہ دلدار علی کی تلاش میں قلعے کے پھاٹک کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسے دلدار علی نظر آ گیا۔ داروغہ اسے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا قلعے کے پھاٹک کی طرف جاتا دکھائی دیا۔

"دلدار علی!" اس نے آواز دی۔

داروغہ اس کی آواز سن کر چونکا اور رک گیا۔ عبداللہ خاں اس کے قریب پہنچا تو داروغہ نے جھک کر آداب کیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" عبداللہ خاں نے پوچھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اسے دیکھتے ہی داروغہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"حضور! میرے ذہن میں ابھی ابھی ایک خیال آیا ہے کہ رابعہ کے پڑوسیوں کا بیان لینا ضروری ہے ممکن ہے ان کے بیان سے کوئی نئی بات معلوم ہو جائے۔ اس وقت میں ادھر ہی جا رہا تھا۔" داروغہ دلدار علی نے عبداللہ خان کے سوال کا جواب دیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل قلعے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور تم اب تک اس کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے ہو! کیوں' ٹھیک ہے نا؟ عبداللہ خاں نے اسے گھورا۔ اسی لمحے عبداللہ خاں کے ذہن میں آیا کہ یہ موقع بہت اچھا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ نگار کو دیکھ سکتا تھا جس کی صورت بھی اب تک اس نے نہیں دیکھی تھی۔ داروغہ نے تو اس کی بات سن کر گردن جھکا لی تھی۔ عبداللہ خاں نے اسے پھر مخاطب کیا۔" لگتا ہے کہ اس سلسلے میں مجھے خود دلچسپی لینا پڑے گی۔ چلو' میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ دیکھوں تو سہی کہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو!" یہ کہتا ہوا عبداللہ خاں آگے بڑھا۔

"حضور!... حضور آپ ... آپ وہاں چلیں گے؟" دلدار علی کے لہجے میں حیرت تھی۔" میں خود ..."

"ہاں تم خود اب تک بہت تیر مار چکے ہو!" عبداللہ خاں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"داروغہ دلدار علی کے ساتھ عبداللہ خاں وہاں پہنچا تو رابعہ کا جنازہ قبرستان روانہ ہو چکا تھا۔"

"ارے میں تو یہ بھول ہی گیا کہ لوگ جنازے کے ساتھ قبرستان گئے ہوں گے! داروغہ نے ندامت آمیز انداز میں عبداللہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ میں پھر آ کر..."

"دلدار علی!" عبداللہ خاں کی آواز تیز ہو گئی۔" کیا رابعہ کے پڑوس میں مرد ہی مرد رہتے ہیں؟"

"جی ... جی!... جی ہاں حضور! دلدار علی ہکلایا۔

"کیا جی ہاں؟" عبداللہ خاں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"جی ہاں حضور' عورتیں قبرستان نہیں گئی ہوں گی۔"

دلدار علی بھولپن سے بولا۔ عبداللہ خاں کو اس کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آتے آتے رہ گئی۔

"تو پھر کیا ارادے ہیں؟" عبداللہ خاں اس سے لطف لینے لگا۔

"حضور کا جو حکم ہو! میں ابھی عورتوں کو بلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر دلدار علی آگے بڑھنے لگا۔

"ٹھہرو دلدار علی!" عبداللہ خان نے اسے روکا۔" کیا تمہارا اوپر کا خانہ بالکل خالی ہے؟" یہ سن کر دلدار علی اسے ہونقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ عبداللہ خاں پھر بولا۔" یہاں سے ابھی ابھی ایک جنازہ اٹھا ہے۔ ذرا سوچو کہ تم اس وقت اپنی تفتیش کا پٹارا کھول کر بیٹھ جاؤ گے تو لوگ کیا کہیں گے؟ میں چوکی کی طرف چلتا ہوں۔ تم رابعہ کے پڑوسیوں کو لے کر وہاں آ جاؤ! سمجھے؟"

داروغہ دلدار علی نے اس طرح تیزی کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا کہ اسے سر ہلانے میں ذرا بھی دیر ہو گئی تو اس کے سر پر آفت ٹوٹ پڑے گی۔ عبداللہ خاں داروغہ کو وہیں چھوڑ کر پولیس چوکی کی طرف بڑھ گیا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔

عبداللہ خاں کو پولیس چوکی میں داخل ہوتے دیکھ کر وہاں موجود سپاہی اس طرح چونک اٹھے جیسے انہوں نے عبداللہ خاں کی بجائے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ ان سب کے ہاتھ مشینی انداز میں سلام کرنے کیلئے اٹھنے لگے۔ عبداللہ خاں برآمدے میں پڑے ہوئے ایک دیوان پر بیٹھ گیا۔ شاہی محلات کے نگران اعلیٰ کا اس طرح پولیس چوکی میں آ کر بیٹھ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی مگر عبداللہ خاں اس وقت

سپاہیوں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کا ذہن نگار میں کھویا ہوا تھا وہ نگار جو اس بات سے بے خبر تھی کہ اسے قتل کر دیا جائے گا' وہ جس کا قتل ہونا عبداللہ خاں کے تحفظ کی ضمانت تھا' وہ جس کے دھوکے میں رابعہ قتل کی جا چکی تھی۔

کچھ ہی دیر کے بعد داروغہ دلدار علی اپنے ساتھ تین لڑکیوں اور متوسط عمر کی دو عورتوں کو لے کر چوکی میں داخل ہوا۔ عبداللہ خاں کی نظر انہی لڑکیوں پر تھی۔ وہ ان لڑکیوں کے چہروں کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ دو لڑکیاں کم عمر تھیں اور تیسری جوان تھی۔ تیسری کی عمر سترہ اٹھارہ سال کے درمیان رہی ہوگی۔

دلدار علی نے ان پانچوں کو کچھ دور ایک بنچ پر بٹھا دیا۔ ان سب کے چہروں پر خوف اور سراسیمگی کے آثار تھے۔ وہ اس طرح پولیس چوکی میں بلائے جانے پر خوف زدہ تھیں۔ بڑی لڑکی جسے عبداللہ خاں' نگار سمجھ رہا تھا' سانولی تھی لیکن اس کے خدوخال تیکھے اور متاثر کن تھے۔ اس کے چہرے میں کشش اور حسن تھا۔

''تمہارا نام؟'' عبداللہ خان نے سب سے پہلے اسی سانولی کو مخاطب کیا۔

''نسرین۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

اس جواب کے ساتھ ہی عبداللہ خان کے ذہن میں زور کا چھناکا ہوا۔ پھر اس نے جلدی جلدی بقیہ عورتوں اور لڑکیوں کے نام پوچھے۔ ان میں نگار کوئی بھی نہیں تھی۔

''کیا تم سب کو لے آئے ہو؟'' اس نے داروغہ دلدار علی کو قہرناک نظروں سے دیکھا۔

''ان میں صرف نگار نہیں ہے حضور! کیوں کہ وہ رابعہ کا جنازہ اٹھائے جانے سے کچھ دیر قبل اپنے بھائی نواز کے ساتھ شہر چلی گئی تھی۔ اس سے بعد میں پوچھ کچھ کر لی جائے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ نگار اپنی علیل خالہ کو دیکھنے شہر گئی ہے۔'' دلدار نے بتایا۔ وہ کچھ سراسیمہ سا لگ رہا تھا۔

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ دلدار علی کا جواب سن کر عبداللہ خاں کا ماتھا ٹھنکا''

''نگار نے شہر جانے سے پہلے رابعہ کی والدہ سے معذرت کی تھی کہ وہ زیادہ دیر نہیں رک سکے گی وجہ اس نے وہی بتائی تھی جو میں عرض کر چکا ہوں حضور!''

عین وقت پر نگار کے غائب ہو جانے سے عبداللہ خاں کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ اب اس کا وہاں مزید ٹھہرنا بے سود تھا۔

''ان سب کے بیانات لے کر انہیں رخصت کر دو! ان سے اگر کوئی اہم بات معلوم ہو تو مجھے فوراً مطلع کرنا۔ نگار جب شہر سے واپس آ جائے تو بلاتاخیر مجھے اس کی آمد کے بارے میں آگاہ کیا جائے!'' یہ کہہ کر عبداللہ اٹھ کھڑا ہوا۔

داروغہ دلدار علی کے چہرے پر شدید حیرت تھی۔ وہ یہ سمجھا تھا کہ عبداللہ خاں خود ہی تمام پڑوسیوں کے بیانات سنے گا' مگر وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

دوپہر تک دلدار علی نے نگار کے بارے میں کوئی اطلاع نہ دی تو عبداللہ فکر مند ہو گیا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خدشات جنم لینے لگے کہ کہیں نگار اس کی طرف سے چوکنا تو نہیں ہو گئی؟ کہیں وہ خوف کے سبب روپوش تو نہیں ہو گئی؟

نگار کا روپوش ہو جانا بعید از قیاس نہیں تھا۔ اس نے عبداللہ خاں کے بارے میں ماہ رخ کو بتایا تھا اور ماہ رخ اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اس کی پراسرار خودکشی نگار کیلئے خطرے کا اشارہ بن سکتی تھی۔ پھر اسی کے برابر والی تدری میں رابعہ کا قتل ہو چکا تھا۔ یہ حالات اسے چوکنا کر سکتے تھے۔ نگار کا عبداللہ خاں کی طرف سے چوکنا ہو جانا' عبداللہ خاں کو کسی خطرے میں بھی ڈال سکتا تھا۔ عبداللہ خاں اس وقت یہی سوچ رہا تھا کہ نگار کا کسی نہ کسی طرح پتا لگنا چاہئے کہ وہ کہاں ہے؟ یہی سوچ کر اس نے داروغہ دلدار علی کو طلب کر لیا اور حکم دیا۔ ''فوری طور پر نگار کی خالہ کا گھر معلوم کرو کہ وہ شہر میں کہاں رہتی ہے؟ یہ تصدیق ضروری ہے کہ نگار وہیں گئی ہے۔ اگر نگار وہاں مل جائے تو اسے فوراً میرے سامنے پیش کرو!''

دلدار علی حکم سن کر چلا گیا۔ عبداللہ خاں اس سلسلے میں کوئی بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

وقت بہت آہستہ روی سے گزر رہا تھا اور عبداللہ خاں اپنے کمرے میں داروغہ دلدار علی کا منتظر تھا۔ وہ اب نگار کو مہلت دینا نہیں چاہتا تھا۔ عبداللہ خاں کیلئے مشکل یہ تھی کہ با اختیار ہونے کے باوجود ابھی وہ اس حیثیت میں نہیں تھا کہ نگار کو قتل کرانے کیلئے کسی دوسرے شخص کو آلہ کار بنا سکتا۔ اول تو اسے شاہجہاں آباد (دہلی) آئے ہوئے بہت کم عرصہ گزرا تھا۔ دوم یہ کہ جو معاملہ درپیش تھا اس میں کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ شہر' یہ ماحول عبداللہ خاں کیلئے ابھی اجنبی تھا۔ ابھی وہ اپنے اردگرد وفادار و با اعتماد لوگوں کو جمع نہیں کر پایا تھا جن پر بھروسہ کیا جا سکے۔ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ خود ہی کچھ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ عبداللہ خاں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ داروغہ دلدار علی کے آنے کی اطلاع ملی۔ عبداللہ خاں نے اسے فوراً اندر بلا لیا۔

''میرے وہاں پہنچنے سے کچھ دیر قبل نگار اپنے بھائی کے ساتھ نکل چکی تھی۔ انہوں نے اپنی خالہ کو بھی بتایا کہ ہم واپس قلعے جا رہے ہیں۔ مگر...'' داروغہ دلدار علی کچھ کہتے کہتے رک گیا؟''

عبداللہ کے چہرے پر ناگواری نظر آئی اور پھر وہ چیخ اٹھا۔ ''مگر کیا؟''

''وہ دونوں قلعے نہیں پہنچے۔'' دلدار علی نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

''رابعہ کے قتل میں یقیناً انہی دونوں بھائی بہن کا ہاتھ ہے ورنہ روپوش نہ ہوتے۔ فوری طور پر شاہجہاں آباد سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی جائے۔ اسی کے ساتھ شہر سے باہر جانیوالے راستوں پر ایسے افراد متعین کئے جائیں جو ان دونوں کو پہچان سکیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ ان دونوں کو شہر میں تلاش کر کے جلد از جلد گرفتار کر لیا جائے!' عبداللہ خاں نے احکام جاری کئے۔''

پھر عبداللہ خاں نے اپنے نائب دلاور خاں کو بھی وہیں طلب کر لیا تاکہ وہ بلاتاخیر احکام پر عملدرآمد کرائے۔

دلاور خاں اور دلدار علی اس کے احکام سننے کے بعد کمرے سے نکل رہے تھے کہ اس نے دلدار علی کو آواز دے کر روک لیا اور دلدار علی کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی کی۔ ''سنو دلدار علی! تمہیں سائے کی طرح دلاور خاں کے ساتھ لگا رہنا ہے اگر تمہیں دلاور خاں کی طرف سے یہ شبہ گزرے کہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کر رہا ہے تو فوراً مجھے مطلع کرنا!''

''بہتر ہے حضور! ایسا ہی ہوگا'' دلدار علی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی آہستہ سے جھک کر بولا۔ وہ

شاید اس باپ پر خوش ہوا تھا کہ عبداللہ خاں نے دلاور خاں بہ نسبت اس پر زیادہ اعتماد کا اظہار کیا تھا حالانکہ دلاور خاں کا عہدہ اس سے بہت بلند تھا۔ اس سے دلدار علی کی کمتری کو بھی قدرے تقویت پہنچی تھی۔

دلدار علی چلا گیا اور عبداللہ خاں ایک بار پھر سوچوں میں ڈوب گیا۔ ہر چند کہ اس نے فوری طور جو اقدامات کئے تھے تسلی بخش تھے لیکن جب تک نگار ہتھے نہ چڑھ جاتی وہ بہرحال خطرے میں تھا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ نگار اس کی طرف سے کھٹک چکی تھی ورنہ روپوش نہ ہو جاتی۔

شام تک عبداللہ خاں اضطراب اور بے چینی کے عالم میں رہا۔ دلدار علی کو دلاور خاں کے پیچھے لگانا بے سبب نہیں تھا۔ عبداللہ خاں کو معلوم تھا کہ نگار' دلاور خاں کی داشتہ ہے۔ نگار کو بچانے کیلئے دلاور خاں فرار کا موقع بھی فراہم کر سکتا تھا۔

نگار کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے جاتے رہے اور یہ اطلاعات عبداللہ خاں کو ملتی رہیں۔ وہ مایوس ہوتا رہا کیوں کہ اب تک نگار یا اس کے بھائی محمد نواز کا کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔

ایک ملازم کمرے میں فانوس روشن کرنے داخل ہوا تو عبداللہ خاں چونک اٹھا۔ فانوس روشن ہوتے ہی اس کے ذہن میں زرینہ کا نام گونجا۔

''ہم تخلیہ چاہتے ہیں اور محل کے اس حصے میں کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتے!'' عبداللہ خاں نے ملازم کو حکم دیا تو وہ خاموشی سے حکم سن کر باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد عبداللہ خاں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باغ کے مشرقی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کو ماہ رخ کی طرح اسے زرینہ اپنی منتظر نہیں ملی۔ فوارے کے اردگرد ٹہلتے ہوئے وہ زرینہ کا انتظار کرنے لگا۔ زرینہ کا حسین سراپا اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ کچھ دیر قبل وہ جن الجھنوں میں گرفتار تھا۔ وہ ذہن کے کسی تاریک گوشے میں جا سوئی تھیں۔ اب اس کے ذہن پر صرف اور صرف زرینہ کا گداز حسین جسم مسلط تھا۔ اس انتظار کی لذت کو کچھ وہی لوگ زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں جنہیں زندگی میں پہلی بار کسی ماہ رو کے انتظار کی سعادت نصیب ہوئی ہو۔ اس انتظار میں لطف بھی تھا اور اضطراب بھی!

درختوں کی سمت آہٹ ہوئی تو وہ چونک اٹھا۔ آنے والی زرینہ ہی تھی۔

''میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوں۔'' اس کے قریب آ کر زرینہ جیسے گنگنائی۔

''یہ جگہ ہماری ملاقات کیلئے موزوں نہیں۔ آؤ' میرے ساتھ آؤ!'' عبداللہ خان نے زرینہ کا ہاتھ تھام لیا۔

''تو پھر؟'' زرینہ بولی۔ اس نے عبداللہ خاں سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''اندر محل میں چلو!'' یہ کہہ کر عبداللہ خاں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے آگے بڑھا۔

''وہاں ہمیں کوئی دیکھ بھی سکتا ہے۔'' زرینہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگی۔ اس نے یہ جملہ کہہ کو عبداللہ خاں کو مزید بے تکلف ہونے پر اکسایا۔ وہ غالباً اپنی آمد کے مقصد سے واقف تھی۔

''ہم دونوں کو وہاں دیکھنے والی کوئی آنکھ موجود نہیں ہماری خلوت میں کوئی خلل انداز نہیں ہوگا۔'' عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ وہ زرینہ کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر عبداللہ خاں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اس پر زرینہ چونکی مگر

عبداللہ خاں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ چونک اٹھنا مصنوعی تھا۔ وہ زرینہ کے ساتھ مسہری پر بیٹھ گیا۔

''زرینہ! اگر میں تم سے کہوں کہ اب تک میری تنہائیاں کسی بھی لڑکی کے قرب سے نا آشنا ہیں تو کیا تم میری بات کا یقین کر لو گی؟ یہ کہتے ہوئے عبداللہ خاں نے مسہری کے سرہانے رکھے تکیے سے ٹیک لگا کر زرینہ کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا تھا۔

''شاید یقین کر لوں۔'' زرینہ بولی۔ ''سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں حضور! وہ کسی بھی لڑکی سے پہلی بار اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں' چاہے ان کی خلوتیں کتنی ہی لڑکیوں سے اپنی تشنہ آرزوئیں سیراب کر چکی ہوں۔ یہ گستاخی ضرور ہے حضور' مگر ایک تلخ حقیقت بھی ہے۔'' زرینہ کی نظریں جھک گئیں۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم کافی تجربہ کار ہو؟'' عبداللہ خاں نے اس پر چوٹ کی۔

''میں ایک کنیز ہوں حضو' اور کنیزیں اپنے آقاؤں کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی کوئی مرضی' کوئی خواہش' کوئی پسند نہیں ہوتی۔ وہ کٹھ پتلی ہوتی ہیں جب تک ان سے کھیلنے والے ہاتھ تھک نہیں جاتے ان سے کھیلا جاتا ہے اور پھر انہیں دھتکار دیا جاتا ہے۔ میں حضور کو اپنی پاک دامنی کا یقین دلانے کی کوشش نہیں کروں گی۔'' زرینہ نے کہا۔ اس کے لہجے میں ایک عجیب سادگی اور ایک انوکھی سی چبھن تھی۔

عبداللہ خاں اس کی صاف گوئی سے متاثر ہوا اور بولا۔ ''زرینہ! میں نے جو کچھ کہا تھا' وہ حقیقت تھی اور تم نے جو کچھ کہا ہے' وہ بھی حقیقت ہے۔'' یہ کہتے ہوئے عبداللہ خاں اس کی ریشمیں زلفوں سے کھیلنے لگا۔ '' مگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں تو اس دل کی دھڑکنیں سنو! کیا ان لوگوں کے دل بھی اس طرح دھڑکتے ہیں جن کیلئے کسی لڑکی کا قرب کوئی نئی بات نہیں ہوتی؟'' عبداللہ خاں کی انگلیاں اس کے پھول ایسے رخساروں سے پھسلتی ہوئی نرم و نازک ہونٹوں کی شادابی تک جا پہنچیں۔ رخساروں کی چکنی جلد کے بعد ہونٹوں کے گداز ابھار کی حرارت عبداللہ خاں نے اپنے وجود میں منتقل ہوتے محسوس کیں۔ ''زرینہ!'' اس کے ہونٹ کانپے۔

''حضور!'' زرینہ کی آواز جیسے کہیں دور سے سنائی دی۔

''میرے قریب آ جاؤ زرینہ!...'' عبداللہ خاں خواب کے عالم میں بڑبڑایا۔

''میں آپ کے قریب ہی ہوں حضور!''

''نہیں!... اور قریب... اتنے قریب کہ ہمارے درمیان جسموں کا فاصلہ بھی نہ رہے۔'' عبداللہ خاں کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

''زرینہ کی آنکھیں بند تھیں اور ان بند آنکھوں میں بڑی وسعت تھی۔ اتنی وسعت اور گہرائی کہ وہ عبداللہ خاں کی روح تک میں جھانک سکتی تھی' پھر اس نے آنکھیں کھول دیں جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔''

''حضور اجازت دیں تو میں فانوس کی لو مدھم کر دوں؟'' زرینہ آہستہ سے بولی۔

آتش شوق اور بھڑک اٹھی عبداللہ خاں اور زرینہ کے دل کی دھڑکیں ہم کلام ہو گئیں' مگر ابھی دست ہوس بند قبا تک نہیں پہنچا تھا۔ ہاں وہ خود فراموشی کی حدود میں ضرور داخل ہو گئے تھے۔ خود

فراموشی!... اور ایسی خود فراموشی جس میں آدمی کو خود اپنے جسم کی بامعنی او بے معنی حرکتوں اور جنبشوں پر کوئی اختیار نہیں رہ جاتا' جب وہ ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتا ہے جس کے بعد کوئی عالم نہیں ہوتا۔ وہ کیفیت جہاں جنون وہوشیاری میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ جہاں زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں اور صرف احساس کی دھیمی دھیمی آنچ گفتگو کرتی ہے۔ وہ ایسے ہی لمحے تھے۔ رفعتوں اور پستیوں کے درمیان عبداللہ خاں کا وجود' عدم وجود کے اسرار حل کر رہا تھا۔

وہ بھٹکتا ہوا اور شہد لب ورخسار کی حلاوتوں نے اسے فرصت نہ دی۔ دام زلف نے اسے آگے نہ بڑھنے دیا۔ نا آشنائے جادہ منزل کے ساتھ یہی تو ہوتا ہے اور وہ جو آشنا تھا اسے بھی نا آشنائی میں ایک انوکھا حسن محسوس ہو رہا تھا۔ تو پھر رہبری کیسی؟... تشنہ آرزوؤں کا سیل بیکراں کب تک شرمندہ لباس رہتا کہ بے لباسی ہی تو اس کا لباس تھی۔ کیف ونشاط نے اجنبیت کے پردے اٹھا دیئے اور دیار رنگ ونکہت کے در وا ہو گئے۔

عبداللہ خاں ایک حسین خواب سے بیدار ہوا تو اس نے زرینہ کی بکھری ہوئی زلفوں کو نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ زرینہ کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ اس شب عبداللہ خاں کو پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ اس نے اب تک اپنی زندگی رائیگاں کی تھی۔ میدان جنگ میں دشمن کو شکست دے کر فتح کی سرشاری سے بڑھ کر بھی ایک اور سرشاری ہے۔ زندگی صرف رزم وپیکار ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ نشہ صرف شراب ہی میں نہیں!

زرینہ تو کچھ دیر بعد چلی گئی مگر اپنے قرب کی خوشبو وہیں چھوڑ گئی اور عبداللہ خاں اس خوشبو کی لطافتوں سے سیراب ہوتا رہا۔

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی عبداللہ خاں نے اپنے نائب دلاور خاں اور داروغہ دلدار علی دونوں کو طلب کر لیا۔ گزشتہ شب وہ زرینہ کی وجہ سے ان دونوں کو ٹال گیا تھا۔ ان دونوں کے لٹکے ہوئے چہروں نے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی عبداللہ خاں کو سب کچھ بتا دیا۔ اس کے باوجود اس نے دونوں سے سخت استفسار کیا اور انہیں حکم دیا کہ اپنی تلاش تیز کر دیں۔ نگار اور اس کے بھائی محمد نواز کا ملنا ضروری ہے۔

دلاور خاں اور دلدار علی چلے گئے تو خادم نے آکر اطلاع دی کہ زرینہ ملنے کی خواہش مند ہے۔

"اسے آنے دو!" عبداللہ خاں نے اجازت دے دی اور سوچنے لگا کہ صبح صبح زرینہ مجھ سے ملنے کیوں آئی ہے؟

"چند ہی لمحوں بعد زرینہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا چہرہ بجھا بجھا تھا۔ عبداللہ خاں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ آداب کرنے کے بعد وہ قالین پر عبداللہ خاں کے قریب ہی بیٹھ گئی۔"

"آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں صبح ہی صبح کیوں آگئی؟" اس نے عبداللہ خاں کی طرف نظر اٹھائی۔

"ہاں حقیقت تو یہی ہے۔" عبداللہ خاں نے اعتراف کیا' پھر کہنے لگا۔ تم مجھے فکر مند اور پریشان سی نظر آ رہی ہو۔ خیریت تو ہے؟"

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے آپ سے اتنی جلدی جدا ہونا پڑے گا۔ زرینہ کی آواز بھاری ہو گئی۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔"

"بیگم ارجمند بانو کا حکم ہے کہ میں ان کے ہمراہ بنگال چلوں اور آپ واقف ہیں کہ مجھے اس حکم سے سرتابی کی مجال نہیں ہو سکتی کیوں کہ میں ایک کنیز ہوں۔" یہ کہتے ہوئے زرینہ کی آواز بھرا گئی۔ "کاش وہ رات جو گزر چکی ہے نہ گزری ہوتی' کاش آپ نے مجھے اتنا دیوانہ نہ کیا ہوتا کہ میں رات بھر سو بھی نہ پائی!... کاش میں اس رات کو بھی ایک کنیز کی مجبوری سمجھ کر فراموش کر سکتی۔ مجھے... مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں... ایک رات میں بدل سی گئی ہوں۔"

زرینہ نے عجیب سے الفاظ میں عبداللہ خاں سے اظہار محبت کیا تھا۔ عبداللہ خاں اس سے متاثر ہوا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔ "شاہی خاندان کے افراد کا حکم ٹالا جانا کسی طرح ممکن نہیں زرینہ! میری دعا ہے کہ تم جہاں بھی رہو خوش رہو!" عبداللہ خاں اسے سمجھاتا رہا مگر وہ نہ سمجھی۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ عبداللہ خاں نے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "یہ آنسو بہت قیمتی ہیں زرینہ! انہیں اس طرح رائیگاں نہ کرو!"

عبداللہ خان کے سینے سے لگی وہ سسکیاں لیتی رہی۔

پھر اسی دن دوپہر سے کچھ پہلے عبداللہ خاں نے بیگم ارجمند بانو' تینوں شہزادوں اور زرینہ کو ایک طویل سفر پر روانہ کر دیا۔

زرینہ کے قرب اور پھر اچانک فراق نے عبداللہ خاں کو متاثر کیا تھا۔ اسے سنبھلتے سنبھلتے دو تین دن لگے۔ ان دو تین دنوں میں دلاور خان اور دلدار علی برابر اس سے ملتے رہے تھے لیکن ابھی تک نگار اور اس کے بھائی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ عبداللہ خان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا قدم اٹھائے؟ نہ جانے کیوں اسے یقین سا تھا کہ دونوں بہن بھائی شاہجہاں آباد سے فرار نہیں ہو سکے اور یہیں چھپے ہوئے ہیں۔ اس یقین کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اس نے راستوں کی ناکہ بندی کرانے میں انتہائی عجلت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ امکان کم ہی تھا کہ دونوں بہن بھائی شاہجہاں آباد سے راہ فرار اختیار کر چکے ہوں۔ زرینہ کو رخصت ہوئے گیارہواں بارہواں دن تھا کہ دلدار علی تقریباً دوڑتا ہوتا عبداللہ خاں کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے عجلت میں حد ادب کو بھی ملحوظ نہیں رکھا تھا کہ اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوتا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ اس لئے پوری کوشش کے باوجود فوراً کچھ نہ بول سکا۔ جب وہ بولنے کے قابل ہوا تو سب سے پہلے اسے عبداللہ خاں کی ڈانٹ پھٹکار سننا پڑی۔

"حضور! دراصل میں یہ اطلاع جلد از جلد آپ تک پہنچا دینا چاہتا تھا کہ نگار کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔" دلدار علی نے پہلے تو معذرت کی پھر اپنی اچانک آمد کا سبب بتایا۔ عبداللہ خاں کے خون کی گردش جیسے تیز ہو گئی۔ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر لئے۔ "نگار کو گرفتار کر لیا گیا؟..." "کب؟ کہاں؟... کیسے؟" داروغہ دلدار علی نے جو تفصیل بتائی اسے سن کر عبداللہ خاں کا اضطراب ختم ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا۔ اس کے خیال میں نگار کے بھائی محمد نواز کا فرار ہو جانا خطرے کی علامت تھا۔

اس واقعے کی تفصیل یہ تھی کہ جب نگار اور نواز کے رشتے داروں کے یہاں چھاپے مار مار کر پولیس ناکام ہوگئی اور ان دونوں کا کہیں پتا نہ چل سکا تو پولیس نے نواز کے دوستوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ یوں دلدار علی' نواز کے ایک دوست الیاس کے گھر تک جا پہنچا۔ پولیس کو یقین نہیں تھا کہ نگار اور نواز وہیں ہوں گے۔ اس لئے الیاس کے مکان کو چاروں طرف سے گھیرا نہیں گیا تھا اور یہی غلط ہوا تھا وہ دونوں اسی مکان میں موجود تھے۔

الیاس تنہا اس مکان میں رہتا تھا۔ پولیس جب مکان میں داخل ہوئی تو الیاس کہیں گیا ہوا تھا۔ پولیس کو گھر میں صرف نگار ہی ملی۔ نگار سے پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ پولیس کی بھنک ملتے ہی نواز مکان کی پچھلی دیوار پھلانگ کر فرار ہوگیا۔ مکان کا پچھلا دروازہ نہیں تھا اس لئے وہ اپنی بہن کو ساتھ نہیں لے جاسکا تھا۔ پولیس فوراً پچھلی گلی کی طرف دوڑی مگر گلی ویران پڑی تھی۔ دلدار علی تو نگار کو گرفتار کرکے قلعے کی طرف آ گیا اور دلاور خاں اپنے ساتھ کچھ سپاہیوں کو لے کر نواز کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔ دلدار علی نے یہ بھی بتایا کہ فرار ہونے والا محمد نواز ہی تھا۔ اس پولیس چوکی پر قلعے کا جو سپاہی متعین تھا اس نے نواز کو بھاگتے ہوئے پہچان لیا تھا۔ پولیس کی اطلاع کے مطابق محمد نواز گھوڑے پر سوار تھا جبکہ الیاس کے گھر سے فرار ہوتے وقت اس کے پاس گھوڑا نہیں تھا۔ قیاس یہی کیا جاسکتا تھا کہ وہ فرار ہوتے وقت راستے سے کسی کا گھوڑا کھول کر لے گیا تھا۔

''نگار اور نواز کی روپوشی' پھر نواز کا فرار! یہ ساری باتیں اس طرف اشارہ کررہی تھیں کہ رابعہ کے قتل میں یہی دونوں بہن بھائی ملوث ہیں۔'' عبداللہ خاں پوری روداد سن کر دلدار علی سے بولا۔ ''تم نے رابعہ کے قتل کے متعلق نگار سے تو ابھی پوچھ گچھ نہیں کی؟''

''جی نہیں۔'' دلدار علی نے جواب دیا۔ ''میں اسے حوالات میں بند کرکے سیدھا آپ کو اطلاع دینے آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے' تم یا اور کوئی شخص اسے سے پوچھ گچھ نہیں کرے گا۔ میں خود اس کا بیان لوں گا! عبداللہ خاں بنے حکم دیا۔'' خیال رہے کہ اس دوران کسی کو بھی نگار سے نہ ملنے دیا جائے' خواہ دلاور خاں ہی کیوں نہ ہو!

''حضور کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔'' دلدار علی ادب سے بولا۔

''اب تم جاسکتے ہو! میں کچھ دیر بعد نگار کو یہاں بلواؤں گا اور تم خود اسے چھوڑنے یہاں تک آؤ گے۔''

حکم سن کر دلدار علی کمرے سے نکل گیا۔ حالات پر غور کرنے کیلئے عبداللہ خاں کچھ وقت چاہتا تھا۔ دلدار علی کو اس نے پوچھ کچھ سے اس لئے منع کیا تھا کہ کہیں نگار گھبرا کر اصل بات نہ بول دے۔ وہ بہرحال لڑکی تھی۔ ایسی صورت میں عبداللہ خاں کیلئے مزید الجھنیں پیدا ہوسکتی تھیں۔ اب اس کے سامنے صرف اور صرف ایک مسئلہ تھا کہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ نگار کو جو کچھ معلوم ہوچکا ہے اس کا اقرار خود اپنی زبان سے کرلے۔ اسی کے ساتھ نواز کے فرار نے بھی اسے الجھا دیا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ نگار نے اپنے بھائی کو بھی اس راز سے آگاہ کردیا ہو جو عبداللہ خاں چھپانا چاہتا تھا۔ اس کی تصدیق نگار کی زبان کھلوا کر ہی ممکن تھی

کہ اس کا بھائی پورے معاملے سے کس حد تک واقف ہے؟

ماہ رخ کی طرح نگار کو بھی عبداللہ خاں اپنے کمرے میں بلوا کر قتل کرسکتا تھا کہ اس نے بھی خودکشی کرلی مگر اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ بات آگے بڑھ چکی تھی' یہ معاملہ تو اب بادشاہ بیگم تک پہنچ چکا تھا۔ ایک ہی نوعیت کی دوسری خودکشی یقینی طور پر عبداللہ خاں کی حیثیت کو مشتبہ بنا سکتی تھی۔ اب یہی ممکن تھا کہ قید کے دوران میں کسی طرح نگار کو قتل کردیا جاتا۔

نگار کو سخت نگرانی میں رکھا گیا تھا۔ اس سے کسی کے ملنے پر پابندی تھی۔ داروغہ دلدار علی بھی بےحد محتاط اور چوکنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے مین عبداللہ خاں دلچسپی لے رہا ہے۔ ایسی صورت میں حوالات کے گرد سخت پہرا ہونا لازمی تھا نہ صرف حوالات بلکہ پولیس چوکی میں کوئی بھی شخص پولیس کی نظر میں آئے بغیر نہیں گھس سکتا تھا۔ اس کے باوجود نگار کو قتل کیا جانا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ کوئی قاتل کی جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔ کوئی یہ جان ہی نہ سکے کہ اس قتل میں خود وہ شخص ملوث ہے جس کے حکم پر تمام تحقیقات ہورہی ہے۔ قاتل وہی ہے جو منصف کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

عبداللہ خاں کو بہرحال کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا تھا۔ جب اس کا ذہن سوچتے سوچتے تھکنے لگا اور وہ کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا تو اس نے دروازے پر موجود ملازم کو آواز دی۔ وہ اب اس فتنے کو دیکھ ہی لینا چاہتا تھا جس نے اسے مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔

حکم کے مطابق نگار کے ہمراہ داروغہ دلدار علی آیا تھا' ساتھ ہی دو سپاہی بھی تھے جو نگار کے بازو پکڑے ہوئے تھے جیسے وہ اب بھی فرار ہوجائے گی۔ عبداللہ خاں کے ہونٹوں پر یہ دیکھ کر مسکراہٹ آ گئی۔ دلدار علی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

عبداللہ خاں نے اس لڑکی کی طرف نظر اٹھائی جس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی خوف کے اثرات تھے' اتنا شدید خوف کہ اس کے خدوخال بھی بگڑ کے رہ گئے تھے۔ اس کا جسم متناسب اور قد دراز تھا۔ جھکی ہوئی آنکھوں سے جیسے آنسو چھلک پڑنا چاہتے تھے۔

''تم لوگ اسے چھوڑ کر چلے جاؤ! جب میں اس سے پوچھ گچھ کرلوں گا تو میں تمہیں بلوا لوں گا۔'' عبداللہ خاں نے دلدار علی اور سپاہیوں کو حکم دیا۔

حکم سنتے ہی سپاہیوں نے نگار کے بازو چھوڑ دیئے۔ اس وقت یوں لگ رہا تھا کہ جیسے نگار اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکے گی۔ دلدار علی سپاہیوں کے لے کر کمرے سے نکل گیا۔

''بیٹھ جاؤ!'' عبداللہ خاں نے کمرے کے دروازے کے طرف بڑھتے ہوئے پہلی بار نگار کو مخاطب کیا۔

نگار اس طرح قالین پر ڈھیر ہوگئی جیسے اسی حکم کی منتظر تھی۔ دروازہ بند کرکے عبداللہ خاں اس کے پاس قالین پر ہی بیٹھ گیا۔

''میں جانتا ہوں نگار کہ رابعہ کے قتل سے تمہارا اور تمہارے بھائی نواز کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم دونوں بے گناہ ہو۔'' عبداللہ خاں نرمی سے بولا۔

نگار اسے اس طرح کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا ہو۔

پھر اس سے پہلے کہ نگار کچھ کہتی عبداللہ خاں بول اٹھا۔ ''میں تمہیں اس قتل کے سلسلے میں بے گناہ سمجھتا ہوں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر تم نے میرے سامنے زبان نہیں کھولی اور جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو ... '' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر کمر سے خنجر کھینچ لیا اور اسے نگار کی آنکھوں کے سامنے گھمایا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مطلب تم سمجھ گئی ہوگی!''

نگار کی آنکھوں میں خوف کے سائے کچھ اور گہرے ہو گئے۔

''مم ... مجھے ... معاف کر دیجئے ... میں بے گناہ ہوں۔ وہ پہلی بار ہکلائی۔''

''میں خود کہہ چکا ہوں' اگر تم زندہ رہنا چاہتی ہو تو میرے سوالوں کا جواب خوب سوچ سمجھ کر دینا۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے!'' اس نے خنجر سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ''میں اس بات سے بھی واقف ہوں جو تم نے ماہ رخ سے کہی تھی۔ میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں کہ تم نے اتنی جرأت کا ثبوت دیا۔ میں تمہاری اس بات کو بھی نظرانداز اور درگزر کر سکتا ہوں مگر صرف ایک شرط پر کہ تم حقیقت کا اظہار خود اپنی زبان سے کرو!''

ماہ رخ کے ذکر پر وہ چونک اٹھی تھی اور اس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ عبداللہ خاں تمام باتوں سے آگاہ ہو چکا ہے۔

''کیا آپ واقعی میری جان بخشی کر دیں گے؟'' وہ التجا آمیز لہجے میں بولی۔

''یقیناً!... مگر صرف اس صورت میں جب تم مجھ سے عہد کرو کہ اپنی زبان ہمیشہ کیلئے بند رکھو گی۔'' عبداللہ خاں نے اسے بہلا دیا کہ اسے جو کچھ معلوم ہے بتانے میں دیر نہ کرے۔

کچھ ہی دیر کے بعد نگار ابتدا سے اب تک کے واقعات بتا رہی تھی۔

میں اس دن دلاور خاں سے ملنے آئی تھی۔ اس کی تلاش میں آپ کے کمرے تک پہنچ گئی۔ وہاں میں نے ایسی باتیں سنیں جو پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ میں اور میرا سارا خاندان زندگی بھر شاہی خاندان کا نمک خوار رہا ہے۔ بچپن سے ہی مجھے شاہی خاندان سے عقیدت کا سبق دیا گیا ہے۔ میں نے ان حالات میں یہی فیصلہ کیا کہ کسی طرح یہ بات شاہی خاندان کے کسی ایسے فرد تک پہنچ جائے جو اس معاملے میں فوری طور پر بادشاہ عالم سے رابطہ قائم کر سکے اور بادشاہ عالم کی نظر میں اس فرد کی توقیر بھی ہو۔ محل میں ایسی ہستی صرف اور صرف بادشاہ بیگم کی تھی مگر میں براہ راست ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی کیوں کہ میں ایک معمولی کنیز تھی۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ شاید میری بات پر اعتماد نہ کیا جائے اس لئے میں نے ماہ رخ کو اس راز سے آگاہ کر دیا۔ پھر اسی رات ماہ رخ نے خودکشی کر لی بلکہ رابعہ بھی قتل کر دی گئی۔ ماہ رخ کی موت سے میں گھبرا گئی تو اب بادشاہ بیگم تک پہنچنے کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اپنے بھائی محمد نواز کو تمام باتوں سے آگاہ کیا۔ محمد نواز میری باتیں سن کر حیرت زدہ رہ گیا اور پھر اس نے خدشہ ظاہر کیا کہ ماہ رخ نے خودکشی نہیں کی اسے شاید قتل کر دیا گیا۔

اپنے بھائی کی یہ بات مجھے اس لئے بھی قابل قبول ہوئی کہ ماہ رخ نے آپ ہی کے کمرے میں خودکشی کی تھی۔

نواز نے یہ کہہ کر مجھے خوف زدہ کر دیا کہ رابعہ کا قتل میرے دھوکے میں ہوا ہے کیوں کہ وہ برابر والی تدری میں رہتی ہے۔ قاتل بھولے سے ہماری تدری کے بجائے رابعہ کی تدری میں جا گھسا ہوگا۔

نواز نے خیال ظاہر کیا کہ میری زندگی خطرے میں ہے اس لئے فوری طور پر قلعے کو خیر باد کہہ دینا چاہئے۔

ہم دونوں اسی لئے رابعہ کا جنازہ اٹھنے سے پہلے قلعے سے فرار ہو گئے۔ قلعے سے ہم خالہ کے گھر جانے کیلئے کہہ کر چلے تھے۔ خالہ کے گھر جا کر ہمیں احساس ہوا کہ وہاں بھی ہمارے لئے خطرہ ہو سکتا ہے' ہمیں کہیں اور منتقل ہو جانا چاہئے۔ پھر ہم اپنے چچا کے گھر ترکمان دروازے جا پہنچے۔ ہمیں وہاں پہنچے کچھ دیر ہوئی تھی کہ ہمارے خالہ زاد نے آ کر اطلاع دی' پولیس ہماری تلاش میں ہے۔ اب ہم دونوں نے خود کو چچا کے یہاں بھی غیر محفوظ سمجھا۔

نواز کا خیال تھا کہ پولیس ہمیں ہمارے تمام رشتے داروں کے یہاں تلاش کرے گی اس لئے اب ہمیں کہیں اور چھپنا چاہئے۔

اسی دن ہم وہاں سے ''چتلی قبر'' چلے گئے۔ وہ نواز کے ایک دوست الیاس کا گھر تھا۔ الیاس پہلے کبھی نواز کے ساتھ ہی شاہی مطبخ میں ملازم تھا مگر اسے کسی بات پر نکال دیا گیا تھا۔

الیاس وہاں تنہا رہتا تھا۔ مکان بڑا تھا۔ الیاس صرف بیرونی کمرے تک محدود ہو گیا۔ الیاس نے ہم دونوں کے قیام کیلئے پچھلا کمرا دے دیا۔ وہاں پہنچنے کے دوسرے دن الیاس نے ہمیں بتایا کہ شاہجہاں آباد سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔

نواز اسی دن مجھے ساتھ لے کر شاہجہاں آباد سے فرار ہو جانا چاہتا تھا مگر اب ہمارا فرار ہو جانا آسان نہیں رہا تھا۔ الیاس نے بھی یہی مشورہ دیا کہ ابھی اسی کے گھر میں روپوش رہیں۔ پولیس جب ہماری تلاش میں ناکام ہو جائے تو ہم شاہجہاں آباد سے فرار ہو جائیں۔ الیاس نے ہم دونوں بہن بھائیوں کی بہت مدد کی۔

نگار تقریباً تمام واقعات بیان کر چکی تھی۔ اسی کے ساتھ عبداللہ خاں کے ذہن میں ایک اور نیا خطرہ جنم لے چکا تھا۔

''کیا تم دونوں نے الیاس کو بھی اپنے راز میں شریک کر لیا تھا؟'' عبداللہ خاں نے ایک د پوچھا۔

''نہیں۔'' نگار نے جواب دیا ''ہم نے الیاس کو کچھ نہیں بتایا' نواز اب کچھ اور ہی سوچ تھا۔ اس نے مجھ سے ایک دن کہا تھا کہ اب یہ راز صرف بادشاہ عالم کے سامنے ہی افشا کیا جائے گا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کسی قدر حالات بہتر ہوتے ہی وہ مجھے ساتھ لے کر دکن روانہ ہو جائے گا۔ وہ مجھے بادشاہ عالم کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ ایک طرف تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے' دوسری طرف ہم بہن بھائی کی زندگی کو کوئی خطرہ بھی لاحق نہ رہے اور ...''

نگار کے الفاظ عبداللہ خان کی روح پر جیسے ضربیں لگا رہے تھے۔ نواز فرار ہو چکا تھا۔ اس کا ارادہ دکن جانے کا تھا جہاں بادشاہ وقت اورنگزیب عالمگیر موجود تھا۔ وہ جس کی دہشت سے پورا ہندوستان کانپتا تھا' وہ جس کا تصور ہی لوگوں کو لرزہ براندام کر دینے کیلئے کافی تھا۔

لگا رہے تھے بوڑھے چودھری بھی۔ "تماشہ ختم ہو جاؤ!" عبداللہ خان تقریباً چیخ اٹھا۔ "مجھے اب کچھ نہیں سننا!" یہ کہتے ہوئے خنجر کے دستے پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ عبداللہ خان کا وہ ہاتھ (جس) جس میں خنجر تھا اور بھی بخود جھک گیا

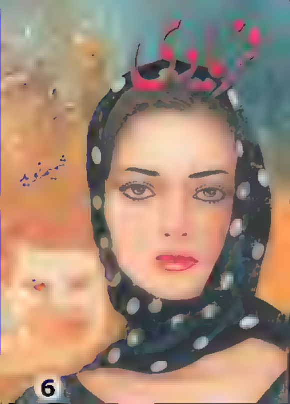
کیا میں فلاں کو قتل کر کے خود کو محفوظ کر سکتا ہوں؟ اس کے ذہن میں یہ سوال گونجا۔

نہیں! اس کے دوسرے حصے کسی نے جواب دیا۔ اس طرح تو نواز کی بات میں اور وزن پیدا ہو جائے گا۔ اس کی بات اور جاندار ہو جائے گی! پھر کیا میں اپنی اور اپنے بھائی حسین علی خان کی گرفتاری کے حکام کا انتظار کروں؟

اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

عذرِ خاک کی پُراسرار آپ بیتی ابھی جاری ہے۔ بقیہ واقعات کیلئے آخری حصہ کا مطالعہ کریں۔


6

ابتدا ہی میں حالات نے عبداللہ خاں کو ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں خوف، وحشت اور بدحالی کے سوا کچھ اور نہیں تھا حالانکہ اقتدار، دہلی پر قبضے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے میں ابھی ایک طویل جدوجہد درکار تھی۔ ان دو بھائیوں کو وہ بڑے عہدے مل جانے کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ جو چاہیں کرسکتے ہیں۔ وہ دراز تک پھیلی ہوئی وسیع و عریض مملکت میں سازش کا جال پھیلا ہوا تھا اور بحران سے کامیابی سے ہمکنار کرنا بڑا امتحان جوکھوں کا کام تھا۔

حسین علی خاں صرف ایک صوبے عظیم آباد کا صوبیدار تھا اور عبداللہ خاں شاہی محلات کا نگران مگر یہ عہدے ان کی طویل جدوجہد میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ انہیں تو اس سے بہت آگے جانا تھا اتنا آگے کہ بادشاہ وقت کے بعد صرف اور صرف انہی کی حیثیت ہو۔ اسی کے بعد ان کے خواب تعبیر آشنا ہوسکتے تھے۔

عبداللہ نے بگڑے ہوئے حالات کو قابو میں کرنے کے لئے اب تک کسی قسم کی کوتاہی کا ثبوت نہیں دیا تھا بلکہ اپنی بساط سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں مارے تھے۔ اس کے باوجود نتیجہ اس کے حق میں نہیں رہا تھا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی صورت نہیں رہی تھی کہ پردہ غیب سے کسی معجزے کا انتظار کرے۔ گرداب کا چھوٹا سا [illegible] کسی طرح حیدرآباد کی دلدل میں کامیاب ہو جاتا تو عبداللہ کا بنا بنایا تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ حسین علی خاں اور خود اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر عبداللہ جب سے ملکوں کی خاطر صرف ایک مہرہ تھا وہ یہ کہ شاہ بادشاہ وقت کسی ثبوت کے بغیر تو ان کی بات تسلیم کرے۔ عبداللہ خاں کیوں کہ اور محمد شاہ عالمگیر کے دربار کے قریب بھی نہیں رہا تھا اس لئے جس کے بارے میں وہ کسی بات کے کا قائل نہیں تھا۔ ویسا اسے اتنا علم ضرور تھا کہ بادشاہوں کے مزاج کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ کسی دوسرے کی کسی واضح ثبوت کے سب کچھ تسلیم کر لیتے ہیں اور کبھی مکمل ثبوت ہونے کی صورت میں بھی رد کر دیتے ہیں۔ بہرحال موجودہ صورت حال میں فیصلہ کن طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ عبداللہ خاں کے بس میں جو تھا تو صرف یہ کہ شاہجہاں آباد (دہلی) کے قلعہ دار محمد یار خاں سے مل کر ان سے شہروں کو خصوصی [illegible] لئے فوری کارروائی احکام جاری کر دے۔ قانونی حیثیت سے قلعہ دار محمد یار خاں ہی اس کا مجاز تھا کہ وہ ان سے شہروں کے اضلاع اور شمالی سلطنت کو کسی مفرور مجرم کے بارے میں ہدایت جاری کر سکے۔ محمد یار خاں اور عبداللہ خاں کی حیثیت تقریباً مساوی تھی بلکہ بعض معاملات میں عبداللہ خاں کے اختیارات زیادہ تھے۔ نواز کے

متعلق اس طرح کے احکام سے صرف ایک فائدہ ممکن تھا کہ اس کیلئے دکن پہنچنے میں دشواریاں پیدا کر دی جاتیں یہ کہ وہ جلد از جلد بادشاہ وقت تک نہ پہنچ سکے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن تھا کہ محدود وقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے عبداللہ خاں ممکنہ طور پر اپنے لئے کوئی راہ نکال لیتا۔

نگار اب تک عبداللہ خاں ہی کے کمرے میں موجود تھی۔ اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ بھی اب تک خنجر کی صورت میں' عبداللہ خاں کے ہاتھ میں تھا اور وہ خیالوں کی گتھیاں سلجھانے لگا تھا۔ نگار کا قتل اب اس کے لئے مزید الجھنوں کا سبب بن سکتا تھا اور اس قتل سے کوئی بھی فائدہ نہیں تھا۔ غالباً اسی لئے عبداللہ خاں نے ذہنی طور پر اس کی جان بخشی کا فیصلہ کیا۔ یہ سوچ کر اس نے خنجر کمر میں لگایا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ نگار خوف زدہ نظروں سے اسے تک رہی تھی۔ اسے شاید اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ اس کی زندگی بچ گئی ہے۔

کمرے کے دروازے پر عبداللہ خاں کا ذاتی محافظ موجود تھا۔

''داروغہ دلدار علی کو حاضر خدمت کرو!'' عبداللہ نے محافظ کو حکم دیا۔

محافظ نے ادب سے سر جھکایا اور عبداللہ کے حکم کی تعمیل میں روانہ ہو گیا۔

عبداللہ خاں نے فیصلہ کیا تھا کہ نگار کو قلعے کے قید خانے میں رکھا جائے اور اس سے ملنے پر مکمل پابندی لگا دی جائے تا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتا سکے۔ اس فیصلے کے باوجود بھی اس نے نگار کو دھمکی دی۔ ''تمہاری زبان اگر اب کسی کے سامنے کھلی تو اسے کاٹ دیا جائے گا!''

عبداللہ خاں کے لہجے کی سفاکی سے نگار لرز گئی۔

کچھ ہی دیر کے بعد محافظ نے داروغہ دلدار علی کے آنے کی اطلاع دی۔ عبداللہ نے اسے اندر بلوالیا۔

''سنو دلدار علی! اس لڑکی کو اس وقت تک سخت نگرانی میں قلعے کے قید خانے میں رکھنا ہے جب تک اس کا بھائی گرفتار نہیں ہو جاتا!... اور سنو! اس سے کسی کے ملنے پر مکمل پابندی عائد ہے۔ کوئی شخص بھی ہماری اجازت کے بغیر اس سے نہ ملنے پائے خواہ وہ قلعہ دار ہی کیوں نہ ہو!'' عبداللہ خاں کی آواز میں سختی تھی۔

''حضور کے حکم کی تعمیل ہوگی۔'' داروغہ دلدار علی نے عبداللہ خاں کے سامنے احتراماً جھکتے ہوئے کہا اور نگار کو ساتھ لے کر کمرے سے نکل گیا۔

داروغہ دلدار علی کے جاتے ہی عبداللہ خاں اپنے کمرے سے نکلا اور اس سمت روانہ ہو گیا جہاں قلعے کے ایک حصہ میں قلعہ دار محمد یار خاں سکونت پذیر تھا۔ عبداللہ خاں اس سے پہلے بھی مل چکا تھا مگر وہ سرسری سی ملاقات تھی۔ عبداللہ خاں اسے ایک بے ضرر سا شخص سمجھتا تھا۔

محمد یار خاں کو عبداللہ خاں کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ اپنی قیام گاہ کے اندرونی حصے سے نکل کر فوری طور پر انتظار گاہ میں پہنچ گیا۔ عبداللہ خاں وہاں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نہایت سکون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ محمد یار خان پر نظر پڑتے ہی عبداللہ خاں نے پہلو بدلا اور پھر ان دونوں کے درمیان مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا۔

''زہے نصیب کہ آپ غریب خانے پر تشریف لائے۔'' محمد یار خاں علیک سلیک کے بعد بولا۔ اس کے لہجے سے خوش اخلاقی کا اظہار ہو رہا تھا۔

عبداللہ خاں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کرے کہ قلعہ دار کا ملازم خاص کمرے میں داخل ہوا۔ پھر اس نے قلعہ دار کو مخاطب کیا۔ ''ابھی ابھی دکن سے ایک قاصد آیا ہے اور اس کے پاس بادشاہ سلامت کا کوئی پیغام ہے۔ وہ فوراً حضور سے ملاقات کا متمنی ہے۔''

قلعہ دار یہ خبر سن کر کچھ حیران سا ہو گیا اور اس نے ملازم سے کہا۔ ''قاصد کو بھیجو۔''

ملازم کے باہر نکلتے ہی ایک جوان العمر شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے جھک کر قلعے دار کو سلام کیا اور ایک ریشمی کپڑے میں لپٹا ہوا پیغام قلعہ دار کی طرف بڑھا کر بولا۔ ''مجھے حکم ملا ہے کہ میں شاہجہاں آباد پہنچتے ہی یہ پیغام حضور کو پہنچا دوں سو میں تعمیل حکم کے تحت فوراً حاضر خدمت ہوا ہوں۔''

قلعہ دار نے اس سے پیغام لیا اور کھول کر پڑھنے لگا۔ عبداللہ خاں نے قلعہ دار کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ کوئی نہ کوئی بات پیغام میں ایسی ضرور ہے جو قلعہ دار کیلئے خلاف توقع کہی جا سکے۔

''اب تم جا سکتے ہو۔'' قلعہ دار نے پیغام پڑھ کر قاصد کو مخاطب کیا۔ ''کل صبح تمہیں اس پیغام کا جواب لے کر بادشاہ سلامت کے پاس روانہ ہونا ہے۔'' قاصد چلا گیا تو قلعہ دار عبداللہ خاں کی طرف مڑا۔ ''اچھا ہوا کہ آپ بھی اس وقت یہیں موجود ہیں۔''

حضور بادشاہ معظم نے پیغام میں کیا تحریر فرمایا ہے؟ عبداللہ خاں نے اسے تجسس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''لیجئے' آپ خود ملاحظہ کیجئے۔'' اس نے پیغام شاہی عبداللہ خاں کی طرف بڑھا دیا' غالباً عالی جاہ دکن میں طویل قیام کا فیصلہ کر چکے ہیں ورنہ بادشاہ بیگم کو اپنے پاس نہ بلواتے۔'' قلعہ دار نے قیاس آرائی کی۔

عبداللہ خاں پیغام پڑھنے لگا۔ پیغام میں قلعہ دار کو حکم دیا گیا تھا فوری طور پر بادشاہ بیگم کو دکن روانہ کر دیا جائے' شاہی محلات کا انتظام کیوں کہ عبداللہ خاں کے سپرد تھا اس لئے یہ پیغام ایک طرح سے اسی سے متعلق تھا۔

''بادشاہ سلامت نے یہ قصد غالباً دکن پہنچ کر ہی کیا ہے ورنہ وہ بادشاہ بیگم کو اپنے ہمراہ بھی لے جا سکتے تھے۔'' عبداللہ خاں نے اپنے خیال کا اظہار کیا' پھر مزید بولا۔ ''عجیب بات ہے کہ جب مجھے محلات شاہی کا نگران اعلیٰ مقرر کیا گیا تو ایک ایک کر کے سارے محلات خالی ہو گئے' بادشاہ بیگم شاہی خاندان کی آخری فرد تھیں جو یہاں موجود تھیں' اب وہ بھی جا رہی ہیں' ہے نا کچھ عجیب سی بات؟''

''ہاں ہے تو'' قلعہ دار نے تائید کی' ''تینوں شہزادوں اور ان کی اولادوں میں سے بھی اس وقت کوئی شاہجہاں آباد میں نہیں اور خود بادشاہ سلامت بھی دکن میں ہیں۔ میری زندگی میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا' بہر حال دارالسلطنت میں کوئی نہ کوئی تو ہونا ہی چاہئے تھا۔''

''خود بادشاہ سلامت کو بھی تو اس کا خیال ہوگا۔ ممکن ہے کہ وہ کسی شہزادے کو یہاں بھیج دیں۔'' عبداللہ خاں نے کہا۔

"ناممکن ہی سا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہزادہ شاہ عالم کابل میں ہیں۔ وہ خود وہاں بادشاہ سلامت کے ایماپر رکے ہوئے ہیں۔ ابھی وہ پوری طرح وہاں کے انتظامات وحسابات کی دیکھ بھال نہیں کرپائے، شہزادہ اعظم شاہ مالوہ میں صوبیداری کے فرائض انجام دے رہے ہیں، پہلے ان کے بارے میں سنا تھا کہ بادشاہ سلامت انہیں مالوہ سے بلانے والے ہیں مگر وہ صرف افواہ ثابت ہوئی اس لئے شہزادہ اعظم شاہ کا مالوہ سے شاہجہاں آباد آنا بھی قرین قیاس نہیں، جب تک کہ مالوہ کا کوئی اور صوبیدار مقرر نہ کر دیا جائے اور وہ نیا صوبیدار مالوہ کے حالات کو اچھی طرح سمجھ کر فرائض کی بجاآوری کے لئے مستعد نہ ہو جائے۔ یہ ممکن نہیں کہ شہزادہ اعظم شاہ کو وہاں سے ہٹالیا جائے۔ رہ گئے شہزادہ کام بخش تو وہ خود پہلے سے دکن میں موجود تھے اور اب وہ بادشاہ سلامت کے ساتھ ہوں گے۔" یہ کہہ کر قلعہ دار خاموش ہوگیا، باتوں ہی باتوں میں قلعہ دار محمد یار خاں سے عبداللہ خان کو بہت کچھ معلوم ہوگیا، پہلے وہ ان باتوں سے لاعلم تھا کہ شہزادے کہاں کہاں موجود ہیں!

کچھ دیر حالات حاضرہ پر گفتگو کرنے کے بعد عبداللہ خاں اصل موضوع پر آگیا، قلعہ دار خود بھی تشویش میں مبتلا تھا، وہ اتنا سیدھا سادہ شخص تھا کہ عبداللہ خاں نے بہت جلد اسے اس بات کا یقین دلایا کہ گزشتہ دنوں قلعے میں جو قتل ہوا تھا اس میں نواز کا ہاتھ تھا، نواز نے کسی ذاتی رنجش کے سبب کنیز رابعہ کو قتل کر دیا ہے۔ ممکن ہے اس قتل کا سبب عشق میں ناکامی رہا ہو۔ ماہ رخ کی "خودکشی" کو بھی عبداللہ خاں نے اسی سلسلے کی ایک کڑی ظاہر کیا۔

قلعہ دار نے اسی وقت عبداللہ خاں کے سامنے تمام شہروں کے قاضیوں اورعمال کو ہدایات جاری کردیں، یہ ہدایات وہی تھیں جو عبداللہ خاں چاہتا تھا۔ ان ہدایات میں نواز کا حلیہ وغیرہ بھی درج کر دیا گیا۔ عبداللہ خاں ہی کے ایما پر قلعہ دار نے نواز کی گرفتاری پر چھوٹے سے انعام کا اعلان بھی کر دیا۔

عبداللہ خاں جب قلعہ دار کے پاس سے اٹھ کر جارہا تھا تو قلعہ دار، بادشاہ بیگم کے حضور میں جانے کی تیاری کر رہا تھا تاکہ انہیں بادشاہ وقت کے پیغام سے آگاہ کر سکے۔ عبداللہ خاں اپنے کمرے میں لوٹ کر آیا تو کسی قدر مطمئن تھا۔ اب اسے یقین تھا کہ نواز بہ آسانی اورنگزیب عالمگیر تک نہ پہنچ سکے گا، شہروں شہروں جب اس کی گرفتاری پر انعام کا اعلان ہوگا تو وہ خود بھی چوکنا ہو جائے گا اور عین ممکن ہے کہ گھبراہٹ میں پکڑا ہی جائے۔ انعام کا چکر عبداللہ خاں نے اسی لئے چلایا تھا۔ وہ چاہتا تھا، خود نواز کے علم میں بھی یہ بات آجائے کہ اس کی تلاش جاری ہے اور اسے کہیں بھی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ ان حالات میں یہ بھی امکان تھا کہ نواز خوفزدہ ہو کر کہیں روپوش ہو جاتا اور سفر کا ارادہ ملتوی کر دیتا۔ بہرحال تمام ہی امکانات عبداللہ خاں کے حق میں تھے یا تو گرفتار ہو جاتا یا روپوشی اختیار کرلیتا یا پھر اس کی دکن روانگی میں دشواریاں پیدا ہو جاتیں۔

یہ اسی شب کا ذکر ہے، عبداللہ خاں اپنے ذہن سے تمام اندیشوں اور وسوسوں کو جھٹک کر سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کا یہ مخصوص انداز اس کے محافظ ہی کا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ محافظ کے پیچھے ایک شخص کھڑا نظر آیا جس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

عبداللہ خاں نے محافظ کو سخت نظروں سے گھورا۔

محافظ نے ڈرتے ڈرتے کہا "یہ شخص، حضور کو کوئی اہم اطلاع دینے کا متمنی ہے۔ اس نے کہا کہ اگر اسی وقت حضور کو بیدار کر کے وہ اطلاع نہ دی گئی جو اس کے پاس ہے تو غضب ہو جائے گا۔"

"کون ہو تم؟" عبداللہ خاں نے اس شخص کو سختی سے مخاطب کیا جو محافظ کے عقب میں کھڑا تھا۔

"حضور آپ کا خیر خواہ۔" اس شخص نے جواب دیا۔ اس کی آواز خلاف توقع پرسکون تھی۔ "میں تخلیے میں حضور سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

ہر چند کہ اس کی آواز عبداللہ خاں کیلئے اجنبی تھی مگر اطمینان یہ ظاہر کر رہا تھا کہ دل میں کوئی چور نہیں کچھ سوچ کر عبداللہ خاں نے کہا "اندر آجاؤ!"

وہ شخص بغیر کسی جھجک کے اندر آگیا۔ عبداللہ خاں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا اور پھر اچانک تیزی سے پلٹ کر اس شخص کے چہرے سے نقاب نوچ لی۔ اسے توقع تھی کہ نقاب کے پیچھے ضرور کوئی جانا پہچانا چہرہ ہوگا مگر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ چہرہ قطعی اجنبی تھا۔ اب اس شخص کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار تھے۔ غالباً اسے عبداللہ خاں سے اس طرح کے کسی رویے کی امید نہیں رہی ہوگی۔

"سب سے پہلے یہ جاننا چاہوں گا کہ تم نے اپنا چہرہ نقاب کے پیچھے کیوں چھپا رکھا تھا؟" عبداللہ خاں سخت آواز میں بولا۔ اس کا ہاتھ خنجر کے دستے پر تھا۔

"یہ جاننے سے پہلے ہی حضور وہ اطلاع سن لیتے جو میں حضور کو دینے والا تھا تو زیادہ بہتر تھا کیوں کہ یہ وقت بہت نازک ہے اور..."

"تمہید اور بکواس نہیں! میں نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دو!" عبداللہ خاں کا لہجہ بدستور سخت رہا۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے حضور کے پاس آتا دیکھ لے۔ مجھے بہرحال اپنی زندگی عزیز ہے اور میں اپنی جان پر کھیل کر ہی حضور تک پہنچا ہوں۔" اس شخص نے جواباً کہا۔ "اب اس اطلاع سے پہلے اپنے بارے میں یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھ سے ملنے کیلئے تم نے رات کے اس حصے کا انتخاب کیوں کیا؟"

"میں داروغۂ زنداں کا نائب ہوں۔"

عبداللہ خاں ہڑبڑا گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اس نے بے ساختہ پوچھا۔ "کیا تم کنیز نگار کے بارے میں کوئی اطلاع لائے ہو جسے ہمارے حکم پر آج ہی قید کیا گیا ہے؟"

"جی حضور! مبارک علی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میرے علم میں تھا کہ نگار کو حضور ہی کے حکم پر قید کیا گیا اور اسے سخت نگرانی میں رکھے جانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس پر شبہ ہے کہ وہ کنیز رابعہ کے قتل میں ملوث ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کنیز نگار، حضور کے نائب دلاور خاں کی منظور نظر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے دلاور خاں کو سیدی قاسم کے پاس منڈلاتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ سیدی قاسم، دلاور

خاں کے خالہ زاد بھی ہیں۔ اس رشتے سے قطع نظر دونوں گہرے دوست ہیں۔ وہ دونوں دوستوں ہی کی طرح ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اسی سبب مجھے شبہ ہوا کہ کہیں دلاور خاں تعلقات اور رشتے داری سے فائدہ اٹھا کر نگار کو رہا کرانے کا کوئی منصوبہ نہ بنا رہے ہوں۔ رات ہوتے ہی دلاور خاں کے ہمراہ سیدی قاسم محفل ناؤنوش میں شرکت کرنے محل کے اس حصے کی طرف آ گئے جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ داروغۂ زنداں سیدی قاسم کو اتنی شراب پلا دی گئی ہے کہ وہ اپنے ہوش کھو بیٹھے ہیں اور دلاور خاں ہی کے کمرے میں غافل پڑے ہیں تو میں چوکنا ہو گیا۔ سیدی قاسم کے بعد قید خانے کی ذمہ داری میری تھی۔ حضور! یہ خادم صحیح عرض کر رہا ہے؟"

"مبارک علی! تمہیں جو کہنا ہے' کہتے رہو! ہماری تائید کی چنداں ضرورت نہیں۔" عبداللہ خاں تیزی سے بولا۔ مبارک علی کا رک جانا اسے گراں گزرا تھا۔

"بجا ارشاد حضور!" مبارک علی سہم گیا' پھر کہنے لگا۔ "تو حضور' یہ خادم عرض کر رہا تھا کہ اپنی ذمہ داری کے پیش نظر چوکنا ہو جانا لازمی تھا۔ کچھ دیر بعد ہی مجھے دلاور خاں نے طلب کر لیا اور ایک اہم کام کا بہانہ بنا کر قلعے سے باہر بھیجنا چاہا۔ دلاور خاں کیوں کہ عہدے میں مجھ سے بڑے ہیں اس لئے میں انکار نہ کر سکا۔ جب میں قلعے سے باہر نکل رہا تھا کہ مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں میری غیر موجودگی سے دلاور خاں کوئی فائدہ تو اٹھانا نہیں چاہتے؟ یہ عجب بات ہے کہ میرا قیاس درست نکلا۔ میں نے جیسے ہی زنداں میں قدم رکھا میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ میں نے کچھ نقاب پوشوں کو زنداں میں دیکھا جو نگار کی کوٹھڑی کا تالا کھول کر اسے رہا کرا رہے تھے۔ مصلحت وقت کو نظر انداز کر کے میں نے ان نقاب پوشوں کو للکارا اور مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ نقاب پوش مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ اسی عرصے میں کسی نے نقاب پوشوں کو حکم دیا کہ وہ کسی بھی طرح مجھے قابو میں کریں اور بے ہوش کر کے وہیں ڈال دیں۔ اس آواز کو میں پہچانتا ہوں حضور! مبارک علی پھر خاموش ہو گیا جیسے کچھ بتاتے ہوئے جھجک رہا ہو۔

"جھجکو مت مبارک علی! بتاؤ وہ کس شخص کی آواز تھی؟" عبداللہ خاں نرمی سے بولا۔

"حضور! وہ... وہ آواز سو فیصد دلاور خاں کی تھی۔ دلاور خاں خود بھی چہرے پر نقاب لگائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد کسی نے کوئی بھاری چیز میرے سر پر ماری اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں نے زنداں کا جائزہ لیا۔ کچھ پہرے داروں کو بے ہوش کر دیا گیا اور کچھ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ان لوگوں کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کیا اور زنداں سے بھاگا۔ مجھے نگار کی فکر تھی۔ میں اس کی تلاش میں دلاور خاں کی طرف دوڑا۔ اگر میں مستعد چوکنا نہ ہوتا تو پھر شاید ایک بار دلاور خاں کے ہتھے چڑھ جاتا میں..."

"مبارک علی! تفصیل سے گریز کرتے ہوئے اصل واقعہ اختصار کے ساتھ بیان کرو!" عبداللہ خاں نے بات کاٹ کر تاکید کی۔

"بہتر ہے حضور! خادم اختصار ہی سے کام لے رہا ہے" مبارک علی بولا' پھر بقیہ بیان کرنے لگا' میں جس سمت سے دلاور خاں کی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا اس سمت سے دلاور خاں نگار کے ہمراہ آ رہے تھے۔ میں ایک ستون کی آڑ میں چھپ گیا۔ جب وہ دونوں میرے قریب سے گزرے تو میں نے

دلاور خاں کو نگار سے یہ پوچھتے سنا کہ آخر تم بادشاہ بیگم سے مل کر کیا کہنا چاہتی ہو؟ مجھے وہ بات کیوں نہیں بتانا چاہتیں؟" جواباً نگار نے کہا تھا کہ میں بادشاہ بیگم کے سوا وہ اہم بات کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ اس کے بعد وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ میں نے دبے پاؤں ان کا تعاقب جاری رکھا۔ جب وہ دونوں میرے قریب سے گزرے تھے تو میں نے محسوس کر لیا تھا کہ نگار انتہائی حواس باختہ ہے کوئی بات ایسی ضرور اسے معلوم ہے جو..."

"تم پھر پٹڑی سے اتر رہے ہو مبارک علی!" عبداللہ خاں نے ٹوکا۔ "مجھے تمہارے ذاتی احساسات وخیالات سے کوئی دلچسپی نہیں! آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے عبداللہ خاں کا لہجہ نسبتاً بدل گیا۔

"معاف کیجئے گا حضور! اب ایسا نہیں ہو گا میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ان دونوں کا تعاقب کرتا ہوا محل کے اس حصے میں پہنچ گیا جو بادشاہ بیگم کیلئے مخصوص ہے۔ پھر میں نے فوری طور پر حضور سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس ملاقات سے پہلے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس کا انتظام کر لوں' کہ حضور سے ملتے ہوئے مجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔ وجہ یہ کہ میں دلاور خاں سے واقف ہوں۔ اگر ان کے کان پر یہ بھنک پڑ گئی کہ میں نے مخبری کی ہے تو وہ مجھے یقیناً قتل کر دیں گے۔ ان سے سبھی ڈرتے ہیں کیوں کہ وہ بہت بااثر ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے محلات شاہی کے تین نگران اعلیٰ بدل چکے ہیں مگر وہ اپنی جگہ موجود ہیں۔ اس..."

"بس بس! اب ہمیں مزید کچھ جاننے کی جستجو نہیں" عبداللہ خاں بول اٹھا۔ "تم جا سکتے ہو!" پھر عبداللہ خاں نے مصلحتاً نرمی سے کہا کہ ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔ مبارک علی کہ تم نے ہمیں ایک مار آستیں سے آگاہ کیا۔ کوئی وقت آیا تو انشاء اللہ ہم تمہیں انشاء اللہ یاد رکھیں گے۔

عبداللہ خاں اب یہ چاہتا تھا کہ مبارک علی جلد سے جلد وہاں سے ٹل جائے۔ مبارک علی سے اسے جو کچھ معلوم ہوا تھا اس نے حواس گم کر دیئے تھے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اگر نگار بادشاہ بیگم کو سب کچھ بتا دیتی تو اب تک کے سارے کئے دھرے پر پانی پھر جاتا۔ بادشاہ بیگم بہرحال اتنی بااختیار ضرور تھیں کہ ان کے معمولی سے اشارے پر عبداللہ خاں کو فوراً گرفتار کر لیا جاتا۔ اس کے بعد تحقیقات ہوتی رہتیں۔ پہلے تو گرفتاری عمل میں آ ہی جاتی' پھر تحقیقات کا نتیجہ بھی ان دونوں بھائیوں کے حق میں نہ ہوتا۔ وہ دونوں مجرم ثابت ہوتے۔ نگار کی بات پر اعتبار کیا جانا بھی بعید از قیاس نہیں تھا۔ اسے عبداللہ خاں سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی! عبداللہ خاں کو شاہجہاں آباد آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے تھے! آخر ایک کنیز کو کیا پڑی تھی کہ وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر کسی صاحب اختیار عہدیدار کے خلاف لب کشائی کرے!

مبارک علی کے جاتے ہی عبداللہ خاں تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا۔ پھر اس طرف تیز تیز قدم اٹھاتا چل دیا جدھر بادشاہ بیگم سکونت پذیر تھیں۔ عبداللہ خاں بہت جلد محل کے اس حصے تک پہنچ گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا مستقبل کیا ہو گا؟ موت یا زندگی؟ اس کا جواب خود اس کے پاس نہیں تھا۔

رات کا ایک پہر گزر چکا تھا اس لئے ہر طرف سناٹا تھا۔ عبداللہ خاں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ وقت بادشاہ بیگم کے محو خواب ہونے کا ہے۔ فوری طور پر دلاور خاں اور نگار ان سے نہیں مل سکتے تھے۔ ملاقات کیلئے ان دونوں کو بہرحال انتظار کرنا پڑتا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس انتظار میں یقیناً اتنا وقت تو صرف ہو ہی

گیا ہوگا جتنا مبارک علی کو اس کے پاس پہنچ کر تمام واقعہ بیان کرنے میں صرف ہوا ہے۔

عبداللہ خاں' بادشاہ بیگم کی خواب گاہ کے نزدیک پہنچا تو اس نے وہاں زندگی کے آثار دیکھے۔ مردانہ حصے میں بھی روشنی تھی اور اندرونی حصہ بھی روشن نظر آرہا تھا۔ اس کا یہی مطلب ہوسکتا تھا کہ بادشاہ کو بیدار کیا جاچکا ہے۔ عبداللہ خاں کا رخ اب اسی راہداری کی طرف تھا جو اندرونی حصے کی بائیں سمت تھی۔ وہاں اس نے ہلکی سی روشنی دیکھی تھی۔ قریب جا کر معلوم ہوا کہ وہ روشنی کھلے ہوئے ایک دریچے سے باہر آرہی تھی۔ وہ دریچے کے قریب پہنچا تو چونک اٹھا۔ اسے ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی اور یہ آواز بلا شبہ نگار ہی کی تھی۔

''ممکن ہے حضور کہ آپ کی ان کنیزوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔'' نگار کہہ رہی تھی۔ ''مجھے اپنے مرنے کا دکھ نہیں ہوگا اگر میں اپنے آقاؤں پر قربان ہوگئی یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔''

''تمہیں کس کی طرف سے قتل کئے جانے کا اندیشہ ہے اور اس کا سبب کیا ہے؟'' بادشاہ بیگم کو گونج دار آواز سنائی دی۔

''وہ... وہ شخص بہت بڑے عہدے پر ہے۔ دراصل میرا قصور یہ ہے کہ میں نے اپنے ان گناہ گار کانوں سے وہ بات سن لی تھی جو مجھے نہیں سننا چاہئے تھی۔ میں حضور کو پورا واقعہ تفصیل سے سنائے دیتی ہوں۔ یقین کیجئے اس میں ذرا بھی کذب شامل نہیں۔ میں ایک صبح محل کے ایک کام کی غرض سے نائب نگراں محلات دلاور خاں کی تلاش میں محل کے اس حصے میں آئی دلاور خاں اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ میں انہیں تلاش کرنے دوسرے کمروں کی طرف بڑھی میں نے سوچا کہ شاید دلاور خاں کو محل کے تگ....''

نگار کا جملہ مکمل نہ ہوسکا اور اس سے پہلے ہی اس کی چیخ سے کمرا گونج اٹھا۔ اس کے سینے میں خنجر ترازو ہوچکا تھا اور خنجر پھینکنے والا ہاتھ عبداللہ خاں کا تھا۔

اندر سے ایک دم چیخ پکار سنائی دی اور کوئی تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ عبداللہ خاں دوڑ کر ایک ستون کی آڑ میں ہوگیا۔ اسی وقت اس نے کسی کو تیزی سے بھاگتے ہوئے اس طرف دیکھا۔ آنے والے کو عبداللہ خاں فوراً پہچان گیا۔ وہ دلاور خاں تھا۔ دلاور خاں ابھی چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ عبداللہ خاں نے اس پر چھلانگ لگادی۔ اس اچانک حملے سے دلاور خان سنبھل نہ پایا اور بے ساختہ ڈھیر ہوگیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا' عبداللہ خاں نے اس کی کمر میں لگا ہوا خنجر کھینچ لیا۔ اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں جو لحظہ بہ لحظہ قریب ہوتی جارہی تھیں۔

''آ... آپ... حضور آپ؟'' دلاور خاں نے بھی عبداللہ خاں کو پہچان لیا۔

''ہاں میں... دلاور خاں میں! ''تمہاری موت۔ غدار شخص! عبداللہ خاں نے دانت پیستے ہوئے خنجر والا ہاتھ بلند کیا اور پھر خنجر اس کی گردن میں گھونپ دیا۔

وار اتنا کاری تھا کہ دلاور خاں کی چیخ اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

عبداللہ خاں جب دلاور خاں کے تڑپتے ہوئے جسم کو چھوڑ کر اٹھ رہا تھا تو اس کے ارد گرد محل کے محافظ اور بادشاہ بیگم کے خادم جمع ہوچکے تھے۔ وہ سب عبداللہ خاں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے جیسے ان کیلئے وہ منظر ناقابل یقین ہو۔

دلاور خان کا جسم آخری بار تڑپ کر ساکت ہوگیا۔ اس کی گردن سے خون بہہ کر دور دور تک پھیل رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد عبداللہ' بادشاہ بیگم کے حضور میں پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بیان کررہا تھا۔ بادشاہ بیگم پردے کی دوسری سمت موجود تھیں اور سخت غصے کے عالم میں عبداللہ خاں کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

بادشاہ بیگم خاموش ہوگئیں تو عبداللہ خاں نے پرسکون آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے دلاور خاں کو خنجر پھینکتے دیکھا تھا۔ اس نے شاید مجھے اپنے قریب محسوس کرلیا تھا۔ اس نے پلٹ کر فوراً مجھ پر حملہ کردیا مگر وہ نہتا تھا کیوں کہ اپنے خنجر سے نگار کا کام تمام کرچکا تھا۔ میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر اسے ہلاک کردیا۔ یوں بھی وہ دہرے جرم کا مرتکب ہوا تھا اور یہ بھی...''

''عبداللہ خاں!'' بادشاہ بیگم کی غصیلی آواز نے عبداللہ خاں کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''تفصیلات ہم بعد میں سنتے رہیں گے! پہلے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ محل میں کیا سازش ہورہی ہے؟۔ اس سے پہلے اتنے مختصر عرصے میں کبھی اتنی لاقانونیت کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ تم نے جب سے عہدہ سنبھالا ہے اسی وقت سے یہ سب ہورہا ہے۔ جواب دو کہ یہ سب قتل کیوں ہوئے؟ کیا ہم نے پہلے ہی قتل اور ایک کنیز کی خودکشی کے بعد تمہیں طلب کرکے سرزنش نہیں کی تھی۔ پھر یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟ ہم بھلا کس طرح یہ گستاخی فراموش کردیں کہ اب ہمارے حضور میں بھی قتل ہونے لگے! بولو جواب دو!''

''حضور والا کا قیاس قطعی درست ہے۔ اس لاقانونیت کے پیچھے یقیناً کوئی گہری سازش تھی مگر شاید اب وہ سازش کبھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گی کیوں کہ میرے خیال میں اس سازش کا سرغنہ ہلاک ہوچکا ہے۔'' عبداللہ خاں نے پرجوش لہجے میں کیا۔

''سازش کا سرغنہ؟... کون اور کیسی سازش؟'' بادشاہ بیگم نے دریافت کیا۔

''میرے خیال میں اس امکانی سازش کا سرغنہ میرا نائب دلاور خاں تھا۔ اب میں اپنی اس بات کے ثبوت میں داروغۂ زنداں کے نائب مبارک علی کو بھی پیش کرسکتا ہوں۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ دلاور خاں کیا سازش کررہا تھا لیکن یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ اس کے ارادے نیک نہیں تھے۔''

اور عبداللہ خاں نے بادشاہ بیگم کو بتایا کہ نگار اور دلاور خاں کے درمیان مشکوک مراسم تھے۔ دلاور خاں اپنے کسی مقصد کیلئے نگار اور اس کے بھائی کو استعمال کررہا تھا۔ نگار کو جب گرفتار کرلیا گیا اور قید میں ڈلوایا گیا دلاور خاں نے اس ڈر سے کہ کہیں نگار سازش کے بارے میں بتا نہ دے اسے قید سے رہا کرالیا۔ عبداللہ خاں نے نگار کی رہائی کے بارے میں پورے منصوبے سے بادشاہ بیگم کو آگاہ کردیا' پھر اپنا خیال ظاہر کیا کہ شاید نگار بادشاہ بیگم سے مل کر سب کچھ بتادینا چاہتی تھی۔ جب دلاور خاں نے خود اپنے کانوں سے سنا کہ نگار' بادشاہ بیگم کو اس سازش سے آگاہ کرنے والی ہے تو اس نے نگار کو دریچے سے خنجر پھینک کر قتل کردیا۔

''اگر تمہارا بیان درست تسلیم کرلیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دلاور خاں نگار کو ہمارے پاس لے کر ہی کیوں آیا؟'' بادشاہ بیگم نے اعتراض کیا۔

''اسے نگار نے یہ نہیں بتایا تھا کہ حضور والا سے کیوں ملنا چاہتی ہے! عبداللہ خاں نے جواب
دیا۔ اس کی مخبری کے متعلق کوئی بات نہ آئے۔ بادشاہ بیگم نے وعدہ کرلیا اور اسی کے ساتھ عبداللہ خاں کو
''یہ بات تم اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہو عبداللہ خاں؟'' بادشاہ بیگم نے پوچھا۔ لید کی کہ فی الحال مبارک علی کا نام سامنے نہیں آنا چاہئے!
''میں غالباً حضور کو یہ بتا چکا ہوں کہ داروغۂ زنداں کے نائب مبارک علی نے دلاور خاں اور نگا جب عبداللہ خان نے بھی رخصت کی اجازت چاہی تو بادشاہ بیگم بولیں۔''عبداللہ خاں! ہم لگی
کا تعاقب کیا تھا۔ اسی دوران میں اس نے نگار اور دلاور خاں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی جس سے کے قائل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں محل میں جو کچھ لاقانونیت ہوئی اس کا ذمہ دار ہم تمہیں سمجھتے
اسے معلوم ہوا کہ دلاور خاں اس بات سے لاعلم ہے کہ نگار، حضور سے کیوں ملنا چاہتی ہے!'' عبداللہ خاں یہ سب کچھ یقیناً تمہاری غفلت اور ناتجربہ کاری کے سبب ہوا ہے۔ ان حالات نے ثابت کر دیا ہے
نے بتایا۔ تم اس اہم عہدے کیلئے موزوں نہیں ہو ہمیں یقین ہے کہ جب ابا حضور کے علم میں یہ واقعات آ ئیں
''اسی وقت بادشاہ بیگم نے اپنی کنیز کو حکم دیا کہ مبارک علی کو فوراً ان کے حضور میں پیش کیے تو وہ تمہیں معزول کر دیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ تم اس سے پہلے ہی استعفیٰ دے دو کہ اسی میں تمہاری
جائے۔ اس کے بعد وہ عبداللہ خاں سے مخاطب ہوئیں۔ عبداللہ خاں! تم مبارک علی کے آنے تک یہیں بھلائی ہے۔''
ٹھہرو گے تاکہ ہم تمہارے بیان کی تصدیق کر سکیں۔'' ''میں شرمندہ ہوں حضور والا! انشاء اللہ آئندہ حضور کو مجھ سے کسی قسم کی شکایت نہیں ہوگی۔''
''بہتر ہے حضور!'' عبداللہ خاں نے پرسکون آواز میں کہا۔ عبداللہ خاں نہایت انکساری سے بولا۔
مبارک علی کا وہاں بلایا جانا خود عبداللہ خاں کے حق میں بہتر تھا۔ مبارک علی کا بیان اسے ہر قسم ''اگر تمہارا تعلق سادات بارہہ سے نہ ہوتا' اگر تم مرحوم جمادت الملک سید احمد بارہہ کے
کے شکوک وشبہات سے پاک کرسکتا تھا۔ وہ اطمینان سے وہیں بیٹھا رہا۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جہاں نگار کا قتل حب زادے نہ ہوتے اور خود ابا حضور کی نظرِ عنایت تم پر نہ ہوتی تو ہم تمہیں خود اپنے حکم سے معزول کر
ہوا تھا۔ ایک بار پہلے بھی بادشاہ بیگم اسے یہاں طلب کر چکی تھیں۔ باہر سے لوگوں کی چہ مگوئیاں عبداللہ یتے۔ بہرحال اگر اب ہم نے آئندہ تمہاری کوئی کوتاہی محسوس کی تو ہم خود ابا حضور سے تمہیں برخاست
خاں کو سنائی دے رہی تھیں۔ عبداللہ خاں نے محسوس کیا تھا کہ بادشاہ بیگم کے خادم نگار کی لاش اٹھا کر قریب کرنے کی درخواست کریں گے۔ اب تم جاسکتے ہو! لیکن ہمارے مشورے پر غور ضرور کرنا کہ تمہیں استعفیٰ
کمرے سے گزر رہے ہیں۔ یہ اندازہ اس نے خادموں کی سرگوشیوں سے لگایا گیا تھا کیوں کہ وہ اس وقت دے دینا چاہئے کیوں کہ اب ابا حضور کو حالات کا علم ہوگا تو وہ کسی صورت تمہاری کوتاہی کو معاف نہیں
جس کمرے میں تھا اس کے دروازوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ اسی وقت عبداللہ خاں کے ذہن یں گے۔ تم ناواقف نہیں ہو کہ وہ کتنے سخت گیر ہیں!'' بادشاہ بیگم یہ کہہ کر چپ ہوگئیں۔
میں یہ خیال آیا کہ اٹھ کر دیکھوں کہیں ایسا تو نہیں کہ نگار ابھی تک زندہ ہو۔ اگر ایسا ہی تھا تو یہ خطرناک بھی ''میں حضور کے مشورے پر یقیناً غور کروں گا۔'' عبداللہ خاں نے بے دلی سے کہا اور تسلیمات
ہوسکتا تھا۔ نگار مرنے سے پہلے سب کچھ بتا سکتی تھی مگر عبداللہ خاں نے اس خیال کو فوراً اپنے ذہن میں سے بجالا کر کمرے سے الٹے پاؤں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔
جھٹک دیا۔ وہ اس جگہ سے اٹھ کر خود کو مشکوک بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے دل پر جبر کئے بیٹھا رہا۔ ذرا ہی اب اسے پہلے فکر یہ تھی کہ فوراً نگار کے بارے میں معلوم کرے۔ نگار کی زندگی اس کی موت
دیر بعد مبارک علی اس کمرے میں داخل ہوا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ عبداللہ خاں سے پروانہ بن سکتی تھی۔ دلاور خاں کی طرف سے وہ مطمئن تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے دلاور خان
کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ پھر جب اس نے بادشاہ بیگم کی آواز سنی تو آدابِ شاہی کے مطابق تسلیمات بجالایا۔ ودم توڑتے دیکھا تھا۔ ویسے دلاور خاں کو قتل اس نے انتقامی جذبے کے زیرِ اثر کیا تھا۔ اگر دلاور خاں
اس کا پورا بیان بادشاہ بیگم نے سنا جس میں داروغۂ زنداں سیدی قاسم کی شراب نوشی اور فرائض سے غفلت زندہ بھی بچ جاتا تو عبداللہ خاں کو اس کی طرف سے کوئی فکر نہ ہوتی مگر نگار کا معاملہ برعکس تھا۔
کا بھی ذکر تھا۔ عبداللہ کو جب محافظ دستے کے کچھ افراد سے معلوم ہوا کہ نگار ابھی مری نہیں زندہ ہے تو اس
''نہ جانے اس بدبخت میں کیا لعل جڑے ہیں کہ شہزادہ عظیم الشان اسے پسند کرتے ہیں۔ بے اوسان خطا ہوگئے۔
بہرحال ہم ابا حضور سے ملیں گے تو داروغہ کی شکایت کرکے اسے معزول کرنے کی درخواست کریں گے۔'' ''اس کے سینے میں گہرا زخم لگا ہے اور خون کافی تعداد میں بہہ گیا ہے۔ بظاہر اس کے بچنے کی
بادشاہ بیگم نے کہا۔ مید نہیں مگر محل کے طبیب اور جراح اسے بچانے کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں کیوں کہ بادشاہ بیگم کا حکم
بادشاہ بیگم کی اس بات سے عبداللہ خاں کے علم میں یہ نئی بات بھی آئی کہ داروغۂ زنداں سیدی ہے کہ اسے کم از کم ایک بار ہوش ضرور آنا چاہئے تاکہ وہ اپنا آخری بیان دے سکے۔'' ایک محافظ نے اسے
قاسم کو شہزادہ عظیم الشان کی پشت پناہی حاصل تھی۔ غالباً اسی سبب سے بادشاہ بیگم نے سیدی قاسم کے ہری تفصیل سے آگاہ کیا۔
خلاف حکم دینے سے اجتناب کیا تھا۔ ''نگار اس وقت ہے کہاں؟'' عبداللہ خاں کوشش کے باوجود اپنے لہجے کا اضطراب نہ چھپا
رخصت ہونے سے قبل مبارک علی نے بادشاہ بیگم سے درخواست کی کہ داروغۂ زنداں کے علم بکا۔
''اسے طبیب شاہی اپنے ہمراہ لے گئے ہیں۔ اور وہاں جانے کی اجازت کسی کو نہیں۔ یہ حکم

بادشاہ بیگم کا ہے۔ انہوں نے قلعہ دار محمد یار خان کو حکم بھیجا ہے کہ وہ بہ ذات خود نگار کی نگرانی کرائیں اور کس کو اس کمرے میں داخل نہ ہونے دیں جہاں طبیب نگار کی جان بچانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

''محافظ دستے کے نائب نے تفصیل سے عبداللہ خاں کے سوال کا جواب دیا۔

عبداللہ خاں کے قدم جیسے خود بہ خود طبیب شاہی کی سکونت گاہ کی طرف اٹھنے لگے۔ جب و وہاں پہنچا تو اس نے ہر طرف محافظوں کو مستعد اور چوکنا پایا۔ ایک محافظ نے اسے آگے بڑھتے دیکھا تو اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

''معاف کیجئے گا سرکار' آگے جانے کی ممانعت ہے اور یہ حکم بادشاہ بیگم کا ہے۔'' محافظ نے ادب کے ساتھ کہا۔

اس طرح روکے جانے پر عبداللہ خاں کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے ضبط کیا اور محافظ سے بولا۔ قلعہ دار محمد یار خان کہاں ہے؟''

''وہ طبیب شاہی کے دروازے پر موجود ہیں تا کہ نگار کو کچھ دیر کیلئے بھی ہوش آجائے تو وہ اس کا بیان قلم بند کر سکیں۔'' محافظ نے بتایا۔

''ان سے کہو کہ ہم ان سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ وہ اگر خود نہیں آسکتے تو ہمیں اپنے پاس تک آنے کی اجازت دیں۔'' عبداللہ خاں نے محافظ سے کہا۔ عبداللہ خاں کے لہجے میں حکم شامل تھا۔ ''بہت ہے حضور! آپ یہیں تشریف رکھیں' میں انہیں اطلاع کئے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر محافظ ایک راہداری میں م گیا۔

عبداللہ خاں اس بات کی پوری کوشش کر رہا تھا کہ اپنے حواس قابو میں رکھے۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ نگار تک اگر رسائی ممکن نہیں تو خود کو اس کے قریب سے قریب تر کرے اور اس کا ذریعہ قلعہ دار محمد یار خان ہی ہو سکتا تھا جسے وہ بہ آسانی بے وقوف بنا سکتا تھا۔ عبداللہ خاں کو امی تھی کہ قلعہ دار اس کا نام سن کر اسے فوراً اپنے پاس بلوائے گا اور ہوا بھی یہی!

''وہ وہیں آپ کے منتظر ہیں۔ وہ معذرت خواہ ہیں کہ آپ کی پذیرائی کیلئے خود یہاں تک نہیں آسکتے۔'' محافظ نے ادب سے جھک کر کہا۔

محافظ کے ہمراہ وہ قلعہ دار کے پاس پہنچ گئے۔ عبداللہ خاں کو دیکھتے ہی قلعہ دار بولا۔ ''میں خو سوچ رہا تھا کہ آپ ادھر ضرور تشریف لائیں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں محافظوں کو ہدایت دینا بھول گ کہ آپ کو اس طرف آنے سے نہ روکا جائے''

''کوئی بات نہیں' کوئی بات نہیں۔'' عبداللہ خاں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا' پھر کہنے لگا۔

''کیا نگار کو ہوش آیا؟... کیا حالت ہے اس کی؟''

''ابھی تک تو وہ بے ہوش ہے۔ طبیب شاہی نے کہا ہے کہ جیسے ہی نگار کو ہوش آیا' وہ مجھے مطل کریں گے۔'' قلعہ دار نے جواب دیا' پھر بولا۔ ''ویسے دلاور خاں کی طرف سے خود میں بھی کبھی کبھ مطمئن نہیں رہا۔ وہ اچھے کردار کا آدمی نہیں تھا۔ بہرحال اب تو وہ مر ہی چکا ہے اور غیبت اچھی نہیں ہوتی۔ خدا اس کے گناہوں کو معاف کرے۔ کیا واقعی اس نے آپ پر حملہ کر دیا تھا؟''

''ہاں یہ حقیقت ہے۔ اگر میں بروقت نہ سنبھل جاتا تو وہ خود میرے خنجر پر ہاتھ ڈال چکا ہوتا۔ اس کا یوں جارح ہونا اور گستاخی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ واقعی مجرم تھا۔ میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے اسے خنجر پھینکتے دیکھا تھا۔'' عبداللہ خاں نے جواب دیا۔

''خدا کرے نگار کو ہوش آجائے اور وہ اپنا آخری بیان دے سکے تا کہ اس الجھی ہوئی گتھی کا کوئی تو سرا ہاتھ آجائے۔''

''یقیناً۔'' عبداللہ خاں نے اپنے احساسات پر قابو پاتے ہوئے تائید میں کہا۔

عبداللہ خاں کے دل وزبان کے درمیان کوئی ربط نہیں تھا مگر وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے دلی جذبات چھپانے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ نگار بے ہوشی کے دوران میں سفر آخرت پر روانہ ہو جائے۔ اگر اس وقت اسے کسی بھی طرح یہ موقع مل جاتا کہ نگار کو موت کی نیند سلا دے تو وہ اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھاتا۔ بادشاہ بیگم اس کی توقع سے زیادہ دور اندیش ثابت ہوئی تھیں۔ گزرنے والا ہر لمحہ اس کے اضطراب میں اضافہ کر رہا تھا۔ قلعہ دار کو اس نے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ اس کی ہمدردی میں وہاں موجود ہے۔

صبح ہونے تک طبیبوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود نگار صرف ایک بار بس چند لمحوں کے لئے ہوش میں آئی۔ اس وقت عبداللہ خاں کی حالت قابل دید تھی۔ جب طبیب شاہی کے ملازم نے نگار کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی تھی۔

اس اطلاع پر قلعہ دار تیزی سے اندر لپکا اور عبداللہ خاں نے بھی تقلید کی۔ وہ کیوں کہ قلعہ دار کے ہمراہ تھا۔ اس لئے کسی میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اسے اندر جانے سے روک سکتا۔

اندر داخل ہوتے ہی عبداللہ خاں کی نظر نگار پر پڑی۔ نگار کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کھلے ہوئے تھے مگر شاید بے انتہا نقاہت اور کمزوری کے سبب وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ قلعہ دار دوڑ کر اس مسہری کی طرف بڑھا جہاں نگار دراز تھی۔ نگار کی آنکھیں لمحہ بھر کو کھلیں اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عبداللہ خاں کی طرف دیکھا۔ نگار کے چہرے پر خوف کا ایک سایہ سا لہرایا۔ پھر اس سے پہلے کہ قلعہ دار اس کے قریب پہنچ سکتا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ نگار کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ عبداللہ خاں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ نگار اسی کو دیکھ کر خوف ودہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی ورنہ ممکن تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کہنے میں کامیاب ہو جاتی۔ شاید عبداللہ خان کی قسمت ہی اس کا ساتھ دے رہی تھی کہ آنکھیں کھولتے ہی نگار کی نظر اس پر پڑی۔ اس شخص پر جس کے خلاف شاید وہ اپنا آخری بیان دینا چاہتی تھی۔ اس اعتبار سے عبداللہ خان کی وہاں موجودگی سودمند ثابت ہوئی تھی۔

''افسوس کہ وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ اگر اسے صبح سے پہلے دوبارہ ہوش نہ آسکا تو اس کی زندگی کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' طبیب شاہی کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''آپ حضرات باہر تشریف لے جائیں۔ میں ایک کوشش اور کرتا ہوں۔''

قلعہ دار اور عبداللہ خان کمرے سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہی قلعہ دار بولا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ آپ کو دیکھ کر ڈر گئی ہو۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کیلئے ہل رہے تھے۔ وہ

کچھ کہنا چاہتی تھی۔ پھر اس کی نظر آپ پر پڑی تھی اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ اس کے بعد پھر اس پر غفلت طاری ہوگئی تھی۔"

عبداللہ خاں نے قلعہ دار کی بات سنی تو چوکنا ہوگیا۔ وہ قلعہ دار کو جتنا سیدھا سمجھ رہا تھا' درحقیقت وہ اتنا سیدھا نہیں تھا۔ قلعہ دار کی قوت مشاہدہ یقیناً خاصی فعال تھی۔ اس نے چند ہی لمحوں اور ایسے ہنگامی لمحوں میں بھی حقیقت کا سراغ لگالیا تھا۔ اس کے خیال کی تردید کرکے عبداللہ خاں اسے اپنی طرف سے کسی قسم کے شبے کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ اسی لئے بغیر توقف بول اٹھا۔ "ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو کیوں کہ میرے ہی حکم پر اسے قید کیا گیا تھا۔ اس نے غیر قانونی طور پر قید سے رہائی حاصل کی تھی اس لئے اس کا خوف زدہ ہونا سمجھ میں آتا ہے۔"

"اگر آپ خیال نہ فرمائیں تو میں آپ سے ایک درخواست کروں۔" قلعہ دار نے عبداللہ خاں کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ نرم تھا۔

"فرمایئے۔" عبداللہ خاں بولا۔

"اب اگر نگار کو ہوش آجائے تو آپ میرے ہمراہ کمرے میں داخل نہ ہوں تاکہ وہ آپ کو دیکھ کر خوف زدہ نہ ہو اور جو کہنا چاہتی ہو کہہ سکے۔" قلعہ دار نے کسی قدر جھجکتے ہوئے وہ بات کہہ ہی دی جو اس کے دل میں تھی۔

"بالکل' بالکل! اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ویسے بھی نگار کا آخری بیان لینے کی ذمہ داری بادشاہ بیگم نے آپ کے سپرد کی ہے۔ میں تو صرف اس لئے یہاں رک گیا کہ آپ تنہائی محسوس نہ کریں اور اسی کے ساتھ میرا یہ تجسس بھی دور ہوسکے کہ نگار نے کیا آخری بیان دیا! عبداللہ خاں نے بہ ظاہر خوش دلی کا مظاہرہ کیا مگر حقیقتاً اسے قلعہ دار کی وہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ قلعہ دار سے اسے اس طرح کی ہوشیاری کی توقع نہیں تھی۔ اس طرح تو اس کی وہاں موجودگی ہی بے معنی ہوجاتی تھی' لیکن وہ خود کو اس بات پر بھی آمادہ نہ کرسکا کہ وہاں سے چلا جائے حالانکہ اب وہاں اس کا رہنا بے مقصد ہی تھا۔ وہ دل ہی دل میں خدا سے دعا کرنے لگا کہ نگار کو ہوش نہ آسکے۔ وہ شاید دعا کی قبولیت کا وقت تھا۔ کچھ دیر بعد ہی طبیب شاہی نے اطلاعات دی کہ نگار بے ہوشی کے دوران ہی سفر آخرت پر روانہ ہوگئی۔

عبداللہ خاں کے سینے سے جیسے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خوشی سے قہقہے لگائے مگر وہ ظاہر داری پر مجبور تھا۔ اس نے نگار کی موت پر قلعہ دار سے افسوس کیا اور پھر اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ صبح ہونے والی تھی۔ عبداللہ خاں کے کشیدہ اعصاب کو اب سکون میسر ہوا تھا۔ اس کا ذہن بوجھل ہونے لگا اور پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکنے لگیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور لباس تبدیل کئے بغیر مسہری پر گر پڑا۔ چند ہی لمحے بعد وہ اس فکر سے بے نیاز گہری نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا کہ صبح ہی صبح اس نے بادشاہ بیگم کی دکن روانگی کے انتظامات کرنا ہیں۔

ابھی اس کی آنکھ ہی لگی تھی کہ کسی کھٹکے نے اسے بیدار کردیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی پہلی نظر دریچے پر پڑی۔ کوئی سیاہ پوش دریچے کے ذریعے اس کے کمرے میں کودا تھا۔ صبح کے

دھندلکے میں عبداللہ خاں کو صرف اس کا ہیولا ہی نظر آسکا۔ سونے سے پہلے وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ اس نے دریچوں کی طرف توجہ نہیں دی تھی کہ وہ کھلے ہوئے ہیں۔

کسی سیاہ پوش کو اس طرح اپنے کمرے میں کودتے دیکھ کر عبداللہ خاں کے اعصاب تن گئے۔ آنے والے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی نیک ارادے سے نہیں آیا ہوگا۔ عبداللہ خاں کو اب اس کے ہاتھ میں خنجر بھی نظر آگیا تھا۔ وہ سیاہ پوش دبے پاؤں مسہری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب عبداللہ خاں اور سیاہ پوش کے درمیان اتنا فاصلہ رہ گیا کہ عبداللہ خاں اچھل کر سیاہ پوش پر چھلانگ لگا سکتا تو حرکت میں آگیا۔ اس نے سیاہ پوش پر چھلانگ لگاتے ہی خنجر والے ہاتھ کی کلائی کو اپنے دائیں ہاتھ کی گرفت میں لے لیا تھا۔ سیاہ پوش غالباً اس اچانک حملے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ گرا اور عبداللہ خاں بھی اس پر آگرا' مگر اس دوران میں بھی سیاہ پوش کی کلائی اس کی گرفت میں رہی۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ جسمانی طور پر سیاہ پوش اس سے کمزور نہیں۔ گرتے ہی سیاہ پوش نے زور لگایا اور عبداللہ خاں کو ایک طرف دھکیل دیا۔ پھر وہ یہ کوشش کرنے لگا کہ عبداللہ خاں پر چھا جائے۔ اسی وقت عبداللہ خاں نے اپنا مخصوص داؤ آزمایا اور سیاہ پوش کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ عبداللہ خاں نے دائیں ہاتھ کے جوڑ پر بائیں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی ماری تھی اور سیاہ پوش کے ہاتھ سے خنجر نکل گیا تھا۔ اسی لمحے سیاہ پوش ایک دم اچھلا۔ عبداللہ خاں کی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پھنس گئیں لیکن اس نے جھٹکا دے کر اپنی انگلیاں گرفت سے آزاد کرالیں۔ پھر اس سے پہلے کہ عبداللہ خاں کچھ سمجھ پاتا' وہ جیسے اڑتا ہوا دریچے کی طرف گیا۔

"ٹھہرو... رک جاؤ! میرے ہاتھ میں خنجر ہے اور میرا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔" عبداللہ خان چیخا مگر اس کی دھمکی کا سیاہ پوش پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ شاید عبداللہ خاں کے کھوکھلے لہجے سے سمجھ چکا تھا کہ عبداللہ خان جھوٹ بول رہا ہے۔

عبداللہ خاں کے زمین سے اٹھنے میں جتنی دیر لگی' اتنی دیر میں وہ سیاہ پوش دریچہ عبور کرکے پچھلی راہداری میں کود چکا تھا۔ عبداللہ خان جب تک دریچے کے پاس پہنچا اور راہداری میں جھانک کر دیکھا' سیاہ پوش راہداری کے اختتام تک پہنچ چکا تھا۔ اس کی تیزی اور مستعدی کے پیش نظر یہ توقع فضول ہی تھی کہ وہ عبداللہ خاں کے ہاتھ آسکے گا۔

یہ وہ وقت تھا جب رات کو پہرا دینے والے محافظ اپنے فرائض ادا کرچکے تھے اور جاچکے تھے اس لئے ان سے جواب طلبی لاحاصل تھی۔ حملہ آور نے بہت مناسب اور محفوظ وقت کا انتخاب کیا تھا۔ عبداللہ خاں کا ذہن چکرا کر رہ گیا کہ آخر مجھ پر قاتلانہ حملہ کرانے کی جرأت کس نے کی؟ اور محل میں میری جان کا دشمن کون پیدا ہوچکا ہے؟ وہ غور کرنے لگا کہ اب تک اس کی ذات سے کس کس شخص کو نقصان پہنچا ہے! اس کے ذہن میں یکے بعد دیگرے مختلف نام آنے لگے' ماہ رخ' رابعہ' نگار اور دلاور خان! لیکن ان تینوں کنیزوں قتل میں عبداللہ خاں براہ راست ملوث نہیں تھا' یعنی اس نے دانستہ ان تینوں کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ پھر یہ کہ عبداللہ خاں کے علاوہ کسی کے علم میں یہ بھی نہیں تھا کہ ان تینوں کا قاتل کون ہے! صرف دلاور خان کا مسئلہ رہ جاتا تھا۔ اس کے متعلق سبھی کو معلوم تھا کہ وہ عبداللہ

خاں کے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔

تو کیا مجھ پر حملہ کرنے یا حملہ کرانے والا' دلاور خان کا کوئی ہمدرد تھا؟ عبداللہ خاں کے ذہن میں سوال ابھرا۔ ان حالات میں اس کے سوا کچھ اور سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا صاف مطلب عبداللہ خاں نے یہی لیا کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ اسے ہر حال میں دلاور خان کے ہمدردوں کا سراغ لگانا ہے جن سے وہ لاعلم تھا۔

بیدار ہو جانے کے بعد اب دوبارہ سونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس عرصے میں عبداللہ خاں کو یہ بھی دھیان آ چکا تھا کہ اسے آج ہی بادشاہ کی دکن روانگی کے انتظامات بھی کرنا ہیں۔ اس نے اپنے عملے کے مختلف افراد کو طلب کر کے انہیں اس سلسلے میں احکام دیئے اور خود بھی محل کے اس حصے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں بادشاہ بیگم کا قیام تھا۔ پورا دن ہی انتظامات میں گزر گیا۔

''قلعہ دار احمد یار خان نے صبح ہی قاصد کو پیغام کا جواب دے کر روانہ کر دیا تھا کہ بادشاہ بیگم 'دکن روانگی پر آمادہ ہیں اور ان کی سواری اسی دن شاہجہاں آباد سے روانہ ہونے والی ہے۔

عصر کے وقت بادشاہ بیگم کی سواری قلعے سے روانہ ہوگئی۔ اسی دوران میں عبداللہ خاں کی نظر ایک قوی ہیکل شخص پر پڑی۔ اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ عبداللہ خاں اس کی جسامت اور قد دیکھ کر چونکا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی دیکھ کر تو اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ صبح کے وقت اس پر قاتلانہ حملہ کرنے والا وہی قوی ہیکل شخص ہو سکتا تھا۔ اس نے حملہ آور کے دائیں ہاتھ پر اتنا بھرپور وار کیا تھا کہ حملہ آور کا پہنچا اتر جانا لازمی تھا۔ وہ بڑی نپی تلی ضرب تھی۔ اس شخص کا چہرہ عبداللہ خاں کے لئے قطعی اجنبی تھا۔

بادشاہ بیگم کی سواری قلعے سے نکلتے ہی عبداللہ خاں اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ پھر جیسے ہی عبداللہ خاں کی نظریں اس سے ملیں' وہ شخص کچھ گھبرا سا گیا۔ اس کے بعد وہ اس طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

''سنو! عبداللہ خاں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑا۔ اس کا یوں اچھل پڑنا بھی عبداللہ خاں کے لئے معنی خیز تھا۔''

''جج... جی!... جی فرمایئے۔'' وہ ہکلایا۔

''تمہارے دائیں ہاتھ کو کیا ہوا؟'' عبداللہ خاں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''وہ... وہ کل... نہیں آج... آج صبح میرا پہنچا اتر گیا تھا۔ میں... نے اسی لئے پٹی باندھ لی ہے۔'' وہ گھگھیا کر بولا۔

''پہنچا کیسے اتر گیا؟ کیا کسی سے تمہارا جھگڑا ہو گیا تھا؟'' عبداللہ خاں نے چبھتے ہوئے لہجے سے سوال کیا۔

''جی... جی ہاں... جی نہیں۔ بس... بس نہ جانے کس طرح... میں سو کر اٹھا تو... شاید سوتے میں۔ سو کر اٹھا تو... شاید سوتے میں دب گیا ہوگا۔'' وہ شخص سٹپٹا گیا۔

''تم میرے ساتھ چلو! مجھے تم سے کچھ...'' عبداللہ خان کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔

''زریاب خان!'' کسی نے قریب آ کر اس شخص کو پکارا۔

''عبداللہ خاں نے مڑ کر دیکھا تو داروغۂ زنداں قاسم تھا۔ اس نے عبداللہ خاں کو دیکھ کر ناگواری سے منہ بنایا اور دوبارہ زریاب خاں سے مخاطب ہوا۔ میرے ساتھ آؤ!''

''زریاب خان سے کچھ کام ہے' یہ میرے ساتھ جا رہا ہے۔ عبداللہ خاں بول اٹھا۔''

''معاف کیجئے گا یہ میرا ملازم ہے' آپ کا نہیں اور مجھے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا حق ہے!'' قاسم کے لہجے میں تلخی تھی۔

''لیکن تم یہ کیسے بھول گئے کہ ہم محلات شاہی کے نگران اعلیٰ ہیں۔ ہمارے حکم سے سرتابی تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے!'' عبداللہ خاں کو غصہ آ گیا۔

''میں آپ کو جواب دہ نہیں' قلعہ دار کا ماتحت ہوں' آپ کا نہیں!'' داروغۂ زنداں سیدی قاسم کے جواب میں بے ادبی کا عنصر شامل تھا۔ عبداللہ خاں کو جواب دے کر وہ مڑا اور زریاب خان سے بولا۔ چلو میرے ساتھ!'' یہ کہتے ہی وہ آگے بڑھ گیا۔

''ٹھہر جاؤ!'' عبداللہ خان غصے کے عالم میں چیخا مگر ان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں عبداللہ خاں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

عبداللہ خاں کا خون کھول اٹھا۔ اب وہ فوری طور پر قلعہ دار محمد یار خان سے ملنا چاہتا تھا جو کچھ دیر پہلے تک وہاں تھا۔ عبداللہ خاں کا رخ اب قلعہ دار کے دفتر کی طرف تھا اور وہ سوچ رہا تھا مجھ پر حملہ کرنے والا کیا واقعی زریاب خان تھا؟ پھر اس کے اور داروغۂ زنداں قاسم کے مابین کیا تعلق ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ داروغۂ زنداں ہی کے اشارے پر زریاب خان نے مجھ پر حملہ کیا ہو؟

میری تمام تر توجہ کا مرکز عبداللہ خاں کا ذہن تھا۔ تاریخ کے طلسم کدے میں' میں ایک ایسے اہم کردار کو دیکھ رہی تھی۔ جو مغل تاجداروں کی آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہونے والا تھا۔ اس کی پیشانی چوڑی' آنکھیں بڑی اور روشن تھیں۔ اس کا رنگ شاید جنگ کے تپتے ہوئے میدانوں نے سنولا دیا تھا مگر سانولے پن کے باوجود اس کے چہرے میں بلا کی کشش اور مردانہ وجاہت تھی۔ اس کا جسم متناسب اور قد دراز تھا۔ قلمیں بڑھی ہوئی اور سروں کی طرف سے کانوں کی جانب مڑی ہوئی تھیں۔ داڑھی اس کے چہرے پر بھلی لگتی تھی۔ ہر عہد میں عمال حکومت اپنے آقاؤں کی تقلید کرتے ہیں جو برسر اقتدار ہوتے ہیں۔ عموماً انہی کی زبان' انہی کی تہذیب' انہی کا لباس' انہی کی بود و باش ہر عہد کا مزاج بن جاتی ہے۔ سو اس عہد میں بھی ایسا ہی تھا۔ عمال' بادشاہ وقت کی تقلید کرتے تھے اور عوام عمال کو دیکھ کر انہی کا سا بننے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ الگ بات کہ معاشی جبر عوام کے اس ''شوق'' کو پورا نہیں ہونے دیتا تھا مگر عبداللہ خاں کسی جبر کا شکار نہیں تھا۔ وہ خود جابروں کے درمیان ایک بڑا جابر بننے کا آرزومند تھا۔ مستقبل کے اس بڑے جابر و آمر کی ایک ایک حرکت پر میری نظر تھی۔ شیطانی ذہانت کا وہ مالک بڑے نپے تلے قدم اٹھا رہا تھا۔ ماضی کا یہ سفر مجھے انتہائی سنسنی خیز معلوم ہو رہا تھا۔ میں اس عہد کے ذہنوں کو پڑھ کر' کرداروں کو دیکھ اور سن کر جو کچھ محسوس کر رہی تھیں' بیان کر رہی ہوں۔

داروغۂ زنداں سیدی قاسم کی حیثیت اور اس کا عہدہ عبداللہ خاں سے بہر حال بہت کم تھا۔

اس نے جس طرح عبداللہ خاں کی ہتک کی تھی' وہ یقیناً ناقابل برداشت کہی جاسکتی تھی۔ قلعہ دار محمد یار خان کے ذریعے عبداللہ خاں' داروغہ سے جواب طلب کرنا چاہتا تھا کہ اس نے بدتمیزی کی جرأت کیسے کی؟

عبداللہ خاں تیز قدمی سے قلعہ دار کے دفتر میں داخل ہوا۔ قلعہ دار اسے دیکھ کر چونک اٹھا کیوں کہ کچھ ہی دیر پہلے ان دونوں کی ملاقات ہوچکی تھی۔ ملاقات کے دوران میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ عبداللہ خاں' قلعہ دار کے دفتر آئے گا۔ پھر بھی قلعہ دار نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

''فرمایئے کیسے زحمت فرمائی؟'' قلعہ دار نے دریافت کیا۔

''مجھے آپ کے داروغہ سیدی قاسم کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے۔ کیا اسے اتنے اختیارات حاصل ہیں کہ وہ میرے عہدے کو نظرانداز کر کے حکم عدولی پر اتر آئے؟'' کوشش کے باوجود عبداللہ خاں اپنی آواز کو پست نہ رکھ سکا۔

''آخر بات کیا ہوئی؟'' قلعہ دار نے پوچھا۔

''میں ایک شخص زریاب خان کو اپنے ساتھ لے جا کر اس سے کچھ تفتیش کرنا چاہتا تھا کہ وہ درمیان میں آ گیا اور زریاب خان کو میرے ساتھ جانے سے روک دیا۔ میں بہرحال اسے اپنی توہین تصور کرتا ہوں۔ اس گستاخ نے کہا تھا کہ زریاب خان اس کا اصل ملازم ہے اور یہ بھی کہ وہ میرے سامنے نہیں' آپ کو جواب دہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس گستاخی پر داروغہ سے جواب طلب کریں۔''

عبداللہ خاں کی بات سن کر قلعہ دار کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولا۔ ''اس نے اتنا بھی کہہ دیا تو بہت ہے کہ میرے سامنے جواب دہ ہے حالانکہ اب تک میری اتنی جرأت نہیں ہوسکی کہ اس سے کسی بھی معاملے میں جواب طلب کرسکوں۔''

''سبب؟ آخر آپ اس کے افسر ہوکر اس سے اتنے دبتے کیوں ہیں؟'' عبداللہ خاں نے بہ حیرت سوال کیا۔

''اس لئے کہ میں معزول ہونا نہیں چاہتا۔ قلعہ دار نے بے دلی سے کہا۔''

''کیا مطلب؟''

''داروغۂ زنداں کی جواب طلبی کرنے کا مطلب یہی ہے' یعنی معزولی!''

''آخر اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔ یہ تو کھلی ناانصافی ہے!'' عبداللہ خاں کے لہجے میں ترشی تھی۔

''اس کی وجہ شہزادہ عظیم الشان ہیں۔ شاید آپ کے علم میں نہیں کہ داروغہ' شہزادہ عظیم الشان کا آدمی ہے۔ ویسے یہ عرض کروں کہ زریاب خان انتہائی خطرناک شخص ہے اور وہ قاسم کا ذاتی ملازم ہے۔ زریاب خاں اسی کو جواب دہ ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ زریاب خان اس کا ملازم ہے۔ زریاب خان کی تنخواہ شاہی خزانے سے نہیں' قاسم کی جیب خاص سے ادا ہوتی ہے۔'' قلعہ دار نے انکشاف کیا۔

''مطلب یہ ہوا کہ قانونی طور پر زریاب خاں سے کسی قسم کی تفتیش ممکن نہیں۔ ہاں آپ یہ بتائیں کہ زریاب خان کی بات انتہائی خطرناک ہونے کے متعلق...''

''میں عرض کرتا ہوں۔'' قلعہ دار بول اٹھا۔ ''میں سمجھ گیا آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں! میری اطلاعات کے مطابق زریاب خان پیشہ ور قاتل ہے۔ میں اسے قلعے میں دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔'' قلعہ دار نے بتایا۔

''پیشہ ور قاتل؟... تو کیا وہ قلعے میں نہیں رہتا؟'' عبداللہ خاں نے پوچھا۔

''جی نہیں۔ وہ کبھی کبھار ہی قلعے میں دکھائی دیتا ہے۔ قلعے میں اس کی موجودگی کسی نہ کسی حادثے پر منتج ہوتی ہے۔ میں اسی لئے فوراً چوکنا ہوجاتا ہوں۔''

''کیا پہلے بھی کوئی حادثہ ہوچکا ہے۔''

''ہاں۔'' قلعہ دار نے جواب دیا۔ ''ایک بار ایک کنیز اغوا ہوئی تھی جس کا آج تک پتا نہیں چلا کہ کہاں گئی! اس کنیز کے بارے میں سنا گیا تھا کہ شہزادہ عظیم الشان کسی سبب اس سے خفا ہوگئے تھے۔ وہ کنیز بادشاہ سلامت کی خدمت میں تھی۔ اس کے علاوہ ایک مرتبہ بادشاہ وقت کے محافظ دستے کا نگران قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق بھی یہی معلوم ہوا تھا کہ شہزادہ عظیم الشان کسی وجہ سے اسے محافظ دستے کا نگران نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ شہزادے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بادشاہ سلامت سے اپنی خواہش کا اظہار کرسکتے۔'' قلعہ دار نے تفصیل سے زریاب خان کے بارے میں بتادیا۔

''کیا یہ سب کچھ بادشاہ سلامت کی موجودگی میں ہوا؟'' عبداللہ خاں نے حیرت سے دریافت کیا۔ اسے تو یہ معلوم تھا کہ بادشاہ وقت کو لاقانونیت قطعی پسند نہیں اور یہ کہ وہ کافی سخت مزاج ہیں' کسی بھی معاملے میں سختی ہی سے باز پرس کرتے ہیں۔

''ان دونوں حادثات کے وقت بادشاہ سلامت شاہجہاں آباد میں موجود نہیں تھے۔'' قلعہ دار نے جواباً کہا۔

''تو کیا محافظ دستے کا نگراں بادشاہ سلامت کے ساتھ نہیں گیا؟''

''اس کی بدقسمتی کہ وہ ان دنوں کچھ علیل ہوگیا تھا۔ اسی سبب وہ بادشاہ سلامت کے ساتھ شاہجہاں آباد سے نہیں جاسکا تھا۔'' قلعہ دار نے وضاحت کی۔ قلعہ دار کی باتوں سے عبداللہ خاں کو خلوص کی خوشبو آرہی تھی۔ اس نے قلعہ دار کو اپنے اوپر حملہ ہونے کے متعلق بتادیا اور یہ بھی کہ قاتلانہ حملے کا شبہ زریاب خان پر ہے۔ بطور ثبوت اس نے زریاب کے اترے ہوئے پنجے کا بھی ذکر کیا۔

عبداللہ خاں کی بات سن کر قلعہ دار چونک اٹھا۔ اسی کے ساتھ اس کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار بھی ہونے لگا۔

''یہ تو بڑی تشویشناک بات ہے'' قلعہ دار بولا۔

''لیکن زریاب خان نے کس کے اشارے پر ایسا کیا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''اس میں کوئی تشویش کی بات نہیں۔ میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔ رہا یہ سوال کہ اس قاتلانہ حملے میں کس کا ہاتھ ہے تو اس سوال کا جواب بھی تلاش کرچکا ہوں۔ میں نے حالات وواقعات سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ زریاب خان کی پشت پر داروغۂ زنداں سیدی قاسم ہے۔ آپ پوچھیں گے سبب؟ اور یہ کہ آخر اسے مجھ سے کیا دشمنی ہے جو قتل کرا دے؟ تو دلاور خان اور قاسم کا معاملہ واضح

ہے۔ دلاور خان میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکا ہے۔ وہ دلاور خان جو قاسم کا خالہ زاد ہونے کے علاوہ اس کا بہترین دوست بھی تھا۔ سمجھے آپ!'' عبداللہ خاں نے اس دوران میں جو کچھ سوچا تھا اس سے قلعہ دار کو آگاہ کر دیا۔

''تو یہ انتقامی کارروائی تھی! قلعہ دار نے ٹھنڈا سانس بھرا۔'' آپ نے جو نتائج اخذ کئے ہیں قطعی درست ہیں۔ مجھے خوشی یہ ہو رہی ہے کہ آپ اتنی جلدی بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔''

''فی الحال ہمیں داروغۂ زنداں کو برداشت کرنا پڑے گا۔'' قلعہ دار بولا۔''خیر کوئی مضائقہ نہیں۔'' عبداللہ خاں مونڈھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا چل دیئے آپ! ابھی تشریف رکھیے! گفتگو میں مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ آج پہلی بار آپ میرے دفتر آئے ہیں۔ مجھے آپ کی کچھ نہ کچھ تواضع کرنا چاہئے تھی۔ فرمایئے کون سا مشروب پیجئے گا؟'' قلعہ دار نے عبداللہ خاں کا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں تکلف کی کوئی ضرورت نہیں! اب میں چلوں گا۔''

''اب آپ کے پاس کام بھی کیا ہے! شاہی خاندان کا کوئی بھی فرد قلعے میں موجود نہیں۔ قلعہ دار نے عبداللہ خاں کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں' لیکن میں کچھ دیر تخلیے میں حالات پر غور کرنا چاہتا ہوں۔'' عبداللہ خاں نرمی سے بولا۔

''آپ کی مرضی ویسے میری خوشی یہی تھی کہ آپ مزید کچھ دیر تشریف رکھتے۔''

''پھر کبھی سہی۔'' عبداللہ خاں یہ کہہ کر قلعہ دار کے دفتر سے نکل گیا۔

عبداللہ خاں جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو غیر ارادی طور پر اس کے قدم رک گئے۔ نہ جانے کیوں اسے کسی خطرے کا احساس ہوا تھا۔ وہ پلٹ کر فوراً باہر نکلا اور اپنے محافظ خاص کے قریب پہنچ گیا۔

''کیا ہماری غیر موجودگی میں کوئی ہماری خواب گاہ میں داخل ہوا تھا؟'' عبداللہ خاں نے محافظ خاص سے سوال کیا۔

''جی... جی نہیں حضور!'' جواب ملا۔

''کیا تم ہمارے جانے کے بعد سے اب تک یہیں موجود رہے ہو؟''

''اس پر محافظ کچھ گھبرا گیا۔''

''عبداللہ خاں نے محافظ کی کیفیت بھانپ لی اور سختی سے پوچھا''میری بات کا جواب دو!''

''وہ... وہ حضور... میں صرف چند لمحات کیلئے یہاں سے ہٹا تھا۔''

''کیوں؟'' عبداللہ خاں چوکنا ہو گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ محافظ کچھ کہتا یا مزید کوئی سوال کیا جاتا' عبداللہ خاں اچھل پڑا۔ وہ پھنکار یقیناً کسی سانپ ہی کی ہو سکتی ہے۔ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے ایک دم ہٹ کر عبداللہ خان ایک طرف ہو گیا۔ اسی وقت جب عبداللہ خاں نے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا تو ایک کالا سانپ اس کی مسہری سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

محافظ کی نظر بھی سانپ پر پڑی اور وہ بدحواس ہو کر چیخنے لگا۔''سانپ!... سانپ!'' اب سانپ مزید آگے بڑھنے کی بجائے قالین پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا پھن ادھر ادھر حرکت کر رہا تھا۔

''چپ رہو!'' عبداللہ خاں نے محافظ کو ڈانٹا اور پیٹی سے خنجر نکال لیا۔

''دوسرے ہی لمحے عبداللہ خاں نے سانپ کے لہراتے ہوئے پھن کا نشانہ لیا۔ خنجر لپکتا ہوا سانپ کی طرف بڑھا۔ عبداللہ خاں کا نشانہ بڑا پکا تھا۔ سانپ کے پھن میں خنجر پیوست ہو گیا اور وہ قالین پر بل کھانے لگا۔ عبداللہ خاں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور سانپ کا پھن اپنے بھاری جوتے سے کچل دیا۔ کچھ ہی دیر میں سانپ بے حس و حرکت ہو گیا۔

ایک ہی دن میں عبداللہ خاں پر یہ دوسرا قاتلانہ حملہ تھا۔ اگر کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے خطرے کا احساس نہ ہو جاتا تو شاید وہ زہریلا سانپ اس کی موت کا حکم بن جاتا۔ عبداللہ خاں نے بلا تاخیر اسی وقت اپنے تمام عملے کو طلب کر لیا۔

عبداللہ خاں نے اپنے عملے کو حکم دیا کہ محل کے اس حصے میں کسی کو بغیر اجازت داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی خواب گاہ کی پچھلی راہداری میں پانچ مسلح افراد کو متعین کر دیا جو چوبیس گھنٹے راہداری کی نگرانی کر سکیں۔ وہاں ایک وقت میں کم سے کم دو افراد کو ضرور موجود رہنا تھا تا کہ بیک وقت پانچ افراد کو شب و روز مسلسل اپنے فرائض کی ادائیگی نہ کرنا پڑے اور انہیں آرام کرنے کا وقت بھی مل سکے۔ اپنی خواب گاہ کے دروازے پر بھی اس نے ایک کی بجائے دو محافظ متعین کر دیئے تا کہ ان میں سے کوئی ایک کسی ضرورت سے چلا جائے تو دوسرا موجود رہے۔

ان تمام حفاظتی اقدامات کا مقصد یہ تھا کہ عبداللہ خاں اپنے اعصاب پر کوئی بوجھ لئے بغیر بے خوف و خطر سکون و اطمینان سے قلعے میں رہ سکے۔

سانپ کا مردہ جسم دیکھ کر عملے کے لوگوں کے چہروں پر حیرت کے آثار عود کر آئے تھے مگر ان میں سے کسی کو اتنی جرأت نہ ہو سکی کہ اس سلسلے میں عبداللہ خاں سے کچھ پوچھ سکتا۔ اب وہ حفاظتی اقدامات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔

عبداللہ خاں کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ اپنی خواب گاہ سے گیا تھا تو دانستہ احتیاطاً تمام دریچے بند کر گیا تھا جو اس وقت تک بند تھے۔ غالباً اسی لئے اس کے دشمن نے محافظ کو وہاں سے ہٹانا ضروری سمجھا تھا۔ عبداللہ خاں نے اپنے محافظ سے جان بوجھ کر یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ اسے کس بہانے اور کس نے وہاں سے ہٹنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ بخوبی جان چکا تھا کہ اس پر حملہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔

تقریباً ایک ماہ کسی قابل ذکر واقعے کے بغیر گزر گیا۔ اس عرصے میں کوئی غیر متوقع بات نہیں ہوئی۔ شاید داروغۂ زنداں سیدی قاسم یہ سمجھ گیا تھا کہ عبداللہ خان کو اتنی آسانی سے ختم کرنا کسی بھی طرح ممکن نہیں۔ اس سے قطع نظر حفاظتی اقدامات بھی بہت سخت تھے۔ عبداللہ خاں کی مرضی کے خلاف محل کے اس حصے کی طرف سے کوئی بھی نہیں آ سکتا تھا۔ ان انتظامات میں اس قدر باقاعدگی اور سختی اس لئے بھی پیدا ہو گئی تھی کہ قلعے میں شاہی خاندان کا کوئی فرد موجود نہیں تھا۔ حفاظتی عملہ قطعی بے کار بیٹھا رہتا تھا۔''بیکار مباش کچھ کیا کر'' کے مصداق حفاظتی عملے کو خواہ مخواہ اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع مل گیا تھا۔

اس عرصے میں عبداللہ خاں محمد نواز کی طرف سے بھی غافل نہیں رہا تھا۔ نواز کے متعلق وہ قلعہ دار سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ قلعہ دار نے اسے یقین دلایا تھا کہ کہیں سے بھی کسی قسم کی اطلاع ملنے پر وہ فوراً عبداللہ خان کو مطلع کر دے گا۔ اس کے باوجود ابھی تک نواز کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ عبداللہ خاں کو یقین سا ہو چلا تھا کہ نواز اپنی گرفتاری کے خوف سے وقتی طور پر کہیں کسی دور دراز قصبے یا غیر معروف گاؤں میں روپوش ہو گیا ہے۔ یہ بھی عبداللہ خاں کی نظر میں تھا کہ نواز خوفزدہ ہو کر اپنا نام بھی بدل سکتا ہے۔ وہ معاملہ دب جانے کا منتظر ہوگا ورنہ اب تک اس کا کوئی سراغ انہیں مل گیا ہوتا۔ شاہجہاں آباد سے دکن صرف پندرہ دن کی مسافت پر تھا۔ اگر نواز کی راہ کھوٹی نہ کی گئی ہوتی تو وہ اب تک دکن پہنچ چکا ہوتا۔

دکن کے حالات سے عبداللہ خاں اور دیگر عمال حکومت بے خبر نہیں تھے۔ انہیں عرضی نویسیوں اور واقعہ نگاروں کے ذریعے وہاں کے حالات کا پورا علم ہوتا رہتا تھا۔ اسی سبب انہیں یہ خبر بھی مل گئی تھی کہ اب بادشاہ وقت نے دکن کو باغیوں سے قطعی پاک کرنے کا قصد کر لیا ہے۔ اس بار دکن میں فیصلہ کن معرکے ہوں گے۔ اس ضمن میں عمال شاہجہاں آباد' بادشاہ کے تازہ فرامین سے بھی آگاہ تھے۔ اورنگزیب عالمگیر نے واقعہ نگاروں کو ہدایت کی کہ آئندہ دکن کو دارالجہاد لکھا جائے۔ اس کے علاوہ جو فرامین جاری ہوئے ان سے پتا چلا کہ بادشاہ نے بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی کیلئے شہزادہ عظیم الشان کو بھی بنگال سے طلب کر لیا ہے۔ بنگال کا صوبیدار اب شہزادے عظیم الشان کا بڑا بیٹا شہزادہ فرخ سیر تھا۔ اورنگزیب نے اپنے منجھلے بیٹے شہزادہ اعظم شاہ کو بھی اپنے پاس بلانے کے احکام جاری کر دیئے تھے۔ شہزادہ اعظم شاہ مالوہ کی صوبیداری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اعظم شاہ کو فوری طور پر دکن پہنچنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ مالوہ کا صوبیدار امانت خان کو بنا دیا گیا تھا جو اعظم شاہ کی نیابت کر رہا تھا۔ شہزادہ کام بخش جو دکن میں اورنگزیب کے ساتھ تھا۔ بادشاہ نے اس سے ناخوش ہو کر اسے فوراً شاہجہاں آباد (دہلی) پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ کام بخش سے اورنگزیب کبھی خوش نہیں رہا تھا۔ اورنگزیب اپنے اس بیٹے کو ناپسند کرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کام بخش کے مزاج میں کسی طرح اضطرار اور سنکی پن تھا۔

پورے ہندوستان میں اتنے بڑے پیمانے پر تبدیلیاں معنی خیز تھیں۔ شہزادہ اعظم شاہ' بہادر غیور اور امین تھا۔ اس کی تلوار کی دھاک دشمنوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا دکن طلب کیا جانا اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ اورنگزیب عالمگیر دکن میں اس بار کوئی بڑا قدم اٹھانے والا ہے۔ یہ قیاس آرائیاں بھی کی جا رہی تھیں کہ ممکن ہے' بادشاہ آئندہ اسی کو دکن کا صوبیدار بنانا چاہتا ہو' اسی کے ساتھ کام بخش کو صوبیداری سے ہٹانا مقصود ہو۔ اس سلسلے میں ابھی تک کوئی فرمان جاری نہیں ہوا تھا مگر توقع یہی کی جا رہی تھی۔ سیاسی حلقے بڑے پیمانے پر ان تبدیلیوں کو بہت اہم سمجھ رہے تھے۔ یہ وہ سیاسی حلقے تھے جو ہر عہد میں عمال حکومت سے قریب ہوتے ہیں۔

ابھی ان تمام اطلاعات کو موصول ہوئے بمشکل تین چار دن گزرے تھے کہ ہندوستان اور خصوصاً مغلوں کی تاریخ کا ایک بڑا سانحہ رونما ہو گیا۔

کچھ دیر تو لوگوں کو اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہ آیا کہ انہوں نے جو کچھ سنا ہے' وہ درست ہے مگر جب اس اطلاع کی تصدیق ہو گئی تو جیسے شاہجہاں آباد میں کہرام مچ گیا۔ عبداللہ خاں کو اس وقت تک یہ

اندازہ نہیں تھا کہ لوگ' مغلیہ تاجدار اورنگزیب عالمگیر سے کتنی محبت کرتے ہیں!

مغلوں کی تاریخ کا ایک باب ختم ہو گیا۔ اورنگزیب عالمگیر صرف کچھ دن علیل رہ کر اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

اورنگزیب عالمگیر کی اس ناوقت موت سے عبداللہ خان کو بھی ذہنی طور پر دھچکا لگا۔ ہر چند کہ عبداللہ خاں کی شدید خواہش تھی کہ اورنگزیب ایسا حکمراں نہ رہے تاکہ وہ اپنے چھوٹے بھائی حسین علی خان کے ساتھ مل کر اپنے منصوبوں کی تکمیل کر سکے مگر اتنی جلدی یہ وقت آ جائے گا' نہ عبداللہ خان کے قیاس میں تھا' نہ ہی حسین علی خان کے تصور میں ایسی کوئی بات تھی۔ ابھی تو انہوں نے اپنے منصوبے کے ابتدائی مراحل پر بھی عملدرآمد شروع نہیں کیا تھا۔

بادشاہ کی موت نے عبداللہ خاں کے ذہن سے ایک بڑا بوجھ ہلکا کر دیا تھا کہ اب ان ہنگامی حالات میں نواز بے دست و پا ہو کر رہ جائے گا اور ان دونوں بھائیوں نے اقتدار پر قبضہ کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا۔ فوری طور پر طشت از بام نہیں ہوگا۔

اورنگزیب عالمگیر کے تین بیٹے تھے۔ شاہ عالم' اعظم شاہ اور کام بخش! اب انہیں تینوں میں سے کسی کو تخت نشین ہونا تھا۔ زیادہ توقع اعظم شاہ کی تھی۔ کیوں کہ وہ بڑا جری تھا۔ اسی کے ساتھ ذہین بھی! اطلاعات کے مطابق وہ دکن پہنچنے والا تھا جہاں اورنگزیب کے سبھی قدیم امرا موجود تھے۔ اعظم شاہ انہیں اپنے حق میں ہموار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر سکتا تھا۔

شاہ عالم سب سے بڑا تھا مگر وہ دکن اور شاہجہاں آباد دونوں سے بہت دور اس وقت قابل میں تھا۔ اس کے متعلق کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ یہ بازی وہ جیت سکتا ہے۔ رہ گیا اورنگزیب کا چھوٹا بیٹا کام بخش تو لوگوں کو یقین تھا کہ وہ تخت شاہی کا اہل نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ چہ مگوئیاں اور قیاس آرائیاں بھی ہو رہی تھیں کہ اعظم شاہ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تو کام بخش اختلاف کی جرأت نہ کر سکے گا۔

ان حالات کے پیش نظر عبداللہ خاں کیلئے یہ سنہری موقع تھا کہ ہونے والے تخت نشین کی حمایت کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرے۔ اس سے یہ فائدہ تھا کہ جب وہ تخت و تاج کا مالک بنے اور برسراقتدار آئے تو اس کی نوازشوں اور عنایات کا مستحق ہوا جا سکے۔ عبداللہ خاں کو معلوم تھا کہ اس طرح کے حالات میں حکومت کے عہدوں پر متعین افراد کیلئے صرف دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یا تو وہ خاموش تماشائی بن کر تخت نشین ہونے والے کے منتظر رہیں اور خود کو کسی ابتلاء و آزمائش میں نہ ڈالیں یا پھر تخت کے لئے دعویداروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں جو ان کی نظر میں واقعی تخت و تاج حاصل کرنے والا ہو۔

ہر چند کہ خاموش تماشائی بنے رہنے کا راستہ بہت محفوظ تھا مگر عبداللہ خاں جانتا تھا کہ ایسے لوگ بھی شاہوں کی نظر میں نہیں آپاتے۔ پھر اسی طرح ایسے لوگوں کی ترقی کے مواقع بھی مسدود ہو جاتے ہیں۔

عبداللہ خاں نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے لئے دوسری راہ کا انتخاب کیا' مگر اس راہ میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ خطرہ اس طرح کہ جس دعویدار کا ساتھ دیا جاتا' اگر وہ برسراقتدار نہ آتا تو یہ امر لازمی تھا کہ برسراقتدار آنے والا دوسرا دعویدار سب سے پہلے انہیں افراد کو معزول کرتا جو اس کے مخالف گروہ میں تھے۔

مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے عبداللہ خاں یہی داؤ کھیلنا چاہتا تھا۔اب اس سلسلے میں اسے چھوٹے بھائی حسین علی خان سے مشورہ کرنا تھا جو عظیم آباد میں تھا۔مصلحت وقت کا تقاضا یہ تھا کہ عبداللہ خاں اور حسین علی خان اپنے دیگر بھائیوں سمیت اعظم شاہ کا ساتھ دیتے۔عبداللہ خاں نے اسی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

عبداللہ خاں نے ابھی یہ فیصلہ کیا ہی تھا کہ اطلاع ملی' اعظم شاہ دکن پہنچ گیا ہے۔توقع کے مطابق وہاں پہنچتے ہی اس نے اراکین حکومت اور امرا کو اپنے حق میں ہموار کرلیا' پھر اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔اسی کے ساتھ اس نے تمام ہندوستان کے صوبیداروں کو فرمان جاری کر دیئے کہ وہ اب اس کے نام کا خطبہ پڑھوائیں۔عظیم آباد میں یہ فرمان حسین علی خان کو بھی ملا تھا مگر عبداللہ خاں اپنے بھائی سے رابطہ قائم نہ کرسکا۔

اسی دن ایک اور اہم اطلاع ملی کہ شاہ عالم کابل سے تیزی کے ساتھ نکل کر لاہور پہنچ چکا ہے اور وہاں اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے۔اس نے بھی صوبیداروں کے نام اطلاعات کے فرامین جاری کر دیئے تھے۔

شہزادہ شاہ عالم' یعنی اورنگزیب عالمگیر کے بڑے بیٹے نے کابل سے لاہور پہنچنے میں جس تیزی کا ثبوت دیا تھا' حیرت انگیز تھا۔شاہ عالم کے اس اقدام نے عبداللہ خاں کو ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کس کا ساتھ دیا جائے؟

دوسرے ہی دن شہزادہ کام بخش کی اطلاع بھی شاہجہاں آباد پہنچ گئی کہ وہ بھی پیچھے نہیں رہا۔اس نے بھی اپنے دونوں بڑے بھائیوں کی طرح اعلان بادشاہت کردیا تھا۔تخت کے اب تین دعویدار ہوگئے تھے۔ان میں سے دو کے تیور خطرناک نظر آرہے تھے کیوں کہ ان دونوں ہی کے پاس بھاری فوج تھی۔اعظم شاہ کو اس تمام فوج کی حمایت حاصل ہوگئی تھی جو اورنگزیب عالمگیر کے ساتھ دکن میں تھی اور شاہ عالم نے لاہور پہنچ کر مزید تیس ہزار فوج کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

شاہ عالم کا بیٹا شہزادہ عظیم الشان بنگال سے چل کر ابھی راستے میں تھا کہ اورنگزیب کی موت کے بعد اپنے باپ کی بادشاہت کا اعلان سنا۔اس نے بنگال واپس پہنچ کر شاہ عالم کے نام خطبہ پڑھوا دیا۔

اعظم شاہ دکن میں اورنگزیب کی تجہیز وتکفین سے فارغ ہوتے ہی بادشاہ بیگم اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کو ساتھ لے کر گوالیار روانہ ہوگیا۔اس کا ارادہ شاہجہاں آباد پہنچنے کا تھا۔

پورا ہندوستان اس وقت عجیب خلفشار کا شکار تھا۔صوبہ سرحد' صوبہ لاہور اور صوبہ ملتان کو شاہ عالم اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔لاہور میں شاہ عالم کا منجھلا بیٹا فخر الدین اس سے ملا تھا۔شہزادہ فخر الدین ان دنوں ملتان کا صوبیدار تھا۔صوبہ بنگال بھی شہزادہ عظیم الشان کی وجہ سے شاہ عالم کے زیر نگیں آچکا تھا۔اس کے علاوہ کئی اور صوبیداروں نے بھی شاہ عالم کو اپنی وفاداری وجاں نثاری کا یقین دلایا تھا۔

اسی دوران میں شاہ عالم نے ایک اور اہم قدم اٹھایا۔اس نے اپنے بیٹے عظیم الشان کو اکبر آباد (آگرہ) پہنچنے کا حکم دیا۔عظیم الشان نے بنگال کی صوبیداری باپ کی ایما پر اپنے بیٹے فرخ سیر کو سونپی اور خود اکبر آباد روانہ ہوگیا۔شاہ عالم نے خود بھی ایک بڑی فوج کے ساتھ لاہور سے اکبر آباد کا رخ

کیا۔

شاہ عالم کے اس اقدام نے عبداللہ خاں کے اس خیال کو یقین میں بدل دیا کہ اگر مستقبل کا کوئی حکمران ہوسکتا ہے تو شاہ عالم ہی ہوسکتا ہے۔اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ اکبر آباد کا خزانہ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ تھا۔وہاں کا خزانہ سب سے پہلے جس کے قبضے میں آجاتا۔وہ ہر اعتبار مضبوط ومستحکم ہوسکتا تھا۔حکومت چلانے اور کثیر فوجی اخراجات برداشت کرنے کیلئے بہر حال خزانے کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔

عبداللہ خاں کے چھوٹے بھائی حسین علی خان نے اب تک اس سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔عبداللہ خاں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں حسین علی خان نے نہ جانے کیا فیصلہ کیا ہو! موجودہ صورت حال میں دونوں بھائیوں کی ملاقات بے حد ضروری تھی۔عبداللہ خاں نے اسی غرض سے فوراً عظیم آباد جانے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ کسی ایک نتیجے پر پہنچا جاسکے۔

ابھی تک عبداللہ خاں اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا کہ اس کے اور قلعہ دار محمد یار خان کے نام شاہ عالم کا ایک فرمان موصول ہوا۔اس فرمان میں ان دونوں کو شاہ عالم کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔عبداللہ خاں کے لئے یہ حکم تھا کہ فوراً اکبر آباد روانہ ہوجائے۔قلعہ دار محمد یار خان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ شاہجہاں آباد میں ہی رک کر شاہ عالم کا انتظار کرے۔

شاہ عالم کے اس حکم سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اکبر آباد کے بعد شاہجہاں آباد کا رخ کرے گا۔اس کی یہ تیزی اور مستعدی بتا رہی تھی کہ وہ مستقبل میں حکمران ہوکر رہے گا۔

قلعہ دار محمد یار خان نے اپنے لئے پہلے راستے کا انتخاب کیا تھا۔وہ کسی خطرے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔عبداللہ خاں ذاتی طور پر اس سے بات کرچکا تھا۔قلعہ دار نے اپنے اسی خیال کا اظہار کیا تھا کہ تینوں دعویداروں میں سے جو پہلے شاہجہاں آباد پہنچ کر اس سے قلعے کی چابیاں طلب کرے گا' وہ چابیاں اس کے سپرد کر دے گا۔یہی حال اکبر آباد کے قلعہ دار کا تھا۔اس نے بھی وہی فیصلہ کیا تھا جو شاہ جہاں آباد کے قلعہ دار کا فیصلہ تھا۔

اب حسین علی خان سے عبداللہ خاں کی ملاقات اور بھی ضروری ہوگئی تھی۔

جس شام عبداللہ خاں اکبر آباد جانے کی بجائے عظیم آباد روانہ ہونے والا تھا۔حسین علی خا خود عظیم آباد سے شاہجہاں آباد پہنچ گیا۔عبداللہ خاں کو اپنے بھائی کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ قلعے دروازے کی طرف دوڑا۔

قلعے کے دروازے ہی پر دونوں بھائی ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے۔عبداللہ خاں وہاں سے اپنے چھوٹے بھائی کو سیدھا اپنی قیام گاہ تک لے آیا۔ہنگامی صورت حال کے باوجود اس نے اپنے محافظوں کو خواب گاہ سے دور ہٹا دیا تاکہ کوئی بھی شخص اس کے اور حسین علی خان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہ سن سکے۔

خلوت میسر آتے ہی حسین علی خان بولا۔"مبارک ہو آپ کو کہ میں نے شہزادہ اعظم شاہ سے معاہدہ کر لیا ہے کہ تخت کے دوسرے دعویداروں سے نمٹتے ہی وہ ہم دونوں ہی بھائیوں کے عہدوں اور

مناصب میں اضافہ کر دیں گے۔''

''تم کیا کہہ رہے ہوں حسین علی خان؟... ہوش میں تو ہو تم!'' عالم اضطراب میں عبداللہ خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں سمجھا نہیں کہ آپ کا کہنا چاہتے ہیں۔! کیا میں نے غلط قدم اٹھا لیا؟... کیا میرا فیصلہ غلط ہے؟'' حسین علی خان کے لہجے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

''قطعی قطعی!'' عبداللہ خاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''کیا تم وقت کی نبض پر انگلیاں رکھنا نہیں جانتے؟...'' ''کیا تم نوشتہ دیوار نہیں پڑھ سکتے؟... کیا تم بالکل دور اندیش نہیں؟ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ تم نے میرے مشورے کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔''

''اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ شہزادہ اعظم شاہ ہی کے حکم پر میں شاجہاں آباد پہنچا ہوں اور میرے ساتھ کثیر فوجی قوت ہے۔ خود شہزادہ اعظم شاہ بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں نے عظیم آباد میں اپنے دیوان راجہ محکم سنگھ کو اپنا نائب مقرر کر دیا ہے۔ اس کی اطلاع بھی میں نے شہزادہ اعظم شاہ کو دے دی ہے۔'' حسین علی خان نے تفصیل کے ساتھ ساری بات بتا دی۔

''کیا تمہیں شہزادہ شاہ عالم کا کوئی فرمان نہیں ملا؟'' عبداللہ خاں نے پوچھا۔

''ملا تھا۔'' حسین علی خان نے جواب دیا۔ ''اس فرمان میں مجھے اکبر آباد کی تاکید کی گئی تھی پھر بھی میں نے موجودہ حالات کے پیش نظر یہی فیصلہ کیا کہ شہزادہ اعظم شاہ کا ساتھ دیا جائے کیونکہ بہادر، ذہین اور جنگجو ہیں۔ آخری فتح انہی کی ہوگی۔''

''یہ تمہارا خیال ہے حسین علی خان! وقت کی تحریر کو پڑھنا سیکھو! تمہاری طرح پہلے میرا بھی خیال تھا کہ ہم تمام بھائیوں کو سادات بارہہ سمیت شہزادہ اعظم شاہ کا ساتھ دینا چاہئے مگر حالات نے میرے اس خیال کو باطل ثابت کر دیا۔ یقین کرو اعظم شاہ سے پہلے شاہجہاں آباد میں داخل ہونے والا شہزادہ عالم ہوگا۔ اس کے پاس اتنی کثیر فوجی قوت اور خزانہ ہوگا کہ اعظم شاہ یہاں کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا'' عبداللہ خاں اس قدر پرجوش ہو گیا کہ اسے شاہی آداب کا خیال بھی نہ رہا۔ اسے مستقبل کے حکمرانوں کے نام اسی طرح نہیں لینا چاہئیں تھے۔ اس زمانے میں اسے بے ادبی میں شمار کیا جاتا تھا۔

''لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ ہم شہزادہ اعظم شاہ کو چھوڑ کر شاہ عالم کا ساتھ دیں تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟'' حسین علی خان بولا۔

''عزت واقتدار اور ذاتی تحفظ!'' عبداللہ خاں نے برجستہ جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ اپنے مقصد اعلیٰ کے حصول کی خاطر مدد! بقول تمہارے اعظم شاہ نہایت ذہین شخص ہیں۔ اگر وہ ہندستان کے تخت وتاج کے مالک بن گئے تو ہم ان کے اقتدار میں اپنے اصل منصوبے کے لئے راہ ہموار نہیں کر پائیں گے جو اشد ضروری ہے تاکہ اقتدار اعلیٰ پر ایک دن ہمارا قبضہ ہو سکے۔ کچھ سمجھے تم!... شاہ عالم اتنے ذہین اور بہادر نہیں۔ ہوا صرف اتنا ہے کہ شاہ عالم کو وقت نے ایسے مواقع فراہم کر دیئے ہیں کہ وہ ان سے فائدہ اٹھا جائیں گے۔ ذرا دور اندیشی سے کام لو! اگر اعظم شاہ کو حکومت حاصل ہو گئی تو مغلیہ حکومت حسب سابق طاقتور رہے گی۔ اس کے خلاف ہمارا کوئی منصوبہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ مگر شاہ عالم کا مسئلہ

مخالف ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ خود اورنگزیب عالمگیر، اعظم شاہ کو پسند کرتے تھے! آخر اس کا کوئی سبب ہوگا! مرحوم بادشاہ نے اعظم شاہ میں کئی تو ایسا وصف دیکھا ہوگا جو انہیں باقی شہزادوں پر ترجیح دیتے تھے! عبداللہ خاں نے تفصیل کے ساتھ پورے معاملے پر روشنی ڈالی۔

حسین علی خان سوچ میں گم تھا۔ یوں جیسے اسے کوئی فیصلہ کن بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

اپنے چھوٹے بھائی کو خاموش دیکھ کر عبداللہ خان پھر بول اٹھا۔'' وقتی اور عارضی فائدے پر نہ جاؤ! ممکن ہے غیور او بہادر سادات بارہہ، اعظم شاہ کا ساتھ دیں تو وہ اپنے مخالفین اور تخت کے ...ں دعویداروں سے نمٹ لیں مگر ان کا برسراقتدار آنا کسی بھی طرح ہمارے حق میں نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' آخر کار حسین علی خان نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''اکبر آباد کی طرف کوچ!'' عبداللہ خاں ہر لفظ پر زور دے کر بولا۔ ''ہمیں بہرحال شہزادہ شاہ عالم کا ساتھ دینا ہے۔ انہیں برسراقتدار لانے کیلئے ہمیں پوری کوشش کرنا چاہئے۔ ہم اسی طرح مغلیہ سلطنت پر پہلی ضرب لگا سکیں گے۔''

حسین علی خان نے اپنے بڑے بھائی کی بات مان ہی لی اور بولا۔'' تو پھر کل صبح ہی شہزادہ شاہ عالم کے فرمان کا جواب دے دوں گا کہ ہم دونوں بھائی، سادات بارہہ کی بھاری جمعیت سمیت آپ کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کل ہی اکبر آباد کی طرف کوچ کر دینا چاہئے۔ ہم اپنی کوچ کی اطلاع بھی شہزادے کو دے دیں گے۔''

دوسرے دن جب حسین علی خان صبح کے وقت شاہ عالم کے فرمان کا جواب لکھ کر قاصد کو روانہ کرنے والا تھا، شہزادہ عالم کے تین فرمان بیک وقت موصول ہوئے۔ ان میں سے ایک فرمان قلعہ دار محمد یار خان کیلئے تھا، دوسرا حسین علی خان کیلئے اور تیسرا عبداللہ خاں کیلئے تھا۔

عبداللہ خاں نے شاہ عالم کا فرمان پڑھا تو چونک اٹھا۔ یہ فرمان اس کیلئے قطعی غیر متوقع اور حیران کن تھا۔

☆......☆......☆

اچانک شاہ عالم نے اپنا لائحہ عمل تبدیل کر دیا تھا جس کا ثبوت عبداللہ خان کو ملنے والا تازہ فرمان تھا۔ اب شاہ عالم اکبر آباد (آگرہ) جانے کی بجائے لاہور سے سیدھا شاہجہان آباد (دہلی) آ رہا تھا۔ عبداللہ خان کی اکبر آباد روانگی منسوخ کر دی گئی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ جواب طلبی کی گئی تھی کہ عبداللہ خان نے گزشتہ فرمان کا جواب کیوں نہیں دیا؟ تقریباً اسی مضمون کا فرمان قلعہ دار محمد یار خان کے نام آیا تھا جس میں دوبارہ اطاعت کی تاکید تھی۔

عبداللہ خان، شاہ عالم کی اس دور اندیشی کو بھانپ گیا۔ شاہ عالم اپنے بھائی اور تاج وتخت کے دوسرے دعویدار اعظم شاہ سے پہلے شاہجہان آباد پہنچنا چاہتا تھا۔ اعظم شاہ کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ اس نے کچھ دن گوالیار میں قیام کیا وہاں فوجیں اکٹھا کیں، بادشاہ بیگم اور شاہی خاندان کے دیگر افراد کو قلعہ گوالیار میں چھوڑا پھر شاہجہان آباد کی طرف کوچ کر دیا۔

اعظم شاہ نے گوالیار میں غیر ضروری طور پر رک کر تاخیر کی تھی، اگر وہ وہاں نہ رکتا اور سیدھا شاہجہان آباد آتا تو صورتحال اس کے حق میں ہوتی۔ اب شاہ عالم، شاہجہان آباد سے صرف ایک دن کی مسافت پر تھا اور اعظم شاہ تین دن کی مسافت پر۔ اس صورت میں شاہ عالم کو بہرحال اولیت حاصل ہوگئی تھی۔ شاہ عالم نے کہیں رکے بغیر کابل سے شاہجہان آباد تک کوچ پر کوچ کیا تھا اور یہی بات اس کے حق میں سود مند ثابت ہوئی تھی۔ حسین علی خان کے نام شاہ عالم کا جو فرمان موصول ہوا تھا وہ بہت اہم تھا۔ شاہ عالم نے لکھا تھا کہ اس کے علم میں ہے حسین علی خان عظیم آباد سے چل کر شاہجہان آباد پہنچ چکا ہے۔ اس سے پچھلے فرمان کا جواب نہ دینے کے سلسلے میں کوئی باز پرس کرنے کی بجائے اسے دوبارہ اطلاعات کا حکم دیا گیا تھا۔ اسی فرمان میں یہ حکم بھی تھا کہ حسین علی خان شاہجہان آباد ہی میں رک کر شاہ عالم کا انتظار کرے۔

دوسرے ہی دن شاہ عالم ایک کثیر فوج لے کر شاہجہان آباد میں داخل ہوگیا۔ وہ آبادی کے باہر نواح میں رک گیا تھا۔ اس نے اپنے وزیر سلطنت معظم خان کو قلعے بھیجا۔ معظم خان کو اس نے خان زمان کے خطاب سے نوازا تھا خان زمان معظم خان، شاہ عالم کا عنایت آمیز پیغام لے کر قلعہ دار محمد یار خان سے ملا۔ قلعہ دار محمد یار خان نے اطاعت کا اظہار کر کے اپنے بڑے بیٹے حسن یار خان کو قلعے کی چابیاں دیں اور شاہ عالم کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس کے علاوہ اس نے خان زمان کے ہاتھ نذرانے کی سو اشرفیاں اور دو ہزار روپیا بھی بھیجا کہ خان زمان اس کی طرف سے مبارکباد کے آداب بجالائے۔

عبداللہ خان اور حسین علی خان بھی اپنے دوسرے بھائیوں کو ساتھ لے کر شاہ عالم کے حضور میں حاضر ہوئے۔ اس موقع پر حسین علی خان نے اپنے ہمراہ موجود پانچ ہزار سپاہیوں کا معائنہ کرایا۔ شاہ عالم نے دونوں بھائیوں کو یقین دلایا کہ وہ جلد ہی ان کی خدمت کا صلہ دے گا۔

اسی روز شہزادہ عظیم الشان کی عرضداشت موصول ہوئی کہ وہ اکبر آباد پہنچ چکا ہے۔ اس کے ہمراہ بیس ہزار سے زیادہ فوج تھی۔ اب وہ اپنے باپ شاہ عالم کے اکبر آباد پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اکبر آباد کے قلعے پر اس نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس خوش خبری کو شاہ عالم نے نیک شگون جانا اور اسی خوشی میں شادیانے بجانے کا حکم دیا۔ پھر شاہ عالم قلعہ دہلی میں منتقل ہو گیا۔ قلعے میں شاہ عالم کے قیام کے تمام انتظامات محلات شاہی کا نگران اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے عبداللہ خان ہی نے کئے۔ عبداللہ خان کی خدمات پر شاہ عالم نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ قلعے میں شاہ عالم کے قریب سب سے زیادہ عبداللہ خان ہی تھا۔

قلعے میں منتقل ہونے کے دوسرے دن صبح بادشاہی ملازموں، عدالت کے عہدیداروں اور دوسرے کارگزاروں نے آ کر مبارکباد دی اور وہ سبھی عنایت و اعزازات سے نوازے گئے۔ شاہ عالم نے دہلی کے بزرگان دین کے مزاروں کی زیارت کی اور درگاہوں کے خدام کو نذرانے پیش کئے۔ شاہ عالم نے دہلی کا نظم ونسق درست کرنے کے بعد وہاں کے خزانے سے تیس لاکھ روپیا لیا اور اوائل ربیع الاول میں آگرے کی طرف کوچ کر دیا۔

شاہ عالم کے ہمراہ حسین علی خان اور عبداللہ خان کے علاوہ سادات بارہہ کی بھاری اکثریت تھی۔ سادات بارہہ بہادری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ شاہ عالم نے انہیں اپنی سواری خاص کے اردگرد رکھا تھا۔ دونوں بھائی عبداللہ خان اور حسین علی خان شاہ عالم کی سواری کے دائیں بائیں تھے مگر دائیں جانب عبداللہ خان سے بھی پہلے خان زمان معظم خان تھا۔ اس وقت عبداللہ کو احساس ہوا کہ بہرحال اس کی حیثیت فی الحال خان زمان کے بعد ہی تھی۔ عبداللہ خان کو محالات شاہی کے نگران اعلیٰ کے عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ابھی اسے کوئی نیا عہدہ نہیں دیا گیا تھا۔ حسین علی خان بدستور عظیم آباد کی صوبیداری پر متعین تھا۔ اسے عبداللہ خان کی طرف سے فکر تھی مگر عبداللہ خان کو یقین تھا کہ اسے جلد ہی شایان شان کوئی بڑا عہدہ ضرور ملے گا۔

آگرے پہنچ کر شاہ عالم نے شہر کے قریب ایک باغ میں قیام کیا۔ اس باغ کا نام دہرہ تھا۔ شہزادہ عظیم الشان اپنے بیٹے محمد کریم کے ساتھ یہیں باریاب ہوا۔ باقی خان قلعہ دار بھی قلعے اور خزانوں کی چابیاں لے کر حاضر ہوا۔ آگرے کے قلعے میں جو خزانہ تھا اس کی مالیت نو کروڑ اشرفیاں تھیں۔ اس کے علاوہ چوبیس کروڑ روپے کے طلائی آلات اور غیر مسکوک چاندی تھی۔ یہ خزانہ مغلیہ تاجدار شاہجہان نے جمع کیا تھا جس میں سے اورنگ زیب نے ایک بڑا حصہ دکن کی مہم میں خرچ کر دیا تھا۔ خزانے میں "غریب نواز" نامی روپیا بھی ملا جو ایک سو تولے سے پانچ سو تولے وزن میں بطور خاص انعام میں دینے کے لئے ڈھلوایا گیا تھا۔ خزانے میں اکبر بادشاہ کے عہد کی بارہ اور تیرہ تولے وزن کی اشرفیاں بھی تھیں۔ ان کی قیمت تیرہ کروڑ روپے کی تھی۔

شاہ عالم نے حکم دیا کہ خزانے میں سے فوری طور پر چار کروڑ کی اشرفیاں اور روپے نکالے جائیں اور ان میں سے ہر شہزادے کو تین تین لاکھ روپیا دے دیا جائے جو کل نو لاکھ روپیا بنتا تھا۔ اس کے علاوہ خان زمان معظم خان اور اس کے بیٹوں کو تین لاکھ' سادات بارہہ کو ایک لاکھ روپیہ اور آغر خان کو اس کے مغل ہمراہیوں کے ایک لاکھ روپیا دیا گیا۔ اسی طرح فوج کے ملازموں اور سرکاری کارگزاروں ان کے مطالبات ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ فوج کی نو مہینے کی تنخواہیں واجب الادا تھیں جو ادا کر دی گئیں۔ جو ملازمین نئے بھرتی ہوئی تھے انہیں دو ماہ کی تنخواہ دے دی گئی اور توپ خانے کے عملے کو تین ماہ کی تنخواہ یک مشت ادا کر دی گئی۔ محل کی عورتوں' کنیزوں' خدام اور تمام عملے کو ان کے واجبات ادا کر دیئے گئے۔ تنخواہوں کے علاوہ مستحقوں' درویشوں اور حاجت مندوں کو جھولی بھر بھر کر روپیا اور اشرفیاں تقسیم کی گئیں۔ اس طرح تقریباً دو کروڑ روپیا سخت نگرانی اور انتظام میں تقسیم کر دیا گیا۔ روپے کی تقسیم میں ایسی سخت نگرانی کی گئی تھی کہ خود خان زمان ہاتھ میں لاٹھی تھامے تقسیم کا انتظام کر رہا تھا۔ اسی دوران میں خان زمان کے ہاتھوں ایک تحویل دار مار کھا کر فوت ہو گیا۔

شاہ عالم نے خان زمان کو ترقی دے کر پانچ ہزاری' پانچ ہزار سوار کا منصب عطا کیا۔ مستقل وزارت کے عہدے پر فائز کر کے صاحب السیف و قلم' وزیر با فرہنگ' جمانہ الملک بہادر ظفر جنگ کا خطاب دیا۔ اس کے علاوہ اپنی فوج کے ہراول دستے کا کماں دار بھی اسی کو مقرر کیا۔

عبداللہ خان کو صوبہ الہ آباد کی صوبیداری عطا ہوئی مگر فی الحال حضور ہی میں رہنے کا حکم دے کر اسے کہا گیا کہ تم اپنا کوئی نائب الہ آباد میں مقرر کر دو۔ رتن چند جو پہلے دیوان تھا وہ صوبہ الہ آباد صوبیدار چلا آ رہا تھا۔ اس نے شاہ عالم کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ عبداللہ خان نے اپنے حامیوں کا حلقہ وسیع کرنے کی خاطر شاہ عالم سے درخواست کی کہ رتن چند کو راجا کے خطاب سے نواز جائے اور اسے الہ آباد میں میرا نائب تصور کیا جائے۔ رتن چند نے کیونکہ شاہ عالم سے وفاداری کا ثبوت دیا تھا اس لئے شاہ عالم کو عبداللہ خان کی بات پسند آئی کہ رتن چند کو الہ آباد کی صوبیداری سے معزول کرنے کی بجائے صوبہ الہ آباد میں عبداللہ خان کا نائب مقرر کر دیا جائے۔ شاہ عالم نے اسی وقت فرمان جاری کر دیا جس میں رتن چند کو راجا کے خطاب سے نواز گیا۔

شاہ عالم نے آگرے ہی میں فوج کی تنظیم نو کرائی۔ اس تنظیم میں دونوں بھائیوں عبداللہ خان اور حسن علی خان کو وزیر سلطنت خان زمان کی مدد کیلئے ساتھ رکھا گیا۔

شہزادہ عظیم الشان بنگال سے گیارہ کروڑ روپیا جمع کر کے لایا تھا اس نے معائنے کے وقت تیس ہزار سوار پیش کئے۔ اس طرح شاہ عالم کی فوج کی تعداد اسی ہزار شمار میں آئی۔

اکبر آباد ہی میں اعظم شاہ کے بارے میں اطلاع موصول ہوئی کہ اس نے اب شاہجہان آباد کا ارادہ ترک کر کے اپنا رخ اکبر آباد کی طرف کر دیا ہے اور اس کا ارادہ شاہ عالم سے جنگ کا ہے۔ تخت تاج کے اس دعویدار نے پچاس ہزار فوج جمع کر لی تھی مگر وہ خزانے کی کمی کے سبب فوج کو روپیا پیسا دے سے ہاتھ روکے ہوئے تھا۔ اس کی فوج میں شاہ عالم کی زرپاشی و گنج بخشی کے بڑے چرچے تھے۔ شہرت کی وجہ سے بہت سے تمندار (قبائلی سردار) اور فوجی اعظم شاہ کا ساتھ چھوڑ کر شاہ عالم کی فوج میں

شامل ہو گئے تھے۔

شاہ عالم فطرتاً صلح جو واقع ہوا تھا۔ وہ اس پر بھی آمادہ تھا کہ جنگ کو جس شرط پر بھی ٹالا جا سکے ٹال دیا جائے۔ اسی غرض سے اس نے اپنے بھائی اعظم شاہ کو ایک پیغام بھیجا جس میں ہندوستان کے بٹوارے کی تجویز تھی۔ اعظم شاہ نے یہ تجویز ٹھکرا دی۔

پھر اگلے ہی روز اکبر آباد سے کچھ دور سرائے جاجو کے مقام پر دونوں تیموری شہزادوں کی فوجیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ اعظم شاہ بلاشبہ انتہائی دلیر اور جنگ جو تھا اور ممکن تھا کہ جنگ کا فیصلہ اسی کے حق میں ہوتا مگر تقدیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ عین اس وقت جب میدان کارزار گرم تھا زور کی آندھی چلی۔ گرد و غبار اور آندھی میں اعظم شاہ کے لشکر پر دنیا تاریک ہو گئی۔ آندھی جدھر سے چل رہی تھی اس طرف شاہ عالم کے لشکر کی پشت تھی اور اعظم شاہ کی فوج آندھی کے مقابل تھی۔ باد تند کے اس رخ سے شاہ عالم کی فوج کو بڑی مدد ملی۔ جو تیر بھی اس کی طرف چھوڑا جاتا دشمن کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوتا کیونکہ ہوا کے رخ پر ہونے کے سبب اس کی قوت اور رفتار اتنی تیز ہو جاتی کہ زرہ بکتر کو توڑتا ہوا نکل جاتا۔ اعظم شاہ کے لشکر سے مسلسل گولہ باری ہو رہی تھی مگر وہ گولے ہوا کے مخالف دباؤ کی وجہ سے درمیان ہی میں رہ جاتے تھے اور شاہ عالم کے لشکر تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔

بلا خیز رزم و پیکار کے باوجود اعظم شاہ آخر دم تک چند سو سپاہیوں کے ساتھ میدان جنگ میں ڈٹا رہا۔ اس نے میدان جنگ سے فرار پر موت کو ترجیح دی۔ ایک تیر اس کی پیشانی میں پیوست ہو گیا اور یوں اس کی عمر کا آفتاب غروب ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کا کٹا ہوا سر شاہ عالم کے ہاتھی کے پیروں میں پڑا ہوا تھا۔

اسی دن شام کے قریب شاہ عالم کی سواری قلعہ اکبر آباد کے لئے روانہ ہوئی۔ فتح و کامرانی کا تاج سجائے شاہ عالم قلعے میں لوٹ آیا مگر اس کے چہرے پر رنج و غم کے سائے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ بہر حال اپنے سگے بھائی اعظم شاہ کی ہلاکت نہیں چاہتا تھا۔

دوسرے دن شاہ عالم نے قلعے میں اجلاس عام کیا جس میں سب سے پہلے چاروں بیٹوں کو اعزازات و خطابات اور منصبوں سے نوازا۔ قدیم الخدمت امرائے رکاب کو اور ان تمام بہادروں کو جنہوں نے حالیہ جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ اضافہ' ترقی' ہاتھی اور نئے نئے خطابات عطا ہوئے۔

اس اجلاس عام میں عبداللہ خان کو قطب الملک کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ خان زمان کو خان خاناں بہادر ظفر جنگ یار وفادار کا خطاب ملا اور ایک کروڑ روپے نقد و جنس کی صورت میں بطور انعام ملے۔ اتنا بڑا انعام تیمور کے خاندان میں آغاز سے اس وقت تک کسی بادشاہ نے کسی امیر کو نہیں دیا تھا۔ خان خاناں کے بڑے بیٹے کو بھی خطاب دیا گیا۔

عبداللہ خان کے لئے وہ دن بڑی مسرت و شادمانی کا تھا۔ اس کے قبل از وقت دور اندیشانہ عمل نے خود اسے اور اس کے بھائی حسین علی خان کو بچا لیا تھا۔ اگر وہ دونوں بھائی اعظم شاہ کا ساتھ دیتے تو آج معتوبین میں ہوتے۔ حسین علی خان بھی بے حد خوش تھا۔ دونوں بھائی اب اس کے منتظر تھے کہ کب اکبر آباد سے روانگی کے احکام ملتے ہیں۔

گوالیار کے بارے میں اطلاعات موصول ہوئیں کہ امیر الامرا اسد خان نے اعظم شاہ کی بڑی بہن بادشاہ بیگم (زیب النساء) کی خدمت میں جا کر پرسہ دیا اور مرحوم کی عورتوں کو تسلی دلاسا دیا۔ گوالیار میں جب شاہ عالم کے فتح پانے اور اعظم شاہ کے مارے جانے کی خبر پہنچی تو ہر خیمے میں نالہ وشیون ہونے لگے۔ امیر الامرا اسد خان نے خزانے کے داروغہ عنایت خانی مدد سے جو ہر خانے اور دوسرے ساز د سامان پر مہر لگا دی۔ اس کے بعد وہ شاہ عالم کے حضور میں پہنچنے کی تیاری کرنے لگا۔

یہ اطلاعات موصول ہوتے ہی شاہ عالم نے گوالیار کے لئے ایک عنایت آمیز فرمان جاری کیا جس میں سب کو امان دی گئی تھی۔ اس فرمان میں امیر الامرا اسد خان، ذوالفقار خان اور حمید الدین خان کو محل کی عورتوں اور تمام ساز و سامان سمیت طلب کیا گیا تھا۔

شاہی فرمان موصول ہوتے ہی امیر الامرا اسد خان، نواب قدسیہ بادشاہ بیگم زیب النساء کی رکاب میں اکبر آباد کے لئے چل دیا۔

جب یہ لوگ اکبر آباد پہنچے تو دیکھا بادشاہ بیگم نے تعزیتی لباس پہنا ہوا تھا۔ بادشاہ بیگم نے بھائی کے سوگ میں مبارکباد کے مراسم ادا نہیں کئے۔ شاہ عالم کو یہ بات ناگوار گزری مگر ازراہ خلق اغماض سے کام لیا اور بادشاہ بیگم کا سالانہ وظیفہ دگنا کر دیا گیا۔ تعزیت و تہنیت کے بعد اعظم شاہ کے محل کی تمام عورتوں کو ہر ایک کے مناسب حال ماتمی خلعت اور یومیہ خرچ عطا ہوا۔ شاہ عالم نے حکم دیا کہ سب کو بادشاہ بیگم کے ہمراہ دار الخلافہ شاہجہان آباد (دہلی) روانہ کر دیا جائے۔

شاہ عالم نے امیر الامرا اسد خان کو نظام الملک آصف الدولہ کا خطاب عطا کیا اور اسے وکیل مطلق کے عہدے پر مامور کیا۔ وکیل مطلق کا عہدہ شاہان سلف کے زمانے میں ہوتا تھا۔ وکیل مطلق کو اختیار ہوتا تھا کہ وہ وزیروں کا تقرر و تنزل کرنے کے علاوہ دوسرے اراکین سلطنت کے عزل و نصب کا بھی مجاز رہے۔ شاہ عالم نے اسد خان کو چار قباؤں والی خلعت، طلائی نقرئی ساز کے پانچ گھوڑے اور مرصع پگڑی عنایت کی اسی کے ساتھ اپنے حضور میں نوبت بجانے کا اعزاز بھی دیا۔

اسد خان پر شاہ عالم نے جو نوازشات کی تھیں اس پر بہت سے امیر خوش نہیں ... ان میں سے ایک نے دبی زبان میں اپنے خیال کا اظہار بھی کیا۔ اس وقت اجلاس برخاست ہو چکا تھا اور شاہ عالم اپنے چند مقربین خاص کے ہمراہ مسند نشین تھا۔ ان میں عبداللہ خان اور حسین علی خان بھی تھے۔

''امیر الامرا اسد خان، اعظم شاہ کے رفیق اور مددگار تھے اس لئے حضور کے خادم ان پر شاہانہ نوازشات دیکھ کر حیران ہیں۔'' ایک امیر بولا۔

''اگر اس ہنگامے کے دوران میں ہمارے اپنے فرزند بھی دکن میں ہوتے تو انکی بھی مصلحت یہی ہوتی کہ اپنے چچا کا ساتھ دیں۔'' شاہ عالم نے جواب دیا اور اس جواب کے بعد کسی امیر کی جرات نہ ہو سکی کہ بات کو مزید آگے بڑھا سکتا۔

ذوالفقار خان بھی خطاب و اعزاز سے نوازا گیا اور اسے حسب سابق میر بخشی کے عہدے پر مامور کر دیا گیا۔ حمید الدین خان کو خطاب و اعزاز دینے کے بعد تن بخشی کی خدمت پر بحال کر دیا گیا۔

تمام چھوٹے بڑے بادشاہی ملازم عنایات شاہانہ سے بہرہ مند ہوئے۔

شاہ عالم نے خان خاناں کو مستقل طور پر وزارت عطا کر دی تھی مگر امرالامرا اسد خان اور ذوالفقار خان کی دل جوئی بھی اس کے پیش نظر تھی اس لئے اسد خان کو وکالت کا عہدہ دے کر وزارت میں شریک کر دیا تھا۔ یہ بات خان خاناں کو ناگوار گزری اور اسے یہ احساس دلانے والے عبداللہ خان اور حسین علی خان تھے۔ دونوں بھائی فیصلہ کر چکے تھے کہ اب سازشوں کی ابتدا کر دیں گے۔ دونوں خان خاناں سے خلوت میں ملے۔ اس ملاقات سے ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ خان خاناں کی قربت حاصل کر سکیں۔

''معاف کیجئے گا ہم دونوں ہی کو بادشاہ وقت کے اس اقدام سے رنج ہوا کہ انہوں نے اسد خان ایسے شخص کو ایک طرح سے آپ کی وزارت میں شریک بنا دیا ہے بلکہ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ اس طرح آپ کا منصب کچھ کم ہی کر دیا گیا ہے۔'' عبداللہ خان نے گفتگو کا آغاز کیا۔ خان خاناں چونک کر عبداللہ کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس کے دل کا چور پکڑا گیا ہو۔

''مگر...... مگر بادشاہ مرحوم کے زمانے ہی سے اسد خان امیر الامرا رہے ہیں۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر خلد مکاں کے خاص الخاص امیروں میں شمار ہوتے تھے۔ اگر انہیں بادشاہ وقت نے اس اعزاز سے نوازا ہے تو ہمارے خیال میں یہ کوئی بے جا بات نہیں۔'' خان رک رک کر محتاط انداز میں بولا مگر اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ خود اسے اپنے الفاظ کے کھوکھلے پن کا احساس ہے۔

''لیکن آپ اس بات کو کیوں فراموش کرتے ہیں کہ قانوناً جب اسد خان اپنا اجلاس منعقد کریں گے تو حسب ضابطہ دوسرے امرا کی طرح آپ کو بھی وکیل مطلق اسد خان کے اجلاس میں حاضر ہونا پڑے گا اور کھڑے ہو کر کاغذات پیش کرنا ہوں گے۔ کیا یہ حاضری آپ کے شایان شان ہو گی۔'' عبداللہ خان نے لوہا گرم دیکھ کر دوسری بھرپور ضرب لگائی۔

خان خاناں سوچ میں پڑ گیا اور کچھ دیر بعد ٹھنڈا سانس بھر کے بولا۔ ''ہاں تو تم صحیح کہتے ہو عبداللہ خان! ہمیں تمہاری ذہانت اور دور اندیشی کا قائل ہونا پڑا۔ واقعی یہ حاضری ہمارے لئے دوبھر ہو جائے گی لیکن اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے؟''

''کوئی ایسی مشکل نہیں جس کا حل نہ ہو۔'' عبداللہ خان نے پر اعتماد لہجے میں کہا کہ اس مسئلے کا حل وہ پہلے ہی ڈھونڈ چکا تھا تا کہ بروقت خان خاناں کے سامنے اپنی تجویز پیش کر سکے۔

''کیا تمہارے ذہن میں کوئی حل موجود ہے؟'' خان خاناں نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' عبداللہ خان نے جواب دیا پھر اپنی تجویز خان خاناں کے سامنے رکھ دی۔'' آپ کے علم میں ہے کہ اسد خان ضعیف آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ بادشاہ مرحوم خلد مکاں کی صحبت میں ہمیشہ سفر و جنگ میں گزارا ہے۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کا انہیں موقع نہیں ملا۔ ان کی نیابت ان کا بیٹا ذوالفقار خان بخوبی کر سکتا ہے۔ اگر بادشاہ بیگم کے ہمراہ اسد خان کو شاہجہان آباد بھیجنے کے احکام صادر ہو جائیں تو تمام مسئلہ حل ہو سکتا ہے کہ ابھی بادشاہ بیگم یہاں سے روانہ نہیں ہوئیں۔ اسد خان دار الخلافہ میں بلا کسی زحمت کے پیرانہ سالی کے دن آرام سے گزار سکتے ہیں۔''

''لیکن بات تو وہیں کی وہیں رہی۔ وہ نہیں تو ان کا بیٹا اس عہدے پر فائز ہو جائے گا۔'' خان

خاناں نے تجویز پر اعتراض کیا۔

''جی نہیں۔ ایک تو اس طرح یہ ہوگا کہ آپ کے عہدے کو مدنظر رکھتے ہوئے ذوالفقار خان کے سامنے آپ کی حاضری موقوف ہو جائے گی دوسرے یہ کہ پروانوں اور اسناد پر وزارت کی مہر کے بعد رسماً ذوالفقار خان کی مہر لگ جایا کرے گی۔ اس کی کبھی یہ جرات نہ ہو سکے گی کہ وہ آپ کے جاری کردہ پروانوں کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکے یا ان پر تائیدی مہر ثبت نہ کرے۔'' عبداللہ خان نے تفصیلاً جواب دیا۔

''خان خاناں یہ بات سن کر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اٹھ کر عبداللہ خان کو گلے لگا لیا۔ ''تم واقعی بہت ذہین اور دور اندیش ہو۔ ہم تم سے بے انتہا خوش ہوئے۔''

حسین علی حیرت سے اپنے بڑے بھائی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس نے کس طرح خان خاناں کو شیشے میں اتار لیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ بادشاہ کے کسی فیصلے کے خلاف اس طرح کھل کر گفتگو ہو اور نہ صرف گفتگو ہو بلکہ اس فیصلے کے خلاف دوسرا راستہ بھی سوچا گیا ہو۔

خان خاناں کی خوشنودی حاصل کرنا مستقبل میں دونوں بھائیوں کے لئے سود مند ثابت ہو سکتا تھا۔ رہا میر الامرا اسد خان تو اسے یہ علم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے خلاف تمام منصوبہ بندی عبداللہ خان کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ دونوں بھائیوں نے خود کو پس پردہ رکھ کر خان خاناں کو اس پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں خود شاہ عالم سے گفتگو کرے۔ انہوں نے خان خاناں کو یقین دلایا تھا کہ شاہ عالم اس سے بہت خوش ہے۔ وہ کبھی بھی اس کی بات نہیں ٹالے گا۔

اسی دن اسد خان نے اجلاس طلب کیا جس میں قہراً و جبراً خان خاناں کو دوسرے امرا کے ہمراہ جانا پڑا۔ اس نے اسد خان کے سامنے کھڑے ہو کر کاغذات وزرات پیش کئے۔ یہ حاضری حسب توقع خان خاناں کو ناگوار ہوئی مگر مجبوراً ضابطے کی کارروائی پر عمل کرنا پڑا۔

اسی رات خان خاناں خلوت میں شاہ عالم سے ملا۔ اس نے شاہ عالم کو عبداللہ خان کی تجویز پر آمادہ کر لیا۔ اسد خان کو جب علم ہوا کہ شاہ عالم نے اس کے لئے کیا احکام جاری کئے ہیں تو وہ ناخوش ہونے کی بجائے خوش ہو گیا۔ واقعی وہ عمر کی اس منزل میں تھا جہاں آدمی آرام طلب ہو جاتا ہے اور کم سے کم ذمے داریاں قبول کرنا چاہتا ہے۔ شاہ عالم نے اسے فوری طور پر بادشاہ بیگم کے ہمراہ شاہجہان آباد روانگی کا حکم دیا تھا۔ اسد خان کو یہ علم ہی نہ ہو سکا کہ اس طرح اس کے ہاتھ کاٹ کر اسے اختیارات سے محروم کر دیا گیا ہے۔

دوسرے ہی دن صبح اسد خان' بادشاہ بیگم اور محل کی دیگر بیگمات کے ساتھ دارالخلافہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس طرح امور سلطنت میں اسد خان کا کوئی عمل دخل نہیں رہا۔ صرف مالی اور ملکی پروانوں پر وزارت کی مہر کے بعد رسماً ذوالفقار خان کی مہر لگائی جانے لگی۔

کچھ روز بعد ہی شاہ عالم کی سالگرہ کی تقریب ''جشن وزن'' اکبر آباد ہی میں منعقد ہوئی۔ شاہ عالم کی عمر کا اکسٹھواں سال شروع ہوا جب کہ تخت نشینی کا یہ پہلا سال تھا۔ جشن کے بعد ہی شاہ عالم نے راجپوتوں کی سرکوبی کے لئے اودے پور اور جودھپور جانے کا قصد کیا۔ اسی کے ساتھ عبداللہ خان اور حسین

علی خان کو عظیم آباد اور الہ آباد جا کر اپنے اپنے عہدے سنبھالنے کا حکم ملا۔

اپنے چھوٹے بھائی حسین علی خان کو عظیم آباد کیلئے رخصت کر کے عبداللہ الہ آباد جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اسی دن خان خاناں نے بھی اسے طلب کر کے محبت و عنایت کا یقین دلایا اور آئندہ ہر طرح خبرگیری و سفارش کی یقین دہانی کرائی۔ بادشاہ وقت شاہ عالم کے بعد سب سے بڑی حیثیت خان خاناں ہی کی تھی۔ عبداللہ خان نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر الہ آباد روانہ ہو گیا۔

روانگی سے قبل ہی الہ آباد قاصد بھیجا جا چکا تھا تاکہ وہاں عبداللہ خان کا شایان شان استقبال ہو۔ حسب توقع جب وہ الہ آباد کے نواح میں پہنچا اور الہ آباد صرف پانچ کوس رہ گیا تو اسے کچھ فاصلے پر سپاہی کھڑے نظر آنے۔ ان سپاہیوں کے آگے کھڑے نقوش والا ایک شخص گھوڑے پر سوار موجود تھا عبداللہ خان کے ہمراہ موجود ایک قدیم سردار میر مشرف نے اسے بتایا کہ وہ تیکھے نقوش والا سانولا سا شخص ہی راجا رتن چند ہے۔

راجا رتن چند آگے بڑھا اور عبداللہ خان کے سامنے پہنچتے ہی سر جھکا دیا۔ پھر وہ گھوڑے سے کود کر زمین پر دو زانو بیٹھ گیا اور تسلیمات بجا لایا۔ یہ آداب صرف بادشاہوں کے لئے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ راجا رتن چند نے عبداللہ خان کو بادشاہوں ایسی تکریم کے قابل سمجھا تھا۔ اس کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اسی وقت اس کے اعزاز میں بارہ توپیں سر کی گئیں اور اس طرح الہ آباد کے عوام کو معلوم ہو گیا کہ ان کا نیا صوبیدار قطب الملک سید عبداللہ خان الہ آباد پہنچ چکا ہے۔

قلعہ الہ آباد میں عبداللہ خان کی خواب گاہ کو شاہانہ انداز میں سجایا گیا تھا۔

اسی شب راجا رتن چند نے عبداللہ خان کے اعزاز میں رقص و سرود کی محفل منعقد کی۔ عبداللہ خان نے اس شب سے پہلے کبھی انگور کی بیٹی کو منہ نہیں لگایا تھا مگر اس شب عبداللہ خان نے فیصلہ کیا کہ یہ رہگزر بھی دیکھ لی جائے۔ اس کی خدمت میں بہترین شراب پیش کی گئی۔ عبداللہ خان نے کیونکہ اس سے پہلے کبھی نہیں پی تھی اس لئے اسے شراب بہت کڑوی لگی۔ ایک ہی جام پی کر اس نے منہ پھیر لیا لیکن جب کچھ دیر بعد اس کے ذہن پر ہلکا سا سرور طاری ہوا تو اسے مزید پینے کی خواہش ہوئی۔ اسی لمحے ساز جاگ اٹھے اور اس کے ساتھ تقریباً ایک درجن ''قیامتیں'' سامنے آ گئیں۔

وہ سب نہایت مختصر اور کسے کسے لباس پہنے ہوئے تھیں جن میں ان کے بھرپور اور جوان جسم چھلکے پڑ رہے تھے۔ وہ سبھی ہندو تھیں۔ عبداللہ خان کے دریافت کرنے پر راجا رتن چند نے بتایا کہ وہ سب کنواری ہیں اور اب تک کسی کے قرب سے نا آشنا رہی ہیں۔ راجا رتن چند نے بطور خاص ان کنواری کنیاؤں کو عبداللہ خان کے حضور میں رقص پیش کرنے کیلئے جمع کیا تھا۔

دوسرا جام چڑھانے کے بعد عبداللہ خان کو کچھ ہی دیر میں دنیا بہت حسین نظر آنے لگی۔ وہ کنواری کنیاؤں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کے دل پر پاؤں رکھ کر رقص کر رہی ہوں۔ اتنا سارا حسن اور ایک جگہ پہلے کبھی اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔

ہر جسم اپنی جگہ جیسے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا مگر ان میں سے ایک تو سراپا پیکر رعنائی تھی۔ وہ جدھر جدھر سے ہو کر گزرتی عبداللہ خان کی نظریں اس کا تعاقب کرتیں۔ وہ رقص بڑا معنی خیز اور جذبات

میں ہلچل مچا دینے والا تھا۔ رقص کے اشاروں کنایوں میں واضح طور پر دعوت وصل تھی۔ عبداللہ خان پیتا رہا اور رقص دیکھتا رہا۔ نصف شب گزر گئی تو اس کا جسم کسی حسین آغوش میں بکھر جانے کے لئے مچلنے لگا۔ راجا رتن چند نے اس کی کیفیت بھانپ لی۔ رتن چند اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ رتن چند آہستہ آہستہ سے عبداللہ خان کی طرف جھکا اور سرگوشی کی حضور والا کو ان میں سے کون سی پسند آئی؟"

"ان سبھی قیامتوں کو ہمارے نام کر دو! ہم آنے والی ہر شب کو ان میں سے باری باری ایک کو طلب کرتے رہیں گے۔ ویسے آج کی یادگار شب کے لئے جو سرخ چولی باندھے ہوئے ہے مناسب رہے گی۔" عبداللہ خان نے اسی قیامت کی طرف اشارہ کیا جو اس کی مرکز نگاہ بنی ہوئی تھی۔ راجا رتن چند کے ایک اشارے پر رقص ختم کر دیا گیا۔ پھر وہ اٹھ کر کچھ دیر کے لئے کہیں گیا اور آتے ہی بولا۔ "اسے حضور کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اب حضور تشریف لے چلیں۔"

عبداللہ جب اٹھ کر چلا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ پہلی بار اس نے خاصی پی لی تھی۔ راجا رتن چند نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور خواب گاہ کی طرف لے جانے گا۔ عبداللہ خان کو اس نے خواب گاہ کے دروازے پر چھوڑا اور کسی شکنتلا کو پکارا۔

خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور وہی سراپا قیامت باہر نکلی جس نے عبداللہ خان کے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔

"حضور کو سنبھالو شکنتلا!" راجا رتن چند اس قیامت سے مخاطب ہوا۔

شکنتلا نے عبداللہ خان کو اپنے گداز و حسین بازوؤں میں سنبھال لیا تو جیسے عبداللہ کا نشہ کچھ اور تیز ہو گیا۔ خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی شکنتلا نے اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ عبداللہ خان کو وہ کشاں کشاں مسہری تک لے آئی۔ شکنتلا کے جسم سے جیسے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ کنوارے حسین جسم کی خوشبو جیسے عبداللہ خان کے حواس پر چھانے لگی۔ شکنتلا نے جب اسے مسہری پر بٹھا کر جوتے اتارے اور اس کے پاؤں اپنی گود میں رکھ کر ان پر جھک گئی تو وہ بے خود سا ہو گیا۔

"شکنتلا!" عبداللہ خان نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے اٹھایا اور پھر فاصلے مٹ گئے۔

شکنتلا سراپا خود سپردگی کے عالم میں تھی۔ "سرکار......! میرے حضور!" شکنتلا جیسے گنگنائی۔

"تم...... تم کتنی حسین ہو! تمہارے حسن کی تعریف کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ شکنتلا!" یہ کہہ کر عبداللہ خان نے اسے اور قریب تر کر لیا۔

"حضور کی عزت افزائی ہے۔" شکنتلا نے سرگوشی کی۔

دیر تک عبداللہ بے سروپا باتیں کرتا رہا اور اسی دوران میں خراج حسن بھی وصول کرتا رہا مگر یہ خراج ابھی حرارت لب و رخسار اور لمس پر بہار سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ پھر بند قبا کی گرہ کشائی کی منزل آئی تو عبداللہ خان کی آنکھوں میں جیسے چکا چوند ہو گئی۔ ہزاروں بجلیاں جیسے ایک ساتھ کوند گئیں۔ اب تاب ضبط کہاں تھی لیکن نہیں! اس شب تو محبت و محبوب کا فرق مٹ گیا تھا۔ عبداللہ خان محبوب تھا اور وہ خواب کے سے عالم میں عشق کی تیز گامیاں دیکھ رہا تھا۔ اسے ہوش ہی کب تھا کہ خود دیار کیف و کم میں قدم رکھتا! وہ تو جیسے اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ رعب حسن نے اس کی قوت گویائی تک سلب کر لی تھی۔ شکنتلا

...نازک ہاتھوں کے لمس اور اس کے لو دیتے جسم کی حرارت نے عبداللہ خان کو سنبھالا دیا ورنہ وہ ...شاید شوق وصال کی خواہش ہی میں گزر جاتی۔ شکنتلا ایک عاشق کا بھرپور کردار ادا کر رہی تھی۔

عبداللہ خان نے جب خود کو انبساط میں محسوس کیا تو اس کے اندر ایک طوفان سا انگڑائی لے کر ...آیا۔ اس کے رگ و پے میں بجلیاں سی بھر گئیں۔ ہاں وہ شب ان تمام شبوں سے زیادہ کیف آور ...اب تک عبداللہ خان شاہجہان آباد میں گزار چکا تھا۔ تھکے ماندے مسافر کو تپتی ہوئی دوپہر میں جیسے ...ل گیا تھا، پھر ایک طوفان کے دھارے سے دوسرے طوفان کا دھارا ٹکرایا تو جیسے ہر طرف رنگ ہی ...بکھر گئے۔ سرشاری کے سبب عبداللہ خان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تسکین کے احساس نے اس کے ...پر غنودگی طاری کر دی اور پھر وہ بے خبر سو گیا۔ اس کے شانوں پر کسی کی زلفیں پریشان ہو چکی تھیں اور ...نیند اس کی تھی۔

عشق و ہوس کے انتخاب میں ہوس عبداللہ خان کے حصے میں آئی تھی اور عشق شکنتلا کے حصے ...آئی مگر یہ بات عبداللہ کو بہت بعد معلوم ہوئی کہ پہلی ہی نظر میں اپنے جسم و جان کو اس کے اوپر نثار کر چکی ...جب راجا رتن چند نے اسے بتایا تھا کہ عبداللہ خان نے اسے اپنی خلوت کے لئے منتخب کر لیا ہے تو ...اس کے دل کی مراد مل گئی تھی۔

اس کے بعد دن کب ہوا، کب شام ہوئی، کب رات ڈھلی، ان دنوں عبداللہ خان کو کچھ ہوش ...تھا۔ اس کے اردگرد شب و روز سرو قدوں کا ہجوم رہتا۔ کاروبار حکومت سے اسے بس اتنی وابستگی رہ ...تھی کہ راجا رتن چند اس کے سامنے جو کاغذات پیش کرتا ان پر اپنے دستخط کر دیتا۔ کچھ دن میں اسے یہ ...گراں گزرنے لگا۔ اس نے راجا رتن چند کو اپنی طرف سے دستخط کرنے کے اختیارات دے دیئے۔ ...مام صوبے کا انتظام و انصرام عملاً راجا رتن چند ہی کے ہاتھ میں تھا۔ عبداللہ خان کے الہ آباد پہنچنے سے اس ...حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

الہ آباد میں عبداللہ خان کا دوسرا دست راست میر مشرف تھا۔ اس نے دبی دبی زبان میں کئی ...عبداللہ خان سے کہا کہ راجا رتن چند اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے مگر عبداللہ خان نے ہر ...اسے ٹال دیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ میر مشرف اور رتن چند میں معاصرانہ چشمک ہے جو کسی حد تک اسی کے ...میں جاتی تھی۔ اگر رتن چند نے کبھی کوئی ایسا قدم اٹھایا جو اس کے عزت و اقتدار کے منافی ہوا تو میر ...اسے باخبر کر دے گا اور ہرگز ایسا نہیں ہونے دے گا۔ راجا رتن چند سے ذاتی طور پر عبداللہ خان کو ...شکایت نہیں تھی بلکہ وہ اس سے خوش تھا۔ کیونکہ راجا ہر شب اس کی دلبستگی کا سامان فراہم کر دیتا تھا۔ ...ایک حسین جسم، ایک سے ایک خوبصورت بدن اس کی آغوش کی زینت بن رہے تھے۔ کسی شب ...کی آغوش خالی نہیں رہتی تھی۔

اب تک تو یہی ہوتا آیا تھا کہ ہر شب ایک نیا خمار، ایک نیا چہرا، ایک نیا سرور اس کے رگ و ...میں راحتیں بھر دیتا جو نازک بدن ایک بار اس کی مشام جاں مہکا جاتا پھر اس کی خواب گاہ میں داخل نہ ...پاتا مگر ایک شب ایسا نہ ہوا۔ عبداللہ خان نے اپنی خواب گاہ میں شکنتلا کو دیکھا۔ وہ ایک اشتیاق کے عالم ...عبداللہ خان کی طرف بڑھی۔ عبداللہ خان اس وقت نشے میں اتنا چور تھا کہ اسے شکنتلا کا نام بھی یاد نہ آ

سکا۔ اس کے ذہن میں بس یہ خیال بار بار گردش کر رہا تھا کہ آنیوالی اس کے لئے نئی نہیں ہے اور پہلے بھی زینت آغوش بن چکی ہے۔ وہ ایک مسلا ہوا پھول ہے جو اس کے شایان شان نہیں۔

عبداللہ نے شکنتلا کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ نفرت و حقارت سے ٹھکرا دیئے اور چیخا۔ ”نکل جا یہاں سے کہ حسن پامال ہمیں پسند نہیں!“

”حضور!...... بس ...... بس ایک بار...... اس کنیز کو اور قریب آ جانے دیجئے...... پھر ...... کبھی بھی تمنا...... آپ کی ...... آپ تمنا نہیں کرے گی۔ آپ ...... آپ میرے دیوتا ہیں ...... اس پجارن کو اپنی پوجا سے نہ روکیں...... ! آپ کو اپنے خدا کا واسطہ!“ یہ کہتے ہوئے شکنتلا عبداللہ کے پیروں سے لپٹ گئی۔

”چھوڑ دے میرے پاؤں...... ! کون ہے تو......؟ کیا نام ہے تیرا......؟ ہمیں علم ہے کہ تو پہلے بھی یہاں آ چکی ہے اور جو یہاں ایک بار آ جاتا ہے پھر کبھی نہیں آتا۔ بتا کہ تجھے دوبارہ یہاں کس نے بھیجا؟“ عبداللہ نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر اوپر کی طرف اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”حضور!“ شکنتلا کے سرخ مرطوب ہونٹ لرزے۔ ”مجھ ابھاگن نے خود راجا جی کی منت کی تھی۔ میں شکنتلا ہوں‘ آپ کی داسی شکنتلا! اور اب ...... اب آپ ہی میرا دھرم ہیں۔ میں آپ کے بنا جیون نہیں بتا سکتی...... ! میرے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ آپ مجھے اپنی کنیزوں میں شامل کر لیں تا کہ میں آپ کو دیکھتی رہوں اور جیتی رہوں...... روز آپ کے درشن کرتی رہوں میرے سوامی!“ شکنتلا کی آواز بھرا گئی۔

شکنتلا نے یہ جملے اتنی عاجزی سے ادا کئے تھے کہ عبداللہ خان کا دل پگھل گیا۔ اسے وہ شب یاد آ گئی جب اس نے پہلی بار الٰہ آباد آ کر شکنتلا کی زلفوں کے سائے میں آرام کیا تھا۔

”اٹھ!“ عبداللہ خان نے اسے حکم دیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو عبداللہ خان نے اسے گھسیٹ کر سینے سے لگا لیا اور بولا۔ ”کیا ہم واقعی تجھے پسند آ گئے ہیں؟“

”حضور...... ! آپ تو میرا جیون ہیں۔ میں تو آپ پر اپنا جیون وار دینے کو اپنی سب سے بڑی عزت جانوں گی۔“

پھر اس شب بھی شکنتلا نے عاشق ہی کا کردار ادا کیا اور عبداللہ خان کو قند مکرر کا لطف آیا۔ شکنتلا کی یہ ادا عبداللہ خان کو بہت بھائی۔

عبداللہ خان تو عیش و عشرت میں جیسے مستقبل کے تمام منصوبوں کو فراموش کر بیٹھا تھا مگر حسین علی خان کچھ بھی نہیں بھولا تھا۔ اسی دوران میں عبداللہ خان کو اپنے چھوٹے بھائی کا ایک پیغام ملا۔ وہ عبداللہ خان سے ملنے کا مشتاق تھا۔ عبداللہ خان نے اسے تحریر کیا کہ وہ کچھ دن کے لئے الٰہ آباد آ جائے مگر جس آسانی کے ساتھ اس نے الٰہ آباد آنے کے لئے لکھ دیا تھا حسین علی خان کا الٰہ آباد آنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لئے دربار سے اجازت لینا ضروری تھا۔ کسی بھی صوبیدار کا غیر سرکاری طور پر دوسرے صوبے میں جانا دربار کی اجازت کے بغیر ناممکن تھا۔ حسین علی خان نے جب مزید پیغام بھیج کر صورت حال کی وضاحت کر دی تو اسے حقیقت کا علم ہوا۔ حسین علی خان نے مزید لکھا تھا کہ دربار سے اجازت ملتے ہی میں الٰہ آباد آ جاؤں گا۔ اس وقت عبداللہ خان کو احساس ہوا کہ دونوں بھائی بڑے عہدے ملنے

کے باوجود اور ہر طرح آزاد و مختار ہو کر بھی کسی قدر مجبور ہیں!

دربار سے اجازت فوری طور پر مل گئی کیونکہ وہاں ان کا خیر خواہ خان خاناں موجود تھا حالانکہ اس قدر جلد اجازت مل جانا عام طور پر مشکل ہی ہوتا تھا۔ سبب ملاقات برادرانہ محبت ہی بیان کی گئی تھی۔ سبھی کو علم تھا کہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے کس قدر محبت کرتے ہیں!

دو ہفتے بعد ہی عبداللہ کو اطلاع مل گئی کہ حسین علی خان الٰہ آباد پہنچنے والا ہے۔ اس کے دل میں برادرانہ شفقت و محبت جوش مارنے لگی۔ وہ یہ فراموش کر چکا تھا کہ اس ملاقات کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے اس سے قطع نظر کچھ اور مقصد بھی ہے۔

حسین علی خان مقررہ دن الٰہ آباد پہنچ گیا۔ عبداللہ خان نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کو دیکھتے ہی اپنے گھوڑوں سے کود پڑے اور دوڑ کر لپٹ گئے۔ دن کے وقت عبداللہ خان شراب پینے سے اجتناب کرتا تھا۔ یوں بھی اس روز تو حسین علی خان آنے والا تھا۔ وہ حسین علی خان پر اپنی شراب نوشی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

دونوں بھائیوں کو خلوت میسر آئی تو حسین علی خان بولا۔ ”سب سے پہلے تو میں آپ کو ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔ شاید آپ نے نگار کے بھائی نواز کو اپنے ذہن سے جھٹک ہی دیا تھا اور اس کا سبب بھی تھا۔ بادشاہ مرحوم کی اچانک موت نے یہ خوف ذہن سے نکال دیا تھا کہ اب ہمارے لئے کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔ نواز کو عظیم آباد ہی کے ایک دور دراز قصبے سے گرفتار کر لیا گیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے قلعہ دار محمد یار خان سے تمام صوبیداروں کو خطوط ارسال کرائے تھے۔ سبھی صوبیداروں کی طرح میں نے اپنے ماتحت عملے کو نواز کے بارے میں احکام دیئے تھے۔ نواز طویل عرصے خوف کے سبب روپوش رہا۔ اس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا تھا۔ وہ شاہجہان آباد جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ وہ کبھی نہ پکڑا جاتا اگر پیٹ کا ہلکا نہ ہوتا۔ اس نے جس شخص کو اپنا دوست بنا لیا تھا اور جس کے یہاں ٹھہرا ہوا بھی تھا اس پر اپنی اصلیت ظاہر کر دی۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ اب وہ شاہجہان آباد جا رہا ہے اور وہاں جانے کا مقصد دونوں بھائیوں کی اصل حقیقت بادشاہ وقت شاہ عالم کو بتانا ہے۔ اس نے ثبوت کے طور پر کہا تھا کہ بہت جلد اس کا دوست یہ خبر سن لے گا‘ صوبہ عظیم آباد کا صوبیدار گرفتار کر لیا گیا۔ جب اس کے دوست کو نواز کے اصل نام اور اصل حقیقت کا علم ہوا تو اسے کچھ دن قبل کیا جانے والا سرکاری اعلان یاد آ گیا جس میں نواز کی گرفتاری پر انعام مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اس انعام کے لالچ میں قصبے کے فوجدار سے ملا اور اسے نواز کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ فوجدار نے نواز کو گرفتار کر کے فوراً میرے پاس عظیم آباد (پٹنہ) بھیج دیا۔ پھر میں نے کسی تاخیر کے بغیر نواز کے سینے میں اس راز کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا جس کا علم صرف ہم دونوں بھائیوں کو ہے۔“ حسین علی خان نے پوری تفصیل کے ساتھ نواز کی گرفتاری اور پھر اسے ٹھکانے لگائے جانے کے بارے میں بتا دیا۔

”بہت اچھا ہوا حسین علی خان! بہت اچھا ہوا‘ اگر ہمارے خلاف کوئی کارروائی نہ بھی ہوتی تو کم از کم یہ ضرور ہوتا کہ بادشاہ وقت ہماری طرف سے شبہے میں پڑ جاتا جو کسی بھی صورت میں ہمارے لئے سود مند نہیں تھا۔ بہرحال تقدیر قدم قدم پر ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔“ عبداللہ خان نے خیال آرائی کی۔

"لیکن ہم اپنی تقدیر کے نوشتے سے غافل ہیں۔" حسین علی خان بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیوں ایسی کیا بات ہے؟" عبداللہ خان نے کہا۔

"ہم نے اب تک محض خیالی پلاؤ پکایا ہے' اپنے منصوبے کی تکمیل کیلئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔"

حسین علی خان کی بات سن کر عبداللہ خان کو جیسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اسے خود سے ندامت سی محسوس ہوئی مگر اس نے حسین علی خان پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اب تک وہ اپنے منصوبے کی طرف سے قطعی غافل رہ کر عیش وعشرت اور عیاشی میں وقت گنواتا رہا ہے۔ اس نے اسی لئے کہا۔ "تم کس طرح یہ کہتے ہو کہ ہم نے اب تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا' اگر ایسا ہوتا تو آج ان عہدوں پر فائز نہ ہوتے جن پر ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہر منصوبہ ایسا نہیں ہوتا کہ فوری طور پر تکمیل کے مراحل طے کر لے۔ بعض منصوبے طویل المیعاد بھی ہوتے ہیں جس کا ثبوت ہمارے سامنے اعظم شاہ کی صورت میں موجود ہے۔"

"لیکن ہم نے جلد بازی سے کام کب لیا ہے! اب تو شاہ عالم کو برسر اقتدار آئے کم از کم ایک سال ہو رہا ہے۔ آخر ہم کب تک انتظار کریں گے؟ اس کے علاوہ ہمیں ابھی اپنے منصوبے کی جزئیات پر بھی غور کرنا ہے۔ یہ سب کچھ ہوگا کیسے؟ کوئی لائحہ عمل بھی تو بنانا پڑے گا!" حسین علی خان بولا۔

"تمہارا خیال درست ہے۔" عبداللہ خان نے اپنے بھائی کی تائید میں کہا "لیکن سوال یہ ہے کہ لائحہ عمل کیا ہو؟ میں نے اس مسئلے پر کافی غور وخوض کیا مگر اب تک میرے ذہن میں کوئی بات نہ آ سکی۔" عبداللہ خان نے صاف صاف جھوٹ بول دیا۔

"میں نے بھی اس مسئلے پر غور کیا تھا اور ایک طویل عرصے سے اس پر غور کر رہا تھا مگر میں ایک نتیجے تک پہنچ چکا ہوں۔ اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کرنے کی یہی ایک صورت ہو سکتی ہے۔" حسین علی خان نے بتایا۔

"مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے؟" عبداللہ خان بے تابی سے بولا۔

"شاہ عالم کا قتل!" حسین علی خان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مگر کس طرح اور کیسے۔ کیا شاہ عالم کے قتل ہوتے ہی شہزادہ عظیم الشان اور دوسرے شہزادوں کے علاوہ کام بخش' یعنی تخت کا تیسرا دعویدار برسر اقتدار نہیں آ جائے گا؟" عبداللہ خان نے چونک کر سوال کیا۔

"ابھی آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ اس قتل سے پہلے بھی ہمیں بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ آپ کے علم میں ہے کہ ہندوستان بھر کی تمام افواج خان خاناں کے زیر نگین ہیں۔ پہلے ہمیں خان خاناں سے مل کر ساز باز کرنا پڑے گی۔" حسین علی خان نے وضاحت کی۔

"تو کیا تمہارا کہنا یہ ہے کہ ہم اپنے منصوبے سے خان خاناں کو بھی آگاہ کریں؟ اگر ایسا ہوا تو کیا خود خان خاناں اقتدار پر قابض ہونا نہ چاہے گا؟" عبداللہ خان نے اعتراض کیا۔

"ہاں وہ ایسا ہی کرے گا مگر اس صورت میں جب کہ زندہ بچ جائے!"

"کیا مطلب! کیا اسے بھی قتل کرنا پڑے گا؟" عبداللہ خان نے دریافت کیا۔

"جی ہاں! مگر اس کا قتل شاہ عالم کے بعد ہوگا۔ پورا منصوبہ یہ ہے کہ میں یا آپ کسی طرح ن خاناں کو اس پر آمادہ کر لیں کہ وہ ہم میں سے کسی ایک کو اپنا نائب مقرر کر لے۔ جب ایسا ہو جائے تو ۔ شاہ عالم اور پھر خان خاناں کو موت کے بعد خود بہ خود تمام افواج میرے یا آپ کے زیر نگیں آ جائے ا۔ اس صورت میں ہم با آسانی اپنے خواب شرمندہ تعبیر کر سکیں گے۔" حسین علی خان نے اپنے ناک منصوبے کی پوری تفصیلات بیان کر دیں۔

عبداللہ خان تمام بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ یہ خطرناک منصوبہ واقعی بے مثل تھا مگر اس میں ف ایک خرابی تھی جو بار بار عبداللہ خان کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ وہ خرابی یہ تھی کہ یہ بات کسی طور یقینی نہیں تھی کہ فوج اور عوام انہیں قبول کر لیں گے۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت بھی عبداللہ خان ا اس بات کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ لوگ اورنگ زیب کے مرنے کی خبر سن کر روتے ہوئے سڑکوں پر ل آئے تھے۔ اس وقت عبداللہ خان کو احساس ہوا تھا کہ عوام میں مغل فرمانرواؤں کی جڑیں کتنی گہری ہ۔ عوام بادشاہ وقت سے کس قدر شدید محبت کرتے ہیں اور کتنے شاہ پرست ہیں۔ اس صورت حال میں ئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی کہ ہندوستان میں خانہ جنگی اور بغاوت شروع نہیں ہو جائے گی۔ خصوصاً ں صورت میں جب کہ شاہی خاندان کے افراد بھی زندہ تھے۔ اگر وہ دونوں کوئی چال چل کے شاہ عالم ے تمام بیٹوں کو بھی حراست میں لے لیتے تو شاہ عالم کا بھائی کام بخش پھر بھی تخت کا دعویدار رہتا' تمام ج اور عوام اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے۔

"آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟"

حسین علی خان نے اپنے بڑے بھائی کو مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھا اور خیالوں کی دنیا سے باہر آ ر بولا۔ "میں اس منصوبے سے متعلق ایک نہایت اہم بات پر غور کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤ حسین علی خان کہ کیا ندوستان کے عوام اور فوج جن پر صدیوں سے مغل حکومت کر رہے ہیں وہ ہمیں صاحب اقتدار تسلیم کر ں گے؟ اس کا جواب ذرا سوچ سمجھ کر دینا! اس سوال کے جواب سے ہمارا آئندہ لائحہ عمل طے ہونا ہے۔"

"اگر آپ کے دل میں اس طرح کے شکوک وشبہات ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کبھی سر اقتدار نہیں آ سکتے! پھر تو تمام جہد و کاوش ہی فضول ہو کر رہ جاتی ہے۔ آپ نے اتنے دن صوبیداری لی ہے۔ کیا آپ کو اس کا تجربہ نہیں ہوا کہ میری مراد عملی تجربے سے ہے کہ جو بات کسی اور طرح نہیں وا قتدار اور طاقت سے منوائی جا سکتی ہے۔ طاقت کے آگے بہر حال ہر ایک کو جھکنا پڑتا ہے۔ پھر ذرا مغلو لی تاریخ پر نظر ڈالئے! کیا انہوں نے بزور شمشیر ہندوستان کے وسیع وعریض علاقے پر قبضہ نہیں کیا؟ کیا نہوں نے یہ سب کچھ یوں ہی حاصل کر لیا؟" حسین علی خان کی آواز میں جوانی کا جوش تھا۔

"جذبات میں نہ بہو حسین علی خان! حالات کو ٹھنڈے دل سے سمجھنے کی کوشش کرو! اس سے اکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغلوں نے یہ حکومت طاقت اور قوت کے بل ہی پر حاصل کی ہے لیکن یہ بات کئی سو سال پہلے کی ہے۔ اس وقت حالات مختلف تھے۔ جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا تو اس وقت ہندوستان ٹکڑوں میں تقسیم تھا مگر اس وقت صورتحال مختلف ہے۔ اس وقت یہاں سے کابل تک صرف مغل حکومت ہے۔ وہ بھی متحد و مضبوط! اس کے علاوہ یہ کہ اس دوران حکومت میں مغل' ہندوستانیوں سے گھل مل

چکے ہیں۔ عوام اور فوج اب مغلوں کو طاقت کے بل پر نہیں محبت وعقیدت کے سبب بھی اپنا حکمران کرتے ہیں۔'' عبداللہ خان نے اپنے چھوٹے بھائی کو صورتحال سمجھائی۔

میں اب بھی نہیں سمجھ پایا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں اور ان تمام باتوں سے کیا نتیجہ اخذ مقصود ہے!'' حسین علی خان بولا۔

''دراصل میں اس نتیجے ہی کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں جس نتیجے پہنچنے کیلئے سوچ بچار کر رہا ہوں وہ غلط ہو لیکن یہ طے ہے کہ فی الحال ہمارے لئے وہی محفوظ راستہ ہے عبداللہ یہ کہہ کر پھر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے سے گہر غور وفکر کا اظہار ہو رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک رک کر وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ''ہاں یہ ممکن بالکل ممکن ہے!''

''کیا بھائی صاحب؟'' حسین علی خان نے سوال کیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''ہمیں اپنے منصوبے میں خان خاناں کو مہرے کے طور پر استعمال کرنا ہے۔'' عبداللہ نے بتایا۔

''وہ کس طرح؟'' حسین علی خان نے پوچھا۔

''وہ اس طرح کہ ہم اسے ساتھ دینے کا وعدہ کر کے اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کرنے کی ترغیب د گے مگر اس شرط پر کہ وہ اپنے بعد ہم دونوں بھائیوں کو حیثیت اور عہدے دے گا۔ ہم دونوں میں سے ا خان خاناں کا عہدہ سنبھال لے گا اور دوسرا وکیل سلطنت کے عہدے پر فائز ہو جائے گا۔'' عبداللہ خ نے جواب دیا۔

''ابھی پوری طرح آپ کی بات کی وضاحت نہیں ہوئی۔'' حسین علی خان نے کہا۔

''یوں سمجھو کہ ہم پہلے خان خاناں کو شیشے میں اتار کر اس بات پر آمادہ کریں گے کہ شاہ کے قتل ہوتے ہی وہ فوراً اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ اسی کے ساتھ شاہی خاندان کے تمام افرا حراست میں لے لے تاکہ کوئی تخت کا دعویٰ نہ کر سکے۔'' عبداللہ خان بولا۔

''لیکن خان خاناں کو تخت وتاج کا مالک بنا کے ہمیں کیا ملے گا؟'' حسین علی خان کے چہر سے الجھن ظاہر ہو رہی تھی۔

''میں اسی لئے تو کہتا ہوں حسین علی خان کہ تم دور اندیشی سے کام لیا کرو۔ سنو! اگر خا خاناں کے بادشاہ ہوتے ہی عام بغاوت ہو گئی' فوج اور عوام نے اسے بادشاہ تسلیم نہیں کیا تو ہم ا بغاوت سے فائدہ اٹھا کر کسی بھی شہزادے کو تخت پر بٹھا دیں گے اور خان خاناں کا قصہ پاک کر دیا جا گا۔ اس طرح ہم بادشاہ وقت کے بعد سب سے زیادہ بااثر ہوں گے' سمجھے! خان خاناں کو برسر اقتدار لا یہ معلوم ہو جائے گا کہ صحیح صورت حال کیا ہے! اگر بغاوت نہ ہوئی اور خان خاناں کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا بھی ہم فائدے میں رہیں گے۔ وہ اس طرح کہ تمام فوج ہمارے زیرنگیں ہو گی۔ ہم سے ایک وز سلطنت اور دوسرا وکیل سلطنت ہو گا۔ اس صورت میں کچھ دن بعد ہی ہم خان خاناں کو اپنے راستے سے کر خود اقتدار پر قابض ہو جائیں گے۔ تم شاید یہ بات نہ جانتے ہو حسین علی خان کہ ایک انقلاب دوسر

ب کو جنم دیتا ہے۔ عوام اور فوج پر سے مغل حکومت کی گرفت پہلے ہی ختم ہو چکی ہو گی۔ جس طرح ں نے خان خاناں کو بادشاہ تسلیم کیا ہو گا ہمیں بھی تسلیم کر لیں گے۔ اب سمجھ گئے میری پوری بات!'' للہ خان نے وہ ساری باتیں اپنے بھائی کو بتا دیں جو اس عرصے میں سوچی تھیں۔

یہ سب کچھ سن کر حسین علی خان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ وہ ایک عجیب سے عالم ولا۔ ''بہت خوب......! لاجواب...... میرا ذہن تو یہاں تک کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی اس بے میں ایک خامی ہے۔ وہ یہ کہ اگر خان خاناں ہمارے منصوبے میں شریک نہ ہوا تو ہم دونوں کی خطرے میں پڑ جائے گی۔ پھر وہ ہمارے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے میرا مطلب اس کی عدم ن اور راز فاش ہو جانے سے ہے۔ اگر اس نے ہماری بات رد کر دی اور شاہ عالم کو اس منصوبے سے کر دیا تو کیا ہو گا؟''

حسین علی خان کی بات پر عبداللہ خان ہنس پڑا۔ حسین علی خان اپنے بڑے بھائی کو حیرت سے لگا۔ عبداللہ خان کے ہنسنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے ہی اس سلسلے میں سوچ چکا تھا کہ ایسی صورت میں کیا ائے گا! اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا۔ ''سنو برادر عزیز! خود میرے ذہن میں بھی یہ جاگا تھا اور میں نے اس کا تدارک سوچ لیا تھا۔ فرض کرو کہ خان خاناں نے ہماری بات نہ مانی اور طرف سے ہمیں خطرہ بھی لاحق ہو گیا کہ وہ شاہ عالم کو ہمارے منصوبے سے آگاہ کر دے گا تو سنو ان خاناں ہمارے منصوبے سے اختلاف کر کے دراصل اپنے پروانہ موت پر دستخط کرے گا۔ ہم اسے ل کر کے فرار ہو جائیں گے۔ ہاں یہ بھی سن لو کہ ہماری یہاں سے روانگی صیغہ راز میں رہے گی۔ ہم ی طور پر نہیں بلکہ چھپ کر شاہجہان آباد پہنچیں گے۔ سرکاری طور پر ہم دونوں بھائی الہ آباد ہی میں گے اس لئے خان خاناں کے قتل کی ذمے داری ہم پر نہیں آئے گی۔''

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ ہاری ہوئی بازی اس طرح بھی جیتی جا سکتی ہے!'' حسین ان خوش دلی سے بولا۔ ''مگر خان خاناں کے قتل ہونے کے بعد کون سا دوسرا مہرہ استعمال کریں ''

''اسد خان کا بیٹا ذوالفقار خان ہمارا دوسرا ہدف ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ خان خاناں کے بعد وزارت سونپی جائے گی۔'' عبداللہ خان نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ کچھ دیر پہلے جو ہیجانی ت اس پر طاری تھی وہ ختم ہو چکی تھی اور اب وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''ایک اہم مسئلہ اور بھی ہے جس پر میں خاصا غور کر کے ایک فیصلہ کر چکا ہوں۔'' حسین علی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ اس ملاقات سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے بڑے بھائی سے ہر مسئلے پر گفتگو کر لینا تھا تاکہ بعد میں کسی اقدام پر پچھتانا نہ پڑے۔

''وہ مسئلہ کیا ہے؟'' عبداللہ خان نے دریافت کیا۔

''وہ یہ کہ شاہ عالم کے قتل کے سلسلے میں کیا حکمت عملی اختیار کی جائے! میری نظر میں کئی ایسے رانہ قاتل ہیں جو بھاری معاوضے پر اس کام کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں سے کسی ایک کو اس اہم کام کے لئے منتخب کر لیا جائے اور بقیہ دوسروں کو اس قاتل کو ہلاک کرنے

کا فرض سونپ دیا جائے تا کہ یہ راز ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے کبھی کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ شاہ عا قتل میں کس کا ہاتھ تھا!'' حسین علی خان نے بتایا۔

''تمہاری تجویز بظاہر بہت عمدہ لگتی ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ تمہیں یہ بھی تو سوچنا چاہئے قاتل کے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ وہ شاہ عالم کو قتل کرنے کی بجائے اگر اسے قتل کی سازش سے آ دے تو نسبتاً وہ محفوظ بھی رہے گا اور اس انکشاف پر اسے اتنے بڑے انعام سے بھی نوازا جائے گا کے معاوضے سے زیادہ ہی ہوگا۔ بات دراصل صرف اتنی ہے کہ یہ راز ہم دونوں کے علاوہ کسی تیہ شخص کو اسی وقت معلوم ہو جب وہ خود بھی پوری طرح پھنس چکا ہو۔'' عبداللہ خان نے مضبوط دلیل کر حسین علی خان کی تجویز کو رد کر دیا۔

''پھر بادشاہ شاہ عالم کو کون قتل کرے گا؟'' حسین علی خان حیرت سے بولا۔

''صرف میں یا تم! تیسرا کوئی نہیں!'' عبداللہ خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''وہ بھ وقت جب خان خاناں سے تمام معاملات طے ہو جائیں۔''

''تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں خفیہ طور پر شاہجہان آباد روانگی کی تیاریاں کرنا چا لیکن الہ آباد سے ہماری غیر حاضری راز کیسے رہے گی؟''

''راجا رتن چند میرے اعتماد کا آدمی ہے۔ صرف اسی کو علم ہوگا کہ ہم دونوں الہ آباد میر ہیں لیکن اسے بھی یہ نہیں بتایا جائے گا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کب تک ہماری واپسی ہوگی!'' ع خان نے جواب دیا۔

اس شب نہ تو عبداللہ خان نے شراب پی اور نہ ہی کوئی مہ وش زینت آغوش بنی۔ اس راجا رتن چند کو اس سلسلے میں پہلے ہی احکام دے دیئے تھے۔ دونوں بھائی اس رات صرف اپنے منہ پر گفتگو کرتے کرتے سو گئے۔

الہ آباد میں ایک دن گزار کر رات کے وقت وہ خاموشی کے ساتھ شاہجہان آباد روانہ ہو روانگی سے قبل ان دونوں نے اپنے جسموں پر ایسا لباس پہن لیا تھا جو صرف ہیرے جواہر کے تاجروں مخصوص تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ہیروں کے تاجروں کی حیثیت ہی سے خان خاناں تک گے۔ انہیں علم تھا کہ خان خاناں ہیروں کا بہت شوقین تھا۔ انہیں یقین تھا کہ جب خان خاناں کو معلو کہ ہیروں کے دو تاجر اسے کچھ نادر و نایاب ہیرے دکھانا چاہتے ہیں تو وہ فوراً ملاقات پر آمادہ ہو گا۔

راستے میں رکتے رکاتے تیسرے دن وہ دونوں شاہجہان آباد پہنچ کر ایک سرائے میر گئے۔ انہوں نے خان خاناں سے ملنے کے لئے رات ہی کا وقت مناسب جانا تھا تا کہ کوئی انہیں با نہ پہچان سکے۔ خصوصاً عبداللہ خان کو تو بہت ہی محتاط رہنا تھا کیوں کہ قلعے میں قلعہ دار محمد یار خان سے کر خدام اور کنیزوں تک سبھی اسے اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے البتہ حسین علی خان سے کم لوگ و تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد ہی انہوں نے قلعے کا رخ کیا۔ جب وہ قلعے کے قریب پہنچے تو ع

خان دانستہ اپنے چھوٹے بائی کے پیچھے ہو گئی اور اپنے چہرے کو کسی قدر چھپا لیا۔ حسب توقع انہیں صدر دروازے کے محافظوں نے روک لیا۔ دونوں نے اپنے آپ کو کابل کے تاجر ظاہر کیا۔ ضروری کارروائیوں سے گزرنے میں خاصا وقت صرف ہو گیا۔ تب کہیں جا کر ایک دم خادم کی معیت میں انہیں قلعے کے اندر داخل ہونے کی اجازت ملی۔ یہ خادم خان خاناں کا فرستادہ تھا جسے انہوں نے ہیروں کی بابت پیغام پہلے ہی بجھوا دیا تھا۔ خان خاناں نے ان دونوں ''تاجروں'' سے ملنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی اور اسی لئے اپنے ایک خادم کو انہیں لینے کے لئے بھیج دیا تھا۔

خادم ان دونوں بھائیوں کو خان خاناں کی قیام گاہ کی طرف لے جا رہا تھا اور اسی کے ساتھ عبداللہ خان کا ذہن ماضی میں گم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس قلعے کا ایک ایک گوشہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ عبداللہ خان کو مہ رخ یاد آئی جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔ زرینہ یاد آئی جس کے ساتھ ایک ناقابل فراموش رات بسر کی تھی۔ رابعہ یاد آئی جو نگار کے دھوکے میں اس کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ نگار یاد آئی جو اس کے لئے خطرہ بن گئی تھی اور آخر کار نگار کو بھی اس کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ دلاور خان یاد آیا جو کبھی اس کا نائب تھا اور اپنی حدود سے تجاوز کرنے کے سبب اس کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ پھر اسے داروغہ زنداں سید قاسم یاد آیا اور اس کا خون کھول اٹھا۔ درواغہ نے ایک ہی دن میں دو بار اس پر قاتلانہ حملے کرائے تھے۔ عبداللہ خان نے اس لمحے فیصلہ کیا کہ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تو سید قاسم کو عبرتناک موت ماروں گا۔

انہیں خیالوں میں وہ دونوں خان خاناں کی قیام گاہ تک پہنچ گئے۔ انہیں اندر لے جا کر خادم نے انتظار گاہ میں بٹھا دیا۔ بیٹھتے ہی عبداللہ خان نے چھوٹے بھائی سے سرگوشی کی۔ ''اپنے منہ پر ڈھاٹا باندھ لو!''

حسین علی خان نے سوالیہ نظروں سے بڑے بھائی کی طرف دیکھا پھر کچھ نہ سمجھنے کے باوجود ھائی کی ہدایت پر عمل کرنے لگا۔ عبداللہ خان بھی ڈھاٹا باندھنے لگا۔

''میں نہیں چاہتا کہ خان خاناں ہمیں اچانک یہاں دیکھ کر ایک دم بوکھلا جائے اور کوئی ایسی رکت کر بیٹھے جس سے معلوم ہو جائے کہ ہم کون ہیں۔'' عبداللہ خان بہت دھیمی آواز میں چھوٹے بھائی سے دوبارہ مخاطب ہوا۔

حسین علی خان نے اثبات میں سر ہلا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی ور نہیں تھا۔ جو خادم ان دونوں کو یہاں تک لے کر آیا تھا وہ خان خاناں کو ان کی آمد سے مطلع کرنے چلا گیا تھا۔

انہیں خان خاناں کا انتظار کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہی خادم انتظار گاہ میں اخل ہوا جو انہیں وہاں بٹھا گیا تھا۔ اس نے اطلاع دی کہ خان خاناں تشریف لا رہے ہیں اس کی نظر ولوں کے چہروں پر پڑی تو چونک اٹھا مگر کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا۔ جیسے ہی خان خانان نے کمرے میں دم رکھا دونوں بھائی اٹھ کر اس کے حضور میں تسلیمات بجا لائے۔ تسلیمات بجا لانے کا انداز قطعی ایسا تھا یسے خان خاناں وزیر سلطنت کی بجائے بادشاہ وقت ہو۔ خان خاناں ان دونوں کو حیرت اور متجسس نظروں

سے دیکھ رہا تھا۔ عبداللہ خان کو علم تھا کہ اس کی حیرت و تجسس کا سبب دونوں بھائیوں کے چھپے ہوئے چہرے تھے۔

”حضور کا دیرینہ خادم عبداللہ خان تخلیے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے اور حضور سے درخواست کرتا ہے کہ جب تک تخلیہ نہ ہو جائے خادم کو اس کے نام سے نہ پکارا جائے۔“ عبداللہ خان نے سرگوشی کی اور اسی کے ساتھ صرف ایک لمحے کو اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔

عبداللہ خان کو دیکھ کر خان خاناں اچھل پڑا۔ اس کے چہرے پر انتہائی حیرت کے آثار تھے۔ وہ جیسے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے حسین علی خان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ عبداللہ خان کے اشارے پر حسین علی خان نے بھی ایک ثانیے کے لئے اپنے چہرے کی جھلک دکھائی۔ اس بار خان خاناں کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ غالباً عبداللہ خان کے ہمراہی کے بارے میں درست اندازہ لگا چکا تھا۔

دونوں بھائی خاموشی سے خان خاناں کے پیچھے چلتے رہے۔ رات کا وقت تھا اس لئے عمارت پر سناٹا طاری تھا۔ خان خاناں انہیں لئے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہو گیا اور اندر سے دروازہ مقفل کر دیا۔

”ہاں اب اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤ کہ تم دونوں بھائی اچانک یہاں دارالخلافہ میں بغیر کسی اطلاع کے کیسے نظر آ رہے ہو؟ یقیناً کوئی اہم بات ہی ہو گی! خان خاناں نے بیٹھ کر ایک مسند سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”اگر اجازت ہو تو دریچے بند کر دوں؟“ عبداللہ خان آغاز گفتگو سے پہلے بولا۔

”بہت احتیاط برت رہے ہو!“ خان خاناں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”کر دو بند...... کر دو۔“

عبداللہ خان نے اٹھ کر تمام دریچے بند کر دیئے۔ اس سے پہلے وہ دریچوں سے جھانک کر یقین کر چکا تھا کہ ارد گرد کوئی موجود نہیں۔ دریچے بند کر کے وہ خان خاناں کے قریب ادب سے بیٹھ گیا' اس کے بعد چہرے سے ڈھاٹا کھول دیا۔ حسین علی خان نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔ ”ہاں تم لوگ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے میرے سامنے آداب شاہی کو ملحوظ کیوں رکھا؟“ خان خاناں خوش مزاجی سے بولا۔

”دراصل بات یہ ہے حضور کہ ہم تو اپنا آقا آپ ہی کو جانتے ہیں۔“ عبداللہ خان نے ادب سے جھک کر جواب دیا۔

”تم بھی کمال کرتے ہو عبداللہ خان! عقیدت و محبت اپنی جگہ ہے اور قوانین و آداب حکومت اپنی جگہ! اگر کسی کو علم ہو جائے کہ ہم نے شاہ وقت کی موجودگی میں اپنے حضور آداب شاہی کی اجازت دی تو مصیبت ہو جائے۔ ممکن ہے یہ معلوم ہونے کے بعد بادشاہ وقت ہم سے برگشتہ ہو جائیں۔“ خان خاناں نے کہا مگر اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ ان دونوں بھائیوں کی اس جسارت پر ناراض ہونے کی بجائے خوش ہوا ہے' اس کی انا کو اس سے تسکین پہنچی ہے۔

”حضور یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ شاہ عالم کو جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ حضور ہی کے سبب ہوا ہے۔“ عبداللہ خان نے برجستہ کہا۔

”خاموش ہو جاؤ عبداللہ خان! تمہارے لہجے میں گستاخی ہے۔ تم ہماری تعریف میں اس حد ل آگے بڑھ رہے ہو کہ آداب شاہی بھی فراموش کر بیٹھے ہو۔“ خان خاناں کی آواز میں غصے اور خوف کا نصر شامل تھا۔ ”یہ نہ بھولو کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں!“

”اگر اظہار حقیقت جرم ہے تو خادم سزا بھگتنے کو تیار ہے۔“ عبداللہ خان نے خان خاناں کے امنے سر جھکا دیا۔

”عبداللہ خان! یہ سر اس لئے نہیں کہ ہمارے حضور جھکے۔ ہم پہلے ہی تمہارے زیر بار احسان ، تم ہمیں مزید شرمندہ نہ کرو!“ خان خاناں محبت آمیز لہجے میں بولا۔ ”تم اپنی آمد کا مقصد بیان کرو! ین کرو کہ ہم سے جو ہو سکا وہ تمہارے لئے ضرور کریں گے۔“

”سب کچھ حضور کے خادموں کو کرنا ہے۔ ہمیں تو صرف حضوری کی رضا مندی و خوشنودی کار ہے۔“ عبداللہ خان نے احتیاط کے ساتھ بات شروع کی۔

”تم واضح الفاظ میں بتاؤ کہ ہم سے کس قسم کی اجازت چاہتے ہو؟“

”ہم حضور سے صرف اس بات کی اجازت چاہتے ہیں کہ ہم آنے والے زمانوں میں حضور کا محفوظ کر دیں' ہم چاہتے ہیں کہ مستقبل کا مورخ حضور کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ ہو۔ وہ حضور کو اس ب و اعزاز سے یاد کرے جس کے حضور مستحق ہیں۔“

”دیکھو عبداللہ خان ہمیں الجھن میں نہ ڈالو! ہم صاف صاف اور دوٹوک باتیں پسند کرتے ۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے کھل کر کہو! یقین کرو کہ اگر کوئی بات ہماری مرضی کے خلاف ہوئی تو ہم اسے ز کر دیں گے۔“ خان خاناں کے لہجے میں نرمی اور محبت تھی۔

”تو پھر حضور ہمیں اس بات کا یقین بھی دلائیں کہ جو گفتگو اس وقت ہونیوالی ہے وہ ہمیشہ صیغہ میں رہے گی خواہ اس تجویز پر عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے جو ہم حضور کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں۔“ اللہ خان نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کسی چوتھے شخص کے منے بھی نہ آ سکے گی۔“ خان خاناں نے یقین دلایا۔

”خواہ وہ ہستی بادشاہ وقت ہی کو کیوں نہ ہو؟“ عبداللہ خان نے لقمہ دیا۔

”کیا کوئی ایسی بات بھی ہو سکتی ہے؟“ یہ کہتے ہوئے خان خاناں کچھ الجھ سا گیا۔

”جی ہاں حضور! گفتگو کچھ اسی نوعیت کی ہے کہ اسے بادشاہ وقت کے علم میں بھی نہیں ا چاہئے۔“

”ہوں!“ خان خاناں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا عبداللہ خان تو ہم ہر اس سے کوئی ایسا وعدہ نہ کرتے مگر ہمیں تمہاری وفاداری' خلوص اور محبت پر بھروسا ہے اس لئے ہم تم عدہ کرتے ہیں کہ ہمارے مابین ہونے والی گفتگو بادشاہ وقت کے علم میں کبھی نہ آ سکے گی حالانکہ ہم ں طرح جانتے ہیں کہ ایسے وعدوں سے نافرمانی و بغاوت کی بو آتی ہے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”خلد مکاں (اورنگ زیب عالمگیر) کے بعد ان کے صاحبزادوں میں سے کوئی نہیں جو ان کی

جگہ لے سکے۔ کیا حضور والا خادم کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں؟'' عبداللہ خان نے پہلا پتھر پھ
''جہاں تک راست گوئی کا تعلق ہے تو یہ سچ ہے کہ خلد مکاں اورنگ زیب کی سی صلاحیتیں شہزادے میں نہیں ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ خلد مکاں شہزادوں کو ہمیشہ اپنا دست نگر رکھنا چا تھے۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ کبھی کوئی شہزادہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس قابل نہ ہو سکے کہ خلد مک کے لئے مصیبت بن جائے۔ کوئی بھی شہزادہ اس حد تک کاروبار حکومت میں دخیل نہ ہو جائے کہ خود مکاں کی زندگی میں انہیں عضو معطل بنا دے جیسا کہ خلد مکاں نے اپنے والد محترم مرحوم شاہجہان ساتھ کیا۔'' خان خاناں نے ایمانداری کے ساتھ تفصیلی جواب دیا۔

''مجھے حضور کے خیالات جان کر خوشی ہوئی یہی خادم کے خیالات ہیں۔'' عبداللہ خان بولا۔

''مگر عبداللہ خان اس گفتگو کا حاصل کیا ہے؟'' خان خاناں نے سوال کیا۔

''خادم وہی عرض کرنے والا ہے۔ دراصل کوئی بھی بات اپنے سیاق و سباق کے بغیر بے ہوتی ہے اس لئے خادم نے تمہید ضروری سمجھی۔''

عبداللہ خان جلدی سے بولا وہ خان خاناں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ کچھ اور سو سکے۔ اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

''خلد مکاں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جو کچھ ہوا اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہ کہ اگر حضور والا بادشاہ وقت شاہ عالم کا ساتھ نہ دیتے کابل اور لاہور میں ان کے لئے انتہائی کم وقت م کثیر فوج جمع نہ کرتے اور شاہ عالم کو کابل سے فوری طور پر کوچ کرنے کے حالات سازگار نہ کر دیتے تو آ حالات کچھ اور ہوتے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' حضور کے بروقت اور مناسب مشوروں نیز محل اقدامات ہی کے سبب آج بادشاہ وقت مغلیہ تخت و تاج کے مالک ہیں۔ حضور اگر خود کو الگ تصور کر ایک غیر جانب دار شخص کی حیثیت سے اپنے خیالات کا ذہانت کے ساتھ اظہار کریں گے تو یقیناً میر خیال سے اتفاق فرمائیں گے کہ بادشاہ وقت کو جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ حضور ہی کے سبب ہوا ہے۔''

''بالفرض محال تمہاری بات تسلیم کر بھی لی جائے تو تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہو؟'' خان خاناں نے آخر کار ہتھیار ڈال دیئے۔

''میں نتیجہ اخذ نہیں کر رہا حضور بلکہ اظہار حقیقت کر رہا ہوں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ ش عالم صرف اس لئے آج تخت و تاج کے مالک اور حق دار ہیں کہ ان کی رگوں میں مغلیہ خاندان کا خون د رہا ہے ورنہ گستاخی معاف خادم کی نظر میں حضور ان سے زیادہ باصلاحیت اور.....''

''خاموش عبداللہ خان!'' خان خاناں تقریباً چیخ اٹھا۔ ''اب ہم آگے ایک لفظ سننا نہیں چاہ تمہاری باتوں سے بغاوت کی بو آ رہی ہے۔ تم ہماری محبت و نوازش سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو!''

''حضور کا حکم ہے تو خادم خاموش ہوا جاتا ہے لیکن اتنا ضرور عرض کرے گا کہ زبان خلق کو نقا خدا سمجھا جاتا ہے!''

''کیا.....؟ کیا کہا تم نے.....؟ کیا یہ بات عوام کی زبان تک بھی آ پہنچی ہے.....؟ اگر ایسا تو..... تو یہ ہمارے لئے انتہائی خطرناک بات ہے۔ اس طوفان کو روکو عبداللہ خان! ورنہ ہم کہیں کے

رہیں گے ہم پر آقا کشی اور احسان فراموشی کا الزام عائد ہو جائے گا۔''

''زبان خلق کو کوئی روک سکا ہے حضور جو میں روک لوں گا! اگر حضور کو میری بات پر یقین نہیں تو حسین علی خان سے پوچھ لیجئے کہ اس کے صوبے کی کیا حالت ہے! اور وہاں لوگ کیا کہتے ہیں!'' عبداللہ خان نے انکسار کے ساتھ کہا۔

عبداللہ خان کے خاموش ہوتے ہی اشارہ پا کر حسین علی خان مستعد ہو گیا اب اس کی باری تھی۔ وہ بولا۔ ''حضور والا! لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر خلد مکاں اورنگزیب کے بعد کوئی اقتدار کا اہل ہے تو صرف آپ صرف حضور.....''

''نہیں.....! نہیں!'' خان خاناں نے بآواز بلند حسین علی خان کی بات کاٹ دی۔ ''ہمیں گنہگار نہ کرو! یہ صرف لوگوں کی محبت و خوش فہمی ہے۔'' اب خان خاناں کی آواز میں وہ سختی نہیں رہی تھی جو کچھ دیر پہلے تھی۔ اس بات کو عبداللہ خان نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ خان خاناں کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں پڑ گیا ہے۔ اسے خاموش دیکھ کر عبداللہ خان بول اٹھا۔ ''الہ آباد اور عظیم آباد دونوں صوبوں کی حمایت کا ہم دونوں بھائی حضور کو یقین دلاتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' خان خاناں ایک دم چونک پڑا۔

''مطلب غالباً حضور والا سمجھ چکے ہوں گے۔ حضور کے خادم حضور کو تخت نشین دیکھنا چاہتے ہیں۔'' عبداللہ خان نے آخر کار وہ بات کہہ ہی دی جس کے لئے اتنی دیر سے خان خاناں کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔

''مگر..... مگر ہم احسان فراموش اور آقا کش تو نہیں! تم نے ہمیں ایسا کیوں سمجھا؟'' خان خاناں کے چہرے سے اب خوف کا اظہار ہونے لگا۔

''اگر حضور نے ہماری تجویز پر عمل نہیں کیا تو..... تو خدانخواستہ جو بات آج عوام کی زبان پر ہے کل بادشاہ وقت کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ ایسی صورت میں حضور خود سمجھ سکتے ہیں کہ کیا ہوگا!''

''ہاں ہم جانتے ہیں کہ ہمیں معزول کر دیا جائے گا' ہم پر الزامات لگائے جائیں گے' فرد جرم عائد ہوگی' ہمیں ناکردہ گناہ کی سزا ملے گی' ہماری رسوائی کا سامان ہوگا! ہاں ہم سمجھ رہے ہیں جو کچھ ہوگا ہم اسے اپنی چشم تصور سے دیکھ رہے ہیں۔'' خان خاناں کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔

''لیکن ہم نہیں چاہتے کہ نصیب دشمناں حضور کو وہ دن دیکھنا پڑے۔'' عبداللہ خان نے فوراً کہا۔

''پھر اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟'' خان خاناں کا لہجہ بجھ سا گیا تھا۔

''جب عبداللہ خان نے خان خاناں کے اس سوال کے جواب میں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو خان خاناں مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔''

کچھ ہی دیر بعد خان خاناں نے عبداللہ خان کو غیر یقینی اور عجیب سے نظروں سے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔ ''تم..... کیا تم واقف ہو کہ..... کہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟ کہیں میری ساعت مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی!''

''حضور نے جو کچھ سنا وہ حقیقت ہے۔ فریب ساعت نہیں حضور کا اقبال بلند ہو۔ حضور کے

خادموں کو صرف حضور کی رضا مندی چاہئے! باقی سب کام انشاء اللہ بہ حسن وخوبی انجام پائیں گے۔ حضور کو کچھ نہیں کرنا صرف رضا مندی کا اظہار کرنا ہے۔'' عبداللہ خان نے آخری پتا پھینکا۔

''بادشاہ وقت کا قتل......! نہیں نہیں عبداللہ خان! یہ اس قدر آسان نہیں۔ تم آگ سے کھیلنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا!'' خان خاناں گھبرا گیا۔

کافی دیر بحث و مباحثے کے بعد عبداللہ خان نے آخر خان خاناں کو شیشے میں اتار ہی لیا مگر اب بھی وہ خوف زدہ سا تھا۔ عبداللہ خان نے بات کا رخ قتل سے ہٹا کر دوسری طرف موڑنے کے لئے دوسری بات چھیڑ دی۔ ''حضور کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ حضور کسی طرح بادشاہ وقت کو اس بات پر آمادہ کرلیں کہ وہ نائب وزیر سلطنت کی جگہ حسین علی خان یا میرا تقرر کردیں تاکہ حضور کی بادشاہت کا اعلان ہوتے ہی تمام افواج کو سنبھالا جاسکے۔''

''لیکن نائب وزیر سلطنت کا عہدہ تو ہے ہی نہیں پھر بادشاہ سلام اس عہدے پر کیسے تقرر کرسکتے ہیں!'' خان خاناں نے اعتراض کیا۔

''عہدہ تو وکیل سلطنت کا بھی نہیں تھا مگر بادشاہ وقت نے اسد خان کے لئے یہ عہدہ پیدا کیا۔ تو کیا وہ چاہیں تو نائب وزیر سلطنت کا عہدہ نہیں ہوسکتا؟''

''یہ بات ان کی صوابدید پر منحصر ہے۔'' خان خاناں نے عبداللہ خان کی بات کا جواب دیا۔

''مجھے یقین ہے کہ بادشاہ وقت حضور کی بات نہیں ٹالے گا۔'' عبداللہ خان پر یقین لہجے میں بولا۔

''تو پھر میں کل ہی اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔'' خان خاناں نے کہا۔

''بہتر ہے۔'' عبداللہ خان بولا۔ ''اب ہم دونوں کل حاضر ہوں گے حضور احتیاطاً اپنے خدام کو ہدایت دے دیں کہ کابل کے تاجروں کو فوراً حضور کے پاس پہنچا دیا جائے ہم کل پھر اسی وقت حاضر ہوں گے۔''

''جاؤ خدا تم دونوں کو اپنی امان میں رکھے۔'' خان خاناں نے انہیں رخصت کرتے ہوئے دعا دی۔ رخصت ہونے سے قبل دونوں بھائی خان خاناں کے سامنے پھر شاہانہ آداب کے ساتھ تسلیمات بجا لائے اور اسی کی رہنمائی میں باہر نکل گئے۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ سرائے کے ایک کمرے میں محو گفتگو تھے۔ وہ سرائے قلعے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ رات گئے تک انہوں نے اپنے منصوبے سے متعلق تفصیل سے گفتگو کی اور دل ہی دل میں دعائیں مانگیں کہ کہیں خان خاناں اپنے قول سے پھر نہ جائے۔ انہیں بہرحال یہ جوا کھیلنا ہی تھا۔ اب ان دونوں بھائیوں کی زندگی خان خاناں کی ایک جنبش لب کی محتاج تھی۔ اگر خان خاناں بزدلی کا ثبوت دے کر شاہ عالم کو آنے والے انقلاب سے آگاہ کردیتا تو وہ کہیں کے نہ رہتے۔ وہ دونوں بظاہر ایک دوسرے کو طفل تسلیاں دے رہے تھے مگر اندر سے دونوں ہی خوف زدہ تھے۔ دونوں کے اعصاب پر یہ خوف سوار تھا کہ کہیں آئندہ روز قلعے پہنچتے ہی انہیں گرفتار نہ کرلیا جائے اس خوف میں اس شب انہیں ٹھیک سے نیند بھی نہ آئی۔

وہ پورا دن بھی وسوسوں اور اندیشوں میں گزرا۔ خدا خدا کرکے رات ہوئی اور ان دونوں نے قلعے کا رخ کیا۔ عبداللہ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا لیکن قلعے پہنچ کر جب انہیں عزت و احترام کے

ساتھ خان خاناں کی قیام گاہ تک پہنچا دیا گیا تو ان کے دل کو کچھ ڈھارس بندھی۔ خان خاناں انہیں خلوت میں لے گیا۔

تخلیہ میسر آتے ہی خان خاناں نے خوش خبری سنائی۔ ''مبارک ہو عبداللہ خان! میں نے نائب وزیر سلطنت کے عہدے پر تمہارا تقرر کرا دیا اور آج ہی الٰہ آباد کے لئے قاصد روانہ ہوگیا ہے۔ تمہیں ہماری نیابت مبارک ہو۔''

''قاصد روانہ ہوگیا ہے!'' عبداللہ خان چونک کر بولا۔ ''کیا آپ یہ بھول گئے کہ ہم دونوں یہاں موجود ہیں؟''

خان خاناں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''ہم اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ تمہاری تقرری کا فرمان ہماری جیب میں ہے۔ قاصد صرف دکھاوے کیلئے روانہ کیا گیا تھا۔ شاہجہان آباد سے نکل کر وہ شاہدرے میں رک گیا تھا جہاں ہمارے ایک معتمد خاص نے اس سے وہ فرمان حاصل کرلیا۔ اب وہ قاصد دو روز بعد یہاں لوٹے گا۔ تمہیں مزید دو دن یہاں روپوش رہ کر گزارنا ہوں گے اور ہاں سنو! تمہیں الٰہ آباد کی صوبیداری سے بھی معزول نہیں کیا گیا۔ تم وہاں کسی کو بھی اپنا نائب مقرر کرسکتے ہو۔''

اس شب خان خاناں سے مزید وعدے وعید ہوئے جن میں یہ بات بطور خاص شامل تھی کہ خان خاناں کے برسراقتدار آتے ہی عبداللہ خان وکیل سلطنت اور حسین علی خان وزیر سلطنت ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ جس شب شاہ عالم کو قتل کیا جائے گا تمام شہزادوں کو بھی گرفتار کرلیا جائے گا۔ خان خاناں کے سر میں اب اقتدار کا سودا سما گیا تھا۔ اس نے ہر بات تسلیم کرلی۔ عبداللہ خان نے خان خاناں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ شاہ عالم کو کس طرح قتل کیا جائے گا اور یہ فرض کون انجام دے گا! اسے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ جس شب ایسا ہوگا خود اس پر بھی ایک ناکام حملہ کیا جائے گا۔ اس حملے کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ بادشاہ کا حفاظتی دستہ خان خاناں کی چیخ پکار سن کر ادھر دوڑ پڑے اور اس دوران میں شاہ عالم کا کام تمام کردیا جائے۔

دو دن بعد ہی عبداللہ خان نے شاہجہان آباد میں اپنی آمد ظاہر کردی اور اسی روز شاہ عالم کے حضور حاضر ہوکر تسلیمات بجا لایا۔ اسی دن قلعے میں اس کی سکونت کے انتظامات کردیئے گئے۔ اسی رات عبداللہ خان نے حسین علی خان کو اپنی سکونت گاہ کے ایک اندرونی کمرے میں بند کردیا تاکہ اس کے ذاتی خدمت گاروں کی نظر بھی حسین علی خان پر نہ پڑ سکے۔ خان خاناں کو عبداللہ خان مزید ڈھیل دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت لوہا گرم تھا اور فوری ضرب کی ضرورت تھی اس لئے دوسری ہی شب آئندہ شب کے لئے تمام تفصیلات خان خاناں سے طے کرلی گئیں۔ عبداللہ خان نے اس خواب گاہ کے دریچے کھلے رکھنے کو کہا تھا تاکہ اس کی چیخ پکار باہر تک سنائی دے سکے اور دریچے سے اس کی خواب گاہ میں خنجر پھینک کر قاتلانہ حملے کا سوانگ بھی رچایا جاسکے۔

جس شب عبداللہ خان شاہ عالم کو قتل کرنے جانے والا تھا اس نے اپنے ذاتی محافظوں کو چھٹی دے دی تھی تاکہ نصف شب کے قریب اسے اپنی خواب گاہ سے نکلتے ہوئے کوئی نہ دیکھ سکے۔ چلتے وقت حسین علی خان نے اسے احتیاط کی تاکید کی اور وہ اپنے چھوٹے بھائی سے گلے مل کر رخصت ہوگیا۔ اس

کے لباس میں دو خنجر پوشیدہ تھے جن میں سے ایک اسے خان خاناں کی خواب گاہ میں پھینکنا تھا اور دوسرے مغلیہ تاجدار اورنگزیب عالمگیر مرحوم کے بیٹے بادشاہ وقت شاہ عالم کو شکار کرنا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لبادے میں ملبوس تھا۔ خان خاناں کی قیام گاہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر تھی اور اس کی قیام گاہ کے بعد محل کا وہ حصہ تھا جو صرف شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا۔ اس حصے کی ابتدا ہی میں شاہ عالم سکونت پذیر تھا۔

عبداللہ خان ننگے پاؤں تھا تاکہ اس کے قدموں کی آواز سنائی نہ دے سکے۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ خان خاناں کی قیام گاہ تک پہنچ کر اس سے متصل راہداری میں داخل ہو گیا' خواب گاہ کے دریچے منصوبے کے مطابق کھلے ہوئے تھے۔ اس نے تیزی سے خواب گاہ میں خنجر پھینکا اور اسی وقت خان خاناں کی چیخوں سے سناٹا گونج اٹھا۔ دوڑو' پکڑو' بھاگو کی صدائیں گونجنے لگیں۔ محل میں ہنگامہ مچ گیا۔ عبداللہ خان نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں قریب ہوتی محسوس کیں اور وہاں سے دوڑتا ہوا ایک راہداری عبور کر کے محل کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں شاہی افراد کی سکونت تھی۔ اس کی توقع کے مطابق محافظ دستے نے حماقت کا ثبوت دیا۔ اس حصے میں ایک محافظ بھی نہیں تھا۔ وہ شاہ عالم کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے خواب گاہ کا دروازہ کھلوانے کے لئے کیا کرنا چاہیے کہ ایک دم دروازہ کھل گیا۔ وہ جھپٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ دروازے سے کوئی باہر جھانکا۔ وہ شاہ عالم کی خواب گاہ کا خادم خاص تھا۔ دوسرے ہی لمحے عبداللہ خان کا جچا تلا ہاتھ خادم کی کنپٹی پر پڑا اور وہ لہرا کر زمین پر گرا۔ عبداللہ خان جھپٹ کر شاہی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ اسے توقع تھی کہ شاہ عالم محو خواب ہوگا مگر شاہ عالم کو بیدار اور اچانک اپنے روبہ رو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ شاہ عالم خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا۔ اسی نے اپنے خادم خاص کو حقیقت حال جاننے کے لئے باہر بھیجا تھا۔ عبداللہ خان شاہ عالم کے قتل کا منصوبہ بناتے ہوئے یہ بات فراموش ہی کر بیٹھا تھا کہ شاہ عالم شب بیداری کا عادی ہے۔ عبداللہ خان کی یہی غفلت اس کے لئے وبال جان ثابت ہوئی تھی۔ اس کے خواب گاہ میں داخل ہونے سے ہلکی سے آہٹ بھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہاں دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ جب وہ خواب گاہ میں داخل ہوا تھا تو شاہ عالم کی پشت اس کی طرف تھی لیکن اب وہ دوبارہ مڑنے والا تھا۔ عبداللہ خان کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں کہ اسی وقت اس نے خواب گاہ کے باہر شور سا سنا اور اسی لمحے شاہ عالم نے اسے پلٹ کر دیکھا۔

جیسے شاہ عالم کی نظر اس پر پڑی' شاہ عالم کو سکتہ سا ہو گیا۔ عبداللہ خان کے ہاتھ میں کھلا ہوا خنجر تھا اور وہ سر سے پاؤں تک اپنا جسم سیاہ لباس میں چھپائے ہوئے تھا۔ شاہ عالم نے پلٹ کر جو منظر دیکھا وہ یقیناً اس کے لئے انتہائی اچانک اور غیر متوقع تھا۔ خواب گاہ کے باہر سے پھر شور بلند ہوا اور اس شور سے نہ صرف جیسے شاہ عالم اپنے حواس میں آ گیا بلکہ عبداللہ خان بھی اچھل پڑا۔ اب ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ عبداللہ خان شور سن کر کسی قدر گھبرا گیا۔ اسی عالم میں اس کا وہ ہاتھ بلند ہوا جس میں خنجر تھا۔ اس نے شاہ عالم کے سینے کا نشانہ لیا اور بھرپور قوت سے شاہ عالم کی طرف خنجر پھینک دیا۔

☆......☆......☆

تاریخ ایک ایسا طلسم کدہ ہے کہ جس میں داخل ہونے کے تو بہت سے راستے ہیں مگر نکلنے کا ...ولی راستہ نہیں۔ میں بھی اس طلسم کدے میں داخل ہو چکی تھی اور تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر کھڑی تھی ...ہاں مغلیہ اقتدار کا سورج ہمیشہ کیلئے غروب ہو سکتا تھا۔ میرے سامنے اس وقت ایک ایسے سفاک شخص کا ...ہ تھا جو ہر قیمت پر اپنے مقصد کا حصول چاہتا تھا۔ وہ اقتدار اعلیٰ پر قبضے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اسی غرض ...ے وہ بادشاہ وقت شاہ عالم کو قتل کرنے اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا تھا' مگر خلاف توقع اسے شاہ عالم ...یدار ملا تھا۔ میں اس کے ذہن کو پڑھ رہی تھی' اس کی تمام نقل و حرکت میری نظر میں تھی اور میں سب کچھ ...ن رہی تھی۔ وہ سنسنی خیز لمحات جب اس شخص نے شاہ عالم کے سینے کا نشانہ لے کر پوری قوت سے اس کی ...ف خنجر پھینکا تھا میرے احساس کی گرفت میں تھا۔ یہ وہ شخص تھا جسے نائب وزیر مملکت بنا دیا گیا تھا۔ یہ ...بداللہ خان تھا' قطب الملک عبداللہ خان۔

خنجر پھینکتے ہی عبداللہ خان تیزی سے مڑا اور یہ دیکھے بغیر بھاگتا ہوا خواب گاہ سے نکل گیا کہ ...ناہ عالم کا کیا انجام ہوا۔ اس نے صرف شاہ عالم کی چیخ سنی تھی' لیکن یہ چیخ حیرت کے سبب تھی یا خنجر سینے ...ں پیوست ہونے کی وجہ سے' یہ وہ نہ سمجھ سکا۔ اسے خطرے کی نوعیت کا پوری طرح احساس تھا۔ اب اس ...لیلئے یہ تقریباً ناممکن تھا کہ شاہی دستے یا دوسرے محافظوں کی نظر سے بچ کر اپنی خواب گاہ تک پہنچ سکتا۔ ...یرت انگیز بات یہ تھی کہ خطرناک صورتحال ہونے کے باوجود وہ قطعی حواس باختہ نہیں تھا۔ اگر وہ اپنے ...واس کھو بیٹھتا تو پھر اس کے ذہن میں وہ تدبیر کبھی نہ آتی جس پر عمل کر کے وہ باحفاظت بچ کر نکل سکتا ...ھا۔

تدبیر پر اس نے فوراً عمل کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سادہ لباس اس کے ہاتھ میں تھا جس ...ے وہ اپنا پورا جسم چھپائے ہوئے تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے چیخنا بھی شروع کر دیا۔ "دوڑو!..... پکڑو!"

وہ چیختا ہوا شاہی محلات کے اس حصے سے باہر نکلا اور اسی وقت اس کی مڈبھیڑ شاہی محافظ دستے ...ے ہو گئی جو اسی طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔

"وہ...... وہ ادھر...... ادھر گیا ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے ایک راہداری کی طرف اشارہ کیا جو ...یم تاریک تھی۔ "وہ مجھ سے...... بچ کر نکل گیا مگر میں نے اس کا...... یہ سیاہ لبادہ اتار لیا... یہ لو!" اس ...نے ایک محافظ کو سیاہ لبادہ تھما دیا' پھر خود اپنی بتائی ہوئی سمت دوڑ پڑا۔

اس کے ہمراہ محافظ دستے کے کچھ لوگ بھی دوڑے ان میں سے کچھ شاہ عالم کی خواب گاہ کی

طرف لپک گئے تھے۔ انہیں شاید اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا کہ انہیں کسی بھی حال میں وہاں سے نہ ہٹنا چاہئے تھا۔

عبداللہ خان اس راہداری کے اختتام تک پہنچ کر رک گیا۔ محافظ اس کی حیثیت اور عہدے سے اچھی طرح واقف تھے اس نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے محافظوں سے کہا۔ ''وہ شاید ف ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے مگر نہیں! وہ قلعے سے باہر نہیں نکل پائے گا جاؤ اور فوراً قلعے میں موجود فو ہماری طرف سے حکم دو کہ وہ قلعے کا چپہ چپہ چھان ماریں۔''

حکم سن کر محافظ تیزی سے ایک سمت دوڑ گئے۔ عبداللہ خان اسی راہداری سے لوٹ کر دو ادھر ہی بڑھا جدھر سے آیا تھا۔ وہ یہ جاننے کیلئے بے چین تھا کہ شاہ عالم کا کیا حشر ہوا؟ وہ لوٹ کر جیسے محل کے اس حصے میں پہنچا تو دیکھا وہاں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ خان خاناں تقریباً دوڑتا ہوا شاہ عالم کی خوا گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ عبداللہ خان پر نظر پڑتے ہی خان خاناں کا چہرہ فق ہو گیا وہ ایک لمحے کیلئے ٹھٹک رکا۔ عبداللہ خان اس دوران میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ محافظوں کی فوج ادھر سے ادھر بھاگی پھر تھی۔

''کیا ہوا؟'' عبداللہ خان نے اس قدر سادگی اور سکون کے ساتھ خان خاناں سے سوال کیا' خان خاناں اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

''کسی نے...... کسی نے حضور...... حضور بادشاہ سلامت پر قاتلانہ حملہ...... کیا تھا' میر خدا...... خدا فضل...... خدا کے فضل سے حضور بچ گئے اور...... اور انہیں معمولی سی چوٹ بھی نہ آ سکی۔ الٰہی حضور بادشاہ سلامت نے فوراً مجھے طلب کیا ہے۔'' خان خاناں نے سنبھل کر جواب دیا۔

خان خاناں کی بات سن کر عبداللہ خان نے شدید حیرت کا اظہار کیا۔ اور بولا۔ ''چلئے میں حضور کی مزاج پرسی کیلئے چلتا ہوں۔''

شاہ عالم زندہ بچ گیا ہے' اسی اطلاع نے عبداللہ خان کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کو خا میں ملا دیا تھا پھر بھی وہ یہ دیکھنے کا مشتاق تھا کہ شاہ عالم پر اس حملے کا کیا اثر' کیا ردعمل ہوا ہے؟

وہ خان خاناں کے ساتھ شاہ عالم کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ شاہ اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ وہ دونوں جھک کر تسلیمات بجا لائے۔ ابھی وہ سیدھے بھی کھڑے نہ پائے تھے کہ شاہ عالم ان پر برس پڑا۔ ''اس قدر لاقانونیت...... اتنی غفلت؟ ہم حکم دیتے ہیں کہ ہمار محافظ دستے کے ہر فرد کو نہ صرف معطل کر دیا جائے بلکہ انہیں واقعی سزا دی جائے۔''

''ایسا ہی ہو گا حضور والا! ایسا ہی ہو گا۔'' خان خاناں نے ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔

''غضب خدا کا کہ اب قاتل ہماری خواب گاہ تک میں گھسنے لگے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے خ خاناں؟ کیا ہو رہا ہے؟'' شاہ عالم اب قریب آ کر خان خاناں پر برسنے لگا۔ ''ہم صبح ہونے سے پ ہر حال میں قاتل کو اپنے حضور دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''گستاخی معاف حضور! یہ کوئی منظم سازش معلوم ہوتی ہے۔ آپ کے اس خادم پر بھی کچھ قبل قاتلانہ حملے کی کوشش کی جا چکی ہے' مگر حضور دعا سے آپ کا خادم بچ گیا۔'' خان خاناں مودب۔

میں بولا۔

''کیا مطلب؟'' شاہ عالم نے حیرت سے کہا۔

''میں سو چکا تھا ظل الٰہی! میری خوش قسمتی کہ اچانک آنکھ کھل گئی۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی اور میں نے مسہری سے اٹھ کر صراحی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسی وقت مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ میں ابھی کچھ سمجھ نہ پایا تھا کہ میری خواب گاہ کے دریچے سے کسی نے خنجر پھینکا۔ خنجر مسہری پر گرا جس پر چند لمحے قبل میں محو خواب تھا۔'' خان خاناں نے اپنے اوپر قاتلانہ حملے کی تفصیل بیان کی۔

پھر اس سے پہلے کہ شاہ عالم کچھ کہتا' عبداللہ خان بول اٹھا۔ ''حضور کا یہ خادم ایک چیخ سنتے ہی اس قدر بدحواس ہو گیا کہ جوتے پہننے تک کا ہوش نہ رہا کیوں کہ وہ چیخ خادم نے پہچان لی تھی۔ غالباً حیرت کی زیادتی کے سبب ہی محترم خان خاناں کے منہ سے وہ چیخ نکلی تھی۔''

''ہوں!'' شاہ عالم نے ایک گہرا سانس لیا' پھر بولا۔ ''خداوند قدوس شاید ابھی ہمیں زندہ رکھنا چاہتا ہے ورنہ اگر ہم بیدار نہ ہوتے تو قاتل اپنا کام کر گیا تھا۔ وہ اتنا دیدہ دلیر تھا کہ اس نے پھر بھی ہمارا نشانہ لے کر خنجر پھینکا' مگر ہم چوکنا تھے فوراً اچھل کر ایک طرف ہو گئے۔''

''خاکم بہ دہن جو حضور کا بال بھی بیکا ہو۔'' عبداللہ خان جلدی سے بولا۔ ''خدا حضور کا سایہ ہم پر قائم رکھے۔''

''آمین!'' خان خاناں بھی تائید کرنے لگا۔

''اگر یہ کوئی سازش ہے تو اس کی جڑیں محل ہی میں ہیں۔'' کچھ سوچتے ہوئے شاہ عالم نے خیال آرائی کی۔ ''قاتل یقیناً اتنا صاحب حیثیت ہے کہ اسے یہ اعتماد ہے' ہمارے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ قلعے کے باہر سے کسی کا اندر داخل ہو کر پہریداروں اور محافظوں سے بچتے ہوئے ہماری خواب گاہ تک پہنچ جانا امر محال ہے۔'' یہ کہہ کر شاہ عالم دھیمے لہجے میں خان خاناں سے بولا۔ ''کیا اس سازش کے پیچھے شاہی خاندان کے کسی فرد کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟''

''گستاخی معاف عالم پناہ! میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ کیوں کہ میرے منہ میں خاک حضور کے قتل سے کسی اور کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔''

خان خاناں نے یہ کہہ کر اپنی دانست میں اپنی صفائی پیش کر دی۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اس کے دل میں چور تھا۔

''حضور والا! صرف میں وہ شخص ہوں جس نے قاتل کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی اور......''

''کیا؟'' عبداللہ خان کی بات پوری ہونے سے پہلے شاہ عالم چونک اٹھا۔ ''تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟''

شاہ عالم کے یوں چونک اٹھنے عبداللہ خان سمجھ گیا کہ ابھی اس تک یہ اطلاع نہیں پہنچی کہ اس نے محافظوں کو سیاہ لبادہ دیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام محافظ قاتل کی تلاش میں سرگرداں تھے جو ظاہر ہے انہیں کسی صورت نہیں مل سکتا تھا۔

عبداللہ خان نے سنبھل کر شاہ عالم کے سوال کا جواب دیا۔ حضور والا جب میں اپنی خواب گاہ

سے نکلا تو سیدھا خان خاناں کی خواب گاہ تک پہنچا میں نے دیکھا کہ وہ باخیریت ہیں۔ اس وقت میں نے ایک بات اور محسوس کی کہ عالم پناہ کا پورا محافظ دستہ وہاں موجود تھا۔ میں دیکھتے ہی حضور کی خواب گاہ کی طرف دوڑا۔ مجھے یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں قاتل ادھر کا رخ نہ کرے۔ میں جب حضور کی خواب گاہ کے قریب پہنچا تو بس اچانک ایک سیاہ پوش خواب گاہ سے بھاگتا ہوا نکلا۔ میرا اور اس کا سامنا ہو گیا۔ میں نے ایک ہی لمحے میں صورتحال کی نزاکت کا احساس کر لیا اور اس سیاہ پوش پر چھلانگ لگا دی' مگر وہ توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ وہ کسی چکنی مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس دوران میں اس کا سیاہ لبادہ اس کے جسم سے اتر کر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کیلئے غالباً یہ موقع غنیمت رہا۔ وہ تیزی سے ایک سمت بھاگ کھڑا ہوا اور اسی لمحے میں نے اس کی خفیف سی جھلک دیکھی۔ اس کے جسم پر موجود لباس قیمتی تھا۔ وہ کوئی جوان آدمی تھا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا' مگر وہ مجھے جل دے کر نہایت عیاری کے ساتھ پیچ در پیچ راہداریوں میں غائب ہو گیا۔ اسی وقت محافظ دستہ وہاں آ پہنچا۔ میں نے قاتل کا سیاہ لبادہ ان میں سے ایک کے حوالے کیا اور پھر خود بھی ان کے ساتھ مل کر قاتل کو تلاش کرنے لگا لیکن تلاش بسیار کے باوجود نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ خدا جانے اسے زمین نگل گئی یا آسمان! میں تھک ہار کر واپس ہوا تو راستے میں میری ملاقات محترم خان خاناں سے ہو گئی۔ انہی سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ظل اللہ پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا ہے پھر میں ان کے ہمراہ حضور کی مزاج پرسی کو آ گیا۔'' عبداللہ نے تفصیل کے ساتھ تمام مفروضہ واقعہ بیان کر دیا۔ اس نے اپنے بیان سے شاہ عالم اور خان خاناں کے اس خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ قاتل کا تعلق شاہی خاندان ہی سے ہو سکتا ہے۔

''کیا تم اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے عبداللہ خان؟'' شاہ عالم نے سوال کیا۔

عبداللہ خان کو اس سوال کی توقع نہیں تھی' پھر بھی وہ بلا جھجک بول اٹھا۔ ''حضور والا! اس کے چہرے پر نقاب تھی۔''

''واقعی وہ بہت چالاک اور عیار شخص ہو گا جس نے سیاہ لبادے ہی کو کافی نہیں سمجھا اور لبادے کے اندر بھی چہرے پر نقاب پہننا ضروری خیال سمجھا۔ اسے یقیناً یہ خدشہ ہو گا کہ پہچان لیا جائے گا۔'' خان خاناں نے بھی مداخلت ضروری سمجھی۔ مقصد محض عبداللہ خان کی تائید ہی تھا۔

''ان حالات میں تو اس قاتل کا پکڑا جانا قطعی ناممکن ہی دکھائی دیتا ہے۔'' شاہ عالم نے کہا' پھر کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ''کچھ بھی ہو مگر ہم چاہتے ہیں اس سازش کی جڑیں تلاش کی جائیں اور سازش کرنے والوں کو بے نقاب کر دیا جائے۔''

''وہ تو خیر لازمی ہے عالم پناہ! مگر اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ کچھ احتیاطی تدابیر پر بھی عمل کیا جائے۔'' عبداللہ خان نے موقع سے فائدہ اٹھانے کیلئے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔

''تمہاری نظر میں وہ احتیاطی تدابیر کیا ہو سکتی ہیں؟'' شاہ عالم نے عبداللہ خان سے سوال کیا۔

''ظل اللہ فوری طور پر قلعے میں اس وقت موجود شاہی خاندان سے متعلق تمام شہزادوں کو حراست میں لیے جانے کے احکام صادر فرما دیں۔'' عبداللہ خان نے نہایت پرسکون لہجے میں اپنا مشورہ پیش کیا جیسے یہ کوئی خاص بات نہ ہو۔

''عبداللہ خان!'' شاہ عالم کی آواز میں تیزی آ گئی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو! ہمیں حیرت ہے ا. ہم نے تمہاری زبان سے ایسے کلمات سنے۔'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے شاہ عالم کے لہجے میں کسی ر خفگی کا عنصر تھا۔

''گستاخی معاف عالم پناہ! خادم نے تو اپنی حقیر سی رائے پیش کی تھی۔ اب یہ حضور کی فہم و ا ت اور منشا پر موقوف ہے کہ حضور اس تجویز کو قبول فرما لیں یا رد کر دیں۔'' بات بگڑتے دیکھ کر عبداللہ ن نے نہایت عاجزی سے کہا۔

''نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا! ہم اپنی خاطر دوسروں کو عذاب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے۔'' شاہ لم کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد عبداللہ خان اور خان خاناں شاہ عالم کی خواب گاہ سے لوٹ آئے۔ ب عبداللہ خان اپنی خواب گاہ کی طرف جانے کیلئے مڑنے لگا تو خان خاناں نے سرگوشی کی۔ ''عبداللہ ن! مجھے تم سے کچھ ضروری گفتگو کرنا ہے' میرے ساتھ آؤ۔''

''اس وقت ہنگامی حالات ہیں حضور! لوگ بیدار اور چوکنا ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کی ر میں یہ بات آئے میں نے خلوت میں آج شب آپ سے ملاقات کی ہے۔ ہم کل کسی وقت موجودہ لات پر گفتگو کریں گے۔'' عبداللہ خان نے دھیمے لہجے میں جواب دیا اور پھر مزید کچھ کہے سنے بغیر اپنی اب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

جب اس نے اپنی خواب گاہ میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا تو اس کا چھوٹا بھائی ین علی خان بے تابی کے ساتھ اندرونی کمرے کا دروازہ کھول کر عبداللہ خان کی خواب گاہ میں آ گیا۔ ، نے عالم اضطراب میں پوچھا۔ ''کیا کام ہو گیا؟''

''نہیں۔'' عبداللہ خان نے جواب دیا۔ ''وہ بیدار تھا۔ میں بمشکل جان بچا سکا۔ دراصل منصوبہ ی کرتے ہوئے ہم نے اس بات کو فراموش ہی کر دیا تھا کہ شاہ عالم شب بیداری کا عادی ہے۔ وہ عموماً ت گئے تک جاگتا رہتا ہے۔ ہمیں اس کام کیلئے صبح سے کچھ پہلے کا وقت منتخب کرنا چاہئے تھا۔ بہرحال جو اسو ہوا۔'' اس کے بعد حسین علی خان کی خواہش پر عبداللہ نے اسے تمام تفصیلی حالات سے آگاہ کر دیا۔

''اگر شاہ عالم آپ کی تجویز مان لیتا تو کام آسان ہو جاتا۔'' حسین علی خاں نے پوری بار ، کر خیال آرائی کی۔

''ہاں اسی لیے میں نے شہزادوں کو حراست میں لیے جانے کی تجویز پیش کی تھی۔ کم از کم ا ے یہ ضرور ہوتا کہ شاہ عالم کے قتل کے بعد فوری طور پر تخت کا کوئی دعوے دار سامنے نہ آ پاتا۔ رہے شاہی ندان کے وہ افراد جو فی الوقت یہاں نہیں ہیں' ان سے بعد میں نمٹا جا سکتا تھا۔'' عبداللہ خان نے کہا۔

رات گئے تک وہ دونوں بھائی تبادلہ خیالات کرتے رہے' پھر سو گئے۔ صبح ہی صبح عبداللہ خان نے یہ مناسب خیال کیا کہ وہ خان خاناں سے مل لے۔ وہ جب وہاں پہنچا تو خان خاناں بیدار ہو چکا تھا۔ ن خاناں اسے خلوت میں لے گیا پھر خلوت میسر آتے ہی خان خاناں نے خوف زدہ سی آواز میں ہ اللہ خان سے پوچھا۔ ''تم نے شاہ عالم کے قتل پر کسے مامور کیا تھا؟ رات بھر مجھے اس خدشے سے نیند

نہ آ سکی کہ کہیں وہ شخص پکڑا نہ جائے۔ کیوں کہ اس شخص کی گرفتاری سے ہم بھی خطرے میں پڑ سکتے ۔

"وہ جو کوئی بھی تھا' گرفتار نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کسی ایسے آدمی کو اس کام کیلئے متعین کیا تھا جو آسانی سے ہاتھ آ جاتا۔ آپ اس طرف سے قطعی فکر مند نہ ہوں۔" عبداللہ خان نے ا۔ دی۔ میں صبح اُٹھتے ہی اس سلسلے میں معلوم کر چکا ہوں کہ وہ شخص گرفتار نہیں ہو سکا۔" خان خاناں ۔ پھر سہمے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "اب کیا ہو گا عبداللہ خان؟ مجھے تو خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔ کہیں عالم کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ۔" جملہ ادھورہ چھوڑ کر وہ عبداللہ خان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بو چہرے سے واضح طور پر فکر مندی اور خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہونا کیا ہے ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھا جائے گا۔" عبداللہ خان نے پرسکون آوا کہا۔ "بلکہ ہماری کوشش تو اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ جاتے' یعنی شاہ عالم کو اپنے راستے سے ہٹا نہیں دیتے۔"

"یعنی...... یعنی تم...... تم دوبارہ شاہ عالم پر...... تم دوبارہ شاہ عالم کو......" خان خاناں بوکھلا

"جی ہاں...... شاید اس کی نوبت نہ آتی۔ بس ذرا سی چوک ہو گئی ہم نے اس بات کا نہیں رکھا کہ شاہ عالم دیر سے سوتا ہے۔" عبداللہ خان نے جواب دیا۔

"مگر اب میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے۔ اٹھتے ہی اس کی اطلاع مل گئی تھی کہ ہم دونوں کے رخصت ہوتے ہی شاہ عالم نے امیر الامرا اس کے بیٹے ذوالفقار خان کو طلب کیا تھا اور اس سے خلوت میں کچھ گفتگو کی تھی۔" خان خاناں گھبرائے لہجے میں بولا۔ امیر الامرا اور اس کا بیٹا' خان خاناں کے مخالف گروہ میں تھا۔

"اسد خان کا بیٹا ذوالفقار خان؟" آخر اسے شاہ عالم نے کیوں طلب کیا؟" عبداللہ خا میں پڑ گیا۔

"میری سمجھ میں تو خود یہ بات نہیں آئی۔" خان خاناں نے کہا۔ "ویسے یہ بات میں جانتا تھا کہ ذوالفقار خان کا دل میری طرف سے صاف نہیں۔" عبداللہ خان خاموش ہی رہا تو خان نے یہ تجویز پیش کی۔ "مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ دن خاموش رہ کر حالات کا جائزہ لیا جائے' ا بعد کوئی قدم اٹھانا مناسب رہے گا۔"

خان خاناں کی رائے سے مجبوراً عبداللہ خان کو اتفاق کرنا پڑا۔

عبداللہ خان نے اسی روز اپنے ذرائع سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ خان خاناں نے موجود شہزادوں کو گرفتار کرنے کیلئے بھی کوئی بندوبست نہیں کیا تھا۔ اس بات نے عبداللہ خان کو سو مجبور کر دیا۔ وہ خان خاناں کی طرف سے کھٹک گیا۔ اگر شاہ عالم کو وہ قتل کرنے میں بھی کامیاب پھر بھی معاملات اس کے حق میں نہ جاتے۔ اس سلسلے میں عبداللہ خان نے خان خاناں سے باز پرس کو لاحاصل ہی جانا۔ اب وہ کسی حد تک اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ خان خاناں بہر حال ایک کمزور مہ ابھی وہ پوری طرح "راہ راست" پر نہیں آ سکا۔ شاید اسے یہ توقع نہیں تھی کہ عبداللہ خان کا منصوبہ کا ہو جائے گا۔ اس کی یہ بے یقینی عبداللہ خان کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ عبداللہ خان نے اس

ی طور پر کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ایک بار پھر نئے سرے سے حالات کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ اس لہ میں عبداللہ خان نے حسین علی خان سے بھی مشورہ لیا۔ حسین علی خان کا کہنا بھی یہی تھا کہ فی الوقت ؤی اختیار کر لینے ہی میں مصلحت ہے۔ جب یہ بات دب جائے کہ شاہ عالم پر قاتلانہ حملہ کرنے یا انے والوں کا کوئی سراغ نہیں ملا' معاملہ سرد خانے میں پڑ جائے تو ازسرنو منصوبہ بندی کی جائے۔ ان ات کے پیش نظر اب حسین علی خان کا شاہجہان آباد میں رہنا فضول اور بے معنی ہی تھا۔ ایک شب اللہ خان نے اسی لیے اسے خاموشی کے ساتھ عظیم آباد کیلئے رخصت کر دیا۔ عبداللہ خان نے روانگی سے ں اسے تاکید کی تھی کہ جیسے ہی میرا پیغام ملے تم فوراً شاہجہان آباد پہنچ جانا اور عظیم آباد سے اپنی غیر ری کو پردہ راز ہی میں رکھنا۔

حسین علی خان کی روانگی کے دوسرے ہی دن شاہ عالم نے خان خاناں اور عبداللہ خان کو طلب لیا۔ وہ ایک اہم مسئلے پر ان دونوں سے رائے لینا چاہتا تھا۔ اسی وقت میر بخش ذوالفقار خان بھی بادشاہ پاس موجود تھا۔ اسے وہاں دیکھ کر عبداللہ خان کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے خان خاناں کے چہرے پر بھی دلی اور ناگواری کے آثار دیکھ لیے تھے۔

"راجپوتانہ کے اخبار نویسوں نے لکھا ہے کہ راجہ اجیت سنگھ نے ازسرنو فتنہ پردازی شروع کر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس سلسلے میں کوئی مناسب قدم اٹھایا جائے۔ ذوالفقار خان کا خیال ہے کہ فی ں ہم اس مسئلے کو التواء میں ڈال کر دکن کا رخ کریں' مگر ہم دکن روانگی سے قبل یہ چاہتے ہیں کہ شہزادہ ش کے ساتھ مراسلت کر کے اس سے معاملہ نمٹانے کی کوشش کریں۔ اس طرح ممکن ہے کہ دکن نہ پڑے۔" شاہ عالم نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"عالم پناہ خود واقف ہیں کہ جسونت سنگھ کا مجہول النسب بیٹا اجیت سنگھ کتنا بڑا فتنہ پرداز ہے۔ ں اجیت سنگھ ہے جو مرحوم بادشاہ خلد مکاں (اورنگزیب عالمگیر) کے عہد میں ایک بار سرکشی پر آمادہ ہو ہے۔ وہ سخت متعصب اور مسلمان دشمن ہے۔ حضور جانتے ہیں کہ اس کی وجہ سے راجپوتانہ میں آباد مانوں کی زندگی ہر وقت خطرے میں ہے۔ اس نے پہلے بھی راجپوتانہ میں گاؤ کشی کی ممانعت کرا دی ۔ اس کے علاوہ اس کافر نے مسجدوں کو بھی شہید کر دیا تھا۔ یہ وہ مسجدیں تھیں جو خلد مکاں کے زمانے بت خانوں کی جگہ تعمیر ہوئی تھیں۔ اس کافر نے ان مسجدوں کو شہید کرا کے ان کی جگہ مندر بنوا دیے ابھی بہ مشکل سات آٹھ مہینے گزرے ہیں کہ اس نے پھر شورش برپا کر دی۔ حالانکہ جب جشن وزن بعد حضور اکبر آباد سے راجپوتانہ پہنچے تھے تو اس نے لڑائی کے بعد اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس نے ہ لیا تھا کہ بت خانوں کو گرا دیا جائے گا اور قاضی القضات کی نگرانی میں شرعی احکام نافذ کر کے اذان' اور گاؤ کشی کا اجراء ہو گا۔ اس کے علاوہ عدالتی عملے کے قائم ہوتے ہی جزیے کی وصولی کے لیے شاہی بھی مقرر ہو جائیں گے' مگر ابھی پوری طرح ان تمام باتوں پر عمل نہیں ہو پایا کہ وہ پھر سرکشی پر آمادہ یا۔ خادم کی نظر میں وہ قابل معافی نہیں ہے اور اس کے خلاف کارروائی کی ضرورت ہے۔ رہا شہزادہ ش کا مسئلہ تو وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ حضور جب چاہیں گے اس سے نمٹ لیا جائے گا۔" خان خاناں تفصیل کے ساتھ اور مدلل انداز میں ذوالفقار خان کی رائے سے اختلاف کر کے اپنا مشورہ پیش کیا۔

خان خاناں کے خاموش ہوتے ہی شاہ عالم نے عبداللہ خان کی طرف سوالیہ نظروں سے ا
اور کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے عبداللہ خان؟''

''میں محترم خان خاناں کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں عالم پناہ۔'' عبداللہ خان
جواب دیا۔

ہر چند کہ حقیقت اس کے برعکس تھی' لیکن عبداللہ خان کو خان خاناں کی تائید کر کے اس کی
میں وزن پیدا کرنا تھا۔ ذوالفقار خاں کی خان خاناں سے چپقلش کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک طرح
عبداللہ خان کا بھی حریف تھا۔ یہ الگ بات کہ ذوالفقار خان نے شاہ عالم کو جو مشورہ دیا تھا' وہی منا
تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ شاہ عالم کی راجپوتانہ روانگی عبداللہ خان کے منصوبے میں تاخیر کا
بھی بن سکتی تھی' لیکن اس نے وہی کہا جو خان خاناں کی خواہش اور اس سے توقع ہو سکتی تھی۔ وہ بہر
ابھی خان خاناں سے کام لینا چاہتا تھا۔

''تو پھر ذوالفقار خان! ہمارے خیال میں خان خاناں اور قطب الملک کی بات ماننا
جائے۔'' شاہ عالم نے ذوالفقار خان کو مخاطب کیا۔

''جیسی حضور کی مرضی! خادم کو جو عرض کرنا تھا کر چکا۔ اب یہ حضور کی منشا کہ جو چاہیں فی
کریں۔'' ذوالفقار خاں شکست خوردگی سے بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' شاہ عالم نے کہا۔ ''تو اب فوری طور پر راجپوتانہ روانگی کی تیاریاں کی جائیں''

کچھ دیر کے بعد عبداللہ خان اور خان خاناں' شاہ عالم کے پاس سے اٹھ آئے۔ ذوالفقار
پہلے ہی جا چکا تھا۔ شاہ عالم ایک کمزور شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ہر ایک کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔
سبب تھا کہ اس وقت بھی اس نے عبداللہ خاں اور خان خاناں کے مشورے کے بعد بھی ایک مرتبہ
ذوالفقار خان سے مشورہ لینا ضروری خیال کیا۔ شاہ عالم میں قوت فیصلہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ ابتدا
سے تیموری خاندان کا یہ طریقہ کار تھا کہ ایک خطاب دو آدمیوں کو نہیں دیا جاتا تھا۔ اگر کبھی ایسا ہو
بھی تھا تو خطاب میں دو ایک لفظ فرق کے لیے رکھ دیئے جاتے تھے' مگر شاہ عالم نے یہ رسم بھی اٹھا
تھی۔ اس کے عہد حکومت میں ایک ہی خطاب دو دو تین تین آدمیوں کے پاس ہوتا تھا۔ اسی طرح منص
نوبت' نقارہ' ہاتھی' جیغہ اور سرپیچ جیسے اعزازت بھی بے وقعت ہو کر رہ گئے تھے جو پہلے بہ لحاظ مرا
دیئے جاتے تھے۔

یہ واقعہ بھی شاہ عالم ہی کے عہد کا ہے۔ احمد آباد پر صفدر خاں بابی متعین تھے۔ اورنگ ز
عالمگیر کے زمانے ہی سے صفدر خاں کو خطاب حاصل تھا۔ شاہ عالم نے اپنی رکاب کے ایک خادم کو ی
خاں کا خطاب عطا کر دیا۔ صفدر خان بابی نے خطاب کی بحالی کیلئے عرضی دی کہ اس سے کوئی قصور
نہیں ہوا ہے پھر اس کا خطاب دوسرے کو کس لیے عطا کر دیا گیا ہے۔ شاہ عالم نے اس کی عرض
لکھا۔ ''بحال' بحال' بحال! اگرچہ دوسرے کا بھی یہی خطاب رہے گا۔'' اسی دن سے ایک ہی خطاب کئی
لوگوں کو دینے میں کوئی قباحت نہیں رہی۔

شاہ عالم کے دور حکومت میں اخلاص خان جدید الاسلام مقصدی گری میں بڑا سخت آدمی

جاتا تھا۔ اسے فضیلت و دیانت میں بھی ممتاز خیال کیا جاتا تھا۔ وہ حساب کتاب میں بڑی دقت نظری سے
کام لیتا تھا۔ شاہ عالم ایک دریا دل اور سخی شخص تھا۔ وہ منصب اور ترقی بلالحاظ مراتب عطا کر دیتا تھا۔
اخلاص خان بادشاہ کی دریا دلی سے تنگ تھا۔ عطیات کا ایک سیلاب تھا جو تھمتا ہی نہیں تھا۔ جب اخلاص
خاں سخت پریشان ہو گیا تو اس نے اس سلسلے میں خان خاناں سے عرض کیا۔ ''بادشاہ کی بے پناہ جود وسخا
کے لیے ہفت اقلیم بھی ہوں تو ناکافی ہیں۔ ساری دنیا زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اگر یہی حال
رہا تو پھر تمام منصب داروں اور خانہ زادوں کی نوکریاں جاتی رہیں گی کیوں کہ ہندوستان کی سلطنت بادشاہ
کی سخاوت کے مقابلے میں عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ ملک کی بہتری اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اس
معاملے میں کوئی تدبیر و بندوبست کیا جائے کہ اس سیل بے پناہ پر کچھ روک لگے۔ ہندوستان کی آمدنی کم
از کم بادشاہ کی بخشش کی تو پابجائی کر سکے۔''

اخلاص خاں چاہتا تھا کہ جب بھی کسی منصب کی یادداشت عرض مکرر اور دستخط کیلئے آئے تو اس
کے اصل و نسب' درجے اور مرتبے کی تحقیق کے بعد ہی وزیر سلطنت دستخط کرے' مگر ایسا نہیں ہوا۔ خان
خاناں نے خلق خدا کی روزی پر پابندی لگانے اور ان کی اسناد کو روکنے کی بدنامی کو پسند نہیں کیا اور اخلاص
خان ہی کو تحقیقات کی ذمہ داری سپرد کر دی۔ اخلاص خان نے بھی لوگوں کے طعنوں اور ملامت سے ڈر کر
یہ ذمہ داری قبول نہیں کی۔ بادشاہ کی فیاضی روکنے کے سلسلے میں لوگ اخلاص خان کو پہلے ہی بخیل اور حاسد
کہنے لگے تھے۔ آخر تنگ آ کر اخلاص خاں ملازمت سے استعفیٰ دینے پر آمادہ ہو گیا۔

اس نئی ملازمت پر آخر کار ایک اور شخص مستعد خان عرف محمد ساقی کو مامور کر دیا گیا جو بڑا
کارپرداز' راست رو اور خوبصورت آدمی تھا۔ اس کی صورت و سیرت دیکھ کر ہی امید بندھتی کہ وہ اپنی ذمہ
داری بہ حسن و خوبی انجام دینے کا اہل ہے۔ یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب بھی منصب کی یادداشت بادشاہ کے
دستخط سے نکل کر عرض مکرر کے آئے تو مستعد خان کے پاس بھیج دی جائے۔ مستعد خان اس بات کی تحقیق
کرے کہ نو ملازم صاحب منصب' بادشاہ کی خدمت کی اہلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ اس نے کسی سبب اور
وسیلے سے تو منصب و اضافہ حاصل نہیں کیا۔ کہیں اسے درجے اور مرتبے سے زیادہ اور مقرر کردہ معیار
حاصل کرنے سے قبل ہی تو اضافہ نہیں مل گیا ہے۔ منصب کے ساتھ یومیہ معاش وغیرہ کی تحقیقات بھی اسی
کے سپرد کر دی گئی۔ وہ ان امور کی تحقیقات کے بعد ہی یادداشتوں پر لفظ ''صحیح'' لکھ کر تصدیق کرتا تھا جس
میں کافی عرصہ لگ جاتا تھا' مگر اکثر یادداشتوں کے ساتھ بادشاہ کی دو بیگمات مہر پرور اور امتہ الحبیب کے
نیز دربار کے بعض خاص مقربین کے داروغہ بھی مسلط ہو جاتے تھے وہ بغیر کسی تحقیق و کاوش کے مستعد خان
سے دستخط کرا کے لے جاتے تھے۔

بہرحال یوں تمام سرکاری معاملات میں بے ضابطگی راہ پا گئی اور شاہ عالم کے دستخطوں کا کوئی
اعتبار نہ رہا۔ شاہ عالم نے متصدیوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارے لیے لوگوں کی درخواستوں کو
قبول کرنے اور انہیں منظور کر لینے کے سوا کوئی راہ نہیں اور خلق خدا کے مطالبات کی بھی کوئی انتہا نہیں۔
بہرحال ہمارے دستخطوں کے باوجود تم لوگ جو بہتر جانو سو کرو۔

شاہ عالم کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ اس طرح وہ بے حیثیت' بے اختیار اور بے وقعت ہو رہا

ہے۔ وہ تو اپنی دانست میں ہر ایک کی دل دہی کر کے نیک اور فیاض بن رہا تھا' مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ اسے شاید کسی نے یہ نکتہ نہیں سمجھایا تھا کہ کوئی بھی شخص ہر ایک کے نزدیک نیک نہیں ہو سکتا۔ خانوادہ تیموریہ میں شاہ عالم ایسا سخی' خلیق' باہمت' عیب پوش اور خطا بخش بادشاہ نظر نہیں آتا گو اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ امور سلطنت میں ملک کی خبر گیری اور بندوبست سے وہ اس قدر بے پرواہ اور بے خبر تھا کہ شوق طبع اشخاص نے اس کے جلوس کی تاریخ ہی "شہہ بے خبر" سے نکال لی تھی۔ وہ راتوں کو دیر تک جاگنے کا عادی تھا اور دن چڑھے دوپہر تک پڑا سویا رہتا تھا۔ سفر میں بھی اس کی آرام طلبی کا یہی حال تھا۔ عموماً اسی سبب کوچ میں بڑی دیر ہو جاتی تھی جس سے لشکر کو بڑی زحمت اٹھانا پڑتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ راتوں میں قیام بڑی تاخیر سے ہوتا تھا۔ اندھیرے میں لشکر ادھر ادھر پڑا رہتا تھا۔ لوگوں کو اپنا سامان اور خیمے تک نہیں مل پاتے تھے۔ لوگ اسی لیے ناچار بادشاہی خیمہ گاہ میں نقار خانے میں' کچہری میں اور لشکر کے بازار میں رات بسر کر لیتے تھے۔

شاہ عالم کی قوت فیصلہ کا یہ عالم تھا کہ جب کسی معاملے میں مدعا اور مدعا علیہ حاضر ہوتے وہ صبح کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ دیتا تو شام کو دوسرے فریق کے حق میں اور دونوں ہی حکم قطعی ہوتے تھے۔

ذوالفقار خان اور خان خاناں کے سلسلے میں ایک بار یہی ہوا جس سے ان دونوں میں مزید اختلافات پیدا ہو گئے۔ کسی سلسلے میں ایک شخص کی سفارش ذوالفقار خان نے اور اس کے مخالف خان خاناں نے کی۔ شاہ عالم نے دونوں کی موافقت میں' مختلف اوقات میں دو قطعی فیصلے دیئے اور معاملہ معرض التواء میں پڑ گیا۔ ذوالفقار خان میر بخشی کے علاوہ پورے دکن کا صوبیدار بھی بنا دیا گیا تھا۔ خان خاناں اور اس کے درمیان اس سلسلے میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ خان خاناں برہان پور اور برار کے نصف حصے کو صوبہ شاہجہان آباد میں شامل کرانا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صوبہ شاہجہان آباد کا صوبیدار اس کا بیٹا مہابت خان تھا لیکن میر بخشی ذوالفقار خان دکن کے ملکی اور مالی معاملات میں کسی دوسرے کو شریک کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس نے دکن میں اپنا نائب مقرر کیا ہوا تھا۔ وہ مسئلہ بھی شاہ عالم کی کمزور شخصیت کے سبب طے نہ ہو پایا جس کے نتیجے میں ذوالفقار خان اور خان خاناں میں مزید اختلاف ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ امرائے دربار کے درمیان نفاق کسی بھی بادشاہ کے لیے بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ شاہ عالم کو مستقبل میں اس نفاق سے نقصانات پہنچنے والے تھے' مگر وہ لاعلم تھا۔

اسی نفاق کے نتیجے میں شاہ عالم کے سامنے دو انتہا پسندانہ مشورے ہوتے تھے۔ خود شاہ عالم میں اتنی جرأت و بیباکی نہیں تھی کہ وہ خود سے کوئی فیصلہ کر پاتا۔ راجہ اجیت سنگھ کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ اس نے اسی لیے عبداللہ خان اور خان خاناں کی رائے کو قبول کر لیا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ ذوالفقار خاں کے خیال کی تائید کر چکا تھا اور تمام ہی امرائے دربار اس بات سے اچھی طرح واقف تھے۔

راجہ اجیت سنگھ کو ایک طرف تو اودے پور کے رانا کی فوجی مدد حاصل تھی۔ دوسری طرف راجہ جے سنگھ اس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ جس سے دامادی کا رشتہ تھا۔ وہ ان سہاروں پر اتنا مغرور ہو گیا تھا کہ شاہ عالم کی خدمت میں نہ تو فتح سے پہلے حاضر ہوا نہ تخت نشینی کے بعد۔ خود شاہ عالم ہی کو ایک بار اس کی

لوپی کیلئے جانا پڑا تھا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ خان خاناں کے علاوہ عبداللہ خاں بھی تھا۔

عبداللہ خان کیلئے راجپوتانہ کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی اپنے والد مرحوم کی زندگی میں وہاں جا چکا تھا۔ اپنی تربیت کے دوران میں اس نے کئی راجپوت سرداروں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اسے فن حرب سکھانے والوں میں ایک راجپوت سردار درگاداس تھا جس کا نام راجپوتانہ کی طرف روانگی سے پہلے بار بار لیا جا رہا تھا۔ اخبار نویسوں نے اطلاع دی تھی کہ راجہ اجیت سنگھ کو ورغلانے والوں میں راجپوت سردار درگاداس کا بہت ہاتھ ہے۔

درگاداس کا نام سن کر عبداللہ خان چونکا تھا۔ عبداللہ خاں نے کافی دن بعد اس کا نام سنا تھا۔ جب وہ راجپوتانہ میں زیر تربیت تھا' اس وقت اس کی عمر صرف سترہ اٹھارہ سال تھی۔ راجپوتانہ نے بھی اسے متاثر کیا تھا' مگر اس وقت اس کی پوری توجہ فن حرب سیکھنے کی طرف مبذول تھی۔ اس نے کبھی کسی حسینہ کو ان نظروں سے نہیں دیکھا تھا جو اس کی عمر کا تقاضا تھا۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ ایک لڑکی بہت اچھی لگتی تھی اس کا نام انیتا تھا مگر سب اسے راجکماری کہتے تھے۔ کیوں کہ وہ راجہ جے سنگھ کی بیٹی تھی۔ عبداللہ خاں اس سے بارہا ملا تھا' مگر اس نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ راجکماری بطور خاص اسی وقت قلعے کے میدان کی طرف آ جاتی ہے جب وہ وہاں شمشیر زنی کی مشق کرتا ہے۔ وہ عمر میں عبداللہ خاں سے شاید ایک دو سال بڑی ہی تھی۔ عبداللہ خاں سے وہ عجیب عجیب سی باتیں کرتی تھی جنہیں عبداللہ خاں بے معنی سمجھ کر بھلا دیتا تھا۔ عبداللہ خاں اس وقت تک ان باتوں کے اصل مفہوم سے نا آشنا تھا۔ راجپوتانہ جا رہا تھا تو اس کے صفحہ ذہن پر نہ جانے کس طرح راجکماری کا چہرہ گھوم گیا تھا بلکہ اور بہت سے چہرے یاد آ گئے تھے۔ ان چہروں میں اس کے اتالیق درگاداس کا چہرہ بھی تھا۔ گھنی بل کھاتی ہوئی مونچھیں' بڑی بڑی آنکھیں' تیکھے تیور اور چوڑا چکلا سینہ! یہ تھا درگاداس! مگر یہ برسوں پہلے کی بات تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس دوران میں درگاداس کے نظریات میں کیا کیا تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ درگاداس بڑا ہنس مکھ' ملنسار' خوش طبع اور غیر متعصب راجپوت سردار تھا۔ معلوم نہیں وہ کیوں اور کیسے مسلمانوں کا دشمن بن گیا تھا۔ راجپوت پہلے ایسے نہیں تھے۔ وہ تو مسلمانوں سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے تو عبداللہ خاں کو اولاد کی طرح پالا تھا' تربیت دی تھی۔ عبداللہ خاں انہی تمام باتوں پر غور کر رہا تھا۔

کوئی ہفتے بھر بعد ہی ایک بھاری لشکر نے راجہ جے سنگھ کے وطن انبیر کے راستے سے کوچ کیا۔ یہ وہی انبیر تھا جہاں عبداللہ خاں ایک عرصے رہ چکا تھا۔ جب لشکر اجمیر اور چتوڑ کے درمیان پہنچا تو رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ شاہ عالم نے اسی لیے وہیں قیام کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

ایک دن قیام کے بعد ہی شہزادہ عظیم الشان کو فوج کا سپہ سالار اور خان خاناں کو ہراول مقرر کیا گیا۔ ذوالفقار خاں اور عبداللہ خاں کو خان خاناں کے ساتھ تعینات کیا گیا۔ اس کے بعد مغل لشکر نے حملہ کر کے اس کفرستان کو روند دیا۔ بکثرت راجپوت مارے گئے اور ان کے بیوی بچوں کی ایک بڑی تعداد کو اسیر بنا لیا گیا۔ بہت سے قصبے اور دیہات اس فوج کشی میں بے چراغ ہو گئے۔ راجپوتوں کے بڑے بڑے سردار دشوار گزار پہاڑوں پر بھاگ گئے' لیکن قسمت کا مارا اجیت سنگھ فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کا سر قلم کر دیا جاتا تاکہ راجپوتوں پر شاہ عالم کی

دھاک بیٹھ جاتی۔ جس نے بغاوت کی تھی' دوسرے اس کے انجام سے خوفزدہ ہو کر آئندہ ایسی حرکت نہ کر پاتے' لیکن شاہ عالم نے سختی ساتھ ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ ہمیشہ کشت و خون خصوصاً قتل سے اجتناب کرتا تھا۔

راجہ اجیت سنگھ کو پابہ زنجیر مغل فرماں روا کے سامنے پیش کیا گیا۔ شاہ عالم نے اس پر قابل رحم نظر ڈالی اور بولا۔ ''اسے ہمارے سامنے سے لے جاؤ' ہم بدعہدوں سے کلام کرنا قطعی پسند نہیں کرتے۔''

''اس کے بارے میں حکم عالم پناہ؟'' ذوالفقار خاں نے کہا۔ وہ بھی اجیت سنگھ کو قتل کیے جانے کے حق میں تھا اور یہی بات اجیت سنگھ کے حق میں بہتر ثابت ہوئی۔ خان خاناں اور عبداللہ خاں' بادشاہ کے ہم خیال بن گئے تھے کہ اجیت سنگھ کو قتل نہ کیا جائے۔

''فی الحال اسے قید رکھا جائے۔'' شاہ عالم نے حکم دیا۔ راجہ اجیت سنگھ کو اسی وقت شاہی خیمے سے ہٹا دیا گیا۔ باغی راجہ اجیت سنگھ کو عام قیدیوں کے ساتھ نہیں رکھا گیا تھا بلکہ ذوالفقار خاں کے خیمے سے کچھ ہی فاصلے پر ایک اور خیمے میں رکھا گیا تھا۔ خیمے کے اردگرد پہرے دار مقرر کر دیئے گئے تھے اور یہ سارے انتظامات عبداللہ خاں ہی کے اشارے پر خان خاناں نے کرائے تھے۔ اسی کے ایما پر خان خاناں نے خیمے پر ایسے پہریدار مقرر کیے تھے جو بظاہر تو ذوالفقار خاں کے آدمی تھے مگر خان خاناں کے پروردہ تھے۔

شام ہوتے ہی خان خاناں کا ملازم خاص' عبداللہ خاں کے خیمے میں اجازت لے کر داخل ہوا۔ اس نے عبداللہ خاں کو خان خاناں کا پیغام دیا کہ خان خاناں ملنا چاہتا ہے۔ عبداللہ خاں کو اس طلبی کا پہلے ہی سے یقین تھا۔ وہ اپنے خیمے سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خان خاناں کے خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ اپنے خیمے سے کچھ دور ہی آیا تھا کہ ایک گھڑ سوار اسی سمت آتا دکھائی دیا۔ قریب آنے پر عبداللہ خاں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ذوالفقار خاں تھا۔ اس نے عبداللہ خاں کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روک لیا۔

''قطب الملک! مجھے تم سے کچھ اہم گفتگو کرنا ہے۔ میں تمہارے ہی خیمے کی طرف آ رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ کہاں جا رہے ہو؟'' ذوالفقار خاں نے عبداللہ خاں کو نرم لہجے میں مخاطب کیا۔ عبداللہ خاں کے لئے اس کا لہجہ خلاف توقع تھا۔ اس سے پہلے وہ عبداللہ خاں سے اکھڑے اکھڑے لہجے میں گفتگو کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عبداللہ خاں کو خان خاناں کا آدمی سمجھتا تھا۔

''صمام الدولہ! تمہیں مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟'' عبداللہ خاں نے بھی اسے اس کے خطاب سے مخاطب کرتے ہوئے چبھتے لہجے میں کہا۔

''اپنا لہجہ درست کرو عبداللہ خاں! اور یہ نہ بھولو کہ خان خاناں کے بعد میری حیثیت سب سے بڑی ہے۔'' ذوالفقار خاں پھر اپنے گزشتہ لہجے میں سختی سے بولا۔

''کس کی حیثیت بڑی ہے اور کس کی چھوٹی' یہ فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا ذوالفقار خاں تم اپنی کہو' مجھ سے کیا کام ہے؟ ظاہر ہے کہ تم کسی کام ہی سے میرے خیمے کی طرف آئے ہو گے۔'' عبداللہ خاں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سے کوئی گفتگو کرنا بیکار ہی ثابت ہو گا۔ خیر کوئی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ گھوڑے کو آگے بڑھانے لگا۔

''ٹھہرو ذوالفقار خاں!'' عبداللہ خاں نے کہا تو وہ رک گیا۔ اس کے رکتے ہی عبداللہ خاں بولا۔ ''میں کچھ دیر بعد خود تمہارے خیمے میں آ رہا ہوں۔ میں بہرحال اتنا بداخلاق نہیں کہ گھر آئے مہمان کی بات نہ سنوں۔''

''میں تمہارا انتظار کروں گا۔ یہ ملاقات خود تمہارے حق میں سودمند ثابت ہو گی۔ آگے تمہیں اختیار ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکا ہوں۔'' ذوالفقار خاں نے یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے ایک طرف بڑھ گیا۔

عبداللہ خاں کسی اور سبب نہیں بلکہ اپنے جذبہ تجسس کی وجہ سے ذوالفقار خاں کے خیمے میں جانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ذوالفقار خاں اس سے کیا بات کرنے آیا تھا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ نہ وہ عبداللہ خاں کا خیر خواہ تھا اور نہ خود عبداللہ خاں اس کا۔ پھر کیا ایسی قدر مشترک نکل آئی تھی۔ جو وہ عبداللہ خاں سے ملنا اور گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ یہی سوچتا ہوا عبداللہ خاں الجھے ہوئے ذہن سے خاں خاناں کے خیمے کی طرف جا رہا تھا۔

جیسے ہی عبداللہ خاں' خان خاناں کے خیمے میں داخل ہوا اور خان خاناں کے قریب جا کر بیٹھا' اس نے اپنے میزبان کو مضطرب سا محسوس کیا۔

''اب تم کیا نیا چکر چلانے والے ہو؟'' خان خاناں فوراً ہی بول اٹھا۔ ''آخر کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو کہ تمہارے اقدامات کا مقصد کیا ہے۔ تم نے راجہ اجیت سنگھ کا خیمہ خاص طور پر ذوالفقار خاں ہی کے خیمے سے قریب کیوں نصب کرایا؟ پھر اس خیمے کے اردگرد ایسے پہریداروں کی کیا ضرورت تھی جو ہمارے خاص آدمی ہیں؟''

''چکر وکر کچھ نہیں۔'' عبداللہ خاں نے ہنس کر جواب دیا۔ ''آپ ذرا سی بات سے گھبرا جاتے ہیں۔'' عبداللہ خاں اچھی طرح جانتا تھا کہ خان خاناں بنیادی طور پر ایک شریف النفس اور نیک طبع آدمی تھا۔ اگر عبداللہ خاں اسے نہ بھڑکاتا تو وہ شاہ عالم کے قتل کی ناکام سازش میں کبھی شریک نہ ہوتا۔

''پھر بھی کچھ تو معلوم ہو میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اندھیرے میں رکھ کر کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھو۔'' خان خاناں بولا۔

''کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟'' عبداللہ خاں نے خواہ مخواہ بوڑھے کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔

''ارے بابا! یہ کون کمبخت کہہ رہا ہے کہ تم پر اعتماد نہیں! میں تو حالات سے باخبر رہنا چاہتا ہوں بھلا مجھے تم سے زیادہ اعتماد کس پر ہو گا۔ تم پر نہیں تو کیا میں ذوالفقار خاں پر اعتماد کروں گا۔'' خان خاناں عاجز آ کر بولا۔

''وہ حضرت بھی ابھی راستے میں ملے تھے۔ مجھ سے کچھ اہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔'' عبداللہ خاں نے اصل بات کرنے کی بجائے نیا شوشہ چھوڑ دیا۔

"کون؟" خان خاناں نے اس طرح حیرت سے پوچھا جیسے بات سمجھنے میں اس سے غلطی ہو گئی ہے۔

"ذوالفقار خاں اور کون!" عبداللہ خاں جواب دے کر خان خاناں کے چہرے کا جائزہ لینے لگا جس پر شدید حیرت کے آثار تھے۔

"کیا واقعی؟" خان خاناں اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "وہ تم سے کس سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتا ہے؟"

"معلوم نہیں۔" عبداللہ خاں نے بے پروائی سے کہا۔ "آپ سے گفتگو کر کے اس سے ملوں گا۔"

"اس سے ہوشیار رہنا عبداللہ خاں وہ اسد کا بیٹا ہے۔ وہ اسد خان جو ایک زمانے میں جوڑ توڑ کا ماہر اور بڑا سیاست داں سمجھا جاتا تھا۔ یہ اسد خان کی سیاست ہی تو تھی کہ اس نے بادشاہ مرحوم خلد مکاں (اورنگزیب عالمگیر) پر ایسا جادو کر دیا تھا کہ حضور بادشاہ بھی اس کی بات نہیں ٹالتے تھے۔" خان خاناں نے عبداللہ کو تاکید کی، پھر بولا۔ "بہر حال اس گھاگ سے جو بھی بات ہو، مجھے ضرور بتانا! خیر اس ذکر کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ راجہ اجیت سنگھ کا کیا معاملہ ہے؟"

"میں راجہ اجیت سنگھ کو فرار کرانا چاہتا ہوں۔" عبداللہ خاں نے بوڑھے سے لطف لینے کیلئے اچانک بغیر کسی تمہید کے کہہ دیا۔

"کک...... کیا...... کیا کہہ رہے ہو تم؟" خان خاناں حیرت کی شدت کے سبب ہکلانے لگا۔

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آج رات راجہ اجیت سنگھ فرار ہو جائے گا۔" عبداللہ خاں نے جواب دیا۔

"ارے ارے! کچھ خوف خدا کرو عبداللہ خاں! اس طرح شاہی لشکر گاہ سے ایک باغی قیدی کا فرار ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے بادشاہ وقت اور مغل افواج کی عزت خاک میں مل کر رہ جائے گی۔ پھر...... پھر یہ ممکن بھی کب ہے۔" خان خاناں بوکھلا گیا۔

"ناممکن کو ممکن بنانے کے انتظامات میں آپ کے ذریعے پہلے ہی کرا چکا ہوں۔ اب صرف آپ کے اشارے کی دیر ہے۔ رہا بادشاہ وقت کی عزت خاک میں ملنے کا مسئلہ تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں اور مغل افواج پہلے ہی اس علاقے کو اچھی طرح روند کر اپنی دھاک بٹھا چکی ہیں۔ ایک شخص کے فرار ہو جانے سے ان کی عزت پر بٹا نہیں لگے گا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ راجہ اجیت سنگھ کے فرار کا سارا الزام ذوالفقار خاں پر آئے گا۔ کیا سمجھے آپ! عبداللہ خاں نے آخر میں اصل بات بتا دی۔"

"عبداللہ خاں! تم بھی آفت کی پڑیا ہو۔" خان خاناں اچھل پڑا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "وہ غریب پہریدار ناحق مارے جائیں گے۔ پھر اس میں ایک خطرہ اور بھی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی اصل بات قبول کر گیا تو؟"

"اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ آپ اس سلسلے میں قطعی فکر مند نہ ہوں۔"

"نہیں، پہلے مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے؟" خان خاناں اجازت دینے سے پہلے پوری

طرح مطمئن ہونا چاہتا تھا۔

"کیا آپ بھول گئے اس شب شاہ عالم کا محافظ کس طرح وہاں سے ہٹ گیا تھا جب کہ وہ تو ہمارے ساتھ ملا ہوا بھی نہیں تھا۔ خیر آپ اس وقت تک شاید مطمئن نہیں ہوں گے جب تک میں تفصیل کے ساتھ تمام منصوبہ آپ کے سامنے عرض نہ کر دوں۔" عبداللہ خان نے قدرے توقف کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔ "پہریداروں تک آپ اپنا یہ حکم پہنچا دیں گے کہ جب انہیں رات کے وقت مشرق کی جانب شعلے بلند ہوتے نظر آئیں تو وہ اس طرف دوڑ پڑیں۔ بعد میں جب راجہ اجیت سنگھ فرار ہو جائے تو وہ عذر پیش کریں کہ وہ سب ایک طرف سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھ کر یہ سمجھے تھے، کسی خیمے میں آگ لگ گئی ہے، لیکن وہ قریب پہنچے تو علم ہوا آگ کسی خیمے میں نہیں خس و خاشاک میں لگی تھی۔ وہ آگ بجھا کر لوٹے تو قیدی غائب تھا۔ اس طرح وہ صاف بچ جائیں گے۔" عبداللہ نے خان خاناں کو پورے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔

"اور راجہ اجیت سنگھ کو کون فرار کرائے گا؟" خان خاناں نے سوال کیا۔

"آپ کا یہ خادم!" عبداللہ خاں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا، پھر بولا۔ "آپ اپنے کسی خادم کو اس کام پر مامور کر دیجئے گا کہ رات کا تیسرا پہر گزرتے ہی وہ خس و خاشاک جمع کر کے ان میں آگ لگا دے تاکہ پہریداروں کو راجہ اجیت سنگھ کے خیمے سے ہٹنے کا جواز مل سکے۔"

"خیر یہ سب تو ہو جائے گا، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اگر کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔" خان خاناں متفکر لہجے میں بولا۔

"اللہ مالک ہے۔" عبداللہ خاں نے کہا۔ "ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنے سے تو ہم دشمن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"یہ تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔" خان خاناں کچھ سوچ کر بولا۔ "ذوالفقار خاں سے بہر حال نمٹنا تو ہے ہی۔"

"اور یہ ایک سنہری موقع ہے۔" عبداللہ خاں نے لقمہ دیا۔ "شاہ عالم اس کی طرف سے باآسانی متنفر ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر عبداللہ نے اس سے سرگوشی کی۔ "اس سے جو بات ہو مجھے کل صبح ہی بتا دینا، میں بے چین رہوں گا۔"

عبداللہ خاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ خیمے سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور ذوالفقار خاں کے خیمے کی طرف رخ کر دیا۔ وہاں پہنچ کر عبداللہ خاں نے اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ خیمے کے در پر موجود پہریداروں میں سے ایک اندر چلا گیا، دوسرا وہیں موجود رہا۔ کچھ ہی دیر کے بعد پہریدار کے ہمراہ خود ذوالفقار خاں، عبداللہ خاں کا استقبال کرنے خیمے کے در تک آ گیا۔

"آؤ آؤ! تم اچھے آئے۔" وہ عبداللہ خاں کے قریب آ کر خوش مزاجی سے بولا۔ عبداللہ خاں نے محسوس کیا کہ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ عبداللہ خاں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تو وہ کہنے لگا۔ "ارے ارے، کیا ہوا؟ آؤ نا۔" یہ کہہ کر اس نے عبداللہ خاں کا ہاتھ پکڑ لیا اور خیمے کے اندر لے جانے لگا۔ عبداللہ خاں کے گھوڑے کی باگ ایک ملازم نے تھام لی تھی۔ "مجھے امید تو نہیں تھی کہ تم آؤ گے، خیر!"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

خیمہ خاصا بڑا تھا۔ وہ عبداللہ خاں کو ساتھ لیے اندر داخل ہوا۔ عبداللہ خاں نے آتے ہی دیکھ لیا کہ خیمہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ عبداللہ خاں نے بیٹھ کر مسند سے ٹیک لگائی اور اپنے میزبان کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ابھی عبداللہ خاں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چونک اٹھا اس کی سماعت سے سسکی کی آواز ٹکرائی تھی۔ وہ سسکی یقیناً کسی عورت کی تھی۔

''چونکو مت!'' ذوالفقار خاں بولا۔ ''یہ بتاؤ پیو گے؟''

''میں یہاں پینے پلانے نہیں آیا۔ تمہیں مجھ سے جو بات کرنا ہے' کرو! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' عبداللہ خاں نے رکھائی سے جواب دیا۔ اسی وقت وہ سسکی کی آواز پھر سنائی دی۔ ''خیمے کے دوسرے حصے میں کون ہے؟'' عبداللہ خاں نے براہ راست سوال کیا۔

''اگر تم یہاں پینے پلانے نہیں آئے تو میں نے بھی تمہیں غیر ضروری سوالات کرنے کیلئے نہیں بلایا۔'' ذوالفقار خاں کسی قدر ترش لہجے میں بولا۔ پھر اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ فوراً ہی نرم پڑ گیا۔ ''سنو عبداللہ خاں! زندگی بار بار نہیں ملتی۔ اس سے جتنی بھی زیادہ سے زیادہ لذت کشید کر سکو' کر لو.... ہاں' میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ بتا سکوں' خان خاناں کی عمر کا آفتاب اب غروب ہونے کو ہے اور میں تمہیں دانشمند سمجھتا ہوں۔ دانشمند کبھی ایسے سہارے تلاش نہیں کرتے جو ناپائیدار اور عارضی ہوں۔''

''ذوالفقار خاں! تمہیں جو کچھ کہنا ہے' کھل کر کہو' اخلاقی جرأت سے کام لو! پہیلیوں میں بات نہ کرو۔'' عبداللہ خاں سپاٹ آواز میں بولا۔

''تو سنو! خان خاناں اب بوڑھا ہو چکا ہے۔ آج نہیں تو کل اسے اس جہان فانی سے کوچ کر جانا ہے۔ تمہارے لیے یہ اندازہ لگانا غالباً زیادہ مشکل نہیں ہونا چاہیے کہ جب وہ نہیں رہے گا تو اس کی جگہ کون لے گا۔ تم ایک بہادر اور ذہین آدمی ہو اس لیے میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم خان خاناں کو چھوڑ کر میرے بہی خواہوں میں شامل ہو جاؤ۔'' ذوالفقار خاں نے مطلب کی بات کہہ دی۔

''گویا میں تمہارا حاشیہ نشین بن جاؤں۔'' عبداللہ خان نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اسے تم جو چاہے نام دے لو' مگر میں سمجھتا ہوں اس طرح تمہارا مستقبل نسبتاً محفوظ اور بہتر ہو سکتا ہے۔'' ذوالفقار خاں بولا۔

''تمہیں میرے مستقبل کی فکر ہے یا اپنی؟'' عبداللہ خاں نے طنز کیا۔

''اپنی فکر؟'' یہ کہہ کر ذوالفقار خان ہنس پڑا۔ ''تم بھی بڑی پرلطف باتیں کرتے ہو۔ میں یعنی صمصام الدولہ ذوالفقار خاں میر بخشی' امیر الامراء' اسد خاں کا فرزند ارجمند اپنی فکر کروں گا۔ یہ بھی خوب رہی۔'' وہ پھر ہنسنے لگا۔ اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔

''بس تمہیں یہی کہنا تھا یا کچھ اور؟'' عبداللہ خاں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سختی سے کہا۔

''کیا تم کچھ اور بھی سننا چاہتے ہو؟'' تو سنو! اگر تم نے میری پیشکش کو قبول نہ کیا تو....'' اس نے نہ جانے کیا سوچ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تو؟'' عبداللہ خاں نے تیوریوں پر بل ڈال کر پوچھا۔

''تو.... تو میں تمہیں شاید ایک موقع اور دوں گا وہ خشک مزاج بوڑھا یقیناً تمہیں بہت جلد کھلنے لگے گا۔ ویسے اگر تم میری بات مان لیتے تو آج میں تمہاری بڑی شاندار دعوت کرتا۔ میں نے تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا' وہ حیرت انگیز طور پر غلط ثابت ہو رہا ہے۔ کہاں تم اور کہاں وہ بوڑھا پارسا؟ کیا تم الہ آباد سے آ کر بالکل بدل گئے؟ آخر اس بوڑھے نے تم پر کیا جادو کر دیا جو تم ایسا رنگین مزاج شخص ایسی خشک زندگی گزارنے پر آمادہ ہو گیا؟''

اس بار ذوالفقار خاں کی بات سن کر عبداللہ خاں چونک اٹھا۔ بات بالکل واضح تھی۔ یقیناً وہ عبداللہ خاں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا وہ کسی طرح اس بات سے آگاہ ہو چکا تھا کہ الہ آباد کے دوران قیام میں عبداللہ خاں نے کیا کیا گل کھلائے تھے۔ عبداللہ خاں نے سوچا کہ اب مجھے اس شخص کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیئے وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور ذوالفقار خاں کو مخاطب کیا۔ ''ممکن ہے تم نے میرے بارے میں کچھ بے سروپا باتیں سنی ہوں۔ مجھے ان کی تردید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ میرا ضمیر مطمئن ہے۔''

''تم اس طرح ایک حسین موقع کھو رہے ہو۔'' ذوالفقار معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے تو تمہاری خوشنودی طبع کی خاطر یہاں بھی ایسا انتظام کر لیا تھا کہ تمہیں میری پیشکش قبول کرتے ہی یہ احساس ہو جائے' صمصام الدولہ اپنوں کے لئے کتنا مہربان ہے۔''

عبداللہ خاں نے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ ذوالفقار خاں کے جملوں کی معنویت کو کسی حد تک سمجھ چکا تھا۔ پھر گفتگو کے دوران میں بار بار نسوانی سسکیوں کی آوازیں بھی اسے ایک نتیجے تک پہنچنے میں مدد دے رہی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا خیال درست ہے یا غلط۔

''اگر میں اس مسئلے پر غور خوض کرنے کیلئے تم سے کچھ وقت چاہوں تو؟'' ذوالفقار خاں خوش مزاجی سے بولا۔ بخوشی! اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم پگھلتے جا رہے ہو۔'' ذوالفقار خاں خوش مزاجی سے بولا۔ ''تو پھر آؤ! میں تمہاری حق تلفی کیوں کروں۔'' یہ کہہ کر اس نے عبداللہ خاں کا ہاتھ تھاما اور اٹھ کھڑا ہوا۔

عبداللہ خاں کو اپنے ہمراہ لیے ذوالفقار خاں اسی خیمے کے دوسرے حصے کی طرف بڑھا۔ سسکیوں کی آوازیں ادھر ہی سے سنائی دے رہی تھیں۔ درمیانی پردہ اٹھا کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ عبداللہ خاں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اندر پہنچتے ہی عبداللہ خاں کے خیال کی تائید ہو گئی۔

خیمے میں بچھے ہوئے قالین پر دو نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں پڑی تھیں۔ وہ دونوں ہی بندھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک کے منہ میں تو کپڑا بھی ٹھنسا ہوا تھا۔ ایک طرف چھوٹی سی تپائی پر ساغر و مینا رکھے تھے۔ شمع دان روشن تھا۔ ایک ساغر میں تھوڑی سی شراب بھی بچی ہوئی تھی۔ عبداللہ خاں سمجھ گیا کہ اس کی آمد سے پہلے ذوالفقار خاں خیمے کے اسی حصے میں ہو گا۔

آؤ پہلے تھوڑی سی پی لیں تاکہ یہ غزالان کوہسار دو آتشے کا کام دیں۔'' ذوالفقار خاں نے ان دونوں کو ''غزالان کوہسار'' کہہ کر بڑی معنویت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ سارا علاقہ پہاڑی تھا۔ یہ کہہ کر وہ اس

تپائی کے سامنے بیٹھ گیا جس پر شراب کی صراحی اور ساغر رکھے ہوئے تھے۔ عبداللہ خاں کو اس نے اپنے قریب ہی بٹھا لیا تھا۔

جس لڑکی کے منہ سے کپڑا نکلا ہوا تھا' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے جسم پر موجود ساری جسم ڈھانپنے کیلئے ناکافی تھی۔ ساری کے بند کئی جگہ سے کھلے ہوئے تھے۔ کچھ دیر پہلے یقیناً ذوالفقار خاں اس سے دست درازیاں کرتا رہا ہوگا۔ غالباً اسی غرض سے اس نے لڑکی کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا بھی نکال دیا ہوگا جو قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ عبداللہ خاں کی آمد سے پہلے ذوالفقار خاں' شائد شراب ہی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

عبداللہ خاں ان دونوں کو دیکھنے میں محو تھا کہ ذوالفقار خاں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''ہم نے سنا تھا عبداللہ خاں کہ تم بڑے حسن پرست ہو۔ بتاؤ ہمارا انتخاب کیسا ہے؟'' اس نے دو ساغروں میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔

''یہ لڑکیاں غالباً انہی راجپوت عورتوں اور لڑکیوں میں سے ہیں جنہیں اسیر بنا لیا گیا ہے؟'' عبداللہ خان نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے خیال آرائی کی۔

''اب زیادہ کریدو مت!'' اس نے ساغر عبداللہ خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں آم کھانا ہیں یا گٹھلیاں گننا ہیں۔''

عبداللہ خاں جواب میں کچھ نہیں بولا اور ساغر لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ عرصہ دراز کے بعد شراب سامنے دیکھ کر اس کی پیاس عود کر آئی تھی۔ دوسرا ساغر تمام کرنے کے ساتھ ہی اسے ماحول بڑا حسین نظر آنے لگا۔ پھر چوتھے ساغر کے اختتام تک وہ بے قابو ہو گیا۔ اس نے ساغر خالی کر کے تپائی پر رکھا اور اٹھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس لڑکی کے ہاتھ کھول دیئے جس کی ساری کے بند پہلے ہی کھلے ہوئے تھے۔ ہاتھ کھلتے ہی لڑکی اپنی ساری درست کرنے والی تھی مگر عبداللہ خاں نے اسے اتنی مہلت نہیں دی۔ اس سے پہلے کہ ذوالفقار کچھ کہتا' عبداللہ خاں نے لڑکی کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

''عبداللہ خاں! یہی میری پسند ہے۔'' ذوالفقار خاں تیزی سے بولا۔ ''ابھی تو میں اس ساغر شباب کا پہلا گھونٹ بھی نہیں لے سکا۔ تمہارے لیے دوسری ہے۔ اسے چھوڑ دو۔''

''اور اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو؟'' عبداللہ خاں نے سہمی ہوئی لڑکی کو اپنی گرفت میں لے کر ذوالفقار خاں کو چبھتی نظروں سے دیکھا۔

''تو یہ تمہاری گستاخی ہوگی۔ تم حد سے تجاوز کر رہے ہو۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''یہ نہ بھولو کہ تم اس وقت میرے خیمے میں ہو۔''

یہ کہتا وہ عبداللہ خاں کے بالکل قریب آ گیا۔

''اور تم بھی یہ نہ بھولو ذوالفقار خاں کہ تم نے خیانت کی ہے۔ سوچو کہ جب بادشاہ وقت کے علم میں یہ بات لائی جائے گی تو تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟'' عبداللہ خاں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس کے ذہن پر شراب کا نشہ اپنا اثر جماتا رہا تھا۔ پھر اس گداز قیامت کے لمس نے تو اس نشے کو اور بھی سوا کر دیا تھا۔ وہ کسی صورت اس لڑکی کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔

''عبداللہ خاں! تم محض ایک لڑکی کی خاطر صمام الدولہ کی دشمنی مول لے رہے ہو! لڑکیاں تو نہیں اور بہت مل جائیں گی مگر یاد رکھنا ہماری خوشنودی نہ مل سکے گی۔'' ذوالفقار خاں کے لہجے میں اب کسی قدر نرمی آ گئی تھی۔ غالباً عبداللہ خاں کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔

''بات دشمنی کی نہیں' معاملے کی ہے ذوالفقار خاں! تم مجھے خوش کرنا چاہتے تھے تو پھر یہ روک ٹوک کیسی!'' عبداللہ خان بولا۔

''ٹھیک ہے' غلطی میری ہے مجھے تم پر اتنی جلدی اعتماد نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' یہ کہہ کر ذوالفقار خاں پیچھے ہٹ گیا۔ پھر شراب کی صراحی اور ساغر اٹھا کر وہ خیمے کے پہلے حصے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ دیر نہ لگانا۔''

عبداللہ خاں اچھی طرح سمجھتا تھا' صمام الدولہ ذوالفقار کبھی نہیں چاہے گا کہ بادشاہ تک یہ بات پہنچے۔ وہ اپنی بچت کیلئے عبداللہ خاں کو عیاشی کا موقع دینے پر مجبور تھا۔ اس کے انداز گفتگو سے عبداللہ خاں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ وہ اس زبردستی پر زیادہ برہم نہیں ہے ورنہ عبداللہ خاں کو اس کی طرف سے کوئی اور خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

لڑکی اب بھی کسی سہمی ہوئی فاختہ کی طرح عبداللہ کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''کیا تم کنواری ہو؟'' عبداللہ خاں نے پہلی بار اسے مخاطب کیا۔

''نہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ اس کی نرم اور شیریں آواز عبداللہ خاں نے اپنے وجود میں اترتی محسوس کیا۔

''پھر بھی بہت خوب ہو!'' یہ کہہ کر عبداللہ خاں جھکا اور نازک لبوں کی حرارت اپنے وجود میں منتقل کرنے لگا۔

عبداللہ خاں نے اس پتھر کو لاکھ پگھلانا چاہا' مگر وہ نہ پگھلا۔ اس نے سارے آزمودہ حربے آزما لیے کہ خود سپردگی کی منزل قریب آ جائے۔ عبداللہ خاں کو گمان تھا کہ وہ منزل آشنا' دیار رنگ و خوشبو سے گریز نہ کرے گی' جذبوں کی مسافت اور احساس کی لطافت اسے ساحل آسودگی کی طلب پر مائل کر دے گی' مگر اس کا یہ گمان محض گمان ہی ثابت ہوا۔ سسکیاں بند نہ ہوئیں' مزاحمت نے دم نہیں توڑا۔ معلوم نہیں وہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ عبداللہ خاں تب ضبط کھو بیٹھا اور پھر کوئی بند قبا اس کی وحشت کو نہ روک سکا۔

''نہیں...... نہیں...... یہ پاپ نہ کیجئے۔'' آخری صدا بلند ہوئی اور پھر دم توڑ گئی۔

پھر عبداللہ خاں کا یہ گمان بھی باطل ہی ثابت ہوا کہ وادی نشاط میں قدم رکھتے ہی رنگ ہی رنگ بکھر جائیں گے اور وہ جو گریز پا ہے' اجنبی ہے' اجنبی نہیں رہے گا' ہم نفس و ہم قدم ہو جائے گا۔ اس سے عبداللہ کی وحشت میں اور اضافہ ہو گیا۔ انکار' مزاحمت' سسکیاں' نتیجتاً لمحہ بہ لمحہ اس کے رویے میں شدت اور سختی آتی گئی' مگر آخر وقت تک مزاحمت ترک نہیں کی گئی۔ عبداللہ خاں کے تمام کلیے غلط ہو گئے۔ وحشت خیز لمحوں کا طوفان تھما تو عبداللہ خاں ایک دم اچھل پڑا۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں خنجر تھا۔

وہ خنجر اس نے عبداللہ خاں ہی کے لباس سے نکالا تھا۔ اس نے لپک کر لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکی کی آخری چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اگر عبداللہ فوری طور پر لڑکی کے منہ پر ہاتھ نہ رکھ دیتا تو شاید ذوالفقار خاں کیلئے ایک مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ لڑکی کی چیخ آس پاس کے خیموں تک پہنچتی۔ پھر کیا ہوتا' اس کے بارے میں قیاس ہی کیا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر ہی میں لڑکی کا جسم ڈھیلا ہو گیا' مگر سینے سے خون اب بھی بہہ رہا تھا۔ دوسری لڑکی جو قالین پر بندھی پڑی تھی' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بھیانک منظر کو دیکھ رہی تھی۔ عبداللہ وہاں سے نکل کر تیزی کے ساتھ خیمے کے بیرونی حصے میں پہنچا۔ اس نے کمال ہوشیاری سے اپنے کپڑوں پر خون لگنے سے بچا لیا تھا ورنہ اس کیلئے اپنے خیمے تک چھپ کر پہنچنا مشکل ہو جاتا۔

باہر کے حصے میں آتے ہی عبداللہ خان کی نظر ذوالفقار خاں پر پڑی۔ ذوالفقار خاں کے ہاتھ میں اب بھی ساغر تھا۔ اس نے عبداللہ خاں کو آتے دیکھ کر گھورا اور بولا۔ ''آج تک کسی کی مجال نہیں ہوئی تھی کہ ذوالفقار خاں سے اس کا شکار چھین لے جائے۔ تم نے جس عیاری کا ثبوت دیا ہے' میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔''

''تمہاری ہوس کی تسکین کیلئے ابھی دوسری زندہ ہے۔'' عبداللہ خاں اس کے قریب جا کر بولا۔ ''پہلی نے خودکشی کر لی۔''

''کیا؟'' ذوالفقار خاں اچھل پڑا۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ذوالفقار خاں! اگر تم کسی مشکل میں پھنسنا نہیں چاہتے تو لڑکی کی لاش کو ٹھکانے لگوا دو۔'' یہ کہہ کر عبداللہ خاں آگے بڑھا۔ اس کا رخ خیمے کے در کی طرف تھا۔ وہ اب وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔

''ٹھہرو! تم نے متوقع دوستی کی مجھ سے ایک بڑی قیمت وصول کر لی ہے۔ اگر اب تم نے فیصلہ میرے حق میں نہ کیا تو.....'' دھمکی کے انداز میں اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر عبداللہ خاں خیمے سے باہر نکل گیا۔ ذوالفقار خاں کے ایک ملازم نے اسے باہر آتے دیکھ کر گھوڑا کھولا اور باگ عبداللہ خاں کی طرف بڑھا دی۔ عبداللہ خاں گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔

سورج ڈوب چکا تھا اور لشکر گاہ میں کہیں کہیں مشعلیں روشن نظر آ رہی تھیں۔ عبداللہ خاں کو اس راجپوت لڑکی کی خودکشی نے خاصا مکدر کر دیا تھا۔ عجیب لڑکی تھی ذرا سی بات پر مرمٹی۔ عبداللہ خاں سوچ رہا تھا۔ اس کے نزدیک وہ ذرا سی بات تھی۔ کوشش کے باوجود بھی عبداللہ خاں اس لڑکی کے خیال کو اپنے ذہن سے نہیں جھٹک سکا۔

رات گئے تک عبداللہ خان کو جاگنا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں پورا منصوبہ ترتیب دے چکا تھا۔ ذوالفقار خان کی باتوں نے اسے قطعی متاثر نہیں کیا تھا۔ اس کا انداز گفتگو اور لب و لہجہ خودسرانہ تھا۔ اگر وہ یہی ساری باتیں نرمی سے کرتا تو شاید اس کا اثر مختلف ہوتا۔ بھلا عبداللہ خاں اس کی خودسری اور حاکمیت کس طرح قبول کر لیتا۔ وہ عبداللہ خاں کو عیاشی کا لالچ دے کر ظاہر ہے کہ اپنا غلام نہیں بنا سکتا تھا۔ وقتی بات اور مصلحت سے قطع نظر عبداللہ خاں بھی ان باتوں کا باآسانی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا تجربہ اسے

...میں ہو چکا تھا۔ دولت و اقتدار خواہشوں کے حصول میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور دونوں ہی ...اللہ خاں کے پاس بھی تھیں۔ اس نے خان خاناں کے ساتھ جو ساز باز کی تھی' اس کا تقاضا یہی تھا ...خان خاناں ہی کا ساتھ دے اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھے۔ ذوالفقار خاں کو وہ ایسا سبق دینا ...زندگی بھر یاد رکھے۔ عبداللہ خاں اسے شاہ عالم کی نظروں سے گرانا چاہتا تھا۔ اس کا بڑا سبب یہ ...کہ شاہ عالم سے ذوالفقار خاں کا قریب ہونا عبداللہ خاں کے منصوبے کے خلاف تھا۔ اس کے ...کامیابی کا دارومدار تو اسی پر تھا کہ شاہ عالم' خان خاناں پر ہر طرح اعتماد کرے' اسی سے سب ...قریب ہو۔ ذوالفقار خاں کا درمیان میں آنا کسی بھی طرح عبداللہ خاں کے حق میں نہیں تھا۔ اس ...عبداللہ خاں کے ذہن میں ایک اور الجھن بھی تھی کہ شاہ عالم نے ذوالفقار خاں کو اپنے قریب ...موقع کیوں دیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس پر عبداللہ خاں جتنا بھی غور کرتا اس کا ذہن الجھتا ہی ...پھر بھی اکثر وہ اس سوال کا کوئی صحیح جواب تلاش کرنے کی سعی میں لگا رہتا تھا۔

رات کا تیسرا پہر گزرنے سے پہلے ہی عبداللہ خاں خیمے سے نکلنے کیلئے تیار ہو گیا۔ اس نے ...کے مطابق اپنے جسم کو ایک سیاہ لبادے میں چھپایا ہوا تھا۔ پیدل سفر کرنے ہی کو اس نے غنیمت ...لشکر گاہ خموشی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ دبے پاؤں اس سمت روانہ ہو گیا جدھر ذوالفقار ...خیمہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ خان خاناں نے اس کے کہنے کے مطابق تمام انتظامات کر دیئے ہوں ...راجہ اجیت سنگھ کے خیمے میں اسے اس وقت داخل ہونا تھا جب وہاں سے پہریدار ہٹ جاتے۔ یہ ...اس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ خیمے کی مشرقی سمت سے اسے شعلے نظر آتے۔ ان شعلوں کو دیکھ کر ہی ...داروں کو وہاں سے ہٹنا تھا۔

راجہ اجیت سنگھ کے خیمے سے کچھ فاصلے ہی پر وہ رک گیا اور اندھیرے میں مشرقی سمت نظریں ...یں۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس کی نظر اندھیرے میں ایک جگہ جم گئی۔ وہاں سے آہستہ ...شعلے اٹھنے لگے تھے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور اسی وقت وہ چونک اٹھا۔

خطرہ...... خطرہ!! اس کے ذہن نے گردان کی۔ وہ شعلے مشرق کی طرف سے نہیں بلکہ دوسری ...ت سے بلند ہوئے تھے۔

وہ چکرا کر رہ گیا۔ اس نے سوچا' کیا خان خاناں کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ میں نے ...ن سی سمت بتائی تھی؟ یقیناً یہی ہو سکتا ہے۔ اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔ اب وہ ایک خیمے کی آڑ میں ...ر اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ وہ اس کا منتظر تھا کہ راجہ اجیت سنگھ کے خیمے پر ...مین پہریدار اسے وہاں سے جاتے نظر آ جائیں۔

ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک اور طرف سے شعلے بلند ہوئے اور یہ سمت یقیناً مشرق ہی کی ...ی۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ عبداللہ خاں نے جھنجلا کر سوچا۔ یقیناً کوئی گڑبڑ تھی' مگر وہ اس کی نوعیت سے ...اقف نہیں تھا۔ تیزی کے ساتھ راجہ اجیت سنگھ کے خیمے کی طرف بڑھا۔

حسب توقع وہاں کوئی پہریدار موجود نہیں تھا اور خیمے کے اندر بھی سناٹا تھا۔ وہ خیمے کا پردہ اٹھا

کر اندر داخل ہو گیا۔ جب چند لمحے بعد ہی اس پر یہ انکشاف ہوا کہ خیمہ خالی ہے تو اس کے ہو گئے۔

راجہ اجیت سنگھ کہاں گیا؟ اس کا ذہن بار بار اسی سوال کی تکرار کر رہا تھا' مگر اس سوال کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ ابھی اسی گومگو کے عالم میں تھا کہ اس کی سماعت سے شور اور ہنگامے کی آوازیں ٹکرا تقریباً دوڑتا ہوا وہ خیمے سے نکلا۔ اسی وقت اس کی نظر ان متعدد مشعل بہ دست گھڑ سواروں پر پڑی جو سے ایک طرف دوڑتے جا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ لشکر میں عجیب سی بھگدڑ اور افراتفری مچی ہوئی جیسے کوئی کچھ نہ سمجھ پا رہا ہو۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یقیناً وہ مشعل برادر دوست نہیں ہو تھے پھر اس نے تیزی سے سیاہ لبادہ اتار پھینکا۔ اب اس لبادے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ آس کے تمام خیموں سے سپاہی نکل کر ایک دوسرے سے پوچھتے پھر رہے تھے کہ ماجرا کیا ہے؟

اسی وقت عبداللہ خاں بہ آواز چیخا۔ ''مشعل برداروں کا پیچھا کرو۔''

سپاہیوں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اسے پہچانتے ہی لپک لپک کر مشینی انداز میں ا اپنے گھوڑوں پر بیٹھنے لگے۔ عبداللہ خاں نے بھی ایک خیمے کے سامنے بندھا ہوا گھوڑا کھولا اور چند سپا کو اپنے ساتھ لیے تیزی سے مشعل برادروں کی طرف لپکا۔ اس کے ہمراہ جو سپاہی گھوڑوں پر دوڑ ر تھے' انہیں مشعل برادروں کی طرف دوڑتے دیکھ کر غالباً دوسرے سپاہی بھی کسی حد تک معاملے کی نو سمجھ گئے تھے۔ اب ان میں بھی کچھ' آگے جانے والوں کے ساتھ ملتے جا رہے تھے۔

ذرا ہی دیر میں لشکر گاہ پیچھے رہ گئے۔ مشعل برادروں کا رخ اب پہاڑوں کی جانب تھا۔ عبد خاں جس گھوڑے کی پشت پر تھا' وہ غالباً اچھی نسل کا تھا۔ عبداللہ خاں اسی لیے اپنے پیچھے آنے وا سپاہیوں سے خاصا آگے تھا۔ اس کا اور مشعل برادروں کا درمیانی فاصلہ لحہ بہ لحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ا پہاڑی سلسلہ بھی شروع ہونے والا تھا۔

عبداللہ خاں کے دیکھتے ہی دیکھتے مشعل برادروں کا اگلا حصہ ایک پہاڑی درے میں داخل گیا۔ عبداللہ خاں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مشعل برداروں کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی۔

اب عبداللہ خاں کیلئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا کہ ان مشعل برداروں کا تعلق ان راجپوتو سے ہے جو پہاڑوں پر بھاگ گئے تھے۔ یقیناً انہوں نے دن کے وقت لشکر گاہ میں اپنے کسی جاسوس کو ہوگا اور اسی کے ذریعے انہیں یہ معلومات حاصل ہوئی ہوں گی کہ قیدیوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔

راجہ اجیت سنگھ کہاں اور کس خیمے میں ہے' یہ بھی راجپوتوں نے دن کے وقت ہی معلوم کر لیا گا۔ اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ عبداللہ خاں کا ذہن تیزی سے نتائج اخذ کر رہا تھا۔ پہریدارو کو خیمے سے ہٹانے کیلئے راجپوتوں نے بھی وہی ترکیب آزمائی تھی جو عبداللہ خاں نے سوچی تھی۔ شمال طرف آگ بھڑکانے والا انہی کا کوئی ساتھی ہوگا۔

ان لوگوں کی بے جا مداخلت نے عبداللہ کے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔ چاہتا تو وہ بھی تھا کہ راجہ اجیت سنگھ فرار ہو جائے' مگر اس کا مقصد اس فرار سے فائدہ اٹھانا تھا جو ظاہر ہے کہ موجو

دہ حال میں ناممکن ہو گیا تھا۔ اب راجہ اجیت سنگھ کے فرار کا ذمے دار راجپوتوں کے شب خون کو ٹھہرایا عبداللہ خاں کو یقین تھا کہ راجپوت اپنے تمام قیدیوں کو رہا کرا کے لے گئے ہوں گے۔ اگر صرف اجیت سنگھ کو رہا کرانا ہوتا تو شاید وہ اتنے بڑے پیمانے پر حملہ نہ کرتے۔ راجپوتوں نے جان پر کھیل کر لشکر گاہ میں گھسنے کی ہمت کی تھی۔ عبداللہ خاں کو وہ شور اور ہنگامہ بھی یاد تھا جو اسے اس وقت سنائی دیا ب وہ راجہ اجیت سنگھ کے خیمے میں تھا۔ اس ہنگامے کا مقصد صرف یہی ہو سکتا تھا کہ حملہ آور راجپوتوں اپنے دوسرے قیدیوں کو بھی رہا کر لیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو راجہ اجیت سنگھ کی رہائی کے بعد وہ خاموشی نکل جاتے۔

عبداللہ خاں کا ذہن کڑی سے کڑی ملاتا رہا۔ انہی خیالوں میں وہ اس پہاڑی درے میں داخل ہوا جس میں مشعل بردار داخل ہوئے تھے۔ وہ کافی طویل تھا' مگر اب اسے دور دور اندھیرے میں کوئی مشعل نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سوچا' ممکن ہے کہ درہ آگے جا کر کسی طرف مڑ گیا ہو جس کی وجہ سے مشعلوں کی روشنی نظر نہیں آ رہی۔ یہ سوچ کر وہ تیز رفتاری سے درے میں آگے بڑھتا رہا۔

ابھی اس نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس پر جال ا گیا تھا۔ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی پشت سے پھسل کر وہ فضا میں معلق ہو گیا تھا۔ گھوڑا اپنے زور میں کے تک دوڑتا چلا گیا۔ اسی وقت اسے ایسی چیخ پکار کی آوازیں سنائی دیں جیسے بہت سے افراد آپ میں گئے ہوں۔ اگلے چند لمحوں میں اس پر یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ یہ بھڑنے والے کون ہیں۔

عبداللہ خاں کو بہ یک وقت دو طرح کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ انہی نعروں نے اس پر بات واضح کر دی تھی کہ اس کے ساتھ آنے والے سپاہی اور راجپوت ایک دوسرے سے بھڑ گئے ہیں۔ فضا میں معلق اوپر کی طرف اٹھتا چلا جا رہا تھا اور اس کے ذہن میں خیالات کی آندھیاں سی چل رہی ہیں۔ معا اس کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ اسی کے ساتھ اس کا سر بہت زور سے کسی سخت چیز سے ٹکرایا اور وہ اٹھا۔ درے کی کسی جانب کا وہ کوئی ابھرا ہوا پتھر ہی تھا جس سے اس کا سر ٹکرا گیا تھا۔ ابھی وہ اس ابتلا سے گزرا ہی تھا جس سے اس کا سر ٹکرا گیا تھا۔ پتھر نے اس کا استقبال کیا۔ یہ دوسری ضرب اس کیلئے ناقابل برداشت ثابت ہوئی اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس کا آخری احساس یہ تھا کہ اس کے ملائم وخت پتھریلی زمین پر گھسیٹا جا رہا ہے۔

ہوش آنے پر عبداللہ خاں نے اردگرد کا جائزہ لینے کیلئے آنکھیں کھولیں۔ ہر طرف اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ کچھ دیر اس کا ذہن اس قابل ہی نہ ہو سکا کہ وہ سوچ سمجھ سکتا۔ رفتہ رفتہ اسے گزرے واقعات یاد آتے چلے گئے۔ اس یاد کے ساتھ ہی اس کا وجود لرز کے رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی قید میں تھا' راجپوتوں کی قید میں۔ اس کا تعلق اسی فوج سے تھا جس نے راجپوتوں کی بستیاں تہ و بالا دی تھیں' جس نے راجپوتوں کے ہزاروں گھر بے چراغ کر دیئے تھے' جس نے ہزاروں راجپوتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ عبداللہ خاں نے سوچا۔ اسی کے ساتھ اسے یہ خیال آیا کہ اب انہوں نے مجھے کیوں زندہ رکھا ہوا ہے؟ کیا وہ مجھے بے ہوشی ہی کے دوران میں سفر آخرت پر روانہ

نہیں کر سکتے تھے؟ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو کیوں؟ کہیں وہ مجھے پہچان تو نہیں گئے کہ میں کون ہ
کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مجھے یرغمال بنا کر شاہ عالم سے اپنی شرائط منوانا چاہتے ہوں؟ اس کے ذہن
یکے بعد دیگرے مختلف سوالات ابھرتے رہے پھر اس نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی تو احساس ہ
جسم رسیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا لگا۔

عبداللہ خاں اپنے خیالوں میں غرق تھا کہ دور اندھیرے میں شگاف سا پڑا۔ وہ روشنی کسی م
کی تھی جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اسی مشعل کے پیچھے پھر دو مشعلیں اور بھی نظر آنے لگیں۔ آ
والے یقیناً عبداللہ خاں کے دشمن ہی ہو سکتے تھے۔ عبداللہ خاں انہیں آتے دیکھ کر سوچنے لگا' کیا وہ
ہلاک کرنے آ رہے ہیں؟ کیا میرا آخری وقت آ پہنچا؟ یہ سوچ کر اسے پسینا آ گیا۔

آنے والے تین راجپوت سپاہی ہی تھے' مگر ان کے ساتھ آنے والی' دو اجلے چہروں او
جسموں کی جوان قیامتیں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک حسین چہرہ کو عبداللہ خاں نے فوراً پہچان لیا اور
زدہ ہو گیا۔ دوسری قیامت کے خدوخال بھی اسے آشنا آشنا سے لگے' مگر فوری طور پر یاد نہ آ سکا کہ
اس قیامت کو کہاں دیکھا ہے۔

ان دونوں کے سامنے سپاہی مؤدب نظر آ رہے تھے۔ ایک کے چہرے پر غم و غصے کے
تھے۔ یہ وہی تھی جسے عبداللہ خاں نہ پہچان سکا تھا۔ وہ دونوں ہی عبداللہ خاں کے قریب آ کر رک گ
عبداللہ خاں ان کے قدموں میں رسیوں سے جکڑا ہوا پڑا تھا۔ ان لوگوں کی آمد کے ساتھ ہی عبداللہ خا
معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے غار نما میں بندھا پڑا ہے۔

''ہاں رکمنی' اب تم اسے ٹھیک طرح پہچان کر بتاؤ کیا یہ وہی ہے......؟ کیا یہ وہی ہے جس
میری بہن...... میری معصوم بہن گیتا کے پوتر (پاک) دامن پر اپنی ہوس کی غلاظت انڈیل دی'
اور......اور اس نے...... میری گیتا نے اپنا جیون ختم کر کے اس داغ کو اپنے دامن سے دھو دیا تھا......
بتاؤ رکمنی' بتاؤ!'' ان میں سے ایک' دوسری سے مخاطب تھی۔ اس کے لہجے میں بے پناہ نفرت اور غ
آگ تھی۔ غصے کی زیادتی ہی کے سبب وہ رک رک کر بول رہی تھی۔

''ہاں راجکماری' یہ وہی پاپی ہے...... وہی!'' دوسری نے جواب دیا۔ اس دوران میں وہ
کر عبداللہ خاں کا چہرہ دیکھ چکی تھی۔

''تو پھر اس پاپی کو میں اتنی آسان موت نہیں مرنے دوں گی۔ میں اس سے اپنی گیتا کا
لوں گی۔ میں اسے سسکا سسکا کر' تڑپا تڑپا کر ماروں گی۔ میں اسے بتاؤں گی کہ ایک استری (عورت
عزت لوٹنے کا انجام کتنا بھیانک ہوتا ہے۔'' جسے راجکماری کہا گیا تھا' وہ بولے جا رہی تھی۔

عبداللہ خاں کا ذہن اس وقت خوف مرگ میں مبتلا ہونے کی بجائے کسی اور ہی خیال میں
ہوا تھا۔ وہ اس بھرپور عورت میں نہ جانے کس کا چہرہ تلاش کر رہا تھا۔ معاً اس کے ذہن میں جیسے رو
ہو گئی۔ اس نے بے اختیارانہ راجکماری کو مخاطب کیا۔ ''تم...... کیا تم راجہ جے سنگھ کی بیٹی راجکماری
ہو؟...... بولو کیا تم وہی ہو؟''

''تم یقیناً وہی ہو...... بالکل وہی۔ تمہاری آواز...... میں...... مجھے آج بھی یاد ہے۔ تم ان

رہنے والی ہوتا...... وہی انبیر جہاں...... جہاں مشہور راجپوت سردار اور ماہر شمشیر زن درگا داس جی ہوتے
تھے۔'' عبداللہ خاں نے پھر کہا۔

''انہیں تم کس طرح جانتے ہو؟'' اس نے عبداللہ کو کڑی نظروں سے دیکھا۔

''وہ...... وہ میرے استاد تھے۔ میں نے شمشیر زنی انہی سے سیکھی تھی اور...... اور وہیں انبیر ہی
میں...... میں نے تمہیں بھی دیکھا تھا۔ بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''ممکن ہے کہ تم کبھی انبیر گئے ہو اور تم نے وہاں پتا جی کے متر (دوست) درگا داس چاچا کا
نام بھی سن لیا ہو اور اب تم اپنی جاں بخشی کیلئے یہ نام استعمال کر رہے ہو' لیکن یاد رکھو اس طرح اپنی یقینی
موت سے نہیں بچ سکتے۔'' راجکماری کے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں مرنے سے نہیں ڈرتا راجکماری!'' عبداللہ خاں بے خوفی سے بولا۔ وہ اب بڑی حد تک
خود پر قابو پا چکا تھا۔ اس کا ذہن بیدار ہو چکا تھا۔ ''سنو! جو بھی پیدا ہوا ہے' اسے ایک نہ ایک دن ناپید
ہونا ہے' مرنا ہے اور جس کی موت کا جو وقت مقرر ہو چکا ہے' اسے کوئی نہیں ٹال سکتا اس لیے مجھے یہ دھمکی
نہ دو' میں جانتا ہوں' اگر میں نے تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا بھی دیا پھر بھی تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو
گی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم وہی رجکماری انیتا ہو جو گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی تھی یا میری
نظریں دھوکا کھا رہی ہیں؟''

''میں اور تمہارے ساتھ گھنٹوں بیٹھی رہا کرتی تھی!'' وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔ ''موت کے
خوف نے شاید تمہارے ذہن پر غلط اثر کیا ہے تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔''

''تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم وہی ہو۔'' عبداللہ خاں نے کہا۔

''اگر میں راجکماری انیتا ہوں بھی تو اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے اس طرح تم اپنی موت
سے تو نہیں بچ سکتے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں!'' عبداللہ خاں جواباً بولا۔ ''تو راجہ جے سنگھ جی نے تمہیں راجہ اجیت سنگھ
کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ اب میں تمام بات سمجھ گیا۔''

''کیا سمجھ گئے؟'' اس نے برہم لہجے میں سوال کیا۔

''اور اگر میں نہ بتاؤں تو؟''

''تو میں تمہاری کھال کھنچوا کر بھس بھروا دوں گی۔ تم شاید مجھ سے اچھی طرح واقف نہیں ہو۔
خود سوچو کہ جو عورت مغلوں کے لشکر پر شب خون مار کر اپنے قیدیوں کو رہا کرا سکتی ہے' وہ کیا نہیں کر سکتی۔''

''مجھے یقین ہے راجکماری! میں تمہاری ہمت و جرأت کی داد دیتا ہوں' لیکن تمہیں یہ بھی یاد
رکھنا چاہیے کہ تم بھی کسی کم حیثیت شخص سے ہم کلام نہیں۔''

میرا نام سید عبداللہ خاں ہے' قطب الملک سید عبداللہ خاں! وہ عبداللہ خاں جس نے اپنا آغاز
جوانی جنگ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں گزارا ہے' وہ جس نے خود راجپوتوں سے فن حرب سیکھا ہے' وہ جو
درگاہ داس کا شاگرد ہے' وہ عبداللہ خاں جو کبھی قلعہ انبیر کے میدان میں روزانہ صبح شمشیر زنی کی مشق کیا
کرتا تھا اور کوئی لڑکی گھنٹوں اسے مشق کرتے دیکھتی تھی' مگر وہ شمشیر زنی کرتا رہتا تھا۔ سنو راجکماری......

ایک بار پھر سنو کہ میرا نام قطب الملک سید عبداللہ خاں ہے اور میں بادشاہ وقت کا نائب وزیر سلطنت ہوں۔ اگر تم نے مجھے رہا نہ کیا تو مغل سپاہی ایک ایک راجپوت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیں گے اب تک لشکر گاہ میں یہ اطلاع پہنچ چکی ہوں گی۔'' بات ختم کرتے کرتے عبداللہ خاں کے لہجے میں سختی آ گئی۔

''کون عبداللہ خاں؟'' راجکماری بڑبڑائی پھر وہ عبداللہ خاں کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ عبداللہ خاں کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی' مگر اٹھنے سے پہلے اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ وہ سیدھی کھڑی ہوئی تو اس کے چہرے پر پھر سختی آ گئی۔ ''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو! تم جس کی زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے! تم جو میری معصوم بہن گیتا کے قاتل ہو! پھر وہ سپاہیوں کی طرف پلٹ کر مخاطب ہوئی۔

''اسے اٹھا لو! اسے یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری نظر میں اس کی کیا حیثیت ہے۔ ہمارے سامنے اپنے نائب وزیر سلطنت ہونے کی بڑ مار رہا ہے ہم اسے بتائیں گے کہ مغلوں کے پالتو کتوں سے ہم کیا سلوک کرتے ہیں!'' یہ کہہ کر راجکماری غار کے دہانے کی طرف بڑھ گئی۔

راجکمای کے حکم پر دو سپاہیوں نے عبداللہ خاں کو اٹھا لیا۔ عبداللہ خاں سمجھ رہا تھا کہ شاید راجکماری پر دھمکی کا کوئی اثر ہوگا' وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی کہ عبداللہ خاں کے ساتھ کوئی ناروا سلوک راجپوتوں کیلئے شدید خطرہ بن سکتا ہے' مگر دھمکی نے الٹا ہی اثر کیا تھا۔ راجکماری اشتعال میں آ گئی تھی عبداللہ خاں کو اپنی کج خیالی پر افسوس ہوا' لیکن اب کیا ہو سکتا تھا' وقت گزر چکا تھا۔

☆......☆......☆

سپاہیوں نے عبداللہ خان کو ایک بڑے اور روشن کشادہ غار کے فرش پر لے جا کر پھینک دیا۔ گرنے سے اس کے کولہوں پر ضرب آئی۔ وہ کراہ اٹھا۔ اس غار میں ایک طرف قالین بچھا ہوا تھا جس پر راجا اجیت سنگھ گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دوسرے افراد بیٹھے تھے۔

''تو رکمنی نے اسے پہچان لیا! کیا یہ وہی ہے؟'' راجا اجیت سنگھ نے راجکماری انیتا کو مخاطب کیا۔

''ہاں یہ وہی ہے۔'' راجکماری نے جواب دیا۔

جواب سن کر اچانک راجا اجیت سنگھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھتے ہی اس نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی۔

اسی وقت راجکماری انیتا سامنے آ گئی اور راجا اجیت سنگھ سے بولی۔ ''نہیں! یہ میرا مجرم ہے اور میں اسے اس طرح آرام سے نہیں مرنے دوں گی۔ یہ میری بہن کا قاتل ہے اس سے میں انتقام لوں گی۔''

راجا اجیت سنگھ غصے میں پھنکارا۔ ''میں اسے قتل کر دوں گا! اسے دیکھ کر میرا خون کھول رہا ہے۔''

راجکماری نے اسے سمجھا بجھا کر اپنی جگہ بیٹھنے پر مجبور کر دیا پھر بولی۔ ''اس کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے؟'' اس کے بعد خود ہی چبھتے ہوئے لہجے میں راجکماری نے بتایا۔ ''یہ مغل بادشاہ کا نائب وزیر سلطنت ہے سید عبداللہ خان! اس نے کچھ دیر پہلے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو مغل فوج ایک ایک راجپورت کو چن چن کر قتل کر دے گی۔'' یہ کہہ کر راجکماری وحشیانہ انداز میں ہنسی۔ یوں ہنسنے سے اس کے حسین چہرے کے خدوخال بگڑ گئے۔ پھر اس کا قہقہہ ایک دم رک گیا اور اس نے کہا۔ ''اسے شاید یہ غلط فہمی ہو گی کہ ہم اس کے عہدے سے مرعوب ہو جائیں گے۔ اس کی یہ غلط فہمی دور کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اسے بتانا پڑے گا کہ ہم مغلوں کے پالتو کتوں کو کیا سمجھتے ہیں!''

''یہ...... یہ سید عبداللہ خان ہے؟ کیا تمہیں یقین ہے؟'' راجا اجیت سنگھ بلند آواز میں بولا۔

''اس نے خود اقبال کیا ہے۔'' راجکماری نے بتایا۔

راجکماری انیتا کا جواب سن کر راجا اجیت سنگھ کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔ پھر وہ

کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے بعد ہی اس نے اپنی دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص سے سرگوشی کی۔ وہ شخص اپنے لباس سے کوئی راجپوت سردار دکھائی دیتا تھا۔ راجا کی سرگوشی کے جواب میں اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے بعد وہاں موجود تمام ہی افراد سرگوشیاں کرنے لگے۔ راجکماری انیتا' رکمنی اور تینوں سپاہی کچھ فاصلے پر تھے اس لئے وہ یہ سرگوشیاں نہیں سن سکتے تھے۔ عبداللہ خان بھی انہی کے قدموں پڑا تھا اس لئے وہ بھی ان سرگوشیوں سے لاعلم رہا۔ عبداللہ خان نے راجکماری انیتا کی طرف نظر اٹھائی۔ وہ الجھی الجھی سی نظروں سے راجا اجیت سنگھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت راجا نے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔ راجکماری قریب چلی گئی۔ راجا نے اس سے بھی سرگوشی کی۔

فوراً ہی راجکماری کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ پھر وہ تقریباً چیخ اٹھی۔ ''کیا یہ آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی بہن کے قاتل کی جان بخشی کر دوں! نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا......! کسی بھی قیمت پر نہیں! میں اپنی بہن کی عزت کا سودا نہیں کر سکتی!''

''تم سمجھتی کیوں نہیں! ہم اسے یرغمال بنا کر مغل بادشاہ سے اپنی شرائط منوا سکتے ہیں۔'' راجا اجیت سنگھ کی آواز بلند ہوئی۔ ''اس طرح یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ واقعی سید عبداللہ خان ہے یا اپنی جان بچانے کی خاطر ڈھونگ رچا رہا ہے!''

عبداللہ خان سمجھ گیا کہ کچھ دیر پہلے ان لوگوں کے درمیان کیا سرگوشیاں ہو رہی تھیں! موجودہ صورتحال اس کے حق میں تھی۔

''رکمنی نے اسے بے ہوشی کے دوران ہی پہچان لیا تھا کہ یہ سید عبداللہ خان ہے۔'' راجکماری کہنے لگی۔ اس کے لہجے میں خفگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔ ''کیا آپ بھول گئے رکمنی نے بتایا تھا کہ میر بخشی ذوالفقار خان نے بھی اسے عبداللہ خان کے نام ہی سے مخاطب کیا تھا! کیا میر بخشی کے خیمے میں جا کر شراب نوشی اور عیاشی کرنے والا کوئی معمولی آدمی ہو سکتا ہے! پھر رکمنی اس کے ہوش میں آنے کے بعد بھی دوبارہ اسے پہچان چکی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خود بھی اقرار کر چکا ہے۔ اس کے جسم پر موجود لباس بھی معمولی نہیں ہے کہ اسے کوئی عام سپاہی سمجھ لیا جائے اور تصدیق کی ضرورت ہو! پھر شک کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ یہ سید عبداللہ نہیں ہے!''

''اگر تمہارے بیان کے مطابق یہ واقعی عبداللہ خان ہے تو اس موقع سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مغل بادشاہ یقیناً اپنے نائب وزیر سلطنت کی جان بچانے اور اسے رہا کرانے کی خاطر ہماری شرائط تسلیم کر لے گا۔'' راجا اجیت سنگھ نے پھر اپنی بات دہرائی۔

''اور پھر...... پھر آپ اسے رہا کرا دیں گے......! یہی نا؟'' راجکماری کی تیوریوں پر بل گئے۔

''وہ...... وہ ایسا تو پھر...... پھر کرنا ہی پڑے گا۔ دراصل یہ صرف میری رائے نہیں بلکہ دوسرے راجپوت سردار جو یہاں موجود ہیں اس تجویز سے متفق ہیں...... میں...... میں صرف...... اس تجویز پر تمہاری رضامندی چاہتا تھا۔'' راجا اجیت سنگھ کی آواز میں نرمی تھی۔

''میری رضامندی......! ایک بہن کی یہ رضامندی کہ اپنی بہن کی عزت و ناموس پامال

دینے والے کو معاف کر دے...... زندہ بچ جانے دے...... ایک قاتل کو رہا ہو جانے دے......! تو پھر سن لیجئے کہ میں اس پر رضامند نہیں ہوں!'' یہ کہتے ہوئے راجکماری کی آواز بھرا گئی پھر وہ وہاں مزید رکے بغیر غار سے باہر نکل گئی۔

''سنو......! سنو تو!'' راجا اجیت سنگھ اسے پکارتا رہ گیا مگر وہ نہ رکی۔ رکمنی نے بھی راجکماری کی تقلید کی اور غار سے نکل گئی۔ عبداللہ خان نے سوچا کہ خواتین کے قیام کی خاطر ان لوگوں نے کوئی اور غار منتخب کیا ہو گا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ راجا اجیت سنگھ کی طرف دیکھنے لگا۔ راجا ایک راجپوت سردار سے مخاطب تھا۔ ''وہ ذرا جذباتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ہماری بات نہ مانے۔''

''اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ موقع دیکھ کر عبداللہ خان کو ہلاک کر دے۔ ہمیں یہ بھی سوچنا پڑے گا راجا جی!'' ایک راجپوت سردار نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''میں خود بھی سوچ رہا ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے!'' راجا اجیت سنگھ فکرمند لہجے میں بولا۔

کچھ دیر غار میں خاموشی رہی۔ عبداللہ خان اس دوران میں ان کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا' اس کی زندگی اور موت کا انحصار ان لوگوں کے فیصلے پر تھا۔ راجکماری کے رویے نے زندگی کی آس پھر توڑ دی تھی۔ سپاہی غار کے دہانے پر جا کر مودب کھڑے ہو گئے تھے۔

کافی دیر بعد راجا اجیت سنگھ بڑبڑایا۔ ''وہ ٹھیک کہتی ہے...... ٹھیک کہتی ہے! ہم...... خودغرض ہو رہے ہیں' ہمیں اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا کوئی حق نہیں!'' راجپوت سردار راجا کو بڑبڑاتے سن کر چونک اٹھے۔ پھر قریب ہی بیٹھا ہوا ایک سردار حیرت سے بولا۔ ''راجا جی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم کو خود بھی حیرت ہے کہ ہمارے ذہن میں یہ ناپاک خیال کیسے آیا! اس وقت ہماری غیرت کہاں جا سوئی تھی! ہم نہ جانے ایک ایسے شخص کو رہا کرنے کے بارے میں کس طرح سوچ رہے تھے جو...... جو ہماری عزت و آبرو کا قاتل ہے...... نہیں......! ایسا نہیں ہو گا۔'' یہ کہہ کر راجا اجیت سنگھ بلند آواز میں ایک سپاہی سے مخاطب ہوا۔ ''راجکماری جی سے کہو کہ ہم انہیں یاد کر رہے ہیں۔''

راجا کا حکم سن کر سپاہی چلا گیا۔ عبداللہ خان کا دل جیسے ڈوبنے لگا اور جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس دوران میں راجا اجیت سنگھ کی گفتگو سے زندگی کی جو امید بندھی تھی وہ امید بھی دم توڑ گئی۔ اب گویا راجکماری انیتا کی طرح راجا اجیت سنگھ بھی عبداللہ خان کی زندگی کا چراغ گل کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ راجا کے چہرے سے اندرونی خلفشار اور شدت جذبات کی غمازی ہو رہی تھی۔ اس کے ارد گرد بیٹھے ہوئے راجپوت سرداروں کے چہروں پر الجھن تھی۔ راجا کے اچانک فیصلے نے انہیں حیرت اور الجھن میں ڈال دیا تھا۔

عبداللہ خان کا ذہن تیزی سے اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچنے میں مصروف تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں آخر اس دن کے لئے تو پیدا نہیں ہوا تھا کہ یوں بے بسی کی موت مارا جاؤں۔

''راجا اجیت سنگھ! تم نے میری قسمت کا فیصلہ کرنے سے پہلے کم از کم مجھ سے تو گفتگو کر لی ہوتی۔'' عبداللہ خان نے معاً راجا اجیت سنگھ کو مخاطب کیا۔

راجا چونک اٹھا۔ وہ جیسے اس شخص کے وجود کو فراموش ہی کر بیٹھا تھا جس کے سبب اس کی راجکماری اور ساتھی راجپوت سردار سبھی الجھن میں پڑے ہوئے تھے۔ خود راجا کی الجھن اور پریشانی کا سبب بھی وہی شخص تھا۔ اس نے عبداللہ خان کو گھور کر دیکھا اور بولا۔ ’’اس مسئلے سے تمہارا کیا تعلق؟ یہ ہمارا اور راجکماری کا معاملہ ہے۔‘‘

’’لیکن تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ تمہارے اور راجکماری کے اس مسئلے سے میری زندگی اور موت وابستہ ہے۔ کیا تم مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتے! کیا تم یہ نہیں جاننا چاہتے کہ تمہارا اصل دشمن کون ہے؟‘‘ عبداللہ خان نے پُراعتماد لہجے میں راجا سے کہا۔

’’ہمارا اصل دشمن......؟ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟‘‘ راجا الجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ’’ہم جانتے ہیں مغل ہمارے دشمن ہیں اور اس سے زیادہ ہم کچھ اور نہیں جاننا چاہتے۔ تم ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے۔‘‘

’’میں تمہیں دھوکا دینا نہیں چاہتا۔ یقین کرو کہ میں ایک اہم بات تمہیں بتانا چاہتا ہوں اگر تم سننا پسند کرو! ویسے تمہیں اختیار ہے۔‘‘

’’کہو! ہم سن رہے ہیں۔‘‘ راجا اجیت سنگھ بیزاری سے بولا۔ ’’مگر یہ بات یاد رکھنا کہ تم ہمیں فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکو گے۔‘‘

’’میں یہ نہیں کہتا کہ تم میری جان بخشی کرو۔ مجھ صرف یہ بتانا ہے کہ راجپوتانہ پر فوج کشی کا مشورہ بادشاہ کو کس نے دیا تھا اور راجپوتوں کا اصل دشمن کون ہے! لیکن بتانے سے پہلے میں اپنے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں، میں بذاتِ خود راجپوتوں کا دشمن نہیں بلکہ میں تو ان کی بہادری اور جرات مندی کا قائل ہوں۔ میں نے خود جو کچھ سیکھا ہے وہ راجپوت سرداروں ہی سے سیکھا ہے۔ انھی راجپوت سرداروں میں سے ایک محترم شخصیت درگا داس جی کی تھی جن سے میں نے ایک عرصے تک شمشیر زنی سیکھی ہے۔ درگا داس جی میرے استاد ہیں اور......‘‘

’’درگا داس جی؟ تم......تم سے ان کا کیا واسطہ؟ راجا اجیت سنگھ چونک اٹھا۔ راجکماری نے اب تک اسے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ یوں بھی راجکماری کو عبداللہ خان کی اس بات پر یقین نہیں آیا تھا کہ درگا داس سے اس کا کوئی تعلق رہا ہوگا۔ راجکماری نے خیال ظاہر کیا تھا کہ عبداللہ خان اپنی جان بچانے کے لئے درگا داس کا نام استعمال کر رہا ہے۔ درگا داس راجکماری کے والد کا دوست بھی تھا۔‘‘

راجا اجیت سنگھ کے اس سوال کے جواب میں کہ درگا داس سے عبداللہ خان کا کیا واسطہ؟ عبداللہ خان نے پھر اپنی بات دہرائی۔

’’تمہارا کہنا ہے کہ تم نے درگا داس جی سے تلوار چلانا سیکھا ہے لیکن درگا داس جی نے تمہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تو؟‘‘ راجا کا لہجہ سخت تھا۔

’’تو پھر جو تمہارے جی میں آئے کرنا۔ میں تو صرف اتنا بتانا چاہتا تھا کہ مجھے قتل کر کے تم لوگ راجپوتوں کے ایک ہمدرد سے محروم ہو جاؤ گے اور ظاہر ہے راجپوتوں کے حق میں یہ اچھا نہیں ہوگا۔‘‘ عبداللہ خان نے معاملہ کچھ بنتے دیکھ کر راجا کو مزید شیشے میں اتارنا چاہا۔ راجا اجیت سنگھ کوئی بوڑھا گھاگ

راجپوت نہیں تھا بلکہ عبداللہ خان سے عمر میں چار یا پانچ سال ہی بڑا تھا۔ بہادر تو وہ تھا مگر زیادہ ذہین نہیں تھا۔

راجا چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ’’تم کسی شخص کے بارے میں بتانے والے تھے جس کے ایما پر مغل بادشاہ نے راجپوتانہ پر لشکر کشی کی ہے!‘‘

’’اس کا نام میر بخشی ذوالفقار علی خان ہے۔ اسی نے بادشاہ کو لشکر کشی پر اکسایا تھا۔ اگر تم یقین کر سکو تو میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں کہ اگر آج شب راجکماری اور تمہارے بہادر ساتھی تمہیں رہا نہ کرا لیتے تو پھر بھی تم مغلوں کی قید میں نہ ہوتے۔‘‘ عبداللہ خان نے بتایا۔

’’کیا مطلب......! میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔‘‘ راجا اجیت سنگھ نے حیرت کا اظہار کیا۔

’’مطلب یہ کہ میں تمہارے فرار کے سارے انتظامات کر چکا تھا لیکن جب میں تمہیں رہا کرانے کی خاطر اس خیمے میں پہنچا جہاں تمہیں قید کیا گیا تو مجھ سے پہلے ہی تمہارے ساتھی تمہیں رہا کرا کے جا چکے تھے۔‘‘ موقع غنیمت جان کر عبداللہ خان نے ایک اور چال چلی۔

’’اس بات کا ثبوت؟‘‘ راجا اجیت سنگھ نے عبداللہ خان کی طرف گھور کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کے آثار تھے۔

’’ثبوت تمہیں راجکماری اور تمہارے وہ ساتھی دیں گے جنھوں نے تمہیں رہا کرایا تھا۔‘‘ عبداللہ خان نے پُرسکون لہجے میں بتایا۔ ’’اور شاید تم نے بھی وہ بات محسوس کی ہو۔‘‘

’’ہم تمہاری زبان سے سننا چاہتے ہیں۔‘‘ راجا کے لہجے میں اب پہلے کی نسبت قدرے نرمی آ گئی تھی۔

’’تو ذرا خود یاد کرو کہ جب تمہیں تمہارے ساتھی قید سے رہا کرانے کے لئے وہاں پہنچے تو کیا خیمے کے باہر پہرے دار موجود تھے؟ کیا تمہارے ساتھیوں کو تمہاری رہائی کے لئے کوئی مزاحمت کرنا پڑی تھی؟‘‘ عبداللہ خان نے مضبوط دلیل پیش کی۔

عبداللہ خان کی بات پر راجا اجیت سنگھ چونک اٹھا۔ اس نے تصدیق کی۔ ’’ہاں اس وقت خیمے کے باہر ایک پہرے دار بھی موجود نہیں تھا۔‘‘

’’کیا تمہاری نظر میں یہ ممکن ہے کہ ایک ایسے اسیر جنگ کے خیمے پر کوئی پہرا نہ ہو جو ایک ریاست کا راجا اور اہم قیدی ہو؟‘‘

’’پہریداروں کی موجودگی میں نے محسوس تو کی مگر جب مجھے رہا کرایا گیا تو وہاں کوئی پہریدار نہیں تھا۔‘‘ راجا اجیت سنگھ نے وضاحت کی۔

’’تو مجھ سے سنو کہ اس وقت وہاں کوئی پہریدار کیوں نہیں تھا!‘‘ یہ کہہ کر عبداللہ خان نے راجا کو وہ تمام داستان سنا دی جو اس پر گزری تھی۔ راجا کو فرار کرانے کے لئے جو منصوبہ عبداللہ خان نے بنایا تھا وہ بھی بیان کر دیا۔ اس سلسلے میں عبداللہ خان نے دانستہ خان خاناں کے ذکر سے گریز کیا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ راجا کے فرار سے وہ کیا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ’’شاید تمہارے سپاہیوں نے بھی آگ کے وہ شعلے دیکھے ہوں جو میرے ہی ایک آدمی کے آگ لگانے سے لشکر

گاہ کی مشرقی سمت میں بلند ہوئے تھے۔"

"ہاں میرے ساتھی خود حیران تھے کہ وہ آگ کس نے لگائی تھی جب کہ ان میں سے کوئی بھی مشرقی سمت نہیں گیا تھا۔" راجہ اجیت سنگھ نے اعتراف کیا۔

"دراصل ہوا یہ تھا کہ میں نے اور تمہارے ساتھیوں نے پہریداروں کو دوسرے قیدیوں اور تمہارے خیمے سے ہٹانے کے لئے ایک ہی طریقہ استعمال کیا تھا۔"

"عبداللہ خان......! اگر تم واقعی عبداللہ خان ہو تو تم نے ثابت کر دکھایا ہے کہ تمہارا بیان درست ہے اور تم واقعی ہمیں رہا کرانا چاہتے تھے۔ تم ہمارے اور راجپوتوں کے خیر خواہ ہو جب کہ اس سے پہلے ہماری اور تمہاری ملاقات بھی کبھی نہیں ہوئی۔" راجا اجیت سنگھ کا لہجہ اب دوستانہ ہو چکا تھا۔

لوہا گرم دیکھ کر عبداللہ خان نے راجا کو اس وقت کی یاد بھی دلا دی جب اسے مغل بادشاہ شاہ عالم کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ خان خاناں کی تقلید میں عبداللہ خان نے راجا کو قتل نہ کئے جانے کے حق میں رائے دی تھی۔

"اس وقت ہمارے ہوش وحواس قابو میں نہیں تھے اور نہ ہم نے نظر اٹھا کر کسی طرف دیکھا تھا مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ خان خاناں ہی کی طرح کسی اور اہل دربار نے بھی ہمارے قتل کی مخالفت کی تھی۔ ممکن ہے وہ تمہی ہو۔" راجا بولا۔ "بادشاہ نے شاید اس کی رائے بھی معلوم کی تھی۔"

"ہاں وہ میں ہی تھا" عبداللہ خان فوراً بول اٹھا۔

"لیکن...... لیکن تم نے ہمارے لئے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ ہم تو تمہارے لئے قطعی اجنبی تھے۔ تم سے تو ہماری کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی!"

عبداللہ خان کو راجا کے اس سوال کی توقع تھی۔ اس نے اسی لئے بلا تامل جواب دیا۔ "میں پہلے ہی اس بات سے آگاہ تھا کہ تمہاری پشت پر درگا داس جی ہیں۔ وہ درگا داس جی جن کی میں عزت کرتا ہوں۔ وہ جو میرے استاد ہیں۔ وہ جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مجھے اسی لئے تم سے ہمدردی تھی اور اسی وجہ سے میں نے تمہارے فرار کا منصوبہ بنایا تھا ورنہ ظاہر ہے میں ایسا کیوں کرتا!"

وہاں موجود دوسرے راجپوت سرداروں کے چہروں سے اب یہ اظہار ہو رہا تھا کہ ان کے دل میں عبداللہ خان کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ عبداللہ خان اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اگر وہ راجا کو اپنے حق میں ہموار کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کی زندگی بچ سکتی تھی لیکن راجا اجیت سنگھ کی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ راجا عجیب مزاج کا آدمی تھا بالکل گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تھا۔

عبداللہ خان کی پوری بات سن کر راجا بولا۔ "تمہارا بیان درست ہے اور ہم تمہاری طرف سے مطمئن بھی ہیں۔ تم واقعی ہمارے اور ہمارے راجپوت ساتھیوں کے خیر خواہ ہو جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں لیکن اگر تمہارا معاملہ ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم تمہیں ضرور معاف کر دیتے۔"

"میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔" عبداللہ خان نے چونک کر کہا۔ "ظاہر ہے کہ راجا تم ہو اور اختیارات بھی تمہارے ہی پاس ہیں!"

"نہیں......! تمہارے معاملے میں ہم با اختیار نہیں رہے۔" راجا بولا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ تم راجکماری کے مجرم ہو۔ تم نے اس کی بہن کی آبرو خاک میں ملائی ہے۔ اس کی خودکشی کے ذمے دار بھی ہو اس لئے تمہیں سزا دینے یا معاف کر دینے کا اختیار ہمیں نہیں راجکماری انیتا کو ہے۔"

راجا اجیت سنگھ کے جذبات سے عاری لہجے کو عبداللہ خان نے محسوس کر لیا اور فوراً اپنی صفائی میں کہا۔ "میں یہی تو کہنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں بھی میرا کوئی قصور نہیں۔ میں بے قصور ہوں اور اصل مجرم میر بخشی ذوالفقار خان ہے۔"

"یہ بات تم کس طرح کہہ سکتے ہو اور کیسے ثابت کر سکتے ہو جب کہ اس واقعے کا ایک عینی گواہ بھی موجود ہے!" راجا اجیت سنگھ بولا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اس بات ہی سے لاعلم تھا کہ مرنے والی راجکماری کی بہن تھی۔ دوسرے یہ کہ سب کچھ ذوالفقار خان کے خیمے میں ہوا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان دونوں میں نے نہیں بلکہ ذوالفقار خان نے قیدیوں کے خیمے سے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے بلوایا تھا۔ دراصل ذوالفقار خان مجھے ایک مسئلے میں اپنا ہم خیال بنانا چاہتا تھا۔ اس نے اسی لئے مجھے شباب وشراب کی پیشکش کی جسے میں نے وقتی طور پر مصلحتاً قبول کر لیا۔ اگر میں وہاں نہ جاتا تو بھی ذوالفقار خان ان دونوں کی عزت و آبرو لوٹ لیتا اس لئے مجرم میں نہیں ذوالفقار خان ہے۔" عبداللہ خان نے پر زور لہجے میں کہا۔

"تمہارا استدلال بہت دلچسپ ہے لیکن جو کچھ ہوا وہ تو تم ہی نے کیا۔ اس بات کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے!"

عبداللہ خان قطعی نہ سمجھ سکا کہ راجا اجیت سنگھ اس کے ساتھ کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ راجکماری انیتا ایک سپاہی کے ہمراہ غار میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک وہ روتی رہی ہے۔ وہ آتے ہی راجا سے بھرائی ہوئی آواز میں مخاطب ہوئی۔ "آپ نے مجھے یاد کیا!"

"ہاں انیتا! ہم تمہارے مجرم کو تمہارے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں اختیار ہے کہ تم اس کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔ تمہارے یہاں سے جانے کے بعد ہی ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ویسے اس شخص نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ ہمارا دشمن نہیں دوست ہے۔" راجا اجیت سنگھ نے راجکماری کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے راجکماری کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ سب کچھ اسے بتا دیا جو عبداللہ خان سے معلوم ہوا تھا۔

"تو یہ عبداللہ خان ہی ہے!" راجکماری کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ چیخ اٹھی۔ "راجا جی! یہ عبداللہ خان ہو یا کوئی اور، یہ راجپوتوں کا دوست ہو یا دشمن مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں! میں صرف یہ جانتی ہوں کہ یہ میری بے گناہ بہن کا قاتل ہے۔"

"تمہیں اس سے اپنی بہن کا انتقام لینے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ تمہیں اس کا پورا حق حاصل ہے۔" راجا اجیت سنگھ نے پر سکون آواز میں کہا۔

"ہاں ضرور! میں اس سے انتقام لوں گی۔ اسے میرے ساتھ بھیج دیا جائے۔" یہ کہہ کر راجکماری انیتا اٹھ کھڑی ہوئی۔

راجا کے اشارے پر سپاہیوں نے عبداللہ خان کی طرف قدم اٹھائے پھر ان میں سے ایک نے عبداللہ خان کو زمین سے اٹھا کر اپنی پشت پر لاد لیا اور راجکماری کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس غار سے نکل کر عبداللہ خان کو معلوم ہوا کہ راجپوتوں نے پہاڑوں کے درمیان ایک دنیا آباد کر رکھی تھی۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ ایک چٹان کے قریب سے گزرتے ہوئے عبداللہ خان کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ اس چٹان پر بھی ایک جلتی ہوئی مشعل رکھی تھی۔ لمحے بھر کو اس کی تپش عبداللہ خان نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں پر محسوس کی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ کسی جلتی ہوئی مشعل پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دوں تو ہاتھوں بندھی ہوئی رسیاں جل سکتی ہیں۔ کچھ فاصلے پر اسے ایک اور مشعل نظر آ رہی تھی۔

عبداللہ خان چوکنا ہو گیا۔ قدم بہ قدم مشعل قریب آتی جا رہی تھی۔ آخر کار سپاہی اسے اپنی پشت پر لادے مشعل کے قریب پہنچ ہی گیا۔ عبداللہ خان نے پشت پر بندھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ مشعل کی لو پر رکھ دیئے۔ اس کے منہ سے کراہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے تکلیف کی شدت سے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا تھا۔ وہ صرف ایک لمحہ تھا۔ سپاہی کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ وہ عبداللہ خان کو پشت پر لادے آگے بڑھ گیا۔ عبداللہ خان کو یقین تھا کہ رسیاں کچھ نہ کچھ جلی ضرور ہوں گی لیکن پوری طرح نہیں۔ دوسرا موقع اسے غار میں داخل ہوتے وقت مل گیا۔ عبداللہ خان نے پھر اپنا عمل دہرایا۔ اس مرتبہ وہ شعوری طور پر اپنے ہاتھوں کو شعلوں پر رکھنے کے لئے آمادہ تھا۔ اسی سبب اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اس کے منہ سے خفیف سی آواز بھی نہیں نکلی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں شدید جلن تھی۔

سپاہی نے جب اسے غار میں بچھے ہوئے قالین پر اپنی پشت سے اتارا تو اس کے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر رسیوں کی گرفت کچھ کم محسوس کی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے ہاتھ اسی طرح رکھے۔ سپاہی راجکماری کا اشارہ پا کر غار سے نکل گیا۔ اب اس غار میں صرف عبداللہ خان اور راجکماری ہی تھے۔ راجکماری قریب آ کر عبداللہ خان کا جائزہ لینے لگی۔ پھر وہ قالین پر عبداللہ خان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ وہ عبداللہ خان کے چہرے کو عجیب سے انداز میں تکے جا رہی تھی۔ عبداللہ خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ راجکماری کی نظریں جھک گئیں۔

"میں تمہیں اس تنہا غار میں صرف اس لئے لائی ہوں کہ پوچھ سکوں، واقعی تم وہی ہو جو خود کو ظاہر کر رہے ہو یا پھر اپنی زندگی بچانے کے لئے یہ سوانگ رچا رہے ہو؟" راجکماری کی آواز دھیمی تھی اور نظریں اب تک جھکی ہوئی تھیں۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں راجکماری کہ میں وہی ہوں، وہی عبداللہ خان جو انبیر میں درگا داس کے ساتھ شمشیر زنی کی مشق کیا کرتا تھا۔" عبداللہ خان نے جواب دیا اور اس کا ذہن برسوں پہلے کے ماحول میں کھو گیا۔ وہ کسی ایسے واقعے کو یاد کر رہا تھا جو راجکماری کو یقین دلا سکے کہ وہی اس کی پہلی محبت تھا، راجکماری نے اسی کو پہلی بار چاہا تھا۔ آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اسے ایک ایسا واقعہ یاد آ گیا تھا۔

عین اسی وقت راجکماری بول اٹھی۔ "لیکن مجھے تمہاری بات پر کیسے یقین آئے؟ اگر تم وہی ہو تو تمہارا چہرہ بہت بدل چکا ہے۔" راجکماری انیتا الجھے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگی۔ "مجھے یاد...... کچھ یاد کیوں نہیں آ رہا تمہیں دیکھ کر؟"

"یاد آ جائے گا راجکماری......! اور نہیں تو میں تمہیں بہت کچھ یاد دلا دوں گا۔" عبداللہ خان جلدی سے بولا۔ "ہاں یاد کرو راجکماری کہ ایک بار تم نے اپنے پتا جی راجا جے سنگھ جی کے ہمراہ قلعہ انبیر سے نکل رہی تھیں اور میں قلعے کے میدان میں مشق کر رہا تھا۔ تم نے ہمارے قریب آتے ہوئے اپنے پتا جی سے کہا تھا کہ تم شمشیر زنی سیکھنا چاہتی ہو۔ تمہارے پتا جی نے تمہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ یہ کام عورتوں کا نہیں مردوں کا ہے۔ تمہیں یاد ہے نا؟ تم اس وقت اپنے پتا جی کے ساتھ چہل قدمی کرنے نکلی تھیں۔"

یہ سنتے ہی راجکماری تقریباً اچھل پڑی اور پھر بے اختیار بولی۔ "مگر تم یہ بات کس طرح جانتے ہو؟" پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ "شاید...... شاید یہ وہی شخص ہے جس نے میرے دل میں شمشیر زنی سیکھنے کا شوق پیدا کیا اور پھر...... پھر میں پتا جی سے چوری چھپے شاہی شمشیر زن گوپال سنگھ سے شمشیر زنی سیکھتی رہی۔ اس کے بعد جب میری شادی راجا جی سے ہو گئی تو میں آزادی سے اپنا شوق پورا کرتی رہی مگر...... مگر تم...... کیا تم وہی ہو؟ اگر یہ سچ ہے تو مجھے تمہاری موت کا دکھ ہو گا۔"

"تو تم یہ جاننے کے باوجود مجھے موت کے گھاٹ اتار دو گی۔ کہ میں وہی ہوں وہی عبداللہ خان جسے تم نے پہلی بار چاہا تھا!"

"چپ رہو! میں...... میں شاید پاگل ہو جاؤں گی پاگل......! تقدیر نے میرے ساتھ بڑا بھیانک مذاق کیا ہے مگر میں...... میں گیتا کا انتقام ضرور لوں گی...... تمہیں میرے انتقام سے کوئی نہیں بچا سکے گا...... کوئی نہیں!" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر بولی۔ "میں نے سوچا تھا کہ تمہیں تڑپا تڑپا کر ماروں گی۔ تمہیں ایسی موت ماروں گی کہ تم موت سے پہلے خود موت کو آواز دو گے لیکن...... لیکن اب...... اب میں شاید ایسا نہ کر سکوں...... اگر...... اگر تم مزید زندہ رہے تو شاید...... شاید میں تم سے اپنی بہن کا انتقام نہ لے سکوں۔" پھر اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے۔ اس نے اچانک اپنے پہلو سے لٹکی ہوئی تلوار کھینچ لی۔

عجیب لڑکی تھی وہ بھی! ایک طرف تو ڈھکے چھپے الفاظ میں وہ عبداللہ خان سے اپنی محبت کا اقرار کر چکی تھی دوسری طرف اسی عبداللہ خان کو اپنی بہن کا انتقام لینے کے لئے قتل کر دینا چاہتی تھی۔ عبداللہ خان راجکماری کے اس رویے پر حیران تھا۔ اس نے دل ہی دل میں یہ اعتراف کر لیا تھا کہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے اور جو لوگ عورت کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

راجکماری ابھی عبداللہ خان کو قتل کرنے کے لئے اپنے ہاتھ میں تلوار تول ہی رہی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر وہ چونک اٹھی۔ آنے والا راجا اجیت سنگھ تھا۔ راجا کے ساتھ وہی سپاہی تھا جو عبداللہ خان کو اپنی پشت پر لاد کر یہاں چھوڑ گیا تھا۔ راجا اجیت سنگھ کی آمد نے وقتی طور پر عبداللہ خان کو مرنے سے بچا لیا تھا۔ عبداللہ خان اب تک حیرت انگیز طور پر زندہ تھا۔ راجا اجیت سنگھ نہ آ جاتا تو راجکماری اب

تک اس کا کام تمام کر چکی ہوتی۔

عبداللہ خان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کے علاوہ اس کا سارا جسم بھی رسیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے بازو بھی بندھے ہوئے تھے۔ اگر وہ اپنے جسم کی پوری قوت و طاقت صرف کر کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی ادھ جلی رسیاں توڑنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو فوری طور پر اپنے جسم کو رسیوں کے مضبوط جال سے آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ عبداللہ خان کو اپنی حالت کا پوری طرح اندازہ تھا۔

راجکماری کو خلاف توقع اس عالم میں دیکھ کر راجا اجیت سنگھ کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ وہ راجکماری کے قریب آ کر بولا۔ ''میں تمہیں اس شخص کو قتل کرنے سے نہیں روکوں گا مگر اس سے پہلے میں تم سے تخلیئے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسی لئے تمہیں وہاں بلوانے کے بجائے خود یہاں چلا آیا۔''

راجکماری نے اپنے شوہر کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ وہ شاید راجا کے گھڑی گھڑی بدلتے مزاج سے اچھی طرح آگاہ تھی۔

''کیوں کیا پھر آپ کا ارادہ بدل گیا؟'' راجکماری نے راجا کو مخاطب کیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ تم شاید کچھ غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تو تمہیں سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ عبداللہ خان کو قتل ہونے سے نہیں روکوں گا۔''

راجکماری نے تلوار نیام میں رکھ لی اور بولی۔ ''چلئے! پہلے آپ ہی سے بات کر لوں پھر اسے دیکھوں گی۔''

راجا اجیت سنگھ اور راجکماری انیتا دونوں ہی غار سے نکل گئے۔ اس دوران میں سپاہی جا چکا تھا۔ وہ راجا کو اس غار تک پہنچانے ہی کے لئے ساتھ آیا تھا۔ عبداللہ خان کو اندازہ تھا کہ وہ دونوں کسی اور غار میں گفتگو کریں گے۔ راجا اسے ہونے والی گفتگو سے لاعلم رکھنا چاہتا تھا۔ ہر چند کہ راجا نے کہا بھی تھا کہ وہ راجکماری کو عبداللہ خان کے قتل سے نہیں روکے گا مگر عبداللہ خان کو یقین تھا کہ راجا اسی غرض سے آیا تھا۔

ان دونوں کے باہر نکلتے ہی عبداللہ خان کو اپنی زندگی بچانے کا موقع مل گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو مخالف سمت میں جھٹکا دیا مگر ادھ جلی رسی نہ ٹوٹی وہ مزید طاقت صرف کرنے لگا۔ آخر کار اس کی کوشش کامیاب ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر رسیاں پہلے ہی جل کر کچھ کمزور نہ ہو جاتیں تو وہ انہیں توڑنے میں ناکام رہتا ہاتھوں کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کرانے کے بعد اس نے بمشکل انہیں پیچھے سے آگے کی جانب لانے کے لئے زور لگایا۔ اس کے بازوؤں پر موجود رسیاں جیسے اس کے گوشت میں اترنے لگیں مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ زور لگاتا رہا' جدوجہد کرتا رہا اور پھر اپنے دونوں بازو اور ہاتھ رسیوں کی گرفت سے آزاد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ راجا اور راجکماری کی گفتگو طول پکڑ جائے اور وہ دونوں اس وقت تک وہاں نہ آئیں جب تک وہ مکمل طور پر رسیوں کے جال سے آزاد نہ ہو جائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ جب وہ اپنے پیروں سے رسیاں نکال رہا تھا تو غار کے باہر قدموں کی چاپ گونجی یہ ایک خطرناک لمحہ تھا۔ اس نے فوراً اپنے جسم پر رسیاں پیٹ لیں اور اسی طرح گٹھڑی بن کر زمین پر پڑ گیا جیسے پہلے وہاں پڑا ہوا تھا۔

آنے والی صرف راجکماری تھی اور اس کا چہرا اترا ہوا تھا۔ وہ آتے ہی بولی۔ راجا جی کی خواہش ہے کہ صرف ایک شب تمہیں اور زندہ رہنے دیا جائے' صرف کل تک جب درگا داس جی بھی یہاں پہنچ جائیں گے تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا لیکن میں جانتی ہوں کہ میرا دل بہلانے کے لئے فی الحال ایسا کہا گیا ہے۔ راجا جی چاہتے ہیں کہ تمہارا مقدمہ درگا داس جی کے سامنے بھی پیش کیا جائے۔ پھر ان کے اشارے پر کوئی قدم اٹھایا جائے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے مجھے یہ بھی یقین دلایا ہے کہ ہو گا وہی جو میں چاہوں گی۔ شاید ایسا ہی ہو جو انہوں نے کہا ہے لیکن تم...... تم یاد رکھو عبداللہ خان کہ درگا داس جی نے بھی اگر تمہاری جان بخشی کا مشورہ دیا تو...... تو بھی تم میرے ہاتھوں قتل ہونے سے نہ بچ سکو گے!''

''عبداللہ خان تو تمہارے ہاتھوں بہت دن پہلے ہی قتل ہو چکا ہے۔'' عبداللہ خان کا لہجہ ٹھیٹ عاشقوں کا سا تھا۔

''تم اپنے بارے میں شاید کچھ زیادہ ہی غلط فہمی میں مبتلا معلوم ہوتے ہو! تمہاری ساری خوش مزاجی میں چند لمحوں میں ختم کر سکتی ہوں۔ اس وقت بھی اگر میں راجا جی کے سامنے بضد ہو جاتی تو انہیں میری بات ماننا ہی پڑتی مگر نہ جانے کیوں میں تمہیں ایک دن کی خیرات دینے پر آمادہ ہو گئی' ایک دن زندہ رہنے کی بھیک میں نے تمہیں دے دی!'' راجکماری نے سخت لہجے میں کہا۔

''اگر تم نہیں جانتیں راجکماری کہ مجھے زندگی کی بھیک دینے پر کیوں آمادہ ہو گئیں تو اس کی وجہ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ اس کی صرف اور صرف ایک وجہ ہے کہ تم مجھے چاہتی ہو! میں تمہاری پہلی محبت ہوں اور عورت زندگی بھر اپنی پہلی محبت کو فراموش نہیں کر پاتی۔ تمہارے وجود میں اس وقت محبت اور انتقام کی جنگ جاری ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جیت محبت کی ہو گی یا انتقام کی!'' عبداللہ خان رکے بغیر کہتا چلا گیا۔

عبداللہ خان نے راجکماری کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ راجکماری کا چہرہ پہلے متغیر ہوا پھر اس پر غصے کے اثرات ابھر آئے اور وہ چیخ اٹھی۔ ''اپنی بکواس بند کرو عبداللہ خان! یہ نہ بھولو کہ تم ہمارے قیدی ہو!''

''قیدی اور آزادی کے درمیان عبداللہ خان کے لئے بہت کم فاصلہ ہوتا ہے راجکماری! کیا یہ الفاظ تم اس لئے کہہ رہی ہو کہ میرا جسم اس وقت رسیوں میں جکڑا ہوا تمہارے قدموں میں پڑا ہے! تو سنو کہ عبداللہ خان کے لئے اس کی کوئی حیثیت نہیں! عبداللہ خان کی بات پر یقین نہیں تو یہ دیکھو!'' یہ کہتے ہی عبداللہ خان ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

راجکماری ایک دم اچھل پڑی۔ یہ منظر یقیناً اس کے لئے خلاف توقع اور حیرت انگیز تھا۔ اس کا ہاتھ فوراً تلوار کے قبضے پر پہنچ گیا۔ خطرے کی بو اس نے پوری طرح محسوس کر لی تھی مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ عبداللہ خان اس کے نرم و نازک ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

''جان! یہ ہاتھ تلوار اٹھانے کے لئے نہیں بلکہ کسی کے گلے کا ہار بننے کے لئے ہیں۔'' عبداللہ خان نے اسے قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

''چھوڑ دو مجھے......! چھوڑ دو!'' راجکماری ہذیانی انداز میں چیخی۔ اسی کے ساتھ وہ عبداللہ خان

کی گرفت سے نکلنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

''راجکماری! عبداللہ خان ایک بار جس کا ہاتھ تھام لے زندگی بھر نہیں چھوڑتا۔'' عبداللہ خا نے یہ کہتے ہی راجکماری کے سرخ لبوں سے خراج محبت وصول کر لیا۔

''گستاخ!'' راجکماری بپھر گئی۔ اس کا جسم غصے سے کانپنے لگا مگر وہ پوری طرح عبداللہ خان کی گرفت میں تھی۔

''اب تمہیں اپنی بقیہ زندگی اسی گستاخ کی آغوش میں گزارنا ہے اس لئے بہتر ہے کہ تم سو سمجھ کر بولو۔''

''میں چیخ چیخ کر سپاہیوں کو بلالوں گی اور وہ تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے ورنہ مجھے چھوڑ دو!''

''اگر ایسا ممکن ہوتا جان تو تم اب تک اس پر عمل کر چکی ہوتیں اور یہ کہ ارد گرد کے غار وا میں لوگ موجود ہوتے تو تم مجھے لے کر یہاں ہرگز نہ آتیں۔ تم مجھے اتنا بچہ کیوں سمجھ رہی ہو کہ میں یہ ذ سی بات بھی نہیں سمجھ سکتا! اس کے علاوہ تم یہ کیوں بھول گئی ہو کہ تم اسی وقت چیخ سکتی ہو جب میں تمہیں اس کا موقع دوں!''

بات تو عبداللہ خان' راجکماری سے کر رہا تھا مگر اس کا ذہن یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ و یہاں سے کس طرح فرار ہو سکتا ہے؟ وہ بھی راجکماری کو اپنے ساتھ لے کر! راجکماری اسے پسند آ گئی تھی۔ راجکماری کا بھرا بھرا گداز جسم اور حسین خدو خال اس کے دل میں کھب گئے تھے۔ یہ فیصلہ کہ وہ اپنے ساتھ راجکماری کو بھی لے جائے گا اس نے اسی وقت کر لیا تھا جب راجکماری تنہا غار میں داخل ہوئی تھی۔

عبداللہ خان نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے پہلا قدم تو یہ اٹھایا کہ راجکماری کی تلوار اپنے قبضے میں کر لی۔ اب اس کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی۔ اس کے بعد عبداللہ خان نے راجکماری کے ہاتھ بڑی جدوجہد کے بعد پشت پر اسی رسی کے ایک ٹکڑے سے باندھ دیئے جس سے کچھ دیر پہلے وہ خود بندھا پڑا تھا۔

راجکاری نے چیخنا چلانا شروع کر دیا تو عبداللہ خان نے اسے دھمکی دی۔ ''اگر تم اب چیخیں تو میں تمہارے حلق میں کپڑا ٹھونس دوں گا ورنہ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ میں جو کچھ کہتا رہوں اس پر خاموشی سے عمل کرتی رہو! مجھے تشدد اور بے رحمی پر مجبور نہ کرو!''

راجکماری کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تیرنے لگے۔ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی تھی۔ ورنہ وہ کسی سپاہی یا کئی سپاہیوں کو بھی اپنے ساتھ غار میں لے کر آ سکتی تھی یا انہیں غار کے دہانے پر متعین کر سکتی تھی مگر اب پچھتانا لا حاصل تھا۔ یہ وہی بہادر راجپوت راجکماری تھی جس نے مغل فوج کی لشکر گاہ پر شب خون مار کر اپنے شوہر اور دوسرے جنگی قیدیوں کو رہا کرا لیا تھا۔ اب وہی عبداللہ کے قابو میں تھی۔

عبداللہ خان ابھی راجکماری کو ساتھ لے کر غار سے باہر نکلنے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ گونجی اور پھر چند لمحے بعد ہی ایک چہرہ غار میں جھانکتا دکھائی دیا۔ وہ چہرہ رکمنی کا تھا' وہی رکمنی جس نے عبداللہ خان کو شناخت کیا تھا۔ غار کے اندر کا منظر دیکھ کر رکمنی مبہوت سی ہو گئی۔ پھر

اچانک ہی وہ چیختی ہوئی بھاگی۔ وہ شاید راجکماری کو تلاش کرتی ہوئی ادھر آ نکلی تھی اور عبداللہ خان کے لئے خطرہ بن گئی تھی۔

اس صورتحال میں راجپوتوں کے درمیان سے اپنی جان بچا کر جانا عبداللہ خان کے لئے تقریباً ناممکن ہو گیا تھا مگر وہ عبداللہ خان تھا۔ وہ عبداللہ خان جس نے جریدہ عالم پر اپنی ذہانت و بہادری کے ایسے انمٹ نقوش ثبت کئے تھے جو تاریخ کی امانت ہیں۔ اگر عبداللہ خان نہ ہوتا تو شاید ہندوستان کی تاریخ کا دھارا کسی اور رخ میں بہتا' مغلوں کی تاریخ یقیناً کچھ اور ہی ہوتی! وہ غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے بڑا عجیب دماغ عطا کیا تھا۔ انسانی دماغ واقعی ایک حیرت کدہ ہے جس کا ثبوت خود مجھے پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات ہیں۔ انہی ناقابل یقین اور حیرت انگیز واقعات میں سے ماضی کا یہ سفر بھی ہے جس کی روداد میں اپنے قارئین کو پوری تفصیل کے ساتھ سنا رہی ہوں کیوں کہ یہ سب کچھ میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ بظاہر یہ ساری باتیں سارے واقعات افسانہ معلوم ہوتے ہیں اور سچائی سے ان کا کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ میں ایک بار پھر ماضی کا سفر شروع کرنے سے پہلے انسانی دماغ کے بارے میں چند ایسے انکشافات کرنا چاہتی ہوں جنہیں جدید سائنس کی روشنی میں سمجھنا مشکل نہیں۔

ان انکشافات کے بعد میری آپ بیتی پڑھنے والے اسے کوئی افسانہ نہیں کہہ سکیں گے۔ جدید سائنس نے اب تک انسانی دماغ پر جو تحقیق کی ہے اور اس تحقیق کے تفصیلی مطالعے سے میں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں میں وہ بیان کرنا چاہتی ہوں۔ اس مطالعے نے خود میری شخصیت کے بہت سے رخ مجھ پر واضح کر دیئے ہیں ممکن ہے کہ میں خود اب تک جن واقعات کو پر اسرار سمجھتی آئی ہوں اور میرے قارئین بھی انہیں پر اسرار سمجھتے رہے ہیں درحقیقت پر اسرار نہ ہوں اس مداخلت کے لئے میں اپنے قارئین سے معذرت خواہ نہیں ہوں کیونکہ اس سے انہیں میری سرگزشت کو پوری طرح سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کا موقع ملے گا۔ اسی کے ساتھ میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو وہ حقیقت کی روشنی میں دیکھ سکیں گے۔ جستہ جستہ پہلے بھی کہیں کہیں میں یہ ذکر کرتی آئی ہوں مگر اب ذرا تفصیل کے ساتھ جدید سائنسی علوم کی مدد سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

☆......☆......☆

انسانی دماغ پر اب تک جتنی تحقیق ہوئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا دماغ ان گنت خلیوں کا مجموعہ ہے۔ انہی خلیات سے ہمارے دماغ کی تشکیل ہوئی ہے۔ ان خلیات کا بڑا حصہ یا بالفاظ دیگر ہمارے دماغ کا بڑا حصہ خوابیدگی کے عالم میں ہے یعنی متحرک یا فعال نہیں ہے۔ مختلف علوم وفنون میں جتنے بھی بڑے لوگ گزرے ہیں ان کے دماغوں کے تجزیے سے سائنس دانوں نے یہ نتائج اخذ کئے ہیں کہ عام انسانوں کے دماغ کی نسبت ان بڑے لوگوں کے دماغ کے خلیات زیادہ متحرک اور فعال تھے۔ دوسرا نتیجہ جو سائنس دانوں نے اخذ کیا وہ یہ ہے کہ اگر کسی بھی سبب انسانی دماغ کا وہ حصہ جو خوابیدگی کے عالم میں ہے اسمیں سے چوتھائی بھی کام کرنے لگے تو ناقابل یقین اور حیرت انگیز باتیں ظہور میں آ سکتی ہیں۔ دماغ کی انہی حیرت انگیز صلاحیتوں میں سے ایک دوسرے دماغ میں پیدا ہونے والے خیالات کو پڑھ لینا یا انہیں اپنی مرضی کے تابع بنا لینا بھی ہے۔ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم اسی کا عملی ثبوت ہے۔ تو کھلا یہ اور

سائنس نے ثابت یہ کیا کہ انسانی دماغ میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ پیش گوئی کی حیرت انگیز صلاحیت' انحصار بھی دماغ کے زیادہ یا کم یا اوسط درجے فعال ہونے پر ہے یعنی انسانی دماغ میں مستقبل بینی کی صف بھی موجود ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انسانی دماغ ماضی کے بارے میں بھی حیرت ناک صفات کا مالک ہے۔

ازل سے لے کر اب تک انسان یا انسانی دماغ جن تجربات سے گزرتا رہا ہے نسل در نسل و تجربات ایک عہد سے دوسرے عہد تک منتقل ہوتے رہے ہیں۔ ایک نسل سے دوسری نسل تک اجتما تجربات و مشاہدات یا اجتماعی شعور کی منتقلی کو ہم ورثہ کہتے ہیں۔ انسانی دماغ کے اجتماعی شعور کی منتقلی کو ورثہ کہتے ہیں۔ انسانی دماغ کا اجتماعی ورثہ! اس اجتماعی شعور کی منتقلی کو ہندوؤں نے کم علمی کے سبب آواگون کا نام دے دیا ہے۔ بظاہر یہ بات یا یہ واقعہ حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نوجوان یا کوئی بچہ کوئی شخص اب سے سو ڈیڑھ سو سال یا پچاس سال قبل کے وہ واقعات بیان کرنے لگے جن کا علم اسے کس طرح نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً وہ سولہ سال کی عمر کا ہے اور پچاس سال پہلے کسی محلے کے ایک مکان میں رہ والے کسی شخص کی بابت بالکل صحیح صحیح باتیں بتانے لگے کہ یہاں فلاں شخص رہتا تھا' اس کی بیوی کا نام یہ اور یہ کہ وہ بیس سال پہلے فلاں مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا وغیرہ! اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ اس نوجوان' دوسرا جنم ہے اور پہلے جنم میں وہ اسی مخصوص محلے کے مخصوص مکان میں رہتا تھا سراسر غلط ہے۔ یہ وہ اجتماعی شعور کی منتقلی کا معاملہ ہے۔

ہے یوں کہ دماغ کے خوابیدہ خلیات کی بیداری کا عمل عارضی بھی ہوتا ہے اور دیرپا بھی! ا نوجوان جس نے پچاس سال پہلے کے واقعات بیان کئے اور اپنی پیدائش سے چار سال قبل مر جا والے شخص کے متعلق بالکل صحیح صحیح واقعات بتائے اس کے دماغ کے کچھ خوابیدہ خلیات عارضی طور متحرک ہو گئے اور بس! اسی دوران میں اس نے گزرے ہوئے واقعات میں سے کچھ بیان کر دیئے۔ ا ہم اس کا دوسرا جنم نہیں کہہ سکتے اور نہ اس سے آواگون کے غلط فلسفے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ متعدد ا واقعات اب تک گزر چکے ہیں جو اس ضمن میں آتے ہیں۔

انسانی دماغ کے تجربات ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے ہیں' اس کے لاتعداد ثبو ہمارے اردگرد موجود ہوتے ہیں مگر ہم ان پر غور نہیں کرتے مثلاً کسی نوجوان نے اپنے باپ دادا کو نہیں دیکھا۔ جن لوگوں نے اس کے باپ دادا کو دیکھا ہے وہ اس نوجوان میں بہت سی ایسی حرکات کا مشاہدہ سکتے ہیں جو اس کے باپ یا دادا میں تھیں۔ انسانی جسم کے اعضا دماغ کے تابع ہوتے ہیں اور اسی کے حک پر حرکت کرتے ہیں۔ اگر ایک نوجوان یا آٹھ دس سال کا بچہ کھانا کھاتے ہوئے اپنے الٹے ہاتھ کی پشت سے بار بار ناک رگڑتا ہے تو اس کا یہ فعل یہ عادت دماغ ہی کی تابع کہلائے گی۔ اس بچے کے باپ میں بھی یہی عادت تھی جسے بچے نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم اسے کیا کہیں گے؟ سائنس کی زبان میں اس انسانی دماغ کے تجربے کی منتقلی ہی کہا جائے گا جس ہم عام فہم زبان میں موروثی عادات و اطوار کہتے ہیں۔

سائنس میں تجربے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عام زندگی میں ہم جن ناقابل توضیح تجربا سے گزرتے ہیں سائنس ان کی بھی وضاحت کرتی ہے۔ انسانی دماغ کے مطالعے میں برین ویو کی بڑ

اہمیت ہے۔ اس کے مختلف رخ ہیں۔ ہمارے دماغ سے یہ نادیدہ لہریں ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہیں اور ان کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کسی کا دماغ پڑھ لینا یا کسی کے متعلق معلوم کر لینا یا خود بہ خود معلوم ہو جانا انہی نادیدہ دماغی لہروں سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے ہم عام فہم زبان میں ٹیلی پیتھی کہتے ہیں۔ ہم اپنے دماغ کی اس حیرت انگیز صلاحیت کو بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میری یہ تحریر پڑھنے والوں میں سے بیشتر افراد اس نوع کے تجربات سے گزر چکے ہوں۔ مثال کے طور پر میں یہاں ایک واقعہ عرض کرتی ہوں میرے ایک عزیز کی والدہ ہندوستان گئی ہوئی تھیں۔ میں ایک روز ان کے گھر گئی تو خلاف توقع وہ بہت ملول نظر آئے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو رونے لگے اور بولے کہ سمجھ میں نہیں آتا جی کیوں اتنا ملول ہے۔ اور رونے کو کیوں دل چاہ رہا ہے! بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ابھی میں انہی کے گھر تھی کہ ہندوستان سے فون پر ایک روح فرسا خبر ملی۔ حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس واقعے کا سائنسی تجزیہ وہی ہے جو میں اوپر بیان کر چکی ہوں۔ کہاں ہندوستان کا ایک شہر سہارنپور اور کہاں کراچی! عین اسی وقت میرے عزیز کا ملول ہو کر رونا اور ادھر عین اسی وقت ان کی والدہ کا حرکت قلب سے انتقال ہو جانا۔ بظاہر یہ واقعہ پراسرار اور عجیب لگتا ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں۔

اپنے حیرت انگیز ذہن کا تجزیہ بھی میں سائنس کی روشنی ہی میں کرتی ہوں تو مجھے وہ تمام واقعات قطعی پراسرار معلوم نہیں ہوتے جن سے میں گزر چکی ہوں۔ کسی کے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو پڑھ لینا' اس کے ذہن کو اپنے ذہن کا تابع کر لینا' اپنے دماغ کی اس صلاحیت کو میں ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم سے تعبیر کر سکتی ہوں۔ صحیح پیش گوئی کی صلاحیت کو بھی میں کوئی پراسرار عمل سمجھنے کی بجائے دماغ ہی کی بہترین کارکردگی اور صلاحیت تصور کرتی ہوں۔ جدید عہد میں اس کی واضح مثال کمپیوٹر سے دی جا سکتی ہے۔ ہم کمپیوٹر میں بہت سی باتیں فیڈ کر دیتے ہیں جنہیں کیلکولیٹ کر کے وہ کچھ نتائج ہمارے سامنے لے آتا ہے جو قطعی درست ہوتے ہیں۔ سو انسانی دماغ میں بھی خود کارانہ طور پر بہت سی باتیں فیڈ ہوتی رہتی ہیں جن سے ایک مطلوبہ نتیجہ شعوری یا غیر شعوری طور پر برآمد ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ کسی شخص کے دماغ کا کتنا حصہ اور کب متحرک ہوتا ہے! دماغ کا یہی کیلکولیشن بعض اوقات زیادہ متحرک ہونے کی صورت میں پیش گوئی بن جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب تک متعدد افراد کی بہت سی پیش گوئیاں قطعی درست ثابت ہو چکی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دماغ کے اس فعل کی وجہ سے کبھی کبھی ہمیں یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ جو کچھ اس وقت گزر رہا ہے شاید پہلے بھی گزر چکا ہے۔ بہ قول شاعر

گزر چکا ہے وہ سب کچھ جو ہونے والا ہے

بات چلی ہے تو اسی ضمن میں ایک اور بات عرض کرتی چلوں۔ آپ بھی زندگی میں یقیناً کبھی نہ کبھی اس احساس سے گزرے ہوں گے۔ میں نے جب پہلی بار اہرام مصر کو دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے پہلے بھی کبھی میں انہیں دیکھ چکی ہوں حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے؟ یعنی جو جگہ پہلے آپ نے کبھی نہیں دیکھی وہ دیکھی دیکھی سی کیوں لگتی ہے؟ یا جس طرف آپ کے قدم اٹھ رہے ہیں اس جگہ کے متعلق دماغ میں پہلے سے یہ باتیں آنے لگتی ہیں کہ وہاں یہ ہوگا' یہ شے فلاں جگہ رکھی ہوگی اور جب آپ وہاں پہنچتے ہیں تو وہ شے وہیں رکھی ملتی ہے۔ اسی نوعیت کا ایک واقعہ میرے ایک کرم فرمانے

سنایا۔ گرمی کے موسم میں وہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے۔ قریب ہی ایک ٹیلا تھا جس پر ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ انہیں پیاس لگی اور ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ پہلے وہ کبھی وہاں نہیں گئے تھے مگر ٹیلے پر چڑھتے ہوئے انہیں یہ احساس ہوا کہ وہ پہلے بھی وہاں آچکے ہیں۔ پانی کا مٹکا مسجد میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب رکھا ہوا مل جائے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ یہ کیا تھا؟ یہ کوئی پراسرار بات نہیں تھی بلکہ یہ ان کے دماغ ہی کی ایک مخصوص کیفیت کا کرشمہ تھا جسے سائنس اجتماعی شعور کا ورثہ یا ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقلی کا نام دیتی ہے۔

ماضی میں جو کچھ گزر چکا ہے اسے حال میں دیکھ لینا انسانی دماغ ہی کی غیر معمولی صلاحیت یا نسل بعد نسل اجتماعی شعور کے تجربات کی منتقلی کا نتیجہ ہے۔ ماضی میں سفر کرنا بھی انسانی دماغ کی مخصوص حالت کا نام ہے۔ ہم اسے جدید سائنس کے مطالعے کی روشنی میں غیر معمولی تو کہہ سکتے ہیں ناممکن نہیں' جدید سائنس انسانی دماغ پر ابھی تحقیق میں مصروف ہے اور اس ضمن میں نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ یہ جہان حیرت ابھی پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آیا ہے لیکن اب تک بھی تحقیق و تجربات سے جو باتیں سامنے آئی ہیں وہ کم حیران کن نہیں ہیں۔

بات عبداللہ خان کے غیر معمولی ذہن سے شروع ہوئی تھی سو پھر میں آپ کو وہیں لئے چلتی ہوں جہاں غیر معمولی ذہن رکھنے والا ایک شخص خود کو موت کے حصار سے نکالنے کی جدوجہد میں مصروف ہے اور اس کے ساتھ ایک نازک اندام حسینہ بھی ہے۔

☆......☆......☆

راجکماری انیتا کو ساتھ لئے عبداللہ خان تیزی کے ساتھ غار کے دہانے سے نکلا اور کانپ اٹھا۔ ہر طرف سے شور بلند ہو رہا تھا اور یہ شور رفتہ رفتہ قریب آتا جا رہا تھا۔ عبداللہ خان کے خیال میں رکمنی نے اس کی توقع سے کہیں پہلے چیخ چیخ کر راجپوتوں کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ عبداللہ خان کو شاید چاروں طرف سے گھیرا جا رہا تھا۔ شور کی آوازیں اب ہر سمت سے آ رہی تھیں۔ عبداللہ خان اس وقت ایک ایسی جگہ سے گزر رہا تھا جس کی دونوں طرف چٹانیں تھیں۔

وہ کچھ اور آگے بڑھا تو شور مزید واضح ہو گیا۔ وہ چونک اٹھا۔ اس نے سوچا کسی فرد واحد کو گھیرنے کے لئے اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر چند ہی لمحوں بعد اس پر حقیقت واضح ہو گئی۔ اس طرح کے شور سے اس کی سماعت آشنا تھی۔ یہ شور یقیناً رزم و پیکار کا تھا۔ اسی وقت اس نے نعرہ تکبیر سنا۔ عبداللہ خان کے لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ مغل لشکر وہاں پہنچ گیا ہے اور اس نے راجپوتوں پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کیا کرے اور کدھر جائے کہ اس نے تیز اور بلند آواز سنی۔ ”وہ رہا......! وہ جا رہا ہے۔“

عبداللہ خان نے مڑ کر دیکھا۔ راجا اجیت سنگھ چند راجپوت سپاہیوں کے ساتھ تیزی سے اس کی طرف بھاگتا چلا آ رہا تھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔ ان کی تعداد پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ عبداللہ خان کو اپنی شمشیر زنی پر ناز تو ضرور تھا مگر وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ راجپوت مٹی کے بنے ہوئے نہیں ہیں' ان میں بھی بہت سے شمشیر زنی میں طاق ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں مقابلے پر

آنا خطرے کو دعوت دینا تھا۔ اس کے علاوہ وہ راجکماری سے بھی ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔ ان لوگوں سے مقابلہ کرنے کی صورت میں ممکن تھا کہ وہ لڑتا بھڑتا' انہیں مارتا کاٹتا نکلتا' مگر اس کے ساتھ راجکماری کو بھی کھو بیٹھتا۔ اس کے ذہن نے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ فیصلہ راجپوتوں سے مقابلہ نہ کرنے کا تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے وہ ایک دم رک گیا۔ اس نے راجکماری کا ایک بازو پکڑ کے اسے آگے کر دیا اور دوسرے ہاتھ سے تلوار لہراتے ہوئے آنے والوں کو دکھائی۔ پھر اس نے تلوار کی نوک راجکماری کی پشت پر رکھ دی اور بلند آواز میں اپنے حریفوں سے مخاطب ہوا۔ ”اگر تم لوگوں نے میرا پیچھا کیا اور لوٹ کر نہ گئے تو میں یہ تلوار راجکماری کے جسم میں پیوست کر دوں گا! کیا تم میری آواز سن رہے ہو راجا اجیت سنگھ؟“

بھاگتے بھاگتے وہ سب ایک دم ٹھہر گئے۔ پھر راجا اجیت سنگھ چیخا۔ ”تم راجکماری کو چھوڑ دو! ہم تمہیں فرار ہونے کا موقع دے دیں گے۔“

”نہیں! یہ نہیں ہو سکتا! میں تم لوگوں کی بات پر اعتبار نہیں کر سکتا!“ عبداللہ خان نے بھی چیخ کر جواب دیا۔ ”یقین کرو کہ میں راجکماری کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ جب میں تمہاری دسترس سے دور نکل جاؤں گا تو راجکماری کو چھوڑ دوں گا۔“ عبداللہ خان نے دانستہ جھوٹ بولا تاکہ وہ لوگ مطمئن ہو جائیں۔

”تمہیں شاید معلوم نہیں کہ مغلوں نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ ہم خود یہاں سے فرار ہو رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں راجکماری مغلوں کے ہاتھ لگ جائے گی۔ تم راجکماری کو چھوڑ دو! ہماری بات پر اعتبار کرو تم سے کچھ نہیں کہا جائے گا اور تمہیں بغیر مزاحمت کے فرار ہونے دیا جائے گا۔“

”ظاہر ہے کہ تم لوگ فرار ہو کر دوسرے پہاڑوں ہی پر جاؤ گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ راجکماری کو بحفاظت تمہارے پاس پہنچا دوں گا اس لئے کہ میں تمہارا دوست ہوں دشمن نہیں۔“ عبداللہ خان انہیں کسی نہ کسی طرح فریب دینا چاہتا تھا اور کسی بھی قیمت پر راجکماری سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔

”ہم اس سلسلے میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتے!“ راجا اجیت سنگھ برہم ہو کر بولا۔

”تو پھر ٹھیک ہے جو تمہارے جی میں آئے کرو! مگر یاد رکھو کہ تمہارا آگے کی طرف بڑھتا ہوا ایک قدم بھی راجکماری کی زندگی ختم کرنے کے لئے کافی ہو گا۔ اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم راجکماری کی زندگی چاہتے ہو یا موت؟“ یہ کہہ کر عبداللہ خان الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔ اسی کے ساتھ راجکماری بھی قدم قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور تھی۔

عبداللہ خان کے ایک ہاتھ کی گرفت میں اب بھی راجکماری کا بازو تھا۔

ان کے ہاتھوں میں مشعلیں اور تلواریں تھیں لیکن عبداللہ خان کے پیچھے ہٹنے کے باوجود کسی نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

”عبداللہ خان......! رک جاؤ عبداللہ خان!“ راجہ اجیت سنگھ آخری بار چیخا۔

راجا کی بات کا عبداللہ خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ راستہ آگے جا کر مڑ جاتا تھا۔ مڑتے ہی عبداللہ خان سیدھا ہوا اور راجکماری سے بولا۔

"دوڑو! تیزی سے دوڑو!" عبداللہ خان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ راجکماری نے اس کا حکم ماننے میں کوئی تامل نہیں کیا۔

وہ راستہ ختم ہونے کو تھا کہ عبداللہ خان کی نظر کچھ فاصلے پر موجود ایک روشن غار پر پڑی۔ غار کے سامنے دو راجپوت سپاہی برہنہ تلواریں ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ غار کے اندر غالباً مشعلیں روشن تھیں جنکی روشنی غار کے دہانے سے باہر آ رہی تھی۔ ان دونوں کی نظر جیسے ہی عبداللہ خان پر پڑی وہ تلواریں اٹھائے حملہ آور ہونے کو جھپٹ پڑے۔ عبداللہ خان کے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

"ٹھہرو! اگر تم نے اس پر حملہ کیا تو میری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔" معاً راجکماری چیخ اٹھی۔

وہ دونوں راجپوت سپاہی ٹھٹک کر رک گئے۔ انہوں نے راجکماری کی آواز پہچان لی تھی اور اب انہیں صورتحال کی نزاکت کا احساس بھی ہو گیا تھا۔

"راجکماری ان سے کہو کہ اگر یہاں کوئی گھوڑا موجود ہو تو لے آئیں۔" عبداللہ خان نے راجکماری سے کہا۔

عبداللہ خان کے الفاظ راجکماری نے دہرا دیئے۔ کچھ دیر بعد ایک شخص روشن غار میں داخل ہو گیا اور جب وہ لوٹا تو ایک گھوڑے کی باگیں تھامے ہوا تھا۔

"عبداللہ خان نے ہاتھ آگے بڑھایا اور باگیں تھام لیں۔ سپاہی پیچھے ہٹ گیا۔ اسی وقت غار کے دہانے پر عورتیں دکھائی دیں۔"

"بیٹی انیتا! ......انیتا! تو کہاں ہے؟" ایک رقت آمیز آواز سنائی دی۔

"میں یہاں ہوں ماں جی......! یقین رکھیں کہ میں اپنی حفاظت کرنا اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ شخص کچھ دور تک مجھے اپنے ساتھ لے جا کر چھوڑ دے گا۔ اسے خطرہ ہے کہ راجپوت سپاہی اس پر حملہ نہ کر دیں۔" راجکماری نے باآواز بلند اس نسوانی آواز کا جواب دیا۔

راجکماری کا جواب سن کر عبداللہ خان حیرت زدہ ہو گیا اور سوچنے لگا کیا واقعی راجکماری کو یقین ہے کہ میں اسے یہاں سے بحفاظت نکلنے کے بعد چھوڑ دوں گا؟ یا یہ خود میرے ساتھ جانا چاہتی ہے؟ اس کی آنکھیں تو کہتی ہیں کہ یہ ذہین ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں سمجھا کہ میں راجا اجیت سنگھ کو محض فریب دے رہا تھا؟ اس غار میں راجپوت سرداروں کی عورتیں تھیں جن کی حفاظت کے لئے دو سپاہی چھوڑ دیئے گئے تھے۔ باقی سپاہی مغل فوج سے برسرپیکار تھے۔ رزم و پیکار کا شور عبداللہ خان کو اب بھی سنائی دے رہا تھا۔ ابھی تک شاید کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔ ویسے عبداللہ خان کو یقین تھا کہ راجپوت مغل فوج کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹک سکیں گے۔ خود راجا اجیت سنگھ بھی اس سے فرار ہو جانے کا اقرار کر چکا تھا۔

عبداللہ خان نے راجکماری کو گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد دی۔ گھوڑے پر زین کسی ہوئی تھی۔ راجکماری کے بعد عبداللہ خان بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ لڑائی کا شور اب دائیں جانب سے سنائی دے رہا تھا۔ عبداللہ خان نے دانستہ بائیں جانب گھوڑے کو بھگانا شروع کر دیا۔

راجکماری گھوڑے پر اس کے آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ گھوڑا جب تیزی سے دوڑتا ہوا ان غاروں

سے دور نکل کر ایک پہاڑی درے میں داخل ہو گیا تو پہلی بار عبداللہ خان کو راجکماری کے جسمانی قرب کا احساس ہوا۔ اس کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"جان! تمہارے ہاتھ کھول دوں؟" عبداللہ خان نے خوابیدہ سی آواز میں راجکماری کو مخاطب کیا۔

"بندھے ہی رہنے دو تو بہتر ہے۔ میں بہرحال تمہاری دشمن ہوں اور دشمن پر اعتبار نہیں کیا کرتے!" راجکماری نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"کون دوست ہے اور کون دشمن اس کے معنی وقت کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر عبداللہ خان نے باگیں کھینچ لیں پھر بغیر مزید کچھ کہے راجکماری کے ہاتھ کھول دیئے۔ یہ ہاتھ تو چومنے کے لئے ہیں باندھنے کے لئے نہیں!" پھر اس نے جو کچھ کہا اس پر فوراً ہی عمل بھی کر دیا۔

"تم حد سے آگے بڑھ رہے ہو عبداللہ خان! یہ نہ سمجھنا کہ تنہا پا کر تم مجھ پر دست درازی کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے اور یہ بھی نہ بھولنا کہ میں ایک شادی شدہ راجپوت عورت ہوں' کوئی جذباتی کنواری لڑکی نہیں جو تمہاری ٹھنڈی میٹھی آہوں سے متاثر ہو جاؤں گی۔" راجکماری کے لہجے میں بلا کی سختی اور اعتماد تھا۔

"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تم پر دست درازی کروں گا! دلوں کے معاملے جبر سے نہیں راضی بہ رضا طے ہوتے ہیں۔ اگر تم مجھے ہوس کار سمجھ رہی ہو راجکماری تو یہ تمہاری غلطی ہے۔" یہ کہہ کر عبداللہ خان نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

"آخر تم مجھے کہاں اور کیوں لے جا رہے ہو؟" راجکماری نے سوال کیا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں تمہیں کب واپس جانے کی اجازت دوں گا! تم نے تو غالباً اپنی ساس اور راجا اجیت سنگھ کی ماں سے یہی کہا تھا کہ میں کچھ دور جا کر تمہیں چھوڑ دوں گا۔" عبداللہ خان کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔ "جواب دو نا میری بات کا!"

"میں نے تم سے اس لئے یہ فضول بات کرنا پسند نہیں کی کہ میں جانتی ہوں تم مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔ رہا ماں جی کو جواب دینے کا مسئلہ تو میں انہیں تسلی دینا چاہتی تھی۔ وہ بوڑھی عورت ہیں خواہ مخواہ گھبرا جاتیں۔" راجکماری بلا جھجک بولی۔

راجکماری کا جواب سن کر عبداللہ خان نے ٹھنڈا سانس بھرا اور سوچا کہ جو کچھ میرا خیال تھا ٹھیک ہی تھا۔ راجکماری واقعی احمق نہیں تھی کہ اس کی باتوں میں آ جاتی۔ اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد راجکماری کو مخاطب کیا۔ "ہاں تو تم مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میں تمہیں کہاں اور کیوں لے جا رہا ہوں؟"

"ہاں مجھے تم سے یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے!" راجکماری کے لہجے میں بے خوفی تھی۔

"کیوں نہیں، تمہیں یقیناً یہ حق حاصل ہے۔" عبداللہ خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"تو سنو جان جب تم نے مجھے پہلے پہل چاہا تھا تو میں نے تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں اور ہی لگن تھی لیکن اب جب میں نے تمہیں دیکھا ہے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری کھوئی ہوئی دولت واپس مل گئی ہے۔ میں تمہیں اپنے ہمراہ مغل لشکر گاہ لے جا رہا ہوں۔ وہاں سے کچھ دن

بعد ہم شاہجہان آباد روانہ ہو جائیں گے اور تم میرے ساتھ ہو گی۔ اب یہ کہ میں تمہیں کیوں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں؟ تم اسے قرض محبت لوٹانا بھی کہہ سکتی ہو۔ تمہاری محبت مجھ پر قرض تھی اور میں یہ قرض اب چکانا چاہتا ہوں۔ میں بھی اب تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ ہاں میں تمہیں اس بات کا پورا یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر میں نے یہ محسوس کیا تمہارے دل میں میری محبت کا چراغ روشن نہیں تو میں دوبارہ تمہیں انہی پہاڑوں پر چھوڑ جاؤں گا۔ فی الحال میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ تمہارا دل میری محبت سے خالی نہیں ہے۔ ہاں تمہیں یہ اور بتا دوں کہ جسمانی قرب حاصل کرنے کے لئے مجھے کوئی کمی نہیں۔ میں ایک صاحب اختیار شخص ہوں۔ میں تمہارے دل سے یہ احساس دور کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ہوس کار ہوں۔ عبداللہ خان کے لئے خوب صورت جسموں کی کمی نہیں۔ اس کا اندازہ تمہیں خود بھی ہو جائے گا۔ معاملہ ہوس کا نہیں عشق کا ہے۔''

عبداللہ خان کی اس طویل گفتگو کے دوران میں راجکماری خاموش رہی۔ اب وہ پہاڑی درے سے نکل آیا تھا اور اس کے گھوڑے کا رخ ایک بلند سی چٹان کی طرف تھا۔ وہ اس پر چڑھ کر لشکر گاہ کی سمت جانا چاہتا تھا۔ اسے علم تھا کہ لشکر گاہ مشعلوں کی روشنی کے سبب بلندی سے بہت جلد نظر آ جائے گا۔ چٹان پر چڑھ کر اسے چاروں طرف نظر دوڑانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سامنے ہی بائیں جانب لشکر گاہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے چٹان سے اتر کر گھوڑا اسی سمت دوڑانا شروع کر دیا۔

لشکر گاہ کے قریب پہنچ کر عبداللہ خان کو اندازہ ہوا کہ سپاہی مستعد، بیدار اور چوکنا ہیں۔ ساری مغل فوج نے پہاڑوں پر چڑھائی نہیں کی تھی بلکہ فوج کا چوتھائی حصہ ہی اس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ جیسے ہی سپاہیوں کی نظر عبداللہ خان پر پڑی وہ خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ عبداللہ خان ان نعروں کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ راجکماری عبداللہ خان کے ساتھ تھی اس لئے فوراً اس نے اپنے خیمے کا رخ کیا۔ عبداللہ خان کے محافظ بھی اسے دیکھ کر خوشی سے چلانے لگے۔ ہاتھ کے اشارے سے عبداللہ خان نے انہیں خاموش کیا اور گھوڑے سے اتر پڑا۔ پھر راجکماری خود ہی گھوڑے سے کود گئی۔ عبداللہ خان نے اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ راجکماری کو اس نے خیمے کے اندرونی حصے میں بھیج دیا اور پھر اپنے ایک خدمتگار امیر اللہ کو بلایا۔

''حکم حضور!'' امیر اللہ نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔

''ہم تازہ ترین حالات جاننا چاہتے ہیں۔ مغل فوج اچانک پہاڑوں پر کیوں چڑھ دوڑی؟'' عبداللہ خان نے دریافت کیا۔

''راجپوتوں سے حضور کا انتقام لینے کے لئے'' خدمتگار نے جواب دیا۔

پھر عبداللہ خان کا اشارہ پا کر تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ ''جو چند سپاہی حضور کے ہمراہ راجپوتوں کے تعاقب میں گئے تھے ان میں صرف چند زندہ بچ کر لوٹنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ انہی سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حضور نصیب دشمناں راجپوتوں کی قید میں جا چکے ہیں۔ ان میں سے ایک نے بحالت بیہوشی حضور کو راجپوتوں کی قید میں دیکھا تھا۔ وہ خود بھی پکڑا جاتا مگر قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا۔ کسی طرح وہ اپنی جان بچا کر بھٹکتا ہوا لشکر میں واپس آ گیا جب عزت مآب خان خاناں نے شاہ ذی وقار سے راجپوتوں پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی تو شہنشاہ معظم نے مشورے کے لئے میر بخشی ذوالفقار خان کو

طلب کیا۔ ذوالفقار خان نے اس تجویز کی مخالفت کی مگر شہزادہ عالی عظیم الشان نے فرمایا کہ یہ مغل وقار کا مسئلہ ہے پہاڑوں پر حملہ کرنے میں چاہئے جتنی مشکلات درپیش ہوں مگر یہ حملہ ضرور اور فوراً ہونا چاہئے۔ شہنشاہ معظم نے شہزادے کی بات مان لی اور عزت مآب وزیر سلطنت کو یہ اجازت دے دی کہ وہ راجپوتوں پر حملہ کر سکتے ہیں۔ عزت ماب خان خاناں نے اپنی فوج خاص کو تیاری کا حکم دیا اور ان سپاہیوں کو بھی ساتھ لے کر پہاڑوں کی طرف روانہ ہو گئے جو پہلی یورش اور تعاقب میں حضور کے ہمراہ تھے اور زندہ بچ کر لوٹ آئے تھے۔ ابھی تک عزت مآب خان خاناں پہاڑوں سے نہیں لوٹے ہیں۔''

خدمتگار امیر اللہ نے عبداللہ خان کو تفصیلات سے آگاہ کر دیا' ابھی وہ خاموش ہی ہوا تھا کہ ایک اور ملازم نے خیمے میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔

''آ جاؤ!'' عبداللہ خان نے اسے اندر آنے کی اجازت دیدی اور وہ خیمے کے در سے اندر داخل ہو گیا۔

''شاہ ذی وقار کا ایک خادم حضور سے ملنا چاہتا ہے اور باریاب ہونے کا منتظر ہے۔'' ملازم نے بتایا۔

''اسے اندر بھیج دو!'' عبداللہ خان نے حکم دیا اور ملازم الٹے قدموں خیمے سے نکل گیا۔

چند ہی لمحوں کے بعد بادشاہ کا بھیجا خادم خیمے میں داخل ہوا اور اس نے عبداللہ خان کے سامنے جھک کر کہا۔ ''شہنشاہ معظم نے اسی وقت آپ کو یاد فرمایا ہے۔'' یہ کہہ کر خادم سیدھا کھڑا ہوا اور جواب طلب نظروں سے عبداللہ خان کی طرف دیکھنے لگا۔

''شاہ ذی وقار کی خدمت میں ہماری جانب سے تسلیمات بجا لانے کے بعد کہو کہ ان کا خادم ابھی حاضر ہوتا ہے۔'' عبداللہ خان بولا۔

بادشاہ کا خادم سر جھکا کے خیمے سے نکل گیا تو عبداللہ خان نے اپنے ملازم امیر اللہ کو مخاطب کیا۔ امیر اللہ سے اس نے خیمے میں موجود وہ چھوٹی سی صندوقچی منگائی تھی جس میں مرہم اور سامان جراحت رہتا تھا۔ اس کے ہاتھ اور کلائیاں جھلسی ہوئی تھیں اور ان میں سوزش ہو رہی تھی۔ صندوقچی آتے ہی عبداللہ خان نے اس میں سے ایک مرہم نکال کر ہاتھوں اور کلائیوں پر مل لیا۔ وہ مرہم ملنے کی وجہ سے جلد میں جذب ہو گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سوزش کم ہو گئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ اب خیمے کے اندرونی حصے کی طرف تھا۔ پردہ اٹھا کر وہ خیمے کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ اندر راجکماری انیتا گاؤ تکئے پر ایک کہنی ٹیکے بڑی بے فکری سے نیم دراز تھی۔ عبداللہ خان کو آتے دیکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

اس سے پہلے کہ عبداللہ خان کچھ کہتا وہ بول اٹھی۔ ''تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو میں جانتی ہوں۔ تم بادشاہ سے ملنے جا رہے ہو۔ یقین کرو کہ میں تمہاری غیر موجودگی میں کوئی ہنگامہ نہیں کروں گی اور نہ فرار ہونے کی کوشش کروں گی۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟''

''تم میری توقع سے زیادہ ذہین ہو۔'' عبداللہ خان نے جواب میں کہا پھر بولا۔ ''تم یہاں آرام کرو میں ابھی کچھ دیر میں آ جاؤں گا۔ ویسے بھی تم کافی تھکی تھکی لگ رہی ہو۔ میرے خادم تمہارا ہر طرح خیال رکھنے کے لئے موجود ہیں۔''

''خیال رکھنے کے لئے یا میری نگرانی کے لئے؟'' راجکماری نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خیر تم جو بھی سمجھو۔'' عبداللہ خان مسکرا کر بولا اور پھر وہاں سے نکل آیا۔

امیر اللہ ابھی خیمے کے بیرونی حصے میں موجود تھا۔ عبداللہ خان نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور خیمے سے باہر آ گیا۔ امیر اللہ اس کے پیچھے تھا۔

''سنو امیر اللہ!'' عبداللہ خان اپنے ملازم کو ایک طرف لے جا کر آہستگی سے بولا۔ ''تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس خیمے کی حفاظت کرنا ہے۔ وہ لڑکی یہاں سے فرار نہ ہونے پائے! تمہاری اطلاع کے لئے یہ بتا دوں کہ یہ وہ بہادر لڑکی ہے جس نے آج ہی شب......'' عبداللہ خان کچھ کہتے کہتے رک گیا اور بات بدل دی۔

''تم نے سن لیا نا کہ وہ لڑکی بہت بہادر ہے اسے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔''

''حضور کے حکم کی پوری تعمیل ہوگی۔'' امیر اللہ نے یقین دلایا۔

اس کے بعد عبداللہ خان گھوڑے پر سوار ہوا اور شاہی خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ ذوالفقار خان کے خیمے کے سامنے سے گزرا تو اس نے ذوالفقار خان کو دیکھا۔ وہ بھی گھوڑے پر بیٹھ کر شاہی خیمہ گاہ کی جانب جانے کے لئے تیار تھا۔ اس نے عبداللہ خان کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ عبداللہ خان نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مبارک ہو عبداللہ خان کہ تمہارے بوڑھے شیر نے تمہیں راجپوتوں کی قید سے رہا کرا لیا۔'' ذوالفقار خان نے مسکراتے ہوئے عبداللہ خان پر طنز کیا۔ بوڑھے شیر کا اشارہ خان خاناں کی طرف تھا۔

عبداللہ خان کو اس کا یہ طرز کلام گراں گزرا۔ اس نے سخت اور ترش لہجے میں ذوالفقار خان سے کہا۔ ''سنو ذوالفقار خان! مجھ سے ہم کلام ہوتے وقت اپنا لہجہ درست رکھا کرو! تعجب ہے تم اتنے بے خبر ہو! تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ابھی خان خاناں پہاڑوں سے نہیں لوٹے۔ عبداللہ خان اپنے اندر اتنی قوت وصلاحیت رکھتا ہے کہ اسے کسی کا مرہون منت نہ ہونا پڑے سمجھے!''

''ارے ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا......! بہرحال مجھے یقین ہے کہ تم کو اسی کے حملے سے فائدہ اٹھا کر فرار ہونے میں کامیابی ہوئی ہوگی۔'' وہ بے حیائی سے ہنسنے لگا' پھر مزید کہا۔ ''خیر ان باتوں کو چھوڑو! سنا ہے کہ تم وہاں سے اپنے ہمراہ کوئی بلبل بھی پکڑ لائے ہو! کون ہے وہ؟''

''تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہونا چاہئے!'' عبداللہ خان نے برہم ہو کر کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہوا بولا۔ ''میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب دینے کے لئے پابند نہیں ہوں سمجھ گئے!''

''ارے ارے! تم تو خفا ہو گئے۔ ہم ادھر ہی چل رہے ہیں جدھر تم جا رہے ہو۔'' ذوالفقار خان نے بھی اپنا گھوڑا دوڑا دیا اور عبداللہ خان کے قریب آتا ہوا بولا۔ ''ویسے تم سے ہمیں یہ امید نہیں ہے کہ تم اس معاملے میں ہمیں بھلا دو گے۔''

''کیا معاملہ اور کیسا معاملہ؟ تم فضول باتیں کرتے ہو!'' عبداللہ خان غصے سے بولا۔

''اب اتنے بھولے بھی نہ بنو! تم اس حسین بلبل کو اکیلے ہضم نہیں کر پاؤ گے۔ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے۔'' وہ بدستور بے غیرتی سے کہتا رہا۔

''ذوالفقار خان! یہ ضروری نہیں کہ سب تمہاری ہی طرح اپنی غیرت کا جنازہ نکال چکے ہوں۔'' عبداللہ خان نے برہم ہو کر جواب دیا۔

عبداللہ خان کی بات پر وہ شیطانی انداز میں ہنس پڑا اور پھر نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ عبداللہ خان نے اپنے گھوڑے کو اس سے آگے نکال لیا تھا۔ اسی کے ساتھ اسے یہ فکر بھی لاحق ہو گئی تھی کہ راجکماری کے معاملے میں روز اول ہی سے رقابت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ عبداللہ خان کا ذہن ایک اور مسئلے میں بھی الجھا ہوا تھا اور وہ مسئلہ تھا راجکماری کی حفاظت! ایک طرف اسے راجکماری کو ہوس کار ذوالفقار خان سے بچانا تھا دوسری طرف عتاب شاہی سے! اگر یہ بات کھل گئی کہ وہ راجا اجیت سنگھ کی بیوی ہے اور اسی نے مغل لشکر گاہ پر شب خون مار کر اپنے شوہر اور دوسرے جنگی قیدیوں کو رہا کرایا تھا تو اسے عتاب شاہی سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی عبداللہ خان اپنے خدمت امیر اللہ کو کچھ بتاتے ہوئے رک گیا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس نے آج ہی شب مغل لشکر گاہ پر شب خون مارا تھا۔

ان حالات کے تحت عبداللہ خان نے یہی ضروری جانا کہ راجکماری کی اصل حیثیت چھپائی جائے اور کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے عبداللہ خان کو خیال آیا کہ اگر دوران گفتگو میں ذوالفقار خان نے شاہ عالم کے سامنے راجکماری کا ذکر کر دیا تو کیا ہوگا؟ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شاہ عالم ان دونوں ہی کو ایک ساتھ اپنے خیمے میں بلوا لیتا۔ یوں بھی ذوالفقار خان شاہی خیمہ گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ اسے بھی شاہ عالم ہی نے طلب کیا تھا۔ عبداللہ خان' بادشاہ وقت شاہ عالم سے اب اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ شاہ عالم ہر ضروری اور غیر ضروری موقع پر اپنے امیروں اور مصاحبوں سے مشورے طلب کرنے کا عادی تھا۔ یہ بات بھی عبداللہ خان کے ذہن میں آئی کہ راجکماری کے متعلق خود شاہ عالم کو بتایا جا چکا ہو۔ شاہ عالم کو اس کی آمد کی اطلاع دینے والے یہ بھی بتا سکتے تھے کہ عبداللہ خان کے ساتھ کوئی راجپوت لڑکی بھی لشکر میں آئی ہے۔

اپنی سوچ اور وسوسوں میں الجھا ہوا عبداللہ خان شاہی خیمہ گاہ تک پہنچ گیا۔ اب صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ اس وقت شاہ عالم ایسے شخص کا بیدار ہونا غیر معمولی حالات کی طرف اشارہ کر رہا تھا ورنہ یہ وقت اس کے سونے کا تھا۔ ایک ہی شب میں حالات نے بڑی تیزی سے کروٹ لی تھی۔ مغل لشکر گاہ پر شب خون مارا گیا تھا۔ عبداللہ خان راجپوتوں کا قیدی بن گیا تھا اور اب ان کی قید سے رہائی پا کر دوبارہ لشکر گاہ میں آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ مغل لشکر نے جوابی کارروائی کے طور پر خان خاناں کی سرکردگی میں راجپوتوں پر یورش کر دی تھی۔

عبداللہ خان اور ذوالفقار خان کے گھوڑے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے سے شاہی خیمہ گاہ کے سامنے رکے۔ دو خدمت گار انہیں دیکھتے ہی آگے بڑھے اور انہوں نے ان دونوں کے گھوڑوں کی باگیں تھام لیں۔ عبداللہ خان ذوالفقار خان کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھا۔

شاہ عالم کو ان دونوں کے آنے کی اطلاع پہنچائی گئی اور پھر عبداللہ خان کا خیال درست ثابت ہوا۔ شاہ عالم نے ان کو ایک ہی ساتھ خیمہ خاص میں طلب کر لیا تھا۔ شاہ عالم کے خیمے میں داخل ہوتے وقت ذوالفقار خان نے اندر جانے میں پہل کی۔ عبداللہ خان نے اسے پہلے اندر جانے دیا۔ اس کے بعد

عبداللہ خان اندر پہنچا اور شاہی آداب کے مطابق تسلیمات بجالایا۔ ایسا ہی ذوالفقار خان نے کیا۔

شاہ عالم مسند پر تقریباً نیم دراز تھا اس کے چہرے پر کبیدگی کے آثار تھے۔ وہ غالباً اس وقت جاگنے اور خلاف توقع حالات پیش آنے کی وجہ سے کبیدہ خاطر تھا۔ اس کے باوجود اس نے مسکرا کر آنے والوں کا استقبال کیا اور ان دونوں ہی کو اپنے سامنے بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ دونوں دوزانو ہو کر اس کے سامنے مودب بیٹھ گئے۔ شاہ عالم پہلے عبداللہ خان سے مخاطب ہوا۔ ''عبداللہ خان! ہمیں تم ایسے بہادروں پر فخر ہے جو ہر وقت مستعد، بیدار اور چوکنا رہتے ہیں۔''

''حضور کی عزت افزائی ہے۔'' عبداللہ خان نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔

''تمہیں ہم نے اس لئے طلب کیا ہے کہ ہمارے خیال میں موجودہ حالات سے تم زیادہ باخبر ہو۔ ہم تفصیلات جاننے کے منتظر ہیں کہ تمہیں راجپوتوں کے شب خون مارنے کا علم بروقت کس طرح ہو گیا؟'' شاہ عالم نے دریافت کیا۔

عبداللہ خان کو شاہ عالم سے کسی ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔ وہ اسی لئے چند لمحے خاموش رہا پھر سنبھل کر جواب دیا۔ ''اے شاہ محترم! اکثر یوں ہوتا ہے کہ آپ کے اس خادم کو کوشش کے باوجود فوری طور پر نیند نہیں آتی۔ اسی صورت میں میں عموماً اپنے خیمے سے نکل کر چہل قدمی کرنے لگتا ہوں۔ آج شب بھی ایسا ہوا۔ میں چہل قدمی میں مصروف تھا کہ مجھے ایک سمت سے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیئے۔ میں سمجھا کہ شاید بے احتیاطی کی وجہ سے کسی خیمے میں آگ لگ گئی ہے لیکن اسی کے کچھ دیر بعد ایک اور سمت سے شعلے اٹھتے نظر آئے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ حضور واقف ہیں کہ عموماً خفیہ اشارات کے لئے بھی آگ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں تیزی سے راجا اجیت سنگھ کے خیمے کی طرف دوڑا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا تھا کہ کہیں راجپوت کوئی سازش کر کے راجا اجیت سنگھ کو تو رہا کرانا نہیں چاہتے! ابھی میں اس خیمے تک پہنچا ہی تھا کہ زبردست شور سنائی دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی راجا اجیت سنگھ کے خیمے کی اطراف کوئی محافظ موجود نہیں تھا۔ میں تیزی کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ خیمہ خالی تھا۔ میں خیمے سے باہر آیا اور اسی وقت میری نظر راجپوت مشعل برادروں پر پڑی جو مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے۔ وہ فرار ہو رہے تھے۔ اس افراتفری کے باوجود میں نے فوراً ایک خیمے کے سامنے بندھا ہوا گھوڑا کھولا اور فرار ہونے والوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ میرے ہمراہ وہ چند سپاہی بھی ہو لئے جو حقیقت حال سے واقف ہو چکے تھے۔'' عبداللہ خان نے پوری تفصیل بیان کر دی۔ پیش آنے والے واقعے میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس نے جھوٹ کی آمیزش کر دی تھی۔ اس طرح کہ پورا واقعہ قابل یقین معلوم ہو۔

''اس طرح تن تنہا راجپوتوں کے تعاقب میں روانہ ہونا یقیناً بڑی بے جگری کا کام تھا۔ ہم تمہارے بیان سے خوش ہوئے عبداللہ خان!'' شاہ عالم نے عبداللہ خان کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر مزید بولا۔ ''اپنا بیان جاری رکھو!'' شاہ عالم کا مقصد بقیہ واقعات کے بیان کرنے سے تھا۔

''حضور والا! میں عالم جوش میں اپنے سپاہیوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر بھگوڑے راجپوتوں کے پیچھے دوڑتا ہوا ایک پہاڑی درے میں داخل ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو راجپوتوں کی قید میں پایا۔ بعد میں اپنی جدوجہد اور ایک راجپوت لڑکی کی مدد سے میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔'' شاہ

عالم سے گفتگو کرتے ہوئے عبداللہ خان نے راجکماری کی موجودگی کا جواز آخر کار تلاش کر ہی لیا۔

''کیا یہ وہی راجپوت لڑکی ہے جو تمہارے ساتھ آئی ہے؟'' شاہ عالم نے سوال کیا۔ اس سوال کا مطلب یہی تھا کہ شاہ عالم کو بھی راجکماری کے بارے میں بتایا جا چکا تھا۔ اہم امیروں، منصب داروں اور حکومت کے معتبر عہدوں پر فائز افراد پر بادشاہ وقت کے مخبر نظر رکھتے تھے۔

''جی حضور! اس کا نام ساوتری ہے۔'' عبداللہ خان نے برجستہ جھوٹ بولا۔

''مگر تم اس راجپوت لڑکی کو اپنے ساتھ کیوں لے آئے؟'' شاہ عالم نے پوچھا۔

''یہ بات کسی طرح راز نہ رہتی عالم پناہ کہ میرے فرار میں اس لڑکی کا ہاتھ ہے۔ اگر وہ وہیں راجپوتوں کے درمیان رہ جاتی تو راجپوت یقیناً اسے قتل کر دیتے۔'' عبداللہ خان نے ایک جھوٹ کے جواز میں فوری طور پر دوسرا جھوٹ بولا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ بہت چوکنا تھا۔ شاہ عالم کے کسی سوال کا جواب دینے میں وہ اب تاخیر سے کام لینا نہیں چاہتا تھا تاکہ اس کے بیان پر جھوٹ کا شبہ نہ ہو۔ وہ رکے بغیر کہتا رہا۔ ''میں اسی لئے اس راجپوت لڑکی کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ دراصل اس کے باپ کو راجا اجیت سنگھ نے بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اسی وقت سے وہ راجا کی طرف سے متنفر تھی۔ اس کے باپ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ مغلوں سے ملا ہوا ہے۔ ساوتری کو اب راجپوتوں سے نفرت ہو چکی ہے اور وہ مغلوں کی حامی ہے۔ جب میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی تو وہ اسی لئے فوراً آمادہ ہو گئی۔ اس نے خود بھی یہی کہا تھا کہ اب اس کا راجپوتوں کے درمیان رہنا خطرناک ہے۔ وہ راجپوتوں کے درمیان رہنے کی بجائے یہ بہتر سمجھتی ہے کہ ان کے خلاف مغلوں کا ساتھ دے کر لڑتی ہوئی ماری جائے بہر حال یہ اس راجپوت لڑکی کے جذبات ہیں جو میں نے حضور کے روبرو بیان کر دیئے ہیں۔''

''کیا وہ لڑکی فن حرب سے بھی واقف ہے؟'' شاہ عالم نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں حضور!'' عبداللہ خان نے جواب دیا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ ایک بہترین شمشیر زن ہے۔''

''پھر تو ہم اس کی شمشیر زنی دیکھنا پسند کریں گے۔ آج شام ہی اس کا انتظام ہونا چاہئے۔'' شاہ عالم دلچسپی سے بولا۔

''حضور کے حکم کی تعمیل ہو گی۔'' عبداللہ خان نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔

''سنو عبداللہ خان! ان باتوں سے قطع نظر ہم نے تمہیں اور ذوالفقار خان کو ایک مشورہ طلب کرنے کے لئے بھی یاد کیا ہے۔'' شاہ عالم بولا۔

''ارشاد ہو ظل الٰہی! خادم ہمہ تن گوش ہے۔'' عبداللہ خان نے فرمانبرداری کا اظہار کیا۔ ایسے ہی الفاظ ذوالفقار خان نے بھی ادا کئے۔

''ہمیں تم سے یہ مشورہ طلب کرنا ہے کہ اب راجپوتانہ سے واپسی کا سفر اختیار کیا جائے یا مزید یہاں رک کر بچے کھچے راجپوتوں کا صفایا کیا جائے؟'' یہ کہتے ہوئے شاہ عالم نے ذوالفقار خان کی طرف بھی دیکھا جو اب تک گفتگو کے دوران میں خاموش ہی رہا تھا۔

عبداللہ خان کی نظریں بھی ذوالفقار خان کے چہرے پر تھیں۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ذوالفقار خان اس مشورے میں پہل کرنا نہیں چاہتا۔

اسی وقت شاہ عالم پھر بول اٹھا۔ ''ہمارا خیال ہے کہ تم دونوں کے کچھ کہنے سے قبل ہم مزید کچھ باتیں بطور وضاحت بیان کر دیں۔ اس سے پہلے ہم خان خاناں سے بھی اس مسئلے پر گفتگو کر چکے ہیں لیکن ہم نے انہیں تاکید کر دی ہے کہ اس گفتگو اور اپنی رائے کا کسی سے بھی ذکر نہ کریں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں اپنے خاص خاص امیروں سے الگ الگ مشورہ کریں اور کوئی امیر ایک دوسرے کی رائے یا مشورے سے متاثر ہوئے بغیر کھلی فضا میں گفتگو کرے۔ ہم نے ایسا اس لئے کیا کہ ذوالفقار خان کے توجہ دلانے پر ہمیں خود بھی یہ احساس ہوا کہ ہمیشہ خان خاناں اور تمہارا مشورہ ایک ہوتا ہے۔ عبداللہ خان! غالباً تم ہماری بات سمجھ رہے ہو!''

شاہ عالم کی بات سن کر عبداللہ خان چکرا گیا۔ اسی کے ساتھ اسے عیار ذوالفقار خان پر بھی غصہ آیا مگر وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے غصے پر قابو رکھتا۔ پھر بولا حضور والا خود محترم خان خاناں کی نیت اور جذبات سے آگاہ ہیں۔ محترم خان خانان حضور کے خیر خواہوں میں پیش پیش ہیں۔ اس خادم کے خیال میں محترم خان خاناں نے ہمیشہ حضور والا کو صائب مشورے دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس خادم نے ہمیشہ ان کی تائید کی ہے۔'' عبداللہ خان نے اپنی صفائی پیش کر دی۔

''ہم جانتے ہیں عبداللہ خان! تم نے درست کہا۔ بہرحال اس وقت ہم تمہیں خان خاناں کے مشورے سے لاعلم رکھ کر گفتگو کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم صرف تمہاری رائے جان لیں۔ اس سے ہمیں یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ خان خاناں اور تمہارے ذہن میں کتنی ہم آہنگی ہے اور بھی یہ کہ تم محض خان خاناں کی تائید ہی نہیں کرتے' حقیقتاً تمہاری وہی رائے ہوتی ہے جس کا تم اظہار کرتے ہو۔'' شاہ عالم نے کہا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہلے عبداللہ خان کے مشورے سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔

یہ لمحات عبداللہ خان کے لئے بڑے نازک تھے۔ وہ اس سے لاعلم تھا کہ شاہ عالم اور خان خاناں کے درمیان کیا بات ہو چکی ہے اور خان خاناں نے اس مسئلے میں بادشاہ کو کیا مشورہ دیا ہے! بہرحال اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

''حضور کا اقبال بلند ہو! راجپوت اب کافی عرصے تک سر اٹھانے کی جرات نہ کر سکیں گے۔ حضور کے خادم کی رائے میں یہاں مزید رکنا وقت کا زیاں ہے۔ اب حضور کو شہزادہ کام بخش کی طرف توجہ دینا چاہئے تاکہ یہ مسئلہ بھی ختم ہو جائے اور تخت کا کوئی دوسرا دعوے دار نہ رہے۔'' عبداللہ خان بولا۔

''ہم تمہاری فہم و فراست اور سمجھ بوجھ کے قائل ہو گئے عبداللہ خان! بخدا یہی مشورہ ہمیں خان خاناں نے دیا تھا۔'' شاہ عالم نے پر جوش آواز میں کہا۔

''اس ناچیز کی حوصلہ افزائی حضور کا کرم ہے۔'' عبداللہ خان ادب سے جھک کر بولا اور ٹھنڈا سانس بھرا۔ اندھیرے کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ اس نے چند لمحے غور کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ ان حالات میں خان خاناں نے شاہ عالم کو کیا مشورہ دیا ہوگا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

''تم کیا کہتے ہو ذوالفقار خان؟'' شاہ عالم اب ذوالفقار خان سے مخاطب ہوا جس کے چہرے

پر ناگواری کے اثرات تھے۔ وہ شاہ عالم کی زبان سے عبداللہ خان کی تعریف سن کر خوش نہیں ہوا تھا۔

''گستاخی معاف حضور!'' ذوالفقار خان بولا۔ ''میں ان دونوں حضرات کے مشورے سے اختلاف کرتا ہوں کیونکہ اتفاق سے میں اس مسئلے پر شہزادہ عالی عظیم الشان سے بھی گفتگو کر چکا ہوں۔ میری اور شہزادہ عالی کی رائے ایک ہے۔ جب تک راجپوتوں کا مکمل طور پر صفایا نہ کر دیا جائے مغل لشکر یہیں راجپوتانہ میں رہے۔ اب اگر نہیں تو راجپوت کچھ دن بعد سر اٹھائیں گے جیسا کہ پہلے بھی تجربہ ہو چکا ہے۔ اگر پہلی بار ہی ان کا مکمل تدارک کر دیا جاتا تو اب حضور کو دوبارہ ادھر کا رخ کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ حضور کو شاید اب بھی یاد ہو کہ پہلی بار بھی حضور کے اس خادم نے انہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ پھر موجودہ صورتحال میں جب کہ باغیوں کا سرغنہ راجا اجیت سنگھ فرار ہو چکا ہے یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں کہ راجپوتوں کو ان کی من مانی کرنے کے لئے چھوڑ کر چل دیا جائے۔ خادم کے خیال میں اگر ایسا کیا گیا تو اس بار پہلے سے بھی کم مدت میں راجپوت شورش برپا کر دیں گے۔ بطور خاص موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ مزید سرکش ہو جائیں گے۔ یہ انکے لئے بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ شاہی قید سے اپنے راجا کو چھڑا کر لے گئے۔ اس کامیابی کا نشہ انہیں شیر بنا دے گا۔'' ذوالفقار خان نے پر جوش لہجے میں اپنی بات ختم کی۔

ذوالفقار خان کی بات سن کر شاہ عالم کے چہرے پر تذبذب کا اظہار ہونے لگا۔ عبداللہ خان کو اس وقت شاہ عالم پر بڑا رحم آیا۔ وہ ایک ایسا بادشاہ تھا' ایسا بااختیار فرماں روا تھا جس کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔

چند لمحے شاہ عالم خاموش رہا پھر بولا۔ ''کیا واقعی شہزادہ عظیم الشان یہاں مزید رکنے کے حق میں ہیں؟''

''حضور والا خود اس سلسلے میں شہزادہ عالی سے دریافت کر سکتے ہیں۔'' عبداللہ خان کی طرف طنزیہ انداز میں دیکھ کر ذوالفقار خان مسکراتے ہوئے بولا۔

''پھر ٹھیک ہے ہم پہلے شہزادے سے گفتگو کر لیں اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔'' شاہ عالم نے کہا۔

''حضور یہ بھی غور فرمائیں کہ فتح و شکست سے قطع نظر یہ معاملہ مغلوں کے وقار کا بھی ہے۔'' ذوالفقار خان نے اپنی رائے کے حق میں ایک اور دلیل پیش کی۔ ''اگر اس وقت سرکش راجپوتوں کو نیست و نابود نہ کیا گیا تو ان کے دل پر کبھی مغلوں کی دھاک نہ بیٹھ سکے گی۔ حضور خود سوچیں کہ ان کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ وہ حضور کے ایک امیر عبداللہ خان کو قید کر کے لے گئے۔ وہ تو خدا نے خیر کر دی کہ ایک راجپوت لڑکی نے عبداللہ خان کو بچا لیا ورنہ خاکم بہ دہن وہ عبداللہ خان کو بھی قتل کر سکتے تھے۔'' ذوالفقار خان کے لہجے سے عیاری ظاہر ہو رہی تھی۔

ذوالفقار خان کی بات پر عبداللہ خان کا خون کھول اٹھا اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ذوالفقار خان کی بات کا مقصد صرف عبداللہ خان کی توہین کرنا تھا۔ اگر اس وقت شاہ عالم نہ ہوتا تو عبداللہ خان اسے منہ توڑ جواب دیتا۔ کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد شاہ عالم نے ان دونوں کو رخصت کی اجازت

دے دی۔

خیمے سے باہر نکلتے ہی عبداللہ خان اپنے حریف پر برس پڑا۔ ''ذوالفقار خان! اپنی اوقات میں رہا کرو!''

''کیا مطلب......؟ تم کون ہوتے ہو میری اوقات یاد دلانے والے!'' ذوالفقار خان بھی بر ہو گیا۔

''میں کون ہوں اور کون نہیں یہ تمہیں وقت بتائے گا ذوالفقار خان! وقت جو سب سے بڑا منصف ہے اور جو بڑے بڑے پرغرور سروں کو جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ تمہیں شاید ابھی وقت کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔'' عبداللہ خان زہریلے لہجے میں بولا اور اس خدمت گار کی طرف بڑھ گیا جو اس کا گھوڑا لئے کھڑا تھا۔

راستے میں ایک بار پھر ذوالفقار خان اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا عبداللہ خان کے قریب آ گیا اور بولا۔ ''اگر اب سارے لشکر میں یہ افواہ گرم ہو جائے کہ تمہیں راجپوتوں کی قید سے ایک لڑکی نے بچایا ہے اور تم صرف ایک لڑکی کا نازک سہارا لے کر موت کے منہ سے بچے ہو تو مجھے الزام نہ دینا کیونکہ تم خود اپنی زبان سے اس بات کا اعتراف کر چکے ہو۔''

''دیکھ ذوالفقار خان! اگر تم نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی اور باز نہ آئے تو تمہارے حق میں بہتر نہیں ہو گا!'' عبداللہ خان نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا......! تو اب تم اس قابل ہو گئے کہ امیر الامرا اسد خان کے فرزند میر بخشی ذوالفقار خان کو دھمکیاں دینے لگو!'' یہ کہتے ہوئے ذوالفقار خان کا ہاتھ تیزی کے ساتھ اپنی تلوار کے قبضے کی طرف گیا۔

عبداللہ خان بھی غافل نہیں تھا۔ وہ ذوالفقار خان سے پہلے اپنی تلوار بے نیام کر چکا تھا۔

''تم اگر یہی چاہتے ہو ذوالفقار خان تو پھر آج فیصلہ ہو ہی جائے!'' عبداللہ خان نے اپنی تلوار بلند کر لی۔

☆......☆......☆

خلاف توقع ذوالفقار خاں کے چہرے کا تناؤ اچانک ختم ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اسی کے ساتھ اس کا ہاتھ تلوار کے قبضے سے ہٹ گیا۔ وہ بہرحال اس شخص کا بیٹا تھا جو مغلوں کے عہد زریں کا گھاگ سیاست داں کہلاتا تھا! چند ہی لمحوں میں اس نے اپنے غصے پر قابو پا لیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ مقابلے کیلئے للکارے جانے کے باوجود اس نے ضبط سے کام لیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہر معاملے میں صرف تلوار فیصلہ کن ثابت نہیں ہوتی۔ بظاہر جواباً اس کا اپنی تلوار بھی بے نیام نہ کرنا بزدلانہ فعل لگتا تھا مگر وہ ذوالفقار خاں تھا' غیر معمولی شخص! اس کے نزدیک یہ بزدلانہ فعل کے بجائے دانش مندانہ فعل تھا۔

اپنے حواس پر قابو پاتے ہی اس نے گھوڑا دوڑاتے ہوئے عبداللہ خاں کی طرف نگاہ کی اور نرم آواز میں بولا۔ ''ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ عبداللہ خاں' اپنی تلوار نیام میں رکھ لو!'' یہ کہتے ہی وہ حیرت زدہ عبداللہ خاں کو دیکھ کر زور سے ہنس پڑا۔ عبداللہ خاں کو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ایک گرگٹ کی طرح رنگ بدل لے گا اور مقابلے پر آمادہ نہیں ہو گا۔ پھر عبداللہ خاں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ بول اٹھا۔ ''میری جان! ابھی تم بچے ہو' بالکل طفل مکتب! تمہیں تو جھوٹ بولنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ جن لوگوں نے اس قتالہ عالم کو دیکھا ہے اور میرے سامنے اس کا حلیہ بیان کیا ہے' وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ پری رو کوئی عام راجپوت لڑکی نہیں ہے۔ اس کا تعلق راجا اجیت سنگھ سے لگتا ہے۔ وہ راجا ہی کے خاندان کی ایک فرد معلوم ہوتی ہے ورنہ اس کے جسم پر راجکماریوں ایسا بہترین لباس نہ ہوتا۔ وہ لڑکی یقیناً راجا اجیت سنگھ کی بیوی' بہن یا کوئی قریبی عزیز ہے۔ سنو! عبداللہ خاں میں اگر چاہتا تو بادشاہ کے سامنے تمہارا بھانڈا پھوڑ سکتا تھا۔ باتوں باتوں میں بادشاہ کو میں اس بات پر آمادہ کر سکتا تھا کہ اسی وقت لڑکی کو بلا کر اس سے تمہارے بیان کی تصدیق کی جائے' مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اب تو تم سمجھ گئے کہ تم ہر وقت میری زد پر رہتے ہو۔ میں جب چاہوں تمہیں ذلیل وخوار کر سکتا ہوں' لیکن اب تک میں نے ایسا کرنے سے اجتناب کیا ہے کہ شاید تم راہ راست پر آ جاؤ اور اس بوڑھے کو چھوڑ کر مجھ سے مل جاؤ۔ اب کچھ عقل آئی!'' یہ کہتے ہوئے عبداللہ خاں کے گھوڑے سے ذوالفقار نے اپنا گھوڑا اور قریب کر لیا۔

ذوالفقار کی گفتگو ہی کے دوران میں عبداللہ خاں نے اپنی تلوار نیام میں رکھ لی تھی۔ اگر ذوالفقار نبرد آزمائی سے گریز کر رہا تھا تو وہ بھی بلا سبب بات بڑھانے کے حق میں نہیں تھا۔ یوں بھی پہل ذوالفقار خاں ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ پہلے اسی کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر گیا تھا۔ عبداللہ خاں نے

اب یہ اعتراف کرلیا تھا کہ ذوالفقار خاں واقعی شیطانی ذہانت کا مالک تھا۔ اس کی باتوں نے عبداللہ خاں کے ہوش اڑا دیئے تھے۔

ذوالفقار خاں کے قیاسات حیرت انگیز طور پر درست تھے۔ اس کا یہ کہنا بھی درست تھا کہ اگر وہ چاہتا تو عبداللہ خاں کو جھوٹا ثابت کرسکتا تھا لیکن اس کے باوجود عبداللہ خاں اس سے اشتراک پر ہرگز آمادہ نہیں تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر پراطمینان لہجے میں بولا۔ ''تم نے مجھے جو مفروضہ کہانی سنائی ہے' اس کا ایک لفظ بھی صحیح نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہے ذوالفقار خاں کہ تم اتنے کم عقل ہو!'' عبداللہ کو بہرحال اس کے خیالات کی تردید تو کرنا ہی تھی۔ ''ویسے اگر تم اس خام خیالی میں مبتلا ہو کہ میں ہر وقت تمہاری زد پر ہوں تو آئندہ اپنی حسرت ضرور نکالنا! میری طرف سے تمہیں پوری آزادی ہے۔''

''جلد بازی نہیں عبداللہ خاں! تم نے سوچ بھی لیا ہے کہ تم کسے مقابلے پر آنے کی دعوت دے رہے ہو؟'' ذوالفقار کا لہجہ پھر بدل گیا۔

''ہاں میں اچھی طرح واقف ہوں کہ میرے مقابل کون ہے اور اس میں کتنا دم خم ہے'' عبداللہ خاں بھی جواباً سخت لہجے میں بولا۔

'' افسوس تو یہی ہے کہ ابھی تم ذوالفقار خاں سے واقف نہیں ہو کہ وہ کیا شے ہے! بہرحال میں اپنی طرف سے تمہیں سوچنے کا ایک اور آخری موقع دیتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں یہ حق نہیں ہوگا کہ مجھ سے شکوہ کرسکو' یہ کہہ کر ذوالفقار خاں اپنا گھوڑا آگے بڑھا لے گیا اور عبداللہ خاں کھولتا رہ گیا۔

اپنے خیمے میں آتے ہی عبداللہ خاں کو اطلاع ملی کہ خان خاناں' راجپوتوں کو دور تک کھدیڑ کر واپس آچکا ہے۔ اسے یہ خبر بھی ملی کہ راجا اجیت سنگھ اور بہت سے راجپوت سردار فرار ہوگئے ہیں' اس کے علاوہ خان خانان کچھ راجپوت سرداروں اور بہت سے سپاہیوں کو قید کرلایا ہے۔ خان خاناں کو عبداللہ خاں کے بارے میں بھی معلوم ہوچکا تھا کہ وہ بخیریت واپس آچکا ہے۔ عبداللہ خاں کے خدمت گار امیر اللہ نے اسے بتایا کہ خان خاناں اس سے ملنے کا مشتاق ہے۔ عبداللہ خاں نے خدمت گار کے ذریعے خان خاناں کو پیغام بھجوا دیا کہ میں بے حد تھکا ہوا ہوں اور کچھ دیر آرام کے بعد ہی خود آپ سے ملوں گا۔

امیر اللہ کے جاتے ہی عبداللہ خاں خیمے کے اندرونی حصے میں داخل ہوگیا۔ راجکماری پر نظر پڑتے ہی اسے ذہن میں ذوالفقار خاں کے جملے گونجنے لگے۔ واقعی راجکماری کو اس لباس فاخرہ میں دیکھ کر کوئی بھی شخص بہت آسانی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کوئی راجکماری ہے یا اس کا قریبی تعلق راجپوتوں کے حکمران خاندان سے ہے۔ عبداللہ خاں کو اندر آتے ہوئے دیکھ کر راجکماری اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی تک بیدار تھی۔ راجکماری کی حفاظت کرنے کیلئے اب یہ سب سے زیادہ ضروری تھا کہ عبداللہ خاں نے شاہ عالم کو اس کے بارے میں جو کہانی سنائی تھی' اسے بھی اس کہانی سے آگاہ کر دیا جاتا تاکہ بعد میں عبداللہ خاں جھوٹا ثابت نہ ہوتا۔ یہ سوچ کر عبداللہ خاں اطمینان سے راجکماری کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

''سنو راجکماری! میں نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں یہاں لانے کی غلطی کی ہے۔ یہ غلطی میرے اور تمہارے لئے شدید خطرہ بن سکتی ہے اس لئے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' اسے پوری توجہ سے سنو! اسی میں تمہاری اور میری بہتری ہے۔'' عبداللہ خاں نے سنجیدہ لہجے میں راجکماری کو مخاطب کیا۔

''کہو! میں پوری سنجیدگی سے تمہاری بات سنوں گی۔ رہی خطرے کی بات تو اس کا احساس مجھے پہلے سے ہی تھا۔'' راجکماری بولی۔

''وہ کیسے؟'' عبداللہ خاں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں جس کیلئے کسی اعلیٰ ذہانت کی ضرورت ہو۔ سیدھی سی بات ہے کہ مغلوں اور راجپوتوں کے درمیان خون ریز معرکے ہوچکے ہیں۔ ان معرکوں کا سرغنہ میرا شوہر تھا۔ تم اس شخص کی بیوی کو لے کر آئے ہو جو مغلوں کا دشمن ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہاں ہر وقت میری زندگی خطرے میں ہی ہوسکتی ہے۔ جیسے ہی بادشاہ کو میرے بارے میں علم ہو' وہ میرے قتل کا حکم دے دے گا۔'' راجکماری دھیمی اور پرسکون آواز میں بولی جیسے اسے اپنے قتل ہونے کی کوئی پروا نہ ہو' اس کی نظر میں اپنے قتل کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

عبداللہ خاں اس بہادر راجپوت لڑکی کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس نے انکشاف کیا۔ ''بادشاہ کو تمہارے بارے میں علم ہوچکا ہے راجکماری!'' عبداللہ خاں کے اس انکشاف پر راجکماری نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا تو وہ مزید بولا۔ ''تمہاری نظر میں اپنی زندگی کی کوئی اہمیت ممکن ہے کہ نہ ہو لیکن راجکماری' عبداللہ خاں کیلئے تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے۔''

''تو پھر کیا تم میری خاطر اپنے بادشاہ سے بغاوت کر دو گے؟ راجکماری نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔''

''نہیں' اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' عبداللہ خاں نے نرمی سے جواب دیا۔

''پھر تمہیں کس طرح یقین ہے کہ تم مجھے مرنے سے بچالو گے؟ کیا بادشاہ پر تمہارا اتنا ہی اثر ہے کہ وہ تمہارے کہنے پر میری جان بخشی کر دے؟''

''اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں کہ میں اس سلسلے میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کروں۔ تم شاید پورے حالات سے واقف نہیں ہو۔ بادشاہ کے امیروں میں جہاں میرے دوست ہیں' وہیں میرے دشمن بھی ہیں۔ ان حالات میں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ بادشاہ میری بات مان ہی لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہیں بچانے کیلئے دوسرا طریقہ سوچا اور وہی میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔'' عبداللہ خاں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور پھر راجکماری کو بتانے لگا۔ 'سنو! راجکماری! اب سے تمہارا نام راجکماری انیتا نہیں بلکہ تم ایک معمولی راجپوت لڑکی ہو۔ تمہارا نام ساوتری ہے۔'' اس کے بعد عبداللہ خاں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس کے متعلق شاہ عالم سے کہہ چکا تھا۔

عبداللہ خاں کی باتیں سن کر راجکماری کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''اور اگر میں تمہاری ان باتوں کو ماننے سے انکار کردوں؟''

''تو میں سمجھوں گا کہ تم خودکشی کرنا چاہتی ہو۔'' عبداللہ خاں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم میری زندگی کیوں بچانا چاہتے ہو؟'' راجکماری نے بڑے بھول پن سے دریافت کیا۔

''کیا اب اس سوال کی گنجائش رہ گئی ہے؟'' عبداللہ خاں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے

ہاتھ میں لے کر سہلانا شروع کر دیا۔ پھر اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اس کے سلگتے ہوئے ہونٹ راجکماری کے ہاتھ کی پشت تک پہنچ گئے۔ راجکماری نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''ہاں وہ تم کیا کہہ رہے تھے کہ تمہارا بادشاہ میری شمشیر زنی دیکھنا چاہتا ہے؟'' راجکماری نے بات بدلنے کیلئے پوچھا۔

''ہاں۔ آج شام تمہیں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا ہے۔'' عبداللہ خاں نے بتایا۔

''کیا اسی لباس میں؟'' راجکماری نے عبداللہ خاں کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اسے احمق سمجھ رہی ہو۔

''نہیں۔ لباس کا انتظام ہو جائے گا۔ تمہیں اب معمولی کپڑوں میں رہنا ہے۔''

''اور ان لوگوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جنہوں نے مجھے اس لباس میں یہاں آتے دیکھا ہے۔''

''وہ رات کا وقت تھا اور لوگوں کو جھٹلایا بھی جا سکتا ہے'' یہ کہہ کر عبداللہ خاں نے اسے ذوالفقار کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ اس کے خیال میں راجکماری کو ذوالفقار خاں کی طرف سے چوکنا کرنا بہت ضروری تھا۔ وہ کہنے لگا' ذوالفقار خاں میر بخشی ہے اور میرا حریف بھی! وہ بھی بادشاہ کے اتنا ہی قریب ہے جتنا میں ہوں۔ اس نے میری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اور مجھ سے مصالحت کی خاطر ہی اسی دن مجھے اپنے خیمے میں بلایا تھا جس دن وہ واقعہ ناخوشگوار پیش آیا۔ تمہاری بہن گیتا اور رکمنی کو اس نے ہی جنگی قیدیوں کے خیمے سے بہ غرض عیاشی اپنے خیمے میں اٹھوا لیا تھا۔ پھر جب میں بھی وہاں پہنچ گیا تو اس نے مجھے عیاشی کی پیش کش کی میں اپنے بارے میں تمہیں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ مرد کی کمزوری عورت ہے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا' ہر چند کہ میں ذوالفقار خاں سے مصالحت کرنے پر آمادہ نہیں تھا تو سنو! اگر میں وہاں نہ پہنچتا تو بھی تمہاری بہن گیتا کے ساتھ وہی ہوتا جو ہوا۔ فرق صرف اتنا ہوتا کہ میری جگہ ذوالفقار خاں' گیتا کو پامال کرتا۔ بہر حال اس کے باوجود بھی مجھے تمہاری بہن کی آبرو لٹنے اور موت پر دکھ ہے۔ یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ تم مجھے بے قصور سمجھو بلکہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اصل مجرم اور قصور وار ذوالفقار خاں ہے۔ یہ بات میں نے راجا اجیت سنگھ کو بھی بتائی تھی۔ ذالفقار خاں' عیاش' لالچی' حریص اور کینہ پرور ہے۔ اسے بھی علم ہو چکا ہے کہ میں تمہیں ہمراہ لایا ہوں۔ اس سازشی کو اس کہانی پر بھی شک ہے جو میں نے تمہارے بارے میں بادشاہ کو سنائی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آدمیوں نے اسے تمہارا جو حلیہ بتایا تھا' اس سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکتا تھا کہ تم یا تو راجا کی بیوی یا بہن ہو یا اس کی کوئی قریبی عزیز ہو۔ وہ سازشی اور عیاش تمہارے معاملے میں مجھ سے یہ چاہتا ہے کہ میں اسے بھی حصے دار بنا لوں۔ میں نے تمہیں اس کے بارے میں پوری تفصیل اس لئے بتائی ہے کہ تم اس کی طرف سے محتاط اور چوکنا رہ سکو۔'' عبداللہ خاں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''آج شام جب میں تمہارے بادشاہ کے سامنے شمشیر زنی کا مظاہرہ کروں گی تو کیا وہ ذوالفقار خاں بھی ہوگا؟'' راجکماری نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

''ہاں وہ یقیناً ہوگا' مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟'' عبداللہ خاں اس کا مقصد کسی قدر سمجھنے کے

باوجود پوچھنے لگا۔

''فی الحال یہ نہ پوچھو اور یہ بتاؤ کہ مجھے اس وقت کس طرح یہ معلوم ہو سکتا ہے'' ذوالفقار خاں کون سا ہے؟'' راجکماری نے عبداللہ خاں کے سوال کو نظر انداز کر کے دریافت کیا۔

''نہیں۔ ہرگز نہیں! میں تمہیں کسی بھی صورت میں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم اپنی زندگی خطرے میں ڈالو۔'' عبداللہ خاں نے راجکماری کی بات کے مقصد کو سمجھتے ہوئے کہا۔

''تم غالباً کچھ غلط سمجھ رہے ہو۔'' راجکماری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''میرا ارادہ اس پر قاتلانہ حملہ کرنے کا نہیں ہے۔''

''پھر آخر تم کیا چاہتی ہو؟'' عبداللہ خاں نے سوال کیا۔

''ابھی تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ میں اس کی طرف سے محتاط اور چوکنا رہوں۔ تو جب میں اسے پہچانوں گی ہی نہیں تو اس سے ہوشیار کیسے رہوں گی!''

''باتیں خوب بنانا آتی ہیں تمہیں! میں سمجھ چکا ہوں کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہوں! تمہارا چہرہ چغلی کھا رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

عبداللہ خاں کی بات پر راجکماری ہنس پڑی' پھر بولی۔ ''تم نے کہا کہ ذوالفقار خاں تمہارا حریف ہے تو کیا تم اسے ذلیل و رسوا ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے؟''

''وہ کس طرح؟ صاف صاف بات کرو تم کیا کہنا چاہتی ہو!''

''میں اسے شمشیر زنی کی دعوت دوں گی۔'' راجکماری نے اصل بات بتا ہی دی۔

''نہیں' وہ تمہارے بس کا نہیں ہے۔ ہرگز نہیں! وہ بہت گھاگ ہے۔ پھر یہ کہ تمہارا مقابلہ شاہی شمشیر زنوں سے ہوگا۔ ''عبداللہ خاں کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''اور اگر تمہارے شاہی شمشیر زن مجھ سے مقابلے میں شکست کھا گئے تو؟ راجکماری' عبداللہ خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔''

''اول تو یہ ممکن نہیں اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس کے بعد یہ تماشا ختم کر دیا جائے گا۔'' عبداللہ خاں نے بتایا۔

''لیکن اگر میں نے خود بادشاہ سے یہ درخواست کی کہ میں اب اس کے کسی امیر سے بھی مقابلہ کرنے کی خواہش رکھتی ہوں تو پھر؟''

''تم ایسا نہیں کرو گی!'' عبداللہ خاں کو اس پر غصہ آنے لگا۔ وہ خواہ مخواہ اپنی زندگی سے کھیلنا چاہتی تھی۔

''اور تم مجھے ایسا کرنے سے روک بھی نہیں سکتے'' راجکماری کا لہجہ بھی قطعی تھا۔

''میں تمہیں یہ جاننے ہی نہیں دوں گا' یہ بتاؤں گا ہی نہیں کہ بادشاہ کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ذوالفقار خاں کون ہے؟''

''تو پھر دیکھا جائے گا۔ آج نہ سہی تو پھر کبھی سہی!'' اچانک راجکماری نے ہتھیار ڈال دیئے اور عبداللہ خاں کو اس پر تعجب ہوا۔

اس وقت عبداللہ خاں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔اس کی آنکھوں میں نیند کروٹیں لینے لگی اس لئے اس نے راجکماری سے مزید گفتگو مناسب نہ سمجھی اور اسے سونے کی تاکید کر کے خیمے کے بیرونی حصے میں آ گیا۔اس نے امیر اللہ کو بلوا کر اسے لباس فراہم کرنے کیلئے کہا۔امیر اللہ' خان خاناں کے خیمے سے لوٹ آیا۔لشکر گاہ میں زنانہ لباس صرف دو خیموں سے حاصل ہو سکتا تھا۔ایک تو شاہی خیمے سے دوسرے خان خاناں کے خیمے سے۔خان خاناں بھی اپنی مستورات کو ساتھ لایا تھا۔ عبداللہ خاں کا حکم سن کر امیر اللہ ایک بار پھر خان خاناں کے خیمے کی طرف چلا گیا اور عبداللہ خاں تکیہ سر کے نیچے رکھتے ہی سو گیا۔

جو لوگ دن کے وقت سونے کے عادی نہیں ہوتے انہیں کم نیند آتی ہے۔عبداللہ خاں بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھا اس لئے وہ دوپہر ہونے تک بیدار ہو گیا۔ جاگتے ہی اس نے خیمے کی اندرونی سمت کا رخ کیا۔راجکماری ابھی تک محو خواب تھی۔وہ حسن خوابیدہ کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔راجکماری سوتے ہوئے اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ اس نے راجکماری کو سونے دیا اور امیر اللہ کو سلفچی لانے کا حکم دیا۔امیر اللہ نے اس کا منہ ہاتھ دھلواتے ہوئے بتایا کہ وہ لباس لے آیا ہے۔ اس نے تاکید کی تھی کہ لباس ذرا پرانا ہونا چاہئے۔جب اس نے امیر اللہ کالایا ہوا لباس دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔امیر اللہ نے اس کی ہدایت کا خیال رکھا تھا۔لباس اس کی مرضی کے مطابق تھا۔ خان خاناں کے حرم میں دو ہندو لڑکیاں بھی تھیں۔ یہ لباس انہی میں سے کسی کا تھا۔

منہ ہاتھ دھو کر عبداللہ خاں نے خدمت گار کو کھانا لگانے کا حکم دیا اور لباس لے کر دوبارہ خیمے کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ اس نے جھک کر راجکماری کے آتشیں رخسار پر اپنے پیاسے ہونٹ رکھ دیئے۔راجکماری ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر عبداللہ خاں کو اپنے روبرو دیکھ کر برا سا منہ بنا کے رہ گئی۔

''تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے عبداللہ خاں!'' وہ غصے میں بولی مگر اس میں بھی عجیب سی لگاوٹ تھی جسے عبداللہ خاں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے مسکرا کر حافظ شیرازی کی غزل کا ایک شعر پڑھا۔اس وقت اس کی نگاہیں راجکماری کے ٹھوڑی کے گڑھے پر تھیں۔شعر یہ تھا۔

اے فروغ ماہ حسن از روئے رخشان شما
آبروئے خوبی از چاہ زنخدان شما

شعر کا مطلب یہ تھا۔اے وہ کہ حسن کے چاند کی رونق تمہارے روئے روشن سے ہے' خوب صورتی کی آبرو تمہاری ٹھوڑی کے گڑھے سے ہے۔

اس وقت اسے معلوم ہوا کہ راجکماری فارسی بخوبی جانتی ہے۔ اکثر راجپوت گھرانوں میں اس وقت فارسی زبان پڑھائی جاتی تھی۔راجکماری نے عبداللہ خاں کے شعر کا جواب حافظ شیرازی کا ایک شعر پڑھ کر دیا۔

تو مگر برلب جوئے زہوس پیشینی
ورنہ ہر فتنہ کی بنی ہمہ از خود بینی

یعنی تو شاید ہوس کی وجہ سے نہر کے کنارے پر بیٹھتا ہے ورنہ جو فتنہ تو دیکھتا ہے خود تیری ہی وجہ سے ہے۔

شعر سن کر عبداللہ خاں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے بے اختیار راجکماری کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور اس کے لب و رخسار پر اپنے بوسے نچھاور کر دیئے۔ راجکماری کسمسائی اور تڑپ کر اس کی آغوش سے نکل گئی' پھر بولی۔''بس بس حد میں رہو' حد سے آگے نہ بڑھو!''

''اچھ چلیے راجکماری جی' آپ فوراً ایک معمولی لڑکی بن جایئے! ہر چند کہ یہ لباس بھی قیمتی ہے لیکن بہرحال اس لباس سے کم از کم آپ راجکماری نہیں لگیں گی۔'' عبداللہ خاں نے لباس اس کی طرف بڑھا دیا۔راجکماری نے ہاتھ آگے بڑھا کر لباس لے لیا لیکن جب عبداللہ خاں وہیں موجود رہا تو اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ یہ دیکھتے ہی عبداللہ خاں اٹھ کھڑا ہوا' اور بولا''اچھا اچھا بس منہ نہ بناؤ! میں جا رہا ہوں۔ میں تو محض اس لئے رکنا چاہتا تھا کہ کچھ اور نہیں تو فی الحال شربت دیدار ہی سے فیضیاب ہو سکوں۔''

اچھا اب جا بھی چکو زیادہ عشق نہ جھاڑو وہ ہنس پڑی اور عبداللہ خاں خیمے کے بیرونی حصے میں آ گیا۔

امیر اللہ دستر خوان بچھا کر کھانا لگا رہا تھا۔ عبداللہ خاں نے اس سے کہا۔''کھانا لگا کر سلفچی لے جانا۔وہ بھی منہ دھوئیں گی۔''

''بہتر ہے حضور!''امیر ادب سے سر جھکا کر بولا۔

کچھ دیر کے بعد عبداللہ خاں نے راجکماری کو وہیں سے آواز لگائی۔''خدمت گار کو پانی لے کر بھیج دوں' منہ دھونے کے لئے!''

''میں باہر ہی آ رہی ہوں۔'' راجکماری نے کہا اور پردہ اٹھا کر باہر آ گئی۔

''راجکماری کے جسم پر موجودہ لباس حالانکہ کسی راجکماری کے شایان شان نہیں تھا مگر لعل تو گدڑی میں بھی نہیں چھپتے۔ وہ اس معمولی لباس میں بھی قیامت ڈھا رہی تھی۔ امیر اللہ نے اس کا منہ دھلوایا' پھر وہ منہ پونچھ کر عبداللہ خاں کے قریب بیٹھ گئی۔''

''میں نے زندگی میں بس ایک بار گوشت کھا کر دیکھا ہے۔خیر آج بھی سہی!'' راجکماری یہ کہہ کر کھانا کھانے لگی۔

کھانے سے فراغت پا کر عبداللہ خاں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔''میں وزیر سلطنت خان خاناں سے مل آؤں۔ جب تک تم مزید آرام کر لو تو اچھا ہی ہے۔تمہیں آج اپنی شمشیر زنی کے فن کا مظاہرہ بھی کرنا ہے اس لئے تم جتنی دیر آرام کر لو بہتر ہی ہے۔'' یہ کہتے ہی عبداللہ خاں خیمے کے در کی طرف بڑھ گیا۔

''خان خاناں' عبداللہ خاں سے ملنے کو بے تاب تھا۔عبداللہ خاں نے اسے مختصر پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ پھر وہ بولا۔'' مگر اس لڑکی کا کیا ہو گا جسے تم اپنے ساتھ لے آئے ہو؟''

''ہونا کیا ہے! وہ میرے ساتھ رہے گی۔'' عبداللہ خاں نے جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہوا تھا کہ ابھی کچھ دیر قبل تمہارا خدمت گار زنانہ لباس لینے آیا تھا۔آخر اس کی کیا

ضرورت پڑ گئی۔ خان خاناں کے لہجے میں شک تھا۔''

''آپ سے بھی' کمال ہے ارے اس کا لباس پھٹ گیا تھا۔'' عبداللہ خاں نے بات بنا دی مگر بات بنی نہیں۔

''مگر کیسے ایسا کس طرح ہو گیا؟'' خان خاناں بال کی کھال نکالنے لگا۔ اس کا لباس کیسے پھٹ گیا اس طرح کہ پہننے کے قابل بھی نہ رہا!''

''میں نے کم از کم نہیں پھاڑا اس کا لباس!'' عبداللہ خاں جھنجھلا گیا۔

''خیر لعنت بھیجو اس بات پر!'' عبداللہ خاں کو جھنجلایا ہوا دیکھ کر خان خاناں بولا اور پھر بات بدلنے کیلئے کہنے لگا۔ ''اور یہ مقابلے کا کیا چکر ہے؟ میں نے سنا ہے کہ آج وہ راجپوت لڑکی' شاہی شمشیر زنوں سے مقابلہ کرے گی۔''

''جی ہاں۔ یہ آپ کے بادشاہ سلامت کی خواہش ہے۔ میرے منہ سے ان کے سامنے نکل گیا تھا کہ وہ راجپوت لڑکی شمشیر زنی بھی جانتی ہے۔'' عبداللہ خاں نے بتایا۔ اس کے بعد عبداللہ خاں اور خان خاناں کے درمیان موجودہ حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔ عبداللہ خاں نے اسے اپنے اور بادشاہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے بھی آگاہ کر دیا۔ خان خاناں نے یہ گفتگو توجہ سے سنی۔

''ایسی صورت میں تو یہی امکان ہے کہ یہاں رکنا پڑے۔'' خان خاناں پوری بات سن کر کہنے لگا۔ ''ذوالفقار خاں کی رائے سے شہزادے عظیم الشان کے متعین ہونے کا مطلب تو یہی ہے۔ بادشاہ محترم شہزادے کی رائے سے ہی اتفاق کریں گے۔ بہرحال جو بھی ہو لیکن ذوالفقار خاں اور شہزادے کا گٹھ جوڑ ضرور معنی خیز ہے۔ ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا۔ اس طرح تو ذوالفقار خاں کا پلہ ہمارے مقابلے میں بھاری ہو جائے گا۔''

''خان خاناں سے اسے مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد عبداللہ خاں لوٹ آیا۔ اپنے خیمے میں پہنچ کر اسے خیال آیا کہ کم از کم یہ تو دیکھ لے' راجکماری میں کتنے کس بل باقی ہیں! کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ واجبی سی شمشیر زنی جانتی ہو! حالانکہ اس کی گفتگو سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس فن میں ماہر ہے۔ یہ سوچ کر اس نے دو تلواریں لیں اور خیمے کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ راجکماری اسے دیکھ کر لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھی۔

عبداللہ خاں نے ایک تلوار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آؤ ذرا دو دو ہاتھ ہو جائیں تم سے! پتا تو چلے کہ تم کتنے پانی میں ہو!'' اس نے عبداللہ خاں کے ہاتھ سے تلوار لے لی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آزمانا چاہتے ہو!'' چلو یونہی سہی! ایک وہ زمانہ تھا کہ میں تمہیں شمشیر زنی کرتے دیکھ کر رشک کیا کرتی تھی اور آج... آج یہ دن بھی آ گیا کہ تم ہی سے...''

''خیر پچھلی باتیں چھوڑو!'' عبداللہ خاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے نیام سے تلوار باہر کھینچ لی' پھر بولا۔ ''آؤ وقت کم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ دو ایک گر تمہیں سکھا دوں۔ میری خواہش ہے کہ اگر تم شاہی شمشیر زنوں کو زیر نہ بھی کر سکو تو آسانی سے شکست نہ کھاؤ۔''

''مجھے گر سکھانے پر کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ وہ گر پہلے سے مجھے نہ آتے ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے راجکماری نے بھی تلوار بے نیام کر لی۔

''ابھی معلوم ہوا جاتا ہے!'' عبداللہ خاں بولا۔ ''ہر چند کہ جگہ کم ہے مگر گزارہ ہو جائے گا۔''

''اچھا تو پھر سنبھلو عبداللہ خاں!'' کہتے ہی راجکماری نے اچانک عبداللہ خاں پر حملہ کر دیا۔

''پہلے ہی حملے میں عبداللہ خاں کو اعتراف کرنا پڑا کہ اگر اسے پہلے سے یقین نہ ہوتا کہ راجکماری ایک ماہر شمشیر زن ہے تو وہ اس کے وار سے نہ بچ پاتا۔ راجکماری کے وار کو اس نے اپنی تلوار پر روک لیا تھا مگر پلہ پھر بھی راجکماری ہی کا بھاری تھا۔ وہ راجکماری کے وار سے بچنے کیلئے زمین پر لیٹ گیا تھا اور اپنی تلوار آگے کر دی تھی۔ راجکماری اس کے اوپر تقریباً چڑھی ہوئی دباؤ ڈال رہی تھی۔ اس نے بہت غیر محسوس انداز میں اپنے دائیں پاؤں کو حرکت دی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ راجکماری کے پاؤں کو اپنے پاؤں سے الجھا کر اسے گرا دیتا' راجکماری ایک دم اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ راجکماری اس کی توقع سے زیادہ پھرتیلی ثابت ہوئی تھی۔ موقع پاتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا' مگر اٹھنے کی اسے بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو تلوار اس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ راجکماری نے تیزی کے ساتھ اپنی تلوار کی نوک اس کے سینے سے لگا دی تھی۔ راجکماری نے اس کے اٹھنے کے درمیان ہی اس کی تلوار پر بھرپور وار کیا تھا اور اس کی تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے ہو گیا تھا۔

''کر دوں آر پار؟'' راجکماری نے تلوار کا دباؤ ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

اگر راجکماری اپنے کہنے پر عمل بھی کر دیتی تو وہ اس وقت بالکل بے دست و پا تھا۔ اس نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا۔ ''تم جیت گئیں راجکماری!... تم نے عبداللہ خاں کو شکست دے دی۔ دراصل مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اچانک حملہ کر دو گی۔''

''تو پھر ایک بار اور سہی!'' راجکماری نے کہا۔ ''اپنی تلوار اٹھا لو عبداللہ خاں!'' اسی کے ساتھ راجکماری نے اس کے سینے سے تلوار کی نوک ہٹا لی۔

اس نے لپک کر تلوار اٹھا لی اور اس بار راجکماری کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس نے پے در پے وار کر کے اسے بوکھلا دیا۔ اس کیلئے جگہ کی تنگی بھی مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ اس بار وہ راجکماری پر بھاری رہا۔ جب راجکماری کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گری تو وہ راجکماری کے سینے پر سوار تھا اور اس کی تلوار کی نوک راجکماری کی گردن پر تھی۔

عبداللہ خاں نے بھی بالکل راجکماری کے انداز میں مسکرا کر کہا تھا۔ ''کروں آر پار؟'' اس کے انداز پر راجکماری کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

پھر جب وہ دونوں الگ ہوئے تو عبداللہ خاں کو احساس ہو گیا کہ راجکماری سہل نہیں ہے۔ شمشیر زنی میں وہ عبداللہ خاں کی ہم پلہ تھی۔ وہ ان تمام داؤ پیچ سے بخوبی آگاہ تھی جو عبداللہ خاں جانتا تھا۔

شام ہوتے ہی جب عبداللہ خاں راجکماری کو ساتھ لئے شاہی خیمے میں پہنچا تو تمام انتظامات مکمل تھے۔ شاہی خیمے کے سامنے تخت شاہی بچھا ہوا تھا۔ تخت کے دائیں بائیں امیروں کے لئے قالین اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے جن پر وہ بڑی تمکنت سے بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں تخت شاہی کے سامنے نیم دائرے کی صورت میں میخوں کے سہارے ایک موٹی رسی باندھ دی گئی تھی۔ رسی کے دوسری طرف سپاہیوں کا ہجوم تھا۔ ابھی شاہ عالم اپنے خیمے سے باہر نہیں آیا تھا۔ عبداللہ خاں بھی راجکماری کو لے کر

امیروں کی صف میں جا بیٹھا۔ ذوالفقار خاں نے بڑی ہوس ناک نظروں سے راجکماری کو دیکھا۔ وہ دو ایک امیروں کے بعد ہی عبداللہ خاں کی بائیں جانب بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے سارے مردوں کے درمیان راجکماری واحد صنف نازک تھی اور سب سے الگ نظر آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی ''باادب باملاحظہ ہوشیار!...'' کی صدائیں بلند ہوئیں۔ تمام امیر ہاتھ باندھ کر دست بستہ کھڑے ہوگئے۔ شاہ عالم کے ساتھ ہی عظیم الشان بھی خیمے سے باہر نکلا۔ سپاہی اپنے شاہ عالم کو دیکھ کر نعرے بلند کرنے لگے۔ جب شاہ عالم تخت پر بیٹھ گیا تو امیر بھی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ شاہ عالم ہی کے برابر ذرا فاصلے سے شہزادہ عظیم الشان دوزانو ہوکر باادب بیٹھا تھا۔

شاہ عالم نے اطمینان سے بیٹھنے کے بعد دایاں ہاتھ بلند کیا۔ یہ مقابلہ شروع کرنے کا اشارہ تھا۔ اس ہاتھ کی حرکت کے ساتھ تخت شاہی کی بائیں سمت سے ایک شمشیرزن برہنہ تلوار ہاتھ میں لئے تخت شاہی کے سامنے نیم دائرے میں پہنچا۔ پھر وہ آداب شاہی کے مطابق جھک کر تین بار شاہ عالم کے حضور تسلیمات بجالایا۔ اسی وقت عبداللہ خاں کے قریب بیٹھی ہوئی راجکماری نے عبداللہ خاں کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔ ''میں تمہارے بادشاہ کے سامنے نہیں جھکوں گی۔''

''کیا مرنا ہے!'' عبداللہ خاں کو اس پر تاؤ آ گیا۔ ''جس طرح اس شمشیرزن نے کیا ہے' وہی تم کرو گی' سمجھیں!'' عبداللہ خاں نے بھی اسے سرگوشی میں سمجھایا۔

''تو پھر بتا دو' ذوالفقار خاں کہاں ہے؟ ورنہ میں تمہارے مشورے پر عمل نہیں کروں گی!''

یہ ایک ایسا نازک لمحہ تھا کہ عبداللہ خاں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوراً اسے راجکماری کی ضد پوری کرنا پڑی۔ راجکماری نے نظر اٹھا کر ذوالفقار خاں کو گھورا۔ ذوالفقار بھی اسی طرف ہوس ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

پھر راجکماری اپنی جگہ سے اٹھی۔ کچھ ہی دیر بعد راجکماری تخت شاہی کے سامنے نظر آئی۔ عبداللہ خاں کو یہ دیکھ کر سکون ہوا کہ راجکماری نے آداب شاہی کا خیال رکھا۔ اس کے فوراً بعد ہی مقابلہ شروع ہوگیا۔

شاہی شمشیرزن امانت خاں کو مقابلے کے آغاز ہی میں احساس ہوگیا کہ اس کے مقابلے پر کوئی کمزور عورت نہیں بلکہ ایک ماہر فن ہے۔ وہ اب صرف اپنی مدافعت کر رہا تھا۔ راجکماری نے اسے اب تک اتنا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ راجکماری پر جوابی حملہ کر سکتا۔ ایک مرتبہ امانت خاں' راجکماری کے حملے سے بچتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا اور تخت شاہی سے جا ٹکرایا۔ یہ موقع راجکماری کیلئے غنیمت ثابت ہوا۔ اس نے امانت خاں کے لڑکھڑاتے ہی اس کی تلوار پر ایک ایسی ضرب لگائی کہ امانت خاں اپنی تلوار نہ سنبھال سکا۔ تلوار زمین پر گرتے ہی اس نے جھک کر تلوار اٹھانا چاہی' مگر اس سے پہلے ہی راجکماری نے اس کی گردن پر تلوار کی نوک رکھ دی۔ امانت خاں کا سر احساس شکست سے جھک گیا۔

''مرحبا' اے راجپوت لڑکی!'' شاہ عالم کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس نے گلے سے موتیوں کی ایک مالا اتار کر راجکماری کی طرف اچھال دی جسے راجکماری نے لپک لیا اور اس کے بعد وہ بطور شکریہ تسلیمات بجالائی۔

اچانک سناٹا سا چھا گیا۔ راجکماری نے ایک ایسی ہی بات کہہ دی تھی۔ شاہ عالم کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔ راجکماری نے تسلیمات بجالاتے ہوئے ہی کہا تھا۔

''اے شاہ ذی وقار! میں نے آپ کے ایک امیر ذوالفقار خاں کی بہت شہرت سنی ہے کہ وہ تلوار کے دھنی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ حضور مجھے ان سے مقابلہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔'' یہ جملہ اس نے ذوالفقار خاں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''اے راجپوت لڑکی!'' ہرچند کہ تو ہمارے حضور گستاخی کی مرتکب ہوئی ہے اور تو نے جسارت بے جا کی ہے' مگر کیوں کہ ہم تیرے فن کی قدر کرتے ہیں اس لئے ہم تیری جان بخشی کرتے ہوئے تیری خواہش پوری کئے دیتے ہیں۔'' شاہ عالم سنجیدہ لہجے میں بولا۔ پھر وہ دائیں جانب مڑ کر انتہائی غصے کی حالت میں ذوالفقار خاں سے مخاطب ہوا۔ ''کسی مغل امیر یا سردار کو مقابلے کیلئے للکارنے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ اس لڑکی کو بتاؤ!''

''معاذوالفقار خاں اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنی نیام سے تلوار نکالتا ہوا تخت شاہی کے سامنے جا پہنچا اور تسلیمات بجالا کر بولا۔'' حضور کا اقبال بلند ہو! یہ خادم' حضور کے ادا کئے ہوئے الفاظ کی عزت رکھے گا مگر اسی کے ساتھ حضور کا یہ دیرینہ خادم ہے ایک درخواست کرتا ہے کہ حضور اجازت دیں' یہ مقابلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک میں اس بڑبولی کافرہ کو اس کے انجام تک نہ پہنچادوں!''

''نہیں ذوالفقار خاں! طیش میں نہ آؤ۔ تم ایسے بردبار امیر کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ایک کمزور عورت تمہارے ہاتھوں قتل ہوجائے۔'' شاہ عالم نے شاہانہ متانت اور وقار کے ساتھ کہا۔

''اے شاہ محترم! میں ذوالفقار خاں سے آخر وقت تک فیصلہ کن مقابلے پر آمادہ ہوں۔ میں حضور سے التماس کرتی ہوں کہ وہ اس بات کی اجازت مرحمت فرمادیں۔'' راجکماری بول اٹھی۔

''لڑکی! ہمیں تمہاری خودکشی پر افسوس ہوگا۔ بہرحال تم بھی یہی چاہتی ہو تو ہم تمہیں نہیں روکتے! تم دونوں کو ہماری طرف سے فیصلہ کن مقابلے کی اجازت ہے۔'' شاہ عالم کے یہ الفاظ عبداللہ خاں کے سینے میں نشتر بن کر اتر گئے۔

راجکماری نے یہ کیا کیا؟ عبداللہ خاں کے ذہن میں طوفان سا گردش کرنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ذوالفقار خاں ایک گرگ باراں دیدہ تھا۔ اس نے سینکڑوں خونریز مقابلے کئے تھے۔ وہ مشاق' عیار اور تجربہ کار تھا۔

اس وقت عبداللہ خاں کے دل کی دھڑکنوں میں شدید اضافہ ہوگیا جب راجکماری اور ذوالفقار خاں ایک دوسرے کے سامنے آئے۔ مقابلے کی شرط کے مطابق اب ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو زندہ رہنا تھا۔ ذوالفقار خاں کے سامنے کھڑی ہوئی راجکماری یوں لگ رہی تھی جیسے ہاتھی کے آگے چیونٹی۔

''مقابلہ شروع کیا جائے!'' شاہ عالم کی آواز سناٹے میں گونجی۔ سبھی دم سادھے بیٹھے تھے۔

بادشاہ کی آواز کے ساتھ ہی ذوالفقار خاں اور راجکماری کی تلواریں بیک وقت بلند ہوئیں اور عبداللہ خاں کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔ حملہ کرنے میں پہل راجکماری ہی نے کی۔ اس نے آگے بڑھ کر ذوالفقار خاں پر وار کیا۔ ذوالفقار خاں کے ہونٹوں پر ایک تمسخرانہ مسکراہٹ ابھری اور اس نے تیزی

سے ایک طرف ہوکر راجکماری کا وار رائیگاں کر دیا۔ راجکماری اپنے ہی زور میں منہ کے بل زمین پر گرنے لگی۔ اس نے اپنی پوری جسمانی قوت صرف کر کے پہلی ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔ ذوالفقار خاں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کیلئے جلدی سے مڑا' مگر راجکماری گرتے گرتے اچانک سنبھل گئی اور اس نے برق سرعت سے ذوالفقار خاں کی تلوار کو اپنی تلوار پر روک لیا۔ سپاہیوں کے منہ سے حیرت کے سبب آوازیں نکل گئیں۔ ہر چند کہ ذوالفقار ایک مغل امیر تھا اور ان کا اپنا تھا مگر وہاں موجود سپاہیوں کی ہمدردیاں ایک عورت ہونے کے ناطے راجکماری ہی کے ساتھ تھیں۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ راجکماری وار سے بچنے کیلئے اس قدر مستعدی کا ثبوت دے گی۔

اب راجکماری اور ذوالفقار خاں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ ان دونوں کی تلواریں ایک دوسرے کی تلواروں پر تھیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے کیلئے زور آزمائی رہے تھے۔ راجکماری بھلا ذوالفقار خاں کی قوت وطاقت کے آگے کب تک ٹک سکتی تھی! اس کے قدم پیچھے ہٹنے لگے۔ سپاہی پھر اضطراب کے عالم میں بولنے لگے۔ جیسے بہت سی مکھیاں بیک وقت بھنبھنا رہی ہوں۔ اگر انہیں یہ خیال نہ ہوتا کہ وہاں شاہ عالم بھی موجود ہے تو شاید سرگوشیوں کی بجائے چیخنے لگتے۔ بس لمحے بھر کو عبداللہ خاں کی پلک جھپکی تھی کہ منظر بدل چکا تھا۔

کیا ہوا؟... کیا ہوا؟ یہ ذوالفقار خاں نیچے کیسے گر گیا؟'' عبداللہ خاں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے امیر سے پوچھا۔

''آپ نے نہیں دیکھا! لڑکی تو بجلی ہے بجلی! اس نے میر بخشی کا داؤ اسی پر استعمال کر دیا ہے۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک دم ایک طرف ہوگئی تھی اور میر بخشی اپنے ہی زور میں نیچے گر پڑے تھے۔ ارے... ارے... یہ کیا؟... دیکھیئے!... واہ!''

ذوالفقار خاں نے نیچے گرنے کے بعد اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی' پھر جیسے ہی راجکماری نے جھک کر اس پر تلوار سے وار کیا تھا' وہ لڑھک کر دور ہوگیا تھا۔ اس دوران میں اس کی دائیں ٹانگ بھی چلی تھی۔ اس نے راجکماری کے پاؤں میں پاؤں پھنسا کر اسے بھی گرا دیا تھا۔ راجکماری کی تلوار زمین پر لگی تھی۔

بقیہ معرکے کا انحصار اب اس پر تھا کہ دونوں حریفوں میں سے پہلے زمین سے کون اٹھتا ہے! توقع یہ تھی کہ اپنے بھاری تن وتوش کی وجہ سے ذوالفقار خاں فوراً نہ اٹھ پائے گا' مگر جب زندگی بچانے اور عزت کی ہو تو آدمی غیر متوقع طور پر عمل کرنے لگتا ہے۔ راجکماری اور ذوالفقار خاں بیک وقت زمین سے اٹھے تھے۔ حملے میں پہل راجکماری نے کی تھی۔ اس نے ذوالفقار خاں کے پاؤں پر وار کیا تھا۔ اگر ذوالفقار خاں اپنی جگہ سے اچھلنے میں ایک لمحہ بھی دیر کر دیتا تو مارا جاتا۔

راجکماری اور ذوالفقار خاں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔ راجکماری کو اب یہ احساس ہوگیا تھا کہ ذوالفقار خاں جسمانی طور پر اس سے کئی گنا زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ اسی لئے اب اسے قریب نہیں آنے دے رہی تھی۔ دونوں ہی کو ایک دوسرے کے ماہر فن ہونے کا پتا چل گیا تھا اس لئے دونوں بہت محتاط ہوکر لڑ رہے تھے۔ اگر ذوالفقار خاں کے مقابلے پر اس وقت کوئی مرد بھی ہوتا تو اب تک

اس کا حوصلہ پست ہوجاتا لیکن راجکماری ایک عورت ہونے کے باوجود اس کیلئے لوہے کا چنا ثابت ہو رہی تھی۔

ان دونوں کی تلواریں بجلی کی طرح کوند رہی تھیں۔ دونوں کے جسم پسینے پسینے ہو رہے تھے لیکن ایک بات سبھی نے محسوس کر لی کہ مقابلہ جس قدر طول کھنچتا جا رہا تھا' ذوالفقار خاں اپنے بھاری جسم کو سنبھالنے میں ناکام ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ اس کے برعکس راجکماری نسبتاً تازہ دم لگ رہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ راجکماری کا جسم ہلکا پھلکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں لوگوں کو یہ احساس بھی ہوگیا کہ راجکماری خود ہی مقابلے کو طول دے رہی ہے۔ وہ ذوالفقار خاں کو تھکا دینا چاہتی تھی۔ وہ اس لئے ذوالفقار خاں کو خود پر زیادہ سے زیادہ حملے کرنے کا موقع دے رہی تھی اور خود مدافعت کر رہی تھی۔ شاہ عالم کے چہرے پر اس وقت غصے کے تاثرات ہونا چاہئیں تھے مگر ایسا نہیں تھا۔ اس کے چہرے سے واضح طور پر شوق اور دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ غیر جانبدار تھا۔ امیروں کے درمیان آپس میں جو سرگوشیاں ہو رہی تھیں' ان کا حاصل بھی یہی تھا کہ ان کی ہمدردیاں راجکماری کے ساتھ تھیں حالانکہ راجکماری کے مقابلے پر انہی کا ایک ہم جلیس تھا مگر یہ قدرتی امر تھا۔ ایک بھرپور اور طاقت ور مرد کے مقابلے پر ایک کمزور عورت تھی۔ ایسی صورت میں ان کی ہمدردیاں راجکماری ہی کے ساتھ ہونا چاہئیں تھیں۔ راجکماری کسی لقمہ خشک کی طرح ذوالفقار خاں کے حلق میں اٹک گئی تھی جسے نہ وہ تھوک سکتا تھا نہ ہی نگل سکتا تھا۔

راجکماری کی تیزی اور مستعدی دیکھ کر عبداللہ خاں بھی حیران تھا۔ اس نے راجکماری سے خیمے سے دو دو ہاتھ ضرور کئے تھے مگر اسے راجکماری سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ وہ ذوالفقار خاں ایسے ماہر شمشیر زن کو ناکوں چنے چبوا دے گی۔ صورت حال اب یہ تھی کہ ذوالفقار خاں کے حملوں میں پہلی سی طاقت اور تیزی نہیں رہی تھی۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا۔ راج کماری شاید اسی وقت کی منتظر تھی۔ اچانک اس نے ذوالفقار خاں کے وار روکتے روکتے بھی وار کرنا شروع کر دیئے اور وہ بھی اس تیزی کے ساتھ پے در پے کہ ذوالفقار خاں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ بوکھلا اٹھا اور اسے مجبوراً دفاعی لڑائی پر اکتفا کرنا پڑا۔ لوگوں کی سرگوشیاں ایک بار پھر تیز ہوگئیں۔

''اس نے میر بخشی کو تھکا مارا ہے۔'' ایک امیر نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''ہاں شاید اب وہ میر بخشی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے گی۔'' دوسرے امیر نے تائید کی۔

اسی لمحے ذوالفقار خاں سنبھل گیا۔ اسے اپنی خطرناک صورتحال کا اندازہ ہوگیا تھا وہ راجکماری کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ اب جیسے ایک دم جوش آ گیا تھا۔

لڑائی ایک بار پھر زور و شور سے ہونے لگی لیکن جس طرح چراغ بجھنے سے پہلے ایک بار بھڑکتا ہے یا قریب المرگ شخص مرنے سے پہلے سنبھالا لیتا ہے' یہی حال ذوالفقار خاں کا تھا۔ وہ زیادہ دیر راجکماری کے حملوں کی تاب نہ لا سکا۔ راجکماری کی تلوار کا ایک اچٹتا ہوا وار ذوالفقار خاں کی تلوار پر پڑا' پھر اس کی تلوار پھسلتی ہوئی ذوالفقار خاں کی کلائی پر لگی۔ لوگوں کا جیسے سانس رک گیا۔ ذوالفقار خاں نے اپنے ہانپتے ہوئے دونوں ہونٹ سختی سے بھینچ لئے اور اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گرنے لگی۔ اس کی

کلائی سے خون بہہ رہا تھا مگر اسی لمحے لوگوں نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ ذوالفقار خاں نے اپنے دائیں ہاتھ سے گرتی ہوئی تلوار کو فوراً بائیں ہاتھ میں لے لیا اور راجکماری کا دوسرا وار روک لیا۔

یہ ذوالفقار خاں ہی کا حوصلہ تھا کہ اس نے ہاری ہوئی بازی کا رخ بدل دیا تھا۔ اب وہ بائیں ہاتھ سے بالکل اسی طرح تلوار چلا رہا تھا جیسے دائیں ہاتھ سے لڑ رہا تھا مگر راجکماری اب بھی اس پر بھاری پڑ رہی تھی۔ ذوالفقار خاں اپنی حریف کے وار روکنے کے سوا کچھ اور نہیں کر پا رہا تھا۔

اچانک ہی جب راجکماری نے ذوالفقار خاں سے کچھ دور ہٹ کر اپنے دائیں ہاتھ سے تلوار اچھالی تو لوگ کچھ نہ سمجھ پائے۔ اس نے تلوار کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی اپنے بائیں ہاتھ سے تلوار کا دستہ پکڑ لیا تھا۔ لوگ اب سمجھے کہ راجکماری ان پر کیا ظاہر کرنا چاہتی تھی! وہ بھی اب ذوالفقار خاں کی طرح بائیں ہاتھ سے لڑنے کا ارادہ رکھتی تھی تاکہ یہ خونریز مقابلہ دیکھنے والے یہ نہ کہہ سکیں' راجکماری نے ذوالفقار خاں کو اس لئے شکست دے دی کہ وہ بائیں ہاتھ سے لڑ رہا تھا۔

وہاں موجود افراد میں سے بہت سے فن آشنا جانتے تھے کہ کسی ماہر فن شمشیر زن کے ایسے ایسے کرتب کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود لوگ راجکماری کے اس عمل سے متاثر ہوئے تھے۔ ذوالفقار خاں کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا ہانپ رہا تھا۔ اس میں اب اتنی ہمت باقی نہیں رہی تھی کہ اس دوران میں آگے بڑھ کر راجکماری پر حملہ کر سکتا۔ اسے طیش دلانے کیلئے راجکماری نے پہلے اپنی تلوار سے قریب آنے کا اشارہ کیا پھر اس کی طرف دیکھ کر زہریلے انداز میں مسکرائی اور اپنی تلوار کی نوک زمین پر رکھ دی۔ ذوالفقار خاں کو طیش دلانے کیلئے اتنا ہی کافی تھا۔ کسی ماہر شمشیر زن کے سامنے اس طرح تلوار کی نوک زمین پر رکھنے کے معنی اس کی توہین کے سوا کچھ اور نہیں ہوتے۔ اس کا واضح مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ فریق مخالف اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اس سے کمتر ہے۔

ذوالفقار خاں ہانپتا ہوا کسی اڑنے بھینسے کی طرح راجکماری پر جھپٹا۔ ذوالفقار کی تلوار سیدھی تھی۔ معاً راجکماری نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے جیسے ذوالفقار خاں کا وار سینے پر روکنا چاہتی ہو۔ یہ لمحات بے حد خطرناک تھے لیکن جیسے ہی ذوالفقار اس کے قریب آیا' بجلی کی سی تیزی سے اس کا وہ ہاتھ حرکت میں آیا جس میں تلوار تھی۔ راجکماری نے اوپر سے ذوالفقار خاں کی تلوار پر بھرپور ضرب لگائی۔ اس بار ذوالفقار خاں تلوار پر اپنی گرفت برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کی تلوار راجکماری کے سینے میں پیوست ہونے کے بجائے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گری۔ اسی وقت راجکماری نے تلوار پر ٹھوکر ماری ورنہ ذوالفقار خاں جھک کر تلوار اٹھا چکا ہوتا۔

راجکماری نے اپنی تلوار کی نوک جھکے ہوئے ذوالفقار خاں کی پشت پر رکھ دی۔ پھر اس نے تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے ذوالفقار خاں کی ٹھوڑی پر اپنا گھٹنا مارا اور دور ہٹ کر بہ آواز بلند بولی۔ ''اے بہادر مغل سردار!'' اپنی تلوار اٹھا لو! میں ابھی تمہیں ختم کرنا نہیں چاہتی۔ مقابلہ ابھی جاری رہے گا۔''

ذوالفقار خاں' راجکماری کے گھٹنے کی ضرب سے اچھل کر دور جا گرا تھا اور جہاں وہ گرا تھا وہیں تلوار پڑی تھی۔ اس نے تلوار اٹھانے میں دیر نہیں کی تھی۔ اصولاً ذوالفقار خاں شکست کھا چکا تھا کیوں کہ راجکماری نے اس پر فتح پالی تھی اور دانستہ اس کی جان بخشی کی تھی۔ اس کے باوجود وہ دوبارہ لڑنے پر آمادہ لہٰذا شکست تسلیم کر کے اسے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دینا چاہئے تھا۔ اس طرح اس کی جان بچ سکتی تھی' مگر وہ ذوالفقار خاں تھا۔ لوگ یہی دیکھ کر چہ مگوئیاں کرنے لگے۔

''میر بخشی ہار چکے ہیں' انہیں اپنی شکست قبول کر لینا چاہئے۔ یہی بہت ہے کہ اس بہادر لڑکی نے موقع ملنے کے باوجود میر بخشی کو قتل نہیں کیا۔''

''یہ بات بہادری کیخلاف ہے کہ میر بخشی دوبارہ لڑنے پر آمادہ ہیں۔''

''میر بخشی کو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا لینا چاہئے کہ یہی عقل کی بات ہے۔ اگر مقابلہ فیصلہ کن ہوا تو یہ بہادر راجپوت لڑکی میر بخشی کو قتل کر دے گی۔ آخر یہ لڑکی کب تک میر بخشی کی جاں بخشی کرتی رہے گی؟''

لوگوں کی سرگوشیاں ابھی جاری تھیں کہ ذوالفقار خاں نے اپنی خجالت مٹانے کیلئے آگے بڑھ کر راجکماری پر وار کر دیا مگر یہ وار اسے مہنگا پڑا۔ راجکماری نے دائیں جانب ہٹ کر اس کا وار خالی کر دیا اور اسی کے ساتھ لوگوں نے سمجھا کہ اب ذوالفقار کا آخری وقت آ ہی گیا ہے۔ انہوں نے راجکماری کی تلوار کو بلند ہوتے دیکھ لیا تھا لیکن موقع ملنے کے باوجود راجکماری نے ذوالفقار خاں کے سر یا گردن پر وار کرنے کے بجائے صرف اس کا شانہ زخمی کرنے پر اکتفا کیا۔ یہ وار بائیں ہاتھ کے شانے پر کیا گیا تھا۔ اگر وار ذرا اور بھرپور کیا جاتا تو یقیناً ذوالفقار خاں کا بایاں ہاتھ' شانے سے کٹ کر زمین پر گر جاتا۔ راجکماری نے دانستہ بھرپور وار نہیں کیا تھا۔ عبداللہ خاں اور دوسرے ماہر شمشیر زنوں نے بھی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وار جان بوجھ کر بھرپور نہیں کیا گیا' ہاتھ ہلکا رکھا گیا ہے' راجکماری ابھی ذوالفقار خاں کو ہلاک کرنا نہیں چاہتی تھی ورنہ تو اس کیلئے یہ بہترین موقع تھا کہ وہ شانے کو زخمی کرنے کی بجائے ذوالفقار خاں کی گردن ہی اڑا دیتی۔

''یہ لڑکی آخر کیا کر رہی ہے' اسے ختم کیوں نہیں کر دیتی؟'' خان خاناں نے پہلی بار عبداللہ خاں کی طرف جھک کر سرگوشی کی وہ عبداللہ خاں کے قریب ہی بیٹھا تھا لیکن اس نے اب تک دانستہ اس مقابلے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اس کی اور ذوالفقار خاں کی رنجش سے تقریباً سبھی امیر واقف تھے جو ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان امیروں میں خان خاناں کے حامی بھی تھے اور ذوالفقار خاں کے بھی۔ عبداللہ خاں نے خان خاناں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

چند لمحوں میں یہ فیصلہ ہو گیا۔ راجکماری کے تابڑ توڑ حملے ذوالفقار خاں نہ روک سکا۔ اب اس کے دونوں ہاتھ زخمی ہو چکے تھے۔ اس کے ہاتھ سے تلوار ایک بار پھر چھوٹ گئی۔ راجکماری کی تلوار اس کے سینے سے آ لگی' مگر وہ اچانک تیزی سے پلٹ کر تخت کے سامنے پہنچی اور با آواز بلند بولی۔ ''اے شاہ محترم! اگر میں چاہتی تو اپنے حریف کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی تھی' مگر شاہ محترم کو میں ان کے ایک بہادر امیر سے محروم کرنا نہیں چاہتی۔''

''مرحبا اے بہادر راجپوت لڑکی! تم نے یہ کہہ کر ہم پر اپنی بہادری ثابت کر دی۔ ہم تمہارے اس فیصلے سے خوش ہوئے یہ کہہ کر شاہ عالم نے اپنے گلے سے ایک اور موتیوں کا ہار اتار کر راجکماری کی طرف اچھال دیا اور بولا'' ذوالفقار خاں شکست خوردہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ تم نے ہمارے امیر کی جاں بخشی

کر کے یقیناً اس پر احسان کیا ہے۔''

ذوالفقار خاں کا جھکا سر ایک جھٹکے سے اٹھا اور وہ تقریباً دوڑتا ہوا تخت شاہی کے سامنے آ جھکا' پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''اے شاہ ذی وقار! میں صرف ایک موقع اور چاہتا ہوں۔''

''نہیں ذوالفقار خاں! تم ہار چکے ہو! اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم اس قابل نہیں' مزید لڑ سکو'' شاہ عالم نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اے بندہ پرور! میں اپنے بھاری جسم کے سبب اپنا تنفس نہ سنبھال سکا۔ اگر مجھے گھوڑے چڑھ کر مقابلے کی اجازت دی جاتی تو شاید صورتحال برعکس ہوتی۔'' ذوالفقار خاں التجا آمیز لہجے میں بولا

''میں شاہ محترم کے حضور درخواست گزار ہوں کہ ذوالفقار خاں کو ایک موقع اور دیا جائے' ممکن ہے وہ مجھے شکست دے دیں۔'' راجکماری نے مسکراتے ہوئے ذوالفقار خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

شاہ عالم خود ایک معتدل مزاج شخصیت کا مالک تھا۔ لمحہ لمحہ اس کے فیصلے بدلتے رہتے تھے۔ چند کہ وہ دیکھ رہا تھا اور اپنی زبان سے کہہ بھی چکا تھا۔ ذوالفقار خاں لڑنے کے قابل نہیں مگر اس کے باو اس کے چہرے پر تردد کے آثار نظر آنے لگے جیسے وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا ہو۔ اس نے شہزادہ عظیم الشا کی طرف دیکھ کر کہا۔''تمہارا کیا خیال ہے شہزادے! کیا ہم مزید مقابلے کی اجازت دے دیں؟''

''حضور کی جیسی مرضی ہو۔ خادم کی نظر میں فیصلہ ہو چکا ہے لیکن اگر میر بخشی بضد ہیں تو انہیں ایک اور موقع دینے میں کوئی مضائقہ نہیں' خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ میر بخشی کے حریف کو بھی اس کوئی اعتراض نہیں۔'' شہزادہ عظیم الشان نے جھک کر شاہ عالم کی بات کا جواب دیا۔ وہ بھی یہی چاہتا کہ ذوالفقار خاں ایک بہترین گھڑ سوار ہے۔ اس کے خیال میں ذوالفقار خاں نے اپنی شکست کا جو سبب بیان کیا تھا' قطعی درست تھا۔ اگر وہ گھوڑے پر بیٹھ کر لڑتا تو شکست نہ کھاتا۔

''ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں ذوالفقار علی خاں!'' شاہ عالم کی آواز گونجی۔''لیکن اس سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ جراح تمہارے زخموں کی مرہم پٹی کر دیں۔'' شاہ عالم نے یہ کہہ کر راجکماری مخاطب کیا۔''اے بہادر راجپوت لڑکی! تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''جی نہیں عالم پناہ حضور کے فیصلے سے اس کنیز کو اتفاق ہے۔'' راجکماری نے ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔

''اس کے بعد شاہ عالم کے ایک خاص جراح نے اپنے معاون کی مدد سے ذوالفقار کے زخموں پر مرہم لگا کر پٹی باندھ دی۔ راجکماری اس دوران میں وہیں تخت شاہی کے سامنے تلوار لئے کھڑی رہی۔ خدمت گار شاہی اصطبل سے دو بہترین گھوڑے کھول کر لے آئے۔ درمیان میں رسی باندھ کر جو دائرہ بنایا گیا تھا' اسے سپاہیوں کو پیچھے ہٹا کر وسیع کر دیا۔ ذوالفقار خاں نے تلوار کے ساتھ ہی ڈھال کی خواہش بھی کی جسے شاہ عالم نے منظور کر لیا۔ راجکماری اور ذوالفقار خاں دونوں ہی کو ڈھالیں دے دی گئیں۔

''کتنا اچھا ہوتا کہ یہ لڑکی ہمارے اس دشمن کو ختم کر دیتی!'' خان خاناں ایک بھر پھر عبداللہ خاں کے کان میں منمنایا۔ کیا اب بھی اس کے ختم ہونے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے اس نے خود ہی اپنی

موت کو دعوت دی ہے۔ عبداللہ خاں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

''اگر اس لڑکی نے اب بھی ذوالفقار خاں کی جان بخشی کر دی تو؟ خان خاناں کی سرگوشی ابھری۔

''تو ظاہر ہے اس سلسلے میں میں کیا کر سکتا ہوں!'' عبداللہ خاں نے بیزار لہجے میں جواباً کہا۔

خان خاناں خاموش ہو گیا اور عبداللہ خاں کی نظریں ایک بار پھر میدان پر مرکوز ہو گئیں۔ راجکماری اور ذوالفقار خاں دونوں گھوڑوں پر سوار ہو رہے تھے۔ پھر وہ دونوں اپنے گھوڑوں کو مخالف سمت لے گئے۔

''مقابلہ شروع ہو'' شاہ عالم بلند آواز میں بولا۔

شاہ عالم کی آواز کے ساتھ ہی راجکماری اور ذوالفقار خاں کے گھوڑے ایک دوسرے کی طرف جھپٹ پڑے۔ ذوالفقار خاں نے ایک ہاتھ سے ڈھال اپنے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے راجکماری پر وار کیا۔ گھوڑے کی باگیں اس نے اپنے دانتوں کے درمیان دبا رکھی تھیں۔ راجکماری نے اس کا وار ڈھال پر روکنے کی بجائے تلوار اور گھوڑے کو بھگاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ چند گز دوڑ کر ہی اس نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور اسے دوبارہ موڑا۔ اس دوران میں ذوالفقار خاں بھی اپنے گھوڑے کی سمت تبدیل کر چکا تھا۔ خلاف توقع اس بار راجکماری نے اپنا گھوڑا اس کی طرف نہیں دوڑایا۔ ذوالفقار خاں نے یہی سمجھا تھا کہ راجکماری گھوڑے کو موڑتے ہی اس پر چڑھ دوڑے گی اس لئے اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی تھی۔ اس مرتبہ بھی راجکماری نے ذوالفقار کو وار کرنے کا موقع دیا تھا۔ ذوالفقار خاں کا گھوڑا تیزی کے ساتھ راجکماری کے قریب سے گزر گیا اور عین اسی لمحے راجکماری نے اپنا گھوڑا موڑ کر ذوالفقار خاں کی طرف دوڑا دیا۔ اب ذوالفقار خاں آگے تھا اور راجکماری اس کے عقب میں۔ اس سے پہلے کہ ذوالفقار خاں اپنا گھوڑا موڑ پاتا۔ راجکماری اس کے سر پہنچ گئی اس کی تلوار بلند ہوئی مگر اس نے تلوار کا وار ذوالفقار خاں پر نہیں بلکہ اس کے گھوڑے کی پچھلی ٹانگ پر کیا تھا۔ تلوار کی بھرپور ضرب گھوڑے کی پچھلی ٹانگ پر لگی۔ ایک ٹانگ میں تو تلوار اندر تک اتر گئی۔ گھوڑے کی آدھی ٹانگ کٹ گئی۔ گھوڑا زور زور سے ہنہنا کر زمین پر گرا اور ساتھ ہی اس نے ذوالفقار خاں کو بھی زمین دکھا دی۔

زمین پر گرتے ہی ذوالفقار اٹھ کر ایک طرف بھاگا۔ راجکماری نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ زخمی گھوڑا گر کر تڑپ رہا تھا۔ راجکماری کا گھوڑا آندھی طوفان کی طرح ذوالفقار خاں پر چڑھ دوڑا۔ ذوالفقار خاں نے گھوڑے کی جھپٹ سے بچنا چاہا مگر ناکام رہا۔ گھوڑا اسے روندتا ہوا گزر گیا۔ تجسس کے سبب بہت سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ انہوں نے ذوالفقار خاں کی چیخ سن لی تھی۔ ذوالفقار خاں کی تلوار گھوڑے کی جھپٹ میں آ کر اس کے ہاتھ سے دور جا گری تھی اور وہ میدان میں اوندھے منہ پڑا تھا۔

راجکماری اپنا گھوڑا دوڑاتی ہوئی تخت شاہی کے سامنے پہنچی اور گھوڑے سے کود کر شاہ عالم کے سامنے جھکی۔ اس بار راجکماری نے بہت جلد فیصلہ کر لیا تھا۔ ذوالفقار خاں نے شاید اپنے چہرے کو بچانے کیلئے اوندھا ہو جانا پسند کیا تھا۔ اس کا جسم بے حس و حرکت میدان میں پڑا تھا اور اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ گھوڑے نے اس کے سر پر پاؤں رکھ دیا تھا۔

"ہم تمہارے قائل ہو گئے' قائل ہو گئے بہادر راجپوت لڑکی!" شاہ عالم فرط جوش سے بولا۔

"حضور کی عزت افزائی ہے۔" راجکماری نے سر جھکا کر کہا۔

اس کے بعد وہ خونریز مقابلہ ختم ہو گیا۔ ذوالفقار خاں کو شدید زخمی حالت میں میدان سے اٹھا لیا گیا۔ وہ زندہ تھا مگر بے ہوش تھا۔ شاہی جراح نے فوراً اس کے زخموں کی پٹی کی اور اس کے خدمت گار اسے اٹھا لے گئے۔

شہزادہ عظیم الشان کے ہمراہ شاہ عالم خیمے میں چلا گیا۔ تمام امرا اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ راجکماری' عبداللہ خاں کی طرف بڑھی۔ عبداللہ خاں کا جی چاہا کہ اس بہادر لڑکی کو گلے لگا لے۔ اس نے ایک مغرور اور سرکش شخص کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا عبداللہ خاں!" خان خاناں دھیمی آواز میں عبداللہ خاں سے مخاطب ہوا۔ وہ دائیں جانب کھڑا تھا۔

خان خاناں کی بات کو عبداللہ خاں نے نظر انداز کر دیا' اس طرح کہ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھر وہ آگے بڑھا اور راجکماری کو مخاطب کیا۔ "مبارک ہو ساوتری! تم نے واقعی ثابت کر دیا کہ تم ایک بہادر راجپوت لڑکی ہو۔"

عبداللہ خاں کی بات سن کر راجکماری مسکرائی۔ وہ جانتا تھا کہ راجکماری کیوں مسکرا رہی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ خاں نے راجکماری کو اس کے فرضی نام سے مخاطب کیا تھا۔ راجکماری نے بدستور مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔ "ساوتری اپنی حوصلہ افزائی پر حضور کا شکریہ ادا کرتی ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد راجکماری کے ساتھ عبداللہ خاں اپنے خیمے کی طرف جا رہا تھا۔ راجکماری کو قریب سے دیکھنے کے لئے سپاہی ہجوم کرنے لگے تھے۔ اس نے کارنامہ ہی ایسا انجام دیا تھا۔ سپاہیوں کا اشتیاق بے جا نہیں تھا۔ ذوالفقار خاں ایسے شمشیرزن کو شکست دینے والی کوئی معمولی لڑکی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہجوم سے بچنے کی خاطر عبداللہ خاں نے خدمت گاروں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں کے گھوڑے لے کر قریب آ گئے۔ راجکماری اور عبداللہ خاں گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ ہجوم کائی کی طرح پھٹ گیا اور وہ دونوں تیزی سے اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے لوگوں کے درمیان سے نکل گئے۔

خیمے میں پہنچ کر تنہائی نصیب ہوتے ہی عبداللہ خاں نے راجکماری کو اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا۔ راجکماری کے پنکھڑیوں ایسے ہونٹوں کی سرخی وہ مزید بڑھانا چاہتا تھا کہ راجکماری نے اپنی دائیں کلائی درمیان میں حائل کر دی۔ اس کی کلائی عبداللہ خاں کی گردن پر تھی تا کہ عبداللہ خاں اپنا چہرہ مزید اس کے چہرے پر نہ جھکا سکے۔ اسی کے ساتھ وہ عبداللہ خاں کی آغوش سے نکلنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

"ہم سے بھی داؤ بازی!" عبداللہ خاں نے اس کی پتلی سی نازک کمر کو اپنے بازو کے حلقے سے آگے کی طرف دباتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"پھر داؤ میں نہ آئے ہوتے!" راجکماری کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔

"اچھا یہ بات ہے!" عبداللہ خاں نے اپنے بائیں ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ کر گردن ہٹا دی مگر اسی کے ساتھ راجکماری ایک دم زمین پر بیٹھ کر اس کی آغوش سے کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسلی اور الگ

ہو گئی۔ عبداللہ خاں پھر اس کی طرف بڑھا۔

"زبردستی نہیں چلے گی' سمجھے!" وہ ہاتھ اٹھا کر ایک ادا سے بولی اور عبداللہ خاں اس ادا پر قربان ہو گیا۔

"اچھا حضور تشریف تو رکھیں۔" عبداللہ خاں نے آگے بڑھتے بڑھتے رک کر اپنے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اس طرح کہا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ عبداللہ خاں کو یوں لگا جیسے بہت سے گھنگرو ایک ساتھ بج اٹھے ہوں۔

"ہاں اس طرح شرافت سے بات کرو تو ٹھیک ہے نا!" وہ گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گئی اور عبداللہ خاں بھی اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"ویسے تم نے کمال کر دیا۔ مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔ ہاں میں تمہاری اس بات سے خوش ہوا کہ تم نے اسے ہلاک نہیں کیا۔" عبداللہ خاں بولا۔

"کیوں؟" اس نے اپنی بڑی بڑی کٹورا سی آنکھوں سے عبداللہ خاں کو دیکھا۔ "اس میں تمہاری خوشی کا کیا سامان تھا؟"

"دراصل کسی دشمن کے بغیر زندگی خالی خالی سی لگتی ہے' اس طرح زندگی گزارنے کا کچھ زیادہ لطف نہیں آتا۔" عبداللہ خاں نے جواب دیا۔

"خوب!" وہ مسکرا اٹھی' پھر سنجیدہ لہجے میں بولی۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تم مجھے یہاں سے جانے کی اجازت کب دو گے؟"

"کیا مطلب؟" عبداللہ خاں چونک اٹھا۔ کیا... کیا تم مجھے... مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟"

"کیوں' تم میں ایسے کیا لعل ٹنکے ہوئے ہیں کہ میں اپنے شوہر سے بے وفائی کر کے تمہارے ساتھ لگی پھروں؟"

"ہاں تم یہ ٹھیک کہہ رہی ہو!" عبداللہ خاں نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "میں کیا' میری بساط ہی کیا! تم ٹھہریں ایک راجکماری! ایک خودمختار ریاست کے فرماں روا کی منظور نظر! بھلا میرے پاس کیا رکھا تھا!"

"دلوں کے فیصلے عہدوں اور حیثیت سے نہیں ہوتے عبداللہ خاں! اگر تمہارا خیال یہی ہے تو مجھے افسوس ہے کہ تم ایسا ذہین اور بہادر شخص اس انداز میں بھی سوچ سکتا ہے۔" راجکماری انیتا کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"پھر تم مجھے چھوڑ کر کیوں جانا چاہتی ہو؟" عبداللہ خاں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ تقدیر نے مجھے تمہارے ساتھ نہیں کسی اور شخص کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔" اس کی آواز میں کسی قدر دکھ تھا۔

"تقدیروں کے فیصلے تدبیروں سے بدل بھی جاتے ہیں۔ راجکماری!"

"مگر یہ فیصلہ ایسا نہیں جسے بدلا جا سکے۔ ہمارے درمیان ایک آہنی دیوار حائل ہے جسے نہ تم

گرا سکتے ہو نہ میں۔‘‘

’’راجکماری! عبداللہ خاں کے لئے کوئی ایسی دیوار نہیں جسے وہ نہ گرا سکے۔ میں تم سے ایک اور بات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں شاید یاد ہو کہ میں نے تمہیں اپنے ہمراہ لاتے ہوئے محسوس کیا‘ تمہارے دل میں میری محبت کا چراغ روشن نہیں تو میں تمہیں پہاڑوں پر واپس پہنچا دوں گا۔ میں آج بھی زبان پر قائم ہوں‘ مگر ابھی میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا۔ واقعی تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں کیونکہ تم نے اب تک اقرار محبت نہیں کیا ہے۔‘‘

’’عبداللہ خاں! اگر یہ سچ بھی ہو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ کیا اس طرح ہم ایک دوسرے کو اپنا سکیں گے؟ کیا یہ ممکن ہے؟ جذبات سے قطع نظر کیا تم ... تم میری خاطر اپنا مذہب چھوڑ دو گے ...؟ ہندو ہو جاؤ گے؟‘‘ راجکماری کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔

’’میں ... میں ہندو... کیا کہہ رہی ہو تم۔‘‘ عبداللہ خاں اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔

’’ہاں اب بولو‘ کیا تم یہ دیوار گرا سکتے ہو؟ مذہب کی دیوار جو میرے اور تمہارے درمیان حائل ہے!‘‘

’’یہ دیوار گرائی جا سکتی ہے... ضرور گرائی جا سکتی ہے!‘‘ عبداللہ خاں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

’’یہ تمہاری خام خیالی ہے عبداللہ خاں! یہ نہ بھولو کہ ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ کہ اگر اس کا شوہر زندہ بھی نہ ہو تو وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔‘‘ راجکماری کے لہجے میں چبھن تھی۔

’’اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہندو ہونے کے بعد بھی‘ اپنا مذہب چھوڑ کر بھی تمہیں نہیں اپنا سکتا۔ یہی کہنا چاہتی ہو‘ نا تم؟‘‘ عبداللہ خاں بولا۔

’’ہاں عبداللہ خاں یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت کو نہیں بدلا جا سکتا۔ راجکماری نے کہا اس کا لہجہ مستحکم تھا‘ ’’اگر ایسا ہی ہے تو ابھی کچھ دیر پہلے تم نے مجھ سے مذہب تبدیل کرنے کی بات کیوں کی تھی؟‘‘ عبداللہ خاں نے سوال کیا۔

’’اس وقت... اس وقت لمحہ بھر کو میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی کہ... کہ میں... شادی شدہ ہوں۔‘‘

’’کیا تم جانتی ہو اکبر اعظم نے بھی ایک راجپوت عورت سے شادی کی تھی! اس کا نام جودھا بائی تھا۔ اس کے لئے نہ تو اکبر اعظم نے اپنا مذہب تبدیل کیا تھا نہ ہی جودھا بائی نے اپنا مذہب ترک کر کے مسلمان ہونے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے ہو گئے تھے۔‘‘

ہاں مجھے معلوم ہے‘ مگر... مگر میں نے اسے کبھی اچھا نہیں سمجھا۔ میری نظر میں وہ پاپ تھا۔ پاپ (گناہ) جیون بھر وہ دونوں پاپ کرتے رہے تھے۔ ہندو دھرم اس کی اجازت نہیں دیتا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے تمہارا مذہب بھی اسے پاپ ہی کہتا ہے۔ تمہارے بادشاہ نے وہ شادی محبت سے مجبور ہو کر

نہیں‘ سیاست سے مجبور ہو کر کی تھی کیونکہ وہ راجپوتوں کو اپنے حق میں استوار کرنا چاہتا تھا۔‘‘

عبداللہ خاں نے راجکماری کی سیاسی بصیرت کا دل ہی دل میں اعتراف کیا مگر زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا اور بولا... میں تاریخ دہرانا نہیں چاہتا کیوں کہ میری نظر میں اس مسئلے کا ایک اور حل بھی ہے بشرطیکہ تم مجھ سے واقعی محبت کرتی ہو!‘‘

’’کیا محبت کیلئے ضروری ہے کہ زبان سے بھی اس کا اظہار کیا جائے؟ محبت لفظوں کی پابند ہے؟‘‘ راجکماری نے عجیب سے لہجے میں کہا‘ پھر خود اعتمادی کے ساتھ بولی۔ ’’ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی پہلی محبت نہیں بھولی۔ میرے دل میں اب تک محبت کی چنگاری موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی‘ مگر میں... میں اپنی محبت حاصل نہیں کر سکتی۔ مجھے... مجھے اپنی مجبوری کا احساس ہے۔‘‘

واضح الفاظ میں راجکماری کے اظہار محبت نے عبداللہ خاں کا حوصلہ بڑھا دیا۔ اس کے سینے میں دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ بولا۔ ’’راجکماری!... تم نے... تم نے مجھے نہال کر دیا۔ میں تمہاری زبان سے اقرار محبت سن کر خود کو انتہائی خوش نصیب سمجھ رہا ہوں۔‘‘

’’کسے خبر عبداللہ خاں کہ ہم دونوں خوش نصیب ہیں یا بدنصیب!‘‘ راجکماری اداس لہجے میں بولی۔

عبداللہ خاں نے اس کا خوب صورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ راجکماری! ہم... ہم بدنصیب نہیں خوش نصیب ہیں جو ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی ایک دوسرے سے مل گئے اور... اور اب ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا‘ کوئی نہیں!‘‘

’’کاش ایسا ممکن ہوتا عبداللہ خاں! مگر حقیقت یہ نہیں بلکہ اس کے برعکس ہے۔‘‘

’’راجکماری! بعض اوقات حقیقت وہ نہیں ہوتی جو نظر آتی ہے۔ میں نے ابھی تم سے کہا تھا کہ میرے ذہن میں اس مسئلے کا ایک حل موجود ہے۔‘‘ ’’وہ بھی بتا دو‘‘ راجکماری نے بے دلی سے کہا۔

’’تم... تم مسلمان ہو جاؤ راجکماری!‘‘ عبداللہ خاں نے وہ بات کہہ ہی دی جس کیلئے اتنی دیر سے تمہید باندھ رہا تھا۔

عبداللہ خاں کی بات سن کر راجکماری چونک اٹھی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بھی عبداللہ خاں کے ہاتھ سے کھینچ لیا‘ پھر کہنے لگی... نہیں! میں... اپنا دھرم نہیں چھوڑ سکتی!... یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے... بالکل نہیں!‘‘

’’اور مجھے چھوڑ سکتی ہو!... اپنی پہلی محبت کو چھوڑ سکتی ہو‘ بولو؟ بولو؟‘‘ عبداللہ خاں نے جوش و جذبات میں اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

’’عبداللہ خاں... عبداللہ خاں! میری محبت کو اتنی کڑی آزمائش میں نہ ڈالو!... اتنا بڑا امتحان نہ لو! محبت کی اتنی بڑی قیمت وصول نہ کرو! نہیں... عبداللہ خاں نہیں!‘‘ یہ کہتے ہوئے راجکماری کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر سسک اٹھی۔

’’راجکماری! سچ بتاؤ کیا تم نے اپنے شوہر راجا اجت سنگھ کو بھی اتنا چاہا جتنا کبھی مجھے چاہا تھا؟‘‘ عبداللہ خاں نے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ اس نے دیکھا کہ راجکماری کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

''ہاں مجھے اعتراف ہے۔ میں نے اسے کبھی... کبھی نہیں چاہا۔ اس سے کبھی محبت نہیں کی، مگر... مگر اس نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ... کہ میں میرا دل شادی سے پہلے کسی اور کا ہو چکا تھا۔ کاش ایسا نہ ہوتا!... ایسا اور... اور میں... میں اس سے محبت کر سکتی'' ایسی محبت جو ہر ہندو لڑکی اپنے شوہر سے کرتی ہے... میں نے تو اس کی آغوش میں بھی کسی اور کے سپنے دیکھے۔'' راجکماری نے ہچکیوں کے دوران میں کہا۔

''تو تمہیں اپنے شوہر سے بے وفائی پر افسوس ہے؟'' عبداللہ خاں اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

''نہیں... نہیں عبداللہ خاں! میں نے اپنے شوہر سے کبھی بے وفائی نہیں کی، کبھی نہیں!'' وہ تیز لہجے میں کہنے لگی۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا راجکماری! میں تو کہہ رہا تھا لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لئے کام میں لائیں لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہے یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جائیے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دیا۔ کہ تم اپنی محبت سے وفا کر کے اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی پر شرمندگی اور رنج محسوس کر رہی ہو۔ دراصل تمہیں بے وفائی کا دکھ نہیں، محبت کا دکھ ہے۔ کیوں ہے نا؟'' عبداللہ خاں نے اس کی ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ اسی وقت خیمے کے بیرونی حصے میں کسی کے داخل ہونے کا احساس کر کے عبداللہ خاں نے بلند آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''آپ کا خادم امیر اللہ حضور!''

''کیوں، کیا بات ہے؟'' عبداللہ خاں نے وہیں سے دریافت کیا۔

''شہزادہ عالی کا ملازم خاص، حضور کا نیاز حاصل کرنا چاہتا ہے اور باریابی کیلئے اجازت طلب ہے۔'' امیر اللہ کی آواز ابھری۔

''اسے بلاؤ، میں باہر آ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر عبداللہ خاں اٹھ کھڑا ہوا اور راجکماری سے بولا۔ ''میں ابھی آیا۔''

''راجکماری چپ رہی اور عبداللہ خاں خیمے کے بیرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ اندرونی حصے کا پردہ اٹھا کر باہر آیا تو اسی وقت خیمے میں امیر اللہ کے ہمراہ شہزادے کا ملازم خاص داخل ہوا۔ عبداللہ خاں کو اس وقت یہ مداخلت گراں گزری تھی۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اس سے ملنا بھی پسند نہ کرتا۔ عبداللہ خاں کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ شہزادے کے ملازم خاص کو اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔''

وہ ادب سے عبداللہ خاں کے سامنے جھکا اور بولا۔ ''حضور کو اسی وقت شہزادہ عالی نے یاد فرمایا ہے۔''

''کیا تمہارے علم میں ہے کہ انہوں نے ہمیں کیوں طلب کیا ہے؟ عبداللہ خاں نے ذرا نرم آواز میں دریافت کیا۔''

''جی نہیں حضور! خادم اس بات سے آگاہ نہیں ہے۔'' اس نے جھک کر جواب دیا۔

''ہم ابھی آتے ہیں۔ تم شہزادہ عالی تک ہماری آمد کی اطلاع پہنچا دو! عبداللہ خاں نے مجبوراً

کہا کیوں کہ شہزادے کی طلبی پر اس کا نہ جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ شہزدے کا ملازم خاص ''بہتر ہے حضور!'' کہہ کر الٹے پاؤں خیمے سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی امیر اللہ بھی چلا گیا۔ عبداللہ خاں خیمے کی اندرونی سمت بڑھا۔ خیمے کا درمیانی پردہ اٹھا کر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ راجکماری بول اٹھی۔ ''میں سن چکی ہوں کہ تمہیں شہزادے نے طلب کر لیا۔ تم اطمینان سے جاؤ! یقین کرو کہ میں تمہاری غیر موجودگی میں خیمے سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گی۔''

''تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو راجکماری!'' عبداللہ خاں نے اندر قدم رکھ کر احتجاجاً کہا۔

''میں وہی کہہ رہی ہوں عبداللہ خاں جو حقیقت ہے۔ کوئی اور کچھ بھی سمجھے یا تم نے میری زندگی بچانے کیلئے کچھ بھی مشہور کر دیا ہو مگر اس حقیقت کو کیسے بدلا جا سکتا ہے کہ میں تمہاری قیدی ہوں۔'' راجکماری نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

راجکماری کے دکھی لہجے نے عبداللہ خاں کے دل پر گہرا اثر کیا۔ وہ جذبات سے بے قابو ہو کر بولا۔ ''راجکماری! اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو ... بہ خدا... میں تمہیں ہرگز نہیں روکوں گا۔ تم... تم اسی وقت جا سکتی ہو۔''

''جذبات میں نہ بہو عبداللہ خاں! اس مسئلے پر پھر کسی وقت بات ہو گی۔ فی الحال تم اطمینان سے شہزادے کے پاس جاؤ! میں تو تمہیں اس لئے فرار نہ ہونے کا یقین دلا رہی تھی کہ تم شہزادے سے پرسکون ماحول میں اور ذہنی یکسوئی کے ساتھ تبادلہ خیال کر سکو۔ یقیناً انہوں نے تمہیں کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کیلئے بلایا ہوگا۔ جاؤ! فی الحال مجھے تنہا چھوڑ دو! میں کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔''

عبداللہ خاں بغیر کچھ کہے خیمے سے نکلا اور امیر اللہ کو آواز دی۔ وہ عبداللہ خاں کا مزاج شناس تھا۔ اس لئے خیمے کے در پر پہلے ہی گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ عبداللہ خاں گھوڑے پر سوار ہوا اور شاہی خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے بھر اس کا ذہن الجھا رہا کہ شہزادے نے اسے کیوں طلب کیا مگر وہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ عبداللہ خاں جیسے ہی وہاں پہنچا شہزادے نے اسے فوراً اپنی خلوت گاہ میں بلوا لیا۔ اس کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ عبداللہ خاں تسلیمات بجا لایا تو شہزادے نے اس سے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ عبداللہ خاں!''

عبداللہ خاں شہزادے کے روبرو دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ شہزادہ خاموش رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو کہ گفتگو کہاں سے شروع کی جائے! اس کے چہرے سے اب الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے عبداللہ خاں کی طرف دیکھتا رہا۔ عبداللہ خاں بھی اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ہم نے تمہیں ایک خاص معاملے میں مشورہ کرنے کیلئے طلب کیا ہے۔'' کچھ دیر بعد شہزادے نے کہا۔

''فرمائیے شہزادہ عالم! یہ اس خادم کی عزت افزائی ہے کہ حضور نے اسے اس قابل سمجھا۔ عبداللہ خاں جھک کر بولا۔''

''معاملہ یہ ہے عبداللہ خاں کہ ابھی کچھ دیر قبل شاہ محترم نے ہم سے اس سلسلے میں گفتگو کی تھی کہ آیا راجپوتانہ میں مزید قیام کیا جائے اور بچے کھچے راجپوتوں کا مکمل صفایا کر دیا جائے یا یہاں سے کوچ

کر کے حیدر آباد دکن کا رخ کیا جائے؟ اس ضمن میں میر بخشی ذوالفقار سے ہماری بات ہوئی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ راجپوتوں کے فتنے کو اب ہمیشہ کیلئے ہی ختم کر دیا جائے۔ ہمارے خیال سے میر بخشی ذوالفقار خاں نے مکمل اتفاق کیا تھا' لیکن شاہ محترم سے ہمیں معلوم ہوا کہ آپ کا اس سلسلے میں کچھ اور خیال ہے۔ اس کے علاوہ خان خاناں بھی یہاں مزید قیام کے حق میں نہیں ہیں۔ یہ سن کر ہمیں سوچنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہم نے شاہ محترم سے ابھی کوئی حتمی بات نہیں کی کیوں کہ ہم چاہتے تھے' پہلے بنفس نفیس آپ سے اس مسئلے پر گفتگو کر لیں۔ آپ کو شاید علم نہ ہو عبداللہ خاں کہ ہم تمام معاملات سلطنت سے اور اپنے امیروں کی باہمی چپقلش سے بخوبی آگاہ رہتے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ میر بخشی ذوالفقار اور خان خاناں کے درمیان نہیں بنتی او روہ ہمیشہ ایک دوسرے کی رائے سے اختلاف کرتے رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ہمیشہ خان خاناں کے حق میں ہوتے ہیں۔ اس بات سے سے خود شاہ محترم بھی واقف ہیں۔ انہوں نے اسی لئے اس بار خان خاناں' میر بخشی اور آپ سے الگ الگ مشورہ کیا مگر اس کے باوجود اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بہرحال اب مسئلہ عزت نفس کا ہے۔ اگر یہاں مزید قیام کی بات شاہ محترم تسلیم نہیں کرتے ہیں تو ہماری اور میر بخشی کی بات انہیں رد کرنا پڑے گی۔ ہم اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری رائے اس مسئلے میں فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ معاملہ اگر صرف میر بخشی کا ہوتا تو شاہ محترم آپ دونوں حضرات کی بات مان لیتے مگر درمیان میں ہماری رائے نے اس مسئلے کو الجھا دیا ہے ہم آپ کی زبانی خود وہ دلائل سننا چاہتے ہیں جن کے سبب آپ راجپوتانہ سے روانگی کے حق میں ہیں۔'' شہزادہ عظیم الشان نے اپنی تفصیلی گفتگو ختم کی اور عبداللہ خاں کو دیکھنے لگا۔

مغل لشکر خواہ راجپوتانہ میں مزید قیام کرتا خواہ وہاں سے دکن کیلئے روانہ ہو جاتا اس سے عبداللہ خاں یا خان خاناں کو نہ کوئی نقصان تھا نہ کوئی فائدہ! عبداللہ خاں سوچ رہا تھا کہ شہزادے نے خواہ مخواہ اس مسئلے کو اتنا اہم بنا کر پیش کیا تھا۔ رہا عزت نفس کا مسئلہ تو یہ بھی اتنی اہم بات نہ تھی۔ یہ مسئلہ تو اس وقت ہوتا جب گفتگو روبرو ہوتی۔ شاہ عالم نے تو خان خاناں اور ذوالفقار خاں سے الگ الگ گفتگو کی تھی۔ عبداللہ خاں کی نظر میں اس مسئلے کی کوئی اہمیت نہیں تھی اس لئے وہ صاف اور واضح الفاظ میں شہزادے سے بوالا۔ ''شہزادہ عالم! خان خاناں یا اس خادم کی رائے آپ کی رائے پر ہرگز افضل نہیں۔ اگر آپ کے خادم کو پہلے سے یہ علم ہوتا کہ حضور کا یہ خیال ہے تو یہ جسارت بے جا نہ کرتا۔ رہا ان باتوں کا سوال جن کے سبب آپ کے خادم نے شاہ ذی وقار کو کوچ کی رائے دی تھی' تو اب اسے زیر بحث لانا فضول ہے کیونکہ خادم' حضور کی رائے جاننے کے بعد اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔''

''ہمیں تم سے اسی جواب کی توقع تھی عبداللہ خاں! اور اب ہم تمہارا جواب سن کو یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنی رائے پر نظر ثانی کریں۔ تم نے ہمارے ساتھ جس خلوص اور وفاداری کا اظہار کیا ہے۔ اس کے پیش نظر ہم اس مسئلے پر دوبارہ غور کریں گے۔'' شہزادے نے کہا۔

''بہرحال حضور بہتر سمجھتے ہیں۔ حضور جو فیصلہ کریں گے' یہ خادم اس فیصلے کو قبول کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔'' عبداللہ خاں نے معاملے کو ختم کرنے کی غرض سے کہا تا کہ شہزادہ اس کی جان جلد چھوڑ دے اور وہ راجکماری سے جو گفتگو ادھوری چھوڑ کر آیا ہے اسے پوری کر سکے' مگر اس نے محسوس کیا کہ شہزادہ

ابھی مزید کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کے چہرے پر تردد کے آثار تھے۔ عبداللہ خاں اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

''ہم سوچ رہے ہیں عبداللہ خاں کہ ہمیں شاید اپنا فیصلہ بدلنا ہی پڑے گا اور آپ کی رائے سے متفق ہونا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر شہزادے نے معنی خیز نظروں سے عبداللہ خان کی طرف دیکھا جیسے وہ متوقع ہو کہ اس کی یہ بات سن کر عبداللہ خاں کا چہرہ کھل اٹھے گا۔

''جیسی حضور کی مرضی!'' عبداللہ خاں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا' پھر کہا اب خادم کو اجازت ہے؟''

شہزادہ چونک سا اٹھا اور جلدی سے بولا۔ ''ابھی ہمیں تم سے ایک اور مسئلے پر مزید گفتگو کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے رک کر کہنے لگا۔ ''جو گفتگو ہم کرنے والے ہیں' وہ صرف ہمارے اور تمہارے درمیان رہے گی عبداللہ خاں!'' شہزادے نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''ہم ایک معاملے میں آپ کی مدد لینے پر مجبور ہیں۔''

''حضور کے حکم کی تعمیل ہوگی۔'' عبداللہ خاں فوراً بول اٹھا۔ ''خدا نہ کرے کہ شہزادہ عالم مجبور ہوں۔''

''فی الحال کچھ ایسی بات ہے عبداللہ خاں! لیکن اگر آپ چاہیں تو ہماری مجبور دور ہو سکتی ہے۔'' شہزادہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ عبداللہ خاں نے بھی احتراماً اٹھنا چاہا مگر شہزادے نے اسے روک دیا۔ ''آپ بیٹھے رہیں عبداللہ خاں! ہم کچھ اضطراب سا محسوس کر رہے ہیں اس لئے چہل قدمی کرنا چاہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر شہزادہ ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ عبداللہ خاں کی طرف پلٹا اور بولا۔ ''ہم نے آپ سے کہا تھا عبداللہ خاں کہ ہماری مجبوری آپ دور کر سکتے ہیں۔ کیا بغیر کچھ جانے ہم سے وعدہ کر سکتے ہیں کہ ہم آپ سے جس خواہش کا اظہار کریں گے' آپ اسے ٹالیں گے نہیں؟''

عبداللہ چونک اٹھا اور سوچنے لگا کہ شہزادہ آخر ایسی کیا بات کرنا چاہتا ہے جس کیلئے مجھ سے قبل از وقت وعدہ لینا چاہتا ہے؟ یہ سوچتے ہوئے وہ چند لمحے اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اسے بات معلوم کئے بغیر وعدہ نہیں کرنا چاہئے۔

''آپ فرمائیں تو حضور! خادم اپنی جان بھی حضور پر نثار کر سکتا ہے۔'' ''عبداللہ خاں! پہلے تم وعدہ کرو!'' شہزادے نے ضد کی۔ ''تمہیں پہلے وعدہ کرنا پڑے گا!''

''کیا حضور کو اپنے خادم پر اعتماد نہیں؟'' عبداللہ خاں نے اس کی زبان کھلوانے کیلئے حربہ استعمال کیا اور اس کا حربہ کامیاب رہا۔

''نہیں' یہ بات نہیں عبداللہ خاں! ہم کو تم پر پہلے بھی اعتماد تھا اور آج بھی ہے بلکہ اس اعتماد میں آج کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔'' شہزادہ بوالا۔ اس کے لہجے سے اضطراب جھلک رہا تھا۔ وہ عبداللہ خاں کو ''آپ' کہہ کر مخاطب کرتے کرتے ''تم'' کہہ کر بات کرنے لگا تھا' مگر ظاہر ہے کہ عبداللہ خاں اسے ایسا کرنے پر ٹوک نہیں سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے اور توجہ کے ساتھ شہزادے کی بات سن رہا تھا۔ شہزادہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''تمہاری باتیں سن کر اور تمہارے خیالات جان کر ہم خوش ہوئے ہیں۔ اگر تم ایسا خیال کرتے ہو کہ خدانخواستہ ہمیں تم پر اعتماد نہیں تو سنو کہ تم سے کیا چاہتے ہیں!'' یہ کہتے ہی شہزادہ دوبارہ عبداللہ خاں کے قریب آ بیٹھا۔ عبداللہ خاں تجسس کے سبب ہمہ تن گوش ہو گیا۔ شہزادے

کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ شہزادے کی بات سن کر عبداللہ خاں کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ شہزادہ کہہ رہا تھا ”عبداللہ خاں! ہم نے جب سے اس غارت گرہوش کو دیکھا ہے‘ ہمیں ایک پل سکون نہیں۔ وہ پیکر حسن وجمال‘ حور شمائل ہمارے خرمن دل کو جلا کر خاک کرگئی ہے۔ ہم... ہم جیسے اپنے حواس میں نہیں رہے۔ رہ رہ کر اس کا سراپا ہماری آنکھوں میں گھومتا ہے اور ہم بے تاب ہو اٹھتے ہیں۔ وہ اس کا برق کی طرح کوند کر میر بخشی پر حملہ کرنا‘ وہ اس کا تڑپ کر وار سے بچنا‘ وہ اس کے تیکھے ابرو جیسے کڑی کمان تیر! ہم سمجھتے ہیں کہ تم ہماری بات سن کر شاید یہ سوچو گے کہ یہ باتیں ہم ایسے صاحب مرتبہ کو زیب نہیں دیتیں۔ یہ اچھا نہ لگا ہوگا کہ ہم اس طرح اپنی کیفیات واحساسات کا اظہار کریں‘ مگر ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ ہم ہوش ہی میں کہاں ہیں۔ ہمارا ہوش اور قرار تو وہ پیکر رعنائی لوٹ کر لے گئی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے شہزادے کو قرار آجائے تو... تو عبداللہ خاں اس حسن مکمل کو ہمارے سپرد کر دو‘ اسے ہمیں بخش دو! سوچو کہ کون شخص تمہارے سامنے دست سوال دراز کر رہا ہے! ہم اگر چاہتے تو حصول مقصد کیلئے دوسرے ذرائع بھی استعمال کر سکتے تھے‘ مگر ہماری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ ہم تمہاری مرضی ومنشا کے بغیر کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ بولو‘ جواب دو عبداللہ خاں! کیا تم ہمارے سکون دل کی خاطر یہ ایثار کر سکتے ہو؟ بتاؤ! خاموش کیوں ہو؟ تمہارا سر کیوں جھکا ہوا ہے؟“

عبداللہ خاں گم صم ہو کر رہ گیا۔ اب وہ سمجھا کہ شہزادے نے اسے کیوں طلب کیا تھا! اس نے ابھی جو کچھ کہا تھا‘ اس طلبی کا مقصد یہی تھا۔ باقی تمام باتیں زیب داستاں کیلئے تھیں۔ عبداللہ خاں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ شہزادہ عظیم الشان‘ راجکماری کے تیر نظر کا شکار ہو جائے گا۔ وہ اس لمحے کو کوس رہا تھا جب اس نے شاہ عالم کو یہ بتایا تھا کہ راجکماری ایک ماہر شمشیر زن بھی ہے۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس کے اتنے بھیانک نتائج سامنے آئیں گے۔ نہ وہ شاہ عالم سے راجکماری کی شمشیر زنی کا ذکر کرتا اور نہ شہزادے کی اس پر نظر پڑتی۔ شہزادے کے سوا اگر اس کا کوئی اور رقیب ہوتا تو وہ اتنا فکر مند نہ ہوتا۔ آخر ذوالفقار خاں نے بھی تو راجکماری کی آرزو کی تھی اور عبداللہ خاں نے اسے دھتکار دیا تھا‘ مگر شہزادے کا مسئلہ مختلف تھا۔ اسے بہت سوچ سمجھ کر اور احتیاط کے ساتھ کوئی قدم اٹھانا تھا۔ اس کا کوئی قدم مستقبل کیلئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے مقابل اس وقت ذوالفقار خاں نہیں شہزادہ عظیم الشان تھا‘ وہ عظیم الشان جس پر بادشاہ وقت شاہ عالم بھی مہربان تھا۔ شاہ عالم بھی اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا کیوں کہ فوج پر شہزادے کا بہت اثر تھا۔ جب اسے گم صم بیٹھے کافی دیر ہوگئی تو شہزادے نے پھر اسے کچھ کہنے پر اکسایا۔

”آپ پر میری جان بھی قربان شہزادہ عالم! مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ حضور کی طلب سر آنکھوں پر مگر جس کا ذکر ہے‘ میری حقیر رائے میں اس کی مرضی معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔“ عبداللہ خاں نے آخر کار ادب سے جھکتے ہوئے جواب دیا۔

”کیوں‘ کیا وہ ہماری طلب کو ٹھکرا دے گی؟“ مستقبل کے فرماں روائے ہند کی خواہش کا احترام نہیں کرے گی؟ کیا ایسا بھی ممکن ہے؟ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو عبداللہ خاں ہمارا خیال ہے کہ وہ تو جب یہ سنے گی کہ ہم اسے کیا اعزاز بخشنے والے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سمائے گی۔“ شہزادہ عظیم الشان کسی قدر سخت اور حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

”میں یہ اس لئے عرض کر رہا تھا شہزادہ عالم کہ وہ... وہ لڑکی اول تو ہندو ہے دوم...“

”تو کیا ہوا‘ ہم اسے مسلمان کر لیں گے۔“ شہزادہ جلدی سے عبداللہ خاں کی بات کاٹ کر بولا۔

”آپ نے بجا فرمایا حضور! مگر اس خادم کی پوری بات تو سن لیجئے! وہ لڑکی... آپ کے اس خادم سے رشتہ وفا باندھنے کا عہد کر چکی ہے اور اس نے...“

”عبداللہ خاں! شہزادہ بپھر گیا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں صحیح کہہ رہا ہوں شہزادہ عالم!“

”تو کیا ہم تمہاری خاطر اس لڑکی کو نہیں چھوڑ سکتے؟“

شہزادے نے براہ راست عبداللہ خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

”کیوں نہیں شہزادہ عالم! عبداللہ خاں نے بات بگڑتے دیکھ کر فوراً‘ پھر بولا۔ ”مگر حضور کے اس خادم نے بذات خود اس لڑکی کو ایسا کرنے پر آمادہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود مائل ہوئی تھی۔ اگر وہ حضور کے دامن فیض سے وابستہ ہونا پسند کرتی ہے تو خادم کو کوئی اعتراض نہیں۔“ عبداللہ خاں نے سنبھل کر داؤ چلا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ راجکماری کبھی شہزادے کی پیش کش قبول نہیں کرے گی۔“

”ہمیں یقین کامل ہے عبداللہ خاں کہ جب وہ یہ جانے گی کہ ہمیں بھی اس کی آرزو ہے تو وہ اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائے گی۔“ شہزادہ تمکنت سے بولا۔

عبداللہ خاں کو شہزادے کی خوش فہمی پر ہنسی آئی۔ وہ خود کو نہ جانے کیا سمجھ رہا تھا! لیکن اسے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ شہزادہ‘ راجکماری کی طلب میں صادق ہے۔ وہ واقعی راجکماری کو باعزت طور پر اپنانا چاہتا تھا۔ اس کا یہ کہنا کہ راجکماری کی جگہ واقعی کوئی معمولی راجپوت لڑکی ہوتی۔ بھلا مستقبل کی ملکہ ہند بننے کے لالچ کو کون لڑکی ٹھکرا سکتی تھی! شہزادہ تو راجکماری کی حقیقت سے بے خبر تھا‘ اسے کیا خبر تھی کہ راجکماری ملکہ ہند نہ سہی مگر اب بھی ایک ریاست کے فرماں روا کی بیوی ہے۔ اس کی نظر میں وہ اعزاز کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو شہزادہ اسے بخشنا چاہتا ہے۔

”شہزادہ عالم! میں اس تک آپ کا پیغام پہنچا دوں گا اور نہ صرف یہ پیغام دوں گا بلکہ کوشش کروں گا‘ پوری کوشش کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دے‘ یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔ عبداللہ خاں نے اس وقت اپنی جان چھڑانے اور اس مسئلے کا کوئی حل سوچنے کے لئے مہلت کی خاطر کہا۔‘

”نہیں عبداللہ! شہزادہ جیسے پھنکارا۔“ فیصلہ ابھی ہوا جاتا ہے۔ معاف کرنا ہم عشق کے معاملات میں کسی پر بھروسہ کے قائل نہیں۔“ یہ کہہ کر شہزادے نے تین بار تالی بجائی۔ اس کا ملازم خاص فوراً اندر آ گیا۔ شہزادے نے اسے مخاطب کیا۔ فوراً عبداللہ خاں کے خیمے پر جاؤ اور وہاں موجود راجپوت لڑکی کو ہماری طرف سے حکم دو کہ ہم نے اسے طلب کیا ہے۔ وہ بلا تاخیر ہمارے حضور حاضر ہو!“

ملازم خاص سر جھکا کر چلا گیا اور عبداللہ خاں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ شہزادہ اس کی توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔ عبداللہ خاں کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ خیالات کے بھنور میں ڈوبنے لگا‘ اب کیا ہوگا؟۔

☆......☆......☆

عبداللہ خاں چاہتا تھا کہ وہاں سے جا کر راجکماری کو تمام حالات سے آگاہ کر دے اور اس کے مشورے سے کوئی ایسی راہ نکال لے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ وہ راج کماری کو شہزادے کی طرف سے محتاط کر دے مگر شہزادے کی ایک ہی چال نے جیتی ہوئی بازی کا رخ بدل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میرا جھوٹ کھل گیا تو کیا ہوگا؟ کیا شہزادہ عظیم الشان مجھ سے برگشتہ ہو جائے گا؟

کچھ ہی دیر بعد راج کماری بھی وہاں آ گئی۔ جب وہ خیمے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے سے فکر اور الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے آداب شاہی کا خیال رکھا تھا۔ وہ جھک کر تسلیمات بجا لائی۔ شہزادے کی نظریں راج کماری کے نشیب و فراز پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ راج کماری کو بڑے شوق واشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ! اے ماہ وش!'' شہزادہ خواب کے سے عالم میں بولا۔

شہزادے کے طرز تخاطب' نگاہوں کی بیباکی اور محویت کو سمجھ لینا راج کماری کیلئے مشکل نہ ہوا۔ وہ ادب سے عبداللہ خاں کے قریب بیٹھ گئی' پھر بولی ''حضور نے اس کنیز کو کس لئے یاد کیا ہے؟'' اس کا لہجہ نرم مگر جذبات سے عاری تھا۔

''تم کنیز نہیں ہو۔ تم تو... تم تو ہمارے دل کی ملکہ ہو لڑکی!'' شہزادے نے پہلا وار کیا۔

''حضور کا حسن نظر ہے ورنہ حقیقت وہی ہے جو میں نے عرض کی' راج کماری نے سنبھل کر کہا۔ وہ سمجھ چکی تھی۔ ''حقیقت کیا ہے؟ یہ ہمارے دل سے پوچھو'' شہزادہ پرجوش آواز میں بولا۔ ''ہم تو اسی وقت سے نڈھال ہیں جب سے تمہیں دیکھا ہے۔ ہم اپنے جذبات کا اظہار عبداللہ خاں سے بھی کر چکے ہیں۔ ہم تمہیں اپنے دل کی ملکہ بنانا چاہتے ہیں اور انشاءاللہ وہ وقت بھی آئے گا جب تم ملکہ ہند کہلاؤ گی۔ بولو تمہیں منظور ہے؟''

''یہ کس طرح ممکن ہے شہزادہ عالم! میں... میں ہندو ہوں اور...''

''تو پھر تم شاید عبداللہ خاں کی خاطر بھی اپنا مذہب تبدیل نہیں کرو گی؟ کیوں ٹھیک ہے نا!'' شہزادے کے لہجے میں چبھن تھی۔ جب تم عبداللہ خاں کے لئے ایسا کر سکتی ہو تو ہمارے لئے ایسا نہیں کر سکتیں؟ بولو!... خاموش کیوں ہو؟ ہم تمہارا جواب سننے کے منتظر ہیں۔'' پھر اچانک شہزادہ' عبداللہ خاں کی طرف مڑ کر بولا۔ ''کیوں عبداللہ خاں' تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟''

''جی شہزادہ عالم!'' عبداللہ خاں کو بولنا ہی پڑا۔ پھر اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر راج

کماری کی طرف دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ ''ساوتری! مجھے شہزادہ عالم نے اس لئے یہاں طلب کیا تھا کہ وہ تمہیں اپنانا چاہتے ہیں۔ جب حضور نے مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے عرض کہ کیا تمہاری مرضی اس سلسلے میں ضروری ہے کیوں کہ تم مجھ سے وابستہ ہونا چاہتی تھیں۔ اب میری خواہش ہے کہ تم میرا خیال دل سے نکال دو اور شہزادہ عالم کی ہو جاؤ!''

شہزادے کا چہرے کھل اٹھا۔ وہ مسکرا کر بولا'' ہم تمہارے خلوص وایثار سے خوش ہوئے عبداللہ خاں!'' پھر اس نے راج کماری کی طرف مڑ کر کہا ''اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟ ہم تو سمجھتے ہیں' تمہیں اس پر فخر کرنا چاہئے کہ خانوادہ تیموریہ کے ایک شہزادے کا قرار بننے والی ہو۔ کیوں' کیا ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں؟''

''شہزادہ عالم! یہ معاملہ عبداللہ خاں کا نہیں میرا ہے اس لئے عبداللہ خاں کے کچھ کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا!'' راج کماری پراعتماد لہجے میں بولی۔

''تم کیا چاہتی ہو؟ وہ بتاؤ!'' شہزادے کے لہجے میں سختی آ گئی۔'' کیا تم خوش نصیب کہلائے جانا پسند نہیں کرتیں؟''

''شہزادہ عالم! خوش نصیبی یا بدنصیبی جو بھی جس کے ''لڑکی! تم کیا واضح الفاظ میں ہماری بات کا جواب نہیں دے سکتیں؟'' شہزادہ غصے کے عالم میں بولا۔

''کنیز کو جو کچھ عرض کرنا تھا' وہ عرض کر چکی ہے۔'' راج کماری کی آواز میں سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ ''اگر عبداللہ خاں آپ کی وجہ سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہیں۔ شہزادہ عالم تو میں ان سے دستبردار ہونا نہیں چاہتی!''

''عبداللہ خاں! اس بے عقل لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ! اسے سمجھانے کی کوشش کرو کہ یہ کیا کھو دینا چاہتی ہے! اسے شاید ابھی یہ معلوم نہیں کہ کسی شہزادے کے دامن فیض سے وابستہ ہونے کا کیا مطلب ہے!'' یہ کہہ کر شہزادہ اٹھ کھڑا ہوا۔

عبداللہ خاں بھی اٹھ گیا اور راج کماری بھی۔ عبداللہ خاں نے ادب سے جھک کر کہا'' خادم کوشش کرے گا یہ لڑکی راہ راست پر آ جائے۔''

''ہاں تم کوشش کر کے دیکھو ورنہ ہمیں دوسرے راستے بھی اپنانا آتے ہیں۔ یہ لڑکی شاید اس بات سے بے خبر ہے۔'' شہزادے نے دھمکی دی اور پھر خیمے کے اندرونی حصے کا پردہ اٹھا کر غائب ہو گیا۔

عبداللہ خاں نے راج کماری کا ہاتھ پکڑا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔ وہ دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے اپنے خیمے تک پہنچ گئے۔ امیر اللہ اور ایک دوسرے خادم نے ان کے گھوڑوں کی باگیں تھام لیں اور وہ خیمے میں داخل ہو گئے۔

'' تمہارا حسن نہ جانے کیا کیا قیامتیں ڈھائے گا! ابھی ایک رقیب سے جان نہیں چھوٹی کہ دوسرا پیدا ہو گیا۔ بس اب اللہ ہی خیر کرنے والا ہے!'' عبداللہ خاں نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا حالانکہ اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا مگر وہ راج کماری کو فکر مند کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''یہ میرے حسن کا قصور ہے' یا تم ایسے خراب نظروں کا! جو زبردستی ایک شادی شدہ عورت کو

اپنے دامن میں پھنسانا چاہتے ہیں۔'' راج کماری نے بھی خوش مزاجی سے مسکراتے ہوئے کہا'' ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی بکاؤ مال بن گئی ہوں جس کے جی میں آرہا ہے' بولی لگا رہا ہے۔ حد ہوگئی!''

''مگر اب یہ دیکھنا ہے سرکار کہ کس کی بولی اونچی رہتی ہے۔

اپنے پورے وجود کو بولی پر لگا دیا ہے۔اب یہ ہماری تقدیر کہ مال کدھر جاتا ہے۔ ویسے مستقبل کی ملکہ ہند بنانے والے کی بولی بھی کم نہیں ہے۔''عبداللہ خاں نے اسے چھیڑا۔

''تو پھر مان جاؤ نا شہزادے کی بات پھر تو ٹھنڈی میٹھی آہیں بھرنا بند کردو گے؟'' وہ گھور کر بولی۔

''حضور کی مرضی ہے خادم کیا عرض کرسکتا ہے!''

''ہوں! آپ خادم بن رہے ہو اور شہزادے کے سامنے مخدوم بنے بیٹھے تھے۔ ذرا جناب کی بڑ تو ملاحظہ کیجئے کہ جناب سے وابستہ ہونا چاہتی ہوں! بہت خوب! جواب ہی نہیں اس خوش فہمی کا!'' اس نے اٹھلا کر کہا۔

''تم اس وقت بالکل ان لڑاکا عورتوں کی طرح لگ رہی ہو جو شوہروں کی ناک میں ہر وقت نکیل ڈالے رہتی ہیں۔''

''تمہاری ناک میں تو ابھی نکیل نہیں ڈالی! تم اپنی ناک بچائے رکھنا! یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ سے ہنس دی' پھر کہنے لگی۔'' اچھا اب یہ ٹھٹول چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اس گاؤدی کو کس طرح سمجھاؤ گے؟'' اس عاشق مزاج شہزادے کو جو بڑی نرم گرم نظروں سے مجھے تکے جارہا تھا جیسے نظروں ہی نظروں میں....''

''ہائے اپنے عاشق صادق کے بارے میں تمہارے یہ خیالات! ''عبداللہ خاں نے ہنستے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

''تم پھر انٹ شنٹ ہانکنے لگے! کیا بھول گئے کہ اس نے چلتے وقت دھمکی بھی دی تھی!''

عبداللہ خاں سنجیدہ ہوگیا اور بولا اس الجھے ہوئے مسئلے کا صرف ایک حل ہے۔''

''اور وہ یہ کہ تم مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دو!'' راجکماری نے شرارت سے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو' ایک حل یہ بھی ہے۔''عبداللہ خاں بدستور سنجیدگی سے بولا' مگر میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔''

''وہ بھی میں بتائے دیتی ہوں۔تم کہو گے کہ میں فوراً مسلمان ہوکر تم سے شادی کرلوں۔ کیوں یہی نا؟'' اس نے عبداللہ خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔عبداللہ خاں لاجواب ہوگیا کیونکہ راج کماری نے وہی کہا تھا جو وہ خود کہنا چاہتا تھا۔ راجکماری مزید بولی''خاموش کیوں ہو۔''

''ہاں یہی بات بھی تھی۔عبداللہ خاں نے اقرار کیا' پھر طویل سانس لے کر پوچھا'' کیا تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے؟''

''مگر شاید اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ راج کماری سنجیدہ نظر آنے لگی۔'' تم اس سے کچھ وقت کی مہلت مانگ سکتے ہو۔تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ تم مجھے شیشے میں اتارنے کی کوشش کررہے ہو' لیکن کب تک میں اسے جھوٹی تسلیوں سے بہلا سکتا ہوں۔'' عبداللہ خاں نے اعتراض کیا۔

''اس وقت تک جب تک کہ کوئی فیصلہ نہ ہوجائے۔'' راج کماری نے جواب دیا۔

''خدا کرے تم جلد از جلد فیصلہ کرلو اور وہ فیصلہ میرے حق میں ہو۔'' عبداللہ خاں بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

خیمے کے بیرونی حصے میں آکر اس کا ذہن پھر الجھ گیا۔ بار بار اسے شہزادے کی دھمکی یاد آرہی تھی اس شب اسی لیے عبداللہ خاں نے خوب ڈٹ کر شراب پی پھر وہ نہ جانے کب بے سدھ ہوکر سو گیا

صبح آنکھ کھلتے ہی اس نے خیمے کے اندرونی حصے کا رخ کیا مگر' جیسے ہی وہ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ خیمہ خالی تھی۔ وہ چیخ اٹھا''امیر اللہ! امیر اللہ دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔عبداللہ خاں اس پر برس پڑا۔''وہ لڑکی کہاں ہے؟''

امیر اللہ حیرت زدہ سا خیمے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں سارے خدمتگار اس کے سامنے موجود تھے۔ انکا بیان تھا کہ وہ رات بھر حکم کے مطابق خیمے کے اردگرد پہرا دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے ایک لمحے کی بھی غفلت نہیں برتی۔ رات بھر خیمے سے کوئی چڑیا کا بچہ بھی باہر نہیں نکلا۔'' پھر وہ کہاں گئی؟'' اسے زمین نگل گئی یا آسمان؟'' عبداللہ خان گرجا۔

خدمتگاروں کے سر جھک گئے۔عبداللہ خاں کے سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

میری نگاہیں تاریخ کے اس عہد پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اس طرح سب کچھ دیکھ اور محسوس کر رہی تھی جیسے وہاں خود موجود ہوں مگر اب تک میرے اس سوال کا جواب نہیں ملا تھا کہ مغلوں کی وسیع و عریض حکومت کس طرح ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گی اور صرف لال قلعے تک محدود ہوکر رہ گئی؟ میرے ذہن میں پھر یہی سوال بار بار گردش کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ واقعات انتہائی تیزی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے' بالکل کسی تیز رفتار ایکشن فلم کی طرح! مگر یہ واقعات پوری طرح مربوط اور مسلسل تھے' ہاں اس میں برق رفتاری ضرور آ گئی تھی۔

تلاش وجستجو کے بعد عبداللہ خاں کو معلوم ہوا کہ راج کماری انیتا فرار نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے اغوا کیا گیا تھا۔اس کا ثبوت وہ سرنگ تھی جو اندرونی خیمے تک کھودی گئی تھی۔ کافی کاوش کے بعد عبداللہ خاں اس نتیجے پر پہنچا کہ راجکماری کے اغوا میں ذوالفقار خاں کا ہاتھ ہے۔ اپنے قیاسات سے اس نے شہزادہ عظیم الشان کو بھی آگاہ کر دیا۔اسی دوران میں راجپوتوں نے اطاعت قبول کرلی۔ طے پایا کہ اب مغل لشکر دارالحکومت شاہجہاں آباد (دہلی) کی طرف کوچ کرے۔عبداللہ خاں نے اپنی آبائی حویلی دوبارہ آباد کر دی۔ قلعے سے اپنی حویلی میں منتقل ہوگیا۔اسی کے ساتھ اس نے راجکماری کی تلاش شروع کردی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ راج کماری واقعی ذوالفقار خاں کے حرم میں موجود ہے یا یہ محض اس کا وہم ہے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر اس نے ذوالفقار خاں کے اردگرد جال پھیلا دیا۔اس نے دو کنیزیں' ذوالفقار خاں کے حرم میں داخل کرادیں تاکہ ان کے ذریعے راج کماری کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکے۔ ایک صبح عبداللہ خاں کا ایک آدمی مراد خاں' راج کماری کے بارے ایک میں اہم اطلاع لے کر آیا۔

مراد خاں نے اطلاع دی کہ راج کماری' ذوالفقار خاں ہی کے حرم میں ہے۔ راج کماری کو

وہاں سے نکالنے کیلئے عبداللہ خاں نے ایک چال چلی۔ وہ راجپوت سردار درگاداس سے ملا اور درگاداس کو شیشے میں اتار کر اس پر آمادہ کرلیا کہ ذوالفقار خاں کے حرم پر راجپوت سپاہی اچانک حملہ کردیں اور راجکماری کو وہاں سے نکال لے جائیں۔ اسی دن عبداللہ خاں کو بادشاہ شاہ عالم نے طلب کرلیا۔

بادشاہ نے امیروں کا اجلاس اس لئے طلب کیا تھا کہ حیدرآباد دکن پر فوج کشی کا مسئلہ طے ہو جاسکے۔ اس اجلاس میں اپنی حیثیت منوانے کیلئے عبداللہ خاں نے ایک تجویز پیش کی جو قبول کرلی گئی۔ تجویز یہ تھی کہ کسی بہادر اور ذہین شخص کو حیدرآباد بھیجا جائے جو شہزادہ کام بخش کے امیروں کے درمیان اختلاف کو مزید ہوا دے کر اس کی فوجی قوت کمزور کرسکے۔ اسی کے ساتھ شہزادہ کام بخش کو مصالحت کا ایک پیغام بھی بھیجے جانے کا فیصلہ ہوا۔ شہزادہ کام بخش تخت کا دوسرا دعویدار اور شاہ عالم کا بھائی تھا۔ اس اہم کام کیلئے قرعہ فال عبداللہ خاں کے نام نکلا اور طے ہوا کہ وہ آئندہ روز حیدرآباد روانہ ہوجائے۔ اس ضمن میں تمام ضروری کارروائیاں فوری طور پر عمل میں لائی گئیں۔

اسی روز بعد مغرب راجپوت سپاہیوں نے ذوالفقار خاں کے حرم پر اچانک حملہ کردیا اور راجکماری کو رہا کرا کے شہر سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ عبداللہ خاں اپنے منصوبے کے مطابق اپنے جاں نثار بہادر ساتھیوں کے ہمراہ شہر سے تقریباً دو منزل دور قومی شاہراہ پر راجپوت سپاہیوں کا منتظر تھا۔ جیسے ہی راجپوت سپاہی قریب آئے عبداللہ خاں نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان پر حملہ کردیا۔ جلد ہی راجپوت سپاہیوں کے پیر اکھڑ گئے۔ عبداللہ خاں سیاہ لبادے میں ملبوس تھا۔ راج کماری سے نبرد آزمائی کرتا ہوا عبداللہ خاں اس جگہ سے دانستہ کافی دور نکل آیا جہاں میدان کارزار گرم تھا۔ راج کماری انیتا ناواقف تھی کہ وہ کس سے شمشیرزنی کررہی ہے۔ اس نے عبداللہ خاں کے گھوڑے کو شدید زخمی کردیا۔ عبداللہ خاں کو اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے روند ڈالنا چاہتی تھی۔ یہ دیکھ کر عبداللہ خاں لرز اٹھا۔

عبداللہ خاں نے فوری طور پر سیاہ لبادہ اتار کر خود کو راج کماری پر ظاہر کردیا۔ پھر اس نے راج کماری کو سب کچھ بتادیا کہ راج کماری کی تلاش میں وہ کن کن مرحلوں سے گزرا اور یہ بھی کہ ذوالفقار خاں کے حرم سے راج کماری کے فرار میں دراصل اسی کا ہاتھ ہے۔ راج کماری کو عبداللہ خاں اپنے ساتھ دوبارہ شاہجہاں آباد لے آیا مگر اس بار راج کماری عبداللہ خاں کی حویلی میں ٹھہری تھی۔ راج کماری اس شرط پر عبداللہ خاں کے ہمراہ رہنے پر آمادہ ہوگئی کہ عبداللہ خاں اس سے جسمانی قرب کی خواہش نہیں کرے گا۔

دوسرے دن صبح عبداللہ خاں، راج کماری اور اپنے کچھ خادموں کے ہمراہ دکن کیلئے روانہ ہوگیا۔

حیدرآباد پہنچ کر عبداللہ خاں وہاں کے گلی کوچوں اور بازاروں کو عجیب سی نظروں سے دیکھتا، ایک محویت کے عالم میں آگے بڑھتا رہا۔ وہ جیسے ان گلی کوچوں میں کھو سا گیا تھا۔ اسکے ذہن میں وہ تمام واقعات جاگ رہے تھے جو اس نے اس شہر کے بارے میں سنے تھے۔ جو کیفیت عبداللہ خاں کی تھی، اس کے ساتھیوں کی بھی تھی۔ ہر چند کہ ابھی صبح ہوئی تھی اور زندگی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی مگر در و دیوار جیسے کہہ رہے تھے کہ یہاں بڑی رونقیں ہیں، بڑی محفلیں ہیں۔ یہاں اجنبی آکر ہمارے سحر میں

کھو جاتے ہیں، ہماری عظمتوں میں گم ہوجاتے ہیں۔ ہماری اپنی روایتیں ہیں، اپنی تاریخ ہے کہ ہم ایک عرصے سے سربلند ہیں اور ایک عمر تک سربلند رہیں گے۔ سننے والے کان در و دیوار کی گفتگو سن رہے تھے اور در و دیوار اپنی عظمت کے فسانے سنا رہے تھے۔ شاید وہ ہر آنے والے کو یہی قصے سنا رہے تھے، مگر سماعت تو اس کی متحمل نہیں ہوتی کہ زبان خاموشی کی گفتگو سن سکے، محسوس کرسکے۔ عبداللہ خاں نے یہ سب کچھ ضرور سنا اور محسوس کیا۔

اسی روز عبداللہ خاں، ایک امیر تقریب خاں سے ملا جو بظاہر شہزادہ کام بخش کا امیر تھا مگر بہ باطن شاہ عالم سے ملا ہوا تھا۔ عبداللہ خاں نے تقریب خاں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ شہزادہ کام بخش سے اس کی ملاقات کیلئے راہ ہموار کرے۔ عبداللہ خاں، راجکماری اور اپنے ساتھیوں سمیت تقریب خاں کی حویلی میں ٹھہر گیا۔ تقریب خاں، شہزادہ کام بخش سے ملنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کسی نے عبداللہ خاں کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ کھولا تو برہنہ شمشیریں اس کی منتظر تھیں۔ شمشیر بہ دست گروہ نے عبداللہ خاں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور پھر ایک نوجوان شخص اس کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی تلوار تھی اور ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ! اسی نوجوان امیر کا نام احسن خاں تھا جس نے عبداللہ خاں کو کام بخش کے حکم پر حراست میں لیا تھا۔ گرفتاری کا سبب یہ تھا کہ عبداللہ خاں کی معزولی کی خبر اس وقت تک حیدرآباد نہیں پہنچی تھی۔ عبداللہ خاں کو اس کی رہائی کی خبر زنداں ہی میں ملی۔

کام بخش کو فریب دینے کیلئے یہ منصوبہ بنایا گیا تھا کہ بظاہر عبداللہ خاں کو معزول کردیا جائے۔ حیدرآباد پہنچ کر عبداللہ خاں یہ ظاہر کرے کہ وہ شاہ عالم سے ناراض ہوکر کام بخش سے آملا ہے۔ پر وہ اپنے بقیہ منصوبے، یعنی کام بخش کے امیروں کے درمیان اختلافات کو ہوا دے کر اس کی قوت کو کمزور کرے۔

عبداللہ خاں کی معزولی کی تصدیق ہونے کے بعد دوسرے دن صبح اسے رہا کردیا گیا۔ گزشتہ شب کام بخش کے نوجوان امیر احسن خاں نے راجکماری انیتا کو زنداں سے اپنی حویلی میں بلوالیا تھا تاکہ اذیت دے سکے، مگر راج کماری اسے زخمی کرکے صبح تک تقریب خاں کی حویلی پہنچ گئی۔ احسن خان نے راجکماری کے متعلق قید خانے سے مفروضہ فرار کی خبر اڑا دی تھی تاکہ وہ الزام سے بچا رہے۔

کام بخش کے امیروں کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ کی سربراہی احسن خاں کرتا تھا، دوسرے کی وزیر سلطنت محسن خاں، مصلحت کے پیش نظر عبداللہ خاں، وزیر سلطنت محسن خاں کے گروہ میں شامل ہوگیا۔ سے یہاں بھی محسن خاں کی سفارش پر نائب وزیر سلطنت کا عہدہ ملا تھا۔ اس روز عبداللہ خاں، کام بخش سے مل کر آیا تو بہت تھکا ہوا تھا اس لئے جلد سو گیا۔ راجکماری برابر والے کمرے میں سوئی۔ سوتے سوتے اچانک عبداللہ خاں نے راجکماری کی چیخ سنی۔ اس نے جھپٹ کر سرہانے رکھی ہوئی تلوار اٹھائی اور دروازے کی طرف دوڑا۔

راجکماری کی چیخ کا سبب یہ تھا کہ تقریب خاں ایک پراسرار وجود کا روپ دھار کر اس کے کمرے میں ایک خفیہ راستے کے ذریعے آگیا تھا۔ وہ راج کماری پر دست ہوس دراز کرنا چاہتا تھا۔ راجکماری اسے کوئی پراسرار وجود ہی سمجھی تھی، مگر جب عبداللہ خاں نے کمرے میں خفیہ راستہ تلاش کرلیا تو وہ

ساری بات سمجھ گئی۔ اس رات عبداللہ خاں نے راجکماری کو اپنے کمرے میں سونے کو کہا تاکہ تقریب خاں دوبارہ یہ سوانگ نہ رچا سکے۔

''مگر یہاں تو صرف ایک مسہری ہے۔'' میں آخر کہاں سوؤں گی؟ راجکماری نے اعتراض کیا۔

''خادم کے پہلو میں سو جایئے گا۔'' عبداللہ خاں نے شرارت سے کہا۔

''اچھا تو تم اس لئے مجھے یہاں لائے ہو! کیا اپنا عہد بھول گئے؟'' راجکماری تیوریوں پر بل ڈال کر بولی۔

''میں کوئی نئی بات تو کہہ نہیں رہا۔ تم پہلے بھی تو شاہجہان آباد میں میرے ساتھ سو چکی ہو اور پھر یہ کہ میں اس سے زیادہ کچھ طلب بھی تو نہیں کر رہا۔'' عبداللہ خاں نے کہا۔

''نہیں! میں نیچے قالین پر سو جاؤں گی۔ تم شرارت کرنے لگتے ہو۔'' راجکماری مسکرائی۔

''تو کیا اب شرارت بھی نہ کروں! یہ تو بڑا ظلم ہے۔'' عبداللہ خاں نے آگے بڑھ کر راج کماری کا ہاتھ تھام لیا اور مخمور لہجے میں بولا ''آ جاؤ' کلیجے سے لپٹ کر مرے سو جاؤ!''

راج کماری کو بادل نخواستہ عبداللہ خاں کے ساتھ ہی مسہری پر دراز ہونا پڑا۔

''شرافت سے دوسری طرف منہ کر کے سو جاؤ!'' راجکماری لیٹے ہوئے بولی۔

''اور اگر میں یہ کہوں کہ تم ادھر میری طرف منہ کر لو تو؟ چت لیٹنے سے تمہاری کمر میں درد ہو جائے گا۔'' عبداللہ خاں نے برجستہ کہا۔

''کمر میری ہے اور فکر تمہیں ہے!'' راجکماری شوخ لہجے میں کہنے لگی۔

''ظاہر ہے تمہاری کمر سے اور کسے دلچسپی ہو سکتی ہے! کیا خیال ہے؟ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں!''

''اور راجہ اجیت سنگھ' یعنی میرے شوہر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔'' راجکماری نے عبداللہ خاں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یہ تلخ ذکر نہ چھیڑو تو زیادہ بہتر ہے۔ قرب کا سارا مزہ کرکرا ہو کے رہ گیا۔'' عبداللہ خاں نے منہ بنا کر کہا۔

''حقیقتیں ہمیشہ تلخ ہوتی ہیں عبداللہ خاں! بہادر وہ ہوتے ہیں جو حقیقتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں۔'' راجکماری عجیب سے لہجے میں بولی۔

''اگر تمہاری نظر میں بہادری کی یہی تعریف ہے تو میں بزدل ہی بھلا! آؤ' ادھر آؤ!... قریب آ جاؤ! یقین کرو کہ میں بوالہوسی کا مظاہرہ نہیں کروں گا اور اپنے ان الفاظ پر قائم رہوں گا جو میں نے تم سے شاہجہان آباد میں کہے تھے۔'' عبداللہ خاں نے اسے گھسیٹ کر سینے سے لگا لیا اور پھر اس کے جسم میں لہو سنسنانے لگا۔

''عبداللہ خاں! تم آخر تشنگی کا یہ کھیل کیوں کھیلتے ہو؟ وہ خواب دیکھا ہی کیوں جائے جو حقیقت نہ بن سکے!'' راجکماری آہستہ سے بولی۔

''خواب تو اندھے بھی دیکھتے ہیں' راجکماری! میں تو پھر روشن آنکھیں رکھتا ہوں۔ رہا تشنگی کا

مسئلہ تو یہ تشنگی سیرابی میں بھی بدل سکتی ہے۔ مجھے صرف تمہاری رضامندی چاہئے کیوں کہ میں بہرحال عہد فراموش اور بوالہوس کہلانا پسند نہیں کرتا' وہ بھی تمہاری زبان سے اور تمہارے مسئلے میں!'' عبداللہ خاں نے راجکماری کی گھنی اور لمبی زلفوں سے کھیلتے ہوئے خمار آلود لہجے میں کہا ''تمہارے لب پر حرف شکایت آئے' یہ مجھے پسند نہیں۔''

''نہیں! یہ ناممکن ہے!'' راج کماری کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ''میں اپنے شوہر کی امانت میں خیانت نہیں کر سکتی تم یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو عبداللہ خاں!''

''میرا خیال ہے راج کماری کہ خواب تو تمہاری آنکھوں میں بھی ہیں مگر تم انہیں تسلیم نہیں کرتیں۔''

''ایسی... ایسی کوئی.... کوئی بات نہیں! تم اگر.... اگر یہ سمجھتے ہو تو غلطی پر ہو...'' راجکماری جلدی سے بولی۔

''اگر خدانخواستہ ایسا نہیں تو اے ظالم! تو میں یہی کہوں گا کہ آنکھیں ہیں تو خوابوں کی تمنا بھی کیا کر! عبداللہ خاں یہ کہتے ہوئے اس کے سرخ و مرطوب ہونٹوں پر جھک گیا۔ اس نے خراج محبت وصول کر لیا۔ خلاف توقع راجکماری نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ عبداللہ خاں نے اپنی بانہوں کا حصار اور تنگ کر دیا۔

''بس اب بہت ہو چکا' مجھے چھوڑ دو!'' راجکماری کسمسائی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔

''لو چھوڑ دیا۔'' عبداللہ خاں نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ آخر کب تک اپنے آپ سے لڑتی رہو گی؟''

''شائد ہمیشہ!.... اور.... اور شاید یہی میرا مقدر ہے۔'' راجکماری کی آواز میں عجیب سا دکھ تھا۔

''اچھا تو اب سو جاؤ' شب بہ خیر!'' عبداللہ خاں نے یہ کہہ کر دوسری جانب کروٹ لے لی۔ خود پر قابو پانے اور اپنے جذبات پر بند باندھنے میں اسے بڑی اذیت سے گزرنا پڑا۔ وہ عہد کر چکا تھا کہ جب تک راجکماری خود جسم و جاں کی یکجائی قبول نہیں کرے گی وہ ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھے گا۔ یہ مرحلہ اس کی عزت نفس اور مردانگی کیلئے ایک طرح اس کی آزمائش تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس آزمائش پر پورا اترے گا۔

دوسرے دن صبح گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے سے تقریب صاف صاف مکر گیا۔ اسی روز صبح وزیر مملکت محسن خاں' عبداللہ خاں سے ملا۔ محسن خان اور اس کے زیر اثر امیروں سے مل کر عبداللہ خاں نے احسن خاں اور اس کے گروہ میں شامل دوسرے امیروں کے خلاف ایک سازش تیار کر لی۔ اس نے کام بخش سے مل کر اسے یقین دلایا کہ احسن خاں' رستم دل خاں اور سیف خاں اس کیخلاف بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ ثبوت کے طور پر اس نے خود احسن خاں کے خادم خاص کو کام بخش کے سامنے پیش کر دیا۔ خادم کو خاصے مال و دولت کے عوض عبداللہ خاں نے جھوٹی گواہی پر آمادہ کر لیا تھا۔ کام بخش کے پہلے

عتاب کا شکار حیدرآباد کا سابق قلعہ دار رستم دل خاں ہوا۔ کام بخش نے اسے سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ یہ سزا خود اس کی سواری کے ہاتھی کے نیچے اسے ڈال کر دی جانے والی تھی۔ گویا رستم دل خاں کی سواری کا ہاتھی اسے کچل دے۔ پھر اسی روز صبح قلعے کے سامنے میدان میں اس حکم پر عمل ہونے لگا۔

میدان کے سرے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ عبداللہ خاں' وزیر مملکت محسن خان اور دوسرے امراء ' کام بخش کے ہمراہ تھے۔ کام بخش کی سواری قلعے سے نکلی اور قلعے کے سامنے میدان میں جو شامیانہ لگایا گیا تھا' اس کی جانب بڑھی۔ شامیانے میں بڑے سے تخت کے سامنے ایک شخص رسیوں میں جکڑا ہوا تھا اور یہ رستم دل خاں تھا' وہ رستم دل خاں جو کبھی اس شہر حیدرآباد کا قلعہ دار تھا اور کام بخش کے جانثاروں میں شمار ہوتا تھا۔ کچھ فاصلے پر رستم دل خاں کی سواری کا ہاتھی کھڑا تھا جس پر فیل بان مستور بیٹھا تھا۔ جیسے ہی کام بخش تخت پر جلوہ افروز ہوا اس نے ہاتھ کے اشارے سے محافظوں کو کارروائی شروع کرنے کا حکم دیا۔

محافظ اشارہ پاتے ہی رستم دل خاں کو گھسیٹتے ہوئے کچھ دور لے گئے۔ پھر وہ الگ ہٹ گئے۔ کچھ فاصلے پر کھڑے ہاتھی کے فیل بان نے ہاتھی کو رستم دل خاں کی طرف ہانکا اور پھر سب دنگ رہ گئے۔ ہاتھی نے رستم دل خاں کو اپنے پاؤں کے نیچے نہیں آنے دیا اور اسے بچاتا ہوا ایک طرف سے گزر گیا۔ فیل بان نے ہاتھی کو دوبارہ اسی طرف لوٹایا جہاں رستم دل خاں پڑا تھا' مگر اس مرتبہ بھی ہاتھی نے رستم دل خاں کو پاؤں تلے نہیں روندا۔ فیل بیان نے لوہے کا آنکس ہاتھی کے سر پر مارا۔ ہاتھی چنگھاڑ کر رستم دل خاں کی طرف جھپٹ پڑا۔ اس بار سب کو یقین تھا کہ رستم دل خاں کا آخری وقت آ پہنچا ہے لیکن وفادار ہاتھی آقا کشی پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا اپنے آقا کے قریب سے گزر گیا اور آقا کو کوئی گزند نہ پہنچنے دیا۔

فیل بان کی تمام تر کوششیں رائیگاں جا رہی تھیں۔ اور کام بخش کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ کام بخش سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ ہاتھی کا غصہ فیل بان پر اتار دیتا مگر ایسا نہیں ہوا۔

''دوسرا ہاتھی لایا جائے!'' آخر کام بخش سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ چیخ اٹھا۔

کام بخش کا حکم سنتے ہی اس کے خادم قلعے کی طرف دوڑ پڑے۔ کچھ ہی دیر میں شاہی فیل خانے سے دوسرا ہاتھی میدان آ گیا۔ رستم دل خاں کے ہاتھی کو میدان سے ہٹا دیا گیا۔ نئے ہاتھی پر دوسرا فیل بان بیٹھا تھا۔ اس نے ہاتھی کو اشارہ کیا۔ ہاتھی نے تخت شاہی کے سامنے پہنچ کر اپنی سونڈ سے سلامی دی اور جھک کر الٹے قدموں کچھ دور گیا' پھر معاً پلٹ کر اس طرف دوڑا جہاں رستم دل خاں بندھا پڑا تھا۔ ہاتھی نے پہلے ہی حملے میں رستم دل خاں کے جسم کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ اس کی آخری چیخیں بڑی دل دوز تھیں۔ کام بخش کے امراء سے ایک ذہین' بہادر اور وفادار شخص کم ہوچکا تھا۔

جس وقت رستم دل خاں کو قتل کیا جا رہا تھا' وہاں سیف خاں اور احسن خاں دونوں ہی موجود تھے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ رستم دل خاں کے بعد کام بخش کے استاد سیف خاں کی باری آ گئی۔ اس بوڑھے نے اپنی بڑی صفائی پیش کی مگر کام بخش نے ایک نہ سنی۔

''خاموش رہ بوڑھے عیار! تو جھوٹ بولتا ہے۔'' کام بخش چیخا۔ تیرے الفاظ سے جھوٹ کی بو آتی ہے۔ ہم تیرے لئے حکم دیتے ہیں کہ ابھی اور اسی وقت تیرا وہ ہاتھ کاٹ دیا جائے جس سے تو نے

دار رستم دل خاں کو خط لکھا تھا۔

کام بخش کے منہ سے ابھی یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ عبداللہ خاں کے اشارے پر تخت شاہی کے قریب کھڑے ہوئے مسلح محافظوں نے سیف خاں کو گھیر لیا اور اسے گھسیٹ کر تخت شاہی سے نیچے اتار دیا۔ وہ چیختے چلانے لگا اور اپنی وفاداری کے ثبوت پیش کرنے لگا مگر اس کی کوئی بات نہیں سنی گئی۔

کام بخش کے محافظ دستے کا نگراں' سیف اللہ کو گھسیٹ کر تخت شاہی کے سامنے لایا۔ دو سپاہیوں نے اسے جکڑ رکھا تھا اور وہ چیختے جا رہا تھا۔ اسی چیخ پکار کے دوران میں محافظ دستے کے نگران نے اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا۔ شدت تکلیف سے وہ چیخ اٹھا اور پھر بہ آواز بلند کام بخش کو گالیاں بکنے لگا اور پھر کام بخش سے بولا۔ ''یہ ماں کی طرف سے تیری کم اصلی کا ثبوت ہے کہ تو نے اس ہاتھ کو بے قصور کٹوا دیا جس ہاتھ سے میں نے تجھے تیر اندازی سکھائی تھی۔''

جس وقت سیف خاں کو یہ سزا دی جا رہی تھی' کام بخش کے حکم پر اس کی بیوی کو بھی گھسیٹتے ہوئے لا کر تخت شاہی کے قریب بٹھا دیا گیا۔ وہ بڑھیا بڑی مجبوری و بے بسی کے عالم میں اپنے شوہر کو سزا پاتے ہوئے اشک بار آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

سیف خاں نے جب گالیاں بکنا شروع کیں اور کام بخش کی اس سے توہین ہوئی تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ چیخ اٹھا ''اس گستاخ اور بے ادب بوڑھے کی زبان بھی گدی سے کھینچ لی جائے!''

''کام بخش کے حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ بوڑھے سیف خاں کے منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ دایاں ہاتھ کٹنے کے سبب اس سے پہلے ہی خون بہہ رہا تھا ضعیفی کی وجہ سے سیف خاں چند لمحے بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا اور تخت شاہی کے سامنے اوندھے منہ گر پڑا۔ اسی وقت لوگوں نے ایک اور عجیب اور پر تاثر منظر دیکھا۔ بوڑھے سیف خاں کی بیوی نے اپنے شوہر کا حال دیکھ کر اپنی زبان بھی حلق سے کھینچ لی۔ وہ بھی زمین پر گر کر تڑپنے لگی اور پھر کچھ ہی دیر میں اس کا جسم بھی ساکت ہوگیا۔ سیف خاں کا جسم سیدھا کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ سفر آخرت پر روانہ ہوچکا ہے۔ ان دونوں بوڑھے اور بڑھیا کی لاشیں گھسیٹ کر رستم دل خاں کی کچلی ہوئی لاش کے برابر ڈال دی گئی۔ رستم دل خاں کی لاش ابھی میدان سے ہٹائی نہیں گئی تھی۔

اس وقت کام بخش کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ اس کے احسن خاں ہی گروہ ہی میں شامل دو اور امیروں کی گرفتاری کا حکم دیا جس کی فوراً تعمیل ہوئی۔ وہ دونوں وہیں موجود تھے۔ گرفتاری کے بعد جب ان دونوں کو تخت شاہی کے سامنے حاضر کیا گیا تو کام بخش کے لبوں کو حرکت ہوئی۔'' اسے ہاں اس احمد خاں افغان کو ہم سزائے موت کا حکم دیتے ہیں اور اس دوسرے گستاخ راشد خاں کی زبان کھینچ لی جائے!'' کام بخش کا حکم سنتے ہی محافظ ان دونوں کو لے کر پیچھے ہٹے۔ اسی وقت کام بخش پھر سپاہیوں سے مخاطب ہوا کہ احمد خان افغان کو کس طرح سزا موت دی جائے! اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گھوڑوں کو اس کے جسم پر دوڑایا جائے!''

کچھ ہی دیر کے بعد ان دونوں کی سزا پر عمل ہونے لگا۔ پہلے راشد خاں کی زبان کھینچی گئی اس دوران دوسرے محافظوں نے احمد خاں افغان کے سفر آخرت کے انتظامات مکمل کر دیئے۔ اسے میدان

میں سیدھا الٹا دیا گیا۔ گھوڑوں کے پاؤں سے دندانے پائے بند باندھ دیئے گئے تھے۔ وہ سات گھڑ سواروں کا دستہ تھا جو تیزی سے گھوڑے دوڑاتا ہوا احمد خاں افغان کے بندھے ہوئے جسم کی طرف لپکا۔ گھوڑے اس کے جسم کو روندتے اور لہولہان کرتے گزر گئے پھر کچھ دور جا کر پلٹے۔ احمد خاں افغان کی چیخیں دور تک گونج رہی تھیں۔ گھوڑوں نے دوبارہ اس کے جسم پر زخموں کے نشان چھوڑے اور اسے روندتے ہوئے آگے نکل گئے۔ آخر احمد خاں افغان نے اس دردناک سزا سے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

جب کام بخش کے محافظوں نے احمد خاں افغان کے مرنے کی تصدیق کر دی تو کام بخش نے آخری حکم دیا۔ ''ان تمام غداروں کی لاشوں کو گدھوں پر باندھ کر تمام شہر میں تشہیر کی جائے۔ اس کے بعد ان کو بغیر کفن دیئے اسی محل کے باغ میں دفن کر دیا جائے۔ ان سب غداروں نے مل کر ہمیں قید کرنے کی سازش کی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تمام افراد کے چہروں پر جیسے زندگی لوٹ آئی۔ وہ سب کام بخش کے پے درپے سفاکانہ احکام سن کر دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ جس کا اظہار ان کے چہروں سے ہو رہا تھا۔ پھر کام بخش کی سواری قلعے میں چلی گئی اور یوں وہ خونی شام رخصت ہوئی۔

عبداللہ خاں وہاں سے وزیر مملکت کے ساتھ اس کی قیام گاہ پر چلا گیا اور پھر رات گئے راجکماری انیتا کے پاس لوٹا۔ راجکماری چیر کھٹ پر نیم دراز اسی کی منتظر تھی۔ اس کے بھرے بھرے اور گداز جسم پر مسلمان عورتوں کا لباس بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ عبداللہ خاں ہی کے ایما پر وہ یہ لباس زیب تن کئے رہتی تھی تاکہ اس کے متعلق کسی کو شک وشبہ نہ ہو حالانکہ اس لباس میں اسے الجھن محسوس ہوتی تھی کیوں کہ وہ ساڑھی باندھنے کی عادی تھی۔

''تم لوٹ آئے! میں تو سمجھی تھی کہ ساری رات وہیں۔''

''بس کچھ دن کی اور بات ہے تمام معاملات نمٹنے ہی والے ہیں۔ پھر ہم دارالخلافہ چلیں گے۔'' عبداللہ خاں نے راج کماری کو تسلی دی۔

''کیا تقریب خاں کا مسئلہ بھی نمٹ گیا؟'' راجکماری نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال۔

''پہلے ایک رقیب سے تو نمٹ لوں۔'' عبداللہ خاں نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔ ''حسن خاں کا مسئلہ نمٹے تو تقریب خاں سے بھگتا جائے۔ یقین کرو کہ میں اسے کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گا لیکن اس سلسلے میں ذرا احتیاط برتنا پڑے گی کیوں کہ اب وہ پانسا پلٹنے کے بعد کام بخش کے وفاداروں کی فہرست میں آ گیا ہے۔'' بہرحال کچھ بھی ہو اسے سزا ضرور ملنا چاہئے راجکماری نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا جان من! اس نے ذرا جھک کر اس کی ٹھوڑی پکڑتے ہوئے جواب دیا اور پھر راجکماری کے قریب ہی لیٹ گیا۔''

''دیکھو کوئی شرارت نہیں!'' راج کماری نے یہ کہہ کر اٹھنا چاہا مگر عبداللہ خاں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

''جانم! تمہیں اتنی اجازت تو مجھے دینا ہی پڑے گی کہ ان حسین لبوں کی سرخی میں مزید اضافہ کر دوں اور پھر اب یہ کوئی نئی بات نہیں رہی۔''

عبداللہ خاں کے خمار آلود لہجے کے جواب میں راج کماری بولی ''لیکن یہ بھی تو ایک حد تک بددیانتی ہے'' پھر اس نے کسمسا کر عبداللہ خاں کی آغوش سے نکل جانا چاہا، مگر ناکام رہی۔ عبداللہ خاں نے اس سرخ لبوں کی سرخی میں واقعی اضافہ کر دیا۔ اسے یہ دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا کہ اب راج کماری کے تپاک میں بھی گرم جوشی تھی۔ اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا کہ عبداللہ خاں کو راج کماری کی طرف سے اپنی وحشتوں کا جواب ملا ہو۔

''راجکماری!'' عبداللہ خاں کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آئی۔

''عبداللہ خاں! راج کماری کے ہونٹ بھی لرزے' پھر اس نے بھی عبداللہ خاں کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔''

''کاش ہم ایک ہو سکتے عبداللہ خاں!...'' اس کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

''یہ فاصلے مٹ سکتے ہیں راج کماری! عبداللہ خاں نے اس کی سرشاری و بےخودی کو بڑھانے کی خاطر کہا' مجھے صرف تمہاری رضامندی چاہئے کیونکہ میں عہد کر چکا ہوں کہ تمہاری مرضی وخواہش کے بغیر آرزوئے وصل نہیں کروں گا۔''

معاً راج کماری کے جسم میں نہ جانے کیسے اتنی قوت آ گئی کہ وہ عبداللہ خاں کی گرفت سے نکل گئی اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور حسین آنکھوں میں ہلکے ہلکے سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ کسی عورت کی یہ حالت وکیفیت عبداللہ خاں کے لئے نئی نہیں تھی۔ راجکماری اس وقت یقیناً سپردگی کی آخری منزلوں میں تھی' ان منزلوں میں جہاں کوئی بھی عورت انکار کے مراحل سے نہیں گزر سکتی مگر راجکماری واقعی ایک مختلف عورت تھی۔ وہ بلا کی قوت ارادی رکھتی تھی۔ ایسی جذباتی حالت میں ایک مرد کی بانہوں کو جھٹک کر الگ ہو جانا اسی کا حوصلہ تھا۔ اس نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پالیا۔

''مم... میں شرمندہ ہوں عبداللہ خاں!... سخت شرمندہ ہوں...'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

عبداللہ خاں نے اپنا سر اس کے زانو پر رکھ دیا اور بولا ''کس بات پر جان من؟'' تمہیں کس سے شرمندگی ہے؟''

''میں... میں بہکنے لگی تھی... اور شاید... شاید اپنے شوہر سے بےوفائی کرنے لگی تھی۔ میں نے تمہارے جذبات کو بھڑکا دیا۔ اس پر شرمندہ ہوں۔ میں تم سے شرمندہ ہوں کہ... کہ میں نے تم سے وہ کہی جو ناممکن ہے... قطعی ناممکن!'' راجکماری کے لہجے میں لمحہ بہ لمحہ خوداعتمادی آتی جا رہی تھی۔

عبداللہ خاں سمجھ گیا کہ راج کماری اب خود پر مکمل قابو پا چکی ہے اور اب اس کے مزید بہکنے کا کوئی لمحہ نہیں آئے گا۔ یہ سوچ کر وہ بولا ''وفا اور بےوفائی کے معنی بدلتے رہتے ہیں' راجکماری! مختلف حالات میں ان کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔ خیر تمہاری مرضی! میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔''

وفا اور بےوفائی کے درمیان ایک واضح لکیر ہوتی ہے۔ عبداللہ خاں! وفا حالات کی پابند نہیں

بلکہ حالات وفا کے پابند ہوتے ہیں۔ شرط صرف وفا کے عرفان کی ہے۔ یوں سمجھو کہ وفا' وفا ہے اور بے وفائی' بے وفائی! ان کے درمیان اور کچھ نہیں۔ بہر حال مجھے تم سے یہی امید ہے کہ تم میری مجبوری اور محبت سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤ گے۔"

"تو تمہیں اعتراف محبت ہے؟" عبداللہ خاں نے سوال کیا۔

"ہاں!" اس نے اعتراف کیا... "اگر ایسا نہ ہوتا تو اس وقت تمہارے ہمراہ نہ ہوتی۔"

"اور تمہیں اپنے شوہر سے بھی محبت ہے؟" عبداللہ خاں نے دریافت کیا۔

"شاید!" اس نے نسبتاً بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا۔

"گویا تمہیں اپنے شوہر سے محبت ہونے پر یقین نہیں!" عبداللہ خاں نے برجستہ کہا۔ "اس کے برعکس مجھ سے محبت پر یقین ہے؟"

"میں اس وقت یقین اور بے یقینی کی منزلوں میں ہوں عبداللہ خاں!... میں فی الحال کچھ... کچھ نہیں کہہ سکتی! مگر مجھے یہ... یہ ضرور علم ہے کہ عورت صرف ایک بار مرد سے محبت کرتی ہے۔" اس نے عبداللہ خاں کے بالوں سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر تمہارا بیان متضاد ہے راج کماری! اگر تمہاری بات مان لی جائے تو خود تمہارے بیان کی تردید ہوتی ہے تمہیں یا تو مجھ سے محبت ہونا چاہئے یا اپنے شوہر راجا اجیت سنگھ سے! جب کہ تم نے دونوں ہی سے محبت کا اعتراف کیا ہے۔" عبداللہ خاں نے اعتراض کیا۔

"عبداللہ خاں! شوہر اور عاشق میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ان دونوں کی محبت میں بھی واضح طور پر فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مذہب' قانون اور سماج ایک عورت کو جیون ساتھی منتخب کرنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ عورت پر کچھ پابندیاں بھی عائد کرتے ہیں۔ عورت کو بہر حال اپنے شوہر کا وفادار رہنا چاہئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو وہ مذہب' قانون اور سماج سب کی مجرم ہے۔ شوہر اور بیوی کے درمیان محبت نہ ہو لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان جو ایک رشتہ رفاقت جنم لیتا ہے۔ وہ ناقابل فراموش ہے۔ یہ رشتہ رفاقت قبل صد احترام ہے۔ اسے صرف محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال میرے شوہر راجا اجیت سنگھ اور میرے درمیان بھی یہ اٹوٹ رشتہ جنم لے چکا ہے جو وقت کی دین ہے۔ میں اسی لئے تم سے یہ کہہ رہی ہوں کہ یہ رشتہ بھی محبت کی طرح عظیم اور بلند ہے۔" یہ کہہ کر راج کماری خاموش ہوگئی۔

"اور اگر ایک عورت سے یہ کہا جائے کہ وہ رشتہ محبت اور رشتہ رفاقت میں سے کسی ایک رشتے کا انتخاب کرلے تو وہ کسے منتخب کرے گی؟" عبداللہ خاں نے سوال کیا۔

"اس عورت کیلئے کسی ایک کا انتخاب مشکل ہوجائے گا اور میں بھی اس مشکل کا شکار ہوں۔" راجکماری نے جواب دیا۔

راجکماری سے مزید بحث فضول تھی۔ وہ اپنی باتوں کو ثابت کرنے کیلئے دلائل کی مضبوط ڈھال استعمال کر رہی تھی۔ اس کے رویے میں فی الحال عبداللہ خاں کیلئے اتنی لچک بھی غنیمت تھی کہ اس نے اعتراف محبت کرلیا تھا۔ یہی سوچ کر عبداللہ خاں نے اس سے مزید گفتگو کی بجائے سونے کو ترجیح دی۔

دوسرے ہی روز صبح عبداللہ خاں نے وزیر مملکت محسن خاں سے مل کر قلعے ہی کے قیام میں اپنی سکونت کا بندوبست کرلیا۔ اب احسن خاں کی قیام گاہ کے قریب ہی تھی۔ راجکماری اب تقریب خاں کے دست ہوس سے دور آ کر مطمئن ہوگئی تھی پھر اسی روز احسن خاں بھی زیر عتاب آ گیا۔ اسے گرفتار کرنے والا بھی عبداللہ خاں تھا۔ عبداللہ خاں کی دلی مراد پوری ہوگئی۔ اب صرف تقرب خاں رہ گیا تھا جس سے عبداللہ خاں بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس کا موقع بھی اسے جلد مل گیا۔ احسن خاں نے اپنی گرفتاری کے بعد زنداں کے ایک محافظ کو انعام کا لالچ دے کر اپنے گھر یہ پیغام بھیجنے پر آمادہ کرلیا کہ تمام زیورات اور مال ودولت اس کے ایک دوست کے گھر بھیج دیا جائے جس کا نام بھی اس نے بتایا۔ محافظ نے یہ اطلاع عبداللہ خاں کو پہنچا دی۔ عبداللہ خاں کو موقع مل گیا۔ اس نے تقریب خاں کو مال ودولت کا لالچ دے کر اس پر آمادہ کرلیا اور وہ احسن خاں کی حویلی سے آنے والے خزانے کو اپنی حویلی میں رکھوا لے اور نصف نصف اس میں سے بانٹ لے۔ عبداللہ خاں نے محافظ کے ذریعے احسن خاں کے دوست کے بجائے تقریب خاں کا نام کہلوا کر عبداللہ خاں' کام بخش سے ملا اور اسے بتایا کہ تقریب خاں بھی احسن خاں کا غدار ساتھی ہے۔ ثبوت کے طور پر اس نے مال ودولت کا حوالہ دیا جو احسن خان کی حویلی سے تقریب خاں کی حویلی میں منتقل ہوا تھا۔ تقریب خاں گرفتار کرلیا گیا اور اس کی حویلی سے احسن خاں کا خزانہ بھی برآمد ہوگیا جو اس کے خلاف ناقابل تردید ثبوت تھا۔

شاہ عالم کا بھیجا ہوا ایلچی اب تک حیدرآباد میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے کام بخش کے جواب کا انتظار تھا۔ کام بخش نے اسے اپنے جواب سمیت شاہ عالم کے پاس بھیج دیا کہ ہمیں ہر پیشکش نامنظور ہے۔ اسی کے ساتھ کام بخش نے شاہ عالم کے پیغام میں جواباً قرآن حکیم کے یہ الفاظ لکھوائے تھے۔ "کتنی ہی قلیل جماعتیں' کثیر جماعتوں پر غالب آ گئی ہیں۔"

پے درپے قتل وغارت کے سبب کام بخش کی فوج میں بد دلی پھیل گئی۔ لشکر والے اس کے جنون وسفاکی سے ڈر کر منتشر ہوگئے تھے۔ اس جنون وسفاکی کو ہوا دینے میں عبداللہ خاں کا بڑا ہاتھ تھا۔ اسی دوران میں شاہ عالم کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ وہ اسی ہزار فوج لے کر حیدرآباد کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔

عبداللہ خاں جس غرض سے حیدرآباد آیا تھا' وہ پوری ہوچکی تھی۔ وہ حیدرآباد سے روانگی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک غیر متوقع واقعے نے اس کے اوسان خطے کر دیئے۔ اس طرح کام بخش ہاری ہوئی بازی جیت سکتا تھا۔ ایک امیر میر اسعد اللہ' شاہ عالم سے باغی ہوکر کام بخش سے آملا تھا۔ اس سازشی نے شاہ عالم کو شکست دینے کیلئے ایک زبردست منصوبہ بنایا تھا۔ وہ راجپوتوں سے معاہدہ کرکے آیا تھا کہ کام بخش کا ساتھ دیں۔ مختصراً اس خطرناک منصوبے کا مقصد شاہ عالم کے تخت وتاج سے محرومی تھا۔ عبداللہ خاں ہر قیمت پر اس منصوبے کو ناکام بنانا چاہتا تھا۔ کام بخش کا سودائی مزاج عبداللہ خاں کا معاون ثابت ہوا۔ اسعد اللہ کے منصوبے کو کام بخش نے ٹھکرا دیا۔ یوں ایک بڑا خطرہ ٹل گیا۔ عبداللہ خاں نے اپنی روانگی سے پہلے راج کماری انیتا کو سمجھا بجھا کر دارالحکومت شاہجہاں (دہلی) بھیج دیا۔ وہ راجکماری کو لشکر میں اپنے ساتھ رکھنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ پھر عبداللہ خاں خود بھی حیدرآباد سے

فرار ہو گیا۔

حیدر آباد کی طرف بڑھتا ہوا لشکر ملکہ پور کے نوح میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ عبداللہ خاں وہاں پہنچ گیا۔ یہاں آتے ہی اس کی چشم تصور نے سب سے پہلے اپنے رقیب کو دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا قریب میر بخشی ذوالفقار خاں لشکر کے ساتھ ہی آیا ہوگا۔ ایک بار پھر عبداللہ خاں اور اس کے درمیان مبازرت کا آغاز ہونے والا تھا۔

عبداللہ خاں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا اپنے خیمے تک جا پہنچا۔ خادم سے اپنی آمد کی اطلاع کرانے کے بعد وہ بیرونی خیمے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ ابھی اسے چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ اندرونی خیمے کا پردہ اٹھا کر ایک دراز قد شخص باہر نکلا۔ اس کے پیچھے ہی ایک اور آشنا چہرہ تھا۔ دراز قد شخص پر نظر پڑتے ہی عبداللہ خاں تسلیمات کیلئے جھک گیا۔ یہ شہزادہ رفیع الشان تھا۔ شاہ عالم کے چار بیٹے تھے' جہاں دار شاہ' عظیم الشان' جہاں شاہ اور رفیع الشان! ان میں رفیع الشان سب سے چھوٹا تھا۔ رفیع الشان سے شاہ عالم بہت محبت کرتا تھا مگر کاروبار سلطنت میں عظیم الشان ہی کو افضلیت دیتا تھا۔

رفیع الشان کے ساتھ باہر آنے والا خان خاناں تھا۔ عبداللہ خاں کو دیکھ کر خان خاناں کے چہرے پر رونق آ گئی۔ عبداللہ خاں تسلیمات سے فارغ ہوا تو اس نے آگے بڑھ کر عبداللہ خاں کو سینے سے لگا لیا۔ یہ خان خاناں کی محبت اور خلوص ہی کا اظہار نہیں تھا بلکہ اس بات کا بھی اظہار تھا کہ اسے عبداللہ خاں کے آنے سے بڑی تقویت ملی ہے۔ عبداللہ خاں' ذوالفقار خاں کے مقابلے میں اس کیلئے ڈھال بن جاتا تھا۔

''عبداللہ خاں کی آمد کے سبب شاید ظل اللہ ہمیں دوبارہ طلب فرمائیں کیوں کہ یہ یقیناً کچھ اہم اطلاعات لائے ہوں گے۔ آؤ خان خاناں! واپس حضور کے پاس چلیں۔'' شہزادہ رفیع الشان نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ خادم اندرونی خیمے سے باہر نکلا۔

''ظل اللہ آپ کے منتظر ہیں۔'' خادم' عبداللہ خاں سے مخاطب ہوا' پھر شہزادہ رفیع الشان کے سامنے جھک کر ادب سے کہا۔ ''حضور کو بھی یاد کیا جا رہا ہے اور عزت مآب کو بھی!'' آخری الفاظ اس نے خان خاناں کی طرف مڑ کر ادا کیے۔

''دیکھو ہم نے کہتے تھے کہ عبداللہ خاں کی آمد کے سبب ہماری بھی طلبی ہوگی!'' شہزادہ رفیع الشان نے مسکرا کر خان خاناں کی طرف دیکھا۔

''حضور کا فرمانا بجا تھا۔'' خان خاناں نے تائید کی اور شہزادے کے پیچھے اندرونی خیمے کی طرف مڑا۔ عبداللہ خاں بھی ساتھ ہی تھا۔

وہ تینوں اندر داخل ہوئے۔ عبداللہ خاں تسلیمات بجا لایا۔ شاہ عالم نے انہیں اپنے قریب ہی بٹھا لیا' پھر خادم کو بلانے کیلئے تالی بجائی۔ خادم آ گیا تو اس نے حکم دیا۔ ''میر بخشی سے کہو ہم انہیں یاد کر رہے ہیں۔ یہ حکم دے کر وہ پلٹا اور بولا۔ ''بہتر ہے کہ میر بخشی بھی یہاں ہوں تا کہ وہ بھی عبداللہ خاں کی روداد سن لیں۔''

''عالم پناہ نے درست فرمایا۔'' عبداللہ خاں نے اپنے دل پر جبر کر کے کہا حالانکہ اسے ذوالفقار

اس کو اتنی اہمیت دیئے جانا کھل رہا تھا۔

ذوالفقار خاں کے آنے تک بوجھل سی خاموشی چھائی رہی۔ وہ آیا' تسلیمات بجا لایا اور ایک طرف بیٹھ گیا تو شاہ عالم نے عبداللہ خاں کو اشارہ کیا۔ ذوالفقار خاں کی آمد سے عبداللہ خاں کچھ کبیدہ خاطر ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ مختصراً اپنے قیام حیدر آباد کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں اس نے کام بخش کی فوجی قوت پر بھی روشنی ڈالی۔

''گویا قطب الملک' آپ نے تو پہلے ہی جنگ جیت لی'' شاہ عالم نے تعریفی نظروں سے عبداللہ خاں کی طرف دیکھا! ہے نا حقیقت! عبداللہ خاں نے واقعی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سنگی میر اسعد اللہ کی سازش ناکام ہو گئی ورنہ ہم مشکل میں پھنس جاتے۔''

''ظل اللہ درست فرماتے ہیں' مگر گستاخی معاف شاہ محترم! عبداللہ خاں ہی کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ اس سازش کی ناکامی میں شہزادہ کام بخش کے مزاج اور غلط فیصلے کو بڑا دخل تھا۔ اس سازش کی ناکامی کا سہرا عبداللہ خاں کے سر نہیں باندھا جا سکتا۔'' ذوالفقار خاں عیار لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے میں مخالفت کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ بہرحال عبداللہ خاں کی ستائش سے خوش نہیں ہوا تھا۔

''خادم کو بھی کچھ عرض کرنے کی اجازت ہو۔ عبداللہ خاں کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر معاً خان خاناں لب کشا ہوا۔ جب شاہ عالم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بولنے کی اجازت دے دی تو اس نے کہا ''اے ظل اللہ! دراصل میر بخشی' عبداللہ خاں کے کارنامے سے صرف نظر کر کے اس کی اہمیت کم کرنا چاہتے ہیں۔ عبداللہ خاں نے تو خود میر اسعد اللہ کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہی جس سے ظاہر ہو کہ وہ اس کا سہرا بھی اپنے سر باندھنا چاہتے ہوں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں خان خاناں! اس میں کوئی کلام نہیں کہ عبداللہ خاں نے اپنی حکمت عملی سے زبردست کامیابی حاصل کر کے ہمارے لئے راہ ہموار کر دی ہے۔ خیر یہ بحث لاحاصل ہے۔ اس سے پہلے کہ کام بخش کو کہیں سے مزید فوجی قوت حاصل ہو سکے' ہمیں حملہ کر دینا چاہئے۔'' شاہ عالم نے فیصلہ سنا دیا۔

اسکے بعد لشکر کشی کے بارے میں خیال آرائیاں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر کے بعد یہ خصوصی نشست ختم ہو گئی۔ شہزادہ رفیع الشان کے سوا وہ سب شاہی خیمے سے باہر آ گئے۔ ذوالفقار خاں' عبداللہ خاں کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ عبداللہ خاں کو خان خاناں اپنے ہمراہ لے گیا۔ اس نے اپنے خیمے میں پہنچتے ہی حکم دیا کہ عبداللہ خاں کا خیمہ اس کے خیمے سے قریب ہی نصب کر دیا جائے۔ خیمہ نصب ہونے تک عبداللہ خاں وہیں رہا۔ اس دوران میں خان خاناں اس سے میر بخشی ذوالفقار خاں کا رونا روتا رہا۔ خیمہ نصب ہونے کی اطلاع ہوتے ہی عبداللہ خاں وہاں سے اٹھ گیا۔

دوسرے دن صبح خادم نے ذوالفقار خاں کے آنے کی اطلاع دی۔ عبداللہ خاں کو اس کی آمد پر حیرت ہوئی اور پھر بیرونی خیمے کی طرف بڑھ گیا۔

علیک سلیک کے بعد ذوالفقار خان تیوریوں پر بل ڈال کر بولا ''اپنی خودسری نہیں چھوڑو گے عبداللہ خاں؟'' اس کا لہجہ ہتک آمیز تھا۔

''ذوالفقار! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے یہ طرز تخاطب قطعی پسند نہیں' عبداللہ خاں نے

برہم ہو کر کہا۔

''دیکھو عبداللہ خاں' اس طرح کوئی بات نہیں ہو سکے گی۔ تمہیں نرمی اور ٹھنڈے دل سے میری بات سننا چاہیے۔'' اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ پھر لمحے بھر رک کر وہ کہنے لگا۔ ''میں نے ایک بار پہلے بھی پیش کش کی تھی کہ اس بوڑھے گدھے کا ساتھ چھوڑ دو۔ آج پھر میں یہی کہنے آیا ہوں۔'' اس نے براہ راست عبداللہ خاں کی آنکھوں میں دیکھا۔

عبداللہ خاں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ بوڑھا گدھا وہ خان خاناں کو کہہ رہا تھا۔ اس وقت معاً عبداللہ خاں کے ذہن میں خیال آیا کہ ذوالفقار خاں ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ آخر خان خاناں تھا بھی کس کے کام کا! وہ بوڑھا' کمزور اور بزدل شخص تھا۔ اس کے ذریعے عبداللہ خاں کبھی اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا تجربہ عبداللہ خاں کو پہلے بھی ایک بار ہو چکا تھا' اس وقت جب عبداللہ خاں نے شاہ عالم کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ عبداللہ خاں نے خان خاناں کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ وہ شاہی خاندان کے تمام افراد کو شاہ عالم پر قاتلانہ حملہ ہوتے ہی حراست میں لے لے' مگر خان خاناں نے یہ انتظامات نہیں کئے تھے۔ اگر خدانخواستہ عبداللہ خاں' شاہ عالم کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو بھی اس کا منصوبہ خان خاناں کی بزدلی کے سبب ناکامی ہی رہتا۔ اس بوڑھے بزدل کے مقابلے میں ذوالفقار خاں بہت تیز' ذہن اور بہادر شخص تھا۔ اگر عبداللہ خاں کسی طرح اسے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر استعمال کر سکتا تھا تو کامیابی کے سو فیصد امکانات تھے' لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ خان خاناں بے وقوف شخص تھا۔ اسے شیشے میں اتارنا آسان ثابت ہوا تھا۔ بہ نسبت اس کے ذوالفقار خاں سخت عیار شخص تھا۔ اسے اپنے ارادوں سے باخبر کر دینا آگ سے کھیلنے کے مترادف ہو سکتا تھا۔ عبداللہ خاں اس وقت الجھ کر رہ گیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ ذوالفقار خاں کی پیش کش قبول کر لی جائے یا ایک بار پھر ٹھکرا دی جائے؟

کافی سوچ بچار کے بعد عبداللہ خاں نے ذوالفقار خان کو مخاطب یا۔ ''میں اس سلسلے میں تمہیں سوچ کو جواب دوں گا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ گنجائش موجود ہے' امید کی جا سکتی ہے!'' ذوالفقار خاں عیاری سے مسکرایا۔

''ہاں' امید پر تو دنیا قائم ہے۔'' عبداللہ خاں نے گول مول سا جواب دیا کیوں کہ ابھی وہ خود کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

''ٹھیک ہے' تم سوچ لو! خوب اچھی طرح سوچ لو! ہم ایک اور ایک گیارہ ہو سکتے ہیں۔'' ذوالفقار خان کا لہجہ ترغیبی تھا۔ تم فائدے ہی میں رہو گے۔''

''تو تم مجھے برابری کا درجہ دینے پر آمادہ ہو؟'' عبداللہ خاں نے کسی قدر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''صرف اس صورت میں جب تم میرے ساتھ آ ملو۔'' ذوالفقار خان نے دوٹوک جواب دیا۔

''ویسے ماشاء اللہ اب تو کافی صحت مند نظر آ رہے ہو۔ کیا طبیبوں نے تمہیں حرم میں جانے کی اجازت دے دی؟'' عبداللہ خاں اسے چھیڑنے سے باز نہ رہ سکا۔ آخر چند لمحوں میں وہ پچھلی رقابت کو کیسے بھلا دیتا! اور ابھی یہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ عبداللہ خاں اور اس کے درمیان مخالفت ختم ہو چکی ہے۔

''پرانے زخم نہ کریدو عبداللہ خاں!'' ذوالفقار خاں اسے گھور کر بولا۔ ''ہم دونوں کیلئے بہتر یہی ہے کہ پچھلی تمام تلخ باتیں بھول جائیں۔''

''کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ مثلاً تم ایسے بہادر شمشیرزن کا ایک راجپوت لڑکی سے شکست کھا جانا'' عبداللہ خاں نے پھر چٹکی لی۔

''عبداللہ خاں! اس وقت جب کہ ہم مصالحت کی گفتگو کر رہے ہیں کیا تمہارا یہ رویہ مناسب ہے کہ تم زخموں پر نمک پاشی کرو؟ وہ بھاری آواز میں بولا' پھر کوئی بات سنے بغیر کہا۔ ''اب میں چلتا ہوں کیوں کہ کچھ دیر بعد ہم حیدرآباد کی طرف کوچ کرنے والے ہیں۔'' یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

عبداللہ خاں اخلاقاً اسے خیمے کے در تک چھوڑنے آیا۔ جب وہ چلا گیا تو عبداللہ خاں بھی کوچ کی تیاری کرنے لگا۔

لشکر نے کوچ کیا اور شام سے پہلے ہی حیدرآباد سے دو تین منزل پر پہنچ گیا۔ شاہ عالم اپنے ہمراہ صرف رفیع الشان اور جہاں شاہ کو لایا تھا۔ شہزادہ عظیم الشان کو وہ دارالحکومت ہی میں چھوڑ آیا تھا اور جہاں دار شاہ بھی وہیں تھا۔ گویا دو شہزادے اس کے ساتھ اور دو دارالحکومت میں تھے۔ شہزداہ عظیم الشان دارالحکومت میں رہ کر اپنے باپ کی نیابت کر رہا تھا۔

وہ شب وہیں گزاری گئی۔ حملہ کرنے کیلئے صبح کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ اس شب شاہی خیمے میں ایک اجلاس ہوا جس میں جنگی حکمت عملی طے کی گئی۔ دوسرے دن صبح شاہ عالم نے لشکر کا معائنہ کیا۔ اس نے شہزادہ رفیع الشان اور جہاں شاہ کو فوج کشی کے لئے مقرر کیا۔ دونوں شہزادوں نے ہراول پر خان خاناں کے علاوہ عبداللہ خاں اور دوسرے افراد کا تقرر کیا۔ اس فوج میں دس بارہ ہزار سوار تھے اور پندرہ سولہ تجربہ کار فیل سوار امیر تھے۔ فوج کے کماں داروں میں مشہور لڑاکا سردار تھے۔ یہ لوگ شہزادہ جہاں شاہ کے زیر کمان تھے۔ شہزادہ رفیع الشان کی فوج میمنہ پر تھی اور ذوالفقار خان پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ میسرہ پر مقرر تھا۔

لشکر حیدرآباد کی طرف سے کوچ کرنے کیلئے پوری طرح تیار تھا۔ شاہ عالم نے لشکر کو رخصت کرنے سے پہلے خطاب کیا۔ ''یہ ہمارا حکم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تم لوگ حملہ کرنے میں سبقت نہ کرنا! تم کوشش کرنا کہ قراولی کے طور پر کام بخش کو اطراف سے محاصرے میں لے لو۔ اسی کے ساتھ تمہیں یہ خیال بھی رکھنا ہے کہ کام بخش زندہ ہاتھ آ جائے' مارا نہ جائے اور مسلمانوں میں خونریزی نہ ہو۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے اپنی مختصر سی تقریر ختم کر دی اور لشکر کو خدا حافظ کہا۔

ذوالفقار خان' شہزادہ رفیع الشان کے ساتھ سوار ہوا اور لشکر آگے بڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں لشکر کام بخش کے مقابلے ایک گولے کی مار کے فاصلے پر پہنچ گیا اور پھر ٹھہر گیا۔ کام بخش بھی شہر سے نکل کر انتہائی مختصر جمعیت کے ساتھ مقابلے پر موجود تھا۔ یہ اس کی ہمت اور سودائی پن ہی تھا کہ وہ چار پانچ سو سپاہیوں کے باوجود ہزاروں کے لشکر سے نبرد آزما ہونے آ پہنچا تھا۔

شہزادہ رفیع الشان کی دائیں جانب تقریباً نصف کوس کے فاصلے پر عبداللہ خاں اور خان خاناں اپنی فوجوں سمیت مستعد تھے۔ بائیں طرف ذوالفقار خاں ایک بان برتاب کے فاصلے پر چوکنا کھڑا ہوا

حملے کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں سردار اور تمام فیل سوار کماں دار دوپہر تک اسی طرح کھڑے رہے اور انہوں نے پیش قدمی نہیں کی کیوں کہ شاہ عالم نے پہل کرنے سے منع کر دیا تھا۔

نہ کام بخش حملے میں پہل کر رہا تھا نہ شاہ عالم کی جانب سے حملہ ہو رہا تھا۔ عبداللہ خاں بیزار سا تھا۔ آخر کار اس نے تنگ آ کر خان خاناں کو مخاطب کیا۔ ''شاہ محترم نے ہمیں الجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔ آخر ہم کب تک یہاں کھڑے ہوئے کام بخش کے حملے کا انتظار کرتے رہیں گے؟''

''حکم حاکم مرگ مفاجات!'' خان خاناں کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

''لیکن اس کا کوئی حل بھی تو ہونا چاہئے۔'' عبداللہ خاں کسی قدر جھنجلا کر بولا ''کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ شاہ محترم کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کر کے حملے کی اجازت لے لی جائے؟ میرا تو خیال ہے کہ انہیں حملے میں پہل کرنے کی اجازت دے دینا چاہئے۔''

''اس بات کا فیصلہ بھی ہم نہیں کر سکتے کہ شاہ عالم کا حکم معلوم ہونے کے باوجود دوبارہ ان سے اجازت لی جائے۔ ہاں اگر شہزادوں میں سے کوئی چاہے تو شاید محترم کی اجازت طلب کرنے کیلئے کسی شخص کو قاصد بنا کر بھیجا جاسکتا ہے۔'' خان خاناں نے جوب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے' میں یہ تجویز شہزادہ رفیع الشان کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہوں۔'' عبداللہ خاں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ یہ کہتے ہی عبداللہ خاں نے اپنے گھوڑے کو ایڑی لگا دی۔ پھر وہ تیزی سے گھوڑا دوڑتا ہوا رفیع الشان کے پاس جا پہنچا۔

رفیع الشان نے سوالیہ نظروں سے عبداللہ خاں کو دیکھا کیا بات ہے عبداللہ خاں؟ تم کچھ مضطرب دکھائی دیتے ہو!''

''خادم ایک تجویز پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔'' عبداللہ خاں نے ادب سے جھک کر کہا۔

''کہو' کیا بات ہے؟'' شہزداہ نرم اور پرسکون لہجے میں بولا۔

ہم صبح سے یہاں کھڑے ہوئے ہیں' نہ ادھر سے حملہ ہوتا ہے اور نہ ہم حملہ کر رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ شاہ محترم کا حکم ہے' ہم سبقت نہ کریں۔ یہ صورتحال زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمارے سپاہیوں میں بد دلی بھی پھیل سکتی ہے۔ وہ سب حملہ کرنے کے لئے مضطرب ہیں تا کہ فیصلہ ہو جائے۔ خادم کی تجویز یہ ہے کہ موجودہ صورتحال سے ظل اللہ کو آگاہ کیا جائے اور ان سے حملہ کرنے کی اجازت لی جائے۔ عبداللہ خاں نے بہت محتاط الفاظ میں اپنی تجویز پیش کر دی۔

عبداللہ خاں کی بات سن کر شہزادہ رفیع الشان کچھ دیر سوچتا رہا' پھر بولا ''تم ٹھیک کہتے ہو' عبداللہ خاں''

اس گفتگو کے بعد شاہ عالم کے پاس یکے بعد دیگرے کئی قاصد بھیجے گئے کہ حملے کی اجازت لے آئیں' مگر کسی کو بھی شرف باریابی حاصل نہ ہوا۔ اندر ہی سے کہلوا دیا گیا کہ بادشاہ سلامت آرام فرما رہے ہیں۔ عبداللہ خاں سمجھ گیا کہ شاہ عالم عمداً قاصدوں سے نہیں مل رہا۔ عبداللہ خاں مایوس ہو کر دوبارہ خان خاناں کے پاس پہنچ گیا۔

''

''ابھی ابھی میر بخشی ذوالفقار خاں کا قاصد میرے پاس یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ یورش کر دی اے۔'' خان خاناں نے عبداللہ خاں کو بتایا۔

''وہ ٹھیک کہتا ہے' آپ نے کیا جواب دیا؟'' عبداللہ خاں نے ذوالفقار خاں کی تائید کرتے ے سوال کیا۔

''ظاہر ہے کہ میرا جواب انکار ہی ہوسکتا ہے۔'' خان خاناں بولا ''یہ تو سراسر حکم شاہی سے کروانی ہے۔''

ابھی خان خاناں کا جملہ پورا ہوا تھا کہ عبداللہ خاں چونک اٹھا۔ طبل جنگ بج چکا تھا۔ عبداللہ ں نے اس سمت نظر اٹھائی جدھر ذوالفقار خان فوجیں لئے کھڑا تھا۔ نقار کی آواز اسی طرف سے آئی ں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ذوالفقار خاں' بادشاہ کے حکم اور خان خاناں کی رفاقت کا انتظار نہ کر سکا اور ما نے کام بخش پر حملہ کر دیا۔

''اب ہمیں بھی پیش قدمی کر دینا چاہئے۔'' عبداللہ خاں نے خان خاناں کو مخاطب کیا۔

''اس شخص نے الجھن میں ڈل دیا۔'' خان خاناں بڑبڑایا۔ اگر اس وقت میں آگے نہیں بڑھتا یہ جنگ کی حکمت عملی کے خلاف ہوگا اور اگر میں بھی حملہ کر دیتا ہوں تو یہ سراسر حکم شاہی کی خلاف ورزی ی جس پر جواب طلبی بھی ہوسکتی ہے۔''

''آپ پر اس سلسلے میں کوئی الزام نہیں آئے گا۔ پہل آپ نہیں کر رہے بلکہ ذوالفقار خاں نے ما ہے۔''

عبداللہ خاں کی بات پر خان خاناں لاجواب ہوگیا۔ وہ ابھی تک گومگو کے عالم میں تھا۔

''تو پھر میں حملے کا حکم دیتا ہوں۔'' عبداللہ خاں بولا۔ اس پر بھی خانا خاناں چپ ہی رہا۔ معاً ہداللہ خاں نے سپاہیوں کو چیخ کر حکم دیا۔ ''یلغار ہو!'' اسی ے ساتھ اس نے آگے بڑھنے کیلئے ہاتھ کا شارہ کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

کام بخش کے مقابلے میں سب سے پہلے ذوالفقار خاں پہنچا۔ اس کے ہمراہ دو امیر اور بھی ے۔ ایک امیر کی کمان میں چار پانچ ہزار مرہٹے تھے۔ ذوالفقار خان کی فوج کام بخش کی جمعیت پر ٹوٹ پی۔ اس گرفتار اجل شہزادے کے پاس مناسب سامان جنگ بھی موجود نہیں تھا البتہ بان کافی تعداد میں وجود تھے۔ ادھر بانوں کو آگ دکھائی گئی۔ ادھر عبداللہ خاں خان' خان خاناں سمیت توپ خانے پر ٹوٹ پا۔ کل تک عبداللہ خاں جس کا رفیق ودمساز بنا ہوا تھا' آج اسی کے مقابل تھا۔ کل تک جو اسے اپنا ہمدم ونس سمجھتا تھا' آج وہ اسی کا حریف ومخالف تھا۔ عبداللہ خاں اپنی فوج سمیت کام بخش سے ایک بان ہتاب پر پہنچ گیا۔

عبداللہ خاں کے حملے میں کام بخش کے دو تین جانثار دیرینہ رفیق مارے گئے اور کچھ زخمی ہوگئے۔ عبداللہ خاں کے لئے دکھ کی بات یہ تھی کہ اس حملے میں سب سے پہلے کام آنے والا شخص' کام بخش کا وزیر سلطنت محسن خان تھا' وہ محسن خان جو عبداللہ خاں کو اپنا خیر خواہ تصور کرتا تھا مگر یہ وقت ان باتوں کو سوچنے کا نہیں تھا۔ عبداللہ خاں نے اسی لئے یہ تمام باتیں اپنے ذہن سے جھٹک دیں۔ اس نے

کچھ فاصلے پر اس مغل شہزادے کو دیکھا جسے دنیا کام بخش کہتی تھی اور سودائی سمجھتی تھی۔ وہی کام بخش بڑا ثابت قدمی سے بیس تیس ہزار سواروں کے مقابلے پر اپنے چند سپاہیوں کے ہمراہ تیر کمان سنبھالے بہادرا سے حملے کر رہا تھا۔ تیر اندازی اتنی شدید تھی کہ اچانک شاہ عالم کی فوج گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی اور اسی ساتھ بھگدڑ مچ گئی۔

خان خاناں اور عبداللہ خاں جس طرف تھے ادھر کام بخش کا بڑا بیٹا محی السنتہ اس خونریز معرکے میں بڑی بہادری کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ کام بخش نے اپنے ہمراہ مختصر سی جمعیت کے باوجود شاہ عالم کی فوجوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تو اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔ وہ بھی بڑھ چڑھ کر حملے کرنے لگا۔ خاندانی بہادری، مغل خون اور جوانی کا جوش تینوں نے مل کر اسے جیسے بجلی بنا دیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھی کو ادھر سے ادھر دوڑاتا پھر رہا تھا۔ وہ جدھر نکل جاتا شور برپا ہو جاتا۔ اس نے عبداللہ خاں کی کمان میں لڑنے والی فوج کو بہت نقصان پہنچایا۔ عبداللہ خاں اس بپھرے ہوئے طوفان کے مقابل نہ ٹھہر سکا اور اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ عبداللہ خاں نے سوچا کہ اگر جنگ کا یہی نقشہ رہا تو بڑی رسوائی ہوگی۔ اس کے ذہن میں وہ الفاظ گونج رہے تھے جو کام بخش نے شاہ عالم کے پیغام میں جواباً لکھوائے تھے۔ یہ الفاظ قرآن پاک سے لئے گئے تھے "کتنی ہی قلیل جماعتیں، کثیر جماعتوں پر غالب آ گئیں۔" عبداللہ خاں نے سوچا کہ آج بھی یہی ہوگا؟

اپنے بہادر ساتھیوں کو لے کر عبداللہ خاں تیزی سے پیچھے ہٹا اور ان لوگوں کے درمیان سے نکل گیا جو آپس میں برسرپیکار تھے۔ محی السنتہ کا ہاتھی دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ عبداللہ خاں نے تیر اندازوں کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ بیک وقت کتنے ہی سنسناتے ہوئے تیر اس ہاتھی کی طرف لپکے جس پر محی السنتہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس حملے میں محی السنتہ کے ہاتھی کا فیل بان اور ردیف مارے گئے۔ ہاتھی اب بغیر فیل بان کے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس وقت عبداللہ خاں کو اعظم شاہ کے قتل کا منظر یاد آ گیا۔ اورنگزیب بہادر کا بیٹا اعظم شاہ جسے شاہ عالم کے مقابلے میں شکست ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کا فیل بان بھی مارا گیا تھا اور اس نے عماری سے نکل کر ہاتھی کو سنبھالنا چاہا تھا لیکن اسی وقت عبداللہ خاں کے چلائے ہوئے ایک تیر نے اس کی پیشانی میں جگہ بنالی تھی اور پھر اعظم شاہ ہلاک ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی عبداللہ خاں اسی منظر کا منتظر تھا جیسے تاریخ پھر ایک بار اپنے آپ کو دہرا رہی ہو۔ اسے توقع تھی کہ محی السنتہ بھی وہی کرے گا جو اعظم شاہ نے کیا تھا۔ ایسے حالات میں بہادروں کے لئے صرف ایک ہی راہ ہوتی ہے کہ وہ لڑتے لڑتے جان دے دیں اور محی السنتہ بھی بہادر تھا۔

عبداللہ خاں کی توقع پوری ہوئی۔ محی السنتہ تیزی کے ساتھ عماری سے نکلا۔ عبداللہ خاں نے جلد کھینچ کر تیر چلایا مگر اعظم شاہ اور محی السنتہ میں فرق تھا۔ اعظم شاہ ادھیڑ عمر تھا اور زخمی بھی لیکن محی السنتہ جوان اور پھرتیلا تھا۔ اس نے اتنی تیزی کے ساتھ عماری سے نکل کر ہاتھی کو سنبھالا کہ عبداللہ خاں کا تیر خطا ہو گیا۔ اسی وقت عبداللہ خاں نے اپنے قریب سے بندوق سر ہونے کی بھاری آواز سنی۔ بندوق سر کرنے والا ایک امیر داؤد خان تھا۔ بندوق کی گولی محی السنتہ کے شانے کو توڑتی ہوئی نکل گئی، مگر وہ ہاتھی پر بیٹھا رہا۔ اس کے دائیں ہاتھ سے آنکس نیچے گر پڑا۔ گولی بائیں شانے میں لگی تھی۔ اس جواں مرد نے شدید

ی ہونے کے باوجود تیر کمان سنبھالا۔ عبداللہ خاں نے ایک تیر چلے پر چڑھایا مگر اس کے تیر سے پہلے ہی ل السنتہ پر تیروں کی بوچھاڑ ہو گئی۔

اس جوان مغل شہزادے کے تمام جسم میں تیر پیوست تھے پھر بھی وہ عماری تک دوبارہ پہنچنے میں میاب ہو گیا۔ اس طرح شاید وہ خود کو محفوظ کرنا چاہتا تھا مگر اب اس کی قوت برداشت جواب دے چکی ی۔ وہ عماری میں بیٹھتے ہی گر کر بے ہوش ہو گیا۔ بغیر مہاوت کا ہاتھی تیر کھا کر بھڑکا اور کئی سپاہیوں کو ندتا چلا گیا۔ اسی وقت ایک شور بلند ہوا۔ یہ شور اس طرف سے سنائی دیا تھا جدھر کام بخش تھا۔ محی السنتہ کو وڑ کر عبداللہ خاں اپنے ساتھیوں سمیت ادھر لپکا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ کام بخش کے گرد دوبارہ اس کے اہیوں نے حلقہ تنگ کر دیا ہے۔

عبداللہ خاں نے اس طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے ایک نظر اس ہاتھی کی طرف دیکھا جو فوج کے میان بے زنجیر دندناتا پھر رہا تھا اور جس پر محی السنتہ تھا۔ اس نے دیکھا کچھ سپاہی اس ہاتھی پر چڑھ گئے عماری میں جو کچھ موجود تھا اسے لوٹنے لگے۔ لوٹ مار کرنے والوں نے اس ہاتھی کو خوب لوٹا۔ عماری کی ھی ڈوریاں اور جھالریں تک سپاہیوں نے لوٹ لیں اور ہاتھی کو چھوڑ دیا۔ ہاتھی جب لشکر سے نکل کر ل کی طرف بھاگ رہا تھا تو عبداللہ خاں نے کچھ سپاہیوں کو اس کے تعاقب میں بھیجا کیوں کہ اس ہاتھی عماری میں زندہ یا مردہ محی السنتہ موجود تھا جسے زندہ ہونے کی صورت میں قتل کرنا ضروری تھا۔

قریب تھا کہ کام بخش کے شدید حملوں سے داؤد خان اور دوسرے سردار ہزیمت کھا کر پسپا جاتے، عبداللہ خاں اپنے سپاہیوں سمیت وہاں پہنچ گیا۔ کام بخش نے تیروں سے بھرے پورے دو ترکش لی کر دیئے تھے۔ اس کی تیر اندازی سے بہت سے سپاہی ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے لیکن اب خود کام بخش ل بہت زیادہ زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے زخموں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اسی اخراج خون کے سبب اس ضمحلال اور ضعف سا طاری ہونے لگا تھا۔ اچانک ہی اس کے ہاتھ سے کمان گر گئی اور وہ جھکتا چلا گیا۔ ے ہاتھی کو داؤد خان، عبداللہ خاں اور ذوالفقار خان نے اپنے سپاہیوں سمیت گھیر لیا۔ ہاتھی پر کام بخش موٹا بیٹا بھی اس کے ساتھ سوار تھا۔ اسے بھی چار پانچ کاری زخم لگے تھے۔

عبداللہ خاں کو اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب بوڑھا ہونے کے باوجود خان خاناں تیزی اس ہاتھی پر چڑھ گیا، مگر اسی وقت دوسری جانب سے ذوالفقار خاں بھی ہاتھی پر چڑھ چکا تھا۔

کام بخش کی گرفتاری پر خان خاناں اور ذوالفقار خاں میں اختلاف ہو گیا اور بات تلخی تک پہنچ ل۔ ان دونوں ہی کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے کام بخش کو گرفتار کیا ہے۔ خان خاناں، شہزادہ رفیع الشان کی شان میں تھا۔ دونوں آپس میں تکرار کرتے ہوئے کام بخش کے ہاتھی کو شہزادے کے پاس لائے۔ عبداللہ ل بھی ان کے ہمراہ تھا۔

"کام بخش کو حضور کے اس خادم نے گرفتار کیا ہے۔" خان خاناں نے بآواز بلند اپنے سینے ر رکھ کر کہا۔

"یہ غلط ہے حضور! خان خاناں بعد میں اپنے سپاہیوں سمیت ادھر آئے تھے۔ کام بخش نے ل معرکہ میرا ہوا ہے اور میں نے ہی اسے شکست دی ہے۔ ہاتھی پر بھی پہلے ہی چڑھا تھا۔ اس بات کی

"گواہی ہر سپاہی دے سکتا ہے۔" ذوالفقار خان بھی ترکی بہ ترکی بولا۔ "اس مرتبے اور درجے کے امیروں کو یوں نہیں لڑنا چاہئے تھا، مگر وہ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے چکر میں اپ منصب تک فراموش کر بیٹھے تھے۔ اگر شہزادہ 'خان خاناں کے حق میں فیصلہ دیتا تو شاید یہ سمجھا جاتا کہ جانبداری سے کام لے رہا ہے۔ چند لمحے وہ دونوں امیروں کے درمیان ہونے والی تکرار بڑے صبر ا سے سنتا رہا پھر ہاتھ اٹھا کر خان خاناں کو مخاطب کیا۔ "خان خاناں! آپ دستبردار ہو جائیں!"

"بہتر حضور! خادم تعمیل حکم کرتا ہے۔" خان خاناں نے ادب سے جھک کر کہا۔

ذوالفقار خاں کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اسی لمحے ایک طرف سے شور اٹھا۔ معلوم ہوا ک بارود اور بان کے ذخیرے میں آگ لگ گئی۔ اس آگ پر جلد قابو پا لیا گیا مگر اس میں چوبیس سپاہی ہلاک ہو گئے۔

دونوں شہزادوں نے فوج کو مراجعت کا حکم دیا۔ بہت جلد وہ سب وہاں پہنچ گئے جہاں لشکر پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ کام بخش کے مقابلے پر تقریباً آدھی فوج ہی بھیجی گئی تھی، بقیہ فوج وہیں تھی۔ ابھی شام ہونے میں کافی دیر تھی۔ کام بخش اور اس کے دونوں بیٹوں کو زخمی حالت میں پابہ زنجیر شاہی خیمے تک گیا۔ ان کے ہمراہ آگے آگے ذوالفقار خان تھا اور پیچھے دوسرے امیر دونوں شہزادے پہلے ہی خیمے میں چکے تھے۔

معاً شاہی خیمے کے اندرونی حصے کا پردہ ہلا اور اس میں سے شاہ عالم باہر نکلا۔ اس کی نظر کام بخش پر پڑی چہرے پر رنج کا ایک سایہ سا آ کے گزر گیا جیسے اسے اپنے بھائی کو اس حال میں دیکھ سخت صدمہ ہوا ہے۔

"طبیبوں کو بلاؤ!" شاہ عالم تقریباً چیخ اٹھا۔

شاہ عالم کا حکم سنتے ہی خدام دوڑ پڑے۔ اسنے دوسرا حکم دیا کہ فوری طور پر زخمیوں کو آزاد کر جائے۔ حکم سنتے ہی زنجیریں کھول دی گئیں۔ شاہی خیمے ہی کے ایک حصے میں زخمیوں کو پہنچا دیا گیا۔ کچھ ہی میں یونانی اور فرنگی طبیبوں کی ایک فوج خیمے میں پہنچ گئی۔ ان کے ہمراہ کئی جراح بھی تھے۔

شاہ عالم دوبارہ اپنے خیمے میں جا چکا تھا۔ کام بخش کو اس کے برابر والے خیمے میں رکھا گیا تھا۔ عالم کی حالت اس وقت بڑی عجیب سی تھی۔ نہ اس نے کسی امیر کو مخاطب کیا اور نہ جنگ کا کوئی حال پو ذوالفقار خاں کے دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ وہ یقیناً داد پانے کی امید میں تھا مگر شاہ عالم نے تو کر یہ بھی نہ پوچھا تھا کہ کام بخش کو کس نے گرفتار کیا! جس کیلئے ذوالفقار خان نے خان خاناں سے اتن کی تھی، وہ لمحہ اپنے ہونے کا احساس دلائے بغیر گزر گیا تھا۔ اسی وقت عبداللہ خاں کی سماعت سے ا درشت آواز ٹکرائی اور یہ بلند و کرخت آواز کام بخش کی تھی۔ عبداللہ خاں بھی شاہی خیمہ گاہ میں موجود تھا۔

"نکل جاؤ تم سب اس خیمے سے! اور شاہ عالم سے کہہ دو کہ میں اس کا احسان لینا نہیں چا مجھے کسی دوا، کسی مرہم کی ضرورت نہیں... کسی کی نہیں"

تمام طبیب اور جراح اترتے ہوئے چہرے لئے خیمے سے باہر آ گئے۔ شاہ عالم کو اس کی اط دے دی گئی کہ کام بخش علاج کرانے پر راضی نہیں۔ عبداللہ خاں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب مجھے ا

ی طرف چلنا چاہئے کہ شاہ عالم کے خیمے سے اس کا خادم باہر نکلا اور اس نے عبداللہ خاں، ذوالفقار خان ور خان خاناں کو طلبی کے بارے میں بتایا۔ وہ تینوں فوراً اندر چلے گئے۔

خیمے کے اندر شاہ عالم بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ تینوں حتراماً کھڑے رہے۔

"تم لوگ بیٹھ جاؤ!" شاہ عالم نے ان کی طرف مڑے بغیر کہا۔ "دراصل اس وقت ہم اتنے ی مضطرب ہیں کہ بیٹھ نہیں سکتے۔"

"مگر اے ظل اللہ! یہ سوئے ادب ہے۔ گستاخی معاف یہ جسارت نہیں کر سکتا۔" خان خاناں دب سے جھکا حالانکہ اس طرف شاہ عالم کی پشت تھی اور وہ خان خاناں کو جھکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"اگر یوں ہے تو ہم بیٹھے جاتے ہیں۔" شاہ عالم نے بیزاری سے کہا اور مسند پر آ بیٹھا۔

وہ تینوں بھی مودب ہو کر بیٹھ گئے۔

بیٹھتے ہی شاہ عالم کو کچھ خیال آیا اور وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا جیسے خود کلامی میں مبتلا ہو۔ "وہ بھوکا بھی ہو سکتا ہے ... بھوکا بھی ہو سکتا ہے۔"

معاً شاہ عالم نے خادم کو بلانے کیلئے تالی بجائی۔ خادم خیمے میں داخل ہوا تو شاہ عالم نے کام نش کے لئے یہ حکم دیا کہ اسے شاہی مطبخ سے شوربہ لے کے فوراً پہنچایا جائے۔ خادم حکم سنتے ہی چلا گیا۔

خادم کے جاتے ہی شاہ عالم نے ان تینوں کو مخاطب کیا۔ "دراصل ہم کام بخش کو اس حال میں بکھکر اپنے حواس قائم نہ رکھ سکے تھے اس لئے آپ حضرات کو فتح کی مبارک باد نہ دے سکے۔ بہرحال ہم آپ سب سے خوش ہیں کہ آپ نے ہمارے حکم کی تعمیل ہی میں سب کچھ کیا۔ ہمیں اس پر بھی خوشی ہے کہ کام بخش کو ہمارے حکم پر زندہ ہی گرفتار کیا گیا ہر چند کہ اسکی حالت خطرناک ہے۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے وہ کچھ فکر مند ہو گیا، پھر بولا۔ "ہم جانتے ہیں کہ وہ بہت ضدی اور خودسر ہے۔ وہ سدا کا ایسا ہے۔ بچپن ہی سے وہ ایسا ہی تھا۔ اب اگر اس نے اپنا علاج نہ کرانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کوئی بھی اس کا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ کاش وہ علاج کرانے پر آمادہ ہو سکتا! مگر ہم جانتے ہیں وہ اپنی جان دے دے گا، ضد نہیں چھوڑے گا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

ان تینوں میں سے کوئی کچھ کہتا بھی تو کیا کہتا! سبھی اسی لئے خاموش تھے ہر چند کہ وقت فتح کامرانی کا تھا، خوشی منانے کا تھا کہ شاہ عالم اب بلاشرکت غیرے پورے ہندوستان کا مالک و مختار بن گیا تھا اس کے دل کا کانٹا نکل گیا تھا لیکن وہ عجیب شخص تھا کہ اس کے باوجود خوش نہیں تھا۔ شاید اس کا سبب س کا گداز دل ہو۔ خیمے میں خاموشی کو کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ شاہ عالم کا وہ خادم پھر خیمے میں داخل ہوا سے شوربہ لے کر کام بخش کے پاس جانے کا حکم دیا گیا تھا۔

شاہ عالم نے خادم کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا۔ "کیا شوربہ پینے سے انکار کر دیا؟"

"جی ہاں ظل اللہ! انہوں نے شوربے کا برتن اٹھا کر پھینک دیا اور برا بھلا کہنے لگے۔" خادم نے ادب سے جواب دیا۔

"ہمیں پہلے ہی خدشہ تھا۔" شاہ عالم نے آہستگی سے کہا، پھر سامنے بیٹھے ہوئے افراد سے

مخاطب ہوا۔ ”آیئے ہم کوشش کرتے ہیں کہ وہ ہماری بات مان لے اور کم از کم کچھ کھا پی تو لے۔“ یہ کہتے ہی شاہ عالم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تینوں بھی شاہ عالم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اپنے خیمے سے نکل کر شاہ عالم ان تینوں کے جلو میں برابر والے خیمے کے اندر داخل ہوا جہاں ایک چھپر کٹ پر کام بخش پڑا کراہ رہا تھا۔ عبداللہ خاں کو خیمے میں داخل ہوتے وقت کچھ جھجک اور شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر میں اس شخص سے کس طرح نظر ملا سکوں گا جسے میں نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا جو مجھے اپنا نمک خوار سمجھتا تھا لیکن اس کے باوجود اسے خیمے میں جانا ہی پڑا۔

عبداللہ خاں پر نظر پڑتے ہی کام بخش کی تیوریوں پر بل پڑے گئے۔ شاہ عالم کے ذہن سے بھی یہ بات نکل گئی تھی کہ اس وقت عبداللہ خاں کو اپنے ساتھ لے جانا مناسب نہیں عبداللہ خاں کو کام بخش نے یقیناً میدان جنگ میں لڑتے دیکھا ہوگا۔ اس وقت عبداللہ خاں کی نظر کام بخش پر پڑی ہوگی۔ جب اسے گرفتار کر کے لایا گیا تھا لیکن عبداللہ خاں دانستہ کام بخش سے دور دور ہی رہا تھا۔ اس کا سبب عبداللہ خاں کے دل کا چور تھا۔ اس وقت پہلی بار عبداللہ خاں اس کے قریب آیا۔

کام بخش اچانک عبداللہ خاں کی طرف انگلی اٹھا کر چیخا۔ ”غدار... غدار ... نمک حرام!... لوگو! دیکھ لو نمک حرام ایسے ہوتے ہیں۔“

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ شاہ عالم کو اب احساس ہو گیا تھا کہ اس سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے! وہ انتہائی نرمی کے ساتھ کام بخش سے مخاطب ہوا۔

”اے برادر! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ تم نے طبیبوں کو ناحق علاج سے منع کر دیا۔ تم انہیں علاج کرنے دو! تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ یہ کہتے ہوئے شاہ عالم اس کے قریب چھپر کٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے کام بخش کی اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا جو عبداللہ خاں کے بارے میں کہی تھی۔ اس نے جیسے کام بخش کے الفاظ سنے ہی نہ تھے۔ شاہ عالم نے اپنے کاندھے پر پڑی ہوئی چادر اتار کر اس برگشتہ نصیب کو اڑھا دی اور رقت بھرے لہجے میں بولا۔ ”ہم تمہیں اس حال میں دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ بے غیرتی کے ساتھ گرفتار ہو کر تیمور کی اولاد پر رسوائی کا داغ لگاؤں۔“ کام بخش طنطنے سے بولا۔ پھر اس نے کہا۔ ”تم سمجھتے ہو کہ اب پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے ہو! تو سنو کہ تم غداروں اور نمک حراموں میں گھرے ہوئے ہو اور بہت جلد تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو میرا ہوا۔“

عبداللہ خاں کی نظریں شرم سے جھکی ہوئی تھیں جیسے اس نے واقعی نمک حرامی کی ہو اور عین موقع پر پکڑا گیا ہو۔ شاہ عالم نے ایک بار پھر کام بخش کی بات کو نظر انداز کر دیا اور خادم کو حکم دیا کہ وہ شوربہ لائے۔

”میں کچھ نہیں کھاؤں گا“ کچھ نہیں پیوں گا! کام بخش غصے سے بولا۔

”یہ نہ بھولو کہ میری اور تمہاری رگوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا ہے تم میرا ہاتھ نہیں جھٹک سکو گے ... میں ... میں تمہارا بڑا بھائی ہوں... بڑا بھائی! یہ کہتے ہوئے شاہ عالم کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ خادم شوربے کا برتن لے آیا۔ کام بخش نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔ شاہ عالم نے بڑی منت سماجت کر کے دو تین چمچے شوربہ پلایا اور آنسو پونچھتا ہوا اٹھا۔ خان خاناں‘ عبداللہ خاں اور ذوالفقار خاں بھی شاہ عالم کے ساتھ خیمے سے نکل آئے اور اجازت لے کر اپنے اپنے خیموں کی طرف روانہ

ہو گئے۔

دوسرے دن صبح ہی لشکر میں ایک اندوہناک خبر گشت کر رہی تھی۔ رات کے آخری پہر کام بخش اور اس کا بیٹا فیروز مند اللہ کو پیارے ہوئے۔ شاہ عالم نے حکم دیا کہ دونوں کی لاشوں کو شاجہاں آباد (دہلی) لے جایا جائے اور ہمایوں بادشاہ کے روضے میں دفن کیا جائے۔ اسی کے ساتھ حکم ہوا کہ تین دن تک تعزیت کے مراسم ادا کئے جائیں گے اور نوبت نہیں بجائی جائے گی۔ یہ تین دن بڑی بے کیفی میں گزرے۔ اس عرصے میں ذوالفقار خاں نے ایک بار پھر عبداللہ خاں سے گفت وشنید کرنا چاہی‘ مگر بے دلی کے سبب عبداللہ خاں نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرا اور ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ جب تعزیت کے تین دن پورے ہو گئے تو شاہ عالم حیدر آباد میں داخل ہوا۔ جشن تاج پوشی کی تیسری سال گرہ قلعہ حیدر آباد میں منائی گئی۔

جشن تاج پوشی کے بعد شاہ عالم نے حیدر آباد کا بندوبست وانتظام کیا اور پھر حیدر آباد سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک امیر مراد خان کو پورے دکن کی صوبیداری عطا کی گئی۔ روانگی سے قبل مراد خاں کو سرکشوں اور مفسدوں کی سرکوبی کیلئے تاکیدی احکام دیئے گئے۔

شاہجہاں آباد (دہلی) سے حیدر آباد دکن کا طویل سفر‘ پھر وہاں خاصے عرصے قیام‘ اس کے بعد شاہ عالم کے ساتھ دارالحکومت شاہجہاں آباد‘ واپسی میں بڑا وقت گزر چکا تھا۔ دارالحکومت شاہجہاں آباد پہنچتے ہی عبداللہ خاں کو کئی اطلاعات ملیں۔ ان اطلاعات کا تعلق راجکماری انیتا کے شوہر راجا اجیت سنگھ سے تھا۔ پہلی چونکا دینے والی اطلاع تو یہ تھی کہ راجا اجیت سنگھ نے دوسری شای کر لی ہے اور اس سے بھی حیرت انگیز خبر یہ تھی کہ راجا اجیت سنگھ کی یہ دوسری نہیں بلکہ تیسری شادی تھی۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی جس سے اس کی ایک بیٹی تھی جو اب چودہ برس کی تھی۔ دوسری شادی اس نے راجکماری انیتا سے کی تھی اور راجکماری سے اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ راجکماری انیتا اور راجا اجیت سنگھ کی عمروں میں خاصا فرق تھا راجا اجیت سنگھ‘ راجکماری سے پندرہ سال بڑا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ راجکماری انیتا کو اب مردہ تصور کیا کرتا تھا کیونکہ طویل عرصہ گزر جانے اور تلاش کرنے کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ راجا اجیت سنگھ نے اپنی پہلی بیوی ہی کی سب سے چھوٹی بہن سے شادی کر لی تھی۔

راجا اجیت سنگھ نے راجکماری انیتا کو مردہ سمجھ کر نئی شادی کر لی۔ اس اطلاع نے راجکماری پر بڑا گہرا اثر کیا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”اس بے وفا نے میرا انتظار بھی نہیں کیا اور... اور مجھے مردہ سمجھ لیا۔ میں... میں اس کیلئے مر گئی۔ جیتے جی مر گئی۔“

”ہاں راجکماری‘ راجا اجیت سنگھ کیلئے مر گئیں اور اپنے محبوب عبداللہ خاں کیلئے زندہ ہو گئیں!“ عبداللہ خاں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

پھر اس شب راجکماری انیتا کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ اس نے خود کو عبداللہ خاں کے حوالے کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ مسلمان ہو جانے اور عبداللہ خاں سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی۔

☆......☆......☆

عبداللہ خاں نے بڑی خاموشی کے ساتھ راجکماری کو مسلمان کر کے اس سے نکاح پڑھوا لیا کیونکہ وہ اس شادی کو شہرت دینا نہیں چاہتا تھا۔ شاہجہاں آباد میں اسے سب سے بڑا خطرہ شہزادہ عظیم الشان کی طرف سے تھا جس نے راجکماری کو اپنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس کا دوسرا رقیب میر بخشی ذوالفقار خان تھا۔ اگر وہ اپنی شادی کو شہرت دیتا تو یہ سوال ضرور اٹھتا کہ وہ کس سے شادی کر رہا ہے؟ اور یہ کہ اس کے سسرال والے کون ہیں وغیرہ؟ اسی سبب اس نے راجکماری سے خفیہ شادی کی تھی۔ راجکماری کا نام اس نے اب دل آرام رکھ دیا تھا۔ مسلمان ہو کر پردہ کرنے کی وجہ سے راجکماری اب اس کے رقیبوں کی نظر سے بھی محفوظ ہو گئی تھی۔

پہلی ہی شب عبداللہ خان کو راجکماری نے دیوانہ کر دیا تھا۔ وہ اس طرح کسی گھٹا کے مانند عبداللہ خاں کی تشنہ آرزوؤں پر کھل کر برسی تھی کہ طویل ہجر کے سارے گلے شکوے مٹ گئے تھے۔ اب تک عبداللہ خان کی زندگی میں جتنی عورتیں آئی تھیں، راجکماری ان سب سے مختلف تھی۔ پہلے سے شادی شدہ ہونے کے باوجود اس کی جوانی میں وہ بھرپور نشہ تھا کہ عبداللہ خان نے ایسا نشہ پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

ابھی عبداللہ خان کو راجکماری سے شادی کیے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ سکھوں نے بغاوت کر دی۔ خان خاناں کو سکھوں کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ عبداللہ خان کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر اس نے اپنا دامن بچا لیا۔ عبداللہ خان تو ابھی راجکماری کی زلف گرہ گیر کی عقدہ کشائی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ دارالحکومت سے کہیں جانا نہیں چاہتا تھا۔ خان خاناں کی غیر موجودگی میں ذوالفقار خان کا پلہ بھاری ہو گیا مگر عبداللہ خان نے اس کی پروا نہ کی۔ اس کے باوجود وہ ذوالفقار خان کی سرگرمیوں سے غافل نہیں تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ ذوالفقار خان نے شہزادہ جہاں دار شاہ کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ جہاں دار شاہ رنگین مزاج اور اس معاملے میں ذوالفقار خان بھی پرانا پاپی تھا۔ شہزادے کو حسن کی رشوت دے کر ذوالفقار خان نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس نے کئی انتہائی حسین کنیزیں، شہزادے کو بطور تحفہ پیش کی تھیں۔ ذوالفقار خان کو ایک شہزادے کی بھرپور حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کا زیادہ وقت شہزادے ہی کی مصاحبت میں گزرتا تھا۔ اب ذوالفقار خاں کو عبداللہ خان کی بھی زیادہ پروا نہیں رہی تھی۔ عبداللہ خان نے سوچا بھی کہ خان خاناں کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ذوالفقار خاں کی پرانی پیشکش قبول کر لے مگر ذوالفقار خان کا رویہ اب اس کے ساتھ بالکل بدل چکا تھا۔ وہ عبداللہ خان کو گردانتا ہی نہیں تھا۔ شہزادہ جہاں دار شاہ کے ساتھ

مل کر ذوالفقار خاں اور کیا کھچڑی پکا رہا تھا، کوشش کے باوجود عبداللہ خان معلوم نہ کر سکا۔ اسی دوران میں اسے ایک اور دھچکا لگا۔ خان خاناں، سکھوں کے گرو کو گرفتار نہیں کر سکا تھا اور گرو اسے دھوکا دے کر فرار ہو گیا تھا۔ سکھوں کے گرو کے فرار ہونے کا ملال اور شرمندگی خان خاناں کو ایسی تھی کہ اس کا مزاج بھی خلل پذیر ہو گیا۔ رنج و غصے سے وہ بیمار پڑ گیا اور مختلف جسمانی عارضوں میں مبتلا ہو گیا جن کے علاج سے یونانی فرنگی حکیم بھی عاجز آ گئے۔ آخر وہ انہیں بیماریوں میں فوت ہو گیا۔

خان خاناں کی وفات کے بعد عبداللہ خان دارالحکومت میں تنہا رہ گیا۔ اسی دوران میں وزارت کا جھگڑا اٹھا۔ تجویز یہ تھی کہ ذوالفقار خان کو وزیر مملکت بنا دیا جائے مگر ذوالفقار خان دکن کی صوبیداری اور بخشی الممالک کے عہدوں سے دست کش ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اسی لیے اپنے والد امیر الامرا اسد خان کو وزارت کا عہدہ دیئے جانے پر اصرار کیا۔ اس پر شہزادہ عظیم الشان نے کہا، ''ذوالفقار خان تو یہ چاہتا ہے کہ وزارت تو اس کے باپ کو مل جائے اور دوسرے اہم عہدے اس کے نام پر محفوظ رہیں۔

اس اختلاف رائے کے سبب بادشاہ مخمصے میں پھنس گیا۔ آخر اس نے یہ طے کیا کہ مستقل وزیر کے تقرر تک عنایت اللہ خان کا بیٹا سعد اللہ خان، شہزادہ عظیم الشان کی نیابت میں امور سلطنت سنبھال لے اور تمام کارروائیاں شہزادے کے علم و اطلاع میں لا کر سرانجام دیتا رہے۔

وزارت کے جھگڑے کو نمٹے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ محرم 1122ھ کے آخری عشرے میں شاہ عالم بیمار پڑ گیا۔ اس کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ سات آٹھ پہر ہی میں سفر آخرت کے آثار نمایاں ہو گئے اور پھر آٹھویں تاریخ کی آخری شب کو وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

عبداللہ خان کے خوابوں کی تعبیر کا یہی وقت تھا۔ تاج و تخت کے چار دعویدار تھے اور اسے انتخاب کرنا تھا کہ ان میں سے کس کا ساتھ دیا جائے؟ ابھی عبداللہ خان کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا عظیم آباد (پٹنہ) سے اس کے چھوٹے بھائی حسین علی خان کا بھیجا ہوا ایک قاصد انتہائی اہم پیغام لے کر آیا۔
عبداللہ خان اپنے بھائی کی طرف سے ملنے والا پیغام پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ پیغام اس کے قطعی غیر متوقع تھا۔ اسے فوری طور پر دارالحکومت سے کوچ کرنا تھا۔

القاب و آداب کے بعد حسین علی خان نے اپنے بڑے بھائی عبداللہ خانکو جو کچھ لکھا تھا، وہ اس کی سیاسی بصیرت و شعور کا پتا دیتا تھا۔ عظیم آباد میں رہنے کے باوجود حسین علی خان دارالحکومت میں پیش آنے والے ایک ایک واقعے سے آگاہ تھا۔ پیغام مندرجہ ذیل تھا۔

''ہم نہیں جانتے کہ چاروں شہزادوں عظیم الشان، جہاں شاہ، جہاں دار شاہ اور رفیع الشان میں سے کون مغل تاج و تخت کا مالک بنے گا۔ ان میں سے ہم کسی کا بھی ساتھ دے کر اپنے لیے خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم دور سے یہ تماشا دیکھیں اور پھر جس کا پلہ بھاری ہو اپنی طاقت اس کے پلڑے میں ڈال دیں۔ ان حالات میں آپ کا دارالحکومت میں رہنا قطعی مناسب نہیں۔ یوں بھی ذوالفقار خان وہاں آپ کے لیے شدید خطرہ بن چکا ہے۔ آپ فوری طور پر عظیم آباد (پٹنہ) آ جائیں۔ میں نے دوسرے بھائیوں اور تمام سادات بارہہ کے اہم سرداروں کو بھی پیغامات ارسال کر دیے ہیں کہ وہ سب یہاں پہنچ جائیں۔ یہیں عظیم آباد میں شہزادہ عظیم الشان کے صاحب زادے شہزادہ فرخ سیر بھی

موجود ہیں اور میں نے ان سے رسم و راہ بڑھالی ہے۔ اگر چاروں شہزادوں میں سے شہزادہ عظیم الشان کو فتح حاصل ہوتی ہے تو پھر شہزادہ فرخ سے میرے تعلقات کام آئیں گے۔ اس موقع پر ہمیں اپنے گزشتہ منصوبے کو بھی مدنظر رکھنا ہے۔ آئندہ مغل تاجدار وہی ہونا چاہئے جسے ہم اپنے اشاروں پر نچا سکیں اور اصل اقتدار اس کی بجائے ہمارے ہاتھ میں ہو۔"

عبداللہ خاں یہ آخری سطور پڑھ رہا تھا کہ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ وہ چونک اٹھا۔ بغیر اجازت اس کے خلوت کدے میں داخل ہونے والی صرف راج کماری ہی ہوسکتی تھی اور اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ راج کماری ہی تھی۔ غیرارادی طور پر اس نے موصول ہونے والا پیغام چھپانے کی کوشش کی۔ اس پر راج کماری ہنس پڑی، پھر بولی "اب کیا فائدہ عبداللہ خاں؟ میں نے تو پیغام پڑھ ہی لیا۔"

باقی تو پیغام میں کوئی ایسی خطرناک بات نہیں تھی البتہ آخری سطور ضرور ایسی تھیں جنہیں کسی کے علم میں نہیں آنا چاہئے تھا۔ راج کماری پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ عبداللہ خاں نے سوچا۔

اس سے پہلے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکتا راج کماری بول اٹھی۔ "عبداللہ خاں! کیا اب بھی تم مجھے اپنے وجود سے الگ سمجھتے ہو؟"

یہ سوال ایسا تھا جس نے اس کے سوال کا جواب دے دیا۔ اس نے راج کماری سے کوئی جھوٹ بولنے کی بجائے اسے اعتماد میں لے لیا۔

"حسین علی خاں نے جو کچھ لکھا ہے، ان حالات میں وہی بہتر ہے۔" راج کماری نے مشورہ دیا۔ "ہمیں جلد از جلد یہاں سے عظیم آباد (پٹنہ) کے لیے کوچ کردینا چاہئے۔"

اس دن کے بعد سے راج کماری، عبداللہ خاں کی محبوبہ اور بیوی ہی نہیں، ہمراز اور دست و بازو بھی بن گئی۔ اسی شب نہایت خاموشی کے ساتھ انہوں نے دہلی (شاہجہاں آباد) سے کوچ کیا۔

ادھر تو عبداللہ خاں نے دہلی سے کوچ کیا، ادھر تخت کے چاروں دعویداروں میں نبرد آزمائی شروع ہوگئی۔ یہ واقعات بیان کرنے سے پہلے میں، یعنی عذرا خان اپنی سرگزشت پڑھنے والوں سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

جس سوال نے مجھے ماضی کے اس سفر پر روانہ کیا، وہ یہ تھا کہ مغلوں کی عظیم الشان اور وسیع و عریض حکومت کس طرح ختم ہوگئی؟ میں نے اس سفر کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت سے کیا تھا اور پھر اس کے بیٹے شاہ عالم کے دور تک جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا، اسے بیان کردیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح میری حیثیت تھرڈ پرسن کی بن گئی کیونکہ میں بہرحال تاریخ کا حصہ نہیں ہوں اور نہ سچ میں جھوٹ کی ملاوٹ کرنا میرا مقصود تھا۔

اس دوران میں اپنی سرگزشت سے متعلق "سچی کہانیاں" کے قارئین کی رائے بھی میری نظر سے جستہ جستہ گزرتی رہی۔ میرے نزدیک تاریخ بھی ایک سچ ہے، اگر اس میں اسمگلنگ نہ کی جائے۔ میں چاہتی تو اپنی آپ بیتی کے اس حصے کو حذف بھی کرسکتی تھی، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا میرے خیال میں "سچی کہانیاں" کا ایک موضوع تاریخ بھی ہونا چاہئے تھا، سو میں نے یہی سوچ کر تاریخ کے حوالے سے

مجھ پر جو انکشافات ہوئے انہیں بھی قلمبند کرنا شروع کردیا۔ یہ سچی داستان بڑی عبرت ناک اور سبق آموز تھی، مگر اس میں طوالت، بہت تھی۔ 1857ء تک پہنچنے کے لیے ابھی مجھے ایک طویل اور صبر آزما دور سے گزرنا تھا۔ اس کا مجھے ایک ہی حل نظر آیا کہ میں شاہ عالم کے عہد سے بہادر شاہ ظفر تک کے دور میں جو واقعات پیش آئے، انہیں انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کردوں اور ماضی کے اس سفر سے زمانہ حالت میں لوٹ آؤں۔

اب میں جو کچھ بیان کرنے والی ہوں اسے تاریخ کا ایک طائرانہ سفر کہا جاسکتا ہے۔ میں نے اپنے اس دلچسپ، عجیب اور پراسرار تجربے کی حدود متعین کردی ہیں۔ میں اب صرف انہی واقعات کو ایک تسلسل اور اختصار کے ساتھ بیان کروں گی جو انتہائی دلچسپ، سبق آموز اور ناقابل فراموش ہیں۔ تاریخ کے جو اہم کردار اس سچی داستان میں اب تک پڑھنے والوں کی دلچسپی کا سبب رہے ہیں، انہیں بہرحال نظرانداز نہیں کیا جائے گا، مثلاً سادات بارہہ جو دراصل اس باب میں مرکزی حیثیت کے حامل ہیں، اب تک وہ مغلیہ اقتدار پر قبضے کے خواب دیکھتے آئے ہیں اور اب ان کی منزل بہت قریب آ گئی ہے۔ اس ضمن میں قبل از وقت کچھ بیان کرکے میں آپ کا مزہ کرکرا کرنا نہیں چاہتی۔ میں اپنے ساتھ ساتھ آپ کو بھی اس عہد میں لے جانا چاہتی ہوں کہ جب شاہ عالم کے بعد اپنے تینوں بھائیوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد جہاں دار شاہ فرمانروا بنا۔ عبداللہ خاں بوجوہ آگرے سے کوچ کرچکا تھا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ اس کی وجہ ذوالفقار خاں تھا جس سے عبداللہ خاں کی لگتی تھی۔ ذوالفقار خاں ہی دراصل جہاں دار شاہ کو مغلیہ تاج و تخت کا وارث بنانے میں کامیاب ہوا تھا۔ یوں گویا وقتی طور پر سادات بارہہ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ شہزادہ عظیم الشان جو اپنے باپ شاہ عالم کے بہت قریب تھا، وہ بھی کوشش اور جنگ کے باوجود فتح مند نہ ہوسکا۔ عظیم الشان ہی کا بیٹا فرخ سیر تھا جو بنگال کا حاکم تھا اور وہاں سے چل کر صوبہ عظیم آباد (پٹنہ) پہنچ چکا تھا اور اس نے اپنے باپ عظیم الشان کے بے پتا ہوتے ہی خود تاج و تخت کا دعویٰ کردیا تھا۔ اسے سادات بارہہ کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہوچکی تھی مگر فرخ سیر کے بیان سے پہلے ہم آگرے چلتے ہیں اور جہاں دار شاہ کی ایک جھلک دیکھتے ہیں کہ اس مغل فرمانروا نے تخت نشیں ہوتے ہی کیا "کارہائے نمایاں" انجام دیئے۔

جہاں دار شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے دشمنوں سے وحشیانہ انتقام لیا اور یہ "دشمن" کوئی غیر نہیں اسی کے اہل خاندان تھے۔ اس کے علاوہ اس کے ظلم کا نشانہ وہ لوگ بھی بنے جنہوں نے عظیم الشان، جہاں شاہ اور رفیع الشان، یعنی اس کے تینوں بھائیوں کا ساتھ دیا۔ فن حرب و ضرب میں کمال رکھنے والے تین مغل سرداروں کے لیے اس نے حکم دیا کہ ان کا عضو عضو جدا کرکے انہیں ہلاک کردیا جائے۔ بیس سے زائد امیروں کو قید و زنجیر کے احکام صادر کیے۔ ان امرا کو شکنجوں میں کس دیا گیا اور اذیتیں دی جانے لگیں۔ ان کے گھربار بھی ضبط کرلیے گئے۔

جب عظیم الشان میدان جنگ سے غائب ہوگیا تو اس کے بیٹے محمد کریم نے وہاں سے فرار ہو کر ایک شخص کے گھر میں پناہ لے لی تھی۔ وہ شخص غریب تھا۔ کریم کے پاس سوائے ایک قیمتی انگوٹھی کے کچھ نہیں تھا۔ اس نے اپنے غریب میزبان کو وہ قیمتی انگوٹھی دے کر بازار میں فروخت کے لیے بھیجا۔ انگوٹھی

قیمتی اور شاہی خاندان کی تھی، سنار نے مخبری کر دی اور یوں شہزادہ عظیم الشان کا بیٹا محمد کریم پکڑا گیا۔

کریم کو جب جہاں دار شاہ کے سامنے پابہ زنجیر پیش کیا گیا تو اپنے سگے بھتیجے کی تقدیر کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے ذوالفقار خاں کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا۔ ذوالفقار بولا ''اس نے بھی حضور والا کے خلاف تلوار بلند کی تھی اور یوں یہ بھی باغی ہوا۔ بغاوت کی سزا کیا ہے ظل الٰہی خود جانتے ہیں۔''

''ہم شہزادہ محمد کریم کو سزائے موت کا حکم سناتے ہیں۔''

جہاں دار شاہ نخوت سے بولا۔ 'یہ باغی کل صبح کا سورج نہ دیکھ پائے!''

سو وہ ''باغی نوجوان'' جہاں دار شاہ کا بھتیجا دوسرے دن صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے قتل کر دیا گیا۔ اپنے تینوں بھائیوں کی اولاد کو وہ پہلے ہی سزائیں دے چکا تھا اور وہ پس دیوار زنداں تھے۔ کریم ہی کا چھوٹا بھائی ہمایوں بخت جس کی عمر صرف دس سال تھی، وہ بھی قید میں تھا۔ صرف فرخ سیر اس کے ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا جو کریم کا بڑا بھائی تھا اور عظیم آباد میں تھا۔

جہاں دار شاہ شراب و کباب کا رسیا اور محفل عیش سجانے کا دلدادہ تھا۔ ایک طوائف لعل کنور سے بھی اس کا عشق چل رہا تھا۔ جب تک شاہ عالم زندہ رہا، وہ چوری چھپے شباب وشراب سے لطف اندوز ہوتا رہا، مگر خود حکمراں بن جانے کے بعد اس نے کسی پردے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اصل بادشاہت اب لعل کنور کی تھی جو بے حد حسین تھی، اتنی حسین کہ مغل فرماں روا کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ لعل کنور کے سوا اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لعل کنور کے ذریعے گانے بجانے والوں کی رسائی دربار تک ہو گئی۔ لعل کنور کے بھائیوں اور قریب و دور کے تمام رشتے داروں کو مغل دربار میں مختلف منصب ملنے لگے۔ وہ سب بادشاہ کو اب اپنا عزیز بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ شب و روز گانے بجانے کی محفلیں جمتی تھیں۔

سفلہ پروری کی اس ریل پیل میں قدیم خانہ زاد امیروں، باکمال لوگوں اور عالموں کو کون پوچھتا! سرکار دربار میں ان کا اعتبار باقی نہیں رہا۔ اسی عرصے کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ لعل کنور کے کہنے پر جہاں دار شاہ نے اس کے ایک بھائی خوش حال خاں کے نام اکبر آباد (آگرہ) کی صوبیداری لکھ دی، اس کے ساتھ بڑا منصب دیا۔ ذوالفقار خاں نے دانستہ فرمان اور اسناد تیار کرانے میں دیر کر دی۔ اس پر لعل کنور نے جہاں دار شاہ سے اس کی شکایت کر دی۔ جہاں دار شاہ نے ذوالفقار خاں کو طلب کر لیا۔

''لعل کنور کے بھائی کے لیے فرمان اور اسناد تیار کرانے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟''

جہاں دار شاہ نے منہ چڑھے ذوالفقار خاں سے دریافت کیا۔

ذوالفقار خاں ایک خود سر آدمی تھا اور بادشاہ کے سامنے بھی نہیں چوکتا تھا۔ یہ زعم اسے یوں بھی تھا کہ جہاں دار شاہ کی اصل طاقت وہی تھا، مگر اسے جو بات بھی کہنا ہوتی تھی، بڑے ادب اور سلیقے سے کہتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جواب طلبی کیوں ہو رہی ہے اس لیے ادب سے کہنے لگا۔ ''ہم خانہ زادوں کو اصل میں رشوت لینے کی لت پڑ گئی ہے، بغیر رشوت لیے کسی کا کام نہیں کر پاتے۔''

جہاں دار شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لعل کنور سے کیا رشوت لینا چاہتے ہو؟''

ذوالفقار خاں نے دست بستہ عرض کیا، حضور ایک ہزار عمدہ قسم کے نقشین طنبوروں کی خواہش ہے۔''

جہاں دار شاہ حیرت سے بولا۔ ''ہزار طنبورے! تم ان کا کیا کرو گے؟''

ذوالفقار خاں نے جواب دیا۔ ''جب ہم خانہ زادوں کے کام ''حضور اس قوم کے سپرد کر دیں گے تو پھر ہمارے لیے اس کے سوا کیا رہ جاتا ہے کہ ہم اس معزز قوم کا پیشہ اختیار کر لیں۔''

جہاں دار شاہ اس پر ہنس دیا اور صوبیداری کی تجویز واپس لے لی۔

اسی مغل تاجدار کی عیش پسند طبیعت و مزاج کا ایک منظر اور بھی میری نظر سے گزرا۔ یہ واقعہ بھی اس کی محبوبہ لعل کنور سے متعلق ہے۔

جہاں دار شاہ اکثر رات کے وقت اپنی محبوبہ کو رتھ پر ساتھ بٹھا کر بازاروں کی سیر کو نکل جاتا تھا۔ لعل کنور کے ساتھ کسی شراب خانے میں بیٹھ کر پینے پلانے سے بھی اسے کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایسی ہی ایک رات کا واقعہ ہے کہ وہ لعل کنور کے ہمراہ ایک شراب خانے میں پہنچ گیا۔ وہاں دونوں نے جی بھر کے شراب پی، جب لوٹنے لگے تو بالکل بدمست اور مدہوش تھے۔ محل واپس آئے تو رتھ سے اترتے وقت لعل کنور کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ جہاں دار شاہ کو اتار لیتی۔ گرتے پڑتے وہ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی اور نشے ہی میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ ادھر بادشاہ وقت جہاں دار شاہ دنیا جہاں سے بے خبر رتھ میں بے ہوش پڑا رہا۔ رتھ بان بھی ترنگ میں تھا۔ اس نے رتھ اصطبل میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ کچھ دیر بعد جب محل کی عورتوں نے لعل کنور کے ساتھ جہاں دار شاہ کو نہیں دیکھا تو ادھم مچا دیا۔ لعل کنور کو بھی اٹھایا گیا۔ بڑی مشکل سے وہ کچھ ہوش میں آئی تو بادشاہ کو اپنے پاس نہیں پایا۔ بے قرار ہو کر وہ اٹھی اور روتی ہوئی ادھر سے ادھر حواس باختگی کے عالم میں دوڑنے لگی۔ ہر طرف بادشاہ کی تلاش ہونے لگی۔ آخر خاصی تلاش کے بعد محافظ دستے نے بادشاہ کو رتھ کے اندر محو استراحت پایا۔ اسی عرصے میں یہ افواہ اڑ گئی کہ لعل کنور کے بھائی نے بادشاہ کو مستی کے عالم میں قتل کر دیا۔

جہاں دار شاہ کی اور بھی چند نازیبا حرکتیں لوگوں کی اذیت کا سبب بنی ہوئی تھیں، انہیں میں سے ایک بڑی اذیت اس کے ظالم عہدیدار تھے۔ دکن کا صوبہ ذوالفقار خاں کے پاس تھا جہاں اس کا ایک نائب داؤد خاں رہتا تھا۔ اس نے اہل دکن کی زندگی جہنم بنا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت میں ذوالفقار خاں ہی کا ایک دیوان سبھا چند کرتا دھرتا تھا۔ سبھا چند اس قدر بیہودہ گو تھا کہ گالی گفتار کے بغیر بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی فحش کلامی سے لوگ تنگ تھے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔

چند ماہ بعد جب جہاں دار شاہ آگرے سے لاہور پہنچا تو وہاں پہنچتے ہی اسے خبر ملی کہ اس کا بھتیجا فرخ سیر پٹنہ میں جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے اور سادات بارہہ اس سے مل گئے ہیں۔ جہاں دار شاہ کچھ روز کے بعد ان خبروں سے پریشان ہو کر لاہور سے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

دہلی پہنچ کر جہاں دار شاہ کو پہلی روح فرسا خبر یہ ملی کہ اس نے سید عبداللہ خاں کی جگہ جس شخص سید عبدالغفار کو الہ آباد کا صوبیدار مقرر کیا تھا، وہ سادات بارہہ کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے۔ اس نے مصلحت وقت کے پیش نظر از سر نو عبداللہ خاں کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ جہاں دار شاہ نے عبداللہ خاں

کے منصب میں اضافے کے ساتھ دوبارہ الہ آباد کو اس کے نام بحال کر دیا، پھر ایک عنایت آمیز فرمان عبداللہ خاں کے نام صادر کیا اور خلعت روانہ کی۔ جہاں دار شاہ کا قاصد ابھی پٹنے نہیں پہنچا تھا کہ اسے ایک اور اطلاع ملی۔ یہ اطلاع پٹنہ سے فرخ سیر کے روانہ ہونے کی تھی۔ فرخ سیر کے ساتھ عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کے قول و قرار کا بھی اسے علم ہوا، اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ سادات بارہہ کے ساتھ ساتھ ہی فرخ سیر کے دوسرے جاں نثار رفیق بھی پٹنہ سے کوچ کر چکے ہیں۔

اطلاعات کے مطابق فرخ سیر کے ہمراہ پچیس ہزار فوج تھی۔ جہاں دار شاہ نے اپنے بڑے بیٹے اعز الدین کو پچاس ہزار فوج کے ساتھ فرخ سیر کے مقابلے پر روانہ کر دیا، جو آگرے میں تھا۔

اعز الدین قصبہ کھجور کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ابھی فرخ سیر کا لشکر تیرہ چودہ کوس دور تھا، مگر اس کی آمد آمد کی خبریں سن کر اعز الدین بدحواس ہو گیا۔ اس نے کھجور کے قریب ہی پڑاؤ ڈال دیا اور لشکر گاہ کی اطراف خندق کھودنے کے ساتھ مورچہ بندی کا حکم دے دیا۔

ان بزدلانہ اقدامات کی خبر جب فرخ سیر کو ہوئی تو وہ اور شیر ہو گیا۔ عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کے پیش رو دستے اعز الدین کے لشکر سے ایک دو کوس کے فاصلے پر پہنچ گئے اور ان کے جھنڈے نظر آنے لگے۔ فوجوں میں ابھی تک کوئی مقابلہ نہیں ہوا تھا۔ عبداللہ خاں نے راج کماری کے ایما پر دیہات کی اطراف مورچہ بندی کر لی۔ راج کماری اس کے شانہ بشانہ مردانہ لباس میں موجود تھی۔ دن کے سہ پہر سے رات کے سہ پہر تک اعز الدین کی فوج پر عبداللہ خاں گولہ باری کرتا رہا۔

اعز الدین پہلے ہی باپ سے شاکی تھا کیونکہ لعل کنور ہمیشہ اس کے خلاف جہاں دار شاہ کو بھڑکاتی رہتی تھی۔ جہاں دار شاہ، بیٹے کے ساتھ سختی و تندی سے پیش آتا تھا۔ پھر یہ کہ اس مہم پر اسے بالکل بے دست و پا بنا کر بھیجا گیا تھا۔ سارے اختیارات خان دوراں کے ہاتھ میں تھے۔ یہ بات بھی اس کے لیے سخت ناگوار تھی۔ موجودہ حالت میں اس نے خان دوراں سے مشورہ کیا کہ کیا ہو؟ خان دوراں خود گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی بزدلی چہرے سے ظاہر تھی۔ ان دونوں ہی نے فرار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر وہ اس بدحواسی کے ساتھ بھاگے کہ صرف جواہرات اور اشرفیاں اپنے ساتھ لے جا سکے باقی تمام خزانہ، ساز و سامان، خیمہ اور توشک خانہ، فرخ سیر کی فوج کے لیے چھوڑ گئے۔ دونوں رات کے آخری حصے میں فرار ہوئے تھے۔ ان کے فرار کی خبر پھیلتے ہی سارا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔

جب اعز الدین، اکبر آباد پہنچا تو قلیچ خاں بہادر (نظام الملک، ایک ترک امیر) نے یہی مناسب سمجھا کہ جہاں دار شاہ کا حکم آنے تک شہزادے کو اکبر آباد (آگرہ) ہی میں روک لیا جائے۔

جہاں دار شاہ کو دہلی میں بیٹے کی شکست کا علم ہوا تو سخت پریشان ہو گیا۔ ذوالفقار خاں کے مشورے پر اب وہ خود دہلی سے اسی ہزار فوج لے کر نکلا اور اکبر آباد کے قریب سموگڑھ کے میدان میں پہنچ گیا۔

مقابل سے فرخ سیر بھی سید عبداللہ خاں، حسین علی خاں اور دوسرے تجربہ کار امرا کے ساتھ اکبر آباد کے قریب آ گیا۔ اس کی فوج جہاں دار شاہ کے لشکر کا تیسرا حصہ بھی نہیں تھی۔ جہاں دار شاہ کی فوج کی کثرت، توپ خانہ اور ساز و سامان کو دیکھ کر اس کی شکست کا بظاہر کوئی امکان تھا ہی نہیں، ذوالفقار

خاں اور کوکلتاش خاں دونوں ہی جہاں دار شاہ کے وفادار و جاں نثار تھے، مگر پہلے جس طرح شاہ عالم کے عہد میں عبداللہ خاں اور ذوالفقار خاں میں ٹھنی رہتی تھی اسی طرح اب کوکلتاش سے ذوالفقار خاں کی نہیں بنتی تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ اچھی سے اچھی تجویز کو بھی وہ مخالفت میں بے اثر بنا دیتے تھے۔ اس وقت بھی دریائے جمنا کے گھاٹ کو عبور کرنے پر دونوں میں سخت اختلاف ہو گیا۔

ذوالفقار خاں کی تجویز یہ تھی کہ دشمن کو دریا عبور کرنے کا موقع نہیں دینا چاہئے اور خود دریا عبور کر کے اس کے مقابل پہنچ جانا چاہئے۔ اس پر کوکلتاش بولا "فرخ سیر کو دریا کے اس طرف آنے دو کیونکہ ہم اگر دوسری طرف جا کر مقابلہ کریں گے تو دشمن شکست کھانے کے بعد بآسانی فرار ہو جائے گا اور دوبارہ فتنہ انگیزی کرے گا۔ یوں مہم طویل ہو جائے گی۔"

جہاں دار شاہ نے کوکلتاش کے حق میں فیصلہ دیا۔ "دریا میں پانی بہت ہے اور کہیں سے بھی دریا پایاب نہیں اس لیے فرخ سیر کا اتنی جلدی دریا عبور کر لینا ممکن نہیں۔"

مجبوراً ذوالفقار خاں کو خون کا سا گھونٹ پی کر خاموش ہو جانا پڑا۔

جس روز فرخ سیر دو روزہ مسافت طے کر کے اکبر آباد کے مقابلے دریائے جمنا کے کنارے پہنچا تو اس کی فوج کا بڑا حصہ ابھی پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ بڑی تھوڑی سی جمعیت تھی۔ اس جمعیت میں سید عبداللہ خاں بھی تھا اور اس کے ساتھ راج کماری بھی!

جہاں دار شاہ کے لشکر نے جب اپنے غنیم کی نقل و حرکت اتنے قریب دیکھی تو ایسا خوف و ہراس پھیلا کہ شب خون کے خوف سے تمام سوار سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے اپنے گھوڑوں کی لگام پکڑے رات بھر جاگتے رہے۔

راج کماری اپنے ساتھ چند سواروں کو لیے دریا کے کنارے کنارے دوڑ رہی تھی۔ عبداللہ خاں سے اس نے کہا تھا کہ اگر صبح ہونے سے پہلے پہلے کوئی ایسی جگہ مل گئی جہاں سے دریا کو عبور کیا جا سکے تو ہمیں دریا عبور کر لینا چاہئے۔ وہ بہت پرجوش تھی۔ عبداللہ خاں نے اسی لیے اسے نہیں روکا تھا۔

خاصی دیر کے بعد جب وہ لوٹ کر آئی تو اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ اس نے خیمے میں داخل ہوتے ہی عبداللہ خاں کو خوش خبری سنائی۔ میں نے ایک ایسا مقام تلاش کر لیا ہے جہاں دریا میں سینے سینے پانی ہے۔"

پھر عبداللہ خاں اور وہ، دونوں ہی جنگی حکمت عملی پر گفتگو کرنے لگے۔ اس گفتگو کے بعد عبداللہ خاں نے ایک نتیجے کی طرف اشارہ کیا۔ راج کماری نے اتفاق کرتے ہوئے اسی وقت عبداللہ خاں کو فرخ سیر کے پاس روانہ کر دیا۔ راستے میں اس نے حسین علی خاں کو بھی ساتھ لے لیا۔ حسین علی خاں بھی اس حکمت عملی کے حق میں ہو گیا۔

دونوں تجربہ کار بھائیوں کی بات فرخ سیر نے مان لی۔ رات کے آخری حصے میں عبداللہ خاں، راج کماری کے ساتھ چڑھائی کی طرف روانہ ہوا اور جہاں دار شاہ کے لشکر کے سامنے سے بڑھتا ہوا مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ یہ گھاٹ روز بہانی کی سرائے کے قریب دہلی کی سمت، اکبر آباد سے چار کوس پر تھا۔ یہاں سے دریا پار کرنے کے بعد اس نے دہلی کی طرف پشت رکھی اور دشمن کے لشکر کے پیچھے جا پہنچا۔

حکمت عملی کے مطابق فرخ سیر بھی اپنے خاص خاص آدمیوں اور بہادر جاں بازوں کو لے کر تین چار گھڑی بعد دریا کو یہیں سے عبور کر گیا۔ حسین علی خاں، جہاں دار شاہ کی فوج کو روکے رکھنے کے لیے دریا کے اسی طرف ٹھہرا رہا۔ جب ہر طرح اطمینان ہو گیا تو ایک دن اور ایک رات کے بعد اس نے بھی اپنی ہمراہی فوج کے ساتھ دریا عبور کر لیا۔

جہاں دار شاہ کے امیروں اور سالاروں کو اس وقت دریا عبور کیے جانے کی خبر ہوئی جب فرخ سیر کی فوج بلائے ناگہاں کی طرح عقب سے نمودار ہوئی۔ جہاں دار شاہ کے لشکر میں پہلے ہی سے کوئی ترتیب نہیں تھی۔ بدحواسی کے عالم میں فوج بندی کی گئی اور توپ خانے کو آگے بڑھایا گیا۔

دن کے سہ پہر تک دونوں فوجوں کے درمیان مقابلے کے آثار نہیں تھے۔

راج کماری بے چین نظر آ رہی تھی۔ وہ ہراول میں عبداللہ خاں کے ساتھ تھی۔ ہراول فوج کا وہ حصہ ہوتا ہے جو سب سے پہلے حملہ آور ہوتا ہے۔ عبداللہ خاں نے اس کی طرف دیکھا اور بے چینی کا مطلب سمجھ گیا۔ راج کماری کا گھوڑا بار بار کنوتیاں بدل رہا تھا۔ عبداللہ خاں نے راج کماری کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ راج کماری نے اپنے گھوڑے کی لگامیں چھوڑ دیں۔ بارہہ کی جری فوج کے ساتھ عبداللہ خاں بجلی کی طرح تڑپ کر جہاں دار شاہ کی فوج پر ٹوٹ پڑا۔

جہاں دار شاہ کے ساتھ جو ترکی و ایرانی امیر تھے، وہ اس کی طرف سے بددل تھے۔ خود ذوالفقار خاں اپنے حریف امیر کوکلتاش کے مقابل اپنی سبکی سے خوش نہیں تھا مگر اس وقت مقابلے پر اس کا دیرینہ حریف تھا۔ وہ اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر عبداللہ خاں کی طرف لپکا۔ اسی کے ساتھ اس نے تیراندازوں کو اشارہ کیا۔

یہ میدان جنگ تھا جس میں دماغ کو ٹھنڈا رکھنا پڑتا ہے اور جنگی حکمت عملی کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ عبداللہ نے ذوالفقار خاں کے ساتھ بہترین لڑاکا فوج کا انداز کر لیا تھا۔ فوری طور پر فوج کے اس حصے سے بھڑ جانا اس نے خلاف مصلحت سمجھا۔ پہلے وہ دشمن فوج کے کمزور حصے پر ضرب لگانا چاہتا تھا اس لیے کترا کر دوسری طرف بڑھ گیا۔ دوسری طرف اس کا بھائی حسین علی خاں تھا جس کے ساتھ داروغہ توپ خانہ بھی تھا۔ بڑے بھائی کی مصلحت کو سمجھ کر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور فوج کو آگے بڑھا کر ذوالفقار خاں کے مقابل آ گیا۔ کوکلتاش کے مقابلے پر اس نے خان زماں اور چھبیلہ رام ناگر کو آگے بڑھا دیا۔

ذوالفقار خاں کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح زقندیں بھرتا بڑھا اور حسین علی خاں کی فوج پر پہلا ہی حملہ ایسا کیا کہ حسین علی خاں کو اپنے ہاتھی سے اترنا پڑا۔ پھر وہ بارہہ کی فوج کے ساتھ ہندوستان کے بہادروں کے طریقے پر انتہائی بے جگری سے لڑا۔ اب وہ بھی گھوڑے پر تھا۔ ذوالفقار خاں نے سارا دباؤ اسی پر ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسین علی خاں کے جسم میں اتنے تیر پیوست ہوئے اور گولی کے اتنے زخم لگے کہ وہ بے ہوش ہو کر گھوڑے سے گر پڑا۔

ادھر عبداللہ خاں کی فوج کو بھی دشمن فوج کی کثرت کے سبب پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کی فوج پر اتنی زبردست تیراندازی ہوئی کہ پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ یہاں اس کے مقابلے پر سید عبدالغفار تھا۔ یہ وہی تھا

جو الہ آباد میں سادات بارہہ کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہو چکا تھا۔ وہ گزشتہ شرمندگی کو اب مٹانا چاہتا تھا۔

عبداللہ خاں کی فوج پسپا ہوتے ہی منتشر ہو گئی تھی۔ اس کے گرد اگرد سو دو سو سے زیادہ سوار نہیں تھے۔ راج کماری بھی اس سے بچھڑ کر کسی اور طرف لڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اسی موقع پر سید عبدالغفار آگے بڑھا اور دور ہی سے چیخ کر بولا ”میں ہوں سید عبدالغفار!“ یہ کہتے ہی اس نے کمان میں تیر جوڑا اور عبداللہ خاں کی طرف چھوڑ دیا۔ عبداللہ خاں کے ہمراہیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔

اس کے تیر کو رد کر کے عبداللہ خاں نے جواباً تیر چلایا اور اسے زخمی کر دیا۔ سید عبدالغفار زخم کھا کر پلٹا اور جان بچا لے گیا۔

عبداللہ خاں سخت پریشان تھا کہ اب کس طرف جائے؟ حسین علی خاں کے متعلق بھی اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ذوالفقار خاں کے مقابلے میں اس پر کیا بیتی؟ پھر راج کماری کی طرف سے بھی وہ تشویش میں مبتلا تھا۔

اسی ہنگامہ کارزار میں اچانک اس کی نگاہ دائیں جانب اٹھی اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ راج کماری اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اس کی طرف جیسے اڑی آ رہی تھی۔ اس سے عبداللہ خاں کو بڑی تقویت ہوئی۔ اس نے سوچا کہ جہاں دار شاہ کی فوج کے عقب سے بڑھ کر دشمن کے بھیر پر پہنچ جائے، یعنی فوج کے اس حصے پر حملہ کر دے جو آگے لڑنے والی فوج کو کمک پہنچاتی ہے، مگر چاروں طرف مخالف فوجیں اس طرح حملہ آور تھیں کہ کچھ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کدھر سے نکل کر کہاں جا پہنچے گا!

راج کماری اب لڑتی بھڑتی اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کے گرد بہادر سپاہیوں نے حلقہ سا بنا رکھا تھا۔ عبداللہ خاں اور راج کماری کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا اور یہی جملے جنگ کا پانسا بدلنے میں انتہائی اہم ثابت ہوئے۔ عبداللہ خاں جس الجھن کا شکار تھا، وہ ختم ہو چکی تھی۔ وہ راج کماری کے ساتھ غنیم کو ریلتا پیلتا ایک ایسے ٹیلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جو جہاں دار شاہ کی سواری اور قلب لشکر سے بس ایک تیر کے فاصلے پر تھا۔

اسی اثنا میں فتح کا شادیانہ بج چکا تھا اور یہ ذوالفقار خاں کے ایما پر ہوا تھا کیونکہ وہ حسین علی خاں کو گرتے دیکھ چکا تھا اور عبداللہ خاں کی فوج کے پسپا ہونے کی خبر بھی اسے مل چکی تھی۔ ادھر تو فتح کا شادیانہ بجا، ادھر عبداللہ خاں نے اپنی مٹھی بھر فوج کے ساتھ پیچھے سے قلب لشکر پر تیروں کی بارش کر دی۔ سادات بارہہ تیراندازی کرتے ہوئے جہاں دار شاہ کی سواری کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔

راج کماری نے جہاں دار شاہ کے لشکر میں زنانہ سواری کے ہاتھیوں کو چھلنی کرنا شروع کر دیا۔

جہاں دار شاہ ابھی پلٹ کر دشمن کے مقابل نہیں ہوا تھا کہ لعل کنور اور دوسرے خواجہ سراؤں کے ہاتھی تیروں کی بوچھار سے گھبرا کر منتشر ہو گئے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ جہاں دار شاہ نے اپنا ہاتھی آگے بڑھایا تو وہ بھی بھڑک گیا اور فیل بان کے قابو میں نہیں رہا۔

اس دوران میں بارہہ کی منتشر فوج ہر طرف سے سمٹ سمٹ کر عبداللہ خاں کے گرد جمع ہو گئی اور جرأت کے ساتھ پیش قدمی کرنے لگی۔

جہاں دار شاہ کے لشکر میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اس کی فوج پسپا ہونے لگی۔ کوکلتاش خاں نے جب یہ رنگ دیکھا تو جہاں دار شاہ کی مدد کے لیے اپنے دستوں کو لے کر بڑھا، مگر چھبیلہ رام نے اس کا راستہ روک لیا۔ مسلسل گولہ باری کر کے اور تیر اندازی کے بعد اس نے کوکلتاش خاں کو گرا دیا، کوکلتاش زخمی ہو کر اکبر آباد کی طرف بھاگا اور پھر بعد میں زہر کھا کے مر گیا۔ جہاں دار شاہ پر عرصہ کارزار اس قدر تنگ ہوا کہ وہ لعل کنور کی سواری کے ہاتھی پر چڑھ کر شام کے وقت اکبر آباد کی طرف نکل گیا۔

اس صورتحال کی اطلاع ذوالفقار خاں کو مل چکی تھی۔ اس پر بھی بڑا سخت وقت تھا، پھر بھی وہ ایک گھڑی رات تک فرخ سیر کے مقابلے پر ڈٹا رہا۔ جہاں دار شاہ اور شہزادہ اعزالدین کی تلاش میں اس نے اپنے سپاہیوں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر دوڑایا کہ جہاں دار شاہ کا کوئی بیٹا بھی آ جائے تو اسے ساتھ لے کر اپنے حریف کو پسپا کر دے کیونکہ شاہی خاندان کے کسی فرد کے بغیر سپاہی کب تک لڑتے! جب کسی کا کوئی سراغ نہ ملا تو بہ مجبوری ذوالفقار خاں کو بھی میدان جنگ سے فرار ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ بادشاہ وقت کی سفلہ پروری اور امرا کے نفاق کا یہی نتیجہ نکلنا بھی تھا۔ ذوالفقار خاں دہلی کی طرف نکل گیا۔

جب فرخ سیر کی فتح و نصرت کا شادیانہ بلند ہوا تو سید عبداللہ خاں کے آدمی، لاشوں کے انبار میں حسین علی خاں کو تلاش کر رہے تھے۔

لفنگوں اور غنڈوں نے اس کی قیمتی پوشاک تک نوچ کھسوٹ لی تھی۔ وہ بے لباس بے ہوش پڑا ہوا ملا۔ اسے جب ہوش میں لایا گیا اور جسم پر چادر ڈال دی گئی تو اس وقت بھی فتح کا شادیانہ بج رہا تھا۔ شادیانہ سن کر حسین علی خاں کے زخم زخم جسم میں جیسے نئی جان پڑ گئی۔ اسے اٹھا کر بڑے بھائی عبداللہ خاں کے پاس لایا گیا۔

میدان جنگ سے فرار ہو کر جہاں دار شاہ نے وہ شب اکبر آباد میں بسر کی۔ اسی عرصے میں اس نے داڑھی منڈوا لی اور پھر صبح ہونے سے پہلے لعل کنور کے ہمراہ چند آدمیوں کو لے کر دہلی روانہ ہو گیا۔ اس کے جسم پر اب معمولی آدمیوں کا لباس تھا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ سکے۔

ذوالفقار خاں اور جہاں دار شاہ ایک کے پیچھے ایک دہلی پہنچے۔ یہاں ذوالفقار خاں کا باپ اسد خاں موجود تھا۔ جہاں دار شاہ نے اس سے مشورہ اور مدد طلب کی۔

ذوالفقار خاں نے بھی اس سلسلے میں باپ سے سفارش کی کہ جہاں دار شاہ کو کابل یا دکن لے جا کر دوبارہ لشکر فراہم کیا جائے اور تلافی کی کوشش کی جائے۔ اسد خاں، اورنگ زیب عالم گیر کے ساتھ مختلف محاذوں پر داد شجاعت دیتا آیا تھا۔ وہ بوڑھا بڑا تجربہ کار اور جہاں دیدہ تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ جہاں دار شاہ فرمان روائی کا اہل نہیں ہے اور یہ بھی کہ اب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہے، مزید جنگی تیاریوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پھر یہ کہ اتنا خزانہ بھی نہیں رہ گیا تھا کہ اس سے نئی فوج بھرتی کی جا سکے۔ وہ خاموشی کے ساتھ سب کچھ سن کر اپنی جگہ سے اٹھا، اٹھتے اٹھتے اس نے ذوالفقار خاں کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور جہاں دار شاہ سے بولا ”خادم ابھی حاضر ہوتا ہے۔“

جہاں دار شاہ گومگو کے عالم میں وہیں تنہا بیٹھا رہا۔ لعل کنور کو اس نے اسد خاں کے حرم میں بھیج دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ دہلی کے قلعہ دار کی معیت میں ایک فوجی دستہ داخل ہوا۔ جہاں دار شاہ

نے حیرت سے قلعہ دار کی طرف دیکھا۔ قلعہ دار نے اسے حراست میں لے لیا۔

”ہم جہاں دار شاہ ہیں، فرماں روائے ہندوستان! تم شاید ہمیں پہچان نہیں سکے۔“ جب قلعہ دار، جہاں دار شاہ کو پا بہ زنجیر کرنے لگا تو وہ بول اٹھا۔

”ہمیں علم ہے۔“ قلعہ دار نے آہستہ سے جواباً کہا۔

”تو پھر تم کس کے حکم پر ہمیں پابند سلاسل کر رہے ہو؟“ جہاں دار شاہ حیرت سے بولا۔

”جمدۃ الملک اسد خاں کے حکم پر!“ قلعہ دار نے جواب دیا اور جہاں دار شاہ کی اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی۔

قلعے میں ترپولیہ پر ایک قید خانہ تھا جسے قبر کی طرح زمین دوز بنایا گیا تھا۔ یہ نہایت تنگ و تاریک جگہ تھی۔ اس میں ان قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جو خطرناک ہوتے تھے یا جن کے فرار ہو جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ اسد خاں کے حکم پر جہاں دار شاہ کو اسی قید خانے میں زندہ در گور کر دیا گیا۔ اسے صرف ایک طشت اور آفتابہ قضائے حاجت کے لیے اور پانی کی صراحی دے دی گئی تھی۔ بس یہی چیزیں قید میں اس کی رفیق تھیں۔ اسی دوران میں لعل کنور کو بھی حرم سے نکال کر قلعے کے زنداں میں ایک چھوٹی سی کوٹھری کے اندر قید کر دیا گیا تھا۔ یہ کوٹھریاں ان قیدیوں کے لیے تھیں جنہیں سزائے موت دی جاتی تھی۔

قلعہ دار نے اپنا فرض ادا کر کے اسد خاں کو اطلاع دی جو اپنے بیٹے ذوالفقار خاں سے خلوت کدے میں مصروف گفتگو تھا۔ قلعہ دار چلا گیا تو اسد خاں نے دوبارہ گفتگو شروع کر دی۔ وہ ذوالفقار خاں کو سمجھا رہا تھا۔ ”تیموری خاندان میں سے جو بھی فرماں روا ہو، اس کی اطاعت ہم پر لازم ہے۔ اب اگر ہم جہاں دار شاہ کو کابل یا دکن لے کر جاتے تو ایک نیا فتنہ برپا ہو جاتا جس کا انجام معلوم نہیں کیا ہوتا۔“

ذوالفقار خاں پہلے ہی باپ سے خاصی بحث کر چکا تھا اور اسے سادات بارہہ کے خطرے سے بھی آگاہ کر دیا تھا مگر بوڑھا اسد خاں کسی دلیل سے قائل نہیں ہوا تھا۔ اس نے جواباً صرف اتنا کہا تھا کہ جہاں دار شاہ کی گرفتاری معمولی بات نہیں، نیا فرماں روا اس کا لحاظ ضرور کرے گا۔ بہ مجبوری ذوالفقار خاں کو تن بہ تقدیر ہونا پڑا۔ وہ سید عبداللہ خاں سے اپنے گزشتہ معرکوں کو بھولا نہیں تھا۔

اب میں آپ کو دہلی سے آگرے لیے چلتی ہوں جہاں نیا مغل فرماں روا فرخ سیر خطرات سے نکل کر فتح و کامیابی سے ہمکنار ہو چکا ہے۔ وہاں سے ہم اور آپ پھر دہلی لوٹ آئیں گے۔ ایک بات بتاتی چلوں کہ اس زمانے میں آگرے کی حیثیت ضمنی دارالحکومت کی سی تھی۔ جسے مستقر الخلافہ کہا جاتا تھا اور دہلی کو دارالخلافہ کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہجہاں اور اس سے بھی بہت پہلے شاہجہاں کے دادا اکبر اعظم نے آگرے ہی کو مرکزی حیثیت دی تھی۔ آگرہ بہت قدیم شہر تھا۔ پہلے مغل فرماں روا بابر سے بھی بہت پہلے لودھیوں کے عہد حکومت میں اس شہر کی بنیاد پڑی تھی۔ بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر حکومت حاصل کی۔ ابراہیم لودھی کا باپ سکندر لودھی تھا۔ سکندر لودھی ہی کے زمانے میں یہ شہر آباد ہوا یہ 1500ء کی بات ہے۔

سکندر لودھی، شمالی ہند میں فوجی نقطہ نظر کے پیش نظر کسی نئے شہر کا انتخاب چاہتا تھا۔ جگہ کا انتخاب اسی لیے بہت زیادہ تلاش و جستجو کے بعد کیا گیا۔ چند دانشوروں اور تجربہ کار لوگوں کا ایک وفد دہلی

سے کشتیوں پر آیا اور اس نے دریائے جمنا کے دونوں کناروں کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد سلطان سکندر لودھی خود ایک کشتی پر اس مقام کے معائنے کے لیے پہنچا۔ منتخب شدہ مقام پر پہنچنے کے بعد بودوباش کے اعتبار سے اس نے یہ علاقہ پسند کیا کیونکہ یہ نسبتاً بلندی پر تھا۔ اس وقت یہاں آبادی نہیں تھی۔ اس نے اپنی کشتی کے ملاحوں کے نگراں کو متوجہ کیا۔ قریب ہی کچھ فاصلے سے زمین دو جگہ پر بلند تھی۔ سکندر لودھی نے ملاحوں کے نگراں سے سوال کیا ''ان دونوں بلندیوں میں سے کون سی زیادہ بہتر ہے؟'' نگراں فوجی مقاصد سے واقف تھا۔ اس کا تعلق فوج ہی سے تھا۔

اس نے جواب دیا ''آ...... گے ...... رہ'' پھر وہ بولا۔ وہ جو سامنے ہے زیادہ بہتر ہے۔ ابتدائی حروف ادا کر کے اس نے اپنا مقصد دوسری زبان میں بیان کیا تھا اور یہ سرکاری زبان فارسی تھی۔

سلطان سکندر لودھی مسکرایا اور بولا۔ ''اس شہر کا نام بھی آگرہ ہی ہوگا۔''

یوں یہ نیا شہر بسا اور اس کا نام آگرہ ہوا۔ بعد میں اکبر اعظم نے اپنے نام پر اسے اکبر آباد بنا دیا۔ طویل ترین عرصے تک یہ اکبر آباد ہی کہلایا، مگر پھر آگرہ کہا جانے لگا اور اب تک یہی کہلاتا ہے۔

سو اورنگ زیب عالمگیر کا پڑپوتا فرخ سیر اسی تاریخی شہر میں تخت نشین ہوا۔ اسی شہر کی خاک میں وہ مغلیہ تاجدار سو رہا تھا جسے شاہجہان کہا جاتا تھا اور جس نے یہاں تاج محل ایسی عمارت بنوائی تھی۔

جب دربار لگا تو قلیچ خاں بہادر اور دوسرے ترک سردار، عبداللہ خاں کی وساطت سے حاضر دربار ہوئے اور نئے بادشاہ کو سلطنت کی مبارکباد دی۔ فرخ سیر نے ان پر عنایات کا اظہار کیا۔ فرخ سیر نے سید عبداللہ خاں اور چند دوسرے امرا کو دارالحکومت دہلی کے بندوبست کی خاطر روانہ کیا اور خود ایک ہفتے کے بعد دہلی کی طرف کوچ کیا۔

فرخ سیر نے دہلی کے قریب بارہ پلہ پر قیام کیا اور یہیں خیمہ گاہ لگا دی گئی۔ یہاں پہنچتے ہی نئے فرماں روا نے دربار منعقد کیا۔

اس دربار میں سید عبداللہ خاں کو خطیب الملک یار وفادار ظفر جنگ کا خطاب دینے کے ساتھ منصب میں اضافہ کیا گیا، اس کے علاوہ وزارت کا عہدہ بھی ملا۔ حسین علی خاں کو امیر الامرا، بہادر فیروز جنگ کا خطاب، منصب میں ترقی کے ساتھ ہی میر بخشی کا عہدہ بھی دیا گیا۔ ترکی سرداران فوج میں سے قلیچ خاں کو نظام الملک کے خطاب و اضافے کے ساتھ دکن کا صوبیدار بھی مقرر کیا گیا۔ دکن اس سے پہلے ذوالفقار خاں کے پاس تھا اور وہاں اس کا نائب داؤد خاں متعین تھا۔ برہان پور کی صوبیداری بھی درحقیقت داؤد خاں ہی کے پاس تھی۔ داؤد خاں کے لیے احمد آباد گجرات کے صوبے پر تقرری کا حکم دیا گیا۔ ایک اور اہم ترکی سردار محمد امین خاں کو اعتماد الدولہ کے خطاب و اضافے کے ساتھ بخشی دوم مقرر کیا گیا۔ قاضی عبداللہ تورانی، (توران ترکی کو کہا جاتا تھا) جہانگیر نگر کا قاضی تھا۔ اسے مناصب کے ساتھ خان خاناں میر جملہ کا خطاب ملا۔ فرخ سیر نے آگرے سے کوچ کرنے سے پہلے ہی اسے بعض خفیہ معاملات سرانجام دینے کے لیے دہلی روانہ کر دیا تھا۔ یہ کیا خفیہ معاملات تھے، ان کا علم فرخ سیر کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ قاضی (جج) عبداللہ جو اب میر جملہ بن چکا تھا بظاہر تو دیوان خاص اور ڈاک کی داروغگی پر متعین تھا، مگر اسے نئے فرماں روا نے اپنا ہمدم اور محرم خاص بنا کر اپنی طرف سے دستخط کرنے کے اختیارات بھی دے

دیے تھے۔ دیگر عہدوں کے علاوہ قطب الملک سید عبداللہ خاں کے تمام بھائیوں اور سادات بارہہ کے اہم سرخیلوں کو حسب مراتب منصب، اضافہ، خطاب اور عہدوں سے نوازا گیا۔

نئے عہدوں اور خطابات کی یہ تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ آئندہ اس تاریخی داستان میں یہی کردار نظر آئیں گے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اہم ترین عہدے دونوں بھائیوں، یعنی عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کے پاس رہے۔ حکومت مغلیہ کے تمام انتظامی امور عبداللہ خاں کے پاس آ گئے اور امیر الامرا ہونے کی حیثیت سے سپہ سالار افواج مغلیہ ہونے کے ساتھ ساتھ حسین علی خاں، میر بخشی بھی بن گیا۔ اس عہدے پر پہلے ذوالفقار خاں متعین تھا اور وزارت کا عہدہ شاہ عالم کے عہد میں خان خاناں کے پاس تھا جو اب وفات پا چکا تھا۔ خان خاناں کا یہ خطاب فرخ سیر نے اب میر جملہ کو دے دیا تھا۔

خطاب اور نئے عہدے کے بعد عبداللہ خاں اور فرخ سیر کے درمیان پہلا نزاع فرخ سیر ہی کی حماقت کا نتیجہ تھا۔ عبداللہ خان نے بحیثیت وزیر سلطنت ''تن'' اور ''خالصہ'' کی دیوانی پر جن دو افراد کو مقرر کیا، فرخ سیر کی ایما پر عبداللہ خاں دہلی پہنچا تو فرخ سیر نے عبداللہ خاں کے بارہ پلہ سے روانہ ہوتے ہی یہ دونوں عہدے دوسرے افراد کو دے دیئے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی تقرریوں اور تعیناتیوں کے سلسلے میں فرخ سیر نے پہلے نائب، یعنی عبداللہ خاں سے مشورہ بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ایسی چھوٹی باتیں بادشاہوں کو زیب نہیں دیتی تھیں۔ ان کا مطلب عبداللہ خاں نے بالکل صحیح نکالا گویا وہ برائے نام وزیر سلطنت بنایا گیا تھا، اختیارات اسے نہیں دیئے گئے تھے۔ اس نے کہا کہ اگر میری وزارت کے آغاز ہی میں میرے مقرر کردہ لوگ نہ لیے جائیں تو میری وزارت کا کوئی اعتبار نہیں رہے گا۔

یہ خبر جب قاضی عبداللہ، یعنی میر جملہ تک پہنچی تو اس نے فرخ سیر کے کان بھرے ''اس میں شک نہیں کہ بادشاہ اپنے ملازموں کو اختیارات دے دیتے ہیں، مگر ملازمین شاہی کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنی حد میں رہیں! بادشاہ کے حکم کے بغیر اہم عہدوں پر لوگوں کا تقرر اختیارات سے تجاوز ہے۔''

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرخ سیر نے احکام واپس نہیں لیے، نہ عبداللہ خاں کو اعتماد میں لیا۔ فرخ سیر دراصل ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ وہ اختیارات کو استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں جانتا تھا۔ اسے امور سلطنت میں تدبر حاصل نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا بچپن باپ اور دادا سے دور صوبہ بنگال میں گزرا تھا۔ وہیں اس نے نشوونما پائی تھی۔ وہ مستقل مزاج اور صاحب رائے نہیں تھا بلکہ دوسروں کی رائے پر چلنے والا تھا۔ یہ تقدیر کا کھیل ہی تھا کہ اسے بادشاہت مل گئی تھی۔ تیموری خاندان اصل جوہر، شجاعت بھی اسے نصیب نہیں تھی۔ ذاتی طور پر وہ بزدل تھا۔ اس کے علاوہ فرخ سیر میں اتنی اہلیت بھی نہیں تھی کہ کسی بات کی تہ تک پہنچ سکے۔ قلعہ دہلی میں عبداللہ خاں نے دانستہ برسرعام وہ الفاظ ادا کیے تھے کہ فرخ سیر تک اس کے خیالات پہنچ جائیں، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ عبداللہ خاں نے قلعے کو اپنی تحویل میں لے کر آصف الدولہ، جمدۃ الملک اسد خاں کو بے دخل کر دیا تھا۔ اسد خاں نے اپنے بیٹے ذوالفقار خاں کو پہلے ہی قلعے سے نکال دیا تھا تاکہ وہ عبداللہ خاں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔

قلعے سے نکل کر اسد خاں نے ذوالفقار خاں کو اس جگہ سے ساتھ لیا جہاں وہ روپوش تھا۔ پھر وہ

دونوں باپ بیٹے بڑے خوف و ہراس کے عالم میں بارہ پلہ پہنچے اور وہاں خیمہ ڈال لیا۔ ان دونوں کا ارادہ نئے بادشاہ کی خدمت میں حاضری دے کر معافی طلب کرتا تھا۔ مغل فرماں روا عموماً ایسے مواقع پر درگزر سے کام لیتے تھے۔ جری امرا اور خاندان شاہی کے قدیم خدمت گاروں کو وہ معاف کر دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ معافی پانے والا تازندگی اس کا وفادار رہتا تھا اور اسے جو عہدہ بھی دے دیا جاتا تھا حسب لیاقت وہ اس عہدے سے متعلق فرائض کو انتہائی دیانت داری سے ادا کرتا تھا۔

اس کے برعکس میر جملہ نے فرخ سیر کو اور ہی پٹی پڑھائی۔ حسین علی خاں کو بھی یہ علم ہو گیا کہ بادشاہ اور میر جملہ کے درمیان کیا گفتگو ہوئی ہے اور ان دونوں باپ بیٹوں کے لیے فیصلہ کیا ہوا ہے! اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے نے اسد خاں کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ میرے توسط سے بادشاہ کی خدمت میں حاضری دیں گے تو آپ کا بال بیکا بھی نہیں ہو گا۔ حسین علی خاں کو یقین تھا کہ فرخ سیر اس کی سفارش کو رد نہیں کرے گا اور میر جملہ پر اسے فوقیت دے گا۔ حسین علی خاں اس طرح دونوں قدیم امرا کی جان بچا کر ایک طرف تو انہیں ممنون احسان بنانا چاہتا تھا، دوسری طرف فوج میں ان دونوں کے زیر اثر جو افسران تھے انہیں بھی اپنا ہمنوا بنا لینا مقصود نظر تھا، مگر اسد خاں نے اپنے بیٹے کے اصرار پر یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ ذوالفقار خاں نے ایرانی امرا سے عہد و پیماں کر لیا۔ اس پر لطیفہ یہ ہوا کہ ایرانی امرا نے میر جملہ کو واسطہ بنایا۔

میر جملہ، اسد خاں اور ذوالفقار خاں کو دربار میں لے گیا اور ان کے ہاتھ بندھوا کر فرخ سیر کے سامنے پیش کیا۔ اسد خاں نے اپنے اور بیٹے کے قصوروں کی معافی کے لیے چند کلمات ادا کیے اور جہاں دار شاہ کو زیر حراست لینے کے متعلق بھی بتایا۔

''ان دونوں کے ہاتھ کھول دیئے جائیں!'' فرخ سیر نے حکم دیا، پھر اس نے اسد خان کو خلعت و جواہرات بھی دیے اور بولا ''اسد خاں! تم تو گھر جاؤ، ذوالفقار خاں سے ہمیں ضروری بات کرنا ہے، اس کے لیے ہمارا حکم ہے کہ وہ خیمے کے باہر طلبی کا انتظار کرے۔''

تعمیل حکم میں بوڑھا اسد خان، بیٹے کو وہیں چھوڑ کر اپنے خیمے میں واپس آ گیا۔ ذوالفقار خان، خیمہ شاہی کے بیرونی حصے میں رک گیا۔ کچھ ہی دیر میں ذوالفقار خاں کو امرائے دربار اور بادشاہ کے محافظ دستے نے گھیر لیا۔

''اے ذوالفقار خاں! ہم تجھ پر شہزادہ محمد کریم کے خون کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تیرے ہی ایما پر اس نوجوان شہزادے کو قتل کیا گیا۔'' ایک امیر سخت لہجے میں بولا۔ ''بول کہ اس جرم میں تیری گردن کیوں نہ ماردی جائے؟''

''ہم تجھ سے نوجوان شہزادے کے خون کا بدلہ لیں گے بتا کہ تو نے یہ ظلم کیوں کیا؟''

ذوالفقار خاں پر سوالوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ وہ بہرحال کبھی کم رتبہ شخص نہیں رہا تھا اور اس سے کم رتبے کے لوگ جواب طلبی کر رہے تھے۔ پھر یہ کہ وہ غصے کا بھی تیز تھا۔ ساری زندگی کسی نے اس طرح اس سے کلام نہیں کیا تھا۔ وہ اسی لیے سخت اور درشت جواب دیتا رہا۔ اسی دوران میں محافظ دستے کے نگران لاچین بیگ نے ذوالفقار خان کے پیچھے سے آ کر اس کی گردن میں تسمہ ڈالا اور اپنی طرف

کھینچا۔ اطراف سے محافظ، ذوالفقار خاں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ لکڑیوں، لاتوں اور گھونسوں سے ذوالفقار خاں کو مارنے لگے۔ انہوں نے چھریوں اور خنجروں سے ذوالفقار خاں کے جسم پر اتنے چرکے لگائے کہ اس کا کام تمام ہو گیا۔

ذوالفقار خاں کو تلوار کا ایک وار کر کے بھی ختم کیا جا سکتا تھا، مگر حکم شاہی یہی تھا کہ اذیتیں دے کر ہلاک کیا جائے۔ اسی پر عمل کیا گیا تھا۔

اس دن فرخ سیر نے اپنے چچا اور سابق مغل حکمراں جہاں دار شاہ کے قتل کا حکم بھی دیا۔ اس کے لیے بھی لاچین بیگ کو مقرر کیا گیا کہ وہ تسمے سے گلا گھونٹ کر جہاں دار شاہ کو ملک عدم روانہ کرے۔ لعل کنور کو بھی زنداں ہی میں اذیت دے کر ہلاک کیے جانے کا حکم ہوا۔

فرخ سیر کے حکم پر لاچین بیگ اپنے عملے کے کچھ محافظوں کو ساتھ لیے اور شاہی فرمان لیے قلعہ دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

بادشاہ وقت کے حکم کی تعمیل ہو گئی تو اس نے بارہ پلے سے دہلی کی طرف کوچ کرنے سے پہلے بڑی نخوت کے ساتھ ایک اور حکم دیا ''جہاں دار شاہ کا سر نیزے پر چڑھا کر ہاتھی پر بلند کیا جائے اور اس کی لاش ہاتھی کی عماری میں بٹھا دی جائے۔ ذوالفقار خاں کی لاش کو ہاتھی کی دم سے اوندھا باندھ دیا جائے۔ ہم جب شہر دہلی میں داخل ہوں تو یہ ہاتھی ہماری سواری کے عقب میں رہے۔ پھر جب ہم قلعے میں داخل ہوں تو دونوں لاشوں کو قلعے کے دروازے پر ڈال دیا جائے۔''

اس روز کسی کو نہیں بخشا گیا۔ اسد خاں کی نظر بندی کا حکم ہوا۔ ذوالفقار خاں کے بے ہودہ گو دیوان سبھا چند کی زبان کاٹ دی گئی، اس کے باوجود سبھا چند کو بات کرنے میں دقت نہیں ہوتی تھی، ہاں وہ گالی بکنے سے ضرور باز آ گیا تھا۔ اسد خاں اور ذوالفقار خان، کوکلتاش اور سبھا چند کے علاوہ دوسرے جہاں دار شاہی امرا کے مال و اسباب کی ضبطی کا حکم بھی دیا گیا۔ جہاں دار شاہ تقریباً گیارہ ماہ حکومت کر سکا تھا، مگر اس عرصے میں اس نے سلطنت مغلیہ کی عزت و آبرو ایک طوائف کے قدموں پر نچھاور کر دی تھی اور میدان جنگ سے بھاگ گیا تھا۔ امیر تیمور کا یہ تیرہواں جانشیں تھا۔

فرخ سیر دہلی پہنچ گیا مگر وہاں پہنچ کر بھی قتل و غارت گری کا یہ بازار گرم ہی رہا۔ اس میں بہت سے بے گناہ بھی مارے گئے۔ دراصل عیار صفت میر جملہ نے فرخ سیر کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ جتنی سخت سے سخت سزائیں دے گا اس کا رعب و دبدبہ بڑھے گا۔ جرم کی تحقیق کے بغیر یہ سزائیں دی جا رہی تھیں اور لاچین بیگ اپنے عملے کے ساتھ بہت مصروف تھا۔ ''تسمے سے گلا گھونٹ کر مار دیا جائے!'' فرخ سیر کے اس ایک فقرے نے دہشت سی پھیلا دی تھی۔ عموماً سزائے موت کے لیے وہ یہی طریقہ استعمال کر رہا تھا۔ بس کسی کے بارے میں کہیں سے بھی اسے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی عہدیدار حکومت وقت کے خلاف ہے یا اس کے کسی امیر کو اس عہدیدار سے شکایت ہے تو پھر وہ عہدیدار تسمہ کشی سے نہیں بچ سکتا تھا۔

اسی دوران میں کہیں سے فرخ سیر کو یہ علم ہو گیا کہ جب عبداللہ خاں محلات شاہی کا نگراں اعلیٰ تھا تو داروغہ زنداں سیدی قاسم کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس بات میں حقیقت بھی تھی۔ سیدی قاسم، عبداللہ

خاں کو کچھ نہیں گردانتا تھا کیونکہ وہ فرخ سیر کے باپ عظیم الشان کے آدمیوں میں تھا۔ فرخ سیر نے کوئی تحقیق کیے بغیر سیدی قاسم کے لیے بھی حکم جاری کر دیا۔ ''تسمے سے گلا گھونٹ کر مار دیا جائے!''

خود عبداللہ خاں کو اس واقعے کا علم بعد میں ہوا اور تو اور ایک درویش شاہ قدرت اللہ کی گردن اڑا دی گئی جسے منصب اور عہدے سے دور کا واسطہ نہیں تھا۔ شہرت یہ تھی کہ فرخ سیر کا باپ عظیم الشان بھی امور سلطنت میں اس درویش سے مشورہ لیتا تھا اور درویش ہی کے ایما پر عظیم الشان کا مقرب ملازم حکیم سلیم قتل ہوا تھا۔ میر جملہ نے درویش کو اپنی حویلی میں دعوت پر بلایا اور بڑے اعزاز سے اس کی آؤ بھگت کی۔ پھر وہ دعوت کھا کر میر جملہ کی حویلی سے نکلا ہی تھا کہ میر جملہ کے محافظوں میں سے ایک نے اس کی گردن اڑا دی۔

لاچین بیگ ''تسمہ کش'' مشہور ہو گیا۔ عالمگیر اور شاہ عالم شاہی امیروں کے دل میں تسمہ کشی کا ایسا ہول بیٹھ گیا تھا کہ جب وہ مجرا تسلیمات پر جانے کے لیے گھر سے نکلتے تھے تو اہل و عیال سے وداع ہو لیتے تھے۔ تسمہ کشی کی اس سزا کا ایسا رواج ہوا کہ بازاری غنڈوں اور لفنگوں نے اسے اپنے رزق کا وسیلہ بنا لیا۔

اسی عرصے میں میر جملہ نے فرخ سیر کو ایک اور ظالمانہ مشورہ دیا۔ دلیل یہ تھی کہ یوں کوئی تخت کا دعویدار نہیں رہے گا۔ مغلوں کے دور عروج میں یہ قانون طے پا گیا تھا کہ ایسا کوئی فرد جو اندھا ہو، چاہے اس کا تعلق شاہی خاندان ہی سے کیوں نہ ہو حکمران نہیں بن سکتا۔

جہاں دار شاہ کا بیٹا اعزالدین میدان جنگ سے فرار ہو کر اکبر آباد (آگرہ) میں روپوش ہو گیا تھا۔ اسے وہاں سے گرفتار کر کے لایا گیا اور پھر میر جملہ کے مشورے پر عمل شروع ہو گیا۔ اعزالدین کو فرخ سیر نے اندھا کرا دیا۔ دوسرے جن شہزادوں کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی، ان میں خود فرخ سیر کا چھوٹا بھائی محمد ہمایوں بخت بھی تھا جس کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اعظم شاہ کے بیٹے والا تبار کا بھی یہی حشر ہوا۔ اعظم شاہ بھی فرخ سیر کا چچا تھا اور جہاں دار شاہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

درباری سیاست کا رنگ یہ تھا کہ بادشاہ وقت، میر جملہ کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا۔ فرخ سیر نے میر جملہ کو اپنی طرف سے دستخط کرنے کی اجازت تو پہلے ہی دے رکھی تھی، اب یہ بھی حکم جاری کر دیا کہ میر جملہ کی زبان کو ہماری زبان سمجھا جائے۔

سادات بارہہ ہی دراصل فرخ سیر کو تخت حکومت پر لے کر آئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے جس سازش کا جال اورنگ زیب عالمگیر کے آخری دور میں بنا تھا، اب اس سازش کی تکمیل کا وقت آیا تھا تو میر جملہ درمیان سے فرخ سیر کو اچک لے گیا تھا۔ عبداللہ خاں اور حسین علی خاں بہت پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ شاہ پرست عوام انہیں بادشاہ کی حیثیت سے کبھی قبول نہیں کریں گے اس لیے اقتدار پر قبضے کی یہی صورت ہے کہ بادشاہ وقت کو یرغمال بنا کر رکھا جائے اور سارے اختیارات ان کے ہاتھوں میں ہوں۔ اختیارات کی حد تک انہیں کامیابی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اہم عہدوں پر فائز ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے، مگر میر جملہ نے کھیل بگاڑ دیا تھا۔ طاقت ان دونوں کے ہاتھوں میں تھی، اختیارات ان کے پاس تھا، مگر فرخ سیر کے توسط سے ایک شہر کا معمولی سا قاضی میر جملہ حکومت کا کرتا دھرتا بنا ہوا تھا۔

میر جملہ کو سادات بارہہ سے بڑا حسد اور بغض تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان کی فرماں روائی کی زمام سادات بارہہ کے ہاتھ میں چلی جائے۔ دونوں بھائیوں کے معاملات میں مداخلت کر کے وہ انہیں مشتعل کرتا رہتا تھا۔ اختیارات کی اس دوعملی سے بڑی بدنظمی پیدا ہو گئی تھی۔ وزارت کی دستور کے خلاف ان کارروائیوں سے سادات کا اثر و رسوخ بھی متاثر ہو رہا تھا۔ دونوں بھائی اسی لیے فرخ سیر سے سخت ناراض تھے۔ اس کا علم خود فرخ سیر کو بھی تھا۔

سادات کی اس ناراضی اور گلے شکوے کو فرخ سیر کے سامنے رکھ کر میر جملہ اپنی خیر خواہی جتلاتا رہتا تھا۔ اس نے فرخ سیر کو یقین دلا دیا تھا کہ یہ ذمے دارانہ خدمات اور ملک بھر کے اختیارات، سادات بارہہ کے حوصلے اور ظرف سے زیادہ ہیں، ان کی حرکت سے نمک حرامی کے آثار ظاہر ہیں۔ ان باتوں سے فرخ سیر کے دل میں دونوں بھائیوں کی طرف سے وسوسے اور اندیشے پیدا ہو گئے۔ وہ عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کو کسی بھی حیلے بہانے سے گرفتار کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا کیونکہ اسے معلوم تھا، سادات پر ہاتھ ڈالنا براہ راست ممکن نہیں ہے۔ بار بار اس نے اس سلسلے میں میر جملہ سے مشورے کیے۔

آخر کار یہ طے پایا کہ دونوں بھائیوں کو نہایت خاموشی کے ساتھ گرفتار کیا جائے۔ گرفتاری کا پورا منصوبہ میر جملہ کے ذہن کی پیداوار تھا۔ فرخ سیر نے اسی منصوبے کو عملی شکل دینا چاہی۔ وہ سیر و شکار کے بہانے محسن خاں کے باغ میں چلا گیا اور وہاں دونوں بھائیوں کے خلاف طے شدہ منصوبے پر عمل کرنا چاہا، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ فرخ سیر کی ماں نے اس منصوبے کی اطلاع عبداللہ خاں کو دے دی کیونکہ وہ اس عہد کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھتی تھی جو دونوں بھائیوں سے اس نے کیا تھا۔

اسی دوران میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر راجپوتوں نے ایک بار پھر سرکشی شروع کر دی۔ انہوں نے مغل تاجدار کی اطاعت سے انکار کر دیا۔ فرخ سیر کو پھر سادات بارہہ یاد آئے۔ راجپوتوں کو بارہہ ہی اطاعت پر مجبور کر سکتے تھے۔ راجپوتانہ میں باغیوں کا سرغنہ وہی راجا اجیت سنگھ تھا جو راج کماری کا سابق شوہر تھا۔ سیاسی طور پر یہ واقعہ کئی اعتبار سے اہم نوعیت کا حامل تھا۔ فرخ سیر، امیر الامرا حسین علی خاں کے پاس کئی بار پیغام بھیج چکا تھا مگر حسین علی خاں دربار میں حاضر نہیں ہوا۔ یہ معاملہ بہر حال میر جملہ کے بس کا نہیں تھا۔ اب فرخ سیر کو سادات کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ ابتدائی زمانے ہی میں راجپوتوں کی بغاوت مغل حکومت کے استحکام کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔ اس کا احساس فرخ سیر کو بھی تھا اور اس کی ماں کو بھی!

اپنی جان کو خطرے میں دیکھ کر دونوں بھائیوں نے حفاظت کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ جمنا کے کنارے عبداللہ خاں کی حویلی کسی قلعے سے کم نہیں تھی۔ اس کی مرضی کے خلاف وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ یہی حال حسین علی خاں کی حویلی کا تھا۔ دونوں بھائیوں کے درمیان موجودہ حالت پر تفصیلی گفتگو بھی ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنی گفتگو اور ملاقات کے بعد دربار کی حاضری موقوف کر دی تھی۔

عبداللہ خاں کی محبوبہ اور شریک حیات راج کماری وہ تیسری ہستی تھی جس کی حالات پر گہری نظر تھی۔ بغاوت کرنے والا کیونکہ اسی کا سابق شوہر تھا اس لیے عبداللہ خاں کو یہ خیال تھا کہ راج کماری کا رویہ راجا اجیت سنگھ کے لیے منتقمانہ ہی ہونا چاہیے۔ راجا نے راج کماری کو بھلا کر نئی شادی کر لی تھی۔

راجپوتانہ میں دوسری بڑی طاقت راج کماری کے باپ راجا جے سنگھ کی تھی۔ راج کماری بہرحال اس کی بیٹی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اکبر اعظم کے عہد سے راجپوتوں اور مسلمانوں کے درمیان رشتے داریاں ہوتی آئی تھیں۔ فرخ سیر کے عہد حکومت تک بھی اسے بہت زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا کہ ہندو راجپوت گھرانے کی کوئی بیٹی کسی مسلمان کے گھر میں ہو۔ ہاں یہ فرق ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ اب راجپوت گھرانے کی لڑکی کو مسلمان بنا لیا جاتا تھا اور راج کماری بھی مسلمان ہو گئی تھی۔

انہی دنوں ایک روز راجکماری نے عبداللہ خاں سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ اب دونوں میاں بیوی کے درمیان کسی بھی معاملے میں کوئی پردہ نہیں رہا تھا۔

''راجپوتوں سے صلح ہمارے لیے ہر طرح سودمند ثابت ہوگی۔'' راج کماری نے کہا۔

یہ شام کا وقت تھا اور عبداللہ خاں ساغر و مینا سے جی بہلا رہا تھا۔ خلوت کدے میں اس وقت راج کماری کے سوا کوئی نہیں تھا اور نہ کسی کو آنے کی اجازت تھی۔ راج کماری ساقی بنی ہوئی تھی۔ اس کی خلاف توقع بات سن کر عبداللہ خاں چونک اٹھا اور کہنی کے بل گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ ساغر اس نے قریبی تپائی پر رکھ دیا تھا۔

''یہ کیا کہا تم نے؟'' عبداللہ خاں حیرت سے بولا ''راجپوتوں کی بغاوت تو ہمارے حق میں جاتی ہے۔ فرخ سیر کو جھکانے کا یہی تو وقت ہے!''

''میں آئندہ کی بات کر رہی تھی۔'' راج کماری نے پہلو بدل کر کہا ''فرخ سیر تو بہرحال جھکنے پر مجبور ہو ہی جائے گا، یہ کوئی مسئلہ نہیں کیونکہ اگر اس نے راجپوتوں کو کھلی چھٹی دے دی تو پھر سارے ہندوستان میں بغاوت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا کیونکہ ایک مثال دوسروں کے لیے قائم ہو جائے گی۔ مغلوں کا جو رعب و دبدبہ اب تک قائم ہے ختم ہو جائے گا۔ یہ بات فرخ سیر کے قریبی امرا بھی جانتے ہیں اور خود فرخ سیر بھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بار بار تمہیں اور حسین علی خاں کو دربار میں حاضر ہونے کے لیے پیغامات نہ بھیجتا۔ کل حسین علی خاں کو اس نے ایک فرمان بھی بھیجا ہے اور جیسا کہ تمہارے علم میں بھی ہے، یہ فرمان بادشاہ کی حیثیت سے اس نے سپہ سالار فوج کے نام بھیجا ہے۔ راجپوتوں کو اطاعت پر مجبور کرنا ایک الگ معاملہ ہے اور ان سے صلح کرنا دوسری بات ہے۔ دراصل راجپوتوں نے صلح کا مطلب انہیں ممنون احسان بنانا ہوگا۔ ہم صرف اپنا مقصد نظر میں رکھ کر بات کر رہے ہیں۔ مغل اقتدار سے ہمیں صرف اتنی دلچسپی ہے کہ ہم اس پر قبضہ کر سکیں۔ راجپوتوں کو سادات بارہہ کے دباؤ میں رہنا چاہیے۔''

راجکماری خاموش ہوئی تو عبداللہ خاں آہستہ سے ہنستا، پھر ساغر سے ایک گھونٹ لے کر بولا ''تم بھی کمال شے ہو! مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تمہارے اندر سادات بارہہ کی روح حلول کر گئی ہے۔ ایک طرف تو تم راجپوتوں پر اپنی برتری ثابت کر کے انہیں دوست بنانا چاہتی ہو، دوسری طرف مغلیہ حکومت کو یرغمال بنانے کی باتیں بھی کرتی رہتی ہو۔ بیک وقت دو دشمن ہمارے سامنے ہیں، راجپوت اور مغل حکومت ! ان دونوں ......''

''ایک ہی تیر سے شکار کیا جا سکتا ہے۔'' راج کماری نے عبداللہ خاں کی بات کاٹ کر کہا۔

''جان من! ہر چند کہ تمہاری سیاسی سوجھ بوجھ کا قائل ہوں مگر موجودہ حالات میں یہ کس طرح

ممکن ہے؟'' عبداللہ خاں نے سوال کیا۔

راجکماری نے عبداللہ خاں کو جو جواب دیا، اس کا انحصار مستقبل پر تھا۔ راج کماری نے یہ مشورہ دیا تھا کہ حسین علی خاں کو راجپوتوں کی سرکوبی کے لیے راجپوتانہ ضرور جانا چاہیے، دوم یہ کہ راجا اجیت سنگھ کو ہر حال میں گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کر دینا چاہیے! اس کی صورت راج کماری نے یہ بتائی کہ راجپوتوں کی طاقت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کا باپ راجا جے سنگھ، اپنے سابقہ داماد کا ساتھ نہ دے۔ طے یہ پایا کہ خود راج کماری، سادات بارہہ کی فوج کے ساتھ راجپوتانہ جائے گی۔ وہ اپنے باپ راجا جے سنگھ سے مل کر اسے باغیوں کا ساتھ دینے سے روک دے گی۔

پھر اسی شام حسین علی خاں کو بھی عبداللہ خاں نے اپنی حویلی بلوا لیا۔ راج کماری اب سادات کے گھرانے کی بہو تھی۔ حسین علی خاں اسے بھابی کہتا تھا، اس کے علاوہ راج کماری کی سیاسی بصیرت اور شجاعت کا بھی قائل تھا۔

یہ سہ رکنی خفیہ اجلاس رات گئے تک چلتا رہا۔ حسین علی خاں اس وقت چونکا جب راج کماری نے راجپوتوں سے صلح کی شرائط میں ایک عجیب شرط رکھی۔

''بھابی جان! میرا خیال ہے کہ راجا اجیت سنگھ اس ذلت آمیز شرط کو قبول نہیں کرے گا۔'' حسین علی خاں نے اپنی رائے پیش کی۔

''برا نہ ماننا برادر عزیز! میں راجپوتوں کو اور خاص طور پر راجا اجیت سنگھ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ اس ذلت آمیز شرط کو بھی قبول کریگا۔ میں تو تمہارے ساتھ راجپوتانہ چل ہی رہی ہوں۔ وہاں چل کر تمہیں دکھا ہی دوں گی کہ راجا اجیت سنگھ اندر سے کیا ہے!''

اس بات کا علم حسین علی خاں کو بھی تھا کہ راجکماری کا سابق شوہر راجا اجیت سنگھ ہی تھا۔ وہ اسی لیے راج کماری کے خیال کو قطعی طور پر رد نہیں کر سکتا تھا۔

''تم دونوں وہاں زیادہ دیر نہیں لگانا!'' عبداللہ خاں بولا ''یہ نہ بھولنا کہ فرخ سیر بہرحال ہمارا دشمن ہو چکا ہے۔''

پھر گردش وقت نے عجب تماشے دیکھے۔ امیر الامرا نے خلاف توقع فرخ سیر کے فرمان کی تعمیل کی۔ راج کماری مردانہ لباس میں اس کے ساتھ تھی۔ سادات کے لشکر نے راجپوتوں کو روند ڈالا۔ راجا جے سنگھ اس معاملے سے کنارہ کش ہو گیا۔ راجپوت دو حصوں میں بٹ گئے۔ انہیں حسین علی خاں سے صلح پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ آخری ذلت آمیز شرط بھی راجا اجیت سنگھ نے مان لی جو دراصل راج کماری نے شرائط نامے میں شامل کرائی تھی۔ اس آخری شرط کے مطابق راجا اجیت سنگھ اپنی بیٹی کو فرخ سیر کے عقد میں دینے پر آمادہ ہو گیا۔

اس عرصے میں میر جملہ کی شہ پر فرخ سیر نے عبداللہ خاں کو دہلی میں تنہا پا کر کئی بار یہ کوشش کی کہ شاہین زیر دام آ جائے، مگر وہ عبداللہ خاں تھا۔ وہ فرخ سیر کے کسی فریب میں نہیں آیا اور اپنے قاصد کو راجپوتانہ بھیج دیا۔ حسین علی خاں کے نام اس نے یہ پیغام بھیجا تھا کہ جلد از جلد دہلی واپس آ جائے، فرخ سیر بے لگام گھوڑا ہو رہا ہے، اس کے لگام ڈالنا ضروری ہے۔

جب یہ خبر دہلی پہنچی کہ راجا اجیت سنگھ نے شکست کھا کر اطاعت قبول کرلی ہے اور کن شرائط پر حسین علی خاں نے صلح کی ہے تو فرخ سیر وقتی طور پر سادات کے گن گانے لگا۔ اس کی ماں نے بھی اسے بہت سمجھایا کہ جب ہم عظیم آباد میں بے سروساماں تھے تو سادات ہی نے آڑے وقت پر ہمارا ساتھ دیا تھا۔ اس وقت ان سے جو قول و قرار ہوئے تھے، تمہیں ان سے نہیں پھرنا چاہیے۔

حسین علی خاں فتح یاب ہو کر دہلی لوٹا تو اس کے ساتھ راجا اجیت سنگھ اور اس کی نوجوان بیٹی بھی تھی۔ یہ لڑکی اس کی پہلی بیوی سے تھی۔ دونوں بھائیوں میں سے اب بھی کوئی حاضر دربار نہیں ہوا۔ راجا اجیت سنگھ نے دربار میں حاضری دی اس کی بیٹی عبداللہ خاں کی حویلی میں رہی۔ راج کماری بہرحال اس کی سوتیلی ماں رہ چکی تھی۔ راج کماری نے پس پردہ رہ کر ناممکن کو ممکن بنا دیا تھا ورنہ راجپوتوں کی طاقت دو حصوں میں تقسیم نہ ہوتی۔ اس کے باپ راجا جے سنگھ نے بات مان لی تھی اور سیاسی تدبیر کا تقاضا بھی یہی تھا۔

راجا اجیت سنگھ کی بیٹی کو مسلمان بنا لیا گیا اور وہ بادشاہ وقت فرخ سیر کے عقد میں آ گئی۔ اس کی رخصتی عبداللہ خاں کی حویلی سے ہوئی تھی۔ اب راجا، بادشاہ کا خسر بن چکا تھا، مگر اس عرصے میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مغلیہ حکومت کی اصل طاقت سادات بارہہ ہیں۔ وہ اسی لیے سادات کا مہرہ بن گیا۔ راج کماری کے ایما پر دونوں بھائیوں نے اس سے مراسم بڑھا لیے۔ راجا نے اب ذہنی طور پر اس حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا کہ راج کماری اب اس کی نہیں، عبداللہ خاں کے پہلو کی زینت ہے۔ راجا نے اب واپسی کا ارادہ کرلیا، مگر آئندہ کے لیے اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ دہلی میں رہنا اس کے لیے زیادہ سودمند ثابت ہوگا۔ روانگی سے قبل وہ دونوں بھائیوں سے مل کر گیا تھا اور دونوں ہی سے خلوت میں اس کی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ راج کماری نے دانستہ اسے نظر انداز کیا تھا۔ صرف ایک بار وہ عبداللہ خاں کی موجودگی میں اس سے ملی تھی۔

ادھر تو راجا اجیت سنگھ اجمیر روانہ ہوا ادھر فرخ سیر نے دونوں بھائیوں سے مصالحت کے لیے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بادشاہ وقت سے سادات کے اختلافات کی خبر نے ملک میں بڑا خلفشار پھیلا دیا تھا۔ غلہ وغیرہ بھی خاصا گراں ہوگیا تھا جیسا کہ غیراطمینان بخش اور سیاسی عدم استحکام کے زمانے میں ہوتا ہے۔

حکومت وقت کے لیے یہ حالات بہرحال بہتر نہیں تھے۔ فرخ سیر اسی لیے جھکنے اور دونوں بھائیوں سے مصالحت پر راضی ہوگیا تھا۔ عملاً حکومت کی طاقت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ مسلسل پانچ ماہ تک فریقین میں نامہ و پیام کا جب کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو خود فرخ سیر کی ماں، عبداللہ خاں کی حویلی میں اس سے جا کر ملی۔ حسین علی خاں کو بھی وہیں بلا لیا گیا۔ مادر شاہ سے ان مذاکرات میں یہ طے ہوا کہ دونوں بھائی اس وقت دربار میں حاضر ہوں گے اور فرخ سیر سے ملیں گے۔ جب قلعہ دہلی میں سادات اپنے آدمیوں کو مقرر کر دیں۔ نتیجے کے طور پر قلعے کا سارا بندوبست عارضی طور پر عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کے آدمیوں نے سنبھال لیا۔ چوکی پہرے پر انہی کے آدمی مقرر تھے۔ اس سے پہلے عبداللہ خاں کو اپنے مخبروں کے ذریعے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ اس مصالحت کی آڑ میں فرخ سیر، میر جملہ کے ایما پر کیا چال

چلنے والا ہے۔ اس چال کا توڑ سوچ لیا گیا تھا۔

دونوں بھائی جب فرخ سیر کے روبرو پہنچے تو مصلحت کے پیش نظر دونوں ہی نے باری باری اپنی سرکشی پر ندامت کا اظہار کیا اور معافی چاہی۔ مغلیہ اقتدار پر پورے طور سے قابض ہونے کے لیے انہیں بہرحال فرخ سیر کو رام کرنا ہی تھا اور اسی کی ساتھ اس کے ہر فریب کو رد کرنے کی کوشش بھی کرنا تھی۔

عبداللہ خاں متاثر کن لہجے میں بولا ''اے ظل الٰہی! ناحق آپ ہم قدیم خدمت گاروں سے بدگمان ہوئے۔ بادشاہ وقت سے ہمیں گلہ ہے کہ اس نے اپنے قول و قرار کا ذرا پاس نہیں کیا۔ اگر حضور ہمیں غدار تصور کرتے ہیں اور اس پر یقین بھی رکھتے ہیں تو پھر...'' جملہ ادھورا چھوڑ کر عبداللہ خاں نے اپنی کمر سے تلوار کھولی اور اس کے اشارے پر حسین علی خاں نے ایسا ہی کیا اور پھر دونوں بھائیوں نے اپنی تلواریں بادشاہ کے قدموں میں رکھ دیں۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا ورنہ قلعے میں ہر طرف سادات ہی کے آدمی تھے۔ بادشاہ کے محافظ دستے کی جگہ بھی سادات کے آدمیوں نے لے لی تھی۔ اگر فرخ سیر ایسا بزدل یہ ہمت بھی کر لیتا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دونوں بھائیوں پر حملہ آور ہو جاتا تو بھی ان دونوں غیر مسلح بھائیوں کا کچھ نہ بگاڑ پاتا۔ محافظ فوراً درمیان میں آ جاتے۔ تلواریں جب فرخ سیر کی قدموں میں رکھ دی گئیں تو عبداللہ خاں نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''اگر حضور کے دل میں ہماری طرف سے کوئی اندیشہ اور وسوسہ ہے تو پھر..... تو پھر اسی وقت ہمارے سر اپنے دست مبارک سے قلم کر دیں یا ہمارے قتل کا حکم دے دیں یا منصبوں سے معزول کر کے کعبتہ اللہ روانہ کر دیں، مگر..... صاحب غرض چغل خور لوگوں کی باتوں میں آ کر جاں نثار بندوں کو جانی و مالی ضرر پہنچانا حق شناس بادشاہوں کا مسلک نہیں۔''

فرخ سیر نے دونوں بھائیوں پر اعتماد کا اظہار کیا حالانکہ یہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی۔ اس نے اسی لیے پہلے سے سوچی ہوئی چال چلی۔ وہ بولا۔ ''دکن سے ہم قلیچ خاں (نظام الملک) کو یہاں اپنے پاس بلانا چاہتے ہیں، اسی کے ساتھ ہماری خواہش ہے کہ دکن کے مرہٹوں کی گوشمالی کے لیے ہم حسین علی خاں کو وہاں کا صوبیدار بنا کر بھیج دیں۔ حسین علی خاں بدستور امیر الامرا بھی رہیں گے اور دکن کے صوبیدار بھی! عظیم آباد (پٹنہ) کی صوبیداری کیونکہ حسین علی خاں ہی کے نام چلی آ رہی ہے، وہاں ہم اپنے کسی اور امیر کو صوبیدار بنا کر بھیج دیں گے۔''

''ہمیں منظور ہے حضور والا۔'' عبداللہ خاں سعادت مندی سے بولا ''یقیناً دکن کے حالات کا تقاضا یہی ہے کہ وہاں حسین علی خان کو بھیجا جائے، مگر اس خادم کی ایک درخواست بھی قبول کی جائے تبھی حسین علی خان، دکن کی صوبیداری قبول کرے گا۔''

فرخ سیر کے چہرے پر عبداللہ خاں کے ابتدائی الفاظ سے جو رونق آ گئی تھی، وہ ختم ہوگئی۔ میر جملہ اور فرخ سیر کا منصوبہ یہ تھا کہ دونوں بھائیوں کو الگ الگ کر دیا جائے تاکہ سادات بارہہ کی طاقت مستقل طور پر دو جگہ بٹ جائے۔ ''درخواست'' کے پردے میں عبداللہ خاں جو شرط عائد کرنے والا تھا، اس سے فرخ سیر آگاہ نہ تھا۔ اس نے بظاہر نرم ہی لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ حسین علی خاں کی دکن روانگی مشروط ہے، پھر بھی ہم وہ شرط سننا چاہیں گے۔''

عبداللہ خاں نے نرم لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو نظر انداز کر دیا اور بولا ''حسین علی خاں کی

دکن روانگی سے پہلے میر جملہ کو صوبہ عظیم آباد روانہ کر دیا جائے۔ حضور خود فرما چکے ہیں کہ وہاں کسی امیر کو صوبیدار بنا کر بھیجنا پڑے گا۔"

کچھ دیر مزید بحث مباحثے کے بعد فرخ سیر کو بجبر و اکراہ یہ شرط ماننا ہی پڑی۔

عبداللہ خاں کی طرح حسین علی خاں زیادہ لاگ لپیٹ کا قائل نہیں تھا۔ عموماً وہ دوٹوک بات کرتا تھا۔ اس مصالحت کے باوجود اس نے فرخ سیر کو واضح الفاظ میں دھمکی دی اس نے کہا "میرے غیاب میں بادشاہ سلامت میر جملہ کو اپنے پاس طلب کریں گے یا میرے بھائی قطب الملک کے ساتھ غلط رویہ برتا جائے گا تو پھر سمجھ لیں کہ میں بیس دن کے اندر یہاں پہنچ جاؤں گا۔ میری دوسری شرط یہ ہے کہ جاگیرداروں کا تقرر د تنزل جزو کل ساری ملازمتیں اور قلعہ داروں کے تبادلے میرے اختیار میں ہوں گے۔"

فرخ سیر بزدل تو تھا ہی، اس دھمکی کا اس پر بڑا اثر ہوا۔ تقاضائے وقت کے تحت اس نے مصلحتاً حسین علی خاں کی دونوں شرطیں مان لیں۔ اسی کے ساتھ اس نے طوعاً و کرہاً اپنی مہر خاص حسین علی خاں کے حوالے کر دی کہ وہ قلعہ داروں وغیرہ کے نام فرامین جاری کرنے میں اس کی منظوری کا محتاج نہ رہے۔

پھر میر جملہ کو عظیم آباد (پٹنہ) روانہ کر دیا گیا۔ دکن میں سلطنت آصفیہ کا بانی آصف جاہ نظام الملک قلیچ خاں بہادر دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسی اثنا میں حسین علی خاں نے دکن کے لیے کوچ کیا۔ راستے میں اس کے مخبروں نے اطلاع دی کہ داؤد خاں جو پہلے دکن میں ذوالفقار خاں کا نائب تھا اور جسے بعد میں فرخ سیر نے احمد آباد کا صوبیدار بنا دیا تھا، اب بادشاہ وقت، یعنی فرخ سیر ہی کے حکم پر اسے خاندیس کا صوبیدار بنا دیا گیا ہے۔ وہ اب برہان پور آ گیا ہے۔ فرخ سیر نے خفیہ طور پر داؤد خاں کو پیغام بھیجا ہے کہ وہ حسین علی خاں سے ملاقات نہ کرے، نہ ہی اس کی اطاعت کرے بلکہ تابہ مقدور حسین علی خاں کے استیصال کی فکر میں رہے۔ اس کے عوض اسے پورے دکن کی صوبیداری کا امیدوار بنایا گیا تھا۔

حسین علی خاں نے سرزمین دکن کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد داؤد خاں کو پیغام بھیجا "چونکہ دکن کی کل صوبیداری ہم سے متعلق ہے اس لیے تمہیں چاہئے کہ راہ اطاعت سے قدم نہ ہٹاؤ اور ہمارے استقبال کے لیے آؤ یا پھر تم بادشاہ کے پاس چلے جاؤ اور مسلمانوں کی خوں ریزی کا سبب نہ بنو!"

داؤد خاں نے دونوں باتیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ داؤد خاں کو مرہٹہ سرداروں سے اپنے میل جول کا بھی بڑا زعم تھا۔ اس کا نتیجہ ایک خوں ریز معرکے کی صورت میں برآمد ہوا۔ داؤد خاں اس پیکار میں مارا گیا۔ حسین علی خاں نے اس کی لاش کو ہاتھی کی دم سے بندھوا کر شہر میں گشت کرایا۔

فرخ سیر تک جب اس معرکے میں داؤد خاں کے مارے جانے کی خبر ملی تو اس وقت وہ خاص طور پر امرا کی صحبت میں بیٹھا تھا۔ ان میں وزیر سلطنت عبداللہ خاں بھی تھا۔ اس اطلاع پر فرخ سیر کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے عبداللہ خاں کی طرف رخ کر کے کہا "ایسا باوقار نامور سردار مارا گیا، افسوس!"

اس موقع پر عبداللہ خاں ذرا نہیں چوکا کیونکہ اسے پہلے ہی فرخ سیر کی دہری چال کا علم ہو گیا تھا۔ وہ بولا "اگر میرا بھائی، داؤد خاں کے ہاتھوں مارا جاتا تو شاید مرضی مبارک کی خوشنودی کا باعث

ہوتا۔" یہ کہہ کر اس نے رخصت کی اجازت لی اور چلا آیا۔

فرخ سیر کی حکومت کو پانچواں سال تھا کہ میر جملہ کی نااہلی سے عظیم آباد کے حالات ابتر ہو گئے۔ میر جملہ خفیہ طور پر عظیم آباد سے نکل گیا اور مسلسل تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا دہلی جا پہنچا۔ انہیں دنوں ہر ہفتے اور ہر مہینے کوئی نہ کوئی افواہ اڑتی رہتی تھی کہ فرخ سیر، عبداللہ خاں کے خلاف سازش اور منصوبہ بندی میں مشغول ہے۔ اب جو میر جملہ خفیہ طور پر اچانک دہلی آ گیا تو یہی افواہ اڑی کہ بادشاہ نے عبداللہ خاں کو گرفتار کرنے کے لیے اسے بلایا ہے۔ میر جملہ نے حاضری دی تو فرخ سیر نے اس سے ملاقات نہیں کی۔ فرخ سیر کو حسین علی خاں کی دھمکی یاد تھی۔ رفع فساد کی خاطر اور عبداللہ خاں کے اطمینان کے لیے میر جملہ کو معتوب اور کم منصب کر کے عظیم آباد کی صوبیداری سے سرحد اور پنجاب روانہ کر دیا گیا۔ مراد آباد کی فوجداری پر نظام الملک کو مقرر کر دیا گیا۔ نظام الملک نے یہ خدمت محض فتنہ انگیزی کے سدباب کی خاطر قبول کر لی۔

ایک مرتبہ مصالحت کے باوجود فرخ سیر بار بار سادات بارہہ سے عہد شکنی کر رہا تھا۔ اسی سال نظر بندی کے دوران میں بوڑھا سابق امیر الامرا اسد خاں سخت بیمار ہو گیا۔ فرخ سیر کو معلوم تھا کہ بوڑھا ایرانی امیر پرانا گھاگ سیاست داں ہے۔ اس نے اسی لیے عیادت کے بہانے اسد خاں کو خفیہ پیغام بھیجا۔ یہ وہی اسد خاں تھا جس کے بیٹے ذوالفقار خاں کو فرخ سیر کے حکم پر بڑی بے آبروئی کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ اسد خاں کے چل چلاؤ کا وقت تھا۔ فرخ سیر نے پیغام میں مزاج پرسی کے بعد لکھا تھا "ہم نے تمہاری قدر نہیں جانی اور تمہارے خاندان کے ساتھ جو کچھ نہیں ہونا چاہئے تھا، ہوا۔ اب اس پر ندامت بے فائدہ ہے۔ ہمیں اب تمہارے مشورے کی ضرورت ہے کہ ہم سادات کے ساتھ کیا رویہ اختیار کریں؟"

اسد خاں نے جواب میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ لکھا "جس طرح وزارت ہمارے خاندان سے نکل گئی، اس طرح سلطنت تیموری خاندان سے نکل جائے گی۔ اب جب وہ اپنا اور اپنے ملک کا اختیار سادات بارہہ کے ہاتھ میں دے رہا ہے، خیر خواہانہ مشورہ یہی ہے کہ تا مقدور اس کے ساتھ حسن سلوک رکھو اور معاملے کو اس حد تک نہ بڑھاؤ کہ فساد برپا ہو جائے اور عداوت و دشمنی میں رہا سہا اختیار بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔"

چند روز بعد اسد خاں وفات پا گیا۔ فرخ سیر نے اس کی نصیحت پر کان نہیں دھرے۔ نتیجے کے طور پر درباری سازشیں جنم لینے لگیں۔ بیشتر امرا، فرخ سیر اور عبداللہ خاں دونوں ہی کو خوش رکھنے میں لگے رہتے تھے۔ عبداللہ خاں نے حسین علی خاں کی دہلی میں غیر موجودگی کے باوجود اپنی حیثیت مزید مستحکم کر لی تھی۔ الہ آباد میں جو رتن چند اس کا نائب ہوتا تھا، اسے دہلی بلا لیا گیا تھا۔ وہاں اپنی نیابت کے لیے اس نے سادات بارہہ کے ایک سردار کو متعین کر دیا تھا۔ وزارت کے محکمے میں اب وہی رتن چند، عبداللہ خاں کا نائب تھا۔ عبداللہ خاں نے اسے راجا کا خطاب دیا تھا۔ رتن چند اپنی من مانیاں کیا کرتا تھا۔ عبداللہ خاں کی شہ پر وہ بادشاہ کو بھی کچھ نہیں گردانتا تھا۔ سادات بارہہ نے اب ایک طرح سے متوازی حکومت قائم کر لی تھی اور فرخ سیر کو عملی طور پر قطعی بے بس کر دیا تھا۔ رتن چند ہی کے سلسلے میں ایک شکایت پر فرخ

سیر نے سخت اعتراض کیا اور عبداللہ خاں پر زور دیا کہ اسے برطرف کردے، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ رتن چند اپنے منصب پر بحال رہا۔ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے واقعات کے سبب فرخ سیر اور عبداللہ خاں کے درمیان نفاق کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ ادھر دکن کے معاملات میں بادشاہ کی مداخلت کو حسین علی خاں نے قطعی تسلیم نہیں کیا۔ یوں ہی ایک سال سے زیادہ بیت گیا۔

جو امرا دہرا کھیل کھیل رہے تھے، یعنی بادشاہ اور سادات، دونوں ہی کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں رہتے تھے، انہوں نے فرخ سیر کو ایک اور پٹی پڑھائی۔ طے پایا کہ جو امرا، بادشاہ کے وفادار ہیں انہیں مختلف شہروں اور صوبوں سے مع فوج دہلی میں طلب کرلیا جائے۔ یوں بارہہ کے خلاف شاہی محاذ بن گیا۔ ان امرا میں نظام الملک کو بھی مراد آباد سے بلا لیا گیا۔

دکن میں حسین علی خاں کو اس کی خبر پہلے ہی ہو گئی تھی۔ جب مختلف صوبوں سے فوجیں دہلی کی طرف کوچ کر رہی تھیں۔ مجہول النسب ایک گمنام شخص معین الدین، راجا ساہو کی قید میں تھا۔ حسین علی خاں نے اس کے متعلق یہ مشہور کرا دیا کہ بادشاہ کا بڑا بھائی وہی ہے۔ پھر اس نے ایک جمعیت بھیج کر بڑی شان و شوکت سے معین الدین کو اپنے پاس بلوایا، مگر یہ احتیاط رکھی کہ کوئی اس کی شکل نہ دیکھنے پائے۔ وہ افواہ جو حسین علی خاں کے ذہن کی پیداوار تھی، اسی کے متعلق اس نے فرخ سیر کو لکھا اور جواب طلب کیا۔ فرخ سیر کو یہ ایک طرح سے انتباہ تھا کہ اگر وہاں میرے بھائی کے خلاف کچھ ہو گا تو میں دکن میں ایک وارث تخت کو تخت نشیں کردوں گا۔

ادھر دہلی میں جن امرا کو طب کرلیا گیا تھا، ان میں راجا اجیت سنگھ بھی تھا۔ فرخ سیر نے اسے احمد آباد کا صوبیدار بنا دیا تھا۔ اب جو وہ دہلی آیا تو اسے مہاراجا کے خطاب سے نوازا گیا۔ اجیت سنگھ پہلے ہی سے عبداللہ خاں کا حامی اور ہمراز بنا ہوا تھا۔ وہ مرتے دم تک عبداللہ خاں کی رفاقت کا عہد کر چکا تھا۔ کسی معرکہ آرائی سے قبل اجیت سنگھ نے موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے خلوص میں فرخ سیر کو عبداللہ خاں سے مصالحت پر آمادہ کرلیا۔ وجہ یہ تھی کہ بادشاہ کی حمایت میں تقریباً اسی ہزار فوج دہلی میں جمع ہو چکی تھی۔ عبداللہ خاں کے زیرنگیں اس سے چوتھائی فوج بھی نہیں تھی۔ دوم عبداللہ خاں، مغل فرماں روا سے نبرد آزما ہو کر شاہ پرست فوج اور عوام کو بھی برگشتہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میدان جنگ کی بجائے وہ یہ معاملہ دوسری طرح طے کرنا چاہتا تھا۔ اس ضمن میں راج کماری اور اس کے درمیان روزانہ بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا۔ اسی بحث و مباحثے کے سبب اب وہ ایک نتیجے تک پہنچتا جا رہا تھا۔

مہاراجہ اجیت سنگھ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ فرخ سیر مصالحت کی خاطر اپنے خیر اندیش امرا کے ساتھ عبداللہ خاں کی حویلی پہنچا۔ نتیجتاً باہم موافقت و تعاون کا عہد و پیماں ہو گیا، مگر عبداللہ خاں اچھی طرح جانتا تھا کہ فرخ سیر پہلے کی طرح عہد و پیماں پر قائم نہیں رہے گا۔ اس عارضی مصالحت سے فائدہ اٹھا کر عبداللہ خاں نے راج کماری کے مشورے پر حسین علی خاں کو تاکیداً دہلی طلب کرلیا۔ ایک بار تو خطرہ ٹل گیا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ ہر مرتبہ ایسا ہی ہوتا۔ فرخ سیر نے دونوں بھائیوں کے معتمد آدمی اخلاص خاں کو فوری طور پر دکن روانہ کر دیا تھا تا کہ وہ حسین علی خاں کو صورت حال سے باخبر کر کے مطمئن کر دے۔

فرخ سیر کا فرستادہ اخلاص خاں اور عبداللہ خاں کا قاصد خاص، دونوں آگے پیچھے دکن پہنچے۔ حسین علی خاں نے دہلی کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ ان دنوں اورنگ آباد کے گھر گھر میں یہ چرچا تھا کہ عبداللہ خاں خطرے میں گھر گیا ہے۔

دکن سے حسین علی خاں کے کوچ کی خبر نے ایک بار پھر دہلی میں ہلچل مچا دی۔ عارضی مصالحت ٹوٹ گئی۔

مصالحت کے بعد دہلی میں جمع ہونے والی فوجیں واپس جا چکی تھیں۔ اختلافات پھر بڑھ گئے۔ ان اختلافات کو رفع کرنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ فرخ سیر کا حال یہ تھا کہ وہ کسی ایک بات پر قائم نہیں رہتا تھا۔ کبھی تو وہ سادات سے صلح کی بات کرتا اور کبھی ان کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کردینے کا عزم کرتا۔ خیر اندیش امرا کی ایک جماعت جب بھی فرخ سیر کو مصالحت کا مشورہ دیتی تھی تو وہ سنی ان سنی کر کے ٹال دیتا تھا۔

اسی اثنا میں حسین علی خاں اپنے ساتھ کثیر لشکر لے کر دہلی پہنچ گیا۔ دہلی کے نواح میں فیروز شاہ کی لاٹ کی طرف لشکر نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی حسین علی خاں نے اعلان بغاوت کے لیے نقارہ بجوانے کا حکم دے دیا حالانکہ سلاطین کے پایہ تخت پر پہنچنے کے بعد نقارہ بجوانے کا طریقہ نہیں تھا۔ حسین علی خاں نے علی الاعلان کہا کہ میں خود کو اب بادشاہ کا نوکر نہیں سمجھتا اس لیے آقا کے آداب کی رعایت میرے لیے ضروری نہیں۔ منصب سے معزولی اور عتاب شاہی کا بھی مجھے کوئی اندیشہ نہیں۔ شادیانوں اور نقاروں کی آوازوں سے سارا شہر گونج گیا۔ ہر کوچہ و بازار میں امیر الامرا کی بغاوت اور مخالفت کے چرچے ہونے لگے مگر فرخ سیر نے اس اعلان بغاوت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ کبھی تو وہ دونوں بھائیوں پر بھڑک اٹھتا تھا اور کبھی دونوں سے صلح کی باتیں کرنے لگتا تھا اور در پردہ نفاق کے دام بچھاتا رہتا تھا۔ اسے بس جوڑ توڑ سے کام نکالنے کی فکر رہی۔ عرب و عجم کے امیر خود میں مقابلے کی طاقت نہیں پاتے تھے۔ خاندانی مغل امیر جو بادشاہ کے خلاف سازش سے بڑی حد تک واقف ہو چکے تھے، وہ بھی بے دست و پا تھے۔ کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ زبان پر یہ بات لائے۔ دونوں بھائیوں کی سرکشی اور غلبہ پر بادشاہ کی چشم پوشی و کم ہمتی کو دیکھ دیکھ کر وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ جاتے تھے۔ فرخ سیر کے اشارے پر جب بھی وہ حسین علی خاں سے ملنے جاتے تھے تو وہاں مدعیان حکومت کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر بہت دل گرفتہ لوٹتے تھے۔

حسین علی خاں نے دہلی پہنچتے ہی جو اعلان بغاوت کیا تھا، اس میں عبداللہ خاں کی رضا بھی شامل تھی۔ دہلی سے ایک منزل پہلے عبداللہ خاں کا قاصد اس سے ملا تھا۔ دہلی پہنچے ہوئے حسین علی خاں کو چوتھا روز تھا کہ دونوں بھائیوں کے درمیان خفیہ ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات رات کے وقت دریائے جمنا میں تیرتی ہوئی ایک کشتی کے اندر ہوئی تھی۔ کشتی کھینے والا مہاراجا اجیت سنگھ تھا جو معمولی مچھیروں کے لباس میں تھا۔ کشتی میں راج کماری بھی تھی۔ وہ مردانہ لباس میں بظاہر ان دونوں "شکاریوں" کی خدمت گار بنی ہوئی تھی۔ دونوں بھائیوں کے جسم پر بھی معمولی شکاریوں ہی کا لباس تھا۔

کشتی جب خاصی دور نکل آئی تو ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ ہوا۔ کشتی کے اندر جو مذاکرات ہو

رہے تھے، ان میں اجیت سنگھ شامل نہیں تھا۔ اسی رات کے بعد پانچویں روز عبداللہ خاں نے فرخ سیر سے بظاہر مصالحت کی گفتگو کی اور شرائط بیان کیں۔ ''اگر حضور والا راجا جے سنگھ کو راجپوتوں کی فوج کے ساتھ ان کے وطن رخصت کردیں، توپ خانے کی خدمت، دیوان خاص کی داروغگی ہمارے آدمیوں کو تفویض کردیں، قلعے میں ہمارا بندوبست اور انتظام قائم ہو جائے تو حسین علی خاں کسی اندیشے کے بغیر حاضر بارگاہ ہو جائے گا اور ہم دونوں بھائی مطمئن ہو جائیں گے۔ پھر ہم قلعے میں بے خوف آمدورفت رکھ سکیں گے۔''

راجا جے سنگھ اور اس کی فوج کو مصلحتاً عبداللہ خاں دہلی سے نکلوانا چاہتا تھا تاکہ راجپوتوں سے ٹکراؤ نہ ہو۔ راجا جے سنگھ نے اس عرصے میں اپنی بیٹی راج کماری کی یہ بات تو مان لی تھی کہ وہ اس جھگڑے میں بادشاہ کا ساتھ نہیں دے گا، مگر اس نے سادات کے ساتھ مل کر بغاوت پر آمادگی سے انکار کر دیا تھا۔ فرخ سیر نے بطور احتیاط راجا جے سنگھ کو دہلی میں روک رکھا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر دہلی سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ عبداللہ خاں نے اس کا حل نکال لیا تھا کہ راجا جے سنگھ پر اس سلسلے میں کوئی الزام نہ آنے پائے اور راجپوتوں سے بھی بلا سبب ٹکراؤ نہ ہو۔ اس نے اسی لیے پہلی شرط یہی رکھی تھی۔

کم عقل فرخ سیر نے تمام شرائط قبول کر لیں۔ راجا جے سنگھ کو دہلی سے نکلنے کی لیے اس نے ایک دن کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ قلعہ دہلی پر سادات کا قبضہ ہو گیا۔ حسین علی خاں دکھاوے کے لیے فرخ سیر کے حضور میں پیش ہوا، مگر ادب آداب بھی جیسا کہ چاہیے تھا، بجا نہیں لایا اور واپس ہو گیا۔

اب فرخ سیر پوری طرح دونوں بھائیوں کے نرغے میں آ چکا تھا۔ دو تین روز خیریت سے گزرے تھے کہ عبداللہ خاں اور اجیت سنگھ اپنے معتمد آدمیوں اور منتخب فوج کے ساتھ قلعے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے دیوان خاص، خواب گاہ اور عدالت کے دروازوں کی چابیاں بھی اپنے پاس طلب کر لیں۔ جب سارے انتظامات ہو گئے تو انہوں نے حسین علی خاں کو بلانے کے لیے پیغام بھیج دیا، ساتھ ہی یہ کہلوایا کہ شہر میں داخل ہو کر ہمارے دوسرے پیغام کا انتظار کرو! حسین علی خاں کو علم تھا کہ اسے شہر میں کہاں ٹھہرنا ہے سب کچھ پہلے سے طے ہو چکا تھا۔ یہ سب احتیاطی تدابیر اس لیے تھیں کہ خانہ جنگی نہ ہو جائے۔

حسین علی خاں شاہانہ دبدبے اور شان سے شہر میں داخل ہوا۔ اس کی فوجیں صبح ہی سے آ رہی تھیں اور قلعے کی اطراف حلقہ بندی کر رہی تھیں۔ معین الدین جسے وہ خانوادہ شاہی کا فرد کہہ کر دکن سے ساتھ لایا تھا، اسے ہاتھی پر سوار کرا دیا اور یہ شہرت دی کہ اسے بادشاہ کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔ شہر میں داخل ہو کر اس نے اپنی حویلی میں قیام کیا۔ یہ علاقہ شائستہ خاں کی بارہ دری کے نام سے مشہور تھا۔

عبداللہ خاں کو اپنے بھائی کے شہر میں داخلے کی خبر مل گئی تو اجیت سنگھ کے ساتھ فرخ سیر سے ملا۔ جس کے ہوش و حواس پراگندہ تھے۔ اس نے فرخ سیر کو مخاطب کیا تو آج اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ''مجھے شاہی خدمات کی نیابت قبول نہیں۔ تمہارے باپ دادا کے لیے ہم نے جان فشانیاں کیں، خود تمہارے لیے جاں نثاری میں کوئی کسر نہیں رکھی، مگر ان خدمات کے عوض ہم نے حق ناشناس بادشاہ سے بہ جز بدگمانی اور فکر فساد کے کچھ نہ پایا۔ اس کا ثبوت وہ فرامین ہیں جن میں ہمارے عمل دخل کو ختم کرنے اور مجھ بے قصور کو قتل کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا۔ یہ فرامین ہمارے پاس موجود ہیں۔ دکن میں داؤد خاں بے دین کو جو

پیام بھیجا گیا، وہ بھی ہم نے حاصل کر لیا ہے۔ خانوادہ تیمور میں ایسی بدعہدی کسی بادشاہ نے کسی شخص کے ساتھ نہیں کی جو ہمارے ساتھ کی گئی۔ ہمارے اندیشے اب اسی صورت میں دور ہو سکتے ہیں کہ دربار کی خدمت نیابت کی قید کے بغیر براہ راست ہمیں دے دیئے جائیں۔'' ان کے علاوہ عبداللہ خاں نے اور بھی شرائط کا ذکر کیا۔

فرخ سیر ان وعدوں کے سلسلے میں عذر معذرت کرتا رہا۔ آخر کار طرفین سے گفتگو بدمزگی اور درشت کلامی تک جا پہنچی۔ عبداللہ خاں پر فرخ سیر ایک بار برس پڑا۔ نہ معلوم اس میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی۔ ''گستاخ عبداللہ خاں! یہ نہ بھول کہ تو کس سے ہمکلام ہے! ہم فرمان روائے ہندوستان ہیں اور تیری گردن میں تسمہ بھی کھنچوا سکتے ہیں۔'' یہ الفاظ اس نے تقریباً چیخ کر کہے تھے۔ یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر محل میں چلا گیا۔

اس قیل و قال میں رات ہو گئی۔ قلعے میں لوگوں کی آمدورفت بند کر دی گئی۔ اس رات شہر میں بڑا خوف و ہراس رہا۔ دونوں بھائیوں کی فوج ہر کوچہ و بازار میں مستور کھڑی ہوئی تھی۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ قلعے میں کیا کچھ ہو گیا! عبداللہ خاں اور اجیت سنگھ اپنے سرداروں کے ہمراہ مشورے کرتے رہے اور اس اندیشے سے کہ نہ معلوم راتوں رات کیا ہو جائے احتیاطی تدبیروں اور انتظامات کی نگرانی میں مصروف رہے۔

دوسرے دن صبح فرخ سیر کے خسر سادات خاں اور کئی امرا اپنی افواج لے کر نکلے جس کی تعداد خاصی کم تھی۔ ان میں نظام الملک بھی شامل تھا۔ اس فوج سے سادات کے لشکر کے، قلعے کے قریب معمولی سی جھڑپ ہوئی۔ اس عرصے میں اعتماد الدولہ، حسین علی خاں سے جا ملا۔ نظام الملک نے جب یہ دیکھا کہ حالات قابو سے باہر ہو چکے ہیں تو اس نے پیش قدمی کو خلاف مصلحت جانا اور اپنے گھر جا کر بیٹھ گیا۔

حسین علی خاں کے ساتھ مردانہ لباس میں راج کماری بھی تھی۔ اس نے حسین علی خاں کو مخصوص اشارہ کیا۔ حسین علی خاں نے اقرار میں گردن ہلائی اور پھر عبداللہ خاں کو پیغام بھجوایا۔ قلعے کے باہر ہنگامہ برپا ہے اور ممکن ہے، مزید کوئی خون خرابے کی نوبت آ جائے اس لیے آپ قصے کو یکسر نمٹا دیں۔''

اسی کے ساتھ اس نے بادشاہی امیروں کے مقابلے پر فوجی دستے بھیج دیئے۔ وہ آہستہ آہستہ قلعے کی طرف ایک بار پھر بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

عبداللہ خاں کو بھائی کا پیغام ملا تو اس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق فوراً عمل کیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ہندوستان کے نئے مغل فرماں روا شمس الدین ابوالبرکات کے تخت نشین ہونے کا شادیانہ بجنے لگا، مگر ابھی یہ محض فریب تھا تاکہ قلعے کے باہر جو ہنگامہ اور شورش برپا ہے، وہ ختم ہو جائے۔ اسی دوران میں سادات کے لشکر نے بڑی حد تک بادشاہی امیروں کو زیر کر لیا تھا۔ جب انہوں نے نئے فرماں روا کی تخت نشینی کا مخصوص شادیانہ سنا اور یہ افواہ ان کے کان میں پہنچی کہ نیا مغلیہ تاجدار قلعے میں تخت نشین ہو چکا ہے تو ہمت ہار دی۔ کچھ مارے گئے، کچھ نے راہ فرار اختیار کر لی۔

قلعے کے اندر عبداللہ خاں نے فرخ سیر کو کئی پیغام بھیجے اور سبز باغ دکھائے کہ کسی طرح وہ قل سے باہر جائے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ محل پر حبشی اور ترک کنیزوں کی فوج جنگ کے لیے مستعد ہو گئی۔ آ کار عبداللہ خاں کا چھوٹا بھائی نجم الدین اور صلابت خاں چند دوسرے سرداروں اور محافظوں کو لے کر میں گھس گئے۔ فرخ سیر انہیں بڑی تلاش کے بعد محل کی چھت پر ایک کونے میں دبکا ہوا ملا۔ محل کی بیگما اس کے گردا گرد تھیں۔ حملہ آوروں نے بیگمات کو دھکے دے کر ہٹایا اور بادشاہ کو بڑی بے حرمتی کے سا کھینچتے ہوئے لے آئے۔ بادشاہ کی والدہ، بیوی اور دوسری بیگمات جو اسے گھیرے کھڑی تھیں محافظو کے پیروں پر گر گئیں اور منت سماجت کرنے لگیں۔ اس وقت سارا محل چیخ پکار، آہ وزاری اور فریادوں سے گونج رہا تھا۔ حملہ آوروں نے زیورات اور مال واسباب بھی خوب لوٹا اور عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنے سے بھی نہیں چوکے۔

فرخ سیر کو عورتوں کے ہجوم میں سے گھسیٹتے ہوئے محل سے باہر لایا گیا اور اندھا کر دیا گیا۔ قلعے میں ترپولیہ پر جو زمین دوز قید خانہ تھا اور جہاں، جہاں دار شاہ کو قید کیا گیا تھا، وہیں فرخ سیر کو قید کرا دیا گیا۔ فرخ سیر چھ سال چار ماہ حکمران رہا۔

جس وقت یہ ہنگامہ برپا ہوا ابوالبرکات قید میں تھا۔ اسے تپ دق (ٹی بی) تھی۔ جب عبداللہ خاں کا پیغام مل گیا اور حسین علی خاں بھی قلعے میں آ گیا تو دونوں سادات بھائیوں نے بیس سالہ ابوالبرکات کو قید سے نکالا۔ یہ شہزادہ جہاں دار شاہ کے بھائی رفیع الشان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ ابوالبرکات ا جلدی کی وجہ سے غسل کرنے یا لباس تبدیل کرنے کی مہلت بھی نہیں دی گئی۔ اسی لباس میں جو وہ پہ ہوئے تھا، لے جا کر اسے تخت شاہی پر بٹھا دیا گیا۔ عبداللہ خاں نے اس کے گلے میں مروارید کا ہار ڈال دیا۔ نئے فرماں روا کی تخت نشینی کا شادیانہ اب تک بج رہا تھا۔ جب حقیقتاً اسے تخت نشین کرا دیا گیا تو ش میں ''الامان الامان'' کی منادی بھی کرا دی گئی۔ دونوں بھائیوں کے لیے یہ وہ دن تھا جس کے لیے برسوں سے خواب دیکھ رہے تھے۔ آج انہیں اپنے خواب کی تعبیر مل گئی تھی۔ اب مغلیہ اقتدار ان کے ہاتھ میں تھا۔

نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے فوراً بعد فرخ سیر کے حامیوں کی مصیبت آئی۔ ان کے گھر بار ضبط کر لیے گئے۔ فرخ سیر کی بیوی راجا اجیت سنگھ کی بیٹی تھی، اس کی جاگیر اور مراتب راجا کی خاطر داری کے لیے بحال رکھے گئے۔

بادشاہی خزانے سے دونوں بھائیوں نے جواہرات، مرصع آلات اور بہترین ہاتھی گھوڑ اپنے تصرف میں لے لیے۔ عبداللہ خاں نے شاہی بیگمات میں سے تین حسین ترین بیگمات کو پسند کر اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اس کے حرم میں اب مختلف ملکوں اور علاقوں کی خوبصورت عورتوں کی تعداد تک پہنچ گئی۔ راجکماری کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ عجیب عورت تھی۔ وہ اکثر یہی کہتی تھی کہ عبداللہ خاں کی خوشی میری خوشی ہے۔ شاید اسی لیے اس کی حیثیت اب تک ممتاز تھی۔ حرم میں اتنی عورتوں باوجود عبداللہ خاں سے اس کا عشق بلاخیز جاری تھا۔

ابوالبرکات کو تخت نشین ہوئے اب دو ماہ ہو رہے تھے، مگر امور سلطنت میں اسے کوئی اختیار نہ

تھا۔ وہ تو ایک طلسمی تصویر کی طرح تھا جسے تخت پر رکھ دیا گیا۔ اس کی اطراف عبداللہ خاں کے آدمیوں کا نرغہ رہتا تھا۔

فرخ سیر قید میں ابھی تک زندہ تھا مگر بڑے سخت عذاب اور مصیبت میں مبتلا تھا۔ ہوس اقتدار ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی نگرانی پر جو لوگ مامور تھے، ان کے ذریعے وہ اکثر دونوں بھائیوں کے پاس عذر معذرت کے پیغامات بھیجتا رہتا تھا۔ اس کی بینائی پوری طرح ضائع نہیں ہوئی تھی۔ قید خانے کے نگراں کو بھی اس نے کئی بار یہ لالچ دیا تھا کہ اگر تم مجھے یہاں سے نکال کر راجا جے سنگھ کے پاس پہنچا دو تو میں تمہیں سات ہزاری منصب دار بنا دوں گا۔ راجا جے سنگھ کو وہ اپنے لیے وسیلہ کامرانی سمجھتا تھا۔ اس کی نگرانی پر مامور افراد دم دلاسا دے کر اس کے خیالات معلوم کرتے رہتے تھے اور ان سے سادات کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ آخر کار دونوں بھائیوں نے اس کا قصہ پاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوبار اسے زہر دیا گیا مگر کارگر نہیں ہوا۔ تیسری بار زہر دینے کا اثر تو ہوا مگر وہ اتنا سخت جان تھا کہ کسی صورت روح نکلتی ہی نہیں تھی۔ اب وہ دونوں بھائیوں کو بددعائیں دینے لگا تھا اور محافظوں کے سامنے انہیں مغلظات سنانے سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ جب حسین علی خاں کو یہ اطلاع ہوئی کہ فرخ سیر انہیں گالیاں بکتا ہے تو اس نے قطعی حکم دے دیا کہ اسے تسمے سے گلا گھونٹ کر ختم کر دیں۔ جب حکم کی تعمیل ہو رہی تھی تو فرخ سیر نے دونوں ہاتھوں سے تسمہ پکڑ لیا اور لاحاصل ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ جلادوں نے لاٹھیاں مار مار کر اس کے ہاتھوں کو شل کر دیا اور پھر تسمہ کھینچ لیا۔ تخت نشیں ہونے کے بعد فرخ سیر بھی سزائے موت دینے کے لیے یہی طریقہ پسند کرتا تھا۔ ہمایوں کے مقبرے میں اسے دفن کیا گیا۔

ابوالبرکات کو تخت نشین ہوئے ابھی تین ماہ ہوئے تھے کہ اس کی حالت بگڑنے لگی، مرض نے شدت اختیار کر لی۔ سادات نے اس کے علاج کی خاطر بہترین طبیبوں کو مقرر کیا تھا مگر مدقوق کی حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔ بادشاہ کا یہ حال دیکھ کر دونوں بھائی کسی دوسرے شہزادے کو قید سے نکال کر تخت پر بٹھانے کی فکر میں پڑ گئے۔ ابوالبرکات نے خود فرمائش کی کہ میرے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو تخت نشین کر کے میری زندگی میں اس کے نام کا سکہ وخطبہ جاری کر دیں۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہو گی اور مجھ پر آپ کا یہ بڑا احسان ہو گا۔

سادات نے یہ تجویز قبول کر لی اور رفیع الدولہ کو تخت نشین کر دیا۔ اپنے بڑے بھائی کی تخت نشینی کے تیسرے دن ہی بیمار ابوالبرکات نے دم توڑ دیا۔ اس نے کل تین ماہ دس دن بادشاہت کی، مگر وہ بادشاہ نہیں، بادشاہت کی پرچھائیں تھا۔

رفیع الدولہ کو شاہ جہاں ثانی کا لقب دیا گیا۔ نام کی نسبت تو شاہجہاں سے تھی مگر درحقیقت وہ بھی کٹھ پتلی بادشاہ تھا۔ اصل بادشاہ تو سادات بارہہ تھے جنہیں تاریخ میں بجا طور پر ''بادشاہ گرید'' کہا گیا ہے۔

نیا فرماں روا مرحوم بادشاہ سے ڈیڑھ سال بڑا تھا۔ دونوں بھائیوں نے اس کے ساتھ بھی وہی وتیرہ رکھا تھا کہ سکہ وخطبہ تو اس کے نام کا جاری کرا دیا، سلطنت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے۔ رفیع الدولہ کے باہر نکلنے، محل میں رہنے، اجلاس کرنے، یہاں تک کہ طعام ولباس سارے معاملات عبداللہ خاں

کے ایک معتمد ہمت خاں سے متعلق تھے۔ مغل تاجدار اس قدر بے بس تھا کہ سادات اور اتالیق کی غیر موجودگی میں نہ تو جمعے کی نماز کے لیے جا سکتا تھا، نہ شکار کے لیے باہر نکل سکتا تھا۔ اسے امرائے شاہی سے بات کرنے تک کی مجال نہیں تھی۔ رفیع الدولہ کے زمانے میں جو شورشیں بھی برپا ہوئیں، دونوں سادات بھائی ان سے نمٹتے رہے۔ مغلیہ سلطنت پر اب دونوں بھائیوں کا پوری طرح قبضہ تھا۔

یہ مغل تاجدار بھی تین ماہ چند روز سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ وہ اسہال (دست) کے عارضے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ مرض اسے تخت نشینی کے دوسرے ہی مہینے لگ گیا تھا۔ سادات کے مقدر میں یہی تھا کہ دونوں بادشاہ یکے بعد دیگرے رخصت ہو جائیں۔

جب عبداللہ خاں، رفیع الدولہ کے علاج کی طرف سے مایوس ہو گیا تو اس نے اپنے ماموں زاد غلام علی خاں کو شہزادہ محمد روشن اختر کو لانے کے لیے فتح پور بھیج دیا تھا۔ روشن اختر، جہاں دار شاہ کے بھائی جہاں شاہ کا فرزند تھا۔ اپنے باپ کی موت اور جہاں دار شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد وہ پہلے قلعہ دہلی ہی میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ روشن اختر کی عمر اس وقت اٹھارہ سال تھی۔ وہ چودہ واسطوں سے امیر تیمور کا وارث تھا۔ وہ خوبصورت اور نوخیز نوجوان تھا۔ روشن اختر کے قلعہ دہلی میں پہنچنے سے پہلے ہی رفیع الدولہ کا انتقال ہو چکا تھا۔

اس نئے مغل حکمراں کا نیا سکہ و خطبہ ''ابوالمظفر ناصر الدین محمد شاہ غازی'' کے نام سے جاری ہوا۔ محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد ہی غلے کا نرخ جو چند سال سے بہت گراں ہو چکا تھا، ارزاں ہو گیا۔ لوگوں نے اسے نئے بادشاہ کی برکت سے تعبیر کیا۔ محمد شاہ کی ماں صدر النساء موقع شناس اور عقل مند عورت تھی۔ محمد شاہ بھی اپنے دو پیشروؤں کی طرح نماز جمعہ اور شکار پر جانے کے اختیارات نہیں رکھتا تھا۔ جس دن بادشاہ کی سواری نکلتی تھی، سادات کے قابل اعتماد افسر سواری کو چاروں طرف سے گھیرے رہتے تھے اور کبھی کبھی دو تین ماہ میں ایک بار سیر و تفریح اور شکار کے نام پر ایک دو کوس تک شہر سے باہر لے جا کر واپس لے آتے تھے۔

محمد شاہ نوجوان اور صحت مند تھا۔ گزشتہ دو بادشاہوں کی طرح اس کے جلد مر جانے کے دور تک آثار نہیں تھے۔ دونوں بھائی اسی لیے مطمئن اور بے فکر ہو گئے۔ عبداللہ خاں دلنواز حسینوں کے جھرمٹ میں کھو گیا۔ دیس دیس کی حسینان خوش اندام جو اس نے اپنے حرم میں جمع کر لی تھیں، اب ذرا فرصت ملی تو انہیں جی بھر کے دیکھا اور برتا۔ رتن چند جس نے سب سے پہلے الہ آباد میں عبداللہ خاں کو یہ چاٹ لگائی تھی وہ حرم کے علاوہ برہمن زادیوں کو بطور نذرانہ پیش کرتا رہتا تھا۔ عبداللہ خاں کی حویلی جو کبھی سیاست کدہ تھی، اب عشرت کدہ بن چکی تھی۔ بس اتنا تھا کہ دن میں کچھ وقت وہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ ضرور گزار لیا کرتا تھا۔ رتن چند روز حاضری دیتا تھا اور اس کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ محکمہ وزارت کے تمام ہی کام رفتہ رفتہ اس نے سنبھال لیے تھے۔ عبداللہ محض دستخط کر دیتا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال اس کے چھوٹے بھائی حسین علی خاں کا تھا، مگر عبداللہ خاں سے کم! اسی زمانے کا ذکر ہے کہ میر جملہ کو صدارت کل کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ میر جملہ نے بہت پہلے ہی فرخ سیر کی زندگی میں دونوں بھائیوں کی برتری تسلیم کر لی تھی۔ اس کی وفاداریاں بدل گئی تھیں۔ اس وقت سے وہ سادات بارہہ کا وفادار چلا آ رہا تھا۔ وہ

سادات کے حکم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ اسے علم تھا کہ خفیف سا اختلاف بھی نہ صرف اسے جاہ و منصب سے جدا کر سکتا ہے بلکہ اس کی زندگی کا چراغ بھی گل کیا جا سکتا ہے۔ یوں بھی وہ ابن الوقت قسم کا آدمی تھا۔ حالات پر بھی وہ گہری نظر رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بادشاہ وقت تو کٹھ پتلی ہے اور حکومت محض سادات کی ہے۔ سادات کی نظر میں جو قابل اعتماد تھا، میر جملہ بھی اس سے چوں نہیں کرتا تھا۔ رتن چند کو بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا اور اس کی حیثیت سے بھی واقف تھا اسی لیے جب رتن چند نے اس کے محکمے میں بھی مداخلت شروع کر دی تو وہ خاموش رہا۔

رتن چند تمام ملکی مالی بلکہ شرعی معاملات میں، یہاں تک کہ شہروں میں قاضیوں اور عہدیداروں کے تقرر میں بھی اس درجہ دخیل تھا کہ تمام چھوٹے بڑے بادشاہی متصدی معطل و بیکار ہو کر رہ گئے تھے۔

ایک دن انہی ایام میں ایک شخص کو رتن چند، عبداللہ خاں کے پاس لے کر آیا۔ عبداللہ خاں اس وقت اپنے مصاحبوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ رتن چند نے اس شخص کے لیے کسی شہر کا قاضی مقرر کرنے کی تجویز و سفارش کی۔

عبداللہ خاں نے اپنے ایک مصاحب کی طرف متوجہ ہو کر ہنستے ہوئے کہا۔ ''لو دیکھ لو، ہمارا رتن چند اب قاضیوں کا تقرر بھی کرنے لگا ہے۔''

اس مصاحب نے موقع دیکھ کر فقرہ لگایا، ''راجا جی ملکی بندوبست سے تو فارغ ہو چکے ہیں، اب دینی معاملات کو سر انجام دینا چاہتے ہیں۔''

رتن چند بہرحال بے وقوف نہیں تھا، سمجھ گیا کہ عبداللہ خاں کو اس کی یہ مداخلت پسند نہیں آئی اور ''پھر حاضری دوں گا سرکار! اجازت دیں۔'' کہہ کر رخصت کا اشارہ پاتے ہی اپنے ہمراہی کو لے کر چلا گیا۔

ان حالات میں ان امرا کو کچھ ہاتھ پاؤں مارنے کا موقع مل گیا جو مغلیہ حکومت کے سچے وفادار اور بہی خواہ تھے۔ انہیں سادات کا اقتدار قطعی پسند نہیں تھا۔ ہندوگردی سے بھی وہ نالاں تھے۔ انہیں امرا میں آصف جاہ نظام الملک بھی تھا۔ مصلحت وقت کے پیش نظر وہ ترک امیر اب تک خاموش تھا۔ وہ مالوہ کا صوبیدار تھا۔ اسے علم تھا کہ بادشاہ وقت یرغمال بنا لیا گیا ہے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ محمد شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد سادات مطمئن ہیں اور عیش پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ دکن میں وہ ایک عرصے رہ چکا تھا۔ وہاں سادات کے متعین کردہ اعمال سے نمٹنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اپنے طور پر اس نے سادات کو برگشتہ ہونے کا موقع نہیں دیا تھا، مگر ایک معاملے میں حسین علی خاں کے ایک معتوب شخص کو اپنے صوبے میں پناہ دے دی تھی۔ اس کی نظر میں وہ شخص مرحمت خاں بے گناہ تھا۔ بس یہیں سے سادات اور اس کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے خفیہ طور پر محمد شاہ سے اس کی مراسلت شروع ہو چکی تھی۔ سادات کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ بادشاہ وقت کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ اپنی ذہین ماں صدر النساء کے ایما پر محمد شاہ نے نظام الملک سے خفیہ مراسلت کا خطرہ مول لیا تھا۔ اسی مراسلت کے نتیجے میں اسے محمد شاہ کی طرف سے یہ پیغام مل چکا تھا کہ ہمیں تم پر کامل اعتماد ہے۔ تم اپنی طرف سے محتاط رہو اور ہمارے اختیارات کی بحالی سے غافل نہ بیٹھو۔

اب جو سادات سے اختلاف کی صورت پیدا ہوئی تو خود محمد شاہ اور نظام الملک کے خیر خواہوں نے اسے واضح طور پر لکھ دیا کہ دونوں بھائی انتہائی خباثت پر اتر آئے ہیں۔ انہوں نے آپ کو طلب کرنے کے لیے دربار سے گرز برداروں کو مقرر کر دیا ہے، اب مہلت نہیں رہی ہے جو کچھ ہو سکے، جلد کر گزرو! اس سے مراد یہ تھی کہ دکن روانہ ہو جاؤ۔ نظام الملک پہلے ہی تھوڑی بہت فوج جمع کر چکا تھا، کچھ لوگ اور بھی جو سادات سے نالاں تھے اپنی فوج لے کر اس سے آ ملے۔ پھر وہ دکن روانہ ہو گیا۔ دکن جانے کا بڑا مقصد وہاں سے فوج اور خزانے کی فراہمی تھی۔

بالآخر نظام الملک دکن پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ پہلی بار دونوں بھائی فکر مند ہو گئے اور انہوں نے نظام الملک کے مقابلے پر اپنے آدمیوں کو فوجیں لے کر بھیجنا شروع کر دیا۔ مگر پے در پے نظام الملک کو دکن میں کامیابیاں نصیب ہوتی رہیں۔ وہ سادات کے مقرر کردہ عمال اور عہدیداروں سے برسر جنگ ہوا اور انہیں شکست دیتا چلا گیا۔ آخر میں عبداللہ خاں نے اپنے منہ بولے بیٹے عالم علی کو فوج دے کر دکن بھیجا، مگر عالم علی بھی سخت مقابلے کے بعد مارا گیا۔ سادات اس وقت محمد شاہ کے ساتھ آگرے میں تھے۔

دونوں بھائیوں کے کوئی اولاد نہیں تھی اور دونوں ہی عالم علی خاں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ دکن میں اس کی ہلاکت اور نظام الملک کی فتح سے وہ طیش میں آ گئے۔ حسین علی خاں اپنے بھائی کے ایماء پر بذات خود کثیر فوج لے کر دکن جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ دکن میں، سادات بارہہ بڑی تعداد میں مارے گئے تھے۔ اس کی بڑی وجہ مرہٹے تھے جو نظام الملک کا ساتھ دے رہے تھے۔ انہیں نظام الملک نے پہلے ہی زیر کر لیا تھا۔ مرہٹہ سردار، نظام الملک کی حاکمیت کو تسلیم کر چکے تھے۔ اسی دوران میں اعتماد الدولہ امین خاں بھی سادات کے خلاف ہو چکا تھا۔ وہ بھی خفیہ طور پر امیروں کے اس گروہ میں شامل ہو گیا تھا جو سادات سے نالاں اور مغلیہ حکومت کا ہمدرد تھا۔ سادات کے نزدیک امیروں کا یہ گٹھ جوڑ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اول تو انہیں یقینی طور پر یہ علم نہیں تھا کہ درپردہ کون کون ان کے خلاف ہے، دوم وہ پہلے نظام الملک سے نمٹنا چاہتے تھے۔ دکن میں نظام الملک کی کامیابی ان کے اقتدار کے لیے بہت بڑا خطرہ تھی۔

شاہ پرست عوام کو بھی اب یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مغلیہ تاجدار دراصل بے اختیار ہے۔ محمد شاہ کو تخت نشین ہوئے کئی برس بیت چکے تھے۔ پھر بھلا عوام سے یہ بات کیسے چھپی رہتی! خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ درپردہ بادشاہ وقت کے خیر خواہ امیر رفتہ رفتہ سادات کے خلاف چھوٹے سے ایک گروہ کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ لاکھ پردہ داری کے باوجود سادات کے خلاف افواہیں گشت کرتی ہی رہتی تھیں۔ لوگ اسی لیے سادات بارہہ سے نفرت کرنے لگے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود سادات بھائیوں کے اتحاد کی وجہ سے اب تک بات بنی ہوئی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کے درمیان مال وزر پر تھوڑا بہت اختلاف کبھی ہوا بھی تو وہ محض وقتی تھا، مگر جب حسین علی خاں دکن کے لیے روانہ ہونے والا تھا تو پہلی بار دونوں بھائیوں کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔

عبداللہ خاں بڑا بھائی تھا، مگر اثر واقتدار چھوٹے بھائی حسین علی خاں کا زیادہ تھا۔ حسین علی خاں نے اپنے حسن سلوک سے حکومت کے عمدہ اور بہترین کارگزاروں کو اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ اس نے بڑے بھائی پر اتنا تسلط اور قابو پا لیا تھا کہ اکثر معاملات میں بڑے بھائی کو مجبوراً اس کی بات ماننا پڑتی تھی۔ اس وقت بھی جب کہ حسین علی خاں دکن جا رہا تھا، دفاتر کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا تو حسین علی خاں نے چاہا کہ تمام ترشہ دیوانی، بخشی گری اور تمام ہندوستان کے بائیس صوبوں کی صدارت مع دیوان تن اور دیوان خالصہ کے اپنے ساتھ لے جائے، عبداللہ خاں کے پاس برائے نام غیر اہم محکمے رہ جائیں تاکہ وہ دہلی میں معطل پڑا رہے۔ محمد شاہ کو بھی حسین علی خاں اپنے ساتھ ہی دکن لے جا رہا تھا۔ محکموں کی اس تقسیم پر دونوں بھائیوں میں بڑی ردوقدح ہوئی۔ آخر اس خیال سے کہ لوگوں کو اس اختلاف کا علم نہ ہو، یہ طے پایا کہ چار صوبوں کے علاوہ دکن کے چھ صوبوں کے محکمے بادشاہ کے ساتھ جائیں گے، گویا حسین علی خاں کے ساتھ! بادشاہ کا جشن تخت نشینی بھی جلد ہی ہونا تھا۔ عبداللہ خاں کی خواہش تھی کہ جشن تخت نشینی اس کے سامنے ہو، مگر حسین علی خاں راضی نہیں ہوا۔ اس نے آگرے سے چار کوس پر بڑے بھائی کو رخصت کر کے کوچ کا حکم دے دیا۔ عبداللہ خاں دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ راج کماری بھی اس کے ساتھ تھی۔

محمد شاہ کی تخت نشینی کا جشن فتح پور کے قریب منایا گیا۔ انہی چار دن کے دوران اعتماد الدولہ اور ایک منصب دار سخاوت خاں کے درمیان حسین علی خاں کے قتل کا منصوبہ طے پایا۔ دونوں ہی سادات بارہہ کے دشمن ہو گئے تھے۔ انہوں نے دوران سفر میں ایک تیسرے شخص کو بھی ہموار کر لیا۔ قتل کے منصوبے میں وہ بھی شریک ہو گیا۔ یہ شخص میر حیدر خاں کاشغری تھا جو چغتائی قوم کے الاؤ والے ترکوں سے منسوب تھا۔ موروثی طور پر میر شمشیر کا لقب ملا ہوا تھا۔ سخاوت خاں نے اسے حسین علی خاں کے قتل پر آمادہ کر لیا۔ پھر ان تینوں نے حلف اٹھایا کہ راز افشا نہیں کریں گے۔ ان کے علاوہ اگر کوئی اس راز سے واقف تھا تو وہ بادشاہ کی ماں صدر النساء تھی جو عبداللہ خاں کی دست گرفتہ تھی۔ اعتماد الدولہ وہی تھا جو فرخ سیر کے خلاف بغاوت کے وقت حسین علی خاں سے آ ملا تھا۔ اب وہی حسین علی خاں کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔

لشکر نے فتح پور سے کوچ کر کے تورہ پر قیام کیا۔ فتح پور سے تورہ پینتیس کوس کے فاصلے پر ہے۔ وہاں پہنچ کر اعتماد الدولہ، حیدر قلی خاں بہادر کے پیش خانے میں چلا گیا۔ اس نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کیا تھا۔ حیدر قلی خاں بھی اس گروہ میں شامل تھا جو درپردہ سادات بارہہ کے خلاف تھا۔ اس نے اب تک دونوں بھائیوں کے ساتھ بڑی ہوشیاری کے ساتھ صلح و مدارت کا رویہ رکھا تھا۔

حسین علی خاں، محمد شاہ کے حرم سرا سے لوٹ رہا تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا۔ میر شمشیر حیدر خاں کاشغری سے حسین علی خاں روشناس تھا۔ میر شمشیر اپنے ”متوقع شکار“ سے بات کرنے کا مجاز بھی تھا۔ جب حسین علی خاں، گلال بار کے دروازے کے پاس پہنچا تو میر شمشیر اپنی جان پر کھیل کر پالکی کے قریب پہنچا۔ میر شمشیر ایک درخواست پہلے سے لکھ کر ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ اس نے وہ درخواست حسین علی خاں کے ملاحظے میں ادب سے پیش کر دی۔ حسین علی خاں درخواست پڑھنے لگا تو میر شمشیر زبانی بھی عرض حال کرنے لگا اور اعتماد الدولہ کی شکایتیں کرتا رہا۔ اسی اثنا میں اس نے تیزی کے ساتھ پیٹی سے خنجر کھینچا

اور حسین علی خاں کے بائیں پہلو میں جھونک دیا۔ دوسرا وار اس نے بائیں طرف ہی دل پر کیا اور یہی وار کاری ثابت ہوا۔ میر شمشیر نے بطور احتیاط اپنے ایک مغل شاگرد کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اس نے اپنے استاد کو حملہ آور ہوتے دیکھ کر تلوار نکالی اور حسین علی خاں کے پیٹ میں اتار دی۔

حسین علی خاں کا بھانجا نوراللہ خاں، پالکی کے قریب پیدل چل رہا تھا۔ اس نے میر شمشیر کی گردن پر تلوار کا وار کیا اور گردن کٹ کر الگ جا پڑی۔ شاگرد بھی فرار ہونے سے قبل نوراللہ خاں کے ہاتھوں مارا گیا۔ میر شمشیر اور اس کے گارد کے قتل ہوتے ہی مغلوں نے ہجوم کر کے نوراللہ خاں کو ٹھکانے لگا دیا اور حسین علی خاں کا سر کاٹ کر بادشاہ کے پاس پہنچا دیا۔ پھر تو ہر طرف مار دھاڑ شروع ہو گئی۔ سید بھائیوں کے حامی اور پشت پناہ ہجوم کرنے لگے۔ سعادت خاں اور حیدر قلی خاں اس چھوٹے محل کے دروازے پر پہنچ گئے جس میں بادشاہ کا قیام تھا۔ حیدر علی خاں نے جرأت سے کام لیا اور محل میں گھس گیا۔ اس نے محمد شاہ کو وفاداری اور حمایت کا یقین دلایا، پھر اسے ہاتھ پکڑ کر محل سے باہر لے آیا۔

اعتماد الدولہ نے محمد شاہ کو اپنے ہاتھی پر سوار کرایا اور خود پیشی میں ردیف بن کر بیٹھ گیا۔ پھر معرکہ گرم ہو گیا۔ سادات بارہہ کے کئی بڑے سردار مارے گئے اور ان کی فوج شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ بادشاہ کی فتح کے شادیانے بجنے لگے۔

فتح کے بعد سادات بارہہ کے حلیفوں کی بڑی ذلت و رسوائی ہوئی۔ عبداللہ خاں کا نائب رتن چند بھی لشکر کے ساتھ تھا، اسے طلب کیا گیا۔ وہ بڑی مایوسی کے عالم میں پالکی پر سوار ہو کر دولت خانہ شاہی پر جانے کے لیے باہر نکلا۔ راستے میں اس پر مغلوں نے اور ان لوگوں نے حملہ کر دیا جو اس بداطوار کے کرتوتوں کا شکار ہوئے تھے۔ اسے پالکی سے گھسیٹ لیا گیا، پھر لوگ اس پر ٹوٹ پڑے، لاتوں، گھونسوں اور ڈنڈوں سے اسے خوب مارا گیا۔ بے لباس کر کے بڑی ذلت و خواری کے ساتھ اسے اعتماد الدولہ کے پاس پہنچایا گیا۔ وہ رو رو کر جان کی امان کے لیے فریاد کر رہا تھا۔ کبھی لوگ جس کے روبرو فریادی بن کر کھڑے ہوتے تھے آج وہ خود فریادی تھا۔ اعتماد الدولہ نے اس کے لیے لباس کی فراہمی کا حکم دیا، پھر طوق و زنجیر پہنانے کا حکم صادر کیا۔ سادات بارہہ کے دوسرے خانہ زادوں پر بھی کچھ ایسی ہی بیتی، صرف چند افراد کو معاف کیا گیا۔

حسین علی خاں اور سادات بارہہ کے دوسرے مقتول سرداروں کی لاشوں کو تابوتوں میں بند کر کے تدفین کی خاطر اجمیر روانہ کر دیا گیا۔

جن افراد نے محمد شاہ کا ساتھ دیا تھا، ان کے منصب میں اضافہ کر دیا گیا۔ حسین علی خاں کی جگہ اعتماد الدولہ کو ترقی دے کر امیر الامرا بنا دیا گیا۔ حیدر قلی خاں کو خطاب و اضافے کے ساتھ مزید اعزازات سے نوازا گیا۔

سادات بارہہ کی بساط الٹ چکی تھی، مگر ابھی سید عبداللہ خاں زندہ تھا۔ وہ بھلا کس طرح بآسانی شکست کو قبول کر لیتا! تقریباً پندرہ سال اس نے اور اس کے بھائی نے مغلیہ اقتدار پر اپنا قبضہ رکھا تھا۔ اتنی مدت کم تو نہیں ہوتی! محمد شاہ کو تخت نشین ہوئے اس وقت لگ بھگ چودہ سال ہو چکے تھے جب حسین علی خاں کو قتل کر کے سادات بارہہ کا تختہ الٹ دیا گیا۔

سید عبداللہ خاں اس وقت تک دہلی نہیں پہنچ سکا تھا۔ جب اسے اپنے بھائی کے مارے جانے کی اطلاع ملی۔ اس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ راج کماری بھی سناٹے میں آ گئی۔ پھر جب ان دونوں کے ہوش بحال ہوئے تو راج کماری نے اسے سمجھایا۔ عبداللہ خاں! یہ نہ سمجھنا کہ میں بزدلی کی بات کر رہی ہوں، لیکن حقیقت کو تسلیم کر لینا مردانگی ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو، صاف لفظوں میں کہو!" عبداللہ خاں کے لہجے میں غراہٹ سی تھی۔

حسین علی خان کے قتل کی خبر انہیں ایک پڑاؤ پر ملی تھی۔ ان کے ساتھ جو مختصر سی فوج تھی، اسے کوچ کا حکم دیا جانا تھا۔ فوج دہلی کی طرف کوچ کے لیے تیار تھی اور اسے عبداللہ خاں کے حکم کا انتظار تھا۔ دن مندے فوج نے پڑاؤ ڈالا تھا اور اب صبح ہونے کے بعد روانگی تھی۔ حسین علی خاں اور دوسرے سادات بارہہ کے سرداروں کے قتل ہو جانے کی خبر لے کر آنے والا عبداللہ خاں کا ایک قدیم ملازم اور وکیل رائے سرمن داس تھا۔ اس کا تعلق ہندوؤں کی کائستہ قوم سے تھا۔ جب حسین علی خاں کو قتل کیے جانے کے بعد ہنگامہ ہوا تھا تو رائے نے داڑھی مونچھیں منڈوا دیئے تھے۔ اپنے چہرے پر اس نے بھبوت مل کر قشقہ لگا لیا تھا اور فقیروں کا بھیس بھر کے نکل آیا تھا۔ عبداللہ خاں کے چہرے کا جائزہ لے کر راج کماری نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شدید غم کے ساتھ طیش میں بھی مبتلا ہے۔ اس نے اسی لیے نرم اور محبت آمیز لہجے میں بات شروع کی۔ "ہم بازی ہار چکے ہیں اور......"

"نہیں!" عبداللہ خاں تقریباً چیخ اٹھا اور پھر اٹھ کر خیمے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ راج کماری کی طرف پلٹا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ اس نے کہا۔ "ابھی عبداللہ خاں زندہ ہے اور اتنا بے غیرت نہیں ہوا کہ اپنے بھائی کے قتل کا انتقام نہ لے!"

جب راج کماری نے ذہانت سے کام لے کر اس کا غصہ قدرے کم کر دیا تو عبداللہ خاں سے پوچھا کہ تم کس طرح اپنے بھائی کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتے ہو؟

"راج کماری! تم بھی یقیناً یہ جانتی ہو کہ فوج نہیں لڑتی، حوصلہ لڑتا ہے۔" اب اس نے بڑی حد تک اپنے طیش پر قابو پا لیا تھا۔ "میرے ساتھ پندرہ ہزار کے قریب فوج تو اب بھی ہے۔ اگر فوری طور پر حملہ کر دیا جائے تو اس خلاف توقع حملے کی تاب لانا بزدلوں کے بس میں نہیں ہو گا۔"

"ہمارے ساتھ جو فوج ہے، اس میں سب عبداللہ خاں نہیں ہیں! ...... یہ بھی نہ بھولو کہ ہماری ہمراہی فوج کے حوصلے پست ہوں گے اور...... دشمن......"

"میں دشمن کو نیست و نابود کر دوں گا!" عبداللہ خاں کو پھر غصہ آ گیا۔

"یقیناً عبداللہ خاں!" راج کماری بولی "مگر ...... اس کے لیے جوش کے ساتھ ہوش کی ضرورت بھی ہے۔"

راج کماری نے اب یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس کا شوہر کسی بھی طرح محمد شاہ اور اس کے حواریوں سے ٹکرائے بغیر باز نہیں آئے گا۔ اب صرف یہی ممکن تھا کہ بہتر حکمت عملی سے کام لے کر فوری طور پر ٹکراؤ کو روک دیا جائے۔ وہ عبداللہ خاں کو خودکشی کیسے کر لینے دیتی! اسی ہزار فوج کے مقابلے پر پندرہ ہزار کی فوج لے جانا اور وہ بھی ایسی فوج کہ جو حوصلہ ہار چکی ہو، خودکشی ہی کے مترادف تھا۔ اس نے ایک بار پھر

اپنے حسن بے مثال کو اپنی سپر بنایا اور عبداللہ خاں کو جوش کی بجائے ہوش میں لے آئی پھر اس نے جو تجویز پیش کی عبداللہ خاں نے اسے مان لیا۔ تجویز یہ تھی کہ دہلی کی طرف کوچ جاری رکھا جائے۔ دہلی میں عبداللہ خاں کا ایک بھائی نجم الدین علی خاں موجود تھا۔ اس کے علاوہ وہاں سادات بارہہ کے دوسرے قدیم نمک خوار، امیر اور منصب دار بھی موجود تھے۔ دہلی پہنچ کر فوج بھی جمع کی جا سکتی تھی اور نئی بھرتی کا آغاز بھی ہو سکتا تھا۔ تجویز کے آخری مرحلے میں راج کماری نے جو کچھ کہا، اسے سن کر عبداللہ خاں نے راج کماری کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر فرط جذبات میں اسے خود سے قریب تر کر لیا۔

تجویز کے مطابق راج کماری تن تنہا فوری طور پر دہلی روانہ ہو گئی۔ فوج کو نقل و حرکت میں دیر لگتی ہے اس لیے راج کماری پہلے چل دی تھی۔

دہلی پہنچتے ہی راج کماری، نجم الدین سے ملی اور اسے مکمل حالات سے آگاہ کرنے کے بعد اپنی تجویز سے آگاہ کیا۔ اس تجویز کے آخری مرحلے پر آئندہ روز صبح سے عمل شروع کر دیا گیا۔ راج کماری کو نئے مغلیہ تاجدار کی تلاش تھی۔ تجویز کے اسی آخری حصے کو سن کر عبداللہ خاں خوش ہو گیا تھا۔ تخت و تاج کے دو دعویداروں کو آپس میں ٹکرا دیا جائے اور حسب سابق نئے فرماں روا کو یرغمال بنا لیا جائے! یہ نیا فرماں روا کون ہو سکتا ہے، راج کماری اور اس کے دیور نجم الدین کو یہی فکر تھی۔

جہاں دار شاہ کے بیٹے دہلی ہی میں تھے، مگر وہ کسی بھی طرح اس پر آمادہ نہ ہوئے کیونکہ وہ برسوں پہلے اپنے باپ کا حشر دیکھ چکے تھے۔ جہاں دار شاہ کے ایک اور بھائی رفیع الشان سے بھی اس سلسلے میں رابطہ قائم کیا گیا۔ اس کا نام ابراہیم تھا۔ نجم الدین نے اس سے درخواست کی کہ اگر آپ ہماری درخواست قبول کر لیں گے تو تمام سادات کی جان بچ جائے گی۔

پہلے اس نے بھی انکار کیا مگر راج کماری سے گفتگو اور بعض شرائط کے بعد سلطان محمد ابراہیم نے بات مان لی اور یہ راج کماری کی بڑی کامیابی تھی۔ ایک نیا شاہ شطرنج بساط سیاست پر آ چکا تھا۔

عبداللہ خاں کے دہلی پہنچنے سے پہلے سلطان ابراہیم کو تخت نشین کر دیا گیا۔ اب ہندوستان کے دو مغلیہ تاجدار تھے، ایک محمد شاہ، دوسرا سلطان محمد ابراہیم۔ بارہہ کے علاقے سے نئی فوج بھرتی کی گئی۔ اس کے علاوہ منصب داروں کے مناصب میں اضافہ کر کے انہیں نئے عہدے دے دیئے گئے۔ مدار المہام عبداللہ خاں ہی تھا جو سپہ سالار افواج بھی تھا اور وزیر سلطنت بھی۔ رتن چند نے جو ایک کروڑ روپے کے قریب خزانہ جمع کیا تھا، وہ نئی فوجی بھرتی میں صرف ہو گیا، پھر بھی کمی پڑی جو وعدے وعید سے پوری کر دی گئی۔ فوری طور پر فوج کی جمع بندی تو ہو گئی مگر عجلت کے سبب بدنظمی بہت تھی۔ بہرحال سید عبداللہ خاں نے محمد شاہ کا مقابلہ کرنے کے لیے نوے ہزار فوج جمع کر لی۔ سادات بارہہ سے بھری ہوئی ڈیڑھ سو سے زیادہ گاڑیاں دہلی پہنچی تھیں۔ ان میں ہر فرد خود کو بیس سواروں کے برابر سمجھتا تھا۔ ہر ایک کو صاحب فیل اور صاحب فوج امیر بن جانے کی توقع اور امید تھی۔ ان سے ایک سال کا نقد خرچ، گھوڑا اور خلعت فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا۔

وہ ڈھینگیں مار رہے تھے کہ مقابلہ ہونے دو، سرداروں کے مقابلے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ ہم ایک ہی برق رفتار حملے میں ننگی تلواریں سونت کر دشمن کے توپ خانے کو روند دیں گے، پھر قول (مرکز

ج) پر جا پہنچیں گے۔ ان میں سے اکثر کو بمشکل گھوڑا اور ایک ماہ کا خرچ مل سکا۔ بہت سے ایسے تھے ان کے حصے میں فتح کے بعد کے وعدے آئے البتہ مدد خرچ کے طور پر انہیں کچھ رقم دے دی گئی۔ گھوڑا نہ ملنے کے سبب انہیں سواری کے ہاتھی کے ساتھ پیدل دستوں میں شامل ہونا پڑا۔

جب یہ لشکر دہلی سے روانہ ہوا تو اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ راج کماری کی کوششوں سے اس میں راجپوتوں کی بڑی تعداد بھی آ ملی۔ اب اس جنگ نے دوسرا ہی رخ اختیار کر لیا تھا۔ یہ عبداللہ خاں اور محمد شاہ کے درمیان جنگ کی بجائے تخت حکومت کے دو مغل دعویداروں کی جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اسے یہ رخ دینے میں راج کماری کا بڑا ہاتھ تھا۔ لشکر کی تعداد اب ایک لاکھ ہو چکی تھی اس میں چودہ ہزار سوار بالکل نئے بھرتی کیے ہوئے تھے۔ اتنی بڑی تعداد کے باوجود اس لشکر میں بددلی اور بیزاری کا بنیادی سبب خزانے کی کمی تھی۔ اسی سبب اکثر سواروں کو تو گھوڑوں کا پورا ''ساز'' بھی میسر نہیں آیا تھا۔ وہ گھوڑوں کی ننگی پشت پر سوار تھے۔

سلطان ابراہیم کے ساتھ ہی عبداللہ خاں بھی ایک ہاتھی پر سوار تھا، مگر راج کماری نے مردانہ لباس میں گھوڑے ہی پر سواری کرنے کو ترجیح دی تھی۔ وہ عبداللہ خاں کے ہاتھی سے کچھ فاصلے پر آگے آگے چل رہی تھی اور اس کے چہرے پر خلاف توقع آج فکرمندی کے آثار تھے۔ اس فکرمندی کی وجہ وہ بے سروپا لشکر تھا جو ساتھ تھا کثرت تعداد کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھی، مگر اس نے عبداللہ خاں پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

خبر ملی کہ محمد شاہ کا لشکر شاہ پور تک پہنچ چکا ہے۔ وہ بھی مقابلے کے لیے بہت پہلے چل دیا تھا۔ عبداللہ خاں کی افواج نے محمد شاہ کی لشکر گاہ سے تین کوس کے فاصلے پر حسن پور میں ٹھہرنا پسند کیا۔

سادات بارہہ کے ٹڈی دل کی خبریں محمد شاہ کے لشکر میں بھی پہنچ رہی تھیں۔ ہر چند کہ محمد شاہ کے لشکر کی تعداد نسبتاً کم تھی، مگر افواج میں نظم تھا اور حوصلہ بھی! پھر یہ کہ خزانے کی کمی بھی نہیں تھی۔ اعتماد الدولہ نے فوج کے واجبات ادا کر دیئے تھے اور توپ خانے کی فوج کے سابقہ مطالبات بھی مان لیے تھے۔

عبداللہ خاں یا سلطان ابراہیم کے لشکر میں فوج بندی کی یہ صورت تھی کہ کبھی ایک ترتیب و تقسیم ہوتی، کبھی دوسری قائم کرنا پڑتی۔ سرداروں میں اس قدر اختلاف تھا کہ کوئی بھی ایک دوسرے کی رفاقت و اطاعت پر راضی نہیں ہوتا تھا اسی لیے فوج کا میمنہ و میسرہ (دایاں اور بایاں بازو) جس طرح چاہیئے تھا، منظم و مرتب نہ ہو سکے جس کا جی جس طرف چاہا اپنا علم بلند کر کے کھڑا ہو گیا اور دوسرے کی کمان میں لڑنے پر تیار نہیں ہوا۔

عبداللہ خاں کے بھائی پچیس ہزار سوار فوج کے ساتھ اس کے دائیں بائیں تھے۔ آگے راجپوتوں کی جمعیت تھی جس کی کمان راج کماری کر رہی تھی۔ بارہہ کی پیدل فوج بھی سواری کے ہاتھی کے ساتھ تھی جس پر عبداللہ خاں کو بڑا بھروسا تھا کہ وہ آڑے وقت میں لڑائی سے منہ نہیں پھیرے گی۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی عبداللہ خاں نے پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ ادھر محمد شاہ قلب لشکر میں ہاتھی پر سوار ہوا، سواری کے وقت حکم ہوا کہ رتن چند کا سر قلم کر دیا جائے! حکم کے مطابق رتن چند کا سر کاٹ کر بطور شگون بادشاہی ہاتھی کے سامنے ڈال دیا گیا۔ کوچ کا حکم ہوا تو سب سے پہلے توپ خانے کی

فوج نے حرکت کی۔ جب دونوں فوجیں مقابل ہوئیں تو دونوں طرف سے گولہ باری اور تیر اندازی شروع ہو گئی۔ توپوں کی گرج اور تیروں کی سنسناہٹ سے فضا گونجنے لگی۔ اس گولہ باری سے محمد شاہ کی منظم اور صف آراستہ فوجوں کو زیادہ نقصان نہیں ہوا، مگر عبداللہ خاں کے لشکر میں گولہ باری سے بھگدڑ سی مچ گئی۔ کیونکہ کثرت ہجوم سے اس میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں تھی۔ پیادہ سوار ٹڈی دل کی طرح میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ نئے بھرتی ہونے والے اور بعض پرانے سپاہی بھی جو بدنظمی کی وجہ سے کسی کے ماتحت نہیں رہے تھے، بھاگ کھڑے ہوئے۔ محمد شاہ کے توپ خانے کی ہر باڑ پر صف کی صف الٹ جاتی تھی۔

بارہہ کے دلاوروں نے بارہا حملے کیے مگر توپ خانے کی پیش قدمی جاری رہی۔ غروب آفتاب کے وقت عبداللہ خاں نے ایک جگہ مختصر خیمہ لگانے کا حکم دیا۔ جب یہ اندازہ ہوا کہ خیمہ گولہ باری کی زد میں ہے تو اسے اکھاڑ دیا گیا اور دوسری جگہ خیمہ لگایا گیا، مگر عبداللہ خاں کو خیمے میں جانے کی مہلت نہیں ملی۔

یہ چودھویں کی شب تھی۔ سارے میدان میں چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ اس سے محمد شاہ کے توپ خانے کو نشانہ لینے میں بڑی سہولت مل گئی۔ حیدر قلی خاں نے توپ گاڑیوں کو متحرک مورچے کی طرح استعمال کیا۔ وہ توپ خانے کا نگراں اعلیٰ تھا۔ اس رات ایسی زبردست گولہ باری کی گئی کہ عبداللہ خاں کے لشکر میں ہلاکت کا بازار گرم ہو گیا۔ حیدر قلی خاں گولہ باری کے وقت مٹھی بھر بھر کے سونا چاندی توپچیوں میں تقسیم کر رہا تھا اور ان کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ توپچی بھی یوں توپیں سر کر رہے تھے کہ لمحہ بھر کو بھی گولہ باری نہیں رکتی تھی۔

بڑی بڑی توپیں ہر معرے میں بس ایک دو بار چلائی جاتی ہیں، مگر اس لڑائی میں ان کی ضرب اتنی متواتر تھی کہ شمار ممکن نہ تھا۔

توپ خانے کا رواج سن سات سو ستر ہجری (770ھ) میں، محمد شاہ بہمنی کے عہد میں دکن سے ہوا۔ توپ خانے کا پہلا کمال دار محمد خاں رومی تھا جس نے بیجانگر کے راجا کی لڑائی میں گولہ باری کی تھی۔ اس وقت سے محمد شاہ کے اس معرکے تک توپ خانے نے کسی وقت بھی ایسی کارگزاری کا مظاہرہ نہیں کیا ہو گا۔

چار پانچ گھڑی رات گزر گئی مگر گولہ باری کا سلسلہ بند نہیں ہوا تو بارہہ کی فوج کے حوصلے پست ہو گئے۔ بہت سے فیل سوار جمعدار اور نامی گرامی تمن دار شہر اور قصبوں کی طرف اپنے جھنڈے اڑاتے ہوئے فرار ہونے لگے۔ آخر شب تک سترہ اٹھارہ ہزار سواروں سے زیادہ میدان میں باقی نہیں رہے تھے جو عار و ننگ کی وجہ سے عبداللہ خاں کے ساتھ مورچوں پر جمے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نیند کی جگہ بارود کے ذرے کھٹک رہے تھے۔ فوج کے سردار بے چینی سے صبح ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس خوف ناک رات کا اختتام ایک اندوہناک واقعے پر ہوا۔ ایک بڑا گولہ راجپوت سردار محکم سنگھ کی سواری کی ہاتھی پر آ کر گرا۔ محکم سنگھ ہاتھی سے کود کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور پھر اس نے راہ فرار اختیار کر لی۔ قریب ہی ایک گھوڑے پر راج کماری سوار تھی۔ اسے غصہ آ گیا۔ اس نے محکم سنگھ کا پیچھا کیا کہ اسے روک لے، عین اسی وقت دوسرا گولہ وہیں آ کر گرا۔ راج کماری اور اس کے گھوڑے کو لوگوں نے فضا میں بکھرتے دیکھا۔

راج کماری کا جسم فضا ہی میں ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ یہ خبر عبداللہ خاں پر بجلی بن کر گری۔ پہلی بار میدان جنگ میں اسے آبدیدہ دیکھا گیا۔

سورج طلوع ہوتے ہی پوری شدت سے جنگ ہونے لگی۔ بارہہ کے لشکر کی ساری سرگرمی نجم الدین علی خاں کے دم سے تھی۔ وہ بڑی دلیری سے لڑ رہا تھا۔ اسے تین چار کاری زخم لگے۔ آنکھ کے قریب تیروں کے لگنے سے وہ لڑائی جاری نہ رکھ سکا۔ عبداللہ خاں نے جب اسے خطرے میں دیکھا تو سادات بارہہ کے بہادروں کو لے کر اپنا ہاتھی، بھائی کی مدد کے لیے بڑھا دیا۔ بروقت کمک سے سادات بارہہ کے حوصلے بڑھ گئے۔ عبداللہ خاں اپنا ہاتھ حیدر قلی خاں کے مقابل لے آیا، حیدر قلی خاں کی فوج نے کمانیں سنبھال لیں اور تیروں کی بارش کر دی۔

اسی وقت عبداللہ خاں کے توپ خانے پر حملہ ہو گیا۔ توپ خانے کا داروغہ جوابی حملہ کر رہا تھا کہ اس پر پے در پے وار ہوئے اور اسے گرا دیا گیا۔ حیدر قلی خاں اور اس کے جانثاروں نے عبداللہ خاں پر زبردست حملہ کیا۔ بارہہ کا یہ سپہ سالار سید عبداللہ خاں بزدل نہیں تھا۔ بار بار ایسے مواقع پر لوگوں نے اسے ہاتھی یا گھوڑے سے اتر کر پیدل لڑتے دیکھا تھا۔ ایک دنیا اس کی بہادری اور دلیری دیکھ چکی تھی، مگر اس وقت عبداللہ خاں کا ستارہ گردش میں تھا۔ اس توقع پر کہ اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی پیدل ہو کر بہادری کا ثبوت دیں گے وہ اپنے ہاتھی سے اتر آیا اس وقت عبداللہ خاں کے ساتھ دو تین ہزار سوار فوج کے بخشی اور بعض عمدہ جمعدار دور و نزدیک موجود تھے۔ وہ کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑا، مگر چند ہی لمحوں کے بعد باقی تمام فوج مع بخشی کے فرار ہو چکی تھی۔ فرار ہونے والوں میں خود اس کا ایک بھائی سیف الدین بھی تھا۔ وہ ظالم اپنے بھائی کو اس معرکہ ہلاکت میں چھوڑ گیا تھا۔

دشمن سے لڑتے ہوئے سید عبداللہ خاں کے ہاتھ پر تلوار کا ایک زخم لگا، پھر ایک تیر اس کی پیشانی کو چھیلتا ہوا نکل گیا۔ اسی لمحے حیدر قلی خاں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شمشیر برہنہ ہاتھ میں لیے عبداللہ خان کے سر پر آ پہنچا۔

عبداللہ خاں نے فریاد کی ”میں سید ہوں“

حیدر قلی خاں نے زندہ گرفتار کر لیا۔ سلطان ابراہیم اس معرکے کے درمیان جنگل میں جا کر چھپ گیا تھا۔ وہ بھی گرفتار ہو کر محمد شاہ کے سامنے آیا کیونکہ وہ بے اختیار تھا اس لیے محمد شاہ نے اس کی جاں بخشی کر دی۔

پھر سادات بارہہ کی بڑی خانماں بربادی ہوئی۔ عبداللہ خاں کی حویلی لٹ گئی۔ حرم کی حسینائیں کچھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئیں، کچھ شاہی کارندوں کے ہتھے چڑھ گئیں۔ نجم الدین علی خاں کی حویلی کا بھی یہی حشر ہوا۔ خواتین چادریں سر پر ڈال ڈال کر جدھر منہ اٹھا اپنی عزت و ناموس بچا لے گئیں۔ ان میں نجم الدین کی دس سالہ بیٹی بھی تھی جسے ایک گوپے کے گھر چھپا دیا گیا تھا۔ وہیں سے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ حسین علی خاں اور دیگر سادات بھائیوں میں سے کسی کی حویلی بھی لٹنے سے نہ بچ سکی۔

احمد آباد اور اجمیر کا صوبیدار مہاراجہ اجیت سنگھ اس عرصے میں سرکشی پر اتر آیا تھا۔ جب سادات بارہہ کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا تو اس نے محمد شاہ کی اطاعت قبول کر لی اور سرکشی کے جرم

میں احمد آباد کی صوبیداری اس سے لے لی گئی۔ صرف صوبہ اجمیر اس کے نام بحال کیا گیا۔

نجم الدین علی خاں کی دس سالہ بیٹی کو محمد شاہ کی والدہ صدر النساء کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ اس بوڑھی ظالم عورت کا ارادہ یہ تھا کہ بارہہ کی دس سالہ بیٹی کو محمد شاہ کے عقد میں لے آئے۔ سید عبداللہ خاں کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ اس نے حیدر قلی خاں سے کہا کہ سادات بارہہ میں کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ ملکہ زماں سے کہنا کہ اس بچی کو میرے بھائی کے گھر واپس بھجوا دیں۔

حیدر قلی خاں ہی نے قید کے دوران میں عبداللہ خاں تک یہ خبر پہنچائی تھی۔ وہ عبداللہ خاں کے کہنے پر ملکہ زماں (محمد شاہ کی ماں) سے ملا اور عبداللہ خاں کا پیغام دیا۔ ملکہ نے اس دس سالہ بچی کو نجم الدین علی خاں کی حویلی میں بھجوا دیا۔ لٹنے کے بعد حویلی کے مکین کچھ عرصے بعد پھر حویلی میں واپس آ گئے تھے۔ نجم الدین خاں قید کے دوران میں زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو چکا تھا۔

پھر جشن فاتحانہ منعقد ہوا۔ فرخ سیر کی بیٹی سے محمد شاہ کی شادی بھی ہوئی۔ اعتماد الدولہ چند روز علالت کے بعد مر گیا اور نظام الملک دہلی پہنچ گیا۔ اسے وزیر سلطنت بنا دیا گیا۔ حیدر قلی خاں کیونکہ اکثر عبداللہ خاں سے ملتا رہتا تھا۔ عبداللہ خاں اسی کے عملے کی نگرانی میں تھا۔ اس نے سادات کا دور عروج بھی دیکھا تھا۔ وہ کیونکہ خود بہادر آدمی تھا اس لیے تمام باتوں سے قطع نظر اس کے دل میں عبداللہ خاں کے لیے نرم گوشہ تھا۔ اس نے محمد شاہ کی ماں کو عبداللہ خاں کا پیغام بھی پہنچا دیا تھا اور یہ سفارش بھی کی تھی کہ نجم الدین کی دس سالہ بیٹی کو اس کے گھر بھیج دیا جائے۔ حیدر قلی خاں پر اسی لیے مختلف الزامات عائد کر کے اس کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور پھر عبداللہ خاں کی نگرانی سے بھی اسے دست بردار کر کے احمد آباد بھیج دیا گیا۔ پہلے بھی وہ اس صوبے کا صوبیدار رہ چکا تھا۔

حیدر علی خاں ابھی احمد آباد نہیں پہنچا تھا کہ محمد شاہ اور اس کی ماں کے ایما پر قید کے دوران ہی میں، ایک روز سید عبداللہ خاں کو کھانے میں زہر دے دیا گیا یوں یہ بادشاہ گر سید اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

مغلوں کا زوال تو اورنگ زیب عالمگیر کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا، مگر سادات بارہہ نے اس میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے بعد بغاوتوں کا دور شروع ہو گیا۔ درباری سازشیں عروج پر پہنچ گئیں۔ نظام الملک اور محمد شاہ کے درمیان انہی سازشوں کے نتیجے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ نظام الملک واپس دکن چلا گیا اور وزیر سلطنت اعتماد الدولہ کے بیٹے کو بنا دیا گیا۔ اسی دوران میں مہاراجا اجیت سنگھ کو خود اسی کے نوجوان بیٹے ڈونگر سنگھ نے خواب گاہ میں گھس کر قتل کر دیا۔ یوں وہ اپنے انجام کو پہنچا۔ نظام الملک نے دکن میں قدم جما لیے۔

دکن میں نظام الملک نے انتظام سنبھال لیا تو مرہٹوں نے مرکز کو کمزور پا کر شمالی صوبوں پر حملے شروع کر دیئے۔ وہ دہلی تک لوٹ مار کر کے جانے لگے۔ محمد شاہ کو ان سے ایک شرم ناک معاہدہ کرنا پڑا۔ پورا صوبہ مالوہ اس معاہدے کے تحت مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا۔ دوسرے صوبے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر خود مختاری کا اعلان کرنے لگے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور دہلی میں قتل عام ہوا۔ نادر شاہ نے

جانے سے پہلے محمد شاہ کی بیٹی سے اپنے بیٹے کا عقد کیا اور دہلی کی ساری دولت سمیٹ کر ہندوستان واپس ایران چلا گیا۔ اس دولت میں شاہجہاں کے عہد کا ''تخت طاؤس'' بھی شامل تھا۔ صلح کے عہد نامے کی رو سے سندھ کے اس پار کا سارا علاقہ نادر شاہ کی قلمرو میں شامل ہو گیا۔

نادر شاہ کے حملے سے پہلے ہی دہلی کی مرکزیت کمزور پڑ چکی تھی۔ نادری حملے سے رہی سہی آبرو بھی جاتی رہی۔ شاہی خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ فوج منتشر ہو چکی تھی محاصل اور خراج ہر طرف سے بند ہو گئے تھے۔ دربار سازشوں کا دنگل بنا ہوا تھا۔ پورا ہندوستان ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ بنگال، بہار، اڑیسہ اور دوسرے کئی صوبے عملاً مغلیہ حکومت سے کٹ گئے۔ خود مختارانہ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ روہیل کھنڈ کے علاقے میں روہیلے اودھم مچائے ہوئے تھے۔ مغربی ساحل کا سارا علاقہ گجرات سے مالوہ اور بالا گھاٹ تک مرہٹوں کے تاخت و تاراج کی زد میں تھا۔ آگرے اور دہلی کے درمیان جاٹوں کی شورش کا سلسلہ جاری تھا۔ دکن کے چھ صوبوں میں نظام الملک آصف جاہ اور اس کے بیٹوں کی عمل داری تھی۔ پنجاب کا علاقہ افغانیوں اور ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔

مغل فرماں روا محمد شاہ اب ''محمد شاہ رنگیلے'' کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ وہ اب صرف محل سرا کا بادشاہ بنا ہوا تھا۔ وہ شخص یقیناً بڑا نکتہ سنج تھا جس نے محمد شاہ کو ''رنگیلے'' کا نام دیا۔ احمد شاہ درانی نے محمد شاہ رنگیلے کے آخری عہد حکومت میں پنجاب پر حملہ کیا تھا۔ محمد شاہ کے بیٹے شہزادہ احمد شاہ نے درانی سے جنگ کی اور پھر وہی اپنے باپ کی وفات کے بعد مغل حکمراں بنا۔

محمد شاہ نے تیس سال تک بادشاہی کی اور **1748** میں اس کا انتقال ہوا۔ **1748**ء سے **1857**ء تک چھ مغل تاجدار آئے، احمد شاہ عالمگیر ثانی، شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی اور آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر، مگر مغلیہ حکومت اس دوران میں سمٹتے سمٹتے دہلی کے قلعے تک رہ گئی۔ پھر **1857**ء میں بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد مغلوں کا عہد تاریخ کا حصہ بن گیا۔

مجھے، یعنی عذرا خاں کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا کہ مغلوں کی وسیع و عریض سلطنت کس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر صرف قلعہ دہلی یا لال قلعے تک محدود ہو گئی تھی۔ اس سوال کا جواب ملتے ہی میں پھر تاریخ کے سفر سے اسی لمحے میں، یعنی زمانہ حال میں واپس آ گئی تھی۔ جہاں سے میں نے ماضی کا سفر شروع کیا تھا۔

میرے سارے جسم میں اس لمحے ایک عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں ایک حیرت ناک اور ناقابل یقین تجربے سے گزری تھی۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میرا پراسرار ذہن صدیوں پر محیط ہے۔

میں نے آنکھوں کھول کر اپنی اطراف دیکھا تو نادر و نایاب تاریخی کتب میرے بستر پر بکھری ہوئی تھیں۔ انہیں سمیٹ کر میں نے ایک طرف ٹیبل پر رکھ دیا۔

اس رات میں ٹھیک طرح سے نہیں سو پائی۔ صبح جب میں اٹھی تو بھی اضطراب میں مبتلا تھی۔ ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب کوئی خطرہ منڈلا رہا ہو، مگر بظاہر کوئی بات نہیں تھی۔ ناشتے کے بعد میں نے ''آپریشن سیل'' ہیڈ کوارٹر سے بھی رابطہ قائم کیا۔ وہاں کمانڈر نواز ڈیوٹی پر تھا۔ اس سے رپورٹ ملی کہ کوئی

قابل ذکر بات نہیں پھر بھی میری بے چینی کم نہ ہوئی۔ اب مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ یقیناً خطرے کی کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، میرا ذہن بلا سبب پریشان نہیں ہو سکتا!

کچھ عرصے قبل امریکی ایجنٹوں سے میرا زبردست ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ امریکی ایجنٹوں کا سرغنہ سولومن میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا جو ڈاکٹر رچرڈ کا نائب تھا۔ سولومن کی جگہ سبز آنکھوں والی لیوسی نے لے لی تھی۔ لیوسی کو ڈاکٹر رچرڈ کی مدد کے لیے اس کے آقاؤں نے انڈونیشیا بھیج دیا تھا جہاں امریکی ایجنٹ صدر سوئیکارنو کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی تمام تر توجہ انڈونیشیا پر تھی۔ ان حالات میں فوری طور پر میرے ملک میں امریکی ایجنٹ سرگرم عمل نہیں ہو سکتے تھے۔ میرے ملک کے خلاف دائیں بازو کے جو غیر ملکی ایجنٹ ریشہ دوانیاں کر رہے تھے، انہیں ملک کے دونوں حصوں میں گرفتار کیا جا چکا تھا۔ بنگال کے سبودھ مکرجی کے سوا کوئی بھی غیر ملکی یا مقامی ایجنٹ بچ کر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ پھر میرا ذہن ''خطرے'' کی گردان کیوں کر رہا تھا؟ یہ سوال میرے لیے حیران کن تھا۔ میں نے ملک دلاور اور اپنے بہت سے دوستوں اور شناساؤں کو فون کیے لیکن کہیں سے بھی خطرے کا سگنل نہیں ملا۔

پھر اسی روز مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ میں اس وقت اپنی کوٹھی ہی میں تھی۔ میرے بزرگ و محترم وزیر داخلہ نے فون پر مجھ سے رابطہ قائم کیا اور سنسنی خیز خبر دی۔ اسی کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی کہ محترم صدر مملکت نے فوری طور پر مجھے اسلام آباد طلب کر لیا ہے۔ وزیر داخلہ کی فراہم کردہ خبر کے مطابق ہندوستان نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اچانک کبھی کچھ نہیں ہوتا، کوئی بھی حادثہ یا واقعہ ایک دم رونما نہیں ہوتا۔ وقت اس کی برسوں رش کرتا ہے تب وہ واقعہ ظہور میں آتا ہے۔ ہاں ہم یہی سمجھتے ہیں کہ ایسا اچانک ہو گیا اس لئے کہ بہت ے پس پردہ واقعات و عوامل ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اس وقت بھی جب ہندوستان نے ستان پر حملہ کیا تو یہی سمجھا گیا کہ ایسا اچانک ہوا ہے۔ وقتی طور پر خود میں بھی یہی سمجھی مگر حقیقتاً ایسا نہیں ۔ ہندوستان عرصہ دراز سے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس نے پاکستان کے وجود کو کبھی دل سے لیم نہیں کیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں غیر ملکی ایجنٹوں کی سرگرمیاں بھی اسی کا شاخسانہ تھیں جنہیں ناکام بنا گیا تھا۔ گزشتہ اٹھارہ سال کے دوران میں ہندوستان کبھی چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ اس کے توسیع پسندانہ ائم ہی کا ایک ثبوت کشمیر تھا جہاں اس نے اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے اور عالمی رائے عامہ کو بھی پس پشت ل دیا تھا۔ جنگی جنون میں مبتلا ہندوستانی حکومت ہمارے ملک کیلئے شدید خطرہ بن گئی تھی۔ اسی جنگی ن کے نتیجے میں اس نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ اسے یہ غلط فہمی تھی کہ پاکستان اپنا دفاع نہیں کر سکے

ابتدا مقبوضہ کشمیر ہی سے ہوئی تھی جہاں مظلوم کشمیری اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اقوام لم کی توجہ کشمیر کے مسئلے سے ہٹانے کی خاطر ہندوستان نے بلا جواز پاکستان کے ساتھ جنگ چھیڑ دی تھی۔

وزیر داخلہ کا فون ملنے کے بعد میں نے ''آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر'' کو خصوصی ہدایات دیں اور راسلام آباد روانہ ہو گئی۔

جب میں اسلام آباد پہنچی تو صدر مملکت کی ولولہ انگیز اور پرجوش تقریر ریڈیو سے نشر ہو رہی تھی۔ زیر اتنی پر اثر تھی کہ اس کا ایک ایک لفظ میں نے اپنے دل میں اترتا محسوس کیا۔

ہنگامی صورتحال ہونے کے سبب وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ کی موجودگی میں صدر مملکت سے ری ملاقات خاصی مختصر رہی۔ کراچی سے میں کچھ اور ہی سوچ کر گئی تھی کہ اسلام آباد پہنچ کر میرا خیال غلط بت ہوا۔ انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو کے نام صدر مملکت کا ایک خصوصی پیغام لے کر مجھے فوری طور پر لستان سے روانہ ہونا تھا۔ میں نے صدر مملکت سے مختصر ملاقات کے دوران میں ایک اجازت بھی لے ۔ انہوں نے اجازت دیتے ہوئے اپنے وجیہہ وزیر خارجہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے سر، میں ان سے بات کر لیتا ہوں۔'' وزیر خارجہ نے کہا۔

پھر ایوان صدر ہی میں وزیر خارجہ سے پہلی بار خلوت میں میری ملاقات ہوئی۔ صدر مملکت بے

حد مصروف تھے اور وزیر خارجہ کے پاس بھی زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے اختصار کے ساتھ انہیں اپنے آیندہ اقدامات سے آگاہ کردیا۔ میرے نزدیک ان اقدامات کے دوررس نتائج نکل سکتے تھے۔

''عذرا خان! مجھے آپ سے پہلی ملاقات اچھی طرح یاد ہے۔ میں اسی کے بعد انڈونیشیا میں تھا۔ انڈونیشیا ہمارا برادر اسلامی ملک ہے۔ اس وقت ہمارا جو فرض تھا، ہم نے ادا کیا۔ صدر سوئیکارنو سے جب میری ملاقات ہوئی تھی تو گفتگو کے دوران میں بھی انہیں میں نے متوقع خطرے سے آگاہ کردیا تھا لیکن اس وقت تو ہم خود خطرے میں گھر گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم دشمن کو منہ توڑ جواب دیں گے آپ جو کچھ چاہتی ہیں اس سلسلے میں ہم صرف اتنا کرسکتے ہیں کہ انڈونیشی حکومت آپ کے ساتھ تعاون کرے۔ یہ ان کا اور ہمارا مشترکہ مسئلہ ہے۔ آپ خود بھی جانتی ہوں گی کہ پاکستان اور انڈونیشیا کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات بڑی حد تک مشابہ ہیں۔ بہرحال تفصیلی گفتگو کا یہ وقت نہیں تھا۔'' وزیر خارجہ کہہ کر کچھ سوچنے لگے۔

''مجھے اندازہ ہے۔'' میں بول اٹھی۔

''پھر ایسا کرتے ہیں کہ میں پاکستان میں متعین انڈونیشی سفیر سے بات کرلیتا ہوں اس لئے کہ آپ کو فوری طور پر انڈونیشیا روانہ ہونا ہے۔ انڈونیشی سفیر بریگیڈیئر جنرل لیکیمنتھو سے میرے ذاتی مراسم بھی ہیں آپ مطمئن رہیں، انڈونیشیا میں آپ کو ہر طرح کا تعاون ملے گا۔''

''تھینک یو سوچ۔'' میں نے وزیر خارجہ کا شکریہ ادا کیا۔

''او کے۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے گھڑی دیکھی۔

''میں اجازت چاہتی ہوں۔''

''خدا حافظ۔'' انہوں نے کہا اور اس کے ساتھ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسی روز رات کو میں ایک خصوصی طیارے کے ذریعے انڈونیشیا جارہی تھی جہاں ڈاکٹر رچرڈ بھی تھا اور وہ خطرناک امریکی ایجنٹ لیوسی بھی جو غیر معمولی ذہنی قوتوں کی مالک تھی۔ یہ وہی لیوسی تھی جو مجھ سے ڈاکٹر رچرڈ کے نائب سولومن کی موت کا انتقام لینے پاکستان آئی تھی۔ اسے اس کے آقاؤں نے پاکستان سے انڈونیشیا بھیج دیا تھا ورنہ اس کا انجام بھی سولومن سے مختلف نہ ہوتا۔

خصوصی طیارہ جکارتہ کی طرف محو پرواز تھا۔ میں تقریباً دس سال کے بعد انڈونیشیا کے دارالحکومت جارہی تھی اور بہت سے چہرے میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں چہرہ بیگم ماریہ الفقہ کا تھا۔ ان کا پورا نام بیگم ماریہ الفقہ سنتوسو تھا۔ وہ انتہائی ذہین اور خوش مزاج خاتون تھیں۔ ان سے میری دوستی کا سبب ہی ان کی خوش مزاجی تھا۔ اس وقت جکارتہ میں انہی کے یہاں میرا قیام رہا تھا مگر میرا وہ دورہ موجود دورے سے قطعی مختلف تھا، وہ دورہ کاروباری تھا۔ اس کے علاوہ میرا مقصد سیر وسیاحت بھی تھا۔ میرا قیام انڈونیشیا میں خاصے عرصے رہا تھا اور میں نے ہزاروں چھوٹے بڑے جزائر پر مشتمل انڈونیشیا کی خوب سیر کی تھی۔ ''سبانگ'' سے ''مرو'' کے تک میں نے سارا انڈونیشیا دیکھ تھا۔ یہ رومانوی سرزمین مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ اپنے قدرتی حسن اور خوبصورتی کے علاوہ انڈونیشیا سے میرے خصوصی لگاؤ کا ایک بڑا سبب اور تھا۔ وہ سبب یہاں کی خواتین تھیں۔ میں نے یہاں کی خواتین کو زندگی

کے ہر شعبے میں سرگرم عمل دیکھا۔ صحافت، تعلیمات، لائبریریوں کے کام، طب، معاشرتی بہبود، قانون، بینکاری اور دیگر شعبوں میں بھی مجھے انڈونیشی خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی نظر آئیں۔ میرا تعلق کیونکہ خود اپنے ملک کے تجارت پیشہ طبقے سے تھا۔ اس لئے یہاں کی صنعتوں کا میں نے جائزہ لیا تو مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ یہاں بہت سی فرمیں ایسی تھیں جو میاں بیوی کے اشتراک سے چل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ فرموں کی سربراہ صرف عورتیں تھیں۔ انڈونیشیا کی عوامی زندگی میں عورتوں کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ انڈونیشیا کے جہاد آزادی میں بھی یہی عورتیں جاں باز سپاہیوں کی طرح پیش پیش رہی تھیں۔ میں نے انڈونیشیا میں کم از کم اتنے ہی محکموں کی افسران اعلیٰ عورتوں کو دیکھا جتنا امریکہ میں دیکھا تھا۔ اسی دوران قیام میں میرے تعلقات بیگم ماریہ الفقہ سے استوار ہوئے۔ پہلے وہ انڈونیشی کابینہ میں معاشرتی امور کی وزیر تھیں جس زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی، وہ انڈونیشی وزیراعظم کے انتظامی معاون کے عہدے پر فائز تھیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب انڈونیشیا میں بنڈونگ کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں ہورہی تھیں اور میں ہوٹل سے بیگم ماریہ الفقہ کے گھر منتقل ہوچکی تھی۔ بیگم ماریہ ہی نے مجھے بنڈونگ چلنے کی دعوت دی تھی کیونکہ وہ خود جکارتہ سے بنڈونگ جارہی تھیں۔ اس وقت تک میں نے مغربی جاوا کا خوبصورت شہر بنڈونگ نہیں دیکھا تھا۔ میں اسی لئے بنڈونگ چلنے پر راضی ہوگئی۔

آج بھی بنڈونگ کانفرنس کی حسین یادیں بھول نہیں سکی۔ صدر سوئیکارنو کو پہلی مرتبہ میں نے اسی کانفرنس میں تقریر کرتے دیکھا تھا۔ اس تاریخی کانفرنس میں ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک کے سربراہ اور نمائندے شریک ہوئے تھے۔ ان ممالک کے نمائندے جو آزادی حاصل کرچکے تھے یا آزاد ہونے والے تھے صدر سوئیکارنو کے افتتاحیہ خطبے کے الفاظ اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ انہوں نے اپنی پرجوش تقریر میں لانگ فیلو کی ایک نظم کے کچھ مصرعے بھی پڑھے تھے۔

ایک چیخ، خوف کی نہیں بلکہ سرکشی کی۔

اندھیرے میں ایک آواز اور دروازے پر ایک دستک! اور ایک لفظ جس کی بازگشت ہمیشہ سنی جائے گی۔

''ہاں'' صدر سوئیکارنو نے کہا تھا۔ ''ہماری آواز ہمیشہ ہمیشہ گونجتی رہے گی! لیکن یاد رکھیے کہ وہ جنگ جو ایک سو اسی سال پہلے شروع کی گئی تھی، وہ اس وقت تک مکمل طور پر نہیں جیتی جائے گی جب تک ہم تمام دنیا کا جائزہ لے کر یہ نہ کہہ سکیں کہ نوآبادیاتی نظام مرچکا ہے۔'' اپنے اسی پرمغز خطاب میں انہوں نے ایک اور بامعنی اشارہ کیا۔ ''استعمار کا ایک جدید روپ یہ ہے کہ کسی ملک کی اقتصادیات اور عقل و ذہانت پر وہیں کے طاقتور گروہوں کے ذریعے قبضہ کرلیا جائے۔''

صدر سوئیکارنو نے دس سال پہلے بنڈونگ کانفرنس میں جس طرح اشارہ کیا تھا اسی کی عملی شکل برسوں بعد میں نے خود اپنے ملک میں اور دیگر ان ملکوں میں دیکھی جو ''دائیں بازو'' کی ریشہ دوانیوں کے شکار تھے۔ خود انڈونیشیا میں بھی تو اس وقت یہی کھیل کھیلا جارہا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ، لیوسی اور دسرے خطرناک ایجنٹوں کی وہاں موجودگی بلاسبب تو نہیں تھی! ادھر میرے ملک پر جنگ تھوپ دی گئی تھی۔ یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی کہ ڈوریاں کہاں سے ہلائی جاتی ہیں! منظر پر کون ہوتا ہے اور پس منظر میں کون! بڑی طاقتوں

کے درمیان کھیلے جانے والا یہ کھیل چھوٹے ملکوں کے میدان میں کھیلا جاتا ہے۔ انہوں نے طے کرلیا ہے کہ جنگ کا میدان اب یورپ کو نہیں ایشیا کو بنایا جائے گا، کٹھ پتلیاں ناچتی رہتی ہیں اور نچانے والے ہاتھ انہیں نچاتے رہتے ہیں۔ ہندوستان بھی اس زمانے میں ایک سپر پاور کی کٹھ پتلی تھا، سو اس نے اشارہ پاتے ہی ڈوریاں ہلتے ہی ناچنا شروع کردیا اور اس کے اندر کی نفرت و تعصب ظاہر ہوگیا۔ لاکھ کوئی کہتا رہے کہ ''ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی'' ''مگر'' کون سنتا ہے فغان درویش!'' سب نے ظاہر ہی کا تو تماشا کیا، اندر کی کہانی کچھ اور ہی تھی! ہمیشہ یہی تو ہوتا ہے۔!

میں انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو سے ملی اور انہیں اپنے ملک کے صدر مملکت کا خصوصی پیغام پہنچایا۔ وہ بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ ملے۔ میں نے اسی ملاقات میں لانگ فیلو کی نظم کا حوالہ دیا اور پھر اسی کے تعلق سے اپنے ملک پر مسلط کی جانے والی جنگ پر بات کی۔ انہیں میں نے بتایا کہ بنڈونگ کانفرنس میں بطور مہمان مجھے بھی شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ بیگم ماریہ الفہ نے مجھے پریس گیلری میں بٹھا دیا تھا۔ دس سال پہلے کی وہ تقریر مجھے یاد تھی۔ اس پر صدر سوئیکارنو خوش ہوئے تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ سرکاری مہمان بن کر نہیں رہنا چاہتی۔ انہوں نے میری درخواست قبول کرلی تھی۔

بعد میں میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا کہ صدر مملکت کا وہ خصوصی پیغام جنگی نقطہ نظر سے بہت اہم تھا۔ اس جنگ کے دوران میں دشمن کو سمندر کی طرف سے حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ انڈونیشی بحری بیڑے حرکت میں آگئے تھے۔ سمندروں سے ان کی دوستی بہت پرانی تھی اور اس بات کا علم ہمارے دشمن کو بھی تھا۔

ادھر مختلف محاذوں پر ہمارے شیر دل جوان دشمن کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا رہے تھے اور ادھر میں انڈونیشیا میں ایک اور ہی محاذ پر برسر پیکار تھی۔ اس سلسلے میں مجھے انڈونیشی حکومت کا پورا تعاون حاصل تھا، لیکن اب تک اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ بیگم ماریہ الفہ سے ملنے کو میرا جی تو بہت چاہا تھا مگر دانستہ میں نے اس سے گریز کیا تھا۔ مصلحت کے تحت نہ تو میں نے سرکاری مہمان بن کر رہنا پسند کیا تھا، نہ بیگم ماریہ کے گھر ٹھہری تھی، میرا قیام جکارتہ کے ایک ہوٹل میں تھا۔

دنیا کی دیگر متعدد زبانوں کی طرح مجھے انڈونیشی قومی زبان ''مہاما'' پر بھی عبور حاصل تھا اور یہی میری کاروباری ضرورت بھی تھی۔ اس وقت انڈونیشیا کی آبادی نو کروڑ ساٹھ لاکھ تھی جس میں نو کروڑ مسلمان تھے باقی دوسری اقلیتیں تھیں۔ میرے لئے یقیناً یہ امر باعث حیرت تھا کہ وہاں تقریباً دو سو سے زیادہ زبانیں بولی جاتی تھیں، مگر ان میں تین بڑی زبانیں بولنے والوں کی تعداد خاصی بڑی تھی۔ بولیوں کی اس کثرت کے باوجود انڈونیشیا ایک قومی زبان کیلئے قبولیت عام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ گزشتہ تیس سال کے دوران میں اس قومی زبان کی نشوونما واقعی ایک کارنامہ ہی تھا۔ عام طور پر زبانیں آہستہ آہستہ نشوونما پاتی ہیں اور ان میں آہستہ آہستہ ہی ردوبدل ہوتا ہے، لیکن انڈونیشیا میں قومی زبان کی ترقی اور سارے ملک میں اس کا رواج شعوری طور پر عمل میں آیا۔ میں نے اسے کارنامہ اس لئے کہا ہے کہ زبان کے معاملے میں کوئی ارادی فیصلہ مشکل ہی سے کامیاب ہوتا ہے۔ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی

زبان ہو جو دیکھتے ہی دیکھتے اتنے زیادہ لوگوں نے اتنی جلدی اپنالی ہو۔ یہاں کی قومی زبان سیکھنا اس لئے بھی بہت آسان ثابت ہوا کہ اس پر عربی زبان کا خاصا اثر ہے۔ مثال کے طور پر جہاز کے کپتان کو ''معلم'' اور علاج کرنے والے کو یہاں بھی ''طبیب'' ہی کہا جاتا ہے۔ تقویٰ، کتاب، قلم، مسکین، فقیری، مکان، مشاورت، قیود وغیرہ، یہ سارے ہی الفاظ انڈونیشی قومی زبان میں رائج ہیں اور یہ سبھی الفاظ عربی کے ہیں۔ انڈونیشی زبان میں ''ایوب'' سایہ دار درخت کو کہتے ہیں۔ سوئیکارنو یا سوکارنو کا مطلب سپوت یا فرزند نیک ہے۔ ''بنگ'' بھائی کو کہتے ہیں۔ صدر سوئیکارنو خود کو ''بنگ کارنو'' کہے جانے پر بہت خوش ہوتے تھے، یعنی بھائی کارنو ''مردیکا'' کا مطلب ''آزادی'' ہے۔

لفظ ''انڈونیشیا'' یونانی زبان کا مرکب لفظ ہے اور یہ اصلاً INDUS NESUS ہے۔ یونانی زبان میں INDUS سمندر کو اور NESUS جزیروں کو کہتے ہیں۔ جب انڈونیشیا پر ہالینڈ کی حکومت تھی تو لفظ انڈونیشیا کا استعمال قانوناً ممنوع تھا کیونکہ یہ تمام جزائر کے اتحاد کی علامت تھا۔ اس وقت انڈونیشیا کو ''جزائر مشرق الہند'' کہا جاتا تھا۔ ترقی پذیر قومی زبان کا استعمال بھی بدیسی حکمرانوں نے ناجائز قرار دیا تھا اور اس کی وجہ بھی انڈونیشی قوم کے اتحاد کو کمزور کرنا تھا۔ کسی بھی ملک کے باشندوں کا کسی ایک زبان پر متفق ہوجانا ان کے اتحاد ہی کی دلیل ہوتا ہے۔ ہالینڈ والوں کو جنہیں ہم ولندیزی کہتے ہیں، انڈونیشی قوم نے اپنے اسی اتحاد سے شکست دی۔ آزادی کی اس جدوجہد میں ایک تماشا اور بھی ہوا۔ انڈونیشی قوم، ولندیزیوں سے برسر پیکار تھی کہ دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی اور اس کے آغاز ہی میں جرمنوں نے ہالینڈ پر قبضہ کرلیا۔ ''مشرق الہند'' یعنی انڈونیشیا پر جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا پھر جنگ کے اختتامی دنوں میں تاریخ نے ایک اور کروٹ لی۔ اسی کے نتیجے میں ہٹلر کو خودکشی کرنا پڑی، جرمنی ہار گیا۔ انڈونیشیا پر ولندیزی اور اتحادی فوجوں نے یلغار کردی مگر جاپانیوں نے انہیں مار بھگایا۔ اس دوران میں جاپانیوں نے یہ پراپیگنڈہ کیا تھا کہ وہ انڈونیشیا کے غریب عوام کو یورپیوں کے ظالمانہ پنجے سے چھڑانے آئے ہیں۔ انڈونیشیا کے باشندے تو بے چارے پریشان تھے ہی جاپانی پراپیگنڈے سے متاثر ہوگئے۔ بہت سے انڈونیشی رہنما یہ بھانپ گئے کہ یہ جاپان کی چال بازیاں ہیں مگر وقت کا تقاضا کچھ اور ہی تھا۔ جن رہنماؤں کو تقاضائے وقت کے تحت یہ احساس تھا کہ اس طرح آزادی کی تحریک چلانے میں بہرحال کچھ نہ کچھ مدد ملے گی، ان میں صدر سوئیکارنو بھی شامل تھے۔

جیسے جیسے جنگ خاتمے کے قریب آئی، جاپانیوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ انڈونیشیا کو آزاد کردیں گے۔ قوم پرستوں کے ایک گروہ نے اس بات کی شدید مخالفت کی کہ وہ کسی حملہ آور فوج سے تحفے کے طور پر آزادی قبول کریں۔

اس موقع پر قومی رہنماؤں میں گرما گرم بحثیں ہوئیں اور ایک مرحلہ تو ایسا آیا کہ جب صدر سوئیکارنو کو اغوا کرلیا گیا، محض اس لئے کہ ان کا وہ بیان شائع نہ ہوسکے جسے دوسرے لیڈروں نے ناپسند کیا تھا۔ آخرکار بیشتر گروہ متفق ہوگئے اور پھر صدر سوئیکارنو نے مختصر لفظوں میں انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان کردیا۔ اس کے باوجود غیر ملکیوں کے تسلط سے مکمل نجات حاصل کرنے کیلئے انڈونیشیا کو طویل جدوجہد کرنا پڑی۔ ولندیزی اتنی آسانی سے انڈونیشیا کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ جرمنوں اور جاپانیوں کے زوال کے

بعد ہالینڈ نے اتحادیوں کی مدد سے ایک بار پھر انڈونیشیا پر یلغار کردی امریکہ اس کا پشت پناہ تھا۔ کروڑوں ڈالر انڈونیشیا کو دوبارہ فتح کرنے پر خرچ ہونے لگے اور یہ کروڑوں ڈالر ہالینڈ کو امریکی حکومت فراہم کر رہی تھی۔ صدر سوئیکارنو اور دوسرے رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا مگر ان کے ساتھی بڑی بہادری کے ساتھ تحریک آزادی چلاتے رہے۔ انڈونیشیا کے ایک بڑے جزیرے سماٹر میں ہنگامی حکومت قائم کردی گئی جو ولندیزیوں کی پہنچ سے باہر تھی۔ جاوا میں جنرل سدیرمن کی کمان میں آزادی کی جنگ لڑی جارہی تھی۔ جنرل سدیرمن اس وقت شدید علیل تھے۔ وہ مرض الموت میں مبتلا تھے لیکن انہوں نے اپنی فوجوں کی قیادت نہ چھوڑی، وہ اتنے بیمار ہوگئے تھے کہ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر لے جایا جاتا تھا۔ زندہ قوموں کی تاریخ میں جنرل سدیرمن ایسے لوگ ہی روشنی اور زندگی کی علامت کہلاتے ہیں۔

آخرکار جب پہلے سے مقرر اقوام متحدہ کے کمیشن نے اس مسئلے پر سرگرمی دکھانا شروع کی تو امریکہ پر دباؤ بڑھا۔ ''مارشل پلان'' کے تحت امریکہ، ہالینڈ کو جو مدد دے رہا تھا، وہ بند کردی گئی۔ امریکی امداد بند ہونے کے بعد ہالینڈ کو مجبوراً گھٹنے ٹیکنا پڑے۔ انڈونیشیا کے قومی رہنماؤں کو رہا کردیا گیا۔ ہالینڈ کی ملکہ انڈونیشیا کی علامتی سربراہ قرار پائی۔ چند سال بعد یہ بندھن بھی توڑ دیا گیا اور انڈونیشیا دنیا کی ایک مکمل خودمختار قوم کی طرح اپنے پیروں پر خود کھڑا ہوگیا۔ ''بناڈیا'' میں اعلان کیا گیا کہ اب انڈونیشیا بالکل آزاد اور خودمختار ملک ہے۔ اس کے فوراً بعد ہی ''بناڈیا'' کا نام جکارتہ رکھ دیا گیا جو اس کے قدیم جاوائی نام ''لیکارتا'' کی جدید صورت ہے۔ یہ واقعہ 27 دسمبر 1949ء کا ہے۔

اس کے بعد صدر سوئیکارنو کی قیادت میں انڈونیشیا ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔ اس نے غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی اپنائی۔ اس کی پاداش میں اسے ''دائیں بازو'' کی سازشوں سے نمٹنا پڑا۔ بنڈونگ کانفرنس میں صدر سوئیکارنو نے جو کچھ کہا تھا اس کا عملی مظاہرہ خود انڈونیشیا میں شروع ہوگیا، یعنی کسی ملک کی اقتصادیات اور عقل و ذہانت پر وہیں کے طاقتور گروہوں کے ذریعے قبضہ کرلیا جائے۔ اسی کے نتیجے میں انڈونیشیا کی ''دائیں بازو'' کی ایک سیاسی جماعت حرکت میں آگئی۔ ظاہر ہے کہ اس کی ڈوریاں ایک غیر ملکی سپر پاور کے ہاتھ میں تھیں، پھر اسی جماعت کے ایک رکن نے صدر سوئیکارنو پر قاتلانہ حملہ کیا جو ناکام رہا۔ صدر سوئیکارنو سے ملاقات کے بعد میں نے جکارتہ میں اسی حکومت دشمن سیاسی جماعت سے رابطہ قائم کرلیا تھا۔ اب میں عذرا خان نہیں بلکہ ہانگ کانگ کی مادام ژی تھی۔ میں نے اسی حیثیت سے جکارتہ کے ایک ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر پلاسٹک میک اپ کیا تھا اور اپنی جلد کی رنگت بھی تبدیل کرلی تھی۔ کانٹیکٹ لینسز نے میری پتلیوں کا رنگ بھی بدل دیا تھا۔ کوئی بھی مجھے دیکھ کر یہی کہتا اور سمجھتا کہ میں چینی نژاد ہوں۔ بطور احتیاط اپنی اس نئی شخصیت سے میں نے انڈونیشی انٹیلی جنس کے سربراہ کو بھی آگاہ کردیا تھا۔ میں بہرحال ایک غیر ملک میں تھی اور حکومت دشمن ایسے عناصر سے رابطے قائم کررہی تھی جن میں سے چند افراد پر حکومت کی کڑی نظر تھی۔ انہی میں سے ایک انڈونیشیا کی مرحوم و مشہور شاعر خیرالانوار کا ہم نام تھا میں اسے صرف انوار کہتی تھی۔

انوار بڑی آسانی سے میری گرفت میں آگیا تھا اس لئے کہ وہ نوجوان بھی تھا اور عاشق مزاج بھی! ایسے عاشق مزاجوں کو قابو میں کرلینا کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوتا۔ اسی کے ایک قریبی ساتھی نے

صدر سوئیکارنو پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔

انڈونیشیا میں اپنی تمام تر سرگرمیوں کے باوجود میں اپنے ملک کے حالات سے بے خبر نہیں تھی۔ اٹھارہ روز کی جنگ کے دوران میں پاکستان نے ہندوستان کی فوجی برتری کے زعم کو خاک میں ملا دیا تھا اور وہ معاہدہ تاشقند پر مجبور ہوگیا تھا۔ اس عرصے میں ''آپریشن سیل ہیڈکوارٹر'' سے بھی میرا رابطہ بحال رہا تھا۔ میرے جیالوں نے دوران جنگ میں مختلف محاذوں پر کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ میں نے ہنگامی صورتحال کے تحت اسلام آباد کے مختصر قیام کے دوران ہی میں ''آپریشن سیل'' کو وزارت داخلہ کا پابند کردیا تھا۔ وقتی طور پر ''آپریشن سیل'' وزارت داخلہ کا ہر حکم ماننے پر مجبور تھا اور یہ مجبوری خود اختیاری تھی۔ کمانڈر نواز اور عثمانی، دونوں ہی کو میں نے واضح ہدایات دے دی تھیں۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ جب میں انڈونیشیا میں تھی تو پاکستان میں ''آپریشن سیل'' نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے! بہرحال جس روز جکارتہ میں مجھے جنگ بندی کی اطلاع ملی تو میرا دل مطمئن ہوگیا۔ اب مجھے پاکستان واپسی کی زیادہ جلدی نہیں تھی اب میں لیوسی اور ڈاکٹر رچرڈ سے نمٹ کر ہی انڈونیشیا سے واپس جانا چاہتی تھی۔

لیوسی یا ڈاکٹر رچرڈ تک پہنچ جانا کوئی ہنسی کھیل نہیں، اس کا اندازہ مجھے پوری طرح تھا، لیکن اس کیلئے میں نے جو راستہ اختیار کیا تھا اس سے پوری طرح مطمئن تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ کوئی معمولی شخصیت نہیں تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے مجھے پاکستان سے اغوا کرالیا تھا۔ ان دنوں وہ قاہرہ میں تھا۔ میری آپ بیتی میں اکثر اس کا ذکر آتا رہا ہے۔ یہ جاننے کے بعد کہ میں ابھی تک دوشیزہ ہی ہوں اور میں نے شادی نہیں کی، اس نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بھی بنانا چاہا تھا۔ میں اس کے دست ہوس سے بچ کر نکل گئی تھی اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا تھا پھر اس نے میری ہم شکل چھوٹی بہن ذکیہ کو اغوا کرلیا تھا تاکہ ذکیہ کی بازیابی کیلئے مجھے مجبوراً دوبارہ پاکستان سے مصر جانا پڑے اور یوں وہ مجھ پر ہاتھ ڈال سکے۔ مجھے دوبارہ قاہرہ جانا پڑا تھا اور ڈاکٹر رچرڈ سے میری معرکہ آرائی رہی تھی۔ ذکیہ کو میں پاکستان لے آنے میں کامیاب ہوگئی تھی اور پھر ذکیہ ہندوستان چلی گئی تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ ہی کے ایک نائب سولومن کا تعاقب کرتی ہوئی میں مشرقی پاکستان سے ہندوستان پہنچ گئی تھی اور پھر وہاں بھی ڈاکٹر رچرڈ سے میرا معرکہ رہا تھا۔ ذکیہ کو بھی میں نے ہندوستان ہی کے ایک شہر کلکتہ میں رہنے کی تاکید کی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ دوبارہ قاہرہ کا رخ کرے اور ڈاکٹر رچرڈ یا اس کے گرگوں کے ہتھے چڑھ جائے۔ دہلی سے ذکیہ کو کلکتہ بھیجنے کے بعد ہی میں ڈاکٹر رچرڈ اور سولومن کے پیچھے لگ گئی تھی۔ یہ ڈاکٹر رچرڈ کی خوش قسمتی تھی کہ جب دہلی میں، میں اس کے ٹھکانے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھی تو وہ اسی رات ہندوستان سے انڈونیشیا کیلئے روانہ ہوچکا تھا۔ اس کا نائب سولومن میرے قابو میں آگیا تھا۔ میں اسے اپنے طاقت ور ذہن کا تابع بنانے میں کامیاب رہی تھی۔ سولومن کا ذہن پڑھ کر ہی مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کس لئے انڈونیشیا گیا ہے۔ میں دہلی ہی میں سولومن کو ٹھکانے لگا دیتی مگر ذرا سی غلطی سے کام بگڑ گیا۔ وہ میرے طاقتور ذہن کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ اس کے نصیب میں پاکستان کی مٹی لکھی تھی۔ میں ہندوستان سے لوٹ آئی اور پھر سولومن سے میرا آخری معرکہ پاکستان ہی میں ہوا۔ میں اس کے ناپاک وجود کو ہمیشہ کیلئے موت کی نیند سلانے میں کامیاب رہی۔ مجھ سے سولومن ہی کا انتقام لینے لیوسی پاکستان پہنچی اور پھر وہ بھی ڈاکٹر رچرڈ ہی کی طرح انڈونیشیا آئی۔

اس کے آقاؤں کا یہی حکم تھا اور اب میں بھی انڈونیشیا میں تھی۔ مختصراً میں نے یہ واقعات اس لئے بیان کیے کہ لیوسی کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد میرا ذہن ماضی کے سفر پر نکل گیا تھا۔ میں ایک پراسرار تجربے سے گزر کر پھر زمانہ حال میں آ گئی تھی۔ میرے لئے تو ماضی کا وہ سفر صرف ایک لمحہ تھا، مگر میری سرگزشت پڑھنے والوں کیلئے وہ پوری ''ایک صدی'' تھی۔

ماضی و حال کے اس پراسرار تجربے سے قطع نظر میری آپ بیتی صرف میری ہی آپ بیتی نہیں، یہ پاکستان اور دیگر کئی ممالک کے دور گزشتہ کی آپ بیتی بھی ہے۔ انہی میں سے ایک ملک انڈونیشیا بھی ہے۔

''دائیں بازو'' کے ایجنٹوں کا ''طریق واردات'' اب میرے لئے نیا نہیں رہا تھا۔ مجھے ان سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے عرصہ دراز ہو چکا تھا۔ ہر ملک میں دو مخصوص نظریات رکھنے والی سیاسی جماعتوں اور تحریکوں کو اپنا آلہ کار بناتے تھے۔ اس کا تجربہ مجھے اپنے ملک میں بھی ہو چکا تھا۔ انتہاپسند سیاسی جماعتیں اور تحریکیں ان کا پہلا ہدف ہوتی تھیں، خصوصاً دائیں بازو کی ایسی سیاسی جماعتیں جو مذہب کی آڑ میں اقتدار پر قبضے کے خواب دیکھتی رہتی تھیں۔ ایسی جماعتوں کی سمجھ میں کبھی یہ بات نہیں آ سکی کہ ماضی میں ''صلیبی جنگیں'' بلاسبب نہیں تھیں یا پھر وہ دانستہ یہ اہم نکتہ سمجھنے سے گریز کرتے رہے ہیں۔ یہودیوں کے حق میں آواز بلند کرنے والوں کو بھلا اسلام سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے، وہ تو دنیا کے مختلف خطوں میں اسلام کے تحفظ کے نام پر خود اپنے سیاسی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور ان کے سیاسی مفادات خود ان کی معاشی ترقی کی ضمانت ہیں۔ سو آج اقوام عالم میں وہی سربلند ہیں ورنہ تو چشم فلک نے ایسے بھی تماشے دیکھے ہیں کہ وہ جو آج سربلند کہلاتے ہیں، کبھی وہی گھٹنوں کے بل اپنی عبادت گاہوں میں پڑے ہوتے تھے۔ ان کے درمیان ہاتھ دعائیہ انداز میں بلند ہوتے اور وہ گڑگڑاتے ''اے خداوند خدا! ہمیں ان کی یلغار سے بچا لے کہ وہ ہم پر اگنی بان چھوڑتے ہیں۔ وہ ہمیں ہمارے اندر اور باہر سے فتح کر لیتے ہیں؟''

یہ اندر اور باہر سے فتح کرنے والے کون تھے؟
''اگنی بان'' کون چھوڑتا تھا؟
اس عہد کا جدید ترین اسلحہ کس کے پاس تھا؟
کون لوگ تھے یہ جنہوں نے یورپ، افریقہ اور ایشیا پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی؟
ہاں یہ اسلام کے نام لیوا ہی تھے! ہاں وہ بھی مسلمان ہی تھے!

اور پھر چشم فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ بساط الٹ گئی، اب منظر بدل چکا تھا، دست دعا اب بھی بلند تھے۔ ''یا خدا! ہمیں بچا لے۔'' انہیں دعائیں مانگنے والوں کو ان کے اندر اور باہر سے فتح کر لیا گیا جو مقہور تھے، سربلند ہوئے اور جو سربلند کہلاتے تھے، ان کے اونچے برج زمین پر آ رہے، کیوں؟ ایسا کیوں ہوا؟

اس سوال کا جواب ماضی قریب کی تاریخ میں دفن ہے۔ میر صادق، و میر جعفر اس کا جواب ہیں جو ہر زمانے میں مختلف ناموں سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں روپ بدل بدل کر یہی

تو سوانگ رچاتے رہتے ہیں اور حاضر ہیں۔ انہوں نے ایسا بہروپ بھرا ہے کہ پہچان کر بھی نہیں پہچانے جاتے۔ ان کے جسموں پر زرنگار قبائیں ہیں۔ ان کے جسم اجلے مگر قلب تاریک ہیں۔ کہیں یہ مذہب کی آڑ لئے بیٹھے ہیں اور کہیں قوم پرستی کی محفوظ پناہ گاہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ کیا، ستم ہے کہ یہ بےنقاب ہو کر بھی بےنقاب نہیں ہیں!

عہد کے فرق سے ان کا طریقہ کار بدل گیا ہے۔ اب یہ ہی نظر نہیں آتے۔ ان کے ساتھ پورے پورے گروہ ہوتے ہیں۔ یہ اب دنیا کے ہر خطے میں گروہ بند ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہم خیال پیدا کر لئے ہیں، جماعتیں اور تنظیمیں بنالی ہیں۔ ان کے حوصلے اب تو اتنے بڑھ گئے ہیں کہ یہ ملکوں پر بھی قبضہ کر لیتے ہیں۔ سیدھے سادے عوام کے جذبات سے کھیلنا، مذہب کے نام پر انہیں بےوقوف بنانا اور اپنی راہ پر لگا لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور جب عوام بےوقوف نہیں بنتے، ان کے کھوکھلے نعروں کے فریب میں نہیں آتے تو ان کے غیر ملکی آقا دوسرے حربے آزماتے ہیں۔ وہ اپنے انہی ''غلاموں'' کے ذریعے ایسی حکومتوں کے تختے الٹ دیتے ہیں جو ان کے سیاسی مفادات کی تکمیل میں آڑے آتی ہیں۔ ایسے سربراہوں کا ''بلیک وارنٹ'' جاری ہو جاتا ہے، ان پر یہی ''غلام ابن غلام'' قاتلانہ حملے کرتے ہیں۔

میں جس زمانے کا ذکر کر رہی ہوں، انڈونیشیا بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔ صدر سوئیکارنو پر ناکام قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ ان ''غلاموں'' کو گائیڈ لائن دینے کیلئے انڈونیشیا میں موجود تھا۔ اسی کے ایک نائب سولومن نے میرے ملک کے ایک حصے میں علیحدگی کے بیج بوئے تھے۔ انڈونیشیا سے نمٹ کر وہ خود میرے ملک پہنچ سکتا تھا یا اپنے کسی نائب کو بھیج سکتا تھا۔ میں اسی لئے انڈونیشیا کی سرزمین کو اس کا مدفن بنا دینا چاہتی تھی۔ اسی کے قدموں کا کوئی سراغ لگانے کی خاطر میں نے خیرالانوار اور دوسرے حکومت دشمن عناصر سے ربط ضبط بڑھایا تھا۔ انوار پر اپنی خصوصی توجہ کا سبب میں بیان کر چکی ہوں۔ وہ ایک ایسے ''غلام'' کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا جس نے انڈونیشیا کے سربراہ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

انوار کے سامنے خود کو میں نے ''دائیں بازو'' کے نظریات کا حامی ظاہر کیا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ میرے قریب تو آ گیا تھا مگر ابھی پوری طرح کھلا نہیں تھا۔ جکارتہ کے ایک ہوٹل میں، میں اس وقت انوار ہی کی منتظر تھی۔ اس نے شام کو آنے کا وعدہ کیا تھا اور اب شام ہو رہی تھی۔

فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی اس لئے میں نے اپنے شانوں پر شال ڈال رکھی تھی۔ کچھ دیر پہلے بارش ہوئی تھی جس سے خنکی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب پھر بارش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوئی حسین و خوبصورت شہر جکارتہ کا نظارہ کر رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کافی منگوا کر پیوں مگر مجھے انوار کا انتظار تھا کہ وہ آ جائے تو دونوں ساتھ ہی کافی پیئں گے۔

انوار کے خدوخال موزوں، اعضا متناسب اور جسم گٹھا ہوا تھا البتہ قد پستی کی طرف مائل تھا۔ قد میں وہ مجھ سے دو ایک انچ کم ہی ہوگا، رنگ ہلکا گندمی تھا، اس کی آنکھوں سے ایک خاص قسم کی بےچینی کا سا اظہار ہوتا تھا جو عموماً ایسے لوگوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے جن کے دل میں چور ہوتا ہے یا جن کا ظاہر و

باطن یکساں نہیں ہوتا۔ وہ خوش لباس تھا اور عموماً پینٹ شرٹ ہی پہنتا تھا۔ ایک آدھ بار وہ مجھے سوٹ پہنے ہوئے بھی نظر آیا تھا۔ سیاہ مخملی ٹوپی اس کے لباس کا خاص جزو تھی۔ وہ چاہے صرف پینٹ شرٹ پہنتا یا سوٹ زیب تن کئے ہوتا، ٹوپی اس کے سر پر ضرور ہوتی۔ اس ٹوپی کو انڈونیشی ''پچی'' کہتے ہیں جو قومی اتحاد کی علامت کہلاتی ہے۔ سیاست سے وابستہ افراد کو میں نے عموماً ''پچی'' پہنے ہوئے ہی دیکھا اور انوار کا تعلق بھی ایک انتہاپسند سیاسی جماعت ہی سے تھا۔ صدر سوئیکارنو کو بھی میں نے ''پچی'' پہنے ہی دیکھا تھا۔ یہ سیاہ مخملی ٹوپی اپنی وضع کے اعتبار سے رام پور کی سیاہ مخملی ٹوپی سے بہت مشابہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ ''پچی'' زیادہ چوڑی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف سے اس کی پٹیوں کی سلائی نہیں ہوتی۔

''پچی'' پہنے ہوئے انوار مجھے کچھ مضحکہ خیز سا لگتا تھا، مگر اس سے کم از کم اس کے قد میں قدرے اضافہ ہوجاتا تھا۔ انوار سے میں نے اپنا تعارف ایک سیاح کی حیثیت سے کرایا تھا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ انڈونیشیا پہلی بار آئی ہوں مگر انڈونیشی قومی زبان ہانگ کانگ ہی میں سیکھ لی تھی۔ اس پر انوار نے قدرے حیرت کا اظہار کیا تھا، پھر خود ہی کہنے لگا تھا کہ ہماری قومی زبان بہت آسان ہے اور چاہے تو اسے ہر شخص سیکھ سکتا ہے۔ میں اس سے انڈونیشی زبان ہی میں گفتگو کرتی تھی اور دانستہ ایک آدھ لفظ غلط بول جاتی تھی۔ انوار مجھے اس لفظ کا صحیح تلفظ اور معنی بتا کر بہت خوش ہوتا تھا۔ اس سے میرا مقصد محض یہ ہوتا تھا کہ زبان کے معاملے میں اپنا مبتدی ہونا ظاہر کرسکوں۔ وہ مجھ سے اظہار عشق کرنے کا حوصلہ ابھی نہیں کر پایا تھا، مگر اس کی ذومعنی باتوں اور رویے سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ شاید مزید انتظار نہیں کرے گا۔

اس روز وہ مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی آگیا اور اپنے مخصوص انداز میں کمرے کے دروازے ہی پر رک کر مسکراتے ہوئے سر جھکایا، میں پھر جواباً مسکرائی اور اسے اندر بلالیا پھر اس سے پوچھا ''آج تم جلدی کیسے آئے؟''

''مادام ژی کے حسن کی کشش کھینچ لائی۔'' اس نے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''سادہ لباس والوں نے آج تمہارا پیچھا نہیں کیا؟'' میں نے آہستہ سے ہنس کر پوچھا وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اس کی نگرانی ہوتی ہے۔

''ان کا تو کام ہی یہی ہے، میں نہیں ڈرتا ان سے!'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''نوکر ہیں بے چارے! کبھی کبھی تو ان بے چاروں پر مجھے ترس بھی آنے لگتا ہے۔ کل ہماری حکومت ہوگی تو یہ غریب ہمارے اشاروں پر ناچنے کیلئے مجبور ہوں گے۔ ذرا سوچ مادام کہ وہ آدمی کتنا قابل رحم ہوتا ہے جس کی اپنی پسند یا ناپسند نہیں ہوتی۔ فرض کرو آج جو لوگ حکومت کررہے ہیں، کل معتوب ہوجاتے ہیں، دارالاسلام، نہفتہ العلماء پارٹی یا ماشوی پارٹی برسراقتدار آجاتی ہے تو یہی سادہ لباس والے آج جن لوگوں کے حکم پر ہماری نقل وحرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں، کل اپنے انہی آقاؤں کے پیچھے لگے پھریں گے اور ان کا کہیں آزادانہ آنا جانا دوبھر کردیں گے، ہے کہ نہیں؟''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو، مگر تم ہی تو ایک روز بتا رہے تھے کہ ماشوی پارٹی پر حکومت نے پابندی لگا

دی ہے وہ کیسے برسراقتدار آسکتی ہے؟'' میں نے اس سے دانستہ انڈونیشی سیاست پر گفتگو شروع کردی تھی تاکہ کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔ ''ماشوی'' کا مطلب ''مجلس شوریٰ'' ہے۔ یہ پارٹی بھی انتہاپسند پارٹیوں میں سے تھی۔

''کسی پارٹی پر پابندی لگانے سے کچھ نہیں ہوتا مادام!'' وہ بولا ''بلکہ اس سے تو وہ پارٹی اور زیادہ مقبول ہوتی ہے، ویسے میں مثالاً یہ بات کہہ رہا تھا۔''

پھر میں نے روم سروس سے رابطہ قائم کرکے اپنے اور اس کیلئے کافی لانے کو کہہ دیا اور اس کی طرف مڑ کر بولی ''تمہارے انتظار میں، میں نے بھی کافی نہیں پی تھی۔''

''تمہاری انہی اداؤں پر تو قربان ہونے کو جی چاہتا ہے مادام!'' انوار نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہورہا تھا۔

''یہ بتاؤ، اگر ماشوی پارٹی کی طرح تم لوگوں کی تحریک پر بھی قانوناً پابندی لگادی گئی تو؟'' میں نے حسب معمول اس کی بے تکلفی کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''اول تو یہ ممکن نہیں اس لئے کہ انڈونیشی افواج۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا، پھر جلدی سے بولا ''چھوڑو نا یہ فضول باتیں! تم ہمیشہ سیاست ہی پر گفتگو کرنے لگتی ہو، کبھی پیار کی باتیں بھی تو کرلیا کرو!'' اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اصل بات گول کرگیا۔ یقیناً روا روی میں وہ کوئی اہم بات بتانے والا تھا۔ انڈونیشی افواج کے ذکر پر میرے کان کھڑے ہوگئے تھے۔

''تم سیاسی آدمی ہو اور ظاہر ہے کہ تمہیں اسی موضوع سے دلچسپی ہوسکتی ہے۔ میں اسی لئے اس موضوع پر بات کرتی ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود مجھے بھی دیس دیس کی سیاست سے بڑی دلچسپی ہے۔'' میں نے بات برابر کی، پھر جو بات اس نے ادھوری چھوڑ دی تھی اس کی طرف آگئی۔ ''تم انڈونیشی افواج کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔''

اس کے چہرے سے قدرے الجھن کا اظہار ہونے لگا جیسے یہ ذکر چھیڑ کر وہ خود ہی پھنس گیا ہو یا اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہ کرنا چاہتا ہو۔

''اگر یہ تمہاری جماعت کا کوئی سیکرٹ ہے تو نہ بتاؤ مجھے! میں اصرار نہیں کروں گی۔'' میں نے دانستہ اسے شہہ دینے کی خاطر لفظ ''سیکرٹ'' استعمال کیا'' کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر ایک کو نہیں بتائی جاتیں، خاص طور پر ان لوگوں کو جن پر بھروسہ نہ ہو۔''

''ہرگز یہ بات نہیں ہے مادام! ایسی کوئی بات نہیں کہ مجھے تم پر بھروسہ نہیں۔ تمہارے لئے یہ قطعی غیر متعلق بات تھی۔ اس وجہ سے میں چپ ہوگیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی کہ انڈونیشی افواج میں ہماری پارٹی کے حامی بھی موجود ہیں یا اس بات کو یوں کہہ لو کہ ان کے جو نظریات ہیں، وہی نظریات ہماری پارٹی کے ہیں۔ ہم ہر قیمت پر انڈونیشیا میں اسلامی نظام لاکر رہیں گے چاہے ہمیں اس کیلئے کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دینا پڑیں۔ تحریک دارالاسلام کامیاب ہوکر رہے گی!'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز پرجوش ہوگئی۔

''زندہ باد!'' میں نے ہنستے ہوئے اس انداز میں تالی بجائی جیسے کسی سیاسی جلسے میں لیڈر کی

تقریر سن کر اس کے پرستار تالیاں بجاتے ہیں۔ میں نے اس سے وہ بات کہلوا ہی لی تھی جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رہی اسلامی نظام لانے کی بات تو میرے نزدیک یہ اس کے دل کی بات نہیں تھی۔ اس نے یہ بات محض دکھاوے کیلئے کی تھی۔ اس کے لہجے میں خلوص اور سچائی کی جھلک نہیں تھی۔ وہ صرف "ڈرامہ" کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی اس کی خوش فہمی ہی معلوم ہوتی تھی کہ اس کی پارٹی کے حامی انڈونیشی افواج میں بھی موجود ہیں۔ بحیثیت مسلمان انڈونیشی افواج میں سبھی کو اپنے دین سے محبت ہوسکتی تھی، مگر اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ وہ کسی خاص سیاسی پارٹی کے حامی تھے، میرے نزدیک خام خیالی یا خوش فہمی ہی تھی۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ انوار جس جماعت کا رہنما تھا اور جس کی پرزور وکالت کر رہا تھا، جس تحریک دارالاسلام کے بارے میں وہ یہ بتا رہا تھا کہ انڈونیشی افواج میں بھی اس کے حامی موجود ہیں وہ تحریک، وہ جماعت اپنی زیر اثر طبقوں پر حکومت کرنے میں تشدد سے کام لیتی تھی۔ یہ پارٹی تشدد پسند تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب صدر سوئیکارنو پر قاتلانہ حملہ ہوا تو اسی روز حکومت نے اعلان کیا کہ فوج کے ذریعے اس تحریک کو کچل دیا جائے گا۔ اگر فوج میں اس تحریک کے حامی افراد ہوتے تو ایسا اعلان نہ کیا جاتا۔ اسی کے ساتھ میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ کسی بھی ملک کی فوج میں انفرادی سطح پر مختلف نظریات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے مختلف ممالک میں فوجی انقلابات نہ آئے ہوتے۔ اس امکان کو بہرحال نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ انفرادی سطح پر انڈونیشی افواج میں بھی مختلف نظریات رکھنے والے بااثر افراد موجود ہوں اور میری نظر میں ذاتی طور پر انہیں یہ حق حاصل تھا۔ دراصل انڈونیشیا میں میرے علم و اطلاع کے مطابق صدر سوئیکارنو اور دیگر رہنماؤں کی ایک بہت بڑی کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے ولندیزی حکومت کو شکست دینے کیلئے مذہبی اور غیر مذہبی جماعتوں کا ایک مضبوط متحدہ محاذ بنالیا تھا جو اپنے مقصد میں کامیاب ہوا، یعنی اس متحدہ محاذ نے آزادی حاصل کرلی، لیکن آزادی کے بعد مختلف گروہوں کو متحد رکھنا مشکل ہوگیا۔ ان دنوں انڈونیشیا کے سیاسی حالات کیا تھے، ان حالات سے مجھے بس ایک حد تک دلچسپی تھی۔ میں بحیثیت پاکستانی کسی بھی قسم کی مداخلت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ان سیاسی حالات سے آگاہی حاصل کرنے کا میرا مقصد غیر ملکی مداخلت کاروں یا ایجنٹوں تک پہنچنا تھا "دائیں بازو" کے ان ایجنٹوں تک پہنچنا جو انڈونیشی حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتے تھے وہ غیر ملکی ایجنٹ جو انڈونیشیا کے دشمن اور میرے ملک میں بھی ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ انہی غیر ملکی ایجنٹوں کے اشارے اور ایما پر بعض انتہاپسند جماعتیں مذہب کا نام لے کر اپنے مخصوص اغراض و مقاصد کے تحت ملک پر قبضہ جمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اپنے ملک ہی کی طرح میں انڈونیشیا میں بھی انڈونیشی حکومت کی کسی ایجنسی یا ادارے کے تحت عملی اقدامات کے حق میں نہیں تھی۔ بہ امر مجبوری ہی میں انڈونیشی حکام سے رابطہ قائم کرتی۔ میں انڈونیشیا میں بھی انہی غیر ملکی ایجنٹوں کی تلاش میں تھی جو خود میرے ملک میں تخریبی سرگرمیوں کے ذمے دار تھے۔

انوار کا تعلق تحریک دارالاسلام سے تھا اور یہ جماعت انتہاپسند تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ اس تحریک کے پیچھے غیر ملکی ایجنٹوں کا ہاتھ ہے۔ میں اسی لئے انوار اور دیگر انتہاپسندوں سے رابطے قائم کر رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد جب انوار چلا گیا تو میں ہوٹل سے نکلی۔ مجھے اب ایک اور انتہاپسند جماعت

کے لیڈر پرامودیا سے ملنا تھا۔ اس نے آج رات کھانے پر میری دعوت کی تھی۔ پرامودیا اوسط عمر کا آدمی تھا۔ اس کے گھر دو روز قبل بھی میں جاچکی تھی۔ بظاہر وہ کٹر مذہبی لگتا تھا، مگر یہ تصویر کا صرف ظاہری رخ تھا۔ اپنے لباس اور وضع قطع سے بھی وہ یہی ظاہر کرتا تھا کہ اسے مذہب سے خصوصی لگاؤ ہے۔ اپنی گفتگو میں بھی وہ عموماً مذہبی حوالے دینے کا "شوقین" تھا مگر اس کے پیچھے عموماً یہ جذبہ ہی کارفرما نظر آتا تھا کہ دوسرے پر اس کی علمیت کا رعب پڑے۔ اگر واقعی اندر سے بھی وہ ایسا ہی ہوتا جیسا خود کو عام طور پر ظاہر کرتا تھا تو مجھ سے ربط ضبط بڑھانے کی کوشش نہ کرتا۔ اس کے علاوہ اسے خود کو وطن پرست ظاہر کرنے کا بھی "شوق" تھا۔ اب تک کی ملاقاتوں میں اس نے "انڈونیشیا" کو "انڈونیشیا" کہنے کے بجائے "تانہ آیر کیتا" ہی کہا تھا۔ محب وطن افراد کی زبان سے عموماً میں نے "انڈونیشیا" کیلئے یہی الفاظ سنے تھے۔ "تانہ" مٹی کو "آیر" پانی کو اور "کیتا" ہمارا کو کہتے ہیں، یعنی ہماری زمین اور ہمارا سمندر "یا" ہمارے جزیرے "ہمارے سمندر" میرا اندازہ پرامودیا کے بارے میں یہ تھا کہ نہ تو وہ مذہبی ہے نہ محبّ وطن! یہی سبب ہے کہ وہ خود کو مذہبی اور محب وطن ظاہر کرتا رہتا ہے۔ پرامودیا مجھے انور سے بھی زیادہ "کام کا آدمی" معلوم ہوتا تھا۔ ایک عورت ہونے کے ناطے میں نے پہلی ہی ملاقات میں اس کی آنکھوں کی گردش اور دیکھنے کے انداز سے یہ سراغ لگالیا تھا کہ وہ جتنا پارسا بنتا ہے اس کے برعکس ہے۔

اپنے ہوٹل سے نکل کر میں ایک "بچک" میں بیٹھ گئی اور پرامودیا کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

اس زمانے میں، انڈونیشیا کے شہروں میں ٹیکسیاں کم تعداد میں تھیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کیلئے سائیکل رکشا چلتے تھے جنہیں "بچک" کہا جاتا تھا۔ "بچک" کی ایک پرلطف خصوصیت وہ آواز ہے جو ربر کی ایک پٹی سے نکلتی ہے۔ ربر کی اس پٹی کو رکشے کے نیچے کھینچ کر باندھا جاتا ہے۔ جب رکشے والا پیڈل چلاتا ہے اور پہیے گھومتے ہیں تو ربر سے "گھر گھر" کی آواز بلند ہوتی ہے۔ آواز کی تیزی کا انحصار رکشے کی رفتار پر ہوتا ہے۔ اس سے رکشے والے اور سواری دونوں کو حرکت کا احساس ہوتا ہے اور پیدل چلنے والے راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ "بچک" کی یہی پرلطف آواز سنتی ہوئی میں اپنی منزل تک پہنچ گئی۔ اپنے بارے میں پرامودیا کو بھی میں نے وہی کہانی سنائی جو انوار کو سناچکی تھی۔

پرامودیا مجھے منتظر ہی ملا۔ اس نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ میرا استقبال کیا اور حسب معمول اس کی آنکھیں "گردش" میں آگئیں۔

اس کا گھر خاصا خوبصورت اور بڑا تھا۔ مردانہ حصہ غالباً بالکل الگ تھا۔ پہلے بھی وہاں مجھے ایک ملازم کے سوا کوئی نظر نہیں آیا تھا اور آج بھی یہی صورت تھی۔ پرامودیا خاص انڈونیشی لباس میں نظر آرہا تھا۔ سر پر "پچی" یعنی مخملی سیاہ ٹوپی تھی، اوپری جسم پر موٹے کپڑے کی قمیص اور نیچے "سرانگ" پہنے ہوئے تھا۔ "سرانگ" عورتیں بھی پہنتی ہیں اور مرد بھی، یہ دونوں ہی کا مشترکہ لباس ہے۔ تہبند کی طرح اسے جسم کے نچلے حصے پر باندھا جاتا ہے، مخصوص انداز میں! انڈونیشی باشندے عموماً اپنے گھروں میں "سرانگ" پہنے ہی نظر آتے ہیں۔ پرامودیا نے آج رات اپنے کئی اور ساتھیوں سے ملوانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ میں نے اسی لئے پہلے انہی کے بارے میں پوچھا۔

"آج ہماری پارٹی کی ایک ہنگامی میٹنگ تھی، سب اسی میں شرکت کرنے گئے ہیں۔ مجھے بھی

جاتا تھا مگر تمہاری وجہ سے نہیں گیا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں سمجھ گئی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے کسی اور کو کھانے پر مدعو ہی نہیں کیا ہوگا۔ کسی اور کو مدعو نہ کرنے کی وجہ کا بھی مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا، لیکن صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب ہم دونوں کھانا کھا چکے، وہ ملازم بھی چائے دینے کے بعد جانے کب اور کہاں غائب ہوگیا!

چائے پیتے پیتے وہ ایک دم اٹھا۔ ''آج ہوا کچھ زیادہ ہی تیز چل رہی ہے، میں کھڑکیاں بند کردیتا ہوں۔''

میں کچھ نہیں بولی اور دل ہی دل میں اس کی حماقت پر ہنسی کہ وہ مجھے بالکل احمق ہی سمجھ رہا ہے۔ کھڑکیاں بند کرنے کے بعد وہ پھر میرے قریب صوفے پر آبیٹھا۔ میرا اس کا درمیانی فاصلہ مزید کم ہوچکا تھا۔

''مادام! تم نے مجھے بتایا تھا کہ اب تک غیر شادی شدہ ہو۔'' وہ حریص نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں، کیوں؟'' میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''یہ بات تمہیں اس وقت کیوں یاد آگئی؟''

''یہ بات میں اس لئے کہہ رہا تھا مادام کہ تم نے اب تک شادی نہ کرکے خود پر ظلم کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پہلو بدل کر میرے اور بھی قریب آگیا۔ ''تم اتنی حسین خاتون ہو......! اور یہ کہ شادی کی ایک عمر ہوتی ہے مگر جسمانی تقاضے......شادی اگر نہ بھی کی جائے تو جوانی کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔'' پھر وہ خود ہی کہنے لگا۔ ''ظاہر ہے کہ تم بھی کوئی کم عقل تو ہو نہیں۔ خود تم نے بھی ان تقاضوں کو سمجھ لیا ہوگا! وہ..... مادام! تمہاری زندگی میں مجھ سے پہلے بھی اور مرد تو آتے ہی رہے ہوں گے؟''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو پراموویا؟ صاف صاف کہو نا! ہکلا کیوں رہے ہو۔'' میں نے چائے کی پیالی سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''سوچ رہا ہوں کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔''

''کس بات کا برا نہ مان جاؤں؟''

''میرے اظہار عشق کا!'' اس نے ڈھٹائی سے کہہ ہی دیا۔ پھر بہت تیزی کے ساتھ میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ جھکا۔ میں نے اس کا ارادہ بھانپ کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور قدرے سخت لہجے میں بولی۔ ''تم مجھے شاید غلط سمجھ رہے ہو۔ پراموویا! دوستی کا مطلب میرے نزدیک جوانی کے تقاضے پورے کرنا نہیں ہے۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی! اور یہ کہ میری زندگی میں کوئی آیا یا نہیں!''

''تم تو بلا سبب ناراض ہوگئیں جان! میں تو تمہیں تمہارے ہی بھلے کیلئے سمجھا رہا تھا۔ اچھا چھوڑو، تمہیں برا لگ رہا ہے تو میں یہ باتیں نہیں کرتا۔'' وہ چاپلوسی کرنے لگا۔ ''انڈونیشیا میں تم ہماری مہمان ہو، تم مجھے بدھ مذہب کی پیروکار لگتی ہو، کیوں، میرا اندازہ درست ہے؟''

''اس میں اندازہ لگانے کی کوئی بات نہیں۔ خود میں نے ہی تمہیں گزشتہ ملاقات میں بتایا تھا۔''

میں نے بدستور رکھائی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تم نے ہی بتایا ہوگا، مجھے یاد نہیں رہا۔ دراصل میں یہ اس لئے کہہ رہا تھا کہ تمہیں ''بوروبوڈر'' کی سیر کرادوں۔ نام تو سنا ہوگا تم نے اس کا؟''

''نہیں۔'' میں نے دانستہ انکار کردیا حالانکہ میں اس بدھ معبد کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔

''جکارتہ سے صرف بیس میل مغرب کی جانب وہ استوپ ہے جو ''بوروبوڈر'' کہلاتا ہے۔ دریائے پروگو کے کنارے وہ ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ اگر تم کہو تو کل ہی وہاں ہم دونوں سیر کیلئے چلے چلتے ہیں۔ میں کار کا بندوبست کرلوں گا۔'' وہ مجھے استوپ کی سیر کرانے کا لالچ دینے لگا۔

''شکریہ پراموویا! تم زحمت نہ کرو، میں خود بھی جا کر دیکھ آؤں گی۔ اچھا اب اجازت دو۔'' میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''بیٹھو نا! چلی جانا! ابھی تو تمہیں جی بھر کے دیکھا بھی نہیں۔'' وہ پھر پٹڑی سے اترنے لگا۔ میرے بالکل قریب آ کر اس نے دوبارہ ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تمہارے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں مادام ژی!''

''ہاں پراموویا! ان کی خوبصورتی میں اس وقت اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے جب یہ کسی کے منہ پر پڑتے ہیں۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''ابھی تم خود کہہ چکے ہو کہ یہ فضول باتیں نہیں کرو گے۔''

''میں تو تمہارے حسن بلاخیز کی تعریف کررہا تھا۔'' وہ ترغیبی انداز میں مسکرایا۔

مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میں اس وقت عذرا خان نہیں مادام ژی ہوں اسی لئے اس ''گرگٹ'' کو اتنی بے تکلفی کا موقع بھی دے دیا تھا ورنہ اب تک اس کے منہ پر میری انگلیوں کے نشان بن چکے ہوتے۔ وہ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ہے، اس کا اندازہ تو مجھے پہلے ہی سے تھا اور یہ بھی خیال تھا کہ بدکردار بھی ہوگا مگر اتنی بے صبری اور بے ہودگی کی توقع بہرحال نہیں تھی۔ یہی سوچ کر میں نے ایک حملہ کیا جس سے اب تک گریز کرتی رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ذہن میرے طاقتور ذہن کی گرفت میں تھا۔

عموماً میں اپنے ذہن کی پراسرار قوتوں کو اسی وقت بروئے کار لاتی تھی جب کوئی اور راستہ نہ رہے یا حالات کوئی ناپسندیدہ شکل اختیار کرلیں۔ سیاسی اعتبار سے پراموویا ایک اہم انتہاپسند جماعت کا لیڈر تھا اور اس جماعت کا تعلق ''دائیں بازو'' ہی سے تھا مجھے یقین سا تھا کہ وہ ڈاکٹر رچرڈ کا ''شکار'' ضرور ہوگا۔ اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لینے کے بعد میں نے اس سے پہلا سوال یہی کیا کہ وہ ڈاکٹر رچرڈ کو جانتا ہے؟

اپنے سوال کا جواب مجھے انکار میں ملا۔ وہ ڈاکٹر رچرڈ نامی کسی شخص کو نہیں جانتا تھا۔ میرا دوسرا سوال لیوسی کے متعلق تھا۔ اس جواب سے بھی مجھے مایوسی ہوئی۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے سوالات کی نوعیت بدل دی۔ وہ دونوں کسی اور نام سے بھی تو پراموویا سے رابطہ قائم کرسکتے تھے یا پھر ڈاکٹر رچرڈ یہ کام کسی اور شخص کے ذریعے بھی تو لے سکتا تھا۔ اس کا مثبت نتیجہ نکلا۔ کئی غیر ملکیوں سے اس کے قریبی روابط

تھے۔

پرامودیا سے سوالات کر کے اور اس کا ذہن پوری طرح پڑھ لینے کے بعد مجھے سب سے اہم جو بات معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جس انتہاپسند مذہبی جماعت سے پرامودیا کا تعلق تھا اسے غیرملکی امداد ملتی تھی۔ امداد کا طریقہ بھی انوکھا ہی تھا۔ یہ امداد کھلے عام کی جاتی تھی جس پر انڈونیشی حکومت کوئی اعتراض بھی نہیں کرسکتی تھی۔ جماعت کی طرف سے رسالے کے نام پر انڈونیشی زبان میں ایک "چھیتزا" نکلتا تھا جس کا ایڈیٹر خود جماعت ہی سے وابستہ ایک رکن تھا۔ سولہ صفحے کے اس "پمفلٹ" کی قیمت اندرون ملک تو خیر کم ہی تھی مگر بیرون ملک ایڈیشن کی قیمت چوگنی تھی۔ یہ پندرہ روزہ رسالہ اتنا اندرون ملک تو خیر کیا بکتا ہوگا کہ اس میں پڑھنے کو کچھ ہوتا ہی نہیں تھا مگر اس کا بیرون ملک ایڈیشن خاصی بڑی تعداد میں شائع ہوتا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ غیرممالک کی لائبریریوں کیلئے اسے ملک سے باہر بھیجا جاتا ہے۔ ہر پندرہ روز کے بعد ہزاروں کی تعداد میں ایک غیرملکی سفارتخانہ یہ رسالہ خریدتا تھا اور وہاں سے گویا اپنے ملک کی تمام لائبریریز کو بھیج دیتا تھا۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس رسالے کو "سمندر برد" ہی کردیا جاتا ہوگا۔

دوسری اہم بات جو پرامودیا کا ذہن پڑھ کر معلوم ہوئی، وہ ایک غیرملکی خاتون سے اس کے تعلقات تھے۔ ان تعلقات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور ان کی نوعیت ہر قیدوبند سے آزاد تھی اس نے پرامودیا کو اپنا نام لزی بتایا تھا۔لزی ہی کے توسط سے پرامودیا کی جماعت کو اپنے غیرملکی آقاؤں کے احکام ملتے تھے۔

لزی تم سے کب، کہاں اور کس وقت ملے گی؟ میرے ذہن نے پرامودیا کے ذہن سے سوال کیا۔

جواب ملا کہ لزی اس وقت جکارتہ میں نہیں ہے۔ وہ ایک اور شہر بوگور گئی ہوئی ہے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کب وہاں سے لوٹے گی۔

ٹھیک ہے، اب تم یہ سب باتیں بھول جاؤ گے کہ کسی کو تم نے اپنے غیرملکی دوستوں یا لزی کے بارے میں کچھ بتایا ہے۔ میرے ذہن نے اسے حکم دیا، اسی کے ساتھ یہ تاکید بھی کی کہ مادام ژی سے تم کوئی جذباتی تعلق قائم کرنے کی کوشش نہیں کرو گے اور اسے محض اپنا دوست سمجھ کر احترام کرو گے!

بحیثیت مادام ژی اس کے ذہن میں جو میرے عزائم اور خیالات تھے، انہیں میں نے کھرچ کر پھینک دیا۔ اس کا ذہن پڑھ کر ہی مجھے اس بات کا علم بھی ہوا کہ آج اس نے دست درازی اور زبردستی اپنی بات منوانے کا فیصلہ بھی کرلیا تھا۔

مجھے اس "بگلا بھگت" پر غصہ تو بہت آیا مگر پی گئی۔ جب آوے کا آوا ہی خراب ہو تو کس کس پر غصہ اتارا جائے۔ پھر یہ کہ میں نے خود کو ایک آزاد خیال غیرملکی عورت کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ ایسی صورت میں پرامودیا کو کوئی سزا دینا مناسب نہیں تھا۔

مزید چند باتیں معلوم کرنے کے بعد پرامودیا کے ذہن کو میں نے آزاد کردیا۔ اسی عرصے میں یہ بھی مجھے پتا چل گیا تھا کہ لزی سے پہلے ایک اور مغربی حسینہ پرامودیا کی دلبستگی کا سامان فراہم کرتی رہی تھی۔ پہلے اسی کے ذریعے احکام ملا کرتے تھے۔ زن اور زر دونوں ہی انہیں مل رہے تھے۔ انہیں بھلا اور

کیا چاہئے تھا۔ "غلام" بننے کیلئے اتنا کافی تھا۔

پھر میں مزید وہاں نہیں رکی تھی۔ پرامودیا کے رویئے میں مجھے واضح تبدیلی نظر آ گئی تھی۔ اس کی نظروں کی آوارگی اب ختم ہو چکی تھی۔

ہوٹل واپس آنے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے اس الجھی ہوئی ڈور کا ایک سرا مل گیا تھا۔ میں اتنے دن سے جس سراغ کیلئے کوشش کررہی تھی، وہ آخرکار مجھے مل ہی گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ لیوسی کو میرے ملک سے انڈونیشیا آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ وہی یہاں آ کر "لزی" بن گئی ہو پھر پرامودیا سے اس کے تعلقات کی نوعیت بھی اسی طرف اشارہ کررہی تھی۔ وہ اپنے شکار کو قابو میں رکھنے کیلئے یہی حربے آزماتی تھی۔ میرے ملک میں بھی سیٹھ عباس کو شیشے میں اتارنے کیلئے اس نے اپنے حسین جسم کو ہی حربے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ عورت کی پاکیزگی اور حرمت کا تصور بھی اسے چھو کر نہیں گیا تھا۔ وہ ذہنی مریضہ ہونے کی حد تک بدکردار تھی۔

اس روز کے بعد مجھے مزید چند روز بوگور سے لزی کی واپسی کا انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران میں دوسرے کئی افراد سے میں ملتی رہی جن پر مجھے شبہ تھا۔ ان سبھی کا تعلق انتہا پسند سیاسی جماعتوں سے تھا۔ موشوی پارٹی کا ایک لیڈر سونان اسماعیل بھی انہی مشتبہ افراد میں شامل تھا۔ پارٹی پر پابندی لگ جانے کے باوجود اس کی سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں۔ کھلے عام نہ سہی خفیہ طور پر وہ اپنے ہم خیالوں سے رابطہ قائم رکھے ہوئے تھا۔ انوار سے بھی اس عرصے میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس نے میری توقع کے مطابق ایک روز مجھ سے اظہار عشق کر ہی ڈالا مگر پرامودیا کی طرح بے لگام نہیں بولا۔ میں نے اسے نرمی کے ساتھ سمجھایا اور وہ ٹھنڈی میٹھی آہیں بھر کے چپ ہوگیا۔ پرامودیا سے بھی میری ملاقاتیں جاری رہیں، اب وہ مجھ سے ملنے خود میرے ہی ایما پر ہوٹل بھی آنے لگا تھا۔ میں روز ہی پابندی کے ساتھ اس سے ملتی تھی۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان ملاقاتوں کا مقصد محض سیروتفریح اور دوستی قائم رکھنا نہیں ہے۔ میں روزانہ ہی اس کا ذہن پڑھ کر یہ معلوم کرلیتی تھی کہ لزی بوگور سے واپس آئی یا نہیں!

پھر وہ دن آ ہی گیا۔ لزی نے پرامودیا سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ بوگور سے جکارتہ واپس آ گئی تھی اور آج رات کو پرامودیا سے ملنے والی تھی۔ یہ ملاقات پرامودیا کے اسی گھر میں ہونے والی تھی جہاں میں کئی بار جا چکی تھی۔ یہ گھر پرامودیا نے ایسی ہی ملاقاتوں کیلئے رکھا تھا۔ یہیں اکثر اس کی جماعت کے خفیہ اجلاس بھی ہوا کرتے تھے۔ اس کے بیوی بچے ایک اور الگ گھر میں رہتے تھے۔

اس رات میں بہت چوکنا تھی اس لئے کہ اگر لزی کے روپ میں پرامودیا سے ملنے والی لیوسی ہی تھی تو اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ ہوتا۔ لیوسی غیرمعمولی ذہن کی مالک تھی۔ ایک بار تو اس نے میرے ذہن پر قابو پاکر مجھے موت کے دہانے تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے مجھے خودکشی کرلینے کی ترغیب دی تھی۔

رات کو وہ کس وقت پرامودیا سے ملنے والی تھی، یہ اس نے نہیں بتایا تھا۔ میں اسی وجہ سے کچھ جلدی ہی اس علاقے میں پہنچ گئی تھی۔ براہ راست پرامودیا کے گھر پہنچنے کے بجائے میں نے اس کے گھر کی نگرانی شروع کردی تھی۔ لیوسی کے باب میں، میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔

ساڑھے نو بجے کے قریب میں نے پرامودیا کے گھر کے سامنے ایک کار کو رکتے دیکھا۔ میں

اس وقت وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک پیڑ کی آڑ میں کھڑی تھی اس کار سے میں نے سنہرے بالوں والی نوجوان غیر ملکی لڑکی کو اترتے دیکھا۔ وہ سکرٹ پہنے ہوئے تھی اور بلاشبہ حسین نظر آرہی تھی، مگر یہ لیوسی نہیں تھی۔

کار سے اتر کر جب وہ غیر ملکی حسینہ گھر میں چلی گئی تو میں نے سوچا، لیوسی میک اپ میں بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی تصدیق کا میرے پاس صرف اور صرف ایک ہی ذریعہ تھا کہ وہ لیوسی ہے یا کوئی اور! اگر اسے دیکھ کر مجھے اس بات کا یقین ہوجاتا کہ وہ لیوسی ہے تو میں اپنے ذہن میں خوابیدہ پوشیدہ پراسرار قوتوں کو بیدار نہ کرتی جو میرے ارادے کی پابند تھیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس طرح لیوسی ہوشیار ہوجاتی اور میں اسے لاعلمی میں شکار کرنا چاہتی تھی۔ کوئی اور چارہ کار نہ ہونے کی صورت میں میں نے اس کا تصور کیا اور پھر اس کے ذہن تک پہنچ گئی۔

اس میں شک نہیں کہ مجھے قدرے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو ہی گئی۔

''کون ہو تم؟'' میرے ذہن نے اس سے سوال کیا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''کرینا۔'' اس کے ذہن نے جواب دیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ یا تو وہ لزی نہیں تھی یا پھر اس کا فرضی نام لزی تھا۔

''لیوسی کو جانتی ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

جواب اثبات میں ملا تو میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوگیا۔ میں نے دریافت کیا۔ ''لیوسی کہاں ہے؟''

''بوگور میں۔''

''اور ڈاکٹر رچرڈ؟ کیا وہ بھی وہیں ہے؟'' دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے معلوم کیا۔

اس نے بتایا کہ ڈاکٹر رچرڈ کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے!

پھر میں نے اس چھوٹے سے خوبصورت شہر بوگور میں لیوسی کی سکونت کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں اور پھر چند دیگر باتیں جاننے کے بعد اس کے ذہن سے رابطہ منقطع کرلیا۔ اس کا اصل نام کرینا ہی تھا جو اس نے پرامودیا کو نہیں بتایا تھا۔ انڈونیشیا میں وہ اسی نام سے داخل ہوئی تھی۔ وہ امریکی ہی تھی مگر لزی کی حیثیت سے اس کے کاغذات اسے ہالینڈ کا باشندہ ظاہر کرتے تھے۔ غیر ملکی ایجنٹ اکثر ایسے کھیل کھیلتے ہیں تاکہ ان کی اصل شخصیت پر پردہ پڑا رہے۔ یہ بات میرے لئے کوئی تعجب خیز نہیں تھی۔

کرینا یا لزی، لیوسی ہی سے ملنے بوگور گئی تھی۔ لیوسی، جکارتہ کے بجائے بوگور میں کیوں تھی؟ اس سوال کا جواب مجھے نہیں مل سکا تھا۔ بوگور کے بجائے جکارتہ اس کیلئے زیادہ مناسب جگہ تھی۔ تیس لاکھ کی آبادی کا یہ شہر جکارتہ ہر اعتبار سے اہمیت کا حامل تھا۔ ایک تو یہ انڈونیشیا کا دارالحکومت تھا، دوم ''دائیں بازو'' کے تقریباً تمام ہی اہم لیڈر یہیں سکونت پذیر تھے۔ میرے نزدیک لیوسی کا بوگور میں رہنا بے معنی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ وہاں رہ کر کوئی نہ کوئی کھیل ضرور کھیل رہی تھی۔

میں نے آیندہ روز ہی بوگور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ لیوسی کا سراغ لگ جانے کے بعد جکارتہ میں میرا مزید ٹھہرنا لاحاصل ہی تھا۔ اس رات ہوٹل واپس آنے کے بعد دیر تک میں جاگتی رہی۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ جکارتہ سے اپنی بوگور روانگی کو راز ہی میں رکھوں یا اس سے انڈونیشی حکام کو آگاہ کردوں؟ سوچنے کا سبب یہ تھا کہ میں بہرحال غیر ملکی تھی۔ میری نقل وحرکت پر لاعلمی میں خود انڈونیشی انتظامیہ بھی نظر رکھ سکتی تھی۔ اس طرح میرے لئے کوئی غیر متوقع صورتحال بھی پیدا ہوسکتی تھی۔ بالآخر میں ایک نتیجے تک پہنچ کر سوگئی۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کرتے ہی میں نے انٹیلی جنس کے سربراہ سے فون پر رابطہ قائم کرلیا۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ بوگور میں وہاں کی انتظامیہ میرے مقصد کے حصول کو نادانستگی میں ناکامی سے دوچار نہ کردے یا کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈال دے۔ اس کے سوا میں کوئی اور تعاون نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اس کا اطمینان دلانے کے ساتھ ساتھ تعاون کی پیشکش بھی کی گئی جو میں نے شکریئے کے ساتھ رد کردی۔ انٹیلی جنس کے چیف سونارڈی کو میں نے یہ بتادیا تھا کہ میں بوگور میں کہاں اور کس نام سے ٹھہروں گی! شہر بوگور بھی میرا دیکھا ہوا تھا۔ سونارڈی کو میں نے اس سے بھی آگاہ کردیا تھا تاکہ وہ میری طرف سے مطمئن ہوجائے۔ انڈونیشی زبان میں ''سونارڈی'' کے معنی ''اچھا شگون'' ہیں۔ سو میں شام ہوتے ہوتے ''اچھا شگون'' جان کر بوگور کیلئے روانہ ہوگئی۔

رات کے مہیب سناٹے میں مجھے ''ٹک ٹک'' کی وہ مسلسل آواز موت کی دستک معلوم ہوئی۔ بستر سے اچھل کر میں ایک دم کھڑی ہوگئی۔ یہ آواز میرے بیڈ کے نیچے سے آرہی تھی۔ میں ابھی کچھ ہی دیر قبل وہ محل وقوع دیکھ کر آئی تھی جہاں بوگور میں لیوسی کی سکونت تھی۔ میرا ارادہ وہاں نصف شب کے قریب جانے کا تھا۔ یہ زراعتی تحقیق کا مرکز تھا۔ ولندیزیوں نے اپنے دور اقتدار میں یہ مرکز قائم کیا تھا۔ یہاں مختلف جزیروں کے سائنسدان نئے پودوں اور کاشت کیلئے طریقوں کی آزمائش کے سلسلے میں انتھک کوشش میں مصروف ہوگئے تھے۔ آزادی کے بعد یہ ادارہ قومی حکومت کی تحویل میں آگیا تھا۔ یہاں ایک نباتیاتی باغ بھی بڑے رقبے پر بنایا گیا تھا۔ لیبارٹری کے علاوہ اس ادارے سے متعلق افراد کی سکونت کیلئے یہاں کئی عمارتیں تھیں۔ انہی میں سے ایک بنگلے کے اندر لیوسی کا قیام تھا۔ بوگور شہر کی آبادی کے شمالی حاشیے پر یہ تحقیقی مرکز تھا۔ اس کے بعد گھنا جنگل شروع ہوگیا تھا۔ انڈونیشی حکومت کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ گزشتہ دنوں برطانیہ سے آنے والی زراعتی ٹیم میں کوئی غیر ملکی ایجنٹ بھی شامل ہوگی۔ ایک معاہدے کے تحت چند سال کیلئے کچھ افراد کا ایک وفد زراعتی تحقیق میں انڈونیشی اسکالرز کی مدد کرنے آیا تھا۔ حسب معمول لیوسی نے یہاں بھی ایک نیا نام اپنا لیا تھا۔ اسے یہاں ویلیس کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔

میں نے دانستہ ایک ایسے ہوٹل کا انتخاب کیا تھا جو تحقیقی زراعتی مرکز سے زیادہ دور نہ ہو۔ اس چھوٹے سے خوبصورت شہر میں زندگی کی گہما گہمی رات دس گیارہ بجے تک ختم ہوجاتی تھی۔ اس وقت دس بجے تھے جب میں اپنے کمرے میں پہنچی۔ اوسط درجے کا وہ اقامتی ہوٹل تقریباً غیر آباد سا تھا۔ اس میں صرف چار چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ان میں سے محض ایک کمرا آباد تھا۔ اس کمرے میں بھی ایک لوبیاہتا انڈونیشی جوڑا ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ دونوں شاید ہنی مون منانے اس پرسکون وپرفضا شہر میں آئے تھے۔

پورے سکون و اطمینان کے ساتھ میں رات کے وقت اچانک لیوسی پر حملہ آور ہونے کا لائحہ عمل مرتب کرچکی تھی۔ سب کچھ بڑے آرام کے ساتھ ہورہا تھا اور میری بے چینی میں اسی لئے اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ طوفان آنے سے پہلے کی سی خاموشی مجھے کھل رہی تھی۔ واپس آ کر ہوٹل میں قدم رکھتے ہی میری چھٹی حس نے مجھے کسی شدید خطرے کا احساس دلا دیا تھا۔ میں نے اسی لئے کمرے میں آتے ہی حفاظتی اقدامات کا بندوبست کرلیا تھا۔ ریوالور، فاضل گولیاں اور دیگر ضروری سامان میں نے کینوس کے ایک تھیلے میں بھرلیا تھا۔ مزید بے چینی بڑھی تو اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کیلئے میں بستر پر دراز ہوگئی اور جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا پھر چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ مجھے "ٹک ٹک" کی مسلسل آواز سنائی دینے لگی۔ وال کلاک کی "ٹک ٹک" الگ سنائی دے رہی تھی۔

ٹائم بم! میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا۔ اچھل کر کھڑے ہوتے ہی میں نے کینوس کا بیگ شانے سے لٹکایا اور پھر دروازے کی طرف لپکی۔ اگر وہ ٹائم بم ہی تھا تو کسی بھی لمحے بلاسٹ ہوسکتا تھا۔ کمرے کا بند دروازہ کھول کر میں تقریباً دوڑتی ہوئی نیم تاریک راہداری میں پہنچی اور اسی وقت میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ کمرے سے نکلتے ہی میرا بڑا "پرتپاک استقبال" کیا گیا تھا، میرے جبڑے پر اتنا بھرپور گھونسا پڑا تھا کہ میں اپنے جسم کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کے باوجود گر پڑی تھی اور اسی لمحے کسی نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی تھی۔

حملہ آور چار تھے اور میں اکیلی! وہ سب مل کر مجھے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دھکیل رہے تھے۔ ان کا ارادہ شاید یہ تھا کہ مجھے اس کمرے میں بند کردیں اور میرا جسم بم بلاسٹ ہونے کی صورت میں چیتھڑے بن کر بکھر جائے۔ کمرے سے نکلنے کا واحد ذریعہ دروازہ ہی تھا۔ کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اگر وہ مجھے کمرے میں بند کرکے باہر سے دروازہ بند کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو وہ کمرا میرا مقبرہ ہی ثابت ہوتا۔ ان حملہ آوروں کا تعلق کمرے میں ٹائم بم رکھنے والوں ہی سے معلوم ہوتا تھا۔ وہ غالباً اسی لئے میرے کمرے کے باہر راہداری میں مستعد و چوکنا کھڑے تھے کہ اگر کسی طرح مجھے خطرے کا احساس ہوجائے اور میں کمرے سے قبل ازوقت نکلنا چاہوں تو دوبارہ زبردستی مجھے کمرے میں بند کردیا جائے۔ معلوم نہیں یہ بات پہلے ان کی عقل میں کیوں نہیں آئی تھی کہ جیسے ہی میں کمرے میں پہنچی تھی باہر سے دروازہ بند کردیتے۔ اس کی وجہ یہی ہوسکتی تھی کہ یا تو انہیں یہ گمان ہوگا کہ میں اب سو جاؤں گی اور مجھے خطرے کا احساس نہیں ہوسکے گا یا پھر وہ چند ہی لمحے پہلے وہاں پہنچے ہوں گے۔ بہرحال انہوں نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔

حملہ کرنے میں جو پہل کرتا ہے عموماً اسی کا پلا بھاری رہتا ہے، سو اس وقت بھی یہی ہوا تھا، مگر ابتدائی لمحات گزرتے ہی میں نے اپنے منتشر حواس پر قابو پالیا۔ میرے جوابی حملے نے انہیں بوکھلا دیا جو قوی ہیکل شخص میرے دائیں ہاتھ میں "آرم لاک" لگائے ہوئے تھا، پہلے وہی بلبلا کر پیچھے ہٹا۔ میری بائیں کہنی پوری شدت کے ساتھ اس کی پسلیوں کے نیچے پڑی تھی اور اسی کے ساتھ میرا دایاں ہاتھ آزاد ہوگیا تھا بقیہ تین میں سے ایک کے شانے پر میں نے کھڑی ہتھیلی کا وار کیا، وہ چیخ مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ ایک اور شخص کی پیشانی پر میری ٹھوکر پڑی۔ وہ جھک کر میری ٹانگ گھسیٹ لینے کی فکر میں تھا۔ تیسرے شخص

نے عقب سے مجھ پر جست بھری اور میری پشت پر سوار ہوگیا۔ میں نے جھکائی دے کر اسے زمین پر پٹخ یا۔ میں ابھی سیدھی کھڑی ہورہی تھی کہ پہلو سے دیوہیکل نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں جکڑ یا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے مجھے پیس ڈالے گا یا دبوچ کر دم نکال دے گا۔ میں نے اپنا سر پیچھے کیا اور بر میرے سر کی بھرپور ضرب اس کی ناک کے بانسے پر پڑی۔ مضبوط گرفت ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اس لی ناک سے خون کی تلی بہنے لگی۔ شاید اس کی نکسیر پھوٹ گئی تھی۔ میرے سر کی دوسری ضرب کھا کر وہ کراتا ہوا پیچھے ہٹا اور پھر میں نے اچھل کر اپنے نشان قدم اس کے سینے پر ثبت کردیئے۔ وہ ڈکراتا ہوا مین بوس ہوگیا۔ اس دوران میں اس کے تینوں ساتھی سنبھل چکے تھے۔ میں پھر ان سے بھڑ گئی۔ ان پاروں ہی کو ہوش وحواس سے بیگانہ کرنے میں پھر مجھے زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

مجھے اس پر حیرت تھی کہ اب تک اتنی چیخ پکار سننے کے باوجود کوئی اس طرف نہیں آیا تھا۔ اپنا یگ اٹھا کر راہداری میں دوڑتے ہوئے میری نظر نوبیاہتا جوڑے کے کمرے کے دروازے پر پڑی۔ روازہ باہر سے بند تھا۔ میں نے اسے کھول دیا تاکہ وہ دنوں اپنی جان بچاسکیں۔ کیا خبر وہ ٹائم بم کتنی لاقت کا تھا!

"بھاگ جاؤ! ...... بھاگ جاؤ یہاں سے ...... یہاں بم بلاسٹ ہونے والا ہے۔" دروازہ کھول کر میں چیخی اور پھر فوراً ہی پلٹ گئی۔ میری آنکھوں نے ایسا ہی منظر دیکھا تھا۔ وہ نوبیاہتا جوڑا دنیا و افیہا سے بے خبر ایک اور ہی عالم میں پہنچا ہوا تھا، ایسا عالم کہ جہاں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ کمرے کی بتی بھی گل نہیں تھی اور دروازہ بھی اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے اور شاید اسی دیوانگی میں نہیں کچھ ہوش نہیں رہا تھا یا پھر اچانک ہی بلا ارادہ ان پر دیوانگی مسلط ہوگئی تھی یا پھر اس کا کوئی اور ہی سبب رہا ہوگا۔ میں بہرحال انہیں ہڑبڑاتے ہوئے چھوڑ کر ہوٹل کے گیٹ کی طرف دوڑنے لگی تھی۔

گیٹ کے قریب ہی منیجر کا دفتر تھا جو تاریک پڑا تھا۔ یا تو وہ تھا نہیں اور اگر تھا تو سو چکا تھا۔ میں نے دفتر کا دروازہ کھلا ہوا ہی دیکھا اور وہی الفاظ چیخ کر دہرائے جو نوبیاہتا جوڑے کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوکر کہے تھے۔

جواب میں "فوں فوں" کی آواز سنائی دی۔ یوں جیسے کوئی ناک سے آوازیں نکال رہا ہو۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کمرے میں سوئچ بورڈ تلاش کرکے اجالا کرسکتی۔ انسانی ہمدردی نے میرے قدم روک لئے تھے ورنہ مجھے فوری طور پر وہاں سے فرار ہوجانا چاہئے تھا۔ ان چاروں غنڈوں سے مجھے بہرحال کوئی ہمدردی نہیں تھی جنہیں میں بے ہوشی کی حالت میں اپنے کمرے کے سامنے چھوڑ آئی تھی۔ وہ مجھے موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتے تھے، پھر اگر خود موت کی نیند سو جاتے تو اسے مکافات عمل ہی کہا جاسکتا تھا۔ صرف "فوں فوں" کی آواز سے میں نے درست اندازہ لگا لیا تھا۔ میں اسی آواز کی رہنمائی میں بندھے ہوئے ایک جسم تک پہنچ گئی۔ میں نے اس سے مسلسل آوازیں نکالتے رہنے کو کہا تھا تاکہ اس تک پہنچ سکوں۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔

اندھیرے میں ٹٹول کر میں نے اس کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھولا اور پھر پہلا سوال سوئچ بورڈ کے بارے میں کیا۔

''چند قدم پر...... دائیں جانب دیوار پر ہے۔'' جواب ملا۔

میں نے کمرے میں روشنی کردی اس لئے کہ اندھیرے میں منیجر کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کرنا ذرا مشکل ہوتا۔

میں اس کے جسم پر سے رسیاں کھول رہی تھی اور وہ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کئے جارہا تھا۔ اس کے ہر سوال کا جواب میرے پاس ایک ہی تھا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔'' جب میں نے اس کے دونوں ہاتھ آزاد کردیئے تو اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''پیروں کی رسیاں تم خود کھول لینا!''

''ارے...... ارے ما...... مادام! رکو تو۔'' وہ چیختا رہ گیا مگر میں رکی نہیں۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کی مدد کردو تو خواہ مخواہ کمبل ہوجاتے ہیں۔ منیجر بھی ایسے ہی لوگوں میں سے لگتا تھا۔ اس نے میرا شکریہ تک ادا نہیں کیا تھا بلکہ مجھ سے اس انداز میں سوالات کرنے لگا تھا جیسے وہاں خود میں نے ہی بم رکھا ہو۔

ہوٹل کا گیٹ مجھے کھلا ہوا ہی ملا۔ اب میں سمجھ گئی تھی کہ ان چاروں غنڈوں کو میرے کمرے کے دروازے تک پہنچنے میں کیوں دیر ہوئی تھی۔ میں جس وقت اپنے کمرے میں پہنچ کر خطرے کا احساس ہوتے ہی کینولیس کے بیگ میں ضروری سامان رکھ رہی تھی، وہ منیجر کو باندھنے میں مصروف ہوں گے۔ وہ عین اس وقت میرے کمرے کے دروازے تک پہنچے ہوں گے جب میں دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی۔ اسی سبب انہیں باہر سے میرے کمرے کا دروازہ بند کرنے کی مہلت نہیں ملی ہوگی۔

یہ اندازہ لگانے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی کہ بوگور میں میرے قتل کا سامان کون کرسکتا ہے، لیکن میری شخصیت کا راز میری دشمن جاں پر کیسے کھل گیا، یہ بات فی الحال میرے لئے معمہ ہی تھی۔ اسے تو انڈونیشیا میں میری آمد کا علم بھی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ پاکستان سے میں کب اور کیوں انڈونیشیا پہنچی اور پھر کیسے میں نے اس کا سراغ لگایا، کس طرح اور کس حیثیت سے بوگور پہنچی، میرے لئے یہ سب کچھ سمجھنا مشکل تھا۔ میں اس وقت خود بھی ان سوالوں پر غور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کب، کیوں اور کیسے؟ ان چکروں میں پڑنے کا یہ وقت نہیں تھا۔ اس وقت تو میں اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاسکتی تھی۔ اس نے اپنی دانست میں میری موت کا پورا بندوبست کردیا تھا۔ اس طرف سے وہ یقیناً مطمئن رہی ہوگی ورنہ خود بھی موقع پر موجود ہوتی کہ میں بچ کر نہ نکل جاؤں۔ سو یہی مناسب ترین وقت تھا کہ میں اس پر اچانک ٹوٹ پڑتی۔ یہی سوچ کر میں نے اس کے ٹھکانے کا رخ کرلیا۔

کسی خالی ''بیچک'' کی تلاش میں وقت ضائع کرنے کے بجائے میں تیز قدمی کے ساتھ پیدل ہی ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔ پرسکون شہر سناٹوں میں ڈوبتا جارہا تھا۔ یوں بھی یہ شہر کا مرکزی علاقہ نہیں تھا، دور دور تک نہ کوئی سواری نظر آرہی تھی نہ راہ گیر!

مجھے اپنی منزل مقصود پر پہنچنے میں بیس پچیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔ وہاں بھی سناٹے ہی کی حکمرانی تھی۔

گیٹ کی طرف جانے کے بجائے میں لمبا چکر کاٹ کر نباتاتی باغ میں داخل ہوگئی۔ اس سے گزر کر میں لیوسی کی قیام گاہ تک باآسانی پہنچ سکتی تھی۔ میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھنے

لگی۔ اس میں مجھے یوں بھی آسانی ہورہی تھی کہ پہلے ہی یہاں کا تفصیلی جائزہ لے کر جاچکی تھی۔ ابھی میں نے باغ کا نصف حصہ ہی عبور کیا ہوگا کہ اچانک ایک نسوانی قہقہہ سن کر میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے، میرے قدم رک گئے اور اسی کے ساتھ میں روشنی میں نہا گئی۔ کسی سرچ لائٹ کی تیز روشنی مجھ پر پڑی تھی اور اسی تیز روشنی کی وجہ سے بے اختیار میری آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔

دوبارہ میں نے آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ اسی لمحے کسی طرف سے مجھ پر جال پھینکا گیا اور پھر فوراً ہی رسی کھینچ لی گئی۔ میں اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔

''عذرا خان! مجھے یقین تھا کہ تم اتنی آسانی سے نہیں مروگی۔ تمہاری موت آخر خود تمہیں یہاں تک کھینچ لائی۔'' لیوسی کے الفاظ میری سماعت میں زہر گھولتے رہے۔

''تمہارا مدفن تمہیں بلا رہا تھا عذرا خان! سولومن تمہارے ہاتھوں مارا گیا تھا اور تم، تمہیں میں تمہاری قبر میں آہستہ آہستہ اتار دوں گی! سنو کہ تمہاری موت بڑی یادگار موت ہوگی۔ تم بہ قید ہوش و حواس خود کو موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھوگی اور مرنے پر مجبور ہوگی۔ دھیرے دھیرے تمہارا جسم دلدل میں اترتا جائے گا اور تم چیخ رہی ہوگی، مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہی ہوگی، مگر...... مگر میں تم پر رحم نہیں کروں گی عذرا خان! میں قہقہے لگاؤں گی اور...... اور یہ قہقہے میرے بچوں کے باپ کی موت کا نوحہ ہوں گے۔ وہ جسے تم نے اپنے وطن کی سرزمین پر موت کی نیند سلا دیا۔ ہاں وہی سولومن میرا عاشق بھی تھا اور میرے دو بچوں کا باپ بھی! وہ بچے اپنے باپ کو امریکہ کے ایک شہر میں یاد کرتے رہتے ہیں اور سولومن یقیناً خوش قسمت تھا کہ اسے یاد تو کرنے والے زندہ ہیں لیکن تمہیں...... عذرا خان تمہیں تو کوئی یاد کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔ کتنی بدنصیب ہو تم! یہ کہہ کر لیوسی پھر وحشیانہ انداز میں ہنسنے لگی۔

اسی دوران میں میرا جسم بالکل گٹھری سا بن کر فضا میں معلق ہوچکا تھا۔ جال اس پیڑ کے اوپر سے پھینکا گیا تھا جس کے نیچے سے میں گزر رہی تھی پھر اس سے پہلے کہ میں جواباً لیوسی سے کچھ کہہ پائی، ایک دراز قد غیر ملکی میری طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے سرنج نظر آرہی تھی۔ سرچ لائٹ کا دائرہ ابھی تک میرے اطراف تھا۔ وہ شخص میرے قریب آیا تو میں اسے پہچان گئی۔ وہ لمبوترے چہرے والا جیمس تھا، لیوسی کا وہی ساتھی جو اس کے ہمراہ پاکستان میں بھی تھا۔

اسی لمحے آخری حربے کے طور پر میں نے اپنے ذہن کی پراسرار قوتوں کو بیدار کیا اور جیمس کے ذہن کو قابو میں کرنا چاہا۔ اس کا ذہن مزاحمت کرنے لگا اور اسی وقت میرے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور میں نے لیوسی کی مکروہ آواز سنی۔ ''عذرا خان! مت بھولو کہ میں بھی تمہاری طرح غیر معمولی ذہن کی مالک ہوں، تم فضول کوشش کررہی ہو، جیمس کے ذہن کو تم یرغمال نہیں بناسکوگی اور سنو، میں جس طرح تمہاری موت کا فیصلہ کرچکی ہوں، اسے قبول کرلو ورنہ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ تمہارے ذہن کو اس سے بڑا جھٹکا بھی دیا جاسکتا تھا لیکن یوں...... میں تمہیں یوں نہیں مرنے دوں گی۔ تمہاری قبر دلدل ہی میں بنے گی عذرا خان!''

اس عرصے میں جیمس میرے ہاتھ کی ایک نس میں سرنج کی سوئی اتار چکا تھا۔

بے ہوشی کی دوا میرے خون میں شامل ہوئی ہی تھی کہ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہی! شاید ساری ہی رات بے ہوشی میں گزر گئی کیونکہ

کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ میں جس بیڈ پر بے حس وحرکت پڑی تھی، وہ کھڑکی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں کھولتے ہی دیکھا کہ سامنے ہی دیوار کے قریب چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر لیوسی اور جیمس ناشتہ کر رہے تھے۔ میری گردن اسی طرف مڑی ہوئی تھی۔

مجھے اس پر شدید حیرت ہوئی کہ میرا جسم رسیوں کی گرفت میں نہیں تھا۔ میں نے ان دنوں کو اپنی طرف سے غافل پا کر ایک دم اٹھنا چاہا، مگر میرے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل کر رہ گئی۔ مجھے اپنا جسم پھوڑے کی طرح دکھتا محسوس ہوا تھا، اسی کے ساتھ مجھ پر یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی تھی کہ میں اپنے جسم کو حرکت نہیں دے سکتی۔

میرا کراہ سن کر لیوسی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا، پھر بولی ”وہ انجکشن جو رات کو تمہیں دیا گیا تھا عذرا خان، یہ اسی کا اثر ہے۔ وہ صرف بے ہوشی کا انجکشن نہیں تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی تقریباً بارہ گھنٹے تک جسم شل رہتا ہے اور ذہن بھی اس کے زیر اثر ہوتا ہے۔ ذہن کے بارے میں تمہیں میں نے اس لئے بتایا ہے کہ ناحق تم اپنی ذہنی قوتوں کو استعمال کرنے کی کوشش میں ہلکان و مایوس نہ ہوتی رہو۔ یہ ڈاکٹر رچرڈ کی ایجاد ہے، رات ہی کو میں نے اسے تمہارے زیر دام آ جانے کی خوش خبری ٹرانسمیٹر پر دے دی تھی اور اب سوچ رہی ہوں کہ میں نے غلط کیا، کل تک کیلئے تمہاری موت ٹل گئی۔ ڈاکٹر یہاں سے اتنے فاصلے پر ہے کہ رات سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا۔ تمہاری موت کا نظارہ کرنے کی خواہش اسے بھی ہے مگر اس کی اصل خواہش کچھ اور ہی ہے۔ وہ نہیں چاہتا عذرا خان کہ تم اس دنیا سے ناکام و نامراد اٹھو، تمہیں وہ راحت بھی حاصل نہ ہو جو ہر عورت کا نصیب ہوتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ اس راحت سے وہ تمہیں قاہرہ میں بھی ہمکنار کرنا چاہتا تھا مگر ہر بات کا ایک وقت مقرر ہے جس طرح تمہاری موت کا وقت مقرر ہو چکا ہے۔ کل کا دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ دعائیں دو ڈاکٹر رچرڈ کو، اپنے محسن کو جس نے تمہیں نہ صرف ایک دن کی زندگی بخش دی بلکہ وہ انمول مسرت و شادمانی بھی آج رات تمہیں بخشنے والا ہے جس سے تم اب تک محروم رہی ہو۔ ارے جیمس، تم کیوں عذرا خان کو یوں ندیدوں کی طرح دیکھے جا رہے ہو، ناشتہ کرو! اگر رات ہی کو ڈاکٹر رچرڈ نے عذرا خان کیلئے اپنی بکنگ نہ کرالی ہوتی تو...... تو شاید میں تمہیں اس وقت چانس دے دیتی۔“

”یہ بات نہیں لیوسی!“ جیمس اپنی بھونڈی آواز میں بولا۔ ”میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔“

”کیا؟“ لیوسی نے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”جیسا کہ ابتدا میں عذرا خان کیلئے ہمارے اعلیٰ حکام نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کے ذہن کو اپنے مفادات کا غلام بنا لیا جائے تو یہ ہمارے لئے بے حد سودمند ثابت ہو سکتا ہے، تو کیا اب یہ ممکن نہیں؟“

”جیمس!“ لیوسی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ”کیا تم بھول گئے کہ یہ سولومن کی قاتل ہے؟ اور کیا تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ پاکستان میں اس نے ہمارے کتنے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے؟ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیمس کہ یہ تم نہیں بول رہے، تمہاری ہوس بول رہی ہے۔ تم...... تم اس پر ریجھ گئے ہو۔ اس کے جسم کے قیامت خیز زاویوں نے تمہارا زاویہ نظر بدل دیا ہے۔“

”سوری لیوسی! میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔“ جیمس کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔ ”میری بات کو

سمجھنے کی کوشش کرو! جو نقصان یہ ہمیں پہنچا چکی ہے، اس کی تلافی اسی طرح ممکن ہے۔ یہ وہ عورت ہے لیوسی جو پاکستان کے ایوان صدر تک میں داخل ہو سکتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم پاکستان کو خارجہ پالیسی بدلنے تک پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کے ذریعے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“ جیمس کی آواز پرجوش ہوتی گئی۔ ”میں آج رات ڈاکٹر رچرڈ سے بات کروں گا۔“

”ہاں بہت کچھ ہو سکتا ہے جیمس!“ لیوسی کی آواز میں خنجر کی سی کاٹ تھی۔ ”تم یقیناً ہمارے اعلیٰ حکام سے زیادہ ذہین ہو جیمس کہ جنہوں نے اس کو بلیک وارنٹ جاری کر دیا ہے اور...... اور تمہاری ذہانت کے اعتراف میں اب تمہیں زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا! امریکہ کو اس قدر ذہین افراد کی ضرورت نہیں جو اپنے بڑوں کے فیصلے کو رد کر دیں!“ یہ کہتے ہی اچانک لیوسی نے تیزی کے ساتھ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور سے ملتا جلتا ایک چھوٹا سا ہتھیار جیمس کی طرف کر دیا۔

”لل...... لیوسی! مم...... مجھے...... معا......“

جیمس کے الفاظ ادھورے ہی رہ گئے۔ اس ہتھیار کی چھوٹی سی نال سے کوئی چمکیلی سی شے نکل کر جیمس کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر اٹھنا چاہا اور پھر ایک طرف لڑھک گیا۔ چند ہی لمحوں میں اس کا جسم نیلا پڑ کر بے حس وحرکت ہو گیا پھر لیوسی نے دیوار پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا۔ ذرا سی دیر میں ایک قوی ہیکل انڈونیشی کمرے میں داخل ہوا۔ ”اس کی لاش یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ اور کسی دلدل میں پھینک آؤ!“ اس کا لہجہ غیر معمولی طور پر انتہائی پرسکون تھا۔

وہ شخص مشینی انداز میں جھکا اور جیمس کی لاش اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لی اور جانے لگا۔

لیوسی کی سفاکی کا مظاہرہ دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے میرے دیکھتے دیکھتے ایک زندہ آدمی کو لاش میں تبدیل کر دیا تھا۔

”اور اب بہتر یہ ہے کہ میں تمہیں بھی۔“ اس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ”کیا خبر تمہارا حسین جسم دیکھ کر ڈاکٹر رچرڈ کا ارادہ بھی بدل جائے۔“ میری نظریں اس ہتھیار پر جمی ہوئی تھیں جس کی نال میری طرف اٹھتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

اپنے سامنے لیوسی کو مجسم موت کی صورت میں کھڑے دیکھ کر مجھے منتشر حواس پر قابو پانے میں چند لمحے لگے۔ اس کے ہونٹوں پر ابھی تک معنی خیز مسکراہٹ موجود تھی۔ اچانک وہ زور سے ہنس پڑی' پھر بولی۔ ''ارے' تمہارے چہرے پر تو ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تم شاید مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہو گی کہ میں تمہیں اتنی آسانی سے مرجانے کا موقع دے رہی ہوں۔ اس وقت میں نے تمہیں چوہیا بنا دیا ہے اور میں' میں وہ بلی ہوں عذرا خاں کہ تم جس کے پنجے میں ہو۔ تمہیں موت کی نیند سلا دینے سے پہلے' تمہاری گردن مروڑ دینے سے قبل مجھے اتنا حق تو ہے نا کہ تم سے کھیل سکوں۔ اگر ڈاکٹر رچرڈ کو تمہارے حسین جسم کی آرزو نہ ہوتی تو اسے داغ داغ کرنے میں مجھے بڑا مزہ آتا اور پھر میں تمہارے تن داغ داغ کو دلدل میں اتار دیتی۔ اب بھی ایسا ہی ہوگا عذرا خان ! ڈاکٹر رچرڈ کیلئے دنیا کی حسین ترین دوشیزائیں اپنی آغوش وا کر دیتی ہیں' اسے حسن کی کوئی کمی نہیں پھر بھی جانے کیوں وہ تمہارا دیوانہ ہو گیا ہے' لیکن اس غلط فہمی کا شکار نہ ہونا کہ اس پر تمہارے حسن کا جادو چل جائے۔ ڈاکٹر رچرڈ عام مردوں سے مختلف ہے اسے تو میں بھی نہیں رجھا سکی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا خطرناک کھلونا دوبارہ گریبان میں رکھ لیا۔

موت میرے قریب آتے آتے وقتی طور پر مجھ سے دور ہو گئی اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے کچھ کر گزرنے کیلئے مہلت مل گئی تھی۔ لیوسی اس کمرے سے جا چکی تھی اور دروازہ کھلا ہی چھوڑ گئی تھی۔ اس طرح یقیناً وہ میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

وہ چلی گئی تو کچھ دیر کے بعد میں نے قدموں کی چاپ سنی۔ ایک نوجوان انڈونیشی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک پستہ قد نوجوان لڑکی بھی تھی۔ وہ دونوں میرے قریب آ کر رک گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتی کہ ان دونوں کی آمد کا مقصد کیا ہے' نوجوان انڈونیشی نے جھک کر مجھے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ لڑکی میرا لباس درست کرنے لگی۔ میری نظریں اس نوجوان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو مجھے اپنی گود میں اٹھائے ایک طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟ کیا مقصد ہے ان کا؟ جلد ہی مجھے ان سوالوں کا جواب مل گیا۔ نوجوان نے مجھے کمرے ہی میں موجود ایک باتھ روم کے اندر کرسی پر بٹھا دیا تھا اور پھر باہر نکل گیا تھا۔ لڑکی وہیں رہی تھی۔ سامنے ہی دیوار پر بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھی۔ میرے چہرے سے مادام ژی کا میک اپ غائب تھا۔ میں سمجھ گئی کہ بے ہوشی کے دوران ہی میں میک اپ ختم کر دیا گیا ہوگا۔

اس لڑکی کی مدد سے بمشکل میں ہاتھ منہ دھو سکی۔ میری حالت کسی مفلوج مریض کی سی تھی۔ میرا منہ بھی تولیا سے اسی نے پونچھا اور پھر اپنے ساتھی کو آواز دے کر بلا لیا۔ اس نوجوان نے مجھے دوبارہ گود میں اٹھا لیا۔ میں نے اس بار بھی اپنے جسم کے لمس کا ردعمل اس کے چہرے پر محسوس کیا پھر انہی دونوں نے مجھے ناشتہ کرایا اور بستر پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ مجھے سہارا دیئے بیٹھا رہا اور لڑکی چائے اور توس کی ٹرے سامنے رکھے مجھے اپنے ہاتھ سے ناشتہ کراتی رہی تھی۔ وہ دونوں چلے گئے تو میں پھر کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ میرے اعصاب پر کہل سا طاری تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ناشتہ کیا تھا۔ جبڑوں کو حرکت دیتے ہوئے مجھے شدید تکلیف محسوس ہوئی تھی۔

ناشتہ کیے مجھے ابھی آدھا گھنٹہ ہوا تھا کہ ایک عجیب سی نشے کی کیفیت نے میرے حواس کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ میں جس کیفیت سے دوچار تھی' وہ میرے لیے بالکل نئی تھی۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ لیوسی میرے ساتھ یہ کیا شرمناک کھیل کھیل رہی ہے؟ یقیناً یہ اسی کی حرکت ہو سکتی تھی۔ ناشتے میں مجھے کوئی ایسی دوا دی گئی تھی جس سے میرے نسوانی جذبات انتہائی مشتعل ہو گئے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب کچھ بھی کھاؤں گی' پیوں گی نہیں' خواہ مجھے بھوکا ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔

میں نے افسانوں اور ناولوں میں اس کیفیت کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا' مگر کبھی مجھ پر اس سے پہلے ایسی کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔ اب میں اچھی طرح سمجھ سکتی تھی کہ مائیں اس جنونی کیفیت کا شکار ہو کر کس طرح اپنے معصوم بچوں کو چھوڑ کر گھر سے فرار ہو جاتی ہیں۔ کس طرح ان کے نوجوان عاشق انہیں بہکانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ علم بھی تھا کہ ساری مائیں ایک سی نہیں ہوتیں' تشنگی و ناآسودگی کے باوجود بھی وہ اپنی عزت و آبرو کی خاطر سب کچھ برداشت کر لیتی ہیں۔ میری مراد تو ایسی عورتوں سے ہے جو بے لگام ہوتی ہیں اور جن کی خبریں آئے دن اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔

دوپہر ہونے تک وہ کیفیت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اسی کے ساتھ میری جھنجلاہٹ میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب تک میں اکیلی ہی تھی معلوم نہیں لیوسی کہاں تھی؟ وہ تو میری بے بسی کا تماشا بھی دیکھنے نہیں آئی تھی۔ دوپہر کو اگر آیا بھی تو صرف وہی نوجوان جو صبح ناشتہ کرانے آیا تھا۔ لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ کھانے کی ٹرے میں نے اس کے ہاتھ میں دیکھی۔ خلاف توقع اس نے اندر داخل ہو کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور پھر چٹخنی بھی چڑھا دی۔ میں اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ بیڈ کے نزدیک آ کر اس نے سرہانے کی طرف رکھی ہوئی چھوٹی سی گول میز پر کھانے کی ٹرے رکھ دی۔

اب تک میں نے بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرا ذہن ہی میرے قابو میں نہیں تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ شاید میں بول نہیں سکوں گی۔ جسم کے دوسرے حصوں کی طرح زبان پر بھی انجکشن کا اثر تھا۔ یہ احساس مجھے صبح ناشتہ کرتے وقت ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں نے بولنے کی کوشش کی۔ ''نن...... نا...... ناہیں۔''

وہ نوجوان میرے بستر پر بیٹھ کر مجھے اٹھا رہا تھا۔ اس نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ مجھے بولتے دیکھ کر لمحے بھر کو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے پھر خوشی کا تاثر نظر آنے لگا۔ ''تم...... تم بول سکتی ہو...... تم تو بول سکتی ہو۔ حالانکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ تم گونگی ہو۔'' اس کی آواز سے خوشی جھلک رہی

تھی۔ یہ الفاظ اس نے انگریزی میں ادا کیے تھے۔

میں نے انڈونیشی قومی زبان بہاسا میں بڑی مشکل سے اس نوجوان کو یہ بتایا کہ میں گونگی نہیں ہوں اور یہ بھی کہ کھانا نہیں کھاؤں گی۔

''تم بہاسا بھی جانتی ہو' یہ تو اور خوشی کی بات ہے۔'' اس نے میرے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہاسا ہی میں کہا' پھر مجھ سے کھانا نہ کھانے کی وجہ پوچھنے لگا۔ ''کیوں' کیا بھوک نہیں ہے؟'' اس کے لہجے سے ظاہری خلوص و محبت کا اظہار ہو رہا تھا اور میں اس ظاہری خلوص و محبت کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس کے ارادے نیک معلوم نہیں ہوتے تھے ورنہ وہ اکیلا نہ آتا اور اگر کسی وجہ سے اسے اکیلا آنا بھی پڑا تھا تو کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے چٹخنی نہ لگاتا۔ میں حیران تھی کہ آخر لیوسی مجھے اس نوجوان کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کہاں چلی گئی ہے؟ میرے لیے یہ صورتحال کسی بھی طرح مناسب نہیں تھی۔ میں قطعی طور پر بے بس تھی اور وہ نوجوان اس بے بسی سے فائدہ اٹھانے کے موڈ میں لگتا تھا۔ اس کے چہرے' اس کی آنکھوں سے اور اس کے ہاتھوں کی آوارگی سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے ظاہری محبت کی آڑ میں حد سے تجاوز کرتا جا رہا تھا۔ ''تمہیں آخر کیا ہو گیا ہے؟ اتنی پیاری تو ہو تم! تمہیں یہ بیماری کیسے لگ گئی؟'' پتا نہیں وہ کون سی بیماری کی بات کر رہا تھا اور اسے میرے بارے میں نہ جانے کیا بتایا گیا تھا؟ مجھے اس سے بحث نہیں تھی۔ میں تو یہ کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح اس کی دست درازیوں سے محفوظ رہ سکوں۔

''نہیں!'' میں نے ایک بار پھر اپنی پوری قوت مجتمع کر کے زور سے کہا اور تکلیف کے باوجود کروٹ لینے کی کوشش کرنے لگی۔

میری حالت ''مردہ بہ دست زندہ'' کی سی تھی۔ اس پر انجکشن کا اثر اور بھی قیامت ڈھا رہا تھا۔ ایک طرف تو اپنے اندر اس انجانی کیفیت سے نبرد آزما تھی' دوسری طرف ایک بوالہوس کی ایذا رسانیوں سے خود کو بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔

''میرا نام مختار ہے۔'' اس نے بتایا۔

''میں شام کو آؤں گا اور...... اور تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔'' اس کی آواز شدت جذبات سے لرز رہی تھی۔ ''کیوں ٹھیک ہے نا؟'' وہ میرے اوپر جھک گیا۔ یہ لمحات انتہائی صبر و ضبط کے تھے۔ اندھیرے میں مجھے روشنی کی ایک کرن نظر آ گئی تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ اور لیوسی کے بھیانک انتقام کی نسبت وقتی طور پر موجودہ روحانی کرب و اذیت بہرحال کم تھی۔ اس نوجوان سے نمٹنا میرے لیے اتنا مشکل نہ ہوتا۔ اسی خیال سے میں نے اثبات میں پلکیں جھپکا کر اسے اپنی رضامندی کا یقین دلا دیا۔

''تم کتنی اچھی ہو! بالکل نینا کرانا کی طرح!'' اس نے کہا۔ ''وہ نینا کرانا۔'' کا پرستار لگتا تھا۔ نینا کرانا' انڈونیشیا کی مشہور گلوکارہ تھی۔ مجھے نینا سے تشبیہ دینے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اسے شاید نینا پسند تھی۔

پھر وہ بمشکل ہی ٹلا۔ اسے لیوسی کی طرف سے اطمینان معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دوران میں وہاں نہیں آ سکتی۔ اس نے اپنی ناشائستہ و نازیبا حرکتوں کی وجہ سے مجھے اتنی مہلت ہی نہ دی تھی کہ میں یہ معلوم کر سکتی۔ کھانا کھلانے کیلئے اس نے زبردستی نہیں کی تھی اور کھانا واپس لے گیا تھا۔

کھلی ہوئی کھڑکی سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس بنگلے کی اوپری منزل تھی۔ گراؤنڈ فلور نہیں تھا۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں مجھے اپنا بیگ بھی رکھا ہوا نظر آ گیا تھا جو میں ہوٹل سے اپنے ساتھ لے کر چلی تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ کینوس کے اس بیگ میں میرا ریوالور اور فاضل گولیاں موجود ہوں گی۔ لیوسی اتنی بے وقوف نہیں ہو سکتی تھی کہ اس بیگ کی تلاش نہ لیتی۔

مختار مجھے لیوسی کا ہی ذاتی ملازم لگتا تھا۔ لیوسی نے جس طرح اپنے ساتھی جیمس کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کسی دلدل میں پھینک دینے کا حکم دیا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں وہ خاصی بااختیار تھی۔ اس کے اختیارات کا اندازہ مختار کو بھی ہو گا' پھر بھی وہ مجھے یہاں سے نکال کر لے جانے کی بات کر رہا تھا تو اس بات میں کوئی وزن ضرور تھا۔ یہ ایک الگ مسئلہ تھا کہ وہ مجھے کس لیے وہاں سے لے جانا چاہتا تھا۔ لیوسی نے مجھے بتایا تھا کہ ہوش میں آنے کے بارہ گھنٹے بعد تک میرا جسم شل رہنا تھا اور رات ہی کو ڈاکٹر رچرڈ وہاں پہنچنے والا تھا۔ یا تو دوبارہ مجھے انجکشن دیا جاتا یا پھر ڈاکٹر رچرڈ آٹھ بجے سے پہلے وہاں پہنچ جاتا۔ یہ بھی نہ ہوتا تو رات کے آٹھ بجنے سے پہلے مجھے بے بس کر دیا جاتا تاکہ میں فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکوں۔ یہ تمام باتیں ہی میرے پیش نظر تھیں۔ اگر میں وہاں سے کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتی تو دوبارہ لیوسی او ڈاکٹر رچرڈ پر ہاتھ ڈال سکتی تھی' بصورت دیگر مجھے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے اپنی موت کی اتنی پروا نہیں تھی جتنی اس بات کی فکر تھی کہ میرے دشمن مجھے قتل کرنے سے پہلے بے آبرو کرنے کے درپے تھے۔

کمرے میں وال کلاک موجود تھا اور میری نظریں بار بار اس پر پڑ رہی تھیں۔ شام کے چار بجنے والے تھے کہ کمرے میں اندھیرا سا پھیلنے لگا اور دھوپ غائب ہو گئی۔ کچھ ہی دیر میں بارش ہونے لگی اور کھلی ہوئی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر آنے لگی۔ بیڈ کے پائینتی ایک بلینکٹ موجود تھا۔ خنکی بڑھی تو میں نے اسے آہستہ آہستہ ایک پیر سے سرکانے کی کوشش کی مگر اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ بلینکٹ نیچے گر گیا۔ ابھی تک کوئی بھی کمرے میں نہیں آیا تھا۔ لیوسی یقیناً بنگلے میں نہیں تھی ورنہ اوپر ضرور آئی ہوتی۔ مختار کو اس کے معمولات کا علم رہا ہو گا اور یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ شام ہونے سے پہلے نہیں لوٹے گی۔ مجھے اسی کی آمد کا انتظار تھا البتہ اچانک بارش شروع ہو جانے کی وجہ سے مجھے کچھ مایوسی ہو گئی تھی کہ کیا خبر وہ اس موسم میں مجھے یہاں سے کہیں اور لے جانے کا ارادہ بدل نہ دے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ تقریباً دس منٹ اور گزرے ہوں گے کہ اسے میں نے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے آتے ہی وال کلاک میں وقت دیکھا اور پھر تیزی سے میرے قریب آ گیا۔

''تمہیں بارش میں تو بھیگنا پڑے گا مگر اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔ اس کے آنے میں کم وقت رہ گیا ہے۔'' مختار کا اشارہ لیوسی ہی کی طرف تھا۔ پھر اسے میں نے کھڑکی کی طرف جاتے دیکھا۔ کھڑکی کی چوکھٹ میں اس نے بڑا سا ایک آہنی ہک اٹکایا۔ اس ہک سے ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ رسی اس نے کھڑکی سے نیچے لٹکا دی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے کھڑکی کے راستے اس کمرے سے لے کر فرار ہو گا۔ اس نے رسی کھینچ کر اندازہ کیا کہ ہک کھڑکی کی چوکھٹ میں پوری طرح اٹک چکی ہے یا نہیں اور پھر وہ میرے پاس آ گیا۔ اس نے جھک کر مجھے اٹھایا' پھر اپنی پشت پر لاد لیا۔ ''کس کر مجھے پکڑ لینا تاکہ تم گرد

نہیں۔'' وہ مزید جھکتے ہوئے بولا۔

اپنے شل بازو میں نے بڑی مشکل سے اس کی گردن میں ڈالے اور اپنے جسم کا بوجھ سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اب کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیکھنے میں تو وہ زیادہ طاقت ور نہیں لگ رہا تھا مگر اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کمزور بہرحال نہیں تھا۔ میں لاکھ سلم سہی' وزن تو مجھ میں تھا۔

خطرہ مجھے یہ تھا کہ کھڑکی سے نیچے اترتے ہوئے میں اس کی پشت سے پھسل کر کہیں نیچے نہ جا پڑوں۔ میرے دونوں بازوؤں کی گرفت اس کی گردن پر برائے نام ہی تھی۔

کھڑکی کے قریب پہنچ کر وہ احتیاط سے اوپر چڑھا۔ اسی وقت بارش کی بوچھار سے میں بھیگ گئی۔ کھڑکی میں پنجوں کے بل بیٹھ کر اس نے اپنا رخ تبدیل کیا' رسی کو پکڑا اور پھر آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ میرا دم خشک ہو رہا تھا کہ بھیگی ہوئی موٹی رسی کہیں اس کے ہاتھ کی گرفت سے پھسل نہ جائے۔ ایک ایک کر کے اس نے اپنے دونوں پیر کھڑکی سے باہر لٹکا دیے۔ ایک ہاتھ سے وہ رسی پکڑے ہوئے تھا' دوسرے ہاتھ سے چوکھٹ تھام رکھی تھی۔ میں نے اپنے دونوں پیر اس کی کمر میں ڈال رکھے تھے۔ میری کوشش یہ تھی کہ اپنے پیروں سے اس کی کمر کو گرفت میں لیے رہوں۔

میں سمجھتی تھی کہ وہ مجھے اپنے اوپر لادے ہوئے رسی سے پھسل کر نیچے پہنچ جائے گا مگر وہ پھسلا نہیں۔ رسی میں کچھ کچھ فاصلے سے موٹی گرہیں لگی ہوئی تھیں جن پر پیر جما کر وہ بڑے اطمینان سے نیچے اتر رہا تھا۔ ایسے کاموں کا اسے خاصا تجربہ معلوم ہوتا تھا۔

بنگلے کا وہ عقبی حصہ تھا جہاں مختار مجھے لے کر اترا۔ بارش اب پہلے کی نسبت تیز ہو گئی تھی۔ اس نے رسی کو مخصوص انداز میں کئی جھٹکے دیئے مگر آہنی ہک چوکھٹ سے نہیں نکلی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ وہ مجھے اپنی پشت پر لادنے کی وجہ سے قدرے جھکا ہوا تھا۔ مجبوراً اس نے رسی اسی طرح وہیں لٹکتی ہوئی چھوڑ دی۔ سامنے ہی درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ بارش کے شور میں اس کے قدموں کی ''چھپ چھپ'' زیادہ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ درختوں کے اسی جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب تک میں اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکی تھی کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے اور وہ جگہ محفوظ ہے بھی یا نہیں؟

درختوں کے گھنے سلسلے میں وہ آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ بارش سے میں شرابور ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے دونوں پیروں اور بازوؤں میں بھی انتہائی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ میں یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ خطرے کی جگہ سے جتنی دور نکل جاؤں اتنا ہی اچھا ہے' اس کے باوجود میری ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ ذرا دیر میں نے کوشش کی کہ اس کی پشت سے لپٹی رہوں' پھر وہ لمحہ آ ہی گیا کہ میرے بازوؤں اور پیروں کی گرفت اس کے جسم پر قائم نہ رہ سکی۔ غالباً اس نے بھی یہ بات محسوس کر لی اور میرے جسم کو مزید جھک کر سنبھالنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ میں اس کی پشت سے پھسل کر کیچڑ میں جا پڑی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ وہ بھی سیدھا کھڑا ہو گیا اور پھر ہانپتے ہوئے جھک کر بولا۔ ''چوٹ تو نہیں لگی؟''

میں اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ گھنے پیڑوں کے باوجود جنگل کا وہ حصہ جل تھل ہو رہا تھا۔

اپنے سوال کا جواب نہ پا کر وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔ نیم تاریکی میں اس نے میرے جسم کو

ٹٹولتے ہوئے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''اووں...... ہوں...... نہیں۔'' مجھے کہنا ہی پڑا۔ وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔

''کچھ دیر ستا لیتے ہیں' پھر چلیں گے۔'' وہ بولا۔

میں اس سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ یہاں دیر نہ لگائے اور جلد سے جلد کسی محفوظ جگہ پہنچ جائے مگر خود میرے اندر اتنی طاقت نہیں تھی کہ فوری طور پر دوبارہ اپنے بازوؤں اور پیروں کو حرکت دے سکتی۔ انجکشن نے مجھے تقریباً ناکارہ بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ اطمینان تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ اور لیوسی کے چنگل سے نکل آئی ہوں۔ اسے میں غیبی مدد ہی کہہ سکتی ہوں۔ میرے لیے ایک بوالہوس کی بوالہوسی موت کے اس حصار سے نکلنے کا بہانہ بن گئی تھی۔ اس بے بسی کے عالم میں مجھ پر جو کچھ گزر رہی تھی' اسے میں برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ پانی بہرحال ابھی سر سے اونچا نہیں ہوا تھا لیکن میرے لیے یہ سب کچھ بھی بہت تھا۔

وہ میرے قریب بیٹھا ہوا بکواس کیے جا رہا تھا۔ اس سے ایسی ہی گھٹیا باتوں کی مجھے توقع بھی تھی۔ ایک مرحلے پر مجھے یوں لگا کہ شاید اب میری عزت و آبرو خطرے میں پڑنے والی ہے کہ اسی وقت کہیں دور سے ایک دھماکہ ہوا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بارش کے شور میں بھی مجھے فائر کی وہ آواز پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی تھی۔ خطرہ! میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔

اسے بھی یقیناً خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ جھکا اور پھر اس نے کسی طرح گھسیٹ گھسات کر مجھے دوبارہ اپنے پشت پر لاد لیا۔ اس دوران میں ایک بار اس کا پیر بھی تھوڑا سا پھسلا مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ میں نے اپنے جسم کی پوری قوت صرف کر کے اس سے لپٹ گئی۔ اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔

نیم تاریکی' جنگل اور بارش! میری بے بسی اور تقدیر کا عجیب کھیل! ایک حصار سے نکل کر دوسرے حصار کی طرف سفر! وہ لمحے بڑے سنسنی خیز تھے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں بچ سکوں گی' مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی کافی ہوتا ہے۔ مختار کی حیثیت میرے لیے کسی ایسے ہی تنکے کی تھی۔ فائر کی اس آواز سے یہ تصدیق ہو چکی تھی کہ دشمن چوکنا ہو چکا ہے۔ فائر کیوں ہوا اور کس پر کیا؟ اس طرح کے سوالات میرے ذہن میں آئے ضرور مگر میں ان پر زیادہ غور نہ کر سکی۔ میری تمام تر توجہ اس پر مرکوز تھی کہ میں دوبارہ مختار کی پشت سے پھسل نہ جاؤں۔

بھاگتے بھاگتے وہ ایک دم رک گیا۔ میں سمجھی کہ شاید اس کا سانس پھول گیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ پیڑوں کے درمیان مجھے ایک چھوٹی سی عمارت کا ہیولا سا نظر آ گیا۔ مختار اسی کے دروازے پر رکا تھا۔ معلوم نہیں اس جنگل میں اس عمارت کا کیا مقصد تھا۔ عمارت اسی مخصوص طرز کی بنی ہوئی لگتی تھی جیسی عموماً انڈونیشیا کے دیہی علاقوں میں ہوتی ہیں۔ بارش زیادہ ہونے کے سبب اوپر سے یہ عمارتیں انگریزی حرف الٹی وی یا اردو کے ہندسے آٹھ کی طرح ہوتی ہیں تاکہ بارش کا پانی رک نہ سکے۔ ہانپتے ہوئے اور جھکے جھکے ہی مختار نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل گیا۔ اندر روشنی تھی۔ یہ روشنی کسی کیروسین لیمپ کی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس روشنی میں دروازہ کھولنے والے کا چہرہ دیکھا تو چونک اٹھی۔ یہ وہی قوی ہیکل انڈونیشی تھا جس نے جیمس کی لاش کو ٹھکانے لگایا تھا۔

''اسے لانے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟'' قوی ہیکل انڈونیشی نے دروازے سے ایک

طرف ہٹتے ہوئے مختار سے پوچھا۔

’’مختار اسے بتانے لگا کہ راستے میں فائر کی آواز سنائی دی تھی اور یہ آواز بنگلے ہی کی طرف سے آئی تھی۔ قوی ہیکل شخص‘ مختار کے ساتھ ساتھ ہی چل رہا تھا۔ میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز بھی سنی تھی۔ معاً میں نے کئی افراد کے قہقہوں کی آوازیں سنیں۔ یہ آوازیں کھلے ہوئے ایک کمرے سے آ رہی تھیں۔ مختار مجھے اپنی پشت پر لادے ہوئے اسی کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے لیے یہ امر تشویشناک تھا کہ وہاں مختار کے علاوہ اور دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔

اِس کمرے میں داخل ہو کر مختار نے مجھے ایک بیڈ پر ڈال دیا۔ وہاں تین افراد پہلے سے موجود تھے جو شغل مے نوشی میں مصروف تھے۔ وہ تینوں ہی بیڈ کی اطراف آ کر کھڑے ہو گئے۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ سب وہاں کیوں جمع ہوئے ہیں۔

’’تم تو بڑی تعریف کر رہے تھے اس کی! یہ تو بھیگی بلی معلوم ہو رہی ہے۔‘‘ ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے قوی ہیکل شخص کو مخاطب کیا۔

’’تمہیں یہ پسند نہیں آئی تو تم جا سکتے ہو۔‘‘ قوی ہیکل شخص تیوریوں پر بل ڈال کر بولا۔ مختار ایک طرف کھڑا ہوا اب تک ہانپ رہا تھا۔ قوی ہیکل شخص نے اس کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’جان پر کھیل کر تو یہ اسے وہاں سے لے کر آیا ہے اور تم اپنی بکواس کیے جا رہے ہو۔‘‘

وہ پانچ تھے میں اکیلی اور پھر ان پانچوں ہی کے درمیان تکرار شروع ہو گئی۔ بات یہاں تک بڑھی کہ وہ سبھی آپس میں الجھ پڑے۔ تینوں مے نوش ایک طرف تھے‘ قوی ہیکل اور مختار ایک طرف۔

فلموں‘ ڈراموں‘ ناولوں اور افسانوں میں تو میں نے عورت کی خاطر مردوں کو ایک دوسرے سے لڑتے دیکھا اور پڑھا تھا مگر اس کا ذاتی تجربہ مجھے اسی روز ہوا‘ مرد کے اندر کتنی وحشت‘ کتنی درندگی و سفاکی اور کتنی کم عقلی ہے‘ مجھے تجربے سے گزرنے کے بعد ہی اس کا پورے طور پر احساس ہوا۔ میں یہ بات ایک عورت ہونے کے ناتے نہیں کہہ رہی بلکہ حقیقتاً اس وقت مجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔ عموماً عورتوں کو مرد کم عقل کہتے ہیں لیکن خود بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ ایک عورت کے حصول کی خاطر ایک‘ دوسرے کا خون بہا دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ میں نے تاریخی کتابوں میں پڑھا تھا کہ عورتوں کی خاطر زمین پر بڑا خون بہا ہے‘ حکومتیں زیر و زبر ہوئی ہیں اور کیا کچھ نہیں ہوا۔ اب بھی ہوتا رہتا ہے تو کیا دنیا کا کوئی بھی باشعور مرد اسے درست کہہ سکتا ہے؟ شاید نہیں! کیوں کہ سب مرد ایک سے نہیں ہوتے اور نہ ہی تمام عورتوں پر کوئی ایک کلیہ صادر آ سکتا ہے۔ عورتیں بری بھی ہوتی ہیں اور اچھی بھی۔ اسی طرح مرد اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ تو وہ برے تھے‘ بہت برے! اسی لیے تو جانوروں کی طرح لڑ رہے تھے۔ قوی ہیکل شخص اور مختار کا پلہ بھاری تھا۔ میں دم سادھے انہیں لڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

مختار پہلے ہی کافی تھکا ہوا تھا اس لیے کہ مجھے خاصی دور سے اٹھا کر وہاں تک لایا تھا۔ لڑائی کا منظر بدلنے میں اسی لیے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہوا یہ کہ ان تینوں میں سے ایک نے شراب کی تقریباً خالی بوتل قوی ہیکل شخص کے سر پر پھوڑ دی اور دور تک شیشہ بکھر گیا۔ ادھر قوی ہیکل شخص سر پر بوتل پڑنے سے لہرایا ادھر بوتل کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ایک ٹکڑے پر مختار کا پیر پڑ گیا۔ وہ لنگڑاتا ہوا کمرے سے بھاگا۔

تینوں مے نوشوں نے قوی ہیکل شخص کو موقع پا کر زمین پر گرا لیا۔ اب تک وہ سب کسی ہتھیار کے بغیر لڑ رہے تھے‘ مگر یہ صورتحال اس وقت بدل گئی جب مختار دوبارہ بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی ایک چھری تھی اس نے آتے ہی ایک مے نوش کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔

عین اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے‘ جیسے کوئی میرا ذہن پڑھ رہا ہے۔ میری قوت ارادی اس وقت انجکشن کے زیر اثر تھی اس لیے مدافعت نہ کر سکی۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ لیوسی ہی ہو سکتی تھی۔ میں جن حالات سے گزر کر وہاں پہنچی تھی لیوسی میرا ذہن پڑھ کر معلوم کر لینا چاہتی تھی۔ معلوم نہیں اس نے اب تک ایسا کیوں نہیں کیا تھا یا اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا۔

اب نہ صرف میں دوبارہ شدید خطرے میں پڑ گئی تھی بلکہ وہ جو میرے لیے ایک دوسرے کی جان کے درپے ہوئے تھے ان کی زندگی کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ رابطہ منقطع ہونے کے بعد میں نے پوری قوت سے چیخ کر ان سب کو پیش آنے والے خطرے سے آگاہ کرنا چاہا‘ مگر انہوں نے کچھ نہیں سنا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ میری آواز زیادہ بلند نہیں ہو سکی تھی۔

وہ ہر خطرے سے بے نیاز لڑتے رہے۔ سبھی لہولہان تھے۔ مے نوشوں میں سے ایک میدان چھوڑ کر بھاگ چکا تھا‘ ایک کی آنتیں باہر آ گئی تھیں اور ایک کو قوی ہیکل شخص نیچے گرا کر گلا دبا کے مار ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مختا کے ہاتھ میں ابھی تک خون آلودہ چھری تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

میرا ذہن خدشات میں گھرا ہوا تھا کہ جانے اب کیا ہو؟ معلوم نہیں مختار کو کیا سوجھا کہ جیسے ہی قوی ہیکل شخص مغلوب مے نوش کو ٹھنڈا کر کے سیدھا کھڑا ہوا مختار نے اس کے پیٹ میں بھی چھری گھونپ دی۔ قوی ہیکل شخص پہلے ہی شدید زخمی تھا اور سر پو بوتل پڑنے سے اس کا سر پھٹ گیا تھا‘ پیٹ میں چھری اتر گئی تو چیختا ہوا گر پڑا۔ کمرے میں ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا اور شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ مختار چھری ایک طرف پھینک کر میری طرف متوجہ ہوا اور پھر احتیاط سے چلتا ہوا اس بیڈ کے پائینتی آ بیٹھا جس پر میں دراز تھی۔ مختار کی پشت میری طرف تھی یا تو وہ ستا رہا تھا یا پھر یہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ اپنے ساتھی قوی ہیکل شخص کو اس نے میری ہی حصول کی خاطر ٹھکانے لگایا تھا۔ مرد بہ مجبوری ہی اپنی عورت میں کسی کو حصے دار بناتا ہے اور یہی حال عورت کا بھی ہے بلکہ عورت تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی انتہا پسند ہوتی ہے۔ اس معاملے میں وہ جائز کو بھی ناجائز قرار دینے لگتی ہے۔ مرد ہی کی فطرت کے پیش نظر مذہب نے اسے بیک وقت کئی عورتیں رکھنے کی اجازت دی ہے مگر اب ہمارے یہاں‘ یعنی مشرق کی عورت بھی مغرب کی حرص میں دوسری عورت کو گناہ عظیم تصور کرنے لگی ہے۔ اسی سبب ہمارے یہاں بھی مغرب کی طرح آوارگی کی راہ کھل گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کی نسبت عورت کو زیادہ قوت برداشت عطا کی ہے‘ اس میں طلب حصول لذت اتنی زیادہ نہیں جتنی مرد میں ہے۔ دین فطرت یعنی اسلام سے دوری نے مشرقی معاشرے کو بھی رفتہ رفتہ اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے اور اس کا سبب تقلید مغرب کے سوا کچھ اور نہیں۔ انڈونیشیا بھی طویل عرصے مغرب کا غلام رہ چکا تھا جو معاشرتی ٹوٹ پھوٹ جنوبی ایشیا کے ممالک میں ہوئی اس میں وہ دیگر مسلمان ممالک بھی شامل تھے جہاں مغرب کی حکمرانی رہی۔ انڈونیشیا

کا شمار بھی انہی ممالک میں ہوتا ہے۔ مختار بھی ایک ایسا ہی انڈونیشی مسلمان تھا جو بس نام کے مسلمان ہوتے ہیں۔

اس نے کچھ دیر ستانے کے بعد مجھے بیڈ سے اٹھایا اور اسی گھر کے دوسرے کمرے میں لے جانے لگا۔

''مخ...... مختار...... یہاں خط...... خطرہ ہے...... خطرہ۔'' میں نے بڑی مشکل سے رک رک کر اسے بتایا۔ ''بکومت!'' اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ یقیناً اس پر وحشت سوار تھی' ایک ایسی وحشت جو کسی بھی مرد میں اس وقت جاگتی ہے جب وہ کسی عورت کو ایک طویل جدوجہد کے بعد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

مجھے گود میں اٹھائے وہ دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ اچانک وہ حادثہ پیش آ گیا جس کی میں بہت دیر سے منتظر تھی۔ فضا پے در پے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ گولیاں مختار پر چلائی گئی تھیں۔ عقب سے گولیاں چلانے والوں نے مختار کے پیروں کو نشانہ بنایا تھا اور اس کی وجہ میں بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ گولیاں چلانے والے یقیناً مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ انہیں یہی حکم دیا گیا ہوگا۔

مختار کو میں نے گرتے دیکھا۔ گرتے گرتے بھی اس نے میرے جسم کو اپنے بازوؤں پر سنبھالنے کی کوشش کی تھی ورنہ مجھے چوٹ ضرور آتی۔ مختار کے بازوؤں سے زمین پر گرتے ہوئے میری نظر ان چار افراد پر پڑی جن کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ وہ گھر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف سے راہداری میں دوڑتے ہوئے میری ہی طرف آ رہے تھے۔ جو سے نوش فرار ہو گیا تھا وہی گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہوگا ورنہ مسلح افراد اتنی آسانی سے گھر میں داخل نہ ہو جاتے۔

خاکی نیکروں اور خاکی ہی شرٹوں میں ملبوس ان چاروں مسلح افراد نے قریب آتے ہی مختار کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اسی وقت میرے ذہن کو خفیف سا جھٹکا لگا پھر مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ میرے ذہن کو جھٹکا دے کر مجھے بیہوش کرنے والی لیوسی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ دور رہ کر بھی وہ اس پر قادر تھی۔ میں نے اسے مسلح افراد کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد میں نے ایک بار پھر خود کو لیوسی کی قید میں دیکھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں زیادہ دیر بیہوش نہیں رہی تھی۔ میں ایک بار پھر اسی کمرے میں تھی جہاں سے مجھے مقتول مختار نکال کر لے گیا تھا۔ وال کلاک میں رات کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ اس وقت میں کمرے میں تنہا نہیں تھی۔ لیوسی میرے سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ کرسی کی دونوں جانب دو مسلح خاکی پوش کھڑے تھے اور ان دونوں کی گنوں کا رخ میری ہی طرف تھا۔

لیوسی کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جسے میں کوئی معنی نہ پہنا سکی۔ ہوش میں آ کر جب میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تو وہ استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولی۔ ''تم بڑی قیامت چیز ہو عذرا خان! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم قطعی بے بس ہونے کے باوجود اس قدر خطرناک ثابت ہو سکتی ہو کہ میرے ملازمین کو بغاوت پر آمادہ کر دو پھر بھی تم نے دیکھا کہ میں نے کتنی آسانی سے بغاوت کچل دی۔ بس اتنا ہوا کہ مجھے اپنے چند ملازمین کو سزائے موت دینا پڑی' وہ سبھی غریب قتل کر دیئے گئے جو

اس بنگلے میں تمہارے فرار کے وقت موجود تھے۔ تمہیں اپنے عاشقوں کی موت پر یقیناً رنج تو ہوگا مگر کیا کیا جا سکتا ہے' مجبوری تھی ویسے تمہیں بہت زیادہ ملول ہونے کی ضرورت نہیں' تمہارا ایک اور عاشق صادق ڈاکٹر رچرڈ یہاں بہت جلد پہنچنے والا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے ٹرانسمیٹر پر میری اس سے بات ہوئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اب تمہیں دوسرا انجکشن نہ دیا جائے۔ وہ تمہیں بہ قید ہوش وحواس دیکھنا اور برتنا چاہتا ہے۔ اندازے کے مطابق ابھی تمہارا جسم تقریباً آدھے گھنٹے مزید شل رہنا چاہئے لیکن کبھی کبھار اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں۔ میں اب مزید کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی اسی لیے یہاں اپنی موجودگی کے باوجود بھی میں نے تمہیں گن پوائنٹ پر رکھا ہوا ہے۔ معلوم ہے تمہیں یہ خاکی وردی والے کون لوگ ہیں؟ تم یقیناً نہیں جانتی ہو گی۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی' پھر خود ہی بتانے لگی۔ ''یہ لوگ آنے والے کل کے حکمراں ہیں' انڈونیشیا کے حکمران! کل انڈونیشیا پر انہی کی حکومت ہوگی۔ تمہیں جب پہلی بار یہ خبر ملی ہوگی کہ میں بوگور میں ہوں تو تم حیرت میں پڑ گئی ہو گی۔ کیوں' ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟ تم نے سوچا ہوگا کہ میں جکارتا کی بجائے اس چھوٹے سے شہر میں کیوں ہوں؟ تو سنو عذرا خان یہی چھوٹا سا شہر انڈونیشیا کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کرنے والا ہے۔ یہ شہر ان مجاہدوں کا ٹریننگ سنٹر ہے جو بہت جلدی انڈونیشیا میں اپنی مرضی کی حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان مجاہدوں نے اب تک بڑی قربانیاں دی ہیں۔ یہاں یہ ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے نظریات کے مطابق ہو۔ ہم ان کے دوست ہیں اور دوستی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ہم ان کی ہر ممکن مدد کر رہے ہیں۔ عملاً اس شہر میں انہی کی حکمرانی ہے۔ یہ جلد صدر سوئیکار نو کا تختہ الٹ دیں گے...... دور تک پھیلے ہوئے یہاں کے جنگل ان کی پناہ گاہ ہیں جہاں یہ فوجی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح کا ایک اور بڑا مرکز دوسرے ایک دور دراز جزیرے پر بھی ہے۔ اس کا نگراں خود ڈاکٹر رچرڈ ہے اور یہاں کی نگراں میں ہوں۔ یہ ساری باتیں میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں عذرا خاں کہ تمہیں یہ سب کچھ سن کر خوشی ہو اور تم جان لو کہ مستقبل قریب میں تمہارے ملک میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ سولومن نے بھی مشرقی پاکستان میں انہی خطوط پر کام شروع کیا تھا مگر تم خواہ مخواہ آڑے آ گئیں...... وہ...... سولومن کا ادھورا مشن اب میں پورا کروں گی مگر تم...... افسوس کہ عذرا خاں تم...... تم اس وقت زندہ نہیں ہو گی۔ تمہاری زندگی کی مہلت تو بس کل ختم ہو جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک عجیب سی خوشی کا تاثر ابھر رہا تھا۔ جب کسی کو یقین ہو کہ سننے والا اس کی بات سننے پر مجبور ہے اور کسی سبب جواب دینے کا اہل نہیں تو وہ طویل کلام کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ رو میں اپنی انا کی تسکین کیلئے ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جو عام حالات میں اس کی زبان پر نہیں آتیں۔ لیوسی کا بھی یہی حال تھا۔

انڈونیشیا میں ''دائیں بازو'' کے ایجنٹ کیا کھیل کھیل رہے تھے' انہوں نے انتہا پسند سیاسی جماعتوں کو کس جنون میں مبتلا کر دیا تھا اور اس کیلئے انہوں نے کیا طریقہ کار اختیار کیا تھا' لیوسی کی باتوں سے سب کچھ واضح ہو گیا۔ میرے نزدیک یہ متوقع انقلاب خانہ جنگی کی صورت اختیار کر سکتا تھا۔ انڈونیشی حکومت سے مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ اس کے ذمے دار افراد پیش آنے والے ایسے سنگین خطرے سے غافل ہوں گے' مگر تھا ایسا ہی۔ ''دائیں بازو'' کے ایجنٹ انڈونیشیا میں ایک ہولناک انقلاب کی راہ ہموار کر رہے تھے۔

ان حالات میں مجھے اپنی زندگی اور زیادہ قیمتی معلوم ہوئی۔ نادانستہ یا دانستہ مجھے ایک ایسا راز معلوم ہو گیا تھا جس کے افشا کا مطلب اس وقت کی انڈونیشی حکومت کے استحکام پر منتج ہوتا تھا۔

''میرا خیال یہ ہے عذرا خان کہ تم بولنے کو ترس رہی ہو' کیوں ہے نا یہی بات؟'' اس نے میری بے بسی سے لطف اندوز ہو کر کہا اور اس کی سبز آنکھیں مجھے مزید سبز نظر آنے لگیں۔ اس کی پتلیوں کا رنگ سبز تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ ''تمہاری یہ سزا پوری ہونے میں بس اب تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔ آٹھ بجنے دو اس کے بعد تم بھی بولنے کے قابل ہو جاؤ گی۔ تم بولنے تک کو محتاج ہو' اس سے مجھے کچھ زیادہ مزہ نہیں آ رہا۔''

لیوسی نے ابھی اپنا جملہ پورا کیا تھا کہ تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چند ہی لمحے بعد خاکی لباس والا ایک پستہ قد شخص تقریباً دوڑتا ہوا کمرے میں آیا اور اس نے انڈونیشیا ہی میں بولی جانے والی ایک زبان میں لیوسی کو کچھ بتایا۔ یہ انڈونیشی قومی زبان بہاسا نہیں تھی۔ انڈونیشیا میں بولی جانے والی قدیم زبانوں میں سے ایک زبان تھی جس سے میں بس اس حد تک آشنا تھی کہ انڈونیشیا میں آباد ہندو اقلیت یہ زبان بولتی ہے۔ آنے والے کے چہرے سے وحشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا اس میں صرف دو ایک لفظ ہی میرے لیے نامانوس تھے۔ اس پستہ قد شخص نے غالباً بہ مجبوری ہی ڈاکٹر رچرڈ کا نام لیا تھا۔ اس سے کم از کم میں یہ ضرور سمجھ گئی کہ اس بات کا تعلق ڈاکٹر رچرڈ سے ہے۔ ایک اور لفظ ہیلی کاپٹر میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ اور ہیلی کاپٹر' ان سے ظاہر ہے کہ میں کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی تھی مگر اس خاکی لباس والے شخص کے چہرے کی وحشت اور پھر لیوسی کے متغیر چہرے نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ کوئی تشویشناک بات تھی' میرے لیے باعث اطمینان ہی ہو سکتی تھی۔

فوری طور پر لیوسی اس شخص کے ساتھ کمرے سے چلی گئی۔ دونوں مسلح افراد اب تک مجھے نشانہ بنائے ہوئے اس طرح کھڑے تھے کہ میں نے ذرا سی بھی حرکت کی اور انہوں نے مجھ پر گولی چلائی۔ ان کی نظریں مجھی پر جمی ہوئی تھیں۔

واپسی میں لیوسی کو زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اب اس کا چہرہ پرسکون تھا۔ آٹھ بجنے میں اب صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ مجھے اپنے سارے جسم میں ہلکی سی خارش محسوس ہونے لگی۔ یہ بھی غالباً اسی دوا کا اثر تھا جو مجھے انجکشن کے ذریعے دی گئی تھی۔ اب اس دوا کا اثر رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔

''عذرا خان! تمہیں یہ سن کر یقیناً خوشی ہو گی کہ تمہارا عاشق صادق ڈاکٹر رچرڈ بہت جلد یہاں پہنچنے والا ہے۔''

خلاف توقع لیوسی شوخ سے لہجے میں بولی۔ وہ پھر اسی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی جس سے کچھ دیر پہلے اٹھ کر گئی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ ''چند منٹ کے بعد تم بولنے کے قابل ہو جاؤ گی اور تمہارا ناکارہ جسم بھی حرکت کرنے لگے گا' مگر کوئی احمقانہ حرکت نہ کرنا ورنہ تمہارے جسم میں اتنے سوراخ کر دیئے جائیں گے کہ جب تمہاری لاش یہاں سے بطور تحفہ تمہارے ملک پاکستان روانہ کی جائے گی تو کوئی تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔'' اس نے مجھے دھمکی دی' پھر مشورہ دیا۔ ''اپنے جسم کو...... ہاتھ پیروں کو آہستہ آہستہ حرکت دینے کی کوشش کرو۔ ابتداء میں ایسا کرنے سے تمہیں تکلیف تو محسوس ہو گی مگر

جلد ہی یہ تکلیف ختم ہو جائے گی۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے ملک میں لوگ یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ انہیں چلتے ہاتھ پیروں سے اٹھالے تو عذرا خان' میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم چلتے ہاتھ پیروں اس جہاں سے اٹھ جاؤ۔ تمہارا یہ آخری وقت ہے' جتنی چاہو راحتیں سمیٹ لو۔ اپنی زندگی کی اس آخری شب کو یادگار بنالو عذرا خان کہ یہ رات پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔'' لیوسی اس طرح یہ باتیں کر رہی تھی جیسے اسے واقعی یقین ہو کہ یہ میری زندگی کی آخری شب ہے۔ میں نفسیاتی حربوں سے اچھی طرح واقف تھی جن کے سبب آدمی قبل از وقت ہی خود کو مردہ سمجھنے لگتا ہے۔ جب آدمی کو وقت سے پہلے ہی مارنا ہو تو ایسی باتیں کی جاتی ہیں۔ لیوسی مجھے بالکل بچہ سمجھ رہی تھی۔ یا پھر دانستہ مینٹل ٹارچر دینے کیلئے ایسی باتیں کر رہی تھی۔

آٹھ بجنے سے پہلے ہی میں نے آہستہ آہستہ اپنے جسم کو حرکت دینا شروع کر دی تھی۔ پھر جب پورے آٹھ بج گئے تو میں نے جسم میں واضح طور پر ایک تبدیلی سی محسوس کی' جیسے کوئی بھاری بوجھ میرے اوپر سے ہٹا لیا گیا ہو۔ اس انجکشن کے بارے میں لیوسی کی فراہم کردہ معلومات غلط نہیں بلکہ حیرت انگیز طور پر درست تھیں۔ ایک مقررہ وقت پر کسی دوا کا اثر قطعی طور پر ختم ہو جانا حیرت انگیز بات ہی تھی۔ میں اپنے جسم کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

''لیوسی!'' اچانک میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم احمقوں کی جنت میں رہتی ہو۔'' مجھے اب بولنے میں ذرا بھی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ''انجکشن کا اثر ختم ہوتے ہی تم نے پھر ڈینگیں مارنا شروع کر دیں عذرا خان!'' لیوسی بولی۔ ''مت بھولو کہ تم اس وقت لب گور ہو اور تمہیں تمہاری قبر میں دھکا دینے کیلئے صرف ایک اشارے کی ضرورت ہے۔''

''یہ تو خیر تمہارے بس کی بات نہیں ہے لیوسی!'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''وہ بات بتاؤ جو تمہارے گرگے نے مجھ سے چھپالی تھی اور جسے سن کر تمہارے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ تم شاید اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ یہاں کی ہندو اقلیت جو قدیم زبان بولتی ہے' میں وہ زبان نہیں جانتی۔'' میں نے اس پر نفسیاتی حربہ آزمایا' اور پھر مزید رنگ آمیزی کیلئے زور سے ہنس پڑی۔ ہنسنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے طفل مکتب سمجھ رہی ہوں۔

''تو تمہیں معلوم ہو ہی گیا عذرا خان کہ ڈاکٹر رچرڈ جس ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہاں آ رہا تھا اسے حادثہ پیش آ گیا ہے اور ڈاکٹر رچرڈ زخمی حالت میں یہاں پہنچ رہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے بڑی کینہ توز اور قہر آلود نگاہوں سے دیکھا' پھر بولی۔ ''یہ تو اور بھی اچھا ہوا عذرا خان! ضروری تو نہیں کہ صرف ڈاکٹر رچرڈ ہی تمہیں ان راحتوں سے ہمکنار کرے' تمہارے امیدوار تو یہاں اور بہت سے ہو سکتے ہیں۔ یہ بیچارے غریب لوگ جو اپنے گھر بار چھوڑ کر مدتوں سے ان جنگلوں میں فوجی تربیت حاصل کر رہے ہیں' انہیں بھی تو زندگی سے اکتساب لذت کا حق حاصل ہے۔'' اس کی آواز میں بلا کی چبھن تھی۔ اس نے مجھے جو دھمکی دی تھی' میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس کج رو عورت سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی۔

چند لمحے توقف کے بعد اس نے مجھے پھر مخاطب کیا۔ ''پہلے ڈاکٹر رچرڈ کو تو یہاں آ جانے دو' کیا خبر کہ وہ زیادہ زخمی نہ ہوا ہو اور تمہارے ارمان پورے کر سکے ورنہ تو متبادل میں نے تمہیں بتا ہی دیا ہے۔'' اس کے لہجے سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

"دھمکیاں دے رہی ہو!" میں پھر ہنس دی۔ مقصد اسے مزید طیش میں مبتلا کرنا ہی تھا۔ "تم شاید یہ بھول گئی ہو کہ میرا نام عذرا خان ہے اور میں تمہیں بھی تمہارے عاشق اور ناجائز شوہر سولومن کی طرح چیونٹی کے مانند مسل کر پھینک سکتی ہوں۔"

"عذرا خان!" وہ شدید غصے کے عالم میں چیخ اٹھی۔ اپنے محبوب کا اس طرح ذکر کیے جانے پر وہ یقیناً برداشت نہیں کر سکی تھی۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب اچانک مگر پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق اس کے ذہن کو میں نے اپنے طاقتور ذہن کی گرفت میں لے لیا۔ پھر ایک لمحہ بھی مزید ضائع کیے بغیر میں نے اس کے ذہن پر اپنی پوری توجہ مرکوز رکھ کر کئی شدید جھٹکے دیئے۔ اسے اپنی مدافعت کا موقع نہیں مل سکا۔ میں نے اسی لیے اسے شدید غصہ دلایا تھا۔ غصے ہی کی حالت میں اس کے غیر معمولی ذہن کو گرفت میں لیا جا سکتا ہے' یہ اندازہ میں بہت پہلے کر چکی تھی۔

لیوسی کی جگہ اگر کوئی اور ہوتی تو شاید اس شدید ذہنی حملے سے زندہ نہ بچتی۔ اس کے ساتھ صرف اتنا ہوا کہ چند لمحوں کیلئے وہ قطعی غافل ہو گئی۔ ذہن کو دیئے جانے والے جھٹکوں کا اس کے بقیہ جسم پر بھی اثر ہوا۔ اس کا جسم جھٹکے کھا کر کرسی سے نیچے لڑھک گیا۔ مسلح محافظ کچھ بھی نہ سمجھ سکے کہ اچانک لیوسی کو کیا ہو گیا ہے۔ گرنے سے اس کے ماتھے پر چوٹ لگی اور پھر اسی کے ساتھ جیسے وہ سنبھل گئی۔ اس نے اپنے ذہن کو میرے طاقتور ذہن کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔

اس سے پہلے کہ مسلح محافظ کچھ سمجھ سکتے لیوسی کسی کی مدد سے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا ماتھا سہلانے لگی جو متورم نظر آ رہا تھا۔ ماتھ سہلاتے ہوئے اس نے مجھے بڑی قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پھر اچانک ہی اس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ اس کا اظہار لیوسی کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ اب اس کے چہرے پر ناگواری نہیں تھی۔

"لیوسی! ہمارے ایک بڑے اور محترم شخص کا قول ہے کہ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے۔" میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ "تمہاری عقل خبط ہو گئی تھی' مگر میری اس بات سے تم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا' خود کو صاحب عقل نہ سمجھ لینا تم نہایت کم عقل اور بے وقوف عورت ہو۔" میں نے اسے پھر تپایا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو عذرا خان!" غصے کی بجائے وہ خوش مزاجی سے بولی۔ "میں واقعی کم عقل اور بے وقوف ہوں' مگر مجھے اتنا وقوف ضرور ہے کہ تم بھی میری ہی طرح بے وقوف ہو۔ اپنا اپنے کو بہت جلد پہچان لیتا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "عذرا خان! تم اگر اس حماقت میں گرفتار ہو کہ مجھے دوبارہ غصہ دلا دو گی تو اب یہ ممکن نہیں۔"

"چلو یہ ممکن نہ سہی مگر اتنا تو ممکن ہے لیوسی کہ تم اپنی چونچ بند رکھو اور میرا بھیجا چاٹنا بند کر دو۔ تم آخر مسلط کیوں ہو مجھ پر؟ جب وہ تمہارا چہیتا قاتلی ڈاکٹر ٹوٹی پھوٹی حالت میں یہاں پہنچ جائے تو مجھے بتا دینا۔ میں اس کی دم میں بھی نمدہ کس دوں گی۔"

"واقعی!" اس نے میرا مذاق اڑایا۔ "ہر چند کہ صورت سے تم بالکل گاؤدی لگتی ہو مگر ہو بہادر!"

"ہاں تمہاری طرح بزدل نہیں ہوں جب گھیرا تنگ ہو جائے تو بزدلوں کی طرح بھاگ لوں جیسے

تم پاکستان سے بھاگی تھیں۔ یقین کرو کہ تم بروقت وہاں سے نو دو گیارہ نہ ہو جاتیں تو تمہاری چٹنی بنا دیتی۔" میں بھی اسے ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔ دنیا کی اور دوسری زبانوں کی طرح وہ دنیا کی تیسری بڑی زبان' یعنی اردو بھی اہل زبان کی طرح بولنے پر قادر تھی۔ وہ مجھ سے اردو ہی میں گفتگو کر رہی تھی۔

میری نوک جھونک کا مقصد محض اسے دوبارہ غصہ دلانا تھا مگر اب وہ چوکنا ہو چکی تھی۔ اسی لیے مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں ڈاکٹر رچرڈ کے وہاں پہنچنے کی اطلاع مل گئی۔

"جاؤ لیوسی' دیکھ آؤ تم اس چوہے کو کہ کس حال میں ہے تاکہ تمہیں بھی کچھ عبرت حاصل ہو۔" میں بے پروائی سے بولی۔ "تمہارے یہ دونوں شیر دل تو یہاں موجود ہیں ہی جنہیں تم انڈونیشیا کے آئندہ حکمراں کا جھانسہ دے رہی ہو۔"

"تم مجھے اس لیے یہاں سے جانے کا مشورہ دے رہی ہو عذرا خان کہ تمہیں خبیث ذہن کی نگرانی نہ کر سکوں اور تم موقع ملتے ہی بساط الٹ دو۔ سنو! بے عقل عورت میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک تمہارا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا۔ تمہیں بے لگام نہیں چھوڑا جا سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کٹکھنی گھوڑی ہو اور ایسی گھوڑیوں کے منہ پر آہنی مچلکا چڑھانا بہت ضروری ہوتا ہے۔" اس کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

پھر اس نے وہیں موجود رہ کر فون پر ڈاکٹر رچرڈ سے بات کی۔ وہ اسی علاقے کے کسی اور بنگلے میں ٹھہرا ہو گا' فون پر گفتگو سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا۔ لیوسی نے اسے اب تک پیش آنے والے واقعات سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کیا۔ کچھ دیر قبل خود اس کو جو واقعہ پیش آیا تھا' وہ بھی اس نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ میرے بارے میں وہ ڈاکٹر رچرڈ سے تازہ احکام لینا چاہتی تھی۔ وہ اپنا سارا زور اس بات پر صرف کر رہی تھی کہ مجھے فوری طور پر ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس نے مجھے سزائے موت دینے کا جو طریقہ خود مجھ سے بیان کیا تھا' وہ بھی فون پر ڈاکٹر رچرڈ کو بتایا۔ میں صرف لیوسی کی گفتگو سن کر یہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ ڈاکٹر رچرڈ دوسری طرف سے کیا کہہ رہا ہو گا۔

"نہیں ڈاکٹر!" لیوسی کہہ رہی تھی۔ "عذرا خان کو اب مزید زندہ رکھنا خطرناک ہے۔ اگر آج رات نہیں تو پھر کبھی نہیں...... اسے ہم آج ہی رات مار دیتے ہیں۔ آج ہی رات یہ قصہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دیتے ہیں۔" پھر وہ اپنی بات کے حق میں دیر تک مختلف دلائل دیتی رہی۔ اس کے بعد وہ دیر تک ہی ڈاکٹر رچرڈ کی بات سنتی رہی۔ اس کے چہرے سے ایک طرح کے تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا۔ آخر کار طویل سانس لے کر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے ڈاکٹر! پھر ایسا ہی کرتے ہیں۔ اسے قطعی مہلت نہیں دیتے' آج رات کی بھی مہلت نہیں۔"

لیوسی کے یہ الفاظ سن کر میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ فیصلہ میری ہی زندگی کا ہو رہا تھا' پھر میں کس طرح اس سے لاتعلق رہ سکتی تھی۔

"میں اسے وہ انجکشن دیئے دیتی ہوں تاکہ کسی قسم کا خطرہ ہی نہ رہے۔ ہاں اب فضول ہی ہے ہمیں اس سے کیا فائدہ! اگر اس کے ذہن میں خوابیدہ حیرت انگیز قوتیں ختم ہو جاتی ہیں تو ہمیں اس سے موجودہ صورتحال میں فائدہ ہی پہنچے گا۔ ٹوٹل ڈسٹروائے...... اچھا میں سمجھ گئی ڈاکٹر۔ ویسے بھی ہم اسے قتل

کرنے ہی والے ہیں۔ میں تو دراصل ایک اور بات سوچ رہی تھی۔'' پھر اس نے وہی بات کی جو مجھ سے بھی کہہ چکی تھی' یعنی مجھے ہلاک کرنے سے پہلے بطور انتقام میری عزت و آبرو بھی پامال کی جائے۔ اس کے لیے لیوسی نے وہاں فوجی تربیت حاصل کرنے والوں کا ذکر کیا تھا۔

دوسری طرف سے ڈاکٹر رچرڈ نے کیا کہا ظاہر ہے کہ میں نہیں سن سکی۔ لیوسی کے مذموم ارادے میرے لیے سوہان روح ہی تھے۔ وہ کمینی عورت مجھے ذلت کی موت مارنا چاہتی تھی جہاں عزت و آبرو خطرے میں ہو وہاں عموماً موت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے کی حد تک تو ایسا ہی ہے مگر یہاں صورتحال مختلف تھی۔ عزت و آبرو بھی خطرے میں تھی اور زندگی بھی۔

میری نظریں لیوسی کے چہرے ہی پر جمی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر رچرڈ کی بات پر اس کے چہرے سے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں ہوا تھا یا پھر وہ اپنا ردعمل ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بھی یہ دیکھ رہی تھی کہ میری نگاہیں اسی کے چہرے پر ہیں۔

فون پر ڈاکٹر رچرڈ سے بات کرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ ٹیلی فون سیٹ اس نے ایک خاکی وردی والے کو تھما دیا تھا۔

''مبارک ہو عذرا خان!'' وہ بڑے زہریلے انداز میں مسکرا کر بولی۔ ''ڈاکٹر رچرڈ نے تو اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ تو تم پر اب تھوکنے کو بھی تیار نہیں۔''

''یہ کیوں نہیں کہتی ذلیل عورت کہ وہ کمینہ اب اس قابل ہی نہیں رہا کہ اپنے ناپاک وجود کو میرے قریب لا سکے۔ یقیناً وہ اس قدر زخمی ہو چکا ہے کہ اب صرف بھونک سکتا ہے۔ قدرت نے چاہے وقتی طور پر ہی سہی اس کتے سے کاٹنے کی اہلیت چھین لی ہے۔''

میری بات سن کر وہ بے غیرت ہنس پڑی اور بولی۔ ''مگر تم اتنی کیوں جل بھن رہی ہو! تمہیں غمزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''بکواس نہ کر!'' مجھے واقعی غصہ آ گیا اور پھر جو بھی منہ میں آیا اسے سناتی چلی گئی۔

''غصہ نہیں کرتے عذرا خان' کیوں کہ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے۔'' اس نے میری ہی بات دہرا کر مجھ پر طنز کیا۔

پھر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک خاکی وردی والا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دو قوی ہیکل شخص اور بھی تھے۔ خاکی وردی والے اس شخص کے ہاتھ میں ڈاکٹروں کا سا بکس تھا۔ اس کے بعد دونوں مضبوط جسم والوں نے مجھے اچھی طرح جکڑ لیا۔ خاکی وردی والے نے میرے ہاتھ کی ایک نس میں انجکشن کی سرنج داخل کر دی۔ لیوسی نے فون پر کہا تھا کہ وہ خود مجھے انجکشن دے گی مگر کسی مصلحت کے پیش نظر اس میں تبدیلی کر دی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ لیوسی میرے ذہن پر اپنی توجہ مرکوز رکھ سکے۔

جب مجھے انجکشن لگا دیا گیا اور خاکی وردی والا غیر ملکی اپنے قوی ہیکل آدمیوں کو ساتھ لیے وہاں سے چلا گیا تو لیوسی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''اب ذرا ہی دیر کے بعد تم ایک بے ضرر چوہیا بن جاؤ گی عذرا خان' جسے کسی بھی کونے میں گھیر کر با آسانی مارا جا سکتا ہے۔ اسے تم اپنی آدھی موت بھی کہہ سکتی ہو۔

تمہارے دماغ کے وہ سیلز اب انجکشن کے ذریعے قطعی طور پر ڈسٹروائے ہو جائیں گے جن کے بل پر آج تک تم اتراتی رہی ہو۔ مبارک ہو عذرا خان کہ تمہارے ذہن میں موجود وہ خوابیدہ حیرت انگیز قوتیں ختم ہونے والی ہیں جنہیں تم پراسرار سمجھتی آئی ہو۔ اب تم ایک معمولی عورت بننے والی ہو' معمولی اور غیر اہم۔ تمہارے غیر معمولی ذہن کو ہم نے اپنے مفادات کا غلام بنانا چاہا تھا مگر تم نے یہ غلامی قبول نہیں کی۔ اسی کے نتیجے میں تم سے تمہارا افتخار ہم نے چھین لیا۔ اب۔''

اس کے بعد معلوم نہیں لیوسی اور کیا کیا بکواس کرتی رہی' میں نہیں سن کی۔ میرے پورے وجود میں جیسے زلزلہ سا آ گیا تھا۔ میں جیسے تند و تیز جھکڑوں کی زد میں تھی۔ میرا ذہن جو لاکھوں سال پر محیط تھا' اس میں جھماکے سے ہو رہے تھے' بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ میرے خون میں انجکشن کے ذریعے جو خطرناک دوا شامل کی گئی تھی وہ میرے خون میں شامل ہو کر دماغ میں دوڑ رہی تھی اور اس نے تباہی مچا دی تھی۔ میں ناقابل بیان اذیت کا شکار ہو گئی تھی۔ میرے اعصاب جیسے ٹوٹ رہے تھے۔ میرے دماغ میں جیسے دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ''ٹوٹل ڈسٹروائے'' یا مکمل تباہی کا مطلب اب میری سمجھ میں آیا تھا۔ ان شیطان صفت درندوں نے آخر کار میرے ذہن کی حیرت انگیز صلاحیتیں اور قوتیں مجھ سے چھین لی تھیں۔ واقعی یہ میری آدھی موت ہی تھی۔

شدید کرب و اذیت کے سبب میں اپنے ہوش و حواس برقرار نہ رکھ سکی اور پھر جب دوبارہ مجھے ہوش آیا تو طوفان تھم چکا تھا۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مگر مجھے علم تھا کہ بہت کچھ ہو چکا ہے۔ اب وہاں لیوسی نظر نہیں آ رہی تھی اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ درندے اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ حادثے کا شکار ہو جانے کے باوجود بھی ڈاکٹر رچرڈ نے میرے ذہن کی صلاحیتوں کو تباہ کر دیا تھا۔ میں نے اس بات کا یقین کرنے کیلئے اپنے ذہن کی قوتوں کو متحرک کرنا چاہا۔ ارادے اور خیال کی صلاحیت ان قوتوں میں حرکت میں لے آتی تھی' لیکن اس وقت ایسا کرنے سے مجھے اپنے سر میں درد سا محسوس ہونے لگا۔ یہ درد بڑھتا ہی گیا تو میں نے اپنی کوشش ترک کر دی۔ اب اس سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ ایک ملال کی سی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی' غصہ بھی آیا مگر سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنا خود کو مزید ڈپریشن میں مبتلا کرنا تھا اور میں ڈپریس نہیں ہونا چاہتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ اس میں خدا کی کوئی مصلحت ہو گی۔ وہ جس نے میرے ذہن کو یہ حیرت انگیز قوتیں عطا کی تھیں' اس نے واپس لے لیں' مجھے تو اس پر شکر کرنا چاہیے کہ میں ابھی زندہ تھی اور زندگی بھی تو اسی نے عطا کی ہے' زندگی بھی تو اسی کی امانت ہے' وہ اپنی یہ امانت بندے سے جب چاہے واپس لے سکتا ہے۔

میرے دل کو کچھ قرار آیا تو میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ مسلح خاکی وردی والوں کے علاوہ بھی اب وہاں کئی مضبوط اور گٹھے ہوئے جسموں والے نظر آ رہے تھے۔ معلوم نہیں ان کے ارادے کیا تھے۔ میں اب بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ مسلح محافظ مجھے وارننگ دے چکے تھے کہ میں بیٹھ تو سکتی ہوں مگر اٹھ کر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ وہ دونوں مجھ سے اتنے فاصلے پر تھے کہ میں ان تک ایک ہی جست لگا کر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ان دونوں نے مجھ پر اپنی گنیں تان رکھی تھیں۔

مضبوط جسم والوں میں سے ایک کے ہاتھ میں مجھے ریشمی ڈوریاں اور رسیاں نظر آ رہی تھیں۔

انہی رسیوں اور ڈوریوں سے چمڑے کی ایک بڑی سی بیلٹ اور دو چھوٹی چھوٹی بیلٹیں منسلک تھیں۔

''اب کھڑی ہو جاؤ اور بیڈ سے ذرا آگے آ جاؤ!'' مسلح محافظوں میں سے ایک نے مجھے حکم دیا۔ وہ انڈونیشی زبان ہی میں مجھے حکم دے رہا تھا۔ اسے غالباً یہ بتایا گیا تھا کہ میں انڈونیشی قومی زبان بہاسا بول اور سمجھ سکتی ہوں۔

''تم لوگ آخر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہم تمہارے آخری سفر کی تیاریاں کر رہے ہیں۔'' دوسرے مسلح محافظ نے بڑے تلخ لہجے میں میرے سوال کا جواب دیا۔

اس کے لہجے کی تلخی سے میں چونک اٹھی اور کہا۔ ''مگر مجھ سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟ میرا تعلق تو ایک ایسے ملک سے ہے جو انڈونیشیا کا دوست ہے۔''

''انڈونیشیا کا دوست یا انڈونیشی حکومت کا دوست؟ ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔'' میں نے مصلحتاً اسے سمجھانا چاہا۔

''تمہارے ملک اور تمہارے بارے میں ہمیں سب کچھ بتایا جا چکا ہے عذرا خان۔'' تم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ ہم ایک عظیم مقصد کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں اور جو بھی اس میں آڑے آیا خواہ وہ انڈونیشیا کا باشندہ یا کسی اور ملک کا ہم اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں گے۔ بہتر یہ ہے کہ تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے' اس پر عمل کرو اور اپنی موت کو مشکل نہ بناؤ گھڑی ہو جاؤ ورنہ زبردستی بھی تمہیں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔''

مجبوراً مجھے اٹھ کر کھڑا ہونا پڑا۔ وہ لوگ میری کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں تھے۔ جیلوں میں جس طرح خطرناک مجرموں کو ''ڈنڈا بیڑی'' پہنائی جاتی ہے' تقریباً ویسی ہی ''ڈنڈا بیڑی'' مجھے پہنا دی گئی۔ فرق صرف یہ تھا کہ جو ڈنڈا بیڑی مجھے پہنائی گئی وہ لوہے کی نہیں تھی۔ چمڑے کی ایک بیلٹ میری کمر پر باندھ دی گئی جس میں سامنے کے رخ پر لوہے کے دو مضبوط چھلے پڑے ہوئے تھے۔ ان چھلوں میں سے رسیاں گزاری گئیں۔ دونوں پیروں میں بھی ٹخنوں کے اوپر چمڑے کی ایسی ہی بیلٹیں تھیں جو ایک دوسرے سے درمیان میں جڑی ہوئی بیلٹ کے چھلوں سے رسیاں گزار کر نیچے ٹخنوں پر بندھی بیلٹوں سے گزاری گئیں۔ بہرحال میرے جسم کو اس نئی طرز کی ڈنڈا بیڑی میں اس طرح کس دیا گیا کہ میں آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر ہی چل سکتی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ اس سے پہلے ہی پشت پر باندھے جا چکے تھے۔

میں چاہتی تو ان لوگوں سے بھڑ جاتی' اس وقت جب انہوں نے مجھے بے بس نہیں کیا تھا مگر میرے نزدیک اس کا حاصل کچھ نہیں تھا۔ دو دو گنیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میں گن پوائنٹ پر تھی اور یہ اندازہ کر چکی تھی کہ میرے ساتھ واقعی کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ میرے پیروں پر تو گولیاں چلا ہی سکتے تھے۔ پھر وہ مجھے آسانی سے باندھ لیتے۔ ایک ایسی ہستی کے ساتھ بھلا کیا نرمی کی جا سکتی تھی جسے وہ موت کے حوالے کرنے جا رہے تھے۔ لیوسی مجھے پہلے ہی یہ بتا چکی تھی کہ مجھ کس طرح سزائے موت دی جائے گی' مجھے دلدل میں پھینکا جانے والا تھا۔

ذہنی طور پر میں خود کو اس کیلئے تیار کر چکی تھی۔ اس کے باوجود میں نے زندگی کے آخری لمحے تک موت کو شکست دینے کا فیصلہ کیا تھا' ایسی صورت میں جب کہ مجھے اس کا کوئی موقع ملتا! اگر میری موت اسی طرح لکھی تھی' اپنے وطن سے بہت دور گہری دلدل ہی میری قبر بننے والی تھی تو مجھے اس پر کوئی رنج نہیں تھا۔ میری تمام زندگی شر سے برسرِ پیکار گزری تھی' سو میں مطمئن تھی' میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ہاں اپنے خدا سے میں یہ دعا ضرور کر رہی تھی کہ مرنے سے پہلے میری عزت و آبرو پامال نہ ہو۔ اب تک میں نے ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی تھی۔ اپنے دل میں' میں نے ایک فیصلہ اور کیا تھا کہ مرنے سے پہلے ظالموں سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی' ان کے سامنے زندگی کیلئے گڑگڑاؤں گی نہیں۔ میرے خدا کی مرضی و حکم کے بغیر نہ وہ مجھے زندہ رکھ سکتے ہیں نہ مار سکتے ہیں۔ مارنے اور جلانے والا کوئی اور ہے۔

مسلح اور غیر مسلح محافظوں کے نرغے میں جب مجھے اس بنگلے سے باہر لایا گیا تو ہلکی ہلکی پھوار سی پڑنے لگی۔ معلوم نہیں وہ لوگ مجھے میرے مقتل کی طرف لے جا رہے تھے یا فی الحال کسی اور جگہ' میں بہرحال چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اطمینان سے آگے بڑھ رہی تھی۔

کچھ دور چلنے کے بعد وہ مجھے ایک بنگلے میں لے گئے۔ یہ بھی لیوسی کے بنگلے کی طرح ہی تھا۔ مجھے اس پر حیرانی ہوئی کہ وہاں کیوں لایا گیا ہے؟ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے اس سوال کا جواب مجھے اس وقت ملا جب میں ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ اس بڑے سے کمرے کی سامنے والی دیوار کے ساتھ ہی ایک آرام دہ بیڈ پر مجھے وہ شخص نیم دراز نظر آیا جس کی خاطر میں نے اتنے پاپڑ بیلے تھے۔ کمرہ بہترین آرام و آسائش سے مزین تھا۔ بیڈ کے سرہانے کی طرف ایک کرسی پر لیوسی موجود تھی۔ مجھے مجرموں کی طرح اس شخص کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔

''عذرا خان!'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''افسوس کہ میں جس ہیلی کاپٹر سے یہاں آ رہا تھا اس میں فنی خرابی پیدا ہو گئی مگر اس حادثے کے باوجود میری جان بچ گئی' صرف ایک ہاتھ میں فریکچر ہوا اور کچھ معمولی چوٹیں آئیں۔ پھر بھی مجھے صحت یاب ہونے میں وقت لگ جائے گا اور لیوسی بڑی بے صبری دکھا رہی ہے ورنہ...... خیر اس ذکر کو اب چھوڑو لیوسی کو میں اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا ہوں' یہ میری ماتحت نہیں بیٹی ہے۔ اس کی تربیت پر میں نے سولومن سے زیادہ محنت کی ہے۔ تم نے سولومن کو قتل کر کے مجھ سے زیادہ لیوسی کو دکھ پہنچایا ہے۔ تفصیل اس نے تمہیں بتا ہی دی ہو گی کہ سولومن اس کے بچوں کا باپ بھی تھا۔ یہ مجھے بہت عزیز ہے' میں نے اسی لیے اس کی یہ بات مان لی کہ تمہیں صرف اپنی خاطر میں مزید زندہ نہ رکھوں۔ اس نے ایک اور تجویز بھی پیش کی تھی جسے میں نے رد کر دیا۔ اگر ڈاکٹر رچرڈ تم سے آسودہ نہ ہو سکا تو پھر دنیا کا کوئی اور شخص یا اشخاص یہ حیثیت کس طرح حاصل کر سکتے ہیں۔ تم میرے ملک کی وفادار نہ بن سکیں' تمہارا غیر معمولی ذہن میرے ملک کے کام نہ آ سکا تو کسی اور کے کام کیوں آئے۔ میں نے اسی لیے تمہارے دماغ کے ان خلیات کو ختم کرا دیا جو دوسرے انسانوں کے دماغوں کی نسبت تمہارے دماغ میں زیادہ بیداری کی حالت میں تھے۔ میرے سوچنے کا اپنا ایک الگ انداز ہے عذرا خان! اگ کوئی شے خود حاصل نہ کر سکو تو کسی اور کو بھی حاصل نہ ہونے دو۔ اسی کے ساتھ یہ کہ تم جو شے حاصل کر چکے ہو کسی دوسرے کو اس شے کو حاصل کرنے کے قابل نہ بننے دو۔ اسے تم میرا قومی مزاج بھی کہہ سکتی ہو۔ ہماری قوم فاتح عالم بننا چاہتی ہے۔ ہم ساری دنیا فتح کرنا چاہتے ہیں مگر ان احمقوں کی طرح نہیں جنہیں دنیا چنگیز

خاں' میسولینی یا ہٹلر کے نام سے جانتی ہے۔ دنیا کو ہم اس کے اندر سے فتح کرنا چاہتے ہیں' باہر سے نہیں' اور اندر سے فتح کرنا ہی اصل فتح ہے۔ آج صرف ایک ملک ہمارے مدمقابل ہے' مگر دنیا دیکھ لے گی کہ ہماری قوم کتنی دور تک دیکھتی ہے۔ مستقبل میں اسے بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔ مستقبل ہمارا ہے عذرا خان! ہمارا! یہ جو ساری دنیا میں ہماری بھاگ دوڑ ہے' تم کیا سمجھتی ہو کہ بلاسبب ہے...؟ نہیں! رفتہ رفتہ ساری دنیا پر دراصل ہماری ہی حکمرانی ہوگی۔ ڈوریاں ہم ہلائیں گے اور دیکھنے والوں کے چہرے وہی نظر آئیں گے جنہیں دیکھنے کے وہ عادی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے ملکوں کو بھی نظرانداز نہیں کرتے۔ انہی ملکوں میں سے ایک تمہارا ملک ہے اور بہت سے ممالک ہیں' مثلاً یہی ملک انڈونیشیا! یہاں تمہاری طرح سرپھرے ضرور ملتے ہیں۔ ہماری پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ انہیں راہ راست پر لے آئیں اور جب یہ ممکن نہیں ہوتا تو انہیں راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے' خواہ وہ کوئی معمولی سیاسی لیڈر ہو یا اپنی قوم کا سربراہ ہو یا نجات دہندہ یا اثر و رسوخ کا مالک ہو۔ ذاتی طور پر مجھے تمہاری موت کا دکھ ہوگا کہ تم بہرحال ذہین' بہادر اور اپنے ملک و قوم کی وفادار تھیں۔ تمہاری انہی صفات کی وجہ سے میں نے تمہیں اس وقت یہاں بلایا ہے۔ تم سے مجھے کچھ پوچھنا بھی تھا۔ جواب دینے کیلئے تمہیں مجبور نہیں کیا جائے گا۔

تمہاری موت کی خبر تمہارے ملک میں یا کہیں کسی اور ملک میں کسے دی جائے؟ ہمارے علم میں ہے کہ تمہارے کچھ عزیز اقارب ہندوستان میں ہیں' مگر انہیں شاید تمہاری زندگی یا موت سے اتنی دلچسپی نہیں ہوسکتی جتنی تمہاری سگی ہم شکل بہن کو ہوسکتی ہے۔ اس کا نام شاید ذکیہ تھا' وہی جسے میں نے مصر کے شہر قاہرہ میں ایک مرتبہ نادانستگی میں اور دوسری بار دانستہ اغوا کرا لیا تھا۔ آخری اطلاعات کے مطابق وہ ہندوستان ہی کے کسی شہر میں تھی' کہاں؟ ہم نے یہ معلوم کرانا ضروری نہیں سمجھا کیوں کہ وہ ہمارے کام کی نہیں تھی۔ تو اگر تم چاہو اور اس کے پتے سے ہمیں آگاہ کرنے پر آمادہ ہو' ہم اسے تمہاری موت سے آگاہ کر دیں گے۔ یہ محض اخلاقیات کا معاملہ ہے جس پر عملدرآمد کیلئے تمہیں مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر تم یہ چاہو کہ پاکستان میں کسی فرد کو آگاہ کیا جائے تو یہ بھی ممکن ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق تم نے ''آپریشن سیل'' کے نام سے ایک خفیہ ادارہ بھی تو بنایا تھا۔ تم اگر اس ادارے کا ٹیلی فون نمبر وغیرہ بتا دو یا اس سے متعلق کسی ذمے دار فرد کو اپنی موت کی اطلاع کرانا چاہو تو یہ بھی ممکن ہے۔ اپنی جائیداد' بینک بیلنس اور کاروبار کے متعلق کوئی قانونی وصیت کرنا چاہو تو اس کا بندوبست بھی ممکن ہے۔ بولو عذرا خان' کچھ کہنا چاہتی ہو تم؟'' سب کچھ کہنے کے بعد وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں اس کی باتیں بڑی توجہ اور دلچسپی سے سن رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس وقت ڈاکٹر رچرڈ بظاہر کتنا صاف گو اور شریف معلوم ہو رہا تھا' اور یہی شخص اندر سے کس قدر منافق اور بدسرشت تھا مجھے ذاتی طور پر گزشتہ برسوں میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس نے نجانے کتنے گھر اجاڑے تھے' کتنے ملکوں' کتنے شہروں میں اس کے اشاروں پر خون بہا تھا۔ اس نے اپنے ملک کے مخصوص مفادات حاصل کرنے کی خاطر کتنے ملکوں کی حکومتوں کے خلاف سازشوں کے جال بنے تھے۔ یہ وہی شخص تھا' وہی ڈاکٹر رچرڈ' بلا کا عیار' بلا کا بدکردار۔

''مجھے کچھ نہیں کہنا ڈاکٹر رچرڈ!'' بالآخر میں بول اٹھی۔

''کسی کو بھی مجھے اپنی موت کی خبر نہیں دینی۔ تمہاری اس پیشکش کا شکریہ۔ رہی وصیت کی وہ میں پہلے ہی مرتب کر چکی ہوں۔ میری موت یا گمشدگی کی صورت میں ایک رفاحی ادارہ میری تمام جائیداد کا مالک ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے پرسکون آواز میں کہا۔

''اب ایک آخری بات عذرا خان!'' اس نے یہ کہتے ہوئے طویل سانس لیا۔ ''دنیا کے ہر مہذب ملک' ہر معاشرے میں مرنے والے سے اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ تمہاری کوئی آخری خواہش؟''

آخری خواہش! میرے ذہن میں روشنی سی ہوگئی' زندگی کی روشنی اور پھر میرا سر جھکتا چلا گیا' یوں جیسے میں نے اپنی شکست قبول کر لی ہو۔

''کیوں' کیا ہوا عذرا خان؟'' ڈاکٹر رچرڈ نے مجھے مخاطب کیا۔ ''تم ایک دم اداس سی کیوں ہوگئیں۔''

''کاش! کاش میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی ڈاکٹر۔'' میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''مگر..... اب..... وقت گزر چکا ہے۔''

''ہاں ٹھیک کہا تم نے۔'' وہ عیاری سے بولا۔ ''تم نے ایسے قصور کیے ہیں کہ تمہارے لیے موت کی سزا بہت معمولی معلوم ہوتی ہے۔ گزرا ہوا وقت کبھی نہیں لوٹتا عذرا خان! اب تمہارا پچھتاوا لاحاصل ہے۔ سنو عذرا خان! تمہاری زندگی کے آخری لمحات میں بھی میں تمہیں ایک گر کی بات بتاتا ہوں۔ جب آدمی کے پاس طاقت ہوتی ہے' وہ نوجوان ہوتا ہے تو اس کے پاس تجربہ نہیں ہوتا اور جب طاقت کے جوش میں تمہیں کچھ ہوش نہیں رہا اور جب تجربات نے تمہیں راہ راست دکھا دی تو وقت گزر گیا۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں عذرا خان کہ ایک ایجنٹ کی تربیت پر کتنے اخراجات ہوتے ہیں' کتنا وقت لگتا ہے جب وہ کسی قابل بنتا ہے اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنی قوم اور اپنے ملک کیلئے دیس دیس کی خاک چھانتا ہے پھر اگر اسے پردیس میں تم جیسی کوئی سرپھری عورت موت کے گھاٹ اتار دے تو کیا گزرتی ہے دل پر خصوصاً ان افراد کے دل پر جو اس کی تربیت کرتے ہیں۔ میرے تربیت یافتہ کتنے ہی ایجنٹ تمہاری ظلم اور زیادتی کا شکار ہوگئے' موت کی نیند سو گئے اور اب..... اب تم پشیمان ہو! نہیں..... تمہارے لیے معافی نہیں' قطعی معافی نہیں۔''

''میں معافی کی طلبگار بھی نہیں ہوں ڈاکٹر! مجھے اب احساس ہو چکا ہے کہ میرے جرائم ناقابل معافی ہیں۔ میں..... میں کسی رحم کی مستحق نہیں۔'' میری آواز بھرا گئی۔

''مجھے پہلی بار اندازہ ہوا عذرا خان کہ تم میں اداکاری کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے باوجود بھی تمہیں میں آخری خواہش کے اظہار کی رعایت ضرور دوں گا۔'' ڈاکٹر رچرڈ کے پتلے پتلے سفاک ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''ڈاکٹر! تم میرے سچے احساسات و جذبات کو اداکاری کا نام دے کر مجھے ذلت کا احساس دلا رہے ہو۔'' سو ڈاکٹر! تمہیں ایک گر کی بات میں بھی بتا دوں کہ جب سب کچھ ختم ہو جاتا ہے' جب کسی سے اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے تو وہ..... وہ جھوٹ نہیں بولتا۔''

"بکواس کرتی ہو تم!" ڈاکٹر رچرڈ کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔ "میں نے آخری لمحات میں...... زندگی کے آخری لمحات میں لوگوں کو جھوٹ بولتے دیکھا' انہیں جو قاتل ہوتے ہیں' انہیں جن کی گردنوں میں پھانسی کے پھندے ڈالے جاتے ہیں' وہ جنہیں الیکٹرک چیئرز پر بٹھایا جاتا ہے' گیس چیمبرز میں دھکیل دیا جاتا ہے' معلوم ہے تمہیں عذرا خان کہ ان سب کا دعویٰ آخری لمحات تک یہی ہوتا ہے کہ وہ بیگناہ ہیں' انہیں بلاقصور پھانسی دی جا رہی ہے۔ تم نے شاید کسی ایسے شخص کو کبھی نہیں دیکھا جسے سزائے موت دی جا رہی ہو ورنہ تم ایسی احمقانہ باتیں کر کے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرتیں۔ سزائے موت پانے والا ہر مجرم آخری لمحات تک جھوٹ بول کر خود کو مظلوم ثابت کرتا ہے۔ اسے موت کا خوف اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے عذرا خان کہ شاید اس کے جھوٹ پر یقین کر لیا جائے' شاید اسے سزائے موت نہ دی جائے۔ فضول قسم کی بحثوں میں الجھ کر اور الجھا کر وقت ضائع نہ کرو عذرا خان! جان لو کہ تم اس وقت ڈاکٹر رچرڈ کے روبرو ہو جسے ٹریپ کرنا کم از کم تمہارے بس کی بات نہیں۔"

"تو پھر انتظار کس بات کا ہے ڈاکٹر! ان لوگوں سے کہو کہ مجھے یہاں سے لے جائیں اور ختم کر دیں۔" میری آواز میں تلخی گھل گئی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ پرسکون آواز میں بولا۔ اس کی نظریں میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ "اسے لے جاؤ!" اس نے حکم دیا۔ "لیوسی! یقیناً تم بھی اس کی موت کا تماشا دیکھنا چاہو گی' تم بھی جاؤ...... اور......" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

لیوسی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور اس بات کا خیال رہے لیوسی کہ جب تک اسے دلدل پوری طرح نگل نہ جائے' تم وہاں سے واپس نہیں آؤ گی۔ ہاں انتظامات تو ہو چکے ہیں نا؟"

"اردگرد سرچ لائٹس لگا دی گئی ہیں ڈاکٹر!" لیوسی نے بتایا۔ "لائٹس اسے آخر وقت تک فوکس کیے رہیں گی۔ میں ہیلی کاپٹر میں رہوں گی۔ اسے اسی حالت میں ہیلی کاپٹر سے دلدل میں پھینکا جائے گا اور پھر میں اسی وقت رسی کاٹ دوں گی جب اس کا آدھا جسم دلدل میں دھنس چکا ہو گا۔"

"ویری گڈ!" ڈاکٹر رچرڈ نے سر ہلا کر اطمینان کا اظہار کیا۔ "اب تم لوگ اسے لے کر جاؤ! واپس آ کر مجھے رپورٹ ضرور دینا۔"

لیوسی کے اشارے پر ایک محافظ نے میرے کمر سے بندھی ہوئی رسی کھینچی۔ یہ گویا چلنے کا اشارہ تھا۔ رسی کا دوسرا سرا محافظ کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے چلتے چلتے مڑ کر ایک بار ڈاکٹر رچرڈ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں مجھے بند نظر آئیں۔ پھر وہ دوسری طرف کروٹ بدلنے لگا۔ میں محافظوں کے نرغے میں کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کھیل ختم ہونے والا تھا۔ اب میرا ہر قدم موت کے دہانے کی طرف اٹھ رہا تھا' ایک یقینی موت میری منتظر تھی' پھر بھی میں ہراساں یا دلبرداشتہ نہیں تھی۔

مسلح اور غیر مسلح محافظ مجھے اپنے حصار میں لیے دروازے تک پہنچ گئے۔ میں نے کمرے کے دروازے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ عقب سے ڈاکٹر رچرڈ کی آواز سنائی دی۔ "رک جاؤ! میں غصے میں اس سے ایک بات پوچھنا تو بھول ہی گیا۔ اسے واپس لاؤ!"

چند ہی لمحوں کے بعد ایک بار پھر میں ڈاکٹر رچرڈ کے سامنے کھڑی تھی اور وہ میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"ڈاکٹر!" میں تقریباً چیخ اٹھی۔ "بند کرو یہ کھیل! مجھے اپنے مقتل کی طرف جانے دو!"

وہ زور سے ہنس پڑا' پھر کہنے لگا۔ "عذرا خان! اتنی جلدی تمہارے اعصاب جواب دے جائیں گے' مجھے یہ توقع نہیں تھی۔ تمہیں یقیناً زندہ نہیں چھوڑا جائے گا' مگر ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اپنی آخری خواہش تو بتا دو چندا!" اس کی شیطانیت اس کے چہرے پر ظاہر ہو گئی تھی۔

"میری آخری خواہش کیوں پوچھنا چاہتے ہو تم؟ اس سے کیا مل جائے گا تمہیں؟ بولو......"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں کہ مجھے کیا مل جائے گا' کیا نہیں!" پہلی بار اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "تمہیں اپنی آخری خواہش بیان کرنا پڑے گی! یہ میرا حکم ہے اور ڈاکٹر رچرڈ کا حکم' حکم آخر ہوتا ہے۔"

"اور اگر میں تمہارا حکم ماننے سے انکار کر دوں تو؟"

"تو!" وہ پھر ہنس پڑا۔ "تو پھر مجھے لیوسی کی تجویز پر مجبوراً عمل کرانا پڑے گا۔" اس کا لہجہ پھر سخت ہو گیا۔ وہ کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا۔ "میں اسی وقت اور یہیں اس جگہ اسی کمرے میں ور...... اور سب کی موجودگی میں تمہاری آبرو خاک میں ملوا دوں گا...... بولو...... بولو عذرا خان! کیا اب بھی تمہیں عزت کی موت قبول نہیں؟"

"ہاں مجھے عزت کی موت قبول ہے۔" میں بڑبڑائی۔

"میں...... میں عزت کے ساتھ اور...... اور باآبرو مرنا چاہتی ہوں۔" پھر میری آواز قدرے بلند ہو گئی۔ "اگر تمہاری یہی ضد ہے ڈاکٹر تو...... تو......" میں سوچنے لگی اور پھر کچھ دیر بعد بولی۔ "آپریشن سیل ہیڈکوارٹر میں کمانڈر نواز سے میری بات کرا دو۔ میں اسے کچھ ہدایات۔ آخری ہدایات دینا چاہتی ہوں۔ یہی...... یہی میری آخری خواہش...... اسی کو میری آخری خواہش سمجھ لیا جائے۔ اور...... اور میں اپنی بہن ذکیہ کو آخری خط لکھنا چاہتی ہوں۔ چاہو...... اگر تم چاہو تو اس میں سے کوئی بھی خواہش پوری کر دو' مجھے کسی بھی خواہش پر اصرار نہیں۔"

"اپنے خفیہ ادارے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کا ٹیلی فون نمبر بتاؤ!" میں نے نمبر بتا دیا۔

کچھ ہی دیر میں لیوسی نے پاکستان میں میرے بتائے ہوئے نمبر پر کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کیا اور پھر بولی۔ "کمانڈر! عذرا خان کا آخری پیغام سنو!" یہ کہہ کر اس نے ریسیور میرے کان سے لگا دیا۔

میں نے کمانڈر نواز کو ہدایات دیں کہ "آپریشن سیل ہیڈکوارٹر" ختم کر دیا جائے۔ ادارے سے متعلق افراد کے تمام تر واجبات میری وصیت کے مطابق جلد ادا کر دیئے جائیں وغیرہ! جب تک میں نے اپنی بات پوری نہ کر لی' لیوسی نے میرے منہ کے سامنے سے ریسیور نہیں ہٹایا۔ پھر میں نے جب کمانڈر نواز سے آخری الفاظ ادا کیے تو میری آواز بھرا گئی۔ "کمانڈر! میری مغفرت کیلئے دعا کرنا۔ خدا حافظ!" میری آنکھوں میں اس وقت آنسو تیر رہے تھے۔

"عذرا خان کی دوسری خواہش بھی پوری کی جائے!" ڈاکٹر رچرڈ کی آواز ابھری۔

پھر میرے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ مجھے قلم کاغذ اور ایک لفافہ فراہم کر دیا گیا۔ کمرے ہی میں

موجود ایک میز پر مجھے بٹھا دیا گیا جو ایک گوشے میں پڑی تھی۔ دونوں مسلح محافظوں کی گنیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر میرا نشانہ لئے ہوئے چوکنا کھڑے تھے۔ میں نے ان کی طرف سے بے نیاز اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کو خط لکھنے میں مصروف تھی۔ خط لکھتے ہوئے بار بار میں اپنی آنکھوں میں آ جانے والے آنسو پونچھتی جا رہی تھی اسی لیے خط لکھنے میں دیر ہو رہی تھی۔

وہاں موجود تمام افراد کی نظریں مجھی پر جمی ہوئی تھیں مگر میں ایک بار ان سب پر اچٹتی سی نظر ڈال کر خط لکھنے میں مصروف ہو گئی تھی مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

''عذرا خان!'' مجھے ڈاکٹر رچرڈ نے مخاطب کیا۔ ''یقین کرو کہ اس طرح تمہاری موت نہیں ٹل سکے گی۔ اگر تم خط لکھنے کے بہانے اپنی مقررہ موت کی گھڑی کو ٹالنے کیلئے سوچ بچار کر رہی ہو تو تمہاری یہ کوشش فضول ہے۔ تم خط لکھ رہی ہو کہ اپنی روداد زندگی؟''

''ڈاکٹر رچرڈ!'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے اپنی آخری خواہش بیان کرنے پر اصرار نہیں تھا' خود تم ہی نے مجھے اس پر مجبور کیا ہے۔ کہو تو میں یہیں اس خط کو ادھورا چھوڑ دوں؟''

''نہیں! خط ضرور لکھو مگر جلد لکھو۔ اور ہاں تم اسے اس وقت تک لفافے میں بند نہیں کرو گی جب تک لیوسی اس خط کو نہ پڑھ لے۔''

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور دوبارہ خط لکھنے لگی۔ ڈاکٹر رچرڈ کی ہدایت پر میں نے تیزی سے عبارت لکھنا شروع کر دی۔ خط لکھنے کے بعد میں نے لفافے پر پتا لکھنے سے پہلے مڑ کر ڈاکٹر رچرڈ سے کہا۔ ''اس بات کی کیا ضمانت ہے ڈاکٹر کہ میری موت کے بعد میری بہن ذکیہ تمہارے دست ستم سے محفوظ رہے گی؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ بھی لیوسی کے انتقام کا نشانہ بن جائے یا...... یا ڈاکٹر تم......''

''تمہیں بڑی جلدی یہ خیال آ گیا عذرا خان!'' ڈاکٹر رچرڈ چبھتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم شاید لفافے پر اپنی بہن کا پتا لکھتے ہوئے جھجک رہی ہو۔''

''ہاں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''اتنی آسانی سے خط لکھنے کی اجازت دے دینا اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اسی طرح یقیناً تم لوگ میری بہن کا سراغ لگانا چاہتے ہو۔''

''اور کیا تم یہ بھول گئیں کہ میں تمہیں کیا بتا چکا ہوں...... ہمارے علم میں ہے کہ تمہاری بہن کہاں ہے؟ ہمیں اس کا سراغ لگانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا عذرا خان! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ہماری سی آئی اے ایک معمولی سی غیر اہم لڑکی کا سراغ لگانے کیلئے حرکت میں آ جائے گی؟''

''جانتی ہوں میں! اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ انتقام اندھا ہوتا ہے۔ تمہیں صرف یہ علم ہے کہ میری بہن کلکتے میں ہے' یہی نا؟...... کلکتہ کوئی چھوٹا سا شہر نہیں ڈاکٹر! پتے کے بغیر اس شہر میں کسی کا سراغ لگا لینا ایسا ہی ہے جیسے سمندر کے کنارے کوئی شخص ریت میں گری ہوئی سوئی تلاش کرے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہو گا ڈاکٹر کہ اس شہر کی آبادی اسی لاکھ سے تجاوز کر رہی ہے۔''

''عذرا خان! لفافے پر اپنی بہن کا پتا لکھو اور بکواس بند کرو...... زیادہ چالاک بننے کی کوشش تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔ یہ نہ بھولو کہ جس دھمکی نے تمہیں آخری خواہش بیان کرنے پر مجبور کیا ہے اس دھمکی کے خوف میں تم پتا لکھنے پر بھی مجبور کی جا سکتی ہو۔''

مجبوراً مجھے لفافے پر پتا لکھنا پڑا۔ لیوسی نے آگے بڑھ کر میز سے خط اٹھا لیا اور اسے دور جا کر ھنے لگی۔

''ڈاکٹر! خط بہت دلچسپ ہے۔'' لیوسی نے ہنستے ہوئے خط پر تبصرہ کیا۔ ''موت سے پہلے آدمی ں قدر بزدل ہو جاتا ہے' یہ خط اس کا واضح ثبوت ہے۔ خط لکھنے والی نے لفظوں میں اپنا درد دل سمونے کوشش کی ہے۔''

''ذرا مجھے بھی پڑھواؤ۔'' ڈاکٹر رچرڈ لطف لینے لگا۔ ''اردو میں لکھا ہے نا؟''

''نہیں! انگریزی میں ہے' وہ بھی......!'' لیوسی نے بتایا۔ ''انگریزی زبان شاید عذرا خان کی ری زبان معلوم ہوتی ہے۔'' اس نے دانستہ مجھ پر گہری چوٹ کی۔

میں اپنی اس کھلی توہین کو برداشت نہ کر سکی اور اسے گالیاں بکتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی۔ گالیاں جانے اور اپنی سات پشتوں کیلئے برا بھلا سن کر وہ بے غیرتی سے ہنستی رہی۔ میرے خطرناک ارادے ہ کر محافظوں نے مجھے جکڑ لیا اور دوبارہ میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے۔

''عذرا خان! پہلے تو شاید میں تمہاری بہن کو غیر اہم سمجھ کر معاف کر دیتی مگر اب...... اب اسے ور کے جنگلوں میں اٹھوا کر ضرور لاؤں گی۔ اور...... اور پھر اسے یہاں تربیت پانے والے گوریلوں کے الے کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر کو یقیناً اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا کیوں کہ یہ معاملہ ذاتی نوعیت اختیار کر ا ہے۔ کیوں ڈاکٹر' میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟'' لیوسی نے ڈاکٹر رچرڈ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا لیوسی! تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ڈاکٹر رچرڈ نے مسکرا کر اب دیا۔ ''میں نے بھی اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ ہو بہو عذرا خان لگتی ہے۔ میں صرف اتنا چاہوں گا کہ تم لے مجھے اس کا دیدار کرا دینا۔ چلیں اپنی قسمت میں عذرا خان نہ سہی' اس کی ہم شکل بہن ہی سہی۔''

پھر میں نے ڈاکٹر رچرڈ کو بھی نہیں بخشا۔ وہ بھی گالیاں کھا کر ہنستا رہا' مگر مجھے یہ اندازہ نہیں کہ اس ہنسی کے پیچھے کیا طوفان چھپا ہوا تھا۔

''لیوسی!'' ڈاکٹر رچرڈ کی پرسکون آواز میں نے سنی۔ ''بہت دن سے میں نے کسی بندریا کا شا نہیں دیکھا۔''

''عذرا خان کو بھی تو کسی بندریا کی طرح ناچنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے ڈاکٹر!'' لیوسی فوراً بولی اور ر اس نے ایک محافظ کو چمڑے کا ہنٹر لانے کا حکم دیا۔ وہ ڈاکٹر رچرڈ کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ گالیاں کھا کر بنا وہ گرگٹ بے مزہ ہو گیا تھا۔

پھر لیوسی نے مجھ پر کوڑے برسا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور ڈاکٹر رچرڈ نے بھی یہ ''تماشا'' ی دلچسپی سے دیکھا اور قہقہے لگاتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ناپاک وجود میں کوئی بدروح حلول کر ی ہو۔ لیوسی مجھ پر تشدد کرتے کرتے تھک گئی تو اس نے کوڑا ایک محافظ کو تھما دیا۔ کوڑے کھا کر میرے م کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور اس سے خون رس رہا تھا۔

''بس کرو لیوسی!'' ڈاکٹر رچرڈ نے حکم دیا۔ ''اسے ابھی اپنی موت کے منظر سے بھی تو لطف وز ہونا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس بندریا کو تم نے اور نچایا تو یہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکے گی۔

مرتے وقت اس کے ہوش و حواس بحال رہنے چاہیں۔"

ڈاکٹر رچرڈ نے غلط نہیں کہا تھا' میری حالت واقعی بہتر نہیں تھی۔ کوڑے کھاتے ہوئے میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا تھا ورنہ میرے منہ سے چیخیں نکل جاتیں۔ اس کوشش میں دانتوں کے درمیان آ کر میرا نچلا ہونٹ تقریباً کچل کر رہ گیا۔ میں نے تکلیف کی شدت برداشت کرنے کیلئے اپنے نچلے ہونٹ کو اتنی زور زور سے کاٹا تھا کہ وہ زخم زخم ہو گیا تھا۔

"عذرا خان! اب تمہیں دروازے سے واپس نہیں بلایا جائے گا!" ڈاکٹر رچرڈ مجھ سے بولا' پھر اس نے لیوسی کو مخاطب کیا۔ "اب تم اسے یہاں سے لے جاؤ۔ دلدل میں اسے آہستہ آہستہ ڈالنا تاکہ یہ تھوڑی بہت تو چیخے چلائے۔ کوڑے کھا کر تو یہ ذرا بھی نہیں چیخی۔"

اور پھر میرا زخم زخم جسم گھسیٹا جانے لگا۔ دانستہ دروازے تک لے جاتے ہوئے کمر سے بندھی ہوئی رسی کو لیوسی کے اشارے پر کئی بار کھینچا گیا اور میں گر پڑی۔ وہ مجھ سے بالکل جانوروں کا سا سلوک کر رہے تھے۔

اسی بنگلے کی چھت پر ایک ہیلی کاپٹر موجود تھا۔ میں اب انتہائی نڈھال ہو چکی تھی۔ ہیلی کاپٹر میں دونوں مسلح محافظ میرے دائیں بائیں بیٹھے۔ لیوسی بھی ہیلی کاپٹر میں موجود تھی۔ ایک محافظ نے ہیلی کاپٹر سٹارٹ کر دیا۔ بقیہ محافظ وہیں رہ گئے۔

رات کی تاریکی میں ہیلی کاپٹر جنگل کی طرف پرواز کرنے لگا۔ میں بمشکل اب تک اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے ہوئے تھی۔

ہیلی کاپٹر زیادہ اونچا نہیں اڑ رہا تھا۔ جلد ہی وہ جنگل کے اس حصے تک پہنچ گیا جہاں نیچے روشنی نظر آ رہی تھی۔

میرے دونوں بازوؤں میں ایک مضبوط رسی اسی طرح باندھ دی گئی کہ میں سیدھی نیچے گروں۔ میرے دونوں ہاتھ جو پشت پر بندھے ہوئے تھے رسی کی گرفت سے آزاد کر دیئے گئے۔

جب مجھے اس رسی کے ذریعے نیچے لٹکایا جانے لگا تو میں نے گھنے درختوں کے درمیان بلبلے سے اٹھتے دیکھے۔ مجھے رسی کے ذریعے نیچے دلدل میں اتارا جا رہا تھا۔ سرچ لائٹس کی روشنی میں دلدل کا مخصوص حصہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں میرے دونوں پیر دلدل میں دھنسنے لگے۔ ہیلی کاپٹر ایک جگہ رکا ہوا پرواز کر رہا تھا۔ جب گاڑھی دلدل میں میرا جسم گھٹنوں تک دھنس گیا تو اچانک رسی کاٹ دی گئی۔ ہیلی کاپٹر اب تک فضا میں موجود تھا۔ لیوسی' ڈاکٹر رچرڈ کی ہدایت پر ابھی وہاں موجود تھی۔

دلدل مجھے آہستہ آہستہ نگلنے لگی۔ اب میرا جسم کمر تک دلدل میں دھنس چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دلدل میں آدمی جتنے زیادہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے اتنی ہی تیزی کے ساتھ دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ اس لئے میں ایسا نہیں کر رہی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں بلند تھے اور میں واقعی اپنے خدا سے دعا مانگ رہی تھی۔

☆......☆......☆

اے خدا! مجھے ہمت دے، انتظار کا حوصلہ عطا کر! میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ اگر واقعی میرا آخری وقت آ گیا ہے تو پھر میری دانستہ اور نادانستہ خطاؤں کو معاف کر کہ تو بڑا رحیم ہے اور خطاؤں سے درگزر کرنے والا ہے۔

یقین اور بے یقینی کے عذاب میں اس وقت مجھ پر ایک ایک لمحہ عذاب بن کر گزر رہا تھا۔

دلدل میرے جسم کو دھیرے دھیرے نگل رہی تھی۔ میرے ہاتھ ابھی تک اسی طرح دعائیہ انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ دانستہ میں نے اپنے دونوں ہاتھ دلدل سے باہر رکھے تھے۔ سرچ لائٹس ابھی تک میرے جسم کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے تھیں اور وہ ہیلی کاپٹر جس سے مجھے دلدل میں پھینکا گیا تھا، ایک ہی جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری دشمن جاں لیوسی دوربین کے ذریعے مجھے دلدل میں دھنستا ہوا دیکھ رہی ہوگی اور اس کے سینے میں سلگتی ہوئی انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑتی جا رہی ہوگی۔ اس کے بچوں کا باپ سولومن میرے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اب اس نے مجھ سے سولومن کا انتقام لے لیا تھا۔ موت اور زندگی کے درمیان بس اب اتنا ہی فرق تو رہ گیا تھا کہ میرا بقیہ جسم بھی دلدل میں اتر جاتا۔

سینے تک دلدل میں اتر جانے کے باوجود ابھی تک میرے دل میں زندگی کی آس باقی تھی۔ ابھی میرے ہاتھ دلدل سے باہر تھے، گردن، دونوں شانے، چہرہ اور سر بھی موت کی آہنی گرفت میں نہیں آیا تھا۔

پھر وہ لمحہ آ ہی گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ فضا میں ہر طرف سے ایک دم گڑگڑاہٹ کی آواز بلند ہوئی اور پھر دھماکے ہی دھماکے سنائی دینے لگے۔ لیوسی کا ہیلی کاپٹر تیزی کے ساتھ درختوں کے درمیان سے اوپر اٹھا۔ اس کے پیچھے میں نے دو ہیلی کاپٹروں کو لپکتے دیکھا پھر ایک ہیلی کاپٹر درختوں کے درمیان ٹھیک اس جگہ آ کر پرواز کرنے لگا جہاں چند لمحے پہلے لیوسی کا ہیلی کاپٹر موجود تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر کچھ اور نیچے ہوا۔ اس کے بعد رسیوں سے بنی ہوئی سیڑھی نیچے پھینکی گئی۔ اسی کے ساتھ رسی کا ایک پھندا میرے دونوں شانوں سے پھسلتا ہوا نیچے آیا اور میرا جسم اس کی گرفت میں آ گیا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ سیڑھی کو پکڑ لیا۔ ہیلی کاپٹر بہت آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ دلدل مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور ہیلی کاپٹر اپنی طرف، مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا جسم دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔

میرا جسم رفتہ رفتہ دلدل سے باہر آ گیا، مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ سیڑھی کے ذریعے چڑھ

کر ہیلی کاپٹر تک پہنچ سکتی۔

دور ونزدیک پے در پے دھماکے ابھی تک سنائی دے رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی میدان جنگ کے اگلے مورچوں پر موجود ہوں۔ جب مجھے ہیلی کاپٹر میں کھینچ لیا گیا، مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے موت کو شکست دے دی ہے تو پھر میرے اعصاب جواب دے گئے، میں بے ہوش ہو گئی۔

ہوش میں آنے پر میں نے خود کو جکارتہ کے ملٹری ہاسپٹل میں پایا۔ فوری طور پر طبی امداد دینے کی خاطر مجھے ہیلی کاپٹر کے ذریعے بوگور سے جکارتہ لے آیا گیا تھا۔ بے ہوشی کے دوران ہی میں مجھے طبی امداد دے دی گئی تھی۔ میں ہاسپٹل کے اس کمرے میں ایک صاف وشفاف بستر پر دراز تھی۔ میرے جسم پر بھی ہاسپٹل کا لباس تھا۔ کمرے میں دو ڈاکٹروں اور ایک نرس کے علاوہ دو افراد اور موجود تھے۔ ان میں سے ایک کو میں پہچانتی تھی وہ انٹیلی جنس کا چیف سونارڈی تھا۔ اس سے میری ایک ملاقات ہو چکی تھی۔ بوگور روانگی سے قبل فون پر میں نے اسی کو یہ اطلاع دی تھی کہ میں بوگور میں کہاں اور کس نام سے ٹھہروں گی! اسے میں نے اس لئے باخبر کیا تھا کہ بوگور میں وہاں کی انتظامیہ میرے مقصد کے حصول کو نادانستگی میں ناکامی سے دوچار نہ کر دے یا کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈال دے۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر دونوں ڈاکٹروں نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر میرا معائنہ کرنے لگے۔ گلوکوز کی ڈرپ ختم ہونے والی تھی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر نے نرس کو اشارہ کیا۔ نرس نے ڈرپ کی سوئی نکال دی۔

معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹروں نے سونارڈی کے استفسار پر بتایا کہ میری حالت اطمینان بخش ہے اور تشویش کی کوئی بات نہیں پھر نرس میرے لئے گرم گرم سوپ لے آئی۔ ڈاکٹر جا چکے تھے۔ میں نیم دراز ہو کر چمچے سے سوپ پینے لگی۔ میرے جسم پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں ابھی تک سونارڈی کے ساتھ وہ اجنبی موجود تھا جو اپنی وضع قطع سے بارعب اور بھاری بھرکم شخصیت کا مالک معلوم ہو رہا تھا۔

ایک مگ سوپ پینے کے بعد میں نے اپنے جسم میں قدرے توانائی محسوس کی۔ نرس برتن لے کر جا رہی تھی کہ کمرے ہی میں موجود ایک میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سونارڈی قریب ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا اور پھر دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا اسے سن کر سونارڈی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ ٹیلی فون کال انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو کی تھی۔ وہ میری خیریت دریافت کر رہے تھے۔ انہوں نے فون پر براہ راست مجھ سے بات کی اور میں نے انہیں اطمینان دلا دیا کہ میں خیریت سے ہوں پھر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

ہوش میں آنے کے بعد مجھے ابھی تک اتنی مہلت نہیں مل سکی تھی کہ سونارڈی سے بات کر سکتی، مجھے دلدل سے نکالنے والا خود سونارڈی ہی تھا۔ ہیلی کاپٹر میں اس کے علاوہ دو افراد اور بھی تھے جن کے جسموں پر ملٹری کی وردیاں تھیں۔ وہ فوجی معلوم ہوتے تھے۔ ہیلی کاپٹر میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص بھی فوجی ہی تھا۔ ہوش کھونے سے پہلے میں ان لوگوں کی بس ایک ہی جھلک دیکھ سکی تھی۔ وہ ہیلی کاپٹر بھی ملٹری ہی کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اتنا اندازہ بہرحال کر لیا تھا کہ بوگور کے زراعتی مرکز پر ملٹری نے ریڈ کیا

تھا مگر اس کے نتائج کیا ہوئے تھے، مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے تھے۔ لیوسی کے ہیلی کاپٹر کے پیچھے میں نے دو ہیلی کاپٹروں کو لپکتے دیکھا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر گرا لیا گیا تھا یا نہیں؟ میرے علم میں نہیں آ سکا تھا۔ اس کے علاوہ میں ڈاکٹر رچرڈ کی طرف سے بھی فکرمند تھی کہ وہ بھی ہتھے چڑھ سکا یا نہیں؟ کم از کم اس گھاگ کی طرف سے مجھے کوئی ایسی غلط فہمی نہیں تھی کہ وہ آسانی سے زیر دام آ گیا ہو۔

صدر سوئیکارنو کی فون کال کے بعد تو جیسے فون کالز کا تانتا بندھ گیا پھر فون پر مجھ سے میرے ملک کے صدر مملکت، وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ نے بات کی۔ مجھے اس وقت انتہائی خوشی بھی ہو رہی تھی اور ایک طرح کا فخر سا بھی محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اپنے میری طرف سے غافل نہیں تھے۔ مجھے انہی فون کالز کے ذریعے معلوم ہوا کہ انڈونیشی حکومت نے اس پر میرے ملک کا شکریہ ادا کیا تھا کہ میری تگ و دو اور جدوجہد سے حکومت کیخلاف ایک ممکنہ انقلاب کی سازش کا سراغ مل گیا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں انڈونیشی حکومت کے ساتھ ہر ممکن تعاون کروں۔ ان فون کالز کے بعد وہ فون کال بھی مل گئی جس کا خود مجھے بے چینی سے انتظار تھا۔ یہ فون کال بھی پاکستان ہی سے آئی تھی۔

”میں تم سے بہت خوش ہوں کمانڈر نواز!“ میں نے اس کی آواز پہچانتے ہی کہا تھا۔ ”رپورٹ پلیز!“

”میں نے جو کچھ کیا، وہ میرا فرض تھا میڈم!“ کمانڈر نواز بولا۔ ”رات ہی کو مجھے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ آپ کو بچا لیا گیا ہے۔ رپورٹ دینے سے پہلے میری درخواست ہے کہ مجھے مطمئن کر دیں کہ آپ...... آپ بالکل ٹھیک اور...... صحیح سلامت ہیں۔“ اس کی آواز میں جذبات کی شدت کے سبب لرزش تھی۔ ”یہاں عثمانی، کیپٹن شاد، سرفراز، نرگس، بلقیس، ساجدہ اور آپریشن سیل سے متعلق تمام ہی ارکان آپ کی طرف سے انتہائی فکرمند ہیں۔“

”تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ میں اس وقت جکارتہ کے ملٹری ہاسپٹل میں ہوں مگر فکر و تشویش کی کوئی بات نہیں۔“ میں نے کمانڈر نواز کو بتایا۔ ”مجھے کچھ زدوکوب کیا گیا تھا جس کی وجہ سے میرے جسم کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں، دو چار دن میں ٹھیک ہو جاؤں گی میں! اپنے تمام ساتھیوں کو میری طرف سے مطمئن کر دو!“

میری طرف سے مطمئن ہونے کے بعد کمانڈر نواز رپورٹ دینے لگا۔ ”جس وقت فون پر مجھ سے یہ کہا گیا کہ عذرا خان کا آخری پیغام سنو! تو اسی وقت میں نے فون سے منسلک ٹیپ ریکارڈ کا سوئچ آن کر دیا۔ میں نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ یقیناً آپ شدید خطرے میں ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ کوڈ ورڈز میں کوئی پیغام ضرور دیں گی پھر آپ نے ایسا ہی کیا۔ بظاہر آپ نے ”آپریشن سیل ہیڈکوارٹر“ کو ختم کرنے کی ہدایت دی اور دوسری باتیں کیں لیکن ان تمام الفاظ کے پہلے حروف میں اصل پیغام موجود تھا۔ میں نے ٹیپ ریکارڈ آن کر کے دراصل پیغام نوٹ کر لیا۔ اسی سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ رچرڈ اور لیوسی کی قید میں ہیں اور کہاں ہیں! یہ سمجھنا بھی میرے لئے مشکل نہ تھا کہ وہ لوگ آپ کو قتل کرنے والے ہیں۔ میں نے فوری طور پر وزیر داخلہ سے فون پر رابطہ قائم کیا اور انہیں آپ کی طرف سے ملنے والے پیغام کے متعلق بتایا۔ انہوں نے فوری طور پر وزیر خارجہ سے بات کی اور پھر وزیر خارجہ نے

انڈونیشی حکومت سے رابطہ قائم کرلیا۔ فون پر وزیر داخلہ ہی نے مجھے اطلاع دی کہ انڈونیشی حکومت سے رابطہ قائم ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں فوری طور پر عملی قدم اٹھایا جا رہا ہے۔ انہی سے پتہ چلا کہ انڈونیشی حکومت کے علم میں ہے کہ آپ بوگور گئی ہیں پھر کراچی، اسلام آباد اور جکارتہ کے درمیان فون کھڑکتے رہے اور ہمیں ایک ایک لمحے کی رپورٹ ملتی رہی۔ اس دوران میں مجھے ملٹری ریڈ کے بارے میں بھی معلوم ہوا اور یہ بھی کہ آپ کو بچا لیا گیا ہے، لیکن ابھی تک حیرانی اس پر ہے کہ دشمن کے چنگل میں آپ کیسے پھنس گئیں؟''

''یہ حیرانی تو خود مجھے بھی ہے کمانڈر!'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''میرے کمرے میں اس وقت انڈونیشی انٹیلی جنس کے چیف سونارڈی موجود ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ اس سوال کا جواب دے سکیں گے۔ ان کے سوا کسی کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ میں بوگور گئی ہوں۔ میں تم سے پھر فون پر بات کروں گی۔''

''ٹھیک ہے میڈم! میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔''

''سنو کمانڈر!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کہ مجھے تمہاری اور سیل کے دوسرے ارکان کی یہاں ضرورت محسوس ہو۔ تم عثمانی، کیپٹن شاد اور سرفراز میرے آئندہ احکام کے منتظر رہو، تم چاروں کو میں کسی بھی وقت یہاں طلب کر سکتی ہوں۔ خدا حافظ!''

کمانڈر نواز سے فون پر گفتگو کے بعد ہی میں سونارڈی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''میڈم!'' سونارڈی مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ان سے ملیے۔'' اس نے کمرے میں موجود بھاری بھر کم شخصیت کی طرف اشارہ کیا۔ ''چیف آف ملٹری انٹیلی جنس اشار اسماعیل۔'' سونارڈی نے اجنبی شخص کا تعارف کرایا۔

اخلاقاً میں نے مسکرا کر اشار اسماعیل سے ملنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس نے بھی ویسے ہی الفاظ استعمال کیے۔

''کیا ہم یہاں ہر طرح کی گفتگو کر سکتے ہیں؟'' میں نے پہلو بدلتے ہوئے سونارڈی سے سوال کیا۔

''اگر آپ کہیں تو میں ہسپتال کے عملے کو ہدایت کر دوں کہ وہ ادھر کا رخ نہ کرے۔'' سونارڈی بولا۔

''ہاں کچھ دیر کیلئے یہی بہتر ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن کمرے کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیجئے گا۔''

سونارڈی اٹھ کر چلا گیا تو اشار اسماعیل بولا۔ ''ویسے بھی یہ کمرا الگ تھلگ ہے اور اس کی اطراف مسلح محافظ ہیں، آپ مطمئن رہیں، یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ رات کو جب ہم یہاں پہنچے تھے تو اسی وقت حفاظتی انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ ہاسپٹل کے باہر بھی میرے محکمے کے افراد متعین ہیں۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ ''آپ لوگوں نے تو یہاں ایسے انتظامات کر رکھے ہیں جیسے خدانخواستہ کوئی مجھے یہاں سے اغوا کر کے لے جائے گا۔''

میری بات سن کر اشار اسماعیل بھی مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''آپ بہرحال ہماری مہمان ہیں اور آپ کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔''

سونارڈی لوٹ آیا تو اصل گفتگو شروع ہوئی۔ پہلا سوال میں نے اس سے لیوسی کے ہیلی کاپٹر کے بارے میں کیا۔

اس نے بتایا کہ اس ہیلی کاپٹر کو مار گرا لیا گیا تھا، پھر وہ تفصیل بیان کرنے لگا۔ ''جس وقت ہیلی کاپٹر نیچے گر رہا تھا تو پیراشوٹ کے ذریعے ایک غیر ملکی عورت نے ہیلی کاپٹر سے چھلانگ لگائی اور اس کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ وہ پیراشوٹ سمیت ایک قریبی دلدل میں جا کر گری۔ اس کے مردہ جسم کو شناخت کیلئے دلدل سے نکال لیا گیا۔ اس کی شناخت ہو چکی ہے۔ اس عورت کا نام ویلیس تھا اور وہ اس وفد کے ارکان میں سے ایک تھی جو گزشتہ دنوں برطانیہ آیا تھا۔''

''اور برطانیہ سے انڈونیشیا آنے والا وفد اس لئے آیا تھا کہ زراعتی تحقیق میں انڈونیشی سکالرز کی مدد کر سکے!'' میں نے مسکراتے ہوئے سونارڈی کی بات پوری کر دی، پھر دریافت کیا۔ ''ویلیس کی لاش کہاں ہے؟''

وہ میرے اس سوال پر چونکا، پھر جواب دیا۔ ''ہم اس کی لاش بھی یہیں لے آئے تھے۔ ہاسپٹل کے مردہ خانے میں موجود ہے۔''

''میں پہلی فرصت میں وہ لاش دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''مگر آپ...... آپ شاید ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ ہسپتال کے مردہ خانے.....''

''لاش کو کسی سٹریچر پر ڈال کر یہاں بھی لایا جا سکتا ہے۔'' اشار اسماعیل نے تجویز پیش کی۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ میں نے لیوسی کے مردہ چہرے کو پہچان لیا۔ وہ نہ صرف میری دشمن تھی، انڈونیشیا کی دشمن تھی اور نہ جانے اس نے ساری دنیا کے کتنے ترقی پذیر ممالک کو اپنے ملک کے مفاد کی خاطر نقصان پہنچایا تھا، اس کے باوجود اس کا مردہ چہرہ دیکھ کر مجھے ایک ملال سا ہوا۔ اس وقت مجھے لیوسی کے ان دونوں بچوں کا خیال آ گیا تھا جن کا اس نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ وہ بچے بہرحال معصوم تھے۔ ان کا کوئی قصور نہیں تھا جو اب لیوسی کی موت کے بعد قطعی بے سہارا ہو گئے تھے۔ ان معصوم بچوں کا باپ سولومن پاکستان میں میرے ہاتھوں مارا گیا تھا اور ماں یہاں انڈونیشیا میں میری موت کا منظر دیکھتے دیکھتے خود موت کی دہلیز عبور کر گئی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ انسانی رشتے کے ناطے مجھے لیوسی کی عبرتناک موت پر کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔

''اسے لے جاؤ!'' میں نے لیوسی کے چہرے پر کپڑا ڈھک دیا۔ سٹریچر وہاں سے لے جایا جانے لگا۔

میں نے محض اس تصدیق کی خاطر لیوسی کا مردہ چہرہ دیکھا تھا کہ مجھے اس کی موت کا یقین ہو سکے۔

''ایک اہم شخص اور بھی تھا۔'' میں خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

''کون؟'' سونارڈی بول اٹھا۔

''ڈاکٹر رچرڈ!''...... مگر اس عورت کی طرح وہ بھی انڈونیشیا میں کسی اور نام سے داخل ہوا ہوگا۔''

پھر میں نے سونارڈی اور اشار اسماعیل کو ڈاکٹر رچرڈ اور لیوسی کے بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کردیا کہ وہ کس لئے انڈونیشیا آئے تھے اور یہاں کی انتہاپسند دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں سے مل کر کیا کھیل کھیلنا چاہتے تھے۔

اشار اسماعیل اور سونارڈی کیلئے بڑی حد تک میری باتیں انکشاف کی حیثیت رکھتی تھیں۔ انڈونیشی انٹیلی جنس کے علم میں یہ بات تو تھی کہ ''دائیں بازو'' کی کچھ جماعتیں اپنے اراکین کو فوجی تربیت دلوا رہی ہیں تاکہ آیندہ ان کے یہ تربیت یافتہ ارکان انقلاب کی جدوجہد کرسکیں مگر وہ ایسا سراغ نہیں لگا سکے تھے کہ ان کا مرکز کہاں ہے؟ بوگور کی اطراف میں پھیلے ہوئے گھنے جنگلوں پر انہیں کچھ شبہ تھا مگر یہ شبہ یقین میں ابھی نہیں بدلا تھا۔ اس کے علاوہ اس بات سے بھی بے خبر تھے کہ دنیا کی ایک سپر پاور ان باغیوں کی پشت پناہی کررہی ہے۔

سونارڈی کو جب میں نے فون پر یہ بتایا کہ میں بوگور جارہی ہوں تو وہ چونک اٹھا۔ اس نے بوگور کے اعلیٰ حکام کو فوری طور پر میرے متعلق ضروری ہدایات جاری کردی تھیں اور یہی اس کی بھیانک غلطی تھی۔ بوگور کے تقریباً تمام ہی اعلیٰ حکام خریدے جاچکے تھے۔ کچھ کو بلیک میل کر کے اشاروں پر ناچنے کیلئے مجبور کردیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں لیوسی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ دادعیش دیتے ہوئے ان حکام کی تصاویر اور فلمیں اپنے قبضے میں کررکھی تھیں۔ انہی اعلیٰ حکام کو جب سونارڈی نے میرے متعلق ہدایات دیں تو انہوں نے فوری طور پر لیوسی کو آگاہ کردیا۔

پھر جب پاکستان سے یہ پیغام فون پر انڈونیشیا پہنچا کہ میں بوگور میں ملک دشمنوں کے ہتھے چڑھ چکی ہوں اور میری زندگی شدید خطرے میں ہے تو سونارڈی نے ملٹری انٹیلی جنس کے چیف اشار اسماعیل سے رابطہ قائم کیا۔ بوگور کے بارے میں ملٹری انٹیلی جنس کی رپورٹ بھی یہی تھی کہ وہاں کوئی خطرناک کھیل کھیلا جارہا ہے۔ اشار اسماعیل اگلے چند روز میں وہاں ملٹری ریڈ کے احکام دینے والا تھا۔ پاکستان سے موصول ہونے والے پیغام کی روشنی میں یہ تصدیق ہوگئی کہ واقعی باغیوں کا مرکز بوگور ہی ہے۔ اسی کے بعد انتہائی تیزی کے ساتھ انڈونیشی ملٹری حرکت میں آگئی۔ خود اشار اسماعیل اور سونارڈی نے اس ریڈ کی قیادت کی۔

میں نے کوڈورڈز میں کمانڈر نواز کو آخری خواہش کے طور پر جو پیغام دیا تھا، اس کے بعد دانستہ وقت گزاری کیلئے اپنی بہن ذکیہ کو خط لکھا تھا اور پھر دانستہ ہی ایسے حالات پیدا کردیئے تھے کہ ڈاکٹر رچرڈ کو غصہ آجائے۔ ادھر تو میرے جسم پر کوڑے برسائے جارہے تھے، ادھر پاکستان اور انڈونیشیا کے درمیان فون کھڑک رہے تھے اور ملٹری ریڈ کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ میرے جسم پر پڑنے والی ایک ایک ضرب مجھے زندگی سے قریب لارہی تھی۔ میں نے ذکیہ کو طویل خط لکھ کر اور پھر اپنے جسم پر کوڑے کھا کر ملٹری ریڈ کیلئے وقت فراہم کردیا تھا۔

سونارڈی نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ بوگور کے اعلیٰ حکام، ملک دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں

ورنہ وہ مجھے ان کی قید میں نہ جانے دیتے۔ سونارڈی نے انہیں میری حفاظت کا حکم دیا تھا۔ اس نتیجے تک پہنچنے میں اشار اسماعیل نے بھی اس کی مدد کی۔ ملٹری انٹیلی جنس کی رپورٹس کے مطابق بوگور کے دو اعلیٰ حکام مشتبہ تھے۔

بوگور پہنچتے ہی وہاں کے تمام اعلیٰ حکام کو حراست میں لے لیا گیا، اس کے بعد ہی بقیہ کارروائی کی گئی تھی۔ انہی حکام کے ذریعے لیوسی کی اصل شخصیت سامنے آئی تھی اور پھر پہلا ہلا اسی کے بنگلے پر بولا گیا تھا، وہیں سے میرے بارے میں سراغ ملا تھا کہ مجھے جنگل کے کس حصے میں دلدل برد کیا جارہا ہے!

سونارڈی اور اشار اسماعیل کی زبانی مجھے جو کچھ معلوم ہوا، اس میں ڈاکٹر رچرڈ کا ذکر کہیں نہیں تھا اور یہ بات میرے لئے تشویشناک تھی۔ انہیں ڈاکٹر رچرڈ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔

''لیوسی تو محض اس کی آلہ کار تھی، اصل سرغنہ تو وہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ زخمی ہونے کے باوجود وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔''

''لیکن میڈم، پورا بوگور اور اردگرد کا سارا علاقہ ملٹری کے گھیرے میں ہے اور اب تک کسی فرد واحد کو وہاں سے باہر نہیں نکلنے دیا گیا۔'' اشار اسماعیل نے بتایا۔ ''میں دراصل آپ کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا تاکہ ہم آپ سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں اگلا قدم اٹھاسکیں۔''

''آپ نے رچرڈ کو دیکھا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور ظاہر ہے کہ ملٹری انٹیلی جنس کے کسی رکن نے بھی اسے نہیں دیکھا ہوگا۔'' میں بولی۔

''جس شخص کو کوئی پہچانتا ہی نہیں تو پھر اس پر کس طرح ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے یا اسے فرار ہونے سے روکا جاسکتا ہے!''

اشار اسماعیل اور سونارڈی دونوں ہی کسی سوچ میں گم ہوگئے۔ میری دلیل آسانی سے رد نہیں کی جاسکتی تھی۔

''اسے تو میڈم صرف آپ...... آپ ہی پہچان سکتی ہیں۔'' سونارڈی کچھ دیر کے بعد کسی قدر جھجکتے ہوئے۔ ''اور...... اور آپ کو اس حالت میں......''

''میرا خیال ہے کہ میں اس قابل یقیناً ہوں کہ ہیلی کاپٹر میں یہاں سے بوگور چل سکوں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''مگر...... مگر یہ ظلم ہوگا آپ پر میڈم!...... اور ڈاکٹرز بھی شاید، اس کی اجازت نہیں دیں گے۔'' سونارڈی بولا۔ اشار اسماعیل نے بھی تائید کی۔

''ڈاکٹروں سے زیادہ میں اپنی حالت کے بارے میں صحیح اندازہ لگا سکتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں بیڈ سے اترنے لگی۔

''ارے آپ...... آپ زخمی ہیں میڈم!'' سونارڈی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس میں یقیناً کوئی شبہ نہیں تھا کہ میں واقعی زخمی تھی مگر اس وقت میرا بیڈ سے اٹھنا ضروری تھا۔ ڈاکٹروں نے تھوڑی سی ردوکد کے بعد اس شرط پر مجھے سفر کرنے کی اجازت دے دی کہ ایک ڈاکٹر اور

نرس کو میرے ساتھ ضروری دواؤں کے ساتھ بوگور جانا تھا۔

میرے ایما پر ایسا ڈھیلا ڈھالا لباس بھی فراہم کردیا گیا تھا جس سے میرے جسم پر موجود زخم متاثر نہ ہوں۔ ہسپتال کے لباس سے مجھے الجھن محسوس ہورہی تھی۔ اس وقت صبح کے پونے دس بج رہے تھے۔ جب میں سونارڈی اور اشار اسماعیل کے ساتھ ملٹری کے ایک ہیلی کاپٹر میں بوگور کی طرف پرواز کررہی تھی۔ اس سے پہلے میں نے سونارڈی سے کہا تھا کہ پراموڈیا کو حراست میں لے لیا جائے۔ روانگی سے قبل سونارڈی نے پراموڈیا کی گرفتاری کے احکام جاری کردیئے تھے، اسی کے ساتھ یہ ہدایت بھی دی تھی کہ اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں اس نے پراموڈیا پر تشدد کی اجازت بھی دے دی تھی اور کہا تھا کہ پراموڈیا جن لوگوں کے نام اپنے ساتھیوں کے طور پر بتائے، انہیں بھی فوراً گرفتار کرلیا جائے۔ میرے کہنے پر پراموڈیا کے اس گھر پر بطور خاص چھاپہ مارنے کے احکام دیئے گئے تھے جہاں میں کئی بار جاچکی تھی۔ میری ہی فراہم کردہ اطلاعات پر اس رسالے کے دفتر پر بھی چھاپہ مارنے کا حکم دے دیا گیا تھا جس کا بیرون ملک ایڈیشن چوگنی قیمت میں فروخت ہوتا تھا۔ یہ وہی پراموڈیا تھا جو انڈونیشیا کی ایک انتہاپسند سیاسی جماعت کا لیڈر تھا اور جس کا ذہن پڑھ کر مجھے علم ہوا تھا کہ اس کی سیاسی جماعت کو غیرملکی امداد ملتی ہے۔ پراموڈیا ہی کے ذریعے میں لیوسی کی ایک ماتحت گرینا تک پہنچی تھی اور پھر گرینا کا ذہن پڑھنے کے بعد ہی مجھے لیوسی کا سراغ ملا تھا۔ ایک سپر پاور کے اشارے پر پراموڈیا کی جماعت انڈونیشیا میں ایک ایسے انقلاب کی راہ ہموار کررہی تھی جو موجودہ حکومت کا تختہ الٹ دیتا۔ اس جماعت کے رضا کار بھی بوگور سے متصل جنگلوں میں فوجی تربیت حاصل کررہے تھے۔ پراموڈیا کو اسی سبب نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

جکارتہ سے بوگور جاتے ہوئے اشار اسماعیل سے مجھے ملٹری آپریشن کے متعلق اور بہت سی باتوں کا علم ہوا۔

اب تک بوگور کے جنگلوں سے سینکڑوں باوردی رضا کار پکڑے گئے تھے۔ انہوں نے ملٹری سے مقابلہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی جس کے نتیجے میں انہیں خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا، ملٹری کا گھیرا اتنا سخت تھا کہ اس نے کسی ایک بھی رضا کار کو مسلح ہونے کے باوجود موت کے اس حصار سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ رضا کاروں سے مسلح تصادم کے نتیجے میں کچھ فوجی بھی مارے گئے تھے اور زخمی بھی ہوئے تھے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔

سونارڈی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ زراعتی تحقیقی مرکز سے متعلق تمام عملہ بھی ابھی تک ملٹری کی نگرانی میں ہے۔ میرے لئے یہ اطلاع اطمینان بخش تھی۔ رچرڈ کی قید کے دوران میں خاصے چہرے میرے لئے آشنا تھے۔ میں ان مسلح اور غیرمسلح باوردی محافظوں کو بھی پہچان سکتی تھی جنہیں میں نے اس بنگلے میں دیکھا تھا جہاں رچرڈ ٹھہرا ہوا تھا۔

مجھے یقین تو نہیں تھا کہ رچرڈ اب تک اس حصار کے اندر ہی ہوگا، پھر بھی میں ایک کوشش کرلینا چاہتی تھی۔ اگر ڈاکٹر رچرڈ نہیں تو اس کا کوئی سراغ ہی بوگور سے مل سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے زخمی ہونے کے باوجود بوگور کے سفر کا قصد کیا تھا۔

نباتاتی باغ میں ایک ہموار جگہ پر ہیلی کاپٹر اتار لیا گیا۔ نرس نے مجھے سہارا دیا اور پھر میں نے زمین پر قدم رکھا۔ ڈاکٹر بھی ساتھ ساتھ تھا۔

''ڈاکٹر اور نرس کو یہیں کہیں رک جانے دیں۔'' میں نے سونارڈی سے کہا۔ ''اگر مجھے ان کی ضرورت محسوس ہوئی تو بلوا لیجئے گا۔ میں خود چل سکتی ہوں۔''

سونارڈی نے میری بات سن کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

''ان کی حالت تو ایسی بھی نہیں کہ یہ بیڈ سے خود اتر سکیں بغیر سہارے کے!'' ڈاکٹر نے کہا۔

''مجھے حیرت ہے سر کہ یہ چل رہی ہیں۔''

''چلنا تو الگ ڈاکٹر، میں تو دوڑ بھی سکتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں پنجوں کے بل کھڑی ہوگئی اور ہنستے ہوئے کہا۔ ''دکھاؤں آپ کو دوڑ کر؟''

''پلیز!'' ڈاکٹر بولا اور مجھے دوڑنے سے روک دیا پھر اسے اجازت دینا ہی پڑی کہ میں سہارے کے بغیر چل سکتی ہوں۔

''آپ اگر چاہیں میڈم تو چلتے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھ لیں۔'' سونارڈی میرے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

میں نے شکریئے کیساتھ اس کی پیشکش رد کردی۔ نباتاتی باغ کے چپے چپے پر مجھے مسلح فوجی نظر آرہے تھے۔ اشار اسماعیل نے غلط نہیں کہا تھا کہ وہاں سے کسی کا فرار ہوجانا آسان کام نہیں تھا، مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ رچرڈ ایسے شیطانی ذہانت کے مالک افراد ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر رچرڈ کوئی معمولی قسم کا سیکرٹ ایجنٹ نہیں تھا، اس کا شمار تو ان لوگوں میں ہوتا تھا جو سیکرٹ ایجنٹوں کو تربیت دیتے ہیں۔

اشار اسماعیل اور سونارڈی کے ساتھ میں جنگلوں کی اس قطار کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں زراعتی مرکز کے عملے کی سکونت تھی۔ انہی میں وہ بنگلہ بھی تھا جہاں لیوسی رہتی تھی اور جہاں گزشتہ روز خود میں بھی زندگی اور موت کے درمیان معلق رہی تھی۔ اس بنگلے کے علاوہ وہ بنگلہ بھی یہیں تھا جس میں ڈاکٹر رچرڈ سے میری ملاقات ہوئی تھی اور جس کی چھت پر سے ایک ہیلی کاپٹر مجھے لے کر جنگل کی طرف روانہ ہوا تھا۔

بنگلوں کا طرز تعمیر کیونکہ تقریباً یکساں تھا اس لئے لیوسی کے بنگلے کو پہچان لینا دن کے وقت بھی میرے لئے آسان نہ تھا۔ وہیں سے میں اندازے کے مطابق اس بنگلے تک پہنچی جہاں ڈاکٹر رچرڈ کو دیکھا تھا۔

لیوسی کو زراعتی مرکز کا عملہ ویلیس کے نام سے جانتا تھا اس لئے لیوسی کا بنگلہ زراعتی مرکز کے عملے والے اچھی طرح جانتے تھے۔ انہی میں سے ایک شخص کے توسط سے ہم لوگ لیوسی کے بنگلے تک پہنچ گئے۔

گزشتہ شب میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اسی قطار میں وہ چوتھا بنگلہ تھا جہاں مجھے لیوسی کے بنگلے سے لے جایا گیا تھا۔

میں، سونارڈی اور اشار اسماعیل کے ساتھ اسی طرف بڑھی۔ ہر بنگلے کے سامنے مسلح فوجی پہرہ دے رہے تھے، بنگلوں کے مکینوں کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

''کیا بنگلوں کی عقبی سمت بھی فوجی موجود ہیں؟'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے اشار اسماعیل

سے سوال کیا۔ اس سوال کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ روز عقبی سمت ہی سے وہ نوجوان مجھے لے کر کھڑکی کے راستے فرار ہوا تھا جسے باوردی رضا کاروں نے جنگل کے ایک مکان میں گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا، جنگلوں کی عقبی سمت گھنا جنگل تھا۔

اشار اسماعیل میرا سوال سن کر بولا۔ ''ادھر بھی فوجی ہونا تو چاہئیں۔ ٹھہریں، میں پوچھتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس نے ایک بنگلے کے سامنے پہرہ دیتے ہوئے فوجی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ فوجی تیز تیز چلتا ہوا قریب آیا اور اسے سلیوٹ کیا۔

فوجی نے استفسار پر بتایا کہ عقبی سمت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، وہاں بھی اس کے دوسرے ساتھی فوجی پہرہ دے رہے تھے۔

زراعتی مرکز کے نگراں کو بھی میرے ایما پر سونارڈی نے ساتھ لے لیا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میں چوتھے بنگلے کے گیٹ پر پہنچ کر رک گئی اور مڑ کر عملے کے نگراں تقدیر علی سے پوچھا۔ ''اس بنگلے میں کون رہتا ہے؟''

''ترتیب کے ساتھ یہ بنگلہ اور دائیں جانب جو بنگلہ آپ کو نظر آ رہا ہے، یہاں سے مسز ویلیس کے بنگلے تک پانچوں بنگلے برطانوی وفد کیلئے مخصوص تھے۔ اس بنگلے میں جس کے سامنے آپ کھڑی ہیں مسٹر جیمس رہتے ہیں۔'' تقدیر علی نے جواب دیا۔

''کل صبح سے اب تک آپ کی ملاقات جیمس سے ہوئی؟'' میں نے تقدیر علی سے سوال کیا۔

میں اس سے انڈونیشی قومی زبان ہی میں گفتگو کر رہی تھی۔

میرے سوال پر تقدیر علی کچھ نروس سا نظر آنے لگا۔

''مسٹر تقدیر علی! میڈم کے سوال کا جواب دیجئے!'' سونارڈی سخت لہجے میں تقدیر علی سے مخاطب ہوا۔

'وہ...... جیمس سے میری ملاقات شاید کل شام ہوئی تھی۔'' تقدیر علی مزید گھبرا گیا۔

''آپ کو یقین ہے کہ جیمس سے آپ کل شام ملے تھے؟'' میں نے دانستہ نرمی کے ساتھ پوچھا۔ ''گھبرائیے مت، سوچ کر جواب دیجئے۔''

''جی ...... جی ہاں ...... بالکل! مسٹر جیمس نے مجھے یہ خط بھی دیا تھا جو......'' یہ کہتے ہوئے تقدیر علی نے اپنی پینٹ میں ہاتھ ڈالا۔

میں اسی وقت چیخ اٹھی۔ ''سونارڈی سنبھلو!''

تقدیر علی نے جیب سے کوئی فرضی خط نکالنے کے بہانے ریوالور نکالا تھا اور اشار اسماعیل نے اس کی کلائی پر ہاتھ مار کر ریوالور نیچے گرا دیا تھا۔ سونارڈی نے تیزی سے پلٹ کر تقدیر علی کو قابو میں کر لیا تھا۔ تقدیر علی شاید سونارڈی کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکل جانے کا خواب دیکھ رہا تھا ورنہ ایسی احمقانہ حرکت نہ کرتا۔ تقدیر علی کو فوجیوں کے حوالے کر دیا گیا جو اسے وہاں سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

''میں اس کی پھولی ہوئی جیب دیکھ کر پہلے ہی اس کی طرف سے چوکنا تھی۔'' میں نے اشار اسماعیل سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ زراعتی مرکز کا عملہ بھی باغیوں سے ملا ہوا تھا جس کا ایک ثبوت ابھی مل

چکا ہے۔ نگرانی کے بجائے تمام عملے کو حراست میں لے لیا جائے تو بہتر ہے۔''

میری تجویز پر فوراً عمل کیا گیا۔ اس دوران میں اسی بنگلے کے سامنے میں، سونارڈی اور اشار اسماعیل کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔

بنگلوں کے مکینوں کو فوجی باہر لانے لگے۔ وہ بنگلہ بالکل خالی ملا جسے جیمس کا بنگلہ بتایا گیا تھا اور جہاں میں نے ڈاکٹر رچرڈ کو دیکھا تھا۔

''آئیں چلیں، اس بنگلے کو اندر سے دیکھتے ہیں۔'' میں کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ممکن ہے وہاں کوئی کام کی چیز مل جائے۔''

سونارڈی اور اشار اسماعیل بھی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سونارڈی نے کہا۔ ''اندر سے بنگلے کو دیکھ کر یہ تصدیق بھی ہو جائے گی کہ لیوسی کے بنگلے سے آپ کو یہیں لایا گیا تھا یا وہ کوئی اور بنگلہ تھا۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے قدم بڑھانے لگی۔

''اس بنگلے کا گیٹ اور اندرونی دروازہ فوجیوں کو کھلا ہوا ہی ملا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں جو افراد بھی رہے ہوں گے، جلد بازی ہی میں انہوں نے بنگلہ چھوڑا ہوگا۔ گیٹ اور دروازہ کھلا ہونے سے یہ بھی تصدیق ہوتی تھی کہ یہی مطلوبہ بنگلہ تھا۔

اندر تین کمرے تھے، انہی میں سے ایک کمرہ وہ تھا جس میں گزشتہ رات مجھے باندھ کر لایا گیا تھا۔ کمرے کے فرنیچر اور سامان آرائش سے میں نے وہ جگہ پہچان لی۔ وہ میز کرسی بھی وہاں موجود تھی جس پر بیٹھ کر میں نے اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کو خط لکھا تھا۔ لفافے پر دانستہ میں نے اس کا پتا غلط لکھا تھا تاکہ لیوسی یا ڈاکٹر رچرڈ اس تک نہ پہنچ سکے۔ اسے تو میں نے محض وقت گزاری کیلئے خط لکھا تھا جیسا کہ میں بیان کر چکی ہوں۔

''یہ وہی بنگلہ ہے۔'' میں نے سونارڈی کو مخاطب کیا۔

پھر سونارڈی اور اشار اسماعیل نے اس بنگلے کا ایک ایک گوشہ دیکھ لیا مگر کوئی کارآمد شے نہ مل سکی۔ ڈاکٹر رچرڈ ہنگامی حالات میں وہاں سے فرار ہونے کے باوجود اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑ گیا تھا۔ ہم تینوں مایوس ہو کر بنگلے سے نکل رہے تھے تو سونارڈی مجھ سے بولا۔ ''میڈم! کیا آپ اس بنگلے میں رہنے والے شخص جیمس کو جانتی ہیں پہلے سے؟ آپ نے تقدیر علی سے خاص طور پر جیمس ہی کے بارے میں کیوں پوچھا تھا؟ اس کے علاوہ مجھے یہ حیرت بھی ہے کہ آپ کو زراعت مرکز کے نگران پر یہ شبہ کیسے ہو گیا کہ وہ باغیوں سے ملا ہوا تھا؟''

''تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے سونارڈی کہ جیمس، لیوسی ہی کے ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ لیوسی کے ساتھ وہ پاکستان بھی گیا تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ زراعتی مرکز کے نگراں تقدیر علی پر مجھے شبہ اس لئے ہوا کہ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے کم از کم تقدیر علی یا دوسرے مقامی عملے کو بے خبر نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ زراعتی مرکز کا عملہ بھی ملک دشمنوں سے ملا ہوا تھا۔''

میں سونارڈی کے سوالوں کا جواب دیتی رہی اس بنگلے سے باہر آ کر دوبارہ اسی کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ اشار اسماعیل اور سونارڈی بھی انہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میری بات ابھی جاری تھی۔ ''ہوا یہ کہ کل صبح میری

آنکھوں کے سامنے لیوسی نے جیمس کو قتل کردیا تھا۔'' میں نے جیمس کے قتل کی تفصیلات سے ان دونوں کو آگاہ کیا، پھر بولی۔ ''تقدیر علی سے جیمس کے بارے میں اسی لئے میں نے سوال کیا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ کل شام جیمس سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے اس جواب سے میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوا کہ وہ جیمس کی گمشدگی اور قتل پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ شخص جسے صبح ہی قتل کیا جاچکا تھا ظاہر ہے شام کو اس سے کس طرح مل سکتا تھا؟ تقدیر علی اپنے جھوٹ سے پکڑا گیا۔''

''اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟'' اشار اسماعیل نے پوچھا۔ ''کیا جکارتہ واپس چلیں؟''

''ابھی نہیں۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک نظر ان تمام افراد کو دیکھنا چاہتی ہوں، جنہیں ان بنگلوں سے نکال کر حراست میں لے لیا گیا ہے۔''

میری خواہش پر کچھ ہی دیر کے بعد زیر حراست افراد کو وہیں لے آیا گیا۔ فوجی انہیں گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔

میں نے کرسی سے اٹھ کر ان سبھی کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ انہیں دو بڑی بڑی قطاروں میں کھڑا کردیا گیا تھا۔ دوسری قطار میں مجھے دو قوی ہیکل انڈونیشی نظر آئے اور انہیں دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ وہ دونوں ہی مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش کررہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرے لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ میرا ابوگورآنا بے سود ثابت نہیں ہوا تھا۔ میں نے ان دونوں کو پہچان لیا تھا۔ ان میں سے ایک وہ تھا جو گزشتہ رات میری کمر کے گرد بندھی ہوئی رسی کا دوسرا سرا تھامے ہوئے تھا اور دوسرا قوی ہیکل شخص وہ تھا جس نے لیوسی کے تھک جانے پر میرے جسم پر کوڑے برسائے تھے۔ یقیناً انہوں نے بھی مجھے پہچان لیا تھا اور اسی سبب نظریں چرا رہے تھے۔

میں دوسری قطار کا جائزہ لیتی ہوئی ان دونوں کے سامنے سے اجنبی کی طرح گزر گئی اور پھر اشار اسماعیل کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔ ''میرے جسم پر زخموں کے پھول کھلانے والوں میں سے ایک تو وہ تھی جس کی لاش ملٹری ہاسپٹل کے مردہ خانے میں پڑی ہے، یعنی لیوسی! اور دوسرا شخص، دوسری قطار میں موجود ہے!''

اشار اسماعیل ہی کے پاس سونارڈی کھڑا تھا۔ اس نے بھی میری بات سنی اور چونک اٹھا۔

اس کے بعد ان دونوں کے سوا بقیہ افراد کو واپس بھیج دیا گیا۔ ان دونوں ہی کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔ چار مسلح فوجی ان پر گنیں تانیں کھڑے تھے۔

''سنو!'' میں نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔ ''تم دونوں کو میں نے پہچان لیا ہے اس لئے جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا!'' میں ان سے انڈونیشی زبان ہی میں گفتگو کررہی تھی۔ ''میرے ایک اشارے پر تم دونوں کو گولی ماری جاسکتی ہے مگر میں تمہیں بے قصور سمجھتی ہوں۔ ظاہر ہے کہ تم غریب لوگ ہو اور تم نے پیسوں کے حصول کی خاطر ہی ان غیرملکیوں کے ہر حکم کی تعمیل کی ہوگی۔ میں تم سے صرف ایک سوال کروں گی۔ اگر تم نے اس کا صحیح جواب دے دیا تو میں سمجھوں گی کہ تم زندہ رہنا چاہتے ہو، جھوٹ بولنے یا جواب نہ دینے کی صورت میں ابھی، اسی وقت اور یہیں تم دونوں کو گولی ماردی جائے گی۔ وہ جو کل اس کے سامنے والے بنگلے کے ایک کمرے میں بیڈ پر نیم دراز تھا اس کا نام ڈاکٹر رچرڈ تھا۔ میں اس

کے بارے میں تم سے یہ سوال کرتی ہوں کہ وہ کب، کیسے اور کہاں فرار ہوگیا؟...... میں اپنے سوال کا درست جواب سننے کیلئے تین تک گنتی گنوں گی، تین کہتے ہی تمہارے جسم گولیوں سے چھلنی کردیئے جائیں گے تو اب میں گنتی گن رہی ہوں۔ مجھے صرف اپنے سوال کا جواب چاہئے! اس کے سوا کچھ اور سننا نہیں چاہتی...... ایک!''

میری نظریں ان دونوں کے چہروں پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اشار اسماعیل کے اشارے پر دو فوجیوں نے اپنی رائفلیں ان کی طرف سیدھی کرلی تھیں۔

''اب بھی وقت ہے، تم اپنی زندگی بچاسکتے ہو۔ کیوں ایک غیرملکی دشمن کی خاطر جان دے رہے ہو؟...... دو میں نے اچانک کہہ دیا، پھر بولی۔ ''اور اب میں جب تین کہوں گی تو تم دونوں موت کی آغوش میں پہنچ جاؤ گے!''

میری دھمکی آخرکار کارگر ثابت ہوئی۔ ان میں سے ایک کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ چیخ اٹھا۔ ''بتاتا ہوں...... تی...... تین نہ کہنا!'' یہ وہی تھا جس نے میرے جسم پر کوڑے لگائے تھے۔

اس نے بتایا کہ جس وقت پہلا دھماکا ہوا اور پھر ہیلی کاپٹر فضا میں بلند نظر آئے تو اسی وقت ڈاکٹر رچرڈ نے فرار ہونے کا حکم دیا۔ ڈاکٹر رچرڈ کو ایک سٹریچر پر ڈال کر بنگلے کے عقبی دروازے سے قریبی جنگل میں لے جایا گیا۔ وہ قوی ہیکل انڈونیشی اس کا سٹریچر اٹھائے ہوئے تھے اور دو مسلح باوردی رضاکار سٹریچر کے ساتھ ساتھ تھے۔ گھنے جنگل میں کسی ایسے ہی موقع کیلئے ایک ہموار جگہ ایک ہیلی کاپٹر موجود تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ اس ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر باوردی رضاکاروں کو ساتھ لے کر فرار ہوگیا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ خود ہیلی کاپٹر اڑا لے گیا۔ اسے ہیلی کاپٹر تک پہنچانے والے یہی دونوں تھے جو میرے سامنے کھڑے تھے۔

ان دونوں کے بیان سے صاف ظاہر تھا کہ جس وقت سونارڈی کے ساتھ آنے والے ہیلی کاپٹر، لیوسی کے ہیلی کاپٹر کی طرف لپکے تھے اور انہوں نے فائرنگ شروع کی تھی، عین اس وقت ڈاکٹر رچرڈ ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر فرار ہورہا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ کے وہاں سے نکل جانے کے بعد ہی ملٹری نے اس پورے علاقے کو گھیرے میں لیا تھا۔

اب وہاں مزید رکنا لاحاصل ہی تھا۔ میں اشار اسماعیل اور سونارڈی کے ساتھ جکارتہ واپس آگئی۔ ڈاکٹر رچرڈ آدمیوں کے جنگل میں کھو گیا تھا اور میں ہر قیمت پر اسے تلاش کرنا چاہتی تھی۔ میری نظر میں اس کی تلاش کا ایک ہی راستہ تھا اور یہ راستہ دانستہ اپنی زندگی داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔ یہی سبب تھا کہ اشار اسماعیل اور سونارڈی دونوں ہی نے اس سے شدید اختلاف کیا۔

اشار اسماعیل بولا۔ ''میڈم! خدانخواستہ آپ کو کچھ ہوگیا تو ہم حکومت پاکستان کو کیا جواب دیں گے؟''

''انشاءاللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''اب تک کئی دفعہ موت میرے انتہائی قریب آکر دور جاچکی ہے۔ ابھی شاید میرا وقت نہیں آیا اور اگر موت کی گھڑی آہی گئی تو پھر کوئی احتیاط، کوئی تدبیر کام نہیں آسکے گی۔ میں یہاں جو کچھ کررہی ہوں، اس کی ذمہ دار خود ہوں۔ اس سلسلے میں آپ لوگوں پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ آپ لوگ مطمئن رہیں، میں پاکستان کے صاحب اقتدار افراد سے بھی

اس سلسلے میں بات کرلوں گی۔"

کافی دیر کے بحث و مباحثے کے بعد اشار اسماعیل اور سونارڈی نے اس روز چند اہم معاملات طے ہوئے۔ انہیں میری تجویز ماننا پڑی اور یہ وہی تجویز تھی جس پر میں اپنے ملک میں بھی دو ایک مرتبہ عمل کر چکی تھی۔

میں بھی زخمی تھی اور میرا دشمن ڈاکٹر رچرڈ بھی بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ میرے زخم مندمل ہونے میں ڈاکٹروں کے مطابق ابھی پورا ایک ہفتہ باقی تھا مگر میں یہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں سونارڈی اور اشار اسماعیل مجھ سے تقریباً روزانہ ہی آ کر ملتے رہے۔ ان دونوں کے محکموں کی کارکردگی کی رپورٹس مجھے ملتی رہیں جن میں کئی اہم باتیں ایسی تھیں کہ جو میرے آئندہ اقدامات کیلئے معاون ثابت ہوسکتی تھیں اسی مرحلے میں پاکستان سے میں نے کمانڈر نواز، عثمانی، کیپٹن شاد اور سرفراز کو بلوا لیا تھا۔ انڈونیشیا پہنچنے کے بعد وہ چاروں میری ہدایات پر مختلف علاقوں میں سرگرم عمل ہوگئے تھے۔ میرا رابطہ ان سے ٹرانسمیٹر پر قائم تھا۔ جکارتہ کا ملٹری ہاسپٹل میرے لئے ایک اعتبار سے آپریشن سیل ہیڈکوارٹر کی حیثیت اختیار کرگیا تھا۔ میں وہاں پوری طرح محفوظ و مطمئن تھی، دشمن مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ انڈونیشی حکومت مجھے تمام تر سہولتیں فراہم کررہی تھی اور میں ڈاکٹر رچرڈ کے گرد ایک مضبوط جال بننے کی کوشش کررہی تھی۔ یہ جال تیار ہو چکا تھا مگر بطور چارا میں نے ابھی خود کو پیش نہیں کیا تھا۔ یہ گویا میرا آخری حربہ ہوتا۔

پھر وہ دن بھی گزر ہی گئے۔ ایک ہفتے بہترین علاج معالجے اور نگہداشت کے بعد میری زخم مندمل ہوگئے مگر یہ ظاہری زخم تھے۔ میری روح کا زخم ابھی تازہ تھا اور یہ زخم اسی وقت بھر سکتا تھا جب ڈاکٹر رچرڈ قابو میں آجاتا۔ اس نے میری عزت نفس پر بڑی شدید ضربیں لگائی تھیں، مجھے بہت ذلیل و رسوا کیا تھا، مگر اس کا بڑا جرم کچھ اور ہی تھا۔ ذاتی عناد و دشمنی سے قطع نظر وہ پاکستان کا دشمن تھا، انڈونیشیا کا مجرم تھا اور ان سب ممالک کا حریف تھا جہاں اس نے اپنے ملک کے مفاد کی خاطر سازشوں کے جال پھیلائے تھے۔ اس نے ناقابل معافی جرم کئے تھے۔ اسے میں اپنی جان کی بازی لگا کر بھی کیفر کردار تک پہنچانا چاہتی تھی۔ میرے دل میں اگر کوئی وسوسہ تھا تو صرف یہ کہ کہیں وہ انڈونیشیا سے فرار نہ ہوجائے۔ اس وسوسے کے ساتھ ہی میرے دل کو ایک اطمینان بھی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ انڈونیشیا کیوں آیا ہے؟ اس کے آقاؤں نے اسے کیا ذمہ داری سونپی ہے؟ وہ یہ ذمہ داری پوری کئے بغیر انڈونیشیا سے نہیں جاسکتا تھا اور یہ ذمہ داری بہت بڑی تھی۔ وہ اسی لئے تو بذات خود انڈونیشیا آیا تھا۔ موجودہ انڈونیشی حکومت کا تختہ الٹے بغیر وہ بھلا کس طرح یہاں سے جاسکتا تھا؟

جکارتہ کے ملٹری ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے کے بعد میں نے جزیرہ جاوا سے جزیرہ سماٹرا کا رخ کیا۔ دانستہ میں نے میک اپ سے گریز کیا تھا اور یہ میرے لائحہ عمل کا ایک حصہ تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ کو اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھانسنے کیلئے میں نے یہ خطرہ مول لیا تھا۔

انڈونیشیا کے جزیرہ جاوا کے بعد سماٹرا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ "سماٹرا" سنسکرت کے لفظ "ثسمدرا" سے نکلا ہے جس کے معنی سمندر ہیں۔ یہ جزیرہ تقریباً ایک ہزار میل لمبا ہے۔ اس کے مغرب میں

سمندر کے کنارے کنارے پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ مشرقی حصہ ڈھلوان ہے جو گھاس کے میدانوں اور دلدلوں تک پہنچتا ہے۔ اس جزیرے پر اس وقت تقریباً ڈیڑھ کروڑ باشندے آباد تھے۔ سماٹرا کے تین شہر ایسے تھے جن میں دو لاکھ سے زیادہ آبادی تھی، میڈون، پالم بنگ اور پاڈنگ! مجھے سماٹرا سے ہوکر "انک کراکاتو" جانا تھا۔ "انک" کا مطلب انڈونیشی زبان میں بچہ ہے، یعنی کراکاتو کا بچہ!

سماٹرا کے جنوبی سرے پر ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جو دنیا کے انتہائی مشہور آتش فشاں پہاڑ کا بچا کھچا حصہ تھا۔ اس آتش فشاں پہاڑا کا نام کراکاتو تھا۔ یہ آتش فشاں 1883ء میں، یعنی اب سے ایک صدی پہلے بھڑک اٹھا تھا۔ جزیرے کا بیشتر حصہ اس آتش فشاں کے لاوا اگلنے سے تباہ ہوگیا۔ سمندر کے طوفان اور گرد کے بادل اتنے زیادہ اٹھے کہ انہوں نے تمام کرہ ارض کے گرد حلقہ بنا دیا۔ 1928ء میں یہ پہاڑ پھر پھٹا اور راکھ کے تودے سے ایک چھوٹا سا جزیرہ بن گیا۔ اسی کو "انک کراکاتو" کہا جاتا تھا۔

آتش فشاں پہاڑ بڑے "ڈرامائی" ہوتے ہیں اور نہایت دلچسپ بھی! انہی کو انڈونیشی زندگی کی تفسیر کہا جاسکتا ہے۔ آتش فشانوں سے جو لاوا نکلتا ہے، وہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک قسم "تیزابی" ہوتی ہے جو زمین کو بنجر بنا دیتی ہے پھر اس زمین میں مشکل ہی سے کچھ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری قسم "اساسی" کہلاتی ہے۔ یہ زمین کو بے حد زرخیز بنا دیتی ہے اور اس سے فصلیں پنپتی ہیں۔ جاوا اور دوسرے جزیروں کے بعض حصے جو حیرت انگیز حد تک زرخیز ہیں، ان کی زرخیزی کا راز یہی ہے۔ وہاں کی مٹی "اساسی لاوے" کی تہوں سے تشکیل ہوئی ہے اور وہاں مسلسل گرمی اور بارش ہوتی ہے۔ جب آتش فشاں پہاڑ بیدا ہوتے ہیں تو ان کی بے پناہ طاقت ضائع نہیں ہوتی بلکہ وہ ان کے خاموش اور ٹھنڈا ہوجانے کے صدیوں بعد تک لوگوں کی زندگی پر اثرانداز ہوتی رہتی ہے۔

انک کراکاتو پہنچ کر میں نے دو تین روز تک اس جزیرے کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ میرے ماتحت کیپٹن شاد کی رپورٹ غلط نہیں تھی۔ میں وہاں سے ایک اور جزیرے کالی منتان جا پہنچی۔ اس جزیرے پر میں نے یہاں کے ایک چھوٹے سے خوبصورت شہر بنجار ماسین میں قیام کیا۔ اس شہر کی آبادی تقریباً پونے دو لاکھ تھی۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے کیپٹن شاد سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کیا۔ کیپٹن شاد کو میں نے حکم دیا کہ وہ انک کراکاتو سے کالی منتان پہنچ جائے اور عثمانی سے آملے۔ عثمانی پہلے سے اس جزیرے پر موجود تھا۔

انک کراکاتو کا خود تفصیلی جائزہ لینے کے بعد میری تمام تر توجہ کالی منتان پر ہوگئی تھی۔ عثمان اور سرفراز دونوں یہیں تھے اور اب کیپٹن شاد کو بھی میں نے یہاں بلوا لیا تھا۔ میرے ہی ایما پر کمانڈر نواز ابھی جاوا ہی میں تھا۔ بنجار ماسین شہر پہنچنے کے دوسرے ہی روز میں نے ٹرانسمیٹر پر اس سے بھی رابطہ قائم کرلیا۔

کمانڈر نواز اس پورے علاقے کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا جہاں میں نے اسے روانہ کیا تھا۔ اسے بھی میں نے کالی منتان جزیرے کے شہر بنجار ماسین آنے کا حکم دے دیا۔ اس وقت تک میں ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے اسی لئے اپنے چاروں ماتحتوں کو اس جزیرے پر جمع کرلیا تھا۔

کمانڈر نواز نے میرے ایما پر اپنا سفر جکارتہ سے بیس میل مغرب کی جانب دریائے پروگر کے کنارے سے شروع کیا تھا اور پھر جزیرہ جاوا ہی کے ایک شہر سیمارنگ پہنچ گیا تھا۔ سیمارنگ ہی میں اس

سے میں نے رابطہ قائم کیا تھا۔ سیمارنگ رقبے میں شہر بنڈونگ کا نصف اور انڈونیشیا کا چوتھا بڑا شہر ہے۔

انڈونیشیا والے جس جزیرے کو کالی منتان کہتے ہیں، دنیا والے اسے بورنیو کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔ اس جزیرے پر ایسے قبیلے آباد تھے جنہیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ پتھر کے زمانے سے بس دو ہی قدم کے فاصلے پر ہیں۔ ان کی زراعت کا طریقہ بہت ہی پرانا تھا اور یہ اس وقت بھی خشکی کے جانوروں یا مچھلیوں کے شکار پر زندگی بسر کرتے تھے۔ انڈونیشی زندگی کی اسی رنگارنگی اور تنوع کی وجہ سے وہاں کا قومی مقولہ ''بھینیکا تنگل ایکا'' ہے۔ جس کے معنی ''کثرت میں وحدت'' ہیں۔

اس جزیرے کا زیادہ حصہ کوہستانی ہے اور جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ کالی منتان کا پورا جزیرہ، گرین لینڈ اور نیوگنی کے بعد دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے لیکن یہ تمام کا تمام انڈونیشیا کی ملکیت نہیں تھا۔ اس کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ تین برطانوی علاقے تھے، سراواک، برونئی، (جھس کے معنی بورنیو ہیں) اور شمالی بورنیو! جزیرے کے برطانوی اور انڈونیشی حصوں میں زمین سے تیل نکالا جاتا تھا اور ربڑ کی کاشت بھی ہوتی تھی جس کیلئے وہ پیڑ اگائے جاتے تھے جن سے ربڑ حاصل ہوتی ہے۔ مغربی حصے میں زراعتی اراضی تھی جہاں چینی لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد چین سے چل کر سونے کی کانوں سے سونا نکالنے یہاں آئے تھے اور اب کھیتی باڑی کرتے تھے۔

کالی منتان جزیرے کی کل آبادی صرف چار کروڑ کے قریب تھی۔ اس کے شمالی اور وسطی حصوں کے لوگ عام طور پر ''وائک'' کہلاتے تھے۔ ان کی اپنی زبان تھی، مگر یہ قومی زبان ''بہاسا'' بھی سمجھ لیتے تھے اور بولنے پر بھی قادر تھے۔ ان کا طرز زندگی ہزاروں سال پرانا تھا۔ کھیتی باڑی کرنے کیلئے عموماً یہ جگہیں بدلتے رہتے تھے اور اس کا سبب تھا۔ اس اعتبار سے انہیں خانہ بدوش قبائل کہنا زیادہ مناسب ہے۔ جانوروں کا شکار اور مچھلیاں پکڑنے کے علاوہ ان کی زندگی کا انحصار زراعت ہی پر تھا۔ یہ لوگ زمین کے کسی حصے کو صاف کرتے، وہاں بیج ڈالتے، چند سال تک فصلیں بوتے اور کاٹتے، پھر جب دیکھتے کہ زمین کے قدرتی کیمیاوی اجزاء اور مٹی میں فصل پیدا کرنے کی قوت ختم ہوگئی ہے تو وہاں سے کوچ کر کے کسی اور علاقے میں پہنچ جاتے۔ کل جزیرے میں جو چند شہر تھے ان میں بنجار ماسین سب سے بڑا تھا اور اسی کو میں نے اپنا مرکز بنایا تھا۔

جزیرہ کالی منتان پر گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا کوہستانی علاقہ میری اصل توجہ کا مرکز تھا۔

میں میک اپ کے بغیر بنجار ماسین شہر میں کھلے عام گھومتی پھرتی تھی۔ یہاں اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں میرا قیام تھا۔ ایک پاکستانی سیاح کی حیثیت سے میں نے یہاں کے مقامی لوگوں سے رسم و راہ بڑھالی تھی۔ ان میں سے ایک کا نام گنگ جاتی، دوسرے کا عبدالرؤف اور تیسرے کا نام دیپونکورو تھا۔ یہ تینوں ہی شہر کی سیاسی شخصیات تھیں۔ انڈونیشیا کی انتہاپسند سیاسی جماعتوں کے ذیلی دفاتر اس شہر میں بھی قائم تھے۔ عبدالرؤف کا تعلق شرکت الاسلام پارٹی سے اور گنگ جاتی، نہفتہ العلما پارٹی کا لیڈر تھا۔ دیپونکورو ایک ایسی جماعت کا رکن تھا جس پر حکومت نے پابندی لگادی تھی۔ دیپو کا تعلق اشوی پارٹی سے تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں۔ اشارا اسماعیل اور سونارڈی کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق [illegible] کی سرگرمیوں پر حکومت کی نظر بھی تھی۔ مگر ابھی تک حکومت اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکی تھی۔ دیپو نے [illegible]

دوستوں میں ایک شخص کرتانگرا کی نگرانی پر میں نے کمانڈر نواز کو متعین کر دیا تھا۔

کرتانگرا اور دیپو کے مراسم میرے لئے حیرانی کا سبب تھے۔ کرتانگرا ہندو تھا اور دیپونکورو کٹر قسم کا مسلمان۔ ان دونوں کے درمیان مجھے کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی تھی۔ کرتانگرا عموماً شہر سے غائب بھی ہوجاتا تھا۔ بظاہر وہ سیروشکار ہی کیلئے کالی منتان کے جنگلوں کا رخ کرتا تھا۔ میں اسی لئے اس کی طرف سے کھٹکی تھی اور کمانڈر نواز کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ کمانڈر نواز اور میرے بقیہ تینوں ماتحت میک اپ میں تھے۔ کمانڈر نواز کا رنگ گورا تھا اس لئے اس نے ایک یورپی سیاح کا روپ دھار رکھا تھا۔

مجھے بنجار ماسین میں پندرہ روز سے زیادہ ہو چکے تھے مگر اب تک کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

کرتانگرا ان دنوں حسب معمول سیروشکار کیلئے جنگلوں کی طرف گیا ہوا تھا اور کمانڈر نواز اس کے پیچھے تھا۔ اسی دوران میں ایک روز میں نے دیپونکورو کی دعوت کی۔ اس نے دعوت قبول کرلی اور میرے ہوٹل پہنچ گیا۔ میں نے اپنے کمرے میں اس کا استقبال کیا۔

ہم دونوں جب کھانا کھا رہے تھے تو دیپو بولا۔ ''عذرا خان! تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ میری دوستی تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

''وہ کیوں بھئی؟'' میں حیرت سے کہنے لگی۔ میرے اور اس کے درمیان انڈونیشی قومی زبان ہی میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں اسے بتا چکی تھی کہ یہ زبان انڈونیشیا آنے سے پہلے محض اس لئے سیکھی تھی کہ یہاں بلاتکلف لوگوں سے گھل مل سکوں اور مجھے سیروتفریح میں کوئی پریشانی نہ ہو۔

میرے سوال کے جواب میں دیپو نے کہا۔ ''آج میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق ایک ایسی سیاسی جماعت سے رہ چکا ہے جس پر موجودہ حکومت نے پابندی لگا دی ہے۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ میری نگرانی کی جاتی ہے۔ تم غیرملکی ہو، تمہارے لئے یہ کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ ایک ایسے شخص سے تعلقات رکھو جو حکومت وقت کی نظر میں ہے۔ اس طرح تم بھی حکومت کی نظر میں آجاؤ گی اور تمہیں ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر انڈونیشیا سے نکال دیا جائے گا۔''

اس وقت میں نے دانستہ اپنے چہرے سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جیسے دیپو کی باتوں سے ڈر گئی ہوں۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیوں، ڈر گئیں نا آخر؟'' میں مسکرایا۔

''نہیں...... نہیں تو۔'' میں خجالت آمیز انداز میں ہنسی۔ ''ایسی ...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میرے ملک کے تعلقات تمہارے ملک سے بہت بہتر ہیں۔ ایسی صورت میں مجھے یہاں سے ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر نہیں نکالا جاسکتا۔''

''بات ملکوں کی نہیں عذرا خان، افراد کی ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بہرحال دوستی کے ناطے مجھ پر جو فرض عائد تھا، میں نے ادا کردیا، آگے تم جانو۔''

''ہاں دوستی یاد آیا کہ آج کل تمہارا دوست کرتانگرا نظر نہیں آرہا۔'' میں نے پانی پینے کیلئے گلاس اٹھایا۔

''وہ سیلانی آدمی ہے، جاوا گیا ہے آج کل گھومنے پھرنے۔'' دیپو نے بتایا۔ ''خاندانی رئیس

ہے، اپنا کاروبار ہے، اسے کیا پروا!''

دیپو نے پہلی مرتبہ ایک ایسی بات کی کہ میں اس کی طرف سے کھٹک گئی۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق وہ کالی منتان کے جنگلوں کی طرف گیا تھا اور کمانڈر نواز اس سلسلے میں مجھے رپورٹ دے چکا تھا۔ دیپو کے جھوٹ بولنے کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی کہ وہ میرے علم میں یہ بات نہیں لانا چاہتا تھا کہ کرتانگرا دراصل کہاں گیا ہے! مجھ سے یہ بات چھپانا ظاہر کررہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

''برادرم دیپو! معاف کرنا تم سے کرتانگرا کی دوستی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا تعلق تو سیاست سے بھی نہیں ہے۔ تمہارے ہی ذریعے اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ وہ ایک ایسا ہندو ہے جو اپنے عقائد میں پختگی رکھتا ہو۔''

اپنی بات پر میں نے دیپو نگورو کو چونکتے ہوئے دیکھا پھر وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''بہت سے لوگ میری اور اس کی دوستی پر حیران ہوتے ہیں اور یہ کوئی غیرفطری بات بھی نہیں کیونکہ وہ مجھے پانچوں وقت مسجد میں دیکھتے ہیں۔''

''اسی لئے تو مجھے بھی حیرت ہے۔'' میں بول اٹھی۔

''تمہیں میں نے اپنا دوست کہا ہے عذرا خان تو آج اس راز سے ابھی پردہ اٹھا دیتا ہوں۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''دراصل میں اسے رفتہ رفتہ اسلام کی طرف راغب کررہا ہوں۔ ایک دن اس شہر کے رہنے والے حیران رہ جائیں گے جب کرتانگرا مسلمان ہوجانے کا اعلان کرے گا۔''

دیپو مجھے واضح طور پر بے وقوف بنانے کی کوشش کررہا تھا، اس کے باوجود میں نے اظہار حیرت کے ساتھ پرمسرت لہجے میں کہا۔ ''یہ تو واقعی کمال کررہے ہو تم! اس سے بڑی نیکی اور کیا ہوسکتی ہے کہ تم ایک کافر کو مسلمان کرلو۔''

''دعا کرو کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں۔'' وہ ڈکار لیتے ہوئے بولا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں نے چائے پی اور پھر دیپو نگورو رخصت ہوگیا۔

اسی روز نصف شب کے قریب ٹرانسمیٹر پر مجھے کمانڈر نواز کی طرف سے اشارہ موصول ہوا پھر اس نے مجھے جو کچھ بتایا اسے سن کر میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کمانڈر نواز، کرتانگرا کا تعاقب کرتا ہوا اس دشوار گزار علاقے میں داخل ہوگیا تھا جہاں اسے باوردی رضا کار نظر آگئے تھے۔ اس اہم اطلاع کا مطلب یہی تھا کہ میرا اندازہ صدفی صد درست ثابت ہوا تھا۔ کالی منتان کے جنگل ہی باغیوں کا ہیڈکوارٹر ہوسکتے تھے اور یہیں ڈاکٹر رچرڈ کے ملنے کے امکانات تھے۔ اطلاعات کے مطابق ڈاکٹر رچرڈ ہی خود اس ہیڈکوارٹر کا سربراہ تھا۔

''رک جاؤ ڈاکٹر رچرڈ!'' میں بھاگتے ہوئے چیخی اور ایک پیڑ کی آڑ لے کر اس پر گولی چلائی۔ فائر کی بازگشت ختم ہوتے ہی میں نے پھر چیخ کر اس سے کہا۔ ''تم اپنی موت سے کہاں تک بھاگو گے ڈاکٹر!..... تم اس موت کے گھیرے کو توڑ کر نہیں نکل سکتے!''

میری بات کا جواب اس نے گولی سے دیا۔ گولی میرے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔

اس وقت اس جنگل میں ہر طرف دھماکے ہی دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ بوگور والا واقعہ ان

جنگلوں میں بھی دہرایا جارہا تھا۔ میرے اشارے پر یہاں زبردست ملٹری ریڈ ہوا تھا۔ باغیوں نے یہاں ہتھیار ڈالنے کے بجائے فوج سے مقابلے کو ترجیح دی تھی اور انہوں نے ایسا ڈاکٹر رچرڈ ہی کے ایما پر کیا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ یہاں بھی بوگور کی طرح ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر فرار ہوجانا چاہتا تھا، مگر میں اور میرے چاروں ساتھی اس کے پیچھے لگ چکے تھے اور اس کے فرار کی راہیں مسدود کررہے تھے۔

ڈاکٹر رچرڈ کی بدنصیبی تھی کہ کرتانگرا میری نظر میں آگیا تھا۔ کرتانگرا معمولی اہمیت کا حامل نہیں تھا، وہ انتہاپسند جماعتوں اور ڈاکٹر رچرڈ کے مابین درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا تھا۔ کمانڈر نواز اسی کا تعاقب کرتا ہوا ڈاکٹر رچرڈ کے خفیہ ٹھکانے پر جا پہنچا تھا اور باغیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ مجھے اس لوکیشن سے آگاہ کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جہاں ڈاکٹر رچرڈ کا گویا ''مضبوط قلعہ'' تھا۔ یہ علاقہ ایسا تھا کہ ممکن ہی نہیں تھا، کوئی باغیوں کی نظر میں آئے بغیر آگے بڑھ جاتا، کمانڈر نواز کو عین اس وقت چھاپ لیا گیا تھا جب وہ ٹرانسمیٹر پر مجھے رپورٹ دے رہا تھا۔ خود میں بھی اس علاقے میں داخل ہوچکی تھی۔ کیپٹن شاد، عثمانی اور سرفراز بھی اسی جنگل میں تھے۔ میری نسبت وہ تینوں اس جگہ سے زیادہ قریب تھے جہاں کمانڈر نواز کو پکڑا گیا تھا۔ میں نے ٹرانسمیٹر پر ان تینوں کو صورتحال سے آگاہ کیا اور اسی کے ساتھ اس طرف بڑھنے کا حکم بھی دیا۔

اس وقت تک ملٹری آپریشن شروع ہوچکا تھا۔ آپریشن کی کمان انڈونیشی فوج کا ایک جنرل کررہا تھا۔ اشار اسماعیل اسی جنگل کے ساتھ ایک ہیلی کاپٹر میں اس علاقے پر پرواز کررہا تھا۔ ٹرانسمیٹر پر اس سے میرا رابطہ برقرار تھا۔

باغیوں پر فضا سے موت برسنے لگی تو وہ اس اچانک افتاد سے گھبرا گئے۔ عثمانی اور اس کے دونوں ساتھیوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کمانڈر نواز کو باغیوں کے چنگل سے رہا کرالیا اور مجھے رپورٹ دی۔

میں نے انہیں حکم دیا کہ اس علاقے سے جلد از جلد نکل جائیں! اسی کے ساتھ میں نے انہیں کچھ اور ضروری ہدایات بھی دیں۔ ان ہدایات کے مطابق کمانڈر نواز اور عثمانی کو ایک ہیلی کاپٹر میں اس سمت فوری طور پر روانہ ہونا تھا جدھر جانے کی انہیں مجھ سے ہدایت ملی تھی۔ سرفراز کو ایک اور سمت ایک ہیلی کاپٹر میں میری آمد کا منتظر رہنا تھا۔ کیپٹن شاد کو بھی جنگل میں ایک مقررہ جگہ پہنچ کر مورچہ بندی کرنا تھی۔

پھر جب میرے چاروں ساتھی ڈاکٹر رچرڈ کے ''محفوظ قلعے'' سے دور ہوگئے تو میں نے اشار اسماعیل سے رابطہ قائم کیا اور اس محفوظ قلعے پر تین طرف سے بمباری کی تجویز پیش کی۔ چوتھی سمت دانستہ میں نے کھلی رہنے دی تھی اور اسی سمت میں خود موجود تھی۔ اپنے ساتھیوں کیلئے دو ہیلی کاپٹر فراہم کرنے کیلئے بھی میں نے کہہ دیا تھا۔ سرفراز اور کمانڈر نواز دونوں ہی ہیلی کاپٹر اڑانا جانتے تھے البتہ عثمانی اور کیپٹن شاد اس کے اہل نہیں تھے۔ میں نے اسی لئے عثمانی کو کمانڈر نواز کے ساتھ رکھا تھا اور کیپٹن شاد کی ڈیوٹی اس سمت مقرر کی تھی جدھر خود میں موجود تھی۔ جنگل میں وہ ایک دوراہا سا تھا۔ ایک راستے پر کیپٹن شاد موجود تھا اور دوسرے پر میں چوکنا انداز مین ایک پیڑ پر چڑھی بیٹھی تھی۔

اچانک جنگل کے اس حصے پر بمباری شروع ہوگئی جسے ڈاکٹر رچرڈ نے اپنا محفوظ قلعہ سمجھا تھا، نتیجہ میری توقع کے مطابق ہی نکلا۔ ڈاکٹر رچرڈ اپنے بل سے نکل کر اسی سمت بھاگا جدھر بمباری نہیں کی

جارہی تھی۔ اس حکمت عملی سے میرے دو مقصد تھے، ایک تو یہ کہ ڈاکٹر رچرڈ کے وہاں موجود ہونے کی تصدیق ہوجائے، دوم اگر اسے زندہ گرفتار کیا جانا ممکن ہو تو زندہ گرفتار کرلیا جائے۔

اپنی پہاڑی پناہ گاہ سے نکل کر وہ نشیب میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں دورابا تھا۔ کیپٹن شاد نے میری ہدایات کے مطابق اس پر فائر کھول دیا۔ نتیجتاً وہ اس طرف ہوکر بھاگا جہاں میں ایک پیڑ پر چڑھی ہوئی تھی۔ میرے لئے یہ عین ممکن تھا کہ میں گولیوں سے اس کا جسم چھلنی کردیتی مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور اسے زندہ گرفتار ہوجانے کی پیشکش کی۔ اس کے بائیں ہاتھ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا جو گردن میں پڑی ہوئی ایک پٹی کی مدد سے لٹک رہا تھا۔

میں نے اس سے رکنے کیلئے کہا تھا اور دانستہ اس کے پیروں کے پاس فائر بھی کیا تھا تاکہ اسے یقین ہوجائے، وہ میرے نشانے پر ہے، مگر میری ہدایت پر عمل کرنے کے بجائے وہ بھاگ کر ایک درخت کی آڑ میں ہوگیا تھا پھر اس نے جوابی فائرنگ شروع کردی تھی۔

اسے آخری موقع دے کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی کیونکہ میرے خیال میں اب وہ گھر چکا تھا۔ میں نے اسی کی تمام راہیں مسدود کردی تھیں، ہر امکانی فرار کو ناکام بنانے کی راہ سوچ لی تھی۔

میرے اور ڈاکٹر رچرڈ کے درمیان زندگی اور موت کی آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ میں اسے خود ہی گرفتار کرنا چاہتی تھی یا پھر اپنے ہی ہاتھوں جہنم رسید کرنے کی آرزومند تھی ورنہ تو میرے پاس اس وقت ٹرانسمیٹر موجود تھا۔ میں اشار اسماعیل کو اشارہ کرسکتی تھی۔ ملٹری کے جوان اس علاقے کو گھیرے میں لے کر گھیرا تنگ کرتے جاتے اور پھر اسے کسی چوہے کی طرح گھیر کر مار دیتے۔ مجھے یہ منظور نہیں تھا اس لئے کہ ڈاکٹر رچرڈ خود میرا مجرم بھی تھا، میرا مجرم، میرے ملک کا مجرم!

اس امکان کو بھی میں نے نظر میں رکھا تھا کہ بوگور ہی کی طرح یہاں بھی کسی آڑے وقت کیلئے اس نے کہیں جنگل میں کوئی ہیلی کاپٹر چھپا رکھا ہو۔ بہرحال اتنا احمق تو نہیں ہوسکتا تھا کہ میلوں پھیلے ہوئے اس جنگل سے پیدل بھاگتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔

پھر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ کچھ دیر کو اس کی طرف سے جوابی فائرنگ رک گئی اور پھر ذرا ہی دیر کے بعد میں نے ایک ہیلی کاپٹر سٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ میں نے ٹرانسمیٹر پر سرفراز سے رابطہ قائم کیا اور سمت پیما کی مدد سے اسے اپنی پوزیشن سے آگاہ کیا۔ اسی دوران میں کچھ فاصلے پر پیڑوں کے درمیان سے ایک ہیلی کاپٹر کو بلند ہوتے دیکھا۔ اس ہیلی کاپٹر میں ڈاکٹر رچرڈ فرار ہورہا تھا۔ اسے یقیناً یہ غلط فہمی رہی ہوگی کہ وہ میرے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہے، مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ پیڑوں کے درمیان جس ہموار جگہ سے کچھ دیر قبل ڈاکٹر رچرڈ ہیلی کاپٹر لے کر اڑا تھا، وہیں سرفراز ہیلی کاپٹر لے کر اتر رہا تھا۔

جب تک میں ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر فضا میں بلند ہوئی، ڈاکٹر رچرڈ کا ہیلی کاپٹر نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔

"میڈم! میں نے اسے جزیرے کے اس حصے کی طرف جاتے دیکھا ہے جو۔"

"برطانیہ کے تسلط میں ہے۔" میں نے سرفراز کی بات پوری کردی۔

"جی ...... جی ہاں میڈم! مگر آپ ...... آپ تو نیچے جنگل میں تھیں اور وہاں سے یہ اندازہ لگانا کیسے ممکن تھا؟" سرفراز حیرت سے بولا۔

"سرفراز! یہ اندازہ تو میں نے اسی وقت لگا لیا تھا جب اس کی پہاڑی پناہ گاہ پر بمباری کرائی تھی، تم اسی طرف چل رہے ہو نا؟"

"جی ہاں میڈم!" سرفراز نے جواب دیا۔ "آپ کا حکم نہیں تھا، میڈم ورنہ میں اسے مار کر گرا لینے کی پوزیشن میں تھا۔"

"کچھ اور جی لینے دو اسے سرفراز! سرفراز موت تو بہرحال اس کا مقدر ہو ہی چکی ہے کیونکہ اس نے زندہ گرفتار ہونے کے آخری موقع کھو دیا ہے۔" میں نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے دور تک جائزہ لیا۔

"میڈم!" اگر وہ برطانوی علاقے کی حدود میں داخل ہوگیا تھا پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔" سرفراز نے ہیلی کاپٹر کی رفتار مزید تیز کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے گا!" میرے لہجے میں یقین تھا۔

اور پھر میرا یقین درست ہی ثابت ہوا۔ ٹرانسمیٹر پر کمانڈر نواز کی آواز ابھری۔ "میڈم! میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ انڈونیشی فضائیہ کے بمباروں سے بچ کر برطانوی زیرتسلط علاقے میں داخل ہونے کے بجائے جاوا کی طرف بھاگ رہا ہے۔ میں اس کے تعاقب میں ہوں۔ اوور......"

"پوزیشن بتاؤ کمانڈر! اوور۔"

میرے کہنے پر کمانڈر نواز نے پوزیشن واضح کی کہ ڈاکٹر رچرڈ کے ہیلی کاپٹر کا تعاقب کرتا ہوا وہ کس طرف جا رہا ہے! سرفراز نے اطمینان سے سر ہلاتے ہوئے وہی پوزیشن اختیار کرلی۔

"تم نے دیکھا سرفراز کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔" میں مسکرا کر بولی۔ "زمین اب اس پر تنگ ہوچکی ہے۔"

"بس میڈم!" سرفراز کی آواز میں جوش تھا۔

جزیرہ جاوا میں جکارتہ شہر سے تقریباً بیس میل دور دریائے پروگو کے کنارے ایک پہاڑی سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ انہی پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر "بوروبوڈر" نامی ایک تاریخی معبد ہے۔ پرامودیا نے بھی مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ اس پہاڑ پر یہ معبد یا بدھ مندر تعمیر کرانے والا ایک ہندوستانی راجا تھا۔ ایک قدیم روایت کے مطابق ہندوستان سے پہلے پہل جو لوگ ہجرت کرکے جاوا میں آباد ہونے کی غرض سے یہاں پہنچے، ان کا رہنما گجرات (کاٹھیاوار) کا ایک راج کمار تھا۔ یہ راج کمار یہاں **750**ء میں پہنچا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسی سن عیسوی میں یہ مندر تعمیر ہوا۔ اس مندر کے گرد و پیش میں اب کسی شہر کے آثار باقی نہیں ہیں۔ یہاں پہاڑوں کے دامن میں دور تک لق و دق میدان یا اکا دکا گاؤں ہیں جو بانس کے درختوں سے چھپے ہوئے ہیں۔ اس مندر سے کچھ فاصلے پر ایک اور مندر ہے جس کا نام چندی منڈوت ہے۔ یہ بھی بدھ معبد ہے۔ ڈاکٹر رچرڈ کی بدنصیبی اسے انہی لق و دق میدانوں اور پہاڑوں کی طرف کھینچ لائی تھی۔

میں جب یہاں اپنے ہیلی کاپٹر میں پہنچی تو اس وقت تک کمانڈر نواز، ڈاکٹر رچرڈ کے ہیلی کاپٹر

کو گرا چکا تھا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر رچرڈ پیراشوٹ کے ذریعے ایک پہاڑی پر کودنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کمانڈر نواز نے ٹرانسمیٹر پر مجھے یہ اطلاع دے دی تھی اور اسی کے ساتھ بتایا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کو اس نے ابھی تک اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ اس نے مجھ سے ڈاکٹر رچرڈ کو گولی مار دینے کی بھی اجازت مانگی تھی۔

"نہیں کمانڈر! وہ میرا شکار ہے، تم اسے گولی نہیں مارو گے۔ میں آ رہی ہوں، اسے نظر میں رکھو! اوور اینڈ آل۔" میں نے کہا اور پھر جلد ہی "بوروبوڈر مندر" کے اوپر سے پرواز کرتی ہوئی کمانڈر نواز کے ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچ گئی۔

میں جب ان پہاڑیوں کے اوپر پرواز کر رہی تھی تو کچھ ہی دوری پر مجھے ڈاکٹر رچرڈ کی "آخری منزل" نظر آ گئی تھی۔ اس کیلئے وہ جگہ انتہائی مناسب تھی۔ میں نے سرفراز سے اس طرف چلنے کو کہا۔ قریب سے میں اس جگہ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ زمین میری آنکھوں سے لگی ہوئی تھی۔

ہیلی کاپٹر اس پہاڑ کی بلندی پر پرواز کرنے لگا۔ میں نے سرفراز کو مخاطب کیا۔ "نیچے دیکھو! بتاؤ کیا یہ جگہ ڈاکٹر رچرڈ کی آخری آرام گاہ کیلئے مناسب ہے۔" سرفراز سے جب میں یہ سوال کر رہی تھی تو مجھے خود اپنی آواز اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔

جواب میں سرفراز اثباتی انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا تھا۔ وہ میرے چہرے کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے مجھے پہلی بار دیکھا ہو۔ اسے شاید اندازہ نہیں تھا کہ میں اندر سے اس قدر سخت بھی ہو سکتی ہوں!

پھر وہ آخری کھیل، موت کا کھیل شروع ہو گیا۔ وہ علاقہ ہی ایسا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کو کہیں چھپنے کی جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ کمانڈر نواز نے صرف اتنا کیا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کو اس پہاڑ کی طرف نہیں جانے دیا تھا جس پر مندر تھا کیونکہ عارضی طور پر سہی ڈاکٹر رچرڈ وہاں پناہ لے سکتا تھا۔ میں نے کمانڈر نواز کو اس آخری ہولناک کھیل کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ جس طرح شکار کیلئے کسی جانور کا ہانکا کیا جاتا ہے، ڈاکٹر رچرڈ کو اسی پہاڑ کی طرف گھیر کر لے جایا جانے لگا جس کا میں جائزہ لے چکی تھی۔ اس کیلئے عثمانی اور میں اس پر مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ عثمانی، کمانڈر نواز کے ہیلی کاپٹر میں تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ کے پاس یقیناً گولیاں ختم ہو گئی تھیں ورنہ وہ اپنی حسرت ضرور پوری کرتا۔ اس کے پاس میں نے کالی منتان کے جنگلوں میں بڑی نال والا جرمن ریوالور دیکھا تھا۔ جب وہ مجھ پر فائرنگ کر رہا تھا تو میں نے اس ریوالور کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ میرے پاس سٹیشن گن تھی اور وافر مقدار میں اس کا میگزین بھی تھا۔ اس لئے بڑے اطمینان سے ڈاکٹر رچرڈ پر مسلسل فائرنگ کئے جا رہی تھی۔ میری ہی طرح عثمانی کا نشانہ بھی بڑا سچا تھا۔ اب تک اس کی چلائی ہوئی کسی گولی نے بھی ڈاکٹر رچرڈ کے جسم کو نہیں چھوا تھا۔

بھاگتے بھاگتے ڈاکٹر رچرڈ حال سے بے حال ہو گیا تھا۔ آخر کار وہ اس پہاڑ پر چڑھنے ہی لگا جسے میں نے اس کی آخری منزل قرار دیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ان گولیوں سے کس طرح بچتا جو اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ جان بچانے کیلئے اسے بہ مجبوری یہ ناگوار مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔

اس پہاڑ کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ اس پر چڑھنا زیادہ دشوار نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ زیادہ

بلند بھی نہیں تھا۔

تقریباً نصف فاصلے طے کرنے کے بعد ڈاکٹر رچرڈ نسبتاً ایک ہموار چٹان پر بے سدھ سا ہو کر گر گیا اور پھر اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر چیخنا شروع کر دیا۔ میرا ہیلی کاپٹر اس کے اوپر ہی چکرا رہا تھا۔

"سرفراز! وہ چیخ چیخ کر شاید کچھ کہہ رہا ہے۔ ہمیں اس کی بات ضرور سننا چاہئے!" میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"وہ جس چٹان پر ہے، اسی کے کچھ اوپر ایک اور ہموار چٹان نظر آ رہی ہے میڈم! اگر آپ کہیں تو میں اس چٹان پر ہیلی کاپٹر اتار لوں؟" میں نے اسے اجازت دے دی اور اپنے ارادے سے کمانڈر نواز کو بھی ٹرانسمیٹر پر آگاہ کر دیا۔

ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ پرواز کرتا ہوا اوپر والی چٹان پر اتر گیا۔ میں سٹیشن گن ہاتھ میں لئے نیچے کود گئی اور پھر چٹان کے سرے پر پہنچ کر نیچے جھانکا۔ مجھ سے تقریباً چھ سات گز نیچے دوسری چٹان پر ڈاکٹر رچرڈ پڑا ہوا ہانپ رہا تھا۔ اس کی نظر بھی مجھ پر پڑ گئی۔

"عذرا خان!" وہ مجھ پر نظر پڑتے ہی پوری قوت سے چیخ اٹھا۔ "ختم کرو یہ کھیل! ختم کر دو مجھے! گولی مار دو مجھے!"

"نہیں ڈاکٹر رچرڈ! یقین کرو، میں تمہیں گولی مارنا نہیں چاہتی۔" میں نے بھی چیخ کر اس کی بات کا جواب دیا۔

"پھر...... پھر کیا چاہتی ہو تم؟ اگر...... اگر تم مجھے زندہ گرفتار کرنا چاہتی ہو تو...... تو گرفتار کر لو! میں...... میں دوڑتے دوڑتے تھک گیا ہوں۔"

"تم یہ موقع بھی کالی منتان کے جنگل میں کھو چکے ہو۔ اس کے باوجود میں تمہیں ایک آخری موقع اور دے رہی ہوں۔ تم اگر اس امتحان میں کامیاب ہو گئے ڈاکٹر تو میری گولی تمہارے جسم میں نہیں اترے گی۔"

"تم...... تم سچ کہہ رہی ہو عذرا خان؟...... اگر واقعی ایسا ہی ہے تو...... تو میں ضرور کوشش کروں گا! مگر تم...... تم اپنے قول سے نہ پھرنا!"

"میں اپنے قول سے نہیں پھروں گی ڈاکٹر رچرڈ! میرے الفاظ یاد رکھنا کہ میں نے تم سے یہ عہد کیا ہے کہ میری چلائی ہوئی گولی تمہارے جسم میں نہیں اترے گی! سنو! تمہیں اس پہاڑ کی بلندی تک پہنچنا ہے اور اس حالت میں تمہارے لئے یہ یقیناً کوشش کسی سخت امتحان سے کم نہیں۔ بولو کیا تم اس سخت امتحان سے گزرنے کو تیار ہو؟"

"ہاں تیار ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس طرح اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے اس میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی ہو۔ "لیکن عذرا خان، اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم اپنے عہد سے نہیں پھرو گی اور یہاں سے واپس نہیں چلی جاؤ گی؟"

"ڈاکٹر رچرڈ! تم میرے ہاتھ میں یہ سٹیشن گن دیکھ رہے ہو؟...... کیا میں تمہیں اسی وقت جہنم رسید نہیں کر سکتی؟ پھر تم کیوں زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر کے آخری موقع کھو رہے ہو! یقین کرو ڈاکٹر کہ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گی۔ میں یہیں چھوڑ جاؤں گی تمہیں!"

اور میں نے اس سے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں تھا۔ میرا ارادہ اسے وہیں چھوڑ جانے کا تھا۔

پھر ڈاکٹر رچرڈ کو میری بات ماننا ہی پڑی۔ میں پھر ہیلی کاپٹر میں آ کر بیٹھ گئی اور سرفراز نے ہیلی کاپٹر کو اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔

میں دوربین سے ڈاکٹر رچرڈ کو اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس حالت میں وہ مجھے کوئی چوپایہ ہی معلوم ہو رہا تھا اور اندر سے وہ چوپایہ ہی تھا۔ اس کے جس ہاتھ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا، وہ کہنی کے بل اسے بھی پتھروں پر ٹیکتا ہوا اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔

جب وہ پہاڑ کی چوٹی سے چند فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے کمانڈر نواز سے ٹرانسمیٹر پر کہا کہ عثمانی کو بتا دو، اسے مہلت نہیں دینی۔

ادھر وہ چوٹی پر پہنچا، ادھر عثمانی اس کے عقب میں فائرنگ کرنے لگا۔ وہ اوپر منہ اٹھا کر ایک مرتبہ چیخا۔ شاید وہ مجھے میرا عہد یاد دلا رہا تھا اور شاید اس نے یہ سوچا کہ میں اپنے عہدے سے پھر گئی ہوں، مگر ایسا نہیں تھا۔ میں اپنے عہد پر قائم تھی۔

اس کے بعد میری سٹین گن بھی شعلے اگلنے لگی۔ اب اس کیلئے سیدھا دوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ گولیوں سے بچنے کیلئے وہ دوڑا اور پھر ...... پھر اپنے آخری انجام تک پہنچ گیا۔ آتش فشاں کے دہانے تک پہنچ کر وہ اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا تھا۔ اس کی آخری چیخ بڑی بھیانک ہی ہوگی۔

اس آتش فشاں پہاڑ کی بلندی پر بالکل درمیان میں ایک گہرا کنواں سا تھا جس کی تہہ میں سرخ لاوا کروٹیں لے رہا تھا۔ میں نے اس کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کی آخری منزل آتش فشاں کا وہی دہانہ ہونا چاہئے۔

کچھ ہی دیر کے بعد میں اپنے عہد کے مطابق ڈاکٹر رچرڈ کو وہیں چھوڑ کر واپس جا رہی تھی۔

اب میری منزل جکارتہ تھی۔

میں اس وقت انڈونیشیا کے ایوان صدر سے لوٹ کر بیگم ماریہ انقہ سنتو مو کی کوٹھی پہنچی تھی۔ صدر سوئیکارنو نے مجھے اپنے ملک کے سب سے بڑے سول اعزاز سے نوازا تھا۔ بیگم ماریہ بھی مجھے اعزاز دیئے جانے کی تقریب میں شریک تھیں۔ یہیں ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ انہیں یہ جان کر شدید حیرت ہوئی تھی کہ میں گزشتہ کئی ماہ سے انڈونیشیا میں تھی۔ مجھے وہ سب سے بڑا سول اعزاز بظاہر پاک انڈونیشیا دوستی مضبوط کرنے کے سلسلے میں دیا گیا تھا۔ یہ بات صرف صدر سوئیکارنو اور چند اعلیٰ افسران کے علم ہی میں تھی کہ دراصل میں نے انڈونیشیا کے دورن قیام میں اس ملک کیلئے کیا اہم خدمات انجام دی تھیں۔

ایوان صدر کے اندر منعقد ہونے والی اس تقریب میں سوناڑدی اور اشار اسماعیل بھی موجود تھے۔ ان دونوں نے بھی مجھے اس اعزاز پر پرجوش مبارکباد دی تھی پھر میں بیگم ماریہ کے ساتھ ان کی کوٹھی پر آ گئی تھی۔ بیگم ماریہ کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں، ان سے میری دوستی بہت پرانی تھی اور اس مرتبہ ان سے ملاقات نہ ہونے کا مجھے افسوس تھا۔ ملاقات ہوتی بھی کیسے کہ میں تو یہاں ایک اور ہی مقصد سے اس بار آئی تھی۔ بیگم ماریہ انقہ ان دنوں بھی ایک بڑے اور اہم سرکاری عہدے پر فائز تھیں۔ انہوں نے مجھے ایک ہفتہ اپنا مہمان رکھا تبھی پاکستان واپسی کی اجازت دی۔ اپنے چاروں ساتھیوں کو میں پہلے ہی پاکستان

واپس جانے کی اجازت دے چکی تھی۔

میں جب پاکستان لوٹ کر آئی تو چند ہی روز بعد میرے محترم وزیر داخلہ نے مجھ سے ملاقات کی۔ انہوں نے پاک بھارت جنگ کے دوران میں آپریشن سیل کی خدمات کا ذکر کیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپریشن سیل ہیڈکوارٹر سے متعلق تمام ارکان کی خدمات مستقل طور پر میں حکومت کے سپرد کر دوں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ صدر مملکت کی بھی یہی خواہش ہے، میں نے ان سے سوچنے کیلئے کچھ وقت لیا۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے وزیر داخلہ کی بات مان لینا چاہئے۔ میرے خدا نے مجھے جو حیرت انگیز صلاحیتیں عطا کی تھیں، وہ مجھ سے واپس لے لی تھیں۔ اپنے ذہن کی حیرت انگیز قوتیں ختم ہو جانے کے بعد اب میں ایک معمولی عورت کی حیثیت سے شاید شر کی قوتوں سے اس طرح نبرد آزما نہیں ہو سکتی تھی جس طرح اب تک رہی تھی۔ سو میں نے اپنے ملک و قوم کے مفاد میں اپنے سرفروشوں کی خدمات حکومت کے حوالے کر دیں۔

اسی کے دوسرے دن مجھے ملک دلاور کا فون ملا۔

''ارے پراسرار خاتون عرف مسمات عذرا خان! یہ اتنے دن سے آپ اپنے عاشق زار کو شربت دیدار کیوں نہیں پلوا رہیں؟'' اس نے اپنے مخصوص شوخ لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ آج کل آپ کہاں کہاں اڑی پھر رہی ہیں۔ آپ کو فون کر کر کے تو انگلیاں دکھ گئیں، واقعی عشق بری بلا ہے!''

''دنیا بدل جائے گی ملک دلاور مگر تم پیدل کے پیدل ہی رہو گے۔ تم آخر کب قاف کو قاف کہنا سیکھو گے!'' میں بولی۔

''اس وقت جب ایک کوہ قاف کی پری میرے گھر کے آنگن میں اتر آئے گی۔ وہ پری تو اتنی ظالم ہے کہ اس نے اپنی ہم شکل پری کو بھی یہاں سے رفو چکر کر دیا ورنہ تو ہم اسی کو دیکھ دیکھ کر دل پشوری کرتے رہتے۔ ملک دلاور کا اشارہ میری چھوٹی ہم شکل بہن ذکیہ کی طرف تھا۔

اس وقت تو میں نے ملک دلاور کو جھاڑ پلا کر فون بند کر دیا، مگر بعد میں مجھے رہ رہ کر کئی روز تک یہ خیال ستاتا رہا کہ میں نے ملک دلاور اور ذکیہ کے ساتھ واقعی زیادتی کی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ میں نے تو خیر تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا مگر بڑی بہن ہونے کے ناطے مجھے ذکیہ کے بارے میں تو سوچنا چاہئے تھا۔ اب تک میری ہنگامہ خیز زندگی نے مجھے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔

میرے ہی ایما پر ذکیہ طویل عرصے سے ہندوستان کے شہر کلکتہ میں قیام پذیر تھی۔ اب ڈاکٹر اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ ذکیہ کیلئے اب کوئی خطرہ نہیں رہا تھا اس لئے چند ہی روز کے بعد اسے میں نے ہندوستان سے بلوا لیا۔

میں نے جب اس کا گھر بسانے کی تجویز سامنے رکھی اور ملک دلاور کا نام لیا تو اس نے نظریں نیچی کر لیں۔

ملک دلاور سے میں نے ذکیہ کی شادی بڑے دھوم دھاک سے کی۔ دہلی اور کلکتہ میں جو

میرے قریبی عزیز تھے بھی اس شادی میں شریک ہوئے۔ انہی میں میرا خالہ زاد بھی تھا جو کلکتہ سے آیا تھا اور ماموں زاد ارشد علی بھی۔ ارشد علی کو اس شادی میں شرکت کرنے دہلی سے آنا پڑا تھا۔

اپنے ماموں زاد ارشد علی کا ذکر پہلے بھی میں اپنی سرگزشت میں کر چکی ہوں۔ وہ پرستش کی حد تک میرے عشق میں مبتلا تھا۔ اس نے اسی لئے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ میرے ماموں نے جب میں صرف چودہ سال کی تھی تو مجھے میری امی سے اپنے بڑے بیٹے ارشد کیلئے مانگ لیا تھا۔ امی اور ماموں کے درمیان زبانی طور پر بات ہو بھی گئی تھی پھر حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔ امی کا انتقال ہو گیا اور ابو ہمیں لے کر پاکستان آ گئے۔ ابو کی وفات کے بعد حالات نے عجیب پلٹا کھایا اور مجبوراً مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑا۔ میں نے نہ صرف اپنی ذمہ داری اٹھائی بلکہ اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کی نگہداشت بھی کی اور اسے بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کیلئے سہارا دیا۔ ذکیہ پاکستان سے مصر چلی گئی تھی اور وہاں اس نے اپنا کاروبار پھیلا لیا تھا۔ اسے پاکستانی شہریت کے ساتھ ساتھ مصر کی شہریت بھی مل گئی تھی۔ اب ملک دلاور سے شادی کے بعد اس نے مصر سے اپنا کاروبار واپس کر کے پاکستان ہی میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ ذکیہ اور ملک دلاور نے مصر کے شہر قاہرہ میں ہنی مون منانے کا فیصلہ کیا تھا اور چند روز کے بعد مصر جانے والے تھے۔

تمام ہندوستانی مہمان ایک ایک کر کے واپس چلے گئے مگر ارشد علی نہیں گیا۔ اس عرصے میں ارشد علی نے مجھ سے ایک عجیب سی خواہش کا اظہار کیا تھا اور میرے لئے اس کی یہ خواہش پوری کرنا مشکل نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اب میں ہندوستان واپس جانا نہیں چاہتا۔ یہاں پاکستان میں رہوں گا تو کم از کم آپ تو میرے سامنے رہیں گی۔ کئی برس پہلے ذکیہ کے سلسلے میں جب میں دہلی گئی تھی تو اس وقت بھی ارشد علی نے میرے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیا تھا اور اب پھر اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ میں نے اسے پاکستانی شہریت دلا دی تھی۔

ارشد علی نے طویل عرصے تنہا رہ کر اپنے عشق کی صداقت کا ثبوت دے دیا تھا اور میں بھی ایک عمر تنہا رہی تھی۔ میں نے جب سے آپریشن سیل کی خدمات حکومت کے سپرد کی تھیں خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے ایک فیصلے تک پہنچنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔

یہ اس روز کا ذکر ہے کہ جب میں اور ارشد علی کراچی ایئرپورٹ پر ذکیہ اور ملک دلاور کو سی آف کر رہے تھے۔ وہ دونوں ہنی مون منانے جا رہے تھے۔ ارشد علی میرے ساتھ ساتھ ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آیا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا اور آج بھی میرا ہاتھ ارشد علی کے ہاتھ میں ہے۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔ زندگی کے طویل سفر میں اب میں اکیلی نہیں ہوں۔ مجھے اب اپنے دشمن کی حیرت انگیز پراسرار قوتیں ختم ہو جانے کا بھی ملال نہیں کہ ارشد علی کی شکل میں مجھے اس سے بھی بڑی قوت و دولت مل گئی ہے۔ عشق سے بڑی قوت و دولت اور ہے بھی کیا!

﴿ختم شد﴾